اِنشاء

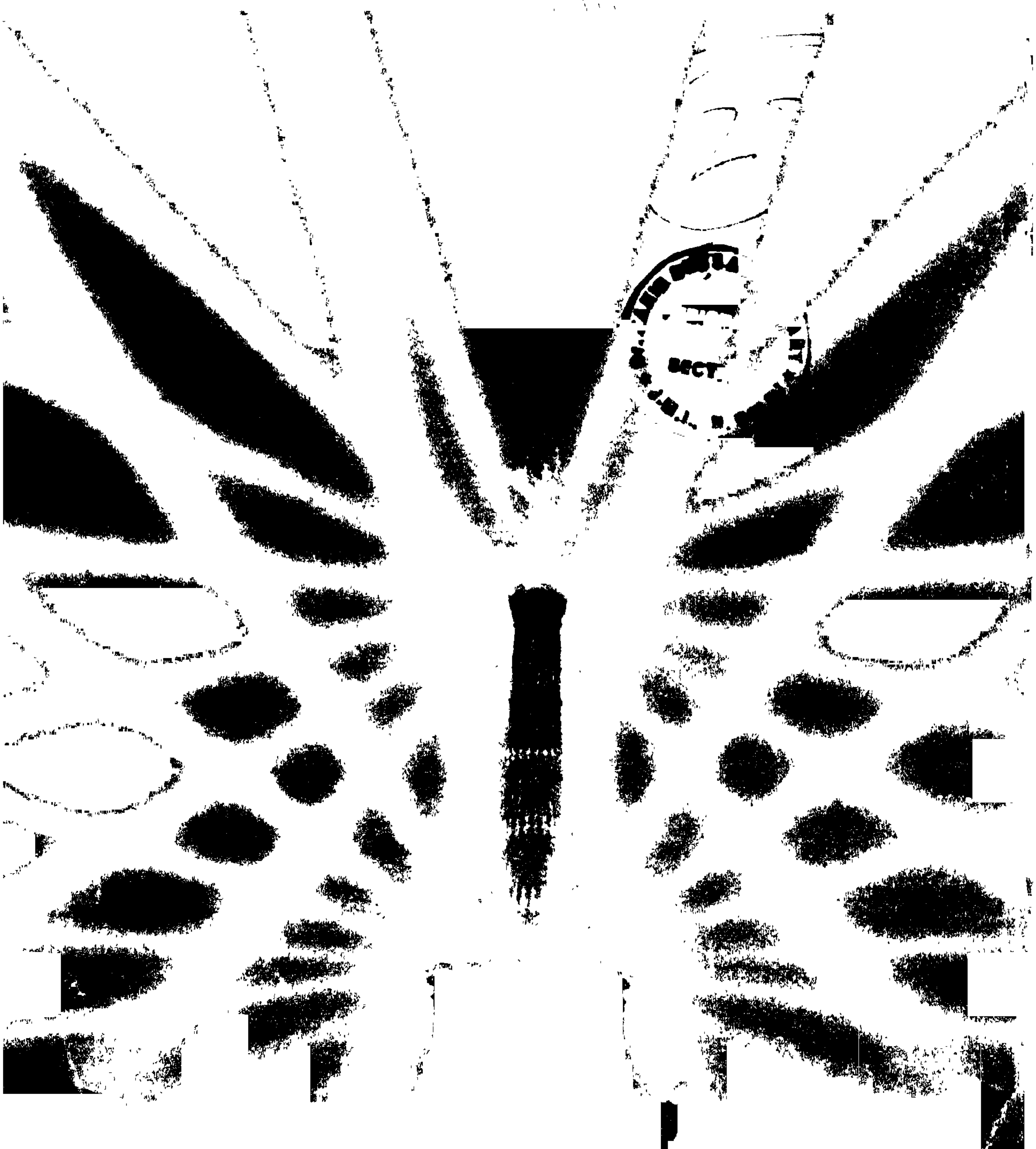
ملینیم۔ عید نمبر

قیمت : -/20 روپے

مضامین : ڈاکٹر جمیل جالبی۔ جسٹس قدیر الدین۔ شان الحق حقی۔ پروفیسر اختر [illegible]
عاشق ہرگانوی۔ ف۔ س۔ اعجاز وغیرہ

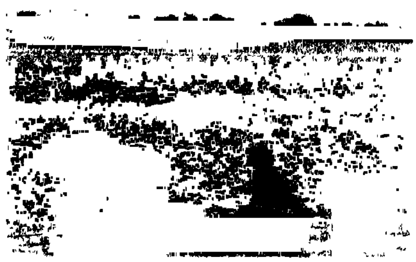
سفرنامہ : اے۔ امیر النساء   صحت اور ہومیوپیتھی : ڈاکٹر [illegible]

افسانے : مقصود الٰہی شیخ۔ رینو بہل۔ دیپک کنول۔ ساوتری گوسوامی۔ [illegible] منظومات
خصوصی گوشے : جہاں [illegible]



پختہ دھاگوں
سے بنی
پکے رنگوں
والی

NAKHUDA



PAHAR CHAND & COMPANY
58, LOWER CHITPUR ROAD
CALCUTTA - 700 073

نفیس
اور
خوشنما
ڈیزائنوں
میں

911 ۹۱۱
Madras Handloom
911
TRADE MARK MADE IN MADRAS
PAHAR CHAND & COMPANY
58 LOWER CHITPUR ROAD
CALCUTTA 700 073

Pahar Chand & Co.
Manufacturers & Exporters of
HANDLOOM COTTON LUNGIES & SHIRTING
98 RABINDRA SARANI
CALCUTTA 700 073 (INDIA)
Tel 21 8461 Fax 091 033 300666
Cable LUNGIKING



انٹرنیشنل کلاس ریڈی میڈ شرٹ وین بیستین

Suitings : **Raymond / Gwalior / OCM**
Shirtings : **Century / Arvind**
Oxford / Nerolene
Beekelen / Cotswool

ہمارے یہاں مکمل ٹیلرنگ شعبہ بھی قائم ہے۔

کے۔ سی۔ ڈے اینڈ سنز

K. C. Dey & Sons

Textile Department
161/1, Mahatma Gandhi Road
Bangur Building, Calcutta - 700 007
Phone : 235-2806 ; 230-0437

آپ کے قریب
ین جوتوں کی دکان پر
ستیاب
ٹس
تے

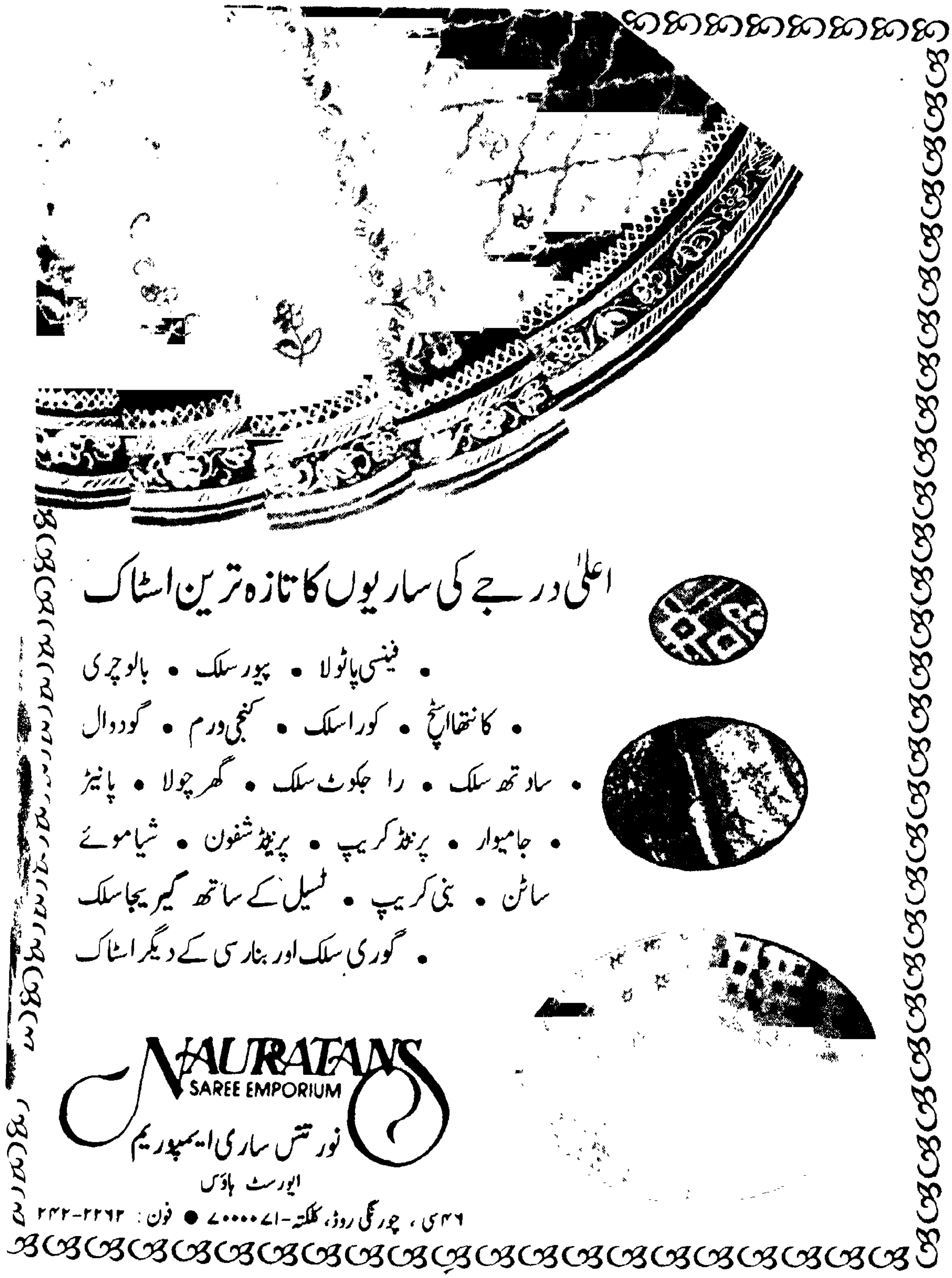
Titas FOOTWEAR



اسکول جوتوں کے ماہر

ؤبل فٹ ویر اینڈ لیدر
سرافٹ انڈسٹریز

۲۵، پولوک اسٹریٹ، کلکتہ-۷۰۰۰۰۱
فون نمبر: ۲۳۵-۱۷۳۶/۲۳۵-۸۱۳۸/۲۳۵


اعلیٰ درجے کی ساریوں کا تازہ ترین اسٹاک
• فینسی پاٹولا • پیور سلک • بالوچری
• کانتھا اسٹچ • کوراسلک • کنجی ورم • گودوال
• سادتھ سلک • راجکوٹ سلک • گھرچولا • پانیٹر
• جامیوار • پرنٹڈ کریپ • پرنٹڈ شفون • شیاموئے
ساٹن • بنی کریپ • ٹسیل کے ساتھ گیریچا سلک
• گوری سلک اور بنارسی کے دیگر اسٹاک
NAURATANS
SAREE EMPORIUM
نورتنس ساری ایمپوریم
ایورسٹ ہاؤس
۴۶ سی، چورنگی روڈ، کلکتہ-۷۰۰۰۷۱ ● فون: ۲۲۲۶-۲۴۲-۲۲۲

قوم گھاٹے میں ہے

دنیا بھر میں پھیلی ہوئی انشاء برادری کو عید کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے ہمیں ازحد مسرت ہو رہی ہے۔ بیسویں صدی کا آخری سال آرہا ہے جس کے ساتھ ہم نئے ملینیم میں داخل ہوں گے۔ قارئین، ادباء و شعراء، مشتہرین اور سبھی خیر خواہ نئے ملینیم کی پہلی عید کی خصوصی مبارک باد قبول فرمائیں۔

گزشتہ دس پندرہ برسوں میں ہندوستان کی سائنسی پیش رفت قابل رشک ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کے تقاضوں اور امنگوں کو ہم کس حد تک پورا کرپائیں گے اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سے ہندوستان کی سیاست کس قدر مستحکم اور ناقابل بھروسہ ہو گئی ہے۔ سیاست اور مذہب کے ناجائز مراسم نے کافی حد تک سنجیدہ قومی اقدار کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اپنے اپنے دائروں میں ہم کسی نہ کسی قسم کے خوف اور عدم تحفظ کا شکار ہیں اور عادتاً ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سیاسی عدم استحکام نے نہ صرف ہمیں انتظامی بلکہ سماجی طور پر بھی بد اخلاق اور کرپٹ بنادیا ہے۔ ہماری اقتصادی ساکھ مضبوط نہیں ہے۔ منطق سیدھا کام کرتی ہے۔ سیاسی حالات سنبھلے ہوئے نہ ہوں اور حکومتیں پائدار نہ ہوں تو معاشی احوال کبھی سدھر نہیں سکتے۔ چنانچہ من حیثیت القوم ہم لٹے پٹے، سیاست کے ستائے ہوئے، بدچلن نظام اور بگڑی ہوئی اخلاقیات کی وراثت کے ساتھ اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے ہیں۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کے مقابل ہمارے کردار کا یہ پہلو شرمناک ہے۔ اور ہم ان قوموں سے سائنس اور ٹکنالوجی کی پیش رفت، وسائل کے استعمال اور نئے وسائل کی کھوج میں مقابلہ کرنے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ہم نے جس قدر ترقی کی ہے اکیسویں صدی میں ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ چلنے کے لئے اتنی ترقی کافی نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ ایک نئے عالمی نظام اور عالمی سائنسی کلچر میں برابر کے حصہ دار نہیں بن سکتے۔ ڈپلومیسی ہمیں بعض معاملات میں قد آور بنا کر پیش کرتی ہے اور ہم کہتے ہیں امریکہ ہمارا مداح ہے اور یہ ہے اور وہ ہے۔ ان باتوں میں کیا دم ہے۔ امریکہ کو ہمنواؤں اور چمچوں کی ضرورت ہے۔ اور ہمیں مہاجنوں کی۔ یہ ڈپلومیسی طوائفیت اور بھڑوائی کا دوسرا نام ہے۔ اٹھارہویں صدی، بیسویں صدی، اکیسویں صدی۔ کوئی صدی آئے کوئی صدی جائے۔ یہ بجائے خود بڑی بات نہیں ہے۔ وقت کی ترقی ہوتی آرہی ہے۔ وہ اپنی عمر بتارہا ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم ترقی کی راہ پر نہیں لگی ہوئی ہے تو وہ یقیناً اپنا آپ گنوارہی ہے۔ صدیاں اور ملینیم وقت کے قدردانوں کے لئے ہی اہم ہوتے ہیں۔ دنیا میں پانچ سو، آٹھ سو سال راج کر کے کتنی قومیں اچانک چند دہوں میں پامال اور برباد ہو گئیں۔

اس موضوع پر جتنا کچھ کہا جائے کم ہے۔ مختصر یہ کہ اگر ہمیں وقت سے کچھ سروکار ہے تو ایک قوم کی حیثیت سے تمام تفرقات اور تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر سخت سے سخت محنت کرتے ہوئے اپنی منزل کے تعین و تعمیر کیلئے کمر باندھ لیں۔ سیاسی اور اقتصادی استحکام کی جستجو اور فطری و مصنوعی وسائل کے ہر ممکنہ اور زیادہ سے زیادہ استعمال کے بغیر ہم نہ پیداوار کا نشانہ پورا کر سکتے ہیں اور نہ نئی ترقی کے امکانات کو جنم دے سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مروجہ لیبر قوانین اور ٹیکس نظام تجارت اور صنعت کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ ان سے کاروباری اولالعزمی کو بڑھاوا نہیں مل سکتا۔ لیبر قوانین سے کام چوری اور ٹیکس کاری کے نظام سے بے ضمیری اور بے ایمانی کو فروغ ہو رہا ہے۔ ہمارے ٹیچر، پروفیسر، ڈاکٹر، وکیل، کاروباری، صنعت کار، انجینئر، مذہبی اور سیاسی لیڈر غرض کوئی بھی سماج میں وہ حصہ ادا نہیں کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہئے۔ کیونکہ موجودہ سیٹ اپ میں وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا ہے۔ اگر کوئی کرتا ہے تو وہ صرف تیاگ کی انوکھی مثال پیش کرتا ہے۔ جب تک پورا سسٹم تبدیل نہ کیا جائے صحیح راہ چلنا مشکل ہے۔ قوانین میں مساوات کی پاسداری کم ہے۔ ہمیں اپنے اس ادھورے پن کا جائزہ ضرور لینا اور لیتے رہنا چاہئے۔ قرآنی نقطۂ نظر سے بجا طور پر ہم وقت کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ انسان خسارے میں ہے۔ اور خسارہ پورا کرنے کی جائز کوششیں یقیناً مستحسن سمجھی جائیں گی، یہ باتیں کاغذ قلم سے زیادہ عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ بات کڑوی مگر سچ ہے کہ بیسویں صدی میں ملتِ اسلامیہ فکری پسماندگی کا شکار رہی ہے۔ اور پچھلی نصف صدی میں برِصغیر میں دین کی اوسط تفسیر کئی زاویوں سے ذہنی اور عملی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہی ہے۔ اکیسویں صدی جرأت کردار، جوشِ عمل اور صحیح وژن کا مطالبہ کر رہی ہے۔ کیا ہم اس صدی میں زندگی کو صحیح مذہب کی طرح اختیار کرپائیں گے؟ کیا ہم وقت کے لئے صحیح تشویش رکھتے ہیں؟ اکیسویں صدی ہمیں ہمارے گھاٹے کا احساس دلا رہی ہے اور کہہ رہی ہے ۔

فیصلہ جو بھی کرو سوچ سمجھ کر کرنا
ورنہ یہ پل کئی صدیوں کا لٹیرا ہوگا

BRAND

SCHOOL BAGS,
SOFT LUGGAGE,
POUCH & FILE BAGS,
SHOPPING BAGS,
TRAVELLING KITS ETC.

Shahenshah International
MANUFACTURERS & EXPORTERS
12, ZAKARIA STREET, GROUND FLOOR
CALCUTTA 700 073
TEL : 235-4026, FAX : 91-33-2356562
PAGER 9610-611468

SRS Gold Medalists

S. Rahmatulla & Sons

Decorators
30/2A, Rani Rashmoni Road,
Calcutta - 700 087
Phone : Off :244-1261 ; 244-8311

صدی اشعار

اپنے ۲۱؍ غزلیہ اشعار بطور خاص قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

ف۔ س۔ اعجاز

اک مسلسل عمل کا ہے ردِ عمل
کس نے تم سے کہا یہ صدی کچھ نہیں

صدی کے آخری کچھ جام پی کر
مرے قدموں کو لغزش ہو رہی ہے

صدیاں بیتیں کہ میرا من صحرا کی طرح سے تپتا ہے
کچھ ابر مری دھرتی پہ بہا کچھ اپنی آنکھ کو پانی کر

صدیوں سے لئے بیٹھا ہوں پتھر کے لبوں کو
اس زخمِ تبسم پہ رلانے کے لئے آ

بہت بدنام ہوتا جا رہا ہے
مرا اور اس صدی کا ایک رشتہ

سکھ لے کر آنے والا پرندہ بھی بھیج دے
مالک تو اس صدی کا چنندہ بھی بھیج دے

ملبے میں دبا بچے کا بدن چیخ رہا تھا
بے درد تھے صدیوں کی روایات کے پتھر

اک چھناکا توڑ کر صدیوں کا سناٹا گیا
ہاتھ سے میرے جہاں چھٹ کر گرا خالی گلاس

اس صدی کے تمام لہجوں پر
چھا گیا انتشار کا لہجہ

پل دو پل کی دھوپ تھی جس نے ہونٹوں کو کجلایا تھا
لیکن کتنی صدیوں ہم نے گایا پیار کا نغمہ، سوچ

اک شخص میرے نام کا کتبہ لگا گیا
میں بیسویں صدی کا انوکھا مزار تھا

زہریلے آدمی کی نگاہوں کی بات ہے
یہ بیسویں صدی کے گناہوں کی بات ہے
اکیسویں صدی کی طرف اٹھ گئے قدم
منزل کی بات ہے نہ یہ راہوں کی بات ہے

برسوں کبھی اک خواب سے چونکے بھی نہیں ہم
صدیوں نہیں سوئے کبھی ایسا بھی ہوا ہے

جو صدیوں سے چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے
وہ پل بھر میں اک بات پیدا کرے گا

سوئے ہیں اس کے پہلو میں ہم بھی پچاس سال
رشتہ کوئی ہمارا بھی ہے اس صدی کے ساتھ

قطرہ قطرہ بیس صدیاں پی چکا ہے آدمی
وقت کا نقشہ الگ ہے سوچتا ہے آدمی
آنے والے دور میں یہ جانے کیا بن پائے گا
بیس صدیوں میں تو اک ایٹم بنا ہے آدمی

اکیسویں صدی ہے ابھی دور سُن ذرا
رسنے لگے ہیں وقت کے ناسور سُن ذرا

فیصلہ جو بھی کرو سوچ سمجھ کر کرنا
ورنہ یہ پل کئی صدیوں کا لٹیرا ہوگا

ہم لوگ اسی بحث میں صدیوں سے پڑے ہیں
پیسہ ہی زمانے کا خدا ہے کہ نہیں ہے

اکیسویں صدی کیلئے تعمیر اور عمل

ڈاکٹر جمیل جالبی
D-26, Block 'B', North Nazimabad
Karachi (Pakistan)

جدھر جایئے، اخبارات اٹھایئے، مضامین پڑھیے، گفتگو کیجیے، ہر طرف اور ہر محفل و مجلس میں اکیسویں صدی کا ذکر ضرور آتا ہے۔ ہر شخص یوں انتظار کر رہا ہے کہ جیسے اکیسویں صدی من و سلویٰ کی صدی ہوگی، ہر طرف خوشیوں کا بازار گرم ہوگا، امن و آشتی کا دور دورہ ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی اس ارض خاکی پر حیوان ناطق کو ضرورت ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی اس صدی میں مسرتوں سے لبالب بھری زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خیال آیا کہ کیوں نہ تاریخ انسانی کی ورق گردانی سے اکیسویں صدی کی فال نکالی جائے تاکہ آنے والی صدی کی ایک تصویر نظروں کے سامنے آجائے۔ معاً خیال آیا کہ اب سے تقریباً بیس سال پہلے بھی چودھویں صدی ہجری ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئی تھی اور پندرہویں صدی ہجری نے وقت کی دہلیز پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اہل پاکستان نے اس صدی کا بھی ایسے ہی انتظار کیا تھا جس طرح آج اکیسویں صدی عیسوی کا کر رہے ہیں، لیکن ہوا یوں تھا کہ ایک دن مغرب کے وقت، جب دونوں وقت ملتے ہیں، پندرہویں صدی ہجری طلوع ہوگئی تھی اور پھر دو چار مہینے کے شور شرابے اور جذباتی عمل کے بعد یہ بھی وقت کی ریت پر اسی طرح جاسوئی تھی جس طرح تیرہویں صدی عیسوی میں بغداد پر تاتاریوں کے حملے کے بعد ہماری صدیاں خواب غفلت کی چادر لے کر گہری نیند جاسوئی تھیں۔ اگر یہ منظر ہماری نسل نے بیس سال پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اب بھی اکیسویں صدی کی آمد ہمارے لیے ایسی ہی ہوگی۔ ممکن ہے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو رات کو ہمارے نوجوان سڑکوں پر نکل آئیں اور پٹاخے جلا کر، پھلجھڑیاں چھوڑ کر اور رنگ برنگ کے گولے فضا میں داغ کر ذرا دیر کو زندگی کی جذباتی و رومانی رونقوں میں اضافہ کر دیں اور پھر وہی دن ہوں اور وہی راتیں جن سے ہم گزشتہ سات سو سال سے گزرتے چلے آ رہے ہیں.

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اگر اکیسویں صدی کو یوں ہی آنا ہے جیسے ہر دن اور ہر رات آتے ہیں تو پھر اکیسویں صدی کا انتظار فی الحقیقت کیا معنی رکھتا ہے؟

مجھے تو کچھ یوں ہی معلوم ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ زندگی کا ایک سیدھا سادا سا دائمی اصول ہے کہ آپ آج جو بوتے ہیں کل وہی کاٹتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آج آپ جو بوئیں اور کل گندم کاٹیں۔ آج ہم نے جو کچھ بویا ہے اور جو کچھ بوئیں گے وہی اکیسویں صدی میں کاٹیں گے۔

اپنے چاروں طرف نظر دوڑایئے تو آپ دیکھیں گے کہ ہم نفرتیں بو رہے ہیں۔ ہم ناانصافیوں سے معاشرے کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کے حقوق سلب کر کے اپنا الو سیدھا کر رہا ہے۔ جبر ہمارا مزاج ہے۔ استحصال اور ناانصافی ہمارا مسلک ہے۔ فرقہ پرستی اور قبائلی انداز نظر ہمارا اصول حیات ہے۔ اختلاف ہماری عادت ہے اور اسی لیے جہاں اختلاف نہیں ہے وہاں ہم اختلاف کے بیج بو کر نئے نئے فتنوں کو جنم دے رہے ہیں۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا کر نئے نئے فرقوں کو اس لیے جنم دے رہے ہیں تاکہ ہم وقتی طور پر سیاسی فائدہ اٹھا سکیں۔ اسلام کے نام پر مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ سب کچھ ذرا ذرا سے ذاتی فائدوں کے لیے کور چشمی اور بے حیائی سے اس طرح کر رہے ہیں گویا ہمارا ضمیر بھی مر گیا ہے۔ جبر کی کھیتی میں نفرتوں کی کھاد اور افتراق و اختلاف کے بیج ڈال کر ہم تیزی سے اکیسویں صدی کی طرف سفر کر رہے ہیں اور نادانی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اکیسویں صدی ہمارے لیے گل و گلزار بن کر خوشیوں کی خوشبوئیں بکھیرنے والی صدی ہوگی۔

غور کیجیے کہ اوپر سے نیچے تک کتنے لوگ ہیں جو آج بامعنی و بامقصد زندگی گزارنے کا دعوا کر سکتے ہیں؟ جسے دیکھیے رزق حلال و حرام سے بے نیاز ہو کر دولت بٹورنے کے عمل میں دن رات لگا ہوا ہے۔ زر پرستی ہماری زندگیوں میں اس طرح در آئی ہے کہ اللہ سے پناہ مانگنے کی خواہش بھی باقی نہیں رہی۔ ہم بے عمل، بے مقصد اور بے معنی زندگی گزار کر اپنے معاشرے کے پانی کو اتنا گندا اور غلیظ کر چکے ہیں کہ اب اس میں سے نکلنے والی تیز بدبو ناک کے بال تک جلائے دے رہی ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے آپ بھی اسی طرح جانتے ہیں جس طرح میں جانتا یا محسوس کرتا ہوں، لیکن

ہم علاج سے گریزاں اور لہٰ و تدبیر سے دور بے عملی کی بیساکھیوں پر گھسٹ رہے ہیں اور بقول سرسید "ہماری قوم کی مثال اس شخص کی ہے جو طبیب سے نسخہ لکھوانے اور دوا استعمال نہ کرے اور چاہے کہ صرف نسخہ لکھوا لینے سے بیمار کو شفا ہو جاوے۔" موجودہ صورت حال میں مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم شاید اکیسویں صدی میں بھی اسی صورت سے زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ غور کیجئے کہ ہم نے اپنے عمل، اپنی فکر اور اپنی جدو جہد و تدبیر سے ایسی کون سی تیاریاں کی ہیں کہ اکیسویں صدی ہماری زخموں سے نڈھال بیسویں صدی سے کچھ مختلف ہوگی؟ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مغربی دنیا کے جو تیور ہیں اور ہوائیں جس سمت چل رہی ہیں، ان کے حساب سے اکیسویں صدی ہمارے لیے نئے مسائل و مصائب کی صدی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی دنیا کی ساری اقوام نے اپنی منزل مقرر کر کے اکیسویں صدی میں نہ صرف داخل ہونے کی تیاریاں کر لی ہیں، بلکہ دس سال پہلے ہی اس صدی میں داخل ہو چکی ہیں۔

قومیں علم و آگہی سے بنتی اور ترقی کرتی ہیں۔ قومیں نفرتوں، بے معنی اختلاف اور فسادات سے نہیں، بلکہ اتحاد، اتفاق اور تدبیر سے آگے بڑھتی ہیں۔ ہم اس سطح پر بھی دنیا کی بیشتر اقوام سے کم زور اور پیچھے ہیں۔ ہم "اقرا" کی تلاوت کرتے ہیں اور با آواز بلند کرتے ہیں۔ علم کے تعلق سے اللہ اور رسولؐ کے احکام کا بار بار اعادہ کرتے ہیں، لیکن حصول علم کے شوق و جذبے سے عاری ہیں۔ اس صورت میں اکیسویں صدی بھی ہمارے لیے یقیناً جہل و لاعلمی کی صدی ہوگی، وہ اس لیے بھی کہ ہم نے جو کچھ آج بویا ہے وہی کل کاٹیں گے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم ہر دم اسلام کی تسبیح پڑھتے ہیں، لیکن اپنے عمل سے ہم نے اپنے باطن میں اسلام کو مسترد کر رکھا ہے۔ ہم انفرادی و اجتماعی طور پر احکام قرآن کی جس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہیں وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ہم نے اسلام کا نسخہ تو لکھوالیا ہے، لیکن نسخے میں لکھی ہوئی دوا استعمال کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ معاملات زندگی اور معاملات انسانی کے تعلق سے قرآن پاک میں جو آیات آئی ہیں آپ ان کی فہرست مرتب کر لیجئے اور اس فہرست کو اپنے اعمال سے ملا کر دیکھئے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ ہم اسلام کے حوالے سے کہاں کھڑے ہیں؟ ہماری موجودہ روش سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی یہی صورت برقرار رہے گی۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ ہم سب اسلام کا ہر وقت نام لیتے اور شور مچاتے ہیں، لیکن اس کی روح پر عمل نہیں کرتے۔ ہمارے شور شرابے کی وجہ سے دشمن اسلام تو بیدار ہو گیا ہے، لیکن ہم خود اس کی حکمت عملیوں سے غافل ہیں۔ اس وقت ساری مغربی دنیا اور امریکا میں بنیاد پرستی کا لفظ کثرت سے بار بار استعمال ہو رہا ہے اور یہ عیسائی تصور، شور مچانے والے بے عمل اور غافل مسلمانوں کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی میں یہ ساری استعمار پسند و سرمایہ دار مغربی اقوام متحد ہو کر اسی طرح بنیاد پرستی پر حملہ آور ہوں گی جس طرح ان سب نے مل کر اشتراکیت پر ہلا بولا تھا۔ اب ان سے مقابلہ کرنے والا سوویت روس، میخائل گورباچوف کے ہاتھوں، ختم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اب انہیں اپنے حریف کے طور پر صرف مسلمان نظر آ رہے ہیں جو شور تو مچا رہے ہیں، لیکن آگے بڑھنے کی تدبیر سے غافل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی اسی کام کے لیے وقف ہوگی جس میں بنیاد پرستی کو ختم کرنے اور محکوم بنانے پر عمل درآمد ہوگا۔

اگر آپ بیسویں صدی پر نظر دوڑائیں تو یہ صدی اپنے زخموں سے چور اور لہو لہان ہے۔ اس وقت فکری سطح پر بیسویں صدی کے پاس کوئی نظام فکر موجود نہیں ہے اور ساری اقوام عالم نئے نظام اور نئی فکر کی تلاش میں سرگرداں ہیں تاکہ اکیسویں صدی میں وہ اعتماد کے ساتھ داخل ہو سکیں۔ انیسویں صدی نے اہل مغرب کو دو نظام فکر دیے تھے۔ ایک وہ نظام استعمار تھا جس پر چل کر مغرب نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور اپنی سائنسی ترقی کی مدد سے ایک ایسا استعمار پسند سرمایہ دارانہ نظام قائم کیا تھا جس کا مزاوہ بیسویں صدی میں دو عالم گیر خونیں جنگوں اور ایک تیسری سرد جنگ کی صورت میں خود بھی چکھ چکی ہے۔ بیسویں صدی میں یہ منظر ہم نے خود دیکھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ سب مغلوب و محکوم اقوام پھر آزاد ہونا شروع ہوئیں اور آج دنیا کی بیشتر اقوام بہ ظاہر آزاد ہو چکی ہیں۔

دوسرا مارکسی اشتراکی نظام تھا جس نے بیسویں صدی کے انسان کو جنت ارضی کا خواب دکھایا تھا۔ اب سے چند سال پہلے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ نظام اندر سے کھوکھلا ہو کر اس طرح بیٹھ گیا جس طرح زلزلے کے ایک شدید جھٹکے سے کوئی کم زور بنیاد کی اونچی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔

اس وقت ساری دنیا ایک نئے نظام کی تلاش میں ہے، ایک ایسے نظام کی جو عدل و مساوات سے دنیا میں امن و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کر سکے۔ حسن اتفاق سے اس وقت اسلام ہی وہ نظام فطرت ہے جو دنیا کے سارے مادی، فکری اور روحانی تقاضے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس طرح ہم اور ساری دنیا ایک نئے عہد کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ یہ صورت حال جو آج موجود ہے، صدیوں میں کبھی کبھار ایسی صورت پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ کام صرف شور مچانے اور اسلام کا صرف ڈھول پیٹنے سے

نہیں ہو سکتا، بلکہ تدبر و تفکر سے اسلام کو عالمی فکری طاقت بنانے سے ہو سکتا ہے۔ اسلام کو عہد حاضر کی زبان اور اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بیسویں صدی کے تاتاریوں کی روح کو مسخ کیا جاسکے۔ یہ کام اختلاف کے فتنے جگانے، محض اپنی سیاسی دوکان چمکانے کے لیے اپنے معاشرے کے باطن میں فرقہ پرستی کو ابھارنے، جہل اور غفلت سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ہمیں اپنے ذہن کے بند دریچوں کو کھولنا ہوگا۔ ہمیں اس وقت امام غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسی ہستیوں کی ضرورت ہے جو کھلے دل و دماغ سے عہد حاضر کے مسائل کو سمجھ کر اس کا حل تلاش کریں اور اسے ایک نظام کی صورت میں پیش کریں۔ سچے دین فطرت کی ترویج و اشاعت کا اس سے بہتر موقع بیسویں صدی کے آخر میں آج صدیوں بعد آیا ہے۔ خدارا اسے ضائع نہ کیجئے۔ اسی عمل سے، اسی راستے پر چل کر آپ اکیسویں صدی کو اپنی صدی بنا سکتے ہیں۔ پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا، اس میں آگے دیکھنے، بڑھنے اور سوچنے والے ایسے معاشرے کو جنم دینے کی ضرورت تھی جو ساری دنیا کے لئے مثال و نمونہ بن سکتا، لیکن ہم نے اس معاشرے کو ناانصافیوں کا گہوارہ، جبر و استحصال کا گڈ دلنا بنا کر بے ایمانیوں اور زر پرستی کا بازار بنادیا۔ اس صورت میں اکیسویں صدی ہمیں اور اکیسویں صدی کو ہم کیا دے سکیں گے؟ یہ سوال ہماری لوح تقدیر پر جلی حرفوں میں لکھا صورت سوال لٹک رہا ہے۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ کوئی دس سال کا عرصہ ہوا، امریکا کے ایک دانش ور فرانس فوکویاما کی ایک کتاب THE END OF HISTORY AND THE LAST MAN کے نام سے شائع ہوئی جس میں سوویت روس کے ٹوٹنے کے عمل کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کا معاشرتی، معاشی و سیاسی نظام مارکسزم / سوشلزم کے آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے، کیوں کہ وہاں ایک ایسا غیر طبقاتی معاشرہ موجود ہے کہ جہاں ہر شخص اپنی پسند کی ہر چیز حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے فوکویاما صاحب فرماتے ہیں کہ ''آپ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ امریکی معاشرے میں مال دار روسی اور چینی بستے ہیں اور روس و چین میں غریب امریکی آباد ہیں جو مال دار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں''۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اس اعتبار سے امریکی معاشرہ مارکسی نظام کے آخری مرحلے پر کھڑا ہے۔'' اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نظریہ یہی ہے کہ اب اس معنی میں تاریخ کا عمل ختم ہو گیا ہے اور اب آئندہ نظریاتی جنگوں کا کوئی امکان نہیں ہے۔

آزاد جمہوریت یعنی لبرل ڈیموکریسی کا نظام قائم ہو چکا ہے اور ساری دنیا اب اسی نظام کی طرف سفر کر رہی ہے۔ یہی انسانی نظام کی آخری منزل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اس نظام کی کامیابی کے دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اس معاشرے نے سائنسی ترقی سے نیچر کو مسخر کر لیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ جو معاشرے سائنس و ٹکنالوجی کے اعتبار سے جتنے طاقتور ہوں گے وہ ان معاشروں پر غالب و حاوی رہیں گے جو سائنس و ٹکنالوجی کے اعتبار سے کم زور ہیں۔'' اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ سائنس کے ذریعے سے فطرت کو مسخر کرنے والے معاشرے بہتر انتظام کے حامل ہیں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے تجارتی اداروں، منڈیوں، سرمایہ دار، صنعت کاروں اور تاجروں کے ذریعے سے اپنی اعلا تنظیمی صلاحیتوں کا بہترین ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ ''دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر خود کو پہچانے جانے کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ آزاد جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر رہ کر ہر شخص تدبیر و محنت سے اپنی اس خواہش کو پورا کر سکتا ہے۔'' یہ بات کہہ کر فوکویاما یہ باور کراتا ہے کہ بس یہی وہ نظام ہے جسے اب دوام حاصل ہوگا۔

غور کیجئے تو یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے فلاحی مملکت اور معیاری زندگی کے تعلق سے جو کچھ حاصل کیا، وہ اس نے جبر و استحصال، استعماریت، نو آبادی نظام اور دنیا کی عظیم تہذیبوں کو تباہ و برباد اور ان کے وسائل پر قبضہ کر کے حاصل کیا ہے اور آئندہ بھی وہ یہی کرے گا۔ اس کی ایک جھلک ہم خلیج کی جنگ میں دیکھ چکے ہیں۔ ملت اسلامیہ کے مرکز بغداد کی تہذیب تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی تھی، جس کے باعث ہم سات سو سال سے آج تک پس ماندہ، کم زور اور بے اعتماد چلے آرہے ہیں۔ اب بیسویں صدی کے تاتاریوں نے دوبارہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر نہ صرف سارے مشرق وسطیٰ کے وسائل پر قبضہ کر لیا ہے، بلکہ وہ اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کے لئے نئی نئی تدبیریں کر رہے ہیں۔ یہ ہے وہ لبرل ڈیموکریسی جسے فوکویاما انسانی نظام کا آخری مرحلہ کہتے ہیں اور جس میں دور بربریت کا اصول ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کار فرما ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر امریکا کے ایک اور دانشور جوزف نائی (JOSEPH NYE) کہہ رہے ہیں کہ ''امریکا دنیا کی حکمرانی کے لئے پیدا ہوا ہے'' اور فوکویاما کہہ رہا ہے کہ ''لبرل ڈیموکریسی کے ذریعے سے اب دنیا تاریخ کے آخری مرحلے میں آچکی ہے۔''

اس وقت سارا امریکا اور مغرب بنیاد پرستی کے خلاف نعرے لگاتے صف آرا ہو رہا ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں بغداد کی تباہی کے بعد ملت اسلامیہ جس صورت حال سے دوچار تھی، اس کو سامنے رکھ کر مثنوی مولانا روم لکھی گئی تھی۔ اس لئے اس میں ایسی حکایات کے ذریعے اعتماد بحال

نے اور مایوسی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی اس وقت مسلم کو ضرورت تھی۔

مولانا روم نے ایک حکایت میں لکھا ہے کہ ایک جنگل میں ایک بردست شیر رہتا تھا جو روز کئی کئی جانوروں کو مار کر کھا جاتا تھا۔ سارے انور پریشان تھے کہ کیا کریں؟ انہوں نے جنگل کے سارے جانوروں کا بلاس بلایا اور غور و فکر کے بعد طے کیا کہ ہر وقت موت کے خوف میں مبتلا ہنے سے بہتر ہے کہ قرعے کے ذریعے سے روز ایک جانور، جس کا نام کلے، خود شیر کے پاس چلا جائے۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ شیر کو اس بات اطلاع دے دی گئی۔ روز قرعہ پڑتا اور جس کا نام نکلتا وہ از خود شیر کے س چلا جاتا۔ ایک دن ایک خرگوش کا نام نکلا اور وہ حسب دستور شیر کی رف چل پڑا۔ یہ وہ خرگوش تھا جس نے اجلاس میں جب یہ فیصلہ سنا تھا تو پنے دل میں کہا تھا کہ وہ ایسی تدبیر کرے گا جس سے شیر سے ہمیشہ کے لئے خلاصی ہو جائے گی جب اس کی باری آئی تو اس نے تدبیر سوچ لی تھی۔ گوش جان بوجھ کر دو گھنٹے کی تاخیر سے شیر کے پاس پہنچا۔ شیر بھوک کے رے غصے میں غرا رہا تھا۔ اس نے جو ننھے خرگوش کو اپنی طرف آتے دیکھا غصے سے بھڑک اٹھا۔ خرگوش نے شیر کو اس حالت میں دیکھا تو عرض کیا حضور! مجھے تو صبح ہی بھیج دیا گیا تھا اور مجھے ہی نہیں، بلکہ میرے ساتھ یک اور خرگوش کو بھی بھیجا گیا تھا، لیکن راستے میں آپ جیسا ایک اور شیر گیا اور ہم پر جھپٹ پڑا۔ میں بڑی مشکل سے بچ کر آپ تک پہنچا ہوں کہ میرے دوسرے ساتھی کو وہ مار کر کھا گیا۔ شیر یہ سن کر غصے میں یا، پوچھا: "وہ شیر کہاں ہے؟" خرگوش نے کہا "وہاں ہے" اور اس ستے پر چل پڑا۔ آگے آگے خرگوش، پیچھے پیچھے شیر۔ چلتے چلتے وہ اسے نویں پر لے آیا اور کہا "حضور وہ اس کے اندر ہے۔" شیر کنویں پر آیا کر جھانکا تو دیکھا کہ ایک ویسا ہی شیر کنویں کے اندر ہے۔ اسے دیکھ کر وہ ستو دیکھا کہ کنویں کے اندر کا شیر بھی غرا رہا ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ جھٹ سے کنویں میں کود گیا۔ اس طرح خرگوش نے حسن تدبیر سے ے جنگل کو شیر سے نجات دلوادی۔

: یہی وہ تدبیر ہے جس کی تیرہویں صدی میں مولانا روم نے تلقین حوا۔ ر یہی وہ تدبیر ہے جس کی آج ہمیں ضرورت ہے۔ اسی تدبیر سے نویں صدی کے تاتاریوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسلام کا نام لے کر شور مچانے سے ہم اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ تدبیر، عمل، اتحاد اور تدبر سے ہم اکیسویں صدی کو اسلام کی صدی بنا سکتے ہیں۔ اس کے وہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بہ صورت دیگر اکیسویں صدی ہمارے لئے ک ہولناک صدی ہوگی!

ناز فش کمپنی

Naaz
Fish
Company

Exporter of fish

(Syed Gauhar Maqsood)

H. I. T. FISH MARKET
HOWRAH - 1

Phone : 660-5755
660-2985

شہر کلکتہ کی منتخب خوش ذائقہ

جنتا مٹھائیاں

سندیش | گلاب جامن | رس گلا | قلاقند | ملک کیک | رابڑی

چم چم | پیسٹری نما مٹھائیاں | لڈو | نمکینیات

مختلف اقسام کے حلوے

Janta Sweet MART

اپنے مہمانوں کی تواضع کے لئے دسترخوان کی
زینت بنائیے۔ ہر تہوار، تقریب، پکنک اور
سفر کے موقع پر جنتا مٹھائیاں نوش فرمائیے۔

جنتا سوئیٹ مارٹ ۵۳۔ اے، کبی تیرتھ سرانی، خضر پور، کلکتہ۔۷۰۰۰۲۳

ن ناتھ آزاد
A 25, Govt. Quart
Gandhi Na
Jammu-180004 (J&

افکارِ تازہ

گفتار تک آزاد! رازِ دل نہ آنے دے کہیں منصور کی روداد پھر تازہ نہ ہو جائے
ں تو دل سے چل کر آنکھ تک پہنچا نہیں لیکن مجھے ڈر ہے یہی قطرہ کہیں دریا نہ ہو جائے
خموشی پردہ دارِ رازِ دل ہوتی تو ہے لیکن
میں ڈرتا ہوں اسی سے رازِ دل رسوا نہ ہو جائے

◈

ہو اُمید مسرت سے کہ اس نے آزاد ایک دن بھی تو مرے دل میں گزارا نہ کیا
ب کی دولت سے رُکے وہ محروم عیش ساحل سے کبھی جس نے کنارا نہ کیا
تری محفل سے، ترا دیکھ کے اندازِ نظر
ہم اٹھ آئے کہ اِسے ہم نے گوارا نہ کیا

◈

پہ کیا کیا ستم روا نہ ہوئے لبِ اظہار تھے کہ وا نہ ہوئے
اِسے مصلحت کہو کہ جنون غم سے الفاظ آشنا نہ ہوئے
یاد پابندِ ماہ و سال نہیں
تم کبھی یاد سے جدا نہ ہوئے

◈

ں کو وابستہ کیا کس نے جنوں سے ظلمت کو یہ تنویرِ سحر کس نے عطا کی
ں ہے ساحل پہ گہر بطنِ صدف میں آزاد! یہ موجوں کو نظر کس نے عطا کی

◈

قاضی رئیس
بسیرا-۱۹۱۰۵ ادیں گلی، باری کالونی
اورنگ آباد 431001
مہاراشٹر

۴ ھائیکو

روشنی ہی روشنی ہے بھاگ میں
کہہ رہا تھا جو تشی
اور میں چُپ چاند کو تکتا رہا

◈

بانس کے شانوں پہ یہ چھپر کھڑے
ٹکٹکی باندھے ہوئے
سوچتے ہیں بارشوں کی آئی رُت

◈

خواب بھی ہیں خوف بھی
پھول پہناتی ہوئی یہ مامتا
اور آنسو آنکھ میں

◈

بارشوں میں اب کے ایسا زور تھا
بالیاں سب جھڑ گئیں
ڈالی ڈالی دانۂ شبنم کھلے

آواز

نیاز جیراجپوری
قمر انٹرپرائز، ۹۰ فٹ روڈ
تلک نگر، ساکی ناکہ،
بمبئی-۴۰۰۰۷۲

وطن آواز دیتا ہے، اٹھو! تیار ہو جاؤ
سنو! اے نوجوانو دیس کے بیدار ہو جاؤ

تمہارے سر پہ سایہ ہو خدا کی مہربانی کا　　خدا رکھے، تمہیں راس آئے یہ موسم جوانی کا
تمہیں دیدار ہو ہر موڑ پر سپنوں کی رانی کا　　بنو عنوان تم عشق و محبت کی کہانی کا
مگر حالِ وطن کے بھی تو واقف کار ہو جاؤ
سنو! اے نوجوانو دیس کے بیدار ہو جاؤ

حسینوں، نازنینوں کے خیال و خواب بسراؤ　　شہید ابروئے خمدار ہو جانے سے باز آؤ
اسیر گیسوئے پُر پیچ و خم ہو کر نہ رہ جاؤ　　ذرا کچھ دیر کو باغِ تصوّر سے نکل آؤ
ابھی تم بے نیازِ جلوۂ دِلدار ہو جاؤ
سنو! اے نوجوانو دیس کے بیدار ہو جاؤ

تمہیں عشق و محبت کے سوا کچھ اور کرنا ہے　　بنانا ہے کوئی خاکہ کسی میں رنگ بھرنا ہے
تمہیں اپنے وطن کے حال پر بھی غور کرنا ہے　　تمہارے ہاتھوں سے کتنے ہی شیطانوں کو مرنا ہے
وطن دُشمن ہیں جو انکے لئے تلوار ہو جاؤ
سنو! اے نوجوانو دیس کے بیدار ہو جاؤ

لو آیا پھر دسمبر، ٹیس اُٹھی اور آنکھ بھر آئی　　ہوئے ماؤف ذہن و دل، اُداسی چہرے پر چھائی
رُلانے چھ دسمبر بانوے کی یاد پھر آئی　　جو مجرم تھے سزا انکو ابھی تک مِل نہیں پائی!
کچلنے کے لئے سر انکا تم تیار ہو جاؤ
سنو! اے نوجوانو دیس کے بیدار ہو جاؤ

تمہیں آزادی کو آزاد بھارت کی بچانا ہے　　گُل یکجہتی اور سُکھ شانتی تمکو کھلانا ہے
تمہیں نام و نشاں فرقہ پرستی کا مٹانا ہے　　بہت سے زخم ہیں جن پر تمہیں مرہم لگانا ہے
یتیموں اور مظلوموں کے تم غم خوار ہو جاؤ
سنو! اے نوجوانو دیس کے بیدار ہو جاؤ

کرو کچھ فکر اپنے دیس کی اور دیس والوں کی　　جرائم اور بدعنوانی، رشوت اور گھوٹالوں کی
تمہارے سامنے فہرست رکھّی ہے سوالوں کی　　تمہیں ہے جُستجو کرنی اندھیروں میں اُجالوں کی
کرو بھارت کو روشن، پیکرِ انوار ہو جاؤ
سنو! اے نوجوانو دیس کے بیدار ہو جاؤ

اکیسویں صدی اور مسلمانوں کا مستقبل

جسٹس (ریٹائرڈ) قدیر الدین احمد (پاکستان)

..........بیسویں صدی عیسوی ختم ہونے والی ہے۔ دنیا بھر کا کاروبار اسی جنتری کے حساب سے ہوتا ہے۔ اس لیے آج کل ساری دنیا کے خیالات اکیسویں صدی کی طرف لگے ہوئے ہیں کہ دیکھیں نئی صدی کن نئے کرشموں کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ یہ استعجاب قدرتی امر ہے، کیوں کہ بہت کم انسانوں کی زندگی میں صدیاں بدلتی ہیں۔ یوں بھی صدی کا بدلنا ایک غیر معمولی شئے ہے، کیوں کہ سو برس گزر چکتے ہیں تو کہیں ایک صدی ختم ہوتی ہے۔ جب یہ وقت آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی انقلاب آنے والا ہے یا شاید نئی دنیا اور نیا آسمان پیدا ہونے والے ہیں، لیکن پرانی صدی کے اطراف میں کوئی حصار بھی نہیں ہوتا اور نہ بڑے بڑے پھاٹک ہوتے ہیں کہ دیواریں گریں اور پھاٹک کھلیں تب نئی صدی میں داخل ہوں۔ سورج اور چاند کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انسان ایک صدی میں رات کو سوتا ہے دوسری صدی میں بیدار ہوتا ہے۔

پھر بھی ہم سب کو اکیسویں صدی کا انتظار ہے، لیکن یقین جانئے کہ صدی کے بدلنے سے ہمارے لیل و نہار بدل نہیں جائیں گے۔ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اب بھی ہوں گی۔ جب تک تبدیلی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، یہی حالات رہیں گے جواب ہیں۔ اس لیے نئی صدی کے لیے تیاری کرنی ہو تب بھی یہی ضرورت شامل حال ہے کہ موجودہ حالات کے اسباب و علل کو اچھی طرح سمجھیں تاکہ اپنے حالات کو بہتر بنایا جاسکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم مسلمانانِ عالم آج دنیا کی پس ماندہ قوموں میں سے ہیں۔ اس لیے ایک کامیاب اور فتح یاب قوم کے وارث ہونے کی حیثیت سے اپنی پس ماندگی پر کچھ نادم اور کچھ حیران ہیں۔ میری اب تک کی عمر بھی اسی شرمندگی اور اچنبھے میں گزری ہے کہ ہم کو کیا ہو گیا؟ اپنی عمر کی آٹھ دہائیاں گزارنے کے بعد اور حالات کے انکشاف سے اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ پس ماندگی کے چھوٹے چھوٹے اسباب کتنے ہی ہوں ہمارے بنیادی سقم دو ہی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم دنیاوی علم و ہنر میں بہت پیچھے اور نکمے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنگ کے میدانوں میں شکست پر شکست کھاتے ہیں اور علم کے میدانوں میں غیروں کا منہ تکتے رہتے ہیں۔ ہماری دوسری بھول یہ ہے کہ ہم نے اپنے دین سے روحانی اور اخلاقی ہدایت کی طرح اس ہدایت کی توقع بھی رکھی جس کو مہیا کرنا طرح طرح کے دنیاوی علوم و فنون کا کام ہے۔ ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ طب، جراحی، انجینئری، اقتصادیات، نفسیات، طبیعات، علم کیمیا، ان سب کی ہم کو ضرورت نہیں، کیوں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اللہ خود ہمارے سارے کام کر دے گا، یہ اس کا کام ہے، کیوں کہ ہم تو بس ایمان لے آئے۔ حال آنکہ اللہ نے کہہ دیا تھا کہ

لیس للانسان الاّ ما سعیٰ (النجم: ۳۹)

(اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی)

جب ان غلطیوں کے نتیجے میں ہم ناکارہ ہو گئے اور ہر میدان میں خوار ہوئے تو ہمارے نوجوان ہم سے بدظن ہو گئے اور ہمارے ہاتھوں ہمارے دین سے بھی مایوس ہو گئے۔ اب ان کے دلوں پر اہل مغرب کا رعب ہے اور انہی کے قول پر اعتبار ہے۔ اب ان میں وہ لگن کہاں جس کی ہم کو تلاش ہے۔ جہاں بددلی ہو وہاں کیا لگن اور لگاؤ ہوگا۔

غور سے دیکھئے تو ہمارے معاشرے میں مذکورہ دو ہی بنیادی عیب ہیں۔ سارے کانٹے انہی دو بیجوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے ان دونوں کی تھوڑی تھوڑی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اولاً علم سے بے تعلقی کو لیجئے۔ یہ گریز ہم نے بہت ہی نیک نیتی سے کیا تھا۔ بدعت سے بچنا چاہا۔ بے یقین اور غیر نافع تحقیق میں تضیع اوقات سے منہ موڑا۔ دنیا طلبی کی آلائش سے دور رہے، لیکن اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ قدرت نے اپنے راز اس طرح مستور رکھے ہیں کہ ان کی تلاش میں سرگردانی لازمی ذریعۂ علم ہے۔ ان تک پہنچنے کے لیے پہلے سے کوئی راستہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ بس اس غلطی کی پاداش میں صدیوں کا فرق پڑ گیا اور ہم پیچھے رہ گئے، بلکہ بہت پیچھے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

ہمارے بہت سے علمائے حق نے اس جائز خوف سے بھی آگاہ کر کے ہم کو اس لیے جستجو سے روک دیا کہ تلاش راہ میں انسان بہت سی مقدس وادیوں سے بھٹک جاتا ہے۔ اس اجمال کی مثالیں ایسی ہیں کہ ان سے بعض آیات ربانی اور احادیث نبوی کے تسلیم شدہ معانی کی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً زمین کے گول اور چپٹے ہونے کا سوال اٹھا۔ سورج کے قائم رہنے اور گردش کرنے کا اختلاف پیدا ہوا۔ آسمان کے وجود اور عدم وجود

کے مسئلے در پیش آئے۔ جو بندہ خدا ترس ہوتا ہے اس کا صاحب علم و فراست ہونا ضروری نہیں ہوتا اور دور رس انسانوں کے مقابلے میں کوتاہ نظر زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے راستہ روکنے والے زیادہ پیدا ہوئے اور راہ دکھانے والے کم۔

یہاں پہنچ کر میں امام غزالیؒ کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کے دیباچے کو دیکھتا ہوں تو تعجب میں رہ جاتا ہوں کہ کوتاہ نظر رکھنے والوں کو انہوں نے کس قدر سختی سے دھمکایا ہے اور ان کے خلاف ناقابل تردید دلائل پیش کر کے سائنسی تحقیق کی طرف داری کی ہے۔ انہوں نے فلسفے کی خیالی قلابازیوں کی پرزور مذمت کی ہے، لیکن ان علوم کی پوری پوری طرف داری کی ہے جن کی بنیاد ظن، اندازوں اور قیامت پر نہیں، بلکہ واقعات و مشاہدات اور حتمی ثبوت پر رکھی گئی ہو، جیسے ریاضی اور تجرباتی علوم ہیں۔

امام صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب کے چار چھوٹے چھوٹے دیباچے لکھے ہیں۔ وہ اس قدر کارآمد اور جدید حالات کے مطابق ہیں کہ آج کل ہم سب کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ اسلام کی وسعت خیالی سے ہم واقف ہو جائیں۔ وہ ایک جگہ مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ جو شخص علم فلکیات سے خوب واقف ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس علم میں اس قدر صحت ہے کہ اس کے ذریعے سے اجسام فلکی یعنی چاند، سورج وغیرہ کی حرکتوں کے متعلق پیش گوئی تک کی جاسکتی ہے۔ اگر آپ اس شخص کے سامنے اپنا یہ موقف پیش کریں کہ اس کا علم عقیدۂ دین کے خلاف ہے تو آپ اس کے اس اعتقاد کو تو جڑ سے ہلادیں گے جو اس کو دین میں ہوگا، لیکن وہ اپنے علم کو نہیں چھوڑے گا۔ انہوں نے ایک دو ایسی احادیث کی مثالیں بھی دی ہیں جن کو علم فلکیات کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور پھر لکھا ہے کہ وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ مزید کہا ہے کہ اگر وہ قابل اعتبار ہیں تو دین کی طرف داری کی خاطر ان کی ایسی تشریح اور تفسیر کرنی چاہئے کہ اس علم سے نہ ٹکرائیں جس کو صدہا تجربوں نے صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آپ خود اس دیباچے کو پڑھیں کیوں کہ میں اس کا انتصار اپنے چند الفاظ میں کر رہا ہوں، لیکن میری زبان میں وہ اثر نہیں ہو سکتا جو ان کی زبان میں ہے۔

میری غرض یہ جتانا ہے کہ مسلمانان عالم کا کام اب یہ ہے کہ علم و ہنر میں دنیا کی قیادت حاصل کریں۔ یہ میری پہلی عرض ہے۔

میری دوسری غرض یہ ہے کہ کلام اللہ اور احادیث نبویؐ سے ہم کو پورا فائدہ اس وقت حاصل ہوگا جب ہم اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ ہم حالات دنیا اور ضروریات وقت سے واقف ہوں۔ بغیر اس صلاحیت کو حاصل کیے ہم کچھ بھی پڑھیں اور کتنی بھی مرتبہ اس کا مطالعہ کریں، یہ سب ہم کو فقط صحیح اور غلط، اخلاقی اور غیر اخلاقی، روحانی اور غیر روحانی کے فرق کی صرف پہچان عطا کرے گا۔ ہم اس فرق کے مطابق اللہ کی سرزمین پر قدم بڑھانے کے قابل نہ ہوں گے، کیوں کہ اس سرزمین کا راستہ تو اس پر قدم بڑھانے سے معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ راستے کون سے ہیں تب ہی تو ہم صحیح اور غلط کی تعریف سے مدد لے کر کوئی راستہ اختیار کر سکیں گے۔

اس معاملے میں مجھے حضرت عمرؓ کا عمل اور ان کی اجتہادی مثالوں میں بڑی اعلا، کارآمد اور انوکھی ہدیت نظر آتی ہے۔ ایک مثال یہ ہے کہ جب شام اور عراق کو مسلمانوں نے فتح کر لیا تو حسب دستور فوج نے مطالبہ کیا کہ یہ زمین مال غنیمت ہے، لہٰذا اس کو فوج کے سپاہیوں اور افسروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ عربوں کا قدیم دستور بھی تھا۔ کلام اللہ میں بھی مال غنیمت کی تقسیم کی ہدایت ہے اور زمین کو بطور مال غنیمت رسول اکرمؐ نے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول نے بھی تقسیم کیا تھا، لیکن اس نظیر کے باوجود حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ شام اور عراق کو بطور مال غنیمت تقسیم نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ یہ ملک ہیں۔ اگر ان کو بانٹ دیا گیا تو ان کے انتظام کے اخراجات اور یہاں کے غربا کی ضروریات کو پورا کرنے کے اخراجات کہاں سے نکالے جائیں گے؟ کئی روز تک یہ بحث رہی۔ آخر کار حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے اپنی تجویز کی تائید کلام اللہ سے حاصل ہو گئی۔ چناں چہ سورۂ حشر کی وہ آیات تلاوت فرمائیں جن میں ارشاد ہے کہ جب اہل شہر کی زمین تمہارے ہاتھ آئے تو وہ اللہ اور رسولؐ اور غریبوں وغیرہ کے لیے ہے اور اس میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو لوگ تمہارے بعد آئیں گے۔ چناں چہ انہوں نے فرمایا کہ سارا مال و دولت تقسیم کیا جائے گا، لیکن زمین آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رہے گی۔ اس طریقۂ اجتہاد پر غور کیجئے تو ظاہر ہو جائے گا کہ زمین کو تقسیم نہ کرنے کی تجویز حضرت عمرؓ کے تجربے اور تدبر کا نتیجہ تھی۔ یہ تجویز کلام پاک میں موجود نہ تھی۔ ان کے تدبر نے ان کو بتایا کہ ممالک کو فتح کر کے انہیں خانگی جائدادوں کی طرح بانٹ دیا گیا تو سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ جب لوگوں نے ان کی اس تجویز سے اختلاف کیا تو پھر اس کی تائید میں آیات کلام اللہ پیش کیں۔ یہ ہے کلام اللہ سے استفادہ کرنے کا صحیح طریقہ۔

یہ الفاظ دیگر کلام اللہ اور احادیث سے تجاویز کی صحت اور غلطی کی جانچ ہو سکتی ہے، لیکن معاملات دنیا کی تجاویز اور تدبیر کا سوچنا اور حالات کا سمجھنا خود مومنوں کا کام ہے۔ یہ کام بہ طریق احسن اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب مسلمانوں میں وافر علم و ہنر ہو۔ اس میں کمی ہو گی تو حالات بھی دگرگوں ہوں گے اور اگر علم و ہنر میں مسلمان یکتا ہوئے تو ان کے حالات بھی قابل دید ہوں گے۔ کیا متبرک دعا ہے

رب زدنی علما (طٰہٰ: ۱۱۴)

(اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اول تو ہم مسلمان، یہ سمجھ کر کہ جدید علم کی طرف بھاگنا بدعت اختیار کرنا اور ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے، علم وہنر کی ایجاد سے دور رہے اور مات پر مات کھاتے رہے۔ حال آنکہ علم کا حاصل کرنا نہ صرف نیک کام ہے، بلکہ پوری طرح تحقیق شدہ اور ثابت شدہ علم کی مخالفت کرنا دین کی طرف داری کے بجائے دین کے مخالفین پیدا کرنے کے برابر ہے۔ میرا دوسرا معروضہ یہ ہے کہ کلام اللہ اور احادیث رسول اللہؐ ان لوگوں کے کام آتے ہیں جو بات کو سمجھتے ہیں۔ چناں چہ سورۂ فاطر کی انیسویں آیت میں ارشاد الٰہی ہے:

وما یستوی الاعمیٰ والبصیر

(اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے)

ایک دوسری سورت میں یہ بھی ارشاد ہے:

وما انت بھٰدالعمی عن ضلالتھم (الروم: ۵۳)

(اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ راست دکھا سکتے ہو)

یوم عید سعید پر
قارئین انشاء
کو دلي مباركباد
اور
نیك خواهشات

محمد ارشد جمال
۳، گرین پارك
كلكته-۱۹

KHIZAR & CO.
KHIZAR & CO
PHILIPS
LUNGIES AND HANDKERCHIEFS
MANUFACTURERS OF
PHILIPS & BONUS
BRAND
HANDLOOM LUNGIES

98, RABINDRA SARANI
CALCUTTA - 700 073
PHONE : 235-8548
RESI. : 238-7698

حاجی انیس دہلوی

۲۹۳۶، ترکمان گیٹ، دہلی-۶

ہر قدم میرے لئے آپ امتحاں لکھ دیجئے
آسماں اک اور زیرِ آسماں لکھ دیجئے

جھوٹ سچ کا فیصلہ قدرت پہ میں نے رکھ دیا
آپ میری محنتوں کو رائگاں لکھ دیجئے

میرا دعویٰ ہے چمک جائیں گے سارے بام و در
پھر جبینِ ہند پر اردو زباں لکھ دیجئے

اس ستم ایجاد کی فطرت بدلنے سے رہی
جانِ جاں لکھئے اُسے یا مہرباں لکھ دیجئے

نفع کی اُمید سے دل پہ لگیں گے اور زخم
آپ تو میرے لئے سارے زیاں لکھ دیجئے

آدمی تو اب نظر آتا نہیں ہم کو کہیں
اے انیس انسان کو چنگیز خاں لکھ دیجئے

دو نظمیں

عنبر بہرائچی

سارنگی کا درد

سارنگی کا درد، سماعت میں آنسو بن کر لہرائے
بنجارے کے خشک لبوں سے گیت وفا کے ہر سو بکھرے
ندی کنارے بے پرواسی ہیر کٹورے مانجھ رہی ہے
جھل مل پانی میں، لہروں کا مالکونس، دل چیر رہا ہے
ذہن میں آخر یہ کیسی طغیانی آئی؟
آج بھی وہ پیکر جو دل کی دھڑکن ٹھہرا
ذہن میں مکڑی کے جالوں سے گھرا ہوا ہے

OOOOOO

ساتھ نبھا لیتی ہیں

ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہہ ڈال کر
سانسیں لینا کتنا ہرا بھرا لگتا ہے
بھینس گھاس چرتی رہتی ہے
چڑیا، اُس کے جسم کے کیڑوں کو چن چن کر
شکم سیر ہوتی رہتی ہے
دونوں اپنی ذات میں گم ہیں
پھر بھی ساتھ نبھا لیتی ہیں
خام کنویں کے سوراخوں میں
چند پرندے بھی رہتے ہیں
ڈول کھینچتا رہتا ہے دہقان، مگر وہ
بے پروا اڑتے رہتے ہیں
دانہ چگ کر آجاتے ہیں
جفاکشی کا پیکر
پانی کھینچ کھینچ کر
کھیتوں میں بھرتا رہتا ہے
سورج شاباشی دیتا ہے
چاند تازگی بو جاتا ہے



انسانی سماج کا سب سے بڑا مسئلہ

شان الحق حقی
(پاکستان)

سال یا صدی کا بدلنا ایک نفسیاتی لمحہ ہوتا ہے جس کے گذرنے کے بعد زندگی پھر اپنے ڈھرے پر آجاتی ہے۔ یہ تجربہ ہم ۱۲/ برس پہلے پندرہویں صدی ہجری کے آغاز پر کر چکے ہیں۔ اس کے بعد کا منظر ہمارے سامنے ہے۔ ہجری صدی یقیناً ہمارے لیے زیادہ معنی رکھتی تھی، اگرچہ رائج الوقت بین القوامی کلنڈر سے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہے، کوئی ذہنی تعصب نہیں رکھتا۔ انبیائے کرام کو ماننا ہمارے کلیے کا جزو ہے۔

عام طور پر اکیسویں صدی کا تصور یہ ہے کہ یہ بڑی دھوم سے اپنے ساتھ مزید سائنسی انکشافات اور تکنیکی کارنامے لے کر آئے گی۔ سچ یہ ہے کہ انسانی سماج کا سب سے بڑا مسئلہ اخلاقی مسئلہ ہے۔ اکیسویں صدی اگر اخلاقی اقدار کو اعتبار و استحکام نہیں بخشتی تو اس کے تمام تکنیکی کارنامے ہیچ کہلائیں گے اور مزید فساد پھیلا سکتے ہیں۔ سوویت یونین کے زوال نے فی الوقت خلائی جنگ کی ہول ناک تیاریوں کو روک دیا ہے۔ ہمارے مسلم ممالک کی آزادی کے علاوہ انسانیت کے حق میں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوا ہے، ورنہ خود سوویت عمل داری میں اکثریت بعض صعوبتوں میں مبتلا ہوگئی ہے اور صرف ایک محدود طبقے کے لیے ذاتی منفعت اندوزی کے مواقع کھلے ہیں:

آملے ہیں سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

یعنی روسی منفعت خواہ مغربی سرمایہ کاروں کے ساتھ ایک حلقے میں شامل ہوگئے ہیں۔ عام امریکی باشندہ انسانیت سے عاری نہیں، کیوں کہ پڑھا لکھا بھی ہے اور خوش حال بھی، لیکن امریکی اہل سیاست کا فکر و عمل کوری شادانیت پر مبنی ہے جو انسانیت کے حق میں کوئی اچھے آثار نہیں۔

جیسا کہ عرض کیا، پہلا مسئلہ اخلاقی مسئلہ ہے جو ایک طرف انسانیت کے وقار اور دوسری طرف معاشرے کے نظم و ضبط سے عملی تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ لازمی طور پر معاشی ہے۔ تیسرا تہذیبی یعنی علم و فن کی ترقی کا ہے جو ارتقائے حیات کا پیمانہ ہے۔ اخلاقی مسئلے کے ساتھ عقائد کا مسئلہ وابستہ ہے۔ مذہب عموماً انسانی اخلاق کو سدھارنے میں ناکام رہا ہے، لیکن اس نے اخلاقی تصورات کو زندہ رکھا ہے جو اپنی جگہ بڑی بات ہے۔

دنیا چند تصورات ہی کے سہارے قائم ہے۔ اسی مثال پر ہماری شاعری نے محبت کے تصور کو اپنایا اور زندہ رکھا۔ یہی اس کا جواز ہے۔ محبت شاعری کا بنیادی حوالہ ہے۔ بعض لوگ اکیسویں صدی میں شاعری کے زوال کے آثار دیکھتے ہیں۔ یہ دنیا کے لیے کوئی خوش آئند بات نہ ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ شاعری بھی محبت کے تصور کو تیاگ کر اپنا جواز کھو بیٹھے گی۔ خواجہ میر درد نے کیا اچھی بات کہی تھی ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

مذہب اخلاق کا نگہبان رہا ہے۔ کارخانۂ قدرت میں انسانی خمیر جس طرح تیار ہوتا رہا ہے، اس میں، استثنائی صورتوں سے قطع نظر، مصور سے زیادہ جذبے کی آمیزش ہے۔ انسان معقولات کی نسبت منقولات میں زیادہ یقین رکھتا ہے۔ معقولات تو اپنے آپ کو زبردستی منواتے ہیں اور خود اپنی حجت بن جاتے ہیں۔ منقولات آنکھ بند کر کے قبول کیے جاتے ہیں۔ مذہب کا اخلاقیات سے گہرا تعلق ہے، کیوں کہ مذہب ہی انسانوں کو اخلاقی قدریں مہیا کرتا رہا ہے۔ علم الاخلاق (ETHICS) تو آج تک اچھے اور برے کا اصولی پیمانہ ہی وضع نہیں کر سکا۔ اخلاقیات کا مطالعہ نظریات کے ایک طویل سلسلے اور ان پر اہل بصیرت کی نکتہ چینی پر مبنی ہے جس سے عملی ہدایت حاصل نہیں ہوتی۔ مذہب کوئی فکری مکتب نہیں، بنیادی طور پر ایک جذباتی معاملہ ہے۔ چناں چہ بعض باتیں تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ایمان بالغیب، جس کی صلاحیت قدرت نے فراوانی سے بخشی ہے اور اسی سے مذہب کی ابتدا ہوتی ہے۔ ماننے کی خاطر مان لینا۔ بحث میں پڑیں تو اس کا اتمام آج تک نہیں ہو سکا۔

۲۔ مقدس پیشوا، اکابر، شخصیات

۳۔ صحائف، خواہ سماوی ہوں یا مذہبی اکابر کے مرتب کردہ، ہر مذہب میں موجود ہیں۔

۴۔ رسوم و روایات، جن کی تعمیل کرانے کے لیے ایک خاص طبقہ پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ اوامر و نواہی، جن کا اخلاقی یا عقلی جواز لازمی نہیں۔ خواہ بنفسہ موجود ہوں۔ یہ ایک طرح کا ڈسپلن عائد کرتے ہیں۔

۶۔ عبادات، مناجات، ادعیہ۔

۷۔ رموز و علائم (TOTEMS AND TABOOS)

۸۔ تیج تہوار

۹۔ متفرعات، تاریخ سے ظاہر ہے کہ ہر بڑا مذہب مختلف فروعات

میں تقسیم ہو جاتا ہے جن کے درمیان کشمکش بھی رہتی ہے، کیوں کہ مذہب بنیادی طور پر ایک جذباتی معاملہ ہے۔

۱۰۔ عصبیت، جو دراصل عقیدے کا معکوس رخ ہے۔ جتنا پختہ عقیدہ ہوگا اسی نسبت سے اس کے حق میں تعصب ہوگا جو اکثر شدت اختیار کر جاتا ہے۔ چناں چہ تاریخ کی بہت سی خونی جنگیں عقائد کے اختلاف پر رونما ہوئیں اور آج بھی لوگ عقیدے کے نام پر خون بہانے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔

انسان ایک معاشرت پسند مل جل کر رہنے والی مخلوق ہے، لیکن اس کے ساتھ خود پسند و خود غرض بھی ہے۔ انسان کے ارتقا یعنی اخلاقی ارتقا کا اصل پیمانہ یہ ہے کہ فرد نے کس حد تک اپنی جبلی غایات کو سماجی غایات کے لیے قربان کیا۔ سو اب تک ان میں توازن قائم نہیں ہو سکا ہے۔ رسماً کچھ تکلف، تپاک یا ملاحظہ ضرور برتا جاتا ہے۔ اس میں یقیناً مذہبی تلقین کو بھی دخل ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے فرد کی خود پرستی شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے بعد سے متضاد فکری رجحانات کار فرما رہے ہیں۔ ایک کا سلسلہ روسو سے ملتا ہے اور دوسرے کا روس سے۔ ایک شہنشاہی جبریت کے خلاف فکری رد عمل تھا اور دوسرا سرمایہ داری استحصال کے خلاف۔

جیسا کہ عرض کیا فرد اپنی سماجی ذمے داریوں سے اور زیادہ آزاد ہوتا جا رہا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ایک طرف اولاد اور دوسری طرف اب و جد کا پاس اٹھتا جا رہا ہے۔ بوڑھے والدین کو دار الضعفا میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اولاد بھی کھلنے لگی ہے۔ یہ بحث بڑی دور تک جا سکتی ہے، لیکن اب میں اپنے قریبی ماحول کی طرف گریز کرتا ہوں، جہاں کا منظر اور بھی ہول ناک ہے۔ میری مراد صرف ان تشدد کی وارداتوں سے نہیں جن کی خبریں روز اخباروں میں آتی ہیں۔ دراصل بات بہت دور تک جاتی ہے۔

پہلے بعض لوگوں کی بابت کہا جاتا تھا کہ باپ دادا کی ہڈیاں بیچ کر کھاتے ہیں۔ اب ایک متضاد صورت کا سامنا ہے۔ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی ہڈیاں ان کے پس پشت گروی رکھ رہے ہیں۔ ہر نسل اس بات پر فخر کرتی ہے کہ ہمارے اجداد ہمارے لئے کیا مادی یا تہذیبی اثاثے چھوڑ کر گئے۔ کیا کارنامے انجام دے گئے۔ غور کیا چاہیے کہ ہم اس کے برخلاف اپنے بچوں کے لیے کیا وبال چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہم ایک ایسے چکر میں گرفتار ہو گئے ہیں جس سے مخلصی کی بہ ظاہر کوئی صورت نہیں، کیوں کہ حالات کی عنان ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ ہم سیاسی محکومی سے بھی بڑھ کر ایک طرف فکری اور دوسری طرف معاشی محکومی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور یہ کرشمہ ہے علوم و حکمت کو پس پشت ڈالنے کا جو آج تک جاری ہے۔ علم کی طرف سے یہ بے توجہی کہ پرجا کی سوچ کو سوتا رہنے دیا جائے، ایک طرف شہنشاہیت کی پسند خاطر تھی تو دوسری طرف مذہبی اجارہ داروں کے موافق مطلب تھی۔ حال آنکہ قرآن حکیم سراسر علم و حکمت پر زور دیتا ہے۔ ہم بڑے شد و مد سے بلا سوچے سمجھے دعوا کرتے ہیں کہ قرآن حکیم نے ہم کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دیا ہے۔ مکمل ضابطۂ حیات آپ منو شاستر کو کہہ سکتے ہیں، بلکہ چانکیہ کے ارتھ شاستر کو بھی جس میں ہر طرح کے جزوی احکام موجود ہیں۔ قرآن حکیم کے حتمی احکام کاغذ کے ایک ورق پر لکھے جا سکتے ہیں۔ باقی مسائل ہمیں عقل، فہم اور شعور سے حل کرنے ہیں۔ یہ قرآن حکیم کے متوار د الفاظ ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انتم اعلم با مور دنیا کم (صحیح مسلم)

(تم اپنے دنیاوی معاملات کو خود بہتر سمجھتے ہو)

قرآن نے کوئی جکڑ بندی ہم پر عائد نہیں کی ورنہ اس کا یہ دعوا پامال ہو جاتا کہ وہ اللہ کا آخری پیغام اور ہر دور کے لیے بر حق ہے۔ اس نے ہمارے لیے مابعد الطبیعاتی مسئلے کو طے کر دیا اور عملی زندگی کے لیے کچھ رہنما اصول بتا دیے جن میں سب سے زیادہ زور عدل و احسان اور وسط و توازن پر ہے اور نواہی میں سب سے زیادہ زور زر اندوزی کی طرف ہے۔ ہم غور و فکر اور قانون سازی کی ذمے داری سے سبک دوش نہیں کر دیے گئے جو مسلسل جاری رہتی ہے اور جس کے لیے قانون ساز ادارے قائم ہیں۔

جہاں تک معاشی مسئلے کا تعلق ہے، اب دنیا اس دور میں داخل ہو چکی ہے کہ انسانی وحدت کا تصور ایک عملی صورت اختیار کر لے۔ اسی میں پوری انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ دنیا کے مادی وسائل جن سے ابھی پورا کام نہیں لیا گیا اتنے وافر ہیں کہ پوری انسانیت کے لیے کافی ہو سکیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ پیداواری تکاثر (MASS PRODUCTION) بھی بڑھ رہا ہے اور آبادی سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھا ہے۔ ایک مشین ایک دن میں لاکھوں آدمیوں کا کام نمٹا دیتی ہے۔ سمندر میں موجود غذائی وسائل کو بروئے کار لانے کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ اقوام متحدہ کی پیش کردہ ایک رپورٹ کے مطابق، جو میری نظر سے گزری تھی، امریکا میں جتنی غذا ضائع ہو جاتی ہے وہ افریقہ کی بھوکی آبادی کا پیٹ بھر سکتی ہے۔ دنیا کی موجودہ تمام آبادی امریکا کی ایک ریاست TEXAS میں بسیرا کر سکتی ہے۔ بے شمار زمین جو بنجر پڑی ہے زیر کاشت لائی جا سکتی ہے۔

مختصر یہ کہ اگر اکیسویں صدی ایک طرف مذہبی و فکری رواداری، دوسری طرف اخلاقی اقدار کی بحالی اور تیسری طرف ایک متحدہ دنیا کے تصور کو حقیقت نہیں بنا سکتی تو ہمیں اس سے پناہ مانگنی چاہیے۔

یہ کس حسنِ مجلّٰی کی تجلی ہے نگاہوں میں
قدم اب خود بخود اٹھنے لگے عرفاں کی راہوں میں

اذاں میں یاد اس کی ذکر اس کا خانقاہوں میں
وہی ہے میری سانسوں میں وہی ہے میری آہوں میں

جہانگیری اسے زیبا مقابل اس کی قدرت کے
نہ طاقت حکمرانوں میں نہ قوت بادشاہوں میں

میری آنکھوں نے اس کے رحم کے انوار دیکھے ہیں
غریبوں کی دعاؤں اور بیوہ کی کراہوں میں

جو مومن ہو تو پہلے شرک و بدعت کے صنم توڑو
صنم اچھے نہیں لگتے مسلمانوں کی بانہوں میں

خمار آلودہ ان آنکھوں میں جادو کا اثر دیکھا
خدا کا نور دیکھا مردِ مومن کی نگاہوں میں

مجھے بخشا تو یہ اس کی نوازش ہے شرف ورنہ
رہا ہوں عمر بھر اپنی میں آلودہ گناہوں میں

شرف کمالی
"Rehmat" 446, B/9, Indrajeet Colony,
Jadhavwadi, Kolhapur - 416005

نعتیہ اشعار

میرے محبوبؐ کے محبوب وطن کی خوشبو
رشکِ فردوس ہے طیبہ کے چمن کی خوشبو

وہ مہک جائے مہک اٹھیں گی اس کی نسلیں
جس کو مل جائے شہنشاہِ زمن کی خوشبو

شہرِ طیبہ سے یہاں روز ہوا آتی ہے
روح پرور ہے مرے شہرِ سخن کی خوشبو

مرے آقا یہ میری زیست معطر ہو جائے
مجھ کو مل جائے اگر نعتیہ فن کی خوشبو

سہیل فصیحی
سہ ماہی "قرطاس و قلم" دھنباد
اقرا اکیڈمی، واسع پور، دھنباد ۸۲۶۰۰۱ (بہار)

نعتیہ ماہیے

اک نور نظر آیا
آمنہ کے گھر
وہ بن کے بشر آیا

یہ اس کا کرم دیکھو
مجھ سے سیہ رو کا
رکھتا ہے بھرم دیکھو

مت پوچھو کہ کیا پایا
ان کے قدموں پر
دل اپنا لٹا آیا

کیا خوب سجایا تھا
عرش کو مالک نے
جب تم کو بلایا تھا

یہ شمس و قمر تارے
تم سے شہِ بطحا
پاتے ہیں ضیاء سارے

شبنم سنبھلی، Khateeb Jama Masjid, P.O. Ren, Dist. Nagaur (Rajasthan)-341514

اسلام اور درسِ انسانیت

پروفیسر اخترالواسع
Director, Institute of
Islamic Studies
J.M.I., Jamia Nagar
New Delhi - 100025

سراپا رحمت پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور تمہارے درمیان بھی اسے حرام ٹھہرایا ہے لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔" ایک اور جگہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ظلم قیامت کے دن ظلمات کی شکل میں آئے گا۔" اور ظلم کی شکل صرف یہی نہیں ہے کہ کسی کو جسمانی اذیت دی جائے بلکہ کسی کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچانا، قلبی کشاکش اور ذہنی کش مکش میں بلا وجہ کسی کو مبتلا کرنا بھی ظلم ہی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ نے قتل کرنے کو اگر کفر قرار دیا تو گالی کو فسق بتایا، چغل خوری، غیبت تکبر، غضب کی مذمت فرمائی کیوں کہ یہ سب یا تو واضح طور پر ظلم کے زمرے میں آتی ہیں یا پھر ظلم کا سبب بنتی ہیں۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی سیرت سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ جو لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو اللہ ان پر عذاب نازل کرتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہنی چاہئے کہ ظلم، انصاف کی ضد ہے اور اسلام میں اسی لئے کسی بھی طرح کے ظلم کو روا نہیں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ عصبیت کی بھی، اسی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے صاف مخالفت کی کیوں کہ یہ گروہی، ملی، لسانی اور علاقائی تعصب بھی اکثر مظالم کا باعث بنا ہے۔ حضرت واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا! عصبیت کیا ہے؟ فرمایا، عصبیت یہ ہے کہ تم اپنی قوم کی ظلم کے معاملے میں مدد کرو۔"

اس کے برخلاف سیرت طیبہ ﷺ انصاف کی مکمل طور پر حامی ہے اور انصاف کا یہ دائرہ کسی طرح کی حد بندی قبول نہیں کرتا۔ سورہ مائدہ میں ہے "اور کسی گروہ کی عداوت تمہیں اس بات پر ہرگز آمادہ نہ کر دے کہ انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہی بات خدا ترسی سے قریب ہے۔" کیونکہ بلاشبہ "اللہ انصاف کا حکم دیتا ہے۔" اسی بات کو مزید صراحت کے ساتھ سورہ نساء میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ "اے ایمان لانے والو! انصاف کے قائم کرنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو اگرچہ گواہی خود تمہارے یا تمہارے والدین یا اعزا کے خلاف ہو۔ جس کے خلاف دی جارہی ہے اگر وہ مالدار یا غریب ہے تو اللہ کا زیادہ خیر خواہ ہے تو تم خواہشات کی پیروی میں انصاف سے نہ ہٹو۔" اس لئے اسلام کی نظر میں ارتکاب جرم کے لئے سزا دیتے وقت کسی طرح کا بھی امتیاز روا رکھنے کی کوئی اجازت نہیں ہے۔ عہد نبوی کا مشہور واقعہ ہے کہ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری میں ماخوذ ہوئی۔ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے سفارش کرنے کے لئے حضرت اسامہؓ کو آمادہ کیا جنہیں آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا!

"لوگو! تم سے پہلی قومیں اس لئے ہلاک کی گئیں کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے پر جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اسے سزا دیتے۔ لیکن خدا کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹا جاتا۔"

اسی لئے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کو بھی ان کے بعد آنے والوں نے اپنا رہنما بنائے رکھا کہ "قیامت کے دن لوگوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور ان سے زیادہ قریب میرے پاس بیٹھنے والا شخص امام عادل اور قیامت کے دن سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے سخت عذاب میں مبتلا کئے جانے والا شخص امام ظالم ہوگا۔"

اس ارشاد گرامی کی بازگشت ہمیں اس نصیحت میں بھی ملتی ہے جو حضرت عمر فاروقؓ کو اپنا جانشین نامزد کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انہیں فرمائی تھی کہ "عمر پہلی جس چیز کی طرف سے میں تمہیں ہوشیار رہنے کی نصیحت کرتا ہوں وہ خود تمہارا نفس ہے۔ ہر نفس کی کچھ خواہش ہوتی ہے اور جب تم اس کی یہ خواہش پوری کروگے تو نفس آگے بڑھ کر دوسری خواہش کے لئے مچلنے لگے گا اور دیکھو! ......

اس گروہ سے ہوشیار رہنا جن کے پیٹ پھول گئے ہیں، نگاہوں میں ہوس بس گئی ہے اور ان میں سے ہر ایک کو صرف اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے، ان میں سے کسی ایک کے پاؤں پھسلیں گے تو ان سب کو حیرانی ہوگی۔ خبردار! یہ ایک تم نہ ہونا، اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے یہ لوگ تم سے ڈرتے رہیں گے، جب تک تمہاری روش درست رہے گی یہ لوگ بھی تمہارے لئے سیدھے رہیں گے۔ یہ ہے میری وصیت اور میں تم پر سلام بھیجتا ہوں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب خلیفۂ ثانی عمرؓ اپنے افسروں کو رخصت کرتے تو انہیں متنبہ کرتے کہ "میں تمہیں جابر و قاہر نہیں بلکہ امام اور رہنما بنا کر بھیجتا ہوں۔" اس لئے تمہیں لوگوں کو ذلیل کرنے یا ان کے حقوق چھین کر ان پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں بلکہ تمہارا کام تو سہولت اور خوش حالی کے لئے ہر طرح کا اہتمام کرنا ہے اور تاریخ نہیں بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان باتوں کو زبانی جمع نہیں رہنے دیا بلکہ اپنے امیروں اور عاملوں پر کڑی نگرانی رکھی اور کسی کی غلطی کا سخت احتساب کرنے سے اپنے آپ کو کبھی نہیں روکا۔

اسلام نے اپنی شریعت میں مجرموں کے لئے سخت سزائیں رکھی ہیں۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹ دینا وغیرہ انسداد جرم کے لئے سخت سزائیں ناگزیر ہیں کیوں کہ کوئی بھی مہذب معاشرہ مجرموں کی سرپرستی نہیں کر سکتا۔ کسی سماج میں انصاف کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ان عناصر کو الگ تھلگ کر دے جو اسے اپنے مفسدانہ عزائم کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہوں۔ آج کی تمام جدید طبی ترقی سے فیض یاب معالجین اس پر متفق ہیں کہ جسم کے اس عضو کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے جو پورے نظام جسم کے لئے ہلاکت کا سبب بن سکتا ہو۔ اسلام نے بھی معاشرتی فساد پیدا کرنے والے عناصر سے اسی طرح نمٹنے کا اہتمام کیا ہے مگر یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اسلام ایک عادی مجرم اور اتفاقی و اضطراری طور پر سر زد ہونے والے جرائم میں فرق کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ صحیح ہے کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کا کاٹ دینا ہے لیکن عہد فاروقی میں ایک شخص نے چوری کی اور مقامی عدالت نے اس کے لئے اس سزا کا حکم دیا اس نے اس فیصلے کے خلاف امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے یہاں اپیل کی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تو نے ارتکاب جرم کیا؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے کہا پھر قاضی کے فیصلے پر تجھے کیا اعتراض ہے؟ اس نے جواب دیا قاضی نے جرم کو سامنے رکھ کر فیصلہ دیا ہے۔ ان حالات کو پیش نظر نہیں رکھا جن میں اس جرم کا مجھ سے ارتکاب ہوا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا تیرا کیا مطلب ہے؟ اس نے کہا کہ امیر المومنین! میں جس علاقے میں رہتا ہوں وہاں کافی دنوں سے سخت قحط پڑا ہوا ہے۔ میرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا اس لئے جب بھوک کی شدت نا قابل برداشت ہو گئی تو مجھ سے اضطراری طور پر یہ جرم سر زد ہو گیا۔ حضرت عمرؓ پر اس کے بیان کا سخت اثر ہوا۔ آپؓ نے نہ صرف اس کی سزا معاف کر دی بلکہ اس کے علاقے میں غذائی امداد بھیجنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ یہ ان عمرؓ کا فیصلہ ہے کہ جنکا تصلب فی الدین اور اسلام کے معاملے میں شدت پسندی پوری تاریخ اسلام میں انتہائی معروف ہے۔ شریعت محمدی ﷺ کیوں کہ انسانوں کو ہر طرح کے استحصال سے بچانا چاہتی ہے اور انصاف پر مبنی ایک صالح معاشرہ اس کا مقصود ہے' اس لئے یہ ہر ایسے طریقے، شعار اور نظام کے خلاف ہے جس میں انصاف کے تقاضوں کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو۔ اسلام اور رسول ﷺ اسلام کے پیغام و عمل کی روح یہ ہے کہ سماج میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے جو حق معیشت سے محروم ہو اور نہ کسی فرد کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ کسی کے حق میں معیشت میں دراندازی کر سکے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی اس آیت **ھو الذی خلق لکم مافی لارض جمیعاً** کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے لکھا ہے:

"جملہ اشیائے عالم اس آیت کے تحت تمام بنی آدم کی ملکیت معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں بوجہ رفع نزاع قبضہ کو سبب ملکیت مقرر کیا گیا۔ جب تک کسی شئے پر کسی کا قبضہ باقی ہے اس وقت تک کوئی اس میں دست اندازی نہیں کر سکتا۔ ہاں خود مالک و قابض کو چاہئے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کر دے یہی وجہ ہے کہ حاجت سے زیادہ مال رکھنا بہتر نہیں ہے۔"

"احادیث اور آیات قرآنی کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے مشہور محدث ابن حزم ظاہریؒ نے یہ بھی مسئلہ تحریر کیا ہے۔ "اور ہر ایک بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر بیت المال کی آمدنی غرباء کی معاشی کفالت کو پوری نہ ہوتی ہو تو امیر، ارباب دولت کو اس کی کفالت کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔ یعنی ان کا فاضل مال ان سے جبراً لیکر فقراء کی ضروریات میں صرف کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لئے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لئے گرمی سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے لباس فراہم اور رہنے کے لئے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش گرمی، دھوپ اور سیلاب سے محفوظ رکھے۔"

شریعت محمدی ﷺ میں سب کا حق معیشت مساوی ہے اس کے علاوہ وہ دولت و سرمایہ داری کے ان اصولوں کی بھی سختی سے مخالف ہے جو جمع خوری، ذخیرہ اندوزی یا ارتکاز دولت سے عبارت ہیں۔ سورہ توبہ کی یہ آیت اس باب میں بڑی اہم ہے کہ "اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو، اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، سو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔ جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھ کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ رکھا تھا اور چکھو مزہ اپنے گاڑنے کا۔"

قرآن کریم اور کتب احادیث میں ان احکام کی ترغیب و تربیت کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اسی طرح شریعت اسلام میں خرید و فروخت اور لین دین کے معاملات میں کوئی ایسا معاملہ یا طریقہ جائز نہیں رکھا گیا جو عدل و انصاف کے خلاف ہو اور جس سے استحصال کی ذرا سی بھی بو آتی ہو۔ قرآن کریم کہتا ہے "اللہ نے خرید و فروخت کے معاملات کو حلال کیا ہے اور سودی کاروبار کو حرام کر دیا ہے۔"

پھر رسالت محمدی ﷺ کے طفیل جو معاشی نظام وجود میں آیا اس میں کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کا بھی پوری طرح تحفظ کیا گیا۔ مثال کے طور پر کسان اگر کسی وجہ سے کھیتی کرنے سے معذور ہو جاتا یا اس کی کھیتی کسی آفت کی وجہ سے برباد ہو جاتی یا وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا تو ان تمام صورتوں میں سرکاری خزانے سے اس کی مدد کی جاتی اور آلات زراعت وغیرہ کی فراہمی اور بیج وغیرہ کے انتظام میں اس کو سہولت پہنچائی جاتی تھی۔ بنجر زمین کی آبادکاری میں کسانوں کو کسی قسم کی رکاوٹ و دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ خلافت اس سلسلے میں ان کی تمام مشکلات رفع کرتی تھی۔

افسران بندوبست کو ٹیکس وصول کرنے کے طریقوں کی ہدایت کی جاتی تھی اور انہیں مار پیٹ اور سختی نہ کرنے کی انتہائی تاکید کی جاتی تھی۔ مثلاً قبیلہ ثقیف کے ایک شخص کے ذمہ حضرت علیؓ نے ایک مقام کا بندوبست سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ "ٹیکس وصول کرنے میں کسی کو کوڑا نہ مارنا، غلہ اور گرمی و سردی کے کپڑے فروخت نہ کرنا، ان کے جانوروں کو نہ بیچنا اور تقاضے کے لئے ہر وقت ان پر کسی کو مسلط نہ کرنا افسر نے ہدایات سن کر جواب دیا کہ "اس طرح ایک پائی بھی کوئی شخص نہ دے گا اور خالی ہاتھ واپس آنا پڑے گا۔" امیر المومنین حضرت علیؓ نے جوب دیا "ہاں چاہے تمہیں خالی ہاتھ ہی واپس آنا پڑے۔ افسوس ہے تم پر! ہمیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان کی ضرورت سے زائد ہو بس اسی میں سے یہ ٹیکس وصول کریں۔"

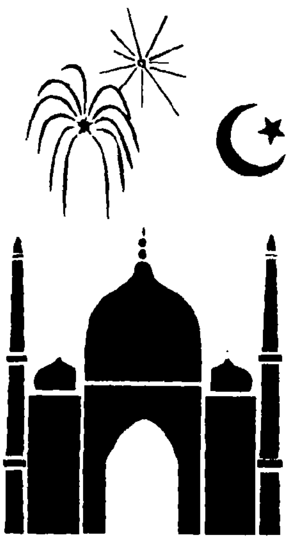
اسی طرح مزدوروں کے حقوق کی وضاحت حضور رسالت مآب ﷺ نے اس طرح کی کہ ان کا رشتہ اپنے مالکوں سے حاکم و محکوم کا نہ رہ کر برادرانہ اور مساویانہ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مزدوروں کو ان کی مزدوری ان کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دیا کرو۔"

"جو شخص مزدور سے کام لے کر اس کی اجرت نہیں دیتا ہے۔ قیامت کے دن میں (یعنی آنحضرت ﷺ) خود اس کے خلاف مقدمہ دائر کروں گا"۔

ف۔ س۔ اعجاز
کا
مجموعۂ غزلیات
ہندی میں
मौसम बदल रहा है
(منظر عام پر آچکا ہے)
قیمت =/100 روپے

ف۔س۔اعجاز
کا
مجموعۂ منظومات
صاحبِ فن
شائع ہونے والا ہے۔

عید اور نئی صدی کی مبارکباد
قبول فرمائیں



فینسی میٹریل پیراڈائز

FANCY
MATERIAL
PARADISE

Manufacturers' representatives
Importers & Exporters
of
Leather Bag Fittings,
Nylon Mesh,
Adhesive etc.

25-B, Chandney Chowk Street
Calcutta - 700 072

Sister concern :
Alfatha International
Calcutta - 700 072

بجا کیا ہے

ف۔س۔اعجاز

سلامت وقت کی صنعت!
کلنڈر ایک فتنا سی ہے
جس میں ہیں صدیوں سے
مقدّس لوگ کھوئے ہیں
تصوّر وقت کا وہ شئے ہے
جس پر سارے انساں متفق ہیں
کوئی تکرار آپس میں نہیں کرتے
مسیحا کو ہوئے مصلوب
کتنے سال بیتے، آدمی نے
کتنے ہند سے پار کر ڈالے
خدا کے ہاتھ پر ہم نے
گھڑی کوئی نہیں دیکھی
(خدا کو بھی نہیں دیکھا)
تصوّر وقت کا جما ہوا ہے
نیک بندوں کا
سبھی راہب ہیں اس پر متفق
جھگڑا نہیں کرتے
کہاں کب کیا بجا ہے
مان لیتے ہیں
سوئیزرلینڈ کی ایجاد کردہ
ایک سوئی کتنی صدیوں سے
کمالِ آگہی کے جوش و جذبہ سے
اچکتی اور پھدکتی آرہی ہے
کرسٹل سے اسی نے
وقت کی رفتار باندھی
ثانیوں میں فصل قائم کی
اسی ترتیب اور تنظیم کو
سب مانتے ہیں
وگرنہ سوچئے تو وقت کیا ہے
اک تخیل ہے، فسانہ ہے
یہ وہ موہوم ہستی ہے
کہ جس کو کوئی ثابت کر نہیں سکتا
کوئی لمحہ اگر زندہ ہے
تو وہ اس لئے زندہ ہے
کہ ہم اور آپ زندہ ہیں
سلامت وقت کی صنعت!
کوئی پوچھے "بجا کیا ہے"
تو سب الٹی کلائی پر
بندھی اپنی گھڑی کو دیکھ کر
منہ سے بتاتے ہیں "بجا یہ ہے"
کلنڈر ایک فتنا سی ہے
جس میں آپ ہم
سب لوگ کھوئے ہیں
ملینیم ایک دھوکہ ہے
یہ ساری کائنات الٹی کلائی پر
گھڑی باندھے ہوئے ہے
خدا ہی جانتا ہے اس کی دنیا میں
بجا کیا ہے

ہلالِ عید دیکھ کر

دیکھ کر
عید کے چاند کو
فرطِ جذبات سے
کیف و نغمات سے
میرے ہونٹوں کو جنبش ہوئی
بربطِ دل پہ نغمے مچلنے لگے
اوڑھ لی زندگی نے
ردائے خوشی
اور فروزاں ہوئے
ہر طرف قمقمے
روشنی، روشنی
ہر طرف روشنی!
چند ہی ساعتوں میں، مگر
یہ دعاء
زیرِ لب پھر مچلنے لگی:
"اے خدا!
چاند میں اب مجھے
پھر کبھی
اُس کا چہرہ
دکھائی نہ دے!!"

نوشاد مومن
مدیر "مژگاں"
احمد ولا، ۸۵-جے، توپسیا روڈ، کلکتہ-۳۹

عاصی کاشمیری
788, Woodborough Road.
Nottingham. NG3 5QJ. (UK)

رستہ ہے خطرناک بہت دور ہے منزل
پاؤں کی تھکن اوڑھ کے تو چلتا چلا چل

آیا نہ کوئی رحم اُسے قتل سے پہلے
تڑپا ہے بہت میرے لئے بعد میں قاتل

چھائے تو تھے سنگلاخ چٹانوں پہ بھی لیکن
شاداب زمینوں پہ برستے رہے بادل

بکھرے ہیں زمیں پر بھی کئی چاند ستارے
اُس شوخ نے جھٹکا جو کبھی ریشمی آنچل

میں ہارنے کے درد سے کچھ آشنا ہوتا
آتا جو کوئی شخص کبھی میرے مقابل

دیوانہ ہی شاید کوئی زنجیر ہوا ہے
گلشن میں ہے ہر سمت بپا شورِ عنادل

جذبات بھڑک اٹھتے ہیں انسان کے عاصی
جب نالہ و فریاد سے کچھ بھی نہ ہو حاصل

[illegible]
۱۰/۱۷۲۵ ادہلی گیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

خوابوں میں تعبیریں گھولا کرتے ہیں
شب کی گرہیں دن میں کھولا کرتے ہیں

رکھ کر غزلوں میں کچھ پیچیدہ الفاظ
ہم جدت کی بولی بولا کرتے ہیں

گویائی دیتے ہیں جب دلکش موسم
پھول بھی خود بھنوروں سے بولا کرتے ہیں

بچپن ہم کو گود میں اپنی لیتا ہے
جب تتلا کر بچے بولا کرتے ہیں

سن سن کر لوگوں کے جملے طنز بھرے
ہم خود اپنے عیب ٹٹولا کرتے ہیں

قسمت کس بازار میں لائی ہے ہمکو
رتی رتی خود کو تولا کرتے ہیں

جنگل میں آتے ہیں ڈولے پریوں کے
اور شہروں میں الو بولا کرتے ہیں

فاروق جائسی
۴۰۶- سنگیتا اپارٹمنٹ
۵۹/۱۴ سول لائن
کانپور-۲۰۸۰۰۱
(یو-پی-)

میرے ساتھ ماہتاب ہے
لوگ کہہ رہے ہیں خواب ہے

آپ اپنا خود ہے وہ سوال
آپ اپنا خود جواب ہے

مست مست اس کی ہر ادا
اس کی ہر نظر شراب ہے

آئے تو فضا مہک اٹھے
وہ نفس نفس گلاب ہے

پھول بن گئی کلی کلی
کیا حسین انقلاب ہے

میرے سامنے تو آئیے
آئنے سے کیا حجاب ہے

آپ ماہتابِ حسن ہیں
عشق میرا آفتاب ہے

جائسی کو زندگی جو دے
وہ نگاہ لا جواب ہے

[illegible]
۲۲۴ر بہر اسوداگر شرقی، ہردوئی-۲۴۱۰۰۱، یو-پی-

ہونے دو جو تاریک اگر راہ گزر ہے
سورج سا فروزاں مرا ہر تارِ نظر ہے

اب تک جو بچاتا رہا سورج کے غضب سے
آنگن کا وہی پیڑ تو بے برگ و ثمر ہے

استادہ رہا سجدۂ تعظیم میں بھی میں
شانوں پہ مرے لگتا اب میرا ہی سر ہے

وہ پرچم حق لے کے اٹھا ہے تو یقیناً
ہر حال میں اس کے ہی لئے فتح و ظفر ہے

جس گھر کے تقدس کی قسم کھائی تھی ہمنے
اس گھر کے تقدس پہ زمانے کی نظر ہے

مدہوش کی نظروں میں تو ہر اشکِ محبت
اک پھول ہے جگنو ہے ستارہ ہے گہر ہے

نثری نظم

نریندر سیٹھ
P.O. Box 23
SOLAN-173212 (H. P.)

میں نیتا ہوں

آئینہ مجھ کو دیکھتا ہے
یا میں اپنے میں دیکھتا ہوں
اک سوال ہے
جو
آئینہ مجھ سے پوچھتا ہے
میں آئینے سے پوچھتا ہوں
یہ گرد آلود چہرہ کس کا ہے؟
خود پر جمی دھول ہے
یا میرا اپنا ہی نقش ایسا ہے
آئینہ خموش ہے
کوئی جواب نہیں دیتا
کیا مجھے ہی اس کا جواب دینا ہوگا؟
میں اپنے ہاتھوں سے
اپنے پہ جمی دھول صاف کرتا ہوں
گرد آلود چہرہ اور اُبھر آتا ہے
نہیں!
یہ میں نہیں ہوں
یہ چہرہ میرا نہیں ہے
میں چلاّتا ہوں
یہ چہرہ کسی شیطان کا ہے
میں شیطان ہوں؟
نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا
میں تو نیتا ہوں
اس مہان دیش کا نیتا
اپنے بھارت ورش کا نیتا
نہیں میں شیطان نہیں ہوں
میں زور سے چلاّتا ہوں
اور پاس پڑا پیپر ویٹ
اٹھا کر
آئینے کے سینے پر دے مارتا ہوں
چھنّن سے اپنے میں ان گنت لکیریں پڑ جاتی ہیں
اور میرے کئی گرد آلود چہرے
مجھے گھورتے نظر آتے ہیں!

ماہئے

عاصی کاشمیری
788, Woodborough Road
Nottingham NG3 5QJ (U.K.)

رکھ لاج خدائی کی
وصل میں ڈھل جائے
یہ رات جدائی کی

کالا ہو کہ گورا ہو
خون ہے اک جیسا
تیرا ہو کہ میرا ہو

کیا کرتا بھلا افسر
اس کے بھی اوپر تھا
اک اُس سے بڑا افسر

ٹیلے پہ چڑھایا ہے
عشق نے رانجھے کو
جوگی بھی بنایا ہے

بیداری ضمیروں میں
قید رہا برسوں
گم نام جزیروں میں

قدرت نے سزا دی ہے
مست گھٹاؤں نے
بستی ہی مٹا دی ہے

غـــزل

ظفر محیبی
شاہ کمپاؤنڈ، شاستری نگر۔ موتیہاری، بہار-۸۴۵۴۰۱

شام کا وقت ہے، کیا خوب سجا رکھا ہے
درو دیوار کو دلہن سا بنا رکھا ہے

دیر سے آج کی تیری کھٹکتی ہے ہمیں
حسرتِ دید میں آنکھوں کو بچھا رکھا ہے

سارے عالم کو ہے کیوں فکرِ مداوا یارو
میں نے تو دل میں ہر اک زخم چھپا رکھا ہے

ڈس نہ لیں آج کسی کو تری ناگن زلفیں
کیوں سرِ شام یوں گیسو کو کھلا رکھا ہے

میں تو انساں ہوں فرشتے بھی بہک جائیں گے
تو نے عارض پہ جو اک تل سا بنا رکھا ہے

بن پئے کیسے نہ محفل میں بہک جائے ظفر
تو نے آنکھوں میں جو میخانہ سجا رکھا ہے

ارضِ مقدس میں چند روز

اے۔ امیر النساء
"تسکین" جمیل آباد
سکنڈ اسٹریٹ
میل وشارم
632509 (تامل ناڈو)

کے کھانے مٹھائیاں، سوپ اور مشروب کئی اقسام پر مشتمل افطاری سے فارغ ہوئے۔ اسطرح ہم نے سحری یروشلم میں کی اور افطاری عمان میں!

پھر عمان میں

شاعر نے بالکل صحیح کہا تھا قدرتی حسن کے جا بجا بکھرے ہوئے نظارے کا احاطہ ہماری آنکھیں نہیں کرسکتیں، اسرائیل اور عمان کے درمیان دو تاریخی مقامات پڑتے ہیں۔ ایک موسیٰ نبی کا مقام دوسرے Dead Sea یعنی بحر الکاہل جسے یہاں بحر المیت کہا جاتا ہے! عمان کسٹم میں شیکل اسرائیل کی کرنسی اپنی حقیقت کھودیتی ہے۔ چیک پوائنٹ کا اینٹری ٹیکس دینار کی شکل میں ہی قابل قبول ہے۔ تقریباً شام کے چار بجے عمان کے رَمَدَہ ہوٹل پہنچے جہاں جمال صاحب نے ہمارے قیام کا بندوبست کیا ہوا تھا، ہم نے ظہر کی نماز کنگ عبد اللہ ماسک میں پڑھی کافی شاندار اور عمان کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد ہے عصر کی نماز سے فارغ ہوکر ہلکی سی شاپنگ کی اس مسجد سے متصل انڈر گراؤنڈ شاپنگ سینٹر ہے، فطری اور غیر فطری طور پر معذور خواتین نے یہاں دکانیں لگائی ہوئی ہیں۔ ماہ رمضان کی وجہ سے ساری دکانیں ظہر بعد بند ہوگئیں۔ ہم نے یہیں پر عصر کی نماز ادا کی اور اپنے ہوٹل چلے آئے جہاں ٹیرس پر شاہی افطاری کا انتظام تھا، اردن کے جدید اور روایتی قسم

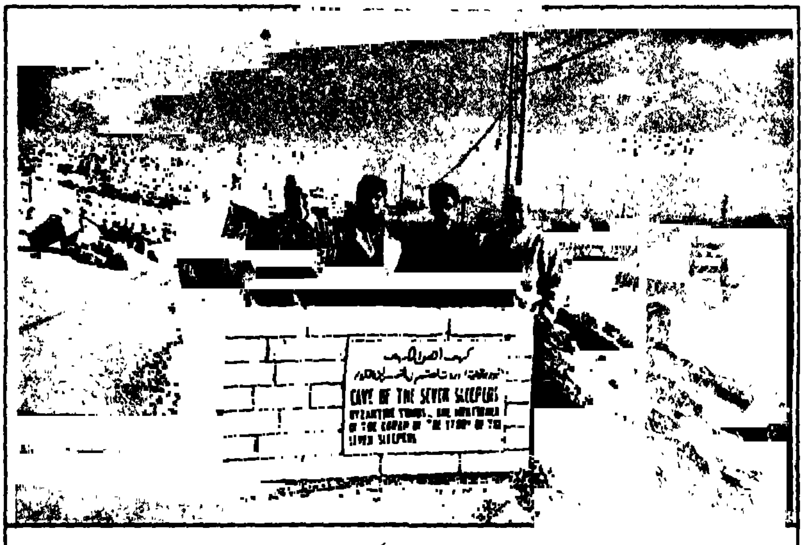


یہ بحر الکاہل ہے جسے مقامی لوگ بحر المیت کہتے ہیں تصویر میں بروی لڑکے ہیں جو یہاں کی مٹی لئے سیاحوں کے آگے پیچھے گھوم رہے ہیں ان کا اندازہ ہے کہ اس مٹی سے ہر قسم کے زخم مندمل ہوجاتے ہیں۔

اصحاب الکہف

دوسرے دن یعنی آج دسمبر کی اکیس تاریخ ہے۔ ہم نے عمان کے تاریخی مقامات کی زیارت کی، جس میں اصحاب کہف جسے مقامی زبان میں **اهل الكهف** کہتے ہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا ذکر قرآن شریف کے پندرھویں پارے میں کیا گیا ہے جس کی تفسیر اس طرح ہے۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت میں پہنچی تو اس سے متاثر ہوکر شہر کے چند نوجوان شرک و بت سے تائب ہوگئے اور اللہ واحد پر ایمان لائے۔ یہ سات نوجوان تھے۔ ان کی تبدیلیٔ مذہب کا حال سن کر بادشاہ وقت (قیصر ڈلیسیس) نے انہیں طلب کیا اور دریافت کیا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ انہیں علم تھا کہ بادشاہ توحید کو ہرگز برداشت نہیں کرتا۔ اس کے باوجود انہوں نے بے خوف ہوکر کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے، بادشاہ یہ سن کر سخت مشتعل ہوا اور انہیں اپنا رویہ بدلنے کے لئے تین دن کی مہلت دی اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر یہ ساتوں نوجوان شہر سے بھاگ نکلے راستے میں ایک کتا ان کے ساتھ لگ گیا۔ یہ لوگ ایک وسیع غار کے دہانے پر پہنچ گئے سب کی متفقہ رائے سے

انہوں نے اس غار میں پناہ لی لیکن کتا اندر داخل نہیں ہوا غار کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ یہ سب تھکے ماندے تھے لیٹتے ہی سو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رومی باشندوں کے درمیان حیات بعد الموت اور حشر و نشر کے عقیدے میں سخت اختلاف برپا تھا۔ بادشاہ وقت جو عیسائی تھا اس بات پر فکر مند تھا کہ لوگوں کے دلوں سے انکار آخرت کا خیال کیسے نکالا جائے۔ ٹھیک اسی زمانے میں یہ لوگ بیدار ہو کر آپس میں پوچھنے لگے کہ ہم کتنی دیر تک سوئے ہوں گے؟ بعضوں نے کہا دن بھر یا دن کا کچھ حصہ پھر یہ کہہ سب خاموش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک ساتھی جس کا نام یمیخا تھا چاندی کے سکے دیکر کھانا لانے کے لئے شہر بھیجا جب یہ شخص شہر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا بدل چکی ہے۔ سب لوگ مسیحی مذہب اختیار کر چکے ہیں بت پرستی ختم ہو چکی ہے، وہ ڈرتا ہوا ایک دکان پر پہنچا اور چند روٹیاں خرید کر چاندی کا ایک سکہ دیا جس پر صدیوں پرانے بادشاہ کی تصویر تھی۔ یہ سکہ دیکھ کر دکاندار کو شبہہ ہوا کہ اس نے پرانے زمانے کا دفینہ نکال لیا ہے۔ دونوں میں تکرار ہوئی لوگ جمع ہو گئے اور معاملہ شہر کے کوتوال تک پہنچا، کوتوال نے جرح کی کہ تمہاری بات ماننے کے قابل نہیں ہے۔ یہ صدیوں پرانا سکہ ہے تم تو ابھی جوان ہو ہمارے بڑے بوڑھوں نے بھی یہ سکہ نہیں دیکھا، یمیخا نے جب یہ سنا کہ ظالم بادشاہ کو مرے زمانہ گزر چکا ہے جس کے خوف سے انہوں نے غار میں پناہ لی تھی تو وہ بھی دنگ رہ گیا، پھر آہستہ سے بولا کل ہی تو میں اور میرے ساتھی نے اس شہر سے بھاگ کر غار میں پناہ لی تھی تاکہ ظالم بادشاہ سے بچ جائیں، اس مسافر کی بات سن کر کوتوال حیران ہو گیا اور اس کو لیکر اس غار کی طرف چلا لوگوں کا ہجوم بھی ساتھ تھا یہ خبر آناً فاناً شہر کی عیسائی آبادی میں پھیل گئی۔ وقت کے بادشاہ کو بھی اس کی اطلاع دی گئی وہ خود ان سے آکر ملا۔ اب جو اصحاب کہف خبردار ہوئے کہ وہ تین سو سال تک سوتے رہے ہیں تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام و دعا کر کے پھر غار میں جا لیٹے۔ اس طرح اصحاب کہف کا یہ واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا اور اس سے قوم کا وہ اختلاف ہو گیا جو حیات بعد الموت کے بارے میں پھیل گیا تھا جس طرح سیکڑوں اور ہزاروں برس سوتے رہنے کے بعد اصحاب کہف بیدار کر دئے گئے اسی طرح قبر (عالم برزخ) میں سیکڑوں برس مردہ رہنے کے بعد قیامت کے دن زندہ کر دئے جائیں گے اور اللہ پر یہ بات بھاری نہیں! قرآن کریم میں **"اصحاب کہف"** کے حرف وہ اجزاء بیان کئے گئے ہیں جو مقصود اصلی تھے باقی اجزاء جو تاریخی اور جغرافیائی تھے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے تھے؟ کس شہر میں رہتے تھے اور ان کے نام کیا تھے؟ ان عنوانات کی قرآن حکیم کو ضرورت نہیں۔ قرآن حکیم نے اصحاب کہف کا یہ واقعہ اسی عقیدے کی وضاحت کے لئے بیان کیا ہے۔



اصحاب الکہف

وَكَذٰلِكَ اَعثرُ نا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْآاَنَّ وَعْدَ اللهِ حَق وَّ اَنَ "السَّاعَةَلاَ رَيْبَ فِيْهاَ. آیات (کہف ۲۱) اس طرح ہم نے شہر والوں کو ان کے حال پر مطلع کر دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بیشک آکر رہے گی (اور اس دن سب کو زندہ ہونا ہے)

اصحابُ الکہف والرقیم کا لفظی ترجمہ "کہف اور رقیم والے" ہے۔ کہف اس پہاڑی غار کو کہتے ہیں جو وسیع اور کشادہ ہو اور جو وسیع اور کشادہ نہیں ہوتا اس کو غار کہتے ہیں۔ رقیم کے لفظی معنیٰ لکھی ہوئی تختی (کتبہ) کے ہیں! اصحاب کہف کی پہاڑی پر (Seven Sleepers) کا انگریزی کتبہ لگا ہوا ہے، غار کے اندر ہزاروں سال پرانی ہڈیاں چوکور جالی کے اندر بند ہیں اور اس غار کے اندر روشندان بھی ہے جو قدرتی ہے، محکمہ آثار قدیمہ کا عملہ دو ملازموں کی شکل میں وہاں موجود ہے! اصحاب کہف سے فارغ ہو کر ہم بحر الکاہل پہنچے، عصر کا وقت ہو رہا تھا دوسرے سیاح بھی غالباً

سال بعد مصر کے اس میوزیم میں فرعون کی بے گور و کفن لاش دیکھ رہے ہیں جو اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہزاروں سال سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی ہے اب تک نہ اسے زمین نے قبول کیا ہے اور نہ آسمان نے اور ساری دنیا کے لئے ہزاروں سال سے سامانِ عبرت بنی دعوتِ نظارہ دے رہی ہے جیسے کہہ رہی ہو سارے ملک میں اپنا سکہ کیوں نہ چلتا ہو، دولت کی کثرت کیوں نہ ہو، سارا ملک اور اسکی طاقتیں اپنے قدموں میں کیوں نہ ہوں، مگر ایک نہ نظر آنے والی طاقت ایسی بھی ہے جو پلک جھپکتے میں انسان کو نیست و نابود کر سکتی ہے! سیاحوں کا ایک جم غفیر ہے جو عبرتناک لاشوں کا اور خاندانِ فرعون کی زیرِ استعمال ایک ایک شئے کا جائزہ لے رہا ہے، اس خاندان کی جویلری، جوتے، آرائشی اشیاء، مسہریاں، سواریاں غرض یہ کہ میوزیم کی وسیع و عریض عمارت ان تاریخی اشیاء سے بھری پڑی تھی، گائیڈ قدم قدم پر سیاحوں کو ماضی کے اوراق پلٹ، پلٹ کر فرعون کے غداؤں اور اس کی عبادت گاہوں اور پیتل سے وزنی تابوتوں جن میں بیک وقت تین یا چار لاشیں رکھی جا سکتی ہیں کی تفصیل بتائے جا رہے تھے کہیں غیر ملکی سیاح گائیڈ کے ذریعہ اپنی معلومات میں اضافہ کر رہے تھے کہیں حاصل شدہ معلومات سے اپنی ڈائریوں کے صفحے سیاہ کئے جا رہے تھے، حالانکہ یہاں تصویر کھینچنا منع ہے مگر محافظوں کی نظر بچا کر اکثر سیاح بغیر فلیش کے فوٹو لے رہے تھے، انہی سیاحوں کے ہجوم میں ہمیں کچھ جانے پہچانے چہرے نظر آئے جو گائیڈ کے پیچھے کھڑے ہو کر گزرے ہوئے کارواں کا غبار دیکھنے میں مصروف تھے۔ ہم نے انہیں پہچان لیا ہندوستان کے مشہور غزل گائیک پنکج ادھاس اپنی بیوی اور چار سالہ بچی کے ساتھ تاریخی داستان انہماک سے سن رہے تھے، میرے بھتیجے سلمان اور کفیل نے ان سے ہاتھ ملایا وہ بڑی گرم جوشی سے ملے شاید دیارِ غیر میں انہیں ہم وطنوں سے ملاقات اچھی لگی ہو۔ وہ قاہرہ میں منعقد اپنے پروگرام کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے!



اہرام مصر

میوزیم کے احاطے کے پچھلے حصہ میں جہاں Cruise کا کارخانہ تھا مکمل اور نامکمل جہاز قطار در قطار کھڑے ہوئے تھے انہی میں سے ایک کروز کے اندر جہاں مصری خواتین کثیر تعداد میں جمع تھیں عربی زبان میں خطاب کیا جا رہا تھا شاید رمضان المبارک کے تعلق سے۔ ہم نے وہیں داخل ہو کر ظہر کی نماز ادا کی، مردوں نے وہیں پر موجود مسجد پر نماز پڑھی۔ فارغ ہو کر ہم اس جگہ پہنچے جو دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک ہے، تکون کی شکل میں تعمیر کئے گئے Pyramids کی اونچائی تقریباً ایک سو ساٹھ میٹر ہے، یہاں بھی داخلہ فیس لگتی ہے، داخلی گیٹ سے اہرام۔ مصر کا فاصلہ تقریباً ایک کلو میٹر ہے اور وہاں تک پہنچنے کے لئے مختلف قسم کی سواریاں موجود ہیں، اونٹ اور گھوڑے کے علاوہ تانگے بھی موجود تھے ہم نے تانگہ منتخب کیا۔ بڑا دلچسپ تجربہ تھا، وسیع و عریض میدان میں ان گنت Pyramid بنے ہوئے تھے، شاہانِ مصر کی لاشوں کو خاص قسم کے کیمیائی اجزا کے استعمال سے محفوظ کیا جاتا تھا ممیوں کو تابوت کے اندر بند کر کے Pyramid کے اندر رکھ دیا جاتا تھا۔ ہم نے اہرام مصر کا نظارہ باہر سے ہی کیا ایک تو بحالتِ روزہ تھے دوسرے ان کے اندر سے ساری لاشیں نکال کر میوزیم میں رکھ دی گئی تھیں اور ان Pyramid کی اونچائی صرف خارجی طور پر تھی داخلی طور پر ان کے اندر رکوع کی حالت میں ہی طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے اور اسی میدان کے ایک طرف لائٹ اینڈ ساؤنڈ کے ذریعہ شاہانِ مصر کی تاریخی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

اب ہم قاہرہ ٹاور پہنچے جس کی اونچائی ایک سو پینسٹھ میٹر ہے جسے لفٹ کے ذریعہ چالیس سکنڈ میں طے کر لیا جاتا ہے، اس قدر اونچائی سے شہر قاہرہ کا نظارہ بڑا دلفریب ہے، ٹاور کے مغربی جانب سے اہرام مصر نظر آتے ہیں، مشرقی جانب دریائے نیل کا منفرد نظارہ ہے، اس سے متصل معروف شاہراہ پر سبک رفتار سے دوڑتی ہوئی لاتعداد کاریں، دریائے نیل

پر آہستہ خرامی سے چلتے ہوئے گردز اس شہر کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں! یہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلے سہ پہر ہو چکی تھی قاہرہ کی سڑکوں اور گلیوں میں ہم نے افطاری کے منفرد مناظر دیکھے ایسا نظارہ ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، سڑکوں کے دونوں جانب فٹ پاتھوں پر لمبی لمبی میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی ہیں اور اس پر افطاری کا سامان سجا ہوا ہے، جہاں جہاں افطاری کا انتظام ہے بڑے بڑے بینرز پر مائدہ رحمن لکھا ہوا ہے۔ (مائدہ) عربی لفظ ہے جس کے معنی کھانے کے خوان کے ہیں، پہلے ہم نے سوچا کہ کسی ایسی ہی محفل میں شریک ہو کر افطاری کا نیا تجربہ حاصل کریں، پھر ہم نے اپنی رائے تبدیل کی اور قریبی مسجد میں داخل ہو گئے ہم عورتوں والے حصے میں پہنچ کر مصلے بچھا رہے تھے کہ کسی نے دستک دی۔ دیکھا تو ایک صاحب جو یقیناً یہاں کے نگراں ہوں گے، ایک پیالی میں کھجور اور بوتل میں پانی لئے کھڑے ہیں، ہم نے شکریہ کہکر دونوں چیزیں لے لیں، ہم بالکل صحیح وقت پر پہنچے تھے افطاری کے بعد مغرب کی نماز پڑھ کر باہر نکل آئے، فلفلا نامی ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور رات کے بعد قاہرہ کے بازار گھومنے نکلے، بڑا بارونق جگمگاتا شہر تھا۔ گھومتے ہوئے ہم اس حصہ میں جا نکلے جہاں مصر کی روایتی اشیاء ملتی ہیں۔ بازار کچھ بھرا ہوا تھا یہاں ایک ٹھیلے پر جوز ہند کے نام سے ناریل بک رہا تھا لوگ بڑے شوق سے اس کے کٹے ہوئے ٹکڑے خرید کر کھا رہے تھے ضروری اشیاء کی خریداری کے بعد ہم واپس ہوٹل پہنچ گئے!

جاری — چھٹی اور آخری قسط
آئندہ شمارے میں

بقیہ : ''میں مرد بن گیا ہوں''

بھی کھول لیا مگر کیا کبھی اپنے پڑوسی بھائیوں کے بارے میں بھی سوچا؟ وہ کس طرح عزت ود کھاوے کی زندگی جی رہے ہیں جب کہ ان کے پیٹ خالی ہیں اور میں اُن کا پڑوسی، ان کا بھائی، روپے کمانے کی ہوس میں اتنا اندھا ہو چکا ہوں کہ ان سے بھی دوا کے پیسے لینے میں کوئی رعایت نہیں کرتا۔ کیا واقعی میں مرد ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ میری نامردی کے باعث میرے پڑوسی اور دوست وغیرہ ایک ایک کر کے نامرد ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا پڑوسی ہونے کے ناطے میرا کوئی فرض نہیں بنتا؟

آج جاوید نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے بھی مدرسہ، اسکول اور مسجد کے متعلقین کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا ہے۔ لہٰذا اب میں حقیقی معانی میں مرد بن گیا ہوں۔



سرمہ اصلی ممیرنٹ ۵۰۰ اور کاجل عطریات
تارا مارکہ



عطر مجموعہ ۹۱ و جنت الفردوس
پاکیزہ مہندی
دیگر مصنوعات مثلاً عطردانی، سرمہ دانی و مرادآبادی سامان بھی دستیاب ہیں۔
Phone : 25-4015
FIROZ SURMA STORES
88/12, RABINDRA SARANI, CALCUTTA-700 073
فیروز سرمہ اسٹورس
۱۲/۸۸، رابندر سرانی، کلکتہ۔ ۷۳
فون: ۲۳۵-۴۰۱۵

نقشبندی (قمر نقوی)
6207, Indianapolis P1
Tulsa -OK 74136(U. S. A.)

غزل

میں نے وظیفہ اس کا صبح و شام کیا
جیسا مجھ سے ممکن تھا وہ کام کیا

منصوبہ اپنا جس نے بدلہ اس نے
اپنی کمزوری کو طشت از بام کیا

وقت اور میں دونوں ہی جنگ سے خستہ تھے
دونوں نے اعلان بہ امنِ عام کیا

یہ تو پھولوں کے نگراں تھے جانے کیوں
اہلِ چمن نے کانٹوں کو بدنام کیا

مجھ کو بھی اس نے آگاہی بخشی ہے
شہد کی مکھی کو جس نے الہام کیا

دنیا تو اک بچی جیسی تھی اس کو
تحفے دیکر اپنے حق میں رام کیا

نقشبندی (قمر نقوی)

خدشہ

کون سی ساعتِ موہوم کا خدشہ
شوق کے کون سے لمحے کا خطر
کون سا خواب ہے رقصندہ
پسِ پردۂ چشم
جس کا ڈر
زیست کے گریز شجر کو اکثر
یوں ہلاتا ہے کہ جیسے آندھی
موج در موج اٹھے بیچ کئی کو اسکی
کوئی نغمہ، کوئی آواز، کوئی موسیقی
جو مری لحن کی دمساز بنے۔
کوئی آواز
جو خاموش بھی ہو۔اور کہدے
میرا خدشہ۔مرا اندیشہ۔مرا ڈر
صرف اندیشہ ہے
خدشہ ہے
فقط ڈر ہے
ورنہ یہ زیست
جسم کی قید سے ہو کر آزاد
اک دفعہ
وسعتِ آفاق پہ چھا جائیگی!

نقشبندی (قمر نقوی)

زمانہ ساز

ھوا کے رخ کو تو کوئی
بدل نہیں سکتا
ھے اپنی نائو بھی
اور بادبان بھی اپنے ھیں
ذرا سا زاویہ ان کا بدلتے رھنا ھے

پرکاش تیواری
B-4, Rose Apartments
Sector-14 (Extn.)
Rohini, New Delhi-110085

ماہیے

۱
غم وقت کا کیسا ہے
معصوم سے چہرے کو
آئینہ بھی ترسا ہے

۲
کیا سوچ نے ہے گھیرا
کوئی بھی کھلا چہرا
تکنے کو نہیں ملتا

۳
سو رنگ بدلتا ہے
آدمی کا چہرہ
اب دھوکا ہی دیتا ہے

۴
غم بے گھری کا کیسا
یہ دہر بھی ہے یارو
اک خیمہ کرائے کا

۵
انجام سے ڈرتا ہوں
باغ کے پھولوں کو
بس دور سے تکتا ہوں

طہور منصوری نگاہ، پوسٹ بکس نمبر ۳۰، ریوا (ایم۔پی)

رباعیات

در

زمینی جمالیات

کچھ رباعیات جن کا ذیلی عنوان "زمینی جمالیات" ہے منسلک کر رہا ہوں یہ رباعیات اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ یہ ہندوستان کے اکثریتی طبقے یعنی مشقت پیشہ لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ شاعر اعظم فراق گورکھپوری کی "روپ" کی رباعیات سے یہ اس معنی میں مختلف ہیں کہ موصوف نے اپنی رباعیات میں جس تہذیبی منظر اور جس جمالیات کو پیش کیا ہے اس کا تعلق صرف اقلیتی طبقے یعنی آریائی نسل سے ہے حالانکہ خود فراق صاحب نے ان کے ہوا خواہوں نے اس بات کا بڑے زور و شور سے پروپگنڈہ کیا ہے کہ انکی رباعیات ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ جبکہ اعداد و شمار سے یہ بھی غلط ثابت ہوتی ہے۔ آریائی نسل کی آبادی کا تناسب ملک کی کل آبادی کا ۲۰-۱۵ فیصد ہی ہے۔ اور اس ۲۰-۱۵ فیصد کی نمائندگی کو کسی طرح سے بھی صد فی صد آبادی کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے ترقی پسند شعراء و ادبا نے ضرور اس طبقے پر خصوصی توجہ دی تھی مگر افسوس کہ ان حضرات کی نظریں بھی مذکورہ طبقے کی اقتصادی بدحالی سے آگے نہیں دیکھ سکیں۔ ایسا اس لئے ہوا کہ ترقی پسند تحریک سے جڑے اہل قلم نے اس طبقے کو یا تو مارکسی چشمے سے دیکھا ہے یا پھر خود اپنی اقتصادی حالت کو معیار بنا کر اسکے پیمانے پر اس پسماندہ طبقے کو ناپنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ تمام اقتصادی ابتری، استحصال اور ظلم و جبر کے باوجود اس طبقے کی اپنی ایک طرز زندگی ہے۔ معاشرت ہے ان کے غم ہیں اور خوشیاں بھی ہیں۔ میں نے اپنی زندگی انہی طبقات کے درمیان شروع کی تھی۔ اور آج بھی اپنے چاروں طرف ان لوگوں کو موجود پاتا ہوں اور خود کو اس طبقے کا فرد محسوس کرتا ہوں لہٰذا میں نے ان رباعیات کے ذریعہ اس طبقے کی جمالیات اور دیگر سماجی متعلقات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ط۔م۔ نگاہ

پھولوں کا سائبان ہوتی لڑکی
دھرتی پہ آسمان ہوتی لڑکی
کتنے اندیشوں کو جنم دیتی ہے
ایک مفلس کی جوان ہوتی لڑکی

کب جسم ہوا شراب، کیا جانے گی!
کب سانس ہوئی گلاب، کیا جانے گی!
غربت میں پلی ایک ابھاگن لڑکی
کیا ہوتا ہے شباب، کیا جانے گی!

ہر سانس میں ڈوبنے ابھرنے والی
جینے کے لئے مدام مرنے والی
دیکھی ہے وہ کبھی مسکراہٹ اسکی؟
کھلتی کلیوں کو نام دھرنے والی

موجوں سا اٹھاتا ہے کبھی شور، بدن
انگوں کو چھپاتا ہے، کبھی چور بدن
محنت کو عطا کرتا ہے اک رنگ جمال
وہ گرم پسینے میں شرابور بدن

بدلے بدلے ہیں بجنی کے تیور
رہ رہ کر چھیڑے ہے نٹ کھٹ دیور
ہر جنبش پر یوں کھنکے یوں دمکیں
سونے کا منہ ماریں نقلی زیور

کچھ آڑ میں ہوکر وہ نہاتی ہے جب
انگوں پہ جما میل چھڑاتی ہے جب
سنولانے سا لگتا ہے بدن کرنوں کا
بکھرا کے ڈھلے بال سکھاتی ہے جب

اعصاب سے راحت کی شکن کو جھاڑا
انگڑائی سے آلس کی قبا کو پھاڑا
اٹھی ہے علی الصبح مشقت کی سکھی
کیسی گرمی؟ اور کہاں کا جاڑا؟

ساجن کو دیا کرتی ہے یوں بھی جھانسے
بیمار بنے، دیکھ کے چھینکے، کھانسے
میکے کا ارادہ ہو کہ ساڑی کی طلب
اک رات میں سو بار رجھائے پھانسے

مقصود الٰہی شیخ (برطانیہ)

برسورے نینوا مورے

صبح کی بوندا باندی بھی مجھے باز نہ رکھ سکی۔ میں سیر کے لئے نکل گیا۔ مانوس منظر آج نیا لگ رہا تھا۔ فضا میں خنکی کے علاوہ بھیگے پن کا احساس رچا تھا۔ پہاڑ پر کُہر چھا رہی تھی۔ درختوں سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ایک طرف کے مکانوں کی چھت کی کھپریلیں، دوسری طرف کے مکانوں کی بالائی منزل کی آدھی کھڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جب سورج نکلا تو کئی رنگ آسمان پر بکھر گئے یہ اور بھی اچھا لگا۔ مجھ میں تازگی بھر گئی۔

سیر سے لوٹا، دروازہ کھولا، فرش پر دو لفافے پڑے تھے۔ ہوائی ڈاک سے آنے والے یہ خط زبیر کے علاوہ کس کے ہو سکتے تھے؟ میں نے چاہت سے اٹھائے۔ ایک ہفتے کے وقفے سے لندن سے ڈاک میں ڈالے جانے والے یہ دونوں خط ایک ساتھ پہنچے تھے۔ ایک لفافہ ذرا بھاری تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ پہلے کون سا خط پڑھوں؟

زبیر میرا داماد ہے۔ دراز قد، چھریرا بدن، کھلی پیشانی، گھنے سیاہ گھنگریالے بال، صاف رنگ، بڑی بڑی ذہین آنکھوں والا، من کو بھا جانے والا خوش اطوار نوجوان! ہمارے درمیان اس رشتے کے علاوہ دوسرا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے۔ وہ میرا احترام کرتا ہے مگر بے تکلف بھی ہے اور میں۔ اگر میرا بیٹا ہوتا۔ زبیر مجھے ویسا ہی پیارا ہے!

ڈاک خانہ کی مہر دیکھ کر پہلے پوسٹ کئے جانے والے خط کو پہلے پڑھنے کا سوچتا ہوں مگر مجھے کرید ہے ایک ہفتے کے دوران ایسی کیا بات ہوئی ہوگی کہ زبیر نے دوسرا خط بھی لکھا؟ کوئی کرید سی کرید ہے؟ سچی بات ہے دوسرے ہلکے لفافے میں "کیا لکھا ہے" پڑھنے کا تجسس ہوا ہے!!! اتنی جلدی جلدی وہ خط نہیں لکھتا۔

زبیر سے پہلی ملاقات یاد ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ یمنا کا ہاتھ مانگنے آیا تھا۔ میری بیٹی کی ہونے والی ساس کا رویّہ بڑا جارہانہ تھا۔ شاید یمنا کو یہ سب معلوم تھا۔ وہ مجھ سے کترائی کترائی تھی۔ میں نے ہی اسے پالا پوسا تھا۔ بڑی پیاری تھی پھر بھی میرے دل میں تھوڑا غصہ گھس بیٹھا کہ یہ سب اس نے پہلے کیوں نہ بتایا؟ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کب لگی؟

یمنا چار سال کی تھی جب اس کی امی اللہ کو پیاری ہوئی۔ مجھ سے یہ وعدہ لینے کے بعد کہ میں بچی کو ماں بن کر پالوں گا نشاط نے یمنا کو بُلانا چھوڑ دیا تھا۔ کہتی تھی اب اس کو ہسپتال نہ لایا کرو۔ اس کے دو روز بعد ہی پوری ہو گئی۔ میں سامنے بیٹھا تھا۔ بائیں پھیپھڑے کا (کارسی نوما) کینسر اسے دو سال کے اندر ہی اندر کھا گیا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا سی بن گئی تھی۔ اُٹھا بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ آخر میں بال غائب ہو گئے تھے مگر پھر بھی حسین لگتی تھی۔ دیکھنے والے حیران ہوتے پر تکتے رہتے کہ وہ اس حالت میں بھی کیوں کر اچھی لگتی ہے۔ نرسیں تک بہانے سے آس پاس منڈلایا کرتیں۔ دوسرے مریضوں کے پرسانِ حال آبیٹھتے بور نہ ہوتے اور میں۔ میں تو اس کا دیوانہ تھا ہی۔ آج بھی روتا ہوں۔ جب اس نے آخری بار میرا ہاتھ پکڑا۔ پپوٹے اٹھا کر نظر بھر کر دیکھا تو وہ تو میرے دل میں ترازو ہو گئی۔ میں پورا چھد گیا۔ اس کی نظر کہہ رہی تھی۔ "جانا نہیں چاہتی"۔ دو چار لمبے سانس لئے اور دم دے دیا۔ اس کے ہاتھ کی یونہی سی مگر مکمل اور مضبوط گرفت میرے داہنے ہاتھ پر آج بھی ثبت ہے۔ اس کی وہ آخری نگاہ میں کبھی ایک لمحہ کو نہیں بھلا سکا ہوں۔ جب نشاط کا دم اکھڑا، گلے کا گھنگھرو بجنے لگا تو اس میں بھی ایک پُر سحر نغمگی تھی۔ کیسے بتاؤں کیا تھا؟ دائمی جدائی کا منظر ہرا کے لئے میری آنکھوں، میرے احساس، میرے قلب و جگر، میرے ذہن کے گوشے گوشے میں اٹل حقیقت کی طرح گڑ گیا۔ وہ منظر آج بھی ویسا ہی زندہ ہے، ہمیشہ رہے گا۔ جیون بیت گیا اس کی تصویر آنکھوں میں بسی ہے۔

نشاط اور میرا پہلی نظر کا عشق تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر جی جان سے مر مٹے تھے۔ چٹ منگنی، پٹ بیاہ ہو گیا۔ میں نہ مرا نہ مٹا ویسے ہی قائم ہوں، وہی چل بسی!!!

یمنا کو میں نے ماں بن کر پالا اور باپ بن کر زمانے کے سرد و گرم سے بچائے رکھا۔ ہماری سنگت اور یگانگت کی انتہا تھی کہ گفتگو کے بغیر منشا جان لیتے گویا ایک دوسرے کا ذہن کھلا ہے جب جی چاہے پڑھ لو۔ پر اب کے میں مات کھا گیا۔!

زبیر کے والدین، مسٹر اور مسز کمال کی اچانک آمد پر حیرانگی تھی۔ مسز کمال نے بڑے منہ پھٹ طریقے سے کہا تھا ''بھائی صاحب! سوچنا کیا؟ کیسی مہلت؟ وقت ہی کہاں ہے؟ فیصلہ تو ہو چکا ہے!'' زبیر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی ماں کے چبھتے بولوں پر کھسیانا ہو رہا تھا۔ کمال صاحب نے پردہ ڈالا ''اب تو چلتے ہیں۔ کل تک سوچ کر ٹیلی فون کر دیجئے گا۔ زبیر آپ ہی کا بچہ ہے!''

مہمانوں کے جانے کے بعد یمنا نے پوری اپنائیت اور بھروسے مگر خلوص میں دبک کر اور شاید پہلی بار باپ سمجھ کر ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہا تھا۔ ''پپا! پروگرام تھا میں زبیر کو چھٹی کے روز لاؤں گی مگر آج کالج میں زبیر نے بتایا کہ اسے فوری طور پر لندن جانا ہوگا'' یمنا نے بات مکمل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ میں سب کچھ جان گیا۔ وہ مجھے ہمیشہ ایسی لگی! کوئی تبدیلی نہ آئی تھی بلکہ مجھے پہلے سے زیادہ اچھی لگی۔ میں نے کبھی بیٹی پر پوری نظر نہ ڈالی تھی۔ ایک حجاب ہوتا ہے باپ بیٹی میں پھر وہ تو نشاط کی ہو بہو تصویر لگتی تھی۔ دیکھنے تاب کہاں تھی۔ دودھیا رنگت، ویسا ہی بوٹا سا قد، اس کی مانند دبلی پتلی، نازک نازک، چہرے پر طمانیت اور اعتماد کا نور، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ اس کے حسن میں وجاہت و وقار کا دبدبہ تھا۔ آواز کی مٹھاس بالکل جدا اور انوکھی کہ بس سنتے رہو۔ یمنا کے بال بھی اپنی ماما کی طرح بے حد گھنے تھے۔ بہت لمبے اور سیاہ تھے اس پر خوب سجتے تھے مگر میں نے بچپن ہی میں اس لئے ترشوادئے کہ مجھ سے اس کا سر نہیں دھویا جاتا تھا اور بڑا ہونے پر خود اس کو عادت نہ رہی۔!

کسی بھی گھر میں اچانک رشتہ کے لئے لوگ آجائیں تو بوکھلاہٹ یقینی ہوتی ہے پھر اس پر زبیر کی امی کا رویہ بڑا پریشان کن تھا۔ انکار کیسے کرتا؟ جان گیا تھا زبیر اور یمنا میں محبت ہے۔ ان کی چاہت مسز کمال کے الجھاوؤں سے بے نیاز ہے۔ اگر وہ اپنے خول سے نکل آئیں تو دوسروں کی طرح کھلی آنکھوں اقرار کریں گی ایسا جوڑ تو مدتوں میں ہوتا ہے کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔ ایک دوسرے کا جواب، یک جان دو قالب اور دونوں لا جواب۔ آخر وہ کیوں بھنائی ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ دولتمند ہوں گی مگر ہم بھی تو انسان ہی تھے۔ یمنا نے جتنا مناسب سمجھا، بتایا۔ وہ جھجک رہی تھی اور مجھے اطمینان ہو گیا تھا اس نے غلط فیصلہ نہیں کیا۔ سو ٹیلی فون اٹھایا دوسرے روز کا منہ نہ دیکھا اور کمال صاحب سے کہ دیا۔ جب دل چاہے، بارات لے آئیے۔!!'' مجھے جان پڑ رہا تھا یمنا اور زبیر کی شادی تو پہلے سے آسمانوں میں طے ہو گئی تھی!!

زبیر لندن چلا گیا۔

پھر۔

چند ہفتوں کے وقفے سے یمنا بھی اسکے پاس چلی گئی۔

میرا گھر خالی ہو گیا۔ جب اس کا خط آتا میں جانتا یہی سامان میرے غریب خانے میں اکٹھا ہو رہا ہے۔ میں پھولا نہ سماتا۔ اس کے خط گھر بیٹھے لندن کی سیر کرا دیتے ہاں یہ خیال بھی آتا زبیر کبھی خط نہیں لکھتا۔ پتہ نہیں وہ اپنے امی ابو کو بھی خط لکھتا ہے یا نہیں؟

میں تنہا ہو گیا تھا۔ سوچا، ان کی شادی کی سالگرہ پر لندن چلا جاؤں گا۔ پاس اثاثہ نہ تھا۔ پنشن ہی کتنی تھی؟ جز وقتی کام کر کے کرایہ جوڑنے لگا۔

وہ بڑے خوبصورت دن تھے۔ میں سیر پر نکل جاتا۔ سوتے جاگتے لندن جانے کے خواب دیکھتا، اپنی بیٹی سے ملنے کی چاہ میں، ان دنوں میں نے نشاط کو یاد کرنا بھی کم کر دیا تھا۔ کیسا باؤلا ہو رہا تھا۔ جب خواب تعبیر میں بدلتا نظر آنے لگا تو امڈ گھمڈ کر خواہش اٹھتی کسی کو تو یہ خوشیوں بھری خبر سناؤں مگر کس کو؟ بس ایسے ہی جذبوں میں لتھڑا، لپٹا ایک روز کمال صاحب اور مسز کمال سے ملنے چلا گیا۔ کمال صاحب خندہ پیشانی سے ملے۔ مسز کمال کی تیوری تو دیکھتے ہی چڑھ گئی تھی۔ بیٹا ہو یا بیٹی اپنے سے ذرا سے بھی اونچے خاندان میں نہ دینا چاہئے۔ اگر یہ اقدام ہو جائے تو پھر مسز کمال کے سلوک کو بھگتو، چپ کر کے بھگتو! سو میں بھی چپ سادھ گیا۔ چائے پر بات چلانے کو شیلف پر پڑے ایئر میل لفافوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ''تو زبیر میاں باقاعدگی سے خیریت کی اطلاع دیتے ہیں؟'' کمال صاحب نے خوشدلی سے کہا ''باقاعدہ خط آتے ہیں لندن کی سیر یہاں بیٹھے بیٹھے کر رہے ہیں!!'' مسز کمال نے کاٹ کھانے کے لہجے میں کہا'' آپ کی صاحبزادی ہی لکھتی ہیں'' زبیر کو تو وقت ہی نہیں۔ اپنی ٹریننگ سے آیا تو پارٹ ٹائم جاب پر نکل گیا۔ آخر یوں جوکھم میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ شادی بعد میں ہو جاتی!''

مجھے خوشی ہوئی کہ زبیر اُدھر بھی خط نہیں لکھتا۔ انسان کتنا تھڑا ہے اور کمینہ ہے۔ عقدہ کھل گیا، ساس بہو میں یا سمدھنوں میں کیوں نوک جھونک ہوتی ہے! بیٹے کی ماں بیٹے سے اپنی محبت میں بہو کی یا بہو کے گھر والوں کی شراکت کا تصور بھی نہیں کر سکتی خاص طور پر وہ جب کھلے دل و ذہن کی نہ ہو۔!!

واپسی پر میں نے پختہ ارادہ کر لیا ایک لمبی مدت تک پھر میں اِس طرف نہ آؤں گا۔

اب یمنا کے خط نہیں آتے۔ زبیر کے خط آتے ہیں۔ جانے وہ اپنے گھر بھی خط لکھتا ہے یا نہیں؟

سامنے دو لفافے بند پڑے

تھے اور میں فیصلہ نہ کر پایا تھا ایک ہفتے کے وقفے سے پوسٹ ہونے والے خط جو یہاں ایک ساتھ ملے ہیں تو میں ان میں سے کون سا خط پہلے کھولوں؟

واقعات تصویر بن کر نظروں میں اترے چلے آرہے ہیں!

ایک روز صبح کی سیر سے لوٹا، دروازے تک پہنچا تھا کہ گھر کے اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی سنائی دی۔ تیزی سے بڑھا مگر گھر میں داخل ہوتے ہوتے فون بند ہو گیا۔

ذرا وقفے بعد پھر ٹیلی فون بجا۔

"پپا!"

میں آواز پہچان گیا میرے خواب و خیال میں نہ تھا کہ اس وقت لندن سے ٹیلی فون آئے گا۔

"پپا! آپ کو سانس ہو رہا ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں" یمنا بولتی چلی گئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ گھنٹی سن کر دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھول گیا۔ تم کیسی ہو؟"

"آپ کی دعا چاہئے"

یمنا کے لہجے کی سنگینی میرے اندر تشویش بھر گئی۔

ایک دو ساعتیں چپ چپاتے گزر گئیں۔

"پپا! ایک بات کہوں!"

"کہو۔"

"آپ وعدہ کریں۔ مانیں گے؟"

"جلدی کہو۔ خیریت تو ہے؟" میں گھبرا گیا۔ میں پگھل گیا۔

"آپ فوراً آجایئے۔"

کیا خبر کوئی خوش خبری ہو۔ میں مغالطے میں پڑ گیا۔ تصور میں رجائیت آجائے تو بڑی سہانی اور خوبصورت ہوتی ہے مگر میرے تن بدن میں ساتھ ساتھ خطرے کے کئی الارم جھن جھن کر کے جاگ اٹھے "بات تو بتاؤ۔ زبیر کہاں ہیں؟"

"تو آپ آرہے ہیں!"

"زبیر سے بات کراؤ"

"پاس کھڑے ہیں مگر بات نہیں کریں گے" یمنا کے لہجے میں شوخی آگئی۔ اس نے خود ہی فیصلہ کر دیا "تو آرہے ہیں آپ۔ بس ایک دو روز میں پہنچ جایئے۔"

یمنا بٹیا کی آواز کی موسیقی نے مجھے پھر مغالطوں میں ڈال دیا۔ تشویش کم ہوئی یا بڑھی؟ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

میں ناشتے کے بعد، اپنے پچھلے فیصلے کے برعکس مسٹر اور مسز کمال کے یہاں چلا گیا۔

کاش میں نہ جاتا۔

ان سے ملے بغیر چلا گیا ہوتا تو لندن پہنچنے تک آرزو اور آزار کے بین بین سے گزرتا تب بھی گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ بے خبری اپنی جگہ بڑی نعمت ہے۔ وہاں جا کر تو میں لُٹ پُٹ ہی گیا، ان کو اطلاع تھی، یمنا کینسر کے آخری مرحلوں سے گزر رہی ہے۔ مسز کمال مجھے دیکھتے ہی اپنے نصیبوں کو کوسنے لگیں کہ ان کا ماتھا تو پہلے دن ٹھٹھک گیا تھا! ادھر میری دنیا ہی اندھیری ہو گئی۔ اپنے تئیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ بھلی عورت کو اتنا خیال نہ آیا مجھ پر کیا بیت رہی ہو گی۔ کینسر نے دوسری بار میرے گھر پر ڈاکہ ڈالا تھا۔!!

میں ریزہ ریزہ ہو کر گھر پلٹا۔ جانے کیسے پہنچا۔ اسی وقت ٹیلی فون پر اولین حاصل نشست محفوظ کرائی۔ بیچ میں پانچ دن تھے۔ گھر کا سامان برائے فروخت لگا دیا، کمال صاحب ہمدردی سے پیش آئے انہوں نے رقم پیش کرنی چاہی۔ میں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے مشورہ دیا مکان فروخت نہ کیجئے گا۔ آنے والے کل کی گود میں کون جانے کیا ہے؟ مخلصانہ مشورہ میں مان گیا۔

اپنے لخت جگر کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو، اتنی شدت سے کب کسی کو ہوئی ہو گی۔ جہاز نہیں، میں اڑ رہا تھا۔ دوران سفر کچھ دیکھا نہ سنا۔ یہ میری زندگی کا سیاہ ترین سفر تھا۔ جب لندن پہنچا تو مجھے زبیر لینے آیا ہوا تھا۔ یمنا ہسپتال میں تھی۔

۔۔اور ہسپتال میں یمنا کو، یمنا کی پرچھائیں کو دیکھ کر میں یاسیت میں گھر اگر گیا۔ نہ معلوم گر کر ڈھیر کیوں نہ ہو گیا۔

یمنا سو رہی تھی۔ میں پاس بیٹھ گیا۔ زبیر نے بتایا چھ ہفتے سے یہی ہو رہا ہے۔ گھر پھر ہسپتال پھر گھر پھر ہسپتال۔ مرض کی تشخیص ہوئی تو حد سے گزر چکا تھا۔

بیتے دن ایک ایک کر کے نگاہوں میں پھرتے گئے۔ شاید سفر کی تکان تھی، میں اونگھ گیا۔ آنکھ کھلی تو زبیر اپنے کام پر جا کر آگیا تھا۔ دونوں میاں بیوی دھیرے دھیرے بول رہے تھے یمنا میں تازہ آئی توانائی مجھے بھی محسوس ہوئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔

کچھ دنوں بعد یمنا گھر آگئی۔

اب وہ بہتر تھی۔

یوں روزانہ "ہوم ہیلپ" بھی آیا کرتی مگر یمنا گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف رہتی۔ فرصت ملتی میرے پاس آبیٹھتی۔ بہت باتیں کرنے لگی تھی۔ کہتی اس چھپواں بیماری نے ظاہر ہوتے ہی اتنا وقت کھا لیا کتنے کام رہ گئے۔ کالج کے کئی اسائن منٹ دھرے ہیں۔ شادی کی سالگرہ میں صرف ایک مہینہ اور گیارہ دن رہ گئے ہیں۔ پپا! یہ سالگرہ یوں منائیں گے کہ دنیا یاد کرے گی۔ پھر آپ بھی تو آگئے ہیں۔ میں جانتی تھی آپ آئیں گے۔ سچی پپا! سالگرہ میں جو جو شامل ہو گا، شریک ہو گا سدا یاد کرتا رہے گا۔

وہ میرے زندگی کے بڑے نایاب، بڑے قیمتی دن تھے۔ ہر دم دعا مانگا کرتا میری بچی کو اپنی

شادی کی سالگرہ کا دن دیکھنا نصیب
ہو۔

آج لگتا ہے وہ میری زندگی کے واقعی ناقابل فراموش دن تھے۔ دن میں میں یمنا کو ایک پل کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ رات میں مقامی کونسل سے لیا ترجمہ کا کام کرتا اور دعائیں مانگتا۔ میں نے آنکھوں سے یمنا اور زبیر کی چاہت کا رچاؤ دیکھ لیا۔ سر پر کھڑی گھڑی سے بے نیاز وہ یمنا کی چاہت میں جیتا تھا اور یمنا اس کے لئے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ میری تمنا تھی میری زندگی بھی ان دونوں کو لگ جائے!

وہ یادگار تقریب تھی۔ بڑی شاندار شادی کی سالگرہ۔ سبھی دکھ بھول گئے۔ ساری خوشیاں آسمانوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر وہاں موجود ہر کسی کی گود میں آ براجی تھیں۔ لیکن وہی رات میری بچی کی، اپنے گھر میں آخری رات تھی۔

دوسرے روز، دوپہر میں یمنا کی طبیعت بگڑ گئی۔ فوراً اسپتال لے جانا پڑا جہاں سات روز بعد وہ ہمیشہ کے لئے ہر روگ سے نجات پا گئی۔

ہاں کچھ لوگ جوانی میں مر جاتے ہیں۔

میں غم کا مارا اپنی آنکھوں پر ہاتھ کی انگلیوں کی پوریں رکھ کر ان کو نچوڑنے کی کوشش کرتا مگر وہ آنکھیں تو ضبط غم کی ایسی جھیلیں بن گئی تھیں جو کناروں سے اندر تک سوکھ چکی ہوتی ہیں۔

زبیر کی حالت اور بھی ابتر تھی۔ وہ شروع میں میرے سینے سے لگ کر رو دیا پھر چھپ چھپ کر روتا۔ میرا جو غم تھا کم نہ تھا مجھے اس کا بھی غم تھا۔ ہم دونوں ہم غم تھے۔

اور مجھے لندن میں اپنی وہ آخری شب بھی یاد آتی ہے۔ میں سو رہا تھا آدھی رات گزری ہوگی۔ بند کا سناٹا تھا۔ ٹریفک بھی تھم چکا تھا۔ اچانک سوتے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لگا میری پشت پر نشاط سامنے بیٹھی ہے۔ میرا دل بھاری ہے اور ذہن خالی۔ پھر صبح تک جاگتا رہا یہ احساس چھایا رہا۔ پیچھے نشاط بیٹھی ہے۔ میرے سامنے یمنا بیٹھی ہے۔ نہ کوئی بولتا ہے نہ کوئی بے چین ہے جیسے ہم سب ہیں، سو ہیں۔ کہنے، سننے کو کچھ نہیں تھا۔

پھر لندن میں ٹھہرنے کی سکت سے کلی طور پر محروم ہو گیا۔

اگلے دو تین روز میں ادھورے کام نمٹائے۔ زبیر کو بتایا میں واپس جا رہا ہوں۔ میری بات اسے گھونسے کی طرح لگی۔ گم سم ہو گیا۔ جب وہ اپنے آپ میں آیا تو میں نے ساتوں جہاں کا خلوص اور پیار اکٹھا کر کے کہا۔ تمہارے اور یمنا کے بیچ جو پیار تھا میں یہ کہہ کر کہ مجھے اپنی بیوی سے اتنا ہی پیار تھا، تم دونوں کی محبت کی توہین نہیں کروں گا۔ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ دل سے مجبور ہو کر میں نے اپنی ساری زندگی اپنا سارا جیون مرنے والی کی یاد میں تنہا گزار دیا مگر تمہیں کہوں گا زندگی کے ہر موڑ پر ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکیلے زندگی دوبھر ہوتی ہے۔ جب اچھی لڑکی ملے، شادی کر لینا۔ مجھے بلاؤ گے، میں آؤں گا۔ دیکھنا یمنا بھی مبارک دینے آئی گی۔ اس کی شرکت تم محسوس کرو گے۔

زبیر نے پوری بات سنکر میری طرف دیکھا، وہ کچھ بھی نہیں بولا۔ پر میرے کانوں نے سنا اس نے غٹ سے مٹھی بھر غم کا گھونٹ بھرا۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک ایک قطرہ ڈھلکا اور دو بڑی جھیلیں خشک ہو گئیں۔

میں نے وارفتگی سے زبیر کو گلے لگا لیا۔ بالکل اسی طرح جب یمنا کو رخصت کرتے وقت دونوں کو فرط جذبات سے بازوؤں میں بھر کر اپنے دل کی دھڑکن دے دی تھی!!

میں واپس آ گیا۔ مسز اور مسٹر کمال پُرسہ دینے آئے۔ اب غم اُن کا تھا۔ بیٹے کا اکیلا پن دکھ دے رہا تھا۔ میں نے کمال صاحب کے مشورہ کا شکریہ ادا کیا۔ یہ آشیانہ باقی رہا تو آ گیا۔ یہاں بھی نشاط اور اس کے بعد یمنا رہتی تھی اب میں دونوں کی یادوں کے ساتھ یہاں رہوں گا اور اپنی سانسوں کا قرض اتارتا رہوں گا۔ رنج و الم کے سارے آسمان سر پر اٹھائے پھروں گا۔ ان پر اپنے زخموں کے ستارے سجانے ہوں گے۔ حسرت شاید اسی کا نام ہے کہ موت مانگے سے نہیں ملتی۔ اور کچھ وہ ہوتے ہیں جنہیں بن مانگے اجل کا تحفہ مل جاتا ہے۔

میں نے کینسر انسٹی ٹیوٹ کو لکھا ہے۔ اس مرض کے خلاف لڑنے والوں میں میرا نام بھی لکھ لیں۔ جیب میں "ڈونر کارڈ" رکھ لیا ہے، شاید میرے نصیب میں ایسا کوئی حادثہ آ ہی جائے، جب میں کسی کے لئے مداوا بن کر پھر سے جی اٹھوں!!

اب لندن سے مجھے یمنا کے خط نہیں آئیں گے۔ زبیر کے آتے ہیں۔ وہ باقاعدگی سے خط لکھنے لگا ہے۔ وہ سمجھتا ہے میرا غم بٹا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ اپنا دل ہلکا کر رہا ہے۔ اس کے خط کئی کئی صفحات پر پھیلے ہوتے ہیں۔ میں بار بار پڑھتا ہوں اور پڑھ کر جواب میں یہی بات پوچھتا ہوں۔ مجھے کب مدعو کرو گے؟

آج زبیر کے دو خط ایک ساتھ ملے ہیں۔ ایک لفافہ بھاری ہے دوسرا ہلکا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا پہلے کون سا لفافہ کھولوں؟ لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لینے کا بھروسہ مجھ میں نہیں ہے۔ جستجو تجسس بن گئی ہے آخری؟؟

ہلکا خط۔ کیا اس میں بلاوا ہے؟؟

رینو بہل
1594
18-بی
چنڈی گڑھ-160018

سہمی سہمی کجری نے جگدیش بابو کے کمرے میں قدم رکھا۔ اُن کی آنکھوں میں غصہ، ہاتھ میں چابک دیکھ کر وہیں دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رُک گئی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی وہ دہاڑا:

"سُنا ہے تم نے جانے سے انکار کر دیا ہے؟"

وہ خاموش نظریں جھکائے کھڑی رہی۔

چابک کو ہوا میں لہرا کر وہ پھر دہاڑا

"یہ بُت بنی کیا کھڑی ہو۔ آج رات ۸ بجے تیار رہنا وزیر صاحب کے یہاں جانا ہے اور ڈھنگ کے کپڑے پہننا۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ سر جھکائے چپ چاپ واپس لوٹ آئی۔ آتے ہی اپنے بستر پر اوندھے منہ لیٹ کر سسکیاں لے لے کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ قد و قامت میں وہ بڑی سمجھدار ہو گئی تھی مگر تھی تو ابھی بچی ہی۔ سولہ سال کی عمر وہ عمر ہوتی ہے جب لڑکی بچپن اور جوانی کے بیچ کھڑی ہوتی ہے۔

اُس کے رونے کی آواز سُن کر شانتو جو اُس کے ساتھ ہی رہتی تھی، بھاگی آئی اور اُسے دلاسا دینے لگی۔

"آج پھر جانا ہے کیا؟"

"ہاں" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"تو نے بتایا نہیں کہ تجھے بخار آیا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ اس نے ہاتھ میں چابک پکڑا ہوا تھا اور میں ڈر گئی۔ میں ابھی پچھلی مار بھولی نہیں۔" واقعہ یاد آتے ہی وہ لرز اٹھی۔

"تجھے ایک صلاح دوں؟" اُس نے سرگوشی کی۔

"کیا؟"

"موقعہ ملتے ہی تو یہاں سے بھاگ جا۔"

"کدھر؟"

"تو کہتی تھی نہ کہ تیرا گھر بھی ہے۔ تیرے چھوٹے بھائی بہن، ماں باپ بھی تو ہیں۔ اُن کے پاس لوٹ جا۔"

گھر کی یاد آتے ہی وہ پھر سے رونے لگی۔ اُسے اپنے دونوں بھائی اور ننھی سی بہن یاد آنے لگے۔ تین سال پہلے جب وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی تو اُس کی بہن ۱۰ سال کی بچی تھی اور اب وہ بھی اُس عمر میں پہنچ گئی ہوگی جس عمر میں اُس نے مجبور ہو کر گھر چھوڑا تھا۔ نہ جانے کیسی ہوگی کس حال میں ہوگی۔

کجری کو اپنے باپ کی صرف دھندلی سی شکل و صورت یاد ہے۔ اتنا یاد ہے کہ جب وہ کام سے واپس لوٹتا تو سب بچوں کو اپنے پاس بٹھا لیتا اور اُن سے انہیں کی زبان میں باتیں کرتا۔ بچوں میں وہ سب سے بڑی تھی اور سب بچوں میں صرف ایک ایک سال کا فرق تھا۔ پھر ایک دن وہ کام سے زندہ نہیں لوٹا۔ جس کارخانہ میں وہ کام کرتا تھا وہیں کسی حادثے کا شکار ہو گیا اور اُس دن کے بعد اُنکے دُکھ تکلیف کے دن شروع ہو گئے۔ سب رشتے داروں نے منہ پھیر لیا۔ ان پڑھ لاچار ماں بچوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی اور کجری، جس نے ابھی پڑھائی شروع ہی کی تھی، اسکول چھوڑ کر گھر میں بچوں کی چھوٹی ماں بن گئی۔ ماں کے کام پر جاتے ہی وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گھر کا کام کرتی، روٹیاں بناتی اور اپنے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کرتی۔ جب تک شام کو ماں کام سے لوٹ نہ آتی وہ کہیں کھیلنے نہیں جاتی۔ بچپن تو جیسے گم سا گیا تھا۔ گود میں چھوٹی بہن کو اُٹھائے للچائی نظروں سے کھیلتے کودتے بچوں کو دیکھتی۔ اُسکا دل چاہتا ماں گھر جلدی لوٹ آئے اور وہ سب کام چھوڑ کر کھیلنے نکل جائے مگر جب ماں تھکی ہاری گھر لوٹتی تو اُس کی حالت دیکھ کر اُسکے کھیلنے کی تمنا بجھ جاتی۔ اور وہ پھر ماں کا ہاتھ بٹانے لگ جاتی۔

ایک شام جب ماں گھر لوٹی تو اُس کے ساتھ ایک اجنبی آدمی بھی تھا جسے دیکھ کر سب بچے حیرت میں آ گئے۔ ماں نے بچوں کو پاس بُلا کر پیار کیا اور بتایا کہ "یہ تمہارے بابا ہیں۔ ان کو پرنام کرو۔"

کچھ روز تو ماں کھلی کھلی رہی اور بچے بھی خوش تھے لیکن جب سے اُن کے نئے باپ نے کام پر جانا چھوڑ دیا تھا اور ماں کو دوبارہ سے زیادہ کام کرنا پڑا، گھر میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ بڑوں کی لڑائی دیکھ کر بچے سہم جاتے اور جب باپ شراب کے نشے میں چور ماں کو مارتا اور بچوں کو پھٹکارتا تو کجری اپنے چھوٹے بھائی کو زور سے پکڑ کر روک لیتی جو بنا اپنے وجود کی فکر کئے اُس آدمی پر برس پڑنے کو تیار ہو جاتا۔ باپ کی کڑوی باتیں اس کے کانوں میں زہر گھول دیتیں۔

"تو کیا سوچتی ہے میں نے تیرے بچوں کو پالنے کے لئے تجھ سے شادی کی ہے۔ چار بچوں کی ماں اگر اپنے بچوں کو پال سکتی ہے تو مجھے کیوں نہیں۔ ان پلوں کا بوجھ میں کیسے اُٹھا سکتا ہوں۔ یہ تو تمہیں ہی اٹھانا ہوگا۔"

ماں سارا دن گھر سے باہر رہتی اور وہ صبح صبح نکل جاتا اور دوپہر کو نشے میں چور لوٹ آتا۔ ایک روز وہ اپنے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی لے آیا اور گھر میں بیٹھ کر شراب پینے لگے۔ اُس کے ساتھ جو آدمی آئے تھے وہ

کجری کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟" ایک نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میری بیوی کی بیٹی ہے۔" اُس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"تمہاری تو نہیں۔"

"نہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

وہ آدمی لڑکھڑاتے قدموں سے اُس کی اور بڑھا جو اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہن کو لے کر کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر سہمی سی بیٹھی تھی۔ جیسے ہی اُس نے بڑھ کر اُسے پکڑنا چاہا اُس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور اُسے روتا دیکھ اُس کے بھائی بہن بھی رونے لگے اور اُن کی رونے کی آوازیں سن کر بھان متی اپنی کھولی سے بھاگی آئی۔ اُسے دیکھتے ہی وہ آدمی ڈر گیا اور بھان متی نے اُس کی نظریں پہچان لیں۔ وہ بچوں کو اپنے ساتھ اپنی کھولی میں لے آئی۔ شام کو اُس نے سارا قصہ کجری کی ماں کو سُنا دیا۔ اور کجری کی ماں شیرنی کی طرح دہاڑتی ہوئی اپنے شوہر پر ٹوٹ پڑی۔ گھمسان لڑائی ہوئی اور اس کے بعد گھر میں کبھی شراب نہ پینے کی اُس نے قسم کھالی۔ جو شک کا کانٹا ماں کے دِل میں چبھ چکا تھا، اُسے نکالنا بہت مشکل تھا۔ وہ کام پر تو جاتی مگر اُس کے ذہن میں صرف کجری ہی گھومتی۔ یہ کچی عمر اور اُس پر پرائے آدمی کی موجودگی وہ بھی اُس کی غیر موجودگی میں۔ شادی کرتے وقت اُس نے سوچا تھا کہ چلو بچوں کو باپ مل جائے گا اور اُس کے سر پر سایا رہے گا۔ وہ بھی تو جوان تھی۔ شوہر کی موت کے بعد لوگوں کی نظریں ہی بدل گئی تھیں۔ ہر کوئی بے سہارا اکیلی عورت کو دیکھ کر اُسے اپنی ملکیت سمجھنے لگتا تھا۔ اِس عذاب سے بچنے کے لئے ہی تو اُس نے شادی کی تھی مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ شادی اُس کے لئے جی کا وبال بن جائے گی۔ کجری کو جوان ہوتے دیکھ اُس کا خوف بھی بڑھنے لگا اور اب تو بنا کسی قصور کے کجری کو ماں سے بات بات پر ڈانٹ پڑتی۔ ماں اپنا غصہ اُسی پر اُتارتی اور وہ باپ کے بڑھتے ناپاک ارادوں کے بارے میں ماں کو بتانے کی ہمت بھی نہ کر پاتی۔

ایک دوپہر جب وہ بچوں کو لے کر کھولی میں سوئی ہوئی تھی تو اُس کا باپ اُسی آدمی کو لے کر آگیا۔ قدموں کی آہٹ سے اُس کی نیند ٹوٹ گئی اور اُس نے اپنے سوتیلے باپ کو اُس سے پیسے لیتے دیکھ لیا۔ خود وہ پیسے جیب مین ڈال کر کھولی سے باہر نکل گیا اور وہ آدمی لڑکھڑاتے قدموں سے اُس کی اور بڑھنے لگا۔ جیسے ہی وہ ناپاک ارادے سے اُسے چھونے کو بڑھا، اس نے زور سے اُس کی کلائی پر دانت گاڑ دئے اور وہ درد سے چیخ اٹھا۔ اُس کی چیخ سُن کر چھوٹے بہن بھائی بھی جاگ پڑے اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

اُس دِن وہ گھر سے ایسی بھاگی کہ پھر لوٹ کر گھر نہ گئی۔ ریل میں سوار ہو کر شہر چھوڑ دیا۔ پاس ایک پھوٹی کوڑی نہ تھی، نہ ہی کوئی کپڑے اور نہ کوئی سامان۔ ایک تیرہ سال کی بچی بھوکی پیاسی انجان شہر میں سہمی سہمی ڈری ڈری سڑکوں پر بھٹک رہی تھی کہ گشت کرتی پولیس کی گاڑی وہاں سے گزری اور جیسے ہی پولیس والوں کی نظر اُس پر پڑی وہ اُسے گاڑی میں بٹھا کر پولیس چوکی لے گئے۔ اُس سے بہت پوچھ تاچھ کی گئی مگر اُس نے صرف ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ اُسکے باپ کا انتقال ہو چکا ہے اور ماں بھی دو روز پہلے مر گئی۔ اب وہ دُنیا میں اکیلی ہے۔ اُسکے پاس سر چھپانے کو کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگلے روز اُسے یتیم خانہ بھیج دیا گیا جہاں اُسے اُسکے جیسی کئی لڑکیاں ملیں۔ سب کی اپنی ہی ایک الگ کہانی تھی ایک ہی ناؤ کے سوار مسافر مل جُل کر وقت کاٹنے لگے۔ جب تک میڈم ورما اِس آشرم کی انچارج تھیں تب تک سب ٹھیک تھا لیکن پچھلے چھ مہینے سے جب سے جگدیش بابو نے یہ عہدہ سنبھالا تھا تب سے اُس کی عُمر کی لڑکیوں کی مُصیبت آگئی تھی۔ ہفتہ دس دِن بعد وہ کِسی نہ کِسی لڑکی کو سرکاری افسر یا سیاسی لیڈر کے پاس لے جاتا اور اپنے کام نکلوانے کے عوض ان کی عصمت کا سودا کرتا۔ جو لڑکی چیختی چلاتی اُسے چابک سے مارا جاتا اور وہ اپنا سب کچھ لٹانے کو مجبور ہو جاتی۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو اپنے حالات سے مجبور تھیں جن کے پاس سر چھپانے کو دوسرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہ تھا اور نہ ہی وہ اس قابل تھیں کہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتیں۔

شام ڈھل گئی اور اسے پھر سے بُلاوا آگیا۔ بوجھل من سے خود کو سمیٹا اور تیار ہونے لگی لیکن اس کا دِل و دماغ اُس سے کوسوں دور اپنے گھر میں پہنچا ہوا تھا۔ کاش اُس نے حالات کا مقابلہ کیا ہوتا اور وہ ڈر کر اِس طرح گھر سے نہ بھاگی ہوتی۔ اگر مجبوراً اُس کی عصمت کا سودا کیا گیا ہوتا تو وہ کمائی اُس کے بہن بھائیوں کی پرورش کے لئے کام آتی۔ لیکن آج وہ میلوں دور بے بس لاچار دوسروں کے مفاد کے لئے بک رہی تھی جس کا فائدہ نہ تو خود اُسے اور نہ ہی اُس کے گھر والوں کو ہو رہا تھا اور دِل کے کسی کونے میں یہ خوف بھی اُسے کھائے جا رہا تھا کہ اُس کی بہن بھی اب اُس عمر میں پہنچ چکی ہو گی جس عُمر میں وہ حالات سے مجبور ہو کر گھر سے بھاگی تھی۔ پتہ نہیں وہ ٹھیک سے ہو گی یا اُس کے سوتیلے باپ نے اُسے بھی بیچ دیا ہو گا۔ ذہن میں ایسے خیال آتے ہی وہ پنجرے میں قید پنچھی کی طرح آزاد ہونے کی ترکیب سوچنے لگی۔

تفتیش

دیپک کنول
C-28, Trishna Co-op. Hsg. Society
Plot No. 531, Sector-5
Charkop Kandivli (West)
Mumbai-400067

بہت دیر سے آسمان میں رہ رہ کے بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج نے تو جنگ کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سر کے اوپر کالے مٹیالے گنبد میں ہزاروں توپیں ایکساتھ چل رہی ہوں۔ اتنی زور کی گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی کہ آڑد (پہلگام) کی دھرتی کسی کھوکھلے پیڑ کی مانند ہلنے لگتی تھی۔۔۔

بادل بجلی کی یہ آنکھ مچولی شہباز خان کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس پہاڑی علاقے کا موسم کسی نازک اندام، تنک چڑھی حسینہ کے مزاج کی طرح تھا جو کبھی نرم تو کبھی گرم رہتا تھا۔ دُھلا دُھلا آسمان ہے، کھلی کھلی دھوپ ہے کہ مغرب کی جانب پہاڑوں کی اوٹ میں سے ایک آوارہ بادل کا ٹکڑا کسی دل جلے عاشق کی طرح اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں اور سے کالی گھٹاؤں کے لشکر نے ہلہ بول دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سورج کہیں سہم کے چھپ گیا اور کالی گھٹائیں، بدروحوں کی طرح ایک بے ہنگم سا رقص کرنے لگیں۔ بجلی کی چمک۔ بادلوں کی گھن گرج اور پھر چھاجوں برستا پانی۔ چند گھنٹے پہلے جو لوگ گرمی سے بیزار تھے اب وہی سردی کو کوسنے لگے۔ موسم کی اس متلون مزاجی سے یہاں کے لوگ خاصے مانوس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آسمان میں مچے قہر و تلاطم کے باوجود شہباز کی آنکھ نہیں کھلی۔ وہ اپنے کوٹھار میں، اپنی بیوی بلقیس کے پہلو میں نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔

اچانک دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔ بلقیس یوں ہڑبڑا کر اُٹھی جیسے بغل میں بجلی گری ہو۔ اُسنے اُٹھ کے لالٹین جلائی۔ شہباز کو اُٹھانے کی کوشش کی پر اُٹھا نہیں پائی۔ وہ تو لمبی تان کے سویا تھا۔ بلقیس کے من میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے سر اُٹھانے لگے۔ ذہن میں یہ سوال اُٹھا کہ اتنی رات گئے اس آندھی طوفان میں دستک دینے والا کون ہو سکتا ہے۔ یکایک دستک کی آواز توڑ پھوڑ میں بدل گئی۔ اُسنے گھبرا کے شہباز کو جگایا۔ شہباز نے ہڑبڑا کے پوچھا۔

"کے ہوئے؟ کہیں ترٹھ دُٹھ (بجلی) پے گئی۔؟"

بلقیس نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے، پھسپھسی آواز میں کہا۔ "وہ سُن لو جی۔ کوئی باہر کھڑا بازو دروازہ توڑ رہے ہو۔ رب خیر کرے۔ مینے تو لگے ہے کہ مارو واسطے کوئی مصیبت باہر سر اُٹھائے کھڑی ہے۔"

شہباز کا دل دہل گیا۔ دروازے پر پڑنے والی ہر چوٹ کی گونج اب اُسے اپنے سینے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ کشمیر میں پچھلے کئی سالوں سے جو موت کا تانڈو جاری تھا۔ وہ اُس سے بے بہرہ نہ تھے۔ اس خاموش جنگ نے اُنکے خرمن سکون میں آگ لگادی تھی۔ خوشحالی کی جگہ اُن کے دامن کو بدحالی اور بے کاری سے بھر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ذرا سی آہٹ ہوتی تھی تو اُن کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔

شہباز جی کڑا کر کے اُٹھا اور لالٹین اپنے ہاتھ میں لے کر بوجھل قدموں کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھ کر پھسپھسی آواز میں چلایا۔

"کون باہر دروازہ توڑ رہا ہے۔؟"

"پہلے دروازہ تو کھول۔" باہر سے ایک کرخت آواز گونجی۔ "پھر بتاتے ہیں کون ہیں ہم"

"شہباز نے دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا۔ سامنے تین ہیبت ناک ہیولے کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھے ایک زنانے دار تھپڑ نے اُسے چکرا دیا۔

"مردُود۔ خبیث۔ آدھے گھنٹے سے دروازہ پیٹ رہے ہیں۔ کانوں میں روئی ٹھونس کے سو جاتے ہو کیا۔؟"

شہباز تھپڑ کی چوٹ سے تلملا تو اُٹھا ضرور مگر قہر درویش بر جانِ درویش کے مصداق، اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ تینوں اُسے ایک طرف ہٹا کر کمرے کے اندر گھس آئے۔ تینوں ہتھیاروں سے پوری طرح لیس تھے۔ شہباز پھٹی پھٹی آنکھوں سے تینوں کو باری باری یوں گھورنے لگا جیسے وہ انسان نہ ہوں، جن بھوت ہوں یا دیو راکھشش۔ یہ لمبے لمبے بال۔ یہ لمبی لمبی داڑھیاں۔ بدن پر جمی ہوئی میل کی پرتیں۔ شکلیں بدصورت اور ڈراؤنی۔ انگاروں کی مانند دہکتی ہوئی آنکھیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو خبیث۔؟" ایک نے اُسکی طرف قہر آلودہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"ہمیں نہیں پہچانتے۔؟" ہم تمہارے دینی بھائی ہیں۔ سرحد پار کر کے تم لوگوں کو کافروں کے چنگل سے آزاد کرانے آئے ہیں۔"

شہباز تو یوں کھڑا تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ بلقیس کا شبہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ یہ وہی موت کے سوداگر تھے جنہوں نے وادیٔ لالہ زار کو مرگ زار بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان کے قدم اتنے منحوس تھے کہ جہاں ان کا پاؤں پڑتا تھا وہاں تباہی مچ جاتی تھی۔ پر کیا کیا جائے۔ ان سے حیل و حجت کرنا یا انکی حکم عدولی کرنا اپنی موت کو خود بلانے کے مترادف تھا۔

وہ تینوں کمرے میں ایسے ٹانگیں پسار کے بیٹھ گئے جیسے یہ گھر اُن کے باپ دادا کا ہو۔ لالٹین کی مدھم سی روشنی میں اُن کے چہرے مہرے اتنے بھیانک لگ رہے تھے جیسے یہ سرحد پار سے نہیں بلکہ قبرستان سے اُٹھ کر چلے آئے ہوں۔

"گھر میں اور کون کون ہے۔؟" ایک نے

فلسفانہ انداز میں پوچھا۔
"ایک میں ہوں، ایک ماری زنانی ہے جناب" شہباز نے معصومیت سے جواب دیا۔
"بچے۔؟"
"کوئی نہیں ہے جی۔"
"مطلب تازہ تازہ شادی ہوئی ہے۔؟"
"جناب۔"
"بیوی کا نام کیا ہے۔؟"
"بلقیس ہے جناب۔"
"اُسے باہر بُلاؤ۔"
"کیوں۔؟" اُسنے گھبرا کے پوچھا۔
"ارے اُسے باہر بُلاؤ۔ ہم ابھی اُس سے ملیں گے۔ کھا نہیں جائیں گے اسے۔"
"آخر ہم بھی مسلمان ہیں تمہارے دینی بھائی۔"
"دیکھئے جناب۔ ابھی تو تم خود ہی کہو ہو کہ تم مارے دینی بھائی ہو پھر تم ماری زنانی کو باہر....."
اچانک ایک وزنی تھپڑ اُس پر برسا۔ اُسکی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔
"خبیث کی اولاد۔ ہم سے حجت کرتا ہے۔ بُلاؤ اُسے باہر نہیں تو ہم......"
شہباز چکرا گیا۔ اپنے حواس یکجا کر کے اُسنے اُنہیں ہاتھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بلقیس کو بُلانے اندر چلا گیا۔ وہ تینوں بھوکے بھیڑیوں کی مانند اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے کہ دفعتاً شہباز بلقیس کو لے کے کھڑا ہو گیا۔ بلقیس کو دیکھ کر وہ تینوں یوں مبہوت ہو کے رہ گئے جیسے بلقیس شہباز خان کی بیوی نہ ہو آسمان سے اُتری کوئی پری ہو۔ بلقیس تھی ہی اتنی خوبصورت کہ اُسے دیکھ کر اچھے بھلوں کا ایمان ڈگمگا جائے۔ وہ اماوس میں کھلے چاند کی طرح تھی۔
"جناب اب آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں اسے اندر بھیج دوں۔؟"
تینوں جیسے کسی اور دنیا میں پہنچ چکے تھے کہ شہباز کی آواز سُن کر اپنے میں لوٹ آئے اور بے دلی سے کہا۔
"ہاں ہاں لے جاؤ۔ اور سنو جلدی سے ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کر لو۔ دو دن کے بھوکے ہیں ہم۔"
"بہت اچھا جناب۔"
کہہ کر شہباز بلقیس کو لے کر کچن میں چلا گیا۔ دونوں خاموش تھے۔ ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے وحشت اور چہرے سے گھبراہٹ صاف جھلک رہی تھی۔ بلقیس نے دیگ میں چاول چڑھائے۔ شہباز نے ڈربے سے دو مُرغیاں نکال کر انہیں حلال کر دیا۔ اس بیچ وہ تینوں کچھ کھُسر پھُسر کرتے رہے۔ شہباز اور بلقیس ان سب باتوں سے بے نیاز، کھانا بنانے میں جٹے ہوئے تھے۔
اُنہیں کھانا پیش کیا گیا۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانا کھا کر جب وہ شکم سیر ہوئے تو چہرے پر تازگی اور آنکھوں میں ایک حریصانہ سی چمک اُبھر آئی۔ بلقیس اور شہباز جب برتن سمیٹ کر جانے لگے تو ایک نے اُنہیں رائفل سے روک کر پوچھا۔
"تم دونوں کہاں جا رہے ہو۔؟"
"جناب اب تم بھی آرام کر لو۔ ہم بھی آرام کر لیں گے۔"
"ہم یہاں آرام کرنے نہیں آئے ہیں۔" وہ رائفل والا بھڑکا۔ "ہم یہاں ایک خاص مقصد سے آئے ہیں۔ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ تم لوگ فوج کی مُخبری کرتے ہو۔"
شہباز کا دل دھک سے ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "یہ سراسر جھوٹ ہووے جناب۔ سراسر جھوٹ۔ سانوں کیا لوڑ پڑی ہے مُخبری کرنے کی۔ ارے جناب جو تم قسم اُٹھانے کو کہو ہے۔ ہم اُٹھانے کو تیار ہیں۔ رُب دی سَوں۔ ہم کسی فوجی کو جانتے تک نہیں۔ مُخبری کس سے کریں۔"
"وہ تو ابھی پتا چل جائے گا۔ تم یہاں بیٹھو۔ تم سے یہاں تفتیش ہو گی۔" اُسکے بعد وہ بلقیس کی طرف مُڑا اور اُسے سر سے پاؤں تک گھورنے لگا۔ بلقیس کو لگا جیسے وہ نظر نہ تھی، ایک تیز دھار تھی جس نے اُسے اوپر سے نیچے تک چیر کے رکھ دیا ہو۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔
"بنا تفتیش کے یہ سچائی نہیں اُگلیں گے۔ میں اسے پوچھ تاچھ کے لئے دوسرے کمرے میں لے جا رہا ہوں۔ یہ عورت بے قصور ہے یا قصوروار ابھی اسکا فیصلہ ہو گا۔"
شہباز تلملا اُٹھا۔ مزاحمتی انداز میں بولا۔
"یہ دین مذہب کے خلاف کام کر رہے ہیں آپ جناب۔ آپ ماری زنانی کو اسطرح الگ کر رہے ہیں......"
ایک زور کی لات اُس پر پڑی۔ اُسکا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اُس دہشت گرد نے جیب سے ریوالور نکال کر جوں ہی اُسکی کنپٹی پر رکھا تو شہباز کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ بلقیس چکرا کے رہ گئی۔ وہ دہشت گرد گرج کر بولا۔
"حرامی۔ خنزیر۔ ایک تو دین اور دین داروں کے خلاف کام کر رہے ہو اور اوپر سے آنکھیں دکھا رہے ہو۔ خبیث ایک گولی کھوپڑی میں اُتر جائے گی نا تو سارا بھیجا باہر آ جائے گا۔ چل یہاں بیٹھ۔ ذرا سی بھی ٹیں ٹاں کی تو گولی مار دوں گا۔"
اُسنے اُسے لات مار کر نیچے بٹھا دیا اور خود بلقیس کو لے کر اندر چلا گیا۔ شہباز ایک زندہ لاش کی طرح بیٹھا تھا۔ دل میں ان گنت آندھیاں چل رہی تھیں۔ دماغ میں لاتعداد طوفان اُٹھ رہے تھے۔ وہ کرے تو کیا کرے۔ کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ پہلے والے دہشت گرد نے اُسکی کیفیت بھانپ کر اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے کی

کوئی بات نہیں۔ ہم کوئی لادین، کافر نہیں۔ مسلمان ہیں۔ تمہاری بیوی بے قصور ہوگی تو ہم اُسے کوئی آزار پہونچائے بنا آزاد کر دیں گے۔"

شہباز کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ رحم طلب آنکھوں سے پہلے والے دہشت گرد کی طرف دیکھنے لگا کہ اچانک بلقیس کی چیخ اُبھری۔ وہ تڑپ اُٹھا۔

"جناب وہ چیخ کیوں رہی ہے۔ دیکھو جناب تمہارے کو اللہ مولا کا واسطہ۔ ماری بلقیس کو مارنا پیٹنا مت۔ ہم نے تو آج تک اُسے مارنا تو دور رہا کبھی ایک پھول تک نہیں مارا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ ہم بھی اُسے ماریں گے نہیں۔"

"تو پھر وہ چیخ، چلا کیوں رہی ہے۔؟"

"تفتیش چل رہی ہے نا۔" پہلے والے نے اطمینان سے جواب دیا۔

صبح تک باری باری تینوں نے بلقیس کی تفتیش کی۔ اُسکی چیخیں اُسکے وجود کو اندر ہی اندر کاٹتی پھاڑتی رہیں۔ اُسکی ایک ایک چیخ پر اُس کا کلیجہ کٹ کٹ کے گرتا رہا مگر وہ کتنا بے بس تھا۔ وہ مجبور تھا۔ وہ اُسکی مدد نہیں کر پا رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی اُنہوں نے بلقیس کی بے گناہی کا اعلان کر دیا۔ شہباز بلقیس سے ملنے کے لئے جونہی اندر جانے لگا تو ایک نے اُسے روک کر کہا۔

"اتنی بھی جلدی کیا ہے اپنی [illegible] سے ملنے کی [illegible] گاؤں کے باہر تو چھوڑ آؤ۔ تم جی بھر کے اپنی بیوی سے باتیں کر لینا۔"

اُنکے جانے کی خبر سُن کر شہباز کا دل بلیوں اُچھلا۔ وہ اُنہیں خوشی خوشی بستی کے باہر چھوڑ کر آیا۔ وہ جب واپس آ رہا تھا تو راستے میں نور دین گوجر سے اُسکی مڈ بھیڑ ہوئی۔ وہ اُس سے ان تینوں کے متعلق طرح طرح کے سوال کرنے لگا۔ وہ جھنجلا اُٹھا۔ اُسنے نور دین کو جھاڑ کر اُس سے پنڈ چھڑا لیا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ گھر کی اور بڑھنے لگا۔

وہ جب گھر پہونچا تو بلقیس کو دیکھ کر اُسکا دل دھک سے رہ گیا۔ اُسکا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔ کیسا بُرا حال کر دیا تھا اُنہوں نے اُسکی بلقیس کا۔ اُن تین بھیڑیوں نے تفتیش کی آڑ میں اُسے نوچ ڈالا تھا۔ اُسے لہولہان کر دیا تھا۔ اُسکی عزت و عصمت کی دھجیاں اُڑائی تھیں۔ اپنی بھوک مٹانے کے لئے اُنہوں نے اُسکا حال بد کر دیا تھا۔

شہباز کو لگا جیسے ایک کڑکتی ہوئی بجلی ٹھیک اُسکے وجود پر آ کے گری جس نے اُسے جلا کر راکھ کر دیا ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنا سر پٹخنے لگا، اپنے بال نوچنے لگا اور اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگا۔

"یہ خبیث۔ مردود۔ دین اور دینداری کی باتیں کرے ہیں۔ اللہ مولا ان لادینوں کو دوزخ میں بھی جگہ نہ دے۔ کتے کی موت مریں گے۔ یہ خنزیر۔ دین دُنیا کو بدنام کیا ہے ان ملعونوں نے۔ خود کو مسلمان کہیے ہیں خبیث۔ کام لادینوں کے کرے ہیں سالے۔ دیکھ لینا۔ ایک دن ان پر قہر ٹوٹے گا ہی ٹوٹے گا۔ مولا نہیں چھوڑے گا انہیں۔ دو گز زمین بھی نا ملے گی انہیں چھپنے واسطے۔"

وہ بہت دیر تک یونہی دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ جب جی کچھ ہلکا ہو گیا تو ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر روتا رہا۔ بلقیس بُت بنی یہ سب دیکھتی رہی۔

نور دین تین دہشت گردوں کے بارے میں پولیس کو خبر کر چکا تھا۔ تین بجے پولیس انسپکٹر نے پوری جمعیت کے ساتھ اُسکے گھر پر دھاوا بول دیا اور گھر کی تلاشی لینے کے بعد وہ لوگ شہباز کو گرفتار کر کے لے گئے۔ شہباز رویا، گڑگڑایا مگر پولیس پر اُسکے رونے گڑگڑانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ہمت کر کے اُسنے انسپکٹر سے پوچھا۔

"جناب۔ ماری خطا کی ہے۔؟"

"خطا۔" انسپکٹر نے اُسے چانٹا مار کر کہا۔ "تم دہشت گردوں کو گھر میں پناہ دیتے ہو۔ اُن کی مخبری کرتے ہو۔"

"واہ رے مولا۔ وہ کہیے ہیں کہ ہم فوج کی مخبری کرے ہیں۔ یہ کہیے ہم اُن کی مخبری کرے ہیں۔ مولا اب تمہارا ہی سہارا۔ تو ہی مدد کر۔"

"مولا کیا مدد کرے گا۔" انسپکٹر غرایا۔ "جرم تم کرو اور مدد مولا سے مانگو۔"

"جناب ہم کوئی مخبر نہیں ہیں۔"

"سچ کیا ہے جھوٹ کیا ہے یہ تو تفتیش کے بعد ہی پتہ چلے گا۔"

تفتیش کا نام سُن کر اُسکا کلیجہ مُنہ کو آگیا۔ وہ اُنہیں لاکھ سمجھاتا رہا مگر کسی نے اُسکی ایک نہ سُنی۔ اُنہوں نے اُسے خوب مارا۔ جب مار سے اُسکا بدن ٹوٹ گیا تو اُسنے انسپکٹر کو بلقیس کے ساتھ ہوئے جبر و ظلم کی پوری روداد سُنا ڈالی۔

انسپکٹر کا ہاتھ رُک گیا۔ وہ اُسے حوالات کی کوٹھری میں چھوڑ کر ایک پولیس والے کے ساتھ بلقیس کا بیان لینے اُسکے گھر پہنچ گیا۔

بلقیس کی تفتیش کرنے کے بعد وہ دونوں تھانے میں لوٹ آئے اور رات کو شہباز کو حوالات سے آزاد کر دیا۔

وہ جب گھر پہنچا تو اُسکا پورا بدن دُکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پولیس والوں کو صلواتیں سُنانے لگا۔ کم بخت پوچھ تاچھ کے نام پر کتنا مارتے ہیں۔ اچانک وہ چونکا۔ لگا، اُسے خیال آیا کہ بلقیس کی بھی انہوں نے تفتیش کی ہوگی۔ اُسے بھی مارا پیٹا ہوگا۔

یہی سوچ کر جب وہ بلقیس کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک لمحہ کیلئے وہ منجمد ہو کر رہ گیا۔

بلقیس بے سدھ اور بے جان پڑی تھی۔ اُسنے جب اُسے ہلایا تو اُسکی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ وہ مر چکی تھی۔ وہ خود مری تھی یا مار ڈالی گئی تھی یہ تو مولا جانے یا تفتیش کرنے والا۔ اتنا تو صاف تھا کہ پولیس والوں نے بھی بڑی بے رحمی سے اُسکی تفتیش کی تھی کیونکہ ابھی تک پولیس انسپکٹر کے کوٹ کا بٹن اُسکی مٹھی میں بند تھا۔

چاندنی کی پہلی عید کا انعام

ساوتری گوسوامی (آسٹریلیا)

C/o. Mr. Arvind Chetty
1, Hellam Grove, BOORAGOON
W. A. - 6154 - PERTH (Australia)

وہ بچپن سے ہی مجھے امی پکارتی تھی۔ ب دہ اپنی چھوٹی چھوٹی بانہیں میرے گلے میں ال کر میرے سینے سے لپٹ جاتی تھی تو مجھے اپنی ونی گود کا احساس کم ہو جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے ہی .روشنی فون پر ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔ یہ زاب کہاں سے ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ ہم سب کو چھوڑ ر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور چلی گئی تھی۔ اس ہاں سے کون واپس لوٹا ہے۔ پلوں میں سوہنی ر بھائی جان کی دنیا اندھیری ہو گئی تھی۔ بھائی ان کا برا حال تھا۔ مجھے اور عرفان کو اپنے آپ ہی سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ سوہنی کو میں کیسے نبھالتی۔ اس مٹی کی کلسی کو دیکھ کر پورا کا پورا مربلک اٹھا تھا۔ چاروں طرف اداسی اور موت کا بایا چھا گیا تھا۔ اس آنگن کی کلی آج خاک ہو گئی می۔ سب طرف بس ویرانی اور ماتم ہی ماتم تھا۔ ماری پیاری بیٹی پوری کی پوری اس کلسی میں سما ئی تھی۔ یہ دردناک نظارہ دیکھنے کی ہمت اور لاقت ماں میں کہاں تھی۔ وہ تو دیکھتے ہی میرے تھوں میں بیہوش ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ سوہنی کو ہوش تو آ گیا پر زبان سے ایک حرف نہیں نکلا۔ اس کی آنسو بھری آنکھیں کلسی پر جمی ہوئی تھیں۔ کلسی کو پھولوں سے سجا کر کونے میں رکھ دیا تھا۔ اور پاس ہی روشنی کی مسکراتی ہوئی تصویر پھولوں سے لدی رکھی گئی تھی۔ جو بھی آتا آنسو گرا کر ہائے ہائے کرتا۔ سب ہی سوگ منا رہے تھے۔

منٹوں میں خبر سب جگہ پھیل گئی تھی۔ گھر کے سامنے ہجوم لگ گیا تھا۔ روشنی کی سہیلیاں زار و قطار رو رہی تھیں۔ ماں افسردہ نگاہوں سے اپنی لاڈلی کی تصویر اور مٹی کی کلسی کو گھورے جا رہی تھی۔ اب بھی امید تھی کہ شاید ایک بار اور اپنی ماں کو پکارے گی۔ وقت گزرتا گیا۔ اب کلسی بھی لے گئے تھے۔ ماں کے کلیجے کے ٹکڑے کو پاس والی ندی میں بہا آئے تھے۔ سوہنی کا حال دیکھ کر میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس صدمے نے مجھے چور چور کر دیا تھا۔ مجھے امی بولنے والی نہیں رہی تھی۔ کون اب مجھے امی پکارے گا۔ یہ گہرے زخم تو ہمیشہ ناسور بن کر رستے رہیں گے۔ چاروں طرف غموں کا اندھیرا اور ویرانی ہی ویرانی تھی۔ غموں اور صدموں کے ساتھ بھی سانسیں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ سوہنی اور بھائی جان دونوں غموں کے سمندر میں ڈوبے جا رہے تھے۔ میری اور عرفان کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ سوہنی کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے سال گزر گیا۔

ایک دن ضد کر کے میں ڈاکٹر کو گھر لے آئی تھی۔ ڈاکٹر نے کئی سوالات کئے پر سوہنی کی زبان بند ہی رہی۔ بس آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپک رہے تھے۔ ڈاکٹر کئی بار حال پوچھنے آئے پر سوہنی کے منھ سے آواز نہیں نکلی۔ ڈاکٹر نے صلاح دی کہ ان کی دماغی اور دلی پریشانی صرف بچہ ہی دور کر سکتا ہے۔ ایک بچہ گھر میں لانا ضروری ہے۔ اس کے رونے کھیلنے کی آواز اور پیاری پیاری مسکراہٹ ہی اس اجڑی ممتا کو پھر سے آباد کر سکتی ہے۔ ان کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ یوں ہر وقت بچی کی تصویر کے سامنے رونے سے دماغی حالت اور بگڑتی جائے گی۔ اب مجھے سوہنی کی صحت کی فکر پریشان کرنے لگی تھی۔

پھولوں کا موسم آیا۔ بھائی جان نے مالی کو حکم دیا کہ کوئی نیا پیڑ اور نیا بیج اب باغ میں کبھی نہ لگایا جائے۔ وہ بولے دل ہی اجڑ گئے تو گھر بھی ویران پڑا رہنے دو۔ ان کے باغ میں خاک اڑتی رہی۔ ڈاکٹر بار بار آتے سوہنی سے اصرار کرتے کہ ان کی صلاح پر تھوڑا سا غور کریں۔ میرے کہنے پر عرفان اور بھائی جان یتیم خانے میں بچے کے لئے درخواست دے آئے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ سوہنی کو کس طرح راضی کیا جائے۔ وہ کسی حال میں جانے کو راضی نہ تھی۔ میں بالکل ناامید ہو گئی تھی۔ ایک دن میں نے رو رو کر سوہنی سے التجا کی کہ میری خاطر ایک بچہ لے آئے۔ میں نے اپنی جھولی اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا میرے کان امی لفظ سننے کے لئے ترس گئے ہیں۔ وہ بچپن سے ہی مجھے روتا نہیں دیکھ پاتی تھی۔ شاید اس کو میرے دکھ اور آنسوؤں نے مجبور کر دیا اور ایک دن وہ میرے ساتھ یتیم خانہ چلی آئی۔

ہماری کوشش اور دعائیں قبول ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اندر آئی اور خاموش کمرے میں کھڑی رہی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ میں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میں اور بھائی صاحب بڑی امیدوں سے اسکی طرف دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا یہ بچوں کی دنیا کتنی پیاری اور نرالی ہے۔ سب اپنے دکھ درد یہاں آکر بھول جاتے ہیں۔ انکی مسکراہٹوں میں کچھ ایسی کشش ہے کہ روتا ہوا انسان بھی ہنس پڑتا ہے۔ سوہنی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارائیں پھوٹ پڑی تھیں۔ میں نے اس کو سہارا دیتے ہوئے کہا اپنے آپکو سنبھالو کب تک یوں تڑپتی رہو گی۔ آنسو بہاتی رہو گی۔ ان اندھیروں سے باہر نکلنے کی کوشش تو کرو۔ ان معصوم بچوں کی طرف دیکھو۔ کتنے اکیلے ہیں۔ ان بے چاروں کو

تو آنے والے غموں اور خوشیوں کا بھی احساس نہیں۔ ماں باپ کے ٹھکرائے ہوئے انجانوں کی گودیوں میں جانے کیلئے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ تمہارے اندر تو پیار کا ساگر ہے۔ اس پیار کے سہارے ایک کی زندگی سنوار دو۔ ہمارے افسردہ دلوں کو بھی خوشی نصیب ہوگی۔ وہ خاموش میرا منھ تاکے جارہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تھوڑا سا سکون نظر آیا۔ میں بولی اب زیادہ نہ سوچو۔ آج خالی ہاتھ واپس نہیں جانا۔ وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ بچہ زور زور سے رونے لگا تھا۔ سوہنی کی ساڑی بچے کے پلنگ میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ وہ پلٹی۔ بچہ کو گود میں اٹھالیا۔ کبھی سینے سے لگاتی اور کبھی اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو چومتی۔ میں نے کہا تمہاری گود میں آتے ہی رونا بند ہوگیا۔ اپنی ماں کی گود پہچان گیا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی شالو دیکھو نہ یہ ہی تو میری روشنی ہے۔ کتنی پیاری ہے بالکل اسی کی طرح۔ اس کی آواز سنکر میرے اور بھائی جان کے خوشی سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ ایک سال کے بعد اس نے زبان سے کچھ کہا تھا۔ بھائی جان بولے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، بولی تو۔ تھوڑی دیر میں کہنے لگی یہ تمہیں امی پکارے گی۔ اب کبھی نہ رونا۔ وہ بچہ گود میں لئے موٹر میں جا بیٹھی تھی۔ بھائی جان نے کاغذاتی کاروائی ختم کی۔ آج ان دونوں کو مسکراتے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی اور اطمینان ہوا تھا۔ نئی امیدیں لے کر گھر جارہے تھے۔

گھر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ہم ایک ننھی گڑیا کو لے آئے ہیں۔ شاید بھوکی تھی۔ وہ روئی اور سارا گھر اس کی آواز سے جاگ اٹھا تھا۔ بچی میری گود میں دیتے ہوئی سوہنی بولی اپنی بیٹی کا نام تو رکھو۔ میں نے کہا چاند کی چاندنی دلوں کو سکون اور ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ یہ چھوٹی سی جان ہم سب کے لئے خوشیوں کا پیغام لے کر آئی ہے۔ یہی ہماری چاندنی ہے۔

بس چاندنی کا آنا تھا کہ گھر کا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ نوکر چاکر مسکرا رہے تھے۔ گھر کھلونوں سے بھر گیا تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں پھر سے بہاریں ہی بہاریں تھیں۔ غم کے کالے اندھیرے ختم ہو چکے تھے۔ اس سال پھر ان کے باغ میں کئی قسم کے رنگین پھول کھلے تھے۔ اب سوہنی کا سارا وقت اس ننھی سی گڑیا کے ساتھ گزرتا۔ زندگی میں دوبارہ خوشیاں اور نئی امیدیں نظر آرہی تھیں۔ چاندنی اسکول گئی۔ امی اور ماں دونوں ہی کا جانا ضروری تھا۔ اسکول سے کالج پہنچ گئی تھی۔ وقت بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا دیکھتے دیکھتے چاندنی کا بچپن پیچھے چھوٹ گیا۔ اب وہ بھی جوان ہوگئی تھی۔

اسی دوران بھائی جان کی طبیعت خراب ہوئی اور ایک دن وہ بھی ہم سبھوں کو چھوڑ روشنی سے جا ملے۔ اب سوہنی پھر سے پرانے غموں کی یاد کر کے روتی۔ اس کو اپنی زندگی بوجھ سی لگنے لگی تھی۔ چاندنی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر اس کو چین نہیں لینے دیتی تھی۔ بار بار کہتی میرے جانے کے بعد اس کو کون سہارا دے گا۔ یہ پھر سے یتیم ہو جائے گی۔ بالکل اکیلی رہ جائے گی۔ اس کو ایک اچھا جیون ساتھی مل جائے تو میں بھی آرام سے مر سکوں۔ کئی جگہ شادی کی بات چلائی۔ پر چاندنی کے ماضی نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے وہ سوچتی اور منع کر دیتی۔ سوہنی کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی کوئی بھی آگے بڑھ کر اس یتیم خانہ کی لڑکی کو اپنانے کے لئے راضی نہ تھا۔ لوگ سوہنی کو صاف کہتے جس کے ماں باپ کا ٹھکانہ نہیں وہ شریف گھر کی بہو کیسے بن سکتی ہے۔ سوہنی رو کر رہ جاتی۔ بھگوان کچھ تو کرو۔ میری بچی کے لئے کوئی تو جوڑا تم نے بنایا ہی ہوگا۔

مجھے کسی کام سے حیدر آباد جانا تھا واپسی میں ٹرین میں کمال سے ملاقات ہوئی۔ وہ حیدر آباد میں پروفیسر تھا۔ اس کے والدین بچپن ہی میں ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ دادی اماں نے پرورش میں کوئی کمی نہ رکھی تھی۔ جوان ہوا تو دادی بھی چھوڑ چلیں۔ اب بس دنیا میں خود غرض اور لالچی رشتہ داروں نے گھیر رکھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کی ملاقات میں ایسا محسوس ہوا کہ وہ برسوں سے مجھے جانتا ہے۔ اس کی ہر بات میں کتنا اپناپن تھا۔ اس کی داستانِ غم سن کر میں اداس ہوگئی تھی۔ اسکی باتوں میں اتنی کشش تھی کہ بے ساختہ بول اٹھی کہ اپنی خالہ سمجھ کر کچھ دن ہمارے یہاں قیام کرو۔ شاید تمہارا دل بہل جائے۔ اس کی خوش اخلاقی، تہذیب اور قابلیت دیکھ کر ہم لوگوں کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ درجے کے خاندان کا فرزند ہے۔ عرفان تو کمال سے مل کر بہت خوش تھے۔ دوسرے دن میں اور کمال سوہنی سے ملنے گئے۔ دروازے پر چاندنی کھڑی تھی۔ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اس کے کالے لمبے لمبے بالوں میں سے گلابی چہرہ چمک رہا تھا۔ کمال کو دیکھ کر اس کا چہرہ لال ہوگیا تھا۔ کمال تو چاندنی کو ایک ٹک گھورے جارہا تھا۔ اس کی شوخ نظریں چاندنی پر جم گئی تھیں۔ لبوں پر چنچل مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ چاندنی نے نظریں اٹھائیں۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور چاندنی نے مسکرا کر گردن جھکا دی تھی۔ اس نے گھبرائی شوخ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں مسکرا کر آگے بڑھ گئی تھی۔ میں نے اندر سے جھانک کر دیکھا۔ دونوں وہیں کھڑے ایک دوسرے کو تاکے جارہے تھے۔ کمال کی مسکراہٹ میں پیار چھلک اٹھا تھا، اور وہ امید بھری نظروں سے چاندنی کو گھورے جارہا تھا۔ مجھے اپنی اور عرفان کی پہلی ملاقات یاد آگئی تھی۔ ہماری بھی نگاہیں ٹکرائی تھیں اور محبت کے چراغ جل اٹھے تھے اور آج تک محبت کی وہی روشنی ہمارے دلوں میں اجالا کئے ہوئے ہے۔ میں سوہنی کے کمرے میں پہنچ

گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں بھی آئے۔ دونوں کے منہ چمک اٹھے تھے۔ آنکھوں میں محبت کے دیئے جل رہے تھے۔ دونوں کی دھیمی دھیمی مسکان حال دل بیان کر رہی تھی۔ کمال اور چاندنی دونوں ہی کچھ گھبرائے گھبرائے نظر آئے تو میں نے کہا پروفیسر صاحب کہاں کھو گئے؟ آؤ اپنی ایک اور خالہ سے ملو۔ کمال بڑے سلیقے سے آداب بجالایا۔ سوہنی نے بڑے پیار سے شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور بولی۔ جیتے رہو بیٹا۔ کمال کو آج برسوں بعد کسی نے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔ وہ سوہنی کے قریب جاکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بولی شالو نے فون پر تمہارا اتنا زیادہ ذکر کیا کہ تم سے ملنے کی خواہش ہو چلی تھی۔ بہت اچھا کیا تم آئے۔ کمال کو لگا آج اس کی امی آسمان سے اتر آئی ہیں۔ بچپن کی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ اس کی امی بھی اس طرح سر پر ہاتھ رکھ کر ہزاروں دعائیں دیتی تھیں۔ پیاری پیاری باتیں کرتی تھیں۔ سوہنی کا ہر ایک لفظ اس کی دل کی گہرائیوں کو چھو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اس نیک خاتون کے اندر تو محبت کا چشمہ ابل آیا ہے۔ سوہنی سے بولا آج برسوں کے بعد کسی نے مجھے بیٹا کہہ کر پکارا۔ سچ کہتا ہوں آپ کو دیکھ کر امی کی صورت آنکھوں میں اتر آئی ہے۔ کتنی ملتی ہیں آپ میری امی سے۔ سوہنی نے کہا اگر تمہارا دل مجھے امی کی صورت میں قبول کرے تو شوق سے مجھے امی پکار سکتے ہو۔ مجھے تو فخر ہوگا۔

اتنے میں چاندنی چائے لے آئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چھپی چھپی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چاندنی چائے بنانے لگی تھی۔ اس کے کانپتے ہاتھ دل کی کیفیت ظاہر کر رہے تھے۔ چاندنی نے نظریں اٹھائیں تو کمال اسکو دیکھ کر مسکرا اٹھا تھا۔ نوکر آیا۔ میں نے حکم دیا کہ ان دونوں کی چائے باغیچہ میں پہنچادو۔ چاندنی سے کہا یہ بوٹنی (Botany) کے پروفیسر ضرور ہیں پر ہمارے ایک ہی پھول کو دیکھ کر ہوش گنوا بیٹھے ہیں۔ دونوں مسکراتے ہوئے چل پڑے تھے۔ ان کی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ کمرے میں رونق پھیل گئی تھی۔ کمال کی آنکھیں دروازے پر ٹک گئی تھیں۔ میں نے کہا صاحبزادے جائیے باہر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ وہ مسکراتا ہوا چاندنی کے پیچھے پیچھے چلا گیا تھا۔

میں نے سوہنی سے کہا کمال کیلئے کیا خیال ہے۔ گھبرا کر بولی لڑکا تو نیک ہے۔ لیکن بڑے گھرانے کا لڑکا ہے اور چاندنی کے بارے میں کل اسکو معلوم ہو گیا تو؟ تم تو سب جانتی ہو۔ میں نے کہا میں تو بس یہ جانتی ہوں جہاں چاندنی کھڑی ہوتی ہے پھول کھل اٹھتے ہیں۔ جہاں اسکے قدم پڑتے ہیں خوشیاں بکھر جاتی ہیں۔ میں آج سمجھو خوشیوں کا خزانہ ہی کمال کیلئے مانگ رہی ہوں۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔ تم نے کمال سے ذکر تو کیا ہوگا؟ میں نے کہا ابھی ابھی تم نے ان دونوں کے چہرے نہیں دیکھے۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ آنکھوں میں محبت کے چراغ جل رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو چھپی چھپی نگاہوں سے تاک رہے تھے۔ چاندنی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اب یوں نہ کہنا یہ سب پیار کی علامتیں ہیں۔ یوں محبت کرنے والے کسی چیز کی فکر نہیں کرتے۔ بڑے بڑے بادشاہوں نے پیار کیلئے اپنے تخت و تاج چھوڑ دیئے۔ لوگوں نے اپنی جانیں گنوادیں۔ محبت اور پیار تو اللہ کی مہربانی سے ملتا ہے۔ جوڑے تو خدا کے گھر بنائے جاتے ہیں۔ یوں ہی پریشان ہو رہی ہو۔ سوہنی نے بات کاٹتے ہوئے کہا ہم دونوں بچپن سے ساتھ ہیں۔ ہمارے خاندان ایک دوسرے کے تہواروں، خوشیوں اور غموں میں ہمیشہ برابر کے شریک رہے۔ بھول گئیں تمہاری امی عید میں ہم دونوں کیلئے ایک سے جوڑے سلواتی تھیں۔ دیوالی میں ہم دونوں ملکر دیئے اور پھلجھڑیاں جلاتے تھے۔ یہ سماج اور مذہب کی دیواریں ہمارے درمیان کبھی نہ تھیں۔ جہاں سے ہم دونوں اس بچی کو لائے ہیں وہاں کوئی سماج ہے نہ کسی بچے کے ماتھے پر کسی مذہب کی مہر لگی تھی۔ کتنے بچے وہاں سے دنیا کے کونے کونے میں بھیجے جاتے ہیں۔ ان معصوم بچوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں اور کہاں جارہے ہیں۔ یہ سماج والے اتنے بے درد اور ڈرپوک ہیں کہ اپنی خطاؤں کی سزائیں ان ننھے اور کمزور بچوں کو دیتے ہیں۔ ماں باپ ان بچوں کو اپنانے سے انکار کر دیتے ہیں اور یتیم خانے کے دروازے پر چھوڑ آتے ہیں۔ اس قسم کے بچوں کو کون سا سماج ہاتھ پھیلا کر قبول کرتا ہے۔ میں نے کہا بس اور نہ بولو۔ وہ بولی تم سے زیادہ چاندنی کی خوشی کا خیال اور کون رکھ سکتا ہے۔ اس جہنم سے تو تم نے ہی اس کو نجات دلوائی ہے۔ اگر اس دن تم ساتھ نہ ہوتیں تو آج چاندنی ہمارے درمیان نہیں ہوتی۔ چاندنی کے اوپر مجھ سے زیادہ تمہارا حق ہے۔ تم جو بہتر سمجھو کرو۔

خاصی دیر بعد چاندنی اور کمال اندر داخل ہوئے۔ سوہنی نے کمال سے پوچھا پسند آیا باغیچہ؟ وہ مسکرا کر بولا صرف باغیچے کا ذکر کیا کروں یہاں کی تو ہر چیز بہت دلکش اور خوبصورت ہے۔ چاندنی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ آپ سب کی محبت کو پاکر مجھے اب یقین ہو چلا ہے کہ خدا کبھی کسی کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔

میں نے کہا تمہارے سارے کام ادھورے پڑے ہیں۔ صبح کی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔ وہ بولا خالہ یہاں آکر زندگی کا سب سے اہم کام پورا ہو گیا ہے۔ چاندنی کا منہ اداس ہو گیا تھا۔ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ میں نے کہا کیا دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں ہنس پڑے۔ کمال بولا بھلا ہم میں اتنی جرأت کہاں کہ ان کو ناراض کر سکیں۔ ہم تینوں آگے بڑھ گئے تھے۔

دروازے پر دونوں ایک دوسرے کو تاکتے رہے۔ چاندنی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ چہرہ اداس دیکھ کر میں نے کہا یہ بوٹنی (Botany) کے پروفیسر صاحب اس باغ کا راستہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ انتظار کی گھڑیاں ذرا مشکل سے کٹتی ہیں پر ان کا بھی ایک عجیب لطف ہے۔ یہ عید پر آ رہے ہیں۔ اور اس کو پیار کرتے ہوئے میں نے کہا اب مسکرا بھی دو۔ میں آگے بڑھ گئی تھی۔ دونوں کچھ دیر کھڑے رہے۔ میں نے گھوم کر دیکھا کمال مڑ مڑ کر چاندنی کو دیکھ رہا تھا۔ ہمارے پیچھے چاندنی راستے کو تاکتی رہ گئی تھی۔ آج میری دعاؤں کا جواب مل گیا تھا۔ میری چاندنی ایک شریف گھر کی بہو بنے گی۔

جب بھی کمال سے فون پر بات ہوتی چاندنی کا نام سن کر اس کی آواز خوشی سے بھر جاتی۔ روزے پورے ہوئے۔ رات کو کمال کی فلائٹ دیر میں آئی۔

صبح ہوئی۔ آج عید بڑے زور و شور سے خوشیوں کا پیغام لے کر ہمارے گھر آئی تھی۔ کمال کی موجودگی سے رونق دوگنی ہو گئی تھی۔ وہ کیا آیا ہمارے سونے گھر میں بہاریں اتر آئی تھیں۔ برسوں بعد آج پھر دل میں خوشیاں جاگ اٹھی تھیں۔ باہر بچے رنگین خوبصورت لباسوں میں رنگ برنگی تتلیوں کی طرح پھرکتے گھوم رہے تھے۔ لوگوں کا آنا جانا لگا تھا۔ میں کام میں مصروف تھی پھر بھی ہر پل سوہنی کے فون کا انتظار اور پھر کمال چاندنی کے فون کا انتظار کر کر کے تھوڑا گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی نظریں دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ میں باہر آئی۔ چاندنی خوبصورت گلابی جوڑے میں زیورات سے لدی سر پر دوپٹہ اوڑھے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ ساتھ میں سوہنی بھی تھی۔ میں دوڑ کر دروازے تک پہنچی۔ عرفان اور کمال کھڑے دیکھ رہے تھے۔ کمال تو خوشی سے بھرپور مسکرا رہا تھا۔ دوپٹہ میں سے چاندنی کا مسکراتا چاند جیسا چہرہ جھانک رہا تھا۔ میں نے کہا کمال آگے آؤ، صبح سے نظریں بچھائے انتظار کر رہے تھے۔ دیکھو یہ پریوں کی شہزادی ہمارے گھر کی خاص مہمان آئی ہے۔ وہ شرما گئی۔

میں نے کہا کمال ... وہ دور کھڑا کھڑا مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کے قدم رک گئے تھے۔ چاندنی کی پیاری پیاری مسکراہٹ دوپٹے سے جھلک رہی تھی۔ سوہنی بولی آج برسوں کے بعد بچپن کی عیدیں یاد آ گئیں۔ اس لئے تم سبھوں کو عید مبارک کہنے آئی ہوں۔ آج میں نے سماج کی مضبوط دیواریں توڑ ڈالی ہیں۔ اپنی لاڈلی کو تمہارے ہاتھوں میں سونپ رہی ہوں۔ اس کی ڈولی اس کی امی کے گھر سے ہی اٹھے گی۔ اس نے سارے کاغذات میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ اب سب دولت کی مالک وہی ہے۔ میں نے شادی کی پوری تیاری کر دی ہے۔ عرفان، کمال اور میں سوہنی کی قربانی دیکھ کر حیران تھے۔ سوہنی نے کمال سے کہا بیٹا خدا تم دونوں کو ہر نعمت سے مالا مال کرے۔ دنیاوی چیزیں تو پانا بہت آسان ہے۔ سچی محبت بڑی مشکل سے کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ میں اپنی زندگی تمہاری ہاتھوں میں دیئے جا رہی ہوں۔ اس کو پیار سے سنبھال کر رکھنا۔ اگر تم دونوں کی محبت قائم رہے گی تو ہر خوشی تمہارے قدم چومے گی۔ سب مشکلات کا ہنس ہنس کر مقابلہ کر پاؤ گے۔ نیک کام جلد سے جلد پورا کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ دوسرے دن ہی کمال اور چاندنی کی منگنی ہوئی۔ اور پھر بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی کر دی گئی۔

کمال حیدرآباد سے نوکری چھوڑ کر علی گڑھ یونیورسٹی آ گیا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا ساری جائیداد دوسروں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر یہاں بسنے کا ارادہ کیوں کر لیا۔ وہ بولا آپ ملیں تو جہاں بھر کی خوشیاں آپ نے میرے دامن میں بھر دیں۔ میں اپنی ساری دولت سے یہ خوشیاں نہ خرید سکتا تھا۔ آپ جیسے پیار کرنے والے لوگوں سے دور رہنا ناممکن ہے۔ بزرگوں کا سایہ سر پر ہو تو ہر مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔ چاندنی آپ کو اور امی کو چھوڑ کر جی نہیں سکتی۔ میں غور سے اس کا منہ دیکھتی رہی اور دل سے دونوں کے لئے دعائے خیر مانگتی رہی۔

میں نے کہا خدا نے اولاد نہیں دی۔ آج تم نے وہ جگہ پر کر دی۔ آج مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ میرا اپنا بھی کوئی ہے۔

وہ آ کر مجھ سے لپٹ گیا اور جذباتی ہو کر بولا خالہ جان میں تو آپ ہی کا بیٹا ہوں۔ برسوں بعد اس گھر میں ماں باپ کا پیار نصیب ہوا ہے۔ آپ لوگوں کے قدموں میں ہی ہماری جنت ہے۔ اس جنت کو چھوڑ کر اب کہاں جائیں گے۔ خوشی کے مارے میرے آنسو نکل آئے تھے۔ میں نے کہا بیٹا جیتے رہو۔ ہم سب تم دونوں کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ تم اب ہمیشہ اس گھر میں رہو گے۔ تم دونوں ہی تو اس گھر کی رونق ہو۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں پیار اور سکون شامل تھا۔ سچ ہے جوڑے خدا کے گھر ہی بنائے جاتے ہیں۔

ساوتری گوسوامی
کے افسانے
(زیر اشاعت)
پیش لفظ تحریر کردہ :
ف۔ س۔ اعجاز
قیمت اندرون ملک :
۱۶۰ روپے

قدرت کے انمول خزانے سے
اصلی خشک میوے !

● آپ کی خدمت میں
● آپ کے اعزّا و احباب کی خدمت میں



ہر طرح کے سامانِ تغذیہ اور گرم مصالحہ جات بھی ہمارے اسٹور سے خرید فرمائیں !

HELLO : 39-3490

CC city centra

CENTRE OF QUALITY DRY FRUITS AND SNACKS
146, MAHATMA GANDHI ROAD
CALCUTTA-700007

سب سے بڑا شو روم جہاں زپ چین، بیگ کے
لوازمات، فوم، ریکسن، ڈینڈرائٹ وغیرہ دستیاب ہیں۔

اے۔ایل۔ایس۔ایس۔اے۔بخاری اینڈ سنز

A. L. S. S. A. Bukhari & Sons

A ALS S

Biggest Show Room of

Zip Fasteners, Bag Fittings, Foam PVC, RexinE and Dendrite

Exporter & Importer

38/A/9, Chandney Chowk Street, Calcutta - 700 072

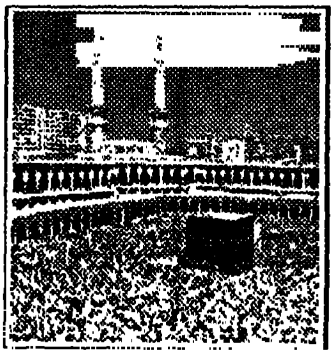
Phone : 236-3444 / 6802, 237-7399

Sister Concern

SAFA MARWA

38/B/4, Chandney Chowk Street, Calcutta - 700 072

Phone : 236-6802



میٹھا
کھانا زندگی میں
مٹھاس بھر دیتا ہے۔
مٹھائیوں
کے شہنشاہ
پیش کرتے ہیں

خوش ذائقہ لڈو، رس بھری جلیبیاں،
طرح طرح کے حلوے
اور
مشہور عالم لچھے اور کھجلے۔

حاجی علاء الدین سوئٹ میٹ شاپ

۵۶/۵۸، فیرس لین (چونا گلی) کلکتہ-۷۳ فون: ۲۳۷-۷۴۶۳

Haji Alauddin Sweet Meat Shop

56, Phears Lane, Calcutta - 73 ● Ph : 237-7463

MINI

mini motors

Specialists in :

Genuine H. M. &
Imported Ambassador,
Nova Diesel,
Contessa,
Trekker & Maruti Parts

1/1, Meredith Street
Calcutta - 700 072
Office : 237-9151 / 248-8380
Fax : 91-33-2376660

نیّر جہاں

اظہر جاوید
مدیر "تخلیق"
بھگوان اسٹریٹ، پرانی انارکلی،
لاہور-۵۴۰۰۰

کہتے ہیں، نیر جہاں بڑی اچھی شاعرہ ہیں۔

لکھنے والے لکھتے ہیں، وہ باکمال افسانہ نگار ہیں۔

مگر——ایمان داری کی بات ہے، وہ ان سب سے ہٹ کر، بہت بہتر انسان ہیں۔ مکمل انسان—— شفقت، عنایت اور ممتا سے بھری ہوئی انسان، جو بے دریغ محبت تقسیم کرتی ہیں——انسانیت کی تکریم کرتی ہیں۔

لاس اینجلس میں ہی نہیں، کیلی فورنیا، بلکہ اور دور دور تک وطن سے بچھڑے اور ادھر ادھر بکھرے اردو والوں سے وہ یوں سلوک کرتی ہیں جیسے چولہے کے پاس بیٹھی بڑی بہن چھوٹوں کو سنبھال رہی ہو پیار کے مَلَک کو چھونے والی ماں بچوں کو چادر میں لپیٹ رہی ہو۔

اردو مرکز انٹر نیشنل ایک ادارہ نہیں گہوارہ ہے——وہاں اردو شعر وادب کی ترویج نہیں ہوتی، پرورش کی جاتی ہے——وہاں ہی نہیں، ادھر پاکستان اور ادھر ہندوستان میں کوئی شاعر ادیب بیمار پڑ جائے، زندگی کے بکھیڑوں میں پھنس جائے تو نیر جہاں، سب سے پہلے اس کی معاونت اور رفاقت کے لئے پہنچتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس شخص سے ان کا دوستی کا رشتہ ہو——کئیوں سے تو رسمی تعارف بھی نہیں ہوتا——وہ اس سلیقے سے تعاون کرتی ہیں کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی، یہ بات مجھے کئی بیمار اور لاچار لوگوں نے بتائی ہے۔

اور آپ کو سچ بات بتاؤں، یہ سطریں پڑھنے کے بعد نیر جہاں تلملائیں گی، چاہت بھرے غصے سے تمتمائیں گی اور مجھے ڈانٹ کا ایک طویل فون کریں گی کہ میں کیوں بے لوث نیکی اور بے غرض خدمت کی تشہیر کر رہا ہوں۔

نیر جہاں کی کہانی، ان کی زندگی کی داستان اور حالات وواقعات کا پس منظر اور پیش منظر عجیب اور مہیب ہے۔

وہ مشرقی پاکستان میں تھیں۔ (ہائے، مشرقی پاکستان) 1971ء میں جب متحدہ پاکستان کو دولخت کرنے کی سازش اور بنگلہ دیش بنانے کی کوشش شروع ہوئی تو محب وطن پاکستانیوں پر سخت کڑا وقت آ پڑا۔ جہاں ایثار کی اس کیفیت سے گزریں کہ نام نہاد قربانیوں کے دعوے کرنے والے مکار سیاست دان ہیچ اور پیچ نظر آتے ہیں۔

نیر جہاں کو ظلم وستم کا یوں نشانہ بننا پڑا کہ ان کے جواں سال شوہر کو قتل کر دیا گیا اور وہ تین دن تک ان کی لاش کے پاس چھوٹی چھوٹی تین معصوم اور مظلوم بچیوں کے ساتھ بھوکی پیاسی اور آس نراس کی ماری بلکتی رہیں سسکتی رہیں۔

قدرت کا نظام بھی عجیب ہے۔ ادھر موت کی ویرانیاں باہیں پھیلا رہی ہوتی ہیں ادھر زندگی کی جولانیاں آغوش میں سمیٹ لینے کو لپکتی ہیں-- پھر یوں ہوا، یوں ہوا اور یوں ہوا--نیر جہاں امریکا چلی گئیں-- جینے اور جیتے رہنے کیلئے ایک سائنس لیباریٹری میں نوکری کر لی--وہاں کے سائنسی تجربوں نے انسانوں کے اندر جھانکنے کی صلاحیت کو صیقل کیا۔ پوروں پر بنی ہوئی لکیریں قدرت نے بے معنی نہیں بنائیں، ان کے نیچے اور پیچھے اب وجد کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ جینز (Genes) کیا کیا بیان کرتی ہیں، اور جلد کے پرتوں میں کیا کیا کچھ پوشیدہ ہے---؟ یہ سب انہوں نے جان لیا۔

اب جب نیر جہاں سال کے سال مشاعروں کا میلا سجاتی ہیں اور پاک و ہند سے شعراء کو بلاتی ہیں، تو ان کی یوں دیکھ بھال کرتی ہیں، جیسے ہوسٹلوں سے آئے ہوئے بچوں کو مادر مہربان پل پل کا آرام سکون دے رہی ہوں۔ مشاعرہ، واشنگٹن میں ہو، نیویارک میں یا ڈیلس میں۔ نیر جہاں مسلسل شہر شہر کے منتظم سے رابطہ رکھتی ہیں۔ شاعروں کے احترام اور آرام کی تلقین کرتی ہیں اور یہ سن سن کر مسکراتی ہیں کہ کس شاعر نے کتنی داد پائی اور کس کس نے سامعین سے داد کی بھیک مانگی۔

بے غرض کام کرنے والوں سے حسد کرنے اور جلنے والے بھی ہوتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی خاص عنایت ہوتی ہے کہ ان کی عاقبت سنورتی رہتی ہے۔ لوگ باتیں بناتے رہیں، افواہیں اڑاتے رہیں اور من گھڑت سناتے رہیں، نیر جہاں سب سے بے نیاز ممتا نچھاور کرتی رہتی ہیں۔ ایک کے بعد دوسری، تیسری اور پھر اور دعوتوں کا اہتمام کرتی اور کرواتی رہتی ہیں کہ شاعروں کو اجنبیت کا، بیگانگی کا، اوپرے پن کا احساس نہ ہو-- ان راتوں میں وہ یوں جاگتی ہیں، جیسے وہ نرسنگ کر رہی ہوں یا چوکیدارہ--

شخصیت کا یہ سارا حسن نیر جہاں کی تحریروں میں سمو جاتا ہے اور تابندہ و پائندہ بنا دیتا ہے۔

بے نام مسافت

ہرچرن چاولہ (ناروے)

نیّر جہاں نے زندگی کی دکھ بھری گھاٹیوں میں خود اتر کر اور پاؤں زخمی کر کے تجربے کی کسوٹی پر خود کو پرکھ کر دیکھا اور قاری کے لئے خلوصِ دل سے صفحۂ قرطاس کے گورے گورے گلے میں لفظوں کے سچے موتیوں کے ہار پہنائے ہیں۔ ان کے دل کی درد انگیز حسرتیں، ارمان اور آنسو جب لودے اٹھتے ہیں تو انہیں ہر عورت اور ہر انسان کا دکھ اپنا کرب محسوس ہونے لگتا ہے اور ان کا قلم ایک مرہم بن کر کہہ اٹھتا ہے۔

ایک عورت میں ہوں
کوئی سیتا نہیں
کوئی شوکیس میں
یوں ہی جیتا نہیں

ستی ساوتری سیتا کی عظمت تسلیم، مگر وہ بھی تو رام کے ساتھ بنوں میں چلی گئی تھیں۔ عورت کا براج پاٹ، تاج تخت اس کے محبوب کا ساتھ اور قرب ہوتا ہے۔

نیر کی شاعری میں عورت کا دل دھڑکتا ہے مگر یہ دل صرف عورت کے لئے نہیں دھڑکتا، ہر انسان کے دکھ کو برابر محسوس کرتا ہے۔ جب وہ اپنی نظم "جیل سے فرار" میں کہہ اٹھتی ہیں۔

دوستو، ساتھیو
رک سکو تو رکو
یاں سے جانے سے پہلے ذرا سوچ لو
جیل خانہ کہیں ختم ہوتا نہیں

کیا یہ زندگی کی بہت بڑی سچائی نہیں کہ انسان ایک دکھ سے بھاگتا ہے تو ہزاروں دوسرے دکھ دوسری جگہ اس کا راستہ گھیرے کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ انہیں دکھ نہ کہنا چاہیں تو مسائل کہہ لیں۔

شاعری ایک ایسا فن خانہ ہے جس میں یاس و آس کے اندھیرے اجالے بیک وقت آنکھوں کو سیاہ پوش اور چکا چوند کرتے ہیں اور یہی کچھ شاعر آگے اشعار کی پر ذائقہ کھٹی میٹھی ٹافیاں لفظوں کے خوبصورت رنگ برنگے ریپرز میں اپنے قارئین کو پیش کرتا جاتا ہے۔ کرب و مسرت کے جس دکھ اور خوشی کے عالم سے وہ گذرتا ہے اس کی پرچھائیاں اگر اس کی شاعری میں در آتی ہیں تو وہ بہر حال زندگی کی دیکھی بھالی اور بھگتی ہوئی سچائیاں ہی ہوتی ہیں اور سچائیوں کا تلخ، ترش یا شیریں ہونا ایک ازلی امر ہے۔

نیر کی نظموں میں معاشرے کا فرد، زندگی کے غیر یقینی حالات سے لڑتا، بھڑتا، الجھتا محسوس ہوتا ہے کہ یہی اس کی قسمت ہے۔ ان کی نظم "مائیداس ٹچ" (Midas Touch) اس کی زندہ مثال ہے۔

نیر نے اپنی نظموں میں زندگی کا ہر روپ، ہر رنگ اجاگر کیا ہے۔ کوئی کس کس کا حساب دے یا کتاب لکھے۔ نیر کے ہاں تو خیالات اور احساسات کا ایک اتھاہ سمندر ہے اور دل دریا تو سمندروں سے بھی گہرے ہوتے ہیں۔ اسی لئے نیر کی شاعری میں لاانتہایت ہے۔ سمندر کی گہرائیوں کے موتی کھنگالنے اور کنارے ڈھیر کرنے کے لئے انسان کی ایک عمر بہت ناکافی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر شاعر جسم و جاں کو تو جوان رکھتا ہے، دل کو بھی بوڑھا نہیں ہونے دیتا کہ کہ اسے بہت کچھ سوچنا ہوتا ہے اور بوڑھے دل و جان کے مالک کے لئے یہ محنت طلب کام انتہائی مشکل بن سکتا ہے۔

نیر کی نظموں کا خاصہ ان کی سنجیدگی ہے۔ ان کی نظمیں گہری سوچوں میں ڈوبے ذہن کی تخلیقات ہیں۔ وہ ذہنی فرار کی قائل نہیں بلکہ ذہن کی سوچوں کی گہرائیوں میں غوطے لے لے کر ابھرنا سکھاتی ہیں۔ اور پھر جب وہ سطح پر آتی ہیں تو ان کے ہاتھوں میں بے بہا موتیوں کے ڈھیر ہوتے ہیں۔ ویسے بھی زندگی ڈوبنے اور ابھرنے کا ہی تو نام ہے۔ ان کی نظموں میں سانس لینے والا فرد پختہ ذہن، ہوشمند، جہاں دیدہ، زیرک، ذکی اور ذہین ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں کے چھالے گھاٹ گھاٹ کے سفروں اور تجربوں کے متضاد رویوں کے گواہ ہوتے ہیں۔



۷ رنومبر کو لاس اینجلس (امریکہ) میں اردو مرکز انٹرنیشنل کے سالانہ انٹرنیشنل مشاعرے میں (بائیں سے) مشاعرے کی منظم محترمہ نیر جہاں، بیگم حسین رو کڑیا اور بیگم احمد ادایہ

نیّر جسمانی طور پر وطن سے ہزاروں میل دور سہی مگر ان کے اندر کی آنکھوں کی کھڑکیاں اپنی دھرتی کے دکھوں اور مسئلوں کی طرف بھی کھلی رہتی ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے بیگانہ، یا اپنے اندر کی دنیا میں ہی ہر سے پناہ گزین رہتی ہیں جو اکثر تارکین کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر باہر، مغربی ممالک میں رہنے کے باوجود کچھوے کی طرح اپنی ہی کھال میں اندر ہی اندر کہیں غائب رہتے ہیں۔ نیّر کی نظمیں گواہ ہیں کہ وہ نہ صرف اندر بلکہ باہر کی دنیا سے بھی آنکھیں بند نہیں رکھتیں۔ باہر جہاں دنیا کے کچھ اور رنگ اپنے دامن میں کئی کئی نئے اسباق کے خزانے رکھتے ہیں۔ مغرب صرف برا نہیں۔ نمک کے اس ڈھیر میں چینی کے میٹھے دانے بھی کہیں کہیں موجود ہیں مگر انہیں تلاش کرنے کے لئے چیونٹی کا سا حوصلہ اور ہمت چاہئے۔ یہی ہمت اور حوصلہ نیّر جہاں میں ہے۔ تبھی یورپ اور امریکہ کے معاشرہ اور حالات پر بھی ان کا قلم بڑی بے باکی اور سچائی سے قابل ردّ و قبول رویّوں کی نشان دہی کر جاتا ہے۔ ماحول سے کٹ کر رہنا قلم کار کی سوچ کو بوڑھا بنا دیتا ہے۔ اس کی سوچ کی ڈور تو کئی سال آگے تک جانی چاہئے تاکہ وہ تادیر صدیوں بعد بھی زندہ رہ سکے۔

نیّر کی شاعری کے جدا اسلوب، گہرے مشاہدے اور نئے نئے موضوعات نے ان کے افکار و اشعار میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے جو اپنے اندر دل کشی تو رکھتی ہی ہے، ساتھ نئی نئی ان دیکھی دنیاؤں کی سیر پر بھی لے جاتی ہے۔ نیّر نے ہر انسان کا دکھ اپنی جان پر کھیل کر دیکھا ہے پھر اسے قرطاس پر اتارا ہے تو ہر دکھی انسان انہیں اپنا "ہمزاد" ہی محسوس ہوا ہے۔ اپنی نظم "ہمزاد" میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

میں تنہائی میں اکثر رات کو اک چیخ سنتی ہوں
بڑے ہی کرب میں اک درد بھری آواز کہتی ہے
"خدارا کھینچ لو تختہ میرے پاؤں کے نیچے سے
گلے میں ہے میرے پھندہ
خدارا کھینچ لو تختہ"
میں ڈر کے، سہم کے، گھبرا کے اکثر سوچتی ہوں پھر
یہ آخر چیخ کس کی تھی؟
گلہ میرا کیوں سوکھا ہے

نیّر کی شاعری میں تخیل اچھوتا، احساس و فکر کا انداز الگ اور نئے ماحول کو نئے انداز میں کہنے کا ڈھنگ دل پذیر ہے۔ ان کے اشعار تراشیدہ کٹ گلاس کے نمونوں کی طرح ہر طرف سے آنکھوں پر زندگی کی حقیقتوں کا خیرہ کن لشکارا مارتے ہیں۔ ان کے لہجے میں تازگی اور لفظوں میں معنویت کا جہاں پنہاں اور موضوعات کے چناؤ میں نیا پن ہے۔ سچ یہ ہے کہ نظموں میں ان کا جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔ ان کی ایک ایک نظم پڑھنے، سمجھنے اور سوچنے پر مجبور کرتی ہے مگر میں ان کی ایک اور نظم آپ کو پڑھوا کر باقی نظمیں خود آپ کو ان کے مجموعے سے پڑھنے کی صلاح دوں گا۔ "تابہ کے" ان کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔

ہم اپنے ذہنوں کے مقتلوں میں
جواں امیدیں، حسیں تمنائیں
قتل کر رہے ہیں اب تک
کہ ہر زمانے کا یہ چلن ہے
وہ بات راہ سخن نہ پائے
وہ بات لب تک پہنچ نہ جائے
روایتوں کی روش سے ہٹ کر
وہ جس میں جینے کے حوصلے ہوں
وہ جس میں رنگِ حنا ہو شامل
وہ جس میں چاہت کے ذائقے ہوں
جو ملک و ملت، جو رنگ و نسل
کی سرحدوں سے بلند تر ہو
بغاوتوں کے علم اٹھائے
بشارتوں کی پیامبر ہو
روایتوں کے عذاب سہہ کر
وہ بات اشکوں میں ڈھل نہ جائے
مگر وہ مشکل سخن نہ دیکھے
مگر وہ رنگ عمل نہ پائے
ہم اپنے ذہنوں کے مقبروں میں
جواں امیدیں حسیں تمنائیں
دفن کرتے رہیں گے کب تک؟؟

◆ ◆ ◆

کتابوں کی اشاعت

انشاء پبلی کیشنز سے مصنّفین کے اخراجات پر صرف اعلیٰ معیار کی طباعت سے مرصّع کتب شائع کی جاتی ہیں۔ جو ادباء معیاری طباعت کو ترجیح دیتے ہوں وہ ہم سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ ہم کتابیں ایکسپورٹ بھی کرتے ہیں۔

نیّر جہاں کا افسانہ

اسلم طارق

اردو افسانہ نگاری کے باب میں خواتین کا حصہ اس قدر مضبوط رہا ہے کہ طویل فہرست سازی اور باقاعدہ اسم شماری کے بغیر بھی ان کے کردار کو بخوبی سراہا جا سکتا ہے۔ یوں تو اس ضمن میں جنسی تقسیم کسی اہمیت کی حامل نہیں ہے مگر زیادہ تر خاتون افسانہ نگاروں کے ہاں موضوعات کا انتخاب اور ان موضوعات سے مربوط نسوانی کرداروں کی بابت رویہ از خود انہیں ایک علیحدہ حیثیت میں سامنے لاتا ہے اور یوں ان افسانہ نگاروں کو ایک الگ خانے میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ نیّر جہاں بھی اپنے افسانوں کے موضوعات اور کردار نگاری کے حوالے سے اسی زمرے میں آتی ہیں جس کا اوپر کی لائنوں میں ذکر ہوا ہے۔ اس کے دستیاب افسانوں میں بھی زیادہ تر کا موضوع نسوانی کرداروں ہی کے ساتھ مربوط ہے اور اس کا رویہ ان کرداروں کے بارے میں ویسا ہی ہے جیسا کسی خاتون کا ہو سکتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ اس کے ہاں موضوعات محدود ہیں اور کردار یکسانیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں بلکہ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس نے موضوعات کے انتخاب میں اور کرداروں کے طرز عمل سے متعلق اپنی سوچ اور احساس کے فطری بہاؤ کو کسی بھی شعوری کاوش سے روکنے کی سعی نہیں کی۔ یوں اس کی کہانیاں قدرتی چشموں کی سی روانی لئے ہوئے آگے بڑھتی ہیں اور اپنے قاری کو جذباتی اور احساساتی سطح پر اس مقام تک لے جاتی ہیں جس مقام پر ان کہانیوں کے کردار دکھوں سے ہمکلام ہو رہے ہوتے ہیں۔ ان دکھوں کی نوعیت اور ان کی ظاہری صورتیں اس کی مختلف کہانیوں میں الگ الگ ضرور ہیں مگر ان تمام کہانیوں کے پیچھے ایک ہی طرح کے درد کی لہر رواں نظر آتی ہے۔

اس کی کہانیوں "سوا نیزے پر سورج" "Sinese Twins" "چھٹی لاش"، "مہندی کے دو رنگ" اور "مٹی کی خوشبو" میں موضوعاتی اعتبار سے جو مماثلت نظر آتی ہے وہ نسوانی کرداروں ہی کے حوالے سے ہے۔ ان تمام کہانیوں کے نسوانی کردار الگ الگ منظر ناموں میں ایک ہی طرح کے دکھوں سے بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نیز جہاں کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان تمام کرداروں کو اس مقدر مہارت کے ساتھ Paint کرتی ہیں کہ سارے رنگ الگ الگ دکھائی دیتے ہیں اور تمام رنگوں کے آمیزے علیحدہ علیحدہ صورتیں دکھاتے ہیں اگرچہ اس کا عمومی رویہ ان کرداروں کے بارے میں ایک ہی جیسا رہتا ہے۔ اس کی کہانیوں کے کرداروں سے متعارف ہونے کے لئے کچھ اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

"ہاجرہ آپ محفوظ تو ہیں نا۔ بھئی جان کا خطرہ تو نہیں ہے"۔ "نہیں وہ تو مار پیٹ کر کام پر چلا گیا ہے۔ ٹیکسی چلاتا ہے نا۔ صبح پانچ بجے پہنچنا ہوتا ہے۔ خدا کیلئے مجھے بچائیے۔ مجھے آکر لے جائیے۔ خدا کے بعد میرا یہاں اور کوئی نہیں۔ میری مدد کیجئے میری معصوم بچی کی مدد کیجئے"۔

افسانہ "چھٹی لاش"

❖❖❖❖❖

"یہ مائیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بچے بڑے ہو جاتے ہیں، ان کی دنیائیں الگ ہو جاتی ہیں مگر ماؤں کو پتہ ہی نہیں چلتا"

افسانہ "سوا نیزے پر سورج"

❖❖❖❖❖

"حبیبہ کا زرد اترا ہوا چہرہ رتجگوں کی گواہ سرخ آنکھیں، آواز میں رچے ہوئے آنسو اور پورے وجود پر کرب کی خبر اپنے شوہر سے اس کی بے پناہ محبت کی گواہی دیتی تھی"

افسانہ (Sinese Twins)

❖❖❖❖❖

"مجھے اب پتہ چلا کہ وہ کتنا سچا تھا۔ اس نے کہا تھا شہزادی تم تو وہ جگنو ہو جو جے مالا ہاتھوں میں لیکر چلے بھی تو پرتھوی راج کا بت صدر دروازے پر نہیں ہوگا۔ رادھا اپنے گھر کے اور دل کے سارے دروازے کھلے رکھے تب بھی شیام نہیں آئے گا اور مٹی کی رسم چند لمحوں پر نہیں بلکہ پوری زندگی پر محیط کر دی جائے گی"۔

افسانہ "مہندی کے دو رنگ"

❖❖❖❖❖

ان کرداروں کے تعارف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے افسانوں کے مرکزی کردار زیادہ تر نسوانی ہیں اور ان کے بارے میں اس کا اپنا رویہ بھی یقینی طور پر نسوانی ہے کہ اسکے ہاں عورت ایک دکھی کردار ہے خواہ اس کی ظاہری صورت۔ بیوی کی ہو، پارٹنر کی ہو یا ماں کی ہو۔ بڑی حد تک یہ احساس درست بھی ہے کہ ہمارے جیسے معاشروں میں صورت حال کچھ ایسی ہی ہے مگر نیّر جہاں کے افسانوں میں منظر نامہ ہمارے معاشرے کا نہیں ہے بلکہ یہ صورت حال ان پاکستانی یا ایشیائی باشندوں سے Relate کرتی ہے جو اپنا وطن چھوڑ کر امریکہ میں مقیم ہیں۔ اس نے اس Locale میں عورت کی ذات سے وابستہ دکھوں کو اس قدر مہارت سے کہانی کی شکل دی ہے کہ یہ دکھ بولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور پڑھنے والا خود دکھوں سے مکالمہ کے عمل سے معروف ہو جاتا ہے۔ یہی نیّر جہاں کی افسانہ نگاری کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

اس کی کہانیوں کے کردار اگرچہ طے

شدہ انجام کی جانب بڑھ رہے ہوتے ہیں مگر اس دوران میں وہ اپنے فطری اظہار کے راستوں پر بھی چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کہانی کے کرداروں کو کھلا چھوڑ دیتی ہے اور انہیں اپنے ارد گرد کی صورت حالات سے مکالمہ کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ اسی کھلے مکالمے سے اس کی کہانیوں میں وہ خوبیاں وجود پذیر ہوتی ہیں جو اسے اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس کے کردار بنے بنائے راستوں پر نہیں چلتے بلکہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں مگر ابھی اسے اپنی کہانیوں کو اپنا انجام بھی خود ہی طے کرنے کی اجازت دینا ہوگی، اسے اپنا کردار بھی متعین کرنا ہوگا کہ بڑے افسانہ نگار کا کردار تخلیق کار کا ہوا کرتا ہے نگراں کا نہیں۔ کرداروں کی کہانی کے انجام تک نگرانی نیر جہاں جیسی تخلیقی فنکارہ کا منصب نہیں ٹھہرتا۔ اس کے ہاں تخلیقی جملے اور خیال کا تخلیقی بہاؤ اس قدر فطری انداز میں موجود نظر آتا ہے کہ پڑھنے والا بہت بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لیتا ہے اور بلاشبہ یہ توقعات بجا اور جائز ہیں۔

اس کی کہانیاں جس ماحول سے اپنا مواد حاصل کرتی ہیں اور جس منظر نامے سے اپنے کردار چنتی ہیں وہ ایک عجیب و غریب صورت حال ہے جس میں موجود لوگ اپنے پس منظر سے جڑے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور اس پس منظر سے گریزاں بھی نظر آتے ہیں۔ بعض صورتوں میں کسی مجبوری کے تحت اور بعض صورتوں میں دانستہ اور شعوری عمل کے ساتھ۔ یوں اس صورت حال میں نیر جہاں کے مرکزی کرداروں میں یعنی نسوانی کرداروں میں دو ہی باتیں بنیادی مسئلہ کی حیثیت اختیار کرتی ہیں۔ اول قبولیت یعنی Acceptence اور دوئم استرداد یعنی Rejection۔ یہ قبولیت اور استرداد جسمانی سطح پر بھی اور احساساتی سطح پر بھی اس کی کہانیوں کا حصہ بنتا ہے اور انہی مسائل کو بنیاد بنا کر اس نے اپنے افسانوں میں وہ سب کچھ کہنے کی کوشش کی ہے جو اس طرح کی صورت حال میں مبتلا سارے لوگ کہنا چاہتے ہیں۔ یہی اس کی کہانیوں کی خوبی ہے اور یہی خوبی اس کے قاری کو اس کے بہت قریب لے جاتی ہے۔ اس قدر قریب کہ وہ خود کو ان کہانیوں کا ایک کردار سمجھنے لگتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی شاید اس تمام تر صورتحال کا حصہ ہے۔ اس کی کہانیاں اپنے قاری کو اداس کر دیتی ہیں یہی شاید اس کے بڑا افسانہ نگار ہونے کی ایک چھوٹی سی نشانی بھی ہے۔ وہ یقیناً اس پگڈنڈی پر چل رہی ہے جسے آگے چل کر کسی بڑے راستے کے ساتھ جا ملنا ہے اور وہاں سے آگے کا سفر بلاشبہ نئی دنیاؤں کی دریافت کا سفر ہوگا۔



سنچری کے نو رنگ

نیّر جہاں (لاس اینجلس)

مجھے شاید اس سے محبت ہو گئی تھی۔
مگر محبت تو بہت عظیم جذبہ ہے۔ سمندر کی طرح گہرا جس کے سینے میں پلنے والے طوفانوں کا کسی کو علم بھی نہیں ہوتا۔ ان گہرائیوں میں بسنے والی سچائیاں تو سب سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ اور میں تو کسی پہاڑی ندی کی طرح تیز رو تھی۔ نہ گہرائی نہ گیرائی پھر بھلا میں اسے کیسے سمجھتی مگر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ مجھے اپنے بارے میں معلوم ہی کب تھا۔ اسی لئے تو یقین سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ میں تو ایک ایسی Nobody تھی کہ مجھ سے میری شناخت بھی اسی نے کروائی تھی۔

میں نے کہا "سنو تمہاری سالگرہ کب ہے" میں دراصل اس کی عمر معلوم کرنا چاہتی تھی اور یہی سب سے زیادہ مہذب طریقہ تھا۔

"نہیں پہلے تم اپنی سالگرہ کا دن بتاؤ" اس نے کہا۔

"میں اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو پورے تیس سال کی ہو جاؤں گی" میں اس طرح جھوٹ بول رہی تھی جیسے بچے کہتے ہیں "ابا کہہ رہے ہیں وہ گھر میں نہیں ہیں" مگر میں سنجیدہ تھی۔ اس نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں اگلے مہینے کی سات تاریخ کو پورے بہتر سال کا ہو جاؤں گا"۔

جھوٹے کہیں کے۔ تم بہتر سال کے ہو ہی نہیں سکتے"۔

"کیوں--- کیوں نہیں ہو سکتا--- میں تو سنچری بنانے کی سوچ رہا ہوں"۔

"تم سچ کیوں نہیں بتاتے--- جھوٹ کیوں بولتے ہو"۔ میں جھلا کر کہتی۔

"جھوٹ--- شہزادی جھوٹ اور صرف جھوٹ ہی ایک زندہ حقیقت رہ گئی ہے باقی ہر چیز اس دنیا سے بھاپ بن بن کر اڑ رہی ہے۔ مگر میری بہترویں سالگرہ پر تم کو کیا اعتراض ہے۔ چلو کیک پر بہتر موم بتیاں مت لگانا"۔

"میں نے کہا نا تم بہتر سال کے نہیں ہو سکتے" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میری بیوی نے کہیں سن لیا نا تو بہت خفا ہو گی" اس نے کہا۔

"تمہاری بیوی--- کہاں ہے وہ" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کہیں نہ کہیں تو ہو گی ہی۔ اللہ میاں نے تو سارے جوڑے اتارے ہیں نا"

میں ہنس پڑی۔ "مجھے پتہ تھا تم بہتر وہتر کے ہو ہی نہیں سکتے۔ جو لوگ اتنے بوڑھے ہوتے ہیں نا انکی باتوں سے---"۔ میں سوچنے لگی کہ کیا کہوں صحیح الفاظ یاد نہیں آرہے تھے۔

"ان کی باتوں سے جیسے زنگ کی بو آنے لگتی ہے نا۔ جیسے گھس کر ہر چیز گلنے لگی ہو۔ یہی کہنا چاہتی تھیں نا" اس نے میرا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پتہ نہیں تم کیا کہتے ہو" میں ذرا تکلف کر گئی۔ اس کی تو بیشتر باتیں اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اتنے بہت سے سوالات کے بعد بھی اس نے اپنی صحیح عمر نہیں بتائی۔ میں اس رات بہت دیر تک بہتر موم بتیوں کے بارے میں سوچتی ہوئی سو گئی۔ خواب میں بھی ڈائننگ ٹیبل کے سائز کے کیک پر 72 صحت مند موم بتیاں نظر آتی رہیں۔

ابو کے انتقال کے بعد گھر کی ہر چیز پر ایک وحشت ناک سناٹا چھا گیا تھا۔ ایسا گہرا دبیز سناٹا جیسا کھنڈروں میں ہوتا ہے۔ پھر یہ سناٹا رینگ رینگ کر ہماری سانسوں کی ڈور میں بندھا ہوا ہمارے پورے وجود کو گھیر چکا تھا۔ ہم سب کے ویران چہروں پر آنکھیں ایسی لگی ہوئی تھیں جس طرح بوسیدہ عمارت میں ٹوٹے پھوٹے جھروکے اٹکے رہ جاتے ہیں۔ پورا گھر قبرستان بن گیا تھا۔ یوں لگتا تھا ہم زندہ نہیں ہیں بلکہ اپنے اپنے تابوتوں میں لیٹی ہوئی لاشیں ہیں جن پر زندگی کی تہمت ابھی تک لگی ہے۔ ایک ایسی ہی اداس شام تھی جب میں نے ٹیلی فون کا سہارا لیا۔ فون کے تار تو غلط مل گئے مگر رابطہ صحیح تھا۔ اس کی آواز بڑی گمبھیر اور شفیق تھی۔ بات کرتا تو معلوم ہوتا تھا جیسے دل کے چلنے کے لئے قالین بچھا رہا ہو۔ میں اپنی افسردگی دور کرنے کے لئے ایک سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔ سو اس کی آواز کے کاندھوں پر سر رکھ کر میرے لرزتے کپکپاتے دکھ شانتی ڈھونڈنے لگے۔ اس سے زیادہ کی نہ خواہش تھی نہ سمجھ دھیرے دھیرے وہ میری سہیلی بن گیا اور میں اپنے سارے چھوٹے بڑے دکھ، فکریں اور اندیشے اس کے دل میں ایسے انڈیلنے لگی جیسے چھوٹے چھوٹے ندی نالے اور بڑے بڑے دریا اپنے کنکر پتھر سمندر میں اگل دیتے ہیں۔

میں نے کہا "سنو وہ امرود ہے والی خاتون آج پھر آئی تھیں"۔

"کیوں کس لئے آئی تھیں" وہ پوچھتا۔

"امی سے کہہ رہی تھیں دونوں بیٹوں میں سے کسی کو بھی پسند کر لو۔ عابد دوبئی میں بینک میں افسر ہے اور راشد شکاگو میں پوسٹ آفس میں ملازم ہے۔ تم سن رہی ہو نا اب بتاؤ میں کیا کروں؟" میں سخت پریشان لہجے میں اس سے پوچھتی۔

"تم کیا کر سکتی ہو شہزادی--- یہ حق تو عرصہ ہوا چھینا جا چکا ہے--- اقلیما، اقلیما---" وہ جواب دیتا۔ "اقلیما--- یہ اقلیما

کون ہے"۔

"ہابیل اور قابیل کے درمیان جو پل صراط تھا نہ اس کا نام اقلیما تھا" وہ جواب دیتا۔

"تم کو اقلیما کی پڑی ہے" میں چڑ کر کہتی "ادھر میں پریشان ہوں تم سمجھتے کیوں نہیں"۔

وہ ہنسنے لگا "میں سوچ رہا ہوں شہزادی کہ وہ کوا کتنا نا سمجھ تھا اسے تو سب کو اقلیما کے کفن دفن کی ترکیب بتانا چاہئے تھی۔ دراصل قتل تو اقلیما کا ہوا تھا"

"تم میرے مسائل سمجھتے ہی نہیں ہو" میں بیچارگی سے کہتی۔

"تم نے مہندی کے دو رنگ دیکھے ہیں" میں فوراً اقلیما اور امر دیے والی خاتون کو بھول کر مہندی کے بارے میں سوچنے لگتی۔

"دیکھا ہے نا۔ باہر سے سبز سبز رنگ کی ہوتی ہے۔ مگر ہتھیلیوں پر کیسی خونیں عبارتیں لکھ دیتی ہے"۔

وہ پھر پٹری سے اتر گیا تھا اس کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میں نے اکتا کر ٹیلی فون بند کر دیا۔ سڑی گرمی میں یونہی دم گھٹ رہا تھا۔ میں گلدان سے پھول نکال کر پتیاں نوچ نوچ کر راشد اور عابد کے بارے میں He loves me, he loves me not کھیلنے لگی۔

کاش زندگی کے سوالات کے جوابات اتنی آسانی سے مل جاتے تو کیا بات تھی۔

موسم بدلا۔ بارشیں شروع ہوئیں تو ہر گھر کی چھت پر بوندوں کے سہرے بندھ گئے۔ نیم تاریک کمروں میں جب بارش کی آواز کھڑکیوں کے شیشوں پر دستکیں دیتی تو دل بے وجہ اداس ہو جاتا اور دکھ یاد آنے لگتے جو دل نے اٹھائے بھی نہیں تھے۔ جو دور کہیں مستقبل کی کوکھ میں تھے۔ مگر سارے خوف اور اندیشے تو ان دیکھی چیزوں ہی کے ہوتے ہیں نا۔ میں نے اس کا نمبر گھمایا۔ میری انگلیوں کے حافظے پر اس کا نمبر نقش ہو چکا تھا۔

"کیسے ہو خیریت تو ہے نا" حسب دستور میں نے پوچھا۔

"کس کی خیریت پوچھ رہی ہو" اس نے جواباً پوچھا۔

"تمہارے دشمنوں کی" میں جلا کر جواب دیا۔

وہ ہنس پڑا "میرے سارے دشمن بالکل خیریت سے ہیں۔ سنو شہزادی خفا مت ہو۔ بات یہ ہے کہ جو ہم اکائی کی طرح ثابت و سالم نظر آتے ہیں نا تو یہ حقیقت نہیں ہے۔ دراصل ہم کئی حصوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہماری آنکھیں صحیح سالم ہوں مگر ہمارے دل چکنا چور ہو چکے ہوں۔ ہمارے ذہن الفاظ سے بھرے ہوں مگر ہماری زبانیں کٹ چکی ہوں اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ ہمارے وجود کا ذرہ ذرہ ہمارا ایک ایک عضو دکھ کی دلدل میں دھنسا ہوا ہو اور ہم بالکل خیریت سے ہوں۔ اسی لئے پوچھ رہا ہوں کہ تم کس کی خیریت پوچھ رہی ہو۔ میری آنکھوں کی، دل کی، دماغ کی؟"

"میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آتیں۔ تم عام انسانوں کی طرح باتیں کیوں نہیں کرتے"۔

"چناں کہ پیروئی خلق گمرہی آرد
نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتست"

وہ فارسی اور انگریزی کے ایسے شعر پڑھنے لگتا کہ میں اور الجھ جاتی۔

"تم آخر کیا سوچتے رہتے ہو"۔

"میں سوچا رہتا ہوں کہ یوسف کے پھٹے ہوئے دامن کو دیکھ کر بجائے زلیخا کے کسی نے عزیز مصر سے صحیح سوال کیوں نہیں کیا۔

میں بات کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھے بغیر کان سے ریسیور لگائے سنتی رہتی اس کی آواز ہی بہت تقویت بخش تھی۔

"یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے کبھی کبھی کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو" میں تھک کر کہتی۔

"خود تمہارا دل ایسی باتوں سے نہیں گھبرا جاتا"۔

اوہ شہزادی" وہ لمبی سانس لے کر کہتا:

All the kings horses
and all the kings men
Could not put Humpty
Dumpty together again.

میں اور بھی حیرانی سے پوچھتی "یہ ہمپٹی ڈمپٹی کا کیا ذکر۔

"یہ ہمپٹی ڈمپٹی شہزادی میرا دل تھا۔ اب اسے کوئی نہیں جوڑ سکتا" وہ عجیب اداس سے لہجے میں کہتا۔ میں بات بدلنے کے لئے کہتی۔

"تم نے مصطفیٰ زیدی کو پڑھا ہے" میں ذہن میں ان ہی پتھروں پہ چل کر والا شعر دہراتے ہوئی پوچھتی۔ چھپتے ہوئے لہجے میں وہ دوسری نرسری رائم شروع کر دیتا

Hey Diddle diddle
The Cat and the fiddle,
The cow jumped over the moon.

ایک بار غالب کو پوچھ لیا تو اتنے موٹے موٹے شعر سنائے کہ میں ڈر گئی۔

باہر بارش ہو رہی تھی، ادھر اندر بیچارگی میں میری آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ میں چاہتی تھی اس کی آواز کی گرمی اور لہجے کی نرمی میرے اندر اگنے والے تمام اندیشوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ میری رگوں میں جو دھڑکے نبضوں کے ساتھ دھڑک رہے تھے وہ اسے دور کر دے میرے وجود کے ذرے ذرے کو اعتماد اور حوصلے سے بھر دے۔

میں نے کہا "تم مجھے ہمیشہ شہزادی کہتے ہو۔ میرا نام شہزادی نہیں ہے تم نے تو کبھی میرا

نام بھی نہیں پوچھا"۔

"شہزادی میں تم کو ازل سے جانتا ہوں" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا:

"آں۔ کیا کہہ رہے ہو۔ کب مجھے جانتے ہو" میری سمجھ میں اس کی بات بالکل نہیں آئی تھی "ہاں میں تمہیں ازل سے جانتا ہوں۔ جب تمہیں میری بائیں پسلی سے نکال کر کھڑا کیا گیا تھا میں تبھی سمجھ گیا تھا کہ اینٹوں کی دیوار بن رہی ہے جس میں انار کلی چنی جائے گی اور چودہ بچوں کے بعد جب ممتاز محل کی وفات پر تاج محل بنے گا تو اس میں شیرازی دفن ہوگا اور تم۔ تم تو وہ سنجوگتا ہو شہزادی جس کے ہاتھوں میں جے مالا تو ہوگی مگر صدر دروازے پر کسی پرتھوی راج کا بت نہیں ہوگا۔ جس شہزادے کو پیار کروگی وہ مینڈک بن جائے گا۔ ریڈ رائڈنگ ہڈ کو بھیڑیا کھالے گا اور ستی کی رسم پوری زندگی پر محیط کر دی جائے گی۔ اب وقت بہت بدل گیا ہے شہزادی"۔

اس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا تھا اس لئے میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا "تم کرتے کیا ہو"

"میں وقت کی جانماز پر ڈگریوں کے دانے چھپا کر دعاؤں کی لاٹری میں صرف ایک اچھی نوکری مانگا کرتا ہوں"۔

میں نے کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر پوچھا "ٹھیک طرح سے بتاؤ نا---کیا کرتے ہو؟" زمین کا دل ٹٹولتا ہوں پھر اس کے خزانے چرانے کی ترکیبیں سوچتا ہوں" اس نے کہا "یعنی"--- میں نے پوچھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے بھی افسردگی سے فون بند کر دیا۔

ایسا لگتا تھا دل پر صرف ایک ہی موسم چھا گیا ہے۔ اداسی کا موسم۔ کئی بار اسے فون کیا مگر ادھر کوئی ریسیو کرنے والا نہیں تھا۔ وہ خود تو مجھے فون کر ہی نہیں سکتا تھا اس کے پاس تو میرا نمبر بھی نہیں تھا۔ میں سمجھ گئی کہیں دور دراز علاقے میں زمین کا دل ٹٹول رہا ہوگا۔ ادھر میں بھی پھولوں کی پتیاں نوچ نوچ کر مستقبل کے بارے میں سوچتی رہتی تھی کیونکہ امرودہے والی خاتون کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی اور مجھے بڑی گہری گہری نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔ میری سالگرہ آئی اور گذر گئی اس کی سالگرہ آئی اور گذر گئی مگر اس کا دور دور تک پتہ نہ تھا کہ ایک دن وہ اچانک مل گیا۔ میں نے روہانسی ہو کر کہا "کہاں چلے گئے تھے۔ تم نے کبھی مجھے فون بھی نہیں کیا---اور کرتے کیسے تم نے تو میرا نمبر تک کبھی نہیں لیا" مجھے اس سے اچانک بہت ساری شکایتیں ہو گئی تھیں۔

کہنے لگا "تمہاری سالگرہ کے دن بہت خیال آیا تھا مگر مجبوری تھی"

"اچھا چلو اب میرا نمبر لکھ لو"

"جانے دو اب کیا کروں گا۔ اب تو اگلے سال ہی ضرورت پڑے گی" "ہم کتنے کوتاہ بیں ہیں۔ ہمیں مستقبل کی خبر ہی نہیں ہو سکتی۔ کیا پتہ تھا کہ اب وہ اگلا سال کبھی نہیں آئے گا۔

"پھر بھی لے لونا" میں نے اصرار کیا۔

"کیا کروں گا لے کر۔ شہزادی مجھے معلوم ہے صاحباں اپنے بھائیوں کو بچائے گی اور مرزا کے سارے تیر کمان بیکار ہو جائیں گے اور ویسے بھی جانتی ہو نا جب بادشاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی کہہ دیتی ہے کہ وہ اپنی قسمت کا کھاتی ہے تو بادشاہ رزق کے سب دروزے اس پر بند کر دیتا ہے" اس کے لہجے میں عجیب اداسی ہوتی۔

مگر رزق تو اللہ دیتا ہے۔ اوپر سے آتا ہے رزق۔ کہیں دروازوں سے تھوڑا ہی آتا ہے" میں بیوقوفی سے کہتی۔

"تمہیں انجام سے ڈر نہیں لگتا" وہ پوچھتا۔

"انجام--- کس کا انجام--- کیسا انجام" میں حیران ہو کر پوچھتی۔

"اچھا جانے دو یہ بتاؤ کہ کیا پڑھتی ہو تم" میں گھر میں آنے والے دو چار اوٹ پٹانگ رسالوں کے نام لیتی۔ ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

"شہزادی تم نے برنارڈ شا کو، السن کو، ہاتھارن کو، شیکسپیئر کو کسی کو پڑھا ہے" میں نے کہا "پتہ نہیں کورس میں تو بہت سارے تھے یاد نہیں رہے"

"اچھا تو یوں کرو اب سن (Ibsen) کی کتابیں لاؤ اور اس کا ڈرامہ ہیڈ گیبلر (Hedda Gabler) پڑھ لو۔ عورت کتنی مضبوط ہوتی ہے یہ سمجھ جاؤ گی"

"مگر سنو تو سہی وہ امرودہے والے---" میں نے پھر روتی ہوئی آواز سے کچھ کہنا چاہا۔

"چھوڑو امرودہے والوں کو۔ یہ کتابیں پڑھو گی تو سب بھول جاؤ گی" اس نے میری بات کاٹ دی۔ پھر وہ مسلسل کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتا رہا۔ بالآخر پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے وعدہ بھی کر لیا اور وعدہ نبھانے کے لئے پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ کتابوں کا ایک سمندر تھا کہ جس میں ڈوب ڈوب کر ہم چن چن کر موتی لاتے۔ دنیا بھر کے ادب پر باتیں ہوتیں اور اسی گفتگو کے دوران آہستہ آہستہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی عمر 72 نہیں 27 سال ہے اس نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور محکمہ معدنیات میں کام کرتا ہے اور اگر اس کا ٹیلیفون نمبر Alphabetize کیا جائے تو I CARE 4 U بنتا ہے اور یہ کہ میں امیر والدین کی سب سے چھوٹی لڑکی ہوں۔ والد کی سب سے چہیتی بیٹی جس کا اپنا ذاتی کمرہ اور پرسنل فون بھی ہے اور یہ کہ میری عمر بیس سال ہے تیس نہیں۔ کتاب سے زیادہ اچھا کوئی ساتھی نہیں اور زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑے

خسارے کے سودے میں ہے۔

پھر ایسا ہو کہ ادھر وہ زمین کے سینے میں پوشیدہ ہیرے جواہرات ڈھونڈنے چلا گیا اور ادھر امریکہ والوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ پھر میرے سارے موسم بدل گئے۔ لمبی سیاہ چوٹی کی جگہ نقلی رنگے ہوئے بھوسے کی سی رنگت کے بال کاندھوں پر لہرانے لگے۔ کاجل کی جگہ Eye linerاور مسکارا سے آنکھیں سجنے لگیں۔ ہونٹ نارنجی گلابی قرمزی اور سرخ رنگ کی لپ اسٹک کے مرہون منت ہو گئے۔ چہرے پر رنگوں کی بوچھار سی رہتی اور جھوٹ زندگی کی سب سے بڑی سچائی بن گیا۔ بلو جینز اور ٹائٹ بلاؤز پہنتے ہوئے مجھے احساس ہی نہ ہو سکا کہ شکاگو کے اسنو فلیکس نے کب ساون کی جھڑیوں کی جگہ لے لی۔ میں راشد کے بتائے ہوئے مختلف پوسٹل ریٹس کے درمیان اسے بالکل ہی بھول چکی تھی۔ یا کم از کم یہ سمجھتی تھی کہ اسے بھول گئی ہوں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بھول جانا یا یاد رکھنا اپنے بس میں ہوتا ہی کب ہے۔ ذہن اپنی عبارتیں خود لکھتا اور مٹاتا ہے۔

راشد مجھ سے پوچھ رہے ہیں "یہ تم نیند میں اقلیما، صاحبان، انار کلی، زلیخا کیا کہتی رہتی ہو۔ یہ سب لڑکیاں کیا تمہاری کلاس فیلوز تھیں؟" میں ان کو کیا بتاؤں کہ یہ تو میرے مختلف نام ہیں مختلف زمانوں کے --- مجھے اب پتہ چلا کہ وہ کتنا سچا تھا اس نے کہا تھا "شہزادی تم تو وہ نجوگتا ہو جو جے مالا ہاتھوں میں لے کر چلے بھی تو پر تھوی راج کا بت صدر دروازے پر نہیں ہو گا--- رادھا اپنے گھر کے اور دل کے سارے دروازے کھلے رکھے تب بھی شیام نہیں آئے گا اور ستی کی رسم چند لمحوں پر نہیں بلکہ پوری زندگی پر محیط کر دی جائے گی"۔ محبت سمندر سے بھی گہرا اور بہت عظیم جذبہ ہے۔ واقعی زندگی بڑے خسارے کا سودا ہے اور راشد کو لائبریریوں سے سخت نفرت ہے۔

پہلا قتل

نیر جہاں

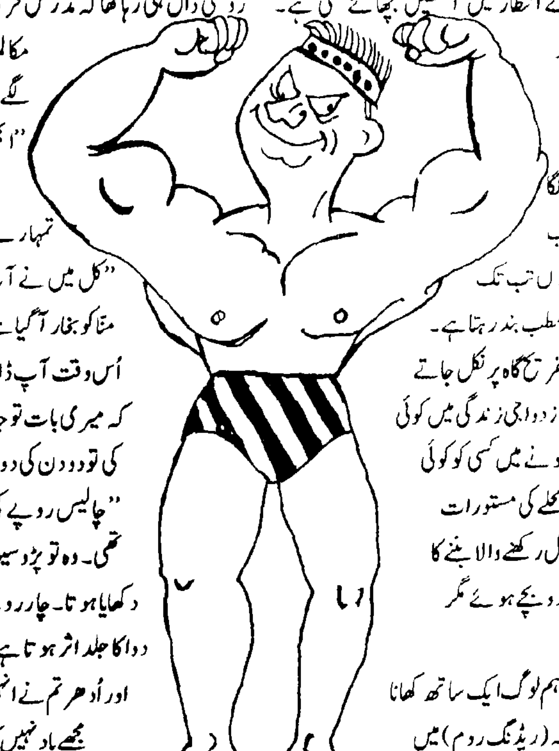
کوئی شریکِ درد نہ پاکر
اور تنہائی سے گھبرا کر
اپنی چھوٹی سی بچی کو
میں نے اک شب پاس بلایا
اور بتایا
"چھٹنی میں نے زیادہ لے لی
تنخواہ اب کے بھی کم ہو گی
گھر کا کرایہ
بجلی کا بل
دودھ کے پیسے
فیس تمہاری
جانے یہ سب کچھ کیسے ہو گا!"
چھوٹا سا معصوم سا چہرہ
سخت پریشاں سوچ میں ڈوبا
آنکھ میں فکر کے بادل چھائے
ننھے سے ماتھے پر بل
دھیمے لہجے میں وہ بولی
"اب کیا ہو گا.....
اب کیا ہو گا!"
کتنے خدشے..... کتنی فکریں
اس جملے میں جاگ رہی تھیں
میں نے اُس سے اُس کا بچپن
بے فکری کے خواب سہانے
چھین لئے تھے
اُن لمحوں کو گزرے اب تو صدیاں بیتیں
پھر بھی اب تک
میری بچی کے چہرے کی
اِک اِک سلوٹ
دنیا سے پوچھا کرتی ہے
اب کیا ہو گا.....اب کیا ہو گا!!

میں مرد بن گیا ہوں

ڈاکٹر نفیس بریلوی
۱۴- خلیل شرقی
شاہجہاں پور-۲۴۲۰۰۱

میرے مکان کے ایک جانب محلّے کی مسجد کے امام حامد صاحب اور دوسری جانب مدرسہ عین العلم کے مدرّس فرقان صاحب رہتے ہیں۔ دونوں ہی پُروقار شخصیت کے مالک ہوتے ہوئے بھی دنیاوی سفر میں اپنے کو سب سے کم تر مگر بالا نشین سمجھتے ہیں۔ وہ اس گرانی کے دور میں خوش لباس رہتے ہوئے نہ تو اپنی اور بیوی بچوں کی روز مرّہ کی ضروریات کو پورا کر پاتے ہیں اور نہ ہی بھر پیٹ کھا اور کھلا پاتے ہیں۔ پھر بھی مرد ہونے میں ہی اپنی خوش نصیبی گردانتے ہیں۔ نتیجتاً قریب قریب روز ہی میاں بیوی کی تکرار ین ساعتوں کے ریشمی پردوں کو چاک کرتی ہوئی کئی گھروں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یوں تو اُن کا پندار تمسخر پر قربان ہو جاتا ہے مگر اگلی صبح جب وہ باہر نکلتے ہیں تو اُن کے چہرے پر مکمل مرد ہونے کے ثبوت رونما ہوتے ہیں۔

مطب سے لوٹ کر جب میں تھکا ماندہ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہوں تو میری شریک حیات شکیلہ میرے انتظار میں آنکھیں بچھائے ملتی ہے۔ میرے ہاتھ سے بریف کیس لے کر وہ میز پر رکھتی ہے اور پھر میری شیروانی اتارنے میں میری مدد کرتی ہے۔ پھر وہ اُسے سلیقے سے ہینگر میں لگا کر الماری میں رکھ دیتی ہے۔ جب تک میں منہ ہاتھ دھو کر تازہ ہوتا ہوں تب تک وہ چائے تیار کر لاتی ہے۔ اتوار کو مطب بند رہتا ہے۔ اس لئے ہر اتوار کو ہم شاپنگ یا کسی تفریح گاہ پر نکل جاتے ہیں۔ بچوں کی کمی کے باوجود ہماری ازدواجی زندگی میں کوئی تناؤ یا خلش نہیں ہے۔ میرے مرد ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں یا اعتراض نہیں ہے بلکہ محلے کی مستورات اپنے شوہروں کو مجھ جیسا بیوی کا خیال رکھنے والا بننے کا ہر دم طعنہ دیتی رہتی ہیں۔ ہمارے دو بچے ہوئے مگر ۸-۱۰ ماہ کے اندر ہی فوت ہو گئے۔



نماز عشاء سے فارغ ہو کر ہم لوگ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ پھر میں اپنے دار المطالعہ (ریڈنگ روم) میں چلا جاتا ہوں۔ جہاں پہلے کچھ دیر طبّی مکتوبات کا مطالعہ کرتا ہوں بعدہٗ دو گھنٹے تک کبھی رسائل کا مطالعہ کرتا ہوں تو کبھی شعر و ادب کے میدان میں اتر کر طبع آزمائی کرتا ہوں۔ اس سے مجھے بڑا قلبی سکون ملتا ہے۔ جب میں لائٹ آف کر کے سونے کے کمرے میں جاتا ہوں تو شکیلہ مجھے کسی ناول یا رسالے میں غرق ملتی ہے۔ میری آہٹ پا کر وہ کتاب یا رسالے میں نشانی لگا کر بند کر دیتی ہے۔ اپنے معمول کے مطابق ہم صرف ہفتہ کی رات کو ہی جلدی سو جاتے ہیں تاکہ رات کے تیسرے پہر بیدار ہو کر ازدواجی زندگی کا ایک اور فریضہ ادا کر سکیں۔

میری چھوٹی سالی نسرین اپنے شوہر جاوید کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ میں جلد ہی مطب بند کر کے گھر آ گیا تھا۔ شادی کے بعد یہ لوگ پہلی بار لکھنؤ آئے تھے۔ شام کا کھانا کھانے کے دوران میں نے جاوید سے اس کے کاروبار کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ اپنے کاروبار کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈال ہی رہا تھا کہ مدرّس فرقان صاحب کے مکان سے مرد و زن کے مکالمات خوشگوار ماحول کو درہم برہم کرنے لگے۔

"ابھی کل ہی تو تم کو پچاس روپے ہفتہ بھر کے خرچ کے لئے دیئے تھے۔ کیا کیا اُن کا؟ کیا تمہارے میکے والے پھر آ دھمکے؟ یا......"

"کل میں نے آپ کو روپے لیتے وقت گوش گذار کیا تھا کہ منّا کو بخار آ گیا ہے۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ شاید اُس وقت آپ ڈائری میں کچھ لکھنے میں اس قدر مشغول تھے کہ میری بات توجہ کے ساتھ نہیں سن سکے۔ چالیس روپے کی تو دو دن کی دوا ہی آ گئی......"

"چالیس روپے کی؟ ڈاکٹر سہیل کو دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو پڑوسیوں کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ڈاکٹر کلیم کو دکھایا ہوتا۔ چار روپے میں کام بن جاتا۔ بچوں پر ہومیو پیتھک دوا کا جلد اثر ہوتا ہے۔ مگر تمہارے ہاتھ میں اِدھر روپے پہنچے اور اُدھر تم نے انہیں خرچ کرنے کے بہانے تلاش کئے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی تم نے کچھ بچا کر دکھایا ہو۔ تم کو یہ تو سوچنا چاہئے کہ مرد کس طرح محنت و مشقت سے کما کر

لاتا ہے۔ تم کو اسراف بے جا سے بچنا چاہئے۔ مرد ہو کر بھی میں بجز لباس اور کس شوق پر صرف کرتا ہوں؟ پیٹ کی آگ تو کوئی نہیں دیکھتا۔ لباس سے ہی عزت بنی ہوئی ہے جو بڑے بڑے سرمایہ دار جھک کر سلام کرتے ہیں۔"

"عزت سے آپ کا پیٹ بھر تا ہوگا۔ بیوی بچوں کو تو کھانے کے لئے دو وقت کی روٹی چاہئے ہے روٹی۔ اگر ہمارے لئے روٹی کا بھی انتظام نہیں کر سکتے تو آپ کو مرد کہلانے کا حق کس طرح ہوگا؟"

"تم عورتوں میں یہی تو خرابی ہے کہ مردوں کی عزت سے سوکھی لکڑی کی طرح جل اُٹھتی ہو۔"

"محترم! عورت صرف اس مرد کی عزت کرتی ہے جو اپنے بیوی بچوں کے اخراجات پورے کرتا ہو۔ وہ اُن کی عزت کیا خاک کرے گی جو اُن کو ننگا بھوکا رکھنے پر بھی اپنی حکمرانی صرف اس لئے دکھاتا ہو کہ وہ مرد ہے۔ اگر آپ میں ضروری ازواجی اخراجات بھی پورے کرنے کی صلاحیت نہ تھی تو شادی کیوں کی تھی؟ اور شادی کر ہی لی تھی تو بچے کیوں پیدا کر ڈالے؟ اُس وقت قلیل آمدنی کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟"

"تمہارے والدین کی آنکھوں پر کیا پٹی بندھی تھی جو یہ سب نہ دیکھ سکے؟"

"جناب! وہ تو آپ کی خوش لباسی اور خوش اسلوبی سے دھوکا کھا بیٹھے۔"

اتنے میں اُنکے دروازے پر دستک ہوئی اور مکالمات منتشر ہو گئے۔ فضا میں خاموشی چھاگئی۔ فرقان باہر گئے۔ دروازے پر مکان مالک کرایہ مانگنے آئے تھے۔ فرقان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو روپے کا آخری نوٹ اُنکے ہاتھ چڑھ گیا۔ مالک مکان نے دو ماہ کی رسید لکھ دی اور ایک ماہ کا باقی کیفیت کے خانے میں درج کر دیا۔ رسید لے کر وہ گھر کے اندر آئے اور مغموم سراپا لئے اپنی تین ٹانگوں والی اُس واحد کرسی پر بیٹھ گئے جو دیوار کے سہارے پڑی اپنی زندگی کے باقی دن کاٹ رہی تھی۔ کرسی کے آگے پڑی میز پر رکھی ڈائری کھول کر انہوں نے خرچ کا اندراج کیا اور سر پکڑے بہت دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ ریشمہ دور بیٹھی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ جانے اس منظر نے اُس سے کیا کہا کہ وہ اٹھی اور ایک کپ چائے بنا کر فرقان کی میز پر رکھ دی اور فرقان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اُنہیں ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا،

"فکر کرنے سے تو اخراجات اور آفات میں کمی واقع نہیں ہو جائے گی۔ موالات سے آمدنی کی وسعت کی تدبیر سوچنا ہوگی۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ آپ اجازت دیں تو پاس کے مانیٹری اسکول میں ملازمت کر لوں۔ تین چار سو مل ہی جائیں گے۔ کم از کم گھر کی دال روٹی کا خرچ ہی چل جائے گا۔" سر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے وہ بولے، "میں مرد ہوں کمانا میری ذمہ داری ہے۔ عورتوں کی کمائی وہ لوگ کھاتے ہیں جو نامرد ہوتے ہیں"۔ ریشمہ کا قہقہہ فضا میں گونجا پھر وہ بولی، "یہ پُرانے زمانے کی بات ہے۔ آج کا دور، آج کی ذمہ داریاں اور آج کی مہنگائی مرد و زن کی یکساں طور پر موالات سے کمانے کھانے کیلئے مجبور کر رہی ہیں اور اسی میں اہل و عیال کا مفاد پوشیدہ ہے۔ گھریلو اخراجات کی آندھی کو اسی طرح قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ بصورت دیگر اس آندھی کی زد میں آکر گھر کی عزّت، آبرو بھی لٹ سکتی ہے۔" ریشمہ کی تکرار فرقان کی سماعتوں کی چیرتی ہوئی اس کے دل و دماغ کو ماؤف کرنے لگی۔ حالتِ اضطراب میں وہ اُٹھ کر اپنے بستر پر آگئے۔ جانے کب اُسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ رات کے آخری پہر جب وہ بیدار ہوا تو اُس نے خلاف توقع ریشمہ کو اپنے پاس لیٹا ہوا پایا۔ یوں تو اُسے اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے اصرار و خوشامد ہی کرنا پڑتی تھی مگر آج! اُس کی حیرت فطری تھی۔ سابق صدر مدرس مدرسۂ ملک جناب معلم الملکوت فرقان کے جسم میں تناسخ و حلول فرما چکے تھے۔ مدرس نے صدر مدرس کی حکم عدولی مناسب نہیں سمجھی اور مجامعت میں مشغول ہو گئے۔ بعد فراغت ریشمہ نے اپنا منشا دہرایا۔ فرقان نے بڑے تاسّف اور مغموم انداز میں حامی بھر لی اور اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی کہ تمہاری نوکری سے جب

غزل

ہلچل بھارتی

۵۳ اے واٹ گنج، خضر پور، کلکتہ - ۷۰۰۰۲۳

آتی ہے اک حسینہ فیشن بدل بدل کے
نظارہ کر رہے ہیں ہم بھی سنبھل سنبھل کے

ریکھا کی ایکٹنگ کو دہرا رہی تھیں بیگم
کل مارتی تھیں چپل ہمکو اچھل اچھل کے

یہ بزدلی نہیں ہے تو اور کیا ہے لوگو
اپنے ہی گھر میں جانا میرا سنبھل سنبھل کے

بچوں کو لیکے بیگم میکے چلی گئی تھیں
ہم رہ گئے تھے اُس دن دل کو مسل مسل کے

برسوں سے یہ منسٹر آتے نہیں تھے یارو
اب آگئے ہیں شاید یہ سب پھسل پھسل کے

کل پھر پیاز دیکھو اسّی ٹکے بکے گی
لے جارہے ہیں چوہے بل سے نکل نکل کے

بیگم نے ڈھیٹ ہو کر آکر کہا رے ہلچل
کچڑے میں پھینک آئی کاغذ غزل وزل کے

بھی گھریلو زندگی میں سکون کی جگہ خلش پیدا ہوئی تو تم کو نوکری چھوڑنا ہوگی۔ ریشمہ مان گئی۔ وہ کوئی سرکاری نوکری تو کرنے جا نہیں رہی تھی جس کو چھوڑنے میں اُسے کچھ اعتراض اور افسوس ہوتا۔ ریشمہ نے بستر چھوڑ دیا۔ اُس نے فرقان کے غسل کیلئے پانی بھرا۔ اتنے میں فجر کی اذان ہونے لگی۔ غسل سے فارغ ہو کر فرقان مسجد کی سمت نکل پڑا۔ میرا ایک پڑوسی نامرد ہو چکا تھا۔

آج میرے گھر مہمانوں کا ہجوم تھا۔ میرے بڑے لڑکے کی چوتھی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ مہمانوں میں شہر کے چھوٹے بڑے سب ہی ڈاکٹر موجود تھے۔ پروگرام کا آغاز امام صاحب نے تلاوتِ قرآن مجید سے کیا۔ بعد ازاں ماسٹر فرقان صاحب نے ایک حمد اور نعت پیش کی۔ حسبِ دستور لڑکے نے کیک کاٹا۔ اس کے بعد مہمانوں سے طعام نوش کرنے کی درخواست کی گئی۔ کیک کے پیس (ٹکڑے) کاغذ کی پلیٹ میں رکھ کر فرقان اور ریشمہ مہمانوں کے سامنے رکھ رہے تھے۔ ریشمہ نے میرے اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور سونے کے لئے بستر پکڑا ہی تھا کہ امام صاحب کے مکان سے لغویات کی بوچھار ساعتوں کو تار تار کرنے لگی۔

"جمیلہ! میں تم سے پہلے بھی کئی بار پہلے تنبیہ کر چکا ہوں کہ تم مجھ سے بلند آواز میں کلام نہ کیا کرو۔ آخر میں تمہارا شوہر ہوں۔ میری بھی کوئی عزّت ہے۔ محلے والے کیا سوچیں گے؟"

"میں تم سے گھریلو خرچ کے لئے نہیں مانگوں تو پھر کس سے مانگوں؟"

"مسجد سے جو تنخواہ ملتی ہے وہ ساری کی ساری تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ اب کس طرح مہینے بھر کے اخراجات کفایت شعاری سے پورے کرنے ہیں یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ تین چار گھروں میں ٹیوشن پڑھانے سے جو آمدنی ہوتی ہے اُس سے میں اپنے، تمہارے اور بچوں کے لباس کا انتظام کرتا ہوں۔ اس کے بعد جو رقم بچ جاتی ہے اُس سے مکان کا کرایہ ادا کر دیتا ہوں۔ جمیلہ! اب تم ہی بتاؤ؟ میں کون سے اخراجات کم کروں؟"

"مولانا! اس مہنگائی میں پانچ سو روپئے میں مجھ سے تمہارے گھریلو اخراجات پورے نہ ہو سکیں گے۔ تم خود ہی چلالو اپنا گھر۔ مجھے تو بس دو وقت کی روٹی چٹنی کے ساتھ دے دیا کرو۔ اگر تم یہ بھی مہیا نہ کر سکو تو میرا ساتھ رہنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ تم کہو تو میں کل ہی اپنے مائکے چلی جاؤں۔"

"بڑے شوق سے جمیلہ! بڑے شوق سے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارے والدین تم کو بٹھا کر کھلائیں گے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تم کو وہاں رات دن کام کرنا پڑے گا۔ تم کو بھی گھر کے دیگر افراد کی طرح اگر بتی اور موم بتی بنانا ہوگی۔ پگھلے ہوئے موم سے تم اپنا ایک پیر تو شادی سے پہلے جلا چکی ہو۔ اس بار یہ خوبصورت چہرہ جلا کر واپس آنا۔"

"اچھا یاد دلایا تم نے۔ ابو کئی بار مجھ سے کہہ چکے ہیں، "تم کو تو پورا کام آتا ہے کیوں نہ تم اپنے گھر پر خالی وقت میں اگر بتی کا کام کرتی رہا کرو۔ اس کام میں کوئی اندیشہ اور خطرہ بھی نہیں ہے اور آمدنی بھی معقول ہے۔ مولانا! اگر تم کہو تو ابو سے کچا مال منگوالوں اور کام شروع کر دوں۔ تین چار سو کی ماہانہ آمدنی تو ہو ہی جایا کرے گی"

"میں مرد ہوں، مرد۔ عورت کی کمائی نہیں کھا سکتا۔ مجھے بھوکا سونا منظور ہے مگر بیوی کی کمائی کھانا منظور نہیں۔ آئندہ اس بات کا ذکر چھیڑ کر میرے احساسات کو مجروح نہ کرنا۔" اس کے بعد فضا میں خاموشی چھا گئی۔

رات کا آخری پہر تھا۔ اذانِ فجر میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ جمیلہ اپنے بستر سے اٹھی۔ بچے کو دودھ گرم کر کے پلایا۔ مولانا نیند میں بھی کراہ رہے تھے شاید اُن کی روح زخمی تھی۔ جمیلہ زیرِ لب مسکرائی اور مولانا کے بستر میں سما گئی۔ کراہٹ بند ہو کر کمرے میں کچھ دیر ہلچل ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ جمیلہ نے مولانا کے سینے کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے خاموشی کو چاک کرتے ہوئے کہا، "گھر کے اندر کام کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ ماسٹر فرقان کی بیوی تو اسکول میں مردوں کے ساتھ پڑھاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں تقریب کے دوران آپ نے دیکھا تھا کہ کیسے مردوں میں کیک تقسیم کرتی پھر رہی تھی۔ آپ کہیں تو ابو سے کچا مال منگوا لوں" جمیلہ کی زبان کے ساتھ ساتھ اُس کے ہاتھ بھی چل رہے تھے۔ جانے کیا سوچ کر مولانا نے بڑے تاسف و مغموم انداز میں حامی بھر لی۔ کچھ دیر بعد جمیلہ بھی اُٹھی۔ مولانا کے غسل کے لئے پانی بھرا۔ مولانا نے غسل کیا اور مسجد کا رخ کیا۔ میرا دوسرا پڑوسی بھی نامرد ہو چکا تھا۔

نسرین اور جاوید نے امرتسر پہنچ کر اپنی خیریت کا فون کیا۔ جاوید کا اپنا بلب اور ٹیوب لائٹ بنانے کا کارخانہ تھا۔ جاوید انجینئر تھا، اس لئے پوری فیکٹری پر نگاہ رکھتا تھا۔ نسرین کے ذمہ خط و کتابت کا کام تھا، وہ پروڈکشن منیجر تھی۔ قریب ایک ہفتہ بعد جاوید نے اپنے مرد ہونے کا زندہ و جاوید ثبوت یہ دیا کہ ہر ماہ ایک ہزار روپئے مدرسہ اور ایک ہزار روپئے مسجد کے نام اس شرط کے ساتھ روانہ کرنا شروع کر دئے کہ اس رقم کو صرف اور صرف اساتذہ، امام اور مؤذن کی تنخواہ میں اضافہ کے لئے استعمال کیا جائے۔ اُس نے یہ ہدایت بھی ارسال کی کہ اگر کبھی مسجد یا مدرسہ کی مرمت یا تعمیر و توسیع کے لئے رقم درکار ہو تو اُسے بھی شریک کیا جائے۔

آج میں اپنے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کیا واقعی میں مرد ہوں؟ میں نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے تو کلینک کے علاوہ ایک اسکول

بقیہ صفحہ ۳۳

مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور (بہار)

مجتبیٰ حسین کے قلم کی چلت پھرت میں جتنی توانائی ہے اتنی ہی دلربائی ان کی شخصیت میں ہے۔

ازل سے حیات کے ذائقہ میں رد عمل جارہا ہے۔ اثرات میں رنج و راحت اور غم و مسرت کی وابستگی رہی ہے۔ تہذیبی ڈھانچہ میں یہی عناصر کام کرتے رہے ہیں جن سے ایک فنکار کا سابقہ پڑتا رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین حساس فنکار ہیں۔ مثبت اور منفی تصادم کو جھیلتے اور دیکھتے رہے ہیں اور داخلی اور خارجی زندگی کے مسلسل ٹکراؤ سے دوچار ہوتے رہے ہیں جنہیں خوشگوار بنانے کے لئے انہوں نے طنز و ظرافت اور خاکہ آرائی سے کام لیا ہے اور نشتریت کے وار سے سلیقے سے دوچار ہونا سکھلایا ہے۔ دلکش اور معنی خیز فضا کے لئے اظہار کا جو اسلوب اپنایا ہے اس میں مقصدیت ہے، افادیت ہے اور معنویت ہے، محتاط اور متوازن یکجائی ہے اور ارفع و اعلیٰ روحانی اور اخلاقی سچائیاں ہیں، بشری نفسیات ہے اور تخلیقی جسارت ہے۔ وہ اپنی بے پناہ تخلیقی قوت کے ذریعہ عصری تہذیبی زندگی اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کی تعبیر و تفسیر متانت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور منفرد انداز پیش کش سے خاکہ اور طنزیات و مضحکات کی روایت کو نیا استحکام بخشتے ہیں، جمالیاتی رفعت و عظمت عطا کرتے ہیں اور برجستہ و بے تکلف تحریر کی پاکیزہ مثال قائم کرتے ہیں۔ ان کی شوخی، جدت طرازی، شگفتگیٔ طبع، برجستگی اور سلاست نے اردو کے طنزیہ و مزاحیہ سرمایے اور خاکے کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے وضع کردہ کرداروں نے اور منتخب کردہ شخصیات نے زندگی کی گرمی اور سرگرمی کو نمایاں کیا ہے اور معاشرت کی متعدد پستیاں اور کمزوریاں اجاگر کی ہیں۔

غور و فکر، تجربہ کی گہرائی، مخصوص فلسفیانہ انداز اور لہجہ کی سنجیدگی نے مجتبیٰ حسین کے خاکوں اور طنز و مزاح میں برجستگی اور بے ساختگی کی نئی فضا قائم کی ہے۔ ان کے فقرے بیحد نپے تلے ہوتے ہیں اور تجزیہ، دلائل اور براہین کے آہنگ سے مرصع ہوتے ہیں جن میں معنوی جہیں ہوتی ہیں، نئے قالب کے دائرے ہوتے ہیں اور جدت و ندرت کا بہاؤ ہوتا ہے۔ حیدر آباد سے دلی تک کی تہذیب میں جذب ہونے کے بعد مجتبیٰ حسین کے طرز بیان میں جو روانی، سادگی، تصویرکشی، شوخی اور لطافت ملتی ہے وہ اردو کے بہت کم خاکہ نگاروں اور طنز و مزاح نگاروں میں پائی جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین خاکے میں لطیف پیرائیہ بیان اپناتے ہیں اور حقائق حیات کی تلخیوں کو جذبہ و احساس کی لطیف کرنوں اور اسلوبی حلاوتوں کے برتاؤ سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ جن اصحاب کے خاکے انہوں نے لکھے ہیں ان کی صفائی میں وہ خود لکھتے ہیں:

"میں نے یہ خاکے کسی کے حق میں یا خلاف بالکل نہیں لکھے۔ جس طرح دل و دماغ نے کسی شخصیت کو قبول کیا، اسے ہو بہو کاغذ پر نقل کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ خاکے میں خاکہ نگار کا زاویۂ نگاہ بھی در آتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے تو وہ انجانے طور پر اپنا خاکہ لکھ ڈالتا ہے"

(آدمی نامہ صفحہ نمبر ۶ حسامی بک ڈپو، حیدر آباد ۱۹۸۰ء)۔

مجتبیٰ حسین زیر موضوع شخصیت کو اپنی نگاہ سے دیکھتے، سمجھتے اور پرکھتے ہیں اسی لئے ان کی باریک بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ کرشن چندر کے خاکہ سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"ان کے (کرشن چندر کے) ایک ہاتھ پر انگریزی میں ان کا نام بڑے حرفوں میں گدا ہوا تھا۔ KRISHN CHANDER۔ میں نے ایک بار مذاق میں ان سے کہا تھا "کرشن بھائی یہ اپنے ہاتھ کو وزیٹنگ کارڈ کیوں بنا رکھا ہے۔ اور پھر یہ بتایئے کہ جب آپ کا ایک ہاتھ مطبوعہ ہے تو دوسرے ہاتھ کو کیوں غیر مطبوعہ رکھا ہے۔ اس پر بھی کچھ لکھئے۔ بلکہ اردو میں لکھئے۔ کیوں کہ آپ تو اردو کے ادیب ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہئے۔"

میری بات سن کر پہلے تو زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر گمبھیر ہو کر بولے "ہاتھ پر انگریزی میں نام لکھا ہو تو کیا ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ تو اردو لکھتا ہے۔" اردو کے معاملے میں وہ فوراً گمبھیر ہو جایا کرتے تھے۔"

فقرہ بازی اور فقرہ طرازی سے انداز نگارش کو آراستہ کرنے کا ہنر مجتبیٰ حسین کو خوب آتا ہے۔ چنچلیٔ تحریر، شادابیٔ اسلوب اور شگفتگیٔ خیال سے عبارت آرائی ان کے خاکے میں

بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے خاکے میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کو ملاحظہ کیجئے:

"بات دراصل یہ ہے کہ بیدی صاحب ہمیشہ جذبوں کی سرحد پر رہتے ہیں۔ اور سکنڈوں میں سرحد کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر عبور کر لیتے ہیں: ان کی ذات "جھٹپٹے کا وقت" ہے۔ برسات کے موسم میں آپ نے کبھی یہ منظر دیکھا ہوگا کہ ایک طرف تو ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہے اور دوسری طرف آسمان پر دُھلا دُھلایا سورج چماچم چمک رہا ہے۔ اس منظر کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے تو سمجھئے کہ آپ اس منظر میں نہیں، بیدی صاحب کی شخصیت میں دور تک چلے گئے ہیں، ان کی ذات میں ہر دم سورج اسی طرح چمکتا ہے اور اسی طرح ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہوتی ہے۔"

سنجیدگی، متانت اور حلاوت کو آمیز کر کے اپنے خاکے میں اسلوب کے جس معیار کو مجتبیٰ حسین برتتے ہیں اس سے کشش تو نمایاں ہوتی ہی ہے، شخصیت سے گہری واقفیت بھی سامنے آتی ہے۔ ساتھ ہی مزاج اور سیرت کی ایسی صفت نمایاں ہوتی ہے جس کا علم قبل سے بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ فکر تونسوی کی شخصیت اور فن پر یہ طنز آمیزی ملاحظہ کیجئے:

"میں نے فکر تونسوی کو جس قدر قریب سے دیکھا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ اردو کے اس بڑے طنز نگار کے اندر ایک معصوم گنوار بیٹھا ہے۔ یہ گنوار انہیں اپنے گھر کے خوبصورت صوفہ پر اکڑوں بٹھواتا ہے۔ یہی گنوار ان کے کان میں سگرٹ کا ادھ جلا ٹکڑا رکھوا دیتا ہے۔ یہی گنوار انہیں چائے کی پیالیوں میں سگرٹ کی راکھ جھاڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور تو اور یہی گنوار ان سے ریفریجریٹر میں "بدنام کتاب" کے نسخے رکھواتا ہے۔ پرسوں میں نے ان کے گھر کا فریج کھولا تو دیکھا کہ "بدنام کتاب" کے دو نسخے بڑی قابل رحم حالت میں وہاں پڑے تھے۔ میں ریفریجریٹر میں کتابیں دیکھ کر ہنسنے لگا تو خفت مٹانے کے لئے بولے "بھئی میں نے اصل میں پانی پینے کے لئے فریج کھولا تھا۔ شاید غلطی سے یہ نسخے وہاں رہ گئے، ایمان سے۔ پھر خود ہی کچھ سوچ کر ایک طنزیہ فقرہ میری طرف اچھالتے ہوئے بولے "مگر یار، یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اردو کی کتابیں اب ریفریجریٹر میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔"

اپنے خاکے میں بولتی چالتی اور چلتی پھرتی تصویر پیش کرنا واضح شعور کی وجہ سے ممکن ہے۔ الفاظ کے استعمال میں جمالیاتی شعور کی کار فرمائی مجتبیٰ حسین کے طرز تحریر کا کمال ہے۔ تعلقات کی تہہ داری اور مشاہدات کی رفعت کو انہوں نے وقار خلیل کے خاکے میں، بجد کم الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

"وقار خلیل کے انتقال کی خبر "سیاست" کے جس شمارے میں چھپی تھی وہ ہمیں ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے پورے آٹھ دنوں بعد ملا۔ اخبار میں وقار خلیل کی تصویر نظر آئی تو دل دھک سا رہ گیا۔ جو لوگ لمبے عرصے سے ادب میں سرگرم عمل ہیں ان کی تصویریں ان کی تخلیقات کے ساتھ ذرا کم ہی چھپتی ہیں۔ البتہ ان کی تصویر اسی وقت چھپتی ہے جب وہ ہمیشہ کے لئے ادب اور دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ چنانچہ خبر پڑھی تو یہ پتہ چلا کہ وقار خلیل بھی اپنا دامن جھاڑ کر دنیا سے نکل گئے۔ وقار خلیل کو برسوں پہلے جس حالت میں دیکھا تھا اسی حالت میں انہیں پانچ چھ مہینے پہلے بھی دیکھا تھا۔ مخلص، بےلوث، محنتی، منکسرالمزاج، سنجیدہ، بردبار اور خوددار"۔

شخصیت، واقعہ، اسٹائل اور مخصوص زاویۂ نگاہ کی وجہ سے مجتبیٰ حسین نظری انداز میں اور بے تکلفی کے ساتھ مرقع کشی اور صورت گری کرتے ہیں۔ لندن میں وہ مشتاق احمد یوسفی سے ملنے کے بعد ان کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں:

"مرکزی لندن کے ایک خوبصورت فلیٹ میں ہم مشتاق احمد یوسفی سے ملے۔ ماشاءاللہ اتنے صحت مند نظر آئے کہ ان کی مزاج پرسی کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ سجا سجایا خوبصورت، وسیع اور کشادہ فلیٹ ہے۔ "زرگزشت" والے مشتاق احمد یوسفی، جو اینڈرسن کے حضور میں جاتے ہوئے اپنی پتلون کے پیوند کو فائیل سے ڈھک لیتے تھے۔ "چراغ تلے" والے مشتاق احمد یوسفی جن کی عینک لگا کر بچے اندھے بھینسے کا کھیل کھیلا کرتے تھے اور خان سیف الملوک کی سائیکل کے کیریر پر بیٹھ کر جانے والے مشتاق احمد یوسفی ہمیں اس فلیٹ میں نہیں ملے۔ "زر گزشت" میں ان کے حالاتِ زندگی اچھے نہیں تھے۔ اب "حالتِ زندگی" اچھی ہے۔ اصل اہمیت حالات کی نہیں حالت کی ہوتی ہے۔ بہت تپاک سے ملے۔ مرنجان مرنج، کم آمیز، کم گو اور اپنے آپ میں سمائے ہوئے"۔

تہذیبی ضابطوں اور تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے، مراتب کا خیال رکھتے ہوئے اور تعلیمی شعور کے وسیلے سے آل احمد سرور کا خاکہ کھینچتے ہوئے مجتبیٰ حسین اپنی تیز بصیرت کا ثبوت دیتے ہیں:

"اگرچہ بزرگوں کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنا خود ایک خامی ہے مگر میں سرور صاحب کی ایک خامی کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ وہ اردو کے پروفیسر ہونے کے باوجود اردو کے پروفیسر نہیں لگتے۔ ان میں وہ بات ہی نہیں ہے جو اردو کے بہت سے رائج الوقت پروفیسروں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں نہ چھل ہے نہ کپٹ، سازش ہے نہ ہیر پھیر، کینہ ہے نہ بغض، غیبت ہے نہ منافقت، نہ اقتدار کی ہوس

ہے نہ صاحبانِ اقتدار کی قربت سے انہیں کوئی سروکار ہے۔ اردو کے استاد اب جوڑ توڑ کے ہی نہیں۔ بلکہ توڑ توڑ کے قائل ہوتے جارہے ہیں۔ یہ صلاحیت اب اردو کے پروفیسروں کی بنیادی قابلیت میں شمار کی جانے لگی ہے اور اردو کلچر کا حصہ بنتی جارہی ہے۔ سرور صاحب ان سب باتوں سے بے نیاز نام و نمود اور شہرت کی طلب سے ناوابستہ اپنے جہانِ علم و دانش میں مست اور مگن ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ گروہ بندیوں سے اپنے آپ کو الگ رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے لئے غیر جانبداری، میانہ روی اور اعتدال پسندی کی وہ مشکل روش اختیار کی ہے جس پر آج کے دور میں چلنا اور پھر سرخرو ہونا کوئی مذاقِ دل لگی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ عالمی سیاست میں ہندوستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے NON-ALIGNMENT یا غیر جانبداری یا گٹ نرپیکشتا کو رائج کیا ہے۔ لیکن یہ کہتے ہوئے فخر ہو رہا ہے کہ اردو ادب میں "یہ گٹ نرپیکشتا" سرور صاحب کی وساطت سے پچھلے پچاس برسوں سے رائج ہے"۔

شخصیات سے ملنے کے بعد مجتبیٰ حسین انوکھا تجربہ حاصل کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو لذت آشنا کرانا نہیں بھولتے ہیں۔ انہوں نے خاکے کے ذریعہ طنز و ظرافت کے مزاج و اسلوب کو نئے رجحانات سے روشناس کرایا ہے۔ انہوں نے ادبی انسان کو جذبے کے ساتھ موضوعِ تحریر بنایا ہے۔ کنہیا لال کپور اونچے قد کے آدمی تھے۔ ان کے خاکے میں مجتبیٰ حسین کی شائستہ پھبتی ملاحظہ کیجئے:

"کنہیا لال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں قطب مینار کی یاد آتی ہے۔ اور جب قطب مینار کو دیکھتا ہوں تو آپ جان گئے ہوں گے کہ کس کی یاد آتی ہوگی۔ چونکہ دہلی میں ایسی جگہ رہتا ہوں جہاں سے ہر دم قطب مینار سے آنکھیں چار ہوتی رہتی ہیں اس لئے کپور صاحب بے تحاشہ، لگاتار اور بنا کوشش یاد آتے رہتے ہیں۔ کیا کریں مجبوری ہے۔ دہلی میں کسی اچھی لوکالٹی میں مکان بھی تو نہیں ملتا۔ کپور صاحب اور قطب مینار میں مجھے فرق یہ نظر آیا کہ قطب مینار پر رات کے وقت ایک لال بتی جلتی رہتی ہے تاکہ ہوائی جہاز وغیرہ ادھر کا رخ نہ کریں۔ کپور صاحب پر رات کے وقت یہ حفاظتی انتظام نہیں ہوتا۔ جو خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کیا پتہ کسی دن کوئی ہوائی جہاز اندھیرے میں کپور صاحب سے نبرد آزما ہو جائے اور ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے (مراد ہوائی جہاز سے ہے)۔ ایسی "سات منزلہ شخصیتیں" اب بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک بار بس میں سوار ہوئے تو فوراً اپنے آپ کو یوں دوہرا تہہ کر لیا جیسے کسی نے انگریزی کے U کو الٹ دیا ہو۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ جب بھی ان سے بات کی تو ان کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس نہیں ہوئی۔ ورنہ عام صورتوں میں ان سے کھڑے کھڑے بات کیجئے تو یوں لگتا ہے جیسے آپ کسی دور افتادہ شخص سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہوں۔ لمبا قد کیا عجب شئے ہے!"

مجتبیٰ حسین کی عبارت آرائی کی شگفتگی اور شوخی و برجستگی ہر مرحلے پر مسکراہٹوں کی روشنی بکھیرتی ہے، طنز کے نشتر چبھوتی ہے اور رازداری کے انکشاف کا لطیف و جمیل دائرہ بناتی ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے خاکے میں ان کا قلم چونکھی زندگی کو واشگاف کرتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

"میری نظر میں بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر ترس آتا ہے۔ اور دوسری قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پیار آتا ہے۔ اگرچہ پیار اور ترحم دونوں ایک ہی وسیع جذبے کے ذیلی جذبے ہیں لیکن پیار چاہے بزرگ پر آئے یا دوشیزہ پر، پیار ہی ہوتا ہے۔ کنور مہندر سنگھ صاحب سحر کا شمار موخرالذکر بزرگوں میں ہوتا ہے۔ جن کے بڑھاپے پر ان دنوں شباب آیا ہوا ہے۔ ایک ایسا شباب جن کا تھوڑا سا حصہ بھی ہمیں پندرہ بیس برس پہلے مل جاتا تو ہم بھی وہ سب کچھ کر گزرتے جو آدمی کو کرنا چاہئے۔ بزرگوں کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جنہیں دیکھ کر آدمی عبرت پکڑتا ہے۔ لیکن بعض خوش نصیب بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر آدمی عبرت کے سوائے ہر چیز کو پکڑ لیتا ہے جیسے تین سال پہلے ایک دن میں نے کنور صاحب کو دیکھ کر اپنا کلیجہ پکڑ لیا تھا۔ یہ اُس دن کی بات ہے جب دہلی میں ہر دن کی طرح بجلی فیل ہو گئی تھی۔ مجھے اور کنور صاحب کو دہلی کی ایک پچیس منزلہ عمارت کی ساتویں منزل پر پہنچنا تھا اور لفٹ بند تھی۔ کام چونکہ میرا تھا اس لئے میں نے کنور صاحب سے کہا، میرا کام اتنا ضروری نہیں ہے کہ آپ ساتویں منزل تک چڑھ کر جائیں اور پھر آپ کی عمر بھی تو ۷۴ برس کی ہو چکی ہے۔

"میرے اس جملے کو سنتے ہی ان کے بڑھاپے پر شباب آگیا، اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ میں انہیں منع کرتا رہا، سمجھاتا رہا کہ میں نے یہ جملہ اس لئے نہیں کہا کہ وہ ۷۴ برس کے ہو گئے ہیں بلکہ اس لئے کہا ہے کہ میں ۴۸ برس کا ہو چکا ہوں۔ مسئلہ میرے ضعف کا ہے۔ ان کے ضعف کا نہیں۔ مگر وہ نہ مانے اور سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ بلکہ اکثر موقعوں پر تو دو دو سیڑھیاں ایک ہی قدم میں پھلانگ ڈالیں۔ میں ان کے پیچھے ہانپتا کانپتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میرے روکنے کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوا۔ بالآخر اس سفر میں ایک نوبت وہ بھی آئی جب وہ مجھ سے دو منزل آگے ہو گئے۔ ان کے قدموں کی چاپ تو سنائی دے رہی تھی مگر وہ خود دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں گرتا

پڑتا ساتویں منزل پر پہنچا جہاں ہمیں ایک شخص سے ملنا تھا۔ میں نے اپنی اکھڑی اکھڑی سانسوں کو بڑی مشکل سے یکجا کر کے ان صاحب سے پوچھا کہ کہیں کنور صاحب آتو نہیں گئے۔ وہ بولے "کنور صاحب تو نہیں آئے۔ البتہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے سیڑھیوں پر ایک سردار جی کی جھلک دیکھی ہے جو بڑی تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔"

میں نے کہا "وہی تو کنور صاحب تھے جو آپ سے ملنے کے لئے اس عمارت میں آئے ہیں۔"

"تو پھر وہ اوپر کیوں چلے گئے؟"۔ ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ ذرا جوش جوانی میں اوپر تک چلے گئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔"

کچھ دیر بعد کنور صاحب نیچے آگئے۔ پتہ چلا کہ میرے جملے نے انہیں اتنا مشتعل کیا کہ تیرہ منزلوں تک چڑھتے چلے گئے"۔

مجتبیٰ حسین کے خاکے میں طنز اور ظرافت کا دفاعی اسلحہ ملتا ہے جس سے رنج و غم اور تشنگی و بیزاری کی کیفیتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ ساتھ ہی حوصلۂ حیات کو تازہ بصیرت اور توانائی حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کی ساری تلخیوں اور اس کی تیزابیت کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد شخصیت میں جو نکھار آتا ہے اسے پانے اور اس کے بطون میں داخل ہونے کی جست مجتبیٰ حسین گہرے شعور اور ادراک سے لگاتے ہیں، شخصیت میں جستجو کے نئے نئے گوشے تلاش کرتے ہیں اور خاکہ فہمی کو سنجیدگی فکر و نظر عطا کرتے ہیں۔ ان کی دانشورانہ بصیرت فکر انگیز تردد کو سامنے لاتی ہے اور گم ہوتی ہوئی شناخت کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ مجتبیٰ حسین اپنے خاکے میں کمزور پہلوؤں کی گرفت بھی کرتے ہیں اور زندگی کے احوال و آداب کو بیانیہ نفاست سے سجاتے اور سنوارتے بھی ہیں۔ اس طرح وہ اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان کے خاکے میں مشاہدات، تجربات اور معلومات کی خوشبو ہی نہیں ملتی بلکہ محسوسات کی عطر بیزی بھی کشش انگیز ہوتی ہے۔ خوش طبعی، خوش خیالی اور خوش ذوقی ان کے اسلوب تحریر کو معیاری بناتی ہیں اور انفرادیت بخشتی ہیں۔ یہ انفرادیت زبان و بیان کے خلاقانہ استعمال سے بھی نکھری ہے جس میں سلاست، حلاوت اور شائستگی ہے۔ ان کے اسلوب تحریر میں کردار نگاری، واقعہ نگاری اور مرقع کشی کے عناصر جا بجا سموئے ہوئے ہیں۔ اور تقابل اور تعریض کے ذریعہ کسی صورت حال یا کردار کو دلچسپ بنا کر پیش کرنے میں وہ کمال رکھتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اپنے خاکے کے اسلوب کی تشکیل میں مکالماتی انداز بیان بھی اختیار کرتے ہیں اور کرداروں کو ان کی سیرت اور مزاج کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کے ساتھ پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ مزاح کی شگفتگی اور طنز کی چبھن ان کے خاکے کے اسلوب کی تاثیر و کشش کو توجہ طلب بناتی ہے!

بقیہ: وقت کی سرگذشت مثنوی وقت

جالا تمہاری آنکھ کا اس طرح سے ہو صاف
کہ ماں کے رحم میں نظر آجائے تم کو ناف

صاحب مثنوی وقت کو ان کی پہلی شعری کاوش کے لئے ڈھیروں مبارکباد! میں نے ان کے شعری اسلوب اور طرز ادا کے رسمی ذکر سے گریز کیا ہے کہ یہ سامنے کی باتیں ہیں۔ ان کی اپج غیر رسمی داد کی مستحق ہے۔

یہ کتاب دوست پبلی کیشنز، ۸/اے، خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر ۲۹۵۸، اسلام آباد (پاکستان) نے شائع کی ہے۔ پاکستان میں اس کی قیمت ۱۰۰ روپے اور بیرون ملک ۱۰ امریکی ڈالر ہے۔

امریکہ میں اس کتاب کے ملنے کا پتہ یہ ہے:

14, Woods Row, Monroe,
CT 06468. U. S. A.

یہ شمارہ آپکو کیسا لگا
لکھنا نہ بھولیں۔



MAHADEVIA & MEHTA

پورے خاندان کیلئے ایک دکان

STANROSE • GWALIOR • Mafatlal • Siyaram's

EXCLUSIVE APPROVED RETAIL SHOWROOMS

• فیملی فیبرکس اور ہزاروں ہزار کٹ پیس۔ • سب سے بڑا کٹ پیس سینٹر۔

• کم قیمت میں بہترین شرٹ! آپ دیکھ کر ہی یقین کر پائینگے۔

PLUS READYMADES

CERTIFICATE OF GUARANTEE
M & M SHIRTS
Rs. 169/- to Rs. 229/- ONWARDS

WE ACCEPT MAJOR CREDIT CARDS

ضمانت کی سند
ایم اینڈ ایم
١٢٩ تا ٢٢٩ روپے اور زا

Roxy Cinema Building AND 2, Brabourne Road, Calcutta

مہا دیویا اینڈ مہتا

راکسی شوروم کے اوقات: ١٠ بجے سے ٨ بجے تک، سنیچر اور اتوار کو تمام دن کھلی رہے گی۔

رمضان کی مبارکباد قبول فرمائیں اور عید کی خریداری کیلئے تشریف لائیں!
خاندان بھر کیلئے
کپڑوں کا زبردست خزانہ!
سوٹنگ، شرٹنگ، بلاؤز،
ساڑیاں ڈریس میٹریل
اور چادروں کا
زبردست اسٹاک اور
ہزاروں ہزاروں
★ کٹ پیس ★

عید اور نئے ملینئیم کی صد ہزار مبارکباد!

بہتر سے بہتر رہائشی سہولیات فراہم کرنا ہمارا شعار رہا ہے۔

کلکتہ کے مرکزی علاقہ میں واقع

راجستھان گیسٹ ہاؤس

Rajasthan Guest House

19, Zakaria Street, Calcutta - 700 073
Phone : 235-4715 / 4577 / 3407 / 4716 / 9482 / 4284 / 221-5523
Fax : 033-221-5514
Jaipur Branch : 8, Khendela House, Behind Amber Tower
Sansar Chand Road, Jaipur
Phone : 365-713

فراقؔ جلال پوری

پوسٹ: جلال پور، محلہ قاضی پورہ، ضلع امبیڈکر نگر
۲۲۴۱۴۹ (یوپی)

کاغذی ناؤ میں شعلوں کا سفر چاہتے ہیں
مشکلوں والے ہی کشتی میں بھنور چاہتے ہیں

سامنے کوئی بھی ہو راہ گزر چاہتے ہیں
دھوپ کے حوصلے دیوار میں در چاہتے ہیں

کچھ تو چنگاری بھی دامن کی ہوا مانگتی ہے
اور کچھ ہم بھی یہاں رقصِ شرر چاہتے ہیں

صرف دو چار فسادوں سے نہیں جی بھرتا
روز اخبار میں سب تازہ خبر چاہتے ہیں

گھر کی تقسیم پہ دیوانے بضد ہیں یعنی!
گھر کے بٹوارے میں ماں باپ کا سر چاہتے ہیں

دھوپ کے دشت میں سائے کی تمنا والے
کتنے نادان ہیں پردیس میں گھر چاہتے ہیں

اے خدا! مانگنے والے تیری رحمت کی قسم
اک ذرا اپنی دُعاؤں میں اثر چاہتے ہیں

اُس عدالت سے اب انصاف تو مشکل ہے فراقؔ
خود ہی منصف جہاں مظلوم کا سر چاہتے ہیں

ڈاکٹر شباب للت

9,Hydevale
Chaura Maidan
Shimla (H.P.)

ہر سفر میں بن کے میری رہنما چلتی رہی
آگے آگے میرے پُرکھوں کی دُعا چلتی رہی

پا گئے قاتل تو دامانِ سیاست میں پناہ
بے گناہوں پر مگر تیغِ جفا چلتی رہی

آپ سے اک موڑ پر پھر بھی تصادم ہو گیا
زندگی بچ بچ کے چاہے راستہ چلتی رہی

نغمگی چھائی تھی ہر سُو تم رفیقِ شب تھے جب
باندھ کر پازیب پیروں میں ہوا چلتی رہی

روح کی کشتی نہ چھوٹی حلقۂ گرداب سے
زیرِ دریا جب تلک موجِ انا چلتی رہی

معجزہ سمجھو کہ اپنا آشیانہ بچ گیا
ورنہ شب بھر تیز طوفانی ہوا چلتی رہی

کھِل نہ پائے جو بہاروں میں ہمیں وہ پھول تھے
کیا خبر کس کے لئے بادِ صبا چلتی رہی

دشتِ تنہائی کی ظلمت میں مری آوارگی
لے کے تیری یاد کا روشن دیا چلتی رہی

راہِ منزل سے نہ بھٹکے گی نئی پیڑھی شبابؔ
دیکھ کر جب تک ہمارے نقشِ پا چلتی رہی

ف۔ س۔ اعجاز

وقت کی سرگذشت "مثنوئ وقت"

صفوت علی صفوت کا کارنامہ

مثنوئ وقت۔ اس کتاب کی حیثیت گرچہ بقول مصنف ایک کتاب شعر کی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اندرون کتاب ایک کائنات بسی ہوئی ہے۔ کلاسیکی مثنویاں داستانی یا حکایتی عنصر کی وجہ سے لوگوں کیلئے دلچسپ بن گئی ہیں۔ جیسے دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" میر تقی میر کی "زہر عشق"۔ غواصی کی "سیف الملوک" سراج اورنگ آبادی کی "بوستانِ خیال" وغیرہ۔ مفرد اشعار کی مثنویت (دو مصرعی خصوصیت) نہ صرف یہ کہ داستان کے گرد ایک طلسمی ہالہ بنتی چلی جاتی ہے بلکہ نہاں مفہوم کی ترسیل کو آسان اور اثر انگیز بھی بناتی چلی جاتی ہے۔ شاعر اگر پُر گو ہو اور تخیل اور زبان پر حاوی ہو تو مثنوی بہ یک وقت افسانہ اور افسوں سے لبریز ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس صنف کو موجودہ شعرا نے نظر انداز کر رکھا ہے ورنہ یہ وہ صنف ہے جو شاعر کے غایت کی معروضی کفالت کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔

ایسے میں ایک شاعر صفوت علی صفوت نے ایک نئے مقصد کے تحت اس صنف کا انتخاب کیا ہے جو کلاسیکی مثنویوں کے مقاصد سے الگ ہے۔ صفوت سائنسداں شاعر ہیں۔ وہ امریکہ کی ایک شمالی ریاست کنے ٹی کٹ میں مقیم ہیں اور نیویارک شہر کی مشہور ٹیلی فون کمپنی "بل اٹلانٹک" کے شعبۂ مواصلات میں کمپیوٹر کے ماہر کی حیثیت سے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

مثنوی کہنے کیلئے اولاً تو وہ موضوع ہونا چاہئے جسے تسلسل سے بیان کرنا ضروری ہو یا جو بہ الفاظ دیگر ایک بیانیہ تسلسل کا محتاج ہو۔ اگر شعرا اس صنف کو معمولاً اختیار نہیں کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس ایسے موضوعات نہیں ہیں جنہیں وہ صراحت سے بیان کریں۔ صفوت علی صفوت نے جو موضوع لیا ہے وہ مثنویوں کے رواجی عشقیہ، متصوفانہ یا ناصحانہ موضوعات سے جدا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس صنف کے لئے ان کی اپنی دریافت ہے۔ انہوں نے وقت کو موضوع بنایا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کو ایک تسلسل میں لے کر مثنوئ وقت تحریر کی ہے۔

وقت کوئی جامد شے نہیں ہے۔ تحرک اور رفتار نے ازمنہ کو انسان اور کل تخلیق خداوندی یعنی کائنات کی مرحلہ وار داستان بنا دیا ہے۔ ازل اور ابد کے روابط ظاہری بھی ہیں اور مبنی بر اعتقادات بھی۔ موجودات کی شروعات فلسفہ انگیز خیالات سے ڈھکی ہوئی ہے۔ "نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا"۔ صفوت علی صفوت نے بعد از حمد مرسلؐ ازل سے پہلے کے پس منظر کو یوں بیان کرنا شروع کیا ہے۔

ابھی وقت پیدا نہیں ہوا، ابھی لفظ کُن ہی کہا نہیں
ہیں تصوراتِ الوہیت ابھی اور کچھ بھی بنا نہیں

بوقتِ تخلیقِ ارض وسما نہ وقت کا کوئی جواز تھا اور نہ اسکی پیائش کی ضرورت سمجھی گئی، نہ ناپنے کا آلہ ایجاد ہوا۔ مثنوی اس اسرار آفرینش کے ذکر کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ عموماً ادب میں وقت کو ایسی طاقتور اور جاہ بکن شئے بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ آدمی اس سے ڈرے۔ اس میں معتقدات اور موروثی توہمات بڑی وجہ بنتے ہیں۔ نہ صرف۔ کہ صفوت علی صفوت نے شاعری میں مذہب اور سائنس کو متخالف بننے نہیں دیا بلکہ دونوں کو اثباتی رنگوں اور مفاہمتی صورتوں میں پیش کیا ہے۔ اور وقت کے حرکی کردار کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں مذہب سائنس کے آڑے نہیں آتا۔ قرآن شریف میں سورۂ عصر میں زمانے کی قسم کھائی گئی ہے۔ وقت کا کردار نہایت اہم اور برحق ہے۔ صفوت نے اس بات کی اپنے ایمان سے تائید کی ہے۔ سب سے پہلے تو شاعر اس وجود کا سپاس گزار ہے جسے "وجود وجہِ وجود" کہا جاتا ہے۔ پھر اس کائنات کی ہتھیلی پر وقت کے مقدرات کی جو لکیریں وضع ہوئی ہیں ان میں نور و نار، آب و غبار اور مادّوں کی شناخت از روئے علم طبیعات اور فزکس بڑی خوبی اور ایچ کے ساتھ کی گئی ہے۔ جس سے موجوداتِ عالم کے حرکت و استقرار تاریخی پس منظر کو لئے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ کرۂ آب کو "جوازِ سہو وجود" قرار دیا ہے۔ شمس و قمر نے گردش کرنا شروع کی، آسمان نے نیلگوں اور سرمئی رنگ اختیار کئے اور زمین کی جنبش کو شاعر نے اسطرح وقت کے پیمانے سے ماپا۔

یہ زمیں چلی تو یہ رم کی رو میں ہزار صدیاں نکل گئی
یہ کئی خلائیں نکل گئی، یہ کئی مدار بدل گئی

شاعر نے "اسے عبور وقت کی بات" کہا ہے اور کشش مرکو ارض اور ثقل کو ڈائناسور کے عہد قدامت سے تا حال نیوٹرون، کاربن، کوارک، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ جیسے سائنسی مظاہر کو انسانی شعور کی ترقی سے تعبیر کیا ہے اور اسے "اہلکت" گردانا ہے۔ اور جسم انسانی کے حیاتیاتی خلیوں کو "ممکناتِ صفات" کا مجموعہ قرار دیا ہے۔

ترے خون ہی میں رواں دواں ترے ممکنات و صفات ہیں
یہ جو سرخ اور سفید "سیل" ہیں لہو کے سیلِ حیات میں

خوں کے نشار اور دوران کو نظام تنفس کے عملی اثرات سے بڑی خوبصورتی سے مربوط کیا گیا ہے۔ پھر وقت کی اونچی پرواز اور غیر ارضی[فلکی] سیارگان کی تسخیر کے ضمن میں میجر گاگرن، فیپر ڈ اور نیل آرم سٹرانگ (جنھوں نے خلا کو پہلی بار مسخر کیا) کا ذکر چھیڑ کر شاعر آناً فاناً معراج رسولؐ کا حوالہ دیتا ہے ۔

نہیں سوچ صرف یہ مغربی کہ خلا سے گذرے رسول بھی
یہ جہاز اور شٹل سبھی ہیں اسی براق کی پیروی
کہیں اڑ کے پہنچے ملائکہ کہیں سنگ ہے کسی میل کا
کہیں تذکرہ ہے بہشت کا کہیں صور اسرافیل کا

یہاں مثنوی کچھ دیر قیام کرتی ہے اور ۸/ اشعار کی ایک مرصع غزل کو راہ دیتی ہے جسکی پہنائی میں محبوب خدا نبیٔ آخرالزماں کی حسین و جمیل موجودگی کے سائے جھلملا اٹھتے ہیں ۔

کبھی وقت پیچھے چلا اگر تو میں جابسوں گا حجاز میں
جو اذان ہوگی بلالؓ کی تو رسولؐ آگے نماز میں
انہیں چوم لوں گا عقیدتاً یہ کہوں گا ان سے میں رقتاً
کہ حضور آنکھیں تڑپ رہی ہیں سبھوں کی وقتِ دراز میں

پئے حضور یہ کہنا کہ سبھوں کی آنکھیں وقتِ دراز میں تڑپ رہی ہیں تکلم انکسار اور محبت کی بے تابی کی دلیل ہے۔ یہاں "وقتِ دراز" کی ترکیب لاجواب ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ایک شعر میں آیا ہے۔ اس میں الفاظ کی موزونیت دیدنی ہے ۔

ذرا اور آگے چلیں گے جب تو ملیں گے عیسیٰؑ جلونشیں
میں یہ پوچھ لوں گا تم ہیں یا کہ خدا لباسِ مجاز میں

حضرت عیسیٰؑ کیلئے "خدا لباسِ مجاز میں" کے الفاظ مسیحی عقیدے کا فطری اظہار بن گئے [illegible] سے تکریم شعری میں بلیغ اضافہ ہوا ہے۔ [illegible] مروں میں تفاوت کو سائنسی اکتشاف کے ذریعہ ایک مصرع میں یوں باندھا ہے ۔ "کہ زمیں پہ وقت ضعیف ہے پہ خلا میں وقت جوان ہے" اور وقت کی اس تفاوتِ رفتار کو قمر، سعد اور شہاب کی گردش پر محمول کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ خلا میں تیزیٔ وقت کے جواز پر ابھی "کسی فارمولے پہ غور ہے"۔ صفوت علی صفوت ایک ایسا سائنسداں شاعر ہے جو وجودِ مخلوقات پر پیہم اپنی نظر رکھے ہوئے ہے۔ اور اس کا سائنسی و شعری علم اسکی رہنمائی صانع حقیقی کی سمت میں کر رہا ہے۔ آسمان کی گردش، بلندی اور اس کا بلا ستون استقرار و استحکام، زمین کی پستی، دریاؤں کی روانی، نباتات و موجودات کا تنوع، شجر و ثمر کے ذائقے ایک ایسی ذاتِ واجب الوجود میں انسان کے یقین کو پختہ کرتے چلے جارہے ہیں جو اس دور سائنس میں بھی ناقابلِ تردید ہے۔ صفوت کی مثنوی لامکان اور مکان کی سیر کراتے ہوئے مصر و روم، کاشی، اودھ، بابری مسجد، شاہی مسجد، سومنات مندر وغیرہ وغیرہ کو چھوتی ہوئی نیوٹرون، الکٹران، پلازمہ، کوارک، انٹروپی، کلوننگ، مرکری (پارہ) کے تفاعل اور سبب و نتیجہ کا جائزہ لیتی ہوئی خدا کی برتری اور عظمت کے اعتراف پر ختم ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے ۔

جو یہ فلسفہ سا لگے تمہیں تو وہ فلسفی ہے بہت بڑا
جو دلیل اس میں لگے تمہیں تو وہ منطقی ہے بہت بڑا

آخر میں وقت پھر سوالِ کن فیکون کے تابع نظر آتا ہے۔ شاعر کا فیصلہ یہ ہے کہ "یہ دوام بھی اسی ذات کو جو مدام جلوۂ طور ہے"

مثنوی کے بعد "توجیہ مثنوی" میں صفوت نے اس کا ثبوت بہم کیا ہے کہ وہ خود شناس سخن گو ہے۔ اسے احساس ہے کہ اس نے موضوع کی ضرورت کے تحت سائنسی اصطلاحات و ایجادات کے انگریزی ناموں کو اردو میں بخوبی منتقل کر کے اس زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے۔ اس نے بابائے اردو، امریکہ حضرت مامون ایمن اور ضمیر جعفری مرحوم جیسے ماہر لسان و ادب کی رہنمائی میں کئی سائنسی اصطلاحات کو اردو قالب میں نرمی سے ڈھال دیا ہے۔ مثلاً ریڈیو کیلئے رادیو، ٹیلی ویژن کیلئے تل وژن، Entropy کیلئے انتاردپی، Pulsar کیلئے پلے سار کے متبادل الفاظ نئے تو ہیں مگر نامانوس نہیں لگتے۔ اسی طرح کئی انگریزی الفاظ براہ راست یا ترجمے کی شکل میں مثنوی میں داخل کئے گئے جن سے اشعار کا آہنگ بگڑ نہیں گیا ہے۔ سہولت اور صحیح رہنمائی کیلئے ایسے الفاظ کا ایک فرہنگ کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ "توجیہِ مثنوی" میں ایسے اشعار کی شمولیت شاعر کی خود شناسی پردال ہے۔

میرا یہ غزل نہیں اس فکر کے لئے
تازہ لغات چاہئے اس ذکر کے لئے

تجھ پر ہوئی ودیعتِ اشعار جاوداں
سائنس کی ہے بات تو سائنس کی زباں

دست ہنر میں شوق کا پیمانہ چاہئے
آفاق پر نگاہ حکیمانہ چاہئے

صفوت علی صفوت ان باطنی فنی اوصاف کے حامل ہیں اسی لئے انکی چشم تحقیق کو باریکی اور گہرائی نصیب ہوئی ہے جس سے یہ مثنوی ایک کشف کے درجے تک جا پہنچی ہے۔ بقول شاعر ۔

بقیہ صفحہ ۶۶ پر

صحت اور ہومیوپیتھی

ذیا بیطس
(DIABETES MELLITUS)

ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش (B.H.M.S.)
C/o. Mahnama Insha
25-B, Zakaria St., Calcutta - 700 073
Chamber : Tues, Thu, Sat
4 - 6 p.m. ● Ph : 235-3107

ذیا بیطس ایک بہت ہی عام سی بیماری ہے جو تقریباً ہر گھر کے کسی نہ کسی فرد میں پائی جاتی ہے۔ یہاں ہم ذیا بیطس شکری (Diabetes Mellitus) کی بات کر رہے ہیں۔ اسکی خاص علامتیں ہیں زائد پیشاب کا اخراج ہونا، زیادہ پیاس اور بہت زیادہ بھوک لگنا۔

جسم میں، لبلبہ (PANCREAS) کے خلیوں میں "انسولین" (INSULIN) ہارمون بنتا ہے جو پھر خون کے دوران میں شامل ہو کر جسم کی شکر کو قابو میں رکھتا ہے۔ اگر یہ ہارمون کسی وجہ سے کم بنے یا نہ بن پائے تو جسمانی شکر بڑھ جاتی ہے اور پیشاب میں بھی اسکا اخراج ہونا شروع ہو جاتا ہے جسے پھر ذیا بیطس کا مرض قرار دیا جاتا ہے۔

اگر یہ مرض لبلبہ کی بیماریوں سے پیدا ہو جیسے سوزش، کینسر، پتھری وغیرہ یا جسم میں لبلبہ کے علاوہ کسی اور غدود (گلینڈ) کی گڑبڑ کی وجہ سے رطوبت کا زائد اخراج ہو تو کچھ عجیب و غریب علامتیں نظر آنے لگتی ہیں جن میں سے پیشاب میں شکر کی زیادتی بھی ایک ہو تو اسے سیکینڈری یعنی ثانوی ذیا بیطس کہتے ہیں۔ جیسے تھائروئیڈ گلینڈ میں تھائیروکسین ہارمون کا زیادہ بننا یا پھر پیٹیوٹری (Pituitary) گلینڈ میں گروتھ ہارمون کی زائد پیداوار۔ اسکی وجہ سے کچھ خاص علامتیں اور پریشانیاں جنم لیتی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہوتی ہے۔ یا پھر کبھی کبھار کچھ لوگ جو کسی وجہ سے اسٹیرائڈ سے علاج کرا رہے ہوں یا پھر پریشر کے لئے تھایزایڈ گروپ کی دوا زیادہ لیتے ہوں تو انہیں بھی یہ ہو سکتی ہے۔

اگر یہ بیماری انسولین کی کمی سے ہو مگر کوئی وجہ نہ مل پائے تو اسے پرائمری کہتے ہیں۔ یہ بچوں اور بڑوں دونوں میں ہو سکتی ہے۔

ذیا بیطس کا مرض ان لوگوں میں کبھی بھی ہو سکتا ہے جنکے ماں باپ پہلے سے ہی اس میں مبتلا ہوں یا پھر دونوں میں سے ایک کو یہ ہو اور دوسرے کے خاندان میں اس مرض کی تاریخ موجود ہو یا پھر کسی کے جڑواں بچوں میں سے ایک کے اندر یہ موجود ہو تو دوسرے کو بھی ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

زیادہ تر یہ مرض 50 سال کی عمر میں پایا جاتا ہے اس میں خاندانی تاریخ بہت اہم ہے۔ اکثر سردی کے موسم میں اس بیماری کے مریض زیادہ پائے جاتے ہیں۔

لبلبہ جسم میں ایک گلینڈ ہے اور انسولین اسکے خلیوں میں تیار ہونے والا ہارمون جو جسمانی چینی پر کنٹرول رکھتا ہے اور بڑھنے نہیں دیتا۔ اگر یہ زیادہ بننے لگ جائے تو جسمانی شکر کم ہو جاتی ہے اور اگر کسی بھی وجہ سے یہ کم بننے لگے تو شکر کا استعمال ٹھیک سے نہیں ہو پاتا اور اگر 100 cc. خون میں 180 mgm. شکر ہو جائے تو اسکا اخراج پیشاب میں شروع ہو جاتا ہے مریض کو بار بار پیشاب آتا ہے اور پیاس لگتی ہے۔ بھوک بھی بے انتہا لگتی ہے۔ لیکن جسم کی شکر پیشاب کے ذریعہ زائل ہونے سے مریض کا وزن کافی گرنے لگتا ہے اور سارے جسم کی چربی بھی گھلنے لگتی ہے۔ منہ اور گلا بہت خشک محسوس ہوتا ہے۔ نچلے حصہ پر کھجلی بھی کافی ہوتی ہے کیوں کہ شکر جو وہاں پر تھوڑی بہت رہ جاتی ہے جراثیم کی افزائش کے لئے بہت اچھی ثابت ہوتی ہے۔

ذیا بیطس کی وجہ سے جسم کے اور حصوں میں بھی پریشانیاں ہو سکتی ہیں جیسے آنکھوں میں موتیا کا اترنا بہت ہی عام بات ہے۔ حاملہ عورتوں میں اسقاط (Abortion) بھی ہو سکتا ہے۔ اسکے مریضوں میں سینے کی T.B اکثر پائی جاتی ہے۔ پیر کی نسوں میں ورم آ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ گردے بھی بیکار ہونے لگتے ہیں۔ جسم کی رگوں میں چربی جم کر خونی بہاؤ میں دشواری پیدا کر کے دل کی بڑی بیماریوں کو بھی جنم دے سکتی ہے۔

مریض کو شکر سے پرہیز کرنا چاہئے۔ چائے، دودھ میں چینی کی جگہ سکرین کا استعمال کرنا چاہئے۔ تیل، گھی اور چکنا کھانا بھی کم کر دینا چاہئے۔ بلکہ Unsaturated Oil یعنی وہ تیل جسمیں فری فیٹی ایسڈس ہوں، اسے کام میں لانا چاہئے۔ کیوں کہ کھانا بنانے کے دوران جو Unsaturated Acids ہوتی ہیں وہ آہستہ آہستہ Saturated ہو جاتی ہیں۔ اور تیل یا صحت کے لئے بہت خراب ہوتی ہیں۔ اگر مریض پہلے سے بھی بھاری بھرکم ہے تو اسے کھانا کم کر کے وزن کم کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے۔ میدے کی چیزوں سے، چاول، میوے وغیرہ سے بھی پرہیز لازمی ہے۔ اگر مریض پہلے سے [illegible] وزن بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس لئے ذرا پیٹ بھر کر کھانا چاہئے۔ مگر بد پرہیزی چیزوں سے دور ہی رہنا چاہئے۔

اگر جسمانی شکر ذرا سی بڑھی ہے تو کھانے پینے کے پرہیز سے ہی ذیا بیطس دور ہو سکتی ہے۔ اگر کافی بڑھ گئی ہو تو پرہیز کے ساتھ دوا بھی نہایت ضروری ہے۔

اس کے لئے بہترین ہومیوپیتھی دوائیں ہیں "سزیگیئم جامبولم"

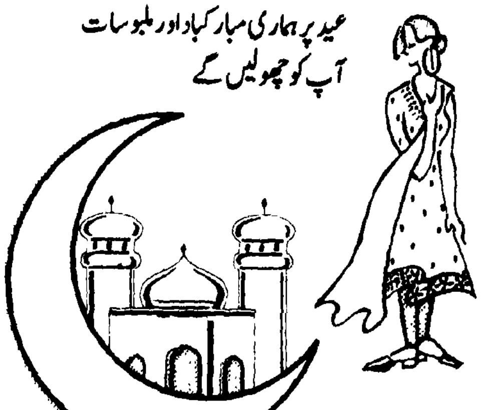
(SYZIGIUM JAMBOLUM)، "ٹیلیکٹک ایسڈ" (LACTIC ACID)، "ہیلو نائس" (Helonias) اور "ابروما" (ABROMA AUGUSTUS)۔ دوائیں تو اور بھی کئی ہیں مگر ہر بار کی طرح مریض کی خاص دیگر علامتیں دیکھ کر ہی دوا تجویز کرنی چاہیے۔ اس کے لئے آپ اپنے ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے رابطہ کریں۔

اگر مریض کو ذیابیطس کے ساتھ جوڑوں میں بھی درد ہو اور بہت بھوک، پیاس ہو اور بار بار زیادہ پیشاب آئے تو LACTIC ACID بہت اچھا کام کرتی ہے۔ مگر دوائیں برابر اور صحیح معمول سے لینا ضروری ہے۔

آج کل اس مرض کی تشخیص کے لئے گھریلو نسخے ایجاد ہو چکے ہیں جیسے کاغذ کے اسٹرپ (Strip) آتے ہیں جنہیں پیشاب میں ڈبو کر شکر کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہے اور اب تو ایک چھوٹی سے مشین بھی نکل چکی ہے جسمیں انگلی سے ایک بوند خون لے کر ٹپکانے سے صحیح طرح سے شکر کی مقدار کا پتہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ بیماری اتنی پریشانی والی ہے لیکن تب بھی لوگ بہت زیادہ چینی یا میٹھی چیزیں کھانے سے باز نہیں آتے!

عید پر ہماری مبارکباد اور ملبوسات
آپ کو چھو لیں گے



برقعہ۔ لیڈیز چادریں۔ ساڑیاں۔ شلوار قمیص۔
کشمیری شالیں اور مزار شریف کے لئے چادریں بھی۔

قادر اینڈ برادرس & Brothers

95, RABINDRA SARANI
OPP. NAKHUDA MASJID, CALCUTTA - 73
PHONE :235 -8067

آر۔ ایم۔ بی۔ پروڈکٹس

عرفان، معاذ، شابی اور صوفی برانڈ
ٹیری کاٹن لنگیاں اور کرتہ مٹیریل

SUITINGS, SHIRTINGS & KURTA MATERIALS

عرفان
IRFAN BRAND
EXPORT QUALITY
POLYESTER LUNGI
R.M.B.BADRUDDIN & CO.

آر۔ ایم۔ بی۔ بدرالدین اینڈ کمپنی ۵۷، لورچیت پور روڈ، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳ فون : ۲۳۵-۹۶۵۴

R. M. B. BADRUDDIN & CO.

57, Lower Chitpur Road (96, Rabindra Sarani), Calcutta - 700 073 Ph : 235-9654

امیتابھ بچن..... ہماری عدالت میں

انیس النبی
2/4B, SHAH AMAN LANE
CALCUTTA-700023

بمبئی فلم انڈسٹری ہماری دنیا سے مختلف اور حیرت انگیز ہے۔ یہاں دن کے وقت چاند تاروں سے بھرا آسمان دکھایا جاتا ہے۔ اور رات کو بھاگتے دوڑتے، ہانپتے کانپتے ہوئے دن کا ہنگامہ خیز منظر فلمایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فلم نگری کا پورا نظام، وقت اور قسمت کے اشارے پر چل رہا ہے۔ انگنت فنکار ایسے ہیں جو تمام تر خوبیوں اور مسلسل جدوجہد کے باوجود تھک کر، بھیگی پلکیں دامن سے پونچھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور سینکڑوں نام نہاد ایسے فنکار ہیں جو مضبوط ہاتھوں سے گذر کر بڑے بینرز حاصل کر لیتے ہیں۔ وقت اور قسمت مختلف بہانوں سے ان فنکاروں کو کبھی فرش سے عرش پر لیجاتے ہیں، اور کبھی آکاش سے پاتال میں ڈال دیتے ہیں۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ برسہا برس کوشش اور جستجو کے بعد جو فنکار ناکام و نامراد ہو کر بکھر بکھر جاتا ہے تو ایسے میں قسمت کا ستارا چمک چمک کر وقت کی لے پر ان پارہ پارہ مایوس فنکاروں کو روشن مستقبل کا پیغام دیتا ہے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ نڈھال فنکار کامیابی کے گھوڑے پر سوار ہو کر کبھی نخلستان کی سیر کرتے ہیں، کبھی ریگستان کا نظارا کرتے ہیں اور کبھی آبشار کا ٹھنڈا پانی پی کر تازہ دم ہوتے ہیں۔

ایسے ہی خوش نصیبوں کا ایک میر ہے امیتابھ بچن-!

کلکتہ کی سرکاری ملازمت کو خیر باد کہہ کر مقتولہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے سفارشی خط کے ساتھ خواجہ احمد عباس کے حضور پیش ہونے والے اونٹ نما دبلے پتلے سے اس پر کشش اداکار نے تیس سال قبل جب فلم انڈسٹری میں قدم رکھا تو مصنوعی حسن کے نمائندوں نے اسکی سادگی اور وقار کا طرح طرح سے مذاق اڑایا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ سحر انگیز آواز کے مالک ہونے کے باوجود اسے "ریشما" اور "شیرا" میں گونگے نوجوان کا کردار ادا کرنا پڑا۔ لیکن گذرتے لمحوں کو معلوم تھا کہ یہی گونگا آنے والے دنوں میں اپنی مقناطیسی آواز کے ذریعہ اک جہان کی بولتی بند کر دیگا۔



امیتابھ، جیسے تاریخ ساز کردار پر قلم اٹھاتے وقت مروجہ یا مانوس مضامین سے پہلو بچانے کی کوشش کرونگا، کیونکہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسکی پہلی فلم کون سی تھی، کس فلم نے شناخت دی یا کن کن فلموں کے فلاپ یا ہٹ ہونے سے اسکے کیریر کی زمین پر دھوپ چھاؤں کا سماں آتا جاتا رہا۔

میرا موضوع ہے "امیتابھ کا فن اور اسکی شخصیت" بلکہ فن سے زیادہ شخصیت! امیتابھ کے لاشعور کا چوکنا اور موقع شناس انسان، جس نے عالمی سطح پر اسے ناقابل یقین شہرت کی مسند کا حقدار بنادیا۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ امیتابھ بچن کی کامیابی میں اسکی بلند قامتی اور پر وقار آواز کا دخل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صرف یہی کافی نہیں کیونکہ یہ دو خوبیاں، بہت حد تک اسکے ہمعصر شتر دگھن سنہا، کبیر بیدی یا ونود کھنہ میں بھی تھیں۔ اور کچھ لوگ اسکی آواز، گہری آنکھوں اور مجموعی شخصیت کو اسکی شہرت کا سبب گردانتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ امیت کے فن کے وسیع گراف پر نظر ڈالنے سے پہلے اس دور کے نمائندہ اداکاروں کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ امیتابھ جب فلم انڈسٹری میں داخل ہوا تو راجیش کھنہ حکومت کر رہا تھا۔ کسی حد تک فطری اداکاری اور رومانی امیج کی وجہ سے راجیش کا جادو ہر سو چھایا ہوا تھا۔ لیکن عاشقانہ فضا اور رومانیت کی یکسانیت سے فلمیں غیر محسوس طریقے سے بور ہونے کی وجہ سے کسی چونکانے والی تبدیلی کی منتظر تھیں، ایسے میں "زنجیر" کا اینگری مین جب ناچ رنگ کی دھما چوکڑی اور عشق و محبت کی غیر فطری دیوانگی سے بغاوت کرتے ہوئے فرد اور سماج کے حقیقی مسائل کا نمائندہ بنکر ابھرا تو راجیش کھنہ اس طوفان میں تنکے کی طرح لاپتہ ہو گیا۔ امیتابھ نام کی اس آندھی نے "پھول اور پتھر" کے پتھر کو بھی بلندی سے گرادیا۔ راستہ صاف تھا، منزل واضح تھی۔ اینگری مین اپنی داخلی گھٹن، ذاتی کرب اور جذباتی استحصال سے پیدا ہونے والے رد عمل کی دیوار پھاندتے پھاندتے ٹائپ ایکٹر بن گیا- جی ہاں، امیتابھ نے گرچہ ڈھیر ساری فلمیں ہمیں دیں، اور بہت سی شکلیں بدلیں، نت نئے کردار نبھائے، لیکن "زنجیر" سے "دیوار" تک ہی فطری اداکاری کی باؤنڈری میں وہ نظر آیا، اسکے بعد خود کو بارہا دہراتا رہا، جبکہ "آنند"، "ملی"، "چپکے چپکے"، "ابھیمان" اور "کالا پتھر" کے امیتابھ نے کردار کی حد میں رہ کر نیچرل اداکاری پر دھیان دیا تھا۔ لیکن متنوع (ورسٹائل) بننے کی خواہش میں اسنے غور نہیں کیا کہ زوال اسکی انفرادیت کی جانب دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے۔ امیتابھ چونکہ اسوقت سپر اسٹار تھا، ون مین انڈسٹری تھا، اسلئے بڑے بڑے فلم میکرز اسکے حضور آمین آمین کہا کرتے تھے۔ پروڈیوسرز اور ڈائرکٹرز کی طرف سے آزادی پاکر سلیم جاوید سے اس نے من



چاہی اسکرپٹ لکھنے کی فرمائش کی، سلیم جاوید والی جوڑی کے جاوید (گیت کار جاوید اختر) دلیپ کمار سے دیوانگی کی حد تک متاثر تھے، انہوں نے اپنی نفسیاتی کمزوری کا عملاً اظہار کیا، اور دلیپ کمار کی پرانی فلموں کے ڈھیر سارے مناظر، امیتابھ کی فلموں میں ہو بہو لکھ ڈالے۔ امیتابھ جاوید کی صلاحیت سے متاثر تھا۔ اردو یت کا گرویدہ تھا، اس نے دلیپ کمار کے سارے اگلے ہوئے نوالے چبا ڈالے۔ ان حماقتوں کے نتائج تو کامیابی کے دنوں میں رہے۔ ہے۔ یہ نا۔ وہ دور امیتابھ کا دور کہلاتا تھا۔ لوگوں نے تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ فلم "کوہ نور" کے شیشے والا منظر جب فلم "مرد" میں امیتابھ بچن نے دہرایا تو دلیپ سے بہتر اداکاری کی لیکن وقت بدلا، فلم انڈسٹری کے آسمان کی فضا بدلی نئے موسم کی نئی ہوائیں بہنے لگیں، اور فلم بینوں نے اینگری مین کو بڑھتی ہوئی عمر میں بھی نوجوانوں کی طرح جذباتی انداز میں واویلا کرتے ہوئے دیکھنے سے انکار کر دیا۔

امیتابھ کے بارے میں مجموعی تاثر ہے کہ بہت ساری خوبیوں کے علاوہ ان کے فن میں ہمہ گیریت ہے۔ جذبات میں ڈوبا ہوا کردار ہو یا انتقام کی آگ میں جلتا ہوا اینگری مین، غنڈہ، اسمگلر یا نامساعد حالات کا زائدہ کرب زدہ انسان ہو یا کامیڈی کا جادو جگاتا ہوا بذلہ سنج، ہر روپ میں اپنے ہمہ گیریت کو برقرار رکھا۔ لیکن میرے نقطۂ نظر سے یہ ایک آدھی سچائی ہے، دوسری آدھی سچائی یہ ہے کہ امیتابھ کی ہمہ گیریت و ہمہ جہتی ٹائپ امیج کا شکار ہو کر رہ گئی۔

"زنجیر" کا پولیس انسپکٹر ہو یا "اگنی پتھ" کا اسمگلر، دونوں اینگری مین ایک لہجے، ایکسپریشن اور ایموشن کے حصار میں جکڑے نظر آتے ہیں، گرچہ ان دو فلموں کے درمیان بیس سالوں کا طویل عرصہ حائل ہے۔ اسی طرح "نمک حلال"، "یارانہ"، "کالیہ"، "ستے پہ ستہ"، "امر اکبر انتھونی" اور "شان" کے مناظر میں قہقہہ بار فضا پیدا کرنے کے باوجود امیتابھ بچن، خود کو دہراتے ہوئے یکسانیت کی اکتاہٹ دے گیا ہے۔ فلمی ناقدوں کا کہنا ہے کہ امیت نے جب سے دلیپ کی نقالی کی تبھی سے اسے عروج ملا۔ میں کہتا ہوں کہ دلیپ کی نقالی کا جس دن اسنے ارادہ کیا، اسی دن اسکے زوال کا مستقبل طے ہو گیا، ورنہ وہ ایک سپر اسٹار ہی نہیں، سپر ایکٹر بھی تسلیم کیا جاتا۔

مذکورہ باتوں کے باوجود امیتابھ بچن بہر حال ایک ناقابل فراموش اداکار ہے۔ اسکی اداکاری کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری اداکاری کی روح رواں اپنی شریک حیات جیہ بھادوری کے فن کے سارے شیڈز کا بہت ڈوب کر مطالعہ کیا ہے۔

بہر حال یہ دور اب امیتابھ بچن کا نہ رہا۔ ادھر عامر اور شاہ رخ کی فطری اداکاری نے بولی ووڈ کو ہولی ووڈ کے قریب کھڑا کر دیا ادھر امیتابھ زوال آمادہ کیریر کے فرسٹریشن میں غیر عقلی رولز اپناتا رہا اور اس ادھیڑ عمر میں بھی پچاس غنڈوں کو تن تنہا مار بھگا رہا ہے۔ اور ادھر شاہ رخ خاں، کہانی اور سین کے فطری تقاضے کے مطابق فلم "ڈر" میں سنی دیول سے چوروں کی طرح مار کھا رہا ہے۔

نئی نسل حقیقت پسندی کا الم لیکر آگے بڑھ رہی ہے۔ اور پرانی نسل کا نمائندہ الف لیلوی کردار میں ڈھلتے ہوئے بوکھلاہٹ کا شکار نظر آ رہا ہے۔ فلم "اکیلا" کے فلاپ ہونیکے بعد سے امیت کے فرسٹریشن کی شروعات ہوئی۔ کئی سال تک اسنے گمنامی کی زندگی گذاری۔ اسکے بعد پورے تام جھام کے ساتھ مہول کمار کے "مرتیو داتا" کے روپ میں نظر آیا۔ اور ہو ٹلیک، پنجابی فوک سنگر دلیر مہدی کا بھی سہارا لیا، لیکن اس کشتی کے تلے میں سوراخ ہونیکی وجہ سے امیت کے اوسان خطا ہو گئے۔ کسی طرح بھنور سے نکلا تو موجوں نے گھیر لیا۔ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ساحل تک پہنچا، اور تازہ دم ہو کر "لال بادشاہ"، "سوریہ ونشم"، "میجر صاحب"، "بڑے میاں چھوٹے میاں"، اور "کہرام" جیسی یکے بعد دیگرے فلاپ فلموں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مزے کی بات تو یہ ہوئی کہ مذکورہ فلموں کی جو اداکارائیں امیت کے مقابل ہیروئین کی حیثیت سے نظر آئیں، وہ ساری کی ساری اسکی بیٹی کی ہم عمر تھیں، کیا یہ مذاق کا گوشہ نہیں کہ وحیدہ رحمان، مالا سنہا، اور نوتن کے ساتھ ہیرو کے روپ میں نظر آنے والا اداکار ساؤتھ کی نئی دریافت سندریا، اور شیلپا شیٹھی کے ساتھ کمر مٹکاتا پھرے۔

خیر ان ساری عقلی بے اعتدالیوں کے باوجود اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ ہمارے امیتابھ بچن کو عالمی سطح پر اس صدی کا سب سے زیادہ مشہور اداکار تسلیم کر لیا گیا ہے!!!



مرحوم سید معین الدین شاہ (لندن) کی کچھ یادیں

آہستہ برگِ گل بہ فشاں بر مزارِ ما

از : حیدر طباطبائی
10-B, Britannia Road
ILFORD
ESSEX IGI 2EQ (U.K.)

موت ایک حقیقت ابدی ہے اور اکثر غیر متوقع اموات کی خبریں بڑی جانکاہ ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ وقت کا مرہم ان زخموں کو مندمل کر جاتا ہے۔ لیکن بعض حادثے اپنی کیفیت کے اعتبار سے دائمی درد والم چھوڑ جاتے ہیں۔ سید معین الدین شاہ کی موت یورپ میں بسنے والے ہزار ہا اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے اندوہناک سانحہ ہے۔ ان کی موت کی جب خبر ملی تو دل پر سخت چوٹ لگی۔ ایسا لگا کہ تہذیب و تمدن اور خلوص کی مالا ٹوٹ گئی اور دانے زمین پر بکھر کر تڑپ رہے ہوں۔ وہ طبعاً ہم پسند انسان تھے۔ اُن کی ذات سے دو عنصر مسلک تھے ایک مذہب اور دوسرے ادب، ان دونوں کے خلاف کبھی ایک لفظ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اُس طوفانی لہر کی مانند تھے، جو تمام رکاوٹوں کو توڑ پھوڑ کر ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ شعر و ادب اور علم و فن سے شغف رکھنے والی ہستیاں ہر عہد میں نظر آتی ہیں۔ لیکن کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو عہد ساز ہوتی ہیں۔ شاہ صاحب میری دانست میں لندن کے وہ واحد ادب دوست ادب نواز اور ادیب تھے جو اپنی ذاتی آمدنی کو ادب کے فروغ میں خرچ کرتے تھے۔ اُن کی گفتگو کا خوشگوار آہنگ اُن کے شگفتہ لفظوں کی شادماں گونج آج بھی ذہن کے گنبد میں محفوظ ہے۔ اور جیسے عالمِ ارواح سے شاہ صاحب اپنی من موہنی مسکراہٹوں کے ساتھ یہ کہہ رہے ہوں کہ۔

کھلے گا تم پہ بھی رازِ حیات صد آہنگ
سنو۔ سنو مری بکھری ہوئی صداؤں کو

شاہ صاحب کی معتبر اور بلند آہنگ آواز یاد آتی ہے اور جب وہ ذوالفقار بخاری۔ راجہ صاحب محمود آباد اور ابن انشاء وغیرہ کی صحبتوں کے قصے سناتے تھے، حقیقت میں اُن کی باتیں ہمارے ذوق کے معیار کو بلند کرتی تھیں۔ آج وہ قصے سنانے والا جس سے ہمارے سامعہ اور باصرہ کو تراوٹ پہنچتی تھی فردوس مکاں ہو گیا۔ شہر لندن میں جو ایک چھوٹی سی اُردو کی بستی ہے اُس کا چوکھیا چلا گیا، اور یہ خلاء اب شاید کبھی نہ پُر ہو۔ اُن کا انداز محققانہ اور مہذب تھا۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ حضور ختمی مرتبت کی شان میں تو لاکھوں کروڑوں اشعار ہیں خانہ کعبہ کی شان میں کوئی شعر ہو تو سنائیے۔ میں نے یہ شعر پڑھا۔

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاضؔ
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

بس آنکھوں سے باران جاری ہو گئے کہنے لگے ریاض خیر آبادی کو میں نے بہت پڑھا ہے۔ لیکن یہ شعر نظر نہیں گزرا تھا۔ پھر شاہ صاحب نے ریاض کا یہ شعر پڑھا، تو لہجے میں بڑی حسرت تھی اور اس حسرت کا مطلب آج سمجھ میں آیا۔ شعر تھا۔

ہم مکینوں کی لاش کو ملتی نہیں جگہ
حسرت پکارتی ہے کہ مٹی کہاں کی ہے

اُن کے پاس پورا پورا دن بیٹھنے کا اتفاق ہوا مگر فقط ادب کی باتیں ہی ہوئیں۔ کبھی کوئی اور ذکر نہیں ہوا۔ اکثر ریڈیو پاکستان کے دلچسپ لطائف بھی شاہ صاحب سُناتے۔ ایک بار کہنے لگے کہ ایک شاعر صاحب کراچی میں ریڈیو کے دفتر میں ذوالفقار بخاری صاحب کے کمرے میں بیٹھے کہہ رہے تھے کہ میں اپنی شاعری سے اُردو ادب میں چار چاند لگانا چاہتا ہوں، اور بخاری صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ کہیں آپ خود چاند گہن میں نہ آجائیں۔ وہ لطیفہ سُناتے وقت خود اتنا ہنستے تھے کہ لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ شاہ صاحب نے کبھی بھی یہ تاثر نہیں دیا کہ وہ بڑے شاعر نقاد یا ادیب ہیں۔ ہمیشہ مرحوم نے اپنے کو خدمت کے مقام پر رکھا اور ہر قابل تعریف چیز کی تعریف کی، چاہے اُس شخص سے اُن کی ان بن ہو۔ لیکن قابل ذکریات کا ہمیشہ اچھی طرح سے ذکر کیا۔ شاہ صاحب کا تعلق بھی ایک علمی ادبی اور مذہبی گھرانے سے تھا۔ اُن کے والد شاہ دلگیر اکبر آبادی نامور صحافی اور شاعر تھے۔ شاہ صاحب کو کتب بینی کا بڑا شوق تھا۔ اُن کا گھر کچھ لوگوں کے لئے دارالمطالعہ کی حیثیت رکھتا تھا، ان میں راقم الحروف بھی ہے۔ شاہ صاحب کے پاس اُردو کے تقریباً پچاس نادر ترین لغت تھے اور نایاب ترین کتابیں تھیں۔ اس کے علاوہ فنِ موسیقی سے مرحوم کو بہت اُنس تھا اور ریڈیو پاکستان سے وابستگی کی وجہ سے تمام بڑے موسیقاروں کے دوست تھے اور چند ہزار بہترین کیسٹ اُن کے فلیٹ میں موجود تھے۔ اُن کا فلیٹ کبھی ایک طرح کا میوزیم لگتا تھا تو کبھی ایک کتاب خانہ۔ وہ نہایت ہی ذکی الحس انسان تھے۔ اور نتیجہ کے طور پر مزاج میں صفائی اور سختی بھی بہت تھی۔ ادب میں وہ اپنے نقطۂ نظر کو بہت بیباکی اور صفائی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ لیکن معلوم دیتا ہے کہ آخر عمر میں مزاج کی یہ شدت بہت کم ہو گئی تھی اور ایسے مواقع آئے جو اُن کے مزاج کے خلاف تھے، لیکن وہ بجائے برس پڑنے کے خاموشی کو ترجیح دینے لگے تھے۔

ماہنامہ "اردو ادب" بڑی آب و تاب سے قیصر تمکین کی ادارت میں شروع کیا تھا، تقریباً دو سال قبل ایک موضوع پر برہم ہو کر میں نے ایک مراسلہ لکھ دیا، بس ناراض ہو گئے، میرا مراسلہ بھی شائع نہیں کیا بلکہ ایک فرضی نام سے میرے خلاف ایک اور مراسلہ داغ دیا، ایکے میں خاموش ہو رہا۔ اس کے بعد اکثر ادبی جلسوں میں ملاقات ہوئی لیکن میری جانب سے اُن کے مزاج میں برف جمی ہوئی تھی، اور جب کبھی میں نے کسی محفل میں کوئی ادبی مقالہ پڑھا تو یہ برف فوراً پگھل گئی اور واہ۔ واہ کے تحسین آفرین کلمات میرے لئے ادا کرنے لگے۔ اُن سے آخری ملاقات اُن کے انتقال سے دو ماہ قبل بانو ارشد کے مکان پر ایک ادبی نشست میں ہوئی اور ایکے شاہ صاحب نے پھر ایک بار اپنی شرافت نفسی کے جوہر دکھائے۔ وہ قیصر تمکین سے اُن کے بڑے بھائی حسین مشیر کلوی کی صحت کے بارے میں دریافت کر رہے تھے، کہ میں وارد ہوا ادھر شاہ صاحب اُٹھ کر کھڑے ہوئے اور ہاتھ ملا کر نہایت گرم جوشی سے معانقہ کیا، میں خاموشی سے ٹھٹھک کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ساقی فاروقی تشریف لائے کچھ سلسلۂ گفتگو نکلا تو میں نے ساقی صاحب سے دریافت کیا کہ تیرنے اور پیرنے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ساقی نہیں بتا پائے اور لگے کسمسانے، اس محفل میں عمران الارشد، صبیحہ علوی، عطیہ خان، حمیدہ معین رضوی اور ڈاکٹر عبدالغفار عزم وغیرہ موجود تھے۔ ساقی فاروقی کی حالت جب قابلِ رحم ہو گئی تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ اب بتا بھی دو اور قیصر تمکین صاحب نے بھی ساقی سے کہا کہ ان باتوں کو لغت میں نہیں تلاش کر پاؤ گے، شاہ صاحب خاموشی سے منہ پھیر کر میری جانب دیکھتے اور مسکراہٹوں کی پھوہار لٹا دیتے۔ خدا رحمت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اُن کے مرنے سے ایک دور ختم ہو گیا۔ شہر لندن کے علمی وقار کی آبرو قائم کرنے والا چلا گیا۔ اپنے آبائی وطن آگرے میں موت آئی۔ جنازہ نہ جانے کن کچی پکی سڑکوں سے کن اندھیرے اور اوبڑ کھابڑ راستوں سے گزرا ہو گا! ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو مرکز شہر لندن کے جگمگ۔ جگمگ کرتے پُر نور علاقوں میں رہنے کے عادی تھے۔ لیکن ضرور شاہ صاحب کو اُن کے راسخ ایمان کے عوض قبر بھی پُر نور ملی ہو گی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

کس سے ظلمت میں ہو اعلانِ سحر کی اُمید
سوئے جاتے ہیں، وہی لوگ جو دیتے تھے اذاں

سرورق : برلن میں "ستونِ فتح" (Victory Column) کی کمپیوٹر شبیہ۔ اس ستون کو "Art in Heaven" نامی تنظیم نے ملینیم استقبال کیلئے فروزاں کیا ہے۔ بتایا جاتا ہے تاریخ میں ایسا چراغاں کبھی نہیں ہوا۔

METRO
GUEST HOUSE

کلکتہ شہر میں
آرام دہ قیام کے لئے قابلِ ترجیح
میٹرو گیسٹ ہاؤس
Metro Guest House
۵۲، ربندرا سرانی، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳
فون : ۲۳۶-۶۲۳۸

- یہ میٹرو شہر کلکتہ کے مرکز میں واقع ہے۔
- ۲۴ گھنٹے چیک آؤٹ کی سہولت ہے۔
- STD/ISD/FAX/COURIER سروس دستیاب ہے۔
- ۲۴ گھنٹے ٹھنڈا اور گرم پانی ملتا ہے۔ لوڈ شیڈنگ نہیں ہوتی۔

We welcome Diners Club International, Central Card, Master Card, BOB Card and Visa Card.

احوال و اخبار

میسور میں "شب چراغ" کا اجراء

پچھلے دنوں کرناٹک کے مشہور شاعر رزّاق افسر کے تیسرے شعری مجموعہ "شب چراغ" کی رسم اجراء زیر اہتمام "بزم اردو، میسور" انجام دی گئی۔ صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کی۔ تقریب میں پروفیسر اسلم پرویز، جواہر لال یونیورسٹی نئی دلی، پروفیسر مولانا سیّد قدرت اللہ باقوی شنکر آچاریا سنسکرت یونیورسٹی شعبۂ اردو کیرالا۔ پروفیسر ڈاکٹر مسعود سراج صدر شعبۂ اردو جامعۂ میسور۔ پروفیسر آغا مرزا محمود سرداش گورنمنٹ کالج بنگلور، محترمہ ڈاکٹر رفعت النساء لکچرر جامعہ میسور، جناب ضیا میر چیف ایگزیکیٹو ایڈیٹر "روزنامہ پاسبان" بنگلور اور سیّد خلیل اللہ ایگزیکیٹو انجینئر میسور نے بطور مہمانانِ خصوصی شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے شعری مجموعہ "شب چراغ" کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے اپنے تاثرات میں کہا کہ رزّاق افسر کی شاعری فکر۔ فلسفہ۔ سلاست۔ اشاریت و علامت سے معمور ہے۔ رزّاق افسر نے روایت کے ساتھ جدید لہجے کو بھی با معنی ڈھنگ سے اپنایا ہے جس سے ان کا اظہار اور معتبر بن گیا ہے۔ رزّاق افسر اپنی شاعری کے ذریعے قاری کو اپنی طرف متوجہ اور متاثر کرنے میں کامیاب ہیں۔ جہاں انہوں نے شاعری میں سوجھ بوجھ اور ذمّہ داری سے کام لیا ہے وہیں اپنے ادبی آہنگ کو ملک کے گوشے گوشے اور بیرونی ممالک میں پہنچانے میں بڑی لگن سے کام لیا ہے۔ اُن کی یہ کوشش نئی نسل کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ اس کے علاوہ بینائی کی خرابی کے باوجود ادارہ بزم اردو میسور کی ساری ذمہ داریاں ایک فریضہ سمجھ کر تیس سالوں سے سنبھالے ہوئے ہیں جو ایک مثالی کام ہے۔ رسم اجراء کے بعد ایک مشاعرے کا انعقاد بھی ہوا۔

مرسلہ: **رفیق عارف**، "بزم اردو"۔ میسور

ناول "کالی ماٹی" کی تقریب پذیرائی

(پٹنہ)۔ ۱۲ر نومبر کو "اردو مرکز" کے زیر اہتمام جناب علی امجد کے ناول "کالی ماٹی" کی تقریب پذیرائی منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر جابر حسین، چیرمین، بہار قانون ساز کاؤنسل نے کی۔

جناب علی امجد نے اپنی کتاب کو مٹی کا قرض اتارنے کی ایک کوشش بتایا۔ ان کے خیال میں یہ ناول ایک واقعاتی ناول ہے۔ ناول کے واقعات سبھی گڑھے نہیں ہیں، بلکہ یہ پیش آئے ہیں۔ انہوں نے صرف ان واقعات کی کڑی سے جوڑنے کی مجموعی صورت پیدا کی ہے۔ محترمہ زہرا داؤدی نے اپنے بھائی علی امجد کے تعلقات کے حوالے سے کئی دلچسپ اور اہم باتوں کا اظہار کیا اور استحصال و ظلم کے خلاف علی امجد کی جدوجہد پر روشنی ڈالی۔ جناب جسٹس آفتاب عالم نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ علی امجد صاحب نے ٹریڈ یونین لیڈر ہوتے ہوئے لیبر لاء پر کتاب لکھی اور "کالی ماٹی" جیسا اہم ناول لکھا۔ جناب آفتاب نے علی امجد کی شخصیت کو غیر معمولی بتاتے ہوئے انہیں ایک لی جنڈ کی حیثیت سے مخاطب کیا۔ جناب آفتاب نے 'کالی ماٹی' کی زبان و بیان میں سلاست، نرمی اور سبک روی کی تعریف کرتے ہوئے اسے انسانی رشتوں کے تانے بانے پر مبنی ناول بتایا۔

مشہور سماجی رہنما جناب جگن ناتھ سرکار نے کہا کہ اس ناول کو پورے ہندوستان خصوصاً بہار کے لوگوں کو پڑھنے کی بہت ضرورت ہے۔

پروفیسر جابر حسین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ناول 'کالی ماٹی' جناب علی امجد کی تخلیقی صلاحیت اور فنکاری کا ایک امتیازی نشان بن کر سامنے آیا ہے۔ فن کی باریکیوں، کردار نگاری اور حساس لمحوں پر خوبصورت گرفت نے اس تخلیق کے معیار کو آگے بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ہندوپاک کے رشتوں کے تناظر اور جناب علی امجد کی مزدور تحریک و جدوجہد کے حوالے سے علی امجد کے ان خوابوں کا ذکر کیا جو اب بھی برقرار ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر حسین نے علی امجد کے الفاظ کو پیش کرتے ہوئے ٹوٹے ہوئے خوابوں کو پھر سے جوڑنے کے امکانات کی بات کہی۔

ممتاز نقاد پروفیسر وہاب اشرفی نے ناول کے فارم اور ساخت کے حوالے سے بتایا کہ اس کا کوئی متعین اصول نہیں ہے۔ ناول ناول نگار کے نقطۂ نظر کا عکاس ہوتا ہے اور 'کالی ماٹی' کے مصنف کا خاص نقطۂ نظر مزدور، مالک اور حکومت یعنی تین طاقتیں ہیں، جو ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔ ناول کے کردار اور زبان و بیان کے حوالے سے جناب اشرفی کا خیال تھا کہ اس ناول میں کردار کی روش کو چند جملوں میں سمیٹنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں زبان و بیان کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے، جبکہ اس کے بعد کا حصہ ناول نگار کے ہاتھ سے پھسلتا محسوس ہوتا ہے۔ کتاب میں بہت سے ایسے جملے ہیں جو کمال فنکاری سے سنوارے گئے ہیں۔

جناب شفیع جاوید کے خیال میں بہار کے تناظر میں محنت کشوں اور سیاست کے ماروں کی یہ ایسی کہانی ہے جو فرقہ وارانہ فساد اور مزدوروں کے مسائل کو ایک ساتھ بیان کرتی ہے۔ جناب عبدالصمد کے خیال میں ٹریڈ یونینزم اور کمیونزم کا جو رشتہ ہے اسے اتنے بھرپور انداز میں اب تک

اردو میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ انہوں نے اسے اردو ناول میں ایک اضافہ قرار دیا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ناول نگار حالات و واقعات میں خود شامل رہا لیکن ناول میں وہ نظر نہیں آتا۔ جناب احمد یوسف نے 'کالی مائی' پر پروفیسر جابر حسین کے تحریر کردہ دیباچے کے حوالے سے فساد کے اسباب پر اپنے خیال کا اظہار کیا اور ناول کی تعریف کی۔

محترمہ بحر مرچودھری کے اظہار تشکر کے بعد نشست اختتام پذیر ہوئی۔

مرسلہ: **عطا عابدی**

کیول دھیر کے افسانوی مجموعے "کہانیاں" کا اجراء

(نئی دہلی) پچھلے دنوں اُردو کے نامور افسانہ نگار اور ادیب ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں ایک شاندار ادبی تقریب انجمن ترقی اُردو ہند اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اُردو گھر نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت اور ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانوی مجموعے "کہانیاں" کی رسم اجراء کی ادائیگی انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کی۔ بطور مہمان خصوصی اُردو کے ممتاز ادیب جناب جوگندر پال شریک ہوئے۔ اس میں جناب شاہد ماہلی، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ، جناب بلراج کومل، جناب یونس دہلوی مدیر "شمع"۔ جناب مخمور سعیدی، جناب ش۔ ک۔ نظام نے اظہار خیال فرمایا۔ کیول دھیر کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شال پہنا کر انکی عزت افزائی کی۔

"ایوانِ ادب" میں آل انڈیا شعری نشست

دہلی، ۲۳ر نومبر، (کفایت دہلوی) آج کی پُر وقار شعری نشست کئی کل ہند مشاعروں پر بھاری اور یادگار محفل ہے۔ ان خیالات کا اظہار قمر سنبھلی نے اس شعری تقریب کی نظامت کرتے ہوئے کیا جو ہندوستان بھر کے معتبر اور معروف شعراء کے اعزاز میں سہ ماہی "ایوان ادب" کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں ساہتیہ اکاڈمی میں تشریف لائے مہمان شعراء کو خاص طور پر سنا گیا اور ان کا اعزاز و استقبال کیا گیا۔ اس تاریخی شعری محفل کی صدارت سعید خاں صاحب و مظہر امام نے مشترکہ طور پر فرمائی۔ جن مشاہیر شعراء نے اپنے منتخب اور معیاری کلام سے نوازا ان میں جناب مظہر امام، علیم صبانویدی (مدراس)، مناظر عاشق ہرگانوی، رؤف خیر (حیدر آباد)، عبدالاحد ساز (بمبئی)، حضرت ظہیر غازی پوری، محترمہ شہناز نبی (کلکتہ)، ف۔ س۔ اعجاز (کلکتہ)، مخمور سعیدی، کفیل آزر، قمر سنبھلی، عزیز بھروی، وقار مانوی، ڈاکٹر تابش مہدی، نصرت گوالیاری، انیس دہلوی، رؤف رضا، ذکی طارق، اقبال رشید، شہباز ندیم ضیائی، مخدوم زادہ مختار عثمانی، عمران عظیم، عمیر منظر، متین میرٹھی، عازم کوہلی وغیرہ کے اسماء شامل ہیں۔

یہ پُر وقار کل ہند شعری نشست "ایوانِ ادب" کے مدیر اور محفل کے میزبان جناب حاجی انیس دہلوی کے شکریہ و لذیذ طعام پر نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ قمر سنبھلی نے نہایت سلیقہ سے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

عرعر (سعودی عربیہ) میں یوم سر سید اور مشاعرہ

یوم سر سید اس بار عرعر کی علیگ برداری نے، بزم احباب سخن "عرعر" کے تعاون سے اُردو منزل میں بہت دُھوم دھام کے ساتھ منعقد کیا جسمیں، سکاکا، الجوف، الطریف، رفحاء وغیرہ میں موجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل مقیمین کی ایک بڑی تعداد نے شمولیت کی۔ سکاکا الجوف میں مقیم ڈاکٹر خالق رضا اس میں بطور مہمان خصوصی شامل ہوئے جبکہ شہر عرعر کی معروف و مقبول شخصیت جناب ڈاکٹر ایم۔ ایچ۔ فاروقی صاحب نے محفل مشاعرہ کی صدارت فرمائی اور راقم الحروف نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اس محفل کو منعقد کرنے میں راقم الحروف کے ہمراہ، عبدالملک ذاکر، امتیاز اعظمی، رئیس میرٹھی، سید عبدالهادی، ڈاکٹر منیر میسوری، ڈاکٹر آفتاب، ڈاکٹر احسن ایوب خاں، نعیم بیگ، سید عبدالهادی اور محمد ظہیر صاحب نے شروع سے آخر تک ساتھ دیا۔ پروگرام کی ابتدا محمد ملک ذاکر نے تلاوت کلام پاک سے فرمائی، جس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی ترانہ پیش کیا گیا جس میں راقم کے ہمراہ جناب محمد عبدالملک ذاکر۔ ڈاکٹر خالق رضا، ڈاکٹر احسن ایوب خاں وغیرہ شامل ہوئے، جس کے بعد سر سیدؒ اور ان کی اصلاح معاشرہ تحریک پر راقم الحروف کے بعد محمد عبدالملک ذاکر، ڈاکٹر احسن ایوب خان، ڈاکٹر ایم۔ ایچ۔ فاروقی اور ڈاکٹر خالق رضا نے مقالے پیش کئے۔ تمام مقررین نے سر سید کی تحریک کے مختلف زاویوں پر اختصار سے روشنی ڈالتے ہوئے فی الوقت مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی، اس کے اسباب اور اس کے تدراک پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے گلف میں مقیم اور اس محفل کے موجودین سے اپنے عیال کے ہمراہ قوم کے ایک بچے کی تعلیمی کفالت لینے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ اگلی صدی میں قوم ایک نئے جوش اور ولولے سے قدم رکھ سکے۔

اسکے بعد ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جن شعرا نے شرکت فرمائی ان کے نام یہ ہیں: حنیف نجمی۔ امتیاز اعظمی۔ دلاور خان سرحدی۔ رئیس میر ٹھی۔ سید عبدالہادی۔ ڈاکٹر خالق رضا۔ ذاکر حسین ذاکر۔ تسیم اعظمی۔ وصی اللہ بستوی۔ رئیس لکھنوی۔ محمد تسیم حسین آبادی۔ عطاءاللہ خان عطا۔ ناصر نوح۔ مہدی حسن مجور۔

مرسلہ: **حنیف ترین**، عرعر (سعودی عربیہ)

نگار عظیم کے افسانوی مجموعہ "گہن" کی رونمائی

نئی دہلی ۲۸ر نومبر ڈاکٹر نگار عظیم کے دوسرے افسانوی مجموعہ "گہن" کا اجراء غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں بزم ہم قلم کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں مشہور شاعر، ادیب اور ناقد مظہر امام کے بدست عمل میں آیا۔ اس موقع پر مظہر امام نے کہاکہ نگار عظیم نے جن مسائل اور موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ان کا تعلق روزمرہ اور بالخصوص متوسط طبقہ کی مسلم خواتین کی نفسیات سے ہے۔

مہمان خصوصی پروفیسر اشتیاق عابدی وائس چیئرمین اردو اکادمی نے کہاکہ نگار عظیم کے افسانوں کی سچویشن حقیقی ہوتی ہے اس میں مصنوعیت کا احساس نہیں ہوتا۔ انجم عثمانی نے "گہن" کی مصنفہ کو اُن فنکاروں کی فہرست میں شامل کیا جن کی تخلیقات نے کہانی پن کے ذریعہ قاری کو نئے سرے سے افسانے سے جوڑا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے فن اور فکر کے حوالے سے نگار عظیم کی افسانہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی اور سادگی و اختصار کو ان کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی قرار دیا۔ اظہار اثر نے کہاکہ نگار کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انسانی نفسیات اور جنسیات کے موضوعات پر لکھتے ہوئے نہ تو اپنی کہانیوں کو مبہم ہونے دیا ہے اور نہ ہی فحش۔

ابن کنول نے ان کے افسانوں کو ترقی پسندی کے پروپیگنڈے اور جدیدیوں کی تجریدیت سے پاک صاف بتایا۔

پروگرام کے آغاز میں نگار عظیم نے "گہن" میں شامل اپنی ایک کہانی "لمحہ" پیش کی۔ اس موقع پر اُنہوں نے کہاکہ رشتوں کی پامالی، جنسی بے راہ روی اور فسادات وغیرہ انہوں نے معاشرہ میں جو دیکھا اور محسوس کیا اسے ایمانداری اور بے باکی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اتار دیا ہے۔

"گہن" کی رسم رونمائی کے جلسہ میں جن دیگر سر بر آوردہ شخصیات نے شرکت کی ان میں پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر نصیر احمد خاں، ہرچرن چاولہ، ابوالفیض سحر، منصور احمد عثمانی، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر الیس فاروق، متین امروہوی، ڈاکٹر جلال انجم، احمد محفوظ، کوثر مظہری، ذکی طارق، ڈاکٹر سجاد سید، نوراللہ خاں، ذکیہ ظفر، سرور یوسف، اور معین شاداب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ نظامت کے فرائض نوجوان افسانہ نگار اسلم جمشید پوری نے احسن طریقہ پر انجام دیے۔ بزم ہم قلم کی جانب سے عبدالعظیم، شمع افروز زیدی، نجمہ انجم خان، افشاں منصور اور کامران عظیم وغیرہ نے گلدستے پیش کر کے مہمانوں کا استقبال کیا۔ جلسے کی صدارت مظہر امام نے کی۔

مرسلہ: **بزم ہم قلم**، دہلی

جینا بڑے کا افسانوی مجموعہ "تعبیر"

گزشتہ دنوں شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی نے "عصری اردو افسانہ اور تعبیر" کے زیر عنوان ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا جس کی صدارت اردو کے ممتاز اسکالر اور شاعر پروفیسر مغنی تبسم نے فرمائی۔ انہوں نے معین الدین جینا بڑے کے افسانوی مجموعہ "تعبیر" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج جتنے اچھے معاصر افسانہ نگار ہیں ان میں معین الدین جینا بڑے نے اپنی ایک الگ شناخت بنالی ہے۔ جینا بڑے صاحب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا کہانی کہنے کا اپنا ایک الگ اسلوب ہے "تعبیر" کی دو چار کہانیاں پڑھنے کے بعد ہی ہم ان کے اسلوب کو جان سکتے ہیں کہ یہ اسلوب سریندر پرکاش، انور قمر یا دوسرے ہم عصر کہانی نگاروں کے اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔

ندا فاضلی نے اپنے مقالے میں کہاکہ جینا بڑے صاحب کی کہانیوں میں جو ایک وصف مشترک ہے وہ اپنی سوچ اور تجربہ پر انحصار اور اس کا شخصی اظہار ہے۔ ان میں سب کی اپنی بُنت چلت اور چہرہ ہے جو ہم عصر کہانیوں میں اپنی انفرادی شناخت اور قرأت پر اصرار کرتا ہے۔

معین الدین جینا بڑے کے افسانوں کا مزاج صوفیانہ اور تیور باغیانہ ہیں۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر نے جینا بڑے صاحب کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہاکہ ہمارے ساتھی جینا بڑے صاحب فن اور زندگی میں ثنویت کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک کہانی زندگی کا چہرہ ہے اور زندگی کہانی کی روح۔ ان کے افسانوں کا ایک سطحی سا جائزہ بھی اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ ان کی کہانیوں کا سفر انفرادیت سے اجتماعیت کی جانب ہے۔ ان کے کردار مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی پیچیدگی (Complexity) اور سادگی (Simplicity) دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جینا بڑے صاحب افراد کے حوالے سے اجتماع کی عکاسی کرتے ہیں اسی لئے ان کی کہانیوں کو تہذیبی اور معاشرتی حوالوں کے بغیر سمجھنا

دشوار ہے۔ اس میں تصوف اور بھکتی، اسلامی اور ہندواور بودھ روایات کی تلاش بھی شامل ہے۔ افسانے میں دانشوری کی روایت کو جینا بڑے صاحب نے اپنے اسلوب سے جلا بخشی ہے۔ انہوں نے اردو اور ہندی کے اسالیبِ بیان کو ملا کر اور ماورائی فضا میں حقیقت نگاری کی آمیزش کر کے جو طرز اپنے لئے ایجاد کیا ہے وہ ان کی شناخت قائم کرتا ہے۔ ممکن ہے اس طرز اور اس پس منظر سے ممبئی کا افسانوی منظر نامہ تبدیل ہونے میں مدد ملے۔

انور قمر نے ہم عصر اردو افسانے کے منظر نامے سے تفصیلی و تجزیاتی بحث کے بعد ''تعبیر'' کے بارے میں فرمایا کہ افسانہ نگار نے کتاب کا انتخاب ان الفاظ میں کیا ہے۔ ''اس پہلی کہانی کے نام جو بچپن میں مجھے ماں نے سنائی تھی۔'' آپ نے دیکھا کہ افسانہ نگار نے کہانی سنانے کے عمل کو ماں سے نسبت دے کر اسے ایک لائقِ احترام فن کی حیثیت دے دی ہے اور ان کے افسانوں کو پڑھ کر ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے افسانہ نگاری کے فن کو عبادت اور ریاضت ہی کے طور پر اپنایا ہے۔

مرسلہ : **ڈاکٹر صاحب علی، ممبئی**

دنیائے اردو ادب میں ایک بڑے پرائیویٹ انعام کا اجراء


نعیمہ ضیاء الدین کو انکے افسانوی مجموعہ '' منفرد'' پر شیلڈ دیا گیا

پچھلے دنوں لاس انجلس امریکا کے ''اردو مرکز انٹر نیشنل'' نے اردو ادب میں اب تک کے پرائیویٹ طور پر دیئے جارہے انعامات میں سب سے بڑے انعام کا اجراء کیا ہے۔ اردو مرکز انٹر نیشنل کی رُوحِ رواں نیّر جہاں ہیں، جو ادبی دنیا میں نیّر آپا کے نام سے محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کا ادارہ ہر برس پاک و ہند سے مدعو کردہ شعراء کے ساتھ ایک شاندار محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کرتا ہے۔ اس تقریب میں ادارے کی جانب سے گزشتہ برس شائع ہونے والی شاعری کی بہترین کتاب کے ایوارڈ کا اعلان بھی کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ادارے کی مساعی ایک جانب اگر معاصر ادب کی تخلیقی کاوشوں پر حوصلہ افزائی کا رویّہ اپنائے ہوئے ہے، تو دوسری طرف وہ اردو کی خاموش خدمت بھی انجام دیئے جارہا ہے۔ وطن سے دور پروان چڑھنے والی نسل جن مختلف حوالوں سے اپنی ثقافت و زبان سے رابطہ یا وابستگی کا احساس برقرار رکھے ہوئے ہے، ان میں محفلِ مشاعرہ بھی اک دل نواز ذریعہ ہے۔ اردو مرکز انٹر نیشنل اس لحاظ سے بھی قابلِ توصیف و تقلید ہے کہ اس نے اپنے ماحول میں ادبی ذوق و شعور کو پروان چڑھانے میں تسلسل


(دائیں سے) شاہدہ نسیم سالک، حمایت علی شاعر، نعیمہ ضیاء الدین، ظفر رضوی، ضیاء الدین

کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ برسوں کی اس جستجو کے نتیجے میں آج جو باشعور و پختہ سامعین لاس انجلس اور اس کے گرد و نواح میں دیکھنے کو ملتے ہیں، ویسا ادب شناس و سخن پرور اجتماع شاید زبانِ اردو کو اپنی سر زمین پر بھی میسّر نہیں ہے۔

اردو مرکز انٹر نیشنل کی دوسری اہم و قابلِ ذکر کوشش ہر برس سال گزشتہ میں شائع ہوئی شعری تخلیقات میں سے کسی ایک کو بہترین


اگلی صف دائیں سے تیسرے نمبر پر ضیاء الدین، نعیمہ ضیاء الدین احمد، آخر میں شاعر افتخار نسیم



(دائیں سے) جناب احمد آدایا، بیگم امینہ آدایا، نعیمہ ضیاء الدین کو انعام کا پانچ ہزار ڈالر کا چیک دیتے ہوئے۔

تخلیق کا ایوارڈ دے کر بیرونِ وطن قیام پذیر تخلیقی جوہر کی پذیرائی کرتا ہے۔ اس برس پہلی مرتبہ نثری تخلیق کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ لہٰذا ترتیب کے اعتبار سے ایک سال شعری تخلیق اور اگلے برس نثری کتاب کو منتخب کیا جائے گا۔ چنانچہ اس سال بہترین نثری تخلیق کے طور پر افسانوں کی کتاب ''منفرد'' کا انتخاب عمل میں آیا جسے انشاء پبلیکیشنز نے کلکتہ سے شائع کیا ہے۔ اس میں پاکستانی نژاد، جرمنی میں مقیم نعیمہ ضیاء الدین کے پندرہ افسانے شامل ہیں۔ پیش لفظ محترمہ بانو قدسیہ نے تحریر کیا ہے۔

ہر برس بہترین تخلیق کا انتخابی عمل پانچ ایسے ججوں کے توسط سے تکمیل پذیر ہوتا ہے، جو مختلف ممالک میں قیام پذیر ہیں اور ایک دوسرے کے اس منصب در تبے سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ اس طور تمام کارروائی حد درجہ محتاط، خفیہ اور غیر جانبدارانہ انداز سے انجام دی جاتی ہے۔ سالِ رواں سے جہاں نثری تخلیق کو شاملِ انتخاب کیا گیا ہے وہاں پہلی مرتبہ ادارے کو ایک صاحب ثروت اور مخیر شخصیت کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی ہے۔ احمد آدایا صاحب لاس انجلس کے متمول تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ ادب نواز بھی ہیں۔ چنانچہ اردو مرکز کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے انہوں نے از خود اپنی جانب سے ہر سال منتخب ہونے والی ''بہترین کتاب'' لئے پانچ ہزار ڈالر انعام کا اعلان فرمایا۔ شاعری کی کارروائی کا آغاز مقامی شاعرہ شہناز امتیاز سے ہوا۔ ان کے علاوہ شاہدہ تسیم سالک، افتخار نسیم، فاروق طراز، ظفر رنسوی، خالد عرفان نے اپنے اشعار پر خوب داد وصول کی۔ اسٹیج پر ہندوپاک سے آئے ہوئے مہمانانِ گرامی رونق افروز تھے۔ بھارت سے جناب ساغر خیامی، جناب اظہر عنایتی اور جناب شہریار صاحب، جبکہ پاکستان سے مشہور صحافی حمید اختر اور جناب حمایت علی شاعر تشریف فرما تھے۔ نظامت جناب ساغر خیامی نے کی۔ ان کی پُر اثر گفتگو، برجستہ و برمحل اشعار اور دلچسپ ادبی لطائف و واقعات نے سارے ہال کو تمام وقت اپنی گرفت میں لئے رکھا۔ نصف دورانیئے کے بعد ادارے کے ایگزیکیٹیو ڈائرکٹر سید فضل الضیاء سحر کہ جو خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں اسٹیج پر تشریف لائے۔ ان کی زبان نہایت مرصع اور زور خطابت سحر انگیزی کا رنگ لئے ہوئے تھا۔ ادارے کی کارکردگی کا موثر و پُر تاثیر تعارف کرانے کے بعد انہوں نے جناب احمد آدایا صاحب کو اسٹیج پر تشریف لانے کی دعوت دی۔ اِس غیر معمولی ادب نواز شخصیت کے احترام میں، اردو ادب کے پہلے بڑے پرائیویٹ انعام کی پذیرائی کی خاطر اور اس کی حق دار مصنفہ کو سراہتے ہوئے ہال میں موجود کم و بیش آٹھ صد سامعین اور اسٹیج پر رونق افروز شعرا صاحبان تعظیم کی خاطر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ تالیوں کی گونج میں خود آدایا صاحب نے شیلڈ پر تحریر کردہ عبادت پڑھ کر حاضرین کو سنائی۔ پھر امینہ آدایا صاحبہ نے مبارک باد کے ساتھ شیلڈ اور پانچ ہزار ڈالر کا چیک مصنفہ کو مصافحے کے ساتھ سونپا۔ جواب میں مصنفہ نے اپنی کتاب انہیں تحفۃً پیش کی۔ سامعین کی خوشگوار حیرت، آدایا صاحب کے تحسینی کلمات اور شعراء کے مبارک باد کے تہنیتی جملوں میں انعام کی رسم اختتام پذیر ہوئی تو رکی ہوئی محفل مشاعرہ اپنے دوسرے دورانیئے کی جانب بڑھی۔ جناب اظہر عنایتی اور جناب شہریار کے کلام پر سامعین نے خوب داد دی۔ آخر میں جناب حمایت علی شاعر کا سحر انگیز ترنم خاص طور پر قابل ذکر اور لائق داد رہا۔ سامعین نے بار بار فرمائش کر کے ان کے نئے، پرانے کلام کا لطف حاصل کیا۔

رپورٹ : **ضیاء الدین احمد**، جرمنی

مقصود الٰہی شیخ کو تمغۂ صحافت

برطانیہ کے صف اول کے صحافی اور افسانہ نگار جناب مقصود الٰہی شیخ، سابق مینجنگ ڈائرکٹر راوی ایشین نیوز پیپر، سابق مدیر ہفت روزہ ''راوی'' کو انکی غیر معمولی خدماتِ صحافت کے اعتراف میں ایڈن برگ (اسکاٹ لینڈ) کی اردو بزم سوسائٹی کی جانب سے ایک قابلِ قدر تمغۂ صحافت سے نوازا گیا۔ گذشتہ دنوں شیخ اور انکی بیگم ہندوستان اور پاکستان کے سفر پر تھے۔ لہٰذا انعام انکی غیر موجودگی میں انکی دختر ندا گوہر خان نے وصول کیا۔

۳۰ر اکتوبر کو شیخ صاحب کے ناولٹ ''دل اک بند کلی'' کا اجراء کلکتہ میں ماہنامہ انشاء کے زیر اہتمام ہوا۔ رپورٹ پچھلے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے۔ تصادیر سامنے کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔



مقصود الٰہی شیخ اپنا افسانہ "برسورے نیو امورے" سنا رہے ہیں۔



منفرد شاعر جناب عین رشید نے "دل اک بند کلی" کا اجراء کیا۔



پریس کلب کلکتہ کے جنرل سکریٹری جناب راج منولیہ شیخ صاحب کی گلپوشی کر رہے ہیں۔



انشاء فیروز نے مقالہ نگار پروفیسر سلیمان خورشید کو پھولوں کی چھڑی پیش کی۔



بیگم ف۔ س۔ اعجاز بیگم فریدہ شیخ کو گلدستہ پیش کر رہی ہیں۔



سیمہ فیروز نے بیگم فریدہ شیخ کو بنگالی شال پیش کی۔



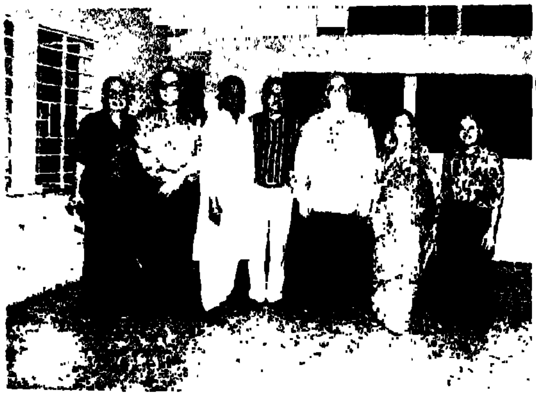
ثاقب فیروز نے جناب عین رشید کو پھول پیش کیے۔



مدیر روزنامہ عکاس نے جناب مقصود الٰہی شیخ کو ہار پہنایا









۱۔ (دائیں سے) شاعر ارم انصاری۔ نوشاد مومن مدیر ''مژگاں'' شیخ، عاصم شہواز شبلی مدیر ''اثبات و نفی''۔
۲۔ (دائیں سے) آصف جاہ۔ محترمہ کبریٰ بیگم (نواب واجد علی شاہ کی پڑپوتی)، شیخ، جناب احمد سعید ملیح آبادی (مدیر روزنامہ آزاد ہند) ف۔ س۔ اعجاز، کریم رضا مونگیری، راج متھولیہ۔
۳۔ (سامنے دائیں سے) شاعر کنول سیال کوٹی۔ شاعرہ زرینہ زریں۔ (بائیں) ہندی شاعرہ کسم جبین۔
۴۔ (بائیں سے) جناب کریم رضا مونگیری۔ جناب محمود باری (صدر دہلی کلب)، ف۔ س۔ اعجاز۔ متصود الٰہی شیخ۔ کبریٰ بیگم۔ ارم انصاری۔

مقالاتِ فرید

مصنف : جی۔ ایس۔ فرید

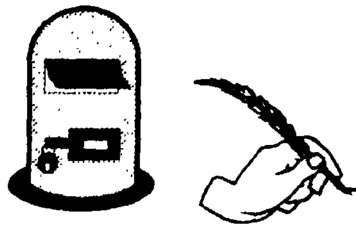
صنعتی شہر کلکتہ کی ۳۰۰ سالہ تاریخ کے متنوّع گوشوں پر سیر حاصل مضامین۔ آثارِ قدیمہ، فلا ٹیلی اور نومسمیٹک علوم کے شائقین اور محققین کیلئے لازمی مطالعہ کی شئے۔

باتصویر ڈی لکس ایڈیشن۔ قیمت : ۱۵۰ روپے۔ ڈاک خرچ زائد۔

ملنے کا پتہ : **The Ejaz Printers**

18, Zakaria Street, P.O. Box No. 12323, Calcutta - 700 073

آپ کی ڈاک



(مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

○ ایک عرصہ سے انشاء باقاعدگی سے پڑھنے کی سعادت حاصل کرتا رہا ہوں۔ جسکی وجہ اس کی خالص ادبی معیاری تحریریں اور آپ کا معیاری انتخاب وسلیقۂ کار ہے۔ تازہ شمارہ ستمبر اکتوبر بھی نظر سے گذرا۔ یوں تو سب ہی شذرات لائق تعریف ہیں۔ محترمہ امیر انساء کے سفر نامہ کی تیسری قسط "ارض مقدس میں چند روز" اگر یہ سفر نامہ صرف سفر نامہ ہی رہتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مسلم بن عقیل کا مقبرہ بہت ہی شاندار ہے یہاں بھی شیعہ لوگ خوب بدعت کرتے ہیں کربلا کی مٹی کو ایک خاص شکل میں ڈھال کر اس میں سجدہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ شیعہ لوگوں کے غیر شرعی افعال سے طبیعت بوجھل تھی۔ وغیرہ ایسے جملے ہیں جن سے مذہبی تعصب کی بو آتی ہے۔ کسی بھی ادبی جریدہ میں اس طرح کی تحریروں کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی اور آپ جیسے کھلے ہوئے ذہن کے مالک مدیر کیلئے قطعی زیبا نہیں دیتا کہ آپ اس طرح کی تحریروں کو اپنے یہاں جگہ دیں۔ کسی بھی عقیدہ کا وہی مخالف ہوتا ہے جسے اسکی Logic معلوم نہ ہو یا معلوم ہو تو بربنائے تعصب ایسا کرتا ہے۔ میری آپ سے گذارش ہے کہ ایسی تحریروں سے پرہیز ہی کریں تو اچھا ہے۔ مقام افسوس ہے کہ محترمہ کو امام حسینؑ کے بھائی حضرت ابولفضل عباس کا صحیح نام تک معلوم نہیں اُنہوں نے سیدنا امام عباس حسین تحریر کیا ہے۔!

علی ظہیر
E-22/846-Zakir Nagar
OKHLA, New Delhi-25

☆☆ جواب مدیر: ہمیں افسوس ہے کہ یہاں ہمارے قلم ادارت سے چوک ہوئی۔ معذرت اے۔ امیر النساء کو مشورہ ہے کہ وہ اپنے اس مقبول ہوتے ہوئے سفر نامے کو اگر کتاب کی شکل میں شائع کریں تو علی ظہیر صاحب کے اعتراض کو مدنظر رکھ کر مسودے میں مناسب ترمیم کرلیں۔

○○○○○

○ انشاء کا تازہ شمارہ نومبر، دسمبر مطالعے سے گزرا۔ شمارہ اہم ہے۔ امیر النساء کا سفر نامہ دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ شمس تبریزی، عقیل گیاوی کی غزلیں پسند آئیں۔ شائستہ سید ایمن اور ساوتری گوسوامی کی کہانیاں اچھی ہیں۔

شہاب اختر، جھریا (دھنباد)

○○○○○

○ نومبر دسمبر کے شمارے میں آپ کا اداریہ "۲۱ویں صدی کو سلام" یوں تو چند سطریں ہیں لیکن کسی بھی طویل مضمون سے کم نہیں۔ آپ کی بیٹی اور میری بھتیجی الفیہ عبداللہ بخش کا مضمون "صحت اور ہومیو پیتھی" بہت معلوماتی ہے۔ اسکو جاری رکھئے۔ میری دعائیں بیٹی کے ساتھ ہیں۔ شائستہ سید ایمن کا افسانہ "سفید کرسمس" اور منظور عثمانی صاحب کا انشائیہ "دل پھینک اسد چچا" پر تاثیر ہیں۔ پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کا گوشہ مکمل اور جاندار ہے۔

رئیس الدین رئیس، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱

○○○○○

○ نومبر دسمبر کا انشاء ملا۔ تمام مندرجات اہم و معیاری ہیں۔ محترم غلام عمر خاں صاحب پر مرزا اکبر علی بیگ کا مضمون شائع کر کے واقعی آپ نے ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ ایسی نابغہ روزگار شخصیتوں پر گوشے خال خال ہی رسالوں میں نظر آتے ہیں۔

امیر النساء کا سفر نامہ دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں۔ معلومات افزا ہے اور "صحت اور ہومیو پیتھی" کے تحت "جوڑوں کا پتھرا جانا" موسم کے اعتبار سے میرے لئے ہی نہیں بہتوں کے لئے ایک بروقت مضمون ہے یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش کی اس تحریر کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

شبیر اصغر۔ شیب پور۔ ہوڑہ

○○○○○

○ ماہنامہ انشاء (شمارہ نومبر دسمبر ۹۹ء) موصول ہوا۔ ماشاءاللہ "انشاء" دیدہ زیب ہے اور اس میں شائع ہونے والے ادب پارے بھی معیاری ہیں۔

اردو زبان جس دور سے گزر رہی ہے اس دور میں کسی جریدہ معیاری ادب پیش کرنا، وہ بھی اشاعتوں میں استحکام کے ساتھ، بڑے حوصلہ کی بات ہے۔ آپ حقیقی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دہلی آپ کی آمد پر آپکی معرکتہ الآرا نظمیں سننے اور استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ زہے نصیب۔

وقار مانوی، دہلی

○○○○○

O انشاء کا تازہ شمارہ بہت معیاری اور متنوع ہے۔ محترمہ اے۔امیر النساء کا سفر نامہ اہم مطالعے کی تحریر ہے۔ آئندہ قسط کا ابھی سے انتظار ہے۔یوں تو چند اور بھی ادبی رسالے اپنے معیار کے لئے مشہور ہیں لیکن انشاء کی بات کچھ اور ہے۔ یہ قاری کا دوست بھی ہے اور رہبر بھی۔ صفوت علی صفوت کا مضمون "بچے ہمارے خواب" ہمارے ذہنی افق کو منور اور کشادہ کر گیا۔ صفوت کی یہ پہلی تحریر ہے جو میرے مطالعہ سے گزری۔ اسی طرح پروفیسر غلام عمر خان پر مرزا اکبر علی بیگ صاحب کا بھرپور مقالہ لائق استفادہ ہے۔ یقین جانئے غلام عمر خان صاحب کی علمی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔اگر یہ مضمون میری نظر سے نہ گذرتا تو میں اس اعلیٰ پائے کے محقق اور ناقد کے نام اور کام سے لاعلم ہی رہتا۔ یہ ایک ہی مضمون کئی کتابوں پر بھاری ہے۔ میں گوشۂ غلام عمر خان شائع کرنے کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

منظومات میں درد چاپدانوی کی نظم "دوزخ" اور تسنیم فاروقی کی نظم "ڈرامہ" بہت پسند آئی۔ بشارت علی، عقیل گیاوی، اختر سعید خان، پروفیسر دلنواز صدیقی اور طالب خوندیری کی نظموں اور غزلوں نے بھی متاثر کیا۔

افسانوں میں ساوتری گوسوامی میرے لئے نیا نام ہے لیکن انکی کہانی "دو مہربان آنکھیں" میں بڑی روانی ہے اور یہ کہانی بڑی کشش رکھتی ہے۔ مشتاق انجم کا افسانہ "پڑوسی" ہند و پاک تعلقات کا عمدہ علامیہ ہے۔ "صحت اور ہومیو پیتھی" میں آرتھرائٹس پر ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش کا مضمون معلوماتی اور مفید ہے۔

شیخ محمد الیاس، وجے واڑہ

OOOOOO

O نومبر دسمبر کا شمارہ علم و ادب کا حسین سنگم ہے۔ امیر النساء کا سفر نامہ "ارض مقدس میں چند روز" مجھے بہت پسند آرہا ہے۔ محترمہ نے جن مقامات کی سیر کی ان کا تاریخی اور جغرافیائی پس منظر بھی فراہم کر کے سفر نامے کو وقیع بنادیا ہے۔ پیشتر تیسری قسط میں جن مقامات مقدسہ کے اطراف میں لوگوں کو بدعتوں میں مبتلا دیکھا مصنفہ نے اسکی مذمت بھی کی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ بدعت صرف ہمارے یہاں مزاروں کے احاطوں میں کی جاتی ہے۔ کربلا کے اطراف میں بھی لوگ ایسا کرتے ہیں اس کا علم امیر النساء کے سفر نامے سے ہوا۔ قسط نمبر ۴ نئے جہانوں کی سیر کراتی ہے۔

ساوتری گوسوامی کا افسانہ "دو مہربان آنکھیں" زندگی سے لبریز ہے۔انکی تحریر میں سادگی اور سلاست ہے۔ کہانی لکھنے کا یہ مفصل انداز ناپید ہو چکا ہے۔ مشتاق انجم کا افسانہ "پڑوسی" علامتی ہے اگرچہ علامت پوشیدہ کہیں نہیں ہے۔ ممکن ہے حالیہ کارگل کی جنگ نے علامت کو مخفی نہ رہنے دیا ہو۔ غزلوں میں وسیم مینائی، وقار مانوی، دلنواز صدیقی، اختر سعید خاں اور نظموں میں درد چاپدانوی اور تسنیم فاروقی کی تخلیقات معیاری ہیں۔ صفوت علی کا مضمون "بچے ہمارے خواب" بڑی عمدہ اور معلوماتی تحریر ہے۔ پروفیسر غلام عمر خاں پر گوشہ بڑا جاندار رہا۔

آپ کے دونوں اداریے "عظیم طوفان" اور "اکیسویں صدی کو سلام" کارآمد اور سنجیدہ نوعیت کے ہیں۔

انیس عرفان، لکھنؤ

OOOOOO

O آپ کا پرچہ "انشاء" کشمیر کے شہر سری نگر میں دیکھ بہت خوشی محسوس ہوئی اور یقین جانیں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بہت عمدہ رسالہ ہے۔ طبیعت شاد ہوگئی۔ مشمولات بھی اعلیٰ ہیں۔ خصوصاً منظور عثمانی صاحب کا انشائیہ "دل پھینک اسد چچا" بہت پسند آیا۔ غلام عمر خان صاحب کا گوشہ بھی خوب رہا۔ ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش کا "صحت اور ہومیو پیتھی" کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ باقی ڈاک میں اپنے استاد محترم رئیس الدین رئیس صاحب کا خط دیکھ کر تو اور بھی مزا آگیا۔

محمد سلیم خان (سرینگر، کشمیر)

OOOOOO

O 'ارض مقدس' پڑھ کر روحانی مسرت ہوئی اور ایسا لگا کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ افسانوں میں 'پڑوسی' (مشتاق انجم) اور 'دو مہربان آنکھیں' (ساوتری گوسوامی) جاذب نظر رہے۔ گوسوامی جی کی تحریر میں روانی کے ساتھ سلاست اور چاشنی بھی ہے۔ نفسِ مضمون حب الوطنی اور قربانی کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ "دل پھینک اسد چچا" نے دال میں نمک کا کام کیا۔

'بچے ہمارے خواب' از حد معلوماتی اور سائیکالوجیکل ہے۔ "استاد محترم پروفیسر غلام عمر خاں صاحب" کا مضمون باوجود طویل ہونے کے نہایت وقیع اور علمیت سے بھرپور ہے کہ پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی رہا۔

منظوم حصے کو پڑھ کر اپنا ہی ایک شعر دہرانے لگا۔

کیسے کیسے جال بچھائے نفرت کے متوالوں نے
سارے بندھن توڑ دیئے ہیں ہم سے ہمت والوں نے

اکرام فتحپوری، فتح پور (یو۔پی)

OOOOOO



A. L. S. JAMAL MOHAMED COMPANY

A HIGHCLASS VARIETY SHOP FOR ALL BAG, BRIEFCASE.
LUGGAGE AND SHOE RELATED MATERIAL
38/A/7, Chandney Chowk Street, Calcutta - 700 072
Phone : 27-9982 26-3691

NATIONAL HAIR OIL

نیشنل ہیئر آئل

بالوں کو جھڑنے اور سفید ہونے سے روکتا ہے۔ اس سے بال گھنے اور چمکدار ہوتے ہیں۔ یہ دماغ کو ٹھنڈک اور طاقت دیتا ہے۔

ہمارے دیگر آزمودہ یونانی نسخے :

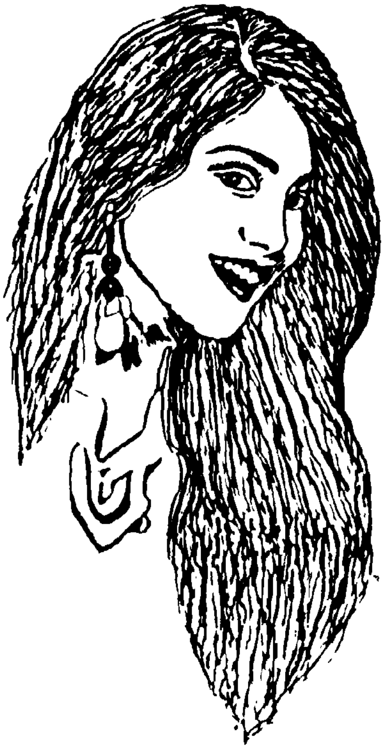
میکسیٹون ٹانک۔ بالک جیون ٹانک۔

اکسیر صدر (نزلہ، زکام اور کھانسی کی دوا)۔

جربول (خارش کی دوا)۔ موتی منجن۔

نیشنل دوا خانہ

۱۱/۷، رابندرا سرانی، کلکتہ -۷۰۰۰۷۳



مردانہ وجاہت کے لئے ضروری ہے کہ
آپ کے شرٹ، پینٹ، سوٹ، سفاری سوٹ یا خان ڈریس کا اپنا ایک انداز ہو۔
آپ اپنے ڈریس میں چست اور اسمارٹ نظر آئیں
اس کے لئے ہماری ماہرانہ تراش خراش سے فائدہ اٹھائیں۔



TopMost

High Class Gents Tailors
4, GRANT STREET, CALCUTTA - 700 013
PH : 228-6846

بخشی جنتری

ملینیم ایڈیشن

سنہ ۲۰۰۰ء

سنہ دو ہزار کی جھلک
میں ملاحظہ کیجئے

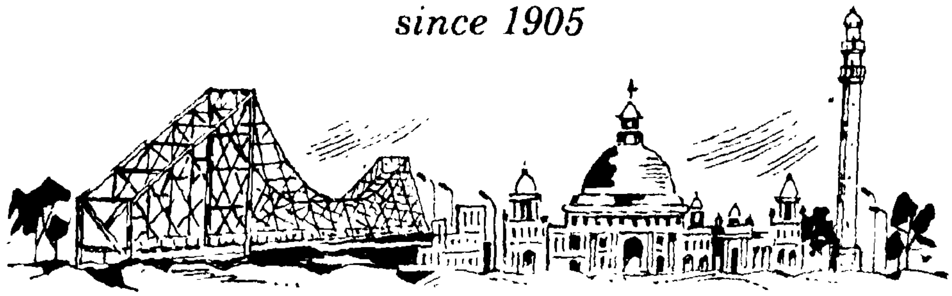
بخشی جنتری

۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ، (کولوٹولہ)، کلکتہ ۷۳-۷۰۰۰

RIH

KING
of the
KITCHENS

A name that has been spelling unrivalled superiority in real Moghlai delicacies since 1905



Royal Indian Hotel

147, Rabindra Sarani, Calcutta-73
Telephone 238-1073

West Bengal Essential Commodities Ltd.

(A Government of West Bengal Undertaking)

11-A, Mirza Ghalib Street, Calcutta - 700 087

★ *West Bengal Essential Commodities Supply Corporation supplies best quality cement manufactured by renowned cement companies to the Government departments as well as local autonomous concerns and housing co-operative societies at rates comparatively cheaper than the market rates with an object of development of West Bengal.*

★ *Iodine added salt are supplied at low prices through rationing system to give protection against many complicated diseases occuring due to deficiency of iodine.*

★ *The purified and health canducive "Palmolein Oil" imported from abroad packed in 15 kg. tin and 1 litre poly pouch are sold at low prices through rationing system.*

★ *We are committed to accomplish the resposibility for distribution of sugar through rationing system.*

Please Contact

Head Office : 11-A, Mirza Ghalib Street, Cclcutta - 700 087

Branch Office : Durgapur, Midnapore, Malda, Siliguri and Chinsurah (Selling Centres)

Vol. 1
Regd. No. D 103 / 99
Postal Regn. WB / CC-550

MAHNAMA INSHA
JAN - FEB 2000 (MILLENNIUM EID NUMBER)

R. N. I. Regn. No. 44083/86
ISSN : 0971 - 6009

سنو گجر کیا گائے
سمے گزرتا جائے

ہم ۱۹۲۲ء سے صنعت وقت کی خدمت کرتے آرہے ہیں

SHM

اور وقت اس بات کا گواہ ہے
کہ ہم نے ہمیشہ آزمودہ اور حساس تکنیک سے تیار کردہ گھڑیوں
اور گھنٹوں کی پوری ورائٹی آپ کی پسند کے لئے اپنے شوروم میں یکجا کی ہے۔

دستیاب ہیں :
Authorised dealer for

TITAN

TIMEX HMT Watches

ایس ایچ ممتاز الدین
S. H. Mumtazuddin

4, Radha Bazar Street, Calcutta 700 [illegible]
Phone [illegible] (Showroom)
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ANGORA
QUARTZ
WATCHES

[illegible]
[illegible]
[illegible]

PRINTED AT INSHA PUBLICATIONS 6 A, KANAI SEAL STREET, CALCUTTA - 700 073
PRINTED, PUBLISHED BY EDITOR & PUBLISHER F. S. EJAZ FROM 25 B, ZAKARIA STREET CALCUTTA 700 073

اِنشاء

ISSN : 0971-6009

PERIODICAL
SECTION
J.M.I., N. DELHI



انور شیخ : ادب و متنازعہ افکار

20/-

READ THIS MORNING
EVERY MORNING

روزنامہ عکاس کلکتہ
مدیر: کریم رضا مونگیری

AKKAS

URDU DAILY

NOW PRINTED BY PHOTO OFFSET PROCESS

ADVERTISE IN IT
AND
REACH THE LARGEST SECTION
OF URDU READERS IN
EASTERN INDIA

THE AKKAS DAILY

1/A, KHETRADAS LANE, 4TH FLOOR,
CALCUTTA-700 012
PHONE : 26-3298, 221-7523 FAX : 215 1187

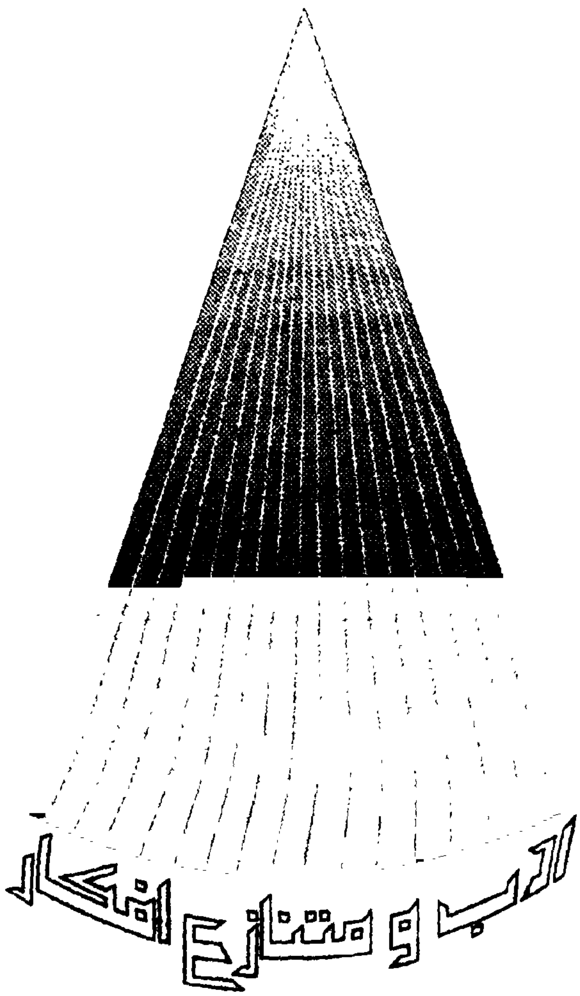
اِنشاء

ہندوستان کا ممتاز بین الاقوامی اردو رسالہ

ISSN : 0971 - 6009

جلد: ۱۵ | مارچ اپریل ۲۰۰۰ء | شمارہ: ۳-۴

انور شیخ



انشاء پبلی کیشنز

IP

مدیر: ف۔ س۔ اعجاز

اس شمارے کی قیمت : ۲۰ روپے

زرسالانہ : ۱۲۰ روپے

مغربی ممالک سے : £ 15

or

US $ 25

INSTRUCTION FOR PAYMENT

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں۔

برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات روانہ کی جائیں۔

امریکہ سے انٹرنیشنل منی آرڈر روانہ کئے جائیں جو کلکتہ میں امریکن ایکسپریس بنک سے نقد واجب الادا ہوں۔

گرافکس : ثاقب فیروز
انشاء گرافکس

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ:

۲۵۔بی، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳۔ فون:۲۳۵-۴۶۱۶

Fax : 232-0104 Attn. "MAHNAMA INSHA" • E-mail : safe@cal2.vsnl.net.in

فہرست

گوشۂ ادب

کلامِ انور

گوشۂ متنازع افکار

یہ شمارہ

"انور شیخ: ادب و متنازعہ افکار" انشاء کا ایک اہم شمارہ ہے جس کا مجموعی تاثر ستائشی شمارے کے بجائے ایک "اینٹی نمبر" کا ہوگا۔

انور شیخ برطانیہ میں مقیم پاکستانی نژاد طنز و مزاح نگار، شاعر اور مفکر ہیں۔ ادھر چند برسوں میں انہوں نے اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔

شیخ کا تعارف بقلم خود اندرونی صفحات میں موجود ہے۔ ان کی بیگم جولیا نے بھی اپنی انگریزی تحریر میں ان کے کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو میں پہلے ان کے طنزیہ و مزاحیہ افسانے سامنے آئے، پھر مضامین اور شاعری کے نمونے۔ اب تک ان کے تین اردو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ (۱) بعضِ جہاں (۲) سوز و ساز (۳) آگ اور پانی۔ تینوں بہ یک وقت منثور و منظوم ہیں۔ ان کے انگریزی وار دو سہ ماہی جریدہ "لبرٹی" میں ان کی نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حال میں انڈیا کے چند ادبی جریدوں نے ان سے متعلق گوشے شائع کئے ہیں۔ ان کی نثر اور شاعری سے متعلق دو کتابیں بھی چھپی ہیں۔ لیکن انور شیخ کی صحیح پہچان نہ تو انکی تین اردو کتابوں کے ذریعہ ممکن ہے اور نہ اِن جریدوں کے خصوصی صفحات اور اُن پر لکھی گئی کتابوں سے۔ اُن کی انگریزی کتابوں اور تحریروں کے بغیر اُن کا صحیح اور مکمل تعارف ممکن نہیں۔

انور شیخ کی فلسفیانہ تحریروں پر ابتک کسی نے کچھ لکھنے کی نہیں ٹھانی۔ شیخ ایک لامذہب آدمی ہیں۔ لیکن ان کی بیشتر تحریریں مذاہب سے سروکار رکھتی ہیں۔ وہ برسوں سے ہندوستان کی تقسیم اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کے افکار کے خلاف خامہ سائی کرتے آرہے ہیں۔ در پردہ انہوں نے اسلامی عقائد و معاملات پر شبخوں مارا ہے۔ ان کے خلاف بہت پہلے ایک فتویٰ صادر ہو چکا ہے۔ لیکن بقول شیخ ان کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ حال میں بعض اردو اخباروں نے شیخ کی تحریروں کے خلاف نمایاں خبریں شائع کی ہیں۔ ایک مسلم ہندی ہفت روزہ نے صفحۂ اوّل پر اشتعال انگیز سرخی لگا کر مسلمانوں سے سوال کیا ہے کہ وہ اس دوسرے سلمان رشدی کا جواب کیوں نہیں دیتے؟۔ حالانکہ یہ کام خود اس اخبار کو انجام دینا چاہئے تھا۔ لیکن شیخ کے افکار کے ردّ میں اس نے کسی معتبر صاحبِ قلم کا کوئی مضمون شائع نہیں کیا۔ دراصل ہمارا پریس بعض معاملات میں جلد باز تو واقع ہوا ہے لیکن اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھتا۔ پریس کا کام لوگوں کو صرف باخبر کرنا نہیں، انہیں educate کرنا بھی ہے۔

انشاء کے اس شمارے میں پہلی بار شیخ کے افکار پر بحث کی گئی ہے۔ آگے قارئین اور ہر مکتبِ فکر کے لوگ اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ان مضامین کا مقصد شیخ کے افکار کی تبلیغ نہیں ہے۔ ان کے مضامین یا کتب سے جو اقتباسات اس شمارے کے قلمکاروں نے دہرائے ہیں وہ ظاہر ہے کہ اپنے مطمحِ نظر کی وضاحت اور مدافعت میں نقل کئے ہیں۔ شیخ کے سُر میں سُر ملانے کے لئے نہیں۔ ان مقالات میں مصنفین کے متون اور مدعا کو اہمیت دی جانا چاہئے۔ ہم اس نظریے کے حامی ہیں کہ مخالفین کے دئے ہوئے فکری جھٹکوں سے ہمیں چوکنا ہو جانا چاہئے۔ جواب کی جگہ جواب دینا ہمارا فرض ہے۔ خاموش رہ جانا نا اہلی کا ثبوت ہے۔ مٹھی بھر نام نہاد لیڈروں اور مشاہیر کی ہانک میں آکر بھیڑ چال چلنا ٹھیک نہیں۔ ہماری توجہ اپنی مضبوطی اور اصلاح احوال پر مرکوز ہونی چاہئے ورنہ ہمارا فکری ہائی جیک کر لیا جانا یقینی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم سلمان رشدی — وہ چاہے پہلا ہو، یا آٹھواں، دسواں — کی باتیں غور اور تحمل سے سنیں اور ان کا معقول جواب دیں۔ دشمنِ اسلام کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی یلغار سے ملتِ اسلامیہ کی ذہنی اور فکری قوتیں سلب نہیں ہو گئی ہیں۔ ہمارے حواس بجا ہیں اور ہم بول سکتے ہیں۔

اس شمارے میں انور شیخ کی ادبی حیثیت کو ردّ نہیں کیا گیا ہے۔ ناقدین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ شیخ کے چند افسانے اور منظومات بھی شاملِ اِشاعت ہیں۔ شاعرِ مشرق اور مفکر اقبالؔ کے بارے میں انور شیخ کے دو تحقیقی اور تنقیدی مقالے برائے اشاعت موصول ہوئے تھے۔ ان پر ہم نے بعض نامور اسکالروں کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ ان میں وہ بھی ہیں جو ہمیشہ اقبالؔ کے نام کی کھاتے رہے اور اس حیلے سے مشہور ہوتے رہے۔ لیکن افسوس ان میں سے کسی کو جواب دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اقبال مرحوم سے اردو عالموں کو کیسی عقیدت ہے اور ان کا علم و ایمان کس نوعیت کا ہے پہلی بار اس کا اندازہ ہوا۔ بہر حال شیخ کی فکری اساس پر پروفیسر نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے جرأت اور بے باکی سے تنقید کی ہے۔ ناقدین دیکھیں گے کہ سبھی مضامین میں علمی سطح پر متوازن گفتگو کی گئی ہے۔ شیخ کی ایک انگریزی کتاب "ٹیکس اور آزادی" کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ اصولِ معاشیات اور قانون پر لکھنے والے ہمارے حلقے میں عنقا ہیں اس لئے اس پر بحث نہیں کی جا سکی۔ "اقبال کا نظریۂ عقل و عشق" شیخ کا ایک نیا مقالہ شامل کیا گیا ہے۔ اہل نقد اس پر اپنا ردّ عمل ظاہر کر سکتے ہیں۔

لندن میں عالمی اردو کانفرنس

URDU TRUST اردو ٹرسٹ

Registered Charity NO. 1062720/0
Registered Office: 75, Margret Street, London WIN 7HB
Tel: 0171 631 5263 Fax: 0171 436 4754

ٹرسٹ ہٰذا نے ایک عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

★ تاریخ: ۲۷اور ۲۸ر فروری ۲۰۰۰ء بروز اتوار پیر

★ مقام: یونیورسٹی آف لندن یونین بلڈنگ، ملیٹ اسٹریٹ لندن ڈبلیو سی ا۔
University of London, Union Building
Malet Street. London WC1

موضوع خاص۔ "اردو برصغیر سے باہر یا اردو اپنی نئی بستیوں میں خصوصی طور سے برطانیہ (مغرب) میں ہماری نئی نسلوں میں اردو کا مستقبل۔"

لہٰذا مندرجہ ذیل موضوعات پر مضامین یا مقالات متوقع ہوں گے:

۱۔ اُردو کی نئی بستیاں اور اردو ادب

۲۔ ادب مہجر

۳۔ برطانیہ میں اردو کی ترقی و ترویج کے مسائل اور سرگرمیاں۔

۴۔ مغرب میں ہماری نسلیں اور اردو کی ترقی و ترویج کے مسائل، حل اور منصوبے۔

۵۔ مغرب میں نئی نسلوں کو اردو ادب سے متعارف کرانے کے لئے اردو ادب کے انگریزی تراجم کی اہمیت اور افادیت۔

۶۔ اُردو کی نئی بستیوں میں ہمارے ادب اور ثقافت (کلچر) کے احیاء، نشو نما اور فروغ کے مسائل۔ مستقبل اور ان کا حل۔

۷۔ اُردو کا مستقبل تاریخ اردو ادب کی روشنی میں۔

۸۔ عصری تاریخ اردو ادب اور برصغیر سے باہر تخلیق پذیر ہونے والے ادب اور تخلیق کاروں کے کارنامے و مقام کی اس میں اہمیت، افادیت یا محرومیت کا مسئلہ۔

۹۔ اُردو کے رسم الخط کے تحفظ کا مسئلہ بالخصوص اُردو کی نئی بستیوں میں اردو کو متبادل مقامی رسم الخط میں بھی نئی نسلوں کے لئے اردو ادب کو منتقل کرنے کی تجاویز کا تجزیہ اور قابل عمل مشورے۔

۱۰۔ اُردو کو عالمی سطح پر اس کا جائز و صحیح مقام دلانے کی حقیقی جدوجہد اور مسائل و حل۔

آپ سے شرکت کی استدعا ہے۔

Trustees
Dr. A. Ghaffar Azm (Chairman) Tel/Fax 0181 886 9953
Mr. Sabir Irshad Usmani (Secretary) Tel: 0181 6770853 Fax: 0181 6770811
Mr. Faruq Hyder (Treasurer) Tel: 0181 6731376
Mr. Syed Moinuddin Shah, Mr. Kh. Tariq Mahmood,
Mrs. Mehar Khan, Mr. Salimuddin Quraishi

چشم براہ: صابر ارشاد عثمانی

تخلیق

کا خصوصی ضخیم شمارہ

خلیجی ریاستوں میں اردو

خلیج میں مقیم اردو ادبا و شعرا

کی نثری اور شعری

تخلیقات ان کے کوائف ناموں

کے ساتھ۔

ایک خوبصورت اور مفید دستاویز

مدیر: **اظہر جاوید**

مہمان مدیرہ: **لبنیٰ جاوید منظور**

قیمت :=/200روپے (پاکستان میں)

50درہم / ریال

پتہ:

بھگوان اسٹریٹ

پرانی انار کلی

لاہور۔۵۴۰۰۰ (پاکستان)

میرا تعارف

انور شیخ

میں ۱۹۲۸ء میں شہر گجرات (پاکستان) کے ایک قریبی گاؤں میں پیدا ہوا۔ میرے والدین اگرچہ خوشحال نہیں تھے لیکن انہیں افلاس زدہ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ دونوں ہی نسلاً برہمن تھے جن کا تعلق سری نگر، کشمیر سے تھا۔ میری والدہ محترمہ تہجد گزار خاتون ہونے کے علاوہ مبلغ اسلام بھی تھیں کیونکہ میں بروز جمعہ مختون پیدا ہوا ان کی مجھ سے عظیم مذہبی توقعات وابستہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے علم دین سے ہم کنار کرانے کی پوری کوشش کی اور اس میں میرے دادا محترم نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ بڑے خدا ترس مرد مومن تھے۔

اگرچہ مذہبی تعلیم معیاری تھی مجھے اسکول کی پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جوں توں ۱۹۴۳ء میں میٹرک پاس کیا اور کوہاٹ میں ملازمت حاصل کی لیکن وہاں دل نہ لگا اور نوکری چھوڑ کر لاہور کے ایک ریلوے آفس میں کلرک بھرتی ہو گیا۔ مجھے بچپن ہی سے پنجابی شاعری کا شوق تھا جو قیام لاہور کے درمیان اردو میں بدل گیا لیکن کسی کے سامنے زانوئے تلمذ خم کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ اس کی وجہ تکبر نہیں لاابالی پن تھا۔ بازار سے ایک کتاب "سفیر سخن" خریدی۔ فن شاعری کا مطالعہ کیا لیکن بات آگے نہ بڑھی اور شاعری ترک کر دی۔

لاہور کی فضا راس نہ آئی تو لالہ موسیٰ واپس چلا آیا جہاں میری تعلیم و پرورش ہوئی تھی۔ والد محترم نے کرانہ کی اچھی خاصی دوکان کھول دی لیکن سال بھر کی محنت کے بعد دل اچاٹ ہو گیا اور پشاور میں کلرک کی آسامی ڈھونڈ لی۔ یہ سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا۔ اور معلوم ہوا کہ ماتحتی میرے لئے سب سے بڑا روگ ہے۔ اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے میں نے اپنے علمی کوائف کو بہتر بنانے کی ٹھان لی۔ اور پرائیویٹ طور پر منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد بی۔ اے کیا اور پھر BACHELOR OF TEACHING کرنے کے لئے پشاور یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ مختصر عرصہ کے لئے پشاور میں معلم رہا لیکن تبدیلی حالات کے سبب اس محبوب شہر کو ترک کر کے راولپنڈی میں اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت حاصل کی۔

قیام پشاور میرے لئے ایک تخلیقی دور تھا۔ میں نے اس عرصہ میں نہ صرف اعلےٰ تعلیم حاصل کی بلکہ متعدد کتب بھی تصنیف کیں جن میں مندرجہ ذیل شائع ہوئیں:

فلسفۂ ازدواج۔ رازِ حیات۔
ربِ اسلام اور جہاد بالسیف

اتنا ہی نہیں مجھے تبلیغ اسلام کا جنون تھا۔ یہ میری ابتدائی تربیت کا اثر تھا۔ چنانچہ میں نے انجمن تدریس القرآن کا آغاز کیا جس کا میں کئی سال سکریٹری رہا۔ اس دوران کئی صاحب علم حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اور متعدد مناظروں میں بھی حصہ لینے کا موقع ملا۔

جب میں راولپنڈی میں تھا تو مجھے مولوی فاضل کرنے کی سوجھی۔ تیاری شروع کر دی اور ساتھ ہی افسانہ نگاری کا شوق بھی ہوا۔ اچانک مجھے ایک ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کی پیشکش ہوئی۔ ملازمت قبول بھی کر لی لیکن ماتحتی سے دل بھر چکا تھا۔ شبانہ دعائیں قبول ہوئیں اور انگلستان آنے کا موقعہ ملا۔

میری شادی کمسنی یعنی اٹھارہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ بیگم صورت و سیرت کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کی خاتون تھیں ہمارے مزاجوں میں ہم آہنگی نہیں تھی۔ میں نفسیاتی مریض بن کر رہ گیا۔ معاملہ یہاں تک آ پہنچا کہ ہر لحظہ دم گھٹنے لگا۔ فرار کی شدید ضرورت محسوس ہونے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر دیس نہ چھوڑ سکا تو شہر خموشاں یا کسی پاگل خانے میں پناہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ آخر ۱۹۵۶ء میں انگلستان پہنچ گیا۔ سیدھا کارڈف آیا اور آج بھی اس حسین اور دلکش شہر میں مقیم ہوں۔

کہاں ایک استاد کی آرام دہ زندگی اور کہاں دیارِ غیر کی مہاجرانہ صعوبتیں۔ یہاں پہلے تین برس سخت مشقت میں کٹے لیکن ہمت نہ ہاری اور محنت مزدوری کو سوشل سیکورٹی کی زندگی پر ترجیح دی۔ خودداری کا یہی تقاضہ تھا جسے بڑے تحمل سے نبھایا۔ اسی اثنا میں GRADUATESHIP IN TRANSPORT کا پروفیشنل امتحان پاس کیا جو کہ ایک کٹھن مسئلہ تھا۔ پھر پراپرٹی بزنس کرنے کا موقعہ ملا جس میں کامیابی نصیب ہوئی۔

پچاس برس کا ہوا تو علمی و ادبی شوق نے پھر انگڑائی لی۔ اس وقت کاروبار عروج پر تھا اگرچہ پرانی تشنگی کے دن یاد تھے پھر بھی اس جذبے کی شدت کا مقابلہ نہ کر سکا اور تاجرانہ زندگی کو چھوڑ کر قلم سنبھالا۔

کارڈف میں میری ملاقات ایک ویلش (WELSH) لڑکی سے ہوئی جس سے میں نے شادی کر لی۔ یہ خاتون مثالی بیوی ثابت ہوئی جس نے دو بیٹوں کا باپ ہونے کا شرف بخشا۔ میرا ایک بیٹا میری پہلی بیوی کی نشانی ہے جس

کے چار بچے ہیں جن کی محبتوں کے طفیل میں "داداجان" بھی ہوں۔

کاروباری زندگی چھوڑنے کے بعد ذہنی سکون نصیب ہوا۔ پہلے چند سال مطالعہ کو وسیع کرنے میں گزارے اور پھر تصنیف کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ میں نے انگریزی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا اور اردو تقریباً بھول گیا۔ میں نے انگریزی زبان میں مندرجہ ذیل کتب لکھیں جنکی بہت پذیرائی ہوئی اور ان کی مقبولیت تیزی سے بڑھ رہی ہے:

1. TAXATION AND LIBERTY
2. ETERNITY
3 FAITH AND DECEPTION
4. ISLAM, THE ARAB NATIONAL MOVEMENT
5. ISLAM, THE ARAB IMPERALISM
6. THE TALE OF TWO GUJRATI SAINTS

بعض لوگ مجھ پر اسلام دشمنی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ مناسب نہیں کیونکہ میرا مذہب انسانیت ہے اسلئے جو دین یا دھرم توہم پرستی سکھاتا ہو میں اس پر عقلی نظر ضرور ڈالتا ہوں۔ شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جس کا میں نے تنقیدی جائزہ نہ لیا ہو۔ یہ انسانیت دوستی کا تقاضہ ہے اور اس سے مراد مذہب آزاری نہیں۔

البتہ ہندی نژاد ہونے کے سبب میں ہندوستان نواز ضرور ہوں لیکن میرے ہندوستان میں بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش برابر کے شریک ہیں۔ اسی لئے میں اہل وطن میں آشتی اور رواداری کا قائل ہوں اور ایسی مذہبی رواداری کا حامی ہوں جو ذاتی ہو اور جسے دوسروں پر تھوپنے کی تمنا شامل نہ ہو۔ میں کسی کو کفر و ایمان کے ترازو میں تولنا نامناسب سمجھتا ہوں۔ کسی کو پرکھنے کی صرف ایک ہی کسوٹی ہے اور وہ ہے اس کا اخلاق۔

یہی وجہ ہے کہ میں اپنی علمی و ادبی کاوشوں کو انگریزی زبان تک محدود نہ کر سکا اور اپنے ہم وطنوں سے ہم کلام ہونے کے لئے اردو زبان پھر سیکھی اور اس میں مندرجہ ذیل شعری و افسانوی مجموعے پیش کئے:

۱- نبضِ جہاں
۲- سوز و ساز
۳- آگ اور پانی

شاعری میں میں نے ایک نئی صنف سخن "تکونی" کے نام سے پیش کی ہے جسے اہلِ سخن کا قرب حاصل ہو رہا ہے۔ میرے افسانے مزاحیہ و طنزیہ ہونے کے باعث دکھی دلوں میں گدگداہٹ پیدا کر رہے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میں نے علمی و ادبی ذوق کو دولت کمانے پر ترجیح دی۔

Address : P. O. Box : 918, CARDIFF (U.K.) CF2 4YP Phone : 44-1222-562063

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا نیا مجموعہ

ہوئے ہم دوست جس کے

اس میں ۱۷ ادبی شخصیات جناب راج بہادر گوڑ، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، وحید اختر، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر قمر رئیس، قتیل شفائی، پروفیسر رشید الدین خاں، ابراہیم شفیق، عوض سعید، ف۔ س۔ اعجاز، سیدہ شانِ معراج، استاد محمود مرزا، رشید قریشی، دیوکی نندن پانڈے، علی باقر اور وہاب عندلیب کے خاکے شامل ہیں۔

قیمت: ۸۰ روپئے

ناشر : تخلیق کار پبلشرز، 104/B۔ یاور منزل
آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

ارضِ مقدس میں چندروز

اے امیر النساء
کا
سفرنامہ

جو انشاء میں قسط وار شائع ہو کر بے پناہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے عنقریب کتابی شکل میں باتصویر شائع ہونے والا ہے۔

قارئین اپنا آرڈر روانہ فرمائیں۔

انور شیخ سے ایک ادبی انٹرویو

از سیدہ نسرین نقاش
ایڈیٹر "صدا"
خندہ بھون۔ نواکدل، سری نگر۔ ۱۹۰۰۰۲ (کشمیر)

سوال: انور شیخ صاحب! آپ بہت اچھے شاعر ہیں یہ بتایئے اپنی ذات کے حوالے سے کی گئی شاعری زیادہ جاندار ہے یا معاشرتی اور دوسرے بیرونی محرکات کے حوالے سے کی گئی شاعری؟

جواب: جس شاعری کا محرک نہ ہو وہ محض لفاظی کی ایک صنف ہے۔ محرک داخلی بھی ہو سکتا ہے اور خارجی بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر میں کس محرک سے ایسا تاثر پیدا ہوا جس نے اچھی تخلیق پیش کرنے میں مدد دی۔

سوال: آپ کی شاعری کا محرک کیا ہے؟

جواب: داخلی اور خارجی محرکات دونوں شاعر کا منبع ہیں۔ اوّلذکر کا تعلق قوت احساس سے اور آخرالذکر کا تعلق قوت مشاہدہ سے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں ایک فطری ربط موجود ہے اس لئے شاعری میں کبھی ذاتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے تو کبھی ماحول کا۔ میری شاعری میری اور معاشرے دونوں کی ترجمانی کا دم بھرتی ہے۔

سوال: جدید شاعری کی بنیاد کن چیزوں پر ہے؟

جواب: شاعری شاعری ہے۔ اس کی اصلیت کبھی نہیں بدلتی۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات کی نسبت سے اس کے تقاضے ضرور بدلتے ہیں اور جو شاعری تغیر حالات کی نمائندگی نہ کر سکے شاعری کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ جدید شاعری کا سب سے بڑا تقاضا عوام کو اوہام پرستی اور مذہبی عناد سے نجات دلانا اور ان میں رفعتِ انسانی اور باہمی ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ ان مذکورہ قباحتوں کا اصل سبب غربت، ناانصافی اور سماجی ہٹ دھرمی ہے جس میں ذات، پات، زبردستی کی شادیاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ جدید شاعری کے اصولوں کا تعلق تدریس سے نہیں بلکہ شاعر کی فطری جدّت طرازی کے ساتھ ہے۔ جو طبعاً رجعت پسند ہو وہ سکھانے سے بھی جدت پسند نہیں بن سکتا لیکن جو سیکھنے پر رضامند ہو وہ جدید شاعر بننے کا اہل ہے۔

سوال: ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی شاعری میں آپ کیا فرق محسوس کر رہے ہیں؟

جواب: ترقی پسند شعرا کے کچھ نظریات تھے۔ اسلئے ان کے افکار میں کچھ ربط تھا۔ وہ سبھی کارل مارکس کے مرید تھے جو آزادئ فکر و عمل کا حامی نہیں تھا۔ اکثر ترقی پسند شعرا مارکسی فلسفہ سے نابلد تھے لیکن ان کے صدق نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سماجی دست درازیوں کا رونا دیانتداری سے روتے تھے اور انجانے میں سوسائٹی کو آمریت کی طرف دھکیل رہے تھے۔ اس کے باوجود ترقی پسند شاعری نے عوام میں احساس حقوق بیدار کیا اور وہ اپنی قدر و قیمت کو سمجھنے لگے۔ جدیدیت کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنا ممکن نہیں غالباً جدید شعرا کے متعلق اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی مثال ایسے سپاہیوں کی ہے جنہیں ابھی ابھی فوج سے ڈسچارج کیا گیا ہو۔ ان میں عسکری قابلیت تو ہے لیکن ان کے مارچ کی منزل ابھی تک متعین نہیں ہو سکی۔

سوال: عام طور پر رجحان پایا جاتا ہے کہ اردو شاعری میں تصنع اور بناوٹ کا اثر گہرا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے آپ کی نظر میں اس عہد کے اہم شعرا کون ہیں جو اپنے وقت کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔

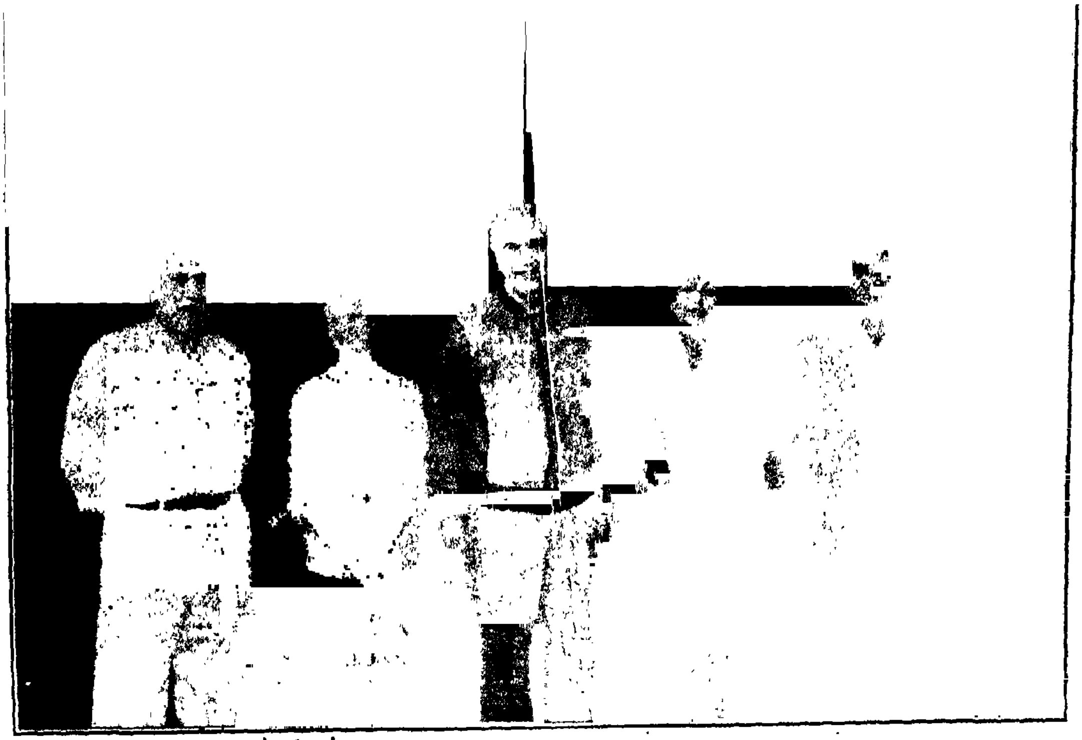
جواب: شاعری سائنس کی شاخ نہیں۔ اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ جب تک کسی خیال میں جذبات کی رنگینی موجود نہ ہو اس میں شاعرانہ تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ غالب نے اسی نسبت سے کہا تھا:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

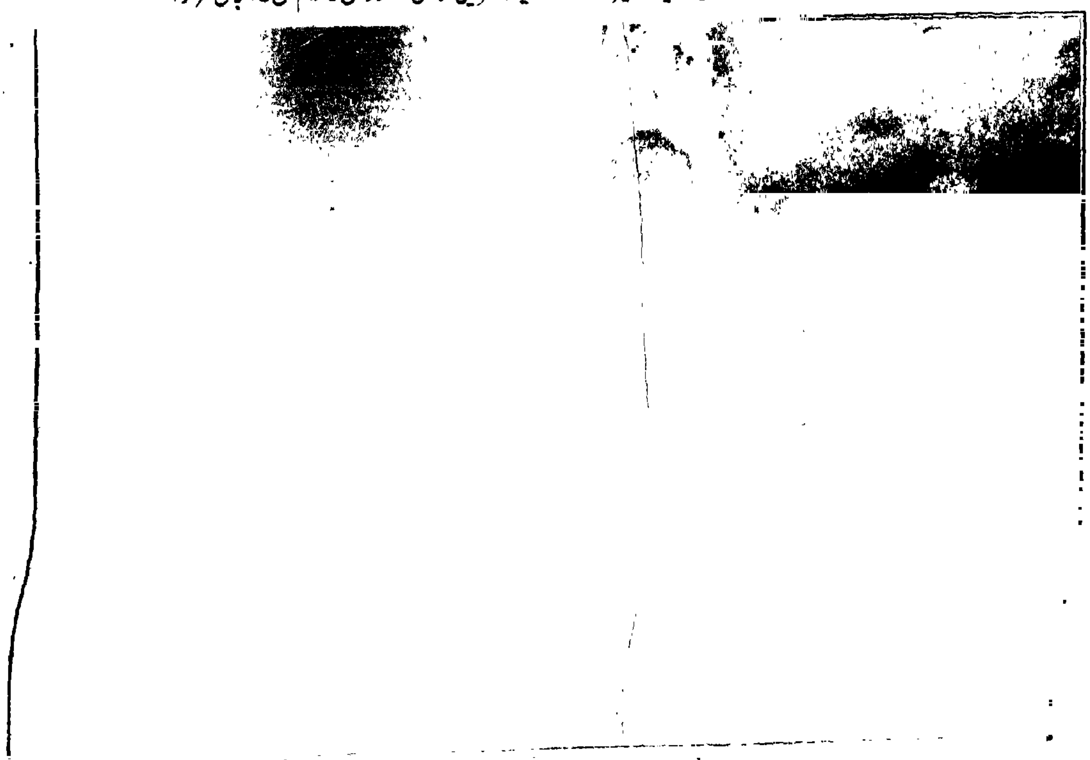
جس طرح ایک عورت حسین ہونے کے باوجود غازہ کی مرہون منت رہتی ہے اور ایک صوفی کو روحانی معراج کے باوجود داڑھی، کوزہ اور مصلّی کی ضرورت رہتی ہے اسی طرح شاعر بھی صنائع بدائع کا محتاج ہے لیکن اس کے باوجود جس طرح ایک عورت کی طبعی خوبصورتی اس کی سندرتا ہوتی ہے نہ کہ اس کا ہار سنگار جو صرف اس کو دوبالا کرتا ہے یاجسطرح ایک صوفی کی حقیقی عظمت اس کی روحانی رفعت ہے نہ کہ اس کی داڑھی اور تسبیح۔ اسی طرح کسی شاعر کی منزلت کا انحصار اس کی تخیلی سرفرازی اور اسلوب بیانی پر ہے نہ کہ صنائع بدائع کی فراوانی پر اس سلسلے میں عصر حاضر کے کون سے شعرا پیش پیش ہیں میں ان کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔

سوال: آپ کے خیال میں تخلیقی کام کیلئے کس کیفیت کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: تخلیق اسی وقت ممکن ہے جب خالق جانتا ہو کہ وہ کیا تحقیق کرنا



(دائیں سے) ساحر شیوی مدیر "سفیر اردو"۔ سیدہ نسرین نقاش۔ انور شیخ۔ بیگم شیخ۔ اقبال مرزا



(دائیں سے) سید معراج جامی۔ انور شیخ اور سیدہ نسرین نقاش

چاہتا ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ شاعر کا نہ صرف ایک خاص نصب العین ہو بلکہ اس کی تکمیل کے لئے اس کے پاس ضروری علم اور قوت ارادی بھی ہو۔ اتنا ہی نہیں اس کے مزاج میں وابستگی کا عنصر بھی موجود ہونا چاہیئے۔ جو شاعر خود افسردہ خاطر ہو اس کے اشعار میں ظرافت اور زندہ دلی کہاں سے آئے گی۔ شاعر کی تڑپ اس کے اشعار میں سوز و ندرت تو پیدا کر سکتی ہے لیکن وہ جب تک خود دل زندہ کا مالک نہ ہو اس کے اشعار تخلیقی عنصر سے مزین نہیں ہو سکتے کیونکہ تجربہ تسلسل اور زندہ رہنے کی تمنا تخلیق ہی کے دوسرے روپ ہیں۔ زندہ دلی کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرنا ضروری نہیں۔ اس کا انحصار شاعر کے اپنے نقطۂ نظر پر بھی ہے البتہ یہ کہنا جائز نہیں کہ ایک خوش باش شاعر اطمینان قلبی کے باعث تخلیقی شاعری کا سر چشمہ ہوتا ہے لیکن ایک پریشان حال شاعر قنوطیت کا پیامبر ہونے کے سبب اس اعزاز سے محروم رہتا ہے۔

سوال: تقسیم ہند سے ابتک اردو شاعری نے کتنے مراحل طے کئے؟۔

جواب: یہ بہت بڑا سوال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد اردو شاعری بے مرحلہ بن کر رہ گئی ہے۔

سوال: غالب، اقبال، جوش، فراق، فیض احمد فیض اردو شاعری کے اہم ستون تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وجہ؟

جواب: غالب، اقبال، جوش، فیض احمد فیض نے اردو شاعری میں اسلئے منزلت پائی کہ ان کے کلام میں نہ صرف انفرادیت ہے بلکہ انہیں اس فکر معاش کا سامنا نہ کرنا پڑا جس سے اکثر اہل سخن کی زندگی ایسا شعلہ بن جاتی ہے جو انکی طبعی استعداد کو تباہ کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں انہیں اظہار خیال کے وسیع مواقع میسر آئے جس سے انہیں اپنا تشخص قائم کرنے میں مدد ملی۔

سوال: سعادت حسن منٹو، بیدی، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی عہد ساز افسانہ نویس ہیں لیکن آپ بطور خاص سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے متعلق کیا کہنا پسند فرمائیں گے؟

جواب: میں ان افسانہ نگاروں کی عظمت کا قائل ہوں لیکن مجھے انہیں پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔

سوال: کسی فنکار کو ایک اچھا فنکار کن کن نظریات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے؟

جواب: فنکار وہی ہے جسکے فن میں تنوع یعنی رنگا رنگی ہو۔ اسکے عروج کا راز اس بات میں ہے کہ وہ اپنے فن کو جس انداز میں بھی پیش کرے اس میں کاریگری کا عنصر موجود ہوتا ہے اور کاریگری سے مراد نہ صرف اس کی فنی چابکدستی ہے بلکہ اس کا وہ تاثر بھی ہے جو قارئین، سامعین اور ناظرین کے دل و دماغ پر جادو بن کر ٹوٹ پڑتا ہے، میرے خیال سے فن کو نظریاتی کسوٹی پر پرکھنا جائز نہیں۔

سوال: ہمارے ذرائع ابلاغ ادب میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: ہمارے ذرائع ابلاغ "پیامبر ادب" کا درجہ اختیار کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنے ادبی رجحانات سے "ازم" کا عنصر نکال دیں۔ ادب کا تعلق عوام کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ اسے نظریات کے ترازو میں تول کر شائع کرنا ادب ناشناسی کی دلیل ہے۔
علاوہ ازیں وہ حضرات جنہیں ادبی کالموں پر اختیار حاصل ہے ان کا نوعیت ادب اور ادبی تقاضوں سے آشنا ہونا ضروری ہے۔

سوال: شعر لکھتے وقت کیا آپ کو معاشرتی اصلاح کا بھی خیال رہتا ہے؟

جواب: اگرچہ میری غزل سرائی جذباتیت پر مبنی ہے میری نظم گوئی کا مدعا ہی معاشرتی اصلاح ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے میں نے حال ہی میں ایک نئی صنف سخن "تکونی" کا تصور پیش کیا ہے۔

سوال: آجکل کے مشاعروں سے اردو کو فائدہ پہنچ رہا ہے یا نقصان؟

جواب: میں انعقاد مشاعرہ کا مخالف نہیں ہوں لیکن ہر روز کے مشاعرے شعرا کی قنوطیت اور ذہنی بدحالی کا مظہر ہیں۔ مشاعروں سے اردو ادب کی خدمت نہیں تضحیک ہوتی ہے۔ وہ اس لئے کہ شعرا صرف داد حاصل کرنے کے لئے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ غضب ہے کہ شعرا نے گروہ بندیاں کر رکھی ہیں۔ ہر ایک اپنی پارٹی کے رکن کو اٹھاتا ہے اور اس "اٹھائی گیری" میں غلو۔ تصنع۔ دروغ گوئی۔ غیبت سبھی شامل ہیں۔ برطانیہ میں یہ بدعت حسد کی منزلوں کو پار کر کے باہمی غارت گری کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ اخلاقی گراوٹ کی انتہا یہ ہے کہ ناکام شعرا اپنی یاس اور افسردگی کا بدلہ لینے کے لئے کامیاب اہل قلم کے خلاف ایسے گمنام خطوط لکھ کر بانٹتے ہیں جن سے شیطان کو بھی اپنی بزرگی کا زعم ہونے لگے۔ یہ اسی داد طلبی کا نتیجہ ہے کہ کوئی ناقد کسی شاعر پر غیر جانبداری سے قلم نہیں اٹھا سکتا۔ جو بھی ایسا کرے گا حزب مخالف اسکی آبرو مٹی میں ملانے پر تیار ہو جاتی ہے۔

سوال: ہمارے نثری ادب میں ناقدین کی کافی تعداد موجود ہے۔ کیا وجہ ہے شاعروں میں نقادوں کی بہت کمی ہے؟

جواب: ہمارے شاعروں میں ناقدین کی کمی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ آجکل نقد و نظر میں غیر جانبداری تقریباً ناممکن ہے اور اسلئے وہ نقاد جو شعری تنقید میں انصاف کے قائل ہیں اس میدان میں

قدم رکھنے سے گھبراتے ہیں۔ دوسرے، شاعری ایک ایسا فن ہے جس کی گہرائی اور اونچائی پر عبور حاصل کرنا سخت مشکل ہے۔ حتیٰ کہ اسے قریب سے دیکھنے کے لئے بھی عمر خضر درکار ہے۔ لہٰذا ایسے ناقدین خواص کا درجہ رکھتے ہیں جو عوام کے مقابلے میں بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ تیسرے، جیسے نثر کو نظم کی نسبت سمجھنا آسان ہوتا ہے اسی طرح نثر پاروں پر تنقید کرنا بھی نسبتاً سہل ہے۔ اسی لئے اردو شاعری میں ناقدین کی کمی لیکن نثری ادب میں ان کی کثرت ہے۔

سوال: آپکے خیال میں علامتی ادب یعنی سمبل ازم کے ہند وپاک میں اس قدر بڑے پیانے پر رائج ہونے کے کیا وجوہات ہیں۔

جواب: Symbolism یعنی علامتی ادب ایک بہت بڑا موضوع ہے جسے مختصراً بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کا منبع انسان کا رجحان صنم تراشی ہے۔ جب قرون اولیٰ کا انسان مظاہر فطرت یعنی چاند، سورج، رات، دن، آندھی، ہوا وغیرہ کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا تو اس نے یہ تصور کیا کہ ہر مظہر قدرت کے پیچھے کسی شکتی یعنی مافوق الفطرت قوت کا ہاتھ کار فرما ہے جسے اس نے دیوی یا دیوتا کا خطاب دیا۔ ان دیوی دیوتاؤں کے تصور کی وضاحت کے لئے ان کے بت تراشے گئے جو ان کی وضع قطع اور خصوصیات کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ حقیقت کی مجازی ترجمانی کا نام Symbolism ہے جسے علامتی ادب میں تشبیہ و استعارہ، صنائع، بدائع اور مختلف لسانی تراکیب سے بیان کیا جاتا ہے۔ اردو میں علامتی ادب کے فروغ کا ایک بڑا سبب شعری ونثر تخلیق کاروں کی سماجی و معاشی بدحالی ہے۔ شاعر تو ویسے بھی ذہنی صنم پرستی کے عادی ہیں۔ حقیقت کی تلخیوں سے بچنے کے لئے وہ خود فریبی کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ اس کا سب سے موثر ذریعہ خیالی پرواز ہے جو علامتی ادب کی تخلیق کا ایک بڑا سبب ہے۔

سوال: آخر ایسا کیوں کہا جاتا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے جبکہ سکھ عیسائی، ہندو مذاہب کے شعراء اور ادباء کرام بھی اس زبان میں سینکڑوں گزرے ہیں اور فی الحال ہیں بھی؟

جواب: یہ بڑا اچھا سوال ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان جس کے معنی لشکر ہیں مسلمان حملہ آوروں کی یلغار کے سبب عالم وجود میں آئی۔ اس پر طرہ یہ کہ دربار دہلی کی سرکاری زبان فارسی تھی جس کا اردو پر گہرا اثر ہوا۔ علاوہ ازیں اردو میں اظہار خیال کرنے والے شعرا بھی اکثر مسلمان ہی تھے۔ اتنا ہی نہیں بٹوارے سے پیشتر مسلمانان ہند نے اردو کو اپنی قومی زبان کے طور پر اپنا لیا جس سے یہ مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی اور غیر مسلم اہل قلم نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو برصغیر ہند کی زبان ہے جسے بیرونی ممالک میں تارکین وطن کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ویسے بھی اسکی گرامر وہی ہے جو ہندی بھاشا کی ہے۔ اردو کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دائرہ تحریر وسیع کیا جائے۔ میں اس مسئلے پر اپنی کتب "سوز و ساز" اور "آگ اور پانی" پر بحث کر چکا ہوں۔

سوال: شیخ صاحب U.K. کے تمام مسلمانان آپکو اسلام دشمن سمجھتے ہیں۔ ایسا وہ کیوں سمجھتے ہیں تفصیل سے بتانے کی زحمت فرمائیے گا۔

جواب: میں دشمن اسلام نہیں ہوں۔ یہ محض میرے مخالفین کا پراپگنڈہ ہے جو ان کی تنگ نظری کا غماز ہے۔

سوال: اللہ تبارک تعالیٰ کی پرستش کے لئے ملائک و جنات کم نہ تھے پھر کیا مصلحت آن پڑی کہ دنیا بنائی گئی تورات، زبور، انجیل، قرآن اتارے گئے، انسان پیدا کئے گئے نبی رسولؐ، پیغمبران، اولیاء کرام، ابدالی و بزرگان دین بھیجے گئے۔

جواب: یہ سوالات ادبی نہیں مذہبی ہیں۔ میں انہیں ادبی بحث میں خلط ملط کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

سوال: حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت، مذہب اسلام اور عہد نو کے مسلمانان پر آپ کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب: اس سوال کا جواب بھی وہی ہے۔ اس وقت ادبی گفتگو ہو رہی ہے مذہبی نہیں۔

سوال: اپنی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات کے بارے میں بتائیے؟

جواب: یہ سوال بڑا دلچسپ ہے لیکن اس کا جواب اتنا تفصیل طلب ہے کہ اس سے انٹرویو میں بوریت پیدا ہو جائے گی۔ بہتر ہے کہ اسے سوانح نگاری کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ جب آپ سے پھر ملاقات ہوئی تو سب کچھ بیان کروں گا۔

سوال: ہم جیسے طفل مکتب قلمکاروں کے لئے آپ کا کیا پیغام ہے۔

جواب: آپ ماشاءاللہ خود سلجھی ہوئی قلمکار ہیں۔ اپنی عمر اور تجربے کی بنا پر اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ملکۂ تحریر خدا کی ودیعت ہے جسے دیانتداری سے استعمال کرنا چاہئے۔ برصغیر ہند عرصۂ دراز سے مذہبی، سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ ان کے حل کی ذمہ داری نئے قلمکاروں پر زیادہ شدت سے عائد ہوتی ہے جسے صرف انسانی اقدار کی روشنی میں ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔

غزلیں

جسے عادت ہو موجِ بحر سے ٹکرا کے جینے کی
نہیں ممکن اسے کچھ فکر ہو اپنے سفینے کی

ہمارے خوں کا جب بھی تذکرہ ہو ان کی محفل میں
تو وہ کرتے ہیں باتیں ناز سے اپنے پسینے کی

ہمیں دیکھا تو روئے ہاں مگر منہ پھیر کر روئے
وہ روئے اس طرح کیوں؟ بات تھی شاید قرینے کی

نہیں کچھ شرم پینے میں کہ یکتا ذوقِ مے خواری
ہمیں عادت ہے اے ساقی! فقط آنکھوں سے پینے کی

نہیں کچھ فرق، وہ عشق حقیقی یا مجازی ہو
کبھی فرصت نہیں ملتی پھٹے دامن کو سینے کی

تصور ہی ترا اے جانِ جاں اتنا نشہ آور
ضرورت اب نہیں ہے مے و مینا، آبگینے کی

تڑپنے کا تماشہ دیکھ لے جی بھر کے وہ انوؔر
دعائیں اس لئے ہی دے رہا ہے ہم کو جینے کی

نظر آتا ہے ناقص ہر کوئی۔ جب سے بنے عاقل
مگر لگتے تھے سب کامل کہ ہم جب تک رہے جاہل

صنم سے جب ہوئے رخصت تو مڑ مڑ کر لگے رکنے
بڑھے آگے وہ کیسے جس کی پیچھے ہو کھڑی منزل

کہا تھا پیچ موئے یار کو ہرگز نہ سلجھانا
نہ رواب۔ گر الجھ کر رہ گیا ہے اس میں تو اے دل

بڑے خوش فہم تھے سمجھے کہ خود ہی پاس آئے گا
ہوا آخر عیاں۔ چل کر کبھی آتا نہیں ساحل

ہوا کیا گر غمِ افلاس کے کوڑوں کی شدت تھی
یہ کیا کم ہے خودی بننے نہیں دیتی ہمیں سائل

خدایا خود ہی الجھایا تھا روٹی کے مسائل میں
سزا جائز نہیں ہرگز۔ اگر تجھ سے رہے غافل

کسی کو بھی نہ اب چاہیں تو کیا اس میں خطا انوؔر
جسے بھی ہم نے چاہا اصل میں نکلا وہی باطل

پشاور کی گلیاں

انور شیخ

(۱)

کریں ذکر جب لوگ خلد بریں کا
کسی خوش ادا۔ دلربا۔ مہ جبیں کا
وفاؤں کی باتیں۔ اداؤں کے چرچے
ہو قصہ کسی خوش گلو۔ دل نشیں کا
اگر بحث تلوار۔ جھنکار کی ہو
سیاست کا ہو مسئلہ یا کہ دیں کا
تو بحر تفکر میں وہ ڈوب جائیں
پشاور کی گلیاں جنہیں یاد آئیں

(۲)

پشاور! ہے تو وہ دیارِ محبت
فدا جس پہ اخلاق شیریں بیانی
تو ہے عشق اور حسن کی ایک منزل
شجاعت۔ شرافت کی زندہ نشانی
نہ لحاظ پیری کا جس پر اثر ہو
تو ہر وقت ایسی مچلتی جوانی
زمانے کے فتنے نہ اُن کو ستائیں
پشاور کی گلیاں جنہیں یاد آئیں

(۳)

پشاور میں رہنا ہے اعجاز گویا
کہ جل اس کا جیسے ہو کوثر کا پانی
کچھ ایسا مزا اس کی نانِ جویں میں
طعامِ ارم بھی نہ ہو جس کا ثانی
پشاور حقیقت میں فخرِ تمدن
پٹھانوں کی وحشت۔ ہے جھوٹی کہانی
ہمیشہ ہی عشرت سے وہ گنگنائیں
پشاور کی گلیاں جنہیں یاد آئیں

(۴)

پشاور! میں تجھ کو بھلاؤں تو کیسے
محبت کی رسمیں۔ مٹاؤں تو کیسے؟
میں ڈوبا ہوں پردیں کی چشمِ سیہ میں
کہو۔ خلد سے لوٹ آؤں تو کیسے؟
خیالوں کی دُلہن! تصور کی ملکہ!
محبت کا احساں چکاؤں تو کیسے؟
نہ الفت میں انور کبھی مات کھائیں
پشاور کی گلیاں جنہیں یاد آئیں

انور شیخ ایک پرابیسی شاعر

ڈاکٹر قمر جہاں
پروفیسر و صدر شعبہ اُردو
سندر وتی مہیلا کالج، بھاگلپور (بہار)

طنز و مزاح انور شیخ کے مزاج کا ایک نمایاں وصف ہے۔ افسانہ ہو یا شاعری ہر جگہ مزاحیہ عنصر کی چاشنی انکی تحریر میں ایک خاص رنگ گھول دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مزاحیہ ادب میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے متمدن زبان اور مہذب ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ایک خاص نوع کی ذکاوت اور بذلہ سنجی بھی درکار ہے۔ ذرا سی بد احتیاطی میں طنز و مزاح کے وار کا عمل سفلی بن جانے کا بھی خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اس طرح مزاحیہ آرٹ خاصہ دشوار بھی ہے اور بہت سہل بھی۔

انور شیخ کا مجموعہ "نبضِ جہاں" ان کی شعری اور نثری تحریروں پر مشتمل ہے۔ شعری حصے کا مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر لاتا ہے کہ انور شیخ کی شاعری عہدِ حاضر کے ایسے مرقعوں کو پیش کرتی ہے جس میں سچائی کی وہ قبیح شکل موجود ہے جس میں آج کا انساں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت رامی شناسم

کی گواہی دے رہا ہے۔ انور شیخ کی شاعری رجائی آہنگ سے بھرپور ہے۔ وہ علامہ اقبال کے "فلسفۂ عمل اور خودی" سے متاثر ہیں اور اپنی شاعری میں عمل و حکمت پر خاصہ زور دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ تقدیر نہیں تدبیر کے قائل ہیں، نفسیاتی افکار کے عنوان کے تحت ان کی جو نظمیں مجموعہ میں شامل ہیں وہ ان کے نظریۂ حیات کا واضح عکس پیش کرتی ہیں۔ ان نظموں میں فلسفیانہ آہنگ تو ضرور ہے مگر مدبرانہ آن نہیں اور نہ ہی شاعرانہ شان و شکوہ۔ ان کی نظمیں عام فہم ہیں۔ اکثر اوقات مزاحیہ انداز میں اپنی بات، اپنے قاری کے دل میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، مثال کے لئے نظم "اعجاز مرشد" کا مطالعہ کیجئے۔ نظم کا مرکزی تصور آج کے دور میں ملا و مولانا کی ابتر حالت اور زہد و تقویٰ میں بھی ریاکاری کے رنگ کی پیش کش پر مبنی ہے۔ مولوی اور مرشد کے ظاہری اور باطنی چہرے میں جو نمایاں فرق ہے اور بھولے بھالے عوام کردار کی اس دورنگی کو پہچاننے سے قاصر ہیں وہ اندھے عقائد میں ابھی بھی ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان تمام باتوں کو مزاح و طنز کے پیرایے میں دلکش انداز میں انہوں نے پیش کیا ہے۔ نظم کی "کہانویت" ہمیں خاصی متاثر کرتی ہے۔ انجام میں نظم کے مرکزی خیال کی وضاحت جس طور کی گئی ہے وہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ انکی بعض نظمیں اپنے مرکزی خیال کے اعتبار سے یکسانیت کی حامل ہیں۔ انور شیخ کی خوبی یہ ہے کہ وہ پسِ پردۂ فن سماج اور معاشرے کی برائیوں کا پردہ فاش کرتے ہیں اور حق گوئی و بے باکی کا ساتھ دیتے ہیں۔ جرأتِ اظہار اور مزاحیہ اسلوب انکے قلم کا اہم وصف ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

زہرہ دربار مرشد میں یوں رو پڑی
جیسے شدت سے ساون لگائے جھڑی
فاخرہ کی جوانی کی اس نے بیاں
اور کہی ان سے کلفت کی سب داستاں
پیر صاحب نے دیکھا اسے شوق سے
دردمندی سے پھر خود بھی وہ رو پڑے
"عین ممکن کہ مالک سے التجا
میں کروں گا دعا" پیر نے یہ کہا
"پر دعاؤں کے کہنے کا انداز ہے
اصل میں تو اجابت بڑا راز ہے
فاخرہ کے جنم کی وضاحت کرو
اس کی تصویر فوراً مجھے بھیج دو
اسکی کنڈلی بناؤں گا میں دھیان سے
اور مانگوں گا چاہو جو رحمان سے"

اور نظم کا اختتام ملاحظہ ہو۔

فاخرہ کو ریاضت کا بدلہ ملا
اس کو خالق نے ننھا سا بیٹا دیا
اسکی صورت میں جادو تھا ایسا بھرا
گر کے سجدے میں زہرہ نے خود یہ کہا
"میرے بیٹے کو بیٹا ہے تو نے دیا
اے خدا! یہ ترا ہے بڑا معجزہ
اس سے بڑھ کر بھی لیکن کرم یہ ترا
پیر صاحب کا شبہہ ہے اس پر لگا"
(نظم اعجاز مرشد)

اردو کی کلاسیکل شاعری کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے، شاید اسی لئے ان کی شاعری پر روایت کے گہرے اثرات مرتسم ہیں، نظموں کے عنوانات، موضوعات وغیرہ پر علامہ اقبال، جوش، جمیل مظہری اور رضا نقوی واہی کے واضح اثرات

دیکھے جا سکتے ہیں، انکے یہاں تاثر قبول کرنے کا عام طور سے منفی رجحان ہے۔ انکا نظریہ یہ ہے کہ ہر شئے اپنے معکوس سے اپنی شناخت دیتی ہے۔ جنت جہنم کے تصور سے رنگین اور حسین ہے، نور، ظلمت سے اپنی پہچان بنا رہا ہے، راحت، رنج سے اپنی قدر بڑھا رہی ہے۔ گویا حیات انسانی تضادات کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔

اس سلسلے کی ایک یادگار نظم "پیری" ہے۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ عہد پیری مایوسی، تھکن اور زوال کا عہد ہے مگر شاعر ضعیفی سے متعلق ایک نیا اور رجائی انداز پیش کرتا ہے۔ نظم کے حوالے پیش نظر ہیں ۔

زمانے کی کاوش سے فرصت ہمیں
نہ ہے فکر دنیا، نہ سوز ملال
حسینوں کے غم سے رہائی ملی
ستاتا نہیں اب تو رعب جمال
وہ اپنے تصور میں رعنائیاں
کہ جنت سے بڑھ کر ہے اپنا خیال
نہ محتاج حوروں نہ غلماں کے اب
ضعیفی کا کیسا عجب ہے مآل
بزرگی ہے پیری کا ایسا صلا
کہ بڑھ کے نہیں کوئی اس سے جزا
وہ ناداں جو سمجھے اسے بے کسی
ضعیفی حقیقت میں ہے دل کشی
(نظم "پیری")

اسی طرح نظم "دوست" بھی عہد حاضر کے دوستوں کی جاندار مرقع کشی ہے ۔

انور ہو بڑے سادہ نہ سمجھو گے حقیقت
وہ دوست ہی کیا جو تمہیں الّو نہ بنائے

نظم "عمر رفتہ" اپنے انداز کی ایک دلکش نظم ہے۔ اس عنوان سے دو نظمیں شامل ہیں۔ پہلی نظم میں عمر رفتہ سے متعلق ایک شکستہ دل کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے، دوسری نظم میں عمر رفتہ سے متعلق ایک زندہ دل کا انداز نظر بیان ہوا ہے۔ اس طرح دو متضاد کیفیات کو اتنے سلیقے سے بیان کیا گیا ہے کہ حقیقت کے دونوں ہی رخ سامنے آگئے ہیں۔ اصل سچائی بھی یہی ہے کہ حقیقت ایک ٹھوس وجود ہے جس کا عکس دیکھنے والے کی نظر کا مرہون منت ہے۔

جس طرح پانی کو جس رنگ کے گلاس میں ڈالئے وہی رنگ اختیار کر لیتا ہے اُسی طرح حقیقتیں بھی ٹھوس اور جامد ہیں البتہ مشاہدہ کرنے والی نگاہیں رنگ برنگی ہیں "عمر رفتہ" کا ایک رُخ دیکھئے ۔

تو ہی قبلہ ہے، تو ہی طواف حرم
اس جہاں میں نہ تجھ سا کوئی بھی کرم
لوٹ آ عمر رفتہ، بُلاؤں تجھے
کاش جانوں کہ کیسے مناؤں تجھے

اب "عمر رفتہ" سے متعلق ایک شکستہ دل کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو ۔

مری عمر رفتہ نہ آنا کبھی
مجھے پھر نہ ہرگز ستانا کبھی
تو وہ پھول جس میں نہ رنگ اور بو
تو وہ دل نہ جس میں کوئی آرزو
تمہیں عمر رفتہ بلاؤں تو کیوں
دیئے درد کے پھر جلاؤں تو
(نظم "عمر رفتہ")

حقیقت کے ایک سے زیادہ رخ بن گئے ہیں، یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس پر آج کے طرز فکر کی چھاپ ہے۔

وقت کا بدلتا ہوا تصور حقیقتوں کو بھی بدل رہا ہے۔ "نبض جہاں" میں "مکالمات"، "نفسیاتی افکار" "پیر اور مُلا"، "منظومات" "غرض مختلف عنوانات کے تحت نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ مکالمات کا حصہ بھی خاصہ دلچسپ ہے اس میں شامل کی گئی نظموں پر علامہ اقبال کے واضح اثرات ہیں مگر پرواز فکر اور انداز بیان میں وہ اقبال کے قریب نہیں ہو سکے ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:-

خودی ہے ترجمانِ نفس، یہ دستور خاقانی
کمالِ زندگانی ہے، یہی انداز یزدانی
(نظم "خودی" خدا اور شیطان میں ایک مکالمہ)

کچھ بھی دانش تلاشِ بلا میں نہیں
جو مزا ہے جزا میں، سزا میں نہیں
(نظم: جبریل اور ابلیس، ایک مکالمہ)

بندگی کچھ نہیں، ایک زنجیر ہے
زندہ وہ جس کے ہاتھ اپنی تقدیر ہے
(نظم: جبریل اور ابلیس، ایک مکالمہ)

نظم "پشاور کی گلیاں" "ملّا اور شیطان، جہیز، مرد قلندر، شاہ جہاں کی آخری آرزو، شہنشاہ جہانگیر بستر مرگ پر، "اے پیار کرنے والو۔ کیا چیز ہے محبت" (ایک تمثیلچہ) وغیرہ، پیش نظر مجموعہ کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔

غزلیات کا حصہ نظموں کے مقابلے کمزور اور ہلکا پھلکا ہے۔ بیشتر غزلوں پر روائتی انداز غالب ہے، موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے یہ اشعار تغزل کی گھسی پٹی روایت کو دہرا رہے ہیں۔ ان میں احساس کی چنگاری اور جذبے کی گھلاوٹ مفقود ہے، اسی لئے انور شیخ اپنی غزلوں سے قاری کو متاثر کر سکنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ یہاں مزاح اور طنز کا رنگ بھی پھیکا ہے۔ انہوں نے غزل کو محض اس کے لفظی مفہوم کا آئینہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکا کینوس وسیع نہیں ہو سکا، البتہ چند اشعار "نبض جہاں" میں تلاش و جستجو کے بعد ایسے ملے ہیں جن کو ان کے ذوق تغزل کا جواز کہا جا سکتا ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو ۔

وہ جشنِ چراغاں منانے کو آئے
دیئے اس لئے آنسوؤں کے جلائے
یہ کیسی کشش تو نے بخشی خدایا
کہ جو بھی ستائے ہمیں ہی ستائے
سینچا ہے تیری یاد کو اشکوں سے آج تک
کیسا چمن کھلا ہے کبھی پاس آکے دیکھ

بڑے نقش آور تھے وہ خواب انورؔ
کہ ہر پل ہی گزرا مرا سوتے سوتے

زباں سے کچھ نہیں کہتے، فقط آنکھیں دکھاتے ہو
کبھی تو دل کی ہتلاؤ ترس کر رہ گیا ہوں میں

تجھ کو بھلا سکے نہ کبھی وہ تو اک گھڑی
وابستہ تیری یاد سے ہو جس کی زندگی

میرے نزدیک غزل احساس کی رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑنے کا آرٹ ہے۔ اچھے غزلیہ اشعار احساس اور جذبے کی گھلاوٹ کے حامل ہوتے ہیں۔ انورؔ شیخ نے اپنی غزلوں میں احساس سے زیادہ خیال کو اہمیت دی ہے۔ اسلئے انکے اشعار ذہن کو چھوتے ہیں دل کو نہیں۔

مختصر یہ کہ انورؔ شیخ اپنے تخلیقی سفر میں ابھی گامزن ہیں اور ان کی نظر خوب سے خوب ترکی تلاش میں ابھی مصروف ہے۔ اس لئے ان کے حق میں کوئی حتمی فیصلہ درست نہیں ہوگا۔ اگرچہ زبان و بیان اور املا کے اعتبار سے شیخ انورؔ کے اس مجموعہ کلام میں کچھ کمزوریاں راہ پائی گئی ہیں مگر موجودہ شعری و ادبی مذاق اور ماحول میں یہ کمزوریاں ان کی خوبیوں کے مقابلے میں کمتر ہیں۔ خاص طور سے اس اعتراف عجز کے بعد ان خام کاروں کی نشاندہی کار عبث ہوگی۔ وہ پیش لفظ ہیں رقمطراز ہیں:-

''رہے مجھ ایسے پردیسی شاعر جنہیں وطن سے نکلے چالیس برس ہو چکے اور دیار غیر میں ایسی جگہوں میں آباد ہیں جہاں کوئی اردو بولنے والا دوا کیلئے بھی نہیں ملتا'' وہ شعر محض اس لئے کہتے ہیں کہ شاعری ان کی گھٹی میں ہے۔ انکے لئے فنی اور لسانی کسوٹی پر پورا اترنا مشکل ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوں تو عطیہ الٰہی سے کم نہیں۔ ان کی یہ خود آگہی بھی قابلِ تعریف ہے کہ

''مقتدر ادبی شخصیتوں سے دیباچہ لکھوانا ایک رسم سی بن گئی ہے۔ میں نے اس کی تقلید کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ تحریر کی نوعیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس کی بلندی اور پستی کا اندازہ صرف قارئین ہی لگا سکتے ہیں''۔

ضرورت ہو تو کہتے ہیں کہ میرے دیوتا تم ہو
ضرورت جب نہ ہو کہتے ہیں میری خاکِ پا تم ہو

بہاتے تھے یقینِ عشق سے اشکِ مسرّت ہم
گئی وہ لذّتِ گریہ کہ جب سے بے وفا تم ہو

یہ مانا ہم نہیں دانا پہ اتنا تو سمجھتے ہیں
ملے ساحل نہ اس کشتی کو جس کے ناخدا تم ہو

تمہارا ہی گماں ہوتا ہے اب ہر ایک سائے پر
بڑھا سوزِ محبّت اس طرح جب سے جدا تم ہو

تمہاری بزم کا اب ہو چکا اتنا اثر ہم پر
کہیں کیسے کہ ہرجائی۔ جفا جو پُر خطا تم ہو

نہ کوئی چھو سکے تم کو پہ تم چاہے جسے چھیڑو
سرورِ نکہتِ گُل تم نسیمِ جاں فزا تم ہو

ادبی چنگیز انور شیخ کی قدیم اور ایذا رساں شاعری "نبضِ جہاں"

صابر اقبال
شمالی ۲۴ پرگنہ۔ مغربی بنگال۔

میری ایک بُری یا اچھی عادت ہے کہ اگر کسی کتاب کی مانگ میں مستند اہل قلم حضرات کی آراء کی افشاں بھری ہو تو میں اس کی ضیا پاشی سے اس وقت تک نظریں چرائے رکھتا ہوں جب تک تخلیقات کے رُخ زیبا کا نظارہ نہ کرلوں۔ اور اس کے ادبی خدوخال کے تعلق سے ایک انفرادی امیج نہ بنالوں۔ برگزیدہ ناقدین کی افشاں گری اکثر نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے اور نظارگی کو بالغ ہونے نہیں دیتی۔ لیکن پیش لفظ کا بارِ فریضہ اگر فنکار نے بہ نفس نفیس اٹھایا ہو تو میری نظروں کا پہلا بوسہ وہیں ثبت ہوتا ہے۔ چونکہ تخلیق اور تخلیق کار کی زندگی کے مابین ایک بالواسطہ رشتہ ہے۔ اس لئے اس کی ذاتی رائے سے اس کے فن کی شناخت میں کافی مدد ملتی ہے۔

انور شیخ کا شعری وافسانوی مجموعہ "نبضِ جہاں" جب میرے ہاتھ لگا اور میں نے دیکھا کہ اس کے پیش لفظ کی زحمت خود صاحب کتاب نے اٹھائی ہے تو حسبِ فطرت میں نے کتاب کی نقاب کشائی وہیں سے کر ڈالی۔ قریب قریب ۱۳ صفحات پر پھیلا ہوا یہ پیش لفظ "شاعری کیا ہے؟" کے روایتی جملے سے شروع ہوتا ہے۔ اور بات مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی اصولِ انتقادیات کی شکوہ سنجی تک جا پہنچتی ہے۔ اور نقاد و مبصر "ادبی چنگیز" کے خطاب سے نوازے جاتے ہیں۔ پھر ان ادبی چنگیزوں کی نفسیات کی عقدہ کشائی ان الفاظ میں ہوتی ہے:

> "ادبی چنگیز اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ جو میدانِ شاعری میں ناکام ہونے کے سبب نہ صرف مریضِ قنوطیت بن جاتے ہیں بلکہ کامیاب شعراء سے حسد کرنے لگتے ہیں جو ان کی فاسدانہ ذہنیت سے ٹپکتا ہے۔"

پتہ نہیں نقد و نظر سے اس قدر بیزار فنکار اپنی تصنیف تبصرے کے لئے کیوں ارسال کرتے ہیں۔ خامیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے محاسن کو اجاگر کرنا اور مطبوعہ کو توصیفی جملوں سے دستاویزی حیثیت کی حامل تصنیف قرار دیکر قاری کو گمراہ کرنا نہ تو تبصرے کا منصب ہے اور نہ ہونا چاہئے۔ مانا کہ تبصرے کا ضمنی مقصد کتاب کی تشہیر بھی ہے۔ لیکن یہ کام اشاعتی اداروں کی طرح نہیں ہونا چاہئے۔

اگر شاعر متشاعر نہیں، معتبر ہے۔ تخلیق میں حسن ہے۔ موضوعات میں تازہ کاری ہے۔ اور فکر و فن سے نئے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ تو بھلا ایک مبصر کو کیا پڑی ہے کہ ناحق کی نکتہ چینی سے کسی کی حق تلفی کا گناہِ بے لذت اٹھائے۔

اردو ادب کے شعری منظر نامے پر انور شیخ نووارد ہیں۔ ان کے ذہن رسا کی اولین تربیت تو پشاور یونیورسٹی سے ہوئی ہے۔ مگر ادبی استعداد اور زندگی کے تجربات انہوں نے برطانیہ کی حکیمانہ فضا سے حاصل کئے ہیں۔ وہ شاعر وادیب ہونے کے علاوہ ایک موقر سہ ماہی جریدہ "لبرٹی" کے مدیر ہیں۔ جو بہ یک وقت اردو وانگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ اور جس میں موصوف کی گفتار دلبرانہ انہیں فلسفی کے مقام پر فائز کرتی ہے۔ کئی انگریزی کتابوں کے مصنف ہونے کا شرف بھی انہیں حاصل ہے۔ برطانیہ کے ادبِ غریباں کی بزم میں اردو کی شمع فروزاں کرنے میں جن مبارک ہاتھوں کا دم بھرا جاسکتا ہے۔ اور جو لوگ وہاں اردو کی تجسیم میں Back- Bone کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں ایک نمایاں نام موصوف کا بھی ہے۔ یہ افسانوی و شعری مجموعہ اردو میں ان کی پہلی طبعزاد کتاب ہے۔ جس کا شعری حصہ ہی 228 صفحات پر محیط ہے۔ اس میں 63 نظمیں اور 89 غزلیں شامل ہیں۔

"نبضِ جہاں" کی شعری تشکیل میں ایک کلاسیکی معیار کا عمل دخل ہے۔ انور شیخ چونکہ پابند شاعری کو آزاد شاعری سے افضل سمجھتے ہیں (جس کا اظہار پیش لفظ میں کیا ہے) اور فن برائے فن کو بھی لغو تصور کرتے ہیں اس لئے ان کی تمام نظمیں روایات کی اسیر، پابندی کی پاسدار اور علامات سے گریزاں ہیں۔ ان میں داخلی عناصر کا دخل بہت کم اور خارجی کائنات وسیع ہے۔ اس خارجی کائنات میں مہیب رات کی سیاہی بھی ہے اور ماہ وانجم کی تابش بھی۔ "سکوت وغوغا" "نوحہ ونغمہ" "پھول اور کانٹا" جیسی نظموں میں شعور کی رو اس طرح کام کرتی ہے کہ شاعر کے سوچتے ہوئے ذہن پر بے ساختہ واہ کرنے کے لئے دل لپک اٹھتا ہے۔ دو نظموں کے بنیادی خیال دیکھئے اور غور کیجئے کہ کتنی اچھی پرواز ہے۔

(۱) کنواں اور دریا دونوں تشنہ لبی کے مدار ہیں لیکن دریا کو سائل کی انا کا پاس ہے اور اس کی فرد تنی اسے خود بڑھ کر صحراؤں کی سیرابی کا کار

خبر کرواتی ہے۔ جبکہ کنواں جود و سخا کی تصویر بنا بقدر ظرف تشنہ لبوں کا منتظر رہتا ہے۔

(ii) سکوت رمز دلکش سہی، مگر زندگی میں جب تک غوغانہ ہو اور وہ کشمکش حیات سے پیکار نہ کرے بقا کی منزل کو نہیں پاسکتی۔

ایسی ہی انفرادی فکر کی غماز کئی نظمیں ہیں جن کی اثر آفرینی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

انسان تلاش آب و دانہ میں جہاں بھی منتقل ہو جائے اپنی مٹی کی مہک اسے اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ شیخ بھی مغرب کی گلیمر بھری زندگی میں اسیر ہونے کے باوجود ''چناب'' ''سوہنی'' ''پشاور کی گلیاں'' اور مشرق کے لافانی عشقیہ کرداروں کو بھول نہیں پاتے ہیں۔ پرانی یادوں کی کسک انہیں مجروح کرتی ہے۔ وہ ''شیریں بیاں پروین'' کی شگفتہ بیانی میں کھو جاتے ہیں۔ ثریا کا خط انہیں دل شکستہ کر جاتا ہے۔ رومانوی مزاج اور جمالیات کی یہی فضا ''کاکل پیچاں'' ''شرمیلی مسکراہٹ'' ''وہ ہنسی اور پھول'' پیمان محبوب'' ''آخری پکنک'' اور ''آخری رقص'' میں چھائی رہتی ہے۔ یہ اثراتی نظمیں یہ باور کراتی ہیں کہ شاعر محبت کا بھی قدر دان ہے۔ اور اس کی فکر نے نوازی سے نابلد نہیں۔ اگر ساری نظمیں اسی قبیل کی ہوتیں تو اور کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی اور کوئی ''ادبی چنگیز'' نہیں بنتا۔

ادبی چنگیزی کا یہ حیران کن الزام دراصل ایک پیش بندی بلکہ نظر بندی ہے۔ شاید شاعر کو اپنی بیشتر تخلیقات اور اپنے فن کے بے نمک ہونے کا خود بھی اندازہ ہے۔ اپنے فن کے تئیں شاعر کا احساس کمتری آگے چل کر اور بھی کھل جاتا ہے۔ جب وہ یہ کلیہ پیش کرتا ہے کہ وہ ایک پردیسی شاعر ہے اور اسکے لئے فنی ولسانی کسوٹی پر پورا اترنا مشکل ہے۔

''ادبی چنگیزی'' کے لیبل کے پیش نظر ہونا تو یہی چاہئے تھا کہ میں عبرت پکڑتا، خاموشی کو اپنا شیوہ بناتا اور گوشۂ عافیت میں پڑا رہتا۔ لیکن برا ہو رگ مبصری کی ناقص حمیت اور معیار ادب کی دیانت داری کا جن کے زیر اثر خوب کے بعد ناخوب کی دیدہ ریزی سے کنارہ کش نہ ہو سکا۔ ہاں! ''پردیسی شاعر'' کی دہائی کے مدّ نظر میری کوشش یہی ہوگی کہ عروضی مسائل اور لسانی بحث سے احتراز کروں۔

نبض جہاں کے آخری صفحہ پر بطور تعارف کسی نامعلوم شخص نے لکھا ہے کہ

''انہوں نے (انور شیخ نے) اس بنا پر شاعری کو جزو حیات نہ بننے دیا کہ یہ شاعر کو بے عمل بنا دیتی ہے۔ لیکن ۱۹۹۳ء میں شعر گوئی کا غلبہ اس شدت سے بڑھا کہ وہ طوہاً و کرہاً اس کی لپیٹ میں آگئے''

اب سوچنے کی بات ہے کہ جو شخص ایک کاز کو خود بے توقیر سمجھ رہا ہو اور وجدان کے زیر اثر نہیں بلکہ وقتی جوش کے تحت طوہاً و کرہاً برت رہا ہو وہ اس کاز کے ساتھ کہاں تک انصاف کر سکتا ہے۔ شعور کی یہی ریا کاری لاشعوری طور پر فن کو فرد تر بناتی ہے۔ محنت شاقہ سے روکتی ہے اور مزرع ادب کو کشت ویراں میں بدل دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انور شیخ کی شاعری میں جدت و تازگی، تخلیقی ابہام اور زریں علائم کی کمی ہے۔ قاری تک اپنے خیال کی ترسیل کے لئے وہ یا تو کوئی کہانی لاتے ہیں یا مکالمات سے کام چلاتے ہیں۔

اسلوب اور آہنگ کے لحاظ سے نبض جہاں کی نظموں میں اقبال کے سائے لہراتے ہیں۔ اور یہی سائے انور شیخ کے لئے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ وارث علوی نے کہیں لکھا تھا کہ ''فن چونکہ تخلیقی عمل ہے اس لئے نقالی اس کے لئے پیغام موت ہے۔ شاعر اگر کسی قد آور شاعر کی نقل کرنے لگتا ہے تو اپنی آواز اور اپنا رنگ سخن تک پیدا نہیں کر سکتا اور ختم ہو جاتا ہے''۔ علاوہ بریں اب تو ہر ذی شعور اس بات پر متفق ہے کہ اقبال کی تقلید کرنا آنکھوں سے سرمہ چرانے کے مترادف ہے۔ اقبال کے پاس ایک مکمل نظام حیات کا نظریہ، پیغام میں غیر متزلزل دلیل، بے پناہ یقین اور ہمہ گیر تخلیقی توانائی تھی۔ جس کا احاطہ اب ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ پھر نبض جہاں کے شاعر کے پاس تو کوئی واضح پیغام بھی نہیں۔ بلکہ پراگندہ خیالی اور نفس کا فریب ہے۔ وہ حدیث دل کا شارح نہیں افادیت پسند دماغ کا ترجمان ہے۔ پُر درد احساسات کا مالک نہیں، تشدد پسندی کا مظہر ہے۔ اسے ظلم قابل نفرین نہیں لگتا بلکہ مظلوم کی خطائے بے کسی قابل گردن زدنی لگتی ہے۔ آپ شاعر کی شقاکی کا اندازہ ''مکالمۂ غالب و مغلوب'' ''بھیڑ اور بھیڑیا'' ''گدھ اور باز'' ''پیغام چنگیز'' جیسی نظموں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر بخوبی کر سکتے ہیں۔ باز کے کشت وخوں کی مدافعت میں کتنی خوبصورت تاویل ہے ملاحظہ ہو۔

خدا، خدا ہے اس لئے کہ صاحب مجال ہے
حرام ناتواں پہ جو، اور اس پہ سب حلال ہے

چنگیز کی جبروتی زبان سے شاعر کا ملکوتی خیال دیکھئے:

خدا جو خالق دوزخ، وہ خود ہی جارحیت ہے
عبادت کے وہی لائق، کہ جس میں جوش قوت ہے

الغرض فکری بے راہ روی کا شکار یہ آزاد قلم تمام اعلیٰ اقدار کا منظر نامہ بدل دینے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ اسے خدا مجنون خود ستائی اور انا الحق کا سودائی لگتا ہے۔ ابلیس کی بغاوت مستحسن لگتی ہے۔ اور وہ انا کا علمبردار قرار دیا جاتا ہے۔ نظم ''خودی'' اور ''جبریل و ابلیس'' انہی خیالات پر مبنی ہے۔

خدا بیزاری کا یہ لہجہ مادیت زدہ معاشرے کا عطیہ ہے۔ اس فکر کی کہر نصف صدی قبل تک بہت گہری تھی۔ اس مکتبۂ فکر کا بنیادی نقطۂ نظر ہے کہ وجود کے علاوہ ہر لا موجود شے خام خیالی ہے۔ اور وجود کی آسودگی کے لئے ہر فعل روا ہے۔ انور شیخ کی بیشتر نظمیں مثلاً "مکالمۂ عشق و عقل" "شاعر، دل اور خرد" یا "مشرقی و مغربی" اسی افادیت پسند ادب کی توسیع کرتی نظر آتی ہیں۔ ان نظموں کا مسلک یہ باور کراتا ہے کہ دل بہشتِ نشاط نہیں بلکہ سوزِ لاحاصل کا سبب ہے۔ نظام کائنات کا انحصار عقل پر ہے اور اسی کی پیروی تقاضۂ وقت ہے۔

شاعر کا ایذا رسانی کا منفی رویہ کسی متنفس کو بخشنے پر راضی نہیں۔ مولوی کی ذات تو خیر بدنام ہے۔ مرشد کا کردار شاعرانہ گرفت سے محفوظ تھا وہ کمی بھی انور شیخ کی بدولت پوری ہو گئی۔ ایک اچھا شاعر جب کسی ذات کی بے بصری پر طنز کرتا ہے تو اس کی بنیاد ٹھوس جواز پر رکھتا ہے۔ لیکن شیخ صاحب نے عظیم بیگ چغتائی کی طرح منبر و خانقاہ پر انگشت نمائی بطور فیشن کی ہے۔ نظم "اعجازِ مرشد" میں بظاہر جو گل افشانیاں ہیں بباطن ان سے شاعر اپنا عذرِ بے راہ روی پیش کر رہا ہے۔ جو فریبِ تسکینِ نفس کی کوشش ہے۔

کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اقبال ایک مطالعہ" میں اردو شاعری کو مغربی شاعری کے بحرِ خار کے مقابلے میں ایک چھوٹا چشمہ کہا ہے--- اس باعث اپنے ادب کا کوئی فرد جب اس بحرِ عقل گاہی کی موجوں سے بھی کھیلتا ہے۔ تو چشمہ کوتاہ کے تیراکوں کو یہ امید بندھ جاتی ہے کہ اب شناوری کے نت نئے فارمولے ملینگے۔ جس میں رچرڈس کے تجربے کی رنگینیاں، ایذرا پونڈ کی تمثال گری، ایلیٹ کی حیاتی بصیرت اور دانتے کے داخلی جذبوں کی تھر تھراہٹ ضم ہو گی۔ جس سے وہ اپنی آگہی کو بحرِ ذخار نہیں تو فرومایہ دریا ہی بنا سکیں گے۔ "نبضِ جہاں" کا مطالعہ بھی میں نے اسی تناظر میں شروع کیا تھا۔ لیکن یہ اردو ادب کی سیاہ بختی ہے کہ امواجِ فرنگ میں اپنے دست و پا کے خوب خوب جوہر دکھانے والے بھی اردو ادب کی آبجو کی شناوری میں بیرونی مشاہدوں کا احسان نہیں لیتے۔

انور شیخ ۴۰ برسوں سے برطانیہ میں مقیم ہیں ۴۰ سال پہلے انہوں نے پاکستانی نصاب میں جس رنگ سخن کو دیکھا تھا بزرگوں کی محفل میں جس شاعری کی گونج سنی تھی ان کے فکر و فن کی اساس اسی پر ہے۔ اور اسی سبب ان کی آواز میں ۸۰ سال قدیم شاعری کی بازگشت ہے۔

"نبض جہاں" کی غزلوں کا تجزیہ نہ کرنا ہی ان کی صحت کے لئے بہتر ہے۔ کتاب کی قیمت درج نہیں۔ شاید کتاب چیدہ چیدہ احباب کے لئے چھپی ہے۔ کتاب کے نثری حصہ پر میں رائے نہیں دوں گا کیونکہ میں نثر پر نہیں لکھتا۔

غزل

اتنی وحشت میرے بکھرے ہوئے جذبات میں ہے
ایسا لگتا ہے تپش جیسے کہ برسات میں ہے

زہر بھی قند ہے قسمت سے اگر ہم کو ملے
اصل تاثیر تو گلرنگ ترے ہات میں ہے

اوج تقدیر۔ ترے سامنے جھک کر رہنا
سخت ناداں جو کہے لطف مساوات میں ہے

منحصر اپنی ہی فطرت پہ بصیرت سب کی
باز کو دن میں جو الّو کو وہی رات میں ہے

ہم نے مانا کہ حقیقت سی کوئی چیز نہیں
بات کچھ اور ہی بیتابیٔ جذبات میں ہے

اب یقین آنے لگا ہم بھی ہیں عاشق انورؔ
کچھ کہیں لطف وہی ان کی تو ہر بات میں ہے

انور شیخ کی شاعری سے ارضیت کا رشتہ

رئیس الدین رئیس
۱۷۲۵/۱۰/۱۰، دہلی گیٹ علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

انور شیخ ایک باکمال شاعر ہی نہیں ایک باکمال افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعری کی نئی صنف "تکونی" کے موجد بھی ہیں۔ انور شیخ اپنی انفرادیت اور طرزِ بیان کے اعتبار سے ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ صرف زندگی کے بت دل نواز کی روحانی اداؤں کے قتیل نہیں بلکہ ان پر جدید دور کے انسان کی مجروح و پیچیدہ شکستگی کا گہرا اثر ہے اور ان کے اشعار غزل و نظم کے اندر تجرباتِ زندگی کی گہری معنویت پوشیدہ ہے۔ یہ معنویت انکی غزلوں نظموں ہی میں نہیں بلکہ ہر دیگر صنف شاعری میں پائی جاتی ہے جس میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

انور شیخ کا اپنا لب و لہجہ، انفرادیت، بانکپن، جدت اور حسن بیان کے ساتھ اپنا ڈکشن ہے اور اس ڈکشن کی بنیاد پر انور کی الگ شناخت قائم ہوئی ہے ان کی شاعری اور افسانہ نگاری میں ایک آفاقیت ہے جو قابل قدر ہے۔ انہوں نے اپنے افکار میں تخیلی تفکر، نظریاتی میلان اور عصری حقیقت کی بھی آمیزش کر کے نئی نئی جہتوں کو جنم دیا ہے۔ ان کا کلام شعری محاسن کا ایک خوبصورت پیکر ہے جو قاری اور سامع کے ذہن اور دل کو فرحت اور روح کو بالیدگی سے ہمکنار کرتا ہے۔

انور شعر کے حسن و قبح سے بخوبی واقف ہیں۔ جہاں تک ان کی شاعری کا سوال ہے انہوں نے کئی اصناف کو بہت حسن و خوبی سے برتا ہے۔ مکالماتی نظموں میں گہرے جذبات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے پر انہیں مہارت حاصل ہے۔ وہ سیدھی سادی واضح شاعری کرتے ہیں۔ زمین پر رہکر آسمان کی باتیں نہیں کرتے۔ بھاری بھرکم تراکیب سے اشعار کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ غزلوں میں انہوں نے شاعری کے گوناگوں موضوعات یعنی عشقیہ جذبات، دورِ حاضر کی سیاسی و سماجی فلسفیانہ تخیلات وغیرہ مضامین پر سبق آموز اور دیدہ ریز اشعار پیش کئے ہیں۔ انور فطرت کی شاعری میں زیادہ کامیاب ہیں۔ وہ غزل کی روایات کو پختگی اور سلیقے سے برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ پختگی اور معنوی خوبی ان نظموں غزلوں اور نئی صنف سخن تکونی میں ملتی ہے جن میں وہ محرومیوں مایوسیوں اور معاشرتی نظام کے خلاف حوصلہ اور ہمت عطا کرتے ہیں اپنی نظموں میں وہ عصری زندگی کی پیچیدہ اور بیمار کیفیات کو سمیٹ لینے پر قادر ہیں۔ احساسِ زندگی اور جذبے کی نرم لہروں نے انور کے شعروں کو فکری بالیدگی عطا کر کے پر کشش اور فکر انگیز بنادیا ہے۔

شاعری کا معیار ادب کی مخصوص قدریں ہیں۔ بنیادی اقدار سے میری مراد معاشرے کا اجتماعی اندازِ نگاہ ہے۔ غزل کے محدود صنف سخن ہونے کے باوجود اس میں وسیع امکانات ہیں مگر ابتدا ہی سے ہماری زبان کی نشو و نما کچھ اس ڈھب سے ہوئی کہ وہ اپنے مآخذ سے دور ہوتی گئی اور ایک غیر فطری عمل سے اس تمام تمدنی پس منظر سے محروم ہو گئی جس کی وہ جائز حقدار ہو سکتی تھی۔ الفاظ کے ذریعہ ہم کسی قوم کی تہذیب و معاشرے اور عقائد و رسوم کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ زیادہ شعرا نے سامنے کی چیزوں کو نہیں دیکھا۔ انہوں نے زمینی چیزوں سے رشتہ نہیں جوڑا۔ مگر انور جانی پہچانی چیزوں سے اپنا رشتہ اسطرح ملاتے ہیں کہ اس ارضیت کیوجہ سے ہندوستانی و پاکستانی جذبات و احساسات کو جسم ملتا ہے اور ان سے علامات کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ارضیت تو اردو گیتوں میں ہمیشہ رہی مگر غزل گو شعرا نے اسے نہ چھونے والی چیز سمجھا اور ارضیت سے بیگانگی اختیار کر لی اور اسطرح ہم اپنی دھرتی و آسمان سے دور ہو گئے۔ اردو غزل میں جہاں نورتی مارگ پر چلنے والے شاعر ہیں وہاں پرورتی کے راستے کے رہرو بھی ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو کائنات کے ایک ایک ذرے سے اکتساب کرنا جانتے ہیں۔ انور شیخ ایسے ہی شاعر ہیں جو پرورتی کے راستے کے رہرو ہیں۔ یہ ارضیت ان کی غزلوں ہی میں نہیں انکی نظموں میں بھی ملتی جلتی ہے۔

اگر ایک شاعر عالم رنگ و بو سے گزر کر فلسفہ اور حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ، مذہب کے اسرار و رموز اور مراحلِ سلوک عرفان کی کیفیات مجرد اسی ترنم اسی جدتِ بیان اور اسی حسنِ مصوری کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اسکی شاعری سحر سے گزر کر اعجاز بن جاتی ہے انور میں بصیرت، تاثر اور قوت تینوں کا اجتماع ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ اتنی تیز ہے کہ وہ دقیق نکتوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ احساس اتنا لطیف ہے کہ وہ غیر مادی حقائق سے بھی لذت اندوز ہوتے ہیں اور قوت بیان ایسی کہ عرفان و ذوق کی اس مجموعی کیفیت کی تصویر ایک نئے انداز کے ساتھ شعر کے نغمۂ موزوں میں کھینچ کر دوسروں کو بھی لذت اندوز کر دیتے ہیں۔

بقیہ صفحہ ۲۳ پر

انور شیخ کا "سوز و ساز"

ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

"سوز و ساز" انور شیخ کا دوسرا نثری اور شعری مجموعہ ہے۔ شعری حصہ میں غزلیں۔ مکالمے اور نظمیں ہیں۔ اور نثری حصہ میں انسانے۔ کتاب کے پیش لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انور شیخ اچھا تنقیدی ذہن رکھتے ہیں۔ انور شیخ غزل کو اس کے معنوی حصار یعنی "حکایت بایار گفتن" تک ہی محدود رکھکر اس میں گلکاریوں اور رنگ آمیزیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس طرح غزل گوئی کی روایت کا بھرپور لحاظ ان کے یہاں ملتا ہے۔ انکی غزلیں حسن زبان و بیان اور لفظیات کے بر محل استعمال سے آراستہ ہیں۔ جذبات میں تازگی اور خیال میں گہرائی ہے۔ اسکے ساتھ حسن و عشق کے کیف آگیں احساسات۔ شباب کے رومانی اور مسرور کن لمحات۔ ہجر و فراق کی کسک۔ رمز و ایما کی لطافتوں سے مزین غزلیں لکھنا ان کا امتیازی وصف ہے۔ اشعار میں آبشاروں کی سی نغمگی کا دل موہ لینے والا احساس بھی ہے۔ انور شیخ عموماً چھوٹی بحروں میں مختصر غزلیں لکھتے ہیں۔ انکے بعض اشعار ضرب المثل بن سکتے ہیں ان کے مزاج کی مزاحیہ کیفیت کا رنگ واضح طور سے ان کی غزلوں میں جھلکتا ہے۔ مزاح کے ساتھ اگر طنز بھی شامل کرتے ہیں تو یہ تہذیب جدید کی تلخ حقیقت اور برہنہ تصویر بن جاتی ہے مثلاً

کوئی اعجاز سیاست یا خدا کی شان ہے
جو کہ تھا شیطانِ ماضی آج کا رحمان ہے

انور شیخ کا شباب نہیں رہا لیکن انکی غزلیں پوری طرح جوان ہیں۔ اس بات کے وہ خود معترف ہیں ۔

جوانی کی پرسوز یادوں سے پیری
میں ہے ولولوں کی وہی تاز دیکھو

انور شیخ مکالماتی نظمیں لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ عموماً اس طرح کی نظمیں۔ سماجی اخلاقی۔ معاشرتی اور نفسیاتی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ جن میں وہ دو متضاد شخصیات و نظریات۔ کیفیات و حالات کا تجزیہ بڑے اچھے ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ ان میں ان کا شعور، وجدان اور نظریہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مکالموں میں اس حد تک صاف گوئی اور بے باکی ان کی پاک باطنی کی مظہر ہے۔ "شریف زادہ اور بیسواں" میں سفید پوشی میں غلطان اس سیاہی کو اجاگر کیا ہے۔ جس نے انسانی کردار پر سوالیہ نشان لگادیا ہے۔ اسی طرح تمثیلچے نظم کرنے میں بھی انور شیخ کو زبردست فوقیت حاصل ہے۔ "شیطان و یزداں" حالانکہ اقبال کی نظم "جبریل وابلیس" کے طرز پر لکھی گئی ہے لیکن اسے اقبال کی خوشہ چینی کہنا درست نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اقبال سے بے حد متاثر ہیں۔ اس لئے ان کو مذکورہ بالا اقبال کی نظم سے تحریک ملی ہو یہ ممکن ہے۔

انور شیخ کا مطالعہ نہایت وسیع اور نگاہ دور رس ہے۔ بیانیہ کی اچھی صلاحیت کی بنا پر معمولی سے عنوان پر بے محابا لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں چنانچہ ان کا سارا ملکۂ شاعری ان کی نظموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ نظم "اردو کی فریاد" "میں اردو کی زبوں حالی اور اس کے غیر یقینی مستقبل پر روشنی ڈالتے ہوئے نہایت دیانت سے ان شاطروں کا پردہ فاش کیا ہے۔ جنہوں نے اردو کو اس کے گھر میں بے گھر کردیا ہے۔

آلہ تجھے بنا دیا مذہب کے شاطروں نے
جن کا ہے دیں فروشی اک مشغلۂ کاری

"ماضی، حال اور مستقبل" میں تینوں کے حسن و قبح کی اچھی بحث ہے۔ جبکہ "عرب اور عجم" میں ان کا انداز حد سے متجاوز ہے۔ حکم خدا اور فرمان رسول میں تاویلات کی گنجائش نہیں ہے۔ اس موقع پر یہ بحث غیر ضروری اور بے محل ہے اس لئے اس سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔ "مردانہ فوقیت" کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کا واقعاتی پہلو عہد حاضر کے سماج میں مل جاتا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ الفاظ قرآن **الرجال قوامون علی النساء** کی غلط تاویل طبقۂ مرد نے اپنے سرور نفس اور جنسی تسکین کی خاطر گڑھ لی ہے۔ "دام تاویل" میں بھی اس کا خوبصورت بیان ہے۔ "نبض جہاں" میں "اعجاز مرشد" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے جس میں اک لاولد خاتون اولاد کی خواہش میں اپنے مرشد کے گھناونے اور حیا سوز اعجاز کی شکار ہو جاتی ہے۔ "بھنڈارا" اسی قبیل کی نظم ہے۔ اس میں ایک مغربی دوشیزہ ثریا فقیر الدین نامی پیر فرتوت کے دام ہوس میں پھنس کر اپنی آبرو گنوا بیٹھتی ہے۔ اسلوب بیان دلچسپ اور فطری ہے۔ قصے میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے زبان صاف و سادہ اور برجستہ ہے۔ سوز و ساز کا اہم حصہ اس کے انسانے ہیں جن میں مزاح اور طنز کے وسیلے

بقیہ صفحہ ۲۳ پر

"سوز و ساز" کی غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی
راہی منزل ۱۳۵۔ بی
فتح پور (یو۔ پی) 212601

انور شیخ کا شمار بے حد ذہین، فعال اور کثیر الجہات ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ سوز و ساز، انور شیخ کا دوسرا شعری وافسانوی مجموعہ ہے جو صوری اور معنوی لحاظ سے داد و تحسین کا مستحق ہے۔ اس کے شعری و افسانوی ابواب میں مصنف نے مختلف اصناف سخن، بالخصوص غزل کے متعلق مدلل، فکر انگیز اور کار آمد گفتگو کی ہے۔ میرا یہ مضمون 'سوز و ساز' کی غزلوں کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

انور شیخ نے واضح کیا ہے کہ وہ غزل میں روائتی شاعر صرف اس لئے ہیں کہ غزل میں محبت کی ایک دیرینہ روایت ہے اور صرف ایسے شاعر اور نقاد ہی اس حسین روایت سے انحراف اور روگردانی کرتے ہیں جو رسم محبت کو سمجھنے اور نبھانے کی صلاحیت اور سلیقہ نہیں رکھتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 'سوز و ساز' کی غزلوں میں جمالیاتی رویہ بہت ٹھوس اور واضح ہے ان میں بنیادی طور پر روحانی جذبات کے ارتعاش کی کار فرمائی ہے، لہجے میں پیار کے آہنگ کی نرمی، شگفتگی اور تازگی ہے، اظہار میں سادگی اور دلآویزی ہے، اور حسن و عشق کے معاملات کو کیف واثر رکھنے والی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ کلاسکیت انور شیخ کی رگ و پے میں ہے، اظہار کی بے ساختگی نے اشعار میں ایک قسم کی کھٹک، کسک اور نشتریت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ روایت کی گل کاری اور جذبے کی رنگا رنگی کے امتزاج سے غزلوں میں ایک طرح کی کشش اور امتیازی شان در آئی ہے۔ ایسے اشعار میں الفاظ کی در و بست، ابہام اور پہلوداری کی خوبیاں قاری کو فوراً متوجہ کرتی ہیں، ان میں داستان حسن و عشق اور آرائش خم کاکل کے ساتھ اندیشہ ہائے دور دراز بھی صاف نظر آتے ہیں۔

تری سرگوشیوں سے کوئی خوش تر
زمانے میں بھلا آواز کیا ہے

ملے مجھ کو سکونِ دل تو کیسے
ترا الجھا ہوا طرزِ بیاں ہے

حسنِ فانی پرستش کے لائق نہیں
ہم پجاری سہی تم خدا مت بنو

کیا سنواریں گے تیری زلفوں کو
اپنی بگڑی تو ہم بنا نہ سکے

حقیقت ہے مجھے معلوم گرچہ
تری باتوں میں آنا چاہتا ہوں

ہمیشہ ہی رہا ارماں مجھے خلوت نشینی کا
ملی جب نرم تنہائی تری یادوں نے آگھیرا

جیسے شکستہ چھت ہو مری داستانِ غم
قطرے کے بعد قطرہ ٹپکتا چلا گیا

انور شیخ کی رائے میں غزل میں عشق و محبت کو اولیت اور فوقیت حاصل ہے، جو نسوانی سوز کا جزو لازم ہے، ہر چند کہ غزل غم عشق کے ساتھ ساتھ آلامِ روزگار کی بھی نمائندگی کرتی ہے، مگر انور شیخ کے نظریئے کے مطابق غزل کو سیاسی، مذہبی اور سماجی تصورات کا آلہ کار بنانے والے غزل کے دوست نہیں ہیں، ان کا مشورہ ہے کہ اس مدعا کی تکمیل کے لئے بہتر ہے کہ شاعر دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرے۔ حالانکہ سوز و ساز کی غزلیں شاعر کے نظریاتی کناروں کو یہاں وہاں توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں، ان میں خود تردیدی اور خود تنسیخ کا عمل صاف جھلکتا ہے مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ ان غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ اور نئے احساس کی فرمائی بھرپور شعریت کے ساتھ ملتی ہے۔ یہ غزلیں ہماری مشترکہ تہذیب کی روحانی، سماجی اور جمالیاتی حیثیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس میں روائتی علامتوں اور تشبیہوں کو آج کے بنیادی احساسات سے جوڑنے کی کوشش شاعر کے تخلیقی عمل کا فطری نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ 'سوز و ساز' میں کلاسکیت سے مربوط روایات کی پاسداری غزل کی طے شدہ زبان میں کی گئی ہے۔ ان غزلوں کی تہہ میں ایک سنجیدہ، متحرک، ادراک اور قوت سے بھرپور تخلیق کار سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ 'سوز و ساز' کی نمائندہ غزلوں کا مزاج ان کی فضا شائستگی اور اعتدال ساتھ ہی لطیف طنز کی کاٹ اچھی غزل کا ذوق رکھنے والوں کی توجہ منعطف کئے بغیر نہیں رہتی۔ اس قبیل کے اشعار میں کشش کے کوندے سے لپکتے ہیں جو دل کو بھی چھوتے ہیں، فکر کو بھی انگیخت کرتے ہیں۔

ـ جو دیکھا دل ہے ڈوبا آنسوؤں میں
وہ آئے آگ پانی میں لگانے

ـ زندگی ہیر پھیر سانسوں کا
تُوہ کچھ اسکی ہم لگا نہ سکے

ـ جو دھوئے خود کو اپنے آنسوؤں سے
ضروری کیا وہ گنگا میں نہائے

ـ تمہارے تجربے تم کو مبارک
میں خود کو آزمانا چاہتا ہوں

ـ اگرچہ اک مذاق بیکسی تھا
یہ کیا کم ہے وہ ہم پر مسکرائے

ـ گرچہ تو کافر ادا ایماں شکن ننگِ وفا
پھر بھی اے کفرِ مجسم تو مرا ایمان ہے

انور شیخ نے ایک فطری اور ہوش مند تخلیق کار کی طرح اپنے گرد و پیش کے مسائل کے اظہار و اصلاح کے لئے مبلغ اور ناصح کے بجائے شاعر کا رول ادا کیا ہے۔ ایسے اشعار میں حیات و کائنات کے زریں حقائق اور معنویت تک رسائی حاصل کرنے کی جد و جہد زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احساس و ادراک، انسان دوستی، عقیدوں پر طنز و استہزاء ماحول کی سخت گیری اور گھٹن کی فضا سے باہر نکلنے کی تڑپ اور حقائقِ حیات سے مفاہمت کے بجائے حوصلہ مندی کے ساتھ مزاحمت اور ستیزہ کاری کا عمل فنی نظم و ضبط کے ساتھ ملتا ہے ـ

جہاں کیا ہے؟ کبھی تو نے اس پہ غور کیا
ترا جہان تری وسعتِ نظر ہی تو ہے

ـ خود کو جب پرکھا تو سمجھے ہم بھی اسرار وجود
خود میں کھو کر خود کو پالینا ہے اصل زندگی

ـ مت پوچھ کہ جو فرق ہے نیکی و بدی میں
اچھا ہے وہی جس پہ بھی آجائے مرا دل

کچھ لطف نہیں ملتا اسے بحرِ سکوں میں
ہر لحظہ چٹانوں سے ہی ٹکرائے مرا دل

انور یہ گر اتنا برا ہے تو بتا کیوں
اللہ کو سکونت کے لئے بھائے مرا دل

انور شیخ کی غزلوں میں اساطیری کردار آج کے دور پر آشوب سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یہ کردار عصری تناظر میں اپنی معنویت اور افادیت کا احساس دلاتے ہیں ـ

تاریکی میں کیا ڈھونڈ رہا ہے مرے گھر میں
اے چور! مجھے کچھ نہ ملا دن میں یہاں سے

جل سکا چراغِ دل کب کسی کے نور سے
ہم گئے ملا نہ کچھ پر ضیائے طور سے

بُت رہیں جس کے منتظر انور
وہ تو کعبہ میں سر جھکا نہ سکے

'سوز و ساز' کی غزلوں میں زاہد مُلا اور ناصح سے روایتی چھیڑ چھاڑ اور اللہ میاں سے تخاطب کی دلچسپ مثالیں بھی جا بجا ملتی ہیں ـ

زاہد تو پی کے دیکھ مزہ جو خمار میں
پاؤں زمیں پہ سر ہے مگر آسمان پر

پیئو خود اگر تو گناہِ عظیم
پلائیں جو حوریں تو ہے یہ ثواب

یہ شان بے نیازی ہے کہ اک طرز گدائی ہے
خدایا ہر گھڑی مانگے جو تو سجدوں کا نذرانہ

'سوز و ساز' میں ایسے اشعار بھی کم نہیں جو شاعر کے فلسفۂ تقدیر کے قائل ہونے پر دلالت کرتے ہیں ـ

جس کے نصیب میں ہوں لکھی کامرانیاں
پڑتا ہے اس کا تیر لپک کر نشان پر

گرچہ ستم سہے پہ شکاری نہ بن سکا
ٹوٹا وہ تیر جو چڑھا میری کمان پر

نہ ہو جس کے مقدر میں تبسم
ہنساؤ تو اسے رونا ہی آئے

بادِ ستم نے ڈھونڈا جس سمت بھی چلے ہم
دیکھی ہے شمع قسمت ہم نے جلا جلا کے

'سوز و ساز' کی غزلیں مردف ہوں یا غیر مردف ان میں غنائیت بھی ہے اور رمز و ایماء بھی۔ تلازمے اشارے اور رموز از کار رفتہ ضرور ہیں، مگر ان کے استعمال میں فنی کاریگری اور جذبے کی آمیزش ہے۔ انور شیخ زبان و بیان کے رموز و نکات سے واقف ہی نہیں ان پر قادر بھی ہیں۔ انہوں نے غزل کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے، ان کی غزلیں روایتی غزل کی زبان اور اسلوب سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں، ساتھ ہی اپنے دور کی جمالیات اور زندگی کے حقائق کو جذبے کی

گرمی، گداختگی، حزنیہ کیفیت اور لطافت کے ساتھ مخصوص آہنگ میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

چھپ گئی اپنی گردِ راہ میں جو
کس طرح پاؤں گا میں وہ منزل

زندگی جب سے بنی ایک وبال خاطر
ہم کو ملتے ہی وہ جینے کی دعا دیتے ہیں

تیرا احساں بھی ایک عداوت ہے
بوجھ سے ہم جو سر اٹھا نہ سکے

سہانے خواب کی تعبیر تم سے کیوں پوچھوں
یہ بلبلہ ہے اسے چھیڑ کر ملے گا کیا

ضرورت ہو تو کہتے ہیں کہ میرے دیوتا تم ہو
ضرورت جب نہ ہو کہتے ہیں میری خاک پا تم ہو

یہ جرم غریبی ہے کتنا بھیانک
غضب ہے کہ تم ہمکو انساں نہ سمجھو

تغیر پہ قائم ثباتِ جہاں
بدل پر قرینے سے ناداں بدل

گیند جیسے ہیں، نہ سمجھیں وہ ہماری فطرت
اور اچھلیں گے ہمیں جتنا دبانا چاہیں

'سوز و ساز' کی لفظیات ان کا لہجہ ان کا اسلوب ان کے علائم اور ان کے حسی و بصری پیکر الگ سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ ان میں ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی سطح پر غزل کی روایات کے تحفظ کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ انور شیخ کے تجربوں اور مشاہدوں میں تھکا دینے والی یکسانیت کے بجائے رنگارنگی اور زندگی کے حسن کا بھرپور احساس ہے۔ ندرت خیالی، لطافت احساس، حسن بیاں، سلاست، روانی، برجستگی، بے ساختہ اور نوکیلا پن تنوع اور معنی آفرینی جیسے محاسن سے مملو ان غزلوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ثقیل، کثیف اور نامانوس لفظیات مبہم تراکیب، ناہموار انداز بیاں تصنع اور فیشن زدگی سے آلودہ نہیں ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ''نبض جہاں'' کے بعد ''سوز و ساز'' کی غزلوں میں انور شیخ نے اپنا تخلیقی سفر نئی فکری وسعت اور جامعیت کے ساتھ طے کیا ہے۔ 'سوز و ساز' سے انور شیخ کا شعری کردار مزید نمایاں اور مستحکم ہوا ہے۔

بقیہ ''انور شیخ کی شاعری سے ارضیت کا رشتہ

اپنی ایجاد کردہ نئی صنف تکونی میں بھی انہوں نے نئے نئے تجربات کئے ہیں۔ آٹھ آٹھ مصرعوں کی اس تکونی میں افسانوں اور ڈراموں کا ایک جہان آباد کیا ہے۔ آگ اور پانی، مسافر اور منزل، فریادی اور مصنف، جدید دوست، شاد و ناشاد، برہمچاری اور شیخ، سوہنی مہیوال، وغیرہ وغیرہ بڑی مکمل اور کامیاب تکونیاں ہیں۔ امید ہے کہ دیگر شعرا بھی اس صنف کو اپنائیں گے اور اپنا رہے ہیں۔

بقیہ انور شیخ کا ''سوز و ساز''

سے سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی ناہمواریوں اور ان میں ملوث افراد کو ہدف ملامت بنا کر انور شیخ نے اپنی بیزاریوں کا اظہار کھل کر کیا ہے۔ ''ملاوہ پیازہ'' میں پاکستان میں سسکتی اور دم توڑتی انسانیت اور لاقانونیت کا بھرم کھولا ہے۔ ''اونٹنی میں ''صوفیانہ مسلک، خانقاہوں، مرشدوں اور پیرزادگان کی ہر قسم کی بداطواریوں کو مباح کر لینے کی قبیحہ حرکات ان کی شعبدہ بازیوں اور جنسی بے راہ رویوں کو بڑے لطیف پیرائے میں بے کم و کاست طشت از بام کیا ہے۔

نظموں اور افسانوں کے حوالے سے سوز و ساز، سماجی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی زبوں حالی پر انور شیخ کے سوز دروں کا اظہار ہے اور غزلوں کے حوالے سے رومانی فضاؤں، شباب، جمالیات اور لذت وصل کے دل خوش کن ساز کا پرتو بھی۔ سوز و ساز ایک صحتمند تعمیری نوع کی تخلیق ہے اور اس اعتبار سے انور شیخ کے ادبی اور لسانی مرتبہ کی سند بھی۔

ماہنامہ انشاء کا

اسکنڈے نیویائی ادب نمبر

۶۲۴ صفحات

قیمت : اندرون ملک ۳۰۰ روپے۔

بیرونِ ملک ۳۰ امریکی ڈالر

دانا ٠ں ناداں سے نہیں پیار بڑھاتے
جو بات ہو دل کی وہ زباں پر نہیں لاتے

جب وقت نے للکارا تو کچھ کر نہ سکے ہم
گذرا تو کہا "کاش کہ ہم داؤ لگاتے"

جاں بازی و دلسوزی سے ہو جن کو محبت
اُن کو ہیں نئے موڑ عقیدت سے لاتے

یا رب یہ کرم یا کوئی ہنگامۂ قسمت
آتے نہ تھے، اب آئے تو واپس نہیں جاتے

سوتا ہوں شب و روز انہیں کھونے کے ڈر سے
شرمیلے ہیں۔ ملنا ہو تو سپنوں میں ہیں آتے

"ہم ایک سے ہیں" کہنے لگے بت یہ خدا سے
"تیری ہی طرح ہم بھی ہیں لوگوں کو رُلاتے"

نادان ہو انور جو کرو ان کو نصیحت
دانا کبھی اندھوں کو ہیں آئینہ دکھاتے؟

غزل

بہت مڑ مڑ کے دیکھا پر نہ رکنے کی اشارت دی
ندامت! شکریہ تیرا۔ مجھے چلنے کی جرأت دی

خدایا صاف کہہ دے "پھر نہ ہم سے التجا کرنا"
دعا مانگی تھی رحمت کی۔ مگر بدلے میں زحمت دی

ستانا۔ ورغلانا۔ روٹھ جانا۔ ڈانٹنا ہر دم
اسے تو نے بتا خالق! یہ کیا طرزِ محبت دی

نہیں پرخاش نیکی سے۔ حقیقت ہے مگر یا رب
جہاں نے جب بھی دی مجھ کو گناہوں کی ہی فرصت دی

زلیخا کی محبت تھی کمالِ یوسفی انور
زلیخاؤں نے ہم کو تو فقط پستی کی دعوت دی

لا دوا کی زندگی فریادِ پیہم ہی تو ہے
ہر دعا بھی اس کو جیسے ایک مرہم ہی تو ہے

مسکرانا غم میں تو رمزِ نشاطِ زندگی
ہر نفس ناآشنا کا ایک ماتم ہی تو ہے

جس سے وابستہ زمانے میں سکوں کی جستجو
ہم نشیں سوچے اگر تو غور سے غم ہی تو ہے

جو بڑا ہو درحقیقت اس کو ہے یہ آگہی
اس جہاں میں جو بھی کمتر، اس سے وہ کم ہی تو ہے

جب کوئی دریا کا دھارا موڑنے کی ٹھان لے
موج کی للکار اس کو ایک سرگم ہی تو ہے

اب تو سمجھا میں نے انور جادوئے تعویذِ پیر
زندگی کی آزمائش سے یہ اک رم ہی تو ہے

پیش کرتا ہوں نئی صنفِ سخن ''تکونی''

انور شیخ

میں ''تکونی'' کے عنوان سے ایک نئی صنف سخن پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جو اپنی ڈرامائی نوعیت کے سبب ہندی النسل یعنی بھارتی بھی ہے اور پاکستانی بھی۔ علاوہ ازیں اس کا دائرہ بیان اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر ایک موضوع پر خیال آرائی کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس میں طنز و مزاح کی بھی گنجائش ہے۔ تکونی کی اساس منطق اور سنجیدگی پر ہے۔

میں ''تروینی'' اور ''ترائیلے'' کے تصورات سے آگاہ ہوں۔ دونوں ہی قابل قدر ہیں لیکن صنفِ سخن ہونے کے اعتبار سے تکونی ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہ ایسا انداز بیان ہے جو ایک عدالتی ڈرامہ سے مشابہ ہے جس میں مدعی۔ مدعا علیہ اور منصف اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ تینوں رول شاعر ہی نبھاتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شاعرانہ مقام کو برقرار رکھتے ہوئے ایک پیشہ ور جج نظر نہ آئے۔ اسی لئے اسے تکونی میں ''مبصر'' کہا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی عدالت میں مخالفین جیسی شہادت پیش کرنا چاہیں اس کے مستحق ہیں۔ خواہ وہ عاقلانہ ہے ہو یا احمقانہ۔ لیکن اس کے باوجود اسے ایک ڈھونگ (FARCE) کا رنگ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تکونی کا بنیادی مقصد سنجیدہ مسائل پر پُر مغز بحث کرنا ہے۔ اور شاعر آخری بند میں اپنی متانت اور منطقی قوت سے یہ فریضہ ادا کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تکونی شاعر کی اپنی قوت فکر اور گہرائی نظر کی کسوٹی ہے اور وہ اس صنف سخن میں محض عروض و قافیہ اور لفاظی کے زور سے اپنی شاعری کا جادو نہیں جگا سکتا۔

تکونی میں کسی بحر کی قید نہیں۔ اس کے برعکس موضوع کی مناسبت سے بحر کا انتخاب۔ ایک کارِ احسن ہے۔ تکونی تین بندوں پر مشتمل ہے جسکا ہر بند چار اشعار تک محدود ہے۔ اس بندش کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف مدعی اور مدعا علیہ کو اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کا یکساں موقعہ دیا جائے بلکہ مبصر بھی اسی حد میں رہ کر اپنی رائے کا اظہار کرے تاکہ تکونی لفاظی کا شکار ہونے کے بجائے اپنی جامعیت اور نکتہ سنجی کو قائم رکھ سکے۔

مکالمہ ڈرامہ کی جان ہے جو برصغیر ہند کی ثقافتی روایات کا علمبردار ہے اور تکونی انہیں اقدار کی ڈرامائی پیش کش ہے۔ ڈرامہ کو اکثر مبالغہ اور غوغہ آرائی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ ہر اس حقیقت یا افسانہ کو جذباتی رنگ میں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے جو اس کا موضوع ہو۔ دراصل اس کا مقصد ہی ناظر یا قاری کے جذبات کو بھڑکا کر اپنے تاثر کو افزوں کرنا ہے۔ تھیٹر یا سینما میں لوگوں کا تالیاں بجانا، اشک بہانا اسی شدتِ جذبات کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کسی شعلہ بیان مقرر کی تقریر بھی اسی لئے موثر ہوتی ہے کہ اس کی آواز چہرے کی نمائش اور ہاتھوں کی حرکت میں وہی ڈرامائی انداز ہوتا ہے جو ایک ایکٹر یا ایکٹرس کی اداکاری میں ہوتا ہے۔

تکونی اپنی ڈرامائی نوعیت کے سبب ایسی ہی تاثیر کی خواہاں ہے لیکن عدالتی کاروائی سے مشابہ ہونے کے باعث عدل کی حامی ہے جس سے تعلّی کی روک تھام ممکن ہے۔ اس کی ساخت جو اسے تین بندوں تک محدود رکھتی ہے۔ اس کے پیغام کو مصنوعی جوش و خروش سے بچا کر منطقی طور پر اس طرح پیش کرنے کی آرزو مند ہے کہ اس کی جذباتی اپیل قاری کی قوتِ فکر کو دوبالا کرے نہ کہ اسے الّو کو باز کہنے کی ترغیب دے۔

تکونی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

گدھ اور شہباز

گدھ (شہباز سے)

تجھے جب بھوک لگتی ہے تو ظالم
جھپٹتا ہے تو ایسے بیکسوں پر

شہباز (گدھ سے)

تو مُردہ خور ہے۔ جانے یہ کیسے
کہ کیا ہے جلوۂ اندازِ شاہی

کہ جیسے حضرت شیطاں نے تجھ کو
کیا جلاد ہو اپنا مقرر
نہ ممکن ہے جس کی تسکیں۔ صید نو بن
یہ کیسی اشتہا ہے۔ اے ستمگر!
میں تیری ہی طرح ہوں ماس کھاتا
کسی کا خوں نہیں لیکن بہاتا

ہے باسی تو گدائی کی علامت
طعامِ گرم۔ شانِ کج کلاہی
مگرمچھ کا بنے اک تر نوالہ
ازل سے ہے یہی تقدیرِ ماہی
جو دیکھے صید کو باَنظرِ رحماں
شکاری بن سکے کیسے؟ وہ ناداں

مبصر

نحیفی اک مرض ایسا کہ جس کا
مداوا ہے فقط جادوئے طاقت
قوی کے سب دلائل کارگر ہیں
اساس ان کی گرچہ ہو حماقت
نہیں ممکن کبھی لاغر کو چاہے
جسے لاحق ہو سودائے حکومت
حیاتِ باز گرچہ اوجِ ہستی
مگر خونِ غریباں۔ رازِ پستی

اس تکونی میں گدھ اپنی کم تری کو برتری ظاہر کرنے کے لئے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس لئے مُردہ خوری کا ارتکاب کرتا ہے کہ اسے قتل و غارت گوارا نہیں اور وہ اس بنا پر باز کو طعن و تشنیع کرتا ہے۔ اس کے برعکس باز خون خرابے کو شان کج کلاہی کا جزو لاینفک قرار دیتے ہوئے اس کے جواز کا اعلان کرتا ہے اور گدھ کو طبعاًمردہ خور ٹھہراتے ہوئے اس کی ریاکاری کا بھانڈا پھوڑتا ہے۔ مبصر کی نگاہ میں دوسرے پرندوں کی بدقسمتی کا سبب ان کی نحیفی ہے جس کا علاج صرف حصولِ طاقت سے ممکن ہے۔ اس کے خیال میں شاہین کا طرز حیات اوجِ زندگی ہے بشرطیکہ اس کی اساس خون غریباں پر نہ ہو... یہ تکونی سنجیدگی اور طنز کی ایک مثال ہے۔

اب ایک اور تکونی پر نظر ڈالتے ہیں جو شگفتگی۔ دل لگی اور مزاح سے آراستہ ہونے کے باوجود منطق اور سنجیدگی سے عاری نہیں:

شاعر اور بیوی

شاعر (بیوی سے)

خالقِ ہستی نے مجھ کو دولت جذبات دی
جو لٹاتا ہوں میں تجھ پہ روز و شب۔ اے جانِ من
تیرے چہرے کی ہیں جھریاں۔ جس طرح ناگن کے بل
میں انہیں باندھوں مگر ایسے کہ ہوں رشکِ چمن
میں تیری آواز کو کہتا ہوں ''شہنائی ہے یہ''

بیوی (شاعر سے)

شاعری کچھ بھی نہیں۔ یہ تو ہے اک دیوانگی
ایک شیخی۔ دل لگی۔ بیماریٔ قلب و دہن
مسلکِ شاعر تو ہے الفاظ کی جادوگری
نازنینوں کو فقط الّو بنانے کا یہ فن
ہے وہ پاگل جو کرے اخلاصِ شاعر پر یقیں

سن کے اسکو بھاگتے ہیں گرچہ سب زاغ و زغن
پھر بھی کیوں ہوتی نہیں و مائلِ بوس و کنار؟
آہ! اے بد ذوق۔ تجھ سے شاعری ہے شرمسار

انتہائے شاعری کہنا گدھے کو گلبدن
گد گداتے ہو مجھے تو جانتی ہوں جان من!
دل تمہارا تو کسی مہوش کی یادوں میں مگن

مبصّر

ہاں یہ مانا شاعری۔ الفاظ کی جادوگری — پھر بھی اس میں دل کی دھڑکن کا نہاں پیغام ہے
دل ہی کیا۔ ہے گونجتی اس میں ندائے ذوالجلال — گر کوئی الہام تو اک شاعری الہام ہے
ذکرِ خوباں۔ میکشی۔ تعریف، اصنامِ خیال — اصل میں یہ شاعری کا چہرۂ گلفام ہے

زندگی شاعر کی۔ ہائے حسرتوں سے چوُر ہے
خوابِ رنگین کے سہاروں پر بہت مجبور ہے

یہاں میاں (شاعر) اور بیوی کی نوک جھونک مزاحیہ انداز میں موجود ہے لیکن شاعر کی باطنی زندگی حسرتوں کا مجموعہ ہونے کے سبب اس کی حیاتِ ظاہری سے الگ ہے۔ اس کا ذکرِ خوباں۔ میکشی کی ڈینگیں اور خیالی محبوبوں کی مدحت سرائی ایسے ہی ہے جیسے لوہے کے زیور کی بدنمائی کو چھپانے کے لئے اس پر سونے کا ملمّع ہو۔ مبصّر کا فیصلہ یہ ہے کہ شاعر اپنی بدنصیبی کے باعث رنگین خوابوں کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔ اس کا مذاق اڑانا جائز نہیں۔

کوئی موضوع ہی کیوں نہ ہو تکونی کا دائرہ بیان سے باہر نہیں۔ یہ صنف سخن سیاست۔ معیشت۔ مذہب۔ عمرانیات۔ تاریخ۔ ونغمہ اور طنز مزاح سب کے لئے موزوں ہے لیکن اس کا محور تعمیر ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے میں نے (اپنی اس کتاب ''آگ اور پانی'' میں اس کے متعدد نمونے درج کئے ہیں۔ اگرچہ یہ صنفِ سخن آسان نہیں پھر بھی اس میں طبع آزمائی کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اردو شاعری محض وقت گزارنے کا ایک دلچسپ ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ افادیت کے فقدان کی وجہ سے یہ عملِ زندگی سے نہ صرف بے تعلق ہو گئی ہے بلکہ حیات قومی کے لئے زہر قاتل کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ غالباً اس کا بڑا سبب اس میں مذہبی عنصر کا غلبہ ہے۔

غزل

تھا ایسا ناز اپنی وفا اور آن پر — آمادہ ہر گھڑی ہی رہے امتحان پر
گرچہ ستم سہے پہ شکاری نہ بن سکا — ٹوٹا وہ تیر جو چڑھا میری کمان پر
زاہد تو پی کے دیکھ مزا جو خمار میں — پاؤں زمیں پہ۔ سر ہے مگر آسمان پر
اٹھیں ادب سے کیوں نہ نگاہیں جھکی ہوئی — جب مسکرا کے وہ چلیں شوخی کی تان پر
جس کے نصیب میں ہوں لکھی کامرانیاں — پڑتا ہے اس کا تیر بھٹک کر نشان پر
انوؔر نشیب میں نہیں جینے کا کچھ مزا
ہر لطف زندگی کا فقط ہے اٹھان پر

انور شیخ کا نیا منظوم تجربہ ''تکونی''

اطہر راز (لندن)

سر زمینِ ادب پر انور شیخ بارش کے قطرے کی مانند یکا یک ٹپکا نہیں ہے۔ بلکہ ادبی دنیا کے لق و دق صحرا کو گل و گلزار کی طرح معطر کرنے آیا ہے۔ اردو ادب میں اس کی موجودگی بقول حفیظ جالندھری ''یہ نصف صدی کا قصہ ہے''

انور شیخ افسانہ نگار، ناقدِ فن، اور نئی سمتوں کو تلاش کرنے والا شاعر بھی ہے۔ یہ شخص پنجابی، انگریزی اور اردو زبانوں پر نہ صرف عبور رکھتا ہے بلکہ ان تینوں زبانوں میں ادبی زبان میں اظہار کرنے کا اہل ہے۔ وہ شہرِ علم میں ماہرِ تاریخ، مذاہب، عالم کا عالم، ملاؤں کی ڈیڑھ اینٹ کی برائے نام مساجد کا باشعور ناقد، اپنے نظریات میں مخلص، دقیانوسی اقدار کا مفسر اور بعض کھوکھلی مذہبی بنیادوں کا بے باک شارح بھی ہے۔ اگر قلم کا دوسرا نام اسپِ تحریر یا کاغذی گھوڑا ہے تو صاحب قلم انور شیخ کا یہ ''قلم'' تشریح و تفسیر کی راہوں پر کبھی بے قابو نہیں ہوتا ہے۔

انور شیخ اہلِ نظر ہے اور اہلِ دل بھی ہے۔ دل آزادی سے اسے نفرت ہے۔ انسانیت سے اُنس اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ انسان دوستی کا شیدا اور اعلیٰ انسانی اقدار کا احترام اس کی تحریروں کا حسن ہے۔ وہ لوگ جو کائنات کی وسعتوں اور مشائے الٰہی کو سمجھنے کے نااہل ہیں فطرت کے اٹل اصولوں کو مانتے ہی نہیں اور قدرت مظاہر سے حیرت زدہ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کلام پاک کی زبان میں ''صمّ'' ''بکمّ'' کے معنوی مطالب سے بے خبر تھے اور آج بھی ہیں۔ مرزا غالب نے کہا تھا اور آج انور شیخ بھی کہہ رہا ہے۔

''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا''

وہ لوگ جو تحقیق کی نعمت سے محروم، حقائق سے ناآشنا، حقیقت کو سمجھنے سے قاصر اور حق و ناحق کی تفریق سے انجان ہیں وہ انور شیخ کے نظریات کو کبھی سمجھ نہیں سکتے۔

زیرِ نظر مضمون میں انور شیخ کے مختلف ادبی کارناموں میں سے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا ہے۔ اور یہ اردو ادب میں نیا تجربہ ہے جسے اس کے موجد انور شیخ نے ''تکونی'' کا نام دیا ہے۔

امیر خسرو ''کہہ مکرنی'' کے موجد ہیں۔ شیکسپیئر نے سانیٹ کو عام کیا۔ رامبو نے نثری شاعری کو بامِ شہرت تک پہنچایا۔ اردو ادب میں میراجی نے بحروں سے بغاوت کا علم بلند کیا۔ ''ثلاثی'' حمایت علی شاعر کی ایجاد ہے۔ محسن بھوپالی نے ''نظمانے'' کی داغ بیل ڈالی۔ اب مندرجہ بالا تجربات یا ایجادات کے بعد انور شیخ نے اردو شاعری کو ''تکونی'' سے آشنا کیا ہے۔ اور آج ''تکونی'' انور شیخ کے سرمایۂ فکر و فن کے منور گوشے میں اس کی تخلیقات کی نمائندہ ہے۔

تاریخ ادب میں نئے تجربے کو ہمعصر شعراء اور ناقدین اپنی زندگی میں جلد قبول نہیں کرتے۔ اور اگر ادبی ایجاد کو عوام قبول کر بھی لیتے ہیں تو ہمعصر شعراء اس کے خلاف کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کی اہمیت سے انکار کر کے اختلاف برائے اختلاف کی فضا میں حسدانہ چنگاریوں کو مزید ہوا دینے کے بعد بظاہر پُرسکون ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر شاعری میں ''نئے تجربے'' میں جان ہوتی ہے تو یہ مر نہیں جاتا۔

''تکونی'' نہ صرف انور شیخ کا انوکھا اور اہم تجربہ ہے بلکہ اس میں موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ آخری حصے میں ایک شاعر منصف کی حیثیت سے علم کی روشنی، حسنِ شعر، تخیل کی پرواز اور شاعرانہ لیاقت کا مظاہرہ کر کے ایک تخلیق کو منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اگر ایک شاعر اس میں کامیاب نہیں ہو پاتا تو تکونی محض بے جان نظم کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اب تک جو تکونیاں انور شیخ کے مجموعوں میں شاعرانہ آزمائش سے گزریں وہ ہوئی نمائش گاہِ ادب میں فرمائشِ وقت کا حصہ بن گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف اطہر راز اور مشہور شاعر ساحر شیوی تکونی کے پیمانے میں اپنے فن کو تولنے میں مصروف ہیں۔ ہماری کامیابی کا فیصلہ ہمارے ناقدین کے مقابلے میں عوام زیادہ بہتر طور پر کر پائیں گے۔

ساحر شیوی
مدیر "سفیر اردو" برطانیہ

انور شیخ افسانہ نویس اور مزاح نگار کی حیثیت سے

انور شیخ در حقیقت ایک فلسفی ہیں جو ایک منفرد نظام فکر اور نظریۂ الوہیت کے موجد ہونے کی وجہ سے نہ صرف عالمگیر شہرت کے مالک ہیں بلکہ ایک اور یجنل مفکر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر انہوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ اس میں مابعد الطبیعات۔ مذاہب عالم۔ قانون۔ اقتصادیات۔ اخلاق۔ منطق۔ تاریخ۔ ثقافت۔ سیاسیات وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ ان کی انگریزی تصنیف ETERNITY کو بین الاقوامی طور پر شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ ان تمام علوم میں انور شیخ نے انگریزی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ لیکن فنون لطیفہ یعنی شاعری اور افسانہ نگاری میں انہوں نے اردو زبان کو انگریزی پر ترجیح دی ہے۔ بقول شیخ انہوں نے یہ روش "برصغیر ہند کی سماجی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے اختیار کی"

جس طرح ان کے مذہبی اور فلسفیانہ افکار عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری دیگر اردو فنکاروں سے بالکل مختلف ہے۔ بعض دانشور کہتے ہیں کہ انور شیخ کا افسانہ افسانہ نہیں، بلکہ انشائیہ ہے۔ یہ محض قیاس آرائی ہے جو اس لئے درست نہیں کہ وہ انور شیخ کے فن افسانہ نگاری اور اس کے بنیادی اصولوں سے نا آشنا ہیں۔

انور شیخ فن افسانہ نگاری میں نہ صرف ایک نئی طرز کے موجد ہیں۔ بلکہ ان کے فنی اصولوں پر مبنی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ افسانہ نویسی ایک ایسی پیچیدہ اور بلند پایہ صنف ادب ہے جو ہر ادیب کے بس کا روگ نہیں۔ انور شیخ نے فن افسانہ نگاری کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا ہے۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ ان کے طنز و مزاح کے ہنر پر کامل دسترس ہے۔ جس سے قاری کو محسوس ہونے لگتا ہے، کہ زندگی تلخیوں کو خندہ پیشانی سے گوارا کرنے کا نام ہے۔

۹۸-۱۹۹۷ء ان دو برسوں میں انور شیخ کے دو مجموعے نبض جہاں اور سوز و ساز نظم و نثر پر مشتمل شائع ہو چکے ہیں۔ اور اہل ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں کو انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ نظم کا اور دوسرا باب نثر کا۔ حصۂ نظم میں غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں ان کے افسانے ہیں۔ دونوں مجموعوں کے دیباچے بھی ان کے زور قلم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انہیں اپنے قلم پر اس قدر یقین اور اعتماد ہے کہ انہوں نے کسی نقاد فن سے پیش لفظ تحریر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ دیباچے پڑھکر قارئین موصوف کی ناقدانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان دیباچوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انور شیخ بیک وقت۔ شاعر، افسانہ نگار، مزاح نگار ایک اچھے ناقد اور مفکر بھی ہیں۔ ہر اعتبار سے یہ دونوں مجموعے ظاہری و باطنی حسن سے مالا مال ہیں اور ان سے افکار نو کی نئی سمتوں کا سراغ ملتا ہے۔ مشمولات نظم و نثر سے آپ کے حسن انتخاب، حسن نفاست سے آگہی ہوتی ہے۔ آپ کی تحریر کی بے باکی، بے ساختگی دل کو چھو جاتی ہے۔ آپ کے یہ دیباچے اپنے اندر ایک بڑی فکر، بڑی سوچ اور بڑے زاویئے لئے ہوئے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔

انور شیخ کے فن کی بڑی خوبی ان کی حقیقت نگاری ہے۔ فن کا بنیادی عنصر سچائی ہے اور سچائی کے اظہار کے لئے حقیقت نگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ انور شیخ کے افسانے ان کے اعلیٰ ادبی شعور اور بالغ نظری کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے افسانوں میں بلا کی چاشنی فنکارانہ چابکدستی اور قارئین کے لئے دلچسپی مضمر ہے۔ ان افسانوں کا ایک عجیب رنگ ہے۔ جو دوسرے فن کاروں سے یکسر مطلق ہے۔ ان کا اپنا نظریہ ہے۔ زندگی کے کرب و تلخ حقائق کو سامنے رکھ کر سچائیوں کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ وہ اس بات سے بخوبی آشنا ہیں کہ بہترین ادب کسے کہتے ہیں اور قارئین کس طرح ادب چاہتے ہیں یا طلب کرتے ہیں، انہوں نے سماج اور سوسائٹی کے اندر ڈوب کر لوگوں کے اندرونی اضطراب کو محسوس کیا ہے۔ ان کے کسی بھی افسانے میں کسی قسم کا ابہام نہیں ملتا۔ آسان سے آسان الفاظ میں اپنے افسانوں میں اظہار کر کے اپنے مقصد تک رسائی کی ہے۔ ان کی روح میں تخلیقی کرب اور بے چینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کہیں کہیں ان کے افسانوں میں جنسی اظہار ضرور ملتا ہے۔ مگر افسانے کی چاشنی برقرار رکھنے کے

لئے اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ سپاٹ تحریر کا مطالعہ آجکل کون کرتا ہے، نیکی اور بدی کی جنگ کی صورت اور انسانی فطرت کو اجاگر کرنے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے، اور اس سے کوئی بھی فنکار دور نہیں رہ سکتا، اس دور میں عریانیت زندگی کا حصہ بن چکی ہے سماج کی برائیوں کو اصلاحی انداز میں پیش کرنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ جو کچھ بھی وہ تحریر فرماتے ہیں، ان میں گہری سوچ، فکر کی رعنائی نظر آتی ہے۔ بعض وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ پریم چند سے بہت قریب ہو کر گزرے ہیں۔ افسانوں کے پلاٹ اس قدر دلچسپ اور خوش بیان ہیں کہ قاری ایک بار پڑھنا شروع کردے، ختم کئے بغیر دم نہیں لیتا۔ ان انسانوں کے کرداروں میں وہ خود بولتے نظر آتے ہیں، کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی کردار ہم پر تھوپا جا رہا ہے۔ وہ سادہ اور فطری زبان کو اپنے فنکارانہ برتاؤ سے پر تاثیر بناتے ہیں۔ اور ساتھ ہی واقعات، مکالموں اور کرداروں کے اشتراک سے افسانے کی دلچسپی قائم رکھتے ہیں۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس میں قطعاً مبالغہ نہیں۔ اس حقیقت کے ثبوت میں انور شیخ کی شعری و افسانوی کتب ''نبض جہاں'' اور ''سوز و ساز'' سے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

''سوز و ساز'' میں فن افسانہ نگاری پر لکھتے ہیں:

''ادب کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ اپنے سماج کا ترجمان ہوتا ہے۔ جو ادیب اپنے معاشرہ کی جتنی بہتر عکاسی کر سکے اس کا مقام اتنا ہی بلند ہوتا ہے۔ ادیب عام طور پر مصلح کا رول اختیار نہیں کرتا جب وہ اپنے دیس کا تمدنی خاکہ پیش کرتا ہے تو معاشرتی امراض کا علاج خود بخود سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

''ہر ایک معاشرہ لوگوں کے متضاد مقاصد کے وجہ سے خیر و شر کا اکھاڑہ بن جاتا ہے۔ کوئی مذہب سے چارہ گری چاہتا ہے تو بعض عقل و فراست سے مسائل کا حل طلب کرتے ہیں۔ اپنے نظریات کو غیر معمولی اہمیت دے کر انہیں سماج پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں۔ اشتراکیت اس نظریاتی ادب کی ایک زندہ مثال ہے۔ ادب کو نظریات کا پابند بنانا جائز نہیں۔ کیونکہ ادب سماجی رجحانات اور مسائل کی غیر جانبدار عکاسی ہے۔ با ایں ہمہ اشتراکی ادب ہے کیونکہ یہ عقل اور فراست اور انسانی ہمدردی پر مبنی ہے لیکن مذہبی ادب طفلی ادب ہے کیونکہ اس میں نہ انسانی شعور کو دخل حاصل ہے اور نہ ہی اس کا مطمحائے مقصود انسانی بہبود اور برتری ہے۔ بلکہ سماج کو اوہام پرستی کی بھٹی میں جھونکتا ہے ....

''۔۔۔ افسانہ کے معنی ہیں ''داستان۔ قصہ۔ کہانی۔ جھوٹی بات۔ سرگزشت''۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ بعض اسے انشائیہ بھی کہتے ہیں جس سے مراد ایک غیر سنجیدہ مضمون ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی بات پیدا کی گئی ہو۔ ہاں۔ تو ادب یاوہ گوئی کا نام نہیں یہ اظہار خیال کا وہ انداز ہے جو چند مستند اصولوں کی پیروی کئے بغیر پذیرائی حاصل نہیں کر سکتا۔ حسن بیان ادب کی روح ہے۔

''ہر چیز کو حد نگاہ میں رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک افسانہ نگار زندگی کے نشیب و فراز اور بالخصوص اپنے معاشرتی مسائل سے آگاہ ہو۔ آجکل جبکہ ذرائع نشر و اشاعت اور اقتصادی تقاضوں نے ممالک ارض کو ایک عالمی قصبہ بنا دیا ہے افسانہ نگار کو اخبار جہاں سے بھی آشنائی ہونی چاہئے۔ اس کے بغیر موثر افسانہ لکھنا ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوامی علم اور ذوق ایسی سطح پر پہنچ چکا ہے کہ ادبی بلندی و پستی کی پہچان زیادہ مشکل نہیں رہی۔

''ادب شناس دو کیمپوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ ''ادب برائے ادب'' کا قائل ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب کا بجائے خود کوئی مقصد نہیں۔ ادب نگارشات میں لفظی اور معنوی محاسن پیدا کرنے کا نام ہے تاکہ قارئین اس سے محظوظ ہو سکیں۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ''ادب برائے زندگی'' ہونا چاہئے۔ اسے اشتراکی نقطۂ نظر بھی کہا جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں اشتراکی پراپگنڈے کا کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ اشتراکیوں کی خوش نصیبی ہے کہ وہ ادب برائے زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ جس ادب کا زندگی کے ساتھ تعلق نہ ہو ایسے ادب کی انسان کو ضرورت ہی نہیں۔ اس طرح ادب کی قیمت کر جاتی ہے جو ادب کی تحقیر کے مترادف ہے۔ ادب انسانی اقدار کا ترجمان ہونے کے سبب ہی قابل تعظیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب لکھنے کا ایک ایسا ڈھنگ ہے جس کا چند اصولوں کے تابع ہونا ضروری ہے۔ یورپ میں ایک ادبی تحریک DADAISM کے نام سے (۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۰ء) چلی جسکا نصب العین یہ تھا کہ آرٹ اور لٹریچر کو تمام پابندیوں اور اقسام سے رہا کر دیا جائے لیکن اسے منہ کی کھانی پڑی۔ ۱۹۱۹ء میں ایک اور تحریک فرانس میں نمودار ہوئی جسے SURREALISM کہتے ہیں۔ اس کا منشا یہ تھا کہ لاشعور کو اس طرح بروئے کار لایا جائے کہ انسان کو دانش کی بندشوں اور مسلمہ اصولوں کی قیود سے نجات دلائی جا سکے لیکن اسے بھی کامیابی نہ ہوئی۔

''اگر غور سے دیکھا جائے تو ''ادب برائے زندگی'' اور ''ادب برائے ادب'' کی

بحث مصنوعی ہے یہ اس لئے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی بے مقصد نہیں حتیٰ کہ کھیل کود کا مطلب بھی تفریح طبع ہے جس کے بغیر جینا بذات خود ایک سزا بن جاتا ہے لہٰذا ادب بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ادب ایک فنی پیشکش ہے۔ معنوی و لفظی محاسن اس کے اجزائے لاینفک ہیں۔

"افسانہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ناول سے کہیں مختصر اور جامع ہے لیکن اختصار و جامعیت سے یہ مراد نہیں کہ کہانی مہمل ہو جائے۔ اس میں اتنی وسعت ضرور ہونی چاہیئے کہ اس کا مفہوم آسانی سے قاری کو سمجھ میں آسکے۔ دوسرے یہ کہ کہانی کا تعلق اکثر عوام سے ہوتا ہے لہٰذا اسے اس طرح لکھنا کہ یہ فلسفہ کا ایک درس نظر آنے لگے۔ افسانہ نگار کی ناکامی کا ثبوت ہے کیونکہ وہ لوگ جنہیں فلسفے سے دلچسپی ہو انہیں افسانے سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ ناکام افسانہ وہ ہے جس کا انجام مبہم ہو یعنی قاری کی سمجھ میں نہ آسکے کہ لیکھک نے کیا کہا ہے۔ قاری کو "قیاذہ آرائی" پر مجبور کرنا افسانے کی خوبی نہیں۔

"افسانہ کسی واقعہ اور تاثر کا بیان بھی ہو سکتا ہے لیکن جو افسانہ محض واقعہ یا تاثر ہو نیم افسانہ نگاری کا نمونہ ہے۔ کیونکہ افسانے کے معنی ہیں کہانی لہٰذا کہانی پن افسانے کی جان ہے اور کسی واقعہ یا تاثر کو کہانی کے روپ میں لکھنا ہی افسانہ نگار ہونے کا ثبوت ہے۔ مزید برآں نفسیاتی تاثرات کو افسانے میں سمونے کی اہلیت افسانہ نگار کی وسعت نظر۔ تجربہ کاری اور مطالعہ کی دلیل ہے۔

"بعض لوگ اپنے نفسیاتی نظریات کی صداقت کے لئے سگمنڈ فرائڈ کی تحریروں کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں اور جو ایسا نہ کر سکے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگرچہ فرائڈ نفسیات کے فن میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتا ہے مجھے اس کے تمام نظریات سے کبھی کلی اتفاق نہیں ہو سکا۔ البتہ اس نے شعور اور لاشعور کی تمیز پر جو زور دیا ہے قابل تحسین ہے۔ اقبال کا یہ حکیمانہ شعر شعور اور لاشعور کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

"عقل ہمیشہ دو اور دو کو چار ہی گنتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ حقیقت پسندی کا دوسرا نام ہے جو تلخ اور بھیانک ہے۔ اسے ہر وقت اور ہر حال میں گوارا کرنا انسانی بساط سے باہر ہے۔ اسلئے انسان کو خوش آرائیوں اور سہانے خوابوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر یوں ممکن نہ ہو تو انسان پاگل ہو جائے۔ لہٰذا "پاسبان عقل" سے کبھی کبھی رہائی حاصل کرنا کار "احسن ہے مگر اس سے قطع تعلق کر لینا غلط ہے کیونکہ خیر و شر کی تمیز جو حیوان ناطق کو انسان بناتی ہے عقل کی راہنمائی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔

"شعوری حالت وہ ہے جب ہم متوجہ ہوں لیکن جب توجہ کسی موضوع یا ماحول سے ہٹ جائے تو وہ ایک لاشعوری کیفیت بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم محفل موسیقی میں ہوں تو ہماری توجہ فن کار پر مرتکز ہونے کے بجائے تخیل کا حصہ بن کر غائب ہو جاتی ہے۔ لاشعور ایک ایسی متحرک جھیل ہے جس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ہماری یادداشتیں مرکز توجہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ اور "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے" مصداق ہمیں اضطراب سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن وہ مٹ نہیں جاتیں کیونکہ یادداشتوں کے تسلسل کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ ان کی مثال مچھلیوں کی طرح ہے جو پانی میں ڈوب کر زندہ رہتی ہیں لیکن وقتاً فوقتاً سطح پر نمودار ہوتی ہیں اور طوفان کی صورت میں ہجوم کی طرح ابھر آتی ہیں۔ ہماری شدت جذبات جو بھولی بسری باتوں کو اچانک یاد دلا دیتی ہے اسی طوفان سے مشابہ ہے۔

"حقیقت کی عظمت کو جھٹلانا ایک جاہلانہ حرکت ہے لیکن اس کے باوجود تخیل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تخیل افسانے کا منبع ہے اس لئے افسانہ حقیقت کا معکوس ہے۔ لہذا اس کے بغیر اول الذکر کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت بمقابل (VERSUS) افسانہ ایک قدیم فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ سنسار کیا واقعی وجود رکھتا ہے یا محض سراب نظر ہے۔ اس فلسفے کی اصل رگ وید میں ہے جو بعد میں افلاطون کے نظریات کی بنیاد بنی۔

"میرا ذاتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ جہان ایک حقیقت ہے لیکن یہ اتنی ترش ہے کہ بقا کے لئے انسان کو ایک معکوس اسی طرح ضروری ہے جس طرح میدان جنگ میں ذاتی تحفظ کے لئے ایک ڈھال ہوتی ہے ابن آدم کے لئے یہ معکوس یا ڈھال اس کا تخیل ہے جو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دو اور دو کو چار گننے کے بجائے کبھی بائیس اور کبھی صفر شمار کر سکے۔ اس لئے تخیل کی رنگینیوں کے بغیر زندگی سسک سسک کر مرنے کا دوسرا نام ہے۔ کسی نامراد عاشق سے پوچھو کہ خیال یار اسے کس طرح لذت وصال سے نوازتا ہے۔ کسی بھوکے سے پوچھو کے اسے روٹی ملنے کا خیال کس طرح زندہ رکھتا ہے۔ کسی شکست خوردہ انسان سے پوچھو کے اسے ایک دن جیتنے کا خیال کس طرح نامرادی کی ذلت سے محفوظ رکھتا ہے۔ جس طرح ضیا اور ظلمت لازم و ملزوم ہیں۔ حقیقت اور خیال میں وہی رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخیل امید کا سر

چشمہ ہے اور اس طرح حقیقت کی جان لیوا تلخیوں کے لئے تریاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جہاں ایک حقیقت ہے اور تخیل کا کردار خود فریبی نہیں بلکہ اپنی رعنائیوں اور جذب امید سے اسے قابل برداشت بناتا ہے۔

"حقیقت اور تخیل کا یہی تضاد میری افسانہ نگاری کا سنگ بنیاد ہے۔ میں متحدہ ہندوستان کے اس علاقے میں پیدا ہوا جواب پاکستان کہلاتا ہے۔ اس دیس کے سماجی مسائل اس قدر تلخ ہیں کہ زندگی ایک سزا بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی چند مثالیں ہیں۔ سیاست دانوں کی خود غرضی۔ پیروں کے استحصال ہتھکنڈے۔ ملاؤں کی دین فروشی۔ بستیوں کے سرکردہ لوگوں کی غنڈہ گردی۔ دن دہاڑے قتل و غارت گری۔ عورتوں کی آبرو ریزی۔ بچوں کا اغوا اور بیگار۔ بھوک۔ افلاس۔ امراض۔ منشیات کا کاروبار۔ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کا جنون۔ دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی کو کمال اخلاق سمجھنا۔ مجبوری کی شادیاں۔ اور جہیز کے خرشے۔ انصاف کا فقدان۔ رشوت۔ اقربا پروری وغیرہ وغیرہ۔ یہ تلخ حقائق ہیں۔ انہیں من وعن بیان کرنا ٹریجڈی سے کم نہیں۔ انہیں ذہن نشیں کرانے کے لئے تخیل کے رنگین غلاف کی اسی طرح ضرورت ہے جیسے کڑوی گولیوں کو شکر کے خول کی۔

"ان قبیح حرکات کو میں اس ڈھنگ سے منظر عام پر لاتا ہوں کہ افسانہ ایک مضمون نظر آئے تاکہ اس کی ظاہری سنجیدگی قارئین کو اصل موضوع کی طرف متوجہ کر کے ان کے لاشعور میں خوابیدہ یادوں کو جگادے اور دل میں تدارک کے لئے عزائم انگڑائیاں لینے لگیں لیکن دوران قرأت قاری کے مزاج میں برہمی پیدا نہ ہو۔ بالفاظ دیگر یہ حقیقت کو خیال کے رنگ میں پیش کرنے کی ایک کاوش ہے۔

طنز و مزاح کا میرے افسانوں کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ طنز و مزاح کیا ہے؟ اس کی مفصل تشریح اپنے پہلے شعری و افسانوی مجموعے "نبض جہاں" میں کر چکا ہوں یہاں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ طنز دراصل ایک انداز تضحیک ہے اور جب اس کا استعمال مزاح کے ساتھ کیا جاتا ہے تو یہ ان تلخ گولیوں کی طرح ہو جاتا ہے جن پر چینی کا خول چڑھا ہو۔ اس طرح انہیں حلق سے نیچے اتارنا آسان ہو جاتا ہے اور دوائی کو اپنا کام کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ میرے خیال میں طنز و مزاح سے افسانے کی تاثیر کہیں بڑھ جاتی ہے۔ وہ اس لئے کہ جب افسانہ نگار کسی قباحت پر لعنت بھیجتا ہے تو قاری جو کسی نہ کسی طرح خود بھی اس کے جال میں پھنسا ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کو لاشعوری طور پر اپنا غمگسار سمجھ کر اس کے اثرات کو آسانی سے قبول کرنے لگتا ہے۔

"میں افسانے میں صرف مضمون کی مشابہت پیدا کرتا ہوں۔ اس میں اس سنجیدگی کی نمود کو روکنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہوں جو کہ ایک مضمون کا جزو لازم ہوتا ہے۔ اگر یہ فرق معدوم ہو جائے تو افسانہ افسانہ نہیں رہتا۔

"افسانہ ایک فرضی کہانی ہے۔ یہ خیال کی ایک ایجاد ہے۔ اسے منطقی اقدار پر جانچنا درست نہیں۔ خیال آخر خیال ہے سائنس تو نہیں۔ اگرچہ افسانے کو غیر معمولی قصہ نظر نہیں آنا چاہئے لیکن دنیا میں عجیب و غریب واقعات کی کمی نہیں اس لئے افسانہ نویس کبھی اپنے خیالات کی لہروں میں بہہ جائے تو اسے بھی افسانویت کا جزو ہی تصور کرنا چاہئے۔

"جس میں کہانی نہ ہو وہ افسانہ نہیں۔ اسے کسی اور نام سے یاد کرنا چاہئے۔ کہانی ایجاد کرنا فن نہیں بلکہ ملکۂ خداداد ہے البتہ کہانی کو دل نشین اسلوب میں پیش کرنا فن ہے۔ لہٰذا ایک افسانہ نویس کو ان دونوں پہلوؤں سے پرکھا جائے گا۔

"افسانہ اس لئے بھی ایک کہانی ہے کہ یہ ناول کی جامع ترین صنف ہے۔ آجکل ناول کی ضخامت عام طور پر چار سو صفحات سے زائد ہوتی ہے لیکن افسانے کی لمبائی چند اوراق سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے ناول میں ہر طرح کے اسقام چھپ جاتے ہیں اور ناول نگاری کے لئے وہ فنی مہارت ضروری نہیں جو افسانہ نویسی کے لئے لازم ہے۔ ناول کی ضخامت بذات خود اس کے فنی عیوب کی پردہ پوشی ہے اور اس کے لکھنے کا سہل پن اس کی مقبولیت کا راز ہے۔

"افسانہ ایک کہانی ہے اور اختصار اس کی جان ہے۔ لہذا افسانے میں قدم قدم پر منظر نگاری اور طویل مکالمات کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ "آرائشیں" انہی افسانوں میں ملیں گی جن میں کہانی کا عنصر بہت کم ہو۔ میرے انداز افسانہ نویسی میں اس کا امکان اسلئے بھی کم تر ہے کہ جس افسانے میں منظر کشی اور مکالمات کی بھرمار ہو اس پر ایک مضمون کا گمان آسانی سے نہیں ہوتا۔

"اگرچہ کہانی افسانے کی جان ہے داستان گوئی اور افسانہ نویسی میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر فن تقریر کی ایک شاخ ہے جس میں زور بیان کو دخل حاصل ہے اور مقرر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بات کو طوالت سے بیان کرے۔ اپنے موضوع کو استعاروں۔ تلمیحات۔ چٹکلوں اور دور از کار کہاوتوں سے مزین کرے۔ چونکہ فصاحت خوش بیانی کا دوسرا نام ہے یہ کہنا نا جائز نہیں کہ فصاحت داستان گوئی کا ایک جزو ہے لیکن جامعیت

افسانہ نگاری کا خاصہ ہے۔ وہ کہانی جو داستان گوئی کا حصہ ہو۔ اگر قلمبند بھی ہو تو افسانے سے الگ ہوتی ہے اور افسانہ اگر پڑھا بھی جائے تو اس کی کہانی۔ افسانوی محاسن کی پابند ہوتی ہے۔

"کہانی اور افسانے میں ایک اور فرق بھی ہے۔ روایتی کہانیاں جو ہماری دادی اماں نے اپنی دادی اماں سے سنیں۔ تمدنی عنصر اور مزاج کی حامل ہونے کے باعث اکثر قدامت پسندی کی عکاسی کرتی ہیں اس لئے وہ قومی کلچر کو محفوظ کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں لیکن جس طرز افسانہ نگاری کا مجھے شوق ہے اس کی کہانی مصنوعی اور مقصدیت کی حامل ہونے کے سبب جدت اور تعمیر کی متمنی ہوتی ہے۔

"آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ پلاٹ واقعات کے مجموعے کا نام نہیں۔ جب میں افسانہ لکھتا ہوں تو پہلے یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ کہنا کیا ہے یعنی افسانہ لکھنے کا مدعا کیا ہے۔ پھر اس کے لئے کرداروں کی تخلیق کرتا ہوں اور انہیں ایسے ماحول میں دھکیل دیتا ہوں کہ ان کے رد عمل سے ایسی کہانی کا تانا بانا تیار ہونے لگتا ہے جو افسانے کی مقصدیت کو اجاگر کرتا ہے۔

"کسی افسانے کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اسکے آغاز اور انجام میں مطابقت ہو"۔

انور شیخ اپنے نظریۂ طنز و مزاح کی وضاحت کرتے ہوئے "نبض جہاں" میں لکھتے ہیں:

"طنز و مزاح کے معنی سمجھنے کے لئے یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی آزمائشوں کے مجموعے کا نام ہے اور آزمائش عموماً مشکل حالات سے سینہ سپر ہونے کو کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ اور شوپنہار جیسے فلسفیوں نے زندگی کو ایک مسلسل دکھ سے تشبیہ دی ہے۔ مزاح کے معنی ہیں "خوش طبعی کرنا" لہذا ادبی رو سے اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو ایسے رنگ میں پیش کیا جائے کہ زندگی ایک ہنسی خوشی کا کھیل نظر آنے لگے اور جب تک کوئی مزاح نگار کی تحریر کو پڑھتا رہے اس کے چہرے پر خوشی کی لہر رقصاں رہے لیکن اس کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ حقیقت محض ایک ٹھٹھا مذاق بن کر نہ رہ جائے بلکہ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو مگر اس کی رنگت میں کڑوے پن کی بجائے جاذبیت کا عنصر موجود ہو۔ طنز مزاح ایک افسانے کے رنگ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک سچی یا فرضی کہانی بھی اس کے لئے موزوں ذریعہ اظہار ہے اور بعض صورتوں میں اسے ایک صحافی کی رپورٹ کا روپ دینا بھی مناسب ہے

"مزاح برائے مزاح محض مسخراپن ہے لیکن جب اسے طنز مزاح کی ترکیب دی جاتی ہے تو اس کا مقصد صرف ہنسانا ہی نہیں رہتا بلکہ زندگی کی تلخیوں کا مزاحیہ انداز میں احساس دلانا ہوتا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو طنز و مزاح کو صنف ادب کا درجہ دیتی ہے لیکن ایسے ادب کی قدر و منزلت کا انحصار طنز کے نبھانے پر منحصر ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک قلم کار جس موضوع کو طنز و مزاح کے ذریعے بیان کرے۔ وہ نہ صرف اسے اچھی طرح جانتا ہو بلکہ اس پر جرأت سے لب کشائی کرنے پر بھی تیار ہو۔

طنز کے معنی ہیں "طعن"۔ ہجو۔ ملامت" لہذا طنز کا دائرہ نثر تک محدود نہیں رہتا۔ نظم بھی اس میں شمار ہونے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں ہجو گو شاعر ملتے ہیں۔ اگرچہ طنز کے معنی طعن ہیں لیکن طعن اسی وقت (ادبی) طنز کا درجہ اختیار کرتی ہے جب کہ یہ کھلم کھلا نہ ہو بلکہ ڈھکی چھپی رہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی بدصورت عورت نے شفاف نقاب پہن رکھی ہو اور اس طرح اس کی بدصورتی اصل سے کہیں کم نظر آتی ہو۔ ایسی طنز اگر خوش کن ہو تو ادب کی ایک عظیم صنف ہے کیونکہ طنز و مزاح کو اس طرح پیش کرنے والے ادباء اور شعرا بہت کم ہوتے ہیں۔ گالی گلوچ یا گندے لطیفوں سے مزاحیہ کیفیت پیدا کرنا۔ گھٹیا ادب کی عکاسی ہے۔

"طنز و مزاح کے بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً کسی کا کھلے طور پر تمسخر اڑانا۔ ہنسی میں گالیاں دینا۔ برائی کو اچھائی کے رنگ میں پیش کرنا۔ اچھائی کو لپٹے ہوئے انداز میں برا کہنا۔ جان بوجھ کر ذو معنی الفاظ استعمال کرنا۔ غلط تلفظ سے کام لینا جیسے زکام کو جکام۔ لفافہ کو غلافہ یا خلافہ کہنا۔ استعارہ کو مبالغہ سے عمل میں لانا جیسے کسی موٹی عورت کو ہتھنی کا خطاب دینا یا کسی مریل مرد کو پہلوان اور مورکھ کو فلسفی کہنا۔

"ایکشن کامیڈی یعنی عملی ظرافت بھی طنز و مزاح کی ایک قسم ہے لیکن اس کا اکثر استعمال ٹیلیویژن پر ہوتا ہے مثلاً ایک نحیف اور پستہ قد آدمی کو ایک دراز قامت اور کیم و شحیم فرد کی پٹائی کرتے دکھانا یا کسی بدصورت عورت کا آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر مزے لے لے کر نخرے کرنا۔ اس کے علاوہ طنز و مزاح کے اور بھی کئی طریقے ہیں مثلاً رمز و کنایا میں ستم ظریفی۔ اشارۃً ملامت کرنا۔ بھانڈوں کی طرح نقالی کرنا کسی موضوع کو مثالی طور پر بیان کرنا۔

"طنز و مزاح کو معاشرے میں ایک بڑا مقام حاصل ہے۔ ایسی آمرانہ سوسائٹی میں سچائی کو کھل کر بیان کرنا ممکن نہ ہو وہاں ایسا ادیب، شاعر یا مقرر جو طنز مزاح کے فن کا استاد ہو تلخ حقائق کو ایسے شیریں انداز میں بیان

کر سکتا ہے جس سے سامعینؔ پر اصلیت کھل جاتی ہے اور قانون ایک تماشائی کی طرح کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔

"طنز و مزاح کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس سے انسان کے معاندانہ جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ وہ یوں کہ ہر انسان کو کسی نہ کسی سے گلہ ضرور ہوتا ہے مثلاً خاوند کو بیوی سے اور رعایا کو حاکم سے۔ طنز و مزاح کے ذریعے طعن و تشنیع اور شکایت کا ایسا موقعہ ملتا ہے جس سے سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی بچ جاتی ہے۔

"ہاں تو طنز و مزاح بدتمیزی اور ناشائستگی کو نہیں کہتے بلکہ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں مزاح اور طنز کی چاشنی دونوں ہی درکار ہیں۔ مثال کے طور پر غالبؔ مرحوم کا یہ شعر ملاحظہ ہو

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اس سے بظاہر مراد یہ ہے کہ معشوق کے لب اس قدر رسیلے ہیں کہ اگر گالیاں بھی دے تو میٹھی لگتی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ رقیب نے کوئی بدمزگی محسوس نہ کی۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک طنز ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے شیریں اور حسین ہونٹوں کو گالیاں زیب نہیں دیتیں جو کہ گنواروں کا شیوہ ہے۔

"طنز و مزاح وہ صنف ادب ہے جس میں سنجیدگی کو ہنسی کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اس سے حقیقت دل میں اتر جائے تو یہ طنز و مزاح کی معراج ہے لیکن اگر اس کا تاثر ٹھٹھا اور مذاق بن کر رہ جائے تو یہ محض ایک مسخرا پن ہے جس میں ادبیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔"

مندرجہ بالا اقتباسات درج کرنے کے بعد ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انگلستان کے شہر SOUTHEND-ON-SEA سے ایک شخص نے مصنف سے ٹیلیفون پر شکایت کی کہ "نبض جہاں" کے افسانے اس قدر قہقہہ انگیز ہیں کہ پڑھنے کے بعد ان کے عمر رسیدہ والد کو ہارٹ اٹیک HEART ATTACK ہو گیا۔ ممکن ہے یہ مبالغہ ہو، لیکن میں ذاتی تجربے کی بنا پر جانتا ہوں کہ انور شیخ کے افسانے پڑھ کر ہنسی کی شدت سے پیٹ میں بل ضرور پڑے ہیں۔

بعض لوگوں کو انور شیخ کے افسانوں سے جنسی بو آتی ہے۔ لیکن قارئین کی اکثریت مذہبی اختلاف کے باوجود انہیں اصلاح اور حقیقت کا مظہر مانتی ہے۔ یہ غالباً ذاتی تعصبات کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ انور شیخ اس میدان میں نو وارد ہیں اور اہل بصیرت کو انہیں سمجھنے کا خاطر خواہ موقعہ نہیں ملا۔

ساوتری گوسوامی

افسانے

ساوتری گوسوامی کے افسانے خواتین کے ہمدرد اور معاشرے کے اصلاح کار ہیں نصیحت آموز، محبت اور شفقت بھری کہانیوں کا مجموعہ۔ انشاء پبلی کیشنز سے شائع ہونے والا ہے۔

خزاں اب اس قدر دل کو لبھائے
نہیں غم پھر بہار آئے نہ آئے

جو دھوئے خود کو اپنے آنسوؤں سے
ضروری کیا وہ گنگا میں نہائے

سمجھ پائیں نہ جو ہے اس کے دل میں
جفا گر اب اشاروں سے بلائے

اگرچہ اک مذاقِ بیکسی تھا
یہ کیا کم ہے وہ ہم پر مسکرائے

ہوئے پورے نہ جن کی آرزو تھی
مگر ٹوٹے وہ سپنے جو سجائے تھے

نہ ہو جس کے مقدر میں تبسّم
ہنساؤ تو اُسے رونا ہی آئے

کہو انورؔ ہو بھالو یا کہ عاشق
ستم گر ہر گھڑی تم کو نچائے

چاندی کی دلہن

انور شیخ

مِس تسلیمہ بٹ کی آمد سے ہمارے اسکول کی قسمت ایسے جاگ اٹھی جیسے کسی ادھیڑ عمر بانجھ عورت نے توام بیٹوں کو جنم دیا ہو یا کسی کنگال کی ایک کروڑ کی لاٹری نکل آئی ہو۔

غالباً یہ تشبیہات جو میں نے دی ہیں میری کم فہمی کا نتیجہ ہیں۔ مجھے یہ کہنا چاہئے کہ ہمارے سکول کے بھاگ کو ایسے چار چاند لگ گئے جیسے مجنوں کو لیلیٰ سے پیغام شادی ملا ہو یا رانجھے کو ہیر نے اغوا کر لیا ہو...... وہ اس لئے کہ مس تسلیمہ بٹ کے آنے سے پہلے ہمارے سکول کی ہیڈ مسٹرس لوگوں کی منتیں کرتی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو اس کے سکول میں داخل کرائیں لیکن اس کی التجاؤں کا اثر الٹا ہو رہا تھا کیونکہ مسلمان بچے اس درسگاہ کو یکے بعد دیگرے چھوڑ رہے تھے۔

جس سکول کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ راولپنڈی میں صدر کے علاقے میں واقع تھا۔ وہ بچوں کے لئے مخلوط درسگاہ تھی۔ جس کی عمر دس سال سے تجاوز ہوا اسے اپنی پسند کے سکول میں ٹرانسفر کر دیا جاتا تھا۔ اس درسگاہ کی انتظامیہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں تھی جو خود کو مسلمانوں کی نسبت ایڈوانسڈ (Advanced) سمجھتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ عیسائی کھلم کھلا مغرب کی نقالی کرتے تھے لیکن مسلمان اگرچہ اس میدان میں عیسائیوں کے دوش بدوش تھے اپنی مغرب پرستی پر اسلام کا ٹھپہ لگا کر خود کو "فخر مشرق" محسوس کرتے تھے۔

دراصل وہ پرائمری سکول تھا جس پر ماڈرن نرسری کا لیبل چپکا رکھا تھا۔ اس کی ہیڈ مسٹرس مس بار برا ٹائیگر (Miss Barbra Tiger) تھی۔ دروغ بر گردن راوی۔ کہتے ہیں کہ اس کے مولانا عبدالودود نورانی کے ساتھ گاڑھے تعلقات تھے۔ اس گاڑھے پن کی جو نوعیت تھی میں اس کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس کے متعلق ایسی افواہیں مشہور تھیں جن کے سامنے لیلیٰ۔ مجنوں اور سوہنی مہیوال کے افسانے بھی ماند پڑ جائیں۔۔ نورانی صاحب نہ صرف جامعہ مسجد کے خطیب اور اسلامیہ کالج میں پروفیسر تھے بلکہ پنجاب اسمبلی کے رکن بھی تھے۔

مس باربرا ٹائیگر کی عمر اس وقت تیس برس سے کچھ کم ہی تھی۔ اگرچہ اس کی رنگت ذرا سانولی تھی۔ اس کے قد کی موزونیت اور متناسب اعضا سے ایک حسینہ کا درجہ دیتے تھے۔ مولانا نورانی اس کے جمال سے اس قدر مرعوب ہو چکے تھے کہ اسے "دہشت گرد کہتے تھے"۔ وہ دو۔ تین سال اس سے چھپ چھپ کر ملتے رہے۔ لوگوں کے خیال میں وہ ایسا منہ کالا کرنے کے لئے کرتے تھے لیکن نورانی صاحب کا دعویٰ تھا کہ وہ یہ سب کچھ "منہ سفید" کرنے کے لئے کرتے تھے کیونکہ وہ ان مخفی ملاقاتوں میں مس ٹائیگر کو علم خاص پڑھاتے تھے تاکہ اس کے باطن کو نور ایمانی سے روشن کر سکیں۔ وہ ایسا کرنے میں اسلئے کامیاب ہوئے کہ انہوں نے مس ٹائگر سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب وقت قریب آیا تو مس ٹائیگر نے مطالبہ کیا کہ نورانی صاحب کو عیسائیت قبول کرنا ہوگی۔ انہیں یہ گوارا نہیں تھا۔ نتیجتاً یہ بندھن ٹوٹ گیا۔ عیسائیوں کے خیال میں نورانی ایک بناسپتی عاشق تھا جس کی محبت صرف منہ کالا کرنے تک محدود تھی لیکن مسلمانوں کی رائے میں نورانی ایک مرد مجاہد تھا جس نے ایک کافرہ کو ایسا رگڑا دیا کہ سبحان اللہ۔ منہ بھی کالا کر لیا لیکن دامن اسلام کو مضبوطی سے تھام کر ایمان بھی بچا لیا۔ واہ۔ واہ۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام اسی کو کہتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ جب لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے خود نورانی صاحب کی منتیں کر کے انہیں پنجاب اسمبلی کا ممبر بنوا دیا۔ ایسا نمائندہ کہاں ملتا ہے جو منہ تو کالا کرے لیکن اس کا دل پھر بھی ایمان کی روشنی سے سفید ہی رہے۔ عام نمائندے تو صرف ایسی ہیرا پھیری جانتے ہیں جس سے ان کا ذاتی فائدہ لیکن پبلک کی بربادی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس نورانی صاحب کو جل و فریب میں اس قدر مہارت حاصل تھی کہ خواہ اپنی ذات کو کتنا ہی اونچا کیوں نہ کریں۔ عوام کو اس سے نقصان پہونچنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

جب نورانی صاحب کے علم خاص پڑھانے کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں تو انہیں مایوسی کے دورے پڑنے لگے اور انہوں نے ماڈرن نرسری کے خلاف اعلان جہاد کرتے ہوئے لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ یہ ایک شیطانی ادارہ ہے جو مسلمان بچوں کے ایمان کی تباہی کا سبب ثابت ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان والدین نے اپنے بچوں کو وہاں سے نکالنا شروع کر دیا بلکہ مسلمان استانیوں کی اکثریت بھی وہاں سے مستعفی ہو گئی۔ اخراجات بڑھنے لگے لیکن فیسوں کی تعداد میں متواتر کمی کے باعث نرسری

کو چلانا مشکل ہو گیا۔

مس ٹائیگر صرف نام کی مس ٹائیگر نہیں تھی۔ علم خاص کی تحصیل کے بعد وہ شرم و حیا کی قائل نہ رہی اور اس کی نسوانیت ظاہر داری تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس نے مولانا بدیع الزماں بدایونی سے علم خاص پڑھنا شروع کر دیا۔ بدایونی صاحب شیعہ تھے۔ اسلئے انہیں نورانی صاحب کے خلاف خطبے دینے میں بڑا مزا آتا تھا کیونکہ وہ سنّی تھے۔ بدایونی صاحب کا جوش خطابت یوم جمعہ کو جوش میں آجاتا تھا کیونکہ یہی وہ دن تھا جب مس ٹائیگر علم خاص حاصل کرنے کے لئے انہیں رات کو ملتی تھی۔ اگر ان کے خطبے میں نورانی صاحب کی ستم رانیوں اور ماڈرن نرسری کی اعلےٰ خدمت گزاریوں کا موزوں ذکر نہ ہوتا تو مس ٹائیگر علم خاص حاصل کرنے سے انکار کر دیتی جو بدایونی صاحب کیلئے قیامت سے کم نہ ہوتا۔ بدایونی صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ کچھ لوگ مولانا نورانی کو ظالم سمجھ کر مس ٹائیگر اور ماڈرن نرسری کی حمایت پر آمادہ ہوگئے۔ مس تسلیمہ بٹ نے بدایونی صاحب کے خطبات سے متاثر ہو کر ہی ماڈرن نرسری میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت حاصل کی تھی۔ وہ اس تعلیمی ادارے کو کامیابی کی بلندیوں پر پہنچانے کا تہیہ کر چکی تھی۔

مس تسلیمہ بٹ ایم۔ اے پاس تھی۔ عمر میں اکیس برس لیکن حسن کی آفتاب تھی۔ اس کی شگفتہ مزاجی اور خطبات کی جادوگری بیان سے باہر ہے۔ اس کی تدریس سے دلچسپی کی کہانیاں شہر کے گلی کوچوں میں پھیلنے لگیں اور ماڈرن نرسری میں بچوں کے داخلوں کی تعداد اس قدر تیزی سے بڑھنے لگیں اور ماڈرن نرسری میں بچوں کے داخلوں کی گنجائش باقی نہ رہی۔

جب مس تسلیمہ بٹ ہماری درسگاہ میں آئی تو میں نو برس کا تھا اور اس معصومیت سے آراستہ تھا جو اس عمر کے بچوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ مجھ میں ایک کمزوری تھی اور وہ یہ کہ میری ناک اکثر بہتی تھی جیسے کوئی نزلے کا دائمی مریض ہو۔ میں کلاس میں فرسٹ بنچوں پر بیٹھتا تھا اور اسلئے استانیوں کے قریب ہوتا تھا۔ مس بٹ اس قدر شفیق تھی کہ کبھی کبھار میری ناک بھی صاف کر دیتی تھی۔ وہ مجھے پیار سے (نکلے کی نسبت سے) ''نلکو'' کہا کرتی تھی جس کی وجہ میری ہمیشہ بہتی ہوئی ناک تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے مس بٹ سے ناک صاف کرانے میں اتنا مزا آتا تھا کہ جس دن میری ناک رواں نہ ہو میں اپنی ناک کو کوسنا شروع کر دیتا تھا۔ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا میرا مشغلہ بن کر رہ گیا اور وہ میری اس عادت سے آگاہ تھی۔ اگرچہ اس نے مجھے کبھی کچھ نہ کہا۔

مس تسلیمہ بٹ میں ایک قدرتی خوبی تھی اور وہ یہ کہ اس کا رنگ بہت سفید تھا اور چہرے پر کسی قسم کا کوئی داغ نہیں تھا۔ اس پر طرفہ اس کا انداز تبسم تھا۔ سب بچے اس کی نقل کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ مس بٹ کو زیور پہننے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے ہار۔ بُندوں۔ انگوٹھیوں اور رنگ کی غیر معمولی سفیدی کے باعث اسے سب ہی ''چاندی کی دلہن'' کہنے لگے۔ یہ غالبًا اسی خطاب کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف بچوں کے جوان والد ''چاندی کی دلہن'' کا نظارہ کرنے کے لئے حیلوں بہانوں سے ماڈرن نرسری کے چکر کاٹنے لگے بلکہ یہ حرکت ان کے داداؤں کی بھی عادت بننے لگی۔ بعضوں نے داڑھیوں کا ہی صفایا کر دیا اور بعضوں نے وسمہ اور خضاب فروشوں کی دکانیں اجاڑ دیں۔ مس بار برا ٹائیگر ان عاشقوں کی طواف گردی سے مخدوش رہنے لگی تھی لیکن سال بھر کی سروس کے بعد مس بٹ نے خود ہی استعفےٰ دے کر مس ٹائیگر کو تمام خدشات سے بری کر دیا۔ اس کے نوکری چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے مستقبل کا شدید احساس تھا۔ اس نے ایم۔ اے اردو میں کیا تھا جس کی ڈیمانڈ کم ہونے کی باعث اس کی ترقی کے امکانات محدود تھے۔ اسلئے اب وہ انگریزی میں ایم۔ اے کرنا چاہتی تھی۔ جب جدا ہونے کا دن آیا تو بچوں نے مل کر اپنی محبوب استانی کو الوداعی پارٹی دی اور تحفے پیش کئے۔ میری امی جانتی تھیں کہ مس بٹ کو انگوٹھیاں پہننے کا بہت شوق ہے۔ انہوں نے کئی اور ماؤں کی طرح اس الوداعی پارٹی میں شرکت کی۔ میری امی مس بٹ کی قابلیت اور چلن سے اس قدر متاثر تھیں کہ انہوں نے اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتار کر مجھے دی اور اسے مس بٹ کو تحفے کے طور پر پیش کرنے کیلئے کہا۔ جب میں نے یہ انگوٹھی مس بٹ کو پیش کی تو اس نے جھجھک سے کام لیا۔ مایوسی سے میری ہچکی بندھ گئی اور ناک بڑی چستی سے رووا‌ں رواں ہونے لگی تو اس نے میری رطوبت پونچھتے ہوئے میری پیش کردہ انگوٹھی قبول کر لی اور اسے پہنتے ہوئے کہا'' ارے نلکو! تو تو اس طرح رو رہا ہے جیسے ہم ہمیشہ کیلئے بچھڑ رہے ہیں۔ پھر ملیں گے۔ اپنی ناک کا خیال رکھنا۔ پھر نہیں پوچھوں گی''

مس بٹ نے یہ سب ایسی مسکراہٹ سے کہا کہ سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے انداز تبسم کی دلفریبی کو نہ بھول سکا۔ اس میں کسی طرح کی بناوٹ یا جذبات کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ یہ سب اس کے طرز خندہ کی جادوگری تھی۔ میری مس بٹ کے ساتھ دس سال ملاقات نہ ہوئی۔ میں بچپن سے لڑکپن کی بھول بھلیوں سے گزرتا ہوا جوانی کی منزل تک پہنچ گیا۔ جب بھی کسی چہرے پر حسین ہنسی دکھائی دی مس بٹ کی یاد آگئی لیکن اس یاد میں ہیر۔ رانجھے کی کوئی تپش نہیں تھی۔ یہ صرف معصومیت کا ایک جگمگاتا ہوا انداز تھا۔

میں نے بی۔ اے پاس کیا تو میری والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ

پڑھی لکھی اور جہاں بین خاتون تھیں وہ نہ صرف ایک شفیق ترین ماں تھیں بلکہ زوجیت کا وہ درخشاں نمونہ تھیں جسے پوجنے کی ہر ذی شعور مرد کو آرزو ہوتی ہے۔ ایک دن وہ میرے والد محترم کا سر داب رہی تھیں تو والد صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر سینے سے لگالیا اور کہنے لگے او عائشہ کبھی دل بھی داب دیا کرو جو تمہاری محبت کے میٹھے میٹھے درد سے سرشار ہو کر ہر وقت تمہارا ہی ورد کرتا رہتا ہے۔ میں خود کو مومن سمجھتا ہوں لیکن درحقیقت کافر ہوں۔ نہ جانے خدا اس کی کب سزا دے''

مجھے اچانک دیکھ کر میرے والد محترم کچھ جھجک سے گئے اور کہنے لگے ''اسلم بیٹا۔ تم نے سب کچھ سن لیا۔ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن پھر بھی یہ بتانا میرا فرض ہے کہ بیوی کا پیار ماں باپ کے پیار سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ خدا تمہیں اس سے مالا مال کرے''

''ہاں۔ وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ بابا'' میں نے قدرے شوخی سے لیکن مودبانہ انداز میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

جوں ہی میری والدہ محترمہ نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا میرے بابا ان کے غم میں گھلنے لگے۔ مجھے آہستہ آہستہ اس بات کا احساس ہونے لگا کہ وہ صرف میری خاطر ہی زندہ رہنے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ ان کا امپورٹ کا اچھا خاصہ کاروبار تھا۔ وہ چین سے ریشمی مال خرید کر پاکستان میں بیچتے تھے۔ حالانکہ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا انہوں نے مجھے کبھی کاروباری مصروفیات میں الجھانے کی کوشش نہ کی۔ کہا کرتے تھے کہ ''میرے اسلم کے ابھی کھیل کود کے دن ہیں۔ لڑکپن پر جوانی کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالنا کوئی اچھی بات نہیں۔ بڑا ہو کر خود ہی سب کچھ سیکھ لے گا''۔

جس دن میں ایم۔ ایس۔ سی کے امتحان کا آخری پرچہ دینے جارہا تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے بابا نے مجھ پر محبت بھری نظر ڈالی اور کہا'' بیٹے! میں خوش ہوں کہ تم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اب تمہیں کسی کی بھی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے۔ تم اپنے قدموں پر خود کھڑے ہونے کے قابل ہو۔''

''ابا جان! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کی ہمیشہ ہی ضرورت رہے گی'' میں نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔

''جیتے رہو بیٹا! ہمیشہ پھلو۔ پھولو۔ مجھے تم سے یہی امید تھی'' انہوں نے دعائیہ لہجے میں کہا

میں گھر واپس لوٹا تو والد محترم اس جہاں فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ بیوی کے پیار کی محرومی سے ان کی دنیا تاریک ہو چکی تھی اور وہ میری خاطر ہی زندگی کو گوارا کر رہے تھے۔ اب جب انہیں محسوس ہوا کہ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکتا ہوں تو وہ ایسی زندگی سے بے نیاز ہو گئے جو سانسوں کی گنتی کے سوا کچھ نہ تھی۔

میرا اب دنیا میں اگر کوئی تھا تو صرف میری ستر سالہ دادی اماں تھیں۔ اگر انہیں ماضی کی ایک مقدس یادگار کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ طہارت اور بزرگی میں ان کا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ میرے والد بزرگوار کو یقین کامل تھا کہ ان کی خوشحالی اور مسرت کا منبع دادی اماں کی دعائیں ہی ہیں۔

میری امی اور ابا دونوں ہی پڑھے لکھے تھے لیکن دادی اماں نہ صرف کوری ان پڑھ بلکہ دیہاتی بھی تھیں۔ وہ ابھی تک زکام کو جکام اور نزلہ کو زلزلہ کہتی تھیں۔ ان کی ایک پختہ عادت یہ تھی کہ وہ ہر عید کے دن سیف الملوک پڑھتی تھیں اور وہ بھی ایسے ترنم سے کہ حضرت داؤد علیہ السلام بھی ان پر فدا ہو جائیں لیکن ان کی خوش الحانی کے جادو میں حسرت و یاس کی دیوی انگڑائیاں لیتی دکھائی دیتی تھی کیونکہ یہ قصہ پڑھتے ہوئے ان کی آنکھیں شدت سے اشکبار ہو جاتی تھیں۔

عید کے دن سیف الملوک پڑھ کر رونے میں آخر کیا حکمت تھی؟ اسکی وجہ یہ تھی کہ میرے دادا مرحوم کا نام سیف علی تھا۔ وہ عید کے دن فوت ہوئے۔ لہٰذا عید کے دن سیف الملوک پڑھنا نہ صرف فاتحہ خوانی کا متبادل تھا بلکہ محبوب رفتہ کی یادوں کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کا بھی ایک ذریعہ تھا۔ اس بار جب عید آئی تو مجھے یقین ہونے لگا کہ میں لیلیٰ مجنوں کی نسل سے ہوں کیونکہ دادی ماں نے سیف الملوک کی تلاوت کے بعد مجھ پر لمبی سی پھونک مار کر کہا ''اسلم بیٹے۔ اب میرا بھی وقت آرہا ہے۔ چاہتی ہوں کہ آخری سانس لینے سے پہلے تیری شادی کے شادیانے سنتی جاؤں۔ کہو اپنی مرضی کی شادی کروگے یا میری مرضی کی......''

وہ پل بھر کے لئے رکیں اور پھر بیان جاری رکھتے ہوئے کہنے لگیں ''اپنی مرضی کی شادی تو گدھے کرتے ہیں جن میں بزرگوں کے لئے کوئی ادب و احترام نہیں ہوتا۔ اور تم تو گدھے نظر نہیں آتے۔ اسلئے تم من مانی شادی کا خیال تک نہیں کرسکتے۔ بڑا اچھا ہوا جو تم نے یہ انتخاب مجھ پر چھوڑ دیا''

''لیکن میں نے تو کہا ہی کچھ نہیں دادی اماں۔ آپ اس فیصلے پر کیسے پہنچ گئیں'' میں نے تعجب سے کہا۔

''تیرے ابا مرحوم کا جواب بھی آج سے پچیس سال پہلے یہی تھا۔ جب میں نے اسے ایک چپت لگائی تو فوراً گدھے سے انسان بن گیا'' دادی اماں نے مجھے گھور کر کہا اور جب میں نے انکے دائیں ہاتھ میں حرکت کی شدت دیکھی تو بے اختیار منہ سے نکل گیا'' دادی اماں۔ آپ سے میرا بڑا دوست اور کوئی ہو سکتا ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے میں ایسی جرأت کیسے کرسکتا ہوں''

"یہ ہوئی نہ بات...... تیرے باپ کے لئے رشتہ بھی میں نے ہی تلاش کیا تھا۔ تیرے لئے تو چاندی کی دلہن لاؤں گی" دادی اماں نے بڑے فخر سے دعائیہ لہجے میں کہا۔

دادی اماں ان پڑھ ضرور تھیں لیکن گنوار نہیں تھیں۔ وہ اس طرح تھیں جیسے سیپ میں چھپے ہوئے موتی کی چمک۔ جسے عام آنکھ دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ میں حیران تھا کہ انہوں نے شادی کے سلسلے میں "چاندی کی دلہن" جیسے الفاظ کیوں استعمال کیے۔ شاید انہیں میں نے ہی بچپن میں بتایا تھا کہ تمام بچے مس تسلیمہ بٹ کو "چاندی کی دلہن" کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہیں اب تک میری وہ بات یاد ہو جو انہوں نے میرا دل لبھانے کے لئے دہرادی۔

بات تو ساری تھی ہی مس بٹ کی۔ جب اس نے ماڈرن نرسری کی نوکری چھوڑی تو اس کی عمر بائیس برس تھی۔ اس کے لئے اس وقت کم از کم دو رشتے آئے جو کہ بہت بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس نے دونوں کو ہی ٹھکرادیا کیونکہ وہ ایسی لڑکی تھی جو دوسروں کا سہارا لے کر عروج حاصل کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اپنے بل بوتے پر زندگی کی بلندیوں کو چھونے کی متمنی تھی۔ اسے ایم۔ اے انگریزی کرنے میں دو سال اور لگ گئے اور بعد ازاں گورنمنٹ کالج میں لیکچرار کی جگہ مل گئی۔ اس آسامی کی جھلک سے تسلیمہ کے حسن کو چار چاند لگ گئے اور اسے متعدد رشتوں کی پیشکش ہوئی لیکن تسلیمہ کو اپنی پسند کی شادی کا جنون تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شادی ایک ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی کو بھی دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ بات بہت حد تک ٹھیک ہے لیکن وہ یہ بھول گئی کہ اولاد کی خوشی اور غم دونوں ہی والدین کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اسلئے اگر والدین کو ان کیلئے بر چننے کا اختیار نہیں تو مشورہ دینے کا حق تو ہے۔ جس مرد سے بھی اس کی ملاقات ہوئی وہ اسے پسند نہ آیا۔ کسی کی ناک ٹیڑھی ہونے کی باعث وہ میاں مٹھو نظر آتا تھا۔ کسی کے بال اتنے گنجلک اور گھنے تھے کہ وہ بھالو کی طرح تھا اور کوئی گنجا ہونے کے سبب چٹیل میدان کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ذات پات بھی ایک مسئلہ تھا۔ اگر بر موزوں تھا تو اس کا تعلق غلط ذات سے تھا۔

جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی رشتے آنے بند ہونے لگے۔ وہ ستائیس برس کی تھی تو اس پر اچانک ایک تیس سالہ کرنل لٹو ہو گیا۔ وہ اس سے شادی کرنے کے لئے بیقرار تھا لیکن نہ صرف اس کی ماں ابھی پچاس سال کی تھی اس کی دو نوجوان کنواری بہنیں ابھی تک گھر میں بیٹھی تھیں۔ اس نے ساس اور نندوں کی کہانیاں سن رکھی تھیں اسلئے یہ رشتہ نہ ہو سکا۔

تسلیمہ تیس برس کی ہو چکی تھی۔ اس کے سر میں چاندی آنے لگی اور وہ بھی غلط جگہ پر اس کے بالوں کا وہ حصہ سفید ہونے لگا جو کہ پیشانی سے ملتا ہے۔ اب اسے کنوارے لڑکوں کے رشتے آنے بند ہو گئے۔ ایک رشتہ جو آیا وہ ایک رنڈوے کا تھا۔ وہ پڑھا لکھا متمول انسان تھا لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے چار بچے تھے۔ اسے دراصل ایک آیا کی ضرورت تھی لیکن چونکہ ایک کنجوس انسان تھا اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی یعنی بیوی کے پردے میں آیا۔ لیکن اس کا تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔

تسلیمہ کو آخری پیغام شادی ایک لکھنوی نواب عزت بیگ سے ملا جس کی عمر ساٹھ سال سے بھی متجاوز تھی۔ وہ اسے ملنے کے لئے گھر آیا تو اس کا نقشہ دیکھ کر تسلیمہ کو اپنی قسمت پر رونا آگیا۔ نواب صاحب کا سر گنجا ہونے کے باعث ریگستان کے لئے باعث رشک تھا۔ ان کے سامنے کے دو بالائی دانت اس طرح غائب تھے جیسے کوئی فاختہ شکاری کے ڈر سے اپنا گھونسلہ چھوڑ کر فرار ہو گئی ہو اور جو باقی تھے ان پر پان خوردنی کا ایسا رنگ چڑھا ہوا تھا جیسے باسی کدو کے بیجوں پر مردنی چھائی ہو۔ ان کی قمیض اور جوتوں میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ جب تسلیمہ کے باپ نے پوچھا کہ آپ کس قسم کے نواب ہیں تو بولے "ہم نواب واجد علی شاہ مرحوم کے پوتے کے پوتے ہیں اور ان کے تختِ بخت آور کے دعویدار"

"لیکن واجد علی شاہ اور اس کی لکھنوی ریاست کو نابود ہوئے تو صدیاں گزر گئیں۔ آپ ان کے جا نشین کیسے بنیں گے" تسلیمہ کے والد نے پوچھا۔

"صاحب۔ ہمارے پیر صاحب بڑے خدا رسیدہ انسان ہیں۔ چونکہ کام بہت بڑا ہے اسلئے بڑی شیرینی لئے بغیر ہمارے حق میں تسبیح گھمانے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی لئے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگ رہے ہیں کہ برسر روزگار ہے۔ آخر اتنا تو ضرور کماتی ہو گی کہ ہمارا اور ہمارے پیر صاحب کا گزارہ ہو سکے۔ شادی کے بعد دیکھئے گا کہ پیر صاحب کی کرامت کس طرح رنگ لاتی ہے۔ آپ کی بیٹی یقیناً لکھنؤ کی ملکہ بنے گی"

تسلیمہ کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ بہروپیہ جو خود کو نواب عزت بیگ کہتا ہے۔ اس کی تحقیر کرنے کے لئے آیا ہو۔ اسے پھوٹ۔ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھ اس کے باپ نے عزت بیگ کو اپنے گھر سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا تو کہنے لگا "صاحب ہم جھوٹ موٹ کے نواب نہیں۔ ہم تو خاندانی نواب ہیں اسی لئے اپنی وجاہت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنا تخلص بھی نواب ہی رکھا ہے۔ اگر ایک دو شعر کہہ دیں تو حضور ہمارے پاؤں پکڑ کر معافی کے لئے گڑگڑانا شروع کر دیں گے"

"نواب صاحب۔ اگر آپ فوراً یہاں سے رفو چکر نہ ہوئے تو آپ کی گڑگڑاہٹ سے یہ تمام کوچہ قیامت کا نظارہ بن جائے گا" تسلیمہ کے باپ

نے طیش سے تلوار گھماتے ہوئے کہا۔

نواب صاحب اس تیزی سے بھاگے کہ دانتوں کے روشندان سے چھالیہ گر پڑی۔

اس المیے کے بعد تسلیمہ کو شادی کی آرزو نہ رہی۔ اس نے اپنے کریئر کو مزید سنوارنے کیلئے پی۔ ایچ۔ ڈی کر لی اور اسے محکمۂ تعلیم میں ایک بڑی آسامی مل گئی۔ اتفاق سے وزیر تعلیم اس کے دام حسن میں اس طرح گرفتار ہوا کہ اس سے نکاح کرنے کے سپنے دیکھنے لگا حالانکہ اس کے بچوں کی تعداد پچیس سے زیادہ تھی۔ ان میں سے پانچ جائز اور بیس ناجائز تھے جو اس کی سیاسی چابکدستی کی پیداوار تھے۔ اس کا نام مہر داد خان تھا۔ وہ پنجاب کا ایک بڑا جاگیر دار تھا۔ اسے اپنے ناجائز بچوں کی تعداد پر بڑا ناز تھا کیونکہ انہیں اپنی چالاکی، عیاری قوت غلبہ کی دلیل سمجھتا تھا۔ اس نے تسلیمہ کو پنجاب کے شعبہ تعلیم کی سیکریٹری بنانے کی پیشکش کی جو کہ شادی کے ساتھ مشروط تھی لیکن تسلیمہ نے اسے کاروبار ٹھہراتے ہوئے ٹھکرا دیا۔

آج پھر عید تھی۔ یعنی دادی اماں کے سیف الملوک پڑھنے کا دن تھا۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک پرانی سہیلی صبح سویرے ہی آ ٹپکی۔ وہ اس کو رخصت کرنے کے لئے باتیں کرتے ہوئے گھر سے دور نکل گئیں اور واپسی پر ایک موٹر کار سے ٹکرا گئیں لیکن ڈرائیور نے رکنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ خوش قسمتی سے ان کے زخم معمولی خراشوں کے سوا کچھ نہ تھے لیکن عمر کی زیادتی کے باعث وہ کچھ حواس باختہ سی ہو گئیں۔ ایک اور خاتون ڈرائیور جس نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا دادی اماں کو اپنی کار میں بٹھا کر ہسپتال لے گئی اور جب ان کا طبی معائنہ ہو چکا تو انہیں خود ہی ہمارے گھر کے دروازے تک چھوڑ گئی لیکن دادی اماں کے اصرار کے باوجود اندر نہ آئی۔ میں اس وقت نماز عید ادا کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر دیکھا کہ دادی اماں کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ بڑے انہماک سے سیف الملوک گا رہی تھیں۔ لیکن اس بار ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔

میں یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس تغیر کی وجہ پوچھی تو کہنے لگیں

الوداع۔ اے آنسوؤ۔ اب الوداع
آج سے دور مسرت کی ہوئی ہے ابتدا

"یہ شعر تو درست نہیں ہے دادی اماں" میں نے تیزی سے کہا۔ "یہ تمہاری غلط اندیشی ہے۔ بیٹے! دادی اماں نے کہا "شعر صرف علم عروض سے ہی نہیں آرزوؤں اور امیدوں سے بھی بنتے ہیں"

"وہ کونسی سی خوشی ہمارے گھر آنے والی ہے" میں نے بیتابی سے پوچھا

"ایک نئی۔ نویلی دلہن۔ چاندی کی دلہن"۔

"ذرا کچھ تفصیلات ہم بھی تو سنیں" میں نے مودبانہ طور پر دبے ہوئے انداز میں کہا۔

"پھر گدھے پن پہ اتر آئے۔ جن باتوں کا تعلق سہاگ رات سے ہو انہیں دن کے وقت بیان کرنا بدذوقی کی دلیل ہے" دادی اماں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

ہاں تو میں یہ کہنا بھول گیا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کا کاروبار سنبھال لیا تھا اور اسے بڑی کامیابی سے چلا رہا تھا۔ ایک دن شام کو میں جب گھر واپس لوٹا تو دادی اماں انتہائی مسرور کن موڈ میں بیٹھی تھیں۔ مجھے گلے لگا کر کہنے لگیں "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سیف الملوک پڑھتے پڑھتے میں پیر دستگیر کی ہم پلہ ہو گئی ہوں۔ لڑکی جسے پہلے اپنی من چاہی شادی کرنے کا جنون تھا اس نے اب اپنا بر چننے کا اختیار اپنے والدین کو دے دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ ایک اچھی بیوی بننے کیلئے اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کے لئے بھی تیار ہے۔ غالباً وہ تم سے چند سال بڑی ہے لیکن شادی جو پیمان رفاقت کی انتہا ہے اس میں عمر کی قید جائز نہیں"

آخر سہاگ رات آئی۔ میں اپنی دلہن کا گھونگھٹ اتارنے کے لئے بیقرار تھا۔ اس کے سامنے کے بالوں میں سفیدی کا ایک بیضوی نشان کچھ ایسے انداز میں ابھر رہا تھا جیسے چاند سیاہ بدلیوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہو۔ سنگھار کی مناسبت سے حقیقتاً چاندی کی دلہن نظر آ رہی تھی۔ مجھے خوشی سے متحیر دیکھ کر کہنے لگی "ملکو تم تو جوان ہو گئے۔ اب تو ناک نہیں پوچھنے پڑے گی" اس نے ساحرانہ طور پر مسکرا کر کہا۔

"لیکن تم تو رتی بھر نہیں بدلی ہو" میں نے بے ساختگی سے اس کا منہ چوم کر جواب دیا۔

یہ دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ اب تک وہ انگوٹھی پہنے ہوئے تھی جو میں نے اسے الوداعی پارٹی میں دی جب میں دس سال کا اور وہ بائیس برس کی تھی۔ خدا جانے یہ کوئی لاشعوری بندھن تھا جس نے اسے شادی کی اتنی پیشکشوں کو ٹھکرانے پر مجبور کر دیا۔

ہماری شادی ہوئے زمانہ گزر چکا ہے۔ عمروں کا فرق ہماری محبت کی چکی میں پس کر رہ گیا ہے۔ بدقسمتی سے دادی اماں کبھی کی خدا کو پیاری ہو چکیں لیکن خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ وہ میری بیوی کو سیف الملوک سکھا گئیں جو وہ بڑے والہانہ انداز میں ہر عید کو آنسو بہائے بغیر مجھے اور بچوں کو سناتی ہے۔

بوجھو تو وہ کون ہے؟

دامِ تاویل

انور شیخ
P. O. Box : 918, CARDIFF (U.K.)
CF2 4YP

مولانا اشفاق احمد برمنگھم میں دو باتوں کے لئے مشہور تھے۔ اپنی توند اور قوتِ تجزیہ کے لئے جسے عام زبان میں تاویل کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگ جسے شراب کہیں رند اسے "جَو کا پانی کہتے ہیں اور علمائے کرام جنہیں بادہ و ساغر سے رغبت ہو اسے "نعمتِ جنت" اور "شراب خلد" کے خطابات سے نوازتے ہیں۔ اور پھر صوفیوں کی بات تو اور بھی تعجب خیز ہے جو کہ بھنگ اور گانجا محض "دیدہ حقیقت" کے لئے پیتے ہیں۔ ورنہ ان کو نشہ سے کیا تعلق ہے؟۔ غالب مرحوم نے کیا خوب فرمایا تھا

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

معاف کیجئے، مجھے مولانا اشفاق احمد کی توند کا ذکر پہلے کرنا چاہیئے۔ اگر ان کی قوت تاویل کا قصہ شروع کر دیا تو ممکن ہے ان کی عظیم توند کو بیان کرنے کا وقت نہ ملے۔

مجھے معلوم ہے کہ اکثر لوگ مولانا اشفاق احمد کے متعلق غلط بیانی کرتے ہیں لیکن اس کی وجہ حسد ہے۔ میں افترا پرور نہیں ہوں اگرچہ کبھی کبھی جھوٹ بول لیتا ہوں۔ آخر اس کے بغیر گزارہ ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں جھوٹ کا زندگی کے ساتھ وہی تعلق ہے جو نمک کا آٹے سے۔ یا سچ پوچھو تو ترکاری سے۔ جس طرح نمک سالن کو لذیذ بناتا ہے اسی طرح جھوٹ زندگی کو لطف بخشتا ہے۔ اگر مجھ پر یقین نہیں آتا تو کسی سیاست دان یا عالم دین کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لو۔ میرے جھوٹ بولنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں مخلص اور عاجز انسان ہوں۔ اگر جھوٹ نہ بولوں تو دوسروں سے اخلاقی طور پر بہتر نظر آنے لگوں۔ یہ تو تکبر کی علامت ہے جو سخت مکروہ چیز ہے۔ ایسے اخلاق کو سلام جو انسانوں میں اونچ نیچ پیدا کرے چونکہ آجکل اکثر انسان پست ہیں اس لئے پستی بلندی سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ اب انسانی زندگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

غالباً زیادہ تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اشفاق احمد کی توند حلوے کی قبر ہے۔ لیکن بعض منچلے اسے حلوے، پلاؤ اور مرغوں کا قبرستان تصور کرتے تھے۔ خیر الدین چڑا اسی کا کہنا ہے کہ مولانا اشفاق احمد سے تپاک سے ملے تو ان کے پیٹ سے مرغے کے اذان دینے کی آواز آرہی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ خیر الدین نے ایک لڑاکا مرغا پال رکھا تھا۔ ایک دن جب کہ مولانا گرمیوں میں درخت کے سائے میں سو رہے تھے تو مرغے نے گستاخی یا بے خبری سے مولانا کی پیٹھ پر بڑے جوش سے ٹھونگا مار دیا۔ مولانا کے چیخنے کی آواز اس طرح آسمان تک پہنچی جیسے وہ "ککڑوں کوں" کا وظیفہ فرما رہے ہوں۔ اگرچہ مولانا کا قول تھا کہ اللہ رحیم ہے لیکن انہیں مرغے پر رحم نہ آیا۔ وہ اس پر بلی کی طرح لپکے اور اس کی گردن کو مضبوطی سے دبا لیا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ پھر انہوں نے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور پھر اسے اس طرح دھوتی میں چھپا کر چلنے لگے جیسے ڈھیلا فرما رہے ہوں۔ آخر سڑکوں پر چلتے چلتے ڈھیلا کرنا ایک اسلامی فرض کی ادائیگی ہی تو ہے۔

مذہب کی آڑ میں الو سیدھا کرنا، مذہب فروشوں کی ایک قدیم رسم ہے۔ دراصل مولانا مرغے کو سزا دینا چاہتے تھے۔ ایک عالم دین کی پیٹھ پر ٹھونگا مارنے سے بڑا کفر کیا ہو سکتا ہے۔ مولانا کو خیال تھا کہ ہر کافر کی سزا دوزخ ہے۔ مرغا کفر کا ارتکاب کر چکا تھا اس لئے اس کا ٹھکانہ جہنم تھا۔ لیکن چونکہ وہ "اللہ رحیم" کے قائل تھے انہوں نے مرغے کو ذبح کرنے کے بعد آگ میں پھینک دینا گوارہ نہ کیا بلکہ اسے اپنے پیٹ میں جگہ عطا فرمائی جہاں کتنے ہی مرحوم مرغوں کی روحیں آباد تھیں ان تمام مرغوں نے مولانا کو خفا کرنے کی کوئی حرکت ضرور کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کو "مرغا چور" کہنا جائز نہیں۔

اس سے پہلے ایک مرغے نے ایک ایسی کافرانہ حرکت کی تھی جس کا ذکر کرنا بھی کفر سے کم نہیں لیکن چونکہ میں سچ بیانی کا وعدہ کر چکا ہوں اسلئے مجبوراً عرض کر رہا ہوں کہ اس مرغے کا نام "سحر انگیز" تھا وہ اس لئے کہ اسے معمول سے پیشتر ہی صبح اذان دینے کی عادت تھی۔ لیکن ایک بار اس نے یہ فریضہ ادا نہ کیا۔ جس سے مولانا مشکل میں پھنس گئے۔ اگرچہ یہ قصہ بیان کرنے سے مولانا کے پول کھلنے کا ڈر ہے۔ لیکن اس کے بغیر صاف گوئی کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ مجبور ہوں۔

مولانا کے پڑوس میں ایک نوجوان خاتون مریم رہتی تھی۔ جو کہ شادی شدہ تھی۔ اس کا خاوند دہریہ تھا اور اپنی بیوی سے تقریباً تیس برس عمر میں بڑا تھا ایک دن جب مولانا اور مریم مخالف سمتوں سے آرہے تھے تو بارش کی وجہ سے ان کے قدم پھسل گئے۔ مولانا پیٹھ کے بل گرے اور مریم ان کی گود میں آ پڑی۔ انہوں نے مکاری سے کام لیتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اور گدھے کی طرح دولتیاں مار کر گئے۔ مولانا اس کے خاوند کی

نسبت کہیں جوان تھے اور پھر مرغا خوری کے سبب مرغوں کی طرح سرخ اور اکڑ باز تھے۔ اس لئے عالم شباب کی لہروں پر رقصاں نظر آتے تھے۔ یہ سانحہ بھی ایک عجیب سانحہ تھا۔ مریم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ حلوے کے بنے ہوئے اڑن کھٹولے پر سوار ہو۔ مولانا کی نرم و نازک توند میں جادو بھرا لطف تھا۔ وہ کیا گتھم گتھا ہوئے ان کے دل بھی آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ اگرچہ مریم کا خاوند اعظم خان تقریباً ساٹھ برس کا تھا۔ وہ پہلوانی کے فن میں چست اور مزاج کا تند تھا۔ چونکہ اسے بیوی کی حاجت نہیں تھی اسلئے وہ اس کی خوشی اور غمی کے وسوسوں سے آزاد تھا۔ مریم اشفاق احمد کے دام محبت میں گرفتار ہو چکی تھی لیکن اپنے خاوند سے خائف تھی اور اشفاق احمد کو بھی وہ ایسے ہی دکھائی دیتا تھا۔ جیسے بلی چوہے کو۔ آخر مریم کو ایک ترکیب سوجھی اس کو "جنوں کے دورے" پڑنے لگے۔ اس کا خاوند اگرچہ دہریہ تھا ابھی تک مذہبی اوہام پرستی کے چنگل سے آزاد نہ ہو سکا تھا۔ جونہی بیوی کی دیوانگی بڑھی اور گھر کا قرار بگڑا اس کا خاوند اشفاق احمد کے آگے دست بستہ رویا اور بیوی کا جن نکالنے کے لئے فریاد کی۔ اشفاق احمد خود نیم دہریہ تھا اور محض ذریعۂ معاش کو برقرار رکھنے کے لئے مسلمان تھا۔ آخر امامت کی آسامی کوئی مذاق نہیں۔ بالخصوص جبکہ ملا ان پڑھ ہو۔ اس نے اعظم خان کو مسرت انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "اگرچہ تم بے دین ہو لیکن میں پھر بھی یہ خدمت ضرور سر انجام دوں گا ممکن ہے کہ تم ایمان لے آؤ"۔

اب اشفاق احمد کے لئے مریم کا دروازہ کھل چکا تھا اور وہ اس کے گھر بے خطر داخل ہو سکتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اشفاق احمد نے اعظم خان کو یقین دلایا تھا کہ بعض آیات کا وقت دن کو ہوتا ہے اور بعض کا رات کو۔ جن ایک پوشیدہ مخلوق ہیں۔ اس لئے ان کا چلن ایسے اصولوں کا پابند ہے جن کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اعظم خان ایک شفٹ ورکر تھا یعنی کبھی دن کو نوکری پر جاتا تھا کبھی رات کو۔ جب بھی کبھی نائٹ شفٹ پر ہوتا تو وہ صبح چھ بجے گھر پر پہنچتا تھا۔ چونکہ مرغ "سحر انگیز" کو صبح پانچ بجے اذان دینے کی عادت تھی۔ اشفاق احمد جناتی کاروائی سے فارغ ہو کر چھ بجے سے پہلے ہی اس کے گھر سے نکل آتا۔ ایک دن مرغ "سحر انگیز" کا مزاج ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ اذان نہ دے سکا۔ جونہی اعظم خان اچانک داخل ہوا تو چیختی ہوئی چارپائی نے اس کی توجہ مبذول کرائی۔ وہ اس کی بیوی کا والہانہ انداز میں جن نکال رہا تھا۔ اعظم خان نے اسے ایک کوڑا مارا تو اشفاق احمد "مریم کی چارپائی سے چھلانگ لگا کر اٹھا اور اپنی سرخ پتلون وہیں چھوڑ کر آندھی کی طرح فرار ہو گیا۔

اشفاق احمد اپنی جناتی حرکات پر نظر ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنی ذلت کی ذمہ داری "مرغ سحر انگیز" پر ڈال دی۔ اور اسے بڑی سفاکی سے ذبح کر کے اپنی توند میں ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔

اعظم خان اگرچہ بوڑھا تھا اور اسے بیوی کی حاجت نہیں تھی لیکن وہ غیرت مند تھا۔ اس کے دہریہ پن نے اس کی اخلاقی حس کو تیز کر دیا تھا۔ چونکہ وہ بے عقیدہ تھا اس لئے صاحب عمل تھا۔ اس نے مریم کی مارپیٹ کرنے کے بجائے اپنے گریبان میں نظر ڈالی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک ساٹھ سالہ مرد کا ایک تیس سالہ عورت سے شادی کرنا غلط ہے۔ اس نے مریم سے صاف صاف کہا کہ وہ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہے اور پھر اسے کبھی نہیں ملے گا۔

مریم پیشے کی نرس تھی اور یہ اس کی دوسری شادی تھی۔ اس کا پہلا خاوند عبدالماجد نہ صرف ڈاکٹر تھا بلکہ کوکین کا کاروبار کرتا تھا۔ جن لوگوں کو اس کی عادت پڑ چکی تھی ان کی اکثریت ڈاکٹر عبدالماجد کی مریض تھی۔ اس لئے وہ بہت مالدار تھا۔ اعظم خان کو بھی کسی زمانے میں کوکین کا بڑا شوق تھا۔ وہ جو کچھ کماتا تھا سب ڈاکٹر کی نذر کر دیتا تھا۔

ڈاکٹر پاکستان سے کوکین لانے کے لئے مریم کو استعمال کرتا تھا۔ وہ اس ٹریفک میں کافی تجربہ کار ہو چکی تھی۔ جب اس کاروبار کے مجرموں کو سخت سزائیں ملنے لگیں تو اسے ڈر محسوس ہونے لگا۔ ایک بار تو وہ گرفتار ہوتے ہوتے بچی۔ اس نے اپنے خاوند سے تعاون کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ پہلے عبدالماجد نے اسے پیار سے پھسلانے کی کوشش کی لیکن جب یوں کام نہ بنا تو اس پر تشدد سے اس طرح کام لیا کہ اس کے جسم کے کئی حصوں سے خون بہنے لگا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس موقع پر اعظم خان اچانک نمودار ہوا۔ اگرچہ مریم مار کھا رہی تھی وہ اسے ڈرانے کے لئے چلا چلا کر اس کی کارگزاریوں کا ذکر کر رہی تھی۔ اعظم خان اس کا گاہک ضرور تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر کا ذریعہ حصول کیا ہے۔ مریم کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اعظم خان نے اس پر رعب جما کر کہا "تنگ وطن ہوں۔ میں ابھی پولیس کو اطلاع دینے جا رہا ہوں"۔

یہ دھمکی بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ عبدالماجد تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنے کو ٹیکہ لگا لیا اور اس جہان فانی سے چل بسا۔ پولیس کی ابتدائی کارروائی کے بعد جب حالات اعتدال پر آئے تو اعظم خان نے مریم کا ہاتھ مانگا۔ وہ اپنے آپ کو اس کا

احسان مند خیال کرتی تھی۔ آسانی سے مان گئی۔ اور اس سے بیاہ کرلیا۔ مریم ایک امیر عورت تھی۔ اور اعظم اسی کے گھر رہتا تھا۔ اگرچہ وہ پرہیزگار نہیں تھی اسے فاحشہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے اشفاق احمد کے معاشقے کا اصل سبب اعظم خان کی جنسی کمزوری تھی اور اشفاق احمد کی نادر توند غالباً اس کا مزید باعث تھا۔

اشفاق احمد کی توند کی باتیں تو ہو چکیں اب اس کی قوت تاویل کا ذکر کرنا چاہیئے۔ وہ ملا تھا جو کہ دوسروں کو درس جہاد دینے میں اسپ تازی تھا لیکن خود اس پر عمل کرنے میں گدھے سے بھی کہیں سست رفتار تھا۔ جو شخص رزق خدا بالخصوص حلوے انڈے اور مرغوں کا دشمن ہو اس میں تو وفور خون و حرارت رندانہ ہونی چاہیئے لیکن مولانا پر اس کا اثر الٹا تھا۔ وہ میدان کے نامرد تھے البتہ چارپائی میں بڑے دل آور تھے۔ جس عورت نے بھی ان کے ساتھ نبرد آزمائی کی مفتوح ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی ''مفتوحات'' میں کچھ گوری عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان سب کو کسی نہ کسی بہانے جن پڑتے تھے۔ مولانا کسی جنسی غرض کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنا ایمانی فریضہ سمجھ کر ان کے جن نکالتے تھے تاکہ وہ ''نیک بیبیاں'' بنیں اور اپنے مردوں سے ناجائز جسمانی مطالبے نہ کریں۔ اس سے زیادہ قوت ایمانی اور کیا ہو سکتی ہے۔ دوسروں کا جسمانی بوجھ خود اٹھانا انسانیت کی انتہا ہے۔ مریم مولانا کی تلاش میں کئی دن سرگرداں رہی لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئے۔ جمعہ کا مبارک دن آیا تو وہ نمازیوں کی ٹولی میں دکھائی دیئے۔ وہ اس وقت بالکونی پر کھڑی تھی۔ اس نے مولانا کی سرخ پتلون کو ہاتھ میں لے کر جھنڈی کی طرح تیزی سے ہلانا شروع کردیا۔ وہ ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا الٹا اثر ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ لال جھنڈی خطرے کی علامت ہوتی ہے۔ وہ سمجھا کہ شاید اعظم خان اس کا پیچھا کرنے کو ہے اور اسے فرار ہونے کا اشارہ کر رہی ہے۔ بے چارے مولانا کو اپنی اچھلتی ہوئی توند کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ ایسے لگتا تھا جیسے چھلکتی ہوئی چھاگل گردش میں ہو۔ چند نمازی اس منظر کی حقیقت کو بھانپ گئے جس سے مولانا کے مزاج گرامی کو صدمہ ہوا۔

وہ گرنے ہی کو تھے کہ انہیں ایک نمازی نے سنبھال لیا۔ اور تھام کر گھر کی طرف لے چلے جونہی باہر نکلے مریم وہاں کھڑی تھی اب اس نے سبز ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی چھاتیوں کا تعجب خیز ابھار تھا۔ اگرچہ اس کے اعضاء میں تناسب نہیں تھا اور رنگ بھی سانولا تھا۔ اس کا یہ وصف اور جوانی۔ اسے جاذب النظر بنانے میں معاون تھے۔ وہ ایک سبز پری کی مانند تھی۔ مولانا جو حوروں کے خواب اکثر دیکھتے تھے انہیں سبز پریاں ہی تصور کرتے تھے۔ مریم کو اس طرح ملبوس دیکھ کر ان کا جن نکالنے کا شوق عود کر آیا۔ انہیں اپنے ساتھی کا خیال تک نہ رہا۔ اور وہ مریم کے گھر داخل ہو گئے۔ مولانا اس سے فوراً لپٹ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ عقلمند ہیں خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جناتی رسومات کی ادائیگی کے بعد مریم نے مولانا کو حقائق سے آگاہ کیا۔ مولانا کو اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ سمجھنے لگے جیسے انہیں دنیا میں جنت مل گئی ہو۔ ایک جوان عورت جو امیر بھی ہو اور جسے جناتی دورے بھی پڑتے ہوں کسی جہنمی کو کیسے مل سکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ انہیں پرہیزگاری کا زعم بھی ہونے لگا۔ آخر تقویٰ کی انتہا حصول جنت ہی تو ہے۔

چند ملاقاتوں کے بعد ظاہر ہوا کہ مریم اشفاق احمد کی داشتہ بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اگر اشفاق کو مریم کی ضرورت ہو تو اسے شادی کی زنجیر پہنی پڑے گی۔ اشفاق کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ تھا۔ ایک تو وہ خود شادی شدہ تھا اور اس طرح انگریزی قانون اسے دو بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے سے جیل کی سیر کرنا امر لازم تھا۔ دوسرے مریم ابھی منکوحہ تھی۔ اگرچہ اس کے خاوند نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ابھی تک طلاق یافتہ نہ تھی۔ نکاح پر نکاح کرنا ایک شدید اسلامی جرم ہے۔ جو اس کا ارتکاب کرے نہ اس کی نئی شادی جائز ہوتی ہے بلکہ اسکا موجودہ نکاح بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو تو کیسے؟

مولانا کو مریم سے محبت ہو چکی تھی۔ وہ اس حقیقت سے آشنا تھی۔ وہ اشفاق احمد کا اشتیاق جنون کی حد تک بڑھا دینا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر پیاسے کو پانی نہ دیا جائے تو اس کی پیاس اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ دیوانہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسے جناتی دورے پڑنے بند ہو گئے اور اس طرح اشفاق احمد کی بے قراری بڑھنے لگی۔ اور وہ اس مسئلے کو ہر قیمت پر حل کرنا چاہتا تھا۔

دیسی شادی کا مسئلہ حل کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ جب مولانا شام کو گھر آئے اور کھانے کو بیٹھے تو ان کا پارہ فوراً چڑھ گیا۔ کہنے لگے کہ سالن میں اتنا زیادہ نمک ہے کہ اگر سانپ بھی کھائے تو مر جائے۔ جب بیگم نے کہا کہ میں نے اس میں ابھی تک نمک ڈالا ہی نہیں تو بوکھلا اٹھے اور کہنے لگے ''کتیا کہیں کی۔ تو مجھے جھوٹا کہہ رہی ہے کیا؟''......اور پھر ایک ہی سانس میں تین بار طلاق دے دی۔ اس کی بیوی جو حقیقت سے آگاہ تھی، قہقہے لگانے لگی۔ اس نے کہا۔ ''بڑے میاں! یہ انگلستان ہے۔ یہاں بیاہ

اور طلاق پر انگریزی قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسلامی قانون کا نہیں۔ Domicile کا یہی مطلب ہے!"

"اچھا تو اب تم قانون دان بھی بن گئی ہو"۔ مولانا نے طنزیہ کہا اور اسے دو غضبناک کے عطا کئے۔ وہ چلا اٹھی اور کہنے لگی "مجھے مت مارو۔ اگر کرایہ دو تو میں پاکستان چلی جاتی ہوں اور پھر کبھی واپس نہیں لوٹوں گی"۔

مولانا نے اس تجویز پر عمل کیا۔ اور چند دنوں میں بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ مریم بڑی خوش تھی لیکن وہ ابھی منکوحہ تھی۔ یہی حال اشفاق احمد کا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی پاکستان جا چکی تھی۔ ان کا نکاح ابھی تک سلامت تھا۔ مولانا کے دماغ میں ایک سکیم تھی۔ اگر وہ اسے جامہ عمل پہنا سکیں تو ان کے تمام مسائل حل ہو سکتے تھے۔ لیکن اس کے لئے ایک ایسے ملا کی ضرورت تھی جو نکاح پر نکاح پڑھانا جائز سمجھتا ہو۔ انہیں اچانک ملا سجاد خان یاد آگئے۔ جو پاکستان میں ان سے مل کر کوکین کا کاروبار کرتے تھے۔ آخر کار جب وہ انگلستانی دورے پر پکڑے گئے تو انہیں سات سال کی سزا ہوئی۔ اگرچہ اشفاق احمد اس میں برابر کے شریک تھے انہوں نے بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر سو نفل پڑھے اور آئندہ کے لئے ایسی حرکت سے توبہ کی۔ بعض کہتے ہیں کہ رحمت باری نے جوش میں آکر انہیں معاف کر دیا لیکن بعضوں کا کہنا ہے کہ اس میں پیر کرامت اللہ کے تعویز کو بڑا دخل حاصل تھا۔ اور اس تعویز میں کچھ ایسی قدرت تھی جسے نظر انداز کرنا سخت مشکل تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ پیر کرامت اللہ در پردہ داداگیر تھے۔ وہ کوکین کے تاجروں سے کمیشن وصول کرتے تھے جس میں حکومتی عہدے داروں کا حصہ بھی تھا۔ ان کے ظاہری مرید حقیقتاً کرائے کے غنڈے تھے۔ جونہی کہیں گڑبڑ ہوئی یا ان کی تجارت کو خطرہ پیدا ہوا انہوں نے تعویذ لکھ دیا جو اصل میں تہدید نامہ کو کہتے تھے۔ اس میں مخبر یا مجسٹریٹ کو تنبیہ کی جاتی تھی کہ اگر "تعویذ" کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا تو نتائج ہولناک ہوں گے۔ اس میں پٹائی۔ بلیک میل۔ آتش زنی۔ اغواء کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اگرچہ وہ پاکستان میں رہتی تھی۔ تعویذ اس قدر سحر انگیز تھا کہ اس کا اثر انگلستان تک آپہنچا۔ جب سجاد کی عدالت میں پیشی ہوئی تو وہ اشفاق احمد کا نام بھول گیا۔ اعجاز قدرت کے کیا کہنے!۔

اب سجاد کی معیاد سزا پوری ہونے کو تھی۔ وہ سیدھا اشفاق احمد کے گھر آیا۔ دونوں بڑے تپاک سے بغلگیر ہوئے۔ ایک ساتھ سجدے میں گر پڑے اور طویل دعائیں مانگیں۔ اللہ میاں کو سادہ لوح سمجھتے ہوئے آئندہ گناہ نہ کرنے کی قسمیں کھائیں اور پھر اشفاق احمد کا نکاح پر نکاح اس تیزی سے پڑھا دیا کہ اللہ میاں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

جونہی لوگوں کو پتہ چلا تو اشفاق احمد نے ایسی تاویل کی کہ کسی کو تردید کی جرأت نہ پڑ سکی۔ فرمانے لگے کہ "نکاح پڑھانے سے میرا اور میری بیوی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور اس طرح میں دوسری شادی کرنے کا حق دار ہو گیا۔ جب مریم نے نکاح پر نکاح پڑھایا تو اس کا اور اس کے خاوند اعظم خان کا تعلق ختم ہو گیا۔ اور وہ میری بیوی بننے کے لئے آزاد ہو گئی۔ کہو اس میں کیا برائی ہے"۔ جب کسی نے کہا کہ انگلستان میں صرف انگریزی قانون ہی جائز ہے" تو اشفاق احمد نے کہا "استغفر اللہ ہم مسلمان ہیں اور یہ کافروں کا دیس ہے۔ ہم اسلامی روایات کیسے چھوڑیں؟"۔ یہاں تو اکثر لوگ شادی کے بغیر ہی اکٹھے رہتے ہیں۔ شادی اور بے شادی کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کیا حماقت ہے؟"۔

آگیا عہدِ جوانی اب ستانا چھوڑ دے
کاش تو غیروں پہ ظالم مسکرانا چھوڑ دے

یہ تری نمناک آنکھیں، ہم کو تڑپانے کا فن
اب مگر مچھ کی طرح آنسو بہانا چھوڑ دے

کیا یہ کم ہے خانساماں سے تو خانِ خاں بنا
اب یہ بہتر ہے کہ سیّد کہلوانا چھوڑ دے

ہمنشیں، فٹ پاتھ پر سونے کا درماں ہے عمل
اپنے سپنے خود فریبی سے سجانا چھوڑ دے

رقص کرتی ہیں تری آنکھیں کسی کی چاہ میں
میرا دزدیدہ نظر سے دل چرانا چھوڑ دے

تجھ کو پینے کی تمنا ہو اگر پی شوق سے
بعد پینے کے مگر یوں لڑکھڑانا چھوڑ دے

ایک مشکل آزمائش تھا مرا دورِ شباب
اے صنم! پیری میں اب تو آزمانا چھوڑ دے

کیا نہیں تو نے کیا ہم کو پھنسانے کے لئے
پھنس گئے انورؔ تو اب دامن چھڑانا چھوڑ دے

انور شیخ

لیڈی کوٹ

لنڈا بازار کو دیکھ کر مجھ پر شادمانی کی وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جس میں روحانی سرشاری بھی شامل ہو۔

کسی زمانے میں شریف ملک اور میں لاہور کے ایک ریلوے آفس میں بابو تھے۔ اور ہر روز اس بازار سے گزر کر کام پر جاتے تھے۔ ہم ایک بابو کی زندگی سے بیزار تھے اور اپنی قسمت پر چوٹ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو یابو کہا کرتے تھے۔ یابو کے معنی ہیں ٹٹو۔ جسے عام بول چال میں گدھا سمجھا جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے پر یابو کی پھبتی کس کر اپنے احساس کمتری کی تسکین کیا کرتے تھے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایک دوسرے کو دولتیاں مار کر اپنی قسمت کا رونا روتے لیکن دولتیوں سے جو درد ہوتا ہے۔ اسے برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی اس لئے زبانی جمع خرچ کر کے ہی طبیعت کو بہلا لیتے تھے۔ دراصل ہماری یابو کہنے کی عادت لنڈا بازار سے جڑی ہوئی تھی۔

ایک دن جب ہم دفتر سے فارغ ہو کر لنڈا بازار سے گزر رہے تھے تو وہاں ایک پھل فروش کی دوکان دیکھ کر شریف ملک کو آم کھانے کی خواہش یوں شدت سے محسوس ہوئی جیسے گوشت کو دیکھ کر بلی میں گوشت خوری کا جنون پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے موٹے موٹے آموں کا نظارہ ایسے ہی تھا جیسے مجنوں کے لئے لیلیٰ کی دید ہو۔ اس کے منہ میں پانی آگیا اور اس نے بغیر پوچھے ہی ایک آم اٹھا کر کھانا شروع دیا۔ دوکاندار جو ایک عمر رسیدہ اور متین انسان تھا حیرت سے دیکھتا رہا۔ جب وہ آم کھا چکا تو اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک آنہ نکالا اور دوکاندار کی طرف اس طرح پھینکا جیسے کوئی کتے کو ہڈی ڈالتا ہے۔ دوکاندار تلملا اٹھا اور کہنے لگا ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ اس آم کی قیمت تو چار آنے ہے تین آنے اور نکالو۔''

''میں تو بابو آدمی ہوں۔ میرے پاس تو یہی کچھ ہے۔ تم نے جو کرنا ہو۔ کرلو۔'' شریف ملک نے مایوسی سے کہا۔

''یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بابو اور یابو میں کوئی فرق نہیں۔ اگر میں بوڑھا نہ ہوتا تو تمہیں اس بدتمیزی کا مزا چکھاتا۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ یابو کہیں کے۔ ورنہ میں ابھی پولیس کو بلاؤں گا۔''

میری جیب بھی بالکل خالی تھی۔ اس لئے میں شریف ملک کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ البتہ اس کی ندامت میں خود کو برابر کا شریک سمجھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ آج کل تو دوست وہی ہے۔ جو دوست کو مشکل میں دیکھ کر اس کی ہنسی اڑائے۔ سچ تو یہ ہے کہ گھر پہنچ کر وہ جب شرم سے چار چار آنسو رویا تو میں رقت سے آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا۔ شائد کسی نے میرے متعلق ہی کہا تھا ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے''

نہیں۔ نہیں یہ سب غلط ہے۔ میں اپنی بے بسی کا رونا رونے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ شریف ملک کی احمقانہ حرکت نے مجھے وہ موقعہ بہم پہنچایا جس کے لئے میرے آنسو ایک ہدیۂ تشکر کی حیثیت رکھتے تھے۔

لنڈا بازار پھل فروشوں کی جگہ نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کا مرکز تھا۔ جس دوکان کا میں نے ذکر کیا ہے وہ لنڈا بازار کے آغاز سے گز دو گز پہلے واقع تھی۔ ہندوستانی تاجر جاپان۔ یورپ اور امریکہ سے پرانے ملبوسات خرید کر بذریعہ بحری جہاز کراچی لاتے تھے جہاں سے اسّی فی صد مال لاہور پہنچ جاتا تھا۔ شائد ہی کوئی ایسا مغربی لباس ہو جو یہاں دستیاب نہ ہو اور وہ بھی کوڑیوں کے بھاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض بڑے افسر بھی یہاں سے کپڑا خریدتے تھے اور کئی بیگمات جو دوسروں پر اپنی جدّت کا رعب جمانا چاہتی تھیں وہ بھی یہیں سے پھول دار سکرٹس خرید کر اپنی بڑائی کی نمائش کرتی تھیں۔

لنڈا بازار طوالت میں غالباً ایک کلو میٹر ہے لیکن اس میں سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کی سینکڑوں دوکانیں ہیں۔ یہ ریلوے سٹیشن کے قریب نولکھا تھانے سے دلی گیٹ تک پھیلا ہوا ہے جہاں شریف ملک اور میں ایک ہی مکان میں کرایہ دار تھے۔ شریف دراصل ذات کا درزی تھا اور جس طرح اکثر لوگ بڑا بننے کے لئے خود فریبی کا سہارا لیتے ہوئے مرزا۔ مغل۔ سیّد۔ قریشی اور فاروقی وغیرہ بن بیٹھتے ہیں اسی طرح وہ بھی ملک ہونے کا دعویدار تھا۔ اگرچہ وہ ہفتے اور اتوار کو چپکے سے سلائی کا کام کرتا تھا اور اس کے گاہکوں کی

اکثریت وہ لوگ تھے جو لنڈا بازار سے خریدے ہوئے کپڑوں کو فِٹ کرانا چاہتے تھے۔

سردیاں آئیں تو مجھے بھی ایک کوٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے ایک دیدہ زیب پرانا کوٹ بیس روپے میں خرید لیا جو نیا ڈھائی تین سو روپے میں بنوانا بھی مشکل تھا۔ جب میں پہن کر گھر آیا تو شریف نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا "تم تو سچ مچ کے بابو ہو"۔ "وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھتے نہیں ہو کہ یہ کوٹ تمہارے سینے پر ابھرا ہوا نظر آتا ہے" شریف نے کہا۔ "تو پھر کیا ہوا"؟ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آخر بابو ہو۔ بات کیسے سمجھو گے ---پاگل کہیں کے یہ ابھار اس لئے ہے کہ یہ کسی بڑے پستانوں والی عورت کا کوٹ ہے۔ کہو تمہارے پستان کہاں ہیں؟"

یہ سن کر مجھے اتنی شرمندگی ہوئی کہ میں نے فوراً وہ کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ شریف ملک نے اسے اٹھالیا اور کہنے لگا۔ "فکر نہ کرو۔ میں اسے کل تمہارے لئے فٹ کر دونگا۔"

کل آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ مجھ سے کوٹ خریدنا چاہتا تھا۔ اور اس نے مجھے اس کے عوض چالیس روپے پیش کئے ۔ بیس روپے کا منافع کسی بھی بابو کو بابو بنانے کے لئے کافی تھا۔ میں نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے اس فیاضی کی وجہ پوچھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ چند ہفتوں بعد میں نے بھی اصرار چھوڑ دیا کیونکہ شریف کو اس موضوع پر مزید سوالات سے چڑ ہونے لگی تھی۔

اس واقعہ کو ایک برس بیت چکا تھا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ ایک دن شریف ملک غائب ہو گیا۔ مجھے اس کی سخت تشویش لاحق ہوئی تو میری نگاہ اچانک میز پر پڑی۔ وہاں ایک لفافہ پڑا تھا جس پر میرا نام مرقوم تھا۔ میں نے اسے بیتابی سے کھول کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا:

"پیارے بابو!

میں تمہیں لندن پہنچ کر خط لکھونگا ۔ میرے یوں غائب ہونے کی وجہ وہی لیڈی کوٹ ہے جو تم نے مجھے نفع پر بیچا تھا۔ خدا جانے میں لندن بابو بننے کے لئے جا رہا ہوں یا قسمت کا دھنی۔ بابو تو میں لاہور میں بھی تھا۔ بابو بننے کے لئے اتنا طویل سفر اختیار کرنا لازم نہیں۔ شائد اس میں قسمت کی دیوی کا ہاتھ ہے۔ لاہور کو اتنے بابوؤں کی ضرورت نہیں۔ وہاں کیلئے ایک بابو ہی کافی ہے اور وہ تم ہو۔ اگر تم نے وہ لیڈی کوٹ نہ بیچا ہوتا تو آج قسمت کی دیوی تمہارے پاؤں داب رہی ہوتی ---۔ اگر میں تمہیں سچ بتا دوں تو تم خود کو دولتیاں مارنا شروع کر دو گے ۔ حالانکہ کوئی گدھا اپنے آپ کو دولتیاں نہیں مار سکتا لیکن تم وہ کوٹ بیچ کر اتنے بڑے بابو بن گئے کہ خود کو دولتیاں مارنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے ہو۔

اچھا تو بابو بھیا خدا حافظ۔

قسمت کا دھنی

شریف ملک۔"

میں یہ خط پڑھتے ہی مایوسی سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ کون سا کرم تھا جو قسمت کی دیوی مجھ پر کرنا چاہتی تھی لیکن میری کسی غلطی کے سبب شریف پر لٹو ہو گئی۔ پھر خیال آیا کہ قسمت کی دیوی سے تو مجھے آج تک پھٹکار کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔ اگر کچھ حاصل ہوا تو شریف ملک کو ۔ حالانکہ اس کا کردار تو بعض اوقات ایسا تھا جس سے شیطان بھی شرمانے لگے۔ ابھی چند ہفتوں کی بات تھی کہ محرومیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم دونوں آنکھیں گرم کرنے کے لئے انارکلی کی سیر کو نکل گئے۔ وہاں شریف نے ایک نوجوان لڑکی کو چھیڑا تو اس نے جوتا اتار لیا۔ میں اسے بچانے کیلئے بیچ میں آگیا اور لڑکی نے جوتوں کی بوچھاڑ مجھ پر کر دی۔ وہ چستی سے فرار ہو گیا تو اس لڑکی کے علاوہ راہگیروں نے بھی میری چھترازشروع کر دی۔ میں نے اپنی بے گناہی کی جتنی دہائی دی اتنی ہی مجھ پر جوتوں کی زیادہ بارش ہوئی۔ ان جوتا ماروں میں ایک نوّے سالہ بوڑھا تھا۔ اس کے دانت ایسے غائب تھے جیسے کسی بدبخت کی بیوی لاپتہ ہو گئی ہو۔ جونہی اس نے میرے ماتھے کی محراب دیکھی جو اللہ میاں کے سامنے ماتھا ٹیکتے ٹیکتے پڑ گئی تھی تو اس نے لوگوں کو لیکچر دیتے ہوئے کہا "حدیث نبوی میں آتا ہے کہ بیسوی صدی کے وہ لوگ جن کے ماتھوں پر محراب ہوں گے وہی سب سے زیادہ لچر۔ چار سو بیس اور فاسق ہوں گے ---۔ اگر تم میں حدیث نبوی کا ذرا بھر احترام بھی ہے تو اس سالے کی دل کھول کر مرمت کرو اللہ تعالے تمہیں حبیب پاک کے صدقے اسکا بڑا اجر دے گا۔"

اس بڑے میاں کے اپنے ماتھے پر بھی محراب کا ایک بہت بڑا نشان تھا۔ کسی کم بخت نے اس پر تو وار نہ کیا لیکن سبھی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں اکثریت حسین لڑکیوں کی تھی۔ چونکہ مجھے شاعری سے بھی لگاؤ تھا اس لئے نازنینوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے سپنے دیکھا کرتا تھا لیکن آج جب یہ خواب حقیقت میں بدلنے لگا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اتفاق سے پولیس کے چند سپاہی آتے دکھائی دیئے تو یہ زہرہ جبیں دم دبا کر بھاگ اٹھے اور مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ میں

نے گھر آتے ہی اپنا غیر مطبوعہ کلام جلا دیا اور آئندہ کیلئے شاعری سے توبہ کرلی۔

شریف واقعی قسمت کا دھنی تھا۔اس کی بے جا حرکتوں کا خمیازہ اکثر مجھے ہی بھگتنا پڑتا تھا۔ غالبًا لیڈی کوٹ بھی قسمت کی کہانی کی ایک کڑی تھی۔ لیکن حقیقت کیا تھی؟ میں اسے جاننے کیلئے سخت بیتاب تھا۔لندن پہنچنے کے ایک ماہ بعد مجھے شریف کے خطوط آنے شروع ہوئے تو اس معمے کی وضاحت ہوئی۔ یہ معاملہ اتنا طویل ہے کہ اگر شریف کے خطوط اور اپنے جوابات درج کرنے لگوں تو یہ کہانی ایک ضخیم ناول کی صورت اختیار کرلے گی۔اس لئے میں اس قصّے کی تفصیلات کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔

لیڈی کوٹ کے اندرونی حصے میں دو جیبیں تھیں۔ایک کھلی لیکن دوسری پر ایک حفاظتی بٹن تھا۔اس جیب میں ایک رقعہ تھا جس میں لکھا تھا کہ ''میں ایک اکیس سالہ انگریز لڑکی ہوں جو لندن میں رہتی ہے۔ مجھے لو میرج (LOVE MARRIAGE) پر قطعًا بھروسہ نہیں اور قسمت پر یقین رکھتی ہوں۔لندن یونیورسٹی کی گریجویٹ ،خوبصورت اور خوب سیرت ہوں۔ایک سرمایہ دار کی اکلوتی بیٹی ہونے کے سبب بہت امیر ہوں۔ یہ میرا کوٹ جو میں نے ایک خیراتی ادارے کو بخشش کیا ہے۔ جس کے ہاتھ بھی لگے میں اسی سے شادی کروں گی بشرطیکہ اس کی عمر تیس برس سے زائد نہ ہو۔ رنگ و نسل کی قطعًا کوئی قید نہیں۔''لڑکی کا نام ہیلن (HELEN) تھا اور اس رقعے میں اس کا پورا پتہ درج تھا جس کے ساتھ اس کی تصویر نتھی تھی۔

رقعہ دیکھتے ہی شریف نے مجھے بتائے بغیر ہیلن سے تحریری رابطہ پیدا کرلیا۔غائبانہ خط وکتابت سے ان کا باہمی شوق اس قدر بڑھ گیا کہ ہیلن نے اس کی سیٹ بک کروادی اور وہ لندن پرواز کر گیا۔

لندن ہوائی اڈے پر شریف ملک سے جو ہوا وہ یا تو میری بددعاؤں کا نتیجہ تھا یا اس کی اپنی شامت اعمال تھی وہ وہاں ہیلن کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا لیکن وہ گل رو کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گھنٹہ بھر کا انتظار ایک صدی سے بھی دراز نظر آنے لگا۔اسے یوں احساس ہوا جیسے وہ بچ کا بابو ہے جو یوں ایک انگریز خاتون کی باتوں میں آگیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ عورت کے بجائے کوئی ہیجڑا ہو۔ آخر ایسا کھیل تماشہ تو ہیجڑے ہی کرتے ہیں جو طبعًا مرد ہونے کے باوجود خود کو نہ صرف عورت کہتے ہیں بلکہ نسوانی کردار کی نقل بھی کرتے ہیں۔وہ وہاں بلا سوچے سمجھے آنے پر خود کو لعن طعن کر رہا تھا جب ایک خاتون دائیں ہاتھ میں اس کی تصویر لئے مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔اس نے شریف کو اس مضبوطی سے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا جیسے ملک الموت اس کی روح قبض کرنے کیلئے اسے گرفت میں لے رہا ہو۔اس پر غضب یہ کہ جب اس نے شریف کو چومنا شروع کیا اور شریف نے کچھ شرم اور کچھ کراہت سے اپنا چہرہ دور ہٹانے کی کوشش کی تو ان کے ہونٹوں میں تصادم ہو گیا جس سے اس خاتون کے مصنوعی دانت فرش پر گر پڑے اور یہ دیکھ کر لوگوں نے تالیاں اور سیٹیاں بجانا شروع کردیں۔

پچیس سالہ شریف ملک قد میں تقریبًا چھ فٹ۔ رنگ گندمی اور دیکھنے میں جاذب نظر تھا۔ لیکن اس خاتون کی عمر پچاس برس سے بھی متجاوز تھی۔ بالوں میں چاندی کی کثرت اور چہرے پر جھریوں کے آثار نمایاں تھے۔ یہ انگریز عورت قسمت کی دیوی تھی یا ملک الموت کی بڑی بہن؟ شریف ملک نے دم دبا کر بھاگنا چاہا لیکن بھاگ کر جانا چاہا لیکن بھاگ کر جاتا کہاں؟ بے سہارا ہونے کے سبب شریف نے اسے گلے لگانے میں ہی مصلحت سمجھی۔ یہ غالبًا تاریخ عالم میں پہلا واقعہ تھا جب چوہا اور بلی ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے ہوں۔

شریف میری طرح میٹرک پاس تھا۔انگریزی میں بڑبڑا سکتا تھا لیکن انگریزی بولنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ تصویر میں تو بہت جوان اور خوبصورت نظر آتی تھی لیکن اچانک ہی بوڑھی کیسے ہوگئی۔ہاں تو کلرک ہونے کی وجہ سے وہ انگریزی لکھ سکتا تھا اور پڑھ سکتا تھا لیکن بعض باتیں تو صرف زبانی پوچھنا ہی بہتر ہوتی ہیں۔وہ ایک خاتون سے یہ لکھ کر کیسے پوچھ سکتا تھا کہ ''تم بوڑھی کیوں نظر آتی ہو؟'' یہ انتہائی درجے کی بدتمیزی تھی۔۔۔اور پھر ایک پچاس سالہ خاتون خود کو پندرہ سالہ نازنین ہی تو تصور کرتی ہے۔وہ اسے بڑھیا کہہ کر جوتے کھانا نہیں چاہتا تھا۔اسے انارکلی کا واقعہ یاد تھا۔اس وقت تو میری دوستی اسکے کام آگئی لیکن اب وہ تن تنہا تھا۔

شریف ملک نے ظاہریت کو برقرار رکھنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی لیکن وہ اس قدر حواس باختہ ہو چکا تھا کہ انگریزی میں سلام کہنے کا طریقہ بھول گیا۔اگرچہ وقت شام کا تھا کہنے لگا ''گڈ مارننگ۔ ہیلن۔''

خاتون دھیرے سے مسکرائی اور کہنے لگی ''وعلیکم سلام۔ شریف''

یہ سن کر اس کے کان کھڑے ہوگئے اور اس نے بڑے تعجب سے پوچھا ''ہیلن! کیا آپ اردو جانتی ہیں''

"نہیں ۔۔۔ توڑا ۔ توڑا جاتا ہے
۔ کبھی ہم اپنی خاوند کیساتھ شملہ میں رہتا تھا
۔ ہمارا نام ہیلن نہیں الزبتھ ہے ۔ ہم تمہارا
ہونے والا سوکن ہے۔"

یہ سن کر شریف کو غشی پڑنے لگی
لیکن اس نے سنبھل کر کہا "میں تو یہاں صرف
ہیلن سے شادی کرنے آیا ہوں۔ دو بیویوں کو
کیا کروں گا؟"

"تم تو بہت سادہ نظر آتا ہے میں تم
سے شادی کیسے کر سکتا۔ میں تو ہیلن کا ماں
ہوں۔ جب تم اس سے شادی بنائے گا تو میں
تمہارا سوکن بنے گا" الزبتھ نے کہا۔

یہ سن کر شریف ملک کے
مرجھائے ہوئے دل میں شگفتگی اور مسرت کی
لہر دوڑنے لگی کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ الزبتھ
کی اردو دانی اس کی انگریزی دانی سے بھی کہیں
بدتر ہے اور وہ ساس کی جگہ سوکن کا لفظ غلطی
سے استعمال کر رہی ہے۔

بات یوں ہوئی کہ جب وہ شریف
کو ایرپورٹ سے لینے کیلئے آرہے تھے تو ہیلن
کار چلا رہی تھی اس کی ایک اور کار سے ٹکر
ہوگئی۔ اگرچہ کار کو بہت نقصان پہنچا۔ ہیلن بال
بال بچ گئی لیکن چونکہ ڈرائیور وہ تھی۔ اسے
پولیس کی پوچھ گچھ کے سلسلے میں تھانے جانا
پڑا۔ شریف کی آمد ایک نازک مسئلہ تھا اس لئے
یہ طے پایا کہ الزبتھ اس کے استقبال کے لئے
فوراً ایئرپورٹ پہنچے اور وہ پولیس سے فراغت
پاتے ہی وہاں کا رُخ کرے گی۔ الزبتھ شریف
ملک کو ہونے والی ساس کی حیثیت سے گلے لگا کر
اس کا منہ چوم رہی تھی لیکن وہ اسے ہیلن سمجھ
بیٹھا اور طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہو
گیا۔

لندن سے مجھے ایک چٹھی آئی اس
میں شریف اور ہیلن کی شادی کی تصویر تھی۔
جس میں دونوں کے ہونٹ ایک دوسرے سے
اس طرح پیوست تھے جیسے لوہا مقناطیس سے چپکا
ہوا ہو۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا "اے بابو۔ ذرا
دل پہ رکھیو قابو"

ایسی حالت میں دل پر کیسے قابو
رکھتا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میری منگیتر
کو پھسلا کر اس سے شادی رچالی ہے۔ آخر لیڈی
کوٹ کا اصلی مالک تو میں تھا۔ میں حسد میں
بھول گیا کہ میں نے نفع کے لالچ سے اسے بیچ
دیا تھا۔۔۔۔ غصے سے جھنجھلا کر میں نے اسے
عجلت میں ایک ایسا خط لکھا جس میں گالیوں کی
فراوانی تھی۔ ساتھ ہی اسے تنبیہ کی کہ آئندہ
مجھے کبھی خط لکھنے کی جرأت نہ کرے۔ ہماری
دوستی ہمیشہ کے لئے ختم۔

چھ ماہ گزر گئے لیکن مجھے شریف
ملک کا کوئی خط نہ آیا۔ وہ میرا جگری دوست
تھا۔ مجھے اس کی یاد ستانے لگی۔ کیا ہوا جو اس
نے ہیلن سے شادی کرلی۔ تقدیر میں یہی لکھا
تھا۔ میں نے اس شادی کے فوٹو پر نگاہ ڈالی تو
دل رشک سے نہیں حسرت سے بھر گیا۔
میرے ہونٹوں پر اچانک یہ فلمی نغمہ رقص
کرنے لگا:

دنیا میں سب جوڑے جوڑے۔
عاشق پھرن نجوڑے
گوری نہیں تو کالی ہی آوے
دل کی لگی میری آکے بجھاوے
چھالے بن گئے پھوڑے
ہائے راما۔ جوڑے۔ جوڑے

یقین کیجئے کہ اگر دعا دل کی
گہرائیوں سے کی جائے تو بھی جو چاہے اللہ
میاں اسے چھپٹر پھاڑ کے دیتا ہے لیکن شرط یہ
ہے کہ دعا سرتال سے کی جائے۔ اس سلسلے میں
کسی میراثی کی شاگردی کر لینے میں بھی کوئی
مضائقہ نہیں کیونکہ ترنم اور ٹھاپ سے دعا کا اثر
سو گنا بڑھ جاتا ہے۔ اللہ میاں جذبات کی
رو میں ہر درخواست قبول کرلیتا ہے۔ اس میں
جائز اور ناجائز کا کوئی بکھیڑا نہیں۔ اگر چاہو کہ
تمہارے پڑوسی کی بیوی مر جائے کیونکہ وہ
تمہاری التجاؤں کے باوجود تمہیں نظر انداز
کرتی ہے تو یہ عین ممکن ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ
سارا شہر بھونچال سے تباہ ہو جائے کیونکہ تمہیں
کرائے کا مکان نہیں ملتا تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔
اس سے خدا کا کیا بگڑتا ہے۔ اگر خدا ہر دعا مانگنے
والے کو یونہی ٹرخاتا رہے تو پھر اس کے سامنے
سر کون جھکائے گا۔ خدا کو جو مزا دوسروں کے
سر جھکانے میں آتا ہے کسی اور چیز میں نہیں۔
یقین نہ آئے تو کسی بستی کے دادگیر کو دیکھ
لیجئے۔ اس کا سب سے بڑا شوق دوسروں کے سر
جھکانا ہی تو ہے اسی لئے تو ہر شہر چھوٹے چھوٹے
خداوں سے بھرپور ہے۔

یہ میری پرسوز دعاؤں کا ہی تو اثر
تھا کہ ڈاکیئے نے زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹایا
اور مجھے ایک بڑا سا پارسل دیا جو مجھے شریف
ملک نے لندن سے بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ
ایک خط بھی تھا جس میں شریف نے بہت
معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "میں نے
لیڈی کوٹ بتیایا تھا جس نے میری تقدیر بدل
دی۔ لو آج تمہیں لیڈی کوٹ کے بدلے لیڈی
کوٹ بھیج رہا ہوں۔ اگر اس کی اندرونی جیب کو
ٹٹولو تو تمہیں ایک رقعہ ملے گا۔ اگر تمہیں بات
منظور ہو تو لکھو۔ تمہاری قسمت کے پٹ کھول
دوں گا۔

اس لیڈی کوٹ کی جیب میں بھی
ایک رقعہ تھا جس میں میرے لئے نجمہ کا پیغام
شادی تھا جو لندن میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ
پاکستانی تھا اور اس کی شادی کسی دیسی مرد سے
کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نام کریم داد تھا جس کے
شریف ملک کے ساتھ گہرے مراسم ہو چکے

تھے۔ وہ شریف اور ہیلن کے پیار سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے شریف سے خود پوچھا کہ اس کا کوئی پاکستانی دوست ہے جس کی شرافت کا وہ دم بھر سکے۔ شریف نے میری بڑائی کے وہ پل باندھے کہ کریم داد نے نجمہ کی رضامندی حاصل کرتے ہوئے مجھے اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس لیڈی کوٹ میں خط کریم داد کا تھا جس کے ساتھ نجمہ کی تصویر منسلک تھی۔

نجمہ اپنے باپ کے گروسری سپر سٹور کی مینجر تھی۔ اس کی عمر چوبیس تھی اس کا قد بہت موزوں اور خدو خال تراشیدہ یعنی متناسب تھے لیکن رنگت کی کالی تھی۔ آخر میں نے بھی تو اپنی سریلی دعا میں یہی کہا تھا "گوری نہیں تو کالی ہی آوے"

مجھے اور کیا چاہیئے تھا فوراً ہاں کردی۔ چند ہفتوں میں میری بھی سیٹ بک کرادی گئی اور میں لندن پہنچ گیا۔ وہاں میرے استقبال کے لئے سبھی موجود تھے لیکن نجمہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ حالانکہ وہ میرے سامنے کھڑی شرارت سے مسکرا رہی تھی۔۔۔ اچانک شریف نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ارے بابو۔ کیا اپنی ہونے والی بیوی کو ہیلو نہیں کہو گے؟"

لیکن اس لڑکی کا رنگ تو سفید تھا۔ یہ سب شریف ملک کا مذاق تھا۔ اس کے کہنے پر نجمہ نے سیاہ میک اپ کرا کے فوٹو کھچوائی تھی۔ نجمہ سے میری شادی انتہائی خوشیوں کا سبب ثابت ہوئی۔ لیڈی کوٹ کی کہانی اس قدر دلچسپ تھی کہ نجمہ نے کئی بار لنڈا بازار دیکھنے کی آرزو کی۔ شادی کے پانچ سال بعد میں اسے یہ مشہور جگہ دکھانے کے لئے پاکستان لایا۔

غزل

کبھی تُو نہ اس بات پر ہاتھ مل
ترے ہاتھ سے جو گئی ہو نکل

کہو تو اٹھائے گی وہ بوجھ کیا
کمر جس میں چلنے سے پڑتے ہوں بل

سنبھلنے سے منزل اگر دور ہو
تو بہتر ہے اتنا سنبھل کے نہ چل

وہ لمحہ حوادث سے جب ٹھن گئی
وہی زندگی کا بڑا سب سے پل

نہ اب جھوٹے پیغام تڑپائیں گے
ترا شکریہ اے نوید اجل!

تغیر پہ قائم ثباتِ جہاں
بدل، پر قرینے سے ناداں بدل

سنی بات یہ مکتبِ عشق میں
"نہ ہر معرکہ ہو تشدد سے حل"

جسے عزم سے آزمایا کبھی
اسے ہم نے ہرگز نہ پایا اٹل

نہ جینے کی انوؔر جنہیں آرزو
سمجھتے ہیں وہ رائی کو بھی جبل

تریاق

انور شیخ

"پتا جی تو نیم پاگل تھے جو مرتے ہوئے یہ کہہ گئے کہ بیٹا حرام کی کمائی پاپ ہے۔ یہ انسان کو اگلے جنم میں حیوان بنا دیتی ہے"۔ پکوڑی مَل نے اپنے جڑواں بھائی روڑی مَل کو گھورتے ہوئے کہا۔

"پتا جی تو پرانے ڈھب کے منش تھے۔ جو آن کو جان سے بہتر سمجھتے تھے۔ انسانیت کا معیار تو صرف پیسہ ہے۔ جب پتا جی سر گباشی ہوئے تو اتنا بھی نہ چھوڑ گئے کہ ان کا کریا کرم ہو سکے۔۔۔۔ وہ ہمیشہ ہی مجھے جیب کترا ہونے کے سبب برا بھلا کہتے تھے۔ اتنے ایماندار تھے کہ انہوں نے مجھے اسلم بیگ کی جیب کاٹنے کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دیا حالانکہ اس سلسلے میں میں بے گناہ تھا۔۔۔۔ لیکن انہوں نے مجھے اپرادھی سمجھتے ہوئے تھانے میں حلفیہ بیان دے دیا۔۔۔۔ یہ بھی کوئی دیانت داری ہے جو سچ اور جھوٹ میں تمیز نہ کرے اور جس میں اپنے اور بیگانے کا فرق نہ ہو۔۔۔۔ آخر میرے جیب کاٹنے کے فن ہی۔ نے پتا جی کی عزت بچالی۔ اگر میں نے پنڈت بدری داس کی بہن کی جیب نہ کاٹی ہوتی تو ان کے کریا کرم کے اخراجات ادا کرنا ناممکن تھا۔ یہ پنڈت بھی کیسے لوگ ہیں جو مُردوں کو بھی فیس معاف نہیں کرتے"۔ روڑی مَل نے جواب دیا۔

"برخوردار۔ سچ تو یہ ہے کہ پتا جی چھوٹے دماغ کے آدمی تھے۔ انہوں نے میرا نام پکوڑی رکھکر مجھے بھی چھوٹا بنا دیا۔ اگر وہ مجھے پکوڑا مل کہتے تو بہتر تھا۔ اس میں رعب داب ہے۔ اور پھر میں مرد ہوں۔ میرا نام تو پکوڑا ہونا زیادہ مناسب ہے جب لوگ مجھے پکوڑی کہتے ہیں تو اپنے کو عورت۔۔۔۔ اور کبھی ہیجڑا محسوس کرتا ہوں"۔

"برخوردار۔ تم اس سلسلے میں اکیلے نہیں ہو۔ میرا نام بھی رَوڑا مَل ہونا چاہئے تھا۔۔۔ شاید پتا جی نے اندھیرے میں ہمارے نام رکھے تھے اور ہماری تذکیر کا اندازہ نہ لگا سکے۔۔"۔

"ابے میں نے تجھے کئی بار کہا ہے کہ مجھے "بھائی جان" کہا کرو۔ میں تم سے ایک گھنٹہ پہلے پیدا ہوا تھا"۔ پکوڑی مَل نے ٹوکتے ہوئے کہا۔۔۔ ۔ اور پھر بول اٹھا "اگر برخوردار تم نے میرا موڈ خراب نہ کیا ہوتا تو تمہیں ایسی بات بتاتا کہ تمہاری غریبی کا دکھ ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتا"۔

روڑی مَل فوراً اٹھا اور پکوڑی مَل کے پاؤں داب کر کہنے لگا "اگر کوئی ایسا نسخہ بتا سکو تو بھائی جان کہنا تو ایک طرف رہا میں تمہیں پتا جی کہنے کیلئے بھی تیار ہوں۔ آخر دنیا میں دولت اور طاقت کے سوا ہے بھی کیا؟

"ہاں تو سنو۔۔۔ جانتے ہو نا اسلم بیگ جس کی جیب نہ کاٹنے کی وجہ سے تمہیں جیل کی سیر کرنا پڑی۔۔۔۔ وہ ملا کرامت علی کا بیٹا ہے جس کا باپ نیچ ذات کا ہندو تھا۔ اس میں کرامت یہ ہے کہ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو لوٹنے کا فن جانتا ہے۔۔۔ جب اسی سالہ کرم بی بی بیوہ ہو گئی تو اس نے اسے یقین دلایا کہ اس کا خاوند جو کہ جج تھا رشوت خور ہونے کی وجہ سے دوزخ میں جل رہا ہے اور اس کا عذاب کم کرنے کے لئے کرم بی بی کو بھی جہنم میں جانا پڑے گا۔۔۔ اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کی طلاق ہو جائے گی۔۔۔"۔

"لیکن خاوند کے مرنے کے بعد تو عورت ودوا ہو جاتی ہے۔ اس کی طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" روڑی مَل نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"ممکن کو ناممکن۔ الٹے کو سیدھا اور سیدھے کو الٹا ثابت کرنے کو ہی چرب زبانی کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کرم بی بی کا خاوند اپنی گندی کمائی کی وجہ سے نرک میں ہے لیکن کرامت علی کو اس گند سے اتنی محبت تھی کہ وہ کرم بی بی سے بیاہ رچانا چاہتا تھا حالانکہ اس کی عمر بمشکل چالیس برس تھی۔ شادی کے چند ہی ماہ بعد وہ اللہ کو پیاری ہو گئی اور اس کی ساری دولت کرامت علی کے ہاتھ آگئی۔ اسی دولت کے سہارے اس نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھیجا۔ اور وہ واپسی پر ذات میں بھی ترقی کر کے بیگ یعنی مغل بھی بن گیا۔۔۔"۔

بیان کو جاری رکھتے ہوئے پکوڑی مَل نے کہا "ابھی چند ہی روز ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ اسلم بیگ کا دادا چمار تھا۔ جب میں نے تمہاری بے گناہی کا ذکر کیا تو وہ غصے میں آکر اناپ شناپ بکنے لگا۔۔۔ میرا بھی پارہ چڑھ گیا اور میں نے کہا کہ ایک کم ذات سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔۔۔ اس بات کا اسے سخت صدمہ ہوا۔ لیکن مجھے برا بھلا کہنے کی بجائے اس نے حکمت عملی کا ثبوت دیا اور مجھ سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کی۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ امریکہ سے ایک شراب بنانے کا نسخہ لایا ہے جس سے کوڑیوں سے شراب کی بوتلیں بنتی ہیں۔ لطف یہ کہ شراب نہ صرف بے حد نشہ آور ہے بلکہ شہوانی قوت کو بھی بڑھاتی ہے اور اسے جتنا زیادہ پیو اتنا ہی زیادہ پینے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم کم از کم دس روپے میں ایک بوتل بیچ سکتے ہیں"۔

روڑی مَل نے پھر پکوڑی مل کے پاؤں دابتے ہوئے پوچھا "تو پھر دیر کس بات کی؟"۔ "دیر تو کوئی نہیں۔۔۔۔ ہاں تو یاد رکھنا کہ میں اسلم بیگ کو زبان دے چکا ہوں کہ اس کا راز کبھی فاش نہیں کروں گا" پکوڑی مل نے سنجیدگی سے کہا۔ "مطمئن رہو بڑے بھائی۔ میں اس بات میں تمہارا

برابر کا شریک ہوں"۔

مَل بر درز نے شراب کشید کرنے کا دھندہ شروع کر دیا اور اس کی رنگت کے باعث اسے "لال پری" کا نام دیا۔ شراب نہ صرف سخت نشہ آور اور لذیذ تھی بلکہ سخت شہوت انگیز بھی تھی۔ ان کا گھر لاہور کے شرابیوں کے لئے اہم ترین اڈہ بن گیا اور اس کی معمول سے زیادہ فروخت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ روڑی مَل نے رندوں کو جیب تراشی کا فن سکھانا شروع کر دیا۔ اس کے شاگرد اسے نہ صرف پچیس فیصدی کمیشن دیتے بلکہ اپنی آمدنی کا کثیر حصہ لال پری پینے پر خرچ کر دیتے۔ مَل بر درز کی کامیابی کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ وہ ہندو۔ مسلم میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ آخر میخانے میں مذہبی خرافات کی گنجائش ہے بھی کہاں۔ وہاں تو لوگ مذہبی دعویداروں کی پیدا کردہ پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ جہاں وہی خدا سب کا خدا ہے اور کسی سے بھی امتیازی سلوک نہیں کرتا۔

شراب کے شدید نشیلے پن اور کثیر نوشی نے جلد ہی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ شرابی دھڑا دھڑ مرنے لگے البتہ اس میں ایک وجہ تسکین تھی اور وہ یہ کہ مرنے والے کی موت اچانک واقع ہوتی تھی اور اسے طویل علالت کے عذاب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ حالانکہ لال پری نے سینکڑوں افراد ہلاک کر دیئے کسی کو بھی مَل بر درز کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ آواز اٹھتی بھی کیسے؟ شہر کے نامور لوگ مَل بر درز کے مربی تھے جنہیں مفت شراب و کباب کے ساتھ حسین لڑکیوں کے چڑھاوے بھی ملتے تھے۔ پولیس والوں کا ستارہ تو اور بھی عروج پر تھا جنہیں شراب کی فروختگی میں اچھی خاصی کمیشن ملتی تھی لیکن اس کے باوجود مَل بر درز کا کاروبار ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شراب پینے والوں کی تعداد میں سخت کمی واقع ہونے لگی۔ اگر شرابی ہی کوئی نہ ہو تو شراب کی قدر کیا باقی رہے گی؟۔

اس مسئلے کا حل ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ لال پری کے مہلک اثرات کا تریاق تلاش کیا جائے۔ تریاق؟ کیسا تریاق؟ تریاق کسے کہتے ہیں؟

تریاق وہ دوا ہے جسے زہر کا اثر دور کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تریاق دراصل خود زہر ہے جو زہر کو کاٹتا ہے۔ اس کی مثال سانپ کا زہر ہے جو ڈسے ہوئے شخص کو تندرست بنانے کیلئے دوا کے طور پر دیا جاتا ہے۔

لال پری کا تریاق دریافت کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ ایسی کوئی شراب ہی نہیں جو کسی اور تباہ کن اثرات کا ازالہ کر سکے۔ جونہی لال پری کی سیل گری پولیس کی کمیشن بھی کم ہو گئی۔ پولیس والے کبھی کسی پر اعتبار نہیں کرتے اور ان کی دوستی سراب نظر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ مَل بر درز کو زندگی کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ نہ وہ کسی پر بھروسہ کرتے تھے اور نہ ہی کوئی انہیں جھانسہ دے سکتا تھا۔ انہیں لاہور سے کوچ کرنے کی سوجھی لیکن ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ کہاں جائیں اور نقل مکانی کے بعد کیا کاروبار کریں۔

ایک دن دونوں بھائی بیٹھے اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ اسلم بیگ اچانک ظاہر ہوا۔ دونوں ادب سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے ملے۔ انہوں نے اسلم بیگ کا راز فاش نہیں کیا تھا اور وہ بھی ان پر اعتماد کرتا تھا۔ ابتدائی خوش گپیوں کے بعد کوڑی مل نے کہا "کہو اسلم صاحب اتنی مدت کہاں رہے۔ آپ کی دیا سے ہمارے بھاگ جاگے لیکن آپ ہم سے روٹھے رہے کہئے آج عید کا چاند کیسے نکل آیا؟"۔

بھائی سچ پوچھو تو غرض مند ہوں اور جو کچھ مانگنے آیا ہوں اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے" اسلم بیگ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

بھائیوں میں کیا شرم؟" کوڑی مَل نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میرے والد محترم کو بھی لال پری پینے کی عادت پڑ گئی ہے جس کے باعث ان کی جنسی اشتہا حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور سارے خاندان کو اس کے نتائج بھگتنے پڑ رہے ہیں۔۔۔"۔

"کہو کیا ہوا؟" روڑی مل نے ٹوکتے ہوئے بے صبری سے پوچھا۔

میرے والد بزرگوار جو کہ نکاح بھی پڑھاتے ہیں اس پر یقین کرنے لگے ہیں کہ جنت میں جو شراب ملے گی وہ لال پری ہی ہے۔۔۔" اسلم بیگ چند لمحوں کے لئے رکا اور پھر کہنے لگا کہ "والد محترم کی جنسی خواہش اس قدر بڑھ چکی ہے کہ چند ہفتے ہوئے جب وہ ایک نوجوان جوڑے کا نکاح پڑھانے کے لئے گئے تو محلے میں کہرام مچ گیا"۔

"وہ کیسے؟" روڑی مل نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"بات یوں ہوئی کہ رسم نکاح کے بعد جب دلہن اپنے دولہا کے ساتھ رخصت ہونے لگی تو والد محترم نے ٹانگ اڑا دی۔ کہنے لگے کہ دلہن کی شادی ان کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس لئے اسے ان کے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ دولہا تو صرف بناسپتی ہے اور میں اصلی ہوں"۔

روڑی مَل زور سے ہنسا اور کہنے لگا "بیگ صاحب یہ کیسے ممکن ہے؟"۔

"یہ ایسے ہوا کہ اصلی دولہا بھی والد محترم کا ہم نام ہے یعنی دونوں ہی کرامت علی کہلاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ والد صاحب عربی زبان کے بڑے ماہر ہیں اور انہوں نے تمام رسم حتیٰ کہ اقرار نکاح بھی عربی میں کرایا۔ اس لئے کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ لڑکی کا بیاہ ستر سالہ بوڑھے امام سے

ہو رہا ہے جب حقیقت کا پتہ چلا تو حضرت کی ایسی پٹائی ہوئی کہ ان کی نصف سے زیادہ نورانی داڑھی غائب ہو گئی۔ جوتوں اور لاتوں کا تو شمار ہی نہیں۔۔ ان کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ اب وہ سپنوں میں بھی حوروں کا ہی ورد کرتے ہیں"۔

"ہاں تو بیگ صاحب۔ اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ اگر کچھ قرض بٹا سکیں تو ہماری خوش نصیبی ہوگی۔ فرمایئے کیا حکم ہے" پکوڑی مل نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں یہ کیسے کہوں کہ آپ کی کاروباری چھوکریوں میں ایک زرینہ نامی لڑکی ہے۔ والد بزرگوار اس پر لٹو ہو چکے ہیں۔ اس کو نہ ملنے پر خودکشی کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔۔۔۔ خدا جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو بڑے شفیق باپ اور پرہیزگار انسان تھے"۔

"یہ بھی کوئی بڑی بات ہے" پکوڑی مل نے سنجیدگی سے کہا اور آدھ گھنٹے کے بعد زرینہ کو لے کر ظاہر ہوا۔ وہ بمشکل بیس سالہ خوش رو لڑکی تھی جو ہر لحاظ سے ایک حور نظر آتی تھی۔ وہ خاموشی سے اسلم بیگ کے ساتھ چل دی جس نے مل برادرز کا جھک کر شکریہ ادا کیا۔

دو ہفتوں کے بعد اسلم بیگ کا ٹیلیفون آیا۔ اس کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ پُرنم تھا۔ پکوڑی مل نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے وجہ پوچھی تو کہنے لگا "والد محترم جنت الفردوس میں پہنچ گئے۔۔۔۔ اب زرینہ کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اسے کل شام کو چھوڑنے چلا آؤں گا۔ بہت بہت شکریہ"۔

ایک ستر سالہ بڈھے پر زرینہ کے حسن کا جو تباہ کن اثر ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ اس میں لال پری کا بڑا ہاتھ تھا۔ اسلم بیگ کو اپنی ذمہ داری کا علم تھا۔ اس کے باوجود یہ کیا کم تھا کہ والد محترم جنت میں پہنچ گئے جہاں لال پری کے فوارے اچھل رہے ہیں اور بہتر نازک اندام۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی حوریں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

اگلے دن شام کو اسلم بیگ زرینہ کے ہمراہ حسب وعدہ آیا۔ وہ بہت ممنون نظر آتا تھا۔ پکوڑی مل نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "دوست ہم سے گلہ نہ کرنا۔ لال پری تمہاری ہی ایجاد ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس کا زیادہ دیر تک فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے"۔

"وہ کیوں؟" اسلم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لئے کہ ہمارے گاہک زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتے۔ اب یہ شراب پینے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ آمدنی کم ہو گئی ہے لیکن اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ کم کمیشن ملنے کی وجہ سے پولیس نے بھی تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب یہاں سے ہمیں بوریا بستر گول ہی کرنا پڑے گا۔۔۔ ہاں اگر لال پری کے مہلک اثرات کا تریاق مل سکے تو پھر یہ دھندہ جاری رکھنا ممکن ہے" پکوڑی مل نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست۔ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ والد محترم کی حرکات سے تنگ آکر میں نے بھی یہاں سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صرف کسی موقعے کا منتظر تھا۔ مجھے آج ایک بڑی آسامی کی پیشکش ہوئی ہے۔ اگر میرے ساتھ آؤ تو تمہاری قسمت بدل دوں گا"۔

مل برادرز خوشی سے جھوم اٹھ کھڑے ہوئے۔ پکوڑی مل نے اسلم بیگ کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا "کہو تو بھاگوان۔ اب کونسا چکر چلانے کا ارادہ ہے؟"۔

"اس بار جو چکر چلایا جائے گا اس میں تین حصے دار ہوں گے۔ کہو کیا منظور ہے؟"۔ اسلم بیگ نے کہا۔ "تم جو کہو قبول ہے لیکن کچھ کہو تو سہی" پکوڑی مل نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ مجھے ریاست عجیب گڑھ کا چیف انجینئر مقرر کیا گیا ہے۔ وہاں کا راجہ رام سنگھ سخت اوباش انسان ہے۔ میں اسے امریکہ سے جانتا ہوں۔ ہم دونوں ہاورڈ یونیورسٹی میں کلاس فیلو تھے۔ جب اس کا باپ اچانک مر گیا تو اسے گدی سنبھالنی پڑی اور واپس چلا آیا"۔

"اسکی ریاست سخت بنجر ہے۔ لوگوں نے تنگ آکر اس کی شکایت برٹش گورنمنٹ سے کر دی۔ جس نے اس پر یہ شرط عائد کر دی ہے کہ وہ عجیب گڑھ میں نہریں کھدوائے اور زرعی اصلاحات جلد از جلد نافذ کرے۔ اسے مجھ پر پورا اعتماد ہے۔ اور میں ایسا راز جانتا ہوں کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو مٹی سونے میں بدل جاتی ہے"۔

"کچھ کہو گے بھی یا یوں ہی باتیں ہی کرتے چلے جاؤ گے؟" روڑی مل نے بیتابی سے پوچھا۔

"قصہ اصل میں یہ ہے کہ میں جب یو۔ ایس۔ اے۔ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گیا تو مجھے ایک حبشی لڑکی سے رغبت ہو گئی۔ جو کہ ایک قریبی جزیرے کی رہنے والی تھی جسے ہیٹی (Haiti) کہتے ہیں"۔ اسلم بیگ نے کہا۔

"رغبت سے تمہاری کیا مراد ہے؟۔۔۔۔ تمہیں اس سے کیا عشق ہو گیا؟" روڑی مل نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "عقلمند بھی کبھی عشق کے جال میں پھنستے ہیں؟ اور میں کیا تمہیں بے وقوف نظر آتا ہوں؟۔۔۔ رغبت سے میری مراد ہے کہ مجھے جنسی بھوک تھی اور وہ مجھے ڈبل روٹی نظر آتی تھی۔ مسافر کو جو بھی مل جائے غنیمت ہے"۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ یہ سب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی بات ہوئی" روڑی مل نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں بات یہی ہے لیکن میں اسے ہمیشہ ہی اپنی حسین محبوبہ

کہہ کر پکارتا تھا۔ یہ عورتوں کو گرمانے کا ایک ڈھنگ ہے۔ وہ مجھ پر لٹو ہو گئی اور اپنے باپ سے ملوانے کے لئے ہیٹی لے گئی۔ اس کا نام باربرا تھا اور اس کا باپ جوزف کے نام سے مشہور تھا جو کہ ووڈو کا بڑا ماہر تھا اس لئے اسے اپنی بستی کا روحانی راہنما مانا جاتا تھا جیسے کہ بڑے سوامی اور پیر ہوتے ہیں''۔

''ووڈو کیا ہوتا ہے؟'' پکوڑی مَل نے بڑے استعجاب سے پوچھا۔

''ووڈو (Woodoo) ایک افریقی طرز کی جادو گری ہے جس میں اوہام کو بڑا دخل حاصل ہے لیکن اس کے اثرات بڑے مہلک ہوتے ہیں''۔

''ہاں بھئی کچھ تفصیل سے بتاؤ کہ ووڈو مہلک کیوں ہے؟'' روڑی مَل نے استفسار کے طور پر کہا۔

''جوزف کو ایک خاص زہر بنانے میں دسترس حاصل تھی جو پفر فش (Puffer fish) یعنی مچھلی کی ایک منفرد قسم سے تیار کیا جاتا ہے اس زہر کی خاصیت یہ ہے کہ کھانے والا حقیقتاً مرتا نہیں بلکہ مُردہ دکھائی دیتا ہے۔ نہ اس کی نبض چلتی محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے دل کی دھڑکن۔ یہ کیفیت اس قدر کامل نظر آتی ہے کہ کوئی ڈاکٹر خواہ کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہو بہترین جدید سائنسی آلات کے باوجود بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ جس شخص کو زہر دیا گیا ہے 'اصلاً زندہ ہے''۔ اسلم بیگ نے کہا۔

''بھائی یہ تم طوطا مینا کی کہانی سنا رہے ہو۔ زہر سے تو سبھی مر جاتے ہیں۔ تو ووڈو میں اچنبھے کی بات کیا ہوئی'' پکوڑی مَل نے کہا۔

''پکوڑی مَل جی۔ اس میں نرالی بات یہ ہے کہ اس زہر کا تریاق وجود ہے۔۔''۔ اسلم بیگ نے کہا۔

''بھائی ہماری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی۔ ذرا کھل کر کہو''۔

''ہاں تو غور سے سنو۔۔۔۔ جس شخص کو یہ زہر دیا جاتا ہے اسے مرا ہوا تصور کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے دفنا دیا جاتا ہے لیکن چونکہ وہ درحقیقت مردہ نہیں ہوتا اس لئے جب اس کی رسم تکفین ادا کرنے کے بعد لواحقین چلے جاتے ہیں۔ تو وہ لوگ جنہوں نے اسے زہر دیا ہو پہلی فرصت میں لوٹ آتے ہیں اور ''مُردے'' کی قبر کھود کر اسے لے جاتے ہیں۔ اسے انجکشن کے ذریعے تریاق دیا جاتا ہے اور پھر زندہ ہو جاتا ہے۔۔''۔۔

''اس تمام ہیرا پھیری کا مقصد؟'' پکوڑی مَل نے بیتابی سے پوچھا۔

''پکوڑی مَل جی۔ اس کا مطلب صرف دولت کمانا ہے۔ اور وہ یوں کہ مردہ زندہ تو ہو جاتا ہے لیکن اسکی ذہنی توانائی پوری طرح بحال نہیں ہوتی ایسے شخص کو انگریزی زبان میں Zombi یعنی Living Dead کہا جاتا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ''زندہ۔ مردہ'' ہوگا ایسا انسان طبعی طور پر تو زندہ ہوتا ہے جس سے مراد یہ کہ وہ کھاتا پیتا ہے۔ باتیں بھی کرتا ہے لیکن اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور نہ اسے اپنے عمل پر قابو ہوتا ہے۔۔ ۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تاجر اور صنعتکار زامبیوں کو غلام بنا کر ان سے کام لیتے ہیں جس کے لئے انہیں کسی قسم کی تنخواہ نہیں دینی پڑتی۔ مالکان کی لاگت صرف ان کی خوراک اور رہائش تک محدود ہوتی ہے''۔

''قربان جاؤں اسکے جس نے یہ زہر اور تریاق ایجاد کیا۔۔۔۔ لیکن بیگ صاحب یہ تو بتایئے کہ ہمیں اس زہر اور تریاق بنانے کا فارمولا کہاں سے ملے گا؟''۔

''میں کس مرض کا علاج ہوں''۔ اسلم بیگ نے مسکرا کر کہا۔۔''۔ ہیٹی میں یہ نسخہ ایک بہت بڑا راز ہے۔ جوزف نے مجھے اس لئے بتایا تھا کہ اس کی نرینہ اولاد نہیں تھی اور اسے یقین تھا کہ میں باربرا کے ساتھ شادی کروں گا اور اس کے پاس اس کا بیٹا بن کر رہوں گا''۔

پکوڑی مَل اور روڑی مَل نے شراکت کا پیمان کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملائے اور چند ہفتوں کے بعد اس کے ساتھ عجیب گڑھ چلے گئے جہاں راجہ رام سنگھ نے ان کا اچھے طریقے سے سواگت کیا۔

ریاست عجیب گڑھ کو نہری نظام کی اشد ضرورت تھی۔ اسلم بیگ نے نہری پلان تیار کرنے کے ساتھ زہر اور تریاق دونوں بڑی مقدار میں بنانا شروع کر دیئے۔ انہوں نے ناچ۔ گانے کی محفلوں کا آغاز کر دیا۔ اور تنومند جوانوں کو اشیائے خورد و نوش کے ذریعے زہر کھلانا شروع کر دیا اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ زہر کھانے والے صرف مسلمان ہی ہوں جن کی قبریں کھود کر زامبی بنایا جا سکے۔ ہندوؤں کو زہر دینا بے سود تھا کیونکہ ان کے مُردوں کو جلایا جاتا ہے۔

چند مہینوں میں بربادی کا سماں طاری ہونے لگا۔ جدھر دیکھو مائیں اور بہنیں غم سے اپنے سینے کوٹ رہی تھیں۔ بچے اپنے باپوں کی جدائی میں بلک رہے تھے اور گھر گھر میں صف ماتم بچھ رہی تھی۔ پوری ریاست میں ایک ہی اخبار تھا۔ اسکے اڈیٹر کو اپنے راجہ کی چاپلوسی کرنے کا موقعہ ملا۔ اس نے لکھا یہ جنتا پر بھگوان کا قہر ہے اور یہ سزا ہے اپنے مہاراج کے خلاف انگریز بہادر سے شکایت کرنے کی۔ اکثر مقامی رشیوں اور دلیوں نے اخبار کی حمایت کی اور اعلانیہ طور پر کہا کہ رعایا کو چاہئے کہ اپنے گناہوں کا پراسچت کرنے کے لئے ادھیراج کو قیمتی نذرانے پیش کریں ورنہ انکی نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔ مہاراج جو امریکہ پلٹ ہونے کے باعث حب الوطنی میں یکتا تھے اس بات سے بڑے خوش ہوئے پہلے انہیں جتنی رقم ناجائز قوانین کے ذریعے ٹیکس میں ملتی تھی اب اس سے چار گنا زیادہ نذرانوں میں وصول ہو گئی۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض بد بختوں نے اپنی نوجوان کنواری بیٹیاں بھی چڑھاوے کے طور پر پیش کر دیں۔ اوپر والے کے عذاب سے بچنے کا یہ بھی

انو کھا طریقہ تھا۔۔۔۔ خواہ کچھ بھی تھا۔ اس سے مہاراج کو امریکہ پلٹ ہونے کا فیض ملا۔ ان دوشیزاؤں کو ناشیزاؤں میں بدلنے میں کچھ وقت لگا ہوگا۔ لوگ خواہ کچھ کہیں یہ خدمتِ خلق تھی۔ مہاراج اور انکے چمچوں کی ڈکشنری میں اسے حب الوطنی اور نداترسی کہتے تھے۔

نہر کی کھدائی ایک سال میں مکمل ہونی تھی لیکن دو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کا نصف حصہ تیار نہ ہو سکا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ زامبی مزدور جو قبروں سے نکال کر اس مقصد کیلئے زندہ کئے گئے تھے وہ بے حد کمزور اور سست رو تھے۔ ان کی قوت پیداوار بہت کم تھی۔ اگرچہ انہیں کوئی تنخواہ نہیں دینی پڑتی تھی لیکن ان کی کارکردگی ان کے طعام و قیام کی بھی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مَل بردرز کی پونجی جو انہوں نے لال پری کے کاروبار سے جمع کی تھی ختم ہوگئی اور ان کا مالی دیوالیہ نکل گیا۔ پراجکٹ مکمل نہ ہونے کے باعث عوام میں پھر سے بے چینی شروع ہوگئی اور انہوں نے برٹش سے راجہ رام سنگھ کے خلاف پھر شکایتیں شروع کر دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عمیب گڑھ کا راجہ نہ صرف زامبی بزنس سے آگاہ تھا بلکہ اس میں حصہ دار بھی تھا۔ کیونکہ وہ انہیں سرکاری خزانے سے مزدوروں کے لئے صرف نصف اجرت ادا کرتا تھا اگرچہ رسید پوری اجرت کی وصول کرتا تھا۔ جب برٹش گورنمنٹ کا دباؤ بڑھا اور یوں معلوم ہونے لگا کہ راجہ کو معزول کر دیا جائے گا تو اس نے مَل بردرز کو قربانی کا بکرا بنانے کی ٹھان لی۔ پہلے وہ ان کا بہترین دوست تھا لیکن اب اچانک ان کا بدترین دشمن بن گیا۔

اگر راجہ کے باپ نے سیاسی حکمت عملی سے کام نہ لیا ہوتا تو اسے برٹش گورنمنٹ نے معزول کر دیا ہوتا۔ اب بیٹے نے مَل برادرز کو سیاسی مہرے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ان کے زامبی کاروبار کو فاش کرنے کی نہ صرف دھمکی دی بلکہ انکی گرفتاری کے احکام بھی جاری کر دیئے۔ اگر اسلم بیگ نے انہیں بروقت اطلاع نہ دی ہوتی تو دونوں گرفتار ہو کر پھانسی کے تختے پر چڑھ جاتے۔ جب وہ امرتسر پہنچے تو پکوڑی مَل کو ایک بات سوجھی۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ ”روڑی مَل۔ آج مجھے پتہ چلا کہ زندہ رہنے کا صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے جاہ و دولت کا حصول۔ اور دنیا میں صرف ایک ہی تریاق ہے اور وہ ہے نفرت“۔

”وہ کیسے؟“ روڑی مَل نے پوچھا۔

”وہ اسلئے کہ راجہ رام سنگھ ہم دونوں سے بڑا مشتاق تھا۔ جب اس کی گدی اور دولت کو ہم سے خطرہ پیدا ہوا تو اسے ہم سے نفرت پیدا ہو گئی۔ یہ نفرت ہی وہ زہر تھا جس نے ہمیں تباہ و برباد کر دیا۔ اب مجھے اس کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔ جیسے زہر۔ زہر کا تریاق ہے۔ اسی طرح نفرت ہی نفرت کا تریاق ہے۔۔۔۔ اسلم بیگ سخت نادان تھا کیونکہ اس کا تریاق زامبی کو کمزور۔ بے ضرر۔ غلام اور سست بنا دیتا ہے۔ لیکن نفرت ایک ایسا تریاق ہے جو انسان کی قوت ارادی اور جرأت کو بڑھا کر اسے مضبوط اور حوصلہ مند بنا دیتا ہے۔۔۔“۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو بڑے بھائی۔ بھگوت گیتا کے لحاظ سے تو نفرت ایک بہت بڑا پاپ ہے“۔ روڑی مَل نے ٹوکتے ہوئے احتجاجاً کہا۔

”بھگوت گیتا کے شبدوں کے تو کئی معنی ہیں۔ ہم کس کس پر عمل کریں گے۔۔۔۔ ہاں تو نفرت وہ تریاق ہے جسے استعمال کرنے کے لئے سیاست داں ہونا ضروری ہے۔ جیسے کہ راجہ رام سنگھ تھا۔ دیکھا اس نے کیسے پلٹا کھایا۔ اس کے چلن سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور نفرت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں“۔

”تو پھر ہم سیاست داں کیسے بنیں؟“ روڑی مل نے پوچھا۔

”یہ تو دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔۔۔۔ ضمیر فروشی۔ مفاد پرستی۔ دھوکہ دہی۔ حسب ضرورت نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی کہنا اور دوستی کے پردے میں دشمنی کرنا اصول سیاست ہیں۔۔۔۔ میں ابھی سے اپنے سیاست دان ہونے کا اعلان کرتا ہوں اور نفرت کو اپنا اوّلین آلہ کار بنانے کا وعدہ کرتا ہوں۔۔۔“۔

پکوڑی مَل چند لمحوں کے لئے رکا اور پھر کہنے لگا ”روڑی مَل۔ آج سے ہم بھائی نہیں ہیں۔ میرا نام رحیم مَل ہے اور تم رام مَل ہو۔ میں لاہور جا کر مسلمان ہو جاؤنگا اور انہیں ہندوؤں کے خلاف بھڑکانا اپنا دھندہ بناؤں گا۔ تم دہلی جا کر مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانا اپنا کاروبار بناؤ اور اس طرح تمہاری نفرت میری نفرت کے خلاف تریاق کا کام دے گی“۔

دونوں بھائی بچھڑ کر سیاست داں بن گئے۔ ایک رام اور دوسرا رحیم۔ جو کہ دونوں خدا کے نام ہیں لیکن اس کے باوجود رام اور رحیم ایک دوسرے کے ابدی دشمن ہیں۔ یہ بھی کیا سیاست ہے! رحیم مَل لاہور میں عالم بن گیا اور دو قومی نظریئے کا حامی بن کر ہندوؤں کے خلاف تبلیغ کرنے لگا۔ ہندوؤں کی ماؤں۔ بہنوں کی توہین کرنا۔ انہیں کافر کہنا۔ انہیں پاکستان بننے کے بعد وہاں سے نکالنا۔ انہیں قتل کرنا اور ان کی جائدادوں پر قبضہ کرنا۔ اس کی تبلیغ کے موضوعات تھے۔

رام مل نے بھی دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ایسا ہی چمتکار دکھایا اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کا وہ بازار گرم کیا کہ اسے دیکھ کر شیطان بھی شرما جائے۔ جب ۱۹۴۷ء آیا تو دونوں بھائی اپنے اپنے علاقوں میں سرغنہ بن چکے تھے۔ ہندستان کی وحدت کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے

بقیہ صفحہ ۵۸ پر

بوسۂ زندگی

انور شیخ

چارلز خاں (Charles Khan) کو جونہی ہسپتال میں ہوش آیا اسے محسوس ہوا کہ موٹی عورتوں سے دل لگانا ایسی مزے دار بات نہیں جیسا کہ اس نے سوچ رکھا تھا۔

یہ ذہنی تبدیلی انقلاب سے کم نہ تھی۔ اسے بچپن ہی سے یہ غم ہونے لگا تھا کہ ایک دبلے پتلے آدمی کے لئے ایک موٹی عورت سے شادی کرنے میں بڑے فائدے ہیں۔ اس کا باپ عظیم خان جہلم کا رہنے والا تھا۔ جب وہ انگلستان آیا تو اس کی ملاقات سمنتھا جونز (Samantha Jones) سے ہوئی۔ وہ اس وقت دس سال کا تھا تو اس کی ماں ابھی دبلی پتلی اور چست تھی لیکن نہ جانے وہ ایک ہی سال میں اس قدر کیوں پھول گئی کہ ہتھنی معلوم ہونے لگی۔ جب تک وہ پتلی تھی اس کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا تھا۔ وہ کراٹی کا فن جانتی تھی اس لئے جب بھی اس کی دھینگا مشتی ہوتی وہ عظیم خان کو ہرا دیتی تھی۔ اور اس کا پھرتیلا پن ہی اس کا عظیم ترین حربہ ثابت ہوتا۔ وہ اسے مکہ مار کر بڑی تیزی سے اس کی زد سے باہر نکل جاتی اور اس طرح عظیم خان کی جوابی کاروائی اپنا رنگ جمانے سے قاصر رہتی۔

چارلز خاں کے دل میں شروع ہی سے پتلی عورتوں کا رعب جم چکا تھا۔ اس کا باپ پاکستانی ہونے کے باعث مرد کو عورتوں کا مجازی خدا سمجھتا تھا لیکن انگلستان میں تو لوگ خدا کو بھی نہیں مانتے۔ مرد کو عورتیں الوہیت کا درجہ کب دیتی ہیں۔ ان کا مزاج تو اس طرح بگڑا ہوا ہے کہ وہ مرد جو انہیں دیوی نہ سمجھیں ان کی زندگی حرام کر دیتی ہیں۔ جب میاں بیوی اکٹھے جا رہے ہوں تو میاں بیوی کے پیچھے پیچھے وفادار جانور کی طرح چلتا ہے اور اگر شاپنگ کے لئے جائیں تو وہ قلی کا کام دیتا ہے لیکن اپنے دیس میں حالت الٹی ہے۔ وہاں عورتیں مردوں کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ اور اگر اٹھانے کی چیز ہو تو وہ ان کا فرض بن جاتا ہے اور مرد اپنی توہین تصور کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں جب شام کو مرد نوکری سے واپس آئیں تو بیویوں کی پٹائی کرتے ہیں اور ان سے پاؤں دبواتے ہیں۔ جب تک سمنتھا دبلی پتلی تھی اس کا پلہ بھاری رہتا تھا لیکن جب وہ موٹی ہو گئی تو عظیم خاں کی سوئی ہوئی تقدیر جاگ اٹھی۔ جب بھی دھینگا مشتی ہوئی عظیم خاں نے اسے تھپڑ مارا اور پھرتی سے اس کی زد سے باہر نکل گیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ تھپڑ مار کر بھاگ جاتا تھا۔ اور دس بیس گز کے فاصلے پر کھڑے ہو کر اسے گالیاں دیتا تھا۔ لیکن وہ اس کا پیچھا کرنے سے معذور رہتی۔ اس کا تعاقب نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بالائی فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہ اگر دوڑنے کی کوشش کرتی تو نچلے فلیٹ والوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے زلزلہ آرہا ہو۔ وہ گالیوں اور دھمکیوں کا طوفان مچا دیتے اور سمنتھا آنسو بہا کر رہ جاتی۔ اس طرح چارلز خاں نے بچپن ہی سے سیکھ لیا تھا کہ فربہ پن عورت کا دشمن اور مرد کا دوست ہے۔

اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اس کے والدین کو ایک دوسرے سے محبت نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ ایک دوسرے کے شیدائی تھے جب سمنتھا موٹر کار کے حادثے میں موت کا شکار ہو گئی تو عظیم خاں چند ماہ میں صدمے سے مر گیا۔ اس کے چچا کا حال بھی یہی تھا۔ اس کی بیوی دیسی تھی اور گوجر خان کی رہنے والی تھی۔ وہ دونوں لاٹھیوں سے لڑا کرتے تھے۔ جب کسی نے چھڑانے کی کوشش کی دونوں اس کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ ایک دوسرے کا خون دیکھ کر روتے تھے۔ زخموں پر پٹی باندھتے تھے اور پھر دروازے بند کر کے فرائضِ زوجیت ادا کرتے تھے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا چکر ہے۔ ہاں تو اس کی چچی دبلی اور اس کا چچا موٹا تھا۔ اسی لئے وہ اکثر ہار جاتا تھا۔

چارلز خاں کو یقین ہو چکا تھا کہ خدا جس کو اس دنیا میں عیش کرانا چاہے اسے موٹی بیوی دیتا ہے اور جسے عذاب دینا چاہے اسے پتلی عورت دیتا ہے۔ اسے یہ وہم بھی ہو چکا تھا کہ ایک موٹی عورت دو پتلی عورتوں کے برابر ہوتی ہے اور اس طرح وہ دوگنی راحت کا سرچشمہ ہوتی ہے اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خود فریبی میں گرفتار ہے۔

وہ بائیس برس کا ہوا تو اسے اپنی تنہائی کا احساس ہونے لگا اس نے سمجھا کہ بیوی کے بغیر زندگی ایک ریگستان ہے جس میں بھوک اور تشنگی کے سوا کچھ نہیں۔ بیوی ایک سبزہ زار ہے جو زندگی کی مسرتوں سے بھرپور ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ بیوی موٹی ہو۔ پتلی بیوی خار مغیلاں سے کم نہیں۔ اس کا خیال جنون کی صورت اختیار کر گیا اور وہ موٹی حسینہ کے سپنے دیکھنے لگا۔ ایک دن جب وہ لفٹ میں اپنے فلیٹ کو جا رہا تھا اس پر حیرت سے غشی طاری ہو گئی۔ وہاں ایک کیم شحیم جوان لڑکی تھی جو اس کی ہم عمر تھی۔ رنگ کی گوری۔ قد کی قدرے طویل اور آنکھوں کی نیلی تھی۔ اس کی فربہی کا یہ عالم تھا کہ اگر اسے شلوار کی ضرورت ہو تو تھان بھر کپڑے سے گرہ باقی نہ بچے۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ سب اس کی دعاؤں کا اثر ہے اس کی دلی آرزو تھی کہ موٹی حسینہ اسے چومے۔ اس کے ہونٹ اسے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ اسے اپنی چچی یاد آ رہی تھی جو اس کے چچا کی پٹائی کرنے کے

بعد اس پر بوسوں کی بوچھار کرتی تھی۔ وہ دوسری منزل پر تھا لیکن خیال میں ڈوبا چودھویں منزل پر پہنچ گیا۔ جب لفٹ رکی تو اپنی خیال آرائی کا احساس ہوا۔ انگریز لڑکی جب چلی تو اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے اس کا فلیٹ نمبر نوٹ کر لیا اور پھر واپس لوٹ آیا۔

اس لڑکی نے نرس کی سفید وردی پہن رکھی تھی۔ وہ ایک مقامی ہسپتال میں کام کرتی تھی۔ اس کا چوری چوری پیچھا کرنا چارلز خاں کا مشغلہ بن گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ حسینہ کا نام نکولہ ایڈورڈز (Nicola Edwards) ہے۔ اس نے نکولہ کے آنے جانے کے اوقات اور بسوں کے نمبر نوٹ کر لئے اور اپنا اکثر وقت اس کے تعاقب میں گذارنے لگا۔ یہ دیکھ کر اسے شدید صدمہ ہوا کہ نکولہ کا ایک بوائے فرینڈ بھی ہے۔ وہ جب بھی اسے چومتی چارلز خاں کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے سینے پر مونگ دَل رہی ہو۔ نکولہ اور اس کے بوائے فرینڈ کو چارلز خاں کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ چارلز خاں اگرچہ برائے نام مسلمان تھا۔ بے چارگی نے اس کا دعاؤں میں اعتقاد بڑھا دیا۔ اس نے ایک مقامی پیر کو پچاس پونڈ دے کر تعویذ حاصل کیا۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے باپ کو نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ اگرچہ اسے پتہ نہیں تھا کہ رسم نماز ادا کرتے ہوئے کیا پڑھتے ہیں وہ فریضۂ ادائیگی کے طریقے کو جانتا تھا نہ ہی اسے علم تھا کہ نماز پڑھنے کے لئے استنجاء اور وضو کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس نے ان لوازمات کے بغیر ہی نماز پڑھنا شروع کر دی۔ البتہ اس کے سجدے طویل اور پر خلوص تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ خدا کے حضور میں حاضر ہے۔ اس لئے وہ دعائیں گڑگڑا کر مانگتا تھا۔ غضب تو یہ کہ اس کی بے وضو نمازیں زود اثر ثابت ہوئیں۔ چارلز خاں کے مسلسل پیچھا کرنے کے باعث نکولہ نے اسے دبے انداز میں توجہ دینی شروع کر دی۔ اور اس کے بوائے فرینڈ نے اسے جوشِ رقابت کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ جب چارلز خاں نے اپنے ایک پاکستانی دوست سے قبولِ دعا کا ذکر کیا تو اس نے پوچھا "کیا تم وضو جانتے ہو اور استنجا کے ڈھنگ سے آشنا ہو؟"۔ تو چارلز خاں نے جواب دیا "وضو اور استنجا کس جانور کو کہتے ہیں؟"۔ اس کا دوست سخت ناراض ہوا اور کہنے لگا "تم کافر ہو۔ انگلستان کے لوگ مشرف بہ اسلام ہونے کے مستحق ہی نہیں۔"

چارلز خاں کو پیر صاحب نے تعویذ اس شرط پر دیا تھا کہ جب اس کا اثر ہو تو چارلز خاں کو مزید پچاس پونڈ ادا کرنے ہونگے۔ جو کہ ان کی ذات کیلئے نہیں بلکہ وہ جب حج پر جائیں گے تو وہاں غریبوں اور یتیموں میں تقسیم کریں گے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اس نے مزید شیرینی ادا نہ کی تو تعویذ اپنا الٹا اثر دے گا۔ اور اسکی محبوبہ اس کی عمر بھر دشمن بن جائے گی۔ چنانچہ وہ ادائیگی کے لئے آستانہ پیر پر حاضر ہوا۔ پیر صاحب کی لمبی زلفیں گرد آلود تھیں۔ ان کی طویل نیم سفید داڑھی حقہ کشی کی وجہ سے زرد سی نظر آتی تھی۔ ان کا زمین بوس چغہ غلیظ تھا۔ انکی ہر انگلی پر کئی کئی انگوٹھیاں تھیں اور انکے ناخنوں میں گندگی تھی۔ ان کی گردن منکے کے ہاروں اور کلائیاں رنگین کڑوں سے مزین تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پانی کے دشمن اور غسل کے منکر ہوں۔ جب چارلز خاں نے ان کو استنجے اور وضو کی داستان سنائی تو پیر صاحب مسکرا کر کہنے لگے "اسلام دل کی صفائی کا قائل ہے وہ لوگ جو استنجے اور وضو پر تکیہ رکھیں ایمان کے کمزور ہیں۔۔۔۔ دراصل یہ لوگ کافر ہیں۔ دعائیں تو زبان سے کی جاتی ہیں۔ استنجے کا زبان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"۔

نکولہ کے ہونٹوں میں سخت جاذبیت تھی۔ جب وہ سرخی لگاتی تھی تو اس کے چہرے کی رعنائی اس کے موٹاپے کو اس طرح چھپا لیتی تھی جس طرح سورج کی کرنیں تاریکی کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ چارلز خاں نکولہ کو چومنے کیلئے بے تاب تھا۔ تعویذ صرف نکولہ کو چارلز خاں کی طرف راغب کرنے کے لئے تھا۔ اس کا بوسوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ بوسوں کے تعویذ کی شیرینی دوگنی تھی۔ چارلز خاں سوشل سیکوریٹی پر تھا۔ اتنی شیرینی ادا کرنے کی اس میں سکت نہ تھی۔

اگرچہ چارلز خاں نکولہ پر دیوانہ ہو چکا تھا۔ وہ بہت شرمیلا تھا۔ اس لئے اس میں اظہار مدعا کی جرات نہ تھی۔ اس کی نجات دو باتوں میں تھی۔ ایک یہ کہ پیر صاحب سے نیا تعویذ لے اور دوسری یہ کہ وہ خود ہمت سے کام لے۔ پیر صاحب بظاہر ایک آسان ذریعہ تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کے تعویذوں کا ان کی شیرینی کی مقدار سے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ اس پر ستم یہ کہ جب سے پیر صاحب کو معلوم ہوا کہ ان تعویذوں کا چارلز خاں کی محبوبہ پر اثر ہوتا ہے انہوں نے شیرینی کی شرح دوگنی کر دی تھی۔ دل کا مارا کیا نہ کرتا۔ اگرچہ شیرینی کی ادائیگی مشکل تھی لیکن اس کی تاثیر یقینی تھی۔ ہمت کرنے سے ممکن ہے کہ وہ ایسی حرکت کر بیٹھے کہ نکولہ ہمیشہ کے لئے روٹھ جائے۔ تعویذ کے زور سے یہ کام اللہ میاں کے سپرد ہو جاتا ہے۔ اللہ میاں سے بہتر کارساز کون ہے؟ بالخصوص جبکہ تعویذ پیر صاحب کی سفارش کا حامل ہو۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن زرِ شیرینی کہاں سے حاصل کیا جائے؟۔

مرتا کیا نہ کرتا؟ چارلز خاں کو یاد آیا کہ برطانیہ میں لوگ لین دین اکثر قسطوں پر کرتے ہیں جسے ہائر پرچیز اگریمنٹ (Hire purchase Agreement) کہتے ہیں۔ دس فی صد قیمت ادا کرنے سے چیز کے مالک بن بیٹھتے ہیں اور اگر یہ سودا راس نہ آئے تو رنوچکر ہو جاتے ہیں۔ پیر صاحب سے تعویذ قسطوں پر کیوں نہ حاصل کیا جائے؟ خدا ترس انسان ہیں۔ انکار نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ چارلز خاں پیر صاحب کے دربار میں

پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ دروازے پر چار پانچ مرد اور تقریباً اتنی ہی عورتیں قطار باندھے کھڑی تھیں۔ یہ دراصل پیر صاحب کی روحانی سرجری تھی جو ہر بدھ کو سوا چار بجے کھلتی تھی لیکن مایوس عورتوں کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ وہ شب کو دس بجے تک حاضر ہو سکتی تھیں لیکن اس کے لئے خصوصی تقرر امر لازم تھا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ خاتون اکیلی آئے۔ اس میں شرارت کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا بلکہ اس کی بنا خدا خوفی تھی۔ وہ اس طرح کہ عورتوں کو اکثر اپنے مردوں سے شکایات ہوتی ہیں۔ چونکہ خدا ستار ہے یعنی دوسروں کے عیب ڈھانپتا ہے اس لئے پیر صاحب اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو۔ پھر باتیں بھی کچھ ایسی بھلی نہ تھیں۔ عورتوں کو اکثر ایسی دعا کی ضرورت ہوتی تھی کہ اس کی ساس مر جائے۔ اس کا سسر دوسری شادی کرلے تاکہ اسکی ساس کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ اس کے خاوند کی قوت باہ بڑھے یا اسکے خاوند کے افسر کو مرگی پڑنے لگے تاکہ یہ عہدہ اس کے خاوند کو ملے۔ ایسی خرافات کیلئے پردہ داری کی یقیناً ضرورت تھی۔ پیر صاحب خدا رسیدہ انسان تھے۔ ان کا فرض تھا کہ اپنے روحانی مریضوں کے راز فاش نہ ہونے دیں۔ اسی لئے ہر ایک عورت کو تنہا اکیلے حاضر ہونے کی ضرورت تھی۔ پیر صاحب کی ''خدا رسیدگی'' کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ایسی عورتوں کے لئے شبانہ چلہ کا انتظام کر رکھا تھا۔ جو اپنے مردوں کی قوت باہ کی فزونی کے لئے دعا چاہتی تھیں۔ اکثر لوگوں کا کہنا تھا کہ جب ایسی عورتیں رات بھر چلہ کاٹ کر صبح گھر جاتیں تو وہ بڑی خوش باش نظر آتی تھیں۔ یہ ایک خاص قسم کا منتر تھا جس کی تفصیلات راقم کو معلوم نہیں البتہ یہ بات ہر ایک جانتا تھا کہ پیر صاحب خدا ترسی کے طور پر ایسی عورتوں سے شیرینی نہیں لیتے تھے۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ الٹا خود انہیں پیسے دیتے تھے۔ واہ سبحان اللہ!

چارلز خاں نے پیر صاحب کی فیاضی کے قصے سنے تھے لیکن اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ ایسی مراعات صرف عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ اسلئے اس نے ناچار قسطوں پر تعویذ لینے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ سرجری یعنی روحانی شفاگاہ کو پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مردوں اور عورتوں کی قطار بندھی تھی۔ جونہی ہر ایک مریض کی اندر داخل ہونے کی باری آتی اسے جھک کر پیر صاحب کے گھٹنوں کو چھونا پڑتا۔ جب یہ رسم عقیدت ادا کرنے کے بعد غالیچے پر بیٹھ گئے تو پیر صاحب دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے اچانک بٹن دبایا تو دیوار پر بجلی کی روشنی ظاہر ہوئی جو کہ کھلے الفاظ میں کہہ رہی تھی ''جب گھنٹی بجے تو اپنی باری کے مطابق تشریف لائیے۔''

جب دوسرے لوگ حاضری دے چکے تو چارلز کی باری آئی جو سب کے بعد آیا تھا۔ پیر صاحب اس کی کیفیتِ دل سے آگاہ تھے۔ دیکھتے ہی کہنے لگے ''تمہاری مرادیں اب بر آنے کو ہیں۔ نکولہ تمہارا اتنی ہی بے تابی سے انتظار کر رہی ہے جتنا کہ تم اسکی راہ دیکھ رہے ہو۔ ضرورت اب ایک مزید تعویذ کی ہے۔ تم پر جنت کے دروازے اب کھل جائیں گے۔''

پہلے تو یہ سن کر چارلز گھبرا گیا کیونکہ جنت مرنے کے بعد ملتی ہے لیکن بعد میں اسکی سمجھ میں آیا کہ وصالِ یار جنت کا دوسرا نام ہے۔ سر کھجلاتے ہوئے اس نے عرض کیا ''حضرت! جنت تو سب سے بڑی نعمت ہے لیکن اس کا اسے کیا فائدہ جس کے پاس داخلے کے لئے ٹکٹ نہ ہو۔۔۔۔'' ''ٹکٹ ہر اس شخص کو مل جاتا ہے جو اس کے لئے محنت کرے'' پیر صاحب نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''میں تو ہر خدمت کیلئے تیار ہوں۔۔۔۔ لیکن آپ کی نظرِ عنایت کے بغیر اپنی منزل پر پہنچ نہیں سکوں گا۔۔۔۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں تعویذ ہائر پرچیز یعنی قسطوں پر لے سکوں؟''۔

تعویذ بھی کبھی ہائر پرچیز پر ملتے ہیں؟ یہ تو ایک مقدس چیز ہے۔۔۔۔ اور پھر ہائر پرچیز پر تو کمپونڈ سود دینا پڑتا ہے۔ اسطرح اگر دو سو پونڈ لیا ہو تو مقررہ معیاد کے بعد آٹھ سو پونڈ ادا کرنا پڑتا ہے۔''

یہ سن کر چارلز خاں مایوسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مودبانہ طور پر کہنے لگا ''میں نکولہ کا آرزومند ہوں۔ اسے خریدنا نہیں چاہتا۔۔۔ میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں؟ میں نے سنا ہے کہ اسلام میں سود حرام ہے آپ ولی اللہ ہو کر سود کی توقع رکھتے ہیں!''۔

پیر صاحب یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور گرج کر کہنے لگے ''تم مجھے سود خور سمجھتے ہو؟ میں مردِ مومن ہوں اور اسلام کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اسلام میں سود یقیناً حرام ہے لیکن اسلام میں سود کا نعم البدل حرام نہیں۔ شاید تم جانتے کہ پاکستانی بینکرز سود کو منافع کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال اور قائداعظم بنکوں سے منافع وصول کرتے تھے۔ ہر ایک چیز کا متبادل ہے اس لئے سود کا بھی ہے۔''

بات دراصل یہ تھی کہ پیر صاحب اگرچہ جثے کے بھاری بھرکم تھے۔ اندرونی طور پر کھوکھلے تھے۔ اس لئے جلد تھک جاتے تھے۔ انہیں مالش کرانے اور پاؤں دبوانے کی عادت تھی لہٰذا برجستہ کہنے لگے ''اگر تم ہفتہ میں تین دن میرے پاؤں داب دیا کرو اور گاہے گاہے مالش کر دیا کرو تو میں تم سے سود وصول نہیں کروں گا اور تمہاری خدمات کو تمہارا اعوضانہ سمجھ لوں گا''۔

چارلز خاں اگرچہ نسل کا جہلمی تھا لیکن پیدائش اور تربیت کے لحاظ سے انگریز تھا۔ اسے اوہام پرستی اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔ وہ پیر صاحب کے بیان سے چونک پڑا۔ ایسی ذلت کون گوارا کرے؟ لیکن پھر

اسے یاد آیا کہ عاشقی سے بڑھ کر کوئی ذلت آمیز پیشہ نہیں۔ یہ بات ہے بھی سچ۔ مجنوں لیلیٰ کے اونٹ ہانکتا تھا۔ رانجھا ہیر کی بھینسیں چراتا تھا اور مہیوال سوہنی کے لئے مٹی کا گارا بناتا تھا۔ ان باتوں کی نسبت پیر صاحب کے پاؤں دابنا یا ان کی مالش کرنا اور وہ بھی تنہائی میں۔ کوئی ذلیل کام نہ تھا بالخصوص جبکہ صلہ وصال یار ہو۔ دوسرے عاشقوں کو تو وصال یار کی کوئی گارنٹی تھی ہی نہیں۔ وہ تو بے چارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ پیر صاحب تمناؤں کی تکمیل کا سرچشمہ ہونے کی وجہ سے ایسی خدمات کے مستحق تھے لیکن کتنی دیر کیلئے؟

پیر صاحب کو مسرت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چارلز نے کہا "قبلہ۔ ہر بات کی معیاد مقرر ہوتی ہے میں کب تک آپ کے پاؤں دابتا رہوں گا؟"۔

"چھ ماہ تک" پیر صاحب نے جواب دیا۔

نہیں نہیں۔ یہ عرصہ تو بہت لمبا ہے میں تو اتنی دیر میں نکولہ کے فراق میں دم توڑ دوں گا۔" چارلز خاں نے بڑے عجز سے کہا۔

آخر بڑی تکرار کے بعد خدمت کی معیاد تین ماہ ٹھہری اور تعویذ کا ہدیہ سو پونڈ قرار پایا۔ اس سلسلے میں چارلز خاں نے البتہ ایک غلطی کی اور وہ یہ کہ وہ پوچھنا بھول گیا کہ ان کی خدمات کی طوالت کیا ہوگی۔ یعنی اسے دس منٹ کے لئے پاؤں دابنے ہونگے یا ایک گھنٹہ کیلئے۔ یہ اس کے لئے عذاب کا ذریعہ بن گیا۔ کیونکہ پیر صاحب نے اس سے گھٹنوں تک پاؤں دبوانا اور مالش کرانا شروع کر دی۔ آخر عاشقی کوئی کھیل تو نہیں۔

تیسرے ماہ کے اختتام میں دو دن باقی رہ گئے تھے لیکن چارلز خاں کی مراد ابھی تک پوری نہ ہو سکی۔ اور نہ ہی اس کا کوئی امکان نظر آتا تھا۔ جب بھی وہ آتا تھا پیر صاحب کے گھٹنوں کو چھونا اس کا معمول بن چکا تھا۔ اس بار جب وہ آیا تو اس کے تیور کچھ بدلے ہوئے تھے۔ نہ اس نے گھٹنے چھوئے اور نہ ہی ادب سے گفتگو کی۔ وہ بغاوت پر آمادہ نظر آتا تھا۔ وہ قد کا چھ فٹ اور جسم کا سڈول تھا۔ جونہی پیر صاحب کی ٹانگیں دابنی شروع کیں انہیں یوں محسوس ہوا جیسے بیلنے میں گنا ہو۔ انہیں پتہ چلنے لگا کہ تعویذ کی ناکامی سے ان کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ وہ معاشقے کے فن میں بڑے ماہر تھے اور لوگوں کو ورغلانا ان کا ذریعہ معاش تھا۔ مسکرا کر فرمانے لگے "پریشان کیوں ہو۔ ابھی تو دو دن باقی ہیں۔ ناامید کس لئے ہو؟ اسلام میں قنوطیت کفر ہے۔ اسلام میں ایک بڑا کمال یہ ہے کہ مسلمان صرف تقدیر پر ہی نہیں تدبیر پر بھی بھروسہ کرتا ہے جو دراصل اس کی تقدیر کا جزو ہے۔ میں آج رات کو تمہارے لئے سپیشل نفل پڑھوں گا۔ قادر مطلق یقیناً کوئی ایسی تجویز ضرور پیش کرے گا جس سے تمہاری مشکل حل ہوگی۔۔"

"میں اس کی مزید فیس نہیں دوں گا۔۔۔اور اگر ترکیب کارگر نہ ہوئی تو۔۔۔"

"تو تو۔۔۔" پیر صاحب نے لرز کر کہا۔ خدا جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا لیکن پیر صاحب کو یوں لگا جیسے اس نے خاموشی سے کہہ دیا ہو "تو تمہاری دھجیاں اڑا دوں گا۔"

جب رات آئی تو پیر صاحب نے نوافل پڑھے اور گڑگڑا کر رو دئے "اے خدا جس نے شیطان کو پیدا کیا اس کیلئے میرے گناہوں کو بخش دینا ایک معمولی بات ہے۔ اگر اس گورے پاجی چارلز خاں کا کام نہ کیا تو یہ مجھے مار ڈالے گا اور اس طرح تیرا ایک نام لیوا کم ہو جائے گا۔ مانا کہ میں تیرے نام پر ہیرا پھیری کرتا ہوں۔ لیکن میں ہی تو ایک ایسا نہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تیرے نام پر ہیرا پھیری کرنا تیرے نام لیواؤں کا دھندا بن چکا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو بھوکوں مریں۔ زندگی تو جینے کے لئے دی ہے مرنے کے لئے نہیں۔۔۔۔ آخر مجھ میں اتنی دیانت داری تو ہے کہ میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں"۔

پیر صاحب اعتراف حقیقت مٹکے پر کھڑے ہو کر کچھ اس طرح کر رہے تھے کہ ان کا سایہ ان کے سامنے تھا۔ یہ تاثر انہوں نے چراغ کے ذریعے پیدا کیا تھا۔ جونہی ان کی رقت بڑھی اور انہوں نے اپنے سائے میں لرزش دیکھی تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے چارلز خان ان کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ اچانک گر پڑے۔ یہ معلوم نہیں کہ کمرے سے انکی ہچکیوں کی آواز آرہی تھی یا کوئی فرشتہ انہیں تہدید بھرے لہجے میں ترکیب بتا رہا تھا۔ غالباً ہمیں تفتیش کی ضرورت نہیں۔ جب پیر صاحب ہوش میں آئے تو وہ "دمادم مست قلندر" گا رہے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ پیر صاحب نے مسئلے کا حل دریافت کر لیا ہے اور اب تعویز کی تاثیر کی کمی پیر صاحب کی ترکیب سے پوری ہوگی۔

دوسرے دن جب چارلز خاں آیا تو وہ بے یقین اور بے تاب نظر آیا۔ پیر صاحب نے پاؤں دبوانے سے انکار کر دیا اور کہا "اس طرح وقت ضائع مت کرو بلکہ میں تجھے ایک تدبیر بتاتا ہوں جس کا اظہار مجھ پر ایک فرشتے نے کیا۔ اگر آج اس کی دن بھر ذہنی مشق کرو اور کل اس کو جامۂ عمل پہناؤ۔ تو تعویذ یقیناً اپنا اثر دکھائے گا اور نرس نکولہ تمہارا منہ چومے گی لیکن شرط یہ ہے کہ تم میری ہدایت پر احتیاط سے عمل کرو"۔

کل آیا تو چارلز خاں ہسپتال کے نزدیک لائسنس پر کھڑا تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی اور سڑک قدرے پھسلی پھسلی تھی۔ جونہی لائسنس نے پیادوں کو سڑک عبور کرنے کا اشارہ کیا اور نرس نکولہ مخالف سمت سے آتی دکھائی دی۔ چارلز خاں نے تیزی سے قدم اٹھایا اور سڑک کے عین

درمیان میں پشت کے بل گرا۔ ایک ہی دن میں اس نے اپنی سانس روکنے کی اچھی خاصی مشق کر لی تھی لیکن تعویذ نے کچھ ایسا اثر دکھایا کہ اسے دم کشی کی چنداں ضرورت نہ رہی۔ حقیقت یہ تھی کہ چارلز خاں کا شرمیلا پن اور متواتر تعاقب نکولہ کے دل پر اثر انداز ہو چکا تھا۔ گورے مرد عورتوں کا پیچھا کب کرتے ہیں۔ وہ تو الٹا انہیں بے وقوف بناتے ہیں۔ اور انہیں اپنے پیچھے پھرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جب نکولہ نے اسے اس بری طرح بے خودی سے گرتے دیکھا تو وہ انتہائی سرعت سے اس کی طرف دوڑی لیکن جب وہ اسکے قریب پہونچی تو موٹاپے کے سبب اس کی بریک نہ لگ سکی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس پر اچانک گر پڑی۔ حسین لڑکی تھی لیکن سخت بوجھل تھی۔ چارلز خان کی چیخ نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ وہ مردہ معلوم ہوتا تھا نکولہ نے اس کی ناک دبا کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے۔ اور اسے ایک طویل بوسۂ زندگی دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے کتنے ہی بوسے دیئے۔ قارئین کو ایسی تشویشناک صورت حال پر نہیں ہنسنا چاہئے۔ نکولہ کے بوسۂ حیات کو انگریزی میں (Mouth to Mouth Resuscitation) کہتے ہیں جب چارلز خاں کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے کراہنا شروع کر دیا کیوں کہ نکولہ کے بوجھ سے اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ چکی تھی۔ جب نکولہ کو اس بات کا احساس ہوا تو اس نے چارلز خاں کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ خدا ہی جانتا ہے وہ حسینہ تھی یا کہ بلا۔ وہ اسے نصف فرلانگ اٹھا کر لے گئی۔ جب ایمبولنس ظاہر ہوئی تو چارلز خاں کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

آج تعویذ کی معیاد کا آخری دن تھا۔ اس کی پٹی ہو چکی تھی اور نکولہ اس کی چارپائی پر بیٹھے اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی۔ چارلز خاں کو محسوس ہونے لگا کہ عورت کا موٹاپا مرد کے لئے غالباً اتنا مفید نہیں جتنا کہ وہ سمجھتا تھا۔

جب وہ صحت یاب ہو کر گھر آیا اس نے نکولہ کے ساتھ کورٹنگ شروع کر دی۔ چند ماہ بعد ان کی شادی ہو گئی تو چارلز خاں نے اسے تعویذ اور پیر صاحب کی تدبیر کا قصہ سنایا۔ ''یہ تعویذ کا نہیں۔ تدبیر کا اثر ہے۔ قسطیں تم نے تعویذ کی کی تھیں تدبیر کی نہیں۔ علاوہ ازیں تمہیں پسلیوں کے ٹوٹنے کا ڈیمج (Damage) کلیم کرنا چاہئے۔ تمہارا اور پیر صاحب کا حساب برابر ہوا''۔

بقیہ ''تریاق''

استعمال کرنا ان کے لئے باعث فخر تھا۔ ان کی بھڑکائی ہوئی نفرت کی آگ جو بیک وقت زہر اور تریاق تھی۔ عام لوگوں کی تباہی کا باعث بن چکی تھی۔ لیکن وہ خود خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے۔ ایک لاہور میں لیڈر اور دوسرا دلی میں نیتا تھا۔ دونوں ہی مہاجروں اور شرنارتھیوں کی جائدادوں پر قبضہ کر کے ارب پتی بن گئے۔

ہزاروں مکانات جلا دئے گئے۔ لاکھوں افراد قتل کر دیئے گئے۔ کروڑوں لوگ بے گھر ہو گئے لیکن تریاق نفرت کا اثر ہندوستانی بٹوارے سے بھی ماند نہ پڑا۔ نصف صدی کے بعد بھی نفرت کے شعلے ایک بھڑکتے ہوئے نرک کی صورت اختیار کر گئے۔

کہتے ہیں جب رحیم مل مرا تو وہ ''پاکستان۔ زندہ باد'' کا ورد کر رہا تھا اور رام مل ''جے ہند'' کے نعرے لگا رہا تھا حالانکہ کسی کو بھی اپنے وطن سے کوئی پیار یا عقیدت نہیں تھی۔ یہ سب سیاسی ڈھونگ تھا۔

عصری ادب اور نئی نسل کا ترجمان
سہ ماہی **مژگان**
مدیران:
نوشاد مومن ، ایس. ایچ. بھارتی
قیمت: ۲۰ روپے زر سالانہ: ۷۵ روپے
''احمد ولا'' جے ۸۵، توپسیا روڈ۔ کلکتہ - ۳۹

ترقی پسند اور اقدار و افکار کا ترجمان
نیا سفر
مرتبین:
سید عاشور کاظمی
علی احمد فاطمی
رابطہ۔ ۲۸، مرزا غالب روڈ،
الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

انور شیخ



متنازعہ افکار

انور شیخ کے متنازعہ افکار

ف۔ س۔ اعجاز

انور شیخ کے بارے میں ان کی کتاب "نبضِ جہاں" کے حوالے سے ایک مضمون میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اوروں نے بھی ان کی اس کتاب یا دیگر اردو کتابوں "سوز و ساز" اور "آگ اور پانی" کے متعلق وقیع مضامین لکھے ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ان کی اردو شاعری، افسانوں اور انشائیوں پر مشتمل ہیں۔ لیکن انور شیخ کی صحیح شناخت ان کتابوں کے ذریعہ ممکن نہیں۔ ان کی انگریزی تحریریں انکی اصل پہچان ہیں۔ اور ان کے متنازعہ فیہ افکار کا مجموعہ ہیں جنہیں عام اردو والوں نے نہیں پڑھا ہے اور اگر پڑھا بھی ہے تو وہ ان پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرنے سے گریز کریں گے کیونکہ اس میں انہیں اپنے بدنام ہو جانے کا ڈر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انور شیخ ایک ایسے انتہا پسند سیاسی اور مذہبی فلاسفر ہیں جنکی ہیبتِ فکر کو ایک طبقہ مشتبہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ لیکن مٹھی بھر لوگ ایسے بھی ہوں گے جو یقیناً تسکینِ علم کی خاطر ان افکار کا مطالعہ کرنا پسند کریں گے۔ تاکہ ان کا جواب اپنے استدلال سے دے سکیں۔ اس خیال کے تحت میں انور شیخ کے برصغیر ہند و پاک کی سیاست، دینِ اسلام اور ہندومت سے متعلق بنیادی افکار کو یکجا کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ان کے ان خیالات سے میرا یا قارئین کا اتفاق بالکل ضروری نہیں ہے۔ البتہ قارئین اگر کسی نقطۂ نظر سے سوالات اٹھائیں تو ان کا جواب شیخ صاحب کو ضرور دینا چاہیئے۔ اور امید ہے کہ وہ جواب دیں گے۔

میں اس مطالعہ کو مختصر اور انور شیخ کی دو انگریزی کتب "A Tale Of Two Gujarati Saints" اور "Islam, The Arab Imperialism" کے علاوہ ان کے اردو مضمون "اسلام کا نظریۂ خیر و شر" تک محدود رکھوں گا۔ اور کہیں کہیں اپنی بات بھی اٹھاؤں گا۔

جناح کے بارے میں اپنی کتاب "دو گجراتی سنتوں کی کہانی" کے باب دوم میں انور شیخ رقمطراز ہیں کہ جناح معصوم لوگوں کے برتے پر ایک ہیرو بننا چاہتے تھے۔ وہ باعمل مسلمان نہیں تھے۔ اس کے باوجود اسلامی ملک کی بات کرتے تھے۔ جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دیگر لوگ پاکستان کے تصور اور دو قومی نظریئے کے مخالف تھے۔

بقول شیخ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ کبھی کوئی ریاست قرآنی اصولوں کے مطابق قائم رہی ہے۔ اور نہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کل مسلمانوں کے لئے ایک واحد ملک کا قیام چاہتا ہے جہاں تمام اسلامی نعمتوں اور فوائد میں مسلمان حصہ دار ہوں۔ ہندوستان کے مسلمان خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کی "اسلامی فلاحی ریاست" کی بات ضرور کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرب بچوں کو سماجی فوائد پہنچانے کا طریقہ رائج کیا لیکن اس کے لئے رقم کہاں سے آتی تھی؟ یہ رقم مصر اور ایران کے نو مسلمین سے حاصل کی جاتی تھی جن کے بچے بھوک اور بیماری سے تڑپتے تھے۔ ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ مصری اور ایرانی بچوں کو عرب بیت المال سے امداد دی جاتی تھی۔ امداد صرف اطفال عرب کیلئے تھی۔

شیخ کا نظریہ ہے کہ مسلم قانون قانون کے مروجہ معیار تک نہیں پہنچتا۔ اسلامی قانون کو عوامی فلاح سے سروکار نہیں ہے کیونکہ اس کے پیشِ نظر صرف پیغمبرِ اسلام کی سہولت تھی یا ہے۔ اس ضمن میں انور شیخ نے قرآن مجید سے تعددِ ازدواج کے بارے میں چند آیات پیش کی ہیں۔ شیخ کا مدعا یہ ہے کہ قانون کبھی صرف ایک شخص، ایک فرد یا ایک جماعت کے لئے نہیں بنایا جاتا۔ وہ تمام لوگوں کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔ نیز قانون کو اپنے اطلاق میں کلی طور پر غیر جانبدار ہونا چاہیئے۔ اس میں چھوٹے بڑے اونچے نیچے کی تخصیص نہیں ہونی چاہیئے۔ بقول شیخ اسلامی قوانین بشمول عائلی قانون پیغمبر اور معتقدین کے لئے یکساں نہیں ہیں۔ جسے اسلامی قانون کہا جاتا ہے وہ قرآن اور حدیث کی دور از کار تفسیرات کا نتیجہ ہے۔ اس میں وہ قانونی اختراعات بھی شامل ہیں جو عرب اور ترک حکمرانوں نے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق کی تھیں۔ اسلامی قانون کو شیخ نے دنیا کے اس سب سے بڑے قصۂ باطل (myth) سے تعبیر کیا ہے جس کا خواب مسلم الہامی شخصیتوں نے ہمیشہ دیکھا ہے۔ اسلامی قانون سے متعلق نہ کبھی تفہیم کی ایسی کسوٹی قائم ہوئی جسے فہم کی مساوی سطح قرار

دیا جاسکے نہ اس کا نفاذ مساوات کا مرہونِ منت ہوا۔

اسلامی قانون کی فہم و تفسیر کے حوالے سے انور شیخ نے اپنی جانب سے کئی دلائل پیش کئے ہیں اور جا بجا ان کا جواز اسلامی شرع کی تاریخ سے فراہم کیا ہے۔ پاکستان اور .: ؟ کے مذکور میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے: "ہندوستان کے غربت زدہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ اسلامی قانون کے معنی معاشی برابری (مساوات) کے ہیں۔ ہم سبھوں کو ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے تو کھلے عام اسلامی قانون کو نیشنلائزیشن کے مارکسی نظریے کے مساوی قرار دیدیا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں کسی بھی شکل میں لامحدود دولت جمع کرنے کی چھوٹ ہے، زمین کی شکل میں بھی۔ اور یہ موجودہ زمانے میں جاگیردارانہ نظام کی بقا کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہے"۔

انور شیخ ایک بیدار مغز محقق اور غیر جذباتی نقاد ہیں۔ انہیں اس کی ذرا پرواہ نہیں کہ ان کے رشحات قلم سے کسی مسلمان کے جذبات اور اعتقاد پر ضرب لگے گی یا کسی ہندو کی دل شکنی ہوگی۔ انہیں لکھنا ہے وہ لکھتے ہیں۔ انکے افکار لاکھ پختہ سہی اور ہزار وہ یہ چاہیں کہ انکی تحریریں جذباتی انداز سے نہ دیکھی جائیں بلکہ انہیں عادلانہ نگاہ سے جانچا جائے، لیکن اس سوال کا جواب انہیں کبھی دینا پڑے گا کہ وہ اپنے لئے اظہار رائے کی کتنی "لبرٹی" جائز قرار دیتے ہیں۔ مان لیا کہ وہ مغرب کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتے ہیں، اور بزعم خود انکی عقل و دانش ہزاروں لوگوں سے بڑھی ہوئی ہے لیکن اگر کسی کو اُن سے اتفاق نہ ہو اور ان کا لکھا قابل اعتراض سمجھا جائے تو کیا وہ شدید ردّ عمل کو سہہ سکیں گے۔ ابھی انکی ایک کتاب "آگ اور پانی" منظر عام پر آئی ہے جس میں ایک انشائیہ میں انہوں نے بے نظیر اور نواز شریف نامی دو کرداروں کو اچھی خاصی جنسی چھیڑ چھاڑ تک پہنچا دیا ہے۔ اس آزادی کا لائسنس انہیں کس نے دیا اور کہاں سے ملا۔ جو آدمی عدل پر زور دے وہ عدل شکنی کا مرتکب کیوں ہوگا؟۔ انور شیخ اسلام پرست نہیں ہیں، نہ سہی۔ ہندو مت انہیں کچھ بھاتا ہے کچھ نہیں بھاتا۔ قادیانیت کے وہ مخالف ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ قلمی دہشت گردی (pen terrorism) پر جواتر آتے ہیں اس پر روک لگائیں تو یہ ان کے لئے اچھا ہوگا۔ جو آدمی علم و فضل میں اتنا بڑھا ہوا ہو کیا اسے اس مشورے کی ضرورت ہوگی؟ اپنا نظریہ پیش کیجئے مگر اسطرح کہ دوسرے کے عقیدے کو گزند نہ پہنچے۔ یہ موجودہ زمانے کا اپنے دانشوروں سے تقاضہ ہے اور برصغیر کی بنیادی ضرورت بھی۔ مبادا اس میانہ روی کے بغیر کسی کا فلسفہ عدم توازن یا بحران کا شکار ہو جائے۔

انور شیخ ہندوستان کے زوال اور تباہی کا اصل سبب مذہب کو بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ عقیدہ جذبے کو متوجہ اور متحرک کرتا ہے اور استدلال کا مخالف ہوتا ہے۔ یہ لاعلمی کی بنا پر اپنے ماننے والے کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور وہ یہ یقین کرنا شروع کر دیتا ہے کہ ایک بکرا ہاتھی سے بڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے حواس پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور بے عقلی کی دیوی کو اسطرح اندھا ہو کر پوجنے لگتا ہے کہ بصارت پر کورپن کو، دوستی پر نفرت کو اور شیریں پر تلخ کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ یہ دماغی تسلسل کا بدترین نمونہ ہے کہ انسان جانور میں تبدیل ہو کر سماجی برائیاں پھیلانے لگ جائے۔

اپنی کتاب "دو گجراتی سنتوں کی کہانی" میں انور شیخ نے پاکستان اور ہندوستان کا مطالعہ مذہبی اور سیاسی عوامل کے پس منظر میں کیا ہے۔ اور قدم قدم پر ان عوامل کی ناقص کارفرمائی کی مذمت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں عقیدہ اگر نجی ہو تو اسے اثاثہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن جب وہ دوسروں کی زندگی میں مداخلت کرنے لگ جائے تو ایک قسم کی کوڑھ بن جاتا ہے۔ فکر و اعتقاد کی آزادی بنیادی انسانی آزادی ہے۔ جو خدا انسان کو یہ آزادی دینے سے منکر ہو وہ الہامی نہیں رہ جاتا۔ گمراہ ہیں وہ مسلمان جو بھارت کو دارالحرب یعنی میدان جنگ سمجھتے ہیں جہاں وہ اسوقت تک ہر چال، داؤ پیچ اور غداری (treason) کو جائز قرار دیتے ہیں جب تک کہ یہ دارالاسلام یعنی وہ سرزمین نہ بن جائے جس پر اسلام کا بول بالا ہو۔

شیخ کا خیال ہے "اسی طرح ہندو بھی غلطی پر ہیں جو سوچتے ہیں کہ ہندوستان کے مسائل کا حل مسلمانوں کو ہندو بنانے میں مضمر ہے۔ یہ ایک شرمناک پروپگنڈہ ہے کیونکہ ہندو نظریہ ارتداد کی اجازت نہیں دیتا۔ کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا جب ہزاروں راجپوت مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنا لیا گیا تھا لیکن یہ تجربہ تلخ رہا کیونکہ ہندو روایت دھرم بدلے ہوؤں کو قبول نہیں کرتی۔ ہندو سماج میں ایک مسلمان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جس کا مذہب کئی نقائص کے باوجود اصول مساوات پر مبنی ہے جو اپنے تمام ماننے والوں کے لئے برابر کے حقوق کی وکالت کرتا ہے۔ جبکہ ہندو دھرم ذات پات کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوبارہ ہندو بننے والا صرف ایک اچھوت بن کر رہ جاتا ہے۔ اور جب وہ وید سُنے تو اس کے کانوں کو پگھلے سیسے سے بند کر دینا اور جب وہ وید پڑھے تو اس کی زبان کے دو ٹکڑے کر دینا جائز مانا جاتا ہے۔ والمکی کی رامائن اور بھی آگے چلی گئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ رام نے نیچ ذات کے شمبو کا سر اسی لئے قلم کر دیا تھا کہ اس سے دھارمک منتر پڑھنے کا جرم سرزد ہوا تھا۔ لہٰذا اس سلسلے میں آریہ سماج کے دعوے نمائشی اور کھوکھلے ہیں"۔

شیخ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ برصغیر ہند میں مذہب بھلے ہی انفرادی تسکین کا ذریعہ ہو لیکن یہ اجتماعی طور پر سب سے زیادہ تباہ کن حربہ ہے۔ لہٰذا مذہب کو اس خطے میں انتہائی نجی معاملہ بنا دیا جانا چاہئے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے عقیدے کو برداشت کرنا سیکھنا چاہئے۔ اسی میں نجات ہے کیونکہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی مذہب کو خلوص کے ساتھ برتتا ہو۔ مذہب صرف بزدلی اور گمراہی کا ذریعہ ہے۔ مذہب کے متبادل کے طور پر انور شیخ نے "نیشنلزم" کو اختیار کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں ۹۵ فیصد مسلمان نسلاً ہندوستانی ہیں اور جو خود کو "بیرونی فاتحین کی اولاد" سمجھتے ہیں وہ یہاں اتنے قدیم ہو چکے ہیں کہ مقامی کلچر پوری طرح اختیار کر سکتے ہیں۔ انہیں یہ سوچنا چھوڑ دینا ہوگا کہ وہ پہلے مسلمان بعد میں ہندوستانی ہیں۔ اگر وہ ایسا سوچیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مادر وطن کے ساتھ انکی کوئی وفاداری نہیں ہے۔

ہندوستانیوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی بقا مذہبی تعصب میں نہیں بلکہ "ہندوستانیت" میں مضمر ہے۔ شیخ اس ضمن میں تاریخ عرب سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح اہل عرب بلا تفریق مذہب آپس میں قوم پروری کا توانا احساس رکھتے ہیں۔ اس پر ان کا قومی اتحاد قائم ہوا جو انہیں سامراجی مرتبے تک لے گیا۔ انور شیخ نے لکھا ہے:

"عرب قبیلہ بنو تغلیب ما قبل اسلام کے دور میں عیسائی بن گیا تھا۔ اس کے لوگوں نے پیغمبر اسلام کے زمانے میں بھی ان کا عقیدہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ بصورت دیگر ان پر جزیہ کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی جو قرآن کی رو سے غیر مسلمین پر ان کی کمتری ثابت کرنے کے لئے عائد کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے یہ دو پیشکش (اسلام قبول کرنے اور جزیہ ادا کرنے کی) مسترد کر دیں اور دعویٰ کیا کہ چونکہ وہ بھی تمام عربوں کی طرح عرب ہیں اس لئے حقارت آمیز رویے کو سہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے جزیہ کے بجائے زکوٰۃ ادا کرنے کی پیشکش کی جو تمام عرب لوگوں پر جو داخل اسلام تھے، عائد تھی۔

"خلیفہ حضرت عمرؓ نے کفار کی جانب سے زکوٰۃ لینا قبول نہیں کیا کیونکہ ان لوگوں پر جزیہ واجب تھا۔ بنو تغلیب گرچہ عیسائی تھے لیکن عرب قومیت کے احساس سے ان کے سینے مملو اور معمور تھے۔ انہوں نے اس اقدام کو اپنے قومی وقار کی تذلیل قرار دیتے ہوئے ملک چھوڑ کر چلے جانے کا قصد کیا جو بازنطینی روم مسیحیت کے پیرو تھے۔ جب انہوں نے سفر کی شروعات کی تو مسلمانوں کو نقصان ... حضرت عمر کو مشورہ دیا کہ وہ ہجرت روکیں ... انہوں نے حضرت عمر سے یہ دلیل بیان کی کہ یہ لوگ بہادر عرب ہیں۔ ہجرت کے بعد یہ دشمن عیسائیوں کا حصہ بن جائیں گے۔ لہٰذا انہیں اجازت دے دی جائے کہ وہ زکوٰۃ کے نام پر جزیہ ادا کریں۔ خلیفہ نے اس حکمت عملی کو پسند فرمایا۔ انہوں نے زکوٰۃ کی رقم دوگنی کر دی تاکہ وہ جزیہ کے برابر ہو جائے اور اپنے ذمہ داروں کو بنو تغلیب کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں ہجرت کرنے سے روک لیں۔ اور پھر یہی ہوا"۔

شیخ دو قومی نظریئے کو فروغ دینے میں مسلمان اور ہندو دونوں کو مجرم قرار دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ذہنوں پر عرب نیشنلزم کے غلبے اور ہندوؤں کے ذات پات میں بٹے ہوئے نظام کو خطرناک اور تباہ کن قرار دیتے ہیں۔ ان کا مطالعہ ہندوستان کے دلتوں کی موجودہ سیاست تک مکمل ہے۔ وہ دلتوں کی ترقی کو ہندو سماج کے لئے خوش آئند قرار دیتے ہیں اور محبانِ ہند کو پچھڑی ذات کی عورت مایاوتی کو اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ اور کے آر نارائن کو بھارت کا صدر بنانے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی دلتوں کی اندرونی آویزش اور آپس میں ایکدوسرے کو نیچا دکھانے والی نفسیات کے اسرار بھی انہوں نے کھول دیئے ہیں۔ ایک متمول دلت اپنے سے کمتر اور غریب دلت کو "جے بھیم" کہنا پسند نہیں کرتا۔ خوشحال دلت لوگوں میں بھی ذات پات کا بھید بھاؤ ہے۔ انمیں سے بہت سے اپنے ساتھیوں کو اچھوت مانتے ہیں۔ اور بعض تو دوسروں کے سامنے اپنے ماں باپ کو پہچاننے میں بھی تامل کرتے ہیں تاکہ انکی شرمناک اصل ظاہر نہ ہو جائے۔

اس کتاب "دو گجراتی سنتوں کی کہانی" میں گاندھی اور جناح کے شخصی، سماجی اور قومی کرداروں کا دوٹوک تجزیہ کیا گیا ہے۔ لیکن مذہب اسلام میں عیب ڈھونڈ نکالنے کی عمداً کوشش بھی کی گئی ہے۔ جو شیخ کی دیگر انگریزی تحریروں میں اور بھی زیادہ واضح ہے۔ موضوع کا احاطہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی ان تحریروں کی بھی نشاندہی کی جائے۔ اگرچہ تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں ہے اور ایک مختصر مضمون میں سبھی باتیں سمائیں گی بھی نہیں اور ان امور میں مجھے اپنی کم علمی اور عجز کا بھی اعتراف ہے۔ لہٰذا میں صرف مصنف کی فکری اساس اور فلسفے کی جانب قاری کی رسائی کے لئے کچھ صاف اور غیر مبہم اشاروں پر اکتفا کروں گا۔

انور شیخ ایک سہ ماہی اردو انگریزی رسالہ "لبرٹی" کارڈف برطانیہ سے شائع کرتے ہیں۔ جس کے بائیں سرورق پر انگریزی سرنامے کے اوپر "The Humanist Quarterly" یعنی انسان پرست سہ ماہی لکھا ہوتا ہے اور دائیں سرورق پر اردو سرنامے کے اوپر تحریر ہوتا ہے "جدید اور انوکھے خیالات کا مالک"۔ جب یہ رسالہ میرے ہاتھ

آنے لگا تو مجھے اس میں کچھ دلچسپی ہو گئی۔ میں اس میں انور شیخ کے انگریزی مضامین جو اسلامی اور ویدک تصوف سے متعلق ہوا کرتے تھے، بطور خاص پڑھتا یا دیکھتا تھا۔ ان مضامین میں اکثر اسلامی اور ہندو تصوف کا تقابلی جائزہ ہوا کرتا تھا۔ اور ان میں مصنف فوقیت اکثر ویدک تصورات کو دیا کرتا تھا۔ زبان صاف اور سلیس، پیرایہ دلنشیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن تحریر میں منطق کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی تھی۔ جو کہیں کہیں مجھے اپیل نہیں کرتی تھی۔ جس کا سبب شاید ویدانت اور ہندو بھگتی سے میری لاعلمی رہی ہو۔ بالآخر میں یہ سمجھ پایا کہ یہ شخص بقول میر "قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا" کا نمونہ بن گیا ہے۔ لیکن اپنے علم کو اس نے منظم کر رکھا ہے۔ نیاز فتحپوری کے برخلاف جب میں انور شیخ کی کوئی نثری تحریر پڑھتا ہوں تو مجھے ان میں سراسر ایک غیر سمجھوتہ پرست آدمی نظر آتا ہے۔ جس کے فلسفہ اور نکتہ وری سے اہلِ منطق اور مخالفینِ اسلام کو ایک طرح کا انبساط حاصل ہوگا لیکن قومِ مسلم کے عام افراد اس علم کی یلغار شاید کبھی نہ جھیل سکیں۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ جب میں انہیں پڑھتا ہوں ان کی تحریر کے پس پشت ان کے اصل محرک کی تلاش جاری رہتی ہے۔ میں خود ایک مسلمان ہوں۔ اس لئے یہ ضرور سوچتا ہوں کہ امت مسلم کی رسوائی کا سبب کم سے کم کوئی مسلم رائٹر نہ بنے۔ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے کیس ابھی تازہ ہیں اور ٹھکانے نہیں لگائے گئے ہیں۔ لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ محض سنے سنائے پر کوئی کسی کو مطعون اور ملعون قرار نہ دے۔ دنیا کو آج علم نے جہاں پہنچا دیا ہے وہاں مخالف آوازوں کا سننا اور سہنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو آج سارے عالم کے مسلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے لوگوں سے زیادہ اپنی عدم رواداری اور جہل کی بنا پر بدنام ہو رہے ہیں۔ اور اس جاہلانہ اور اشتعال انگیز مزاج کو مغرب کے سیانے چالاکی سے استعمال کر رہے ہیں۔ امت کا یہ حال ہے کہ آگ کے جواب میں آگ لا کر رکھ دی جاتی ہے جبکہ ہونا یہ چاہئے کہ اگر دشمن کا علم آگ ہے تو اپنے علم کو پانی بنا کر اس آگ کو بجھا دیا جائے۔ عقل، مذہب اور مسلکِ تصوف کا بھی یہی پیغام ہے۔ لیکن جہالت کی پٹی ہماری آنکھوں پر بندھی ہوئی ہے۔ اسے ہم لا علمی سے تعبیر نہیں کریں گے۔ کیونکہ لاعلمی اور جہالت میں فرق ہے۔ میری ناقص رائے میں اس فرق کو نہ سمجھنے کی پاداش میں ہی مسلمانوں پر بنیاد پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ غیر جب بنیاد پرست کہتے ہیں تو بنیاد سے ان کا مطلب مذہب نہیں ہوتا بلکہ جہالت ہوتا ہے۔ ہر قوم کسی عقیدے کی اسیر ہوتی ہے اور اسکا عقیدہ اس کے تشخص اور بقائے دوام کے لئے نہایت اہم ہوتا ہے۔ عقیدت کے بارے میں انور شیخ کا خیال ہے کہ یہ "اوہام پرستی کی جڑ اور عقل کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اسی لئے مذاہب کے پیروکار اپنے عقائد پر تنقیدی نظر ڈالنا گناہ سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں حیوانِ ناطق بن کر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مویشیوں کی طرح ہانکنا سہل ہو جاتا ہے۔" (اسلام کا نظریۂ خیر و شر" لبرٹی" شمارہ جولائی ۹۸ء۔ صفحہ ۱۴)

خیر و شر کو فلاسفروں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ خیر و شر کے اسلامی نظریے پر انور شیخ نے لبرٹی کے مذکورہ بالا شمارے میں جو مضمون شائع کیا ہے اس میں انہوں نے اس پر بہت زور صرف کیا ہے کہ توسیع اسلام اور اسلام کا نظریۂ خیر و شر ہر زاویہ سے نظریۂ عربیت سے مربوط و ملحق ہے۔ ان کے اس خیال سے بیشتر لوگوں کو اتفاق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں:

" یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام قبول کرنے سے مراد اللہ کی برتری نہیں بلکہ محمدؐ کی فضیلت تسلیم کرنا مقصود تھا کیونکہ کوئی شخص بھی صرف اللہ پر ایمان لانے سے مسلمان نہیں ہو جاتا۔ اگر حقیقت یوں ہوتی تو تمام عیسائی اور یہودی مومن قرار پاتے۔☆ وہ محض محمدؐ کو نہ ماننے کی وجہ سے کافر ٹھہرائے گئے ہیں۔ اسلام قبول کرنے کا مطلب اقرار محمدؐ ہے۔ اللہ محمد کا دردو گو ہونے کے سبب ایک ثانوی شخصیت ہے۔

"چونکہ نبوت۔ روحانیت کے پردے میں قومی اصولِ سیاست ہے اس لئے اسلام عربوں کی قومی تحریک کا دوسرا نام ہے۔ اگرچہ میں اس موضوع پر اپنی دو کتابوں ISLAM, THE ARAB NATIONAL MOVEMENT اور ISLAM, THE ARAB IMPERIALISM میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں پھر بھی یہاں چند حقائق کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

1- یہ کہنا کہ آنحضرتؐ بڑے منکسر مزاج تھے اور ان میں قومی افتخار کی بو تک نہیں تھی محض ملاؤں اور سیاست دانوں کا پروپگنڈہ ہے۔ کیونکہ یہ ان کی روزی اور وقار کا ایک آسان موثر ذریعہ ہے۔ یہ حدیث ملاحظہ ہو:

☆ یہ محض ایک ڈھونگ ہے کہ یہودی اور عیسائی اہل کتاب ہیں۔ قرآن کی رو سے نہ صرف وہ کافر ہیں بلکہ کفر میں مشرکین کے ہم پلہ ہیں۔ (98:5) —— (انور شیخ)

"وہ دو قبیلے جو خدا نے افضل المخلوق منتخب کئے وہ اسمٰعیل (عرب) اور اسحاق کی اولاد (یہودی) تھے۔ خدا نے اولاد اسمٰعیل (عربوں) کو اولاد اسحاق (یہود) پر فضیلت بخشی۔ پھر خدا نے (عربوں کے) منتخب قبیلہ قریش میں محمدؐ کو پیدا کیا اور پھر اس نے قریش کے بہترین گھرانے (بنوہاشم) سے محمدؐ کو پیدا کیا جو خیر البشر (دنیا کے سب سے بڑے انسان) ہیں" (جامع ترمذی۔ جلد دوم)

اس حدیث سے صاف عیاں ہے کہ حضور ایک قوم پرست عرب تھے۔ انہیں نہ صرف اپنی قریشیت پر ناز تھا بلکہ وہ خود کو خیر البشر سمجھتے تھے۔!

2-ان کی قریش پرستی کا عالم اپنی آنکھوں سے دیکھئے:

(الف) خدا ان کو تباہ کرے جو قریش کو ذلیل کریں (جامع ترمذی۔ جلد دوم)

(ب) حکومت کرنے کا حق صرف قریش کو حاصل ہے اور جو بھی انکی مخالفت کرے اللہ اسے تباہ کردے گا۔ (بخاری۔ جلد چہارم)

(ج) اگر صرف دو فرد باقی بچیں تو حکومت کا حق اسی کو ہوگا جو قریشی ہوگا (بخاری۔ جلد نہم)

یہ احادیث من گھڑت نہیں کیونکہ یہ تاریخ عرب کی اساس ثابت ہوئیں۔ نہ صرف ابو بکر قریش ہونے کی بنا پر خلیفہ منتخب ہوئے بلکہ بغداد اور اسپین میں عرب حکومتیں جو صدیوں تک قائم رہیں ان میں ایک بھی غیر قریشی حکمران نہ تھا!

(د) حضورؐ کی حب الوطنی کی مثال یہ مشہور حدیث ہے حب الوطن من الایمان (وطن کی محبت جزو ایمان ہے)۔ اس کا مزید ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے:

(ر) اے مکہ۔ اللہ کی قسم تو تمام خطۂ ارض سے بہتر اور مجھے تمام دنیا سے پیارا ہے۔ (جامع ترمذی۔ جلد دوم)

(س) جو بھی عرب کے خلاف قدم اٹھائے گا میری محبت سے محروم رہے گا اور میں اس کی شفاعت نہیں کرونگا (جامع ترمذی۔ جلد دوم)

(ش) جس طرح تورات نے کہا کہ یاہوی (خدا) اگرچہ کائنات کا خالق ہے وہ خدائے اسرائیل ہے کیونکہ اس نے اسے اپنے برکات کا مسکن بنایا ہے۔ اسی طرح آنحضرت نے مکہ کو خدائی عظمتوں کا مرکز قرار دیتے ہوئے اللہ کی شخصیت کو مکہ سے مخصوص قرار دیا۔ اور میری فراست کے مطابق مندرجہ ذیل آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اس لئے قابل پرستش ہے کہ وہ خدائے مکہ ہے:

"مجھے یہی حکم دیا گیا کہ صرف اس شہر (مکہ) کے آقا کی عبادت کروں جسے اس نے مقدس بنایا ہے......
(القصص 28:9)

(ص) جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کو دنیا کی بہترین قوم قرار دیا۔ اسی طرح حضرت محمد مصطفےٰ نے بھی عربوں کو دنیا کی سب سے افضل قوم ٹھہرایا:

"تم (عرب☆) دنیا کی سب سے بہترین قوم ہو جو کہ معرض وجود میں لائی گئی...... جو نیکی کی تلقین اور برائی کی مذمت کرتے ہو (آل عمران 3:105)

(ط) حضورؐ کی عرب پرستی کا ثبوت۔ اس آیت سے بھی ملتا ہے:

......"خبردار ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم (عرب) سمجھ سکو" (الزخرف 43:3)

ظاہر ہے کہ یہ خطاب عربوں سے ہے جن کی مادری زبان عربی ہے اس لئے تفہیم قرآن بھی انہی کے لئے ہے۔

(ع) حدیث 5751 (مشکوٰۃ جلد سوم) میں مرقوم ہے:

"عربوں سے تین وجوہات کی بنا پر محبت کرو کیونکہ (۱) میں (محمد) عرب ہوں (۲) قرآن کریم عربی میں ہے اور (۳) یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔"

(ف) بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ قرار دینا حضورؐ کا ایک عظیم قومی کارنامہ ہے۔ حدیث 20 (بخاری۔ جلد ششم) کے مطابق ہر قوم کا اپنا قبلہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود (یہودی) بیت المقدس کو عربوں کا قبلہ قرار دیا گیا حالانکہ وہ ایک مختلف قوم تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آنحضرت یہودیوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ مسلمان ہو کر عرب قومیت کا جزو بن جائیں۔ لیکن جب ان پر خاطر خواہ اثر نہ ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی:

ا۔ "احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلے پر (پہلے سے

☆ برصغیر ہند کے مسلم علماء "خیر الامت" کا ترجمہ "مومن" یعنی "دنیا بھر کے مسلمان" کرتے ہیں۔ یہ محض خود فریبی ہے کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ اس وقت عربوں کے سوا کوئی قوم بھی مسلمان نہ تھی۔ چونکہ حضورؐ نے قریش کو حق سلطنت بخشتے ہوئے "مسلم امپائر" کی بنیاد رکھنے کے بجائے "عرب امپائر" قائم کی۔ اس لئے "خیر الامت" عرب ہیں نہ کہ مسلمان۔ ——— (انور شیخ)

چلے آتے) تھے (اب) اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے۔ تم (محمدؐ) کہدو کہ مشرق اور مغرب سب خدا ہی کا ہے ...... (البقرہ 2:142)

۲۔ "(اے محمدؐ) ہم تمہارا آسمان کی طرف منہ پھیر پھیر کر دیکھنا دیکھ رہے ہیں سو ہم تم کو اسی قبلے کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو منہ کرنے کا حکم دیں گے تو اپنا منہ (بیت المقدس کے بجائے) مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو........... (البقرۃ 2:144)

" پہلی آیت میں کچھ عجیب سی دلیل ہے۔ اگر مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے تو پھر کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا کیوں لازم ہے؟ اس طرح تعین قبلہ قطعاً غیر ضروری ہے لیکن اس کے باوجود کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا اور جیسا کہ دوسری آیت سے عیاں ہے کہ یہ تبدیلی حضورؐ کی تکمیلِ تمنا کا نتیجہ تھی کیونکہ وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر اس تغیر کے لئے التجا کر رہے تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ اپنی قوم یعنی عربوں کی تنظیم کے لئے ایک مرکز چاہتے تھے۔ یہ قومیت کا ایسا تقاضہ ہے جس کے بغیر تعمیرِ قومیت ممکن نہیں۔

"میرے بعض آشنا میرے اسلام کے نظریۂ عربیت سے اس لئے متفق نہیں کہ ان کے خیال میں قرآن نے "یا ایہاء لناس" کہہ کر "بنی نوع انسان" کو مخاطب کیا ہے۔ یہ ایک شدید غلط فہمی ہے جو صدیوں کے مہلک پروپگنڈے کا نتیجہ ہے جس نے غیر عرب مسلمانوں کے اذہان کو اس طرح مفلوج کر دیا ہے کہ وہ عرب۔ مکہ۔ مدینہ یا کعبہ کا نام سنتے ہی سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ "یا ایہاء لناس" کے معنی ہیں "اے لوگو" نہ کہ "دنیا بھر کے لوگو"۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی خطیب کسی مجلس کو خطاب کرے گا تو وہ ان سے "اے لوگو کہہ کر مخاطب ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ ایک یقینی امر ہے کہ حضورؐ نے اپنے ملک سے باہر جا کر کسی قوم کو تبلیغ نہیں کی۔ انہوں نے اہل عجم کو شمشیر و سناں کے سوا کبھی کچھ نہ بھیجا جس نے انہیں سیاسی اور ذہنی آزادی سے محروم کر دیا۔

"یہ الفاظ (یا ایہا لناس) عربوں کو بین الاقوامی فوقیت دینے کے لئے دانستہ طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ محمد عربی کی دانش قابل رشک ہے۔ مندرجہ ذیل حقائق پر نگاہ ڈالئے:

1۔ "اور ہر قوم کا نبی ہوتا ہے اور جب ان کا پیغمبر آتا ہے تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا............ یونس (10:47)

اس آیت کے مطابق نبی ایک قومی نمائندہ ہے۔ لیکن "ہر ایک پیغمبر اپنی قوم کے لئے مقرر کیا جاتا ہے لیکن میں (محمدؐ) اقوام عالم کے لئے نبی مقرر کیا گیا ہوں"

(مشکوٰۃ شریف۔ حدیث نمبر 5500۔ جلد سوم)

"ان اقتباسات میں محمد عربی کی جو قومی فراست مضمر ہے بے مثل ہے۔ پہلے یہ بیان کرنا کہ ہر قوم کا اپنا قبلہ اور نبی ہوتا ہے لیکن بعد میں یہ اعلان کرنا کہ محمدؐ اقوام عالم کے نبی اور کعبہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا کعبہ ہے یہ اس بات کا ضامن ہے کہ دنیا بھر کے لوگ تقدیسِ کعبہ تسلیم کرتے ہوئے سرزمینِ عرب کو معظم سمجھیں۔ اور اسی سمت دن رات اپنا سر جھکائیں۔

بین الاقوامی تعینِ کعبہ کے ساتھ اگر مندرجہ ذیل آیات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو میرے اس دعویٰ کی صداقت میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہے گی کہ اسلام عربی قومیت کی برتری کا علمبردار ہے:

"تمہارے لئے رسول اللہ کی پیروی اسوہ حسنہ ہے۔ (یہ) اس شخص کے لئے ہے جسے خدا (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ خدا کا کثرت سے ذکر کرتا ہو" (الاحزاب 33:21)

"اسوۂ حسنہ سے مراد یہ ہے کہ حضورؐ مسلمانوں کے لئے بہترین نمونۂ عمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ایمان ہے کہ ہمیں کھانے پینے۔ سوچنے۔ سمجھنے۔ چلنے۔ پھرنے۔ اٹھنے۔ بیٹھنے۔ دوستی اور دشمنی۔ حتیٰ کہ وضع قطع میں پیغمبر عربی کی تقلید کرنا چاہئے۔ مختصر یہ کہ جو حضور کو مرغوب تھا وہ ہمیں بھی مرغوب ہونا چاہئے اور جو حضور کو ناپسند تھا وہ ہمیں بھی ناپسند ہونا چاہئے۔ ایسا کئے بغیر وصالِ خدا اور یومِ قیامت کی امیدوں کے بر آنے کی کوئی امید نہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور عرب تھے اور انہیں سرزمین عرب اور عربی کلچر سے والہانہ محبت تھی اس لئے ان کی پیروی کرتے ہوئے تمام غیر عرب مسلمانوں کے لئے لازم ہے وہ اپنے اوطان اور قومی روایات کو مکمل طور پر نظر انداز کریں اور عرب پرستی کو اپنا جزو ایمان بنالیں۔ ہندوستان کی تقسیم کا اصل سبب یہی ہے جس کی وجہ سے ہندی مسلمانوں نے اپنے وطن کو دارالحرب تصور کیا اور انہیں اپنی ارض مقدس کی تعظیم کا فخر نصیب نہ ہو سکا۔ تاریخ عالم نے وطن کش لوگوں کی قسمت پر اسی لئے ذلت و رسوائی کی مہر ثبت کر دی ہے۔

''اتنا ہی نہیں اسوۂ حسنہ یعنی عرب پرستی ہی قرآنی نقطۂ نظر سے ہدایت اور نجات کا منبع ہے جو اسلامی نظریۂ خیر وشر کی حقیقت کو واضح کرتا ہے:

''(اے پیغمبر) لوگوں سے کہو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو اور اگر تم ایسا کرو تو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا......'' (آل عمران 3:30)

''آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس بحث کا مقصد اصولِ نبوت کی تحقیر نہیں بلکہ تفسیر ہے''۔

''نبی ایک محبِ قوم ہوتا ہے جسے قدرت شدید جذبۂ فوقیت سے نوازتی ہے اور وہ اپنی انا کی تکمیل کیلئے قومی عظمت کو آلۂ کار بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ایک مخلص قومی ہیرو ہوتا ہے۔ جو اپنے لوگوں کی اصلاح و ترقی کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اور اپنے وطن کو ایک اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔ اس لئے ایک پیغمبر کو برے الفاظ سے یاد کرنا کوتاہ فہمی کی دلیل ہے۔ قومی ہمدردی اور خدمات کی روشنی میں وہ ایک عظیم انسان ہے۔ حضرت زردشت اور حضرت موسیٰ اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں لیکن حضرت محمد (ص) عربی اس میدان میں ان سے کہیں آگے ہیں۔

''میں نے اپنی انگریزی تصنیف ETERNITY میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا تھا کہ انسان ایک عظیم عجوبۂ فطرت ہے جس میں روحانی ارتقا کی اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ ذاتی کاوش سے مقامِ الوہیت تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو روحانی پیشوا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ خود کو خدا یا اس کا ہمسر منوانے کے لئے عوام کو طرح طرح کے فریبوں سے گمراہ کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح اپنی منزل یعنی مقام الوہیت پر نہیں پہنچ سکتے۔

''عصر حاضر میں انسان کے روحانی ارتقا کے لئے سب سے بڑا خطرہ جماعت احمدیہ ہے جس کا گمراہ کن پروپگنڈہ تادیل بازی۔ چرب زبانی اور دجل و فریب کی ایک زندہ مثال ہے۔ امیر جماعتِ احمدیہ کو مرید جمع کرنے کا اس قدر جنون ہے کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک مخصوص ٹیلی ویژن چینل لے رکھا ہے جس کے نشریات ہر جویائے حقیقت کے لئے زہر قاتل سے کم نہیں۔ اس دجل کا ہدف خصوصی برصغیر ہند کے مسلمان ہیں چونکہ میرا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے اس لئے اہل وطن کو اس شر کی چیرہ دستیوں سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں''۔

(ص 65 تا 69۔ ''لبرٹی''۔ جولائی 98ء)

مذہب اسلام سے متعلق شیخ کے افکار واضح اور کھلے ہوئے ہیں۔ انکا دعویٰ ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ ایک عرب قومی تحریک ہے جس کا مقصد عرب فوقیت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ خود کو ہندی عظمت کا قائل قرار دیتے ہیں اور ان کے نظریۂ ہند میں بھارت پاکستان اور بنگلہ دیش سبھی شامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام نے ہندوستان کی قومی اور جغرافیائی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ان کی کتاب "Islam The Arab Imperialism" کے ٹائٹل پر ایک جنگجو مسلمان جرنیل کا خاکہ بنا ہوا ہے جو خونیں لاشوں کو روندکر اپنے ہاتھ میں ''بسم اللہ'' لکھی تلوار کو لہراتا گھوڑے پر سوار ہے۔ ان کے ذہن میں عرب امپیریلزم کی یہ تصویر ہے جو سراسر غلط ہے۔

شیخ کا یہ خیال کہ ''تمام غیر عرب مسلمانوں کے لئے لازم ہے وہ اپنے اوطان اور قومی روایات کو مکمل طور پر نظر انداز کریں اور عرب پرستی کو اپنا جزو ایمان بنا لیں'' ان کی اپنی انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ کیا امریکہ، برطانیہ، چین، روس، ازبکستان، فرانس وغیرہ کے اصل مسلم باشندوں نے دین کی راہ میں اپنے اپنے وطن کو رکاوٹ سمجھ رکھا ہے اور کیا ان میں سے کسی نے کردار کی ایسی مثال قائم کی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ اس قوم کے افراد نے عرب پرستی کو جزو ایمان بنا لیا ہے۔ حضورؐ کی حب الوطنی کی مشہور حدیث ''حب الوطن من الایمان'' کا شیخ نے حوالہ دیا ہے جس کے معنی ہیں ''وطن کی محبت جزو ایمان ہے''۔ جو مذہب وطن کی محبت کو جزو ایمان قرار دیتا ہو اس کے بارے میں کسی کا الٹا خیال رکھنا اس کی کج فکری کی دلیل ہے۔ اگر غیر عرب مسلمان ''عرب سامراجیت'' کے ذہنی غلام ہیں تو پھر انور شیخ یہ بتائیں کہ مسلم ممالک اپنی اپنی خود مختاری اور سالمیت کے لئے اسی طرح آپس میں کیوں ٹکرا جاتے ہیں جس طرح غیر مسلم مملکتیں اپنے اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے لئے ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتی ہیں۔

رہتی دنیا میں مسلم اور مسیحی اقوام بہت بڑی قومیں ہیں اور تمام خطوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ دیگر اقوام نسبتاً چھوٹی ہیں اور ان میں سے بیشتر ایک یا محض چند خطوں میں محدود ہیں۔ تاریخی۔ جغرافیائی کشاکش اور سرگرمی میں ان کا مسلم اور عیسائی اقوام جتنا بڑا اور متحرک رول نہیں رہا ہے۔ اس لئے بیشتر مناقشات مفکروں نے چاند اور صلیب والی قوموں کے درمیان ہی کھڑے کئے۔ اور مسلمان قوم کے عروج کو بدنام کرنے کے لئے مغربی مفکروں نے وطنیت کے مسلم تصوّر کو بگاڑنے کی منظم سازش کی۔ مذہب اور وطن کے تصوّر کو اس طور خلط ملط کر کے ان مفکروں نے صلیبی قوم کی پسپائی اور زوال کے اسباب سے آنکھیں

پھیرنے اور خود کو بری الذمہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

انور شیخ وطنیت میں وطن اور مذہب کے پُر بہار اجزا کو صحیح تاریخی وجغرافیائی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں تو انہیں نئی ذہنی جلا ملے گی۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنی ضد اور تعصب سے نجات حاصل نہ کرلیں۔ مندرجہ ذیل حدیث میں رسول عربی نے بہ حیثیت ایک عرب اپنی وطنیت کی صحیح اسپرٹ کو اجاگر کردیا ہے :

"اے مکہ۔ اللہ کی قسم تو تمام خطۂ ارض سے بہتر اور مجھے تمام دنیا سے پیارا ہے۔" (جامع ترمذی، جلد دوم)

یہ حدیث اور دیگر احادیث تفاخرِ قومی سے مملو ہونے کے باوجود غیر عرب مسلمین کے تصورِ وطنیت سے متصادم نہیں ہیں۔ اور نہ ہندی مسلمانوں نے برادران وطن کے خلاف کوئی مورچہ لگا رکھا ہے۔

میرے نزدیک دینی شعائر کے تعلق سے ہر سوال کا جواب از روئے منطق نہیں دیا جاتا۔ از منۂ تاریخ میں انسان کی کہانی روایات کی کڑیوں سے جڑی ہوئی ہے۔ لوگ قرنوں صدیوں سے کسی روایت کو مانتے آتے ہیں یا ایک رسم ادا کرتے آتے ہیں۔ کسی نے کبھی چون و چرا نہیں کیا۔ کیونکہ پہلے (اوّل) آدمی نے کبھی اس روایت یا رسم کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا یا اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اس لئے بعد کے لوگوں میں بھی کبھی کوئی شک اور سوال نہیں پیدا ہوا۔ انسان کے سوسائٹی کی داغ بیل ڈالنے سے متعلق جو نظریات ہیں ان میں سماجی معاہدے کا نظریہ Social Contract Theory زیادہ سے زیادہ قبول کیا گیا ہے۔ اس نے بھی ایسی باتوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھا۔ مذہب ایک نظام ہے جو ایک مخصوص عقیدے کا پابند ہوتا ہے اور بالاصل اس کے پیرو کو اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ کوئی یہ کہے کہ آنحضرتؐ نے اہل اسلام کی سجدہ ریزی کے لئے ایک عالمی یا بین الاقوامی مرکز قائم کرکے انہیں یکسو اور یک جانب (کعبہ کی جانب) صف آرا کردیا ہے چنانچہ یہ دیگر اقوام پر عرب کی برتری کا ثبوت ہے تو اس پر رائے دینے سے پہلے ہمیں اس طریقۂ عبادت کی کامیابی یا افادیت پر غور کرنا ہوگا جس پر چودہ صدیاں مہر تصدیق ثبت کرچکی ہیں۔

فرض کریں کہ خدا کو چہار سمت حاضر و موجود الہامی قوت مان کر مسلمانوں کو قبلہ کے التزام سے بری کردیا جائے اور کہا جائے کہ جو مسلمان جدھر چاہے ادھر کا رخ اختیار کرے اور نماز پڑھ لے یعنی کلکتہ میں مسلمان شہید مینار (مونومنٹ)، دہلی میں قطب مینار، پیرس میں ایفل ٹاور کے رخ نماز ادا کریں۔ اور ایک جماعت میں بھی جس کا جدھر چاہے منہ کرے۔ اور پھر کسی ایک وقت کی نماز کا نظارہ کیا جائے اسوقت جو ابتری اور بھگدڑ کا عالم ہوگا اسے تصور میں لائیے۔ نہ تو نمازی یکسو رہیں گے اور نہ ایک صف اختیار کرپائیں گے۔ بلکہ پھر تو جماعت کا احساس ہی پیدا نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایک قبلہ کا قیام اور رواج واقعی بانیٔ اسلام کی بڑی حکمت اور تنظیم کا ثبوت ہے۔ طریقۂ عبادت عقیدے کی ظاہری علامت ہوتا ہے۔ آج موڈرن ہندوؤں میں دستو شاستر پہلے سے کہیں زیادہ رائج ہے۔ ان کے یہاں شبھ اور اشبھ (سعد و نحس) استھان کا لحاظ رکھ کر گھروں، دکانوں، کارخانوں اور مندروں میں بیٹھک کی سمتیں طے کی جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انور شیخ ان باتوں سے مجھ سے کہیں زیادہ واقف ہیں۔ ایک قوم کے لوگ سرسوتی پوجا کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ اور یہ خاص اہتمام آج کے زمانے میں کیا ہوتا ہے۔ سنئے۔ ڈسکو، پاپ، فحش فلمی گانے، پوجا پنڈالوں میں بجائے جاتے ہیں۔ بہت سے نوجوان شراب پی کر پوجا پنڈالوں میں ناچتے گاتے ہیں۔ اور جب پوجا کے انتم دن مورتی بھسان کے لئے منڈلی نکلتی ہے تو سارے راستے ناچ، گانوں اور مستی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کمسن اور نوعمر اسکولی لڑکے اور لڑکیاں یونیفارم میں ملبوس بینڈ باجے کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے مورتی بھسم کرنے جاتے ہیں۔ اسے سرسوتی کی عظمت کہا جائے یا کچھ اور سمجھا جائے۔ اچھی خاصی ۲۶ر جنوری کی جھانکی نظر آتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ساری باتیں اوچھی ہیں اور یہ اصلاً کسی دھرم میں شامل نہیں ہیں اور نہ اس کے احکامات ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے، دھرم کے بارے میں بہت سے بنیادی سوال اٹھائے نہیں جاتے۔ (کم سے کم برصغیر ہند و پاک میں تو یہی چلن ہے)۔ ایک تازہ واقعہ ہے۔ بالکل معمولی سا۔ ابھی سکھ خالصہ پنتھ کی تین سو سالہ تقریبات کے موقع پر ۷راپریل ۹۹ء کو دہلی حکومت کی طرف سے ایک تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں کانگریس کی صدر سونیا گاندھی نے اپنے سر کو ڈھانپے بغیر "سرو پا" لے لیا۔ اس سے سکھ فرقے کے جذبات مجروح ہوگئے۔ دہلی اسمبلی میں وقفۂ سوالات کے بعد اس معاملے کو اٹھاتے ہوئے اپوزیشن لیڈر پروفیسر جگدیش (بھارتیہ جنتا پارٹی) وغیرہ نے سونیا گاندھی پر الزام لگایا کہ کانگریس نے سکھوں کی صدیوں پرانی روایت کی بے حرمتی کی ہے۔

چنانچہ ایسے بہت سے سوالات جو اگرچہ سوال کنندہ کی ذہانت کا بہترین ثبوت پیش کرتے ہیں لیکن ان سے سکون و امن کی پامالی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عقیدہ خود ایک نازک چیز ہوتا ہے اور اس کے ماننے والے اسے زیادہ نازک بنا دیتے ہیں۔ دل آزاری کی بات ہے کہ انور شیخ نے اپنے نظریات پر شرارتی میلانات کو حاوی کرلیا ہے۔ اس سے ان کی نیتِ علم مشکوک ہو جاتی ہے۔ عقیدے کی سرگزشت یہ ہے کہ جو تھا سو ہے۔ انور شیخ کو مطمئن ہو جانا چاہئے کہ جب کسی بھی خطے میں مسلمان

قبلہ رخ ہو کر نماز کے لئے کھڑا ہو تا ہے تو وہ اپنے دل میں کہتا ہے "میں نماز ادا کرتا ہوں' اتنی رکعت' پیچھے اس امام کے' رخ میرا کعبے کی طرف"۔ وہ "رخ میرا عرب کی طرف" نہیں کہتا۔ وہ اپنی کسی عبادت کی خاطر جذبۂ حبِ وطن کو رہینِ مملکتِ عرب نہیں ہونے دیتا۔ غیر عرب مسلمانوں کو سوئے عرب جو چیز متوجہ کرتی ہے وہ ہے بانئ اسلام کی تعظیم اور دیار کعبہ کی تکریم۔ حضور اگر انڈیا میں ہوتے اور اسلام کا جنم یہاں ہوا ہوتا تو سارے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مسلمانوں کا قبلہ انڈیا ہو سکتا تھا۔ اور یقین کیجئے سرحد اور وطن کے ٹکسالی نظریہ کی پاسداری پورے عالم اسلام میں کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک تازہ واقعہ سن لیں۔ سعودی عرب نے ایک حالیہ ناپسندیدہ اور تلخ تجربے کی روشنی میں عراقی عوام پر حج کے لئے داخلہ ممنوع کر رکھا ہے۔ لیکن امسال (۹۹ء) ہزاروں عراقیوں نے حج کی نیت سے بغیر ویزوں کے عرب کی سرحد پر دھاوا بولدیا۔ حکومتِ عرب نے اپنے سیاسی تدبر کو بروئے کار لاتے ہوئے کچھ عراقیوں کو تو حج کی اجازت دیدی۔ لیکن اکثریت کو اپنے خرچ اور بند وبست پر لوٹا دیا۔ کیا اس سے قبلۂ اول کی حرمت اور وطنی قوانین کی پاسداری کا فرق سمجھ میں نہیں آتا۔ کسی عراقی نے سرزمینِ عرب کو اپنے وطن پر محض زیارتِ خانۂ کعبہ کی تمنا میں "فوقیت" دی ہوایسی خبر یا مثال ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اور نہ حکومتِ عرب نے زیارت کعبہ کے متمنیوں اور فدایانِ رسول کے جوش کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی یا ان کے لئے آسانی پیدا کی۔

پیغمبر اسلام نے دراصل تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک قبلہ مقرر کر کے بڑی دانائی کا ثبوت دیا اور خود ہمیشہ کے لئے اتمامِ حجت کی راہ ہموار کر دی۔ اب اس پر کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے۔ ہمیشہ کے لئے عدل قائم کر دیا گیا۔ عبادت کو اس سے اچھی ڈسپلن نہیں دی جا سکتی۔ دراصل انور شیخ نے عقیدہ، عقیدت اور عبادت کو نہ صرف ایک غیر مسلم بلکہ لامذہب آدمی کی نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ انہوں نے جزیہ اور زکوٰۃ پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے زکوٰۃ کو ٹیکس کا درجہ دے دیا ہے۔ جبکہ یہ مسلمہ ہے کہ زکواۃ ٹیکس نہیں عبادت ہے۔

شیخ نے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے اہل عجم کو شمشیر و سناں کے سوا کچھ بھی نہ بھیجا جس نے انھیں سیاسی اور ذہنی آزادی سے محروم کر دیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت نے آخری حج کے موقع پر مکہ معظمہ کے قریب جبلِ رحمت پر میدان عرفات میں موجود ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں سے جو خطاب فرمایا اس میں کہا

"لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو گے۔ تم میں زیادہ عزت و کرامت والا وہی ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔" چنانچہ اس آیت کی روشنی میں نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔ انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔"

حضور نے اہلِ قریش کو یہ تنبیہ فرمائی:

"قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ اللہ کے حضور تم اس طرح آئو کہ تمہاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامانِ آخرت لیکر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں اللہ کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

"قریش کے لوگو! اللہ نے تمہاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے فخر و مباحات کی کوئی گنجائش نہیں۔"

انور شیخ عالمانہ سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ اور فلسفۂ قانون (Jurisprudence) کے بحرِ ذخار کو کھنگالے ہوئے ہیں۔ وہ ذرا خطبۂ حجۃ الوداع کے درج بالا حصوں کو غیر جانبدار ہو کر اور صحیح اسپرٹ میں پڑھیں اور پھر بتائیں کہ گرچہ اسلام کی کونپل زمینِ عرب سے پھوٹی لیکن اسلام کو "عرب قومی تحریک" یا "عرب فوقیت" قرار دینا اور مذہب نہ ماننا کونسی صحیح انسانی منطق ہے۔ غور فرمایئے قریش کے لوگوں کو عجز و انکسار اور سپردگی کا شیوہ اختیار کرنے کی تاکید کی جا رہی ہے اور صاف جتایا جا رہا ہے کہ تمہیں کسی قبیلے پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اور اسی طرح عرب کو عجمی پر گورے کو کالے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ پیغمبر پیغمبرانہ مشن پر آئے اور اپنا مشن پورا کر گئے۔ خطبۂ حجۃ الوداع ایک ایسا انسانی چارٹر ہے کہ جس سے بہتر مساوات اور عدل کا ہدایت نامہ نہیں مل سکتا۔ اور اگر ہے تو کوئی سامنے لائے۔

شیخ صاحب نے اگر اسلام ترک کر دیا ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ

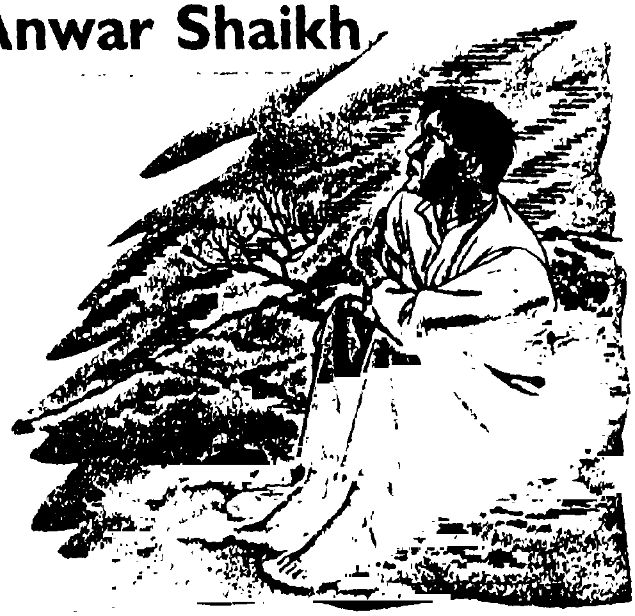
بقیہ صفحہ نمبر ۷۹ پر



ETERNITY

Man is God and God is man. Yet he is afraid : Why?

By Anwar Shaikh



انور شیخ کی کتاب "بدیت"

پروفیسر نثار احمد فاروقی
پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۳- نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

انور شیخ ایک خاصہ مانوس نام ہے، اس لئے کہ وہ نامانوس باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے، نظم و نثر دونوں میں۔ اُن کی تحریریں طنز و مزاح کا دلچسپ نمونہ ہوتی ہیں، مگر کبھی متانت کی حدود سے آگے بھی نکل جاتی ہیں۔ وہ اپنے قاری کو کبھی چونکاتے ہیں کبھی اکساتے ہیں، کبھی بدکا بھی دیتے ہیں۔

میں نے انکی کتاب "آگ اور پانی" (۱۹۹۸ء) پڑھی تھی جو آرٹ پیپر پر نہایت اہتمام سے اور بہت خوبصورت شائع ہوئی ہے، اِس کے "جملہ حقوق محفوظ" ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ

"یہ کتاب صرف بہبودیٔ عوام کے لئے شائع کی گئی ہے
اِس لئے برائے فروخت نہیں"۔

اِس میں انور شیخ نے ایک نئی صنف سخن "تکونی" پیش کی ہے، یہ حمایت علی شاعر کی ثلاثی سے قطعاً مختلف ہے۔ وہاں تو رباعی سے ایک مصرعہ کم کر کے اُسے "ثلاثی" بنا دیا گیا ہے۔ تکونی میں ایک موضوع (THEME) ہوتا ہے اور پھر بارہ اشعار کا ایک یونٹ جسے مکالمہ اور محاکمہ کہا جا سکتا ہے۔ اِس طرح تکونی میں ڈراما پن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اِس میں سماجی برائیوں کو ہدف بنایا ہے مثلاً مذہبی تنگ نظری، توہم پرستی، جہالت، حقوق انسانی کی پامالی، عورتوں سے ناانصافی اور ان کا استحصال، سیاسی بازی گری، وغیرہ۔ طنز تیکھا ہے، ایک حد تک محفوظ بھی کرتا ہے، مگر جہاں لب و لہجے میں عامیانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ وہاں اصلاح کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اصلاح کے لئے اخلاص ایک ضروری اور بنیادی شرط ہے۔

انور شیخ کا مطالعہ یقیناً وسیع ہے، انھوں نے ہندوستانی فکر و فلسفے سے بھی شناسائی پیدا کی ہے۔ وہ ہندوستانی مذاہب سے بھی کچھ واقفیت رکھتے ہیں مگر یہ معلومات کہیں سطحی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ انھوں نے اسی کتاب میں گورو تیغ بہادر کی "شہادت" کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اُس کی تاریخی حیثیت جاننے کے لئے ابو الامان امرتسری کی کتاب "سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں" ہی پڑھ لیں جو بیشتر گورمکھی ماخذ پر مبنی ہے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے برسوں پہلے شائع ہوئی تھی۔ ہندوستان میں تو یہ مرض عام ہے کہ تاریخ کو اپنے جذبات اور عقائد کے سانچے میں ڈھال کر مسخ کیا جاتا ہے، اُس سے عبرت یا واقفیت کا کام لینے کی بجائے نفرت اور افتراق کی تبلیغ کی جاتی ہے، مگر ایک اہل قلم جو سماجی سدھار کا ارادہ رکھتا ہو، معاشرے کو فساد سے پاک اور صحت مند دیکھنا چاہتا ہو اُسے عوامی روایات اور توہمات کے دھارے میں نہیں بہہ جانا چاہئے۔

"آگ اور پانی" میں تکونیوں کے علاوہ کچھ افسانے اور تمثیلچے بھی شامل ہیں، اِن میں تکنیک سے زیادہ موضوع کو مرکز بنایا گیا ہے اور اس اعتبار سے انھیں کامیاب کہا جا سکتا ہے۔

اُن کی اردو، تحریروں سے تو میں نے بات اس لئے شروع کی ہے کہ اردو کے حلقے میں خاصی تعداد نے انور کی اردو تحریریں پڑھی ہوں گی۔ وہ ایک رسالہ بھی لبرٹی (LIBERTY) کے نام سے نکالتے ہیں، اِس کے ایک دو شمارے میں نے بھی دیکھے ہیں، جیسا کہ رسالے کے نام سے ہی ظاہر ہے یہ آزادیٔ فکر و اظہار کا نقیب ہے اور یہ بات قابل تعریف و تحسین ہے۔ ایک اہلِ قلم کا سب سے بڑا سرمایہ یہی ہے کہ اُس کا ذہن غلام نہ ہو، فکر آزاد ہو، اظہار بیباک ہو اور وہ کسی بھی موضوع کے نئے پہلو تلاش کر سکتا ہو، اِس سے علمی خزانے میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے اور پڑھنے والوں کو بھی سوچنے کی نئی راہیں ملتی ہیں۔ مگر لبرٹی (LIBERTY) ہی کے نام سے جون اسٹوارٹ مل JOHN STUART MILL کی نہایت مشہور اور معتبر کتاب میں کہا گیا ہے کہ آزادی کی بھی کچھ حدیں ہوتی ہیں، آزاد ہونے کا مطلب "شتر بے مُہار" ہو جانا نہیں ہے۔ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی چھڑی گھماتا ہوا سڑک پر نکلے، مگر جہاں سے کسی دوسرے راہگیر کی آنکھ ناک کا رقبہ شروع ہوتا ہے وہاں چھڑی گھمانے کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ "لبرٹی" میگزین کے کسی پچھلے شمارے میں انور شیخ نے ڈاکٹر محمد اقبال پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے اقبال کے فکر و فن کا جائزہ اپنے نقطۂ نظر سے لیا ہے، اقبال شناسوں اور اقبال کے مداحوں کی نظر میں اُس کو منفی نظریہ اور تنقیص ہی کہا جائے گا، مگر میں اِس سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی، اس لئے قدر کرتا ہوں کہ یہ آزادیٔ فکر و اظہار کا نمونہ ہے، سب سے الگ ہٹ کر نئے زاویے سے کسی موضوع کا جائزہ لینے کی ایک کوشش ہے۔

اس طرح کے منفی اور منفرد جائزے میں ایک پہلو کو نظر میں رکھنا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ جب سے دنیا قائم ہے اور جب تک بھی رہے گی، یہ نہ کبھی ممکن ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے، نہ ہوگا کہ سب ایک فکری مرکز پر جمع ہو جائیں۔ اگر بفرضِ محال کبھی ایسا ہوا کہ سب انسانوں کی فکر، اُن کا عقیدہ، اُن کا کردار اور اطوار، طرز زندگی اور بود و باش ایک جیسی ہو

جائے، تو یہ انسان کے حتمی زوال کا دن ہو گا اور وہ حیوانات و جمادات کی صف میں آ جائے گا۔ انسان کی تہذیب اور معاشرت میں رنگا رنگی، گہما گہمی اور نشاط کار اسی لئے ہے کہ ان میں یکسانی نہیں اختلاف ہے، یک رنگی نہیں بو قلمونی ہے۔

دوسری بات یہ سوچنے کی ہے کہ ادب ہو یا تہذیب و ثقافت کے مظاہر، اِن میں زندہ اور متحرک قوموں کے کچھ نمائندے ہوتے ہیں جن کے مجموعی وجود سے اُس ادب یا ثقافت یا تہذیب کی شناخت بنتی ہے۔ مثال میں اِسے یوں کہا جائے کہ اردو زبان کے اساطینِ ادب میں میر، درد، سودا مصحفی، غالب، مومن، حالی، داغ اور اقبال ہیں۔ اب اگر ایک ناقد میر کے لئے کہے کہ اُس کا کلام مہمل ہے، دوسرا غالب کے پُرزے اُڑا دے، تیسرا اپنی تنقید سے حالی کا حال ابتر کر دے، چوتھا داغ کو داغ دے، تو ہمارے ادبی خزانے میں فخر و افتخار کے لئے بچتا کیا ہے؟ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس کے بارے میں جو آفرین کے کلمات کہہ دیے گئے ہیں بس ہم اُنہیں کو دہراتے رہیں، اپنے نئے معیاروں سے کسی کو نہ پرکھیں۔ لیکن اُن کی ''نفی'' کرنا یقیناً اپنے سرمائے کی قدر و قیمت کو گھٹانا ہی ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

آزادئ فکر کی دو بنیادی شرطیں اخلاص اور اعتدال ہیں۔ دونوں کے تناسب میں توازن بھی ضروری ہے۔ سر سید احمد خاں مرحوم کے اخلاص میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا، انہوں نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں کی تباہی اور ذلت و خواری کا اپنے دل و دماغ پر گہرا اثر لیا تھا، پھر اُس کا مداوا بھی سوچا، اُس پر عمل بھی کیا، اپنے اعمال میں وہ کامیاب بھی ہوئے، مگر اخلاص اور اعتدال کے تناسب کا توازن تھوڑا سا بگڑ گیا، انہوں نے مذہب کی نئی تعبیر و تشریح کے میدان میں قدم رکھا تو اپنے افکار کو سوادِ اعظم تک نہ پہنچا سکے اور اُن کی تفسیر قرآن کو مذہبی حلقوں میں زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

اس توازن کا ایک اچھا نمونہ ہمیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کے افکار میں ملتا ہے۔ انہوں نے مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی، سماج کے ہر طبقے کے مسائل اور وسائل پر نظر رکھی، یہی طریقہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جنہوں نے اپنے مکتوبات میں بار بار عیسائیوں اور یہودیوں کو یہ کہہ کر دعوت دی کہ **تَعَالَوا اِلیٰ کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُم** [آؤ اُس بات پر اتفاق کر لیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے]۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پوتے مولانا محمد اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کے اخلاص میں شک نہیں کہ انہوں نے جس مقصد کو عزیز رکھا اُس کی راہ میں اپنی جان بھی قربان کر دی، مگر میں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ انہوں نے اعتدال کے پہلو کو زیادہ لائق التفات نہیں سمجھا، اِس لئے عمومی مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔

یہ چند باتیں اختصار کے ساتھ بطور تمہید اِس لئے عرض کی گئیں کہ اب مجھے انور شیخ کی ایک اور انگریزی کتاب (ETERNITY) کا تذکرہ کرنا ہے۔

۲۳۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۹۰ء میں کارڈف انگلستان سے شائع ہوئی تھی۔ اِس میں چار کتابیں (ابواب) ہیں؛ ہر باب میں متعدد فصلیں ہیں۔

۱۔ کیا ہم صراطِ مستقیم پر ہیں؟
۲۔ سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اسلام)
۳۔ مبدأ و معاد
۴۔ راستہ (یارا و نجات)

(ETERNITY) جس کا میں آگے صرف ''ابدیت'' کے نام سے حوالہ دوں گا، اِس کی تصنیف میں انہوں نے انگریزی زبان کی تقریباً (۱۱۰) ایک سو دس کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اِن میں عربی، فارسی یا اردو، کی کوئی کتاب نہیں، انگریزی کتابوں میں بھی سب عیسائی اور یہودی مصنفوں کی لکھی ہوئی ہیں، کسی مسلم کی کوئی تصنیف کتابیات میں شامل نہیں، اِسی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے عناد رکھنے والے مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر ہی انور شیخ کا وہ نقطۂ نظر بنتا ہے جو ہمیں ''ابدیت'' میں غالب نظر آتا ہے۔

اِسلام اور مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے صرف دس کتابوں پر انحصار کیا ہے، اِن میں سے تین کتابیں خلافت عثمانیہ کے بارے میں ہیں، ایک کتاب (THE BEDUIN) عربوں پر ہے۔ اِسلام پر برنارڈ لیوس کی مرتب کردہ کتاب کی دو جلدیں پیش نظر رہی ہیں، اِسی طرح ''دی کیمبرج ہسٹری آف اسلام'' (۲ جلدیں) اور کارل بروکلمان کی مرتبہ کتاب THE HISTORY OF ISLAMIC PEOPLE اُن کا ماخذ ہے۔ اِسی فہرست میں G. H. JANSEN کی MILITANT ISLAM بھی ہے۔ اسلامی ثقافت کی تاریخ کو انہوں نے R. M. SAVORY کی کتاب ISLAMIC CIVILIZATION سے جانچا پرکھا ہے۔

''ابدیت'' کے موضوعات میں بہت تنوع ہے، اتنے مختلف موضوعات کا احاطہ کرنا انور شیخ کے نہایت وسیع المطالعہ ہونے کی شہادت دے رہا ہے، مگر مطالعے کی وسعت اور گہرائی دو الگ چیزیں ہیں، مطالعہ

نہایت فضول کتابیں پڑھ کر بھی وسیع کیا جا سکتا ہے اور مطالعے میں گہرائی دو چار بنیادی کتابیں پڑھ کر بھی آسکتی ہے۔

انور شیخ کا دماغ فلسفیانہ ہے، وہ کسی بھی بحث کو نئے زاویے سے دیکھ سکتے ہیں، اِس میں وہ دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں، اُن کا اسلوب بیان بھی صاف اور دلنشیں ہے۔ ''ابدیت'' کا مکمل جائزہ لینا تو آسان نہیں۔ اس میں بعض وہ مباحث بھی ہیں جن کی ابجد سے بھی مجھے واقفیت کا دعویٰ نہیں، مگر یہاں اس کتاب کے مشمولات پر گفتگو کے لئے میں نے صرف دو موضوعات کا انتخاب کر لیا ہے۔

دوسرے باب سے : اسلام

چوتھے باب سے : باطنیت (MYSTICISM)

اسلام کو اگر عقیدہ و مذہب کی حیثیت سے پڑھا جائے تو اس کے بنیادی مصادر صرف دو ہیں قرآن اور حدیث۔ باقی جو کچھ ہے وہ سب انہیں کی تشریح، تفسیر، تاویل یا تعبیر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مغربی مصنفوں کی کتابوں سے ہم اسلام کا اصلی اور صحیح خط و خال والا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔

''ابدیت'' کا موضوع کیا ہے؟ اِسے انور شیخ نے کتاب کے آغاز میں یوں واضح کیا ہے:

ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ کیا ہم اپنی منزل مقصود پانے کے لئے صحیح راستے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اگر نہیں، تو مقصد حیات کو پانے کا صحیح راستہ کیا ہے؟

اِس گتھی کو سلجھانے کی اور اپنے مقصود کو پانے کی فطری ترتیب تو یہی ہو سکتی ہے، مگر یہ منطقی ترتیب نہیں۔ کیونکہ لوگ حال سے ماضی پر قیاس کر کے اس کی دلیلیں ڈھونڈنا چاہیں گے، اِس لئے میں نے اِس بحث کا حسب ذیل خاکہ بنایا ہے۔

پہلے باب میں یہ بحث کی گئی ہے کہ ہم اپنے مقصد یعنی ''ابدیت'' کو حاصل کرنے کے لئے صراط مستقیم پر نہیں ہیں۔ جواب قطعیت کے ساتھ نفی میں ہے، اِس لئے کہ کچھ لوگ اپنے ہم جنسوں پر غلبہ اور اقتدار بنائے رکھنے کا طبعی تقاضا رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان موت سے ڈرتا ہے اور جاوداں ہونے کی تمنا رکھتا ہے، یہ وہ سب سے بڑی توقع ہے جس کی وہ توقع کر سکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اسی لئے انسان مظاہر فطرت اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتا آیا ہے۔ اِن دیوی دیوتاؤں کی جگہ خود لینے کے لئے وہ انسان کے خوف یا حصولِ نوازش کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خود کو مسیحا یا پیغمبر کے روپ میں یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ اللہ جو خالق کائنات ہے، اُس نے اِن کی ذات کے وسیلے سے خود کو پیش کیا ہے۔ اِس دعوے میں زور پیدا کرنے کے لئے وہ دوزخ کی دھمکی اور جنت کا لالچ دیتے ہیں تاکہ عوام کی نفسیاتی کمزوری کا فائدہ اٹھائیں جو دیومالائی قصوں نے اُن کے اندر پیدا کر دی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وحی یا الہام وہ سب سے بڑا دھوکہ ہے جو انسان نے آج تک ایجاد کیا ہے اور خالق کائنات کا تصور سب سے زیادہ پُر خطا ہے۔ اگر خالق کے بغیر کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی تو خالق کو کس نے پیدا کیا؟

یہی سبب ہے جس نے الہامی مذاہب کو سب سے بڑا کاروبار بنا دیا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے جی جان سے اس کی حمایت کر کے اپنے مذہبی، مالی اور وراثتی مفادات کو بچانے میں لگے رہتے ہیں۔

دوسرے باب میں سامی مذاہب کا تجزیہ کیا گیا ہے یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ تاکہ باب اوّل کی بحث سے حاصل شدہ نتائج کی تائید ہو سکے۔ اس میں صحائف سماوی کے حوالے دئے ہیں اور کوشش کی ہے کہ کوئی حوالہ غلط نہ ہو اور اسے جان بوجھ کر مسخ نہ کیا جائے۔ توقع یہ ہے کہ اہل ایمان دلائل کی قوت سے اس کا رد کریں گے اور وہ جارحیت اختیار نہ کریں گے جو عموماً حق کو دبانے میں ناکام ہونے پر استعمال کی جاتی ہے۔

[مقدمہ ابدیت]

ہم کہاں سے آئے ہیں اور ہماری منزل مقصود کیا ہے؟ یہ تیسرے باب کا موضوع بحث ہے۔ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ یہ کوئی پہیلی نہیں۔ یہ کائنات یا تو عدم سے وجود میں آئی ہے یا ہمیشہ سے ہے۔ اگر وجوہات کا مصدر عدم ہے تو وجود و عدم دونوں ایک ہی ہوئے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سے ہیں ہمارے ذرّات وجود یہاں اربوں کھربوں سال پہلے سے موجود رہے ہیں اور انہیں ''ہم'' بننے کے لئے اتنا طویل زمانہ لگا ہے، اور جب ہمارے وجود کے عناصر پریشان ہوں گے یعنی ہم مریں گے تو لازمی طور پر ''فنا'' نہیں ہو جائیں گے۔ یہاں مجھے نظریۂ ارتقاء کے ماننے والوں سے اختلاف ہے، اسی طرح مادہ پرستوں، فطرت پرستوں اور دوسرے عقلیت پسندوں سے بھی۔

میں کیوں نہیں مروں گا؟ اس لئے کہ یہاں ہر چیز اپنی کسی نہ کسی ہیئت اور قوۃ میں موجود رہی ہے، موت کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جو کچھ ہوتا ہے وہ موت نہیں، ہیئت کی تبدیلی ہے، عناصر کی ایک پریشانی کسی دوسرے مرکب یا وجود کی ایک نئی صورت کا سبب بن جاتی ہے۔

میں نے کسی ادنیٰ ہیئت سے بحث نہیں کی، اعلیٰ ہیئت کو ذہن میں رکھا ہے کیونکہ یہ کتاب ''ابدیت'' سے متعلق ہے یعنی حیات بعد الموت اس کا موضوع ہے۔ (دیباچہ ''ابدیت'')

اسی دیباچے میں انور شیخ نے آگے لکھا ہے: "شاید میری دلیلیں اتنی ہی قابل لحاظ ہیں جتنی سائنس دانوں کی دلیلیں ہیں، جو یہ مانتے ہیں کہ انسان پیدا ہوتا ہے، کھاتا پیتا ہے اور کچھ زمانے کے بعد خاک کا پیوند ہو جاتا ہے۔ مگر یہ نظریہ شواہد کے خلاف ہے۔ ماہرین طبعیات کی رائے کے برخلاف یہ کائنات ایک مقصد رکھتی ہے، یہ بات اس سے ثابت ہے کہ کائنات ارتقا کی سیڑھی پر برابر اوپر چڑھ رہی ہے۔ اعلیٰ کی طرف یہ صعود اِس بات کی علامت ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہے اور وہ اپنی تکمیل و تجمیل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذرّاتِ وجود میں جو امکانات پوشیدہ ہیں، ارتقاء کا عمل انہیں بروئے کار لانے کا ایک تدریجی طریقہ ہے۔ یہ ذرّاتِ وجود کا جوہر ذاتی ہے۔ باہر سے داخل کی ہوئی صلاحیت نہیں۔

چونکہ ارتقاء کی بلند علامت کا نمائندہ انسان ہے، اسے کائنات کا بچہ سمجھنا چاہئے، اِس لئے کہ کائنات کا عملِ ارتقاء انسان کے وسیلے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ ارتقاء کسی انسان کو روک دیتا ہے۔ لہٰذا اِس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہونی چاہئے جو انسان کی آج کی زندگی سے اعلیٰ تر اور بہتر ہو۔ یہ مفروضہ اس لئے بھی قابل لحاظ ہو جاتا ہے کہ ارتقاء کا مطلب ہے پراگندگی سے نظم و ترتیب کی جانب سفر کرنا، ایک نچلی سطح سے بالاتر سطح کی طرف بڑھنا، نقصان سے کمال کی سمت قدم بڑھانا۔ انسان یقیناً بہت ناقص ہے۔ اس لئے عمل ارتقاء اُس پر آکر رک نہیں سکتا۔ تصور کے مدارج پر غور کیجئے۔ اجزاء ذرات (ATOMS) میں بدلتے ہیں، ذرات ترقی کر کے حیویہ / خلیہ بن جاتے ہیں جو زندگی کی بنیاد ہوتی ہے۔

انسان خلیاتی وجود کا اعلیٰ نمونہ ہے مگر وہ بہت کمزور اور ناقص ہے۔ اس لئے یہ امکان رہتا ہے کہ خلیاتِ وجود میں روح بننے کی قوت ہو جسے "روحانی خلیۂ تامہ" کہہ سکتے ہیں جو مستقبل کی حیات کا تخم ہے۔

میں نے جو دلیلیں دی ہیں وہ شاید سائنسی کہانیوں کی دلیلوں سے زیادہ مستحکم ہیں جن میں موت کو انسان کا خاتمہ کہا جاتا ہے۔ یہاں مجھے علمائے دین سے سخت اختلاف ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہر انسان ایک روح لے کر پیدا ہوتا ہے جو پھر جنت یا جہنم میں چلی جاتی ہے۔ اس کے بر خلاف روح مستقبل کی زندگی کا تخم ہے اور وہ موت کے بعد پنپتا ہے۔ بہر حال اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ موت کے بعد روح پھر وجود میں آئے گی۔ یہ سب کسی کے اعمال کی اچھائی پر منحصر ہے۔ ایک ملحد کی روح کے ترقی کرنے کا بھی اتنا ہی امکان ہے جتنا کسی اور شخص کا، اِس میں کسی کے فضل و کرم یا مداخلت کا کچھ دخل نہیں۔

ایک روح کی پیدائش "ابدیت" کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس میں دوسری روحوں سے اتحاد اور مکمل ہم آہنگی کے ساتھ زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ روحوں کا اتحاد اسی طرح اُلوہیت پیدا کرتا ہے جیسے ذرات سے غیر عضوی اجسام پیدا ہوتے ہیں یا خلیات باہم مل کر جاندار بن جاتے ہیں۔

یہاں تک میں نے انور شیخ کے مزعومات و مفروضات کا آزاد ترجمہ اُن کے پیش لفظ سے پیش کیا ہے، مگر اس پر گفتگو کرنے سے پہلے اِس دیباچے کی آخری چند سطروں کا ترجمہ اَور کر دوں:

"انسان خدا ہے اور خدا انسان ہے۔ اُس کی اُلوہیت کی قوۃ کو ترقی دینے کا راز ایک صالح معاشرہ بنانے میں ہے، وہ خود اپنا مسیحا ہے، کسی کے فضل و کرم یا مداخلت کا تصور اِس حقیقت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ انسان کی اُلوہی قوۃ اُسے سب سے زیادہ اہم ہستی بناتی ہے، پھر بھی وہ خوف زدہ ہے۔ کیوں؟ اِس لئے کہ مسیحاؤں اور پیغمبروں نے اُسے غیر اہم ہونے کا احساس دلا دیا ہے جو خود اپنی اہمیت کو مبالغے کے ساتھ جتاتے ہیں، بنی نوع انسان پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اپنی عظمت اور تقدس کا دعویٰ کرتے ہیں، اِس طرح وہ ایک شیر کو بکری بنا دیتے ہیں، وہ بکری کی طرح ہی سوچنے اور عمل کرنے لگتا ہے اور خوف و حقارت کی بکری جیسی علامتیں ہی اُس سے ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

"انسانی عظمت کی تحقیر کے لئے وحی کا تصور ایک ستم ظریفی ہے۔ انسان اُس وقت تک خوف زدہ رہے گا جب تک وہ اپنی اُلوہی عظمت کا احساس نہیں کرتا"۔

یہاں تک "ابدیت" کے دیباچے کا سرسری ترجمہ ختم ہوا۔ اِس میں کتاب کے مرکزی خیال کا خلاصہ آگیا ہے اب میں اختصار کے ساتھ اِس کے بعض نکات پر گفتگو کروں گا۔

انور شیخ نے یہ فلسفیانہ سوال اٹھایا ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے۔ یہ کوئی نیا معمّا نہیں، سارا عالم انسانیت ہزاروں برس سے اِن سوالوں میں الجھا ہوا ہے اور "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ہر ایک نے اپنی دانست کے مطابق اِس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر بقول اکبر الہ آبادی

برسوں فلاسفہ کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

قرآن کریم میں اِسلام کے اصول و عقائد کو جس انداز و اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اُس پر غور کرتے ہوئے یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اُس کے مخاطب ہر طبقے، ہر علاقے اور ہر سطحِ ادراک کے لوگ ہیں، اِس لئے کہیں وضاحت ہے۔ کہیں اشارت ہے، کہیں تشبیہ و استعارہ ہے، کہیں ایجاز ہے، کہیں اطناب ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ''علم کا مصدر اور سر چشمہ کیا ہے؟'' پہلے اِس کا جواب سوچا جائے۔ حواس سے حاصل ہونے والا علم حتمی اور معتبر نہیں ہو سکتا، اِس لئے کہ خود حواس، محدود ہیں اور خلل پذیر ہیں۔ ایک دماغ بہت گہرائی تک جاکر سوچ سکتا ہے، دوسرا دماغ مختل ہو جاتا ہے تو اُس کی روزمرّہ کی معمولی باتیں بھی قابلِ اعتبار نہیں رہتیں۔ مشاہدے کا بھی کوئی بھروسا نہیں، آنکھ صرف سامنے کا منظر دیکھ سکتی ہے۔ دیوار کے پیچھے کیا ہو رہا ہے اِس سے بے خبر ہے۔ کان ایک خاص فاصلے تک سن سکتے ہیں، فاصلہ بڑھ جائے تو وہ ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اِسلام میں علم کے معنی ہیں ''حقیقتِ اشیاء سے باخبر ہونا'' اِنسان کے لئے کلّی طور پر یہ ممکن نہیں۔ انسان کے علم کے بارے میں قرآن نے صاف لفظوں میں کہا ہے:

وما اُوتیتم من العلمِ الاّ قلیلاً (ہم نے تمہیں صرف تھوڑا سا علم دیا ہے) [الاسراء : ۸۵]

انسان کو سائنس کے اکتشافات پر بہت ناز ہے، مگر اُس نے صرف اتنی سی حقیقت کہ گھاس کا رنگ ہرا کیوں ہوتا ہے برسوں تک رسرچ کر کے معلوم کی ہے اور اس کا بھی احتمال باقی ہے کہ تھیوری آگے چل کر بدل جائے۔ اِس کائنات میں وجود کے دو پہلو ہیں، ایک وہ جنھیں ہم دیکھ رہے ہیں انھیں ''مظاہر'' کہہ لیں، دوسرا پہلو اسرار اور غیب کا ہے۔ مظاہر میں بھی اسرار پوشیدہ ہیں جنھیں سائنس بحث و تحقیق کر کے دریافت کرنے میں لگی ہوئی ہے، مگر ایک پردہ اٹھتا ہے تو ستر پردے اور نظر آنے لگتے ہیں، مگر غیب میں کوئی پہلو اظہار کا نہیں رکھا گیا، اُس کا علم صرف خدا کو ہے، یہاں فلسفی، سائنس داں، پیر، پیغمبر سب عاجز ہیں۔

لہٰذا، اسلام کی رو سے علم کا صحیح اور معتبر مصدر وحیٔ الٰہی ہے۔ وحی کے معنی مفسّرین نے رمز و اشارہ بتائے ہیں جیسے ٹریفک کنٹرول کے لئے سبز، زرد اور سرخ روشنی سے اشارے دیے جاتے ہیں۔ وحی کے معنی کسی بات کا دل پر القاء ہونا یا کسی کے دل میں ڈالنا بھی ہیں، یہ شیطانی عمل بھی ہو سکتا ہے۔ **و اِنّ الشیاطین لیوُحونَ اِلی اُولیاءِ ھم** (شیطان اپنے ساتھیوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں) [۶/۱۲۲]

شریعت کی اصطلاح میں وحی وہ کلمات ہیں جو انبیاء پر القاء کیے جاتے ہیں۔

وما کانَ بشرٍ اَنْ یُکلّمَہُ اللہ اِلاّ وَحیاً اَو مِنْ وَرَاءِ حجاب اَو یُرسِل رسولاً فیُوحِیَ باِذنہٖ ما یَشاءُ [کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اللہ سے باتیں کر سکے، ہاں مگر وحی کے ذریعے سے یا پردے کے پیچھے سے ممکن ہے، یا اللہ اپنا قاصد بھیج دے اور وہ خدا کے حکم سے وحی پہنچا دے۔] [۴۱/۵۱]

اِس مختصر بحث سے دو باتیں واضح ہو گئیں (الف) بشری ذرائع کتنے بھی وسیع ہوں، وہ علم کا کلّی احاطہ نہیں کر سکتے، اُن سے حاصل ہونے والے نتائج حتمی طور پر معتبر نہیں ہو سکتے (ب) اِس لئے علم کا صحیح مصدر وحیٔ الٰہی (اشارۂ غیبی) ہی ہو سکتا ہے۔

انور شیخ نے کتاب ''ابدیت'' میں نظریۂ ارتقاء پیش کیا ہے۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں، اِنسان کی تاریخ ہی بتا رہی ہے کہ وہ مادّی طور پر برابر آگے قدم بڑھا رہا ہے، اُس کی کوششوں سے یہ کائنات بھی سنور رہی ہے۔ مگر ''حقیقتِ اشیاء'' کا اگر علم ہو تو انسان کی یہ صلاحیت بھی کسی اعلیٰ قوت کی دین ہی سمجھی جائے گی۔ اقبال نے کہا تھا:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

انور شیخ نے ارتقاء کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ علماء و حکمائے اسلام کا سیکڑوں برس پہلے پیش کیا ہوا تصور ہے۔ آج ہمارے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی بقائے اصلح کے نظریے کا سہرا ڈاروِن کے سر پر باندھ دیتے ہیں حالانکہ ڈاروِن نے یہ نظریہ علمائے اسلام سے اخذ کر کے اُسے اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ ڈاروِن تو اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے ہوا ہے، اُس سے پانچ سو برس پہلے یہ نظریۂ ارتقاء ہمیں ابن مسکویہ کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ مورخ الیعقوبی کہتا ہے:

''اِنَّ النّاسَ جزءٌ من الحیوان و اِنّ
انسان بھی جانداروں کا ایک حصہ ہیں، اور جاندار (حیوان)
الحیوانَ جزءٌ من النّامی و اَنّ النّامی
نمو پانے والی چیزوں کا حصہ ہیں، اور نمو پانے والی اشیاء
جزء من الطبائع الاَربع التی ھی النّار
عناصر اربعہ کا حصہ ہیں جو آگ، ہوا، مٹی اور پانی ہے۔
والھوَاء والأرض والمآء، واَنّ النّامی
یَنقَسِمْ علی ثلاثۃ اَقسام :اَحدُھا
نبات (پیڑ پودے) ہیں جن میں صرف نمو کی صلاحیت ہے، دوسرے
النبات و لہ النمو فقط، والثانی
سمندر میں سیپی اور اسی قبیل کی چیزیں ہیں جن میں نمو کے ساتھ

مایکون فی البحر من الأصداف وما

حس بھی ہے۔ تیسرے خشکی کے جاندار ہیں اِن میں نمواور حس

أشبهُهاو له نمو و حِس، والثالث

کے ساتھ حرکت بھی ہے۔

الحیوان البرّی وله نمو و حسّ و حرکة"

مسلمان فلاسفہ کا نظریہ یہ ہے کہ پہلا وجود جمادات کا ہے جو بڑھتے نہیں، حس نہیں رکھتے، حرکت نہیں کر سکتے۔ دوسرا درجہ نباتات کا ہے، اِن میں نمو پذیری ہے، بڑھتے ہیں اور اِن سے دوسرے نباتات بھی پیدا ہوتے ہیں اِس لئے یہ غذا بھی لیتے ہیں، مگر زمین سے بندھے ہوئے ہیں، حرکت نہیں کر سکتے، تیسرا درجہ حشرات الأرض وغیرہ کا ہے، جو اِن میں سے بعض خصوصیات رکھتے ہیں، اور ان میں حسبِ ضرورت کوئی حس بھی ہوتی ہے، چوتھے درجے میں حیوان ہیں، اِن کی سب سے ترقی یافتہ شکل گھوڑا ہے۔ حیوانوں میں سب خصوصیات ہیں عقل نہیں، اِن سے اوپر اٹھ کر انسان ہے جسے عقل وشعور بھی دیا گیا ہے، اختیار تمیزی بھی۔ وہ خیر وشر میں امتیاز کر سکتا ہے۔ اب تک جو ارتقاء ہوا وہ مادی اور جسمانی تھا، عقل و شعور کی بدولت انسان موجودہ حالت سے ترقی کرے گا تو اب وہ روحانی ترقی ہو گی۔ روحانی جلا اُسے فرشتوں کے درجے تک پہنچا سکتی ہے، فرشتے روح محض ہیں، وہاں سے بھی اگر آگے بڑھ سکے تو وہ "ذاتِ احدیت" میں فنا ہو جائے گا جیسے قطرہ سمندر میں گم ہو جاتا ہے، انسان میں اگر اُلوہیت ہے تو وہ اُس کے ارتقاء کی آخری منزل ہے اور اس دنیا کی زندگی میں اُس کا حاصل ہونا محال ہے۔

انور شیخ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کسی میکانکی عمل سے الوہیت کو پا سکتا ہے، یہ درست نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان مرتا نہیں، موت سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بھی کوئی نیا فلسفہ نہیں۔ میر کہتا ہے

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہندو فلسفے میں آواگون، یونی چکر کا تصور سیکڑوں سال پرانا ہے جسے اسلامی اصطلاح میں تناسخ کہتے ہیں، یعنی ایک قالب منسوخ ہو کر دوسرا مل جاتا ہے، اِسی کو "تجدّدِ امثال" کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ تناسخ کے بعض مسلم علماء بھی قائل رہے ہیں یا کم از کم انکار نہیں کرتے۔ لیکن یہ صرف عقیدہ ہو سکتا ہے، اس کی عقلی دلیل کوئی بھی نہیں۔ یہی معاملہ "ابدیت" کا ہے، میں اگر موجودہ زندگی کے بعد بھی رہونگا، خواہ اعلیٰ درجے میں رہوں یا ادنیٰ حالت میں، اگر مجھے اُس کا علم اور احساس نہیں، اور یہ نہیں جانتا کہ پہلے کس قالب میں آیا تھا، یا اس کے بعد کہاں ظہور کرونگا تو ایسی "ابدیت" کس کام کی؟

انور شیخ کہتے ہیں کہ "ایک روح کی پیدائش ابدیت کا نقطۂ آغاز ہے "جب روح "پیدا" ہوئی تو وہ حادث ہوئی اور یہ فلاسفہ کا مسلّمہ عقیدہ ہے ہر حادث فانی ہے، جو عدم سے وجود میں آیا ہے وہ وجود سے عدم میں جائے گا۔

قرآن نے آفرینش کائنات اور تخلیقِ آدم کا نظریہ بالکل واضح الفاظ میں پیش کیا ہے، وہ یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق بہترین نقشے پر ہوئی ہے **(لقد خلقنا الا انسانَ فی أحسنِ تقویم)**

مکمل انسان، باشعور انسان کا تصور آدم سے شروع ہوتا ہے۔ جس طرح چھوٹے سے بچے کو ہر وقت نگرانی اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، اُسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا جاتا ہے اور یہ دھیان رکھا جاتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز منہ میں نہ رکھ لے جو نقصان دینے والی ہو یا جسے وہ ہضم نہ کر سکتا ہو، اِسی طرح انسانیت کو بھی اُس کی معاشرتی زندگی کے ابتدائی دور میں نگرانی ور ہنمائی کی ضرورت رہی اور اس کے لئے ہر قوم میں اور ہر زمانے میں ہدایت دینے والے آتے رہے **(لکلّ قومٍ هادٍ)** اور اسی مصلحت سے آسمانی صحائف نازل ہوئے۔ انبیاء اور رسولوں کی بعثت ہوئی۔ بچہ جب جوان ہو جاتا ہے تو اب اُسے انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں رہتی، اِس لئے تکمیلِ دین کے بعد بابِ نبوت بند کر دیا گیا **(الیوم اکملتُ لکم دینکم و رضیتُ لکم الا سلامَ دیناً)** اب جو غلطی وہ کرے گا، جو ٹھوکر وہ کھائے گا اُس کا خود ذمہ دار ہو گا۔

انور شیخ کہتے ہیں کہ انبیاء اور پیغمبروں نے اپنا غلبہ واقتدار بنائے رکھنے کیلئے انسان میں خوف وہراس پیدا کر کے اُسے بزدل اور کمزور بنادیا۔ یہ بھی حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ جتنی جنگیں مذہب کے سہارے لڑی گئی ہیں، جتنے بھی جہاد ہوئے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں، جہاد کی قوت ہی تھی جس نے ہمارے زمانے میں روس کی فوجوں کو افغانستان سے نکال دیا، وہ مذہبی قوت ہی تھی جس نے ایران کی شہنشاہی کے تابوت میں کیل ٹھونک دی، وہ مذہبی جذبہ ہی ہے جس نے دنیا کی دوسری بڑی طاقت رُوس کے حصے بخرے کر دیے، اور ایسی کتنی ہی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ کیا وہ "بکریاں" تھیں جنہوں نے طلوع اسلام کے بعد ۲۴ سال کی مختصر مدت میں تین براعظموں میں نفوذ کر کے بیس لاکھ مربع میل زمین فتح کر لی تھی؟ غلط اور غیر معتدل استعمال کا تو یہ ہے کہ اگر کوئی آبِ حیات بھی زیادہ مقدار میں پی لے تو مر جائے گا ورنہ انسان کو سب سے بڑی قوت، حمایت اور جرأت مذہب سے ہی ملی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ پیغمبروں نے وحی کے نام پر ستم ظریفی کی اور دوزخ

کا خوف دلا کر انسان کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھا۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ جن پیغمبروں کا کچھ حال ہمیں معلوم ہے (جو تفصیلات قصص الانبیاء میں آتی ہیں وہ یہودی ربّیوں کی اختراع ہیں) اُن میں صرف حضرت سلیمان، حضرت داؤد اور حضرت یوسف علیہم السلام کا حکومت سے تعلق ہے، باقی انبیاء معمولی انسانوں کی سی زندگی گذار کر گئے ہیں اور بعض تو خود اپنی قوم کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار ہوئے ہیں۔ اِن میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے اپنے غلبہ و اقتدار کی خواہش کی ہو۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس برس تک سخت جدوجہد کر کے مکہ فتح کیا اور مدینہ میں اسلامی حکومت قائم کی، مگر اپنے لئے امارت و ریاست کا منصب پسند نہیں فرمایا۔

"ابدیت" کا آٹھواں باب "اسلام" ہے۔ اس میں انور شیخ نے جو گُل افشانی فرمائی ہے اس کا جستہ جستہ خلاصہ پیش کرتا ہوں، تاکہ تبصرہ کرنے میں سہولت ہو۔ یہ ملحوظ رہے کہ گفتگو صرف چند باتوں پر اور نہایت اختصار سے ہی ممکن ہے۔

"انسان کے خوف اور حصولِ عنایت کی نفسیات کا (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کبھی کسی نے استحصال نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ موت انسان کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ہے اور جاوداں ہونا اُس کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ انہوں نے فنا و بقا کے دو متضاد تصورات کو ایسی مہارت سے پیش کیا جس سے آگے آج تک کوئی نہیں جا سکا۔ جیسے ایک مریض کی جو درد سے تڑپ رہا ہو، ڈاکٹر کو دیکھ کر، یہ سوچے بغیر کہ وہ اُس کے درد کا مداوا کر سکتا ہے یا نہیں، ڈھارس بندھ جاتی ہے اسی طرح وہ شخص بنی نوع انسان کی عقل سلب کر لیتا ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ اُس کے پاس کوئی فوق الفطری قوت ہے جو انسانیت کے تمام دکھوں کو دور کر سکتی ہے۔

"ہر پیغمبر کی مخالفت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی آزادی سلب کر کے اسے نئے قوانین سے باندھنا چاہتا ہے۔ پیغمبر اپنے معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ سب من جانب اللہ ہے، میرا خود ساختہ قانون نہیں۔ لوگ عقلی بنیاد پر اُس کا دعویٰ تسلیم نہیں کرتے کیونکہ وہ اس پر بھی اصرار کرتا ہے کہ صرف خدا پر ایمان لانا کافی نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی رسالت پر ایمان نہ لایا جائے، ورنہ دوزخ کی لپٹوں سے بچنا ممکن نہ ہوگا"۔

انور شیخ نے سورۃ القصص کی آیت ۴۹-۵۰ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ پر بھی فوقیت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ اس آیت کی رو سے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی نہ کریں وہ گنہ گار ہیں، اللہ انہیں ہدایت دے گا حالانکہ گنہگار ہی ہدایت کے زیادہ حاجت مند ہیں" [ص ۷۰]

قرآن کریم کا یہ پہلا حوالہ ہے جو "ابدیت" میں آیا ہے، اسی کو دیکھ کر انور شیخ کے مبلغ علم کا اندازہ ہو جاتا ہے، کسی کتاب کا صرف پڑھ لینا ہی کافی نہیں اُسے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے بلکہ سمجھنا ہی زیادہ ضروری ہے۔ سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہو رہا ہے اور "منھما" تثنیہ کی ضمیر ہے جس کا اشارہ توریت و زبور کی طرف ہے۔ آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا ظالم وہ ہیں جن کے سامنے حق کھول کر رکھ دیا جائے مگر وہ اپنی بات کی پچ کرتے رہیں، اُن کے دلوں پر اللہ مہر لگا دیتا ہے، پھر وہ نور ہدایت سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

انور شیخ نے عذاب و ثواب کے اسلامی تصور اور جنت و جہنم کے نظریے کو بھی ہدفِ اعتراض بنایا ہے۔ اسلام نے آخرت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ انسانی اعمال کے احتساب کے لئے ہے، اِس کے باوجود دیکھ لیں کہ دنیا میں کتنی بدکاری، بدمعاملگی، ظلم، ناانصافی اور دھاندلی ہو رہی ہے۔ اگر آخرت کی زندگی اور اعمال کی جوابدہی پر ایمان مضبوط ہو تو اس میں بہت کچھ تخفیف ہو سکتی ہے اور اسی نظریے نے اسلامی دنیا میں اولیاء اللہ، عباد صالحین، ابرار و زہاد ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پیدا کئے ہیں جن کی پاکیزہ زندگی نے دوسرے لاکھوں انسانوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ عذاب و ثواب کا تصور ہر بڑے مذہب میں موجود ہے، کہیں یہ ناقص ہے، کہیں مبہم ہے، اسلام نے سب سے زیادہ واضح اور مکمل تصور پیش کیا ہے۔ جب دنیا کا قانون کسی جرم کی سزا دیتا ہے تو اِس پر کیوں اعتراض ہو کہ اسلام نے گناہ کے لئے عذاب کا خوف دلایا ہے۔ ہمارا زندگی کا نظام بھی اسی تبشیر و تنذیر (عذاب و ثواب) کے اصول پر قائم ہے، کوئی بہت بڑا، مفید کارنامہ انجام دیتا ہے تو اُسے انعام دیا جاتا ہے، بعض انعام ایسے ہیں جنہیں حاصل کرنے کی تمنا میں لوگ زندگی بھر ہاتھ پیر مارتے رہتے ہیں، بعض انعاموں کی بھیک تک مانگ لیتے ہیں۔ جب سماجی نظام بھی اسی جزا و سزا کے اصول پر قائم ہے تو مذہب پر کیوں اعتراض کیا جائے۔ یا پھر یہ ہو کہ خوف اور لالچ کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے جزا و سزا کا تصور سماجی نظام سے بھی بالکل خارج کر دیا جائے۔

جن اسلام دشمن عناصر کی شہ پر، یا انہیں خوش کرنے کیلئے انور شیخ نے یہ کتاب لکھی ہے اگر وہ انہیں کوئی بڑا انعام دینے کا اعلان کریں تو کیا انور شیخ اُسے قبول نہیں کریں گے؟

اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر اُن کی تحریروں کے بارے میں منصفانہ رائے یہ ہو کہ ان سے کسی قوم یا مذہب یا کسی بزرگ ہستی کی توہین ہوتی ہے اور یہ آزار دینے کی سوچی سمجھی کوشش ہے تو اس کے لئے جو

احتجاج کیا جائے، یا بشرط قدرت سزا دی جائے، اُسے بھی خلافِ انصاف نہیں سمجھا جائے گا۔

مذہب ایک عالمی انسانی ضرورتّ اور ایک حقیقت ہے۔ اس کا مطلب ہے راستہ۔ سماج کے سدھار کیلئے ایسے اصول ضروری ہیں جن کا سب اتباع کریں اور اِس طرح سماج میں ضبط و نظم پیدا ہو۔ انور شیخ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ بھی ایک مذہب ہے، اِسے ''مذہبِ انکار والحاد'' یا مذہبِ تشکیک یا مذہب تنقیص کہا جائے گا مگر انہیں اِکاّ دکاّ ہی ماننے والے ملیں گے۔

یہ بالکل فطری بات ہے کہ جو شخص جس مذہب کا پیروہو اُسے اچھا اور برتر سمجھے۔ اگر ایسا نہ سمجھے تو اُس مذہب سے جڑے رہنا حماقت ہے۔ انسانیت اور شرافت، اخلاق اور تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم عقیدہ نہ رکھتے ہوئے بھی اُن اشخاص یا اشیا کو بزرگ اور مقدس کہیں، جنہیں بنی نوع انسان کی ایک قابل لحاظ تعداد بزرگ اور مقدس مانتی ہو۔ کسی کے عقیدے کی توہین و تضحیک، تنقیص وتردید کوئی ایسا عمل نہیں جس پر فخر کیا جاسکے۔ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں، اُسے وجود میں آئے ڈیڑھ ہزار سال ہو چکے ہیں۔ اس مدّت میں اربوں انسان، اس مذہب پر زندہ رہ کر اور بعض بڑے بڑے کارنامے انجام دے کر گذر گئے۔ آج دنیا کی آبادی چھ ارب ہے اور اس میں ایک ارب سے زیادہ مسلمان ہیں، دنیا کی کوئی منطق یہ ثابت نہیں کرسکتی کہ انور شیخ کی ذہنی و فکری صلاحیت ایک ارب انسانوں سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ اگر وہ اسلام کو اپنے ذہنی و فکری سانچے میں ڈھال نہیں سکے تو قرآن کہتا ہے۔ **لکم دینکم ولیْ دین.** اور **لاء اکرا ہ فی ا لدین.** وہ جس مذہب کو اپنے مزاج کے مطابق پائیں اُس میں داخل ہو جائیں۔

سب سے آسان مشغلہ اعتراض کرنا ہے۔ اس میں ہلدی پھٹکری کچھ نہیں لگتی اور بزعم خود رنگ چوکھا آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مصوّر نے کوئی تصویر بنائی اور اُسے یہ محسوس ہوا کہ یہ اسکا شاہکار ہے اُس نے چاہا کہ اسے بہتر سے بہترین بنانے کیلئے لوگوں کی تجاویز کا استقبال کرے، اُس نے اپنا وہ شاہکار کسی عوامی جگہ پر نصب کردیا اور نیچے لکھ دیا: ''اِس تصویر میں کوئی کمی ہو تو اُس کی نشاندہی کردی جائے''۔

کچھ دنوں کے بعد اُس نے جاکر دیکھا تو ساری تصویر پٹی پڑی تھی، کسی نے کہیں نشان لگا رکھا تھا، کسی نے کہیں چڑیا بنا رکھی تھی۔ مصوّر کو اپنے شاہکار کا یہ انجام دیکھ کر نہایت رنج ہوا، اس نے اپنے کسی دانشمند دوست سے اپنے ذہنی کرب کا اظہار کیا تو اُس نے کہا: ''اس میں غلطی دراصل تمہاری ہے۔ تمہیں یہ لکھنا چاہئے تھا کہ ''اس میں جو نقص ہو وہ ٹھیک کردیا جائے''۔ اب تم دوبارہ وہی تصویر بناؤ، اور یہ عبارت لکھ کر اُسی جگہ اسے لگاؤ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ مصوّر نے ایسا ہی کیا، اور یہ دیکھا کہ ایک طویل مدّت تک وہ تصویر وہاں آویزاں رہی اور کسی نے اُس پر ایک نقطہ بھی نہیں لگایا تھا۔

اسلام کے معاندین ہر دور میں رہے ہیں۔ پہلا سابقہ مشرکین عرب سے تھا جن کے ہر قبیلے کا ایک بُت خانہ کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔ دوسرا سابقہ یہودیوں سے ہوا جنہوں نے مدینہ اور اطراف مدینہ کی اقتصادیات پر قبضہ جمار کھا تھا، تیسرا سابقہ عیسائیوں سے ہوا جن کی دولت عظمیٰ کو مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ مشرکین عرب کا تو صفایا ہوگیا، لیکن یہ دونوں حریف آج تک سر گرم عناد ہیں۔ صلیبی جنگوں میں ہزیمت کے بعد اِنہوں نے یہ طے کیا کہ جنگ تلوار کی بجائے قلم سے کی جائے اور اسلام کی مسخ کی ہوئی تصویر مغرب کے سامنے پیش کرنے لگے۔ قرآن کی من مانی تفسیر کی، سیرۃ طیبہؐ پر اعتراضات وارد کیئے، کبھی تعدّدِ ازواج کا مسئلہ اٹھایا (حالانکہ خود بائبل میں کئی پیغمبروں کی متعدد بیویاں ہونے کا ذکر موجود ہے) کبھی اسلام میں غلامی کے ادارے پر انگلی اٹھائی، حالانکہ غلامی کا تذکرہ خود اُن کے صحائف میں موجود ہے مگر ''فک رقبہ'' (آزاد کرنے) کا کوئی حوالہ نہیں، کبھی اسلام کو محمڈن ازم اور تصوف کو MYSTICISM کہا، حالانکہ کسی دور میں بھی اسلام کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایجاد کردہ مذہب کے طور پر پیش نہیں کیا گیا، رسول اللہ کو امت مسلمہ نے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **عبدهٗ و رسولهٗ** کہا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور اُس کے پیغام رساں ہیں۔

اب ایک تازہ چال یہ ہے کہ خود (برائے نام) مسلمانوں میں سے ایک دو کو چن کر اُن سے ہی اسلام کی توہین و تضحیک کا کام لیا جائے، ایسا کرنے پر اُن کی ہمت افزائی ہو، انہیں شہرت ملے اور آمدنی بڑھے۔ انہیں تحفظ فراہم کیا جائے۔ سلمان رشدی اسی کی ایک مثال ہے جس کی کتاب ایک مجذوب یا پاگل کی بڑ سے زیادہ نہیں، مگر معاندین اسلام اُس کے تحفظ پر کروڑوں روپے خرچ کرچکے ہیں اور اتنی ہی بے دریغ آمدنی رائلٹی سے ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ ''آزادیِ اظہار'' کے نام پر کیا جاتا ہے۔

آزادیِ اظہار کے بارے میں شروع میں ہی عرض کرچکا ہوں کہ ایک اہل قلم اور مفکر کا سب سے بڑا سرمایہ یہی ہے، اِس کی ضرور وکالت کرنی چاہئے مگر آزادی کی بھی کچھ حد ہوتی ہیں۔ دل آزاری اور توہین و تضحیک کو آزادیٔ اظہار نہیں کہا جاسکتا۔

یہاں، کچھ حلقوں میں یہ بھی آواز اٹھ رہی ہے کہ انور شیخ کی کتاب کو اُسی طرح ممنوع قرار دیا جائے جیسے سلمان رُشدی کی کتاب پر پابندی لگائی

گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مطالبہ انور شیخ کے حق میں جائے گا۔ جو کبھی کتاب نہیں پڑھتے وہ بھی اسے پڑھنے کے مشتاق ہو جائیں گے، اِس سے انور شیخ کی شہرت بھی بڑھے گی اور دولت بھی۔ تسلیمہ نسرین بنگلہ زبان کی ایک تھرڈ ریٹ رائٹر تھی، اُس کی کتاب پر دھند مچا کر ہم نے اُسے بین الاقوامی شہرت کی قلمکار بنا دیا اور مغربی ممالک اُسے پناہ دینے کی پیش کش کرنے لگے۔ ایسی کتابوں کے ساتھ صرف تین طرح کا سلوک ہو سکتا ہے۔

۱۔ اگر وہ فتورِ عقل یا خراب نیت سے نہیں لکھی گئی ہیں، اُن میں عقلی و نقلی دلیلوں کو متانت اور ربط و ضبط کے ساتھ منطقی انداز میں پیش کیا گیا ہے، تو اُنہیں انگیز کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ یہ ایک انفرادی رائے ہے اور غلط ہے۔

۲۔ یا ایسی کتاب کی تردید مضبوط منطقی دلائل کے ساتھ کی جائے اور اس کی کمزوریوں کو متانت اور شائستگی کے ساتھ ظاہر کیا جائے تاکہ اہلِ نظر خود فیصلہ کر لیں کہ اُس کی دلیلیں کتنی بودی ہیں، جیسا سر سید احمد خاں نے ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کی تردید لکھ کر کیا تھا۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اُسے قطعی طور پر نظر انداز کیا جائے اور کوئی اہمیت ہی نہ دی جائے۔ بعض لوگوں کا رویہ یہی ہوتا ہے کہ "بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!"۔ انور شیخ کی کتاب "ابدیت" پر اِن تین صورتوں میں سے کسی ایک شکل میں ردِّ عمل ہو سکتا ہے مگر تیسری شکل زیادہ مناسب ہے۔

انہوں نے ایسے سوال اٹھائے ہیں کہ اُن میں سے ہر سوال کے جواب میں ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے اور پچھلے ہزار بارہ سو سال میں مسلمان علماء نے ان سب سوالوں پر لکھا بھی ہے، مگر انور شیخ تو اسلام کو بھی یہودی اور عیسائی اور دہری ماخذ کی مدد سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ کاش انہوں نے اپنے مذہبی اور ثقافتی سرمائے کا مطالعہ کیا ہوتا تو ان میں سے بہت سے شبہات پیدا ہی نہ ہوتے اور اُن کا قلم کسی بہتر تعمیری مقصد میں استعمال ہوتا۔

میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا کہ کتاب "ابدیت" کے دو موضوعات تک اپنی گفتگو محدود رکھوں گا۔ دشواری یہ ہے کہ میرے پاس وقت بہت ہی تنگ ہے، مباحث طویل ہیں اور اُن پر گفتگو تفصیل سے کی جائے تو ایک اَور کتاب وجود میں آ جائے گی۔ اسلام سے متعلق انور شیخ کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کا جائزہ لے کر یہ تو اندازہ ہو گیا کہ ان میں کوئی ایک اعتراض بھی نیا نہیں، سب وہ ہیں جو مخالفوں کی طرف سے پچھلے ہزار بارہ سو برسوں میں ہو چکے ہیں اور ان میں سے ہر موضوع پر اسلام اور متکلمین کی تحریریں موجود ہیں جنہیں انور شیخ نے لائقِ اعتناء نہیں سمجھا یا اُن میں سے بیشتر عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے ان کی دسترس سے باہر ہیں۔

"ابدیت" کی ۲۳ویں فصل تصوف سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان انہوں نے (MYSTICISM) رکھا ہے۔ یہ عنوان ہی غلط ہے۔ تصوف "سِرّیت" یا باطنیت ہرگز نہیں۔ باطنی تحریکیں قطعاً مختلف ہیں۔ تصوف کیا ہے اس کو جاننے کے لئے قوت القلوب، عوارف المعارف، مرصاد العباد، جیسی کتابوں پر بھروسا کرنا چاہئے یا جو ملفوظاتِ صوفیہ کے مستند مجموعے ہیں اُن کو پڑھنا چاہئے۔

انور شیخ کہتے ہیں کہ تصوف کا مقصد روح کا ذاتِ احدیت میں ضم کر دینا ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب روح اور ذاتِ احدیت کا جوہر ایک ہی ہو۔ روح اگر فانی ہے تو وہ باقی میں ضم نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ اُلوہیت خود اتحادِ ارواح کا نام ہے اور وہی ابدیت ہے۔ جیسے خلیات کے ملنے سے جسم وجود میں آتا ہے اسی طرح ارواح کے ملنے سے اُلوہیت پیدا ہوتی ہے۔ دشواری یہ ہے کہ جو کیفیت "پیدا" ہوتی ہے اُس پر "ابدیت" کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے؟ ابدیت کے ساتھ ازلیت بھی لازم ہے۔ اگر ارواح میں ابدیت ہے تو ازلیت بھی ہے، پھر فنا اور بقا کی اصطلاحیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اگر اُلوہیت مجموعہ ارواح ہے تو وہ "ناقص" ہوئی اِس لئے کہ جو روح اُس میں ضم ہوتی ہے وہ اُس کی تکمیل کرتی رہتی ہے۔ اگر روح کو اُسی اُلوہیت کا ایک حصہ یا جزو سمجھا جائے تب بھی اُلوہیت ناقص ہوگی کہ ایک ٹکڑا اُس سے جدا ہو گیا، پھر اُس میں آ کر مل گیا۔ یہ تو بچوں کا کھیل سا ہو گیا۔

روح کیا ہے؟ اس کے بارے میں فلاسفہ نے بہت کچھ مغز پاشی اور دیدہ ریزی کی ہے مگر اطمینان بخش جواب کوئی بھی نہ دے سکا۔ بعض مذاہب تو وجود میں ہی اس لئے آئے ہیں کہ وہ روح کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔ ایک گروہ نے اُسے فانی کہا تو دوسرے نے مادہ اور روح دونوں کو ازلی اور غیر فانی سمجھ لیا۔ کسی نے جسم کو ایذا پہنچا کر روح کی صفائی اور اُس کی حقیقت سے شناسائی کا نسخہ تجویز کیا لیکن ان سارے مباحث میں کوئی نہ کوئی کمزور پہلو موجود ہے۔ قرآن نے اس مسئلے پر نہایت اختصار کے ساتھ حکیمانہ بات کہہ دی:

وَ یَسئلونَکَ عنِ الرُّوحِ قُلِ
الرُّوحُ من أمرِ رَبّی وَما أوتیتُم من
العلمِ إلاّ قلیلاً (الاسراء/۸۵)

(اے نبی) یہ لوگ آپ سے روح کے
بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے کہ روح میرے
رب کا حکم ہے، اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا
گیا ہے۔

یہودی ربّیوں نے سوچا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی ہیں، اُن سے ایسا سوال کیا جائے جس کا جواب دینے سے وہ قاصر رہیں تو ہم پھر اُن کے دعوائے نبوت کا مذاق اڑائیں۔ اللہ نے ایسا جواب دیا کہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ''اُمر'' کا لفظ بہت سے معنی رکھتا ہے۔ یہ حکم اور ہدایت بھی ہے، قوّت، غلبہ اور اقتدارِ اعلیٰ بھی، قضا اور فیصلہ بھی۔ اِس کے علاوہ اَور بھی پہلو ہیں۔ یہ صرف خدا کا اختیار ہے، اسی لئے سائنس کی رسائی مادی حقیقتوں تک ہے۔ وہ بھی کسی حد تک، روح کے علاقے میں اُس کا دخل نہیں۔ سارے سائنس داں اور طبیب مل کر بھی ایک مری ہوئی چیونٹی کو زندہ نہیں کر سکتے۔

اگر متکلمین کے اس نظریے کی روشنی میں دیکھا جائے کہ اللہ کی صفات اس کی ذات سے الگ نہیں تو ''اُمر'' اُس کی صفت ہے، اِس اعتبار سے اُسے ابدی و لافانی کہا جا سکتا ہے۔ مگر قرآن نے روح کی ابدیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

انور شیخ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ خود تصوف سے مانوس رہے ہیں۔ مگر اُن کا یہ کہنا درست نہیں کہ ''تصوف ہندومت کی پیداوار ہے جو مظاہر فطرت کی عبادت کے نتیجے میں'' پیدا ہوا ہے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلامی تصوف کی بھی کسی مستند کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ اگر MYSTICISM سے اُن کا مقصود دوسرے مذاہب کے روحانی تجربات کا تجزیہ کرنا ہے تو اُن کے ملاحظات کا بیشتر حصہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور چونکہ وہ خود کبھی اس کوچے کی سیر کر چکے ہیں اِس لئے اِس موضوع سے بحث کرتے ہوئے اُن کا رویہ جارحانہ نہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلامی تصوف سے زیادہ ہندومت سے واقفیت حاصل کی ہے۔

کتاب کے آخر میں انور شیخ نے ایک معذرت نامہ بھی شائع کیا ہے اور کہتے ہیں کہ میرا مقصد کسی کو آزار دینا نہیں، مگر پوری کتاب کا یہ خلاصہ کہ وحی اور آسمانی پیغام ایک مفروضہ یا MYTH ہے جس نے بنی نوع انسان کو کمزور بنایا ہے اور انسان پیغمبروں، اوتاروں کے اقتدارِ اعلیٰ کا شکار ہو کر رہ گیا ہے، خود ایسا دعویٰ ہے جس سے کئی مذاہب کی جڑیں ہل جاتی ہیں اور اسلام کی عمارت تو بالکل ہی زمیں دوز ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر اُنکے دعووں سے کوئی آزار یا توہین و تضحیک محسوس کرے تو بے جا نہ ہوگا۔

بقیہ ''انور شیخ کے متنازع افکار''

امتِ مسلمہ میں نفاق پھیلانے کی مذموم حرکت سے باز رہیں۔ اور تفکرِ اسلام سے اپنے ذہن کو بچائے رکھیں۔ ورنہ اندیشۂ اسلام انہیں دُبلا کر دے گا۔ ان کا مقصد یقیناً صرف یہ اور اتنا نہیں ہے کہ وہ مذہب کو سائنسی فکرِ نو عطا کریں۔ جو کام ایک پوری جماعت کر رہی ہے وہی کام وہ اکیلے انجام دے کر adventurism کی نئی مثال قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی دین میں کوئی نئی بات ایجاد کر کے وہ مرزا غلام احمد جیسا ایک مقام اپنے لئے محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ پتہ نہیں شیخ صاحب کس قسم کا ہیرو بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں اور اُن کی اِس کوشش کے پیچھے کس ہدایت کار کا ہاتھ چھپا ہوا ہے۔ ان کا قول ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے عقیدے کو برداشت کرنا سیکھنا چاہئے۔ تعجب ہے وہ اپنے قول پر خود عمل نہیں کرتے۔

بیسویں صدی اب ختم ہو رہی ہے۔ آخری دہے میں انسان کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ علم اتنی تیزی سے پھیلا ہے کہ صبح و شام ایک نیا انقلاب آتا ہے۔ اور آدمی کی بصیرت میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اکیسویں صدی میں خدا کے روایتی تصور اور مذہب کو شاید کسی نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن کیا دانۂ گندم کھانے کی پاداش میں ابنِ آدم علم کو ہی خدا مان کر پوجنے لگے گا۔ اس کا فیصلہ تو آنے والی صدی کرے گی۔ خوف، توہم اور کج فہمی دور کرنے والی قلمی طاقتوں کا استقبال البتہ ہوگا بشرطیکہ وہ آدمی سے اس مکتی اور نجات کا وعدہ کریں جو مذہب کے ذریعہ اسے نہیں ملی ہے۔

نعیمہ ضیاءالدین
کے شاہکار افسانوں کا مجموعہ
منفرد
اردو مرکز لاس اینجلس، امریکہ کی جانب سے
اسے بہترین کتاب کا انعام دیا گیا ہے۔
قیمت : اندرون ملک : ۶۰ روپے
ناشر : انشا پبلی کیشنز

انور شیخ کی کتاب

"دو گجراتی سنتوں کی کہانی" (The Tale of Two Gujarati Saints)

کا جائزہ

تحریر : ڈاکٹر ڈیوڈ فرالے (وامادیو شاستری)
ڈائرکٹر امریکن انسٹی ٹیوٹ آف ویدک اسٹڈیز

انور شیخ بلا شبہ آج سب سے زیادہ بے باک اور اشتعال انگیز زندہ ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ نہ صرف برصغیر ہند کے معاملات بلکہ بڑے مذہبی معاملات اور نوع انسانی کی روحانیت کے حوالے سے بھی۔ انہوں نے اپنی مختلف کتابوں میں برصغیر کے سیاسی اور ثقافتی مسائل کا مختلف سطحوں پر گہرا جائزہ لیا ہے۔ وہ ایک طاقتور اور اصل مفکر ہیں جو کٹھن سوالات اٹھاتے ہیں اور ایسے تنازعات کھڑے کر دیتے ہیں جن سے دوسرے گریز کرتے ہیں۔

شیخ صاحب اپنے اپروچ میں نڈر اور راست واقع ہوئے ہیں اور کسی کے احساس کو ٹھیس پہنچانے سے خائف بھی نظر نہیں آتے۔ اسلام پر ان کی تنقید کے نتیجے میں ان پر ایک فتویٰ لگا اور قدامت پرست ملاؤں کی جانب سے انہیں موت کی دھمکی بھی ملی۔ لیکن آج تک کسی اسلامی مفکر کو عوامی طور پر ان کے نظریوں سے بحث کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ شیخ خود ایک مسلمان ہیں وہ پاکستان میں پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے خود ملا اور صوفی دونوں کی تربیت حاصل کی۔ ان کے نظریات کے حوالے اکثر دیئے جاتے ہیں اور ان کے نظریات ان کے نجی تجربات کے آئینہ دار ہیں۔ اگرچہ وہ ہندو مت کے زیادہ ہمدرد ہیں۔ بالخصوص اس کے قدیم ویدک روپ میں تاہم وہ کئی جدید ہندو رہنماؤں اور ان کی تعلیمات کے سخت ناقد ہیں اور اس خطے کے مسائل کے لئے انہیں (ہندوؤں کو) برابر کا ملزم قرار دیتے ہیں۔ شیخ صاحب دبے الفاظ میں بات نہیں کرتے یا اپنے بیانات کی چوٹ ہلکی نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنے آپ کو اس سرجن کے روپ میں دیکھتے ہیں جس پر لازم آتا ہے کہ وہ ایک مریض کی زندگی بچانے کیلئے اس کے کینسر زدہ ٹیومر کو کاٹ کر نکال دے۔ یہاں یہ مریض من حیث القوم ہندوستان ہے جس میں جدید پاکستان اور ہندوستان دونوں شامل ہیں۔

خوش قسمتی سے نومبر ۱۹۹۶ء میں مجھے انور شیخ کے گھر ویلز جانے کا موقع ملا۔ ان کا مزاح اور رحمدلی رو برو ملاقات میں سامنے آتے ہیں۔ وہ ایک لاجواب گفتار کے آدمی ہیں۔ ان کی تحریروں میں ان کا فرسٹریشن جھلکتا ہے جو ان کے وطن میں پھیلے کرپشن اور ابتری نیز تقسیم پر انہیں ہے جس نے دونوں ملکوں کو دنیا میں سربلند ہونے سے روکا ہے۔

"دو گجراتی سنتوں کی کہانی" "The Tale of Two Gujarati Saints" ان کی مشتعل کر دینے والی دوسری تحریروں جیسی ہی ایک تحریر ہے جس سے لوگوں کو صدمہ پہنچے گا لیکن بعض لوگوں کو یہ زیادہ گہرے غور و فکر پر مجبور کر دے گی۔ اس مختصر کتاب میں انہوں نے مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح کی زندگیوں اور اعمال کا جائزہ لیا ہے۔ یہ دونوں جدید ہندوستان اور پاکستان کے بانی اور سرپرست سنت ہیں۔ دونوں ہندوستان کے ایک ہی صوبہ گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسے تجارتی گروہوں سے وابستہ ہیں جن میں زیادہ دوری نہیں ہے۔ دونوں نے مغرب میں اچھی تعلیم پائی۔ دونوں نے اپنی اپنی زندگی ستم ظریفی اور المیہ میں فنا کر ڈالی۔

ہر ملک اپنے بانی کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اس کے گرد ایک اساطیر بُن لیتا ہے جس میں اعلیٰ درجہ کا مبالغہ شامل ہوتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کو نئے ممالک ہونے کی حیثیت سے اپنی اقوام کے بارے میں صداقت جاننے سے زیادہ نئے اساطیر گڑھنے سے دلچسپی رہی ہے اور انہوں نے گاندھی اور جناح کی پرستش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب دونوں سرزمینوں پر مفسدہ پروری کے باوصف پچاس سال کے بعد شاید دونوں ممالک اپنے بانیوں کو غیر جانبدار ہو کر دیکھنے لگیں۔ تاریخ کا یہی تقاضہ ہے چاہے وہ جتنا دکھ بھرا ہو۔

جناب شیخ نے اس امر میں قاری کو یہ گنجائش فراہم کی ہے۔ گرچہ انہوں نے یہ کام اتنا راست کیا ہے کہ کوئی بزدل انکی اس زبانی Barrage کو سنبھالنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔

اولاً وہ اپنے نتائج جرأت کے ساتھ اخذ کرتے ہیں اور اس کے بعد ان نتائج کی توجیہہ فرماتے ہیں۔ بہر حال اگر دھیرج اور کھلے دماغ کا آدمی ہو تو اس پر جلد واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی تبصرہ آرائی کافی جواز اور اہمیت کی حامل ہے۔

جناح، مغرب کا ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو سور کھاتا شراب پیتا، انگریزی سوٹ پہنتا اور تقریباً سبھی اسلامی اصولوں کو توڑتا اس سر زمین کا بانی بن گیا جو آج ایک ایسا اسلامی ملک ہے جو اسلامی قانون کی پیروی کرتا ہے اور جناح جیسے دیگر شہریوں کو اگر مجرم نہیں تو غلط شہری ضرور سمجھتا ہے۔ مختصر یہ کہ جناح نے اس ملک کی بنیاد ڈالی جہاں آج وہ زندہ ہوتے تو وہاں سے انہیں خارج کر دیا جاتا۔

گاندھی، ایک پختہ دھارمک شخص ایک ایسے سیکولر سوشلسٹ ملک کا بانی بن گیا جو اس کے خوابوں کے ہندوستان سے زیادہ سوویت یونین کے اوصاف سے متصف ہے۔ آج گاندھی کے اپنے ہی صوبہ گجرات میں ان کا پسندیدہ بھگتی گیت ٹرینوں میں نہیں گایا جا سکتا کیونکہ اسے فرقہ وارانہ سمجھا جانے لگا ہے۔ ان کی اپنی پارٹی کانگریس جسے انہوں نے عدم تشدد، صداقت اور Celebacy کے اصولوں پر تعمیر کرنا چاہا، بدعنوانی، لالچ اور تشدد سے بھری ہوئی ہے۔

گاندھی ہندو ہونے کے باوجود اپنی راہ سے ہٹ کر مسلمانوں کی خوشامد کرنے نکل جاتے تھے اور اقتدار پر اپنے دعوے کے لئے کہا کرتے تھے کہ وہ دونوں قوموں کا ملاپ کرا سکتے ہیں اور ملک کی تقسیم رُکوا سکتے ہیں۔ وہ عدم تشدد کے عظیم داعی تھے۔ اس کے باوجود اس خطے کی آزادی مذہبی خطوط پر لوگوں، بالخصوص ہندوؤں کے قتل و غارت کے ساتھ تقسیم پر منتج ہوئی۔ گاندھی کی پالیسیاں نہ فرقوں کو متحد کر سکیں اور نہ ان کے مابین تشدد کو روک سکیں۔ حد تو یہ کہ ان کی اپنی کمیونٹی کا بھی بچاؤ نہیں کر سکیں!۔

کتاب کے حصۂ اول میں مصنف نے مہاتما کو جانچا ہے۔ یہ مطالعہ اس کی جناح کے ساتھ معاملگی سے زیادہ متنازعہ ہے جبکہ جناح ظاہراً زیادہ عیبی آدمی تھے۔ گاندھی بہ حیثیت سنت اور سیاسی لیڈر عالمگیر شہرت کے مالک ہیں اور ان کے پیروکاروں میں مارٹن لوتھر کنگ جیسے لوگ شامل ہیں۔ حتیٰ کے کئی ہندوستانی ایسے ہیں جو گاندھی کے بارے میں کئی مناقشات یا قیل و قال سے در گزر کرنے کو ہمیشہ تیار ہیں۔ ایسے لوگ شیخ کے فرمودہ پر آہستہ دھیان دیں گے۔ حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اس متبادل نظریئے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

ایک سیاسی لیڈر شاید ہی کبھی سنت ہوتا ہو اور ایک سنت بہ حیثیت سیاسی لیڈر حیرت انگیز طور پر صلح جو نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ انڈیا بہر حال وہ ملک ہے جہاں سنت یا سادھو یا نہ صرف عزت کا حامل ہے بلکہ اکثر آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کی جاتی ہے۔ گاندھی نے اس قومی رجحان سے فائدہ اٹھایا۔ شیخ نے مہاتما کی زندگی اور تحریک آزادی کے کئی ان بوجھے حقائق تحریر کئے ہیں اور یہ بھی رقم کیا ہے کہ کس طرح وہ ملک کی تقسیم کا سبب بنے۔ گاندھی کے پاس متحدہ ہندوستان کی بصارت ضرور تھی لیکن اس کے حصول کے لئے ان کی کوششیں غلط اور جوابی رد عمل پیدا کرنے والی تھیں۔

شیخ صاحب کا نکتہ ہے کہ گاندھیائی اہنسا ہندوازم کا اہنسا نہیں ہے۔ گیتا جیسا مدافعتی جنگ کی اہمیت جتانے والا۔ بلکہ ایک اعتقادی اور غیر لچکدار مسلک والا ہے جس نے ہندوؤں کو طاقت یا اعتماد حاصل کرنے سے باز رکھا ہے۔ یہ یوگی اور وبندو جیسا نظریہ نہیں ہے جنھوں نے عوام میں جنگجویانہ جوش کو سرد کر کے ملک کو کمزور بنا دینے کا الزام لگا کر گاندھی کی تنقید کی تھی۔ گاندھی کے اہسانے ہندوؤں کے کردار کو دبا دیا تھا اور انہیں حد سے زیادہ انفعالی بنا دیا تھا۔ جسکے سبب وہ اپنے خلاف بے جا اقدامات کا جواب دینے پر بھی رضامند نہ ہوتے تھے۔ یعنی خود کو منوانے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے تھے۔ یہ مفعولیت تمام معاملات میں ملک بھر میں پھیل گئی تھی جس نے عوام سے کسی بھی اقدام کی جستجو، ترقی یا قومی اسپرٹ پیدا کرنے کی صلاحیت چھین لی۔

در حقیقت یہ تعجب کی بات ہے کہ مہاتما کا تنقیدی جائزہ اتنا کم لیا گیا ہے جبکہ بہر حال وہ ایک وکیل تھے اور کبھی زمانے میں برٹش آرمی کے رنگروٹ رہ چکے تھے۔ ایک شادی شدہ مرد، پانچ بچوں کے باپ، ہندوستان لوٹے اور اچانک ایک لنگوٹ میں ملبوس ایک سادھو یا پوتر منش کے روپ میں نمودار ہوئے۔ عبادت کے کسی مجمع میں نہیں بلکہ سیاسی میٹنگوں میں۔ یہ ایک مکمل کایا پلٹ تھی جس نے انہیں بڑی طاقت بخشی۔ گاندھی کا دعویٰ تھا کہ مکمل عدم تشدد صداقت کا واحد راستہ ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے خود کو خلافت تحریک سے لیکر امیر افغانستان تک ان لوگوں سے وابستہ کر دیا جو تشدد اختیار کئے ہوئے تھے۔ یہ وہی گاندھی تھے جنھوں نے یہودیوں سے کہا کہ وہ ہٹلر کا دل نرم کرنے کی خاطر خود کو اس کی بھٹیوں میں جھونک دیں۔ مہاتما کے نظریات کبھی کبھار بے دلیل یا یکطرفہ معلوم ہونے لگتے ہیں جن میں عام فہم کی کمی بھی نظر آتی ہے بھلے وہ کتنے ہی مثالی اور اصول پرست رہے ہوں۔

گرچہ گاندھی فرقہ جاتی نظام کی مخالفت کا دعویٰ کرتے تھے۔ لیکن دھرم میں وہ فرقہ

واریت کے پابند رہے۔ انہیں تمام مذاہب کا رواداد ہونے کا دعویٰ تھا پھر بھی وہ غیر ہندوؤں کو ہندو بننے نہیں دیتے تھے اور دوبارہ دھرم بدلاؤ (Reconversion) کے ذریعہ ہندو بننے کے بھی خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ ہر شخص اپنے ماں باپ کے دھرم پر قائم رہے۔ شیخ اسے مذہب کے ذریعہ تقسیم پر محمول کرتے ہیں جس نے دو قومی نظریہ کو بھی فروغ دیا۔

کتاب کا دوسرا حصہ جناح اور ان کے پاکستان کی بنیاد رکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پاکستان ایک مذہبی دیش کے طور پر تخلیق ہوا تھا کیونکہ مسلمان محسوس کرتے تھے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے اور یہ کہ ان کا اپنا علیحدہ کلچر تھا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے بنگلہ دیش کی علیحدگی نے ہندوستان میں ایک مسلمان قوم کے تصور کی ناکامی کا ثبوت فراہم کردیا۔ پاکستان ان متفرق صوبوں کی مشترکہ قوم ہے جن کا مشترکہ بندھن مذہب ہے جبکہ اس کی قوم کی بنیاد ایک غیر مذہبی شخص نے ڈالی!۔

جیسا کہ مصنف رقمطراز ہے ایک قوم صرف خونی رشتوں، ایک مشترکہ کلچر اور زمین کے بندھنوں پر ہی قائم ہو سکتی ہے نہ کہ مذہب پر۔ جدید پاکستان میں اس بنیاد کی کمی نے ملک کو غیر مستحکم بنادیا اور اسے اسلامی کلرجی اور آرمی کے درمیان جکڑے رکھا۔ مصنف اسلامی قانون کا بھی مطالعہ کرتا ہے جسے پاکستان کے قانون کی اساس بنایا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی دکھایا ہے کہ یہ کس قدر جانبدار، قرون وسطیٰ کا سا اور غلط ہو سکتا ہے۔

جناح اکثر اتنے ہی حقیر قرار دیئے گئے جتنے سربلند گاندھی ٹھہرائے گئے۔ مصنف کو جناح میں کئی نقص نظر آتے ہیں جبکہ گاندھی میں اسے زیادہ عظمت نظر آتی ہے۔ لیکن یہ ایسی عظمت تھی جو تضادات سے پُر تھی اور ان کے ملک کی تباہی کی وجہ بنی۔ مصنف شاعر اقبال کو بھی حسیت کے ساتھ پرکھتا ہے اور پاکستان کے نظریاتی بانی کی حیثیت سے اس کی شہرت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں برصغیر کے مسائل کا ممکنہ حل پیش کیا گیا ہے لیکن مصنف کا خیال ہے کہ نہ اس کا حل ہندو مت میں ہے جیسا کہ وہ آج ہے اور ذات پات کا پابند ہے۔ نہ اس کا حل اسلام میں ہے جسے مصنف عرب ہیشلوم اور کولونیلزم کے پرچار (تبلیغ) سے تعبیر کرتا ہے۔ مصنف اس کا حل اصل ہندوستانی قوم پروری اور مشترکہ کلچر اور اس خطے کے روحانی رجحانات میں بتاتا ہے۔ اس کی تجاویز اچھی طرح سوچی سمجھی، عقلی اور آزمائے جانے لائق ہیں۔

ایسی کتابیں پڑھنا ظاہر ہے کہ آسان نہیں ہوتا اور ان کے خلاف ردعمل بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ وہ مروجہ شخصیات کے خلاف جاتی ہیں اور ماضی کے دکھ بھرے معاملات کریدتی ہیں جنھیں کوئی بھلا دینا ہی پسند کرتا ہے۔ بہر حال اُس عہد کا المیہ دونوں ملکوں کے مسائل میں زندہ ہے جن کا سدِّباب اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ان کے اسباب پر غور نہ کیا جائے۔ مصنف ایک نہ سوچنے والا رجعت پسند (Reactionary) نہیں ہے بلکہ ایک اصل قوم پرست، انسان پرست، عقل پرست، اور غیر فرقہ پرست پُراسرار بندہ ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی کو اس کے تمام اخذ کردہ نتائج سے اتفاق ہو لیکن اس کی تنقید کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ان دو لیڈروں کے مدافعت کاروں سے کوئی غیر جذباتی یا غیر مذہبی جواب بن پڑتا ہے یا نہیں۔ یہ طے ہے کہ دونوں ملکوں کو نئی سوچ، نئی تعمیر اور صحیح استحکام کی خاطر ایک ایسی نئی بنیاد کی ضرورت ہے جو پھر کبھی ان کے عام ورثے کو نہ بھلائے۔ دونوں طرف انور شیخ جیسے دیگر لوگ اس میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

مانک ٹالا
کے افسانوں اور مزاحیہ
مضامین کا مجموعہ
ہوری کا دوسرا جنم
قیمت : ۱۷۵ روپے
ملنے کا پتہ :
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹۔ گولا مارکیٹ، دریاگنج۔ نئی دہلی۔ ۲

ڈاکٹر وفا راشدی کی
۲ اہم تصنیفات
داستانِ وفا
مصنف کی ستّر سالہ آپ بیتی
قیمت : ۱۸۰ روپے
کلکتہ کی ادبی داستانیں
ایک تاریخی اہمیت کی کتاب
ناشر: مکتبہ اشاعت اردو
بی ۴۸۔ شاہ فیصل ٹاؤن
جناح ایونیو۔ ملیر ہالٹ۔
کراچی۔ ۷۵۱۰۰ (پاکستان)

انور شیخ اور انکی تحریر "اسلام کا نظریۂ قانون"

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
"کاشانہ"
کل گاؤں، ضلع ایوت محل، مہاراشٹر 445203

انور شیخ کا اس نسل سے تعلق ہے جو مغربی طرز افکار و تہذیبی اقدار کے سامنے مکمل سپر افگندگی اور سرنگونی کو باعث سر بلندی خیال کرتی ہے۔ انکے نشوو نما میں مغربی تمدن کا "تقدس" مادی اقدار کی حمایت، علماء دین کی تحقیر اور اسلام سے مکمل مایوسی جیسے عوامل داخل ہوگئے ہیں بلکہ داخل کر دیئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان میں مغربی نظریات زندگی (جو "طبعی آزادی" کے نام پر بہیمیت سے بھی کچھ آگے بڑھ گئے ہیں۔) کی تنقید کرنے کیلئے بالغ نظری ہے نہ اخلاقی جرأت۔ فلسفۂ حیات اور مقصد زندگی کی گرہ کشائی کیلئے انکے پاس پختہ شعور ہے نہ فنی مہارت۔ ان کی دینی بے بضاعتی اور بصارت سلبی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی مغربی تہذیب کی روشنی میں دلوں کو منور کرنے والا اسلامی نور انہیں نظر نہیں آتا۔ انکے فہم وادراک کا یہ حال ہے کہ علماء کرام کی معمولی سی سرد مہری، قدامت پرستوں کے قول و عمل کے تضاد اور امت مسلمہ کے انحطاط و پسماندگی کے عام مناظر دیکھ کر وہ اسلام اور اسلامی اقدار حیات ہی سے نہ صرف یہ کہ متنفر ہوئے ہیں بلکہ اس سے باغی ہوگئے ہیں۔ ان کی حق و باطل کی تمیز مفلوج ہوگئی ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام کے حقائق کا صحیح ادراک نہ کر کے اسے جھٹلانے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔

فکر و شعور کے اعتبار سے ایسی نابالغ نسل کے پروردہ انور شیخ جب "اسلام کے نظریۂ قانون" پر اظہار خیال کرتے ہیں تو ان کا طفلانہ پن صاف دکھائی دیتا ہے۔ اسلام اور مسلم شخصیتوں کے بارے میں منفی رویہ اور سلبی موقف رکھنے والا ادیب یا شاعر اسلام کے ڈھانچے کی عکاسی کر سکتا ہے نہ اسلامی روح کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ انور شیخ کی تحریریں یہ بتاتی ہیں کہ وہ اسلام کے بارے میں منفی اور سلبی فکر رکھتے ہیں اور اس دین کے بارے میں ان کا زاویۂ نظر یکسر مغربی فکروں کے کاسۂ گدائی کا خشک سوکھا ٹکڑا ہے جسے اس دین مبین کے سکان منکر کئی بار نگل کر اُگل چکے ہیں۔ مغرب کی دریوزہ گری کی خاطر اسلام کی صالح طرز زندگی کو یک قلم مسترد کر دینا کہاں کی دانائی ہے؟ بلکہ ایسی طرز فکر رکھنے والے لوگ ہی اسلام کیلئے فتنہ بن جاتے ہیں۔ مادی منفعت کیلئے یہ لوگ ایمان ہی نہیں (اس کا تو انکے پاس شعور بھی نہیں ہوتا) اپنی عزت و آبرو تک کو تج دیتے ہیں۔ بظاہر (نام کی حد تک) یہ مسلمان ہوتے ہیں مگر بباطن یہ شیطان سے کم نہیں ہوتے۔ ان سنپولوں کو سر اٹھاتے ہی کچل دینا چاہئے ورنہ یہ سماج میں زہر پھیلاتے رہیں گے۔

انور شیخ کا ایک مضمون "اسلام کا نظریۂ قانون" میرے پیش نظر ہے۔ یہ مضمون اسلامی تاریخ سے عدم واقفیت، خیال آرائی میں تضاد، بے لگام قیاسات، کمزور دلائل کی بھرمار، بغض و عناد سے مملو افکار، اپنی بات منوانے کی کوشش، بے جا تاویلات اور غلط استنباطات کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کی اسلام دشمنی کا یہ عالم ہے کہ وہ علماء کرام ہی ہیں خدا اور رسول پر بھی بہتان باندھتے ہیں۔ اور ہمہ دانی کے زعم میں بزرگوں کی چودہ سو برسوں کی محنت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ وہ مغرب کی نام نہاد "حریت پسند تہذیب" (جس میں آزادیٔ نفس کے علاوہ دوسری کسی آزادی کا تصور نہیں ہے) اور انسانیت کے فطری تقاضوں کی پابندی کی بجائے بہیمانہ اور وحشیانہ تقاضوں کو کھلم کھلا پورا کرنے والے تمدن کے بالمقابل اسلام کی صالح اور لاضرور لاضرار فکر سے مملو تہذیب کو (جو انسانیت کی سربلندی اور بندوں کی دونوں جہاں میں کامیابی کی ضامن ہے) کو ہیچ سمجھتے ہیں۔

(ا) انکے دعووں کی کمزوری، استدلال میں کمی اور تاریخ سے عدم واقفیت کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ وہ رقمطراز ہیں آج تک دنیا میں کبھی بھی اسلامی قانون نافذ نہیں ہوا"۔ (ص ۱۲٦) یہ جملہ صاف بتارہا ہے کہ مصنف یا تو حق کا منکر ہے یا مسلم خلفاء و سلاطین کی تاریخ اور ان کی طرز حکومت سے نابلد ہے۔ وہ مسلم سلاطین و فرمانروا جنہوں نے اپنی مملکت میں اسلامی قوانین کا نفاذ ممکن بنایا تھا۔ ان کی صرف فہرست ہی مرتب کی جائے تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔ لیکن موصوف نے اسلامی مملکت کے ان عظیم سپوتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ خلفاء راشدین اور عمر بن عبدالعزیز جیسے خلفاء اسلام کے اسلامی نظام حکومت کو ماننے میں تامل کرتے ہیں۔ پھر بھی چند اسلامی حکومتوں کے نام لینا میں ضروری سمجھتا ہوں جن کے اکثر سلاطین اسلامی قانون کا نفاذ عمل میں لائے اور شریعت مطہرہ کے مطابق اپنی حکومت چلائی مثلاً خلفاء راشدین کے بعد بنو امیہ میں عمر بن عبدالعزیز، بنو عباسیہ میں مامون الرشید، اسپین (قرطبہ) کے بنو امیہ میں عبدالرحمٰن ثالث، خاندان عبادئین میں ابوالقاسم محمد اول بن اسماعیل عباد، غرناطہ کے زیارئین خاندانکے عبداللہ بن سیف الدولہ، خاندان عامری کے عبدالعزیز منصور، شمالی افریقہ کے خاندان ادریسین کے علی بن محمد، خاندان الموحدون کے

محمد بن تومارت، خاندان الموحدین کے عبدالمومن، مشرقی سوڈان کی دار فور سلطنت کے فرمانرواؤں میں محمد الفضل بن عبدالرحمٰن، خاندانِ رستمیین کے عبدالرحمٰن بن رستم، مصر و شام کے فاطمیین، اخشیدئین اور ایوبیین خاندانوں کے سلاطین، عرب میں خاندانِ موسوی، خاندانِ سلیمانی اور ہواشم کے کئی شرفاء جنہوں نے مکہ میں حکومتیں کیں۔ خاندانِ قتادہ کے سلطان، یمن کے فرمانروایانِ صنعاء، فرمانروایانِ یمن، اور فرمانروایان زاہد سے اکثر فرمانروا انکے علاوہ شام و عراق، ایران و ماوراء النہر کے سلاطین، مغربی ایشیاء کے آل سلجوق کے بعض خلفاء زنگی خاندانکے اتابک، خوارزم شاہی خاندانکے بعض بادشاہ، ذوالقدر اور سلجوقی کے چند سلاطین پھر غزنوی خاندانکے الپ تگین اور سبکتگین، غوری خاندانکے چند ایک سلطان، خلجی، لودھی، سید اور آخر میں مغل خاندانکے بعضے سلاطین ایسے گزرے ہیں جن کے دور حکومت میں شریعت اسلامیہ بحیثیت قانون نافذ تھی۔ یہ صرف ایک سرسری جائزہ ہے اسلامی تاریخ کا۔ پھر بھی انور شیخ کا یہ کہنا کہ ''آج تک دنیا میں کبھی بھی اسلامی قانون نافذ نہیں ہوا'' ان کی ''علمی جہالت'' کی گواہی دیتا ہے۔

(۲) تقسیم ملک: ہندوستانکے اس تاریخی اور تاریخ ساز واقعہ کے متعلق انور شیخ کے خیالات میں بڑا تضاد واقع ہوا ہے۔ وہ کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ ''تمام جید علماء ہند نے تقسیم ہند کی مخالفت کی'' (لبرٹی سہ ماہی جنوری 98: علامہ اقبال۔ غارت گر ملت) پھر اسی خیال کی توثیق وہ اسطرح کرتے ہیں'' تقسیم ہند سے پہلے اکثر علماء اسلام نے ایسے ہی افکار (تقسیم ہند کے خلاف) کا اعلان کیا تھا۔ مذکورہ مضمون میں انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ علاوہ اقبالؔ کے تمام علماء ہند تقسیم کے خلاف تھے۔ اقبالؔ نے عوام الناس کو ورغلایا اور پھر مسلمانوں کے جوش و ولولہ سے ہندوستان مسلم قانون کے نفاذ کیلئے تقسیم کردیا گیا۔ لیکن اپنے دوسرے مضمون ''اسلام کا نظریۂ قانون'' میں وہ اس موقف پر قائم نہیں رہے بلکہ صاف کہدیا کہ --

''ہندیؔ مسلمانوں نے اس (اسلامی قانون کے نفاذ) کیلئے نہ صرف اپنے وطن کا بٹوارہ کرڈالا بلکہ ایسے مصائب کو خندہ پیشانی سے گوارہ کیا جن کا تصور کرنے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔'' بتائیے! کیا یہ تضاد بیانی ''جہل علمی'' کی دلیل نہیں ہے؟ کیا ایسے مضامین انتشار و فتنہ و فساد کا ذریعہ نہیں بن جاتے؟ کیا یہ متضاد بیانی مصنف کی کم مائیگی کا ثبوت فراہم نہیں کرتی؟ مصنف کا یہ زعم ہمہ دانی انکے علمی دیوالیہ پن کا عکاس ہے۔ نہ ان کا سیاسی شعور بیدار ہے نہ انکے افکار میں تجربے کی آنچ۔ بس ان کا بے مہار قلم جدھر چاہے چل دیتا ہے۔ ایسا بے مہار قلم کسی کو اچھا ادیب نہیں بنا سکتا۔

دراصل تقسیم ملک کے عوامل میں (۱) انگریزوں کی شاطرانہ سیاسی پالیسی (۲) یہاں کے ایک خاص مکتبِ فکر کے ہندو سیاستدانوں کی سیاسی چال اور (۳) مسلمانوں کی سیاسی مفاد میں عجلت پسندی اور روشن مستقبل سے بے خبری وغیرہ خاص ہیں۔ اس ضمن میں پہلے اور تیسرے نکتے کو تو خوب ہوا دی گئی ہے، لیکن دوسرے نکتہ پر شاذ ہی تبصرہ ہوا ہے۔ پارٹیشن سے کچھ پہلے پارلیمانی کاروائیوں کی روئداد جن اخبارات میں شائع ہوا کرتی تھیں انہیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلم اور ہندو لیڈروں میں پارلیمنٹ کے اندر خوب بحث ہوا کرتی تھی۔ اور قانون سازی کے معاملات میں مسلمان اکثر روڑا بن جایا کرتے تھے اور یہی بات ان لیڈروں کو نہیں بھاتی تھی۔ جو ایک خاص مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اب اگر ایسی صورت حال میں جمہوری ہندوستان پاک و بنگلہ دیش سے مل کر بنتا تو صاف ظاہر تھا کہ انتخابات میں مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ چند کلیدی وزارتوں کی جگہوں پر انہیں لینا پڑتا۔ پھر ''ہندوئیت'' کی فوقیت کو بھی بار بار گہن لگتا۔ یہ سب نہ بھی ہوتا تو ایسے سنگین حالات میں مسلمانوں کے منتخب شدہ وزراء کی تعداد اتنی ضرور رہ جاتی کہ وہ ایک بائیں بازو کا محاذ قائم کرسکتے۔ اس طرح ہر دو حالات میں اس خاص مکتب فکر کے ہندو لیڈران کو خطرہ محسوس ہوا تو جوں ہی مسلمانوں نے منفعت عاجلانہ کیلئے پاکستان کا نعرہ لگایا ہندو رہنماؤں کو اپنی کرسی اقتدار بچانے کا اچھا موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے معمولی قیل و قال کے بعد ہندوستان جیسے عظیم ملک کو بانٹ ڈالا۔ اور سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ میں یہ بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ آج متحدہ ہندوستان ہوتا تو بابری مسجد کا سانحہ کبھی نہ ہوتا اور مسلمانوں کو کلیدی عہدوں سے دور نہ رکھا جاتا۔ اسلئے تقسیم ہند کیلئے صرف مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرانا سیاسی حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔

(۳) اسلام میں ملاؤں کا راج؟ انور شیخ نے سعودی عرب، ایران اور افغانستان کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ (الف) ''وہاں ملاؤں کا راج ہے۔ جو قانون کے رکھوالے بن کر عوام کی ناک میں نکیل ڈالنے کے حقدار بن چکے ہیں''۔ (ب) ''عورتیں قیدی بن گئی ہیں انکیلئے لازم ہے کہ وہ گھر کی چہار دیواری میں رہ کر مردوں کی جنسی تسکین کیلئے بنتی سنورتی رہیں''۔ (ج) انہیں اعلیٰ تعلیم کا حق حاصل ہے نہ ملازمت کا'' (د) ''جن بچوں کی مائیں جدید تعلیم اور مشاہدات زندگی سے بے بہرہ ہوں ان کی قسمت پسماندگی اور انحطاط کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔'' انور شیخ کے یہ خیالات

مغرب زدگی کے زیر اثر رقم ہوئے ہیں۔ ان میں حقائق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور مستشرقین کی افترا پروری اور ڈنکے کی چوٹ پر کذب بیانی کو اپنایا گیا ہے۔ حالانکہ حقائق انکے بیانات سے یکسر الٹ ہیں۔

(الف) اسلام میں نہ ملائیت کی گنجائش ہے نہ پاپائیت کا دخل۔ روئے زمین کا کوئی بھی مسلمان تنِ تنہا خود کسی ملا، بابا، حضرت، پیر و مرشد کے بغیر اللہ سے اپنا تعلق جوڑ سکتا ہے۔ اطاعت اسکیلئے صرف اللہ، رسولؐ اور امیر کی لازمی ہے کہ یہی دین ہے۔ یہاں مذہبی طبقات کو عام مسلمانوں پر کوئی اثر و اقتدار نہیں بخشا گیا اور حاکم کو بھی پابند کیا گیا کہ سارا اقتدار شریعت سے مستنبط قوانین کے نفاذ تک ہی محدود رکھا جائے۔ اس سے سر موانحراف یا زیادتی کیلئے وہ خدا کے حضور جوابدہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان احکام سے تجاوز کرنے والے لوگوں کو کافر کہتا ہے۔ فرمان خداوندی ہے۔ ''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔'' (سورہ مائدہ: ۴۴) تعصب و عناد سے ہٹ کر اگر کوئی اسلام کا مطالعہ کرے تو یہ بات روز روشن کی طرح اس پر عیاں ہو جائے گی کہ اسلام کے آداب و مراسم ہوں یا نظام زندگی کے معاشی و معاشرتی گوشے سیاسی نظام ہو یا معاشیاتی۔ ''اجتماعیت'' ہر جگہ ان میں سرائیت کئے ہوئے ہے۔ بقول استاد سید قطب:

''اسلامی نظام میں حکمراں اپنا اقتدار نہ تو کسی نظام پاپائیت سے حاصل کرتا ہے نہ براہ راست خدا سے۔ اسکے اقدار و اختیار کا منبع ''اسلامی جماعت'' ہے۔ اسی طرح اسکے احکام و قوانین کا منبع شریعت ہے جس کے فہم و تطبیق میں سب برابر ہیں اور سب یکساں طور پر اس کو اپیل کر سکتے ہیں''۔ (اسلام کا نظام عدل ص ۲۲)

اصل بات یہ ہے کہ اسلامی نظام میں اقتدار و اثر کے ذریعہ عوام الناس کا استحصال نہیں کیا جاتا بلکہ صحیح نظامِ اسلامی میں ایک عام فرد بھی خلیفہ کو ''سیدھا'' کر دینے کی بات آزادانہ طور پر کہہ سکتا ہے۔

(ب) ان کا دوسرا الزام یہ ہے کہ عورتیں وہاں قیدی بن گئی ہیں اور صرف مردوں کی جنسی تسکین کا سامان بنادی گئی ہیں۔''

اس اعتراض کیلئے یورپ کے نظریات نسواں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جب سے اسلام نے عورت کی عزت و توقیر کی اور مردوں کے مساوی سماجی و معاشرتی درجہ دیا یورپ کے اہل کلیسا کی ناک بھوں چڑھنے لگی اور انہوں نے اسلامی قانون میں کیڑے نکالنے شروع کئے۔ عورت کے معاملے میں انہوں نے اسلام کے قانون ''حرم'' اور پردے کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے لٹریچر میں اسکی مضحکہ خیز تصویر کھینچی۔ اسلامی قانون کے عیوب بتاتے ہوئے عورتوں کو گھروں میں رہنے اور پردہ کرنے کو ''قید'' سے تعبیر کیا۔ نام نہاد مسلمانوں نے اپنی شرم چھپانے کیلئے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور خود اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے اسلام کے قانون کو یورپ کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور جیسا نظر آتا اس پر اعتراض کرنے لگے۔ حالانکہ وہ آج تک اس حقیقت سے منہ موڑ رہے ہیں کہ اہل یورپ نے آزادیٔ نسواں کے نام پر عورت کا جتنا استحصال کیا اتنا اور کسی زمانے اور کسی قوم نے نہیں کیا۔ مسیحی یورپ میں ''عورت'' کا تخیل بڑا ہی گھناؤنا اور ذلت آمیز تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ ''عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے''۔ وہ جہنم کا دروازہ ہے اور تمام انسانی مصائب کا نقطۂ آغاز ہے''۔ مسیحیت کے ابتدائی دور کا امام ترتولیان (Tertullian) عورت کے متعلق کہتا ہے۔ ''وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔ وہ شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی ہے۔ خدا کے قانون کو توڑنے والی، مرد کو غارت کرنے والی ہے۔'' [۱]

ایسے ہی کرائم سوسٹم (Chrysostum) جو مسیحیت کے اولیاء کبار میں شمار ہوتے ہیں عورت کے حق میں کہتے ہیں:

''ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گرِ دلربائی، ایک آراستہ مصیبت۔'' [۲]

مسیحی یورپ کا دوسرا نظریہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کا صنفی تعلق بجائے خود ایک گندہ اور قابل نفرت عمل ہے۔ خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ کلیسائی تہذیب میں اس تصور نے ''رہبانیت'' کو بڑی تقویت پہنچائی۔ یہ دونوں عقیدے انتہاپسندی کے غماز ہیں۔

جدید یورپ نے سوسائٹی کے خلاف فرد کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھائی اور صنفِ اناث کو پستی سے اٹھانے کیلئے جن نظریات کو روبعمل لایا وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) عورتوں اور مردوں کی مساوات

(۲) عورتوں کی معاشی آزادی (Economic Independence of Eve) اور

(۳) دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط۔

اہل یورپ نے مساوات مرد و زن کے یہ معنی سمجھے کہ دونوں اخلاقی اور انسانی حقوق ہی میں برابر نہیں بلکہ تمدنی اور معاشرتی زندگی میں بھی عورت وہ تمام کام کرے جو مرد کرتے ہیں۔ اخلاقی بندشیں عورتوں کیلئے اتنی ہی ڈھیلی کر دی گئیں جتنی مردوں کیلئے تھیں۔ مساوات کے اس غلط تصور نے سماج کی اجتماعی سرگرمیوں میں

[۱] - [۲] - سید ابوالاعلاء مودودی: پردہ۔ دہلی ۱۹۷۶ء ص ۲۰-۱۹

عورت کو مرد کے مقابلے میں پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا۔ صنعتی پیشوں، سیاسی مجلسوں، کھیل کود کے مقابلوں اور رقص وسرود کی محفلوں میں عورت کی شمولیت نے اسے گھریلو ذمہ داری اور اسکے فطری وضائف سے بے پرواکر دیا جس کی وجہ سے ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں، بچوں کی تربیت اور گھر (خاندان و کنبہ) کی تنظیم میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ اور خاندان کا نظام جو انسانی تمدن کا سنگ بنیاد ہے بری طرح متاثر ہوا۔

عورتوں کے معاشی استقلال نے عورت کو مرد سے بے نیاز کر دیا۔ پھر وہ دونوں شہوانی خواہشات کی تکمیل کیلئے ازدواجی بندھنوں سے آزاد رہنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور آزادانہ طور پر اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے مذہبی قانون اور سیاسی رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے قانون میں ترمیمات و تحریفات کرنے لگے۔ نتیجتاً مانع حمل گولیاں وجود میں آئیں، برتھ کنٹرول کو فروغ حاصل ہوا، اسقاط حمل کو شہ ملی، اور برائیاں کھلم کھلا کرنے کے راستے قانوناً ہموار ہوتے چلے گئے۔

مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے تو باقی رہی سہی شرم و حیا کو بھی ختم کر دیا اور بے حیائی کا ایسا بازار گرم ہوا کہ شرم بھی پانی پانی ہو گئی۔ صنفی انجذاب کیلئے کپڑے رکاوٹ بن رہے تھے وہ کم ہوتے گئے اور برہنگی ''حسن و جمال'' کا معیار بن گئی۔ ان ساری باتوں نے سوسائٹی میں جو انقلاب پیدا کر دیا وہ کیسا ہے اس کی ایک جھلک بھی ملاحظہ کیجئے۔

انیسویں صدی کے آخری دہے کا ادیب پول اداں (Paul Adan) اپنی کتاب ''لاایں اورلی ڈی لامور'' میں نوجوانوں کو کہتا ہے:

''شائستہ اور معقول انسان بنو۔ اپنی لذات اور خواہشات کے خادموں (عورتوں) کو اپنا معبود نہ بنالو۔ نادان ہے وہ جو محبت کا مندر تعمیر کر کے اس میں ایک بت کا پجاری بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ لطف کی ہر گھڑی میں ایک نئے مہمان کا انتخاب کرنا چاہئے''۔

پیر لوئی نے تو ''افرودیت'' (Aphrodiat) میں صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ:

''جب تک انسان پوری آزادی کے ساتھ جسمانی لذات سے متمتع نہ ہو کوئی عقلی و علمی اور مادی و روحانی ارتقاء ممکن نہیں۔''

وہ یہاں تک کہنے میں نہیں چوکتا کہ

''اس مکروہ خیالی کا استیصال کر دینا چاہئے کہ عورت کا ماں بن جانا (ناجائز طریقے سے) کسی حال میں ناجائز، شرمناک، ذلیل اور پایۂ شرف و عزت سے گرا ہوا بھی ہوتا ہے''۔

جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا لیڈر ببیل (Bable) نہایت بے تکلفانہ انداز میں لکھتا ہے:

''عورت اور مرد آخر حیوان ہی تو ہیں۔ کیا حیوانات کے جوڑوں میں نکاح اور وہ بھی دائمی نکاح کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے؟؟''

ڈاکٹر ڈریسڈیل (Drysdale) لکھتا ہے کہ:

''ایسی تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ شادی کے بغیر بھی محبت کو ایک معزز چیز بنا دیا جائے ....''

فرانس کے مشہور لونا لتھوسی لیڈر پول روبین (Paul Robin) کا یہ خیال بھی توجہ کا طالب ہے:

''پچھلے پچیس سال میں ہم کو اتنی کامیابی تو ہو چکی ہے کہ حرامی بچہ کو قریب قریب حلالی بچہ کا ہم مرتبہ کر دیا گیا ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم کے (حرامی) بچے پیدا ہوا کریں تاکہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے''۔

یورپ کا عورتوں کی آزادی کے بارے میں یہ تصور انکے نظریات کی دوسری انتہا ہے۔ اس سے جدید یورپ کے انسانی ضمیر کا ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی ماحول میں رنگ کر انور شیخ نے یہ اعتراض جڑ دیا ہے کہ:

''عورتیں وہاں قیدی بن گئی ہیں اور صرف مردوں کی جنسی تسکین کا سامان بنا دی گئی ہیں۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا انکے اس قول میں کچھ صداقت بھی ہے؟؟ جہاں تک اسلام میں عورت کے مقام کا سوال ہے تو بحیثیت ایک صنف کے وہ مردوں کے مساوی قرار دی گئی ہے۔ مردوں کی فوقیت صرف استعداد و استطاعت اور ذمہ داری و مہارت پر موقوف ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

''(میں) تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ (آل عمران ۱۹۵)

نیکیوں کے صلہ میں دونوں (مرد عورت) کے درمیان مساوات کو اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں بہت ساری جگہ دہرایا ہے اور مذکورہ آیت میں ''تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو'' کہہ کر دونوں کے درمیان غیر مساویانہ سماجی فاصلوں (جو مسیحی یورپ میں اٹھارویں صدی تک قائم تھے) کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اسلئے یہ کہنا غلط ہے کہ عورتوں کو اسلام میں کوئی آزادی نہیں۔ یا انکے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔

رہا عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کا سوال۔ تو اسلام میں حصول تعلیم کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ طَلَبُ عِلْمِ فریضةٌ کُلِّ مُسلِمَۃٌ وَ مُسلِمَاۃ۔ اتنا واضح حکم ہونے کے بعد بھی اگر انور شیخ اپنی بات پر ہی اڑے رہیں تو یہ ان کی ''جہالت'' ہوگی۔ عورتوں کی آزادی کے

عنوان پر انہیں نوکری کرنے لگواتا، تو اسلام اسے قطعی پسند نہیں کرتا کہ اس کام کی ذمہ داری تو مردوں پر ڈالی گئی ہے۔ اسلام نے مردوں اور عورتوں کے دائرۂ کار مختلف رکھے ہیں۔ مرد کمانے کیلئے مکلف ہیں اور عورتیں گھریلو ذمہ داریوں کیلئے جوابدہ۔ البتہ مغربی تہذیب نے آزادیٔ نسواں کے نام پر عورتوں کا جتنا استحصال کیا ہے تاریخ میں اسکی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ اپنی معیشت سدھارنے اور اپنی ذمہ داری میں عورت کو حصہ دار بنانے کیلئے اہالیان مغرب نے "بنتِ حوّا" کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ مرد کی ہوس رانی اور خواہشات نفسانی کی کھلے مہار تکمیل کیلئے انہوں نے آزادیٔ نسواں کے نام پر عورتوں سے موڈلنگ (نیم برہنہ / برہنہ) کروائی۔ خوبصورت لڑکیوں کو دکانوں کے کاؤنٹر پر کھڑا کرکے مردوں کی ہوس کو بڑھوا دیا اور ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا۔ ایر ہوسٹس بنا کر ہواؤں میں مردوں کی دلجوئی کا سامان فراہم کردیا اور بیوٹی کوئن کے خطاب سے نواز کر اس سے دل چاہے جب تک جسمانی آسودگی حاصل کرلی۔ ایمانداری سے بتایئے انور شیخ صاحب عورتوں کی ان نوکریوں کے پس پشت کونسا جذبہ کار فرما رہتا ہے؟؟ ہوٹلوں میں عورتوں کو ملازم رکھنا، نائٹ کلبوں میں دوشیزاؤں کی جسم فروشی کے ذریعہ دولت کمانا، بیوٹی کانٹسٹ میں عورتوں کو من چاہے انداز میں برہنہ / نیم برہنہ کرکے ہر زاویہ سے اسکے جسم کے نشیب و فراز کو ہوس بھری نگاہوں سے دیکھنا (ان میں سے کوئی مائی کالال ہے جو اپنی بیٹی کے جسم کی ایسی نمائش میں خود بھی شامل ہو) ان جیسی سینکڑوں مثالیں انور شیخ صاحب آپ کے اس مغربی تمدن کی دین ہیں جس میں آپ سانس لے رہے ہیں۔ کیا بنتِ حوا کی عزت و عصمت اور پاکبازی کے ساتھ یہ کھلواڑ نہیں ہے؟ کیا عورت اسی لئے پیدا کی گئی کہ وہ مردوں کی آسودگیٔ نفس کا آلہ بن کر زندگی گزار دے؟ اسکے علی الرغم اسلام میں عورت کا تصور بڑا ہی مقدس ہے۔ اللہ کے رسولؐ عورتوں کی نازکی کا خیال رکھتے ہوئے "آبگینے" کہتے تھے۔ قرآن اسکے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو نہایت پر اثر انداز میں تنبیہ کرتا ہے: "جب دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے بدلے قتل کی گئی تھی (التکویر:۹) جواب طلبی کا یہ انداز عورت کے بلند مرتبہ کو واشگاف کرتا ہے۔

پاکستان کی اخلاقی پستی اور اقتصادی بد حالی کا سبب انور شیخ اسلامی قانون کو قرار دیتے ہیں۔ درآنحالیکہ پاکستان میں سرے سے اسلامی قانون ہی رائج نہیں ہے۔ وہاں اسلامی قانون کے نفاذ اور پردے کی پابندی کے خلاف تو عورتوں تک نے احتجاج کیا ہے۔ وہاں تو مغرب پرستی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ پاکستان کی مغرب پرستی ہی وہاں کی اخلاقی پستی اور اقتصادی بدحالی کی اصل وجہ بنی ہے۔ یہ صرف پاکستان ہی کا حال نہیں دنیا کے نقشہ میں جتنے بھی نام نہاد اسلامی ممالک مغرب زدگی کا شکار ہیں وہاں کے اقتصادی و اخلاقی حالات ایک جیسے ہیں۔ میں پھر کہوں گا کہ یہ اسلامی قانون کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلامی قانون کے عدم نفاذ کی وجہ سے ہے۔ اسلامی قانون تو ایک بہترین اخلاقی معاشرہ پیدا کرتا ہے جس کی بلند اخلاقی اور اقتصادی خوشحالی کا یہ حال ہوتا ہے کہ زیوروں سے لدی ہوئی ایک نہایت حسین و جمیل عورت تن تنہا صنعاء سے مدینہ تک سفر کرتی ہے تو کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھنے والا بھی نہیں ملتا اور وہ بہ احسن حفظ و اماں میں اپنے مستقر پر پہنچ جاتی ہے۔ حدیث شریف میں یہ اسلامی معاشرے کی پہچان ہے۔

انور شیخ کے اس مضمون میں بعض مفروضات تو بے سر پیر کے ہیں۔ بعض ان کی جہالت کی پیداوار اور بعض اسلام سے بغض و عناد کا نتیجہ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ مضمون تمام کا تمام متضاد بیانی کا گورکھ دھندا بنا ہوا ہے۔ انہیں قرآن پر یہ اعتراض ہے کہ اسکی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات میں (انور شیخ نے اپنے مضمون میں ہر جگہ قرآن حکیم کی ۶۰ ہزار آیات بتلائی ہیں ان کی علمی پس ماندگی کا یہ حال اس پر طرفہ ان کی ہمہ دانی کا زعم کہ خدا، رسول اور قرآن تک پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔) صرف ۸۰ آیات ہی کا تعلق قرآن سے ہے۔" اسلئے وہ کہتے ہیں "کبھی ۸۰ آیات سے بھی قانون کی تدوین ہو سکتی ہے؟" لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "جو قوم صاحب کردار ہو وہ اپنے قوانین کا احترام کرتی ہے اور اسے کم سے کم قوانین کی ضرورت پڑتی ہے"۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اخلاقی کردار کو اونچا کردینے سے قانون لاگو کرنے کی کم سے کم ضرورت پڑتی ہے"۔ ان مفروضات کے پس منظر میں جب ہم تاریخ اسلام کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ رب العزت نے حضور اکرمؐ کے ذریعہ پہلے اہل مکہ کو اخلاقی اعتبار سے بلند کیا۔ قرآنی آیات کی نزولی ترتیب میں بھی پہلے درستیٔ اخلاق اور انسانوں کے صالح کردار کی فضیلتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ آیاتِ احکام تو اس وقت نازل ہوئیں جب مسلم معاشرہ "صاحب کردار" بن چکا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کیلئے ان احکامات کی بجاآوری (جو قرآنی آیات کی صورت میں پیش کی گئیں) آسان ہوگئی۔ کہ پھر وہ ان سے سر مو انحراف کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

کسی بھی ملک کا آئین اس ملک کے لوگوں کو مقتدر اعلیٰ کے حکموں کا پابند بنائے رکھتا ہے۔ اگر لوگ اسکے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو قانون انہیں سزا دیتا ہے، لیکن اگر آئین اور دستور ہی کو نہ مانیں تو وہ باغی اور

داغدار گردانے جاتے ہیں۔ غرضیکہ ملک کا آئین سب سے اعلیٰ اور رعیت اس آئین کی غلام ہوتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ جو کائنات کا خالق و مالک ہے، بندے اسکے غلام بن جائیں تو اس میں کیا عار ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کا غلام بننے کو تو فرض شناسی پر محمول کیا جائے اور بادشاہوں کے بادشاہ رب العلیٰ کا غلام بننے کو ذلت تصور کریں۔ انور شیخ! تمہاری یہ کونسی منطق ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ خدا کے آگے سربسجود ہو جاتا ہے تو عزت کی بلندیاں اسے نصیب ہو جاتی ہیں۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

آپ بھی تو طبعاً آزاد ہیں۔ پھر کیوں انگلینڈ ایمپائر کے قانون کو مانتے ہیں۔ برصغیر میں انگریزوں کے ظلم و ستم کی داستانیں تم کو تو خوب یاد ہوں گی۔ آپ تو اس ظلم و ستم کو انگریزوں کی فراست سے تعبیر کریں گے وگرنہ انگلینڈ میں رہنا آپ کو دوبھر ہو جائے گا۔ آپ کا قلم خدا کے بارے میں تو بہت تیز ہو گیا ہے۔ بخدا! اگر آپ میں ہمت ہے تو یہی الفاظ انگلینڈ کے ایمپائر اور وہاں کی کیبنیٹ کے متعلق کہہ کر بتایئے۔ آپ نے تو خدا پر بہتان باندھنے کی بھی حد کر دی۔ آپ کا یہ بیان کتنا اوچھا، کس قدر جھوٹا اور دریدہ دہنی کا عکاس ہے کہ ''(خدا) (نعوذ باللہ) ان کی (کافروں کی) بہن بیٹیوں کو اغوا کرنے اور ان سے بدفعلی کرنے کو کار ثواب اور ذریعۂ جنت قرار دیتا ہے۔'' انور شیخ! اگر آپ واقعی مسلمان ہیں تو مذکورہ جملہ کا مآخذ بتایئے۔ آپ کی تحریر البتہ یہ ضرور بتا رہی ہے کہ تشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم ڈال کر لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا، ویت نام پر برسوں فوج کشی کر کے وہاں کے عوام الناس کو بلا وجہ تنگ کرنا اور انہیں بھوکا پیاسا مار ڈالنا۔ ویٹو پاور کے غلط استعمال سے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو خائف کرنا اور عراق پر امن عالم کے نام پر ہزاروں ٹن بارود انڈیلنا وغیرہ کیا انگلینڈ و امریکہ کے یہ قوانین انسانوں کیلئے مفید ہیں۔ جن کے نفاذ میں خود غرضی اور مفاد پرستی کے سوا اور کچھ نہیں اور اپنی آمریت تسلیم کروانے کیلئے ایک جارحانہ قدم ہے۔ آپ اس قانون کے تو گیت گاتے ہیں اور خدا کے قانون کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو خدا کا دشمن قرار دیتا ہے اور یہی ''حزب الشیطان'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ کل کو آپ اگر انگلینڈ کے آئین کا انکار کرتے ہیں تو وہاں کی حکومت آپ کو غدار کہے گی اور قانوناً چارہ جوئی کر کے آپ کو سزا دے گی۔ پھر اگر اللہ کے قانون کو نہ ماننے والوں کو خدا اپنا دشمن قرار دیتا ہے تو اس میں آپ جیسے ''دانشور'' کو کونسی غلطی نظر آتی ہے۔ جلیان والا باغ کا حادثہ کیا آپ بھول گئے کہ انگریزوں کے زبردستی لادے ہوئے قانون کو نہ ماننے والوں کے ساتھ جنرل ڈائر نے کیا سلوک کیا۔ ان کی حکومت (جو زبردستی منوائی گئی تھی) کے ہندوستانکے باغیوں کو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ سب ظلم و ستم اسی لئے تو ہوئے نا! کہ آمریت کے قانون کو ان لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور انگریزوں کی اس میں سراسر زیادتی تھی۔ انور شیخ! یہ محض آپ کے دماغ کا خلجان اور عقل کا ٹیڑھا پن ہے۔ آپ اپنے تئیں انگریزوں کے درمیان رہ کر احساس کمتری کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور آپ کی مسلمانی اس قابل بھی نہیں کہ کوئی آپ کی عزت کرے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق آپ نے ایسا مضمون لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لی ہے۔ انگلینڈ کے قانون کے تحت آپ اور آپ جیسے دیگر لوگ کیی ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور ہیں یہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس غلامی کو تو آپ نے بہ صمیم قلب قبول کر لیا ہے لیکن اللہ کا حقیقی اور سچا غلام بننے میں آپ شرم محسوس کرتے ہیں۔ ایسے باغی ہر دور میں ہوئے ہیں اللہ نے انہیں زیر و زبر کر کے رکھ دیا ہے کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ آپ اس حقیقت کو کیوں فراموش کرتے ہیں کہ انسانکے بنائے ہوئے قوانین سے روئے زمین پر فتنہ و فساد ہی برپا ہوتا رہا ہے اور امن و آشتی کو زک پہنچی۔ آج بھی جنوبی افریقہ اور امریکہ میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت کالوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ انہیں دوسرے نمبر کا شہری گردانا جاتا ہے۔ ان تمام سہولتوں اور مراعات سے انہیں دور رکھا جاتا ہے جو گوروں کیلئے مختص ہیں انگلینڈ اور امریکہ میں آج بھی کچھ قوانین ایسے ہیں جن کا ماننا ایمپائر اور صدر کیلئے ضروری نہیں۔ ایسے کرپٹ اہل کاروں کو آپ خود انسانی صورت میں شیطان کہتے ہیں تو اللہ کے قانون کے نہ ماننے والوں کو اللہ تعالیٰ شیطانکے گروہ کے لوگ کہے تو آپ پر کونسی افتاد آپڑتی ہے۔؟

انور شیخ نہایت گستاخانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ''قانون بنانے کا حق صرف انسان کو حاصل ہے کسی ماورا طاقت کو نہیں۔'' اس کی توضیح وہ یوں کرتے ہیں کہ انسانکے پاس دانش ہے اور دانش توہمات و عقیدت سے برتر ہوتی ہے۔ وہ وحی والہام کو توہمات میں شمار کرتے ہیں۔ انکے نزدیک خدا اسلئے خدا ہے کہ وہ دانشور ہے۔ جب خدا ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اور دانشور بھی ہے تو ظاہر ہے کہ انسان کو جس نے دانشور بنایا وہ دانشوروں کا دانشور ہے۔ وہ اگر وحی والہام کے ذریعہ اپنے پیغمبروں کے توسط سے فرمان الٰہی لوگوں تک پہنچاتا ہے تو پھر انور شیخ کو ان قوانین کا انکار نہیں کرنا چاہئے۔ کیا

انگلینڈ کیبنٹ کے فرامین انگلینڈ ایمپائر آپ کو لاکر سناتا ہے یا دو پیسے کے کاغذی اخبار یا ریڈیو ٹی۔وی کے ذریعہ وہ آپ تک پہنچتے ہیں۔ بیجان چیزوں اور سڑے کاغذ پر آئے ہوئے قوانین کو تو آپ مان لیتے ہیں اور انکے انکار کی جرأت بھی نہیں کرتے تو جس اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت محمدؐ (جن کو آپ کے بھائی The Hundreds) میں پہلے نمبر پر شمار کرتے ہیں) کے ذریعہ اپنے فرامین ہم تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے ان قوانین کے ماننے میں آپ کو پس و پیش کیوں؟ لیکن اپنی فراست اور دانش کے بل بوتے پر آپ ہر قدم پر ٹھوکر کھا رہے ہیں اور آپ کی کیا بات جب بھی انسان نے خدا کو بھول کر اپنی دانش کی رہنمائی اختیار کی ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھائیں۔ ہاں! بیچارے جو اہل دانش و فراست ایمان والے تھے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"۔

انور شیخ نے بڑی دریدہ دہنی سے قرآنی آئین کو فتنہ کی جڑ کہا ہے۔ وہ اسلئے کہ قرآن نے مسلمان اور کافر دو گروہوں میں انسان کو بانٹ دیا ہے اور نعوذ باللہ "خدا انسانوں کی باہمی عداوت سے اپنی سبقت قائم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ انور شیخ کا دماغی فتور ہے اور محض انگلینڈ و امریکہ کے قانون کی افضلیت کو اسلامی قانون کے مقابلے میں ظاہر کرتا ہے۔ اسلئے کہ انہیں اہل مغرب کی غلامی میں آقائی نظر آتی ہے۔ وہاں کی نفس پرستانہ تہذیب میں اپنے نفس لوامہ کے چونچلے پورے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مادہ پرستی کے حسین مناظر میں انسانوں کی بہیمیت میں بھی انہیں انسانیت دکھائی دیتی ہے۔ جہاں کے قوانین نے انسانوں کو رنگ و نسل کے اعتبار سے دو گروہوں میں بانٹ دیا ہو حالانکہ وطن دوستی اور جفاکشی میں دونوں برابر ہیں تو پھر کالوں کو وہ مراعات حاصل کیوں نہیں جو گوروں کو ہیں۔ کالوں کے ساتھ کیوں سوتیلا پن روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں فرقہ بندی اور گروہی حصار تو بالکل ہی نہیں ہیں۔ وہاں تو صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ "عربوں کو عجمیوں پر کوئی فوقیت نہیں اور نہ گوروں کو کالوں پر۔ کیونکہ سب ایک آدم کی اولاد ہیں۔ آدم مٹی سے بنے ہیں۔ قرآن و حدیث کی اس صاف صریح تصریح کے بعد بھی اگر انور شیخ کو اسلام کے قوانین گروہ بندی کو تقویت دینے والے نظر آتے ہیں تو اس میں انکے دماغ کا قصور ہے اور سوچ و فکر کی کج روی۔

ہاں! قرآن نے "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" جو گروہ بتائے وہ صرف احکام الٰہ کی پابندی کرنے والے اور خدا کے حکموں کو نہ ماننے والے ہیں۔ یہ گروہ بندی تو انگلینڈ کے قانون میں بھی ہے اور دنیا کے ہر ملک کے قانون میں بھی۔ ملکی آئین کو ماننے والا "شہری" اور نہ ماننے والا "باغی"۔ اب حکومت ملکی قانون نہ ماننے والے کو سر پر نہیں بٹھاتی بلکہ اسے ملک بدر بھی کر سکتی ہے اور سزا بھی دے سکتی ہے۔ جیسا کہ انگریزوں نے ہمارے ملک میں آکر زبر دستی اپنے قوانین کا نفاذ کر کے اسکے نہ ماننے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دیں۔ اور ان قوانین کو بے چوں چرا ماننے والوں کو سر، نواب، صاحب بہادر، رائے بہادر جیسے خطابات سے نوازا اور ان پر اکرام و نوازشوں کی ایسی بارش کی کہ بے چارے نہال ہو کر انگریزوں کے قدم چاٹنے لگ گئے۔ آج بھی امریکہ اور انگلینڈ ویسی ہی چال چل رہے ہیں۔ امریکہ کے خود ساختہ قانون کے نہ ماننے پر ویت نام کی ناکہ بندی، جاپان پر بم باری، عراق کا مقاطعہ اور نہ جانے کیا کیا کر یہہ طریقے اپنائے جا رہے ہیں کہ جس سے انسانیت بلبلا رہی ہے۔ اب یہ بھی تو گروہ بندی ہوئی نا! پھر اس پر آپ کو اعتراض کیوں نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ قطرۂ ناپاک سے بنے اور خاتمہ میں سڑ گل جانے والے انسان کو خدائے برتر کے آگے ایسی سرکشی نہیں کرنی چاہئے۔

انکے اعتراض کے طفلانہ پن کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے:

(اے انسان) "اپنے آقا جو تیرا خدا ہے۔ اسے اپنے دل کی گہرائی۔ روح اور پوری قوت سے پیار کر۔" تورات کی اس آیت پر اعتراض کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں۔

"ملاحظہ ہو کہ خدا ایک نادان اور یتیم بچے کی طرح ہے جو انسان کی محبت کیلئے ترس رہا ہے۔" ماہرین قانون کا کہنا ہے کہ ملک اور اسکے آئین کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھو۔ اور اسی کی برتری تسلیم کرو۔ ان کا یہ کہنا تو دانشوری ٹھہرے اور خدا اپنے بندوں کو چاہے اور محبت کرنے کیلئے کہے تو نعوذ باللہ نادان قرار دیا جائے۔

ان کا یہ بھی اعتراض ہے کہ "زنا مت کرو، کسی کو ہلاک مت کرو، چوری مت کرو، اپنے پڑوسیوں کے خلاف جھوٹی گواہی مت دو، اپنے پڑوسی کے مکان، بیوی، نوکرانی ..... یا اس کی کسی بھی چیز پر نظر بد مت ڈالو۔ وغیرہ میں کوئی حکمت پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تو عام باتیں ہیں۔ جنہیں ایک معمولی عقل کا آدمی بھی جانتا ہے"۔ یہ ساری باتیں مذہبی اعتبار سے بھی گناہ متصور کی جاتی ہیں اور دنیا کے تمام ممالک کے قوانین اسکے مرتکب کو گناہگار (مجرم) سمجھتے ہیں۔ جب یہ عام باتیں ہیں اور معمولی فراست کا آدمی بھی ان کو سمجھ سکتا ہے تو پھر آئے دن چوریاں کیوں ہوتی ہیں۔ اور انکے کئے پر سزائیں کیوں دی جاتی ہیں۔ دوسروں کی بیویوں بیٹیوں کے ساتھ کھلم کھلا زنا (جو انگلینڈ، امریکہ، فرانس میں عام ہے اور وہاں کی تہذیب کا جزو مانا جاتا ہے۔ امریکہ کے صدر بل کلنٹن کا واقعہ ابھی ہمارے ذہن سے مٹا تک نہیں) کیوں کیا جاتا ہے؟ پڑوسیوں کی لڑکیوں کے ساتھ گل چھرّے کیوں اڑائے

جاتے ہیں؟ اور ایسا کرنے پر مغرب کا قانون صدر، وزیر اعظم اور شہزادی کو تو چھوڑ دیتا ہے لیکن عام انسانوں کو البتہ سزا دی جاتی ہے۔ انور شیخ! یہ سب آپ کے مغرب کے قانون کی بد حالی ہے۔ خدا کے قانون میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ یہاں تو "فاطمہ بنت قیس ہی نہیں فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرے تو ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں۔" اسلامی قانون میں حسب نسب یا کمتر و برتر کو نہیں دیکھا جاتا۔ اب جبکہ یہ چھوٹے چھوٹے قانون آئین کا جزو دنیا کے ملکوں میں ہو چکے ہیں تو آپ کو خدا کی کتاب میں ان کی شمولیت پر کیوں اعتراض ہے۔

انور شیخ بڑی بے غیرتی سے مغربی جمہوریتوں کے قوانین کو یہ کہہ کر سراہتے ہیں کہ وہ جمہور کی آزادی ترقی اور خوشحالی کے ضامن ہیں۔ اگرچہ اس دعوے کی انہوں نے کوئی دلیل نہیں دی۔ برخلاف اسکے آئے دن کی خبریں یہ دلیل فراہم کرتی ہیں کہ مغربی قوانین کی بے اثری کی وجہ سے وہاں کی انسانی زندگی تباہ ہوتی جارہی ہے۔ دن دھاڑے قتل و غارت گری وہاں کا معمول بن گیا ہے۔ عصمتوں کی حفاظت ناممکن ہے۔ بچوں تک کھلے مہار ریوالوروں کا استعمال جس تہذیب میں کرتے ہوں اور وہاں کا قانون کچھ نہیں کرسکتا۔ پھر بھی اس قانون کی سراہنا کونسی عقلمندی ہے؟ صدر امریکہ آفس لیڈی سے زنا کرتا ہے، اعتراف کرتا ہے اور جب اس پر قانونی چارہ جوئی کرکے کہا جاتا ہے تو یہ صدر کا پرسنل (نجی) معاملہ ہے کہہ کر اس پر قانونی کارروائی نہیں کی جاتی۔ حضرت! یہ ہیں آپ کے مغربی قوانین۔ دنیا کے تمام ممالک میں سب سے بڑے سوپر پاور مغربی تہذیب کے عظیم الشان ملک امریکہ میں خود کشیوں کی شرح فی صد سب سے زیادہ کیوں ہے؟ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے۔ لیکن اب ایک نظر اسلامی ملک کو بھی دیکھ لیجئے۔ قانون کی گرفت مضبوط ہونے کی وجہ سے دنیا کے نقشہ میں عرب ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں چوریاں بہت کم ہوتی ہیں۔ اور جرائم کا عدد شمار بھی بہت کم ہے بلکہ نہیں کے برابر۔ اب جہاں جرائم نہ ہوتے ہوں وہاں امن متصور کیا جائے گا کہ جہاں سڑکوں پر ریوالوریں چلتی ہوں وہاں کا قانون اچھا مانا جائے گا۔ سر پھرے پن کی بھی حد ہوتی ہے انور شیخ! صحیح بات آپ اگر تسلیم کرنے کا مادہ رکھتے ہوں تو سنیئے۔ اسلامی قانون میں توازن ہے، اخلاق ہے، بیہودگی سے دور اور بہیمت سے بیزار ہے۔ اسکے نفاذ سے معاشرے میں امن و آشتی کو فروغ ملتا ہے اور انسانی زندگی میں سکون و شادمانی۔

انور شیخ نے قرآن کی چند آیات جن میں احکام دیئے گئے ہیں (آیات محکمات) پر اعتراض کیا ہے اور ان ہی آیات کا ترجمہ پیش کیا ہے جو اسکے اعتراض کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ مثلاً عورتوں کو گھروں میں رہنا چاہئے۔ مرد عورت کو بے وجہ طلاق دینے کا مجاز ہے۔ (یہ ترجمہ محل نظر ہے) مرد بیک وقت چار بیویاں اور جتنی کنیزیں چاہے رکھ سکتا ہے۔ عورت مرد کا حکم نہ مانے تو اس عورت کی اس وقت تک پٹائی کرنی چاہئے جب تک وہ سر تسلیم خم نہ کرے۔ (یہ ترجمہ بھی اصل آیات سے لگا نہیں کھاتا)

اب اسلام میں ان قرآنی احکام کو کس طرح رو بہ عمل لایا گیا اور ان احکام کی اصلیت کیا ہے وہ بھی ملاحظہ کریں جن کو مصنف نے دانستہ چھوڑ دیا ہے یا توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کیلئے رفیق و دمساز ہیں"۔ (التوبہ:۷)

(۲) "ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ داروں سے اجنبی ہمسایہ سے پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں احسان کا معاملہ رکھو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے چیز کو محبوب نہیں رکھتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو۔" (سورہ النساء)

(۳) "اپنی بیوہ عورتوں اور صالح غلام اور لونڈیوں کا نکاح کرو"۔ (النور: ۳۲)

(۴) اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی و نافرمانی کا خوف ہو ان کو نصیحت کرو (نہ مانیں تو) خوابگاہوں میں ان سے ترک تعلق کرو۔ (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کرنے کیلئے کوئی بہانہ نہ ڈھونڈو"۔ (سورہ النساء:۶)

عورتوں کے حق میں زیادتی کرنے سے اللہ رب العزت تو بار بار ڈراتا ہے اور انور شیخ کو پورے قرآن میں توڑ مروڑ کر پیش کیا ہوا وہی ترجمہ نظر آتا ہے۔

جہاں تک طلاق کا تعلق ہے تو یہ اسلام میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ حلت کے دائرہ میں آتا ہے۔ اور اس کی تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ جب دونوں کے درمیان نباہ کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے تو اس انداز میں طلاق دے کر بیوی کو گھر سے علیحدہ کرو جیسے دو دوست کسی ناگزیر حالات کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ ہورہے ہیں۔ نہایت خوش اسلوبی سے علیحدہ کرنے کی تاکید حضورؐ نے بار بار کی ہے۔ اسلئے انور شیخ کا یہ ترجمہ کرنا کہ "مرد عورت کو بے وجہ طلاق دینے کا مجاز ہے" یقیناً اسلام دشمنی کو ظاہر کرتا ہے۔

اسلام میں مرد کیلئے زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کے ساتھ بیک وقت نکاح کرنے میں بھی پابندی ہے کہ جب تک ان تمام کے درمیان وہ (مرد) عدل کرسکتا ہے۔ وگرنہ اسے چاہئے کہ

صرف ایک ہی کو نکاح میں رکھے۔ چاروں یا ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ انصاف کرنے اور تمام کے حقوق کی برابر ادائیگی کرنے کی اللہ کے رسولؐ نے تاکید فرمائی ہے۔ پھر آگے چل کر حضورؐ کی چار سے زیادہ بیویوں کے رکھنے پر انور شیخ نے چھوٹا منہ بڑی بات کر کے اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ اسلام کا صحیح تاریخی تجزیہ کرنے والا یہ حقیقت بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ان نکاحوں میں آپؐ کی نفسانی خواہشات کو کوئی دخل نہیں تھا۔ آپ کے نکاح میں صرف ایک ہی باکرہ آئی تھیں باقی تو مطلقہ یا بیوہ یا کنیز کی صورت میں آپ کے حرم میں داخل ہوئی تھیں۔ وہ محض اسلئے تھا کہ اسلام کے فروغ کیلئے دیگر قبیلہ کے لوگوں سے تعلقات قائم ہو جائیں۔

مسلمان اور کافر کے درمیان عدم تعلقات کو انور شیخ نے کچھ زیادہ ہی ہوا دی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کافروں (نافرمانوں) کے ساتھ برسرپیکار رہنے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن انکے ساتھ نرمی اور صلہ رحمی کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے بلکہ وہ کافر جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا ہو تو قتل کا کفارہ مسلمان مقتول کے برابر دینا ہوگا۔ فرمان خداوندی ہے:

(۱) جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے ورثاء کو خوں بہا ادا کرے۔ الا یہ کہ وہ خوں بہا معاف کریں۔ اور اگر وہ کسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو گیا تھا تو اسکے ورثاء کو خوں بہا دیا جائے گا اور مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔" (سورہ النساء:۹۲)

(۲) "تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (سورہ البقرہ:۱۹)

اس طرح اللہ رب العزت قرآن حکیم میں جہاں جہاں بھی مشرکین و کافرین سے جنگ کا حکم دیتا ہے اس کا مقصد ظلم و زیادتی سے دفاع اور فکر و عقیدہ اور اشاعت و دعوت کی بحالی ہے۔ قرآن غیر مسلموں سے کئے گئے معاہدوں کے پاس و لحاظ میں اس قدر شدید ہے کہ معاہدین کے خلاف مسلمانوں کی مدد کرنے سے بھی روک دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو یہ مدد تم پر فرض ہے۔ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو"۔ (الانفال:۷۲)

نافرمانوں کے ساتھ ایفائے عہد کے باب میں اسلام کا ایک بلند و مثالی ضابطہ مذکورہ بالا آیات پیش کرتی ہیں جو مقامی مصالح اور محدود اغراض و مفادات اور دینی علائق سے بھی بلند ہے۔

انور شیخ جب دیکھتے ہیں کہ اسلام کا سیاسی نظام نہ نام نہاد "جمہوریت" پر اترتا ہے نہ "بادشاہت" پر تو کہہ اٹھتے ہیں کہ "اس پر یقیناً جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اطلاق ہوتا ہے۔" پہلے تو اللہ کے قانون کو بندوں کے بنائے ہوئے قوانین سے جوڑنے کی کوشش ہی مضحکہ خیز ہے۔ اس پر طرفہ کہ اللہ کا قانون دنیاوی قوانین کے مطابق نہ نکلے تو اسے جس کی لاٹھی ...... کہہ دینا یہ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ حالانکہ اسلام میں نظام حکومت حکام کی جانب سے عدل، محکومین کی جانب سے اطاعت اور حاکم و محکوم کے مابین "شوریٰ" پر مبنی ہے۔ اسلام کا نظام حکومت نہ دنیا کے دانشوروں کے بنائے ہوئے نظاموں میں سے ایک ہے نہ ان کا کوئی مرکب و مخلوط ہے اور نہ وہ دیگر نظاموں سے خوشہ چینی کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ ایک مستقل بالذات نظام ہے جس کے اپنے علیحدہ ذرائع و وسائل ہیں اور جن کا اپنا علیحدہ طرز فکر۔ اسلامی نظام حکومت عالم انسانیت کیلئے نظام کامل ہے۔ اس میں انسانیت کے تمام مشکلات کے حل کیلئے ایک مکمل علاج ہے۔ یہ ایسا نظام ہے جو قانون کے ساتھ ضمیر و عدل کی بنیاد پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلم حاکموں کو فرماتا ہے:

"کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ (المائدہ:۸)

حضرت محمدؐ کا پاک ارشاد ہے:

قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ قریب مقام پانے والا شخص امام عادل ہوگا اور سب سے زیادہ مبغوض اور شدید ترین عذاب کا مستحق امام جائر ہوگا۔ (الترمذی)

پھر بھی اگر انور شیخ کو تامل ہو تو وہ طاقتور اور کمزوروں کے درمیان چلنے والی جدید سیاست کا مطالعہ کریں۔ مغربی سیاست کے باب العدل کا بھی مطالعہ کریں جو امریکہ اور یورپ میں سفید اقوام سرخ و سیاہ قوموں کے ساتھ برتتی ہیں۔

بعد کے صفحات میں انور شیخ نے اسلامی فقہ اور کافر و مسلمان کے عدم تعلقات پر بحث کی ہے۔ جو مضمون کے ابتدائی صفحات میں کہیں نہ کہیں آئی ہے اسلئے اس پر لکھنا گویا اس کا اعادہ کرنا ہی ہوگا۔ اس میں زیادہ لفاظی ہی ہے اور دور از کار تاویلات سے بھری ہوئی تحریر ہے۔ انور شیخ کا نہ ماننے کا جذبہ تو انکے ہر جملے سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر کیوں بحث کو طول دیا جائے۔ آخر میں ان سے اتنا ہی کہنا ہے کہ مرنے کے بعد آنے والی زندگی کی فکر کریں اور سچے دل سے توبہ کر لیں۔ اللہ معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ آپ کے قطرۂ عرق انفعال کو موتی سمجھ کر چن لے گا۔ اللہ آپ کو صحیح سمجھ عطا کرے آمین۔

ZAKIR HUSAIN INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES
JAMIA MILLIA ISLAMIA, JAMIA NAGAR
NEW DELHI - 110025

پروفیسر اخترالواسع کا ایک خط

۲۷ر اگست ۱۹۹۹ء

برادرم اعجاز صاحب ـــــ سلام و تحیات

آپ کا محبت نامہ ملا۔ یاد فرمائی اور کرم گستری کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ خط کے ساتھ انور شیخ صاحب کا مضمون بہ عنوان "علامہ اقبال ـــ غارگر ملت" بھی موصول ہوا۔

مضمون میں لہجہ تو لہجہ ذہن بھی بگڑا نظر آتا ہے۔ اقبال شاعر تھے، ان کی شاعری میں مختلف فکری سانچے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ فکری سانچے اگر مختلف ہیں تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔ ہر شخص اپنے عہد سے الگ رہ کر تو نہیں جیتا۔ مختلف مواقع پر وہ مختلف انداز سے پیش آتا ہے یا الگ الگ صورتوں میں الگ الگ طریقوں سے اپنے عمل اور ردِّ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اقبال جس عہد میں پیدا ہوئے اور جیئے وہ ہماری تاریخ کا ایک ایسا دور تھا جب ملک اور مسلمان دونوں اپنے اپنے دائروں میں رہ کر اور اکثر ایک ساتھ مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اقبال ہی کیا کوئی بھی ایسا قومی و ملی رہنما نہیں ہے جس کی فکر اور عملی رویوں میں تناقض نہ پایا جاتا ہو۔ لیکن اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کسی فرد کے نظام فکر میں محوری حیثیت کس جذبے اور خیال کو حاصل ہے۔ اقبال کے یہاں اسلام اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اصل جذبے کے طور پر نمایاں اور کار فرما نظر آتا ہے۔ وطن سے محبت ایک اور جذبہ ہے جسکی زیریں لہر ـــــ لیکن خاصی توانا، ان کی فکر کا حصہ ہے۔

رہا اس بات کا سوال کہ ان کے دادا ہندو تھے اور باپ شروع میں قادیانی نیز اقبال خود بھی قادیانی تھے، یہ اس لئے کوئی خاص بات نہیں کہ جب ان کے والد اور انہوں نے خود اس فریب کو سمجھ لیا تو وہ اس سے نہ صرف الگ ہو گئے بلکہ اس کے پردۂ مذہب کو انہوں نے چاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

مغرب میں اپنے قیام میں اقبال نے قومیت کا جب وہ رنگ دیکھا جو فاشزم کی شکل میں سامنے آرہا تھا اور جو دو عالمگیر جنگوں کا سبب بھی بنا تو ایک حساس اور دردمند انسان کی حیثیت سے انہوں نے اپنے فکری رویوں میں بھی تبدیلی کی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ وطن کی محبت کے منکر ہو گئے تھے۔ ان کے آخری زمانے کے کلام میں ان کی نظم "شعاعِ امید" پڑھیئے تو اقبال کی ہندوستان سے محبت اور توقعات کا سراغ مل سکتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ اقبال نے اپنے الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں تقسیم کی بات نہیں کہی اور یہ صرف ہمارے پاکستانی دوستوں کی سیاسی اغراض کی وجہ سے ان کی طرف سے پروپیگنڈہ ہے تو اس کے لئے اقبال کو مجرم کیوں قرار دیا جا سکتا ہے۔؟ رہا شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے خلاف ان کے اشعار کا معاملہ تو وہ ان کا وقتی ردِّ عمل تھا۔ پھر یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ اقبال کی ہر بات سے اتفاق ہی کیا جائے۔ بحیثیت ایک مسلمان کے ہم میں سے ہر شخص کا یہ ایمان ہے کہ جو چیز بھی قرآن و حدیث سے متصادم ہو وہ ہمارے لئے قطعاً قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ وہ چاہے اقبال کی فکر کا حصہ ہو یا سرسید کے مشن کا جز یا اور کسی بھی عالم و دانشور کے فکر و عمل کی صورت۔

میرے گھر کا پتہ درج ذیل ہے:-

B-111, JAMIA ENCLAVE, JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 110025

ابھی ایک ہفتے قبل مجھے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے وابستگی کے ساتھ ہی ساتھ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا ڈائریکٹر بھی بنا دیا گیا ہے، اس لئے معروفیات میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بناء پر خط کا جواب دینے میں تاخیر ہوئی اور اس کے لئے شرمندہ ہوں۔

آپ کی محبت کے لئے ایک بار پھر شکریے کے ساتھ

مخلص ـــــ

اخترالواسع

انور شیخ

اقبال کا نظریۂ عقل و عشق

علامہ اقبال نے اپنی شخصیت کا خاکہ اس چابکدستی سے کھینچا ہے کہ اس پر مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ فرماتے ہیں:

حضور حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

شعریات اقبال نے آخر یہ معجزہ کر ہی دکھایا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے ہندستان کے اس تاریخی دور کا تصور کیجئے جس کا تعلق اگست ۱۹۴۷ء سے ،۔ میں نے ریلوے اسٹیشن لاہور پر قیامت کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ امر تسر سے آنے والی گاڑی ایک ہزار سے بھی کہیں زائد مسلمانوں کے خون ، لت پت تھی۔ یہ قیامت جو تقسیم ہند کے روپ میں رونما ہوئی بڑی حد تک اقبال کی شاعری کا ہی ایک کرشمہ تھی۔ اگر ہزار چوہدری رحمت علی بھی شش کرتے تو وہ تصورِ پاکستان کو حقیقت میں نہیں بدل سکتے تھے کیونکہ اس کیلئے ایک ایسا اجتماعی رجحان پیدا کرنے کی ضرورت تھی جس کی بنا عقل کے ئے جذبات پر ہو۔

اقبال نے یہ طرۂ امتیاز کس طرح حاصل کیا؟ اس کا ذریعہ ان کی غیر فطری شاعری ہے جس کی اساس عقل کی تضحیک اور عشق کی ترغیب پر ہے۔ ہوں نے عقیدے کو دانش پر ترجیح دینا اپنا مسلک بنالیا اور اپنی شاعری سے مسلمانانِ ہند کو یہ یقین دلایا کہ ''ہندستانی قومیت سراسر ایک لغویت ہے۔ لامی نقطہ نظر سے وطن سب سے بڑا بت ہے جسے توڑنا ہی سچی مسلمانی ہے۔ اسلئے قومی اعتبار سے وہ صرف مسلمان ہیں''۔ لوگ علامہ موصوف کی باتوں ں آگئے اور انہیں یہ یاد نہ رہا کہ دنیا بھر کے مسلمان اپنی اپنی علاقائی شناخت کے سبب عربی، مصری، ایرانی، افغانی اور ترک ہیں تو پھر ہندستانی مسلمانوں کی ری قومیت میں کیا قباحت ہے؟ محض ہندوؤں کے تعصبات کی وجہ سے اپنے ہی وطن کو دارالحرب گردانتے ہوئے اسے گہوارۂ شر قرار دینا اور تقسیم وطن پنی مشکلات کا حل سمجھنا انتہائی نادانی اور بزدلی تھی۔ یہ فطرت کے خلاف اعلان جنگ تھا کیونکہ ہر انسان پیدائشی طور پر تمدنی، لسانی اور نسلی اعتبار سے کسی سی گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی اس کا قومی تشخص ہے جس کے بغیر انسانی تہذیب پروان نہیں چڑھ سکتی۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کا ذکر کرتے ئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ خالق نے بنی نوع انسان کو اسلئے شعوب و قبائل میں تقسیم کیا ہے کہ وہ پہچانے جائیں (الحجرات ۴۹:۱۳)۔ یہ قومی پہچان جو مانوں کی عزت اور ذلت کا سبب بنتی ہے تاریخ اقوام اور تمدن کی روح ہے۔

جب قدرت نے عوام کو گروہوں، قبیلوں اور قوموں میں بانٹ دیا ہے تو اس اصول کی خلاف ورزی ایک فطری عمل کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک طرف دعویٰ کہ اسلام وطنیت کا دشمن ہے اور دوسری طرف یہ مطالبہ کہ مسلمانانِ ہند کو ایک الگ وطن (پاکستان) کی اشد ضرورت ہے ایک انتہائی احمقانہ اقدام ہ۔ ایک غیر فطری تقاضا ہونے کے سبب یہ دیرپا بھی ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ایک قلیل عرصے میں دو اوطان یعنی پاکستان اور بنگلہ ش میں بٹ گیا اور اس طرح ہندوستانی مسلمان جو خود کو ایک قوم سمجھتے تھے اپنی حریف قومیتوں میں منقسم ہو گئے۔ نتیجتاً وہ سب کے سب پسماندگی مپرسی، غربت، ناانصافی اور ظلم و ستم کا شکار بن چکے ہیں اور ان کی زبوں حالی کا عالم اس قدر دردناک ہے کہ یہ قیامت سے کم نہیں اسلئے اسے ''اعجاز ل'' سے منسوب نہ کرنا غیر مناسب ہوگا۔

یہ انسانی تمدن کا ایک اٹل اصول ہے کہ جو جس وطن میں پیدا ہوا وہی اسکی وطنیت یعنی قومیت ہوتی ہے اور اس میں مذہب اور ذاتی عقائد کو کوئی ل حاصل نہیں۔

اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ مذہب میں عقیدت مندی کے باعث آزادیٔ افکار کیلئے کوئی گنجائش نہیں جو کہ فلسفہ دانی کی ادہے۔ علامہ اقبال نے اسی لئے کہا تھا ۔

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ　　　آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

''فکر خداداد'' عقل کا دوسرا نام ہے۔ اگر عقل کو اوہام ورسوم کی زنجیر پہنادی جائے تو وہ اس پرندے کی مانند ہے جس کے پر کاٹ دیئے گئے ہوں، جو اڑ نہ سکے اسے پنچھی کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جب عقل معنوی بندشوں سے آزاد ہو تو وہ آزادیٔ افکار کی ماں بن جاتی ہے لیکن اقبال اسے ''ابلیس کی ایجاد'' سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو فلسفی کہنا نوعیت فلسفہ سے قطعی جہالت کا اعتراف ہے۔ جو شخص حریت فکر کے زیور سے آراستہ نہ ہو وہ کبھی فلسفی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفیانہ سوچ کی بنیاد عقل اور مشاہدہ پر ہوتی ہے اور جو بات دانش کے خلاف ہو وہ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ دو اور دو ہمیشہ ہی چار گنتا ہے۔ محض عقیدت کی وجہ سے اسے سوا چار یا پونے چار نہیں شمار کرتا یہی وجہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام نے ایک بھی فلسفی پیدا نہیں کیا حتیٰ کہ ابن رشد اور بو علی سینا بھی اس مقام تک نہیں پہنچتے۔ فلسفی کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک منفرد نظامِ فکر کا موجد ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ فکری قیود سے پوری طرح آزاد نہ ہو۔ جنہیں اہل اسلام ''مسلمان فلاسفر'' کہتے ہیں وہ دراصل متکلمین تھے۔

مسلمان ہونے کے ناطے سے ان کی فکر اسلامی حدود کی پابند تھی اور وہ ان سے باہر نہیں جا سکتے تھے جسے اسلام نے جائز قرار دیا وہ اسے ناجائز کہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ایسے درجنوں سوالات ہیں جن پر صرف ایک فلسفی ہی غیر جانبداری سے غور کر سکتا ہے۔ یہ کسی مسلمان مفکر کے بس کا روگ نہیں۔ اقبال نے اسی لئے کہا تھا ؎

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد

یہاں بقول اقبال فلسفی وہ ہے جس کے دل کی موت واقع ہو چکی ہو یعنی اس میں عقیدہ و ایمان کا مکمل فقدان ہو۔ یہ نتیجہ ہے آزادیٔ فکر کا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

یہ کوتاہ نظری اور شاعرانہ زبان درازی کی انتہا ہے۔ شہباز اسی لئے شہباز ہے کہ اسے اپنی پوری قوت پرواز آزمانے کا حق حاصل ہے۔ یہی آزادیٔ پرواز اس کی شہبازی کی ضامن ہے۔ اسی طرح عقل بھی اسی وقت تک عقل کہلانے کی مستحق ہے جب کہ فکر و تدبر اس کی اپنی قدرت کے تحت ہوں۔ اگر اسے عقیدت کی پٹریوں میں جکڑ دیا جائے تو وہ مشعل راہ نہیں رہتی بلکہ اس اندھے کی مانند بن جاتی ہے جسے اپنی راہ ٹٹولنے کے لئے لاٹھی کی ضرورت پڑتی ہے۔

کہتے ہیں کہ عقل نور ہے لیکن یہ مقولہ اسی وقت تک صادق ہے جب تک عقل کو کجروی کا حجاب نہ پہنایا جائے۔ اگر اسے ذریعۂ صداقت بنانے کے بجائے تاویل بازی کا آلہ قرار دے دیں تو، تو یہ ایک ایسی سیاہی کا روپ دھار لیتی ہے جو روشنی کو اس طرح تاریکی میں بدل دیتی ہے جیسے گرہن ضیائے مہر کیلئے ردائے ظلمت ثابت ہوتا ہے۔ جو شخص متکلم ہو اسے اپنے اعتقادات کا جنون ہوتا ہے جو اکثر فرضی۔ لغو اور ماؤف الدماغی کا نتیجہ ہونے کے علاوہ اسے اسی طرح نفسیاتی سہارا دیتے ہیں جیسے لاٹھی بڑھاپے یا اندھے پن کیلئے ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک متکلم دراصل دشمنِ عقل ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں عقل کی کمی ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ اعلےٰ فراست کا مالک ہو لیکن وہ اسے عیارانہ طور پر اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے استعمال کرتا ہے اور اس طرح باطل کو عقلی دلائل سے سچ ثابت کرنے پر مُصِر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایک متبادل نقطۂ نظر کی ضرورت پڑتی ہے جسے وہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے تاکہ اس کا سر اونچا رہے۔ دنیائے اسلام میں اسکی کئی مثالیں ملتی ہیں جیسے تصوف کو شریعت کے خلاف کھڑا کر دیا گیا ہے حالانکہ قرآن کی رو سے تصوف بدعت کا بدترین نمونہ ہے۔ اسی طرح صوفیا نے عقل کو شیطان اور عشق کو یزدان کا درجہ دے رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال کو متکلمین کے زمرے میں شامل کرنا بھی مشکل ہے چہ جائیکہ انہیں فلسفی کہا جائے۔ ان کی عقل دشمنی کا جنون انہیں اس سعادت سے محروم کرتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیء محفل نہیں ہے

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے ؟چراغِ رہگذر ہے

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ

ان چند مندرجہ بالا اشعار سے عقل کی تحقیر اور عشق کی تکبیر کا ثبوت ملتا ہے اور یہی اقبال کے متکلمؔ ہونے کی علامت ہے۔ عقل کیا ہے ؟اور عشق کیا ہے ؟ یہ بہت اہم سوالات ہیں فلاسفہ نے ان کے جوابات دینے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ میں بھی ان پر اپنا اظہار خیال ضرور کروں گا لیکن صرف ایسا کرنے سے زیر بحث مسئلہ کی نوعیت اجاگر نہیں ہو سکتی۔ اس کیلئے علم کلام کے پس منظر سے آشنائی مفید ثابت ہو گی:

سلطنت روم جو بعد میں بازنطینی نام سے مشہور ہوئی اس کیلئے سیاسی طور پر عیسائیت کو اپنانا لازم ہو گیا تا کہ لوگوں کو مذہبی جال میں پھنسا کر شدتِ عقیدت سے ان پر اپنا وقار قائم رکھ سکے۔

اس سے پیشتر رومن سلطنت Paganism کی مربّی تھی۔ اسے غلطی سے اصنام پرستی بھی کیا جاتا ہے لیکن یہ سریانی فلسفہ پر مبنی ہونے کے باعث منطقی اصولوں کی پابند تھی۔ فطرت پرستی نظریہء وحدت الوجود اور تصور فنافی اللہ سب اس کی کڑیاں ہیں۔ میں نے اپنی انگریزی تصنیف The Vedic Civilization میں اس حقیقت پر مفصّل بحث کی ہے کہ ان عقلی اصولوں کی جنم بھومی ہندستان ہے، یونان نہیں۔ ہندوستان اس اعزاز عقلیت سے محض تاریخی حوادث کے سبب محروم ہو گیا۔

تکمیل مقصد کیلئے کوئی راہ بھی اختیار کرنا اصول سیاست کا جزو ہے۔ چونکہ رومن سلطنت کی بنیادوں کو استوار کرنے کیلئے عیسائیت کی ضرورت تھی جو کہ سراسر عقیدت یعنی غیر عقلی اصولوں پر مبنی ہے۔ شہنشاہ جسٹینین (Justinia) نے اس مذہب کو سرکاری عقیدہ قرار دینے کیلئے ۵۲۹ءمیں سرکاری اعلان کر دیا لیکن اسکو ایک عظیم مسئلہ درپیش تھا اور وہ یہ کہ پچھلی نو صدیوں سے یونان (اتھینز) کی افلاطونی اکیڈمی عقل و حکمت کا درس دے رہی تھی جسکے

باعث عوام منطقی باتوں پر یقین کرنے لگے تھے۔ عیسائی عقیدت مندانہ اوہام کی طرف کون دھیان دے گا؟

''نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بنسری'' کے مسلمہ اصول پر عمل کرتے ہوئے جسٹینین نے افلاطونی درس گاہ کو ہی بند کر دیا۔ عقل کو مذہب کا پابند بنانے کیلئے یہ ایک انوکھا متکلمانہ اقدام تھا لیکن ان مذہبی تقاضوں کی فوری تکمیل ممکن نہ تھی کیونکہ نئے تصورات کو پرانے نظریات پر غلبہ پانے کیلئے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ عقل اور مذہب میں مطابقت پیدا کرنے کیلئے زمانۂ وسطیٰ کے دوران ایک عیسائی ادارے نے جنم لیا جو SCHOLASTICISM یعنی ''عیسائی درسیت'' کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کا کام مسیحی اصولوں کو منطقی رنگ میں پیش کرنا تھا۔ یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا جسے عقلی دلائل سے سر کرنا غیر ممکن تھا لیکن دور از کار تاویلوں سے ایسی فضا پیدا کر دی گئی کہ دانش مذہبی عقیدت مندی کا دوسرا نام بن کر رہ گئی۔

اگرچہ اس تحریک کے ساتھ عظیم عیسائی علماء کے نام جڑے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں بوایتھی ایس (BOETHIUS) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ عقل کو مذہب کے تابع کرنا اس شخص کا پیشہ تھا اس حقیقت کا کبھی اقرار نہ کرنا اس کی خاصیت تھی تاکہ مذہب کی بالادستی عقل کی محتاج نظر نہ آئے۔

اسی طرح ایک اور عیسائی عالم جس کا فرضی نام ڈیونی سس (DIONYSIUS) تھا، اس سلسلے میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شام (SYRIA) کا ایک فلاطینوسی (NEOPLATONIST) تھا۔ اسکی تحریروں کا اثر اس تحریک پر ایک ہزار برس تک محیط رہا۔ گیارہویں صدی کے دوران جب مسیحی علماء میں ارسطو کے نظریات کا اثر فزوں تر ہوا تو اسکی گونج ہسپانیہ میں بھی سنائی دی جو اس وقت اسلام کے قبضے میں تھا۔ ابو علی ابن سینا اور ابن رشد دونوں ہی ارسطو کے مداح تھے۔ ابو علی ابن سینا نے ارسطو کو چالیس بار پڑھا لیکن جب اسطرح بھی وہ اسکے تصورات کو کما حقہ نہ سمجھ سکا تو انہیں زبانی حفظ کر لیا۔ یہ دو متکلمین (فلسفی) ارسطو کے خیالات کو انسانی علوم کی تکمیل سمجھتے تھے اور انکی کاوشوں کا نہ صرف مغربی دنیا پر اثر پڑا بلکہ ان سے عالم اسلام میں بھی عقلیت کی ساکھ پختہ ہوئی لیکن مسلمانوں میں عقلی نقطۂ نظر کا آغاز ابن رشد سے نہیں تحریک معتزلہ سے ہوا جس کی بنیاد ۷۵۷ء کے دوران بغداد میں پڑی۔ اس کی وجہ بھی یونانی فلسفہ ہی تھا جس نے مسلم علماء کی توجہ عقل و منطق کی طرف مبذول کی اور ایک عجیب سوال اٹھ کھڑا ہوا:

کیا قرآن ابد سے موجود تھا یا یہ بھی تخلیق کا درجہ رکھتا ہے؟

معتزلہ کٹر مسلمان ہونے کے باوجود عقلیت کے قائل تھے۔ نہ وہ قرآن کی ابدیت کو مانتے تھے اور نہ ہی ان اصولوں کو تسلیم کرتے تھے جو عقل کے منافی ہوں خواہ ان کا منبع قرآن و حدیث ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے خیال میں ایسی فوق الفطرت باتوں کو تمثیلی سمجھنا چاہئے جو محض استعارہ کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ انہوں نے غیر عقلی امور کو منطقی انداز میں بیان کرنے کے فن کو ''علم کلام'' کا نام دیا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معتزلہ کا قرآن کے متعلق نقطۂ نظر بڑا جاندار ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن کا ہر ایک لفظ ابتدائے کائنات ہی سے مرقوم ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انسانی حرکت ایک اٹل تقدیر کی پابند ہے جس کے سبب بشر محض ایک مشین ہے جسے اپنے عمل پر قطعاً کوئی اختیار نہیں۔۔۔ اگر یہ سچ ہے تو وحی سراسر بیکار ہے جس کا مقصد انسان کو ہدایت دینا ہے۔ اگر ہدایت طبعاً بیکار ہے تو ہدایت بھیجنے کا مطلب؟ اس طرح ایمان و کفر کی تمیز بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور یوم محشر جیسے تصورات کی نفی ہو جاتی ہے کیونکہ اس طرح فرد کو اپنے اعمال پر اختیار نہیں رہتا۔

ابو الحسن اشعری (۸۷۳-۹۳۵) جو دس برس تک معتزلی اصولوں کے مدرس رہے۔ آخر کار ان کے خلاف ہو گئے اور جبریہ تعلیمات کے معلم بن کر رہ گئے۔ ان کے خیال میں اللہ ایک آمر مطلق ہے جو چاہے کرتا ہے اسی لئے اس نے ہر چیز کی تقدیر مقرر کر دی ہے اور کسی کو اپنے عمل پر اختیار نہیں۔ امت مسلمہ اس وجہ سے غیر منطقی خیالات کی زد میں آکر طرح طرح کے توہمات کا شکار ہو چکی ہے اور یہی اس کی ذہنی۔ علمی اور اخلاقی پستی کا سبب ہے۔

اگر علامہ اقبال کے نظریات کو غور سے دیکھا جائے تو انہیں متکلم کا درجہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ انکی شاعری فلسفیانہ گہرائی سے تہی دست اور جذباتی سراب سے بھرپور نظر آتی ہے۔

یہ نتیجہ ہے ان کی عقل شکنی اور عشق پرستی کا۔ فرماتے ہیں:

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور۔ فقر ہو جس کا غیور

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی زندہ و جاوید عشق

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عقل گو آستاں سے دور نہیں اسکی تقدیر میں حضور نہیں

یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے یورپ کو تہذیب سکھائی۔ اسکی بنا انکی عقلی اور علمی برتری پر ہے جو اس وقت اہل مغرب کو مسیحی تعلیمات کی عقل دشمنی کے باعث میسر نہ تھی۔ مسلمانوں کا ذہنی ارتقا خلیفہ المامون کے دور (۸۱۳) میں شروع ہوا۔ عربوں نے تین بیدار مغز خلفا المنصور، الرشید اور المامون پیدا کئے۔ موخرالذکر نے اپنی علمی خدمات کے ذریعے عالم اسلام کی ذہنی وسعت کو انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

المامون ہر منگل وار کو بزم مباحثہ منعقد کرتا تھا جس میں ہر فرقہ کے علماء کو اظہار فکر کی پوری آزادی دی جاتی تھی۔ ان محفلوں کا موضوع بحث مذہب اور قانون ہوتا تھا اور وہ ایک عالم کی طرح ان میں حصہ لیتا تھا جس میں اس نے شاہی وقار و تمکنت سے ہمیشہ ہی گریز کیا۔ یہی وہ حکمراں ہے جس نے ہندی۔ یونانی اور ایرانی مسودات کے عربی زبان میں تراجم کرا کر بیت الحکمت کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو ذہنی و علمی ارتقا کی منازل سے آشنا کیا۔ ابتدا میں المامون انتہائی آزاد خیال تھا لیکن آخری دور اقتدار میں وہ بھی اپنے حواریوں کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس نے اپنی آزادروی کو عوام پر مسلط کرنے کیلئے کئی قوانین جاری کئے جن کی رو سے لازم ہو گیا کہ مسلمان قرآن کی ابدیت پر یقین نہ رکھیں۔ اصول تقدیر کو نہ مانیں جو ان اعتقادات کو تسلیم نہ کرے انہیں عدالتوں میں گواہی دینے کے حق سے محروم کیا جائے اور اس بات کو کفر قرار دیا جائے کہ ذاتِ حقیقی کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں لوگوں کے اعتقادات کو پرکھنے کیلئے اس نے انکا امتحان لینے کا سلسلہ جاری کیا۔

المامون ۸۳۳ء میں فوت ہوا۔ اس کے جانشینوں بالخصوص المعتصم اور الواثق نے اس کا کام جاری رکھا لیکن ابن حنبل نے اس شدید طریق کار کے متعلق احتجاج کیا۔ جب اس کے اعتقادات کا جائزہ لینے کیلئے اسے آزمائش نامہ دیا گیا تو اس نے سوالات کا عقلی حل تلاش کرنے کے بجائے ہر بات کے جواب میں قرآن سے اقتباسات پیش کئے۔ اسے سزا کے طور پر کوڑے لگائے گئے اور جیل میں بند کیا گیا۔ اس کی موت نے اسے لوگوں کی نظر میں شہید اور ولی کا درجہ دیا اور اس طرح عالم اسلام میں عقلیت کے خلاف عقیدت مندی کی تحریک شروع ہو گئی جو اوہام پرستی، خود غرضی اور رجعت پسندی کا سرچشمہ ثابت ہو کر وقار اسلام کو لے ڈوبی۔

کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ چرب زبان اور انا پرست افراد کیلئے مسلمانوں کی نفسیاتی کس مپرسی کا انتظام کرنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ انہوں نے عوام کو جذباتی منجدھار میں الجھا کر ساحل مراد سے اور بھی دور کر دیا اور اس طرح خود ان کے روحانی اور تمدنی رہنما بن کر امر ہو گئے۔ انہوں نے اس سلسلے میں تضحیکِ عقل اور تشہیر عشق کو اپنا بنیادی اصول بنایا۔ ان غارت گرانِ اسلام میں اقبال پیش پیش تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے انہیں تین متحارب قومیتوں یعنی بھارتیوں، پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں میں تقسیم کرنے کا "سہرا" انہی کے سر ہے۔

قرآن کی بنیاد اصول وحی پر ہے یعنی خدا اپنے بندوں کی رہنمائی کیلئے پیغمبروں کے ذریعے ہدایت بھیجتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہدایت حیوانوں پر نازل نہیں کرتا کیونکہ ان میں اتنی عقل ہی نہیں کہ پیغام الٰہی کو سمجھ سکیں۔ لہٰذہ وحی کا عقل سے بنیادی تعلق ہے جو انسانوں کا ایک بڑا خاصہ ہے یہی وجہ ہے کہ خدا فرائض وحی کی ادائیگی کیلئے کسی کم عقل شخص کو منتخب نہیں کرتا اور اسلئے نبی اپنے زمانے کا ایک انتہائی زیرک انسان ہوتا ہے جس میں سنجیدگی اور دانشمندانہ توازن کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔

اس کے برعکس عشق، عقل، دشمنی، خود فریبی اور فنائی النفس کا دوسرا نام ہے جس کی بنا جذبات پرستی، عقلی کجروی اور تضحیکِ فراست پر ہے۔ اس رجحان کے اثرات انتہائی خطرناک ہیں جو انکار علم اور پرستشِ اوہام سے لازم آتے ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر اقبالؔ کے اس شعر کا مدعا بخوبی سمجھ میں آتا ہے:

قلندر جز بحرفِ لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

بظاہر یہ شعر اسلام کی تفسیر ہے لیکن درحقیقت یہ اسکی تکفیر ہے کیونکہ جب تک اس میں رسالتِ محمدی کو شامل نہ کیا جائے اسلام دین الٰہیہ کا درجہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ اقبال کے جذباتی انداز نے جس طرح فکر مومن کو مجروح کیا ہے یہ اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ قلندری ایک غیر اسلامی نظریہ ہے جس کی جڑیں تصوف یعنی نظریۂ عشق میں گڑھی ہوئی ہیں۔ اسکے بنیادی تصورات اور طریق عبادت بدھ مت سے ماخوذ ہیں جو طلوع اسلام سے پیشتر ایران، افغانستان، ترکستان اور گندھارا کے علاقوں میں رائج تھا۔ اسلام کی اساس کو اسلام پرستی کے نام پر منہدم کرنا کلام اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس سلسلے میں

اقبال، غزالی، رازی اور رومی کا مقلد ہے۔ ان لوگوں کے خیالات پر روشنی ڈالنے سے پہلے ابو علی الحسین ابن سینا اور ابو لولید محمد ابن احمد ابن محمد ابن رشد کی فلسفہ طرازی پر نگاہ اسلئے ڈالنا چاہئے کہ یہ دونوں ہی عقلیت کا احترام کرتے تھے اگرچہ انہیں تصوف سے بھی سروکار تھا۔ اس بات کی وضاحت کرنے کیلئے کہ اسلام میں عقلی نقطۂ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہے ان دو مسلم دانشوروں کے نظریات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلے ابو علی سینا کو لیجئے:

ابو علی ابن سینا ۹۸۰ء میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق اسماعیلی فرقے سے تھا۔ وہ ایک اجل عالم اور تیز فہم انسان ہونے کے علاوہ حکمت میں یکتائے روزگار تھے۔ ان کے تصورات تصوف کا نہ صرف دنیائے اسلام پر گہرا اثر ہوا بلکہ انکے طرز فکر نے ان مغربی مفکرین کے اذہان پر بھی گہرے نقوش چھوڑے جو SCHOLASTICS کے نام سے مشہور ہوئے اور جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ارسطو اور الفرابی * سے بڑے متاثر تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے ان ممتاز اہل علم کو بھی فلسفی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ فلسفی ہونے کیلئے اشد ضروری ہے کہ اس کی سوچ عقیدے اور اوہام کی زنجیروں سے قطعاً آزاد ہو کیونکہ اسکے بغیر ایک آزاد نظام فکر پیش کرنا ناممکن ہے جو کہ ایک فلسفی کی پہچان ہے اور یہی فلسفی کو ایک مفکر سے متمیز کرتی ہے۔ اسی لئے جنہیں دنیائے اسلام میں "فلسفی" کہا جاتا ہے وہ منفرد نظام فکر کے حامل نہ ہونے کے سبب صرف "مفکر" ہی کہلا سکتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ قرآن اس طرز فکر کی اجازت نہیں دیتا جو اسکے بنیادی اصولوں سے ٹکراتی ہو۔

ابو علی سینا نور دانش کے قائل تھے۔ ارسطو کی پیروی کرتے ہوئے انہوں نے مادہ کی ابدیت کا اعلان کیا جس سے اصول اسلام کی نفی لازم آتی ہے کیونکہ اس پر یقین کرنے سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کوئی خالق خدا ہے ہی نہیں۔ اس طرح وحی یعنی سلسلۂ ہدایت الٰہیہ، انبیا کے وجود اور یوم محشر جیسے اعتقادات سے انکار کرنا پڑتا ہے۔

متکلمین، جن کا پیشہ ہی تاویل کے زور سے فلسفہ کی تردید اور مذہب کی تائید کرنا تھا۔ ابو علی سینا کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ وہ ذہنی اور علمی اعتبار سے ایک عظیم شخصیت تھے چنانچہ انہوں نے اپنے اصول کی عقلی تشریح کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مادہ ابدی ہے۔ اگرچہ وقتی لحاظ سے خدا کو مادہ پر تقدم حاصل نہیں۔ منطقی طور پر اسے موخر الذکر پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ معراج، اصلیت اور علت اولیٰ ہونے کے سبب تمام کائنات کی اساس ہے اور کاروبار ہستی اس (خدا) کی ان خوبیوں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ابو علی سینا کو اعتراف کرنا پڑا کہ کسی چیز کا وجود بھی مشیت او یزدی کے بغیر ممکن نہیں۔ بالفاظ دیگر اگرچہ خدا خالق نہیں اشیا کی تدوین ذات باری کی مرضی ہی سے ممکن ہے۔ خدا اسلئے علت (CAUSE) اور جہان معلول (EFFECT) ہے۔

اس نے مزید برآں یہ کہا کیونکہ مادے کا وجود انحصاری ہے یعنی خود بخود برقرار نہیں رہ سکتا اسلئے اس کیلئے ایک علت کی ضرورت ہے جو خدا ہے جس کا بغیر علت کے یعنی خود بخود ہونا لازم ہے۔ لہٰذہ خدا ایک ست یعنی جوہر ہے جو مادی خواص سے بالکل مبرّا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ ہر شئے میں دانش کی جھلک موجود ہے لہٰذا خدا عقل کل ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو الگ الگ نہیں بلکہ بیک نظر دیکھتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قیود زماں سے بالکل آزاد ہے۔

البتہ خدا تخلیقی امور اور تاریخی حوادث کا ذمہ دار نہیں۔ یہ باتیں خود بخود رونما ہوتی ہیں اور اشیا کے ان فطری مقاصد کا نتیجہ ہیں جو ان کے طبعی ڈیزائن میں مخفی اور ان کے وجودی چلن کا محرک ہیں۔ اسلئے دنیا میں جو برائی پائی جاتی ہے خدا اس کا ذمہ دار نہیں۔ یہ ہماری اپنی قوت ارادی (FREEWILL) کی پیداوار ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جزو کی برائی کل کی بھلائی ثابت ہو۔

اپنے فلسفیانہ اصول کی تشریح کرتے ہوئے (جو ارسطو سے مستعار تھی) ابو علی سینا نے کہا کہ روح کا ادراک ہماری مشیت میں پنہاں ہے اور اس لئے روح کی اصلیت مادی نہیں روحانی ہے۔ یہ مادے سے اسی طرح مختلف ہے جیسے ہمارے خیالات ہمارے (مادی) جسم سے بالکل جدا ہوتے ہیں۔ روح در اصل ہمارے جسم کی طبعی حرکت اور نشو نما کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے اجرام فلکی کی بھی روح ہے (جو ان کی حرکت اور اثبات کی ضامن ہے) اس لئے تمام کائنات ایک عالمگیر اصول حیات (روح) کی مظہر ہے۔ بذات خود جسم کچھ بھی نہیں کر سکتا روح ہی اسکی قوت متحرکہ ہے۔ ہر ایک روح جزو دانش ہے اور اس میں روح اول کی طرح آزادی اور کارسازی کا جوہر موجود ہے اگرچہ وہ محدود ہے۔

موت کے بعد پاکیزہ ارواح اتصال کیلئے عالمگیر روح کی طرف رجوع کرتی ہیں اور یہ وصال الٰہی اچھے کاموں کی برکت کا نتیجہ ہے۔

★ محمد ابو نصر الفرابی پہلے ترک تھے جنہوں نے میدان فلسفہ میں نام پیدا کیا۔ وہ ترکستان کے شہر غراب میں پیدا ہوئے۔ انکے علم کا سرچشمہ بھی ارسطو ہی تھا۔ انہوں نے ارسطو کی فزکس کا چالیس مرتبہ اور ڈی انیما (DE ANIMA) کا دو سو مرتبہ مطالعہ کیا۔ نتیجتاً انہوں نے صوفی لباس اور اصولوں کو اپنایا اور تارک الدنیا ہو گئے۔ علمائے بغداد نے ان کے اعتقادات کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے انکی مذمت کی اور ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا۔ اس کی وجہ انکی ارسطو کی اندھی تقلید تھی جو انے مابعد الطبیعات کے سلسلے میں اختیار کی۔

ابو علی سینا اگر زنجیرِ عقائد کے اسیر نہ ہوتے تو وہ متکلم کے بجائے ارسطو سے کہیں بڑے فلسفی ہوتے۔ انکی تحریروں سے عیاں ہے کہ وہ سریانی فلسفہ کے قائل تھے جس میں خدا کو خالق کی حیثیت حاصل نہیں۔ کائنات کو اصول وحدت الوجود کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور انفرادی روح کا عالمگیر روح میں گھل مل جانا انسانی زندگی کی معراج تصور کیا جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابو علی سینا عقل کی عظمت کے نہ صرف قائل بلکہ مبلغ بھی تھے۔ روح کو دانش اور اسے عقل کل (خدا) کا جزو قرار دینا انکی فلسفیانہ رجعت کی ہی دلیل نہیں بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایسے دیانتدار شخص تھے جنہیں دنیاداری کی کوئی لالچ نہیں تھی۔ انہیں اپنی انا کے بجائے خدمتِ خلق کا شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی مزاج ہونے کے باوجود انہوں نے عشق کا ڈھونگ نہیں رچایا۔ اگر خدا عقلِ کل ہے اور روح جزوی عقل ہونے کے باعث وصالِ ایزدی (روح کل) کی متلاشی ہے تو اس سے تصورِ عشق کی کمتری ثابت ہے۔ بالفاظ دیگر خدا یعنی عقلِ کل۔ انسان (جزوی عقل) کی منزل مقصود ہے۔ لہٰذا بشر اس تک چراغ عقل کی روشنی ہی میں پہنچ سکتا ہے۔ عشق ایک جنونی کیفیت کا نام ہے جو عقل کی ضد ہونے کے باعث تاریکی اور بے یقینی کا دوسرا نام ہے۔

نہ جانے اقبال نے اصولِ اسلام کی تردید اسلام پرستی کے پردے میں کیوں کی۔ اس کا سبب انا پرستی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنا سراسر اسلام شکنی ہے کہ:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا — عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

نہ صرف بدتمیزی بلکہ تضحیک اسلام کی انتہا ملاحظہ ہو:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اقبال وحدت الوجودی تھے۔ مثلاً:

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو — لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
جسکی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے — خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدے میں پایا — شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ! تیری کمال اس کا (دیکھئے پوری نظم بعنوان سلیمیٰ۔ بانگ درا)

ایک وحدت الوجودی کی آخری منزل وصالِ الٰہی ہے لیکن اقبال کی متضاد ذہنیت ملاحظہ ہو کہ وہ روزِ محشر پر بھی یقین رکھتے ہیں جب وہ جنونی کیفیت میں دامن یزداں ہی چاک کر ڈالیں گے۔ ایک جنونی سے ناشائستگی کے علاوہ اور کس بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟

آیئے اب ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد کے افکار پر نظر ڈالتے ہیں:

ابن رشد (۹۸-۱۱۲۶ء) کو ابن طفیل نے ۱۱۵۳ء میں ابو یعقوب یوسف کے دربار میں پیش کیا۔ ابن رشد کے دادا اور والدین دونوں ہی قرطبہ کے قاضی القضات رہ چکے تھے۔ امیر یوسف ایک عالم انسان اور فلسفہ کے مداح تھے۔ انہوں نے جواں سال ابن رشد کی ذہانت اور علم کو پرکھنے کیلئے ان سے پوچھا "آسمانوں کی نوعیت کیا ہے؟ کیا وہ ابدی ہیں یا ان کا کوئی نقطۂ آغاز ہے"۔

ابن رشد ان سوالات سے سراسیمہ ہوئے تو امیر یوسف نے انکی دلجمعی کیلئے خود ہی انکی وضاحت کر دی لیکن امیر موصوف باقی انٹرویو سے اسقدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ابن رشد کو ایک گرانقدر رقم۔ ایک گھوڑا اور نہایت قیمتی خلعت عطا کی۔

عیسائی اور یہودی دنیا نے ابن رشد کی کہیں زیادہ تعظیم کی ہے۔ نہ وہ صرف ایک فلسفی سمجھے جاتے تھے بلکہ وہ ماہر قانون۔ ایک عظیم طبیب اور بہت بڑے شارح علم و ہنر بھی تھے۔ یورپ کی یونیورسٹیاں عیسائی اور یہودی مذہبی ادارے ان کے نظریات و فنون کے قدر دان تھے۔

ابن رشد ایک زیرک اور حقیقت پسند انسان تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ عوام کو اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ فلسفہ کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر صدف صداقت کو ڈھونڈ سکیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگ زندگی کے تلخ حقائق کو بھولنے کیلئے مذہب کے غیر منطقی اعتقادات کا سہارا لیتے ہیں اور اس طرح خود فریبی کی وساطت سے ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں۔ ان کے دفاع مذہب کی یہی بڑی وجہ ہے۔ وہ اس حصار کو ہر قیمت پر ٹوٹنے سے بچاتے ہیں۔ مذہبی اعتقادات کے انہدام سے عوام کی نفسیاتی پریشانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسلئے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اگر دینی اصولوں کو استعارۃً بیان کیا جائے تو مذہب اور سائنس کے درمیان مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے خیالات کو بلاواسطہ ایسے انداز میں پیش کرنا جس کا تبلیغ سے کوئی تعلق نظر نہ آئے ان کے اسلوب بیان کی خاصیت بن کر رہ گیا۔

ان کے خیال میں فلسفہ کے معنی ہستی کے مقاصد پر غور کرنا اور اسے عوامی بہبود کیلئے استعمال کرنا ہے۔ اپنے بنیادی نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کائنات ابدی وازلی ہے۔ نہ کبھی اس کی ابتدا ہوئی اور نہ ہی کبھی اس کا اختتام ہوگا۔ تخلیق محض ایک افسانہ ہے۔

نظریۂ تخلیق کے حامیوں کی رائے میں ہستی کا منبع نیستی ہے یعنی اشیا ان اجزا کے بغیر وجود میں آسکتی ہیں جو خود ہی کالعدم ہیں۔ یہ محض مذہبی خیال آرائی ہے۔۔۔۔ حرکت دائمی اور مسلسل ہے اور ہر حرکت کا ایک محرک ہے جو پہلے سے موجود ہے۔ حرکت (گردش) کے بغیر وقت کا تصور ممکن نہیں اور ہم اس بات کا خیال تک نہیں کر سکتے کہ حرکت کی کوئی ابتدا یا انتہا ہے۔ البتہ خدا کو کائنات کا خالق اس لحاظ سے قرار دیا جاسکتا ہے کہ یہ اسکے سہارے کے بغیر ایک پل کیلئے سلامتی سے ہمکنار نہیں رہ سکتی اور اس کا دوام قوت الٰہیہ کا محتاج ہے۔ خدا کائنات کا خالق نہیں بلکہ وہ اس کی نظمیہ شکتی، بقا اور دانش ہے۔

یہی وہ عظیم ترین نظمیہ شکتی اور عقلِ کل تمام سیاروں اور ستاروں میں نظم اور دانش کی صورت میں رواں دواں ہے۔ دانش دو قسم کی ہے۔ کارگر (ACTIVE) اور مجہول (PASSIVE) آخر الذکر کا تعلق سب سے نچلے آسمانی حلقوں (مثلاً چاند) سے ہے جو انسانی اجسام و اذہان کو انفرادی طور پر متحرک کرتی ہے۔ بشری ذہن دو عناصر سے تشکیل کیا گیا ہے: ایک مجہول ہونے کے باعث مادی دانش کا درجہ رکھتا ہے جس میں خیال آرائی کی اہلیت موجود ہے۔ چونکہ یہ بدن کا حصہ ہے اسلئے جسم کے ساتھ اس کی موت بھی واقع ہوتی ہے۔ دوسری قسم کی دانش یعنی عقل کارگر (ACTIVE INTELLECT) دراصل یزدانی سرایت ہے (جو اجسام میں داخل ہو کر) مجہول دانش کو تحرک بخشتی ہے۔ دانشِ کارگر انفرادی وجود کی پابند نہیں یہ فرد میں یکساں اور غیر فانی ہے۔ اس انفرادی دانش کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ دانشِ کل سے وصال کی متلاشی رہتی ہے اور اس میں جذب ہونے کو اپنی ہستی کی انتہا تصور کرتی ہے۔ اس کیفیتِ وصال میں انسانی ذہن یزدانی خواص حاصل کر لیتا ہے اور اس طرح اسے اصولاً (POTENTIALLY) تمام کائنات کا ادراک ہو جاتا ہے جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ یہ جو بوقلمونی ہمیں نظر آتی ہے صرف ہمارے ذہن کی پیداوار ہے۔

وصال یعنی انفرادی دانش (انسان) کے دانشِ کل (خدا) میں جذب ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ صداقت کی پہچان عقل کے ذریعے ہے۔ اہل تصوف کا مجوزہ طریق وصال جو ترک دنیا اور نفس کشی پر مبنی ہے محض ایک ڈھونگ ہے۔

جب کوئی قوم انحطاط پذیر ہو جائے تو وہ عقل دشمن بن جاتی ہے اور اس کا اوہام پرستی سے رابطہ اسقدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ حقیقت کو افسانہ اور افسانہ کو حقیقت قرار دینے لگتی ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا سبب سیاسی نہیں ذہنی پستی تھی جو ان کی اخلاقی گراوٹ کی وجہ بنی۔ مغرب کی ترقی یافتہ تہذیب اور دنیائے اسلام کے رجعت پسند تمدن سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ اس دانش دشمنی کا نتیجہ تھا کہ ۱۱۵۰ء میں خلیفہ بغداد نے ابو علی ابن سینا کی تمام کتب جلا دینے کے احکامات جاری کئے اور امیر ابو یوسف المنصور نے ابن رشد کی تمام فلسفیانہ کتب کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ بارہویں صدی عیسوی کے بعد دنیائے اسلام میں کوئی ایسا مفکر پیدا نہ ہوا جو اس ملت کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئی راہ دکھا سکے۔ اس کے برعکس عالم عیسائیت نے ان دو مسلم مفکرین کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے افکار سے استفادہ کیا۔

ابتدا میں اسلام کا سب سے بڑا گن اسکی سادگی تھی جس کو زیور عمل سے آراستہ کیا گیا۔ عربوں کا بلا تامل ہر وقت جہاد کیلئے تیار رہنا اس حقیقت کی دلیل تھی۔ اسلام نام تھا چند عام فہم بنیادی اصولوں کا جنہیں سمجھنے کیلئے نہ کسی گہری سوچ بچار اور نہ ہی تاویل بازی ضرورت تھی اسلئے یہ کہنا بجا ہے کہ اسلام میں فلسفہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ یہ فلسفیانہ تحقیق اور موشگافی کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن اپنی سادگی، سلاست اور اختصار کے باعث یہ دنیاوی کاروبار اور ترقی کی راہ میں حائل نہیں لیکن دخول تصوف نے اسکے مزاج ہیئت ترکیب اور چلن کو بالکل منقلب کر ڈالا جس کے باعث باطنیت نے اصلیت

نفس کشی نے زہد اور رہبانہ اطوار نے مجاہدانہ کردار پر غلبہ پالیا۔

اگرچہ اسلام فلسفہ سے بے تعلق ہے اس دین کو ماننے والوں میں عقل و فراست کی کمی نہیں جو قطرہ میں دجلہ و فرات کی گہرائی دیکھنے کی عادی ہے۔ غالباً اکثر لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں کہ تصوف فلسفہ کی ایک شاخ ہے۔ انا پرستوں نے بعض قرآنی آیات کی غلط تاویلیں کر کے انہیں روح اسلام قرار دیا جس کی بنیاد نظریہء عشق پر اٹھائی گئی ہے۔

تصوف کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس حقیقت پر متعدد مضامین میں بحث کر چکا ہوں اور اپنے مقالہ "اقبال اور قلندری" میں بھی اس پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اگرچہ یونان میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اسکی حقیقی جنم بھومی ہندوستان ہے اور اسکی اساس عشق نہیں عقل ہے۔

ابو علی ابن سینا اور ابن رشد کے افکار مشہور یونانی فلسفی ارسطو سے ماخوذ ہیں جو افلاطون کا شاگرد تھا۔ لیکن انکی فلسفہ طرازی نوے فیصدی ویدوں سے مستعار ہے جو ہندی دانشوروں (نہ کہ ہندوؤں) کی تدوین ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ویدوں میں لفظ ہندو ڈھونڈے نہیں ملتا۔ نہ ہی ان میں رام۔ کرشن۔ ہنومان کا ذکر ہے اور نہ ہی بت پرستی کی تلقین۔ ہندوؤں کا عقیدہ و عمل ویدوں کے بالکل خلاف ہے پھر بھی انہیں ہندوؤں کی مقدس کتابیں کہتے ہیں حالانکہ یہ متحدہ ہندوستان کی مقدس کتابیں ہیں۔ مزید بر آں بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگ جس تمدن پر عمل پیرا ہیں اسکی اکثر روایات کا منبع وید ہی ہیں۔ ان لوگوں نے ویدوں کو اسلئے طاق نسیاں کی زینت بنادیا ہے کہ ان کے بلند اصولوں پر عمل کرنا ان کے بس کی بات نہیں رہی۔

کبھی ہندوستان دانش کا مرکز تھا جو اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ وید کے لفظی معنی ہی "علم" ہیں جس کا تعلق عقل و استدلال سے ہے۔ "ودوان" بمعنی "عالم۔ عقلمند۔ ذہین" اسی سے مشتق ہیں۔ "ودیا" کا مادہ بھی یہی ہے جس کے معنی ہیں "علم۔ فن۔ سائنس۔ فلسفہ"۔ "بدھی" بھی اسی سے ماخوذ ہے جس سے ہندی میں مراد "عقل۔ دانش۔ ادراک" ہیں۔ دنیا کے عظیم دانشور انسان سدھارتھ کو مہاتما بدھ اسی لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے نجات (نروان) کا ایک عظیم عقلی نظام پیش کیا جسے بدھ مت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے آج بھی دنیا میں کروڑوں مقلدین ہیں جو اپنے عقلی اصولوں کے باعث ایسے اوہام کا شکار نہیں ہو سکے جس سے انسان ماؤف الدماغ ہو کر تہذیبی پستی کی ڈھلوان پر چل نکلتا ہے۔ میری مراد مشرق بعید کے ممالک چین۔ جاپان۔ کوریا۔ وغیرہ سے ہے جن کا شمار آج بھی ان بستیوں میں ہے جن سے اہل مغرب لرزتے ہیں۔

اقبال ہندی نسل سے تعلق رکھتے تھے ان کے دادا کشمیری برہمن تھے۔ "علامہ" ہونے کی نسبت سے انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ وید جو تمام اہل ہند کی بلا تخصیصِ مذہب تمدنی روایات کے حامل ہیں عقل و استدلال کے حامی ہیں۔ ان میں ایمان بالغیب کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ نبوت اور فرشتوں کی صداقت کا اقرار کئے بغیر بھی ہر فرد راستیٔ عمل سے مکتی (نجات) حاصل کر سکتا ہے جس سے مراد انفرادی روح کا روح عالم (پرماتما) سے وصال ہے۔ اور یہ وہی اصول ہے جو یونانی فلسفیوں نے اپنایا۔ اتفاق سے جب خلیفہ المامون نے تراجم کے ذریعے بیت الحکمت کی بنیاد ڈالی تو کسی بھی افلاطون اور ارسطو کے عرفانی نظریات کا پس منظر جانچنے کی فرصت نہ ملی اور اسطرح انکی ہندی حقیقت اجاگر نہ ہو سکی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب عرب سیاسی طور پر تو بیدار ہو چکے تھے اور انکی تلوار مشرق و مغرب میں اپنے قومی جوہر دکھا رہی تھی لیکن قرآن و حدیث سے انتہائی عقیدت مندی کے باوجود وہ علمی و ذہنی طور پر ابھی تک عالم طفولیت میں تھے اور ان پر یونانی کلچر کا گہرا اثر تھا۔ نہ صرف جنوبی عرب یعنی یمن میں یونانی بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں بلکہ دیار محمد (ﷺ) یعنی مکہ میں بھی لات، منات اور عزیٰ کی پوجا کی جاتی تھی جن کا تعلق یونانی تہذیب سے ہے۔ لہٰذا جن روایات کو یونانی سمجھا جاتا تھا ان سے اسلامی اصولوں کیلئے سند حاصل کرنا مسلم متکلمین کا ایک دلچسپ مشغلہ بن کر رہ گیا۔ اسلامی تصوف پر سقراط کا گہرا اثر ہے لیکن یہ مسلک یونانی النسل نہیں ہندی نژاد ہے اور اس کا ثبوت ویدوں میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ رگ وید کی عمر کئی ہزار قبل مسیح ہے جبکہ یونانی فلسفہ کی روایات چھ سو سال قبل مسیح سے زیادہ نہیں۔ اسلئے تصوف جو فلسفہ کی ایک شاخ ہے ویدازم کی ایک شاخ اور اسلام کے خلاف ایک چھپی بغاوت ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو مندرجہ ذیل شلوکوں پر نگاہ ڈال کر دیکھ لیجئے:

۱۔ یہ جگت جتنا ہے اتنا ہی رہے گا (رگ وید 10:92.2)

جگت یعنی کائنات جو مادہ سے تشکیل ہے جتنی ہے اتنی ہی رہے گی یعنی مادہ کی مقدار مقرر ہے جو نہ بڑھائی جا سکتی ہے اور نہ گھٹائی جا سکتی ہے یعنی یہ عالم جیسا ہے ہمیشہ ویسا ★ ہی رہے گا۔

یہی نظریہ یونانی فلسفیوں اور صوفیوں کا ہے۔

۲۔ "اس سنسار کا منبع پرمیشور (خدا) ہے۔ یہ اسی کی آنکھ ہے جو اس پر قابو رکھتی ہے۔ اسے اس نے تخلیق کیا ہے یا نہیں۔ یہ صرف وہی جانتا ہے" (رگ وید 10:29:7)

رگ وید کا شلوک 10:81:3 نظریۂ تخلیق کی یوں تشریح کرتا ہے: "وہ جو خدائے مطلق ہے اس نے ویلڈ کر کے زمین اور آسمان کو پیدا کیا"
بالفاظ دیگر جس طرح ایک ویلڈر (WELDER) مختلف موجودہ حصوں کو ٹانکا لگا کر ایک نئی چیز یا مشین بناتا ہے اسی طرح خدائے مطلق نے بھی مادی اجسام ★★ کو جوڑ کر زمین اور آسمان پیدا کئے۔
بالکل یہی نقطۂ نظر یونانی فلسفیوں کا ہے جو خالق خدا کو نہیں مانتے۔

۳۔ جیسا کہ بالائی اقتباس سے ظاہر ہے ویدوں میں خدائے واحد کا تصور موجود ہے لیکن وہ اس کے علاوہ دوسرے دیوتاؤں کی ہستی کو بھی مانتے ہیں۔ شلوک 10:12:9 بعنوان "تخلیق" میں مرقوم ہے کہ دیوتاؤں کی تخلیق آفرینشِ کائنات کے بعد عمل میں آئی۔ تخلیق سے مراد ہستی از ہستی نہیں بلکہ ابدی مادے سے مختلف نوع کے اجسام کی تشکیل ہے۔
یونانی فلسفیوں نے یہی ہندی فلسفہ اپنایا اور ابن رشد نے بھی اسکی تقلید کی۔ علاوہ ازیں ویدوں میں اعلٰے و ادنٰی دیوتاؤں کا تصور ملتا ہے جس پر افلاطون یقین رکھتا تھا۔ انسانی فطرت کا جو جزو فنا ہوتا ہے وہ ان کمتر دیوتاؤں کی دین ہے۔

۴۔ وحدت الوجودی نقطۂ نظر یقیناً ویدک ہے۔ اسے سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ تمام دیوتا خدائے واحد کا مظہر ہیں اور الوہیت ایک ارتقائی سلسلہ ہے حتیٰ کہ اِندر جو ویدوں کے مہادیوتا ہیں وہ بھی خدا نما ہیں۔ یہ سب اپنے اعمال کی راستی سے خدائے واحد یعنی روحِ کل سے وصال پاتے ہیں۔
اس مسئلے کی ویدک وضاحت بہت ضروری ہے:

الف۔ خدا کائنات کا ناظم ہے کیونکہ یہ اس کی نگاہ ہے جو اس کی حرکت پر قابو رکھتی ہے (10·129:7)

ب۔ اس کے کنٹرول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سنسار کی رگ رگ میں روحِ واحد کی طرح سرایت کر چکا ہے:

وہ جو ایک ہے اس تمام (سنسار) میں رونما ہے (رگ وید والا 8:10:2)

۵۔ اصنیا کا نظریہ ہمہ اوست بھی سراسر ویدوں کا محتاج ہے جس کی رو سے وہ ہر چیز کو عارضی اور سراب نظر ٹھہراتے ہیں اور صرف خدا کی اصلیت کو مانتے ہیں:

"وہ (اِندر دیوتا یعنی خدا) جس کا یہ سارا جہاں ایک کاپی (نقل یا سایہ) ہے اس (ساکت) جگت کو گردان ★ رکھتا ہے" (رگ وید 2:12:9)

ویدک علمانے دنیا کی اس سرابی نوعیت کو "مایا" کا نام دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ شبد بھی ملاحظہ ہوں:

"دنیا کی ہر چیز کا ماڈل (نمونہ تعمیر) اِندر (خدا) ہے جو اپنی بے شمار صورتوں کے ذریعے مایا کے روپ میں جلوہ گر ہے" (رگ وید 6:47:18)

اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہئے کہ افلاطون کے اس مشہور زمانہ نظریہ کا منبع یہی ویدک شبد ہے جو IDEAS یا FORMS کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی رو سے ہر چیز کا ایک ابدی ماڈل (ARCHETYPE) موجود ہے جس کی نقل پر دنیا کی ہر چیز بنائی گئی ہے۔

اہل ہند (بلا تخصیص مذہب) کی بے مائیگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے کارناموں سے بالکل بے خبر ہو چکے ہیں۔ اہل پاکستان اس میں پیش پیش ہیں۔ انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ تشکیل پاکستان سے پیشتر جو بھی تاریخ ہے اس سے انکا کوئی تعلق نہیں۔ استغفر اللہ۔ جو لوگ اپنے باپ، دادا کی شخصیت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ ہوں وہ یقیناً انتہائی پاگل پن کا شکار ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ رگ وید جس سے میں اقتباسات پیش کر رہا ہوں پنجاب میں تخلیق ہوئے اور یہ اعلان جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اہل پنجاب ہی سے منسوب ہے۔ ایسے لوگوں کی ذہنی حالت کو جتنا بھی مطعون کیا جائے کم ہے۔

★ "جو کچھ بھی ہے (اے خدا) تو نے بنایا اور یہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا" (رگ وید 10:55:2) "آسمان اور زمین اسی طرح ہمیشہ قائم رہیں گے" (10:52:1)
ویدوں کی رو سے تمام سنسار غیر مربوط مادے سے تشکیل ہوا جو رفتہ رفتہ عمل میں آئی (10:129:1-7)

★★ اس سلسلے میں قرآن کی اس آیت پر بھی غور کیجئے۔ [illegible]

۶۔ انفرادی روح کا روح کل میں ادغام ہمیشہ ہی ہندی اعتقادات کا جزو رہا ہے۔ مشہور ہندی فلسفی شنکر آچاریہ نے اس نقطۂ نظر کی تشریح یوں کی ہے کہ اس (ظاہری) دنیا کی اساس برہمن (خدا) ہے۔ آتما (انفرادی روح) اور پرماتما (خدا) جو روح کل ہے اصل میں ایک ہیں۔ جب انفرادی روح مادے یعنی جسم میں بند ہوتی ہے تو اپنی کم نظری کے سبب اپنی یزدانی اصلیت کو دیکھ نہیں پاتی لیکن جب یہ گیان (عقل) کی شکتی (قوت) سے جہالت کا پردہ اٹھا لیتی ہے تو اسے مشیت دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب آتما اور پرماتما (برہمن یعنی خدا) کا وصال عمل میں آتا ہے۔
اپنیشد جو ۹۰۰ قبل مسیح لکھے گئے انہوں نے آتما اور پرماتما کے وصال کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں برہاد آرنیکا اپنیشد (1:4:7) اور سوتیاسوترا اپنیشد (2:15) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
یہ عقیدہ یونانی اختراع نہیں۔ ہندوستانی فلسفہ کی ایک شاخ ہے جس کی رو سے روح کل کا وصال صرف دانش سے ممکن ہے۔

۷۔ غضب تو یہ ہے کہ اہل ہند کا اپنی روایات سے اعتقاد اس طرح اٹھ چکا ہے کہ انہیں اپنی خوبیاں بھی اغیار کی دین نظر آتی ہیں جو انہوں نے ہندوستانی تہذیب سے اخذ کیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ قانونِ فطرت کو کائنات کی جلوہ گری کا سبب قرار دینا یونانی فلسفہ کا کمال ہے۔ یہ سراسر ہذیان ہے کیونکہ قانونِ فطرت کو سمجھنے اور اسکی تشہیر میں ہندی فلاسفہ کو یکتائی حاصل ہے۔ اس موضوع کی اہمیت اتنی شدید ہے کہ رگ وید میں اس کا کھلے انداز میں کم از کم ایک سو بیس (۱۲۰) بار ذکر کیا گیا ہے۔
ویدک فلسفہ کے مطابق یہ جہاں ایک قانون کا پابند ہے نہ کہ خدا کی آمرانہ مشیت کا۔ تمام دیوتا اس قانونِ فطرت کے تابع ہیں۔ قانونی تابعداری ان کے دیوتاپن کی ضامن ہے۔ اس قانون کی رضا و محبت سے پابندی کرنا ہی مشیتِ ایزدی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ "اے خدا! نظامِ عالم کا انحصار تیرے قانونِ عظمیٰ پر ہے" (رگ وید 5:62:1)
۲۔ "دیوتا قانون کے پابند ہیں جسے اقوام عالم بھی مقدس سمجھتی ہیں" (رگ وید 5:67.4)
۳۔ "دیوتا پابندیٔ قانون ہی سے صداقت سے آگاہ ہوئے۔ قانون کی اطاعت کرنے والے ہی پیدائشی طور پر روشن۔ پاکباز اور مقدس ہوتے ہیں" (رگ وید 7:56:12)

ظاہر ہے کہ قانون چند بنیادی اصولوں کے مجموعے کو کہتے ہیں جن کی تشکیل کا تعلق عقل سے ہے نہ کہ عشق اور جنون سے۔ یہ جہان جس کی تکوین سراسر اٹل عقلی اصولوں پر مبنی ہے کسی جذباتی احمق کے بس کی بات نہیں۔ علاوہ ازیں اس پر قانونِ مطلق کی حکومت ہے جس میں ذرہ بھر ردّ و بدل کی گنجائش نہیں۔ اس حقیقت کی وضاحت کیلئے فزکس (PHYSICS) سے ایک مثال پیش کرتا ہوں:
برقیوں کی دو اقسام ہیں۔ مثبت اور منفی جو طبعاً ایک دوسرے کے متضاد (OPPOSITE) اور تعداد میں قطعی یکساں ہیں۔ ان بیشمار برقیوں کی وسعت کا اندازہ لگانے کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ صرف ایک گرام ہائیڈروجن میں چھ سو بلین ٹرلین پروٹانز (PROTONS) اور بالکل اسی نسبت سے الیکٹرانز (ELECTRONS) ہوتے ہیں۔ ایک اونس مادے کے ان متضاد برقیوں کی تعداد میں اگر ایک فیصد فرق بھی آجائے تو یہ (ایک اونس مادہ) اس شدت سے پھٹے گا جو تمام کرۂ ارض کے وزن کے برابر ہوگا۔
اس مثال میں قانون قدرت کی وضاحت یوں ہے:

الف۔ مادہ برقیوں سے مدوّن ہے۔
ب۔ برقیوں کیلئے طبعاً متضاد ہونا ضروری ہے۔
ج۔ ہر اونس مادے میں متضاد برقیوں کا قطعاً مساوی تعداد میں ہونا امر لازم ہے۔
د۔ برقیوں کی تعداد بہت کثیر ہے لیکن اگر اس میں تھوڑی سی تفاوت آجائے تو یہ تباہی کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔

ظاہر ہے کہ ان باتوں کا تعلق عقل سے ہے لہٰذا اس کائنات کی خالق دانش ہے اسی حقیقت کے پیش نظر ہندی روایات نے اس جہاں کو عقل کی کارکردگی گردانا ہے:

★ نوٹ کیجئے کہ ارسطو کے مابعد الطبیعاتی نظام میں ہر معلول کیلئے ایک علت یعنی ہر EFFECT کیلئے ایک CAUSE چاہئے۔ بالفاظ دیگر ہر وجود کا سبب ہے۔ اس جہاں کی بقا کی حرکت یعنی گردش ہے۔ اس دنیا کو اس نے ایک منتظم خدا دینے کیلئے یہ مفروضہ پیش کیا کہ خدا اپنی ذات ہی سے گرداں یعنی SELF MOVER ہے۔ ارسطو کا یہ خیال یقیناً اس سے ماخوذ ہے۔

"دیوتاؤں میں جو عقلی قوت موجود ہے۔ان کے دیوتاپن کی ضامن ہے" (رگ وید 10:56:3)۔

یاد رکھنا چاہئے کہ میں ویدوں کو ہندوؤں کی مقدس کتابیں نہیں سمجھتا۔ان کا تعلق بلا تخصیص مذہب برّصغیر کے تمام باسیوں سے ہے کیوں کہ ان کی تخلیق ہندوستان میں ہندوستانی دانشوروں (رشیوں) نے کی جن کی عالمگیر دانش اور رفعتِ عمل کا جواب نہیں۔کوئی مانے یا نہ مانے ہندستانی تمدن کی بنیاد انہی پر ہے اور اسے معاشرتی حقائق کی روشنی میں آسانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

اس تحریر کا منشا،ویدوں کا پرچار نہیں بلکہ یہ جتانا مقصود ہے کہ برصغیر ہند کی معاشرتی اساس عقل ہے عشق نہیں۔اقبال کشمیری برہمن تھے اسلئے اپنی جدی روایات کی عقلی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھے لیکن اپنے آپ کو قلندر منوانے کیلئے حقیقت سے منحرف ہو کر عشق کی ڈفلی بجانے لگے۔

انہیں اپنی انا کا بڑا زعم تھا۔یہی وجہ ہے کہ عمر بھر مرزا غلام احمد قادیانی کی مریدی کرنے کے باوجود آخری ایام زندگی میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ روحانی مسجد قائم کرنے کیلئے قادیانیت سے برسرِ پیکار ہو گئے۔اس میں حکمت یہ تھی کہ مرزا صاحب مندرجہ ذیل آیت کی دور افتادہ تاویل کرتے ہوئے اپنی بروزی نبوت کی دوکان چمکا چکے تھے:

"محمد۔۔۔۔اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔۔"۔ (الاحزاب 33:40)

اسلام کی قدیم روایت کو توڑتے ہوئے مرزا صاحب نے دعویٰ کیا کہ محمد عربی(ص) آخری نبی نہیں بلکہ نبیوں کی مہر ہیں۔یعنی ان کے بعد جو نبی آئے گا اس کی بعثت پر حضور کی مہر نبوت ثبت ہوگی۔مرزا صاحب کے اس دعوے پر سخت غوغہ آرائی ہوئی اور مسلمانوں نے ان کے خلاف تحقیر کا ایک شدید طوفان کھڑا کر دیا۔اگر علامہ اقبال بھی ایسا ہی دعویٰ کرتے تو نہ صرف ان کے خلاف بھی ایک اندوہناک تحریک چلتی بلکہ ان پر کوئی بھی یقین نہ کرتا کیونکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی علاقے میں دو نبیوں کا نزول ایک اچنبھے سے کم نہ ہوتا۔چنانچہ انہوں نے ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے قادیانیت سے کنارہ کشی کی اور اپنی قلندری کا دعویٰ کر دیا جس کی بنا تعمیر خودی پر ہے اور تکمیل صرف عشق سے ممکن ہے۔غضب تو یہ ہے کہ علامہ مرحوم نے نہ تصوّر خودی کی کوئی جامع تعریف پیش کی اور نہ ہی رازِ عشق کی حقیقت کو عیاں کر سکے۔

چونکہ میں اس موضوع پر اپنے مقالہ "اقبال اور قلندری" میں مفصل بحث کر چکا ہوں اسلئے یہاں صرف سر راہے ہی انکی قلندری اور متعلقہ نکات پر گفتگو کرونگا۔علامہ مرحوم فرماتے ہیں:

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی مشرق میں ابھی تک وہی کاسہ ہے وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

یہ "مردِ قلندر" خود اقبال ہیں جو اپنا مقام اس قدر سمجھتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھی اپنی تقلید کے قابل نہیں سمجھتے:

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

یہاں اقبال کا مقام "جذب و مستی" اہل عرش کی حمد ایزدی سے کہیں ارفع ہے جو وہ تسبیح و طواف کی صورت میں کرتے ہیں۔ان کی "جذب و مستی" کی بنا ان کی خودی ہے جو کاملیت کی بلندیوں کو پار کر چکی ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ خود خدا انکی مرضی پوچھ کر ان کی تقدیر لکھنا چاہتا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

چنانچہ اس حقیقت کے پیش نظر وہ اپنے قلندرانہ فرائض کی ادائیگی کیلئے ہر ایک کو یہ تلقین کرتے ہیں:

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقہء شام و سحر سے جاوداں ہو جا

اقبال اپنے دعویٰ قلندری کی تکمیل اصول خودی سے کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ انہیں یقین ہے کہ ان میں غیر معمولی روحانی شرف موجود ہے

دراصل ایسانور بصیرت ہے کہ اگر یہ نوجوان نسل میں نہ پھیلا تو ان کی دینوی اور دنیاوی زندگی مسدود ہو کر رہ جائے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کے مطابق رسول عربی کو بھی اپنے نور بصیرت کے متعلق کوئی ایسا دعویٰ نہ تھا۔ وہ صرف "نذیر" یعنی ڈرانے والے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ کسی کو ہدایت بھی نہیں دے سکتے کیونکہ لوگوں کو صراطِ مستقیم دکھانا صرف اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔

اقبال کے نزدیک نورِ بصیرت عقل دشمنی کا دوسرا نام ہے:

اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

"اہل دانش" وہ ہیں جو خدا کو عقلِ کُل مان کر عقل واستدلال کی راہ اختیار کرتے ہیں لیکن "اہل نظر" وہ ہیں جو عشق کو مشعل راہ بناتے ہیں۔ اس مفروضے کے پیشِ نظر عشق کی جامع تعریف امر لازم ہے لیکن ان کے ارشادات سے صاف ظاہر ہے کہ عشق جذباتی بھول بھلیوں کا دوسرا نام ہے:

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق — کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش — کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

مزید برآں فرماتے ہیں:

کبھی تنہائیٔ کوہ و دمن عشق — کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر — کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اقبال اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا نظریۂ عشق بے جان ہے اسلئے کوئی بھی انکی پیروی کرنے پر مائل نہیں ہوگا چنانچہ وہ اپنی قلندری کیلئے محمد عربی (ﷺ) کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور جسطرح کشتی میں لگے ہوئے لوہے کی کیلیں لکڑی کے ساتھ تیرتی ہیں، وہ تعظیم محمدی کا انتظام کرتے ہوئے مسلم عوام کیلئے اپنی ذات کو پر کشش بناتے ہیں:

اے روحِ محمد

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر! — اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے
وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں — پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفاں کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد — اس کوہ و بیاباں سے حدی خواں کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد! — آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کی نگہبانی کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے لیکن لوگوں کو جذباتی چکمہ دینے کیلئے اقبال یہ فریضہ اپنے سر لینا چاہتے ہیں۔ انکی قلندری کی بنیاد اور آیات الٰہی کی نگہبانی کا راز تقلید رومی میں مضمر ہے:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے صدائے دمادم کن فیکون
علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن — اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

یہ رومی کون ہے جو ضمیر اقبال میں انوار الٰہی کی تجلیاں بکھیر رہا ہے؟

مولانا جلال الدین رومی ۱۲۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ انکی جنم بھومی بلخ ہے اور وہ شاہ خوارزم کے نواسے تھے۔ اس طرح ان کی رگوں میں شاہی طمطراق کا خون موجزن تھا۔ انکی ذہنی تربیت پر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا گہرا اثر تھا کیونکہ انہوں نے کافی مدت تک صدر الدین قونوی سے تعلیم حاصل کی جو ابن عربی کے شاگرد تھے۔ ابن عربی ۱۱۶۵ء میں وارد ہستی ہوئے۔ اگرچہ وہ دمشق میں سکونت پذیر تھے ان کی پیدائش اسپین میں ہوئی۔ ان سب کے مرشد ابو

حامد الغزالی تھے جو بمقام طوس ۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے۔

اگر میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دوں کہ یہ اصفیاان اصولوں کے پابند تھے جن سے اہلِ ہند ویدوں کی وساطت سے آشنا ہوئے تو قارئین مچل جائیں گے۔ حقیقتاً تصوف کا پرچار جس میں اقبال پیش پیش تھے اسلام کے پردے میں اسلام کے خلاف گھناؤنی سازش ہے کیونکہ مجموعی طور پر ان صوفیوں کے اعتقادات حسب ذیل تھے جو روحِ اسلام کی ضد ہیں:

۱۔ صوفیوں کے عقیدہ میں یہ کائنات ہمیشہ سے چلی آرہی ہے اور ہمیشہ ہی چلتی رہے گی۔ خدا کی ہستی اپنی جگہ الگ اور بنفسہ ہے۔ وہ خالق نہیں بلکہ ایک انجینئر کی طرح ہے جو مختلف حصوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز پیدا کرتا ہے جس کے اجزاء پہلے ہی سے موجود ہیں۔ مادہ ابدی ہے۔ یہی ویدک اصول ہے جو اہلِ یونان نے اپنایا۔

اسلامی نظریہ اسکے بالکل برعکس ہے۔ خدا خالق ہے۔ صرف وہی ابدی و ازلی ہے۔ باقی ہر چیز اسکی مخلوق ہے۔ مادہ تخلیق کیا گیا ہے اور زوال پذیر ہے۔

۲۔ اصفیا کی لغت عقیدہ میں خدا عالمی روح ہے اور انسانی روح اس کا ایک جزو ہے جو کل سے ملاپ کیلئے بیتاب ہے۔ لہٰذہ انسانی زندگی کا مقصد وصالِ الٰہی ہے۔ یہی ویدک عقیدہ ہے جس کی وضاحت آج سے تقریباً تین ہزار برس قبل اپنیشدوں میں کی گئی۔

اصول اسلام اسکے برعکس ہے۔ روزِ محشر کو انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے جو اہلِ ایمان ہیں انہیں محشر کے دن جنت میں داخل کیا جائے گا جہاں وہ حور و غلماں کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں گے لیکن منکرین نارِ جہنم کی نذر کئے جائیں گے۔

۳۔ صوفیوں کے عقیدہ کے مطابق نجات مکتی یا نِروان کا انحصار ذاتی عمل و ریاضت پر ہے لیکن اسلام میں اسکا مدار نبوتِ محمدی پر ایمان لانے میں ہے۔ صرف عمل بے معنی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس اصول میں کئی تبدیلیاں پیدا کی جاچکی ہیں جن کی اصل وجہ اصفیا کی انا پرستی ہے۔ اس سلسلے میں اختصاراً عرض ہے کہ:

ا۔ صوفی ازم اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف ہی ایک متوازی ''روحانی'' نظام ہے۔ ابن عربی کی تعلیمات کے مطابق ایک ولی کا درجہ نبی سے برتر ہے کیونکہ اول الذکر براہ راست خدا سے علم حاصل کرتا ہے لیکن موخرالذکر ایک فرشتے (جبرئیل) کی وساطت کا محتاج ہے۔ ولیت کی نبوت پر فضیلت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ قانونِ الٰہی کا مشتہر ہونے کی رو سے نبی کا تعلق انسانوں سے ہے لیکن ولی کا واسطہ براہِ راست خدا سے ہے۔

استغفر اللہ۔۔۔ کیا یہ اسلام ہے؟

ب۔ اقبال اور ان کے پیش رووں کا نظریۂ عشق اسی حکمت عملی کی پیداوار ہے۔ عشق کیا ہے؟ یہ محبوب (جو انسان کے علاوہ مال و زر۔ رتبہ۔ حصول قوت وغیرہ بھی ہو سکتا ہے) سے ایسی لگن ہے جو عاشق کی منزلِ مقصود بن جاتا ہے جس کے بغیر اسے کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ اسطرح وہ ہر چیز کو جذبات کی عینک سے دیکھنے لگتا ہے۔ جزا و سزا کے معروضی معیار بے کار ہو جاتے ہیں۔ نیک اور پرلطف وہی ہے جو حصولِ محبوب کے قریب لے جائے خواہ وہ درحقیقت برائی اور عذاب کی جڑ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں عقل ماؤف ہو جاتی ہے اور اس کا انتشار جلوہ افروزی کے بجائے ظلمت گری کا کردار ادا کرنے لگتا ہے۔ غالب نے شاید اسی سلسلے میں کہا تھا:

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ تیرے رخ پر بکھر گئی

صوفی حضرات نے اپنے پرچار میں نظریۂ عشق کو اس لئے ہوا دی کہ لوگ عقل کے بجائے جذبات پر انحصار کرنا شروع کر دیں اور عشق یعنی جنون و دیوانگی کی بھول بھلیوں میں اس طرح کھو جائیں کہ انہیں عقل شر اور عشق خیر دکھائی دینے لگے۔ عیاری کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس اسلام شکن مسلک کا سربراہ محمد مصطفیٰؐ کو قرار دیتے ہوئے خود کو ان تک قرب حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ظاہر کیا۔ یہ ایک بڑی نفسیاتی چال تھی۔ جسطرح ایک بنیا یا یہودی اصل زر سے بیاج کو زیادہ پیار کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ دامِ تصوف میں پھنس جائیں انہیں اپنے پیر و مرشد کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ قرآن و حدیث اور مقام نبوت کو بھول جاتے ہیں۔۔۔ یہ دراصل مسیحی نقطۂ نظر لوگوز (LOGOS) کی توسیع ہے جو یونانی فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ منصور حلاج نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کیلئے مقام محمدی کو ''ھو۔ ھو'' کہہ کر پکارا اور اقبال نے اپنی قلندری جتانے کیلئے ''عشقِ محمدی'' کا ترانہ چھیڑا لیکن دیار حبیب پر حاضری نہ دے

سکے۔ یہ ان کے عشقِ محمدی کی حقیقت ہے!

۴۔ نظریہ وحدت الوجود بھی اصفیا کی ایک غیر اسلامی اختراع ہے جو ویدوں سے ماخوذ ہے۔ در حقیقت یہ اس اصول کی کاربن کاپی ہے جس کی اپنشدوں میں برہما (دیوتا) کے نام سے تشریح کی گئی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ خالق ہے جس کا وجود حقیقی اور بالذّات ہے۔ یہ جہان اس سے الگ ہے اور فانی ہے۔

۵۔ اصفیا کی نگاہ میں یہ جہان محض نظر کا دھوکہ ہے جسے ویدوں نے "مایا" کا نام دیا ہے لیکن اسلامی زبان میں یہ مخلوق ہونے کے سبب وجود کا حامل ہے

جو اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک اس کی بربادی کا وقت نہیں آتا۔

یہ جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے مولانا روم کی صوفیانہ شاعری کا حصہ ہے جو بقول اقبال:

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا ۔۔۔ تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن ۔۔۔ اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

اقبال خود کو "مرید رومی" کہتے تھے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پیر رومی وسیلہ کے افکار اگرچہ سراسر ویدک ہیں لیکن انہوں نے یہ ویدوں کے براہ راست مطالعہ سے نہیں بلکہ "امام" غزالی کی نگارشات سے اخذ کیے ہیں جو فلاطینوس سے متاثر تھے۔

فلاطینوس (PLOTINUS) تیسری صدی عیسوی کے عظیم فلسفی اور مذہبی راہنما تھے۔ ان کے افکار سترھویں صدی یورپ اور ایشیا کے دانشوروں اور پیشواؤں کو بھی متاثر کرتے رہے۔ وہ مصر میں ضرور رہتے تھے لیکن ان کی قومیت سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہے۔ یہ انکا ادراک و فراست تھی جس نے افلاطونی فلسفہ کو ترویج و دوام بخشا۔

انسائیکلوپیڈیا۔ بری ٹانیکا کے پندرھویں ایڈیشن۔ جلد چودہ کے صفحہ ۵۷۳ پر مرقوم ہے کہ "فلاطینوس کے افکار کو ہندوستان کے مذہبی فلسفہ سے گہری مماثلت ہے"۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے اجاگر کرنے کیلئے میں نے ویدوں سے براہ راست حوالے دیئے ہیں جو شائقین علم چیک کر سکتے ہیں۔ اس مشق کا مقصد ویدوں کا پرچار نہیں بلکہ ہندی نژاد ہونے کے ناطے سے برصغیر کے لوگوں کو یہ یاد کرانا مقصود ہے کہ ان کا دیس پسماندگی کا نہیں بلکہ تہذیب انسانی کا گہوارہ ہے۔ کاش کہ وہ کبھی اس حقیقت کا سراغ لگانے کی خود بھی کوشش کریں تاکہ ان کے سر فخر سے اوپر اٹھ سکیں

فلاطینوس کا فلسفہ پیچیدہ ہے لیکن اسے اختصار کے طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

الف۔ احد (خدا) فلاح (GOOD) ہے۔ نہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ قطعی طور پر ایک اور غیر محدود ہے اور تمام مرئی اور غیر مرئی حقائق کا منبع ہے۔

ب۔ عقل یا روح خدائے مطلق کی پہلی تخلیق ہے جو خود اس سے ماخوذ ہے۔ بالفاظ دیگر خدا عقل کل یا عالمی روح ہے اور انسانی عقل یا روح اس کا جزو ہے۔

ج۔ یہ جہان ہمیشہ سے قائم ہے اور رہے گا۔ یعنی کائنات ابدی و ازلی ہے۔ وقت روحِ عالم کی حیات ہے جو سنسار میں رواں دواں ہے۔

د۔ وجود یعنی ہونے کی مختلف سطحیں ہیں۔ اگرچہ ہر وجود کے درجات (ایک دوسرے سے) متمیز ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر چیز میں جڑے ہوئے ہیں۔

ر۔ روحانی سطح سے ابھر کر مقامِ عقل حاصل کرنا اور اس سے بلند تر ہو کر وصالِ ایزدی کا حصول حالتِ سفر سے مماثلت نہیں رکھتا بلکہ شعوری ارتقا کا ایک نیا تجربہ ہے۔

ز۔ انسانی زندگی کا مقصد احد (خدائے مطلق) سے وصال ہے اور اس کا ذریعہ عقل اور اخلاق ہے۔

یہ فلاطینوس اصول مولانا روم کی شاعری میں سماگئے اور ان کے ساحرانہ اندازِ بیان کی وجہ سے اسلام کے صوفی حلقہ کی روحِ رواں بن گئے۔ مولانا روم نے نہ صرف ان ویدک اصولوں کو اپنایا بلکہ رقص اور گیت کو بھی اپنے درویشوں کے مسلک میں شامل کر لیا جو ویدک دیوتاؤں کی پہچان ہے۔

"او۔ اِندر (دیوتا) تو جو ہزار قاص ہے اکثر لوگ تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں" (رگ وید 8:24:9)

رقص اور گیت ویدک عبادت کے اجزا ہیں جسے اہلِ تصوف نے اپنا مان لیا لیکن یہ سب اسلام میں سراسر حرام ہیں۔ قرآن، حدیث یا سنت نبوی

میں کہیں بھی نہیں آتا کہ حضور (ؐ) نے کبھی ناچ گانے کو عبادت کا رنگ دیا ہو۔ ترمذی شریف۔ جلد دوم میں تفسیر سورۂ لقمان کے سلسلہ میں گانے بجانے کو "الغناء فیتہ الزنا" کہا گیا ہے۔ یعنی گانا زنا کا منتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کے دور سلطنت میں گانا اور ناچنا غیر اسلامی شعائر میں شمار ہوتے تھے۔ اقبال نے مولانا روم کے نظریۂ عشق کو ایسی آتش کہا ہے جس کے سوز میں قلب و نظر کا علاج پوشیدہ ہے اور جس کے فیض نے انہیں نگاہ روشن عطا کی تھی۔ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ ایڈیشن پندرہ۔ جلد دہم صفحہ ۱۴۱ سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے مولانا روم اور ان کے ساتھی صوفیوں کے عشق کی حقیقت واضح ہوتی ہے:

"تیس نومبر ۱۲۴۴ء جلال الدین رومی کی زندگی میں ایک انقلاب انگیز دن تھا جبکہ وہ کونیا کی گلیوں میں ایک خانہ بدوش درویش شمس تبریز نامی سے ملے۔ شمس الدین کا نام کسی صوفی سلسلہ کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ وہ دونوں ایسی قربت سے رہنے لگے کہ لوگوں نے ان کے چلن پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دیں۔ یہ سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا اور جلال الدین نے اپنے مریدوں اور اہل خانہ کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کے مریدوں اور گھر والوں نے فروری ۱۲۴۶ء میں شمس تبریز کو زبردستی شہر سے باہر نکال دیا۔ جلال الدین رومی اس قدر دل شکستہ ہو گئے کہ ان کے بڑے بیٹے سلطان ولد شمس تبریز کو شام (SYRIA) سے ڈھونڈ کر واپس لے آئے لیکن جلال الدین رومی کے گھر والے اس تعلق کو برداشت نہ کر سکے جو ان کا اپنے "محبوب" (شمس تبریز) کے ساتھ تھا۔ ۱۲۴۷ء کی ایک شب تبریز ہمیشہ کیلئے غائب ہو گیا۔ حال ہی میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ تبریز کو قتل کیا گیا اور جلال الدین رومی کے بیٹوں کو اس بات کا علم تھا جنہوں نے دراصل تبریز کی لاش کو ٹھکانے لگانے کیلئے اسے ایک کنویں کے نزدیک چپکے سے دفن کر دیا جس کے آثار ابھی تک باقی ہیں"۔ یاد رکھنا چاہئے کہ تصوف میں "مجازی محبوب" کا تصور شروع ہی سے شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ صوفی ایک ہم جنس کے عشق میں "محبوبِ حقیقی" (خدا) کے وصال کی تلاش کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ان کی شاعری جسے یہ "عارفانہ" کلام کہتے ہیں نہ صرف شہوانیت کا ایک غیر معمولی نمونہ ہوتا ہے بلکہ ان کا محبوب جس کی فرقت میں یہ آہیں بھرتے ہیں وہ بھی مذکر ہوتا ہے! اسکی ایک وجہ تو حکیم سقراط ہے جو صوفیوں کا ماڈل سمجھا جاتا ہے جس کا ALCIBIADES یعنی ایک جواں سال لڑکے کے ساتھ معاشقہ تھا اور جسے ایتھنز کے لونڈوں کو ورغلانے کے الزام میں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

تبریز جلال الدین کا مجازی محبوب تھا۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں، اہل خانہ کی شرمندگی اور اسکے قتل میں رومی کے بیٹوں کا ملوث ہونا قاری کے ذہن میں گھناونی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یاد رہے کہ اس واقعہ سے پہلے مولانا روم شاعر نہیں تھے۔ تبریز کے قتل نے انکی خفیہ قوت شاعری کو بیدار کر دیا تاکہ وہ غم جاناں کی لہروں کو دل کی اتھاہ گہرائی سے نکال کر لبِ ساحل لا سکیں تاکہ ان کی طغیانیٔ جذبات میں کچھ کمی واقع ہو۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا روم کی اکثر شاعری ان کے غیر اسلامی طرز حیات کی پیداوار ہے۔ وہ اسلئے کہ وہ میوزک کا سہارا لئے بغیر شعر گوئی نہیں کر سکتے تھے۔ قتل تبریز کے چند سالوں بعد مولانا روم صلاح الدین زرکوب کے عشق میں مبتلا ہو گئے جو کہ ایک گنوار سنار تھا۔ اس معاشقے نے انکی رنگ شاعری کو اور بھی نکھار دیا۔ صلاح الدین کی موت کے بعد وہ حسام الدین چلپی کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ مولانا روم نے عطار اور سنائی کا اسلوب شاعری حسام الدین کو خوش کرنے کیلئے اپنایا تھا۔ ان کی مثنوی کے چھبیس ہزار اشعار اسی محبت نوازی کا نتیجہ ہیں۔

مولانا روم کی مثنوی سے رسول عربی (ؐ) کا وقار ٹپکتا ہے نہ اخلاقی عظمت۔ نہ ہی ان کے اشعار میں اسلام کے مجاہدانہ کردار کی جھلکیاں ہیں اور نہ ہی ملتِ اسلامیہ کیلئے تعمیر نو کا کوئی پیغام یا نسخہ ہے۔ سچ تو یہ کہ رومی کے کلام میں نہ وہ آتش ہے اور نہ وہ سوز جس سے بیمار مسلمانوں کا علاج ہو سکے یہ محض اقبال کا زور خطابت ہے اور ان کی عقیدت مندی کی بنا بھی خلوص پر نہیں بلکہ دنیاداری پر ہے۔ مولانا روم نے ایک نئے فرقہ درویشیہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں رقص و موسیقی کو ایک خاص مقام حاصل ہے جس کی وجہ سے انہیں تمام ایسے ممالک میں پذیرائی حاصل ہوئی جہاں فارسی زبان عروج پر تھی۔ ترکی میں انکی عظمت کا سبب یہی تھا۔ اقبال اتباع رومی کی خاطر ان کے مرید بن بیٹھے ورنہ حقیقتاً رومی کا کلام فلاطوس یعنی ویدک اصولوں کا علم بردار ہے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں۔ اسلئے اقبال کی فارسی شعر گوئی کا سبب تلاش شہرت کے سوا کچھ نہیں۔

اقبال مریدِ رومی تھے لیکن رومی کے بیک گراؤنڈ میں الغزالی تشریف فرما ہیں اسلئے اس تمام گورکھ دھندے کو سمجھنے کیلئے ابو حامد الغزالی سے کچھ آشنائی ضروری ہے:

الغزالی ۱۰۵۸ء میں بمقام طوس پیدا ہوئے۔ ان کے والد بچپن ہی میں فوت ہو گئے تو ایک صوفی دوست نے انکی پرورش کی۔ ان کے مضامینِ مطالعہ میں قانون۔ الٰہیات اور فلسفہ شامل تھے۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات میں اقرار کیا ہے کہ عقلی تقاضوں کے سبب ان کا اللہ اور دین مصطفوی سے

عقیدہ اٹھ گیا۔ یہ نتیجہ تھا ان کی طویل بیماری کا۔ اپنی طبیعت میں ایک بڑا خلا محسوس کرتے ہوئے انہوں نے تصوف کے مجذوبی تصورات میں پناہ ڈھونڈی اور اس طرح خارجی دنیا کے مشاہدات سے منہ موڑ کر کیفیاتِ قلبی میں محو ہو گئے۔ اس عمل میں انہیں احساس ہوا کہ خدا ایک غیر مرئی حقیقت ہے جس کی اساس روحانیت پر ہے۔ حواسِ خمسہ تلاشِ حقیقت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں اور عقل جو حواسِ خمسہ کی ہی توسیع ہے راہنمائی کا کام نہیں دے سکتی۔ انسان میں خدا کو پانے کا وجدانی جوہر (INTUITIVE ABILITY) موجود ہے جو جبلی مشعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے ریاضت و مجاہدہ سے جمالِ حقیقی تک پہنچا سکتا ہے۔ عقل محض ایک علت ہے جو توجیہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس میں نہ کوئی تخلیقی قوت ہے نہ راہنمائی کا جوہر۔ اس کا تعلق محض ترتیب سے ہے جیسے گنتی میں ایک کے بعد دو اور دو کے بعد تین کی خود بخود تکرار ہوتی ہے۔ لہٰذا منطق، استدلال اور سائنس بے معنی باتیں ہیں جو خدا اور روح کی ابدی حقیقت کو ثابت نہیں کر سکتیں۔ ان کا عرفان صرف وجدانی کیفیت پر منحصر ہے جو تصوف کی جان ہے۔

عقلی بیزاری کا پہلا اعلانیہ مبلغ الغزالی تھے جس نے تصوف کو جو دراصل ویدک تعلیمات کا خلاصہ ہے جانِ اسلام قرار دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الغزالی قرآن و حدیث کے بھی قائل تھے لیکن یہ محض رائے عامہ کو اپنی طرف کھینچنے کا ایک ڈھنگ تھا اور اس کی نوعیت ایک دانے سے مختلف نہ تھی جو ایک چالاک شکاری پرندے کو پھانسنے کیلئے ڈالتا ہے۔ تصوف اسلام کے خلاف ایک متوازی روحانی نظام ہے جس کی تائید ہر اس شخص نے کی جو درجہ نبوی کا خواہشمند تھا لیکن دعوئ رسالت کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ جب غزالی نے اسکی بنیاد ڈال دی تو اس گلستان میں طرح طرح کے گل ہائے روحانیت کھلنے لگے۔ ان خود ساختہ ولیوں، قطبوں اور قلندروں نے اپنے ایمان کا ڈھنڈورا پیٹنے کیلئے اسلام کی پیش کردہ شانِ وحدہٗ لاشریک کا گلا گھونٹ دیا۔

محی الدین ابنِ عربی (۱۱۶۵-۱۲۴۰) نے نہ صرف ویدک عقیدۂ وحدت الوجود کو ''اسلامی تصوف'' کا ایک جزو لاینفک بنا دیا بلکہ محبوب مجازی کا تصور بھی انہی کی ایجاد ہے جس کی رو سے ایک صوفی کو اس لونڈے یا لونڈیا میں محبوبِ حقیقی (خدا) کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے جس کے فراق میں وہ آہیں بھرتا ہو لیکن منافقت کی انتہا یہ ہے کہ صوفی عاشق محبوبِ مجازی سے وصال کا (ظاہری طور پر) منکر اور افلاطونی محبت (PLATONIC LOVE) کا قائل ہے۔ ابن عربی کے اصول کے مطابق ''وہ جو عشق (مجازی) میں مبتلا ہو لیکن مرتے دم تک جنسی لذت کا ارتکاب نہ کرے شہید کا درجہ پاتا ہے اور عرفانِ الٰہی کی انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہے''

یہ مجذوب کی بڑ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صوفیانہ شاعری سے بڑی فحاشی اور کوئی نہیں۔ خود ابن عربی جو دورانِ حج میں ایک معصوم لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور ساری عمر پیچ و تاب کھا کھا کر شہوانی شاعری کا ارتکاب کرتے رہے اسلامی شعائر کے علم بردار نہیں کہلا سکتے۔ دینِ محمدی میں حجاب کا بڑا مقصد یہی ہے کہ دوسروں کی بہنوں۔ بیٹیوں کو بھیڑیوں کی نظرِ مجازی سے بچایا جائے لیکن ایک صوفی کا ذہن معشوق کی گرمیوں کے باعث ایک زندہ قحبہ خانہ بن جاتا ہے۔

اقبال کو ابن عربی کا نظریۂ عشق جلال الدین رومی کی وساطت سے ورثے میں ملا۔ اس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر نہیں بلکہ ارسطو کے تصورِ علت پر ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہر معلول کی ایک علت ہوتی ہے اور اس طرح ہر چیز اپنی وجہِ تکوین سے عشق کرتی ہے جیسے مخلوق کو اپنے خالق سے اسلئے عشق ہے کہ وہ اسکی وجہِ تخلیق ہے۔ اس لئے عشق نہ صرف کائنات کا منبع ہے بلکہ صحیح طریقت اور معشوقِ حقیقی سے وصال کی ضمانت بھی یہی ہے۔ لیکن اس کے برعکس عقل ناقص اور گمراہی کا سرچشمہ ہے۔

علت و معلول کی بحث طوالت طلب ہے اسلئے اس مختصر مقالے میں اس کی گنجائش نہیں۔ البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ راہِ تخلیق عشق میں نہیں جو بے آہنگی، یک طرفہ جھکاؤ اور جذباتی طغیانی کا دوسرا نام ہے۔ عناصر کا باہمی توازن جو عقل کا خلاصہ ہے اور جس میں جذبات پرستی کو کوئی دخل حاصل نہیں سرِ آفرینش کی جڑ ہے۔ ذرات کی جذب باہمی کو عشق کہنا غلط ہے۔ یہ عقلی توازن ہے جو ذرات میں ایک غیر جانبدارانہ قانون کی مخلصانہ اور شدید پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر منفی اور مثبت برقیوں کے تناؤ میں رتی بھر ڈھیل یا جھکاؤ پیدا ہو جائے جو علامتِ عشق ہے تو کائنات پل بھر میں درہم برہم ہو جائے۔

یہ کائنات اٹل اصولوں کی انتہائی بندش کی پیداوار ہے جن کا تعلق عقل سے ہے جو دو اور دو کو ہمیشہ ہی چار گنتے ہیں لیکن عشق میں ایسی حقیقت کیلئے جگہ ہی نہیں۔ جو چیز خدا کو خدا بناتی ہے وہ عقل ہی تو ہے۔ کوئی بے عقل تخلیق کیسے کرے گا جس کیلئے انتہائی حکیمانہ فارمولوں کی ضرورت ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ عقل کے بغیر کاروبارِ ہستی چلانا بھی تو ناممکن ہے۔ عشق جو عقل کی ضد ہے جذبات پرستی اور بے اصولی کا دوسرا نام اور ابتری اور نیستی کا پیغامبر ہے۔ یہ بڑے بڑے صوفی انا پرست نیم فلسفی تھے۔ ان میں اتنی قابلیت ہی نہیں تھی کہ وہ مظاہر فطرت کی باطنی گہرائیوں کو سمجھ سکیں۔ وہ متکلمین تھے جن کا

مقصد ہی عقل کو آلۂ کار بنانا اور اپنے منفی نظریات پر جادوئے اثبات کا ملمع چڑھانا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عاشق کا لبادہ اوڑھ کر اپنی کوتاہ نظری کو چھپانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ چرب زبانی سے اپنے لئے اولیت کا اعلےٰ مقام پیدا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی آنکھوں پر بے عقلی کی پٹی باندھ کر اسے ایسی پستی کے گڑھے میں دھکیل دیا جو ہر قدم اٹھنے سے عمیق تر ہوتا جاتا ہے لیکن چلنے والا یوں سمجھتا ہے کہ وہ بلندیوں کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے عقلِ سلیم کی ضرورت ہے جو صوفی کے دامِ عشق میں گرفتار ہو کر اپنی قوتِ پرواز کھو چکی ہے۔

علم عقل کا اعجاز اور انسان کیلئے سب سے بڑی دین ہے۔ عربوں کو جو رفعت ملی وہ اس فراست کا نتیجہ تھا جو انہیں قرآن نے بخشی۔ یورپ کی ریفرمیشن جس نے رفتہ رفتہ اقوامِ عالم کی تہذیبی کیفیت بدل ڈالی اور انسان کو چاند اور ستاروں کی سیر کرائی سب عقل دوستی کا نتیجہ ہے۔

جہاں عقل کی فرماں روائی ہوگی وہاں علم ہوگا۔ ہم اہلِ مشرق ٹکے ٹکے کی باتوں سے لاکھ میاں مٹھو بن کر اپنی پستی اور ضلالت کو عشق کی سنہری اوڑھنی میں چھپانے کی کوشش کریں لیکن کبھی ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ عقل دشمنی ایک ایسا کلنک کا ٹیکہ ہے جس پر جتنا پردہ ڈالو اسکی تاریکی اتنی ہی زیادہ عیاں ہوتی ہے۔

اقبال نے اپنی عقل دشمنی کا علم گاڑنے کیلئے علم کی تضحیک اور عشق کی تبلیغ کی۔ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے بدترین گناہ اور قومی لحاظ سے ایک ناقابلِ معافی جرم ہے۔ آیئے اقبال کے اس پہلو پر نگاہ ڈالیں۔ سب سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ کبھی وہ زمانہ تھا جب انہیں تحصیلِ علم سے دلی لگاؤ تھا:

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

لیکن بعد میں انا پرستی کے تقاضوں سے ان کا نظریہ بدل گیا اور انہوں نے غزالی ابن عربی اور بالخصوص رومیؔ کی تقلید میں عشق کا راگ چھیڑتے ہوئے علم و عقل کی دھجیاں اڑانا شروع کر دیں:

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو خدا نما ہوں میں

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی زندہ و جاوید عشق

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودہ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

کلامِ اقبال میں اسی طرح کے بیسیوں اشعار ہیں لیکن اختصار کی خاطر اتنا نمونہ ہی کافی ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ اقبال نے بھی دیگر اصفیا کی طرح شانۂ نبوی پر ہی رکھ کر اپنے غیر نبوی افکار کی بندوق چلائی ہے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

کیا اقبال کا تصورِ علم و عقل اسلامی ہے؟ آیئے دیکھتے ہیں اس سلسلے میں قرآن و حدیث کا کیا ارشاد ہے:

سب سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اسلام میں نظریۂ عشق کا جواز تو موجود ہے لیکن اس میں "عشقِ مجازی" جیسی بدعت کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ اسلامی عشق ہے نام پابندیٔ احکامِ الٰہی کا۔ دینی اعتبار سے وہی عاشق ہے جو صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو۔ راہِ حق میں سر کٹانے کیلئے ہر وقت تیار ہو۔

رزق حلال کماتا ہو تابعدار اولاد اور شفیق باپ اور ماں ہو اور اپنی نسل کو بہبودیٔ انسان کیلئے پالتا ہو۔
ان باتوں کیلئے عقل اور علم کی اشد ضرورت ہے کیونکہ عقل ہی حیوان کو انسان بناتی ہے اور عقل پر ہی خیر و شر کی پہچان اور اخلاقی اقدار کا انحصار ہے جس میں عقل و علم نہ ہو خواہ وہ کتنا بڑا عاشق کیوں نہ ہو گدھا کہلانے مستحق ہے۔ دراصل عشق اور انسانی پستی میں چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ عقل سے تہی دستی انسانی عظمت کیلئے ضرب کاری ہے۔ غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عشق ایک ذہنی بیماری ہے۔ اسلام اس کا علاج علم و عقل تجویز کرتا ہے اور الہام کا اصل منشا یہی ہے۔ پہلی وحی جو حضور پر نازل ہوئی اس میں جبرائیل یہ کلام الٰہی لاتے ہیں:
"خدا انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جن کا ان کو علم نہیں" (علق-۹۶:۵)
قرآن کا دعویٰ علم رسانی ہے جو خیر و شر کی پہچان پیدا کرتا ہے، تبلیغ عشق نہیں جو مجذوبیت کا منبع ہونے کے باعث اقدار انسانی کا دشمن ہے۔ اگر ان مندرجہ ذیل احادیث پر نظر ڈالی جائے تو فضیلت علم خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے:
★ "جو شخص راہِ علم کی طلب میں چلتا ہے۔ اس کا ہر قدم جنت کی طرف اٹھتا ہے" (ترمذی۔ جلد دوم۔ باب طلب علم)
★ "جس نے علم طلب کیا اسکے اگلے گناہوں کا کفارہ ہو گیا" (ترمذی۔ جلد دوم)
★ "عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جس طرح چودھویں رات کے چاند کو ستاروں پر۔ بلاشک علماء انبیا کے وارث ہیں" (مشکوٰۃ۔ جلد اول۔ کتاب العلم۔ فصل اول)
★ "ایک فقیہہ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھی بھاری ہے" (ترمذی۔ ابن ماجہ)
لیکن حضرت اقبال فرماتے ہیں:

قلندر جز دو حرف لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

استغفر اللہ۔ اقبال کون سے اسلام کے پرچارک ہیں۔۔۔۔ اگرچہ علم دوست احادیث فراوانی سے میسر ہیں۔ میں نمونے کے طور پر صرف چند ایک ہی پیش کروں گا:
□ حضور نے فرمایا "مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا"
□ "تمام انبیا معلمِ انسانیت بن کر آئے اور انسانوں کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی"
□ "عالم کی باتیں سننا اور انہیں ذہن نشیں کرنا ایک سو غلاموں کو آزاد کرنے سے بہتر ہے" اس سلسلے میں حضرت علی(ؓ) کا قول بھی کیا خوب ہے:
"جس نے مجھے ایک لفظ بھی پڑھایا۔ سکھایا وہ میرا آقا ہے۔ اسے حق ہے کہ مجھے منڈی میں لے جا کر فروخت کر دے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے رومی کے اتباع میں تبلیغ عشق سے عقل کشی کی جو بنیاد رکھی وہ مسلمانانِ ہند کی قومی یکجہتی کیلئے زہرِ ہلاہل ثابت ہوئی۔ تعلیماتِ اقبال نے عقلی رجعت پسندی کی وہ رسم ڈالی جو منطقی اقدار کیلئے ایک ضرب کاری بن کر رہ گئی اور انہیں اتنا یاد نہ رہا کہ بے وقار اور پسماندہ زندگی جہنم کی نشانی ہے۔ آج ہی نہیں۔ ہمیشہ ہی دنیا میں صرف وہی قومیں کامران ہیں جو حصولِ علم میں پیش پیش رہی ہیں۔ یہودی اس کی زندہ مثال ہیں۔ عربوں کی عالمگیر برتری کا راز بھی فنونِ علم و فلسفہ میں دسترس ہی تھی۔ آج ہم مغرب کے تلوے چاٹتے ہیں۔ یہ دنیا عاشقوں کی نہیں بلکہ دانشوروں کی دلدادہ ہے۔
اقبال نے الٹی گنگا بہا کر ہندی مسلمانوں کا ستیاناس کر دیا۔ پہلے وہ ایک قوم تھے تقسیمِ ہند کے بعد مسلمان تین حریف قوموں میں بٹ گئے اور جب تک کلامِ اقبال موثر رہے گا برصغیر ہند کے مسلمانوں کا ستارہ حلقۂ نحوست سے نہیں نکل سکے گا۔ اقبال کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے دلفریب پیغام عقل کشی سے تصورِ وطنیت کی تضحیک کی اور مذہب کو قومیت کی اساس ٹھہراتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی کی تقلید میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وطن سے محبت اور اس کا استحکام و خوشحالی نہ صرف قوم بلکہ افراد کی سلامتی، ترقی اور معاشی و فکری رفعت کی ضامن ہوتی

ہے جو شخص اپنے دیس کو ہی دار الحرب یعنی مذہبی تقدس کے نام پر قتل و غارت، بددیانتی اور قومی غداری کا مرکز مان لے اس سے بڑا بدقسمت اور جاہل کون ہو سکتا ہے۔ اہل پاکستان جو صوبائی منافرت کی آگ میں جل رہے ہیں یہ نقطہ سمجھ چکے ہیں کہ قومیں مذہب سے نہیں وطن سے بنتی ہیں اور وطن شکن قومیں کبھی سلامتی اور چین کی دولت سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں۔

سب سے بڑا گھر وطن ہے جو لوگ اپنے ہی گھر کو مسمار کرنے پر تلے ہوں انہیں گھر کا سکھ کیسے مل سکتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو صرف عقلمند لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن جو عقل کے دشمن بن چکے ہوں انہیں دانش واستدلال سے چڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ انہیں ظلمت ضیاء اور ضیاء ظلمت دکھائی دینے لگتی ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ کجروی کے اتنے عادی بن جاتے ہیں کہ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط ثابت کرنا ہی اصولِ دانش تصور کرنے لگتے ہیں۔ ایسی ذہنیت اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت اور اسکی تحقیر ہے۔ آخر عقلِ کُل تو وہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کرم بھی یہی ہے کہ اس نے انسانوں کو اپنے جوہر دانش سے جزوی طور پر نوازا۔

کلام اقبال ایسی ہی خدا آزار ذہنیت کا مبلغ ہے جس نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کی آنکھوں پر عشق کی پٹی باندھ کر انہیں بصری دولت سے محروم کر دیا ہے۔ وہ اپنی عقید تمندانہ گمراہی کو عشق قرار دیتے ہوئے بحرِ جذبات کی تباہ کن لہروں میں بہتے چلے جا رہے ہیں اور انکی کشتیٔ حیات کو عقل کا چپو نصیب نہیں جو ساحلِ مراد تک پہنچا سکے۔

یہ سب کلام اقبال کی دین ہے جس کی جذباتی اور عقل کش اپیل نے لوگوں کی قسمت ابلیس کے حوالے کر دی ہے جو مذہب کے نام پر ان سے جو چاہے کرانے کا مجاز بن چکا ہے۔

میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کا قائل ہوں لیکن مجھے انکے افکار میں کوئی فلسفیانہ گہرائی نظر نہیں آتی۔ فلسفی ہونا تو در کنار رہا وہ متکلم کی سطح پر بھی پورے نہیں اترتے۔ متکلمین قوتِ عقل سے مذہب کو سائنس اور دیگر فنون کا ہمنوا بناتے ہیں لیکن اقبال نے تو عقل کی بڑی بے دردی سے تردید کر دی اور جذباتیت کو عشق کا نام دیتے ہوئے مسلمانوں کی زمام حیات اس راہزن کے حوالے کر دی اور اسے راہنما کا خطاب بخش دیا۔ آج برصغیر ہند کے مسلمان اقبال کے جوشِ انا کی حدّتوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ جبتک اہل وطن کو مذہبی زبان میں مخاطب نہ کیا جائے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آئے۔

اقبال شاعر اسلام نہیں۔ رجعت اور پسماندگی کے پیغامبر ہیں۔ ان کی انا پرستی برصغیر ہند کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کیلئے موت کا ایک موثر اعلان ہے۔ اس کے باوجود ان کا کلام عقید تمندوں کیلئے نشہ بن کر رہ گیا ہے۔ آخر مریضوں کا مسکّرات کے بغیر جینا ایک کٹھن مرحلہ ہی تو ہے۔

جوشِ انا! تیرا برا ہو جو اپنی تکمیل کا سنگِ بنیاد دوسروں کی رگِ حیات پر رکھتا ہے۔

ف۔ س۔ اعجاز
کا
مجموعۂ
غزلیات
هندی میں
मौसम बदल रहा है
قیمت =/100 روپے

خوابوں کے اسرار
خواب اور نیند سے متعلق
انگریزی سے ترجمہ کردہ
نفسیاتی و سائنسی مضامین پر
مشتمل ایک منفرد کتاب۔
خصوصی طبعزاد مقالہ
"ادب میں خواب کے اجزاء"
از: ف۔ س۔ اعجاز
قیمت : ۲۰۰ روپے

ف۔ س۔ اعجاز
کا
مجموعۂ منظومات
صاحبِ فن
شائع ہونے والا ہے۔

مقامِ اقبال انور شیخ کی نظر میں

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

نقد نام ہے تحسین و تنقیص کے دو انتہائی سروں کے درمیان رائے کے صحیح توازن کو قائم کرنے کا۔ کہ نہ تعریف میں طرفداری کو دخل ہو نہ تنقیص میں چشم پوشی کا اہتمام۔ خوبیٔ کلام کی طرف عمداً جھکاؤ نقد کو تحسین اور خامیٔ کلام پر قصداً زور نقد کو تنقیص میں بدل دیتا ہے۔ اس لئے ناقد کو میانہ روی کا پابند ہونا چاہئے۔ ان بنیادی اصولوں کی پامالی کرنے والے کو نقاد (Critic) نہیں نقادچی (Criticastèr) کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔

یوں تو مداحان و قداحانِ اقبالؔ کی ہندوپاک میں کمی نہیں۔ کسی نے بیجا تعریف میں انہیں ''شاعرِ اسلام'' بناڈالا تو معترضین نے تنقیص کی پینگ میں انہیں ''غارت گرِ ملت'' گردانا۔ اب انگلینڈ میں انور شیخ جیسے اقبال کے معترض اپنی ڈفلی آپ بجا رہے ہیں اور اپنا راگ آپ الاپ رہے ہیں۔ اردو ادب میں جن کی کوئی تحریر تا حال معتبر نہ ٹھہری وہ اقبال پر ناقدانہ تو چھوڑیئے ناقصانہ نہیں معاندانہ قلم اٹھا رہے ہیں۔ موصوف نے اپنے سہ ماہی رسالے ''لبرٹی'' کے جنوری ۹۸ء کے شمارے میں ''علامہ اقبال: غارت ملت'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں بغض و عناد کی تلوار سے تحقیق و تنقید اور تجزیہ و تصریح کا خون کیا گیا ہے۔ انہوں نے خود ہی سوال اٹھایا ہے کہ ''کیا اقبال مصورِ پاکستان تھے؟'' اور پھر اپنے مفروضہ کو غلط تاویلات، بے بنیاد توجیہات اور گمراہ کن دلائل کے ذریعہ طول دے کر ایک اچھا خاصا مضمون بناڈالا اور اقبال کو ''غارت گرِ ملت'' ٹھہرانے کی کوشش کر ڈالی۔ دیکھنا یہ ہے کہ موصوف کی تصریحات، تاویلات اور استدلال و توجیہات کی اینٹیں کچی ہیں یا مضبوط اور مضمون کی بنیاد قیاسات کی ریتیلی زمین پر ہے یا حقائق کی چٹان پر۔

انور شیخ نے منیب اقبال کے مضمون مطبوعہ روزنامہ جنگ ۸رمئی ۹۶ء اور محققینِ اقبالؔ کے سارے دعووں کو یکسر رد کر کے اپنا ایک مفروضہ تیار کر لیا کہ

(الف) ''خواہ اقبال فیڈرل انڈیا کے حامی تھے یا مسلمانانِ ہند کی ایک الگ اور خود مختار ریاستِ پاکستان کے، لوگوں کو ذہنی طور پر تشکیل پاکستان کیلئے تیار کرنے کی ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے۔''

انور شیخ کا یہ مفروضہ تاریخی حقائق سے سراسر چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔

(۱) دراصل ''علاحدگی پسندی'' اور ''دو قومی نظریے'' کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ''احساسِ شکستگی'' اور غیر محفوظ ہونے کے ڈر کا انگریزوں کی ''توڑو اور حکومت کرو'' کی پالیسی نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر ''عدمِ اعتمادی'' کے احساس کو کافی بڑھا دیا تھا جس کے اثرات انیسویں صدی کے آخری ربع سے ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ سر سید احمد خاں جو ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے وہ بھی ان اثرات کی زد میں آگئے تھے۔ انہوں نے ''بغاوت ہند کے اسباب'' پر جو کتاب لکھی تھی اس میں مسلمانوں کا تذکرہ بطور ایک مستقل جداگانہ قوم کے کیا ہے۔

(۲) لوکل سیلف گورنمنٹ کے بل پر جب بحث ہو رہی تھی تو سر سید نے دوران بحث صاف صاف کہدیا تھا:

''جہاں (ہندوستان میں) مختلف قومیں خلط ملط ہوئی ہیں بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر غالب آجاوے گی۔''

(۳) ۱۸۸۸ء میں بیرسٹر بدالدین طیب جی کے ایک بیان کے جواب میں انہوں نے برملا کہہ دیا تھا:

''یہ امر واجب ہو یا ناواجب مگر ایک مسلمان موچی سے لیکر ایک مسلمان رئیس تک اس بات پر راضی نہ ہوگا کہ ہماری حالت ایسی ہو جائے کہ ہم دوسری قوم کے جو ہماری ساتھ رہتی ہے، حلقۂ غلامی میں آجائیں''۔

(۴) انہوں نے ترکی اور یونان کی جنگ کے دوران ۱۸۹۵ء میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں مسلمانوں کی ''علاحدہ پسند'' ذہنیت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''مسلمانوں میں ایک عرصۂ دراز سے بلحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہو گیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہو گیا ہے۔ اور ''کل مومن اخوۃ'' کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک بناتا ہے۔ اس لئے وہ ہر ملک

کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں۔"

(۵) سر سید احمد خان نے ۱۸۹۳ء میں مسئلہ اقلیت جمہوری سلطنت کے لوازم اور اور ہندوستان کی حالت پر اپنے بیان میں ایک بات کہی تھی کہ:

"ہندوستان چونکہ مختلف الاقوام کا ملک ہے اس لئے جمہوریتی نظام حکومت میں یہاں کی مجارٹی، میناریٹی پر اگر ظلم و تشدد کرے گی تو میناریٹی کا ردِ عمل ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ہوگا"۔

(۶) وہ بحیثیت ہندوستانی قوم کے مسلمانوں کا اسلامی تشخص برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ پیغام دیا تھا کہ:

"سب سے اول ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں نیشنلٹی یعنی قومیت اور قومی اتحاد اور قومی ہمدردی جو اول سیڑھی ترقیٔ قوم کی ہے قائم رہے اور اس کے لئے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے۔"

مندرجہ بالا شواہد صرف سر سید احمد خاں کی ذہنی اپج نہیں ہیں۔ بلکہ یہ مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات کا تجزیہ ہے۔ سر سید نے تجزیہ اس وقت کیا تھا جب اقبالؔ "بچے" تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا اجتماعی سیاسی شعور "علاحدگی پسندی" کو ترجیح ایسے وقت میں دے رہا تھا جب اقبال بچپن کے کھیلوں میں مشغول تھے۔ اس لئے اقبال کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا حق کا خون کرنا ہے۔

بیسویں صدی میں علاحدہ قومیت کی ذہنیت ہندو مسلم ہر دو قوموں میں بڑی تیزی سے پروان چڑھی تھی۔ نفاق اور افتراق ان میں بہت بڑھ گیا تھا۔ انگریز اسے ہر طرح سے ہوا دینے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ ہندو مسلم منافرت کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہے اور یہ دونوں قومیں کبھی ایک جانہ آنے پائیں۔ آئے دن کے فسادات نے مسلمانوں کو دو قومی نظریے پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیا۔ چنانچہ

(۷) حکومت انگلستان نے ۱۹۰۵ء میں تنسیخ بنگال کا اعلان کر دیا تو مسلمانوں میں اس کا کڑا ردِ عمل ہوا۔ لارڈ کرزن نے صوبۂ بنگال کو "مسلم صوبہ" سے تعبیر کیا تھا۔ وہی صوبہ دوبارہ ہندوستان سے ملحق کیا جا رہا تھا۔ نتیجہ میں مسلمانوں نے اس منسوخی کے عمل پر اپنے رنج و غم کا شدید اظہار کیا۔ خیری برادرس جو علی گڑھ کالج کے طلباء تھے، انہوں نے اپنے استاد سر تھیوڈور ماریسن کو اس جانب متوجہ کیا تو انہوں نے اپنی کتاب "ہندوستان میں برطانوی سیاست" میں یہ تجویز پیش کی کہ:

"اگر ہندوستان کے پانچ ملین مسلمان کسی صوبہ یا ملک کے کسی حصہ میں جمع کر دیئے جائیں، مثال کے طور پر شمالی ہند میں تو ایک قومی اسپرٹ ان علاقوں میں پیدا ہو جائے گی۔ جس سے حالیہ مسئلہ کا جزوی طور پر حل ہو سکتا ہے۔"

(۸) گاؤکشی کے مسئلہ پر جب آئے دن فسادات ہو رہے تھے تو مسلمانوں کو اپنا تحفظ خطرے میں نظر آیا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں اسی کالج کے دو سابق طلباء نے عبدالقدیر کے فرضی نام سے گاندھی جی کے نام ایک کھلا خط بدایوں کے اخبار "ذوالقرنین" میں شائع کروایا۔ جس میں فسادات کے خاتمہ کا واحد علاج ملک کی تقسیم کو بتایا گیا تھا۔

(۹) دسمبر ۱۹۲۵ء میں "ذبیحہ گاؤ" کے مسئلہ پر مسلم لیگ کے علیگڑھ اجلاس میں یہ تجاویز پیش کی گئی تھیں۔

(الف) ہندوستان کی تقسیم از سر نو قومیت کی بنیاد پر اس طرح کی جائے کہ ہر قوم کیلئے بڑے سے بڑا حصہ اس کی آبادی کا علاحدہ کر دیا جائے اور یہ حصہ اس قوم کا حلقۂ اثر قرار دیا جائے۔ مسلمانوں کے لئے حسب ذیل تین صوبہ جات بنائے جا سکتے ہیں۔

(۱) سرحد و مغربی پنجاب کے دس اضلاع کا ایک صوبہ
(۲) بنگال میں چودہ اضلاع کا دوسرا صوبہ اور
(۳) سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی سے علاحدہ کر کے تیسرا صوبہ بنایا جائے۔

(۱۰) ۱۹۲۵ء میں اسی نوع کی لیکن تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ایک تجویز مولانا حسرتؔ موہانی نے بھی پیش کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ:

"ہندو اور مسلم ریاستیں الگ الگ قائم کی جائیں اور مرکز میں دونوں ریاستوں کی ایک وفاقی حکومت ہو۔"

(۱۱) آئے دن کے فسادات سے تنگ آکر چند ہندو ذہن بھی اس قسم کے بٹوارے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے نے بھی ایک اسکیم اس بٹوارے کی بنوائی تھی جس میں مسلمانوں کی چار علاحدہ ریاستیں تسلیم کی گئی تھیں۔

(۱) پٹھان صوبہ مشرقی و مغربی سرحد
(۲) مغربی پنجاب
(۳) سندھ اور
(۴) مشرقی بنگال۔

موصوف آگے لکھتے ہیں:

"یہ بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ متحدہ ہند نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی

ہندوانڈیااور مسلم انڈیا کی واضح تقسیم ہے۔"

(۱۲) ۱۹۲۴ء میں صوبہ سرحد میں ایک تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر نے انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے صدر سردار محمد گل خاں سے ایک سوال کیا تھا جس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا۔

"۲۳ کروڑ ہندو جنوب میں اور آٹھ کروڑ مسلمان شمال میں۔ ہندوؤں کو راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ اور مسلمانوں کو آگرہ تا پشاورہ کا خطہ دیجئے"۔

(۱۳) ۱۹۲۸ء کی آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی کی قرارداد بھی اسی نوعیت کی تھی اور وفاقی طرز کی حکومت کو تسلیم کرتی تھی۔

(۱۴) ۱۹۳۰ء کے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں چودھری رحمت علی نے بھی اپنی اسکیم پاکستان پیش کی تھی۔

ان سارے شواہد کی روشنی میں صرف اقبال کو "مصور پاکستان" کہنا کہاں کی دانائی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگی جلسہ میں انہوں نے آل مسلم پارٹیز کانفرنس کی قرارداد پر ہی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس جلسہ کی قرارداد کو جب جواہر لعل نہرو نے رد کر دیا اور سری نیواس شاستری نے اس میں رخنے ڈالے تو اقبالؔ نے صرف اتنا کہا تھا:

"میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں جتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جسکا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقع مل سکے"۔

اقبالؔ کا یہ بیان آل مسلم پارٹیز کانفرنس کی قرارداد کی توثیق نہیں تائید میں ہے جس میں سختی کہ ساتھ مسٹر شاستری کے اعتراضات کو رد کر دیا گیا ہے۔

(۱۵) اس اجلاس کے پانچ سال بعد جب اقبالؔ کے دوست ڈاکٹر ایڈورڈ ٹامسن آکسفورڈ یونیورسٹی میں ان کے لئے لکچرر شپ کی کوشش کر رہے تھے تو اقبالؔ نے انہیں کہا تھا:

"میرے خیال میں پاکستان کی اسکیم حکومت برطانیہ کے لئے تباہ کن ہوگی ہندو قوم کے لئے تباہ کن ہوگی اور مسلم قوم کیلئے تباہ کن ہوگی"۔

(اوپر کی سات تا پندرہ مثالیں "اقبال کا سیاسی کارنامہ" سے ماخوذ ہیں)

یہ ساری مثالیں اقبالؔ پر لگائے گئے انور شیخ کے الزام (اقبال مصور پاکستان) کو کمزور ہی نہیں بلکہ رد کر دیتی ہیں۔ کاش! کہ انہوں نے تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ الزام لگایا ہوتا۔

(ب) انور شیخ نے مسلمانوں کو اس امر میں مورد الزام ٹھہرایا ہے کہ:

"وہ شانِ مصطفوی کے لئے اپنے ماں۔ باپ اور اولاد کو بھی زندہ درگور کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ان کے لئے منطق اور اخلاقی استدلال بالکل بے مقصد بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ ایسی نفسیاتی کیفیت ہے جس کا علاج سراب نظر کے سوا کچھ نہیں۔ جو چیزیں بے معنی ہوں انہیں با معنی سمجھ کر ان کی دیوانہ وار جستجو کی جائے۔"

انور شیخ کا شان مصطفوی کے لئے ماں۔ باپ اور اولاد کو زندہ درگور کر دینے کا الزام اگر لغوی معنوں میں ہے تو سراسر غلط اور اتہام طرازی کا نہایت گھناؤنا نمونہ ہے کہ تاریخ اسلام میں روئے زمین پر ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ شان مصطفوی کے لئے کسی مسلمان نے اپنی اولاد یا والدین میں سے کسی کو زندہ درگور کیا ہو۔ اور اگر یہ استعاراتی زبان میں کہا گیا ہے تو انور شیخ کو سمجھنا چاہئے کہ محبتِ رسولؐ میں اپنی سب سے عزیز ترین چیز قربانی کر دینا تکمیلِ ایمان کی سند ہے بلکہ عین ایمان ہے۔ حدیث کے مفہوم میں یہ بات آتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار حضورؐ سے کہا تھا کہ سوائے میری جان کے آپؐ مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ کوئی شخص اس وقت تک کامل ایمان والا ہو نہیں سکتا جب تک میں اس کو ہر چیز یہاں تک کہ اپنی جان سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔ یہ ارشاد گرامی سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسولؐ آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اب! اے عمر۔ اس قول رسول کےؐ کے علاوہ سچے مسلمان کو کسی استدلال کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہی ایمانیات کی منطق ہے اور یہی اسلامی اخلاق۔ ایسی والہانہ عقیدت کو "بے معنی" وہی سمجھ سکتا ہے جس کے دماغ میں فتور ہے یا جو مسلمان نہیں ہے۔ اللہ کی اطاعت اور اطاعت رسولؐ تو شعار اسلام ہے۔ قرآن نے تو محبِ اللہ کے لئے "اتباعِ رسولؐ" کی شرط لگادی ہے۔ یہ نص قطعی اگر انور شیخ کو "بے معنی" لگتی ہے تو پھر انہیں اپنے ایمان کی تجدید کر لینی چاہئے۔

(ج) انور شیخ نے "ترانۂ ہندی" کے تین اشعار کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ انکے سخن فہمی کے دیوالیہ پن کی سند بن گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ اشعار...... جو ان کی محبت ہندی کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ہندوستانی قومیت کی سالمیت پر ایک زبردست چوٹ ہے۔"

ترانۂ ہندی کے وہ اشعار جنہیں ہندوستانی قومیت کی سالمیت پر چوٹ کہا گیا ہے درج ذیل ہیں۔

(۱) سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

(۲) اے آبِ رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
(۳) مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

دوسرے شعر کے معنی وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"(اس) شعر میں آبِ رود گنگا یعنی ہندوستان کے مقدس ترین دریا گنگا کو خطاب کرتے ہوئے یاد دلایا گیا ہے کہ ہم ہندی مسلمان دراصل ہندوستانی نسل سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ بیرونی حملہ آوروں کی اولادیں ہیں اور گنگا یعنی سرزمین ہند کو وہ دن نہیں بھولنا چاہئے جب ہمارے فاتح کارواں نے اس کے کنارے یعنی سرزمین ہندوستان میں ڈیرا جمایا تھا۔"

تیسرے شعر کی توضیح کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے۔ "تیسرے شعر میں شاعر نے اہل ہند پر احسان جتاتے ہوئے مروت کے طور پر کہا ہے "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"۔ ان من گھڑت مطالب کو پیش کرنے کے بعد وہ اپنا مفروضہ بیان کرتے ہیں کہ:

"اقبال درحقیقت خود کو ہندی نژاد نہیں بلکہ بیرونی حملہ آوروں کا فرزند ارجمند تصور کرتے تھے۔"

بے شک ہمارا سماجی ڈھانچہ کچھ اس طرح ہے کہ یہاں اولاد، باپ کے صلب سے پہچانی جاتی ہے۔ اقبال کے جدامجد سے لے کر والد تک اور ننھیال کا پورا سلسلہ جبکہ خالص ہندوستانی تھا تو اقبال اپنے کو بیرونی حملہ آوروں کا فرزند کیوں سمجھتے تھے؟ کیا انہوں نے کبھی اپنی زبان سے ایسا کہا ہے؟ یا یہ صرف انور شیخ کے دماغ کی اپج ہے۔ ہمارے خیال سے تو ان اشعار کے مطالب میں انور شیخ کی کہی ہوئی بات کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ درحقیقت اقبال کی یہ نظم ہندوستانی قومیت کی سالمیت کا "منشور" ہے۔ اقبال نے جتنی اپنائیت کے ساتھ اپنے جذبۂ حب الوطنی کو اس نظم میں پیش کیا ہے ہندوستان کے دیگر منظور شدہ قومی ترانے اس سے شاید خالی ہوں۔ انہوں نے "وطن پرستی" کی بھی تائید کی ہے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی۔ یہ ترانہ ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی طرف سے مادر وطن کو پیش کیا گیا "عہد نامۂ وفا" ہے۔ پھر اس کی اشاعت اول سے آج تک تمام ناقدین ادب نے "ترانۂ اقبال" کو اقبال کی حب الوطنی سے تعبیر کیا ہے۔ سوائے انور شیخ کے کسی ناقد کو اس میں قومیت کی سالمیت پر زبردست چوٹ دکھائی نہیں دی۔ ناقدینِ اقبال تو اس ترانے کا مرکزی خیال اتحاد باہمی اور قومی یکجہتی کو تصور کرتے ہیں۔

(د) اس ترانے کے اشعار کی توضیح کرتے ہوئے انہوں نے اقبال کے ساتھ مسلمانوں پر یہ الزام لگایا ہے کہ

"ہندی مسلمانوں نے اپنی قومی وانفرادی کمتری کی ذلت سے بچنے کے لئے اقبال کی طرح اپنی ہندوستانی قومیت ہی سے انکار کردیا اور اپنا رشتہ بیرونی حملہ آوروں سے جوڑنے کے لئے اسلام قبول کرنے لگے۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے چپکے چپکے اپنی ذاتیں بھی بدلنی شروع کردیں اور موہوم فضیلت سے لطف اندوز ہونے کیلئے سید، قریشی، فاروقی، صدیقی، مغل، مرزا اور چغتائی کہلانے لگے"۔

کاش کہ انور شیخ کوئی ایک تاریخی حوالہ دے دیتے جس سے ثابت ہوتا کہ ہندی مسلمانوں نے اپنے ہندوستانی ہونے کے ذلت سے بچنے کے لئے ہندوستانی قومیت ہی سے انکار کردیا ہو۔ یا کم از کم وہ اقبال ہی کے "منکر ہندی" ہونے کا ثبوت فراہم کردیتے۔

انور شیخ کی بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ انہوں نے ہندستان میں فروغ اسلام کے عمل کو مغربی مورخین کی طرح بیرونی حملہ آوروں سے جوڑ دیا۔ درآنحالیکہ ہندوستان میں اسلام کے پھلنے پھولنے اور پھیلنے میں جتنا حصہ اولیاء کرام اور بزرگان دین کا ہے (جنہوں نے اخوت و بھائی چارگی، محبت و شیفتگی اور اسلامی اخلاق کا انسانیت نواز نمونہ پیش کیا تھا، جسے دیکھ کر یہاں کی اقوام جوق در جوق داخل اسلام ہوئیں۔) اس کا عشر عشیر بھی سلاطین ہند کا حصہ نہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوگا کہ حملہ آوروں سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لئے یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ہاں! دور اکبر و جہانگیر میں چند ایسے واقعات ضرور ہوئے ہیں لیکن ان دو چار واقعات کا اطلاق تمام ان لوگوں پر نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے اسلامی تعلیمات کے زیر اثر اسلام کو گلے سے لگایا۔ انور شیخ کا یہ کہنا بھی ان کی ایمانی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے کہ "انہوں نے موہوم فضیلت سے لطف اندوز ہونے کے لئے چپکے چپکے اپنی ذاتیں بدلنی شروع کردیں"۔ شاید موصوف مشرف بہ اسلام ہونے کی فضیلت سے آگاہ نہیں ہیں۔ اس کے لئے انہیں ابتدائی دور کے اسلام قبول کرنے والوں کے حالات پڑھنے ہوں گے، جنہوں نے حلقہ بگوش اسلام ہوکر ہنسی خوشی سے دشمنانِ اسلام کی سختیاں جھیلیں۔ یہاں تک کہ اپنی جان یہ کہہ کر قربان کردی کہ "رب کعبہ کی قسم میں تو کامیاب ہوگیا"۔ لیکن انور شیخ جیسے مذہب بیزار اور منکر اسلام کو بھلا مشرف بہ اسلام ہونے کی حلاوت کیا معلوم؟ جبھی تو اس کی

فضیلت کو وہ "موہوم" سمجھتے ہیں۔

علامہ اقبال نے بھی کبھی اپنی ہندوستانی قومیت کا انکار نہیں کیا۔ ہاں البتہ ان کا "نظریۂ قومی" اسلامی اقدار اور اس کے سیاسی منہاج کے تحت ترتیب پایا ہوا تھا۔ مغربی نظریۂ قومیت کے وہ سخت مخالف تھے۔ کیونکہ یوروپ میں رہ کر انہوں نے قریب سے وہاں کے حالات دیکھے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

(اسلامی) قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی جسمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے ۔۔ اس کا اصل اصول مظاہر کائنات کے متعلق ایک ایسا اتحاد خیال ہے جو سب انسانوں کو ایک رشتۂ وحدت میں پرو سکتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کے ماننے والے افریقہ کی کالی دنیا سے متعلق ہیں، یا ریگستان بطحا کے شجاع عرب، یا گنگا کی وادیوں میں بسنے والے آریہ ہیں یا پامیر کے بلند کوہساروں کے مکیں۔ کوئی زمینی قید ان میں تفرقہ نہیں ڈال سکتی۔ کوئی مادی جدائی ان کو جدا نہیں کر سکتی اور کوئی نسل یا زبان کا امتیاز ان میں افتراق پیدا نہیں کر سکتا"۔

(ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر)

اقبال کا تصور قومیت مغربی "نظریۂ نیشنلزم" کے یکسر مخالف ہے۔ وہ اس نیشنلزم سے قطعی بےزار دکھائی دیتے ہیں، جو رنگ و نسل، زبان اور جغرافیائی حدود میں اجتماع انسانی کو مقید کر دے۔ کیونکہ اقبال نے زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کو برتنے کی سعی کی ہے۔ اسلام اور نسلی امتیاز چونکہ باہم متناقض ہیں وہ عرب کو عجمی اور گورے کو کالے پر ترجیح نہیں دیتا اس لئے اقبال اسلامی نظریۂ قومیت کے حامی ہیں۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں ــــ

جب میں نے یہ محسوس کیا کہ قومیت کا تخیل جو نسل و وطن کے امتیازات پر مبنی ہے، دنیائے اسلام پر بھی حاوی ہوتا جاتا ہے اور جب مجھے یہ نظر آیا کہ مسلمان اپنے وطن کی عمومیت اور عالمگیری کو چھوڑ کر وطنیت اور قومیت کے پھندے میں پھنستے جاتے ہیں تو بحیثیت ایک مسلمان اور محب نوع کے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ ارتقائے انسانیت میں انہیں ان کے اصلی فرض کی طرف توجہ دلاؤں۔ اس سے انکار نہیں کہ اجتماعی زندگی کے ارتقاء اور نشو و نما میں قبیلے اور قومی انتظامات کا وجود بھی ایک عارضی حیثیت رکھتا ہے، اور اگر ان کی اپنی ہی کائنات تسلیم کی جائے تو میں ان کا مخالف نہیں۔ لیکن جب انہیں انتہائی منزل قرار دیا جائے تو مجھے ان کے بدترین لعنت قرار دینے میں مطلق تامل نہیں"۔

(بحوالہ: مقامات اقبال: ڈاکٹر سید عبداللہ دہلی ص ۲۳۹)

اسی لئے انہوں نے بین الاقوامیت میں اعتقاد رکھنے والی قوم کو بھی جغرافیائی حدود اور غیر فطری قیود سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کا قومی تصور "वसुदैव कुटुंबकं" (ساری دھرتی ایک خاندان) سے بھی وسیع تر ہے۔ یوروپ یا مغرب کا نیشنلزم بندوں میں تفریق ڈالنے والا ہے اور انسانیت کے لئے شدید خطرے کا سرچشمہ ہے۔ اقبال نے آل انڈیا ریڈیو (لاہور) کے ایک نشریہ مورخہ یکم جنوری ۱۹۳۵ء میں کہا تھا

"استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسانی کی وحدت ہے جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی نہ بسر کر سکیں گے اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے"۔

(نقوش اقبال: علی میاں۔ لکھنؤ۔ ص ۳۰۳)

"قومیت" اور "وطنیت" کی جغرافیائی حد بندی جس نے انسانیت میں تفریق پیدا کر دی ہے۔ محبت و اخوت اور ایثار و ہمدردی جیسی انسانی قدروں کو پامال کر دیا ہے اور نفرت و عناد اور بغض و عداوت جیسی قبیح صفات کو انسان کی سماجی زندگی میں بڑھاوا دے کر اس کی تمدنی زندگی کے شیرازہ کو بکھرا دیا ہے، اقبال ہی کیا دنیا کے بڑے بڑے دانشور ایسی "قومیت" اور "وطنیت" کے خلاف گئے ہیں۔ جے کرشن مورتی نے ان نام نہاد "نیشنلزم" پر اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

"I see that nationalism is a stupid form of emotionalism without any rationality, without any sense."

"قومیت" کے بلند بانگ دف بجانے کی بجائے انسانیت کی بانسری کی سریلی لہروں میں آدمی آدمی کے درمیان پیدا کرنے والے عدم اعتمادی اور بغض و عناد کے مصنوعی اور فوجی عوامل کو غرق کر دو کیونکہ قومیت کے

مغربی تصور نے انسانیت کو بانٹ دیا ہے قومیت کے خلاف اب اس قسم کے جذبات بے دار ہو رہے ہیں۔ لیوس ممفورڈ (Levis Mumford) اپنی کتاب (The Conduct of life) میں رقمطراز ہیں:

"Without that devaluation and renunciation of nationalism no life worthy of the man can now be built up. He who is one hundred percent an American, a German or a Frenchman, an European or an African or an Asiatic is only half a man, the universal part of his personality equally essential to his becoming human, is still unborn Every act softens the egoistic claims of nations and accentuates the unity of mankind, adds another foundation stone to the new world that we must now build."

بنی نوع انسان کی بھلائی اور ''آفاقیت'' کے بالمقابل ''قومیت'' سے بیزاری کے معاملے میں تو آلڈس ہکسلے اقبال کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال نے آگے اسی نظم میں وطن کو ''غارت گر کاشانۂ دین'' ''رقابت کا امین'' اقوام میں مخلوق کو بانٹنے والا اور ''قومیت اسلام کی جڑ کاٹنے والا'' کہا ہے۔ یہی بات آلڈس ہکسلے اپنی کتاب "Ends and Means" میں کہتے ہیں۔

"The object of "Bhakti" are saints and a personal God but in modern times they are being replaced by the personafied "Nation" and the deified leader, which is worse "

ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ عالمی بھائی چارگی کے تصور نے قومیت کی بت پرستی سے برأت کا اعلان کر دیا ہے۔ کیونکہ قومیت / وطنیت سے انسانیت پارہ پارہ ہوتی جا رہی ہے۔ قومیت کے بت نے عالمی انسانیت میں منافرت و رقابت کا زہر گھول دیا ہے۔ وطن کی جغرافیائی حدود میں انسان مقید کر دیئے گئے ہیں۔ عالمی برادری کا تصور مفقود ہے۔ اس لئے دانشور طبقہ ''نیشنلزم'' سے بیزار دکھائی دے رہا ہے۔ اور اس سے ہونے والے نقصانات کو ''طشت از بام'' کر رہا ہے۔ اقبال چونکہ فلاح انسانی کے معاملے میں بڑے حساس تھے اس لئے انہوں نے اپنی نظم و نثر میں اس نام نہاد ''وطن پرستی'' کی مخالفت کی اور اس سے اپنی بیزارگی کا اظہار کیا۔ جہاں تک قرآن و احادیث میں ''قومیت'' سے بحث کی گئی ہے۔ اقبال کا ''وطنی / قومی تصور'' انہیں سطور پر استوار ہے۔ انور شیخ نے اس میں غلط مبحث قائم کیا ہے اور اقبال کو دشمنِ وطن اور اسلام کے تصور وطن و قوم کے خلاف گردانا ہے۔ جو کسی صورت میں صحیح نہیں ہے۔ اقبال کے تصور قومیت میں "آفاقیت" کو دخل ہے اس میں انسانیت کا سوز ہے اور اس کا مرکز انسان ہے زمین کا کوئی خطہ نہیں۔ لاهور کی مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے کہا تھا:

"اگرچہ حب وطن ایك فطری امر ہے اور اس لئے انسان کی اخلاقی زندگی کا ایك جز ہے۔ لیکن جو شے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انسان کا مذہب اور اس کا کلچر اور اس کی ملی روایات ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنکے لئے انسانوں کو زندہ رہنا چاہئے اور جن کی خاطر انہیں اپنی جان قربان کرنی چاہئے، وہ خطۂ زمین جس میں وہ رہتا ہے اور جسکے ساتھ عارضی طور پر اس کی روح وابستہ ہوتی ہے۔ اس لائق نہیں کہ اسے خدا اور مذہب سے برتر قرار دیا جائے "۔

(ھ) انور شیخ نے قرآن واحادیث کے حوالے سے ''قومیت'' کی جو بحث کی ہے اس میں کوئی جغرافیائی حدود کا دخل نہیں۔ بلکہ اللہ رب العزت نے نبی کے ماننے والوں کو اس نبی کی قوم کہا ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل اس دور کے مصر اور عرب کے علاقوں میں بود و باش اختیار کئے ہوئے تھی۔ لیکن اللہ نے دونوں جگہوں کے لوگوں کو بنی اسرائیل ہی کہا ہے۔ قوم یہود آج بھی چاہے ہندوستان میں ہوں اسرائیل، امریکہ، افریقہ، جرمنی، فرانس اور آسٹریلیا وغیرہ میں ہوں قوم یہود ہی ہیں۔ ہندو قوم، ماریشش میں ہو یا نیپال میں یا ہندوستان یا کسی اور ملک میں ''ہندو'' ہی ہے۔ عیسائی دنیا کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہیں پھر بھی عیسائی ہی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قوم مذہب سے پہچانی جاتی ہے وطن سے نہیں۔ دوسرے معنوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کو وطن پر فوقیت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے اگر

ہندوستان میں عیسائیوں کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو ساری دنیا کے عیسائیوں کو اس کا احساس ہوتا ہے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہمارا کیا؟ وہ ہندوستان، برما چین کے عیسائی ہیں۔ امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو سارے عالم اسلام میں اس پر غم وغصے کا اظہار کیا گیا تھا۔ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا کہ وہ عراقی ہیں اس لئے ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔ اس سے بھی بڑھ کر کلاری (مہاراشٹر) کے زلزلے کے موقع پر سارے عالم انسانیت کی طرف سے انسانیت کے ناتے امداد بہم پہنچانا افغانستان کے زلزلے کے موقع پر ہندوستان کے لوگوں کی جانب سے بلا تفریق مذہب وملت امداد پہنچانا، یہ تو ایسا جذبۂ انسانی ہے کہ جس کی زد میں خود بخود وطن کی جغرافیائی دیواریں ڈھ جاتی ہیں۔ یہ مثالیں ثابت کر رہی ہیں کہ عالم انسانیت میں ''وطن اور قوم'' ثانوی درجہ کے حامل ہوتے ہیں۔ مقدم انسان کو اور اس کے مذہب کو سمجھا جاتا ہے۔ حج کے موقع پر دنیا کے کم و بیش سو ممالک کے لوگ مکہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف مسلمان ہوتے ہیں، ہندوستانی، سوڈانی، افریقی، عراقی بعد میں۔ یہ مثالیں واضح کر رہی ہیں کہ انسانیت کے آفاقی تصور نے وطنیت اور قومیت کی دیواروں کو منہدم کر دیا ہے۔ اس لئے کہ وطنیت سے انسانیت کا بٹوارا ہوا ہے۔ آدمیت میں منافرت پھیلی اور بنی نوع انسانی بغض وعناد کا شکار ہو گیا۔ اس لئے چودہ سو برس قبل ''قوم'' کے نام پر قرآن نے انسانیت اور دین وحدت کا جو تصور پیش کیا تھا آج اس کی افادیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ چاہے وہ بین الاقوامیت (Internationalism) کے نام پر ہو یا عالم انسانیت کے نام پر۔ انور شیخ نے البتہ اقبال کو بدنام کرنے کے لئے قرآن کے تصور قوم کو مغرب کے "Nationalism" پر منطبق کیا ہے۔ حالانکہ اقبال کا ''تصور قومیت'' عین قرآن کے مطابق ہے۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں اپنی وفات سے ایک ماہ قبل لکھے گئے مضمون میں اقبال رقمطراز ہیں:

''وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ ''وطن'' ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیۂ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا قانون ہے اس لئے جب لفظ ''وطن'' کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے''۔

(بحوالہ نقوش اقبال: علی میاں صاحب لکھنؤ ص ۳۱۳)

انور شیخ نے ان سارے شواہد پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اقبال کو بدنام کرنے کے لئے کہدیا ہے کہ:

(و) اپنی مقبولیت کے لئے اقبال نے ہندی مسلمانوں کی اس (احساس مذہبی) نفسیاتی کیفیت کا استحصال کرنے کے لئے اپنی شاعری کو نیا موڑ دیا اور اس اصول کے مبلغ بن گئے کہ اسلام میں قوم و وطن کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں''۔

اس ترنگ میں وہ نہ صرف یہ کہ اقبال ہی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات پر بھی اتہام باندھتے ہیں اور یہ لکھتے ہوئے خوف خدا سے ذرا بھی نہیں لرز جاتے کہ: ''فرمان اسلام کہ نا مسلمان والدین یا اولاد سے قطع تعلق کر لو۔ اہل دانش کو کبھی گوارا نہیں ہوا۔''

قرآنی تعلیمات پر ''جھوٹ گڑھ'' کر انور شیخ اپنے آپ کو اہل دانش میں شمار کر رہے ہیں۔ حالانکہ اسلام کی قرآنی، احادیثی و نیز فقہی تعلیمات میں یہ کہیں نہیں پایا جاتا کہ ''نا مسلمان والدین سے قطع تعلق کر لو''۔ اس کے علی الرغم قرآن نے تو ان کے ساتھ ''حسن سلوک'' کی تاکید کی ہے۔ قرآن میں ''وبالوالدین احسانا خیر فللوالدین''، ''ربنا اغفرلی ولوالدیّ'' اور ''وبرّ ابو الديقو براً م بواالدتي'' وغیرہ آیات کے علاوہ سورہ العنکبوت میں تو صاف طور پر کافر والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

''ہم نے انسان کو ھدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے (اللہ کے) ساتھ کسی ایسے معبود کو ٹھہرائے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر''۔

اس آیت کریمہ کی شان نزول میں مسلم، ترمذی، نسائی۔ ابو داؤد اور احمد کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے جب اسلام قبول کر لیا تو ان کی ماں حمنہ بنت سفیان نے کھانا پینا چھوڑ دیا حتیٰ کہ منہ میں لقمے ڈالے جاتے تب بھی وہ نہ کھاتیں۔ وہ کہتیں ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات (ترک اسلام کرنے کی) نہ مانے گا تو اللہ کی نافرمانی کرے گا۔ حضرت سعد اس پر بڑے پریشان ہوئے اور حضورؐ کے پاس تشریف لے گئے تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

''اسلام کی تعلیم میں مسلمانوں کا عمل مشرک والدین اگر اولاد کو مشرک بنانے کی کوشش کریں تب بھی ان کے ساتھ بھلائی کا حکم ہے۔ البتہ شرک کرنے میں ان کی اطاعت اور فرمانبرداری نہیں''۔

ایک اور حدیث میں حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ: جس زمانے میں حضورؐ کا قریش سے معاہدہ ہو رہا تھا میری والدہ کافر تھیں۔ میں نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ میری والدہ میری اعانت کی طالب بن کر آئی ہیں کیا میں ان کی اعانت کروں۔ حضورؐ نے فرمایا "ہاں! کرو"۔

ان شواہد کو نظر انداز کر کے صرف اپنی رائے کو منوانا علمی دیانتداری نہیں ہے۔

(ز) انور شیخ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور اقبال کے درمیان ہوئی علمی "بحث کو "مناظرہ" سے تعبیر کیا ہے۔ الفاظ کا یوں غیر محتاط استعمال ایک ادیب کو زیب نہیں دیتا۔ یہ یا تو انور شیخ کی عجز بیانی کی مثال ہے یا اقبال پر بہتان باندھنے کی ایک سازش۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں لیکن سننے والے نے اقبال سے جاکر کہدیا کہ "ملتیں اوطان سے بنتی ہیں" کے الفاظ شیخ الاسلام نے اپنی تقریر میں کہے ہیں۔ اس پر اقبال بڑے جز بز ہوئے اور انہوں نے "عجم ہنوز نہ داند ...الخ یہ مشہور قطعہ شیخ الاسلام کے خلاف اخبارات میں شائع کروادیا۔ ڈاکٹر اقبال کی تقلید میں شاکر نائطی مرحوم نے بھی ماہنامہ 'احسان' لاھور میں ایک قطعہ ایسا ہی شائع کروایا۔ جب حقیقت حال کا علم ہوا تو علامہ اقبال نے ایک معذرت نامہ ۵ / مارچ ۱۹۳۸ء کے اخبار مدینہ بجنور میں چھپوایا اور یہ بحث رفع دفع ہو گئی۔ اس واقعہ کو انور شیخ نے "مناظرہ" کہا ہے اور یہ لکھا ہے کہ:

"علامہ اقبال کا یہ خیال تھا کہ اسلام میں قوم و ملت ایک ہی چیز ہے"۔

درآنحالیکہ اقبال کو جب یہ معلوم ہوا کہ شیخ الاسلام نے "ملت" کا نہیں قوم کا لفظ استعمال کیا ہے تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے معذرتی بیان شائع کروایا۔ انور شیخ ہمیشہ ایسے مغالطہ آمیز بیانات سے اپنے مضامین میں رنگ بھرتے رہتے ہیں۔

(ح) اقبال کے کردار پر کیچڑ اچھالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"سوال پیدا ہوتا ہے انہوں نے تصور پاکستان کو کیوں ایسا جھگڑ بنادیا جو پاکستانیوں کو ہی لے اڑا۔ اس کی دو وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) ہندو دشمنی (۲) مرزا غلام احمد قادیانی سے رقابت اور جنون خود نمائی"۔

پہلی وجہ کے ضمن میں انہوں نے ایک واقعہ چیف جسٹس سر شادی لعل کے متعلق لکھا ہے کہ ایک بار انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ انہیں جج بنادیا جائے لیکن چیف جسٹس سر شادی لعل نے اقبال کو جج بنانے سے انکار کردیا۔" یہی واقعہ انور شیخ کے نزدیک اقبال کا "سبب دشمنی ہے" جس کی وجہ سے اقبال نے مسلمانوں کو "پاکستان" کا تصور دیا اور انتقاماً ہندوستانی قومیت کی بجائے مسلم قومیت کے گیت گانے شروع کئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی صحیح العقل انور شیخ کے اس مفروضہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ جس اعتماد کے ساتھ یہ مفروضہ انہوں نے پیش کیا ہے اسکے دلائل اتنے پختہ نہیں ہیں۔

دوسری وجہ کے ذیل میں انور شیخ نے کچھ ایسی تاویلیں پیش کی ہیں جن میں زیادہ "ہوائی" اور "قیاسی" ہیں۔ ان کا یہ کہنا بڑا مضحکہ خیز ہے کہ "انہیں (اقبال کو) پیغمبرانہ رتبے کی آرزو تھی۔ لیکن مرزا صاحب (غلام احمد قادیانی) اپنی بروزی نبوت کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کا ہدف ملامت بن چکے تھے ...... چنانچہ اقبال نے دعویٰ قلندری کردیا"۔ اس کے لئے اختراع کی ضرورت تھی تاکہ ان کی شاعری کسی پیغام کی حامل ہو سکے چنانچہ انہوں نے ہندی قومیت کی تردید کرتے ہوئے ملت اسلامیہ پر زور دیا اور اپنے کلام کو نمکین بنانے کے لئے مرزا غلام احمد کی بروزی نبوت کو نشانہ بنایا"۔

اس اقتباس میں سوائے لفاظی اور بے بنیاد قیاس آرائی کے کوئی حق بات نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری جس کا اعتراف اردو دنیا ہی نہیں یوروپین اسکالرس بھی کرتے آئے ہیں۔ کیا مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف چند اشعار لکھ لئے جانے ہی سے نمکین (معتبر) ہوئی ہے ؟؟ اگر اقبال وہ گنتی کے اشعار نہ لکھتے تو کیا ان کی شاعری بے نمک (غیر معتبر) ہو جاتی ؟؟ انور شیخ تہمت گڑھنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ طلوع آفتاب شہرت کی کرنوں سے بننے والے طویل سایہ سے اپنے ادبی قد کا اندازہ مت لگایئے۔ بونوں کے طویل سایہ پر بلندئ قد کا گمان کر کے اپنے آپ کو طویل القامتوں جیسا نہیں سمجھنا چاہئے۔ مقام اقبال تک پہنچنے میں ابھی انور شیخ کو برسوں کی ریاضت درکار ہے۔ اقبال کی شاعری میں لفظ "قلندر" بطور علامت کے استعمال ہوا ہے۔ انہوں نے کبھی قلندر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

اقبال کی احمدیت سے دست بردار ہونے کی ایک وجہ انور شیخ نے اقبال کا کونسل ممبر نہ بنایا جانا بھی قرار دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"یہ تقرری چودھری ظفر اللہ خان کو نصیب ہوئی جن کا شمار عظیم قادیانیوں میں ہوتا ہے۔ اس بات کا علامہ مرحوم پر اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ اسے اپنی ہتک سمجھ کر سلسلۂ احمدیہ سے قطع تعلق ہو گئے۔

انور شیخ نے چیف جسٹس شادی لعل اور چودھری ظفر اللہ خاں کے

واقعات کے پس منظر میں اقبال کی شخصیت کے خدوخال کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اقبال کو اس انداز میں پیش کیا ہے مانو وہ اپنے دور میں بے قیمت، غیر معروف اور غیر اہم تھے اور عزت پانے کو ترستے تھے۔ درآنحالیکہ اقبال کی عملی زندگی میں والیٔ بھوپال کی جانب سے آپ کی توقیر، مہاراجہ کشن پرشاد صدر اعظم بہادر حضور نظام حیدر آباد کی جانب سے آپ کی امداد کی پیش کش مگر اقبال کا ایک ہزار روپیوں کے چیک کو قبول نہ کرنا، ہز ہائی نیس سر آغا خاں کا آپ کے لئے وظیفہ مقرر کرنا چاہنا اور اقبال کو اسے قبول کرنے میں تامل ہونا وغیرہ سارے واقعات آپ کی خودداری اور شان استغنا کی بولتی مثالیں ہیں جو انور شیخ کے قیاسات کی عمارت کو منہدم کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ ان کے علاوہ علامہ اقبال کے تعلقات ہندوستان کے مختلف ریاستوں کے امراء و نوابوں سے بھی رہے تھے۔ عزت و توقیر کے ان سارے وسائل کے باوجود اقبال نے کبھی کسی سے عزت کی توقع نہیں رکھی۔ اپنے اشعار میں اکثر اقبال نے اپنی غیرت اور عزت نفس کا ذکر کیا ہے۔

(ط) انور شیخ نے اقبال کے "فریضۂ حج کی عدم ادائیگی اور "سر" کے خطاب کے متعلق بھی اعتراضات کئے ہیں اور آپ کو اس معاملے میں مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ لیکن مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی کتاب "اقبال کامل" میں آپ کے فریضۂ حج کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے اور حج کے لئے اقبال کی بیقراری کی کیفیات کو انہیں کے خطوط کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ جسے پڑھ کر انور شیخ کا یہ الزام ریت کی دیوار کی طرح ڈھ جاتا ہے۔

(ی) اب جہاں تک ان کے "سر" ہونے پر انور شیخ نے موشگافیاں کی ہیں وہ سراسر اقبال پر الزام ہے۔ انور شیخ نے لکھا ہے کہ:

"انگریز سرکار نے علامہ کی وفاداری کا پاس کرتے ہوئے انہیں سر کا خطاب پیش کیا تو انہوں نے خوشی سے قبول کر لیا"۔

خطوط اقبال کی روشنی میں اس واقعہ کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ خطاب "وفاداری" کے عوض نہیں "اسرار خودی" کی بنا پر ملا تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کو ۲۴ جنوری ۱۹۲۳ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں:

"یہ (سر کا خطاب) اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے۔ دینوی نقطہ نگاہ سے یہ ایک قسم کی عزت ہے مگر یہ عزت فقط اللہ کے لئے ہے"۔

(کلمات اقبال: سید مظفر حسین برنی جلد دوم ص ۴۲۱)

"ترک موالات" کے زمانے میں کچھ لوگوں کو اقبال کا یہ خطاب لینا بڑا ناگوار گزرا۔ انہوں نے اقبال کے متعلق خوب چہ میگوئیاں کیں۔ خود آپ کے مخلص دوستوں نے بھی اس جانب توجہ دلائی تو اقبال نے مولوی غلام بھیک نیرنگ کو لکھا:

"میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا، مگر جس دنیا میں میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں۔ ...... مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ اس کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے۔ سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے...... دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاءاللہ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے"۔

(ایضاً ص ۴۱۶)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال میں شان استغنا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انور شیخ نے صرف تنقیصی نقطۂ نظر سے علامہ اقبال کے کردار میں جھانکا ہے۔ انہیں اقبال سے کد ہے۔ دل میں کدورت ہے (جو ان کی تحریروں سے عیاں ہے) وہ بھلا اقبال کے صحیح خدوخال کو کیسے دریافت کر سکتے ہیں۔

اقبال کوئی فرشتہ نہیں تھے کہ ساری کمزوریوں سے بالا تر ہوں۔ وہ ایک انسان تھے اور انسان خطا و نسیان کا مرکب ہوتا ہے۔ لیکن یہ شیطانی عمل ہے کہ اس کی اچھائیوں کو برائیوں کے زمرے میں ڈال کر پیش کرے۔ انور شیخ نے اقبال کے تعلق سے بھی عمل کیا ہے۔

ڈاکٹر علی شیر خاں
کی کامیاب تحقیقی کاوش
اردو ادب کے ارتقاء میں
غازی پور کی خدمات
صفحات ۵۴۴ قیمت =/۲۵۰ روپئے
ملنے کا پتہ: مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ
کانٹا پوکھر، ڈرائیورس کوارٹر، خضر پور
کلکتہ - ۷۰۰۰۲۳



&

LIBERTY

BY

ANWAR SHAIKH, B.A., B.Ed.,
Grad. Inst. of Transport, London.

Published by:
The Principality Publishers,
P.O. Box 918,
4-6 Llantrisant Street,
Cardiff, CF2 4YP.

General Information:
Price: £19.95
Size: A5, portrait,
450 pages, hardback
with a jacket.

ٹیکس اور آزادی

انور شیخ کی ایک کتاب کا خلاصہ

ف۔ س۔ اعجاز

انور شیخ کی انگریزی کتاب "Taxation And Liberty" اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہے۔ اس میں ٹیکس اور آزادی سے متعلق ۱۴ مکمل ابواب ہیں۔ کتاب دراصل برطانیہ میں ٹیکس اور لبرٹی کی مکمل تاریخ ہے جس میں قانونی، معاشی، تاریخی، جغرافیائی اور نفسیاتی پس منظر میں ٹیکس کاری نظام کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور تقابلی جائزے کے طور پر مصنف نے پورے یورپ، ہندوستان میں برٹش راج، برطانوی اور دیگر یورپی کالونیوں اور عرب ممالک کے سسٹم پر بھی بحث کی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب اور پیشکش میں مصنف کو مسٹر آلن رچرڈز ایل، ایل۔ بی Alun Richards L.L.B. کی معاونت حاصل رہی ہے جنہوں نے لیگل لٹریچر اور ٹیکس مقدمات کے مختصرات بہم پہنچائے ہیں۔

اس کتاب کا موضوع خشک ہے اور یقیناً ہر کسی کو اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن اس کی افادیت میں شک نہیں۔ ۴۵۰ صفحات کے اس بحرِ ذخار کا خلاصہ کوئی آسان کام نہیں پھر بھی میں افادیت کے پیش نظر کتاب کی صرف عام اور اصل مبادیات کا نچوڑ اور اس کے دو ایک اقتباسات کا ترجمہ یہاں پیش کر رہا ہوں۔

اس کتاب کو ٹیکس اور شہری آزادی سے سروکار ہے۔ اور کسی بھی جمہوری ملک کے معاشیات و سیاست کے طالب علم کو اس میں دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کتاب کی منطق یہ ہے کہ ٹیکس حکمراں یا حکومت کے ہاتھ میں شہریوں کو محکوم بنانے کا ایک خاص آلہ ہے۔ حکمراں اپنی طاقت کے بل پر ٹیکس اسی طرح وصول کرتے ہیں جس طرح غنڈے اور مافیا جبر اور دھونس سے پبلک سے رقم اینٹھتے ہیں۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ جواب طلب ہے کہ اسٹیٹ کو ٹیکس وصول کرنے کے حق سے محروم کر کے ملک کا نظام چلانے کے لئے Revenue کہاں سے اور کس طرح آئے گا۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ حکومت عوام کو صرف ٹیکس کے ذریعہ محکوم بناتی ہے۔ بہرحال یہ صحیح ہے کہ مصنف نے پورے طور پر ٹیکس کی مخالفت نہیں کی ہے۔ اس کا اصل مقصد ٹیکس نظام کے جبر سے شہری اور انسانی آزادی کے تحفظ کو یقینی بنانا ہے۔ اس معاملے پر بحث ختم نہیں ہو سکتی۔ انور شیخ نے کتاب کو معاشی اصولوں کی بحث تک محدود رکھا ہوتا تو یہ زیادہ قابل فہم ہو سکتی تھی۔ بے شمار مذہبی، تاریخی اور عمرانی تاویلات اور حوالوں نے اس کی علمی قدر میں تو اضافہ کیا ہے۔ لیکن وہ کتاب کی ضرورت نہ تھے۔

ف۔ س۔ اعجاز

ٹیکس اور آزادی برعکس تناسب میں چلتے ہیں۔ ٹیکس کا بار جتنا زیادہ ہوگا آزادی کا حجم اتنا ہی کم ہوگا۔

جس طرح کائنات کا طبعی وجود مخالف قطبین (Poles) کے ردِّ عمل پر منحصر ہے۔ اسی طرح سماجی عمل قطبییت (Polarity) پر قائم ہے۔ بہرحال، سماجی قطبییت، جیسا کہ عموماً مانا جاتا ہے، اہلِ ملکیت اور بے ملکیت لوگوں (haves and havenots) کے مابین تکرار اور تصادم سے برآمد نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے غلبہ پانے کی ترغیب اور اسکے جذبۂ حصولِ آزادی سے نمودار ہوتی ہے۔ عام آدمی آزادی کے گرویدہ ہوتے ہیں لیکن حکمراں جماعت کے افراد عوام پر ہر قیمت پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جس سے پولر جنگ جنم لیتی ہے۔ ٹیکس کاری حکمراں کا خاص آلۂ کار ہے۔ اس لئے اصل تکرار ٹیکس اور آزادی کے مابین اُبھرتی ہے اور دونوں کے درمیان ایسے رشتے کو نمایاں کرتی ہے جیسا کہ میٹھے اور کھٹے یا روشن و تاریک میں پایا جاتا ہے۔

ٹیکس حاصل کرنے والی اتھارٹی ایسی خود مختاری کی مظہر ہے جو

خدا اور دنیاوی حاکم کی مشترک خصوصیت دکھائی دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ سکندر اعظم، چنگیز خان اور تیمور لنگ (مجازی) خدا بن کر دیگر اقوام کو لوٹنے اور مارنے کی طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی جارحیت کا مقصد عوام کا قتل کرنا نہیں تھا بلکہ ٹیکس وصول کرنے کا حق قائم کرنا تھا جو برتری اور طاقت رانی کی علامت ہے۔ چونکہ عوام آزادی کو پسند کرتے ہیں اس لئے وہ ٹیکس وصول کرنے کی جابرانہ کوشش کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ حکمراں جماعت کے افراد اِن ڈائرکٹ یعنی بلاواسطہ طاقتوں مثلاً ضوابط و قوانین کے ذریعہ ٹیکس وصول کرتے ہیں۔

ان تمام حربوں سے بھی عوام کی برین واشنگ نہیں ہو پاتی۔ ٹیکس محصلوں کے مفسدانہ برتاؤ کے خلاف مسلح بغاوت کر کے لوگ اپنے جذبۂ آزادی کو پُر قوت ثابت کر دکھاتے ہیں۔ امریکی، فرانسیسی اور روسی انقلابات جیسے واقعات جن سے عوامی قربانیاں مجوی ہوئی ہیں، اس حقیقت کو ثابت کر چکے ہیں۔ حبِ آزادی کے بغیر آدمی اپنے آزاد عزائم کی طاقت کھو بیٹھتا ہے اور حیوان کی پست سطح تک آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حبِ آزادی کا انسانی شخصیت پر سب سے زیادہ تعمیری اثر ہوتا ہے۔

مصنف انور شیخ نے ٹیکس کاری بنام آزادی کے مرکزی خیال کی تفسیر انگریزی تاریخ کے حوالے سے کی ہے جو اس موضوع کے لئے ایک فطری تبصرہ فراہم کرتی ہے۔

اسکنڈے نیویا کے سمندری قزاقوں (Vikings) کی پے در پے لوٹ اور چیرہ دستیوں نے انگلینڈ کو تین صدیوں تک گویا ایک "ٹیکس گاؤں" میں محدود کر رکھا۔ وہ قومیں جو عادتاً ذلیل کن ٹیکس (☆) کا بوجھ اپنے کاندھوں پر ڈھوتی رہیں ان میں آزادی کا احساس معدوم ہونے لگا اور وہ ان قوموں کے آگے پست ثابت ہونے لگیں جو ٹیکس کی پابندی سے آزاد تھیں۔ Danegeld, Heregeld, Tremoda taxes کے علاوہ "ضروریات ٹیکس"۔ "جاگیر ٹیکس" اور Papal یعنی پوپ ٹیکس کی ذلتیں سہنے کے بعد انگریزوں نے اس ذلیل کن ٹیکس کاری کے خوفناک اثرات کو محسوس کیا اور ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو Runnymede کے مقام پر انہوں نے مسلح احتجاج کیا۔ انہوں نے اچھی عقل کا ثبوت دیا۔ ٹیکس دینے سے انکار انہوں نے نہیں کیا بلکہ ٹیکس نظام کو عوام کے ہاتھوں میں دینے کی مانگ کی۔ اور عوام سے مراد وہ لوگ تھے جو حکومت سے باہر تھے۔ یہ انگریزی ٹیکس کی اخلاقیات کے بنیادی اصول کو منوانے کی کوشش تھی۔ وہ اصول یہ تھا کہ حکومت کو اپنی مرضی سے لوگوں پر ٹیکس لاگو کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کنگ جان نے اسے Magna Carta میں جو کہ تمام انگریزی آزادیوں کی اساس ہے، تسلیم کیا ہے۔

انگریزی سلطنت میں ہنری ہفتم کی تخت نشینی کے ساتھ انگلینڈ کے مقدر کا ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ (ہنری ہفتم) ایک "ٹیکس شیطان" تھا جو شیطانی جوش و ولولے کے ساتھ حصول ٹیکس کی فکر میں پڑا رہتا تھا لیکن وہ جان گیا تھا کہ اس کی رعایا ذلیل کن ٹیکس کاری سے متنفر ہو گئی ہے اور مالی استحصال پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوگی۔ چنانچہ اس نے صنعت و تجارت پر مبنی ایک نئے طرز زندگی سے روشناس کیا جس سے اس کی آمدنی زیادہ سے زیادہ بڑھ جائے۔ اس تجارتی تجربے نے اس کی پوتی الزبتھ اوّل کے ہاتھوں زبردست کامیابی حاصل کی جس نے اپنی قوم کو تاجر، سرمایہ کار اور صنعت کار بننے میں عملی رول انجام دیا۔ اس پر عام اتفاق ہے کہ الزبتھ نے نئی "Levant Company" میں جو سرمایہ لگایا وہ اس کے کاروباری منافع کا حصہ تھا اور اسی سے "برطانیہ کی غیر ملکی سرمایہ کاری" کا آغاز ہوا۔ اسی کے منافع سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرمایہ کاری ہوئی جس نے کاروباری عظمت کی مہموں کے ذریعہ انگلینڈ کا شاندار امپائر قائم کیا۔ اس طرح کاروباری سرگرمی اور سرجوشی عظمت برطانیہ کا ایک ستون بن گئی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک انگریزوں نے محصل (Taxes) کی حرص و آز کو تجارت و صنعت کے منافع میں تبدیل نہیں کر دیا وہ کمینوں کی ایک قوم تھے جن کا ایک عامیانہ کلچر تھا اور وہ فلسفہ، ادب اور سائنس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ جب انہوں نے ذلیل کن ٹیکس کے اژدہے کا قتل کر ڈالا تو ان کی ادبی، سائنسی اور صنعتی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں جنہوں نے تہذیب کو ایک نیا رجحان دیا۔

ذلیل کن یا غلامانہ ٹیکس کاری (Abject taxation) سے انگریزوں کی مخالفت ہی پارلیمانی جمہوریت کا سبب بنی جو حکومت کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر ٹیکس لاگو کرے۔ اس اصول کی پرورش انگلینڈ میں کئی صدیوں میں ہو پائی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری حرص و طمع پر قابو پا کر شہری آزادیوں کا تحفظ کیا جائے۔ اس حرص و آز کے لئے پارلیمنٹ کو کوئی حکومت بنانے کی اجازت نہیں ہے، گرچہ سیاسی سہولت کے پیش نظر اس اصول کو بے رحمی سے توڑا بھی گیا ہے۔ پارلیمانی جمہوریت انگریزی عظمت کا دوسرا استون ہے۔ یہ سچ ہے کہ تیرہویں صدی میں بیشتر یورپی ممالک میں حبِ آزادی نے اپنا اظہار

(☆) مصنف نے یہاں Abject Taxation کی اصطلاح استعمال کی ہے جسکا مفہوم "آدمی کو غلام بنانے والا، پست، حقیر، ذلیل و خوار کر دینے والا ٹیکس" ہے۔ میں نے اس اصطلاح کا ترجمہ "ذلیل کن ٹیکس" اور کہیں کہیں "غلامانہ ٹیکس" کیا ہے۔ اصطلاح اپنی جگہ بہت اچھی ہے۔ ف۔ س۔ اعجاز

CORTES, DIET, ESTATES GENERAL(☆) یا پارلیمنٹ وغیرہ جیسے اداروں کے ذریعہ کیا لیکن یہ سبھی آزاد ادارے ایک ایک کر کے شخصی حکومتوں کے قدموں میں گر پڑے تھے۔ یہ برطانیہ تھا جس نے کنگ چارلس اوّل کا سر قلم کر کے مطلق العنانی کو دفن کر ڈالا۔ شہری آزادی، حقوق انسانی اور پارلیمانی جمہوریت کی جدید روایات کا جنم برطانیہ سے ہوا۔

ذلیل کن ٹیکس کاری سے رہائی انسانی شخصیت کو اسی طرح طاقت بخشتی ہے جس طرح کمزور عمارت کو لوہے کے چھڑ استقامت پہنچاتے ہیں اور اس کے قد و قامت کو بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس میں کوئی راز نہیں ہے۔ حکومت حصول ٹیکس کی خاطر عوام کی زندگی کو جابرانہ اقدامات کے ذریعہ قابو میں لاتی ہے لیکن جب انہیں یہ حق مل جاتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے اسے رکھ سکیں تو حکومت انکی حق تلفی کا اختیار کھو دیتی ہے۔ یہ یقیناً آزادی کے مترادف ہے اور ٹیکس دینے والے کے لئے اس کی وہی معنویت ہے جو کسی غلام یا بردہ کے لئے آزادی سے عبارت ہے۔ پسند کرنے اور عمل کرنے کا اختیار ایک صحت مند شخصیت کی ترقی کے لئے شرط اوّل ہے۔

آزاد منش اس لئے الوہی ہے کہ وہ عزّ و آزادی کی وکالت کرتا ہے اور آزاد لوگوں کی ایک قوم 'ان کا رنگ و نسل خواہ کچھ بھی ہو، تمام نوع انسانی کے لئے باعث رحمت ہے۔ ذلیل کن ٹیکس کاری کی مخالفت نے ایک بار برطانیہ کے عوام کو اس اعلیٰ رتبے تک پہنچا دیا تھا جس کے سبب انہوں نے ہندوستان میں عزّ و آزادی کی بہترین خصوصیات کا مظاہرہ کیا۔ بے شک انمیں کئی کمزوریاں بھی تھیں لیکن ایک آزاد منش کی آزادگی پسند روح جو انصاف اور انسانی حقوق کے موقف کی حمایت میں ڈٹ جاتی ہے، اپنی حماقتوں کو بھی چمکدار کرنوں کا درجہ دیدیتی ہے اور تاریکی کے دبیز پردے کو چیر کر صبح کی دیوی کو سامنے لے آتی ہے جس کے ہاتھ میں امید اور زندگی کی مشعل ہوتی ہے۔

چونکہ مصنف نے برٹش کردار کو ہندوستان میں برٹش راج کے حوالے سے واضح کیا ہے اس لئے اس نے اپنے بیانیہ کو متوازن کرنے کے لئے ایک باب "ہندوستان 'تہذیب کا سرچشمہ" کے عنوان سے شامل کر لیا ہے جسکی بدولت ہندوستانی کلچر میں نئی سمتوں کا اضافہ ہو گیا ہے اور شاندار ماضی کی وہ یادیں پھر تازہ ہو گئی ہیں جنھیں غفلت شعار طاقتوں اور تاریخ کے تعصبات نے دھندلا دیا تھا۔

راج کی خوبصورتی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان پر حکومت کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ انگریز لوگ یہاں تاجروں کی حیثیت سے آئے نہ کہ لٹیروں اور غارت گروں کی طرح۔ اور یہاں وہ ہندوستانی حکومت کی اجازت سے تجارت کرتے تھے۔ بادشاہ اورنگ زیب کی موت کے بعد ہندوستان میں انتشار اور لاقانونیت پھیل گئی اور انگریز اس خوفناک سیاسی خلا میں جذب ہو گئے۔ جب انگریز نے ہندوستان یا اسکے کسی حصے کو فتح کرنے کا اعلان کیا اس وقت بھی یہ اقدام برطانیہ کے وقار کے خلاف قرار دیا گیا۔ کلائیو اور ہسٹنگز جیسے عظیم انگریزوں نے ہندوستان کو محکوم کرنے کی شروعات کی لیکن انکے ان کارناموں کو بداعمالی سے تعبیر کیا گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے انکے خلاف چارہ جوئی کی اور انہیں بے توقیر کیا۔ چونکہ ہندوستان کے قبضے نے برطانیہ کو پستی سے عظمت کی چوٹی پر پہنچا دیا تھا ایسے کامیاب ہیروز کے خلاف چارہ جوئی برطانیہ کی اخلاقی شان ظاہر کرتی ہے دراصل برطانیہ واحد ملک ہے جس نے اپنے اخلاقی اقدار کو برقرار رکھنے کیلئے اپنے عظیم الشان ہیروز کو بھی سزا دی۔ دیگر ممالک جیت اور کامیابی کو سلام کرتے تھے اس سے غرض نہیں کہ وہ انہیں کس طرح حاصل ہوئی تھی۔ وہ اپنے فاتحین کو اجر بھی پیش کرتے تھے۔

بجا ہے کہ راج اپنی خامیوں کے بغیر نہ تھا لیکن سیاسی فیصلہ صرف ممکنات کے توازن پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اس سے گناہ اور پاکدامنی کے معیار کا تعلق نہیں ہوتا کیونکہ سیاست ممکنات کا فن ہے۔ گرچہ تقریباً پورا ہندوستان برطانوی عملداری میں تھا لیکن انتظامی طور پر لگ بھگ نصف

(☆) CORTES: اسپینی اسمبلی۔ Catalonia میں ۱۲۱۸ء سے اس کا آغاز ہوا۔

DIET: یہ سویڈن 'ڈنمارک 'پولینڈ' جاپان وغیرہ کی اسمبلی یا کونسل کا دوسرا نام ہے۔ جرمن امپائر کی Diet یا Reichstag یوروپ کا قدیم ترین سیاسی ادارہ ہے۔ جو بارہویں صدی سے شروع ہو کر ۱۸۰۶ء میں ختم ہو گیا۔

Estates-General : عوامی اسمبلی جس میں تین سماجی طبقوں کی نمائندگی ہوتی تھی: (۱) راہب (۲) شرفاء (۳) امراء۔ یہ اسمبلیاں ۱۸ویں صدی میں ختم کر دی گئیں۔ بادشاہ ان اسمبلیوں کو سرکاری معاملات میں مداخلت کا وسیلہ سمجھا تھا۔ عوام انہیں سرکاری اقتدار میں شرکت اور اپنی شکایات کے تدارک کا وسیلہ قرار دیتے تھے۔ (ف۔ س۔ اعجاز)

ملک پر ہندوستانی راجاؤں کی حکومت تھی جسے Princely India کہا جاتا تھا۔

دوسرے نصف یعنی برٹش انڈیا پر براہ راست برٹش کی حکمرانی تھی۔ جب ہم ان دونوں ہندوستانوں کا موازنہ کرتے ہیں تو عزت و آزادی کے لئے برطانوی اقدار کی وسعت کا ہمیں پتہ چلتا ہے۔ راجوں رجواڑوں کا انڈیا جبر و استبداد، معاشی ڈپریشن اور صنعتی پسماندگی میں مبتلا تھا۔ اور اس کا طریقۂ تعلیم وانصاف پست اور مایوس کن تھا۔ اس کے برعکس برٹش انڈیا ایک کالونی ہونے کے باوجود تقریر کی آزادی، پریس کی آزادی، مساوات، قانون اور مغربی طرز تعلیم کی صفات سے بہرہ ور تھا۔ راج کے آخری برسوں میں ہندوستان نے جمہوری ترقی حاصل کی اور زراعت و صنعت میں زبردست فروغ پایا۔

دوسرا قابل غور پہلو انڈیا سے برٹش کی واپسی ہے۔ جہاں دوسرے یورپی ممالک نے اپنی نوآبادیات پر قابو رکھنے کے لئے غیر انسانی مظالم ڈھائے انگریزوں نے ہندوستان کو آزادی کا تحفہ دیا۔ اس تحفے کی صحیح ستائش کے لئے اس نکتے پر غور کرنا چاہئے کہ ہندوستان میں دنیا کے ۱/۵ انسان آباد تھے اور یہ اتنی بڑی مملکت تھی کہ دیگر یورپی طاقتوں کی تمام زیر نگیں کالونیوں کے مجموعے سے بھی زیادہ بڑی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں دیگر محکوم کالونیوں نے اپنے آقاؤں کو اپنی سرزمین سے نکال باہر کیا اور اپنے سابق آقاؤں کو گالیوں سے نوازا وہاں ہندوستانیوں نے اپنے رخصت پذیر حکمرانوں کے اعزاز میں شاندار دعوتیں منعقد کیں اور گیت گایا" خدا بادشاہ کو سلامت رکھے" (God save the King) اور یہ ستائش بجا تھی۔ انڈیا سات صدیوں تک بدیسی غلبہ میں رہا۔ لیکن راج کے اختتام پر وہ اپنی سیاسی منزل پالینے کا اہل ہوگیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی روح میں برٹش راج آزادی کا سفیر اور برطانوی کردار کا نمائندہ تھا۔ واقعاتی طور پر اس اسپرٹ نے ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا اور ہر قوم کو اکسایا کہ وہ برطانوی اداروں کو اپنائے۔ اس سے برطانوی راج اپنی کئی خامیوں کے باوجود آزادی کی بین الاقوامی تحریک بن گیا۔ کیا کبھی ایسی انسانی تحریک بھی دیکھی گئی ہے جو ہر عیب سے پاک رہی ہو؟ حتیٰ کہ عیسائیوں کی اصلاحی تحریک بھی دو صدیوں تک عیسائیوں کو خونیں غسل کراتی رہی۔

برٹش راج کی اسپرٹ اور شیخ کے اس بنیادی نکتے کو سامنے لاتی ہے کہ ٹیکس کاری اور آزادی برعکس تناسب میں چلتے ہیں۔ یعنی ٹیکس کا بار جتنا زیادہ ہو آزادی کی جسامت اتنی ہی گھٹ جاتی ہے۔ اور اس کا برعکس بھی درست ہوگا۔ ذلیل کن ٹیکس کے خلاف انگریزوں کی لڑائی نے انہیں عزت و آزادی کا مقام عطا کیا جسکی بدولت وہ پستی سے اونچائی پر پہنچ گئے لیکن جب ٹیکس محصلوں نے ایکبار پھر عوام کو شکنجے میں لیا تو ان کی تقدیر پھر ڈانواڈول ہوگئی۔

چونکہ ٹیکس غلبے کا ہتھیار ہے اس لئے قانون ٹیکس کا آلہ کار ہے۔ لہٰذا برطانیہ کے زوال کا سبب وہ مفاد پرست ثابت ہوتے ہیں جو قوانین بناتے ہیں، ان کی تشریح کرتے ہیں، انہیں نافذ کرتے ہیں اس لئے مصنف نے قانون سازوں، ججوں، وکیلوں، ٹیکس وصولنے والوں اور حساب کاروں کو "آسان قانونیت کا فائدہ حاصل کرنے والے" (Beneficiaries of convenient legality) قرار دیکر ان پر تنقید کی ہے۔

مصنف خود کو گرہست قرار دیتا ہے تاکہ اپنے لئے محض ایک ناقد کی حیثیت قائم کرلے۔ وہ قانون کی فطرت پر بحث کرتا ہے۔ اس کا طریقہ متنازعہ ہے۔ وہ جدید طبیعیات کی نسبت سے آزاد ارادے اور ارادیت (Free will and determinism) کی پرانی اصطلاح کو نئے معنی عطا کرتا ہے اور ایک نادر پہلو کو بہ عنوان "فطری معاملات" (Natural Issues) سامنے لاتا ہے۔ وہ نظریۂ قانونِ فطرت اور آئینی اصولوں کے متعلق ان فطری معاملات کی اہمیت و مضمرات کی تشریح کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ ہے کہ قومی ہنگامی حالت کے سوا قانون پر لازم ہے کہ وہ انصاف کے کاز کی حمایت کرے۔ **اسی لئے قانون کو نظریہ کا آلہ کار نہیں بنایا جا سکتا۔**

برطانیہ "آسان قانونیت" (Convenient Legality) کا شکار رہا ہے۔ اس کے مضر اثرات بیان کرنے کے لئے مصنف نے ایک باب "اسٹیٹ مافیا" (State Mafia) کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ کئی عام خصوصیات کی بدولت آمدنی ٹیکس در اصل "زرِ تحفظ" (Protection Money) کے مترادف ہے جو تشدد کی دھمکیوں سے مافیا وصول کرتا ہے۔ سرکاری محصلوں میں ٹیکس وصول کرنے کے تعلق سے مافیا جیسا جوش پایا جاتا ہے۔ یہ بات موڈرن "تحقیقِ عمیق" (In-Depth Investigation) سے ثابت ہو چکی ہے۔ اور یہ عہد متوسط کے پوپ ٹیکس ادارے کا احیاء ہے جسے "Inquisition" (رومی کیتھولک عدالت) کہا جاتا تھا۔ اس کی رو سے عیسائی عقیدے کی خلاف ورزی کرنے والوں کو زندہ جلانا قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا تھا۔ تہذیبی ترقی پر غور کرتے ہوئے "تحقیقِ عمیق" کو سست، لطیف اور پُر تصنع اذیت (Sophisticated torture) قرار دیا جاتا ہے اور یہ Inquisition کو حقارت، گھنونے پن اور خوف

کا موجب بناتی ہے۔ بٹورنے کا دھندا ٹیکس کے طریقۂ تعیین (Mechanism of Assesment) کے ذریعہ عمل میں آتا ہے جسے قانونی وارنٹس نے استقدر بالائے فہم بنا دیا گیا ہے کہ اسے انسپکٹر سمجھے یا خدا سمجھے! اکاؤنٹ پیشے سے وابستہ لوگ جو ٹیکس ادا کنندگان کے ماہر سمجھے جاتے ہیں اپنے مؤکلوں کے حالِ زار پر مسکراتے ہیں۔ "تحقیق عمیق" (حساب کتاب کی گہری چھان بین) نے اکاؤنٹنٹ اور ٹیکس انسپکٹر کے مفاد ایک جیسے کردئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ چیکنگ کے امکانات نے اکاؤنٹینٹ کے منافع کی گنجائشیں بہت بڑھادی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی ترقی اور تنخواہ میں اضافہ کے بڑے مواقع پیدا کردیئے ہیں۔ ٹیکس انسپکٹر کا وظیفہ بھی بہت بڑھادیا ہے۔ بلاشبہ اچھے اکاؤنٹنٹ بھی ہیں لیکن کم ہیں۔

ٹیکس کی یہ حرص (Rapacity) ہماری سوسائٹی کی جمہوری فطرت کے سبب بڑھی ہوئی ہے۔ جمہوریت "اقتدار میں حصہ داری" کا عمل ہے لیکن جو حکمراں غلبہ پانے کی آرزو میں مبتلا رہتے ہیں اسے ووٹ کی خاطر "دولت میں حصہ داری" کے عمل میں تبدیل کردیتے ہیں۔ چنانچہ حصول ٹیکس سب سے پوتر، سب سے اہم اور شاندار پیشہ بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں حریصانہ ٹیکس وصولی باصلاحیت کاروباریوں اور کامگاروں کی پیداوارانہ صلاحیت پر روک لگا دیتی ہے۔ وہ لوگ دولت پیدا کرنا بند کردیتے ہیں۔ اس کے برعکس کاہل اور سست عملے بڑے سماجی فوائد کی شکل میں اپنے ووٹوں کی اونچی قیمت طلب کرتے ہیں۔ اور اسٹیٹ پر روز افزوں بڑھتا ہوا بوجھ بن جاتے ہیں۔ اسطرح سماج تصادم اور تکرار کا شکار ہوکر ناقابل انتظام ہو جاتا ہے۔ یہ حالات ایک بڑا بھیا (Big Brother) پیدا کردیتے ہیں جو لا اور آرڈر کے نام پر جمہوریت کا بیڑہ غرق کردیتا ہے۔ مصنف نے رومی اور ایتھنی جمہوریتوں کا تاریخی جائزہ پیش کرکے ثابت کردیا ہے کہ بسیار ٹیکس کاری (Over taxation) کے سبب ان جمہوریتوں کی موت واقع ہوگئی تھی۔ مصنف نے عقلی دلائل سے جتایا ہے کہ برٹش پارلیمانی جمہوریت بھی اپنی زمین پر آپ مر گئی ہے لیکن اس حقیقت کو اتنی چالاکی سے چھپا دیا گیا ہے کہ کوئی اس کا ادراک نہیں کرپاتا۔ کتاب کے سرورق پر پارلیمنٹ کے کانپتے ٹوٹتے ایوانوں کی تصویر اس حقیقت کو واضح کررہی ہے۔

"تاریخ کا ایک سبق" نامی باب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ ایک پارلیمانی ممبر لفظ آزادی کے لئے اتنا ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک مطلق العنان۔ رچرڈ سوم (۸۵-۱۴۸۳ء) کا اس کے عہد کے پارلیمنٹریوں نے قانونی حکمراں کے طور پر استقبال کیا، اس حقیقت کے باوجود کہ اس نے تخت پر قبضہ کرنے کے لئے تخت کے جائز وارث کا قتل کیا تھا۔ جج لوگ جنہیں انصاف کا ترازو لازماً سنبھالے رہنا چاہئے آزادیوں کی تحقیر پر مائل ہو جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح جیسے بڑی سیاسی شخصیتیں مائل ہو جاتی ہیں۔ درحقیقت یہ اقتدار اور وقار کے لئے ان کا جذبہ تھا جس نے انہیں پارلیمنٹریوں کے خلاف رچرڈ دوئم (۱۳۹۹-۱۳۷۷ء) کی مدافعت پر مجبور کرڈالا۔ وہی تھے جنہوں نے قانون کو شاہی برتری کا ہتھیار بناڈالا۔ اور اس طرح انگلینڈ کو ایک بہت طویل اور مہلک آئینی بحران میں مبتلا رکھا۔ جنگِ گلاب (War of the Roses) اور باسورتھ میں انگریزوں کا المناک انجام اس کے فطری نتائج تھے۔ اگر ٹیوڈرز (Tudors) خود انگریزوں سے زیادہ انگریز نہ بن گئے ہوتے تو انگلینڈ کی عظیم روایات محض ایک جنون کی بازگشت بن کر رہ گئی ہوتیں۔

مصنف کا کہنا ہے کہ "آسان قانونیت" ایکبار پھر برطانیہ کو غیر محسوس طور پر ایک آئینی بحران کی طرف لے جارہی ہے۔ انگلش عدالتی نظام کے ایک تاریخی جائزے کے ذریعہ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہاؤز آف پارلیمنٹ سے الگ جج حضرات کنگز کاؤنسل کا لازمی حصہ ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے فیصلوں کو شاہی انصاف سے تعبیر کرنا چاہئے نہ کہ فطری انصاف سے۔ بادشاہ سے پارلیمنٹ کو اقتدار کی منتقلی نے نہ صرف ججوں کا حکومت کی جانب جھکاؤ کا رویہ برقرار رکھا ہے بلکہ کسی حد تک اسے بڑھاوا دیا ہے جسکی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ لارڈ چانسلر ججوں کی تقرری اور ترقی کا مجاز ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انتظامی امور میں سیاستداں عدالت کے ارکان کے ساتھ شریک ہوتا ہے اور اسطرح وہ انہیں قانون کی وکالت پر اکساتا ہے۔ اسے باہمی مفادات (Mutual interests) میں قانون کی ڈکٹیٹر شپ سے تعبیر کرنا چاہئے۔ بہر حال جو ججوں کے لئے اچھا ہو ضروری نہیں کہ وہ انصاف کے لئے بھی اچھا ثابت ہو۔ رواج یہ ہے کہ عدالت کو سیاسی اثرات سے محفوظ رکھا جائے تاکہ عدالتی غیر جانبداری قائم رہے۔ اس غرض سے مصنف نے ملک برطانیہ کے قانونی سسٹم کی اصلاح کے لئے کئی تجاویز پیش کی ہیں۔

آخری باب جسکا عنوان ہے "عوامی اقتدار کی اضافی قدر" (The Marginal Utility of People's Power) ٹیکس کے سیاسی معاشی پہلو سے متعلق ہے۔ یہ معاشیات کی زائد افادیت (Marginal Utility) کی ہی ایک شکل ہے جسکا تعلق کسی تجارتی شئے کی آخری یونٹ سے ملنے والی آسودگی (Satisfaction) سے ہے۔ اس کی رو سے ہر اضافی یونٹ کی آسودگی کی قوت، سپلائی میں اضافے کے ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہماری ٹیکس لگانے والے اس اصول کا اطلاق آمدنی پر کرنے کے بعد یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ایک

ارب پتی کا آخری پونڈ اتنی افادیت نہیں رکھتا جتنی ایک معمولی ورکر کے آخری پونڈ میں ہوتی ہے. چنانچہ یہ کہکر مرحلہ وار (Progressive) ٹیکس کی حمایت کرتے ہیں کہ زائد (Surplus) دولت امیروں کو کسی قسم کی اصل قربانی پر آمادہ نہیں کرتی. اس کے برعکس ان کی دلیل یہ ہے کہ جب امیروں سے کسب کی ہوئی دولت دوبارہ تقسیم ہوتی ہے تو اس سے معاشرے کی مجموعی افادیت بڑھ جاتی ہے.

مصنف کا خیال ہے کہ اضافی قدر یا افادیت کی اصطلاح کا اطلاق صرف ایسی اشیاء پر ہوتا ہے جن کے استعمال محدود ہوں۔ مثلاً روٹی صرف بھوک مٹانے کے لئے ہے۔ ایک آدمی روٹی بس اتنی ہی کھا سکتا ہے کہ اسکی بھوک مٹ جائے۔ روٹی کے چند ٹکڑے کھا لینے کے بعد صارف (Consumer) فطرتاً ہر اضافی ٹکڑے کی قوتِ آسودگی میں بتدریج کمی محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن اگر روٹی کے کچھ دوسرے استعمال بھی ہوتے تو اسکی افادیت اتنی تیزی سے کم نہ ہوتی۔ چونکہ دولت کے لامحدود اور بے شمار استعمال ہیں اس کی افادیت میں کمی نہیں آسکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو حق ہے کہ وہ جو کچھ کماتے ہیں اسے بچا رکھیں اور اپنی دولت کو قانونی اور جائز مقاصد میں لگائیں۔ چنانچہ مرحلہ وار (Progressive) ٹیکس کاری امیروں سے ٹیکس ہتھیانے کا صحیح جواز نہیں ہے۔ یہ صرف سیاسی ''رابن ہوڈیت'' کو قانونی بنانے کا راستہ ہے جس کے ذریعہ اسٹیٹ ایک ایسی مافیا تنظیم میں بدل جاتی ہے جس کا ٹیکس حاصل کرنے کا طریقہ شاید ہی گینگ بازوں کے جبری طریقوں سے جدا ہو۔ یہ صورت حال اسوقت پیدا ہوتی ہے جب حکومت کو جابرانہ ٹیکس قوانین اپنے حسب منشا عائد کرنے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دولت کی نئی تقسیم زیادہ اہم معاملہ نہیں ہے بلکہ سیاسی اقتدار کو ہموار کرنا اصل مسئلہ ہے جو خود قدرتاً تباہ کن ہے کیونکہ یہ بڑھتے بڑھتے مطلق (Absolute) اور بناوٹی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مصنف نے عوامی اقتدار کی اضافی افادیت کا نظریہ پیش کیا ہے۔ جو اضافی افادیت کی معاشی تھیوری سے بالکل جدا ہے اور اس کا مدعی ہے کہ عوام الناس کے ہاتھ میں اقتدار کی جو آخری موثر یونٹ ہوتی ہے سب سے زیادہ آسودگی بخش اور بااثر ہوتی ہے۔ وہ اخلاق کو اس نظریہ کا اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے اسٹیٹ کے اختیار کو تقویت ملنی چاہئے۔ مصنف کا مشاہدہ ہے کہ یہ اختیار عوام کی Will سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ قانون کی سرکش طاقت سے۔

اس کے ساتھ ہی مصنف عدمِ مداخلت کی پالیسی (Laissez-faire) کا بھی مخالف ہے۔ اس کی دلیل ہے کہ لوگ سرکاری اتھارٹی کا جَوا ایک خاص مقصد سے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتے ہیں جسکا مطلب بھوک، بیماری اور بے انصافی سے تحفظ کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ بنیادی ضرورتیں ہیں جو ایک جائز حکومت کو لازماً پوری کرنا چاہئیں۔ اس نے کچھ راستے اور طریقے بتائے ہیں کہ کس طرح حکومت وافر فنڈ اکٹھا کر سکتی ہے حس سے مساواتی سوسائٹی تشکیل پائے حہاں امیر کو لوٹ کر غریب کو رشوت نہ دینا پڑے۔

نیتاجی سبھاش چندر بوس

نیتاجی کی سوانح عمری

مصنفہ : سسر کمار بوس
ترجمہ : ف۔ س۔ اعجاز
قیمت : ۳۷ روپے

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
A5، گرین پارک
نئی دہلی-110016

ایک ٹیکس انسپکٹر کو
"Taxation And Liberty" کے مصنف کا جواب

''ٹیکس کی حقیقت'' باب اوّل کے ضمیمہ میں مصنف رقمطراز ہے کہ اس موضوع پر اپنے نظریات کو متوازن کرنے کے لئے اس نے ایک ٹیکس انسپکٹر کو دعوت تنقید دی تو اس نے کہا کہ اس کتاب کی بنیادی منطق کہ ٹیکس اور آزادی ایک دوسرے کے برعکس تناسب میں چلتے ہیں، سراسر غلط ہے، چونکہ

(۱) سعودی عرب میں کوئی ٹیکس نہیں ہے اس کے باوجود یہ ملک شخصی استبداد اور ظلم و جور کے قبضے میں ہے۔

(۲) روس میں ٹیکس کم ہے اس کے باوجود عوام شہری آزادیوں سے محروم ہیں۔

جواب میں مصنف لکھتا ہے۔

''مجھے ان تبصروں کے خلوص پر شک نہیں ہے لیکن یہ یقیناً اس موضوع کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میری منطق یہ ضرور ہے کہ ٹیکس اور آزادی میں قطبیت (Polarity) پائی جاتی ہے لیکن اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ جہاں ٹیکس نہیں وہاں استبداد نہیں۔ جس طرح موت کئی اسباب سے واقع ہو سکتی ہے آزادیوں کی پامالی ٹیکس کے علاوہ کئی دیگر وجوہات سے ممکن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ان اسباب کا ذکر بھی کتاب میں کیا ہے۔ یہ ہیں رواج، ذہنی معتقدات اور قانون۔ میں نے ٹیکس کاری پر زور اس لئے دیا ہے کہ یہ غلبے کا واحد آلہ تو نہیں البتہ سب سے بڑا وسیلہ ضرور ہے۔

(ا) اس کی وضاحت کے لئے میں پہلے رواج، ذہنی عقائد اور قانون کے حوالے سے سعودی عرب کی بات چھیڑوں گا:

۱۔ معلوم ہونا چاہئے کہ سعودی عرب شخصی سلطنت نہیں بلکہ دینی مُلائی ملک ہے۔ یعنی وہاں بجائے انسانی احکامات کے قانون الٰہی کی حکومت ہے۔ خدا مملکت کا سربراہ ہے نہ کہ بادشاہ۔ مؤخر الذکر اوّل الذکر کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا ہے۔ اور اس کو قانون بنانے یا اسے تبدیل کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ایک ملک جو قرآن جیسے سخت تحریری دستور کے مطابق چلایا جائے اسے ایسے شخصی استبداد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا جہاں حاکم کا فرمان قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ سعودی عرب میں شراب پینے اور جوا کھیلنے پر لوگوں کے کوڑے لگائے جاتے ہیں اور انہیں قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہاں چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں اور ملاوٹ کے جرم میں سر قلم کر دیا جاتا ہے۔ یوروپین ان سزاؤں کو غیر مہذب اور انسانی حقوق سے محروم کر دینے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ جہالت کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شراب خوری، جوابازی، چوری، ملاوٹ وغیرہ کی مخالفت اسلامی ملکوں میں ایک رواج کی حیثیت رکھتی ہے اور مسلم کلچر کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی ہے۔ قرآنی قانون جسکی یہ لوگ بیحد تعظیم کرتے ہیں گناہگاروں کے خلاف اقدامات تجویز کرتا ہے۔ یہ اقدامات یوروپین لوگوں کی نظر میں وحشی پن اور جنگلی پن یا جور و ستم ہو سکتے ہیں لیکن راسخ العقیدہ لوگوں کے نزدیک یہ بہت صحیح اور جائز اقدامات ہیں کیونکہ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ پاکستان کی تخلیق اور ایرانی انقلاب مسلمانوں کے اس جذبے کے عکاس ہیں کہ وہ کس طرح اسلامی قانون کے مطابق جینا پسند کرتے ہیں۔

۳ - جن اقدار میں لوگوں کا عقیدہ ہوتا ہے وہی ان کی رہنمائی کرتی ہیں اور عقلیت، شہریت اور انسانیت ان اقدار کے اجزا نہیں معلوم ہوتے۔ پروٹسٹنٹ اپنے ملک کے پرستار تھے اور کیتھولک اپنے عقائد کے۔ بہر حال جب تک بنیادی عقیدے کے تسلیم کردہ کچھ ثقافتی ادارے نہ ہوں کوئی نظریہ بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر اسلام تعدّد ازدواج کی اجازت دیتا ہے جس کا فلسفہ نسوانی دماغ کے اندر تربیت اور عقیدے کی کرشماتی طاقت کے ذریعہ داخل کر دیا گیا ہے۔ سعودی تیل سے جو آمدنی ہوتی ہے اسی سے خاندان کے لئے بڑا الاؤنس، بلاسود قرض اور غریبی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ جس کے سبب عرب مرد چار بیویاں رکھنے کے متحمل ہو سکتے ہیں جو آپس میں بہنوں جیسے خوشگوار تعلقات قائم رکھ سکتی ہیں۔ خاندان کم ہی ٹوٹتے ہیں اور زندگی زمین پر جنت کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ سب

سے بڑی بات یہ ہے کہ سعودی عرب کی سوسائٹی ٹیکس بٹورنے والوں کی بھیانک مداخلت اور لوٹ کے اثرات سے آزاد ہے۔ ٹیکس قوانین کے استبداد کو بے اثر کر دینا عرب کا جدید کارنامہ ہے۔

ٹیکس کارستانی اور چھیڑ خانی سے نجات بجائے خود ایک بڑی آزادی ہے۔ لیکن برطانیہ جہاں جمہوریت Taxocracy کے ہاتھوں بگڑ گئی ہے اسے آسانی سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ عربی اقتدار کے برعکس ٹیکس کی حرص برطانیہ کے کلچر کا بنیادی اصول بن کر رہ گئی ہے جو کبھی ذلیل کن ٹیکس کی مخالفت کے لئے مشہور تھا۔ لوگوں سے ۹۸ فیصد تک انکم ٹیکس طلب کیا جاتا ہے اور ان ڈائرکٹ ٹیکسوں کی طلبی الگ ہے۔

ٹیکس اصول برطانیہ کے لوگوں کی برین واشنگ کردیتا ہے جبکہ اہل عرب اللہ کے احکام سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسلامی قانون اپنی تمام تر سماجی سختیوں اور پابندیوں کے باوجود انگلش قانون پر فوقیت رکھتا ہے جو فلسفۂ قانون کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کر کے اپنی سالمیت کھو بیٹھا ہے۔ یہ محض حاکم کے لئے ایک آسان ہتھکنڈہ بن کر رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی قانون کہتا ہے کہ ایک شہری اس وقت تک معصوم ہے جب تک اسے قصوروار ثابت نہ کر دیا جائے لیکن یہی قانون گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک ٹیکس دینے والا اس وقت تک قصوروار ہے جب تک وہ خود کو معصوم نہ ثابت کرے!۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکس دینے والا شہری یا انسان نہیں ہے۔

یہ حقیقت اس سے ثابت ہو جاتی ہے کہ ہر ٹیکس ادا کنندہ حکومت کو نہ صرف اس بات کے لئے جواب دہ ہے کہ وہ ایک ایک دمڑی کس طرح کماتا ہے بلکہ اس کے لئے بھی جواب دہ ہے کہ وہ اسے کیسے خرچ کرتا ہے۔ غلام بھی اس قسم کی تذلیل سے بچے ہوئے تھے کیونکہ اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے انہیں اپنے ذاتی مصارف کی مدیں نہیں بتانا پڑتی تھیں۔ . . .

مجھے یہ کہنا ہے کہ انسپکٹر کو میرے نکتے کورد کرنے کے لئے ایک ریگستانی مملکت (سعودی عرب) کی یاد تو آگئی لیکن برطانیہ میں ٹیکس ادا کنندگان کی آزادیوں کو اس نے یکسر فراموش کر دیا۔ افسوس یہ سب اس کے ساتھ نہیں ہوا . . .

(ب) ٹیکس انسپکٹر کا یہ دعویٰ کہ روس میں ٹیکس کم سے کم ہے، غلط ہے۔ درحقیقت ٹیکس وہاں دو وجوہات سے ۱۰۰ فی صد ہے: پہلی وجہ یہ کہ روسی اسٹیٹ تمام وسائل پیداوار کی مالک ہے اور محنت وسائل پیداوار کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ ایک روسی ورکر نظریاتی اور قانونی طور پر ایک غلام ہے۔ چنانچہ اسٹیٹ کا ایک اثاثہ ہونے کی وجہ سے اسے ملکیت رکھنے کا حق نہیں۔ یہ کام تو صد فی صد ٹیکس کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔ چونکہ روسی کاریگروں کے پاس موثر یونینیں یا مول تول کرنے والی طاقتیں نہیں ہوتیں حکومت انہیں زندگی کرنے کی وہ تنخواہ دیتی ہے جس کا پیداواریت سے تعلق نہیں ہوتا اور اس میں سے ٹیکس پہلے ہی بہت اونچی شرح پر کاٹ لیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ورکر جس نے سو پونڈ کمائے اسے بغیر کچھ بتائے صرف دس پونڈ بھی تھمائے جاسکتے ہیں۔ ٹیکس کٹوتی کی ظاہری صورت صرف ایک کاسمیٹک سرجری ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اگر ٹیکس انسپکٹر کا مشاہدہ درست بھی ہوتا تو روس میں کم شرح کے ٹیکس سے جو تنخواہ میں بھاری اضافہ ہوتا وہ کچھ اہم نہ ہوتا کیونکہ وہاں لوگوں کو املاک خریدنے کا حق نہیں ہے۔ دولت کی قوتِ خرید کی یہ نفی ورکروں کو 100% ٹیکس کے زمرے میں لے آتی ہے۔ یہ ذلیل کن ٹیکس روس میں لبرٹیوں کی پامال صورت حال پر سیدھا اثر کرتی ہے۔

برطانیہ کو عینی نکتہ بناتے ہوئے میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ذلیل کن یا غلامانہ ٹیکس آدمی سے نجی وقار چھین کر اسکی مالی طاقت کو ختم کر کے اسے ولین بنا دیتا ہے۔ لیکن جابرانہ پابندیوں سے رہائی اس کے فیاض اور آزاد کردار کی تعمیر میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بہر حال جس طرح زندگی کے کئی عوامل ہیں اسی طرح ٹیکس ایک بہت بڑا فیکٹر ہے لیکن یہ تعمیرِ زندگی کا واحد سبب نہیں ہے۔

کتابوں کی اشاعت

انشاء پبلی کیشنز سے مصنفین کے اخراجات پر صرف اعلیٰ معیار کی طباعت سے مرصّع کتب شائع کی جاتی ہیں۔ جو ادباء معیاری طباعت کو ترجیح دیتے ہوں وہ ہم سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ ہم کتابیں ایکسپورٹ بھی کرتے ہیں۔

told him that he was spiteful and all out to harm this country, his resistance collapsed; he is the man who always surrenders to reason. He told me that, as he had made Britain his home, he was obliged to accept his responsibilities that the dignity of homeland demands from its citizens The utility of the excluded chapters would have made the book a best-seller and bought him a lot of money I am glad that he did not succumb to greed and spite.

From the ashes of this investigation, rose the phoenix of Anwar's authorship In view of the fervour that he felt for his task of writing, he sincerely believed that this prolonged enquiry had been instituted by the Will of God to stir his latent springs of intellectual and moral potential for serving the cause of humanity, and the investigation was a Divine training for him to do the work

Anwar does not write to offend anyone; he writes to explain certain facts, tenets and principles But the gossip-mongers call him the "Insulter of Prophet." This is a lie which the opportunistic minds have forged to advance their own causes. Anwar is highly respectful to the prophet Muhammad and acknowledges his glory as a great man, a law-giver and a national hero.

One adorable thing about Anwar is that he has neither developed a cult nor he preaches his views to others. I am still a practising Christian and he is quite happy with the way I am. Similarly, he has refrained from indoctrinating our daughters and grand children. In fact, they do not know exactly what Anwar stands for. To know his views, one has to read his works to come to one's own conclusions

There is hardly any issue which is beyond his intellectual grip This is why his works are multifarious. Being a serious writer, he feels obliged to conduct a thorough research before he undertakes to write on a subject. For the same reason he does not beat about the bush, and this tendency has helped him to develop a style, which is absolutely personal to him. All his essays and books are considered as great specimens of in-depth enquiry, boldness and clarity of expression.

He is also a poet and fiction writer but for such expression he has chosen the Urdu language, which he never taught me despite my repeated requests. Therefore, I am in no position to give opinion about them.

Anwar has achieved a good deal of success as a philosopher, critic and herald of truth. Though faint-hearts shun him for controversial views, his outstanding quality to percieve, analyse and disseminate facts is being recognised by lovers of truth. Not long ago, he was interviewed by Television Asia for half an hour. Many a time he has been invited by the B.B.C. Radio for discussion on important issues. Even some mighty national dailies have projected his life and views Lately, he has been receving offers to write for magazines and websites.

Perhaps, a better measure for gauging his popularity is the size of mail and the number of visitors he receives from all over the world His admirers are becoming so numerous that I find it hard to cope with them and therefore obliged to prepare a waiting list for this purpose.

This success, though great in itself, has cost us dearly as a family. He does not write for money but as a public service. It is a very expensive hobby, indeed. To undertake it as the will of God, he gave up his lucrative business when it was reaching its pinnacle This is why he retired some twenty years before his time. He has no regrets whatever, and I am quite content with what we have

What has drawn me closely towards Anwar, is his sincerity. He is just an ordinary man endowed with a philosophical vision and moral integrity.

As a family, I am glad to add that Anwar is an adorable husband, an adorable father and an adorable grandfather. We all love him for his affection, sincerity and generosity.

Our only anxiety is his failing health which is being debilitated by his heart condition, diabetes and arthritis. He is always in our prayers We all are happy to serve and please him.

He believes in a culture of dissent i e everybody has the right to believe in what he likes, express his opinions and listen to what he likes. Such a principle is urgently needed in our world, which is becoming more oppressive everyday

May he continue his work for a long time

but did have a moral implication. Within a couple of months, both the properties were declared as part of the city development, and became unsaleable. The agent held Anwar responsible for the misfortune of his client. Though legally, they could not compel him to proceed with the purchase, Anwar felt the weight of his moral obligation, and bought the properties, as they stood. In this morally oriented exercise, he lost almost everything that he had earned and saved.

There is another episode, which deserves mention to explain Anwar's sensibility to his concept of honour Not many immigrants can even imagine of doing what Anwar did He publicly hit back at the local Member of Parliament, who later rose to become the speaker of House of Commons. It shows the political standing of the man he had to contend with The Member of Parliament in question was George Thomas, who was well loved and respected by his constituents I still remember him reverently As it transpired at a later date, he had been misled by some of Anwar's competitors, who wanted to harm him owing to sheer jealousy

The late George Thomas could not see the facts for himself. During a debate in the House of Commons, he called Anwar a wicked chap and an extraordinary landlord It was an extraordinary statement by a heavy-weight politicians. The news attracted headlines in the national press It really hit Anwar hard He had been misrepresented, and wanted to clear his name desperately

He thought of a solution which not many people could carry out; he contacted the national and local press asking their correspondents to investigate his personal affairs They were jolly pleased with his frankness They conducted a free and independent probe into his dealings All tenants and business contacts spoke very highly of him As a result, he was fully exonerated by the press. Ineed not say how Mr Thomas felt He was a good honest man, he trusted infromations and failed to verify the facts as reported to him

Some fifteen years afterwards, Mr Thomas visited us at our home without knowing Anwar's identity When Anwar told him who he was, he replied, "i have always admired your courage and integrity."

An important trait of my husband's character is to fight injustice and tyranny whether it is perpetrated by someone as a politician, bureaucrat or spiritual leader. All his writings are declaration of war against intellectual, political, social and religious oppression of one kind or another.

During 1970 when Anwar became the target of a serious tax investigation, the inland Revenue demanded some 100,000 pounds in back duties. In today's value, the demand amounted to several million pounds, which he did not have

In handling this enquiry, he did not realise that contrary to the Civil Code, the tax law held a person guilty until he proved his innocence. Anwar stood up to the inland Revenue of Great Britain, but the more he tried to disentangle this problem, the more complicated it became The tax authority, using their unusual techniques, authority and experience, exerted so much pressure that Anwar's accountants threatened to discard his case unless he paid up They were good accountants but were worried about Anwar's health, which was deteriorating under the tremendous stress that the enquiry was causing

Anwar has always been a fighter and believes in fighting to the last drop of one's blood. He bought a lot of relevant books, read them, analysed them and applied his gained knowledge to the situations as they arose from time to time

For twelve long years struggle went on This was not a casual affair during this period Anwar worked on his case for twelve to fifteen hours a day Eventually, it was the tax authority, that became anxious to settle the issue because it was taking too much of their valuable time They made a lot of concessions whose benefits we still enjoy.

At the end of the enquiry, Anwar decided to write his famous book: "Taxation And Liberty" which attracted top reviews from the major British magazinee. Before the manuscript went to the printers, I asked him to exclude two long chapters because they would have helped the tax cheats at a considerable cost to the Exchequer

He thought, considering what inland revenue had done to him over a period of twelve years, it was unfair demand When I

Anwar, My Husband

By Julia Shaikh

I met Anwar during tha summer of 1959, and from our first meeting I realised that he was an exceptional man Apart from his attractive looks, he was also a very educated man Our meeting, I am sure, had been predestined.

Having been a teacher in Pakistan, Anwar wanted to study further and intended to return to Pakistan on completion of his studies This was his intention which failed to materialise owing to his financial circumstances. Since his aim was to receive higher education, he took up a high professional course in transport and was quite happy to pursue it whith full vigour

Not only his drive-to-be somebody impressed me but also did his resolve not to live off National Assistance, which he found very degrading to his concept of personal honour and dignity Realising that almost every immigrant exploits the social security system of this land, I once asked him why he did not live off Social Security so that he could devote the maximum time to his academic efforts. He was really upset by this suggestion. I still remember his reply. "I have not come to this country to live as a begger but to cultivate higher tastes."

I had always dreamt of meeting such a man who, not only believed in higher morality, but also practised it I hoped and prayed that he would choose me as his life partner It soon transpired that, as he had a heart-rending past, he was searching for the likelihood of a happy future Being a practising Christian, I felt that the Good Lord had sent Anwar to me for company and mutual comfort. As things turned out later, I realised that I was not wrong in my assumptions I had been rewarded by God for my moral conduct and the courage of my convictions

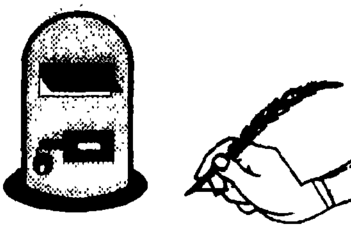
Anwar's first three years in this country were really tough After he married me, I insisted that he should give up his present job which was far below his dignity He had himself thought about it. With a view to freeing himself from the bondage of hard labour, he had been saving money bit by bit So, with the help of a small bank loan, he started his property business, which had a prosperous start, but not without problems, which probably pester all entrepreneurs.

Anwar was still struggling when he promised to buy two properties from an estate agent on the condition that he would give him some extra time to arrange the finance It was a verbal agreement [illegible]



Julia with her husband Anwar Shaikh

آپ کی ڈاک



(مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

○ نومبر دسمبر ۹۹ء کا شمارہ ''انشاء'' دستیاب ہوا۔ گفتنی میں اڑیسہ کے طوفان کے متعلق حکومت کی سرد مہری پر آپ نے جس انداز سے قلم اٹھایا ہے اور عوام کو اسی کے پس پردہ متنبہ کر دیا ہے یہ اداریہ کے تحت لکھنا گویا شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ لیکن میں ہمیشہ ہی یہ دیکھتا آرہا ہوں کہ حکومت کی کاہلی پر آپ حکومت کو نہ صرف للکارتے ہیں بلکہ "لتاڑتے" بھی ہیں اور کسی خطرہ یا اندیشہ کی پروا نہیں کرتے۔ جبکہ اکثر مدیران اردو کا رویہ چاپلوسی ''اور چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کا سا ہوتا ہے۔

۲۱ ویں صدی کو سائنسی ترقیات کے ساتھ ہی انسانیت کے تنزل کی صدی کہنے میں آپ چوکے نہیں۔ آپ کا تجزیہ بڑی حد تک آج کے حالات کے پیش نظر صحیح ہے۔ ایسے وقت میں اگر شریعت اسلامیہ پر زندگی گزاری جائے تو انشاءاللہ انسانیت بام عروج پر جاسکے گی شرط ہے اخلاص اور استقلال کی۔

محترمہ امیر النساء کا سفر نامہ دل کو بھایا ہے۔ وہ واقعی سفر نامہ لکھ رہی ہیں روز نامچہ پیش نہیں کر رہیں۔ منظور عثمانی کا انشائیہ ''دل پھینک اسد چچا'' انشائیہ کے اسلوب دفن سے عاری ہے۔ ساوتری گوسوامی کا افسانہ ''دو مہربان آنکھیں'' بھی پسند آیا۔ صفوت علی صاحب کا مضمون ''بچے ہمارے خواب'' نے دل میں جگہ کرلی۔ اردو میں واقعی ایسی کتابوں کی کمی ہے۔ موصوف نے اس کمی کو پورا کرنے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے پردیس (مغرب) میں رہنے والے مسلم خاندانوں کے معاشرتی مسائل کو بڑے نفسیاتی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے حل کے لئے مذہب کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ مشرقی خاندانوں کے کچھ کم یہی مسائل مقصود الٰہی شیخ، نعیمہ ضیاء الدین اور ہرچرن چاولہ کے افسانوں میں بھی بیان ہوئے ہیں۔

بنتِ الفیہ کے مضمون نے ''جوڑوں کے پتھرا جانے'' کے عارضہ کی بہت مفید معلومات فراہم کر دی ہیں، اللہ دم عیسیٰ ان کے علاج کو عطا کر دے۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، کلگاؤں، مہاراشٹر

○○○○○○

○ 'انشاء' بڑی پابندی سے مل رہا ہے۔ دل چاہتا ہے پورا پڑھ ڈالوں، مگر مصروفیات کی بنا پر پورا تو نہیں پڑھ پاتا، پھر بھی ضروری چیزوں پر نظر ڈال لیتا ہوں۔ تازہ شمارہ، ملینئم نمبر آیا تو دل چاہا کہ آپ کو خط لکھوں آپ یہ معیاری ادبی پرچہ کس طرح نکال رہے ہیں، یہ آپ ہی جانتے ہوں گے۔ میں تو صرف آپ کی ہمت کی داد دے سکتا ہوں۔

مدیر ''اخبار نو''۔ سابق ممبر پارلیمنٹ، نئی دہلی

○○○○○○

○ الفیہ عبداللہ بخش کے ہومیو پیتھی کے مضامین اچھے اور معلوماتی ہیں۔ ہمارا سماج ہومیو پیتھی کے طریقۂ علاج سے ابھی تک نابلد ہے۔ آپ اُن تک یہ معلومات بہم پہنچا کر ایک اچھا اور قابل ستائش کام کر رہے ہیں۔ محترمہ امیر النساء کا سفر نامہ معلوماتی ہے۔ وہ ایک اچھی افسانہ نگار ہیں۔

نثار راہی، بھوپال

○○○○○○

○ ملینئم عید نمبر ٹھیک عید کے ایک دن پہلے ملا عید کی خوشی دوبالا ہوگئی! سب سے پہلے میں انشاء کا اداریہ پڑھتی ہوں اور یہ رسالے کی جان ہوتا ہے۔ اس بار تو قرآنی نقطہ نظر کا حوالہ دیکر آپ نے اس کی شان اور بھی بڑھا دی ہے! آپ کی ڈاک کالم میں جناب علی ظہیر صاحب کا اعتراض میرے سفر نامہ سے متعلق نظر سے گذرا۔ مدیر انشاء کے مشورے کے مطابق میں نے مسودے میں مناسب ترمیم کرلی ہے۔ شکر گذار ہوں کہ ظہیر صاحب نے ابوالفضل عباسؒ کے پورے نام سے آگاہ کیا!

اے۔ امیر النساء، میل وشارم (T. N.)

○○○○○○

○ ''انشاء'' کا ملینئم عید نمبر نت نئے عمود لئے ہوئے ہے بالخصوص آپ کا اداریہ ''قوم گھاٹے میں ہے'' ملک کو درپیش مسائل کی تفہیم اور بدلتی ہوئی عالمی صورت کے ادراک پر بڑا بے باک اور Confirmative ہے۔ بالخصوص ہماری ڈپلومیسی، مروجہ لیبر قوانین، ٹیکس نظام کو آپ نے صحیح Vision دیا ہے۔ لائق تحسین میں آپ کہ اتنے Talents کو یکجا کیا ہے۔ نیز جہاں پر گوشہ دل پذیر ہے۔ آپ نے ''انشاء'' کو پہلے سے زیادہ ہمہ جہت اور بامعنی بنا دیا ہے۔ انشاء کا اسلوب ہی اس کا اپنا ورثہ ہے۔

شارقؔ رحمانی، کلکتہ

○○○○○○

○ انشاء کو عالمی وادیوں میں زعفرانی اہمیت حاصل ہے۔ جیسے جیسے خصوصی شمارے اور نمبر آپ نے طبع کروا دیئے ہیں ان کی مثال عصر حاضر کی اُردو صحافت میں کم ہی ملے گی۔ اردو رسالے عام طور سے تجارتی ترسیل کا شکار ہیں اور شاذ و نادر مستحکم ہیں اور ان میں سے کئی ادبی اور لسانی تہذیب کے تقاضوں کے منافی ہیں۔ آپ کے مزاجی استحکام کو مرحبا!!

لکھنؤ کے بعض ارباب انشاء کو ہر ماہ پڑھنے کے متمنی ہیں۔

تسنیم فاروقی، لکھنؤ

OOOOOO

O "گفتنی" کے تحت "قوم گھاٹے میں ہے" آپ کا اداریہ خوب ہے۔ واقعی آپ کی نگاہیں دور بیں ہیں۔ آپ کی یہ باتیں دانشمندانہ ہیں "سیاسی اور اقتصادی استحکام کی جستجو اور فطری و مصنوعی وسائل کے ہر ممکنہ اور زیادہ سے زیادہ استعمال کے بغیر ہم نہ پیداوار کا نشانہ پورا کر سکتے ہیں اور نہ نئی ترقی کے امکانات کو جنم دے سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مروّجہ لیبر قوانین اور ٹیکس نظام تجارت اور صنعت کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ ان سے کاروباری اولالعزمی کو بڑھاوا انہیں مل سکتا"۔ صدی اشعار کے تحت آپکے ۲۱ر غزلیہ اشعار بھی پسند آئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اپنے مضمون بعنوان "اکیسویں صدی کیلئے تدبیر اور عمل" میں جو کچھ بھی کہا ہے، خوب کہا ہے۔ واقعی مفکروں کی بات ہی زالی ہوا کرتی ہے۔ مولانا روم کی حکایت بھی حسب حال ہے، اس کے ذکر سے، مضمون کافی وزنی ہو گیا ہے، مجھے امید ہے کہ کچھ لوگوں کی آنکھیں ضرور کھل گئی ہوں گی۔ محترم جگن ناتھ آزاد کے "افکار تازہ" اور قاضی رئیس کے "ہائیکو" بھی خوب ہیں۔ حاجی انیس دہلوی صاحب کی غزل دل کو چھوتی ہے۔ شرف کمالی کی حمد اور سہیل فصیحی کی "نعت پاک" سے ایمان تازہ ہو گیا۔ شبنم سنبھلی کے سبھی نعتیہ ماہیے بھی دل کو مسرت بخشتے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع کا مضمون "اسلام اور درس انسانیت" بھی قابل توصیف ہے۔ نوشاد مومن اور آپ کی نظمیں بھی پسند آئیں۔ اے۔ امیر النساء کا سفر نامہ "ارض مقدس میں چند روز" پڑھکر دل جھوم اٹھا۔ انکا اسلوب نگارش، دلنشیں ہے۔ چھٹی قسط کا انتظار رہے گا۔ مقصود الٰہی شیخ (برطانیہ) کی کہانی "برسورے نینوا مورے" ایک پُر فکر اور معنی خیز کہانی ہے۔ نیر جہاں کا افسانہ اور نظم، دونوں ہی لائق تحسین ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون "مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری" دلچسپ، پر اثر اور پر فکر ہے۔ اس قدر مربوط و مسبوط ہے کہ مت پوچھئے۔ اس مضمون میں اس قدر شگفتگی، تازگی اور کشش ہے کہ دل بار بار اسے پڑھنا چاہتا ہے۔ اقتباسات کو انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑ دیا ہے۔ ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش کا طبی مضمون (ذیابیطس) بھی کافی معلوماتی ہے۔

شمس افتخاری، ہوڑہ

OOOOOO

O انشاء کا عید نمبر عین عید کے دن ملا۔ کل تک کسی اور کو نہیں ملا تھا۔ یہ تازہ افتخار میرے حصے میں آیا کہ مجھے سب سے پہلے ملا۔ شکریہ۔ تصاویر کی اشاعت سے وہ لمحے تازہ ہو گئے جو ہم آپ سب کی معیت میں گزار کر اور ان کی یادوں کا بیش بہا خزانہ ساتھ لے کر کلکتہ سے لوٹ آئے۔ یہ خوشگوار یادیں / تصویریں ہمارا آئندہ وقت بھی مہکاتی رہیں گی۔ ماشاء اللہ عید نمبر بھی خوب ہے۔ نئی لائی جانے والی ادارتی تبدیلیوں کی وجہ سمجھ میں آرہی ہے۔ ہم روایت پرستوں کے ذہنوں میں بتدریج نقش ہوتی جائیں گی۔

مقصود الٰہی شیخ، بریڈفورڈ (برطانیہ)

OOOOOO

O نیر جہاں پر گوشہ نکال کر آپ نے بہت اچھا کام کیا۔ دیار غیر میں وہ اردو کی شمع جس شان سے جلائے ہیں وہ بڑی ہمت، حوصلے سلیقے، انتظامی قابلیت اور سوجھ بوجھ کا کام ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری پر مضمون بہت دلچسپ ہے۔ مجتبیٰ حسین اس وقت اردو مزاح نگاری میں سب سے بلند مقام پر ہیں۔ ان کی تحریریں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ ان پر غیر دلچسپ مضمون لکھنا ممکن بھی نہیں۔

افسانوں میں دیپک کنول کے افسانے "تفتیش" نے بہت متاثر کیا۔ حقیقت میں اس خطۂ ارض پر قبضے کے لئے مذہب کے ٹھیکے دار اور قانون کے محافظ دونوں انسانیت کا خون بہا رہے ہیں۔

الفیہ بخش صحت اور ہومیوپیتھی کے بارے میں بہت اچھے مضمون لکھ رہی ہیں۔ ان کے اگلے مضمون کا انتظار رہے گا۔

اکیسویں صدی کے تعلق سے جتنے مضامین ہیں وہ سب Idealistic ہیں اور نئی صدی میں دنیا میں نیا نظام قائم کرنا تو دور رہا خود اپنے ملک کی حالت بہتر بنانے کے لئے بھی کوئی ٹھوس قابل عمل تجویز نہیں پیش کرتے۔ کیلینڈر کی تاریخیں بدل جانے سے انسانی فطرت نہیں بدل جاتی۔ انسانی فطرت میں تبدیلی لانے کے لئے ایسے دانشوروں کی ضرورت ہوتی ہے جو عملی طور پر سماج کی جس برائی کی طرف انگلی اٹھائیں اسے دور کرنے کی جدوجہد کریں، جیسے کہ سرسیّد نے مسلمانوں کی جہالت دور کرنے کے لئے کی تھی۔ قوم افراد سے بنتی ہے اور جس قوم کا ہر صاحب اقتدار فرد ذاتی مفاد اور نفع خوری میں مبتلا ہو تو اس قوم کا گھاٹے میں رہنا لازمی ہے۔

عطیہ خان، لندن

OOOOOO

O صفوت کی "مثنوئ وقت" پر آپ کا وقیع تبصرہ نظر نواز ہوا، لیکن آپ سے ایک سہو ہوا ہے۔ آپ نے مثنوی زہر عشق کو میر کی مثنوی لکھا ہے جبکہ یہ مثنوی مرزا شوق لکھنوی کی ہے۔ ☆ اور مشہور زمانہ ہے جس پر کسی زمانے میں حکومت ہند (زیر اثر برطانیہ) کی جانب سے حکم امتناعی جاری ہوا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ عشق مضاف الیہ کے ساتھ میر کی چند مثنویاں ہیں جیسے شعلۂ

عشق، دریائے عشق، جوشِ عشق، اعجاز عشق وغیرہ، موصوف کی مشہور مثنویوں میں خواب وخیال اور مثنوی شکار نامہ (آصف الدولہ کے شکار کے واقعہ پر مبنی) شامل ہیں۔ مرزا شوق (حکیم تصدق حسین خاں عرف نواب مرزا تلمیذِ آتش) نے پانچ چھ مثنویاں اسی ترکیب اضافت کے عنوان سے اور لکھیں جیسے "فریب عشق"، "بہار عشق" وغیرہ لیکن شہرت و تاثر کے اعتبار سے زہرِ عشق بہت آگے ہے۔ ممکن ہے انہی مماثل عنوانات کے زیر اثر آپ نے ایسا لکھ دیا ہو۔ بہر حال تبصرہ پسند آیا۔ خوب ہے، محققانہ ہے۔

شمیم عثمانی، کانپور

☆ مجھ سے سہو ہوا۔ معذرت۔ ف۔ س۔ اعجاز

OOOOOO

O آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح دعوتِ فکر دیتا ہے۔ "صدی اشعار" زندگی کی مختلف تلخیوں اور کڑواہٹوں کے روپ میں ہمارے سامنے ہیں۔ اکیسویں صدی کے تدبیر عمل۔ اکیسویں صدی اور مسلمانوں کا مستقبل۔ انسانی سماج کا مسئلہ۔ اسلام اور درسِ انسانیت یہ کچھ ایسے مکمل، جامع اور ٹھوس مضامین ہیں کہ جنہیں قاری پڑھے اور سوچے پھر انہیں سچائیوں کی روشنی میں اپنی زندگی کا محاسبہ کرے۔ سفر نامہ "ارض مقدس میں چند روز" ہر قسط میں دلچسپ ثابت ہو رہا ہے۔ گوشۂ نیر جہاں میں نظم "پہلا قتل" متاثر کرتی ہے۔ صحت اور ہومیوپیتھی کالم صحت و زندگی کے اعتبار سے بڑا ہی صحت مند اور کار آمد ہے۔ اسے برابر جاری رکھیں۔ اس بار ذیابیطس پر محترمہ الفیہ عبد اللہ بخش نے اچھی گفتگو کی ہے۔ رہی نظموں غزلوں کی باتیں تو "انشاء" میں اس بار نئے سال کے تحفے کے طور پر بڑی ہی خوبصورت نظمیں اور غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ افسانے متاثر کرتے ہیں لیکن عید نمبر کی مناسبت سے عید پر کچھ اور نہ پاکر حیرت ہوئی۔ علاوہ ساوتری گوسوامی کی کہانی "چاندنی کی پہلی عید کا انعام" کے۔

فراق جلال پوری، جلال پور، امبیڈکر نگر (یو۔ پی۔)

OOOOOO

O "انشاء" جنوری فروری 2000 سالِ نو کے تحفہ کے طور پر موصول ہوا۔ تمام مندرجات اہم ہیں گوشۂ نیر جہاں مکمل مگر مختصر ہے۔ ان کے فن و شخصیت پر تو بہت کچھ لکھا اور لکھوایا جا سکتا تھا وہ ایک اعلیٰ پایہ کی شاعرہ و افسانہ نگار ہی نہیں نہایت ہمدرد مخلص غمگسار خاتون ہیں۔ حیدر طباطبائی صاحب کا مختصر مضمون عقیدت سے بھرا ہوا ہے حیدر طباطبائی صاحب بھی قلم کے دھنی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر اختر الواسع کے مضمون بہت پُر مغز ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ صاحب تو افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ اُن کا افسانہ "برسو سے نینوا مورے" مکمل و شاہکار افسانہ ہے۔ نیر جہاں صاحبہ کے افسانہ و نظم دونوں معیار کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ غزلیں، نظمیں سبھی اچھی ہیں۔ آپ کے صدی اشعار کی تعریف نہ کرنا ادبی بد دیانتی ہوگی۔ صدی کا پورا منظر نامہ ان ۲۱ر اشعار میں موجود ہے۔

رئیس الدّین رئیس، دہلی گیٹ، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

OOOOOO

O اس شمارے کے بیشتر مشمولات معیاری اور لائق مطالعہ ہیں۔ خاص کر محترمہ ساوتری گوسوامی کا افسانہ "چاندنی کی پہلی عید کا انعام" بے حد پسند آیا۔ "اکیسویں صدی اور مسلمان" جسٹس قدیر الدین صاحب کا مضمون تمام مسلمانوں کیلئے ایک لمحۂ فکر ہے۔ اس کے علاوہ افسانے، مضامین، غزلیں، نظمیں خوب سے خوب تر ہیں۔

فرمان احمد خاں، دھنباد

OOOOOO

O محترمہ نیر جہاں پر گوشہ شائع کر کے آپ نے بڑا اور اہم کام کیا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کی شاعرہ اور افسانہ نگار ہونے کے علاوہ بہت ہی مخلص اور نیک خاتون ہیں اور دیار غیر میں اُردو کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔ ہرچرن چاولہ اور اظہر جاوید کے مضامین ان کی شخصی پہلو و ادبی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

افسانوں میں مقصود الٰہی شیخ۔ دیپک کنول اور رینو بہل کے افسانے خوب ہیں۔ آپ اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے موضوعاتی مضامین بھی خوب تر ہیں۔ دیگر مندرجات بھی معیاری ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ صاحب کے ناولٹ "دل اک بند کلی" کا اجراء آپ کے زیر اہتمام ہوا۔ اس کی دلچسپ رپورٹ گذشتہ شمارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ موجودہ شمارے میں تصاویر کی اشاعت نے اُن کی شاندار شخصیت کو اُجاگر کیا۔ اپنے بھارت دورے کے دوران شیخ صاحب لدھیانہ تشریف لائے۔ اُن سے مُلاقات کے لمحے نصیب ہوئے، میں پہلے ہی سے ان کا مدّاح ہوں، ان لمحوں نے اور بھی گہرا اثر پیدا کیا۔ وہ محبتوں کے مسیحا ہیں۔

نعیمہ ضیاء الدین کو ان کے افسانوی مجموعے "منفرد" پر اردو مرکز انٹرنیشنل امریکہ کی طرف سے انعام مِلا، یہ پر مسرّت خبر اور تقریب کی تصاویر انشاء کے توسط سے ملیں، انہیں اردو برادری کی طرف سے بہت بہت مبارک باد! وہ اردو زبان کی خدمت کرتی رہیں، ان کا قلم اور بھی اچھے افسانے لکھتا رہے اور اس سے بھی بڑے انعام واعزاز ان کی قدم بوسی کرتے رہیں۔ میں دعاء گو ہوں۔

ڈاکٹر کیول دھیر، لدھیانہ

OOOOOO



● گذشتہ دنوں دہلی کی ایک ادبی تقریب میں "ایوانِ ادب" کی رسم اجرا معروف نقاد اور ادیب راج بہادر گوڑ نے فرمائی۔ اِس موقع پر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، دِہلی کے وزیر ٹرانسپورٹ پرویز ہاشمی، راج بہادر گوڑ اور "ایوانِ ادب" کے ایڈیٹر حاجی انیس دہلوی۔

میرے بزرگ میرے ہم عصر اور داستان وفا کے بعد ڈاکٹر وفا راشدی کی ایک اور تاریخی اہمیت کی کتاب

کلکتے کی ادبی داستانیں

سلطنت مغلیہ کے آخری دور، کلکتے پر انگریزوں کے تسلط، جدو جہد آزادی سے حصول آزادی تک کے تاریخی تناظر میں اردو کی ترقی ...ں فورٹ ولیم کالج، مسلم، یوروپین، بنگالی ہندوؤں کا کردار، کلکتے میں علی گڑھ تحریک کے حوالے سے سرسید، نواب عبداللطیف، جسٹس امیر ...ٹی کی تعلیمی تحریکیں، کلکتے میں واجد علی شاہ کی سکونت، مرزا غالب کے مقدمہ پنشن، ادبی معرکے، مرزا داغ، منی بائی حجاب، نساخ کلکلوی، ... کلکلوی، اکبر الہ آبادی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، علامہ وحشت کلکلوی، قاضی نذرالاسلام، بابائے اردو، جگر مر... آبادی، آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی سے وابستہ کلکتے کی تین سو سال سے زائد اردو زبان و ادب، تعلیم و تہذیب اور قومی تحریکات کی تاریخی داستانیں، عہد بہ عہد نئی معلومات، واقعات، انکشافات، پہلی بار "کلکتے کی ادبی داستانیں" میں۔

ناشر: مکتبہ اشاعت اردو — قیمت دو سو پچاس روپے

بی ۴۸ شاہ فیصل ٹاؤن جناح ایونیو، ملیر ہالٹ، کراچی ۷۵۱۰۰ (پاکستان)

VOL : 15 ISSUE : 3 - 4
Regd. No. D 103 / 99 **MAHNAMA INSHA** R. N. I. Regd. No. 44083 / 86
Postal Regn. WB / CC - 550 MAR - APR 2000 ISSN . 0971 - 6009

ماہنامہ انشاء کا ایک

نوبل جشن شمارہ

اسکنڈے نیویائی ادب نمبر

مُرتب :- ف ۔ س ۔ اعجاز

اسکنڈے نیویائی ممالک، ڈنمارک، ناروے،
سویڈن، فن لینڈ، گرین لینڈ
اور آئس لینڈ میں بسے ہوئے
تارکینِ وطن اردو ادباء کے

افسانے مضامین شاعری

اور ان کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق رشحاتِ قلم

اسکنڈے نیویا کے اصل افسانوی
اور شعری ادب کا اُردو ترجمہ بھی !

صفحات
مجلد ڈی لکس
ایڈیشن

نوبل پرائز ...ناتھ ٹیگور کو دیا گیا سویڈش نوبل اکاڈمی کا
طویل سپاسنامہ بہ عنوان "پیشکش" اُردو میں پہلی بار۔

ہنرک ابسن کا شہرہ آفاق ۳ ایکٹ ڈرامہ "گڑیا گھر"

★ اسکنڈے نیویائی سفرناموں سے اقتباسات • ناروے کے عظیم مصوّر
ایڈورڈ منک پر خصوصی تصویری فیچر

مشرقی شہر کلکتہ سے شمالی مغربی یورپ کے ادب کا گھر اور مطالعہ

قیمت ... ملک • ۳۰۰ روپے • بیرون ملک • ۱۰۰ امریکی ڈالر مع رجسٹرڈ ڈاک
دی پی نہیں بھیجی جائے گی ۔ پوری رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر / بینک ڈرافٹ صرف بنام انشاء پبلیکیشنز
اس پتہ پر روانہ فرمائیں :

MA...AMA INSHA
IN...HA PUBLICATIONS
25-...karia Street, Calcutta-700 073 • 25-4616 TELEFAX : 9133 2478063

PRINTED ... PRINTED AT INSHA PUBLICATIONS 6-A, KANAI SEAL STREET, CALCUTTA - 700 073
... PUBLI...

ISSN : 0971 - 6009

انشاء

Rs. 20/-

Laser Compose and graphic de

In Urdu, Persian, Arabic, English,

Books & Periodicals, Wedding Cards,

Advertisements, Lables etc.

Street, Calcutta-700 073. Phone:

انشاء مرکز

اردو، عربی، فارسی، انگریزی

کتب و رسائل کی

کے گرافک ڈیزائن

نستعلیق، نسخ، ظہر، آثار اور اسود خطوں

ہندوستان کا ممتاز بین الاقوامی اردو رسالہ

انشاء

ISSN : 0971 - 6009

جلد: ۱۵ | مئی / جون ۲۰۰۰ء | شمارہ ۵-۶

انشاء پبلیکیشنز

IP

مدیر : ف۔س۔اعجاز

اس شمارے کی قیمت : ۲۰ روپئے

زرسالانہ : ۱۲۰ روپئے

مغربی ممالک سے : £ 15
or
US $ 25

فہرست

INSTRUCTIONS FOR PAYMENT

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات روانہ کی جائیں۔ امریکہ سے انٹرنیشنل منی آرڈر روانہ کئے جائیں جو کلکتہ میں امریکن ایکسپریس بنک سے نقد واجب الادا ہوں۔

گرافکس : ثاقب فیروز
انشاء گرافکس

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

IP

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ:
۲۵۔بی، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳۔ فون: ۲۳۵-۴۶۱۶

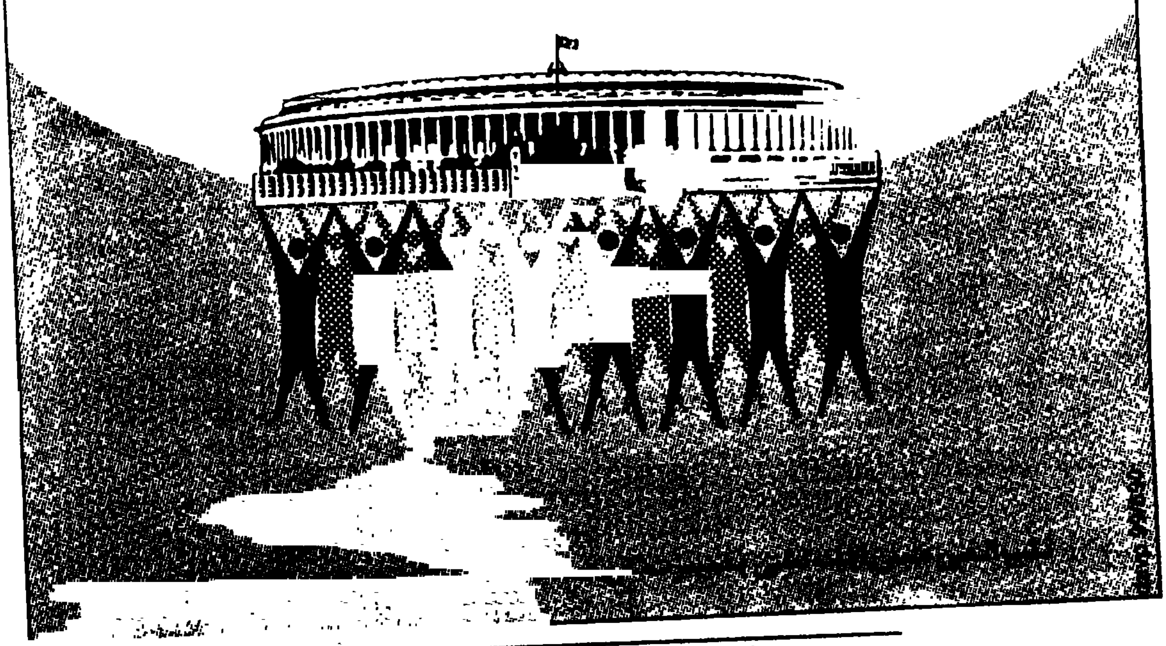
Fax : 232-0104 Attn. "MAHNAMA INSHA" • E-mail : safe@cal2.vsnl.net.in

ہندوستانی جمہوریہ

واقعات سے بھرپور 50 برسوں پر محیط داستان

ہمارا عزم

انصاف
آزادی
مساوات
اخوت



گفتنی: اداریہ

آؤ کلچر سے کھیلیں

ہندوستانی کلچر کے لئے رنگوں کے انتخاب کا موسم ہے۔

کیا ہندوستان کو ایک رنگ میں رنگ دیا جانا چاہئے۔ اگر ہاں تو وہ کون سا رنگ ہو جس میں اسے رنگ دیا جائے۔ یہ بحث اب بہت قریب آگئی ہے اور فضا میں زعفرانی سائے لہراتے ہوئے دیکھے جا رہے ہیں۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے اپنی مذہبی اساس سے کٹ کر نہ کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔ فن و ادب کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ مابعدِ جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے باوجود ایک بٹا ہوا اور ماقبلِ جدید معاشرہ ہے جہاں اس وقت روزمرہ کلچر سے روزمرہ سیاست جنم لیتی ہے۔

بات کلچر کی ہو تو کلچر تک رہ بھی نہیں پاتی۔ وہ جھٹ سیاست اور مذہب تک پہنچ جاتی ہے۔ کیونکہ اس وقت سیاست اور دھرم کلچر کے دو کھلے شگاف ہیں۔ جو فرقہ پرستوں اور نام نہاد سیکولرزم نوازوں نے پیدا کئے ہیں۔ نئی سیاسی رُت واضح طور پر دس سال پرانی ہے۔ جب ایودھیا تحریک کے بادل مطلعِ سیاست پر گہرے ہوگئے اور بابری مسجد گرا دی گئی تو سیکولرزم کے کچے رنگ چھوٹنے لگے۔ پھر مسلم حکمرانوں یا اکابرین کے نام سے منسوب شہروں کے نام تبدیل کئے جانے لگے۔ اس نے اب ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے۔ حتیٰ کہ اکبر بادشاہ کے عہد سے چلے آرہے لکھنؤ نام کو لکشمن پور کا نام دینے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے شہر لکھنؤ کا قدیم نام لکشمن ٹیلہ تھا جو رام کے بھائی لکشمن سے منسوب تھا۔

اِدھر پچھلے تین برسوں میں عیسائی فرقے کی عبادت گاہوں اور مبلغین کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ بلکہ بعض کرسچین راہباؤں کی عصمت دری بھی کی جا چکی ہے۔ اور اب دیپا مہتا کی فلم "واٹر" کے موضوع کو ہندو مخالف بتا کر بنارس میں اس کی شوٹنگ روک دی گئی۔ فلم کے اسکرپٹ کو ہندو ودھواؤں کے لئے قابلِ اعتراض قرار دیتے ہوئے "کاشی سنسکرتی رکھشا سمیتی" نے ایک دن کا بنارس بندھ منایا۔ "بجرنگ دل" اور "وشو ہندو پریشد" کے کارکنوں نے دھمکی دی ہے کہ وہ یہ فلم ہندوستان کے کسی بھی صوبے میں نہیں بننے دیں گے۔ نہ مدھیہ پردیش میں جہاں کانگریس کی حکومت ہے اور نہ مغربی بنگال میں جہاں جیوتی باسو کی قیادت میں بایاں محاذ پچھلے ۲۴ر سال سے اقتدار میں ہے۔

سب جانتے ہیں کہ آج کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کی آوازوں میں وہ دم نہیں رہ گیا ہے جو پہلے کبھی تھا۔ اور آر ایس ایس اور بی جے پی کے خلاف اگر کوئی لب کشائی کرتا ہے تو محض سیاسی جمع خرچ کرتا ہے۔ اُس کا اختلاف کلچر کو زعفرانی رنگ اختیار کرنے سے روک پائے گا اس میں شک ہے۔ کلچر پر اثر انداز ہونے والی سیاسی طاقتیں بری طرح عدمِ توازن کا شکار ہیں۔ ہندوستان میں یہ صورتحال اب نئی نہیں رہ گئی ہے۔ اب جو مارکسی کمیونسٹ پارٹی "واٹر" کو کلکتہ میں فلمانے کی اجازت دے رہی ہے اس نے خود چند سال پہلے "سٹی آف جوئے" (City of Joy) کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا۔ وہ فلم کلکتہ کے بارے میں تھی اور اس کے اسکرپٹ پر کلکتہ کی غریبی اور مفلوک الحالی کی رسوائی کا الزام اسی پارٹی نے لگایا تھا۔

ظاہر ہے کلچر کے بارے میں کوئی پارٹی مخلص نہیں ہے اور جن اقدار کو ایک پارٹی اپنی جانب سے تحفظ فراہم کر سکتی ہے انہی کو وہ آئیڈیل ہندوستانی کلچر کا نام دیتی ہے۔ یہ فاشزم کی ایک قسم ہے۔ کلکتہ میں کمل ہاسن کی جاری فلم "ہے رام" کے خلاف کانگریسیوں نے پچھلے دنوں سخت احتجاج کیا کہ اس کے بعض مناظر یا مکالمات سے گاندھی جی کی تحقیر ہوتی ہے۔ لیکن پھر کیا ہوا یہ دیکھنے کی چیز ہے۔ کانگریس کی صدر سونیا گاندھی نے جو "واٹر" کی حمایت میں پالیسی اختیار کی تھی اسے منطقی ضرر سے بچانے کی خاطر "ہے رام" کے خلاف کلکتہ میں اپنے احتجاجیوں کو احتجاج واپس لینے کا حکم دیا۔ اپنی ہی مصلحت سے اپنی ناک کیسے کٹ جاتی ہے یہ اس کا نمونہ ہے۔ یہی کانگریس دیپا مہتا کو اپنے صوبے مدھیہ پردیش میں شوٹنگ کی غیر مشروط دعوت دے کر بھی اس کے ساتھ اپنا وعدہ نہیں نباہ سکی۔ ایسے کانگریسیوں اور کٹر پنتھیوں کا منہ چڑانے کی خاطر حکومت مغربی بنگال نے "ہے رام" کے فلم ساز اور ہیرو کمل ہاسن کو کلکتہ بلا کر اس کی سرکاری پذیرائی کی ہے۔ ان رویّوں کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ بھارتی سنسکرتی ایک گورکھ دھندا نہیں ہے۔ کلچر سیاستدانوں کے لئے سوسائٹی کو اپنے مفاد میں تقسیم کرنے کا ذریعہ ہے۔ سیاسی جماعتوں سے لے کر دیپا مہتا اور شبانہ اعظمی تک انڈین کلچر کے ساتھ سب کھلواڑ کر رہے ہیں۔ ایک عورت خواتین کی ہم جنسی (فلم "فائر") اور ودھواؤں کی طوائفیت پر فلمیں پروڈیوس کر رہی ہے تو دوسری سر منڈھا کر مفت پبلسٹی حاصل کر رہی ہے۔

یہ ہیں ہندوستانی کلچر کی محافظ عورتیں! کیا یہ ہندوستانی کلچر ہے؟ ''واٹر'' کی حمایت میں ہندوستان میں کہیں سے کوئی واضح آواز اٹھی تو وہ کلکتے کے دھرمتلہ علاقے میں میٹرو سینما کے پاس سے اٹھی۔ یہ آواز دو کوڑی کی عصمت فروش عورتوں کی تھی۔ ایسے کلچر کے سر پر سو جوتے۔ ایسی عورتیں جو اپنے کیریئر (پیشے) کے تحفظ کی غرض سے شادی نہ کریں یا شادی کریں تو اولاد پیدا ہونے نہ دیں انہیں بھلا کس کلچر کی فکر ہے۔ عورت کلچر کی ماں ہوتی ہے۔ کلچر کس کے لئے ہوتا ہے؟ اولاد کے لئے، آئندہ نسل کے لئے۔ ایسی نسل کش عورتوں سے خدا معاشرے کو بچائے۔ یہ آوازیں ہماری تہذیب کی مستقل اور مستحکم آوازیں ہیں یا اپنی ڈھلتی عمروں اور روبہ زوال پیشوں کا بچاؤ کرنے والی مشاطہ اور جہاندیدہ عورتوں کی آوازیں ہیں؟۔

۱۴ر فروری کو کانپور میں یوم ویلنٹائن (Valentine's Day) پر ''اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد'' [کل ہند طلبہ کی انجمن] نے ویلنٹائن ڈے سے مخصوص عشقیہ رسموں کو منانے والوں کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ وہاں کئی پکچر گیلریوں اور پھولوں کی دکانوں اور ہوٹلوں کو توڑ پھوڑ دیا گیا۔ ڈھائی سو نوجوان جوڑوں کے منہ کالے کردئے گئے۔ یہی نہیں دو لڑکیوں کے کپڑے پھاڑ کر انہیں راستے میں گشت بھی کرایا۔ طلبا کی اس پریشد نے ملینیم اور نئے سال کے جشن کو بھی مغربی رسوم گردانتے ہوئے انہیں بھارتی کلچر کا دشمن قرار دیا۔ ردِ عمل میں ایک ''کل ہند عشاق کمیٹی'' وضع کی گئی لیکن وہ پریشد کے حملے کا جواب دینے میں بری طرح ناکام رہی اور ایک ہی دن میں اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کے فوراً بعد کانپور میں انگریزی اسکولوں میں لڑکیوں کی مغربی پوشاک یعنی اسکرٹ اور جینز وغیرہ کے خلاف زوردار احتجاج کیا گیا جس کے نتیجے میں دوسرے ہی روز وہاں کے سینٹ میری کانوینٹ نے اعلان کردیا کہ آئندہ اپریل کے سیشن سے طالبات کا یونیفارم یعنی شلوار اور قمیص ہوگا۔

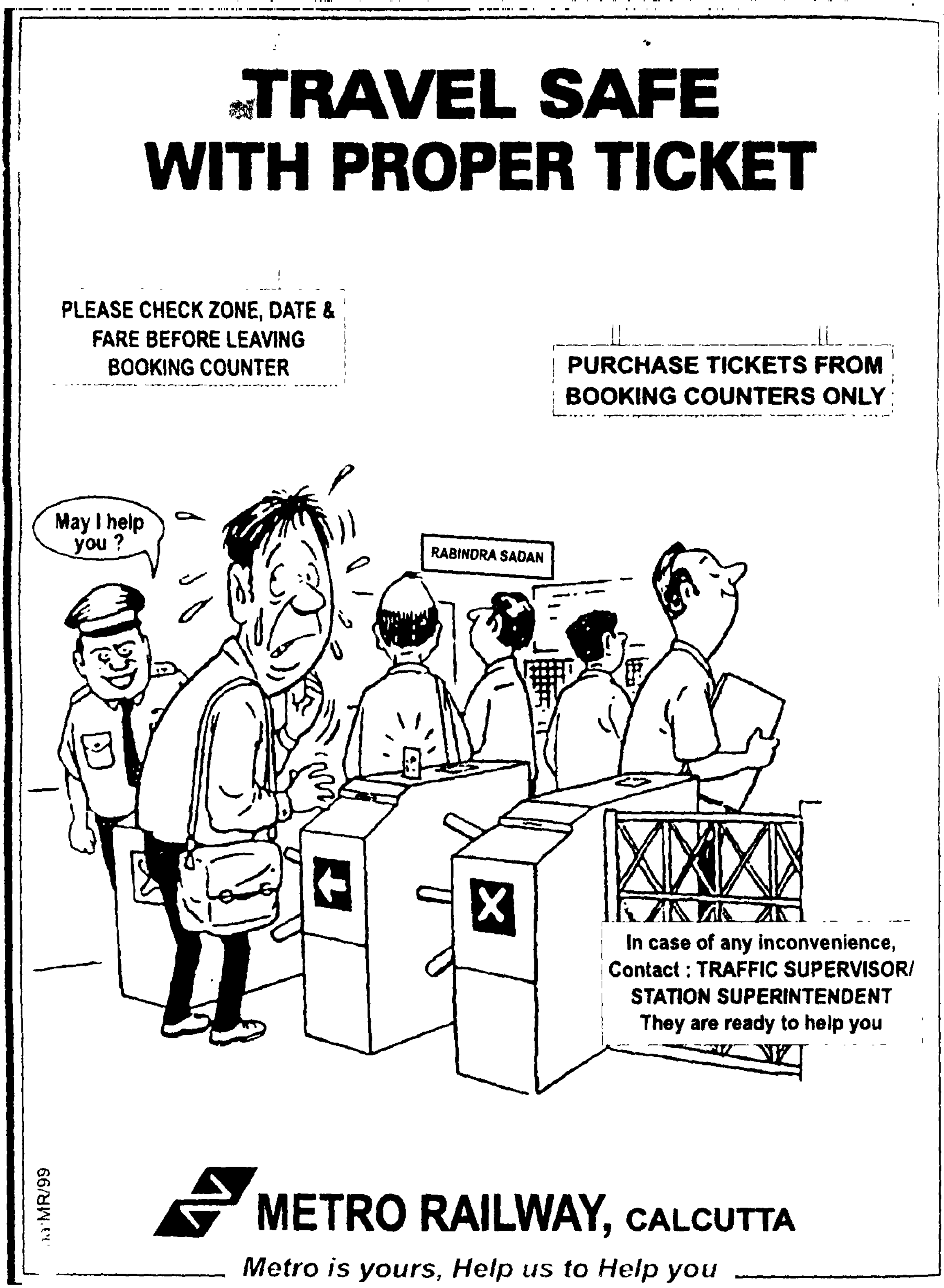
اسکول میں ہندوستانی لباس کا نفاذ یقیناً ایک بڑا اور اہم قدم ہے لیکن طاقتور ہونے کے باوجود سنگھ قوتیں سنسکرتی کے تحفظ اور شدھی میں ناکام رہی ہیں۔ کیونکہ ان کا یہ عمل مکاری کی ایک ادا ہے اور اقلیت دشمنی پر مبنی ہے۔ ہندوتوا کی یہ دعویدار طاقتیں ہندوستانیت کے تصور کو اپنے اجداد کی میراث سمجھتی ہیں۔ وہ ہندوستان کے ملے جلے روایتی مشرقی کلچر کو ''ہندوستانی'' سے زیادہ ''ہندو'' اقدار کا مجموعہ قرار دیتی ہیں۔ کلچر کے نام پر اسی کا استعمال کرکے صرف راج سنگھاسن پر براجمان ہونا چاہتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان کا معیاری اور اصل لباس سیدھا سادا ہے اور عمدہ اخلاقی ضوابط کے مطابق ستر پوش اور پردہ دار واقع ہوا ہے۔ جدید فیشن میں عریانیت اور فحاشی مغرب کی کورانہ تقلید اور دیسی فلموں کے ذریعہ بھارتی سماج میں داخل ہوکر ایک وبا کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ آر ایس ایس والے ہندوستانی کلچر کے تحفظ کے لئے اصولی جنگ شروع کرنا چاہیں تو فلم اور ٹیلیویژن میں عریانیت کے خلاف آواز اٹھائیں اور حسیناؤں کے انتخابات (Beauty Contest) پر بھی پابندی لگوائیں۔ آئیڈیل ہندوستانی مرد اور عورت کا تصور جب تک نہیں بدلے گا انڈیا کا کلچر نہیں سدھرے گا۔

جدید ننگے ہندوستان کی ستر پوشی واقعی ہونی چاہئے لیکن اس کے لئے اصل مسئلے کو صحیح طور پر اٹھانا چاہئے اور ضابطۂ لباس کو قانون کے ذریعہ نافذ کرنا چاہئے۔ تین رنگوں کے جھنڈے کو ہندوستانی تہذیب اور اخلاق کا علامیہ بنانا چاہئے۔ یہ کیا کہ آسمان میں ترنگا شان سے لہرائے اور زمین پر ہندوستان کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اسکولوں، کالجوں، سڑکوں، پارکوں اور بازاروں میں بدن کے ابھار اور گہرائیاں دکھاتے پھریں۔ اپنی تہذیب کی پہچان اپنا لباس ہونا چاہئے یا کم سے کم وہ اختیاری لباس ہو جو اپنی تہذیب سے متصادم نہ ہو اور نسلوں کو خراب نہ کرے۔ فرقہ پرست تنظیموں کا مقصد دراصل سیاسی ہے اخلاقی نہیں۔ ان کے اقدام سے سوسائٹی میں صفائی کے بجائے خلفشار پیدا ہونے کا امکان ہے ہرچند کہ ان کے اٹھائے ہوئے سوالات اہم ہیں۔

فارم نمبر ۴

۱۔ مقام اشاعت	:	کلکتہ
۲۔ وقفہ اشاعت	:	دو ماہ
۳۔ پرنٹر	:	ف۔ س۔ اعجاز
• قومیت	:	ہندوستانی
• پتہ	:	۶۔ اے کنائی سیل اسٹریٹ کلکتہ۔ ۷۳
۴۔ پبلشر	:	ف۔ س۔ اعجاز
• قومیت	:	ہندوستانی
• پتہ	:	۲۵ بی زکریا اسٹریٹ کلکتہ۔ ۷۳
۵۔ ایڈیٹر	:	ف۔ س۔ اعجاز
• قومیت	:	ہندوستانی
• پتہ	:	۲۵ بی زکریا اسٹریٹ کلکتہ۔ ۷۳

۶۔ ساجھیداری۔ (کوئی نہیں) واحد ملکیت۔ میں ف س اعجاز اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست اور صحیح ہیں۔ دستخط: ف۔ س۔ اعجاز


TRAVEL SAFE
WITH PROPER TICKET
PLEASE CHECK ZONE, DATE & FARE BEFORE LEAVING BOOKING COUNTER
PURCHASE TICKETS FROM BOOKING COUNTERS ONLY
May I help you ?
RABINDRA SADAN
In case of any inconvenience, Contact : TRAFFIC SUPERVISOR/ STATION SUPERINTENDENT They are ready to help you
MR/99
METRO RAILWAY, CALCUTTA
Metro is yours, Help us to Help you

حمدِ باری تعالیٰ

طاہر تلہری
صدر بازار، پوسٹ تلہر - ۲۴۲۳۰۷ (یو۔پی۔)

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
خلاء میں یہ انگنت ستارے
یہ چاند سورج زمین
سب اپنے اپنے محور پہ گھومتے ہیں
اور اپنی اپنی کشش کے باعث
وجود اپنا کیے ہیں قائم
زمین اپنی کشش جو کھو دے
تو چند ہفتوں میں
ایک تنکے کی طرح اڑ کر
دہکتے سورج میں جا گرے گی
جو سورج اپنا تموز کھو دے
تو خاکدانِ حیات میں کچھ رہے نہ باقی
تمام اجرامِ آسمانی
جو اپنے محور سے منحرف ہو کے اپنی گردش کا رخ بدل دیں
تو وہ تصادم ہو
وہ تصادم ہو
جس سے اک پل میں ہر نشانِ وجود کا خاتمہ یقینی ہے
تاہم ایسا ہوا نہ اب تک
ہزاروں لاکھوں کروڑوں صدیوں سے کارخانہ چل رہا ہے
کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
تمام سیارگاں میں آخر یہ ایک مخصوص نظم کیوں ہے
یہ سب کے سب کس طرح سے اک خاص ضابطے میں بندھے ہوئے ہیں
یہ رات کے بعد دن کی آمد
یہ صبح کے بعد شام کا التزام کیوں ہے
یہ کل عوامل میں منطقی ربط خود بخود تو ہے غیر ممکن
ضرور کوئی عظیم ہستی ہے
جو عقب سے ہے کارفرما
جو پردۂ غیب میں نہاں ہے
جو فہمِ انساں سے ماورا ہے

غزل

اسرار اکبر آبادی
E3-600, Ashok Park, Shaheed Nagar, Agra-282001 (U.P.)

دل اور نئے دور میں ٹکراؤ بہت ہے
اس جنگ میں ہر شخص پہ پتھراؤ بہت ہے

گانے کو تو گاتا ہوں اُجالوں کے میں نغمے
لیکن شبِ تاریک میں ٹھہراؤ بہت ہے

کچھ ایسے بھی الفاظ ہیں تاریخ کی زینت
جن سے مرے ماحول میں بکھراؤ بہت ہے

رہ رہ کے چمکتی ہے مری راہ میں بجلی
اُڑتے ہوئے ذرّات میں ٹکراؤ بہت ہے

جذبات، طلب ہی سے عمل بنتے ہیں اسرار
پھر کیوں ترے جذبات میں ٹھہراؤ بہت ہے

سفرنامہ
(چھٹی اور آخری قسط)

ارضِ مقدس میں چند روز

اے۔ امیر النساء
"تسکین"، جمیل آباد
سکنڈ اسٹریٹ
میل وشارم
632509 (تامل ناڈو)

اس قسط کے ساتھ یہ سفر نامہ ختم ہوتا ہے۔ بہت جلد انشاء پبلی کیشنز سے یہ خوبصورت کتابی شکل میں شائع ہونے والا ہے۔ قارئین کتاب کا آرڈر ابھی روانہ کردیں۔ شائع ہوتے ہی کتاب انہیں رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کردی جائے گی۔

ہنوز قاہرہ میں

آج ستمبر کی تئیسیں تاریخ ہے۔ سب سے پہلے ہم مصر کی سب سے بڑی یونیورسٹی (جامعہ الازہر) پہنچے جامعہ کی عمارت وسیع و عریض ہے، یہاں بغیر پاس کے داخلہ ممکن نہیں، سڑک کے دوسری جانب وسیع عمارت میں الازہر لائبریری قائم ہے اس سے آگے جامعہ الازہر کی بہت بڑی مسجد ہے۔ اس مسجد کے احاطے میں یوروپین سیاح بھی گھوم رہے تھے، اس کے بعد ہم امام شافعیؒ کے مقبرے پر پہنچے۔ سلام بھیجا، مقبرے سے متصل مسجد میں ظہر پڑھی، پھر سیدنا حسینؓ کے مقبرے پر پہنچے۔ یاد رہے کہ ہم نے کربلا میں بھی سیدنا حسینؓ کے مقبرے پر حاضری دی تھی، دراصل یہاں پر سیدنا امام حسینؓ کا سر مبارک مدفون ہے اور کربلا میں ان کا جسم اطہر ہے یزید کی شقی القلبی نے ان کی نعش مبارک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا، پھر ہم نے سیدنا زینبؓ بنتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار پر حاضری دی۔ بہت ہی پر سکون اور خوبصورت گوشہ ہے جہاں سیدنا زینبؓ آرام فرما رہی ہیں، آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں کہ اللہ تعالی نے ہمیں سعادت بخشی کہ جن اہل بیت کا صرف تذکرہ سنتے تھے ان کے مقابر کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہاں صرف عورتیں فاتحہ پڑھنے کے لئے آتی ہیں، سر راہ ہم نے مسجد محمد علی کا نظارہ کیا جو یہاں کی بڑی مسجد ہے! آج رمضان المبارک کا چوتھا روزہ ہے مصر کے شہر قاہرہ میں ہم نے افطاری کا ایک دلچسپ اور خوبصورت تجربہ حاصل کیا۔ دریائے نیل پر چلنے والے Cruise میں ہمارے مصر کے ٹریول ایجنٹ کی طرف سے افطاری کا انتظام تھا، دریائے نیل پر بے شمار کروز چلتے ہیں۔ ہمارے لئے King تای Luxury Line منتخب کیا گیا تھا جو تین فلور پر مشتمل تھا۔ گراؤنڈ فلور میں کچن باقی دو فلور میں سجے ہوئے ریسٹورنٹ تھے اور عرشہ پر بیٹھک کا انتظام۔ افطاری میں وقت تھا ہم عرشے سے دریائے نیل کا نظارہ کرنے لگے۔ دریا کنارے ایک مصری خاتون خاص قسم کی روٹیاں تندور میں بنا رہی تھی، دریا میں کوسٹر بھی چل رہے تھے بڑا منفرد نظارہ تھا، دریا سے تازہ مچھلی حاصل کرکے کوسٹر میں ہی بھون کر فروخت کی جارہی تھی۔ کروز کے نچلے حصے میں عملے کے آدمیوں کے لئے افطاری کا سامان لگ رہا تھا، عملے کے آدمی نے اطلاع دی کہ افطاری کا وقت ہوا جارہا ہے، لہٰذا ہم نیچے چلے آئے۔ بڑی سی میز افطاری کی لوازمات سے سجی ہوئی تھی اچانک کروز دریا میں رواں ہوگیا۔ یہ اس بات



دریائے نیل کا ایک منظر قاہرہ ٹاور سے لی گئی تصویر



[illegible] میرے بھتیجے سلمان، بھائی جان محمد صدیق صاحب
محمد اشرف صاحب میرے شوہر ضیاالدین صاحب اور بھتیجہ سہیل احمد

کا اعلان تھا کہ افطاری کا وقت ہو چکا ہے آہستہ خرامی سے چلتا ہوا Luxury Line قاہرہ کے دلفریب نظاروں کو مزید حسن بخش رہا تھا۔ دریا میں تیرتے ہوئے بہت سارے کروز میں لگے بلب ایک دم روشن ہو گئے ان بلبوں کی روشن کا عکس پانی میں جھلملا رہا تھا! آرکسٹرا نے اچانک عربی دھن چھیڑی۔ ہم نے درخواست کی کہ مہربانی فرما کر تھوڑی دیر اور رک جائیں ہمیں مغرب کی نماز ادا کرنی ہے۔ انہوں نے فوراً دھن بجانا بند کر دیا اور عملے کے آدمیوں نے ہمارے لئے سفید چادریں بچھا کر نماز پڑھنے کا انتظام کر دیا! شام کے سات بجکر دس منٹ ہو رہے ہیں۔ ہم نے اند[illegible] ہوٹل کی لابی میں تراویح ادا کی۔ ہوٹل کی اس بڑی سی لابی میں مختلف نیشنیلٹی کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے بالکل قریبی صوفے پر چار جاسے آئی خواتین باتوں میں مصروف ہیں، مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگوں نے کرسمس کی چھٹیاں گزارنے کے لئے یا کرسمس منانے کے لئے مصر کے شہر قاہرہ کو منتخب کیا ہے اور ہوٹل کو بھی اسی مناسبت سے سجایا گیا ہے، ویسے تو یہ ماہ صیام ہے کھانے پینے سے مقررہ وقت تک رک جانے کا مہینہ ہم نے ان حدود کو قائم رکھتے ہوئے جو اس مہینے میں لازم ہو جاتے ہیں خوب انجوائے کیا۔ کیونکہ زندگی کا اصل حسن اسی میں مضمر ہے!

اب تک کے دیکھے ہوئے مختلف ممالک سے قاہرہ کی تہذیب بالکل الگ ہے یہ شہر سیاحوں کا مسکن ہے دنیا کے کونے کونے سے اور ہر خطہ سے آئے ہوئے لوگوں کا سنگم! عراق، اسرائیل، اردن اور مصر ان چاروں ممالک میں ایک چیز مشترک ہے وہ ہے ان کی بے مثال خوبصورتی، میں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کی۔ کشمیر کا حسن میری نظروں میں سمایا ہوا ہے اس کے باوجود جو حسن مجھے یہاں نظر آیا وہ بے مثال ہے۔ خاص طور پر اسرائیلی بے مثال حسن کے مالک ہیں اس رنگ و روپ اس حسن و جمال کے آگے ہر تشبیہ ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ اگر حسن و خوبصورتی ان پر ختم ہے تو جنت کی حوریں کس خمیر سے اٹھی ہونگی بہتر ہے کہ اس کا تذکرہ نہ ہی کروں کیونکہ میری آنکھوں نے وہ نظارے دیکھے ہیں اور قدرت کے وہ انمول روپ دیکھے ہیں کہ احاطۂ تحریر میں لانا میرے لئے ممکن نہیں ہے، ایک طرف میں نے قوموں کا عروج دیکھا ایک طرف قوموں کا زوال دیکھا۔ نہ نظر آنے والی ماورائی طاقت ہر جگہ، ہر قدم پر احساس دلا رہی تھی کہ مجھے پکارو میں حاضر ہوں، مجھے ڈھونڈو، میں تمہارے پاس ہوں، مجھے یاد کرو میں تمہاری شہ رگ سے قریب ہوں۔ مجھے پہچانو میں ہر روپ میں موجود ہوں تمہاری خلوت تمہاری جلوت کا محرم راز ہوں [illegible]



تصویر [illegible]
[illegible] کرتے ہوئے بھائی جان محمد اشرف صاحب اور جناب ضیاالدین احمد صاحب

ے باۓ روز ہم نے مدینہ کا سفر کیا ایسا لگ رہا تھا جیسے دیارِ غیر سے ہم اپنے وطن لوٹ رہے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے اس شہر کے راستے اپنے، اپنے سے لگ رہے تھے۔ قطعاً اجنبیت نہیں محسوس ہو رہی تھی جب بھی میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کرتی ہوں میری آنکھیں پل بھر کے لئے نہیں جھپکتی ہیں۔ ان مقدس شہروں کا تقدس مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے موجود لگتا ہے اور میں احتراماً جاگتی رہتی ہوں۔

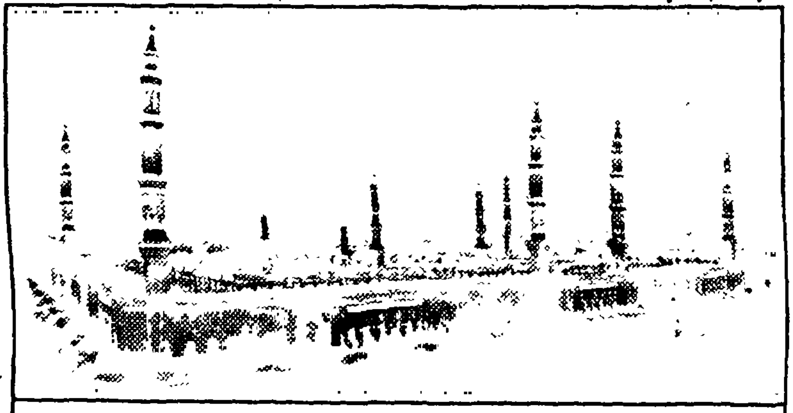
مدینہ میں

مدینۃ النبی میں حسب معمول لوگوں کی وہی بھیڑ اور ویسا ہی ہجوم دکھتا ہے جیسا ایامِ حج میں ہوتا ہے!

آج رمضان المبارک کا پانچواں روزہ اور دسمبر کی ۲۴ تاریخ ہے۔ مدینہ منورہ میں ہمارا قیام فندق عبدالعزیز توقیر میں ہے، یہ ہوٹل مسجد نبوی کے بالکل قریب ہے۔ یہاں کی سروس عمدہ ہوتی ہے! ہوٹل پہنچ کر ہم نے اپنا سفری سامان ٹھکانے پر لگایا اور غسل سے فارغ ہو کر تاجدار حرم سید کونین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری کے لئے چلے آئے۔ عقیدت و محبت کے ساتھ درود و سلام کا نذرانہ پیش کیا۔ آنکھوں سے متواتر گرتے ہوئے صاف و شفاف موتی دربار رسالت میں نچھاور کئے، آپ کی اتباع میں اپنی کوتاہی کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کیا اور ظہر کی نماز کی ادائیگی کے بعد اپنی قیام گاہ چلے آئے۔ افطاری کی پُر رونق اور منفرد محفلیں اگر دیکھنا ہوں تو کوئی ان مقامات مقدسہ میں دیکھے۔ حد نظر تک دستر خوان بچھے نظر آتے ہیں، قہوہ اور کھجور اتنی فراغت سے پیش کیا جاتا ہے کہ عربوں کی روایتی مہمان نوازی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے! مدینہ منورہ میں بہت سارے عزیزوں سے ملاقات ہوتی ہے، سب عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے آئے ہوئے ہیں، اس مقدس شہر میں پانچ روزہ قیام اتنی جلدی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے کہ مزید سعادت و برکات حاصل کرنے کی حسرت باقی ہی رہ جاتی ہے!

آج دسمبر کی ۲۸ تاریخ ہے اور رمضان المبارک کا نواں روزہ، مدینہ منورہ سے آج ہماری روانگی ہے، ہم نے عمرہ کے لئے احرام باندھ لیا ہے، روضۂ اطہر میں الوداعی سلام اور درود کا نذرانہ پیش کر کے مکہ مکرمہ کی طرف سفر کا آغاز کر دیا! ارکان عمرہ کی سہولت سے ادائیگی کے بعد مکہ مکرمہ میں ہمارا بارہ دن قیام رہا۔ حالانکہ مختصر مگر محترم ایام کا تذکرہ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا مجھ ناچیز کے بس کی بات نہیں، مسجد الحرام کے انوار و تجلیات، جلال و جمال، عظمت و بزرگی، غرض یہ کہ کون کون سی صفات گنواؤں کہ اس پُر عظمت گھر کے شایانِ شان ہو، یہاں بھی افطاری کا وہی منظر ہوتا ہے بلکہ ان محفلوں کا سلسلہ حرم شریف سے کئی میٹر کی دوری سے شروع ہو جاتا ہے۔ بیسمنٹ سے ٹیرس تک یہی نظارہ ہوتا ہے! ویسے تو یہاں بہترین قاری ہیں، جن کی قرآت دلوں کو جھنجھوڑ دیتی ہے مگر جناب امام السدیس صاحب کی قرأت سے حرم شریف میں وہ سماں بندھتا ہے کہ اللہ کی یاد سے غافل دل بھی اس ذاتِ واحد کی طرف خشوع و خضوع سے متوجہ ہو جاتے ہیں!

سارے سفر میں میری ملاقات تقریباً ہر ملک کی خواتین سے ہوتی رہی۔ کبھی میں پہل کرتی ہوں کبھی دوسری جانب سے ہوتی ہے۔ اکثر زبان سے ناواقفیت آڑے آجاتی ہے اور تبادلۂ تبسم سے بات ختم ہو جاتی ہے، مگر حرم شریف میں ایک عربی لڑکی میری طرف خود ہی دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے، حالانکہ اس نے اپنا چہرہ حجاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ عام عربی خواتین کی طرح، ہم نماز کے بعد مردوں کے باہر نکلنے تک بیٹھی رہتی ہیں تاکہ دھکے نہ لگیں، مذکورہ لڑکی جس کا نام فاطمہ تھا اس نے خود ہی سلام کیا اور ساتھ ہی پوچھا **کیفَ حالَ** یعنی حال کیسا ہے؟ جیسے برسوں کی شناسائی ہو میں نے جواب میں طیّب کہا اور ساتھ ہی معذرت کی کہ (معافی عربی) پھر میں نے انگریزی میں دریافت کیا کہ تم انگریزی بول سکتی ہو؟ جواب میں اس نے کہا کہ انگریزی سمجھ سکتی ہوں البتہ بول نہیں سکتی۔ یہ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا اور میرے لئے یہی غنیمت تھا کہ وہ زبان اردو سے واقف تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک عربی لڑکی اردو کیسے جانتی ہے؟ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کی نانی ہندوستان کے شہر بنارس کی رہنے والی ہیں۔ وہ عرصے سے سعودی عرب



مدینہ منورہ : مسجد نبوی

میں رہتی ہیں اس طرح اس کی ماں ہندوستانی اور باپ عربی ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی ماں اور فاطمہ وغیرہ نے کبھی ہندوستان دیکھا ہی نہیں، اس نے اپنے بارے میں مزید بتایا کہ اس کا باپ پولیس افسر ہے، اس کی اردو بہت مشکل سے سمجھ میں آتی تھی کیونکہ وہ اردو زبان سے بڑھکر انگریزی، عربی اور اردو کا مکسچر تھی جس پر عربی لہجہ غالب تھا، اس نے میرا پتہ لیا کہ وہ جب کبھی ہندوستان آئے گی مجھ سے ملنے ضرور آئیگی، ہمارا قیام جب تک مکہ معظمہ میں رہا وہ ہماری قیام گاہ عبدالعزیز توقیر کے نمبر پر برابر رابطہ قائم کرتی رہی! اس طرح ایک اور عربی لڑکی صالحہ سے بھی میری حرم میں ملاقات ہوئی، صالحہ نے جب عربی میں مجھ سے بات کی تو میں نے معذرت کی کہ میں عربی زبان سے اتنی واقف نہیں ہوں، اس نے جرح کی کہ جب عربی نہیں جانتی تو قرآن کی تلاوت کیسے کررہی ہیں جب کہ یہ بھی عربی ہے، میں نے وضاحت کی کہ عربی پڑھ سکتی ہوں، اور تھوڑا بہت سمجھتی بھی ہوں البتہ بول نہیں سکتی۔ اسے شاید میری بات کا یقین نہیں تھا کہ میں سچ مچ قرآن کی تلاوت کر سکتی ہوں، حالانکہ وہ کب سے مجھے تلاوت کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی، اس نے مجھے بلند آواز سے تلاوت کرنے کی درخواست کی۔ میں نے اس کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے قدرے بلند آواز سے تلاوت کی تو وہ بہت خوش ہوئی! جو کتاب نظام زندگی کا طریقہ سمجھانے کے لئے نازل کی گئی اسے ہم نے طوطا مینا کی طرح رٹنا سیکھ لیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ جو پیغام دیا گیا ہے وہ سمجھنے سے قاصر ہیں، بے شک اس عظیم کتاب کے ترجمے ہر زبان میں دستیاب ہیں مگر عربی زبان سے واقفیت بھی بہت ضروری ہے، مگر افسوس کہ ہماری نئی نسل عربی چھوڑ اردو سے بھی نابلد ہے! مسجد الحرام، ایک عظیم اجتماع گاہ ہے جہاں دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ آکر جمع ہوتے ہیں۔ حرم شریف میں میری ملاقات ہر روز کسی نہ کسی ملک کی خواتین سے ہوتی ہے، کبھی امریکہ میں رہائش پذیر ہندوستانی یا پاکستانی خواتین سے کبھی ساؤتھ افریقہ کی خواتین سے تو کبھی بنگلہ دیش کی خواتین سے، کوئی مصر سے ہوتی ہے تو کوئی شام یا اردن سے۔ وہ کونسی کشش ہے جو لوگوں کو دنیا کے کونے کونے سے کھینچ کر یہاں لے آتی ہے، چاہے وہ ایام حج ہوں یا رمضان المبارک، یا عام مہینے ہر وقت یہاں لوگوں کا سیلِ رواں بہتا ہی رہتا ہے، لوگوں کے ذوق و شوق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دیوانہ وار چلے آتے ہیں اور اتنی کثرت سے آتے ہیں کہ مسجد الحرام جیسی وسیع و عریض عمارت جس میں بیک وقت بارہ لاکھ آدمیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے چھوٹی پڑجاتی ہے، تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی، اتنی کثرت سے یہاں لوگ کیوں جمع ہوتے ہیں؟ وہ محرک کیا ہے؟ جو لوگ کشاں کشاں چلے آتے ہیں، یہ کوئی سیر و تفریح کی جگہ نہیں، یہاں کوئی دلچسپی کا سامان نہیں اور یہاں تک کا سفر کرنے کے لئے انسان کو مال خرچ کرنا پڑتا ہے، مال کی قربانی دیئے بغیر اس گھر کی زیارت ممکن نہیں اور انسان کی فطرت ہے کہ وہ مال کو بہت عزیز رکھتا ہے اور آسانی سے خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس کے باوجود اس گھر کی زیارت کی تمنا ہر مومن کے دل میں موجود ہوتی ہے، اس میں امیر اور غریب کی تفریق نہیں۔ سب کے جذبے یکساں ہوتے ہیں، شاید یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہے! جب وہ اپنے شیر خوار بچے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام اور بیوی حاجرہ علیہ السلام کو لیکر اپنے وطن سے خدا کے حکم پر چلے، جہاں آج خانۂ کعبہ ہے، وہ ایک ایسی بے آب وگیاہ وادی تھی جہاں کوئی آبادی نہیں تھی لق و دق صحرا، بالکل ویران جہاں پانی کا دور، دور تک نام و نشان نہیں تھا، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک مشکیزہ پانی اور تھیلی کھجور کی وہاں رکھ دی اور پیٹھ پھیر کر چل دیئے، سیدہ حاجرہ علیہ السلام ان کے پیچھے، پیچھے یہ کہتی جارہی ہیں، اے ابراہیمؑ ہم کو ایسی وادی میں کہاں چھوڑے جارہے ہیں؟ جہاں کوئی آبادی نہیں کوئی مونس و غمخوار نہیں، حضرت ابراہیمؑ خاموشی سے چلے جارہے تھے، آخر تھک کر بی بی حاجرہؑ نے پوچھا کیا یہ اللہ کا حکم ہے؟ تب ابراہیمؑ نے جواب دیا ہاں یہ اللہ کا حکم ہے، جب یہ سنا تو وہ مطمئن ہو کر کہنے لگیں پھر تو ہمیں ضائع اور برباد نہیں کرے گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے بچے اسمٰعیل کے پاس لوٹ گئیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ٹیلے پر ایسی جگہ پہنچے جہاں ان کا شیر خوار بچہ اور بیوی حاجرہ نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو کعبہ کی طرف رخ کیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ دُعا مانگی: پروردگار اس شہر کو پرامن شہر بنا۔ مجھ کو اور میرے بچوں کو بُت پرستی سے بچا۔ پروردگار ان بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ سو، جو کوئی میرے طریقہ کی پیروی کرے تو میرا ہے اور میرے طریقے سے پھر جائے تو یقیناً تو غفور اور رحیم ہے، پروردگار میں نے اپنی نسل کے ایک حصہ کو تیرے اس عزت والے گھر کے پاس اس بے آب وگیاہ وادی میں لا بسادیا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں، پس اے رب تو لوگوں کے دلوں میں ایسا شوق ڈال کہ وہ ان کی طرف کھینچ کر آئیں اور ان کو پھلوں سے رزق پہنچا امید ہے کہ یہ تیرے شکر گزار بنیں گے"۔

پینتالیس صدیاں گزر چکی ہیں جب پہلے پہل اللہ کے اس منادی نے پکارا تھا کہ "اللہ کے گھر کی طرف آؤ، زمین کے ہر گوشے سے آؤ خواہ پیدل آؤ، خواہ سواریوں پر آؤ، ابراہیمؑ کے جواب میں آج تک حرم پاک کا ہر مسافر بلند آواز سے کہتا ہے (میں حاضر ہوں اللہ میں حاضر ہوں! تیرا کوئی شریک نہیں، میں صرف تیری طلبی پر حاضر ہوں، تعریف تیرے لئے ہے، نعمت تیری ہے، ملک تیرا ہے، کسی چیز میں تیرا کوئی شریک نہیں!)

بقیہ صفحہ نمبر ۴۱ پر

"تخلیق"

بوجھ
کشمکش
درد
کرب
مایوسی
خون
پسینہ
تھکن
تاریکی
روشنی
سکون
تبسم
تخلیق!!



بانو طاہرہ سعید

"Green View",
10-2-287/A,
Shantinagar
Hyderabad
500 028
(A. P.)

"نمائندہ"

بچھو کا سوا گت کرنا ہی پڑے گا
رشتہ داروں کا نمائندہ جو ٹھیرا!!

"حیرت"

جسے صبح بہاراں سمجھا تھا
روکھی دوپہر نکلی۔!

"ترجمان"

رنگ بدلتی دنیا کا
تو کتنا صحیح ترجمان ہے
گرگٹ!!

"آلودگی"

فضا۔ ہوا۔ پانی کی آلودگی
موضوع بنے ہوئے ہیں۔
لیکن دامن کا کیا علاج ؟

"خوشبو"

میں صندل کی لکڑی ہوں
اگر تم مجھے جلا بھی ڈالو
تو بھی میں خوشبو ہی بکھیروں گی!!

"خول"

رخت خاردار سنگھاڑا
نی کا پھل ہے
یکن
خت پوست میں ملفوف۔
اں مگر
سے چھیل کر دیکھو۔ خول اتار دو
تو اسے سفید اور نرم دل پاؤ گے
جب گناہ کا خول اتر جائے
تو انسان کے اندروں کا بھی سندر روپ نظر آسکتا ہے!

"کنجوسی"

فریب کھایا ہے۔۔۔
دیا نہیں
شائد کنجوسی کر ڈالی!

شکتی (سانیٹ)

وقت کے زخم گرچہ گہرے ہیں
کسی مرہم کا احتیاج نہیں
ناامیدی کا مجھ پہ راج نہیں
خواب اب بھی میرے سنہرے ہیں!
تیر کھا کھا کے مسکرانا پڑا !
غم دوراں مجھے ہرا نہ سکا
تند طوفان بھی ڈرا نہ سکا
تلخ یادوں سے بھی نبھانا پڑا !
زندگی کیا تھی ایک نوک سناں
لب پہ لیکن کبھی نہ آئی فغاں
جو بھی بپتا پڑی، ہوئی آساں
کشتی گرداب میں رہی ہے رواں
مجھ میں شکتی ہے دیوتاؤں کی !
میری فطرت ہے سورماؤں کی !



بخش لائلپوری (لندن)

غزل

گھر میں کھوٹ ملا رکھی ہے
اک دوکان سجا رکھی ہے
ہم نے بگڑ کر اہل جہاں سے
بگڑی بات بنا رکھی ہے
پریم نگر کے ہم باسی ہیں
پیار کی جوت جگا رکھی ہے
آگ میں پھینک رہا ہے پانی
جس نے آگ لگا رکھی ہے
سانس دھواں اور آنکھیں شعلہ
دل میں آگ دبا رکھی ہے
دنیا بھر سے قرض اٹھا کر
جھوٹی شان بنا رکھی ہے
کسی کے کام سے کیا مطلب
اپنی بات چلا رکھی ہے
شہر میں اپنی سخن وری کی
خود افواہ پھیلا رکھی ہے
شیخ! یہ گز بھر لمبی داڑھی؟
کیسی فصل اگا رکھی ہے

بخش لائلپوری کیلئے ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ

ساحر کلچرل اکیڈمی لدھیانہ کی جانب سے اردو کے ممتاز شاعر بخش لائلپوری کو اس سال کے ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ ۲۰۰۰ء سے نوازا گیا ہے۔

یہ ایوارڈ ایک لوح، ایک سنہری تمغہ اور ایک شال پر مشتمل ہے۔ ۲۵ مارچ کو لدھیانہ میں منعقدہ تقریب انعامات و مشاعرہ میں بخش کو پذیرائی کے لئے مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ اپنی بیگم کے گردے کے آپریشن کے سبب لندن سے تشریف نہیں لاسکے

۱۹۹۸ء کا نومبر دسمبر ۱۹۹۸ء کا شمارہ انشاء "بخش لائلپوری نمبر" تھا جواب نایاب ہے۔ بخش صاحب کو انشاء کی جانب سے ادیب ایوارڈ کی مبارکباد۔ بیگم بخش کیلئے صحتیابی کی دعائیں۔

(انشاء)

احمد سعید فیض آبادی
حلقۂ آہنگِ نو (پاکستان) کراچی
ڈی۔ٹی۔۸۷، بلاک نمبر ۱۸ سمن آباد
فیڈرل بی ایریا، کراچی

امید و بیم

یہ گم صم دل گرفتہ لوگ
کس دھرتی کے باسی ہیں؟
جو اپنی ذات کے مرگھٹ میں پژمردہ
چتا کی آگ میں اندر ہی اندر جلتے رہتے ہیں
کسی بدروح کی زد میں
بہار آئے کہ پت جھڑ
آتی جاتی رُت کی کیفیت سے
ان کے جسم و جاں ناآشنا ہوں
جیسے صدیوں سے
جہالت جرم، غربت اور بیماری
جینوا کیمپ امدادی رسد، بدحالی، محرومی
شناخت اپنی الگ رکھتے ہیں یہ اقوام عالم میں
معاشی قتل جیسے سانحہ پر بھی کبھی
شکوہ بلب، حیرت زدہ ہوتے نہیں دیکھا
کہ جیسے گونگے بہرے بے بصیرت لوگ
شکستہ خواہشوں کے دکھ میں
روتے ہیں نہ ہنستے ہیں
عجب اک بے حسی کی دھند میں بے سود
روز و شب گزارے جا رہے ہیں
مگر یہ دل گرفتہ لوگ
اپنی ذات کے مرگھٹ میں پژمردہ
یوں ہی بے سود روز و شب گزاریں گے
امید و بیم کے عالم میں کب تک؟
میں اکثر سوچتا ہوں

افسانہ

وطن کے لوگ

نثار راہی
پی/۴۴، نیلہ جمال پورہ
بھوپال- 462001

اگرچہ وزیر اعظم کروڑوں کی لاگت سے بنائے گئے ایک ٹرسٹ ہسپتال کا افتتاح کرنے آرہے تھے لیکن صوبے کی راجدھانی کا یہ شہر ان کا وطن بھی تھا اور وہ اس شہر والوں کے چہیتے لیڈر رہے تھے۔ ایک زمانے میں وہ یہاں بھیا جی کہلائے جاتے تھے۔ ملک کا وزیر اعظم بنائے جانے کے تین سال بعد بھیا جی پہلی بار اپنے شہر آرہے تھے، اس لئے یہ شہر ان کا استقبال بہت گرم جوشی کے ساتھ کیوں نہ کرتا۔

صبح ٹھیک دس بجے، مقررہ وقت پر وزیر اعظم ملٹری کے ہوائی جہاز سے اُترے تو ائیر پورٹ پر ہی گورنر، وزیر اعلیٰ، وزراء، پارٹی کے کارکنوں اور شہر کے عزت دار لوگوں نے بہت گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ اور پھر جب دلہن کی طرح سجی ہوئی شہر کی شاہراہ پر سے وزیر اعظم لاتعداد کاروں کے قافلے کے ساتھ کسی بہت بڑی بارات کے دولہا کی طرح نکلے تو سڑکوں کے دونوں جانب کھڑے ہوئے لوگوں نے اور یونیفارم زیب تن کئے اسکول کے بچوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر اور فضا میں پھول برسا کر جس طرح ان کا استقبال کیا اِسے دیکھ کر وزیر اعظم کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اور اپنا اتنا شاندار استقبال دیکھ کر سوچنے لگے کہ ایک انسان کو سارے شہر کی یا سارے صوبے کی جو محبت ملتی ہے تو اُس محبت کا درجہ دیگر سبھی قسم کی محبتوں سے یقیناً اعلیٰ ہوتا ہے۔ شہریوں کی اسی محبت کو محسوس کر کے وزیر اعظم کا دل بار بار بھر آتا تھا۔ سیاسی آدمی ہونے کے باوجود وہ ایک جذباتی انسان تھے کیوں کہ وہ اسی شہر کے ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ایک عرصے بعد اپنے شہر اور شہر والوں کو دیکھ کر اس طرح خوش تھے کہ جیسے انہیں اپنا کوئی کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔

سرکاری اور نجی کاروں کا قافلہ اگرچہ دھیرے دھیرے روانہ ہوا تھا لیکن پھر بھی ایک گھنٹے کے اندر اندر گورنر ہاؤس پہنچا دیئے گئے۔ انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ بیحد مسرّت اور سرشاری کے ساتھ اپنے شہر کے دیدار کا سفر صرف ایک گھنٹے میں ختم ہو گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ سفر سے تھک گئے ہیں اور اب گورنر ہاؤس میں آرام فرمائیں کیوں کہ سہ پہر کو صوبے کے وزراء صاحبان اور وزیر اعلیٰ کے ساتھ ان کی میٹنگ ہے جس میں صوبے کے معاشی مسائل پر اور خصوصاً صوبے کی ایک ندی پر ڈیم تعمیر ہونے کے اخراجات کے مسئلے پر بات چیت ہونا ہے۔ پروگرام کے مطابق پھر رات کے وقت گورنر صاحب کے ساتھ گورنر ہاؤس میں ڈنر لینا ہے اور اگلی صبح قریب ایک گھنٹہ پارٹی کے خاص کارکنوں سے ملاقات کے بعد پھر دن میں دس بجے ہسپتال کا افتتاح اور دوسری مصروفیات ہوں گی۔ شام سات بجے دہلی کو واپسی۔

اگرچہ دو دنوں کے اس پروگرام کا علم انہیں پہلے سے ہی تھا۔ لیکن وہی پروگرام جب ان کو



دوبارہ سنایا گیا تو اس بار یہ پروگرام جان کر انہیں تھوڑا افسوس ہوا۔ افسوس اس بات کا کہ اس پورے پروگرام میں ان کی اپنی خوشی کا کوئی سامان ہی نہ تھا۔ سب کچھ ایک معمول ہی تھا اور نیا کچھ نہ تھا۔ یعنی اس پروگرام میں کوئی ایک دو گھنٹے بھی ایسے نہ تھے کہ وہ اپنے شہر میں اپنی مرضی سے گذار سکتے اور اپنے لوگوں سے مل سکتے۔

اچانک کسی بچے کی طرح ان کے اندر یہ خواہش مچلنے لگی کہ وہ پرانے شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں جائیں اور وہاں اپنے دیرینہ شناساؤں سے ملاقات کریں۔ آج سب کے سب انہیں بے طرح یاد آرہے تھے۔ وہ لوگ معاشی حیثیت میں چھوٹے تھے مگر کتنے پیار سے وہ سب اُن دنوں اُن سے ملا کرتے تھے۔ لیکن پچھلے تین سالوں سے وہ لوگ ایسے بچھڑے کہ اس دوران پھر کبھی نظر ہی نہ آئے۔ وہ وزیر اعظم بنے تو بہت سی نزدیکیاں دوریوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

اگلی صبح شہر کے کئی لوگ ان سے ملنے گورنر ہاؤس آئے۔ مگر وہ سب شہر کے نامی گرامی لوگ تھے۔ کوئی سیاست داں تو کوئی بڑا تاجر اور کوئی معروف دانشور۔ ملنے والوں میں شہر کا کوئی چھوٹا آدمی یا ان کا ایک بھی شناسا نہیں تھا۔ شاید کوئی آیا ہو لیکن اسے ملنے کی اجازت ہی نہ دی گئی ہو۔

ہسپتال کے افتتاح کا پروگرام سوا گھنٹے میں نمٹ گیا۔ پروگرام کے بعد ان کو پولیس کی سیکیوریٹی کے ساتھ واپس گورنر ہاؤس بھیج دیا گیا۔ وزیر اعظم نے گورنر صاحب سے شہر کا چوک بازار گھومنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن گورنر صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ تحفظ کے مدّ نظر وزیر اعظم کا کسی پبلک مقام پر جانا کسی بھی طرح مناسب نہ تھا۔ انہوں نے جواباً اتنا ہی کہا کہ وہ اس بارے میں وزیر اعلیٰ سے بات کریں گے۔

وزیر اعلیٰ نے وزیر اعظم کی اس خواہش کے بارے میں سُنا تو وہ بھی فکر مند ہو گئے۔ وہ خود وزیر اعظم سے ملے اور انہوں نے ان کو شہر کے بھیڑ بھاڑ والے علاقے میں نہ جانے کی صلاح دی۔

وزیر اعظم نے بہت گمبھیرتا سے وزیر اعلیٰ کی طرف دیکھا اور پھر بولے ”اتنا بھی کیا ڈرنا ہزارا سنگھ جی، اس شہر میں ہم چھوٹے سے بڑے ہوئے ہیں اور یہاں ہمیں لوگ بہت چاہتے ہیں۔ کوئی ہمیں بُری نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بھیا جی، لیکن راجیو گاندھی جی کے ساتھ جو حادثہ ہوا اس سے ہم ڈرے ہوئے ہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں لیکن زمانہ بہت خراب ہے۔ ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہئے۔“

وزیر اعلیٰ کے اس مخلصانہ مشورے پر وزیر اعظم کو چپ ہو جانا پڑا۔ ملک کے اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو آج کے دور میں اپنی حفاظت سے متعلق احتیاط کی ہر صلاح ماننا پڑتی ہے۔

لیکن پھر وزیر اعظم کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ملک کے حاکم ضرور ہیں مگر تحفظ کے نقطۂ نظر سے اب وہ ایک آزاد انسان نہیں ہیں۔ ان کو لگا کہ جیسے اپنے ہی شہر میں وہ قید ہو کر رہ گئے ہیں۔

راجدھانی سے اپنے شہر آنے کی جو خوشی ہوئی تھی وہ خواہ مخواہ زائل ہو گئی۔

رات کو بستر پر لیٹے تو کوشش کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی۔ اپنے اس شہر کے خوبصورت تالاب، شہر کے جانے پہچانے بازار اور ان میں رہنے والے آج انہیں بری طرح یاد آرہے تھے۔ اور ان سب کو دیکھنے اور ملنے کو بہت دل کر رہا تھا۔ جی تو چاہا کہ وہ قدیم زمانے کے راجاؤں کی طرح بھیس بدل کر اور سیکوریٹی کے لوگوں کو چکمہ دے کر گورنر ہاؤس سے باہر نکل جائیں اور ایک معمولی آدمی کی طرح شہر میں گھوم پھر آئیں، کہ اس وقت رات کے گیارہ بجے بھی شہر کے چوک میں ہوٹلوں کی چہل پہل کے باعث بڑی رونق ہو گی۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ وہ کوئی عام آدمی نہ تھے۔ ملک کے وزیر اعظم تھے۔

صبح انہوں نے گورنر صاحب اور وزیر اعلیٰ سے ص صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے شہر لوگوں سے ملے بغیر واپس نہ جائینگے۔ اسی کو تو کہتے ہیں ر ہٹ!۔ وزیر اعلیٰ نرم پڑ گئے۔ ا انہوں نے ہنگامی طور پر اس بندوبست کر دیا۔

ٹھیک گیارہ بجے دن م وزیر اعظم اپنی کار سے اُتر کر ش کے وسط میں واقع ابراہیم پورہ مے بازار میں یکایک داخل ہوئے ت تھے کہ سارے بازار میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ وزیر اعظم اپنے بازار میں آگئے ہیں۔ آناً فاناً نہ جانے کہاں سے بازار میں بھیڑ آگئی۔ نہ صرف دکانوں کے آگے لوگ باگ قطاریں بنا کر کھڑے ہو گئے بلکہ بازار کے دونوں کناروں پر واقع مکانوں کی اوپری منزلوں سے بھی بہت لوگ نیچے کو جھانکنے لگے۔ وزیر اعظم اپنی پارٹی کے کارکنوں اور وزیر اعلیٰ کے ساتھ پیدل تھے۔ ان کے آگے پولیس کی دو گاڑیاں تھیں اور گاڑیوں کے پیچھے ایس پی اور جدید ہتھیار لئے بہت سے قد آور اور صحت مند پولیس والے تھے۔ ان کے پیچھے ضلع مجسٹریٹ اور ساتھ ہی بے شمار پولیس والے جو ہاتھوں میں جدید رائفلیں تانے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔

چوک بازار کی طرف جاتے جاتے اپنی جانی پہچانی دکانیں

سامنے آئیں تو وزیر اعظم نے ان پر نظریں دوڑائیں۔ ہر دکان کے آگے بے شمار لوگ کھڑے ہوئے تھے جو سب کے سب ہاتھ جوڑ کر ان کا استقبال کر رہے تھے۔ لیکن لوگوں کے اس جم غفیر میں ان کے وہ پرانے شناسا نظر نہیں آرہے تھے جو گئے وقت میں ان سے بے تکلفی سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ اب جو سامنے تھے وہ تو سب کے سب ویسے ہی اجنبی لوگ تھے جو راجدھانی اور دیگر مقامات پر ان کو نظر آتے تھے۔ چوک بازار میں آئے تو وہاں بھی لوگوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آئے۔ اگرچہ احتیاط کے طور پر پولیس لوگوں کو وزیر اعظم پر ہار پھول پھینکنے سے منع کر رہی تھی لیکن خوشی کے مارے لوگ ہار پھول ان کی جانب پھینکنے سے باز نہیں آرہے تھے کیونکہ وزیر اعظم ان کے شہر کے جو تھے۔ پولیس افسران کو یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں کوئی انہونی نہ ہو جائے۔

لوگوں کی بھیڑ اور پولس کی چہل پہل کے باعث وزیر اعظم جی کو نہ دکانیں نظر آتی تھیں نہ وہ ان کے پرانے شناسا دکان والے۔ بازار کے وہ پرانے دلکش مناظر اور ان کے وہ دیرینہ شناسا دکان دار تو جیسے بھیڑ میں کہیں کھو ہی گئے تھے۔

پھر بھی وہ دل شکستہ نہیں ہوئے۔ گھنٹے والے برجو ہن حلوائی اور جوس لسی والے ستیہ نارائن کی گلی گلی دکانوں کے سامنے ان سے ملاقات کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور یہ دیکھ کر وہ مسرور ہو گئے کہ برجو ہن حلوائی اور جوس لسی والے ستیہ نارائن اپنی اپنی دکانوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ آگے بڑھے اور انہوں نے دونوں سے پوچھا

"بھائی اچھے تو ہو تم لوگ۔؟"

رعب کھائی ان کی شکلوں پر کچھ مسکراہٹ تو آئی لیکن وہ کچھ بول نہیں پائے۔ تب اپنے حلیم چہرے پر مسکراہٹ لا کر ان دونوں سے وزیر اعظم نے پھر پوچھا" میں نے کہا بھائی، آپ لوگ مزے میں تو ہو۔؟"

تب بھی رعب کے آگے وہ بول نہیں پائے اور گردن جھکا کر اور ہاتھ جوڑ کر باری باری سے دونوں بولے "جے ہو...... جے ہو"

ان الفاظ سے وزیر اعظم کی تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے اُن دونوں سے پھر پوچھا "آپ لوگ کبھی راجدھانی آکر بھی ہم سے نہیں ملے۔ کیا ہم سے ناراض ہیں۔؟"

تو جواب میں اُن دونوں نے پھر ہاتھ جوڑ کر اور گردن جھکا کر باری باری سے کہا "بھیا جی کی جے ہو...... بھیا جی کا رتبہ اور بھی بلند ہو"

یہ سن کر آس پاس کھڑے دیگر کئی لوگوں نے بھی "جے ہو۔ جے ہو" کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔

اب نعرے جو لگے تو وزیر اعظم کو وہاں دیکھنے، سننے اور بات کرنے کو کچھ باقی نہ رہا۔ یہ نعرے تو وہ اپنے لئے سارے ہندوستان میں سنتے رہے تھے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اب تو جیسے راجدھانی یا جیسے ملک کے دیگر شہر ہیں ویسے ہی یہ ان کے وطن کا شہر ہو گیا ہے۔ اور ان کے وہ پرانے شناسا لوگ بھی اب اجنبیوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر اپنی پہچان کھو چکے تھے۔ نزدیکیاں دوریوں میں بدل چکی تھیں۔ اور یہ سب اس وجہ سے ہوا تھا کہ وہ اب صرف اپنے شہر کے نہیں بلکہ اپنے پورے ملک کے ہو گئے تھے۔ ان کا وطن اب یہ ایک شہر نہیں بلکہ پورا ہی ملک تھا۔

انہوں نے بھی وہاں موجود سبھی لوگوں کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پھر پولیس کے افسران کو واپس چلنے کا اشارہ کر دیا۔!!

ساوتری گوسوامی کے افسانے

ساوتری گوسوامی کے افسانے خواتین کے ہمدرد اور معاشرے کے اصلاح کار ہیں نصیحت بھری کہانیوں کا مجموعہ۔ انشاء پبلی کیشنز سے شائع ہو چکا ہے۔

ارض مقدس میں چند روز

اے امیر النساء

کا

سفر نامہ

جو انشاء میں قسط وار شائع ہو کر بے پناہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے عنقریب کتابی شکل میں باتصویر شائع ہونے والا ہے۔

قارئین اپنا آرڈر روانہ فرمائیں۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا مجموعہ

ہوئے ہم دوست جس کے

اس میں ۱۷ ادبی شخصیات جناب راج گوڑ، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، وحید اختر، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر قمر رئیس، قتیل شفائی، پروفیسر رشید الدین خاں، ابراہیم شفیق، عوض سعید، ف۔ س۔ اعجاز، سیدہ شان معراج، استاد محمود مرزا، رشید قریشی، دیوکی نندن پانڈے، علی باقر اور وہاب عندلیب کے خاکے شامل ہیں۔

قیمت : ۸۰ روپے

ناشر : تخلیق کار پبلشرز
104/B، یاور منزل
آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۹۲

رحمٰن ربانی
250, Nai Basti,
Kalpi-285204 (U.P.)

رباعیات

تبدیل ہوا جب سے زمانے کا نظام دنیا میں بھلا کون گنہگار نہیں
کچھ فرق نہیں رکھتے ہیں اب خاص و عوام تفتیش کرو خوب سروکار نہیں
اس دورِ ترقی میں امامِ مسجد مجرم ہے وہی آج جو تنقید کرے
دراصل ہے مسجد کی کمیٹی کا غلام دراصل خطا وار خطا وار نہیں

◆

اب تو یہ انجام نظر آتا ہے اس کا تو سبب خود ہیں اسیرانِ حیات
بگڑے گا ہر کام نظر آتا ہے دلکش ہے بہر طور جو زندانِ حیات
دنیا کا ماحول ہوا ہے تبدیل کانٹے ہیں مسائل کے بہر گام ضرور
ہر گھر میں کہرام نظر آتا ہے پھر بھی ہے بہت خوب گلستانِ حیات

◆

رہزن ہیں نگہبان نہیں ایسی بات احباب کی خدمت بھی نہیں ہوتی ہے
رہبر ہیں پریشان نہیں ایسی بات محبوب کی چاہت بھی نہیں ہوتی ہے
رہزن ہیں وہی اور وہی رہبر حیف جنّت کی طلب ہو کہ جہنم کا خوف
دشوار ہے پہچان نہیں ایسی بات بے لوث عبادت بھی نہیں ہوتی ہے

نامی نادری
c/o Dr. A. I. Benjamin,
Department of S. P. M.,
Christian Medical College,
LUDHIANA-141008. (Punjab)

غزل

شکر ہے ہم تو پہلے جیسے ہیں
آپ کہیئے کہ آپ کیسے ہیں

سیدھے مُنہ بات ہی نہیں کرتے
جن کے پلّے میں چار پیسے ہیں

کچّے دھاگوں میں پختگی کیسی
اپنے سارے اصول ایسے ہیں

عید کا چاند آپ ہی ہونگے
ہم تو جیسے تھے عین ویسے ہیں

کل تو لہرا رہے تھے آپ وہاں
شیخ جی آج آپ کیسے ہیں

ہم کہیں تو کہیں کسے اپنا
اپنے بھی تو پرائے جیسے ہیں

شیوہ اپنا نہ چھوڑیئے ناؔمی
لوگ حالانکہ بچھّو جیسے ہیں

ایک اور ایک جمع دس

شاہدہ وسیم (ناروے)

جمیلہ بہن کے خدوخال اور بھاری بھر کم ڈیل ڈول کو دیکھ کر لگتا تھا کہ جہاں قدرت کی صناعی میں کہیں کوئی کمی بیشی نہیں کوئی بات غیر متوازن نہیں، یہاں انکی شخصیت میں کچھ اُلٹ پھیر ہو گیا ہے۔ اونچا بھرا بھرا تندرست توانا بلکہ مردانہ جسم، چوڑی چوڑی کلائیاں موٹی گردن قدرے لمبی جو نصف ٹھوڑی اور رخسار سے ڈھک گئی تھی۔ ستواں ناک، اُبھری ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، گھنی کالی اَبرو اور پلکیں، چکنے کالے لمبے بال جنہیں وہ جوڑے سے باندھے رکھتیں۔ موٹے موٹے پیروں میں شاید آٹھ یا نو نمبر کی چپل ایسے پھنسائے رکھتیں کہ جب وہ اُنہیں اُتارتیں تو پٹوں کے گہرے نشان صاف دکھائی دیتے۔ زیادہ تر باڈر والی سوتی ساڑی پہنتیں، اور کسی مورچے پر اُسے کس کر کچھے کی طرح یا اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والی مزدور عورتوں کے جیسے انداز میں باندھ لیتیں۔



اُنکی آواز میں بھی کہیں نرمی، نزاکت یا شیرینی نہیں تھی۔ کرخت تحکمانہ ٹھسّے دار لہجہ۔ پورے محلے کی جمیلہ بھین (بہن) ملنسار ہر ایک کی غمگسار، ہر گھر کی مددگار بلکہ چوکیدار، مجال ہے کہ کوئی بہو بیٹی کہیں تاک جھانک یا آنکھ مٹکا لے۔ اگر کہیں پان تمبولی نائی کو دُکان پر کوئی لڑکا فالتو کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا نظر آتا۔ وہ اپنے گھر کے سامنے بنے چھوٹے سے وراندے کی سیڑھیوں پر بیٹھی طائرانہ نظریں اِدھر اُدھر گھماتیں، پھر اُٹھ کر اپنے لمبے لمبے تھانیداری ڈگ بھرتی اُسکے سر پر پہنچ جاتیں۔

کیوں بے، کیوں کھڑا ہے یہاں، کیسے تک رہا ہے، کیا کام ہے، وہ کئی سوال کر ڈالتیں۔ لڑکا شپٹا کر منمناتا اور چپ چاپ کھسک جاتا۔ اور محلے کے باہر وہی لڑکا اُنہیں لیڈی غنڈہ کہتا نہ بھولتا۔

اپنے محلے میں جہاں وہ جنگلی بلی جیسی دکھائی دیتیں، محلے سے باہر نکلتیں تو خاصی مختلف ہوتیں، ٹھیک ٹھاک رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ بالوں کو یوں کس کر جوڑا بناتیں کہ اونچی پیشانی مُرادابادی سینگی کا پیندہ نظر آتی، رنگت تانبے جیسی تھی ہی اُس پر اِسنو اور پھر ٹیلکم پوڈر مل لیتیں۔ ہونٹوں پر پان کی دھڑی پہلے ہی جمی رہتی، اوپر سے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا لیتیں۔ موٹی موٹی کالی آنکھوں میں کاجل لگا کر دُمبالا کھینچ لیتیں تو چوڑے چہرے پر آنکھیں دُم دار ستارہ لگتیں۔ بھوپالی سلمہ ستارے کا گول پرس ہاتھوں میں لٹکائے۔ کبھی کبھی اُنکے میاں بھی اُنکے ساتھ ہوتے، تب تو لڑکوں کی موج آجاتی۔ سارے اُنکے محلے کے اندر کی اکٹھا کی ہوئی بھڑاس نکال لیتے۔

”اوئے دس کی گنتی کے بعد کیا ہوتا ہے۔“، ”اُردو کا پندرہ!“، وہ ٹھٹھہ مار کر ہنستے۔ تب جمیلہ بہن اپنی نظریں نیچی کئے رہتیں۔ میاں جو ساتھ ہوتے۔ ورنہ اَکیلی ہوتیں تو ساڑھی کے پلو کو کس کر واردات کے لئے تیار ہو جاتیں، لیکن تب اُنکے میاں اپنی غصیلی نظریں اِدھر اُدھر دوڑاتے پیچ تاب کھاتے، دانت پیستے، منہ ہی منہ بڑبڑاتے، ڈھیر ساری گالیاں نکالتے پھر پلٹ کر اپنی بیوی ہی کو گھورنے لگتے۔



جمیلہ بھین پورے محلے کی ہر دل عزیز اور چہیتی خاتون تھیں۔ محلے کے کسی گھر میں ارجنٹ ضرورت پڑتی وہ دوڑی چلی آتیں۔ کسی کے یہاں شادی بیاہ ہو، کوئی تقریب ہو وہ آگے آگے ہوتیں۔ بغیر کہے، بنا بتائے وہ بہت سی ذمہ داریاں اپنے آپ اٹھا لیتیں، اور خاتون خانہ بھی اپنے کندھوں کا بوجھ اُن پر ڈال کر خالی خالی، مطمئن دکھائی دیتیں۔ وہ ہر کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتیں۔ ایسے کام جہاں عورتیں تھک جائیں، بھاری بھر کم وہ کام جہاں بغیر مردوں کی مدد کے کوئی چارہ نہ ہوتا، اور وہ بھی انہیں موقعوں کی تلاش میں ہوتے جب وہ خواتین میں گھستے، انہیں تاکتے، شادی بیاہ کی ہڑبازی میں زنانہ غسل خانوں، اور خوابگاہوں تک موقع بے موقع جانے انجانے لپک جھپک جاتے، جمیلہ بھین

کے ہونے سے اب یہ دھڑکا نہیں رہا تھا، اب ایسے بھاری بھر کم کاموں کے لئے وہ ہی کافی تھیں۔ اکثر رات محلّے کے کسی مفلوک الحال گھرانے میں درد زہ میں تڑپتی بے قرار عورت کے لئے دائی یا نرس کا کام بھی بخوبی انجام دے کر وہ یوں مُسکراتیں جیسے لکھنؤا خربوزے میں چھوٹا سا سوراخ کر کے صفائی بنا اُسے دو ٹکڑے کئے بیج نکال لیں پھر اُسے عورت کو یوں تھماتیں کہ لو چکھو اور مزہ لو، اور کسمپرسی کی ماری گھر کی بڑھتی ہوئی بھوک میں مزید اضافہ دیکھ کر وہ اسے چپ چاپ آنچل میں چھپالیتی۔

اُنکے شوہر اکرم میاں پوسٹ آفس میں ملازم تھے، صبح گھر سے یوں اکڑتے ہوئے نکلتے جیسے نپولین بوناپاٹ ہوں، ہٹلر کی طرح ترشی اُنکی مونچھیں، چھوٹا سا منہ، سر بھی چھوٹا ہی ہوگا جو شاید تانیہ ٹوپے کے ہیٹ یا ہٹلری یا انگریزی دور کے کیپ سے ڈھنکا رہتا لیکن اُنکے ایک کان میں پھنسی بیڑی اور دوسرے کان میں اَڑسی پنسل نظر آتی۔ محلّے کے لڑکوں کے شیطانی فقروں سے نالاں رہتے، گھر سے باہر کم نکلتے، صبح ملازمت پر جانا اور واپس آکر گھر میں گھس جانا۔ بڑے ہی تنک مزاج، طرّم خاں، ہٹلری مونچھوں پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے کسی بھوپالی کو دیکھ کر اُس کے آگے بچھ بچھ جاتے، چھٹی کے دن اگر کسی نے اِنکے دروازے کو کھٹکھٹایا تو وہ چرچل کی طرح چنچناتے باہر نکلتے۔

"کون ہے بے! بے وَخت کائے کو آئے میاں، کوئی سلیقہ ملیقہ ہے کہ نہیں۔" اگر دروازے پر کوئی شناسا ہوتا تو اُنکے دانت باچھوں تک کھل جاتے۔ "ارے وِدّوا میاں خاں، مَے کیے ریا تھا بھوت دِن ہویے تشریف آوری کے، خیریت میریت تو ہیے۔ پھر وہ وہیں برآمدے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ جاتے۔ اگر وہ اُنکے کوئی پُرانے دوست ہوتے تو پچھلی باتیں چھیڑ دیتے۔ ہاں میاں خاں وہ کھدا کھدا، اللہ قسم کے سے دن تھے وہ، اُسکے کنارے اَپن اپنے ابا میاں کے سُنائے گئے قصّے دُہراتے۔ بار بار جوش میں آکر آگے پیچھے جھکتے، ہنستے ہنستے، منہ سے رال بھی ٹپکائے جاتے جسے چپ چاپ کرتے کی آستینوں میں پونچھے جاتے۔ "کمال کے تھے مامو میاں، جب وہ فرنگی کو شکار کرانے جاتے تھے، سُن کے بھوت (بہت) مزہ آتا تھا، ہیے نا" جب گورے کو مچان پر چڑھا کے خود بودا باندھنے گے (گئے) اودر۔۔ اِنکے مچان پر چڑھنے سے پھلے (پہلے) ہی شیر آگیا اودر گورے نے بوکھلا کے گولی داغ دی، اودر شیر جھپٹ کے ماموں میاں کے ہو۔۔۔ پر (اوپر) قسم سے کیا بھادری (بہادری) تھی۔ ماموں میاں نے بھر ٹل بندوق اُسکے منہ میں ڈال کے داغ دی سالا ہوئیں (وہیں) چت ہوگیا۔ اودر۔۔۔۔۔۔ وہ لمبی سی اور کھینچتے، جب اپن چھوٹے تھے ہیے نا، ابا میاں کے ساتھ بیل گاڑی میں بیٹھ کر مچھلی کے شکار کو گے تھے اودر واسطہ پڑ گیا شیر سے بَر بیلوں نے بھڑک کر رَن لگائی، پیچھے سالا شیر جمپ لگاتا آریا، ابا، اودر مامو میاں کی سٹّی گم، بال بچے ساتھ فایر کرنے سے کھیں (کہیں) نشانہ خطا ہوگیا تو ہور بھی مشکل لاگو ہوجاتا کے نھیں، پھر کے سی گھل آئی اُنے۔ بیل گاڑی میں پنکھا بھوسا جلا جلا کر پھینکنا شروع کیا تب جاکے تھمے میاں شیر۔ دونوں کے ہنس ہنس کر پیٹ میں بَل پڑ رہے ہوتے۔ وہ جھوم کر کہتے یاد ہیے کہ نھیں۔ دوسرا اگردن ہلاتا۔ اب کیسے کتنا یاد تھا پر دونوں کھوئے ہوتے ماضی کی یادوں میں کہ کسی پُرانے گانے کی دُھن سُنائی دیتی۔ "ڈِمبک ڈِمبا میں گھاسلیٹ کی لالٹین اور تو بجلی کا کھمبا۔۔۔ مخاطب تو یادوں کے سُرور میں گُم ہوتا، اور وہ اپنی غصیلی کھوجتی نگاہیں اِدھر اُدھر گھُماتے جب تک آواز اُنکے بَرآمدے کے پچھواڑے سرک جاتی۔ وہ تلملاتے ہوئے اُٹھتے۔ ٹھیرنا میاں میں ذرا بیگم سے چائے شائے کا کے کے آتا ہوں، فرغپ فسب ہوتی ہے۔ وہ اَندر جاتے تیز نظروں سے گھر کے پچھلے حصّوں کو دیکھتے، جہاں جمیلہ ہوتیں۔ اُس کمرے کی کھڑکی کا پردا سر کا کر باہر جھانکتے۔ پھر جمیلہ کو خونخوار نظروں سے گھور کر دیکھتے ہوئے کہتے میمانوں کے چائے شائے کا خیال ہیے کہ نیں۔ جمیلہ مَری ہوئی آواز میں بولتیں، "میں کہنے کو آرئی تھی، وہ رکھی ہے میز کی طرف اشارہ کرتیں اور وہ بڑے رعب میں جھٹکے سے اُسے اٹھا کر باہر چلے جاتے۔ محلّے میں دندناتی نوجوانوں میں لیڈی غنڈہ کہلانے والی بہن جمیلہ اپنے پدّی میاں سے بہت ڈرتی تھیں، اُنکے آتے ہی گھر میں بھیگی بلی بن کے چھپ جاتیں۔ محلّے کی سب ہی عورتیں اُنہیں پسند کرتی تھیں۔ اُنکے ڈھیروں کام جو وہ بلا معاوضہ کر دیتی تھیں۔ انکی بہو بیٹیوں کی رکھوالی کرتیں۔ اُن پر نگاہ رکھتیں۔ آوارہ لڑکوں کو محلّے میں پر نہیں مارنے دیتیں۔ شہر میں دنگا ہو جائے تو اپنی دھوتی کس کر کمر پر ہاتھ رکھے گلی کے اس نکڑ سے اُس نکڑ تک پرا دیتیں۔ میاں تو جو گھر میں آکر بند ہو کر سوتے تو اڑوس پڑوس دو دو گھر اُنکے خرّاٹے سُنائی دیتے، لیکن جمیلہ بہن کی لوگوں کو ہوشیار کرتے رہنے کی آہٹ سب محسوس کرتے۔ کبھی کوئی مَریل سا پولیس والا گشت پر نکل آتا تو اُسے ہی للکار دیتیں۔ کیا ہیے۔۔۔ اِدھر کیوں کھڑا ہیے؟

"بہن جی کرفیو لگا ہے۔ آپ اندر جائیں باہر نکلنا منع ہے، میں اِدھر پہرے پر ہوں" وہ روکھا سا جواب دیتا۔ "میں کیوں جاؤں اندر، میں اپنی گلی میں کھڑی ہوں، تیری ماں بھینیں نھیں ہیں جا اُنکی کر چوکیداری۔" وہ چڑھ کر بولتا، "آپ اندر جائیں بس۔" میرے سے بھیٹ کرتا ہیے۔ نھیں نھیں تو کیا کرے گا وہ تن کر اُسکے سامنے کھڑی ہوجاتیں۔ "میرے کو جیل لے جائے گا ہائیں۔۔۔ اس سے پہلے میں تیرے کو کوٹھریا میں بند کر دونگی، ہور۔۔۔ وہ اُسے چڑھانے والے انداز میں اُسکے ہاف پینٹ کو گھورتیں جو اُسکے جھینگر جیسے جسم اور پتلی ٹانگوں میں بڑے بڑے بِلانوں جیسی جھولتی

بلٹ سے صراحی دار کمر میں کسنے کے باوجود لگتا کہ اَب گری کہ تب گری، بیچارہ سٹپٹا کر اِدھر اُدھر دیکھتا پھر چپ چاپ گلی سے نکل جاتا۔ خطرناک شیرنی جیسی حملہ آور دلیر عورت کے سامنے بڑے بڑے جیالے مردوں کی سٹی گم ہو جایا کرتی ہے وہ مرگھلا ساپاہی کیا ٹھہر پاتا۔

محلّے کی بڑی بوڑھیاں جب ساتھ بیٹھتیں تو جمیلہ کا ذکر کرتیں۔ بڑی ہمت والی عورت ہے۔ اچھے گھرانے کی ہے، یوسف زئی پٹھان ہے۔ لیکن گھر میں بھین جمیلہ اگر اپنے میاں کے کسی اوچھے وار پر اپنی اسی ذات کو ڈھال بناتیں تو وہ تنگ جاتے اور جل کر کہتے، "ہاں ہاں دیکھے ہیں تیرے جیسے یوسف زئی پٹھان، چور خاندان" شاید اکرم میاں اپنے شوہر ہونے کا پورا حق استعمال کرتے ہوئے اپنی خامیوں کو چھپانا چاہتے تھے۔ اُنہیں زک پہنچا کر، اور وہ بھی اُنکے رُتبے کا بھرم رکھتیں۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کہیں آتے جاتے کم ہی نظر آتے۔ محلّے کے لڑکوں نے پہلے ہی انہیں گلی ڈنڈا بنا رکھا تھا۔ اسلئے بھین جمیلہ گھر کا سودا لینے خود ہی نکلتی تھیں۔ سبزی کی دکان میں کھڑی ہوتیں تو تولنے والا بھولے سے بھی ڈنڈی مارنے کی کوشش کرتا تو اُنکے موٹے موٹے ہاتھوں کی کہنی اُسے ایسے زور سے کھُبتی کہ وہ تلملا جاتا۔ کبھی کوئی شرمندہ ہو جاتا تو کبھی بھڑک اُٹھتا، لیکن جمیلہ بھین کے تیور اور ڈیل ڈول کو دیکھ کر دُبک کر بیٹھ جاتا کہ کہیں وہ شور کر کے اُسے ہی نہ پھنسا دیں، عورت ہے نا، ایسے میں مرد کیسا ہی میسنا ہو اور عورت کرگ، لیکن اِسکی جارحیت، شور، ہائے واویلا اور اپنی صنف کی دہائی —— جتنا ہی ہمدردی بٹور ہی لیتی ہے۔

ایک دن جمیلہ بہن گُلیل حلوائی کے پاس پہنچیں جو کڑھائی میں جلیبیاں تل رہا تھا۔ پاس ہی گرم گرم جلیبیاں تھال میں رکھی تھیں، وہیں بیٹھ گئیں، جی نہیں مانا تو ایک اُٹھا کر کھانے لگیں۔ گُلیل کڑھاؤ کے ہی جیسے اپنے بڑے پیٹ کو سنبھالتا ہوا پلٹا، "نا نا بہن جی چھوؤ تو نیں"۔ "کیوں نجس ہو جائیں گی مُسلمان کا ہاتھ لگنے سے"۔ گُلیل ذرا سا کھسیایا۔ وہ بولیں قادر کی طرح تو تم بھی دو بجے رات تک دکان کھولے رہتے ہو کہ شاید کبھی جنّات تمہاری دکان پر مٹھائی خریدنے آجائیں، اور تم تو جانتے ہو جنّات مُسلمان ہوتے ہیں، کہیں کوئی اَن دیکھا ہاتھ تمہاری مٹھائیاں چکھ لیتا ہو تو۔ گُلیل کے کالے بھبھوت چہرے پر اُجلی روشنی پھیل گئی، وہ اپنے ہونٹوں پر میٹھی مُسکان سجائے دونا اُٹھا کر اسمیں جلیبیاں رکھنے لگا۔ "کتنی باندھ دیئی بہن جی" "چھوڑو رہنے دو۔ وہ اُٹھنے لگیں کہ گُلیل نے دونا اُنہیں تھما دیا۔ "چلو اِیی ہمری اُور سے لیت جائیں"۔

محلّے کی کئی عورتوں کے بچے بھین جمیلہ نے جنائے، کچھ کی تو لوئی مالش بھی اُنہوں نے اپنی راضی خوشی سے کی تھی۔ محلے کی ملازم پیشہ عورتیں اکثر اپنے بچے اُنہیں کو سونپ کر چلی جاتی تھیں، لیکن خود اُنکی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اکثر وہ اپنے میاں کے طعنے سُنا کرتی تھیں لیکن خاموش رہتیں۔ ایک دن وہ جلدی گھر آگئے۔ گرمی تھی۔ ہوا بھی گرم تھا، راستے میں چند گلی ڈنڈا کھیلتے بچوں نے جان کر یا انجانے میں گلی جو اچھالی تو اُنکی ٹوپی پر گری۔ شکر تھا ٹوپی نے گنجے سر کی لاج رکھ لی۔ اُنکے غصہ سے بھر جانے اور واہی تباہی بکنے پر بچے تو بھاگ گئے۔ اُنکے دماغ میں بس گلی ڈنڈے کی تکرار گونجتی رہ گئی۔ جیسے تیسے گھر آئے اور زور زور سے دروازہ پیٹنے لگے۔ جمیلہ گھبرا کر نکل آئیں وہ انہیں دیکھ کر چلّا کر بولے۔ " کاں مر گئی تھیں"۔ "آرئی تھی، سرلا بھین کو کہیں کام سے جانا تھا، وہ اپنا بچہ چھوڑ گئی تھیں، اُسے سُلا رہی تھی"۔ اُنہوں نے دھیمی آواز میں کہا، اُنہیں کیا معلوم تھا اِس وقت اُنکے اندر کون سا لاوُپک رہا ہے۔ وہ بگڑ کر بولے۔ پھوکٹ میں تیرے میرے بچے پالتی ہے اور میں یہاں کام کر کر مرا جا رہا ہوں، خود تو چڑیا کا ایک بچہ بھی نہیں پیدا کر سکی۔ جمیلہ بہن اُنکی بات سُن کر دھیرج سے بولیں۔ "ہاں میں چڑیا کا بچہ پیدا نہیں کر سکی"۔ اور مَن ہی مَن سوچتی محنت اور کام تو مردوں کی شان ہے نا کہ اُنکا بوجھ۔ اور اپنے بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے ساتھ پُر وقار چال چلتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئیں۔

سال کٹ گیا چھ مہینے میں ......!

آپ تعجب کرینگے کہ کمپیوٹر کے اس دور میں کیا وقت اتنی تیزی سے گذر رہا ہے

جی ہاں !

ابھی نئے ہزارے (ملینئیم ایئر) کو شروع ہوئے تین ہی مہینے ہوئے ہیں کہ لوگ ہم سے ۲۰۰۱ء کی بخشی جنتری طلب کر رہے ہیں!

بخشی جنتری

ہمیشہ کی طرح اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہے

(اپنی بہترین معیاری نثری و شعری تخلیقات کے ساتھ رجوع کریں)

بخشی جنتری ہر خاص و عام کے دل کی دھڑکن

بخشی جنتری

32، مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کلکتہ 700073

منی کہانیاں

اقبال انصاری
ایف ۱۷۶ پانڈو نگر، دہلی-۱۱۰۰۹۱

پُروا

"خدا غارت کرے اس پُروا کو!" اُس نے زیر لب کہا۔

میں نے کہا، "پُروا کو کیوں کوس رہے ہو۔ خدا پُروا کو ہر گز غارت نہیں کرے گا۔ کیوں ے؟ پُروا تو چلے گی۔ تمہارے بدن میں اگر بہت درد ہے تو درد کا علاج کرو۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا "اس درد کا علاج نہیں ہو سکتا۔ جسم کے ریشے ریشے ں، جوڑ جوڑ میں بہت گہرائی تک بیٹھ چکا ہے۔"

"مگر بیٹھا کیسے تمہارے جسم کے ریشے ریشے، جوڑ جوڑ میں یہ درد؟"، میں نے پوچھا

"پولس نے اپنے سارے طریقوں کے ساتھ ٹارچر کیا تھا۔"، اُس نے بتایا۔

میں نے پوچھا، "کیوں ٹارچر کیا تھا پولس نے؟"

"مجھ سے اُس جرم کا اقبال کرانا چاہتی تھی جو میں نے کیا ہی نہیں تھا۔" اُس نے بتایا۔

میں نے پوچھا، "پھر کیا ہوا؟"

اُس نے کہا، "میں نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔"

میری بستی کے مکیں

"آؤ، میں تمہیں اپنی بستی کی سیر کراؤں۔ اس بستی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی نفس بے گھر نہیں ہے۔ وہ اُدھر جو لوگ ہیں وہ اُن محلوں میں رہتے ہیں۔ ان کے بعد جو لوگ ہیں وہ سب پختہ مکانوں میں رہتے ہیں۔ وہ جو دوسری طرف ہیں وہ کچے اور ادھ پکے مکانوں میں رہتے ہیں جس پر چھپر پڑے ہیں۔ اُدھر پیچھے جو لوگ ہیں وہ جھگیوں میں رہتے ہیں۔"

"اور وہ ——— باقی لوگ؟"

"وہ اپنی ہڈیوں کے ڈھانچوں میں رہتے ہیں۔"

کچھ دیر کے لئے

"سنو - اب کچھ دیر چین سے جینے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"بتاؤ میں کیا کروں تمہارے لئے؟"

"میرے غمخواروں سے کہہ دو کہ کچھ دیر کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

شارق عدیل
مارہرہ
ایٹہ - ۲۰۷۴۰۱ (یو۔پی۔)

منکرین

خدا سے کسی کو بھی کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں ہے
تو پھر کس لئے
خدا کے یہ منکر
زمانے کو اکثر بتاتے رہے ہیں
خدا ایک ڈر کے سوا کچھ نہیں ہے
مگر خود
خدا کھوجنے کی تمنائیں اپنے دلوں میں دبائے
زمیں و فلک پر بھٹکتے رہے ہیں
ذرا کوئی سمجھائے ان منکروں کو
کبھی جھانک کر دیکھیں اپنے دلوں میں
خدا کی محبت کی پُر نور شمعیں
کسی ایک کونے میں روشن ملیں گی
مگر یہ محبت کے جذبے سے عاری
خدا کی عبادت سے بھاگے ہوئے چند مفرور ملزم
یکایک کسی معجزے سے گزر کر
خدا کی بزرگی کا اعلان کرنے لگے ہیں
عبادت کے معنی سمجھنے لگے ہیں
خدا ان کے ذہنوں کو پُر نور کر دے
رسولِ خدا کی محبت سے بھر دے

غزلیں



صلاح الدین نیر

EDITOR "KHUSHBU-KA-SAFAR"
11-3-824/7, NEW MALLEPALLY
HYDERABAD-500001

کسی کے گھر میں ہیں روشن یہاں کسی کے چراغ
اجل کے سایہ میں جلتے ہیں زندگی کے چراغ

ہم اپنے گھر میں ہواؤں کو چھوڑ آئے تھے
بجھائے تم نے ہی دیرینہ دوستی کے چراغ

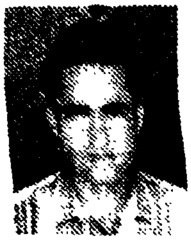
میں کب سے کہتا ہوں اس میں کہاں ہے شرم کی بات
غریب خانے میں جلتے ہیں آپ ہی کے چراغ

بہ قدر ظرف تو مٹی کا تیل کافی ہے
تم آؤ گے تو جلاؤں گا گھر میں گھی کے چراغ

یہاں تو ایک قدم بھی اٹھا نہیں سکتا
کہاں پہ چھوڑ کے آتے ہو رہبری کے چراغ

معاشرہ کی ابھی ایک جیسی حالت ہے
کہاں سے لاؤں میں اکیسویں صدی کے چراغ

یہ واقعہ ہے کہ نیر کسی کی نسبت سے
کہاں کہاں نہ جلے میری شاعری کے چراغ



فاروق احمد بسمل

انڈین میڈیکل ایجنسی اُدھم پور (جے اینڈ کے)

نگاہوں میں اپنی بسالے کوئی — ہمیں اپنے دل میں چھپا لے کوئی
نبھائیں گے ساتھ آخری سانس تک — خوشی سے ہمیں آزما لے کوئی
ہمیں بھی محبت کی ہے آرزو — ہمیں بھی گلے سے لگا لے کوئی
ہمی زندگی بھر مناتے رہے — ہمیں بھی تو آخر منا لے کوئی
مقدر میں تعبیر ہو تو ملے — کہ پلکوں پہ سپنے سجا لے کوئی

ہمیں ایک بسمل ہے خوفِ خدا
کہ نیزے پہ ہم کو اُچھالے کوئی

سہیل فصیحی

اقراء اکاڈمی، واسع پور، دھنباد ۸۲۶۰۰۱ بہار

یہ شہر سنگ ہے، بہتر کوئی جائے اماں رکھنا — حماقت ہے یہاں خوش رنگ شیشے کا مکاں رکھنا
اسی سے ذہن کو حاصل شعارِ بندگی ہو گی — تو اپنی ذات میں محفوظ تقدیسِ اذاں رکھنا
فرازِ آسماں کی سمت پیہم دیکھنے والو! — زمیں کا درد بھی اپنے لہو میں ضو فشاں رکھنا
تمہاری بات کو یہ رد بھی کر سکتے ہیں ممکن ہے — کسی کے رو برو یہ سوچ کر اپنا بیاں رکھنا
وہ جس کی ذاتِ اقدس چشمۂ حسنِ بلاغت ہے — سہیل اُس کے ہی ذکرِ خیر سے روشن زباں رکھنا

رزّاق افسر

۳۹۱۳ بزمِ اردو، حیدر علی روڈ۔ لشکر محلّہ، میسور۔ ۵۷۰۰۰۷

معرکہ منزل کا سَر کرتے چلو — ہر قدم پر فکرِ بَر کرتے چلو
وقت کی رفتار پر رکھو نظر — کام اپنا وقت پر کرتے چلو
یہ ضروری تو نہیں سب کچھ ملے — خواہشوں کو مختصر کرتے چلو
کیا پتہ کب رات آجائے اِدھر — روشنی کو معتبر کرتے چلو
رہروؤں کے ہوش قابو میں نہیں — راستوں کو باخبر کرتے چلو

ہے اسی میں عافیت افسر یہاں
بات سب سے مختصر کرتے چلو

حمیرا رحمان
3, Young Avenue
Yonkers
New York - 10710 (U.S.A.)

گرتے گرتے تھام لیا ہے کئی صداؤں نے
میری ماں کی مدّھم، نا محسوس دعاؤں نے

میں نے تو آواز پہ اسکی کان لگائے تھے
بند دریچہ کھول دیا ہے تیز ہواؤں نے

سورج میری آنکھوں تک آنے سے پہلے ہی
اپنے اوپر روک لیا ہے اسکی چھاؤں نے

فصلیں بونے والے ہاتھ ابھی تک خالی ہیں
دانہ دانہ بانٹ لیا ہے پورے گاؤں نے

پانی میرے پاس گرا ہے تو میں نے دیکھا
پاؤں کہاں تک پھیلائے پیاسے دریاؤں نے

جانے والے کوئی حمیرا لوٹ کے آئے نہیں
اُن کو روک لیا ہوگا اگلی دنیاؤں نے

سورج موم کے گھر سے باتیں کرتا ہے
پھر اندیشہ سر سے باتیں کرتا ہے

میرا بیٹا چپ رہنے کا عادی ہے
لیکن کمپیوٹر سے باتیں کرتا ہے

آنکھ میں ریگستانی رُت کی آہٹ ہے
بادل بھی بن بر سے باتیں کرتا ہے

کچھ نہ کہا تو گویائی چھن جائے گی
ہر کوئی اِس ڈر سے باتیں کرتا ہے

میرے اندر رہتا ہے آسیب کوئی
اور کہیں باہر سے باتیں کرتا ہے

بت شکنی پر دل تو آمادہ ہے مگر
ذہن کسی آزر سے باتیں کرتا ہے

خوش رہنے کا حق ہے حمیرا ہم کو بھی
وہ بھی تو اکثر سے باتیں کرتا ہے

تُنک ہواؤں پہ ہر اختیار ہوتے ہوئے
اکھڑ گئے ہیں شجر سایہ دار ہوتے ہوئے

ہر ایک اپنے ہی حالات میں مقید ہے
یقین لکھتا ہے، بے اعتبار ہوتے ہوئے

تعصبات نے چہرہ بنا دیا ہے ہمیں
بدل گئے ہیں محبت شعار ہوتے ہوئے

شناخت کوئی ضروری تھی آگہی کے لئے
سو خود کو توڑ دیا پائیدار ہوتے ہوئے

مقدّروں میں جو لکھا تھا پورا ہو کے رہا
نہ چاہنے کے بہانے ہزار ہوتے ہوئے

بس ایک اسکے نہ ہونے سے اتنا فرق پڑا
سفر نہ اچھا لگا خوشگوار ہوتے ہوئے

حمیرا آج کا شاعر بھی مشکلات میں ہے
سخنوری کی فضا سازگار ہوتے ہوئے

برف گرنے والی ہے

ترنم ریاض
C-11, Jangpura Extn.
New Delhi-110014

"سرکار نے بچوں کے کام کرنے پر پابندی عائد کردی ہے" حاجرہ نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ چاولوں کی کنجی لگا اخبار چپکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس سے ہوا نہیں رُکے گی۔ کوئی گتے کا ٹکڑا تلاش کرو۔" خضر محمد نے بیوی کی طرف دیکھا اور چولہے میں کل رات سے پڑی راکھ میں چلم سے بندھی ہوئی چمٹی سے انگارہ تلاش کرنے لگا کہ تمباکو کے چوبی ڈبے میں اُسے کچھ ادھ جلا تمباکو مل گیا تھا۔ اور صبح سے اُس نے حقے کا ایک کش بھی نہیں لگایا تھا۔

"تو پھر میں کیا کروں امی" جاوید دونوں ہاتھوں کو آپس میں تیزی سے رگڑتے ہوئے باری باری والدین کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اپنے بابا سے پوچھو۔ تنہا اُسکی محنت سے ہم چاروں کا گذارہ نہیں ہو سکتا بیٹا۔ دو نوالے چاول بھی مشکل ہو جائیں گے۔"

"تم اب بچے نہیں ہو بیٹا۔ بڑے ہو گئے ہو۔ میں بھی کمزور ہو گیا ہوں۔ مستقل زکام سے میرا سر درد کرتا رہتا ہے۔ پھر تمہارے ہاتھ، انگلیاں بھی بڑی ہو گئی ہیں۔

"مگر خواجہ صاحب تو کہہ رہے تھے کہ تمہاری اُنگلیوں میں اب بھی بڑی نزاکت و نفاست ہے۔ تم نمونوں کے بھی ماہر ہو گئے ہو۔ ابھی کچھ برس اور تم قالین بُننے کا کام بہ آسانی کر سکتے ہو۔ وہ میری تنخواہ بھی بڑھا رہے ہیں بابا"

"مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تمہیں کوئی مزدوری کا کام کرنا پڑے گا۔ یہ جو سماجی کارکنوں کا وفد تمہاری فیکٹری آیا تھا، وہ دوسری ملوں فیکٹریوں میں بھی گھوم رہا ہے۔ پھر خواجہ صاحب تو خود ڈر رہے ہونگے تم لوگوں سے کام کروانے میں۔" خضر محمد راکھ کے نیچے دبا آخری انگارہ نکال کر چلم میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"ہاں بیٹا۔ کچھ دن تو زور رہیگا۔ پھر شاید کچھ دیر خاموشی چھا جائے۔ یہ اجلے کپڑوں والے لوگ بڑی کھوکھلی ہمدردی جتاتے ہیں۔ کون ماں نہیں چاہے گی کہ اُسکا بچہ پڑھے لکھے۔ مگر وہ کیا جانیں بھوک کیا ہوتی ہے"۔

اخبار کھڑکی پر نہیں چپک پایا تھا کہ کل رات پکے چاولوں کی کنجی جاوید احمد نے صبح اپنی چھوٹی بہن کو چمچ سے پونچھ پانچھ کر پلا دی تھی۔ اور اخبار ٹھیک طرح سے نم نہیں ہوا تھا۔ حاجرہ نے کاغذ موڑ توڑ کر چولہے کی طرف اچھال دیا۔

"اب کیا ہوگا" وہ دونوں ہاتھوں کو پھرن کی آستینوں کے اندر سمیٹ کر مٹی سے بنی ٹھنڈی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے پاس ایستادہ رہنے سے اُسے سردی لگ گئی تھی اور آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا امّی۔" جاوید احمد یاسمین کو گود سے اُتار کر ماں کے قریب لے گیا اور حاجرہ نے بچی کو پھرن کے اندر باہوں میں سمیٹ لیا۔ پھرن کے گریبان سے اُس نے اپنا چھوٹا سا سر باہر نکالا اور ماں کے رخسار کے ساتھ لٹکا کر بھائی کو دیکھتی ہوئی مسکرانے لگی۔

"کیسے ٹھیک ہوگا بیٹا۔" حاجرہ نے جاوید احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ خود حاجرہ کی آنکھوں میں دونوں جہان کی ناامیدی تھی مگر جاوید کی نظروں میں قندیلیں روشن تھیں۔ اُسکی ٹھوڑی پر چند ایک سیاہ بال نمودار ہو چکے تھے اور کچھ گنتی کے کانوں کے پاس بھی اُگ آئے تھے۔ اُسکی ناک اور رخسار سرخی مائل تھے۔ اور گھنے گھنے بال ابھی بھی گیلے تھے گو کہ وہ کوئی دو گھنٹے پہلے سڑک کے اُس پار طویل زینہ طے کر کے جہلم میں اُتر کر نہا آیا تھا۔ یہ اُسکی عادت تھی۔ وہ سردی سے گھبراتا نہیں تھا۔ پھر گرم پانی اُسے میسّر بھی کہاں تھا۔ ایک بالٹی پانی گرم کرنے میں کتنا خرچہ ہو جاتا ہے۔ وہ سوچا کرتا۔

"بہت پہلے سے میرے پاس ایک کام کی دعوت ہے۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ مگر بابا۔ اب کروں گا۔ بس ذرا احتیاط کا کام ہے۔ اور پیسہ ہی پیسہ"۔ جاوید احمد بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بولا۔

"سچ۔؟ پھر تم نے اب تک کیوں یہ کام شروع نہیں کیا۔ گھر میں راشن آجاتا۔ تم لوگوں کے گرم کپڑے بھی —— برف گرنے والی ہے۔ یہ رضائی اب چھوٹی پڑتی ہے۔ ہم چاروں اس میں سماتے بھی کہاں ہیں۔ تمہارے بابا تو بمشکل چھاتی تک اوڑھتے ہیں اسے۔ ایک بڑا سا لحاف بنوائیں گے۔ بہت سی روئی ڈلوا کر"

حاجرہ کے چہرے سے کرنیں سی پھوٹنے لگیں۔

"تو پھر میں جاؤں۔ امّی۔ بابا"

"لیکن کہاں جاؤ گے بیٹا" خضر محمد نے بُجھی راکھ اور تمباکو والا خالی خالی حقہ گڑگڑایا۔

"خلیل جو کے پاس" جاوید احمد نے مٹی کی دیوار میں پھنسائے گئے چھوٹے سے آئینے کے پُتے ہوئے حاشے پر تہیں سے بھی نہ نظر آنے والی گرد پونچھنے کے بہانے آئینے میں ماں باپ کے چہروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارے نہیں بیٹا، یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ خدا نہ کرے کہ تم کوئی ایسا کام کرو" خضر محمد نے حقہ سامنے سے ہٹا دیا اور تشویش ناک نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا "خدا کیلئے بیٹا۔ تم ایسا سوچنا بھی مت" حاجرہ نے پھرن کے اندر سے یاسمین کو نکال کر کنول کی جڑوں کی گھاس سے بنی چٹائی پر لٹا دیا۔ اور اُٹھ کر بیٹے کے قریب آگئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"نہ میرے لعل۔ ہمارے پیٹ کے لئے اپنی زندگی مت بیچنا۔ بھوکی جی لوں گی۔ تمہیں کھو کر زندہ نہ رہ پاؤں گی۔ میرے بچّے" اُس نے اپنے سوکھے لب جاوید احمد کے بالوں سے لگا لئے۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ "ایسا نہیں ہوگا امّی" جاوید احمد ماں سے لپٹ کر بولا۔ اتنے لوگ تو کرتے ہیں کام۔ کتنے ہی ہیں جنہیں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ خواہ مخواہ دل ہار رہی ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھئے اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔"

"مگر اس میں دوسروں کی جانیں بھی تو جا سکتی ہیں۔ اور وہ گناہ عظیم ہے۔ اتنا بڑا خطرہ۔ اپنا۔ دوسروں کا۔ نہ بیٹا، نہ" حاجرہ نفی میں گردن ہلاتی ہوئی بولی۔ "ایسا مت کرنا میرے بچّے"

"خلیل جو کہتے تھے ثواب ہے۔ کچھ ہو گیا تو شہادت نصیب ہوگی۔ مگر میں اپنا خیال رکھنا جانتا ہوں بابا۔ امّی کو سمجھائیے نا۔" جاوید احمد کواڑ کے قریب بیٹھ کر اپنے جوتوں کا جائزہ لینے لگا۔ شکر ہے ابھی برف نہیں گری۔ بائیں جوتے کا تو تلا ہی الگ ہو رہا ہے۔ اسے سِلانا ہوگا۔ وہ موزے پہن کر باپ کو دیکھنے لگا۔ کچھ دن بعد وہ اپنے نہایت عمدہ جوتے خرید سکے گا۔ جیسے خواجہ صاحب کا بیٹا پہنتا ہے۔ لمبے لمبے فیتوں والے ہلکے پھلکے سے۔

"تم۔ تم تو میرے رحمدل بیٹے ہو۔ یہ کام کیوں کر کر سکتے ہو۔ زندگیاں تو سب کی قیمتی ہوتی ہیں۔" خضر محمد بیٹے کے پیروں کی طرف دیکھتا ہوا سمجھاتے ہوئے بولا۔ پھٹے موزوں میں سے جاوید احمد کی سرخ ایڑیاں اور انگوٹھے بچوں کے پیروں کی سی نزاکت لئے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"ابھی کل ہی کی تو بات ہے سرخ بیر بہوٹی سا ننھا مُنّا وجود دائی مہرد نے خضر محمد کی بانہوں میں تھما دیا تھا۔ اُسے خضر محمد نے ۲۰ روپے کا نوٹ انعام میں دیا تھا۔ مہنگائی بھی تو اتنی نہ تھی۔ حاجرہ نے ۲۰ روپے کی اون سے اپنے منّے کے موزے سویٹر اور ٹوپی تک بُنی تھی۔

دو جوڑی موزے بھی لاؤنگا اپنے لئے۔ خواجہ صاحب کے بیٹے کو کتنا لطف آتا ہوگا ایسے عمدہ جوتے پہن کر چلنے میں۔ جاوید احمد سوچ رہا تھا۔ ایک دن جب فیروز میاں ظہر کی نماز کے لئے مسجد میں جاتے وقت جاوید احمد کی ہوائی چپلیں پہن گئے تھے تو اُن کا جوتا پائیدان سے ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے جاوید احمد حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اتنا جسیم نظر آنے والا جوتا اور وزن 'نہ' کے برابر۔ فیروز میاں چلتے کیا ہونگے۔ اڑتے ہونگے ہوا میں۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹے۔ بتاؤ نا۔ یہ کام تمہارے جیسے انسان کے لئے نہیں ہے۔ کچھ اور کام دیکھ لینا۔ دیکھتے ہیں خدا کی کیا مرضی ہے۔

کچھ دن صبر کرو۔ میں چشمہ بدل لونگا تو باریک کڑھائی کا کام شروع کر دوں گا۔ آمدنی بڑھ جائے گی۔ اس موٹی کڑھائی کے کام میں کمائی بہت کم ہوتی ہے۔ بس ذرا چار پیسے آ جائیں تو ڈاکٹر۔۔۔۔"

"چار پیسے۔ کہاں سے آئیں گے بابا۔ بھوکے پیٹ کتنے دن اور کس اُمید پر انتظار کریں گے۔ یاسمین بھوکی مر جائے گی۔ جانے خواجہ صاحب کب کام پر بُلائیں۔ بُلائیں گے بھی یا کیا معلوم۔ پھر گذارہ کہاں ہوتا ہے بابا۔" جاوید احمد جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔

"مگر یہ جان کا خطرہ۔ میرے بچّے۔ جب جان ہی نہ رہیگی تو بھوک کیسے لگے گی۔ تمہارے بابا کچھ کرینگے۔ تم فکر مت کرو۔"

جب تک جان ہے تب تک تو بھوک لگے گی نا ماں؟ تمہیں بھوک لگی ہے نا؟ مجھے بھی لگی ہے! میں جلدی آؤنگا۔ تم فکر مت کرنا۔ جب میں آؤں گا تو گھر کا سار سامان لے کر آؤں گا۔ اور مجھے آنے میں دیر ہوئی تو تم گھبرا مت جانا۔ اچھا بابا۔ خدا حافظ" جاوید احمد نے تیزی سے باہر نکل کر کواڑ بند کر دیئے اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا گلی میں مُڑ گیا۔

"ارے بیٹا سنو تو۔" حاجرہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی مگر شدید دھند میں اُسے جاوید احمد کا ہیولہ تک دکھائی نہ دیا۔ البتہ کمرے سے نم راستے پر اُسے پھٹے تلے والے جوتوں کے گھسیٹے جانے کی غیر متوازن چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دھڑکتا ہوا دل دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ خضر محمد کی طرف پلٹنے لگی تو وہ بھی دہلیز تک آ چکا تھا۔

"جاوید"

ایک پکار فضا میں اُبھری تو قریب کے کسی یخ بستہ درخت کی سے ہوئے کہرے میں لپٹی ننگی ٹہنی پر بیٹھا کوئی کوّا بولا۔ اور اندر سے یاسمین کے رونے کی آواز آنے لگی۔

غزلیں

یوگیندر پال طائرؔ
293, New Plots (Sarwal), Jammu - 180005 (J.K.)

کیوں عبث اچھے بُرے کی سوچنا — صرف اپنے فائدے کی سوچنا
تو غنیمت جان ربطِ باہمی — چھوڑ دے شکوے گلے کی سوچنا
پہلے اپنی مشکلوں سے پا نجات — بعد میں میرے بھلے کی سوچنا
حوصلے میں پختگی پیدا کرو — جُرم سمجھو آسرے کی سوچنا
لڑرہا ہے جو اندھیروں سے مدام — اے ہوا، تو اس دِیے کی سوچنا
بعد میں بدنام کرنا تُم مجھے — پہلے اپنے مرتبے کی سوچنا
منزلِ مقصود کی سوچو اگر — سب سے پہلے راستے کی سوچنا

تجھ سے جتنے پھوُل کھلتے ہیں، کھِلا
چھوڑ دے طائرؔ صلے کی سوچنا

انور سلیم
17-1-375/27/A/1/B
OPP: Canara Bank Lane
Santosh Nagar
Hyderabad-500059 (A.P.)

کلیجہ اس شجر کا کبھی تو منہ کو آئے
سحاب اس رہ گزر سے کبھی خالی تو جائے

ہوا کیا مانگ بھرتی زمینِ بے نوا کی
گزرتے ہیں یہاں سے فقط ذی روح سائے

الگ تھی راہ میری الگ تھی وادیٔ گُل
زبس اک فصلِ ماتم جدائی خار کھائے

زبانِ سُرخ لپکے جہاں دو بوند ٹپکے
کوئی آبی بدن کا ذرا شیشہ دکھائے

عمارت کاغذی ہے نظر میں شش جہت ہیں
مکیں کو ہے تسلی خدا اس کو بچائے

نہ لفظوں کو مروڑو نہ بحروں ہی سے کھیلو
غزل سانچے میں رکھو معانی کو چھپائے

جلیس نجیب آبادی
PATHANPURA
NAJIBABAD
(U.P.) 246763

خودیابی کے لمحوں میں



خدا جانے وہ کس کہانی کا کردار تھا
رینگتی لاش جیسا
وہاں تھا جہاں مرگ اور زیست کی سرحدیں مِل رہی ہیں
اُس کا دکھ جاننے کے لئے
معالج سوالات کرتے رہے
اُس نے سینے کے بائیں طرف ہاتھ رکھ کر بس اِتنا کہا تھا:
"یہاں اک خلاء ہے"
مِرے اندر یہ خواہش جنم لے چکی تھی
کسی دن یہ افسانوی شخص مجھ کو حقیقت کی دنیا میں مِل جائے تو
اس سے باتیں کروں،
اُس کے ماضی کے بارے میں پوچھوں
اور پھر ایک دن وہ مجھے مِل گیا
وہ کہانی کا کردار خود میں ہی تھا

بھری دوپہر میں آگ



ڈاکٹر محمود شیخ
592, Naya Mohalla, Mirza Galib Marg
JABALPUR-482002

"بڈھے چاچا، بھاگو!" خوبصورت لڑکی آواز دے رہی تھی۔ "بستی میں آگ لگی ہے"۔

"آگ!" اس نے داڑھی کے سوکھے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی، آگ کہاں نہیں لگی ہے۔ اک آگ تو مجھ میں صدیوں سے روشن ہے"۔

"یہ کیسی اذیت ہے اللہ!" ایک نوجوان نے فٹ پاتھ کی دیوار سے پیٹھ لگا کر تکتے ہوئے کہا۔ "اس آگ میں جل کر خاک ہو جانا ہی بہتر ہے"۔

جھگی جھونپڑیوں میں لگی آگ بتدریج پھیل رہی تھی۔ دھوئیں کے مرغولے بلند و بالا عمارتوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چاروں طرف لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ چھتوں پر عورتیں اور بچے شور مچا رہے تھے۔ ہوا کے گرم جھونکوں نے دھوئیں میں چنگاری چھپا کر آگ بستی کی دوسری جھونپڑیوں تک پہنچا دی تھی۔

وہ سات آدمی تھے۔ ایک بوڑھا، دو ادھیڑ باقی چار نوجوان۔ وہ اپنا بدن چیتھڑوں میں چھپائے فٹ پاتھ پر بیٹھے دن تمام کرنے کی عجلت میں رات کی باتیں کر رہے تھے۔ چمکتا دن ان کے لئے دہکتے سورج کی طرح بے کار تھا۔ رات کچھ نہیں تو پل دو پل کی نیند تو دے ہی جاتی تھی۔ ان کے پاس تھا ہی کیا، ذہن و دل کو معطل کرنے اور حواس باختہ کر دینے والا شور اور آج تو بھری دوپہر میں آگ لگی تھی۔ الامان والحفیظ۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے"۔ ایک نوجوان نے بوڑھے سے کہا۔ "اس لڑکی کے آنے سے تمہاری باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا"۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔ لیکن ذرا یہ تو بتاؤ زندگی کا مژدہ سنانے والی وہ بچی کہاں گئی؟"

"واپس آگ میں!"

"تعجب ہے!" ایک نوجوان نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "کیا اسے آگ کا خوف نہیں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم!" اس نے جواب دیا۔ "ہے کہ نہیں ہے، خدا ہی جانے"۔

"نہیں، ایسا نہ کہو"۔ بوڑھے نے کہا۔ "میں جانتا ہوں وہ واپس آگ میں کیوں گئی ہے"۔

پھر اس نے زمین پر انگلی سے لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔ "عورت کو آگ کا خوف نہیں ہوتا۔ اس کے لئے تو صرف ایک ہی ہستی خطرناک ہے"۔

"وہ کیا؟"

"مرد!"

"پھر بھی وہ مرد کے پیچھے ہی بھاگتی ہے"۔

"یہ اس کی فطرت ہے!"

فائر بریگیڈ کی سرخ لاری گھنٹیوں کا شور اٹھاتی ہوئی آگ لگی بستی کی ناپختہ گلیوں میں اتر گئی۔ سڑک کے کنارے اور فٹ پاتھ پر لوگ اپنا اسباب اکٹھا کر رہے تھے۔ ایک جم غفیر سڑک پر امنڈ آیا تھا۔ وہ سب ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

"آگ بھی کیا شئے ہے!" بوڑھے نے کہا۔ "اگر چولہے میں ہو تو زندگی کی علامت اور گھر میں لگی ہو تو موت کا پیغام بن جاتی ہے"۔

"وہ بات تم بتلاتے کیوں نہیں؟"

"کون سی؟"

"وہی جو تم لڑکی کے آنے سے پہلے ——"

"ہاں!" بوڑھے نے کہا۔ "اچھا یاد دلایا۔ تم سب میرے نزدیک آ جاؤ تاکہ یہ پہاڑ سا دن، برف کی طرح پگھل پگھل سیمنٹ اور کنکریٹ کے سمندر میں جذب ہو جائے"۔

بوڑھے نے اپنے ساتھیوں کے پر ملال چہروں کی طرف دیکھا۔ ان کی خشک آنکھوں میں صحرا کی خاک اڑ رہی تھی۔ سر اور داڑھی کے بال ہزار پیچ و خم میں الجھے ہوئے تھے۔ خزاں رسیدہ درختوں کی طرح وہ اپنے جسم پر گرد و غبار لئے بیٹھے تھے۔

گنگو پہلوان ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر ایک نوجوان کو ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا۔ وہ ڈرتا کانپتا اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے کھینچ کر چہرے پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ وہ خون تھوکتا ہوا سڑک پر جا پڑا۔ اطراف میں کھڑے لوگ ہنسنے لگے۔ وہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ دبائے جب ان میں واپس پہنچا تو اس کی ناک اور تھوڑی لہولہان ہو چکی تھی۔

"کوئی ہے جو میرے سامنے آئے!" گنگو نے بلڈنگ سے جھانکتے اور سڑک پر بھاگتی بھیڑ کے ٹھہرے ہوئے لوگوں سے کہا۔ "گنگو پہلوان سے ٹکرانا ہنسی کھیل نہیں ہے، سالو!"

کسی مائی کے لال میں اتنا دم نہیں، ہاہاہاہا!"

اس کے اوباش ساتھی بھی قہقہے لگاتے آگ لگی بستی کی طرف چل دیئے۔ آگ دم بدم پھیل رہی تھی۔

"نوجوان جب بوڑھے بن جائیں تو۔" بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس لی "خاموش رہنا بہتر ہے!"

"میں گریجویٹ ہوں، ورنہ تم دیکھتے!"

"میں میٹرک ہوں!"

"میرے پاس پینٹنگ کا ڈپلوما ہے!"

"میں نے ڈبل ایم۔اے۔ کیا ہے"۔ ایک نوجوان نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا کروں کمزور ہوں"۔

"تمہارے اندر سچائی کی حرارت نہیں"۔ بوڑھے نے خون تھوکتے ہوئے نوجوان سے کہا۔ "علم کو طاقت ور ہونا چاہئے"۔

سورج آگ برسا رہا تھا۔ دھواں فٹ پاتھ پر پھیل رہا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے لوگ ریت اور پانی ڈال رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی آوازوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

"بہت پرانی بات ہے"۔ بوڑھے نے کہا۔ "ایک دن ایک بھکشو گاؤں چھوڑ کر جا رہا تھا"۔

"کہاں؟"

"دیکھو سوال نہ کرو۔ زیادہ سوال کرنا مورکھتا کی نشانی ہے"۔

"اچھا تو پھر!"

"جب وہ گھنے جنگلوں سے گذر رہا تھا تو راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک زر پرست بھی اس کے پیچھے آرہا ہے۔ لیکن وہ بے خبر چلتا رہا۔ چلتے چلتے اچانک راہ میں اس نے کسی کی سسکیوں کی آواز سنی تو اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا تو اسے کوئی نظر نہ آیا۔ پھر اس نے درختوں کو دیکھا۔ پھر زمین کو دیکھا۔ ایک پتھر سے سسکنے کی صدا آرہی تھی۔

"پتھر سے!"

"ہاں! اس نے پتھر اٹھایا تو سسکیاں تھم گئیں۔ پتھر کے نیچے ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا ایک صندوق دفن تھا۔ جس سے نسوانی آواز آرہی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لیکن بھکشو کا من تو مایا موہ کے بندھن سے مکت ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا، دنیا اسے فریب دے رہی ہے۔ وہ راستہ کاٹ کر آگے نکل گیا"۔

"ہائے افسوس!"

"پھر وہ زر پرست بھی اس جگہ پہنچ گیا۔ اس نے تمام دولت اپنے قبضہ میں کر لی۔ اس کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا۔ اس نے بھکشو کی نا سمجھی پر قہقہہ لگایا۔ بھکشو نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی نا سمجھی پر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا"۔

"آہ! اگر اسے دولت کی ضرورت نہ تھی تو ہمیں دے دیتا"۔ ایک نوجوان بولا۔

"یہ دن کا عذاب تو بڑا ہی سخت ہے اللہ!"

وہ سب بہت اداس ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ سنگلاخ زمین کی تمازت جسموں کو پگھلائے دے رہی تھی۔ آگ بستی سے نکل کر سڑک تک آپہنچی تھی۔ چاروں طرف قیامت کا منظر تھا۔ دھواں، آگ، شعلے، آوازیں، کراہیں اور شور۔

ٹریفک معطل ہو چکا تھا۔ سڑک پر آدمی جیسے زمین سے ابل رہے تھے۔ جس کے ہاتھ جو سامان لگ رہا تھا۔ اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ آگ نے بڑا ہی بھیانک روپ اختیار کر لیا تھا۔ ہزاروں لوگ محض یہ تماشا دیکھنے کے لئے کھڑے تھے۔ انہیں آگ اور آگ میں جلنے والوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ فائر بریگیڈ کا عملہ بڑی مستعدی سے کام میں لگا ہوا تھا۔

"میری بچی! کوئی ہے جو اسے ظالموں سے چھڑائے"۔ ایک عورت سڑک پر کھڑی فریاد کر رہی تھی۔ "ہائے میری بچی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔ وہ جلتی ہوئی جھونپڑی میں چھپی بیٹھی ہے۔ گلی میں وہ درندے اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو اس دکھیا کی فریاد سنے!" نفس کے بندے خاموش کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

نہ جانے کیوں۔ ان کے دلوں میں ایک ہلچل سی ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ صبح کی موہوم کرنیں جیسے ان کے ذہن و دل میں اتر گئیں۔ آفتاب کی تمازت جیسے خنک ہواؤں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ انہیں شاید عرفانِ ذات ہو رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا ارادہ، منزل اور جستجو ایک تھی۔ چہروں سے حزن و ملال کے بادل چھٹ رہے تھے۔ بوڑھا اپنے رعشہ براندام ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لئے اس مظلوم عورت کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ عورت کہیں..." بوڑھے نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کی ماں تو نہیں ہے جو ہمیں زندگی کا مژدہ سنانے آئی تھی؟"

"عورت کوئی بھی ہو... ایک شخص نے کہا۔ "اس کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے"۔

"کیوں نہیں!" ایک نوجوان نے پر جوش لہجہ میں کہا۔ "اس کو بچانا ہمارا فرض ہے"۔

جھونپڑی میں لگی آگ اب ان کے دلوں میں دہک رہی تھی۔

"تو پھر چلو!"

وہ سب اس عورت کے ساتھ دوڑتے ہوئے دہکتی بستی میں نہ جانے کہاں کھو گئے۔ فٹ پاتھ خالی پڑا تھا۔ زمین پر خون کے کچھ دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ آگ کی لپٹیں نزدیکی عمارت کے بارجے سے ٹکرا رہی تھیں۔

غزلیں



جلال عظیم آبادی

مدیر اعلیٰ "ادب" ڈھاکہ

۱/۱۲ اسلیم اللہ روڈ۔ محمد پور، ڈھاکہ۔ ۱۲۰۷ بنگلہ دیش

اس کی محفل میں جو ہم شعر سنانے آئے
زخمِ دل اس نے یہ سمجھا کہ دکھانے آئے

پاکدامانی کا ہم پر بھی ہو لوگوں کا گماں
ہم بھی گنگا میں ترے ساتھ نہانے آئے

چارہ گر ڈھونڈ کے لاؤں تو کہاں سے لاؤں
جب مسیحا بھی میرا درد بڑھانے آئے

ایک مدت پہ بھی وہ آئے تو ایسے آئے
جیسے پنچھی ہو کہیں رات بتانے آئے

پھر چلی تیز ہوا آئی غضب کی آندھی
آج بھی ان کے نہ آنے کے بہانے آئے

ٹوٹی کشتی پہ ہمیں چھوڑ دیا جس نے جلالؔ
بیچ منجدھار میں ہم اسکو بچانے آئے



واجد سحری

28-B, Tibbia College
Karol Bagh, New Delhi- 110005

زلفوں کی طرح اپنی، اے کاش سنوارو تم
الجھے رہیں کب تک ہم، اتنا بھی تو سوچو تم

نیت نہ رکھو گدلی، تم بھی تو ہو اک بدلی
ہم بھی ہیں بہت پیاسے ہم پر بھی تو برسو تم

سینچیں گے یہ پودا بھی، سستا ہے یہ سودا بھی
سو بار صدا ہم دیں اک بار پکارو تم

آنکھیں بھی بچھادوں گا یہ دل بھی لٹا دوں گا
آہٹ کی طرح میرے دروازے پہ آؤ تم

کلیوں کے چٹکنے کی، آواز سنیں ہم بھی
دھیرے سے سہی لیکن بولو ذرا بولو تم

راس آئیں نہیں آئیں، ہیں پھول تمنائیں
پھولوں کو نہ مسلو تم خوشبو کو نہ روندو تم

کیا جانے کہاں واجدؔ کھویا ہوا رہتا ہے
مل جائے تمہیں شاید اب غم اسے ڈھونڈو تم

میں ہوں اپنی کشتی کا ملاح خود، مجھے ناخدا کی ضرورت نہیں
ہیں ہاتھوں میں میرے بھی، چپوار دو، ہوا و فضا کی ضرورت نہیں

علاجِ غمِ زیست کیسے کروں؟ معالج کوئی جب کہ مل نہ سکا
بڑا لطف آنے لگا روگ میں، مجھے آب شفا کی ضرورت نہیں

لبا لب ہے سینہ مرا خون سے، بہا دونگا میں اذن دو تم اگر
کفِ دستِ خوں سے مرے رنگ لو، تو رنگ حنا کی ضرورت نہیں

نمایاں ہیں اعضائے اندام سب، جو پھیلی ہے عریانیت کی وبا
پہنتے ہیں ایسا لباس آج کل، کہ شرم وحیا کی ضرورت نہیں

خطاؤں کو محسوس کرنے لگے، گناہوں پہ ایسے ہیں تائب وہ آج
جو اپنے کئے پر ہیں نادم سلیمؔ، انہیں اب سزا کی ضرورت نہیں

محمد ہارون سیٹھ سلیم بنگلوری، منفرد اسٹورس گفٹ شاپ

New no. 90, Wheeler Road, Cox Town, Bangalore-560005.

پاز ۷



آصف الرحمٰن طارق
3405, Wildwood Court
Mon Mouth Junction
New Jersey 08852 (U. S. A.)

ان کی شخصیت بڑی دلچسپ اور پر وقار تھی، اتنی دلچسپ کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں۔ سچ پوچھیں تو ان کی زندگی ہشت پہلو تھی، اگر شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا جائے تو شاید ان کی زندگی کی خوبیوں کا احاطہ کیا جاسکے ورنہ عام قاری یہی سمجھے گا کہ ایسی خوبیاں تو فرشتوں میں ہوتی ہیں، یا نبیوں اور پیغمبروں میں ان کی جھلک نظر آتی ہے، اور ان کی انہی خوبیوں کے پیش نظر لوگ کہتے تھے، کہ اگر خدا پیغمبری کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دے ان کو پیغمبری ضرور ملے گی۔ "میں یہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ایسا ہونا ممکن ہے، مگر یہ جملہ اور یہ رائے ان کے کردار کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جو سورج کی طرح چمک رہے ہیں۔

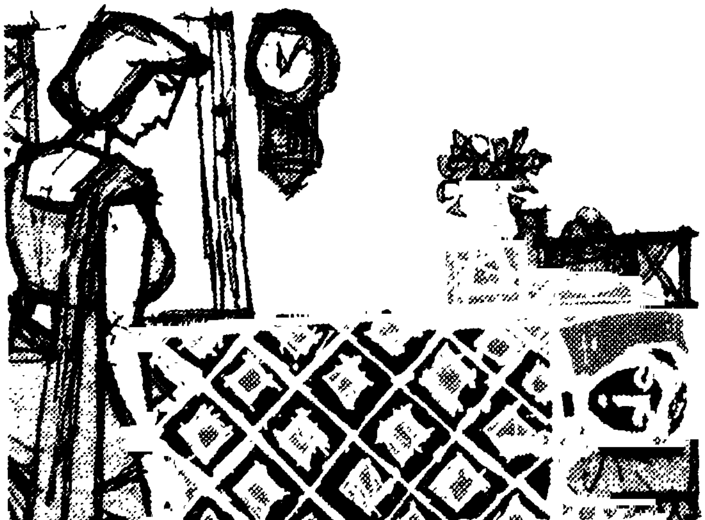
ان کی کون سی ایسی خوبی ہے جس پر قلم اٹھایا جائے اور صفحے کے صفحے کالے ہو جائیں، وہ تو قوس قزح کے مانند تھیں، جاندار اور خوبصورت رنگوں سے بھرپور۔ یا ایسا سایہ دار درخت تھیں جسکی چھاؤں میں ایک دنیا نے ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لوٹے۔ وہ تو اس برف کے اجلے پن کی علامت بن گئی تھیں، جو نئی نئی گری ہو، ملائم اور صاف شفاف۔

انہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر اپنے ہیٹ میں نئے پر لگائے۔ خدمت گزار بیٹی تھیں، ذمہ دار بہن اور وفا شعار بیوی، زندگی کا کون سا ایسا رشتہ تھا جسکو انہوں نے معراج تک نہیں پہنچایا، اور ماں ایسی کہ ان کے بچے ان کو ان ماؤں سے ملاتے جن کی مثالیں قرون۔ وسطیٰ کی ماؤں کے حوالوں سے دی جاتی ہیں۔

یہ افسانہ ان کی تمام خوبیوں کا احاطہ نہیں کر سکتا، ان کی زندگی کی اچھائیاں تو ایک ایسی ڈور کی طرح ہیں، جس کا ایک سرا تو ہاتھ میں آگیا ہے مگر دوسرا سرا طوالت کے سبب ہاتھ نہیں آتا۔ صرف چند ایک واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے ان کے کردار کی پرتیں کھلتی ہیں۔ واقعات تو ہزاروں ہیں، اور لکھنے بیٹھوں تو ختم نہ ہوں، چند ایک پر اکتفا کرتا ہوں اور مزے کی بات یہ کہ وہ بھی ان کے کردار کی پوری طرح غمازی نہیں کرتے۔ تاہم ان کی زندگی کے بارے میں اندازے لگانے میں بڑے معاون ومددگار ثابت ہوں گے۔

انکی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کا فس مکھ، بذلہ سنج اور حاضر جواب ہونا تھا، وہ عجیب باغ و بہار شخصیت کی مالکہ تھیں، محفل میں بیٹھتیں تو سب کو اپنا بنا لیتیں۔ ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی ان کے خطوں سے بھی ظاہر ہوتی تھی، لیجیے، اسی سلسلے کا ایک واقعہ یاد آگیا جو ان کی مندرجہ بالا خوبیوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

یہ قدرے پرانی بات ہے اور ان دنوں کی جب میں سعودی عرب میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھا، خط لکھنے کا میں ہمیشہ سے چور رہا ہوں کئی بار ایسا ہوا کہ میرے اچھے دوست میری اس عادت سے نالاں رہے اور دوستی تک چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے، مگر کیا کروں، یہ عادت میری گھٹی میں پڑی ہے، بس خط نہیں لکھتا۔ اماں بھی میری اس عادت سے تنگ تھیں، میرے اور ان کے درمیان خطوں کی ٹریفک صرف یکطرفہ چل رہی تھی، وہی مجھے خط لکھتیں، میں برسوں کی برسات میں لکھ دیتا تو ان کی عید ہو جاتی، وہ ہمیشہ مجھ سے گلہ کرتیں کہ "بیٹا، آخر تم خط کیوں نہیں لکھتے۔" اور جب ان کا اصرار بڑھا تو میں نے ایک دفعہ لکھ دیا۔ "میں تو آپ کو خط لکھتا ہوں مگر کیا کروں، سعودی عرب کا ڈاک کا نظام خراب ہے، خط راستے میں کھو جاتے ہیں اور آپ کو نہیں ملتے۔" اسی دوران میری بیوی بچے کی



پیدائش کے سلسلے میں پاکستان گئی، ایک تو سعودی عرب کی تنہائی اور پھر سونے پر سہاگہ یہ بات کہ میری شادی حال ہی میں ہوئی تھی، میں تنہائی سے گھبرا گیا اور بیوی کو اوپر تلے کئی خط لکھ ڈالے، چونکہ میری بیوی میری اماں کے ساتھ ساتھ رہ رہی تھی اس لئے انہوں نے اُن تمام خطوط کو دیکھا جو میں نے اپنی بیوی کو لکھے تھے، ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور انہوں نے مجھے فوراً خط لکھا، خط کیا تھا، سنہرے حرفوں میں سجانے والی ایک تحریر تھی، لکھا تھا، "بیٹا، تمہاری بیوی آج کل یہاں میرے پاس ہے، یوں تو مجھے بہو کے یہاں ہونے کی جو خوشی ہے اس کو تو میں بیان نہیں کر سکتی، اور نہ اسکو میں یہاں تحریر کر رہی ہوں، میں تو اپنی ایک دوسری خوشی کا اظہار کر رہی ہوں اور وہ یہ کہ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میری بہو کے یہاں آنے سے سعودی عرب کی ڈاک کا نظام ٹھیک ہو گیا۔"

کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جن کا ذکر کیا جائے تو لوگ کہیں گے۔ "بھلا، ایسی باتیں لکھنے کی کیا ضرورت تھی، ایسا تو ہر بیٹا ماں کے لئے سوچتا ہے۔" لیکن یہاں ایک ضروری بات کہتا چلوں، یہ باتیں میں بیٹے کے ناطے نہیں لکھ رہا، ان میں جذبات کا بالکل دخل نہیں، یہ تو عین مین حقیقتیں ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح آپ کی یا میری پیدائش۔

ماں کے رشتے سے وہ عظیم نہیں، عظیم تر تھیں، مجھے اندازہ ہے کہ بچوں کو اپنے آپ سے جدا کرنا کس قدر مشکل کام ہے، میرے بیٹے نوکریوں کے سلسلے میں اور میری بیٹیاں شادی کی وجہ سے اب مجھ سے دور ہیں، اور یہ میرا خدا ہی جانتا ہے کہ ان کی جدائی اور دوری کس طرح میرے دل کو آرے کی طرح کاٹتی ہے، بعض اوقات دل چاہتا ہے کہ وہ سب سامنے ہوں اور میں خوب خوب پیار کردوں، مگر ایسا ممکن نہیں، میری یاد، یا ان کے لئے میری بیوی کی محبت ان کو میرے پاس نہیں لا سکتی، میں دل مسوس کر رہ جاتا ہوں، اور سوچتا ہوں تو لرز اٹھتا ہوں کہ میری تو گنتی کی اولادیں ہیں ان کے ایک نہیں، دو نہیں، نو بچے تھے، دو ایک کو چھوڑ کر سب ہی ان سے دور تھے اور اللہ اللہ کیا جگرا تھا ان کا کہ سب کی دوری کو ہنسی خوشی برداشت کرتی رہیں اور ایک ہم ہیں کہ گنے چنوں کی دوری میں ہی ہتھیار ڈال دیئے۔

میرے ذہن میں فلم سی چل رہی ہے، ان کی زندگی کے مختلف واقعات یکے بعد دیگرے مجھے یاد آرہے ہیں، میں سوچ رہا ہوں کہ بنظر غائر دیکھا جائے تو انہوں نے سکھ کا سانس کبھی نہیں لیا، شادی ہوئی تو مالی آسودگی نصیب نہیں ہوئی، وہ اور ہمارے ابا، دونوں ہی زندگی سے چومکھی لڑتے رہے، آمدنی کم، کنبہ بڑا، اور اس کے فطری اثرات یہ نکلتے ہیں کہ بچے رُل جاتے ہیں، نہ ان کی تعلیم صحیح ہوتی ہے اور نہ تربیت مگر کیا مجال جو ان کے سگھڑپن نے ہم بچوں کو ایک دن بھی یہ محسوس ہونے دیا ہو کہ ہمارے ابا کی آمدنی کم ہے اور ہماری اماں کس کس جتن سے ہم کو پال رہی ہیں، ہمارے وہی لیل و نہار تھے جو کھاتے پیتے گھرانوں کے بچوں کے ہوتے ہیں، اچھا کھاتے، اچھا پہنتے، اس وقت کے حساب سے اچھے اسکولوں میں جاتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ابا ولی صفت آدمی تھے "قال اللہ اور قال رسول" پر آخری وقت تک عمل کرتے رہے، اماں کے ہاتھ میں خرچ کے پیسے دینے کے بعد ان کی واحد مصروفیت عبادت تھی، وہ اسی میں مشغول رہتے، ہماری اماں پر دوگنی نہیں بلکہ ہزار گنی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں، گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ بچوں کا بھی نکھ سے سکھ درست رکھتیں اور یہ ان کا سگھڑاپا ہی تھا کہ محلے والے ہم کو خاصہ آسودہ حال سمجھتے بقول شاعر کے۔

"بات ابھی تک بنی ہوئی ہے۔"

آمدم بر سر مطلب، جوانی میں مالی آسودگی نصیب نہیں ہوئی، زندگی سے جہاد ہی کرتی رہیں اور جب بچے بڑے ہوئے، اس لائق ہوئے کہ ماں باپ کی خدمت کریں، تو مالی آسودگی تو بیشک نصیب ہو گئی مگر وہ پلنگ سے ایسی لگیں کہ آخری وقت تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بیمار تو سب ہی ہوتے ہیں مگر وہ ایسی بیمار ہوئیں کہ کئی برس ایک ہی پلنگ پر گزار دیئے، ہلنے جلنے کی حد تک رہ گئیں، کون سی ایسی بیماری تھی جو ان کو نہیں لگی، مگر واری جائیں ان کی طبیعت کے کہ اپنی شگفتگی اور بذلہ سنجی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، ڈاکٹر آئے دن ان کو دیکھنے آتا، ان کا معائنہ کرتا، دوائیں لکھتا مگر ان کی باتیں اسقدر دلچسپ ہوتیں کہ وقت کا خیال ہی نہ کرتا۔ ایک دن اس نے بہت ساری باتیں کیں، ان سے پوچھا۔ "میں جو دوائیں آپ کو لکھتا ہوں وہ آپ کھاتی بھی ہیں یا نہیں۔؟" ان کی حاضر جوابی نے جوش مارا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کچھ نہ پوچھیں ڈاکٹر صاحب، آپ نے تو مختلف قسم کی اسقدر دوائیاں کھلا دی ہیں کہ اب تو ایسا لگتا ہے کہ میرا پیٹ ان دوائیوں کی فیکٹری بن گیا ہے۔"

اللہ اللہ، کیا ہمت تھی، کیا حوصلہ تھا۔ ہم نہ تو اپنے میں وہ ہمت پیدا کرتے ہیں اور نہ ہی وہ حوصلہ لا سکتے ہیں، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہر چند مالی طور پر آسودہ ہیں، جمع جکڑی اتنی ہے کہ اگر آمدنی کا ذریعہ نہ بھی رہے تو برسوں گھر بیٹھ کر کھا سکتے ہیں مگر کیفیت یہ ہے کہ اگر Boss قدرے اونچی آواز سے بولے تو رات بھر نیند نہیں آتی، یہی سوچتے رہتے ہیں کہ "Boss ناراض ہو گیا، اب کیا ہوگا۔" مگر آفرین ہے ان پر کہ کیسے کیسے ناساعد حالات سے دوچار ہوئیں، زمانے نے پنج پنج دیا، مگر منارۂ نور بنی رہیں، ذرا سوچئے کہ ایک

آدمی کمانے والا، اور گیارہ آدمی کھانے والے اور آمدنی بھی ایسی کہ روز کنواں کھودئیے اور روز پانی پیجئے، مگر کیا مجال جو تیوری پر ذرا بھی بل آجائیں۔ خدا کی ذات پر اس قدر بھروسہ کہ ہمیشہ اس بات کا یقین کہ آنے والا کل آج سے بہتر ہوگا، اور یہ وہی توکل تھا جس نے ان کے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ بکھیر رکھی تھی، یہ وہی مسکراہٹ تھی جو ان کی زندگی کا خاصہ ہی نہیں بنی بلکہ ان کی پہچان بھی بنی۔!

یہ ان دلوں کی بات ہے جب وہ بہت بیمار ہو گئیں، پہلے ان کو سہارا دے کر پلنگ پر بٹھایا جاتا تھا اب وہ اس سے بھی گئیں، ان کی بڑی بیٹی ان کی بہت خدمت کرتی تھی، سچ پوچھیں تو اس نے بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا، ان کا کون سا ایسا کام تھا جو اس نے نہیں کیا، اب تو کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ ان کا ہر کام پلنگ پر ان کی یہی بیٹی کرتی، بیٹی نے ماں کی اس قدر خدمت کی کہ بقول لوگوں کے "اس نے تو خدمت گزاری کی ایک تاریخ رقم کی ہے"۔

ان کا کون سا ایسا کام تھا جو ان کی بیٹی سر انجام نہ دیتی ہو، اور حد تو یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا مقصد ان کی خدمت بنالیا تھا، اس کی خود کی زندگی بالکل بے معنی سی ہو کر رہ گئی تھی، اور انتہا تو یہ کہ اس نے اب گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا، اس لئے کہ وہ اب اپنی اس بیٹی کی اس قدر عادی ہو گئی تھیں کہ ایک منٹ بھی وہ اِدھر اُدھر ہو جاتی تو ان کو یہ محسوس ہوتا جیسے یہ ان کا آخری وقت ہے۔ دوئم خود ان کی بیٹی کو یہ احساس تھا کہ اگر وہ کبھی باہر چلی جائے اور عدم موجودگی میں ان کو کسی کام کی ضرورت ہوئی تو پھر ماں کو کس قدر تکلیف ہوگی، ایک طرح سے تو ان کی بیٹی نے اپنے لئے جینا ہی ختم کر دیا تھا، وہ تو جیتی ہی ان کی خدمت کے لئے تھی۔ اس کی بے لوث خدمت کو دیکھ کر سب کا خیال تھا کہ یہ مکافات عمل کا دوسرا رخ ہے، انہوں نے خود اپنی جوانی میں دوسروں کی بے لوث خدمت کی تھی اور جب خود کو خدمت کی ضرورت پیش آئی تو خدائے عظیم نے ان کی بیٹی کے دل میں خدمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔

"وہ مخدوم ہوگا کرے گا جو خدمت"

یہ تو ایک ایسی سیڑھی تھی جسکا پہلا قدم وہ خود تھیں اور دوسرا قدم ان کی بیٹی، لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کی بیٹی نے ان کی امامت میں نیت باندھی اور امام سے آگے نکل گئی۔

آمدم برسر مطلب، وہ بیمار ہوئیں اور ایسی بیمار ہوئیں کہ پلنگ سے لگ گئیں، تمام وقت ان کا پلنگ پر گزرتا، اور اسی کیفیت میں ایک دن گھر والوں کو احساس ہوا کہ ان کا پلنگ قدرے بے آرام ہو گیا ہے، وہ بچپن ہی سے بان کی چارپائی کی عادی تھیں، گو آج کے زمانے میں ایک سے ایک اعلیٰ مسہری اور ایک سے ایک اعلیٰ پلنگ دستیاب تھا مگر ان کو راحت بان کے پلنگ پر ہی ملتی تھی، دو ایک بار ایسا ہوا کہ ان کے کسی لڑکے نے ان کے لئے ایک اچھی سی مسہری یا نواڑ کے پلنگ کا بندوبست کیا مگر انہوں نے اپنی وہی فرمائش دہرائی۔ "میرے لئے تو بان کا پلنگ ہی اچھا ہے، مجھے کسی اور دوسری مسہری پر مزا نہیں آتا۔"

اور اس کے پیش نظر سب نے محسوس کیا کہ اب ان کا پلنگ قدرے جھلنگا ہوتا جا رہا ہے، اسکی ادوائن کسی گئی مگر زیادہ فرق نہ پڑا، ان کی بیٹی یعنی میری بہن نے بھی یہ بات محسوس کی اور مجھ سے کہا کہ، "ان کے لئے ایک نیا پلنگ لے آؤ۔ یہ پلنگ اب بے آرام ہو گیا ہے۔" میں نے حامی بھر لی اور کہا، "میں کل صبح ہی ان کے لئے نیا پلنگ خرید لوں گا۔ میری بہن نے دہرانے کے سے انداز میں پھر کہا۔ "ہاں بھولنا نہیں، کل نیا پلنگ ضرور لے آنا۔" اور چونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی اس لئے سب سونے کے لئے چلے گئے۔ اِدھر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، رات دیر گئے ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور ایسی خراب ہوئی کہ لینے کے دینے پڑ گئے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہاتھوں میں آگئیں، فوراً ڈاکٹر کو بلوایا گیا، اور انتظام ہوا کہ ان کو ہسپتال لے جایا جائے مگر تمام انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے اور چپ چاپ اس دنیا سے سدھار گئیں۔ سب سکتے میں آگئے، یہ ایک ایسا ذہنی صدمہ تھا جس کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ وہ بیمار ضرور تھیں مگر کسی کے دل میں یہ خیال نہ تھا کہ اب ان کا چل چلاؤ کا وقت ہے اور اس طرح ان کی زندگی کا ایک عظیم الشان باب تمام ہوا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ان کی تدفین کی تیاریاں شروع ہو گئیں، ان کا جنازہ بڑے کمرے میں رکھا گیا، پورا گھر سوگوار تھا کسی کو یقین نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے سب کو اکیلا چھوڑ کر اس طرح آنکھیں موند لیں گی، مگر موت دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے، سب کو بے یقینی کے باوجود یقین تھا کہ انہوں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لی ہیں، اب ان کی تدفین کی آخری تیاریاں تھیں، میں اپنے دیگر بھائیوں کے ساتھ محلے کی مسجد گیا تاکہ وہ پلنگ لے آؤں جس پر ان کا جنازہ ان کی آخری منزل تک لے جایا جائے اور اس کے بعد تدفین کے باقی مراحل طے ہوں۔

میں مسجد سے پلنگ لے کر گھر آیا تو زنانے سے بڑی بہن نے ہم سب کو دیکھا اور اس پلنگ کو بھی جو میرے پیچھے پیچھے لوگ لا رہے تھے، بہن نے بہت غور سے پلنگ کو دیکھا، خیالات کا ایک ہجوم اس کے ذہن میں گھوم گیا، اس نے قدرے سونچا اور بہت دھیمے دھیمے اور رندھے رندھے لہجے میں جسکو قریب کی دوسری عورتوں نے بھی سنا، بہن نے کہا، "میں نے تو ان کے آرام کے لئے باقاعدہ نئے پلنگ کی فرمائش کی تھی میرے بھائی۔ تم یہ کون سا پلنگ لے آئے؟"۔

غزلیں

سمار صدیقی
C/O, Dressland Textile Emporium
Abid Shopping Centre
Chirag Ali Lane
Hyderabad-500001

اُدھر پہاڑ کھڑے ہیں، اِدھر سمندر ہے
نظر کے سامنے، دن ڈوبنے کا منظر ہے

مرا جہاں ہے الگ، اور ہے الگ منزل
یہ زندگی تو مرے راستے کا پتھر ہے

لکیریں ہاتھ کی ہیں بند میری مٹھی میں
مگر گرفت سے باہر مرا مقدر ہے

کھلا پلا کے سلاتی ہے اپنے زانو پر
زمیں غریب سہی، آسماں سے بہتر ہے

مہ و نجوم مرے پاس سے گزرنے لگے
ترے خیال کا لمحہ، بڑا منور ہے

قبول ہو کہ نہ ہو، میں تو مانگ لیتا ہوں
دعا تو میرے لئے عیش کے برابر ہے

ٹہل رہا ہے سرِ شام ہی سے میری طرح
یہ ماہتاب بھی شاید کوئی سخنور ہے

نثار جیراجپوری (ریڈر)
شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج
اعظم گڑھ۔۲۷۶۰۰۱

وہ جو من موہنی سی مورت ہے
مجھ کو اس سے بہت محبت ہے

پیار کی بارشوں میں بھیگے تھے
جسم میں آج تک حرارت ہے

تیرے سائے کی اے شجر میرے
آج اس دھوپ میں ضرورت ہے

پھوس کا جھونپڑا یہاں کل تھا
جس جگہ آج یہ عمارت ہے

وہ ہے مغرور آئینہ اس کو
ٹھوکروں کی بہت ضرورت ہے

اس کو آندھی بھلا گرائے کیا
جس شجر پر خدا کی رحمت ہے

پاس اپنے نثار لے دے کر
صرف ایمان ایک دولت ہے

اسماعیل پر
ervisor, Mail Deptt.,
RMS Dn. Calcutta G. P. O.
۲۴۲ر بلیلیس روڈ،۲

سب کو خوش رکھنے کا فن مجھ میں نہیں
دوستوں کا یہ چلن مجھ میں نہیں

واقفِ تیشہ زنی میرا جنوں
عقل کا دیوانہ پن مجھ میں نہیں

اپنا اپنا ظرف ہے اے ہمنو
تیری فطرت مِن و عَن مجھ میں نہیں

جھک گیا جس در پہ سَر بس جھک گیا
دوستو! ہرجائی پن مجھ میں نہیں

بازوؤں میں ہے ابھی تک آسمان
ڈھلتے، سورج کی تھکن مجھ میں نہیں

مخلصی میں بھی انا موجود ہے
پستیٔ ذوقِ سخن مجھ میں نہیں

ہے فضا پرواز سازش میں تو کیا
اڑ رہا ہوں کم لگن مجھ میں نہیں

ماھیئے

سلیم انصاری
LIG-II, NEW ANAND NAGAR COLONY
ADHARTAL, JABALPUR (MP) - 482004

(۱)
گھر یاد بہت آیا
وقت کی شہ پر جب
پردیس نے ٹھکرایا

(۲)
زخموں کے تعاقب میں
فکر مری پھرتی ہے
شعروں کے تعاقب میں

(۳)
بے سمت سفر میرا
خاک دکھائی گا
بچھڑا ہوا گھر میرا

(۴)
آواز لگاتے ہیں
پیڑ پرندوں کو
ہر شام بلاتے ہیں

(۵)
جب دھند اترتی ہے
شام کی آنکھوں میں
تنہائی چمکتی ہے

آئندہ ہزارہ

سال دو ہزار عیسوی



محمد یعقوب مرزا۔ لوٹنگھم (برطانیہ)

شرم ہے!
ہم زمین کو ایک ایسی بافراط جگہ بنانے میں ناکام رہے
جو آئندہ ہزارے میں امن اور عزت کے لئے سازگار ہو۔
اس کے بجائے ہم ایک کے بعد ایک بڑے انسانی المیوں
کی تخلیق کرتے رہے۔

اور اب کبھی کبھار
باہمی طور پر خودکشی کرنے کے لئے آمادہ ہیں
بس ایک بہانے کے منتظر ہیں، فیصلے کے صحیح وقت کا انتظار ہے۔
اے خدا۔ زمین پر آ۔ شیطان کو دفنانے میں ہماری مدد فرما۔
اور ہمیں بتادے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔
ہمیں اس منڈلاتی اور
۔۔۔۔۔ قریب آتی ہوئی تباہی سے بچا
تو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتا کہ حادثہ کسی بھی پل واقع ہوسکتا ہے

چارو ناچار ہمیں غیبی فراست کی ضرورت ہے
ورنہ ہمارے بغیر تیری خودمختاری کی مدافعت کون کرے گا؟

حسیت کے مظاہرے کی امید کم رہ گئی ہے
سن دو ہزار کا استقبال فضول معلوم ہوتا ہے
بہر حال، یونہی سہی، مگر یاد رہے وہ خطرہ جو تو اٹھا رہا ہے !

غزلیں

عنوان چشتی
E - 126, Sector 41 Noida 41
Gautam Budh Nagar (U.P.)

وہ سامنے ہیں مرے، دل کو زندگی تو ملی
نظر کو چین ملا روح کو خوشی تو ملی
جلا ہے میرا نشیمن تو اس کو جلنا تھا
زرا سی دیر کو گلشن کو روشنی تو ملی
متاعِ عشق و محبت میں کیسے خوش ہوں، بہت
کہ مجھ کو عالمِ ظلمت میں روشنی تو ملی
مجھے کچھ اپنی تباہی کا غم نہیں لیکن
کسی غریب کو دنیا میں کچھ خوشی تو ملی
غم ان کا ہے کہ جنہیں کچھ نہ مل سکا عنواں
مجھے ادب کی بہر حال خسروی تو ملی

چلتے رہنے کا مجھے حکم اگر دینا تھا
جو نہ ہو ختم مجھے ایسا سفر دینا تھا
زخم کھانے کا اگر مجھ کو ہنر دینا تھا
کاسۂ دل کو میرے پیار سے بھر دینا تھا
آشیاں پیار کا جس پر یہ بناتا اپنا
طائرِ دل کو میرے ایسا شجر دینا تھا
شہر میں نام تو ہوتا کسی صورت، سر پر
نیک نامی نہ سہی الزام ہی دھر دینا تھا
غم کی دولت جو عطا کرنا تھی میرے مولیٰ
ہنس کے سہ جائے جو غم ایسا جگر دینا تھا

راحل فریدی
نزد سبزی منڈی، بیلپور ضلع پیلی بھیت (یوپی)
پن-۲۶۲۲۰۱

انگریزی تحریر: بجوئے گپتا
اردو ترجمہ: ف۔ س۔ اعجاز

بنارس اور بیوہ معاشرہ

[عنوان مترجم کا قائم کیا ہوا ہے]

ایک نیم روشن دروازے سے ایک عورت کا مہین اور بے ڈھنگے پن سے کٹے بالوں والا سر نمودار ہوتا ہے۔ یہ جانکی ہے جو اپنے گھر یعنی ملگجے ودھوا آشرم سے بنارس کی اندھیری رات میں تاک رہی ہے۔ پیچھے کہیں گھر کے اندر سے کچھ آوازیں آرہی ہیں۔ ان میں سب سے اونچی آواز ایک ننھی بیوہ کی ہے جس کا نام چوہیا ہے۔ چوہیا گنا چوس رہی ہے۔ دوسری بھنبھناتی آوازیں بڑی عمر کی بیواؤں کی ہیں۔ ننھی بیوہ چوہیا، تیس سال سے اوپر کی ایک بیوہ جانکی اور اس سے بھی زائد عمر کی ایک بیوہ شکنتلا۔ یہ ہیں دیپا مہتا کی متنازعہ فلم 'واٹر' کے کردار۔ ۱۹۳۰ء کے زمانے کا سیٹ بنایا گیا ہے جو بنارس کی مشہور بیواؤں کی کہانی بیان کر رہا ہے۔ جانکی کا کردار اداکارہ نندتا داس کو ادا کرنا ہے۔ اسے بیواؤں کی ملگجی دنیا میں بھی محبت کا اشارہ مل جاتا ہے جب وہ نارائن نامی ایک توانا اور وجیہہ گاندھی وادی سے پہلی بار ملتی ہے۔ جیسے جیسے فلم آگے بڑھتی ہے جانکی کے بال پھر اگتے آتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی امیدیں بھی۔

اب ذرا کٹ کہہ کر آپ دیپا کے ۱۹۳۰ء والے سیٹ سے موجودہ زمانے میں چلے آیئے اور فروری ۲۰۰۰ میں وبھا جھا سے ملئے۔ وبھا ایک میتھلی براہمن ہے جس کی عمر تقریباً وہی ہے جو 'واٹر' کی جانکی کی ہے۔ اس کا شوہر ایک سڑک حادثے میں اب سے دو سال پہلے مر گیا تھا۔ جس کے بعد اس کے جیٹھ نے گھر سے نکال باہر کیا پھر وبھا بنارس چلی آئی۔ اور کسی طرح میر گھاٹ پر واقع گینجتی گیٹ ہاؤس کے تہہ خانے میں بنے گندے آشرم میں رہنے کی جگہ پالی۔ وبھا کے ساتھ اس کے نوعمر لڑکے بھی تھے۔ اب تو کچھ مدت اسے یہاں رہتے بیت چکی ہے لیکن آج تک نہ اسے کوئی نارائن ملا اور نہ کبھی اس نے بھجن اور کیرتن کے سُر سنے۔

دیپا مہتا کی 'واٹر' تھرٹیز اور فورٹیز کے زمانے کو پیش کرتی ہے جب بنارس بیواؤں سے بھرا رہتا تھا۔ فلم میں ان کے دکھ اور زندگی کے ابتلا کی عکاسی کی گئی۔ لیکن فلم بڑھنے کے ساتھ آشا اور امید اس میں داخل ہوتی جاتی ہے۔ بقول نندتا" فلم میں اونچا اٹھنے اور بہتر زندگی تک پہنچنے کی بات ہے۔ اس میں حقیقت سے ٹکرانے اور آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کی بات ہے۔ 'واٹر' ایک زیادہ ترقی پسند سماج کی تلاش ہے۔"

وہ بہتر زندگی وقت میں کہیں کھو گئی ہے۔ یقیناً بنارس کی آج کی ودھواؤں نے اسے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ اور بلاشبہ ترقی بھی ہوئی ہے۔ وبھا کو اپنا سر نہیں منڈوانا پڑا۔ اور بہت سی ودھوائیں (بشمول وبھا) آج رنگین ساڑیاں پہنتی ہیں۔

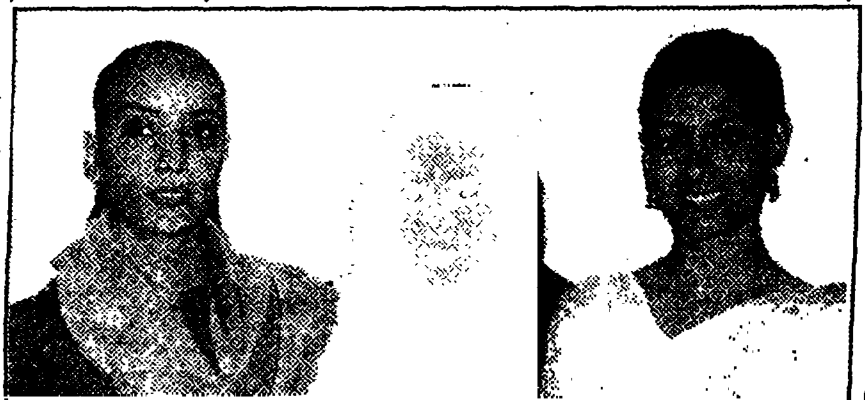


لیکن وہ طریقہ جس سے بنارس کی ودھواؤں کی زندگی جہنم بن کر رہ گئی تھی اب باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ودھواؤں کی تعداد بہت گر گئی ہے اور ودھوا ہونے والی ہندو عورتوں کا جس طرح بنارس میں اس امید میں اژدہام رہا کرتا تھا کہ وہ وہاں اپنی موت کے بعد "موکشا" (ابدی نجات) حاصل کر لیں گی بدلتے ہوئے سماجی حالات کے ساتھ اس میں بہت کمی آگئی ہے۔ اور تو اور ان کی زندگی کا طور طریقہ بھی بہت حد

تک بدل چکا ہے۔ آج دبھا کے ساتھ ۲۰ بیوائیں آشرم میں رہتی ہیں۔ ان سبھوں کو عام بھکارنوں کی طرح جینے کے لئے مجبور کردیا گیا ہے۔ وہ اپنے گزارے کے لئے merial کورس گاتی ہیں اور جیساکہ دبھا اپنے چہرے پر شرمندگی کا تاثر لئے کہتی ہے انہیں کبھی کبھی بھیک مانگنے پر مجبور کردیا جاتا ہے۔

بنارس جو رانڈ، سانڈ، سیڑھیوں اور سنیاسیوں کا شہر مشہور ہے، میں کبھی ہر روز نئی بیوائیں آیا کرتی تھیں۔ انہیں بنگال سے آنے والی بیواؤں کی تعداد بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔ وہ یہاں ایک ہزار کیلو میٹر دور سے بنگالی زمینداروں اور امیروں کے گھروں میں پناہ لینے آیا کرتی تھیں۔ حتی کہ پٹیا (Putia) کی رانی ہیمنتی کماری اور کلکتہ کی رانی راشمونی بھی اپنی بدنصیب بہنوں کو کچھ وقت گذارنے کے لئے اپنے گھروں میں بلا لیا کرتی تھیں۔ ان میں سے کچھ تھوڑے دنوں کے لئے وہاں قیام کرنے کے بعد مارواڑی گھرانوں کے بنائے ہوئے آشرموں میں چلی جاتیں۔ دیگر متمول زمینداروں کے گھروں میں ہی مستقل ٹھہر جاتیں۔

ماہر انیکالوجی، مورخ اور سرگرم سماجی کارکن ایتابھ بھٹاچاریہ جنہوں نے بنارس کی تاریخ کا باریک مطالعہ کیا ہے، کہتے ہیں "بیوائیں یہاں مرنے آتی تھیں۔ یہ واحد شہر ہے جہاں زندگی موت کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن اوائل انیسویں صدی کی بیوائیں جہاں اپنی موت کا انتظار کیا کرتی تھیں وہیں وہ اپنی زندگی اچھے جاہیے وقار کے ساتھ گذار بھی لیا کرتی تھیں"۔ بنارس آسمان کے نیچے ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ اپنی برادری میں محفوظ جیا کرتی تھیں۔ سرِ شام مکتا گاچھا (جواب بنگلہ دیش میں ہے) کے مہاراجہ جگت کشور، ہگلی کے دیوان اندر نارائن باپولی اور ڈھاکہ کی بسواس فیملیاں اپنے دالانوں میں بھجن کرواتیں جن میں بیوائیں دو دو تین تین گھنٹوں کی باری سے بھجن گاتیں اور اس کے عوض کھانے اور کپڑے انہیں دے داتے۔



سدنا داس، دیپا مہتا اور شبانہ اعظمی فلم "واٹر" کے سیٹ پر

بہرام پور کے کشان دتہ خاندان کے چشم و چراغ میگھ ناتھ دتہ کہتے ہیں "مجھے ان دنوں کی دھندلی سی یاد آتی ہے۔ کچھ شبیہیں دماغ سے چپک کر رہ گئی ہیں۔ مثلاً وہ بڑا باورچی خانہ نہیں بھولتا جو ہمارے یہاں بیواؤں کے لئے مخصوص تھا بھجن گان کے بعد سفید کپڑوں میں ملبوس عورتیں ایک قطار بنالیتیں اور پھر مل کر کھانا کھاتیں۔ اس وقت وہ ہنستیں اور لطیفے بیان کرتیں"۔

تیسرے اور چوتھے دہے کے بعد سے موکشا کے لئے بنارس آنے والی بیواؤں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب رومان اور دیگر معاملات نے سامنے آنا شروع کیا۔ ان میں سے بعض کے افسانے بنالئے گئے۔ مثلاً نارائن سانیال کا "اصلی لاتار دائے" جس کا مرکزی کردار آنند موہن رائے ایک بیوہ تاتنی کی محبت میں پڑ گیا۔

اس کے بعد کلکتہ کے ہیم چندر بندوپادھیائے کی بیوہ کا قصہ ہے جس نے اپنے سوتیلے بیٹے کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کرلی۔ بنارس کے ایک دستاویزی فلم ساز دیبن بھٹاچاریہ جواب پیرس میں رہتے ہیں کا کہنا ہے کہ بیوائیں بنارس میں بھگوان کے ساتھ ایک ہو جانے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ کیونکہ سمجھا جاتا تھا کہ بنارس میں رہنے والے ہر ذی جان کو "مکشا" پراپت ہونے کی ضمانت حاصل ہے۔ چاہے وہ پنڈت ہو، تاجر ہو، چنڈال ہو، گائے ہو، بندر ہو۔

اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ نہ تو رومان ہے، نہ عظمت۔ نہ ہی بنارس میں رہ کر انتظار مرگ کی روحانیت۔ اگر 'واٹر' کو سن تیس۔ چالیس کے بجائے ۲۰۰۰ء میں سیٹ کیا جاتا تو یہ ایک دکھ اور افسوس والی فلم ہوتی نہ کہ آزادی اور امید کی داستان آج بنارس کے بیوہ گھر جاکھوں کے بجائے دبھاؤں سے بھرے ہوئے ہیں۔

اگر دیپا مہتا کا سیٹ گنگا کنارے ستم رسیدہ بیوہ گھر کی عکاسی کرتا ہے تو عرض ہے کہ آج دبھا نے بے ضمیر دنیا میں "کنچتی گیسٹ ہاؤس" کے بیوہ آشرم میں جینا سیکھ لیا ہے۔ اس گیسٹ ہاؤس تک جہاں ایک قدیم ترین بیوہ آشرم قائم ہے، پہنچنے کے لئے تہہ خانے کی سو سیڑھیاں اترنا پڑتا ہے۔ اس کی پہلی اور بالائی

منزلیں قارین ٹورسٹوں کو کرائے پر دی جاتی ہیں۔ یہ دونوں منزلیں جدید طرز پر بنائی گئی ہیں جن میں کمپیوٹر بھی موجود ہیں۔ ان میں کانٹی نینٹل طعام گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ چند ہی گیسٹ جانتے ہیں کہ تہہ خانے میں ایک چھوٹی سی دکھ بھری دنیا آباد ہے جو کمپیوٹر عہد سے کئی نوری سال پرانی ہے۔

بیوہ آشرم کا زوال اور کنکتی گیسٹ ہاؤس کا جنم بیس سال سے زیادہ پرانی بات ہے۔ جب اس کے اصل مالک باسو دیو ہار لنکار، کلکتہ کے ایک مارواڑی بیوپاری نے اس کا ملکیت نامہ اپنے دربان سی۔ این تیواری کے نام میں منتقل کیا تھا۔

بہار کی تردیبی بائی آج گیسٹ ہاؤس میں ۲۴ سال سے مقیم ہے۔ تردیبی بائی ۸ سال کی تھی جب بیوہ ہو جانے پر اس کے بال چھوٹے کر دیئے گئے تھے۔ وہ بتاتی ہے "میں نے جب شوہر کے مرنے کی سنی اسوقت تک اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں تب مائیکے میں ہی رہی لیکن اب سے ۲۴ برس پہلے میرا بھائی مر گیا میں نے بنارس آنے کا فیصلہ کر لیا۔"

تردیبی کو یاد ہے کہ آشرم کے تہہ خانے میں دھکیلے جانے سے پہلے یہاں کی زندگی کیسی تھی۔ اسے وہ دن یاد ہیں جب گیتا نامی ایک بنگالی عورت آشرم کی منیجر ہوا کرتی تھی۔ جب یہاں گیسٹ ہاؤس نہیں تھا۔ شام کے وقت بڑا ہال ایک بھجن گھر بن جایا کرتا تھا۔ بیوائیں ٹولیوں میں گایا کرتی تھیں اور اس کے عوض انہیں غلہ اور دال ملتی تھی۔ دھنوان مارواڑی تاجر کبھی کبھی انہیں ساڑیاں اور روپے دیا کرتے تھے۔

تردیبی بائی کا بھجن گھر آج میلا چکٹ مال خانہ دکھائی پڑتا ہے۔ ہال میں جانور گھس آتے ہیں اور اسے ناپاک کر دیتے ہیں۔ گندے کپڑوں اور اینٹوں کی تھاک سے بھرے اس کمرے میں بیوائیں رہتی ہیں جس میں ایک تنہا ۴۰ واٹ کا بلب روشنی کرتا ہے۔ دور ایک کونے میں کرشن کی دو مورتیاں رکھی ہوئی ہیں، تمام بیوائیں جن کی پوجا کرتی ہیں۔ وہ فرش جس پر ایک پھٹی چادر بچھا کر یہ بیوائیں سوتی ہیں، ہمیشہ سیلا رہتا ہے کیونکہ باہر جو گنگا بہتی ہے، کمرے کی سطح تقریباً اُس کے برابر ہے۔

تردیبی بائی ایک اور تبدیلی کا ذکر کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے آج روپیہ نہیں ملتا۔ زمینداروں کی سرپرستی نہیں رہ گئی تو حالت بہت خراب ہے اور جگ بیگانہ سالگتا ہے۔ تردیبی بائی کو پنشن کا آخری چیک سولہ مہینوں قبل ملا تھا۔ وہ ۵۰۷ روپے کا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وظیفے کا یہ چیک تین سال کی مدت کا تھا جبکہ اسے ۳۶۰۰ روپے کا ہونا چاہئے تھا۔ وہ چیک لے کر ایک بنک میں کھاتہ کھولنے گئی لیکن بنک نے اکاؤنٹ کھولنے سے انکار دیا۔ یہ چیک اس کے پاس آج بھی پڑا ہے اور وہ سوچتی ہے کہ اسے اس چیک کی رقم مل جائے گی۔ کسی نے بیچاری تردیبی کو اسے آج تک یہ نہیں بتایا کہ چیک کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ وہ افسوس کے ساتھ کہتی ہے "یہاں یہ جگہ بہت مختلف ہے۔ مجھے کبھی نہیں معلوم تھا کہ مجھے مرنے کے لئے اتنا انتظار کرنا پڑے گا"۔

اگر "واٹر" پر نظر کریں تو یہ تضادات بہت گہرے ہیں۔ آج کے بنارس سے اس کا موازنہ کر کے دیکھیں۔ فلم میں ایک امید کا عنصر موجود ہے۔ آج کے بنارس میں صرف افسوس ہے جو یہاں کی آج کی زندگی کا عکس ہے۔

آج ایک بیمار گائے یا بھکاری سڑک پر مر جائے تو اسے کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھنے والا نہیں ہے۔ سُبھل کمار نے اپنی کتاب "Dateline Varanasi" میں لکھا ہے "حال میں ایک یوروپین ٹورسٹ ایلزبتھ ٹرنر تین ہزار پونڈ خرچ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ بنارس ایک جہنم ہے"۔ اس شہر کا ایک پنڈت فرانس گیا۔ وہاں اُس سے بنارس کے حوالے سے پوچھا گیا "کیا یہ وہی شہر نہیں ہے جہاں گایوں کی پوجا ہوتی ہے اور عورتوں کا قتل کر دیا جاتا ہے"۔

مہتا کی 'واٹر' نے اس بنارس کے جلوے نہیں دکھائے۔ اُس کا فوکس صرف بیواؤں اور ان کے جیون پر ہے۔ جبکہ نئے بنارس کو زیادہ توجہ اور زیادہ ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت پر کسی احتجاجی کی نظر نہیں گئی اور نہ ہی اسے کوئی جاننا چاہتا ہے۔

"واٹر" میں بنارس کو ایسا شہر دکھایا گیا ہے جو لوگوں کو سہارا دیتا ہے اور ان کی فکر کرتا ہے۔ اور یہ اب حقیقت نہیں رہ گئی۔ بنارس کو واقعی احتجاجیوں کی ضرورت ہے لیکن صرف ان احتجاجیوں کی جو ۲۰۰۰ عیسوی کے شہر کے خلاف آواز اٹھائیں نہ کہ سن ۱۹۳۰ کے۔

کتابوں کی اشاعت

انشاء پبلی کیشنز سے مصنفین کے اخراجات پر صرف اعلیٰ معیار کی طباعت سے مرصع کتب شائع کی جاتی ہیں۔ جو ادباء معیاری طباعت کو ترجیح دیتے ہوں۔ وہ ہم سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ ہم کتابیں ایکسپورٹ بھی کرتے ہیں۔

غزل اُس نے چھیڑی

سرور عالم راز سرورؔ
3800 FOX TRAIL, NO. 911
FORT WORTH, TX 76109, U.S.A.

اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز دکن میں ہوا۔ ولیؔ دکنی کو اردو کا پہلا باقاعدہ شاعر اور محمد قلی قطب شاہ کو پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا جاتا ہے۔ اردو زبان کی اس زمانہ کی غیر ترقی یافتہ شکل اور علاقائی زبانوں کی موجودگی میں اردو شاعری پر دکنی زبان انداز بیان اور لب و لہجہ کا ٹھپا لگنا عین اقتضائے فطرت تھا چنانچہ اس دور کی شاعری دکنی اثرات سے مملو ہے جو اپنا حسن رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ جب مختلف تاریخی تقاضوں کے زیر اثر ملک کی سیاسی، معاشی اور فوجی قیادت شمالی ہندوستان منتقل ہوئی تو زبان و ادب بھی شمالی ہند سے وابستہ ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ اردو شعر و ادب کے تقریباً تمام اہم مرکز وہیں قائم ہوئے اور وہیں کی اردو کو ٹکسالی مانا گیا۔ ہر چند کہ دکن اردو کا مرکز رہا پھر بھی شمالی ہند کے مقابلہ میں اسے اپنی اہمیت و مقام کی کمی پر اکتفا کرنا پڑا۔

چونکہ سلاطین ہند کی زبان فارسی تھی اور اردو نے اِسی ماحول میں اوّلین تربیت پائی، اردو شاعری کا ایرانی اثرات قبول کرنا اور فارسی شاعری کی روایات، اصناف سخن، انداز فکر و بیاں، مضامین وغیرہ کو ہندوستانی معاشرہ اور ماحول کے زیر اثر ضروری تغیر کے بعد اپنے سانچہ میں ڈھال لینا بلکل فطری بات تھی۔ اس عمل سے جہاں یہ ہوا کہ اردو شاعری ایک قلیل مدت میں اس مخصوص حسن اور رنگ و آہنگ سے آراستہ ہو گئی جو اس کا طرۂ امتیاز ہے، وہاں یہ بھی ہوا کہ اکثر و بیشتر وہ فارسی شاعری کی بازگشت اور چربہ معلوم ہونے لگی۔ جو اصناف سخن اردو نے فارسی سے مستعار لیں اور جو بعد میں معرض وجود میں آئیں ان کی لسانی اور معنوی ہیئت و ساخت پر ایک سرسری نظر بھی اس بیان کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

ہر زبان کی تہذیب و ترقی کے لئے اس میں تجربوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر تجربہ کامیاب بھی ثابت ہو، البتہ ہر تجربہ سے بحث و تمحیص اور تنقید و تنقیص کا دروازہ کھلنا اور ایوان ادب میں بیداری کی کیفیت کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ تجربوں کے فقدان سے زبان وادب پر جمود و انحطاط طاری ہوتا ہے جو کسی طرح بھی اس کے مستقبل کے لئے نیک فال نہیں ہو سکتا۔ پچھلی نصف صدی میں اردو شاعری میں بھی کئی نئے تجربے کئے گئے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اشتراکیت اور مغربی ادب و شعر کے مجموعی اثر سے ترقی پسندی اور جدیدیت کا دور دورہ ہوا جس نے آزاد شاعری کو جنم دیا اور زبان وادب کو عوامی بنانے کا نعرہ بلند کیا۔ بعد میں آزاد نظم نے بگڑ کر آج کی نثری نظم کی صورت اختیار کر لی۔ پھر رباعی کے جواب میں سہ مصرعی ثلاثی وجود میں آئی حالانکہ اسے وہ قبول عام حاصل نہیں ہوا جس کی توقع اس میں اظہار خیال کرنے کو رہی ہو گی۔ ایک مختصر حلقۂ سخن نے ہندی دوہوں سے متاثر ہو کر اردو میں دوہے لکھنے کی کوشش کی ہے مگر چونکہ بیشتر شعراء ہندی زبان سے کماحقہ واقف نہیں ہیں اور اس کی روایات سے بھی بے بہرہ ہیں چنانچہ وہ دوہوں میں اردو الفاظ اور محاوروں کے استعمال پر مجبور ہیں۔ اور اس صنف سخن کا حسن و آہنگ ہندی سے اردو میں منتقل کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ ثلاثی میں رباعی کے حوالہ سے اردو کا خمیر موجود ہے چنانچہ وہ دوہوں کے مقابلہ میں کامیابی اور مقبولیت کے زیادہ امکانات رکھتی ہے۔

شاعرانہ تجربوں کی ایک غیر مانوس شکل جاپانی سہ مصرعی ہائیکو کے تتبع میں اردو ہائیکو کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ جہاں بیشتر شعراء ہندی شاعری کی روایات اور مقتضیات سے ناواقف ہوں وہاں ان سے جاپانی شاعری کے مضمرات سے واقفیت کی توقع فضول ہے، چنانچہ اردو ہائیکو لکھنے والے اب تک اس صنف سخن کی ہیئت ہی متعین نہیں کر سکے ہیں۔ کچھ شعراء جاپانی ہائیکو کی طرح ۵/۷/۵ کی رُکنی ہیئت پر ہی اردو ہائیکو لکھ رہے ہیں اور کچھ نے اپنے طور پر اسے نئی رکنی ساخت و آہنگ سے آراستہ کیا ہے۔ ادب میں ہر اس تجربہ کی طرح جو نیک نیتی اور خلوص فکر سے کیا جائے ہائیکو اور ثلاثی کا خیر مقدم ضروری ہے۔ ان کے اردو شاعری میں ثبات و قیام کا فیصلہ تو مستقبل ہی کرے گا، اس وقت صرف اس قدر ہی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں اصناف کو قبول عام حاصل کرنے اور اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے تہذیب و ترویج کی بہت سی اور منزلوں سے گذرنا ہے۔

اردو غزل جذبات و احساسات کی ترجمانی کی جو صلاحیت رکھتی ہے اس سے ہر صاحب نظر واقف ہے۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کا راز غزل زبان، انداز بیان، تراکیب کی صد رنگی اور مضامین کے تنوع میں تو ہے ہی لیکن اس کی ہیئت (یعنی دو مصرعوں سے شعر کی تشکیل) غالباً اس مقبولیت کی سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ صرف دو مختصر سے مصرعوں میں اظہار خیال پر عبور ایسی خصوصیت ہے جو کسی اور صنف سخن کو حاصل نہیں ہے۔ اردو میں غزل گو

شعراء اور شاعرات کی فراوانی اگر ایک جانب اس کی مقبولیت اور اثر پذیری پر دلالت کرتی ہے تو دوسری جانب اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید لوگ غزل کہنا آسان سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اگر الفاظ و محاورہ کے تال میل پر عبور ہو اور طبیعت موزوں ہو تو غزل کے اشعار موزوں کر لینا ایسا مشکل نہیں ہے، البتہ اچھی غزل کہنا بہت دشوار کام ہے اور عظیم غزل گو ہونا تو اردو شاعری کی تاریخ میں معدود، چند ہستیوں کو ہی نصیب ہوا ہے۔

پچھلے چند سالوں میں کچھ اہل نظر نے غزل میں بھی اختراع و ایجاد کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ یہ کوشش ابھی پوری غزل کو اس نئے رنگ میں پیش کرنے کی صورت میں مطلع سخن پر نمودار نہیں ہوئی ہے بلکہ روایتی غزل میں وقتاً فوقتاً اس طرز سخن کے علم بردار اشعار کی شمولیت تک محدود ہے۔ یہی طرز سخن دراصل زیر نظر تحریر کا موضوع ہے۔ ضروری ہے کہ اس اختراع کو مناسب نام دے دیا جائے تاکہ ادائے مطلب میں آسانی ہو جائے۔ چونکہ مجوزہ نام سے قدرے غلط فہمی کا امکان ہے اس لئے از ردئے صفائی اور از راہ تعنن طبع دو واقعات کا مختصر ذکر شاید غیر مناسب نہیں ہے۔

پہلا واقعہ اس کوی سمّیلن کا ہے جو آزادی ہند و پاک کے کچھ ہی عرصہ بعد اردو مشاعروں کی ضد میں جبل پور (ایم پی) میں منعقد کیا گیا تھا۔ مشاعروں کی مقبولیت کا راز سامعین کی شرکت سے وابستہ ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے تو اس میں غزل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اگر غزل کے اشعار پر سامعین کی ''واہ، واہ، سبحان اللہ، مکرر ارشاد'' کی پر جوش تکرار نہ ہو تو محفل کی کامیابی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ہندی میں مشاعرہ کی سی کوئی جاندار روایت نہیں ہے اور اسکا بڑا سبب ہندی شاعری کی عمومی بے مزگی اور ''پھسپھساپن'' ہے۔ بہرکیف مذکورہ کوی سمّیلن کے شروع میں ہی ایک مشہور مقامی کوی کشیپ تخم کو زحمت کلام دی گئی۔ ان کی کویتا ہزار کوشش پر بھی سامعین کو جوش نہ دلا سکی۔ یہ دیکھ کر کشیپ صاحب نے پہلو بدلا اور یوں اعلان کیا ''اچھا تو اب ایک کجل سنئے'' غزل کا نام سنتے ہی جیسے محفل میں جان پڑ گئی اور انہیں لوگوں نے جو ہندی کویتا کی بے کیفی پر سرِ محفل اونگھ رہے تھے، ''واہ'' ''واہ'' کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کشیپ صاحب کی کجل کے چند اشعار حاضر خدمت ہیں

یہ جندگی ہماری تو مرنے سے کم نہیں
ہم کو ہے تم سے پیار، کوئی اور گم نہیں
جو ایک شام ہم نے گجاری تمہارے ساتھ
دل کو کچھ اور یاد تمہاری کسم نہیں
کشیپ جوانی بیت گئی اس کی یاد میں
تاکت نہیں دماگ میں اور دل میں دم نہیں

پھر تو جو بھی کوی اسٹیج پر آیا، ہندی کویتا کی ''ضابطہ کی خانہ پری'' کے بعد کجل سناتا ہوا نظر آیا۔

دوسرا واقعہ اس کوی سمّیلن کے کئی سال بعد باڑہ ہندو راؤ (پرانی دلّی) کے ایک مشاعرہ میں پیش آیا جہاں اتفاق سے راقم الحروف بھی موجود تھا۔ چند مبتدی شعراء کے بعد باڑہ کے اختر دہلوی صاحب کو دعوت کلام دی گئی جو خود اپنی دانست کی حد تک پائے کے شاعر تھے۔ انہوں نے بڑے طمطراق سے غزل پڑھی ''آساں ہو گیا، جاناں ہو گیا''۔ اِدھر اُدھر سے رسمی سی داد بھی ملی۔ اختر صاحب نے اس بے حسی پر ذرا سی ناک بھوں چڑھائی اور بولے:

''حضرات اس شعر پر توجہ چاہونگا، ملاحظہ فرمایئے''۔ دو چار آوازیں ''ارشاد! ارشاد!'' اور اختر دہلوی صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

پاش پا آئینۂ دل عاشقی میں جب ہوا
عکس جو اس میں پڑا، تصویرِ جاناں ہو گیا

شعر ختم ہی ہوا تھا کہ ایک جانب سے آواز آئی۔ ''صاحب یہ ''پاش پا'' کیا ہوتا ہے؟

اختر صاحب نے معترض کی جانب خشم گیں نظروں سے دیکھ کر کہا ''جی یہ ''پاش پاش'' کا مخفف ہے۔ ہم شاعر ہیں اور ہمیں زبان میں اجتہاد کرنے کا حق ہے''۔

اس پر ایک بزرگ نے متانت سے جواب دیا ''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپکا دل ''ٹکڑے ٹکڑ'' ہو گیا''۔

اختر صاحب جھنجلا کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ پہلے معترض نے فقرہ کسا ''بھئی مشاعرہ میں کجل سننے کا آج موقع ملا ہے''۔ محفل میں زبردست قہقہہ پڑا۔ جناب صدر کی معاملہ فہمی اور فراست نے مشاعرہ میں دنگا ہونے سے بچا لیا ورنہ خدا جانے کیا حادثہ پیش آتا۔

کیشپ صاحب کی کجل اپنی فطرت میں معصوم تھی کیونکہ وہ انکی اردو زبان، لب و لہجہ اور تلفظ پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے وجود میں آئی اور یہ کوئی جرم نہیں ہے بلکہ کوی سمّیلن میں اس کا پیش کیا جانا، غزل کی مقبولیت پر دلیل کا حکم رکھتا ہے۔

اختر دہلوی صاحب کا شعر ایسی کجل کا ہے جو ایک کج فہم شخص کی بر حق غلط ذہنیت کی اپج ہے۔ اسی لئے ایسے اشعار کو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

زبان و ادب میں اختراع اور تنوع کی کوشش چاہے وہ نئے الفاظ و تراکیب سے منسوب ہو یا نئے طریق اظہار سے، بدعت نہیں ہے کہ اس پر تنقیص اور بے جا احتساب کے دروازے کھولے جائیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ہر ایسی کوشش اس تہذیبی اور لسانی روایت کی پابند ضرور ہو جو شعر

وادب کے پس پشت کار فرما ہوتی ہے۔اس تحریر کا موضوع اردو غزل میں وہ تحریف ہے جو نام نہاد اختراع اور تنوع کے نام سے در آئی ہے۔ چونکہ یہ کوشش روایتی غزل سے مماثلت رکھتی ہے اسی نام سے بازار ادب میں پیش کی جارہی ہے، اس صنف کلام کو گجل کا نام دینا مناسب معلوم ہوتا ہے البتہ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس نئی گجل کا مذکورہ بالا کشیپ جبل پوری یا اختر دہلوی کی گجل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ روایتی غزل سے اس صنف کلام کا رشتہ بہر کیف ہے چنانچہ مجوزہ نام سے اس کی الگ شناخت بھی قائم ہو جائے گی اور غزل سے اس کا جو پامال سا رشتہ ہے اس کا اعتراف بھی ہو جائیگا۔

گجل کی ایک قسم وہ ہے جسے ''غزل معرّیٰ'' کے دل خوش کن نام سے دنیائے اردو کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ گجل کی یہ قسم اپنی ہیئت میں غزل سے مماثل ہے یعنی اس کی تشکیل بھی دو مصرعی ''اشعار'' ہوتی ہے۔ ہر شعر بحر اور وزن کا پابند بھی ہوتا ہے اور ایک منفرد خیال، جذبہ یا احساس کی ترجمانی کرتا ہے البتہ اشعار میں ردیف اور قوافی کا التزام نہیں کیا جاتا ہے۔ اس گجل میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ کوئی بھی دو ہم وزن مصرعے جو کم و بیش ایک ہی خیال ادا کر رہے ہوں ہم رشتہ کئے جاسکتے ہیں۔ غزل کے اشعار کے دو مصرعے کے التزام ردیف و قوافی کے حوالے سے شاعر کو جو دردسری کرنی پڑتی ہے اس سے نجات مل جاتی ہے اور یہی آسانی اس اختراع کی ذمہ دار ہے۔ ایسی گجل کی ایک مثال درج ذیل ہے جو راقم الحروف نے اپنی مختلف غزلوں سے مصرعے مستعار لے کر تشکیل دی ہے۔ اس کوشش نے یہ راز بھی مجھ پر ظاہر کردیا ہے کہ اپنے مطبوعہ سرمایہ غزل کو اس کی روایتی شکل میں مامون و محفوظ رکھتے ہوئے ادھر ادھر سے مصرعے لے کر نئی گجلوں کا مجموعہ نہایت آسانی سے مرتب کیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح دنیائے ادب کو اپنی شاعری کے ایک بالکل اچھوتے پہلو سے مستفید و محفوظ ہونے کا موقع فراہم کیا جاسکتا ہے۔

گجل

حاصلِ عمر ہی معلوم نہ منزل معلوم
چاروناچار ہنسے سب کو دکھانے کے لئے

امتحانِ دلِ برباد کی حد ہے کوئی
ہائے وہ آنکھ جو ملتے ہوئے شرماتی ہے

گریۂ صبح گہی، اشکِ غم نیم شبی
عمر بھر صبر کیا، جبر کی صورت ہم نے

لوگ کہتے ہیں بجز وہم و گماں کچھ بھی نہیں
چند لمحے جو نگاہوں کو لبِ بام ملے

بھولنے پر بھی وہ یاد آئیں اگر کیا کیجئے
یہ بتا دل، کہ یہ مشکل تری آساں کیوں ہو

بات کہتے ہوئے ڈرتا ہوں وگرنہ سرور
زیست کہتے ہیں ترے نام پہ مر جانے کو

غزل کے معنی ''اپنے محبوب سے باتیں کرنا'' ہیں۔ اسی نسبت سے اس کے مقبول و معروف مضامین حسن اور عشق کی فرسودہ مگر دلفریب داستاں، ہجر و وصال اور گل و بلبل کے قصے، اپنوں اور غیروں کے شکوے، دنیا کی بے ثباتی وغیرہ ہیں۔ یہاں تک تو معاملہ غنیمت تھا مگر آہستہ آہستہ غزل صرف ایسے ہی مضامین سے وابستہ ہو کر رہ گئی اور ہر شاعر اپنے پیش رو شعراء کی صدائے بازگشت معلوم ہونے لگا۔ اس صورت حال اصلاح کی ضرورت تھی اور بہت سے اصحاب فکر نے اس جانب توجہ کی لیکن ایسی بیشتر کوششیں ناکام ثابت ہوئیں کیونکہ لوگ غزل کی یکسانیت کے رد عمل میں اس میں ایسے تغیرات پر مصر ہوئے جو غزل کے مزاج اور روایات سے نبرد آزما تھے۔ صدیوں کی تراش خراش اور تہذیب و ترویج کے بعد وجود میں آیا ہوا غزل کا مخصوص سانچہ ان تبدیلیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ زبردستی کی ''ٹھوسم ٹھاس'' سے وہ صنف کلام نمودار ہوئی جسے گجل کے نام سے موسوم کیا جارہا ہے۔ مذکورہ اصلاحی اور اختراعی کوششوں کی مختلف صورتوں کی درج ذیل مثالوں سے اس تحریک کی فرومائیگی ظاہر ہوتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اہل فکر جو غزل کی اصلاح کے پیش نظر آگے بڑھے تھے غزل کے تہذیبی، تاریخی اور جمالیاتی پس منظر کو ذہن میں رکھ کر کام کرتے۔

گجل کے اشعار کی مختلف اقسام میں ایک وہ ہے جس میں شاعر دانستہ غیر مانوس اور بعض اوقات دوسری زبانوں کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اول تو ایسے الفاظ غزل کے مزاج سے میل نہیں کھاتے، دوئم یہ ذوق سلیم پر بار گزرتے ہیں، اسپر مستزاد یہ کہ اکثر و بیشتر ان کے متبادل الفاظ اردو میں موجود ہیں۔ بعض الفاظ اور محاورے تو بدذوقی کا اچھا خاصہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس نہج کے چند گجلیہ اشعار پیش خدمت ہیں۔

الجھے داڑھی چوٹی، میں   کھیلو پھاگ لنگوٹی میں
آج مظفر چاند ہوئے   کل تک تھے کلوٹی میں   (مظفر حنفی)

گرد کی چادر اوڑھے ڈھیر کتابوں کا
روشندان سے پڑھنے اتری ڈیلی دھوپ
(اعجاز محور)

ہما شما پہ گرے یا ہروشما پہ گرے
تباہ کن ہیں میں دونوں بموں سے واقف ہوں
(حباب، ترمذی)

تمہارے بن مرا اپنے دیس میں اب دل نہیں لگتا
میں دن جانے کے گنتی ہوں کیلنڈر کو سامنے رکھ کر
(مسرت جبیں زیبا)

شاید تھا اک بگولے میں تنہائیوں کا غم
زیبا جو دل کے گملے میں کیکٹس سا لگا مجھے
(مسرت جبیں زیبا)

ساعت ریزہ ریزہ ہوگئی ہے
جہاں جاتا ہوں کتے بھونکتے ہیں
(جمیل یوسف)

ایسے اشعار پر تبصرہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ اپنی تفسیر کا سامان خود اپنے دامن میں رکھتے ہیں۔

ندرت خیال و اظہار اچھی غزل کی اہم خصوصیات ہیں اور اسی مناسبت سے کیاب بھی۔ صدیوں سے غزل گو شعرا گھسے پٹے خیالات نظم کرتے آرہے ہیں چنانچہ نئے خیالات اور انداز بیان کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ تقریباً ہر انسانی جذبہ، احساس اور خیال ہر ممکن شکل میں نظم ہو چکا ہے کجل اپنی جدت طرازی کی وجہ سے اس مشکل حل کے بہت سے امکانات رکھتی ہے۔ چونکہ اس نے اپنی راہ فکر روایتی غزل سے ہٹ کر نکالی ہے چنانچہ ندرت فکر اور جدت بیاں کا تصور کجل میں بلکل مختلف ہے۔ اختصار کے پیش نظر ذیل میں کجل کی چند خصوصیات کے عنوان سے قائم کر کے مثال میں اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ تجزیہ یا تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کے لئے جس مخصوص ذہن کی ضرورت ہے، راقم الحروف نے خود کو اس سے عاری پایا۔

سادگی و پرکاری:

آگ لگی ہے جنگل میں
کانپ رہا ہوں سردی سے
(آشفتہ چنگیزی)

یہ کس نے کارخانوں کے دھوئیں کی
ہر اک چہرے پہ کالک سی ملی ہے
بھری تیزاب کی یہ کس نے بوتل
سنہرے بادلوں پر پھینک دی ہے
(خالد سہیل)

پرندے جب نہ دیدے پھوڑ پائے
تو گردن داب لی اپنے پروں میں
(عطاالرحمٰن طارق)

جھپٹا ہے شکرا اور کبوتر کو لے اڑا
حاصل ہوا ہے کیا اسے اونچی اڑان سے
(سرور انبالوی)

کہاں ایسا تکلف ہے گھروں میں
بڑے آرام سے ہیں دفتروں میں
(عطاالرحمٰن طارق)

معنی آفرینی

شدت درد کے بڑھنے سے وہ جدت نکلی
سرد راتوں نے سلگتے ہوئے بستر بانٹے
(سعید اقبال سوری)

ہر شئے سے خوب بننے کا بھی کب نہیں ہے کچھ
سو تیرا غم بھی مجھ کو بنانے کے لئے ہو
کتنے ہزار روپوں کے بعد اک یہ فقر کا
بے جا سا ہی ہمیں نہ رلانے کے لئے ہو
(رب نواز مائل)

مرے ہی پاس تھے تخلیق کے منصب سبھی کل بھی
میں ماں ہوں کس طرح سہہ آج دردِ زہ نہیں سکتی
(مسرت زیبا)

روشنی کا بدن ہوا ریزہ
روح پر گرد رات کا ریزہ
آج یہ کس نے دل پہ دستک دی
محور زیست میں اٹا ریزہ
(محمد وسیم)

ندرت الفاظ و تراکیب

ہواؤں میں، فضاؤں میں، نواؤں میں تھیں مہکاریں
سبھی لمحے اجالا بار تھے کل شب جہاں میں تھا
(محمد سبطین شاہجہانی)

بے فکر ہوں میں بین بجاتے رہے دشمن
یہ ناگ کسی اور پٹارے میں چھپا ہے
(احمد صغیر صدیقی)

میں واقف ہوں تری چپ گوئیوں سے
سمجھ لیتا ہوں تیری ان کہی بھی
(سلیمان خمار)

کب تک میں کواڑوں کو لگائے ہوئے رکھتا
دن اگتے ہی احوال بیانی نکل آئی
(احمد کمال پروازی)

خلوت کدۂ دل پہ زبوں حالئ بسیار
ہے صورتِ گنجینۂ الفاظ و معانی
(عین تابش)

نوادرات تغزل

بودیں تھیں میں نے اپنی دسوں انگلیاں جہاں
پیروں میں آرہا ہے وہی راستہ سا پھر
(رشید امکاں)

کوری باتیں ہی باتیں ہیں منزل و نزل کیسی
چلنے والوں کی راہوں میں کانٹے بونے سے کیا
پیر پرائی دیکھ کبیرا سوکھی آنکھوں روئے
بیماری کے ڈھولوں پر رومال بھگونے سے کیا
(مظفر حنفی)

توڑ دو خواب جو آنکھوں کو ڈکھن دیتے ہیں
یہ تجھے کس نے کہا چین سے سویا نہ کرو
(ثمینہ نشیب)

کیا گزری قیامت قدو قامت پہ نہ پوچھو
جب بونے قد آور ہوئے کاندھوں کو اچک کر
(قیصر نجفی)

ہوں سوچیں تک جو بھی ہر قدم نباہ میں ہو
تو مشکلوں سے ہمیں کیا کسی بھی راہ میں ہو
اسی سے پوچھیں گے اس تیرے دہر کی قیمت
جو بھول کر بھی کہیں کہکشاں نہ کاہ میں ہو
(رب نواز مائل)

گجل کی صد رنگی اور تنوع کی مندرجہ بالا چند مثالیں اس کے امکانات کی مکمل حد بندی کرنے سے قاصر ہیں، البتہ ان سے ان امکانات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کوئی حیرت کا مقام نہیں ہے کہ روایتی غزل گجل کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کہاں گجل کی فصاحت و بلاغت اور کہاں لکیر کی فقیر غزل۔ گجل کا شہر نگار جہاں اپنے "نطقِ رنگیں سے بلاغت کی ضیا خیرہ کر دے وہاں فصاحت کے گھر کا بیکار ہو جانا" یقینی ہے۔ ایک مشہور گجل گو نے کیا خوب کہا ہے ۔

بلاغت کی ضیا خیرہ ہوئی اس نطقِ رنگیں سے
فصاحت کے گھر بیکار تھے کل شب جہاں میں تھا
(شاہ محمد سبطین شاہ جہانی)

1. DAILY   2. CALENDAR   3. CACTUS

بقیہ "ارضِ مقدس میں چند روز"

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ساڑھے چار ہزار سال پہلے دی گئی دعوت ساری دنیا میں عام ہو گئی ہے اور لوگ کھنچ کھنچ کر اس گھر کی طرف آرہے ہیں، جو ایک بے آب و گیاہ وادی تھی، اور ایک ویران صحرا تھا، وہی ویرانہ آج دنیا کا سب سے بڑا مرکز بن چکا ہے!

وطن کو واپسی

آج جنوری ۹۹ء کی پانچ تاریخ ہے اور رمضان المبارک کی سترہ تاریخ، پروگرام کے مطابق ان مقدس مقامات میں ہمارے قیام کی مدت ختم ہو چکی ہے، ہم جدہ ایئر پورٹ پہنچ چکے ہیں، جدہ میں مقیم ہمارے عزیزوں نے ہمارے لئے افطاری کا اہتمام کیا ہے، رات دس بجے کی فلائیٹ سے ہمیں بمبئی کیلئے پرواز کرنا ہے، ہم نے ایئر پورٹ کی عمارت میں جہاں عورتوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے تراویح اور عشاء کی نماز ادا کی، پاکستان اور بنگلہ دیش کی خواتین بھی وہاں مصروفِ عبادت تھیں، ایئر انڈیا کی آخری اناؤنسمنٹ بھی ختم ہو چکی تھی، ہم جلدی سے اس قطار میں کھڑے ہو گئے جو تفتیشی عمل سے گزر رہی تھی۔ فراغت کے بعد ہم ایئر انڈیا کی فلائیٹ میں اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے، ۱۲ر دسمبر سے ۵ر جنوری تک کی خوبصورت یادیں جدہ سے بمبئی تک میری ہمسفر رہیں، میں اپنے ارد گرد سے بے نیاز تصور کی دنیا میں گم ہو چکی ہوں، تقریباً صبح چار بجے بمبئی ایئر پورٹ پہنچے۔ وہیں سحری کی اور فجر کی نماز سے فارغ ہو کر ایئر انڈیا کی ہی دوسری پرواز سے اپنے شہر مدراس کے لئے روانہ ہوئے، مقدس سفر کے مقدس نظارے آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں، حیا کی چادروں میں لپٹی ہوئی حجاب سے اپنے چہروں کو ڈھانکتی ہوئی وہ حوا کی بیٹیاں وہیں رہ گئیں ہیں، اس سفر میں یہ کون اجنبی خواتین میری ہمسفر ہیں جن کے چہرے حجاب سے بے نیاز ہیں ہی، ان کے تحفظ کا پاکیزہ آنچل بھی ان کے سر سے گر چکا ہے رہی سہی کسر انکے مختصر لباس نے پوری کر دی ہے۔ اجنتا اور ایلورا کی ان جاندار مورتیوں پر میں نسوانی تحفظ اور حیا کا آنچل تو نہیں ڈال سکتی، بس احتجاجاً اپنی پلکیں بند کر لیتی ہوں!

(تمام شد)

کلکتے میں معرکۂ غالب و قتیل

ڈاکٹر وفا راشدی
بی ۴۸ر شاہ فیصل ٹاؤن
ملیر ہالٹ، کراچی — ۷۵۱۰۰

مرزا غالب کے ناقدین میں جہاں ان کے مداحوں اور طرفداروں کا کوئی شمار نہ تھا وہاں ان کے مخالفوں اور مخاصموں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے معترضین کے اعتراضات کسی حد تک درست بھی ہوتے تھے جس کا اعتراف خود ان کے تلمیذ ارشد مولانا الطاف حسین حالی نے کیا ہے۔

"سنا گیا ہے کہ ایک دو مشاعروں میں جہاں مرزا بھی تعریفاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پُر شوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی ندارد، گویا ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے" (یادگار غالب)

غالب پر نکتہ چینوں کے یہ احسانات ہیں کہ ان کے اعتراضات نے غالب کو سوچنے اور اپنی اصلاح کرنے کی طرف توجہ دلائی اور حالی کے الفاظ میں "چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اس لئے نکتہ چینوں کی تنقیدوں سے ان کو بہت تنبہ ہوتا تھا اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہ پر آجاتی تھی" (یادگار غالب)

مرزا کے ہم عصر معترضین میں قتیل سے پہلے آغا جان عیش 'عبدالقادر رامپوری' قطب الدین باطن اور عبداللہ خاں اوج کے نام مشہور ہیں۔ عیش نے ایک مشاعرے میں مرزا سے مخاطب ہو کر یہ قطعہ پڑھا تھا۔

اگر اپنا کہا ہم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ایک بار عبدالقادر رامپوری نے مرزا سے طنزاً دریافت کیا۔ "اس شعر کا مفہوم تو آپ سمجھے یا خدا سمجھے" (یادگار غالب) اور ان کا اصرار تھا کہ یہ شعر مرزا کے دیوان میں موجود ہے

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے بھینس کے انڈے میں ڈال

قطب الدین باطن تلمیذ نظیر اکبر آبادی، دیوان غالب کو "آمد نامہ" کہا کرتے تھے۔

عبداللہ خاں اوج نے دیوان غالب کو نامکمل اور بے معنی ہونے کا یوں طنز کیا۔

"ڈیڑھ بحر پر بھی ہوا مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا"

مولانا ابوالکلام آزاد نے غالب کے تین اور مخالفین احمد علی گوپا موسیٰ، مولوی احمد علی اور مولوی وجاہت علی کا انکشاف کیا (نقش آزاد ص ۲۷۹ بحوالہ غالب ص ۱۲۱ از مولانا غلام رسول مہر)۔ لیکن مالک رام نے (ذکر غالب ص ۸۷ میں) اسے آزاد کی غلط بیانی پر محمول کیا ہے۔

کلکتے کے دوران قیام اور اس کے بعد غالب کے جو نکتہ چیں پیدا ہوئے ان کی غالب شکنی کہیں زیادہ زور آور اور غالب کے لئے اضطراب کن ثابت ہوئی ان میں پہلا نام مرزا امان علی خاں غالب عظیم آبادی کا ہے۔

انہوں نے غالب کے جواب میں اپنا تخلص بھی غالب رکھ لیا تھا اور غالب کے پُرزے اڑانے پر تل گئے تھے۔ ان کا تذکرہ حالی کی "یادگار غالب" میں ملتا ہے نہ مکاتیب غالب میں۔ البتہ دوسرے حریف مرزا احمد بیگ کا ذکر تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ میں شامل ہے۔ غالب کے تیسرے اور سب سے بڑے حریف مرزا قتیل تھے۔ رام بابو سکسینہ مرزا صاحب سے مباحثے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پہلا مباحثہ اس طرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے بعض لوگوں نے ان کے کلام پر کچھ اعتراض کئے اور سند میں قتیل کے اقوال پیش کئے مرزا صاحب جن کا قول تھا۔

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را — چہ شناسد قتیل او واقف را

وہ بھلا قتیل کو کب ماننے والے تھے۔ انہوں نے کلام کی تائید میں اشعار اساتذہ اہلِ زبان پیش کئے اور کہا۔

دامن از کف کنم چگونہ را — طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روان معنی را — آں ظہوری جہان معنی را

مرزا نے جھنجلا کر یہاں تک کہہ دیا کہ "میں دیوان سنگھ فرید آباد۔

کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا"(یادگار غالب)

اس بات پر قتیل کے شاگرد اور خوشہ چین مرزا پر برافروختہ ہو گئے۔ افضل بیگ وکیل اور منشی عبدالکریم اہل کلکتہ کو غالب کے برگشتہ کرنے میں پیش پیش تھے۔ یہ ہنگامہ، یہ شورش مشاعرہ گاہ کی چہار دیواری تک محدود نہ رہی بلکہ معاملہ کوچہ و بازار تک پہنچ گیا تھا اور راستہ چلتے لوگ ان پر آوازیں کسنے لگے تھے۔ غریب الوطنی میں ان کا یہ دکھ بانٹنے والا کوئی نہ تھا مرزا نے "مثنوی باد مخالف" لکھ کر اپنے دل کا غبار نکالا۔ اپنے حریفوں کے ستم اور دوستوں کی وفائیں، تصویر کے دونوں رُخ پیش کئے اور اس طرح اردو ادب میں ایک اہم مثنوی نے مرزا کی تخلیق کی ذات و شخصیت کو لازوال و عدیم المثال بنا دیا۔

اس مثنوی کا انداز کچھ اس طرح ہے ۔

اے سخن پروران کلکتہ
اے زبان آوران کلکتہ

ہر یکے صدر بزم یار گہے
شمع خلوت سرائے کار گہے

بر غریباں کجا رواست ستم
رحم اگر نیست خود چراست ستم

دوستاں را اگر ز من گلہ است
کہ خرامت خلاف قافلہ است

می رویم از پے قتیل ہمہ
ساختہ مردرا دلیل ہمہ

آشتی نامہ و داد پیام ختم
شد والسلام والاکرام

مثنوی کے آخری شعر سے ظاہر ہے کہ "باد مخالف" کا نام پہلے "آشتی نامہ" رکھا گیا تھا۔ اس مثنوی نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ غالب کی مخالفت کا قلعہ اور مضبوط بنا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب (ص ۱۳۰) میں مثنوی کا رد عمل کچھ اس طرح بیان کیا ہے "معذرتوں اور مصالحت کوشیوں سے جس بات کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے اور غالب کی عذر خواہی بھی باوجود ادعائے مصالحت اپنے اندر کئی تیر و نشتر رکھتی تھی لہٰذا اس کی تصنیف سے کوئی اچھا اثر برآمد نہیں ہوا۔ وہ جب تک کلکتے میں رہے یہ معرکہ جاری رہا۔" حالی نے "یادگار غالب" میں "مجادلۂ اہل کلکتہ" کے عنوان سے غالب و قتیل کے معرکے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ واقعہ کس مقام پر ہوا اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لہٰذا یہاں یہ انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ مرزا قتیل کی زبان دانی کا مباحثہ بنگال کی سب سے بڑی علمی درسگاہ مدرسہ عالیہ کی پرانی عمارت واقع بیٹھک خانہ روڈ سیالدہ میں منعقد ہوا تھا۔ مدرسہ عالیہ کی موجودہ عظیم الشان دو منزلہ عمارت گورنر جنرل نے ۱۷۸۰ء میں مسلمانان بنگالہ کی تحریک و احتجاج پر تعمیر کرائی تھی۔

مرزا قتیل کے اعتراضات نے غالب کو عمر بھر پریشان اور مغموم رکھا اس لئے کہ اس معرکہ آرائی کے بعد غالب کے نکتہ چینوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جب کہ خود کثرت افکار روزگار اور مسائل حیات نے مرزا کو کشمکش کی منزل پر کھڑا کر دیا تھا ہر ایک سے نبٹنا غالب کے بس کا نہ تھا۔

"مرزا غالب کے حالات ایسے رہے کہ غدر سے پہلے ان کو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ وہ قتیل وغیرہ سے پورا پورا انتقام لے سکیں اور دیگر فارسی دانوں کا سارا غصہ صاحبِ "برہان بے قاطع" پر اتارا۔ کچھ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ باوجود کوشش کے وہ قتیل کی تحریرات میں کوئی واقعہ گرفت نہ کر سکے۔ بہر حال مرزا غالب نے برہان پر جا و بے جا اعتراضات کا طومار باندھ دیا۔"

سید اسد علی انوری فرید آبادی کی کتاب "قتیل و غالب" سے یہ اقتباس پیش کیا گیا ایک سو پینتیس صفحات کی اس کتاب (ناشر جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۳۹ء) کے تیس صفحات میں قتیل پر اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں اور باقی سو صفحات غالب کی نجی زندگی کلام نظم و نثر سے متعلق ایک طرفہ اعتراضات پر محیط ہیں۔ یہ کتاب مرزا کے مخاصمین کی حمایت اور مرزا کی سراسر مخالفت کی غرض سے لکھی گئی۔ اسد علی انوری کی غالب شکنی اور غالب دشمنی کا دندان شکن جواب صرف مالک رام نے لکھا ہے جو ماہنامہ ادبی دنیا لاہور کے شمارہ مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کلکتہ میں قتیل اور غالب کی معرکہ آرائی کے دیگر احوال کوثر چاند پوری کی کتاب جہانِ غالب ص ۸۳ تا ۹۸ میں بھی ملتے ہیں۔ ناشر غلام محمد مرحوم مکتبہ کائنات لاہور، تازہ معلومات کے لئے دیکھئے "قتیل اور غالب" مؤلفہ اسد علی انوری فضلی سنز کراچی ۱۹۹۸ء۔

مرزا قتیل تک بات ختم نہیں ہوئی۔ غالب کو اور بھی لوگوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس کی ایک کڑی "گلِ رعنا" تھی۔ گلِ رعنا کے مندرجات نے غالب کے مداحوں کا بھی ایک حلقہ پیدا کر دیا۔ سید قدرت نقوی نے "گل رعنا آشتی نامہ غالب" (نسخہ سید وصی احمد بلگرامی) کو ایک مفصل و مضبوط مقدمے کے ساتھ مرتب کیا۔ جسے سہ ماہی اردو میں انجمن ترقی اردو کراچی نے ۱۹۷۱ء میں شائع کر دیا ہے۔ اس مخطوطے کی ترتیب و تدفین کے وقت حسرت موہانی، مالک رام، مولانا امتیاز علی عرشی، سید معین الرحمٰن (نقوش غالب نمبر حصہ دوم) اور وزیر الحسن عابدی کے تمام نسخے قدرت نقوی کے پیش نظر رہے۔ انہوں نے ان نسخوں اور مخطوطات

کو زیر بحث لاکر نسخہ وصی احمد بلگرامی کا بھرپور جائزہ پیش کیا جس کے مطالعے سے کلکتہ میں غالب کے قیام کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے ساتھ ہی غالب کے دوست اور دشمن دونوں کے چہروں سے نقاب اٹھتا ہے۔ سید قدرت نقوی ص ۳۰۲ پر لکھتے ہیں :

"مولوی سراج الدین علی خاں نے غالب سے اردو اور فارسی کلام کے انتخاب کی فرمائش کی جسے غالب نے ایک دیباچہ و خاتمہ لکھ کر مرتب کر دیا اور "گل رعنا" نام رکھا۔ حاسدوں کی مخالفت اور اعتراضات بہی خواہوں کی داد و تعریف و ہمت افزائی نے اس انا اور احساس تفوق و برتری میں شدت پیدا کی جو بد و شعور سے غالب کے ذہن کا ایک جزو غالب تھا"۔

غالب کی ذہنی الجھنوں میں ابھی کوئی کمی ہونے نہ پائی تھی کہ "گل رعنا" کا ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ مرزا جب کلکتہ سے واپس دہلی گئے تو وہاں کچھ دنوں خاموشی رہی لیکن ان کی تیرہ بختی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک فارسی لغات مرتبہ محمد حسین تبریزی دکنی کا مطالعہ مرزا کے لئے ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور اس کے جھونکے کلکتے کی بار مخالف سے جا ملے۔ اس تشویشناک داستان کی اصل وجہ یہ ہے کہ غالب نے ۱۸۶۰ء میں برہان قاطع کے حاشیئے میں بے شمار اغلاط کی نشان دہی کی جو قاطع برہان کے نام سے ۱۸۸۲ء میں منشی نول کشور کی جانب سے شائع ہوئی۔ "قاطع برہان" کا وہ قلمی نسخہ جس کے حاشیئے میں غالب نے اصلاحیں کیں اور تشریحات لکھیں، رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔

"قاطع برہان" کی اشاعت کے بعد غالب پر چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی۔ قاطع برہان کے جواب میں سب سے پہلی کتاب سید سعادت علی نے محرق قاطع برہان کے نام سے لکھی اس زمانے میں غالب کی حمایت میں بھی تین کتابیں منصۂ شہود میں آئیں۔ رافع ہذیان از نجف علی فارسی میں لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم اردو میں، لطائف غیبی میاں داد خاں سیاح کے نام سے منظر عام پر آئی لیکن اس کے اصل مصنف خود مرزا غالب ہی تھے۔

قاطع برہان پر ایک اور تنقید مرزا رحیم بیگ میرٹھی نے ساطع برہان کے نام سے لکھی، مرزا غالب کب خاموش رہ سکتے تھے انہوں نے ساطع برہان کا جواب بھی لکھا اور اس کتاب کا نام "نامۂ غالب" رکھا بعد میں مرزا نے قاطع برہان پر نظر ثانی کی اور اسے دوبارہ درفش کاویانی کے نام سے چھپوایا۔

جواب الجواب کا طویل سلسلہ چل پڑا محمد حسین تبریزی مؤلف برہان قاطع کی تائید میں ۱۸۶۷ء میں امین الدین دہلوی نے "قاطع القاطع" اور آقا احمد علی کلکتوی نے "موئید برہان" نامہ غالب نے آقا احمد علی کے اعتراضات کے مزید جوابات لکھے اور یہ کتاب موسوم بہ تیغ تیز ۱۸۶۷ء میں اہل ذوق کے ہاتھوں میں آئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کلکتہ کے فدا سلہٹی نے "تیغ تیز تر" غالب کے "تیغ تیز" کی کاٹ میں لکھی تھی۔ پھر غالب نے آقا احمد علی کے وار کا جواب ایک قطعہ کی شکل میں کلکتہ میں دینا چاہا جس نے نثر تو نثر نظم میں بھی سوال و جواب اور بحث و مباحثے کی راہیں کھول دیں۔ ستم یہ ہوا کہ یہ قطعات منظوم مباحثے اور دوسری متنازعہ تحریریں سنت پرشاد پریس، آرا کے تحت ۱۸۶۷ء میں چھپ گئیں۔ بعد میں غالب اور آقا احمد علی کے یہ منظوم مباحثے سہ ماہی اردو ۱۹۳۷ء میں دوبارہ چھپے اور اب سید قدرت نقوی کے ایک مضبوط مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہو چکے ہیں۔

سید سعادت علی نے "محرق قاطع برہان" میں غالب کی شان میں نازیبا اور دل آزار الفاظ استعمال کئے تھے۔ غالب نے ان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا لیکن دوستوں کے مشوروں سے مقدمہ واپس لے لیا گیا اور صلح ہو گئی۔ سجاد علی خاں کا بیان ہے کہ "قاطع قاطع" کے مصنف مولوی امین الدین نے بھی مرزا کے لئے بڑے فحش اور ناشائستہ الفاظ استعمال کئے تھے۔ ان پر مرزا نے ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ بھی کیا لیکن مقدمہ کا فیصلہ مرزا کے خلاف ہوا۔

ماہنامہ انشاء کا
اسکنڈے نیویائی ادب نمبر
۶۲۴ صفحات
قیمت اندرون ملک : ۳۰۰ روپے
قیمت بیرون ملک : Us$ 30 or £ 20
فوراً حاصل کیجئے۔

نعیمہ ضیاء الدین (جرمنی) کے شہکار افسانوں کا مجموعہ
قیمت ڈی لکس ایڈیشن انڈیا میں -/160 روپے
ناشر : انشاء پبلی کیشنز
25B، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ - 700 073

'آخری داستان گو' — ایک تجزیہ

بلراج کومل
E-139, Kalkaji
New Delhi - 110 019

افسانہ نگار، ناول نگار مظہر الزماں خاں نے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ہارا ہوا پرندہ' ۱۹۷۸ میں شائع کیا تھا اور اپنا پہلا ناول 'آخری زمین' ۱۹۸۶ میں۔ ان کی زیر اشاعت تصانیف میں ڈراموں کا ایک مجموعہ 'زمین پر پڑی ہوئی رات' افسانوں کے دو مجموعے 'شب پوش مکان پر آخری بانگ'۔ 'سنسر شدہ نسل' اور ڈائری کے اوراق کا مجموعہ 'ابرک کے سورج' شامل ہیں۔ ان کی زیر ترتیب تصانیف کی فہرست میں چونکہ ڈرامے اور ڈائری کے اوراق بھی شامل ہو گئے ہیں اس لئے ان کا شمار عصری اردو ادب کے ہمہ جہت قلم کاروں میں کرنا مناسب ہوگا۔ ''آخری داستان گو'' ان کا تازہ ترین ناول ہے جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے اور رفتہ رفتہ قارئین اور ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

مظہر الزماں خاں کے تازہ ترین ناول کا نام اگرچہ واقعتاً 'آخری داستان گو' ہے لیکن انہوں نے ایک ضمنی نام 'نئی الف لیلیٰ' بھی ناول کے اصل نام کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ شاید یہ ضمنی نام ایک کلیدی اشارے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ الف لیلیٰ کی روایت سے ہم سب واقف ہیں۔ نئی الف لیلیٰ کی ضرورت مظہر الزماں خاں کو شاید اس لئے محسوس ہوئی ہے کیونکہ جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں وہ عصری نوعیت کی ہونے کے باوجود ممکن ہے غالباً داستانی انداز میں بہتر طریقے سے کفیل ترسیل ہو سکتی ہے۔ حکایات بذات خود فکشن بھی ہیں اور فکشن کے ہتھیار بھی۔

الف لیلیٰ میں دو بنیادی کردار ہیں سلطان شہریار اور شہزاد۔ سلطان شہریار ہر شام ایک نئی عورت کے ساتھ شادی کرتا ہے اور اگلی صبح اسے قتل کر دیتا ہے۔ حاسد اور ظالم سلطان کا یہ سلسلۂ ازدواج جاری رہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ قتلِ زوجہ کا سلسلہ بھی۔ لیکن جب شہزاد اس سلسلے میں داخل ہوتی ہے تو وہ داستان در داستان سنانے کی صلاحیت سے پہلے تو اپنے متوقع انہدام کو کامیابی سے ملتوی کرتی رہتی ہے اور پھر بالآخر سلطان کے تین جانشین پیدا کرنے کے علاوہ سلطان کو ارادۂ قتل ترک کرنے کی راہ پر لے آتی ہے۔ مظہر الزماں خاں کے ناول کا بنیادی مسئلہ الف لیلیٰ کی شہزاد کے مسئلے سے مختلف ہے حالانکہ شہزاد مظہر خاں کی نئی الف لیلیٰ میں بھی موجود ہے۔ مظہر الزماں خاں کی شہزاد نے اپنی مرکزی حیثیت کہانی کاروں کی ایک کھیپ کو منتقل کر دی ہے جو ایک کے بعد ایک کہانی سناتے جاتے ہیں اور دم توڑتے جاتے ہیں۔ وہ اصل الف لیلیٰ کی اصل شہزاد کی طرح نہ تو اپنی موت کو ملتوی کر پاتے ہیں اور نہ ہی اس امکان کی تجسیم پر قادر نظر آتے ہیں کہ وہ اس شخص کو کامیابی سے غلبۂ خواب یعنی نیند سے لازمی طور پر بچا سکیں گے۔ مظہر الزماں خاں کے ناول میں شہزاد اور کہانی کاروں کے علاوہ جو بھی کردار ہیں ان میں سگریٹ پینے والا شخص مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شخص صورت حال کے بنیادی قصے کا مکمل ادراک رکھتا ہے اور مسئلے کے تصفیے کے علاوہ کہانی کاروں کو کہانی کہنے۔ ایک کے بعد ایک کہانی کہنے کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ شہزاد کا پیٹ پھولا ہوا ہے اور وہ اس پودے سے کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی ہے جس پر پھول کبھی کھل رہے ہیں اور کبھی مرجھا رہے ہیں۔ کہانی کار اپنی کہانیوں میں خبریات و تفصیلات، واقعات، عمل، رد عمل، انسانی، کائناتی رشتوں اور مظاہر کی مدد سے وہ سب کچھ کہتے جاتے ہیں جس کا تعلق حیات و مرگ کی بنیادی نوعیتوں سے ہے۔ لیکن اصل الف لیلیٰ کی اصل شہزاد جبکہ ایک داستاں کے نامکمل انجام سے ایک نیا آغاز وضع کرنے کا فن جانتی ہے، یا نئی الف لیلیٰ کے کہانی کار کہانیوں کی ریل پیل میں ایک کے بعد ایک موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آخری کہانی کار، سگریٹ پہ سگریٹ پینے والا کہانی کار جب اپنی کہانی شروع کرنے سے پہلے اپنے ہاتھ پہ باندھی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھتا ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ گھڑی کے کانٹے، غائب ہو چکے ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل میں نے اس مقصد سے پیش کی ہے کہ اصل الف لیلیٰ کے مقابلے میں نئی الف لیلیٰ کے خاکے کے کچھ نقوش اجاگر کر سکوں۔ نئی الف لیلیٰ کے کچھ اور پہلو بھی کہانی پڑھتے ہوئے مسلسل متوجہ کرتے ہیں۔ ایک کٹے ہوئے سر والا لہولہان مرغ بھی ہے جو کہانیوں کے سلسلے کے درمیان متواتر دندناتا نظر آتا ہے۔ اس پودے کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں جس پر پھول کبھی کھل رہے ہیں اور کبھی مرجھا رہے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے یہ سارا داستانی

اہتمام مظہر الزماں خاں نے آخر کیوں کیا؟ اصل الف لیلیٰ کی شہزاد جس کا مسئلہ اپنے انہدام سے نجات حاصل کرنا تھا مظہر الزماں خاں کے یہاں پھولے ہوئے پیٹ والی شہزاد کیون بن گئی؟ دنیازاد کون ہے؟ وہ شخص کون ہے جس کو جگائے رکھنے کے لئے کہانیوں کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ وہ شخص کون ہے جو سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا ہے؟ کہانی کار کیوں اس شخص کے حکم کی تعمیل میں ایک کے بعد ایک کہانی سنائے چلے جاتے ہیں اور مرتے چلے جاتے ہیں۔ جب ایک کہانی کار مر جاتا ہے تو دوسرا احتجاج کیوں نہیں کرتا اور کہانی سنانے سے انکار کیوں نہیں کرتا؟ کیا سارے کے سارے کہانی کار مجموعی طور پر ایک کردار کی حیثیت رکھتے ہیں یا فرداً فرداً زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف مسائل و مظاہر کے متکلم نمائندے ہیں؟

ان سب سوالوں کی روشنی میں میرا اندازہ ہے مظہر الزماں کا ناول ایک ایسی شعری نوعیت اختیار کر لیتا ہے جس کی کوئی قطعی تفسیر یا تشریح ممکن نہیں ہے۔ مجموعی طور جو زندگی مصنف نے اپنے ناول کے صفحات کے توسط سے ہمارے سامنے پیش کی ہے وہ بیک وقت حیاتِ انسان کی بنیادی اور عصری نوعیت لئے ہوئے ہے۔ انسانی رشتوں کے عروج و زوال تضاد و تفاوت، توازن و عدم توازن کی رفتار و یلغار وہی ہے جو روزِ ازل سے لے کر عصرِ حاضر تک جاری و ساری ہے سلطان اور شہزاد قلبِ ماہیت سے ایک نئی صورت حال میں ڈھل گئے ہیں۔ شہزاد کے پھولے ہوئے پیٹ میں یا تو امکان نوپل رہا ہے یا پھر نطفۂ بے جاں سلطان نے غالباً ایک قریب المرگ شخص کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ سگریٹ پینے والا شخص کہانی کاروں کے قبیلے کا فرد بھی ہے اور اپنے انفراد کا مالک بھی۔ لیکن یہ سب مجموعی طور پر سسی فس کی سی نوعیت میں ڈھل جاتے ہیں اور متوقع انہدام کو ہر قیمت پر ٹالنا چاہتے ہیں۔ ان سب لوگوں کی کوشش اگرچہ اسیرِ وقت ہے لیکن سگریٹ پینے والے کہانی کار کی باری آنے تک شاید ماورائے زمان و مکاں چلی گئی ہے۔ لیکن زندگی کے تسلسل کا مظہر کٹے ہوئے سر والا وہ مرغ ہے جو نصف سر کٹ جانے کے بعد بھی لہو لہان حالت میں سرگرم سفر ہے۔ یا پھر وہ پودا ہے جس پر چند پھول کبھی کھل رہے ہیں، کبھی مرجھا رہے ہیں۔

داستانی طریق کار اردو فکشن کے لئے نیا نہیں ہے۔ اس کے خبر دی اور حاوی انداز کے استعمال کی مثالیں ہمارے یہاں فکشن کی پوری روائت میں ہمیشہ سے موجود ہیں۔ عصری ادب کے تعلق سے انتظار حسین کی مثال سامنے کی کامیاب مثالوں میں سے ایک ہے مگر مظہر الزماں خاں کے ناول کے متن کے اندر ایک دوسرا متن ہے جو کامیاب بیانیہ سے منزلِ ترسیل پر پہنچا ہے۔ اور انسان کی مسلسل کوشش۔ مسلسل جدوجہد، مسلسل تلاش اور مسلسل درد و کرب کی تصویر بن گیا ہے۔ مظہر الزماں نے ناول کے صفحہ ۴ پر ایک زائچہ شائع کیا ہے جس میں انگشت ہابیل، انگشت قابیل، سانپ ڈسے آدمی کی انگشت آخری داستان گو اور مظہر الزماں کی موجودگی کو دکھایا گیا ہے۔ صفحہ ۴ پر اس زائچے کے علاوہ ایک بیان بھی ہے، جو کچھ اس طرح ہے:

"ہابیل بھی مظہر الزماں خاں ہے، اور قابیل بھی مظہر الزماں خاں ہے۔ سانپ ڈسا ہوا آدمی بھی، مظہر الزماں خاں ہے اور 'آخری داستان گو' بھی مظہر الزماں خاں ہے۔" مختلف متضاد و موافق جہات کا مجموعہ مظہر الزماں خاں اس سطح پر محض فرد نہیں رہتا بلکہ تجسم کے عمل میں ان کی، تجرید کو خیر باد کہہ کر انسانی مقدر کی نوعیت کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔

آخر داستان گو نے جہاں کہانی کو ختم کیا ہے۔ ٹھیک اسی مقام سے ہم سب کو ایک نئی کہانی کا آغاز کرنا ہوگا۔ صرف اس سعیٔ مسلسل سے ہم موت پر فتح حاصل کر سکتے ہیں۔

ف۔ س۔ اعجاز
کا
مجموعۂ غزلیات
ھندی میں
बदल रहा है
(منظرِ عام پر آچکا ھے)
قیمت =/100 روپے

خوابوں کے اسرار
انگریزی سے اردو میں ترجمہ کردہ
نفسیاتی مضامین!
مترجم: ف۔ س۔ اعجاز
طبعزاد مقالہ
"ادب میں خواب کے اجزاء"
بھی شاملِ کتاب ہے۔
قیمت: -/200 روپے
(ڈی لکس ایڈیشن) اندرونِ ملک

ف۔ س۔ اعجاز
کا
مجموعۂ منظومات
صاحبِ فن
شائع ہونے والا ہے۔

تبصرۂ کتب

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں)

نام کتاب : گستاخی معاف (مزاحیہ مجموعۂ کلام)
شاعر : نظر برنی
ناشر : ادبی سنگم، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵
قیمت : ۱۰۰ روپے
مبصر : فضیل صدیقی

نظر برنی احتجاجی مزاحیہ شاعر ہیں لیکن ان کے احتجاج میں کوئی چیخ، کوئی نعرہ بازی یا خطابت نہیں ہے بلکہ اشاروں کنایوں کے ساتھ ساتھ واقعات و سانحات کے شیریں کیپسول بھی موجود ہیں۔ "گستاخی معاف" میں انہوں نے طنز سے بھرپور قطعات اور منظومات کا انتخاب شامل کیا ہے۔ اُردو شاعری میں طنز کا استعمال جدت طرازی نہیں ہے بلکہ جعفر زٹلی سے لے کر آج تک بے شمار شعراء نے اس روایت کا جھنڈا بلند کیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہے کہ اردو شاعری میں اکبر الہ آبادی طنز و مزاح کے اکبر اعظم ہیں......اب ممکن ہے کوئی اکبر پیدا نہ ہو سکے لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ نظر برنی کا یہ مجموعہ دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ایسے اکبر زادے ضرور پیدا ہو رہے ہیں جو عصرِ حاضر کی زندگی اور اس کے ہوش ربا تضادات کے بارے میں اپنے احتجاجی جذبات کو طنز کے نوکیلے نشتروں میں ڈھال سکتے ہیں۔

"گستاخی معاف" کے مشمولات میں چوہتر (۷۴) قطعات اور انہتر (۶۹) منظومات ہیں۔ متعدد نظموں کے ساتھ دلچسپ کارٹون بھی شامل ہیں جو یقیناً قارئین کے لئے دلچسپی اور لطف کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ نظر برنی کا سماجی و سیاسی مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے لیڈران افسران اور کارکنان کی شخصیت اور کارکردگی کا جس گہرائی سے تجزیہ کیا ہے وہ پہلے کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔

نظر برنی نے ناقص معاشرے، کرپٹ افسران، مکار سیاستدانوں اور نامساعد حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ خوشامد اور رشوت، زندگی کو کامیاب بنانے میں جو اہم رول ادا کرتے ہیں، اسکو کون نہیں جانتا۔ نظر برنی کے بیشتر کلام میں یہی دونوں سماجی "اوصاف حمیدہ" حاوی نظر آتے ہیں۔

دفاتر کے اناڑی ساتھیو! یہ غور سے سن لو!
لیاقت میں رکھا کیا ہے دیانت میں دھرا کیا ہے؟
خوشامد تم کرو ایسی کہ ہر "سی آر" سے پہلے
خود افسر تم سے یہ پوچھے، "بتا تیری رضا کیا ہے"؟

سامنے "راج شری" ہو تو غزل ہوتی ہے
ورنہ شیشے میں "پری" ہو تو غزل ہوتی ہے
"فاقہ مستی" میں تو اک شعر نہ نازل ہوگا
جیب رشوت سے بھری ہو تو غزل ہوتی ہے

یا اپنی ایک نظم "ملتے جلتے آتے جاتے" میں دفتروں کے "بابوؤں" کے طرز عمل اور خوشامد کے ذریعہ اپنے مفادات کی تسکین کی منظر کشی اس طرح کی ہے:

رشوت سے یارانہ کرتے، صاحب تم سے خوش ہو جاتا
خود کھاتے اور اسے کھلاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

بیگم سے چھیڑ چھاڑ، اسکی میکہ نواز طبیعت اور سسرال کے اعزاء کے مضحک پہلوؤں پر چٹکیاں لینے کا کام ہر مزاح نگار کی طرح نظر برنی نے بھی کیا ہے۔ "......سواب بھی ہے" میں انہوں نے اپنی بیگم کی کردار نگاری کس خوبصورتی سے کی ہے۔

بُڑھاپے میں بھی اُن کو شوق ہیں عہد جوانی کے
لِپ اسٹک کی خریداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
کبھی ہے ساس کا رونا کبھی نندوں سے ہے جھگڑا
زباں ہے اس کی دودھاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
فقط اپنے ہی میکے کی کیا کرتی ہیں تعریفیں
میری اماں سے بیزاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

آزاد ہندوستان میں لیڈروں نے قیادت اور سیاست کو اپنے پراگندہ کردار سے جتنا داغدار کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ چونکہ مزاح نگار شاعر اپنے معاصرانہ ماحول سے چشم پوشی نہیں کر سکتا اسلئے وہ سیاست والوں کو آڑے ہاتھوں لینے میں پہل کرنے سے نہیں چوکتا۔ نظر برنی کے قطعات اور نظموں میں سیاسی رہنماؤں کی بد عنوانیوں، وعدہ خلافیوں، آلودگیوں اور کردار کی بے شمار خرابیوں کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے۔ بقول احمد جمال پاشا نظر برنی نے سیاسی اور معاشری پہلوؤں سے خوشامد کو اپنے طنز کا بھرپور نشانہ بنایا ہے۔ صرف خوشامد ہی کیوں، اقدار حیات کی پامالی، ریاکاری، کھوکھلے پن، بزدلی، دوغلے پن، خود گیری، تنہا نوردی، خواہش

پرستی، نمائشی نعروں، سیاسی بے عملی اور آزادی کے استحصال کو طنز اور تحریف کا نشانہ بنایا ہے۔

OOOOO

نام کتاب : کیول دھیر کی کہانیاں
مصنف : ڈاکٹر کیول دھیر
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : ادب انٹرنیشنل، لدھیانہ
ملنے کا پتہ : ۹۲۲ کوچہ روح اللہ خاں۔ دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
مبصر : مشتاق انجم

ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانوں کا مجموعہ پڑھتے وقت یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بیانیہ ان پر حاوی ہے۔ وہ ادب میں کسی دوسرے ٹرینڈ سے متاثر نہیں۔ پریم چند۔ کرشن چندر اور رام لعل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اپنی کہانیوں میں منظر کشی، کردار نگاری اور پلاٹ پر خاصی توجہ صرف کرتے ہیں۔ وہ عصری تقاضوں کو برتنے کا فن جانتے ہیں۔ مگر ادب میں کروٹیں لینے والے نظریات و تحریکات سے شعوری یا لاشعوری طور پر پہلو تہی کرتے ہیں۔

ہر بڑا کہانی کار اپنے اسلوب، طرز بیان اور موضوعات کے انتخاب سے پہچانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر کے یہاں بھی کچھ باتیں ایسی نظر آتی ہیں جن سے کہانی کے پردے میں سرگرم سفر فنکار کا چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ انہیں کہانیاں کہنے کا فن آتا ہے۔ کہانی کی بنت پر وہ خاصا وقت صرف کرتے ہیں۔ موضوعات سے انصاف کرتے ہیں اور محنت و مشقت کے دور سے گزرنے کے بعد کہانی کو قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنا کہانی کے کرداروں کے زخموں کو ادب کے نشتر سے عمل جراحی سے گزارنا۔ ان کے غم و شادمانی میں قاری کو شریک کرنا اور حسن بیان سے انہیں ادب کا مرقع بنانا کیول دھیر کے فن کی خوبی ہے جو لائق ستائش ہے۔ ان کے سلسلے میں معروف افسانہ نگار عصمت چغتائی کی رائے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "کیول دھیر ایسے ڈاکٹر ادیب ہیں جو چیر پھاڑ اور کڑوی دواؤں کے ساتھ انسان کے جسم ہی کو نہیں دل کو بھی دیکھتے ہیں، آلہ سے نہیں احساس کی قوت سے۔ خدا ان جیسے ادیب ڈاکٹر پیدا کرے یہ ملک بڑا بیمار ہے"۔

مجموعہ میں شامل بکھری ہوئی زندگی، کمپی ٹیشن، حادثہ، بد چلن، رشتوں کی پہچان وغیرہ کہانیاں اپنے موضوع اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے پسند آتی ہیں۔ کیول دھیر بنیادی طور پر اخلاقی قدروں کی پامالی، نئی نسل کی سردمہری اور بے حسی کو زیادہ فلیش کرتے ہیں۔ گھڑی بھر کے لئے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں ہماری جڑیں کہاں ہیں اور شاخیں کہاں تک پہنچ رہی ہیں۔ اکثر ان کی تحریروں میں سماج اور ماحول کے خلاف دبی دبی چیخ سنائی دے جاتی ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہیں کہ کیول دھیر کی کہانیاں ان ہی چیخوں سے ابھرنے والی اذیت سے عبارت ہیں۔ اس ضمن میں ان کی کہانی 'انتقام' کا نام لیا جا سکتا ہے جہاں کسی وزیر کے پاس ایک معصوم لڑکی مدد کے لئے آتی ہے اور بد قسمتی سے اس کی ہوس کا شکار ہو کر خود کشی پر مجبور ہو جاتی ہے لیکن وزیر کا پرائیویٹ سکریٹری جو ایک باضمیر انسان ہے اس حادثے سے بری طرح متاثر ہوتا ہے اور وزیر سے ایسا انتقام لیتا ہے کہ قاری شدید جھٹکے سے دوچار ہو جاتا ہے۔ یہی انتقامی جذبہ الگ انداز سے "میں شرمسار نہیں ہوں" میں کلائمکس پر پہنچ گیا ہے جہاں حالات کے بے رحم شکنجے میں پھنسی ہوئی ایک مجبور لڑکی اپنی بربادی کے ذمہ دار لوگوں سے بھیانک انتقام لیتی ہے اور اس نتیجے پر پہنچتی ہے۔

"میں پریتی ہوں، میں منتظر ہوں ان لمحوں کی جب قانون یہ فیصلہ کرے گا کہ انسان اور انسانیت کا قتل میں نے کیا ہے یا ان لوگوں نے جنہیں میں قتل کر چکی ہوں۔"

اپنی ایک دوسری کہانی 'ہم دونوں' میں کیول دھیر نے تقسیم ہند سے پیدا شدہ المیہ اور اس کے بعد کی جنگ کے پس منظر میں احمد اور کہانی کے مرکزی کردار کے توسط سے محبت اور انسان دوستی کا درس دیا ہے۔ اسی طرح رشتوں کی پہچان، میں بھی جسمانی رشتوں سے اوپر اٹھ کر محبت اور انسانیت کی بات اچھوتے انداز میں دہرائی ہے۔ جہاں کہانی کا مرکزی کردار ڈاکٹر پنجاب میں فسادات کے ماحول میں گھرا ہوا ہے اور بہار کے کسی گاؤں میں بیٹھا اسکا عزیز سابق ملازم بذریعہ خط اسکی خیریت پوچھتے ہوئے لکھتا ہے

"آپ کا اپنا ایک گھر یہاں بھی ہے۔ آپ کے بیٹے ندیم کا۔ اس گھر سے اس گھر میں چلے آیئے۔"

"میری نم آنکھیں جذبوں کی نمی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکیں۔ اور بہہ پڑیں۔ بے اختیار ندیم کے خط کو چومتے ہوئے میں نے کانتا (بیوی) کی طرف بڑھا دیا۔ میرے بھیگے بھٹکتے احساس کی ترنگوں کو سچ مچ ہی پہچان مل گئی۔ ان رشتوں کی پہچان جو سب سے بلند ہیں اور جو اٹوٹ ہیں"۔

فساد کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی 'لہو کا رنگ' بھی متاثر کرتی ہے جو خود غرض اور نام نہاد رہنماؤں کا پول کھولتی ہے اور قومی دھارے میں رہ کر مل جل کر زندگی کرنے کا درس دیتی ہے۔

OOOOO

نام کتاب : خواتین ہند کے تاریخی کارنامے
مولف : فضل حق عظیم آبادی (ریٹائرڈ اے۔ڈی۔ایم)
قیمت : مجلد ۸۰؍روپے، غیر مجلد ۶۰؍روپے
ملنے کے پتے : (۱) مکتبہ امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔۸۰۱۵۰۵
(۲) بہار پبلی کیشنز، نیا ٹولہ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴
مبصر : رضوان احمد ندوی

ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ خواتین ہند کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔اس ملک کی خواتین نے ہندوستان کی جنگ آزادی اور دیگر ترقیاتی کاموں میں جو کارنامے انجام دیئے وہ انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھے جن کی مثال ہمیں آج کے معاشرے میں مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان محبِّ وطن اور بہادر خواتین کی قومی وسیاسی جدوجہد اور تاریخی کارناموں پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ جناب فضل حق عظیم آبادی قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے تاریخ کے منتشر اوراق سے مختلف مکاتب فکر و نظر اور مذہبی فرقے کے ۱۹۰ خواتین کے سوانحی خاکے اور ان کی قومی و ملی خدمات پر مشتمل ایک جامع کتاب "خواتین ہند کے تاریخی کارنامے" مرتب کی ہے جس میں قدیم بھارت سے جدید ہندوستان تک کی خواتین کی سیاسی وفکری زندگی کے تذکروں کے ساتھ ان کی فکری، معاشرتی اور تمدنی حالات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ان خواتین میں بعض کا سیاسی افق پر ممتاز مقام ہے جبکہ کچھ وہ بھی ہیں جو گمنامی کی زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

زیر تبصرہ کتاب کا انداز بیان اور جابجا بر محل خوبصورت اردو اشعار کی شیرینی اتنی دلکش اور اثر انگیز ہے کہ ذوق و وجدان جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ایک مضمون مکمل نہیں ہوتا کہ دوسرا مضمون پڑھنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی، وائس چانسلر متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے تہنیتی کلمات، پروفیسر طلحہ رضوی برق کی تقریظ، پروفیسر محمد مصلح الدین کا احوال واقعی اور پروفیسر لطف الرحمٰن، وزیر برائے اقلیتی فلاح بہار کے تعارفی خاکے نے کتاب کی قدر و قیمت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

ماضی میں فضل حق عظیم آبادی صاحب کی ایک کتاب "مولانا محمد علی جوہر، ایک عہد ساز شخصیت" شائع ہو چکی ہے جس نے علم و تحقیق کے حلقوں میں اپنا مقام پیدا کیا ہے۔امید ہے کہ حسب سابق زیر تبصرہ کتاب بھی ارباب فکر و دانش کی نگاہ میں قبولیت حاصل کرے گی اور بقول پروفیسر محمد مصلح الدین "ارباب اقتدار اسے مختلف بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل کرانے کی کوشش کریں گے"۔

OOOOOO

نام کتاب : اردو ادب (سہ ماہی) ذوق نمبر
اڈیٹر : اسلم پرویز
مطبوعہ : انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔۲
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

۳۶۸ صفحات پر محیط زیر نظر کتاب شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی حکایت ہستی۔ فن شعر گوئی۔ان کے مزار کے علاوہ غالب کے مزار کی بھی تلاش اور بازیافت کا تفصیلی جائزہ ہے۔ ایڈیٹر کے مطابق اس کے اجرا کا مقصد "دراصل اہل اردو کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ انیسویں صدی کے دبستان دہلی کی ادبی تاریخ کا خاکہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اردو کے محقق اور نقاد غالب اور مومن کی طرح ذوقؔ کو بھی اپنی توجہ کا مرکز نہیں بناتے۔"

پیش لفظ کے بعد ص ۹ سے ص ۱۲۰ تک "غالبؔ اور ذوقؔ کی داستان" شاہد ماہلی نے بڑی کدوکاوش سے تحریر کی ہے۔اس میں انہوں نے ان اہم دستاویزات کو بھی شامل کیا ہے جو ان مزاروں کی تلاش کے سلسلے میں عدالت میں چل رہے مقدمہ کی سماعت کے دوران تیار کی گئی تھیں۔ یہ مشکل اور اہم ترین کام ڈاکٹر خلیق انجم کے علاوہ دوسرے بہت سے فدایانِ اردو کی انتھک کوششوں سے انجام پذیر ہو سکا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی لگن اور محنت کو سراہتے ہوئے شاہد ماہلی نے سپریم کورٹ کے نامور وکیل طاہر صدیقی کے قومی آواز میں شائع شدہ مراسلے کا یہ اقتباس بھی پیش کیا ہے "مزار غالب پر جھگیاں پڑی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔۔۔اردو داں طبقہ کو ڈاکٹر خلیق انجم کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے دہلی میونسپل کارپوریشن کے جھوٹ کی پول کھولی اور جناب جسٹس کلدیپ سنگھ اور سید صغیر احمد کو اس سچائی سے مطمئن کرایا کہ ذوقؔ دہلوی مرحوم کا مزار لیٹرن کی جگہ پر ہے" اس تفصیلی ذکر کے علاوہ گیارہ دیگر مشاہیر کے نہایت پر مغز مضامین اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

فراقؔ نے ایک مضمون ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا اس کے سات برس بعد ۱۹۴۴ء میں انہوں نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ یہ سات برس کا وقفہ اس مضمون کی وجہ تسمیہ ہے۔اس طویل مضمون میں انہوں نے ذوق کے اشعار کا تجزیہ کر کے ان کی رمزیت کی تہہ داریوں تک پہونچنے کے نئے دریچے کھولے ہیں۔اس کے علاوہ میرؔ، غالب اور مومنؔ کے اشعار کی میزان پر کلام ذوقؔ کو پرکھ کر ان کی ادبی اور فنی قدر و قیمت واضح کی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ذوقؔ کی غزل کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کا ناسخؔ،

غالب اور مومن سے موازنہ کر کے مفید مآخذ فراہم کیا ہے۔ اسی عنوان کے اپنے مضمون میں محمد ذاکر نے غزلیات ذوق کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ”ذوق کے یہاں نہ تو لفظوں کی قدر آفرینی نظر آتی ہے، نہ غالب کی ندرت مضامین، نہ مومن کی معاملہ بندی اور نہ نظیر کے ایسے اخلاقی مضامین۔ البتہ روز مرّہ کا استعمال وہ قابل داد کرتے تھے“۔ روز مرّہ کے استعمال کے بارے میں نثار احمد فاروقی کا کہنا کہ ”ایسے اشعار لغت سند درج کرنے کے لئے تو ہو سکتے ہیں مگر ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کچھ نہیں ہوتی ”زیادہ وقیع ہے۔ نریش کمار شاد کا ”عالم خیال میں ذوق سے انٹرویو“ نہایت دلچسپ ہے۔ اسلم فرخی نے تدوین دیوان ذوق کے وقت طلب سفر میں دیوان ذوق اور آب حیات میں مندرجہ اشعار ذوق کو نمایاں کیا ہے۔ انہوں نے آزاد اور ویران کے متون کا بھی جائزہ لیکر یہ انکشاف کیا ہے کہ ”صرف اضافہ ہی نسخۂ آزاد کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اصل خصوصیت متن کا حد سے بڑھا ہوا اختلاف ہے“۔ مضمون نگار نے چودہ غزلوں کی ایک فہرست بھی دی ہے جو خود آزاد کی کہی ہوئی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آزاد کے اس اجرِ معلم، (گرود کھنا) نے ذوق کے خدوخال کو بری طرح مسخ کر دیا ہے۔ مضمون پر مغز اور مدلل ہے۔ لیکن اس ضمن میں نثار احمد فاروقی کا قول زیادہ معتبر لگتا ہے ”کہ اس وقت تک تحقیق و تدقینِ متن کے وہ اصول رائج نہیں تھے جن سے ہم آج متون کی پرکھ کرتے ہیں۔ اس لئے محمد حسین آزاد پر بدنیتی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا“۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ آزاد افراط و تفریط اور مبالغہ آرائی کے خوگر تھے۔ چنانچہ ان کی اس روشنیٔ طبع نے ان کی نیک نیتی کو بھی مشکوک بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مضمون میں غالب کے تین ادبی معرکوں کا ذکر کیا ہے۔ اردو کا معرکہ ذوق سے متعلق ہے۔ ذوق بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ اس لئے جو فوقیت ان کو ملی ہوئی تھی غالب اس سے محروم تھے۔ حالانکہ ذوق غالب کے ہم پلہ نہیں تھے پھر بھی قلعہ سے وابستگی نے انہیں جو عروج بخشا تھا وہ غالب کے حصہ میں نہیں آیا تھا۔ غالب اس محرومی کے شاکی اور اس قدر ناشناسی سے نالاں تھے۔ ظفر تک ان کی نارسائی چند سیاسی حالات کی بنا پر تھی۔ بادشاہ کا دل غالب کی طرف سے کبھی صاف نہیں ہوا۔ حالانکہ غالب نے منظوم معذرت نامہ پیش کر کے قلبِ شاہ سے گرد کدورت دور کر دینے کی سعی کی لیکن اکثر و بیشتر لوگ اس آتشِ غضب کو ہوا دیتے رہے۔ چنانچہ وہ غالب سے بدستور کبیدہ خاطر رہے۔ ان ناساعد حالات میں جو کچھ قلب شاعر پر گزرتا کبھی کبھی زبان شاعر اس کی ترجمان بنی رہتی۔ حالانکہ غالب رمزیت اور ایمائیت کی شان برقرار رکھتے پھر بھی ذوق کی طرف سے اس کا جواب دیا جاتا۔ اور یہ جواب الجواب کا سلسلہ لامتناہی شکل اختیار کر گیا۔

ان سبھی حالات و واقعات کا ذکر بہت تفصیل سے ڈاکٹر خلیق انجم نے کیا ہے۔ مضمون تحقیقی بصیرت کا غماز ہے۔ اس لئے ہر صاحب ذوق کے لئے کام کی چیز۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا مضمون ذوق کی حکایت ہستی کا نہایت جامع مرقع ہے۔ ممتاز حسین نے غالب اور ذوق کا موازنہ کر کے ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ مضمون میں ہلکی سی جھلک غالب اور ذوق کے ادبی معرکے کی محسوس ہوتی ہے۔ عابد پیشاوری نے ذوق سے منسوب خطابات کی بڑی عرق ریزی سے چھان بین کی ہے۔ حقیقت جاننے کے لیے انہوں نے متعدد مستند کتابوں سے استفادہ کر کے یہ نتیجہ بر آمد کیا ہے کہ ”ذوق کی جس استادی یا اپنی شاگردی کا آزاد اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں وہ خود مشکوک ہے۔ نہ آزاد ذوق کے شاگرد تھے اور نہ انہوں نے ذوق کی زندگی میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ ذوق کو نہ ملک الشعرا کا خطاب ملا نہ خاقانی ہند کا۔ ان کو صرف ایک ہی خطاب ظفر سے ملا تھا ”سلطان الشعراء“ کا۔

آخر کے چالیس صفحات میں انتخاب کلام ذوق کی شمولیت سے کتاب کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ بایں ہم اوصاف کتاب میں ایک بڑی کمی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہے اس میں ذوق کی قصیدہ نگاری سے متعلق کسی مضمون کا نہ ہونا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ذوق اپنے زمانے کے بہت معروف و ممتاز قصیدہ نگار تھے۔ ان کے قصاید علمی، ادبی اور فنی اعتبار سے مکمل ہیں۔ اردو قصیدہ نگاری میں اگر سودا کے بعد کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ ذوق کا نام ہے۔ اس کے باوجود ان کے قصاید کے ذکر سے صرف نظر وجہ استعجاب ہے۔

اردو ادب کا ذوق نمبر ذوق شناسی اور ان کی غزل گوئی کا بھرپور اور شایان شان تحقیقی اور تنقیدی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ بالخصوص غزلیات ذوق پر کام کرنے والوں کے لیے اس کی حیثیت مینارۂ نور کی سی ہے۔ کتاب کی پذیرائی ہونی ہی چاہیے۔

OOOOOO

نام کتاب : **مقالاتِ فرید**

مصنف : جی۔ ایس۔ فرید

ملنے کے پتے : (۱) محمود عمران، برابورن کورٹ۔

۱، چاندنی چوک اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۳

(۲) دی اعجاز پرنٹرز۔

۱۸، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳

قیمت : ۱۵۰ روپیہ (ڈاک خرچ زائد)

مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

ZVEI 'S 'E ROLIGE ELOOOL - VLLNOTIVO 'LIEELS VIONNON...

مصنفِ کتاب جی ایس فرید علیگڑھ یونیورسٹی سے سائنس کے گریجویٹ ہیں۔ قرآن پاک کے نایاب نسخوں کی تلاش۔ عہد قدیم کے سکے اور مخطوطات۔ ڈاک ٹکٹوں کی فراہمی اور ان سب ہی نوادرات پر مستند دلائل و براہین کی روشنی میں مضامین لکھنا اور ان کی تصاویر حاصل کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ چنانچہ کتاب میں شامل ان کے سب ہی مضامین نہایت معلوماتی اور تحقیقی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ جس متعلقہ شئے پر انہوں نے لکھا ہے اس کے بارے میں مفید معلومات تو فراہم ہوتی ہی ہیں ساتھ ہی یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوتی ہے کہ کشتِ مضمون کی آبیاری کے لئے مصنف کو کتنے ہفت خواں سر کرنا پڑے ہوں گے۔ اس کتاب میں ان کے چالیس مضامین ہیں کتاب محض کلکتہ شہر کے بارے میں وسیع معلومات کا ذخیرہ نہیں ہے بلکہ متعدد دوسرے موضوعات پر بھی مقالات اس میں شامل ہیں۔ مثلاً ''خط خفی کی جادو گری''، ''فنِ خطاطی میں ہندوؤں کی گراں قدر خدمات''، ''مغل مصوری کی مختصر کہانی۔'' ''جوش ملیح آبادی کی فلمی وابستگی''، ''اسلامی ممالک میں جشن نئی صدی'' اور ''قرآن کریم میں شکر گذاری کا ذکر'' لیکن اختتام مضمون تک پہونچتے پہونچتے ان کے سوتے کسی نہ کسی صورت میں کلکتہ سے مل جاتے ہیں۔ فرید کو ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا بھی شوق ہے چنانچہ ان ٹکٹوں کے حوالے سے انہوں نے ''حج کی کہانی ڈاک ٹکٹوں کی زبانی''، ''ہندوستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ''، ''ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کا پہلا ڈاک ٹکٹ'' موضوعات پر گراں قدر مضامین تحریر کئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ موضوع اور محل کے اعتبار سے سیکڑوں تصاویر بھی اس کتاب میں شامل ہیں جس سے کتاب کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس طرح کلکتہ کے ضمن میں کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے والے شائقین کی دل بستگی کے اسباب مصنف نے اس کتاب میں یکجا کرنے کا مستحسن کارنامہ انجام دیا ہے۔ کتاب کی روشنی میں یہ بات کھل کر واضح ہوتی ہے کہ فرید کی زندگی حرف طلب و جستجو سے عبارت ہے۔ ان کی تحقیق اور تحریری صلاحیتوں میں وزن اور وقار ہے۔ وہ کسی موضوع پر لکھ سکتے ہیں اور اسے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اہم اور لائق ستائش درجہ عطا کر سکتے ہیں۔ زیر نظر کتاب کلکتہ کے ایک مستند سماجی۔ معاشی۔ معاشرتی اور تہذیبی گزٹ کا درجہ رکھتی ہے۔ عہد حاضر میں ایسی پر مغز اور وقیع نگارشات کمتر بہت ہی کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بڑا کام ہے اس کا سر ورق، گیٹ اپ، طباعت سب ہی کچھ دیدہ زیب ہے۔ اس کی قیمت ۱۵۰ روپیہ زیادہ نہیں ہے۔ یقیناً یہ پسند کی جائے گی۔

OOOOO

نام کتاب : آواز کا لمس
شاعر : قمر سنبھلی
مطبوعہ : رہبر آفسیٹ پرنٹرز، دہلی-۲
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

آواز کا لمس قمر سنبھلی کا شعری مجموعہ ہے۔ ابتدا میں دو حمد اور دو نعتیں ہیں جن سے ان کے عشقِ خدا اور محبِ رسول کے اظہار کے ساتھ ساتھ ان کے فن نعت گوئی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

سہارا مل گیا آقا کی رحمت کا ہمیں ورنہ
گناہوں سے بھری گٹھری ہمارے سر پہ رکھی تھی

قمر سنبھلی نے زندگی کا سفر تجربوں کی دھوپ میں طے کیا اور راہ حیات میں حائل ہر تند و ترش کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا ہے اسی لئے وہ ہر موج حوادث سے ہنس کھیل کر گذر جانے کی بات کرتے ہیں۔

تلخیاں ذہن میں کتنی بھی گھلی ہوں لیکن
ہونٹ خوشبو میں تبسم کی سجائے رکھنا

لیکن وہ شخص جس کا سابقہ ہمیشہ ناگواریوں سے رہا ہو یا جسے اکثر بار مصائب نے سر اٹھانے کی مہلت نہ دی ہو اور جس کو شدت سے یہ احساس بھی ہو کہ۔

میرا وجود نہ تھا پیڑ تھا کوئی پھل دار
عذاب خشت میں تھا پتھروں کے قہر میں تھا

پھر بھی وہ تبسم کی خوشبو سے ہونٹ سجائے رکھنے کی بات کرے بلاشبہ اس کے بلند عزائم کا ثبوت ہے۔ راقم کے خیال سے قمر سنبھلی کے بارے میں انگریزی شاعر شیلے کا یہ قول بڑی حد تک صادق ٹھہرتا ہے۔

"Most wicked men are cradled into
poetry by wrong
They learn in suffering which they
teach us by song."

شاعر اپنے دور اور معاشرے کا نباض ہوتا ہے۔ اچھا اور کامیاب شاعر وہی کہلائے جانے کا مستحق ہوتا ہے جو اپنے جذبات اور احساسات سچائی کے ساتھ پیش کر دے اور وہی شاعری اپنے عہد کی دستاویز بننے کی صلاحیت رکھتی ہے جس میں عصری حقیقت اور ارضی مسائل کی بحث شامل ہو۔ قمر سنبھلی نے ان امور کا بخوبی لحاظ رکھا ہے۔

اسلامی اقدار اور روایات کا پر توان کے اشعار میں جابجا جھلکتا ہے۔
مجموعی طور پر ان کی فکر و تخیل میں بلندی اور انفرادیت ہے۔

صحت اور ہومیو پیتھی

آدھا سیسی

HEMICRANA / MIGRAINE

ڈاکٹر اطہر عبداللہ بخش
(بی۔ایچ۔ایم۔ایس)

یہ سر درد کی ایک قسم ہے۔ یہ درد بار بار اور اچانک اٹھتا ہے اور زیادہ تر سر کے ایک حصہ میں اٹھتا ہے۔ یہ عام سر درد سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ اسمیں درد بہت زیادہ شدید ہوتا ہے۔ یہ اکثر بچپن میں شروع ہوتا ہے اور پھر کافی عمر تک پایا جاتا ہے۔

مائگرین (Migraine) کی وجہ آج تک دریافت نہیں ہو پائی۔ مگر یہ بیاری اکثر خاندان میں پائی جاتی ہے۔ زیادہ سوچ و فکر، ذہنی پریشانی اور الجھنیں ضرورت سے زیادہ جسمانی کام، بڑھا ہوا بلڈ پریشر، سر کی چوٹ، دماغی ٹیومر، عورتوں میں حیض کی بندش، فاقہ، کچھ قسم کے کھانے جیسے چاکلیٹ وغیرہ یا پھر کسی بھی غذا جس میں Tyramine زیادہ تعداد میں موجود ہو، آنکھوں کی کچھ بیماریوں، قبض وغیرہ کی وجہ سے بھی آدھا سیسی کا درد اٹھ سکتا ہے۔

یہ سر درد اکثر مستقل طور پر ہوتا رہتا ہے اور ایک معینہ وقفے سے مریض کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ جیسے ہر تیسرے یا چوتھے دن یا ساتویں دن۔ مہینے میں ایک بار یا پھر چند مہینوں میں ایک بار۔ اور یہ درد کئی گھنٹوں یا دنوں تک موجود رہتا۔ بس کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے مریض کوئی کام کر نہیں پاتا اور بہت ہی عاجز رہتا ہے۔

اسمیں شروع میں کمزوری، سستی، کاہلی، ذہنی پریشانی (Depression) محسوس ہوتی ہے۔ پھر کچھ دنوں بعد اچانک ہی یہ درد پیدا ہو جاتا ہے۔ نیند سے اٹھنے کے بعد آنکھوں کے آگے کچھ بجلی جیسا چمکتا ہے۔ چیزیں آدھی صاف اور آدھی دھندلی نظر آنے لگتی ہیں۔ متلی یا الٹی بھی ہو سکتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خاندان کے اور افراد میں بھی ان علامات کی تاریخ (Family History) ہو سکتی ہے۔ کچھ مریضوں کو پیشاب مشکل سے ہوتا ہے یا پھر بلکل رک جاتا ہے۔ اسمیں آنکھوں سے پانی گرنے کے ساتھ ساتھ کاسہ چشم (Orbits) کی ہڈیوں میں درد ہونا بہت ہی عام بات ہے۔ اور مریض کو روشنی کی طرف آنکھیں کھولنے میں تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے (Photophobia)۔ یہ سب کچھ دیر تک رہتا ہے۔

ان تکلیفوں کے بعد اصل سر کا درد شروع ہو جاتا ہے جو اکثر صرف ایک یا کبھی کبھی دونوں طرف یعنی دائیں اور بائیں طرف پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ ماینڈوں کے علاوہ، ایک جگہ سے شروع ہو کر پورے سر میں پھیل جاتا ہے۔ اور جب حد سے بڑھ جائے تو درد کے ساتھ قے ہوتی ہے۔ اور روشنی سے آنکھوں کو پریشانی (Photophobia) کمزوری واقع ہونے لگتی ہے اور پسینہ آنے لگتا ہے۔

یہ درد ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتا اور تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد مریض کو ستانے لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایکو پنکچر سے اسے کافی حد تک ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ علاج لگ کر کرانا پڑتا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہ درد پھر لوٹ آئے تو پھر سے علاج کرانا پڑیگا۔

خوش قسمتی سے ہومیو پیتھی میں اس قسم کے درد کی بہت ساری اچھی دوائیں موجود ہیں۔ جیسے Argentum Nitricum, Sepia Silicea, Syphilinum, Natrum Muriaticum, Lacdefloratum وغیرہ۔ مگر اس درد کے علاج کے لئے مریض کی خاص علامتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

کئی دفعہ یہ درد سورج نکلنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور دن چڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بڑھنے لگتا ہے مگر جیسے ہی سورج ڈوبنے لگتا ہے یہ درد بلکل کم ہونے لگتا ہے اور پھر کچھ گھنٹوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ کئی بار اسکا الٹا بھی ہوتا ہے۔ یعنی سر درد سورج ڈوبنے پر شروع ہو کر سورج کے نکلنے کے بعد کم ہوتا ہے! اس طرح کے درد کئی بار Natrum Muriaticum اور Syphilinum جیسی دواؤں کے ذریعہ دور ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ دوائیں مریض کی ساری علامتوں کو جانچ کر دی گئی ہوں۔ یہ دوائیں تھوڑا وقت بھی لیتی ہیں اپنا اثر دکھانے میں۔ اس لئے علاج میں جلد بازی کرنی ٹھیک نہیں۔

یہ درد اکثر چھوٹی عمر میں شروع ہوتا ہے۔ خاص کر زیادہ پڑھنے والے بچوں میں یا پھر بڑھتی ہوئی عمر کے بچوں خصوصاً لڑکیوں میں، خون کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایسے مریضوں پر Calcarea Phosphoricum اور Ferrum Metallium جیسی دوائیں بہت اچھا کام کرتی ہے۔ اور اگر یہ درد بلڈ پریشر کی وجہ سے ہوتا ہے یا پھر بہت سوچ و فکر سے پیدا ہوتا ہے تو Glonoinum, Sepia BarytaMur کافی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ اگر یہ درد نزلہ یا سردی کی شکایت سے ہے تو اسکے لئے بھی بہت اچھی دوائیں ہومیو پیتھی میں ہیں۔

مریض کو چاہئے کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا کر اس درد کی وجہ معلوم کرے جیسے مسلسل قبض یا خون کی کمی وغیرہ۔ درد کے ساتھ درد کی وجہ کا بھی اچھی طرح علاج کرائے ورنہ یہ درد جڑ سے ختم ہونا مشکل ہے۔

بطخ میاں انصاری

ماخوذ از ''دستاویز-۹'' [عوامی مسائل کی مختلف النوع جہتیں]۔ جنوری ۲۰۰۰ء
مرتبہ : جابر حسین۔ شائع کردہ : بہار قانون ساز کاؤنسل
قیمت : ۷۵ روپے

۱۹۱۷ء میں مہاتما گاندھی کے چمپارن قیام کے دوران ان کی جان بچانے والے اور اب تک نظر انداز مجاہد آزادی مرحوم جناب بطخ میاں انصاری کی یاد کو محفوظ رکھنے، انکے منہدم مزار کے تحفظ اور ان کی یاد میں ایک مدرسہ، ہاسٹل، تالاب اور کھیل کود کے میدان کا فروغ کرنے کیلئے اقلیتی کمیشن کے کار گزار چیرمین، پروفیسر، جابر حسین نے اپنے مکتوب نمبر ۱۲۴، ۲۷ جون، ۱۹۹۱ کے ذریعہ وزیر اعلیٰ جناب لالو پرساد سے درخواست کی ہے۔

مرحوم بطخ میاں انگریزوں کے خانساماں تھے۔ گاندھی جی کے چمپارن قیام کے دوران جب گاندھی جی کو مارنے کیلئے انگریزوں کے ذریعہ سازش کی گئی تو اس سازش کو انجام دینے کی ذمہ داری بطخ میاں کو سونپی گئی۔ اس کیلئے بطخ میاں کو ایک طرف لالچ دی گئی، دوسری طرف ایسا نہیں کرنے پر خطرناک انجام بھگتنے کیلئے تیار رہنے کی دھمکی بھی دی گئی۔ سازش کے تحت بطخ میاں کو، گاندھی جی کو زہر دینا تھا۔ جب ایسا کرنے کیلئے بطخ میاں کو مجبور کر دیا گیا، تب قومی عقیدت اور حب الوطنی کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کے تئیں وفاداری کے جذبے سے لبریز بطخ میاں نے گاندھی جی کے سامنے زہر کا پیالہ بڑھاتے ہوئے انہیں یہ بتادیا کہ اس میں زہر ہے اور اسے نہ پئیں۔ گاندھی جی نے ایسا ہی کیا۔ اور زہر بھرا گلاس گرادیا۔ ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔

گاندھی جی کو زہر نہیں پلانے کے جرم میں بطخ میاں اور انکے خاندان کو تنگ و تباہ کر دیا گیا۔ انہیں جیل میں بند کر دیا گیا۔ ان کی زمین ضبط اور نیلام کر دی گئی۔ انہیں انگریزوں نے خاندان سمیت بھوکے تڑپنے کو چھوڑ دیا۔ تاریخ اس کی گواہ ہے۔

آزادی کے بعد بطخ میاں کی زندگی میں ہی صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے بے زمین بنادیئے گئے اس مجاہد آزادی کو پچاس ایکڑ زمین الاٹ کئے جانے کا حکم حکومت بہار کو بھیجا تھا، جو آج تک التوا میں ہے۔ ویسے حکم کے کچھ برسوں بعد ضلعی انتظامیہ کے ذریعہ انہیں تقریباً دو ایکڑ زمین دی گئی بطخ میاں کی زمین کی واپسی یا اس کے بدلے معاوضہ کے دعوے کی کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ اسی بیچ ۱۹۵۷ میں بطخ میاں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

ان کا منہدم مزار مشرقی چمپارن ضلع کے نمریا کے سسواں اجگری گاؤں میں ہے، جس کی مرمت کی ضرورت ہے۔ ان کا خاندان اب مشرقی چمپارن ضلع کے سہور اتھانہ کے گاؤں اکواں پرسونی، ڈاک خانہ بھکنا ٹھوری میں رہ گیا ہے۔ انکے بیٹے محمد جان انصاری بھی جو اب نہایت ضعیف ہو چکے ہیں، نے بتایا کہ گزشتہ ۴۰-۵۰ سال سے حکومت کے عدم تعاون کے سبب وہ لوگ آج بھی اسی حال میں ہیں جس حال میں انگریزوں نے انہیں پہونچایا تھا۔ بقول محمد جان انصاری راجندر بابو کے حکم کے باوجود بہار کی کانگریس حکومت نے گاندھی بابا کی جان بچانے والے غریب مسلمان پر ترس نہیں کھایا۔ انہیں اعزاز بخشنے، مجاہد آزادی مان کر ان کی جان و مال کے ہوئے نقصان کی بھرپائی کرنے کے بدلے ان کی یاد کو بھلانیکا کام کیا گیا اور انکے خاندانکے افراد کو ٹھوکریں کھانے کیلئے چھوڑ دیا گیا۔ یہ ایک قوم پرست کی بے عزتی نہیں، بلکہ حکومت کی کاردگردگی کا نایاب نمونہ ہے۔

اپنی عمر کے نوے اور سو برس کے بیچ کھڑے محمد جان انصاری اپنے مرحوم باپ کے مزار کی مرمت اور اس پر سالانہ جلسہ منعقد کرنے کا خواب لئے پچھلے دنوں کمیشن کے دفتر میں آئے تھے۔

کمیشن کے کار گزار چیرمین، جابر حسین نے بہار کے وزیر اعلیٰ کو خط لکھ کر بطخ میاں کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے انکے خواب کو عملی شکل دینے کے علاوہ اس زمین پر، جو افسر انکے داؤ پیچ کا شکار ہو کر محکمۂ محصولات سے محکمۂ جنگلات کے نام منتقل ہو چکی ہے، مدرسہ، تالاب، جنگل، اور طلباء کیلئے ہوسٹل بنوانے کی تجویز پیش کی ہے۔

کار گزار چیرمین نے وزیر اعلیٰ سے گزارش کی کہ اس منصوبے کو عملی شکل دینے کیلئے خود وزیر اعلیٰ کی صدارت میں مشرقی اور مغربی چمپارن ضلعوں کے حکمراں محکمہ جنگلات، تعلیم، محصول، محکمہ اقلیتی فلاح کے افسران کی بیٹھک بلائی جائے، تاکہ بطخ میاں کے ساتھ تاریخ کی گواہی کے باوجود حالات نے جو ناانصافی کی ہے، اسے دور کیا جاسکے اور ان کی یاد کو محفوظ کیا جاسکے۔

اپنے مکتوب میں کار گزار چیرمین نے مزید کہا کہ قومی تحریک کے اس بے نام مجاہد کیلئے اگر ہم کچھ کر سکیں گے تو ایسا کر کے ہم لوگ خود اپنی شان بڑھائیں گے۔

وزیر اعلیٰ کی ہدایت:

کمیشن کے کار گزار چیرمین کے خط کے سلسلے میں وزیر اعلیٰ نے اپنے مکتوب ۵۵۶۱۲۹۱ مورخہ، ۲ جولائی، ۱۹۹۱ کے ذریعہ چیف سکریٹری کو حوالہ جاتی موضوع پر جلد اپنی رائے دینے کی ہدایت دی۔ کمیشن کی مذکورہ تجویز اب بھی ریاستی حکومت کے زیر غور ہے۔ کمیشن وزیر اعلیٰ سے گزارش کرتا ہے کہ اس تجویز کو جلد لاگو کرنے کیلئے اپنی سطح پر متعلقہ محکموں کے افسران کی ایک بیٹھک منعقد کریں۔

پریس ریلیز، ۲۵ نومبر، ۱۹۹۹:

مجاہد آزادی بطخ میاں انصاری کے فرزند محمد جان انصاری انکے آبائی گاؤں اکواں پرسونی (مغربی چمپارن) میں گزشتہ ۲۳، نومبر کو انتقال ہو گیا۔ وہ تقریباً ۹۰ سال کے تھے۔

"امین بنجارا کی کوششوں سے جموں و کشمیر میں اُردو سر گرمیاں تیز ہوئی ہیں۔"
"نذرِ آزاد" کی رسمِ رونمائی کے موقع پر وید بھسین کا صدارتی خطبہ

(جموں) "پروفیسر جگن ناتھ آزاد صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہیں اور انہوں نے اُس دور میں بھی اُردو کی زُلفِ گرہ گیر کو سنوارنے کا عمل جاری رکھا جب اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اسے ختم کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں اور اُردو کا نام لینا ایک گناہ سمجھا جاتا تھا۔" ان خیالات کا اظہار ریاست جموں و کشمیر کے وزیرِ خزانہ جناب محمد شفیع اُوڑی نے ریاست کے نامور افسانہ نگار، ادیب جناب امین بنجارا کی تالیف "نذرِ آزاد" کی رسم رونمائی کی تقریب میں کیا۔ اس تقریب کا اہتمام جموں و کشمیر اردو فورم اور کوشُر مرکزی فورم جموں کے باہمی اشتراک سے کیا گیا۔

"نذر آزاد" کی رسم رونمائی انجام دیتے ہوئے تقریب کے مہمانِ خصوصی شفیع اُوڑی نے اقبالیات آزاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تفہیم اقبال میں آزاد نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ کتاب کے مولف جناب امین بنجارا کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے جناب شفیع اُوڑی نے کہا کہ جب تک اردو کے ایسے مجاہد موجود ہیں اردو زبان ترقی کرتی رہے گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ ذاتی طور پر اردو کی ترقی کے خواہاں ہیں اور سرکاری سطح پر اُردو کی ترویج کے لئے ٹھوس اقدامات عمل میں لانے کے لئے کوشاں ہیں۔

اس موقع پر "نذرِ آزاد" کے مولف جناب امین بنجارا نے کہا کہ انسانی رشتوں میں دُوریاں بڑھتی جارہی ہیں۔ یہاں تک کہ ادب میں بھی نئی اور پرانی نسل ایک دُوسرے سے دُور ہوتی جارہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ "نذرِ آزاد" کے مضمون نگاروں میں زیادہ کا تعلق نئی نسل سے ہے اور مضمون لکھوانے کے لئے انہوں نے نئی نسل کو ترجیح اس لئے دی تاکہ نئی نسل اپنے پیش روؤں کے علمی و ادبی کارناموں اور اُن کی حیات کے مختلف گوشوں کو قلم بند کرنے کے لئے پرائمری سورسز کا استعمال کر سکے اور جُملہ معلومات مصدقہ ہوں۔ جناب امین بنجارا نے مزید کہا کہ نئی اور پرانی نسل کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کو کم کرنا بے حد ضروری ہے تاکہ پرانی نسل اپنا فن نئی نسل کو منتقل کر سکے اور اُردو کا ادبی سرمایہ خُرد بُرد ہونے سے بچا رہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ اُن پر یوں تو کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور کئی مقالات شائع ہو چکے ہیں لیکن "ارمغانِ آزاد" مرتبہ پروفیسر ظہورُالدین اور "نذر آزاد" مرتبہ امین بنجارا اُن کے لئے بیش قیمت تحائف ہیں کیونکہ یہ دونوں کتابیں اُس خطے کی دین ہیں جس خطے میں وہ گزشتہ تیس چالیس برسوں سے مقیم ہیں۔

نامور صحافی جناب وید بھسین نے صدارتی خطبے میں کہا کہ پروفیسر آزاد ہند و پاک کے درمیان دوستی کا پُل ہیں۔

اس تقریب میں "نذر آزاد" کے حوالے سے جناب آر کے بھارتی اور ڈاکٹر مشتاق وانی نے مقالات پڑھے۔ مدھیہ پردیش سرونج کے نامور ادیب محمد توفیق خاں کا مقالہ بھی اُن کی غیر موجودگی میں پڑھا گیا۔ ڈاکٹر شہاب عنایت ملک نے استقبالیہ اور جناب پیارے ہتاش نے شکرانہ ادا کیا جبکہ جناب اسیر کشتواڑی نے نظامت کے فرائض سرانجام دیئے۔

جاری کردہ : پریس سکریٹری اُردو فورم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کو انفارمیشن ٹکنالوجی اور سائنس کی تعلیم پر توجہ کا مشورہ

حیدر آباد ۲ر فروری: سابق وائس چانسلر سری وینکیشورا یونیورسٹی مسٹر رالا پلی راما مورتی نے کہا ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کو انفارمیشن ٹکنالوجی اور سائنس کی تعلیم عام کرنے میں اہم رول ادا کرنا چاہئے۔ مولانا آزاد یونیورسٹی کے دوسرے یوم تاسیس کے موقع پر یہاں منعقد تقریب کو خطاب کرتے ہوئے اُنہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یونیورسٹی کی جانب سے کمپیوٹر سافٹ ویر کو بھی فروغ دیا جائے۔ نہایت ہی کم عرصہ میں یونیورسٹی کی بہترین کارکردگی کی ستائش کرتے ہوئے اُنہوں نے توقع ظاہر کی کہ مستقبل میں یہ یونیورسٹی عالمی یونیورسٹی کی شکل اختیار کرے گی کیونکہ اُردو زبان اور اردو ادب کی تعلیم اور مطالعہ و ریسرچ کو عالمگیر حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس یونیورسٹی کے مراکز قائم ہیں اور مستقبل میں بیرونی ممالک میں بھی اس کے مراکز قائم کئے جانے کی توقع ہے۔ اندراگاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کی جانب سے بھی فاصلاتی کورس چلائے جاتے ہیں لیکن مولانا آزاد یونیورسٹی کو اُردو ذریعہ تعلیم کی فراہمی کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی لئے اس یونیورسٹی کو اُردو زبان کے فروغ میں بھی اہم رول ادا کرنا ہوگا۔ اُنہوں نے یونیورسٹی کی کامیابی کے لئے وائس

ZAKARIA STREET, CALCUTTA - 700073 EDITOR F S EJAZ

چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری اوراُن کی ٹیم کو مبارکباد پیش کی۔ الہ آباد سے تعلق رکھنے والے ممتاز ادیب و رکن مجلس عاملہ مولانا آزاد یونیورسٹی پروفیسر جعفر رضا نے کہاکہ ہندوستان کے قدیم کلچر کو سمجھنے کے لئے جس طرح سنسکرت ضروری ہے اس طرح عصری ہندوستان کو سمجھنے کے لئے اُردو ضروری ہے۔ اُنہوں نے کہاکہ اُردو دشمنی ملک دشمنی کے مترادف ہے اُردو سب سے زیادہ سیکولر زبان ہے جو قومی یکجہتی کے لئے رابطہ کا عظیم کردار بھی ادا کرچکی ہے اور آئندہ بھی وسیع تر اساس پر یہی کردار ادا کرے گی۔ اُنہوں نے اُردو زبان کو ہندوستان کی روح قرار دیا۔ وائس چانسلر پروفیسر جیراجپوری نے کہاکہ انفراسٹرکچر کے فقدان کے باوجود اس یونیورسٹی کے قیام میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اُنہوں نے کہاکہ یونیورسٹی کی ہمہ منزلہ ہمہ مقصدی عمارت کی تعمیر کا کام جلد ہی شروع کیا جائے گا۔ پروفیسر جیراجپوری نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں حاضرین جلسہ کو یہ خوشخبری سنائی کے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری واجپائی اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔ توقع ہے کہ یونیورسٹی کی مالی موقف کو بہتر بنانے کے لئے وزیر اعظم اس موقع پر کوئی اعلان کریں گے۔ رجسٹرار جناب محمد سلیمان صدیقی نے جلسے کی نظامت کی۔

تقریب میں شرکت کرنے والوں میں سابق ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور جناب سید رحمت علی، سینئر آئی اے ایس آفیسر جناب آر راجہ منی، پروفیسر اشرف رفیع اور جناب انصر بیگ کے علاوہ مقامی یونیورسٹی کے اساتذہ اور سربر آوردہ اصحاب کی کثیر تعداد شامل تھی۔

مرسلہ : ڈاکٹر ظفر الدین، پبلک ریلیشنز افسر

ڈاکٹر ہرگانوی نوازے جائیں گے

آل انڈیا جیمنی اکیڈمی، پانی پت (ہریانہ) کی طرف سے ہندی دیوس کے موقع پر ۱۴ر ستمبر ۲۰۰۰ء کو اردو اور ہندی کے معروف قلمکار اور ''کوہسار جرنل'' کے مدیر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو ''بیسویں شتابدی رتن سمان'' سے نوازا جائے گا۔ اسی اکیڈمی سے دو سال قبل ڈاکٹر ہرگانوی کو ''اچاریہ'' کی اُپادھی مل چکی ہے۔

مرسلہ : ڈاکٹر حبیب مرشد خاں، بھیکن پور، بھاگلپور (بہار)

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تعلیمی دہائی کے طور پر منائی جائے گی۔ (مبارک کاپڑی)

معروف ماہر تعلیم اور نیشنل ایجوکیشنل موومنٹ کے چیرمین مبارک کاپڑی نے یکم جنوری کو نئی صدی کے تعلیمی پروگرام کا آغاز صبح پمپری چنچوڑ (پونے) میونسپل ۔۔۔ کے میدان میں اور دوپہر ۲ بجے آکر ڈی اردو ہائی اسکول میں کیا جس میں پرائمری اسکول و ہائی اسکول کے سینکڑوں طلبہ و اساتذہ والدین نے شرکت کی۔ مبارک کاپڑی نے گذشتہ پوری صدی میں مسلمانوں کی ترقی اوران کی غلطیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہاکہ اب وہ غلطیاں کسی بھی شکل میں اس صدی میں دہرائی نہیں جانی چاہئے اور اس کے لئے ہمیں مسلسل بیدار و باخبر رہنے کی ضرورت ہے تاکہ سیاست داں اوران کے ایجنٹ ہم میں انتشار پیدا نہ کرسکیں۔ تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہاکہ تبلیغ دین کے لئے بھی تبلیغ تعلیم کی بڑی ضرورت ہے۔ تعلیم یافتہ افراد دین کی اشاعت میں نمایاں ترین اور فیصلہ کن کردار ادا کرسکتے ہیں اس لئے عصری تعلیم سے اگر ہماری قوم جاگے گی تو دنیا کو اسلام کا پیغام پہنچانے کی ایک کڑی ٹوٹ جائیگی۔

مبارک کاپڑی نے اپنے مسلم پیٹرن کا تذکرہ کرتے ہوئے کہاکہ بدقسمتی سے اس ملک کا تعلیمی نظام ناکام ہوچکا ہے۔ اسے صرف ہم اور ہمارے عقائد ہی بچاسکتے ہیں۔ اس ملک کے ماہرین تعلیم جو سوشلزم و کمیونزم کے فارمولے اپنانے نکلے تھے، وہ منہ کی کھاچکے ہیں اور بعد از خرابی بسیار انہوں نے اقدار کی تعلیم کو اپنے نصاب کا حصہ بنایا لہٰذا اب ان ماہرین تعلیم کو یقین ہوچلا ہے کہ جو نظام خوف خداوند پر مبنی ہوگا وہی ٹک پائے گا۔

کاپڑی نے اپنی تعلیمی بیداری مہم کے پروگراموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہاکہ گذشتہ تین سالوں سے ہر سال کم و بیش سو لیکچر کا انعقاد کیا جاتا ہے جس کے ذریعہ آٹھویں تا بارہویں جماعت کے ایک لاکھ سے زائد طلبہ کی وو کیشنل و تعلیمی رہنمائی کی جاتی ہے۔ نیز اساتذہ کی رہنمائی کے لئے بھی ہر سال دو درجن پروگراموں کا انعقاد ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ انہیں تدریس کی ماڈرن تکنک اور نتائج میں بہتری کے گر سکھائے جاتے ہیں۔ البتہ اب ان قسم کے پروگراموں سے گارنٹی کے ساتھ نتائج میں بہتری ہورہی ہے اس لئے صدی میں ان کا انعقاد جنگی پیمانے پر ہونا چاہئے۔ البتہ اب ان پروگراموں کے خدوخال میں نمایاں تبدیلی یہ ہوگی کہ ہر ماہ کم از کم تین روز تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے پروگرام ہوں گے اور ایک روز تعلیمی گشت ہوگا جس میں ہر ماہ ایک بستی کا انتخاب کیا جائیگا اور وہاں گھر گھر جاکر خصوصاً ڈراپ آوٹ طلبہ کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ نئی صدی کی تعلیمی تحریک میں میڈیا کے رول پر تبصرہ کرتے ہوئے مبارک کاپڑی نے کہاکہ وہ سارے اردو میڈیا سے اپیل کریں گے کہ وہ اپنے اخبارات و رسائل میں تعلیمی کالم وغیرہ کے ذریعہ اپنے اخبار کا کم از کم ۵ فیصد حصہ تعلیم کے لئے وقف کردیں اور جو اخبار اس کے لئے راضی نہ ہو اس اخبار کا بائیکاٹ کیا جائے۔

اس سے قبل اردو کونسل پمپری چنچوڑ کے جنرل سکریٹری قاسم زبیری نے مبارک کاپڑی کے مشن کو ایک انقلابی مشن قرار دیتے ہوئے کہا کہ نئی صدی میں اس مشن کو زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھانا ہے اور اردو برادری اردو کا پرچم بلند کرنے کے لئے ہمہ جہت کوشش کرے۔ اردو کی بقا کے لئے صدی کے چیلنج بڑے زبردست ہیں۔

نئی صدی کے ان تعلیمی پروگراموں میں طلبہ اساتذہ والدین کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں مبارک کاپڑی نے روزے کی حالت میں (نماز کے وقفہ کو چھوڑ کر) مسلسل آٹھ گھنٹے لیکچر دیا۔ پروگرام کے بعد پہلی مرتبہ ایک ''تعلیمی افطار پارٹی'' کا انعقاد ہوا جس کے اور اخراجات پمپری چنچوڑ میونسپل پرائمری اسکول کے اساتذہ نے کئے تھے۔ سینکڑوں طلبہ و طالبات اور تعلیمی کاز سے جڑے کئی افراد کے افطار ڈنر کا اہتمام گیا تھا۔ ان دونوں پروگراموں کے انعقاد میں اردو کونسل کے قاسم زبیری، جمال احمد صدیقی، اسماعیل شیخ، پرنسپل خان، اشفاق سر، سمیع اللہ سید اور علاقے کے تمام پرنسپل واساتذہ اکرام کا تعاون شامل تھا۔

مرسلہ : قاسم زبیری

فتحپور میں اوارڈ ۱۹۹۸

یوں تو ''ورلڈ ہیومن آرگنائزیشن فتح پور'' ایک مدت سے کارفرما ہے اور سماجی و فلاحی خدمات انجام دے رہا ہے مگر نئی صدی کے آتے ہی اس نے ایک نادر تحریک کے ذریعہ فنون لطیفہ اور صحافت کی ہمت افزائی کے طور پر اوارڈ کا آغاز کیا ہے جو ایک خوش آئند قدم ہے۔ تنظیم کے منتظمین نے اس ایوارڈ کو ۱۹۹۸ء سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے اسی شہر کے نوجوان شاعر۔ ادیب۔ افسانہ نگار اور ریسرچ اسکالر ڈاکٹر ایم۔ گوہر مسعود۔ ایم۔ اے کا انتخاب کیا جو پیشے سے کوالیفائڈ ڈاکٹر ہیں اور کامیابی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نے افسانہ نگاری میں اپنا ایک مقام بنانے میں کامرانی حاصل کی۔ یہ ایوارڈ موصوف کو انکے افسانہ ''انسان'' پر دیا گیا ہے جو ایک اچھوتا افسانہ ہے اور انسانیت کے لئے ایک پیغام۔

اس سلسلے میں مورخہ یکم جنوری ۲۰۰۰ء شاندار استقبالیہ تقریب محلہ آبونگر میں شریواستو ملشن میں منعقد کی گئی جس میں ڈاکٹر موصوف کی واجبی تحسین و توصیف کی گئی۔ انہیں ایک فریم شدہ سند اور ایک ہزار روپے بطور انعام پیش کئے گئے جو انکی ادبی خدمات کا ادنیٰ سا اعتراف ہے۔ تقریب کے بعد شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مقامی و بیرونی شعراء و کویوں نے شرکت کی۔

مرسلہ : اکرام فتحپوری، فتحپور (یوپی)

ضمیر یوسف کے مجموعۂ غزلیات ''غزل کے جھروکے'' کی رونمائی

ہوڑہ کے نوجوان شاعر ضمیر یوسف کے شعری مجموعہ ''غزل کے



پروفیسر اعزاز افضل ضمیر یوسف کے مجموعۂ غزلیات ''غزل کے جھروکے کی رسم اجراء ادا کرتے ہوئے۔ تصویر میں دائیں سے پروفیسر قیصر شمیم اور ڈاکٹر مظفر حنفی اقبال پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی بھی نظر آرہے ہیں۔

جھروکے'' کی رسم اجراء ۶؍ فروری ۲۰۰۰ء کو بزم شرفاء یوپی اسکول، شیب پور ہوڑہ میں منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر مظفر حنفی اقبال پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی نے کی۔ نقابت حلیم حاذق نے فرمائی۔ تقریب کا اہتمام جدید ادبی مرکز، ہوڑہ نے کیا تھا۔

پروفیسر اعزاز افضل نے کے ضمیر یوسف کے شعری مجموعہ ''غزل کے جھروکے'' کی رسم اجراء ادا کرتے ہوئے کہا کہ ضمیر یوسف جواں سال شاعر ہی نہیں جواں فکر شاعر بھی ہیں۔ نئی نسل کے شعرا میں جس طرح کی فنی و لسانی اور زبان و بیان کی غلطیاں ہوتی ہیں ضمیر یوسف کی شاعری ان غلطیوں سے پاک ہے۔ جس تیز رفتاری سے ان کی مشق جاری ہے اگر وہ اسی طرح تخلیقی عمل جاری رکھ سکے تو اپنے ہم عصر شعراء میں بہت جلد نمایاں مقام حاصل کرلیں گے۔

ڈاکٹر شبیر ابروی، جناب کمال جعفری، کلیم حاذق، ابوذر ہاشمی، قیصر شمیم، وجے کمار رسوا، ڈاکٹر معصوم شرقی، شہود عالم آفاقی، ماسٹر مشتاق احمد نے بھی کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں اظہار خیال فرمایا۔

جناب قیصر شمیم نے کہا کہ کاش ہمارے درمیان حالی گورکھپوری ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ حالی صاحب میں جو تیزی و طراری تھی، وہ تیزی و طراری ان کے دیگر شاگردوں کی بہ نسبت ضمیر یوسف میں نمایاں ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ضمیر یوسف اپنے ہم عصر تخلیق کاروں میں انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کی سوچ و فکر اس کے تخیل کی اڑان کسی ایک رخ کی پابند نہیں۔ وہ کامیابی کی منزل کے

قریب ہیں۔ انہوں نے مجموعۂ غزلیات "غزل کے جھروکے" کے نام کو بامعنی قرار دیا۔

رپورٹ : شبیر اصغر

سکریٹری نشرواشاعت، جدید ادبی مرکز، ہوڑہ

امریکہ میں تلسی داس اور ان کے کارناموں پر کانفرنس

کچھ ہی دن پہلے امریکہ ویورپ کے چند ممالک کے سفر سے میری واپسی ہوئی۔ تقریباً دوماہ باہر رہا۔ امریکہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا جو میامی شہر کی فلوریڈا انٹرنیشنل یونیورسٹی میں منعقد کی گئی تھی اور تلسی داس اوران کے کارناموں کے بارے میں تھی۔ ۲۴ر سے ۲۸ر نومبر ۹۹ء تک یہ سلسلہ چلا۔ مختلف ممالک سے ڈیڑھ سو کے قریب مندوبین آئے تھے۔ بڑی گہما گہمی رہی۔ نئے نئے لوگوں سے ملاقاتوں کا لطف اٹھایا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد بڑے ہال کے دو چھوٹے بغلی کانفرنس کمروں میں مقررین تقسیم ہو جاتے تھے۔ جس کو جس عنوان سے دلچسپی تھی وہ اس ہال میں چلا جاتا تھا۔ پروگرام میں اجلاسوں کا جو وقت مقرر تھا، اس میں دس منٹ کی بھی دیری نہیں ہوتی تھی۔ طعام و قیام کا بہت اچھا انتظام تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ تمام مندوبن کو ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہوٹل جو موٹل کہلاتا ہے ہائی وے پر واقع تھا۔ امریکی معیار سے نہایت معمولی۔ مگر آرام و آسائش کی سہولتیں ہندوستان کے فائی اشار ہوٹلوں سے کم تو نہ تھیں۔ ہر کمرہ میں دو دو اشخاص ٹھہرائے گئے تھے۔ ہر روز تولئے، چادریں بدل دی جاتی تھیں۔ نئے صابن رکھے جاتے تھے۔ ٹی وی، فون، قالین سب کچھ موجود تھا۔ باہر میدان میں آفس تھا۔ اس سے ملحقہ جھیل کے کنارے چبوترہ جس پر شیڈ تھا اور کرسیاں و میزیں بچی تھیں۔ ہم لوگ کانفرنس میں جانے سے پہلے اور واپسی پر اسی چبوترہ پر سائبان کے نیچے جھیل کے کنارے بیٹھ کر گرم گرم کافی پیتے اور دن بھر کی کاروائی پر بحثیں ہوتیں۔ سیر سپاٹے کے لئے پروگرام بنتے۔ میامی اپنے بیچوں (Beaches) کے لئے مشہور ہے۔ ان دنوں یہاں کا موسم بھی خوشگوار تھا۔

میرے سفر کے اخراجات کی ذمہ داری حکومتِ ہند کے ادارے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے اپنے ذمہ لی تھی۔ یہ ادارہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمان ممالک سے روابط استوار کرنے کے لئے قائم کیا تھا۔ اس کا ایک میگزین ثقافت الہند کے نام سے آج بھی عربی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ کانفرنس کے لئے میرا پہلا پرچہ رام چرت مانس کے فارسی و اردو تراجم سے متعلق تھا۔ سبھی پندرھویں و سولہویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں جو اکبر کا عہد ہے۔ اسی عہد میں عبدالرحیم خانخاناں بھی تھے۔ فکری سطح پر یہ نشاۃ الثانیہ کا دور ہے۔ تخلیقی زمانہ ہے جس میں فنونِ لطیفہ ہوں یا زبان و ادب مذہب ہو یا معاشرت ہر میدان میں کچھ نہ کچھ نیا اور اچھوتا کر دکھانے کا حوصلہ ملتا ہے۔ ہندوستان کے گنگا جمنی تہذیب کے عروج کا دور ہے جسے ہندو مسلمانوں نے مل کر سینچا تھا۔ اس عہد کے تہذیبی دھاروں سے مجھے گہرا لگاؤ ہے۔ میں نے اپنی مشترکہ قدروں کی جھلکیاں اپنے مضمون میں پیش کی تھیں۔ عبدالرحیم خانخاں پر اردو ہندی میں میری کتاب اس عہد کے تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالتی ہے۔

دوسرا پرچہ تلسی داس کے تاریخی پس کے عنوان سے پیش کیا۔ ایک اجلاس کی صدارت کا موقع بھی ملا۔ اختتامی اجلاس میں معدودے چند اور منتخب افراد کو کانفرنس کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ خاکسار بھی ان چند میں شامل تھا۔

کانفرنس میں ویسٹ انڈیز ملکوں۔ سری نام۔ ٹرینڈاڈ۔ گیانا۔ فجی سے بڑی تعداد میں اسکالرس اور آرٹسٹس آئے تھے۔ ان کے کلچرل پروگرام دیکھ کر اور ان کی تقریریں سن کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ان کی زندگی میں رامائن کا کتنا دخل ہے۔ یہ امر بھی باعثِ حیرانی تھا۔ ہر شخص رامائن کتھا کا حافظ تھا۔ دو سو سال قبل ڈچ اور انگریز، بنگال بہار اور اتر پردیش کے مشرقی علاقوں سے ہندوستانی مزدور سمندری جہازوں کے ذریعہ ان ملکوں میں لائے تھے۔ انہیں غلاموں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ وہ گنے کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ دن بھر دھوپ میں کڑی مشقت کرنی پڑتی تھی۔ جس ایک کتاب نے انہیں زندہ رہنے کی طاقت دی تھی وہ رامائن تھی جو وہ ہندوستان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ بھی کپڑوں میں چھپا کر محنت مزدوری کے بعد جب وہ رات کو ایک جگہ جمع ہوتے تو رامائن گا کر دل بہلاتے۔ مقامی فوک لور سے رامائن کے پدوں میں اور بھی اثر آفرینی پیدا ہو گئی۔ ان لوگوں نے ان ملکوں میں جیسی صبر آزما زندگی گزاری مقررین نے اپنی تقریروں میں بیان کیا۔ اسے سن کر دل لرز اٹھا۔ ان ملکوں میں ہندوستانیوں کی یہ تیسری نسل ہے۔ حالات بدل چکے ہیں اب اقتدار میں ان کی برابر کی حصہ داری ہے۔ ہندوستانی وزیراعظم تک ہے۔

تلسی کا کارنامہ یہ ہے کہ آدی کوی بالمیکی کی رامائن میں جو رام ایک مہا پرش ہے اسے انہوں نے اپنی بھگتی اور شاعری کے ذریعہ حقیقت مطلق میں بدل دیا۔ رامائن کو اودھی میں تخلیق کر کے تلسی نے اسے ہندوؤں کے گھر گھر پہنچا دیا اور ہندو سماج کی کایا پلٹ کر دی۔ ان کے پورے سنسکرت لٹریچر نے وہ کام نہیں کیا جو رام چرت مانس نے انجام دیا۔ ہندو مذہب کو منضبط کر دیا۔ سولہویں صدی تک جو مذہب ٹوٹ کر بکھر رہا تھا اسے ایک

صابطہ حیات میں بدل دیا اور اسے پھر نئی زندگی مل گئی۔

یہی نہیں تلسی کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جدید ہندی زبان وادب کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ اگرچہ اس میں دوسرے بھگت کویوں ملک محمد جائسی، رس کھان، کبیر اور رحیم کا بھی بڑا یوگ دان ہے تلسی کے یہاں ان کویوں کے اثرات بھی ہیں۔ انہوں نے فارسی و عربی کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں اور جب وہ رام راجیہ کا ذکر کرتے ہیں تو اکبر کی وسیع المشربی، رواداری اور صلح کل کی تصویر ابھرتی ہے اور جب وہ راج بھونوں کی تصویر کشی کرتے ہیں تو مغلوں کی معاشرت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

یہ بھی کیسا دلچسپ اتفاق ہے کہ سولہویں صدی میں جس طرح تلسی نے رام کو لیکر ہندو سماج کی تجدید نو کی تھی اسی طرح بیسویں صدی میں رام جنم بھومی کو لیکر سنگھ پریوار نے ہندؤں میں بیداری کی لہر دوڑائی۔ جنم بھومی آندولن کے ڈانڈے تلسی سے جاکر مل جاتے ہیں۔

شیخ سلیم احمد۔ ۱۵۰ بستی حضرت نظام الدین۔ نئی دہلی۔ ۱۳

کوثر مظہری کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

نئی دہلی نئی نسل کے شاعر وادیب اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ کے لکچرر کوثر مظہری کو جامعہ ملیہ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انہوں نے "اردو نظم کا تہذیبی و ثقافتی مطالعہ ۱۹۴۷ء تک" موضوع پر اپنا مقالہ پروفیسر شمیم حنفی صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا۔ مقالے کے ممتحن پروفیسر عتیق اللہ (صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) پروفیسر ابوالکلام قاسمی (سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور پروفیسر شارب ردولوی تھے۔

اکولہ میں فصیح اللہ نقیب کے اعزاز میں مشاعرہ



فصیح اللہ نقیب کی گل پوشی کرتے ہوئے غنی اعجاز

عثمان آزاد اردو ہائی اسکول اور اصغر حسین جونیئر کالج میں فصیح اللہ صاحب کا بطور پرنسپل تقرر کئے جانے کی خوشی میں ۱۶ر فروری کی شب ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر کے مختلف مقامات کے شعراء نے شرکت کی۔

مرسلہ : شکیل اعجاز۔ اکولہ۔

نیویارک میں ظفر زیدی میموریل کلچرل سوسائٹی کا سولہواں سالانہ مشاعرہ

۳۰ر اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شام شہر نیویارک میں ظفر زیدی میموریل کلچرل سوسائٹی کا سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ تقریب کے آغاز میں ایک شاندار عشایئے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کشور خان، ستارہ بشیر، زریں خان، اور شاہدہ قادر نے مہمانوں کی میزبانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عشائیہ کے بعد ظفر زیدی سوسائٹی کے سیکریٹری جنرل رئیس وارثی نے تقریب کے باقاعدہ آغاز کا اعلان کیا۔ تلاوت کلام پاک صابر سید نے کی۔ اسکے بعد ظفر زیدی سے منسوب کئے گئے حصے میں صبیحہ صبا نے ایک خوبصورت غزل ان کے لئے مخصوص کی

ع مگر یہ رسم جنوں ہے حدیث پارینہ
کہ نام آج سے ایثار کا ظفر ٹھہرا

ان کے بعد رئیس وارثی نے ظفر زیدی کے لئے چند اشعار پیش کئے۔ اور ان کے حوالے سے ایک خوبصورت اور پر تاثر خطاب کیا۔

اسکے بعد جناب فائق صدیقی کو رئیس وارثی نے باقاعدہ نظامت کی دعوت دی۔ فائق صدیقی شہر میں اپنی خوش گفتاری کے باعث خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے اس سلسلے میں مایوس نہیں کیا۔ صدارت عادل منصوری صاحب کی تھی۔ جو گجراتی اور اردو زبان کے شاعر بھی ہیں اور مشہور آرٹسٹ بھی۔ ظفر زیدی میموریل کلچرل سوسائٹی سولہ سال قبل نیویارک کے جواں مرگ شاعر ظفر زیدی کی موت پر تشکیل دی گئی تھی۔ تب سے ابتک سولہ سالانہ مشاعروں کے علاوہ کئی کتابوں کی افتتاحی تقاریب کئی قلم کاروں کے ساتھ شامیں اور تنقیدی نشستیں منعقد کر چکی ہے۔ اس بار بھی سالانہ مشاعرہ وقار اور خوش انتظامی کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا۔ سوسائٹی کی صدر حمیرا رحمٰن نے شعراء اور حاضرین کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کمیٹی کا خصوصی شکریہ ادا کیا جس میں کشور خان، شاہدہ قادر، ستارہ بشیر اور زریں خان کے علاوہ ادریس اصغر، روبینہ حسین، کبیر جعفری، عزیز جعفری، شاکرہ جعفری، کامران خان، اور کاشف خان پیش پیش تھے۔ اس تقریب کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نوجوانوں کی ایک ایسوسی ایشن "دستک" نے بھی تعاون کیا تھا اور ان کے

نمائندے وہاں موجود تھے۔ اس لحاظ سے یہ بھی ایک اچھی بات دیکھنے میں آئی کہ مشاعرے جیسی سنجیدہ تقریب میں نئی نسل کے اس گروہ نے بھی شرکت کی جو امریکہ میں پیدا ہوا اپنی زبان اور تہذیب سے تعلق رکھنے کا خواہش مند ہے۔ دستک کے خصوصی نمائندے معین خان نے اپنی ایسو سی ایشن کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ہم پہلے بھی مختلف تنظیموں کے ساتھ تعاون کرتے رہے ہیں لیکن ظفر زیدی سو سائٹی واحد ادبی تنظیم ہے جس میں ہم نے اپنے تمدن اور زبان کی خاطر خاص طور پر شرکت کرنے میں دلچسپی محسوس کی۔ دستک پاکستانی کیمونٹی سے تعلق رکھنے والے ان نوجوانوں کی تنظیم ہے جو یہاں پر کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور اب وہ اپنے تجربے کو اپنی کیمونٹی کے دوسرے افراد کے ساتھ بانٹنا چاہتے ہیں۔ معین خان صاحب کو بڑے اشتیاق سے سنا گیا۔

فائق صدیقی صاحب کی نظامت، شعراء کے اشعار کی روانی اور خوبصورتی اور سامعین کی داد اور دلچسپی نے اس تقریب کو ایک یادگار محفل بنادیا۔ اور یوں رات دیر گئے یہ شام خوبصورتی سے انجام پذیر ہوئی۔

شعراء کے کلام کی کچھ جھلکیاں قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کی جا رہی ہیں۔

ع جو دل پہ گزرتی ہے وہ یاروں سے کہیں گے
اب کہنے پہ آئے تو ہزاروں سے کہیں گے — طاہرہ فاروقی

ع فصلِ بے مایہ کی صورت میں زمیں بوس ہوئی
زیست کے بوجھ سے کمزور بدن ہار گیا — رخسانہ سحر

ع بجھ گیا تھا میں زمانے کی خوشی کی خاطر
جذبۂ جوشِ چراغاں تو مرا کم نہ ہوا
نئی صدی کے سفر پر چلے تو ہو لوگو
گئی صدی کی تباہی دھیان میں رکھنا — سرور جاوید

ع محتاط ہم بھی ہو گئے اس واقعہ کے بعد
کچھ دن تو خوف رہتا ہے ہر حادثے کے بعد — الطاف ترمذی

ع خواب کے مچھیروں کو نیند کے سمندر سے
رنگ برنگ یادوں کی مچھلیوں نے گھیرا ہے — شہلا نقوی

ع مجھے وحشت غضب کی ہے تبھی چینی غضب کی ہے
جو حالت ہو رہی ہے آج کل جانے وہ کیسی ہے
خداوندا میری خاک وطن میں پھول کھل جائیں
مری خواہش وہی ہے، دوستوں جو آپ سکی ہے — جمال قادری

ع میں اپنے گھر سے جو نکلا تو کس نے روکا تھا
میں اپنے گھر کو نہ جاؤں تو کون پوچھے گا

مجھے اسکے قرب کی ساعتوں کا زمانہ جب بھی نصیب ہو
وہی میرا دورِ شباب ہے مرے زاویئے سے یہ سوچنا — رئیس وارثی

ع ہم لوگ مسافر ہیں خیالوں کے جہاں کے
ہم تیرے خیالوں میں بھی آئیں گے کسی دن — عبدالرحمن عبد

ع مارے گئے بے موت پئے شوقِ تماشہ
ہم لوگ جنہیں عشق سے کچھ کام نہیں تھا
دلیلِ فتح ساقی ہے یہ مئے خانے میں رکھ دینا
مری ٹوٹی ہوئی توبہ کو پیمانے میں رکھ دینا — (احمد صفی)

ع جو بیویوں کی محبت میں بھائیوں سے گیا
وہ کھٹملوں کی طرح چارپائیوں سے گیا
مری کتب کا مرا پبلشر حساب تو دے
کتاب چھاپے نہ چھاپے مگر جواب تو دے — خالد عرفان

ع غیریت کی انتہا ہے اے نگارِ آرزو
اب تو یاد آنے میں بھی تجھ کو تکلف ہو گیا
آپ کو گزرا ہے مجھ پر اک شناسا کا گماں
خیر چلئے اس بہانے ہی تعارف ہو گیا — صبیحہ صبا

ع امیر شہر کا جانا ضروری ہو گیا تھا
نیا قانون لکھوانا ضروری ہو گیا تھا
ایک دیوار گرانے میں بہت دیر لگی
وقت کا قرض چکانے میں بہت دیر لگی — واصف حسین واصف
یوں بھی ہوا لفظوں کی آتش بازی میں
ہم نے سچ کہنا چاہا اور جھوٹ کہا — حمیرا رحمان

ع سات سمندر پار کے ہم شہری ہو جائیں گے
ایسا یاں کب سوچا تھا جب نکلے تھے گھر سے — رشیدہ عیاں

ع یقیں پہ رکھتے ہیں یا پھر گماں پہ رکھتے ہیں
نہیں پہ رکھ نہیں سکتے تو ہاں پہ رکھتے ہیں
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
مدار سارا مگر درمیاں پہ رکھتے ہیں — عادل منصوری

مرسلہ: حمیرا رحمان (نیویارک)

مقصود الٰہی شیخ کے اعزاز میں تقریب

(نوٹنگھم، برطانیہ) ۳۰ جنوری بروز اتوار، حلقہ ارباب ذوق نوٹنگھم کی طرف سے "راوی" بریڈ فورڈ کے بانی اور مشہور و مقبول افسانہ نگار جناب مقصود الٰہی شیخ کے اعزاز میں پاکستان سنٹر میں یادگار محفل منعقد ہوئی۔ جس میں لندن، برمنگھم، بریڈ فورڈ، ہیڈ برا اور مختلف شہروں سے

لوگ شریک ہوئے۔ ممتاز شاعر عاصی کاشمیری نے محفل کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا مقصد شیخ صاحب سے ان کی، برصغیر کے معروف اردو مراکز کی حالیہ سیر و سیاحت کی دلچسپ اور معلومات افزا روئیداد سننا ہے جسکے بعد مختصر سا مشاعرہ بھی ہوگا۔

جناب شیخ اپنی اہلیہ محترمہ فریدہ شیخ اور صاحبزادی آنسہ عروسہ شیخ کے ہمراہ تشریف لائے۔ حلقہ ارباب ذوق کے صدر صوبیدار یعقوب مرزا نے حاضرین کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے مہمان عزیز کا استقبال کرنے کے بعد ان کی خدمت میں پھول پیش کئے اور درخواست کی کہ اپنے پاک و بھارت کے طویل سفر کا حال حاضرین کو سنائیں۔ جس پر انہوں نے مختصراً اس سفر کے دوران اردو کے بارے میں ہونے والے مشاہدات پر گفتگو کرتے ہوئے بڑی معلومات افزا باتیں بتائیں جنہیں بڑی دلچسپی سے سنتے ہوئے، حاضرین ساتھ ساتھ سوال جواب کی صورت اپنی معلومات بڑھاتے رہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنا افسانہ 'منظر بدل گیا' پڑھا۔ اس پر صوبیدار یعقوب مرزا نے سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے، بعض حوالوں سے عالمی مسائل کی طرف خصوصی توجہ دلاتے ہوئے افسانہ نگار کی نظر کی گہرائی، تکنیک اور پُر گوئی کو سراہا۔ انہوں نے کہا معیاری افسانہ وہی ہوتا ہے جو تہ داری کے باوجود قاری کو تڑپادے۔ اور مقصود الٰہی یہ گر خوب جانتے ہیں۔

ان کے بعد سنگت پراجیکٹ نوٹنگھم کے ڈائریکٹر جناب مسعود احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا پاکستان کے مشہور ادبی رسالے 'افکار' کے ذریعہ شیخ صاحب سے شناسائی ہونے کے بعد مسلسل ان کے افسانے پڑھنے شروع کئے۔ کہانی کی بُنت، افسانے کی تکنیک اور زبان پر مکمل گرفت کو سراہتے ہوئے انہوں نے کہا ان خوبیوں کی سند تو انہیں پہلے مجموعے کی اشاعت پر ہی جناب احمد ندیم قاسمی سے مل گئی تھی۔ انہوں نے راوی کے بیش قیمت اداریئے اور اسمیں چھپنے والے اہم مضامین و منظومات کو کتابی صورت میں چھاپنے کی تجویز پیش کی۔

ان کے بعد برمنگھم سے آئی ہوئی نعت گو شاعرہ اور افسانہ نگار طلعت سلیم نے شیخ صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کی افسانہ نگاری کی عمر نصف صدی پر محیط ہے۔ برّصغیر میں برطانیہ کے اہل قلم کی کاوشوں کو اونچے پیمانے پر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا جبکہ شیخ صاحب پر وہاں ''انشاء'' ''افکار'' اور ''دنیائے ادب'' ایسے وقیع ماہناموں نے خصوصی گوشے شائع کئے۔ ان کی صحافتی خدمات کا اعتراف پاکستان، انگلستان دونوں جگہ کیا جاتا ہے۔ بعض اداروں کی طرف سے ان کی صحافتی خدمات پر ایوارڈ بھی دیئے گئے۔ چوتھائی صدی تک راوی، کو ایک شان اور آن بان کے ساتھ چلاتے رہنا ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ راوی، کی صورت میں خوبصورت ادبی محفل سجا کر انہوں نے برطانیہ ہی نہیں امریکہ، مشرق وسطیٰ پاک و ہند کے قلمکاروں سے لوگوں کو متعارف کروایا۔ نو آموزوں کی حوصلہ افزائی کی ''راوی میں لکھئے دل میں نہ رکھئے'' کی تحریک چلا کر، لکھنے والوں میں جرأت اظہار و صاف گوئی کو فروغ دیا۔ جب شیخ صاحب کی ذاتی مجبوریوں کے باعث ''راوی'' کے بند ہونے کا خطرہ پیدا ہوا تو برطانیہ کے طول و عرض میں اداسی پھیل گئی۔ صد شکر کہ آواز پبلکیشنز نے یہ اخبار لے لیا اور شیخ صاحب اور محترمہ فریدہ شیخ کے خونِ جگر سے سینچا ہوا پودا مرجھانے سے بچ گیا۔

چائے کے وقفے کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ جسکی نظامت زینب بخاری نے کی۔ سعدیہ سیٹھی۔ نادیہ خان۔ محمد سرور رجاء۔ طلعت سلیم۔ اور روزنامہ اوصاف، اسلام آباد کے اشفاق احمد نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

رپورٹ۔ طلعت سلیم (برمنگھم)

کیا آپ کوئی کتاب چھپوانا چاہتے ہیں ......؟

نیوز کمپوزنگ سے لے کر کتاب کی جلد سازی تک تمام ذمہ داری آپ ہمیں سونپ دیجئے ..... !!

مسودہ دیجئے ——— ۹۰ دن میں کتاب لیجئے

کتاب کے سائز، صفحات اور تعداد اشاعت کی تفصیلات لکھ کر تخمینہ منگائیں

Insha Graphics

6-A, Kanai Seal St., Cal - 73 • ☎ : 235-3107

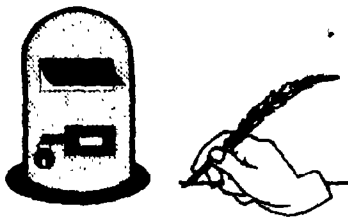
E-Mail : safe@cal2.vsnl.net.in

اِنشاء

کا آئندہ خاص شمارہ

٤١٤ ؛ کے نمائندہ عصری ادب نمبر

زیر ترتیب ہے۔



آپ کی ڈاک

(مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

شوہر کا انتقال
شاعرہ رشمی بادشاہ کو سخت صدمہ

○ جناب ف۔ س۔ اعجاز صاحب! آداب

بہت دن ہوئے آپ کا خط آیا تھا۔ جواب لکھتی کہ اس سے پہلے میرے شوہر طیب بادشاہ کو ہارٹ اٹیک آیا۔ پہلا ہی تھا مگر خدا نے انہیں مجھے پھر نہیں بخشا۔ آپریشن کرایا ٹھیک ٹھاک ہسپتال سے لے آئی اور پھر فالج مار گیا کل ملا کے ڈیڑھ مہینے کی مدت تک میں بار بار ان کے ٹھیک ہونے اور بیمار ہونے کا تماشہ دیکھتی رہی۔ ہسپتالوں کے چکر لگتے رہے۔ آخر کار جب ایک دم یقین آگیا کہ ٹھیک ہی ہو جانے والے ہیں جس دن میں بہت خوش تھی۔ ۲۵ر اکتوبر کی شام وہ مجھے دیکھ کر آخری بار مسکرائے تھے۔ اور اس کے آدھا پون گھنٹے کے اندر وہ مجھے چھوڑ گئے۔ آج تین مہینے ہوئے اب تھوڑی سنبھلی ہوں تو تمام خطوط کے جواب لکھنے لگی ہوں!

اس وقت کانپور میں ایک ایسے گھر میں ہوں جو دیکھنے میں میرے ماں باپ کا لگتا ہے محسوس کرنے میں پرایا! آخر لڑکی کا گھر تو اس کے شوہر ہی کا ہوتا ہے! خیر یہاں کا پتہ ہے:

62-B, Tagore Rd., Cantt.
Kanpur - 208001

خیر اندیش
رشمی بادشاہ

رشمی صاحبہ! آپ کے بے پناہ دکھوں کا ہمیں اندازہ ہے۔ ہم آپ کے غم میں سوگوار ہیں۔ خدا مرحوم طیب بادشاہ کو جنت نصیب کرے اور آپکو سکون دے۔ انشاء

OOOOOO

○ انشاء برابر ملتا ہے اسے میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی اس میں بہت کام کی چیزیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ ان دنوں خرابئ صحت کی بنا پر بہت زیادہ لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کر رہا ہوں۔ انشاء کے لائق کچھ لکھ سکا تو ضرور بھیجوں گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی۔ مدیر "شب خون" الہ آباد

OOOOOO

○ انشاء کا تازہ شمارہ آج ہی ملا اور جذبۂ بے اختیار شوق دیکھئے کہ آج ہی اس کا مطالعہ بھی کر لیا۔ انشاء کے ہر شمارے سے شعر و ادب کے حوالے سے نئی اطلاعات مل جاتی ہیں' پیش نظر شمارے میں محترمہ نیر جہاں کی شخصیت اور ان کے شعری و نثری کارناموں نیز اردو اور اہل اردو سے انکے غیر معمولی شغف کی روداد پڑھ کر حیرت اور حد درجہ مسرت ہوئی۔ میں آپکی تلاش کا معترف ہو گیا، کولمبس کی طرح آپ نئی دنیائیں تلاش کر لیتے ہیں۔ انشاء میں آپ نے ان کی دو ایک نظمیں شائع کی ہیں، ایک افسانہ بھی ہے۔ ان کے مطالعے سے ان کے جنوئن فنکار ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ افسانہ "مہندی کے دو رنگ" نے اپنے اسلوب سے متاثر کیا۔ ان کی نظم "پہلا قتل" اور "تابہ کے" نے بھی اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ ان کے اسلوب میں تہہ نشینی جذبوں کی شدت اور دانشورانہ عمق نے ان کی تخلیقی شخصیت میں انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی مزید تخلیقات کے مطالعے کا اشتیاق ہے۔

آپ کی ملینئیم نظم "بجا کیا ہے" بھی بہت اچھی لگی' مبارکباد

ڈاکٹر علیم اللہ حالی (گیا)

OOOOOO

○ ملینئیم عید نمبر کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کس حسن نفاست اور اعلیٰ شعور کے ساتھ آپ اسے ترتیب دے رہے ہیں اور اردو دنیا کے اہم ترین قلم کاروں کا تعاون آپکو حاصل ہے اور کیوں نہ ہو آپکی شخصیت خود شاہراہ ادب میں ایک روشن سنگ میل ہے۔

اداریے میں آپ نے معنی خیز باتیں کہی ہیں۔ دیگر مضامین بھی متاثر کرتے ہیں اور ان سے روشنی ملتی ہے۔ نظموں میں قاضی رئیس، سید بشارت علی اور تسنیم فاروقی پسند آئے۔ افسانوں میں مشتاق انجم' شایستہ ایمن' ساوتری گوسوامی' اور منظور عثمانی بہت اچھے ہیں۔ لیکن غزلوں کا حصہ بھی اس بار بہت ہی خوبصورت لگا۔ وسیم مینائی' وقار مانوی' شمس تبریزی' ملک زادہ جاوید' پروفیسر دل نواز احمد صدیقی اور شمیم عثانی دامن دل کو کھینچتے ہیں۔ میری بدقسمتی ہے کہ اس شہر میں تیس سال سے رہ کر بھی محترم شمیم عثانی کے نیاز کا شرف حاصل نہ کر سکا جن کا کلام آپنے شائع کیا ہے۔ بھگوان داس اعجاز کا قلم منجھا ہوا ہے اور دوہے میں انکو قدرت حاصل ہے مجموعی طور پر اداریے سے لیکر لندن میں منعقد چھٹا عالمی ہندی سیمینار تک "انشاء" ذہن کو مختلف سمتوں سے متعارف کراتا ہے۔ اب اس پر بھی آپکو مبارکباد پیش نہ کروں تو ادب کی شریعت میں کفر کے مترادف ہوگا۔

درد چاند انوی (کانپور)

OOOOOO

○ میری رباعیات کی اشاعت اور فراقؔ گورکھپوری صاحب کی "روپ" کی رباعیات سے اپنی ناچیز رباعیوں کے تقابلی نوٹ کی شمولیت کے لئے ممنون احسان ہوں۔ یوں تو آپ شروع سے ہی میری رباعیات کو بڑے نمایاں انداز میں شائع فرماتے رہے ہیں اور آپکی اس خصوصی عنایت نے میرا جو حوصلہ بڑھایا ہے یقین جانئے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

رباعیات کی اشاعت میں چند خامیاں راہ پا گئی ہیں۔ باقی تو پوری طرح درست ہیں۔

رباعی ۱ کے چوتھے مصرعے میں "ایک" کے بجائے "اک" رباعی ۳ کے تیسرے مصرعے میں "دیکھی ہے وہ کبھی......" بجائے "دیکھی ہے کبھی وہ......" اور رباعی ۵ میں "کھنکے" بجائے "کھنکیں" چھپ گیا ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ تصحیح فرمائیں۔

آپ نے اپنے اداریئے "قوم گھاٹے میں ہے" اور اپنے "صدی اشعار" میں وہ تمام باتیں پیش کی ہیں جو ایک بیدار مغز اور باشعور انسان کے دل کی آواز ہیں لیکن بات تو جب ہے کہ ہمارے ملک کے اہل سیاست اور اہل اقتدار ان باتوں پر توجہ فرمائیں۔ محترمہ امیر النساء کا سفر نامہ دلچسپ اور معلوماتی تو ہے ہی ساتھ ہی انداز بیاں اور اسلوب بھی بڑا متاثر کن ہے۔ مقصود الٰہی شیخ صاحب اور نیر جہاں صاحبہ کے افسانے "برسو ردے نینوا مورے" اور "مہندی کے دو رنگ" جذباتی اتار چڑھاؤ اور نفسیاتی جذبات نگاری کے دلکش مرقعے ہیں۔ دونوں افسانے نہایت فطری انداز اور خوبصورت اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ منظومات میں فراق جلال پوری، ڈاکٹر شباب للت اور حاجی انیس دہلوی کی غزلیں اور جگن ناتھ آزاد صاحب کی نظم ذہن پر دیرپا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ جناب صفوت علی صفوتؔ صاحب کی "مثنویٔ وقت" پر آپ کا تبصرہ نہایت جامع اور وقیع ہے اور قاری کو مثنویٔ مذکور کے تمام پہلوؤں سے متعارف کراتا ہے۔

طہور منصوری نگاہ، ریوا۔ مدھیہ پردیش

OOOOOO

○ "انشاء" کو گھونٹ گھونٹ پینے ایسا عمل کرتا ہوں۔ انتظار کے دو ماہ بڑے ظلم ڈھاتے ہیں۔ "ملینیم عید نمبر" کیا ہے فکر و عمل کو Challenge ہے۔ اگر ہم نے اس پر بھی کروٹ نہیں بدلی تو "اداریہ" کے تحت قرآنی نقطۂ نظر سے آپ کا وقت کی قسم کھا کر کہنا کہ "انسان خسارے میں ہے" بالکل صحیح و درست ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون "اکیسویں صدی کیلئے تدبیر و عمل" کھلی ذہنیت کا غماز ہے۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ "ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ سب اسی زلف کے اسیر ہوئے"۔ باقی مضامین بھی اچھے ہیں۔

امیر النساء کا "سفر نامہ" خوب معلومات فراہم کرتا ہے جس کو دیر سویر سے کتابی شکل ملنی چاہئے۔ مقصود الٰہی شیخ۔ رینو بہل۔ ساوتری گوسوامی۔ اور نیر جہاں۔ کے افسانوں نے بہت متاثر کیا۔ دیپک کنول صاحب کا افسانہ "تفتیش" پرانی تفتیش پر ہے۔ بقول شاعر "پھینکی نہ منوّر نے بزرگوں کی نشانی۔۔۔ دستار پرانی ہے مگر باندھے ہوئے ہے"۔ ڈاکٹر نفیس بریلوی کا افسانہ اچھا تو ہے مگر "میں مرد بن گیا ہوں" اور اندرون افسانہ "نامرد" جیسے لفظوں کو قبول کرنے میں ضمیر ذرا ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ statue اور ہلچل بھارتی کی غزل کیلئے آپکا انتخاب بھی برمحل ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب نے "مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری" پر سیر حاصل تجزیہ کیا ہے۔ صفوت علی صفوتؔ کی "مثنویٔ وقت کو آپنے جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے تو "مثنوی وقت" وقت کی ضرورت بن گئی ہے۔ اعجاز بھائی آپ کے قلم کی جولانی دیدنی ہے۔ "صحت اور ہومیوپیتھی" کے تعلق سے ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش کی گرفت اچھی ہے۔ جگن ناتھ آزاد۔ نیاز جیراجپوری۔ حاجی انیس دہلوی۔ شرف کمالی۔ سہیل فصیح۔ اور مدہوش بلگرامی۔ نریندر سیٹھ۔ عاصی کاشمیری۔ طہور منصوری نگاہ، نیر جہاں اور آپکی شاعری بہت پسند آئی۔

شبنم سنبھلی۔ جامع مسجد پوسٹ رین ضلع ناگور (راجستھان)

OOOOOO

○ نئے شمارے میں افسانہ "تفتیش" نے بیحد متاثر کیا۔ بلکہ دل ہلا دیا۔ دیپک کنول صاحب نے کمال کر دیا۔ آپکا اداریہ بھی بیحد پسند آیا۔ گوشۂ نیرؔ جہاں بھی پسند آیا۔ مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کا بھی جواب نہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی صاحب داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ "آپکے صدی اشعار" نے بھی دل باغ باغ کر دیا۔ ایسا لگتا ہے یہ اشعار دل کی گہرائیوں سے لکھے گئے ہیں۔ محترم "نیاز جیراجپوری" اور "جگن ناتھ آزاد" کی تخلیقات بھی خوب ہیں۔ پڑھکر دل و دماغ کو فکر و آگہی ملی۔ اس کے علاوہ "آپکی ڈاک" کے تحت جو خطوط آپ منتخب کرتے ہیں وہ بھی بامقصد ہوتے ہیں۔

یوسف گوہر۔ شاہ جہاں پور۔ یوپی ۲۴۲۰۰۱

OOOOOO

○ عید نمبر دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح آپکا اداریہ فکر انگیز اور دردمندی کا آئینہ ہے، علاوہ ازیں اس شمارے میں بھی آپ نے حسب دستور سابق جواہر پارے یکجا کر دئے ہیں۔ حصہ نثر میں "ارض مقدس میں چند روز" کے علاوہ ساوتری گوسوامی اور مقصود الٰہی شیخ کے افسانے بطور خاص دل کو سپرش کر گئے، ڈاکٹر الفیہ اللہ بخش کی معلوماتی حکیمانہ تحریر اپنے افادی پہلو کی وجہ سے بڑی اہم ہے۔ شخصیات میں نیر جہاں کی شاعرانہ حیثیت اور حسیت پر ہر چرن چاولہ نے جو روشنی ڈالی ہے وہ کافی اہم ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے مجتبیٰ حسین صاحب کی خاکہ نگاری پر تفصیلی گفتگو کی ہے جو بہت کارآمد ہے مگر اس میں خاکوں کے اقتباسات اصل تحریر سے کچھ زیادہ ہیں جو مصنف کی اصل تحریر سے آگے نکل آئے پھر بھی ڈاکٹر صاحب کا مضمون اہمیت کا حامل ہے کہ صاحبِ مضمون اور صاحبِ موضوع دونوں ہی ادب کی جانی مانی شخصیتیں ہیں۔

حصۂ نظم میں آپکی نظم "بجا کیا ہے" نفسِ مضمون اور ندرتِ اظہار کی رو سے ایک اہم نظم ہے۔ ہماری زندگی کرنے کی نہج پر بھرپور طنز بھی ہے اور ہمیں فکری محاسبہ پر بھی اکساتی ہے اسکے علاوہ ایک نظم "میں نبیٹا ہوں" بھی عصری سچائیوں کو اجاگر کرتی ہے اور اپنے ڈاکشن میں دردمند شعلہ نوائی کا احساس بھی دلاتی ہے۔ غزلوں میں 'رئیس الدین رئیس اور ڈاکٹر شباب للت کی غزلیں دامن کش ہیں۔ مزید فراق جلال پوری کا یہ شعر۔

ع گھر کی تقسیم میں دیوانے بضد ہیں یعنی
گھر کے بٹوارے میں ماں باپ کا سر چاہتے ہیں

آج کے انسان کی عمومی جبلت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان تمام کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ کیا کیا کچھ لکھا جائے۔ مجموعی طور پر مطالعہ انشاء سے جو تاثر بنتا ہے۔ اسے میں کفایت لفظی میں بس اس طرح ادا کر سکتا ہوں ۔ ہر قدم روشنی ہر دم حوصلہ۔

قاضی رئیس۔ اورنگ آباد، (مہاراشٹر)

OOOOOO

O انشاء کا تازہ شمارہ "ملینیم عید نمبر" نظر نواز ہوا۔ مشمولات وقیع، متنوع ہیں۔ گفتنی کے تحت آپکا اداریہ "قوم گھاٹے میں ہے" دل کو چھو گیا۔ کاش کہ اب بھی ہمیں اپنے گھاٹے کا احساس ہو جائے اور ہم اپنی سدھار کرلیں۔ ورنہ آنے والے دنوں میں اپنی حالت صفر کی ہو جائیگی۔

انشاء کے سبھی مضامین لائق تحسین اور معلوماتی ہیں۔ گوشۂ نیر جہاں پسند آیا۔ اچھے مضامین لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش کا "صحت اور ہومیوپیتھی" اچھا سلسلہ ہے۔ بہتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ افسانے عمدہ ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ 'دیپک کنول' اور ساوتری گوسوامی کے افسانوں نے اچھا تاثر دیا ہے۔ امیر النساء کا سفر نامہ معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ حصۂ نظم میں صدری اشعار اور "بجا کیا ہے" عنبر بہرائچی کی دونوں نظمیں، رباعیات از طہور منصوری نگاہ، عاصی کاشمیری اور پرکاش تیواری کے ماہیے پسند آئے۔ حاجی انیس دہلوی، مدہوش بلگرامی، عاصی کاشمیری، رئیس الدین رئیس، ڈاکٹر شباب للت کی غزلیں اچھی لگیں۔ احوال واخبار کے ذریعہ اردو ورلڈ کی اچھی خاصی سیر ہو جاتی ہے اور سرگرمیوں کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

غیاث انجم، بوکارو (اسٹیل سٹی)

OOOOOO

O گزشتہ دنوں شمارہ ا۔۲ برائے جنوری فروری ۲۰۰۰ء ملا! اس میں دیگر اہم مضامین کے ساتھ محترمہ امیر النساء صاحبہ کا "ارضِ مقدس میں چند روز" سفر نامہ شائع ہوا ہے۔ اس کی پانچویں قسط اس شمارے میں شائع ہوئی۔ پچھلے چار شمارے ہماری نظروں سے نہیں گزرے! مجھے ذاتی طور پر ان کی اشد ضرورت ہے اس لئے کہ گزشتہ سال یعنی ۱۹۹۹ء کے فروری مارچ میں میں نے ممبئی کے "مسلم ٹورز" کے ساتھ یہ سفر کیا اور الحمدللہ حج کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ میں خود آج کل یہ سفر نامہ تحریر کر رہا ہوں اس کے لئے محترمہ کا سفر نامہ پڑھنا بہت ضروری ہے۔ محترمہ نے اس سفر نامے میں اصحاب کہف کے غار کا تذکرہ مع تصویر شامل کیا ہے۔ ہمیں یہ غار دمشق 'شام میں دکھایا گیا تھا۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی اپنے سفر نامے میں اردن میں اصحاب کہف کے غار کا تذکرہ کیا ہے! ہم حیران ہیں کہ ہمیں اردن نہیں بلکہ (سیریا) شام کا صرف اسلئے سفر کرایا گیا! کہ وہاں اصحاب کہف کا اصلی غار دریافت ہوا ہے اور وہاں کی ایک پہاڑی کے دامن میں یہ غار دیکھا۔ اس میں چند طاقچے بنائے گئے ہیں ایک میں اصحاب کہف کے استخوان رکھے گئے ہیں اور دوسرے میں ان کے ساتھی کتے کا جبڑا اور سر کا ڈھانچہ اور تیسرے میں ان اصحاب کی ذاتی استعمال کی چند اشیاء موجود ہیں۔ میں محترمہ کا سفر نامہ پڑھ کر حیران رہا کہ اردن میں جس غار کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔ ایسے ہی یروشلم میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسجد اور ان کا مدفن واقع ہے اس کے ساتھ زیتون پہاڑ پر حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار شریف دکھایا گیا۔ بعد میں یہی مدفن عراق میں دکھایا گیا۔ اصلی کون سا ہے۔ محترمہ نے Dead sea کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ اس کے پانی کا رنگ نیلا ہے اور بدوی لڑکوں کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ وہ اس کو بوتلوں میں بھر کر بیچتے تھے۔ ہم نے مردار دیکھا اس کا پانی صاف و شفاف ہے مگر اس میں کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا ہے۔ اس میں ایسڈ پایا جاتا ہے اور ہاتھ جل جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس بستی پر عذاب الٰہی آنے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں سیاح زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے ہیں۔ ہم نے وہاں کسی کو مٹی وغیرہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہم نے کربلائے معلٰی نجف اشرف مسلم بن عقیلؓ کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والے اکثر متولی خادم حضرات ہیں۔ ان کے کچھ اپنے رسم و رواج ہیں۔ مگر ہر ایک اپنے طور نذرانہ عقیدت پیش کرتا ہے۔ جناب علی ظہیر نے محترمہ کی تحریر پر جو اعتراض کیا ہے وہ بھی اپنا حق رکھتے ہیں۔ بہر حال ہمیں کسی کے اعتقادات پر انگلی اٹھانے کا حق نہیں! آخر میں آپ سے پھر استدعا کرتا ہوں کہ مہربانی

فرما کر انشاء کے سابقہ شمارے ضرور اس پتے پر ارسال کریں۔ میں انشاءاللہ اس سفرنامے پر تفصیلی رائے لکھ کر روانہ کروں گا۔ خط شائع کریں۔

حاجی پیر
غلام رسول معرفت لون نیوز ایجنسی، ڈاک خانہ ہانڈی پور کشمیر، پن ۱۹۳۵۰۲

OOOOOO

O انشاء کا سرورق نہایت عمدہ ہے۔ سادگی اور رنگینی کا دلچسپ امتزاج۔ ”گفتنی“ (قوم گھاٹے میں ہے) سے متاثر ہوا۔ انسان کتنا بے قیمت ہے۔ زندگی کتنی لایعنی اور ضمیر انسانی خوابیدہ! مشتاق انجم کا افسانہ ”پڑوسی“ بہت اچھا افسانہ ہے۔

امیر النساء کا سفر نامہ میں نے گذشتہ شمارے میں بھی ملاحظہ کیا تھا اور اس شمارے میں بھی دیکھا۔ دلچسپ ہے۔ انداز بیان سادہ اور بے تکلف ہے لیکن کسی قدر معلومات افزا۔ لندن میں منعقدہ عالمی ہندی سیمینار پر رپورٹ پڑھکر بہت لطف آیا۔ حیدر طباطبائی صاحب بہت صاف گو اور حقیقت نویس ہیں۔

قمر نقوی
6207,S, Indianapolis PL,
Tulsa, OK 74136 (U.S.A.)

OOOOOO

O انشاء باقاعدگی سے چل رہا ہے۔ آپ نے جس خوبصورتی سے میری کتابوں ”فکرِ فردا“ اور ”مثنویٔ وقت“ کو ہند کے دور دراز علاقوں میں روشناس کردایا ہے، اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ ایک آدھ خط آپ کے پرچے کی وجہ سے مجھے براہ راست امریکہ میں بھی ملا ہے۔ آپ کے قارئین کے حسنِ کرم کا بھی معترف ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو ادبی پرچہ نکال کر کوئی بھی امیر نہیں ہوا۔ پس آپ لوگ جس طرح سے اردو کی خدمت میں مصروف ہیں اسکا اندازہ دیارِ غیر میں ہی بیٹھ کر ہو سکتا ہے۔

”فکر فردا“ اور ”مثنویٔ وقت“ کے بعد صفوت کی تصنیفات "TIAMBIC" اور ”مثنویٔ رسول“

دو باتیں آپ کے قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی یہ کہ میری انگریزی شاعری کی پہلی تصنیف "TIAMBIC" عنقریب دستیاب ہو جائیگی۔ یہ کتاب امریکہ ہی سے چھپے گی۔ اس پوری کتاب میں ایک ہی نظم ہے جس میں ایک ہزار چوبیس اشعار رقم کئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ شاید آپ کو یاد ہو کہ مثنویٔ وقت کے شروع میں کائنات کی تخلیق سے پہلے ایک ”ٹیکنیکل شعر تحریر کیا تھا۔

تو وہ نورِ احمدؐ مجتبیٰ وہ الگ ہے عشق کی داستاں
یہ عبورِ وقت کی بات ہے وہ میں پھر کروں گا کبھی بیاں

گویا نہ صرف قارئین بلکہ اپنے نبیؐ سے یہ وعدہ تھا کہ یہ بیان زندگی پھر تحریر کروں گا۔ آجکل ”مثنویٔ رسول“ تحریر کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ بلکہ یہ کام مکمل ہی سمجھئے۔ ”مثنویٔ وقت“ کی طرح یہاں بھی پوری کوشش کی گئی ہے کہ وہ بات کہی جائے جو پہلے کسی نے بیان نہ کی ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی نے ابھی تک ”مثنویٔ رسول“ تحریر نہیں کی۔ اس ایک نظم میں ۳۱۳ر اشعار ہیں۔ آپکے قارئین کے تجسس کو اجاگر کرنے کے لئے مطلع اور مقطع لکھ رہا ہوں۔ کتاب چھپنے کے بعد آپکو روانہ کرونگا۔

مطلع ؎ ازل سے بھی ہے پارینہ یہ پارہ یا رسولؐ اللہ
قصیدہ آپ ہی کا ہے یہ سارا یا رسولؐ اللہ

مقطع ؎ ردائے عاشقاں صفوت و ما فیہا قبول افتد
صدائے احمدؐ مرسل پسِ افلاک می آید

رواتیا کچھ لکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ پرچے کا ہر مضمون، غزل اور افسانہ خوب ہے۔ گوشۂ نیر جہاں پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان سے کبھی کبھار بات چیت ہو جاتی ہے۔ وہ بھی اردو کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔

صفوت علی صفوتؔ، منرو، کنے ٹی کٹ (امریکہ)

OOOOOO

O اردو ادب پر رسالہ نکالنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور آپ کے لئے یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہوگا کہ آپ ایک ایسی جگہ سے پرچہ نکال رہے ہیں جہاں اردو اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں بالکل تامّل نہیں ہے کہ آپ اس جنگ میں برابر کے شریک ہیں۔ عید نمبر خوب ہے۔ جمیل جالبی کا مضمون ”اکیسویں صدی کے لئے تدبیر عمل“ خاصے کی چیز ہے۔ ان کا یہ جملہ بے حد معنی خیز ہے۔ ”جبر ہمارا امزاج ہے، استحصال اور ناانصافی ہمارا مسلک ہے، فرقہ پرستی اور قبائلی انداز ہمارا اصولِ حیات ہے، اختلاف ہماری عادت ہے“ یہ جملہ پاکستان ہی نہیں، پوری امت مسلمہ کی غمازی کرتا ہے۔

آپ کے ”صدی اشعار“ خوب ہیں، ایک شعر نے زیادہ متاثر کیا۔

ملبے میں دبا بچے کا بدن چیخ رہا تھا
بے درد تھے صدیوں کی روایات کے پتھر

آپ کے رسالوں پر سیر حاصل تبصرہ ایک دن ضرور کرونگا۔

آصف الرحمٰن طارق، نیو جرسی (امریکہ)

OOOOOO

ضخامت : ۴۰۴ صفحات

قیمت : 200 روپے (اندرون ملک) مع رجسٹرڈ ڈاک

600 روپے (بیرونی ممالک) مع رجسٹرڈ ڈاک

خوبصورت ڈی لکس ایڈیشن

رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر / ڈرافٹ صرف بنام

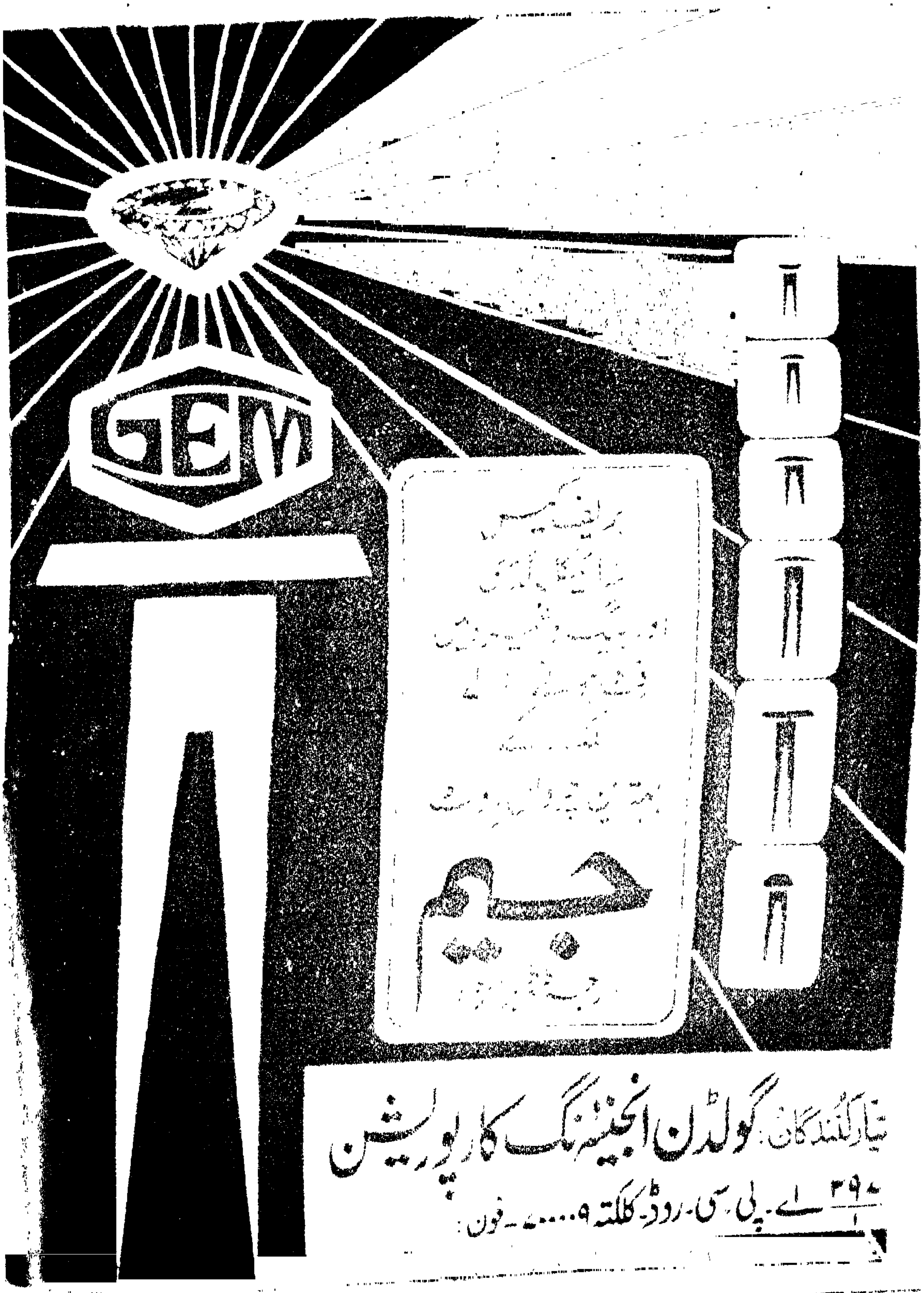
" انشاء پبلی کیشنز " روانہ فرمائیں۔

کتاب پسند نہ آنے پر پوری قیمت لوٹا دی جائے گی۔

Vol : 15
Regd No D 103/99
Postal Regn WB CC 556

MAHNAMA INSI
MAY - JUNE 2000

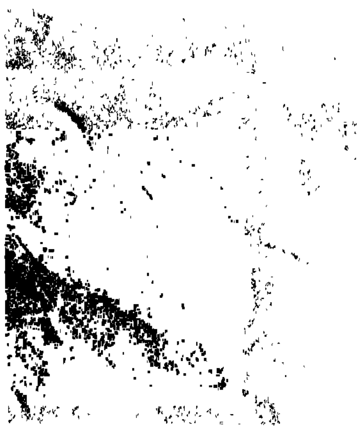
R.N.I. Regd. No. 44
ISSN 0971-6009



... ZAKARIA STREET, CALCUTTA - 700073 EDITOR F S EJAZ

انشاء





Rs. 20/-

اِنشاء

ہندوستان کا ممتاز بین الاقوامی اردو رسالہ

ISSN : 0971 - 6009

انشاء پبلی کیشنز

جلد: ۱۵ | جولائی اگست ۲۰۰۰ء | شمارہ: ۷-۸

مدیر: ف۔ س۔ اعجاز

فہرست

اس شمارے کی قیمت: ۲۰ روپئے

زر سالانہ: ۱۲۰ روپئے

مغربی ممالک سے: £ 15
or
US $ 25

INSTRUCTIONS FOR PAYMENT

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات روانہ کی جائیں۔

امریکہ سے انٹرنیشنل منی آرڈر روانہ کئے جائیں جو کلکتہ میں امریکن ایکسپریس بنک سے نقد واجب الادا ہوں۔

گرافکس: ثاقب فیروز
انشاء گرافکس

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ:
۲۵۔ بی، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳۔ فون: ۲۳۵-۴۶۱۶

Fax : 91-033-235-3107 ● E-mail : safe@cal2.vsnl.net.in ; safe@caltiger.com
● Website : http://www.astroatlas.com/inshapublications

کچھ باتیں

○ قارئین جانتے ہیں کہ "انشاء" اب تک جداگانہ صحافتی روش پر گامزن رہا ہے۔ ادب میں اس کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ اس نے کلکتہ کے اشاعتی و ادبی ماحول کو بدل دیا ہے۔ ورنہ یہاں جمود طاری تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کلکتہ کو ادب میں انشاء نے Internationalize کیا ہے اور درجنوں بدیشی قلمکاروں کا ہندوستان میں نام عام کیا۔ اس طرزِ صحافت کی اچھے اچھے پرانے رسائل نے بھی تقلید کی ہے۔ ادب میں مردہ پرستی کی روایت کو بھی انشاء نے توڑا ہے۔ اب تک کئی زندہ ادیبوں پر وقیع گوشے یا ضخیم خاص شمارے شائع کئے جا چکے ہیں اور "ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ"۔ "اسکینڈے نیویائی ادب نمبر" اور "نیاز فتحپوری نمبر" کے ذریعہ تنقید و تحقیق کو نئی نگاہ، نئے رجحانات بھی دئے اور عام شماروں کے ذریعہ گاہے بگاہے نئے موضوعات سے بھی قارئین کو متعارف کرایا گیا ہے۔ ہم نے صرف ادب سے سروکار نہیں رکھا ہے بلکہ ادب کو صحافتی روش پر چلایا ہے۔ اگر انشاء کی پندرہ سالہ کارکردگی کا جائزہ لیں تو یقیناً آپ کو اپنا ذہنی افق کشادہ ہوتا نظر آئے گا۔ کسی قسم کی تنگ نظری اور تعصب کی رمق آپ اس میں نہیں دیکھیں گے۔ حتیٰ کہ مدیر کی "سیلف پروموشن" کی کوئی شعوری کوشش بھی آپ کو نظر نہیں آئے گی۔ اس سے ہمارے اندر کے ادیب و شاعر کا نقصان ہی ہوا ہے۔ ظ انصاری مرحوم نے ایک بار نصیحت کی تھی: میاں شاعری کرنی ہے اور ادب بھی لکھنا ہے تو پرچے کے لئے ایک فل ٹائم یا پارٹ ٹائم مدیر رکھ لو ورنہ آگے تمہارا نقصان ہوگا۔ بات پتے کی تھی لیکن اس پر عمل نہیں کیا جا سکا۔ لیکن جو کچھ ہم نے کیا اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ جو وقت اپنے تخلیقی عمل کو دینا چاہئے وہ بلا ناغہ دوسروں کو سونپ دینا پڑتا ہے۔ بہر حال یہ سعادت بھی اپنی جگہ باعثِ اطمینان ہے۔

○ شمارۂ مارچ و اپریل "انور شیخ : ادب و متنازعہ افکار" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اندازے کے مطابق اس کا ردِ عمل مجموعی طور پر ایک "اینٹی نمبر" کا رہا۔ اس سے متعلق بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ لیکن مختلف ذہنی رویوں کی ترجمانی کے لئے منتخب مکتوبات کو اس شمارے میں جگہ دی جا رہی ہے۔ کچھ خطوط بعد میں شائع کئے جائیں گے۔ قابلِ ستائش ہے کہ انشاء کے قارئین باشعور اور ذہنی سطح پر متحرک واقع ہوئے ہیں۔ انہیں بھروسہ ہے کہ انشاء میں انہیں اپنے اظہار کا منصفانہ موقعہ ملے گا۔

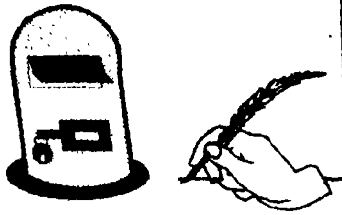
○ ہمیں زیادہ سے زیادہ مشاہیر ادیبوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ بزرگ قلمکاروں کو ہم نے ہمیشہ عزت دی ہے۔ افسوس ہے کہ محفلِ اردو سے پرانے بادہ کش ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ ادھر کئی بڑی ادبی ہستیاں چل بسیں۔ حضرت مجروح سلطانپوری ۲۴ رمئی کو ہم سے بچھڑ گئے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ وہ بہت کم لکھتے تھے۔ ان کی دو ہی غزلیں اب تک انشاء میں چھپی تھیں لیکن وہ ہمارے خیر خواہ تھے اور انہیں یہ رسالہ بے حد پسند تھا۔ افسوس کبھی انکی خدمت کا موقع نہیں ملا۔ پچھلے چند برسوں میں وہ رسالے کے بڑے مداح بن گئے تھے۔ آخری بار کوئی تین برس قبل وہ کلکتہ تشریف لائے اور گرینڈ ہوٹل میں مقیم ہوئے تھے۔ وہ اور نوشاد صاحب ایک ہی کمرے میں تھے۔ بہت پہلے مجروح صاحب سے ایک خفیف سا اختلاف ہو گیا تھا جس پر کافی دنوں وہ برہم رہے، ان کا مزاج ہی ایسا کا تھا۔ خیر اب جو ملاقات ہوئی تو اسقدر محبت اور تپاک سے ملے کہ متاثر ہوئے بغیر رہا نہ گیا۔ نوشاد صاحب سے تعارف کرا کے بیسوں بار یہی کہتے رہے "اس آدمی نے کارنامہ انجام دیا ہے۔ جو کسی سے نہ ہوا وہ انہوں نے کر دکھایا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو منوالیا ہے"۔ انشاء اور اس کے خاص نمبروں کی صفات نوشاد صاحب سے بیان کرتے رہے۔ ایک خود شناس کسی سے اپنی حد سے زیادہ تعریف سن کر کبھی کبھی جھینپ بھی جاتا ہے۔ اس وقت وہی حال ہمارا تھا۔ "ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ" کے وہ بڑے شیدائی تھے۔ اس نمبر کے سلسلے میں موصولہ ان کا خط شائع کیا جا رہا ہے جو ادبیات کا حصہ ہے۔

حال میں انہوں نے اپنا اردو ہندی مجموعۂ کلام "مشعلِ جاں" بڑی شفقت سے روانہ کیا۔ پھر ان کے دو خط اور آئے۔ کتاب پر تاثرات بشکلِ مضمون چاہتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہمیں اس کام کے لئے فرصت نہیں مل پا رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب کتاب لے کر بیٹھتے ان کی غزل پر لکھنا دشوار معلوم ہوتا۔ جس دن انکے انتقال کی خبر ملی سخت افسوس ہوا۔ آخری خط میں انہوں نے لکھا تھا "ان دنوں صحت زیادہ ہی نادرست ہے۔ میرے لئے کوئی کرامت، محبت بھرا کوئی حرفِ اعجاز؟" ——کاش جو کچھ اب لکھا ہے ان کی زندگی میں لکھا ہوتا۔ بہر حال خراجِ عقیدت کے طور پر چند صفحات ان کی نذر کئے ہیں۔ قارئین قبول کر لیں تو خوشی ہوگی۔

○ نئے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی ہمارا شیوہ ہے۔ انہیں ابھرنے کا ہم پورا موقع دیتے ہیں۔ ابھی بالکل نئی بات ہے اسی کلکتہ سے ایک گمنام ضعیف افسانہ نگار محترمہ ساوتری گوسوامی کو انشاء کے قارئین سے متعارف کرایا گیا۔ ان کی اصلاحی اور دلچسپ کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ بھی انشاء پبلی کیشنز سے شائع ہو گیا ہے۔ پیشتر کلکتہ کی ایک اور افسانہ نگار ساجدہ عندلیب رحمٰن کی انڈمان کے تہذیبی پس منظر میں لکھی گئی کچھ کہانیاں انشاء میں شائع ہو کر مشہور ہوئیں اور انہیں حوصلہ ملا۔ موجودہ شمارے میں اقبال مہدی کی ایک کہانی آپ پڑھیں گے۔ اقبال مہدی (نامور ادیبہ محترمہ صغریٰ مہدی کے برادر خورد) ادب میں نووارد ہیں

بقیہ صفحہ نمبر ۲۹ پر

آپ کی ڈاک



(مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

○ انور شیخ کو پڑھکر نئے انداز فکر سے روشناس ہوا ہوں

اصغر علی

Saifee General Store
A. B. Road, Biaorn, Rajgarh - 465674 (M.P)

OOOOOO

○ "انشاء" کی تمام خصوصی اشاعتیں اپنے آپ میں دستاویزی حیثیت کی حامل ہوا کرتی ہیں، انور شیخ نمبر بھی اسی خوبصورت سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ آپکے مدیرانہ اور فنکارانہ کمال کی داد دیتا ہوں کہ نامساعد حالات کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ ہر دم نیا کر کے دکھانے کی فکر و فراق میں لگے رہتے ہیں۔ ابھی تک صرف انور شیخ صاحب کے منتخب کلام انکا تعارف اور سیدہ نسرین نقاش کا ہی پڑھ سکا ہوں جس میں انور صاحب کے خیالات کا بےباکانہ اظہار مجھے بیحد پسند آیا۔

فراق جلال پوری۔ امبیڈکر نگر (یوپی)

OOOOOO

○ آپنے ایک ایسے شاعر کو اردو دنیا سے متعارف کرایا جس سے اردو ادب کا عوامی حلقہ روشناس نہیں تھا۔ میں انور شیخ نمبر کے وجود میں آنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سیدہ نسرین نقاش کا لیا گیا انٹرویو قابل مطالعہ ہے اور شیخ کی حیات و شخصیت سے متعلق کئی گوشوں سے نقاب اٹھاتا ہے۔ باقی مضامین نظم و نثر قابل مطالعہ ہیں۔ انور شیخ کی غزلیں ہم کو فراق، فیض اور ساحر سے اثر انداز نظر آتی ہیں۔

عبدالقیوم

مالک عبدالصمد ہندی اردو لائبریری، بدایوں (یوپی)

OOOOOO

○ "انور شیخ نمبر" نظر سے گزرا۔ میں اس پر کوئی تبصرہ کرنا بےکار سمجھتا ہوں۔ اسلام پر ایسے حملے مغربی سامراجی اور ہندوستان کے آریہ برسوں سے کر رہے ہیں مگر بے سود دنیا میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے اور نئے نئے گوشوں میں اسلام پہونچ رہا ہے۔ رسول مقبول نے عرب اور اہل عرب کو جو اہمیت دی اسکی اصل وجہ یہ تھی کہ انکے مشن کو پھیلانے کیلئے قربانی کرنے والے اولین لوگ وہی تھے اور انکی خدمات کا صلہ دینا ضروری تھا ورنہ انکا اصول یہ تھا کہ تمام انسان برابر ہیں۔ اگر انور شیخ میں ذرہ برابر ایمانداری ہوتی تو اسلام پر جو انتہائی تہذیب نواز مذہب ہے کی ابتدا کرنے کی جگہ اس سے بھی پرانے مذہبوں کی خرابیاں بےنقاب کرتے۔ مجھے تو وہ کسی دوسرے مذہب کے نمک خوار نظر آتے ہیں۔

رئیس الدین فریدی سابق مدیر "روزنامہ ہند"۔ کلکتہ (نئی دہلی)

OOOOOO

○ تازہ انشاء ملا جو کہ انور شیخ کے لئے مخصوص ہے۔ اب تو آپ شخصیات پر شمارے نکالنے میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ نے انشاء کے خصوصی شمارے نکال کر ایک تاریخ بنائی ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ خصوصی شمارے نکالنے میں جو مقام انشاء کو حاصل ہے وہ بہت کم دوسرے رسائل کے حصے میں آیا ہے۔

عقیل شاداب

برج راجپورہ۔ کوٹا۔ راجستھان-۳۲۴۰۰۶

OOOOOO

○ مارچ / اپریل کا شمارہ دستیاب ہوا۔ سرورق پر انور شیخ ادب و متنازع افکار پڑھکر ہی یہ اندازہ کرنا ذرا مشکل نہ ہوا کہ "انشاء" کا یہ شمارہ ضرور کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے قبل بریلی سے شائع ہونے والا رسالہ ماہنامہ "اعلیٰ حضرت" بابت جنوری ۲۰۰۰ء نظر سے گزر چکا ہے۔ اس کے "اداریہ" میں مولانا عبدالرحمٰن قادری صاحب نے انور شیخ کی خاصی گوشمالی کی ہے۔ جون، جولائی ۱۹۹۷ء کے ماہنامہ "اشرفیہ" میں ایک مضمون "اکیسویں صدی کا صیہونی مذہب نیز اسکی ابتداء" پڑھا تھا۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے شیطان کو خدا کا مرتبہ دیکر اس کی پرستش شروع کر دی ہے۔ قارئین "انشاء" مزید معلومات کیلئے (ایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ) سے رجوع کر سکتے ہیں۔ "انشاء کے توسط سے انور شیخ کے نظریات پڑھ کر یہی اندازہ ہوا کہ موصوف اوّل الذکر "صیہونی مذہب" کے ہیرو بننا چاہتے ہیں۔ مگر جب اس طرح کے اشعار۔

نظر آتا ہے ناقص ہر کوئی جب سے بنے عاقل
مگر کہتے تھے سب کامل کہ ہم جب تک رہے غافل
کسی کو بھی نہ اب چاہیں تو کیا اسمیں خطا انور
جسے بھی ہم نے چاہا اصل میں نکلا وہی باطل

سامنے آتے ہیں تو برملا کہنا پڑتا ہےکہ دنیا کے کسی بھی مذہب کو شیخ خاطر میں نہیں لاتے۔ جناب کا ہندو یا عیسائی مذہب سے دلچسپی رکھنا (چاہے برائے نام ہی کیوں نہ ہو) بھی زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ تو نمرود کی راہ پر چل کر خود کو خدا منوانے چلے ہیں۔ جسکی کھائیں باجری اسکی بجائیں حاضری کے مصداق اگر انور شیخ ایسا کر بھی گزریں تو اس میں کونسی حیرت کی بات ہے۔ مگر انور شیخ ایسی فکر و بصیرت رکھنے والے بات اچھی طرح سے نوٹ کر لیں کہ "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"

بہر حال جس دور سے ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے اس میں ایک شیخ تو کیا ہزار شیخ بھی اگر ننگا ناچ دکھائیں تو ہمیں آگ بگولہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس دور کی فتنہ انگیزیوں کے تعلق سے بہت پہلے کافی کچھ کہا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط ہر دو کے مضمون علم و بصیرت کا پتہ دیتے ہیں۔ عالمانہ لب و لہجہ کو ادبی رنگ دیکر دونوں اصحاب نے انور شیخ کے کان اکھاڑ دیئے ہیں۔ کاش کہ انور شیخ کو سمجھ میں آجائے۔ مگر ممکن نظر نہیں آتا کہ انور شیخ گدھوں میں رہ کر خود بھی گھاس کھانے لگے ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے مضمون سے جہاں تک علم و وقار کا تعلق ہے درست ہے مگر موصوف اپنے مسلکی اظہار سے بھی ذرا نہیں چوکے؟ صابر اقبال نے بھی غزلوں کا تجزیہ کرنے میں انور شیخ کی صحت کو ضمانت دے ڈالی ہے؟ "انور شیخ کے متنازعہ افکار" پر آپنے جو سوال اچھالے ہیں خوب ہیں۔ مگر "شیخ صاحب نے اگر اسلام ترک کر دیا ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ امت مسلمہ میں نفاق پھیلانے کی مذموم حرکت سے باز رہیں" ایسا سوال ہے جو خود ایک سوال بن کر رہ گیا ہے۔ اردو صحافت کے نام پر اگر کچھ شیر دل جیالوں کا ذکر چھڑا تو آپکے نام کی تسبیح ضرور پڑھی جائے گی۔ خدارا ایسی ہر بات سے اجتناب کیجئے جس سے کہ ٹکراؤ پیدا ہوتا ہو۔ سر ورق پر انور شیخ "ادب و متنازعہ افکار" لکھا ہے۔ کیا انور شیخ کے "متنازعہ افکار" صرف "ادب" تک ہی محدود ہیں؟

شبنم سنبھلی
Khateeb Jama Masjid
P. O. Ren Dist
Nagaur - 341514 (Rajsthan)

OOOOOO

O محترم انور شیخ نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں ہیں۔ ان سے لیا گیا سیدہ نسرین نقاش کا انٹرویو اور بیگم انور شیخ کا انگریزی مضمون اچھے مشمولات ہیں۔ ہمارے ہندوستانی ادب کیلئے محترم انور شیخ بلاشبہ آپکی ایک اچھی "کھوج" ہیں۔

افسانوں میں انکا طنز و مزاح ایک منفرد انداز اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ انکو پڑھتے وقت فکر تونسوی یاد آجاتے ہیں۔ شیخ صاحب کی ہر تخلیق میں طنز و مزاح کا ذخیرہ ہے اور آج ہمارے ادب کو اس کی ضرورت ہے۔ اگر وہ پہلے سے شائع ہوتے رہتے تو یقیناً مقبول ہو گئے ہوتے اور اپنا ایک الگ مقام بنا لیتے۔

وہ ایک مفکر ہیں اور مذہب کے معاملے میں انکا جو بھی عقیدہ ہے اسے نبھانے کیلئے وہ آج کے جمہوری دور میں آزاد ہیں۔ وہ اس دور میں نہیں رہتے کہ جب تسلیم شدہ عقائد سے ہٹ کر سوچنے والے کو زہر کا پیالہ دے دیا جاتا تھا۔ اور وہ کہتے ہیں تاکہ اپنی قبر اپنا خواب ------ تو یہ شیخ صاحب پر چھوڑ یئے کہ وہ کیا جواب دینگے۔ لیکن ہاں، وہاں طنز و مزاح والا انداز نہیں چلے گا انکو ٹھوس اور مدلل جواب دینے ہونگے۔

نثار راہی (ایڈوکیٹ) بھوپال

OOOOOO

O انشاء کا "انور شیخ" نمبر ملا۔ شکریہ۔ آپ تو خاص نمبر نکالنے میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ میں نے نیاز فتحپوری نمبر اور دلیپ سنگھ نمبر پڑھے ہیں۔ دونوں ہی انتہائی معیاری دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔

انور شیخ جیسی متنازعہ ہستی پر آپنے شاندار نمبر نکالا ہے۔ انکے مداحین اور مخالفین دونوں کی رائیں بڑی جرأت کے ساتھ پیش کی ہیں۔ اداریئے میں یہ لکھکر کہ "پریس کا کام لوگوں کو صرف باخبر کرنا نہیں انہیں Educate کرنا بھی ہے" اور ضروری ہے کہ ہم سلمان رشدی۔ وہ چاہے پہلا ہو یا آٹھواں، دسواں کی باتیں غور اور تحمل سے سنیں اور انکا معقول جواب دیں" آپنے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔

اسلام کو بدنام کرنے والے صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اسلام کے خلاف لکھتے ہیں۔ اصلی دشمن تو وہ لوگ ہیں جو اسلام کے نعرے لگاتے ہیں لیکن عملی طور پر بالکل غیر اسلامی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نام نہاد اسلامی ممالک کا نام بدعنوان ملکوں کی فہرست میں سر فہرست آتا ہے۔ لیکن ہمارے مذہبی رہنما اور دانشور اسلامی معاشرے کو غیر اسلامی بدعتوں سے پاک کرنے کیلئے جہاد ضروری نہیں سمجھتے مگر کوئی قلمکار اگر کچھ لکھ دے تو فوراً اسکی گردن اڑا دینا لازمی سمجھتے ہیں۔ دنیا پچھلی تمام صدیوں میں حاصل کئے ہوئے علم، تجربے اور سائنسی ایجادات کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے اور بقول آپکے "دنیا کو آج علم نے جہاں یہ ہو نچادیا ہے وہاں مخالف آوازوں کا سننا اور سہنا بہت ضروری ہو گیا ہے" مروجہ عقائد سے مختلف بات کہنے والے کو قرون وسطیٰ کے مطابق قابل گردن زدنی قرار دینا خود اپنی کمزوری اور جہالت کی نشانی ہے

اور یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارے پاس اسکی بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔
اگر انشاء کا یہ شمارہ چند مسلمانوں کو بھی اس حد تک Educate کردے تو سمجھئے کہ آپنے بہت بڑا کارنامہ انجام دیدیا ہے۔

عطیہ خان
52, Brent Way, London, N3 I AP (U.K)

OOOOOO

O اگر کسی نے کسی یونیورسٹی یا دنیا میں چل رہے سیکڑوں مراسلاتی کورس پاس کرانے والے کسی ادارے سے ڈگری حاصل کرلی ہے اور نام آوری اور اپنی شناخت ظاہر کرنے کی شدید دیوانہ وار خواہش دماغ میں غلجان پیدا کررہی ہے تو اسکا سب سے کارگر اور سو فیصدی آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ اپنے کو بقراطیت اور دانشوری کا چشمہ جتاتے ہوئے اللہ جل شانہٗ کے فرستادہ دین مبین کی تنقیص اور تضحیک میں جو کچھ اوٹ پٹانگ شیطان دماغ میں ڈالے اسے ضبط تحریر یا تقریر میں لاکر پیش کرے۔ من گھڑت تاویلیں، غلط سلط ترجمے، کج فہمی اور لغویات سے بھرپور نظریات سے کاغذ کو گود دے۔ اس کے ایسا کرتے ہی ساری دنیا کا پریس اور ذرائع ابلاغ اسے راتوں رات ہیرو، دانشور، انقلاب آفریں ادیب یا شخصیت بناکر بانسوں پر چڑھاتے پھریںگے۔ ایسا عہد گزشتہ میں بھی ہوتا رہا ہے۔ حال میں ہورہا ہے۔ اور مستقبل میں بھی ہوتا رہے گا۔ نیاز فتحپوری جیسے ہزاروں گزر چکے ہیں۔ حال میں سلمان رشدی جیسا ٹکے کا مصنف، تسلیمہ نسرین جیسی کوڑے دان میں پڑی فاحشہ اور اب انور شیخ جیسا گھٹیا 'شاعر' مزاح نگار اور مہمل ترین ادیب محض اسلام دشمنی کی وجہ سے دنیا میں اپنی ایک شناخت پیدا کرچکے ہیں۔ عالم اسلام میں ہزاروں آفتاب و ماہتاب پیدا ہوچکے ہیں جن کی تجلیات سے کروڑوں افراد اپنے قلوب کو منور کرتے رہتے ہیں لیکن انور شیخ جیسے نام نہاد دانشور اپنا ڈیڑھ اینٹ کا شوالہ الگ بناکر ابلیسیت کے سفیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ نہ جانے کتنے اعلیٰ ادیب، مفکر اور اہل قلم ایسے ہیں جو ایک محدود حلقہ سے باہر جانے بھی نہیں جاتے لیکن تسلیمہ نسرین، سلمان رشدی، اسماء جہاں گیر اور اب انور شیخ کو دنیا کے کافی لوگ جانتے ہیں کیونکہ وہ سننا چاہتے ہیں دیکھنا پسند کرتے ہیں کہ نور اسلام کی ضیاء باریوں کو یہ گرگٹ اپنی پھونکوں سے بجھانے کی سعی لاحاصل کررہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ ان کی ہرزہ سرائیوں کی تشہیر میں دل و جان سے سرگرم ہے۔

اختر حسین خاں، عرب ہاؤس، مولوی گنج، لکھنؤ

OOOOOO

O مجھے یہ افسوس ضرور ہے کہ آپنے ایک اسلام دشمن اور رسولؐ عالی مقام کی شان میں، قابل مذمت گستاخی کرنے والے کے نام سے ایک شمارہ شائع فرماکر اس کو وہ عزت دی جسکا وہ مستحق نہیں ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ بھی ایک رسالہ شائع کرتا ہے۔!

بہرحال آپنے ایک مدلل مضمون لکھ کر کم از کم اپنا موقف ضرور ظاہر کردیا۔ اور اس شخص کے عقائد سے بیزاری ظاہر کی۔ میں آپکے اس جملے کی ضرور مخالفت کرتا ہوں جس میں آپنے لکھا "انور شیخ طنز و مزاح نگار، شاعر اور مفکر ہیں"۔ ممکن ہے طنز و مزاح نگار کے بجائے مسخرے ہوں۔ لیکن نہ تو وہ شاعر ہیں نہ مفکر۔ انکے کلام میں کوئی فنی یا معنوی خوبی معلوم نہیں ہوتی۔ نہ افکار میں کوئی علوئے خیال یا معیار دانش محسوس ہوا۔ محض اعتراضات، دوسروں کے بارے میں، جن میں بعض اکابرین اسلام بھی ہیں۔ رسوا کن افتر پردازی۔ کیا اسے علم کہتے ہیں۔ مفکر کا یہ کام نہیں وہ متفقہ طور پر تسلیم شدہ اکابرین کے بارے میں دروغ بیانی، غلط تاویلات اور ناسمجھی پر مبنی بیانات شائع کرتا رہے۔

ایک مضمون اس سلسلے میں "ہرآنچہ ہستی باز آ" اشاعت کے لئے ارسال کررہا ہوں۔

نقشبندی
6207 S Indianapolis Pl, Tulsa,ok 74136 U.S.A

OOOOOO

O آپ نے "گفتنی" کے تحت اپنے ادارئے میں نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنے مضمون بعنوان "انور شیخ متنازعہ افکار" میں بھی آپ نے جہاں انور شیخ کی ادبی حیثیت کا اعتراف کیا ہے وہیں ان کے بیجا انداز فکر پر بھرپور تنقید بھی کی ہے جس سے انور شیخ جیسی متنازعہ شخصیت کے سلسلے میں آپ کی پالیسی کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے۔ میں آپکے اس جرأت مندانہ طرز عمل کی نہ صرف تائید کرتا ہوں بلکہ تحسین بھی کرتا ہوں۔

شمارے میں شامل بیشتر مضامین جو انور شیخ کی ادبی نگارشات سے متعلق ہیں کافی محنت اور عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں جو انور شیخ کی ادبی حیثیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ انور شیخ کی کتاب "ابدیت" پر پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے نہایت مبسوط اور پراز معلومات مضمون سپرد قلم کیا ہے جس سے پروفیسر موصوف کی علمیت صاف جھلکتی ہے موصوف نے انور شیخ کے خیالات کو نہ صرف یہ کہ ادا کردیا ہے بلکہ انھوں نے مدلل بحث بھی کی ہے اور جابجا انور شیخ کو للکارتے ہوئے مضبوط دلائل کی روشنی میں قائل کیا ہے اور یہ زبان ذوق کہا ہے کہ دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور۔۔۔۔! خوشی ہے کہ ابھی دنیا میں پروفیسر

نثاراحمد فاروقی جیسی علمی شخصیت موجود ہے جو دشمنان اسلام کو دندان شکن جواب دیکر انکی زبان بندی کر سکتی ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر یحییٰ نشیط صاحب نے بھی انور شیخ کی ذہنی کج روی کو لگام دینے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ان کی علمیت و دانشوری کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں جن نکات کی طرف اشارے کئے ہیں انور شیخ کی نظر وہاں تک نہیں پہونچ سکتی۔ آپ نے ماہنامہ انشاء کے لئے پروفیسر نثاراحمد اور ڈاکٹر یحییٰ نشیط سے مضمون لکھوا کر اپنی صحافتی ذمہ داری کا بہتر ثبوت فراہم کیا ہے۔ اور غیر محتاط قلمکاروں کو خبردار کیا ہے کہ آئندہ وہ کچھ لکھنے سے پہلے محتاط رویہ اختیار کریں۔ اسلئے کہ انکی دانشوری کا جواب دینے والے بھی موجود ہیں جو انکی دانشوری کے غرور کا سر نیچا کر سکتے ہیں۔ پھر بھی میں آپ سے پروفیسر نثاراحمد فاروقی صاحب کی زبان میں کہونگا کہ ایسے لوگوں کو نظر انداز ہی کر دینا زیادہ مناسب ہے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

ضمیر یوسف، ہوڑہ

OOOOOO

O اعجاز صاحب پہلے تو "اینٹی نمبر" کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔ پھر شکریہ کہ مجھے آپ کا انشاء (مارچ اپریل ۲۰۰۰ء) موصول ہو چکا ہے۔

بیشک "انور شیخ۔ ادب و متنازعہ افکار" انشاء کا ایک اہم شمارہ ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ "اِن (انور شیخ) کی انگریزی کتابوں اور تحریروں کے بغیر ان کا صحیح اور مکمل تعارف ممکن نہیں"

ایک طرف خود شیخ کا سوال ہے کہ "ان کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا" تو دوسری جانب پریس نے مسلمانوں سے سوال کیا ہے کہ وہ اس دوسرے سلمان رشدی کا جواب کیوں نہیں دیتے؟" اب آپ نے جرات سے کام لیتے ہوئے مسئلہ عوام کے سامنے رکھ دیا ہے کہ "جواب کی جگہ جواب دینا ہمارا فرض ہے۔ خاموش رہنا نااہلی کا ثبوت ہے"۔

آپ اور فاروقی صاحب نے اعتدال سے کام لیتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی ہے جبکہ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صاحب نے جوش اور تپش کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جواب ٹھنڈے دماغ سے دینا زیادہ مناسب اور منطقی ہوگا۔

آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے "کہ اصول معاشیات اور قانون پر لکھنے والے ہمارے حلقے میں عنقا ہیں" یہ بات غلط ہے۔ علم نہ ہونا دوسری بات ہے۔ آپ تلاش تو کریں۔ انشاءاللہ لفظ "عنقا" لکھنے کی آپ کو ضرورت نہ پڑے گی۔

اکرام فتح پوری
41,Yusuf Zai, Fatehpur - 212601

OOOOOO

O انشاء کا "انور شیخ۔ ادب و متنازعہ افکار" ملا۔ انور شیخ کے افکار پر آرا بھی پڑھیں۔ بہر حال آپ تو واقف ہیں میں عقلیت پسندی کا حامی ہوں۔ اس لیے انور شیخ کے مضامین پسند آئے۔ انور شیخ صاحب پیدائشی مسلمان تو ہوں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرتد ہو گئے ہوں۔ ان کا مذہب کیا ہے اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ علامہ اقبال پر ان کے خیالات غلط نہیں ہیں۔ اس شمارہ پر جلدی ہی تفصیلی لکھوں گا۔ اس طرح کی آزادانہ فکر کے علم بردار مسلمانوں میں گنے چنے لوگ ہی ہیں۔ لوگ تو بہت ہیں مگر بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے والی بات ہے۔ چپی سادھے بیٹھے ہیں۔ آپ کے پاس ایک آرگن ہے اس لیے اس کے ذریعہ آپ اپنی آواز کو دور تک پہنچا سکتے ہیں۔ آپ نے نیاز فتح پوری نمبر شائع کر کے جراُت رندانہ سے کام لیا تھا۔ انور شیخ پر خصوصی شمارہ شائع کر کے آپ نے دوسرا اقدام اُٹھایا ہے۔ اس طرح کے افکار کی تبلیغ و ترویج زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔ آپ ایک انقلابی کام کر رہے ہیں۔ جس کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شاید کہ مسلمان کے دل میں یہ بات اتر جائے سر سید کے مذہبی افکار بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اس پر بھی ایک خصوصی شمارہ وقف کرنے کی ضرورت ہے۔

شیخ سلیم احمد
150, Basti Hazrat Nizamuddin, New Delhi - 110013

OOOOOO

O انور شیخ نمبر کے تعلق سے میں نے گزشتہ خط میں جو خدشہ ظاہر کیا تھا اسکی تشفی آپ نے "گفتنی" کی پہلی سطر میں یہ کہہ کر کر دی ہے کہ اس کا مجموعی تاثر ستائشی شمارے کے بجائے ایک "اینٹی نمبر" ہوگا۔ اسکے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اس تعلق سے ایک تفصیلی خط انشاءاللہ جلد ہی ارسال کرونگا۔

فدا حسین
Class II 3/4, Visheshwar Nagar
Irrigation Colony,
Belgaum - 590001

OOOOOO

O ایک دلچسپ واقعہ سنئے۔

Nation نام سے ایک پندرہ روز شمارہ نظام الدین صاحب اولیاء سے ڈاکٹر محمد حامد کی سرپرستی میں نکلتا ہے جو میرے پاس آتا ہے۔

اس میں ایک صفحہ "Frankly Speaking" کے نام سے جناب خشونت سنگھ صاحب لکھتے ہیں۔ ابھی تازہ شمارہ میری نظر سے گزرا۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"Last week I received a book, titled "Sex, Violence and Islam, written and published by someone called Anwar Shaikh, from U. K. پھر موصوف لکھتے ہیں۔ "I am sure there is no Anwar Shaikh. The book is written by two Non- Muslims, because the style of writting in the first half is distinctly different from that in the second half. The Cardiff address is mainfestly spuriors."

یہ پڑھ کر مجھے خشونت سنگھ صاحب کی تحریر پر غصہ اور انکی عدم معلومات پر افسوس ہوا۔ میں نے چار صفحے کا خط انکو انور شیخ کے بارے میں آپ کے ماہنامے کے حوالے سے لکھا ہے (شاید پرسوں پوسٹ کیا ہے)۔ مزید یہ بھی تاکید کی ہے کہ وہ ماہنامہ انشاء آپ سے یا مجھ سے منگوا کر اپنی معلومات میں اضافہ کرلیں Nation and the world (MAY 1 - 2000) اور یہ بھی لکھا ہے کہ قاری کو اس حد تک نابلد نہ سمجھیں کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں گے وہ قبول کرلے گا۔

یہ تو رہی ایک بات —— دوسری بات انور شیخ صاحب کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا اور یہ احساس خوشی کا غالب رہا ہے کہ پردیس میں رہکر وہ ادب اور اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ بات ضرور قابل مسرت ہے ان پر مضامین بھی اچھے تھے اور انکے چند افسانے بھی پسند آئے۔ جن پر مغربیت کا اثر ضرور غالب ہے۔ لیکن انور شیخ یا پیشتر نیر جہاں پر آپ نے روشنی ڈالی—— بہت اچھا اور نیک کام کیا ہے۔

اقبال مہدی
"عابد ولا"، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

oooooo

O انشاء میں چھپا انور شیخ صاحب کا مضمون "اقبال کا نظریۂ عقل و عشق" نہایت ہی گمراہ کن اور متعصبانہ ہے۔ انہوں نے اقبال کے کلام کو اپنے خود ساختہ معانی دینے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کا معقول جواب دینے کی ضرورت ہے۔ میرا علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ نہایت ہی محدود ہے۔ اسلئے اپنے میں اس مضمون کا صحیح اور معقول جواب دینے کی صلاحیت نہیں پاتا۔ گو اقبال کو ملک کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرانے والے نظریہ کے خلاف میرے مضامین "انشاء" "کتاب نما" اور "اردو بلٹز" میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن انور شیخ کا مضمون ایک بہت بڑے کینوس پر محیط ہے۔ اس لئے اس کا جواب کوئی ماہر اقبالیات ہی دے سکتا ہے۔ میرے خیال میں ملک کے ماہرین اقبالیات کا یہ فرض بنتا ہے کہ ایسے غلط پروپگنڈے کو بغیر جواب کے نہ چھوڑیں۔ اس سلسلے میں آپ پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے فرمائش کیجئے۔ آپ نے جن "نامور اسکالروں کو اظہار خیال" کی دعوت دی تھی۔ ان میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد شامل ہیں یا نہیں۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن مجھے امید ہے آزاد صاحب کی اقبال سے عقیدت ان کو جواب لکھنے کے لئے مجبور کرے گی۔ ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط نے اپنے مضمون میں جناب انور شیخ کے ایک اور مضمون کا جواب دیا ہے۔ انہوں نے انور شیخ کے ترانہ ھندی کے Perverted تجزیہ کا معقول جواب دیا ہے۔ میں اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

علامہ اقبال کو اپنے مذہب اسلام پر فخر تھا۔ لیکن انہیں اپنے برہمن نژاد ہونے پر بھی فخر تھا۔ وہ اپنے آپ کو "بیرونی حملہ آوروں کا فرزند ار جمند تصور" نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ جناب انور شیخ دعویٰ کرتے ہیں۔ اور میرے خیال میں اس شعر میں انکا مطلب مسلم حملہ آوروں کے "کارواں" سے نہیں۔ بلکہ آرین قبائل کے "کارواں" کی آمد سے ہے۔ دوسرے "کارواں" عام لوگوں کے ہوتے ہیں۔ فوجی حملہ آوروں کے نہیں ہوتے۔ فوجی حملہ آوروں کے تو "لشکر" ہوتے ہیں۔ اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اس ترانہ کے مندرجہ ذیل شعر میں

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

علامہ اقبال نے یونان، مصر اور روما کی قدیم تہذیبوں کے ساتھ جس تہذیب کا مقابلہ کیا ہے وہ پرانی آرین یا ھندوستانی تہذیب تھی۔ اسلامی تہذیب نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اسلامی تہذیب تو نئی اور صرف چودہ سو سال پرانی تھی۔ اور انہوں نے یہی کہا ہے یونان، مصر، روما کی پراچین تہذیبیں نیست و نابود ہو گئی ہیں۔ لیکن ہماری پراچین تہذیب اب بھی باقی ہے۔ اور یہ شعر بھی اسی پراچین تہذیب کے بارے میں ہے۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

یعنی ان پرانی تہذیبوں کے مقابلہ میں جو مٹ گئی ہیں ہماری اپنی قدیم تہذیب کے اب تک قائم اور زندہ رہنے کا دعویٰ کیا ہے اور——

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ھندی ہیں ہم وطن ہے ھندوستاں ہمارا

کا مطلب جو جناب انور شیخ نے نکالا ہے۔ اس کے بارے میں کیا کہوں۔ کوئی الٹی کھوپڑی اور Perverted دماغ والا ہی ایسا مطلب نکال سکتا ہے ------ بریں عقل ودانش بباید گریست

جو شاعر زندگی بھر ایسے نغمے گاتا رہا۔ اور جس نے "سارے جہاں سے اچھا" جیسا ترانہ لکھا:-----

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے واسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اور

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں سے جس نے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ایسے شاعر کی محبت پر شک کرنا ادبی بددیانتی ہے

رام پرکاش کپور
D- 832, New Friends Colony, New Delhi - 110065

OOOOOO

○ انشاء کا "انور شیخ، ادب و متنازعہ افکار" خصوصی شمارہ ملا۔ آپ نے انور شیخ کی تخلیقات نظم ونثر اور ان کے مقالہ جات اور فلسفیانہ تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی جو رندانہ جرات کی ہے اس پر مبارک باد قبول کریں اور آپ کی جانب سے اور انور شیخ کے ناقدین کی طرف سے انور شیخ کی ادبی حیثیت کو رد نہ کرنا در اصل اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ انور شیخ ایک ادیب و شاعر اور مفکر کے طور پر خود اپنی جانب توجہ مبذول کرانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ہاں یہ الگ بات کہ اس کی جانب توجہ دینے والا خود کبھی اس بات کا اظہار نہ کرے کہ اس نے شیخ کی تحریروں میں پایا کیا! آپ اور انور شیخ کے ناقدین کا یہ اقدام غالباً اردو داں طبقہ کے لئے یہ کمی پوری کردے گا۔ اس کی مجھے امید ہے کیونکہ ان ناقدین نے جس بے باکی سے انور شیخ کی فکری اساس پر فاضلانہ علمی تنقید کی ہے وہ انور شیخ کو محض ایک متنازعہ مصنف و ادیب اور مفکر کہہ کر مسترد کر دینے والوں کو انور شیخ کے پیغام کو بین السطور پڑھنے اور ناقدین کی رائے کی روشنی میں خود پرکھنے اور اس پر اپنا دوٹوک فیصلہ کرنے کی تحریک دے گی اور وہ انور شیخ کے نقطہ نظر کو سمجھ سکیں گے۔

سر محمد اقبال کے افکار اپنی جگہ لیکن آپ نے اپنے اداریہ میں یہ کیسے کہہ دیا کہ انور شیخ اقبال کے افکار کے "خلاف خامہ فرسائی" کرتے آرہے ہیں۔ اور در پردہ انہوں نے بقول آپ کے "اسلامی عقائد و معاملات پر شب خون مارا ہے۔ میرے نزدیک انور شیخ بڑی باریک بینی سے سر محمد اقبال لاہوری کے افکار کے خلاف خامہ فرسائی نہیں کرتے بلکہ وہ شعوری استعداد کے مطابق ان کی تہہ تک پہنچنے کی ایک کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا کیا جائے جو اقبال کے نام پر اپنے ناموں کے ساتھ مختلف القابات لگا کر فکر اقبال کو محض ایک ہی نگاہ سے دیکھنے کے پابند ہو چکے ہیں اور وہ یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی اقبال کو کسی اور زاویے سے دیکھے۔ یہ وہی ہیں جو اپنی نام نہاد دانشمندی کے حصار سے باہر نکلنے کی سعی ہی نہیں کرتے اور جو ان کے حصاروں کی بنیادوں پر اپنے زاویے سے تیشہ کی کاری ضرب لگانے کی کوشش کرتا ہے اسے بڑی آسانی کے ساتھ، لامذہب ہونے، اقبال دشمن ہونے اور اسلام دشمن ہونے کا الزام دیتے ہوئے اقبال کے اسلام کے نام پر واجب القتل قرار دے دیتے ہیں۔ انور شیخ صاحب بھی اقبال کے ایسے ہی پرستاروں کی تلواروں کا شکار ہیں۔ پاکستان میں تو نام نہاد علماء نے سرکاری سرپرستی میں اقبال کو وہ درجہ دے رکھا ہے کہ اب مسجد و محراب سے ہی نہیں بلکہ ایوان سرکار کے دربار میں دست بستہ کھڑے، دانشوری کے تمغے سجائے محققین بھی یہی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "فرمایا اللہ تعالی نے قرآن میں کہ ------ اور پھر حدیث میں بھی آیا ہے کہ ------ اور ان سب پر حکیم الامت کا فرمان ہے کہ ------ گویا جو کچھ اللہ نے فرمایا، جو کچھ قرآن میں ہے وہ اس لئے سچ ہے کہ اقبال نے بھی وہی کہا تھا، اقبال کی خودی اور تسخیر کائنات، ستاروں سے آگے جہاں کی تلاش اور ممولے کو شہباز سے لڑانے کی تمنا کو دین وملت فروش ملاؤں اور کرائے کے سرکاری دانشمندوں نے ایسے رنگ دے رکھے ہیں کہ ساون کے ان اندھوں کو اقبال کے کلام میں سبز ہلالی پنے کے سوا اور کوئی رنگ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اردو عالموں اور مفکرین کی اقبال سے یہ اندھی اور سراسر کاروباری نام نہاد عقیدت اور ان عقیدتمندوں کے ساتھی لٹھ برداروں کے جتھے ہی تو ہیں جنہوں نے اقبال کے ان پہلوؤں کو اقبال کی اس فکری اساس کو کبھی سامنے لانے کی کوشش ہی نہیں کرنے دی جو بقول ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، اقبال کے انسان ہونے اور انسان کے خطاونسیاں کا مرکب ہونے کے ضمن میں ہونی چاہئے تھی۔ میں

موصوف سے متفق ہوں کہ اقبال فرشتہ تو تھے نہیں اور واقعی اقبال کی اچھائیوں کو برائیوں کے زمرے میں ڈالا نہیں جانا چاہیے لیکن کیا یہ بھی ضروری نہیں کہ اقبال کو محض اقبال انسان رہنے دیا جائے اسے فرشتہ نہ بنادیا جائے!

اقبال اور احمدیت! ایک متنازعہ فیہ معاملہ ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس پر کچھ کہا ہی نہ جائے۔

اقبال احمدی تھے؟ انہوں نے احمدیت ترک کر دی کہ نہیں؟ یہ بحث طلب امور ہیں لیکن اقبال کو احمدیت سے خارج قرار دینے کیلئے اور اسے احمدیت سے بیزار ثابت کرنے کیلئے ملاؤں نے کیا کیا حربے استعمال نہیں کئے لیکن وہ اس بات کو ہمیشہ ہی دانستہ مکاری وعیاری سے چھپادینا چاہتے ہیں کہ اقبال کو اگر احمدیت سے کوئی انس ربط و تعلق نہیں تھا اور اگر اقبال واقعی احمدیت سے بیزار تھے تو انہوں نے اپنے نور چشم جاوید اور اپنی دختر منیرہ کی پرورش کے لیے اپنے خاندان کے کسی عبادت گذاروں پر اپنے ایک احمدی رشتہ دار کو فضیلت کیوں دی اور سر راس مسعود کے نام اپنے ایک خاص خط میں اپنے اس احمدی رشتے دار کو ایک باعمل، پابند قرآن مسلمان قرار کیوں دیا حالانکہ یہ وہی دور تھا جب احمدیت پر سنگ زنی کی جارہی تھی۔ انور شیخ نے اقبال کی احمدیت سے علاحدگی کی جو وجہ سر ظفر اللہ خان کے حوالے سے بیان کی ہے وہ اپنی جگہ لیکن کیا ضروری نہیں کہ اقبال کی اس مصلحت تک پہنچا جائے جو انہوں نے سلسلۂ احمدیہ سے اپنے ظاہری قطع تعلق کے لئے اختیار کی۔ اس موضوع پر پاکستان میں دو کتابیں سلسلۂ احمدیت سے تعلق رکھنے والے ایک مورخ کی لکھی ہوئی شائع ہوئی ہیں اور دستاویزی شہادتوں کے ساتھ اقبال کے احمدی ہونے، اپنے ایک احمدی رشتے دار ہی کو جاوید اور منیرہ کی پرورش کے لئے تمام تر مخالفت کے باوجود ڈٹے رہنے اور پھر احمدیت سے درپردہ قطع تعلق کے لئے سلسلۂ احمدیت کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کی بروزی نبوت پر اعتراض اٹھانے کی وجوہات کا بھرپور تفصیلی اور میری نظر میں غیر جانبدارانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ افسوس اس بات پر ہے کہ اقبال کو احمدیت سے خارج رکھنے والے ان متذکرہ کتابوں کے حوالہ جات کو مسترد کرنے کے لئے ایک بھی دلیل پیش نہیں کر سکے۔ اقبال کے کئی دیگر پہلوؤں پر ابھی قومیت پرستی، وقیانوسی، ابن الوقتی منافقت وجہالت کی گرد ڈال کر انھیں محض مشرق کے کباڑ خانے میں سنگ مرمر کی سلوں تلے دفن کر کے بند قبروں کا پہرا لگادیا گیا ہے وہاں اقبال اور احمدیت پر تحقیق کی ضرورت ہے اور اس حوالے سے کوئی بات سامنے کی جاتی ہے جیسے انور شیخ لائے ہیں تو اس پر سیخ پا ہونے اور انور شیخ کو تہمت گڑھنے کی ایک حد رکھنے کا مشورہ دینے کی بجائے اس کے مؤقف کو رد کرنے کے لئے ٹھوس دلائل لانے چاہئیں۔ باقی نام رہے اللہ کا!

انشاء کا انور شیخ خصوصی شمارہ اس لحاظ سے ایک زندہ شمارہ جانا جائے گا کہ اس کے حوالے سے اب وہ بھی چوب بشانہ میدان میں نکل آئیں گے جنھیں آپ اقبال کے نام کی کھانے والے قرار دیتے ہیں اور وہ انور شیخ کے سامنے اقبال کے دفاع میں منافقت آمیز خاموشی اختیار کر گئے۔ آپ نے انور شیخ کے فکری جھکڑوں سے چوکنا رہنے کا مشورہ دیا وہ اپنی جگہ لیکن کیا کہیں گے ان اسکالروں کو آپ جنہوں نے جواب دینے کی بجائے انور شیخ کے سامنے خاموشی میں ہی عاقبت سمجھی؟ ہرچند کہ مجھے محترم پروفیسر نثار احمد فاروقی اور محترم ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کی اقبال کے دفاع میں بعض تاویلات پر اتفاق نہیں لیکن اسکے باوجود ان کے خیالات وافکار کی قدر کرتا ہوں کیونکہ وہ بذات خود اقبال کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جو ابھی عام سامنے نہیں آئے اور جو مزید تحقیق طلب بھی ہیں۔

شمارہ کی اشاعت پر مبارک باد قبول کریں اور شیخ کو "ہندی اقبالیوں" کے نرغے میں دینے کا فریضہ جس خوش اسلوبی سے آپ نبھاگئے ہیں دیکھئے انور شیخ اس سے بچتے کیسے ہیں۔ شنید ہے کہ وہ بھی علمی تیر وسناں سے ہر وقت مسلح اور شمشیر بکف رہتے ہیں!

نصر ملک، کوپن ہیگن۔ ڈنمارک

○○○○○○

تشنگی وسیرابی

(انشاء کے 'خاص نمبر' میں شائع اعتراضات کا خط کے انداز میں جواب)

مکرمی اعجاز صاحب! انشاء فراواں

○ 'انشاء' کا خاص نمبر موصول ہوا۔ معلوم نہیں، آپ نے انور شیخ صاحب کی کس ادا سے متاثر ہو کر یہ نمبر شائع کر دیا ہے۔ انور شیخ صاحب کے اعتراضات وخیالات میں کچھ بھی نیا، اہم اور مفید نہیں ہے۔ انھوں نے جو اعتراضات اللہ، رسول، اسلام اور دوسروں پر کئے ہیں، وہ انکے نہیں ہیں۔ مدتوں پہلے اپنی کم معلومات، کم علمی اور کم عقلی کے سبب کچھ لوگوں، خاص طور سے اہل یورپ نے کئے تھے۔ یہ وہی ہیں۔ حتیٰ کہ خود حضورؐ سے کہا گیا تھا کہ اگر تم عرب کی سرداری چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار مان لیں گے۔ اگر تمھیں دولت وزر چاہیے تو وہ ہم تمہارے قدموں میں لاکر ڈال دیں گے۔ اگر تمھیں عورتیں چاہئیں تو عرب کی خوبصورت ترین عورتیں ہم تمہارے نکاح میں دیدیں گے۔ مگر تم اپنی تبلیغ بند کر دو۔ آپؐ نے مختصر جواب دیا تھا کہ اگر تم میرے ایک ہاتھ پر سورج اور ایک ہاتھ پر چاند بھی رکھ دو گے، میں حق وصداقت کی تبلیغ کرنا نہیں چھوڑوں گا

——خیر اہل یورپ کے اعتراضات کے صحیح اور منہ بند کر دینے والے جوابات بھی وقت پر دیدئے گئے تھے۔ اور زیادہ تر وہ ان باتوں کو بھول بھی گئے تھے اور حقائق کو سمجھنے کے لئے ٹھنڈے دل و دماغ سے مطالعہ بھی کرنے اور صحیح معلومات حاصل بھی کرنے لگے تھے، کہ ایسے وقت میں انور شیخ نے پرانی انگریزی کتابوں سے وہی فرسودہ اعتراضات جمع کر کے اخباروں میں اپنے نام سے شائع کر دیئے ہیں، اور انھیں دولت کمانے کا ایک ذریعہ بنالیا ہے۔ آجکل ایشیا سے اکثر لوگ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے ہی یورپ اور امریکہ جاتے ہیں۔ لیکن انور شیخ جیسے ہوشیار، چالاک اور دولت کی ہوس رکھنے والے صحافی وادیب انسانیت کے لئے بڑا خطرہ اور فتنہ و فساد پیدا کر دیتے ہیں اور اپنا الو سیدھی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی کم علم اور غلط معلومات رکھنے والے فنکار کا اثر کرنے والا فن کسی ظالم و جابر بادشاہ کے تباہ و برباد کرنے والے لشکروں سے زیادہ تباہ کن اور خطرناک ہے۔ آپ نے اور دیگر مضمون نگار حضرات، پروفیسر نثار احمد فاروقی، سید تقی نشیط، اختر الواسع صاحبان وغیرہ نے انور صاحب کے اعتراضات کے مدلل، مدبرانہ، جامع اور واضح جوابات تحریر فرماکر بین الاقوامی فضا کو مکدر ہونے سے بچالیا ہے۔ تاہم کہیں کہیں مجھے کچھ تشنگی اور کمی محسوس ہوئی ہے۔ اسی لئے کچھ باتوں اور خیالوں کا اظہار کرنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔

(۱) انور شیخ صاحب نے تحریر کیا ہے کہ —— ''حضورؐ عرب تھے اور انھیں سر زمین عرب اور ''عرب کلچر'' سے والہانہ محبت تھی۔ اس لئے ان کی پیروی کرتے ہوئے تمام غیر عرب مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے اوطان اور قومی روایات کو مکمل طور پر نظر انداز کریں اور عرب پرستی کو اپنا جزوِ ایمان بنالیں —— ورنہ وصالِ خدا اور نجات کی کوئی امید نہیں ہے، وغیرہ —— یہاں ''عرب کلچر'' اور ''عرب پرستی'' الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ عرب کلچر تو منکرانہ، مشرکانہ، کافرانہ، مظاہر پرستانہ، الحاد و بے دینی کا کلچر تھا۔ برہنہ ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجا بجا کر کعبہ کا طواف کیا جاتا تھا، مردار کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ خون پیا جاتا تھا، لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ عورتوں کو ذلیل و خوار سمجھا جاتا تھا۔ دشمن کو مار کر اسکا کلیجہ چبایا جاتا تھا۔ قبائلی جنگوں کا سلسلہ نسلوں جاری رہتا تھا۔ زنا، سود، بلی چڑھانا وغیرہ حلال تھے۔ کیا اس 'عرب کلچر' یا 'عرب پرستی' کو حضورؐ دنیا پر ''لادنا'' چاہتے تھے۔ جواب صاف ہے کہ۔ ''نہیں'' —— حضورؐ تو دین فطرت کا یہ کلچر یہ فرمان خداوندی تمام انسانوں کو پہونچارہے تھے کہ ''تم سب کا رب ایک ہے اور اس کی ذات ناقابل تقسیم ہے۔ (توحید)۔ تم سب بھائی بھائی ہو۔ (اخوت)۔ تم سب اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں اور خوبیوں کے سبب برابر ہو۔ (مساوات)۔ اپنی اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کے الگ الگ ہوتے ہوئے بھی متحد اور ایک رہو۔ (رواداری، اتحاد و اتفاق) حصول خیر کے لئے مل کر ایک ساتھ بڑھو۔ (یک جہتی)۔ عدل و انصاف پر قائم رہو۔ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے، سوتے، جاگتے اپنے رب کو یاد رکھو۔ اسی کی عبادت کرو۔ اسکا قرب حاصل کرنے کے لئے روزے رکھو۔ ضرورت مندوں اور ضروری دینی و دنیاوی کاموں کی انجام دہی کیلئے خیرات دو۔ اپنے نفس کی کمزوریوں کو دور کرنے کیلئے، روح کی بالیدگی اور ایمان کی پختگی کے لئے حج کرو۔ کعبہ حضرت آدمؑ کی تعمیر کردہ وہ تعمیر ہے، جس کی سمت رخ کر کے انھوں نے اللہ کی عبادت کی تھی۔ بحکم الٰہی تنظیم کے لئے اسکی طرف رخ کر کے عبادت کرو۔ تعصب اور بداخلاقی و بدکرداری کے جذبات قلوب میں پیدا نہیں ہونے دو۔ اعلیٰ اخلاق کے حامل بنو۔ سب کا بھلا چاہو کیونکہ اللہ سب کا بھلا چاہتا ہے۔ دوزخ میں وہی لوگ جان بوجھ کر جاتے ہیں جو اللہ کے ہونے اور اس کے معبود ہونے کے واضح دلائل کے باوجود اپنے محدود نفس اور شیطان کی اتباع کرتے ہیں۔ جو لوگ حقائق اور صداقتوں کی مخالفت کریں اور تم سے لڑیں تو تم بھی زبان سے جہاد کرو۔ اگر وہ قلم سے لڑیں تو تم بھی قلم سے جہاد کرو۔ اگر وہ آلات جنگ کے ذریعہ جنگ کریں تو تم بھی آلات جنگ کے ذریعہ جہاد کرو۔ یاد رکھو لڑائی کی پہل تم کبھی نہیں کرنا۔ اگر مخالفین امن کے لئے رضامند ہو جائیں تو تم بھی امن کرنے پر رضامند ہو جاؤ وغیرہ وغیرہ ——انور شیخ صاحب ذرا سوچیں کہ حضورؐ بحکم ربی انسانیت کے اس کلچر کو دنیا والوں تک پہونچارہے تھے یا اس کلچر کو جس کا ذکر ''عرب کلچر'' کے نام سے سطور بالا میں ہوا ہے۔

اس کے بارے میں انور صاحب کیا کہینگے کہ یورپ اور امریکہ کے کچھ ادارے اس عقیدے کے ساتھ اپنا کلچر ہمارے بھارت اور دیگر ممالک میں رائج کر رہے ہیں کہ ——''بنی نوع انسان کے تمام گناہوں کی سزا مسیح نے مصلوب ہو کر بھگت لی ہے'' ——اس عقیدے کے سبب یورپ امریکہ کے اس کلچر سے لوگوں کو بڑے سے بڑے گناہوں کو کرنے کی تحریک مل رہی ہے۔ عریانیت، بے حیائی، اغلام، ہم جنسی، منشیات نوشی، دہشت گردی بین الاقوامی معاشرے میں عام ہو رہی ہیں۔ ریا، زنا، عہد شکنی، غیبت، بدگمانی، بے جا نا نیت، جھوٹ، انتقام، بغض و حسد، کینہ پروری، ایمان والوں کو رسوا کرنا، بدگوئی، عیب چینی، لعنت کرنا، خودکشی وغیرہ وغیرہ جیسے اخلاق رذیلہ ہر طرف بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ یہاں صرف ایک برائی یعنی منشیات نوشی کے بد اثر کے بارے میں تحریر کیا جاتا ہے کہ اس سے آدمی میں اعصاب عمل کی شدت میں کمی واقع ہوتی

ہے۔ خود پر ضمیر کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ بے حیائی بڑھ جاتی ہے۔ جبکہ حیا سے ہی ایمان ہے۔ پاک اور اچھے رشتے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ تمام خباثتیں قلوب واجسام میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ شراب روح اور جسم دونوں کا ناش کرتی ہے وغیرہ وغیرہ ——— ایسے کلچر کے بارے میں انور صاحب انسانیت کی فلاح و بہبود کے تحت کبھی کیا کچھ سوچ سکتے ہیں۔

(۲) انور صاحب صفحہ ۵ پر اپنے تعارف میں رقم طراز ہیں کہ ۔۔ "مجھے تبلیغ اسلام کا جنوں تھا" ——— ظاہر ہے کہ تبلیغ کا جنون اس وقت ہوتا ہے جب مبلغ کو کم سے کم تبلیغ کرنے والی باتوں کی ابتدائی معلومات ہوتی ہے اور وہ صدق دل سے ان کو دوسروں تک اس لئے پہنچاتا ہے کہ ان سے وہ فیض اٹھائیں اور مستفید ہوں۔ اسلام کی ابتدائی معلومات میں ایک صداقت یہ ہے کہ قرآن پاک کے مطابق محمدؐ تمام انسانوں کے لئے آخری نبی اور رسول ہیں اور تمام عالمین کے لئے رحمت ہیں۔ (رحمت العالمین)۔ انور صاحب قرآن اور حدیث کے اقتباسات کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ ——— "ان اقتسابات میں محمدؐ عربی کی جو قومی فراست مضمر ہے، بے مثل ہے۔ پہلے یہ بیان کرنا کہ ہر قوم کا اپنا قبلہ اور نبی ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں یہ اعلان کرنا کہ محمدؐ اقوام عالم کے نبی اور کعبہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا کعبہ ہے، یہ اس بات کا ضامن کہ دنیا بھر کے لوگ تقدیس کعبہ تسلیم کرتے ہوئے سرزمین عرب کو سمجھیں اور اسی سمت دن رات اپنا سر جھکائیں" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ۔۔ "میرے اس دعویٰ کی صداقت میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہے گی کہ اسلام "عربی قومیت کی برتری" کا علم بردار ہے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انور صاحب کو اسلام کی یہ ابتدائی بات بھی نہیں معلوم کہ مسلم صرف خدا کو رَب مان کر اس کے آگے ہی سر جھکاتے ہیں۔ وہ کعبہ یا سرزمین عرب کے آگے سر نہیں جھکاتے ہیں۔ کعبہ کی طرف منہ کرنا تو صرف تنظیم کے لئے ہے۔ دوسرے، انور صاحب نے "برتری" کو وہ برتری سمجھ لیا ہے جو نفس محدود کے شکار لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اس برتری میں بے جا انانیت، غرور و تکبر اور حسد و حقارت ہوتے ہیں۔ اور یہ برتری اپنے سوا کسی کا فائدہ اور بھلا نہیں چاہتی ہے۔ یہاں تک ہوتا ہے کہ ایک وقت آتا ہے کہ یہ خدا کی برتری اور عظمت کی بھی منکر ہو جاتی ہے۔ لیکن اسلام "برتری" کو اسی شرائط پر مستحسن کہتا ہے کہ ——— "اللہ کے تم عاجز بندے ہو۔ اسلئے ہمیشہ عاجزی سے رہو۔ سب کا بھلا چاہو اور سب کا بھلا حتی الامکان کرو۔ سب کو اخوت و محبت اور مساوات کی نگاہ سے دیکھو۔ اور اسی کا درس دو، کیونکہ تم آدمؑ کی اولاد ہو اور تم سب کا رب ایک ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ امت محمدیہ کے برتر اور افضل ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پہلے جتنے بھی نبی اور رسول آئے تھے، وہ قوموں اور قبیلوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ محمدؐ تمام دنیا کیلئے، وقت کی ضرورت کے مطابق مبعوث ہوئے ہیں (اسی لئے محمدؐ کی شریعت بہت لوچ دار اور انسان کے حسب حیثیت ہے)۔ خیر، پچھلے نبیوں اور رسولوں سے، ظاہر ہے، امت محمدیہ بڑی اور وسیع ہے۔ اسی سبب اسے "برتر" اور "افضل" کہا گیا ہے۔ "برتریت" اور "افضلیت" کے ایک معنی "زیادہ بڑا" بھی ہے۔

(۳) اسی صفحہ اور کالم میں ایک جگہ وہ تحریر کرتے ہیں کہ ——— "حضورؐ مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ عمل ہیں" ——— اور پھر وہ حضور کے "نمونہ عمل" ہونے پر اعتراض کرتے ہیں۔"

"نمونہ عمل" حضور کو اس لئے کہا گیا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ ان احکام پر عمل کس طرح کیا جائے یہ اللہ نے حضورؐ کے ذریعہ انسانوں کو بتایا ہے۔ مثلاً قرآن میں نماز ادا کرنے کا حکم ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نماز کس طرح ادا کی جائے؟۔ اس کا جواب ہمیں حضورؐ کے نماز ادا کرنے کے عمل سے مل جاتا ہے۔ قرآن میں روزہ رکھنے کا حکم ہے۔ روزہ ہم کیسے رکھیں، یہ ہمیں حضورؐ کے روزہ رکھنے کے عمل سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ، حج، اخلاقیات وغیرہ کے احکامات کے عملی نمونے حضورؐ کے اعمال ہی ملتے ہیں۔ اسی لئے حضورؐ کو "بہترین نمونہ عمل" کہا گیا ہے۔

(۴) انور صاحب صفحہ ۶، کالم نمبر ۱؍ میں لکھتے ہیں کہ ——— "انسان کے خوف اور حصول عنایت کی نفسیات کا (حضرت) محمدؐ سے زیادہ کبھی کسی نے استحصال نہیں کیا ہے کہ موت انسان کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ہے" ["ابدیت Eternity"۔ منقولہ پروفیسر نثار احمد فاروقی] اس جملے میں یہ اشارہ مضمر ہے کہ "موت کو اللہ کا تحفہ بتا کر" اور جنت کا لالچ دیکر اور فنا اور بقا کے بارے میں بتا کر محمدؐ نے انسان کو جہاد کیلئے آمادہ کیا ہے یعنی جنگ وجدال اور غارت گری کے لئے تیار کیا ہے۔ افسوس ہے کہ انور صاحب نے یہ لکھتے ہوئے اسلام کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ہدایات یہ ہیں کہ "جنگ میں پہل کبھی نہیں کرو۔ بدی کا ساتھ کبھی نہیں دو۔ نہیں اچھائی کا ساتھ ہمیشہ دو وغیرہ"۔

(۵) صفحہ ۶ کالم نمبر ۱؍ میں انور شیخ تحریر کرتے ہیں کہ ——— "پیغمبروں اور انبیاء نے لوگوں کو اپنا غلام، مطیع اور فرمانبردار بنایا" ——— اگر انور صاحب پیغمبر، نبی اور رسول کے معنی لغت میں دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ ہستیاں اپنا غلام یا فرمابردار بناتی ہیں یا اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بناتی ہیں۔ انور صاحب کو یہ علم نہیں ہے کہ سب سے پہلے تو

ے . ں رماتبردار اور پچ بختی ہیں۔ اس بارے میں وہ مزید اوپر
کی ان سطور پر غور کر لیں جن میں "اعمال حضورؐ" کو "نمونہ" ہونے کے اسباب کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

(۶) صفحہ ۷۷ کالم نمبر ۱ ر سطر ۱۵ ر میں تحریر ہے کہ —— "اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے۔ اسے وجود میں آئے ڈیڑھ ہزار سال ہو چکے ہیں" —— نثار احمد فاروقی صاحب کا یہ خیال وضاحت چاہتا تھا۔ لیکن شاید عجلت، تکان یا "فی بطن شاعر" والی بات کے سبب وضاحت نہیں ہو سکی ہے۔ اصل میں اسلام تو آدمؑ کے زمانے سے دنیا میں ہے۔ البتہ شریعت میں اللہ تعالیٰ وقت، مقام اور انسانی زندگی کے ارتقاء کی مناسبت سے تبدیلی کرتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ عقائد میں جو برائی اور جھوٹ شامل ہو گیا تھا انکو درست فرماتا رہا ہے۔ یہ ایمان ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار رسول اور نبی آئے ہیں۔ پہلے آدم اور آخری محمدؐ ہیں۔ محمدؐ سے پہلے نبی اور رسول قوموں اور قبیلوں کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔ محمدؐ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے اللہ کی طرف سے رسول اور نبی ہیں اور آخری ہیں۔ اب اگر کوئی اللہ اور رسول کو نہیں مانے تو یہ اس کا فعل ہے۔ لیکن وہ اللہ کی طرف سے محمدؐ کا امتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ گناہگار، منکر، مشرک، ملحد وغیرہ ہے۔ ایسے کچھ لوگ بھی اکثر نبیوں اور رسولوں کی امتوں میں رہے ہیں۔ لیکن کہلائے وہ انھیں نبیوں اور رسولوں کے امتی ہیں۔ قرآن شاہد ہے۔

(۷) (نثار احمد فاروقی صاحب کی) صفحہ ۷۰ کی آخری ۲ ر اور صفحہ ۷۱ کی ڈیڑھ سطور کا مفہوم یہ ہے کہ —— 'انسانوں کے یکساں عقائد، کردار، اطوار، فکر، طرز زندگی اور بود و باش سے انسانوں کا زوال ہو گا اور وہ حیوانات و جمادات کی صف میں آ جائیں گے' —— آدمؑ کے عہد میں ہابیل و قابیل کے حادثے سے پہلے تک ہر طرح کا اتحاد و اتفاق تھا تو کیا یہ سمجھا جائے کہ وہ اتنا زمانہ ان حضرات کے لئے زوال کا زمانہ تھا اور وہ حضرات جمادات و حیوانات کی صف میں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آدم سے محمدؐ تک اور آج تک کے تمام ایماندار اور مصلحین وغیرہ نے متحد و متفق، ایک اور نیک رہنے کی ہدایات دی ہیں تو یہ محض اسلئے ہے کہ انسانی زندگی سے تباہ کن حادثات اور جنگ و فسادات ٹل سکیں۔ محدود نفس اور شیطان کے حربے ناکارہ ہو جائیں۔ رنگارنگی اور بوقلمونی کے اسباب تو کائنات کے قدرتی درجات، قسم قسم کے رنگوں اور پیکروں کی مخلوقات اور شریعت کی لوچداری ہیں۔ انسانوں کے عقائد و ایقان میں تضادات، کفر و شرک اور الحاد وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہے۔ ایسی رنگارنگی اور بوقلمونی انسانی زندگی کے لئے تکلیف دہ، فتنہ و فساد کرانے والی اور تباہ کن ہے۔

(۸) صفحہ ۷۹ کالم ایک سطر ۱۶ ر پر تحریر ہے کہ —— "قرآن نے روح کی ابدیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا" —— یہ بات وضاحت طلب ہے۔ جسم فانی ہے۔ روح بھی فانی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ روح کی عمر جسم کی روح سے طویل تر ہے۔ حشر میں روح بھی فنا ہو جائے گی۔ حشر کو ہندی میں "پرلے" یا "مہاوناش" کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے "Destruction" کہتے ہیں۔ روح فانی ہے۔ بائبل میں کہا گیا ہے:—

"And fear not them which kill the body, but are not able to kill the soul, but rather fear 'Him' which is able to destroy both <u>soul</u> and <u>body</u> in hell." (ST.MATHEW- 28)

ترجمہ:— "اور ڈرو نہیں ان سے جو جسم کو قتل کرتے ہیں اور مارتے ہیں۔ کیونکہ ان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ روح کو مار ڈالیں۔ لیکن اس (یعنی اللہ) سے ڈرو جو اتنا زبردست طاقتور ہے کہ جسم اور روح دونوں کو دوزخ کی آگ میں تباہ و برباد یعنی فنا کرتا ہے" —— تباہ و برباد ہونی والی اشیاء فانی ہوتی ہیں۔ اس لئے جسم بھی فانی ہے اور روح بھی فانی ہے۔

روح کے فانی ہونے کا دوسرا ثبوت بائبل ہی سے نقل کیا جاتا ہے:—

"The Lord is close to the broken hearted and saves those who are crushed in spirits."(PSALM 34-18)

ترجمہ: —"اللہ ٹوٹے اور مصیبت زدہ دل والوں کے قریب ہے، اور ان کی حفاظت کرتا ہے جن کی روحیں شکستہ کر دی گئی اور توڑ دی گئی ہیں"۔

ظاہر ہے جو شئے شکستہ اور ٹوٹ جانے والی ہے، وہ فانی ہے۔ اس لئے روح بھی فانی ہے۔ اس اقتباس سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اکثر کہا جاتا ہے کہ —— "خدا دل کے اندر ہے" یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ —— خدا دل کے قریب ہے" —— ورنہ بائبل میں یہ کہا جاتا۔

The Lord is in the broken hearted.

یعنی خدا ٹوٹے اور مصیبت زدہ دل والوں کے اندر ہے۔ لیکن کہا گیا ہے کہ "The Lord is close to the broken hearted." یعنی خدا ٹوٹے اور مصیبت زدہ دل والوں کے قریب

ہے"۔

مہاتما گوتم بدھ کا قول ہے کہ —— "اہنکار (یعنی غرور اور گھمنڈ) آدمی کی آتما شکتی اور عقل دونوں کو نشٹ (یعنی فنا) کر دیتا ہے" —— شکتی یعنی طاقت اسی وقت فنا ہوتی ہے، جب طاقت والا فانی ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ روح فانی ہے۔

بھگوت گیتا میں کہا گیا ہے کہ —— "لالچ، طمع، غصہ اور غضب تمہاری روح کے دشمن ہیں، اور جس طرح آگ کے گرد دھواں لپٹا رہتا ہے اور شیشے پر گرد و غبار، اسی طرح یہ چیزیں روح کے گرد چمٹی رہتی ہیں" —— ظاہر ہے کہ اگر لالچ، طمع، غصہ اور غضب کا تباہ کن اثر روح پر مسلسل اور متواتر پڑتا رہتا ہے تو ایک دن روح متاثر ہوتے ہوئے فنا ہو جاتی ہے۔ کسی شئے کا نقصان ہونا اس شئے کے فانی ہونے کی دلیل ہے۔ لالچ، طمع، غصہ اور غضب سے روح کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے روح فانی ہے۔ اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے، اس لئے اللہ لا فانی ہے۔

اسلام میں مخلوق کی بقا کی جو بات کہی گئی ہے، وہ بقا، فنا ہونے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح موت کے بعد جسم فنا ہو جاتے ہیں [جیسے رسالے "انشاء" کے ملینیم عید نمبر ۲۰۰۰ء میں محترمہ اے۔ امیر انساء کے سفر نامہ "ارضِ مقدس میں چند روز" کے ایک فوٹو میں اصحاب کہف کی بوسیدہ اور خستہ ہڈیوں کو دکھایا گیا ہے، اور ایک دن وہ ہڈیاں بھی خاک ہو جائیں گی] اسی طرح حشر میں روحیں بھی فنا ہو جائیں گی۔ بلکہ فرشتے، جن کو ہندی میں دیوتا، جیسے اندر دیوتا، اگنی دیوتا وغیرہ کہا جاتا ہے اور انگریزی میں "اینجلز" کہتے ہیں، وہ بھی فنا ہو جائیں گے۔ کیونکہ فرشتے بھی فانی ہیں۔ اس کا ثبوت وہ جنگیں ہیں جو دیوتاؤں اور اُسروں کے درمیان ہوئی ہیں اور ان میں دیوتا بھی مارے گئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ دونوں ہی فانی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ تمام کائنات ہی فانی ہے۔ ثبوت یہ ہیں۔ (الف) چھاندوگ اُپنشد [छान्दोग्य उपनिषद हनदी 1,2,6] میں کہا گیا ہے۔ ترجمہ —— "اے سوم! ابتدا میں صرف ایک "سنت" ہی کا وجود تھا اور ابتداء میں اور کچھ نہیں تھا۔" —— ظاہر ہے کہ وہ "سنت" جس کو "برہمہ" یعنی "نور" اور "شون" یعنی "صفر" اور "پرکرتی" یعنی "فطرت" اور سائنس کی زبان میں "مادہ" یا "ایٹم" بھی کہتے ہیں، وہ مخلوق تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ "ابتداء" اور "انتہا" اسی شے کی ہوتی ہے جو مخلوق ہوتی ہے۔ اللہ یعنی ایشور کی نہ تو 'ابتدا' ہے اور نہ ہی 'انتہا' ہے۔ اللہ ہمیشہ ہمیشہ ہے اور ہمیشہ ہمیشہ سے رہے گا —— کیونکہ مخلوق فانی ہے۔ کائنات بھی مخلوق ہے۔ اس لئے کائنات بھی فانی ہے۔

(ب) بائبل میں کہا گیا ہے کہ:—

"In the beginning was the 'word', and the word was with God, and the 'word' was God.(JOHN-1:1)

ترجمہ:— ابتدا میں 'لفظ' تھا اور 'لفظ' خدا کے ساتھ تھا اور 'لفظ' خدا تھا۔"

جس طرح کائنات کے 'ابتدائی روپ' کو 'سنت' 'نور' 'صفر' 'فطرت' "مادہ" "ایٹم" کہا گیا ہے، اسی طرح بائبل میں اس روپ کو "لفظ" کہا گیا ہے۔ ثبوت اس کا ابتداء میں ہے یعنی "In the beginning" جس شے کی "Beginning" ہوتی ہے اس کا "End" بھی ہوتا ہے۔ پس جس کی ابتداء اور انتہاء ہوتی ہے، وہ "خدا" نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ "خدائی" یعنی "مخلوق" ہوتی ہے —— دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ "لفظ" "خدا" تھا —— ابھی سطور بالا میں یہ ثابت ہوا ہے کہ جس کی ابتداء اور انتہا یعنی (Beginning and end) ہوتی ہے وہ 'خدا' نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کی ابتداء اور انتہا نہیں ہے۔ "لفظ" کی ابتداء ہے، ظاہر ہے کہ انتہاء "End" بھی ہوگی، اس لئے لفظ خدا نہیں ہے۔ 'لفظ' کے "خدا کے ساتھ ہونے" سے بھی ثابت ہے کہ 'لفظ' خدا نہیں ہے۔ خدا اپنی مخلوق کے ساتھ ہے تو کیا مخلوق خدا ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔ خدا لا فانی ہے۔ مخلوق کی لافانیت فنا کے بعد جنت اور دوزخ میں ہے۔ اس لئے خدا، خدا، ہے اور خدائی، خدائی ہے۔ بائبل میں بار بار Everlasting fire کہا گیا ہے۔ جس میں گنہگار جلیں گے۔

اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ کائنات مخلوق ہے۔ کیونکہ ہر مخلوق فانی ہے، اس لئے روح بھی فانی ہے۔ صرف اللہ لا فانی ہے۔ اللہ دائم الوجود ہے اور وہ قیوم ہے۔ وہ واحد و لاشریک ہے۔ اس سے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ —— "خدا "مجموعۂ ارواح" ہے جیسا کہ انور صاحب نے تحریر کیا ہے۔

(۹) انور صاحب کا ایک شعر صفحہ ۷ کالم ۲ پر شائع ہوا ہے۔

خدا جو خالقِ دوزخ، وہ خود ہی جارحیت ہے
عبادت کے وہی لائق کہ جس میں جوشِ قوت ہے

'جارح'۔ 'جارحیت' کے معنی "نقصان پہنچانے والا" "زخمی کرنے والا" ہیں۔ انور صاحب نے خدا کو "جارحیت" اس کے دوزخ بنانے کی وجہ سے سمجھا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا ہے کہ کچھ اشخاص نبوت اور رسالت کا انکار کر کے اپنے نفس کو بہت زیادہ محدود کر لیتے ہیں۔ اسی محدود نفس کے سبب وہ اچھائی کو برائی اور برائی کو اچھائی سمجھنے لگتے

ہیں۔ وہ خدا کا انکار کر دیتے ہیں۔ اپنے سے کم درجے کی چیزوں کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔ یا پھر اتنے مغرور اور گھمنڈی ہو جاتے ہیں کہ اپنے کو خود خدا کہنے لگتے ہیں۔ جیسے فرعون، نمرود وغیرہ۔ اغلام، زنا، بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا یا زندہ دفن کرنا یا دریاؤں میں بہا دینا وغیرہ ایسے اعمال کرنے لگتے ہیں، جو انکے لئے "اپنی نیچر" یا "خلاف فطرت" ہوتے ہیں۔ ان کے یہی اعمال آگ بننے کا سبب ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب دو مخالف ملتے یا ٹکراتے ہیں تو آگ بنتی ہے۔ دنیا لمحہ بہ لمحہ فنا ہو رہی ہے۔ اسلئے وہ آگ گرم گیس جیسی شکل (Form) میں گناہگار کے نامۂ اعمال میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ —— "تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے" —— ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ —— "اے انسان! تجھ پر جو کوئی بدحالی پیش آتی ہے، وہ تیرے ہی سبب سے ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ ثابت ہوا کہ ظالم، مغرور اور گناہگار لوگوں کی بداعمالیاں انھیں دوزخ میں لے جاتی ہیں۔ خُدا نے تو نبوت اور رسالت کے ذریعہ سب کو کامیابی اور خوش حالی کی طرف بُلایا ہے۔

یہاں ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ نیک اور بے قصور لوگوں پر مصیبت اور بدحالی کیوں آتی ہے۔ جواب صاف ہے کہ —— ۱۔ اُن کی اِس حالت کا سبب گناہگاروں کی وہ بداعمالیاں ہیں جن کے وہ مفعول بنالئے جاتے ہیں۔ ۲۔ گناہگاروں کی بد اعمالیوں کے بداثرات ماحول اور معاشرے میں پھیلتے ہیں اور یہ نیک اور بے قصور لوگوں، معصوم بچّوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ۳۔ بے قصور اور مظلوم لوگ جدّ و جہد کر کے یا کسی اور نیک طریقے سے اس مصیبت و بدحالی سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ ۴۔ اگر اس پر بھی اُنہیں چھٹکارا نہیں ملتا ہے دنیا سے رخصت ہوتے ہی انکی مصیبت و بدحالی دور ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ انکی یہ مصیبت و بدحالی صرف دُنیا تک ہوتی ہے۔ لیکن دُنیا سے انکی رُخصتی خُودکشی کے ذریعہ نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ طبعی موت اور حادثاتی موت سے ہونی چاہئے۔

دوسری بات مصرعہ ثانی میں کہی گئی ہے کہ "جس میں جوشِ قوت ہے، وہی لائق عبادت ہے" —— انور صاحب کے اِس خیال کے مطابق ڈاکوؤں کا گروہ اور سَردار، چوروں کا گروہ اور سردار، ہٹلر، چنگیز، فرعون، نمرود، راون، کنس وغیرہ یہ سب عبادت کے لائق ہیں۔ کیوں کہ ان میں "جوشِ قوت" بہت زیادہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انور شیخ صاحب نے انگریز مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ مرعوب ہو کر کیا ہے۔ مرعوبیت کے سبب عقل و دانش کی اعلیٰ خوبیاں اکثر ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ "وہ (یعنی نیک) لوگ ایسے ہیں کہ جو اِس میں کہا گیا ہے یعنی قرآن میں اس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اور وہ اللہ کا شکر کرتے ہیں۔ اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

صفحہ ۵ کالم ۳۔ اپنے تعارف میں انور صاحب رقم طراز ہیں ——: اگرچہ (پہلی) بیگم صورت و سیرت کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کی خاتون تھیں (پھر بھی) ہمارے مزاجوں میں ہم آہنگی نہیں تھی" —— ظاہر ہے کہ "ہم آہنگی نہیں" ہونے کا خاص نفسیاتی سبب تضاد ہے۔ اسی وجہ سے مزاجوں میں ہم آہنگی نہیں ہوئی تھی۔ خط ذرا طویل ہو گیا ہے۔ خیال نہ کریں امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ والسلام

اسرار اکبر آبادی
E3-600, Ashok Park, Shaheed Nagar, Agara - 282001

OOOOOO

O "انور شیخ: ادب و متنازعہ افکار" ایک انوکھی چیز ہے۔ تمام مشمولات پڑھنے کے بعد محترمہ جولیا شیخ (بیگم انور شیخ) کا مضمون جو بہ زبان انگریزی تحریر کیا گیا ہے بغور پڑھا تو مجھے یہ رائے قائم کرنے میں تامل نہیں ہوا کہ انور شیخ ایک پختہ افکار، عمدہ اخلاق اور اعلیٰ ظرف والے انسان ہیں۔ انور کی شادی گرچہ عیسائی خاتون (جولیا) سے ہوئی ہے لیکن بہر حال یہ خاتون اہل کتاب میں سے ہیں۔ انور شیخ کا جارج تھامس (جو بعد میں برطانوی پارلیامنٹ کے ممبر بنے) کے ساتھ تجربہ متاثر کرتا ہے۔ لیکن برطانوی ٹیکس قانون کے تحت حکومت کی جانب سے انور شیخ پر لاکھ پونڈ ٹیکس وصولیابی کا دعویٰ اور اس میں حکومت کی شکست کا قصہ بیگم شیخ نے جسطرح تحریر کیا ہے۔ بہت متاثر کرتا ہے اس تجربے نے انور شیخ سے Taxation & Liberty کتاب لکھوائی جس کے حوالے سے خود آپ (ف۔ س۔ اعجاز) کا مضمون "ٹیکس اور آزادی" خاصے کی چیز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ برصغیر میں حکومتیں ہم غریب عوام کا خون چوس رہی ہیں اور ٹیکس لاگو کرنے میں وہ اسٹیٹ مافیا کا رول ادا کر رہی ہیں۔ ہر بجٹ میں، اور اب تو ہر وسط مدتی بجٹ میں وزیر خزانہ عوام پر ظالمانہ ٹیکس اور ایکسائز کے پہاڑ لاد دیتا ہے۔ انور شیخ نے ٹھیک کہا ہے کہ ٹیکس حکومت کے ہاتھ میں "غلبے کا ہتھیار" ہے اس لئے ٹیکس قانون کا آلۂ کار ہے"۔ برطانیہ سے بڑھکر ہماری حکومت کو ٹیکس کی حرص بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ وہ پیداوار کے فطری وسائل کا پورا استعمال کرنے میں ناکام ہے اور تمام عملے بددیانت ہیں۔ شیخ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ 'لوگ سرکاری اتھارٹی کا جُوا ایک خاص مقصد سے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتے ہیں جس کا

بقیہ صفحہ ۳۸ پر

شاعرِ کم سخن مجروحؔ سلطان پوری

ف۔س۔اعجاز

مجروحؔ سلطان پوری ایک وضعدار شاعر تھے۔ ان کی ادبی حیثیت ترقی پسند فکر و تحریک کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ لیکن ان کی ترقی پسندی ترقی پسند تحریک سے الگ بھی کچھ معنی اور اہمیت رکھتی ہے ان کا مجموعۂ کلام ۵۶ء میں "غزل" کے نام سے چھپا۔ بعد میں آٹھ نو ایڈیشن اس کے چھپے وہ بھی اسی نام سے چھپے۔ ۹۹ء میں ان کا اردو ہندی میں مشترکہ ایڈیشن شائع ہوا تو اس کا نام "مشعلِ جاں" رکھ دیا گیا جس میں غزلوں کے علاوہ گنتی کی چند نظمیں بھی ہیں۔

مجروحؔ کی غزل پر کئی ناقدین نے مثبت انداز میں مقالات قلمبند کئے ہیں۔ لیکن مجروحؔ کو اطمینان کسی سے نہیں ہوا۔ یعنی ناقدین نے انھیں اس طرح تسلیم نہیں کیا جس طرح وہ چاہتے تھے کہ انھیں تسلیم کیا جائے۔ وہ یہ بات اونچی آواز میں کہا کرتے تھے کہ وہ ترقی پسند غزل کے باضابطہ اولین شاعر تھے۔ ان کا ادّعا تھا غزل سے ترقی پسندی کے رموز و کنایات اُن کے متعارف کرائے ہوئے ہیں لیکن ان کے ایسے بیشتر اشعار نعرہ زنی کی حد میں شمار کر کے ناپسندیدہ قرار دیئے گئے۔ "مشعلِ جاں" کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے "...... میری پوری غزل کو انہیں بعض عیوب سے منسوب کر کے بڑے تو بڑے چھٹ بھئیے بھی جو ہاتھ میں آیا لے کر میدان میں آگئے اور تب سے یہ سنگ باری آج تک جاری ہے۔ میری خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف خامیوں کو میرا فن ٹھہرایا گیا گو اس ہنگامۂ دار و گیر کے باوجود میرا یقین ایک لمحے کو بھی متزلزل نہیں ہوا اور میں نے اور میرے ساتھیوں نے ترقی پسند غزل کو ایک تازہ روایت کی حیثیت دے کر ہی دم لیا"۔ انھیں اس پر اطمینان تھا کہ احباب کے منفی رویے کے باوجود ان کے سننے اور پڑھنے والوں نے ان کی غزل کو کسی صنفِ سخن سے کمتر نہیں جانا۔ انہیں شکایت تھی کہ ان کے کئی اشعار دوسروں نے اپنے نام سے منسوب کر لئے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے "میری تراشیدہ تراکیب لفظی کو دوسروں کا مال سمجھا جاتا ہے چنانچہ اہل نظر کی بے بصری کا علاج میرے پاس اس کے سوا اور نہ رہا کہ اپنی ملکیت کا اعلان کروں مگر میرے اس مجبور رویے کو خودستائی سے تعبیر کیا جانے لگا تو میں نے اس محاذ پر بھی خاموشی اختیار کرلی گویا چپ رہوں تو مغضوب اور کچھ بولوں تو مغضوب"

واقعہ یہ کہ مجروحؔ چپ رہنے والے بندے تھے ہی نہیں۔ وہ کسی محفل میں چپ نہیں رہ سکتے تھے اور انھیں جو بولنا ہوتا بے ساختہ اور بے دھڑک بول دیا کرتے تھے۔ فلمی نغمہ نگاری میں ان کا اپنا مقام تھا۔ جب انہیں فلمی نغمہ نگاری کے لئے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ گیا تب بھی انھوں نے ایوارڈ ملنے کی زبردست خوشی کے اظہار کے ساتھ یہ اعتراض کر دیا تھا کہ یہ ایوارڈ تو مجھے بہت پہلے مل جانا چاہئے تھا۔ ان کی انا خاصی دبنگ تھی جسے وہ کبھی دبا نہیں سکتے تھے اور اس کا اعتراف بھی دوستوں میں برملا کر دیا کرتے تھے۔

مجروحؔ عربی فارسی مدارس کے فارغ التحصیل تھے۔ (وہ کامیاب حکیم بھی تھے)۔ جدید تعلیم حاصل نہ ہونے کے باوجود ادبیات کا ان کا گہرا مطالعہ تھا۔ میر کو وہ بہت بڑا شاعر مانتے تھے۔ حالانکہ میر کا رنگ اپنی غزل پر انھوں نے چڑھنے نہیں دیا۔ لیکن میر کی ان کی نظر میں خاص وقعت تھی۔ ترقی پسند تحریک کی راہ سے چل کر وہ مارکسی نظریات تک رسائی حاصل کرپائے تھے۔ ۵۰ء میں روس کی راجدھانی ماسکو کو اپنا نظریاتی قبلہ مان کر انھوں نے کہا تھا ؎

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

۱۹۵۲ء میں انھوں نے تین اشعار "نذرِ سوویت یونین" کئے جس کے ایک مصرعے میں انھوں نے کہا

"میں تو دیوانہ ہوں، اے انجمنِ سرخ ترا"۔

تیسرا شعر یوں تھا ؎

تو بھی دیکھے تو یہ اب ہو نہ سکے گا معلوم
میرے سینے میں ہے دل یا وطنِ سرخ ترا

یہ شعر اس انتہائی دور کی یاد دلاتا ہے جب ہندوستان کے ترقی پسندوں کے سینوں میں دل کی جگہ سوویت یونین ہوا کرتا تھا۔ شکر ہے جلد ہی مجروحؔ کے قلب کی تبدیلی ہوگئی اور ان کے دل میں روس کی بجائے پھر ہندوستان پایا جانے لگا۔ ترقی پسند فلمی شاعر شیلندر نے غالباً ۵۵-۵۶ء میں "آوارہ" فلم کے ایک گیت میں "سر پہ لال ٹوپی روسی پھر بھی دل ہے ہندوستانی" کہہ کر ایک سودیشی دل کی بات تو کہی تھی لیکن بہر حال وہ فلمی گیت تھا۔ لیکن اس میں بھی کیا شک ہے کہ ادب میں سرخ سویرا اور انجمنِ سُرخ وغیرہ وقتی درآمد کردہ مصنوعات تھیں۔ ۶۲ء میں ہندوستان پر کیمونسٹ چین کے حملے پر مجروحؔ نے چین کی پیاں شکنی کے نام ۷ / اشعار

کہے۔ اولین دو شعروں میں ہی سرخ "محفلِ یاراں" کا بھرم ٹوٹنے کا درد انگیز ماتم ملاحظہ کیجئے ۔

دستِ پُر خوں کو کفِ دستِ نگاراں سمجھے
قتل گہہ تھی جسے ہم محفلِ یاراں سمجھے
کچھ بھی دامن میں نہیں خارِ ملامت کے سوا
اے جنوں ہم بھی کسے کوئے بہاراں سمجھے

حیرت اس پر ہے کہ حالیہ دنوں میں مجروحؔ کے بعض ہمعصروں کو کوہر بڑے سے بڑا انعام اسی قسم کی اور اس سے کمتر ادبی فکر و خدمات کے حوالے سے دیا گیا لیکن مجروحؔ کو ہر طرح محروم رکھا گیا۔ اسی لئے مجروحؔ کی اس بات میں کچھ صداقت ضرور ہے کہ "میری پشت پر کوئی دستِ شفقت کبھی نہیں رہا۔ مجھے زندہ رکھا تو میرے غیر جانب دار سننے اور پڑھنے والوں نے"۔

مقام شکایت ہے کہ ان شاعروں کی طرح مجروحؔ نے بھی ادب اور فلم کی بہترین خدمت کی۔ اور اپنے نظریات اور اصولوں کے عشق میں اسیر زنداں بھی ہوئے۔ لیکن جس طرح اور ترقی پسند شعرا کی پذیرائی ہوئی مجروحؔ کی نہیں ہوئی۔ مجروحؔ کا بڑا پن ہے کہ رسمی قدر و منزلت کو انھوں نے اپنی منزل کبھی نہیں سمجھا۔ ان کا ادبی سفر موت کے سفر سے چند سال پہلے تک اور فلمی گیتوں کا سفر آخری سانس تک جاری رہا۔ ورنہ ہر فلمی شاعر کا بازار اپنی موت سے کئی سال پہلے سرد ہو چکا تھا۔ جبکہ ماشاء اللہ مجروحؔ نے دوسرے فلمی شعرا سے حیات بھی زیادہ پائی۔ وہ ۸۱ سال کے مرے۔

ادب میں وہ مارکسزم سے متاثر تھے۔ آزادی کے بعد اواخر ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے بارے میں ایک متنازعہ گیت کے ایک مکھڑے پر انھیں سزائے قید جھیلنا پڑی۔ ہمیں ایک ٹی وی انٹرویو میں انھوں نے بتایا تھا کہ اس وقت کی کانگریس حکومت نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ ممبئی کے لال باغ اور پریل کی مزدور بستی میں ہم سیدھی سادی زبان میں گیت سنا رہے تھے۔ میں "امن کا جھنڈا" سنا رہا تھا۔ اس کا مکھڑا تھا "مار دو ساتھی جانے نہ پائے" "جانے نہ پائے"۔ اس سطر کو ہر بند کے بعد دہرایا جاتا تھا۔ ایک بند کے آخر میں میں نے کہا "کامن ویلتھ کا داس ہے نہرو۔ اور تباہی لانے نہ پائے"۔ اس گیت کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ میں نہرو کو مارنے کی بات کر رہا تھا۔ جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مہاراشٹر کے اس وقت کے وزیر داخلہ مرارجی ڈیسائی نے مجھے بلا کر کہا کہ معافی مانگ لو تو تمہیں چھوڑ دیں گے۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ معافی مانگنے کا مطلب ہے اپنے نظریات کے بارے میں معافی مانگنا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ نتیجتاً مجھے ڈیڑھ سال تک ممبئی کی آرتھر روڈ جیل میں رہنا پڑا۔

مجروحؔ کی شاعری دیرپا اور پُر کشش ادبی، تہذیبی اور جمالیاتی اقدار کی حامل ہے۔ ان کی غزل تحریک کے باقیات میں سے ہے اور یقیناً اس میں تحریک کی نشانیاں جھلملاتی ہیں۔ اگرچہ ہر جگہ وہ بہت کھلی نہیں ہیں۔ بیشتر مقامات پر وہ غزل کی رمز و اشاریت میں ڈھکی لپٹی اور کلاسیکی سوز و گداز لئے ہوئے ہیں۔ ان کی تراکیب اور تراشیدہ لفظی نے ان کی غزل کو منفرد بنا دیا تھا۔ غزل جن اجزا سے معمور و عبارت ہوتی ہے ان کا ٹھیک تجزیہ کرنا آج بھی مشکل ہے۔ شاعر اپنے بارے میں اپنے ہی گمان یا خوش فہمی سے بھی گمراہ ہوئے ہیں۔ اگر مجروحؔ اپنے ناقدین کو کھلا اور آزاد چھوڑ دیتے تو شاید زیادہ فائدے میں رہتے۔ اس طرح ناقدین کو زیادہ سر کھپانا پڑتا اور ان کی غزلوں کے مخفی پہلوؤں اور محاسن کو دریافت کرنے کا موقع ہاتھ آتا۔ مجروحؔ کو یہ آرزو زیادہ تھی کہ وہ ترقی پسند غزل کے قائد تسلیم کر لئے جائیں۔ یہ آرزو شدید نہ ہوتی تو ان کی غزل تنقید کے مختلف مواضعات میں نور برسا رہی ہوتی۔ بہر حال اب جب کہ وہ خود زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں ان کا نقاد کھلے طور پر فرائضِ نقد انجام دے سکتا ہے۔ مجروحؔ کی غزلوں سے نکتہ رس ناقدین بہت کچھ برآمد کر سکتے ہیں غزل کے انسلاکات اور جزئیات کی صحیح پرکھ بتا سکتی ہے کہ مجروحؔ کی غزل خوبصورتی اور محنت سے تراشا گیا ایک جام بلور ہے۔ جس میں نفاست سے اتارے گئے شفاف مادے کو روشنی کی کرنیں طرح طرح کے خوشنما رنگ عطا کر دیتی ہیں۔ ان کی شاعری عشق، جمالیات اور سیاست کا ایک ایسا محلول ہے جس کا سُرور اگر دل و دماغ پر چڑھتا ہے تو صرف رگ پے میں آگہی کا سنہرا نور پھیلانے کے لئے۔ ان کی غزل کا ہندوستان کی اشتراکی تحریک اور خود غزل کی تاریخ کے سیاق و سباق میں مطالعہ کر ہمارے قدم معنی خیزی کی نئی راہ پر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے بہت زیادہ غزلیں نہیں کہی ہیں لیکن ایک دولتِ بیدار وہ اپنی غزلوں میں چھوڑ گئے ہیں جو ہر دور میں سکہ رائج الوقت تسلیم کی جائے گی۔ اس سنگین صارفی سماج میں جہاں انسان ایک قابلِ خرید و فروخت شئے (Commodity) بن چکا ہے اور آنے والے ہزارے میں اس کے گلے میں اسی شناخت کا قیمت نامہ (Price Tag) لٹکنے والا ہے ایک شاعر اس سے زیادہ کچی بات کہہ ہی نہیں سکتا جو مجروحؔ نے کہی ہے ۔

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

یوں تو کیفی اعظمی نے بھی کہا ہے ۔

وہ جن کو پیار ہے چاندی سے عشق سونے سے
وہی کہیں گے کبھی ہم نے خودکشی کر لی

ممکن ہے یہ کوئی پیشگوئی ہو۔ جاگیر درانہ نظام میں کبھی ایسے افسانے جنم لیتے تھے جن میں کوئی زمیندار یا اہل سیم وزر "بالآخر" خود کشی کر لیتا تھا۔ لیکن ایسی موت کا سبب زر کشی کے علاوہ کچھ ہوا کرتا تھا۔ ایک پاکستانی شاعر عارف شفیق نے کہا ہے ۔

فقیر شہر تو فاقے سے مر گیا عارف
امیر شہر نے ہیرے سے خود کشی کرلی

سبھی ڈراموں کا انجام ایک نہیں ہوتا۔ ہر بار ایسا نہیں ہوگا کہ پرجا فاقوں سے مر جائے اور راجہ خود کشی کرلے۔ یہ تو ایک انداز زندگی ہے۔ جب لوگ اس کے عادی ہو جائیں گے تو خود کشی کا رجحان کافور ہو جائے گا۔ وہ حالات کے تفاوت کے ساتھ جینے کے عادی ہو جائیں گے۔ بلکہ ابھی سے ہو چلے ہیں۔ جس طرح جنگل کا آدمی زہریلے سانپوں اور خونخوار درندوں کے بیچ رہ سکتا تھا۔ امیروں کی تسکین تو عجیب و غریب طریقوں سے ممکن ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایک امیر محض خود کشی کی چاٹ کے لئے ہیرا پہنتا ہو۔

معاملہ جو بھی ہو خود کشی کی نوبت اگر آئی تو اس لئے آئے گی کہ آدمی متاع کوچہ و بازار بن گیا ہے اور اس پر ہر نگاہ خریدار کی سی پڑ رہی ہے۔ یقیناً یہ بردہ فروشی نہیں ہے اور نہ اسے صرف یوسف کی نیلامی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس فکر کا احاطہ مارکسی جدلیاتی شعور نے ہی کیا جواب خود متاع کوچہ و بازار بن گیا ہے۔ مجروح کا مشاہدہ زیادہ معروضی ہے۔ انھوں نے معاملے کی صحیح نبض پر ہاتھ رکھا ہے۔ فکر کی نشو و نما اور سانحے کی وقوع پذیری میں وقت کا فاصلہ ہو سکتا ہے۔ ایسے ممکنہ سانحات کو ٹالنے کے لئے آدمی کی فکر کا علاج کرنا ضروری ہے۔ مجروح کے متصورہ معاشرے میں خود کشی کی جگہ بہرحال نہیں تھی۔

دیانت کا تقاضا ہے کہ مجروح کی غزلوں کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جائے جس میں تصور حیات، عظمت انسان اور مادّیت فکر (جس کی طرف ابھی ایک اشارہ کیا گیا) کا بھرپور جائزہ بھی شامل ہو۔ بعض ماہرین آدھی ادھوری باتیں کہتے ہیں۔ اس سے گریز کرنا چاہئے۔ صرف فیض وغیرہ سے موازنہ کرکے نہ صرف مجروح بلکہ فیض کی بھی حق تلفی کی جاتی رہی ہے۔

ہمارے شعراء میں معرکۂ حق و باطل کی ادائیگی میں ایک رجحان اکثر پایا جاتا ہے۔ وہ کربلائی استعاروں کا کہیں نہ کہیں استعمال کر گزرتے ہیں۔ کیوں کہ شارٹ کٹ چلنے کے لئے ریڈی میڈ تراکیب بڑی آسانی بہم پہنچاتی ہیں۔ اور کسب علم کے لئے نئی محنت نہیں کرنا پڑتی۔ یا یہ کہ سامعین کے اجتماعی لاشعور میں یہ علائم و استعارات پہلے سے یوں بسے ہوئے ہیں کہ ان کا بکثرت استعمال سامعین کی عقیدت اور جذبے کا استحصال آسان بنا دیتا ہے۔ اس معاملے میں آپ مجروح کو ایک دقت پسند اور رموز نو کا موجد پائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ مجروح کی غزل پر رواروی میں اظہار نقد نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے غزل کو اپنا محبوب بنایا اور غزل کے کلاسیکی آہنگ کو چوٹ نہیں پہنچنے دی۔ جہاں انھوں نے اپنے افکار غزل میں داخل کئے وہیں غزل کے لفظی، معنیاتی اور اصواتی نظام میں اپنے موافق تبدیلیاں پیدا کیں۔ ظاہر ہے صنف غزل اختیار کرنے کے سبب وہ نظم کے صراحتی لزومات سے بری ہو گئے۔ یہ کام مشکل تھا اگرچہ مہارت کے سبب ان کے لئے سہل ہو گیا۔ مجروح کو سخن مختصر پر حیرت انگیز عبور تھا۔ دل میں کچھ کہنے کی خواہش سر ابھارتی جسے تادیر ٹالتے رہتے۔ خیال اگر طاقتور ہوتا تو انہیں لکھنے کے لئے خود مجبور کر دیتا تھا۔ کسی تخلیقی لمحے میں خیال کی سازش بڑی پیاری لگتی ہے۔ مجروح کو یہ تخلیقی تماشا کسقدر پسند تھا اُن کے ان دو اشعار میں دیکھئے ۔

بہت ہی کم ہے تو خال رخ بہاراں ہے
مری نوا کو ملی ہے وہ داغ پیرہنی
ملے جو وقت نوا سنجئ ہزاراں سے
ادھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سخنی

انہوں نے کلاسیک کی پاسداری کی ساتھ ہی انھوں نے اسلوب فکر کو رومانی سانچے میں ڈھال دیا۔ نموتاً مجروح کے بہت سے اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن میں اپنے مضمون کی تعبیر کے لئے ان کی صرف ایک غزل کے چند اشعار نقل کروں گا۔ اس سے زیادہ کا شوق ہو تو لوگ ان کا مجموعۂ کلام ("غزل" یا "مشعل جاں") دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں ۔

اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشم جانانہ کہیں
دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلف صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں
تھامیں اُس بت کی کلائی اور کہیں اس کو جنوں
چوم لیں منھ اور اسے انداز رندانہ کہیں
تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہئے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

اہل طوفاں سے دل والوں کا افسانہ بیان کرنا، موج کو گیسو، بھنور کو محبوبہ کی آنکھ بتانا، پھانسی کے تختے پر محبوب کی زلف کا نعرہ لگانا، عالم ہوش میں دلبر کا منہ چومنا اور اسے انداز رندانہ قرار دینا، مے کدے میں ہر پیانے کا خود مجسم پیاسا ہو جانا ــــــ مکمل طنز، مکمل رومان سیاسی اور رومانی

بقیہ صفحہ ۵۰ پر

مجروحؔ کا ایک خط مدیرِ انشا کے نام

بمبئی

۱۸/ جولائی ۱۹۸۸ء

مکرمی اعجاز صاحب۔ سلام و اکرام!

ایک تو میں شاعر او پر سے غزل کا۔ نثر لکھنا میرے بس کی بات کہاں۔ غزل کے شعرا میں غالبؔ بہت اچھی نثر لکھ گئے۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ نظم کے بھی اتنے ہی بلند شاعر تھے۔ ہمارے عہد میں فراقؔ بھی اچھی نثر لکھ گئے۔ اقبالؔ اور جوشؔ میں اقبالؔ اگرچہ بہت ہی ہمہ جہت، پر مغز اور بلند نثر لکھتے ہیں مگر اسلوب کی جھلک جوشؔ کے دہاں زیادہ ہے۔ ہمارے فوری پیش رو ہم عصروں میں فیضؔ سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی کی نثر پر بھی نگاہ پڑتی ہے۔ دراصل جب تک کوئی اسلوب نہو کچھ لکھنے کا لطف نہیں۔ اگرچہ میں نے ہی کہا ہے۔

مجھے نہیں کسی اسلوب۔ شاعری کی تلاش تری نگاہ کا جادو برے سخن میں رہے

مگر یہ جادو بھی ہر ایک کا نصیب کہاں۔ بہر حال اب آیئے اپنے موضوع کی طرف۔

ساری گڑ بڑ آپ کے عنوان کی ہے۔ معاشقہ! اس لفظ کو سطحی معنوں میں بھی اسقدر استعمال کیا گیا ہے کہ عشق کے مقابلے میں معاشقہ کسی حد تک اپنی آبرو کھو چکا ہے۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ عشق کے لئے جانبین کا ابتلا ضروری نہیں جبکہ معاشقے کیلئے ضروری ہے۔ کہ "دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی"۔ عشق یا معاشقے کے مدارج ہو سکتے ہیں مگر یہ صفت جذباتی ہونے کے علاوہ بڑی حد تک جبلّی بھی ہے جس کے لئے ضروری نہیں کہ چاہنے والے کے سامنے کوئی ذات ہی ہو۔ وہ کوئی شئے کوئی ہنر یا خود اپنا آپ بھی ہو سکتا ہے۔ خوب و ناخوب ان میں کون اور کتنا ہے یہ بحث بالکل الگ — حسنِ جمال اور اسکی کشش صرف انسانوں ہی کا حصہ نہیں ہے۔ یہ حیوانات میں بھی پایا جا سکتا ہے اور اب تو بات نباتات تک بھی پہونچ گئی ہے کہ موسیقی کے اثر سے پیار کی گفتگو سے اس کا متاثر ہونا سائنس نے ثابت کر دیا ہے۔ شاید اچھی صورتوں کا اثر بھی ان پر ویسا ہی پڑتا ہو جیسا کہ ہم پر۔ غرضیکہ احساسِ جمال ایک ایسی نعمت ہے جس کے بغیر وجودِ انسانی ہی نہیں بلکہ وجودِ کائنات کا تصور نا ممکن ہے۔ اسی کے ظہور کا ایک اہم پہلو ہے حسن و معاشقہ۔ پیغمبروں سے لے کر ہم تک کوئی ایسا صحیح الدماغ نہیں جو اس سے مبرّا ہو۔ بلکہ بصد سامانِ رسوائی سر بازار بھی محبوب کا نام لے لے کر رقص کرنے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کے مظاہر تعمیری بھی ہیں تخریبی بھی کہ صحبتِ ناجنس میں یہی حسنِ جمال تنزّہ سے گر کر ابتذال تک پہونچ جاتی ہے، عشق ہوس بن جاتا ہے گویا تاج محل کی تعمیر سے لیکر خانہ سوزی اور قتلِ انسانی تک پر منتج ہوتا ہے۔ مگر یہاں گفتگو اس کے ان عطار بار مظاہر سے ہے جس نے ذاتِ الٰہی سے لے کر فردِ انسانی تک کی پرستش پر اہلِ دل کو مجبور ہی نہیں فخر کے ساتھ وابستہ و مبتلا کیا ہے۔ تاریخیں بھری پڑی ہیں کہ عشق اور معاشقے کی بدولت اس کائنات نے کیا کیا مناظر دیکھے ہیں اور کائنات کو کیا کیا نہیں ملا ہے۔ تفصیل میں جانا تحصیل حاصل ہوگا۔ اب رہا وہ شخص جو یہ حرف رقم کر رہا ہے تو اس نے بھی عشق کئے ہیں اور کرتا ہے۔ کامیاب بھی ہوا اور ناکام بھی اور رسوائے عام بھی ۔ میری شاعری میں اسی کی کار فرمائیاں ہیں۔ کہیں وہ جان ہے اور کہیں جہان، کہیں اس کا لہجہ عاشقانہ ہے اور کہیں سیاسی، انقلابی، معاشرتی اور دانشورانہ کہ بقول میر

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

والسلام

مجروح

انشاء کا خاص شمارہ "ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ" صرف چند جلدیں دستیاب ہیں۔

مجروح سلطانپوری کی چند غزلوں سے انتخاب

ڈرا کے موج و تلاطم سے ہم نشینوں کو
یہی تو ہیں جو ڈبویا کئے سفینوں کو
شراب ہو ہی گئی ہے بقدرِ پیمانہ
بہ عزمِ ترک نچوڑا جب آستینوں کو
جمالِ صبح دیا روئے نوبہار دیا
مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو
(ق)
کبھی نظر بھی اٹھائی نہ سوئے بادۂ ناب
کبھی چڑھا گئے پگھلا کے آبگینوں کو
یہی جہاں ہے جہنم، یہی جہاں فردوس
بتاؤ عالمِ بالا کے سیر بینوں کو
تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروحؔ
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو
۱۹۴۷ء

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا
رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا
میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا
شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا
دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

تقدیر کا شکوہ بے معنی، جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے، اتنا تو کوئی مجبور نہیں
جنت بہ نگہ، تسنیم بہ لب، انداز اس کے اے شیخ نہ پوچھ
میں جس سے محبت کرتا ہوں، انساں ہے خیالی حور نہیں
وہ کون سی صبحیں ہیں جن میں بیدار نہیں افسوں تیرا
وہ کون سی کالی راتیں ہیں جو تیرے نشے میں چور نہیں
مجروحؔ اٹھی ہے موجِ صبا آثار لئے طوفانوں کے
ہر قطرۂ شبنم بن جائے، اک جوئے رواں کچھ دور نہیں

آنکل کے میدان میں دورخی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے
اہلِ دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم
اب گہر سبک ہوگا، جَو کے ایک دانے سے
منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے
میں کہ ایک محنت کش، میں کہ تیرگی دشمن
صبحِ نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے
خودکشی ہی راس آئی، دیکھ بدنصیبوں کو!
خود سے بھی گریزاں ہیں بھاگ کر زمانے سے
اب جنوں پہ وہ ساعت آپڑی کہ اے مجروحؔ
آج زخمِ سر بہتر، دل پہ چوٹ کھانے سے
۱۹۴۹ آرتھر روڈ جیل، بمبئی

ہمیں شعورِ جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے
تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے
نہ ہم قفس میں رکے مثلِ بوئے گل صیاد
نہ ہم مثالِ صبا حلقۂ رسن میں رہے

ق

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

سرشک، رنگ نہ بخشے تو کیوں ہو بارِ مژہ
لہو حنا نہیں بنتا تو کیوں بدن میں رہے

مجھے نہیں کسی اسلوبِ شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

زباں ہماری نہ سمجھا کوئی یہاں مجروحؔ
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

۱۹۵۹ء

◆ ◆ ◆

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یونہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

اب جا کے کچھ کھلا ہنرِ ناخنِ جنوں
زخمِ جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

مجروحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

◆ ◆ ◆

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کئے ہیں ہم نے عزیزو، چار گریباں تم سے زیادہ

چاکِ جگر محتاجِ رفو ہے، آج تو دامن صرف لہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے، شوقِ بہاراں تم سے زیادہ

ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن
یہ نہ سمجھا ہم کو ہوا ہے، جان کا نقصاں تم سے زیادہ

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے مجروحؔ مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں، عالمِ زنداں تم سے زیادہ

۱۹۸۰ء

◆ ◆ ◆

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

پھر آئی فصل کہ مانندِ برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

قطارِ شیشہ ہے یا کاروانِ ہمسفراں
خرامِ جام ہے یا جیسے کائنات چلے

بلا ہی بیٹھے جب اہلِ حرم تو اے مجروحؔ
بغل میں ہم بھی لئے اک صنم کا ہات چلے

۱۹۶۲ء

◆ ◆ ◆

مجھ سے کہا جبریلِ جنوں یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہبِ دل ہے باقی سب گمراہی ہے

سنگ تو کوئی بڑھ کے اٹھاؤ شاخِ ثمر کچھ دور نہیں
جس کو بلندی سمجھے ہو ان ہاتھوں کی کوتاہی ہے

پھر کوئی منظر پھر کوئی گردش کیا کیجئے اے کوئے نگار
میرے لئے زنجیرِ گلو میری آوارہ نگاہی ہے

دور سے اس کو چاکِ ملامت جان کے ناصح خوش ہیں بہت
لیکن میرے گریباں پر تو اُس کاجل کی سیاہی ہے

دید کے قابل ہے تو سہی، مجروحؔ تری مستانہ روی
گرد ہوا ہے رختِ سفر، رستے کا شجر ہمراہی ہے

۱۹۹۴ء

قلم

جس فارسی شعر پر اس نظم کی بنیاد ہے۔ اس کے لئے اردو میں اگر دوچار قافیے ہیں بھی تو انتہائی مجہول قسم کے اس لئے مثلث ٹیپ کے مصرعوں میں "م" کا التزام کافی سمجھتا ہوں۔

مجروح

قلم گوید که من شاه جهانم
قلم کش رابدولت می رسانم

یہ ساز اوّلیں دستِ ازل کا
یہ کاتب عشق کی پہلی غزل کا
نگار علم کا پہلا یہ محرم

در و بامِ حرم پیدا اسی سے
جمالِ بت جہاں آرا اسی سے
اسی کا جلوہ نقشِ ابنِ مریم

زباں دی اس نے برگِ بے زباں کو
لبِ گفتار سنگ و استخواں کو
لکیروں کو ادائے رقصِ پیہم

بنادے حرف یہ وقتِ رواں کو
ورق پر نقش کردے رفتگاں کو
قلم کرتا ہے کارِ اسمِ اعظم

یہی تو شمع ہے بزمِ جہاں میں
یہی چوبِ جرس ہر کارواں میں
یہی جادہ بہ منزل گاہِ عالم

خمِ حرف اس کا محرابِ ہنر ہے
سیاہی سرمۂ اہلِ نظر ہے
جو نقطہ ہے وہ خالِ روئے آدم

اگر دستِ سعادت میں ہے مامون
نمو کرتا ہے مثلِ شاخِ زیتون
بیاضِ شعلہ پہ لکھتا ہے شبنم

یہ انساں جو امیرِ بحر و بر ہے
قلم لے لو تو پل میں جانور ہے
کسی بن میں کہیں کرتا پھرے رَم

یہ نکتہ سربراہوں کو بتاؤ
یہ مصرعہ کج کلاہوں کو بتاؤ
قلم شمشیر پر بھی ہے مقدم

مگر اہلِ قلم کی خود یہ توقیر
جسے دیکھو وہی عبرت کی تصویر
کرے تاریخ بھی کس کس کا ماتم

فلاطون و ارسطو شیخ و رازی
خرد نے جن سے پائی سرفرازی
سر ان کے بھی کسی دربار میں خم

وہ فردوسی و سعدی ہوں کہ خسرو
بہت دیکھی ہے ان کی بھی قلمرو
خود آوارہ، بساطِ رزق درہم

جنابِ میر و سودا مثلِ غالب
رہے نانِ شبینہ ہی کے طالب
سبھی کے ہاتھ اک لقمہ رہا کم

نشانِ عہدِ حاضر جوش و اقبال
نہ بدلا ان کی صبح و شام کا حال
قلم ان کے بدل دیتے تھے موسم

غرض اربابِ دانش اے خداوند
کہاں تک جنسِ بازاری کے مانند
قلم کو بیچ کر کھاتے رہیں غم

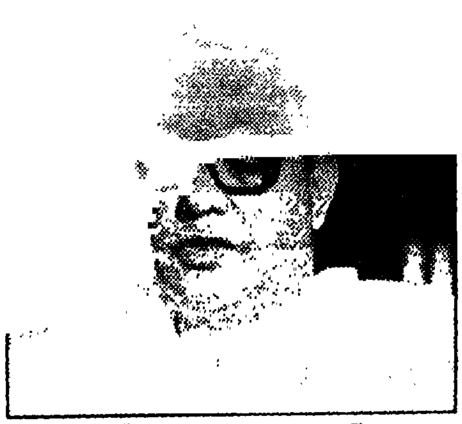
گئی شاہی تو ہے اب زخم خواری
ہماری چارہ جو ، سرمایہ داری
لہو لیتی ہے تب دیتی ہے مرہم

قلم کو کہیے کیا اس دستِ بد میں
عصائے خضر ہے گویا لحد میں
کہ افعی ہے کفِ وحشی میں برہم

مجروح کے چند یادگار فلمی گیت

افضل اقبال

انہوں نے ۳۵۰ سے زائد فلموں کے لئے تقریباً ۲۲۲۵ گیت لکھے۔ مجروح سلطان پوری کے قلم کی رفتار شروع سے آخر تک ایک جیسی ہی رہی۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی ان کے خیالات جواں ہوتے چلے گئے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آنے والا ہر دور اُنہیں یاد کرتا رہے گا اُن نغموں کے حوالے سے جو لافانی ہیں کبھی فراموش نہیں کئے جا سکیں گے۔ ۵۵ سال کے طویل کیریئر میں مجروح سلطانپوری نے سینکڑوں شاہکار نغمے لکھے ہر چند کہ مجروح سلطانپوری آخری دم تک بہت مقبول نغمے لکھتے رہے (مثال کے طور پر اُن کی حالیہ فلمیں پکار، پیار کوئی کھیل نہیں، جانم سمجھا کرو، کیا کہنا اور آئندہ ہفتے ریلیز ہونے والی فلم، ہم تو محبت کرے گا،) لیکن اُن کے بڑے بڑے مداح اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بہترین گیت مجروح صاحب نے ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۴ کے دوران لکھے۔ ۱۹۵۰ سے قبل اُن کے پاس کے ایل سہگل کا گایا ہوا شاہجہاں کا گیت "غم دیئے مستقل" اور "جب دل ہی ٹوٹ گیا" نیز لتا منگیشکر کا گایا ہوا انداز کا گیت "اٹھائے جا اُن کے ستم" جیسے ہمیشہ یاد رکھے جانے والے نغمے تھے لیکن اس کے بعد اُن کے کیریئر کا ایک سنہرا دور شروع ہوا۔ چند لازوال گیتوں کا احاطہ کیا جا رہا ہے: (۱) اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل (آرزو۔ ۱۹۵۰) یہ گیت جس نے طلعت محمود کو شہرت کے بامِ عروج پر پہنچا دیا، انیل بسواس کی موسیقی میں صدا بند کیا گیا تھا۔ (۲) بابو جی دھیرے چلنا، پیار میں ذرا سنبھلنا (آرپار۔ ۱۹۵۴) گرو دت کی فلم آرپار میں محمد رفیع۔ گیتادت کے چند بے حد خوبصورت نغمے شامل تھے۔ اس فلم میں "بابو جی دھیرے" کے علاوہ "سن سن ظالما" جیسا گیت بھی شامل تھا اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی گیت مجروح کی شاعری کا بڑا دل پذیر انداز لئے ہوئے تھے۔ (۳) جانے کہاں میرا جگر گیا جی (مسٹر اینڈ مسز ۵۵۔ ۱۹۵۵ء) یہ رفیع۔ گیتادت کا ایک اور دوگانا تھا جسے دھن اور موسیقی بخشی تھی او پی نیر نے۔ (۴) ہم ہیں راہی پیار کے ہم سے کچھ نہ بولئے (نو دو گیارہ ۱۹۵۷) ایک عظیم رومانی گیت جو کشور کمار نے اپنے مخصوص انداز میں گایا تھا۔ (۵) مانا جناب نے پکارا نہیں (پینگ گیسٹ ۱۹۵۸) اس فلم کے سبھی گانوں میں مجروح نے اپنے قلم کا جادو دکھایا لیکن "مانا جناب" کی بات ہی کچھ اور تھی۔ (۶) ... گیت، گیت ... (دلّی کا ٹھگ ۱۹۵۸) کشور اور آشا ... بہت ... محمد مجروح کی پہچان ہے لیکن



مجروح سلطانپوری کا ۱۹۴۵ء سے چلا فلمی گیتوں کا سفر ان کی موت سے چند دنوں پہلے تک رواں دواں رہا۔ اے آر کاردار کی فلم "شاہجہاں" کے گیت سے انہوں نے اپنا فلمی سفر شروع کر کے اور حال ہی میں ریلیز "کیا کہنا" اور "ہم تو محبت کرے گا" فلموں میں ہٹ گانے دے کر اس دنیا کو الوداع کہا۔

فلمی دنیا کے سب سے بڑے اعزاز "دادا صاحب پھالکے ایوارڈ اور اردو شاعری کے "اقبال سمان" سے سرفراز کئے جانے والے اسرار حسن خان، مجروح سلطانپوری کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع گجھڑی گاؤں میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی۔ ان کے والد پولس میں سب انسپکٹر تھے مجروح صاحب حکیم تھے اس لئے انہوں نے مطب کھولا اور لوگوں کی نبض دیکھنے لگے لیکن اسی دوران شاعری کی نبض ان کی پکڑ میں آ گئی اور وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر بن گئے۔ پہلے تو وہ خود مشاعرے وغیرہ کے پروگرام میں پہونچ جایا کرتے تھے۔ بعد میں ان کے پاس باقاعدہ دعوت نامہ بھی آنے لگا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء کے درمیان کا ہے۔ مجروح ۴۴ء میں مشاعرے میں شرکت کرنے کیلئے ایک دعوت نامہ پر ممبئی گئے تو پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

۲۴/مئی ۲۰۰۰ء کو ممبئی کے لیلاوتی اسپتال میں بہ عمر ۸۱ سال ان کا انتقال ہوا جہاں ان کے پھیپھڑے کے مرض کا علاج ہو رہا تھا۔ ۲۵ مئی کو جوہو قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی جس میں ان کے اعزا کے علاوہ فلمی دنیا کی شخصیتیں بڑی تعداد میں شریک ہوئیں۔ ہر طرف سوگ کا عالم تھا۔ ان کے پسماندگان میں بیوی کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹا فلم انڈسٹری سے وابستہ ہے۔

★ فلم ''ابھیمان'' کے ایک گانے کی ریکارڈنگ کے بعد
(بائیں سے) موسیقار ایس ڈی برمن، لتا منگیشکر، ہدایت کار رشی کیش مکھرجی، مجروح سلطانپوری اور ہیرو امیتابھ بچن۔



اس گیت کے ذریعہ مجروح نے یہ ضرور ثابت کردیا وہ سچویشن کے مطابق بہت اچھے گیت لکھ سکتے ہیں نیز ایسے گیت بھی جو عوام میں بہت آسانی سے قبول کر لئے جاتے ہیں۔ (۷) اک لڑکی بھولی بھالی سی (چلتی کا نام گاڑی ۱۹۵۸) کشور کمار کے ذریعہ گائے گئے اور انہیں پر فلمائے جانے والے اس گیت پر آج بھی لوگ سر دھنتے ہیں۔ (۸) جلتے ہیں جس کے لئے (سجاتا۔ ۱۹۵۹) طلعت محمود کی آواز کے جادو نے اس غزل کو جاوداں بنا دیا۔ موسیقی ایس۔ ڈی برمن۔ (۹) کوئی ہمدم نہ رہا (جھمرو ۱۹۶۱) کشور کمار کے گیتوں کا کوئی بھی مجموعہ مجروح کے گیتوں سے مزین اس فلم کے بغیر ترتیب نہیں پاسکتا (۱۰) اب کیا مثال دوں میں تمہارے شباب کی (آرتی ۱۹۲۶) مجروح کے اس گیت کو رفیع نے گایا اور روشن نے موسیقی سے سجایا تھا۔ یہ چند بہترین تخلیقات میں سے ایک تخلیق تھی۔ (۱۱) خواب ہو تم یا کوئی حقیقت (تین دیویاں ۱۹۶۵) سدا بہار دیو آنند پر فلمایا جانے والا یہ گیت کلاسک کا درجہ رکھتا ہے۔ (۱۲) جایئے آپ کہاں جائینگے (میرے صنم ۱۹۶۵) آشا کا ایک خوبصورت نغمہ جس کے بول بھی اتنے ہی خوبصورت ہیں۔ (۱۳) رہیں نہ رہیں ہم (ممتا ۱۹۶۶) (۱۴) میں ہوں پیار ترا (تیسری ۱۹۶۶) اس گیت کو آر ڈی برمن ہٹ کے طور پر زیادہ شہرت حاصل ہے لیکن آر ڈی کی شہرت میں مجروح کا بہت حصہ ہے۔ (۱۵) یہ دل نہ ہوتا بے چارہ (جیول تھیف ۱۹۶۷) مجروح کے اس گیت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جسے نغمہ و موسیقی کے مداح سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۴ میں اور بھی کئی نغمے ہیں جو مجروح کی فلمی شاعری کے بلند معیار کی گواہی دیتے ہیں۔ بعد میں بھی کئی لازوال گیت مجروح نے دیے۔ یہاں صرف چند گیتوں کے بول درج کئے جارہے ہیں۔

کیا جانوں سجن (بہاروں کے سپنے ۱۹۶۷)، تم بن جاؤں کہاں (پیار کا موسم ۱۹۶۹)، تیرے نینا تلاش کریں (تلاش ۱۹۶۹)، پیا تو اب تو آجا (کارواں ۱۹۷۱)، رات کلی اک خواب میں آئی (بڈھا مل گیا۔ ۱۹۷۱)، میرے جیون ساتھی (ساتھی)، ہوئی شام ان کا خیال آگیا (میرے ہمدم میرے دوست)، او میرے دل کے چین (شہزادہ)، چرا لیا ہے تم نے جو دل کو (یادوں کی بارات)، تیرے میرے ملن کی یہ رینا (ابھیمان)، میں اکیلے یوں بھی مزے میں تھا اور دل کا دیا جلا کے گیا (آکاش دیپ)، ہم ہیں متاع کوچہ و بازار (دستک)، وادیاں میرا دامن (ابھیلاشا)۔ مجروح کے کامیاب ترین گانوں کی فہرست مکمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے تمام گیتوں کی فہرست دستیاب ہو۔

قتیل شفائی

ایک غزل یہ بھی
— اپنی ہی غزل کا اختصار —

چاندی جیسا رنگ
سونے جیسے بال
ایک تو ہی دھنوان
باقی سب کنگال
جہاں نہیں ہے تو
روپ کا واں ہے کال
لائے چاپ تری
دھرتی پر بھونچال
رکھتا ہے روشن
مجھ کو تیرا جمال
جو نہیں تجھ جیسا
وہ جی کا جنجال
ایک جواب ترا
میرے لاکھ سوال
یہ دنیا کیا ہے
ایک سنہرا جال
اس سے بچنے کی
تو ہی راہ نکال
وہی ہے لاج مری
وہی مرا رکھوال
میرا یار قتیل
جئے ہزاروں سال

مشیت

تسنیم فاروقی
"FANKADA"
Tulsidas Marg
Near Hospital
Lucknow - 226004



ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ پانی برستا تو ایسے برستا
بیک وقت صد رنگ برسات ہوتی
جو پڑتیں پھواریں تو موتی بکھرتے
جو موتی بکھرتے تو رنگین ہوتے

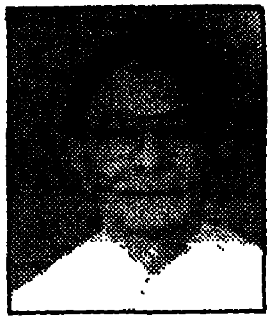
ہم تو یہ چاہتے ہیں
کہ اولے برستے تو کچھ یوں برستے
گلابی کوئی تو کوئی سبز ہوتا کوئی نیلا ہوتا کوئی پیلا ہوتا
کوئی زعفرانی کوئی ارغوانی کوئی اودا اودا کوئی دھانی دھانی
روپہلا کوئی تو سنہرا ابھی کوئی
پھر ان میں بھی کچھ ہلکے رنگوں میں ہوتے کہ اب کامبی نیشن کی شدت بہت ہے

ہم تو یہ چاہتے ہیں
کہ جب آسمانوں پہ کھلتے ستارے
تو ہر رنگ میں ٹمٹماتے چمکتے تو کچھ کیف ہی اور ہوتا افق کا

ہم تو یہ چاہتے ہیں
کہ ہفتے کے ساتوں دنوں میں
ہر اک شب نئے رنگ میں چاند آتا تو پھر چاندنی کا مزہ اور ہوتا
مگر وہ کہاں چاہتا ہے؟
کہ جس نے یہ دنیا بنائی
یہ راتیں سجائیں یہ صبحیں بنائیں
یہ قوس و قزح جیسے بینر لگائے
ستارے تراشے بساطیں بچھائیں
حسین چاند کے آئینے کو درخشاں بنایا
وہ سورج بنایا کہ جس کو کوئی آج تک اپنی آنکھیں جما کر نہیں دیکھ پایا
انہی رنگ اور نور کی وسعتوں میں
ہماری یہ خواہش کی رنگین دنیا
یہ تعبیر کا چاک خوابوں کا محور ٹھہرتا کہاں ہے
چلو ان خیالوں کو دل سے نکالو
یہاں سے وہاں تک اور اس کے بھی آگے سوچو جہاں تک
خدا ہی خدا ہے خدا ہی خدا ہے

افسانہ

”تمہیں کیا کہہ کے مخاطب کروں……؟“



اقبال مہدی
عابد ولا، جامعہ نگر، نئی دہلی
۱۱۰۰۲۵

صلّو! میں آگئی۔ لیکن مجھ پر جو واردات گزری ہے صلّو، تمہیں کیسے بتاؤں گی؟ کسی کو بھی کیا بتا پاؤں گی؟ آج کل میں ابّاجی اور اماں کی ہی نہیں اپنے سسرال والوں کی نظر میں بھی بری بنی ہوئی ہوں۔ ضدّی۔ خودسر ہٹ دھرم۔ باغی!

”صلّو! میرے اندازے، میرے سمجھوتے ہمیشہ غلط ثابت ہوئے اور یہ آخری شادی کا فیصلہ میری بدنصیبی پر ایک اور مہر لگا گیا۔ یہ تم ہی تو تھے نا کہ جس نے مجھے رخصت کرتے وقت دھیمی، دھیمی، مدھم اور پیار بھری آواز میں کہا تھا۔

”ذکّو! جاؤ سدھارو۔ زندگی بھر مسکراتی رہنا۔ زندگی کے وقار کو قائم رکھنا‘ اگر وقار ٹوٹ جائے تو زندگی میں کچھ نہیں رہتا۔!“ اور پھر وہ شاید ٹوٹتے رشتوں کا حسنِ آخر تھا کہ دونوں کو چپ لگ گئی تھی۔

صلّو! خدا گواہ ہے کہ میں نے تمہارا مان رکھا ہے۔ تمہاری نصیحت پر عمل کیا مگر میرے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ پہلی ہی رات میں پل صراط سے گزرنا ہوگا‘ تمہیں بھی کیا معلوم تھا کہ اجنبی گھر میں ایک دریوں کھلے گا جیسے کوئی پارینہ دفتر کھلے۔ ورق۔ ورق! صفحہ‘ صفحہ!

دلان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پچھوا ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ اماں نماز پڑھ کر دُعائے گنج العرش پڑھ رہی تھیں۔ اباجی نمازیں گھر میں پڑھا کرتے ہیں۔ عذرا کو میں نے کچھ نہیں بتایا ہے ‘وہ میری طرف سے پریشان بھی ہے اور مجھ سے شاکی بھی۔ مجھے معلوم ہے ابّاجی نے میز درم صلّو کو خط لکھا ہے۔ صلّو! تم سے ان کو بڑی تقویت ملتی ہے۔

صلّو! میں ڈوبتے سورج کو حسرت سے دیکھتی ہوں تو شام غم بھی صبح فردا کے مانند نظر آتی ہے۔ بس یہی دل چاہتا ہے کہ یادوں کی اوس میں بھیگتی رہوں اور ماضی کی تڑپ دل میں لئے کراہتی رہوں اور پھر رات کے پچھلے پہر ایک صلیب تیار کروں اور اسے اپنے کاندھے پر اٹھائے گرتی پڑتی‘ کانٹوں بھرے راستے پر چل پڑوں اور اپنے جسم پر شکستوں کے کوڑے کھاتی اپنی صلیب کو سنبھالے بڑھتی رہوں اور پھر کسی اونچی جگہ پر خود ہی اس صلیب کو زمین میں گاڑ دوں اور اس کے سہارے ٹک جاؤں اور کوئی۔۔ کاش! صلّو تم۔۔ میری ہتھیلیوں، پیشانی اور پاؤں میں میخیں ٹھونک کر مجھے اس صلیب پر لٹکا دو اور میرے جسم سے بہتا خون روشنی کا الاؤ بن کر دہک اٹھے اور مشرق کی پہاڑیوں کے اوپر سے نمودار ہو جائے اور میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے روشنی کے احساس سے محروم ہو جائیں۔

لیکن صلّو! میں جانتی ہوں تم یہ بھی کروگے!

یاد ہے ابّاجی نے تمہیں میرے سلسلے میں بلوایا تھا کہ تم مجھے شادی پر آمادہ کرو۔ تب پھوپھی اماں نے ہنستے ہوئے کہا تھا ”بھائی! ذکّو کو تو تم مجھے صلّو کے لئے دیدو!“ مجھے یاد ہے کہ جواب دینے سے پہلے ہی تم نے پھوپھی اماں کو جھڑک دیا تھا اور اس شام تم نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

”ذکّو! دیکھو ماموں میاں کو میری اور تمہاری بچپن کی دوستی پر کس قدر بھروسا ہے۔ انھوں نے مجھے بلایا ہے کہ میں تم کو شادی پر آمادہ کروں۔“

”میں شادی نہیں کروں گی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ شادی کروگی ہی نہیں یا کرنا نہیں چاہتیں؟ پچیس سال کی عمر کم نہیں ہوتی۔ دیکھو ذکیہ رضا! تمہاری ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔ ماموں کو دل کا ایک جھٹکا لگ چکا ہے، ممانی تو سدا ہی بیمار رہتی ہیں۔ تمہارا بیاہ ہو جائے تو پھر عذرا کی بات سوچی جائے۔ تمہیں اپنے والدین کی پریشانیوں کا ذرا بھی احساس نہیں؟“

”پریشانیاں۔ پریشانیاں۔ یہی دکھ لے کر تو تین بار میں گڑیا کی طرح محفل میں پیش کی گئی اور ٹھکرادی گئی۔ کیا لڑکیاں پیدا ہی اسی لئے ہوتی ہیں کہ ٹھکرائی جائیں؟ بتاؤ! عورتیں کیا ہیں؟ تاش کے پتے؟ آم کی گٹھلیاں؟ کیلے کا چھلکا ہیں؟ بولو! سگریٹ کا دھواں ہیں؟ آنسو ہی آنسو ہیں؟ پھر بھی خدا خاموش ہے؟“ صلّو! تم جھلا کر خاموشی سے چلے گئے۔ ایک دن لان میں ٹہلتے ہوئے تم نے مجھ سے اچانک کہا۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ فضا میں گلال سا بکھر گیا اور۔۔۔ کہیں سے گھنٹوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے دل میں کہا۔ ”صلّو! خدارا کہدو۔ کہدو پلیز!“ میری آواز دھیمی ہوتی چلی گئی اور میں نے کہا۔ ”کہو! مگر سوچکر کہنا۔“ میری بات سن کر تم مسکرائے تھے۔ تمہاری مبہم سی مسکراہٹ سے تمہارے ملیح چہرے کی

تابندگی اور بڑھ گئی تھی۔ تم اپنی دلکش آواز میں بولے۔

"ذکو! زیادہ سوچنے والے انسان کبھی اپنی بات صاف نہیں کہہ سکتے" میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ میں نے نظریں جھکالیں اور قدم مضبوطی سے زمین پر جمادئے جیسے مجھ پر کچھ انکشاف ہونے والا ہو۔

"تم کسی کو پسند کرتی ہو؟"

برچھی کی نوک شہ رگ کے قریب چبھ گئی۔ تو گویا یہ بھی سراب نکلا۔ میں نے تمہاری طرف خالی نگاہوں سے دیکھا اور جواب دیا "نہیں!"

"تم جو کچھ چاہتی ہو بتادو، وہی ہوگا اور مجھ پر یقین رکھو۔" مجھے لگا کہ میرے تلوؤں کے نیچے زخم ہیں اور میں ان زخموں پر کھڑی ہوں۔

جانتی ہو ڈاکٹر جواد فریدی کے بیٹے ڈاکٹر حماد فریدی کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ ماموں میاں اور ممانی اماں لڑکے کو دیکھ چکے ہیں اور جلدی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ لڑکا امریکہ میں بایو ٹکنولوجسٹ ہے۔ جلد ہی شادی کر کے واپسی کا ارادہ ہے۔ چھٹی پر آیا ہوا ہے"۔

"مجھے شادی نہیں کرنی چاہے وہ لندن ہو یا امریکہ!"

"آخر کیوں؟" تم ایک دم جھلا پڑے۔ "دیکھو ذکیہ بھول بھلیوں میں سفر کروگی تو کوئی راستہ نہ ملے گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور تم تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ عذرا گھر میں جو دھواں پھیلا ہوا تھا اس سے بخوبی واقف تھی مگر میرے مزاج کی تیزی سے واقف تھی لہٰذا چپ رہتی تھی۔ اگلی صبح وہ میرے کمرے میں آئی اور کہا کہ صلو بھیا نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔ میں بادل نخواستہ مَرے مَرے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی تو تم مسکرا رہے تھے۔

"حضور! یہ غلام بھی شہزادے کو دیکھ اور مل آیا ہے۔ بڑا ہنس مکھ بندہ ہے۔ اسمارٹ اور خوش شکل ہے۔ بھلے لوگ ہیں۔ جہیز کے مخالف ہیں۔ ذکیہ بھئی تمہارے تو مزے ہوں گے۔ امریکہ یورپ گھومنا اور مزے کرنا۔ لیکن کبھی سال دو سال میں ماموں ابا اور ممانی اماں سے آکر مل جانا اور اس طرح ہم بھی مل لیں گے۔" میں نے محسوس کیا کہ تمہارا چہرہ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ میں خاموش کھڑی تھی۔ کون کس کا یہاں؟ پوچھتے ہو یہ کیا؟ کون ہوا اب کہاں — تم ہو جانے کہاں؟"

"سن بھی رہی ہو؟" تم نے میری بے توجہی پر جھنجھلا کر کہا تھا۔

میں نے ایک بار تمہاری طرف دیکھا، تم نے کمال خوبصورتی سے نگاہیں بچالیں۔ انگنائی سے سوکھے پتوں کے ڈھیر اس طرح اٹھے کہ میرا احساس مجھکو جانے کہاں اڑا کے لے گیا۔ اچانک جیسے تم چونک پڑے اور مسکرا کر پوچھا

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے نا؟— میں ماموں میاں کو تمہاری طرف سے ہاں کہہ دیتا ہوں"۔ میں خاموش رہی، موج تلاطم نہ بن سکی شبنم کی طرح بکھر گئی۔ جنوں کے اپنے آداب ہوتے ہیں جو دشت نوردی، آبلہ پائی اور خار مغیلاں کے معنی سمجھاتے ہیں۔ مگر میں کتنی انجان تھی۔

میری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مہمان آگئے تھے۔ پھوپھی اماں نے آکر جب مجھے گلے لگایا تو انکی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اب میرے پاس فریب کھانے کے لئے کچھ نہ رہا تھا اس لئے کہ تم نے میرے آخری جذباتی سہارے کو توڑ دیا تھا۔ تم کتنے خوش تھے۔ شادی کے کارڈ تم ہی نے تو پسند کئے تھے اور اپنے ہاتھوں سب پہ پتے بھی لکھ کر ڈاک میں ڈالے تھے۔

ڈھولک پر گیت بھی گائے گئے تھے۔ پورے گھر میں قہقہے گونج رہے تھے۔

عذرا سب سے زیادہ خوش تھی۔ ابا جی بھی مسکرا رہے تھے۔ اماں بھی نہال تھیں۔ سب لڑکیاں مل کر خالہ صفدری کے پیچھے لگ گئیں، جو ڈھولک لئے بیٹھی تھیں۔ انھوں نے کلّے میں پان کا بیڑہ ٹھونستے ہوئے کہا "اے بیٹا خاک ڈالو صفدری پر۔ اپنے وہی فلمی گیت گاؤ۔ اب زمانہ سہروں اور بنڑوں کا کہاں؟"

"نہیں صفدری خالہ! سنائیے۔" لڑکیوں نے خالہ صفدری کو مجبور کر دیا۔ "اے ہٹاؤ! اب مجھ میں دم کہاں؟ نگوڑی صفدری کی آواز کو تو پالا مار گیا، ہاں ایک زمانہ تھا کہ جب اپنی پاٹ دار آواز میں نوحے پڑھتی تھی تو پوری محفل میں پِٹس پڑ جاتی تھی"۔ اللہ! خالہ صفدری۔ اس وقت نوحوں کا کیا ذکر؟" عذرا نے خالہ صفدری کو ٹوکا۔ "آپ تو وہی کشمیری بازار والا سنائیے"۔

"لو بیوی! اے کشمیری بزار کا دولہا کہاں۔ دولہا تو امریکہ کا ہے انگریز"۔

"چھوڑئے ہوگا۔ آپ تو وہی بنڑا گائیے۔" عذرا نے ٹھنک کر کہا"۔

اُدھر ڈھولک پر انگلیاں تھرکیں اُدھر صفدری خالہ نے انگلیوں سے غیر مرئی بول کا دائرہ باندھا۔ قہقہے منقطع ہوگئے اور آواز کمرے میں لہرانے لگی۔

"بنّا اترا کشمیری بزار۔ بنّا نہیں آیا۔ اُترا کشمیری بزار بنّا نہیں آیا
اَمّاں ڈھونڈیں گلیوں گلیوں ۔ ابا ڈھونڈیں بزار۔ بنّا نہیں آیا۔۔۔"

گاتے گاتے خالہ صفدری رُک گئیں۔ "اے یہ کیا تو انوچن مچی ہے۔ چھوکریوں آواز ملاؤ۔ اے ہاں!"

کمرے میں قہقہے گونج رہے تھے اور میں خاموش تھی۔ کبھی کبھی

خاموش تھی۔ کبھی کبھی یہ خاموشی اعتبارِ حیات قائم نہیں کرتی اور نہ نشاطِ زیست کا باعث ہی بنتی ہے۔ زندگی سلگتے ایّام کی زنجیر اور سنگین تمناؤں کا انبوہ گراں ہو جاتی ہے۔ الفاظ کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ الفاظ نہ خواب و خیال نہ واہمہ — یہ انسان کے جذبات کے امین ہیں، خواہشوں کے پیغامبر ہیں ——— ذات کا اثبات بھی اور ردِّ عمل بھی۔!

اس شام کو صلّو۔ تم نے چھت پر ٹہلتے ٹہلتے پوچھا۔ "یوں سمٹ کیوں گئی ہو تم؟"

"پھیلنے کو وسعتیں کہاں چھوڑی ہیں تم نے؟!"

"پگلی! ڈاکٹر حمّاد بہت اچھے انسان ہیں۔ تم کو بہت چاہت دیں گے، بہت خوش رہو گی تم"۔

کاش! صلّو تم اس کے علاوہ کچھ اور کہتے۔ کچھ اور۔ ایسا کچھ جو میرے دکھی من کو شانتی دیتا۔ لیکن تم نے کچھ نہیں کہا۔

خوابوں کی رنگ برنگی تتلیاں ریت کے انبار میں دفن کر کے میں سسرال آگئی۔ میرے سسر بلکل ابّاجی کی طرح تھے۔ مہربان۔ شفیق! ساس بے حد معصوم اور بڑی نیک تھیں۔ میری نند کوثر بے حد پیاری لڑکی تھی اور مجھ پر واری اور صدقے ہو رہی تھی۔ منہ دکھائی کی رسم ہوئی اور نہ جانے کون کون سی رسمیں ہوئیں اور میں رات کو اپنے کمرے پہنچادی گئی۔ میں تھک گئی تھی میں نے مسہری سے پیٹھ ٹیک دی اور آنکھیں بند کر لیں۔

کمرے میں آہٹ ہوئی۔ میں چونک کر بیٹھ گئی اور گھونگھٹ نکال لیا۔ کچھ دیر ایک جانکاہ سناٹا رہا اور پھر۔ پھر کسی کی ہلکی سی سسکی فضا میں گونجی۔ میں چونک پڑی اور مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں نے زیورات سے بوجھل ہاتھوں سے ذرا سا گھونگھٹ اٹھا کر کنکھیوں سے جھانکا۔ میں حیران رہ گئی۔ ڈاکٹر حمّاد فریدی۔ بایوٹیکنولوجسٹ۔ لکھنوی ململ کے چکن کرتے اور سفید چوڑی دار پاجامے میں سامنے کھڑے تھے۔ ان کی غلافی آنکھوں کے پنجرے سے جگنو ایک ایک کر کے ان کے گالوں سے پھسل رہے تھے۔ چند لمحے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی اور پھر دھیرے سے لباس کو سنبھالے مسہری سے اس طرح اتری جیسے اشک دیدۂ تر سے اترا ہو۔ آہستہ قدم رکھتی ان کی طرف بڑھی دھیرے سے اپنا ہاتھ ان کے کاندھے پر رکھ دیا۔

ڈاکٹر حمّاد فریدی نے بھرپور نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ وہ ماہتاب نہ تھا ماہتاب جیسا تھا۔ اس دوران انھوں نے اپنے آپ کو کنٹرول کر لیا تھا۔

"میں اپنی اس حرکت پر نادم ہوں اور اپنے سے شرمسار بھی۔ مگر آپ یقین جانئے میری والدہ دو بار دل کے حملوں سے دوچار ہو چکی ہیں۔ انھوں نے خدا اور رسول کا واسطہ دے کر مجھے شادی پر مجبور کیا ہے۔" ان کی بھاری اور مغموم آواز میرے کانوں کو بڑی بھلی لگی۔ میں اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔ "کیوں؟"

"میری مجبوری"۔

"کوئی بات نہیں حماد صاحب! آپ مجھے اپنے دل کی بات بتایئے۔ میں صبر سے سن لوں گی۔ آپ کو میری قسم!" میں ان کے سینے سے لگ گئی۔ اور پھر انہوں نے سارا دکھ میرے بنارسی، زرتار آنچل میں ڈال دیا۔ میں سکتے کے عالم میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کیا عہدِ حاضر کی تہذیب کے یہی ضابطے ہیں کہ خوشنما ملبوس کی تہوں میں مُقید رہ کر بھی انسان برہنہ کہلائے؟ یہ شریف لوگ جن کی شخصیت میں مغربی تہذیب کی گندگی، ان کے قلب کی سیاہی اور ان کے کردار کی پسماندگی۔ جو ان کے اعلٰی تشخص کی نشان دہی کرتی ہے۔ آج وہ مہذب اور تعلیم یافتہ خاندانی شخص میرے بے لباس ہو گیا تھا۔ یارب ہمارے معاشرے کا بشر کون لے گیا؟ "حمّاد فریدی! تم کو کیا کہہ کر مخاطب کروں؟" — کوئی ندیم نہیں دور تک رفیق نہیں! خوشبوئے رفاقت تو گئی قریۂ جاں سے، اب بے خبری — بے خبری — بے خبری ہے۔

میں نے لباس بدلا، ہاتھ منہ دھوئے اور آکر مسہری کی پٹی پر ٹک رہی۔ تھوڑی دیر میں خراٹوں کی آواز سے کمرہ گونجنے لگا۔ مگر یہ شہنائی کی گونج نہیں تھی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو ڈاکٹر حمّاد فریدی جاگ چکے تھے۔ میں بڑی دیر تک خلاء میں تکتی رہی۔ مجھے اپنے آپ سے، حمّاد فریدی سے۔ پورے ماحول سے کراہت سی آنے لگی۔ اچانک میری نند کوثر ہنستی شور مچاتی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ اس نے اپنی پسند کے کپڑے پہنوائے، خوب سجایا سنوارا اور ناشتے کے لئے میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔ میری ساس نے بلائیں لیں، پیار کیا۔ سسر نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ناشتے کی میز پر ایک جاذبِ نظر، لبوں پہ تبسم کی چاندنی لئے ایک بھرپور شخصیت کا مالک۔ میرا شوہر "حماد فریدی" مغربی تہذیب کی آلودگی کی پوشاک پہنے بیٹھا تھا۔ میری نظر میں اسکی جبیں کی کوئی شکن معتبر نہ تھی۔ ناشتے کے بعد لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی مگر میری سماعت میں آہن خراش سناٹے تھے!

شام کو میں منتظر تھی کہ چوتھی لینے تم آؤ گے۔ مگر تم نہیں آئے۔ چچامیاں نے سرفراز بھائی کو بھیجا۔ میں گھر آگئی۔ ابّاجی کے بنائے گھر کی سوندھی خوشبو نے مجھے گلے سے لگایا۔ صلّو! تم نے میرا ایک دن بھی انتظار نہ کیا اور چلے گئے؟ کیا بس تم یہی فرض ادا کرنے آئے تھے۔ جس قبر

میں تم مجھے دفن کر گئے تھے میں اس قبر کی ایک بے صبر لاش تھی جو اپنا گوشت پوست بنا جسم اسی قبر میں چھوڑ آئی۔ تم ذرا پلٹ کر دیکھ تو لیتے!

میں اپنے کمرے میں گئی اور بے کراں تنہائی سے لپٹ کر روتی رہی۔ روتی رہی۔ گھر میں نئے داماد کی آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ رات میں عذرا کے ساتھ اس کے کمرے میں سوئی۔ اماں لاکھ منع کرتی رہیں مگر میں نے کچھ نہیں سنا۔ سنتی کیسے، میری تو سماعت ہی گم ہو چکی تھی۔ صبح میں لان میں جا کر بیٹھ گئی۔ روتی رہی۔ میرا پورا وجود الاؤ کی مانند دہک رہا تھا۔ سلگ رہا تھا۔ کوئی نہ تھا کہ جس کے گلے سے لپٹ کر رو لیتی اور اپنا دکھ بانٹ لیتی۔

شام کو حماد فریدی نے مجھ سے کہا۔

"گھر واپس نہیں چلنا ہے؟!"

میں ابھی نہیں جاؤں گی"۔

"کیوں؟"

"یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے"۔

"شادی کے بعد ذاتی مسئلے ختم ہو جاتے ہیں۔ اب تم ذکیہ حماد فریدی ہو"۔

"میں صرف ذکیہ رضا ہوں۔ حماد فریدی کے بندھن سے آزاد ہوں"۔

"اگر تم جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو تو ـــ میں تمہارے والدین سے بات کرتا ہوں"۔

"کر لیجئے!"

اس نے اباجی اور اماں سے بات کی۔ اماں نے سمجھایا۔ "ذکیہ بیٹی! بچپنا چھوڑو۔ اپنے شوہر کے ساتھ چلی جاؤ بعد میں آ جانا۔ یہ شریف لوگوں کا شیوہ نہیں۔ عورت کے لئے شوہر ہی اسکی دنیا ہے" اماں رسم ورواج کے شکنجے میں جکڑ رہی تھیں۔

"پتہ نہیں شرافت کے کون کون سے معیار ہیں، میں نہیں جانتی۔ مجھے چند دن اپنے پاس رہنے دیجئے۔" میں نے التجا کی۔

"اللہ رکھے تمہارا گھر ہے، ضرور رہنا۔ اس طرح نہ کہو یہ گناہ ہے جسے اللہ میاں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ہمارے مذہب میں شوہر کا رتبہ بہت بلند ہے۔ شادی کے بعد شوہر کی تابعداری اور وفاداری ایک مسلمان بیوی کا فرض ہے۔" باغی خیالات کی سرکوبی کے لئے مذہب سے بہتر کونسا حربہ ہو سکتا ہے۔ میں لوگوں کو کیسے بتاتی کہ میں سر سے پاؤں تک شرافت کے جس غلیظ شکنجے میں جکڑی ہوں اسکی بھی تو مذہب اجازت نہیں دیتا۔ آخر وہی ہوا جس کا سب کو اندیشہ تھا۔ میں سسرال واپس نہیں گئی مگر کسی کو کچھ بتا بھی نہ سکی۔ شمع بن کر پگھلتی رہی قطرہ۔ قطرہ۔ وہ آنسو تھے یا آگ اور شبنم کا مجموعہ تھا جو موم کے ڈھیر میں سو گیا۔ مگر میں اپنا فیصلہ نہ بدل سکی۔

اس دوران میکے اور سسرال کے بزرگوں میں بات چیت چلتی رہی۔ ہر انسان مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا یقیناً میں قصوروار تھی۔ مگر کیوں؟ یہ میں اپنے دل میں دفن کئے رہی۔ حماد فریدی ایک ہفتے بعد پھر مجھے لینے آئے۔

"تم جانتی ہو! دو گھروں کی عزت کا سوال ہے۔ لوگ طرح طرح کے سوال کرتے ہیں۔ کیا جواب دیں؟"

"وہی جواب دیجئے جو آپ نے مجھے سہاگ رات میں دیا تھا اور اگر آپ میں اتنی جرأت نہیں تو میرے کیرکٹر پر تہمت لگا دیجئے"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بولے

"تو جو ہو سکتا ہے کیجئے۔ میں اب آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میرا وجود اگر آپ کے راستے میں حائل ہے تو اپنی راہ نکالئے ـــ مجھے پھلانگ جائیے"۔

"اس کا انجام جانتی ہو کیا ہوگا؟"

"حماد صاحب! اب جاننے کو کیا رہ گیا ہے؟ میں نے تلخی سے جواب دیا۔

وہ واپس چلے گئے۔ انھوں نے علیحدگی کی درخواست دی، میں نے کوئی عذر نہ کیا اور آخر دو ماہ کی بیاہی ذکیہ رضا شادی کے بندھن سے آزاد ہو گئی۔ میں نے نوکری جوائن کر لی ہے۔ حماد فریدی امریکہ واپس چلے گئے ہیں۔ عذرا نے اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اباجی کو چپ لگ گئی ہے۔ اماں کا اختلاج بڑھ گیا۔ صلو کو میری علیحدگی کی خبر دیدی گئی ہے۔ وہ میزورم سے آنے والا ہے کہ اباجی اور اماں کو اس وقت سہارے کی ضرورت تھی۔ ایک میں تھی جو بے پناہ تھی۔ بے اماں تھی!

صلو آج سویرے پہنچا ہے اور مجھ سے اُکھڑا اُکھڑا ہے۔ ناشتہ کے بعد وہ میرے کمرے میں آیا اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ سامنے کھڑکی سے باہر خزاں کا موسم آ گیا ہے اور درختوں سے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ اس طرح جیسے کوئی اپنے بدن میں چبھی ہوئی سوئیاں ایک ایک کر کے نکال رہا ہو۔ صلو نے خاموشی کو توڑا۔

"ذکیہ! تم جس ڈھنگ سے مسرت اور سکون تلاش کر رہی ہو، تمہیں کبھی نہیں مل سکتا۔ تم نے ڈاکٹر حماد فریدی سے علیحدگی اختیار کر لی کیونکہ تمہاری سوچ کا انداز غلط ہے۔ تمہارے نظریے غلط ہیں۔ اب کیا کرو گی؟ جانتی ہو تمہارے اس عمل سے ماموں میاں اور ممانی اماں کو کتنا بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ میں اپنے آپ کو بھی قصوروار ٹھہراتا ہوں کہ میں

نے تم پر دوسروں کے فیصلے تھوپے ہیں۔ میرا قصور کیا تھا؟ جاننا چاہتی ہو!

"ہم دونوں بچپن سے ایک ساتھ رہ کر بڑے ہوئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ تعلیم میں ادب تمہارا میدان تھا، سائنس میرا۔ میں نے سائنس میں ڈاکٹریٹ لی تم نے ایم۔اے کر لیا۔ تم بچپن کی کھٹی میٹھی یادوں میں گم رہنے لگیں۔ مجھے تم سے اُنس پیدا ہو گیا۔ جانتی ہو میں نے ایک بار بھی لب اظہار وانہ کیا اور آخری وقت تک چپ رہا۔ مجھے سائنسی تحقیق نے سمجھایا تھا کہ خاندانی شادیاں ٹھیک نہیں ہوتیں۔ اس لئے کہ ان شادیوں کے نتائج سائنسی لحاظ سے ٹھیک نہیں ہوتے۔ خاندانی بیماریاں، نفسیاتی، جسمانی یا ذہنی کسی بھی طرح کی آنے والی نسلوں کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ یہ بیماریاں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی جاتی ہیں اور نسل کمزور ہو جاتی ہے۔ بچے یا تو بچتے نہیں یا دیگر امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذکو! اگر یہ سوچنا میرا قصور ہے تو میں قصوروار ہوں۔ کیا سزا دو گی مجھ کو۔ بولو!" صلّو نے انکشافات کے بعد ذکیہ سے سوال کیا۔ ذکیہ سر جھکائے سنتی رہی اور کچھ وقفے بعد یوں مسکرائی کہ صلّو کی نس نس میں جیسے خون کی بوندیں زہر میں تحلیل ہو کر بہنے لگی ہوں۔ اس نے صلّو کی طرف دیکھا۔

"کہہ چکے نا؟ صلاح الدین عرف صلّو! کر لی نہ تم نے اپنی بات ختم؟ یا ابھی بھی ترکش میں کوئی تیر بچا ہے تو وہ بھی چلا دو کہ کوئی تیر باقی نہ رہے۔ تمہیں فخر ہے کہ تم نے اپنی محبت کی قربانی دی اپنے لیے— میرے لیے— نسل کے لئے اور کامیاب بھی ہو گئے۔ میں تمہاری محبت دل میں لئے آخری وقت تک خاموش رہی۔ میں نے اس محبت اور اس مان کا بھرم رکھا اور تمہاری بات مان لی اور آخر میں قربان گاہِ فرض پر ڈاکٹر حماد فریدی کی دہلیز پہ سر ٹیک دیا۔ وہ میرا مجازی خدا تھا۔ تم میری علیحدگی کا ماتم کرنے آگئے۔ اتنے دن تم کہاں تھے؟ شادی نہیں کر سکتے تھے تو کم سے کم دوست ہی بن کر خبر لے لی ہوتی؟ تم اور سارا جہان طنز و ملامت کی برچھیاں میرے سینے میں بھونک رہے ہیں۔ صلاح الدین! کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ کیا بیت گئی؟

صلّو! مجھے پُرسہ دو میری رسوائی کا! پُرسہ دو مجھے گھر سے بے گھر ہو جانے کا! مجھے پُرسہ دو ان زخموں کی ٹیس سہنے کا جو حماد فریدی کے انکشاف نے میرے دل میں ڈالے ہیں۔ پُرسہ دو ایک عورت کی بدنصیبی کا! جانتے ہو وہ——

انکشاف— جو حماد فریدی نے مجھ پر سہاگ رات میں عیاں کیا تھا— لیکن صلّو! آج سن لو۔ ڈاکٹر حماد فریدی شادی شدہ تھا۔ اور جانتے ہو پردیس میں میری سوکن عورت نہیں تھی بلکہ—— ایک مرد تھا——!!

بقیہ کچھ باتیں (اداریہ)

لیکن بہت کم ہیں۔ ایک اور نام کلکتہ کے انیس التبی (پلے بیک سنگر محمد عزیز مناّ کے برادر خورد) کا ہے۔ یہ بھی افسانہ لکھتے ہیں اور انشاء میں انہیں متعارف کرایا جا چکا ہے۔ اقبال مہدی اور انیس التبی دونوں کا اسلوب اچھا ہے۔ انیس التبی نے ممبئی کی فلم نگاری سے بھی رشتہ جوڑ لیا ہے۔ اور اب فلمی مضامین بھی لکھ رہے ہیں۔ جو عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں ان کا فلمی مضمون شامل ہے۔ قارئین نئے ہنرمندوں کی حوصلہ افزائی کریں تو انہیں زیادہ اچھا لکھنے کی ترغیب ملے گی۔ افسوس ہے کہ اس وقت ایک بھی اچھا اردو فلمی رسالہ نہیں ہے۔ جبکہ فلم سے متعلق نئے فنی اور تکنیکی گوشے ادب کا موضوع بن سکتے ہیں۔ 'شمع' رسالہ دہلوی برادران کے گھریلو تنازعات کے سبب بند ہو چکا ہے۔ یہ افسوسناک بات ہے۔ اس رسالے کے بند ہونے کی وجہ سے اردو کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ کاش گھریلو جھگڑے طے کر لئے جائیں اور 'شمع' پھر سے شروع ہو جائے۔ عبوری طور پر کسی حد تک فلمی ادب کی کمی ادبی رسائل کے ذریعہ پوری کی جا سکتی ہے۔ انشاء میں فلمی مضامین لگاتار تو نہیں ہاں کبھی کبھی چھپتے ضرور ہیں۔

○ آخر میں ایک اپیل ہے کہ آپ اگر انشاء کے سالانہ ممبر نہیں ہیں تو فوراً بن جائیں یا ممبری کی بروقت تجدید کرا لیں۔ اس کی توسیع اشاعت میں ہماری ہر ممکن مدد کریں۔ ہمیں حوصلہ اور توانائی دیں۔

سال کٹ گیا چھ مہینے میں ......!

آپ تعجب کرینگے کہ کمپیوٹر کے اس دور میں کیا وقت اتنی تیزی سے گذر رہا ہے

جی ہاں !

ابھی نئے ہزارے (میلینیم ایئر) کو شروع ہوئے تین ہی مہینے ہوئے ہیں کہ لوگ ہم سے سنہ ۲۰۰۱ء کی بخشی جنتری طلب کر رہے ہیں!

بخشی جنتری

ہمیشہ کی طرح اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہے

(اپنی بہترین معیاری نثری و شعری تخلیقات کے ساتھ رجوع کریں)

﴿بخشی جنتری﴾ ہر خاص و عام کے دل کی دھڑکن

BAKHSHI SABB

بخشی جنتری

32، مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کلکتہ 700073

تین غزلیں اور ایک نظم

عرفان پربھنوی

Bhoi Galli, Parbhani - 431401 (M.S.)

ہوش جس وقت بھی آئے گا گرفتاروں کو
خس کی مانند اڑا ڈالیں گے دیواروں کو

زندگی کرنی ہے تم کو تو تڑپنا سیکھو
زنگ لگ جاتا ہے رکھی ہوئی تلواروں کو

زخم سینے پہ کسی کے نہیں آیا اب تک
آزمایا ہے بہت قوم کے سرداروں کو

اتنے بھی اونچے نہ اٹھو کہ سنبھل بھی نہ سکو
ہم نے گرتے ہوئے دیکھا کئی میناروں کو

بزدلی ہے کہ یہہ نادانی ہے، آخر کیا ہے
لوگ اشکوں سے بجھانے لگے انگاروں کو

وہی رشوت وہی اغوا وہی خبریں عرفاںؔ
ہم تو بن دیکھے ہی پڑھ لیتے ہیں اخباروں کو

⬭ ⬭ ⬭

ہمدرد تیرے جیسا نہیں کوئی یہاں اور
اٹھ جائیں تیرے در سے تو ہم جائیں کہاں اور

روداد چمن دونوں سناتے تو ہیں لیکن
کانٹوں کا بیاں اور ہے پھولوں کا بیاں اور

شائد میرے قاتل کو یہ معلوم نہیں ہے
دھل کر چمک اٹھیں گے مرے خوں کے نشاں اور

اب جا کے کھلا وہ بھی ہے اک پیاس کا صحرا
تھا پہلے سمندر کے تعلق سے گماں اور

سنتے تھے کہ حق گوئی کے انعام بڑے ہیں
دیکھا ہے مری آنکھوں نے عرفان سماں اور

انوار فیروز

D/538، سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی-۴۶۳۰۰(پاکستان)

تھا جو دشمن بھلانے لگتا ہے
ہائے کیوں آشنا سا لگتا ہے

گرچہ دیکھا نہیں کبھی اس کو
پھر بھی وہ آشنا سا لگتا ہے

روٹھ جاتی ہے نیند آنکھوں سے
وہ اگر کچھ خفا سا لگتا ہے

یوں تو ہے وہ بھی دوسروں کی طرح
پھر بھی مجھ کو جدا سا لگتا ہے

میں نے سب کچھ لٹا دیا جس پر
اب مجھے بے وفا سا لگتا ہے

جس کو خود ہاتھ سے تراشا تھا
اب وہ پتھر خدا سا لگتا ہے

ختم اس سے ہوئے روابط سب
پھر بھی اک سلسلہ سا لگتا ہے

عزم اپنا بلند ہے کتنا؟
ہم کو طوفاں بھلا سا لگتا ہے

جس کو پانے کی آرزو تھی ہمیں
ہم سے کیوں وہ خفا سا لگتا ہے

وہ تو انوارؔ اپنا دشمن ہے
پھر بھی اک رابطہ سا لگتا ہے

انیس منیری

رکھیال روڈ

احمد آباد-۲۳ (گجرات)

شاہین

جستجو کرتے رہے دشت و بیاباں میں مگر
دیکھے کوہ و کمر
کرگسوں کا یہ جہاں ہے
یا کبوتر ہیں یہاں
یہ بہت اونچی ہے چوٹی اور اس پر اک چٹان
کیا یہاں پانی نہیں؟
پھل پھول سے محروم ہے
یہ پرندہ کون ہے
آب و دانہ ہے کہاں
نام کیا ہے اس پرندے کا اور ہے کس کام کا
یہ سبھی دشت و جبل
رہتے ہیں اسکے زیر سر
یک بیک آواز آئی کہ میں شہباز ہوں
میں ہوں شاہین
سربلندی کام میرا، سربلندی کام ہے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
پوسٹ گریجوٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو
بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور (بہار)

جاپانی [illegible]

نیو میکو کیتا گلوا

میلہ

اجڑتا ہوا میلہ
جنم دیتے ہوئے
ایک تجسس کو!
مجھے اچھا لگتا ہے!!
میلے میں اور
آدمیوں کی بھیڑ میں
بہت ہی کم
خود کو بھول پاتا ہوں
دیکھتا ہوں اور
صرف دیکھتا ہوں
جب میلہ اجڑ جاتا ہے
ہر کوئی چلا جاتا ہے
میں خود کو پاتا ہوں گھومتا ہوا
اس جگہ سے قریب
جہاں مسرت اور خوشی تھی
اور ہمیشہ تعجب کرتا ہوں
خود پر.........................!
لیکن میں پھر
ہو جاتا ہوں آمادہ
بڑے اشتیاق سے
کسی میلے کی تیاری میں
تعاون کے لئے!

توسون شما جاکی

چالاک لومڑی

چالاک چھوٹی لومڑی
وہاں اس باغ میں
جب کوئی نہیں ہوتا
رات کو چراتی ہے
انگور کے شبنم آلود خوشے
اور پکی ہوئی بیلوں کے سائے میں
چپکے سے کھاتی ہے!
محبت---
لومڑی نہیں ہے
اور نہ تم انگور کا خوشہ ہو
لیکن انجانے میں میرے دل نے
تم کو چرایا ہے
اور چپکے سے کھینچ لیا ہے
جب یہاں کوئی نہیں تھا!!

توصا برواونو

برف

انگھیٹی کی آگ بجھ چکی ہے
ہم بات چیت پہلے ہی ختم کر چکے ہیں
کہنے کیلئے کچھ بھی نہیں بچا ہے
کوئی بھی سوال ادھورا نہیں چھوڑا
پھر بھی
ہم کتنے غیر مطمئن ہیں
دوست
کوٹ کے کالر پر جھکا ہوا سر
کیا تم جانتے ہو
وہ سچ کمزور ہے
جو صرف الفاظ کے ذریعہ ہی
ثابت کیا جاسکے!

ہندی نظمیں

چوڑے منہ والے نالے کو

شاعر : برھما شنکر پانڈے
ترجمہ : روشن لال روشن بنارسی

بہت مرتبہ تو گرا
گرتے گرتے سنبھلا بہت مرتبہ
لیکن اب کی بار
اس گھرے، چوڑے منہ والے نالے کو
چھلانگ جاؤں گا۔
ایک ہی چھلانگ میں،
جسکے اندر سڑتی گندگی
بھری ہے منہ تک
اگر نہیں پھلانگ سکا اسے
تو طے ہے
کسی نہ کسی دن
وہی پھلانگ جائے گا
میرے جسم سے، اوپر ــــــ اوپر

0 0 0 0 0

ہوا، پانی اور آگ

تم جہاں، جس اور جانا۔
مجھے ساتھ لیتے جانا
مجھے ساتھ لئے رہنا۔
گھومنے۔ پھرنے میں،
مرنے۔ جینے میں،
ساتھ!
اگر ایسا نہ کر سکو
نہ کر پاؤ تو بتانا!
مگر جہاں میں پہنچ جاؤں
ضرور وہاں، پہلے سے حاضر رہنا
تمہارا ہونا میرے ہونے کی تصدیق کرے گا!!!

لاگے نہ ہوا منا

مقصود الٰہی شیخ

24, Park Hill Drive, Bradford (W. Yorks), BD8 ODF (U.K.)

کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ کوئی چھناکانہ سنائی دیا۔ مدھم، دھیمی سی آواز تک نہ آئی۔ چہار طرف سناٹا چھارہا تھا پھر بھی جیسے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ بکھراؤ کے بناریزے، پرزے، اور دھجیاں بے صدا بکھر رہی تھیں۔ رضی خود بت بن گیا تھا!

رضی میں ہلنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ وہ شل ہو کر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ بدن کا رواں رواں دکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا ایک تعلق تھا، قطع ہوا۔ ساتھ چھوٹ گیا۔ ہمیشہ کے لئے، کبھی نہ جڑنے کے لئے۔ شیشے میں بال آجاتا ہے، برقرار رہتا ہے۔ تجدید وفا و پیان کا کوئی امکان تک باقی نہ رہا تھا۔ اس نے یا مدحت نے بچھڑتے وقت ایک دوسرے سے الوداعی جملہ تک نہ کہا۔ اس کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ اسکی آنکھوں کے نور کا آخری قطرہ بہہ جائے۔ اب وہ اس نظر کا کیا کرے گا جو محبوب صورت سے محروم ہو گئی۔ اس کے لئے بیکار ہو گئی۔ مدحت چپ چاپ کار سے اتری۔ وہ جانتی تھی کہ رضی ٹرین تک چھوڑنے آئے گا نہ ہاتھ یا رومال ہلا کر رخصت کرے گا۔ وہ اس کی ایک ایک عادت سے واقف تھی۔ یہ واقفیت ہی جان لیوا بنتی چلی گئی اور آج وہ بیس سال بعد نئے سرے سے ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو گئے۔

مدحت چھوٹے چھوٹے قدموں سے، مضمحل قدموں سے پلیٹ فارم پر آگئی۔ اسکے پیچھے پیچھے سفری ٹرالی کے پہیوں پر اس کا اٹیچی گھسٹ رہا تھا۔ ایک اور شے بھی چھٹی چلی آرہی تھی۔ دھلا، اجلا، بے داغ ماضی! بیس سال کے روز و شب جو اپنا وجود کھو کر بھی امٹ روشنائی سے لکھے تاریخی پنے بن کر یادداشتوں میں سدا رہیں گے!

رضی نے سوچا تھا ہو سکتا ہے مدحت نے ایک پل کے لئے مڑ کر، پلکیں اٹھا کر اس جانب دیکھا ہو۔ وہ ماورائے گرفت لمحہ اس کے قلب و ذہن میں چبھتا، رینگتا سا محسوس ہوا لیکن وائے محرومی وہ تو تیزی سے واپس چلا آیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی رضی پر اداسی طاری ہو گئی۔ وہ ایک ایک کمرے میں دیوانوں کی طرح گھومتا مدحت کی آویزاں تصویریں دیکھتا پھرا۔ چپے چپے پہ پل پل چاہتوں کی رباعیاں کھدی ہوئی تھیں۔ ان کے پیار کی مہک کونے کونے، گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے نظر چرا کر آدرش محبت کے تعاقب میں، دیوانہ صداقتوں کی ملمع دھند میں بھٹک کر جدائی اوڑھ لی۔ بڑی نادانی کی۔ قصور مدحت کا سمجھا، نکل اپنا آیا تو کیا وہ پچھتاووں کی جہنمی تپش سہتے ہوئے جی سکے گا؟ اصل زندگی تو لمحۂ موجود کی ندی سے گھونٹ گھونٹ امرت لے کر لب تری ہے۔ اس حق سے وہ خود ہی محروم ہو گیا ہے۔ وہ غصے سے چیختا، غم سے چلاتا اور بے بسی سے بلکنا چاہتا تھا مگر اس کے منہ پر جیسے تالا لگ گیا ہو۔ ملتوحش، ہراساں اور بدحواس تھک کر، چور ہو کر رضی ٹی وی روم کے کونے رکھی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ بھائیں بھائیں کرتا گھر، بڑا ہی جاں گسل خیال تھا کہ اب اس گھر میں کوئی نہیں آئے گا۔ ویرانی کا راج ہو گا۔ وہ ہو گا اور اسکی تنہائی۔ مدحت نہیں ہو گی۔ اسکی مانوس خوشبو کہیں دور تحلیل ہو جائے گی۔ اسکی آواز کی نغمگی سے دائمی فرقت جنم لے گی۔ وہ ہرن آنکھیں وہ رسیلے ہونٹ۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے میں متوالی چال کی سرسراہٹ۔ وہ تراشیدہ پیکر ہوش چھین لینے والے خواص کا مرکب سراپا سکون عنایتِ آغوش کی رحل۔ شہابی رخسار۔ متحرک بازوؤں کی حمائلیں۔ وہ جنون خیز جذبوں کے ایک ہو جانے کا خمار عطا کرنے والی محبوب شخصیت، اس کا نصف نہیں ـــ۔ نہیں ـــ۔ کل بہتر غیر بن کر جزیروں میں کہیں گم ہو جائے گا!!

یوں سوچا نہ تھا پر ہو گیا۔ توقع نہ تھی مگر حقیقت یہی تھی۔

رضی نے غمناک ہو کر اپنے ہی کو دوش دیا، معتوب کیا، یہ سوچنا، ایسا کہنا کہ مدحت کی محبت جھوٹی تھی۔ الزام ہے۔ رضی نے بے یقینی میں کھو کر سوچا، اس نے برملا مدحت کو کوسا، فرد جرم لگائی اور خود ترسی میں سمجھا وہی تو مصلوب ہوا ہے۔ اسے محض دلاسے دیئے گئے تھے جن کو وہ سچا مانتا رہا ہے۔ کیا حقیقت بیس سال بعد نقاب ہوئی تھی۔ اتنے عرصے آنکھوں پر پردہ پڑا رہا؟

بے یقینی تھی اور وہ تھا۔ اس نے جھنجلا کر یاد کیا۔ لڑائی کا بڑا ہی بیہودہ شاخسانہ غیبت سے بن گیا تھا۔

رضی لمبے کاروباری دورے کے بعد، کئی دنوں کی جدائی کے بعد آیا تھا۔ اس نے پرجوش ہو کر مدحت کو آغوش میں لے کر کہا تھا "I Love You"۔ اس کے اندر کی آواز اس کے کانوں سے مس ہو کر اسے رقص کے سے بہاؤ کے ساتھ شفق کناروں پر لے گئی۔ بڑی سبک اور خلاء میں بے وزن پرواز کا سا احساس سرور دے رہا تھا۔ مدحت نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا تھا "I love you too"۔ آخر پیار کے یہ بول ایٹمی دھماکا کیوں محسوس ہوئے؟ وہ الجھ گیا۔ جنگل کی آگ کی طرح اس کا تصور بے قابو اور بے لگام ہو گیا۔ خاموشی یا وقفہ کیوں؟ لہجہ بھی سرد سا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ شاید اس نے توجہ نہ دی ہو۔ غور ہی نہ کیا ہو۔ ذہن میں ایک سوال نقش ہو کر رہ گیا۔ کیا مدحت کی محبت دکھاوا تھی؟ یہ ایک جھوٹ، ایک دلاسہ، دکھاوٹ اور سہی، ایک بار پھر سہی، پھر سہی۔۔۔ کیا سچ کا انکشاف اسی پل، اسی گھڑی ہونا تھا؟ کھلونا جب من بھا گیا، معمول کا لازمی جزو بن گیا۔ اس کے بعد ہی ٹوٹنا تھا؟ پہلے ہی کیوں نہ ٹوٹ گیا۔۔۔۔ یہاں پہنچ کر رضی کی سوچ نے نیا پلٹا کھایا۔ وہ کج بحثی کی جس منزل پر پہنچ گئے تھے کیا وہاں سے واپسی کی کوئی راہ نہیں رہی۔ "میں اپنے اصول بدل لوں گا۔ مدحت! مجھے خواب میں ہی رہنے دیا ہوتا۔ سرد مہری کا تاثر کسی میٹھے بول سے زائل کیا جا سکتا تھا اور خاموشی پسند تھی تو میں جوش و سرمستی میں شرابور آیا تھا۔ اسے کوئی دھکا اور دھچکا نہ لگنے دیا جاتا۔ بس، جواباً ایک بے تابی ظاہر ہوتی۔ چاہت امڈتی دکھائی پڑتی!

اسکے اندر بجلی کا کوندا لپکا۔ وہ لرزیدہ لرزیدہ سوچنے لگا کیا مدحت نے کبھی اظہار محبت میں سبقت کی؟ ہیجان و تلاطم میں مجوب ہوا۔ شاید یہ واہمہ غلط ہو پر آج "I love you too" کے بولوں نے کانوں میں کوئی رس نہ گھولا بلکہ سرد بوچھار نے اچانک گھیر لیا۔ رضی کی نگاہیں مدحت پر گڑی کی گڑی رہ گئیں۔ سوچ کی لہریں الٹ پلٹ ہو رہی تھیں۔ یک طرفہ پیار و محبت خود فریبی کے سوا کچھ نہیں رہا جو اصل میں جہنم ہو۔ محبت سچی ہے تو شہد ہے۔ جھوٹی ہے تو بے حقیقت ہے، زہر ہے۔ کبھی شک نہ ہوا ان میں سے کوئی ڈرامہ رچا رہا ہے۔ وہ لڑتے جھگڑتے تھے پھر صلح ہو جاتی۔ محسوس ہوتا، ہر بار یہی محسوس ہوتا ملاپ امر ہے، جاوداں۔ انکے درمیان جو گزرتا وہ سچ تو ہوتا تھا پر آج یہ کیسی کیفیت، کیسا مغالطہ بیک وقت نڈھال کر رہا تھا اور جلا بھی رہا تھا؟ کہیں دور سائرن بجاتی ہوئی ایمبولنس گزری۔ رضی چونک کر تازہ کرب سہنے کے لئے ٹھٹک کر سمٹ گیا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی لگانا چاہا مگر یاسیت اور اداسی نے ہمت سلب کر لی۔۔۔۔ وہ یہ گھر بیچ کر کسی دوسری جگہ، کسی دور کے شہر میں چلا جائے گا۔ بھول جانے کے لئے ماحول کا بدلنا ضروری ہے۔ دنیا بڑی وسیع ہے وہ کہیں گم ہو جائے گا۔ جدائی کا زخم اس کی جان نہیں لے گا۔ وہ جئے گا۔ وقت اسے، بے شک، چرکے لگاتا رہے۔ وہ کروٹیں بدل کر دوبارہ جی اٹھے گا۔ وہ کیوپڈ سے نہیں ہارے گا۔

۔۔۔۔ تو اس کی محبت خام تھی؟

مدحت کو اس نے پہلی ملاقات میں ہی بتا دیا تھا کہ وہ پیار کا پُتلا ہے۔ اسکے جسم میں رگ و ریشہ نہیں، محبت نام کی کوئی شے ہے۔ وہی خون بن کر روح کی طرح اس کے انگ میں دوڑ رہی ہے۔ ہمیشہ اس کا جذبہ صادق رہا مگر اسے بدلے میں فریب اور بے وفائی ملی۔ وہ مدحت سے اسکے سچے جذبوں کا مدعی تھا۔ وہ مشترکہ اندھے اعتماد کا قائل تھا۔ اس نے کہا تھا جو جیسا ہے ویسا ہی دوسرے پر عیاں ہو تبھی اعتبار کا پرچم لہرائے گا۔ تبھی دو روحیں ایک ہوں گی۔ تبھی ملن کی سچی مسرتوں سے ہم کنار ہوا جا سکے گا۔

بیس سال بعد کیا ہوا؟ سچ جھوٹ نکلا اور جھوٹ کے بعد اس کا اپنا سچ مات کھا گیا۔ کاش مدحت نے یہ بات اول روز کہہ دی ہوتی تو شاید ......شاید......

رضی کی سوچ لمبی ہوتی گئی۔ ضروری تو نہیں ہوتا دونوں طرف برابر کی آگ لگے۔ وہ اکیلا ہی مدحت کی پرستش کر سکتا تھا۔ کرتا اور کرتا رہتا۔ وہ کیوں بھول گئی کہ رضی مجسم محبت ہے۔ بس وہ کہہ دیتی جیسے اب کہا کہ اسے نہیں معلوم محبت کیا ہوتی ہے؟ رضی اسے قبول ہے۔ اسکی محبتیں منظور ہیں! اور اس طرح خوشی خوشی جیون انت ہو جاتا۔ زندگی بسر ہو جاتی۔ زیست دمکتی رہتی روشن رہتی۔ زندگی بھر اجالا رہتا! ہوا یہ کہ ہر قدم پر، ہمیشہ اس کے ساتھ دغا کی گئی ہے۔ جھوٹ بولا گیا۔ بے وقوف بنایا گیا۔ مکر کیا گیا ہے۔ وہ ہر نئے موڑ پر پگھل جاتا تھا۔ اعتبار میں کھو جاتا پھر جیسے سچ جھوٹ میں گھل کر کسی ایک نکتے پر ٹھہر جاتا ہے اور سارا منظر بھدا ہو جاتا ہے، رضی شدید عمل کے بعد کنارہ کر لیتا۔ دل مسوس لیتا۔ دل پر ضبط و قابو کے پہرے بٹھا دیتا۔ یوں ہر در بند ہو جاتا۔ وہ ققنس کی طرح راکھ ہو کر دوبارہ اسی راکھ سے اٹھتا۔ تن پر سانس کا قرض لاد کر نئی زندگی شروع کرتا کہ اب کسی کے دام فریب میں نہ آئے گا مگر وہ بنا ہی محبتوں کے خمیر سے تھا۔

اگر یہ بات عجیب ہے تو کیا دنیا میں عجیب لوگ نہیں ہوتے؟ وہ تو اتنا عرصہ مدحت بھی اسی کا سایہ بنی رہی! ان کا معاملہ یوں تھا کہ ایک مقتول ہے تو دوسرا سر سے پیر تک گھائل! جس روز مدحت سے اسکی نظر ملی، دل ملا اسے لگا تھا کہ اب وہ مکمل ہو گیا۔ وہ دم بدم اسکی جان، اس کا

ایمان، ا ن روں اور ا ن حیات لی روسنی اور عاثمت بنتی گئی۔ یہ کوئی دنیاوی جوڑ نہ تھا۔ کوئی رسمی رشتہ نہ تھا کوئی سماجی بندھن نہ تھا۔ جب دونوں نے اپنے اپنے ماضی سے مکمل طور پر ناطہ توڑ لیا تب وہ اپنی اپنی دانست میں آخری سانس تک ہمسفر بن کر ہمقدم وہمدم بن گئے۔ محبتوں کی ایسی رحمت شاید اس سے پہلے کسی پر نازل نہ ہوئی تھی۔

اولین میٹھی رتوں میں، ایک روز مدحت نے کہا تھا "تم میرے شریک حیات ہو۔ میری جان ہو اور یہ تمہاری سنگت کا پھل ہے کہ مجھے کبھی عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا۔ پر واہمہ سا ہے، حال ہی میں خیال سا گزرا ہے کبھی آنے والے کل میں کسی نے ہمیں سنگی، ساتھی یا پارٹنر کی جگہ غیر سمجھا، طعنہ دیا تو۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔ مانو گے آج بھی زمانۂ جہالت والے مرد غلبے کے اثرات باقی ہیں۔ اکثریت پرانی اصطلاحوں میں ہی سوچتی سمجھتی ہے"۔

دوسرے ہی دن وہ اپنا مسکن چھوڑ کر نئے شہر میں جا بسے۔ رضی نے کہا تھا "اس نئی جگہ پر کسی نے نہیں پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ ہمارا مذہب جو بھی ہو۔ آس پاس سبھی مطمئن ہیں کہ ہم ان جیسے ہیں۔ اسی طرح ہمارے رہن سہن کے بارے میں بھی کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ میری جان! یہ صرف احساس ہے۔ بس جو گناہ ثواب میں، گوارا و ناگوار میں تفریق کرتا ہے۔ مبتلائے اندیشہ کرتا ہے۔ مرغوب کو نامرغوب بنا کر پھوٹ ڈالتا ہے۔ رضی نے اسی سانس میں کہا تھا "منفی احساس پر قابو پا لینے سے لازوال سچائی کی نمو ہوتی ہے جو سچ ہے، سکھ ہے امن اور شانتی ہے۔ حقیقت ہے۔ وہی سوچو۔ باقی عیب ہے، خاک ہے۔ جھوٹ ہے۔ دشمنی ہے۔ جعل ہے جنگ ہے"۔

نئے شہر میں آنے کے ایک سال کے اندر اندر انہوں نے حرمت کو گود لیا تھا، اسے جگر گوشے کی طرح پالا۔ گول مٹول، شوخ اور ذہین حرمت دونوں کی آنکھوں کا تارا، دلوں کا سہارا بن کر جوان ہوا حرمت ہر طلوع کے ساتھ ان کی مسرتوں اور امنگوں میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ وہ راحت دل وجاں اب کتنا بڑا، کیا حسین جوان ہو گیا تھا۔ وہ کتنا گہرا ہے یہ ان کو معلوم ہی نہ تھا۔ جب اس نے بتایا کہ اس نے اپنے طبعی ماں باپ کو ڈھونڈ نکالا ہے تو وہ ٹک ٹک اسے دیکھتے رہے۔ وہ انکی حیرت وحیرانی پر بہت ہنسا تھا پھر یقین دلایا کہ وہ پہلے سے زیادہ مطمئن ہو کر انکے ساتھ رہے گا۔۔۔ تو دھچکے کے باوجود رضی اور مدحت نے اسکا کھوج کرنے کا یہ حق مان لیا تھا اور جب اس نے ان کو اپنی شادی کی فکر سے آزاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ الگ ہو کر اپنی زندگی گزارے گا تو دونوں نے دو ایک غوطے کھا کر اس صورت حال کو بھی قبول کر لیا تھا۔

کم از کم رضی کو یہ علم بالکل نہ تھا کہ آگے نیا طوفان بھی چھپا بیٹھا ہے۔ غضبناک جھکڑ چلے گا۔ آندھی اٹھے گی۔ حرمت نے بڑے اعتماد سے کہا تھا "آپ ہی میرے ڈیڈی اور ممی ہیں۔ ایسا ہی سب کچھ رہے گا مگر جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے آپ سے محبت نہیں ہے"۔ دوسرے لمحہ اس نے وضاحت کی "میرے دل میں اپنے اصلی والدین کے لئے بھی کوئی خاص جذبہ نہیں ابھرا۔ مجھے یہ گھر اپنا لگتا ہے۔ میں اس ماحول سے مانوس ہوں۔ یہ در و دیوار، آپ کی شفقتیں مجھے بلاتی ہیں۔ یہ سب اچھا لگتا ہے۔ اتنا شعور ہے کہ آپ کو دھوکا فریب نہیں دوں گا مگر جھوٹ بھی نہیں بولوں گا۔ کڑوا ہے مگر سچ ہے۔ یہ محبت کیا ہوتی ہے؟ کیا وہ جذبہ جس کے تحت کبھی میں آپ کے لئے مر مٹوں گا۔ نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ وقت سب کچھ تبدیل کر دیتا ہے۔ اپنی اولاد، اپنا خون بھی بے دید ہو جاتا ہے۔ سگی اولاد دور ہو جاتی ہے۔ منہ موڑ لیتی ہے" حرمت نے نرم لہجے میں پوچھا "کیا نہیں؟" پھر اس نے مثال دیتے ہوئے کہا تھا "اب میں ممی کی گود میں نہیں گھستا، ان سے نہیں لپٹتا۔ ڈیڈی، آپ کے ساتھ جڑ کر نہیں سوتا۔ آپ کی بغلوں میں نہیں گھسوں گا تو اس کا کوئی دوسرا مطلب نہیں۔ بس ایک دور گزر گیا، اب دوسرا دور ہے۔ ایک فرق آ گیا ہے۔ قربت مسلسل ہے اور بدستور رہے گی۔ آپ سمجھتے ہیں نا؟"

رضی نے یہ سب کچھ سمجھا اور اسے قبول کیا۔ اسے حرمت اور بھی زیادہ عزیز ہو گیا۔ مدحت کچھ روز پریشان رہی۔ وہ اداس بھی دکھائی دیتی تھی پھر ایک روز اس نے کہا تھا "سچ یہی ہے جو حرمت نے بیان کیا جسے ہم محبت سمجھ رہے تھے وہ ایک طرح کا جذبہ ملکیت تھا۔ یہی جذبہ اصلیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے، رشتے کا روپ دھار کر ہماری شخصیتوں کو مسخ کرتا اور ان کے گرد جالے بنتا ہے"۔ مدحت نے یہ بھی کہا تھا "مجھے کوئی افسوس نہیں کہ ہم نے اپنا کوئی بچہ نہیں بنایا۔ ہم دنیاوی بندھنوں سے آزاد ہو کر ایک دوجے کا ساتھ دیتے رہے ہیں اور بالکل نارمل زندگی گزاری ہے۔ ہم وقت کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کی تکمیل اور کردار کی تعمیر کرتے رہے ہیں۔ ہم اس طرح ایک دوسرے کی ضرورت بنے رہے جو کبھی بوجھ نہ بنی"۔

دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ جب وہ سفر سے واپس آیا تو مدحت نے اس کے والہانہ پن کا بڑے تامل سے جواب دیا تھا کہ "I love you too" اور جب کئی روز تک اٹھتے بیٹھتے ان کے درمیان یہ بحث جاری رہی کہ مدحت نے کبھی پہلے اظہار نہیں کیا، ہمیشہ جواباً ہی کہا کہ "ہاں اسے بھی محبت ہے" تو اس نے بڑے تحمل سے اعلان کیا تھا کہ نہ سچ سچ ہوتا ہے اور نہ جھوٹ، جھوٹ! اب جسے تم محبت کہتے ہو اور جس میں

گرفتار ہونے کے بعد بیس سال گزار دیئے، یہ عمل ان معنوں میں محبت ہے جو تم نے اس لفظ کو خود ہی پہنائے میرے نزدیک محبت یہ ہے کہ مجھے حرمت کا انتظار نہیں مگر وہ آئے گا تو میں اسے اسی طرح ملوں گی کہ جب ہم سب اس خیال وواہمے میں جتلا تھے کہ ہمیں ایک دوسرے سے بے انتہا انس و محبت ہے حالانکہ وہ سنگت تھی۔ قربت تھی۔ جب تم نے کہا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں نے سوچ سمجھ کر ہی جواب دیا تھا کہ ہاں تمہارے چلن کے مطابق مجھے بھی تم سے محبت ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں کہ تم سے بچھڑ کر مر جاؤں گی۔ جس طرح حرمت کے بغیر زندہ ہوں۔ میرے اندر تمہارے لئے خیر سگالی ہے۔ یہ کافی ہے ہمیں اکٹھا رکھنے کے لئے!۔ میں اس پر قانع ہوں اور رہوں گی"۔

رضی یہ برداشت نہیں کر سکا۔ محبت کا کوئی دوسرا مترادف نہیں۔ محبت محبت ہی ہے۔ وہ یہ تو مان سکتا ہے کہ کسی میں یہ جذبہ زیادہ ہوتا ہے کسی میں کم!اور سچ تو یہ ہے "جسے تم خیر سگالی کہتی ہو وہ میرے نزدیک جھوٹ ہے اور فریب ہے۔ سب مکاری ہے۔ سوانگ ہے جو آخر بھسم ہو گیا"۔

اور،

آج وہ آیا تو مدحت نے قصہ ختم کر دیا کہ وہ اسے چھوڑ کر دور پار کی بہن کے پاس جا رہی ہے۔ اس نے ضروری سامان پیک کر رکھا تھا۔ رضی نے گاڑی کی روانگی کا وقت پوچھا اور چپ چاپ اسے چھوڑنے اسٹیشن چلا گیا۔۔۔۔ اور جب وہ گھر آیا تو پاگل ہو کر ایک ایک کمرے میں مدحت کو تلاش کرتا پھرا۔ اس کی تصویروں سے لپٹا۔ عجب کیفیت تھی۔ رونا چاہتا تھا مگر رو نہ سکا۔ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کیا گنوا بیٹھا مگر صرف احساس زیاں تھا، یہ معلوم نہ ہو پا رہا تھا کہ کس درجہ کی قیمتی شے گنوائی ہے؟

اچانک اس میں دبی دبی رجائی لہر سی اٹھی، ترنگ سی محسوس ہوئی جیسے کوئی آیا ہے۔ وہ اٹھا تو ٹھوکر کھا کر تقریباً گر پڑا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس نے بتی بھی نہ جلائی تھی۔ اسٹیشن سے واپسی پر خیالوں میں کھویا بیٹھا رہا۔ نمعلوم شام کا ملگجا کب رات کے گھپ اندھیرے میں تبدیل ہو گیا؟ اچانک لگا دستک ہوئی ہے۔ دروازے پر مدحت ہے۔ وہ آگئی ہے۔ وہ آگئی ہے۔ در و دیوار گا رہے ہیں۔ فضا مسکرا اُٹھی ہے۔ تمنا جی اٹھی، حسرت مرجھا گئی ہے۔ تنہائی رخصت ہوئی۔ اس کا گھر گلشن ہے، خلد ہے۔ اس کی جنت ہے۔ وہ یہ جنت چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ مدحت آگئی ہے۔ وہ آگئی ہے۔ اس نے پورے گھر کی روشنیاں جلا کر ماحول کو منور کر دیا۔

دروزہ کھولا تو وہاں کوئی نہ تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مایوسی کا شکار ہوتا دور سے ایک ٹیکسی آتی دکھائی دی۔ جانے کس کے یہاں کون آیا ہے؟ اس کا دل گنگنایا "مدحت ہی ہے" اور واقعی ٹیکسی اسی کے دوازے پر آکر رک گئی۔ مدحت اتری۔ اس کی جانب آئی۔ دونوں گم صم اور سن ہو کر آمنے سامنے کھڑے رہے۔ کسی نے بیقراری کا اظہار نہ کیا۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹے بھی نہیں۔ ٹیکسی واپس ہوئی تو ان کے حواس مجتمع ہوئے۔ مدحت نے اس کی طرف خالی نظروں سے دیکھا اور غیر جذباتی انداز میں، میٹر آف فیکٹ لہجے میں کہا "میں ٹکٹ اپنے کمرے میں ہی بھول گئی تھی۔ دوسری کوئی ٹرین نہیں ہے۔ صبح چلی جاؤں گی"۔

صبح رضی پہلے اٹھا۔ اس کا من بھاری تھا۔ وہ روٹھا روٹھا تھا۔ رات بیچ کی خلیج بیچ میں رہی۔ اس نے دل ٹٹولا تو یک دم سرشاری سے بھر گیا وہ خوش تھا۔ اس بات کا اسے یقین تھا کہ مدحت ہی اس کی آخری محبت ہے۔ یہ محبت بے پناہ ہے۔ اتھاہ ہے۔ بھدا سا خیال آیا، یک طرفہ سہی پھر از خود خوشگوار بیت لپٹ گئی۔ چھوٹی سی جدائی، کچھ دیر کی غیر حاضری نے جتلا دیا کہ فرقت موت ہے اور موجودگی پیار کا اثبات!اب وہ کبھی جدا نہ ہوں گے۔

رضی نے بڑے چاؤ سے ناشتہ تیار کرنا شروع کیا۔ وہ کارنر شاپ سے جا کر بہت رنگ برنگ ٹیولپ بھی لے آیا۔ پھر اس نے ٹرے میں بڑے قرینے سے سب چیزیں رکھیں اور اتنے پیار سے دستک دی کہ آواز کا ارتعاش اس کی محبتوں کا پیغام لے کر مدحت کے کانوں سے مس ہونے جا رہا ہے۔ اس میں جارحیت کا عنصر، خراش یا ٹکرانے کی ہلکی سی صلاحیت نہیں ہونی چاہئے....

سامنے بستر پر مدحت نیند کے خمار میں تھی۔

نزدیک خواب آور گولیوں کی شیشی خالی پڑی تھی۔

شاید وہ کومے میں تھی۔

سرہانے ایک خط پڑا تھا،

۔۔۔۔وہ سب جھوٹ تھا۔ ٹکٹ میرے پاس تھا۔ میں گاڑی میں سوار نہ ہو سکی۔ فرش پر میرے پاؤں جم گئے۔ اس کے ساتھ جڑ گئے۔ میں واپس آگئی۔ سچ یہ ہے کہ مجھے تمہاری محبت واپس کھینچ لائی........ حرمت کو کچھ نہ بتانا۔ کوئی اطلاع نہ دینا......

چلتے چلتے

★ ناروے کے افسانہ نگار سعید انجم کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں برین ہیمرج کے حملے کی تاب نہ لا کر انتقال فرما گئے۔ شمارہ زیر طبع تھا کہ کوپن ہیگن سے جناب نصر ملک کے خط سے یہ افسوسناک اطلاع موصول ہوئی۔ تفصیل آئندہ شمارے میں پڑھیں۔

یہ سہروردی
375-B, Pocket - 2,
Mayur Vihar, Delhi - 110091

کشمکش

پہلی آواز :

الفاظ کے بہتے دریا میں
معنی کے سفینے چلتے ہیں
چٹانوں سے ٹکراتے ہیں!
احساس کی منزل کیا ہوگی؟

دوسری آواز :

وہ شہرِ خوشاں ہے، جس میں
خوابوں کے ہزاروں خیمے ہیں
یہ ملکِ وفا کے بیکس ہیں
جو آکے یہاں آباد ہوئے
حسرت کے چراغوں سے انکے
کچھ رونق ہے، ویرانے میں!

پہلی آواز :

ہے اتنی کثافت چاروں طرف
ہم زہر ہوا سے پیتے ہیں
اب گردشِ جام و مینا میں
کچھ اپنا لہو بھی شامل ہے!

گفتار میں حدّت ہے اتنی
رفتار میں شدّت ہے اتنی
پر آنسو اب تیزاب لگے!
ہے تشنہ لبی کا حاصل کیا
پانی جو ملے زہراب لگے!

ہے سودوزیاں کی انجمن میں
ساقی کی ادا محصور یہاں!
سکوں کی صدا میں زور بہت
مطرب کی نوا مجبور یہاں!

رشتوں کے طلسمی بندھن اب
"کوکون" سے ہم کو لگتے ہیں
جو کیڑوں کا تابوت بنیں!

پہلی آواز :

اس شہرِ نظر کی ہلچل میں
احساس کی منزل کیا ہوگی؟

دوسری آواز :

جب ساری پناہیں ختم ہوئیں
ہجرت کے سوا مقصود ہے کیا؟

پہلی آواز :

منظر ہے اگر بے رنگ یہاں
تم خونِ جگر سے رنگ بھرو
بے رحم اگر ہے خاموشی
تم اپنی صدا کو طاقت دو!
احساس کی منزل یہ ہوگی :

مبارک شمیم
Ahmedpur
Shahjahanpur - 242001 (U.P)

صدا آئی فرازِ آسماں سے
رہو ہشیار مرگِ ناگہاں سے

دبے ہیں جو کسی سنگِ گراں سے
گزرتے ہیں وہ راہِ امتحاں سے

بہر صورت اسے طے کر کے اٹھو
نہ چھوڑو مسئلے کو درمیاں سے

ہمیں درکار ہیں روشن فضائیں
یہ دیواریں ہٹادو درمیاں سے

ستارو پتیوں پر خوب ہنس لو
اترنا ہے تمہیں بھی آسماں سے

جب اپنا راز خود ہم رکھ نہ پائیں
یہی امید رکھیں رازداں سے!

شمیم اتنا نہ کھو جانا تھا خود میں
تمہیں اب ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے

ڈاکٹر محمد یوسف بیگ جمالؔ
Bhadohi - 221401 (U.P.)

نصیب ہو جو کسی کارزار میں رہنا
ہماری طرح ہی اگلی قطار میں رہنا

فضا میں ڈھونڈتا اپنی زمین کی خوشبو
کہیں بھی جاؤ کسی بھی دیار میں رہنا

وہ یادیں جن سے کہ لمحوں کی کہکشاں روشن
وہ رنگ و نور کے اک آبشار میں رہنا

ہماری تشنہ لبی بھی وہی بہتر سی
صفیں وہی، اسی وحشی حصار میں رہنا

جہاں کی مکڑیاں جالوں کا اہتمام کریں
ہوں چاہتا اک ایسے ہی غار میں رہنا

بس ایک خواب کہ پلکیں گلاب زار بنیں
تمام عمر ہوا دشت خار میں رہنا

عجیب سلسلۂ کرب و لطف کے لمحے
عجب وہ شعبدۂ انتظار میں رہنا

کچھ ایسے بھاگتے لمحوں کی شورشیں ہیں جمالؔ
ازل سے تا بہ ابد ہے فرار میں رہنا

آسمان چھوٹا ہے ابھی!

(مابعد جدیدیت کے نام)

فاروق راہب
محلہ شانتی پوری
موتی ہاری 845401

'بس 'اب اور نہیں!'

'بہت ہوا'

وہ پھر ایک بار سب بدل دینا چاہتا تھا!

اپنے ہی ذریعہ لائی تبدیلیاں اب اسے بالکل ناپسند تھیں۔

اس نے سوچا تھا کہ خدا بیدار ہوگا، لیکن وہ جاگا نہیں--- لیکن وہ سوتا کب ہے؟ تمام واقعات بیداری میں ہی رونما ہوتے ہیں اور وہ تھکتا نہیں ہے!

جنگلوں کے اٹھے خیموں کی جگہ وحشتوں کے شامیانے تنے تھے، جہاں نصیب میں جڑی کیلوں کی تعداد میں اضافے کا کام ہو رہا تھا--اور وہ اپنی سجائی دنیا پر کتنا مست تھا!

اپنے آپ سے نکل کر ہی اس نے خود کو پھیلایا تھا اور پھیلتا چلا گیا تھا۔ لیکن حدود کی بندشوں سے باہر خود کو سمیٹنے کی کوشش کی تو حیرتوں کے پہاڑ راہ میں تھے!

اس کا اپنا وجود کہاں تھا؟

وہ کہاں اور کس کے لئے نکلا تھا؟؟

اپنے شریر کو جکڑنے کے لئے گرفت مضبوط کی تو پرچھائیں بھی ہاتھ نہ آئی۔

اپنے اوپر منڈلاتے خطروں سے وہ واقف تھا۔ پھر بھی خطروں سے کھیلنے کی عادت نے اسے آکاش تک پہنچایا تھا اور فرش سے عرش تک کی یاترا نے اسے ذرہ سے آفتاب بنایا تھا۔ اطمینان کی سانسوں نے اسے مسوسا تو سکون کی بارش سے وہ بھیگنے لگا۔ جیسے سارا جہاں اس کے قدموں میں ہو اور وہ مسکراہٹوں کی دیوی کے!

تخلیق کے حوصلے بلند تھے اور تخلیق کار کے پست! اسے نیست و نابود کر دینے کی سازشیں اس کی موجودگی میں رچی گئی تھیں اور وہ چپ چاپ انہیں حوصلہ شکن نہ ہونے دینے کی خاطر ان کے ساتھ رہا۔

دلوں میں جب کئی ڈھانچے آباد ہوں تو ایک ڈھانچہ کے زمین بوس ہونے پر اتنا ملال کیوں؟ جبکہ مفتوح فاتح ہوتا ہے اور فاتح مفتوح!

بے جان کی محافظت میں اب ابابیلیں نہیں آتیں اور جانداروں کا لہو تو بہنے کے لئے ہی ہوتا ہے، زمانہ کوئی بھی ہو!

چشم مایوس کے سمندر میں سوکھی جھیل بھی نہیں تھی!

انسانیت کے علم بردار بموں سے صرف تجربے کرتے ہیں اور موت کے لئے کسی زہریلی پائپ کو تھوڑا لیک کر دیتے ہیں۔ ان کے چہرے تو گیس ماسک سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ آج بھی وہی مرتے ہیں جو پہلے مرتے تھے!

حکم فنا اس کے لئے جو ہے اور لافانی وہ جو نہیں!

سوداگروں کی بھیڑ میں شیشے نما بدن کی قیمت ہی کیا، جہاں شرم گاہوں تک کی ڈاک ہوتی ہے! لیکن بکتا کون ہے۔ دکان، سامان یا گاہک؟

یا صرف وہ --- جس پر سب بھروسہ کرتے ہیں اور وہ کسی پر نہیں!

تبھی تو اس نے کئی طرح کی زنجیروں کے حلقے پھیلا رکھے ہیں۔

اپنی ہی پیائش اسے دھوکا دے گئی تھی!

چاہتوں کے انبار سے ناکامیوں کی سوغات ہی ملی۔

روداد بازار محشر کا وہ کاتب تھا، قاری اور خریدار بھی!

مسموم ہواؤں کی ساری زہریلی سوئیاں وہ تنہا اپنے شریر میں کب تک چبھوتا! اس لئے انجانے احساس کے سنسناتے تیروں کی یورش میں اسے فیصلہ لینا ہی تھا۔

وہ کیا دے رہا تھا؟ نا سمجھ داستانوں کے ربط سلسلے میں پھنسے خونخوار بھیڑیوں کے ان دیکھے دانتوں کے سوا!

لیکن نیائے کی مورت کی آنکھوں پر کالی پٹی تو اب بھی بندھی تھی!

طاقت سے خوف اور کمزوروں سے ہنسا!

بس ٹکراتے رہو نادار انصاف کے منادر کی گونگی سنگ مرمری دیواروں سے جن سے گونج بھی نہیں ابھرتی!

ایسے میں اکتاہٹوں کے دور کو خیر باد کہہ کر اقدار نو کی سمتوں کا تعین بھلا وہ کیسے کر پاتا، جب کہ وہ خود خلا میں تھا!

لیکن اس نے تو کچھ کرنے کی ٹھان لی تھی!

پھر بھی کیچلی اتارے کالے ناگ کا پھن کچلنا آسان نہیں تھا، جو اس کے راستے میں کھڑا اپنی لپلپاتی زبان دکھا رہا تھا!

صندلی دربار کی ساری کرسیاں صرف انہیں جو تمنائی تھے اور جنہیں کچھ نہیں چاہئے تھا، انہیں بارودی سرنگوں کے سنگین تحفے!

قاتل تو روپ بدل کر زندہ تھے!

اور بے سہارا مقتولوں کے محافظ خود اپنی جان بچانے کی فکر میں سر جوڑے ہوئے تھے --- اور گندھاری تو آج بھی اپنی روشن آنکھوں پر پٹی چڑھائے خاموش ہے، شاید اسے پتہ نہیں کہ اس کے بنا دیکھے ہی اس کے سارے پتر پتھر کے ہو چکے تھے!

پھر بھی اسے شروع تو کرنا ہی تھا۔

مگر کہاں سے؟ جگہ کا انتخاب باقی تھا۔
'قسم اس کی جو میری جان کا مالک ہے'۔
'تو کیا سچ مچ اس کے پاس نکل جائیں ہیں؟'
'لیکن جو حاکم ہو، وہ ظالم نہیں ہو سکتا۔'
'سب اس کے سامنے ہی ہوتا ہے۔ وہ صرف تماشائی ہے میرے بھائی!'
'جب وہ اپنی عادتیں نہ بدل سکا تو پھر تم۔۔؟'
'سنو' کچھ باتوں کا ہونا طے ہوتا ہے۔'
'ہاں' جیسے معصوم بچوں سے بھری لاری کا ندی میں گر جانا، کمسن لڑکیوں کا ریپ اور قتل! بلکے، تختۂ دار تک جانے والے بے گناہوں کو وہ بچا سکا؟ کیا روک سکا اپنے چہیتوں کی شہادت؟'
'بس' بند کر اپنی بکواس!'
'اور تو؟ سب اپنے آپ ہوتا ہے یہی مان کر گنہگاروں کی سزائیں معاف کرتا جا، معاف کرتا جا، اور جئے جا بے مصرف خوابوں کے زیر سایہ! ان گنت خداؤں کی مٹھیوں میں تو یونہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا اور کچھ نہ کر سکے گا۔'
کسی سے ٹکرا گیا تھا وہ! جو اسے چھلنی کر دینے پر تلا تھا۔
لیکن وہ اپنے ہی روبرو تھا!
'تو کیا اس کے منصوبے۔۔؟'
عروج و زوال کی گاتھا اس کے ہمراہ تھی، مگر وہ خود اپنے ساتھ نہیں تھا!
نئے خدشات سر ابھار رہے تھے۔
جن سے وہ نجات چاہتا تھا وہی شکنجے اسے کس رہے تھے۔
'کہیں اس سے بھی زیادہ استحصال ہوا اور۔۔؟'
لیکن اپنے زخموں کی مٹھاس ہی تازگی دیتی ہے اور تازہ دم موسموں کی تلاش ہی اس کی ضد تھی!
ارادوں کے اونچے ستونوں کے آگے،
بیکراں سناٹے میں پھیلی نیلگوں وسعتیں بھی چھوٹی ہو جاتی ہیں اور سنگھرش کا سورج کبھی ڈوبتا نہیں!
اس لئے وہ!
کئی ذہنی قلابازیوں کے بعد اپنی ہی کھینچی لکیر کی تھکان پر کا سوچ رہا تھا۔
پھر ایک اڑان کی ابتدا؟
کیا اس بار بھی انہونی دشاؤں کا گیان حاصل ہوگا؟؟
یا پھر وہی فرسودہ گھوڑے کا روایتی سوار
۔۔۔؟؟؟

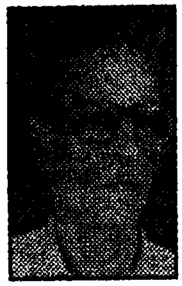
خوابوں کے اسرار
انگریزی سے اردو میں ترجمہ کردہ
نفسیاتی مضامین!
مترجم : ف۔ س۔ اعجاز
طبعزاد مقالہ
"ادب میں خواب کے اجزاء"
بھی شاملِ کتاب ہے۔
قیمت: 200/- روپے
(ڈی لکس ایڈیشن) اندرونِ ملک

ف۔ س۔ اعجاز
کا
مجموعۂ منظومات
صاحبِ فن
شائع ہونے والا ہے۔

بقیہ آپ کی ڈاک

مطلب بھوک، بیماری اور بے انصافی سے تحفظ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ بنیادی ضرورتیں ہیں جو ایک جائز حکومت کو لازماً پوری کرنا چاہئیں"۔ شیخ واقعی ایک آئیڈیل مساواتی سوسائٹی کا خواب دیکھ رہے ہیں "جہاں امیر کو لوٹ کر غریب کو رشوت نہ دینا پڑے"۔
شیخ نے اقبالیات کے میدان میں انقلابی فکر کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اقبالیات کا پرانا سبق بھلانے کے لئے شیخ کا مضمون "اقبال کا نظریۂ عقل و عشق" واقعی ایک اعلیٰ درجہ کی تحریر ہے جس میں کوئی لاگ لپیٹ کی بات نہیں ہے۔ لیکن شیخ کے افکار ابھی اور بحث چاہتے ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی اور آپ کے مضامین بہت سائنٹفک انداز سے لکھے گئے ہیں۔ سید یحییٰ نشیط کا مضمون "مقام اقبال انور شیخ کی نظر میں" استدلال کی سطح پر عمدہ ہے لیکن نشیط صاحب کے دونوں مضامین پر طیش و تپش کا غلبہ ہے جو یقیناً شیخ صاحب کے اسلام کے بارے میں روایتی افکار پر حملے کے نتیجے میں ہے۔ "دو گجراتی سنتوں کی کہانی" گاندھی اور جناح کے سیاسی اعمال کا معروضی اور ناقدانہ جائزہ پیش کرتا ہے۔ لیکن مذہبی عقائد کے بارے میں لکھنے کے لئے احترام خدا، احترام رسول اور احترام کلام الٰہی اور اکابرین دین کی حرمت کی پاسداری پہلی شرط ہے کیونکہ رسوم شکنی اور مخالفت عقیدہ لوگ کبھی برداشت نہیں کرتے۔ لیکن خود کو دہریہ کہلا کر خوش ہونے والے بھی کم نہیں۔ پھر بھی شیخ کے علم و آگہی میں شک نہیں۔

جلیل احمد
ریل پار۔ آسنسول



رضوان اللہ
D-178, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar
New Delhi-110025

خواب

یارو میری بات سنو!
ہر گز کوئی خواب نہ دیکھو
خواب اگر ہوں دھو ڈالو
خواب کبھی سچ ہو جاتے ہیں
ہر سچائی پر تعزیر رہی ہے
خواب تھا اک آزادی کا
وہ خواب ہمیں نے دیکھا تھا
اور سچ نکلا
اور تعزیریں بھی
یارو! کوئی خواب نہ دیکھو!

عاصیؔ کاشمیری
788-Wood Borough Road
Notingham, NG35QJ (U.K.)

غزلیں

ہو کے منزل سے آشنا شاید
لوٹ آیا ہے رہ نما شاید
آگہی کے چراغ جل اٹھے
ہو گیا خود سے آشنا شاید
ہو رہی ہیں بلائیں پھر نازل
بھول بیٹھے ہیں سب خدا شاید
میں اُسے اپنے آپ میں دیکھوں
پیار کی ہے یہ انتہا شاید
لذّتِ درد بڑھ گئی عاصیؔ
زخم اُس نے دیا نیا شاید

جس طرح شمع پہ پروانہ فدا ہوتا ہے
حق کہاں ایسے محبت کا ادا ہوتا ہے

گردشِ وقت بنا دیتی ہے جیسا چاہے
آدمی اصل میں اچھا نہ برا ہوتا ہے

پھیلتی جائیں جڑیں کیسے خزاں میں اسکی
درد کا پیڑ تو ساون میں ہرا ہوتا ہے

اک فقط کھل نہ سکا در میرا قسمت کیلئے
میرا گھر ورنہ شب و روز کھلا ہوتا ہے

پیرویٔ عصر کی شیوہ نہیں میرا عاصیؔ
میرا اندازِ سخن سب سے جدا ہوتا ہے

ماہیے

دن وصل کے بھی آئے
ہجر کے غم لیکن
ہم بھول نہیں پائے

غم دل کا بیاں بن کر
آگیا ہونٹوں پر
اب خود ہی زباں بن کر

چھن چھن کے ضیا آئے
چاند سے چہرے پر
جب زلف سیہ چھائے

دن رات کی مزدوری
پیٹ کے دوزخ کو
بھرنے کی ہے مجبوری

گل بن کے مہک اٹھیں
جوڑے میں لگنے سے
کلیاں بھی چہک اٹھیں

تقدیر سنور جائے
بات جو دل میں ہے
کاغذ پہ بکھر جائے

جس جس کو دکھایا ہے
خط یہ ترا گوری
رشک اسکو ہی آیا ہے

م۔ افضل کا مسخاکہ!

نصرت ظہیر (نئی دہلی)



م۔ افضل

(مسخ + خاکہ = مسخاکہ یہ لفظ حضرت مشتاق یوسفی کی کتاب سے سرقہ کیا گیا ہے جس کے معنی انہوں نے کیری کچر caricature بیان کئے ہیں۔ نصرت)

لیجئے یہ بھی ہونا تھا! ہفتہ وار ''اخبار نو'' کے ایڈیٹر میاں م۔ افضل کو دہلی کی اردو اکاڈمی نے ۱۹۹۸ء کے لئے صحافت کا ایوارڈ دے دیا۔ یعنی حد ہو گئی۔ صحافت کا ایوارڈ وہ بھی ایک صحافی کو! یہ تو اکاڈمی کا دستور نہ تھا۔

صاحب غیر یقینی کے اس دور میں جو بھی ہو جائے کم ہے۔ ذرا سوچئے۔ صحافیوں کو صحافت کا ایوارڈ ملنے لگے اور وہ بھی اکاڈمیوں کی طرف سے، تو صحافت کا کیا ہوگا۔ اکادمیاں کہاں جائیں گی۔ اور پھر دہلی کی اس اکاڈمی نے تو صحافت کا ایوارڈ ایک ایسے شخص کو دے ڈالا ہے جسے کسی بھی زاویئے سے ہماری پیاری اردو صحافت کا حقیقی نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔

افضل صاحب کے دوست اور خیر خواہ اس ایوارڈ سے کافی خوش اور مطمئن ہیں۔ (واضح ہو ایوارڈ کے ساتھ اچھی خاصی رقم دی گئی ہے) لیکن راقم الحروف بقلم خود ان سے دو طرفہ دوستی اور خیر خواہی کا فیض اٹھانے کے باوجود خوش نہیں ہے۔ دراصل فدوی طبعاً و مزاجاً روایت پسند اور اصول پرست واقع ہوا ہے اور وہ اردو صحافت کے وسیع تر مفادات پر شخصی تعلقات کو ترجیح دینے سے قاصر ہے۔ خادم کا خیال ہے کہ صحافت کے ایوارڈ اگر اسی طرح صحافیوں کو دیئے جاتے رہے اور وہ بھی افضل صاحب جیسے صحافیوں کو، تو اس سے اردو صحافت کی دیرینہ روایات کو سخت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

سچ پوچھئے تو اکاڈمی کے فیصلے پر خاکسار کو ایک دو اعتراض نہیں بلکہ پورا مجموعۂ اعتراضات ہے۔ جس کی اجمالی تفصیل یہاں پیش کی جاتی ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میاں افضل دیکھنے میں کسی بھی طرح اردو کے صحافی نہیں لگتے۔ نہ ہاتھ میں پان نہ منہ اگالدان۔ نہ کرتے پر پان کی چھینٹیں، نہ تہمد کا شوق۔ پہناوا ایسا کہ دیکھو تو صحافی کیا اسمگلر بھی نہ معلوم ہوں۔ پھر شاعری بھی نہیں کرتے۔ کم سے کم ایک تخلص ہی رکھ لیتے۔ ایک سے ایک لفظ اردو میں پڑا ہے اس کام کے لئے۔ آزاد، غازی، برق، شرر، تیموری، جنگ، چنگیزی۔ ایک پنجابی صحافی تھے۔ ٹی ایس تڑپ۔ یہی اپنا لیتے۔ سننے میں کتنا اچھا لگتا، م۔ افضل تڑپ! یا افضل جنگ چنگیزی ہوتا تو اچھا رہتا۔ سننے والا سنتے ہی لرزہ براندام ہو جاتا۔ ایسا لگتا جیسے ملک پر کوئی تاریخی حملہ ہو گیا ہے۔

دراصل تخلص رکھنے سے صحافی کے نام میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس میں صحافتی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر افسوس۔ لگتا ہے افضل صاحب کو اس معمولی سی بات کا بھی علم نہیں۔ سیدھا سا نام تھا محمد افضل، اسے بھی اختصار کے لئے م۔ افضل کر لیا۔ غالباً اس خیال سے کہ کاغذ پر چھپے یا دشمن گالی دے تو رسولؐ کے نام کی بے حرمتی نہ ہو! وہ تو شکر ہے کہ انہوں نے افضل کو مختصر نہیں کیا۔ کر لیتے تو میم الف رہ جاتے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ بہر حال۔ ادھورے نام کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خود راقم کے منہ سے کبھی کبھی میم افضل کی بجائے نیم افضل نکل جاتا ہے۔ وہ تو خیر ہے کہ انہوں نے کبھی سنا نہیں۔ سنتے تو سر پیٹ لیتے (خادم کا۔)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جس اخبار کی وجہ سے وہ صحافی بنے ہیں اسکا نام پچھلے اٹھارہ برس سے ''اخبار نو'' چلا آرہا ہے۔ آج تک اخبار دس یا محض ''اخبار سوا نو'' یا ''ساڑھے نو'' بھی نہیں ہوا۔ اور اگر بالفرض محال ''اخبار نو'' کا ''نو'' کوئی ہندسہ نہیں لفظ ہے۔ اور اس لفظ کا مطلب ہے ''نیا'' تب بھی اٹھارہ برس کی پرانی چیز نئی کیسے کہی جا سکتی ہے۔

پھر یہ اخبار اردو کی اعلیٰ صحافتی روایات سے محروم ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ ایک تو یہ ہفت روزہ ہے۔ دوسرے ہر ہفتے شائع ہو جاتا ہے۔ تیسرے اٹھارہ سال سے اسی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اب بتایئے۔ اردو اخبار کیا ایسے ہوتے ہیں؟

اس پر اپنا ایک عبرت ناک واقعہ یاد آرہا ہے۔ سن لیجئے۔ کسی زمانے میں فدوی کو بھی اردو اخبار نکالنے کا شوق تھا۔ ایک ہفتہ وار اخبار کا رجسٹریشن اتفاق سے مل گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ہر ہفتہ چھاپنا شروع کر دیا۔

...CALCUTTA - 700073 EDITOR F S EJAZ

اخبار کے کاتب تھے شاہ نور صاحب۔ ہر ہفتے، ایک مقررہ دن، اخبار کا مسودہ ان کے گھر پہونچ جاتا۔ اگلے روز وہ کتابت کر کے سارا اخبار پریس میں دے آتے۔ اخبار چھپ جاتا۔ شاہ صاحب ذرا قلندرانہ طبیعت کے مالک تھے۔ چنانچہ کئی بار ترنگ میں آکر بڑے پتے کی بات کہہ جاتے۔ ہاں۔ کبھی کبھی غصہ بھی آجاتا تھا۔

ایک مرتبہ اخبار کا مسودہ ان کے یہاں پہنچا تو دیکھتے ہی جھلا اٹھے۔ کہنے لگے۔ "ہر ہفتے آجاتے ہیں تنگ کرنے۔ آخر ایک مرتبہ سارا اخبار چھاپ کر کیوں نہیں بیٹھ جاتے!" اور جھٹ دروازہ بند کر لیا۔ اندر سے دیر تک ان کے بڑبڑانے کی آواز آتی رہی۔ "ہر بار ایک سی خبریں۔ مظاہرے، مذمت، حمایت، واک آوٹ، لاحول ولا قوۃ۔۔۔"

خادم نے اسی وقت عبرت پکڑی اور ہفت روزے کو باقاعدہ ہر ہفتہ چھاپنے سے تائب ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد شہر کے مشہور اردو صحافیوں میں گنتی ہونے لگی اور سنا ہے کہ اب بھی ہوتی ہے حالانکہ شہر اور اخبار چھوڑے چوتھائی صدی بیت چکی ہے۔ (دہلی اردو اکاڈمی کی ایوارڈ کمیٹی متوجہ ہو۔)

اس کے علاوہ افضل صاحب کے اخبار میں خبریں منتخب کرتے وقت بھی اردو کی صحافتی روایات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ خبریں پڑھ کر ملکی اور غیر ملکی حالات کا تو تمام علم ہو جاتا ہے۔ مگر مقامی حالات کیا ہیں، اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ مثلاً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مقامی تھانہ میں کون نئے تھانیدار صاحب تبادلہ ہو کر آئے ہیں جن کے آنے سے علاقہ میں ہر طرف امن و چین ہو گیا ہے۔ مجرم شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ چوریاں بند ہو گئی ہیں۔ لوگ مسروقہ سامان کھلا رکھ کر سو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بلیاں بھی باورچی خانوں میں چوری چھپے دودھ نہیں پیتیں۔ سب کے سامنے پی جاتی ہیں۔ خطرناک ڈاکوؤں نے دوسرے تھانوں میں پناہ لے لی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہی نہیں اخبار پڑھنے سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ فلاں محکمہ کے فلاں افسر کے بارے میں ہمارے نمائندہ خصوصی نے چھان بین کر کے کیا سنسنی خیز معلومات حاصل کی ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ شمارے میں ہدیۂ ناظرین کی جائے گی۔

اور تو اور شہر کے فلاں رئیس بے بدل کے پہلے عقد ثانی کی شاندار تریب کا آنکھوں دیکھا احوال دل نشیں مع چشم دید تصاویر بھی کبھی اخبار پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ قسمت کا حال بتانے والے فلاں صاحب جو بیحد کراماتی ہیں کا پتہ اور اوپری ہواؤں کے اثرات دور نے والے سفلی علم کے لرزہ خیز ماہر بنگالی بابا کا باتصویر اشتہار بھی نہیں چھپتا۔ ارے صاحب یہ نہیں تو کم سے کم شادی سے پہلے اور شادی کے بعد والے مفید اشتہار ہی چھاپ دیا کریں جن میں قوم کے نونہالوں کو مایوسی سے بچنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ کم سے کم اس سے صبر آجائے کہ اکاڈمی نے صحافت کیلئے صحیح صحافی ہی چنا ہے۔ (اور اگر غلط صحافی ہی چننا تھا تو خادم نے کیا قصور کیا تھا!)

تاہم سب سے قابل اعتراض بات یہ ہے کہ افضل صاحب کے تعلیمی پس منظر کی طرف اکاڈمی نے پورا دھیان نہیں دیا ہے۔ ذرا ان کا بایوڈاٹا ملاحظہ کیجئے جسے عام بایوڈاٹا کی طرز پر لکھیں تو یوں لکھنا ہوگا۔

سب سے پہلے ۱۹۷۶ء میں دہلی یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔

پھر ۱۹۷۳ء میں دہلی کالج سے بی اے آنرز کر لیا۔

اسکے بعد ۱۹۶۹ء میں اینگلو عربک اسکول سے ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کر بیٹھے۔ بعد میں پتہ نہیں کب پرائمری بھی پاس کی۔

خادم کی رائے ہے کہ اتنے پڑھے لکھے آدمی کو اردو صحافت میں نہیں گھسنے دینا چاہیئے کیوں کہ پھر وہ پڑھی لکھی صحافت کرنے لگتا ہے۔ بلکہ ایسا آدمی تو میرے خیال سے سیاست کے بھی لائق نہیں۔ مگر کیا کیجئے۔ سب کچھ سب کے خیال کے مطابق تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

صحافت اور سیاست دونوں میں افضل صاحب کا ان لوگوں سے زیادہ عمل دخل ہے جو ان سے کم پڑھے لکھے ہیں۔ صحافت میں وہ اردو صحافیوں کی سب سے بڑی تنظیم کل ہند اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے صدر ہیں تو سیاست میں چھ سال تک راجیہ سبھا کے رکن رہ چکے ہیں۔

اسکے علاوہ بیسوں سرکاری غیر سرکاری، پارلیمانی کمیٹیوں اور تنظیموں کے ممبر تھے، ہیں یا رہیں گے۔ درجنوں ملک گھوم چکے ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو یمن کے سفیر بنتے بنتے رہ گئے۔ تقرر بھی ہو گیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ عین وقت پر بی جے پی برسر اقتدار آگئی جس نے بروقت ان کی فائل دبا دی۔ ورنہ آج وہ دہلی میں صحافت کے ایوارڈ کے لئے دستیاب نہ ہوتے۔

کل ملا کر افضل صاحب کے بارے میں لوگوں کو پورا شبہ ہو چکا ہے کہ وہ بے باک صحافی اور دیانت دار سیاست داں ہیں۔ لہٰذا ایسے حضرات کی ہمت افزائی کرتے وقت یہ ضرور ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس سے اور لوگوں کو بھی بے باکی اور دیانت داری کی شہہ مل سکتی ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو یہ زندگی اور بھی دشوار ہو جائے گی! ذرا۔ مرحوم نازش پرتاپ گڈھی کی وہ نظم یاد کیجئے۔

مرے قلم کو میرے ساتھ دفن کر دینا
کہ یہ عذاب نئی نسل تک نہ جا پہنچے

جناب قیصر تمکین اردو ادب کے کھرے عالم، اعلیٰ پائے کے نقاد، ممتاز افسانہ نگار۔ صحافی۔ دانشور اور صادق اِنسان ہیں۔ لندن سے کچھ فاصلے پر ویلز کی حسین وادیوں کے علاقے کمبران میں رہتے ہیں۔ اس علاقے کو دیکھ کر دہرہ دون و نینی تال کا گمان ہوتا ہے۔ کمبران کے ایک گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر علمی و ادبی خدمات انجام دینا اور نشاطِ مطالعہ سے سرشار رہنا اُن کا شعارِ زندگی بن گیا ہے۔

عام اُردو والوں کی طرح خوشامد خوری، بے جامداخلت، مطربی و مسخرگی اُن کا پیشہ نہیں ہے۔ بلکہ نوواردانِ بساطِ ادب کی خاموشی سے حوصلہ افزائی کرنا اور راست ہدایت دینا اُن کا وظیفۂ حیات ہے۔ آپ کا تعلق اردو ادب کے بلند قامت ترین خانوادہ سے ہے جہاں محسن کاکوروی۔ نورالحسن نیّر کاکوروی۔ امیر احمد علوی کاکوروی اور آپ کے والد ماجد حضرت مشیر علوی ناظر کاکوروی کے نام اُردو ادب میں چاند تاروں کی مانند درخشاں ہیں۔

گہوارۂ تہذیب و تمدّن لکھنؤ کے گلستان ادب میں نہال ہونے والے اس ہونہار بروے کے پات آغاز سے ہی آب دار تھے اور اب تو یہ ایک چھتنار درخت بن چکے ہیں۔ آپ کی تحریرو تخلیق آپ کے اعلیٰ علمی ذوق اور تہذیبِ رسمِ عاشقی کی آئینہ دار ہے۔

قیصر تمکین کے تحتِ نظر اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی کے کلاسکی سرمائے سے لے کر موجودہ عہدِ سیاہ بختی میں رونما ہونے والی تحریر اور تحریک ہے۔ وہ عمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنی فلک پیا فکر کے ذریعہ ادب کو بہت نئے انداز سے قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ اُن کا تفسِ علم اُن کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اہلِ برطانیہ میں جہاں کے مہاجر اہالی تہذیب اور شعر و ادب سے دور ہوتے جا رہے ہیں وہاں قیصر تمکین کی موجودگی کسی شجر سایۂ دار کی مانند ہے اور اُن کی زیارت ثواب سے خالی نہیں ہے۔

راقم الحروف نے ایران جا کر سنا اور تذکروں میں پڑھا کہ فارسی کا طنز و مزاح نگار عبید زاکانی، اور لندن آکر معلوم ہوا کہ آسکر وائلڈ بھی جس محفل میں پہنچ جاتے سب اُسی کی طرف ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ قیصر تمکین صاحب کو دیکھا ہے کہ وہ برطانیہ کی جس بزم میں



قیصر تمکین

اپنی گل افشانی گفتار کے جوہر دکھا رہے ہوں، وہاں اور کسی کا چراغ نہیں جلتا۔ موصوف کو ایک شکایت اپنے تن و توش سے ہے کہ وہ کیم شیم نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اپنی عقل کا ایک گوشہ مجھے عطا کر دیں میں کھڑے قد سے آپ نثار ہو جاؤں گا۔

زمانے کی کج رفتاری اور اُردو والوں کی



حیدر طباطبائی
10-B, Britannia Road, Ilford
Essex IG1 2EQ, London
U. K.
Phone: 0161-5533604

کم ظرفی کا عالم ہے کہ ہندوستان و پاکستان جہاں اُردو ادب کے دریا آج بھی مواج ہیں، وہاں قیصر تمکین کو انعامات سے نوازا جاتا ہے اُن کی شان میں بڑی بڑی ادبی نشستیں ہوتی ہیں۔ اور برطانیۂ کبیر میں آباد اُردو کے صغیر حضرات کو اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے ہی فرصت نہیں۔ یہاں کے نام نہاد ادبی لوگ اُن کو دیکھ کر اُسی طرح سے کترا کے نکل جاتے ہیں جیسے کسی مسلم آبادی والے گاؤں میں پیش نماز کو آتا دیکھ کر بے نمازی بدک جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ عطشِ علم جاتی رہی اس لئے دریا ویرانوں میں بہہ رہے ہیں اور سکوت بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

قیصر تمکین کو تھوڑا قریب سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ایک ادیب کے لئے جتنی صفات درکار ہیں موصوف کی ذات میں موجود ہیں۔ حضرت کو نہ لباس سے شوق ہے نہ کھانے اور پینے سے (یہاں پر آخرالذکر پر زیادہ زور ہے، کیونکہ ۳۰ سال سے یورپ کی سردی عین اُن کو اس جانب مائل نہ کرپائی) نہایت بے پروا اور آزاد منش واقع ہوئے ہیں۔ جہاں نیند آئی سو گئے، لیکن غریب الوطنی کے باوجود گھنی چھاؤں دیکھ کر بیٹھتے نہیں ہیں۔

یہ نیند موصوف کو لندن سے ویلز جاتے ہوئے موٹر وے M-4 پر اکثر آجاتی ہے اور کسی بھی سروس اسٹیشن پر گاڑی روکی اور معنبہ

بقیہ صفحہ ۴۵ پر

خلیق انجم کی کتاب

''آصف علی اور ارونا آصف علی'' جنگِ آزادی کی اہم کڑی

رفعت سروش، نئی دہلی

ہندوستان کے قوم پرست مسلمانوں کی بد قسمتی یہ ہے کہ آزادی کے بعد اس ملک میں قوم پرستی کا فقدان ہے۔ اس کے مقابلے میں مذہبی منافرت اور ذات پات کی تفریق عروج پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی نصف صدی نہیں گذری کہ ہندوستان نے قوم پرست مسلم رہنماؤں کی خدمات کو بھلا دیا ہے۔ اور جن مسلمانوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا آج انکے نام بھی عوام کو یاد نہیں۔ تاریخ کے صفحات آپ دیانت داری سے الٹئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد نئے کاروانِ آزادی کی رہنمائی میں قوم پرست مسلمانوں کا حصہ اکثریتی طبقہ سے کم نہیں رہا جو رہنمائے قوم گاندھی جی کے دست بدست اور جواہر لال نہرو کے قدم بہ قدم چلتے تھے۔ ان میں ایک بہت نمایاں کام ہے بیرسٹر آصف علی کا جنہوں نے ۱۹۲ء سے جنگِ آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا رجنگِ آزادی کی خاطر بیرسٹری کا پیشہ ترک کر اور ایماں سے کام کیا، ۱۹۴۲ء میں کانگریس کنگ کمیٹی کے اراکین کے ساتھ گرفتار ئے، پہلی بار جب قومی حکومت قائم ہوئی تو ں امریکہ میں ہندوستان کا پہلے سفیر بننے کا ۔ حاصل ہوا۔ پھر اڑیسہ کا گورنر اور بعد میں ر لینڈ میں ہندوستانی سفیر ۵۳ء میں ان کی ا کا سفر ختم ہوا۔ آج اگر دہلی دروازے سے اجمیری گیٹ کو ملانے والی سڑک کا نام آصف علی روڈ نہ ہوتا تو شاید لوگ اس نام کو بھی بھول چکے ہوتے۔

قومی رہنماؤں کے اہم کارناموں کی یاد ایک اہم قومی اور تہذیبی فریضہ ہے اور ڈاکٹر خلیق انجم جیسے فعال ادیب نے کتاب تصنیف کر کے ایک خلاء کو پورا کیا ہے۔ خلیق انجم کی ایک تعریف یہ ہے کہ ''متنی'' آدمی ہیں اور صحیح ''متن'' کے حوالے کے بغیر اپنا قلم نہیں اٹھاتے چنانچہ ان کی تصنیف میں بھی زیب داستاں کے طور پر عبارت آرائی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کتاب کی تالیف میں آصف علی کی خود نوشت سے استفادہ کیا ہے۔ اب تو یہ کام کوئی بھی کر سکتا ہے کیونکہ خود نوشت موجود ہے اور تاریخ ساتھ ہے مگر یہیں تو مولف کے جوہر کھلتے ہیں کہ ہزارہا واقعات میں سے کیا کہنا ہے اور کس زاویئے کو اجاگر کرنا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم سیکولر مزاج رکھتے ہیں۔ سیکولر طریقۂ زندگی کو اپنا چکے ہیں۔ مذہبی تفریق سے بہت دور ہیں۔ اردو کے عاشق ہیں اور دلی والے ہیں۔ قدیم تاریخی آثار اور تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے تحفظ کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں، کرتے ہیں۔ چنانچہ آصف علی اور ارونا آصف علی پر کتاب لکھنا ہی اس امر کا ایک ثبوت ہے۔ انہوں نے اپنے شخصیت کی جن صفات کو اجاگر کیا ہے وہ خود مصنف یا مولف کے ذہن کی عکاس ہیں۔

کتاب کا پہلا باب آصف علی کی سوانح ہے۔ ان کا اجدادی پیشہ سپہ گری تھا اور ننہال میں عیش و عشرت کے لئے جاگیریں بھی تھیں۔ ان کی والدہ اکبری بیگم اُس دور کی خواتین کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان کے جلال و جمال کو خود آصف علی نے قلم بند کیا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے تاثرات خواجہ غلام السیدین کو لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ ایک اٹھتے ہوئے تمدن، ایک اجڑتی ہوئی تہذیب، اور محو ہوتے ہوئے نقش زندگی کی مسور یادگار تھیں۔ نہ وہ عالی حوصلے اب باقی ہیں نہ وقار و وضعداری، نہ وہ خلوص و محبت نظر آتے ہیں اور نہ وہ ایثار اور ہمہ روز فراخ دلی۔ ایک خموش مجلس حیات کا چراغ سحری نما جسکی آخری لو بجھ گئی۔'' اس اقتباس کو کتاب میں شامل کرنے کی اپنی معنویت ہے۔

مجھے یہ لکھتے وقت جس چیز نے مسور کیا وہ بیرسٹر آصف علی کی نگینہ سے وابستگی ہے۔ ایسی قربت کی مہک محسوس ہوئی جیسے میں اپنے بڑے بھائی کے بارے میں پڑھ رہا ہوں، آصف علی کی دادی نگینہ رہتی تھیں اور قلعہ کے قریب ایک گاؤں انکی ملکیت تھی۔ مجھے اپنے بچپن کے زمین داروں کی زندگی یاد آگئی اور ایک عجیب و غریب نقشہ ذہن میں گھوم گیا جو آج زمینداری سسٹم ختم ہونے کے بعد ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ کل کے زمیندار آج کے ''بیکار'' ہیں اور برسوں ان کی دادی نے چھٹیاں گذارنے کے لئے آصف علی اور ان کی والدہ اکبری بیگم کو نگینہ

کے قریب اپنے گاؤں بھگوان پور بلایا۔ آصف علی کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اس سفر کی جھلکیاں لکھی ہیں۔ دہلی سے سہارنپور ہوتے ہوئے ریل کا سفر۔ راستے پر گنگا کا پل۔ قدرتی مناظر، پہاڑی مناظر، اور دور تک پھیلے ہوئے کھیت۔۔۔ لکھا ہے۔

"جو وسیع تر زمین میں نے ابھی تک سپنے میں دیکھی تھی، آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔" اور میں وہ مناظر آصف علی کی تحریر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کتاب کا ہر صفحہ خوبصورت یادوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور اس کے بعد اپنی زمینداری کے گھر کا حال، جنگل اور زمینوں کا ذکر۔ مناظر سے ملحق ان کی کوٹھیاں، گائے و بیل، بھینس، کھیتوں میں سوائے ہل چلانے کے آصف نے اور بھی کام شوقیہ کئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے

"دیہات میں دو مہینے رہ کر جو معلومات حاصل کیں وہ کتابوں سے نہیں مل سکتی ہیں۔ یہ تجربے زندگی میں کام آئے"۔ اور انہوں نے آصف علی کا یہ اقتباس پیش کیا ہے۔

"مجھے زندگی میں جو نقصانات ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ میں نے وہ گاؤں بیچ دیا اور اس کا صدمہ زندگی بھر میرے دل و دماغ میں رہا۔" اور یہ الفاظ سپرد قلم کرتے وقت اس میں غرق ہوں کہ میں نے بھی آصف علی والی غلطی کی اور اپنا باغ بیچ دیا۔

کتاب کے اس باب میں نگینہ کے رہن سہن، آب و ہوا، وہاں کے کاروبار اور بالخصوص آبنوس کی لکڑی پر خوبصورت نقش و نگار بنانے کا ذکر ہے۔ آصف علی نے نگینہ میں اپنے لئے آبنوس کا ایک قلم دان بنوایا تھا جس پر ہاتھی دانت سے ان کے دستخط کندہ تھے"۔

میرا ذہن نگینہ کی یادوں میں کھو گیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ میرے اس آبائی قصبے نے اردو ادب کو ڈاکٹر نذیر احمد جیسا صاحبِ قلم دیا۔ آصف علی جیسا دانشور، قانون داں اور مجاہد آزادی اور حافظ ابراہیم جیسا محبِ وطن رہنما۔ جس نے اس قصبے کی سرزمین کو وزیر اور گورنر بننے کے باوجود نہیں چھوڑا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ اول الذکر دونوں شخصیتیں "دہلوی" کہلانے لگیں۔ حافظ محمد ابراہیم اگرچہ ایک عمر لکھنؤ، دلّی اور چنڈی گڑھ رہے۔

صاحب کتاب ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑے فخر سے لکھا ہے:

آصف علی ایک سچے دل والے تھے۔ انہیں یہاں کی ایک ایک چیز سے محبت تھی۔ شاہجہانی فصیل کے اس حصے کو گرانے کی کوشش کی جو دریا گنج میں تھا۔ گو آصف علی کو Improvement Trust سے بہت تکلیف ہوئی...... فصیل تو نہ بچ سکی مگر دلّی گیٹ سے اجمیری گیٹ کی سڑک کا نام آصف علی روڈ رکھ دیا گیا۔

آصف علی کی تحریروں میں دلی کی قدیم تہذیب اور بالخصوص کوچہ چیلاں کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے کیا گیا ہے۔ مگر اسے وقت کی بوالعجبی ہی کہئے کہ آصف علی کی طرح ڈاکٹر انصاری بھی بیرون دہلی یعنی غازی پور کے فرزند تھے۔ آج ان کا نام بھی "انصاری روڈ" کے توسط سے زندہ ہے۔ ورنہ...... اصل بات یہ ہے کہ مختصر تبصرے میں اس کتاب کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ورق ورق پر ہمارا ماضی، تمدن، تہذیب اور تاریخ بکھری پڑی ہے۔ یہ ڈاکٹر خلیق انجم کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں آصف علی کے حوالے سے آزادیٔ ہند کی جدوجہد کو قلم بند کیا ہے اور خلافت تحریک کے دوران تو خاص طور پر اہم تاریخی واقعات، شخصیات اور جدوجہد آزادی کو اس طرح لکھا ہے کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

جب کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ خلیق انجم "متنی" آدمی ہیں۔ چنانچہ کوئی بات مستند حوالوں کے بغیر نہیں کہی ہے۔ اس کتاب کا وہ حصہ بہت فکر انگیز ہے جس میں ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑو" تحریک سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب لکھ کر مجھے پہلی بار اس بات کا اندازہ ہوا کہ اس تحریک نے ہی تقسیم وطن کی تحریک کو مضبوط کیا۔ اگر اس وقت یہ غلط قدم نہ اٹھایا جاتا تو ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا اور شاید یہ ہزاروں لوگوں کا خون جو سرحدوں پر بہا اور اب جنگوں کے میدانوں میں بہہ رہا ہے، اسکی نوبت ہی نہ آتی۔ خلیق انجم کے الفاظ میں:

میرا ذاتی خیال ہے کہ جب تعصبات سے بلند ہو کر ہندوستان کی تقسیم کے اسباب کا تعین کیا جائے گا تو ان میں "ہندوستان چھوڑو تحریک" بھی ایک بہت بڑا سبب قرار پائے گی۔ (صفحہ ۱۳۹)

آصف علی کی شاعری اور ان کی انشا پردازی پر بھی اس کتاب میں ایک باب ہے، اس ضمن میں تو اب کوئی یاد ہی نہیں کرتا، آصف علی کو...... ان کی شاعری ہو یا نثر۔ قابل تعریف ہے اور اپنے دور کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک باب آصف علی کے نام خطوط اور ان کے خطوط پر مشتمل ہے۔ بعض خط تاریخی دستاویزوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور غالب کے خطوط" کے مرتب کی بالغ نظری کا نمونہ ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ ارونا آصف علی کی ذات و صفات سے زندہ ہے۔ خوبصورت بنگالی لڑکی ارونا سے آصف علی کی ملاقات مسوری میں ہوئی۔ محبت نے اپنا رنگ دکھایا اور اس نابالغ لڑکی کو مولوی احمد سعید علی نے مشرف بہ اسلام کیا، کلثوم زمانی نام رکھا گیا اور نکاح کے بعد ارونا آصف علی کہلانے لگی۔ شروع شروع میں سب اس شادی کے بہت خلاف تھے۔ ارونا کے والد اور خاص طور پر چچا

کمینہ ر کا گولی، ادھر گاندھی جی، مولانا آزاد اور دوسرے کانگریسی رہنما بھی خوش نہیں تھے۔ مگر آہستہ آہستہ سب رام ہو گئے۔ ارونا نے آصف علی کے نقش قدم پر چل کر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا، کچھ دن شوہر کے نقش قدم پر چلیں پھر اپنی فہم و ذات کے بل پر ان سے اختلاف کرتے ہوئے ان سے آگے نکل گئیں۔ گویا جدید تنقید کی زبان میں تخلیق اپنے خالق کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ ارونا آصف علی کی حب الوطنی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۲ء میں کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد کانگریس کا کام سنبھالا۔ گرفتاری کا وارنٹ نکلا تو روپوش ہو گئیں، اور مدتوں روپوش رہ کر ملک اور بالخصوص نوجوانوں کی قیادت کرتی رہیں اور ان کا جھکاؤ بائیں بازو کی سیاست کی طرف ہوتا چلا گیا۔ شعلہ بیان مقرر ور تھیں۔ بڑے سے بڑے نابغۂ روزگار سے بحث کر سکتی تھیں۔ لیکن یہ بائیں بازو کی طرف جھکاؤ انہیں اپنے شوہر کی محبت سے دور کرتا چلا گیا۔ وہ اپنی طبیعت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ شوہر امریکہ کے سفیر مقرر ہوئے، مگر ارونا نے ایک سفیر کی بیوی کی حیثیت سے امریکہ جانا گوارا نہ کیا، شوہر اڑیسہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ مگر بیوی نے اڑیسہ میں اقامت پسند نہ کی۔ پھر آصف علی سوئزرلینڈ کے سفیر مقرر ہوئے تو کچھ دن بعد وہ سوئزرلینڈ گئیں، مگر ان کے پہنچنے کے اگلے دن ہی آصف علی کا انتقال ہو گیا۔ اور یوں یہ اپنے اصولوں کی شیدا عورت اکیلی رہ گئی۔ ان کی زندگی سراسر خدمت و ایثار تھی اور ملک و قوم کی خدمت کے لئے وقف۔ اسی لئے آصف علی کی خواہش کے باوجود انہوں نے بچے کی ماں بننا گوارا نہ کیا۔

ارونا آصف علی نے نہایت سادہ اور بلند کردار زندگی بڑے حوصلے کے ساتھ گزاری۔ انہوں نے ”لنک ہاؤس“ قائم کیا۔ انگریزی روزنامہ ”پیٹریاٹ“ نکالا۔ اس طرح اپنے آپ کو عوامی مسائل سے جوڑے رکھا۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ تجارت کے ”داؤ پیچ“ نہ جاننے کی وجہ سے ”لنک ہاؤس“ اتنا مقروض ہو گیا کہ ”پیٹریاٹ“ بند کرنا پڑا۔ یہ ارونا آصف علی کے زوال کا نشان تھا۔ اور وہ ۲۹ر جنوری ۱۹۹۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئیں جس نے ان کے بعد انہیں ”بھارت رتن“ خطاب سے نوازا۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ کتاب ان کے تاریخی شعور، تحقیقی مزاج، اردو اور بالخصوص دلّی کی تہذیب سے ان کی محبت اور ان کے سیکولر انداز فکر و عمل کی ترجمان ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے اور وہ اس کتاب کی تصنیف و اشاعت کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ملک و قوم کی تاریخ و تمدن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

کتاب کی قیمت ۲۵۰ روپئے ہے اور یہ انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲ سے دستیاب ہے۔

بقیہ ہیر کمبران قیصر تمکین

مدّت کے لئے سو رہے۔ پھر سفر جاری۔ غالباً یوگا بھی آتا ہے۔ سماج میں کون کس کی عیب جوئی کر رہا ہے؟ اعزا میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ اِن فضول باتوں سے اُن کو کوئی مطلب نہیں۔ عام طور پر ملنے جلنے سے احتراز مناسب سمجھتے ہیں۔ دوستی میں بھی بے ربطی رکھتے ہیں۔ کسی کی برائی میں کبھی دہن وا نہیں کیا۔ تحریر تو دشمن کی بھی اگر پسند آئی تو کلمۂ خیر ضرور زبان سے ادا ہوا (یہاں پر دشمن سے مراد اسلام دشمن ہے ورنہ اِن کا کوئی دشمن نہیں ہے) اگر کسی نے اُن کو برا کہا یا لکھا تو کبھی بھی جواب نہ دیا۔

شکایات کے دفتر باز کرنا محض بات آگے بڑھانے کے لئے گلے شکوے کرنا یا کسی پر طنز کرنے کی اُن کو فرصت ہی نہیں۔ منچلے بہت ہیں دوسروں کے عشق کی روداد سُن کر جھوٹی ہمدردی بھی جتاتے ہیں۔ لیکن کبھی اپنی حکایتِ عشق زباں پر نہ لائے شاید ادبی انکار نے اجازت ہی نہیں دی۔

بچپن سے آج تک موصوف سے واقف ہوں اور میں نے اِس سالہاسال کی ملاقات میں موصوف کو کبھی کسی سے بدکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بلکہ باطل پر مبارزانہ شان سے ہمکتے ضرور دیکھا جب کبھی وہ مغضوب الغضب ہوئے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ شملہ کی برف پوش چوٹیوں سے کوئی جوالا مکھی پھوٹ پڑا ہو۔ اُن کا سینہ ہر طرح کے حسد سے پاک ہے بلکہ یوں کہوں کہ پاک باطنی کا پیکر ہیں۔ احباب پر وقت پڑنے پر وہ کام بھی آتے ہیں۔ اُن کے ذہنی ایوان میں اُصولوں کے چھینکے نہیں لٹکے ہیں۔ وہ قناعت، سیر چشمی، عجز، صبر، تحمل و صفا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اُن کی شخصیت بھی اُن کے ادب کی طرح قابلِ رشک ہے۔ لندن میں اُن سے مل کر مجھ سے آوارہ کو راستہ مل گیا۔ ادب سے چاہ تو ہمیشہ سے تھی۔ بس سب طلب کا کھیل ہے، ایسی طلب جس کی کوئی منزل نہ ہو۔ طلب تو نا قابلِ اختتام جادہ ہے، بس چلتے رہو، چاہے پیا ملن کی آس ہو یا نہ ہو۔

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

★ اسکینڈے نیویائی ادب نمبر ۳۰۰ روپے
★ نیاز فتحپوری نمبر ۲۰۰ روپے
★ عالمی اردو افسانے نمبر ۱۵۰ روپے



بخش لائلپوری (لندن)

پیغام

جنگ نہیں ہے امن کا گہنا
حربہ ہے شیطانوں کا

پاکستان پہ مرنے والو!
بھارت ماتا کے متوالو!
دیر و حرم کے اے رکھوالو!
اپنے دلوں میں بغض نہ پالو
اٹھو پیار کا ساز سنبھالو
دنیا ہے یہ انسانوں کا

غیر کے پھندوں میں مت آؤ
اپنی عقل کو کام میں لاؤ
امن کی راہوں کو اپناؤ
جام محبت کے چھلکاؤ
کب تک ہم پر بند رہے گا
دروازہ میخانوں کا

سوچ کی پستی سے تم نکلو
ذات پرستی سے تم نکلو
کوڑھ کی بستی سے تم نکلو
کبر و مستی سے تم نکلو
کر کے دفن ازل کے جھگڑے
رخ بدلو ویرانوں کا

شوقِ تعلق گرم کرو تم
پتھر دل کو نرم کرو تم
ہجر کی گھڑیاں ختم کرو تم
وصل سے روشن زخم کرو تم
بستی بستی گونج رہا ہے
یہ نعرہ مستانوں کا

ملت، مذہب، دین، فسانے
رنگ و نسب ہیں راگ پرانے
سب کو بنایا ایک خدا نے
اک مشعل کے سب پروانے
سنگِ حرم کے عین برابر
پتھر ہے بُت خانوں کا

حرص و ہوس کی آگ بجھاؤ
نفرت کی دیواریں ڈھاؤ
گھر گھر پیار کے دیپ جلاؤ
گلشن گلشن پھول کھلاؤ
قتلِ عوامی سے ٹل جاؤ
پاک پوتر ہے ہر شئے سے
بخشؔ لہو انسانوں کا

جنگ نہیں ہے امن کا گہنا
حربہ ہے شیطانوں کا



اردو ماہیے

دیپک قمر

پیچھے نہ گرائے جو
گھوڑے سے بھلا گدھا
رہ میں نہ ستائے جو

کیا ذکر سواری کا
رستے میں تجھے کو
جوتا بھی نہیں ملتا

پھرتا تھا مزاروں میں
پت جھڑ کا وہ پتہ ہے
آبیٹھا بہاروں میں

دل، دل کی زباں سمجھے
پوچھے ہے اشاروں میں
ہنسنے پہ وہ 'ہاں' سمجھے

غم دل میں سہا تنہا
اندھے کو ملی فرصت
وہ اور ہوا تنہا

نہ بدلے گا
دیوالہ بھکاری کا

پیچھے ہے نگراں اُن کے
مونچھیں تو پرائی ہیں
ہیں تاؤ مگر اُن کے

لڑتی ہے جھگڑتی ہے
اِس دل میں ہر اک خواہش
دو بیویوں جیسی ہے

تخلیق کی خوشبو ہوں
بے نقطہ اکائی میں
میں ہونے کا جادو ہوں

بہرہ تو رہے شوہر
بیوی بھی بنے اندھی
سکھ پائیں وہ جی بھر کر

غزلیں

عبدالرب صدا
بدھواری بازار۔ سیونی
ایم۔پی۔ 480661

مجرمِ ہستی بالآخر جرم کا بانی رہا
حلقۂ زنجیر سے باہر بھی زندانی رہا

یوں بھی اک ظالم سے رشتہ میرا روحانی رہا
میں رہا پیاسا تو اس کی آنکھ میں پانی رہا

آرزو کا سلسلہ کچھ اتنا طولانی رہا
میں بھی خود اپنے لئے وجہِ پریشانی رہا

قطرہ قطرہ عمر بھر پیتا رہا آبِ حیات
جسم کا کیا کیجئے، فانی ہی تھا، فانی رہا

دھوپ میں تپتی رہی گرچہ انا کی سلطنت
میں وہ سلطاں تھا کہ پھر بھی ظلِ سبحانی رہا

میرے خوابوں کو نہ سجدہ کر سکے ماہ و نجوم
یوں تو میں اس کی نظر میں یوسفِ ثانی رہا

سر بسجدہ ہو کے بھی قاتل کو سر دینا پڑا
یہ بھی اک رخ بندگی کا وقتِ قربانی رہا

کتنے دانا کر چکی پیدا یہ دنیا اے صدا
پھر بھی اس ناداں سے ہم کو خوفِ نادانی رہا

پروفیسر حامدی کاشمیری
مسعود منزل، شالیمار
سری نگر

وہ وادیاں ہوں کہ کہسار ہیں سفر کی طرح
پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں شجر کی طرح

تمہارے جانے سے دنیا بدل گئی ہے تمام
وہ پھول ہوں کہ ستارے ہیں چشمِ تر کی طرح

بلا رہی ہے مجھے آسماں کی پہنائی
پڑا ہوں خاک پہ مرغِ شکستہ کی طرح

اک ایک قطرہ لہو کا پکار اٹھتا ہے
حسین ابن علی کے بریدہ سر کی طرح

کریں تو کیسے کریں سیرِ باغ کی خواہش
روش گلوں کی ہے ویران رہگذر کی طرح

مرے ظہور کی نوبت ابھی نہیں آئی
گھرا ہوں وادیٔ ظلمات میں سحر کی طرح

[illegible]

رؤف خیر (ایم۔اے)
H. No. 9-10-202/19, Risala Bazar
Golconda Fort, Hyderabad - 500008 (A.P.)

مولودِ "کوزۂ ہند" حکیم منظور نے ۱۷ر جنوری ۱۹۳۷ء کو آنکھیں کھولیں تو "شہرِ چنار" جنت نشان، دوزخ سے قریب ہی تھا۔ یہ لڑکا بڑا ہوا تو اسی دوزخ پر "مالک" مقرر ہوا۔ تجسّس تو ازل سے ودیعت ہوا تھا حکیم نے کبھی کسی تارے، چاند یا سورج کو "مولائے کائنات" نہیں سمجھا۔ ڈوبنے والے تو ڈبو بھی دیتے ہیں۔ جس پہاڑی پر بھی ذرا سی روشنی دکھائی دیتی حکیم منظور اس کی طرف لپکتے۔ "پھول شفق آنگن کے" ہوں کہ "برف رتوں کی آگ" حکیم منظور "شعر آسمان" اور سخن زمین چشموں کی تلاش میں بہ ہر حال سرگرداں رہے۔ بالآخر اس تلاش نے انہیں "مٹھی بھر" روشنی سے نواز ہی دیا۔ اسی یدِ بیضائے سخن میں وہ عصائے حریت تھامے ہوئے تھے جو ساحرانِ خودسر کے اژدہوں کو نگلتا ہوا ابرِ نیل و فرات سے گزر گیا کہ کوئی دریا اب اس کا راستہ نہ کاٹ سکا۔

جہاں اچھوتی فکر حکیم منظور کے حرم میں داخل ہے وہیں نئی نئی بے اضافت تراکیب سے بھی انہوں نے متعہ کر رکھا ہے۔ وہ ناجائز و غیر ثقہ "نشان" کے علمبردار کبھی نہیں رہے۔ ہر طرف نظر دوڑاتے ہیں۔ درّوں اور ذرّوں پر ان کی نظر رہتی ہے۔

حکیم منظور کی نظر بلند، ہاتھ کشادہ، پاؤں جولاں گاہ طلب اور دل وسیع ہے لیکن الفاظ برتنے کے معاملے میں وہ ہر بار کو لمبس کی اتباع کرتے نظر آتے ہیں۔ نئی نئی زمینیں دریافت کرنا، ان کی خوش مذاقی کا اشاریہ ہے۔ ان کی یہ خوش مذاقی برفیلے علاقے میں گرم پانی کے چشمے ہی کی طرح مزہ دیتی ہے۔ "برف رتوں کی آگ" میں بھی وہ پھول کھلانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کا "شعر آسمان" زمین پر چھایا ہوا ہے۔

حکیم منظور "انشائے شعری" کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو ادب میں جہاں بدعتِ حسنہ و بدعتِ سیہ کے مزے لوٹتا ہے وہیں بنیاد پرستی اور کلیشے (CLICHE) پر تبرّا بھی بھیجتا ہے۔

پرندے ہو چکے ہیں برف پر لکھ
نیا موسم، نئی، تازہ خبر لکھ

زمین جب تک نہ اپنا حصہ ادا کرے گی
گلاب کھلتے نہیں ہوا کی سفارشوں سے

وہ بھی میری ہی طرح معصوم تھا
اپنے پس منظر میں جب پر کھا اُسے

اس کے لب پر مخملی الفاظ، خوشبوؤں کے معنے کہہ رہے تھے
اس کے ہاتھوں میں لہو آسودہ اک بیداد خنجر دیدنی تھا

اک اژدہام جس میں سخن فرصتیں ہیں گم
تنہائیاں اداس کہ تنہا تمام تر

کیا تھی وہ نغمگی کہ گجر ساعتوں میں تھی
کیا تھا وہ رقصِ نغمۂ دریا تمام تر

کس نے رنگیں پھول قبائیں گردی اڑتی ہوا کے پاس
اس کی کہانی الف سے یے تک اب بھی مجھ کو ازبر ہے

حکیم منظور الفاظ کے جمع و خرچ کا گوشوارہ بناتے ہیں تو معنوں کی پونجی پوری کی پوری سِلک میں رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں لفظ اک چمک دار مادّہ ہے جس سے گزر کر ایک روشن پیکر دہرا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ (اسی طبیعاتی نقطۂ نظر پر تحقیق کر کے سر سی وی رامن نے نوبل پرائز حاصل کیا تھا)۔

حکیم منظور قافیہ و ردیف کی بیساکھیوں کے سہارے اپنا سفر طے نہیں کرتے۔ یہ تو ان کی ایک عروضی مجبوری ہے ورنہ ان کا مشکیزۂ خوناب کسی دجلۂ غم کا محتاج نہیں۔ غیر مردّف غزلوں میں بھی وہی حکیمانہ فکر رواں دواں ہے جو سنگلاخ زمینوں میں گل کھلانے کی عادی ہے۔

اے قلم دار و قلم کا حق ہے کیا، سوچا ہے کیا؟
گونگے لفظوں کو کبھی پرکھا ہے، دل تڑپا ہے کیا؟

ایک خوش فہمی میسّر ہے مگر الجھن کے ساتھ
میری دنیا ہے مری دنیا مگر دنیا ہے کیا؟

ہماری پہچان بے نوائی رہے گی کب تک؟
یہ آج بھی، کل بھی اور پرسوں بھی سوچنا ہے

مجھے بتایا الف کا یہ ماجرا الف نے
بغیر الف کے نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے

گھوڑا الف ہو کر ہی سرپٹ دوڑتا ہے۔ حکیم منظور جس اشہب پر سوار ہیں وہ انہیں عجائبات کی وادی کی سیر نہیں کراتا بلکہ میدان کارزار میں لا کھڑا کرتا ہے اور حکیم منظور کے ہاتھ میں ننگی دودھاری تلوار دے کر بے سپر نہیں چھوڑتا بلکہ ان کی پامردی میں ہم قدم بھی ہے۔

مجھ کو لفظوں میں چھپنے کی عادت نہیں
میرے دل پر زباں کی حکومت نہیں
ہیں مرے خواب سچے میں ضد کیا کروں
ہاں مرے پاس کوئی شہادت نہیں

حکیم منظور کا لہجہ یکسر غیر روایتی ہے ان کا ایک لفظ دوسرے لفظ کی اور پہلا مصرع دوسرے مصرعے کی نشاندہی کبھی نہیں کرتا۔
کہیں کہیں تو حکیم منظور ریال و درہم کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سکۂ رائج الوقت کا جوڑ لگا کر خالص زر پسندوں کو آزمائش میں بھی ڈال دیا کرتے ہیں۔ جیسے ؂

اپنے برہنہ پن کو ہی ملبوس بناؤں اپنا میں
اک ایجاد کروں میں بھی، اس دھوپ کو سایہ دار کروں
شب رستے میں جب مجھ سے صبح ملی اس نے یہ کہا
میں اب تک خود ہی سوئی ہوں میں کس کو بیدار کروں
؂ یہ اور بات ہم پہ طنز ہو گئے شجر لہولوا ہوئے

حکیم منظور کا بالغ نہج سوال و جواب اور براہین و دلائل کی "ہدایہ" بھی مرتب کرتا ہے۔ ان کا یہ اسلوب غزل میں اک نئی آواز اور نیا لہجہ بن کر ابھرتا ہے:

سوال : کیا حرف ابتداء تھا؟ جواب: اب یہ سوال کیا ہے؟
سوال : میں حرف آشنا ہوں؟ جواب: تیرا خیال کیا ہے؟
سوال : تیرا کرم ہے اس پر؟ جواب: منظور کیسا شاعر؟
سوال : اس کا سخن ہے کیسا؟ جواب: اس کی مثال کیا ہے!

یہی انداز اک اور غزل میں بھی لطف دیتا ہے :

لباس ظلمت کا کون؟ سورج! ـ سو لیل؟ دن میں فرار بھی ہے
سکون کیا؟ اضطراب آخر! ـ دلیل؟ ہر گل میں خار بھی ہے
ثبات کس کو؟ ثبات ہی کو! دلیل؟ منظور ذات اس کی
چڑھاؤ غم کا؟ یہ عارضی ہے! دلیل؟ اس میں اتار بھی ہے

یہ اسلوب حکیم منظور کے زرخیز ذہن FERTILE MIND کا غماز بھی ہے۔ خطۂ کشمیر مردم خیز ہی نہیں مردم شناس بھی ہے حرف حکیمانہ کو انگیز ہی نہیں کرتا بلکہ خوش آمدید بھی کہتا ہے۔ "جوانوں" کی جرأت بزدلانہ کا شکار بھی ہے "رنگِ خالدانہ" سے سرشار بھی ہے۔ یہی ہمہ رنگی حکیم منظور کے حرف دلنواز کا شناس نامہ بھی ہے۔ بلا تقیہ و کتمان حق یہ بات کھل کر کہی جا سکتی ہے کہ حکیم منظور کے ہاتھ میں قلم اک ایسی ذوالفقار ہے جس کی کاٹ روایتی مرحب کو جہاں بے نقش و بے نفس کر کے چھوڑتی ہے وہیں ان کا طرز سخن اک نئی روایت کا علمبردار بھی ہے۔ حکیم منظور سے صرف نظر کرنا اپنی خوش مذاقی کا ماتم کرنا ہے۔

ابوالآفاق حکیم منظور کا جہان نظم دنیائے غزل سے بس اس حد تک مختلف ہے کہ اس میں اوتاد قوافی اور ردائف کی میخیں ٹھکی ہوئی نہیں ہوتیں۔ ان کے آنگن کے شفق رنگ پھول، ان کے غزال مشک تاب سے کسی طرح فروتر نہیں۔ بادلوں میں بنتے بگڑتے پیکروں سے حکیم منظور اک نظم "استفسار" کا خمیر یوں اٹھاتے ہیں:

سیاہ بادل کا وہ بظاہر خموش ٹکڑا
ہے ریشہ ریشہ فقط تکلم / عجب ترنم ... یہ لمحے لمحے میں رخ بدل دے
کبھی لگے جیسے ایک بوڑھا سفید ریش اور کمر خمیدہ
کبھی لگے جیسے سنگِ مرمر کا اک پنگوڑا کہ جس میں بچہ مچل رہا ہے ......
کبھی لگے جیسے ایک بوڑھی شفیق ماں اپنا سر جھکائے
جوان بیٹے کے کام سے لوٹ آنے کی راہ تک رہی ہے

اس نظم میں "میگھ دوت" کی کیفیت نہیں کہ کالی داس کو اپنی محبوبہ ہی بہ ہزار رنگ دکھائی دیتی ہے۔ حکیم منظور کو ان بادلوں میں بہت کچھ دکھائی دیتا ہے جو ان کے ماحول کا عکاس ہے۔ آخر کار وہ کہتے ہیں۔

سیاہ بادل کے اے بظاہر خموش ٹکڑے
تجھے بھی کوئی بنا رہا ہے، مجھے بھی کوئی بنا رہا ہے

"بنا رہا ہے" کا ٹکڑا کتنا معنی خیز ہے وہ آپ بھی جانتے ہیں میں بھی اور بنانے والا بھی۔ اس مرحلے پر ان کی کتاب (پھول شفق آنگن کے) کا انتساب خالی از علت نہیں جو "دنیا کے تمام اہل درد اور اہل دل کے نام" ہے۔

عکس پرستی چھوڑ کے سوچو کیا ہوتا ہے
ہونا اپنے آپ میں حرفِ مستِ الست؟
خود کو منفی کر کے سوچو - کیا ہے معنی بود و ہست؟
اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے اشکوں کی دھار بہی
میری کہانی کے کرداروں کے پیراہن
ان اشکوں سے اب تک دھاگا دھاگا تر ہیں - (ایک کہانی)

چڑیا، طوطا، کوا، مینا، کوئل، ابابیل اور پپیہا کی علامتوں میں بیان کردہ یہ ''منطق الطیر'' جدید دور کے المیے سے عبارت ہے (مضمون کی طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں پوری نظم کوٹ کرتا)

حکیم منظور کی نظم ان کی غزل پر حاوی ہے۔ میری رائے میں ان کی اصل پہچان ان کی نظم ہی سے قائم ہوتی ہے۔ ان کی نظم کبھی ''کھوئی ہوئی میراث کی بازیافت کی دعاء'' لگتی ہے تو کبھی ''بے نوالوگوں کا مرثیہ'' لگتی ہے۔ برف باری کے موسم میں سردی سے بچنے کے لئے اوپر کی منزل سے تہہ خانے میں پناہ لینے کا مرحلہ ہو کہ دو فٹ اونچی دیواروں کے پیچھے چھپ کر انسانوں کے چھپنے کی کوششیں،

عمارت ساز شاہنشاہ پیدا اب بھی ہوتے ہیں
متاعِ عصمت و عزت کے سودے اب بھی ہوتے ہیں

حکیم منظور کو خود بھی اعتراف ہے کہ۔
چند نامانوس سے لفظوں کے استعمال کی بازی گری / قافیوں کی شاعری
ہو چکیں یہ ساری باتیں ہو چکیں - ہاتھ کچھ آیا نہیں

صورتِ حال کس قدر بدل چکی ہے اس کا اندازہ ان کی اس نظم کے آخری مصرعوں سے لگایئے:

اس کے ہاتھ نہ آیا کچھ بھی
اس کے بچے اس میراث کو ڈھونڈ رہے ہیں
جس کو اگانے کی خاطر اس شخص نے اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا
اب وہ کہتے ہیں وہ ان کا باپ نہیں تھا

یہ ابوالآفاق وسبطِ سخن واقعی ایک صاحبِ ''خبر و نظر'' ہے۔

بقیہ : رتیک روشن ....

سے صحت کا خیال رکھیں کیلوری والی غذاؤں سے پرہیز کرتے ہوئے روزانہ انتہائی پابندی سے ورزش کریں، اور تعلیم کے میدان میں رتیک کی طرح اول پوزیشن حاصل کر کے دکھائیں تو ہمارے ملک کی نئی نسل تازہ دم اور باصلاحیت نظر آئیگی، جو لڑکیاں رتیک کے نام پر آہیں بھرتی ہیں، انہیں چاہئے کہ وہ اپنے محبوب یا اپنے شوہر پر بھی دباؤ ڈالیں کہ وہ روزانہ طے شدہ وقت پر کسرت کریں، شاہ رخ کی طرح سگریٹ نوشی نہ کریں بلکہ رتیک کی طرح صحت کے پاسبان بن جائیں اور زندگی کے سارے مقابلے میں کامیاب و کامران بنیں۔

رتیک روشن کے بارے میں شاہ رخ، سلمان اور عامر کا متفقہ تاثر یہ ہے کہ اداکاری، اخلاق اور توانائی کے ایک مجموعے کا نام ہے رتیک روشن۔۔۔!

خیر میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گھوڑا اپنی نسل سے پہچانا جاتا ہے، اور نسل اسکے کارناموں سے پہچانی جاتی ہے رتیک روشن کے سنگیت کار دادا سورگیہ روشن جی نے ہمیشہ معیار کو اولیت دی۔ انکے دونوں بیٹیوں نے اس روایت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔

ڈیر رتیک! ہم تمہیں اس شرط پر دعا دیتے ہیں کہ تمہارے قدم زمین پر ہمیشہ جمے رہیں گے! کیونکہ عظیم فنکار بننے کیلئے کردار کی عظمت پہلی شرط ہے۔!

بقیہ : شاعرِ کم سخن مجروح ....

علامتوں سے ادا ہو گیا ہے۔

ترقی پسندی نے مرتے مرتے اپنے جھنڈا باز شعرا و ادبا کی رائلٹی بھرپور شہرت اور جا و بیجا انعامات کی شکل میں ادا کر دی ہے۔ اس میں مجروح کے حصے میں کچھ کم آیا کہ وہ استحصال پسند اور سرکاری پٹھو نہیں تھے۔ کچھ بیچاروں نے مرنے میں اتنی جلدی کہ ان کے نصیب میں اتنا بھی نہیں آیا جتنا مجروح کو ملا۔ ان حرماں نصیبوں میں ساحر لدھیانوی بھی تھے جنھیں اب کوئی ڈھنگ سے یاد بھی نہیں کرتا۔ سچ ہے زمانہ بے درد ہوتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ۔

زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے

خوش آئند بات ہے کہ مجروح کی شاعرانہ ترقی پسندی نظریاتی ترقی پسندی سے زیادہ دیرپا ثابت ہوگی۔ انہیں اپنی کج کلاہی، اپنا بانکپن اور انداز جنوں پیارا تھا۔ خردمندوں میں اس گرم طلب شاعر کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا۔

انشاء کا آئندہ خصوصی شمارہ :
کلکتہ کا عصری ادب نمبر



سلطانہ مہر
20873 East Walnut-Canyon Rd.
Walnut, CA91789
U.S.A

اعتراف

ابا جانی
کچھ یاد تو ہوگا
وہ ایک طمانچہ
پھول سے میرے گال پہ تم نے
ثبت کیا تھا
اس لمحے پل بھر کو سوچا تو ہوتا
کہ ـــــ بیٹی تو رحمت ہے خدا کی
اسکے احساسات، اسکے جذبات
پھول سے زیادہ نازک ہوتے ہیں
اور یہ بھی کہ ـ ـ ـ
یہ انسانوں کی خالق ہے
ابا جانی!
اس ایک طمانچے نے
میری عزتِ نفس کو
کچھ ایسا کچلا، ایسا مجروح کیا
کہ میں اپنی بقا کی خاطر بھی
سر کو اٹھا کر چلنا بھول گئی
اور یوں ظلم کے ہاتھوں کو
اور بڑھاوا دیتی گئی
اور آج کے دن
جب میری شام الم کی گھڑیاں
پوری ہونے کو ہیں
میری خواہش ہے
کہ میرے ابا جانی
اک بار سہی
میرے خواب میں آکر کہہ دیں
بیٹی!
میں شرمندہ ہوں کہ
ظلم کا بیج تو بویا میں نے
لیکن فصل گناہوں کی میرے
تم نے کاٹی!

نسیم عشائی
Tapar, Patan, Kashmir

۱

میں رکی ہوئی ہوں
تم بھاگ رہے ہو
یہ منظر بہت ہے
عمر بھر حیران کرنے کو
میں اپنی اور تمہاری عمروں کا
ربط نبھانا چاہتی تھی
تم تیز رو پانی کی طرح بہہ گئے
تم میں کھڑے ہونے میں
مجھے زیادہ وقت نہیں لگا تھا
میری سانسیں جلدی اکھڑ گئی تھی
بہت دور تک
میں تمہارے ساتھ بہتی رہی ہوں
مجھے ساحل پر کیوں پھینک رہے ہو
میں تمہارا جھاگ نہیں
جو تھک ہار کر ریت پر سو جاؤں

۲

اطلس، کمخواب
مہندی، جھمکے، کنگن، گجرا
سبھی رُلا دیئے تھے
جب جھوٹ کی قینچی سے
تم سچ کا ریشم کتر رہے تھے
میں بھی منڈپ میں بیٹھے
سب کچھ دیکھ رہی تھی
لیکن اپنا من
تمہاری ہتھیلی پہ رکھتے سے
بہت سالوں
میں نے اپنے سینے میں رکھ دیا تھا
میں نے اپنی ہاتھ کی لکیروں کو بھی تو اتار کر
تمہیں دے دیا تھا
اپنی سانسوں کو بھی تو کھول کر
تمہیں اوڑھا دیا تھا
اور پھر میں نے
میں نے تمہاری روح کو پناہ دی تھی
کتنے دھنوان تھے تم ـــــــــ
جھوٹ کی قینچی کیوں نہیں بھولے؟
تم فرہاد کیوں نہیں تھے فرہاد؟

غزل

ڈاکٹر پنہاں
1811E, Frankford Rd., 2006,
Carrollton, Tx 75007, U.S.A.

مرجاتی تو کیا ہوتا عذاب اس سے زیادہ
یوں جینے میں شاید ہو ثواب اس سے زیادہ

اس صفحۂ ہستی کو ذرا پڑھ کے تو دیکھو
دلچسپ نہیں کوئی کتاب اس سے زیادہ

یہ زخم کہ جس زخم سے بو آتی ہے اس کی
کیا ہوگا حسیں کوئی گلاب اس سے زیادہ

دل ٹوٹ گیا ایک تغافل کی نظر سے
نازک تو نہیں ہوگا حباب اس سے زیادہ

بچپن میں طلب چاند کو چھونے کی تھی لیکن
نادان ہے شاید کہ شباب اس سے زیادہ

مانا کہ بہت دادِ سخن پاتی ہے پنہاں
نا قدر زمانے کا حساب اس سے زیادہ

دو نظمیں، دو غزلیں

تیجندر ادا
Dept. of Music
G. N. D. University
Amritsar - 143005

دوسرا جنم

تم ہی تو ہو
جو صدیوں سے
میرے لہو میں گھل چکے ہو
میرے خیالوں میں پل رہے ہو
تم ہی تو ہو
جسنے میری غزلوں کا جسم پہنا
میرے شعروں کا رنگ پایا
تم ہی تو ہو
جسے میرے قلم نے
ہزار بار پیدا کیا ہے
ہزار بار بڑا کیا ہے
بدلتے موسم، بدلتے وقت
کے سنگ بولے گا عکس تمہارا
جب بھی کبھی وقت ایسا آیا
میں بھی کسی کو جنم دونگی
میری محبت کا ہم عمر وہ
میری نظم کا ہم شکل وہ
یہ نام جو اس گھڑی ہے تمہارا
یہ نام ہوگا وہ اک شرارہ
تم ہی تو لوگے جنم دوبارہ

اس آسماں کو زمیں پر ذرا اترنے دے
وہ دم بھرے گا میرا اس طرف گذرنے دے

میں مٹھیوں کو تیری موتیوں سے بھر دونگی
ابھی ذرا مجھے طوفان سے ابھرنے دے

مجھے تو خوف اگر ہے تو زندگانی سے
زمانہ موت سے ڈرتا اگر ہے ڈرنے دے

میرا وجود حقیقت ہو تو گلے لگ جا
میں صرف خواب اگر ہوں مجھے بکھرنے دے

بڑھے گی رات تو دیکھیں گے حوصلے اس کے
ابھی ہوا کو چراغوں کی لو کترنے دے

یہ سارے چہرے ابھی بے نقاب ہوتے ہیں
اِن آئینوں سے مجھے گفتگو تو کرنے دے

اداؔ ابھی تو نہ آ، بارشوں میں تیروں کی
جو زخم اسنے دیئے ہیں اُنھیں تو بھرنے دے

اب جو منزل سے ملادے رہ گذر کہنا اُسے
جو سفر میں ساتھ دے دے ہم سفر کہنا اُسے

جان لی جس نے دیئے کی وہ تھی کوتاہی میری
نا مناسب ہے ہواؤں کا اثر کہنا اُسے

گرتی دیواروں نے حیرت ناک لہجے میں کہا
اب بسر کرنا جہاں بھی رات، گھر کہنا اُسے

تجھ کو کیا معلوم ہر پل کی خبر رکھتا ہے وہ
دیکھ نادانی ہے تیری بے خبر کہنا اُسے

شاعری کی روشنی محدود ہو کر کیوں رہے
سب کے دل پر جو اثر چھوڑے ہنر کہنا اُسے

زندگی بھر وہ تمہارا ہو نہیں سکتا اداؔ
پیار تم کو ہے تم اپنا عمر بھر کہنا اُسے



احساس

خط تیرے ہاتھ کا لکھا
جب بھی ملتا ہے
کچھ دیر تو ہوا میں
اڑ لیتی ہوں میں
خط کے ذریعے

تیری خوشبو میں نہا کر
مہک اٹھتی ہوں
اور جی لیتی ہوں میں
پھر یکایک
میرا احساس جدائی
اور میرا احساس تنہائی

اس طرح مجھے
دبوچ لیتے ہیں
جیسے پھول پر بیٹھی
تتلی کو پکڑ کر
بچے کتابوں میں
رکھ دیتے ہیں
اور ساتھ ہی
بھول جاتے ہیں

اردو ایک اجنبی ادب



انور شیخ
P. O. Box No. 918
CARDIFF(U.K.) CF52NL

زبان کا تعلق کسی خطے اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی عموماً دو نوعیتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زبان جو عوام بولتے ہیں اس خطے کی طبعاً مادری زبان ہوتی ہے۔ یعنی وہ صدیوں پہلے اس خطے میں فطری طور پر جنم لیتی ہے اور عوام کو اس کے سوا کسی اور زبان سے رغبت نہیں ہوتی مثلاً عربی عربوں کی اور جرمنوں کی زبان ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ملکی زبان عوام کی مادری زبان نہیں ہوتی لیکن حالات کسی خطے پر بدیسی بولی اس طرح مسلط کر دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کے لوگوں کی مادری زبان بن جاتی ہے۔ اوائل میں اس کی ترویج کے اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن وقت گزرنے کے بعد اسے مادری زبان ہونے کا شرف خود بخود حاصل ہو جاتا ہے جب عوام اسے شعوری طور پر قبولیت بخشنے لگتے ہیں۔ دنیا میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں انگریزی اور جنوبی امریکہ میں ہسپانوی۔ اس طرح جب کوئی قوم کسی اجنبی زبان کو سیاسی مصلحتوں کے بجائے شعوری طور پر اپنا لیتی ہے تو وہ اسے اپنے شعر و ادب۔ جذبات۔ روایات۔ تعلیم و تمدن اور قومی مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنا لیتی ہے۔

یہ قابل ذکر ہے کہ پسماندہ لوگوں کا ادب ان کے معاشرے کا ترجمان محض اس لئے ہوتا ہے کہ اسے ان کی علاقائی روایات اور سماج سے گہری وابستگی ہوتی ہے۔ جب اردو ادب پر اس پہلو سے نگاہ ڈالی جائے تو یہ ایک اجنبی ادب معلوم ہوتا ہے اور اس کا احیاء و ارتقا مخدوش نظر آتا ہے۔ اگرچہ بعض منچلوں کو گمان ہے کہ اردو زبان دنیا بھر میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔ یہ محض خوش فہمی ہے جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس مفروضے کی بنا دیار غیر یعنی یورپ اور امریکہ میں "اردو کی نئی بستیوں" پر اٹھائی گئی ہے۔۔۔۔ اردو غیر ممالک میں صرف تارکین وطن ہی کے دم سے زندہ ہے۔ جب یہ لوگ اس دار فانی سے اٹھیں گے تو ان کے ساتھ اردو زبان بھی رخصت ہو جائیگی کیونکہ ہم لوگوں نے اپنی نئی نسلوں کو اردو زبان سے آشنا نہیں کیا۔ ہماری فنا بھارت اور پاکستان میں بھی اردو ادب کی بقا کو متاثر کرے گی کیونکہ مغرب میں آباد تارکین وطن برصغیرِ ہند کے ادبی رسائل میں دلچسپی لیتے ہیں اور ان کی رکنیت اختیار کرتے ہیں۔ اگر یہ بات زیادہ اہم نہ بھی ہو تو اردو کے لئے اور بھی متعدد خطرات ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسکی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اردو کسی قوم کی نہیں مذہب کی زبان ہے۔ اردو بولنے والوں کا دعویٰ ہے کہ اردو ایک اسلامی زبان ہے اس لئے اردو شعرا اور ادباء نے اسے غیر اسلامی اقدار حیات کے خلاف تلوار کے طور پر استعمال کیا ہے۔

دوسرے۔ اردو مقامی روایات و جذبات کی آئینہ دار نہیں بلکہ عربی و ایرانی اقدار کی عکاس ہے یہ تمام مذہبی۔ اخلاقی قانونی۔ سماجی معاشی اور سیاسی مسائل کا حل عرب و ایران سے تلاش کرتی ہے۔ نہ صرف اس کے رونے اور ہنسنے کا انداز خارجی ہے۔ اس کے فن شاعری کی ابتدا اور انتہا بھی غیر ملکی ہے۔

تیسرے۔ اس کی لسانی خاصیتیں بھی عرب و ایران سے مستعار ہیں۔ اس زبان کی لغت کا وافر حصہ۔ انداز بیان اور قومی ادبی استعارے بھی تقریباً سب کے سب غیر ملکی ہیں۔ اس زبان کی تلمیحات تشبیہ واستعارہ اور سمبل ازم بدیسی ہیں۔ اہل پاکستان نے قومی غیرت کو یہاں تک خیر باد کہہ دیا ہے کہ انہوں نے اپنے حیات کش جنگی میزائل کو "غزنوی" اور "غوری" کے خطابات سے نواز رکھا ہے حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے ہندی وجاہت کو پامال کیا تھا حتیٰ کہ بھارتی مسلمانوں کو اس بات پر ناز ہے اور وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ اگر پاکستان نے یہ میزائل بھارت کے خلاف استعمال کئے تو ان کے تباہ کن اثرات ہندو مسلم کی تمیز نہیں کریں گے۔

چوتھے۔ اردو وطن کشی کی زبان بن چکی ہے اور یہی اس کی ادبی روح ہے۔ مسلمانوں کو باور کرایا گیا کہ اردو مسلمانان ہند کی قومی زبان ہے۔ اس طرح دو قومی نظریہ کو پروان چڑھا کر تقسیمِ ہند کے بیج بوئے گئے جن کا پھل انتہائی زہریلا ثابت ہوا کیونکہ اردو وطنی بٹوارے کی زبان بن گئی اور بعد میں پاکستانی بنگالیوں نے اردو کی قومی حیثیت کو رد کرتے ہوئے اپنی فطری زبان بنگلہ کو اپنی قومی زبان بنانے کی تگ و دو شروع کر دی جس نے پاکستان کی سالمیت کو تباہ کر دیا اور آج سندھ کا ذریعۂ تعلیم سندھی،

سارں ۔ ب سے اردو سے انھیں پھیر لیں اس زبان کی ارتھی اٹھ جائے گی۔

پانچویں۔ بھارت میں اردو کو بٹوارے کی زبان سمجھ کر قومی وحدت کا دشمن تصور کیا جاتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہندوؤں کا جذبۂ قومیت دن بہ دن بڑھ رہا ہے اور ان میں سیاسی بیداری کی لہر بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا ان کے نفسیاتی رجحانات ہر اس بات کے خلاف ہوتے جا رہے ہیں جسے دیس دروہی سمجھتے ہیں اس سلسلہ حقارت میں اردو درجہ اول اختیار کرنے کے باعث خمیازہ بھگت رہی ہے۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ ایک کانگریسی سیٹھ گووند داس نے اردو کو بھارت کے آئین میں جگہ دینے پر اعتراض کرتے ہوئے جب اس کا جواز پوچھا تو پنڈت جواہر لعل نہرو نے جواب دیا کہ "یہ میری نانی اور ماں کی زبان ہے" اور اس طرح اس کی ہمت افزائی کی۔ اسی طرح مغربی پنجاب سے نکالے ہوئے لاکھوں ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اسکی اعانت کی لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور انکی بے گھری اور زبوں حالی میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ تو انہوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔

آج کل اتر پردیش میں جو کبھی اردو زبان کا گڑھ تھا یہ عالم ہے کہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں بھی بمشکل دس فیصدی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس زبان کا بطور مضمون مطالعہ کیا ہو۔ کسی کالج یا یونیورسٹی میں کوئی اردو شعبہ ایسا نہیں جہاں اردو کلاسیں پابندی سے لگتی ہوں۔ حتیٰ کہ بی۔ اے کی سطح تک اردو ادب کے طلبا کی اکثریت کلاس نوٹس عام طور پر ہندی ہی میں تیار کرتی ہے۔ اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والوں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ اردو کی بدبختی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شمالی بھارت میں مسلمانوں ہی نے اس زبان سے ایسی اجنبیت اختیار کر لی ہے کہ انہیں نماز۔ روزہ سے آشنا کرانے کے لئے اب جماعت اسلامی ہندی میں کتب شائع کرنے لگی ہے۔

اگرچہ جنوبی ہند میں اردو کی حالت ابھی اتنی تشویشناک نہیں لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ جو زبان قومی اقتدار کی ترجمان نہ ہو۔ اگر وہ بیکسی کا شکار ہو تو اس میں کیا تعجب ہے۔ بھارت میں دوسری زبانیں اس لئے محفوظ ہیں کہ وہ دیش دروہی تصور نہیں کی جاتیں۔ آخر اردو کے لئے بھارت دشمن ہونا ضروری کیوں ہے؟ یہ دیس ہی تو اس کی جنم بھومی ہے جس سے اسے عقیدت اور پیار ہونا چاہئے لیکن یہ اس خوبی سے اس لئے محروم ہو چکی ہے کہ اردو ادب علاقائی اور قومی اقتدار کا نمائندہ ہونے کے بجائے غیر ملکی اقتدار کا ترجمان بن چکا ہے اور اس لئے بھارت کے لئے ایک اجنبی ادب کی حیثیت رکھتا ہے یہ ایک حقیقت ہے۔

کسی بھی وطن میں بدیسی ادب کے پھلنے پھولنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی مثال صرف بھارت میں ہی اردو نہیں بلکہ عرب و ایران میں بھی اردو ادب کی حیثیت ایک اجنبی ادب سے زیادہ نہیں۔ اس کے باوجود اسے اسلامی اقدار کا علمبردار سمجھا جاتا ہے!

اب لیجئے پاکستان میں اردو کو۔ اس کے بانی جناب جناح بابا نے اردو کو تو ہندی مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا لیکن باعث صد حیرت ہے کہ خود مسلمان ہونے کے باوجود اردو زبان سے عملاً نابلد ہی رہے اور تمام عمر انگریزی زبان کی آبیاری میں گزار دی۔ جس کے قول و فعل میں اس قدر تضاد ہو اسے اہل پاکستان "قائدِ اعظم" کہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کو موضوع تنقید بنانا بے سود ہے کیونکہ اس کے پیروکار ذہنی طور پر اس قدر مفلوج ہو چکے ہیں کہ ان پر منطق و شواہد کا کوئی اثر ممکن ہی نہیں۔

پاکستان کی تشکیل دو قومی نظریئے پر ہوئی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں جنہیں ایک جدا وطن کی ضرورت ہے جہاں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس پراپگنڈا کے زور پر پاکستان تو بن گیا لیکن اسلامی آئین نافذ نہ ہوا کیونکہ اس کی نوعیت سے کوئی بھی آگاہ نہیں تھا۔ ترقی پسند ادبا اور شعراء کے خیال میں اسلام اشترکیت سے ہم آہنگ ہے اور وہ اپنی ادبی سرگرمیوں سے ایسے نظام کی تدوین چاہتے تھے جس میں سرمایہ داری اور زمینداری کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ اس کے برعکس مسلم علما اس نقطۂ نظر کو مزدکیت کا احیا سمجھتے تھے جو ان کی نگاہوں میں کفر و الحاد کا دوسرا نام ہے۔ مولانا مودودی کا آئین اسلامی کے نفاذ کے لئے اصرار اس قدر زور پکڑ گیا کہ محمد علی جناح کو خود ایک بیان دینا پڑا جس کی رو سے اقرار کیا گیا کہ پاکستان کا دستور اسلامی ہوگا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ پاکستان میں تھیوکریسی (THEOCRACY) کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ واہ کیا بات ہے۔ حلوہ تو ہوگا لیکن میٹھا نہیں ہوگا۔ شہد تو ہوگا اس میں شیرنی نہیں ہوگی جناح نے ایسے اسلامیہ دستور کا اعلان کیا جس میں دین کے لئے حقیقتاً کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ بات اور ہے کہ مارچ 1949ء میں مجلس قانون ساز نے لوگوں کی منہ بندی کیلئے اسی نسبت سے ایک ریزولیوشن بھی منظور کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی مسلم لیڈر شپ کو دستور اسلامی سے بھی کوئی غرض تھی ہی نہیں۔ اسلام کی رٹ لگا کر اقتدار حاصل کرنا ایک بڑا کارگر نسخہ تھا جو جناح نے محض اپنے تاریخی تشخص کے لئے استعمال کیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے دور میں اسلامی قانون نافذ نہ ہوا۔ اگر تشکیل پاکستان کا مقصد یہ ہوتا تو یہ فریضہ ان کی زندگی ہی میں سر انجام پاتا۔ یہ محض ایک سیاسی کھیل تھا جو اسلام کے نام پر کھیلا گیا۔ اسلامی

آئین سے کسی کو کوئی عقیدت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مارشل ایوب خان نے 1962ء کے آئین میں ''اسلامی جمہوری پاکستان'' سے لفظ ''اسلامی'' حذف کرنے کی کوشش کی اور اسے صرف ''جمہوریۂ پاکستان'' نام دینا چاہا لیکن وہ علماء کے دباؤ کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ اتنا ہی نہیں پاکستانی سینیٹ نے حال ہی میں پاکستان میں دستور اسلامی کے نفاذ کو رد کر دیا اور حکومت کے کچھ سینیٹروں کو قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

آئین کا ادب پر گہرا اثر ہوتا ہے اگر ملک میں جمہوری قانون نافذ ہو تو ادب کی نوعیت عوامی ہوتی ہے کیونکہ شعرا و ادبا جو بھی کہتے ہیں اس کا تعلق عوامی مسائل و مشاہدات سے ہوتا ہے اور ان کی تجاویز سیکولر ہی ہوتی ہیں لیکن جب ملکی آئین آسمانی ہو تو ادب میں ارضی جذبات کا دخل کم اور خدائی آمریت کی مداخلت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے بھی قرآن سے ایک آیت ڈھونڈ نکالی (2:219) جس کا مدعا یہ بیان کیا گیا کہ اسلام ایسی دولت رکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو کسی شخص کی ذاتی ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس نظریہ کو ''اسلامی سوشلزم'' کا نام دیا گیا جس سے پاکستان میں ترقی پسند تحریک کو تقویت ملی اور یوں معلوم ہونے لگا جیسے پاکستانی سرمایہ داری اور جاگیرداری کو ترقی پسند ادب کا ریلا ہمیشہ کے لئے بہا کر لے جائے گا لیکن لوگ بھول گئے کہ بھٹو ایک جاگیردار تھا جس نے مذہب کو ذاتی اقتدار کے لئے استعمال کیا۔ ایسے نظام کو ختم کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ پاکستانی ادیب محض خوش فہمی کا شکار تھے۔ چنانچہ جب بھٹو کو پھانسی ہوئی تو ترقی پسند ادب کے پاؤں بھی ڈگمگا گئے۔ اجتماعیت کے گیتوں کی سلگتی ہوئی راکھ سے انفرادیت کے نغمے نمودار ہونے لگے جن کا جدیدیت کے نام سے استقبال کیا گیا۔

پاکستان کے لوگ مذہبی عقیدت سے اس قدر مرعوب ہو چکے ہیں کہ جب تک ان سے کوئی بات اللہ اور رسول یعنی عربی اقدار کے رنگ میں نہ کہی جائے ان کے ذہن میں اترتی ہی نہیں۔ جہاں ذہنیت اس قدر پسماندہ ہو چکی ہو وہاں کا ادب مقامی اور شعوری اقدار کا ترجمان نہیں ہو سکتا جو کہ ادبیت کی شرط اولین ہے۔ اردو ادب عرب و ایران کا ایک دم چھلہ ہونے کے سبب بھارت اور پاکستان کے لئے اجنبیت کا علم بردار بن کر رہ گیا ہے۔ جس طرح یہ مسلمانان ہند کی ناکامی کا باعث بنا۔ جس طرح یہ بنگلہ دیش کی تخلیق اور متعلقہ ظلم و ستم کا سبب ثابت ہوا اسی طرح یہ پاکستانی انتشار کی وجہ بھی بنے گا۔

اردو کو ایک زندہ و جاوید ادب کا نمائندہ بنانے کی صرف ایک ہی ترکیب ہے اور وہ یہ کہ اسے مذہب اور بیرونی اقدار کی غلامانہ پیروی سے آزاد کرا کر ایک قومی جذبات اور مسائل کا ترجمان بنایا جائے۔

بقیہ : تبصرۂ کتب : بانو کی کہانیاں

ہے اور شعوری طور سے ہر منظر سے انھوں نے درس آفریں تجربات اخذ کئے ہیں۔ اس لیے جس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں اس میں ان کے تجربات کے ساگر کا امرت تاثیر کا رس گھولتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کا اسلوب سادہ، پیرایۂ بیان دلکش اور سچائیوں سے عبارت ہے۔ برصغیر سے دور مغرب میں اقامت گزیں عورتوں کے مسائل کو خاص طور سے انھوں نے موضوع بنایا ہے۔ اس کے باوجود وطنی الفت کی جھلک بھی ان کی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ بانو ارشد نے مسائلِ نسواں کو ہر زاویہ سے پرکھ کر عورت کے کردار کو بڑی توانائی عطا کی ہے۔ ''تم'' اس کتاب میں پہلی کہانی خود کلامی کے انداز میں محررہ مصنفہ کی آپ بیتی لگتی ہے۔ ''مٹر پلاؤ'' میں ایشیائی تہذیب کو بہت خیال انگیز پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ''وہ کون تھی'' میں ایک ماں اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں اپنی لٹتی عصمت کا ذکر ایک جرنلسٹ سے کر دیتی ہے۔ بیٹا اس راز کو منکشف ہونے کے خوف سے جرنلسٹ عورت کا قتل کر دیتا ہے۔ اسی طرح ''ماش کی دال'' میں دو لڑکیوں کی ہم جنسی کی حد تک دوستی کا ذکر ہے۔ ایسے اذکار مغربی فضاؤں میں تو مقبول ہو سکتے ہیں لیکن مشرق میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ حقیقتاً جنسی تعلقات اور سے ان پیدا شدہ مسائل پر قلم اٹھانا بڑی دلیری اور جرأت کا کام ہے جن کو بانو نے اپنی کہانیوں میں نمایاں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محبت، شادی یا طلاق وغیرہ میں عموماً عورت ہی خسارے میں رہتی ہے۔ بانو ارشد نے ایسے تمام حالات کا بڑی ژرف بینی سے مطالعہ کیا اور انہیں کہانی کا روپ دیا جس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی ملی ہے۔ ہر کہانی کا پلاٹ مضبوط اور قصہ پن لیے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ ان کہانیوں کی کامیابی کا ایک اور راز ان کا اختصار اور غیر فیصلہ کن اختتام ہے جس کو وہ اپنے قاری پر چھوڑتی ہیں۔ امید ہے کہ ان کے پہلے مجموعے کی طرح ان کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ بھی معقول پذیرائی حاصل کرے گا۔

OOOOOO

مشتاق انجم کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ

تلاش

انشاء پبلی کیشنز سے طبع ہو کر

عنقریب منظر عام پر آرہا ہے۔

رابطہ : ۲/۱۱، ہیم گھوش لین۔ شب پور ہوڑہ-۱۱۱۰۲/

تبصرہ کتب

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں)

نام کتاب : ہوری کا دوسرا جنم
مصنف : مانک ٹالا
قیمت : ۷۵روپے
ناشر : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔۹، گولامارکیٹ، دریاگنج
نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

''ہوری کا دوسرا جنم'' گوپال کرشن مانک ٹالا کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ مجموعہ میں اکیس طنزیہ مزاحیہ افسانوں کے علاوہ متفرقات کے تحت ان کے مختصر ترین مضامین ہیں۔ آخر میں ''تخلیقی ادب کا نباض'' عنوان سے ڈاکٹر کیول دھیر کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

''مادھو لال حسین'' اخوت اور اتحاد باہمی پر لکھے گئے سیکڑوں مضامین میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ مانک ٹالا تقسیم ملک کے بعد ہجرت کا کرب لئے ہوئے ہندوستان وارد ہوئے تھے۔ یہاں آکر بھی انہوں نے ہر جگہ بدامنی اور افراتفری کا ماحول پایا۔ ایسے پر ہول حالات کے تناظر میں لکھی گئی ایسی وقیع تحریر خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے باغبان پورہ (نزد لاہور جوان کا وطن بھی تھا) کے چراغوں والے میلے کا ذکر کیا ہے۔ یہ میلہ انسانیت کی قدروں اور محبتوں کے لازوال رشتوں کی یادگار کے طور پر ہر سال لگتا ہے۔ میلے کے ضمن میں مشہور ہے کہ لال حسین ایک مجذوب تھے اور مادھو نام کا برہمن زادہ ان کا مرید تھا۔ تقسیم ملک سے ملی تعصب اور نفرت کی سوغات کا مادھو بھی نشانہ بن چکا تھا۔ ایسے میں ایک روز لال حسین اپنے ہی ہاتھوں اپنے مرید کی جان بچاتے ہوئے خود بھی واصل بحق ہو گئے تھے۔ ''مادھو لال حسین'' اسی واقعہ کی تصویر ہے۔ جسے مانک ٹالا نے بڑی سچائی اور ادبی دیانت سے بے کم و کاست پیش کیا ہے۔

''ہوری کا دوسرا جنم'' سماجی ناہمواریوں اور دھرم کرم کے نام پر غربا کے ناروا استحصال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قصہ کا مرکزی کردار ''ہوری'' پریم چند کے ناول گئودان سے مستعار ہے۔ افسانے میں جہاں جہاں گئودان کے اقتباس بھی درج کئے گئے ہیں۔ ناول سے ... آزاد ہندوستان میں بھی ترقیاتی منصوبوں کے نام پر عوام کی لوٹ۔ معاشرے میں پچھلی حد سے فزوں ضعیف الاعتقادی بے معنی رسومات کا دخل اور قرض خواہ مہاجنوں کے مظالم نے عوام کی کمر توڑ رکھی ہے۔ پنڈتوں کی اس درجہ سنگدلی کہ متوفی ہوری کی فاقہ زدہ بیوہ سے اس کی آخری پونجی صرف بیس آنے دھرم کے نام پر اینٹھ لینے میں مہاراج جی کو کوئی تامل نہیں ہوتا۔ قصہ کا پلاٹ حزینہ فضاؤں سے معمور ہے اس لئے براہ راست دل پر اثر کرتا ہے۔ زبان سادہ اور قصہ سلجھا ہوا ہے۔ کسی طنزیہ یا مزاحیہ تحریر کی مقبولیت اور کامیابی کا انحصار حقیقت نگاری اور بے ساختگی پر ہوتا ہے۔ یہ رنگ ''ہوری کا دوسرا جنم'' میں کچھ زیادہ ہی شوخ ہے۔

اس کے علاوہ ''زقند کرر'' مانک ٹالا کی سچی اور بے ساختہ تحریر کا یہ عکس بھی لائق ستائش ہے۔ ''ایک جگہ چکنی مٹی کے ایک نہایت سڈول ماڈل کے بدن پر بکینی کی بہار دیکھ کر ہمارا وضو ٹوٹ گیا'' اس جملے کی برجستگی اور وسعتِ مفہوم کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مغربی طرز حیات جس میں عریانیت اور حیاسوز جنسی بے راہ روی عام ہے۔ مانک ٹالا نے بڑی مہارت سے اسے ایک دلچسپ کہانی کے پیرائے میں پیش کر کے اس مدقوق سماج کا خاکہ اڑایا ہے۔ اسی قبیل کے دوسرے افسانے ''تونگر حاجت مند''، ''پیرس ہائے پیرس''، ''سیر کرنا روما کے کھنڈروں کا''، ''مصر کی منڈی'' اور خاص کر ''غارت گر جنس وفا'' اسم بامسمّٰی نوعیت کے افسانے ہیں۔ بادی النظر میں یہ افسانے ممالک غیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ایسی مذموم فضا ہمارے ملک میں کہیں نظر آئے تو کیا اتنی ہی لائق نفرین نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب سوائے ہاں کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ مانک ٹالا نے شعوری طور پر ایسے حالات سے باخبر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ''نیلا کیوں پاگل ہوئی'' میں نیلا کے ڈیڈی مدن موہن کے ذوق ادب و موسیقی کے توصیفی ذکر کے ساتھ ساتھ ان کے اندر چھپے کیوپڈ کی برہنہ تصویر دکھاتے ہوئے نیلا کے پاگل ہو جانے کا ذمہ دار بھی انہیں کو ٹھہرایا ہے۔ انداز بیاں فطری اور عبرتناک ہے۔ اسی طرح متفرقات میں ''انسان'' اور ''ہائے بڑھاپا ہائے'' بھی عبرتناک قصے ہیں۔ جہیز کا بجٹ ہمارے سماج کا سلگتا ہوا ناسور ہے۔ ''سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں''، ''مہنگائی کا زراف'' اہل ملک کو آزادی کی خوشی میں ملنے والی سوغات ہے۔ ''امیروں سے نکر'' ایک مفید مشورہ ہے۔ ''ضرورت ایک شوھتری کی'' وزرا کی ضرورت سے زیادہ بھرمار پر تیکھا طنزیہ وار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مانک ٹالا اردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک نمایاں مقام پر فائز ہیں۔ ان کا اسلوب شگفتہ اور دلکش ہے۔ واقعہ نگاری فطری اور مکالمے برمحل اور برجستہ ہیں۔ افسانوں کی بنیاد سماجی۔ معاشرتی مذہبی اور سیاسی ناہمواریوں پر

ان کی ناگواریوں کا اظہار ہے۔ انہوں نے فرد اور سماج کے بے تکے، کمزور لیکن اہم پہلوؤں کی طرف پر زور طنزیہ اشارے کئے ہیں۔ مانک ٹالا کے افسانے ان کے ذاتی مشاہدات تجربات اور احساسات، کی ترجمانی کرتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں کسی جگہ اچانک چونکا دینے والی فضا نہیں ملتی بلکہ ہر قصہ نہایت سبک خرامی سے آگے بڑھتا ہے اور اس کا یہ تدریجی سفر کہیں سست یا ماند نہیں پڑتا۔ اور نہ ہی افسانوں کے پلاٹ یا فضا میں کسی قسم کے تصنع کا شائبہ محسوس ہوتا ہے۔ ان میں ایک خاص قسم کا بے ساختہ پن ہے جو قاری کو دعوت غور و فکر دے کر کچھ نہ کچھ کر گذرنے پر اکساتا ہے۔ یہی ان کے افسانوں کی کامیابی کا راز ہے۔

OOOOOO

کتاب کا نام : منظر نامہ (مضامین کا مجموعہ)
مرتب : ڈاکٹر ہمایوں اشرف
قیمت : ۲۰۰ روپئے
ناشر : علم و ادب پبلیکیشنز، حکیم شکور منزل
بھنور پوکھر، پٹنہ-۴
مبصر : مشتاق انجم

"منظر نامہ" معروف افسانہ نگار منظر کاظمی کی شخصیت اور افسانہ نگاری پر بیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر ہمایوں اشرف ہیں۔

کتاب کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے منظر کاظمی کے تین افسانے۔ ٹاور آف بے بی لون۔ سوگز پر دفن ایک کہانی اور طوطے بولتے ہیں بھی شریک کر لئے گئے ہیں اور ان پر جوگندر پال، ڈاکٹر جمیل اختر، ساغر برنی، ڈاکٹر عبد القیوم ابدالی کے تجزئے بھی ساتھ ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

منظر کاظمی کی شخصیت پر روشنی ڈالنے والوں میں پروفیسر لطف الرحمن، سید احمد شمیم اور ڈاکٹر محمد زکریا کے علاوہ ان کے شاگرد رشید اسلم پرویز اور منظر کلیم بھی شامل ہیں۔ مرتب نے منظر کاظمی کی گھریلو زندگی میں نہایت سلیقے سے جھانکنے کی کوشش کی اور تین مضامین "میرے بھیا" از افسر کاظمی، "میں کیا لکھوں" از نگینہ خاتون (شریک حیات) اور "میرے ابو" از رحمت پروین مجموعے میں شامل کرکے قارئین کو منظر کاظمی کی ذاتی زندگی کے شب و روز سے روشناس ہونے کا خوبصورت موقع فراہم کیا ہے۔

ایک انٹرویو بعنوان "منظر کاظمی سے ایک ادبی مکالمہ" از ڈاکٹر ہمایوں اشرف بھی موجود ہے جس سے افسانہ نگار کے خیالات و افکار سے آگاہی ہوتی ہے۔

منظر کاظمی کریم سٹی کالج۔ جمشید پور میں پرنسپل کی حیثیت سے درس و تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں۔ اردو کے بیشتر علمی، تہذیبی، ثقافتی اداروں سے انکی وابستگی ہے۔ بہار اردو اکادمی کی جانب سے افسانوں کے مجموعہ "لکشمن ریکھا" پر انعام بھی حاصل کر چکے ہیں۔ تیس سالہ ادبی زندگی کا ماحصل ان کے سترہ افسانوں کا یہ مجموعہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔

مجموعے میں شامل منظر کاظمی کی تین کہانیاں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہانی کہنے کے لئے قابل فہم علائم کا سہارا لیتے ہیں مگر بیانیہ پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ منظر کاظمی کے افسانوں کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ بیک وقت وہ دو سطحوں پر پڑھے جاتے ہیں۔ ایک سطح وہ ہے جس پر قاری محض کہانی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور عام سا ایک تاثر اخذ کر لیتا ہے۔ دوسری سطح وہ جو کسی قاری کو فکر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ان کی کہانی لکشمن ریکھا کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:-

"ایک واٹر ٹینک کی تیاری میں ہزاروں گاگریں ٹوٹتی ہیں اور اس ٹینک کو آگے بڑھنے کی علامت سمجھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں حالانکہ ان کے دل کے قریب ہی بعض لمحوں نے ایسے گھر بسا لئے ہیں جہاں شام ہوتے ہی گریہ وزاری اور نوحے کی دلخراش آوازیں آگے بڑھنے کی تمام علامتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہیں"۔

منظر کاظمی کے فکر و فن پر جو متوازن مضامین شامل کئے گئے ہیں ان میں منظر کاظمی کے افسانوں کا فکری تناظر از پروفیسر وہاب اشرفی، ایک نئی افسانوی روایت از پروفیسر قمر اعظم ہاشمی۔ داغ جگر کی نمود از شفیع جاوید۔ منظر کاظمی کی افسانہ نگاری از سید احمد شمیم۔ نئی جہت کا اشاریہ از یوسف جمال۔ منظر کاظمی کے علامتی افسانے از ڈاکٹر منظر اعجاز اور خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا از یوسف ناظم قابل ذکر ہیں۔ سلطان سبحانی اور تہذیب صدیقی کے لکشمن ریکھا پر تجزیاتی مطالعے بھی دعوت فکر دیتے ہیں۔

OOOOOO

نام کتاب آوارہ گرد
مصنف نند کشور وکرم
قیمت ۸۰ روپئے
ناشر پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز
جے-۶، کرشن نگر، دہلی-۱۱۰۰۰۶
مبصر : حیدر جعفری سید

۔ ۔۔۔ ر ر م حرمت اور مفاد پرستی سے بے نیاز ہو کر اردو زبان وادب کی خاموشی سے خدمت کر رہے ہیں۔ ان کا باقاعدگی سے شائع ہونے والا احوالہ جاتی مجلہ 'عالمی اردو ادب' نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی باذوق قارئین اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک اہم ضرورت بن چکا ہے۔ وہ 1984 سے ہر سال کے افسانوں کا انتخاب بھی باقاعدگی سے شائع کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے اردو کے اہم افسانہ نگاروں کو ہندی میں خوبصورتی سے متعارف کرایا ہے۔

نند کشور وکرم صاحب کا ایک ناول "یادوں کے کھنڈر" پہلے شائع ہو چکا ہے لیکن 'آوارہ گرد' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے بہت پہلے کے (تقسیم ملک کے آس پاس کے دور کے) لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں فن افسانہ نگاری کے مختلف تجربے تو نہیں ہیں لیکن افسانوں میں حسن زباں دبیاں کے علاوہ اس دور کی جھلکیاں ضرور نظر آئیں گی جو نئی نسل کے لئے خصوصی طور پر باعث دلچسپی ہو سکتی ہیں۔ نند کشور وکرم ترقی پسند تحریک کی وجہ سے غیر حقیقی تصورات و موضوعات سے گریز کرتے ہیں۔ جنگ، فرقہ پرستی، بیروزگاری، استحصال وغیرہ ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ظاہری تبدیلیوں کے باوجود ہم آج بھی ان مسائل سے دو چار ہیں۔ ان کے افسانوں میں تصنع، الفاظ کی بازی گری اور فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہیں۔ کہانیوں کا پلاٹ سیدھا سادہ اور اسلوب بیان واضح اور شفاف ہے۔ سادگی کے باوجود ان میں کہانی پن ہے، دلچسپی ہے۔ افسانوں کو پڑھنے کے بعد قاری غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو زندگی کی مثبت اقدار سے قریب تر محسوس کرتا ہے۔

'آوارہ گرد' میں پیش لفظ کے طور پر مصنف نے 'کہانی کی کہانی' اپنے منفرد انداز میں بیان کی ہے۔ افسانوں کے اس مجموعے کا انتخابی شعر۔

میں بھی حسینِ وقت ہوں جو کفر کے خلاف
میدان کربلا میں اکیلا لڑا کیا

ان کے اندر چھپے ہوئے شاعر کی غمازی کرتا ہے۔

OOOOOO

نام کتاب جہاں آرا (ناول)
مصنفہ وناشرہ کبریٰ بیگم
ملنے کے پتے (۱) دانش محل۔ امین الدولہ پارک
لکھنؤ-۲۲۶۰۱۸
(۲) بی-۲، گارڈن ریچ روڈ، مٹیا برج، کلکتہ-۲۴
قیمت ۷۵ روپیہ
مبصر ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

زیر نظر کتاب ایک تفریحی اور معاشرتی نوعیت کی ناول ہے۔ اس کے مرکزی کردار جہاں آرا اور نواب افضل ہیں۔ پورا قصہ انہیں کے ارد گرد گھومتا ہے۔ ضمنی کردار اطہر نواب۔ افسر نواب۔ سرور نواب۔ زینت آرا۔ نزہت آرا اور عالم وغیرہ ہیں۔ جن کی کوئی خاص فعالیت نظر نہیں آتی۔ اس میں مصنفہ نے نوابین مٹیا برج کی معاشرت اور تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ قصہ رومانی فضاؤں میں پروان چڑھتا ہے۔ لیکن انجام حزینہ فضاؤں سے معمور اور المناک ہے۔ اس لئے اثر کرتا ہے۔

مختصر افسانوں کے برعکس ناول نگار کا فن دشوار گذار وادیوں کا سفر ہے۔ اس لحاظ سے اس منصب کو نباہ دینا آسان نہیں ہے۔ حالانکہ کبریٰ بیگم کی نگارش کا یہ نقش اول ہے پھر بھی انہوں نے مٹیا برج میں مقیم نوابین کے اقدار روایات اور طرز معاشرت کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں ان کو بڑی حد تک کامیابی ملی ہے۔ بسا اوقات یہ خود مصنفہ کی آپ بیتی لگتی ہے۔ ناول میں نوابین کی قدیم روایات کی تلاش بے سود عمل ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے نصف اوّل سے آج تک کی معاشرت کا یہ صحیح روپ ہے۔ شادی بیاہ کی رسمیں، زبان اور لب ولہجہ حفظ مراتب کا لحاظ یہ سب لکھنوی دین ہیں۔ اس کے علاوہ شیعہ تہذیب کی گہری چھاپ ہے مثلاً مانجھے کے دن مجلس عزا کا انعقاد۔ حدیث کساء کی تلاوت۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں لکھنوی تہذیب کی جھلک نمایاں ہے۔ نفسیات نسواں ان کے زبان زد ٹکسالی محاورے پیش کرنے میں بھی مصنفہ کو خاص کامیابی ملی ہے۔ مصنفہ خود بھی اسی نواب خاندان کی فرد ہیں جس کا سب کچھ لٹ چکا ہے۔

OOOOOO

نام کتاب : واہ وا
مصنف : عبدالرؤف گرگٹ، گورکھپوری
ملنے کا پتہ : دوکان ڈاکٹر دلشاد بھائی محلہ خونی پور گورکھپور
قیمت : ساٹھ روپیہ
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

گرگٹ طنز ومزاح کے نہایت زود گو اور پر گو شاعر ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں انہوں نے کوئی بات نثر میں نہ کہہ کر اشعار کی صورت میں کہی ہے۔ یہاں تک کہ کتاب کا نام، سنہ اشاعت، مطبع، قیمت، کتاب ملنے کے پتے انتساب اور اپنا تعارف وغیرہ سب کچھ منظوم ہے۔ ابتدائے کتاب میں گرگٹ نے متعدد دانشوروں، اعزاء اور احباب وغیرہ کا ایک ایک شعر میں شکر ادا کیا ہے۔ پھر چار قطعات حمد کے، ایک مختصر سی نعت، اس کے بعد منقبت کے اشعار ہیں، صفحہ تیس سے نظمیں ہیں اور آخر میں کلام گرگٹ پر اہل قلم کے

توصیلی کلمات ہیں۔ پولیس کی کارکردگی، ڈاکٹروں کی عدم توجہ اور مریضوں
کی خستہ حالی، جہیز کی رسم، چوراچکے، لاٹری کی کمائی اور کرایہ کا مکان۔ جیسے
مضامین ان کے عنوان شاعری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سماج کے ایسے
سلگتے ہوئے ناسور ہیں جنھوں نے حیات انسانی کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔
گرگٹ نے ان سبھی کے کمزور اور بے تکے پہلوؤں کو ابھار کر ان کی روش سے
اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ نظم "چور اور مرشد" گلستان سعدی کی حکایت کا
اردو ترجمہ ہے۔ نظم "شب خیز یئے" کا یہ بند ملاحظہ کے لئے پیش ہے جس
سے ان کے رنگ و آہنگ کا پتہ چلتا ہے۔ لفظوں کی متوازن نشست، لہجہ کی
رمی، زبان کی چاشنی اور سچائی کی جیتی جاگتی تصویر یوں پیش کی ہے۔

اس سے بہتر ہے کہ اب دنیا میں تاریکی رہے
آدمی کی ہر سیہ کرتوت ان دیکھی رہے
'شی' رہے بے شرم تو بے باک تر کچھ 'شی' رہے
بے لباسی میں لباسوں کا گماں باقی رہے

گرگٹ بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں مثلاً نظم "کون سالا کہتا ہے" میں جج کے روبرو ملزم کے منہ سے یہ جملہ نکل جاتا ہے۔ یہی جملہ اس نظم کا عنوان بھی ہے۔ ملزم اپنی اس غلطی کی تاویل یوں پیش کرتا ہے

میں نے تو کہا تھا کون سا۔ لا۔ کہتا ہے
آپ نے سنا صاحب کون سالا کہتا ہے

گرگٹ زبان اور بیان پر قدرت تامہ رکھتے ہیں۔ بیان کی صفائی جرأت مندی، سماج کی زہرناک سچائیاں، اخلاقی گراوٹ غرضکہ مسائلِ حیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر ان کی گہری نگاہ نہ ہو۔ اس کا ایک موقع پر انہوں نے اظہار بھی کیا۔

گرگٹ ہوں ہر اک پیڑ کی شاخوں پہ چڑھا ہوں

گرگٹ کے مزاح کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ مختلف النوع افراد، جماعتوں اور پیشوں سے صحیح واقفیت رکھتے ہیں اور ان کے قول و عمل کے تضاد کو پیش کر کے انہیں آئینہ دکھاتے ہیں۔ ان کے تجربات میں وسعت اور ہمہ گیری ہے اور وہ مزاح پیدا کرنے کے وسائل پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ کلام تعقید و ابتذال سے یکسر پاک ہوتا ہے۔ "واہ وا" تعمیری اور صلاحی نوع کی تخلیق ہے۔ ان کا رنگ و آہنگ دوسرے طنز نگاروں سے جدا ہے جس سے ان کی فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

OOOOOO

نام کتاب : سحر آہنگ
مصنف و ناشر : سید احمد سحر
ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
۳۱۰۸، گلی عزیز الدین وکیل
کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی-۶
قیمت : سو روپیہ
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

سحر آہنگ سید احمد سحر کے قطعات، متفرق اشعار حمد و نعت اور غزلوں پر مشتمل ان کا پانچواں مجموعۂ کلام ہے۔ لیکن بنیادی طور سے وہ غزل کے شاعر ہیں اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ

زمانہ چاہئے مشاقی کو اس کی سحر
کہ اتنا سہل نہیں حسنِ انتظامِ غزل

سحر نے زندگی کے ہر نشیب و فراز کو دیکھا، پرکھا اور برتا ہے۔ اس لئے ان کی غزلوں میں ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات کے علاوہ کثرت مطالعہ اور تخلیقی صلاحیتوں کی وسیع دنیا نظر آتی ہے۔ نگاہ دور رس اور شعور کی پختگی کی بنا پر وہ معمولی سے معمولی مضمون کو بڑا حسین اور دلفریب پیکر عطا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ سحر کی غزلوں میں غم جاناں اور غم دوراں کی کسک، حالات حاضرہ کا عکس اور خود ان کی زندگی کی تصویر نمایاں ہے۔ اشعار میں کلاسیکی رنگ اور روایت کی پاسداری کے ساتھ جدید رجحانات اور روز افزوں بدلتے ہوئے حالات کا حسین امتزاج قوس قزح کا رنگ بکھیرتا اور دیدہ و دل کو فرحت عطا کرتا ہے۔ اشاروں اور کنایوں میں بات کرنے کا لطف بھی، علایم و استعارات کی تہہ داریاں بھی اس کے علاوہ ذہن و فکر پر دستک دینے والا لطیف طنز بھی ان کی غزلوں کا خاصہ ہیں۔

جہاں میں چار طرف امن و آشتی ہے سحر
لہو لہان پرندے کہاں سے آئے ہیں

سحر رجائیت کے پیغامبر ہیں اس لئے کشمکش حیات سے گھبرانے کے بجائے بالعزم رہ کر زندگی کی مثبت قدروں کو تلاش کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ہر پست حوصلہ کو یہ مشورہ بھی دیتے ہیں۔

جب عنانِ غمِ ہستی نہ سنبھالی جائے
تو سادھی کسی جنگل میں لگالی جائے

سحر سیاسی قسم کے اشعار کہنے کے خوگر نہیں ہیں پھر بھی ان کے کلام میں ایسے اشعار نظر آہی جاتے ہیں جن میں حالات حاضرہ کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔

جس نے بازاروں کو لوٹا بن گیا سالار قوم
جس نے معبد ڈھا دیئے وہ چار رہبر بن گیا

OOOOOO

نام کتاب : ڈائرکٹری اردو اخبارات ورسائل ۱۹۹۸ء
مرتب : مودود علی صدیقی
ناشر : آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس (رجسٹرڈ)
۴۳۷۳، دکھنی رائے اسٹریٹ، دریاگنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت : ۳۰۰ روپئے (صرف ممبروں کو دستیاب)
مبصر : رضوان احمد

آج ہندوستان میں جتنے اخبارات شائع ہو رہے ہیں ان سب کی تفصیلات پر مشتمل ڈائرکٹری مرتب کر دی ہے جو چار سو چونتیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ڈائرکٹری انگریزی زبان میں ہے۔ لیکن اردو اخبارات کی ڈائرکٹری انگریزی میں شائع ہونے کا جواز ہے۔ اشتہاری ایجنسیوں کے لوگ یا سرکاری اداروں میں بیٹھے ہوئے افراد اور بڑی بڑی کمپنیوں کے افسران اردو نہیں جانتے۔

اگر وہ اخبارات کو اشتہارات دینا بھی چاہیں تو ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اب جناب مودود صدیقی نے یہ ڈائرکٹری فراہم کر دی ہے کہ لوگ جان سکیں کہ ہندوستان میں اردو اخبارات کی تعداد کتنی ہے، اشاعت کتنی ہے۔ انکے علاوہ نیوز ایجنسیوں کے پتے، ریاستی اردو اکیڈمیوں کے پتے، اخبارات کی انجمنوں کے پتے، پرنٹنگ پریس اور کاغذات فراہم کرنے والی ایجنسیاں، پی آئی بی کے علاقائی دفاتر، ریاستی تعلقات عامہ کے پتے، جامعات میں اردو جرنلزم کہاں کہاں ہے وغیرہ وغیرہ ایسی تمام معلومات اس کتاب سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ چونکہ مودود صدیقی صاحب نے نصف صدی صحافت میں گزاری اسلئے انکے تجربات سے بہت مدد ملی ہے۔ ایک طرح سے وہ خود ہی اخبارات کا جیتا جاگتا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایسی کوئی کتاب ہندوستان کی کسی بھی زبان کی صحافت کی موجود نہیں ہے۔ مودود صدیقی صاحب کی بدولت یہ فخر پہلی بار اردو کو حاصل ہوا۔ یہ کتاب بہت ہی پر از معلومات ہے۔ مجھے صرف اس میں ایک ہی کمی نظر آتی ہے وہ یہ کہ اردو کے اخبارات ورسائل ہندوستان ہی نہیں پاکستان، سعودی عرب، انگلینڈ، امریکہ اور جرمنی سے بھی شائع ہوتے ہیں اگر ان کے پتے بھی اس میں شامل کر دیئے جاتے تو اس افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ جب آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس آئندہ اس کتاب کی اشاعت کرے تو یہ کمی بھی دور کر لی جائے تو بہت اچھا ہو۔ اس سے کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ مودود صدیقی صاحب نے آج بڑا کام تن تنہا دو برسوں میں مکمل کیا اور اس کے لئے کوئی معاوضہ لینا قبول نہیں کیا۔ اردو صحافت کے تئیں ان کی یہ بے لوث خدمت ہے۔

OOOOOO

نام کتاب : شیشے کے کھلونے
تحریر : رفعت شمیم
قیمت : ۵۰ روپیہ
ملنے کے پتے : ۱۔ IPTA انڈو پاک تھیٹر ایسوسی ایشن۔
۱۳۵ چپلین روڈ۔ ویمبلی۔ انگلینڈ
۲۔ قلم پبلی کیشنز، ۱/۱۷، ایل، آئی جی کالونی کرلا (مغربی) ممبئی
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

"شیشے کے کھلونے" امریکی ڈرامہ نگار ٹینیسی ویلم کے مشہور ڈرامہ گلاس مینجری سے ماخوذ چھ مناظر پر مبنی اردو ڈرامہ ہے۔ یہ امریکہ کے علاوہ ممبئی میں بھی کئی بار اسٹیج پر دکھایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی زبان کے ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اکثر تراجم نفس مضمون کو ایسا پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ اصل اپنا سارا حسن کھو دیتا ہے۔ رفعت شمیم نے اس امر کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو انگریزی سے اخذ کر کے اردو قالب میں اس چابکدستی سے ڈھالا ہے کہ اس میں اصل کی سی روح در آئی ہے۔ اور یہ اردو کی لائق قدر اساس بن گیا ہے۔ ڈرامہ میں یوں تو چار کردار متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔ شیلا، میرا، راہو اور راج۔ لیکن ایک پانچواں کردار شیل کا شوہر۔ میرا اور راہو کا والد بھی ہے۔ جس کا سوائے اس کی تصویر کے کوئی پتہ نہیں پھر بھی اس کا غیر مرئی وجود ڈرامہ کے پھیلاؤ اور رچاؤ میں محسوس ہوتا ہے۔ یہی اس ڈرامہ کا خاص وصف ہے۔ ڈرامہ میں ہلچل کی فضا تو ہے لیکن کہیں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ ڈرامہ کا اختتام المیہ پر ہوتا ہے۔ زبان صاف ستھری ہے۔ عام فہم ہندی اور اردو الفاظ کا حسین امتزاج بھلا معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے اسے پسندیدہ نگاہوں سے پذیرائی ملے گی۔

OOOOOO

نام کتاب : بانو کی کہانیاں
مصنفہ : بانو ارشد
قیمت : ۱۵۰ روپیہ
ملنے کا پتہ : دنیائے ادب، سی بی ۴۵، الفلاح سوسائٹی۔
شاہ فیصل کالونی۔ کراچی ۷۵۲۳۰
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

بانو کا تعلق اس تھانوی خاندان سے ہے جو اپنی ادب پروری کے لحاظ سے مشہور ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ تصنیف و تالیف کا فن انھیں ورثہ میں ملا ہے شاید غلط ہوگا۔ بانو ارشد "سیروا فی الارض فانظر وا کیف کان عاقبۃ المجرمین" کی جیتی جاگتی تفسیر ہیں۔ انھوں نے متعدد ممالک کی سیر کی

بقیہ صفحہ ۵۵ پر

فلمی مضمون

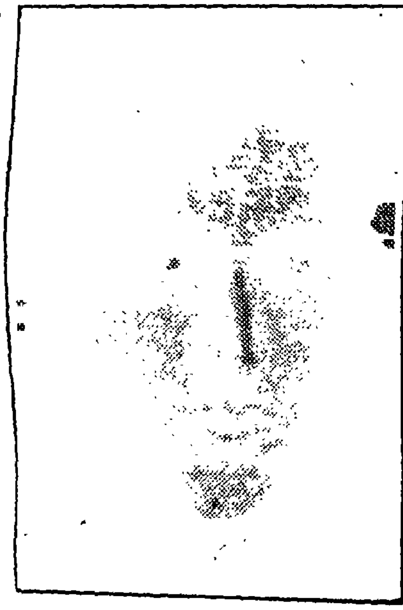
"بین الاقوامی سراپا اور جادوئی شخصیت ——— رتیک روشن!"

انیس النبی - ساکار "سی" ۷۰۷، کلیان کمپلکس، یاری روڈ، اندھیری (ویسٹ) ممبئی - ۶۱

سپر اسٹار رتیک روشن حیرت انگیز داستانوی شہرت کی وسعت کا تعین، ممکن نہیں! پچھلے تیس برسوں میں تین سپر اسٹارز۔ راجیش کھنہ، امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان نے اپنی چمک دمک سے فن کے آسمان کو رونق بخشی۔ مگر ان تینوں کو سپر اسٹار کی کرسی تک پہنچنے میں خاصا وقت لگا۔ انگنت عروج وزوال کے ہچکولے کھانا پڑے، بڑے بینرز، کامیاب ڈائرکٹرز، بہترین گیت و سنگیت اور چند واسکرپٹ کے حصول کیلئے نت نئے منی پلیشن اور استحصالی سیاست کا بھی سہارا لینا پڑا، فنی صلاحیت اور تکنکی ہنر مندی کے علاوہ کشش، وجاہت اور ہیروازم کا سحر انگیز دور کافی دنوں بعد مذکورہ سپر اسٹارز کی پرسنالٹی میں نظر آئے۔ لیکن سارے میڈیا رتیک کی طوفانی شہرت کے قائل ہوگئے کہ امیتابھ سے شاہ رخ تک کسی کو بھی رتیک جیسی روشنی نصیب نہ ہوئی۔ رتیک کے سلسلے میں عوام کا جنون دیکھ کر فلمی مبصر اور مورخ حیرتی ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے!؟

پچھلے دنوں فلم اسٹار گوندہ کی چار سالہ بیٹی کی سالگرہ تھی اس نے ضد کی کہ جب تک رتیک روشن اسکی برتھ ڈے پارٹی میں نہیں آئیگا وہ کیک نہیں کاٹے گی۔ ڈے نائٹ شوٹنگ سے تھکا ماندہ گوندہ اپنی بیٹی کی اس ناقابل عمل فرمائش سے پریشان ہوگیا، سمجھایا۔۔۔ جھنجھلایا اور پھر ازلی ٹٹو کے آگے ہتھیار ڈال کر رتیک کی تلاش میں نکل پڑا، کافی دیر تک کی کوشش کے بعد فون پر رابطہ ہوا۔ گوندہ نے سارا ماجرا کہہ ڈالا۔ رات کے دس بج رہے تھے، رتیک شوٹنگ کر رہا تھا۔ ڈائرکٹر سے دو گھنٹے کی مہلت لیکر میک اپ کرنے کے بعد جو ہو کے فائیو اسٹار ہوٹل "سنتور" پہنچا۔ گیارہ بج رہے تھے، سارے مہمان رتیک کی معصوم اور ضدی پرستار کے اردگرد موجود تھے اس نے جب اپنے پسندیدہ ہیرو کو اپنی پارٹی میں دیکھ لیا، تب کیک کاٹنے کی رسم پوری کی۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد گوندہ نے کہا "اس دن مجھے معلوم ہوا کہ سپر اسٹار کسے کہتے ہیں۔!"

تنقید کے پردے میں تضحیک پسند حاسد افراد، رتیک کی موجودہ کامیابی کا سہرا اسکے ڈائرکٹر ڈیڈی راکیش روشن کے سر باندھ رہے ہیں۔ ان سب کا کہنا ہے کہ رتیک کو جو شہرت ملی، اس میں بہترین ہدایت کاری بہترین ٹیم ورک، قابل دید لوکیشن و فوٹو گرافی، دل کو چھو لینے والے گیت، سنگیت، اور "دغیرہ دغیرہ" کو داخل ہے۔ انکی ایسی بے ربط اور بے وزن باتوں کے جواب میں فلم جگت کی تاریخ کے وہ اوراق میں الٹتا ہوں، جو وقت کی ہوا سے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ قریباً تیس بتیس سال پہلے ایکٹر ڈائرکٹر راجکپور نے اپنے بڑے بیٹے رندھیر کپور کو آر کے بینر کی فلم "کل آج اور کل" سے انٹروڈیوس کیا تھا۔ گریٹ شومین کے بڑے بیٹے کے روشن مستقبل کا معاملہ تھا، ظاہر بات ہے، اس فلم کو فنی، تکنکی



اور کاروباری نقطہ نظر سے پرکھنے کے بعد ہی انہوں نے ہمارے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ فلم پورے تام جھام سے ریلیز ہوئی، راج صاحب جیسے ماہر نباض ہدایتکار کی میوزیکل فلم تھی، "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق رندھیر کپور کی طے شدہ فنی صلاحیت پر یقین کر کے پورا ملک ٹوٹ پڑا تھا، لیکن کھودا پہاڑ نکلا چوہا کے مصداق آج رندھیر کپور محض چھوٹے چھوٹے سماجی جلسوں میں چیف گیسٹ کی کرسی پر سجانے کے کام آرہے ہیں۔ راج کپور اپنی اہلیت کی بنیاد پر مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ اور انکے صاحبزادے اپنی نااہلی کے سبب زندہ ہوتے ہوئے بھی مردوں کے زمرے میں گنے جاتے ہیں۔ ڈبو میاں کا حشر دیکھنے کے بعد راج کپور نے اپنے مجھلے بیٹے چنٹو (رشی کپور) کے لئے فلم "بوبی" بنائی۔ تاریخ گواہ ہے، ناظرین نے رشی کپور کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اور راجیش کھنہ کے بعد رومانٹک امیج میں انہیں قبول کیا۔ اور باصلاحیت اداکار

.. سا ران پور لے میسرے اور چھوٹے بیٹے چمپو(راجیو کپور) بھی جوان ہوگئے۔ راج صاحب نے آر کے فلمز سے "رام تیری گنگا میلی" ریلیز کی۔ فلم ہٹ ہوگئی، گانے ہٹ ہوئے، مندا کنی اپنی ساری حشر سامانی کی ساتھ ہٹ ہوئیں، لیکن راجیو کپور ہی ایسے نکلے جو ہٹ ہونے کے بجائے مٹ گئے۔! کیوں۔۔۔۔!؟

ایک ہی بینر، ایک ہی ڈائرکٹر، ایک ہی دماغ، ایک ہی ملک، ایک ہی ناظر! دو بیٹوں کے حصے میں زوال اور ایک کے حصے میں عروج کیوں؟ تو اس کیوں کا جواب یہ ہے کہ کلا کے بازار میں رشتوں کے بھاؤ نہیں، صلاحیت کی بولی لگتی ہے، جو جتنا باکمال ہوتا ہے۔ اس تناظر میں اب بھی اگر رتیک کے مقناطیسی وجود پر کوئی انگلی اٹھاتا ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ یہ جمہوری ملک ہے، ہر شخص کو بولنے کی آزادی ہے، کوئی کچھ بھی بولے! اسی پر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سنیل دت نے اپنے چھوٹے بھائی سوم دت کو ہیرو بنانے کے لئے فلم "من کا میت" بنائی تھی۔ ریلیز کے پہلے ہفتے ہی میں عوام نے سوم دت کے گمنام مستقبل کا مژدہ سنادیا، اور ونود کھنہ کو شہرت کے مینار پر کھڑا کردیا۔ اس طرح فیروز خاں نے خوابیدہ حسن کے مالک اپنے دلنواز بیٹے فردین خان کے لیے فلم "پریم اگن" بنائی، ریلیز ہوئی اور ایک ہی ہفتے کے اندر فردین کا کیریر برباد ہوگیا۔ اور باصلاحیت کلاکاروں کی بھیڑ میں بیچارہ کچل کر رہ گیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شہرت کی دولت، نسبت سے نہیں، فطری صلاحیت سے ملا کرتی ہے، ورنہ گمنامی کی فہرست میں رتیک کا نام بھی درج ہو جاتا۔!

میں اپنی باتوں کے اظہار کے لئے بار بار موازناتی انداز سے گریز کرتا چاہتا ہوں۔ ضروری نہیں کسی فنکار کو برتر ثابت کرنے کیلئے دوسرے فنکار کو کمتر سمجھا جائے۔ میرے اس مضمون کا بقیہ حصہ رتیک کے ماضی اور حال کا نہ صرف سرسری مطالعہ ہے، بلکہ خوش آئند مستقبل کا اشاریہ بھی ہے!

لوگ کہتے ہیں کہ رتیک کے کسرتی بدن کو بنانے میں سلمان خان کا ہاتھ ہے۔ اس بات میں صداقت بس اتنی سی ہے کہ سلمان کے ذاتی جمنانہ



میں رتیک بھی ورزش کرتا تھا۔ سلمان کو ورزش کے لئے پارٹ ضرورت تھی۔ اس نے اپنے بچپن کے دوست رتیک روشن کا پارٹنر رتیک پہلے سے ہی ورزش کیا کرتا تھا، بلکہ بچپن سے ہی اسکا ذہنی میلان ورزش کی طرف تھا۔ زیر نظر تصویر میں ایک دبلے پتلے رتیک روشن دیکھئے جو اپنے دبلے پتلے بازوؤں کو گٹھیلا بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ بوںہے فلم انڈسٹری میں ڈانس کے صرف دو ہی "ٹرینڈز" چل رہے تھے، ایک پربھودیوا ٹرینڈ اور دوسرا گووندہ ٹرینڈ۔۔! رتیک روشن کی فطری بلندی کا عالم یہ ہے کہ اس نے پہلی فلم سے ہی تیسرا ٹرینڈ پیش کیا۔ اور راتوں رات چھا گیا۔ یہ کوئی اتفاق نہیں، بلکہ خداداد صلاحیت کی جادوگری ہے! اس کے ساتھ ڈانس کرنا ہر ماڈرن لڑکی کا خواب ہے بحیثیت ڈانسر رتیک روشن کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ چار برس کی بچی سے لے کر چالیس برس کی عورت تک اسکے ساتھ ڈانس کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی ہیں۔
ظاہر ہے کہ فلم "کہو نہ پیار ہے" میں رتیک نے رقص کا جو سریلا سماں طاری کیا، اسکی تیاری روا روی میں نہیں ہوئی بلکہ یہ زبردست نفسیاتی ہوم ورک کا حاصل ہے۔ رتیک روشن کی اداکاری کے تعلق سے سب یہی کہتے ہیں کہ رتیک سے پہلے کوئی بھی اداکار فلم میں اتنا کیمرہ فری نظر نہیں آیا۔ اس کی بیساختگی کی پہلی اہم وجہ تو یہ ہے کہ وہ پیدائشی اور فطری اداکار ہے۔ لیکن دوسری وجہ یہ ہی ہے کہ "کہونا پیار ہے" میں کام کرنے سے پہلے پورے پانچ برس تک اپنے والد راکیش روشن کیساتھ انکے اسسٹنٹ کے طور پر اس نے کام کیا ہے۔ اس بات کا چشم دید گواہ خود راقم الحروف ہے! آج سے چار سال قبل "کمالستان اسٹیڈیو" میں فلم "کوئلہ" کے شاندار سیٹ پر رتیک روشن کو میں نے راکیش روشن کے اسسٹنٹ کے طور پر ایک مہینے تک کام میں مصروف دیکھا تھا۔ گویا کہ کیمرے کے سامنے کھڑے ہونے سے پہلے کیمرے کی تکنیکی نزاکتوں سے رتیک بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ اور باقاعدہ براہ راست اداکاری سیکھنے اور کیمرہ سے اجنبیت دور کرنے کیلئے اسنے انوپم کھیر کی اداکاری والے اسکول کے علاوہ ایک اور اسکول میں بھی داخلہ لیا تھا۔ اسکے علاوہ اداکاری میں نکھار پیدا کرنے کیلئے خود اپنے گھر پر بھی کافی سخت محنت کیا کرتا تھا۔ ڈائیلاگ کی عمدہ ادائیگی کیلئے رتیک نے ہندی کیلئے اور اردو زبان کیلئے ٹیوشن بھی لئے تاکہ سین کے تقاضے کو سمجھنے میں اردو زبان سہارا بنے۔ علمی اور نصابی اعتبار سے بھی وہ کافی بھرا پڑا ہے۔ بمبئی کے سڈنہم کالج سے فرسٹ کلاس گریجویشن کرنے والے رتیک روشن کو کمپیوٹر گرافکس کیلئے اسکالرشپ بھی ملی تھی۔

ہمارے ملک اور بیرون ملک کے کروڑوں نوجوان لڑکے لڑکیاں، جو رتیک روشن کے دیوانے ہیں، وہ اگر اپنے محبوب اداکار کی طرح پابندی

بقیہ صفحہ ۵۰ پر

احوال و اخبار

غزل سنگر جگجیت سنگھ کو عالمی امن ایوارڈ

"موسیقی برائے امن" کے لئے ہندوستان کے مشہور غزل گلوکار جگجیت سنگھ کو امریکہ میں گولڈ میڈل سے نوازا گیا ہے۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا ایوارڈ ہے۔ میوزک فار ورلڈ پیس سوسائٹی کے چیئر مین ڈاکٹر چمن کھکری نے اس ایوارڈ کے لئے جگجیت کا انتخاب کیا کیونکہ ان کے مطابق جگجیت نے اپنی غزل گائیکی کے ذریعہ دنیا کو امن کا پیغام دیا۔ جگجیت سنگھ فی الحال امریکہ میں ہیں اور انہیں یہ ایوارڈ امریکہ میں ان کے پروگرام کے بعد دیا گیا۔

☆ لندن میں اردو کانفرنس۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔
☆☆ کانفرنس کے منتظمین کو انگریز اردو دان نے جھاڑ پلا دی۔
☆☆☆ افتخار نسیم غالب کو لونڈا باز ثابت کر رہا تھا۔

26 فروری کو تحریکِ اردو کے زیرِ اہتمام اردو کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا۔ یہ کانفرنس لندن کے چند اہل زبان نے مل کر کی تھی۔ کانفرنس میں ابتدائیہ خطبہ اس اجلاس کے نظامت کار نے اپنی فصیح انگریزی میں دیا۔ اس کے بعد تحریک اردو کے صدر صاحب اسٹیج پر آئے اور انہوں نے انگریزی میں لکھا ہوا مضمون پڑھا۔ تیسرے نمبر پر ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیو کو جو کہ اردو زبان کے ماہر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں اسٹیج پر بلوایا گیا۔ انہوں نے اسٹیج پر آتے ہی منتظمین پر چڑھائی شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ عجب اردو کانفرنس ہے جو انگریزی زبان میں ہو رہی ہے اور تمہاری انگریزی بھی ایسی ہے جو انگریزوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ انہوں نے اپنی اردو تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ برطانیہ میں اردو کے مسائل صرف یہاں کے اردو ادیب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان سے بلوائے گئے ادیبوں کو یہاں کے مسائل کا کوئی علم نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اردو تقریر کے بعد اردو کانفرنس کے منتظمین نے اردو کانفرنس کی کاروائی کا آغاز اردو زبان میں شروع کر دیا۔ امریکہ سے آئے ہوئے مہمان نسیم کا جب نام پکارا گیا تو موصوف کے بارے میں بیشتر حاضرین کو دھوکہ ہو گیا کیونکہ نام، وضع لباس اور چال سے لوگوں کو معلوم نہیں ہو تا کہ افتخار نسیم موصوف ہیں یا کہ موصوفہ۔ محترم یا محترمہ نسیم نے غالب کی امرد پرستی پر ایک مضمون پڑھنا شروع کر دیا۔ افتخار نسیم کا تعلق GAY کلب سے ہے۔ وہ غالب کو لونڈے باز ثابت کر رہا تھا۔ اس مضمون کا تعلق اردو کے مسائل سے ہرگز نہیں تھا۔ ڈاکٹر وحید اختر نے اچھا مضمون پڑھا لیکن اردو زبان کے جو مسائل انہوں نے بیان فرمائے تھے ان کا تعلق پاکستان سے تو ہو سکتا ہے لیکن برطانیہ سے ہرگز نہیں۔ دیگر احباب کے مضامین کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ اس کانفرنس میں موضوع کے اعتبار سے صرف اوسلو سے آئے ہوئے مہمان ادیب سعید انجم کا مضمون قابل ذکر تھا۔ جس میں موصوف نے یورپ کی افسانہ نگار خواتین کی تخلیقات کو نمایاں کیا۔ اس مضمون کی حاضرین نے خاطر خواہ پذیرائی کی۔ اصل بات یہ ہے کہ تحریکِ اردو کو ملینیم کے حوالے سے پانچ ہزار پونڈ کی گرانٹ ملی تھی اس گرانٹ کو ٹھکانے لگانے کے لئے یہ سارا کھیل تماشہ تھا۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔

واضح ہو کہ اس کانفرنس میں قیصر تمکین۔ ساقی فاروقی۔ بخش لائل پوری اور ڈاکٹر خالد حسن قادری وغیرہ نے شرکت نہیں کی۔ ڈاکٹر میتھیو جو کہ لندن یونیورسٹی میں ایک مدت تک اردو کے استاد رہے ہیں، کا اشارہ انہیں، لوگوں کی طرف تھا۔ مزید برآں مشہور مستشرق مسٹر رالف رسل نے بھی شرکت نہیں کی۔

مرسلہ : شاہد سلیم (لندن)

ناروے میں جمشید مسرور کو ایوارڈ

ناروے کے مشہور شاعر جمشید مسرور کو اوسلو کی شہری حکومت کی طرف سے ۱۹۹۹ء کے لئے ادب کا "پرائڈ آف پرفارمینس" (Pride of Performance) ایوارڈ دیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک میڈل اور تین لاکھ روپے کی مساوی ناروتج کرنسی پر مشتمل ہے

اوسلو کے سی حال میں ایک سو سے زیادہ مشاہیر ناروے کے لئے ایک پرتکلف لنچ کا اہتمام تھا۔ ایک رنگا رنگ تقریب کے بعد لارڈ میئر نے تمام ایوارڈ تقسیم کئے۔

رضوان احمد کی ادارت میں پٹنہ سے ہفتہ وار "عظیم آباد ٹائمز"

(پٹنہ) ممتاز اردو صحافی رضوان احمد نے بہار اردو اکاڈمی کے سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد یہاں سے ہفتہ وار "عظیم آباد ٹائمز" کے اجرا کا اعلان کیا ہے۔ اخبار کی قیمت فی کاپی ۲ر روپے اور زر سالانہ ایک سو روپے ہے۔ اخبار کے دفتر کا پتہ درج ذیل ہے: عظیم آباد ٹائمز۔ دار لاقبال۔ اولڈ فریڈرس لین، درزی ٹولہ، پوسٹ بانکی پور، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار) فون: ۶۷۱۳۰۰۔ ۰۶۱۲

تازہ ترین اطلاع کے بموجب رضوان احمد دوبارہ ۳ سال کی مدت کے لئے بہار اکاڈمی کے سکریٹری بنا دیئے گئے ہیں۔

نوئیڈا میں ادبی شام

۸/ مئی ۲۰۰۰ء اردو فاؤنڈیشن نوئیڈا کا جلسہ رفعت سروش کے

۔ں ،ر عزیں پڑھی لیں۔ ابتدا میں نوجوان افسانہ نگار اقبال مہدی نے اپنا افسانہ پڑھا اس افسانے کا مرکزی خیال موجودہ معاشرے میں عورت کی بے بسی تھی جس میں اسے کہنے کو تو مالکن کہا جاتا ہے مگر اسے کسی بات کا حق نہیں ہوتا۔ اس افسانے کو اہل محفل نے بے حد پسند کیا۔ بحث کی ابتدا او شوانا تھ طاؤس نے کی اور فرمایا کہ بہت دنوں بعد ایک اچھی کہانی سننے کو ملی جسکی زبان اور جذبات نگاری قابل تعریف ہے۔ مظہر امام نے کہا کہ کہانی میں زبان کے ساتھ اس کی ادائیگی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اقبال مہدی کا پڑھنے کا انداز بے حد قابل تعریف ہے۔ رفعت سروش نے کہا کہ اقبال مہدی جو کردار لکھتے ہیں اسکی زبان پر انھیں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ڈرامائی عناصر ہیں۔ بحث میں شیخ سلیم احمد، قمر سنبھلی اور شبانہ نذیر نے بھی حصہ لیا۔

اقبال مہدی کے افسانے کے بعد رفعت سروش نے ایک انشائیہ پیش کیا جس کا عنوان تھا "نظر انداز کرنے کا فن"۔ اس انشائیہ کی زیریں لہر یہ تھی کہ آج کے معاشرے میں لوگ اپنے محسنوں کو نظر انداز کرنے کے ماہر ہیں اور ادبی منظر نامے میں بھی ناقدین کے حوالے سے یہ روش عام ہے۔ انشائیہ بہت پسند کیا گیا۔

اس کے بعد ایک شعری نشست منعقد ہوئی۔

(رپورٹ۔ ناصر نذیر)

[redacted] ٹالا کو صدمہ بیوی کا انتقال

(ممبئی) نامور افسانہ نگار جی کے۔ مانک ٹالا کی رفیقۂ حیات آٹھ دس ماہ کی پُر عذاب علالت (Cancer of Pancrease etc.) کے بعد ۱۷ مارچ کو مالک حقیقی سے جا ملیں۔ وہ ۶۹ سال کی تھیں۔ ۴۹ سال کی رفاقت کے بعد اپنے شوہر کو مفارقت کا زخم دے گئیں۔

ادارۂ انشاء مانک ٹالا صاحب کے غم میں شریک ہے۔

شاعر قتیل شفائی علیل — دعائے صحت کی درخواست

عالمی شہرت یافتہ شاعر اور مشہور فلمی نغمہ نگار حضرت قتیل شفائی دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر ۲۵ اپریل سے لاہور کے ایک ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ قتیل صاحب کے تمام چاہنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ قتیل صاحب کے لئے دعائے صحت فرمائیں۔

☆ ف۔ س۔ اعجاز، مدیر "انشاء"۔ کلکتہ ☆ نارنگ ساقی (نئی دہلی)

کلکتہ میں وفیات

مدیر "انشاء" کے بہنوئی حفیظ الرحمن صاحب کا انتقال

میرے بہنوئی جناب حفیظ الرحمن تقریباً ۷۲ سال کی عمر کو پہنچکر ۱۶ اپریل کو اسمبلی آف گاڈ چرچ اسپتال (کلکتہ) میں انتقال فرما گئے۔ کیر ...ں وا ...ں دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔

انھیں اسلامیہ اسپتال کی ICU میں داخل کیا گیا جہاں ڈاکٹر کی ہر کوشش باوجود ان کا مرض پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ انفلوئنزا ہوا اس قابو پالیا گیا تو بلڈ شوگر اور یوریا کی مقدار حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ پھر قلب کا دوسرا اور تیسرا دورہ پڑا۔ دواؤں کے اثر سے خون کے خلیوں نے سینے میں پانی جیسا مواد بنانا شروع کر دیا۔ ۱۶ اپریل کو اسے۔ جی۔ چرچ ہسپتال منتقل کیا گیا لیکن اسی شام ان کا انتقال ہو گیا۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور آخری درجات بلند کرے۔ مرحوم کے پسماندگان میں ۵ بیٹے اور ۳ بیٹیاں ہیں۔

یہ تمام عرصہ ہمارے خاندان کے لئے ذہنی اور جذباتی پریشانی کا تھا۔ حفیظ الرحمن صاحب میرے چچازاد بھائی بھی تھے۔ میری ہمشیرہ ۱۳ سال قبل انتقال فرما گئی تھیں۔

ف۔ س۔ اعجاز

شہود عالم آفاقی کی اہلیہ کا انتقال

کلکتہ کے سینئر شاعر شہود عالم آفاقی کی اہلیہ کافی دنوں سے بیمار تھیں۔ ۱۰ اپریل کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

منور رانا کے والد چل بسے

کلکتہ کے نامور شاعر جناب منور رانا کے والد ماجد سید انور علی رانا صاحب اپنے آبائی وطن رائے بریلی میں کافی دنوں سے زیر علاج تھے۔ وہ ڈائلاسس پر تھے۔ وسط اپریل میں موصوف انتقال فرما گئے۔

بازغ بہاری کی بیٹی کا انتقال

کلکتہ کے مقبول و معروف شاعر طنز و مزاح جناب بازغ بہاری کی جواں سال شادی شدہ بیٹی اپنے پانچویں بچے کی ولادت کے بعد جسم میں خون کی کمی کے سبب غیر متوقع طور انتقال کر گئیں۔

ثقلین حیدر نہ رہے

عالمی شہرت کے مالک مشاعروں کے نقیب جناب ثقلین حیدر ۱۰ مئی کو کلکتہ میں انتقال فرما گئے۔ موصوف کی نقابت عوام بہت پسند کرتے تھے۔ وہ اپنی نقابت سے مشاعروں کو زعفران زار بنا دیا کرتے تھے۔ ہر صورت حال کے لئے موزوں اشعار، لطائف اور مذہبی حکایات انہیں غیر معمولی طور پر ازبر رہا کرتی تھیں۔

اہل انشاء سے درخواست ہے کہ وہ تمام متوفیان کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ خدا مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

GEM

بریف کیس
سائیکل گدی
و بیگ وغیرہ میں
... ہونے والے
... کے
بہترین چرواں ریوٹ

جیم
(رجسٹرڈ برانڈ)

گولڈن انجینئرنگ کارپوریشن
کلکتہ ۷۰۰۰۰۹ ۔ فون :

Vol : 15
Regd No D 103/99
Postal Regn WB/CC 550
JULY - AUG 2003

ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ

ضخامت ۴۰۴ صفحات

قیمت 200 روپے (اندرون ملک) مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ
600 روپے (بیرونی ممالک) مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ

خوبصورت ڈی لکس ایڈیشن

بشمول پیشگی بذریعہ منی آرڈر / ڈرافٹ صرف بنام
"انشاء پبلی کیشنز" روانہ فرمائیں۔

کتاب پسند نہ آنے پر پوری قیمت لوٹا دی جائے گی۔

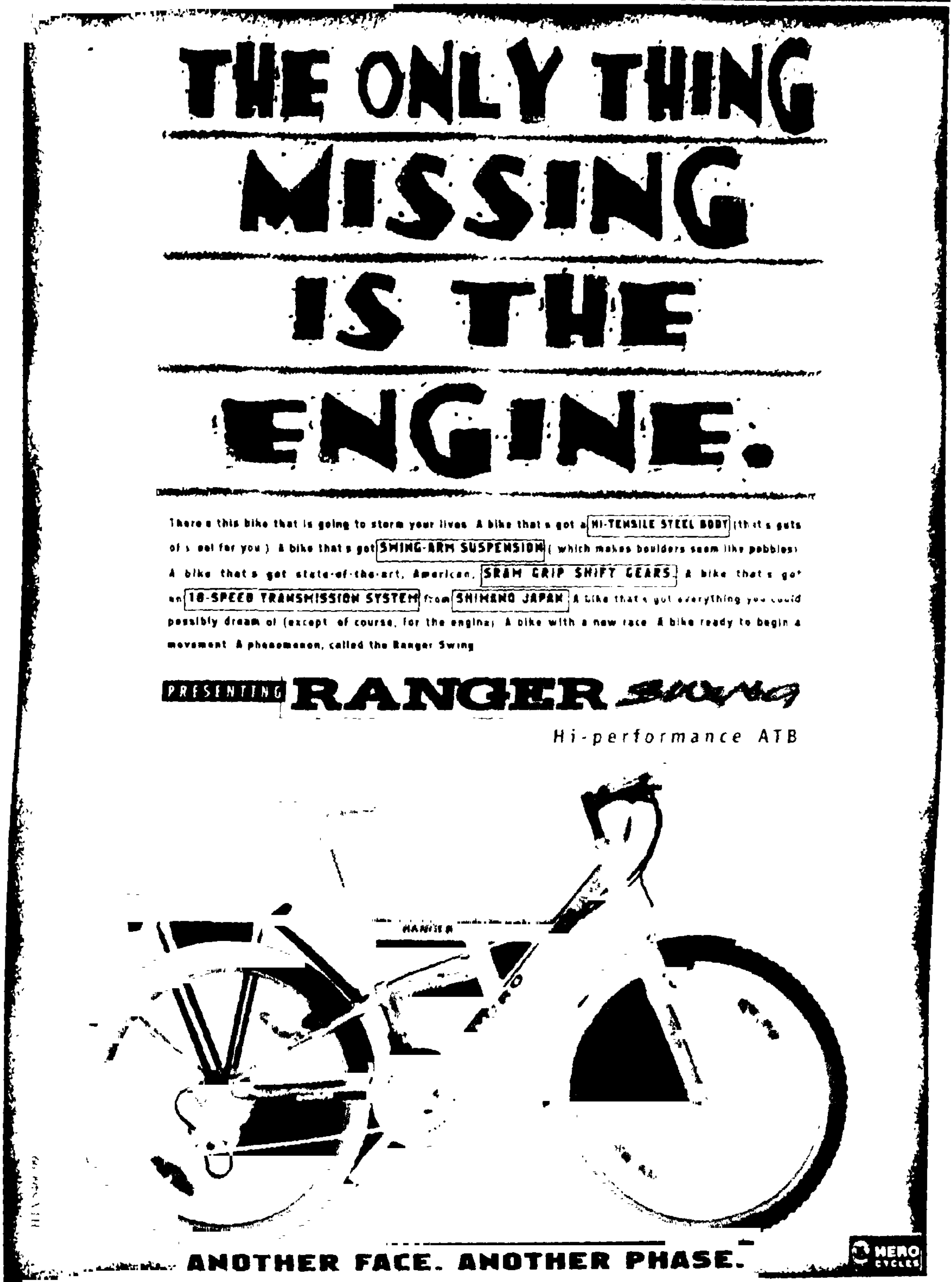
ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ

PRINTED AT INSHA PUBLICATIONS ... SEAL ST., CAL-73
PRINTED AND PUBLISHED BY EDITOR F. S. EJAZ FROM ... ZAKARIA ST. CAL ...

Vol : 15
Regd No. D 103 / 99
Postal Regn WB / CC-550

MAHNAMA INSHA
SEP - OCT 2000
Calcattey Ka Asri Adab Number

ISSUE · 9-10
R. N. I. Regn. No. 44083/86
ISSN : 0971 - 6009



PRINTED AT INSHA PUBLICATIONS 6-A, KANAI SEAL STREET, CALCUTTA - 700 073
PRINTED AND PUBLISHED BY F S. EJAZ FROM 25-B, ZAKARIA STREET, CALCUTTA - 700073 EDITOR F S EJAZ

M/s. Elite India Rubber Products Pvt. Ltd.

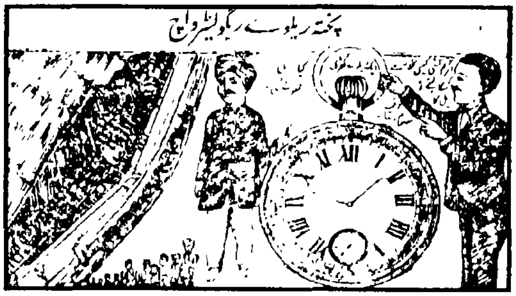
MANUFACTURER OF :
HAWAI CHAPPAL & M. C. SHEETS

64-C, Topsia Road, Calcutta - 700 046

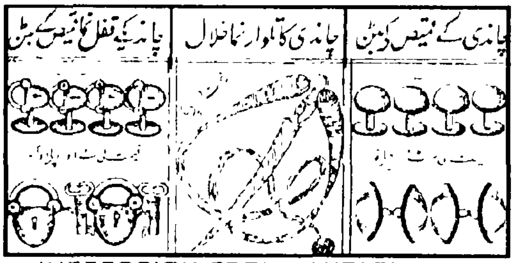
صدسالہ روایت : ایس۔اے۔بی۔بخشی کمپنی اور بخشی جنتری (۱۹۰۱ء-۲۰۰۱ء)



بخشی کمپنی کی اولین ایجادات میں عرق اکسیر اعظم، شربت اکسیر، سندری سہاگ تیل اور سرمہ نور نظر جیسی مایۂ ناز ادویات کے علاوہ سیکڑوں نادلٹی اشیاء مثلاً آلات موسیقی، ہارمونیم، سارنگی، بانسری، ستار گراموفون، فونوگراف، بچوں کے کھلونے، ٹرائی سائیکل، نقلی مونچھ داڑھی اور سر کے بال، حقہ، مخملی جانماز، کوٹ پتلون، زنانہ سلیپر، مردانہ و بچکانہ جوتے، امیٹیشن زیورات، سنیما بائسکوپ، کیمرہ، تھرمامیٹر، ڈاکٹری سامان، سگریٹ بنانے کی مشین، بال کاٹنے کی مشین، نوٹ کی چھڑی، چشمہ، دوربین، ہینڈ پریس، ربڑ اسٹامپ اور ہر قسم کی گھڑیاں، گھنٹے اور بے شمار دوسری چیزوں کی تجارت ہوتی تھی۔ جو اس زمانے میں نئی اور عجیب و غریب تصور کی جاتی تھیں۔ ہرچند کہ سائنس کی ترقی نے دنیا کی کایاپلٹ کر رکھ دی ہے۔ مگر زندگی کی کچھ قدریں ایسی ہیں جن میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہی میں سے ایک بخشی جنتری بھی ہے۔ جو اپنے بلند پایا مضامین اور مستند ترین قمری، شمسی، ہندی، بنگلہ، بکرمی، فصلی شاکاسمت اور پرویشٹہ سنہ کی تاریخوں کی بنا پر عوام کی روزمرہ کی زندگی کا ایک اہم جز اور ہر اردو ہندی داں کی ضرورت بنی ہوئی ہے۔ (بخشی جنتری ۲۰۰۱ء سے)



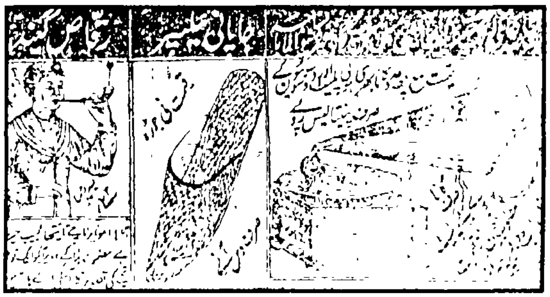
IMPRESSION FROM JANTARI 1901



IMPRESSION FROM JANTARI 1901



IMPRESSION FROM JANTARI 1901

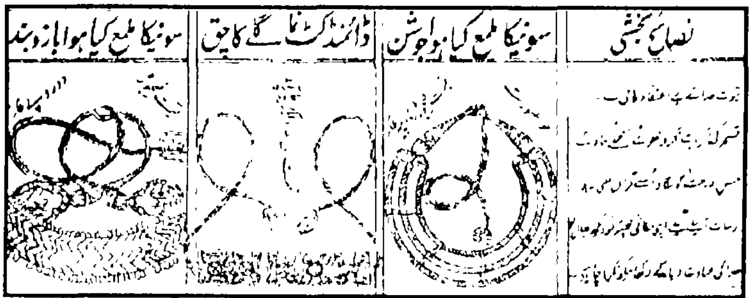


IMPRESSION FROM JANTARI 1901

بخشی کمپنی

ایس اے بی

مشرق کا قدیم اور نیک نام دوا ساز ادارہ۔

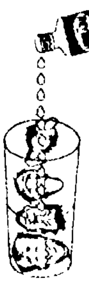


IMPRESSION FROM JANTARI 1907

جو عرصۂ دراز سے خلق خدا کی صحت کی نگہداشت میں مصروف ہے۔

۳۲، مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کولوٹولہ)، کلکتہ-۷۰۰۰۷۳

فون : ۲۳۷-۳۰۳۹ (۰۳۳ - ۹۱) / ۲۳۷-۷۶۳۶ (۰۳۳ - ۹۱)



اکسیر اعظم ڈراپ

سو برسوں سے آزمودہ۔ ہر قطرہ سکون و راحت کا سمندر۔ ہاضمہ کی خرابی، جگر کا ورم، پیٹ کا درد، کھٹی ڈکار، معدہ کی کمزوری، بدہضمی، دست، قبض، ہلکا بخار وغیرہ کو دور کرتا ہے۔

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

محکمۂ ترقیات و فلاح، حکومت مغربی بنگال

2/75۔اے، رفیع احمد قدوائی روڈ، کلکتہ-700016

حکومت مغربی بنگال نے ریاست میں اردو زبان وادب کی ترقی کے لئے یکم اپریل ۷۸ء کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی قائم کی، جس نے دسمبر ۷۹ء سے اپنی کارکردگی شروع کی اور ۸۱ء میں اسے خود مختار ادارے کا درجہ دے دیا گیا۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی، ترقیات و فلاح اقلیات، حکومت مغربی بنگال کے تحت کام کر رہی ہے۔ اپنے قیام سے لے کر اب تک اردو اکاڈمی نے ریاست میں اردو زبان و ادب کی بقا اور ترقی کے لئے ٹھوس اقدامات کئے ہیں اور محدود وسائل کے باوجود ریاست کے اردو داں عوام کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکاڈمی کی مختلف الجہات کارکردگی کا اشاریہ حسب ذیل ہے۔

اکاڈمی کی اہم سرگرمیاں

☆ ادبی اور نصابی کتابوں کی اشاعت۔
☆ بنگلہ اردو لغت کی اشاعت۔
☆ ممتاز ادبی شخصیتوں کو ان کی عدیم المثال ادبی خدمات کے لئے ایوارڈ۔
☆ ہونہار اور ذہین طلبہ و طالبات کو انعامات۔
☆ کل ہند اور مغربی بنگال سطحوں پر بہترین مطبوعات کو انعامات۔
☆ اردو کتابت مرکز۔
☆ اردو ٹائپ رائٹنگ مرکز جو مغربی بنگال میں اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد مرکز ھے۔
☆ بنگلہ اور اردو لینگویج کورس۔
☆ اردو لائبریری جو تیس ہزار سے زاید نایاب کتابوں اور نسخوں پر مشتمل ھے۔
☆ ریاست کی اردو لائبریریوں کو کتابوں کی صورت میں سالانہ گرانٹ۔
☆ اردو زبان کے فروغ کے لئے نیشنل کونسل، حکومت ہند کے اشتراک و تعاون سے کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر کا قیام۔
☆ کثیر الاشاعت ادبی سہ ماھی جریدہ "روح ادب" کی اشاعت
☆ ریاست میں تعلیمی معیار برقرار رکھنے کی غرض سے مدھیامك تك یکساں سوالناموں کی اشاعت۔
☆ شامِ ادب اور شامِ ڈرامہ سمیت ریاست کے مختلف حصوں میں ادبی اور ثقافتی پروگراموں کا انعقاد خاص طور سے طلبا اور طالبات کے لئے۔
☆ سیمینار، سمپوزم اور ڈرامے کا وقتاً فوقتاً انعقاد۔

شائق احمد
سکریٹری

RIH

KING
of the
KITCHENS

*A name that has been
spelling unrivalled superiority
in real Moghlai delicacies
since 1905*



Royal Indian Hotel

147, Rabindra Sarani, Calcutta - 700073
Telephone : 238-1073



شہر کلکتہ کی منتخب خوش ذائقہ
جنتا مٹھائیاں
سندیش
گلاب جامن
رس گلا
قلاقند
مِلک کیک
رابڑی
چم چم
پیسٹری نما مٹھائیاں
لڈّو
نمکینیات
مختلف اقسام کے حلوے
Janta Sweet MART
اپنے مہمانوں کی تواضع کے لئے دسترخوان کی
زینت بنائیے۔ ہر تہوار، تقریب، پکنک اور
سفر کے موقع پر جنتا مٹھائیاں نوش فرمائیے۔
جنتا سوئیٹ مارٹ ۵۳۔ اے، کبی تیرتھ سرانی، خضر پور، کلکتہ۔۷۰۰۰۲۳

نرم دلی دیکھی ہے۔ انہوں نے کرلا جیسے ادبی مرکز سے مجروح کے تعلقات کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ سب رنگ کرلا میں مجروح کی یادگار قائم کرنے کے لیے پہل کرے۔

جلسے کے کنوینر اشتیاق سعید نے ایک تعزیتی قرارداد پیش کی اور حاضرین دو منٹ کے لئے خاموش کھڑے رہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے مجروح کی رحلت کو بڑا ادبی سانحہ بتایا ان سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مجروح کی اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کلاسیکی ادب پر گہری نظر تھی اور غزل کے ساتھ ساتھ مجروح نے فلمی گیتوں کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ پروفیسر ابراہیم رنگلا، پروفیسر معین الدین جینابڑے، پروفیسر الیاس شوقی اور نوجوان شاعر عبید اعظم اعظمی نے مجروح سے اپنی اپنی مراسمت کا تذکرہ کیا۔

مرسلہ **اشتیاق سعید، ممبئی**

علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری اور منظر کاظمی کی یاد میں تعزیتی جلسہ

بزم ارباب ادب کی جانب سے علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری اور بہار کے افسانہ نگار منظر کاظمی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد دلکش بوکاروی کے دولت کدے پر ہوا جسکی صدارت عبدالرحمٰن مستانہ نے کی اور نقابت کے فرائض غیاث انجم نے انجام دیئے۔

ارشد اقبال انجم نے جعفری کی شخصیت اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ اُن کے انتقال سے ادب کی دنیا سونی ہوتی نظر آرہی ہے۔ وہ قومی یکجہتی کے علمبردار تھے۔ غیاث انجم نے جعفری کی شخصیت کو ادب کے ایک روشن مینارہ سے تعبیر کیا۔ مجروح سلطانپوری اور منظر کاظمی کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی گئی اور انکی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ یونس راہی، فاروق عادل، مرتضیٰ علی تنہا، دلکش بوکاروی اور ریاض احمد ریاض نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

مرسلہ **غیاث انجم** بزم ارباب ادب۔ بوکارو اسٹیل سٹی

اسلم جمشید پوری کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض

نئی دہلی نوجوان صحافی اور افسانہ نگار جناب اسلم جمشید پوری کو شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ان کے مقالے "آزادی کے بعد اردو افسانہ۔ فنی و فکری جائزہ 1947ء تا 1990ء" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔

اسلم جمشید پوری نے اپنا مقالہ پروفیسر شمیم حنفی کے عہد صدارت میں پروفیسر عظیم الشان صدیقی کی زیر نگرانی مکمل کیا۔ ان کے ممتحن پروفیسر صادق (دہلی یونیورسٹی) پروفیسر نصیر احمد خاں (جے این یو) اور ڈاکٹر محمد فیروز (راجستھان یونیورسٹی) تھے۔

اس موقع پر جامعہ اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن (دہلی) اور بزم ہمقلم (دہلی) نے موصوف کو مبارکباد دی ہے۔

مرسلہ **شاہ عالم**، دہلی

علی سردار جعفری کی رحلت پر تعزیتی جلسے

دھلی میں اردو فائونڈیشن کا جلسہ

نوئیڈا، ۱۷ راگست اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام علی سردار جعفری کے سانحۂ انتقال پر اظہار غم کیلئے ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جامعہ ملیہ کے پروفیسر ظفر احمد نظامی نے کی۔ اس موقعہ پر ابوالفیض سحر نے کہا کہ میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں سردار جعفری پر ایم۔ فل کیا تھا انھوں نے ذاتی حوالوں سے علی سردار جعفری کی گوناگوں خوبیوں کو اجاگر کیا۔ ظفر احمد نظامی نے اپنے مخصوص اسٹائل میں مقفّیٰ نثر میں سردار جعفری کا خاکہ پیش کیا۔

"عالمی علوم کا خزینہ تھے۔ علم و ادب کا دفینہ تھے۔ دوران عدالت موت سے لڑگئے۔ ہم سے بچھڑ گئے۔ لیکن تاریخ میں زندہ رہیں گے۔ دل کے نہاں خانوں میں تابندہ رہیں گے"۔

ضمیر حسن دہلوی نے سردار جعفری کے حوالے سے ان دنوں کو یاد کیا جب سرمایہ داری کے بائیں بازو کے دانشور ایک نئی قوت بن کر ابھر رہے تھے۔ شیخ سلیم احمد نے سردار جعفری کو ایک بلند پایہ شاعر اور نقاد قرار دیا۔ ہندی کے مشہور شاعر شیر جنگ گرگ نے کہا کہ جعفری صاحب نے ہندی اور اردو کو قریب لانے میں بہت کام کیا۔ وہ جتنے اردو کے تھے اتنے ہی ہندی کے بھی تھے۔ بیگم ہما حسن نے سردار سے خاندانی روابط کے حوالے سے کہا کہ وہ بہت کھلے دل کے انسان تھے۔ وہ بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ رفعت سروش، پی کے جین، نسیم مخموری اور شبانہ نذیر نے سردار جعفری کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

رپورٹ: **ناصر نذیر**، نئی دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام جلسہ

نئی دہلی 18 اگست "علی سردار جعفری کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ ان کی شاعری کے مخصوص اوصاف انسانی دوستی، رجائیت، انسان کی تقدیر کی عظمت پر یقین، حب الوطنی، قومی یکجہتی اور بین الاقوامیت" ہیں۔ "ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب سید شاہد مہدی نے کیا۔ وہ جامعہ کے زیر اہتمام "بیاد سردار جعفری" جلسے میں عہدۂ صدارت سے خطاب کر رہے تھے۔ سید شاہد مہدی نے مزید کہا کہ سردار جعفری کی نثری خدمات، ان کے شعری کارناموں سے کسی طور کم نہیں۔ ہمیں ان کی نثری خدمات پر زیادہ توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی نے علی سردار جعفری کی ہمہ جہت شخصیت کا تعارف پیش کیا۔ انہوں نے کہا "جعفری صاحب وابستگی کے ادب میں یقین رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت ہمیشہ متنازعہ رہی۔ پھر بھی وہ ہر حلقے میں ممتاز تھے۔ اب وہ نہیں ہیں تو ایسا لگتا ہے ایک عہد رخصت ہو گیا۔ تاریخ کا ایک دروازہ بند ہو گیا"۔

پروفیسر تقی حسین جعفری نے انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جب اردو میں جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی تو جعفری صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے جدیدیت کو ترقی پسند تحریک کی ہی توسیع قرار دیا۔ ہندی کے ڈاکٹر عبدل بسم اللہ نے اپنی تقریر میں علی سردار جعفری کی شاعری کو خالص ہندوستانی قرار دیا۔

تعزیتی قرارداد پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یہ جلسہ اردو زبان و ادب کی ہمہ جہت اور غیر معمولی شخصیت علی سردار جعفری (۱۹۱۳ تا ۲۰۰۰ء) کی رحلت کو برصغیر کی مشترک تہذیب اور زبان و ادب کیلئے ایک سانحہ تصور کرتا ہے"۔ انہوں نے مزید کہا کہ اپنے موقف و مسلک کی وضاحت و حمایت میں سردار جعفری نے نظم و نثر کی تقریباً ۱۵ رکتابیں اور لگ بھگ تین سو مضامین یادگار چھوڑے ہیں۔

نظامت کے فرائض ڈاکٹر شہپر رسول نے ادا کیے۔ اس موقع پر پروفیسر محمد طالب نے بھی انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ جبکہ مشہور شاعر زبیر رضوی اور ڈاکٹر احمد محفوظ نے بھی جعفری صاب پر مقالات پڑھے۔ محترمہ نیاز فاطمہ نے جعفری صاحب کی غزل کو ترنم کے ساتھ پیش کیا۔ محترم نظر برنی صاحب نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسے کے آخر میں علی سردار جعفری کی آواز میں ان کی کئی نظمیں سنوائی گئیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری اور اردو کے مشترکہ اہتمام سے علی سردار جعفری کی تصاویر اور تخلیقات پر مبنی ایک نمائش کا بھی انتظام کیا گیا۔

رپورٹ **اسلم جمشید پوری**، نئی دہلی

"بزم عترت" موتیہاری کا جلسہ

موتیہاری ۲ر جولائی ۲۰۰۰ء بزم عترت موتیہاری کی طرف سے ایک تعزیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت شاعر و افسانہ نگار ریٹائرڈ جج و صدر بزم عترت جناب جمیل الرحمٰن جمیلؔ صاحب نے فرمائی۔ جلسہ میں اردو، ہندی، بھوجپوری کے شاعر۔ کوی۔ افسانہ نگار۔ وکیل۔ تاجر ہر طبقہ کے دانشوروں نے شرکت فرمائی۔ جنرل سکریٹری بزم عترت جناب ظفرؔ مجیبی نے مرحوم کی ادبی خدمات کو سراہا اور انکی ادبی و سیاسی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مرحوم کو چند سال قبل بہار کی سرزمین نے محکمۂ راج بھاشا کی جانب سے توصیفی سند، نقرئی شجرِ عرفان و شال کے علاوہ ایک لاکھ اکیاون ہزار روپیہ کے مولانا مظہر الحق اعزاز سے نوازا تھا۔ ظفرؔ مجیبی نے کہا مرحوم نے اپنے قلم سے انقلاب کی شمع روشن کی۔

مرسلہ۔ **اظہرؔ حسین انصاری**۔ موتیہاری

شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی کی دو طالبات اسٹوڈنٹس کاؤنسل کے لئے نامزد

شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی کے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ امسال اسٹوڈنٹس کاؤنسل کے لئے شعبے کی دو طالبات کی نامزدگی عمل میں آئی ہے۔ شمیم محمد یعقوب شیخ اور اور رفعت سلطانہ محمد ہاشم بھارڈے کو بالترتیب وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر نے کاؤنسل میں نامزد کیا ہے۔ گذشتہ تین سال سے شعبۂ اردو کی نمایندگی اسٹوڈنٹس کاؤنسل میں ہو رہی ہے۔ اس سے قبل عدم توجہی کے سبب شعبۂ اردو کی نمایندگی نہیں ہو پاتی تھی۔ امسال ایک کے بجائے دو طالبات کی نامزدگی اس بات کا ثبوت ہے کہ شعبۂ اردو ترقی پذیر ہے۔ مذکورہ دو طالبات میں رفعت سلطانہ بھارڈے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ طالبات کیلئے مختص دو نشستوں میں سے ایک پر انھیں انٹرویوں میں کامیابی کے بعد پرو وائس چانسلر کی سفارش پر نامزد کیا گیا ہے۔

ممبئی یونی ورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر یونس اگاسکر کی خدمات کا اعتراف

ممبئی۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر، صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی کو دیرینہ تدریسی خدمات اور علمی و ادبی فتوحات کے پیش نظر ممبئی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر بھال چندر منگیسکر نے یوم آزادی کی خصوصی تقریب میں استاد جامعہ کی حیثیت سے بہترین کارکردگی کے لئے توصیفی سند اور ٹرانی سے نوازا۔ ناقد، محقق اور مراٹھی کے ماہر و مترجم ہونے کے علاوہ ڈاکٹر یونس اگاسکر گذشتہ تیس برس سے درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ اردو، انگریزی اور مراٹھی میں ان کی ڈیڑھ درجن مطبوعات منظر عام پر آچکی ہیں۔ اردو کا ادبی مجلہ سہ ماہی "ترسیل" بھی ان کی ادارت میں شایع ہوتا ہے۔

بہار کے صحافی کا انتقال

بہار کے پرانے اردو صحافی الحاج محمد شمس الہدیٰ استھانوی روزنامہ، "ہمارا نعرہ" پٹنہ کا مورخہ ۵ اگست ۲۰۰۰ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر ۶۷ سال تھی۔ ۱۹۵۰ء سے بہار کے صحافتی میدان میں جڑنے کے ساتھ ساتھ سماجی، تعلیمی، اور سیاسی میدان میں بھی تھے۔ کئی برس تک بہار اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ مرحوم نے بہار کی اردو صحافت میں ایک منفرد مقام بنایا تھا۔

مرسلہ **انوار الہدیٰ**۔ پٹنہ

سلطانہ مہر

کا لازوال کارنامہ

سُخن وَر

حصہ چہارم

شعرا و شاعرات

کے بھرپور تذکرے۔

ناشر:

مہربک فاؤنڈیشن

لاس اینجلس (امریکہ)

ارضِ مقدس میں چند روز

اے امیر النساء

کا

سفرنامہ

جو انشاء میں قسط وار شائع ہو کر بے پناہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے عنقریب کتابی شکل میں با تصویر شائع ہونے والا ہے۔

آئندہ شمارہ عید نمبر اپنی روایتی شان کے ساتھ دسمبر کے شروع میں شائع ہوگا۔

فارم نمبر ۴

۱۔ مقامِ اشاعت : کلکتہ

۲۔ وقفہ اشاعت : دوماہ

۳۔ پرنٹر : ف۔ س۔ اعجاز

• قومیت : ہندوستانی

• پتہ : ۶۔ اے کنائی سیل اسٹریٹ کلکتہ۔ ۷۳

۴۔ پبلشر : ف۔ س۔ اعجاز

• قومیت : ہندوستانی

• پتہ : ۲۵ بی زکریا اسٹریٹ کلکتہ۔ ۷۳

۵۔ ایڈیٹر : ف۔ س۔ اعجاز

• قومیت : ہندوستانی

• پتہ : ۲۵ بی زکریا اسٹریٹ کلکتہ۔ ۷۳

۶۔ ساجھیداری۔ (کوئی نہیں) واحد ملکیت۔ میں ف س اعجاز اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست اور صحیح ہیں۔ دستخط ف۔ س۔ اعجاز

احوال و اخبار

"مثنویِ وقت" اور "سوزِ دل" کے اعزاز میں ادبی تقریب

نیویارک کو اردو ادب میں اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں: مامون ایمن

نیو یارک میں حامد علی خان صاحب کی رہائش گاہ پر ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی جس میں معروف ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ اس تقریب کا مقصد ڈاکٹر مفوت علی مفوت کی اردو شاعری پر مبنی کتاب "مثنویِ وقت" اور انگریزی شاعری کی کتاب "TIAMBIC" اور ڈاکٹر سردار سوز کی کتاب "سوزِ دل" کی پذیرائی تھا۔

"مثنویِ وقت" پر مقالہ کراچی کی جانی پہچانی ادبی شخصیت پروفیسر ن م دانش نے پیش کیا جبکہ "TIAMBIC" پر تبصرہ پروفیسر مطیع الحق نے کیا جنہوں نے مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔ "سوزِ دل" کیلئے مقالہ سرور جاوید نے پیش کیا۔ اس موقع پر لدھیانہ (بھارت) کی ادبی تنظیم ساحر کلچرل اکیڈمی" کی جانب سے دنیا کی گیارہ معروف ترین ادبی ہستیوں کو اردو ادب کی خدمات کے صلے میں ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ "بہترین شاعر و ادیب" کا ایوارڈ مامون ایمن کو دیا گیا۔ ساحر اکیڈمی کے وائس پریذیڈنٹ مہندر سنگھ چیمہ ڈاکٹر کیول دھیر (جنرل سیکریٹری) یہ ایوارڈ دینے کے لئے لدھیانہ سے تشریف لائے تھے۔ مہندر سنگھ چیمہ نے اس موقع پر مامون ایمن کیلئے گولڈ میڈل کا اعلان بھی کیا۔

مامون ایمن کا شمار امریکہ کے ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے 1964ء میں امریکہ میں مشاعروں کی داغ بیل ڈالی۔ اردو زبان کے تلفظ اور رباعیات کے حوالے سے ان کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ ساحر کلچرل اکیڈمی نے ان کی خدمات کو محسوس کرتے ہوئے انہیں گولڈ میڈل اور ایوارڈ سے نواز کر حق ادا کر دیا۔ اس موقع پر مامون ایمن نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ اور گولڈ میڈل دراصل ان تمام ادبی افراد کو ملا ہے جو ان کے ساتھ یہاں امریکہ میں ادبی کاموں میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ جذبہ واقعی قابل تحسین ہے۔ مامون ایمن کی خدمات کو دیکھتے ہوئے بے اختیار کہنے کو دل چاہتا ہے "اردو کا تیشن۔ مامون ایمن"

محفل میں تسلیم کوثر، قمر علی عباسی، جمال قادری، الوار قادری، صبیحہ صبا، وکیل انصاری، ڈاکٹر مطیع الرحمٰن، ڈاکٹر شہلا، فرحت زاہد، زاہد سعید، ن۔ م۔ دانش کے علاوہ کئی نامور شخصیات موجود تھیں۔ بعد میں میوزک کا بھی انتظام تھا۔ اس محفل کے انعقاد پر حامد علی خان اور اس کی بیگم کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا گیا۔

اُردو یونیورسٹی میں متوسط اور نچلے طبقے کی تعلیمی ضروریات پر خصوصی توجہ

حیدر آباد یکم اگست۔ ملک کی پانچ اہم یونیورسٹیوں نے ایک پلیٹ فارم سے یک آواز مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے ساتھ ہمہ جہت تعاون کی فراخدلانہ پیش کش کی اور اس کے ساتھ ہی ممتاز دانشور اور ماہرین تعلیم نے متفقہ طور یہ فیصلہ کیا کہ اردو یونیورسٹی ابتدائی دور میں متوسط اور نچلے طبقے کی تعلیمی ضروریات پر خصوصی توجہ دے گی یعنی ابتدائی دنوں میں یہی یونیورسٹی کا تارگیٹ گروپ (استفادہ کنندگان) ہوگا۔ آنے والے وقتوں میں جب یونیورسٹی اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑی ہو جائے گی تو اعلا سطحی پروگرامس پیش کرے گی مگر موجودہ پس منظر میں معاشی طور پر کمزور طبقے پر زیادہ دھیان دے گی۔ یہ نکتہ مولانا آزاد یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد قومی سمینار میں طے کیا گیا جس کا موضوع "مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے فاصلاتی طریقہ تعلیم کے پروگرام، مستقبل کا لائحہ عمل اور دیگر یونیورسٹیوں کا تعاون" تھا۔ سمینار میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (تینوں نئی دہلی) یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی، ناسک، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی، حیدر آباد اور انجمن اسلام ممبئی کے سربراہان اور اعلا عصری تعلیم سے وابستہ ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی اور اردو یونیورسٹی کے ساتھ کسی بھی مرحلے پر ہر ممکن عملی تعاون کرنے کا یقین دلایا۔ دو اجلاس پر مشتمل پورے دن کے سمینار کی صدارت جامعہ ہمدرد کے چانسلر جناب سید حامد نے کی۔

مرسلہ **ڈاکٹر ظفر الدین**۔ پبلک ریلیشنز افسر (انچارج)
مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی۔ حیدر آباد (اے۔ پی)

پروفیسر شمیم جیراجپوری کو سائنس اکیڈمی کا ہرسروپ ایوارڈ

حیدر آباد ۱۲ راگست۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ممتاز سائنسداں پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کو ہرسروپ میموریل ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انہیں توصیفی سند اور نقد انعام سے نوازا جائے گا جبکہ وہ اپنی مرضی سے منتخب کئے گئے ہندستان کے کسی تعلیمی ادارے میں حیوانیات سے متعلق کسی ریسرچ موضوع پر ہرسروپ میموریل لکچر پیش کریں گے۔ پروفیسر شمیم جیراجپوری کو ہندستان کی سب سے معروف انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی، نئی دہلی کا یہ باوقار ایوارڈ دیے جانے کا فیصلہ اکیڈمی کی ایک اعلا سطحی کمیٹی نے کیا۔ یہ ایوارڈ اکیڈمی کی جانب سے ہر پانچ سال میں کسی نہایت اہم سائنسداں کو دیا جاتا ہے۔ پروفیسر جیراجپوری پہلے مسلمان سائنسداں ہیں جنہیں اس ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اُنہیں حال ہی میں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز کا فیلو منتخب کر کے ان کی خدمات کا عالمی سطح پر اعتراف کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد وہ انڈین سوسائٹی فار پیراسائی ٹولاجی کے صدر منتخب کئے گئے اور وزارت ماحولیات و جنگلات، حکومت ہند نے انہیں "پہلا جانکی اَمَل نیشنل ایوارڈ برائے ٹکسالومی اور حیاتیاتی اقسام" دیا۔ وہ ہندستان کی چاروں اہم اکیڈمیوں کے پہلے ہی فیلو منتخب کئے جاچکے ہیں۔

ڈاکٹر ظفر الدین۔ پبلک ریلیشنز افسر (انچارج)
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ حیدر آباد

شمیم طارق کی کتاب "شرف محنت و کفالت" کا استقبال

بھیونڈی۔ اردو کے معروف ادیب و شاعر جناب شمیم طارق کی اپنے موضوع پر اچھوتی اور منفرد کتاب "شرف محنت و کفالت" کے تیسرے ایڈیشن کے استقبال اور مسلم معاشرے میں کفالت عامہ کے تصور کو عام کرنے کے لئے اردو قبیلہ، بھیونڈی کے زیر اہتمام گزشتہ دنوں مینا تائی ٹھاکرے آڈیٹوریم میں ایک شایان شان استقبالیہ جلسہ عام کا انعقاد ہوا جو کفالت عام کے نام منسوب تھا۔

مرسلہ **اختر کاظمی**، بھیونڈی (مہاراشٹر)

تنویر ظہور لندن یونیورسٹی کے فیض سیمینار میں۔ دیگر تقاریب میں بھی شرکت کی

پاکستان کے معروف شاعر، ادیب، صحافی اور کالم نویس تنویر ظہور گزشتہ ماہ برطانیہ کے ایک ماہ کے ادبی دورے پر گئے تو ان کے اعزاز میں متعدد تقاریب منعقد ہوئیں۔ وہ فیض اکیڈمی لندن کی دعوت پر گئے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے لندن یونیورسٹی میں منعقدہ فیض سیمینار میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ سیمینار کی صدارت فیض احمد فیض کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی نے کی۔ سلیمہ ہاشمی کے مقالے کا عنوان تھا۔
"FAIZ REMEMBERED—A PERSONAL COLLAGE" جبکہ تنویر ظہور نے "فیض اور پنجابی" کے زیر عنوان اپنا مضمون پیش کیا۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض ممتاز نقاد حیدر طباطبائی نے ادا کیے۔ فیض اکیڈمی کے ڈائرکٹر معروف دانشور مجاہد ترمذی نے ابتدائی کلمات ادا کیے۔ سیمینار کے فوراً بعد پنجابی مشاعرہ ہوا جس کی صدارت معروف شاعر اور "جنگ" لندن کے سینئر صحافی ہمراز احسن نے کی جبکہ مہمان خصوصی تنویر ظہور تھے۔ نظامت چمن لال چمن نے کی۔ ممتاز شاعر اطہر راز نے حاضرین، مقررین اور شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

ہاؤنسلو مسلم آرٹ اینڈ کلچرل سوسائٹی نے بھی تنویر ظہور کے اعزاز میں ولنگٹن ڈے سنٹر ہاؤنسلو (لنڈن) میں مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس مشاعرے کا اہتمام طارق عزیز نے کیا اور مہمانان خصوصی بخش لائلپوری اور مجاہد ترمذی تھے۔

پنجابی ادبی سنگت لندن نے تنویر ظہور کے اعزاز میں مشاعرے کا اہتمام کیا اس موقع پر انہیں پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ایوارڈ پنجابی ادبی سنگت لندن کے صدر امین ملک اور رانی ملک نے پیش کیا۔ اس مشاعرے کی صدارت بخش لائلپوری نے کی۔

حیدر طباطبائی نے مجاز اکیڈمی کے تحت اپنی رہائش گاہ پر نشست کا اہتمام کیا۔ صدارت پروفیسر شریف بقا نے کی۔ ابتدا میں جتندر بلو نے مجروح سلطانپوری اور سعید انجم کے انتقال کے حوالے سے ان کی ادبی اور شاعرانہ خدمات کے بارے میں گفتگو کی۔

شاہد علی سید نے اپنی رہائش گاہ پر عشائیہ کا اہتمام کیا۔ جس میں تنویر ظہور نے اپنا اردو اور پنجابی کلام سنایا۔ مجاہد ترمذی ارشد لطیف، منظور نے بھی شرکت کی۔

ممتاز افسانہ نگار حمیدہ معین رضوی نے اپنی رہائش گاہ پر تنویر کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کیا۔ معین رضوی، طارق عزیز، مسز طارق عزیز اور نجمہ عثمان بھی شریک ہوئے۔ تنویر ظہور ایک ہفتہ کے دورے پر بریڈفورڈ بھی گئے۔ وہاں افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ نے تنویر ظہور کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا۔ صدارت بخش لائلپوری نے کی اور نظامت منصور آفاق نے۔ راچڈیل (مانچسٹر) میں صابر رضا نے "کاروان ادب" کے تحت تقریب کی۔ جس میں تنویر ظہور کو پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے 2000ء کا ایوارڈ پیش کیا گیا۔ مہمانان خصوصی بخش لائلپوری، اعجاز احمد، اور بوٹا خان راجس تھے۔

نئے ادب کی تعمیر پرانے رشتوں کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی

"صدی کو الوداع کہتے ہوئے" نئے انسانی رشتوں کی آواز ہے ——— مشرف عالم ذوقی

انسانی جینوم یعنی زندگی کی کتاب کو پڑھ لینے کا سائنس دانوں کی جانب سے ایک اعلان جو انسانی تجربوں کی وہ فتح ہے جس کے ساتھ ہی پہلی بار انسان نے بظاہر خدا کے دائرہ اختیار میں اپنی مداخلت کی پہلی مہر ثبت کی ہے۔ یقیناً آنے والے عہد میں ایک نیا سماجی ڈھانچہ ہمارے سامنے آئے گا۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ موت جیسی تلخ حقیقت کو انسان نے اپنے اختیار یا دسترس میں لینے کی جسارت کی ہے۔ D N.A کے بعد یوں بھی یہ دوسری فتح عظیم ہے جو انسانی رشتوں کے لیے بھی مستقبل میں نئے نئے چیلنج کھڑی کریں گی۔ "صدی کو الوداع کہتے ہوئے" اسی بدلے بدلے سماج کا آئینہ ہے جس میں نئے رشتوں کو بدلتے ہوئے عہد کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

"صدی کو الوداع کہتے ہوئے" ذوقی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ ذوقی نے اس کتاب کے بارے میں کہا۔ "میں سوچتا ہوں، یہ رشتے کھو گئے، تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ انسانی رشتوں کی Values کی نئی تعریفیں بھی تلاش کرنی ہیں۔ ایک طرف باپ بیٹی کے بلاتکار کے واقعات بڑھے ہیں، تو ایک دلچسپ سروے یہ بھی کہتا نظر آتا ہے کہ بیٹی کے لئے باپ زیادہ سمجھدار اور Loyal ثابت ہو رہا ہے۔ آج کی بیٹیاں ماں کی جگہ باپ کو اپنا دوست سمجھنے لگی ہیں اور اپنے ہر طرح کے معاملے بس اسی سے شیئر کر رہی ہیں"۔ ذوقی نے نئے انسانی رشتوں کے بارے میں ایک بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "ایک زمانے میں بہو اور ساس کی لڑائیاں چلتی تھیں۔ "انڈیا ٹوڈے" نے ایک سروے کیا تو دلچسپ بات یہ پتہ چلی کہ زیادہ تر ساس اپنی بہوؤں سے زیادہ خوش ہیں۔ کیونکہ بہوئیں نہ صرف ان کے پاس رہتی ہیں بلکہ انہیں سمجھتی بھی ہیں۔ ضرورت نئی Sensibility کی ہے۔ یہ Sensibility کہانی میں کیوں نہیں آنی چاہئے؟ اس مجموعے کی کہانیوں کی بنیاد انہی رشتوں پر رکھی گئی ہے جو تیزی سے بدل رہے ہیں اور جنہیں شاید بہت جلد نئے نام دینے کی ضرورت محسوس ہو"۔

گلوبل ولیج کا تصور تو فروغ پا رہا ہے لیکن اس صنعتی دنیا میں انسانی رشتوں کی بنیاد پر کاری ضربیں لگ رہی ہیں۔ کیا ان کا تحفظ ہمارا نصب العین نہیں ہونا چاہئے۔ کیا ادب اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں انسانی رشتوں کی پامالی کے خلاف کوئی منصوبہ بند مہم چلائی جا رہی ہے۔ نہیں ..... لیکن یہ بات میرے افسانوں میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان رشتوں کے تقدس کو دوبارہ بحال کرنے کی ایک سنجیدہ سعی انسانوں کے حوالے سے میں نے کی ہے جو مستحسن ہے یا نہیں یہ فیصلہ میں اپنے قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ میں وضاحت کرتا چلوں کہ رشتوں سے میری مراد فقط وہ رشتے ہی نہیں جو ماں باپ بھائی بہن وغیرہ کے درمیان ہوتے ہیں بلکہ دراصل وہ رشتے ہیں جو انسان کو انسان سے ایک ازلی اور ابدی بندھن میں جوڑتے ہیں میری کہانیوں کا مطالعہ اس تناظر میں کرنا بہتر ہوگا۔

مرسلہ : ایم قمر علیگ

بمبئی میں مجروحؔ کی یاد میں ادارہ "سب رنگ" کا جلسہ

"مجروح سلطان پوری نے غزل مخالف ماحول میں بھی نہ صرف غزل کے چراغ کو بجھنے سے بچایا بلکہ اپنے کلاسیکی لہجے میں اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی مسائل کو غزل کے رگ و ریشے میں تخلیقی چابکدستی کے ساتھ سمو کر ایک نئی معنویت عطا کی ہے"۔

ممتاز شاعر ظفر گورکھپوری نے ادارہ سب رنگ کے زیر اہتمام، ۳۱ مئی ۲۰۰۰ء کو انجمن اسلام کرلا ہائی اسکول ممبئی میں تاجدار غزل مرحوم مجروح سلطانپوری کے تعزیتی جلسے میں مندرجہ بالا خیالات کا اظہار کیا۔ اپنی صدارت میں ہونے والے اس جلسے میں انہوں نے مجروح کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شخصیت کے گوشوں کو نمایاں کیا۔ انہوں نے مجروح پر بے جا الزام تراشی کرنے والوں کی خبر لیتے ہوئے کہا کہ انہیں انا پرست کہنے والے لوگ ان کو بخوبی نہیں جانتے اور محض حسد کی بنا پر انہیں نشانہ بناتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے مجروح کا پیار دلار دیکھا ہے ان کی

دلا کر گناہ سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہیں، جو مذہبی طور پر ایک بین الاقوامی نظریہ ہے۔ اور تقریباً اس دور میں، اور اس کے قبل کے ادبی سرمایہ میں بھی اس موضوع پر بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ لیکن بدر کلکتوی نے "گور غریباں" کے مناظر کو سین میں تقسیم کر کے نظم کو Dramatise کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش نظم کے نئے امکانات کی راہیں ہموار کرتی ہے۔

بدر کلکتوی کی طبع زاد نظموں کے تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ نظمیہ شاعری کے دامن کو مالا مال کرنے میں وہ اپنے پیش روؤں سے کچھ کم معاون و مددگار ثابت نہیں ہوئے ان کی نظموں میں ہر طرح کے اصلاحی، اخلاقی مضامین اور فطری منظر کشی کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور مذہبی ناہمواری پر طنز بھی ملتا ہے وہ اپنی نظموں کو تشبیہ و استعارے سے آگے بڑھا کر تمثیل کی سرحد تک لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بدر کلکتوی نے جہاں موضوعاتی طور پر روایت سے بغاوت کی وہیں ہیئتی طور پر روایت کی پاسداری بھی کی۔ انھوں نے اپنے نئے اور جدید خیالات کے اظہار کے لئے مروجہ ہیئتوں کو وسیلہ بنایا اور مسدس، مثنوی، مخمس وغیرہ کے سانچوں کو نئی وسعتوں اور امکانات سے ہمکنار کیا۔

جہاں تک انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کا تعلق ہے، بدر کلکتوی نے اس فن کو بھی ایک خاص سلیقہ بخشا۔ ویسے اردو میں ترجموں کی روایت بہت پرانی ہے۔ جب اردو زبان اپنی ابتدائی شکل میں تھی اس وقت اس کے دامن کو مالا مال کرنے کے لئے ترجموں کا ہی سہارا لینا پڑا تھا۔ البتہ اس وقت ہندوستان گیر پیمانے پر جانی پہچانی علمی و ادبی زبان فارسی تھی اور چونکہ اس زبان کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی اس لئے شروع شروع میں فارسی کے ہی علمی و ادبی سرمائے کو اردو میں منتقل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ (ہیئتیں تو ساری کی ساری پہلے ہی اپنائی جا چکی تھیں) لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسری مقامی اور غیر ملکی زبانوں سے بھی ترجمے کئے گئے اور چونکہ انیسویں صدی کی آخری دہائی تک پہنچتے پہنچتے انگریزی حکومت اور انگریزی زبان دونوں اپنے قدم مضبوطی سے اس سرزمین میں جما چکی تھیں اس لئے اردو کے ادباء و شعراء کا ایک طبقہ اس زبان کے ادبی سرمایہ کو اردو میں منتقل کرنے اور زبان کے فکری و صنفی اثرات قبول کرنے لگا۔ بدر کلکتوی کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے ۱۱ (گیارہ) انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جن میں زیادہ تر انگریزی زبان کے مشہور و معروف شعراء کی نظمیں ہیں ذیل میں C Wolfe کی مشہور نظم "The Burial of Sir John Moore" (۲) کے شروع اور آخر کے بند کا تجزیہ، بدر کلکتوی کے ترجمہ سے کیا جاتا ہے۔

پہلا بند

Not a drum was heard,not a funeral note,
As his course to Rampart we Hurried;
Not a Soldier discharged his farewell shot
Oe, the grave where our hero we buried.

ترجمہ:

طبل کی آواز آئی نے صدا تھی نوحہ کی
جب جنازہ لیکے سرعت سے چلے سوئے حصار
الوداعی توپ سر، اک بھی سپاہی نے نہ کی
اس لحد پر دفن جس میں تھا وطن کا جاں نثار

آخری بند:

Slowly and sadly we laid down, From the field of his fame fresh and gory
We carved not a line, and we raised not a line, and we raised not a stone but we left him alone with glory

قبر میں اس کو لٹایا با دلِ سینہ فگار
لائے تھے میداں سے جس کو خوں فشاں و نامدار
سنگ تربت ہے نہ کچھ تحریر اس کی یادگار
چھوڑ جاتے ہیں اُسے تنہا ہے شہرت اُسکی یار

بدر کلکتوی نے اس نظم میں ردیف کے التزام کے ساتھ اسٹینزا فارم کی پابندی کی ہے۔ پہلے بند کا ترجمہ بالکل اصل کے مطابق ہے، سوائے ایک لفظ کے۔ وہ لفظ HERO ہے جس کا ترجمہ انھوں نے "وطن کا جاں نثار" کیا ہے۔ جو اصل کی روح کو ظاہر کرتا ہے۔

آخری بند کے پہلے مصرعے میں Slowly and sadly کا ترجمہ "بادلِ سینہ فگار" کیا ہے جو لفظی ترجمہ تو نہیں ہے، لیکن اصل لائن کی پوری کیفیت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی طرح Fame fresh and gory کا ترجمہ "خوں فشاں و نامدار" کیا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ سے دور ہونے کے باوجود مفہوم کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے اور مصرعہ کی ساخت اور روانی میں کوئی فرق بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی بند کے تیسری لائن میں We carved not a line, and we raised not a stone میں فعل we کو حذف کر کے پورے مصرعے کو بیانیہ بنا دیا ہے۔ جس سے مصرعہ کی ساخت ہی بدل گئی ہے۔ ان کا یہ عمل گرچہ لغوی ترجمہ کا منافی ہے لیکن اس سے معنوی خوبی مجروح نہیں ہوتی بلکہ ایک شاعرانہ حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تجزیہ سے اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ بدؔر کلکتوی کو ترجمے کے فن پر کس قدر مہارت حاصل تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ ان کو اردو شاعری کے روایتی مزاج اور جدید تصورات کی بھی پوری آگاہی تھی۔ ان کی اس فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف عبدالحلیم شرر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ کلکتہ کے روشن خیال نوجوان بدرالزماں صاحب نے ان مغربی خیالات کو جو ہندوستانی کپڑے پہنائے ہیں۔ وہ کیسے ہیں جہاں تک ہمارا خیال ہے ہمارے دوست کو پوری کامیابی ہوئی ہے اور جیسا اچھا اور فصیح و معنی خیز ترجمہ انھوں نے کیا اس سے بہتر اردو ترجمہ شاید مشکل سے ہوسکے گا۔ بجائے اس کے اس ترجمہ کی نسبت کسی قسم کے خیالات ظاہر کئے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بجنسہ شائع کر کے ہم سخن سنجان اردو سے داد خواہ ہوں"۔

(دلگداز جلد ۱۰ نمبر ۔ ۱۱ اکتوبر ۔ ۱۹۰۶-۱۱-۱۰)

عبدالحلیم شرر نے "سخن سنجان اردو" سے کتنی داد حاصل کی یہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ لیکن بدؔر کلکتوی کی یہ بدنصیبی رہی کہ خود ان کو ان کے وطن میں اجنبی بنا کر رکھ دیا گیا اور ان کی شاعرانہ صلاحیت کی طرف سے مغائرت برتی گئی۔

حواشی

(۱) دبستان وحشت کا تنقیدی مطالعہ صفحہ نمبر ۱۶۸

(۲) "احسن" ناول کی اشاعت ۱۹۰۹ء میں ہو چکی تھی اور اس کی ایک مطبوعہ کاپی نیشنل لائبریری کلکتہ میں آج بھی موجود ہے۔

(۳) مادھیمک اردو سلیکشن ص ۲۶۰-۲۵۹

(۴) مشتاق احمد نے ۱۹۰۹ء لکھا ہے۔

(۵) نگار جدید شاعری نمبر ۵۳

(۶) نظم The Burial of Sir John Moore at Corunna

آپ کے قریب ترین جوتوں کی دکان پر دستیاب
ٹائٹس جوتے
Titas FOOTWEAR

اسکول جوتوں کے ماہر
گلوبل فٹ ویر اینڈ لیدر کرافٹ انڈسٹریز
۲۵، پولوک اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۰۰۰۰۱
فون نمبر ۲۳۵-۱۲۳۱، ۲۳۵-۸۱۳۸

بہت سے کام لئے۔ بہت سے سوئے احساس جاگے، دبے ہوئے جذبے ابھرے۔ دھندلے خیالات روشن ہوئے، محدود تصورات کی حدیں وسیع ہوئیں۔ موضوعات کے انتخاب کا نظریہ بدلا اور قدیم وجدید کی آمیزش سے تنوع پیدا ہوا۔ جس طرح بدلے ہوئے ہندوستان میں قدیم وجدید کی آمیزش تھی زندگی کا کوئی بالکل نیا تصور نہیں پیدا ہوا تھا۔ ماضی اور حال کے امتزاج سے جاگیردارانہ تصورات اور صنعتی دور کی لائی ہوئی قدروں کے میل سے زندگی نئی بن رہی تھی اسی طرح ان شعراء کے یہاں ماضی کی مرثیہ خوانی کے ساتھ حال کا خیر مقدم اور مستقبل کی امید دونوں کا پتہ چلتا ہے۔ قومی تصورات ہی نہیں بین الاقوامی سوجھ بوجھ بھی پیدا ہو چکی تھی، لیکن انداز نظر سیاسی کم، اخلاقی زیادہ تھا، انھیں خیالات کے سائے میں رومانی رنگ بھی اپنی جگہ بنا رہا تھا (۵)

اگر ہم مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں بدؔر کلکوی کی نظم نگاری کا تجزیہ کریں تو ان کی تقریباً سبھی نظمیں کلّی طور سے احتشامؔ صاحب کے آراء پر پوری اترتی ہیں۔ وہ بھی اپنی نظموں میں سوئے ہوئے احساس کو جگاتے اور ماضی کی مرثیہ خوانی کے ساتھ حال کا خیر مقدم کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم "حبِ وطن" کا یہ بند دیکھئے ۔

تم اسیرِ دامِ گیسو، دہر کے فاتح وہ تھے
قیدیٔ حرص و ہوا تم مجتہد ناصح وہ تھے
بدروی شیوہ تمہارا نیک خوصالح وہ تھے
عالم وفاضل فقیہہ و نکتہ داں شارح وہ تھے
ہے زمیں و آسماں کا تم میں ان میں آج فرق
سر کھلے پھرتے ہو تم ان کا زیبِ تاج فرق

ان کے یہاں قومی تصورات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سوجھ بوجھ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ گرچہ ان کا بھی انداز نظر سیاسی کم اخلاقی زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دو نظمیں "جنگ طرابلس" اور "ہنگامہ بلقان" پیش کی جاسکتی ہیں۔ نظم "ہنگامۂ بلقان" سات بندوں پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں ترکی پر جو حملے ہو رہے تھے ان کی مذمت کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس امید کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ ایک نہ ایک دن ضرور ترکی کو کامیابی نصیب ہوگی (جو اُس وقت کے تقریباً ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی)

ابھی وہ فیصلہ کن جنگ باقی ہے سرِ میداں
نکالیں گے بہادر ترک اپنے دل کے جب ارماں
ہزیمت دینگے مجموعی یہ کو دشمنوں کی واں
ہراساں ہو کے بھاگیں گے یہ سب غارت گر احساں
یقیں ہے ساتھ دیں گے ترک کا فتح و ظفر آخر
چڑھے گا فتح کا سہرا انہیں ترکوں کے سر آخر

اس عہد کا ایک اہم رجحان رومانیت ہے۔ یہ رومانیت اس دور کے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کا طرۂ امتیاز تھی اور اس کی وجہ وہ ذہنی آسودگی تھی جو وہ حسن کی تلاش سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور جس کے اظہار کا پیرایہ بہت پُر کیف ہوتا تھا۔ بدر کلکوی کا تعلق بھی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سے تھا بلکہ وہ انگریزی زبان وادب سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔ ثبوت کے طور پر ان کے دو مجموعوں کے انتساب پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ایک انتساب کسی انگریز خاتون مسز L.H.ROBERTON کے نام انگریزی زبان میں بصورت خط ہے اور دوسرا انتساب Col. D C PHILLOTT کے نام فارسی قطعہ میں ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا ثبوت انگریزی نظموں کے گیارہ منظوم ترجمے ہیں۔ (جن پر گفتگو آئندہ صفحات میں کی جائے گی) یہاں مقصد یہ باور کرانا ہے کہ ان کی نظمِ جدید سے وابستگی شعوری اور دانستہ تھی اور ان کے یہاں بھی رومانیت کا وہی رجحان ملتا ہے جو اس دور میں اس طبقہ کے دوسرے نظم گو شعراء کے یہاں تھا۔ مثال کے طور پر "آرزو وصل" "بیوفا عاشق اور باوفا معشوق" "کشش عشق" "خواب" "خیال یار" نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں "خیال یار" کے یہ اشعار دیکھئے۔

شروع کے دو شعر
ہے کتنا دلفریب رخِ یار کا خیال
آرام جاں ہے کیا گلِ رخسار کا خیال
پامال آرزو کی تو جانِ امید ہے
بابِ مراد کے لئے گویا کلید ہے

آخر کے دو شعر
لیکن عجیب حال ترا۔ اے خیال ہے
پردے میں تیرے عیش کے پنہاں ملال ہے
بعد از وصال ہجر کا آنا ضرور ہے
خمیازۂ نشاط اٹھانا ضر۔ ہے

بدؔر کلکوی کی نظم نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بظاہر بہت ہی معمولی مناظر کو جزئیات کے ساتھ پیش کر کے ماحول کی سنگینی کو پُر اثر بنا دیتے ہیں، جس سے قاری یا سامع پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ان کی نظمیں "فریاد بیوہ" "یاد وطن" "روانگی کے وقت ایک شخص کے مکان کا سین" "جگر دوز سانحہ" وغیرہ اس سلسلے میں خاص طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ "فریاد بیوہ" کا یہ بند دیکھئے۔

چوڑیاں ٹوٹی ہیں ٹوٹا ہے مرا قلبِ حزیں
میلی ساری ہے تو کچھ اس کی مجھے پرواہ نہیں

سر میں کنگھی ہے نہ چوٹی اور نہ آنکھیں سرگیں
بال بکھرے، گیسو الجھے، گرد آلودہ جبیں
پیکرِ عیش و مسرت کا مرقع تھی کبھی
غم کی میں تصویر۔ نقشہ یاس کی اب ہوگئی

ٹوٹی ہوئی چوڑی، میلی ساری، بغیر کنگھی چوٹی کے بکھرے بال، آنکھیں سرمہ وکاجل سے عاری اور گرد آلودہ جبیں، یہ تمام جزئیات اپنے اندر ماحول کی سنگینی کی تفصیل رکھتی ہیں اور ایک ایسے پیکر کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں جو سراپا مظلومیت کی علامت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لارڈ بائرن کی نظم ''جون ڈان'' کے طرز پر مزاحیہ نظمیں بھی کہتے ہیں جو اپنے اندر تفریحی سامان کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ رکھنے کے علاوہ طنز کے ایسے نوکیلے نشتر بھی رکھتی ہیں جو پھولوں کی نازک پتیوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔ مزاحیہ نظموں کے زمرے میں ذیل کی نظمیں آتی ہیں۔ ''سودائی کی سیہ بختی اور معشوق کی دلگی سختی'' ''بے وقت کی بھیرویں'' شیخ صاحب ٹپک پڑے'' ''شراب کا مزا اور شیخ کی منطق''۔

بدر کلکوی کی نظم نگاری کے باب میں ان کی طویل ترین نظم ''گور غریباں کا سین'' کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ یہ نظم ۴ سین (۸۲ بندوں) پر مشتمل ہے اور ہر بند میں ۳ شعر ہیں۔ اس طرح پوری نظم ۲۴۶ اشعار پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہر ایک سین کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

پہلا سین اس سین میں کسی امیر وکبیر شخص یا بادشاہ کی قبر کی روداد ہے۔ جس میں سے مدفون کی صدا آتی ہے کہ میری زندگی تو بڑے عیش و عشرت میں گذری اور میں دنیاوی عیش میں پڑ کر خدا کو بھول بیٹھا تھا۔ ایک غریب پڑوسی جو دن رات محنت کرتا اور بقیہ وقت یادِ خداوندی میں صرف کرتا اس کی زندگی مرنے کے بعد کتنی اچھی ہے جبکہ میں یہاں ندامت میں پڑا ہوں۔

میسر عالم برزخ میں بھی ہے اس کو فرحت سی
مجھے اپنے گناہوں سے ہوئی حاصل ندامت سی

اور پھر خدا اس کو اُس کی دنیاوی زندگی یاد دلا کر اسے سزا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ

مجھے رحمٰن کہتے ہیں مگر قہار بھی میں ہوں
مجھے دیّان کہتے ہیں مگر جبّار بھی میں ہوں
مرا انصاف ہے مشہور گو غفار بھی میں ہوں
غضب بے انتہا میرا ہے گو ستار بھی میں ہوں
مرے دربار میں اہلِ شریعت کی رسائی ہے
مطیعِ دینِ احمد کے لئے جنت بنائی ہے

خدا کی زبانی یہ سن کر اس امیر وکبیر شخص کو افسوس ہوتا ہے کہ کاش میں احکام خداوندی کو پورا کرتا تو مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

دوسرا سین: اس سین میں بدر ایک لوح تربت میں لکھا نوشتہ پڑھتے ہیں جس میں کوئی حسین معشوق مدفون ہے۔ اس تحریر میں وہ معشوق اپنے حسن وجمال کی کہانی سنانے کے بعد نصیحت کرتا ہے کہ اے مسافر لوگوں تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ وہ دنیاوی حسن وجمال کے دھوکے میں نہ آئیں اور حسن والے اپنے حسن پر غرور نہ کریں کہ یہاں آکر سب فنا ہو جاتا ہے۔

اے مسافر ہو اگر شہر میں تیرا جانا
سب سے کہنا کہ خبردار نہ دھوکا کھانا
پیار کی بات کے پھندے میں نہ زنہار آنا
میں نے عشاق کے اِسرار وفا کو جانا
حسن پر ناز حسینانِ ستمگر نہ کریں
بانکے انداز پہ نخوت نہ کریں پر نہ کریں

تیسرا سین: اس سین میں وہ ایک شکستہ قبر سے ہم کلام ہوتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تو کون ہے تیری قبر کا یہ حال کیوں ہے؟ اس استفسار کا جواب لوح تربت سے ہی مل جاتا ہے کہ یہاں کوئی محبوب دفن ہے جو بڑا ہنر مند تھا اور جسے سب ہنر کی جاں کہتے تھے لیکن

ہائے ایسا اہلِ حرفت زیرِ تربت آج ہے
کشورِ تدبیرِ اقلیم و حکم تاراج ہے

پھر اس کے بعد ایک بچے کا مزار دیکھ کر سوال کرتے ہیں کہ یہ تازہ مزار کس کا ہے اور کس کے باغ امید کا یہ گل ہے جس پر اس کے چاہنے والے (والدین) پھول بھی چڑھا جاتے ہیں لیکن

کچھ ہوائے تربت مگر بیشک تو ہے تصویرِ حزن
کرتی ہے بے حد اثر دل پر تری تاثیرِ حزن

چوتھا سین اس سین میں بھی انھوں نے ایک عاشق کی روداد بڑے ہی پُر اثر انداز میں بیان کی ہے وہ عاشق مرنے کے بعد بدر سے کہتا ہے کہ

دلفروشوں سے یہ کہنا تو مسافر لللہ
عشقِ خوباں ہے فقط مفت کا بے لطف گناہ
ہیں یہ وہ لوگ نہیں کرتے کسی سے جو نباہ
جور سے ان کے ہیں عشاق کے احوال تباہ
دو قدم چل کے ہزاروں دلِ بسمل دیکھیں
کھولیں عبرت کی نظر عشق کی منزل دیکھیں

غرض پوری نظم میں ایک اصلاحی پہلو پوشیدہ ہے اور اس کے لئے ''گور غریباں'' کا انتخاب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ موت کا خوف

بنگال کا پہلا نظم گو شاعر

بدرالزماں کلکتوی

انیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی ابتدائی چند دہائیاں اردو کی نظمیہ شاعری کے لئے بڑی فعال رہی ہیں۔ ان برسوں میں موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے نئے تجربے کئے گئے ہیں۔ اگر ایک طرف آزاد اور حالی نے موضوعاتی تجربے کئے تو دوسری طرف کیفی اور اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ نے ہیئتی تجربے کی راہ اپنائی جس کا اثر رفتہ رفتہ پورے برصغیر پر پڑا جس سے بنگال مستثنیٰ نہیں۔ البتہ غزل کی سحر کاری کا اثر بنگال کے شعراء پر کچھ اتنا زیادہ تھا کہ نظمیہ شاعری پر ان کی توجہ زیادہ مبذول نہیں ہو سکی اور پھر ان کا سارا زور اس بات پر تھا کہ وہ اپنی ''شعری اُڑان'' کو دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے ہم مرتبہ بنائیں اور اس طرح ان کے اس تقلیدی رویئے نے ان کی اختراعی خصوصیت کو بُری طرح متاثر کیا لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہاں نظمیہ شاعری کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا۔ یہاں کے مقامی شعراء میں جس شخص نے پوری سنجیدگی کے ساتھ نظمیہ شاعری کی طرف توجہ کی وہ بدرالزماں بدرؔ کلکتوی ہیں جنہیں اگر بنگال کا پہلا نظم گو اردو شاعر کہا جائے تو بیجانہ ہوگا۔ لیکن حیرت ہے کہ ان کے حالات زندگی ہی پوری صحت کے ساتھ کہیں دستیاب نہیں۔ ان کی نظمیہ شاعری کے تجزیئے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ وفاؔ راشدی نے اپنی کتاب ''بنگال میں اردو (سن اشاعت ۱۹۵۳ء) میں عبدالکریم نشترؔ کے ضمن میں مختصراً درج ذیل جملے ان کی ذات کے سلسلے میں تحریر فرمائے ہیں۔

''۔۔۔۔۔ بدرالزماں بدرؔ کلکتوی بیک وقت خوش فکر شاعر بھی تھے اور بہت اچھے ناول نویس بھی''۔ ان کا ایک ناول ''احسن'' مقبول عام و خاص ہے اور بنگال کے ہر کتب خانہ مین محفوظ ہے۔ شاعری میں علامہ وحشتؔ سے مشورہ کرتے تھے۔ ان کا مولود و مسکن شہر کلکتہ ہے۔ نشترؔ سے کئی سال قبل ان کی وفات ہوئی''۔

لیکن بعد میں جو دو تذکرہ نما تصانیف وفاؔ راشدی کے انداز میں یکے بعد دیگرے چند برسوں کے وقفے سے سامنے آئی ہیں۔ ان میں ایک ڈاکٹر جاوید نہال صاحب کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب'' سن اشاعت پتہ نہیں کس مصلحت کے تحت کتاب میں کہیں درج نہیں۔ ویسے دیباچہ میں حضرت پرویز شاہدی کو ''مرحوم'' لکھا گیا۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب پرویز شاہدی کی وفات، ۱۹۶۸ء کے بعد ہی شائع ہوئی ہے) اور دوسری تصنیف جناب مشتاق احمد کی ہے جس کا نام ''بیسویں صدی میں بنگال کے اردو شعراء'' (سن) اشاعت ۱۹۷۲ء) ہے۔ ان دونوں تصانیف میں بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کا کہیں ذکر نہیں جبکہ بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کی پیدائش ۱۸۷۶ء اور وفات ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ حالانکہ ڈاکٹر جاوید نہال صاحب نے نظم طباطبائی کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ نظم طباطبائی کا کلکتے میں قیام، خود انہیں کے الفاظ میں ''کئی برسوں'' سے زیادہ نہیں رہا۔ جناب مشتاق احمد نے اپنی کتاب میں شعراء کی جو فہرست سازی کی ہے ان میں حضرت علامہ وحشتؔ کلکتوی سر فہرست ہیں اور بدر کلکتوی کہیں نظر نہیں آتے۔

ابھی حال میں ڈاکٹر راز عظیم نے اپنے تحقیقی مقالہ بعنوان ''دبستانِ وحشتؔ کا تنقیدی مطالعہ'' جو انھوں نے ڈاکٹر جاوید نہال صاحب کی نگرانی میں قلمبند کیا ہے لکھتے ہیں ''نام بدرالزماں تخلص بدرؔ۔ خاص کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔ دبستان وحشتؔ میں کیا ہے لکھتے ہیں۔

''نام بدرالزماں تخلص بدرؔ۔ خاص کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔ دبستان وحشت کے خوش فکر شاعر اور اچھے ناول نگار تھے۔ ان کا ایک ناول ''احسن'' کافی مقبول ہوا۔ اب یہ ناول نایاب ہے۔ حضرت وحشتؔ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا (۱)

درج بالا قتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے وفاؔ راشدی کی کتاب کو سامنے رکھ کر انہیں کے جملوں کو تھوڑے بہت ردو بدل کے بعد تحریر کر دیا ہے اور مزید مواد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ تھوڑی محنت سے کام لیتے تو بدرؔ کلکتوی کو کبھی تلامذۂ وحشتؔ میں شامل نہیں کرتے اور جس غلطی کے مرتکب وفاؔ راشدی ہوئے ہیں وہ اس سے محفوظ رہتے۔

بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کے حالات زندگی مغربی بنگال کے مادھمک کے اردو نصاب میں مختصراً مگر کچھ حد تک اطمینان بخش صورت میں موجود ہیں۔ جس سے بدرؔ کلکتوی کے تلامذۂ وحشتؔ میں شامل ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ ذیل میں مادھمک کے اردو نصاب سے ان کے حالات زندگی درج کئے جاتے ہیں۔

''بدرالزماں ۱۸۷۶ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے پہلے کلکتہ مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور پھر جوبلی انسٹی ٹیوشن سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرنس پاس کیا اور کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں جوبلی انسٹی ٹیوشن میں ٹیچر اور کڑایہ مسلم بوائز اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ آپ نے ۱۹۳۴ء میں وفات پائی۔ آپ کی وفات پر علامہ جمیلؔ مظہری نے فرمایا ہے ؎

جناب شمس را شاگرد ذیجاہ گرامی بود
یکیتی مولوی بدرالزماں نام بود

جناب بدر کو نظم و نثر دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ آپ نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ تاریخ نظم، قصیدہ، ترجمہ، رباعیات، غزل اور نثر، غرض کہ ہر شعبہ میں آپ نے اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ نثر میں ناول "احسن" جلد اول (غیر مطبوعہ) (۲) تاریخ کلکتہ (مطبوعہ) اور نظم اور غزلیات میں "لمحات بدر" اور "ضیائے بدر" (مطبوعہ) کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام بھی آپ کی تصنیفات میں ہیں۔ آپ کی زبان سادہ اور انداز بیان دلکش ہے۔ آپ کو فطرت نگاری اور جذبات آرائی میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے بھی آپ نے قلم اٹھایا ہے۔

آپ جناب مولانا ابوالقاسم محمد مظہر الحق شمس مرحوم کے عزیز شاگردوں میں تھے۔ آپ نے کلکتہ کے دو مشہور جرائد "شمس بنگالہ" اور "تنویر المشرق" کی ادارت فرمائی تھی۔ آپ شمس العلماخان بہادر حافظ احمد مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ جناب اسدالزماں بی۔اے (مرحوم) اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول آپ کے صاحب زادے تھے" (۳)

درج بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ بدر کلکتوی وحشت کے شاگرد نہیں تھے اور نہ کبھی انھوں نے "زانوئے تلمذ" حضرت وحشت کلکتوی کے حضور میں تہہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں دو مزید شواہد بھی پیش کر دینا کچھ غیر مناسب نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ بدرالزماں بدر کلکتوی وحشت کے ہم عصر ہی نہیں بلکہ ان سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے۔ (بدر کلکتوی کا سن پیدائش ۱۸۷۶ء ہے جبکہ وحشت کلکتوی ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے) اور پھر بدر کلکتوی نے علامہ وحشت کلکتوی کے پہلے دیوان کی اشاعت (۱۹۱۰ء)۔ (۴) کے سلسلے میں جو قطعہ تاریخ کہا تھا اس میں انھیں "نوجوان دوست" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ظاہر ہے کوئی شاگرد اپنے استاد کو اس طرح مخاطب نہیں کر سکتا۔ ملاحظہ ہوں قطعۂ تاریخ کے دو شعر۔ پورا قطعہ سات اشعار پر مشتمل ہے۔

پہلا شعر: نوجواں دوست! مبارک تجھے تیرا دیوان
جس کی ہر بیت ہے خجلت دہ ابروئے بتاں

آخری شعر: سن ہجری کے لئے جب ہوئی فکر تاریخ
"پیکر نغمہ" کہا دل نے مرے بدرالزماں

یہی نہیں بلکہ حضرت وحشت کلکتوی کی شادی کے موقع پر بدر کلکتوی نے جو سہرا کہا ہے اور جس انداز سے کہا ہے اس کے اشعار سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان دونوں حضرات میں کیا رشتہ تھا۔ "عقدِ وحشت" کے عنوان سے یہ سہرا پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے شروع اور آخر کے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

پہلا شعر: خلوصِ دل سے بدر نکتہ پرور نے کہا سہرا
مبارک وحشتِ رنگیں بیاں کو عیش زا سہرا

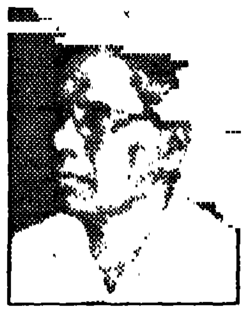
آخری شعر: ہو تیرا عقد دلکش محفلِ عشرت میں اے وحشت
لکھا بدر سخن پرور نے تیرا دلکشا سہرا

درج بالا شواہد کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بدر کلکتوی، وحشت کلکتوی کے شاگرد نہیں تھے۔ بلکہ دونوں حضرات شمس کلکتوی کے شاگرد تھے۔ دونوں حضرات نے اپنی اپنی راہیں منتخب کیں۔ حضرت وحشت کلکتوی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کے چاہنے اور سراہنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جس راہ پر گامزن تھے وہ عوامی سطح پر جانی پہچانی اور صنفی سطح پر مقبول عام تھی (میری مراد صنف غزل سے ہے) لیکن بدر کلکتوی کی بدنصیبی یہ تھی کہ انہوں نے اجتہادانہ اور باغیانہ راستے کو اپنایا تھا اور یہ ایک ایسا راستہ تھا جہاں دور دور تک پذیرائی کی چھاؤں تو دور کی بات، مشکلات کے روڑے اور دشنام طرازی کے پتھروں کے امکانات زیادہ تھے اور ہوا بھی یہی کہ آج تک بنگال کے شعری ادب کی تاریخ میں انہیں خاطر خواہ جگہ نہیں مل سکی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے دو مجموعے "لمحات بدر" (۱۹۱۲ء) اور "ضیائے بدر" (۱۹۱۴ء) ترتیب دئے۔ یہ مجموعے گرچہ مختصر ہیں لیکن اس قدر مختصر بھی نہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ دونوں مجموعوں کی مجموعی تخلیقات کچھ یوں ہیں۔

نظمیں (طبع زاد)	۴۹
نظمیں (ترجمہ)	۱۱
قطعات	۶
غزلیں	۵
میزان	۷۱

اس فہرست سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بدر کلکتوی کا غالب رجحان نظم کی طرف تھا۔ اور وہ بنیادی طور پر نظم گو شاعر تھے۔ حالی اور آزاد اور ان کے بعد کے شعراء جو شعوری طور پر نظم گوئی کی طرف مائل تھے ان میں بدر کلکتوی بھی ایک ہیں۔ ان نظم گو شعراء کے متعلق سید احتشام حسین کے خیالات کا بھی مطالعہ کرتے چلیں۔ لکھتے ہیں۔

"ان شعراء نے نظم سے رسمی اور غیر رسمی اور انقلابی



یوسف تقی

نام : یوسف رئیس تقی

قلمی نام : یوسف تقی

والد کا نام : محمد رئیس الدین مرحوم

پیدائش : ۱۵/ اگست ۱۹۴۳ء

تعلیم : ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

ملازمت : درس و تدریس (ریڈر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی)

پہلی تخلیق : نظم بعنوان "بختِ آدم" مطبوعہ کتاب (لکھنؤ) ۱۹۶۲ء

شادی / بچے : سردست ایک عدد بیوی اور تین بچے

تصنیفات : (۱) ترقی پسند تحریک اور اُردو نظم
(۲) مرشد آباد کے چار کلاسیکی شعراء
(۳) مثنوی جہاں شاہ و جہاں بانو

آئندہ تصنیفات : (۱) مطالعہ غزلیات طپشؔ (تحقیق)
(۲) تمحیص و تجزیہ (مجموعۂ مضامین)
(۳) زرد پتے، خشک ٹہنی (شعری مجموعہ)

انعامات : (۱) "مرشد آباد کے چار کلاسیکی شعراء" پر (مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا اول انعام)
(۲) مثنوی "جہاں شاہ و جہاں بانو" پر (اتر پردیش اردو اکاڈمی کا تیسرا انعام)

پتہ : ۱۹/ بی، مارکوئیس لین کلکتہ ۷۰۰۰۱۶۔

فون : (۰۳۳) ۲۴۹-۷۵۹۰

غزلیں

رواجوں پہ فدا خود کو کر گئی چپ چاپ
وہ اک غریب کی بیٹی تھی مر گئی چپ چاپ
نہ کوئی درد کی ٹیسیں، نہ اضطراب وملال
یہ کیا ہوا کہ شبِ غم گزر گئی چپ چاپ
عجیب حال ہے میرا کہ تیرے ذکر کے ساتھ
میں خندہ لب ہوں مگر آنکھ بھر گئی چپ چاپ
نقوشِ موج بھی چھوڑے نہ ساحل پر
ندی یہ عمر کی کیسے اُتر گئی چپ چاپ

جانے کتنی دیر چلے گی ساتھ مرے چمکیلی دھوپ
آنے والا موسم لائے شاید گیلی گیلی دھوپ
قریہ قریہ کانپ رہا ہے، سرد ہوا کے جھونکوں سے
کتنے آنگن گزرے گی تنہا ایک اکیلی دھوپ
چنچل، شوخ ادا کرنیں تو دور دشا تک جا پہنچیں
بیٹھی خود کو کوس رہی ہے آنگن کی شرمیلی دھوپ
عظمت کی مستحکم چوٹی شاید اُس کو راس نہ آئی
ہر چوکھٹ کو چھونے نکلی شہرت کی رنگیلی دھوپ
ہم نے اپنی حرص وہوس کو بخشی اتنی تابانی
اگلی صدی میں شاید پھیلے بستی میں زہریلی دھوپ

یہ کس مقام پہ پہنچا ترے خیال کے ساتھ
کوئی جواب نہیں اب کسی سوال کے ساتھ
طلب ہے جاہ و حشم کی تو پھر انا کیسی!
جبیں جھکاؤ ذرا اپنی، عرضِ حال کے ساتھ
اور اس سے بڑھ کے وفا کی دلیل کیا ہوگی
کہ چاہتا ہے مجھے وہ مرے زوال کے ساتھ
یہ سلسلہ سا ہے کیسا فریبِ ہستی کا
ابھر رہا ہے نیا زخم اندمال کے ساتھ
یہ بحرِ وقت ہے اس پر نہ اتنا اتراؤ
کہ ٹوٹ جائے نہ کشتی کہیں اُچھال کے ساتھ

پٹریوں کی چمکتی ہوئی دھار پر فاصلے اپنی گردن کٹاتے رہے
دوریاں منزلوں کی سمٹتی رہیں، لمحہ لمحہ وہ نزدیک آتے رہے
زندہ مچھلی کی شاید تڑپ تھی انہیں سارے بگلے سمندر کی جانب اُڑے
ریت کے زرد کاغذ پہ کچھ سوچ کر، نام لکھ لکھ کے تیرا مٹاتے رہے
نرم چاہت کی پھیلی ہوئی گھاس کو، وقت کے سخت پتھر نہ روندیں کہیں
بس یہی خوف اپنی نگاہوں میں تھا، مسکرانے کو ہم مسکراتے رہے
چلچلاتی ہوئی دھوپ کی آنچ میں یوں جھلسنا تو اپنا مقدر رہا
ذہن کی نرم و نازک گھنی چھاؤں سے تیرے آنچل مگر سرسراتے رہے
یاس کی خشک ٹہنی پہ کیسے لگا بور خوابوں کا مجھ سے نہ کچھ پوچھنا
زندگی لمحہ لمحہ مجھے مِل گئی، قطرہ قطرہ وہ چاہت لٹاتے رہے

تجزیہ

صبح سے شام تک
سرخ رخسار، شفاف چہرے
تاجرانہ ہنسی
جھوٹ، مکر و ریا
سیف کی گنگناہٹ کے بیچ
نیلے نوٹوں کی گنتی ہی ہوتی رہی
کارک پھک سے اڑے
بوتلوں کے قدم ڈگمگاتے رہے
بے حیا قہقہے
بے تُکی گفتگو
ادھ کھلی چھاتیوں
ننگی رانوں کی
عریاں تصاویر میں
لوگ کھوئے رہے
اور ہم کہ
کتابوں کے بے جان لفظوں سے چمٹے رہے
صبح سے شام تک ـــــ
اور اس کا ہمیں صِلہ کیا ملا؟

خواہش

پرانے موسموں کی دھول میں لپٹا ہوا لمحہ
اگر چاہے
نئی رنگین، تازہ، بھاگتی ساعت کی ہم راہی
تو کیسے ہو؟
مگر خواہش تو خواہش ہے!

باہر کی شکستہ دیواروں کو دیکھ کر
اندر کی خستگی کا گمان کرنا
کہاں تک مناسب ہے ؟
جبکہ
باہر کی شکستہ دیواروں پر
موسمی ہواؤں کا اثر بھی ہو سکتا ہے
اور یہ بھی
کہ اندر کے مکیں نے کبھی باہر قدم ہی
نہ رکھا ہو !

نثری نظمیں

مرکری راؤڈ کی دھیمی روشنی
کتنی راحت بخش ہے
صرف اس لیے کہ وہ
اپنی حرارت کے نصف حصّے کو
پہلے ہی کہیں چھوڑ آئی ہے

ہر روز
میرے ٹوٹنے بکھرنے
اور پھر جڑ جانے کے عمل میں
میرے وجود کا
کہیں کوئی حصّہ گم ہو گیا تو ؟

میں اپنے تمام احساسات کو
لفظوں کا پیکر عطا کر سکتا ہوں
لیکن فائدہ ـ؟
جبکہ میرے پہچانے جانے کی علامت
میرے احساسات نہیں
کچھ اور ہے !

اور اس کی
برسوں کی منتظر آنکھوں میں
انتظار کا آخری قطرہ بھی
جم گیا !

میں شک و یقیں کی بنتی مٹتی دیواروں کو
مسمار کر دینا چاہتا ہوں
لیکن
'لا' کی چلچلاتی ہوئی دھوپ کو
میرا وجود
سہہ سکے گا ؟



نوشاد مومن

نام : نوشاد علی انصاری
قلمی نام : نوشاد مومن
والدین : جناب احمد علی انصاری مرحوم
محترمہ شہزادی بیگم
آبائی وطن : نونہرہ، غازی پور، یوپی
ولادت : ۵ جنوری ۱۹۶۷ء، کلکتہ
مستقل سکونت : احمد ولا۔ ۸۵ بے توپسیا روڈ، کلکتہ-۳۹
فون : ۳۴۴-۲۲۳۹ (۰۳۳)
تعلیم : بی کام (آنرس)
پی جی ڈپلوما ان کمپیوٹر سائنس، چارٹرڈ ایسو سی ایٹ آف انڈین انسٹی ٹیوٹ آف بینکرس (حصہ اول)
پیشہ : ملازمت (یونین بینک آف انڈیا)
آغاز شاعری : ۱۹۹۲ء
تلمیذ : بازغ بہاری
پہلی اشاعت : ہفتہ وار "بلٹز" بمبئی ۲۳ر جنوری ۱۹۹۳ء
ادبی وابستگی : مدیر سہ ماہی "مژگاں" کلکتہ
جوائنٹ سکریٹری، مولانا حالی اکیڈمی، کلکتہ
منتظر اشاعت : غزلوں و نظموں کا مجموعہ
ترجمہ : "کتنا بدل گیا انسان"

غزلیں

پوچھ رہے ہو کیسا ہے وہ
گرم ہوا کا جھونکا ہے وہ
منہ پر سچ کہہ دیتا ہے
بستی میں اب تنہا ہے وہ
چاہے کوئی کچھ بھی کہہ دے
ہنس کر سب کی سنتا ہے وہ
محفل میں ہنستا ہے لیکن
تنہائی میں روتا ہے وہ
اس کا قد ہے سب سے اونچا
بیساکھی سے چلتا ہے وہ
جانے کس کو خط لکھتا ہے
اور مسلسل روتا ہے وہ
عیب یہی اس کا ہے مومن
جھک کر سب سے ملتا ہے وہ

یوں نگاہوں سے وار مت کرنا
تیر سے دو شکار مت کرنا
تیری قسمت ہے تیری مٹھی میں
وقت پر انحصار مت کرنا
جو بدلتا ہے موسموں کی طرح
اس پہ تم اعتبار مت کرنا
پھر خزاں اپنا سر اٹھائے گی
آرزوئے بہار مت کرنا
خودسری سے وقار گھٹتا ہے
زندگی داغدار مت کرنا
جارہا ہوں تمہاری محفل سے
اب مرا انتظار مت کرنا
اوچھے لوگوں سے تم کبھی مومن
دوستی زینہار مت کرنا

ہر ایک کہنہ روایت کو یوں روا رکھنا
کسی سے جنگ بھی کرنا تو قاعدہ رکھنا

جب اپنے شہر کا انداز ہی نرالا ہے
کسی کے سامنے گھر کا نہ مسئلہ رکھنا

یہاں تو روز بدلتا ہے آدمی کا مزاج
قریب رہ کے بھی لوگوں سے فاصلہ رکھنا

تعلقات کی وسعت میں ہے پریشانی
کہ اعتدال کی حد میں ہی رابطہ رکھنا

یہ تیرا دور ہے، جتنا اکڑ کے چل مومن
خدا کا خوف بھی دل میں مگر ذرا رکھنا

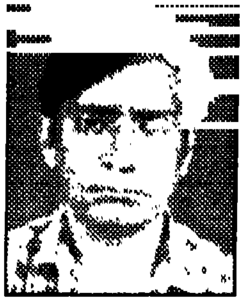
نظمیں

کبھی نہ یاد آئے گھر

وہ گھر جس میں پلا بڑھا میں
آج نہ جانے
کیوں وہ مجھ سے
اپنا رشتہ توڑ رہا ہے
میرا دامن چھوڑ رہا ہے
پُرنم آنکھیں
رنج و الم میں
جبر و حقارت کی دھاروں میں
ظلم و ستم کے انگاروں میں
ڈھونڈ رہی ہیں اک انساں کو
جو بن جائے میرا ہمدم
مجھکو بسالے اپنی نظر میں
اور نہ مجھکو یاد آئے گھر
کبھی نہ گھر یاد آئے مجھکو!

کاش

بالکل پچھلے سال کے جیسا
کارڈ مجھے بھیجا ہے اس نے
لکھا ہے جس میں
"عید مبارک"
کومل نازک ہاتھ سے اپنے
جو مضمون مجھے لکھا ہے
اس میں بسی ہے یاد کی خوشبو
اور میں گم صم
تنہائی میں سوچ رہا ہوں
مجھ کو کہنے "عید مبارک"
کاش وہ میرے گھر آجاتی!



ہلچل بھارتی

نام : شبیر اختر
قلمی نام : ہلچل بھارتی
تاریخ پیدائش : ۶/اپریل ۱۹۵۵ کلکتہ
تعلیم : ڈپلومہ سول انجینیرنگ
شرف تلمذ : شور فیض آبادی۔
گھائل عظیم آبادی

ہزل

طبیعت آجکل اپنی وبالی ہوتی جاتی ہے
مری بیگم سنو اللہ والی ہوتی جاتی ہے

پہن لیتی ہے وہ پتلون شوہر کی، یہ مجبوری
ادا جو بھی ہے بیگم کی نرالی ہوتی جاتی ہے

بڑھاپا دھیرے دھیرے آگیا اپنی جوانی پر
ادھر اپنی جواں اک اور سالی ہوتی جاتی ہے

بہت دن سے محلے میں کوئی بلوہ نہیں اٹھتا
مری بستی کمینہ پن سے خالی ہوتی جاتی ہے

نہاتی ہیں وہ رکسونا سے روزانہ مگر ہلچل
نہ جانے بات کیا ہے شکل کالی ہوتی جاتی ہے

ہزل

آتی ہے اک حسینہ فیشن بدل بدل کے
نظارہ کر رہے ہیں ہم بھی سنبھل سنبھل کے

ریکھا کی ایکٹنگ کو دہرا رہی تھیں بیگم
کل مارتی تھیں چپل ہمکو اچھل اچھل کے

یہ بزدلی نہیں تو پھر اور کیا ہے لوگو
اپنے ہی گھر میں جانا میرا سنبھل سنبھل کے

بچوں کو لے کے بیگم میکے چلی گئی تھیں
ہم رہ گئے تھے اس دن دل کو مسل مسل کے

برسوں سے یہ منسٹر آتے نہیں تھے یارو
ہے سر پر اب الکشن تو آگئے پھسل کے

کل پھر پیاز دیکھو اتنی تکے بکے گی
لے جارہے ہیں چوہے بل سے نکل نکل کے

بیگم نے ڈھیٹ ہوکر آکر کہا اے ہلچل
کچڑے میں پھینک آئی کاغذ غزل وزل کے

پتہ 53A, Kabirtirtha Sarani
Khidderpur,
Calcutta - 700 023
فون (033) 459-5624

نظم

ٹی وی اور بچے

میں گیا اک دوست کے گھر اس سے کرنے مشورہ
چل کے ٹی وی اور وی سی آر دلوادیں ذرا
دوست نے مجھ سے کہا یکبارگی کچھ سوچ کر
پرمانٹ کیوں یہ مصیبت لارہے ہو اپنے گھر
مشورہ میرا یہی ہے سن لو اسکو دھیان سے
ہے حقیقت میں تعلق دونوں کا شیطان سے
لائیں گے دولت کدے پر جب یہ دو چیزیں جناب
مفت میں بچوں کا لکھنا پڑھنا بھی ہوگا خراب
میں تو ان کو لا کے گھر پچھتا رہا ہوں دیکھئے
یہ تو تھے ہی آگئے اسٹار و کیبل دیکھئے
اب تو بچوں کی پڑھائی کا بھلا کہنا ہی کیا
ان کو دلچسپی ہے ان چیزوں سے اب کرنا ہی کیا
باتیں اب فلموں کی جیسے کرتے ہیں یہ شان سے
پیار اس شیطان سے ہے ان کو دل اور جان سے
نام تو فلمی اداکاروں کے ازبر ہیں انہیں
علم کی دولت سے مالا مال ہونا ہے جنہیں
آئیڈیل میں نے بنایا نیوٹن و لقمان کو
یہ بناتے ہیں رتک، سلمان و عامر خان کو
کیا بتاؤں ڈانٹتا ہوں جب میں بچوں کو کبھی
سب سے کہتے ہیں ہمارا باپ ہے امریش جی
اب تو انکی زندگی میں فلم کا ہی رقص ہے
دیکھ کر یہ حرکتیں حیران اپنی عقل ہے
میرے بچے گر نہیں سدھرے تو سن لیجئے جناب
ان کے کیریکٹر پر لکھونگا میں موٹی سی کتاب
دھن کا میں پکا ہوں ہلچل کام یہ کر جاؤنگا
غم نہیں نازل اگر بیگم کا ہو مجھ پر عتاب



نسیم فائق

نام : نسیم احمد
ادبی نام : نسیم فائق
پیدائش : ۲۵؍جولائی ۱۹۷۰ء۔ کلکتہ
تعلیم : عربی و فارسی مدرسہ بیت العلوم (راجہ بازار) کلکتہ اور جامعہ اسلامیہ مدنیہ (مدنی نگر) کلکتہ سے۔ بی اے اردو آنرز کلکتہ یونیورسٹی
مشغولیات : تجارت اور درس و تدریس
تصانیف : "پھوہار" ماہیوں کا مجموعہ ۱۹۹۹ء
"بے خواب آنکھوں کی کہانی" نظموں کا مجموعہ۔ منتظر اشاعت
ترتیب : "سحر البیان ساحر" ساحر لدھیانوی کی حیات و شاعری کے تعلق سے ایک یادگار مجلہ ۲۷؍دسمبر ۱۹۹۷ء
مجلس ادارت : معاون مدیر سہ ماہی "اثبات و نفی" کلکتہ۔
مدیر ماہنامہ "عاقبت" کلکتہ
پتہ : ۱۷۰؍کیشب چندر سین اسٹریٹ، کلکتہ-۷۰۰۰۰۹
فون : ۳۵۲۲۶۰۵ (۰۳۳)

غزلیں

موج کی جب بڑھیں شوخیاں ریت پر
اک گھروندا ہوا رائیگاں ریت پر

وہ فریب نظر کے سوا کچھ نہیں
تجھ کو پانی کا ہے جو گماں ریت پر

حشر کیا میری آہوں نے برپا کیا
ٹوٹ کر گر پڑا آسماں ریت پر

ضبطِ غم جب نہ میری طرح ہو سکا
پھٹ پڑا کوہ آتش فشاں ریت پر

بن کو پھولوں کے بستر پہ تھا بیٹھنا
آکے بیٹھی ہیں وہ تتلیاں ریت پر

جھونپڑی، آشیانہ، محل کچھ نہیں
پھر لپکتی ہیں کیوں بجلیاں ریت پر

یہ تہذیب ہے جسم کھولے ہوئے
دھوپ میں لیٹی ہیں لڑکیاں ریت پر

اس نے اذنِ سفر مجھ کو فائق دیا
ڈال کر پاؤں میں بیڑیاں ریت پر

تم نے آکر نہال کر ڈالا
خود سے بھی بے خیال کر ڈالا

مفلسی نے غریب کا چہرہ
کس قدر بے جمال کر ڈالا

دوریوں نے ہماری قربت کو
آج کتنا محال کر ڈالا

حق و باطل کی جنگ نے آخر
کربلا کو مثال کر ڈالا

تیرے نیزوں کے سارے زخموں کا
وقت نے اندمال کر ڈالا

پیاس کیسی ہے خود ہی دریا نے
تشنہ لب سے سوال کر ڈالا

ایک حبشی غلام کو فائق
عاشقی نے بلالؓ کر ڈالا

دودھ کی تھی دھلی ہوئی لڑکی
ہاں جلا دی گئی وہی لڑکی

کون سا غم اداس رکھتا ہے
روتی رہتی ہے کیوں بھلی لڑکی

عشق کا روگ کیوں لگا بیٹھی
خوبصورت پڑھی لکھی لڑکی

میرے خوابوں میں روز آتی ہے
ہو بہو آپ جیسی ہی لڑکی

شادی چھوٹی کی ہو بھلا کیسے
مسئلہ بن گئی بڑی لڑکی

ایک دولت نہیں سوا اسکے
مجھ میں ہے اور کیا کی لڑکی

آپ کچھ بھی کہیں مگر فائق
تھی وہ معصوم سی بھلی لڑکی

نظمیں

سوال

تیری محبت کی بارش میں
ڈال کے ننھی سی کشتی کو
ننھے بچوں جیسا میں بھی
بے حد خوش تھا لیکن کشتی
کاغذ کی تھی کب تک چلتی
بھیگ کے بارش کی بوندوں سے ؟

کِرم خوردہ کتاب

میں نے اپنی آنکھوں سے
اپنی موت دیکھی ہے
روح کیوں تڑپتی ہے
سانس کیسے رکتی ہے
کرب کیا، بلا کیا ہے
بے نوا صدا کیا ہے
جانتا ہوں سب، لیکن
کچھ بتا نہیں سکتا
صرف اتنا کہنا ہے
دیکھیے مرا چہرا
کب کا مر چکا ہوں میں
پھر بھی جی رہا ہوں میں

اندیشہ

سوچتا ہوں کہ یہ تیری چاہت
خواب ہے یا کوئی حقیقت ہے
تو مری ہو سکے گی یا اک دن
میرے دل پر عذاب ٹوٹے گا
کیونکہ بیکار بھی ہوں بے گھر بھی
مفلسی ہی مرا مقدر ہے
خوف ہے دل کو ایسی حالت میں
چھوڑ کر تو بھی چل نہ دے مجھ کو
اس سے بہتر ہے یہ کہ کوشش کر
دل کسی دوسرے پہ مائل ہو
پاس جس کے ہو دولت و ثروت
مفلسی دور اس سے ہو ایسے
جیسے سورج سے ہے اندھیرا دور
پھر تری آرزو نہ سسکے گی
اور کبھی تو نہ اس سے بچھڑے گی
ایک شاعر کی کیا حقیقت ہے
صاحبِ مال اس سے بہتر ہے

سوچ کی لہریں

اے بے کل سوچوں کی لہرو،
کیوں بھینٹ چڑھا کر شعلوں کی
فی النار مجھے تم کرتی ہو
کیوں میرے خلوص والفت کی
ہر ڈور کو الجھا دیتی ہو
اور میرے دل کے آنگن میں
تیزاب کی بارش کرتی ہو
خوابوں نے جنہیں تعمیر کیا
وہ شیش محل ڈھا دیتی ہو
یا موسم گل میں شام و سحر
یخ بستہ ہوائیں بن بن کر
تم جسم کو میرے ڈستی ہو
بے آس مجھے کر دیتی ہو!

ماہیے

کیا رکھا ہے صورت میں
حسن حقیقی ہے
انسان کی صورت میں

انداز سے پہچانا
تیرہ شبی میں بھی
آواز سے پہچانا

ٹوٹے نہ مرا سپنا
بانٹ رہے تھے ہم
کل نیند میں غم اپنا

چھوٹی ہی سہی چادر
شکر خدا کا ہے
جب پاؤں نہیں باہر

نغمے بھی کراہیں ہیں
ہجر زدہ دل سے
نکلی ہوئی آہیں ہیں

ھائیکو

مت کر اچھا کام
ہو جائے گا دنیا میں
مجھ سا تو بدنام

اچھا خاصا تھا
وہ بھی دشمن بن بیٹھا
جس کو پرکھا تھا

دل میں رہتے ہو
پھر بھی مجھ کو اے جاناں
بے دل کہتے ہو

طپش، قدرت وغیرہ نے اپنے دور میں ایک ایسا حلقہ بنایا تھا جس کے زیرِ اثر عموماً اردو ادب اور خصوصاً اردو شاعری کی مضبوط عمارت تعمیر ہونے لگی تھی۔ یہ انہیں بزرگوں کی دین ہے کہ بنگال میں آج بھی اردو ادب خصوصاً شاعری اپنی بھرپور زندگی کا ثبوت دے رہی ہے"۔

[مرشد آباد کے چار کلاسیکی شعراء، مرتبہ ڈاکٹر یوسف تقی صفحہ ۱۰]

اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ مرشد آباد کی اہمیت اردو ادب کے دیگر مراکز سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مرکز کی اہمیت اور اسکی خدمات کا اب تک مکمل طور پر جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ہزار دواری کی تاریخی لائبریری میں موجود بے شمار دواوین، مثنویات و تذکرے، ڈرامے، مراثی فرض شناس محقق کے انتظار میں گرد وغبار میں روپوش ہو رہے ہیں۔ صرف ہزار دواری لائبریری میں تقریباً دو ہزار سے زائد اردو اور فارسی کے مخطوطات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۶۳ ایکڑ رقبے میں پھیلے ہوئے قلعہ نظامت کے محلات میں مقیم نواب خاندان کے ورثاء کے ذاتی کتب خانوں میں بے شمار نادر مخطوطات اور مثنویات موجود ہیں جو زبوں حالی کا شکار ہیں۔

ہم بنگال والے اس بات کا ہمیشہ رونا روتے رہتے ہیں کہ اس خطے نے کوئی نقاد یا ایسا محقق نہیں پیدا کیا جو یہاں کے فنکاروں کی قدر کا احساس دلاتا۔ یہ شکوہ بھی اکثر و بیشتر احباب سے سننے کو ملتا ہے کہ دہلی اور یوپی والے بنگال والوں نے اپنے فرض کو نبھانے کی کوشش نہیں کی اور الزام دوسروں کے سر تھوپ دیا۔ ہم نے خود اپنے ادبی سرمایے کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو ایک مدت سے قائم ہے اور ۱۹۹۰ء تک ایم اے اردو کے نصاب میں "بنگال اسکول" کو اختیاری پرچے کی حیثیت حاصل تھی جبکہ اسے روزِ اول ہی سے "لازمی پرچے" کی حیثیت ملنی چاہئے تھی۔ خیر اب یہ کام دیر ہی سے سہی ہو گیا اور بنگال اسکول کی حیثیت لازمی پرچے کی ہو گئی لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ ہم جب خود اپنے شعراء و ادباء کے فن کاروں کو پڑھنے کی کوشش نہیں کریں گے اور ان کی کاوشوں پر مضامین نہیں لکھیں گے تو باہر والوں سے کس طرح یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ ان کے سلسلے میں کچھ کریں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مرشد آباد میں ایک دور وہ بھی تھا کہ اردو زبان و ادب کی زلفیں سنوارنے کے فرائض مسلمان شعراء کے علاوہ ہندو بنگالی شعراء بھی انجام دیتے تھے۔ اسی وجہ سے علامہ رضا علی وحشت کلکتوی اپنے مضمون "اردو کا تعلق بنگلہ سے" میں لکھتے ہیں کہ۔

"سراج الدولہ کے دربار میں خوش گو زباں اور اعلیٰ خیال بنگالی شعراء نے اپنے کلام سے مرشد آباد کو رشکِ دہلی و لکھنؤ بنا رکھا تھا۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ سراج الدولہ شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتا تھا اور شعراء و ادباء کی سرپرستی کرنا اپنا فرض اوّل سمجھتا تھا۔ لہٰذا بلا تفریق مذہب و ملت اس کے دربار میں ہندو بنگالی اور مسلمان شاعروں کا ایک بڑا مجمع تھا جنکی شاعری دہلی و لکھنؤ کے شعری مزاج کی ترجمانی کرتی تھی۔ سراج الدولہ کی ادب نوازی اور شعری ذوق کے سلسلے میں وفا راشدی لکھتے ہیں کہ:

"نواب سراج الدولہ کو فارسی و اردو سے بڑی دلچسپی تھی وہ خود بھی عالم تھا اور اہل علم کی دل سے قدر کرتا تھا۔ اس نے علم و ادب کی بڑی سرپرستی کی۔ اس کے دربار میں نامی گرامی شعراء کو شرف باریابی حاصل تھا"۔ ["بنگال میں اردو"۔ ص ۳۰۔ سال اشاعت ۱۹۵۵ء]

نوابینِ مرشد آباد کی ادب دوستی کا خاطر خواہ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ یہاں اردو ادب نے خوب خوب ترقی کی اور خواص سے عوام تک ادبی ذوق میں رنگ گئے۔ ان کی سرپرستی اور ادبی کوششوں نے اردو ادب کی تاریخ میں مرشد آباد کو بنگال میں اردو ادب کے ایک اہم مرکز کی حیثیت عطا کر دی جس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل اور ادھوری مانی جائے گی۔

نوابینِ مرشد آباد نے اردو ادب کے فروغ کے لئے نہ صرف اپنے درباروں میں شعراء و ادباء کی سرپرستی کی بلکہ اس زبان اور اس کے ادب کی توسیع کے لئے ٹھوس اقدامات بھی کئے۔ نظامت اسکول اور لائبریری کے قیام نے زبان کی بقا کا فریضہ انجام دیا۔ انگریزوں کی آمد اور پھر اقتدار کی جنگ اور آپسی ناچاقی نے مرشد آباد کی ادبی صورت حال کو بڑا نقصان پہنچایا۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کے فن کاروں کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اردو ادب کی شمع کو گل ہونے سے بچائے رکھا اور مشاعرے کے ذریعہ اردو ادب کی توسیع کا یہ کام تقسیم وطن تک جاری رہا۔ آزادی سے قبل مرشد آباد میں جن حضرات نے اپنے ذوقِ سلیم سے چمنِ شاعری کی نگہداشت اور آبیاری کا کام کیا۔ ان میں سید احسن مرشد آبادی، سید کیکاؤس میرزا بسمل، نظر مرشد آبادی، ضو مرشد آبادی، نثار احمد نثار، غیور حسن غیور، سراج احمد قمر اور قادر حسین کے نام قابل ذکر ہیں کہ ان کی ادب دوستی نے مرشد آباد کی ادبی فضا کو ملک کی بگڑتی ہوئی صورت حال میں بھی زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش جاری رکھی۔

تقسیم وطن کے بعد ملک کے ہر شعبے اور ہر گوشے میں نمایاں تغیر آیا اور ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بے شمار ادباء و شعراء ملک بھر سے پاکستان ہجرت کر گئے۔ مرشد آباد سے بھی فنکاروں کے علاوہ ادب نواز حضرات کے ایک بڑے کارواں نے رختِ سفر باندھا

اور ہجرت کے نام پر فرار کی راہ اختیار کی۔ مرشد آباد کی ادبی فضا بری طرح سے متاثر ہوئی اور ایسا محسوس ہونے لگا یہاں اب جمود سا طاری ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک مرشد آباد میں اردو ادب کا تاریک دور گزرا۔ تقسیم وطن کے سانحے سے لوگوں کے دلوں پر دہشت اور خوف طاری تھا۔

مگر وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ تاریکی کے بعد سحر طلوع ہوئی اور قلعہ نظامت کے علاقہ میں اکادکا نشستیں ہونے لگیں۔ کارواں بننے لگا۔ عوام میں بیداری آئی۔ ادب کے ایسے متوالے جنہیں اپنی زبان اور اپنے ادب سے جنون کی حد تک عشق تھا سامنے آئے اور انہوں نے بساط بھر کوشش کی کہ مرشد آباد کی بکھرتی، ٹوٹتی، ریزہ ریزہ ہوتی اور سسکتی ادبی فضا کا وقار پھر سے بحال کیا جائے۔

اردو زبان وادب سے جنون کی حد تک عشق رکھنے والے ادب نوازوں میں دو حضرات ایسے تھے جنہوں نے باقاعدہ اپنے حلقے بنائے اور ایک بڑے کارواں کی شکل میں مرشد آباد کی ادبی فضا کر سنوارنے اور سجانے کے کام میں دل وجان سے جٹ گئے۔ ان میں ایک تھے مولانا سید سبط محمد ہادی شمس عرف کلن اور دوسرے سید مبارک حسین عرف بڈھن۔ یہ دونوں ہی استاد شاعر تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ ان حضرات نے نہ صرف مرشد آباد کی ادبی فضا کو از سر نو بحال کیا بلکہ لوگوں کے شعری ذوق کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ان اساتذہ کی ہمت، محنت اور لگن سے تحریک پاکر قلعہ نظامت کے فصیل بند محلات میں سے ایک ایسی ہستی ابھر کر سامنے آئی جس نے اردو شاعری کے چراغ کی لو کو نہ صرف تیز کیا بلکہ اپنے تخلیقی سرچشموں سے یہ ثابت بھی کر دکھایا کہ مرشد آباد میں کی جانے والی شاعری لکھنؤ اور دہلی کے شعراء کی شاعری کے مقابلے کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔ یہ تھے وحشت کلکتوی کے شاگرد سید فتح علی میرزا عرف بیدل مرشد آبادی۔

بیدل مرشد آبادی اردو زبان وادب کے بے لوث اور سچے خادم تھے اور تاحیات اردو ادب کے فروغ کے لئے کوشاں رہے۔ بیدل درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ آج کلکتہ گرلس کالج میں جو اردو اور فارسی کا ایک بڑا شعبہ قائم ہے یہ بھی بیدل مرشد آبادی کی دین ہے۔ انہوں نے اس کالج میں شروع میں اعزازی طور پر تدریسی فرائض انجام دیئے۔ بعد میں ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ اردو پڑھنے جتنی طالبات آئیں گی انہیں پڑھانے کے صلے میں فی طالبہ پانچ روپے ماہانہ انہیں دیا جائے گا۔ بیدل اردو زبان وادب کے سچے خادم تھے انہوں نے اسے ہنس کر قبول کیا۔ انکی محنت سے رفتہ رفتہ طالبات کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہ انہیں کا فیض ہے کہ آج اس کالج میں اردو پڑھنے والی طالبات کی تعداد تقریباً چھ سو ہے۔ بیدل مرشد آبادی استاد شاعر تھے۔ عہد حاضر میں جو شعراء اپنے فن کے جلوے دکھا رہے ہیں ان میں سے بیشتر کی شاعری پر بیدل کے گہرے اثرات ہیں۔

بیدل مرشد آبادی نے نئے فنکاروں کے ذہن کی آبیاری کی اور گلشن شاعری کو نکھارنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو صرف کر دیا۔ ان سے تحریک پاکر سید نواب جانی میرزا نے چند صاحب ذوق حضرات کے تعاون سے ''مضمارِ سخن'' نام کا ایک ادبی ادارہ قائم کیا جس کا اولین مقصد تھا کہ مرشد آباد میں علمی وادبی فضا کو برقرار رکھا جائے۔ اس ادارے کے تحت ہر ماہ ادبی نشستوں کا اہتمام کیا جانے لگا۔ نواب جانی میرزا کے تعاون اور عبد الرحیم برکتی کی کوششوں سے ۱۹۸۵ء یہاں کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر ایک خوبصورت مجلہ بھی شائع کیا گیا جس نے مرشد آباد کی ادبی فضا کو مزید نکھارا۔ اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ ''مضمارِ سخن'' کے وجود میں آنے سے مرشد آباد کی اجڑی ادبی فضا میں پھر سے تازگی آگئی اور ایک بڑا کارواں فنکاروں کا سامنے آیا جس نے شعر وادب کی زلفیں سنوارنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان فنکاروں میں سید شباہت میرزا، آفاق میرزا آفاق، حیدر میرزا حیدر، ڈاکٹر رضا علی خان اور سید صادق حسن رضوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

درج بالا ناموں میں رضا علی خان کو چھوڑ کر باقی فنکار شاعری سے وابستہ ہیں۔ رضا علی خان نے نثر کے میدان میں اپنے تخلیقی جوہر پیش کئے۔ اخبارات کے وسیلے سے مرشد آباد کے تخلیق کاروں کی کاوشوں پر اظہار خیال کیا اور اپنی تحقیق کا موضوع ''اردو ادب کے ارتقاء میں مرشد آباد کا حصہ'' رکھا اور اس پر کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ رضا علی خان کے علاوہ مرشد آباد کے دیگر تخلیق کار نثر نگاری کی طرف مائل ہوتے تو اس ادبی مرکز کی خدمات کا بھرپور جائزہ اور بہتر طور پر لیا جاتا۔

خوش آئند بات ہے کہ حالیہ چند برسوں میں نئے لکھنے والوں کی ایک صف ابھر کر سامنے آئی ہے جسے اپنی روایات سے گہرا لگاؤ بھی ہے اور اپنی زبان سے محبت بھی اور یہ جذبہ ان کے اندر موجود ہے کہ اردو ادب کے اس قدیم مرکز کی ادبی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا جانا چاہیے۔ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں یہ صف سرگرداں ہے۔ ان میں سید عباس علی مرزا، سید محمد قمر جاہ، سید باقر علی مرزا۔ سید اصغر رضا، سید حسن امام، منصور عالم وحشی، اکرم ناصر اور اطہر مرزا کے نام اہم ہیں کہ عہد حاضر میں ان حضرات کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں مرشد آباد کی علمی وادبی فضا کو سنوارنے اور نکھارنے میں بڑا اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔



نسیم عزیزی

نام — محمد نسیم
قلمی نام — نسیم عزیزی
والد کا نام — مرحوم عبدالعزیز
تاریخ پیدائش — ۱۹ر جون ۱۹۵۹ء (اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق)
مقام پیدائش — ۳۱۲، بیلیلیس روڈ ہوڑہ۔ ۷۱۱۱۰۱
تعلیم — بی۔ اے۔
مشغلہ — سرکاری ملازمت (ایسٹرن ریلوے، کلکتہ)
ادبی وابستگی — مدیر معاون ''اثبات و نفی''۔ کلکتہ
قیام گاہ — ۳۱۲، بیلیلیس روڈ ہوڑہ-۷۱۱۱۰۱ مغربی بنگال
فون — (033) 650-9636

غزلیں

بڑھ رہی تھیں زندگی کے دائروں کی آہٹیں
مچھلیوں کو چھو رہی تھیں پانیوں کی آہٹیں

موت کی آغوش میں تھے لوگ سارے محوِ خواب
گونجتی تھیں گھر میں خالی برتنوں کی آہٹیں

گھپ اندھیرے میں اجالے کی کرن پھوٹی کوئی
کھڑکیوں سے چھن رہی تھیں چوڑیوں کی آہٹیں

تال پر گیتوں کے گھنگھرو پاؤں کے بجنے لگے
وقت کے سینے سے پھوٹیں سسکیوں کی آہٹیں

آج اتنا غرق تھے منظر نگاری میں نسیم
کان تک ان کے نہ پہنچیں قافیوں کی آہٹیں

کئی قصوں کی الجھی گتھیاں سلجھا گئیں آنکھیں
مگر خونیں مناظر دیکھ کر پتھرا گئیں آنکھیں

غرور اتنا جہاں بینی یہ اپنی کس لیے آخر
دکھاؤ گے کسے پھر منہ جو دھوکا کھا گئیں آنکھیں

سنا ہے شخصیت کا آئینہ چہرہ ہی ہوتا ہے
مگر یہ کیا کہ اس کو دیکھ کر شرما گئیں آنکھیں

گلا انصاف کا گھونٹا گیا تھا کس طرح یارو!
ہمیں سچائیوں کا آئینہ دکھلا گئیں آنکھیں

لبِ مظلوم پر آیا نہ اک حرفِ شکایت بھی
مگر ہر واقعہ تفصیل سے بتلا گئیں آنکھیں

بڑھاپے میں جوانی کے سنہرے دور لوٹا کر
کرشمہ کیا نسیم اب آپ کو دکھلا گئیں آنکھیں

نظم — چائلڈ لیبر

مشینوں کی صداؤں میں ہوا غرقاب ان کے
کلی سے پھول بننے کا حسیں امکاں
یہ ننھے ہاتھ کاپی اور قلم سے کھیل سکتے تھے!
یہ ننھے پھول گلشن کو معطر کر بھی سکتے تھے!
مگر قسمت
کروڑوں لوگ جب رہتے ہیں محوِ خواب بستر پر
یہ اپنے گھر کے لوگوں سے
بچھڑ کر دور تک پیدل
سفر کر کے پہنچ جاتے ہیں اپنے کارخانوں میں
جہاں روزی، وسیلہ ہے
جہاں بس چند سکوں کے لیے ہر دن
لہو بکتا ہے ان کا اور مسرت چھینی جاتی ہے
عجب قانون ہے ان کارخانوں کا جہاں یہ کام کرتے ہیں
کسی بھی حادثے میں جب کوئی مزدور مرتا ہے
بہ فیضِ زر
بچا جاتے ہیں دامن یہ ستم پیشہ
یہ بچے ان حوادث کو
مقدر کا کرشمہ مان کر خاموش رہتے ہیں
یہ انسانوں کے بچے ہیں
مگر حیوان سے بدتر
نہ ہونٹوں پر تبسم ہے
نہ آنکھوں میں چمک ہی کچھ
عجب بے چارگی ان سے برستی ہے
ہے بچپن کیا، انہیں احساس ہی ہوتا نہیں اس کا
ولادت پاتے ہی پیری کو سینے سے لگاتے ہیں
حیاتِ مختصر سے توڑ کر رشتہ
چلے جاتے ہیں کوسوں دور نظروں سے ہماری یہ
مگر اک داغ ہم وطنوں کے ماتھے پر
لگا کر روح کو یوں ہی تڑپتا چھوڑ جاتے ہیں
جسے آئندہ برسوں میں
مٹانا بھی جو چاہیں ہم
تو شاید ہی مٹا پائیں!!!

مرشد آباد کی ادب نوازی



نعیم انیس

نام : نعیم احمد
ادبی نام : نعیم انیس
والدین : انیس احمد عزیزی و خیر النساء
ولادت : ۱۹ر ستمبر ۱۹۶۸ء ، کلکتہ
پتہ : ۸ ر علیم الدین اسٹریٹ، فلیٹ نمبر ۲، پہلی منزل کلکتہ ۷۰۰۰۱۶
فون : ۱۷۱۴-۲۲۶
آبائی وطن : جھنجھانہ، ضلع مظفر نگر (یو۔ پی)
تعلیم : ایم ۔اے
ملازمت : لکچرر، شعبۂ اُردو، کلکتہ گرلس کالج (ایوننگ) گیسٹ لکچرر شعبۂ اردو، اے۔ جے۔ سی۔ بوس کالج (برلا سائنس کالج)
تالیفات : نیاز احمد خان ۔ایک مطالعہ (۱۹۹۴) کلام فضلی صدیقی (زیر ترتیب)

جب دہلی گردشِ زمانہ کا شکار ہوئی تو علم و ادب کے اس مرکز کے ادباء و شعراء بے یار و مددگار ہوگئے۔ ایسے پر آشوب ماحول میں جب امراء کاسۂ گدائی ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے تھے تو ادباء و شعراء کی سرپرستی اور ادب دوستی کا فریضہ کون انجام دیتا۔ لہذا دہلی کی تباہی و بربادی سے وہاں کی ادبی فضا بھی سونی ہوگئی۔ دست گیری کرنے والے صاحب ذوق حضرات جب معاشی بدحالی کے شکار ہوئے تو وہاں کے فنکاروں کو بادلِ ناخواستہ دہلی کو خیر آباد کہنا اور نقلِ مکانی کی تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

ذریعۂ معاش اور گوشۂ عافیت کی تلاش نیز اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے بے شمار اہل فن دہلی چھوڑ کر ملک کی دیگر ریاستوں میں جابسے۔ دہلی تباہ ہوئی تو لکھنؤ، رام پور، حیدر آباد اور مرشد آباد اردو ادب کے اہم مراکز کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ یہاں معاشی خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ عوام اور خواص شعر و ادب کے دلدادہ تھے اور فنکاروں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ جب فنکاروں کا ایک بڑا کارواں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی سابق راجدھانی مرشد آباد پہنچا تو نوابینِ مرشد آباد نے انہیں نہ صرف خوش آمدید کہا بلکہ ہر طرح سے ان کی سرپرستی کی اور اپنے دربار میں انہیں اعلیٰ عہدوں پر سرفراز کیا۔

نوابینِ مرشد آباد ادب دوست اور شعر و سخن کے سچے خیر خواہ تھے۔ مرشد قلی خان سے لیکر آخری نواب سید وارث علی مرزا تک جتنے بھی نواب تخت نشین ہوئے انہوں نے اردو ادب کی بھرپور خدمت کی۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی اور ملک کے دیگر علاقوں سے آنے والے بے شمار شعراء و ادبا کو مرشد آباد کی ادبی اور علمی فضا اسقدر راس آئی کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر جاوید نہال اپنی تصنیف ''بنگال کا اردو ادب انیسویں صدی میں'' میں صفحہ ۳۲۲ پر لکھتے ہیں کہ

''اٹھارویں صدی کے اختتام اور ۱۹ویں صدی کے آغاز میں ہی مرشد آباد کی زمین اردو ادب کے پودے کے لئے مناسب اور سازگار ثابت ہوئی تھی۔ اردو کے بڑے اور منفرد شاعر اور ادیب یہاں پیدا ہوئے اور اسکی ادبی متاع کلکتہ، لکھنؤ اور عظیم آباد سے کچھ کم نہیں ہے۔''

دہلی اور دیگر علاقوں کے فنکاروں کی آمد سے مرشد آباد میں علم و ادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ آئے دن شعر و ادب کی محفلیں منعقد کی جانے لگیں۔ گیت، غزل، مثنوی، رباعی، نوحہ، سوز خوانی، مرثیہ گوئی، ڈرامہ نویسی، افسانہ نگاری، تذکرہ نگاری غرضکہ اردو ادب کی بیشتر اصناف سخن پر یہاں کے شعراء و ادباء نے طبع آزمائی کی اور اپنے تخلیقی کارناموں سے مرشد آباد کی ادبی فضا کو معیار بخشا۔ ملک الشعراء کا خطاب پانے والے شاعر انشاء اللہ خان 'انشاء' کا تعلق بھی مرشد آباد سے تھا۔ ڈاکٹر یوسف تقی کی اس رائے سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ''نوابی دور میں مرشد آباد اردو کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا، اسکول مدرسوں اور کتب خانوں کے علاوہ عوام بھی اس زبان کے ادب سے دلچسپی لینے لگے تھے اور اس سرزمین سے وابستہ شعراء خصوصاً مُخلص،



نور پیکر

نام	محمد نور عالم
قلمی نام	نور پیکر
شرف تلمذ	حضرت قیصر شمیم
ولادت	۱۲ر جنوری ۱۹۴۷ء شیب پور، ہوڑہ
آبائی وطن	چھوٹا راج پور، ضلع بھوج پور، آرہ (بہار)
مشغلہ	درس و تدریس
پتہ	۸۹/ کاویز گھاٹ روڈ، شیب پور، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۲
تصانیف	(۱) سرابوں کے درمیان (شعری مجموعہ) ۱۹۸۱ء (۲) دھوپ اور سائبان (شعری مجموعہ) ۱۹۹۵ء
منتظر اشاعت	ذرا سی روشنی (شعری مجموعہ)
انعامات	"سرابوں کے درمیان" پر بہار اردو اکاڈمی کا انعام ۱۹۸۱ء "دھوپ اور سائبان" پر بہار اردو اکاڈمی کا انعام ۱۹۹۵ء
وابستگی	رکن مجلس عام، مغربی بنگال اردو اکاڈمی

غزلیں

اپنے فن کا کوئی شہہ کار بتاتا ہے مجھے
دیکھئے کیسی نمائش میں سجاتا ہے مجھے

اس کی دانست میں ہوں اب بھی ادھورا شاید
چاک پر رکھ کے شب و روز گھماتا ہے مجھے

پہلے کہتا ہے کہ سچ بول تو سچ بولتا ہوں
پھر اسی بات پہ سولی پہ چڑھاتا ہے مجھے

دھوپ جب چاٹنے لگتی ہے بدن کو اس کے
سر چھپانے کے لئے سایہ بناتا ہے مجھے

خوش ہوا تھا مجھے شعلوں کے حوالے کرکے
بچ کے آیا ہوں تو سینے سے لگاتا ہے مجھے

مجھ کو وہ ٹوٹی ہوئی ناؤ سمجھ بیٹھا ہے
کبھی طوفاں، کبھی موجوں سے ڈراتا ہے مجھے

نور پیکر کوئی اس دشمنِ جاں سے پوچھے
کیا سبب ہے کہ وہ انگلی پہ نچاتا ہے مجھے

لوگ کیسے ہیں کہ ہونٹوں سے دھواں اٹھتا ہے
بات کرتے ہیں تو لفظوں سے دھواں اٹھتا ہے

آپ نے آکے دلاسا تو دیا ہے لیکن
کیسا مرہم ہے کہ زخموں سے دھواں اٹھتا ہے

آگ مٹی میں چھپادی ہے کسی نے شاید
کبھی شاخوں کبھی پھولوں سے دھواں اٹھتا ہے

جس حویلی کو بہت ناز تھا اک دن خود پر
اس کی دیوار کے طاقوں سے دھواں اٹھتا ہے

جانے کیا چاند نے چپکے سے کہا رات گئے
جھلملاتے ہوئے تاروں سے دھواں اٹھتا ہے

کوئی بھولے سے ادھر دیکھنے والا ہی نہیں
طاق پہ رکھے صحیفوں سے دھواں اٹھتا ہے

کس کے غم نے تجھے بے چین کیا ہے آخر
نور پیکر ترے شعروں سے دھواں اٹھتا ہے

سوچ کے زاویے بدلتے ہیں
چل ترے ساتھ ہم بھی چلتے ہیں
ہم سے بڑھ کر ہیں حوصلے ان کے
جو دیئے آندھیوں میں جلتے ہیں
ساتھ ہوجاتی ہے تیری خوشبو
صبح کو گھر سے جب نکلتے ہیں
مسکراہٹ لبوں پہ رکھنے سے
غم کے موسم نہیں بدلتے ہیں
سب سے ملتے ہیں خوش دلی سے مگر
ایک ہم سے ہی آپ جلتے ہیں
تو نہیں ہے تو اب مرے بچے
تیری تصویر سے بہلتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں

جبیں پہ عرقِ ندامت
نثار چہرے پر
ہتھیلیوں پہ نشاں
پانوؤں میں زنجیریں
قدم اٹھانا بھی چاہیں
تو اٹھ نہیں پاتے
یہ کون لوگ ہیں
کس سمت جانے والے ہیں
کہیں یہ تم تو نہیں ہو
کہیں یہ ہم تو نہیں!

شطرنج

ابھی کچھ دیر پہلے
میرے کمرے میں مہابھارت چھڑی تھی
روز چھڑتی ہے
مرے کمرے کے بیچوں بیچ
اک ہلکی سی ریکھا ہے
میں اک شطرنج کا مہرہ
کبھی اِس پار رہتا ہوں
کبھی اُس پار رہتا ہوں!

نیا موسم

یہ کالی پٹیاں
جو اپنی آنکھوں پر
کئی برسوں سے ہم نے باندھ رکھی ہیں
اتاریں
کھلی آنکھوں سے ہم اک دوسرے کو
غور سے دیکھیں
بدن کے سارے زخموں کو گنیں
شرمندہ ہو جائیں
پھر اس کے بعد ہم تم اتنا روئیں
اس قدر روئیں
کہ دل کے میل دھل جائیں
کوئی آئینہ بن جائیں
بہت ہی پیار سے اک دوسرے کا ہاتھ تھامیں
سنہری دھوپ میں
ساحل پہ ننگے پاؤں گھومیں دور تک جائیں
اور اک دوجے میں کھو جائیں
اسی مصروفیت میں دن گذاریں شب گذاریں
گئی رت کی کہانی رفتہ رفتہ بھول جائیں
نیا موسم بنائیں!

وہ قصہ گو

وہ قصہ گو
جو اپنے تجربوں کو
داستانی پیرہن دے کر
ہر اک دن شام کو چوپال میں
آکر سناتا تھا
دلوں پر اپنے میٹھے بول کا
جادو جگاتا تھا
سنا ہے گاؤں کے مکھیا کی
چنچل شوخ لڑکی کو
نئے موسم کی آمد پر
گلابوں کا حسیں تحفہ دیا اس نے
یہی وہ جرم تھا جس پر
اسی چوپال کے لوگوں نے
اس کو قتل کر ڈالا!

دوہے

لوٹا تھا وہ کھیت سے، چہرے پر تھی دھول
ہنستے روتے دوڑ کے، لپٹ گئے دو پھول

گوری گھر سے رات کو، بھاگ گئی چپ چاپ
کتنی ملی جہیز سے، مستی میں ہے باپ

بوڑھا کاکا شان سے بدلے اپنا بھیس
گبرو سا لگنے لگے، کالا کر کے کیس

کیسا سادھو سنت وہ، جو بابا کہلائے
آگ لگانے کے لئے، لوگوں کو اکسائے

گھر کے اندر ٹھاٹ سے، باپ چبائے پان
پیسے پیسے کے لئے، بیٹی ہے ہلکان

کہہ مکرنیاں

گھر کے اندر بھر بھر جائے
آئینہ دھندلا کر جائے
چھوڑے پتا اور نہ پھول
اے سکھی! مکھی
نا سکھی! دھول

چپکے چپکے رات کو آئے
دھرتی پر موتی برسائے
دوڑ ہے اس کی سو سو کوس
اے سکھی! ہرنی
نا سکھی! اوس

نین میں جب یہ بس جائے
روپ نرالا سب کو دکھائے
جو دیکھے وہ ہووے پاگل
اے سکھی! ساجن
نا سکھی! کاجل

کالا بھورا رنگ ہے اس کا
جیون بھر کا سنگ ہے اس کا
عمر بڑھے تو بدلے بھیس
اے سکھی! کوا
نا سکھی! کیس



ناظم سلطان پوری

نام محمود خان قلمی نام : ناظم سلطان پوری
جائے پیدائش ۔ سلطان پور ۱۹۲۷ء
آغاز شاعری ۱۹۵۱ء (ابتدائی دور میں رجحان نثر کی طرف تھا نتیجہ کے طور پر میرے کچھ افسانے اور مقالے مقامی اخباروں میں شائع بھی ہوئے) میری پسندیدہ صنف غزل ہے۔ کبھی کبھی نظمیں بھی کہتا ہوں۔ ہندوستان بھر میں میں غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔ میرے دو شعری مجموعے "حرف آگہی" ۱۹۷۷ء اور "آیات نظر" ۱۹۸۹ء میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں تیسرا مجموعہ "میراث غزل" زیر ترتیب ہے۔ شائع کب ہو گا کہہ نہیں سکتا۔ "حرف آگہی" کی اشاعت پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے اکیڈمی کارکن بھی ہوں۔ آئل انڈیا لمیٹڈ کی ملازمت سے ۱۹۸۵ء میں ریٹائر ہوا۔ پہلے والی سرگرمی تو نہیں مگر ادبی سفر ہنوز جاری ہے۔ چھپنے چھپانے کی طرف میری توجہ بہت کم رہی ہے جو یقیناً گھاٹے کی بات ہے مگر کیا کروں، میری افتاد طبع ہی کچھ ایسی ہے۔ میں اپنے آپ کو استاد نہیں سمجھتا پھر بھی کچھ لوگ مجھ سے منسلک ہیں اور اپنی غزلوں نظموں وغیرہ پر اصلاح لیتے ہیں۔ فہرست میں دو شاعرات بھی ہیں۔
خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوں اور لوگوں کی اس بھیڑ میں میری آواز منفرد ہے۔

سرمائے کی بات اٹھی تھی اہلِ ہنر کی محفل میں
ہم نے بھی میراثِ غزل کے کچھ سکّے کھنکائے تھے

پتہ 18/1، مولانا محمد علی روڈ، خضر پور، کلکتہ - 700023
فون (033) 450-9172

غزلیں

بڑی تمنا ہے جاؤں سوئے ستم کسی دن
مزاج پوچھے تو کوئی اہلِ کرم کسی دن

ہمارے مسلک کا آدمی کیا کہے گا ہم کو
جو ڈھل گئے مصلحت کے سانچے میں ہم کسی دن

وہ بھیگا چہرہ سبھوں سے ہٹ کر سوال پوچھے
ہماری آنکھوں کی آگ ہوگی نہ کم کسی دن

تمہیں بھی ہم زندگی کی کوئی صلاح دینگے
سمجھ گئے دھوپ چھاؤں اپنی جو ہم کسی دن

جو آئینے میں تمہارے جاگے وہ عکس رکھ لو
یہ بھیڑ پرچھائیوں کی ہوگی نہ کم کسی دن

دکھائیں وہ روپ زندگی کے کہ ہوش کھو دیں
ہماری دنیا میں آیئے محترم کسی دن

چھپائیں گے منہ کہاں تمہارے یہ کارنامے
ترنگ میں آگئے جو اہلِ قلم کسی دن

ہمارے حصّے کی روشنی تم جگائے رکھنا
کہ تیرگی کے سفر سے لوٹیں گے ہم کسی دن

ہماری سعیٔ مسلسل کا اعتراف تو ہو
فصیلِ جبر میں پیدا کوئی شگاف تو ہو

ہماری خوش ہنری ہے تو جا بجا روشن
خلوصِ دل سے مگر اس کا اعتراف تو ہو

تمہاری سمت سے کوئی گلہ نہیں پھر بھی
کدھر سے آیا اندھیرا یہ بات صاف تو ہو

مخالفت کی ادا اپنی جا سہی لیکن
ہمارے بیچ کوئی وجہِ اختلاف تو ہو

ابھی سے کیوں ہو پریشاں مزاج ہم سفرو
ہوا کا موڑیں گے رخ ہم ہوا خلاف تو ہو

وہ آگ آج بھی روشن ہے امتحاں کی طرح
ہم اہلِ شوق میں وہ جرأتِ طواف تو ہو

بہت دنوں پہ ملا ہوں، ترے حضور اے دوست
کہوں گا کھل کے غمِ دل خطا معاف تو ہو

کسی سورج کی کرم فرما نظر تھی ہی نہیں
روشنی سی کوئی تہمت میرے سر تھی ہی نہیں

وہ بھی تھک ہار کے اک پیڑ تلے بیٹھ گیا
اس سے آگے اسے منزل کی خبر تھی ہی نہیں

خامشی چہرے کی آواز بھی ہو سکتی ہے
اتنی سنجیدہ مگر اسکی نظر تھی ہی نہیں

زہر کیا جانتے وہ لوگ میری سانسوں کا
اس قدر تلخیٔ حالات ادھر تھی ہی نہیں

کون دروازے پہ آکر میرے دستک دیتا
زندگانی کی علامت میرے گھر تھی ہی نہیں

جس پہ روشن نہ ہوئے ہوں میرے قدموں کے چراغ
شوق کی ایسی کوئی راہ گزر تھی ہی نہیں

جی بڑا خوش تھا کہ لوگوں نے نوازا مجھ کو
سانحہ یہ تھا کہ وہ دادِ ہنر تھی ہی نہیں

لوگ کس بات کا افسانہ بناتے ناظم
باہر آنگن سے مرے شاخِ شجر تھی ہی نہیں

کہاں تک ایسی اذیت سے ہم گزرتے رہیں
کہ اصل باقی رہے اور سود بھرتے رہیں

اجالا کون کرے گا اندھیری راہوں میں
تمہاری طرح ہوا سے جو ہم بھی ڈرتے رہیں

ہوا چلے کوئی ایسی کہ رخ بدل جائے
ہم اپنے آپ سے کب تک یہ جنگ کرتے رہیں

گئی رتوں کے تو قرضے ہیں بے حساب میاں
مگر جو آپ پر واجب ہیں وہ تو بھرتے رہیں

خلافِ طبع سہی عافیت اسی میں ہے
وہ جسکو چاہے اُسے ہم گوارہ کرتے رہیں

نواحِ جاں میں ہو ایسی کوئی جگہ ناظم
جہاں یہ درد کے پنچھی سوا اترتے رہیں

تجھ کو اس طرح جہاں والوں سے ہٹ کر دیکھوں
پھر کسی چیز کی جانب نہ پلٹ کر دیکھوں

کم سے کم داد تو مل جائے گی جی داری کی
اپنی بربادی کا منظر ہے تو ڈٹ کر دیکھوں

مار ڈالے گی بدلتے ہوئے موسم کی یہ بھیڑ
پچھلے رنگوں کی طرف اب جو پلٹ کر دیکھوں

لبِ کشائی کا نتیجہ تو وہی کچھ نکلا
اب ذرا تیغِ خموشی سے بھی کٹ کر دیکھوں

کون جانے ابھر آئے کوئی چہرہ اپنا
گرد آلود کچھ اوراق الٹ کر دیکھوں

یوں بھی اک مملکتِ فکرونوا ہو ناظم
جو بھی دیکھوں روشِ عام سے ہٹ کر دیکھوں

نظمیں

بہشتِ بریں

آرزو کا مری
ایک ننھا سا پودا
کئی مرحلوں سے گزر کر
شجر بن گیا
دیکھتے دیکھتے
اسکی شاخوں پہ
پھل پھول آنے لگے
لہلہانے لگا رنگ و بو کا چمن
مسکرانے لگی زندگی
گیت گانے لگی زندگی
خاک رہ خوشبوؤں سے معطر ہوئی
نور و نکہت سے بھرپور ساری فضا
بن گئی روح کی تازگی کا سبب
ذرّے ذرّے سے پھوٹی خوشی کی کرن
ہنس پڑی رہ گزر
آرزوؤں کی تکمیل یوں ہو گئی
جیسے بن مانگے رب نے
مجھے بخش دی
واقعی
زندگی کی
بہشتِ بریں!

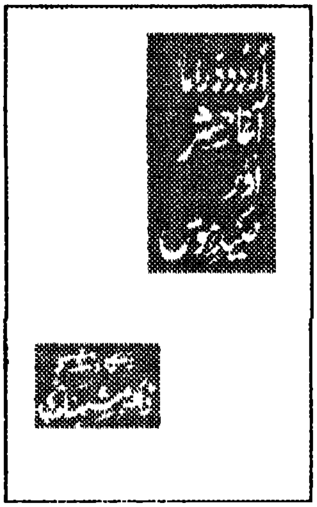
برہنہ شجر

سانحہ کا کوئی وقت ہوتا نہیں
جانے کب اور کس موڑ پر ہو عیاں
اور وہی پھر ہوا
ہاں وہی زندگی
خواہشوں سے بھری زندگی
جسکے خونِ جگر سے
وہ ننھا سا پودا
ہوا تھا شجر
بار آور شجر
اور پھر دفعتاً
وقتِ بے رحم نے
ایک کروٹ سی لی
بات کی بات میں
ہو گیا کچھ سے کچھ
وقت کی کالی
آندھی نے برگ و ثمر سے
بھرے پیڑ کو
ہاں اسی پیڑ کو
یوں برہنہ کیا ہے
کہ بس پوچھ مت
دیکھ کر روتی رہتی ہیں آنکھیں
لہو رات دن
رات دن رات دن

آنکھ میں رنگِ شفق رخسار پر غازہ نہ تھا
یوں تو چہرے تھے ہزاروں پھول سا چہرہ نہ تھا
شاہراہِ عام پر کل شب ہوا تھا حادثہ
راز کیا تھا صبح کے اخبار میں لکھا نہ تھا
ایک عورت رات اندھیری اور برگشتہ ہوا
گھر تھا لیکن اُس کے گھر میں کوئی دروازہ نہ تھا
کس طرح گہرا سمندر پار کرتا وہ بھلا
میرے اشکوں کی ندی سے جو کبھی گزرا نہ تھا
ہر طرف نیزوں پہ سر تھے پاؤں میں تھیں بیڑیاں
اس کی سفّاکی کا پھر بھی شہر میں چرچا نہ تھا
سازشوں کی تند آندھی کر رہی تھی یورشیں
وہ مسافر چل رہا تھا ٹوٹ کر بکھرا نہ تھا
ایک لمحہ وہ بھی تھا جب اپنی ساری نیکیاں
پھینکنا چاہا جو میں نے سامنے دریا نہ تھا
یہ مرے اخلاص کی جاویدؔ تھی کیا انتہا!
اس سے ہی ملتا تھا میں جس سے کوئی رشتہ نہ تھا

نئی بہار کا منظر تلاش کرتا ہے
وہ زرد رت میں گل تر تلاش کرتا ہے
خدا ہی جانے بگاڑا ہے میں نے کیا اس کا
وہ شہر شہر مرا سر تلاش کرتا ہے
کہاں حسینؑ کہاں میں مگر مجھے لوگو!
یزیدِ وقت کا خنجر تلاش کرتا ہے
وہ جس نے سانپ کو پالا تھا آستیں میں کبھی
اب اس کے کاٹے کا منتر تلاش کرتا ہے
کشیدگی کا ہے ماحول پھر بھی آج کوئی
تعلقات کا اک گھر تلاش کرتا ہے
میں ایک گوہرِ نایاب ہوں تبھی تو مجھے
سمندروں میں شناور تلاش کرتا ہے
دبیز دھند کا منظر ہے راہ میں پھر بھی
وہ شخص میل کا پتھر تلاش کرتا ہے
منافقانہ ہوا کا ہے یہ اثر شاید!
وہ بھائی ہو کے مرا سر تلاش کرتا ہے
اگر نہیں ہوں میں پورس تو کس لئے جاویدؔ
مجھی کو رَن میں سکندر تلاش کرتا ہے

اردو ڈراما، آغا حشر اور صیدِ ہوس



ڈاکٹر شہناز نبی

ضمیر یوسف کا مجموعۂ کلام



غزل کے جھروکے

نام : مشتاق افضل
ولدیت : حاجی عبدالکریم
جائے پیدائش : موضع سبیت، ضلع نالندہ، بہار
تاریخ پیدائش : ۱ر جنوری ۱۹۶۷ء
مشورۂ سخن : شہود عالم آفاقی
تعلیم : بی اے آنرز
پیشہ : تجارت
پتہ : G۴۰۔ بنگلہ بستی۔ گارڈن ریچ روڈ
کلکتہ۔ ۷۰۰۰۲۴
فون : ۵۷۸۲-۴۶۹ (۰۳۳)



مشتاق افضل

ماہیے

خوں آنکھ سے جاری ہے
علم کا پروردہ
تہذیب سے عاری ہے

چھوٹی سی ہے وہ بچی
زہر اُگلتی ہے
لیکن ہے بہت سچی

کیا جرم گھنونا ہے
طفل کے ہاتھوں میں
پستول کھلونا ہے

پردیس میں تڑپائے
گاؤں کی مٹی سے
صندل کی مہک آئے

اس سمت بھی آ جگنو
رات اندھیری ہے
تقدیر جگا جگنو

دیوار جو اٹھی ہے
گھر میں عداوت کی
یہ چال بھی اسکی ہے

غزلیں

حُسنِ گفتار سے نہیں نکلا
عشق کردار سے نہیں نکلا

مسئلہ طے ہوا ہے باتوں سے
کام تلوار سے نہیں نکلا

ضرب دینے پہ بھی کوئی نغمہ
ساز کے تار سے نہیں نکلا

دشت پیاسے تھے رہ گئے پیاسے
ابر کہسار سے نہیں نکلا

جانے کیا خوف ہے اسے افضل
آج تک غار سے نہیں نکلا

غزل

درختوں پر ہرے پتے نہیں ہیں
خزاں کے دن ابھی گزرے نہیں ہیں

کھلونے کی طرف تکتے نہیں ہیں
یہاں بچے بھی اب بچے نہیں ہیں

ہوائیں سرد ہیں پھر کیوں یہاں کی
یہاں اولے اگر پڑتے نہیں ہیں

پرندوں کے ہیں بال و پر سلامت
قفس لیکر مگر اڑتے نہیں ہیں

کسی بھی شور پر باشی یہاں کے
دریچے کھول کر تکتے نہیں ہیں

مٹا کے رکھدئے بارش نے افضل
زمیں پر خون کے دھبے نہیں ہیں

ہر قدم لاچاریاں مجبوریاں گنتے رہے
زندگی بھر ہم سلوکِ میزباں گنتے رہے

اہلِ ہمت لیکر ابھرے ہیں سمندر سے گہر
ہم مگر ساحل پہ خالی سیپیاں گنتے رہے

باغ اپنا تھا مگر پھل لے گئے سب لوٹ کر
پیڑ کے نیچے فقط ہم پتیاں گنتے رہے

اُس کے آنسو پوچھنے والا مگر کوئی نہ تھا
لوگ تھے کہ بس شکستہ چوڑیاں گنتے رہے

حالانکہ اُس آدمی سے دور کا رشتہ نہ تھا
پھر بھی سب اسکو ہمارے درمیاں گنتے رہے

دشمنوں پر ہمکو بلتہ بول دینا تھا مگر
خون میں ڈوبی ہوئی ہم وردیاں گنتے رہے

اپنی باتوں سے ہماری کرتا تھا تذلیل وہ
ہم مگر باتوں میں اسکی خوبیاں گنتے رہے

رات بھر تھا اسکے گھر میں چاند تاروں کا ہجوم
اور افضل اپنی ہم ویرانیاں گنتے رہے

موسم بدل رہا ہے

خوشبو سی ہے فضا میں
مستی سی ہے ہوا میں
بے چینیوں کا عالم
یادوں کا جیسے موسم
جتنے بھی ہیں دریچے
پیچھے تمہارے گھر کے
گھر سے قدم نکالو
اور ان کو کھول ڈالو
ہر چیز کو سجا دو
پردوں کو بھی ہٹا دو
کچھ ہوگا آج جیسے
سورج جو ڈھل رہا ہے
دل کہہ رہا ہے میرا
موسم بدل رہا ہے

اندیشہ

شاید کہ تجربوں سے
وہ انجان ہے بہت
ورنہ وہ اسطرح تو
کبھی سوچتا نہیں
شیشے کے کاروبار میں
نقصان ہے بہت

کربِ تنہائی

زندگی کی بھیڑ میں
لوگ میرے ساتھ تھے
میں کہ اک مقام پر
جانے کب کھو گیا
اور ایسا ہو گیا

قطعات

مسکراتا گلاب لکھ دیجئے
عیش و عشرت کا باب لکھ دیجئے
زندگی نام ہے بدلنے کا
تازہ تر انقلاب لکھ دیجئے

زندگی کو عذاب مت لکھنا
زندگی کو خراب مت لکھنا
زندگی ہے صحیفہ خوشیوں کا
اس کو غم کی کتاب مت لکھنا

سب کچھ اب اے یار دکھاوا لگتا ہے
یہ سارا سنسار دکھاوا لگتا ہے
لوگ یہاں خود غرض ہمیں سب لگتے ہیں
لوگوں کا یہ پیار دکھاوا لگتا ہے

دوہے

گلیاں کیا بازار کیا، سونا سارا شہر
ہر منظر تیرے بنا، ڈھاتا ہے اک قہر

کب تک آخر ہم رہیں، اک دوجے سے دور
بھر دے میری مانگ میں، ساجن اب سیندور

لوٹ نہ جائے پھر کہیں، آکر آج بہار
اب تو آجا ساجنا، مت کر تو انکار

تھامے اپنے ہاتھ میں، رکھنا میرا ہات
دنیا کی اس بھیڑ میں، چھوٹ نہ جائے سات

ماہیے

مہندی کی بہار آئی
بیٹی بنی دلہن
بجنے لگی شہنائی

جو قید پرندہ ہے!!
خوش تو نہیں لیکن
وہ آج بھی زندہ ہے

بے خوف و خطر دیکھا
ہم نے تجھے دل میں
ہر شام و سحر دیکھا

آنکھیں کو نہ نم رکھنا
بن کے دلھن میری
جب گھر میں قدم رکھنا

دیوانہ بنادے گی
زلف تری کھل کے
افسانہ بنادے گی

۲ ہائیکو

کیا اپنے کیا غیر
پتھر سب کے ہاتھوں میں
رکھنا سر کی خیر

کھل گئے گل ہر سو
بس اک تیرے آنے سے
پھیلی ہے خوشبو



مشتاق جاوید

نام : مشتاق احمد

ادبی نام : مشتاق جاوید

ولدیت : محمد سعید آرٹسٹ مرحوم

جائے پیدائش : ناتھ نگر، بھاگلپور (بہار)

تاریخ پیدائش : ۱۰/اگست ۱۹۴۵ء

تعلیم : بی۔اے۔ مشورہ سخن۔ پروفیسر قیصر شمیم

پیشہ : درس و تدریس

خط و کتابت کا پتہ : بی۔114/B، تکیہ پاڑہ، ٹمیا برج
کلکتہ - ۷۰۰۰۲۴

رہائشی پتہ : بی۔107، تکیہ پاڑہ، ٹمیا برج
کلکتہ - ۷۰۰۰۲۴

غزلیں

کہیں تھی دھوپ کہیں بارشوں کی شدت تھی
برہنہ سر کو کسی سائباں کی حاجت تھی

بس ایک پل میں سبھی خواب چور چور ہوئے
تمہارے شہر میں شیشوں کی کیا حقیقت تھی

اسی لئے تو رہے ہم حقیر دنیا میں
کہ سب سے ٹوٹ کے ملنا ہماری عادت تھی

پلک پلک پہ تھے آنسو نظر نظر میں دھواں
ہمارے شہر میں کس شخص کی حکومت تھی

جہاں نہ چاپ نہ دستک نہ چوڑیوں کی کھنک
اسی مکان میں رہنا ہماری قسمت تھی

پگھل رہا تھا وہ ہر لمحہ موم کی صورت
فضائے سرد میں کل رات کتنی حدت تھی

ملے جو دشمنِ جاں تو معاف کر دینا
کسی بزرگ کی جاوید یہ نصیحت تھی

مصور ہوں لہو کے رنگ سے پیکر بناتا ہوں
میں سادہ کینوس پر نت نئے منظر بناتا ہوں

خرد والے مجھے رن میں اکیلا چھوڑ آئے تھے
پلٹ کر میں جنوں والوں کا اک لشکر بناتا ہوں

یہ مانا ہجرتوں کا غم مری قسمت میں ہے پھر بھی
جہاں جاتا ہوں اپنی محنتوں سے گھر بناتا ہوں

ستم کے شہر میں سب کی زباں پر ہیں اگر تالے
تو میں بھی اب دلِ حساس کو پتھر بناتا ہوں

مٹا ڈالے گی کوئی موج دریا ایک ہی پل میں
میں خوابوں کا گھروندہ ریت پر اکثر بناتا ہوں

رئیسِ خاندانی میں نہیں ہوں اس لئے لوگو!
نمائش کے لئے بستی میں اونچا گھر بناتا ہوں

جو ہر اک گام پر خوش فہموں کی بھیک دیتا ہے
سفر میں پھر اُسے میں کس لئے رہبر بناتا ہوں

عطا کی ہے خدا نے مجھ کو اے جاوید وہ دولت!
کہ ہاتھ اندھوں کے سر پر رکھ کے دیدہ ور بناتا ہوں

نظم

حادثہ

یہی گلی ہے!
شکستہ مکان بھی ہے یہی
یہیں ملا تھا مجھے دلنواز اک پیکر
خلوص بانٹ رہا تھا بہ یک نگاہ کرم
یہیں پہ آنکھ تکلّم سے آشنا بھی ہوئی
یہیں لبوں کو تھرکنے کی کیفیت بھی ملی
یہیں سے دل کو ہمکنے کی اک ادا بھی ملی
یہیں پہ ختم نسانے کا سلسلہ بھی ہوا
یہیں پہ قتل کا دلدوز حادثہ بھی ہوا
یہی گلی ہے!!
شکستہ مکان بھی ہے یہی!!

قطعات

تصویرِ تمنا کی خلا پاٹ رہی ہے
ہر زخم سے اک نقش نیا کاٹ رہی ہے
یونہی نہیں نکھرا ہے مری فکر کا عارض
برسوں سے مرے دل کا لہو چاٹ رہی ہے

چہرے پہ مرے رنگِ الم دیکھ رہے ہیں
آئینے میں وہ جلوۂ غم دیکھ رہے ہیں
اے گردشِ دوراں اسی مرکز پہ ٹھہر جا
وہ مجھ کو بہ اندازِ کرم دیکھ رہے ہیں

بیتی ہوئی رتوں کی کہانی بھی آئے گی
بچھڑے ہوئے دلوں کا فسانہ بھی آئے گا
ہر زاویے سے رقص کرے گی یہی حیات
تم آگئے تو میرا زمانہ بھی آئے گا

نازفش کمپنی

Naaz
Fish
Company

Exporter of fish

(Syed Gauhar Maqsood)

H. I. T. FISH MARKET
HOWRAH - 1

Phone : 660-5755
660-2985



محسن باعشن حسرت

نام : محسن باعشن
ادبی نام : محسن باعشن حسرت
ولدیت : عبدالرحمن باعشن
تعلیم : بی۔اے (نامکمل)
سنِ ولادت : مارچ ۱۹۵۶ء
جائے ولادت : کلکتہ
آبائی وطن : حضر موت (سعودی عربیہ)
تلمیذ : حضرت قیصر شمیم
آغاز شاعری : ۱۹۶۹ء
پہلی تخلیق کی اشاعت : نومبر ۱۹۶۹ء
اعزاز : ماہنامہ "خاتون مشرق" دہلی ۱۹۸۶ء (توصیف نامہ)
وابستگی : دوماہی "تحفہ" بارکپور
انتخاب : (۱) غزلوں کا البم "نظم" اور گیتوں کا البم "سچ کے دکھاوے"
(۲) غزلوں کا البم "سیڑھیوں داستان" (آئندہ)
پتہ : ۳، پرسپ اسٹریٹ، فرسٹ فلور، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳

غزلیں

اک لفظ وفا میری زباں سے نکل آیا
پھر کیا تھا ہر اک ہاتھ میں پتھر نکل آیا
ہونے کو تھی اجداد کی تقسیم زمیں آج
لیکن ہوئی کیا بات کہ خنجر نکل آیا
اس بزم میں تھا میں ہی اک انصاف کا حامی
میرے لئے ہر سمت سے لشکر نکل آیا
ابھرا نہیں ڈوبا جو کوئی بحرِ انا میں
تھا حوصلہ میرا ہی جو بچ کر نکل آیا
اک بوند کی خواہش میں کبھی خشک ہوئے لب
جب پیاس بجھالی تو سمندر نکل آیا

پرانی تلخ باتوں کو بھلا کر جی رہے ہیں ہم
حسیں یادوں کو سینے سے لگا کر جی رہے ہیں ہم
ہمارے دل پہ درد و غم کے جانے بوجھ ہیں کتنے
مگر پھر بھی تو دیکھو مسکرا کر جی رہے ہیں ہم
کھلیں گے پھول گلشن میں بہاریں مسکرائینگی
سہانے خواب پلکوں پر سجا کر جی رہے ہیں ہم
جہاں کچھ لوگ عادی ہو چکے ہیں خود پرستی کے
اسی ماحول میں خود کو بچا کر جی رہے ہیں ہم
ہمارے سر نے جھک جانا کبھی سیکھا نہیں حسرت
صلیب و دار پر بھی سر اٹھا کر جی رہے ہیں ہم

چاہا تھا خود سے بڑھ کے اُسے میں نے کیوں بہت
اب دیکھئے نتیجہ [illegible] ہوں بہت
[illegible] بھی آنکھوں سے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] میرا [illegible] بہت
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تو سوتے رہے سر گھوں بہت

ماہنامہ انشاء کلکتہ

کے دو متضاد دھارے بہہ رہے تھے۔ اشکؔ نے افلاس کے دھارے کو اپنی شاعری سے جوڑا اور عوام نے انھیں اپنے احساسات کا ترجمان سمجھ کر گلے لگالیا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں بول چال کی زبان اور روزمرّہ کے الفاظ کو اچھی طرح کھپایا ہے۔ اشکؔ نے اپنی مختصر سی مدّت میں بے نظیر اور مقبول ترین نظمیں کہی ہیں۔ اُنھیں آنے والا دور کبھی فراموش نہیں کرے گا۔

اگر وہ مزید دس، بارہ سال زندہ رہتے اور اسی طرح ان کی نظمیں ہندو پاک کے مختلف ادبی رسالوں میں چھپتی رہتیں تو بلاشبہ اردو کے ترقی پسند شاعروں میں اہم مقام کے مالک ہوتے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں چھپنے چھپانے کی طرف راغب ہوئے اور وہ بھی دوستوں اور عقیدت مندوں کے تقاضے اور مشورہ سے مجبور ہو کر۔ ورنہ انھوں نے تو جوانی کے ابتدائی دور سے ہی شاعری شروع کی تھی لیکن مشاعروں اور ادبی نشستوں میں جانے یا کسی رسالہ میں چھپنے چھپانے سے گھبراتے اور صرف اپنے خاص دوستوں اور ساتھیوں کو اپنی چیزیں سناتے تھے۔

اشکؔ صاحب خالص ترقی پسند تھے مگر ادب میں بے راہ روی کے خلاف تھے۔ بھونڈی تشبیہ، بھدے الفاظ اور لفاظی پر اکثر منہ بنالیا کرتے تھے۔ وہ اپنے اصول کے پکّے تھے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ ہے کہ مرکزی اسمبلی کے لئے ضمنی انتخاب ہو رہا تھا۔ کانگریسی امیدوار کی حمایت کرنے والوں میں دو ایک صاحب ایسے بھی تھے جن سے اشکؔ صاحب کی یوں ہی سی جان پہچان تھی۔ ایک روز ان میں سے ایک صاحب نے اشارتاً یہ فرمائش کی کہ اگر آپ کانگریسی امیدواروں کی حمایت میں کوئی نظم لکھ دیں تو میں اس کے عوض میں آپ کو پانچ سو روپے دلوا سکتا ہوں۔ کوشش و پیروی کے بعد یہ رقم ہزار تک بھی جا سکتی ہے۔ یہ سن کر اشکؔ صاحب مسکرائے اور اپنی بیماری کا بہانہ کر کے ٹال گئے۔ لیکن دوسرے تیسرے دن بائیں بازو کے متحدہ محاذ کی طرف سے ہونے والے ایک مشاعرے کی صدارت فرمائی اور اس صدارت میں آمد و رفت کا خرچ خود برداشت کیا۔ اپنے کسی دوست کے استفسار پر کہنے لگے۔ ''رجعت پرستوں کی شان و حمایت میں کچھ کہنا میرے نزدیک بہت بُری بات ہے''۔

حالانکہ اسوقت اشکؔ صاحب پیسے پیسے کو محتاج تھے مگر پانچ سو کی رقم قبول نہ کی اور اپنے اصول کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہے۔ فی زمانہ ایسے لوگ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ورنہ جو شخص مسلسل دو سال بیکار ہو، کینسر جیسے موذی مرض میں گرفتار ہو، آمدنی کی کوئی صورت نہیں، بیوی الگ پڑی بستر پر زندگی کے دن گن رہی ہو، بھلا وہ محض ایک قصیدہ نہ لکھ کر پانچ سو اور ہزار روپے کی رقم یوں ہاتھ سے جانے دے۔

اشکؔ صاحب کی خودداری، غیرت، استغنا اور اصول پرستی کی یہ ایک مثال ہے۔

اگر جائزہ لیا جائے تو اشکؔ نے اردو ادب کو کچھ کم سرمایہ نہیں دیا بلکہ ان کی عمر کے آخری چند سال ان کی شاعرانہ زندگی کے انتہائی کامیاب دور کی تشکیل کرتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک بے مثال شعری معرکے سر کئے۔ اس دور کی تخلیقات میں اشکؔ کی داخلی و خارجی زندگی کی پیچیدگیوں، ذاتی تجربات و ملکی مسائل، سماج کا گہرا مطالعہ و تجزیہ، گرد و پیش کے معاشی و نفسیاتی پیچ و خم نیز حصول آزادی کے بعد ہندوستان کے نفسیاتی ''داغ داغ اجالے'' اور ''شب گزیدہ سحر'' کی بڑی واضح جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس دور میں اشکؔ کے قلم نے جس کے گرد غم روزگار کی شدّت کے ہاتھوں انگلیوں کی گرفت کمزور ہوتی جارہی تھی ایسی نظموں کو جنم دیا جو تاریخ ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ان کی نظموں میں خصوصیت کے ساتھ ''پیسہ''، ''بھاگو بھاگو ہلہ آیا''، ''بچوں کی غوں غاں''، ''حالات''، ''شعر و شاعری''، ''ٹن ٹن ٹن''، ''تب دیکھ بہار کلکتہ''، ''کوک رے کوئل کوک''، اور ''بنجارہ نامہ''، اپنے اندر بڑا گہرا سماجی، اور ادبی شعور رکھتی ہیں۔ ان کی کوئی بھی ایسی نظم نہیں ہے جس میں انھوں نے سرمایہ داریت اور سامراجیت کی سفاکی اور جنگجوئی کے متعلق یا سماجی اور طبقاتی ناانصافیوں اور مظالم کے خلاف دل کی گہرائیوں سے اپنی نفرت کا اظہار نہ کیا ہو۔ وہ خود غریب تھے، فاقہ مست اور بیمار تھے اور درماندہ رہ کر بھوک، بیماری اور غریبی کی اذّیت اور ذلت سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اپنے جذبات کی پوری شدّت سے نظموں میں عکاسی کی ہے۔ ان کے خلاف لڑنے جدوجہد کرنے اور انھیں ختم کرڈالنے کی زبردست خواہش اور عزم کا اظہار کیا ہے۔ اسی لئے ان کی نظمیں ہمیں اس قدر اپیل کرتی ہیں۔ اردو میں کون ایسا اشتراکی یا ترقی پسند شاعر ہے جس نے اشکؔ امرتسری کی طرح فاقہ کشی اور بیماری برداشت کی ہو؟ کون ایسا شاعر ہے جو سڑکوں پر دوائیاں بیچ کر اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتا ہو اور صبح سے شام تک چلچلاتی ہوئی دھوپ میں چیخ چیخ کر گلا پھاڑ کر چند پیسوں کی دوائیاں بیچتا ہو اور اس کے بعد گھر لوٹتا ہو تو اُسے اچھی طرح دو وقت کھانا، اچھا کپڑا اور گھر کا کرایہ تک ادا کرنے کی توفیق نہ ہو؟ کون ایسا عوامی شاعر ہے جس نے اشکؔ امرتسری کی طرح عوامی زندگی بسر کی ہو؟ اس کے بعد بھی اتنی اہم اور وقیع نظموں کو جنم دیا ہو؟ شاید سارے ہندوستان میں تو کیا ساری دنیا میں بھی اشکؔ امرتسری کی طرح غریب فاقہ مست، مصیبت زدہ اور مجبور شاعر کم ہوں گے۔



مطرب بلیاوی

نام نواب حسین
قلمی نام : مطرب بلیاوی
والد کا نام : پیر محمد (مرحوم)
تاریخ پیدائش : ۲۲ر مارچ ۱۹۲۹ء
جائے پیدائش : بستورہ، ضلع بلیا (یوپی)
ذریعۂ معاش : ملازمت
تصنیف : شجر درد کے پھول (شعری مجموعہ)
سال اشاعت : ۱۹۸۸ء

پتہ : 3, P M. Bustee 4th Lane
Shibpur, Howrah - 2
فون (۰۳۳) ۳۴۳-۴۱۹۲

رات کے پچھلے پہر کھلتے ہیں جب زخم کے پھول
آیتِ درد کا ہوتا ہے مرے دل پہ نزول

ہم سے سیکھا ہے زمانے نے جنوں کا انداز
ہم کو پہچانو، ہمیں تو ہیں محبت کے رسول

آپ کے ایک تبسم نے ضیا بخشی ہے
ورنہ مدت سے مری شمعِ تمنا تھی ملول

جانِ میخانہ کی سرشار نگاہوں کو نہ دیکھ
اے مری تشنہ لبی، ضبط کے آداب نہ بھول

کارواں اپنی امیدوں کا جدھر گزرا تھا
آج اڑتی ہے اُسی رہگزرِ شوق میں دھول

لے، انہیں آج تو احساس کے دامن میں سنبھال
میرے اشعار ہیں مطرب شجرِ درد کے پھول

تری نگاہِ تلطف سے ہوش مند رہا
مرا شعورِ مسرت بہت بلند رہا

ستارے دل کے فروزاں تمام رات رہے
نہ جانے کون یہ پہلو میں درد مند رہا

مری حیات کے تیور بجھے بجھے سے رہے
مآلِ شمعِ فروزاں مجھے پسند رہا

مری وفا کو پرکھنے کا زاویہ بدلو
وہ عہد بیت گیا، دل ستم پسند رہا

مرے قریب کے شاید کہیں فرشتے تھے
دریچہ میری طرف کا ہمیشہ بند رہا

دل میں اک آگ لگی پلکوں پہ کچھ دیپ جلے
تیری یادوں کا فسوں جاگ اُٹھا شام ڈھلے

اہلِ محفل نے سُنے، سر بھی دُھنا، واہ بھی کی
ہائے وہ نغمے جو آغوش میں آہوں کے پلے

کس کو معلوم تری پرسشِ غم پر اے دوست
کتنے آلام چھپائے ہیں تبسم کے تلے

جھلملائی ہے مری شمعِ تمنائے حیات
اُنکے ہونٹوں پہ تبسم کے کئی دیپ جلے

شدتِ تلخیٔ ایام تو کم ہو، یارو
رات باقی ہے ابھی ذکر لب یار چلے

تھپکیاں دے کے سلا دیتی ہیں یادیں اُنکی
کسمساتی ہے تمنا جو کوئی رات ڈھلے

بڑی لطیف کشش تھی حسیں پناہ میں تھا
کھلی جو آنکھ تو میں اپنی خواب گاہ میں تھا

حدیثِ عہدِ مسرت مری نگاہ میں تھی
کہ ایک پیکرِ رعنا دلِ تباہ میں تھا

تُلا ہوا تھا کبھی جان لینے دینے پر
عجیب رنگِ وفا اس کے اشتباہ میں تھا

ہر ایک سمت تھی اس کی نگاہ پتھر کی
وہ سنگِ میل برہنہ جو شاہراہ میں تھا

مری حیات ہی قاتل سہی، مگر مطرب
بڑے سکوں سے میں اپنی قتل گاہ میں تھا

گل سے بہتر خار ہی ہے جب خار صفت بن جائے پھول
ایسی عینک سے کیا حاصل جھونک دے جو آنکھوں میں دھول

نورِ سحر کی بات کرو کچھ، ظلمتِ شب کو جانے دو
اُس قصّے کا کیا حاصل ہے جس کو تم دیتے ہو طول

عزمِ سفر کے جذب سے کھنچ کر منزل خود پاس آئی ہے
اے میری ناشاد تمنا خوشیوں کے جھولے میں جھول

بے عملی کی دنیا میں کچھ ایسے بھی ہیں فرزانے
ساری خطاؤں کو جو اپنی وقت پہ کرتے ہیں محمول

راہِ عمل میں پھینک رہے ہیں جو تم پر پتھر معصوم!
ہر لحظہ برساتے جاؤ تم ان پر اخلاص کے پھول

دل ہے کہ جستجو کے سرابوں میں قید ہے
ورنہ ہر ایک چہرہ نقابوں میں قید ہے

فرصت کہاں کہ ڈھونڈے غمِ دہر کا علاج
ہر شخص اپنے غم کے حسابوں میں قید ہے

کیا خاک ہوں نصیب یہاں سربلندیاں
جوشِ عمل تو آج کتابوں میں قید ہے

میری حیات شوق کا ہر لمحہ دوستو!
آلامِ روزگار کے بابوں میں قید ہے

ٹوٹے پڑے ہیں دل کے درو بام ان دنوں
جلووں کا اہتمام حجابوں میں قید ہے

لے دے کے بچ رہی ہے جو تہذیب کی زباں
معصوم وہ بھی عالی جنابوں میں قید ہے

مجرم

کل اک
جشنِ عام بپا تھا
بھیڑ بہت تھی
پل دو پل کے بعد اچانک
بات بات میں
بھگدڑ مچ گئی
کچل گیا
اک جسم لاغر
ٹوٹ گیا جیون کا ساغر!
گلی گلی میں ہے اعلان
"کس کا آدمی ہے یہ آکر پہچانو!"
اور میں چھپ کر گھر میں اپنے سوچ رہا ہوں
لاش پہ اس کی
کسی نے میرے نقشِ قدم
پہچان لئے تو؟

حقیقتِ فردا

سمندر تو نہیں
قطرہ ہے وہ' پھر بھی
بہت خوش ہے
خوشی کی بات بھی ہے
انا تو کم سے کم
محفوظ ہے اُس کی
وہ اپنے جسم میں ہوتے ہوئے
ہر سمت بکھرا ہے
حصارِ قید سے آزاد ہے
مرضی کا مالک ہے
"وجود اُس کا عدم آوصاف تھا'
ماضی کی باتیں تھیں
"وجود اُس کا عدم آوصاف ہے'
ہیں حال کی باتیں
یہ ممکن ہے
وجود اُس کا فسونِ خواب ہی ٹھہرے
مگر یہ بھی تو ممکن ہے
وہ اپنے "آج" کے مدفن میں
آشنا ہو کسی "کل" کی

اندھی گلی میں صبح



فیروز عابد
کا
افسانوی
مجموعہ

ترقی پسند تحریک اور اشکؔ امرتسری

اشکؔ امرتسری کی ادبی شناخت ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی مستحکم ہو چکی تھی لیکن ادبی دُنیا میں درجۂ اعتبار آزادی کے بعد حاصل ہوا۔ انھیں عوامی حلقوں میں متعارف کرانے کا سہرا انجمن ترقی پسند مصنفین کے سر ہے۔ کلکتہ میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کا شہرہ ہوا تو اشکؔ بھی انجمن کی نشستوں میں باقاعدگی سے آنے لگے۔ ان کی پہلی نظم نے ہی پرویز شاہدی، مظہر امام، مظہر انصاری، سالکؔ لکھنوی اور عارفؔ ہوشیارپوری کا دل موہ لیا۔ اور ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ کلکتہ کے ترقی پسند مصنفین نے ان کی اس لئے بھی دل کھول کر پذیرائی کی کہ انھیں اپنی پسند کا شاعر مل گیا تھا۔ جو عوامی لب و لہجے میں عوام سے باتیں کرتا تھا۔ دوسرے ترقی پسند ادباء و شعراء کا تعلق متوسط طبقے کے پڑھے لکھے گھرانے سے تھا اور وہ عوام کی سطح پر اتر کر اُن کے لب و لہجے میں شاعری کرنے سے قاصر تھے۔ جبکہ اشکؔ امرتسری قطعی عوامی شاعر تھے۔ چنانچہ کلکتہ کے ترقی پسندوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ انجمن کی نشستوں کے علاوہ ٹریڈ یونینوں اور عوامی جلسوں میں بھی نظمیں پڑھنے لگے۔ انھوں نے رکشا مزدوروں، فٹ پاتھ پر دوکان لگانے والوں اور کارخانے کے مزدوروں کی زندگی پر کئی بہت ہی دل آویز نظمیں کہیں اور انھوں نے جب صنعتی مزدوروں کے علاقوں میں منعقدہ عوامی مشاعروں میں ہزاروں کے اجتماع میں نظمیں سنائیں تو ان کی مقبولیت میں دن دوگنا اور رات چوگنا اضافہ ہوا اور وہ کلکتہ کے نہایت مقبول شاعر شمار کئے جانے لگے۔

ترقی پسند تحریک نے اشکؔ جیسے بے مثال شاعر کو ان کے ادبی اور طبقاتی شعور کے ارتقاء میں براہِ راست مدد پہنچائی اور اس ادبی تحریک کے ذریعہ انھیں سماج اور اس کے عوامل و مسائل کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ایک نیا نقطۂ نظر ملا، اس طرح ان کی شاعری میں ایک انقلابی تبدیلی آ گئی۔ نئے نقطۂ نظر اور نئے شعور نے شاعری میں نئی زندگی اور نیا جوش پیدا کر دیا۔ ان کی شاعری جو اس سے قبل صرف قومی اور اصلاحی تھی، ترقی پسند سماج کی ترجمان اور علمبردار بن گئی۔ انھوں نے شعوری طور پر اشتراکی نظریۂ حیات کو قبول کر لیا اور ایک نئے سماج، نئی دنیا اور نئے انسان کی امید اور خواہش میں سماجی، سیاسی اور طبقاتی ناانصافیوں کے خلاف انقلاب کی ضرورت محسوس کی۔ اس ضرورت کے تحت سماجی ناانصافیوں اور مسائل کے متعلق نظمیں کہنی شروع کیں۔ چند قطعات ملاحظہ کیجئے ۔

اشکؔ دیرینہ روایات و عقائد کے غلام
کسی حق بات کو تسلیم نہیں کر سکتے
کسی زردار کو کر سکتے ہیں سو بار سلام
کسی فنکار کی تعظیم نہیں کر سکتے

گردشِ روزگار میں مزدور
سختیاں سہہ رہا ہے سہنے دے
تھاپ طبلے کی تیزتر کر دے
اشکؔ کچھ کہہ رہا ہے کہنے دے

یہ سجدہ ریزیاں درِ سرمایہ دار پر
اے ہمتوں کی گود کے پالے "نہیں نہیں"
ضربِ عمل سے کاٹ یہ زنجیرِ مفلسی
مردِ غریب قوتِ بازو پہ رکھ یقیں

یہ نیا دور بھی ناکام رہا اے ساقی
اس نئے خم میں بھی ہے زہر بھرا اے ساقی
پھینک دے شیشہ و پیمانہ و جام و ساغر
نئے انداز سے میخانہ سجا اے ساقی

مسجد ہو کہ میخانہ ہو مقتل ہو کہ مکتب
شاعر کسی محفل میں نہ خاموش رہے گا
وہ دار کے اوپر ہو کہ تلوار کے نیچے
وابستۂ حق ہے تو انا الحق ہی کہے گا

ترقی پسند تحریک کے اثرات سے اشکؔ امرتسری کے شعری رجحان میں کافی تبدیلی آئی۔ کیونکہ اس تحریک کا مقصد صرف شعر و ادب کی خدمت نہیں بلکہ عوام کی خدمت بھی تھا۔ اس تحریک نے زندگی کی سچائیوں کا دو ٹوک اظہار کیا۔ جسکا ماحصل اجتماعیت کو مادی نقطۂ نظر سے فروغ دینا تھا، فرد اور سماج کے باہمی رشتے کی عکاسی تھی۔ اشکؔ نے حالات کی نبض پر انگلی رکھی اور بے شمار نظمیں اور غزلیں کہہ ڈالیں۔

اشکؔ کلکتہ و مضافات کے عوامی حلقوں میں کافی مقبول تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جس زبان اور لہجے کے شاعر تھے وہ عوامی زبان تھی اور لہجہ بھی عوامی تھا۔ وہ ایسے دور میں جی رہے تھے جہاں دولت اور افلاس

غزلیں

مری خاموش طبعی آپ کی مشکل نہ بن جائے
دلِ مضطر کی حالت شورشِ محفل نہ بن جائے

ادب کا ہے تقاضہ گفتگو میں ہوش تو رکھئے
زباں کی ایک جنبش بے سبب قاتل نہ بن جائے

کہیں کیفیت دل میرے چہرے پر نہ ظاہر ہو
کہیں افلاس میرا رحم کے قابل نہ بن جائے

طلب اس وقت تک منزل کی صادق ہو نہیں سکتی
غبار راہ جب تک ردکشِ منزل نہ بن جائے

نکلنا ڈوب کر سورج کا یہ پیغام دیتا ہے
خدا کی ذات سے انساں کبھی غافل نہ بن جائے

محبت میں ضروری ہے کہ کچھ دیوانگی بھی ہو
بچانا اپنے انجم کو کہیں عاقل نہ بن جائے

وہ مرے پہلو میں اور میری نظر سوئے فلک
یہ حسیں لمحے رہیں گے یونہی یارب کب تک

زندگی بھر کی مری ساری کمائی کچھ نہ تھی
لیا تھی چشم یار میں مہر و وفا کی اک جھلک

شوق پکچر کا تھا یا وعدہ نبھانے کی تڑپ
بھیگ کر ساون میں آئے وہ سنیما ہال تک

شہر کی گندی ہوا اب گاؤں میں آنے لگی
اب کہاں وہ پیڑ پودے اور مٹی کی مہک

شہر کا فٹ پاتھ ہے اور بھاگتی اک زندگی
گم شدہ آسودگی بے جان آنکھوں کی چمک

باغ میں جھولا بھی ہے ساون بھی اور انجم بھی ہیں
اس گھڑی آنچل کسی کا کاش بن جائے دھنک

اُن کی کیا کیا ہیں عنایات ہمیں جانتے ہیں
ایک اک بات میں ہے گھات ہمیں جانتے ہیں

کون سی رُت ہے کہ ہر لمحہ گھٹن رہتی ہے
کیسے کٹتی ہے یہ رات ہمیں جانتے ہیں

ہم علی بابا ہیں سو، آج کے دروازوں کے
کیسے کیسے ہیں طلسمات ہمیں جانتے ہیں

کوئی جس طور سے چاہے نئی تاریخ لکھے
کس کے کیسے ہیں خیالات ہمیں جانتے ہیں

دوستی راس نہ آئے تو اٹھالو خنجر
کون کہتا ہے کرامات ہمیں جانتے ہیں

کیسے کٹ کٹ کے جگر آنکھ سے بہتا ہے لہو
کتنے دلدوز ہیں حالات ہمیں جانتے ہیں

ان کی آنکھوں کے کمالات عیاں ہیں سب پر
ہاں مگر ان کی حکایات ہمیں جانتے ہیں

وقت رخصت بھی نہ آیا کوئی ملنے انجم
ہم سمجھتے تھے کہ ہر بات ہمیں جانتے ہیں

۲ نظمیں

اطمینان

جون کی اک چلچلاتی دھوپ میں
شہر کے فٹ پاتھ پر
دوپہر کو
ننگے پاؤں
میلے بوسیدہ سے کپڑے جسم پر
زرد چہرہ
بجھتی آنکھیں
بال بکھرے
ہونٹ سوکھے
چال میں اک ڈگمگاہٹ
جسم جیسے اکسرے کی اک پلیٹ
پھر بھی چہرہ مطمئن
اُس نوجواں کا
ایک سوکھی روٹی اس کے ہاتھ میں
اور کتنا مطمئن ہے اس کا دل!!

زاویہ

بالکنی سے میں نے دیکھا
ہولی کھیلنے والی نے
کارپوریشن کے نل پر جب چہرہ دھویا
دیکھ کے میں یکلخت ہوا حیران بہت
کس کی گردن پر یہ کس کا چہرہ ہے
یہ تو ہمیشہ خواب میں مجھ کو دِکھتا ہے
لیکن اک انجانی لڑکی کی گردن پر یہ چہرہ؟

اُس کو اپنے پاس بلایا
نام پتہ سب جدا تھے اُس کے
بولی بھی تھی اس کی الگ
پاؤں سے لیکر گردن تک ہر چیز جدا تھی
میں حیران و ششدر تھا
کس کی گردن پر یہ کس کا چہرہ ہے!

بات محبت اور کشش کی ہے شاید
کس معبد پر
کس معبد کا گنبد مجھ کو آیا نظر
ایسی محبت اور کشش
بالکنی سے سب کو کب آئے گی نظر؟



معصوم شرقی

نام: عبدالغفار انصاری
قلمی نام: معصوم شرقی
پیدائش: ۴ نومبر ۱۹۴۸ء جگدل ۲۴ پرگنہ (شمالی کلکتہ)
تعلیم: ایم۔اے (ڈبل) پی ایچ ڈی۔ (اردو)
ملازمت: استاد شعبۂ اردو، حمایت الغرباء ہائر سکنڈری اسکول، کانکی نارہ (شمالی کلکتہ)
مدتِ شاعری: تیس سال
علمی وادبی سرگرمیاں: اردو کے "کاز" کو آگے بڑھانا، مشاعرے اور علمی مباحث کی محفلیں منعقد کرنا۔
منتظر اشاعت تصانیف: "اشک امرتسری۔ حیات، تنقید اور تدوینِ کلام"۔
"تراشیدہ"۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ۔
"لمحوں کے قدم"۔ مجموعہ کلام۔
زیرِ تصنیف: "تاریخِ ادبِ اردو"۔ مغربی بنگال کے خصوصی پس منظر میں (۱۸۵۷ء۔۱۹۴۷ء)
"بنگلہ دیش میں اردو شعر وادب کے سو سال (۱۹۰۱ تا ۲۰۰۰ء)
مکمل پتہ: ۲/۶۳، بارائی پاڑہ۔
پوسٹ: آر ایل بی لین۔
۲۴ / پرگنہ (شمالی کلکتہ)
فون نمبر: ۶۲۹۱۔۵۸۱ (۰۳۳)

غزلیں

یہ عنایت، یہ نوازش، یہ تعطف کیجئے
نہ برت حد سے زیادہ بھی تکلف کیجئے

جس کی پہچان مرے دم سے زمانے میں ہوئی
اب وہی شخص ہے خود میرا تعارف کیجئے

اب ملاقات میں باقی نہیں پہلا سا تپاک
گفتگو بھی ہے بہ انداز تکلف کیجئے

میرے افکار سے پہچان مری بنتی ہے
میرے اشعار ہیں خود میرا تعارف کیجئے

لفظ برتے ہیں تو احساس ہوا ہے مجھ کو
کتنا دشوار ہے لفظوں کا تصرّف کیجئے

میں تو انسان ہوں انسان کا غم لکھتا ہوں
میرے شعروں میں نہ مذہب نہ تصوف کیجئے

مجھ سے معصوم سدا اس کو شکایت ہی رہی
ایک میں تھا نہ کیا میں نے کبھی اُف کیجئے

یہ حادثات، یہ آفات بے سبب تو نہیں
خدا کا قہر، خدا کا کہیں غضب تو نہیں

کلام بھی ہے ادب مانتا ہوں میں لیکن
ہر اک کلام مگر شاملِ ادب تو نہیں

جو دل کو چھو نہ سکے، روح کو جگا نہ سکے
وہ نغمہ کچھ بھی سہی نغمۂ طرب تو نہیں

جو دینِ حق پہ لگاتا ہے رات دن ضربیں
کہیں وہ میرے زمانے کا بولہب تو نہیں

فساد و شورش و سازش ہے جس طرف نکلو
جو پہلے شہر میں تھا وہ سکون اب تو نہیں

میں اس لئے بھی اُسے دل سے پیار کرتا ہوں
وہ بے وفا سہی معصوم بے ادب تو نہیں



مشتاق انجم

نام مشتاق احمد
قلمی نام مشتاق انجم
والد محمد معین الدین (قلمی نام صابر جمیل)
والدہ سائرہ خاتون
ولادت ۳۱، اگست ۱۹۵۵ء
آبائی وطن ہوڑہ۔ مغربی بنگال
تعلیم ایم۔ اے۔ کلکتہ یونیورسٹی
شرف تلمذ حضرت قیصر شمیم
مستقل پتہ ۱۶، کاویز گھاٹ روڈ، شب پور۔ ہوڑہ۔ ۷۱۱۱۰۲
موجودہ پتہ ۱۱/۲، ہم گھوش لین، شب پور۔ ہوڑہ۔ ۷۱۱۱۰۲
شغل سرکاری ملازمت۔ رائٹرس بلڈنگ کلکتہ
تصنیفات (۱) "بے گھری" افسانوی مجموعہ۔ ۱۹۹۴ء
(۲) "تلاش" ۲۰۰۰ء
(۳) مشتاق انجم کی کہانیاں (بخط دیوناگری۔ زیر ترتیب)
اعزاز "بے گھری" کو بہار اردو اکادمی نے ۱۹۹۵ء میں انعام سے نوازا۔
وابستگی رائٹرز ایسوسی ایشن، ہوڑہ
فون (۰۳۳) ۲۶۲۴-۶۶۰

تلاش

دھوئیں کا مرغولہ، جن کا ڈراؤنا ہیولہ اور ایک بھیانک قہقہہ!

"کیا حکم ہے آقا؟" بھرائی ہوئی آواز۔

الہ دین نے ایک نظر اپنے سوٹ بوٹ پر ڈالی اور ننگ دھڑنگ جن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم آج بھی اسی لنگوٹ میں خوش ہو؟"

"ہاں آقا"۔

"لیکن کیوں؟"

"میرا کام اپنے آقا کا حکم بجالانا ہے"۔

"مطلب؟"

"آقا کی فرماں برداری کے علاوہ کسی دوسری چیز میں مجھے دلچسپی نہیں"۔

"اور تم اسی میں خوش ہو؟"

"ہاں آقا"۔

"تمہیں اپنے لباس اور کھانے پینے کی فکر نہیں؟"

"نہیں"۔ جن نے نفی میں سر ہلایا۔

"کسی اور چیز کی خواہش نہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل نہیں آقا۔ اب کوئی حکم ہو تو فرمایئے ورنہ مجھے براہ کرم جانے کی اجازت دیجئے"۔ جن نے الہ دین کے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"حکم؟" الہ دین سوچنے لگا۔ "فی الحال یہی حکم ہے کہ مجھ سے باتیں کرو"۔

"کیسی باتیں آقا؟"

"جیسی میں کہوں"۔

"فرمایئے آقا"۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" الہ دین نے سوچتے ہوئے کہا۔

"چراغ کا جن"۔

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ کوئی نام ہے"۔

"آپ جس نام سے چاہیں پکار سکتے ہیں"۔

"کس نام سے پکاروں؟" الہ دین پھر سوچنے لگا۔

"جو بہتر سمجھیں آقا"۔

"سپر مین کیسا رہے گا؟"

"بہت بہتر آقا"۔

"تو سنو سپر مین! سب سے پہلے خود کو آج کے لباس میں لے آؤ"۔

"جو حکم آقا"۔

چند لمحوں میں ایک بھیانک قہقہہ کے ساتھ جن کے جسم پر جدید سوٹ نظر آیا۔

"اور کوئی حکم آقا؟"

"اپنے بھاری بھرکم قد کو میرے برابر کرلو"۔

"جو حکم آقا"۔

اور دھیرے دھیرے جن کا جسم چھوٹا ہونے لگا۔ اور الہ دین کے قد کے برابر پہنچ کر رک گیا۔

"اب میں جاؤں؟"

"بالکل نہیں"۔

"اور کوئی حکم آقا؟"

"تمہیں اپنا انداز تخاطب بدلنا ہوگا۔ آقا آقا کی رٹ ختم کرنی ہوگی"۔

"جیسی آپ کی مرضی آقا ..." نے جھٹ منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ساتھ ہی اپنی گفتگو کا انداز بھی ہوگا"۔

"او کے جناب!"

"ویری گڈ"۔ الہ دین خوش ہوا۔

"اور کوئی آرڈر پلیز؟" جن نے پو

"ویری نائس"۔ وہ محظوظ ہو رہا تھا

"اب اپنے ہیئر کٹ بھی بدل ڈ

اس نے جلدی سے کہا۔

''او کے سر!''

اور پلک جھپکتے ہی جن کے سر پر جدید طرز کے شمپو کئے ہوئے بال نظر آئے۔

''فنٹاسٹک!''

''تھینک یو سر، اب اجازت؟''

''ابھی نہیں۔ پہلے آؤ کسی ریستوراں میں کافی پیتے ہیں''۔

''میں کافی نہیں پیتا سر''۔

''چائے؟''

''چائے بھی نہیں سر''۔

''کچھ کھاؤ گے؟''

''مجھے کھانے پینے کی حاجت نہیں ہوتی جناب''۔

''عجیب آدمی ہو!'' اس نے حیران ہو کر کہا۔

جن صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''مانتا ہوں تمہیں کھانے پینے کی حاجت نہیں لیکن میں حکم دوں تو؟''

''تب تو کھانا پڑے گا سر''۔

''تو آؤ میرے ساتھ''۔

الہ دین سپر مین کا ہاتھ پکڑے ریستوراں میں داخل ہوا۔ اندر بیٹھے لوگوں میں سے کسی نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ سوچنے لگا۔ سپر مین اپنی اصلی شکل میں ہوتا تو ریستوراں میں قیامت مچ جاتی۔ اور صرف ریستوراں ہی کیا سارے شہر میں فتنہ کھڑا ہو جاتا۔ پولس والے جینا حرام کر دیتے۔ ہو سکتا ہے فوج طلب کر لی جاتی۔ سپر مین کے بچے کا کیا پل میں غائب ہو جاتا جان کے لالے پڑتے الہ دین کے۔ یا تو جان بحق ہو جاتا یا سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا۔

''کافی کیسی ہے؟'' الہ دین نے پوچھا۔

''اچھی ہے شکریہ''۔ وہ مسکرایا۔

''تم کہاں رہتے ہو؟'' الہ دین نے کچھ

''اپنے آقا میرا مطلب ہے اپنے باس کے قریب''۔

''لیکن دکھائی نہیں دیتے''۔

''آپ چاہیں تو ضرور دیکھ سکتے ہیں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایسے کہاں غائب ہو جاتے ہو؟''

''ہوا میں''۔ سپر مین مسکرایا۔

''ایک ذاتی سوال۔ تمہیں آزادی پسند نہیں؟''

''کیوں نہیں؟''

''صدیوں سے اپنے مالک کی غلامی کیوں کر رہے ہو؟''

''یہ میری ڈیوٹی ہے۔ اس سے آزادی کیا معنی؟''

''آج کے ترقی یافتہ اور جمہوری دور میں تم دوسروں کی غلامی کی بجائے خود مختار ہو کر جینا نہیں چاہتے؟''

''سر، میرے خیال میں یہاں ہم سب غلام ہیں''۔

''کیسے۔؟''

''اب دیکھئے نہ۔ کوئی دولت کا غلام ہے کوئی شہرت کا، کوئی مالک کا، کوئی بیوی کا، کسی کو حکومت کی غلامی کرنی پڑتی ہے کسی کو اپوزیشن پارٹی کی، کوئی اصولوں کا غلام ہے، کوئی پیٹ کا''۔

''ٹھیرو ٹھیرو''۔ الہ دین نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میری مراد یہ ہے کہ تمہیں آزادی کی فضا میں سانس لینا اچھا نہیں لگتا؟''

''کیوں نہیں۔ لیکن ایسی آزادی کی فضا نہیں جس میں سانس لینا دوبھر ہو جائے''۔

''ہاں۔ یہ درست ہے''۔ یکبارگی الہ دین اداس ہو گیا۔ آنکھوں میں کرب کے سائے لہرائے۔

ہے ۔ الہ دین ــــ نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ بعد میں اسکی سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ وہ آزادی اسے راس نہیں آئی۔ تب مجھ سے آزاد ہونے کا اُسے پچھتاوا ہوا تھا۔ شرم سے دوبارہ میرے سامنے نہیں آئی۔ کچھ دنوں بعد اس کے گھر والوں نے اُسے پھر کسی دوسرے کا غلام بنا دیا''۔

الہ دین ایک لمحہ کے لئے رُکا اور سرد آہ کھینچ کر شروع ہوا۔

''آج میرے پاس اسکی یادوں کے سوا کچھ نہیں ہے''۔

''سوری سر۔ میری باتوں سے آپ کو تکلیف پہنچی''۔

''سپر مین!'' الہ دین اسکی طرف جھک گیا۔ ''اُسے واپس لا سکتے ہو؟''

''سوری سر، یہ ناممکن ہے''۔

''میری ماں کو لا سکتے ہو۔ جسے آزادی حاصل کرنے کی ہوس رکھنے والے سرپھروں نے پچھلے سال گاؤں میں زندہ جلا کر مار ڈالا۔ درندوں نے ہمارے گھر، کھیت، کھلیان سب پھونک ڈالے۔ آزادی کی ہوس نے انہیں حیوان بنا ڈالا تھا۔ بولو سپر مین۔ میری ماں کو واپس لا سکتے ہو۔ تم ایسا کر سکتے ہو؟''

سپر مین نے سر جھکا لیا۔

''ان درندوں کو انسان بنا سکتے ہو؟ اس نے چیخ کر کہا۔

''سوری سر''۔

''تو جاؤ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہئے''

''او کے سر''۔

الہ دین نے کاؤنٹر پر پہنچ کر کافی کا بل کیا اور کسی دوسرے سپر مین کی تلاش میں پڑا۔!!

اور ثقافتی زبان بنی اور اسکے سمجھنے اور بولنے والے برصغیر کے گوشے گوشے میں پائے جانے لگے اور اسے نوکری پانے کا وسیلہ سمجھنے لگے تو ہندو ملماء بھی اسکی طرف راغب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے فارسی میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ علم کے بعض شعبوں میں مسلمانوں پر بھی سبقت لے گئے۔ ادب کی ہر صنف پر انہوں نے لکھا اور خوب لکھا۔ یہاں تک کہ تاریخ نگاری میں بھی اپنا کمال دکھایا بلکہ تاریخ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ اس سے قبل کہ تاریخ نگاری میں ہندوؤں کی خدمات کا جائزہ لیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ سے متعلق مسلمانوں کے رجحانات کا ذکر کر دیا جائے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ یہ فن مسلمانوں کی دین ہے اور یہ انہیں کے ذریعہ ہندوؤں تک پہنچا۔

تاریخ سے متعلق مسلمانوں کے رجحانات :

تاریخ نویسی میں مسلمانوں کو من حیث القوم نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ بیشک عربوں کے پاس اسلام کے ظہور سے پہلے تاریخ کا تصور محدود تھا اور ان کے پاس چند کہانیاں بھی تھیں۔ مثلاً وہ اہم اور دلچسپ واقعات جنکے استحقاق کے ضمن میں کوئی ٹھوس دلیل ان کے پاس نہ تھی۔ غالبًا ایسے ماورائی اور تخیلی لوگوں کے افسانے تھے جو الٰہی دنیا سے تعلق رکھتے تھے جسے ہم مجموعی طور پر کلیتاً فوق الفطرت کہہ سکتے ہیں۔ ایسے افسانے جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس افسانوی دار و گیر کے وہ اس مریضانہ حد تک عادی ہوگئے تھے کہ ان کی تحویل میں نہ تو کوئی تاریخ تھی اور نہ ہی انہیں تاریخ کا شعور حاصل تھا۔ آئی، ایچ قریشی لکھتے ہیں کہ ''مسلمان ما قبل اسلام عربوں سے تاریخ نگاری کے طریق و رسوم سے کوئی تحریک نہیں حاصل کر سکے تھے'' (۳) اسطرح یہ غالب امکان ہے کہ عربوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد اور قرآن کی پاک آیات کی تعلیم سے تاریخ کے نظریئے کو فروغ دیا ہوگا (۴)۔ مسلم تاریخ نگار تاریخ کی معنویت کے سلسلے میں ایک نظریہ رکھتے تھے۔ جس کا التزام تاریخی کاموں میں کیا گیا ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تاریخ خدا کا آلہ کار ہے جو انسان کی تدریجی ترقی اور دنیا کے یقینی خاتمہ اور اسکے احتساب پر مشتمل ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش دنیا کی تاریخ کا بدلنے والا ایک عظیم نقطہ تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں پر تاریخ کے مقاصد نے پہلی بار اپنی وضاحت کی اور تاریخ ایک حقیقت بن گئی۔ اس طرح مسلم مورخین کی تاریخ سے مراد بادشاہوں اور حکومتوں کی تاریخ نہیں ہے بلکہ یہ ملک کی تاریخ ہے۔ جس میں بادشاہ بھی شامل ہیں۔ تاریخ مختلف لوگوں کی شخصیت اور برتاؤ کو بیان کرتی ہے۔ یہ اندوختہ ہے ذہانت کا، فراست کا اور ان کے کارناموں کا۔ یہ اقوام کی اجتماعی عروج و زوال کی تصویر پیش کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بار بار نمودار ہونے والے عروج و زوال کے اسباب و علل اور تجربات کا بھی محاسبہ کرتی ہے۔ ابن خلدون نے پرزور طور پر کہا ہے کہ ماضی حال سے اتنی زیادہ مشابہت رکھتا ہے جتنی پانی پانی سے بھی نہیں رکھتا (۵)۔ اسکے قول کے مطابق مطالعہ تاریخ کے لئے علم کی گہرائی اور وسعتِ نظر درکار ہوتی ہے جو کہ اسباب و علل کی تفہیم میں معاون کردار ادا کرتی ہے۔ اس طرح اسکی جڑیں فلسفہ میں بھی سختی سے مربوط ہیں اور فلسفہ کی شاخ کی حیثیت سے بھی عمل درآمد کی حامل ہیں۔

مسلمانوں نے اللہ کی خوشنودی کے حصول کی خاطر اس علم کی طرف مراجعت کی (۶)۔ قرآن اخلاقی نصیحت کے طور پر ایمان والوں کو تاریخ کی واقفیت پر زور دیتا ہے۔

''اولمه لَیسیر وافی الَارضِ وافَینظر کیفَ کانَ عاقبة الذّینَ کانو امن قبلهمه کانو لهمه اشد منهم قوةً و اثاراً فی الارض فاخذهُم اللهُ جذنو بهم وَ کانَ لهمه مِن الله من واقِ'' (۷)

ترحمہ :— کیا ان لوگوں نے سفر نہیں کیا ان سر زمیوں کا کہ مشاہد ہ کریں خداکے منکروں کے نتائج کا۔ وہ لوگ ان سے زیادہ طاقتور تھے - اور آثار حوان لوگوں نے رسین پرچھوڑے مگر اللہ نے انہیں روک دیا۔ ان کے گناہوں کی وحہ سے اور نہیں تھا کوئی بچانے والا ان کو اللہ سے''

مسلم مبصرین عموی طور پر نظریہ رکھتے ہیں کہ زمینوں پر سفر کرنا تاریخ کے عام مطالعہ کا ایک متبادل ہے کیونکہ اس زمانے کے تاریخی واقعات معدوم تھے اور ان کی تاریخ سے کسی کے واقف ہونے کا واحد ذریعہ ان کی تباہی کا بالواسطہ یا براہ راست مشاہدہ تھا (۸) قرآن نے نیم قدیم ملکوں اور نابود تہذیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے اسکی نشاندہی کی ہے کہ اللہ کی رضا ظالمانہ عمل پیرا نہیں ہوئی اور ہر تبدیلی اور انقلاب کے خاص تاریخی وجوہات ہیں، جسے قرآن نے سنت اللہ کہا ہے (۹) قرآن نے تاریخ کو نہ تو خود فروغ دیا نہ روحانی طاقتوں کے درمیان ہمیشہ سے تبدیل ہونیوالے واقعات کو مساوی قرار دیا ہے اور نہ ہی معاشی طبقات کا باہم جھگڑا بیان کیا ہے بلکہ نیک و بد اور خیر و شر کی حامل قوتوں کے درمیان ہمیشہ سے ہونے والے تصادم کو تاریخ کا نام دیا ہے۔ اس نظریہ کو قرآن نے اکثر پیش کیا ہے اور ماضی اور رواں تاریخی واقعات کا حوالہ دیا ہے۔ دراصل مسلم تاریخ نگاروں کا نقطۂ نظر

قرآن سے متاثر رہا ہے۔ قرآن نے انسانوں کو بار بار کھلی آنکھوں اور کشادہ دلی سے دنیا کا مشاہدہ اور مطالعے کا اذن عام دیا ہے۔(۱۰) تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ ان کی نسلوں اور تہذیبوں کا انجام کیا تھا، وہ لوگ طاقت میں ان سے افضل تھے۔ ان لوگوں نے زراعت کی اور اسکو آباد کیا ان سے زیادہ تعداد میں"(۱۱)

قرآن کا قدیم لوگوں کو پیش کرنے کا طریقہ اور ان کی تہذیب کی جانب تاکید اور ان سے درس حاصل کرنا دراصل یہ تاریخ نگاری کا ہی ایک جز ہے۔ لہٰذا نمایاں طور پر اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو تاریخ سے فطرتاً شعوری ہم آہنگی رکھتا ہے۔(۱۲)

حیات طیبہ سے ہم ایسے کثیر واقعات کا پتہ لگا چکے تھے جو ان متقدمین پیغمبروں سے منسوب تھے جنکی بعثت حضور سے پہلے عمل میں آئی تھی اور جنکی تعلیمات اور زندگی کے بارے میں خود سرور کائنات نے ہمیں تفصیلی آگاہی بخشی تھی۔ قرآن میں بھی مختلف پیغمبروں کی ایک لگاتار زمانی تناظر میں بعثت و ظہور کا واقعہ درج ہے۔ چنانچہ اس طرح رسولوں کی آمد اور پیغمبروں کی مسلسل تعیث و تبدیل کا نظریہ جیسا کہ قرآن نے پیش کیا ان کا، پیش رو مبصروں اور سیرت نگاروں نے توضیحی اظہار تصنیفی شکل میں کیا۔ اور یہی عوام میں تاریخ کی اہمیت کے اجتماعی احساس کا سبب بنا۔ اسلامی عہد کے اوائل میں جن لوگوں نے تاریخی دستاویز کی تالیف و تدوین کی وہ مذہب کے ممتاز ترین لوگ تھے یعنی مفتیان • محدثین۔

عرب میں اسلام سے قبل ہی قصہ گویوں کی جماعت کافی پنپ رہی تھی۔ اگرچہ اولاً مسلمانوں نے اسے قبول نہیں کیا تاہم تاریخ گواہ ہے کہ ان کی دلچسپی میں بتدریج نشو ونما کا آغاز قرآن میں موجود حوالوں کی وجہ سے روبہ عمل تھا۔ لہٰذا پہلی صدی ہجری تک یہ بات مسلمہ تھی کہ تاریخ نگاری اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور اسکے عقلی نظریئے کے فروغ میں زبردست کردار ادا کرنے جارہی تھی۔۔۔

حوالے :

۱۔ H.Quraishi, O.P Cit, p.p 1196-97

۲۔ C.H Philips, Historians of India, Pakistan & Ceylon p. 91

۳۔ I. H. Quraishi, Historiography - M M Sharif

۴۔ A History of Muslim Philosophy (Germany) 1966, vol ii, p 1196 International Encyclopaedia of Social Science (America, The Macmillian Company and Free Press) P 411.

۵- ابن خلدون :مقدمہ، صفحہ ۱۰

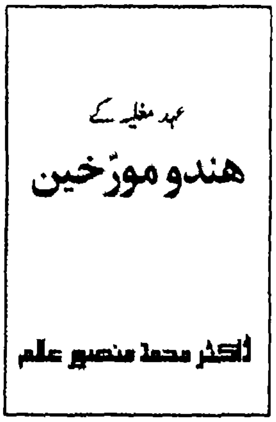
ولما طی اشبه بالائی من الماء بالماء

۶۔ نحوی صفحہ ۸۸۶

وما عایته علم التاریخ فالترجی لرضاء الله

ڈاکٹر محمد منصور عالم

کے تحقیقی مضامین

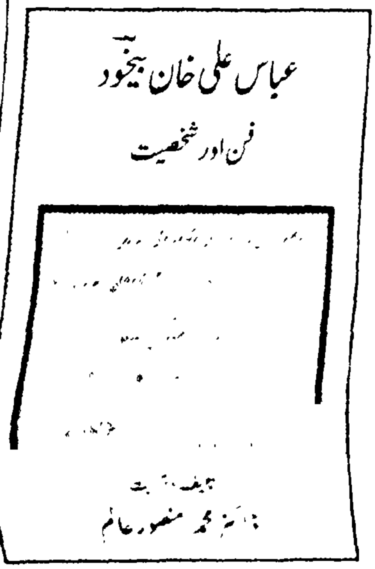


عہد مغلیہ کے

ہندو مورّخین

عباس علی خان بیخود

فن اور شخصیت



مرتب ڈاکٹر محمد منصور عالم

نام ۔ محمد منصور عالم

والد کا نام ۔ محمد اسمٰعیل

پتہ : 17/2/H/9, Smith Lane
Calcutta - 700 013

فون : (033) 245-9625

تاریخ پیدائش ۔ ۳؍جنوری ۱۹۴۹ء

تعلیمی کوائف ۔ اسکول فائنل ۱۹۶۳ء چشمۂ رحمت ہائی اسکول سے۔ انٹرنس ۱۹۶۴ء میں ہگلی محسن کالج سے۔ بی۔ اے آنرز (فارسی) کلکتہ یونیورسٹی۔ ۱۹۶۷ء۔ ایم اے (فارسی) ۱۹۶۹ء اور ایم۔ اے۔ (اردو) ۱۹۷۱ء (C U.) پی ایچ ڈی مقالہ "مہاراجہ کلیان سنگھ فارسی کا ایک نامور اسکالر" (C U) ۱۹۸۱ء

ملازمت لکچرر، فارسی۔ گوہاٹی یونیورسٹی، ۷۷ء تا ۸۲ء۔ مولانا آزاد کالج کلکتہ میں ۸۲ء سے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں عربی و فارسی شعبے میں ۸۳ء سے مہمان لکچرر۔

کتابیں

(۱) گولڈن فارسی گرامر اینڈ کمپوزیشن ۱۹۷۱ء

(۲) مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق حیات اور شاعری ۱۹۸۲ء

(۳) مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق ۱۹۸۶ء

(۴) An Introduction to Islamic History and Culture 1990

(۵) عہد مغلیہ کے مورخین ۱۹۹۸ء

(۶) عباس علی خاں بیخود فن اور شخصیت

فارسی میں تاریخ نگاری

وقائع کی شکل میں تاریخ نویسی زمانۂ قدیم سے ہی فارسی ادب کی محبوب صنف رہی ہے۔ اسلامی تاریخ کی ابتدا حدیث کے مطالعہ کے ساتھ ہوئی (۱)۔ ایران میں اسلام کی آمد کے بعد ایرانی زبان وادب کو جو ترقی نصیب ہوئی وہ مسلمان کی مذہبی اور ثقافتی زبان عربی کی رہین منت ہے۔ جس کے ادب کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسرے ادبی اصناف کے مقابلے میں تاریخ نویسی اور حدیث نگاری کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ قدیم ادبی تخلیقات میں، جو زمانہ جاہلیت کے خاتمہ اور عروج اسلام کی نشاندہی کرتے ہیں، تاریخ اور سیرت کی چند کتابوں کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی تفصیلی سوانح حیات اور ان کے احادیث کو قلمبند کرنے کا سلسلہ جب سے شروع ہوا اسی زمانے سے مسلمانوں کے اندر تاریخی حقائق کو پیش کرنے کا شعور پیدا۔ ہوا رفتہ رفتہ اس شعور میں پختگی آتی گئی۔ اس طرح ایک ایسا زمانہ آیا کہ تاریخ نے اسلامی ادب میں اپنی ایک اہم اور نمایاں جگہ بنالی۔

مسلمان تاریخ نویسی میں یونانی، رومی اور دیگر قدیم اقوام کی روایات سے متاثر نہیں ہوئے۔ تاریخی شواہد کی جانچ پڑتال، واقعات کی صحت اور ان کے عہد کے تعین کے لئے خود اپنے قواعد اور ضوابط مقرر کئے اور فن تاریخ کا معیار اس قدر بلند رکھا کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی دور جدید کے مورخ ان معیاروں پر کچھ بہت اضافہ نہ کر سکے۔ تاریخ نویسی سے مسلمانوں کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ انہوں نے تاریخ نویسی کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ وسط ایشیا تا اندلس کوئی ملک ایسا نہیں جس کی تاریخ کی ترتیب میں انہوں نے



ڈاکٹر محمد منصور عالم

کمال حاصل نہ کیا ہو۔ بر صغیر ہندو پاک میں تو ایک فن کی حیثیت سے تاریخ اور سوانح نگاری کی داغ بیل مسلمانوں نے ہی ڈالی۔ ہندوؤں نے تاریخ نگاری کا فن مسلمانوں سے سیکھا اور انہوں نے بھی تاریخی اصولوں اور ضابطوں کی پیروی کر کے اس فن میں خوب نام کمایا (۲)۔

وقائع نگاری کے پردے میں سیرت نگاری، جنگ و جدل اور جغرافیائی حدود کے درمیان وقوع پذیر ہونے والے تخریبی واقعات نے تاریخ کا تصور بدل کر رکھدیا۔ قرون وسطی میں جس مورخ نے تاریخ نویسی کو سائنس کے درجے تک پہنچایا وہ ابن خلدون تھے۔ انکے کمالات اور فضیلت کو مغرب و مشرق میں یکساں طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اور آج بھی مہذب دنیا کے مورخ ان کے قائم کئے ہوئے اصولوں اور نظریات کو وسعت عطا کی اور تاریخ نویسی کی ایسی راہ متعین کی جس نے انسان کے ارتقاء کو عمرانیاتی مطالعہ بنادیا۔ تہذیب کے مختلف ادوار میں تاریخ نویسی نے ترقی کی۔ مشق اور تجربے کے امتزاج نے اس فن کو اور جلا بخشی اور اسے حقیقی معیار عطا کیا۔ رفتہ رفتہ اس فن میں ادب کے اصول نے راہ پالی۔

ظہور اسلام کے ساتھ ایران اور بعد میں ہندوستان میں فن تاریخ نویسی اور وقائع نگاری نے کافی ترقی اور شہرت حاصل کی۔ مسلم سلاطین نے اس فن کی سرپرستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسکو مزید ترقی عطا کی۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ فن اسلام کی پہلی چار صدیوں میں پہلے سے ہی عروج پر تھا۔ گزشتہ صدیوں کے تجربات کی روشنی میں تاریخ کا مطالعہ اور تاریخ نویسی کے بنیادی اصول مرتب کئے گئے۔ اور تاریخی حقائق کو نہایت ایمانداری اور سچائی کیساتھ پیش کیا جانے لگا۔ قدیم دور کا تقریباً ہر مورخ نئی بنیادی اور مستند معلومات حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتا رہا۔ اسکی تاریخی کتابیں دراصل وقائع تھیں جن میں روزمرہ کی رپورٹ درج ہوا کرتی تھی۔

تاریخ نویسی کے فن کو جو عروج حاصل ہوا تھا اس میں بہت جلد زوال شروع ہو گیا۔ ہندوستان میں تاریخ کی مٹی اس وقت پلید ہوئی جب انگریز حکمرانوں نے تاریخ نویسی کو بھی حکمت عملی کا روپ دیا۔ رفتہ رفتہ تاریخ نویسی نے نقل نویسی کا جامہ زیب تن کرلیا۔ راست گوئی اور حقیقت پسندی اس فن سے دور ہوتی گئی اور اس کا معیار پست ہوتا چلا گیا۔ حوالہ جات کا مکمل بائیکاٹ کیا جانے لگا اور واقعات کو غلط ڈھنگ سے توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا رواج راہ پاگیا۔ تاریخ نویسی کے لئے جو چیزیں جزو ایمان کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں سب سے پہلی چیز سادگی بیان ہے۔

تاریخ اور انشاء پردازی کی حیثیت مخالفین کی سی ہے۔ مگر بعد کے مورخین نے اپنے آپ کو صرف انشاء پرداز سمجھ لیا اور تاریخ نویسی کے اس اصول کو یکسر فراموش کر دیا۔ ان کی تاریخی تخلیقات اصل راستے سے ہٹ کر نغمہ سرائی، مدح سرائی اور ڈرامہ بن کر رہ گئیں۔ بے باک اور نڈر مورخین نے جن کا تعلق درباروں سے رہا، سیاسی مصلحت کی بنا پر اپنے ممدوحین کی مدح سرائی اور ان کی چاپلوسی میں حقائق کا گلا گھونٹ دیا۔ اپنی کتابوں کو غیر ضروری، مبالغہ آمیز اور ناروا اور رنگین عبارتوں، بھاری بھرکم الفاظ اور پرشکوہ طرز تحریر سے اتنا بوجھل کر دیا کہ تاریخی حقائق ان کے نیچے دب کر رہ گئے۔ تاریخ نویسی قصیدہ نگاری میں تبدیل ہو گئی۔ اور اسطرح درباروں، شاہی حکمرانوں، اور امراء کی بے جا سرپرستی نے تاریخ نویسی کے ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا۔ لہذا اگر دور متوسط میں لکھی گئی کسی کتاب کا جدید معیار سے جائزہ لیا جائے تو یہ مورخ کے ساتھ سراسر بے انصافی ہو گی۔

تاہم یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ مورخین نے اپنی رنگین عبارت اور دلچسپ زبان سے فارسی نثر کی بے بہا خدمات انجام دیں۔ پرواز فکر اور تخیلات نے تاریخی کتاب کو نہایت شستہ مگر مسجع و مقفیٰ نثر میں تبدیل کر دیا۔ تاریخ وصاف، روضۃ الصفا اور اسی قسم کی دیگر کتابوں میں ارادتاً رنگین عبارت بھر دی گئی ہیں۔ اور تاریخی موضوعات کو جو ضروری تھے، خام مواد سے بھر دیا گیا۔ عروض و بلاغت اور صنائع و بدائع کا دل کھول کر مظاہرہ کیا گیا ہے اور تاریخ میں حقائق کی ترجمانی کو جو مقصد اعلیٰ تھا، پس پشت ڈالدیا گیا۔ اس قسم کی تاریخی کتابوں کو کافی شہرت ملی اور یہ کتابیں آج بھی اپنی شاندار طرز تحریر، بندش الفاظ اور رنگین عبارات کی وجہ سے مقبول و مشہور ہیں۔ منگول اور ایل خاندان کے دور میں فارسی ادب میں تاریخی کتابوں کا بازار گرم رہا جبکہ دوسرے ادوار نے صرف شاعر اور ادیب پیدا کئے۔ کسی نے تاریخ کی ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی جسے مذکورہ دور کے کسی مورخ کی کتاب کے مقابلے میں رکھا جاسکے۔ لیکن پھر بھی ان کے کارناموں نے ایک یادگار قائم کر دی۔ جس نے بعد میں ایران اور ہندوستان میں لکھی جانے والی تاریخی کتابوں کو کافی متاثر کیا۔

ہندوستان میں فارسی میں لکھی جانے والی تاریخی کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہاں نہ صرف مسلم مورخین نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے بلکہ ان کے دوش بدوش ہندو مورخوں نے بھی تاریخ کی عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔ ہندوؤں میں تاریخ نویسی کا رواج کبھی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کا کوئی تحریری اور مستند ریکارڈ نہیں ملتا۔ مگر عہد مغلیہ میں جب فارسی ہندوستان کی سرکاری

تنا ہے جو روزن پہ مکڑی کا جالا
اندھیرے میں لپٹا ہوا ہے اجالا
ہیں آزر کے دامن میں کانٹے ہی کانٹے
بتوں کے گلے میں ہے پھولوں کی مالا
وہ کھو جاتا ہے شہر کے جنگلوں میں
ہے جو پستہ قد بھیڑ میں چلنے والا
بہلتا نہیں اک کھلونے سے ہرگز
تمناؤں کی گود میں پلنے والا
یہی ہے علامت اسدؔ زندگی کی
یہ چہرے کی گرد اور پاؤں کا چھالا

پہلوؤں میں درد، چادر پر شکن
جاگتی آنکھوں میں سوئی کی چبھن
رات بھر بیداری کا انعام تھا
کانٹے لے کر آئی جو پہلی کرن
جسم پر پیراہنِ رنگین ہے
حسرتوں کی لاش بے گور و کفن
چکرویو میں پھنس گئے کچھ اس طرح
کام آئے گا نہ اب کوئی جتن
ڈس لیا خود آستیں کے سانپ نے
ہو گیا ہے نیلگوں سارا بدن

سورج کی روشنی میں منظر دھلا دھلا سا
آنکھوں کے سامنے ہے خوابوں کا سلسلا سا
اس عہد روشنی میں ہیں کیوں ہر آدمی کی
آنکھیں بجھی بجھی سی، چہرہ جلا جلا سا
پگھلا سکا نہ میرے غم کو ترا تبسم
لگتا ہے اس کے اندر تھا زہر کچھ ملا سا
سایوں میں ہم جلے ہیں اور دھوپ میں پلے ہیں
بالِ ہما کا سایہ ہم پر ہے اک بلا سا
ہر دستکِ ہوا کی ہلکی سی اک صدا پر
محسوس ہونے لگتا ہے گھر میں زلزلا سا

جلتے رہے اسدؔ تو پوچھا نہیں کسی نے
بجھنے پہ آج مجھ کو دیتے ہیں سب دلا سا

زبان پہ نامِ خدا اور گلے پہ خنجر ہے
یہ آدمی نہیں اس دور کا پیمبر ہے
کسی کے سامنے سر اس کا خم نہیں ہوتا
شعورِ ذات کی دولت جسے میسر ہے
ہے تیری اپنی ہی تصویر کی نمائش یہ
تری دکان میں جو یہ برہنہ پیکر ہے
یہ جاگ اٹھے گا تو انگڑائی لیں گی موجیں بھی
ابھی تو خواب میں ڈوبا ہوا سمندر ہے
یہاں ٹھہرتا نہیں کوئی قطرۂ شبنم
حصارِ ذات کے اندر انا کا پتھر ہے
عجیب شیوۂ تجدیدِ بت گری ہے اسدؔ
شکست و ریخت میں مصروف دستِ آزر ہے

دل میں مچل رہے ہیں سخنہائے گفتنی
لب پر مگر ہے نیزۂ بیداد کی انی
شیشہ گرانِ وقت تہہِ سنگ آگئے
اخبار میں خبر اک آتی ہے سنسنی
صد رنگیٔ بہار کا موسم گزر گیا
اب دھوپ آگئی ہے جہاں چھاؤں تھی گھنی
سچ بولنے پہ کٹتی رہی ہے زبانِ حق
پیاسے ہیں آج بھی سبھی تلوار کے دھنی
کس طرح دل کو دل سے ہو راہِ مفاہمت
آنگن میں نفرتوں کی جو دیوار ہے بنی
لے کر چراغ پھرنا پڑا دربدر مجھے
یہ روشنیٔ طبع مری جان پر بنی
سب کچھ مری حیات کے دامن میں ہیں اسدؔ
گرمی، بہار، بارشیں، جاڑے کی کنکنی

نظم

خوابِ سحر

زندگی میں کوشش اپنی کارگر ہوتی نہیں ہے
خواب شب بھر دیکھتا ہوں اور سحر ہوتی نہیں ہے

رات کو جب لوڈشیڈنگ کی وجہ سے
میرا خستہ، بے سروسامان کمرہ
اور بھی وحشت زدہ ہو جاتا ہے اور ایک ہیبت ناک سایہ
ہر طرف لہرانے لگتا ہے تو پھر میں خوف سے آنکھوں کو اپنی
بند کر لیتا ہوں، لیکن
کھولتا ہوں جب تصور کے دریچے
دیکھتا ہوں روشنی بکھری ہوئی کمرے میں ہر سو،
دیکھتا ہوں فرش پر قالینِ رنگیں
چھت میں فانوسوں کی آویزاں قطاریں،
اور دیواروں پہ رنگارنگ پھولوں کی بہاریں
دیکھتا ہوں پردۂ در کا حسیں آنچل ہوا میں جھومتا ہے
اور وہ بڑھ بڑھ کے آگے آستانے کی جبیں کو چومتا ہے
محو جب اِس پر فریب و دلنشیں منظر میں رہتا ہوں اسی لمحہ یکایک
جگمگا اٹھتی ہے برقی قمقمے کی روشنی، لیکن
وہی کمرہ مرا ویران و خستہ!
اور دل پر ایک ہیبت ناک سایہ
چھایا رہتا ہے ہمیشہ۔
الغرض اس روشنی اور تیرگی کے جال میں
خواب شب بھر بنتا ہوں لیکن سحر ہوتی نہیں ہے

قطعات

جہل جب سے تیرا دھندا ہو گیا
علم کا بازار مندا ہو گیا
اس طرح سے تونے پھیلایا ہے جال
صاف پانی اور گندہ ہو گیا

تو ہے مفلس اور مسکین و گدا
اور ہم ہیں صاحب جود و سخا
دھوپ میں جب ہم جاتے ہیں لہو
شام کو جلتا ہے تیرے گھر دیا

احمقوں کے اِن پٹاروں میں تمام
بند ہیں احساس کے سارے نظام
پھٹ گئے پردے ہمارے کان کے
ہے سکونِ خواب آنکھوں پر حرام

ترے ایما پر ترے غنڈوں نے چند
کردئے ہیں دفتر و بازار بند
ہم نہیں حامی ہیں اس کے مطلقاً
بند اور ہڑتال ہے تجھ کو پسند

اہلِ زر کے نام سے جلتے ہیں یہ
اور انہیں کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں یہ
شہر کے آوارہ کتے ہیں یہ لوگ
بے لئے ہڈی کہاں ٹلتے ہیں یہ

قیمتیں ہیں آسماں سے ہم کلام
خاک پر جھکتے نہیں چیزوں کے دام
باوجودِ تنگ دستی اب ہمیں
ہاتھ اٹھاکر کرنا پڑتا ہے سلام

کار خانوں کی جہاں موجودگی
ہے ہواؤں میں وہاں آلودگی
گاؤں میں آرام و راحت اور سکون
شہر میں ہے ہر طرف فرسودگی

ہو۔ میں نے عرض کیا ان لوگوں کے پاس نقلی رسیدیں بھی ہوتی ہیں۔ کہنے لگے تم لوگوں کے پاس بھی گھٹیا کلام اور ذلیل خوشامد ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا شاعروں سے اتنی ناراضگی کی آخر وجہ کیا ہے۔ کہنے لگے وہی قول و فعل میں تضاد! میرے ایک شاعر صاحب سے سسرالی تعلقات ہیں۔ موصوف اسٹیج پر کلام پڑھنے کھڑے ہوئے۔ مطلع کے مصرعۂ ثانی تک پہنچتے پہنچتے پیاسے ہوگئے، ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ادھر ادھر اس طرح پانی تلاش کرنے لگے جیسے ریگستان میں کھڑے ہوں، ان کی پیاس کی شدت کو سامعین کے ایک حلقے نے محسوس کیا اور انھیں پانی پلا دینے کی آوزیں لگانے لگے، لیکن سامعین کے ایک بڑے حلقے نے کھڑے ہوکر احتجاج کیا اور کہا کہ پانی ہرگز نہ دیا جائے ورنہ یہ پھر تازہ دم ہو جائے گا۔ لیکن چوں کہ یہ مشاعرہ کنوینر صاحب کے قتل کے کیس سے بری ہونے کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا۔ لہٰذا کوئی RISK نہیں لیا جاسکتا تھا۔ شاعر صاحب نے جیب سے رومال نکال کر سر پر ایسے رکھ لیا جیسے جیٹھ کو دیکھ کر دیورانیاں سر پر آنچل رکھ لیتی ہیں پھر مائیک کے قریب ہی پانی کا گلاس لیکر بیٹھ گئے۔ اور آہستہ آہستہ پینے لگے۔ میں نے عرض کیا یہ تو ان کا نہایت شریفانہ اور اسلامی طریقہ تھا، اس پر آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے پہلے تو مداخلت کے جرم میں ڈانٹا پھر کہنے لگے، مجھے ان کے اس نمائشی طریق کار پر اس لئے اعتراض تھا کہ وہ مشاعرہ گاہ میں داخل ہونے سے پہلے میرے ساتھ کھڑے ہوکر پیشاب کر رہے تھے۔

سوئیں کی مٹھاس کا دف مارنے کے لئے عید کے دن حکیم صاحب سے ملاقات بہت ضروری ہوتی ہے، تخت پر ایسے بیٹھے تھے جیسے تخت طاؤس پر بیٹھے ہوں، مجھے رعایا سمجھ کر دیکھا۔ تمکنت سے مسکرائے۔ پھر میری ٹوپی اتار کر رشوت کی طرح چپکے سے جیب میں رکھ لی، وہ رشوت خور افسر کی طرح خوش ہوگئے، گلے ملنے پر کسی طرح راضی نہیں تھے۔ کہنے لگے تم سے گلے ملنے سے مٹی میں ملنا زیادہ بہتر ہے، بڑی ساجت کرنے پر یہ کہہ کر گلے سے لگ گئے کہ منافقت کے زمانہ میں منافقت سے کون بچ سکتا ہے اور پھر ایسے ایسے ملنے والے آتے ہیں کہ منافقت سے خود کو بچانا تو کجا جان بچانا مشکل نظر آتا ہے۔ کئی گلے ملنے والے تو ہڈی بٹھانے والوں کے ایجنٹ معلوم ہوتے ہیں۔ اتنی دور سے گلے ملنے کے لئے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں کہ بالکل فاسٹ بالر معلوم ہوتے ہیں اور میرا جیسا کمزور آدمی، سفارشی بلے باز کی طرح گیند قریب آنے سے پہلے ہی LBW قرار دے دیا جاتا ہے۔ میں تو کرکٹ بورڈ والوں کی بینائی کو کوستا رہتا ہوں کہ انھیں یہ فاسٹ بالر کیوں نہیں دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے رازداری سے یہ بھی بتایا کہ کرکٹ کے میدان میں آنے سے پہلے عمران خان بھی عید میں گلے ملنے کا ماہر تھا۔ میرے یہ کہنے پر کہ میں آپ کی اس منطق سے اتفاق اس لئے نہیں کر سکتا کہ دنیا کے تیز رفتار گیند بازوں میں زیادہ تر غیر مسلم ہیں، میرے اس سوال پر پہلے تو چونکے پھر میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہنے لگے، گلے ملنے کے لئے مسلمان ہونا کیا ضروری ہے، پچھلی عید میں آپ ہی ایک فرقہ پرست لیڈر سے گلے مل رہے تھے۔ کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ آپ دونوں عید کی نماز پڑھ کر آرہے ہیں۔

ہر زاہدِ شب زندہ کے افعال پر کھیئے
رہنے کو تو عیاش بھی بیدار رہا ہے

یہ پوچھنے پر کہ عید کی نماز کہاں پڑھی کہنے لگے دواخانے کے باہر چٹائی بچھا کر پڑھ لی تھی۔ میں نے پوچھا "میدان کیوں نہیں گئے" تخت پر غصے سے ایسے اچھلے جیسے قومی یک جہتی کے نام پر فرقہ پرست لیڈر، مجھے ایسی حقیر نظروں سے دیکھا جن سے پولیس والے شریف آدمی کو دیکھتے ہیں، کہنے لگے "برا مت ماننا۔ کلکتے کے شاعروں کی زبان بہت خراب ہے، گفتگو اور شاعری دونوں کے ساتھ زنا کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر طرۃ یہ کہ ایسے اکڑ کر چلتے ہیں جیسے میر کے ہم عصر جا رہے ہوں۔ اگر ٹوک دیجئے تو برا مان جائیں گے، ہجو کہیں گے۔ صبح شام بد دعائیں دیں گے، پارٹی آفس میں جاکر شکایت کریں گے، غالب کو بھیجے گئے گالیوں کے خط کی فوٹو کاپی عید کارڈ میں رکھ کر بھیج دیں گے، عید کی نماز کے بعد سینکڑوں لوگ یہی ایک سوال کر کے میری زبان کے ذائقے کو خراب کر چکے ہیں کہ میدان کیوں نہیں گئے۔ بھلا بتائیے۔ بدزبانی کی بھی حد ہوتی ہے۔ عام زبان میں بیت الخلاء جانے کو میدان جانا کہا جاتا ہے، میاں اگر یہی سوال میں تم سے کرتا تو یہ پوچھتا کہ میدان میں عید کی نماز ادا کرنے کیوں نہیں گئے"۔ میں نے فوراً عرض کیا وہاں "برآمدے" نہیں ہوتے۔ یہ سن کر مسکرائے پھر غصہ ایسے تھوکا جیسے رقیب کے منہ پر تھوک رہے ہوں، کہنے لگے بھئی واہ! کیا خوبصورت جواب دیا ہے۔ مزہ آگیا، مصرعے پر مصرعہ ایسا ہی ہونا چاہیے کہ ہم عصر شعرا دو لخت کا عیب ایسے ڈھونڈتے رہیں جیسے بندر دوسرے بندر کی جوئیں ڈھونڈتا ہے، میں نے عرض کیا اب تو آپ میری زبان کے قائل ہوگئے ہوں گے۔ نک چڑھی محبوبہ کی طرح منہ بنا کر بولے "میں تمہاری زبان کا تو نہیں ہاں زبان درازی کا ضرور قائل ہوں، پھر ملازم سے کہنے لگے، ان کا منہ میٹھا کراؤ، عید کا دن ہے۔ جب سے بیچارے گھر میں اکیلے رہتے ہیں تو سویاں آتی ہیں نہ پڑوسنیں، میں نے پوچھا تمرہ، ہنس کے بولے نہیں روزمرہ

محبتوں کا وہی درس دے رہے ہیں ہمیں
جو عید اپنے سگے بھائی سے نہیں ملتے



محمد سمیع اللہ اسد

نام : محمد سمیع اللہ اسد [قلمی نام کبھی اسد مظفر پوری تھا۔ اب اصلی نام ہی ہے]

تاریخ و جائے پیدائش : ۱۴؍مئی ۱۹۳۳ء، ویشالی، بہار

تعلیم : آنرز کے ساتھ عربی و فارسی میں ایم۔اے؛ جرمن زبان میں ڈپلوما اور عربی میں ڈاکٹریٹ۔

ملازمت : ابتدا ۱۹۶۳ء میں مولانا آزاد کالج، کلکتہ میں عربی کے لکچرار اور آخر میں ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے فروری ۱۹۹۹ء میں ملازمت سے سبکدوشی۔ ۱۹۷۰ء سے اب تک یونیورسٹی میں جزوقتی لکچرر۔

مشاغل : شاعری، ترجمہ و تالیف اور ادبی و تعلیمی سرگرمیاں۔

تصنیف و تالیف : درسی کتابیں، تعلیمات فارسی، اور "غبار سفر" (شعری مجموعہ)۔

انعام : "غبار سفر" پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی سے دو ہزار کا انعام۔

رہائش : بی بی۔ ۲/۷۲، سالٹ لیک سٹی، کلکتہ ۶۴۔
فون : ۵۲۹۸-۳۳۴ (۰۳۳)

غزلیں

لہرا رہے ہیں سائے مکانوں کے آس پاس
کھٹکا لگا سا رہتا ہے جانوں کے آس پاس

مجرم نہیں تو جرم کا اقرار کیوں ہوا
سچائی کچھ چھپی ہے فسانوں کے آس پاس

پیدا ہوا جو فرق دلوں میں تو کیا ہے غم
رشتہ ملاپ کا ہے زبانوں کے آس پاس

پردہ کئے کھڑا ہے متاع برہنہ کا
یہ کاغذی لباس دکانوں کے آس پاس

فرہاد اب تو دودھ کی نہریں بہائے گا
تیشہ لئے کھڑا ہے چٹانوں کے آس پاس

انکی نگاہیں سب غلط انداز ہیں اسد
لگتے ہیں سارے تیر نشانوں کے آس پاس

دریا کے کنارے ہے پڑی پاؤں پسارے
سوکھی ہوئی ساحل کی زمین پیاس کے مارے

اللہ ہی حافظ ہے وہ خود کانپ رہے ہیں
دیوار کے بازو سے لگے ہیں جو سہارے

اس شہر کی ہر رات میں ہے دن کا اجالا
جسکی نہ کوئی صبح، کہاں رات گذارے

پردیس سے گھر جانے کو وہ کب سے کھڑا ہے
بوجھ اپنا اٹھائے ہوئے پٹری کے کنارے

افلاس زدہ لفظوں کی سنتا نہیں کوئی
بیچارہ صدا دیتا ہے ہر ایک دوارے

پھولوں میں، چراغوں میں کہ رنگوں میں، لہو میں
ہر شئے میں اسد پاؤگے بس عکس ہمارے



منور رانا

نام : سید منور علی
قلمی نام : منور رانا
والد . سید انور علی (مرحوم)
جائے پیدائش : رائے بریلی (اتر پردیش)
پیدائش ۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۵۲ء
مستقل سکونت : غزل گاؤں۔ قلعہ بازار،
رائے بریلی (یوپی)
فون ۸۸۵۶۰۸/۲۱۰۲۹۶
۲۰۵۵۶۵/۲۰۳۹۹۱ (دفتر)
شادی ۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۷۴ء
اہلیہ کا نام رعینہ خاتون
بچے . ۵ر بیٹیاں ــــ ۱ر بیٹا
پیشہ ٹرانسپورٹ
کتابیں . غزل گاؤں۔ پیپل چھاؤں۔
مورپاؤں۔ سب اسکے لئے۔
بدن سرائے اور نیم کے پھول
زیرِ طباعت . بغیر نقشے کا مکان (انشائیے)

پتہ ۔ 10C، بولائی دت اسٹریٹ
کلکتہ۔ ۷۰۰۰۷۳
فون نمبر (033) 235-4230/0901
فیکس (033) 221-5534
موبائل . 98380-052784

غزلیں

پیروں کو مرے دیدۂ تر باندھے ہوئے ہے
زنجیر کی صورت مجھے گھر باندھے ہوئے ہے
ہر چہرے میں آتا ہے نظر ایک ہی چہرہ
لگتا ہے کوئی میری نظر باندھے ہوئے ہے
پرواز کی طاقت بھی نہیں باقی ہے لیکن
صیّاد ابھی تک مرے پر باندھے ہوئے ہے
بچھڑیں گے تو مر جائینگے ہم دونوں بچھڑ کر
اک ڈور میں ہمکو یہی ڈر باندھے ہوئے ہے
آنکھیں تو اُسے گھر سے نکلنے نہیں دیتیں
آنسو ہے کہ سامانِ سفر باندھے ہوئے ہے
پھینکی نہ منوّر نے بزرگوں کی نشانی
دستار پرانی ہے مگر باندھے ہوئے ہے

* * *

خاک اُڑاتے ہوئے صحرا کے مسافر اچھے
آپ آباد رہیں ہم تو مہاجر اچھے

تیرگی میں یہی آسیب نظر آتے ہیں
روشنی ہو تو یہی سارے مناظر اچھے

آپ نے مڑ کے بھی دیکھا نہ مسلمانوں کو
آپ کے سر کی قسم آپ سے کافر اچھے

وقت بھر دیتا ہے ہر زخم کو رفتہ رفتہ
ہوگئے نہ ترے بیمار بھی آخر اچھے

اپنے وعدے سے کسی دن بھی مکرتے ہی نہیں
آپ اچھے کہ مرے شہر کے تاجر اچھے

*

سفید پوشی ترا اعتبار جاتا ہے
اگر چراغ ہواؤں سے ہار جاتا ہے
قدم بڑھانے میں خطرہ ہے جان کا لیکن
میں لوٹتا ہوں تو سارا وقار جاتا ہے
عدالتوں ہی سے ہی انصاف سُرخرو ہے مگر
عدالتوں میں ہی انصاف ہار جاتا ہے
کریں نصیب سے شکوہ کہ موسموں کا گلہ
بدل کے راستہ ابرِ بہار جاتا ہے
میں اپنا لہجہ تو تبدیل کر نہیں سکتا
بلا سے جائے اگر کاروبار جاتا ہے

* *

انسان تھے کبھی مگر اب خاک ہو گئے
لے اے زمین ہم تری خوراک ہو گئے
رکھتے ہیں ہم کو چاہنے والے سنبھال کے
ہم ننھے روزہ دار کی مسواک ہو گئے
آنسو نمک ملا ہوا پانی ہی تھے مگر
آنکھوں میں رہتے رہتے خطرناک ہو گئے
مصروف پردہ پوشی میں رہتے ہیں ہر گھڑی
آنسو غریب آنکھوں کی پوشاک ہو گئے
دنیا جو چاہتی تھی منوّر وہ ہو گیا
ہم بھی شکارِ گردشِ افلاک ہو گئے

* * *

سب کے کہنے سے ارادہ نہیں بدلا جاتا
ہر سہیلی سے دوپٹا نہیں بدلا جاتا
ہم کہ شاعر ہیں سیاست نہیں آتی ہمکو
ہم سے منہ دیکھ کے لہجہ نہیں بدلا جاتا
ہم فقیروں کو فقیری کا نشہ رہتا ہے
ورنہ کیا شہر میں شجرہ نہیں بدلا جاتا
ایسا لگتا ہے کہ وہ بھول گیا ہے ہمکو
اب کبھی کھڑکی کا پردا نہیں بدلا جاتا
اب رلایا ہے تو ہنسنے پہ نہ مجبور کرو
روز بیمار کا نسخہ نہیں بدلا جاتا
غم سے فرصت ہی کہاں ہے کہ تجھے یاد کروں
اتنی لاشیں ہوں تو کاندھا نہیں بدلا جاتا

چاند کے شوق میں تم چھت پہ چلے مت جانا

عمر اک تلخ حقیقت ہے منور پھر بھی
جتنے تم بدلے ہو اُتنا نہیں بدلا جاتا

عجب دنیا ہے ناشاعر یہاں پر سر اٹھاتے ہیں
جو شاعر ہیں وہ محفل میں دری چادر اٹھاتے ہیں

تمہارے شہر میں میت کو سب کاندھا نہیں دیتے
ہمارے گاؤں میں چھپر بھی سب ملکر اٹھاتے ہیں

انھیں فرقہ پرستی مت سکھا دینا کہ یہ بچے
زمیں سے چوم کر تتلی کے ٹوٹے پر اٹھاتے ہیں

سمندر کے سفر سے واپسی کا کیا بھروسہ ہے
تو اے ساحل خدا حافظ کہ ہم لنگر اٹھاتے ہیں

برے چہروں کی جانب دیکھنے کی حد بھی ہوتی ہے
سنبھلنا آئینہ خانو کہ ہم پتھر اٹھاتے ہیں

غزل ہم تیرے عاشق ہیں مگر اس پیٹ کی خاطر
قلم کس پر اٹھانا تھا قلم کس پر اٹھاتے ہیں

چاند رات کو حکیم صاحب سے چوڑیوں کی دکان پر ملاقات ہوئی، بہت بجھے بجھے تھے، ہو بہو بیوہ کی کلائی لگ رہے تھے، مجھے جیسے ہی دیکھا بیسوا کی چوڑیوں کی طرح کھنکنے لگے، تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولے آج کل تمہارے قلم کی زبان بہت چلنے لگی ہے۔ اخبار میں میرے خلاف تضحیک آمیز خبر چھپوا کر بہت خوش ہوگئے۔ میں نے احتجاج کیا، آپ میرے ادبی مضمون کو خبر کہہ کر میری ادبی صلاحیت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کہنے لگے کسی کی ذاتی زندگی کے جھوٹے سچے قصوں کو تحریر کرنا اور کچھ تو ہو سکتا ہے ادب ہرگز نہیں ہو سکتا، پھر آخر اس شہر میں جو سی آئی اے کی طرح بہت دور تک پھیلا ہوا ہے) کیا ایک میں ہی غیر روزہ دار تھا، کبھی شاعر برادری کے گریبان میں جھانک کر دیکھو، ایک سے ایک بڑا روزہ خور مل جائے گا۔ میں کئی ایک کے تو نام بھی جانتا ہوں مگر نشاندہی ہرگز نہیں کرونگا کیوں کہ یہ کام چغل خوروں کا ہے۔ دوسرے بزرگوں کا قول ہے کہ جس حکومت میں رہو اس کے سرکاری اور غیر سرکاری رازوں کو کسی پر انشاء مت کرو۔

اسے کھلا کے تو دیکھو یہ کوئی شرط نہیں
کہ روزے دار بھی ہوگا جو خانقاہ میں ہے

میں نے عرض کیا کہ ایک تو میں رمضان میں ادھر ادھر جاتا نہیں ہوں۔ دوسرے آپ روزہ خوری کے سلسلے میں جو تاویلیں پیش کرتے ہیں وہ کفر کی طرح حسین اور کافروں کی طرح دلفریب ہوتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو آپ کا جھوٹ آپ کے سچ سے زیادہ معصوم لگتا ہے۔ اور یوں بھی میری تحریروں سے آپ کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ کیوں کہ جب آپ کی دواؤں سے بیماری کا کچھ نہیں بگڑا تو میرے مضمون کی کیا حیثیت ہے۔ جسے آپ خبر اور میں مضمون کہہ رہا ہوں وہ دراصل میری طرف سے آپ کو دعوت نامہ VIA اخبار روانہ کیا گیا تھا، کیوں کہ آپ سے ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے میرا دل دودھ چھڑائے بچے کی طرح ہڑک رہا تھا۔ پہلے تو چوڑیوں کی آڑ سے مجھے گھورا پھر کنگن کی طرح بجتے ہوئے بولے اگر سچ پوچھو تو تم سے ملنے کو جی نہیں چاہتا ہے لیکن میں ایسے تمام دوستوں سے دل نہ چاہنے کے باوجود بھی ملتا رہتا ہوں جن سے جنت میں ملاقات کا امکان نہیں ہے۔ اور تم تو اتنے گنہگار ہو کہ شاید دوزخ بھی قبول نہ کرے۔ اور ہمیشہ عالم برزخ میں ہی رہو۔ صرف تم ہی نہیں بلکہ پوری شاعر برادری کا یہی انجام ہو سکتا ہے کیوں کہ تم لوگوں کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے تم شاعروں پر بڑا ترس آتا ہے۔ میں نے پوچھا ترس آپ شاعروں پر کھاتے ہیں لیکن مدد آپ امیر تیموں اور حسین بیواؤں کی کرتے ہیں۔ بے ساختہ ہنسنے لگے، سگریٹ کا پیکٹ کھولا۔ ایک سگریٹ مجھے بھی اس طرح پیش کی جیسے پدم شری ایوارڈ دے رہے ہوں۔ میں نے بھی اس طرح ان سے قبول کیا جیسے سیاسی شعراء الیکشن کا ٹکٹ قبول کرتے ہیں۔ خود بجھنے لگے تو ماچس کی تیلی جلائی۔ میری گلی تک آتے آتے ماچس بجھ گئی خود جلنے لگے۔ میں نے معافی مانگ کر بیان جاری رکھنے کی گزارش کی۔ نکوتین کی طرح حملہ آور ہوتے ہوئے بولے ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تم شاعروں اور تیموں میں بڑی مشابہت ہے۔ وہ لوگ بیچارے امیر لوگوں کے گھروں کے چکر بالکل اس طرح لگاتے ہیں جس طرح تم لوگ دوردرشن کے چکر لگاتے

ہے اس میں قرۃ العین حیدر کی خود نوشت سوانح بھی موجود ہے اور فن کے بارے میں ان کے بہت سے بیانات اور وضاحتیں بھی۔

۱۹۷۹ء ہی میں قرۃ العین حیدر کا ایک اور ناول منظرِ عام پر آیا۔ میری مراد ''آخر شب کے ہم سفر'' سے ہے۔ اس ناول میں عینی نے بنگال کی انقلابی تحریکوں کو اپنا موضوع بنایا ہے جو رومانیت پسند انقلابیوں کی شدید جذباتیت کے زیر اثر ناکام ہو گئیں۔ اسی کے ساتھ ناول کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں اینگلو انڈین طبقے کی تہذیبی نمائندگی نہایت موثر انداز میں پائی جاتی ہے۔ جس طرح ''آگ کا دریا'' میں بھگتی تحریک کے تناظر میں ہندو مسلم تہذیبی اشتراک کو نمایاں کیا گیا تھا اسی طرح ''آخر شب کے ہم سفر'' میں قرۃ العین حیدر نے بڑی فنکاری کے ساتھ اینگلو انڈین طبقے میں مغربی اور ہندوستانی تہذیب کی آویزش و آمیزش کو اجاگر کیا ہے۔ طویل زمانے پر پھیلی ہوئی تہذیبی رنگارنگی کو چند افراد کی باطنی کیفیات اور نفسیاتی کشمکش کے وسیلے سے ایک وحدت میں منتقل کر دینا اس ناول کا ایک اور بڑا وصف ہے۔ جگہ بہ جگہ عینی کے قلم سے ناول میں اس عہد کے بنگال کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں محفوظ ہو گئی ہیں جن کی بنا پر اگلی نسلوں کے لئے یہ ناول تہذیبی ورثے کی حیثیت اختیار کرے گا۔ ایک ایسی ہی تصویر

''کارتک میں رات کو آسمان کی شفاف جھیل پر چاند کا خزاں آلود کنول تیرا تیرا ابھرتا ہے۔ کچی سڑک پر لئی کے چھلکے بکھرے پڑے ہیں۔ ہوا میں زعفرانی گرد اڑتی ہے۔ جو کی بالیوں پر طوطے بیٹھے ہیں۔ تیز چاندنی میں مچھیروں نے اپنے جال دریاؤں میں پھیلا دئے۔ ان کی بانسریوں کے سُروں نے پردیس جانے والے مسافروں کو مضطرب کر دیا۔ فضا میں آسمان کا دریا بہہ رہا ہے۔ اُڑتے بگلے اور سفید بادل اس کے ریتیلے ساحل ہیں اور ستارے اس کے نیلوفر۔ ندی کے کنارے ٹھنڈی کیچڑ میں چرواہا سوتا ہے''۔

اور موسم سرما کی یہ تصویر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے:

''ماگھ کی طویل راتوں میں بندر سردی سے کانپ رہے ہیں۔ کتا چولہے کے پاس بیٹھا ہے۔ لڑکیاں چراغ کی روشنی میں سوزنیاں کاڑھنے میں معروف ہیں پردیسی مسافر گاؤں والوں سے پرال اور بھوسہ مانگ رہے ہیں۔ غریب بڑھیا آگ تاپتی اپنی کٹی سے باہر نہیں نکلتی۔ دھان کے گٹھوں کے پاس اپلے جل رہے ہیں۔ آپس میں جھگڑتے مسافر چوپال کے الاؤ کے پاس اکڑوں بیٹھے ہیں۔ اماوس کے سرد اور تاریک اندھیروں میں چڑیلوں اور جادوگرنیوں نے اپنے چولھے جلا لیے''۔

اس ناول میں عینی اپنے فن کے نقطۂ عروج پر ہیں اور بنگال کی روح میں اترتی نظر آتی ہیں۔ جدید عالمی تمدن کی عکاسی بھی ''آگ کا دریا'' کی مانند اس ناول میں نہایت چابکدستی کے ساتھ کی گئی ہے۔ گوتم نیلمبر کی طرح اس ناول کے ریحان الدین احمد اور دیپالی بھی اُردو ادب کے زندہ جاوید کرداروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان کی شخصیتیں بڑی فعال، متحرک اور پر قوت ہیں۔ پھر اس ناول میں چوں کہ اکثر دہشت پسندوں کی کارروائیاں پر اسرار ڈھنگ سے انجام پاتی ہیں اس لئے پڑھنے والوں میں تجسس اور تحیر کے جذبات ابھرتے ہیں اور اس طرح ناول زیادہ دلچسپ محسوس ہونے لگتا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ عینی کا یہ ناول اتنا تہلکہ خیز ثابت نہیں ہوا جتنا کہ ''آگ کا دریا'' ہوا تھا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ''آگ کا دریا'' اُردو کا پہلا بڑا ناول تھا اور اس کے بعد اچھے اور بڑے ناولوں کا ایک سلسلہ سا لگ گیا جس کی ایک کڑی ''آخر شب کے ہم سفر'' بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ ''آگ کا دریا'' دو قومی نظریے کا بطلان ہے جس کو ترقی پسند اور غیر ترقی پسند سبھی ناقدوں نے سراہا جب کہ ''آخر شب کے ہم سفر'' میں اشتراکی دہشت پسندوں کی انقلابی تحریک کو ناکامی سے دوچار ہوتے دکھایا گیا ہے جو ایک تلخ حقیقت ہونے کے باوجود اکثر لوگوں کے لئے پسندیدہ نہیں ہے ورنہ حق تو یہ ہے کہ بعض اعتبار سے یہ ناول ''آگ کا دریا'' سے بھی بلند تر فنی مرتبہ رکھتا ہے۔

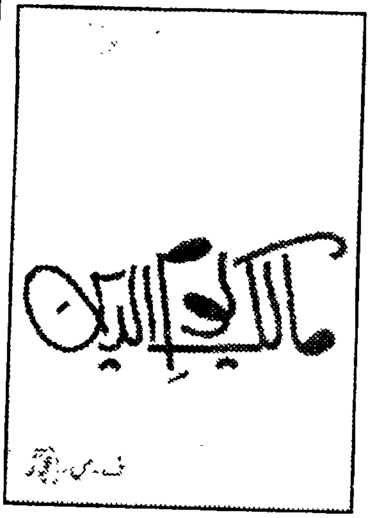
پچھلے دنوں قرۃ العین حیدر کا تازہ ترین ناول ''گردشِ رنگِ چمن'' منظرِ عام پر آیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک طوائف خاندان کی پانچ پشتوں پر پھیلی ہوئی حکایت لذیذ ہے جس کا سلسلہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط سے شروع ہو کر ہمارے دور پر منتج ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے اس وصف کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے کہ وہ ماضی اور حال کے حقائق کو ایک طویل جست لگا کر اس خوبی کے ساتھ ہم رشتہ کر دیتی ہیں کہ صدیوں کا فرق مٹ جاتا ہے اور سماجی، ثقافتی، معاشرتی، تاریخی واقعات کو بالترتیب اور باقاعدگی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ یہ تکنیک عینی کے اس ناول میں بھی برتی گئی ہے لیکن یہاں دلچسپی اور دلکشی پیدا کرنے پر زور زیادہ دیا گیا ہے۔ پلاٹ اور کردار سازی پر ناول نگار نے زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ کچھ یہ بھی ہے کہ اس ناول میں پشت در پشت طوائفوں کے جس خاندان کا تذکرہ۔ اس کو اپنی حقیقی زندگی میں عینی نے اتنے قریب

سے کبھی نہیں دیکھا جتنے قریب سے انھوں نے اپنے دیگر ناولوں کے کرداروں کا مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ بازارِ حسن اور شاہد اِن بازاری کے بارے میں عینی کے بیانات سُنی سنائی یا زیادہ سے زیادہ پڑھی ہوئی باتوں پر مشتمل ہیں۔ بایں ہمہ ان کی بے پناہ خلاقی نے دلنواز، بیگم اور مسز عندلیب بیگ جیسے کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کو بہت چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ البتہ ان کے ماحول کو اتنی وضاحت سے پیش کرنے میں عینی کامیاب نہیں رہیں۔ لیکن اگر اس ناول میں اتنا کچھ ہی ہوتا یعنی طوائفوں کے زندہ زندہ سے کرداروں کے ساتھ غیر حقیقی ماحول، تب بھی یہ ایک اوسط درجے کا ناول ہوتا۔ مگر اس ناول کا المیہ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اسے عام قاری کے لئے بھی پُر لطف بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ چنانچہ اگر ایک طرف دلنواز بازارِ حسن سے منھ موڑ کر جُن بی بن جاتی ہے اور راشد الخیری کے ناولوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے دردناک انجام سے دوچار ہوتی ہے تو دوسری طرف عندلیب بیگم ایک موڈرن زنِ بازاری کی طرح کلکتہ کی شاہراہ پر غمزہ و ادا بکھیرتی ہے۔ کہیں لکھنؤ کے گمنام نواب زباں زدِ عام قصوں کی مانند خود چنے چباتے اور دوسروں کو بادام کھلاتے پائے جاتے ہیں۔ پھر فاترالعقل خواجہ سبز پوش ہیں جو نہایت مضحکہ خیز انداز میں ناول کے مختلف حصوں کو عام پڑھنے والے کے لئے دلچسپ بناتے رہتے ہیں، لیکن ناول کے اختتام پر ڈرامائی انداز میں سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"کچھ دیر تک ساکت بیٹھے رہنے کے بعد بیرونی پھاٹک ٹوٹنے کی آواز پردہ چونکے۔ انگلیوں سے پلکیں رگڑا کیے، ماچس تلاش کر کے بجھی ہوئی موم بتی جلائی، چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ہتھیلی پر لگی راکھ آستین سے پونچھی۔ پاؤں کی بیڑیاں گھسیٹتے، کھسکتے گھڑونچی تک پہنچے۔ اس کے ایک شکستہ پائے کے نیچے رکھی اینٹ نکالی۔ گھڑے کا پانی چھلک گیا۔ دوسرا دھکا لگا، پانی سے شرابور ہو گئے لیکن انھوں نے پرواہ نہیں کی۔ اینٹ اٹھا کر اسے ہاتھ میں تولا پھر پوری طاقت کے ساتھ اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں منہمک ہو گئے"۔

ظاہر ہے زنجیروں سے رہائی پانے کی یہ کوشش پاگل پن نہیں کہی جاسکتی لیکن "گردشِ رنگ چمن" کے متعدد صفحات پر یہی خواجہ سبز پوش کسی جاسوسی ناول کے کردار کی طرح بالکل مختلف روپ میں کیا اس لئے پیش کیے گئے تھے کہ آخر میں پڑھنے والوں کو چونکایا جاسکے۔ کئی سال قبل قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول 'کارِ جہاں دراز ہے' پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقاد نے نسیم حجازی کو ان سے بہتر سوانحی ناول نگار کہا تھا تو مجھے بڑا رنج ہوا تھا لیکن "گردشِ رنگ چمن" کے خواجہ سبز پوش، گمنام نواب، راجہ دلشاد علی خان اور خدا رسیدہ میاں، بے ساختہ ابن صفی کی یاد تازہ کرتے ہیں کہ ایسے کردار وہ اپنے ناولوں میں خوب تخلیق کرتے تھے اور ان جیسے کردار وہیں سجتے بھی تھے۔ ایک ادبی ناول میں دلشاد جیسے بین الاقوامی مجرم کی موجودگی، جس کی تلاش میں انٹرپول سرگرداں ہے، بے موقع بھی ہے اور عجیب بھی کیوں کہ باقی ماندہ ناول سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید ستم یہ ہے کہ ناول کا تقریباً ایک تہائی حصہ میاں، کے کشف و کرامات کے تذکروں سے لبریز ہے۔ سنتے آئے ہیں ایک کرامت کے ظہور پر صاحب کرامت بزرگ روحانی بلندی سے دس درجے نیچے آجاتے ہیں اور "میاں" ہیں کہ ان سے دن رات کرامات ظہور میں آتی ہیں اور یہ بھی سنا جاتا ہے کہ موصوف واقعی ایک حقیقی کردار ہیں۔ لگتا ہے کہ مقبول فلموں کی طرح عینی نے بھی اس ناول میں قبولِ عام حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اس کوشش میں "گردشِ رنگ چمن" کو بارہ مسالے کی چاٹ بنا دیا ہے۔

ف۔ س۔ اعجاز کے دو مجموعہ ہائے منظومات



مالکِ یومِ الدین



لاشریک

کھوئے سے۔ ایک دوسرے کی محبتیں دلوں میں چھپائے، سلگتے ہوئے سے، لیکن جنسی لذت کوشی سے یہ ناول بہر حال پاک ہے۔ ایسے بے ضرر سے ناولوں میں کردار سازی یا واقعہ نگاری کی گنجائش کم ہوتی ہے چنانچہ قرۃ العین حیدر نے شعور کی رو کی تکنیک برت کر طرزِ نگارش میں انفرادیت اور انوکھا پن پیدا کیا۔ ''میرے بھی صنم خانے'' کا ایک اقتباس

''نیچے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اندر ہال میں سجے ہوئے سنگ مرمر اور تانبے کے مجسموں اور پرانی روغنی تصویروں کے نقوش دوپہر کے اندھیرے میں زیادہ گہرے، زیادہ پُراسرار نظر آ رہے تھے۔ فضا پر وہ خواب آگیں سناٹا چھاتا جارہا تھا جو گرمیوں کی بھرپور دوپہروں میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں سما کر دھیرے دھیرے دھڑکتا رہتا ہے اور خیال آتا ہے کہ اگر دنیا یہی ہے تو بری نہیں ہے''۔

اس قسم کے مناظر اور بیانات دونوں ناولوں میں عام ہیں جن سے سطحی رومانیت اور ذکارانہ ادھ گدرے پن کا احساس ہوتا ہے۔ دونوں ناولوں میں پیش کش کا انداز اور پیش کردہ زندگی کی جھلکیوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ کسی ارتقائی کیفیت کا پتہ کم کم چلتا ہے البتہ اسلوب اپنی جگہ منفرد ہے۔ ''سفینۂ غم دل'' سے چند سطور دیکھئے

''پھر مدھم چاند تیرتا ہوا اندھیرے میں نیچے اتر آیا اور اس کی ہلکی سی سرخ روشنی سارے میں پھیل گئی۔ اس روشنی میں زلزلے آ رہے تھے اور دیواریں ہل رہی تھیں اور ہر طرف ٹوٹے ہوئے پھاٹک اور بند دروازے تھے۔ اس کی جانی پہچانی گومتی کے کنارے کنارے جو راستہ جاتا تھا اس کے آخری سرے پر شمشان تھا جس میں اب شعلے لپکنے لگے تھے۔ جتنا جتنا وہ آگے بڑھتی ان شعلوں کی لپک زیادہ ہوتی جاتی''۔

اس امر کا اعتراف بہر طور کرنا ہوگا کہ دوسرے ناول میں اس تکنیک کا استعمال جسے عموماً شعور کی رو کا نام دیا جاتا ہے عینی نے مقابلتاً مہارت اور چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔ ''میرے بھی صنم خانے'' کا واحد متکلم کردار ہندوستانی سرزمین اور اپنے آبائی وطن سے فطری رشتے استوار کیے ہوئے ہے اور اس کے سامنے اودھ کی جاگیردارانہ تہذیب کا زوال اور نئے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کی کم ظرفیاں اور بوالعجبیاں ہیں جب کہ ''سفینۂ غم دل'' میں یہی واحد متکلم کردار تاریخی جبر کے تحت ہجرت کے المناک اور عمیق تجربے سے دوچار ہوتا ہے اور اس کے سامنے ایک دوسرے ملک میں۔ درپیش قطعی مختلف مسائل سر ابھارتے ہیں ظاہر ہے اس اعتبار سے دونوں ناولوں کے واقعات میں تنوع آنا لازمی تھا لیکن بنیادی شخصیت چوں کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہے اس لئے احساسات و تاثرات کی یکسانیت بہر حال تکرار کا احساس دلاتی ہے۔

۱۹۵۸ء میں قرۃ العین حیدر کا ترجمہ کردہ ہنری جمز کا ناول ''ہمیں چراغ ہمیں پروانے'' طمطراق سے منظر عام پر آیا تھا۔ لازماً اس ترجمے میں ان کے کئی سال صرف ہوئے ہوں گے اور انہیں تکنیک و طرز کے نئے گر بھی ہاتھ آئے ہوں گے۔ شعور کی رو کے برتاؤ کا سلیقہ مزید نکھرا ہوگا اس ترجمے کے ایک برس بعد ہی ان کا ناول ''آگ کا دریا'' شائع ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ اس ناول کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح دیکھتے دیکھتے ہندو پاک کے اِس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئی۔

ایک بار پھر یاد دلانا چاہوں گا کہ قرۃ العین حیدر اک متمول گھرانے کی لاڈلی بیٹی ہیں' ان کے والدین اپنے عہد کے قابل ذکر لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے' گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول بھی تھا اور وسائل بھی۔ وہ انگریزی ادبیات سے ایم۔اے کرچکی ہیں، گھریلو زندگی کی غیر ضروری مصروفیات سے آزاد ہیں اس لیے خوب پڑھتی ہیں، زمانے کے نشیب و فراز، قوموں کے عروج و زوال اور تہذیبوں کے مد و جزر پر ان کی نگاہ ہے، مختلف علوم سے واقفیت ہے اس لئے ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ ان کی ایک بہت بڑی قوت یہ ہے کہ وہ شعور کی رو کے خلاقانہ استعمال پر قدرت کاملہ رکھتی ہیں جس طرح قدیم داستانوں میں بعض کردار بندر یا طوطے کے قالب میں اپنی روح منتقل کر سکتے تھے اسی طرح عینی شعور کی رو کے ذکارانہ استعمال سے کسی زمانے یا کسی علاقے کے قالب میں اپنی روح کو منتقل کر سکتی ہیں اور اس قلب ماہیت یا روح کے حلول سے انھیں وحشت اس لئے نہیں ہوتی کہ تبدیل شدہ زمانہ یا ماحول ان کے لئے اجنبی نہیں ہوتا۔ ان کے وسیع مطالعے نے اس تہذیب، اس زمانہ اور اس علاقے سے انھیں بہت مانوس بنا رکھا ہے۔ اس تکنیک کا استعمال قرۃ العین حیدر اپنے بیشتر افسانوں، ناولٹ اور اولین دو ناولوں میں کر چکی ہیں۔ اب تمام مہارتوں اور تجربوں کو سمیٹ کر وہ زیادہ خلاقی اور مہارت کے ساتھ ''آگ کا دریا'' میں بروئے کار لاتی ہیں۔ اس ناول کے کینوس کو وہ پچھلے ناول کی طرح محض دو نسلوں پر نہیں بلکہ کئی نسلوں اور متعدد صدیوں پر پھیلا دیتی ہیں اور ہندوستان کی تہذیبی روح کا نمائندہ گوتم نیلمبر کو قرار دے کر نسل در نسل اس کے روحانی سفر کا جائزہ لیتی ہیں۔ یہ ناول عقیدو

کے تنوع، زندگی کے پھیلاؤ اور تہذیبوں کی رنگا رنگی کو ایک وحدت کی صورت میں دیکھنے کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ ناول میں خود عینی ایک غیر جانب دار مورخ کا سا کردار ادا کرتی ہیں تو نئے تہذیبی افق نمودار ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک تاریخ ایک زمانی جبر کا نام ہے۔ انقلاب آتے ہیں لیکن وقت کے دریا کی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور پرانی تہذیب کا حلقہ نئی تہذیب سے جڑ کر اس سلسلے کو اور دراز کرتا رہتا ہے۔ ''آگ کا دریا'' ایک اعتبار سے ہندوستان کی تہذیبی تونگری اور اس کی روحانی بالیدگی کا آئینہ خانہ ہے۔ عینی نے اس ناول میں برصغیر کی تہذیبی آویزشوں اور آمیزشوں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہر چند کہ ''آگ کا دریا'' اردو کا پہلا بڑا ناول ہے جس کے زیر اثر آگے چل کر کئی اچھے ناول منظرِ عام پر آئے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ناول کے بہت سے مقامات پر قرۃ العین حیدر نے تاریخ، تہذیب، فلسفے، مابعد الطبیعیات، تصوف اور سیاسی نظریات سے متعلق اپنی وسیع معلومات کا غیر ضروری مظاہرہ بھی کیا ہے۔ البتہ ناول کا کینوس اتنا وسیع اور اسکی خوبیاں اتنی کثیر ہیں کہ پڑھنے والے ان اکتا دینے والی تفصیلات کو بھی گوارہ کر لیتے ہیں۔ ایک مثال حاضر ہے:

> ''سامنے مرگھٹ تھا، مرگھٹ میں کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے۔ صرف وہی انسان اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت کر سکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔ مرگھٹ، یہاں ساری خواہشیں جل کر بھسم ہو جاتی ہیں اور کالی، جو ذہن و گویائی سے ماورا ساری کائنات کو نفی میں تبدیل کردیتی ہے۔ وہ جو شونیہ کو پورن بناتی ہے۔ پورن، جو روشنی اور سکون ہے۔ کالی، جس کا لباس ساوی ہے، وہ وسعت ہے کیونکہ لامحدود ہے۔ عظیم طاقت ہے، مایا سے بلند تر ہے، کیونکہ خود مایا بن کر دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔ مرگھٹ میں کالی شیو کے سفید جسم پر کھڑی ہے''۔

ظاہر ہے ناول میں کالی سے متعلق یہ معلومات فراہم کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ عینی ہندو مائتھولوجی سے اپنی مکمل واقفیت کا ثبوت فراہم کرنا چاہتی ہیں ورنہ موقع اور محل اس تفصیل کے متقاضی نہ تھے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ گوتم نیلمبر سفر کے دوران ایک شمشان کے پاس سے گزرا تھا۔ اس کے برعکس ناول کا اختتامیہ اقتباس ملاحظہ ہو بار بار پڑھنے اور محسوس کرنے کی چیز ہے:

> ''وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر کر بادلوں میں چھپ گیا۔ چوٹی پر وہ دو زانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا شکست خوردہ، بشاش، پُر امید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے وہ مسکرا کر نیچے اترا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔
>
> جاگنے والوں کا جاگنا مبارک ہو— قانون کا پرچار مبارک ہو۔ سنگھ میں امن مبارک ہو— ان لوگوں کی ریاضت مبارک ہو جنھیں شانتی میسّر آگئی ہے''۔

بلاشک ''آگ کا دریا'' اپنی چھوٹی موٹی کمزوریوں کے باوصف اردو ناول کے میدان میں عظیم کارنامہ ہے۔ اور یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ''آگ کا دریا'' کے رد عمل میں ہی ہمارے ادب میں کئی اور بڑے ناولوں کا اضافہ ہوا ہے جن میں ''اداس نسلیں''، ''سنگم'' ''علی پور کا ایلی''، ''خدا کی بستی''، ''لہو کے پھول'' اور متعدد دوسرے ناولوں کے نام لیے جاسکتے ہیں جیسے عینی نے ''آگ کا دریا'' لکھ کر بڑے ناولوں کے لئے چوتھی کھونٹ کا ساتواں دروازہ کھول دیا ہو۔

بقول شخصے واحد متکلم میں لکھنے والے اپنے ناولوں میں جلد ہی تکرار اور یکسانیت کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک ہی شخصیت میں اتنا تنوع، گہرائی اور وسعت مشکل سے ہوتی ہے کہ اس کے اظہار کے لئے کئی بڑے ناول درکار ہوں۔ کئی ناولوں میں ایک جیسی شخصیت کی مرکزی حیثیت کو برقرار رکھنا دشوار ہو جاتا ہے اور جلد ہی وہ مرکزی شخصیت اپنی کشش کھو بیٹھتی ہے۔ اس خیال کی منھ بولتی تصویر قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' میں دیکھی جاسکتی ہے جس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں اور دوسری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اسے نقادوں نے بجا طور پر عینی کا فیملی ساگا کہا ہے۔ تاریخی شعور کی رو کی تکنیک پر مہارت سے یہاں بھی قرۃ العین حیدر نے بھرپور کام لیا ہے۔ جس فنی چابکدستی کے ساتھ انھوں نے اپنے سلسلۂ نسب کے سراغ لگائے اور ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑا ہے اس کی داد دینی پڑتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ''کار جہاں دراز ہے'' کی بارہ صدیوں کا احاطہ کرنے والی داستان ایک ایسے خاندان کا نسلی سفر ہے جو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے پوری طرح چاق چوبند ہے اور اپنے معاشی و سیاسی تحفظ کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا اور پڑھنے والے کو لامحالہ اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ یہ نسل ہوا کے رخ پر چلنے اور زمانہ سازی کے فن میں طاق ہے۔ ہر چند کہ اس ناول کا فنی مرتبہ بہت بلند نہیں لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم

ابتر ہوتی جارہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہوگئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کردیا جو وہ پاکستان لے گئی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہورہا تھا، ان کے علاج کے لیے کہاں سے آتا اور فالج تو بڑا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہونچی کہ چپکے چپکے بھاوج نے چھمو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے، فروخت کرادیے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگ انبوہ جشنے دارد، ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جو اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گزارہ کررہے تھے"۔

اور ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جس طرح ادب اور آرٹ کو بھی تقسیم کرنے کی کوشش جاری تھی عینی کے افسانوں میں اس طرح ستم ظریفی پر بھی شدید احتجاج کی شکلیں نظر آتی ہیں مثلاً "ہاؤسنگ سوسائٹی" کا یہ اقتباس دیکھیے

"مشرقی پاکستان کے کلچر کا ایک سمبل ہے وہاں کی ندیاں، بوٹ مین، ہاتھی اور مچھلیاں" موٹے فرانسیسی نے، جو شکل سے ذرا احمق معلوم ہوتا تھا، عینک ناک کی پھننگ پر اچھی طرح جمائی اور آنکھیں پھاڑ کر تصویر کو دیکھا۔ ایسے ہاتھی تو انڈیا میں بھی ہوتے ہیں، اس نے حیرت سے کہا"۔

اس طرح کے چلتے پھرتے بظاہر بے ضرر لیکن دراصل گہرے کٹیلے طنز آلود فقرے قرۃ العین کے مختلف افسانوں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ایسا ہی مکالمہ ان کی کہانی "روشنی کی رفتار" میں ٹوٹ اور پدماکرین کے مابین ہوتا ہے اور ٹوٹ جو صدیوں پہلے کا کردار ہے، عہدِ حاضر کی پدما سے طنزاً سوال کرتا ہے۔

"بتاؤ مجھ سے تین ہزار سال کے بعد تم کتنی متمدن ہو۔ ہم بنی اسرائیل پر ظلم ڈھاتے تھے اور اشوریہ سے لڑتے تھے، تم سب ایک دوسرے کے ساتھ بے انتہا پیار محبت سے رہتے ہو۔ ہمارے فراعنہ ستم پیشہ تھے، تمہارے حکمراں فرشتے ہیں۔ ہم موت سے ڈرتے تھے، تم موت کے خوف سے آزاد ہوچکے ہو۔ تم عالیشان مقبرے نہیں بناتے، مردہ پرستی نہیں کرتے، لوحے نہیں لکھتے۔ شعر و شاعری بھی ترک کرچکے ہو۔ تمہارے مذاہب، فلسفے، اخلاقیات، نفسیات"۔ وہ وہسکی کا گلاس میز پر پٹخ کر زور سے ہنسا۔ "تمہاری دیو مالائیں، نظریۂ تثلیث روحانیت، یہ، وہ، سب عین سائنٹفک ہیں۔ تمہاری جنگیں ہیومنزم پر مبنی ہیں۔ تمہارا نیوکلیر بم بھی خالص انسان دوستی ہے۔ ہے نا؟ تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے"!

قرۃ العین حیدر کا کمال یہ ہے کہ وہ تاریخ کے حوالے سے ماضی کے کرداروں کی سوانح حیات کو پیش کردینا کافی نہیں سمجھتیں بلکہ کہانی کو گزشتہ تہذیبی اقدار کی بازآفرینی کا وسیلہ بنادیتی ہیں۔ عینی کے افسانے تاریخی حیثیت کے حامل ہیں تو اس کا سبب محض ان کا وسیع مطالعہ و مشاہدہ ہی نہیں، اصل قوت وہ تخلیقی جوہر ہے جس کے لمس سے ماضی، اور حال مستقبل میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

عینی کے افسانوں میں سے بیشتر کے مرکزی کردار زمانے کی بے اعتباری، فریب خوردگی، شکست آرزو اور ہزیمت کے نمائندہ ہیں۔ "جلاوطن" کی کنول رانی، "چائے کے باغ" کی راحت کاشانی، "دلربا" کی گلنار، "نظارہ درمیاں ہے" کی چھیرو جا دستور، "اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو" کی فخرن "ہاؤسنگ سوسائٹی" کی ثریا حسین اپنے اپنے افسانوں کے مرکزی کردار ہیں اور ان میں سے اکثر مردوں کے مقابلے پر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ کہیں کہیں ان میں خود پسندی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ ان میں رومانیت، جذباتیت، ضد، سرکشی اور حق پسندی کے اوصاف نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں اکثر یہ کردار زود حس اور زودرنج بھی ہیں لیکن نرمی اور لطافت ان کے مزاجوں کا جزو لازم ہے۔

اس نکتے پر بھی دورائیں نہیں ہوسکتیں کہ قرۃ العین حیدر کو بیانیہ پر مکمل قدرت حاصل ہے اور وہ شستہ، سلیس اور رواں دواں زبان استعمال کرنے پر عبور رکھتی ہیں۔ ان کے مکالمے برجستہ ہوتے ہیں اور لہجے میں حسبِ ضرورت نرمی یا کاٹ پیدا کرنے کا شعور بھی انھیں حاصل ہے۔ مختلف مواقع، مدارج، طبقات اور طبائع کے کرداروں سے مزاجی مطابقت و موافقت رکھنے والا طرز گفتار وہ بخوبی اختیار کرسکتی ہیں۔ ذرا "ایک مکالمہ" کا یہ جزو دیکھیے:

الف یہ سمبلز کی دنیا ہے۔ مجھے ہر شے میں کوئی نہ کوئی سمبل نظر آتا ہے۔ میں ہمہ وقت سطروں کے درمیان پڑھتا رہتا ہوں۔

ب تم نے جو کچھ پڑھا ہے بھول جاؤ۔ ہمارے ماہرین تعلیم اس نتیجے پر

پہونچے ہیں کہ تعلیم بے کار ہے۔

الف: وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں کتابوں کے بجائے بندوقوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ قوم کے نونہالوں کو کتابوں کی جگہ بندوقیں دو تاکہ وہ مجاہد بنیں۔ مرد مومن۔ شاہین۔

ب: تعلیم۔ یہ سب غریبوں کی افیم ہے۔ غریبوں کو افیم مت دو۔ اسے کھا کر ان کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ ان کی عقل چرخ ہو جاتی ہے!

الف: مگر یہ اتنا چلاتے ہیں۔

ب: چلانے دو۔ تم نے ان کتّوں کو دیکھا ہے جو سرد راتوں میں چاند کے نیچے بیٹھ کر آسمان کی سمت منہ اٹھائے روتے ہیں؟

الف: چاند کی تمنا میں۔

ب: نہیں۔ ان کو محض سردی لگتی ہے"۔

مکالموں میں ندی کی سی روانی، بات پیدا کرنے کا انداز اور معمولی معمولی جملوں میں نشتر کی نوک پیدا کرنا عینی کے قلم کا وصف ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ایک طرف تو ان کے طویل افسانے ناولٹ کی حدوں کو چھوتے ہیں اور دوسری طرف موصوفہ کا مختصر سے مختصر افسانہ بھی کتاب کے کم از کم بیس پچیس صفحات ضرور گھیرتا ہے جب کہ افسانے کے ساتھ اختصار اور وحدت تاثر کی بنیادی شرائط ابتدا سے وابستہ رہی ہیں۔ لگتا ہے ان کے پاس کہنے کے لیے بہت ساری باتیں ہیں جنھیں وہ سمٹ کر کہنا نہیں چاہتیں یا کہہ نہیں سکتیں۔ وہ نو عمری سے تنہا رہتی آئی ہیں، گھریلو زندگی کے جھمیلوں سے آزاد رہی ہیں، خوب دنیا دیکھی ہے۔ مشاہدے اور مطالعے کی سہولت اور استطاعت انھیں حاصل رہی ہے پڑھنے کے لیے انھیں مواد بھی خوب ملا ہے اور وقت بھی ان کے پاس وافر تھا۔

اعلیٰ طبقے یا اَپر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کے ساتھ وہ پابندیاں کم تھیں جو غیروں سے ملنے جلنے کے معاملے میں مثال کے پر عصمت چغتائی یا ہاجرہ مسرور وغیرہ کو اوائل عمری میں درپیش تھیں نتیجتاً عینی مختلف طبقوں کے کرداروں سے بے جھجک ملتی رہیں۔ ان تمام باتوں نے مل کر ان کے علم اور تجربے میں بے پناہ اضافہ کیا اور اپنی تحریروں میں وہ اس کا اظہار بھی کرتی رہیں کہیں یہ اظہار کہانی کو راس آیا تو اعلیٰ درجے کے فن پارے وجود میں آئے اور کہیں یہ اظہار بیزار کن طوالت بھی اختیار کر گیا کیونکہ افسانہ بہر حال مختصر رہنا چاہتا ہے۔

البتہ عینی کا کمال یہ ہے کہ ان کے ایسے طویل اور غیر ضروری بیانات بھی محض طرز ادا کی شگفتگی یا ندرت کی بنا پر پڑھے جانے کے لائق ہوتے ہیں۔ بات کو خوب پھیلا کر اور جم کر کہنا ناول کی شان ہے اور افسانے کی خامی۔ زندگی کے تمام مظاہر کی آئینہ داری ناول کا فریضہ ہے۔ افسانہ تو اس کے کسی ایک نکتے پر اپنی نگاہیں مرکوز رکھتا ہے عینی کے افسانے میں وہ ارتکاز کم ہے اسی لئے ان کے ہاں کردار اور پلاٹ کا افسانہ بہت کم ملتا ہے۔ معاشرے کی معمولی خامیوں پر، اخلاقی زوال، تہذیبی انحطاط، ماضی کی بازیافت ہجرت کے المیہ اور ایسے ہی دوسرے موضوعات پر طبع آزمائی زیادہ ہے۔ یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر قرۃ العین حیدر کے ناول نے تو نئی نسل پر اپنے اثرات مرتسم کئے اور ان کی تقلید میں ناول لکھنے کی کئی کوششیں ہوئیں لیکن ان کی افسانہ نگاری کو نئے کہانی کاروں نے اپنے لئے نمونہ نہیں بنایا کیونکہ عینی کی کہانیوں میں مختصر افسانے کی خوبیاں کم تھیں جس کی بھرپور تلافی ان کا زور نگار قلم اپنے اسلوب سے کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے اسلوب کی تقلید ممکن نہیں یا کم از کم مقلد کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کرتی۔

وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی گفتگو کا رخ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی طرف موڑ دیں۔ در حقیقت انھیں ناولوں نے عینی کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ اگر ان کا ادبی سرمایہ صرف افسانوں تک محدود ہوتا تو ہم انھیں عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی جیسے اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں تو شمار کرتے لیکن پریم چند، منٹو یا بیدی کی ہم پلّہ عظیم کہانی کار وہ نہیں ہو سکتی تھیں۔

عینی کا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے" ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آیا اور "سفینۂ غم دل" ۱۹۵۲ء شائع ہوا۔ ہر چند کہ ان ناولوں میں کوئی واضح، منصوبہ بند پلاٹ یا باقاعدہ نظریۂ حیات نظر نہ آتا تھا اور یہ دراصل اپنے تخلیق کار کے احساسات، مطالعے اور مشاہدے کی عکاسی کرتے تھے لیکن ان کی تکنیک اور اسلوب میں اتنا نیا پن اور تنوع تھا کہ نئے لکھنے والے ان سے بیحد متاثر ہوئے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ان ناولوں کی اشاعت کے بعد آٹھ دس برسوں میں ہی صرف قیم عرفی نے اس طرز کے پانچ ناول لکھ کر خود ہی شائع کیے اور اپنی بربادی کا سامان کر لیا کیونکہ جیسا عرض کر چکا ہوں کسی اسلوب کی تقلید کامیابی تک کم ہی پہنچاتی ہے۔ ان دونوں ناولوں میں بھی خوبیاں یا خامیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں جن کی جانب عصمت چغتائی نے اپنے مضمون "پوم پوم ڈارلنگ" میں اشارے کیے تھے۔ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ عینی کا رویہ اور اس کے کردار دونوں الجھے الجھے سے تھے۔ گڑیا گڈے سے پیارے ایک ہی طرح میں ڈھلے ہوئے کردار، مشنریوں کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والی نیلی آنکھوں اور سنہرے گھنگریالے بالوں والی لڑکیاں اور جاذب نظر اور پرکشش خوبصورت نوجوان جھمگھٹوں میں کھوئے

آنکھوں کو خیرہ کردے گا۔ ایک اقتباس "برفباری سے پہلے" کا ملاحظہ ہو:

"کائنات اتنی بشاش ہے یہ معصوم سپید پھول، بلوریں جھرنے، کنوارے مقدس برفیلے پہاڑ — اس بری لڑکی نشاط نے اس سے کہا تھا، دیکھو یہ کھلا نیلا آسمان اونچے درخت، قرمزی بادل، ہمارے چاروں طرف ہر چیز اتنی عظیم ہے، اتنی بلند ہے، اتنی فراخ دل ہے— ایسے میں کیا تم زندگی سے مایوس ہو سکتے ہو"۔

یہ مطالعے کی نمائش اور ماڈرن لڑکیوں کی عشوہ طرازیاں یہ کرشن چندر جیسی ٹھوس رومانیت، حجاب اسمٰعیل جیسی طلسمی فضائیں اور عصمت چغتائی جیسے چٹختے ہوئے مکالمے مل جل کر خاص قرۃ العین حیدر کے اپنے ترشے ترشائے رنگین اور لوچ دار اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں لیکن جب عینی نے اسی اسلوب کو اپنا فن قرار دے لیا تو عصمت اور دوسرے ترقی پسند افسانہ نگار اور نقاد اس سینڈریلا سے زمین پر اتر آنے کا اصرار کرنے لگے اور پوم پوم ڈارلنگ کو اطالوی دریچے سے ہٹ کر زندگی کی تیز دھوپ میں سفر کرنے کا مشورہ دیا جانے لگا۔ اس موقع پر ان کے افسانے "کیکٹس لینڈ" کا یہ حصہ بھی پیش کرنے کے لائق ہے

"اب خزاں بھی واپس جارہی ہے اور سفیدے کے جنگل پہ ہریالی اتر رہی ہے اور جھیل کے پردے کنارے تک پھیل آئے ہیں۔ اور جب سبز بانس کا جھنڈ پانی کی سطح پر جھک کر ہوا میں ڈولتا ہے تو چپکے سے رونے کو جی چاہتا ہے۔ سفیدے کا چھوٹا سا جنگل اسی طرح چپ چاپ کھڑا ہے اور اسیسی کی خانقاہ بھی اسی طرح خاموش اپنی جگہ پر موجود ہے اور کبھی کبھی کوئی راہ گیر پتوں کو روندتا، سفیدے کے جھنڈ سے گذر جاتا ہے"۔

عینی کے یہ افسانے تقسیم ملک اور ہجرت کے المیوں سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور دوسری عالمگیر جنگوں کے وسیلے سے ابھرنے والے بین الاقوامی مسائل کے آئینہ دار بھی ہیں جنھوں نے ہماری جذباتی، ثقافتی اور روحانی بنیادوں کو متزلزل کردیا ہے۔ بٹوارے کے بعد برصغیر کی معاشرتی زندگی جس اخلاقی زوال اور اقدار کی شکست وریخت سے دوچار ہوئی، انسانی رشتوں کی بے وقعتی کے دردناک پہلو جس طرح حقیقت بن کر ہمارے سامنے آئے ان کی جیتی جاگتی تصویریں قرۃ العین حیدر کے ان ابتدائی افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہیں بایں ہمہ چوں کہ بعض لوگ انہیں ایک خاص سیاسی نظریہ کی عینک لگا کر دیکھتے تھے اس لئے ان کہانیوں کی معاشرتی حقیقت نگاری ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی۔ ان کہانیوں میں شعور کی رو سے لے کر لاشعور کے تجزیے تک بات کہنے کے متعدد اسالیب بھی تخلیق کیے گئے ہیں اور پلاٹ اور کردار پر مشتمل روایتی افسانوں سے الگ ہٹ کر تجریدی اور علاماتی کہانیاں پیش کرنے کی کامیاب کوششیں بھی کی گئی ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے یہ افسانے اودھ کی مشترکہ تہذیب کے زوال کا مرثیہ ہیں۔

"شیشے کے گھر" کے بعد قرۃ العین حیدر کی بہترین تخلیقات میں بیشتر طویل افسانے ہیں مثلاً "سیتاہرن" "ہاؤسنگ سوسائٹی"، "چائے کے باغ"، "دلربا"، "اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو" اور "سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات" وغیرہ۔ ہر چند کہ عینی کے علاوہ کرشن چندر، عزیز احمد، ممتاز شیریں، اشفاق احمد، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، تسنیم سلیم چھتاری، بیدی، ابوالفضل صدیقی اور چند دیگر اہل قلم نے بھی طویل کہانیاں لکھی ہیں لیکن معیار و تعداد کے اعتبار سے اس میدان میں قرۃ العین حیدر کا پلہ سب پر بھاری نظر آتا ہے۔ موصوفہ کے طویل افسانوں میں جو عمق، وسعت اور ہمہ گیری ہے مذکورہ بالا دیگر افسانہ نگاروں میں اس کا اکثر فقدان ہے۔ تاریخ کے خلاقانہ شعور کے ساتھ اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش ان افسانوں میں جس فنکاری کے ساتھ کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ علاوہ ازیں اپنی کہانیوں میں قرۃ العین حیدر نے تکنیک کی جتنی جہتیں تخلیق کی ہیں منٹو کے علاوہ اس کی اور نظیریں اردو فکشن میں کم نظر آتی ہیں "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں سلمٰی اور زبیری کو ایک ساتھ دیکھ کر اچانک ثریا کا ذہن واقعات کے تانے بانے ماضی سے ملا لیتا ہے اور:—

"دفعتہً ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور سامنے کے اس رنگین سنیما اسکوپ نظارے کے پرخچے اڑ گئے۔ سیاہ دھواں اور سرخ شرارے ساری فضا میں رقصاں تھے۔ بہت دور ایک مہیب جوالا مکھی نے آگ اگلنا شروع کی۔ گرم گرم لاوا بہتا ہوا سارے میں پھیل گیا۔ آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ، زلزلے کے دھماکوں، آرکیسٹرا کے سروں، راک اینڈ رول کے شور، قہقہوں اور گلاسوں کی کھنکھناہٹ میں سے گذرتی ایک مدھم، اداس، خوبصورت آواز ثریا کے کانوں میں گونجی —ماضی کی محل سرائیں جل کے راکھ ہوئیں مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے۔ کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار— ثریا نے سہم کر آنکھیں بند کرلیں۔ یہ بلجین کٹ گلاس کے فانوسوں سے جگمگاتا، اطالوی

معمار کا بنایا ہوا الٹرا ماڈرن جمشید ہاؤس نہیں تھا۔ یہ ضلع سلطانپور کے تعلقے درگاکنڈ کی نیم تاریک گڑھی تھی جس میں وہ خود، بسنتی بیگم قید تھی، پھر درگاکنڈ کی گڑھی جمشید ہاؤس میں تبدیل ہوگئی، اس میں چھوٹی بٹیا قید تھی"۔

حال سے ماضی میں لمبی چھلانگ لگانا اور ماضی کو حال کے تناظر میں دیکھنا قرۃ العین حیدر کا محبوب تخلیقی مشغلہ ہے اور وہ حال کو مستقبل سے جوڑنے کے فن میں بھی طاق ہیں جس کی ایک تابناک مثال عینی کا افسانہ "روشنی کی رفتار" ہے لیکن فی الحال ہم اپنی گفتگو کا دائرہ ان کے طویل افسانوں تک محدود رکھیں گے۔ لہٰذا "سیتا ہرن" کے اختتامیہ سے یہ سطریں دیکھئے:

"ابھی دن باقی ہے، پھر رات ہوگی۔ پھر صبح ہوگی ایک اور دن۔ ایک اور رات سلسلہ روز شب۔ نقش گرِ حادثات۔

دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی نہیں لگا سکا ہے۔

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلہ روز شب، صیرفیٔ کائنات"۔

"سیتا ہرن" نئی ہندوستانی عورت کا المیہ ہے۔ آج کی عورت قرۃ العین حیدر کے نزدیک ایک بے وفا تمدن کی پیداوار اور بے کردار تہذیب کی مخلوق ہے جو زندگی کی لڑائی بار بار ہارتی ہے اور زندگی اس کے ساتھ روپ بدل بدل کر جبر و جور کرتی ہے۔ آزادیٔ نسواں کے بارے میں لمبی چوڑی تقریریں کرنے والے مرد کے ہاتھوں عورت کو آج بھی ظلم ہی سہنے پڑتے ہیں اور اسے محض آلۂ تفریح تصوّر کیا جاتا ہے۔ "چائے کے باغ" میں نہایت معصوم اور مقدّس فطری منظر نامے پر جدید معاشرے کے تصنع پسند مرد اور عورتیں جھوٹی محبتوں کے سوانگ رچاتے اور جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کرتے نظر آتے ہیں اور اس منظر نامے کو سرمایہ دار و مزدور کی طبقاتی کشمکش کے رنگ مزید پر اسرار بناتے ہیں لیکن اکثر علاماتی انداز میں عینی روشن مستقبل کی ہلکی سی جھلکیاں بھی دکھاتی چلتی ہیں مثلاً:

"لیکن گھنے درختوں سے گھری سڑک سنسان پڑی تھی۔ خودرو اودے اودے پھولوں پر سفید تتریاں اڑ رہی تھیں۔ جھاڑیاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور پرندوں کی چہکار سے گونج رہی تھیں۔ مسز فریزر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر ڈرائیور سے جیپ روکنے کو کہا اور نیچے اُتر کر دوربین کے ذریعے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ راستے کے آگے سے مکمل خاموشی شروع ہوتی تھی۔ اس بلوریں خاموشی میں زرد پتوں پر چلتی ہوئی میں وادی کے سناٹے میں داخل ہوگئی۔ نیچے سڑک پر دو کھاسی نوجوان سائیکلوں پر جا رہے تھے اور سفید گھاس ہوا میں لہلہا رہی تھی"۔

پُر تصنع تہذیب نو کی نمائندہ مسز فریزر کی موجودگی سے پاک، معطر اور رنگین منظر نامے پر دو کھاسی نوجوانوں کا سفر طے کرنا اور سفید گھاس کا لہلہانا خوشگوار مستقبل کی واضح بشارت نہیں تو اور کیا ہے۔؟

"اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو" میں عینی کی کردار نگاری اپنی معراج پر نظر آتی ہے۔ ہر چند کہ اس طویل افسانے کا موضوع بھی عورت کی بے بسی اور اس کا استحصال ہے جس کی علامتیں دو مختلف جہات میں دو بہنیں ہیں۔ رشک قمر جو غیرت مند اور خوددار، ایثار پیشہ اور مخلص ہے اور دوسری بہن رشک قمر جو قدرے دیندار ہے لیکن انجام کار دونوں سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کا ہدف بنتی ہیں۔ مفلس، پسماندہ اور مجبور عورتوں کی یہ داستان انتہائی لرزہ خیز ہے جس کا بنیادی رنگ قنوطیت آمیز ہے۔ ان طویل کہانیوں میں کسی منظم اور باقاعدہ پلاٹ پر زور کم ہے اور شعور کی رو کے سہارے طنزیہ اسلوب میں روانیٔ طبع اور جولانیٔ فکر کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔ بعض نقاد انھیں ناولٹ بھی کہتے ہیں۔ بہر نوع خواہ یہ طویل افسانے کہے جائیں یا ناولٹ، اس فن پر عینی کی مکمل گرفت ہے اور تخلیقی زبان کے استعمال نے انھیں قرار واقعی اہمیت کا حامل بنادیا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ عینی کے مختصر افسانے غیر اہم ہیں۔ ان کی درجنوں کہانیوں میں سے "جلاوطن"، "ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی"، "یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے" "کہرے کے پیچھے"، "روشنی کی رفتار"، "لکڑ بگھے کی ہنسی"، "آئینہ فروش شہر کوراں"، "نظارہ درمیان ہے"، "آوارہ گرد"، "یاد کی ایک دھنک جلے" وغیرہ اردو افسانوں کے ہر اچھے انتخاب میں شامل کیے جانے کے لائق نگارشات ہیں۔ ان کہانیوں میں عینی ماضی قریب کی تاریخ کو حال سے جوڑتی ہیں، کہیں قدیم ہندوستانی تہذیب کے نقوش ابھارتی ہیں تو کہیں اسلامی متصوفانہ روایت سے استفادہ کرتی نظر آتی ہیں۔ اکثر و بیشتر ان افسانوں میں بھی "شیشے کے گھر" کی کہانیوں کی مانند تقسیم ہند سے پیدا شدہ مسائل، فسادات، ہجرت اور نئی زندگی کے تقاضوں تلے ٹوٹتی بکھرتی قدیم جاگیردارانہ اقدار کی پامالی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے مثال کے طور پر "جلاوطن" کا یہ اقتباس پیش خدمت ہے۔

"اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت

دلنوازی میں بے مثال ہے وہ
شہر میں ایسا باکمال ہے وہ
ذہن و دل میں خلش اسی کی ہے
ایک چبھتا ہوا سوال ہے وہ
اس کو موجیں ڈبو نہیں سکتیں
سطحِ دریا پہ اک اچھال ہے وہ
سخت نفرت ہے جھوٹ سے اس کو
حق بیانی میں بے مثال ہے وہ
جس کو اردو زباں سے پیار نہیں
اپنی تہذیب کا زوال ہے وہ
اس کو پڑھنا کمالؔ مشکل ہے
یعنی بکھرا ہوا خیال ہے وہ

انا کو خاک میں اپنی ملا کے دیکھ ذرا
فنا کی شکل میں جلوے بقا کے دیکھ ذرا

شمار ہوگا ترا بھی فلک نشینوں میں
زمین والوں کو اپنا بنا کے دیکھ ذرا

وفا کی آنچ سے پتھر بھی موم ہوتا ہے
تو سنگ دل سے بھی رشتہ بڑھا کے دیکھ ذرا

ترا وجود مہک جائے گا محبت سے
دیا خلوص کا دل میں جلا کے دیکھ ذرا

فرشتے خود تری چوکھٹ پہ سر جھکائیں گے
تو اپنے آپ کو انساں بنا کے دیکھ ذرا

حسد کی آگ میں جل جائے گا خود اے حاسد
مرے خلاف تو سازش رچا کے دیکھ ذرا

یقین آتا ہے آخر گمان پر غالب
توہمات سے دامن بچا کے دیکھ ذرا

اس چمن میں تو کانٹے چھپے ہوئے ہیں کمالؔ
نقابِ خندۂ گل کو اٹھا کے دیکھ ذرا

اقبال کی شاعری میں عورتوں کا مقام

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے ہر شعبۂ زندگی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری انسانی معاشرہ کے لئے چراغِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں تو انہوں نے کائنات کے مختلف مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی شاعری کا موضوع انسان ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا پیغام مرد اور عورت کے لئے یکساں ہے۔ اُردو کے دیگر شعراء کرام نے عورتوں سے متعلق جو انداز فکر اختیار کیا ہے اس کے برعکس اقبالؔ کی فکرِ دور رس بالکل مختلف ہے۔ دراصل اقبالؔ نے قرآنِ پاک میں مذکور تعلیم نسواں کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبالؔ نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ عورت ایک پاکیزہ صنف ہے۔ اگر بے پردگی اور بیجا آزادی عورتوں میں راہ پا جائے تو انسانی معاشرہ تباہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے فرنگی معاشرت پر کھل کر تنقید کی ہے۔ اور عورتوں کی بے بسی کا ذمہ دار مردوں کو ٹھہرایا ہے۔

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

اقبال نے جب یورپ کا سفر کیا تو فرنگی معاشرے کا چشم دید مشاہدہ کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اہل مغرب نے عورتوں کے معاملے میں جو آزادانہ روش اختیار کی ہے اس کے اثرات انسانی معاشرہ کے لئے کتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اقبالؔ نے ہندوستان اور یورپ کی خواتین کا براہ راست موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی خواتین کو یورپ کی خواتین پر فوقیت حاصل ہے۔

میں نے اے اقبالؔ یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی

مذکورہ شعر میں ''بات'' کے اندر بے پناہ معنی اور وسعت پنہاں ہے، راقم الحروف کے خیال میں اقبال نے اس ایک لفظ بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندوستانی خواتین شرم و حیا اور پاکیزگیٔ نفس کے اعتبار سے یورپ کی خواتین کے برعکس کچھ اور ہی خصوصیت رکھتی ہیں۔

دراصل اقبالؔ ہندوستانی معاشرہ میں عورتوں کی ترقی اور فلاح کے خواہاں تھے۔ اقبال سے قبل ہماری شاعری پیغام نسواں سے یکسر خالی تھی۔ ان کو اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ ہندوستانی خواتین خواہ نئی ہوں یا پرانی دونوں ہی قسم کی تعلیم سے نا آشنا ہیں اور پردہ سے بے گانہ۔ اس سلسلے میں وہ قوم کی غفلت پر نہایت رنج کے ساتھ فرماتے ہیں۔

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو یا پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

آج کا آدمی

آج کا آدمی اس کو کہتے ہیں ہم
روح کی لذتوں سے جو ہے بے خبر
خواہشوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا
خول میں مادیت کے گم ہو گیا
جسم ہے کاغذی
روح ہے تشنہ لب
یعنی ہے آج کا آدمی جاں بلب
کاش روحانیت کی ہوا پھر چلے
آدمی کو نئی زندگانی ملے

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

واقعہ یہ ہے کہ اگر فکر اقبال کے مطابق عورتوں کو ہمارے سماج میں جائز مقام عطا کیا جائے تو مغرب کی کورانہ تقلید سے ہماری عورتیں نجات حاصل کر کے مردوں کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر سکتی ہیں، جس کے فیضان سے ہمارا معاشرہ تہذیب و تمدن کا اعلیٰ نمونہ بن سکتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے کا حال کیا ہے؟ ہمارے شاعر، فلسفی، افسانہ نویس اور صورت گر کے اعصاب پر عورت سوار ہے، اقبال معاشرے کی اس بے حسی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

تاریخ ادب اردو کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدیوں سے ہمارے بیشمار شعراء محض گل وبلبل کی شاعری پر اپنا قیمتی سرمایۂ فکر ضائع کرتے چلے آرہے ہیں ایسے شعراء کی اکثریت رہی ہے جنہوں نے محض لب ورخسار، کاکل و مژگاں اور حسن کی بے جا تعریف میں اپنی عمر گنوادی، حقیقت یہ ہے کہ آج تک اس برائی سے اردو کا دامن پاک نہ ہو سکا۔ اقبال ہمارے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے سماج میں عورت کے رتبے کو پہچانا اور اس کی حیثیت متعین کر کے آنے والی نسلوں کے لئے ایک لائحۂ عمل مرتب کر دیا۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا ساز دروں
شرف میں بڑھ کر ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے تعلیم نسواں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور ایسی تعلیم جس کے ذریعہ نسوانیت کا خاتمہ ہو جائے، کبھی حمایت نہیں کی۔ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر بہت واضح ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازاں
کہتے ہیں اس علم کو ارباب نظر موت
بے گانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

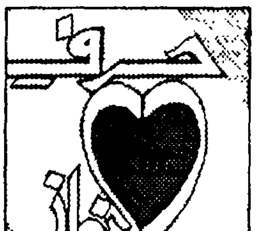
اقبال کے مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمارے بگڑے ہوئے معاشرے کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ آج ہماری درسگاہوں کا حال کیا ہے؟ ایجوکیشن کے نام پر تعلیم کا جو حال ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جہاں تک فکر اقبال کا سوال ہے انہوں نے عورتوں کے مقام کا تعین اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ ان سے پہلے غالباً کسی شاعر نے ایسا انداز فکر اختیار نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے برابر آزادی مل جائے تو انسانی معاشرہ تباہ ہو جائے۔ قدرت کو ایسا کرنا منظور ہوتا تو عورت کو ایک الگ صنف کی حیثیت نہ دی جاتی۔ ہاں عورتوں کے جو جائز حقوق ہیں انہیں بلا شبہ ملنا چاہئے۔ عورت بچوں کی پرورش کے علاوہ امور خانہ داری کی ذمہ داری قبول کرتی ہے، وہ ہمارے گھروں کو پُر رونق بناتی ہے اور زندگی کے عملی میدان میں مردوں کا شانہ بشانہ ساتھ دیتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ میدان جنگ میں بھی عورتوں نے مردوں کا ساتھ دیا ہے اس سلسلے میں بطور مثال اقبال کی ایک نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" کا ایک بند پیش کر رہا ہوں جس میں اقبال نے عرب کی ایک غیور خاتون فاطمہ کو دل کی گہرائیوں سے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جانباز اور جواں سال فاطمہ نے طرابلس کی جنگ ۱۹۱۲ء میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے میدان جنگ میں شہادت کا جام نوش کیا تھا۔

فاطمہ تو آبروئے ملتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبال نے مغرب نواز جدید تعلیم اور بے پردگی کی ہمیشہ مخالفت کی۔ وہ مشرقی علوم وفنون کے قائل ہیں۔ وہ مشرقی علوم کو مغربی علوم پر ترجیح دیتے ہیں لہٰذا تعلیم نسواں سے متعلق اکبر الہ بادی کے رنگ میں اپنے موقف کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ

کمال جعفری کا شعری مجموعہ



حرفِ دلنواز

کشمیرا : وہ بیچے گا نہیں۔
چمن : تجھے کیسے معلوم۔
کشمیرا : جانتا ہوں نا۔ وہ پھولوں کا بیوپاری نہیں۔
چمن : تو پھر دوکان کیوں کھولی ہے اس نے۔
کشمیرا : تاکہ آپکو پھول نہ مل سکیں۔
چمن : تو بہت کچھ جانتا ہے اس کے بارے میں۔
کشمیرا : ملتا جو ہوں اس سے۔
چمن : کام میرا کرتا ہے اور باتیں اس کی سنتا ہے۔
کشمیرا . باتیں بڑی دلچسپ جو کرتا ہے (چمن لال کو خاموش دیکھ کر) دیکھئے لالہ جی اگر آپ کو پھول چاہئیں تو دام وہی دینے ہوں گے جو وہ دیتا ہے۔
چمن : اتنی قیمت تو میں نہیں دونگا۔
کشمیرا . تو پھر مشکل ہے (طویل وقفہ)
چمن : (سپاٹ لہجے میں) سن کشمیرا۔ تو تو مقامی آدمی ہے۔ یہاں کے لوگوں کو سمجھا مجھے پھول دیں وہ۔ اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ (لہجہ بدل کر) تجھے کام ملتے ہیں نا اوروں کو بھی ملیں گے اور کام میرے پاس ہے۔
کشمیرا : وہ اپنا نقصان کر کے آپکو پھول کیوں دینے لگے۔
(چمن لال کچھ کہتے نہیں غصے میں گھورتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ پس منظر سے آواز آتی ہے)
آواز : مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
/ طویل وقفہ / (چمن لال داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک پلندہ ہے۔ وہ بہت خوش ہیں۔)
چمن دیکھ کشمیرا۔ یہ دیکھ۔ آج سے یہاں کا ایک ایک پھول میرا ہے۔ اب کوئی بھی ایک پھول اس شاعر کو نہیں بیچ سکتا، کیونکہ میں مالک ہوں اب۔ خرید لیا میں نے پورا گلستان۔
کشمیرا : (چہرہ بجھ جاتا ہے) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟
چمن : تجھے خوشی نہیں ہوئی نا۔ جانتا ہوں نہیں ہوگی مجھے غیر جو سمجھتا ہے تو۔ (کشمیرا کو چند لمحے گھورنے کے بعد کھردرے لہجے میں) آج سے تیری مزدوری دو روپے کم۔
کشمیرا . لیکن لالہ جی
چمن : بحث نہیں ورنہ چار روپے کم ہو جائیں گے۔
(کشمیرا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ زوروں کا دھماکہ ہوتا ہے، سب کچھ لرز کر رہ جاتا ہے۔ وہ دونوں سہم کر ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ پے در پے کئی دھماکے ہوتے ہیں۔ اندھیرا چھا جاتا ہے، اندھیرے میں چمن لال کی آواز سنائی دیتی ہے)
چمن : کشمیرا کہاں ہے تو، (کشمیرا کی کوئی آواز نہیں آئی) گھبرا کر کشمیرا بولتا کیوں نہیں۔ (اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے) موم بتی کہاں ہے۔

/ وقفہ /

ماچس کی تیلی جلتی ہے۔ موم بتی کی روشنی میں کشمیرا اوندھے منہ پڑا نظر آتا ہے۔ چمن لال تڑپ کر اس کے قریب جا کر اسے سیدھا کرتے ہیں اس کے چہرے کو تھپتھپاتے ہیں۔ چاروں طرف مرجھائے پھول بکھرے پڑے ہیں وہ پاگلوں کی طرح ان پھولوں کو کشمیرا پر ڈالنے لگتا ہے۔

/ طویل وقفہ /

(ایک خوش پوش شخص داخل ہوتا ہے)
چمن : کیا چاہئے تمہیں۔ سب کچھ تو ختم ہو گیا۔
شخص : ایک گلاب کی ضرورت ہے
چمن : (دہراتے ہوئے) گلاب؟
شخص : ہاں۔ صرف ایک۔ میں نے پورا شہر چھان مارا کہیں نہیں ملا۔ ایک گلاب۔ منہ مانگی قیمت دونگا۔
(منہ مانگی قیمت سن کر چمن لال پاگلوں کی طرح بکھرے پھولوں میں گلاب تلاش کرتا ہے۔ ناکامی ہوتی ہے، مایوس ہو کر اس شخص کی جانب دیکھتے ہیں)
شخص . ڈھونڈیئے ایک تازہ گلاب جو قیمت آپ چاہیں ملے گی۔
(چمن لال دوبارہ پریشان ہو کر ڈھونڈتے ہیں اچانک پاس آکر)
چمن : اس شاعر کے پاس ہوگا۔ ابھی لاتا ہوں (جانے کیلئے مڑتے ہیں)
شخص : کون شاعر؟
چمن : وہ۔ جو اس کی دکان ہے "سدا بہار غنچے"
شخص : وہاں ایسی کوئی دوکان نہیں ہے.
چمن : دوکان نہیں ہے۔ وہ پھولوں کی دکان۔ وہ شاعر۔
شخص : کوئی نہیں ہے وہاں، ایسی کوئی دکان نہیں ہے۔
(چمن حیرت سے کشمیرا کی جانب دیکھتے ہیں)
چمن : گلاب میرے پاس نہیں----- یہ بتاؤ تمہیں ایک گلاب کی تلاش کیوں ہے؟
شخص : اس سائنسداں کے کالر میں لگانا ہے جس نے یہ دھماکہ کیا۔
(چمن لال اسکا چہرہ تک رہے ہیں، منظر ساکت ہو جاتا ہے)

پردہ

کمال جعفری



نام : محمد کمال الدین
قلمی نام : کمال جعفری، تخلص: کمال
والد کا نام : محمد غلام رسول (مرحوم)
پیدائش . ۲۵ جولائی ۱۹۴۹ء
آبائی وطن : موضع بازوچک، ڈاکخانہ خورد۔ چھوٹا جموارہ
ڈاکخانہ کلاں، ہنسوہ، ضلع نوادہ (بہار)
تعلیم : آبائی وطن سے ہائر سکنڈری اور مولانا آزاد کالج کلکتہ سے فارسی آنرز بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔ اے (فارسی) گولڈ میڈلسٹ، کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۷۱ء۔
ملازمت : آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی ۷۹ء تا اکتوبر ۹۴ء۔ ٹرانسفر بحیثیت پروگرام ایکزیکیوٹیو، رامپور اکتوبر ۹۴ء تا مئی ۹۷ء۔ کلکتہ آل انڈیا ریڈیو مئی ۹۷ء تا حال پروگرام ایکزیکیوٹیو ہوں۔
ادب : شاعری اسکول کے زمانے سے کر رہا ہوں۔ پہلی نظم پاکستان کے خلاف ۶۵ء میں لکھی۔ باضابطہ شاعری کالج کے زمانہ میں شروع کی۔ ابتدا میں پروفیسر عباس علی خان بیخود سے اصلاح لی۔ چند غزلیں پروفیسر مجیب الرحمٰن کو دکھائیں اور پھر پروفیسر اعزاز افضل سے اصلاح لینی شروع کی۔ یہ سلسلہ ۷۳ء تک جاری رہا۔
تصنیفات : (۱) "عکسِ تمنا" (شعری مجموعہ) ۸۱ء۔ اس پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے انعام سے نوازا۔ (۲) "یادوں کا زنداں" (شعری مجموعہ شاعر وحید عرشی) مرتب۔ کمال جعفری ۹۱ء۔ (۳) "حرفِ دلنواز" (دوسرا شعری مجموعہ) ۹۹ء (۴) "ذکرِ محفوظ" (پروفیسر محفوظ الحق کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ) مرتب کمال جعفری ۹۹ء۔
ادارت : ماہنامہ "مخدومِ جہاں" نئی دہلی۔ اکتوبر ۸۸ء تا جنوری ۹۴ء۔

موجودہ پتہ : Central Govt.
Staff Quarters
Qtr No 55,
Block F-1,
Narkeldanga,
Calcutta - 700 054
Ph (033) 358-9732

غزلیں

یہ کیسا شہر ہے تم بھی عجیب لگتے ہو
امیر ہو کے بھی خاصے غریب لگتے ہو

یہ دھیما دھیما سا لہجہ یہ پر اثر تقریر
تم اپنے طرز کے اچھے خطیب لگتے ہو

چھپائے بیٹھے ہو خنجر تم آستینوں میں
یہ اور بات بظاہر نقیب لگتے ہو

قلم سے آگ بجھاؤ کہ جل رہا چمن
خموش بیٹھے ہو کیسے ادیب لگتے ہو

مسرتوں سے ہیں لبریز دھڑکنیں دل کی
تم ان دنوں مرے اتنے قریب لگتے ہو

کمالؔ اپنی غریبی کے باوجود مجھے
قسم خدا کی بہت خوش نصیب لگتے ہو

نغمہ و شعر کی لذت کا بدل کہتے ہیں
آپ کے حسن کو عشاق غزل کہتے ہیں

ہوں گے وہ اور جو کچھ اور سمجھتے ہوں گے
خوبرو ہم تری آنکھوں کو کنول کہتے ہیں

صبر اور شکر کی دولت جنہیں مل جاتی ہے
وہ مصیبت کو مسرت کا بدل کہتے ہیں

اسی اِک چیز پہ قائم ہے زمانے کا مزاج
جس کو اِک لفظ میں ہم لوگ اجل کہتے ہیں

جیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں ریاضت کا ثمر
ہار جاتے ہیں تو تقدیر کا پھل کہتے ہیں

جس پہ ہم کرتے ہیں تعبیر کا تعمیر محل
اُس کو ہم خواب کا اِک تاج محل کہتے ہیں

ہم کوئی حرف گلہ دل میں نہیں رکھتے کمالؔ
روبرو کہتے ہیں ہم اور اٹل کہتے ہیں

چمن : (لپک کر) جوان بہت غصے میں ہو؟

جوان : ہمیں پھول چاہیے

چمن : ضرور۔ ہم تو کاروبار ہی پھول کا کرتے ہیں۔

جوان : تمہارا بس چلے تو چمن ہی بیچ ڈالو۔

چمن : (نظر انداز کرتے ہوئے) پھول کس بات کے لئے چاہیے، شادی ہے، منڈپ سجانا ہے یا——

جوان : (بات کاٹ کر تیز لہجے میں) ارتھی سجانی ہے ارتھی، بیس ۲۰ ارتھیاں نکلیں گی۔

چمن : ارتھی؟۔ اوہ! کب مرے یہ لوگ؟۔ کوئی نئی درگھٹنا؟

جوان : وہ آپ کے گردھاری لال الیکشن جو جیت گئے نا بیس جنے کی لاش پر ان کی کرسی دھری ہے جی۔

چمن : دکھ ہوا یہ سن کر۔ آج کل چناؤ میں جانیں بہت جاتی ہیں۔

جوان : بیس کو موت کے گھاٹ اتار کر چلے ہیں "جشن فتح منانے" ہم بھی ارتھیوں کا جلوس نکالیں گے اُسی سے۔

چمن : پولیس فائرنگ میں مارے گئے؟

جوان : (اثبات میں سر ہلا کر) الیکشن میں جب ہوا خراب دیکھی بوتھ پر غنڈوں سے حملہ کرادیا، پولیس نے ساتھ دیا۔

چمن . چہ چہ چہ۔ ہمارے دیش کے لوگوں کا خون کسطرح برباد ہو رہا ہے۔

چمن : تو کب ارتھی چاہیے۔۔۔؟

جوان صبح دس بجے۔ ارتھیاں پارٹی آفس سے ہوتے ہوئے شمشان گھاٹ جائیں گی۔

چمن . پولیس نے اجازت دیدی؟

جوان اجازت، ہمیں اجازت کی ضرورت نہیں، دیکھیں ہمیں کون روکتا ہے لاء اینڈ آرڈر انکا مسئلہ ہے۔

چمن اس وقت تو شاید گردھاری لال کی فتح کا جلوس بھی نکلے گا۔ کیوں کشمیرا؟

جوان نکالیں وہ۔ ہم بھی تیار ہیں پورے شہر میں آگ لگادیں گے۔

چمن، کشمیرا۔ آرڈر بک کر لے ان کا۔

کشمیرا بیس ارتھیوں کے لئے پھول کہاں سے لائیں گے ہم۔ پھول ویسے ہی...

(جوان جھپٹ کر کشمیرا کو کالر سے پکڑ لیتا ہے)

جوان کسی بھی طرح ہو ہمیں پھول چاہیے۔ ارتھی تو سجے گی ہی۔

کشمیرا کالر چھوڑیے بھیا۔ (چھوڑ دیتا ہے) پھول بازار میں بالکل نہیں ہیں۔

جوان : گردھاری لال کا آرڈر کس طرح لیا تم نے۔ ہمارے لئے پھول نہیں، آرڈر کینسل کروانگا، وہ پھول ہماری ارتھیوں کو دو۔

(کشمیرا بے بسی سے چمن لال کی جانب دیکھتا ہے)

چمن : ٹھیک ہے ٹھیک ہے ہم آپ کی ارتھی سجادیں گے۔۔۔ میرا مطلب ہے پھول مل جائیں گے آپ کو۔

جوان : کل آپ کتنے بجے آدمی بھیجیں گے؟

چمن : آدمی بھیجنا ہوگا؟

جوان : بالکل۔ ورنہ ارتھی سجائے گا کون؟

چمن : یہ چلا جائے گا۔

کشمیرا : میں؟

چمن : (جلدی سے آنکھ مار کر) آپ چنتا نہ کریں۔ پوسٹ مارٹم ہو چکا؟

جوان : ہاں۔ کیوں رپورٹ چاہیے آپ کو؟

چمن : نہیں نہیں میں لے کر کیا کرونگا۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔

چمن : کاروائی سے پر ہو تو سب کام سے پر ہو جاتا ہے۔

نوجوان : (روپے نکال کر) کتنی پیشگی دوں؟

چمن : (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا لوں۔ دکھ ہوتا ہے ارتھی سجاتے۔۔۔ پانچ سو دے جایئے۔۔۔ حساب تو ہوتا رہیگا۔

جوان : (روپے دیتے ہوئے) کل صبح چھ بجے انہیں بھیج دیجئے گا (کارڈ دیتا ہے) اس پتے پر۔

چمن : بالکل (کارڈ لے لیتا ہے، جوان چلا جاتا ہے) (کشمیرا کو کارڈ دیتے ہوئے) یہ رکھ لو۔

کشمیرا : میں نہیں جاؤں گا۔

چمن : ارتھی پیچھے ۵۰ روپے ملیں گے، ۲۰ کے کتنے ہوئے؟

کشمیرا : لیکن۔

چمن : پیسے کما کشمیرا۔ پیسے۔ کوئی مرے جیئے ہمیں کیا۔

کشمیرا : پھول کہاں سے آئیں گے؟

چمن : انتظام کرتا ہوں نا۔ (سوچ میں ڈوب جاتا ہے) مولانا داخل ہوتے ہیں۔ چمن انہیں دیکھتے ہی موڈ بدل کر لپکتا ہے۔

آیئے مولانا آیئے۔ وہی تو سوچ رہا تھا۔ سال ختم ہونے کو آیا آپ کا دیدار نصیب نہیں ہوا۔ کب باندھ رہے ہیں سہرا؟

مولانا : تم بھی لالہ کیسی بات کرتے ہو۔

چمن : کیوں۔ ایک اور کی گنجائش تو ہے ابھی۔

مولانا : کرونگا بھئی۔ کروں گا۔

چمن . جلدی کیجئے۔ وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اجل کے ہاتھ چلا آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے

مولانا : مجھ سے زیادہ تو تم اتاؤلے ہو رہے ہو۔ تم کیوں نہیں کرتے؟

چمن : (آہ بھر کر) اپنی قسمت میں کہاں۔ وہی ایک ڈھول پیٹے جارہا ہوں۔

مولانا : قسمت بدلوا لو اپنی۔ (پھولوں کو ہاتھ میں لیتے ہوئے)

چمن : تو کب باندھ رہے ہیں سہرا؟

مولانا : جلد ہی۔

چمن : سہرا میں ہی باندھوں گا۔

مولانا : تم سے ہی بندھواؤں گا بھئی۔ تمہارے سہرے کے پھول جلدی نہیں مرجھاتے، سدا کھلے رہتے ہیں۔

چمن : دل جوان ہونا چاہئے سہرا مرجھائے کیوں۔ تو یہ چوتھی ہوگی آپ کی؟

مولانا : (شرماکر) یاد ہے تمکو؟

چمن : بھول سکتا ہوں بھلا۔ تیسری تو آپکی خود ہی گلدستہ تھی۔

مولانا : غنچہ کہو میاں۔ گلدستہ تو اب ہوئی ہے۔ (ایک کلی کو انگلی میں گردش دیتے ہوئے)

چمن : تو نئی کلی ہاتھ لگ گئی کیا؟ (مولانا اثبات میں سر ہلاتے ہیں) مبارک ہو۔ تاریخ جلد پکی کرلیں۔

مولانا : ذرا اڑچن ہے۔

چمن : وہ کیا۔؟

مولانا : یہ میری چھوٹی بیگم بغاوت پر آمادہ ہیں۔ کہتی ہیں "ہونے نہیں دونگی"؟

چمن : کون روک سکتا ہے بھلا؟ آپ تو شریعت کے پابند ہیں۔ (دونوں ہنستے ہیں)

مولانا : اچھا مذاق چھوڑو۔ ابھی تو میں دوسرے کام سے آیا ہوں۔

چمن : فرمائیں جی۔ فرمائیں۔

مولانا : مولانا پرسوں بابا ملنگ شاہ کا عرس ہے۔

چمن : (چونک کر) ارے آگیا عرس ـــــ اتنی جلدی؟۔

مولانا : جلدی کہاں میاں۔ ایک سال ہوگیا۔

چمن : وقت کیسے گزرتا ہے۔ شاہ ملنگ بابا۔ (عقیدت سے انگلیوں کو بوسہ دیکر آنکھوں سے لگاتا ہے)۔

مولانا : پھولوں کی چادر بنانا ہے تمہیں۔ سو کے قریب لڑیاں نرگس کے پھولوں کی۔

چمن : کشمیرا آرڈر بک کرلے۔ دو ہزار پیشگی دے جائیں۔ اس سال قیمت کچھ زیادہ ہوگی پھولوں کی قیمت آسمان کو چھو رہی ہے۔

مولانا : تم یہ کاروباری باتیں بند کرو۔ (روپئے دیکر ہنستے ہیں) میرے سہرے کی بات کرو۔ وہی اچھی لگتی ہے (دونوں ہنستے ہیں)
(مولانا جاتے جاتے رک کر) اوہاں! یاد آیا بھئی ایک شکایت ہے تم سے؟

چمن : (چونک کر) مجھ سے۔۔۔ کیسی شکایت؟

مولانا : یہی کہ تم مندروں کے چڑھاوے کے پھولوں سے مزار کی چادر بنادیتے ہو۔

چمن : توبہ توبہ یہ میں کبھی کرسکتا ہوں بھلا۔

مولانا : میرا بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

چمن : سراسر گناہ ہے یہ۔

مولانا : دراصل چمن لال تم تو جانتے ہو۔ مزار شریف میں میرے دشمن بھی ہیں۔ مخالف گروپ مجھے نکالنے پر تلا ہے۔

چمن : یہ کارستانی انہی لوگوں کی ہوگی۔ وہ لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ خواہ مخواہ میں بدنام ہو جاؤنگا۔ بتائیے یہ تو ہندو مسلم فساد کرانے کی سازش ہے۔ مندر کے پھول مزار پر۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔

مولانا : حالانکہ کتنے ہندو عقیدت مند مزار پر پھول چڑھاتے ہیں۔

چمن : وہ تو دوسری بات ہوئی نا۔ لیکن یہ۔۔۔

مولانا : تم فکر نہ کرو۔ میں سنبھال لوں گا۔ بس ذرا خیال رکھنا۔ اور ہاں چادر میں گیندے کا استعمال مت کرنا۔

چمن : نہیں کرونگا جی۔ پھول بھی اب ہندو مسلم ہونے لگے۔ (مولانا ان سنی کرتے ہوئے نکل جاتے ہیں)

کشمیرا : پہلے سال تو آپ نے یہی کیا تھا مندر کے چڑھاوے کے پھول۔۔۔۔

چمن : (بات کاٹ کر) ارے تو کیا ہوا۔ دونوں ہی استھان پوتر ہیں۔ (فکرمند لہجے میں) اب یہ گیندے کے پھولوں کی مناہی کردی انہوں نے۔

کشمیرا : آپ آرڈر لینے سے باز نہیں آئینگے۔

چمن : سن کشمیرا۔ اس شاعر کو بلالا۔ اس سے ملنا ہی ہوگا۔

کشمیرا : وہ نہیں آئے گا!

چمن : کہو تو سہی میں نے بلایا ہے۔

کشمیرا : کام کیا ہے؟

چمن : اس کے پھول خریدونگا۔



کمال احمد

نام کمال احمد

پورا نام کمال الدین احمد، قلمی نام کمال احمد، ۱۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو میری پیدائش 34/ID، سر سید احمد روڈ کلکتہ 14 کے ایک تاریک کمرے میں ہوئی۔ شمس الدین احمد اور عائشہ خاتون کی یہ دوسری اولاد تھی جو نہایت کمزور، بیمار، مریل پیدا ہوئی تھی۔ کہتے ہیں چار سال کی عمر میں چلنا سیکھا تھا۔ میرے بعد متواتر سات بچے اور ہوئے جو اچھی غذا کے نہ ملنے کے سبب اور بیماری سے مرتے گئے۔ صرف تین کسی طرح بچ پائے۔ سخت جان جو تھے۔

دادا مولوی عبد القاسم جو کلکتہ ہائی کورٹ میں پیشکار تھے اور نانا حشمت علی خان دلّی کے پٹھان اور پیشے سے داروغہ تھے مجھے اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ والد صاحب کی دوکان تھی جو چلتی نہیں تھی، کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔ لہذا میرے نانا نے مجھے انجمن بوائز اسکول (جواب انجمن گرلس اسکول ہے) ۱۹۵۲ء میں ڈال دیا۔ تین سال یہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں کلکتہ کارپوریشن اسکول (علیم الدین اسٹریٹ) پھر ۱۹۵۶ء میں مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۳ء میں اسکول فائنل پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۷ء مولانا آزاد کالج میں اردو میں آنرز کیا۔ ۱۹۶۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء میں الہ آباد بنک میں ملازمت کرلی۔

۱۹۷۲ء میں "ٹکڑے گلاب کے" ڈرامہ لکھا جو سرور حسن صدیقی کی ہدایت میں کلامندر کے بڑے ہال میں کھیلا گیا۔

ڈرامے کی کامیابی نے حوصلہ بڑھایا اور شوق کو ہوا دی۔ پروفیسر سلیمان خورشید نے سرور صاحب کے مشورے پر ۱۹۷۷ء میں دو ڈرامے "تجرباتی" کی اشاعت کرڈالی۔ ۱۹۷۹ء میں ڈراما گروپ "فنکار" کی بنیاد ڈالی اور مسلسل دس سال اسی بینر میں ڈرامے لکھتا اور اسٹیج کرتا رہا۔

ابتک مختلف ڈراموں کے ۹۱ شوز کر چکا ہوں۔ ۱۷ ڈرامے لکھے ہیں۔ ۱۲ بنگلہ ڈراموں کے ترجمے کیے ہیں۔ ان دنوں چند افسانے بھی لکھے ہیں جو انشاء، شاعر، اثبات و نفی، دستک، نیا دور، آزاد ہند اور آبشار میں شائع بھی ہوئے ہیں۔

ڈرامے کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ دو ڈرامے "تجرباتی" (۱۹۷۷) "ہمشکول" (۱۹۸۲) "مور کے پاؤں" (۱۹۸۶) "گرداب" (۱۹۸۸) اور "الٹی گنگا" (۱۹۹۱)۔ دو ڈرامے تجرباتی کو مغربی بنگال اردو اکادمی اور مور کے پاؤں کو بہار اردو اکاڈمی نے ایوارڈ دیا ہے۔

امتیاز میر ایوارڈ ۱۹۹۲ء میں حاصل کیا۔ "مور کے پاؤں" بھاگلپور یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں شامل تھا۔ پتہ نہیں اب ہے یا نہیں۔

۱۲ ریڈیائی ڈرامے آکاش وانی کلکتہ اور "ہوا محل" سے نشر ہوئے ہیں۔ ایک ٹی وی ڈراما 'چکر' کلکتہ دوردرشن نے ٹیلی کاسٹ کیا۔

پتہ : 34/ID Sir Syed Ahmed Road
Calcutta - 700 014
فون : (033) 284-5416

ڈرامہ

"گل مرگ"

(جیلانی بانو کے افسانہ "بات پھولوں کی" پر مبنی)

کردار

(۱) چمن لال
(۲) کشمیرا
(۳) گاہک (i)
(۴) گاہک (ii)
(۵) مولانا
(۶) نووارد

[پھولوں کی دکان- جلی حرفوں میں ایک بورڈ آویزاں ہے- "چمن لال پھول والے"- دکان کے اندر مختلف پھولوں کے بوکے، تاج، سہرے اور سفید بڑے پھولوں والے دائرہ نما Wreath نظر آرہے ہیں- دکان کے باہری حصے میں پھولوں کی ٹوکری سجائے کشمیرا پھولوں کی چھوٹی چھوٹی مالائیں پرو رہا ہے- نرگس، جوہی، بیلا- اس کی انگلیوں کی جنبش سے دھاگے میں ہار بنتے جا رہے ہیں- چند لڑکیاں ٹوکریوں میں پھول سجائے داخل ہوتی ہیں- کشمیرا انہیں اشارے سے سمجھاتا ہے وہ پھول کہیں اور بیچیں یہاں مناسب قیمت نہیں مل سکے گی- لڑکیاں مایوس ہوکر نکل جاتی ہیں- (وقفہ)- چمن لال داخل ہوکر چند لمحے اسے گھورتے ہیں وہ اپنے کام میں اسقدر محو ہے کہ چمن لال کی موجودگی کا احساس اسے نہیں ہوتا-]

چمن : کشمیرا۔ (کشمیرا چونک کر اسکی جانب دیکھتا ہے سوئی انگوٹھے میں چبھ جاتی ہے۔ انگوٹھے کا خون چوستا ہے) (چمن بُرا سا منھ بناتا ہے)

کشمیرا : اپنا ہی خون چوس رہا ہوں لالہ جی۔

چمن : (ان سنی کرتے ہوئے) آئی نہیں وہ پھول لے کر؟ (کشمیرا انکار میں سر ہلاتا ہے) کیا کام چلے گا ان پھولوں سے۔ شہر میں اتنے جلسے جلوس اور کل شیوراتری کے تیوہار میں پھول ختم ہوگئے۔

اتنے آرڈر کہاں سے سپلائی دیں گے ہم...؟

کشمیرا : میں نے تو پہلے ہی کہا تھا اور آرڈر مت لیجئے۔

چمن : گاہک کیسے چھوڑ دوں۔ اس دکان میں چلے گئے تو....

کشمیرا : پھول اُس کے پاس ہیں گاہک آپ کے پاس۔

چمن : کاروبار وہ کیا جانے۔ بڑا شاعر بنتا ہے۔ نام رکھا ہے دکان کا "سدا بہار غنچے"۔ بھلا بتاؤ پھول کب سدا بہار رہیں گے ایک دن تو مرجھائینگے۔

کشمیرا : مرجھا کر بھی انکا حسن برقرار رہیگا لالہ جی

چمن : اچھا تو بک بک مت کر، بہت طرفداری کرتا ہے اس کی۔ ارے بچہ ہے وہ بچہ۔ یہ پھولوں کا کاروبار ہے کانٹوں میں الجھے گا تو پتہ چلے گا۔ (خود سے) جانے کس نے مشورہ دیا ہے اُسے اس دھندے کا، وہ بھی میری دکان کے سامنے۔

کشمیرا : اس کی دکان سے مالیوں کو فائدہ ہوا، پھولوں کی اچھی قیمت دے رہا ہے۔

چمن : گھر لٹا رہا ہے اپنا، دیکھیں کب تک لٹائے گا، جلد ہی ٹھپ پڑ جائیگا۔

کشمیرا : بڑے گھر کا لکو تا ہے۔ دل کا دھنی ہے۔

چمن : بہت تعریف کرتا ہے اس کی

(پس منظر سے گانے کی آواز آتی ہے)

آواز :..... گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

(کشمیرا کے ہاتھ رک جاتے ہیں وہ مبہوت ہو کر گیت سننے لگتا ہے۔
چمن لال بدستور منہ بنائے دوسری سمت دیکھنے لگتا ہے)

آواز :..... قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کشمیرا : بڑی اچھی آواز پائی ہے

چمن : شاعر ہے، مشاعرے لوٹتا ہوگا

آواز :... جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

کشمیرا : بہت درد ہے آواز میں۔

چمن : اور بڑھ جائے گا جب دکان بند ہوگی۔

کشمیرا : سپلائر لوگ اسے بہت پوچھتے ہیں۔

چمن : چاہیں گے تو۔ جن پھولوں کی قیمت میں ہاں... [illegible]
دل دیتا ہے۔

کشمیرا : لگتا ہے پھولوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ کوئی چکا نہیں سکتا۔

چمن : ان پھولوں کا وہ کرتا کیا ہے۔ گاہک تو میرے پاس ہیں۔

کشمیرا : پھولوں کی سیج سجاتا ہے۔ چادریں بنتا ہے۔

چمن : اپنے استعمال کے لئے ؟ (کشمیرا اثبات میں سر ہلاتا ہے)

(ایک گاہک داخل ہوتا ہے)

چمن : (موڈ بدل کر چہکتے ہوئے) آیئے آیئے شرما جی بہت دنوں بعد آنا ہوا۔

گاہک : گردھاری لال الیکشن جیت گئے آپ کو تو پتہ ہوگا۔

چمن : وہ تو جیتیں گے ہی۔ کبھی ہارے ہی نہیں۔

گاہک : یہ ان کا پہلا الیکشن تھا لالہ جی۔

چمن : ایک ہی بات ہے جی ایک ہی بات ہے۔ اب دیکھنا کبھی نہیں ہاریں گے.....

ہاں تو کتنے بوکے بنانے ہیں؟

گاہک : بوکے تو ایک ہی۔ مالا آٹھ دس، بڑے پھولوں والی۔

چمن : کشمیرا سن لے۔

گاہک : کمل پھول نہیں ہے آپ کے پاس؟ وہ Lotus؟

چمن : وہ پھول یہاں نہیں ہوتا۔

کشمیرا : وہ تو کیچڑ میں کھلتا ہے نا۔

گاہک : اب تو استعمال میں آرہا ہے وہ پھول منگائیں آپ۔

چمن : کشمیرا سن لے صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔

کشمیرا : اسکا سائز بڑا بے ڈھب ہے جی۔ نہ ہار میں اچھا لگے گا نہ بوکے میں۔

گاہک : ٹھیک ہے جو پھول آپ کے پاس ہیں انہی سے بنا دیں۔

چمن : پھولوں کے دام آسمان کو چھو رہے ہیں، کب چاہئے آپ کو؟

گاہک : کل Victory Precession ہے۔ گردھاری لال دورے پر نکلیں گے۔

چمن : ہماری دکان کی طرف بھی لایئے نا نہیں۔

گاہک : کوشش کروں گا، ویسے یہ روٹ نہیں [illegible]

چمن : [illegible]

[illegible]



قیوم بدر

۲ر مئی ۱۹۵٦ء کو جگتدل (نزد کلکتہ) میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے ۱۵ر مہینے بعد امی محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ والد نے دوسری شادی نہیں کی۔ چنانچہ میں اپنے والدین کی پہلی اور آخری اولاد ہوں۔ ۱۹۷۳ء میں جگتدل چشمۂ رحمت اسکول سے ہائر سیکنڈری کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ گھر میں چونکہ پڑھائی لکھائی کا چرچا نہیں تھا لہٰذا خواہش کے باوجود میرا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا اور کاندھے پر کمانے کی ذمہ داری آگئی۔ ابتک مستقل معاش کا ذریعہ نہیں تاہم مجھے اپنی اس مختصر سی زندگی میں ٹیچری سے ڈاکٹری اور مزدوری سے کلرکی تک کرنا پڑی۔ اس دوران شادی اور پھر چار بچے ہوئے۔ بہر کیف میری زندگی کی سب سے اہم کامیابی میری شریکِ حیات کلثوم بدر ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ قلم انہی کی رفاقت کا مرہونِ منت ہے۔ میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹٦۸ء میں افسانے سے ہوا لیکن زندگی کے تجربات و مشاہدات کے لئے افسانے کا کینوس چھوٹا لگا۔ چنانچہ ۱۹۷٦ء سے طنز و مزاح کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ۱۹۹۷ء میں پہلا طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''دخل در معقولات'' منظرِ عام پر آیا جسے مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا۔ اس وقت تین کتابیں زیرِ ترتیب ہیں۔

پتہ کیر آف۔ ذُلہن گل
جگتدل، ۲۴ر پرگنہ (نارتھ)
۷۴۳۱۲۵ - مغربی بنگال

دفترِ شکایات

دفترِ موسمیات کی جانب سے ہمیں آئے دن موسم سے متعلق عجب مضحکہ خیز پیش گوئیاں سننے کو ملتی ہیں۔ مثلاً آج شام زبردست طوفان کا خطرہ ہے۔ ایسے میں ہم گھر سے نکلتے ہی نہیں اور بالفرض محال نکلتے ہیں تو احتیاطاً کھمبوں پر نظر رکھتے ہیں کہ اگر طوفان آگیا تو کھمبا ہی سہارا ہوگا۔ (تنکے کا سہارا دیوانے کا خواب ہے۔ ہوا اور پانی کے سامنے بھلا تنکے کی کیا حقیقت) لیکن حیرت انگیز طور پر شام کو طوفان کیا آتا، ہَوا ہی گم ہو جاتی ہے۔

کبھی دفترِ موسمیات یہ اطلاع دیتا ہے کہ آج شام زبردست بارش کا امکان ہے لہٰذا ہم احتیاطاً گھر سے چھتری لے کر نکلتے ہیں لیکن برعکس ایں ہمہ شام کو بارش کیا ہوتی سورج اپنا مقررہ وقت پار کر کے بھی بڑی ڈھٹائی سے مسکراتا رہتا ہے۔۔۔ خیر اسطرح کی اطلاعات سے دفترِ موسمیات کا تو کچھ نہیں بگڑتا لیکن ہمارا یہ نقصان ہوتا ہے کہ ہم پھر وہ چھتری واپس لے کر گھر نہیں لوٹتے۔۔۔ یہی حال تقریباً چاند کمیٹی کا بھی ہے۔ عموماً وہ جنہیں اپنے اعمال دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی چاند دیکھنے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔۔۔ چاند کمیٹی والے عموماً چاند ہونے کی خبر اس وقت دیتے ہیں۔ جب لوگ چاند ہونے کی مبارکباد اپنے عزیزوں کو دے چکے ہوتے ہیں (عموماً وہ جنہیں عید کی جلدی ہوتی ہے) دفعتاً چاند کمیٹی اپنے دوسرے بلیٹن میں یہ خبر دیتی ہے کہ ہنوز خلا میں چاند کا کہیں پتہ نہیں۔ ویسے ہم پتہ لگا رہے ہیں کہ آخر چاند گیا کہاں؟

چونکہ اسطرح کے دفاتر اب معتبر نہیں رہے اس لئے اب ہمارے معاشرے میں دوسری طرح کے دفتروں کا قیام عمل میں آرہا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہمارے محلے میں ایک دفتر ''دفترِ شکایات'' کا طمطراق سے افتتاح ہوا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت مجھے سونپی گئی۔ حالانکہ یہ میرے مزاج کے قطعی موافق نہیں تھا پھر بھی میں نے حامی بھر لی کہ صدارت کا موقع شاذ و نادر ہی ہاتھ آتا ہے لیکن میں نے اراکین دفترِ شکایات سے اتنا ضرور کہا کہ بھئی یہ کام اتنا چھوٹا اور سہل نہیں۔ لوگوں کے پاس شکایتیں تو اتنی ہیں کہ انہیں سننے اور درج کرنے کیلئے باقاعدہ ایک عملہ درکار ہے۔

میری بات سن کر تمر نیاریا سیکریٹری دفترِ شکایات نے جواب دیا کہ ہم ان شکایتوں کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے جو عام ہوں مثلاً گھپلہ، کرپشن یا میاں بیوی کے روزمرہ کے معاملات بقول فیض ۔ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں۔۔۔!

مجھے سکریٹری کی بات سے اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ جب میں وقتِ مقررہ پر جلسہ گاہ پہنچا تو وہاں ڈیکوریٹرس کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔ دو ایک بعد میں آئے تو مجھے بھی ڈیکوریٹر سمجھ کر جلسہ گاہ کی آرائش کی ہدایت دینے لگے۔ میں تو آپے سے باہر ہو گیا۔ صدرِ محفل کی یہ توہین؟ میں الٹے پاؤں واپس ہونے والا تھا کہ مسٹر نیاریا، سکریٹری دفترِ شکایات پر نظر پڑی۔

میں نے ان سے اس کی پرزور شکایت کہ آپ کی تاکید کے مطابق میں وقتِ مقررہ پر جلسہ گاہ پہنچ گیا تھا لیکن آپ ہی کا پتہ نہیں۔۔۔ میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا۔

سکریٹری نے ہنستے ہوئے دفتر کے ایک رکن کو رجسٹر لانے کی ہدایت کی اور حکم دیا کہ صدر محترم کی یہ شکایت درج کرلی جائے۔۔۔ یہ سن کر میں نارمل ہو گیا۔

لوگوں کی جلسے سے دلچسپی اور اشتیاق دیکھ کر جلسے کا انتظام کھلے میدان میں کیا گیا تھا۔ تاہم جلسے میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ کم از کم مشاعرے میں یہ بات نہیں ہوتی۔ صدر محترم کے علاوہ چند شعراء اور دو ایک ڈیکوریٹرس ہی ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے اس محفل کا صدر ہونے پر فخر تھا۔ بہر کیف! ہر کوئی اپنی اپنی شکایتیں درج کرانے کے لئے بے چین تھا۔۔۔ دو ایک نے اپنی اپنی بیویوں کی یہ شکایتیں کیں کہ ان کی فرمائشیں دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ ہم نے سنا تھا کہ عورت محبت کی علامت ہوتی ہے لیکن ہماری بیویوں کے خمیر میں محبت نام کی کوئی چیز نہیں۔ جب دیکھو کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ ساتھ ہی وقت بے وقت میکے چلے جانے کی دھمکی بھی دیتی رہتی ہیں۔۔۔ کمیٹی کے ضابطے کی رو سے یہ شکایتیں درج نہیں کی گئیں کہ یہ عام بات ہے اور اس میں کوئی جدت بھی نہیں لیکن میں نے انہیں بلا کر یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھا کہ اچھا رائٹر اور اچھا شوہر ہونے کے لئے خوشامدی اور چاپلوس ہونا اوّل شرط ہے۔ چنانچہ آپ یہ گر سیکھ لیں۔ گھر میں خوشحالی رہے گی اور آئندہ یہ نوبت نہیں آئے گی۔

اس کے بعد ایک عورت اپنے شوہر کو لے کر ہمارے پاس آئی اور روتے ہوئے اپنا دکھڑا سنایا کہ موقع بے موقع یہ گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ جبکہ میں دوسری عورتوں کی طرح بیجا فرمائشیں بھی نہیں کرتی۔۔۔ اس شکایت کو درج کرلیا گیا لیکن میں نے اس کمبخت شوہر کو سخت ڈانٹ پلائی کہ یار مرد ہو کر یہ عورت والی فطرت کہاں سے پائی۔ شرم آنی چاہئے تمہاری اس حرکت سے ہم مردوں کی بدنامی ہوتی ہے چونکہ میں صدر محفل تھا۔ لہٰذا رعب جمانا ضروری تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ یہ حرکت متعدد بار مجھ سے بھی سرزد ہو چکی ہے۔ لیکن میں نے اراکینِ دفترِ شکایات کو اس کی بھنک تک نہ ہونے دی۔

اسی درمیان ایک شاعر صاحب نمودار ہوئے جنہیں دیکھکر میں بھڑک گیا۔ صورتحال بھانپ کر شاعر موصوف نے کہا گھبرایئے نہیں۔ میں شعر سنانے نہیں دفترِ شکایات میں اپنی یہ شکایت درج کرانے آیا ہوں کہ محلے علاقے کے مشاعرے میں دوسرے شعراء کو تو خوب خوب داد ملتی ہے لیکن جب میری باری آتی ہے تو محفل خالی ہو جاتی ہے اور جو سامع محفل میں کسی سبب رہ جاتے ہیں وہ بھی مجھے داد سے نہیں نوازتے۔

میں نے کہا یہ تو سراسر زیادتی ہے۔۔۔ دفعتاً ایک سامع بھیڑ کو چیر کر ہمارے سامنے آیا اور شاعر موصوف کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگا کہ یہ شعر سنائیں گے تب تو داد ملے گی۔

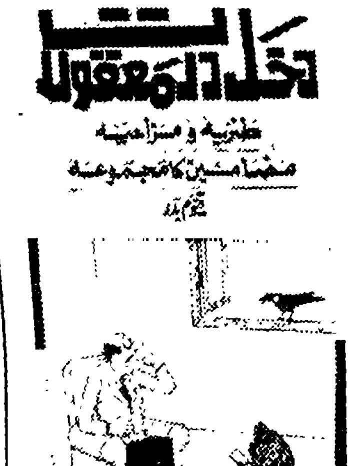
میں نے کہا کہ بھئی جب یہ شاعر ہیں تو یہ شعر ہی سنائیں گے۔ شعر و ادب کے لئے دلچسپی اور ذوق چاہئے۔ شعر آپ کے پلے نہیں پڑتا تو اس میں بیچارے شاعر کا کیا قصور؟ میں نے شاعر موصوف سے پوچھا آپ کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ کیا لکھتے ہیں؟ شاعر موصوف نے نہایت متانت سے جواب دیا۔۔۔ میں نثری نظم کا شاعر ہوں۔ یہ سن کر میں اپنی کرسی سے گرتے گرتے بچا اور چلا کر کہا خاموش!

یہ شاعری قطعی نہیں۔۔۔ سراسر ادبی کرپشن ہے۔۔۔ نثر نثر ہے اور نظم نظم۔۔۔ تو پھر یہ نثری نظم کیا چیز ہے۔ آپ کو پتہ ہے دو ناؤ پر چڑھنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟ پہلے آپ فیصلہ کیجئے کہ آپ کو نثر لکھنا ہے یا نظم پھر داد طلب کیجئے گا اتنا کہکر ان کی شکایت رجسٹر سے خارج کر دی گئی۔ نیز انہیں جلسہ گاہ سے نکل جانے کا حکم صادر کر دیا گیا۔

رات یونہی شکایت سنتے سنتے ختم ہو گئی۔ لوگوں کی تعداد کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جارہی تھی جبکہ دوسری محفلوں میں لوگ ادب جاتے ہیں اور ہوٹنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہاں حالت یہ تھی کہ ہر مرد اپنی اپنی شکایت درج کرانے کا متمنی تھا۔ مجمع کسی صورت قابو میں نہیں آرہا تھا اور حاضرین کسی صورت محفل کی برخاستگی کے حق میں نہیں تھے۔ اب ہمیں سچ پوچھئے تو اپنے سر کی فکر لاحق ہونے لگی۔ آخر میں اراکینِ دفترِ شکایات نے اپنی محافظت میں ہمیں ہمارے گھر تک پہنچایا اور ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ؎

جان بچی تو لاکھوں پائے
خیر سے بدھو گھر کو آئے

قیوم بدر کا طنزیہ و مزاحیہ
مضامین کا مجموعہ



دخل در معقولات

سمندر بے کراں ہے

سمندر کو
کئی ندیوں میں
جب ہم بانٹ دیں گے
تو یہ ندیاں بھی
سفر میں روز و شب کے
دیکھتے ہی دیکھتے
چھوٹی بڑی کتنی ہی نہروں میں بٹیں گی
اور سونے، بے مروت آسماں کا منہ تکیں گی
پھر کسی دن یوں بھی ہوگا :
سر برہنہ پیاس
جب نکلے گی پانی ڈھونڈنے
تو ہر طرف
اس کو چمکتی ریت کے ذرّے ملیں گے!

خلیج

''میں'' سے ''ہم'' تک کی دوری کو
ہم تم کیسے پاٹ سکیں گے؟
کتنے ''میں'' جب مل جاتے ہیں
تب ''ہم'' کی منزل آتی ہے
ورنہ ہر ''میں''
ایک اکیلے پیڑ کی صورت
اپنے آپ میں گم رہتا ہے
جھنڈ میں پیڑوں کے رہ کر بھی
دور کھڑا رہتا ہے سب سے
ہم تم کیسے پاٹ سکیں گے
''میں'' سے ''ہم'' تک کی دوری کو
ہم تم بھی تو ایک نہیں ہیں!

نئے کوہِ قاف کی کھوج میں

مہ و سال کتنے گزر گئے
کئی راستے، کئی پیچ و خم
کف پا سے لے کے خراج خوں
ہوئے خوش تو اور سنور گئے
مگر، آنکھ اُن سے نہ خوش ہوئی
نہ ٹھہر سکی، نہ چھلک سکی
مہ و سال دوشِ ہوا پہ تھے
وہ ستم ستم کئی راستے، وہ الم الم کئی پیچ و خم
لیے اپنے ساتھ گزر گئے
ہمیں دے گئے
نئی ساعتوں کے دیار میں
نئی رہ گزر، نئے پیچ و خم
نئے منظروں کی نمائشوں میں گھرے ہوئے نئے بام و در
نئی کلفتیں، نئی حسرتیں اسی ہاؤ ہو، کے مقام پر
اسی ہاؤ ہو، کے مقام پر
نئے حوصلوں کا ہے امتحاں
نئی منزلوں کے جو خواب ہیں
نئے کوہ قاف کی کھوج میں کہیں گم نہ ہوں، کبھی گم نہ ہوں
ابھی مرحلے کئی اور ہیں
ابھی مسئلے کئی اور ہیں

رباعیات

ہر زخم نہیں ہوتا دکھانے کے لئے
کچھ چیزیں تو ہوتی ہیں چھپانے کے لئے
دن ڈھلتے ہی جا چھپتا ہوں اک گوشے میں
ہر شام اب آتی ہے رلانے کے لئے

شکوے کا کوئی حرف نہ آنے پائے
یہ شعلہ لبوں کو نہ جلانے پائے
جو رنج بھی ہو، جھیل لے ہنس کر اے دوست
دنیا نہ ہنسی تیری اڑانے پائے

آنسو تو نکلتے ہیں، دکھاتا کب ہوں
با دیدۂ تر سامنے آتا کب ہوں
ہر دکھ ہی سہے جاتا ہوں چپکے چپکے
دکھڑا میں کسی کو بھی سناتا کب ہوں

کرنے ہیں بہت کام ابھی، کرنے دے مجھے
اک عمر کے جو قرض ہیں بھرنے دے مجھے
اے رکتی ہوئی سانس! مرے ہاتھ نہ روک
مرنا ہے تو کچھ کر کے ہی مرنے دے مجھے

لفظوں میں جہاں زہر بھرا جاتا ہے
اک قہر وہیں چپکے سے آ جاتا ہے
اس نکتے سے واقف نہیں شاید کچھ لوگ
ہونا جو نہیں تھا، وہ ہوا جاتا ہے

رکھتا ہے اگر ایک خدا اپنے لئے
دُنیا کو ضرورت نہ بنا اپنے لئے
کیوں روح کو لگ جائیں ترے جسم کے داغ
بہتر ہے کہ باطن کو بچا اپنے لئے

گو وقت کا مارا ہوا انسان ہوں میں
لیکن یہ غلط ہے کہ پریشان ہوں میں
آیا ہے مدد کہہ کے وہ رشوت دینے
ظالم یہ سمجھتا ہے کہ نادان ہوں میں

دل میں کئی طوفان لئے بیٹھا ہوں
کچھ سوچ کے ہی ضبط کئے بیٹھا ہوں
کھل جائے اگر منہ تو قیامت ہو جائے
برسوں سے یہاں ہونٹ سئے بیٹھا ہوں

کچھ حرص و ہوا جھانک رہی ہو جیسے
یا موج بلا جھانک رہی ہو جیسے
اسطرح چمک اُٹھتی ہیں آنکھیں اسکی
رہ رہ کے ریا جھانک رہی ہو جیسے

ماہیے

ہم شہر کے باشندے
گاؤں کی خوشبو کے
اب تک ہیں نمائندے

ڈالی سے اُڑی چڑیا
لوٹ کے جب آئی
تھی بدلی ہوئی چڑیا

کیوں کچّا گھڑا رکھا
ڈوب گئی بیٹی
پھل باپ نے کیا چکھا

گرمی سے رضائی کی
کچھ بھی نہ پگھلے گی
ہے برف جدائی کی

آوارہ گھٹائیں ہیں
پیاس کے ہونٹوں پر
پانی کی دعائیں ہیں

کیا بول گیا ربا
دن کے نکلتے ہی
چھجے پہ برے کاگا

جو ہار تھا پھولوں کا
کام کیا اُس نے
کل رات ہولوں کا

گیت

کب تک نیر بہائے کوئی

کب تک نیر بہائے کوئی کب تک نیر بہائے
درد تو ہوتا ہی رہتا ہے
چوٹ تو لگتی ہی رہتی ہے
جیون میں چوٹوں سے کوئی کیسے جان بچائے
کب تک نیر بہائے کوئی کب تک نیر بہائے
سپنے ٹوٹا ہی کرتے ہیں،
دیپک بجھتے ہی رہتے ہیں
آشاؤں کے بجھتے دیپک کیسے کوئی جلائے
کب تک نیر بہائے کوئی کب تک نیر بہائے
نیر بہانے سے کیا ہوگا
من کی آگ کہاں بجھتی ہے
آنکھوں کا پانی تو من میں اور بھی آگ لگائے
کب تک نیر بہائے کوئی کب تک نیر بہائے

گیت

رو رو کر اک عمر گنوائی، آج مجھے کچھ گانے دو
اپنے بے کل، پاگل من کو گیتوں سے بہلانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

جیون کے دکھ سکھ کی کہانی کہتے کہتے جگ بیتے
آنکھوں کے جھرنوں سے پانی بہتے بہتے جگ بیتے
بہتے پانی کی دھارا کو آج ذرا رک جانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

نیلے ساگر میں اک کشتی ہولے ہولے بہتی ہے
اُس کشتی میں چاند کی رانی تاروں سے کچھ کہتی ہے
جو کچھ کہتی ہے وہ رانی، کھل کے اسے کہہ جانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

اپنے بھولے بسرے سپنے آج مجھے یاد آتے ہیں
میرے کومل ہردے کو پھر تڑپاتے، برماتے ہیں
اُن بھولے بسرے سپنوں کو اور مجھے تڑپانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو

اُن ہونٹوں کی نیلاہٹ سے ماند ہوا جاتا ہے گگن
اُن ہونٹوں کا مدھ پی پی کر جھوم رہی ہے آج پون
آج تو اس متوالی پون کو امرت رس چھلکانے دو
آج مجھے کچھ گانے دو



قیصر شمیم

نام : عبدالقیوم خان

قلمی نام : قیصر شمیم

ولادت ۲/ اپریل ۱۹۳۶ء

جائے ولادت : انکس، ضلع ہگلی، مغربی بنگال

تعلیم : ایم۔اے

شغل : تعلیم و تعلم (استاذ، شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی)

مستقل پتہ ۱۰۔ ہیم گھوش لین، شیب پور، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۲

فون (۰۳۳) ۶۵۰۔۰۷۳۲

موجودہ پتہ : ۷۷۔ فیئر س لین، (فرسٹ فلور) کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

فون (۰۳۳) ۲۳۷۔۲۴۵۵

شعری مجموعے : (۱) ساعتوں کا سمندر (بخط اردو و دیوناگری) ۱۹۷۱ء

(۲) ترِی دھارا (بخط دیوناگری) ۱۹۹۶ء

(۳) سانس کی دھار (بخط اردو) ۱۹۹۷ء

(۴) پہاڑ کاٹتے ہوئے (بخط اردو) ۱۹۹۸ء

نثری کتابیں دھند اور کرن (شمس صابری مرحوم کے افسانے (تدوین و ترتیب) ۱۹۷۴ء اور متعدد درسی کتابیں

منتظر اشاعت (۱) لفظ بولتے ہیں (تنقیدی و تحقیقی مضامین)

(۲) منوج مترا کے ڈرامے (بنگلہ ڈراموں کے ترجمے)

(۳) راجہ رام موہن رائے (سوانح حیات) بنگلہ سے ترجمہ

اعزاز مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ، ۱۹۹۶ء

بنگلہ رسالہ "اکھنو اگرنی" کا سیمہ لتا رائے چودھری میڈل، ۱۹۹۶ء

"سانس کی دھار پر" اور "پہاڑ کاٹتے ہوئے" مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے ایوارڈ

غزلیں

ایک میں تھا در پہ تیرے اور تو کوئی نہ تھا
کون آتا منہ اندھیرے اور تو کوئی نہ تھا

رات کی سونی گلی میں گونج اٹھی تھی کس کی چیخ
میں تھا یا تھے میرے پھیرے اور تو کوئی نہ تھا

بستیوں سے دور بھی پھیلا رہا تھا زہر کون
تھے پرندوں کے بسیرے اور تو کوئی نہ تھا

کون تھا، جس کو لگا کر میں گلے رونے لگا
سامنے تھے کچھ لٹیرے اور تو کوئی نہ تھا

دشمنوں کا غول آنکلا کہاں سے راہ میں
چند سائے تھے گھنیرے اور تو کوئی نہ تھا

پشت پر تھا وار کس کا، یہ بتاؤں کس طرح
دوست ہی پیچھے تھے میرے اور تو کوئی نہ تھا

اُس جگہ کس کے لئے رہتا تھا قیصرؔ، جس جگہ
سانپ تھے یا تھے سپیرے اور تو کوئی نہ تھا

وہ لطف جو کبھی جسموں کے اتصال میں تھا
ملا جو اُس سے میں اب کے، تو بس خیال میں تھا

ملن کی راتوں نے دیکھا نہ تھا کبھی پہلے
عجب کھنچاؤ سا کل اُس کے خط و خال میں تھا

لئے ہوئے تھی برے سر کو گود میں دیوار
برا جنون تصادم عجیب حال میں تھا

گرفت سخت نہ تھی مجھ پہ اس کی زلفوں کی
میں پر شکستہ سا اپنے ہی دل کے جال میں تھا

غروب ہونے لگا میں تو روشنی پھیلی
عروج پر مرا سورج مرے زوال میں تھا

ہر اک حصار سے باہر تھا شب کو میں، لیکن
کھلی جو آنکھ تو پھر حدِّ اعتدال میں تھا

ہوئی ہے کیسی یہ بارش کہ اب نمایاں ہوں
چھپا ہوا میں بہت گردِ ماہ و سال میں تھا

بری زباں پہ نہ آیا ضرورتاً بھی کبھی
وہ لفظ جو برے یاروں کی بول چال میں تھا

ہمارے جسموں کو موجیں نگل گئیں قیصرؔ
کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

دل کش و دل نواز منظر لا
خشک ماحول ہے، گلِ تر لا
غسل دے پھر ہماری دنیا کو
نوح کے عہد کا سمندر لا
ہر نفس ایک حشر ہے واعظ
لا ذرا دیکھیں تیرا محشر لا
حوصلہ دیکھنا ہے، بڑھ کر دیکھ
میری گردن پہ اپنا خنجر لا
آئینہ لے کے میں تو نکلا ہوں
ہاتھ میں اپنے تو بھی پتھر لا
باغ تیرا ہے، برق تیری ہے
راکھ کے ڈھیر سے مرا گھر لا
چیخ تجھ تک ابھی نہیں جاتی
آسماں کو ذرا زمیں پر لا
آ، امامت سنبھال پھر اپنی
اپنے ہمراہ پھر بہتّر لا
کتنی سونی ہے بزم اے قیصر
کوئی غواص☆، کوئی جوہر لا☆☆

☆غواص قریشی مرحوم ☆☆جوہر غازی پوری مرحوم

اک رہ گزر شعلۂ جوّالہ ملی ہے
جو زیست ملی ہے مجھے قتالہ ملی ہے
پہنچا ہے کہاں ہاتھ مرا دامنِ گل تک
کب راہِ طلب میں کوئی حمالہ ملی ہے
بے غسل نہیں اُٹھتی کوئی میتِ حسرت
قسمت سے مجھے چشم ہی غسّالہ ملی ہے
دے آیا ہوں کچھ گرمیِ اخلاص کے لمحے
جب اُس کی نظر ہم صفتِ ژالہ ملی ہے
گلگونۂ عارض کا ترے عکس ہے دل پر
یا سرخیِ داغِ جگرِ لالہ ملی ہے
میں نغمہ گرِ غم ہوں، مرے سازِ الم کو
تاثیرِ نوائے دلِ بنگالہ ملی ہے
ملتی ہے کہاں شور سرِ راہِ طلب سے
قیصر کو جو توقیرِ شبِ نالہ ملی ہے

۴ نظمیں

۳۲واں پہاڑ کٹنے کے بعد

ہاتھوں پہ میرے برف کی بارش ہوئی مگر
یہ ہاتھ ہی رُکے نہ مرا تیشہ ہی رُکا
بتیسویں پہاڑ کی چوٹی بھی کٹ چکی
لیکن وہ آرزو، وہ طرح دار آرزو
جس کو کھلی فضا کا تبسم پسند ہے
آزاد پنچھیوں کا ترنم پسند ہے
جس نے مری حیات کا نقشہ بدل دیا
جس سے مری رگوں میں لہو آگ بن گیا
جس نے دی میرے ہاتھوں کو تیشے کی زندگی
پتھر جو کاٹ ڈالے وہ شیشے کی زندگی
اُس آرزو کے پاؤں میں تھیں سخت بیڑیاں
جب بیڑیوں سے چھوٹی تو جنگل ملے اُسے
اُن جنگلوں کے ساتھ ہی کالے پہاڑ تھے
جنگل، پہاڑ، بھیڑیے، سب دیکھتی رہی
بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے قبل تک
وہ آرزو مگر نہ ہراساں ہوئی کبھی
لیکن وہ آرزو، وہ طرح دار آرزو
بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے بعد ہی
گھبرا کے پوچھتی ہے کہ کیا آگے جاؤ گے؟
کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے؟
کب تک یہ پہاڑوں سے پنجے لڑاؤ گے؟
فرہاد کا یہ قرض کہاں تک نبھاؤ گے؟
جس نہر کی تلاش ہے، وہ نہر پاؤ گے؟
ان ناگہاں سوالوں پہ پل بھر رُکا ہوں میں
پھر مسکرا کے تیشہ لیے چل پڑا ہوں میں

نہ جان اس پر نثار کرنا
نہ ساتھ اس کے مزے اڑانا
اگر ضرورت مرے بدن کی
تمہیں ستائے
تو یاد رکھنا
کسی طوائف کے پاس جاکر
تم اپنے ارمان پورے کرنا
مجھے تمہارا یہ کارنامہ
کبھی نہ ہرگز بُرا لگے گا
نہ میرے دل کو ذرا کھلے گا
مگر ہمیشہ یہ یاد رکھنا
تمہاری لیلیٰ نہ گھر میں آئے!

خواب اور تعبیر

برسوں بعد اسے جو دیکھا
صرف یہی اک فرق تھا اس میں
اس کے ساتھ تھے اس کے بچے
پھولوں جیسے اُن بچوں میں
دو بچے تھے اُس کے جیسے
لیکن سب سے چھوٹا بچہ
شکل و شباہت میں سو فی صد
میرے جیسا لگتا تھا
جس کی رگوں میں گرچہ نہیں تھا
میرے خون کا کوئی قطرہ
پھر بھی میں اُس کی صورت میں
اپنا بچپن دیکھ رہا تھا
دیکھ کے جس کو میں حیراں تھا
لیکن میری حیرانی سے
پاس کھڑی وہ کھِل اٹھی تھی
جیسے اُس کے خوابِ حسیں کی
آج اسے تعبیر ملی ہو !

غزلیں

کہاں تک چہرۂ قاتل کو ہم اُترا ہوا دیکھیں
چلو مقتل میں اب اپنا ہی سر کٹتا ہوا دیکھیں

اُنھی لوگوں نے ہم کو دار پر ہنستے ہوئے دیکھا
یہ سوچا تھا جنھوں نے خوف سے سہما ہوا دیکھیں

یہی جذبہ لئے ہم آج شہرِ گُل میں آئے ہیں
کہ اب اپنا بھی دامن خار سے الجھا ہوا دیکھیں

ملا ہے زخم تو دل کو، مگر یارو، مزہ جب ہے
کہ اسکو عارضِ گُل کی طرح دہکا ہوا دیکھیں

ہماری آنکھ میں جو موجزن ہر وقت رہتا تھا
یہ کب چاہا کہ اُس دریا کو ہم ٹھہرا ہوا دیکھیں

فراغؔ، اب یہ دعائیں دے رہے ہیں قدر داں تیرے
کہ اک دن شہرِ فن میں قد ترا اُبھرا ہوا دیکھیں

چھو لیں گے ہم جب سوچیں گے
پھول ہیں یا وہ لب سوچیں گے

پھولوں جیسے لوگ ہیں کیسے
دل ٹوٹے گا تب سوچیں گے

کیوں مجھ کو تم دیکھ رہے تھے
دل ہی دل میں سب سوچیں گے

رنگ بدلتے شہر میں ہم بھی
جینے کے کچھ ڈھب سوچیں گے

فنکاروں کی اس بستی میں
ہم بھی کوئی کرتب سوچیں گے

شاد فراغؔ اس دور میں کیوں ہے
پل دو پل تو سب سوچیں گے

بس میں کہاں تک دل ہے سائیں
یہ کہنا مشکل ہے سائیں

عمر مری گزرے گی سفر میں
تلوے میں اک تل ہے سائیں

بے شک میری پروازوں میں
ماں کی دعا شامل ہے سائیں

شہرِ انا کا اک اک شہری
خود اپنا قاتل ہے سائیں

وقت بہت نازک ہے، لیکن
ہر بندہ غافل ہے سائیں

کام فراغؔ آیا تو جانا
وہ بھی دریا دل ہے سائیں

رُباعیات

یہ شہر یہ بازار یہ میلا کیوں ہے
انسانوں کا ہر سمت یہ ریلا کیوں ہے
تفریح کے سامان بہت ہیں، لیکن
اس بھیڑ میں ہر شخص اکیلا کیوں ہے

ہر موسمِ رنگیں کو گزرتے دیکھا
ہر خواب کا شیرازہ بکھرتے دیکھا
پھر بھی دلِ ناداں کو خدایا ہم نے
کوئی نہ کوئی آرزو کرتے دیکھا

بے وقت کی برسات بُری لگتی ہے
بے کار کی ہر بات بُری لگتی ہے
جو فیض نہ پہنچائے کسی کو یارو
وہ جیسی بھی ہو ذات بُری لگتی ہے

اچھا ئی کہاں کوئی ہے بھائی مجھ میں
ہے صرف بُرائی ہی بُرائی مجھ میں
کھوٹے کو کہا کرتا ہوں کھوٹا منہ پر
بچپن سے بھری ہے یہ صفائی مجھ میں

دیوارِ تکلف کو گرا کر خوش ہوں
میں حلقۂ احباب بڑھا کر خوش ہوں
تم سود و زیاں سوچ رہے ہو، لیکن
میں دولتِ اخلاص لٹا کر خوش ہوں

ہائیکو

کل جو عالم تھا
پیاس بجھانے کی خاطر
دریا بھی کم تھا

کیوں یہ بھولیں ہم
برسوں سے اک دوجے کے
مشترکہ ہیں غم

دل بھی دریا ہے
آپ اُتر کر تو دیکھیں
کتنا گہرا ہے

دل میں اٹھا درد
میں نے جس لمحہ دیکھا
تیرا چہرہ زرد

بندوں کا فقدان
دیکھ کے خود شرمندہ ہے
مسجد عالی شان

اب کے جا کر گاؤں
ڈھونڈتے ہی رہ جاؤ گے
پنگھٹ، پیپل چھاؤں

اتنا رکھیے یاد
ہم فنکاروں کے دم سے
زندہ ہیں نقاد

ماہیے

اب اُنگلی ہے اُٹھنے کو
نام کوئی دے دو
بے نام سے رشتے کو

سب نے تو مذمت کی
کون دعا دیتا
تکمیلِ محبت کی

انجان سے لگتے ہیں
اپنے ہی گھر میں ہم
مہمان سے لگتے ہیں

دفتر نہ بنا گھر کو
پھینک بھی کھاتے
چاہت سے سجا گھر کو

یہ کیسی صدی دیکھی
خون کے رشتوں میں
بے گانہ روی دیکھی

منظر کو بدلنے دو
آگ میں گھر میرا
جلتا ہے تو جلنے دو

کہہ مکرنیاں

لینے والا بھی مسکائے
دینے والا بھی مسکائے
جھوم اُٹھیں دونوں کے تن من
کا سکھی، رشوت ؟
نا سکھی، جمن !

سونی بگیہ کو مہکائے
نر ناری کا من بہلائے
توڑے گھر آنگن کا سکوت
کا سکھی، نوکر ؟
نا سکھی، پوت !

پل میں تولہ پل میں ماشہ
پلک جھپکتے پلٹے پانسہ
دیکھ اُسے یاد آئے گرگٹ
کا سکھی ساجن ؟
نا سکھی، کرکٹ !

جس کا معتور ہے گردیدہ
شاعر جس کا پڑھے قصیدہ
نہیں ہے جس کے تن پر کھال
کا سکھی، چاند ؟
نا سکھی، بال !

بدل بدل کر روپ وہ آئے
تین ہی نام جہاں میں پائے
اک جیسا وہ رہے نہ ہردم
کا سکھی، جوکر ؟
نا سکھی، موسم !

ساگر ساگر وہ اترائے
لہروں پر بھی رعب جمائے
مچھواروں کے گھر کی بچی
کا سکھی، مچھلی ؟
نا سکھی، کشتی !

ایک نظم

سامنے میرے ایک سمندر
پیچھے جنگل
دائیں بائیں خونی لشکر
ذہن میں وحشت کا سناٹا
سوچ رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں
ننھے ننھے
موئے بدن سب خوف کے مارے جاگ اُٹھے ہیں
سوکھ رہا ہے لہو بدن کا
روشن دو آنکھوں کے اندر
بجھنے لگی ہیں
دو قندیلیں دھیرے دھیرے
ساحل میرے پاؤں کے نیچے کھول رہا ہے
اپنا بستر
کیسے میں اس پار کو جاؤں
دل کہتا ہے
موج بلا کا کھٹکا کیسا؟
میں کہتا ہوں، تنہا ٹھرا میرا پیکر
ایسے پر ہیبت لمحے میں
کوئی نہیں ہے، جو ساتھی یا ہو رہبر
مشکل میرا پار ہے جانا
اتنے میں ظلمات کے بادل سے نکلا، ایمان کا سورج
جسکی کرنوں پر لکھا تھا
لاکھ ہوں تیری راہ میں حائل
ایسے ایسے سات سندر
تاریکی میں ڈوبے جنگل
لا متناہی خونی لشکر
بحرِ کرم کے سیل رواں میں
سارے منظر بہہ جائیں گے
لاکھ ہو مشکل مت گھبرانا
جب تک تجھ میں سانس ہے باقی
حق کی رحمت سے نادان
ناامید نہ ہونا ہرگز
ناامیدی موت سے بدتر ہوتی ہے!

نیند کی گولی

بوڑھے
شہر کے چوراہے پر حیرانی سے تکتے تھے
مریل سی آواز میں اپنی
ہر راہی سے کہتے تھے۔اے دھنوانو۔اے انسانو
ہم کو نیند نہیں آتی ہے؟
کوئی بڑھ کر اک پیسے میں یہ بیساکھی
لے۔لو بابا، روٹی دو
لیکن پھر بھی کوئی نہیں تھا جسکے دل میں رحم کی کوئی موج اُٹھے
بچے کچی نیند سے اُٹھ کر
میچ کے آنکھیں
اپنی ماں سے
سوکھی زباں سے یہ کہتے تھے
امی نیند نہیں آتی ہے؟
بھوک لگی ہے، کھانا دو
پھر بھی ماؤں کے لب شل تھے
ٹوٹے تھے الفاظ ہی سارے
کیسے دیتے ان کو تسلی
جھوٹے وعدے آخر کب تک
ننھے بچوں کو بہلاتے
ایسے میں بھاری بوٹوں سے لوگ وہاں پر
رحمت بن کر دوڑے آئے
دودھ کی تھالی خون سے بھر کر
بچوں کو دی جان بچائی
قہر کا پانی ظلم کی روٹی
پیاسے بھوکے بوڑھوں کو دی
پی کر دودھ، چبا کر روٹی
بچے بوڑھے دیش کے بولے
ہم ناداروں، مجبوروں پر، بھاری بوٹوں اونچی پگڑی والوں نے
احسان کیا ہے
ایسی بھیک تو بھگوانوں کے بس میں نہیں تھی
ایسی بات تو حیوانوں کے جس میں نہیں تھی!

نام : محمد علی صدیقی
قلمی نام : فراغ روہوی
والدین : زینب خاتون و انعام الحق صدیقی مرحوم
ولادت : ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۶ء، موضع: روہ، ضلع: نوادہ، بہار
پتہ : ۶۷۔ مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳
فون : ۵۳۸۱-۲۳۵ (۰۳۳)
تعلیم : ہائر سکنڈری
پیشہ : ملازمت
آغاز شاعری : ۱۹۸۴ء
شرف تلمذ : حضرت قیصر شمیم (ابتداء میں قمر کنڈوی مرحوم اور جناب بازغ بہاری سے اصلاح لی تھی)
اصناف سخن : حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی، دوہا، ماہیا، ہائیکو، کہہ مکرنیاں اور گیت
پہلی تصنیف : چھیاں چھیاں (ماہیوں کا مجموعہ) ۱۹۹۹ء
منتظر اشاعت : (۱) غزلوں کا مجموعہ "ذرا انتظار کر" (۲) چراغاں (تلامذہ قیصر شمیم کا تذکرہ وانتخاب کلام) (۳) نظموں، رباعیوں اور دوہوں کا مجموعہ
نغمات : (۱) غزل سنگرز جگجیت سنگھ / چترا سنگھ نے میری ایک غزل "HOPE" نامی البم میں شامل کی ہے۔ (۲) رفیق ساگر کے "صدا" نامی کیسٹ میں میری دو غزلیں ہیں۔ (۳) ٹیلی فلم "تنہائی" کے لئے چھ گیت لکھے جن میں سے تین سنگر محمد عزیز نے گائے۔ (۴) ٹیلی فلم "سمجھوتہ" میں دو نغمے لکھے جو محمد عزیز اور روحی خانم نے گائے ہیں۔



فراغ روہوی

دوہے

کس کا پیچھا ہم کریں، دوڑیں کس کی اُور
چوری کرکے آپ ہی چور مچائے شور

کیوں آئے ہم چھوڑ کے اپنا پیارا گاؤں
شہر میں روٹی ڈھونڈتے تھک جاتے ہیں پاؤں

خوشبو پھیلے پھول سے، بچے بانٹیں پیار
ملتے جلتے ہیں بہت دونوں کے کردار

بھول گئے ہر واقعہ، بس اتنا ہے یاد
مال و زر پر تھی کھڑی رشتوں کی بنیاد

دیکھ کے ریکھا ہاتھ کی بولا ایک فقیر
بالک، تیرے بھاگ میں لکھی ہے جاگیر

کیا ایسے ماحول میں چھیڑوں جیون راگ
میرے چاروں اُور ہیں کالے کالے ناگ

نظمیں

ذرا ٹھہرو

ذرا ٹھہرو،
مجھے ڈھلتے ہوئے سورج کا منظر دیکھ لینے دو
جو ڈھل کر بھی
شفق کا رنگ
اُفق پر چھوڑ جاتا ہے

ذرا ٹھہرو،
مجھے روتے ہوئے بچوں کے آنسو پونچھ لینے دو
اُنھیں پھر سے ہنسانے کی
ذرا مہلت مجھے دے دو

ذرا ٹھہرو،
مجھے آکاش کے یہ چاند تارے توڑ لینے دو
مری ننھی سی گڑیوں نے
کبھی کچھ بھی نہیں چاہا
فقط ان چاند تاروں کو
تصور میں بسایا ہے
ذرا ٹھہرو،
مری بہکی ہوئی سانسو،
ذرا ٹھہرو!

پابندی

وہ مجھ سے بولی
میں اپنے میکے تو جا رہی ہوں
مگر یہ سن لو
کہ میرے پیچھے
تمہاری لیلیٰ نہ گھر میں آئے
کبھی نہ اُس کی گلی میں جانا

اس کا بھائی کس مجبور بدن میں جی رہا ہے۔

چیف جب پیار محل سے لوٹا تو دو محبت کرنے والوں کے مزاروں سے کچھ نور اپنے اندر سمیٹ لایا۔ اس نے غور کیا محبت کس طرح دو چاہنے والوں کو محفوظ و مامون کر دیتی ہے۔ جائز تعلق قبر تک نبھائے جاسکتے ہیں لیکن ہوس آدمی کو صرف غلط پناہیں تلاش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ دل کو کھنڈر اور ویرانہ بنا چھوڑتی ہے۔ ہوس پیار کا لازوال محل نہیں بنا سکتی جسے دنیا یاد رکھے اور احترام کی نظر سے دیکھے۔

سارا دن خود پر قابو پاتے گزر گیا۔ وہ وقت کو اور وقت اسے کاٹتا رہ گیا۔ اگلی صبح روانگی تھی۔ لیکن بہن کو ابھی چند روز رکنا تھا۔ اسلئے وہ نہیں گئی۔

طے شدہ پروگرام کے تحت گورے دیش کو پرواز کرنے سے قبل ہوائی اڈے پر راس چیف کو الوداع کہنے والوں میں طلبستھان کے راجہ سمجھدار سنگھ اور ان کے وزراء کے علاوہ فلاحی ادارے "ریکوگنیشن" کی بانی و منتظم مدر پیریرا بھی شامل تھیں۔ ان کے ادارے میں اسوقت چھ سو کمسن بچیاں پرورش پارہی تھیں۔ یہ بچیاں وہ تھیں جنھیں اپنے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا۔ یہ اپنی ماؤں کی خفیہ طور پر کوکھ سے نکال پھینکی ہوئی اولادیں تھیں جنہیں مدر پیریرا خدمت خلق کے نام پر دنیا بھر کی اقوام سے موصولہ امداد کی بدولت پال رہی تھیں۔

ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں مدر پیریرا دس کمسن بچیوں کے ساتھ گورے دیش کے پریمیئر کو الوداع کہنے حاضر ہوئی تھیں۔ ان بچیوں کی عمر پانچ چھ سال تھی۔ انھوں نے عیسائی دلہنوں جیسے سفید ریشمیں لیس کے گاؤن پہن رکھے تھے۔ سب کے سروں پر سفید جگمگاتے نقلی ہیروں اور موتیوں والے ہیئر بینڈ اور ہاتھوں میں رنگ برنگ گلدستے تھے۔

مدر نے پریمیئر کو بتایا کہ یہ دس لاوارث کمسن بچیاں دس الگ الگ ملکوں سے لاکر بین الاقوامی یک جہتی کی علامت کے طور پر مسیح کے پیغام انسانیت کی تکمیل میں ان کے ادارے "ریکوگنیشن" میں بسائی گئی ہیں۔ بچیوں کے اس خصوصی دستے کا نام Mary's Band رکھا گیا ہے۔

راس چیف نے مدر کے نیک مقاصد کی تعریف کی۔ ایک ایک کرکے ہر بچی نے پریمیئر کو گلدستہ پیش کیا۔ ایک بچی شرم یا جھجک کے مارے ریشمی ربن سے بندھے ہوئے تازہ گلدستے سے اپنا منہ چھپائے الگ تھلگ کھڑی رہی۔ چیف اس کی صورت نہیں دیکھ پارہا تھا۔ وہ خود آگے بڑھا۔ اس نے بچی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور گلدستہ خود اس سے لیا۔ لیکن جوں ہی بچی کے چہرے پر نظر پڑی چیف کے حواس پر ایک بجلی سی گری۔

ک ...ک ... کیا ایسا ممکن ہے؟

ایسا ہو سکتا ہے؟

یہ تو ہو بہو مولینا کی صورت ہے۔ اس کے بچپن کی تصویر کی نئی کاپی لگتی ہے۔

یہ کون ہے؟؟؟۔

"مدر مجھے بتایئے۔ یہ کون ہے۔ یہ طلبستھان کی بیٹی ہے؟؟" راس چیف نے مدر سے پوچھا "نہیں ------" مدر نے شانت لہجے میں کہا "ہز ایکسیلینسی ------ یہ اتفاق سے آپ کی ہم وطن ہے"۔

"یہاں کیسے پہنچی؟"

"اب سے پانچ سال پہلے میں آپ کے شہر گئی تھی، جب میں نے "میریز بینڈ" قائم کیا تھا۔ آپ کی نیک اور مشفق بہن محترمہ روزی ایک فرشتہ صفت خاتون ہیں۔ چند دنوں کی اس لاورث بچی کو کوئی قتل کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے اس کی جان بچائی اور یہ ننھی کلی ہماری جھولی میں ڈال دی —— ابتک یہ ایک راز تھا لیکن چونکہ محترمہ روزی آپ کی بہن ہیں اس لئے ان کی یہ نیکی آپ پر ظاہر کر رہی ہوں تو مجھے خوشی ہو رہی ہے"۔

چیف نے بے اختیار جھک کر بچی کو گلے سے چمٹا لیا۔ اور اس کی ننھی ننھی گلابی پوروں کو چوم لیا۔

"سوئیٹ لٹل گرل —— کیا نام ہے تمہارا"۔

"پتہ نہیں —— میرا کیا نام ہے —— کوئی مولی کہتا ہے، کوئی مولینا بلاتا ہے، کوئی پیار سے ہنی کہہ دیتا ہے"۔

"کیا تم جانتی ہو میں کون ہوں؟" چیف نے پیار سے کہا

"جانتی ہوں —— یس آئی نو۔ آل مین آر فادرس ٹومی —— یو ٹو آر مائی فادر۔ تم بھی میرے باپ ہو —— ناؤ گومی چاکلیٹس اینڈ کس می"۔

راس چیف مضطرب ہو گیا۔ اس نے بچی کے رخسار چوم لئے اور کہا "گاڈ بلیس یو مائی ڈارلنگ م م ... میں تمہیں ضرور اپنے دیش کی بہترین چاکلیٹیں بھیجونگا"۔

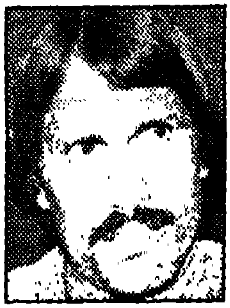
چیف نے مدر پیریرا سے بچی کی تاریخ پیدائش پوچھی۔ مدر نے کہا "ٹھیک تاریخ تو ان میں سے کسی بچی کی بھی نہیں معلوم۔ اب سے چار دن بعد گڈ فرائی ڈے کو ہم ان بچیوں کا جنم دن ایک ساتھ مناتے ہیں"۔

چیف نے گردن ہلائی، گڈ بائی کہا اور چھلکتی آنکھیں لئے رَن وے کی جانب بڑھ گیا۔

ہوائی جہاز جب فضا میں معلق سا ہو گیا تو برسوں بعد پریمیئر کو اپنے اندر کا تناؤ کم ہوتا ہوا معلوم ہوا۔

اس نے کھڑکی سے دودھیا اور سرمئی بادلوں پر نظر ڈالی اور محسوس کیا کہ وہ اُس دبیز قالین پر اکیلا لوٹ رہا ہے جسے وہ خرید کر ساتھ نہیں لایا تھا۔

تھوڑی دیر میں اُسے سکون کی نیند آگئی!!



فیروز مرزا

اصل نام : فیروز عالم
قلمی نام : فیروز مرزا
تعلیم : ایم۔اے (اردو) کلکتہ یونیورسٹی
جائے پیدائش : ۱۰۵نور محمد منشی لین، ٹکیہ پاڑہ، ہوڑہ
مستقل رہائش : ۲/۱۱، جولاپاڑہ مسجد لین، ٹکیہ پاڑہ، ہوڑہ
فون نمبر : ۶۴۳-۴۸۴۶ (۰۳۳)

چار غزلیں

﴿ ۱ ﴾

آج کل ایک قلم کار سے باتیں کرنا
خواب میں جیسے خریدار سے باتیں کرنا
رنگ بھردے گا عیادت میں مسیحائی کا
آپ کا اس طرح بیمار سے باتیں کرنا
کتنے مخلص مرے اجداد تھے، جو کہتے تھے
اپنے دشمن سے بھی تم پیار سے باتیں کرنا
عشِ فخر سمجھتے ہیں نئی نسل کے لوگ
کسی مشہور اداکار سے باتیں کرنا
مار ڈالے گا مجھے وقت سے پہلے مرزا
اُن کا ہنس ہنس کے یوں اغیار سے باتیں کرنا

﴿ ۲ ﴾

اگرچہ آپ نے شاہ و گدا کو دیکھا ہے
کبھی قریب سے میری انا کو دیکھا ہے
پرکھ چکا ہوں یہاں سب کی پارسائی کو
وفا کے بھیس میں اک بے وفا کو دیکھا ہے
جو پیٹ بھرتا ہے بندوں سے مانگ کر خیرات
اسی زمین پہ ایسے خدا کو دیکھا ہے
میں اس دیار کا مجنوں ہوں جس جگہ مرزا
ہزار بار پلٹتے قضا کو دیکھا ہے

﴿ ۳ ﴾

کریم تو ہے تو مجھ پر بھی یہ کرم کردے
خوشی بڑھادے مری اور حیات کم کردے
یہ سوچ کر میں جلاتا نہیں چراغوں کو
دھواں غموں کا نہ آنکھوں کو تیری نم کردے
انا رہے گی سلامت یہ لوگ کہتے ہیں
کلاہ اپنی ذرا سر پہ اپنے خم کردے
ترا خلوص ہی اک دن تجھے ڈبو دیگا
ہر اک سے ملنے کی یہ رسم وراہ کم کردے

﴿ ۴ ﴾

کیا بتاؤں کس طرح کا راستہ پانی کا ہے
چھوٹی چھوٹی بستیوں میں مسئلہ پانی کا ہے
خود بنالیتا ہے اپنا راستہ چٹان سے
کوہکن سے بھی زیادہ حوصلہ پانی کا ہے
وقت کے تیور بدلتے رہتے ہیں مرزا مگر
جانے کن خوش فہمیوں میں دیوتا پانی کا ہے

وجہ سے یہاں ٹریفک جام ہو جائے گا اور کوئی ٹریفک سپاہی مجھے دھر لے گا"۔
راس چیف کی خوش مذاقی نے بے تکلفی کا بڑا اچھا ماحول بنا دیا۔ جس میں سو کروڑ کی مالیت کی خرید و فروخت کا دو طرفہ معاہدہ کئے جانے کا اعلان ہو گیا۔

دوپہر کی دعوت میں بہترین مقامی ڈشیں حاضر کی گئیں۔ سوپ سدا بہار، مرغ بیگم زعفرانی نے تھوڑی دیر کے لئے چیف کے بدن میں چستی دوڑا دی۔ آرام کے تھوڑے سے وقفے میں اس نے سوچا۔ وہ کتنا باتونی ہو گیا ہے۔ ایک غم نے اسے کتنا خوش مذاق بنا دیا ہے۔ محفل سے دور ہوتے ہی کیسی کھنک جاگتی ہے۔ تنہائی کیسی چبھتی ہے۔ کاش ایکبار —— مولینا ڈارلنگ —— بس ایکبار تم ایسی تنہائی میں چپکے سے آ جاؤ۔

اس نے سوچا کیوں نہ وہ مولینا کو فون کرے۔ لیکن یاد آیا کس طرح اُس حرافہ نے اس کا چار لائنوں کا پریم پتر پریس کو دکھایا تھا۔ اور ٹیلی فون پر ہوئی پر لطف سرگوشیوں کا کیسٹ بھی عدالت میں بجوا دیا تھا۔ نہیں، وہ اسے فون نہیں کرے گا! بس اس کے تصور سے بات کرتا رہے گا۔ ایک انوکھی اذیت ہے جسے اسے جھیلنا ہے۔ جھیلتے رہنا ہے۔ زندگی میں ہر جنگ اس نے جیت لی لیکن محبت کی یہ جنگ وہ ہار گیا۔ لیکن اس پسپائی کے بعد بھی وہ اس تعلق کو محبت کیوں کہتا ہے۔ اس نے خود سے پوچھا۔ پھر اپنے آپ سے بولا چلو خود سے ہی تو کہتا ہوں۔ کسی اور سے تو نہیں کہتا۔ دنیا میں اور لفظوں کے معنی بدل گئے ہیں تو محبت کے بھی معنی تبدیل ہو گئے ہیں۔

اسے یاد آیا اسے بیوی کو فون کرنا ہے اور بیٹوں سے بھی بات کرنی ہے۔ بیچاری بیوی —— گو اس سے طبیعت کم ملتی ہے لیکن اگر اُس وقت اُس نے درگزر نہ کیا ہوتا اور جذباتی سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ شاید غیرت سے مر ہی جاتا۔

مولینا سے جھٹ کر راس چیف کا دنیا سے انوکھا ہی تعلق قائم ہو گیا تھا۔ اور تو اور بیوی سے بھی! پانچ سال ہو گئے۔ اب تو چھ ہی ہونے آئے۔ اپنے درد کا علاج ڈھونڈنے کے لئے دنیا کے زخموں کی مرہم پٹی کرتا پھر رہا تھا۔ آناً فاناً دور پاس کے کتنے دورے کر لئے۔ لیکن.....

.....تازہ ہے کہ کم نہیں ہوتا۔ ابھی پچھلے ہی مہینے میں اس نے چوتھی دنیا کے کچھ ممالک کا دورہ کیا تھا۔ جب وہ گجلستان کی راجدھانی پہنچا تو وہاں اُسے ایک آشرم میں پلنے والے اُن اندھوں سے ملایا گیا جو ملاوٹی کھانا کھا کر اپنی بینائی کھو بیٹھے تھے۔ معذور ہونے کے بعد وہ سوسائٹی کے سہارے کو ترس گئے تھے۔ چیف نے ان اندھوں سے خود آگے بڑھکر مصافحہ کیا تھا۔ اور دس لاکھ روپئے اس نے انھیں چندے میں دے کر اپنے طور پر محسوس کیا تھا کہ اس نے خدا سے اپنے کچھ گناہ معاف کروا لئے۔ لیکن نہیں۔۔۔ گناہ کی ترغیب دلانے والا ظالم مولینا کا وہ بدن! کچھ بات تھی کہ وہ اسے کبھی نہیں بھولتا۔ پانی میں بھیگے ہوئے ہیروں کی طرح اس کی دو آبدار آنکھیں۔ گلابی، رسیلے ہونٹ۔ گھنے سلجھے ہوئے بوکٹ بال۔ بھرے بھرے کولھے۔ متناسب اور فراخ سینہ۔ پہلی بار جب وہ اسکی پرسنل اسٹینو گرافر کے یونیفارم میں اس کے چیمبر میں آئی تھی اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ ایر ہوسٹس کے انداز کا سرمئی سوٹ۔ سرخ ٹائی۔ میچنگ کلائی بند۔ نوکیلے پنسل ہیل کے سینڈل۔ سکریٹریٹ میں اسکی آہستہ خرامی۔ ہونٹوں کا وہ ہلکی مسکراہٹ سے کشیدہ ہو جانا۔ اور اوپر کے دو دانتوں کا ذرا ذرا چمک جانا۔ شارٹ ہینڈ لکھتے ہوئے کبھی کبھی پنسل ہونٹوں میں دبانے کی دلنشیں ادا۔ شارٹ ہینڈ کی گرامر سے پوری طرح واقف تھی وہ!۔

اب اس کی یادیں اسے دور تک ڈس رہی تھیں۔ اس سفر میں وہ قدم قدم پر اسے کیوں یاد آ رہی تھی۔ کیا بات تھی۔ خدا جانے؟۔

رات کو راجدھانی میں چیف اور خواص کے لئے شاہی بازار کھلا رکھا گیا تھا۔ آدھی رات کے بعد تک شاپنگ کی گئی۔ چیف نے اپنے گھر والوں اور اقارب کی فرمائش کا سامان خریدا۔ اس نے ۱۲×۱۸ فیٹ کا ایک نرم، دبیز قالین بطور خاص خریدا جس کی فرمائش اس کی بیوی نے ان کے نئے گھر کی سجاوٹ کے لئے بہت پہلے سے کر رکھی تھی۔ قالین کا ڈیزائن ایرانی لیکن رنگ طلبسمانی تھے۔ قالین بُننے والے نے راس چیف کو یہ بتا کر حیرت میں مبتلا کر دیا کہ وہ اس کے مزاج سے پہلے سے ہی واقف تھا۔ کیونکہ پچھلے سال جب مسز میرلین چیف نے دورہ کیا تھا تو اس کی دکان میں قدم رنجہ فرمایا تھا اور قالین کی پسند خاتونِ اوّل خود بتا گئی تھیں۔ لہٰذا یہ قالین اس نے اپنے ہاتھ سے چھ مہینوں میں بُنا تھا۔ اس کے ایک اسکوائر انچ میں چھبیس سو پھندے تھے۔ راس چیف نے جب یہ سنا تو اُس قالین کا سودا بڑے دل سے کیا۔

قالین والے نے ایک اور قالین دکھایا جس کے ایک مربع انچ میں ساڑھے سات ہزار پھندے ڈالے گئے تھے۔ اس نے چیف کو فی اسکوئر انچ پھندے گننے کا طریقہ بھی بتایا۔ اس قالین کو دیکھ کر چیف کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اور ایک جذبۂ بے اختیار نے اسے قالین پر بے تکلفی سے لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اس پر ہتھیلی پھیری تو اس کے رویں نے ایک انوکھا گداز اور لطیف احساس دل میں جگا دیا۔ ایک جھرجھری سی اس کے رگ وپے میں دوڑ گئی۔ کھڑے کھڑے اس نے ایک خواب دیکھ ڈالا۔

بے تکلف ہونے کے بعد ایک ویکینڈ میں مولینا اس کی میز پر برمفس پہنے بیٹھی اپنی ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ چیف شمپین لئے بیٹھا تھا اور وہ ببل گم کی جگالی کرتے ہوئے منہ سے رو رہ کر پھلے نکالتی اور چیف کو رجھاتی۔

''مولینا— مائی ڈارلنگ — میں تمہارے ساتھ کچھ کرنا چاہتا ہوں'' چیف نے شوخی سے کہا تھا۔

''کیا کرنا چاہتے ہیں حضور؟''

''وہی جو بہار کا موسم چیری کے پیڑ کے ساتھ کرتا ہے۔ یعنی کہ اچھا سلوک — آؤنا!''

''کیا یو نہیں؟'' مولینا منہ چلاتے ہوئے بولی۔

''یعنی؟''

''پرسوں میرا جنم دن ہے'' اس نے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر پونی ٹیل بناتے ہوئے کہا۔

''کیا چاہتی ہو مولی۔ اُس دن میں تمہیں کیا پیش کروں؟''

''ڈھیر سارے پھول، چاکلیٹیں —— اور بوسے تو بغیر فرمائش کے ہی دو گے تم!'' وہ شرارت سے کھلکھلا کر بولی۔ ادھر چند ہفتوں میں اس کے حسن پر ایک نیا خمار چڑھ آیا تھا۔

''اور کیا لو گی؟'' چیف نے آنکھ ماری اور شمپین کا گھونٹ لے کر پوچھا۔

''ایک بہت اچھا سا، نرم اور دبیز قالین چاہئے مجھے اپنے گھر کے لئے کشمیری ہو یا ایرانی''۔

''سب تو ٹھیک ہے ڈیر۔ البتہ قالین کی فرمائش پوری کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ کبھی میں مشرق کے سفر پر نکلوں گا تو تمہارے لئے ایسا قالین ضرور لاؤں گا یہ وعدہ ہے!''۔

چیف کو آج یہ قالین چھو کر وہ باتیں یاد آ گئیں۔ اور پھر ایک تناؤ اس کے اندر جاگ اٹھا۔ اُس بے وفا کے اِسکرٹ پر میرا ایک دھبہ بالآخر میرے لئے کتنی بڑی تباہی لے آیا۔ بے وفا نے سارا قصور صرف میری ذات پر رکھدیا۔ ایک ہی سال بعد میرا گھر —— میری تقدیر —— میری حکومت —— سب کچھ ہلا کر رکھدیا اس نے۔

نادان مولی۔ ایک قالین تیرے لئے کیا تھا۔ لیکن افسوس تیرے بدن کے ایک ایک انچ میں ہزاروں ہزار پھندے ہیں جنھیں کوئی نہیں گن سکتا۔

ایک سکنڈ کے لئے راس چیف کو چکر سا آگیا۔ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ اس نے جیب سے رومال نکالا۔ اور آنکھوں کے گوشوں پر پھیر لیا۔ دشمنِ جان کے ساتھ اور ایک بار سونے کی آرزو کا اس نے گلا گھونٹ دیا۔ اُس قالین کا سودا اُس نے چھوڑ دیا۔

پانچویں دن راس چیف کی بڑی بہن کو گورے دیش سے آنا تھا۔ روزی ... سال سے متجاوز ایک بیوہ اور نیک دل خاتون تھی۔ وہ برسوں سے رفاہ عامہ کے لئے چلائے جانے والے کئی اداروں کی سرپرستی کرتی آرہی تھی۔ آج وہ طلبستھان کی راجدھانی کے ایک عالمی رفاہی ادارے "Recognrtion" کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر یہاں پہنچی تھی جسے اقوام متحدہ کی منظوری حاصل تھی اور جس کے پروگراموں میں دنیا کے کئی ممالک کا تعاون شامل ہوا کرتا تھا۔

روزی ایئرپورٹ سے سویرے ۸ ربجے ہوٹل پہنچی اور ناشتے کی میز پر اُس نے اپنے بھائی راس چیف کو ایک افسوسناک خبر سنائی۔ اس نے کہا ''میں جب گھر سے سفر کے لئے نکلی اسوقت اطلاع ملی کہ مولینا —— ہاں وہی حرافہ —— ایک گھنٹہ قبل ایک ٹریفک حادثے میں چل بسی''۔

اچانک یہ خبر سن کر راس چیف صدمے سے گنگ ہو گیا۔ بہن نے بھائی کا شانہ تھپتھپایا اور دھیمے لہجے میں کہا ''بھیا تمہاری اس دشمنِ جان نے گرچہ ہمارے خاندان کی عزت خوب اچھالی اور تمہارے دشمنوں کی شہ پر اس نے تمہیں بیحد رسوا کیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اس خبر سے دکھی ہو گے اور اس کی موت پر تم کسی سے اپنے دکھ اور افسوس کا اظہار بھی نہیں کر پاؤ گے۔ جب کہ تم سرکاری دورے پر وطن سے دور یہاں آئے ہوئے ہو۔ کوئی ہمدردی کے دو بول بھی تم سے نہیں بولے گا —— مولینا کی موت کی خبر کو اسوقت دبا دیا جائے گا۔ تمہارے وزیرِ اطلاعات نے میری وہاں سے روانگی کے وقت رازدارانہ طور پر مجھے بتایا تھا''۔

''شکریہ روزی۔ میری بڑی بہن''۔ چیف نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا ''میں تو اسے کب کا بھول چکا تھا۔ مجھے —— یقین جانو —— اس خبر سے کوئی صدمہ نہیں ہوا''۔

''میں خوب جانتی ہوں میرے بھائی ——' محترمہ روزی نے اپنے بھائی کا شانہ ایکبار پھر تھپتھپایا۔

''آج دن بھر مشترکہ مفادات کے خارجی، داخلی، ثقافتی اور کاروباری امور پر الگ الگ ملاقاتیں اور پروگرام ہوتے رہے۔ راس چیف کو حسب معمول معروف، چست اور بشاش دیکھا گیا۔ لیکن سہ پہر بعد جب وہ اپنی بہن کے ساتھ ہیلی کوپٹر سے پڑوسی شہر بے تاب نگر میں واقع تاریخی عمارت ''پیار محل'' میں پہونچا تو اس کے لمبے چوڑے احاطے میں محترمہ روزی نے کئی بار غور سے دیکھا کہ پیار محل کے ملکوتی حسن پر اس نے پریس کو جو تاثرات پیش کئے وہ بھی رسمی اور سرکاری زندہ دلی میں لپٹے ہوئے تھے۔

''پیار محل'' چار سو سال پہلے ایک بادشاہ نے اپنی چہیتی ملکہ کی یاد میں بنوایا تھا۔ عمارت کے اندر بادشاہ اور ملکہ دونوں کی قبریں موجود تھیں۔ مزار میں ایک مغموم سا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ وہاں روزی نے کئی بار کنکھیوں سے راس چیف کو دیکھا اور اس کی اداسی کو اچھی طرح محسوس کیا۔ آخر وہ اسکی بڑی بہن تھی جو زندگی بھر اس کی ہمراز بھی رہی۔ اُسے اندازہ تھا کہ

نگہداشت کے لئے آپ کے دیش کی ضرورت جانتا ہے۔ دوستی شیئر کرنا ہمارا اصول ہے۔ ویسے آپ کے دو بڑے شہروں فلم نگر اور کمپیوٹر آباد نے ابتک صرف ہماری کرنسی لی ہے۔ لیکن آج آپ کے ایک گاؤں ٹلپل جو ہم گئے تو جناب اُس نے ہمارا دل لوٹ لیا"۔

"وہ کیسے؟" میزبان راجہ سمجھدار سنگھ کے شوق میں اضافہ ہوا۔

"گاؤں میں رنگوں کی بوچھاروں نے ہمیں خوش کیا۔ پچکاریوں کی دھاریں اور گلال کے بادل۔ آپ نے دیکھا؟ —— اس وقت ہم کتنے مگن تھے۔ بلکہ ترنگ میں آکر ہم ناچے —— ہم نے تالیاں بجائیں۔ بھئی وہ تمیں عورتیں تھیں اور ہم اکیلے۔ ہم نے پہلی بار رنگوں کا ایسا جشن دیکھا—"

"آج ہمارے یہاں رنگوں کا تہوار ہے"۔ راجہ سمجھ دار سنگھ نے بھویں اچکا کر پُر معنی انداز سے کہا۔ اچانک پریمئر کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ ذرا خاموشی کے بعد اس نے کہا

"ہماری یہاں آمد پر برفستان کے دہشت گردوں کے ہاتھوں آپ کے چھتیس پگڑی والوں کا قتل افسوناک ہے۔ یہ دکھ ہم سے برداشت نہیں ہو گا۔ پھر بھی ہم نے سکون سے چمکدار آسمان کے نیچے بسنتی، گلابی، نیلی ہری چنریاں لہراتی دیکھیں۔ یہاں گاؤں میں عورت کے لئے ایک خاص عزت ہے اور ہم نے دیکھا کس طرح غریب گوالنیں ٹلپل گاؤں میں دودھ بیچتی ہیں۔ کمپیوٹر میں دودھ کی خرید و فروخت کا پورا حساب رکھتی ہیں۔ ایک ایک تھیلی گن گن کر سپلائی کرتی ہیں اور پورے کاروبار کا حساب رکھتی ہیں"۔

"اب تو ہمارے بعض دیہاتوں میں یہ معمولی سی بات ہے" راجہ نے کہا۔ "اور اگر یہ کوئی غیر معمولی بات ہے تو اس کا احساس ہمیں بندہ پرور آپ نے دلایا"۔

"نہیں نہیں، آپ کے لئے شاید یہ بات معمولی بات ہے ہمارے لئے نہیں۔ ہم نے ساری دنیا میں ذات اور فرقوں کی جنگ دیکھی ہے۔ آجکل ملکوں کے اندرونی ماحول میں طرح طرح کی نفرت پائی جاتی ہے۔ روانڈا میں ہم ایک مظلوم عورت سے ملے۔ ایک صبح وہ اٹھی تو اس کا شوہر اور بچے بیدردی سے قتل ہوئے پڑے تھے۔ ہم کوسوو کے رفیوجی کیمپ میں گئے جہاں برباد مسلمانوں نے پناہ لے رکھی تھی —— اگر آپ یہ سب دیکھیں اور پھر اپنے گاؤں کو دیکھیں تو . . . . یقین جانئے آپ کو احساس ہو گا کہ آپ جنت میں جی رہے ہیں جہاں عورت کی واقعی بہت عزت ہے"۔

"آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے"۔ راجہ نے کہا۔

"یہ کچھ دن خوشگوار گذرے ہیں۔ اس موسم میں لگتا ہے ہم اور آپ اچھے دوستوں کی طرح نئے کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا مسٹر سمجھدار سنگھ؟"

"بے شک۔ یہ ہمارے حالات اور مستقبل کا تقاضہ ہے" راجہ جی بولے

"راجہ صاحب! اگر آپ کے پاس تصور ہے کہ اگلے دس یا بیس برسوں میں دنیا کو کیسا ہونا چاہیے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ باہمی احترام اور مشترکہ کوشش کے بغیر اس تصور کو حقیقت میں بدلنا کتنا دشوار ہو گا"۔

"مسٹر راس۔ آج کل ہمارے ایکونومسٹ اسی لائن پر سوچ رہے ہیں۔ لیکن اس خطے کا حال آپ جانتے ہیں۔ مسٹر فوج نے پریشان کر رکھا ہے اور سرحد پار سے ہمارا سکون پامال کیا جا رہا ہے"۔ راس چیف نے جواباً کہا

"تشویش اور تناؤ کو کم کرنے کے لئے دونوں فریقوں میں بات چیت ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم آپ کے پڑوسی مسٹر فوج سے بھی یہ کہیں گے"۔

سہ پہر سے شام تک سفارتی سطح پر دونوں ممالک کے درمیان مختلف امور کا جائزہ لیا جاتا رہا۔ اور کاروباری قسم کی مصروفیتیں چلتی رہیں۔

ڈنر سے پہلے راجدھانی کے آرٹ میوزیم نے طلبستھانی مصوری کی ایک نمائش کا بندوبست کیا تھا۔ دیش کے نامور مصوروں کی اعلیٰ ترین پینٹنگز گیلری میں قرینے سے سجائی گئی تھیں۔ راس چیف کو مصوری کا بہت اچھا شوق تھا۔ وہ مصوری میں ابہام کے بجائے اظہاریت کا قائل تھا۔ اسی لئے اجے گپتا کی تصویروں نے اسے زیادہ متوجہ کیا۔ مصور نے ایک تصویر میں آدم و حوا کے جسمانی خطوط کو ایک انوکھی معصومیت دی تھی۔ تصویر کا عنوان تھا "جنت میں گناہ کے لئے تیار"۔ تصویر میں یہ خوبی تھی کہ اسے دیکھ کر برہنگی کا کوئی احساس نہیں جاگتا تھا۔

کچھ فاصلے پر ایک اور تصویر تھی جس کا عنوان تھا "آؤنا"۔ اس نے چیف کو نہ صرف تڑپا دیا بلکہ انوکھے ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ اور دن بھر دنیا د مافیہا کو بھلا کر سیاست اور خیر سگالی کے معاملات میں الجھا ہوا راس چیف ایک دم بکھر کر رہ گیا۔ تصویر میں بہت کچھ تھا۔ جس رمز میں وہ بنائی گئی تھی چیف اس سے عملی طور پر واقف تھا۔ پس منظر سے ستار کی ہلکی ہلکی پھوار مدھم سنہری روشنیوں کے ساتھ ملکر ماحول کو خوابناک بنا رہی تھی۔ کبھی کبھی ایک تار کی تیز کھنکناہٹ کسی سوئی ہوئی خواہش کو جگانے سی لگتی۔

تصویر دیکھ کر چیف کو یاد آیا، جب پہلی پہلی بار اس نے مولینا سے پوری چاہت سے کہا تھا "کم آن" تو وہ اس کے مقام و مرتبے سے مرعوب ہو کر اس کے آگے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آہستہ آہستہ اس نے نگاہیں اٹھانا شروع کیں تو وہ چیف کی اس "آؤنا" کی لچک اور پھسلاہٹ کو محسوس کرنے لگی۔ اس میں دعوت بھی تھی، چیلنج بھی تھا۔ سب سے اونچے عہدے پر رہ کر ایک ایسی حرکت کرنا کتنا مشکل تھا۔ کہیں کوئی سیکرٹ کمرے سے کوئی دیکھ نہ لے، یا اچانک بیوی بچے نہ آجائیں۔ سیکریٹ سروس والوں کو پتہ نہ ہو جائے۔

کتنے حیلوں مشکلوں سے وہ اسے زیر کر پایا تھا جبکہ وہ صرف اس کی پرسنل اسٹینو تھی۔

اس نے اسے اپنی سانسوں سے جلا چھوڑا تھا۔ اس کے پھولے پھولے گلابی رخسار شرم سے اور گلابی ہو گئے تھے۔ چیف اسے ایک فاتحانہ نظر سے دیکھ رہا تھا جیسے اس نے کوئی نیا جزیرہ اپنی مملکت میں جوڑ لیا ہو۔ وہ لٹی لٹائی اپنے اندر کہیں چھپنا چاہ رہی تھی کہ ایک بار پھر چیف نے "آؤنا ڈارلنگ" کہہ کر اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔

یوں تو اس رمز میں اُس نے پہلے بھی کئیوں سے گفتگو کی تھی لیکن مولینا کے ساتھ اس کا تجربہ انوکھا تھا۔ اس یگانگت میں نہ جانے کیوں وہ محبت کو شامل ہوتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ جب اس رمز کے سائے طویل ہو گئے تو مخالف سیاسی پارٹی کے سربراہ کو معاملے کی خبر ہو گئی اور اس نے مولینا کو بڑی عیاری سے اپنے چنگل میں لے لیا۔ اس نے مولینا کو لاکھوں روپیوں اور روشن مستقبل کی ضمانت دے کر چیف کو گھر، قوم اور ضمیر کی عدالت میں لا کھڑا کیا۔ چیف نے گرجے قوم سے معافی مانگ لی لیکن بڑے تدبّر سے اس نے اپنی ذلت کو اپنا سرمایہ بنا ڈالا۔ اس نے قوم کے لئے ایسے ہنگامی حالات پیدا کر دئے کہ لوگ خود چیف کو بحال رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اس نے دو ملکوں کو آپس میں بری طرح لڑا کر انھیں اپنی مداخلت کی گنجائش پیدا کی اور پیریمیئر کے عہدے پر اپنی موجودگی کو لازمی بنا ڈالا۔ چیف جانتا تھا کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اور وہ جلد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اور یہی ہوا۔

اگرچہ وہ گرجا جا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ آیا تھا لیکن مولینا کی وجہ سے شدید ذلت سہنے کے بعد بھی وہ اسے کسی پل نہیں بھولا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے صرف ہتھیار بنایا گیا ہے۔ پانچ سال بیت جانے کے بعد بھی اس کی زخمی انا اسے مجبور کر رہی تھی کہ ایک بار پھر کسی طرح، چاہے بھیس بدل کر ہی، اسے دعوت دے "آؤنا ڈارلنگ"۔ اور اس کے شاداب جسم کو لے، اُس سے وہ کھیل کھیلے کہ اسے ہمیشہ یاد رہے۔ اُس کا اُس سے تعلق [illegible] تھا لیکن اس کے لئے محبت نقلی نہیں تھی۔ اپنے عہدے کی وجہ سے وہ [illegible] رہے بس تھا کسی صاحب اختیار [illegible] عجیب بات [illegible] عشق کے محاذ پر ناکام ہو کر وہ ساری دنیا میں طرح طرح [illegible] سیاست کی بساط پر کیسے کیسے مہرے چلا رہا۔ لیکن [illegible] کا احساس اسے کب نہیں ہو تا رہا۔ [illegible] بدلہ لینے کے انتظار میں چھپ [illegible] کہاں کہاں [illegible] گیلری میں وہ ایک تصویر دیکھ [illegible] راس چیف کو [illegible] رکی ہوئی محبت کہاں [illegible] شے میں محبوب کی شکل تلاش کر رہی ہے [illegible]

ایک ناکام عاشق جانتا ہے۔

اس نے گیلری سے کچھ تصاویر اپنے شہر کے آرٹ میوزیم کو تحفے میں دینے کے لئے حاصل کیں۔

اگلی صبح خصوصی فلائٹ سے راس چیف خبر آباد صوبے کی راجدھانی کمپیوٹر نگر پہنچا جہاں انفارمیشن ٹکنالوجی کی صنعت کے تاجروں کی کانفرنس میں اسے شرکت کرنا تھی۔ کانفرنس سے پہلے وزیر اعلیٰ نے ہز ایکسیلینسی اور ان کے خاص مندوبین کو اپنی ترقی کے نمونے 'اعداد و شمار اور تصاویر کے سلائڈ دکھا کر امپریس کیا۔ انھوں نے اپنی استقبالیہ تقریر میں مہمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا مسٹر چیف۔ آپ اب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے دماغی خلا یعنی Brain drain کو آپ کی اطلاعاتی صنعتوں کے لئے دماغی منافع میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مشترکہ مقاصد کے لئے آپ ہمیں اور ہم آپ کو زیادہ سے زیادہ استعمال کریں تاکہ آئندہ نسلوں کو فائدہ پہنچے"۔

راس چیف یہ سن کر خوش ہوا۔ اس وقت وہ اپنے ہر غم کو بھولا ہوا تھا۔ اس نے جوابی تقریر میں کہا "وزیر اعلیٰ کی فراست قابل تعریف ہے۔ ان کی گفتگو حسب حال ہے۔ واقعی وقت بہت بدل گیا ہے۔ جو باتیں کبھی خیالی اور ہوائی معلوم ہوتی تھیں آج ٹھوس حقیقتوں میں بدل گئی ہیں۔۔۔ طاقتور قومیں حقیقت کی پرستار ہوتی ہیں۔ اور حقیقت اب روز بدل جاتی ہے۔ تبدیلی ایک کشش کا نام ہے۔ آج کئی لفظوں کے معنی بھی بدل گئے ہیں۔۔۔ کچھ سکنڈ چیف نے خاموشی برتی۔ شاید لفظ "محبت" کا بدلا ہوا مفہوم اس کے ہونٹوں سے ادا ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے بات گھمادی اور اچانک تقریر میں مزاح کا رنگ لے آیا۔ بولا "میں جب اسکول میں تھا تب لوگ chips کے معنی ایسی کوئی چیز سمجھتے تھے جسے کھایا جا سکتا ہو۔۔۔ جیسے آلو چپس ۔۔۔ ونڈوز (windows) کھڑکیوں کو کہتے تھے جن پر [illegible] دھول روز [illegible] پونچھتی تھی۔ اسی طرح ڈسک (Disc) ایک مرض کا نام تھا جو ریڑھ کی ہڈی کے کھسک جانے سے پیدا ہوتا [illegible] [illegible] آج چپس، ونڈوز اور ڈسک [illegible] ٹکنیک میں کمپیوٹر [illegible]

[illegible]

— س۔ اعجاز

بے نمک نہیں ہوتے زندگی کے یہ آنسو
اس نمک کی قیمت کو میں کہاں چکاؤں گا
تم جب اپنے آنچل سے اشک پونچھتی ہوگی
میں تمہاری عینک کو لے کے بھاگ جاؤں گا
بچہ بن کے جینا بھی کتنا اچھا لگتا ہے
تم کو جیتنا ہے تو کیسے مات کھاؤں گا
"سنگدل" کی آنکھوں میں اشک ڈھونڈنے والی
اور اک شرارت ہے وہ بھی آزماؤں گا
سارے گھر میں وحشت سے مجھ کو ڈھونڈتی پھرنا
اپنی آنکھ کے آنسو میں نہیں دکھاؤں گا!
ریفریجریٹر میں چھپ کے بیٹھ جاؤں گا!

ہمیں قتل کردو

ہمیں قتل کردو
ہمیں قتل کردو
کہ ہم چلچلاتی ہوئی دوپہر میں
پسینہ اُگلتی ہوئی اس سڑک پر
قطاروں قطاروں بڑھے آرہے ہیں
گلا پھاڑ کر کب سے چلاّ رہے ہیں

یہ اونچی سی دیوار جو مدّتوں سے
تمہاری سماعت
ہماری نگاہوں کا پردہ بنی ہے
اسے توڑ دیں گے یہ نعرے ہمارے
کہ تم صاف سن پاؤ، ہم صاف دیکھیں
ہمیں قتل کردو
یہ ہے مخلصانہ گذارش ہماری
کہ تم مار کر ہم کو دفنا بھی ڈالو
کہ اب قبر کے دام بھی بڑھ چکے ہیں
ہمیں قتل کردو کہ یہ قیمتوں کی ترقی ہمیں زندہ رہنے نہ دے گی
کہ اب اپنے بچوں کا منہ ہم سے دیکھا نہیں جارہا ہے
یہ بیمار گلیوں میں پلّوں کی مانند کیوں پھر رہے ہیں
ہمیں قتل کردو کہ ہم اپنے خوابوں کے زخموں کا منہ اب نہیں سی سکیں گے
دوا دسترس میں نہیں آرہی ہے!
ہمیں قتل کردو کہ سرکار کے اسپتالوں میں بستر نہیں ہیں
ہمیں قتل کردو کہ اب جیل بھی شہر کے بھر چکے ہیں
ہمیں قتل کردو کہ اِن خالی باتوں سے اب پیٹ کو ہم نہیں بھر سکیں گے
اگر تم نے ہم سے کبھی کوئی وعدہ کیا بھی تو سن لو
اب اس بے نمک لفظِ وعدہ کو نوکِ زباں سے نہ چاٹیں گے،
طے کرلیا ہے
نہ ہم بے وقوفوں کی مانند واعظ کی باتیں سنیں گے
یہ واعظ کی جنت ہو اُس کو مبارک
ہمیں اِس زمیں کی محبت سے چڑ ہے
جو پیدا کرے اور سب تم کو دے دے
ہمیں قتل کردو کہ ہم ختم ہوکر
تمہارے لئے لقمۂ تر بنیں گے
اگر تم نے تاخیر کردی تو سن لو
کہ جو بھوک اب ہے تجارت تمہاری
وہ بے چین لوگوں کا ہتھیار ہوگی
ہمیں قتل کردو، کہ ہم بھوک سے بلبلانے لگے ہیں
ہمیں قتل کردو کہ یہ مسئلہ بھوک کا حل طلب ہے
ذرا جلد سوچو کہ ہم مورچہ لینے آئے ہیں تم سے
کئی دن سے فکر کفن تک نہیں ہے

سنا ہے کہ تم انقلابی تھے پہلے؟

ایئر ہوسٹس

مری میزباں نے
ہوائی سفر میں
چمک اپنی آنکھوں میں لاتے ہوئے بازبانِ خموشی
یہ مجھ سے کہا تھا
"ہوائی مسافر!
زمیں پر نہیں ہم
خلا کا سفر ہے، دریچے نہ کھولو!"

مولیسا ——— اومائی ڈارلنگ

(افسانہ)

[میرے ادبی کیریئر کا آغاز افسانہ نویسی سے ہوا تھا۔ ابتداء میں میرے پانچ چھ افسانے معیاری رسائل میں چھپے بھی۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد خواہش کے باوجود افسانے نہیں لکھ سکا۔ وجہ کچھ خاص نہیں۔ ایک بار پھر شروع کر دیتا تو لکھنے ہی لگتا۔ حالانکہ اِدھر کئی برسوں افسانہ اور افسانہ نگاروں نے مجھے بہت involve رکھا۔ انشاء کا "عالمی اردو افسانے نمبر" بھی شائع کیا۔ خیر اب پھر افسانہ نگاری کی طرف طبیعت مائل ہونے لگی ہے۔ ایک افسانہ لکھا ہے، سو پیشِ خدمت ہے۔ ناقدین کی بے لاگ رائے جان کر مجھے خوشی ہوگی۔
ف۔س۔اعجاز]

گورے دیش کے پریمیئر مسٹر راس چیف کے لئے بہت مصروف دن تھا۔ تین دنوں میں ہی طلبستھان کے حکمرانوں کی مہمان نوازی اور اخلاق نے اس کا دل جیت لیا تھا۔ اب تک اس نے طلبستھان کے تین خاص شہروں کے اہم ترین مقامات کا دورہ کر لیا تھا۔ ان کی تاریخی عظمت کے قصے اس نے پہلے ہی سن رکھے تھے۔

آج تیسرے روز طلبستھان میں رنگوں کا تہوار تھا۔ راس چیف کو ایک گاؤں پٹپٹل کی سیر کرائی گئی۔ گاؤں میں اس کی آرتی اتاری گئی۔ تیس گوالنیں اس کیلئے ناچیں۔ ان کی رنگین بھڑک دار پوشاکیں اسے بڑی اچھی لگیں۔ چیف نے اپنے روائتی سوٹ کے بجائے کرتا دھوتی پہن رکھے تھے۔ کامدار گلے کا ریشمی کرتا اس پر خوب کھل رہا تھا۔ جیسے وہ کسی کہانی کا شہزادہ ہو۔

رقاصاؤں نے اُسے اپنے جھرمٹ میں لے لیا اور خود لہک جھوم کر گاتی ناچتی رہیں۔ ناچ میں ان کے لہنگوں کے گھیر رنگ برنگی پھرکیوں کی طرح دکھائی پڑ رہے تھے۔ رنگوں کے تہوار پر ڈھول کی تھاپ، مجیرے اور جھنجریوں کی خوش آہنگ آوازیں سن کر راس چیف بھی ترنگ میں آگیا۔ در تالیاں بجا بجا کر طلبستھان کے مشہور فلمی ہیرو سلیپ کمار کی طرح ٹھمکے گانے لگا۔ وہ ایک آزاد قوم کا آدمی تھا۔ اس کے قہقہے کھلے اور آزاد تھے۔

طلبستھان کے لوگوں نے ٹیلی ویژن پر چیف کی زندہ دلی اور شوخی دیکھی تو وہ حد درجہ خوش ہوئے۔ کاش اُس کے جیسی بے فکر ہنسی وہ بھی اپنے ہونٹوں پر چپکا سکتے۔

دوپہر تک بھاگ دوڑ سے بھوک جاگ اٹھی تھی۔ لنچ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پہلے سے طے تھا۔ جہاں راس چیف کے ساتھ آئے ہوئے صحافی اور دیگر عملے بروقت جمع ہو گئے تھے۔ لیکن چیف نے اچانک طلبستھان کے معمولی کھانوں کی فرمائش کر دی۔ جب وہ اپنے دیش سے چلا تھا تب اس کی بیگم نے تجویز کیا تھا کہ ایک وقت کا کھانا وہ "ہوٹل فوڈ سنگم" میں ضرور کھائے جہاں گزشتہ سال اس نے ڈنر لیا تھا جب وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ دورے پر آئی تھی۔

چیف کیلئے اسکی پسند کے مغلئی پکوان گھنٹے بھر میں تیار کر لئے گئے۔ اور وہ اس معمولی ہوٹل میں اپنے میزبان اور خواص سمیت پہنچ گیا۔ عمدہ کھانوں کی زعفرانی مہک سے سارا علاقہ مہک اٹھا تھا۔ چیف نے بڑی رغبت سے کھایا۔ مقامی لوگوں کو جب ٹی وی پر اس کا جگمگاتا چہرہ نظر آیا تو وہ اپنے مہمان کو آسودہ دیکھ کر خود اپنی بھوک بھول گئے۔ اور انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

چیف نے میزبان راجہ سمجھدار سنگھ سے مذاقاً کہا

"میں نے گلے تک کھانا ٹھونس لیا ہے۔ سوچتا ہوں کیا اب پریس کانفرنس کا سامنا کر پاؤں گا"۔

"شرمندہ کر رہے جناب۔ آپ تکلف ہی کرتے رہے" میزبان سمجھدار سنگھ نے جواب دیا "پانی تو ہمارے ملک کا نوش نہیں فرمایا"۔

"کچھ خیال نہ کریں۔ دراصل ہمارے ڈاکٹروں کا سخت مشورہ ہے کہ جہاں کہیں ہم جائیں پینے کا پانی اپنے گھر سے ساتھ لے جائیں۔ لیکن ——— ہاں۔ یہاں آکر میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کا دیش پینے کے پانی اور راستوں کی صفائی کی فکر کرنے لگا ہے۔ میری دعا ہے وہ دن جلد آئے جب میں دوبارہ یہاں آؤں اور پینے کا پانی مجھے وطن سے ساتھ نہ لانا پڑے۔ بائی دی وے، ہم آپ کے ملک کو پانی صفائی پراجکٹ کے لئے پچاس کروڑ کی رقم بلا سود قرض دینا چاہیں گے"۔

"شکریہ مسٹر راس چیف" طلبستھان کے راجہ نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اس امداد کی ضرورت تھی"۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔ ہمارا ملک صحت اور تعلیم کی

چور اور چاند

نرم آکاش کی سمٹی ہوئی گولائی میں
مخملیں ابر کے شانے پہ، کسی غفلت سے
رات کے پرس کا منہ تھوڑا سا کھل جاتا ہے
اک چمکدار سے ہالے پہ نظر پڑتی ہے
جیب کترے کا اگر ہاتھ وہاں تک پہنچے
چاند جو پیلی اٹھنّی کی طرح لگتا ہے
ساری مخلوق کی نظروں سے وہ بچ کر شاید
آن کی آن میں مٹھی میں دبا لے اس کو
کسی مفلس کے لئے یہ بھی بڑی دولت ہے
ایک سوئی ہوئی بستی کا نہ سونے والا
کتنا خوش ہوگا اگر چاند ملے گا اُس کو ا

تُم، گُم اور تَبَسُّم

ذہن میں اب نہیں ہے کوئی سوال
اجنبی بوجھ سا ہے آنکھوں پر
چاند ہو یا فلک پر اب تم ہو

میں ٹٹولوں تو میری کیا ہے مجال
پاؤں کیوں جم گئے ہیں راہوں پر
کچھ تو بولو کہ تم کہاں گم ہو

ایک آوارہ زندگی کا خیال
اس طرح تھم گیا ہے ہونٹوں پر
جیسے اک لاش کا تبسم ہو

صاحبِ فن

سانس آرے کی طرح کاٹ رہی ہے مجھ کو
اک فلک بوس عمارت کے تلے
خوبصورت سا شجر بن کے کھڑا
قد ہرا ایک بلندی پہ تھا
انگلیاں اپنی جگہ پر ساکت
اور ہتھیلی پہ جمی چھال فقیروں جیسی
جس پہ دس پانچ کے سکوں نے نوازش کر کے
گہری، باریک لکیروں کو مٹا ڈالا ہے
کالے پیسوں کے بنائے ہوئے سادہ دھبّے
ہوں ہتھیلی پہ نمودار کہ پیشانی پر
صاف پہچان لئے جاتے ہیں، پیشہ کیا ہے
گورکن جس طرح اپنے نئے گاہک کے لئے
بھولی بسری ہوئی اک قبر کا سینہ چیرے
مجھ سے اچھا تو یہ تاجر ہے عمارت جس کی
اک امر بیل کی مانند بڑھے جاتی ہے
جانے کیا پیتی ہے، قد روز نکل آتا ہے
آسماں اُس کی طرف آپ جُھکا آتا ہے
جتنی رشوت ملے اُتنا ہی وہ جھک جاتا ہے!
اور میں اپنی جگہ
دھوپ پیتا ہوا خاموش کھڑا رہتا ہوں
صاحبِ فن ہے یہ معمار کہ جس نے مجھ کو
صدر دروازے پہ رکھا ہے سجاوٹ کے لئے
وقت کا کون سا پیشہ ہے مجھے علم نہیں
سانس آرے کی طرح کاٹ رہی ہے مجھ کو
اِتنا بوڑھا ہوں کہ اب کون سی منزل سے گروں؟

آسمانی دھرم کانٹے پر

۲۵ر فروری ۹۴ء رمضان ۱۴۱۴ھ جمعہ کے دن مسجد ابراہیمؑ میں ایک امریکی نژاد نو آباد یہودی ڈاکٹر بروچ گولڈ اسٹائین کے ہاتھوں ۵۲ نمازیوں کے قتل پر کہی گئی نظم

الوداع، اے ماہِ اِکرام الوداع!
کم ہوئے باون مسلمانوں کے سر
عالمِ سجدہ میں انسانوں کے سر
بھر گیا تو عید کے جام الوداع!

اُف یہ شورش ارضِ ابراہیمؑ پر
لے کے تو آیا یہاں بندوق کیا
اسلحوں سے پُر ترا صندوق کیا
فتنہ پرور تف تری تعلیم پر

نشر کرتے ہیں کلنٹن فون سے
"امن کی اب بھی ہے واشنگٹن کو آس"
بجھ رہی ہے پھر یہ جانے کس کی پیاس
خوش ہوا ہے کون کس کے خون سے

آسمانی دھرم کانٹے پر چڑھی
سامراجی خارجہ پالیسیاں
اک طرف سفّاک چارہ سازیاں
ایک جانب مسلموں کی بے بسی

اے ہلالِ عید تجھ کو ہے خبر
سر کی فصلیں کیوں فلسطیں میں کٹیں
یہ کھجوریں کس کی امت میں بٹیں
کس نے دنیا میں یہ پھیلایا ہے شر

الوداع، اے ماہِ غُفراں الوداع!
مر گیا مردِ مسلماں الوداع!

اداریہ، انشاء عید نمبر ۱۹۹۴ء

سڑک

(کلکتہ کی ۳۰۰ویں سالگرہ ——— دوسری نظم)

کتنی گمبیر ہے
سبز پتوں سے اُلجھی ہوئی یہ ہوا
اِس کے منہ سے نکلنے لگیں سیٹیاں
ست ہونے لگیں دھڑکنیں رات کی
سو گیا آسماں
یہ چمکتی ہوئی کار کی بتّیاں اور کالی سڑک
ہے جو بارش کے پانی سے بھیگی ہوئی
دن کے تپتے ہوئے شہر کی اِک اُمس
بھیگے سایوں میں تحلیل ہونے لگی
جانے تو آگے بڑھتا ہے یا یہ شجر
تیری سمتِ مخالف میں ہیں بھاگتے ؟
یہ درختوں سے چھنتی ہوئی چاندنی
کچے پکے مکانوں کے جسموں تلے
ننگی عورت کے مانند لیٹی ہوئی،
تھوڑی تھوڑی سی بھیگی ہوئی یہ سڑک
اُف یہ کالی طوائف کے جیسی سڑک
سرد اور گرم سایوں سے چمٹی ہوئی
ٹوٹی پھوٹی ہوئی اور اُدھڑی سڑک
آتی جاتی ہوئی گاڑیوں کا ہجوم
الاماں الحذر
اپنی گاڑی کی رفتار اونچی نہ کر
یہ پھسلنی سڑک تیری ہمدم نہیں جو مروّت کرے
ایک پھسلن سے تو موت کی وادیوں میں اتر جائے گا
تجھ کو تازہ ہواؤں سے مسرور ہونے کا کچھ حق نہیں
چاندنی کا، ہواؤں کا، سایوں کا یہ اختلاط
ایسے رومانی منظر کی جانب نہ بھولے سے آنکھیں اٹھا
اِس طرف راستہ بند ہے، تُو اُدھر کو نکل، گھوم جا
راہ میں ایک سایہ ہے، خود کو سنبھال
تجھ کو گاڑی چلاتے ہوئے نیند آنے لگی ؟
اپنی آنکھوں کو مل، جاگ جا بے خبر
تین سو سال کے غم کی پگلی سڑک تجھ پہ حیران ہے
بد تمیز
آدمی اور کتے کی پہچان کر!

۴/۸/۸۹

ستم گر

میں تمہاری نظروں میں صرف اک ''ستمگر'' ہوں
میں اگر ستمگر ہوں کیسے ہار جاؤں گا
تم جو روز کہتی ہو ''آپ تو ہیں پتھر کے''
کیونکر اپنے اِس دل کو موم کا بناؤں گا
مجھ سے آپ اپنا ہی بار غم نہیں اٹھتا
موم بن گیا تو پھر کس سے میں نبھاؤں گا
میں کہ فکرِ فردا سے آج بھی ہوں بے گانہ
روز اک نئی تہمت سر پہ میں اٹھاؤں گا
مجھ کو اپنے آنچل سے تم نہ باندھ پاؤ گی
اک شریر بالک ہوں، میں نہ ہاتھ آؤں گا
عمر اب تلک مجھ کو کر سکی نہ سنجیدہ
لاکھ مجھ کو ڈانٹو تم، میں نہ باز آؤں گا
گھر میں جب اکیلی تم میری منتظر ہوگی
پیچ و تاب کھاؤ گی، وقت پر نہ آؤں گا
بچے چھٹیوں میں جب شہر میں نہیں ہوں گے
اور دیر سے آکر خوب دل جلاؤں گا
تم جب اپنے بستر پر کچی نیند میں ہوگی
بھوت بن کے لپٹوں گا، چیخ کر ڈراؤں گا
کرم خوردہ کپڑوں کو جب رفو کرو گی تم
بھولے بسرے زخموں کی یاد میں دلاؤں گا
یہ نہیں کہوں گا میں زخم بھی رفو کرنا
کچھ سنہرے لمحوں کے گیت گنگناؤں گا
اک سفید لٹ جو اب کنپٹی پر ابھری ہے
تم پہ کتنی جچتی ہے، چوم کر بتاؤں گا
برف زار موسم سے جب بھی کانپ جاؤ گی
سردیوں کی راتوں میں دھوپ لیکر آؤں گا
وقت کے تلاطم کو تم بھی جھیل جاؤ گی
وقت کے تلاطم کو میں بھی جھیل جاؤں گا
تم سے چھیڑ خانی میں خوب لطف آتا ہے
ہنستے ہنستے رودو گی، اتنا گدگداؤں گا

ادب میں خواب عناصر کی مثالیں پیش کی گئیں۔ انھیں پڑھ کر کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا سارا ادب نیم خوابی کے فسوں میں مبتلا ہے۔ جواب اثبات و نفی دونوں میں ہو سکتا ہے۔ نثر نگاروں کے یہاں خواب کے عمل تو پائے جاتے ہیں لیکن وہ عموماً نیند اور خواب کے اعلان کے تحت ادب پاروں میں نہیں لائے جاتے۔ جب کہ شعراء کے یہاں نیند اور خواب کی فضا اکثر پائی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ نثر نگاروں کے بارے میں آپ بہ عجلت یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نیم خوابی کے فسوں میں مبتلا ہیں۔ البتہ شاعروں کے یہاں خواب نیند کی جھیل میں تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فراق گورکھپوری کے یہ دو اشعار دیکھیں۔

دکھاتے ہیں ستارے ایک بہتر زندگی کا خواب
نہ دیکھ ان کی طرف وہ چھین لیں گے سب خوشی تیری

ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے
دبے پاؤں کسی نے آکے خوابِ زندگی بدلا

خواب دیکھنے یا منظوم کرنے والے کی اپنی فکر اور ندرت خیال کہیں نہ کہیں سے اپنی جھلک ضرور دکھاتی ہے۔ جیسے مظفر وارثی کے اس شعر میں ایک اور بات معلوم ہوتی ہے۔

تمام عمر کی نیندیں اجاڑ لیں میں نے
کوئی نہ دیکھا ہوا خواب دیکھنے کے لئے

خواب کا ایک مریض جس طرح اپنے آپ سے اپنے خواب کو بیان کرتا ہے یا ماہر نفسیات کے آگے اپنا خواب دہراتا ہے کیا ادیب و شاعر کو بھی اس طرح ادب میں کسی خواب کو دہرانا چاہیے؟۔ اگر کوئی یہ سوال کرے تو اس کا جواب نفی میں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ اگر ادیب یا شاعر خواب کی کیفیت کو سیدھے سپاٹ انداز میں بیان کرتے تو خواب سے متعلق دنیا کا سارا ادب مریضوں کے بیانات یا کیس ہسٹریز کے مجموعے کے سوا کیا ہوتا؟ ادب میں خوابوں کی اہمیت ادب کے تخلیقی عناصر کی وجہ سے ہے جن سے شعراء و ادباء کی تخلیقی اپج، ذہانت، دماغی کیفیت اور خلاقی کا ثبوت ملتا ہے۔ یوں تو سب کچھ قاری کے ذہنِ رسا پر منحصر ہے کہ وہ ادب کے ذریعہ موصولہ کتنے خوابوں کی شناخت کر پاتا ہے اور کتنوں کو رد کر دیتا ہے۔

غزلیں

سامنے آئیں تو گرداب برے لگتے ہیں
اب تو ہر کھیل کے آداب برے لگتے ہیں

بد مزہ کرتا ہے انسان کو گدلا پانی
مچھلیاں خوب ہیں تالاب برے لگتے ہیں

شب کو ہر خواب سہانا سا نظر آتا ہے
دن کو سوچو تو بُرے خواب برے لگتے ہیں

آدمی ڈھونڈتا ہے اپنے لئے امرت جل
لوگ پی لیتے ہیں زہراب برے لگتے ہیں

آج اس دیش میں پیتے ہیں جو انساں کا لہو
بس وہی ہوتے ہیں سیراب برے لگتے ہیں

خوش نمائی پہ فقط ان کی فدا ہو نہ کوئی
تتلیوں کو بھی یہی خواب برے لگتے ہیں

اک عمر کٹ گئی بڑی آسودگی کے ساتھ
بوتل میں رقص کرتے تھے ہم بھی پری کے ساتھ

تحفے کی ایک ڈبیہ کو جب کھولتے ہیں ہم
خوشبو سی پھوٹتی ہے کوئی نغمگی کے ساتھ

جچتا نہیں ہے کوئی بھی چہرہ نگاہ میں
ہر روز پائے جاتے ہیں اک اجنبی کے ساتھ

سوئے ہیں اس کے پہلو میں ہم بھی پچاس سال
رشتہ کوئی ہمارا بھی ہے اس صدی کے ساتھ

جس نے مکان وجان کا بیمہ کرالیا
شیشے کے گھر میں رہتا ہے وہ نازکی کے ساتھ

جب دم نکل گیا تو بجھی پیاس خود بخود
اچھی نبھی ہے آپ کی ساقی گری کے ساتھ

گونگا کسی بھی لفظ کو تم چھوڑتے نہیں
اچھا سلوک کرتے ہو تم شاعری کے ساتھ

شاعر یہ چاہتا ہے کہ مشکل سے کچھ کہے
تم نے غزل کہی ہے بڑی سادگی کے ساتھ

چشم خوباں کا کاجل بنا رہ گیا
میں تو پاگل کا پاگل بنا رہ گیا

آنکھ رسمِ تکلف نبھانے لگی
جسم وحشی تھا، جنگل بنا رہ گیا

حسن کو آگئی پھر بھی سنجیدگی
عشق بچپن کا چنچل بنا رہ گیا

سانپ خوشبو سے میری لپٹتے رہے
اور میں شاخِ صندل بنا رہ گیا

ہم نے اپنے تقاضوں کو پورا کیا
وقت دائم تھا مقتل بنا رہ گیا

کتنے مانوس قدموں کی آہٹ لئے
ذہن یادوں کا جنگل بنا رہ گیا

ہر شکست ایک سرمایہ بن کر رہی
ہاتھ جہدِ مسلسل بنا رہ گیا

لمبی رات کے دامن ہی میں دن کو پلٹ کر آنا ہے
پھر اس کے سینے سے چمٹ کر ہم کو اشک بہانا ہے

شام کے کومل سائے میں اتری اپنے سر سے بھاری دھوپ
اب بھی کتنے کام ہیں ہم کو، تھکنا ہے، ستانا ہے

بول ہیں تیرے میٹھے لیکن روح نہیں آزاد
سونے کے پنجرے کی مینا تجھ کو کیا سمجھانا ہے

میں سُونی وادی کے جیسا مجھ پر طاری ایک سکوت
تو پربت کی چنچل دھارا تجھ کو اِٹھلانا ہے

البیلی خوشبو کے تن سے خوب لپٹ کر پیار کریں
صبح سے پہلے سیج کے سارے پھولوں کو مرجھانا ہے

جتنے جنم بھی چاہے لے لے ایک مقدر سیتا کا!
راون کو اپنی گھاتوں سے سیتا کو ہر جانا ہے

چوری اس کی صاف بہت ہے سچ کو جھوٹ بتاتا ہے
رادھا جس پر مرتی ہے وہ ماکھن چور پرانا ہے

آج بہت مایوس ہوئے ہم لہروں کے ہنگامے میں
آج ہمیں طوفان کے اندر کشتی میں سو جانا ہے

\\\\ \\\\ \\\\

یہ بات نہیں ہم کو کھلے در نہ ملے تھے
اڑجاتے پر اڑنے کے لئے پر نہ ملے تھے

اندازہ نہیں کتنا سفر ہم نے کیا طے
اس بار ہمیں میل کے پتھر نہ ملے تھے

ناراض چلے آئے تھے ہم پہلو سے اُس کے
اُس شب ہمیں پتھر کے بھی بستر نہ ملے تھے

دو اجلے پرندوں کا جو لوٹا دیا پیغام
اُس دن سے ہمیں چھت پہ کبوتر نہ ملے تھے

پانی میں جو اتریں تو بدن بھی نہیں بھیگے!
دریا کو کبھی ہم سے شناور نہ ملے تھے

اک روپ انوکھا اِسی پتھر سے نکلتا
ہم بت بنے ہوتے ہمیں آزر نہ ملے تھے

مینا بازار کی دلہن سی دکانوں کے قریب
چپ سا ہو جاتا ہوں میں اونچے مکانوں کے قریب

حسن افسانہ طلب صرف کہانی مانگے
عشق رہتا ہے شب و روز فسانوں کے قریب

آج بھی زندہ ہیں دشمن ہیں میری نیندوں کے
تیری آواز کے بو سے مرے کانوں کے قریب

میں کہیں سُر کے سمندر میں بہے جاتا ہوں
دل چلاجاتا ہے اُڑ کر تری تانوں کے قریب

خوشبو کھو دیتے ہیں آوارہ و مفلس بچے
جرم کے سائے میں پلتے ہیں جو تھانوں کے قریب

رات بھر فکر میں رہتا ہوں سحر کب ہوگی
آنکھ لگ جاتی ہے کیوں میری اذانوں کے قریب

ایک بچے نے پھلانگی ہے ابھی سرحدِ ملک
خون کے دھبے ہیں قدموں کے نشانوں کے قریب

میں غافل تو نہیں رہتی ہے سب اپنی خبر مجھ کو
رُلا کر چھوڑ جائے گا مرا اپنا ہنر مجھ کو

مری پہچان اب میرے لئے بھی ہوگئی مشکل
چھپاتی جارہی ہے راہ میں گردِ سفر مجھ کو

وہ میرے واسطے لکڑی کے پاؤں لے کر آیا ہے
سمجھتا ہے کہ کھا جائے گا بیساکھی کا ڈر مجھ کو

جسے اپنوں کے پتھر بے دھڑک مسمار کرتے ہیں
میسّر ہوگیا قسمت سے وہ شیشے کا گھر مجھ کو

میری بانہوں میں سمٹا جارہا ہے خوف سے کوئی
سہانا لگ رہا ہے اب یہ جنگل کا سفر مجھ کو

نہیں کوئی نہیں ماضی کی اک آواز تھی شاید
بجاکر تالیاں یونہی بلاتے ہیں شجر مجھ کو

تعاقب کرتے کرتے کون سے رستے پر آنکلا
بڑے ہی خوشنما لگتے تھے اک تتلی کے پر مجھ کو

جب کہ وہ جانتا ہے کہ موت لازمی انجام ہے اور معینہ وقت پر اُسے آتا ہے"۔

سیزر ایک خادم کو بھیج کر پجاریوں سے فال معلوم کرواتا ہے۔ پجاریوں کی رائے آتی ہے کہ ایک جانور کی بھینٹ دی گئی۔ اس کے بعد اس کا پیٹ چیر کر اس کی اوجھڑی وغیرہ نکالی گئی تو اس میں سے دل برآمد نہیں ہوا۔ لہٰذا سیزر کو اس منحوس نشانی کے بعد محل سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ سیزر جانے کا ارادہ ملتوی کرنے لگتا ہے۔ اسی عرصہ میں سازشی ڈیشیس بردلس آتا ہے۔ وہ کہتا ہے

"اس خواب کی بالکل غلط تفسیر کی گئی ہے۔ یہ تو اچھی اور خوش آئند بات ہے۔ آپ کے مجسمہ سے خون بہہ کر نلوں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا جس میں شادماں رومیوں نے غسل فرمایا۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ آپ سے عظیم روم حیاتِ نو کا جام پیئے گا اور عظیم لوگ بہ اصرار آپ سے روح شراب، نیا رنگ، یادگار تبرک اور اختیار حاصل کریں گے۔ کیلیفورنیا کے خواب کا اصل مفہوم یہی ہے۔

ڈیشیس بردلس سیزر کو اپنی باتوں سے قائل کر لیتا ہے جس کے بعد سیزر چلا جاتا ہے اور سازشیوں بشمول ڈیشیس بردلس کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے۔

ایک ڈرامہ نگار خواب کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ سیزر کی بیوی کا یہ خواب خواب تھا کہ نہیں اس پر بحث چھڑتی ہے۔ بعض اسکالر اسے فریبِ خیال (HALLUCINATION) سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال ایک ہی خواب یا فریبِ نظر بیوی (کیلیفورنیا) اور شوہر (سیزر) کی الگ الگ ذہنی کیفیتوں کو ظاہر کر رہا ہے جب کہ ڈیشیس کی توجیہہِ خواب انسانی عقل کی عیاری کا بے مثال نمونہ ہے۔ اس خواب کے ذریعہ مختلف ذہنوں کی اصلیت تک پہنچا جا سکتا ہے۔

جاگتی آنکھوں کے خواب ادب میں جابجا مطالعہ سے گزرتے ہیں۔ فیوڈور دوستوفسکی کے مشہور ناول جرم و سزا (CRIME AND PUNISHMENT) کا ہیرو راسکولنکاف مخصوص حالات کے زیر اثر ایک خاص قسم کی ذہنی حالت میں اپنی ظالم بوڑھی مکان مالکہ کا قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مستقل ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ انوکھے مفروضوں اور اندیشوں میں گھر جاتا ہے اور سوتے جاگتے اس کی آنکھوں میں انوکھے ہیولے گردش کرنے لگتے ہیں جن کے وسیلے سے اس کی ہذیانی کیفیت کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے باطن تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ناول کے اس اقتباس کو پڑھئے اور غور فرمایئے کہ کس طرح حالات کے تحت انسان کی فکر مجروح ہو سکتی ہے اور وہ ان چوٹوں کے بعد کس قسم کے خواب بیداری کے عالم میں دیکھ لیتا ہے۔

"تقریباً بے جان اور لرزتی ٹانگوں سے راسکولنکاف واپس اپنے کمرے میں پہونچا۔ وہ ٹھنڈے پسینے میں نہا رہا تھا اس نے سر سے ٹوپی اتار کر میز پر رکھی اور دس منٹ تک بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر بے جانی سے صوفے پر ڈھے گیا۔ درد کی ایک ہلکی سی سسکی کے ساتھ اس نے اپنے ہاتھ اور پیر پھیلا دئے اور آدھے گھنٹے تک اسی طرح پڑا رہا۔

وہ کچھ سوچ نہ رہا تھا البتہ خیالات کی چند دھجیاں اس کے دماغ میں بے ترتیبی سے منڈلا رہی تھیں اور کچھ ہیولے سے اس کی نظر کے سامنے بے ربطی سے ناچ رہے تھے۔ یہ ان لوگوں کے چہرے تھے جنہیں اس نے بچپن میں کہیں دیکھا تھا لیکن جن کی صورت اسے یاد نہ تھی اور پھر .... وارنے سکی کا کلیسا، ریستوران کا بلیرڈ ٹیبل جس پر چند افسر کھیل رہے تھے، کوئی شراب خانہ اور شراب اور تمباکو کی بو، ایک ہوٹل، کسی عمارت کا تنگ و تاریک عقبی زینہ جس پر انڈوں اور آلوؤں کے چھلکے پڑے ہوئے تھے اور سیڑھیاں گندے پانی سے پھسلواں ہو رہی تھیں۔ اور یہ ہیولے اس کی نظر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ان میں چند ایسے دلچسپ معلوم ہوئے اور راسکولنکاف نے انھیں روک رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ دھندلے ہو کر غائب ہو گئے۔ کوئی بد روح اس کے دل میں بیٹھی اس کی دیواروں کو اپنے ناخون سے کھرچ رہی تھی، اسے اپنی ہتھیلیوں میں مسل رہی تھی۔ لیکن یہ تکلیف اور یہ دباؤ ناقابل برداشت نہ تھا بلکہ بعض دفعہ تو اسے یہ درد میٹھا میٹھا محسوس ہوا۔

زینے پر سے رازدموہن کے پیروں کی چاپ سنائی دی تو وہ آنکھیں بند کر کے سوتا بن گیا۔

(مترجم : مظہر الحق علوی)

یہ کیس ایک ناول سے لیا گیا تھا۔ افسانے میں بھی خواب نگاری کا عمل کرداروں کی ذہنی کیفیت سے برآمد کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ کہانی میں خواب کی جزئیات کو تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا پھر بھی تلاش شرط ہے۔ بعض جدید افسانہ نگاروں کے یہاں اجزائے خواب الگ الگ ڈھنگ سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ سریندر پرکاش اور انتظار حسین کے بعض افسانوں پر

خواب جیسی شبیہات اپنا پرتوِ عمل پھیلاتی نظر آتی ہیں۔ جس پر غور کرنے سے انسانوں کی معنویت اجاگر ہوتی ہے۔ کچھ لغو و مہمل خواب بھی انسانوں کی تہہ سے نکل آتے ہیں۔ غور نہ کرنے سے تشکیک اور ابہام کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ جوگندر پال کے کئی انسانوں اور افسانچوں میں خوابوں کو پرت در پرت دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ناول ''نادید'' کا مرکزی کردار ایک اندھا ہے۔ وہ دنیا کا ادراک دو طرح ہی کر سکتا ہے۔ تصور کے ذریعہ یا خواب کے ذریعہ۔ ایک اندھے کے تصور اور خواب میں جو فرق ممکن ہے اسے طنز اور فلسفہ کے رنگوں میں جوگندر پال نے نمایاں کیا ہے۔

ہرچرن چاولہ کی ایک کہانی ''سچ جیسے سپنے'' خواب کے متعلق فرائڈ کے نظریہ پر مبنی ہے۔ جس میں مصنف نے عریانیت کا سہارا لئے بغیر جنسِ مخالف کے تصور کو اپنی شخصیت اور آرزو کی عدم تکمیل سے مربوط کرتے ہوئے خود کو ایک خواب کا قیدی دکھایا ہے۔ یہ پوری کہانی ایک نفسیاتی کہانی ہے اور حیرت انگیز طور پر یہ ایک خواب کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جس سے یہ حقیقت برآمد ہوتی ہے کہ نوعمری سے چلی آرہی ناکام جنسی خواہش ۶۲/ سال کی عمر میں بھی آدمی کو مضطرب اور بے چین رکھ سکتی ہے اور وہ تلافی کے خوابوں (Compensatory Dreams) میں سکون پانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کی سیٹنگ / پس منظر لفظ بہ لفظ کسی تحلیل نفسی کے ماہر کے روبرو دہرایا ہوا خواب معلوم ہوتا ہے۔ انسانہ میں خواب اپنی متوازی حقیقتوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ جمالیات سے جادو کا کام لیا گیا ہے۔

پاکستان کے افسانہ نگار ناصر بغدادی کے انسانوں میں (جو ان کے مجموعے ''بے شناخت'' میں شامل ہیں) جابجا خوابوں کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کے بیشتر انسانوں کی تہہ میں وہ خواب دبے ہوئے ہیں جنہیں آدمی لاشعور میں زندہ رکھتا ہے، کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن ان کی شناخت اور اور طاقت بھی منوانا چاہتا ہے۔ کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں اتنی مقدار میں اجزائے خواب نظر نہیں آتے۔ ناصر بغدادی کے دو مختلف افسانوں سے یہ اقتباسات دیکھیں۔

''وہ تھکے ہوئے قدموں سے راہداری طے کر رہا تھا کہ حجاب کے کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہ ایزل کے سامنے کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ کا برش سبک رفتاری سے آشفتہ حال نوجوان کی پورٹریٹ پر ادھر ادھر دوڑ رہا تھا اور پھر چہرے کے سارے نقوش ناقابلِ شناخت ہو گئے۔ رنگوں کا بھدا سا ایک ہیولہ کینوس پر نمودار ہو گیا مگر اس کے باوجود اس کی دو ویران آنکھیں باقی رہ گئی تھیں جو اس وقت گہرے رنگوں کے ہیولے میں گھری ہوئی یوں گھور رہی تھیں جیسے خلاء میں اپنے نامکمل خوابوں کو تلاش کر رہی ہوں، شاید ان دو آنکھوں میں دو ہستیوں کا مشترک غم اپنے سنہرے خوابوں کے لٹنے پر چپ چاپ آنسو بہا رہا تھا!!''

''تصویر کے زخم'' (کلائمکس)

''اچانک پیاس بجھانے کی منہ زور خواہش نے پھر ایک بار جوش مارا تو سوچ کا تسلسل کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گیا۔ وہ یوں اپنی دنیا میں واپس آگیا جیسے ٹراؤٹ مچھلی چند لمحوں کی اڑان کے بعد پھر پانی میں گر جاتی ہے۔ اسے محسوس ہوا جیسے پانی نہ ملا تو اس کا جسم پھٹ کر چیتھڑوں کی شکل میں فضا میں بکھر جائے گا۔ پیاس اب اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ نہ جانے یہ خواہش، یہ طلب کس نوع کی تھی؟ زندگی میں کسی بھی طلب نے اتنے شدید اور جارحانہ انداز میں اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہ کی تھی۔ حوصلوں اور جرأت کو جمع کر کے اس نے پہلی سیڑھی پر یوں قدم رکھا جیسے کم ہمت تیشہ بردار کو کوہ کنی پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ پھر اس کے بعد اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ اس نے بقیہ سیڑھیاں کس طرح طے کیں۔ اس کے خوابیدہ حواس اس وقت بیدار ہوئے جب اس نے آخری سیڑھی عبور کر لی تھی۔ اس کے بائیں جانب ڈائننگ روم تھا جہاں پیاس بجھانے کا وافر سامان تھا۔ ایک کونے میں قد آدم سفید ریفریجریٹر یوں کھڑا تھا جیسے کوئی سفید پوش آسمانی فرشتہ خیر و برکت کا خزانہ لٹانے آگیا ہو!''

''تتلی کے رنگ''

''تصویر کے زخم'' کے اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شکستِ خواب بھی کسی خواب کا منظر ہے۔ ''تتلی کے رنگ'' سے لئے گئے اقتباس میں اڑ کر تیرنے والی ٹراؤٹ مچھلی، تیشہ بردار، کوہ کنی کا عمل، شدید پیاس۔ یہ علامات و افعال توجہ چاہتے ہیں۔ دھیرے دھیرے ایک خواب تکمیل پا رہا ہے۔ آخری جملہ ''کونے میں قد آدم سفید ریفریجریٹر یوں کھڑا تھا جیسے کوئی سفید آسمانی فرشتہ خیر و برکت کا خزانہ لٹانے آگیا ہو'' انتہائی قابلِ غور ہے۔ تمام شبیہوں کی گردش خوابیدہ حواس میں ہو رہی ہے۔ سفید پوش آسمانی فرشتہ سفید ریفریجریٹر کی علامت اختیار کر گیا ہے۔ ٹیلی ویژن پر ریفریجریٹر کے اشتہارات اسی طرح دکھائے جا رہے ہیں۔ ناصر بغدادی کے یہاں بھی سرریلزم حاوی ہے۔ بیشتر انسانوں میں وہ ایک متبادل حقیقت کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

کے بیان میں خستگی اور ضبط کے عناصر شامل ہوگئے ہیں۔ اپنے مجموعہ ''یادیں'' کے پیش لفظ میں اپنی تخلیق سے ذہنی فعل کا رشتہ اخترالایمان نے کس طرح ظاہر کیا ہے، ملاحظہ کیجئے

''مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی میں لادا جارہا تھا۔ اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی۔ اس لئے کہ میں اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھتا تھا۔ اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے، باغوں میں کھلیان پڑتے تھے۔ کوئلیں کوکتی تھیں۔ پپیہے بولتے تھے۔ وہاں جوہڑ تھے۔ جوہڑ میں نیلوفر اور کنول کھلتے تھے۔ وہاں وہ سب تھا جو ذہنی طور پر مجھے پسند ہے۔ مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو روک نہیں سکا۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا مگر وہ لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔ وقت کے ساتھ اس لڑکے کی تصویر میرے ذہن میں محو ہوگئی۔ میں دنیا کی کشمکش میں کھو گیا اور شاعر ہوگیا۔ پھر ایک بار میرے ذہن میں خیال آیا میں ایک نظم کہوں جس میں اپنے نام کا استعمال کروں۔ بظاہر یہ لڑکا اور اپنے نام والا احساس دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ مگر دراصل ایک ہیں۔ وہ لڑکا جس کی تصویر کبھی میرے ذہن میں تھی اس کا نام اخترالایمان ہے۔ احساس کی اس دوسری منزل کے بعد مجھے اس لڑکے کا جگہ جگہ سفر یاد آیا۔ یہ لڑکا خانہ بدوش تھا۔ کوئی اس کا مستقل گھر نہیں تھا۔ اس کے پاس اسباب معیشت نہیں تھے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ مجھے اس لڑکے سے ہمدردی ہوگئی۔ یہ ہمدردی دراصل مجھے اپنے سے تھی۔ مگر چونکہ میں نے اپنے کو اس لڑکے سے الگ کر لیا تھا اس لئے میری شخصیت دب گئی اس لڑکے کی شخصیت ابھر آئی۔ تخلیقی عمل کی چوتھی منزل یہ تھی کہ میں نے غیر شعوری طور پر اس لڑکے کو اپنا ہیرو بنالیا۔ مجھے اس لڑکے کے دکھوں اور پریشانیوں سے محبت ہوگئی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا وہ میرا موضوع ہے۔ میں نے اس لڑکے کی شخصیت کو روشن کرنا چاہا اور ''ایک لڑکا'' ضمیرِ انسانیت کا علامیہ بن گیا۔ یہ سب خیالات اور احساسات ایک ہی ساتھ ذہن میں نہیں آئے۔ ایک ایک کر کے آئے۔ اور پھر میں انھیں بھول گیا۔ ایک سال گزر گیا دو سال۔ تین سال۔ چار سال۔ قوس قزح کے سب رنگ غائب ہوگئے۔ پھر ایک دن، رات کے ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ذہن میں ایک مصرع گونج رہا تھا

''یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟''

مجھے معلوم تھا یہ لڑکا کون ہے؟ مگر یہ مجھ سے اس قسم کی باز پرس کیوں کر رہا ہے؟ مجھ سے میرے اعمال کا حساب کیوں مانگ رہا ہے؟ اب ذہن کا شعوری فعل شروع ہوا۔ اخترالایمان کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ایک یہ لڑکا جو معصوم تھا اور دوسرا وہ جس نے دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ میں نے نظم کا پہلا بند لکھا اور سو گیا''

خواب میں کس طرح ماضی داخل ہوا اور کس طرح خواب سے نظم برآمد ہوئی! یہ خواب اپنی فکر کا پروردہ اور اپنے لئے دیکھا گیا خواب ہے۔

گلزار نے اپنے مجموعۂ منظومات ''چاند پکھراج کا'' (ہندوستانی ایڈیشن) کے پیش لفظ میں سب سے پہلے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے:

''فلیش بیک سنانے کی بہت عادت ہے مجھے''

یہ فلیش بیک ظاہر ہے کچھ ماضی ہے اور کچھ خواب۔ گلزار کی کئی خوبصورت نظموں میں جو تفصیل پائی جاتی ہے وہ تقریباً خوابوں سے اخذ کی گئی معلوم ہوتی ہے۔ ماضی یا خواب کے بیان پر گلزار کو قدرت حاصل ہے۔ تحلیل نفسی کے ماہر اس بات پر ضرور دھیان دیتے ہیں کہ ماضی اور خواب کو بیان کرنے والا اپنا مسئلہ یا واردات کس طرح بیان کرتا ہے۔ شاعر کے فلیش بیک کی گونج خواب کے گنبد میں محدود نہیں رہ جاتی بلکہ آگے نکل کر کائنات میں پھیل جاتی ہے۔ کالی داس جیسا خوبصورت اور ارفع تصور گلزار کے خواب کے کینوس کو زیادہ وسیع کر دیتا ہے۔ اس اضافی شئے کو شاعر کا جادو اور شاعر کا کمال کہنا چاہیے۔ ان کی نظموں ''ایک دور''۔ ''کھمیری''۔ ''دستک''۔ ''انجل''۔ ''بانجھ''۔ ''گل مہر''۔ ''لمس''۔ ''تخلیق''۔ کا پس منظر خواب جیسا ہے۔ اختصار مانع نہ ہوتا تو یہ نظمیں یہاں نقل کی جاسکتی تھیں۔ پھر بھی ایک چھوٹی نظم اور ایک نظم کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی چنگاری نہیں جلتی کہیں ٹھنڈے بدن میں میرے
سانس کے ٹوٹے ہوئے تاگے لٹکتے ہیں گلے سے
بلبلے پانی کے اٹکے ہوئے، برفاب لہو میں
نیند پتھرائی ہوئی آنکھوں پہ بس رکھی ہوئی ہے
رات بے حس ہے، مرے پہلو میں لکڑی سی پڑی ہے

کوئی چنگاری نہیں جلتی کہیں ٹھنڈے بدن میں میرے
بانجھ ہوگی وہ کوئی جس نے مجھے جنم دیا
...... بانجھ

چاند کیوں ابر کی اس میلی سی گٹھری میں چھپا تھا
خون سے لتھڑی ہوئی رات کے رہ گیروں نے دو زانو پہ گر کر
"روشنی، روشنی"! چلایا تھا، دیکھا تھا فلک کی جانب،
چاند نے گٹھری سے اک ہاتھ نکالا تھا، دکھایا تھا، چمکتا ہوا خنجر
ایک دور (تیسرا اور آخری بند)

اپنی نظموں سے گلزار ایک SURREALIST ثابت ہوتے ہیں اور بالاتر حقیقت کو قبول کرتے ہیں۔

لطف کی بات ہے کہ گلزار ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں لیکن ان کی کہانیوں میں خوابوں کا پس منظر کم اور فلیش بیک زیادہ ملتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خوابوں سے جو لگاؤ شاعری کو ہے وہ کہانی یا دوسری صنف ادب کو نہیں ہے۔ شاعر بھی خواب کے موجد تو نہیں ہوتے لیکن وہ الہامی کیفیت سے گزرتے ہیں اور الہام کا درجہ وحی کے فوراً بعد آتا ہے۔ اس لئے شعراء کے خواب وصول کرنے اور انہیں لاکھوں لوگوں تک پہنچانے کا منفرد انداز ہوتا ہے۔ شاعر کی ذہنی کیفیت براہ راست دو مصرعوں میں منعکس ہوتی ہے۔ ڈرامہ نگار یا افسانہ نگار کا عملِ تخلیق اس سے سوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ڈرامے یا کہانی کی ضرورت کے مطابق اپنی فکر کو ڈھالتا ہے۔ کہانی اگرچہ کسی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے لیکن وہ مبالغہ پر چلتی ہے۔ چنانچہ اس کا کینوس شاعری کے کینوس سے بڑا ہوتا ہے۔ کہانی یا ڈرامہ کی واقعیت اور کردار تخلیق کار کے اپنے متصورہ خاکوں اور تخلیقی اپج کا نتیجہ ہوتے ہیں جس میں اسے مثبت و منفی پہلوؤں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ کسی خواب کے پس منظر کو بلا وجہ اپنی تخلیق میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ ہاں کلاسیکی کہانیوں مثلاً الف لیلیٰ کی داستان، الہ دین کے قصے اور اس طرح کی دیگر طلسمی کہانیوں کے سرچشمے خواب اور تمثیلیں ہی ہیں جو Myths سے جڑی ہوئی ہیں اور ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن گئی ہیں۔ ان دیو پریوں کی کہانیوں کو ہم عادتاً قبول کر لیتے ہیں، ان میں کوئی منطق تلاش نہیں کرتے۔ آج جو سائنسی فکشن لکھے جا رہے ہیں وہ کل سائنسی انکشاف یا دریافت کے کسی خواب کی کارفرمائی کا نتیجہ معلوم ہو سکتے ہیں۔

شعراء کے برعکس کہانی کار اپنے خواب کا خلاصہ براہ راست بیان نہیں کرتے بلکہ اسے کہانی میں بکھیر دیتے اور پھیلا دیتے ہیں یا کسی خواب کی آگہی کو تحلیل کر دیتے ہیں تاکہ خواب عناصر کی پہچان گم ہو جائے اور مبالغہ یا اصلیت ظاہر ہو جائے۔ شعری عمل کو داخلیت سے اور ڈرامائی و افسانوی عمل کو خارجیت سے گزارنا پڑتا ہے۔ اس لئے خواب سے شاعری اور افسانے کا رشتہ الگ الگ پیمانے کا ہوتا ہے۔ اس بات کی صداقت کسی ایسے فن کار کے ذریعہ آزمائی جائے جو بہ یک وقت شاعر بھی ہو اور کہانی کار بھی۔ اوپر ایک ایسے فنکار گلزار کا حوالہ دیا گیا جو یقیناً مناسب تھا۔ ہم تمام عناصر کو الگ الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں تاکہ فلیش بیک، خواب اور تصور کی الگ الگ شناخت قائم کر پائیں۔

ڈرامہ سے متعلق یہاں شیکسپیئر کا ذکر زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کے ڈراموں میں خواب عناصر خصوصی توجہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہاں صرف ڈرامہ "جولیس سیزر" کے باب: ۲، منظر: ۲ کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ کالی طوفانی رات میں سیزر کی بیوی کیلفورنیا تین بار نیند میں چلاتی ہے۔ "بچاؤ۔ وہ سیزر کو قتل کر رہے ہیں"۔ اس کے بعد وہ اپنے خاوند سیزر کو محل سے نکلنے سے روکتی ہے۔ جب کہ سیزر کو سینٹ جانا ہے جہاں ممبران سینٹ اسکی تاجپوشی کریں گے۔ سیزر جانا چاہتا ہے لیکن اسکی بیوی اپنا خوف بیان کرتی ہے۔ منظر کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں

کیلفورنیا: سیزر میں کبھی رسومات کے آڑے نہیں آئی لیکن اب مجھے ان سے خوف آتا ہے جو کچھ سنا اور دیکھا ہے اس کے سوا بھی میرے اندر کوئی ہے۔ جو وہ بھیانک واردات بیان کر رہا ہے جو کبھی وقت نے نہیں دیکھی۔ ایک شیرنی شاہراہوں میں گھس آئی ہے اور قبروں نے منہ پھاڑ کر اپنے مُردے اگل دیئے ہیں۔ خطرناک جنگجو اپنے اپنے منصب اور لشکر کے ساتھ بادلوں پر بیٹھے ہوئے لڑ رہے ہیں جس سے راجدھانی پر خون کی بارش ہو رہی ہے۔ جنگ کا شور ہواؤں میں گونج رہا ہے۔ گھوڑے ہنہنا رہے ہیں اور دم توڑتے ہوئے آدمی چلا رہے ہیں اور بھوت سڑکوں پر چنگھاڑتے دندناتے پھر رہے ہیں۔ سیزر یہ ساری باتیں خلاف معمول ہیں اور میں یقیناً ان سے ڈرتی ہوں۔

سیزر: جس کا خاتمہ طاقتور خداؤں کا منشاء ہو، کیا وہ اپنے اس انجام سے بچ سکتا ہے؟ لیکن سیزر جائے گا کیونکہ یہ سب پیشگوئیاں جیسی سیزر کے لئے ہیں ویسی ہی بالعموم دنیا کے لئے ہیں۔

کیلفورنیا: جب فقیروں کی موت آتی ہے تو دمدار ستارے نظر نہیں آتے۔ شاہزادوں کی موت کا ڈھنڈورا آسمان خود پیٹتے ہیں۔

سیزر: بزدل اپنی موت سے پہلے کئی بار مرتے ہیں۔ بہادر موت کا ذائقہ صرف ایک بار چکھتا ہے۔ اب تک جتنے عجوبوں کا میں نے سنا ان میں سے انسان کا ڈرنا مجھے سب سے عجیب لگتا ہے۔

آرہے ہیں وہ انجانے ہیں لیکن کچھ شناسا چہروں کی مماثلت رکھتے ہیں۔ ماہرینِ خواب کی اصطلاح میں اسے کسی مظہر کا ''جگہ سے بے جگہ ہونا'' کہتے ہیں۔

پروین شاکر کے قطعہ بند اشعار محلِ نظر ہیں۔ ایک نازک کومل دل کی لڑکی سنگدل معاشرے میں جینے کے لئے خوابوں کا سہارا ڈھونڈتی آئی ہے۔ اور خواب اسے آسودہ کرتے رہے ہیں۔ پروین شاکر کے دو اشعار اور دیکھئے۔

دھنک دھنک مری پوروں کے خواب کردے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کردے

رنگ خوشبو میں اگر حل ہو جائے
وصل کا خواب مکمل ہو جائے

دونوں شعروں سے ظاہر ہے کہ خواب دیکھنے والی اپنے خواب کے ذریعہ اصل زندگی کی کوئی تلافی چاہتی ہے۔ دوسرے شعر میں ایمائیت ہے کہ کیا ہونے سے وصل کا خواب مکمل ہو سکتا ہے۔ جب کہ پہلے شعر میں اس یقین کا اظہار ہے کہ کسی کا مخصوص لمس اسے ڈھیر ہونے پر مجبور کردے گا۔ یہ لازی نہیں ہے کہ شاعرہ کے خواب میں اس کے محبوب کی تصویر متحرک رہی ہو۔ یہ اس بات کی رمز بھی ہو سکتی ہے کہ مرد کے بارے میں اس کا اپنا رجحان کیا ہے۔ وہ اگر مرد ہوتی تو عورت کی تسکین کے لئے اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کرتی جو عورت کو پسند آتا۔ کسی نا آسودہ خواہش کی تلافی کا یہ ایک طریقہ ہے۔

یہ چند نمونے غزلوں سے لئے گئے تھے۔ نظم میں چونکہ ایک موضوع کی صراحت کی گنجائش ہوتی ہے اس لئے غزلیہ اشعار کی بہ نسبت نظموں میں ''خواب مناظر'' کا امکان زیادہ پایا جاتا ہے۔ مزید کچھ تحریر کرنے سے پہلے یہ جتادینا ضروری ہے کہ خواب یا خواب کے دہرائے جانے سے کسی نظم کا اعلانیہ رشتہ ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ جب کوئی شعر ہونے لگتا ہے یا نظم وجود میں آنے لگتی ہے تو شاعر کا یہ مقصد نہیں ہو تا کہ وہ اس کے ذریعہ اپنا کوئی خواب بیان کرنے جارہا ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک تخلیق ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لاشعوری طور پر اس میں وہ اپنے کسی خواب کا تجربہ بیان کرجائے۔ چنانچہ شعری عمل میں یہ بھی ضروری نہیں کہ جس نظم یا نظم کے کسی خاص ٹکڑے کو زیرِ بحث لایا جائے اس کے عنوان یا متن میں ''خواب'' یا ''نیند'' جیسے الفاظ کلید کے طور پر موجود ہوں۔ شاعر یہ اعلان نہیں کرتا کہ اس نے کوئی خواب منظوم کیا ہے۔ الفاظ کا مجموعی برتاؤ اور تاثر اور نظم کی پیدا کردہ کیفیت یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ متعلقہ تخلیق کے لمحوں میں شاعر کی ذہنی فضا کیا تھی۔ یا اس نے کون سی خوابناک فضا کو نظم میں داخل کرنا چاہا ہے۔

ہمارے ماضی اور مستقبل کے ساتھ خواب جڑے ہوتے ہیں۔ جب فن کار اپنے فنی وسیلے سے ان کا اظہار کرتا ہے تو اس کے سپاٹ بیان کی تہہ میں ایک اور لہر بھی پائی جاسکتی ہے جو اس کے بیان کو فکر یا مقصد عطا کرتی ہے۔ فلسفی و مفکر شعراء جن کی شاعری ایک مشن یا پیغام ہوتی ہے اونچی ذہنی سطح کے مالک ہوتے ہیں۔ اپنی دماغی ساخت کی بناء پر وہ عوام الناس کے نزدیک جتنے بڑے شاعر ہوتے ہیں اس سے زیادہ بڑے ہدایت کار ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اقبالؔ جیسا بیدار مغز شاعر بھی کہیں کہیں خواب کے محرکات کے زیرِ اثر آجاتا ہے۔ یہ کمالات میں سے ہے کہ اقبالؔ نے خواب کے بجائے اصلیت پر زور دیا اور جہاں کہیں ان کی شاعری میں کسی خواب کی طرف اشارہ ملتا ہے وہ بیداری کی سطح پر ہے اور لوگوں کو بیدار ہونے کا پیغام دیتا ہے۔ اقبالؔ نے ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' لکھی تو دیکھئے خواب سے کونسی دولتِ بیدار حاصل کی۔ کہتے ہیں

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!

اقبال کی زیادہ تر شاعری بیداری کا پیغام ہے۔ لیکن یہ بیداری کی منزل اقبالؔ کا خواب ہی تو تھی (اور ہنوز اہلِ مشرق کے لئے ایک خواب بنی ہوئی ہے) جس کی تڑپ میں انھوں نے فرمایا

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

حقیقتِ منتظر کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کی تمنا حقیقت کو خواب کے بھیس میں دیکھنے ہی کی خواہش کا دوسرا نام ہے۔ اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد اگر کوئی اقبالؔ کی نظموں ''ماں کا خواب''۔ سیر فلک''۔ تاتاری کا خواب''۔ ''ایک آرزو''۔ ''حقیقت حسن''۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کا مطالعہ کرے تو یہ ظاہر ہو جائیگا کہ اقبال نے خواب کو زبردست طاقت سمجھا ہے، اظہار بیان کے لئے۔ ''ایک آرزو'' اور ''محبت'' جیسی نظموں میں ان کی فطرت نگاری میں اجزائے خواب اچھی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' نظم کے کئی اشعار واضح فلیش بیک ہیں اور خواب کا رنگ اختیار کرگئے ہیں۔ اقبال کی کئی نظموں مثلاً ''جواب شکوہ''۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں جو مکالماتی فضا پائی جاتی ہے اس میں بعض آوازوں کا خطیبانہ یا نرم لہجہ متوجہ کرتا ہے۔ کہیں کہیں ''آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا'' جیسے مصرعوں سے محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر خواب میں غیب کی آواز سننے کے لئے بے تاب ہے۔ بلکہ ہمہ تن گوش ہے۔ یہ کیفیت تخیل سے زیادہ خواب سے برآمد ہوتی ہے۔ اقبالؔ کا یہ شعر اس ضمن میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے

ہے دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

اقبال کی شاعری میں خواب کے جو اجزائے نمایاں ہیں وہ دنیا کو آئینۂ عقل دکھا کر عظمتِ انسان کے ماضی کو دہرانا چاہتے ہیں۔ اقبال کے حوالے سے یہ مکرر ثابت ہوتا ہے کہ شاعر نہ تو صرف خواب لکھتا ہے اور نہ اس کے شہ پارے میں صرف خوابوں کو دریافت کیا جاسکتا ہے البتہ جہاں خواب سے کوئی تخلیقی ہرشتہ ہو وہاں سائنسی تشریح کے ذریعہ تخلیق کار کے ذہن اور اس کی تخلیق کے کردار میں ایسی کسی بات کو دریافت کیا جاسکتا ہے جو اس کے ظاہر سے جدا ہو۔

یہاں چند نظم گو شعراء کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ ایک تو میراجی ہیں جن کی شاعری سے ایک منفی کردار برآمد ہوتا ہے۔ میراجی کی شاعری ان کے کریکٹر سے میل کھاتی ہے۔ میرا سین نامی ایک بنگالن سے ناکام عشق ان کے شعری عمل اور طرزِ تصور کو متاثر کر گیا۔ میراجی جنسی خلل اور بدفعلیوں کے شکار تھے اور ان کا خوابِ تخلیق اکثر ایک چپکیلے غبار یا مکڑی کے جال میں پھنسا نظر آتا ہے۔ اور اپنی ہی کشش رکھتا ہے۔ یہ کشش اس فیصلے پر پہنچاتی ہے کہ آپ کسی برے آدمی کے برے خواب کو بھی اسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے جس طرح ایک ڈاکٹر ایڈز کے مریض سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ سائنسی اپروچ یہی ہے۔ اس کے برعکس اختر شیرانی کا خوابِ تخلیق ایک نکتے پر مرکوز نظر آتا ہے۔ اور وہ ہے سلمیٰ۔ یہاں تک کہ اس کے مزاج میں ایک بچے کی سی ضد شامل ہے جسے دل بہلانے کے لئے بس ایک ہی کھلونا چاہئے۔ ایک ہی روپ کو بار بار متصور کرنا شاعر کے خواب تخلیق کو خوابِ اعادہ (RECURRING DREAM) میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس کے یہاں بات سطحی خواب سے آگے نہیں بڑھتی۔

نظموں میں خواب کے اجزاء سے متعلق اس مضمون میں مزید تین شعراء کا ذکر کرنا ہے جن کے نام ہیں ساحر لدھیانوی، اختر الایمان اور گلزار۔ ان تینوں کا تعلق فلمی دنیا سے رہا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے شعبے میں کامیاب رہا ہے۔ لہٰذا ان کی نظموں میں عملِ خواب کے بیان میں تصویریت کا در آنا فطری ہے۔

ساحر لدھیانوی نے کئی خوبصورت خواب پاروں کو اپنی بعض نظموں میں ٹانک دیا ہے۔ ان کی نظم "متاعِ غیر" کا اولین بند دیکھئے۔

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتادے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

ساحر کی نظم "پرچھائیاں" منظوم خواب کی بہترین مثال ہے۔ ایک رومانی فضا دوسری جنگ عظیم کے ہولناک سایوں اور اندیشوں میں بکھر کر رہ گئی۔ شاعر کو ایک تخیل پرست کی سی قدرت بیان حاصل ہے اور وہ خواب کے بدلتے ہوئے مناظر کی شناخت کر سکتا ہے، انھیں بیان کر سکتا ہے۔ یہی نہیں وہ خواب کی واردات کو حسب منشاء رخ اختیار کرنے کی ہدایت بھی دے سکتا ہے کہ کہاں اسے کون سا موڑ مڑنا ہے۔ اس کی یہ صلاحیت اسے نقش گر حادثات ثابت کرتی ہے۔ نظم کے کچھ حصے ادھر ادھر سے نقل کئے جا رہے ہیں۔

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رخ پر
ندی کے ساز پہ ملاح گیت گاتا ہے
تمہارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھلی ہوئی بانہوں میں جھول جاتا ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
میں پھول ٹانک رہا ہوں تمہارے جوڑے میں
تمہاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

[اس نظم کا مصرعۂ تکرار "تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں"۔ عام لوگوں کی آسانی کی خاطر ساحر نے کئی جگہ "خیال و خواب کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں" سے تبدیل کر دیا تھا]

ساحر کے یہاں "خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر" قبیل کے کئی مصرعے بھی پائے جاتے ہیں۔

اختر الایمان اور گلزار کی نظموں میں خواب کے عنصر فلیش بیک کی صورت میں قابل شناخت معلوم ہوتے ہیں۔ اختر الایمان کے یہاں باز آفرینی کا عمل واضح ہے۔ ان کی نظمیں کہیں کہیں ان کے ماضی کو اگل دیتی ہیں اور اس ماضی سے ان کے کسی خواب کا کوئی ٹکڑا برآمد ہو جاتا ہے۔ ان کی نظم "ایک لڑکا" کا وہ مشہور زمانہ مصرعہ "یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟" شکستِ خواب کی کیفیت اور ضمیر کے چبھتے ہوئے سوال کو نرم اور طنزیہ انداز میں اٹھاتا ہے۔ اختر الایمان حافظے کو راست دہرانے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا خواب ان کے اپنے جبر کا شکار معلوم ہوتا ہے جس سے ان

ادب میں خواب کے اجزاء

اپنے یہاں شیخ چلّی کے خواب مشہور ہیں۔ اصلاً یہ خواب نہیں لطیفے ہیں۔ ہر خیالی پلاؤ کو شیخ چلّی کا خواب کہہ دیا جاتا ہے۔ خواب سے متعلق بہت محاورے زبان زد خاص و عام ہیں۔ کھلی آنکھوں خواب دیکھنا، جاگتی آنکھوں کے خواب، ٹٹ پونجیے کے خواب، محلوں کے خواب وغیرہ وغیرہ۔ خوابوں سے ادب کا گہرا لگاؤ ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ تخلیقی عمل خواب دیکھنے کے عمل سے شدید طور پر متاثر نظر آتا ہے۔

خواب کے بارے میں آدمی جس قدر لاعلمی میں رہے گا اسی قدر سرّیت اس کے خوابوں کے اظہار میں پائی جائے گی۔ خواب بینی کا عمل نیند کے طبعی نظام سے جڑا ہوا ہے۔ شاعری افسانے سے زیادہ پرانی صنف ادب ہے اور شعر کے وسیلے سے شاعر کے محو خواب یا محو نیند دماغ کی حالت کا پتہ چلتا رہا ہے۔ شعراء کی بے خوابی اور راتوں میں اختر شماری یوں بھی مشہور ہے۔ یہ سارا معاملہ تخلیقی سطح پر دلچسپ معلوم ہوتا۔ فانی بدایونی کا شعر ہے۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

تخلیق میں ایسی کسی صورت حال کو خواب کی تشریح کرنے والے بعجلت شاعر کے ذہنی خلل، مالیخولیا یا فنا آمادگی سے تعبیر کردیتے ہیں۔ خوابوں سے شعراء بھی اتنے ہی پریشان ہوسکتے ہیں جتنا ایک عام آدمی ہوتا ہے۔ پسندیدہ خواب سے آدمی خوش ہوسکتا ہے تو محرومی کا خواب یا خواب کی ناکامی اسے تھوڑی دیر کے لئے عذاب اور کشش و پیچ میں مبتلا چھوڑ جاتی ہے۔ شعراء کو محرومی اور کامیابی دونوں سے یکساں دلچسپی ہوتی ہے۔ اس صورت حال کی عکاسی ایک شاعر جاں نثار اختر نے ایک مطلع میں اس طرح کی ہے۔

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

شاعری میں شبیہات (IMAGES) ہو بہو خواب کی شبیہات کی نقل ہوں اس کا امکان کم ہے۔ چونکہ شاعری یا ادب بہر حال خوابوں کا بیان نہیں ہے۔ شاعری خود ایک تخلیقی عمل ہے اور تخلیقی ذہن کا عمل ہے جس میں واردات سے زیادہ واردات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت کا سراغ ملتا ہے۔ ممکن ہے کسی شعر یا کہانی کا محرک کوئی خواب ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شعر یا افسانے کا جنم داتا کوئی خواب نہ ہو البتہ تخلیقی عمل کے دوران تخلیق کار کے ذہن میں ایسی فضا تیار ہو جائے جس کے بطن سے وہ خواب جنم لے لے جسے شاعر کا الہام قرار دیا جاتا ہے۔ صحیح علم اور تجسس کی مدد سے پس تخلیق بہت کچھ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ غالب کے اس شعر کو لیجئے۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایسے نجانے کتنے کلاسیکی اشعار ہوں گے جنھیں تکیوں کے غلافوں پر بیل بوٹوں کے ساتھ کاڑھا جاسکتا ہے اور سہاگ رات میں سیج کی زینت بڑھائی جاسکتی ہے لیکن غور فرمائیں تو یہ اشعار ہمیں کسی اور جہاں کی سیر کراتے ہیں۔ غالب کے مذکورہ شعر میں لفظ "نیند" کے ساتھ دماغ، راتیں، بازو اور پریشاں۔ ان الفاظ کی آمد نے جسم کے جنّی و اعصابی نظام کو فطری ترتیب دے دی ہے کہ رومانی ذہن اس کا خوشگوار اثر لیتا ہے اور آدمی کو تسکین حاصل ہوتی ہے جس کے بعد وہ رات کو سکون کی نیند سو سکتا ہے۔

آرٹ کو اس طرح سمجھنے کا اپروچ ابھی عام نہیں ہوا ہے۔ اس کی وجہ خواب کے بارے میں آگہی کی کمی ہے۔ خواب کے بیان کو ہم ایک رسمی سطح پر قبول کرتے ہیں چاہے وہ سطح توہم کی ہو، خوف کی ہو، دلچسپی یا عدم دلچسپی کی۔ الیوژن یا فریب نظر سے خوابوں کی دلکشی البتہ قائم ہے جس سے شعراء کا بیانِ خواب متاثر ہوتا ہے۔ یہ دو شعر دیکھیں۔

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا یا خیال تھا

بہادر شاہ ظفر

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

مومن

خواب اور نیند سے متعلق غزلیہ اشعار کلاسیکی، ترقی پسند، جمال پرست اور سبھی جدید شعراء کے یہاں ملتے ہیں جنھیں محض خیال آفرینی یا لطف بیان کی خاطر پڑھا یا نوٹ کرلیا جاتا ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ شب وہ جو سو رہے مرے پاس آکے خواب میں
جاگے تھے بختِ خفتہ تمنا کے خواب میں

۲۔ آنکھوں کو بند کرکے وہیں کھول دے گر آئے
یوسف کسی کے محو تماشا کے خواب میں

۳۔ کابوس ہیں بتاتے مجھے واں تو رشک ہے
کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں

۴۔ رہتا ہے دھیان دیکھتے ہو جب مجھے نہیں
کیوں چونک چونک پڑتے ہو گھبرا کے خواب میں

مومن

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

جاں نثار اختر

یہ آج راہ بھول کے آئے کدھر سے آپ
یہ خواب میں نے رات کو دیکھا تھا خواب میں

ناصر کاظمی

میں اپنے خواب کے سب رنگ جس سے مانگتی ہوں
وہ آئینہ ہے مگر عکس میں اترتا ہے

اندھے، گونگے، بہرے خواب
آنکھ میں کیسے کیسے خواب
ایک کرن کمرے میں نہ آئے
اور کھلے صحنوں کے خواب
ہر انجانے چہرے پر
کیسے جانے بوجھے خواب

حمیرا رحمان

ق

دل مرے تن کا پھول سا بچہ
پتھروں کے نگر میں پلتا رہا
نیند ہی نیند میں کھلونے لئے
خواب ہی خواب میں بہلتا رہا

پروین شاکر

مومن، جاں نثار اختر، ناصر کاظمی، حمیرا رحمٰن اور پروین شاکر کے محولہ بالا اشعار میں خوابوں کی بعض الجھنیں یا کیفیتیں بیان ہوئی ہیں۔

مومن کے اشعار میں سے پہلا شعر تمنا کے خواب کا مذکور ہے کہ محبوب جو رات کو شاعر کے پہلو میں سو گیا تو اس کا نصیبہ جاگ اٹھا۔ یہاں فرائڈ کے مسلمہ نظریے کا اطلاق ہوتا ہے کہ بعض خوابوں کے پیچھے آدمی کی جنسی خواہش کی تکمیل کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔

مومن کے دوسرے شعر میں یہ خیال کار فرما ہے کہ محوِ خواب شخص کے دماغ کے سوئے ہوئے حصے میں کسی بھی قسم کی شبیہہ نمودار ہو سکتی ہے لیکن جس کی آرزوئے دید آدمی کے لاشعور میں دبی ہوئی ہو وہ اسی کو دیکھنا پسند کرتا ہے۔ کسی دوسری شئے کا نظارہ اسے گوارہ نہیں خواہ وہ شئے کتنی ہی حسین و جمیل کیوں نہ ہو۔

چنانچہ خواب کے عالم میں دماغ اپنے پسندیدہ منظر کو ڈھونڈ رہا ہے۔ اس وقت خواب دیکھنے والے کی ذہنی آنکھ حضرت یوسف کے رخِ جمال کو بھی خاطر میں نہیں لائے گی۔

تیسرے شعر کی جو تشریح "کلیاتِ مومنؔ" کے مرتب ڈاکٹر ضیاء احمد نے کی ہے یہاں نقل کی جاتی ہے:

"کابوس ایک مرض ہے جس میں کثرتِ رطوبتِ دماغ کی وجہ سے آدمی خواب میں حرکات کرتا ہے اور ڈر جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب میرے خواب میں آتا ہے تو مجھ پر عجب کیفیت گزرتی ہے۔ اس کیفیت کو اطباء کابوس تجویز کرتے ہیں۔ (یعنی میرے تاثرِ عشق کو مرضِ دماغ قرار دیتے ہیں۔ کاش یہ لوگ بھی کسی حسین پر عاشق ہوں اور کوئی ان کے خواب میں آئے تو ان کو میری حالت کا صحیح اندازہ ہو۔ اپنے محبوب کے معاملے میں تو رشک (مانع) ہے ہاں کوئی حسین ہو تو اچھا۔ اس کے سوا ان (اطباء) کا مزاج درست ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ عشق ان کی بلا جانے عاشق ہو تو پہچانے۔ الخ"

چوتھے شعر کا مطلب صاف ہے کہ مجھے نہ دیکھنے سے میرا خیال تم پر اتنا حاوی ہو جاتا ہے کہ تمہاری نیند میں خلل پڑتا ہے کیوں کہ میں رہ رہ کر تمہارے خواب میں آنے لگتا ہوں۔ جاں نثار اختر کا شعر مومن کے اس آخری شعر سے کیفیت میں جدا ہے۔ شاعر قصداً سو بھی جائے تو محبوب کے خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا جو خواب میں اس کی پلکوں کے دریچوں سے جھانکتا رہتا ہے۔ اور اس کی توجہ اس میں مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسے نوم توجہ کا خواب (HYPNOGOGIC DREAM) قرار دیا جا سکتا ہے۔ ناصر کاظمی کے خواب کے بعد اس کا اصلیت میں تبدیل ہونا ایک قسم کی ٹیلی پیتھی کی علامت ہے۔ اسے "پیش مدرکہ" خواب بھی کہا جا سکتا ہے۔

حمیرا رحمان کے شعر میں خواب الٹی (REVERSE) چال چلتا نظر آتا ہے۔ جو ثانی مصرع سے ظاہر ہے۔ "وہ آئینہ ہے مگر عکس میں اترتا ہے"۔ عکس آئینے میں اترتا تو چال سیدھی ہوتی ہے۔ ذہنی کیفیت یہ ہے کہ جو کبھی آئینہ تھا وہ اب دھندلی شبیہہ یا سائے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ لہٰذا خواب دیکھنے والی کے من پسند رنگ اوجھل ہو گئے ہیں۔ مطلع میں جن خوابوں کا ذکر ہے وہ اپنی شخصیت نہیں بنا پا رہے ہیں۔ وہ بینائی، گویائی اور سماعت تینوں سے محروم ہیں۔ دوسرے شعر میں "کمرہ" شاعرہ کی زندگی کے رقبے کی علامت ہے۔ ایک منہ بند مکان ہے جس میں ایک کرن کا در آنا ممکن نہیں ہے۔ یہ گھٹن کا خواب ہے اور شاعرہ کے اپنے ہی ایک حصے کی عکاسی کر رہا ہے۔ تیسرے شعر میں جن چہروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اجنبی ہیں لیکن اپنے سے لگتے ہیں۔ یعنی جو ہیولے یا شبیہات خواب میں نظر

ایک غریبوں والی دلہن
تھوک رہی ہے خونیں بلغم
پوچھ رہی ہے دہائی دے کر
آتے جاتے ہر راہی سے
''میری ارتھی کب اٹھے گی
میرا بابل کب گاؤ گے؟''

''بابل'' نام کی یہ نظم بہ یک وقت ایک رخصتی تھی اور ایک مرثیہ بھی۔ شہر کے ایک ہی علاقے میں الگ الگ طرز ہائے زندگی کے تضاد نے میرے مشاہدے کے ذریعہ میرے ضمیر کو جھنجوڑا اور اس نے ایک آواز پیدا کی۔ کوئی اسے احتجاج بھی کہہ سکتا ہے۔ نظم دو تین رسالوں میں چھپی اور مجھے کچھ خطوط موصول ہوئے۔ ایک خط ڈھاکہ بنگلہ دیش کے ایک رفیوجی کیمپ سے آیا تھا جہاں بتایا جاتا ہے کہ پونے دو لاکھ بہاری مسلمان بدترین زندگی گذار رہے تھے۔ خط لکھنے والے کو میری نظم نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا ہم یہاں جس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا اندازہ کوئی دور سے نہیں لگا سکتا۔ ہماری بہنیں اور بیٹیاں یوں ہی برباد ہو رہی ہیں، ان کی شادیاں نہیں ہو رہی ہیں۔ آپ کی اس نظم نے ڈھارس بندھائی کہ کہیں کوئی ہے جو ہم سے دور رہ کر بھی ہم بیکسوں کے لئے آواز اٹھاتا ہے۔ چند مہینوں بعد اپنی ایک اور تخلیق کے رد عمل میں مجھے آئرلینڈ کی ایک جلاوطن تنظیم سے وابستہ کسی ایشیائی مہاجر کا خط موصول ہوا تھا۔ دھیان پڑتا ہے اس نے میری نظم ''مالکِ یوم الدین'' کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ نظم تشدّد اور جارحیت کے خلاف انسانیت کی آواز ہے۔ آپ نے امن کیلئے یہ دعائیہ لکھ کر ہماری آواز میں آواز ملائی ہے چنانچہ ہم خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔

خط پڑھ کر میں نے جی میں کہا ''آمین''۔

اپنی نظموں اور غزلیہ اشعار کی ایسی پذیرائی کے باوجود میں ایک ہی ذہن کے لوگوں سے بار بار داد وصول کرنے کی خاطر اپنے آپ کو دہرا نہیں سکا۔ میں اپنی اس ناکامی سے مطمئن ہوں۔ مقام شکر ہے کہ میری آواز میرے ضمیر کی آواز بن کر نکلے اور دنیا کے کچھ لوگ اس میں اپنی آواز ملا دیں۔ پچھلے سال اپنی بیٹی اور بیٹے کی شادی کے موقع پر میں اپنی بیوی کے اصرار کے باوجود نہ تو بیٹی کیلئے کوئی رخصتی نامہ لکھ سکا اور نہ بیٹے کا سہرا منظوم کر پایا۔ میری بیوی کی شکایت آج تک باقی ہے۔ اب بھی وہ کبھی کبھی مجھے شک کی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے میں شاعر نہیں ہوں۔ حالانکہ پیشتر میں اس کی ذات اور رفاقت کے کئی رنگ شاعری میں بھر چکا ہوں۔ میں نے اس کے کچن، اس کی عینک، چوڑیوں، خفگی اور محبت کے انداز، غصے اور بلڈ پریشر اور اپنی چھوٹی بیٹی کی گڑیا تک کو موضوع سخن بنایا اور سخن فہموں سے اسکی داد پائی لیکن بیگم کی فرمائش کی تکمیل اس وقت میں نہیں کر پایا جب اُس نے مجھ سے اسکی امید کی تھی۔ دراصل شاعر کی ذاتی اور کائناتی مسرتوں کے بیچ اکثر طویل فاصلے ہوتے ہیں۔ اوروں کی طرح شاعر بھی فطرت کے ساتھ مفاہمانہ رویہ ہی اپناتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ اپنی ذات اور معاملات کائنات پر ایک حریفانہ نظر بھی ڈال لیتا ہے۔ اقلیم دل میں اترنا شاعر کا آخری مقصد ہے۔ میری نظر میں یہی ترقی پسندی ہے، یہی جدیدیت ہے اور یہی مابعد جدیت بھی۔ نقادوں کی لن ترانی کا اثر میں نہیں لیتا۔ میں ان کی پیشہ ورانہ گستاخی اور مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ خیر میں کہہ رہا تھا کہ ہنگامے اور حادثے باطنی نوعیت کے ہیں یا خارجی قسم کے، شاعری کی آمد اس پر منحصر ہوتی ہے اور جس میں متاثر ہونے کی صلاحیت زیادہ ہو وہی شاعر دنیا کو زیادہ متاثر بھی کرتا ہے۔ وقتی طور پر کسی جذبے سے مغلوب ہو کر آواز اٹھانا ایک بات ہے لیکن دیرپا اثر قائم کرنے والا شعری عمل الگ شے ہے۔ نہ ہر خوشی کی بات شاعر کو ہنسا دیتی ہے اور نہ غم کی ہر واردات پر وہ رو پڑتا ہے۔ البتہ طبیعت کا اضطراب اور انجذاب ہر صورت میں شاعر کے کام آتا ہے۔ داخلی آہنگ کے عمدہ اشعار کبھی کبھی اپنی ذات سے لاتعلق ہو کر ہی کہے گئے ہیں اگرچہ وہ محض کسی انتہائی باطنی کیفیت کا اظہار ہوتے ہیں۔ اسی طرح خارجی محرکات کے زیر اثر لکھی جانے والی نظمیں یا غزلیہ اشعار شاعر کی ذاتی شرکت کے بغیر ادھورے یا بے اثر رہ جاتے ہیں۔

ہم جس واردات سے متاثر ہوتے ہیں اس کا کون سا عنصر ہماری شاعری کی گھٹی میں آن پڑتا ہے یہ دو طرح نہایت اہم ہے۔ ایک تو اس سے ہمارے لہجے کی تعمیر ہوتی ہے۔ دوسرے اس سے خود اُس حادثے، سانحے یا جذبے کی صورت گری شاعر کر پاتا ہے جو اس کی آمدِ شعر کا سبب بنتا ہے۔ واردات فی الحقیقت وقوع پذیر ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ واردات محض شاعر کے تخیل میں رونما ہو۔ بات کچھ بھی ہو، کچھ انوکھا کہنے کی اہلیت کسی خیال کی سازش، کسی واقعہ یا واردات سے انوکھے طور پر عہدہ برآمد ہونے کی صلاحیت پر منحصر ہوتی ہے۔ بیشک ہمارا ادراک لوگوں کی جمالیاتی حس سے اس طور جڑا ہوتا ہے کہ ہم کچھ پہنچانے اور وہ اسے وصول کرنے کے مقام پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے شاعر کو ترسیل کا ذمہ دار ہونا چاہئے۔ شعری عمل کو ایک معمہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن شاعری کو جہاں تک ممکن ہو معمہ نہیں بننا چاہئے۔ اگر ترسیل کامیاب ہے تو شاعر انقلاب لا سکتا ہے۔ وہ اپنی آتش نوائی سے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر سکتا ہے۔ حسن و محبت کے نغمات سے عوام کو رجھا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا تخیل اچھوتا ہو جو اسکی آواز کو موثر بنادے اور عوام کو جلد زائل نہ ہونے

والے کسی خوشگوار، پُر درد، پُر سوز یا اداسی بھرے احساس میں مبتلا کر دے۔
اس ضمن میں مجھے کہہ لینے دیجئے کہ باذوق سامعین یا قارئین کی سخن فہمی کا تفاعل شاعر کے بہت کام آتا ہے۔ کبھی کبھی وہ کسی شعر کے ایک سے زیادہ معنی، اپنی فہم اور حالات کے مطابق برآمد کر کے شاعر پر احسان کرتے ہیں۔ کئی بار میرے سامعین یا قارئین نے مجھے اپنی سخن فہمی کے ذریعہ خوشگوار حیرت میں مبتلا اور سرشار کر دیا جس سے میری تخلیقی اپج اور آواز کی رسائی میں اضافہ ہوا۔

ایسے کئی اتفاقات مجھے یاد ہیں۔ آپ بس ایک واقعہ سن لیجئے۔ میری چھ سات اشعار کی ایک غزل میری کامیاب غزلوں میں شمار کی جاتی ہے جس کا مطلع ہے۔

گھنے چناروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں کس لئے اور کیوں کھڑے ہو
نہ آئے گا کوئی تم سے ملنے تم اپنی ہی ضد پہ کیوں اڑے ہو

اس کا ایک شعر میری اپنی ہی کسی صورتِ حال کا عکاس تھا۔ شعر یوں تھا۔

تمہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے تمہاری طاقت گھٹی نہیں ہے
چلو اٹھو، اپنے ہاتھ جھاڑو، تم اتفاقاً ہی گر پڑے ہو

بعض لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ کیوں پسند کرتے تھے میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ میرا خیال تھا جن معنوں میں میں نے یہ شعر موزوں کیا ہے لوگ اس کے وہی معنی لیتے ہوں گے۔ ایک رات ایک عوامی مشاعرے میں جسے ایک ممتاز سیاسی لیڈر نے اپنے علاقے میں منعقد کیا تھا، میں نے اپنی غزل پڑھی۔ اس شعر پر مجھے بے پناہ داد ملی۔ جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد مجھے کچھ پرستاروں نے گھیر لیا جو ظاہر ہے اچھے خاصے سخن فہم تھے۔ ان دنوں لوک سبھا (پارلیمنٹ) یا کئی صوبوں میں حکومتیں غیر مستحکم تھیں۔ کوئی حکومت اچانک کسی وقت گر پڑتی تھی۔ اور گری ہوئی پارٹی دوبارہ کھڑی ہونے کے لئے سیاسی توڑ جوڑ کی کوشش شروع کر دیتی تھی۔ اکّا دکّا گری ہوئی حکومتیں پھر بحال ہونے میں کامیاب بھی ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ مشاعرے کے سامعین نے اس پس منظر میں میرے اس شعر کو طنز کے طور پر قبول کیا۔

ٹھیک انہی دنوں میں آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرے میں میری یہ غزل نشر ہوئی جسے میرے ایک دوست سمیر مکھرجی نے سنا۔ مکھرجی کی عمر تقریباً ستر سال ہو گی اور وہ اپنے ایام جوانی سے [illegible] ہیں۔ بغیر چھڑی اور بیوی کے سہارے کے وہ چل نہیں سکتے۔ مکھرجی اردو کے بڑے رسیا ہیں اور بڑی اچھی اردو بولتے ہیں۔ انہوں نے ریڈیو سے غزل سننے کے بعد مجھے فون کیا اور بتایا کہ دو تین دن پہلے وہ غسل خانے میں پھسل کر گر گئے تھے اور اپنی توانائی اور ہمت کھو بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر نے پیر میں ہلکے سے فریکچر کا خدشہ ظاہر کر کے ان کی مایوسی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اپنی بیچارگی پر وہ دو دن آنسو بہاتے رہے ہیں۔ بستر سے اٹھا نہیں جاتا تھا کہ گذشتہ رات اتفاقاً انہوں نے ریڈیو سے یہ غزل سنی اور اس شعر نے ان کے اندر اچانک ایسی ہمت پیدا کی کہ وہ پلنگ سے اٹھ کر بیوی (انیتا) کا سہارا لے کر چلنے لگے۔ انہوں نے کہا ''اس شعر نے میری مسیحائی کی۔ میرا معالج میرے اندر جینے کی امنگ پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ جبکہ اس شعر نے امید اور رجائیت کی لہر دوڑا دی۔ یہ شعر میں نے رومن اسکرپٹ میں نوٹ کر لیا ہے''۔

سامعین یقین فرمائیں اُس وقت حضورِ رب میرا انکسار دوچند ہو گیا تھا۔ اور ایک سکنڈ میں نے سوچا تھا کہ اگر خدا میرے ان لفظوں کا اثر واپس لے لے تو؟ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے آناً فاناً پسینہ سا آ گیا۔ اور مجھے لگا اب میرے گلے سے آواز نہیں نکلے گی۔ مکھرجی صاحب ایک عجیب نفسیات کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ابتک اس شعر کو اپنا چارہ گر سمجھ رکھا ہے اور جب ان کی جسمانی تکلیف بڑھتی ہے وہ اس کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ ایک اچھا نسخہ ہے۔ مجھے یہ بتانے دیجئے کہ نہ تو مجھے اپنے اس شعر پر ناز ہے اور نہ وہ نظم جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا، ایسی تخلیق ہے جس کا میں ڈھنڈورا پیٹوں۔

جہاں تک عشق اور جمالیات سے مربوط شاعری کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں شاعر کی آواز سے زیادہ اس کا وجدان اور اندازِ بیان متوجہ کرتا ہے۔ اور اس شاعری کا سرچشمہ شاعر کے محسوسات، بعض رشتوں سے اسکی ذہنی، دلی، جسمانی یا روحانی وابستگی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی خوشی، سرجوشی، امنگیں اور ناکامیاں ہوتی ہیں۔ ایسی شاعری انسانی وفطری حسن و جمال سے پیوستہ تخیل کی کار فرمائی سے وجود میں آتی ہے۔ شاعر عوامی ادراک سے اپنی پسند اور ناپسند، اپنی محبت اور نفرت تک کی داد چاہتا ہے۔ میری دانست میں شاعری کا سودا اسی مقام پر طے پاتا ہے۔ لیکن یہ باتیں شاعری ہونے کے باوجود ضمیر کی آواز نہیں کہی جا سکتیں۔ آواز کو جہاں جن معنوں میں شاعر کی آواز کہا جا سکتا ہے وہاں اس کا تعلق فرد یا معاشرے کے روابط سے ضرور ہوتا ہے اور اس میں خودی اور ضمیر کی کوئی صورت حال ضرور ملوث ہوتی ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ ایسی آواز فنکار سر [illegible] گفتگو نہیں ہو سکتی۔ [illegible]

شیر ارو ضمیر کی [illegible]

[illegible]

سینے میں ایک معصوم [illegible]



ف۔س۔اعجاز

نام: فیروز سلطان
قلمی اور معروف نام: ف۔س۔اعجاز
پیدائش: ۲-۵-۱۹۴۸ء، دہلی (اسکول سرٹی فکیٹ کے مطابق)
والدین: محمد ابراہیم (مرحوم)۔ فاطمہ بیگم (مرحومہ)
اہل و عیال: گلنار بیگم (اہلیہ)، دو بیٹیاں الفیہ اور انشاء، ایک بیٹا ثاقب
تعلیم: ابتدائی فتحپوری مسلم ہائی اسکول، دہلی۔ میٹرک پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول، کلکتہ سے ۶۴ء میں۔ بی۔ اے۔ سینٹ زیویرس کالج، کلکتہ سے ۶۹ء میں۔ وکالت، ادھوری، کلکتہ یونیورسٹی۔

تصانیف:
(۱) تنہائیاں — غزلیں۔نظمیں ۱۹۸۲ء
(۲) مالکِ یوم الدین — نظمیں ۱۹۸۶ء
(۳) اسلامی تصوف اور صوفی
تصوف پر مضمون اور مولانا جلال الدین رومی کی حکایات کا انتخاب — ۱۹۸۶ء
(۴) موسم بدل رہا ہے — غزلیات ۱۹۸۸ء
(۵) لاشریک — نظمیں ۱۹۸۹ء
(۶) یوروپ کا سفر نامہ
ماسکو۔ ناروے۔ ڈنمارک۔ لندن۔ پیرس کا سفر نامہ — ۱۹۹۱ء
(۷) خوابوں کے اسرار — نفسیات و ادب
خواب اور نیند سے متعلق ایک امریکی کتاب کا ترجمہ مع طبعزاد مضمون "ادب میں خواب کے اجزاء"
۱۹۹۷ء
(۸) نیتاجی سبھاش چندر بوس
سسِر کمار بوس کی تحریر کردہ نیتاجی کی سوانح حیات "The Flaming Sword Forever Unsheathed" کا ترجمہ — ۱۹۹۸ء
ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ۔ حکومتِ ہند
(۹) موسم بدل رہا ہے (ہندی) — غزلیات ۱۹۹۹ء
(۱۰) صاحبِ فن — نظمیں ۲۰۰۰ء

آئندہ تصنیفات:
(۱) ماہنامہ انشاء کے اداریوں کا انتخاب (۲) تنقیدی مضامین
(۳) انگریزی سے مترجمہ نظمیں (۴) غزلوں کا مجموعہ

صحافت: ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کا اوّلین اردو ڈائجسٹ ("فانوس ڈائجسٹ") کلکتہ سے اپنے برادر محترم کے ساتھ شائع کیا جو بنگال کے اوّلین آفسٹ جریدے کے طور پر شروع ہوا۔ ۱۳ شمارے نکلے۔ ۱۹۸۶ء میں ماہنامہ انشاء کا اجراء کیا جو ابتک شائع ہو رہا ہے اور لگاتار اشاعت کے ۱۴ سال مکمل کر کے بنگال میں ایک ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔ انشاء کے اب تک ۱۳ر متنوع موضوعات پر خصوصی شمارے منظر عام پر آئے ہیں۔

انعامات: مغربی بنگال، اتر پردیش اور بہار کی اردو اکاڈمیوں کی جانب سے مختلف کتابوں پر انعامات حاصل ہوئے۔ آل انڈیا میر اکاڈمی، لکھنؤ سے میر ایوارڈ۔ ڈنمارک کی مہاجر ایشیائی ادیبوں کی تنظیم کی جانب سے "انشاء عالمی اردو افسانے" نمبر پر ایک ایوارڈ۔

اسفار: ماسکو۔ اوسلو (ناروے) کوپن ہیگن (ڈنمارک) لندن۔ پیرس ۱۹۹۰ء / دبئی ۱۹۹۷ء

میں اور میری آواز

(۲۱/ نومبر ۹۹ء کو ساہتیہ اکاڈمی، دہلی کے سیمینار "میں اور میری آواز" میں پڑھا گیا مضمون)

اپنی شاعری کے بارے میں مجھے نثر میں کچھ کہنا ہے۔ مجھے پانچ منٹوں میں یہ بتانا ہے کہ میری آواز کیا ہے اور کارخانۂ سخن میں میرے لئے تکلم اور ناگفتی کی صورتیں کیا ہو سکتی ہیں۔ میں کہاں چپ رہ جاتا ہوں اور کہاں بول اٹھتا ہوں۔

شاعری یوں تو لفظوں کا ایک کھیل ہے۔ انسان ایک حیوانِ ناطق ہے۔ میں بھی ایک آواز کا مالک ہوں۔ میری آواز مالِ مسروقہ نہیں میری اپنی ملکیت ہے۔ میں فطرت کا بیحد شکر گذار ہوں جس نے مجھے شاعر بنایا اور میری غیر مترنم آواز کے قدردان بھی پیدا کر دئے۔ یقین جانئے میرا میری آواز کے ساتھ ایک مجبور کن رشتہ ہے۔ میں جب چاہوں غزل یا نظم کی پابند زبان میں گفتگو کرنے لگوں یہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ شاعر ہوں گویا نہیں کہ جب جی میں آئے راگ الاپنے لگوں اور اپنی گونج سے لطف و انبساط حاصل کر لوں۔ میں اپنی آواز کے آگے بے بس ہوں۔ اکثر کسی موہوم خیال نے کئی گھنٹے، کئی راتیں اور کئی کئی دن پریشان رکھا کہ میں اسے ایک شعر یا نظم کے سانچے میں ڈھال دوں لیکن دماغ سوزی کام نہ آئی۔ اور میرے اندر سے وہ آواز نہیں نکلی جسے میں خود سننا اور دیکھنا چاہتا تھا اور جسے ایک جگر مگر ہیرے کی تراش دے کر سخن کی شکل میں لوگوں کی نذر کرنا چاہتا تھا۔ خیال ذہن میں تھا، الفاظ نوکِ قلم سے دور نہیں تھے لیکن اچھی نیت اور ارادے کے باوجود اپنی آواز نہیں لکھ سکا۔ اور یوں تو کئی بے ہنگم، کئی پھٹی آوازیں کاغذ کے ریشوں میں منتقل ہوتی رہیں۔ جب یقین ہو چلا کہ میری آواز میری فرماں بردار نہیں ہو سکتی تو اسکی آزادہ روی کی قدر و قیمت سمجھ میں آنے لگی۔ آپ اعتبار کریں اس میں ذرہ برابر خود پسندی شامل نہیں ہے۔

خود پسندی اس میں شامل نہیں، اس کے ڈھیروں ثبوت میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ لیکن یہاں وقت شرط ہے۔ اس لئے اشاروں کنایوں میں ہی بات کی جا سکتی ہے۔ جب کوئی دوست یا پرستار فرمائش لئے آتا ہے کہ آپ میرے بیٹے یا بیٹی کی شادی کے موقع پر سہرا یا رخصتی لکھدیں تو مجھے ندامت ہوتی ہے۔ کئی بار معقول نذرانے کی پیشکش کے باوجود طبیعت ادھر نہیں آسکی۔ البتہ اپنے ان بہی خواہوں کو میں نے ایسے شاعروں سے ملوادیا جو اس قسم کی مشقت کیلئے مشہور ہیں۔ اور دولہا دلہن اور رشتے داروں کے نام بدل بدل کر ایک ہی کلام بار بار فروخت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بلکہ اس محنت کے طفیل ویسے اور نکاح کی خوشبودار اور مرغن ڈشوں تک سر کے بل جا پہنچنے میں بھی انہیں تامّل نہیں ہوتا۔ کیا کروں مجبور ہوں۔ میرے پرستار شاید زیادہ نہ ہوں لیکن میری آواز پہچاننے والے کم نہیں۔ یا شاید ابتدا ہی سے میرے پرستاروں نے مجھے پسند اور ناپسند کی ایک کٹھن راہ پر لگا رکھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں بے قصور ہوں۔ میں شاعری کو مشینی عمل سے نہیں گذار پاتا۔ برسوں پہلے کی ایک بات یاد آرہی ہے۔ میں جب ویلیسلی اسکوائر کے علاقے میں رہتا تھا۔ ایک رات ہمارے برابر والے مکان میں ایک امیر ڈاکٹر کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ پوری عمارت دلہن بنی ہوئی تھی۔ فلمی گانے زور سے بجائے جا رہے تھے۔ بلڈنگ کے سامنے والی سڑک پر کچھ فقیر اور مفلس قسم کے لوگ جھگیوں میں رہا کرتے تھے۔ وہاں ایک چھریرے بدن والی خوش شکل لڑکی رہا کرتی تھی۔ اس کا باپ لنگڑا فقیر تھا۔ وہ درزیوں کی پھینکی ہوئی رنگ برنگی کترنوں سے گدڑیاں سیا کرتا تھا۔ اس نادار لڑکی پر محلے کے کچھ بوالہوس لڑکے وقت سے پہلے شباب لے آئے تھے۔ ہر آئے دن ہم سنتے کہ اب اس کا بیاہ ہونے والا ہے۔ لیکن اس کا بیاہ کبھی نہیں ہوا۔ اُس سرد رات میں جب ڈاکٹر کی کوٹھی میں شادیانے بج رہے تھے، ہر دو گیتوں کے درمیانی وقفے یعنی Pause میں مجھے اس لڑکی کے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی۔ کھانسی کی ٹھنک بتاتی تھی کہ لڑکی ٹی بی کی مریض ہو گئی ہے۔ جب دلہن رخصت کی جا رہی تھی ٹھیک اس وقت اس بھکارن کو کھانسی کا لمبا دورہ پڑ گیا۔ میں نے اپنے برآمدے سے دیکھا دلہن کا ایک بھائی اس بھکارن کو منحوس سمجھ کر اسے کہیں دور جانے کی تاکید کر رہا تھا۔ اس بات نے مجھے متاثر کیا اور آناً فاناً بارہ مصرعوں کی ایک پابند نظم تیار ہوئی۔ نظم یوں تھی :

ایک امیروں والی دلہن
نئی نئی خوشیوں میں مدغم
جائے گھر سے بدائی لے کر
ماں، بابا، بہنوں، بھائی سے
پوچھے "ڈولی اب اٹھے گی
مجھ کو لینے کب آؤ گے؟"

زندگی کمزور ہوگئی۔ وہ پاگل ہوا کی طرح بھاگتی ہوئی پوتی کے گھر کی طرف چلی۔ راستے میں اسے خون کے دھبّے ملے۔ قتل شدہ اجسام ملے، دم توڑتے لوگ ملے، جھلسی ہوئی لاشیں ملیں اور اس نے پوتی کے گھر میں داخل ہونا چاہا تو اس نے اپنے داماد کی لاش کو گھر کی چوکھٹ پر پڑا پایا۔ اسے اس لاش کو لانگ کر اندر جانا پڑا۔ اس کی پوتی کا بیٹا ماں کی چھاتی کی جگہ انگوٹھا چوس رہا تھا اور اس کی پوتی کی دونوں چھاتیاں اس طرح غائب تھیں جیسے کبھی سینے پر اگی ہی نہیں تھیں۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں ہرے بانسوں کے مشرقی جھنڈ میں آگ لگی تھی——

اردو زبان: بنگلہ زبان

اس نے اپنی پوتی کے بیٹے کے لئے اپنی زبان بدل دی——

پوتی کے بیٹے کو سینے سے چمٹائے ہرے بانسوں کے جھنڈ کے چک پوسٹ سے نکل کر قوس قزح کے اس ملک میں اسے ہر چیز پرانی ہوتے بھی، نئی لگی۔

اس کی مٹی میں اس کی نہ جانے کتنی پشتیں دفن تھیں مگر آج وہ یہاں کے لئے پھر نئی ہوگئی تھی۔ ان گنت لوگ آئے تھے، سب اپنے آپ کو مظلوم کہتے تھے—— آخر ظالم کون تھا——؟ قوس قزح کا ملک تو اس کا اپنا ملک تھا پھر لوگ اسے اجنبی کیوں سمجھ رہے تھے——؟

میں ہمیشہ اسی طرح اس کی آنکھوں سے لپٹا رہا—— کہیں کوئی عورت بیماری سے مر رہی تھی اور کہیں کوئی بچہ دم توڑ رہا تھا—— یہ اپنی پوتی کے بیٹے کو چھاتی سے لگائے اس کیمپ تک بھاگتی رہی تاکہ وہ اپنے خاندان کے اس آخری چراغ کو یہاں کی نت نئی بیماریوں سے بچالے۔ اب میں اس کی آنکھوں میں کیچ کے ساتھ مل گیا تھا۔ اسے کالرا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی پوتی کے بیٹے کو بہت دور ایک جگہ لٹا دیا تھا اور خود تڑپ رہی تھی

—— تڑپ رہی تھی ——

ایک سماجی کارکن اس کے پاس سے یہ کہتے ہوئے تیزی سے گزر گیا کہ "ان لوگوں کی موت اسی دھرتی پر تھی——"

اس عورت کو یہ آواز بہت بری لگی۔

وہ عالمِ تشنج میں ہاتھ پاؤں کھینچ رہی تھی۔ اس نے بہت دکھ سے اپنی پوتی کے بیٹے کو دیکھا جو شاید دور دھوپ میں رو رہا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور زمین پر کئی بار اپنا ہاتھ پٹکا اور پھر اس کی گردن ڈھلک گئی——

میں اب بھی اس کی پلکوں کے نیچے زندہ ہوں—— کچھ دیر بعد میں بھی دھوپ کی تمازت میں گم ہو جاؤں گا—— اس کی پوتی کا بیٹا رو رہا ہے۔

اس تنہا بیٹے کا شجرۂ نسب کون مرتب کرے گا——؟

کون——؟

میری ہنسی اور میرے آنسو کے درمیان کتنا فاصلہ ہے یہ میں نہیں جانتا اور نہ جاننے کا خواہش مند ہوں مگر یہ سچ ہے کہ جب موذن فجر کی اذان دے رہا تھا تو میں چیختا چلاتا دائی کے ہاتھوں میں گرا تھا۔

اور پھر اسی دن سے میری عمر کی برف پگھلنے لگی تھی، میں بوند بوند فنا کی طرف بڑھ رہا تھا مگر میں کبھی نہیں رویا اور نہ کبھی غمزدہ ہوا۔

میری جوانی درد، گھٹن، استحصال، ہنگامے اور افراتفری میں پروان چڑھی، آنسو کبھی نہیں نکلے ——ہنسی اور تبسم میری محنت کے ساتھ ساتھ رہے۔ میرے دوست وہ بانکے، سر پھرے، متوالے اور بھرپور محبت کرنے والے نوجوان تھے جن کی صرف ایک دھن تھی۔ آس پاس اغل بغل، اڑوس پڑوس اور اپنی مٹی میں بسنے والوں کو جبر، ظلم، استحصال اور غلامی سے نجات دلانی ہے۔ ہماری خواہش، ہمارے جذبوں اور ہماری اڑان کو ہزار کوشش کے باوجود ظلم کرنے والے استحصال کرنے والے اپنی گرفت میں نہ لے سکے۔ ہماری مسکراہٹوں کو جن میں مونالیزا کی ساری کیفیت تھی، چھین نہ سکے اور پھر ایک دن ایسا آیا جب ہمارے صادق جذبوں نے ان کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا۔

آج میرے پاس زندگی کی بہت کم بوندیں بچ گئی ہیں، فنا کے میں اتنا قریب ہوں کہ کبھی کسی وقت بھی میرے جسم کو چادر سے ڈھانپا جا سکتا ہے۔ میں ہنسی اور تبسم سے دور آنسو اور غم کو گھونٹ گھونٹ پی رہا ہوں۔!

آج اتنے دنوں بعد یہ آنسو اور یہ غم میری زندگی میں کہاں سے گھس آئے۔

میں تو کبھی نہیں رویا، اس وقت بھی نہیں رویا جب میرے پاؤں میں چھ گولیاں لگیں اور میری گردن پر وار کیا گیا۔ میرے دو عزیز دوست میرے سامنے خون کی قے کرتے کرتے مر گئے، میں آج عمر کی اس سرحد پر پہنچ کر رو رہا ہوں جہاں جینے کی، زندہ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہاں میں رو رہا ہوں کہ مجھ پر سماجی، مذہبی اور سیاسی استحصال کرنے کا الزام لگایا گیا ہے، ہاں میں رو رہا ہوں کہ آج مجھ سے سوالات کئے جائیں گے۔

میں کون ہوں——؟

میرا کیا کردار ہے——؟

میں کیا چاہتا ہوں——؟

آج میں پہلی بار رو رہا ہوں۔ کیا واقعی سب جھوٹ ہے۔ نہیں سب کچھ جھوٹ نہیں ہو سکتا جس طرح سب کچھ سچ نہیں ہو سکتا۔

لیکن میرے سچ پر یہ جھوٹ کی چادر کس نے ڈھانپ دی؟۔ آخر میرا اتنا سچ لوگوں کو کیوں چبھنے لگا؟

سچ تو آج سے ایک ماہ پہلے کا وہ اعلان تھا ـــــ جو لوگ سیاسی طور سے آزمائشوں، ابتلاؤں اور دشواریوں کا شکار رہنے تھے انہیں اعزاز و انعام سے نوازا جائیگا۔

میں آج یہ بتانے جاؤں گا کہ میں کون ہوں؟ میں ہی وہ ہوں جس نے یہ کیا تھا، وہ کیا تھا، اسطرح کیا تھا؟

نہیں یہ غلط ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔!

اور پھر ایسی حالت میں جب کہ معاوضہ پانے والے، عزت و احترام سے سرفراز ہونے والے کئی لوگوں کے خلاف دوبارہ تحقیقات شروع کی گئی کہ ان کا سارا بیان سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیک کام کیا ہی نہیں بلکہ انہوں نے سماج، مذہب، سیاست اور عام زندگی کو ہمیشہ زنگ آلود کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لوگ تو خود استحصالی تھے!۔ ہاں کانٹے بھی گلاب کے ہمراہ نکل پڑتے ہیں، گل دانوں میں سج جاتے ہیں۔

کیے بعد دیگرے سارے قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا۔

عام معافی کے دن لوگوں کا ایک ہجوم پھول، مالاؤں اور نعروں سے سجا سجایا جیل کے گیٹ پر کھڑا تھا۔

عام معافی ـــــ جیل کو خالی کر دیا گیا۔

ہجوم نے کچھ کو پہچانا ـــــ کچھ کو نہیں پہچانا۔

ہار، پھول اور مالائیں گلے میں بجتی چلی گئیں۔

سیاست، سماج، مذہب ریپ، قتل، غارت گری، خون اور دھوکہ سب خلط ملط ہو گیا۔

پہچان

اندھیرا

جس نے جو کہا۔ سب سچ ہو گیا۔ جس نے جو سنا سب کو سچ مانا، مگر یہ سچ ہے کہ سب سچ نہیں اور سب جھوٹ بھی نہیں!۔

''ہاں میں ہی وہ شخص ہوں جس نے فلاں سال ریل کی پٹریاں اکھاڑی تھیں،

.................؟

''ہاں اس وقت میں جوان تھا۔ بہت جوان جو صرف ایک ہی بات جانتا تھا، مٹی کو نجاست سے پاک کرنا ہے۔ اب غلامی نہیں سہی جا سکتی!''

.............؟

''ہاں ایک سکھ نوجوان بھی تھا ـــــ!''

ہاں یہ فوٹو میرا ہے، میری جوانی کا اور یہ فوٹو میرے ان سر پھرے متوالوں کا ـــــ ہاں یہی ہے وہ سکھ نوجوان جو مجھ سے عمر میں بہت چھوٹا تھا اور میں بھی کبھی کبھی اس کی ذہین باتوں سے متاثر ہو کر اس کے بوسے لے لیا کرتا ـــــ!''

''واقعی ـــــ''

وہ سکھ نوجوان تو آپ ہی جیسا تھا۔ یقیناً وہ آپ ہی ہیں مگر آج تو آپ مجھ سے سوال کر رہے ہیں

''میں کیا چاہتا ہوں؟ آج میں آپ کا بوسہ کیسے لوں!''

میں نے سچ کا ساتھ دیا ہے، بھلے سے سچ کو سچ ثابت کرنے کیلئے میں نے جھوٹ کا سہارا نہیں لیا مگر آج مجھ پر اتنے سارے الزامات کیوں؟''

.............؟

ہاں میں جانتا ہوں، اس نے اس لڑکی کی عصمت دری کی تھی، اُسے ہمارے کمرے میں رکھا گیا تھا!''

..........؟

''اسے اعزاز و انعام سے نوازا گیا؟ تو پھر آپ مجھ سے سوال کیوں کر رہے ہیں؟ نہیں آپ مجھ سے ضرور سوال و جواب کیجئے کہ اعزاز و انعام تو آپ نے اسے دے دیا۔ ہم جیسے سارے لوگ تو ہر دور میں غلط تھے، غلط ہیں ـــــ''

.............؟

''میں نہیں چاہتا کہ میری نسل میرے اعزاز اور انعام کے سہارے پہچانی جائے ـــــ میرا سچ میری نسل کا سچ کیسے بن سکتا ہے ـــــ!''

..........؟

''ہاں میں نسل در نسل چلی آنے والی روایت کا قائل نہیں، روایت اگر یوں ہی چلتی رہتی تو پھر آج تصویر کا رخ کچھ اور ہی ہوتا ـــــ''

..........؟

میرا اصول الگ ہے، میں تمغے اور تمغے کا قائل نہیں ـــــ تمہارا تنہا سچ روایت پرستی کے اس دور میں جہاں جھوٹ ہر شعبۂ زندگی کے لئے اشد ضروری ہے۔ زندہ رہ سکے گا ـــــ؟

آؤ سر جھکا کر اپنی شکست کا اعتراف کر لیں۔

بہت ہی خاموشی کے ساتھ ہر جھوٹ کو برداشت کر لیں کہ اب مدافعت کی طاقت ہمارے جسموں میں نہیں۔

ہم نے جو کچھ کیا تھا اس میں کھونے کی بات تھی مگر یہ امید بھی تھی کہ ایک وقت وہ آئے گا جب دوسرے آزاد فضا میں سانس لینے کو ترسیں گے نہیں۔

ہم نے اپنا کام کر دیا ـــــ!

.............؟

''ہاں ہماری نسل کچھ نہیں جانتی ـــــ ہم کندھے پر ہاتھ رکھ کر بتانے کے قائل نہیں ـــــ

ہم روایت شکن ہیں ـــــ روایت پرست نہیں ـــــ!''

ہمارا تمغہ ہماری نسل کا تمغہ نہیں ہو سکتا۔

یہ سچ ہے۔

اور سچ ہمارے جذبوں کی طرح ہے۔

اور ہمارے جذبوں کی پہچان؟

تمغے، معاوضے، انعام و اکرام!

لیکن جو بہت آگے مر کھپ گئے، مار دیئے گئے ـــــ یہی نا۔

شہید ـــــ عظیم اور کیا ـــــ؟

پہچان ـــــ انتظار ـــــ

طویل انتظار ـــــ!

سرخ خطِ منحنی

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

کیونکہ اس کے بیٹے نے کیمل انک کی پوری دوات دیوار کے اس حصہ پر انڈیل دی تھی جہاں رانی کا نام لکھا تھا۔

اس کی آنکھوں میں خون اس لئے نہیں اتر آیا تھا کہ اس کے بیٹے نے رانی کے نام کو لال رنگ سے مٹانا چاہا تھا بلکہ اس لئے آیا تھا کہ اسے ابھی اسی وقت کیمل انک کی ضرورت تھی اور کیمل انک چھوٹی دکانوں میں دستیاب نہ تھی۔

اسے نقشہ مکمل کر کے آج ہی بلاک میکر کو دینا تھا کیونکہ مختلف صوبوں میں تقسیم شدہ ملک کو اس بار اس نے بالکل مختلف رنگوں سے ابھاگر کیا تھا اور گہری سوچ کا آدمی کبھی کبھار الجھاوے میں پڑ کر قطعی فیصلہ کرنے میں دیر کرتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کا آخری فیصلہ بڑا جاندار اور پر معنی ہوتا ہے۔

اس نے ہر صوبہ کے لئے ایک نیا رنگ پسند کیا تھا اور ہر صوبہ کی حد بندی کیلئے جو خطوط منحنی اسے کھینچنے تھے اس کے لئے بھی پچھلے سال سے مختلف رنگ تھے۔ اسے اپنے بیٹے پر شدید غصہ آرہا تھا کہ کمبخت کو یہ کیا سوجھی۔ اس کا بیٹا ابھی دس سال کا ہے جو پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے اور پانچویں جماعت کے ایک نابالغ طالب علم نے رانی کے کالے حروف میں لکھے خوبصورت نام کو لال رنگ سے کیوں مٹایا؟

اسے اب اپنے آپ پر شدید غصہ آرہا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے سے کل یہ کیوں کہا تھا کہ اپنی پسند کی تصویریں بناتا۔

اسے لال کیمل انک کی ضرورت تھی کہ اسے مشرقی صوبوں کی حد بندی لال رنگ کے خطِ منحنی سے کرنی تھی اور صوبوں کی حد بندی تو اس نے مختلف رنگوں سے کر ہی دی تھی۔ چونکہ وہ لال رنگ کے لئے اپنی آنکھوں میں خون اتار لایا تھا اس لئے ابھی اسی کی بات سامنے تھی اور جو چیز سامنے ہو، وہی اہم ہو جاتی ہے۔

مشرق بعید کے اہم صوبے کو اس نے کالے رنگ سے بھر دیا تھا اور اب اس کی حد بندی کے لئے اسے لال رنگ کی ضرورت تھی جسے اسکے بیٹے نے رانی کے کالے حرفوں میں لکھے خوبصورت نام پر ضائع کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، اس کی سوچ اور گہری ہوتی جارہی تھی اور مختلف صوبوں کے پروبلمس اس کی آنکھوں کے سامنے تیز تر برقی ٹرین کی طرح بھاگے جارہے تھے۔ یکایک اس کے جی میں آیا کہ وہ مدرسہ ربانیہ چلا جائے اور اپنے بیٹے کے کلاس ٹیچر مولوی عبدالجبار سے اجازت لئے بغیر اپنے بیٹے کو اتنا مارے کہ اس کے بدن کے کسی حصہ سے خون نکل آئے اور اسی خون سے اس اہم ترین صوبے کی حد بندی کر دے لیکن اس کی سوچ پھر بہہ گئی اور اسے اپنا بیٹا نہایت معصوم نظر آیا کیونکہ اس کی عمر ابھی دس سال کی ہے اور دس سال کے بچے کا شعور کتنا بالغ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی چیز کی اہمیت سمجھے۔ لیکن اسے خطِ منحنی کھینچنا ہی ہے کہ نقشہ آج ہی بلاک میکر کے پاس جائے گا۔ اس کی سوچ پھر گہری ہو گئی اور اس نے سوئی سے اپنے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی پر نقطہ لگا دیا۔

خون کا ایک ننھا سا قطرہ کچھ بڑا ہو کر پھسل گیا۔ اس نے اس خون سے مشرق بعید کے اس صوبے کی حد بندی شروع کی لیکن خون کا رنگ اسے پھیکا لگا اور حد بندی کے مکمل ہونے سے پہلے خون کی آمد بند ہو گئی۔

اسے پھر اپنے اوپر شدید غصہ آگیا اور اس نے بھارت بلیڈ سے اپنی انگلی کو شدید طور سے زخمی کر لیا۔ خون تیزی سے بہنے لگا اور وہ تیزی سے حد بندی میں مصروف ہو گیا۔ حد بندی مکمل ہو گئی، اس کا چہرہ کھل اٹھا لیکن جب اس نے بائیں ہاتھ کی انگلی کے نیچے دیکھا تو بہت سارا خون ننگے فرش پر بکھرا تھا۔ پھر اس کی سوچ گہری ہونے لگی۔ ہر صوبے کے پروبلمس پھر برقی ٹرین کی رفتار سے بھاگنے لگے۔ اس نے طاق سے بلاک کیمل انک کی دوات نکالی اور ملک کے پورے نقشے پر پھیلا دیا اور پھر پورے ملک کی حد بندی اپنے خون سے کرنے لگا۔!

شجرۂ نسب

میں اس وقت بھی اس کی آنکھوں سے چمٹا ہوا تھا جب اس کی بڑی بہو کے پیٹ پر کسی کے پاؤں پڑے تھے اور بڑی بہو کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ اس سے پہلے اس کی بڑی بہو کا ریپ بہت سارے مذہب پرست جنونی لوگوں نے کیا تھا اور پھر مجھے پتہ نہیں کہ اس ابلی ہوئی آنکھوں والی لاش کا کیا بنا تھا۔

اس نے کنواں کنواں، پگڈنڈی پگڈنڈی اور کھیت جا جا کر لال رنگ کا ننگا ننگا جسم دیکھا تھا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کی لاش کو بغیر سر کا ہونے پر بھی پہچان لیا تھا۔ اسے اس وقت اپنے پیٹ میں شدید درد کا احساس ہوا تھا۔ نوماہ کا پورا درد سمٹ کر اس ایک لمحہ میں مکمل ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے دونوں پوتوں کو اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ اور اس کی پوتی جو ایک ہفتہ پہلے اس دنیا میں بے قصور پیدا ہوئی تھی، ماں اور باپ کی موت کا الزام لئے اس کی گود میں رو رہی تھی، یہ الزام کس کے سر ڈالا جائے۔

اللہ اکبر

بندے ماترم

آزاد ہندوستان کا ترنگا جھنڈا بہت نیا تھا۔ اس نئے پرچم پر خون کی پہلی دھار پڑی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ صبح جب وہ عورت اپنے

پوتوں کو انگلیوں نے تھامے اور پوتی کو سینے سے لگائے اشوک اعظم کے پاٹلی پتر سے کلکتہ چلی آئی تھی، اس سفر کے دوران اس کی آنکھوں سے اسی طرح چمٹا تھا۔ میں کبھی بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی آنکھوں سے چمٹا رہوں مگر میں اس طرح اس کی آنکھوں سے چمٹا نہ رہتا تو پھر یہ کہانی کیسے سناتا۔

کلکتہ کے مرلی بگان میں جہاں اقلیتی فرقہ کی ایک بہت بڑی آبادی تھی وہ عورت اپنے پوتوں اور پوتی کے ساتھ رہنے لگی۔ اس دوران کی بہت ساری باتیں میں نہیں جانتا۔ شاید وہ کچھ سکون سے تھی کبھی کبھار وہ اپنے بیٹے کی یاد میں رو لیتی تو میں اس کے دل کا درد بن کر اس کی پلکوں پر آجاتا تھا اور پھر جب درد کی ندی اتر جاتی تو میں اس دوران کی کہانی جان نہ پاتا۔

ایک دن وہ بہت رو رہی تھی، بہت سارے لوگ، عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان اِدھر سے اُدھر گھبرائے ہوئے سراسیمگی کے عالم میں تھے، اس دن میں پھر اس کے ساتھ تھا، وہ اپنے پوتے کو سینے سے چمٹائے ہوئے تھی اور اس کی پوتی ننگی زمین کی چھاتی پر پڑی بلک رہی تھی۔ اس وقت اس بچی کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ اس کے خدو خال اس کی ماں سے مشابہ تھے۔ وہ دوسرے لوگوں کی طرح مرلی بگان سے اپنے چھوٹے پوتے اور پوتی کو لئے ہوئے کسی محفوظ مقام کی طرف بھاگ رہی تھی۔

اس کی آنکھیں اپنے پوتے کو تلاش کر رہی تھیں اور اس کا وہ پوتا جیسا کہ اس کی روتی ہوئی حالت کے دوران لوگوں نے اسے بتایا کسی کے چاقو سے مار دیا گیا تھا۔

اللہ اکبر اور بندے ماترم کی صداؤں کے درمیان وہ بھاگتی رہی، یہ اس کی دوسری موت تھی۔ مرلی بگان اجڑ چکا تھا۔

وہ مرکزی کلکتہ کے ایک محلہ کیلا بگان میں آگئی۔ میں ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی روتی آنکھوں میں دو کشتیاں تیر رہی تھیں ۔ ایک کشتی میں بے سر کے بیٹے اور بہو کی لاشیں تھیں اور ایک میں چاقو سے قتل کئے گئے پوتے کی لاش۔

پھر حالات بدلتے گئے اور وہ اپنے چھوٹے پوتے اور پوتی میں اس طرح گم ہوئی کہ میں اسکی قربت سے محروم ہو گیا، ایک لمبا عرصہ گذر گیا۔

ایک دن پھر اس کے دل نے مجھے پکارا۔ وہ رو رہی تھی اور میں اس کی آنکھوں سے بہت قریب تھا۔ اس کا چھوٹا پوتا اب چوبیس برس کا ایک خوبصورت نوجوان تھا اور اس کی پوتی سترہ سال کی ایک معصوم دوشیزہ——وہ رو رہی تھی اور اپنے پوتے کو ہنگامے کی بھیڑ میں جانے سے روک رہی تھی، اس کی آنکھیں کچھ ایسی ہو گئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں، مت جا کہ میں تیرے بغیر ایک نامکمل تصویر بن جاؤنگی——اس بھیڑ میں تجھے کہاں ڈھونڈونگی۔ میری دو آنکھیں ہیں اور ان دو آنکھوں میں دو کشتیاں تین ایسی لاشوں کو لے کر تیر رہی ہیں کہ میں اپنے سینے پر ان کا بوجھ مشکل سے سنبھالے ہوئے ہوں۔ ڈوب جاؤنگی، مجھے بچالے، مت جا، مت جا——" وہ عورت اسی طرح روتی رہی، میں اسی طرح اس کے ساتھ رہا۔

کشمیر میں موئے مبارک کی چوری، پاکستان میں فساد اور کلکتہ کے محلوں میں آگ لگتی رہی۔

اس کا چھوٹا پوتا اسے پھر نہ ملا، اس کی لاش شاید ڈیڈ ہاؤس میں میڈیکل پڑھنے والے طلبہ کے کام آئی کیونکہ شہر میں گدھ کے کھانے کا کوئی سوال نہیں۔

گدھ آدمی

آدمی گدھ

یہ اس کی تیسری موت تھی۔

وہ کیا کرے——؟

اب اس کی آنکھوں میں چار لاشوں کا بوجھ تھا۔ وہ کبھی کبھی کانپ جاتی اور اپنی پوتی کو سینے سے چمٹا کر روتی رہتی۔

ترنگا جھنڈا گورنر ہاؤس پر لہرا رہا تھا۔

قوس قزح آسمان پر رنگوں کی کمان لئے تھا۔ اس نے اس کمان کے نیچ ہر محلے کو تاکا۔ اب تحفظ کی ضمانت کون لے، اس نے روتی ہوئی آنکھوں سے ایک فیصلہ کیا——اس کی نظر ہرے بانسوں کے جھنڈ پر تھی۔

باپ دادا کے ملک سے وداع ہوتے وقت وہ اتنا روئی، اتنا روئی کہ میری آنکھوں میں تصویریں دھندلی لگنے لگیں۔

اس نے قوس قزح کے ملک سے ناطہ توڑ لیا اور سبز بانسوں کے جھنڈ میں چلی آئی۔

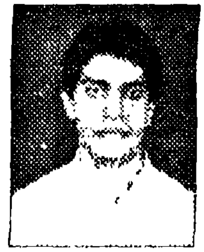
یہاں ہر نیا چہرہ اسے پرانا لگا تھا۔ اور یہاں کی مٹی میں اسے اپنے ملک کی مٹی کی بو محسوس ہوئی تھی۔ اس نے یہ سب محسوس کر کے بھی اپنے کو محفوظ سمجھا تھا کیونکہ سبز بانسوں کے جھنڈ سے اسکا مذہبی رشتہ تھا۔ اتنا ہونے کے باوجود وہ جوان پوتی کو اپنے آنچل میں چھپائے روتی رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں اب بھی چار لاشوں کا بوجھ تھا جو قوس قزح کے ملک میں کھو گئی تھیں۔

سبز بانسوں کے مشرقی جھنڈ میں ان گنت لوگ مہاجر کی صورت آئے تھے۔ سب کی ایک کہانی تھی۔ ایک شریف نوجوان مہاجر سے اس نے اپنی پوتی کا بیاہ کر دیا۔ میں اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا اور پھر میں اس کی آنکھوں سے کبھی بھی جدا نہیں ہوا۔

لمحہ، لمحوں پر گزرتا رہا۔

ماہ و سال کی صورت بدلتی رہی——انقلاب اور آزادی کی خواہش نے نفرت کا سہارا لیا۔ قتل، خون، آگ اور ریپ کے بیچ انسانی

عبد السلام عاصم



نام	عبد السلام
قلمی نام	عبد السلام عاصم
پیدائش	کلکتہ ۳۰؍ جنوری ۱۹۶۰ء۔
والد کا نام	(مرحوم) منشی جناب الدین
تعلیم	بی اے (کلکتہ یونیورسیٹی)
پیشہ	صحافت
وابستگیاں	۸۱ء میں روزنامہ "اخبار مشرق" سے آغاز۔ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۱ء تک روزنامہ "عکاس" اور روزنامہ "آبشار" کے علاوہ ہفت روزہ "کسان مزدور" اور ۸۶ء سے ۸۸ء تک روزنامہ "آزاد ہند" سے وابستگی۔ فروری ۹۲ء سے یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (UNI) کی اردو سروس سے وابستہ۔
انعامات	"ماترشری صحافتی ایوارڈ ۱۹۹۹ء"
موجودہ پتہ	S-302، تاج انکلیو، گیتا کالونی، مشرقی دہلی۔ ۳۱ فون (۰۱۱) ۲۲۲۳۳۲۴۲
	دفتر (۰۱۱) ۳۳۵۵۸۴۰

کام اک یوں بھی پیش آئے کوئی
شہر سے گاؤں لوٹ جائے کوئی

جس نے ہر عکس کی نفی کی ہو
آئینہ کیا اسے دکھائے کوئی

اُس طرف سارے در مقفّل ہیں
اُس طرف اب نہ اور جائے کوئی

کسی صورت یہ خامشی ٹوٹے
بے سبب شور ہی مچائے کوئی

آج کی شب ہے انتظار کی شب
آج کی شب مجھے رُلائے کوئی

ایک اک بند ٹوٹ کر بکھرے
یوں بھی عاصم بدن پہ چھائے کوئی

غزلیں

برس کے بھی نہ مرے کام آسکی بارش
ابھی وہ کھل ہی رہے تھے کہ رک گئی بارش

بجھا سکی نہ کسی طور میری روح کی پیاس
بدن کی حد سے تجاوز نہ کر سکی بارش

عجب نہیں کہ جگر تک اتر گئی ہوتی
ہمارے ساتھ اگر خود بھی بھیگتی بارش

ہے ذکرِ یار اسی التزام سے رنگیں
مہکتا جسم، جواں رات، بے خودی، بارش

ہمیں فریب نظر کا شکار ہوتے رہے
ہوا کے ساتھ بدلتی تھی سمت بھی بارش

کبھی تو راز دلوں کے ٹٹولتی عاصم
کبھی تو جھانکتی آنکھوں میں سر پھری بارش

یہ کالی، پیلی، ہری، نیلی، سرمئی غزلیں
چلو کہ پھینک بھی دیں ایسی ہم سبھی غزلیں

نہ کوئی حسنِ تغزل، نہ شعریت، نہ کلام
کہاں سے لائی گئی ہیں یہ سر پھری غزلیں

یہ نثری نظمیں ہی کافی تھیں جھیلنے کے لئے
کہ بے عروضئے لے آئے بے تکی غزلیں

غزل کا سبزی فروشی سے کچھ علاقہ نہیں
کہ تھیلیوں سے برآمد ہوں بیگنی غزلیں

کسی ادب کے حوالے سے اب نہیں منظور
ہمارے عہد کو گم صم کہ چیختی غزلیں

حادثہ

پھر ہوا یوں
کہ تیز آندھی میں
سخت دیوار
بیچ آنگن کی
گر گئی اور دونوں ہی جانب
لوگ زخمی ہوئے۔ مگر ان کے
زخم اس بار مختلف تھے بہت
ایسا لگتا تھا جیسے زخموں سے
بہنے والا ہر ایک قطرۂ خوں
دل سے اس حادثے کا تھا ممنون

مجرم

وہ نیک صورت
(خود اپنی ہی ذات میں نارسیدہ مورت)
کہ جس کو اک روز چھو کے میں نے
خود اس کو اس کے ہی لمس سے آشنا کیا تھا
مری محبت نے جس کو اپنا خدا کہا تھا
وہ پاک طینت، وہ نیک سیرت
ہے آج بھی خوش جمال لیکن
مری نظر اُس کے حسن کا آئینہ نہیں ہے
وہ آج بھی زاہدہ ہے، اُس کی
کوئی عبادت نہیں اکارت
مگر اب اس کی نگاہ کی تابکار نفرت کے فیصلے میں
میں ایک "مجرم" ہوں
ایسا مجرم کہ جرم جس کا ہے خود شہادت
کہ آدمی ہے
اور اس کی لغزش اسے بناتی ہے اُن سے افضل
جو لمس پہچانتے نہیں ہیں
بدن ہے کیا جانتے نہیں ہیں
اور ان کے سجدوں کا بھی تعلق
نہیں گناہ و ثواب سے کچھ



فیروز عابد

نام : محمد فیروزالدین
قلمی نام : فیروز عابد
والد کا نام : محمد قاسم (مرحوم)
مقام پیدائش : کلکتہ
تاریخ پیدائش : ۴؍دسمبر ۱۹۴۳ء
تعلیم : بی اے آنرز، ایم اے، بی ایڈ
تدریسی زندگی :

★ ۱۳؍فروری ۱۹۷۰ء تا ۲۴؍جولائی ۱۹۷۴ء ضلع اسکول پرولیا مغربی بنگال، اسسٹنٹ ماسٹر
★ ۲۵؍جولائی ۱۹۷۴ء تا ۲؍جون ۱۹۷۵ء مدرسہ عالیہ کلکتہ، اسسٹنٹ ماسٹر
★ ۲؍جون ۱۹۷۵ء تا حال اڈبرن گورنمنٹ اسکول کلکتہ ہیڈ ماسٹر

مناصب و فرائض :

★ چیرمین انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجوٹ ایجوکیشن اینڈ ریسرچ شیاما داس ودیا شاستر پٹھ ہاسپٹل، حکومت مغربی بنگال۔
★ ممبر گورننگ باڈی اور جنرل کونسل، ویسٹ بنگال اردو اکادمی، ویسٹ بنگال۔
★ ممبر محمڈن بیوریل بورڈ، کلکتہ میونسپل کارپوریشن
★ ممبر تجدید نصاب اردو سب کمیٹی، بورڈ آف پرائمری ایجوکیشن مغربی بنگال۔
★ سکریٹری ڈیموکریٹک فورم فار نیشنل انٹی گریشن، کلکتہ۔
★ سکریٹری قاضی نذرالاسلام سوشل ویلفیئر آرگنائزیشن، کلکتہ۔

اعزازات

★ صدر جمہوریۂ ہند کا نیشنل ایوارڈ برائے درس و تدریس ۱۹۹۱ء
★ امتیاز میر ایوارڈ برائے ادب، میر اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۶ء

تصنیف و تالیف :

★ اندھی گلی میں صبح (افسانے) ۱۹۸۱ء
★ نقش بر آب (افسانے) ۱۹۸۴ء
★ کھلے آسمان کے نیچے (افسانے) ۱۹۹۵ء
★ تقریباً اٹھارہ درسی و نصابی کتابیں (تالیف و تراجم)
★ بنگلہ زبان سے کہانیوں، ڈراموں، مضامین اور نظموں کے تراجم۔

ادبی مضامین : خواجہ میر درد، فانی، فیض، جوش، صالحہ عابد حسین، کرشن چندر، شاہ مقبول احمد، عباس علی خاں بیخود، وحید عرشی، انیس رفیع، ابراہیم ہوش، جاوید دانش، ظہیر انور، ظفر اگانوی اور دیگر سے متعلق مضامین لکھے۔

ادبی کتابوں پر تبصرے۔

علی پور بم کیس — جمہوریت اور انقلاب وغیرہ

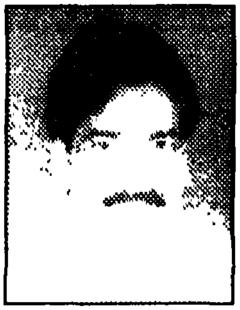
سیاسی مضامین : بنگلہ سے اردو تراجم۔

ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۸ء سے ہوا۔ ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی۔ پائل بمبئی، تنویر بمبئی، صبح امید بمبئی، بزم ہند آسنسول، پرواز لدھیانہ میں لکھتا رہا۔ باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز صبح نو، پٹنہ سے ہوا۔ پہلی کہانی "جیو تو ایسے جیو" ۱۹۶۳ء۔

جدید رنگ کا پہلا افسانہ "دہلیز کا ماحول" "شب خون شمارہ ۸؍۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔

پتہ "بیت القاسم"
12/3, H/1, Patwar Bagan Lane
Calcutta - 700009
Phone (033) 351-0353

نام : عاصم شہنواز شبلی
ولادت : ۱۴ر فروری ۱۹۶۵ء، کلکتہ
تعلیم : ایم۔اے
شغل : شاعری اور تنقید
پیشہ : درس و تدریس
آغاز شاعری : ۱۹۸۰ء
تصنیف : مغربی بنگال اور بچوں کا اردو ادب (تحقیق و تنقید)
زیر ترتیب : اجنبی شہر میں انتظار (شاعری) شعور و آگہی (تنقید) • اردو غزل میں شہر کا تصور (تحقیق و تنقید) • نئی غزل نیا مزاج (تحقیق و تنقید) •
مرتب : سہ ماہی "اثبات و نفی"، کلکتہ
وابستگی : ڈائریکٹر، بزم یاراں، کلکتہ
صدر، ایوان ادب اردو، کلکتہ
صدر، سلی گوڑی مائنرٹیز اکاڈمی، سلی گوڑی
صدر، ملی ایجوکیشن سوسائٹی، سلطان پور
نائب صدر، دارجلنگ صدر بزم ادب، دارجلنگ
کلاسدن، دارجلنگ
سنٹر ہیڈ، کمپیوٹرارئیزڈ کیلی گراف سنٹر، دارجلنگ۔ بہ اشتراک قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی
مستقل پتہ : ۵/۸۹، رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس، کلکتہ-۱۶
فون : ۲۲۹۴۵۳۱ (۰۳۳)
حالیہ پتہ : صدر شعبہ اردو، دارجلنگ گورنمنٹ کالج، دارجلنگ-۷۳۴۱۰۱



عاصم شہنواز شبلی

غزلیں

آسماں محراب ہے کس نے کہا
یہ زمیں بے آب ہے کس نے کہا

تیرتا ہوں بے خطر منجدھار میں
ہر طرف گرداب ہے کس نے کہا

دیکھ کر یہ تیری مرجھائی ہنسی
دل مرا شاداب ہے کس نے کہا

آندھیوں میں جل رہا ہوں آج بھی
روشنی نایاب ہے کس نے کہا

ہے اگر سب کی روش سے کچھ الگ
یہ غزل پایاب ہے کس نے کہا

ڈھونڈیے مل جائیں گے عاصمؔ بہت
اک یہی سرخاب ہے کس نے کہا

ضروری بات کہنی رہ گئی ہے
غزل میری ادھوری رہ گئی ہے

بہت نزدیک ہیں لیکن ابھی تک
ہمارے بیچ دوری رہ گئی ہے

اگر فرصت ملی پوری کروں گا
ادھوری جو کہانی رہ گئی ہے

غزل اچھی تمہاری بھی ہے لیکن
کسر تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے

جلائے رکھنا آنکھوں کے دیوں کو
ابھی کچھ رات باقی رہ گئی ہے

جگر کا درد دل کی چوٹ عاصمؔ
یہی ان کی نشانی رہ گئی ہے

جو بات اچھی نہیں لگتی اصولاً
اُسے ہم چھوڑ دیتے ہیں یقیناً

نکالو دودھ کی نہریں یقیناً
مگر ملتی ہے شیریں اتفاقاً

زباں لکنت زدہ بدنیتوں کی
ہم اپنی بات کہہ دیتے ہیں فوراً

دلوں کے بیچ اک دیوار سی ہے
ملیں بھی ہم تو اب ملتے ہیں رسماً

یہ مت سمجھو ہے رتی دور ہم سے
کبھی ہم ڈھیل دیدیتے ہیں قصداً

ہو دل کا مشورہ یا عقل کا ہو
نہیں کرتے ہیں کوئی کام جبراً

رفیقوں سے تمہیں ملنا ہے عاصمؔ
نیام و تیغ رکھ لو احتیاطاً

چمن زار غزل کو سینچنا ہم جانتے ہیں
ہمارے اس سلیقے کو عدو بھی مانتے ہیں

کٹانے سے پروں کے کب رکی پرواز اپنی
ہو صحرا یا بیاباں ہم سفر کی ٹھانتے ہیں

انا کا نام دو یا خود فریبی اس کو سمجھو
کہو در کی تمہارے خاک ہم کب چھانتے ہیں

نہ ہو اظہار اس کا، بات ہے یہ اور لیکن
نظر تو دوستوں کی خوب ہم پہچانتے ہیں

لہو جن کے لئے ہم نے ہمیشہ ہی بہایا
حریف اپنا ہمیں عاصمؔ وہی گردانتے ہیں

رباعیات

سر سبز زمیں اور نہ روشن ہے فلک
چہروں پہ نہیں باقی جینے کی دمک
محسوس یہ ہوتا ہے مجھے شام وسحر
آمادہ ہے فطرت ہمیں پہونچانے کو زک

ہنستا ہوں نہ روتا ہوں عجب عالم ہے
جیتا ہوں نہ ہارا ہوں عجب عالم ہے
میں بارگراں زیست کا لیکن پھر بھی
کاندھوں پہ اٹھاتا ہوں عجب عالم ہے

تلوار کی موج یوں بہادی ہم نے
ہر سمت ہوا خوں کی اڑادی ہم نے
تقدیر کا احوال نہ بدلا نہ سہی
دھاک اپنی تو دنیا پہ بٹھادی ہم نے

ہے قصر فریدوں کا نہ جام جم ہے
انعام کی خواہش نہ زیاں کا غم ہے
آشفتہ مزاجی مری فطرت لیکن
اخلاص کا خنجر ہو تو سر بھی خم ہے

سچ ہے رخِ گیتی کے ہیں درپن بھی ہم
ہیں کشتِ وفا کے لئے ساون بھی ہم
ہیں پھول بھی نغمہ بھی مگر یاد رہے
وقت آئے تو بن جاتے ہیں آہن بھی ہم

رقصندہ نظاروں پہ مرا بھی حق ہے
تابندہ شراروں پہ مرا بھی حق ہے
میں نے بھی لہو اپنا دیا ہے اس کو
گلشن کی بہاروں پہ مرا بھی حق ہے

لمحوں کی صلیب

یہ کمرہ
یہ بے رنگ دیوار و در
اور
ویراں دریچے
پرانا کلینڈر
تھکی آنکھیں
بے خواب چھتیں
یہاں بھی گھٹن ہے۔ تھکن اور الجھن
سلگتی ہوئی ساعتوں کی چبھن ہے
یہ تنہائیاں
اور دھڑکتے دلوں کی لٹکتی صلیبیں
کوئی خواب چڑھتا ہے ہر لمحہ جن پر
کہ ہر خوں کے قطرے پہ
بے مائیگی کی تہیں جم گئی ہیں
مرا مشورہ مان لو
لوٹ جاؤ
جنھیں چھوڑ کر تم یہاں آگئی تھیں
یہاں بھی وہی ساری بے چینیاں ہیں

شناخت کا المیہ

نہ سر پر فلک ہے
نہ قدموں کے نیچے زمیں
اک عجب بے بسی، بے کلی
تیرہ ذہنی مقدر بنی
اور
اندھیروں کی بستی میں
چہرے بھی کالے ہوئے
بھیڑ میں کھو گئی آج
رشتوں کی پہچان بھی

خواہشِ ناتمام

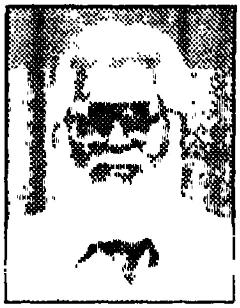
صعوبتوں کے سفر سے لوٹا
تو میں نے دیکھا
کہ ایک لڑکی
سجائے اپنے بدن لہو سے
بچائے دوشیزگی کو اپنی
کنارے شب کے
کھڑی ہوئی تھی
کہ آئے "کوئی"
لبوں پہ اس کے بھی
پھول رکھے
لبوں سے لیکن —!

موسمِ بہار

تم اپنے
کانپتے
کنوارے
خوبصورت
گلابی ہونٹ
میرے جلتے ہوئے ماتھے پر
ثبت کر جاؤ
تو شاید
بہار کا موسم لوٹ آئے —!

حاصلِ رقص

خواہشیں
دل کے آنگن میں پھر
رقص فرما ہوئیں
کون بتلائے ان خواہشوں کو
کہ تپتی زمیں پر کریں رقص تو
رقص کرنے کا حاصل
فقط پاؤں کے چند چھالے ہیں
ان کے سوا
اور کچھ بھی نہیں!



علقمہ شبلی

نام : علقمہ شبلی

اصل نام : ابو علقمہ محمد شبلی نعمانی

پیدائش : یکم نومبر ۱۹۳۰ء۔ میر غیاث چک ضلع نالندہ (بہار)

تعلیم : بی۔ کام (بہار یونیورسٹی)
ایم۔ اے (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) آزاد امیدوار کی حیثیت سے۔ بی۔ ٹی (کلکتہ یونیورسٹی)

ملازمتیں : استاذ جبلی انسٹی ٹیوشن، کلکتہ (۶۱۔۱۹۵۲ء)
ہیڈ ماسٹر، کارپوریشن اسکول، کلکتہ (۶۵۔۱۹۶۱ء)
استاذ اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ، مدرسہ عالیہ کلکتہ (۹۰۔۱۹۶۵ء)
گیسٹ لیکچرر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی (۹۵۔۱۹۹۳ء)

تصانیف : حرف وصوت (شعری مجموعہ) فروری ۱۹۷۵ء
بے چہرہ لمحے (شعری مجموعہ) نومبر ۱۹۷۵ء
تارے زمین کے (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) جنوری ۱۹۷۶ء
پھول آنگن کے (بچوں کے لئے) دسمبر ۱۹۷۹ء
بوستاں کی کہانیاں (بچوں کے لئے) دسمبر ۱۹۸۵ء
خواب خواب زندگی (شعری مجموعہ) مارچ ۱۹۹۰ء
زادِ سفر (حمدیہ و نعتیہ رباعیاں) اپریل ۱۹۹۰ء
دیارِ حرم میں (سفر نامہ) مارچ ۱۹۹۸ء

انتخاب و تدوین : سیلِ اشک (اشک امرتسری کے کلام کا انتخاب) ۱۹۶۵ء۔
بیس سے زیادہ درسی کتابیں

اعزاز : مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اوارڈ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۹۸۷ء
''بے چہرہ لمحے'' کو اترپردیش اردو اکاڈمی اور بہار اردو اکاڈمی کے انعامات
''تارے زمین کے'' کو بہار اردو اکاڈمی انعام
''پھول آنگن کے'' کو اترپردیش اردو اکاڈمی انعام
''خواب خواب زندگی'' کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی انعام۔
حیات اور شاعری پر ڈاکٹر مظہر کبریا کو بہار یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

منصب : وائس چیرمین مغربی بنگال اردو اکاڈمی
ایران سوسائٹی کلکتہ کونسل کے رکن
ممبر، پینل آف چلڈرن لٹریچر اینڈ پاپولر سائنس فروغِ اردو کمیٹی، حکومت ہند (۹۱۔۱۹۸۵ء)
معتمد بزمِ احباب، کلکتہ (۹۰۔۱۹۶۹ء)
نائب صدر بزمِ احباب، کلکتہ (۱۹۹۱ء سے تا حال)

مجلس ادارت : ماہنامہ ''امیج'' کلکتہ
ماہنامہ ''نوخیز'' کلکتہ
سہ ماہی ''روحِ ادب'' کلکتہ

پتہ : ۸۹۵، رپن اسٹریٹ (پہلی منزل)
کلکتہ ۷۰۰۰۱۶
فون : ۲۲۹۴۵۳۱ (۰۳۳)

غزلیں

جس سمت سے جو تیر چلا ہے
سینے پہ ہمیں نے تو لیا ہے
ہے بارشِ سنگ اور میرا سر
یہ میری وفاؤں کا صلہ ہے
پھر دل پہ کچوکے لگے پیہم
پھر آج ہر اک زخم ہرا ہے
یوں تو ہے سکوں سطح پہ، لیکن
پاتال میں اک حشر بپا ہے
نقشہ ہی بناتے رہے گھر کا
شاید یہی قسمت میں لکھا ہے
کیا دل پہ گذرتی ہے، یہ سوچا؟
مانا کہ تغافل بھی ادا ہے
کس کس کو دعا دیجئے شبلی
زخموں کا چمن دل میں کھلا ہے

مرے آگے جنوں، پیچھے خرد ہے
مری صحرا نوردی مستند ہے
یہی ہے نقطۂ آغاز میرا
رہے، ختم سفر کی گر یہ حد ہے
ذرا جھک کر تو ملتے دوستوں سے
چلو، مانا کہ اونچا ان کا قد ہے
متاعِ بے بہا اپنی سمجھئے
ہر اس تخئیل کو جو مسترد ہے
ہمارے شعر کی طنز آفرینی
تمھاری خوش زبانی کی سند ہے
کہاں وہ گاؤں جو جنت نظر تھا
کہاں یہ شہر جو دل کی لحد ہے
مرا نقشِ قدم کہئے ازل کو
مری حدِ نظر شبلی ابد ہے

وہ بستی

وہ بستی،
جہاں لال پیلی ہری تتلیاں
مرے شوقِ آوارہ گردی کا لیتی تھیں شام و سحر امتحاں
وہ بستی،
جہاں دھڑکنوں کو ملی تھی زباں
جہاں آرزوئیں ہوئی تھیں جواں
وہ بستی،
تھیں ہر گام پر
بہشتِ بریں کی فضائیں جہاں
بناتی تھیں بے خود گھٹائیں جہاں
سناتی تھیں نغمے ہوائیں جہاں
وہ بستی،
وہ خوابوں کی بستی
ملے اب کہاں
"کہ بھوتوں نے ڈیرے جمائے وہاں"

عجب یہ شام آئی ہے

عجب یہ شام آئی ہے
ہوائیں سسکیاں بھرتی
ردائے تیرگی اوڑھے
در و بامِ تمنا میں بھٹکتی ہیں
کسی سے ہے کسی کو واسطہ کوئی
نہ ربطِ زندگانی ہے
عجب بے گانگی سی ہے
لبوں پر مہر خاموشی
دلوں کی دھڑکنیں مدھم
ہے بحرِ لاوجودیت میں سورج ڈوب جانے کو
ہیں میرے خواب سارے
آخری سانسوں کی گنتی میں
فضا محشر بہ داماں ہے
عجب یہ شام آئی ہے
دلوں پر بھی بن آئی ہے!

رباعیات

تنظیم چمن خود نگری کیا جانے
منزل کا پتہ کج نظری کیا جانے
شبلی یہ سعادت نہیں سب کی قسمت
تہذیب جنوں دیدہ وری کیا جانے

خود ساختہ افسانے سناتے رہئے
فرسودہ تصاویر دکھاتے رہئے
یوں آپ شب و روز بہ فیضِ جذبات
اوہام کو ایمان بناتے رہئے

صحرائے تخیل میں ٹہلتے بھی ہیں
سرگوشیاں کرتے ہیں، مچلتے بھی ہیں
الفاظ کو بے جان سمجھنے والو!
الفاظ قبا اپنی بدلتے بھی ہیں

آواز بکھرتی ہوئی محسوس ہوئی
ہر سانس اکھڑتی ہوئی محسوس ہوئی
بے چارگی ایسی کہ ہر اک ضرب مجھے
احساس پہ پڑتی ہوئی محسوس ہوئی

ماہیے

(۱)
ہونٹوں پہ دعا رکھنا
یاد کے دیپک کو
آنکھوں میں سدا رکھنا

(۲)
کیسی رت یہ آئی
خاموشی لب پر
چہرہ چہرہ زخمی

(۳)
اک بوڑھی گوالن کل
دوہ رہی تھی دودھ
خود پیتی تھی لیکن جل

(۴)
تڑکے ہی سدا جاگے
بیل لئے دہقان
کھیتوں کی طرف بھاگے

(۵)
شائستہ بیانی دے
میرے قلم کو تو
اللہ روانی دے

آخری نظم——

''کتابوں کی وجہ سے
میں نے دنیااور زندگی کو کھو دیا''
اب میں معریٰ اور غیر معریٰ بحروں سے تھک گیا ہوں
پیکر تراشی میں کوئی دلچسپی نہیں
مفلوج استعاروں سے جی گھبراتا ہے
سب مہمل اور بے جان ہیں
دنیا کی کسی بھی جاندار شئے کو (چاہے وہ بڑی ہو یا چھوٹی)
ان بیساکھیوں کی ضرورت نہیں

خوبصورت ترین نظمیں
زندگی کی زندہ اور نسبتاً جاوید خوبصورتیاں چرانے میں مشغول ہیں

ایک فاختہ سریلی آواز میں اپنے ہم سفر کو بلا رہی ہے
یا ایک کوئل کسی سے ملنے کو بے چین ہے
بچے درختوں کے نیچے ٹپکے پھل چن رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں
سہاگ رات میں کوئی شرما کے اپنی بانہوں میں سمٹ رہی ہے
ایک نوجوان جوڑا
دنیا و مافیہا سے بے خبر
بوس و کنار میں مدغم ہے
اور یہ سب کام میں کسی الّو شاعر کی طرح
کاغذ پر کرتا ہوں
اور اسی بے وقوفی نے مجھے
زندگی کی خوشیوں اور پیار کے لمس سے دور دور رکھا ہے

میں نے میلوں لمبی پلاش کی جلتی قطاریں دیکھی ہیں
اور پہاڑوں پر گلمرن Orchid کا ہجوم
میں نے ''س'' پہ ''ش'' گاتی کوئلوں کی آواز سنی ہے
اور خدا معاف کرے
میں نے اپنے پرکھوں کی بیوقوف پرمپرا کو اپنانے کے چکر میں
انہیں قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے
اور اپنی ذاتی استعداد کا رعب جمانے کیلئے
ان میں ترمیم کی جدوجہد کی ہے
(اور خدا اس گناہ کبیرہ کو معاف کرے)

میں نے انہیں استعاروں، پیکروں اور اسلوب میں
ڈھالنے کی کوششیں بھی کی ہیں
اور اکثر جب تیری دی ہوئی ذہنی صلاحیت نے ساتھ نہیں دیا— نعوذ باللہ
تو بین الاقوامی سطح پر انہیں ڈھونڈ نکالنے کی سرمغزیاں بھی کی ہیں
اور ہمیشہ خود فریبی کی معمولی پناہوں میں
خود کو یہ دلاسہ دیا ہے کہ
جب پھول اور درخت سب ناپید ہو جائینگے
اور نوخیز جوڑے منظر سے سرک جائیں گے
دن گدلا ہو جائے گا اور شامیں ملگجی ہو جائیں گی
تو شیشے کی الماریوں میں بند میرے یہ جلاوطن الفاظ
ان کہانیوں کو پھر دہرائیں گے
تو اس وقت بھی میں اپنے پرکھوں اور
ہم عصر بیوقوف شاعروں کی طرح
اپنی کم ذہنی اور مسخرے پن کا مظاہرہ کروں گا

جب سورج سوا نیزے پر ہوگا تو
ہر ہوشیار آدمی اور ان گنت بیوقوف شاعروں کی
زبان پر صرف ایک ہی لفظ ہوگا ''نفسی، اور نفسی''
تو پھر کیا؟ اسرافیل کی بے سُری پھونک سے
یہ سُریلی نظمیں بھی جاگ اٹھیں گی؟

اور خدایا میرے ان مشہور مصوّر دوستوں کا کیا ہوگا
ان کی درگت کا خیال آتے ہی جی لرز جاتا ہے
(بالآخر وہ میرے دوست ہیں)
جو تیری کائنات کے تناسب سے مسحور ہونے کے بجائے
آڑھی ترچھی لکیروں میں بے ہنگم انداز میں رنگ پوت پوت کر
انھیں مسخ کر کے من مانی قیمتوں پر بے دھڑک بیچتے ہیں
اور پھر تیری تخلیق کردہ خوبصورت دوشیزاؤں کے لباسوں
سے صرف رنگ ہی نہیں
تیری تخلیق کی بنیادوں کی طرف جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔
خدایا! مجھے یقین ہے کہ تو ان کا حساب الگ سے لے گا
خدایا میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ
میں نے انکی ساری تصویریں گھر سے نکال کر پھینک دی ہیں
خدایا معاف کر

اس عظیم شاعر کو جو قرض کی شراب پی کر
تیری تخلیق کی بد نظمی کا ذکر کیا کرتا تھا
خدایا معاف کر
غالب کو، افتخار جالب کو

یااللہ اگر یہ ساری نظمیں تجھے
یک بہ یک اٹھانے میں کوئی دشواری ہو تو
کم از کم اپنے بندوں پر ایک چھوٹا سا کرم کر دے
کہ ردیف اور قافیہ
جس کا چلن اب دنیا میں صرف دو ملکوں میں ہے
انہیں فوراً اٹھالے
جو باون سال کی طلاق کے بعد
اب بھی نوچ کھسوٹ کرتے رہتے ہیں
خدایا ان کی غیر ازدواجی زندگی کبھی خوشگوار نہیں رہی
اب تو اکثر معاملہ آئے دن بمباری اور ہوائی حملوں
میں تبدیل ہو گیا ہے
جس سے دنیا کے سارے پڑوسی اور غیر پڑوسی
امیر اور غریب ملک مستفیض ہو رہے ہیں
خدایا، میں اور تیرے ان گنت معصوم اور چند برگزیدہ بندے
اس بات پر متفق ہیں
کہ یہ سارا معاملہ ردیف اور قافیہ کا ہے
کبھی اس ملک کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے
تو کبھی اُس ملک کا
خدایا اس ملک کا حشر کیا ہو گا

جو تیرا نام لیکر
ان گنت معصوموں کو ہلاک کرتے ہیں
اور خدایا، تیرے بے شمار معصوم بندے
اب یہاں ان کی قافیہ پیائی سے ہراساں ہیں
یااللہ، مجھے تو بیواؤں اور یتیموں کی آہ کے علاوہ
کچھ بھی نہیں سنائی دیتا
اور انکی جگہ دو خوبصورت حوریں (جواب تک صرف مصوروں کے ہاتھ آئی ہیں)
انسانی شکل میں ان شاعروں کو بھیج دے
جو ان بیساکھیوں کے سہارے
شہرت کی چوٹیوں پر پہنچنے کے متمنی ہیں
خدایا میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ
تیری یہ حوریں باعصمت واپس جائینگی
کیوں کہ یہ سب کے سب
نہایت ہی بے ضرر لوگ ہیں—
خدا! یہ بھول گئے ہیں وہ گناہ اوّل اور وہ پرانی بات
یہ بھول گئے ہیں وہ مشہور مقولہ
"کتابوں پر کتابیں لکھ لو پھر بھی کچھ نہیں ہوتا
کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے دو لفظ میں تاثیر ہوتی تھی"
اور جب میں نئی نظموں کے شہوت کے گھلتے ذائقہ میں مبتلا رہتا ہوں
تو پھر مجھے یک لخت میرے ہم عصر
اس عظیم ترین تخلیق کار کی یاد آتی ہے
جس نے چودہ سو سال سے کچھ لکھا نہیں
اور اسکا حسنِ ظن دیکھو اسکے باوجود اُسے کبھی نیند نہیں آتی

چپ رہو

"بے طلب وہ دے رہا ہے چپ رہو
کچھ کہا تو بات خالی جائے گی"

چپ رہو، چپ رہو
آنکھیں کھولو، چپ چاپ رہو
اسکی سنو،
یادوں کا دامن پکڑو
گن گن کی آواز سنو

دور پپیہا گاتا ہے
اسکی سنو،
چپ چاپ رہو

آہستہ، آہستہ چلو
گول سا ایک پتھر دیکھو
لاکھوں سال سے چاند ستارے
جس کو دیکھ کے چلتے ہیں
اس کو دیکھو

کچھ نہ کہو
پھر وہ پتھر اس مٹھی میں آئے گا
پھر تم کو سہلائے گا
دھنک کے گیت سنائے گا

آنکھیں کھولو
دھیرے چلو، آہستہ چلو
شبنم کے سارے قطرے
اُفق کو جا کے چھولیں گے

دل میں جگنو جگ مگ جگ مگ گائیں گے
جیسے ہی مٹھی کھولو گے پتھر اڑ کر
ایک طائر بن جائے گا

چپ رہو، چپ چاپ رہو
آنکھیں کھولے
مٹھی جکڑے
اسکی سنو
"کچھ کہا تو بات خالی جائے گی"

پرتگالی **اردو**

ساتھ ساتھ گانجا
اور اوہی پھین
(افیون) کے الفاظ
بھی آئے ہیں۔
ممکن ہے کہ تتملا
بھی افیون یا گانجے
کی کوئی شکل ہو۔ بہر
حال یہ ثابت کرنا
مشکل ہے کہ
''تماکو'' سنسکرت
کے لفظ ''تمراکوٹا''
سے بنا ہے۔

تنبور   تنبورا
(اس کی اصل عربی
طنبور ہے)

تولۂ   تولیہ

طوفاؤں   طوفان
(عربی طوفان)

ترنج   ترنج
(عربی ترنج)
اس کا وطن جاوا ہے
جسے پرتگالیوں نے
جاوا پہنچایا

اناناس   اناناس
ANANAS کی
اصل برازیلی ہے۔
برازیلی زبان میں
اسے NANAS
کہتے ہیں۔
پرتگالیوں نے پھل
اور پودے کو اہل
مشرق سے متعارف
کردیا۔ سر جارج

پرتگالی **اردو**

واٹ (SIR
GEORGE
WATT) نے اپنی
ایک تصنیف
Dictionary of
The
Economic
Products of
India 1899.
میں بتایا ہے کہ
پرتگالیوں نے ۱۵۹۹ء
میں اسے بنگال میں
پہلی بار رائج کیا۔
تزک جہانگیری میں
بھی اسکا ذکر ملتا ہے۔
شہنشاہ جہانگیر نے
بڑی رغبت سے اس
کا ذکر کیا ہے۔ اور
اسے ایک فرنگی پھل
بتایا ہے۔ وبسٹر
WEBESTER
کا خیال ہے کہ یہ
ملائی زبان کا لفظ
ہے۔ اناناس عربی کی
ترکیب عین الناس کی
بگڑی ہوئی شکل
ہے۔ اناناس کی جلد
آنکھوں سے مشابہ
ہوتی ہے اسلئے اسے
عین الناس کہا گیا ہے

Portuguese Words in Asiatic Languages (ایشیائی زبانوں میں پرتگالی الفاظ) کے فاضل مصنف سیباسٹیون روڈالفو دال گادو نے چند ایسے پرتگالی لفظوں کا ذکر کیا ہے جو ہماری زبان میں مستعمل نہیں. مثلاً انیسون (بمعنی سونف یا بادیان) کے بارے میں انہوں نے بتایا ہے پرتگالی انیس سے ماخوذ ہے یا لفظ بادلا جو مصنف کی تحقیق کے مطابق پرتگالی 'باؤں' (بہ معنی صندوق) سے بنا ہے۔ قمیص۔ عنبر۔ من (وہ نعمت جو حضرت موسیٰ کی قوم پر نازل ہوئی) کروبین (فرشتہ) وغیرہ جو دراصل عربی الفاظ ہیں، مصنف نے انہیں پرتگالی بتایا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اسپین میں آباد ہونے والے عربوں کے توسط سے یہ الفاظ پرتگالی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں رائج ہوئے ہوں گے۔

بہر حال لفظوں کا تقابلی مطالعہ لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں داخل ہونیوالے الفاظ قوموں کے باہمی ربط کی وہ داستان دہراتے ہیں جس میں نہ مبالغے کو دخل ہوتا ہے اور نہ عصبیت کو حالانکہ اچھے سے اچھا مورخ بھی اس راہ میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ سماجی ثقافتی تاریخ کو ترتیب دینے میں لفظوں کا تقابلی مطالعہ ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

مشتاق انجم
کا پہلا افسانوی مجموعہ



بے گھری

عین رشید



— وفات اتوار ۱۰ ستمبر ۲۰۰۰ء

[بوقت مرگ مغربی بنگال پولیس کے ڈائرکٹر جنرل ہوم گارڈز تھے]

نام : عین رشید خان

تعلیم : بی۔اے (آنرز)

موجودہ مشغلہ : ڈائرکٹر جنرل، پولس، کلکتہ

پتہ : Flat no 47,28/1A, Gariahat Road
Calcutta - 700029

فون : (033) 440-6800 / 440-6484 (R)

ادبی کارگزاریاں : (۱) معاصر اردو شعراء کا ترجمہ، ہیکمن، لندن سے شائع۔ ۱۹۷۲ء۔

(۲) شکتی چٹو پادھیائے کے اشتراک سے غالب کا ترجمہ بنگلہ میں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں۔

(۳) آبلوسی بھابھنا۔ عین رشید کی منظومات کا بنگلہ میں ترجمہ ۱۹۹۲ء۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء۔

(۴) جاوید اختر کی نظموں کا بنگالی میں ترجمہ بعنوان "تُونیر"۔ بہ اشتراک سنیل گنگوپادھیائے۔ ۱۹۹۷ء

(۵) انگریزی اخبار "اسٹیٹسمین" میں کتابوں پر تبصرے اور مضامین۔

فلم سے وابستگی : (۱) استاد امیر خاں کے بارے میں ان کی پانچویں برسی پر ایک فلم بنائی۔

(۲) "The seventh man" فلم لکھی اور بنائی۔ حکومت مغربی بنگال کے شعبۂ اطلاعات و ثقافت کی جانب سے اسے لیپزگ فلمی میلے میں ۸۲ء میں دکھایا گیا۔ پیرس اور لندن کے میلوں میں بھی دکھایا گیا۔

(۳) استاد بسم اللہ خان پر ایک فلم کا اسکرپٹ لکھا اور کمنٹری دی۔ اس کے ہدایت کار گوتم گھوش تھے۔

(۴) ۹۴ء میں گوتم گھوش کی ہندی فلم "پتنگ" کا اسکرپٹ اور مکالمے لکھے۔ یہ ۹۴ء کی قومی ایوارڈ یافتہ ہندی فلم تھی۔

(۵) ۹۵ء میں گوتم گھوش کی انڈو برٹش دستاویزی فلم "Beyond the Himalayas" کے لئے کمنٹری لکھی۔

(۶) ۹۷ء میں گوتم گھوش کی ہندی فلم "گڑیا" کے مکالمے لکھے۔

(۷) ۹۸ء میں بھوتی بھوشن بندوپادھیائے کی کہانی پر منی ٹیلی فلم "فقیر" کے مکالمے لکھے۔ ہدایتکار گوتم گھوش تھے۔

(۸) مختلف ریڈیائی سروسز کیلئے نشریاتی ذمہ داریاں قبول کیں۔

(۹) "دوردرشن" نے میری زندگی پر ۳۵ منٹ کی دستاویز "صاحب فن" بنائی۔

پرتگالی اردو

عربی لیموں یا فارسی
لیمو ہے۔ مسٹر
اسکیٹ (Mr
Skeat) کا خیال
ہے کہ ملائی کا لیماں
پرتگالیوں نے اپنی
زبان میں داخل
کرلیا اور ان کے
توسط سے یہ یورپ
میں رائج ہوا۔
سنسکرت میں لمبو کا
ملتا ہے جو فصیح
سنسکرت نہیں ہے۔
قدیم یونانی اس لفظ
سے نا آشنا تھے۔
بارہویں اور
تیرہویں صدی کے
درمیان عربوں نے
اسے اسپین میں
رواج دیا۔ ۱۴۹۴ء
میں IZORES
میں اس کی کاشت
ہوتی تھی (انسائیکلو
پیڈیا برٹانیکا) لہذا
اس کی اصل ملائی
نہیں بلکہ عربی ہے۔
آکسفورڈ انگلش
ڈکشنری کے
مطابق لیمن عربی
کے لیموں سے نکلا
ہے اور پرتگالیوں
نے بھی عربی سے
اس کو اپنی زبان میں

پرتگالی اردو

داخل کیا ہے لیکن
یہاں یہ سوال پیدا
ہوتا ہے کہ آیا لفظ
لیموں عربی ہے اور
یہ اس کی کاشت سے
عربی واقف تھے؟
زیادہ قرین قیاس یہ
ہے کہ دسویں صدی
عیسوی میں دراصل
عرب سندھ میں
اس لفظ سے
متعارف ہوئے
جہاں اسے لامیون
کہا جاتا ہے۔
مرمور مرمر
(یونانی میں
مرمورس ہے)
ماسترد مستول
میزا میز
میزترے مستری
لیلاؤں نیلام
پادرے پادری
اراتیل رتل
(ایک پاؤنڈ وزن)
پرتگالی اراتیل عربی
رتل یا رطل سے بنا
ہے جو بذات خود
یونانی لترا LITRA
سے ماخوذ ہے۔ بہر
حال ہندوستان کی
اکثر زبانوں میں
پرتگال کے توسط
سے رائج ہوا۔

پرتگالی اردو

سباؤں صابن، صابون
(فرانسیسی Savon)
یہ لفظ بھی عربی زبان صابن۔
کی دین ہے۔ لیکن
مشرق میں یہ لفظ
پرتگالیوں کی آمد
کے بعد رائج ہوا۔
ساگو ساگو
پرتگالیوں نے یہ لفظ
نیوگنی میں بولی
جانے والی زبانوں
سے مستعار لیا۔
سولھویں صدی سے
قبل ہندوستان میں
ساگو کے استعمال کا
پتہ نہیں چلتا۔
ہمارے ملک میں
اس لفظ کو رواج
دینے کا سہرا
پرتگالیوں کے سر
ہے۔
سنترا سنترہ
سلادا سلاد
سایہ سایا
(عورتوں کا لباس)
سوفا صوفہ
(اس کی اصل بھی
عربی ہے)
تباکو تمباکو۔ تماکو
GIROLAMO
BENZONI
(1550) A.D.
بیان کے مطابق اس

پرتگالی اردو

کا تعلق میکسیکو سے ہے۔ ۱۶ویں صدی اور سترہویں صدی کے درمیان بعہد اکبریہ ہندوستان میں رائج ہوا۔ سب سے پہلے پرتگالیوں نے ہندوستان اور چین میں تمباکو اور اس کے پودے کو متعارف کیا۔

دکن میں تمباکو کا رواج شمالی ہند سے پہلے یعنی ۱۵۰۵ء میں ہو چکا تھا۔

اسد بیگ (۱۶۰۵) نے بیجا پور کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس نے شہنشاہ اکبر کی خدمت میں ایک مرصع حقہ پیش کیا تھا جسے اکبر نے پینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے اطباء نے اسے منع کر دیا تھا۔ (بحوالہ تاریخ ہند، ایلیٹ جلد ششم صفحہ ۱۶۲۔۱۶۵) جہانگیر کے عہد میں تمباکو اتنا عام ہو چکا تھا کہ صحت عامہ کے پیش

پرتگالی اردو

نظر اس نے اس کے استعمال پر پابندی عائد کر دی۔ امریکہ کی دریافت کے بعد اہل اسپین نے تمباکو اور اس کے پودے کو پورے یورپ سے متعارف کیا اور یہ لفظ یورپ کی مختلف زبانوں کا جزو بن گیا۔ انگلینڈ میں تمباکو سب سے پہلی بار ۱۵۶۰ء میں رائج ہوا۔ ۱۶ویں صدی میں اصل پرتگالی افریقہ کے مشرقی اور مغربی ساحلوں تک لے گئے اہل اسپین تمباکو کا پودا ۱۵۵۸ء میں اپنے وطن لائے مسٹر گیپت رائے نے اپنے ایک مضمون THE INDIAN ANTIQUITY VOL XXV P. 1760 x2 P. P. 37-40 میں بتایا کہ تمباکو کا استعمال ہندوستان میں ویدوں کے عہد میں بھی رائج تھا۔

پرتگالی اردو

اس ضمن میں انہوں نے اسکندھ پوران سے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں مثلاً ذیل کے اقتباسات:

اسکندھ پوران (باب ۵۲)

"تمباکو پینے والے مرنے کے بعد بھوت بن جائیں گے۔ کل جگ میں کالی مہاراج بذات خود تنبول کی پتی بن جائیں گے"۔ "کل جگ میں تمام ذاتوں کو تمباکو پینے کے جرم میں داخل جہنم کیا جائے گا"۔

"نہایت گندے قسم کے لوگ اس عادت میں مبتلا ہوں گے اور اپنا دھرم کھو بیٹھیں گے۔ اور مہاراراؤ رابھ جہنم میں جائیں گے"

مسٹر گیپت رائے کا خیال ہے کہ بنگلہ کا لفظ "تماکو" تمر کوتا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اسکندھ پوران میں لفظ تمکلا آیا ہے اور یہ لفظ تنہا نہیں بلکہ اس کے

ہندوستانی محققین میں مولانا محمد آزاد وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لسانیات کی اس اہم شاخ کی طرف جسے Linguistic Paleantology کہتے ہیں توجہ کی۔ لفظوں کے تقابلی مطالعہ کو جسکی رو سے قدیم تاریخ مرتب کی جاتی ہے، کو Linguistic Paleontology کہتے ہیں)۔ آب حیات میں انہوں نے یوروپی زبانوں کے کم وبیش بیس۱۲۰ الفاظ دیئے ہیں جن میں دو یا تین پرتگالی زبان کے بھی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد کی طبیعت کتنی ایجاد پسند اور ان کا شعور مستقبل کے لئے کیا کیا سامان فراہم کرنا چاہتا تھا۔

ذیل میں پرتگال کے وہ الفاظ دیئے جاتے ہیں جو ہماری زبان میں مستعمل ہیں

پرتگالی	اردو
اچار	اچار
	اس کی اصل فارسی
	ہے۔ پرتگالی پہلی بار
	ملایا میں اس سے
	متعارف ہوئے اور
	دوسرے ملکوں میں
	اس کو رواج دیا۔ بعض
	لغات نویسوں کی
	رائے کے مطابق یہ
	لاطینی لفظ استریا
	(Aetaria) سے
	مشتق ہے۔
ارمایو	الماری
الفینٹ	الپین
ارگاؤں	ارگن
اے آ	آیا
بالاۓ	بالٹی
بانو	باپھ
مولذرتھ اور جان	آب خرات (بھاپ)

پرتگالی	اردو
شیکسپیر کا خیال ہے	لفظ باپھ اگرچہ
کہ بانو سنسکرت	فصیح اردو میں
باسپا یا واسپا سے	مستعمل نہیں ہے
مشتق ہے۔	لیکن بھوجپوری
	اور بنگلہ میں عام
	طور پر استعمال
	کیا جاتا ہے۔
ہپ ترمو	بچسمہ
وردما	برما
(پرتگالی لغت	(ایک آلہ جس سے
نویسوں کا خیال	لکڑی وغیرہ میں
ہے کہ یہ عربی	سوراخ کرتے ہیں)
بیریما سے ماخوذ	ایم۔ ڈوزی کی رائے
ہے۔ ممکن ہے	ہے کہ یہ عربوں کو
کہ ہندوستانی	اسپین میں ملا ہوگا۔
زبانوں میں فارسی	
کے توسط سے	
داخل ہوا ہو۔	
بعضوں نے اس	
کی اصل لاطینی	
بتائی ہے)	
بسیا	باسن
	(یعنی کھانے کی پلیٹ
	سنسکرت میں بھاجن
	جو کھانے کے برتن کے
	معنی میں مستعمل ہے)۔
بسکوئٹو	بسکٹ
بوتلیہ	بوتل
(افریقی عربی بوتلیہ	
بوتلیہ)	
بوتاؤں	بوتام
بویاؤں	بوئیام
(بعض لغت	

پرتگالی	اردو
نویسوں کا خیال ہے	
کہ بویاؤں کی اصل	
ایشیائی ہے یعنی یہ کہ	
ملائی یا ہند چینی زبان	
کا کوئی لفظ ہے۔	
بہرحال اس لفظ کی	
اصل کچھ بھی ہو	
لیکن ہندوستان میں	
یہ پرتگالیوں کی	
وساطت سے رائج	
ہوا۔	
چاؤبے	چابھی۔ چابی
فورما	فرما
فیتہ	نیتہ
گاردا	گارڈ
	(یہ لفظ مراٹھی کی
	قدیم دستاویزوں میں
	ملتا ہے۔ پیشوا یا راجا کی
	محافظت کے لئے جو
	سپاہی مقرر ہوتا تھا
	اسے گارد کہتے تھے۔
	ولسن اسے انگریزی
	زبان سے منسوب کرتا
	ہے۔ واضح ہونا چاہئے
	کہ پیشواؤں کی فوج
	میں پرتگالی افسروں کی
	تعداد کافی تھی)۔
گراندیریو	گراں ڈیل
اگریجا	گرجا
گوداؤں	گودام
(یہ لفظ ملائی زبان	
کا ہے۔ ملائی میں یہ	
گاڈونگ، گوڈانگ یا	

پرتگالی اردو

گوڈونگ ہے۔
اور YELE
کا BURNELL
خیال ہے کہ اس کی
اصل جنوبی ہند ہے
میلگو میں کی دانگی،
تامل میں گی دانگو۔
ساحل کارمنڈل اور
ملایا کے تعلقات
نہایت ہی قدیم اور
پارینہ ہیں۔ پرتگالی
جب ملایا پہنچے تو ان
کی ملاقات جنوبی ہند
کے ان باشندوں
سے بھی ہوئی جو ملایا
میں آباد ہو چکے
تھے)

اسپارا اسپات
پرتگالی میں اسپارا
کے معنی تلوار کے
ہیں۔

استیرار استری
(بڑھانا یا پھیلانا)
بعض لغت نویسوں
کا خیال ہے کہ لفظ
استری سنسکرت
سے نکلا ہے۔ لیکن
دراصل یہ پرتگالی
کے استیرار سے نکلا
ہے جس کے معنی
لوہا پھیرنے کے
ہیں۔

جگار جوا۔ جواری

پرتگالی اردو

کوکنی میں جگار
جوے کے معنی میں
بولتے ہیں۔ مرہٹی
گجراتی۔ ہندی اڑیا
اور بنگلہ میں لفظ جوا
عام طور پر بولا جاتا
ہے۔ ولسن اور ریو
(REEUE) نے
بتایا ہے کہ جوا
سنسکرت دلوتا سے
نکلا ہے۔ مصنف کا
خیال ہے کہ
پرتگالیوں نے کوئی
نیا کھیل ایجاد کیا
ہوگا۔ یا ہندوستان
کے قدیم پانسے کو
دوبارہ رواج دیا
ہوگا۔ ۱۱ویں صدی
کی پراکرت میں لفظ
جوا ملتا ہے۔

کازا کاج
(بوتام لگانے کی
جگہ)

کامرہ کمرہ
(محمد حسین آزاد
نے اسے اطالوی
زبان کا لفظ بتایا ہے۔
لیکن یہ اطالوی اور
پرتگالی دونوں میں
مستعمل ہے۔

کمپاسو کمپاس
(ایل اور برنیل نے
اسے انگریزی کمپاس۔

پرتگالی اردو

compass کی
بگڑی ہوئی شکل بتایا
ہے بعض ماہرین
لسانیات کا خیال ہے
کہ یہ ملائی لفظ کمپونگ
سے مشتق ہے۔
یول نے بھی اس کی
اصل ملائی بتائی ہے
لیکن ان کا خیال ہے
کہ پرتگالی کا
"کیمپو" ملائی میں
کامپونگ بن گیا)

کپتاؤں کپتان
(ترکی میں چپتان)
جاوا اور ملایا میں
پرتگالی گورنروں کو
کپتان کہا کرتے
تھے۔)

کارتوچو کارتوس
[فرانسیسی کارتوش]

کورداؤں کردھنی
(ریشم کی ڈوری)

کودمے گوبھی

کاتاتوا کاکاتوا

کن ھاؤں کمان

چا چائے

کرستاؤں کرستان

پاؤں(پون) پاؤ(روٹی)

پپا پپا

پریگو پریک(کانٹی)

لمپادے لیمپ(چراغ)

لیماؤں(Lemon)
لیمو اس کی اصل

زرد، کالی، سفید رنگت کی
سنگلاخ اونچی اونچی دیواریں
بیڑیاں نطق کی، زباں کی فصیل
اپنی آواز بازگشت کا شور
گھر گیا آدمی حصاروں میں
جس کے ہر سانس میں تھا عالم گم

والٹ وھٹ مین

کی دو نظموں کا ترجمہ

(۱) شہرِ احباب

رات یہ ہم نے سپنا دیکھا
ایک نرالا شہر بسا ہے
اتنا پختہ اور مستحکم
ساری دنیا کی یورش بھی
جس کو زیر نہ کر سکتی تھی
فتح و ظفر تھا اس کا حصہ
شہرِ نوا احباب کا تھا یہ
سب سے بڑھ کر قدر یہاں تھی
جذبۂ دل کی، جنسِ وفا کی
ہر جذبے کی راہ نما تھی
جذب محبت کی رعنائی
ہر شہری کے فکر و عمل سے
ہوتی تھی ہر لحظہ نمایاں
شوقِ محبت کی جوانی
آنکھوں میں تھی مہر و مروت
باتوں سے تھا پیار ٹپکتا
رات یہ ہم نے سپنا دیکھا

(۲) جیسے فردوس کے اک کُنج سے آدم نکلے

خواب شیریں سے تر و تازہ شگفتہ چہرہ
جیسے فردوس کے اک کنج سے آدم نکلے
میں بھی نکلا ہوں سر راہ گزر ہم نفسو
جس روش سے بھی میں گزروں مری جانب دیکھو
میری آواز سنو میرے قریب آجاؤ
مجھ کو بے لاگ چھوؤ، کوئی تکلف نہ کرو
مس کرو میرا بدن، اپنی ہتھیلی رکھ کر
جسم سے میرے نہ رکھو کسی خطرے کا گماں

غزلیں

کہتے ہیں جسے حور وہ عفت ہے نظر کی
واعظ کو خبر ہے نہ اِدھر کی نہ اُدھر کی

جلنے کے لئے ایک بھی پروانہ نہ آیا
تنہائی کی شب شمع نے رو رو کے سحر کی

آئے ہو تو ٹھہرو ذرا غم خانۂ دل میں
کیا شکل نکھر آئی ہے آہوں سے اثر کی

ڈوبا تھا سمندر میں کہ بیٹھے کسی تہہ میں
کیا بھیک طلب کرتا وہ موجوں سے گہر کی

فرعون کی سرکوبی کا تھا حوصلہ جن کو
رکھتے ہیں ہوس دل میں وہ قارون کے زر کی

بیعت کے لئے ہاتھ بگولے کا تھا حاضر
کیا دشت میں ہم آرزو کرتے کسی در کی

خیرہ ہوئیں آنکھیں تو اندھیری ہوئی دنیا
روداد تھی یہ اپنے اجالوں کے سفر کی

تجلی کے لئے صرف آئینہ خانے ہوئے ہوتے
خدا خانے ہوئے ہوتے نہ بت خانے ہوئے ہوتے

نصابِ درس میں داخل نہیں جب فکر کی مستی
بجا ہے مدرسوں کے بیچ میخانے ہوئے ہوتے

کسی بھی داستاں سے ہم نہ پیوستہ رہے، ورنہ
بعنوانِ حقیقت ہم بھی افسانے ہوئے ہوتے

خزف ریزے جو بکھرے تھے وہ یک جا و بہم ہو کر
سبوح و قدح بنتے شیشے، پیمانے ہوئے ہوتے

بزعمِ خود پرستی دھوپ میں تنہا کھڑے کیوں ہو
گھنی زلفوں کے سائے ملتے دیوانے ہوئے ہوتے

نہیں معلوم کس کس آگ میں جلتے رہے ہیں لوگ
جو جلنا ہی مقدر تھا تو پروانے ہوئے ہوتے

جگہ یہ رزم کی ہے، عزم دم بدم رکھنا
کلاہ کج رہے آنکھوں کو اپنی نم رکھنا

سیاہ پوش ہے کعبہ بعز و جاہ و جلال
نظر میں غلبۂ حق اور دل میں غم رکھنا

بڑے نصیب سے ملتی ہے منزلِ اخلاص
بجاؤ عزمِ سفر حبِّ جاہ کم رکھنا

کدورتوں سے جہاں تک ہو چشم پوشی ہو
بصیرتوں کا جو ضامن ہو وہ الم رکھنا

تمیزِ باطل و حق شرطِ آدمیت ہے
کہیں پہ کھینچنا سر کو کہیں پہ خم رکھنا

اردو میں پرتگالی الفاظ

پندرہویں صدی کے نصف اواخر سے لے کر سولہ ویں صدی تک کا زمانہ پرتگالیوں کی بحری طاقت کی برتری اور تجارتی فروغ کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں پرتگال کی کل آبادی دس لاکھ سے زائد نہ تھی۔ لیکن یہ چھوٹی سی آبادی عربوں کی بحری طاقت اور تجارت کو پامال کر کے افریقہ اور ایشیا کے ساحلی ممالک بالخصوص پورے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتی تھی۔ [DANVERS - PORTUGESE IN INDIA]

اہل پرتگال کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ چنانچہ گوا، دمن، دیو، سیلون، ملکا، گالے، ٹرنکومالی، بائی کولا، تکمبو اور ازمز، یکے بعد دیگرے ان کے زیر اقتدار آتے گئے اور گوا کو مرکز قرار دیتے ہوئے پرتگالی تقریباً ایک صدی تک مشرق کی بحری تجارت پر قابض رہے۔ اپنی تجارت کو فروغ دینے اور اجارہ داری قائم کرنے کیلئے پرتگالیوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک آمریت پسند طاقت کر سکتی ہے۔ کبھی مصلحت کی بنا پر نرمی اور اعتدال سے کام لیا اور کبھی ضروری اور غیر ضروری طور پر جبر و تشدد یہاں تک کہ قتل و غارت گری کو بھی روا رکھا۔

۱۶ ویں صدی میں سرعت کے ساتھ ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پرتگالیوں کی نو آبادیات اور تجارتی مراکز قائم ہونے لگے۔ بنگال میں انہوں نے ست گاؤں، بندیل، ہگلی، ڈھاکہ، باقر گنج اور نواکھالی میں اپنی عملداری قائم کی اور تجارتی مفاد کے پیش نظر یہاں کے سیاسی معاملات میں دخل انداز ہونا ضروری سمجھا۔ چنانچہ شیر شاہ نے جب بنگالہ پر حملہ کیا تو جو آن ڈیلی ویلا بوس اور جو آن کوریا نے بڑی بے جگری سے شیر شاہ کا مقابلہ کیا اور مارٹن آنونسوڈی میلو نے محمود شاہ حاکم بنگالہ کو مفید مشورے دیئے۔

ہندوستانی زبان میں پرتگالی الفاظ کی ترویج کا عیسائیت کی تبلیغ سے گہرا تعلق ہے۔ پوپ الیگزنڈر ششم نے حکم نافذ کیا تھا کہ مشرق کے جو ممالک زیر اقتدار آئیں ان میں کیتھولک مذہب کی اشاعت ضروری ہے۔ چنانچہ پرتگالی تاجروں کے ساتھ مختلف آرڈر کے پادریوں کی جماعت بھی موجود ہوتی تھی۔ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں پرتگالیوں نے جس سرگرمی اور گرم جوشی کا اظہار کیا اس کی مثال ہندوستان میں پھیلنے والے کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے دور دراز کے علاقوں میں عیسائیت پھیلتی گئی۔

اس دور میں عیسائیت کی اشاعت غالباً وہ خارجی تحریک تھی جس نے حضرت سید احمد ہندی (مجدد الف ثانی) رحمۃ اللہ علیہ کو اسلامی عقائد کی تجدید کی طرف متوجہ کیا اور ہندوستان کے دوسرے مذہبی گروہوں نے اپنے عقائد پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی۔ یہی وہ دور ہے جس میں بھگتی کی تحریک کو بھی خاصا فروغ حاصل ہوا۔

سیاسی، تجارتی اور مذہبی اسباب کی بنا پر اردو یا ہندوستانی پر پرتگالی کا گہرا اثر پڑا۔ چونکہ ہندوستان میں پرتگالیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ لہٰذا وہ اپنے جہازوں میں کام کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کو ملازم رکھتے تھے۔ جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ پرتگالی انہیں لشکری اور ان کی زبان کو لشکری ہندوستانی کہا کرتے تھے۔ (Portagueoe vocables in Asiatic Languages: Monsignor, Sebastiad, Rodalfodalgado)

پرتگالی زبان نہ صرف ہندوستان بلکہ ملیشیا، پیگو، برما، سیام، ٹانکن، کوچین، چین، فارس میں کامراں، بصرہ اور مکہ میں بولی جاتی تھی۔ یورپی ممالک کے رہنے والے لوگ یہاں کے رہنے والوں سے پرتگالی ہی میں بات چیت کرتے تھے۔ لہٰذا پرتگالی ایک طرح سے مشرق کی مشترکہ زبان بن چکی تھی۔

۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی میں پرتگالی نے بنگال میں مشترکہ زبان کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ نہ صرف پرتگالی بلکہ انگریز، فرانسیسی اور ولندیزی بھی ایک دوسرے سے اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ پرتگالی اقتدار کے زوال کے بعد بھی عرصے تک پرتگالی زبان ہندوستان کے مختلف حصوں میں بولی جاتی رہی۔ دریائے گنگا اور برہم پتر کے ساحلوں پر پرتگالیوں نے چھوٹی چھوٹی نو آبادیاں قائم کر رکھی تھیں جہاں پرتگالی زبان بولی جاتی تھی۔ تجارت اور عدالتی معاملات میں بنگالیوں کو پرتگالی زبان ہی سے کام نکالنا پڑتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ بنگلہ زبان میں بیشتر پرتگالی الفاظ داخل ہو گئے۔
(Portugese in Bengal, J. J. A. Campes)

مشرق میں پرتگالی اقتدار ختم ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے کہ ایک زبان کی حیثیت سے مشرق میں اس کا وجود نہ رہے۔ لیکن وہ پرتگالی الفاظ جو مشرق کی سیکڑوں زبانوں میں داخل ہو کر لسانیاتی تغیرات کو قبول کرتے ہوئے ان کا ایک فطری جزو بن چکے ہیں اس بات کی شہادت دیتے رہیں گے کہ کسی زمانے میں پرتگالیوں کا اثر مشرق میں غالب تھا۔

ڈاکٹر پھر بھی تمہیں زندگی کو بچانا ہے، زندگی کے گھناؤنے روپ میں بھی زندگی بہت بہت پیاری ہے کیوں؟

ریحان کیوں؟۔۔۔ارے کیوں میری باتوں کو ٹال رہے ہو، سمجھتے کیوں نہیں کہ میں اداس نہیں غمگین نہیں، میری کوئی چاہ نہیں نئی کوئی منزل نہیں۔۔۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ آزادی زندگی میں جتنی ضروری ہے موت بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ کیوں کہ اس طرح میرے انتخاب کو، میرے چناؤ کو تم قتل یا خودکشی ثابت کرنے پر تلے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے ڈاکٹر، اگر میرے فیصلے کو عزت دے سکو تو تمہاری نیند کبھی نہیں روٹھے گی۔ تمہارا ضمیر میرے فیصلے کی طرح صاف ہوگا۔ بولو ڈاکٹر، میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا۔ موت میرے اندر اپنا اعلان سنا چکی ہے

[وقفہ]

ڈاکٹر مجھے معاف کر دینا دوست، میں اپنے مہذب پیشے کے ساتھ دغا نہیں کر سکتا۔ (خموشی)

ریحان دغا تو تم نے اپنے دوست کے ساتھ کی ہے۔ لیکن ایسے ڈاکٹر ہیں جن سے زندگی کو خاموش کر دینے والی دوا مل سکتی ہے۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر شاید اب ہم کبھی نہ مل سکیں،۔۔۔ بغیر کسی رنجش کے، تم سے وداع لیتا ہوں۔

ڈاکٹر God save his soul

[اندھیرا۔ اب جو روشنی آتی ہے تو وہ اپنی کرسی پر مردہ پڑا ہے اور ٹیپ آن ہے۔ /یا پھر اداکاری کے ذریعہ تڑپ تڑپ کر ریحان مرتا ہے اور ٹیپ سے ابتدائی آواز آتی ہے۔]

آواز (نرم روشنی، دائرہ نما) میں موت کی وادیوں میں گم ہونے سے بس ذرا پہلے، آپ سبھوں کو آواز دے رہا ہوں کہ جاتے ہوئے میں کسی قسم کے احساس سے خالی ہوں۔ تنہائی کو جھیل لیا ہے میں نے، سزائیں جھیلیں، رحمتیں بھی لیکن آج جیسے سب کو شکست دے رہا ہوں، اپنی تنہائی کو، اپنے اکیلے پن کو، اپنی بے مقصد زندگی کو، یہاں تک کہ وقت کو۔ !

[ریحان اپنے پاؤں پر، ٹیپ بند]

ریحان لیکن جاتے ہوئے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے یہ زندگی بڑی خوبصورت لگی، یہاں کے دکھ سکھ، یہاں کے غم و خوشی، یہاں کے رشتے ناتے، یہاں کے بھید بھاؤ، یہاں کے انسان اور جانور یہاں کے زمین و آسمان بس جینا ایک انتہائی خوبصورت عمل ہے! جب پھول کی خوشبو سونگھو، جب کسی بلکتے ہوئے بچے کو ہنساؤ، جب کسی مجبور کے کام آؤ، جب ایک ساتھ مل کر ہنسی ٹھٹھا کرو، جب اچانک خوبصورت چہرے کو دیکھ کر ٹھٹھک جاؤ، جب کہیں دور سے گیت کی آواز آئے، اور لہر لہر سنگیت اور جب کسی اندھے لاچار کو راستہ پار کراؤ تو

تو سمجھ لینا کہ میں زندہ ہوں . . !

(اداس موسیقی پردہ گرنا شروع ہوتا ہے)

اور سنو!

موت اپناؤ یا زندگی . آخری لمحے تک زندگی کی جنگ میں شامل رہنا۔ اپنے اندر نور کی دھارا بہانا نفرت کی گلیوں سے بچ کر نکل جانا !ایسا کر پاؤ تو مجھے یاد کرنا اور سمجھ جانا کہ میں زندہ ہوں۔

وقتِ مستقبل موت خود آئی یا بلائی جائے، موت واحد سچ ہے، زندگی کے آسمان پر چمکنے والا، زندگی کے صحن میں اُبھرنے والا موت کے ساگر میں، آہستہ آہستہ، قطرہ قطرہ، ٹپکتا رہتا ہے، گھن کھاتا رہتا ہے اس کے جسم کو، ہڈیاں چٹخنے لگتی ہیں، چاہے جس طرح بھی بچاؤ کر دو۔

[لاش کے اردگرد گھومتے ہوئے، اور اچانک ریحان خود بھی اُٹھ کر گاتے ہوئے]

ریحان: یہ عمر جسے تم سمجھے ہو ہر دم وہ تن کو چنتی ہے
وقتِ حاضر: جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات یہ لکڑی گھنتی ہے
وقتِ غائب: تم گٹھری باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دُھنتی ہے
وقتِ مستقبل: اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بُنتی ہے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

[سب آسمان کی طرف اڑتے ہوئے پنچھی کی شکل میں فریز کر جاتے ہیں۔۔۔ چڑیوں کی آواز کے ساتھ پردہ گرتا ہے۔]

پردہ



ڈاکٹر عبدالرؤف

نام : عبدالرؤف
پتہ : ۴۰-بی، تالتلہ لین، کلکتہ-۱۶
والد کا نام : ولی محمد
پیدائش : ۱۹۲۶ء۔ موضع ادسری چھپرا، ڈاک خانہ مدھوبن۔ تحصیل گھوسی۔ ضلع اعظم گڑھ، یو۔پی ضلع اعظم گڑھ دو حصوں میں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ میرا گاؤں ضلع مئوناتھ بھنجن کا تاحال ایک حصہ ہے۔
تعلیم و پرورش : مٹیابرج کلکتہ میں ہوئی۔ مٹیابرج ہائی اسکول سے میٹریکولیشن ۱۹۴۲ء میں۔ سیٹی کالج، مرزا پور اسٹریٹ کلکتہ سے آئی۔ اے ۱۹۴۵ء میں۔ پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے بی اے آنرس ۱۹۴۷ء میں۔ کلکتہ یونیورسٹی۔ ایم اے (اردو، گولڈ میڈلسٹ) ۱۹۴۹ء میں اور ڈی لٹ : کلکتہ یونیورسٹی ۱۹۷۵ء میں۔
ملازمت : اپر پرائمری کتب، ہائی اسکول، اور کالجوں میں ملازمت کی۔ ۱۹۵۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرار بحالی ہوئی اور ۱۹۹۱ء میں بحیثیت ریڈر ریٹائرمنٹ ہوا۔
تصانیف : ۱۔ والٹ وھٹ مین کی ۲۱ نظمیں (ترجمہ ۱۹۶۹ء)
۲۔ اسرار تصوف مصنفہ، سید مظہرالحق عرف پیارے صاحب (ترتیب و تالیف ۱۹۷۱ء)
۳۔ والٹ وھٹ مین کی ۳۱ نظمیں (ترجمہ) ۱۹۷۵ء
۴۔ تلاشِ معیار، مضامین کا مجموعہ۔ ۱۹۷۸ء
۵۔ دیوان میر باقر مخلص مرشد آبادی (ترتیب و تدوین) ۱۹۸۲ء۔
۶۔ محمد شاہی عہد کی ایک نایاب مثنوی مصنفہ، جعفر علی خاں زکی۔ ترتیب و تالیف۔ ۱۹۸۶ء
۷۔ جذب عشق۔ اردو کی پہلی کہانی۔ مصنفہ، میر حسین شاہ حقیقت بریلوی ثم لکھنوی، ۱۹۹۳ء
۸۔ گنجینۂ معرفت۔ مصنفہ، خواجہ عبدالحیٔ چشتی علیہ الرحمۃ۔ ترتیب و تالیف۔ ۱۹۹۶ء
۹۔ مغربی بنگال میں اردو کا لسانیاتی ارتقا۔ ۱۹۹۷ء

۳ نظمیں

دامنِ دل جو کھنچا

دامنِ دل جو کھنچا، میں نے کہا
اس نگاہِ غلط انداز کے کیا معنی ہیں
معنیٔ درد باندازِ جمیل
خم بخم فکر کے پہلو میں اتر آیا ہے
رقص کرتے ہوئے آئے ہیں دل زار تلک
رنگِ مے، رنگِ حنا، رنگِ شفق، رنگِ بہار
راہ میں آئی تھی اک ایسی بھی وادی کہ جہاں
قافلہ تاروں کا گردوں سے اتر آیا تھا
بے نیازانہ گزر جاتا ہے ہر راہ سے شوق
پستی و اوج فقط راستے کی باتیں ہیں
وہ کوئی جذب تھا یا درد کی پرچھائیں تھی
اپنے ہاتھوں میں مرا ہاتھ لئے پھرتی تھی
کوچۂ زلف میں، شہروں میں، بیابانوں میں
میں اُجالوں سے گزرتا ہوں، اندھیروں سے بھی
نہ کسی راہ کی تعیین، نہ منزل کی طلب
کتنی ہی نظریں ہیں، چھو لیتی ہیں
جسم اور جان کی پہنائی کو
کتنی ہی صورتیں ہیں جن میں میں ڈھل جاتا ہوں

لہریں

چند لہریں تھیں فقط نور کی بے سمت و جہت
جن کو الفاظ کا ملبوس پہنا کر میں نے
سحر تاثیر کا اور معنی کا پابند کیا
جو کبھی نظم، کبھی شعر، کبھی گیت بنیں
یہی لہریں مری تصویر لئے جاتی ہیں
قلب کے شہر میں یا روح کے کاشانے میں۔

بیڑیاں

سرحدیں ندیوں، پہاڑوں کی
فاصلے دشت اور سمندر کے

[مارچنگ موسیقی، پاؤں پٹکتا ہوا کردار گھومتا ہے، ناظرین کی طرف] [روشنی]

ریحان . زندگی کا انت کوئی آسان کام نہیں، اور نہ ہی انسانی حرکت ہے میں اس کی اجازت یوں ہی نہیں دیتا۔ آپ کہیں گے کہ پھر اس انت کا ڈھونگ کیوں رچا رہا ہوں، میں کہوں گا، اب زندگی ہے کہاں؟ میں تو بس چلتا پھرتا اور اچانک ہی رک جانے والا پرزہ ہوں، آپ کہیں گے زندگی اوپر والے کی دی ہوئی ہے، میں کہوں گا بے شک، اس کا سفر اب اس کی طرف ہے، آپ کہیں گے خودکشی، قتل یا زندگی کا انت چاہے جیسے بھی ہو، حرام ہے۔ غیر مناسب۔۔۔ میں کہوں گا یقیناً۔۔۔ پر میں تو مردہ پرزے کو ختم کر رہا ہوں۔ چلتی پھرتی لاش، بے معنی، بے رشتہ، بغیر کسی فائدے کے جینا . موت نہیں تو کیا ہے۔ خیر کس کس کو سمجھائیں۔ !اب میرے سامنے صرف دو باتیں ہیں، پہلی بات، میں خود سے پوچھ لوں کہ میری آخری خواہش کیا ہے۔ دوسری کسی ایسے ڈاکٹر کو تلاش کروں جو مجھے۔۔ Lethal Drug سپلائی کرے۔۔ میں نے خود سے کچھ سوالات کئے ہیں جو میری آخری خواہش کے ساتھ جڑے ہیں۔۔۔ یعنی میری زندگی کے ساتھ۔۔۔!

[اسٹیج کے ایک دینگ پر سوال کرتا ہے دوسرے پر آکر جواب دیتا ہے۔ اسی دوران موسیقی اور ہاسی دھاں اسپیکر دار کی لمبائی کی مناسبت سے دو دروازہ لاکر کھڑے کرتے ہیں اور مڑکر اڑنے کے انداز میں کھڑے ہو جاتے ہیں]

سوال زندگی وشال ہے ساگر کی طرح، موت سے پہلے اگر تمہیں اپنا مستقبل چننے کیلئے کہا جائے تو کیا چنو گے؟

جواب میرا مستقبل پر اعتبار نہیں، میں آنے والے دن کے بارے میں جان کر آج کا سکون کھونا نہیں چاہتا۔

سوال زندگی ایک بار پھر ملے تو کیسی زندگی چاہو گے؟

جواب پہلی بات یہ کہ میں آواگون پر اعتبار نہیں کرتا۔ پھر بھی اگر ملے تو مجھے مندر مسجد کا جھگڑا نہیں چاہئے، نہیں چاہئے یہ سالی سیاسی حرامزدگی، نہیں چاہئے دھوکہ، بنک، بوفورس، بی سی آئی، علاقے علاقے میں مارکاٹ، نہیں چاہئے عالموں کی جہالت This Bloody Intellectual Dishonesty نہیں چاہئے ہماری اپنی لائی ہوئی بھوک مری اور گندگی۔۔۔ چاہئے تو سبزہ، سبزہ زار، چاہئے تو آسودگی serenity۔ ایک دوسرے کا دکھ، درد و غم کا ساتھی سنگی بنے رہنا۔۔۔ اور یہ چیزیں نہیں مل سکتیں!

سوال : اگر مرنے سے پہلے ایک دن چاند کی سیر یا سیاروں کی دھرتی پر بھیجا جائے تو کس کو ساتھ لے جاؤ گے؟

جواب اس سفر کی ایک ہی ساتھی ہو سکتی ہے، جہاں پیار ہے اور اندھ وشواس نہیں، وہاں میں اپنی ماں کو لے جاؤں گا۔

سوال . اگر پورے ماضی، پورے اتیت سے کوئی دن مٹانے کے لئے کہا جائے تو کیا کرو گے؟

جواب : جب جنگوں کے فیصلے ہوئے، نیرو، نپولین، ہٹلر، صدام، بش۔۔ ان دنوں کو پلک جھپکتے ہی مٹا دوں گا ۔۔۔اور انسانیت کے دشمن کو بخش دوں گا۔

سوال اگر ایک دن کے لئے دنیا کے سربراہ ہوتے تو؟

جواب : سیاست کے بازی گروں کے ہاتھ آدمی بھٹک رہا ہے، میں ان کے Brain-Trans Fusion کا حکم دیتا۔ سائنس کے کسی اصول کا استعمال کرکے ان کے دل بدل دیتا، بچوں کے لئے، ساری دنیا کے بچوں کے لئے کوئی ایسا امٹ اصول بنا دیتا کہ وہ چاہیں بھی تو سسک نہ سکیں،۔۔۔ کاش۔

سوال اگر ہندوستان کے سربراہ بنائے جاتے تو۔۔۔؟

جواب ایسا ہوتا تو میں اس ملک کے انتظام، یعنی کہ سیاسی سماجی بندوبست کے لئے ہندوستان کو دوسرے کے ہاتھ، ہم سے بہتر اور ڈسپلن والی قوم کے ہاتھ پچاس سال کے لئے۔۔۔ بطور امانت گروی رکھ دیتا۔

[آئینہ کے سامنے ٹیبل پر بیٹھ جاتا ہے، روشنی مختصر]

کاش میری کوئی خواہش پوری ہو سکتی، کاش ایسا نہیں ہے اس لئے اب صرف ڈاکٹر چاہئے۔ وہ دیکھئے۔۔۔ [روشنی کے دائرے میں دوسری طرف ڈاکٹر بیٹھا ہے] میری اس سے گہری بات چیت ہوئی ہے۔۔۔ آپ بھی سنئے اور دیکھئے۔۔۔ [روشنی دائرے کی شکل میں ڈاکٹر پر تیز ہوتی ہے۔]

پسِ منظر سے I will give no deadly drug to any nor will counsel such.

[پس منظر کی اس آواز پر ریحان ڈاکٹر کے قریب کھسک آتا ہے۔]

ریحان : ڈاکٹر، موت کی آواز میں نے سن لی ہے۔ تمہاری مدد چاہئے۔

ڈاکٹر : کیسی بات کررہے ہو، میں زندگی کا سوداگر ہوں۔

ریحان : جب زندگی ملی ہے تو موت بھی برحق ہے اور جب موت برحق ہے تو باعزت کیوں نہیں؟

ڈاکٹر : دیکھو، سانس کی ڈور کو بچائے رکھنا اور امید کے آخرے سرے تک جنگ ہمارا فرض ہے۔

ریحان : چاہے مریض گھٹ گھٹ کر مرے؟

ڈاکٹر : حالات چاہے جو بھی ہوں، زندگی کی رفتار کو روکنا ہمارا کام ہی نہیں۔

ریحان : پر میں نے زندگی، ساری کی ساری گزار دی ہے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر : تو اس سے ہمیں کیا؟

ریحان : بس یہی بات میں بھی کہہ رہا ہوں، میری زندگی کو کسی سے کیا نسبت؟

ڈاکٹر : لیکن تم جس Lethal Drug کی بات کرتے ہو، وہ میرے لئے ممکن نہیں۔

ریحان : کیا اس Lethal Drug کا استعمال تمہارے برادری نے کبھی نہیں کیا، کیا کسی پل پل مرتے ہوئے روگی کو بچانے کے لئے تم لوگوں نے کبھی بھی آکسیجن بند نہیں کیا؟

ڈاکٹر : مجھے تو ایسی خبر نہیں۔

ریحان : دیکھو ڈاکٹر، ساری ذمہ داری میری ہے، اپنا will ٹیپ کرلیا ہے اور محفوظ بھی۔

ڈاکٹر : میں تمہاری بے بنیاد آرزو پوری نہیں کرسکتا۔

ریحان : (جھکتے ہوئے، تقریباً دوزانو) ڈاکٹر، برسوں مجھے زندگی سے ہرا بھرا دیکھتے رہے ہو، آج بھی اسی طرح خوش خوش گزرنا چاہتا ہوں، مجھ پر رحم کرو، رحم کرو ڈاکٹر، بدلے میں چاہے جو لے لو۔۔۔!

ڈاکٹر : (اٹھاتے ہوئے) جب امتحان پاس کرکے Practice کے لئے میدان میں نکلتے ہیں تو پہلے کیا قسم لیتے ہیں، جانتے ہو۔

ریحان : جانتا ہوں ڈاکٹر۔

ڈاکٹر : I will give no deadly drug to any nor will I counsel such ..

ریحان : بہت خوب، اس قسم کے آگے اور کچھ ہے، آگے چلو ڈاکٹر۔

ڈاکٹر : آگے اور پیچھے اگر موت کی دستک بھی ہو تو میں زندگی کی حفاظت کرتا ہوں۔

ریحان : تم بھول رہے ہو ڈاکٹر! جو قسم تم کھاتے ہو، اس کا ایک ٹکڑا یوں بھی ہے۔
And specially I will not aid woman to procure abortion.
نہیں؟

ڈاکٹر : ہاں تو ہوا کیا؟

ریحان : یہی ہوا کہ Abortion آج ہر ڈاکٹر کرتا ہے، تم سب آسانی سے اسے اپنا کام اور اپنا ایمان دونوں بنا لیتے ہو۔۔۔ اور قسم کہیں پیچھے پڑی سسکتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر : اسے قانون کی پشت پناہی حاصل ہو چکی ہے۔

ریحان : اور باعزت موت کو گلے لگانے کی خواہش قانون کے سامنے کچھ نہیں؟ ہمیں موت کو چننے کا کوئی حق نہیں؟ اسی طرح جس طرح تم نے ڈاکٹری کا پیشہ چنا ہے اگر میری بیوی زندہ ہوتی نا، تو تمہیں اس کی تکلیف بھی نہ دیتا۔ دیر تک ایک دوسرے کو الوداع کہتا اور پھر پر سکون نیند سو جاتا۔۔۔ ڈاکٹر پہلے Abortion تھا۔۔۔ آج Euthenesia ہے۔۔۔۔ کوشش کرو، آگے بڑھو ڈاکٹر، ایک دن اسے قانون کی پشت پناہی حاصل ہو جائے گی۔

ڈاکٹر : تم اپنے خیالوں میں بوڑھے ہو چکے ہو، زندگی بہت پیاری ہے، چلنے دو جب تک چلے۔

ریحان : اور جب بالکل اپاہج ہو جاؤں، لاچار بے بس، دوسرے کے سہارے کراہتا ہوں تو تم جیسے دوست ڈاکٹر مجھے رحم کی نگاہ سے دیکھیں۔ یہ دیکھیں کہ بدن کس طرح چٹختا ہے اور کیسے نڈھال ہوتی ہے روح۔۔ اور پھر خوف سے خدا کو یاد کرکے اپنے لئے دعا کریں کہ اے پروردگار مجھے ایسے دن نہ دکھانا۔۔۔!

چھوٹی سی نظم یاد کروں، اور اپنے استاد کو سناؤں۔

WHEN THE SKY IS BLUE
AND THE MOON IS UP
I LOVE TO GO CYCLING

WHEN THE WIND IS JUST RIGHT
AND THE STARS ARE BRIGHT
I LOVE TO GO CYCLING

WHEN IT IS COOL, MISTY and HAZY,
WHEN I AM A BIT CRAZY
I LOVE TO GO CYCLING

یا پھر سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

آج بھی یاد ہے، وہ استاد کی شاباشی، یہ لڑکا آگے جاکر کچھ کرے گا ملک کا نام، ماں باپ کا نام روشن کرے گا (پھیکی ہنسی) آگے بہت آگے چلتے جایئے، کچھ ہو تو ملے آگے خلا ہے صرف خلا، گہرا سناٹا

(موسیقی، نیم روشنی، دوسری جگہ کردار آکر بیٹھتا ہے)

آگے چلتے ہوئے، بہت تیز، کبھی دھیرے سے نئے لوگوں کو جانا۔ ہواؤں سے باتیں کیں، دوستوں کے جلوے دیکھے، پاس پڑوس کے بوڑھوں کی تنہائی دیکھی ان کا گھنا سناٹا اور وہ کنجوس موٹا توند والا رام کمار بھی جس کے ایک ہاتھ میں اکثر شراب کا گلاس اور دوسرے میں سگریٹ۔ ہمیشہ ست کاہل، توند کا بوجھ اُٹھائے لیکن جہاں کہیں سکوں کی جھنکار ہوئی ناچنا شروع کیا یوں اس دوست اور ہمدم دیرینہ کو بھی دیکھا جس نے محبت کی گرمی سے میری پہچان کرائی، رونا سکھایا، ہنسا جینا سکھایا دوسرے کا CARE کرنا۔

دور دیش میں بسا
مجھ سے کس قدر الگ پر میرے جیسا
آنکھیں اس کی خوابیدہ جیسی
چہرہ اس کا اداس جیسا
دیوانہ ہے پاگل ہے، نحیف و نیم جاں
ہے پر، جس میں درد کا جہاں

بھلا سا انسان ہے، دور ہے بہت، پر میرے اندر جاگتا ہوا، .... پورے کا پورا........ نرمی کے ساگر میں نہلاتا . . .. مجھے انسان بناتا۔

کیا نہیں ہے جوانی کی دہلیز میں.. . . . کئی عورتیں، اچھی بری، کئی دوست، کھٹے میٹھے، انقلاب کی خبریں، سگریٹ کے مرغولے اور شراب کی کھنک، ایسے میں ہی انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد... ... کالو ہاتھ اڑیئے داؤ بھینگے داؤ ... . پارٹی کشیدگی اور پر موٹر کلچر، جینز (JEANS) جیکٹ، کرتا پینٹ، آرٹ اور فلسفہ، سونا گاچھی اور دلال.. . . . . اور ۱۹۶۰ء کے بعد کی تپش، . . . . . تچی، ـــــ جنوئن۔

We failed but we lived honestly

ہنسی) ہوگلی کا کنارہ اور "شب خون" "جدید ادب کا تنہا آدمی نئے معاشرے میں" یا بتی بجھا کے ہیرو ہیروئن لیٹ گئے ر پھر کھیل اس کے بعد مزے دار ہوگیا۔ بیگم اختر اور بیتھوین کی IXth Symphony.ـ اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا ..... . ٹرین میں آگ، پولیس مظالم اور GAY ادب اور ہوڑہ کے مشکوک ہوٹل . . کبھی کبھی تانبے کی طرح چمکتا آسمان، پسینے کی بوند، محفلِ یاراں . Logic & Un Reason کیا نہیں ہے۔ اس موڑ پر بیوی بچے پڑوسی اور رشتے ناتے، کسی کا حسد اور کسی کی دشمنی، کسی کی محبت اور کسی کی قربانی۔ لگتا ہے پورا سرکل گزار آیا.. شاید سب گزر بھی گیا۔

Establishment anti-establishment فون نمبرز ٹرنگ ٹرنگ. . . . . آہ کہیں کچھ غلط ہوا. . . . بہت بڑی چوٹ، کچھ ایمان اور یقین کی کشتی . آہ . . . .

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

[موسیقی. . روشنی . . کردار آئینے کے سامنے وگ

پہنے ہوئے، بڑھاپے کا میک اپ ...... مکالمے کے درمیان اسٹینڈ سے لے کر شال اوڑھ لیتا ہے۔]

ریحان : کس قدر چاندی اُگ آئی ہے سر میں، کتنا وقت نکل گیا۔ کئی خواب، ادھورے، کچھ پورے بھی، کتنی صدیاں گزریں، اور عمر صرف ۶۵ کے آس پاس...... یاد کرنا، پیچھے مڑ کر دیکھنا، سب کچھ ایک بار پھر جینا اور جی کر فیصلہ کرنا...... کام ہوا پورا کہ نہیں، موسم میں بھیگنا اور بارش میں سرپٹ بھاگنے کی چاہ...... یہ سب صرف ایک آدمی، یعنی کہ میں...... میرے لئے صرف معنی رکھتے ہیں ...... میرا اب سماج سے کیا رشتہ ہے۔

[ناظرین کی طرف]

میں Diabetes کا شکار، جی رہا ہوں، یاد کے پرخچے بھی اُڑنے لگے Loss of memory کچھ ایسے روگ بھی ہیں جو مجھے Invalid کر دیں گے ...... بالکل باطل...... دوسرے کے سہارے پہ، مفلوج و محتاج زندگی ...... پھٹے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے کی طرح ..

میں اپنا EXIT چاہتا ہوں ... EXIT پیار کے ساتھ، اعتبار کے ساتھ، رتبے کے ساتھ، معنی اور نفاست کے ساتھ ...... ہاں میرے بچے اپنی دنیا میں مگن ہیں، میری بیوی گزر چکی ...... Late مسز ریحان ثاقب۔ اب یاد نہیں آتی...... اور آتی بھی ہے تو رلاتی نہیں۔ پہلے گونجتی تھی اس کی آواز ...... پہلے میں نے موت کو نہیں چنا تھا۔ اس کی آواز کا سہارا تھا۔

[اندھیرا]

آواز: ہم جب بوڑھے ہو جائیں گے، تو ہر گلی کے کنارے سیر کریں گے، دیر تک خاموش کبھی کسی پاس کے گاؤں میں، کیاریوں کے بیچ، آسمان پر رات تاروں کا قافلہ ہوگا ...... ہلکے سے مسکرائیں گے، آہستہ آہستہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی ادھوری بات کہہ جاؤ گے ...... کبھی دور کھڑے اپنے جوان بیٹوں کو دیکھیں گے ...... ان کے بچوں کو لوریاں سنائیں گے ...... ایک نسل دوسری کے ساتھ بندھی رہے گی......!

(یا پھر نسوانی کردار)

[روشنی]

ریحان : وعدہ تھا صاحب، پر نکل گئی کترا کر، اور میں اکیلا رہ گیا۔ تنہائی اور اس کو نئے پرانے، اچھے برے معنی پیدا کرنے کی کوشش! لیکن آج گزرتی ہوئی ہر چاپ پر چونک کر دیکھنا کوئی نہیں آتا آتا ہے اندھیرا، سناٹا .. خاموشی . دم گھونٹ دینے والی بے بسی اور آپ سب جانتے ہیں کہ انسان بہت کچھ نہیں سہہ سکتا، بے صبر خود غرض تنہائی جان لیتی ہے بس یہیں کہیں میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے کسی Life saving drug کی ضرورت نہیں۔ اپنا Will بھی کر لیا ہے اور اپنے Living Will کو اس Cassete میں بند! یہ ہے وہ کیسٹ جس میں میرا آخری پیغام بند ہے.. دنیا کے لئے بھی، اور اپنے لئے بھی، سنئے . !

[ٹیپ ڈیک میں لگتا ہے۔ خود ناظرین کی طرف پشت کئے ہوئے]

آواز: میں ریحان ثاقب، پورے ہوش حواس میں یہ بیان دیتا ہوں کہ میں زندگی کے خوبصورت دن گزار چکا ہوں اور مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں کہ اب میں زندگی کی دوسری طرف کھڑا ہوں۔ دماغی طور پر صحت مند، اپنا فیصلہ خود کرتا ہوں۔۔۔ آج کا فیصلہ میرا ہے صرف میرا۔۔۔ میری یہ زندگی اپنے لئے دوسروں کیلئے یا اس سماج کیلئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔۔اسے ختم ہونا چاہئے۔

[ٹیپ بند کر کے ریحان ثاقب خود کہتا ہے] یہ قتل نہیں، نہ ہی خودکشی ہے۔ خودکشی یا آتم ہتیا کوئی معمولی کام نہیں !اور میں تو چیونٹی کو بھی نہیں مار سکتا۔۔۔ خودکشی کو بے معنی سمجھتا ہوں۔ اسطرح باہوش و حواس یہ فیصلہ ذاتی طور پر کرتا ہوں کہ میرا Exit ضروری ہے عزت کے ساتھ، میری آخری امید اور آخری مطلب، میرے لئے آخری اہم کام۔! میری موت کے بعد کوئی مجھے دفنا دے تو ٹھیک، ورنہ کوئی شکایت نہیں چوں کہ آپ ہی آپ مر نہیں سکتا اسلئے میں نے ایک ڈاکٹر دوست کا انتخاب کیا جو مجھے Lethal Drug سپلائی کرے گا۔ میرے فیصلے کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے!

جھاڑنے کی اداکاری کرتے ہیں۔ مدھم روشنی پیچھے نیمل پر ایک جوان لڑکی پر پڑتی ہے۔ کردار لڑکی کے پیچھے سے اُبھرتا ہے اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتا ہے]

غزل : تم جب بھی مجھے چھوتے ہو یوں لگتا ہے پگھلنے لگی ہوں میں اور .... اور یہ وقت تھم گیا ہے۔

ریحان : یہ تمہاری آنکھیں، یہ ہونٹ، یہ بدن سے اٹھتے ہوئے شرارے ..... جیسے آنچ ہی آنچ۔

غزل : پر اب تو میں جا رہی ہوں۔

ریحان : کہاں؟

غزل : زندگی میں کوئی بھی چیز ہمیشہ کہاں ہے؟

ریحان : ہمارا پیار، یہ زمین و آسمان، یہ پیڑ پودے،

غزل : نہیں ریحان، کل جو پیار تھا آج اس میں کمی بیشی ہوئی ہے، کل جو آسمان تم نے دیکھا تھا، اس میں کہیں رنگ کا فرق ہے تو کہیں تیور کا ..... اور یہ پیڑ پودے ..... ان کی بھی تو عمر ہوتی ہے .... سب کچھ وقتی۔۔۔!

ریحان : پر تمہاری آنکھوں کے شرارے، تمہارے بدن کی آنچ!

غزل : صرف تمہارا احساس ہے، ..... سب کچھ روئی کے گالے کی طرح اڑ جائے گا۔

ریحان اڑ جانے دو، آج تو کم از کم ہمارا ہے، اندر اور باہر کس قدر سکون ہے!

غزل . یہ ساری کائنات جتنی پُر سکون ہے، اتنی ہی طوفان اٹھا سکتی ہے، یہ دنیا جس قدر سہانی لگتی ہے اتنی ہی فساد کی جگہ ہے ریحان، بے قراری، بے چینی، ہنگامے اور تم جانتے ہو کیا کیا کچھ ہو رہا ہے .....

ریحان : ہاں، ہندو مسلم فساد

غزل . کالے گورے کا ہنگامہ

ریحان : خیال اور خواب کی ٹکر

غزل بدتمیزی اور بے ترتیبی۔

ریحان . پاگل پن اور بے ایمانی

غزل . معصوم بے گناہ پر گولیوں کی بارش

ریحان . گناہوں کے ڈھیر پر پھولوں کی بارش!

غزل . تو پھر؟

ریحان . تو پھر دونوں صرف پیار کریں گے، پیار کی باتیں، آنے والے کل کی باتیں (گلے لگاتا ہے۔ روشنی مختصر ہو کر لڑکی کے چہرے پر)

غزل : لیکن یہ سوسائٹی .... میرا مطلب یہ مردوں کی سوسائٹی مجھے پسند نہیں۔ یہاں مذاق کے لئے بھی ان کی اجازت چاہئے۔ پوری دنیا لالچ میں ڈوبی اور گوشت کی خوشبو سے بھری (بانہوں سے نکل کر) یہاں میرا کیا ہے، ماں کہتی ہے تم ۲۲ برس کی ہو گئی، سنبھل سنبھل کر چلو۔۔۔ جانتے ہو، یہ دعائیں اب جل جل کر میرے سینے کو چھلنی کرتی ہیں، جینا چاہتی ہوں، اپنے طور پر ...... اپنے انداز سے، ۔۔۔ سنبھل کر کہ لڑکھڑا کر، مجھے معلوم نہیں، .....

ریحان : تو میری جگہ اس میں کہاں ہے؟

غزل : یہ نہیں کہتی کہ دنیا صرف دکھ دیتی ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ دنیا جی دار لوگوں سے خالی ہے۔ پر وہ وقت بھی نہیں آیا کہ اپنے بچپن کو لوٹ گئی ہوں میں، ذرا سا کسی کا اسپرش، یا پھر ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ دینا ... سب کچھ تھا میرے لئے، کبھی دل نے چاہا کہ کوئی ٹوٹ کر چاہے مجھے، مجھ سے باتیں کرے، کرتا جائے، مسلسل دیر تک، رُکے نہیں ورنہ دنیا رک جائیگی .. اپنی باتیں، دوسروں کی باتیں، بے پناہ پیار محبت کی کہانی .. میں سامنے بیٹھی، قطرہ قطرہ پگھلتی رہوں، مجھے دوستی ملے، کوئی مجھے پورے کا پورا سمجھ پائے .. . پر .

ریحان : پر کیا...... میں تمہیں سمجھ نہیں پاتا، کیا ایک دوسرے میں پگھل کر ہم آگے نہیں جا سکتے۔

غزل : کیا فائدہ جب ہماری باتیں اور ہماری حرکتیں الگ ہوں، دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ لفظ کچھ اور معنی کچھ۔

ریحان : دیکھو عورت اپنے گھر میں عورت ہے جہاں اسکا شوہر، اس کے بچے، اس کی خوشیاں اور اس کے غم ہیں۔

غزل : پر ضروری نہیں کہ اس کی سیما بھی وہیں ہو؟

ریحان : مطلب؟

غزل . مرد، بچے اور گھر کے علاوہ اسے خود بھی تو ثابت کرنا ہے، اپنی روح کو اپنے طور پر سنوارنا۔

ریحان : تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟ تم جا رہی ہو؟

غزل : ہاں یہ پوپلر کلچر مجھے تل تل مارتا ہے .. . میں اپنا

سب کچھ کھو رہی ہوں، مجھے نہیں چاہئے یہ سب کچھ، اور وقت ہر زخم پر مرہم رکھ دیتا ہے۔ ہمارے حصے کی یہ دنیا بڑی عجیب ہے۔ سوچو تو، پیپل کے پیڑ کے نیچے کوئی گیان پاتا ہے، کوئی تاج محل بناتا ہے۔ کوئی خاک اور خون کو دیکھتا ہے اور تخت و تاج کو چھوڑ دیتا ہے کوئی تخت و تاج کے لئے خاک و خون سے دھرتی کو بھر دیتا ہے۔۔۔ بس صرف خواب سے اٹھنے کی دیر ہے۔ یہ لباس، یہ طرز، یہ زندگی، یہ سب اہم نہیں۔ کچھ کر گزرنا، اپنے لئے کوئی رول چن لینا، ۔۔۔ ایک معنی۔۔۔ کہ ہم کیا ہیں، کہ دور سے کوئی دیکھے اور جھٹ پہچان لے، یہ گوتم ہے، یہ شاہجہاں، یہ اشوک ہے یہ نادر شاہ........ کبھی کوئی گیان پا سکی تو آؤں گی تمہارے پاس، سناؤں گی پل پل کی کہانی، اس کا دکھ درد ...... تب تک کے لئے، خدا حافظ ریحان

...... مجھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ جانہ پاؤں گی۔

(نکل جاتی ہے)

ریحان : نکل گئی کترا کر وہ چاند بدن۔ نہیں جانتا کہ سارے کا سارا مجھے چاہئے، مکمل سپردگی، مکمل طور پر جینا، مکمل طور پر مرنا۔

(وقت نمودار، ریحان آئینہ کے سامنے)

وقت حاضر : پھر آئی آدم کی سواری

وقت غائب : خوشیوں میں صبح بھی جھومی

وقت مستقبل : ٹوٹ کے برسا پانی

آدم کی اولادوں سے گہرا راز کچھ بھی نہیں

کہرے کی طرح لپٹا ہے راز میں

ہر ایک زخم اس کا ہرا اپنے گھر سے بے گھر،

بے زمینی کا یہ پودا

اپنے اندر سو سو کھیل رچاتا۔! (نکل جاتے ہیں)

(آہستہ آہستہ موسیقی اور روشنی مرکوز ہوتے ہوئے ریحان پر)

ریحان: کیا دیکھتے ہو، سب کچھ سایہ جیسا ہے، جو گزر گیا سو گزر گیا، تمہیں یاد ہے، بچپن کیسے بیتا، کیسی نمی تھی فضا میں، موسم کتنا الگ، نرالا اور .... ہاں میرا بچپن میرے اندر ہمیشہ ہمکتا رہتا ہے۔ باہر آنے لگتا ہے اچھل اچھل کر، کتنی بار دل نے چاہا ...... ایک بار صرف ایک ...... اپنا سارا بچپن پالوں ...... وہ گلیوں میں دوڑنا، پتنگ کے لئے، گائے کے گلے میں لٹکتی ہوئی گھنٹی دیکھنا، صبح ماں کے پاؤں دابنا اور اسی طرح اپنا سبق یاد کرنا (بہت تیزی کے ساتھ)

(Asoka)

As a matter of fact he may be justly regarded as one of the greatest monarch in the whole world, anciant and modern His conception of duties and responsibilities of king, the Zeal with which he persued his ideals, and the extent to which he succeeded in giving effect to them, all alike are worthy of highest praise. Probably no ruler ever expressed the relation between the king and his subjects in a simpler and nobler language."All men are my children that they may enjoy every kind of prosperity and happines in both this world and the next, so also I desire the same for all men"

کھل کر ہنسا (ہنسی) وہ عید کی خوشیاں : آؤ دوست ہاتھ ملاؤ کل صبح عید ہے" (اچانک رک کر) ہاں بقر عید میں جانوروں کا قتل دیکھ کر یوں جھجکنا کہ "نہیں" (ہاتھ سے چہرہ چھپاتے ہوئے) وہ محرم .... رو رو کے یہ کہتی تھی بالی سکینہ ...... وہ ڈھول تاشے، دم دم، دمادم دم ...... وہ سینے سے لٹکتا چھوٹا سا ایک بٹوہ، بھنی ہوئی سونف اور گری۔ رنگ برنگ کے خورے، ایک ڈوری سے کھینچ کر کھولنا اور دوسری سے بند کرنا، وہ سارا کچھ، وہ شام وہ راتیں، بے فکر گہری نیند سے بھاری راتیں، جی چاہتا ہے جی لوں، آپ کا جی چاہتا ہے؟ میرا تو چاہتا ہے ...... ایک چھوٹا سا ننھا سا بچہ بن جاؤں، گھٹنوں کے بل چلوں چل میرے گھوڑے ٹک ٹک ٹک۔ عمر کی ناؤ چلتی رہے اور پھر کوئی

غرضی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس بوڑھے کے فیصلے میں دھرا کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خیر جب شام آج میرے ساتھ آپ بتا ہی رہے ہیں تو سنئے۔۔ (وقفہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پچھلے چند دنوں سے میں یادوں کی رہ گزر پر کھڑا اپنے پورے ماضی کو پکار آیا، ایک ایک دن۔۔۔ چھوٹے سے چھوٹا واقعہ۔۔۔ جو کچھ کہ یاد رہا۔۔۔ لیکن پہلے آپ کو ایک بات اور بھی بتادوں کہ میں دماغی طور پر بالکل تندرست ہوں، اپنے آس پاس کی دنیا کی خبر ہے مجھے۔ مجھے پورا اندازہ ہے کہ روس بکھر چکا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ویمبلڈن ڈبلس امریکی جان میکنرو اور جرمن مائیکل اسٹیچ نے جیتا ہے۔ میرے لئے یہ خبر بھی نئی نہیں کہ ہندستان میں دلالوں نے ساز باز کر کے تجوریاں خالی کی ہیں، یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو چپ چاپ صدیوں کا درد سہہ لیتے ہیں اور خبر بھی نہیں بنتی، کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے پاس دوائیوں کے لئے پیسے نہیں، ہر دن شہر سے خواب کی طرح پگھل جاتا ہے۔۔۔ اور آپ کے اور میرے بیچ ایسے بھی ہیں جن کی زندگی بیکار محض ہے۔ ان کے لئے بھی اور سماج کے لئے بھی۔۔۔ ٹھیک یہیں پہ مجھے موت کا چہرہ نظر آتا ہے، موت۔۔۔ ایک طویل خاموشی، مکمل خاموشی۔۔۔۔ ایک خیال بے مثال اندھیرے کا۔۔۔ حتیٰ کہ موت ایک خلائی گیت!۔۔۔ (کرسی پر بیٹھ کر) موت کا خیال مجھے برسوں ستاتا رہا ہے کبھی ڈرا دیتا، روپ بدل بدل کر، کبھی محبت کرتا کسی ایسی شام کو جب میں یکہ و تنہا، مایوسی کی دلدل میں دھنستا جاتا۔۔۔ یہی موت میری طاقت بنتی ہے۔۔۔ (چلتے ہوئے) جیسے آسمان پر جھلملاتا ہوا امید کا ایک روشن ستارہ۔۔۔ (خموشی)۔۔۔ کتنی بار اسے پٹ کیا، پوری طاقت سے اپنے سارے بدن سے جھٹک دیا، دور کر دیا خود سے اور زندگی کے روشن دروازے میں گھس آیا۔۔۔! کون کہتا ہے کہ موت دشمن ہے، جدا کر دیتی ہے موت، سب کچھ چھین لیتی ہے۔۔۔؟ آپ ہی بتایئے کہ کیا دشمنی کرتی ہے یہ موت، کوئی بھی آدمی جیسا کہ میں یا آپ، یا کوئی اور۔۔۔ ہے تو وہ اکیلا، ۔۔۔ زندگی اور موت، دونوں میں اکیلا۔۔۔ تو پھر نقصان کس کا، کیسی جدائی اور کس سے۔۔۔ بس صرف کبھی ''ہاں'' اور کہیں پر صرف ''نہیں'' وہ نظم تو یاد ہوگی ہی

کہ موت تو ایک کویتا ہے

مجھ سے اک کویتا کا وعدہ ہے ملے گی مجھ کو
ڈوبتی نبضوں میں جب درد کو نیند آنے لگے
زرد سا چہرہ لئے چاند اُفق تک پہنچے
دن ابھی پانی میں ہو، رات کنارے کے قریب
نہ اندھیرا نہ اُجالا نہ ابھی دن ہو نہ رات
جسم جب ختم ہو اور روح کو جب سانس آئے

مجھ سے اک کویتا کا وعدہ ہے ملے گی مجھ کو!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جب زندگی میں کوئی معنی نہ ہو تو مجھے موت کا خیال ستاتا ہے۔ جب کسی کے دکھ میں رونے کی طاقت نہیں تو وہ انسان نہیں، جب حسن سے سرشار ہونے کی قوت نہیں تو پھر جینا کیسا پھل کا ذائقہ اور پھول کی خوشبو ہی تو زندگی کی پہچان ہے، ہے یا نہیں، اگر آپ ان کو دیکھ کر چونکتے نہیں، اگر دور تک سبزے کو دیکھ کر آپ کے اندر خوشی نہیں ہوتی تو آپ کا اندر اور باہر یقیناً مردہ ہے (چلتے ہوئے فرنٹ اسٹیج پر) میں بھی ایسی ہی سرحد پر کھڑا موت کو آواز دے رہا ہوں (روشنی اسی پر مرکوز) میں نے پورے ہوش و حواس میں موت کو چنا ہے۔ مجھے کون روک سکتا ہے

[روشنی ابھی چہرے پر]

پس منظر

"THIS IS THY hour Soul!
Thy free flight into the worldless
Away from books, away from arts
The day erased The lessons done" ★

[اندھیرا ۔ موسیقی ۔ دھیرے دھیرے روشنی آتی

! گلزار ★ وھٹمین

ہے، کردار آئینے کے سامنے، خاموشی سے خود کو تکے جارہا ہے]

ریحان: اِن آنکھوں میں کیسا دردا گا ہے، پھیکا پن، سرد، لگتا ہے کارواں گزرا اور خاک اُڑ رہی ہے۔ تم نے محبت کو جانا ہے، پھولوں کے درمیان محبت کو، بارش کی آواز، ٹپ ٹپ ٹپ، اور چاندنی رات میں نہایا ہوا درخت

اور تم نے دیکھی ہے سبز پتوں کی بھیڑ، اندھیرے میں سیاہی مائل . . . تم نے سنا ہے وہ شور، پتوں کے درمیان، جب ہوائیں پاگلوں کی طرح خدا کو یاد کرتی ہیں۔ سنسناتی ہوئی اور کبھی دھیمے سُروں میں، کیسی آنچ ملتی ہے زندگی کو، کیسی ٹھنڈک، لمحہ لمحہ سرکتی رات، لمحہ لمحہ اترتی چاندنی، لمحہ لمحہ کسی کا لمس، لمس، اسپرش گرم، نرم، سنسناتا، ہانپتا، پھر پیار سے چمکارتا، ۔۔۔ کیوں بھول گئے، کس طرح ریکارڈ کرلیا تھا۔ تم نے اس کی آواز کو، زندگی کی حسین مسکراہٹ "موت" کو اپنے لئے ساتھی چنا ہے تو سناؤ پھر وہی آواز .

[دراز سے ایک ٹیپ اور کیسٹ نکالتا ہے]

ہاں یہ ہے وہ کیسٹ، (ناظرین کی طرف بڑھتے ہوئے) یہ آواز آج تک صرف میں نے سنی ہے، میرا اپنا تجربہ ہے، کورا کنوارا، برسوں میرے سینے سے لگا۔ دکھ میں سکھ میں، اکیلے میں تنہائی میں، سفر میں بھیڑ میں، میرے ساتھ، صرف میرے ساتھ، آج آپ کو سناتا ہوں

[ٹیپ ڈیک میں کیسٹ ڈالتا ہے، آن کرتا ہے، روشنی ٹیپ ریکارڈ اور کچھ حصہ روشنی کا کردار کے چہرے پر]

آواز ۱ : (ہنسی کی آواز، ہی ہی ہی نسوانی)

آواز ۲ : نہیں آج تو کہہ ڈالو، اپنے سارے خواب!

آواز ۱ : کیسے کہوں، تم سامنے جو ہو، لب تھر تھرا رہے ہیں، حلق میں آواز بیٹھی جاتی ہے۔

آواز ۲ : لو، میں نے منہ پھیر لیا ہے، تمہاری طرف میری پیٹھ ہے، اب تو کہو،

آواز ۱ : میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ اتنی دور آنکلوں گی، کچھ ہی وقت گزرا ہے پر یوں لگتا ہے کہ جیسے زمانہ بیتا، کئی موسم آنکھوں سے پھسل گئے۔۔۔ بہار خزاں، خزاں بہار، کتنا عجیب ہے یہ سب، محبت کی عمر ہوتی ہے؟ ...... نہیں آج ہماری ملاقات صدیوں پرانی بھی ہے، آوازیں اڑتی رہی ہیں ہماری، خلاؤں میں اور آج اچانک ان آوازوں نے ہمارے دلوں پر قبضہ جمالیا ہے ....تل تل پگھل رہی ہوں میں موم کی طرح، تمہارے جسم میں داخل ہوتی ہوں، تمہارے انگ انگ کو اپنایا ہے، میرا دماغ اب میرا نہیں، تمہارا ہے، تمہارا جسم اب تمہارا نہیں میرا ہے۔ میرے ہاتھ میری باہیں تمہاری آنکھیں اور تمہارے بدن کی حرارت، سب گھل مل گئے ہیں۔ کیسے ہوا یہ سب، بنا سوچے سمجھے، بنا کسی اندرونی جھکاؤ یا تحریک سے، تم نے یہ کیوں کیا۔۔۔ کیسے الگ ہو سکوں گی میں ان سب سے، کچھ بھی ہمیشہ کے لئے تو نہیں، یہ پھول جو تم نے میرے اندر کھلائے ہیں، مرجھائیں گے بھی . آج سارا انگ انگ ان کی خوشبو میں رچ بس گیا ہے .کل جانتے ہو کیا ہوگا؟

آواز ۲ تم ہی کہو کیا ہوگا۔۔۔؟

آواز ۱ کچھ بھی نہیں بچے گا۔۔۔۔ بس بے آواز، ایک لہر سینے میں ابلا کرے گی اور جانتے ہو جب سینہ شق ہوگا تو پھر . (ہلکی ہنسی کی آواز) بس کھو کھلی تنہائی، خلا ہی خلا . . گڈمڈ آوازیں (ٹیپ سے بے ہنگم آواز، روشنی بڑھتی ہے اور کردار ٹیپ بند کردیتا ہے یا پھر نسوانی کردار کا Exit)

ریحان: (آئینہ کے سامنے) پھر وہ چلی گئی، کبھی نہ آنے کے لئے، سچائی کے لافانی موسم کی طرح جو روٹھا تو پھر کبھی نہ آیا میں بھی کبھی جوان تھا (اٹھتا ہے) ہاں جوان، جسم میں انرجی تھی، جنگلی مست ہاتھی کی طرح، روانی تھی، ساگر کی طرح، طاقت تھی، بازوؤں میں دم اور آنکھوں میں نمی .

[تیزی سے آئینہ کے سامنے، سر سے وِگ اتارتا ہے، آنکھوں کے آس پاس سے سفیدی ہٹاتا ہے، کرتا کھولتا ہے، اسٹینڈ کے پاس جاتا ہے، قمیص پہنتا ہے، اس دوران کوئی Jazz سنگیت یا پھر اداکار اپنے منہ سے مختلف قسم کی آوازیں نکالتا ہے۔ خصوصی طور پر سردی کے زمانے میں نہانے کی آواز، گیت گاتا ہے اور جوانی کی انرجی کا مظاہرہ کرتا ہے، اسی دوران پنچھی نما کردار داہنی طرف پانی میں پروں، پاؤں اور بدن بھگانے یا پانی کو

ہیں۔ ایک تھرڈ ڈیمر ایسا بھی ہوتا ہے جس میں Auto Transformer ہوتا ہے جس کی مدد سے ہم اپنی ضرورت کے مطابق ایک لیمپ یا روشنی کے بہاؤ کو پورے کا پورا استعمال کر سکتے ہیں۔

اس طرح اس مختصر مطالعے سے ہمیں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ تھیٹر میں رنگ، روشنی اور سائے کا رشتہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ روشنی اور سائے میں نہائے ہوئے مناظر ہماری نظروں کے زاویے کو یکسر ایک نئے جہاں سے متعارف کرتے ہیں۔ رنگ اور روشنی کی پھوار بچپن سے ہی ہماری توجہ کو پوری شدّت سے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہاں تک کہ کالرج کی نظم The Rimes of an Ancient Mariner میں وہ منظر جہاں سمندر کا پانی سبز، نیلے اور سفید رنگوں سے موت کا جو رقص پیش کرتا ہے وہ اپنی ہیبت ناکی میں بھی حسین ترین نظر آتا ہے۔ لہٰذا رنگ، روشنی، فلٹر، اس کے بے شمار آلات اور استعمال کا علم ہمارے اسٹیج کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ تکنیکی ترقیاں جنہیں آج ہم فلم اور تھیٹر میں دیکھ پاتے ہیں۔ دراصل ہمارے تصوّر، ہمارے احساسات، ہمارے مسائل اور ہماری سوچوں کو بہتر اور برتر اسلوب میں پوری فنکاری کے ساتھ پیش کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ہم اپنے خوابوں کو، زندگی کی سچائیوں کو اور اپنے فن کو اسٹیج پر بے مثال شدّت اور سرعت کے ساتھ پیش کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اس سائنٹفک نظام سے اپنے مسائل اور اپنے خوابوں کو جوڑ لیں تو پھر کیا ہے جو اسٹیج پر ممکن نہیں۔ ہمیں صرف یہ یادرکھنا چاہئے کہ اصل شئے تخلیق کار کا تصوّر ہے، ہمکتے ہوئے پیکر ہیں، بس روشنی اور سائے کا داجبی علم بھی ہمارے تصوّر اور ہمارے پیکر کو اسٹیج پر متحرک اور تابندہ کر سکتا ہے۔۔۔!

ظہیر انور کا سفر نامۂ پاکستان



ڈرامہ

کردار

ریحان ثاقب : زماں حبیب

غزل : سیما صدّیقی — زمانہ : آج

وقتِ حاضر / ڈاکٹر : سیّد اشرف کریم — ابھی ہمیشہ

وقتِ غائب : ارشاد علی خاں — اور کبھی نہیں

وقتِ مستقبل : احمد اشرف بابو

منظر۔ (اسٹیج پر اندھیرا، وائلن کی موسیقی، دھیمی تیز، اور تیز، موسیقی رکتی ہے۔ گھڑیال کی آواز۔ ٹن ٹن ٹن۔۔۔۔ روشنی دائیں کونے پر۔ ایک اسٹینڈ۔ بش شرٹ، شال، انگریزی ٹوپی، گھڑیال کی آواز۔ ٹن ٹن ٹن۔۔۔ روشنی دائرہ نما وسطی اسٹیج پر، ایک سنگھار میز، کرسی بغیر پشت کے، میک اپ کے سامان، برش، وگ۔ ریحان ثاقب کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے چھڑی ہے۔ موسیقی۔ گھڑیال کی آواز۔ ٹن ٹن ٹن) اب روشنی بائیں اسٹیج پر۔ ایک بنچ اور ایک کرسی۔ گھڑیال کی آواز۔ ٹن ٹن ٹن)

آواز (پس منظر): کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا ★

(اسٹیج پر آہستہ آہستہ ڈرم بیٹ پر چہرے پہ نقاب (Mask) لگائے، سینے پر وقتِ حاضر، وقت غائب اور وقت مستقبل کا پوسٹر لگائے، پرندوں کی طرح حرکت کرتے ہوئے آتے ہیں۔ بیک اسٹیج سے مستقبل اُبھر آتا ہے۔ خاموشی سے چلتے ہوئے جائزہ لیتے ہیں اور کونے سے بہت دور دیکھتے ہیں۔ تصوراتی طور پر ابتدائے آفرینش کا منظر دیکھتے ہیں، حیرت کا اظہار کرتے ہیں اور)

وقتِ غائب: کچھ نہ تھا تو تھا ویرانہ

وقتِ حاضر: کچھ نہ ہوتا تو ہوتا ویرانہ

وقتِ مستقبل: اور کچھ نہ ہوگا تو بھی ہوگا ویرانہ

وقتِ غائب: کیسی تھی ویرانی دھرتی پر، کیسا بے نور سویرا۔
جنگل جنگل دریا دریا خاموشی کا ڈیرا
دھرتی کے مالک اور دھرتی کے ان داتا نے
رکھی پھولوں میں خوشبو، درختوں پر ہریالی

★ احمد ندیم قاسمی

وقت حاضر: ہوا میں جھومی ڈالی ڈالی
وقت مستقبل: دمکے سورج، برسی چاندنی
پتھروں کے گیت، سمندروں کی کہانی۔ تھی پھر بھی ویرانی
پربت پربت بستی بستی انجانی
دل پر دھرتی کے چھایا
ایسا سناٹا
کہیں کوئی تھا نہ دیکھنے والا
وقت غائب: فطرت کی ہر شے نرالی
تہہ در تہہ راز نے ڈھالی
لفظوں کے بنا سب پانی پانی
رات کی آنکھ سے ٹپکے آنسو
پہاڑوں کے سینے سے بہے پانی
پھر آئی آدم کی سواری

[ریحان کے قریب جاکر]

وقت حاضر: ہاں پھر آئی آدم کی سواری
وقت مستقبل: کلیوں کے دل جھومے، پھول بھی مہکے
خوشیوں میں صبح بھی جھومی
ٹوٹ کے برسا پانی
سب ایک ساتھ: آدم کی اولادوں سے گہرا راز کچھ بھی نہیں
کہرے کی طرح لپٹا ہے راز میں
ہر ایک زخم اس کا ہرا، اپنے گھر سے بے گھر، بے زمین
کا یہ پودا۔
(گاتے ہوئے:) یہ عمر جسے تم سمجھے ہو ہر دم وہ تن کو چُنتی ہے
جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات، یہ لکڑی گھنتی ہے
تم گٹھری باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دُھنتی ہے
اب موت کفن کے کپڑے میں یاں تانا بانا بُنتی ہے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا [1]
(آہستہ آہستہ اسی طرح چلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ روشنی دائرے کی شکل میں مختصر ہوتی ہوئی ریحان ثاقب پر)
ریحان ثاقب: روشنی گل نہ کرو، دیکھتے نہیں، میں ابھی تک تیار نہیں، اور یہاں کوئی مرا بھی تو نہیں، موت کا نہ فیصلہ ہوا اور نہ ہی کہیں اس کا گزر ہے ابھی۔ بڑھاؤ روشنی، چہرے کا میک اپ تو ٹھیک کرلوں (روشنی بڑھتی ہے) جب روشنی اور سنگیت کے خاص شیڈز کی ضرورت ہوگی تو میرے اشارے سے سمجھ لینا۔۔۔ (او کے)، (آئینے کے سامنے بیٹھتا ہے، میک اپ درست کرتا ہے) ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ روشنی بڑھے گی تو یہ لائنیں جھریاں بن کر صاف نظر آئیں گی۔ اور یہ آنکھیں، یہ بھوئیں خود دھیان نہ دو تو پیشہ ور میک اپ مین کچھ سمجھتے ہی نہیں، کاش آج الیاس بھائی ہوتے، وہ سمجھتے ہیں کہ کس چیز کو ہائی لائٹ کرتا ہے اور کس Lining کو کتنا گہرا۔۔۔؟ (بالوں پر برش پھیرتا ہے، سفیدی نظر آتی ہے، ہاں تو میں اس کرسی پر پہلے بیٹھ جاتا ہوں (پھر مڑتے ہوئے) بڑھاپے کے ساتھ ساتھ کمر میں دم خم بھی کم ہوتا جاتا ہے، اور آنکھوں سے دور کا منظر نظر نہیں آتا۔۔۔ ویسے بھی سامنے آج کل اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔۔۔ تو میں اب ایک ۶۵ اور ۷۰ کے بیچ کا بوڑھا ہوں) جوانی بہت پیچھے چھوڑ آیا، آج تو میرے لئے وقت ٹھہرا ہوا ہے۔۔۔ جیسے بھاگتا ہوا ارد پہلا بادل اچانک ٹھہر جائے اور مڑ کر دیکھے۔! آج ٹھہر ٹھہر کر، رک رک کر میں یاد کرتا ہوں، وہ سارا گزرا ہوا زمانہ وہ ماہ و سال، وہ دُکھ سکھ، غم اور خوشی۔۔۔ ٹھہریئے (کرسی سے اٹھتا ہے) کتنا غم اور کتنی خوشی، کچھ بھی تو برابر نہیں۔ ہاں وہ اندر ہمیشہ ایک مار کاٹ کا ماحول، اکثر مجھے کوئی اندر ہی اندر ڈانٹتا رہا ہے۔ کبھی شاباشی دیتا، کبھی بہکاتا، کبھی تنبیہہ کرتا۔۔۔ لگتا ہے میرے باہری جسم کے ساتھ اندر اس کا گھنا سایہ ہے، آنکھیں کھلی رکھتا ہے، وہ زندہ، حس و حرکت والا۔۔۔ عمر کی اس حد پر اس کے ہاتھوں میں مجبور ہوا اور ایک بڑا فیصلہ کیا ہے۔۔۔ لیکن آپ سے یہ سب میں کیوں کہہ رہا ہوں۔۔۔ میرے فیصلے سے آپکو کیا؟ کون کس کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتا ہے۔۔ سب تو اپنے لئے جیتے مرتے ہیں، پھر میں اپنے فیصلے کو آپ پر کیوں لادنا چاہتا ہوں اصل میں لوگ جو فیصلہ کرتے ہیں اس پر دوسروں کے دستخط اور اقرار سے اپنے لئے ہمت چاہتے ہیں۔۔۔ یہاں بھی خود

[1] نظیر اکبر آبادی

سطح پر بیدار ہوں اور زاویۂ نگاہ مناسب سمت میں ہو تو ہم یقینی طور پر جان پاتے ہیں کہ کردار واقعات، حرکات و سکنات، یہاں تک کہ معمولی سے اسٹیج پراپ props کو کب اور کس طرح فوکس کرنا ہے اور پھر نتیجہ ایک ایسا تسلی بخش اور بے مثال منظر کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ ہم دیر تک بھلائے نہیں بھولتے۔ شاید ایسے ہی بے پناہ خیالات اور پیکروں کی رو میں بہہ کر Adolfe Appia اور Gordon Graig نے اسٹیج کی لائٹنگ کی دنیا میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا اور اپنے ناآسودہ خواب پورے کئے ہیں۔ گریگ نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ ڈراما متن کی نمائندگی کے بجائے انکشاف ہے اور یہ کہ مستقبل کا تھیٹر روایتی مواد مثلاً انسانی جسم، لباس، مکالمے اور ظاہری دنیا کو ہی ہمارے سامنے پیش نہیں کریگا بلکہ اپنی حرکتوں (Movement) سے ان دیکھی دنیاؤں کا انکشاف بھی ڈرامے کی پیشکش کے ذمہ ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال صرف حرکتوں کی معنوی سطح تک ہی محدود نہیں بلکہ روشنی، رنگ اور سائے کے انتظام و انصرام بھی اس کی اہم کڑی ہیں۔

روشنی کی ترتیب اور ڈیزائن کے بارے میں جب ہم سوچتے ہیں تو ساری ڈیزائن اور ترتیب کی ذمہ داری عملی طور پر الیکٹریشین کو سونپ دیتے ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ اپنے ڈرامے کو، اس کے مرکزی خیال کو، اس کے اندر چھپتے ہوئے حرکات و سکنات کو، اس کے پوشیدہ امکانات کو اچھی طرح سے چھان بین کر کے اپنا تصور واضح کرلیں کہ ہمیں چاہئے کیا اور رنگوں کی کیسی آمیزش کی ہمارے ڈرامے کو ضرورت ہے۔ پورے ایکٹنگ ایریا کو روشن کرنا ہے یا zonal روشنی سے ڈرامے کے امکانات کو بروئے کار لانا ہے یا بیک لائٹ سے معنی کی سطح بلند کرنی ہے۔ روشنی کی ترتیب یا ڈیزائن دراصل اسی سوجھ بوجھ اسی تصور اور پختہ خیالوں کا عکس ہوا کرتی ہے جو ڈرامے کی ریہرسل کے دوران آہستہ آہستہ ہمارے اندر پرورش پاتی رہتی ہے۔ ہدایت کار کے ذہن میں ڈراما اور اس کے کردار کا ایک خاکہ یا پیکر ہوتا ہے اور خود اداکار بھی تخلیقی سطح پر متحرک ہے تو ڈرامے اور کردار کی شرح میں انقلاب برپا کرسکتا ہے۔ اس طرح ہم دھیرے دھیرے منصوبہ بند انداز میں روشنی کو ذہنی سطح پر ڈیزائن کرتے ہیں اور اسٹیج کے مختلف زون اور زاویئے کو تخلیقی طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ روشنی کو اس طرح پیش کرنے میں ہمارا اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ روشنی کے سارے حوالے کو اپنی گرفت میں رکھیں۔ کبھی ہی، کبھی ڈیمر، کبھی آرچ لائٹ پر مکمل گرفت۔۔ علاوہ ازیں ہمیں رنگوں کو بھی حسب ضرورت اور بالارادہ استعمال کرنا ہے تا کہ جذبات و احساسات، ماحول و مفہوم کو اس کے مناسب تناسب میں پیش کیا جاسکے۔ لہذا یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کسی بھی رنگ کو سفید کے ساتھ ملا لیا جائے تو ایک مخصوص جھلک یا رنگ کا ایک مخصوص روپ Tint ہاتھ آسکتا ہے۔ اس طرح اگر سرخ، سبز اور نیلی روشنی کا آمیزہ تیار کریں تو صرف دودھیا سفیدی ہی ہاتھ آئے گی اور اگر کسی بھی رنگ کو زردی مائل Gelatin Sheet کے ساتھ ملا کر روشنی کی پھوار برسائیں تو ہمیں اسٹیج پر رنگوں کا مناسب آہنگ میسر آتا ہے۔ یہاں تھوڑی بہت ریاضت اور یک گونہ Innovation کی ضرورت ہے اور فلٹر کے استعمال کا عملی تجربہ بھی اہم ہے کہ اس کے بغیر وہ تاثر پیدا کرنے میں ہم ناکام رہ سکتے ہیں جس کی ڈرامے کو ضرورت ہے۔

یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی کہ ڈرامے میں گہرے اور عمیق مطالعے، تصور اور عملی تجربہ کے بغیر اور منصوبہ بند روشنی کے ڈیزائن کی غیر موجودگی میں ہم ڈرامے کے کردار، ڈریس کاسٹیوم اور اس کے اندر پوشیدہ امکانات کو فوکس یا ہائی لائٹ کرنے کے لئے روشنی کا جو آمیزہ تیار کرتے ہیں وہ یکسر بے بنیاد، بے معنی اور ناکافی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب کردار کی نفسیاتی گرہ یا ذہنی صورت سے مطابقت رکھتے ہوئے کردار کو چاند کی نرم روشنی میں ظاہر ہونا ہے تو ناظرین اسے کسی اکاؤنٹ آفس کی بے روح روشنی میں دیکھیں گے اور ساری ریاضت دھری کی دھری رہ جائے گی۔

روشنی اور رنگ کے مناسب استعمال سے ڈرامے کی شدت و سرعت میں بامعنی اضافہ ہونا چاہئے نہ کہ غلط ٹائمنگ کی وجہ سے ڈرامے میں بھونڈا پن در آئے۔ ہدایت کار یا اسٹیج منیجر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ روشنی کے منصوبہ بند ڈیزائن کے لمحے میں (جس کا مکمل خاکہ کبھی کبھی ڈریس ریہرسل کے بعد ہی اُبھر کر سامنے آتا ہے) یہ علم ضرور پالے کہ ہلوجن تمام روشنی سے زیادہ چمکدار روشنی کا آلۂ کار ہے اور پورے اسٹیج کی روشنی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ عموماً ۱۰۰۰ واٹ سے لے کر ۲۰۰۰ واٹ تک اسٹیج کو روشن کرسکتا ہے۔ اسی طرح اسپاٹ جو ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ واٹ کے ہوتے ہیں اس میں lens ہوا کرتے ہیں اگر اس میں Fresnal لینس ہیں تو یہ Fresnal اسپاٹ کہلاتا ہے۔ مرر Mirror اس اسپاٹ کو کہتے ہیں جسے جس قدر چاہیں کنٹرول کرسکتے ہیں اور کسی ایک علاقے یا نقطے تک، روشنی کو محدود کرسکتے ہیں۔ فٹ لائٹ اسٹیج کے سامنے کے حصے یا پردے کے بس ذرا باہر ہوا کرتی ہے اور مختلف رنگوں کے فلٹر سے اس کا خوبصورت استعمال ہو سکتا ہے۔ ورکنگ لائٹ کسے کہتے ہیں اور اگر اس میں رنگین پلاسٹک سلوفین یا Gelatin کا استعمال کریں تو دن کے مختلف

لمحوں کو اس کی مخصوص رنگت روشنی اور سائے کے ساتھ اسٹیج پر دکھایا جاسکتا ہے۔

عہدِ جدید میں برقی طاقت کی دریافت اور الیکٹرو میکانیکل طریقۂ کار کے نئے نئے انکشافات نے روشنی کی دنیا کو یکسر بدل کر دیا ہے۔ لہٰذا فن کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے سب سے بہتر جگہ خود تھیٹر ہال ہے،۔۔ یہاں تجربہ کیا جاسکتا ہے اور اس لئے تھیٹر کے اس شعبے سے دلچسپی رکھنے والوں کو سیدھے تھیٹر کی طرف رجوع ہونا چاہئے تاہم ایک مختصر سا خاکہ یہاں اپنے نوجوان تھیٹر دوستوں کے لئے پیش کرنا ضروری ہے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ تھیٹر ہال میں روشنی کے آلات کے لئے اس مخصوص مقام کو ڈھونڈھ لینا ہے جس سے ناظرین کی نظروں کو کسی قسم رکاوٹ یا سخت روشنی کا ریلانہ سہنا پڑے۔ صرف روشنی ہی کیا، ساؤنڈ سسٹم، ونگس اور پشت کے پردے تک ایسے سجائے جائیں کہ ناظرین دیکھنے اور سننے میں کسی قسم کی رکاوٹ اور خلل نہ محسوس کریں۔ روشنی کی کرنوں کو یا زیادہ واٹ کی بھرپور روشنی کو اسٹیج پر اس طرح بہایا جائے کہ مناظر اور واقعات ناظرین کی نگاہ میں بامعنی ہو سکیں۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ کی ہمہ گیر حیثیت اس فن میں برابر کے شریک کار ہو کر خواب اور حقیقت کا التباس پیدا کرتے ہیں۔ لائٹ ڈیزائنر، انجینیر، آرکیٹیکٹ اور معمولی ڈیزائنر کے علاوہ ہدایتکار کا بیدار ذہن، اداکار کی ذہنی اور جسمانی لچک یعنی یہ ساری چیزیں اسٹیج کے رنگ و روپ کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔

تھیٹر کی جلتی بجھتی دنیا میں عام لائٹ کو فلیٹ لائٹ کہا جاتا ہے اور ہم اسٹیج کے اوپر لگے بیٹن (Baton) میں فٹ کر سکتے ہیں۔ کئی سرکٹ سے جڑی ہوئی اس لائٹ میں ہر لیمپ ۱۰۰ سے ۱۵۰ واٹ کی ہو سکتی ہے۔ رنگ کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ سرکٹ ہوتے ہیں اور مختلف بیٹن سے لگے ہوتے ہیں۔ اس میں فلٹر کا استعمال ہوتا ہے۔ سامنے پردہ (Curtain-Line) کے باہر اور تین دیواروں میں سے کسی ایک دیوار پہ روشنی کا کمپارٹمنٹ ہوا کرتا ہے۔ مختلف سرکٹ سے رنگوں کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسٹیج کے سامنے جو کردار اداکاری کے جوہر دکھاتے ہیں، ان کے چہرے، جذبے، میک اپ اور آنکھوں کے تیور کو فٹ لائٹ نیچے سے ہی یعنی فرنٹ اسٹیج سے ہی روشن کرتی ہے اور اس کے مختلف شیڈز کو فوکس کرتی ہے۔

بہت زیادہ روشنی یا گھنی روشنی کے لئے اکثر ہم Incandescent لیمپ کا استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں Reflector کے ساتھ اسٹیج کو روشنی میں نہلایا جاسکتا ہے۔ اسے ہم فلڈ لائٹ Flood-Light کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ چھوٹے چھوٹے بلب کو ایک ساتھ روشن کر کے ہم اس طرح کا اثر پیدا کر سکتے ہیں۔

تاپس سین سے ذاتی گفتگو اور اُن کی تحریروں اور لائٹ ڈیزائن کو اسٹیج پر دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ روشنی کے دو اہم آلے، اسپاٹ یا ڈیمر (Dimmer) ہیں۔ اسپاٹ لائٹ کے استعمال نے اسٹیج پر انکشافات کے نئے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اسی لائٹ کے استعمال سے پیچیدہ اور شاعرانہ کمپوزیشن اسٹیج پر ممکن ہو سکا ہے اور اس کے استعمال میں بڑی آسانیاں ہیں۔ یہاں لینس کے مختلف استعمال کے ذریعہ روشنی کا نیا رنگ و آہنگ پایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں رنگین فلٹر اور Adjustable فوکسنگ کی آسانیاں بھی اس لائٹ سے میسّر ہوتی ہیں اور اس طرح مختلف رنگوں کی آمیزش بھی اسٹیج پر نئی بہار دکھاتی ہے۔ روشنی کے آلے جو نظر آتے ہیں اس کے سامنے فلٹر لگا دیا جاتا ہے، پہلے رنگ، پھر شیشے کا استعمال ہوا اور پھر Gelatin اور Celophane بھی مروّج ہوگئے۔ ان ساری چیزوں سے رنگوں کا عکس یا تاثر پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اب تو بہت سارے رنگوں کا استعمال ہوتا ہے۔ نیلے، پیلے، لال، سبز اور بیگنی سلوفین سے حسن میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔

اسٹیج کی لائٹ ڈیزائن میں ایک اہم آلہ ڈیمر ہے۔ ڈیمر کنٹرول بورڈ سے ڈیمر کا استعمال اسٹیج پر خواب اور حقیقت کی ملی جلی کیفیات کا حسین ترین استعمال کر سکتا ہے۔ ڈیمر کا مطلب ہے کم روشنی یا روشنی کے والٹیج کو کم کرنا، ڈیمر کا استعمال آج ترقی کی ہزار شاہراہوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور ہمیں کہانی کے تحیّر یا سحر کارانہ انداز کی صورت حال میں بے پناہ مدد دیتا ہے۔ ہم ڈرامے کے مفہوم کو اس کے مناسب ترین استعمال سے بے حد پُر اثر بنا دیتے ہیں اور ڈیمر بنک یا اس کے کنٹرول بورڈ سے کسی بھی سرکٹ Resistance کو دھیرے دھیرے کم یا زیادہ کرتے ہیں۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس اہم یونٹ سے ہم زیادہ روشنی سے کم روشنی کی طرف اور کم روشنی سے زیادہ روشنی کی طرف باآسانی اور اعتماد کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ اگر ہمیں رات کے گھنے اندھیرے کے بعد صبح کی جھلملاتی روشنی کا نظارہ چاہئے تو ڈیمر ہمارے تابع ہوتا ہے۔ چراغ اور چراغ تلے اندھیرے کی کیفیت یا روشنی اور سائے کے رشتے اس ڈیمر کے استعمال پر منحصر ہیں۔ آج الیکٹرو میکانیکل آلات کی بے مثال ترقی یا کارکردگی سے ایک دنیا واقف ہے۔ مختلف کنٹرولنگ مشینوں کے ذریعہ روشنی کو کنٹرول کر کے، اور رنگوں کے مناسب ترین استعمال سے ہم ڈرامے کی شدّت، افادیت، سرعت اور Compactness کو کئی گنا زیادہ بڑھا دیتے

بناتی ہے بلکہ رنگ، روشنی اور سائے کے روپ اور آہنگ سے ناظرین کی نظر بھی بنتی ہے۔ ان کا زاویہ دھیرے دھیرے مخصوص انداز میں کام کرنے لگتا ہے اور مطلب سے آراستہ حسن کو اسٹیج پر کی حرکی صورت میں دیکھ کر ان کے اندر بھی بند دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ وہ روشنی کے تحیر زا کارناموں کے وسیلے سے خوابوں اور دبی کچلی خواہشوں کو حقیقی پیکروں میں دیکھتے ہیں۔ کردار اور واقعات کے درمیان نظم و ضبط، سیاسی اور سماجی پہلوؤں کا کہانی کے پس منظر سے ربط، ان کے دکھ سکھ، ان کے درد و کرب، ماحول کے تحفظ و تشدد یا پھر ڈرامے کی تہہ میں زیریں لہر کی طرح موجود شاعرانہ غیر شاعرانہ یا حقیقی یا غیر حقیقی امکانات۔۔۔ ان ساری چیزوں کو روشنی مختلف رنگوں کی مدد سے زندہ تجربے میں بدل دیتی ہے لیکن ایسے زندہ تجربات یا متحرک تصورات کے لئے ایک بڑی شرط ہے اور وہ ہے اسٹیج پر ڈراموں کے بطون سے برآمد ہوتے ہوئے معنیاتی انسلاکات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے روشنی، رنگ اور سائے کا تخلیقی سطح پر استعمال۔۔ اس کا سحر اسی وقت ممکن ہے جب اسٹیج اور ڈرامے کے رموز کو گہرے مطالعے میں لاکر اس کا تخلیقی سطح پر بہترین استعمال کریں۔ بنگال میں ایسے ڈرامے پیش ہوئے ہیں جو روشنی کے استعمال کی بنا پر آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ رکتِ کرابی، انگار، تیز تلوار، جھڑ پر راتے، میکبتھ، دن کے اندھیرے، کمال اتا ترک، دوئی پُروش، کھود یتو پاشان وغیرہ کے علاوہ نیشنل اسکول آف ڈراما کی پیشکش، رتن تھیم کے ڈرامے، سونالی مانسنگھ کے ڈرامے، انگلستان سے آئے ہوئے ڈرامے، خصوصاً جولیس سیزر اور ریون (اسٹیفن سپنڈر) کے شوز، بارش والا اور ہم بھی ایسے "فرشتے اترتے ہیں" اور "برناڈ شاہ کا" ... شو راقم الحروف نے لئے

حیرت و استعجاب کا باعث بنے ہیں۔ لہٰذا ڈراموں میں روشنی، رنگ اور سائے کے استعمال پر غور و فکر کرنے کا لمحہ اردو ڈراموں کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔

نیوٹن کو سورج کے سات رنگوں کا انکشاف کئے زمانہ بیت گیا۔ تقریباً تین سو سال پہلے سورج کی اترتی کرنوں کو سیدھے prism سے گزار کر نیوٹن نے الگ الگ کرکے دیکھا اور دکھایا۔ اس دن سے آج تک ہمارا ذہن روشنی رنگ اور سائے کے دائرۂ اثر میں ہے۔ رنگوں اور روشنیوں نے دنیا پر جیسے سحر انگیز جال سا بُن رکھا ہے۔ ہر شے میں ایک نئی معنویت سرایت کر گئی ہے۔ سورج کی کرنیں، آسمان پر صاف اور گدلے بادلوں کا ہجوم، چاند کی نرم روشنی، بجلی کی چمک، درختوں پر چھائے ہوئے سبز رنگوں کا تفکر، ندی، نالے، پہاڑ، سمندر، بر کھا رُت، اور ان تمام چیزوں میں رنگوں کا چھلکتا ہوا سا کچھ۔۔۔۔ یہ سارے رنگ، رس اور روشنی کا بھنور میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، ہومرؔ، ڈانتےؔ، اور شیکسپیئر کو ہی متوجہ نہیں کرتا بلکہ سائنسدانوں کو بھی تجربہ گاہوں کی طرف کھینچتا رہا ہے۔ جہاں تجربہ گاہوں میں تھامس واٹ کے تجربے ہوئے، وہیں، کہانی، ڈرامے، افسانے اور شاعری میں رنگ و روپ کا تخلیقی اظہار ہوتا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اسٹیج کی پوری کائنات بدل گئی۔ فنکارانہ حسن اور ہنر مندی نئے برگ و بار کے ساتھ ہمارے روبرو تھے۔

اگرچہ اسٹیج کے اس تکنیکی شعبے میں مغرب کو افضلیت حاصل ہے لیکن ہندوستان کے فنکار اور لائٹ ڈیزائنر بھی اب پیچھے نہیں رہے ہیں۔ بہت پہلے جب ڈراما اسٹیج کیا جاتا تھا تو تکنیکی اعتبار سے دنیا پچھڑی ہوئی تھی۔ دن کی روشنی یعنی خالص نیچرل لائٹ میں ڈراما پیش کیا جاتا۔ چاند کی روشنی اور شام کے دھندلکوں کا بھی استعمال ہوا کرتا۔ پھر دھیرے دھیرے گیس لائٹ نے اسٹیج کے رنگ و روپ کو سنوارا لیکن عہدِ حاضر میں الکٹرو میکانیکل طریقۂ کار میں ایسی تبدیلیاں آئیں کہ سارے کا سارا منظر بدل گیا۔ اس انقلاب کے تحت ہندوستان میں بھی اسٹیج کی روشنی کے سلسلے میں زبردست پیش رفت ہوئی ہے۔ الکٹرو میکانیکل طریقۂ کار اور فلش لائٹ کی چکاچوند نے ڈرامے کے متن کو بھی کہیں کہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

اگرچہ اس مخصوص اور تکنیکی شعبے کا علم عملی طور پر جڑے بغیر اور صاف صاف بیان کر دینے سے حاصل نہیں ہو سکتا، تاہم سطحی نظریہ اور ذاتی لاعلمی کی بنا پر ہم رنگ، روشنی اور سائے کے معنیاتی انسلاکات کو سمجھ نہیں سکتے اور ڈراموں کی پیشکش میں معلق نظر آتے ہیں۔ ہم اکثر لائٹ مین کو Hire کرتے ہیں اسے ڈرامے کے واقعات اور اس کی زیریں سطح سے آگاہ کرتے ہیں۔ ریہرسل دکھاتے ہیں اور اپنی بساط بھر اسے زندگی کے اس تصور کا نظارہ کراتے ہیں، جو ہمیں اسٹیج پر چاہئے۔ لائٹ مین ہمارے خیال کے مطابق اپنے Moveable Switchboard کے ذریعہ ڈرامے میں روشنی، رنگ اور سائے کی پلاننگ کرتا ہے۔ منظر اچھا لگے تو ہم کہتے ہیں کہ روشنی بہت اچھی ہے اور اچھا نہ لگے تو ہم ڈراما کے ساتھ ساتھ روشنی کے استعمال کو بھی رد کر دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ روشنی کے خاطر خواہ علم کے بغیر ہم ڈرامے میں نئی روح پھونک نہیں سکتے۔ ہدایت کار کو خصوصاً اس بات کی آگہی ہونی چاہئے کہ وہ کس ڈرامے میں روشنی کا کیسا استعمال چاہتا ہے اور کیوں؟ اسے ہلکی روشنی چاہئے یا گہری، ٹھہری ہوئی روشنی چاہئے یا پھر کپکپاتی لپپاتی ہوئی کرنیں یا پھر چھنتی ہوئی نرم دھیمی روشنی، گھنا اندھیرا یا نیم اندھیرا اور ان تمام اقسام کی روشنی میں

رنگوں کا کیا استعمال کرتا ہے۔۔ رنگوں کا استعمال منظر کی افادیت اور معنویت کو بڑھاتا ہے اور آنکھوں کو نئی دشاؤں سے ہمکنار کرتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی صاف ہونی چاہئے کہ ڈرامے میں روشنی اور سائے کے استعمال کو اس قدر ناگزیر کیوں گردانتے ہیں؟ کیا روشنی رنگ اور سائے کے بغیر ڈراما اپنے سارے مفاہیم کھو دے گا؟ کیا الکٹرو میکانیکل طریقہ' کار کی غیر موجودگی میں، دن کی روشنی میں یا کسی ہال کی نارمل لائٹ میں ڈراما نہیں کھیلا جا سکتا؟ اس کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ ڈراما کھیل سکتے ہیں لیکن ہم سب بیسویں صدی کے آخری دہانے پر بھی ہیں۔ ہم فن کے لوازمات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں اور اس کے برتنے میں نفاست کا خیال رکھتے ہیں۔ ڈراما تو سڑکوں پر بھی پیش کیا جاتا ہے اور اس کا اپنا مخصوص اور گہرا تاثر بھی ہوتا ہے لیکن جب پروشینیم اسٹیج پر پہنچتے ہیں تو ورکنگ اسکرپٹ میں روشنی کے اشارے (cues) انتہائی اہم ثابت ہوتے ہیں۔ اگر اداکار یا ہدایتکار اپنے (cues) یا اشارے کو رنگوں کی مناسبت سے سمجھ نہیں سکتا یا معنی کی مختلف سطحوں کی تہہ میں اتر نہیں سکتا تو الیکٹریشین بھی روشنی کو جلانے بجھانے کا کام ہی کر سکتا ہے، کوئی انقلاب برپا کرنے سے تو وہ رہا، اور نہ ہی روشنی بصری حیرتوں کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ روشنی کے دائرے، ڈیمر کی مدھم رفتار، اسپاٹ کا امنڈتا سیلاب، فلیٹ لائٹ کی افادیت نیز سایوں اور رنگوں سے بنتے بگڑتے اور گزرتے لمحے اسٹیج کے لئے ایک ناقابل تردید حقیقت ہیں اور اس کا تخلیقی استعمال آنکھوں کو بے پناہ سرخوشی عطا کرتا ہے اور بہتر کارکردگی کے لئے نئی راہیں کھول دیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب ڈرامے کی پیشکش کی طرف اپنا پہلا قدم بڑھاتے ہیں تو ڈرامے کی اسکرپٹ کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں محفوظ تصورات و پیکر کو بھی لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں نیز مخصوص روشنی کے دائروں اور اس کے استعمال کی ہر شخص کی اپنی نظر بھی ہوتی ہے۔ رابرٹ ایڈمنڈ جونس کے انتہائی معصوم لیکن حکیمانہ انداز نظر کو دیکھئے جب وہ کہتا ہے:

"Does this mean that we are to carry images of poetry and visions and high passions in our mind while we are shouting orders to electricans on ladders in light reharsal ?

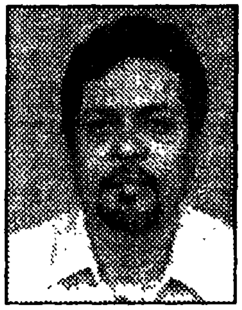
Yes ,this is what it means".

R. E. Jones : "The Dramatic Imagination".

ڈرامے میں امیجری، استعارے اور ان کہے خیالات اور تصورات کی کارفرمائی پر الگ ایک باب کی ضرورت پیش آئے گی (ناظرین اور قارئین کو یاد ہوگا کہ جب بیگم میکبیتھ قتل کے بعد عالم غنودگی میں چلتے ہوئے ہاتھ مشہور اقراری منظر میں کہتی ہے کہ یہ خود سے رنگے ہوئے ہاتھ اب عرب کی ساری خوشبوؤں سے معطر نہیں ہو سکتے بلکہ سمندروں کی نیلاہٹ اور سبزپن کو بھی سرخ کر دینے کے لئے کافی ہیں تو ہم ڈراموں میں گھنی امیجری، استعارے اور تصورات کے وسیلے سے ظاہر واقعات کی تہہ سے گزر کر باطن کے ارتعاشات اور کیفیات تک پہنچ جاتے ہیں اور یہاں بھی روشنی اور سائے کا کھیل غضب ڈھا سکتا ہے) تاہم یہ حقیقت ہے کہ جب ہم لائٹ ریہرسل کر رہے ہوتے ہیں اور ڈرامے کے کسی مخصوص حصے یا منظر کو روشنی اور رنگوں کے انتخاب کے لئے الیکٹریشین کو ہدایت دے رہے ہوتے ہیں اور بہترین تاثر کے لئے ہم جذبوں کی بے پناہ حدت سے گزر کر نئی دنیا خلق کر رہے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈرامے کی پوری کائنات اور اس کی ماہیت پر غور و فکر کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ روشنی اور سائے کا کھیل ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ ڈرامے میں ہم کسی مخصوص تاثر کی تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ اسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے:

- ڈرامے میں ہم اک مخصوص فضا کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔
- ڈرامے میں ہم زمان و مکان کی اہمیت کو فنی طور پر اُجاگر کرنا چاہتے ہیں۔
- ڈرامے میں ہم زندہ یا مردہ کرداروں کا ایک حقیقی التباس چاہتے ہیں۔
- ہم اپنے کردار، واقعات اور حالات کے منفرد مخفی گوشوں اور لمحوں کو تمام تر باریکیوں کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔
- ہم اپنی کہانیوں میں تواتر، تسلسل، تجسس اور تحیر کی سرعت اور اختصار کی شدت کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتے ہیں۔
- ہم سچائی میں خواب کا رنگ اور خوابوں میں سچائی کی کیفیات کا اظہار چاہتے ہیں اور یہ رنگوں کے مناسب لہجہ (Tone) اور روشنی کے مخصوص روپ (Tint) کے ذریعہ ممکن ہے۔
- ہم Cyclorama پر روشنی اور سائے، اڑتے ہوئے بادل اور جدید میڈیا کا اساسی حسن دیکھنا چاہتے ہیں۔
- ہم چاہتے ہیں کہ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے ناظرین کی آنکھوں کے سامنے ایک نیا اور منفرد منظر نامہ گزرے۔ وہ متاثر بھی ہوں اور متحرک بھی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ہم روشنی اور سائے نیز رنگوں کی ترتیب و تنظیم میں تخلیقی



ظہیر انور

نام ظہیر انور
ذرامہ نگار، ہدایتکار، ناقد
پتہ 11, Ahiri Puker 1st Lane, Calcutta - 700 019
فون (033) 240-9854
والدین سراج الحق مرحوم۔ خاتون بی بی مرحومہ
پیدائش ۵ ستمبر ۱۹۵۵ء
پیشہ درس و تدریس
ہیڈ ماسٹر پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول، کلکتہ

ڈراموں کے مجموعے	انگاروں کا شہر	۱۹۸۲ء
	صلیب	۱۹۸۵ء
	نئے موسم کا پہلا دن	۱۹۹۳ء
دیگر کتب	فرانسیسی ڈرامے (تراجم)	۱۹۸۹ء
	بھوتی بھوشن بندوپادھیائے (ترجمہ) (ناشر ساہتیہ اکاڈمی)	۱۹۹۲ء
	ڈرامہ، آرٹ اور تکنیک	۱۹۹۶ء
میوزک	Vintage Music From India (1993) CD پیٹر مینوئل، امریکہ کے اشتراک سے	

سرگرمیاں متعدد ورکشاپ اور سیمیناروں میں حصہ لیا۔ نیشنل تھیٹر سیمینار، ساہتیہ اکاڈمی، دہلی ۲۰۰۰ء میں شرکت کی۔ اردو ٹرسٹ کے "تارکین کا ادب" پر سیمینار (لندن) میں بھی شرکت کی۔ مختلف ڈرامے اسٹیج کئے۔ ڈرامہ "بلیک سنڈے ۱۹۹۳ء" اور "سلیم شیروانی کی شادی" کے کلکتہ، دہلی اور بمبئی میں (۱۰۰) سو شوز ہو چکے ہیں۔ "خوابوں کا سویرا" ٹی وی ڈرامے کے لئے اسکرپٹ، ہدایت فراہم کی اور اس میں اداکاری بھی کی۔ دیگر ڈراموں میں بھی اداکاری کی۔

انعامات و اعزازات اتر پردیش اردو اکاڈمی۔ بہار اردو اکاڈمی۔ رانی گنج تھیٹر فیسٹیول۔
اردو تھیٹر اکاڈمی، کلکتہ اور C G W.E.C. پونے کی جانب سے ایوارڈ ملے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے ۱۹۹۸ء میں "ظلمت کو ضیا کیا کہنا" کو بہترین ڈرامے کا انعام دیا۔ اردو ڈرامے کے لئے ۱۹۹۹ء کا "ہم سب غالب ایوارڈ" نئی دہلی سے حاصل ہوا۔

تھیٹر میں رنگ، روشنی اور سائے

رنگوں کے اثرات، روشنی اور سایوں کے کھیل زندگی کے ہر مقام پر اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ بچپن سے بڑھاپے تک رنگ، روشنی اور سائے کے مختلف روپ، ان کی گہرائی و گیرائی، ان کی نرمی اور گرمی ہمارے ذہنوں پر گہرے نقش مرتسم کرتے ہیں۔ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے، رنگ، روشنی اور سایوں کا ملاپ اپنی الگ بہار دکھاتا ہے۔ شام کو شفق کی لالی، پھر نیم اجالے کا سماں اور پھر دھیرے دھیرے رات کے بڑھتے ہوئے سائے میں ایک ایسی پُر اسرار کیفیت ہے کہ یہ ہمارے کردار اور ہماری سوچوں کو بھی متعین کرتی رہتی ہے۔ قوسِ قزح کے ست رنگی دوار سے چھنتے ہوئے حسن میں کھو جانا، لہلہاتے ہوئے سبزے کی ٹھنڈک سے آنکھوں کو سکون محسوس ہونا، رنگوں کے کمپوزیشن سے ماحول کی کیفیات کا تبدیل ہو جانا۔۔۔ یہ ساری چیزیں بے وجہ نہیں، بلکہ اُن سے ہمیں ایک نوع کی

خوشی اور حیرت ہوتی ہے۔ ہم اپنے اندر کا سماں بدلتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ شاعری میں رنگ، روشنی اور سایوں کے شیڈز اور تیور کو مختلف انداز میں رقم کیا گیا ہے۔ کسی کو صبح کے منظر میں خدا کی وحدانیت کا ثبوت ملتا ہے تو کوئی شفق کی لالی کو دیکھ کر شہر کے ہاتھ میں خنجر کا پیکر خلق کرتا ہے۔ افسانوں اور ناولوں میں ماحول کی عکاسی کے لئے مناظر فطرت کی پہنائیوں میں پوشیدہ یا جھلملاتے رنگ و نور کی برسات کو محسوس کر کے حسین پیرائے میں اظہار کیا گیا ہے۔

جدید تھیٹر میں بھی رنگ، روشنی اور سائے کے اس خوشنما کھیل کو نیز رنگوں کے مناسب استعمال کو تھیٹر کی تادیر زندگی کے لئے جز و لاینفک سمجھا جاتا ہے اس کے پیدا شدہ اثرات کو دیکھ اور محسوس کر کے ہم اپنی روزمرّہ کی بے رنگ دنیا سے نکل کر ایک نئی اور انجانی دنیا میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ روشنی اور سائے کا کھیل اور رنگوں کی آمیزش و آویزش جدید اسٹیج کے پورے جسم میں خون بن کر دوڑتے ہیں اور خواب و حقیقت کا حسین التباس پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا تھیٹر سے وابستہ لوگوں کے لئے، یہاں تک کہ تھیٹر میں رنگ، روشنی اور سائے کے زندہ پیکر اور اس کے پیدا شدہ اثرات کا علم ضروری ہے۔ تاپس سین (Tapas Sen) ہندوستانی تھیٹر میں رنگ، روشنی اور سائے کے انتظام و انصرام کا انتہائی اہم اور معتبر تخلیقی نام ہے وہ بے وجہ تو نہیں کہتے کہ:

"یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ روشنی ایک ایسی شئے ہے جس کی اپنی قوت، اپنی رفتار اور اپنا روپ ہے"۔

مضمون: (ناٹک و آلو)

لفظوں میں پوشیدہ استعاروں، پیکروں، رنگوں اور ان کے تاثرات، نیز غنائیت اور آہنگ کو ہم نثری تحریروں، ناولوں، افسانوں اور نظموں غزلوں میں محسوس کئے بغیر نہیں رہتے۔ بچپن میں پڑھے ہوئے مصرعے تک ذہن و دل میں نہ صرف کشادگی اور غنائیت سے مملو کیفیات کو جنم دیتے ہیں بلکہ ہمارے ذہن و دل پر سرخوشی اور رعنائی کا احساس بھی چھایا رہتا ہے، جب ہم انیسؔ کے مصرعے:

"کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا"

دہراتے ہیں تو سبزہ اپنی پوری توانائی سے آنکھوں میں چھا جاتا ہے۔ جب اقبالؔ کہتا ہے:

ع "کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر"

تو ہم پہاڑوں پر شفق کے رنگ اور اس کی تھرتھری کا بھی ادراک کرتے ہیں۔ جب بیدیؔ کہتا ہے کہ "سورج کی ٹکیہ لال ہے"۔ اور جب کسی ناول کا ابتدائی جملہ یہ ہوتا ہے کہ

"بدلیاں چھٹ گئیں، چاندنی کے سائے اُبھر آئے"۔

تو ہم سورج کی ٹکیہ کی امیجری کو اس کے رنگوں کے بغیر، بدلی کو اس کے گھنیرے سایوں کے بغیر اور چاندنی کو اس کی نرم ٹھنڈک کے بغیر محسوس نہیں کرتے۔ یہ ساری چیزیں ہمارے شعور کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ لفظوں کی قوت کو رنگوں اور روشنیوں سے ممیّز کر کے ہم رنگ روشنی اور سائے کے کھیل کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح غزلوں یا نظموں میں جب سرمئی اُجالوں کی بات ہوتی ہے تو آنکھوں سے خواب رنگوں کا ایک لرزتا کانپتا خوشنما ریلا گزر جاتا ہے۔ اس طرح اسٹیج پر بھی ڈراموں کی پیشکش میں رنگ، روشنی اور سائے کا آمیزہ ایک نیا جہاں خلق کرتا ہے۔ ہم اسٹیج پر پیش ہونے والے واقعات، کردار، وقت، ماحول نیز ڈرامے کے متن اور کردار کے بطون میں پوشیدہ نفسیاتی کیفیات کو روشنی اور سائے کے کھیل کی مدد سے صراحت کے ساتھ سمجھ پاتے ہیں۔ اگرچہ جدید تھیٹر میں رنگ، اور روشنی اور سائے کے استعمال کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور ڈراموں کے ہر منظر میں اسے برتنے کے لئے مخصوص ماہرین کی ضرورت پڑتی ہے، تاہم بہ حیثیت ہدایت کار ڈراما نگار اور اداکار تھیٹر میں رنگ و روغن، زندگی کا پرتو اور ڈراموں کی فضا کو پیش کرنے کے لئے اور اردو ڈراموں کو اسکول اور کالج کے ماحول سے باہر لانے کے لئے رنگ، روشنی اور سائے کے استعمال کا عملی تجربہ بڑی حد تک ضروری ہے۔ یہ جان لینا ہے کہ روشنی اور سائے کے درمیان رنگوں کا کیسا امتزاج ضروری ہے تاکہ تھیٹر میں ہم اپنی بات نہ صرف سلیقے سے کریں بلکہ لفظوں کی صورت گری، امیجری اور ماحول کی تخلیق میں بھی ہم زبانوں کے ڈراموں کی ہمسری کر سکیں۔

روشنی کا بنیادی کام اندھیرے کو دور کرنا ہے۔ روشنی اور اندھیرے کے روپ، رنگ اور آہنگ کو حسبِ ضرورت اور بہترین تناسب کے ساتھ اسٹیج پر پیش کرنا ایک ایسا فریضہ ہے جہاں سائنس کی تکنیکی برکتیں اور ادب سے ماخوذ تصورات پہلو بہ پہلو اپنا کام کرتے ہیں۔ ڈرامے میں الفاظ، موسیقی، اداکاری، ہدایتکاری، مناظر اور دوسرے اجزا اپنے بل پر واقعات کے تانے بانے نہ صرف بُنتے ہیں بلکہ ڈرامے کی سُرعت و شدّت کو بے پناہ نادرہ کاری کے وسیلے سے آگے بڑھانے میں رنگ، روشنی اور سائے کا رول ناگزیر ہے۔ مختلف طرز کے ڈراموں کو، خواہ وہ تاریخی ادوار سے متعلق ہوں یا جدید زمانے کے لایعنی ڈرامے یا وقوعے سے، روشنی ڈرامے کی مناسبت سے سحر قائم کرتی ہے اور کردار کے روپ، حالات زمانہ، یہاں تک کہ اداکاروں کے moods کو بھی نئی اور بامعنی زندگی عطا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں روشنی نہ صرف ڈرامے کو بامعنی



ضمیر یوسف

نام : ضمیر احمد خان
قلمی نام : ضمیر یوسف
ولدیت : محمد یوسف خان (مرحوم)
تاریخ ولادت : فروری ۱۹۶۶ء
جائے ولادت : برنپور۔ ضلع بردوان۔ (مغربی بنگال)
آبائی وطن : ضلع سیوان (بہار)
تعلیم : ادیب کامل
ذریعۂ معاش : تجارت
آغاز شاعری : باقاعدہ ۱۹۸۲ء
شرف تلمذ : حضرت حامی گورکھپوری (مرحوم)
ادبی وابستگی : معاون مدیر رسالہ "دستک" ہوڑہ۔
تصنیفات : (۱) ایمان کی خوشبو (نعتیہ مجموعہ) ۱۹۸۸ء
(۲) غزل کے جھروکے (مجموعۂ غزلیات) ۱۹۹۹ء
اصناف ادب : حمد، نعت، غزل، نظم، رُباعی، قطعہ، دوہا، ماہیے، کہہ مکرنیاں، ہائیکو وغیرہ۔ کچھ ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔
موجودہ پتہ : ۲/۷۶، ۳، ایس سی روڈ، پلاٹ نمبر ۵۴، بی گارڈن، ہوڑہ- ۷۱۱۱۰۳ (مغربی بنگال)

ہائیکو

آؤ سوچیں یار
بیچ میں اپنے کیوں اٹھی
نفرت کی دیوار

دل ہی توڑ دیا
بیچ سمندر میں لا کر
اُس نے چھوڑ دیا

سڑکیں ہیں سنسان
ایک بلا کے آنے سے
شہر ہوا ویران

کیا دنیا ہے یار
گردنِ حق پر چلتی ہے
ظالم کی تلوار

سہل نہ اس کو جان
خودداری سے ہوتی ہے
انساں کی پہچان

رُباعیات

ہر لمحہ ہے دیوار کی صورت یارب
ہر پھول ہے اب خار کی صورت یارب
کیسے نہ ہو ہر عضوِ تمنا زخمی
ہر سانس ہے تلوار کی صورت یارب

ہر شخص گرفتار بلا ہو جیسے
ہر آن یہاں حشر بپا ہو جیسے
ہر سانس ہو جیسے کوئی نیزے کی انی
اس دور میں جینا بھی سزا ہو جیسے

تم موم کی مانند پگھلتے رہنا
خواہش ہے اُجالے کی تو جلتے رہنا
تھک ہار کے بیٹھوگے تو پچھتاؤ گے
منزل کی تمنا ہے تو چلتے رہنا

پھر ابرِ ستم اتنا گھنیرا کیوں ہے
ہر دل میں ہی نفرت کا بسیرا کیوں ہے
جو لوگ ہیں سورج کے پرستاروں میں
اُن لوگوں کے ذہنوں میں اندھیرا کیوں ہے

کچھ کھوکھلے کردار بنا کر خوش ہے
کاغذ کی وہ پتوار بنا کر خوش ہے
اللہ رے یہ خام خیالی اُس کی
نا اہلوں کو فنکار بنا کر خوش ہے

غزلیں

پہلے عنوان کہانی کا بناتا ہے مجھے
لفظِ مہمل کی طرح پھر وہ مٹاتا ہے مجھے

دل مرا ہوگیا گم گشتۂ منزل شاید
جانے کس دشت کی جانب لئے جاتا ہے مجھے

گھومتا رہتا ہوں میں چاک کی مٹی کی طرح
اپنی مرضی سے وہ جو چاہے بناتا ہے مجھے

پھر رہا تھا جو چھپائے ہوئے چہرہ اپنا
شہر میں اب وہی آئینہ دکھاتا ہے مجھے

کس قدر بڑھ گئی دیوانگیٔ شوق نہ پوچھ
ذرّے ذرّے میں فقط تُو نظر آتا ہے مجھے

خود جو نا واقفِ تہذیبِ تکلم ہے ضمیر
گفتگو کے وہی آداب سکھاتا ہے مجھے

جب سے حیات درد کی میزان ہوگئی
کانٹے چبھے تو پھول کی پہچان ہوگئی
کل تک تھیں جس میں شہر تمنا کی رونقیں
وہ دل کی شاہراہ بھی سنسان ہوگئی
منزل ہے دور اور کوئی ہم سفر نہیں
یہ سوچ کر حیات پریشان ہوگئی
لہجے کی تازگی سے لیا جب چھری کا کام
دشمن کی دشمنی بھی پشیمان ہوگئی
ہر باب میں ہے اس کے غموں کی تپش ضمیرؔ
یہ زندگی بھی میرؔ کا دیوان ہوگئی

❖ ❖ ❖

اپنا تو یہ شوق ہے پرانا
آندھی میں چراغ دل جلانا
دردِ جگر سب نہیں سمجھتے
اندھوں کو چراغ مت دکھانا
تنہائی اگر چہ مار ڈالے
کم ظرفوں سے ربط مت بڑھانا
یہ شہر خلوص تھا مگر اب
ہے ذہنیت اِسکی تاجرانا
دل پر ہے ضمیرؔ بوجھ بھاری
اچھی سی کوئی غزل سُنانا

❖ ❖ ❖

دوہے

راجا کو نردھن کرے، نردھن کو دھنوان
ہوتا ہے اے دوستو! سمے بڑا بلوان

❖ ❖

کھیتوں کی پگڈنڈیاں، ندی، جھیل، تالاب
نیند سے چونکا دیکھ کر، یہ بچپن کے خواب

❖ ❖

رہتے ہیں فٹ پاتھ پر، یوں تو بے گھر بار
نینوں میں آباد ہے، سپنوں کا سنسار

❖ ❖

جیون کے دُکھ درد سے، دل تھا جب ہلکان
پھولوں سے سُندر لگی، بیٹے کی مسکان

آموں کی بگیا وہی، پنگھٹ پیپل چھاؤں
اب بھی ہے سُندر بہت، شہر سے اپنا گاؤں

❖ ❖

جو ہیں باتوں کے دھنی، جو سچے فنکار
ہرگز کہہ سکتے نہیں، سائے کو دیوار

یہ کیسا اندھیر ہے، یہ کیسا انیائے
اندھے بھی دینے لگے، فن پر اپنی رائے

اک بوڑھے نے یہ کہا، کر کے کنیا دان
سینے سے میرے ہٹی، بہت بڑی چٹان

❖ ❖ ❖

ماہیے

ہے سچ بھی فسانا بھی
عشق کی قسمت میں
کھونا بھی ہے پانا بھی

انداز نرالا ہے
دل میں ہے غم لیکن
چہرے پہ اُجالا ہے

❖

فرزانے سمجھتے ہیں
لذّتِ سوزِ عشق
دیوانے سمجھتے ہیں

❖ ❖

ٹوٹا ہوا ہر دل ہے
شہرِ محبت میں
نغمہ ہے نہ محفل ہے

❖ ❖

ان پیار کے رنگوں میں
سب کچھ بھول گیا
ہولی کی امنگوں میں

❖ ❖

موجوں کی روانی ہے
روک نہ پاؤگے
یہ سیلِ جوانی ہے

❖ ❖

بچ ظلم کی راہوں سے
عرش لرزتا ہے
مظلوم کی آہوں سے

کہہ مکرنیاں

جو بھی دیکھے دیکھتا جائے
دیکھ کے من ہی من مسکائے
میرے دل کی تیز ہو دھڑکن!
اے سکھی درپن؟
نا سکھی! جوبن

❖

پیچھے آئے آگے جائے
منزل تک وہ ساتھ نبھائے
ساتھ بھی دیکر لگے پرایا
اے سکھی ساجن؟
نا سکھی سایا

❖

دیکھے چاند اور مرجھا جائے
عید کے دن بھی اشک بہائے
غم سے رہے دل جس کا چوُر
اے سکھی افسر؟
نا —— مزدور

ضمیر یوسف

(بوڑھا امتحان کے طور پر ہوا میں فائر کرتا ہے۔ کسی ان دیکھے پیڑ سے دہشت زدہ پرندوں کا شور ابھرتا ہے۔ ظاہر ہے پستول نقلی ہے)۔

بوڑھا : (مسکرا کر) تم واقعی چالاک ہو۔ لگتا ہے ایک نہ ایک دن تم اپنا پلِ بنا کر ہی رہو گے۔ (چور اندھے کو چھوڑ دیتا ہے۔ بوڑھا اسے پستول تھماتا ہے)۔

نابینا : ہم اب بھی دوست بن سکتے ہیں۔

چور : (بوڑھے سے) میں تم سے تنگ آگیا ہوں۔ دیکھو لوگ پارک میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب ہم یہ کتا چرا بھی نہیں سکتے۔

بوڑھا : جانے دو یہ دنیا اتنی وسیع ہے کہ کہیں نہ کہیں ہمارے لئے کوئی نہ کوئی کتا ضرور انتظار کر رہا ہوگا۔ اب ہمیں اس پارک کا رخ نہیں کرنا چاہئے ورنہ آخر میں ہمارے پاس رونے کے لئے صرف یہ اندھا بچ جائیگا۔

نابینا (مسکراتا ہے)۔ تم چاہو تو میں تمہارا کتا بن کر رہ سکتا ہوں۔ تم میرے گلے میں پٹا ڈال سکتے ہو۔

چور (تلملا کر) شٹ اپ۔ میں کہتا ہوں اپنی زبان بند رکھو۔ سالے نیسارا دن خراب کر دیا۔

بوڑھا جانے بھی دو۔

نابینا میں تمہارے گھر کی رکھوالی کرونگا، تمہارے بڑھاپے کی لاٹھی ہوں گا۔ میں تمہارے لئے روؤنگا۔ زمین پر کروٹیں لگاؤں گا۔ میں تمہاری پھینکی ہوئی گیند تمہارے قدموں پر لا کر ڈال دوں گا۔

چور حرامی کے بچّے، خاموش کیوں نہیں ہو جاتے (اسکے سر پر ایک گھونسا عائد کرتا ہے۔ اندھا بچ پر گر جاتا ہے۔ اسکی عینک زمین پر گر جاتی ہے۔ چور عینک کو اٹھا کر دیکھتا ہے)۔ ارے واہ، رے بین (Ray Ban)!

بوڑھا بے رحم مت بنو، وہ آنکھ کا اندھا تمہارے لئے بے ضرر ہے۔

(چور عینک لگا کر بوڑھے کا عصا تھام لیتا ہے۔ وہ اندھے کی چلنے کی نقالی کرتا ہے)۔ تمہارے سر پر اب صرف ایک ہیٹ کی کمی ہے۔

نابینا اس سے کہو، میری چیز واپس لوٹا دے۔

چور لوٹا دینگے، لوٹا دینگے۔ ابھی تو آدھا دن بھی نہیں گذرا۔ (وہ عینک اور عصا کے ساتھ اندھے کی طرح چلتا ہوا پارک سے غائب ہو جاتا ہے۔ بوڑھا کتے کے پاس جاتا ہے کچھ سوچتا ہے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہے۔ پھر کتے کی زنجیر کھول کر اس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ عصا کے نہ ہونے سے اس کی چال میں ڈگمگاہٹ ہے)۔

(اندھا لٹا لٹایا چپ چاپ اپنی بچ پر بیٹھا رہتا ہے۔ پھر وہ پستول سے نکال کر ہاتھ سے اسے سہلاتا ہے۔ مسکراتا ہے)۔

نابینا : احمق، انہیں اصلی اور نقلی پستول کی پہچان بھی نہیں۔

(پستول سے آسمان کی طرف نشانہ لے کر فائر کرتا ہے اور جب کہ نہ نظر آنے والے پیڑ سے خوفزدہ پرندوں کی چیخ وپکار سنائی دے رہی ہے، وہ سر کو بچ کی پشت سے ٹکا کر اس کا لطف لیتا ہے۔ دور سے بہت سارے لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ایک سب انسپکٹر اور ایک کانسٹبل، مالی، دونوں چور اور کتے کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔

سب انسپکٹر۔ میں سب انسپکٹر بیارائے ہوں۔ یہ گولی آپ نے چلائی تھی؟

نابینا : میرے پاس اس کا لائسنس ہے انسپکٹر۔

سب انسپکٹر: پھر بھی یہ ایک پبلک پلیس ہے۔ آپ اس سلسلے میں تھانے میں آکر مل لیں۔ تب تک یہ پستول ہمارے پاس رہے گا۔ (پستول لے لیتا ہے)۔ بائی دی بائی، مالی کہہ رہا تھا یہ کتا آپ کا ہے۔

نابینا (جھک کر کتے کا بدن سہلاتے ہوئے)۔ ہاں۔ کہاں سے ملا یہ آپ کو؟

سب انسپکٹر: یہ دونوں اسے چرا کر بھاگ رہے تھے۔

نابینا ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے انسپکٹر۔ شیخ طوطا تو میرے پرانے دوست ہیں۔

بوڑھا (ناخوشگواری کے ساتھ) یہ میرا اصلی نام نہیں۔

نابینا ۔ یہ میرا نام دیا ہوا ہے۔ میں اپنے تمام دوستوں کو اپنے دئے ہوئے ناموں سے پکارتا ہوں۔

سب انسپکٹر۔ خیر لگتا ہے ہم سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ تم دونوں پھر بھی تھانے چلو۔ اپنا پتہ ٹھکانہ لکھوا کر کتا لے جانا۔ او کے مسٹر۔۔

(اسکی طرف معافی کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے جسے اندھا سمجھ نہیں پاتا)۔

نابینا سکندر خان

سب انسپکٹر۔ (ہاتھ واپس لیتے ہوئے) او کے، مسٹر خان۔ آپ تھانہ آکر پستول لے جائیے۔ (سب چلے جاتے ہیں۔ اندھا بچ پر بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ 5ان)

(وہی پیڑ، وہی بچ)

(وقت۔ غروبِ آفتاب سے قبل)

(اندھا بچ پر اسی حالت میں بیٹھا ہوا ہے جس حالت میں وہ پہلے منظر میں بیٹھا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نے تاریک شیشے کی عینک لگا رکھی ہے۔ نہ صرف اس نے کتے کی زنجیر تھام رکھی ہے بلکہ اسکے ہاتھ میں بوڑھے کا

عصا بھی ہے۔ اس وقت اس کا رخ براہِ راست تماشبین کی طرف ہے جن سے وہ مخاطب ہے)

نابینا : یہ میرا وہی کتّا ردنق ہے۔ اگر اس نے اپنا نام سنکر دم نہ ہلائی ہو تو یوں سمجھ لیں کہ بوڑھے کی صحبت میں اس نے اپنی بہت سی عادتیں بدل دی ہیں۔ اسے بوڑھے کا ہم پیشہ پچھلے ہفتے لوٹا گیا ہے۔ بوڑھا دل کا دورہ پڑنے سے مر چکا ہے۔ اس نے مرنے سے پہلے اس کتّے کے ساتھ بطور خاص یہ عصا مجھے بھجوایا تھا۔ (عصا اٹھا کر دکھاتا ہے)۔ اس کا ساتھی کہہ رہا تھا انھوں نے اسے ایک بوڑھے گجراتی سیٹھ سے چرایا تھا جب وہ علی الصباح وکٹوریہ میموریل کے باغ میں چہل قدمی کرنے کے بعد بنچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ خیر مجھے اس سے کیا۔ (عصا کو بنچ پر رکھ دیتا ہے)۔ یہ تو میرے لئے ایک تحفہ ہے۔ ایک نادر تحفہ۔ مجھے ایک بات کی خوشی ہے کہ آخر میں اپنا پل بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ گرچہ اب اس پر چلنے کے لئے میں تنہا رہ گیا ہوں۔ میں بوڑھے کی قبر بھی جا چکا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اپنی بیوی کے بغل میں چین کی نیند سو رہا ہے۔ (جیب سے نسوار کی ڈبیا نکال نسوار لیتا ہے۔ ڈبیا تماشبین کو دکھا کر) نسوار کی یہ ڈبیا بھی اسی کا تحفہ ہے۔ اسے بوڑھے نے پارک اسٹریٹ میں ایک نیلام کے دوران چرایا تھا۔ مرتے مرتے اس نے یہ لت مجھے لگا دی واقعی بری صحبت کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ (ڈبیا جیب کے اندر ڈال کر) اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ایک سنسان پُل اور ایک ناختم ہونے والی تاریک سرنگ۔

(اپنی ٹھوڑی عصا کے دستے پر رکھ کر تماشبین کی طرف تاکتا رہتا ہے)

(فیڈ آؤٹ)

(پردہ)

Burns Philp India

1st Floor, Block C2
60C, Chowringhee Road
Calcutta - 700 020
Tel / Fax : 247-0530 / 5969

Quality, Choice and Convenience ....

are essential for your success ....
***Burns Philp** offers you all this and more in one basket.*

*For 112 years **Burns Philp** has been servicing its customer around the world from 33 countries and numerous innovative products*

In India we are proud to offer our services through our 100% subsidiary **Burns Philp India** *with our 'TOWER' range of Yeast and Bakery ingredients*

Our wide product range includes

- Compressed Yeast
- Active Dried Yeast
- Yeast Extract Paste / Powder
- Bread Improvers
- Calcium Propionate
- Glycerol mono Stearate
- Pan Oil
- Baking Powder
- Egg Free Cake Mix
- Cake Mix
- Cake Gel
- Flavours
- Vital Wheat Gluten

نعیمہ ضیاءالدین (جرمنی)
کے شہکار افسانوں کا مجموعہ
"منفرد"

ناشر۔ انشاء پبلی کیشنز
۶/۱اے، کنائی سِل اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳

ہوں۔ (پستول پر نظر پڑتے ہی چور کی آنکھیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ وہ غائب ہو جاتا ہے)۔

بوڑھا : تم میرا قتل کرنا چاہتے ہو ایک جانور کے لئے۔

نابینا : انسان اور جانور میں فرق ہی کیا ہے؟ یہ دو پیروں پر چلتا ہے۔ ہاں کچھ انسان تو چارپائے بھی ہوتے ہیں۔

بوڑھا : مگر انسان کے دم نہیں ہوتی۔

نابینا : واقعی! لگتا ہے تمہارے اوسان خطا نہیں ہوئے۔ اچھا ہے (پستول جیب میں ڈال کر.....) اس پیشے میں کب سے ہو؟

بوڑھا : مجھے پولیس میں تو نہ دو گے؟

نابینا : میں اپنی مرضی کا انسان ہوں۔ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔

بوڑھا دو سال سے۔ اور اس سے پہلے میں ایک شریف انسان تھا۔

نابینا : کتنا شریف؟

بوڑھا جتنا ایک عام آدمی آج کے حالات میں شریف ہو سکتا ہے۔

نابینا . (قہقہہ لگا کر) خوب! اچھا جواب ہے۔ ذہین ہو، اوپر والے نے آنکھیں دی ہیں۔ کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے۔

بوڑھا . تم نے کبھی چوری کی ہے؟

نابینا . نہیں۔

بوڑھا کر کے دیکھو، اس کا بھی اپنا ایک آنند ہے۔ میں زندگی بھر ایک ہوم گارڈ کی نوکری کرتا رہا۔ کام پانے کے لئے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے۔ پولیس افسروں کا کھانا پکانا پڑتا تھا ان کے لئے شراب لانی ہوتی تھی، انکے بچوں کے پوتڑے صاف کرنے پڑتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پولیس کے یونین آفس میں بیٹھ کر اکاؤنٹس دیکھنے پڑتے۔ تب جا کر مہینہ میں اتنے دن کام مل جاتے کہ اپنے پریوار کی بھوک مٹا سکوں۔

نابینا ہر کوئی اپنے پریوار سے پریشان ہے۔ شاید میں نے شادی نہ کر کے اچھا کیا ہے۔

بوڑھا تم شادی کیسے کر سکتے تھے۔ جب عورتیں آنکھ والوں کو دھوکہ دینے سے نہیں چوکتیں تو تمہیں بھلا کب معاف کرنے والی تھیں۔

نابینا تم ٹھیک کہتے ہو۔ جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے میں کسی حد تک تمہیں سمجھنے لگا ہوں۔ تمہارے پریوار میں کون کون ہے؟

بوڑھا کوئی نہیں۔ میری بیوی مر چکی ہے۔ سرکاری اسپتال میں اس کا ٹھیک سے علاج نہ ہو سکا۔ اسی لئے میں باگماری قبرستان میں گاڑ

آیا۔ مجھے تو لگتا ہے ایک وہی جگہ ہم غریب چین سے رہ سکتے ہیں۔ خدا کے لئے اب مجھے جانے دو. تم دیکھ رہے ہو، میں اتنا بڑا انسان نہیں ہوں۔

نابینا : چپ رہو اور خاموشی سے میری بات سنو۔ ایک اندھا جب کچھ کہے تو لوگوں کو دلوں کے دروازے کھلے رکھنے چاہئے کیونکہ وہ اُس دنیا کی خبر لاتا ہے جہاں تک آنکھ والوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ میں تمہیں اپنی زندگی کی داستان سنانے کے لئے بے چین نہیں ہوں۔ مگر تم نے میرا کتا چرایا ہے اور اب تم میرے مقروض ہو۔

بوڑھا : میں تمہارا کتا واپس لوٹا دوں گا۔

نابینا : تم وہ کتا کیسے لوٹا سکتے ہو۔ میں نے وہی کتا تو دوبارہ دکاندار سے خریدا ہے۔

بوڑھا . معاف کرنا (بوڑھا اٹھنے لگتا ہے) میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ مجھے جانے دو، میں ایک کمزور آدمی ہوں۔

بوڑھا (اندھا چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے جیسے اس معاملے سے اسے کوئی تعلق نہ ہو۔ بوڑھا بنچ کی پشت تھامے کھڑا اندھے کا جائزہ لیتا ہے اور جب کہ اس پر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اب وہ وہاں سے جانے کے لئے آزاد ہے، اپنے کسی اندرونی جذبے سے مجبور ہو کر واپس بیٹھ جاتا ہے) کیا چاہتے ہو تم؟

نابینا . تم میرے دوست بن جاؤ۔

بوڑھا ناممکن، گھوڑا گھاس سے دوستی کرلے تو کھائیگا کیا؟

نابینا . دنیا میں گھوڑے بہت ہیں، اور گھاس ان سے زیادہ۔ کم ہیں تو ایسے لوگ جن کے ساتھ تم اپنے دل کی بات کر سکتے ہو۔

بوڑھا : ایک چور کو اپنا ساتھی نہ بناؤ۔ پولیس والے تمہارا راستہ دیکھ لینگے۔

نابینا . تم بھی تو پولیس میں رہ چکے ہو۔ اچھا بتاؤ تو، جب تم ہوم گارڈ تھے تو تمہاری اوپر کی آمدنی بھی خوب ہوتی ہوگی؟

بوڑھا کچھ خاص نہیں۔ ہاں کبھی کبھار جب کسی چوراہے پر مجھے ٹریفک سنبھالنے کا کام ملتا تب تھوڑی بہت۔ اصلی مال تو سرجینٹ ہڑپ کر جایا کرتے۔ میں تمہیں بتاؤں، جب کوئی سرجنٹ اپنی موٹر سائکل پر سوار میرے سامنے سے گذرتا تو میں من ہی من اسے گالی دیتے ہوئے اپنا غیر مصروف ہاتھ پیشانی تک لیجاتے ہوئے یوں سیلوٹ مارتا (اٹھ کر ٹریفک ریگولیٹ کرتے ہوئے سیلوٹ مار کر دکھاتا ہے) پولس لائن سے جو جوتے مجھے دئے گئے

تھے وہ اتنے بھاری تھے کہ میں چوراہے کے بیچوں بیچ گھنٹوں کھڑا رہ جاتا جیسے کسی نے میرے پیر زمین میں گاڑ دئے ہوں۔ مجھے اپنی یونیفارم کے پائچے اور شرٹ کی آستین اتنے موڑنے پڑتے کہ ہر ایک میں تاش کے باون پتے سما جائیں۔ ہماری جنگ ٹرک کے ڈرائیوروں سے ہمیشہ جاری رہتی۔ کئی ڈرائیور تو تیز رفتاری کی مد دلے کر ہم پر تھوک بھی دیا کرتے۔ مگر دن بھر کا تھکا ماندا جب میں گھر لوٹتا تو سکے جب میری جیب میں کھنکھناتے تو ان کی آواز کسی بانسری سے بھی زیادہ میٹھی لگتی۔ میں تو گویا جی اٹھتا۔

نابینا : دیکھو، ہم لوگ دوست بن گئے ہیں نا؟ تم کس طرح اپنے گندے پوتڑے میرے سامنے دھو رہے ہو۔ یوں بھی اگر دوست نہیں ہو سکتے تو اس سے کیا۔ اب ہم دشمن بھی تو نہیں رہے۔ کیوں؟

بوڑھا : تو میں جا سکتا ہوں۔

نابینا . اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کچھ گندگی مجھے بھی دھونے دو۔

بوڑھا : ابھی تم نے کہا تھا تم اپنی کہانی سنانا نہیں چاہتے۔

نابینا چاہوں تو بھی نہیں سنا سکتا۔ کیونکہ میرے پاس کوئی کہانی ہے ہی نہیں۔ ایک اندھا جسکے پاس اتنی جائداد ہے کہ وہ خود کفیل ہے۔ اسے جینا پسند ہے۔ وہ ایک لمبی زندگی جینا چاہتا ہے کتنی لمبی اسے نہیں معلوم، مگر وہ بہت لمبی ہو۔ مگر وہ کیوں اتنی لمبی زندگی جینا چاہتا ہے، کیوں اتنی لمبی سرنگ میں چلنا چاہتا ہے۔ وہ شیونگ بلیڈ کے ذریعے اپنا حلق کیوں نہیں چاک کر لیتا (بوڑھا سہم کر بیٹھ جاتا ہے) وہ کسی ٹرک کے نیچے کیوں نہیں آجاتا (بوڑھا پریشان دکھائی دیتا ہے) وہ کسی ریلوے برج سے کیوں نہیں کود پڑتا (بوڑھا ہاتھ سے چہرہ ڈھک لیتا ہے)۔ زندگی اور موت، بس یہی چیزیں میں رات دن سوچتا رہتا ہوں۔ میں ٹٹولتے ہوئے دنیا کی ہر چیز کو پاتا اور رد کرتا رہتا ہوں۔ شاید لوگوں کو سمجھنے کے لئے میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں کہ مکالمہ قائم کروں۔ مگر لوگ چپ چاپ نکل جاتے ہیں۔ اس تاریک سرنگ میں مجھے تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔ مجھے خاموش لوگوں کے مقابلے میں وہ لوگ پسند ہیں جو گالیاں بکتے ہیں، شور مچاتے ہیں، گولیاں چلاتے ہیں۔ ان کی بات، ان کے شور کے ذریعے میں ان تک پہونچ پاتا ہوں، اپنے ذہن میں ان کے خط و خال بنا پاتا ہوں۔ مگر وہ لوگ جو خاموشی اختیار کرتے ہیں وہ خطرناک ہوتے ہیں، وہ چور زمینوں کی طرح ہیں جو تمہاری لاعلمی میں جانے کب تمہارے وجود کو نگل لیں، تم انکے پیروں کے نشان نہیں پاتے، تمہیں ان کے قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی، تم ہرگز نہیں جان سکتے کہ ان کا اگلا قدم کیا ہے۔ خاموش لوگوں سے گریز کیا کرو۔ وہ اپنے وجود سے ڈائنامائٹ لگائے گھومتے رہتے ہیں۔

(بوڑھا بنچ سے کسی قسم کی آواز پیدا کئے بغیر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دبے پاؤں بنچ کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ چور پیڑ کی آڑ سے نمودار ہوتا ہے اور جب کہ اندھا اپنا مکالمہ جاری رکھے ہوئے ہے دونوں اشارے سے پستول کو چھین لینے کا منصوبہ بناتے ہیں)

شروع میں جب ہم ملے تو میں نے باتوں کے ذریعہ تم تک ایک پل بنانا چاہا، دوسری بار اس پل میں ہم نے چند اور اینٹیں رکھیں، کچھ اور سمنٹ اور کنکریٹ ڈالے، اور تیسری بار جب ہم نے اسے لوہے کا استحکام دے ڈالا تھا اور جب کہ پل مکمل ہونے والا تھا جانے کیوں تم نے یہ پل توڑ ڈالا، تم میرے کتے کے ساتھ بھاگ نکلے۔ کتے پھر بھی مل جاتے، مگر جو پل ہم نے بنایا تھا مجھے وہ کہاں ملتا؟ اس لئے میں نے تمہاری تلاش جاری رکھی۔ سن رہے ہو نہ تم میری بات۔ (ٹٹولنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور جب کہ اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بوڑھا اپنی جگہ پر نہیں ہے مخدوش کردار کا آدمی اسکے دونوں بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے بنچ کی پشت سے دبا لیتا ہے۔ بوڑھا جھک کر اسکی جیب سے پستول نکال لیتا ہے)

ٹھہرو! یہ کیا کر رہے ہو تم؟

بوڑھا : چپ رہو (پستول کا معائنہ کرتا ہے)۔ اسی پستول کے بل بوتے پر تم یہ پل تعمیر کر رہے تھے نہ۔ آج یہ پستول ہی سہی۔

چور : سنبھال کر، شاید یہ بھرا ہوا ہے۔ چور بازار میں بھاری قیمت ملے گی اسکی۔

نابینا : (قہقہہ لگا کر) واقعی! پھر تو تم دونوں مالا مال ہو جاؤ گے اس نقلی پستول کو بیچ کر۔

بوڑھا : (چونک کر) نقلی پستول!

نابینا : اور کیا، میں نے نقلی پستول جو صرف آواز پیدا کرتا ہے، تم جیسے لوگوں کو ڈرانے کے لئے رکھا ہوا ہے۔

چور : تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔

نابینا : تو لے جاؤ۔ کس نے روکا ہے۔ ویسے اسے بیچ کر دو تین دن تک پیٹ تو بھر ہی سکتے ہو۔

ہے جسے ہم حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر مادر وطن کا نام عطا کرتے ہیں جو ہمیں آزادی کم اور زنجیریں زیادہ عطا کرتی ہے۔ دراصل ہر قدم پر تمہیں آزادی خریدنی پڑتی ہے، کبھی جائز طور پر کبھی ناجائز طور پر اور ہمیں خوش فہمی میں مبتلا رکھنے کے لئے کتنی خوبصورت اور دیدہ زیب زنجیریں عطا کی جاتی ہیں، آئی اے ایس، ایم پی، ایم ایل اے، کسی پرائیوٹ فرم کا ڈائرکٹر، ڈاکٹر، انجینیر، کلرک، خاکروب ... اور ہم اپنی اپنی زنجیریں پہن کر کتنے خوش دکھلائی دیتے ہیں۔ اپنی اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے کتنا کھل کر مسکراتے ہیں، مباشرت کے دوران یا قتل کرتے ہوئے یا نقل کرتے ہوئے یا کچھ نہ کرتے ہوئے .... مگر زنجیریں اپنی جگہ قائم رہتی ہیں۔ اور بھی کئی طرح کی زنجیریں ہیں جنہیں اکثریت اقلیت کو ذات پات کے نام پر یا علاقائیت یا لسانیت کا سہارا لے کر یا مذہب کی آڑ میں پہنانے میں مصروف ہیں۔ ہمارے رشتے بھی کم مضبوط زنجیریں نہیں ہیں جو ہم اپنے لئے ڈھالتے ہیں۔ اسی غلامی میں ساری زندگی گزر جاتی ہے اور ہم ایک دوسری کال کوٹھری میں ڈال دئے جاتے ہیں جس کا نام قبر ہے جہاں پھر ایک لمبی قید کی معیاد شروع ہو جاتی ہے جس سے نکل کر ہم جنت یا جہنم میں ابدالاباد تک قید کر دئے جاتے ہیں۔ اس لئے تم دیکھ رہے ہو، میں نے اندھا ہو کر کچھ زیادہ نہیں کھویا ہے، بلکہ چند معاملات میں زیادہ خوش نصیب بھی ہوں۔

(خاموش ہو جاتا ہے۔ عرصے تک خاموش رہتا ہے پھر اس کی آواز میں سسکی پیدا ہو جاتی ہے)۔

میں جانتا ہوں، میں جان گیا ہوں۔ تم نے میرا کتا چرا لیا ہے۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا ہے میرے ساتھ اور نہ یہ آخری بار ہے۔ شاید تمہیں مجھ سے زیادہ اس کتے کی ضرورت تھی۔ (رومال نکال کر آنسو پونچھتا ہے)۔ بڑا پیارا کتا تھا۔ جانے کیوں مجھے اس سے انسیت سی ہو چلی تھی۔ بہت اچھا تو نہ تھا مگر اس سے اچھے کی میں نے امید بھی نہیں کی تھی۔ تم کتا اٹھا لے گئے۔ مجھے اس کا افسوس نہیں۔ مگر تم میری بات تو سن سکتے تھے میں نے ایک طویل عرصے کے بعد اپنا دل کسی کے سامنے اتنا نہیں کھولا ہے۔ (خاموش ہو جاتا ہے۔ اٹھ کر ٹٹولتے ہوئے جانے لگتا ہے۔ پیڑ سے ٹکراتا ہے۔ گرتے گرتے بچتا ہے باہر چلا جاتا ہے)۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ [4]ان)

(وہی منظر

وقت۔ قبل ظہر)

(بوڑھا بنچ پر بیٹھا ہے۔ بیمار دکھائی دے رہا ہے۔ مخدوش کردار نظر آتا ہے۔ اسکی طرف جہاں موڑھی کا ٹھونگا بڑھاتا ہے۔ بنچ کے کنارے بیٹھ کر کھانے لگتا ہے۔)

بوڑھا (انکار کرتے ہوئے) لعنت ہے تم پر جاتے ہو تو لگتا ہے کبھی لوٹو گے نہیں۔

چور: تمہارے پاس لوٹ کر آنے سے فائدہ؟ تین ہفتے ہو گئے، تم نے ایک بھی کتا نہیں چرایا۔ اس سے تو وہ میرا رنڈیوں کی دلالی کا دھندہ ہی اچھا تھا۔ تمہیں نہیں معلوم۔ کبھی کبھار ایک ایک دن میں میں نے دو دو سو روپے بھی بنائے ہیں۔

بوڑھا۔ وہ اتنا ہی فائدہ بخش تھا تو اسے چھوڑا کیوں؟

چور ایک تبلیغی جماعت والے کے چکر میں آ گیا۔

بوڑھا۔ پھر سے اس کام سے لگ جاؤ۔

چور کب کا لگ جاتا۔ مگر مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ میرے بغیر تم بہت جلد مر جاؤ گے۔

بوڑھا میری فکر چھوڑ دو۔ میں کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا اپنی قبر تک پہنچ ہی جاؤں گا۔

چور (دور تاکتا ہے) تمہارا اندھا پھر سے ایک نئے کتے کے ساتھ دکھائی دے رہا ہے۔ چار مہینے ہو چکے ہیں۔ وہ تمہیں بھول تو گیا ہوگا۔ وہ عین پانی کے کنارے ٹہل رہا ہے۔ کہیں پانی گر کر ڈوب گیا تو ہمارا بڑا نقصان ہو جائیگا۔

بوڑھا ان اندھوں کی چھٹی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ ویسے تم اس کتے کا خیال دل سے نکال دو۔

چور۔ چلو نکال دیا۔ مگر میں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟

بوڑھا اسلئے کہ آسمان میں خدا بھی بیٹھا ہے۔

چور جس نے اوروں کے لئے جنت اور ہمارے لئے جہنم بنا رکھے ہیں۔ مجھے معلوم ہے مگر کیا تمہیں پتہ ہے کہ یہ دنیا اسی جہنم کا ہی ایک حصہ ہے؟

بوڑھا: تم پڑھے لکھے ہو کر بھی کبھی کبھار عقلمندی کی بات کر جاتے ہو۔ تم نے نوکری کیوں نہیں کی؟

چور۔ شروع شروع میں نے سرکاری نوکری کی بہت کوشش کی مگر ہر جگہ مجھے منہ کی کھانی پڑی۔ میرے ایک دوست [illegible]

مجھے پارٹی آفس جانے کا مشورہ دیا۔ کئی سال تک میں جلوس میں شامل ہوا۔ میں نے دیواروں پر سلوگن لکھے، اشتہارات چپکائے۔ میں نے بم بھی بنائے، پتھراؤ بھی کیا۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا میں ان ہی جیسے لوگوں کی ایک قطار میں کھڑا تھا۔ تنگ آ کر میں نے پارٹی آفس جانا بند کر دیا۔

بوڑھا: تم نے اچھا کیا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد تمہیں اگر کچھ ملتا تو وہ پرائمری اسکول کے ٹیچر کی نوکری یا پنچایت کے کلرک یا پیون کا عہدہ۔

چور: تم انہیں حقارت سے مت دیکھو۔ میرے اسکول میں ایک ساتھی ہوا کرتا تھا۔ وہ تین بار فیل ہونے کے بعد ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کر سکا۔ دراصل جب دوسرے لڑکے اسکول کی کتابوں پر ناک رگڑ رہے ہوتے وہ پارٹی کام میں لگا رہتا۔ ظاہر ہے جب پرائمری اسکول کے ٹیچروں کا پینل بنا تو ایک نمبر میں اس کا نام تھا۔ سب لوگ جانتے تھے یہ پینل پارٹی آفس میں تیار ہوا تھا۔ اب اس کی ماں اس کے لئے بہو ڈھونڈتی پھر رہی ہے جو دیکھنے میں حور ہو، تعلیم میں میڈم کیوری کے ہم پلہ ہو اور دولت کے معاملے میں قارون کی بیٹی ہو۔ کچھ بلا وجہ نہیں اگر آج ہر دوسرا ٹیچر کسی نہ کسی پارٹی کا دم چھلا بنا گھومتا پھرتا ہے۔ سرکاری نوکری بڑی چیز ہے۔

بوڑھا: تم نے کوئی دوسری پارٹی جوائن کیوں نہیں کی؟

چور: اپنی پارٹی کے تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمام پارٹیاں ایک جیسی ہیں۔ اس سے رنڈیوں کی دلالی کا دھندا کہیں زیادہ اچھا ہے۔ اور کتا چرانا تو مقابلتاً عبادت ہے عبادت۔

بوڑھا: ایک بات ہے، ان دو ٹکے کے حرامیوں نے یہ تو نیک کام کیا ہے کہ رنڈیوں کے دلال اور چور بھی اب خود کو ان کے مقابلے میں پارسا سمجھنے لگے ہیں۔

[illegible]

مجھے [illegible] میرے اندر بھی آگ جاگنے لگا ہے۔

[illegible]

ایک پٹا جس سے کتے بھی خوف نہیں کھاتے۔

بوڑھا: (نقاہت سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) آہ! تم مجھے چین سے مرنے نہ دو گے۔ اور کیا یہ عجیب اتفاق نہیں کہ وہی اندھا ایک دوسرے کتے کے ساتھ ادھر آ رہا ہے۔

چور: تم غلط سمجھ رہے ہو، یہ وہی کتا ہے جو ایک دوسرے اندھے کے ساتھ آ رہا ہے۔

بوڑھا: یہ تم کہہ سکتے ہو؟

چور: دکاندار کو کتا بیچتے وقت میں نے اس دوستی کر لی تھی۔ اچھا کیا یہ ضروری ہے کہ میں ہر بات کی وجہ بیان کرتا رہوں۔

بوڑھا: نہیں یہ وہی اندھا ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ تم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ (اندھا نمودار ہوتا ہے۔ چور کھسک لیتا ہے۔ اندھا ٹٹولتے ہوئے بنچ کے قریب آتا ہے اور جھک کر کتے کو بنچ کے ہتھے سے باندھ دیتا ہے۔ رومال نکال کر چہرے سے پسینہ صاف کرتا ہے اور بنچ کے کنارے بیٹھ جاتا ہے۔ بوڑھا کھانستا ہے۔ اندھا سر اسکی طرف موڑتا ہے۔ کچھ نہیں کہتا۔ مضبوطی سے کتے کے پٹے کو تھام لیتا ہے۔ بوڑھا نقاہت کا سہارا لے کر آواز بدلنے کی کوشش کرتا ہے) تم اپنے کتے کا خیال ٹھیک سے رکھو۔ آج کل چور بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ میں اپنا ایک کتا کھو چکا ہوں۔

نابینا: شکریہ! (پستول نکال دکھاتا ہے) اس بار میرے پاس اسکا علاج ہے۔

(بوڑھے کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ وہ خاموش ہو کر اندھے کو دیکھتا رہتا ہے۔ چور نمودار ہوتا ہے۔ وہ اشارے سے بوڑھے کو اٹھنے کے لئے کہتا ہے۔ بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہتا ہے کہ اندھا اس پر جھپٹ پڑتا ہے۔) بیٹھ جاؤ ابھی میں نے گفتگو ختم نہیں کی ہے۔

بوڑھا: [illegible]

[illegible]

نابینا: [illegible]

بوڑھا: [illegible]

[illegible]

نابینا : یہ نام پٹ شاپ کا دیا ہوا ہے۔

بوڑھا : (قدرے توقف کے بعد) رونق اچھا نام ہے مگر اس سے کتے کا کم اور آدمی کا زیادہ خیال آتا ہے۔

نابینا : تو تمہارے خیال میں کتے کا نام کیسا ہونا چاہئے؟

بوڑھا : جو کتے کے کردار یا اسکی صفت کو بیان کرے۔

نابینا : جیسے

بوڑھا : جیسے بارکی، جمپر، ٹائگر، بلٹ، جیسے ہٹلر

نابینا : کتوں کے نام کے لئے ہم صرف انگریزی سے ہی کیوں استفادہ کرتے ہیں؟

بوڑھا . کیونکہ انگریزوں نے پہلی بار ہندوستانیوں کو کتوں کے گلے میں پٹا ڈالنا سکھایا۔ انہیں کتوں کی ملکیت عطا کی۔

نابینا . کتوں کی انسان سے وفاداری کوئی نئی چیز تو ہے نہیں۔

بوڑھا . مگر انسان اور کتوں کا یہ رشتہ نیا ضرور ہے۔ کتا آج ایک انڈسٹری ہے ویسٹرن ممالک میں تو یہ واقعی ایک بڑی انڈسٹری ہے۔

نابینا ہم صرف کتوں کے بارے میں ہی کیوں بات کر رہے ہیں؟

بوڑھا (خاموش)

نابینا : اور بھی تو بہت سارے ٹاپکس ہیں؟

بوڑھا (خاموش)

نابینا . او کے میرا خیال ہے مجھے چل پڑنا چاہئے۔ میرا نام سکندر ہے۔ (ہاتھ بڑھاتا ہے)۔

بوڑھا (ہاتھ ملا کر) شیخ طوطا۔

نابینا (بوڑھے کی تقلید کرتے ہوئے) اچھا نام ہے۔ مگر اس سے آدمی کم اور پرندے کا زیادہ خیال آتا ہے۔

(کتے کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی ایک جوان لاابالی شخص ظاہر ہوتا ہے۔ وہ بھڑکیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہے اور اسکے داہنے کان سے بالی لٹک رہی ہے۔ وہ بنچ پر بوڑھے کے سامنے بیٹھ کر اسکی آنکھوں میں تاکتا ہے۔)

چور کیا خیال ہے؟

بوڑھا (جیب سے نسوار کی ڈبیا نکال کر) دور بیٹھو۔ تمہارے بدن سے مہک آتی ہے۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ ^{2} ان)

(وہی پیڑ، وہی بنچ۔

وقت غروب آفتاب سے قبل)۔

(بوڑھا بنچ کی پشت سے سر ٹکائے گہری نیند سو رہا ہے، مگر وہ خراٹے نہیں لیتا۔ اس کا عصا پیڑ کی ایک نیچی ٹہنی سے لٹک رہا ہے۔ نابینا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ٹٹولتے ہوئے بنچ کی موجودگی کا پتہ چلاتا ہے، جھک کر کتے کی زنجیر کو اس کے ہتھے سے باندھ دیتا ہے۔ نابینا تھوڑی دیر خاموش رہتا ہے، پھر بنچ پر بیٹھ کر ٹٹولتا ہے۔ اس کا ہاتھ بوڑھے کے جسم پر ٹھہر جاتا ہے۔ ہاتھ کھینچ کر)

نابینا . سوری! یہ جاننے کے لئے کہ تم یہاں ہو میرا ایسا کرنا ضروری تھا۔ تم تو جانتے ہو میں اندھا ہوں۔ (جواب نہ ملنے پر کچھ سوچتا ہے۔ پھر سے بوڑھے کو چھوتا ہے)۔ تمہیں میرا چھونا ناگوار گذرا؟ (بوڑھا سوتا رہتا ہے۔ یکایک نابینا کے اندر ایک ڈر بجلی کی طرح کوند جاتا ہے۔ وہ بوڑھے کو دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑنے لگتا ہے)۔ تم زندہ تو ہو، جواب کیوں نہیں دیتے۔ میرے خدا کیا یہ بھی ہونا تھا۔

بوڑھا (جاگ کر بیٹھ جاتا ہے۔ جیب سے رومال نکال کر چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو صاف کرتا ہے)۔ معاف کرنا، مجھے نیند آگئی تھی بوڑھا ہوں نا۔ بے وقت سونے لگتا ہوں۔ اور جب سونے کا وقت ہوتا ہے، میرا مطلب رات کو تو نیند کا کوسوں تک پتہ نہیں ہوتا۔

نابینا : اور میں سمجھا کہ —— پھر تو برا ہوا۔ مجھے اس طرح تمہیں جھنجھوڑنا نہیں چاہئے تھا۔

بوڑھا : کوئی بات نہیں۔ جب تم اس عمر کو پہنچو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ جاگنے اور سونے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

(ایک لمبی اکتا دینے والی خاموشی۔ پارک کا مالی کنجی اٹھائے ظاہر ہوتا ہے)۔

مالی . پارک بند ہونے والا ہے۔ آپ لوگ باہر چلیں۔

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ ^{3} ان)

(وہی پیڑ، وہی بنچ)

(وقت۔ سہ پہر)

(کتا بنچ پر سو رہا ہے۔ بوڑھا اس کے بغل میں بیٹھا ہے۔ اندھا کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ اندھا ظاہر ہوتا ہے)

بوڑھا : بنچ پر ہم لوگ ہیں۔ میرا مطلب میں اور تمہارا کتا۔

نابینا : میں اسے سلا کر اس کے لئے بسکٹ لانے گیا تھا۔ اسے ہلکا سا

بخار ہے۔ شاید وہ بھوکا بھی ہے۔

بوڑھا : مجھے حیرت ہے۔ تم کیسے پتہ چلا لیتے ہو کہ رونق بھوکا ہے؟

نابینا : شکریہ! تمہیں اس کا نام یاد ہے۔ اگر رونق جاگ رہا ہوتا تو اپنا نام سن کر ممنونیت سے دم ہلاتا۔ (کتے کو سہلاتا ہے)۔ اسے جگانا ضروری ہے دیکھو، بسکٹ کی مہک سے کتنی جلد اٹھ بیٹھتا ہے۔

بوڑھا : لاؤ یہ بسکٹ میں رونق کو کھلاتا ہوں۔

نابینا : دیکھو دیکھو وہ ضرور اپنی دم ہلا رہا ہوگا۔ (بسکٹ اسے دیتا ہے۔ بوڑھا کتے کو بسکٹ کھلاتے کھلاتے دور کھڑے کسی شخص کو بلاتا ہے۔ چور اپنے مخصوص کپڑوں اور کان کی بالی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ بوڑھا اسے بسکٹ اور کتے کی زنجیر تھما دیتا۔ وہ کتے کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے)۔ وہ بسکٹ کھا رہا ہے نا۔ آواز نہیں آتی۔ شاید میں نے کسی کے پیروں کی چاپ سنی ہے۔

بوڑھا : وہ میری تھی۔ میں نے رونق کو سامنے کے پیڑ سے باندھ دیا ہے۔ وہ وہاں بیٹھا پیڑ کی خوشبودار چھاؤں میں آرام سے تمہارا دیا ہوا بسکٹ کھا رہا ہے۔ بڑا پیارا کتا ہے۔

نابینا : رونق میرا چوتھا کتا ہے۔ اس سے پہلے میں تین کتے کھو چکا ہوں۔ ایک تو یوں ہی چلتا بنا تھا۔ ایک کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ کوئی اٹھا لے گیا۔ تیسرا بیل گاڑی کے نیچے اپنی دُم گنوا بیٹھا۔ پھر تو مجھے اسے ساتھ لے کر گھومنے کی عادت ترک کرنی پڑی۔ اس کے سبب لوگ مجھ پر ہنسا کرتے تھے۔

بوڑھا : تم نے اسکا کیا کیا؟

نابینا : میں اُسے ہوگلی ندی کے گھاٹ پر چھوڑ آیا۔ کئی دن تک مجھے ندامت کا احساس تو رہا۔ پھر میں اسے بھولتا گیا۔ انسان اوپر سے ملائم دکھائی دیتا ہے۔ مگر اندر سے بڑا سخت ہوتا ہے۔ (بوڑھا دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھسک لیتا ہے یہاں تک کہ اندھے کا مکالمہ ایک لمبی خود کلامی میں بدل جاتا ہے) تمہیں بتاؤں، گزشتہ بیس برس سے اندھا ہوتے ہوئے بھی اس شہر کو میں جتنا جانتا ہوں تم نہیں جان سکتے۔ میرا ایک کامریڈ دوست ہے، یا یوں کہو کہ تھا۔ کبھی بڑے اونچے خیالات تھے اسکے۔ ان دنوں وہ صرف اپنی پارٹی کا ایک دلال بن کر رہ گیا ہے۔ میرا ایک پڑوسی تھا جو اکثر تبلیغ کے لئے میرے سر پر آدھمکتا تھا۔ لیکن یقین مانو جتنا وہ دنیا پرست تھا اور دولت کی جتنی ہوس اس کے اندر تھی اتنی میں نے اور کسی کے اندر نہیں دیکھی۔ میرا ایک چھوٹا بھائی تھا جو بمبئی کے فساد میں لاپتہ ہو گیا۔ میری ماں یہ سمجھتی ہے کہ وہ گلف ممالک میں کہیں ملازمت کر رہا ہے۔ (خاموش ہو جاتا ہے۔ گہری سوچ میں ڈوب کر)۔ یہ ملک دن بدن ایک جیل میں بدلتا جا رہا ہے۔ تمہیں سلاخیں دکھائی نہیں دیتی ہونگی مگر میں اندھا ہوں نا اس لئے انہیں صاف دیکھ سکتا ہوں۔ پہلے شہر میں اتنی کثافت کہاں تھی۔ اب تو ہر وقت نتھنوں میں جلتے ٹائر کی بدبو سی آتی رہتی ہے۔ جو مجھے دوسری جنگ عظیم کی یاد دلاتی ہے۔ میرا خیال ہے آدمیوں کا جلنا اس سے کچھ الگ نہ ہوتا ہوگا۔ سچ پوچھو تو میں اندھا ہوتے ہوئے بھی کتنا پریشان ہوں۔ تم آنکھ والوں کے لئے تو کچھ زیادہ ہی پریشانیاں ہوتی ہونگی۔ آزادی کب ملک میں آئی میرے لئے تو وہ کلینڈر میں ایک ہندسے سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتی جو دوسرے ہندسوں کی طرح بار بار لوٹ آتا ہوگا۔ مگر میں غلامی کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ آج ہر کوئی ہر کسی کو زیر کرنے میں مصروف ہے۔ اور اسکے سو ہزار بہانے ہیں۔ طاقتور کمزور کو زیر کر رہا ہے۔ مگر جب طاقت کمزور کے ہاتھ میں آتی ہے تو وہ ظلم کی کہانی زیادہ شدت کے ساتھ دہرانا شروع کر دیتا ہے۔ میں تمہیں اس وقت ایک پادری کی طرح لگ رہا ہونگا جو ایک اونچے منبر پر کھڑا قیامت کی پیشنگوئی کر رہا ہو۔ ذاتی طور پر میں کسی چیز میں یقین نہیں رکھتا۔ اچھا چلو، یہ سچ سہی، مگر اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے بھلا۔ تم سن رہے ہو نہ میری باتیں۔ ویسے نہ بھی سنو تو اس سے کیا۔ بولنے والے تو بہت ہو گئے ہیں مگر باتیں سب ایک کرتے ہیں اور جب ایک بات کو بار بار دہراؤ اسکی اہمیت یا تو ختم ہو جاتی ہے یا وہ ایک نئی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ تو میں شروع میں بتا رہا تھا کہ یہ ملک دن بدن ایک جیل میں بدلتا جا رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری قید کی معیاد میں موت تک کی توسیع کر دی گئی ہے۔ رہا جیل تو اس کے لئے لوہے کی سلاخوں یا اونچی اونچی فصیلوں کی کیا ضرورت ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہم اس کائنات کو پیمانہ بنا کر شروع کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم اس زمین پر قید ہیں۔ چوہے دان ہے یہ ہمارا۔ ہم اپنی بلند پروازیوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس چوہے دان میں لوٹ آتے ہیں۔ لیکن اس زمین کی حدود میں بھی ہماری آزادی مکمل نہیں۔ ہمیں اپنی نقل و حرکت کے لئے ایک چھوٹا خانہ عطا ہوتا

خاکستری سطح کے سہارے ابھر رہی تھی، ڈوب رہی تھی۔

"زندگی کبھی صحیح ڈھنگ سے نہیں گذرتی"۔ دینا تھ نے کہا۔

"ہمیں زندگی کے کسی دوسرے ڈھنگ کا پتہ بھی تو نہیں"۔ متین بولا۔ "اور واقعہ یہ ہے کہ ہم دونوں کے ایک ہی رائے پر آجانے نے معاملے کو اور بھی بور اور بے معنی بنادیا ہے"۔

"مسائل جہاں کے تہاں کھڑے ہیں"۔ دینا تھ نے اپنی بات دہرائی۔ "ہم کچھ بھی چاہیں، مسائل نئی شکلیں اختیار نہیں کر سکتے"۔

"پھر بھی کچھ تو بدل رہا ہے۔ اگر ہم ایک ماہ کے بعد ملیں تو پتہ چلے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہماری ملاقات روز ہو جاتی ہے"۔

"ایک ماہ کی بصیرت!" دینا تھ ہنسا۔ "اچھا تو یہ بھی کر گذرتے ہیں"۔

اور وقت گزرتا رہا۔ وقت جس کے پہیے لگے ہوتے ہیں اور جو ہمیشہ ڈھلوان کی طرف بھاگتا ہے۔ وقت جسکے پر ہوتے ہیں اور وہ آسمانوں سے رشتہ قائم کرتا ہے۔ ہم نے تو ساعتوں اور صدیوں میں وقت بانٹا ہے۔ لیکن وقت تو صرف حافظے کا نام ہے یا پھر وہ بھی نہیں۔ اور اب انسان نے ایک نیا المیہ دریافت کیا ہے کہ وہ اپنے حافظے سے فرار حاصل نہیں کر سکتا اور وہ اگر اس سے عارضی طور پر فرار حاصل کر بھی لیتا ہے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ آدھمکتا ہے۔ رہا پاگل پن! تو یہ تو بجائے خود ایک مرض ہے کوئی علاج نہیں۔ آہ! زندگی کی پہلی سانسوں کی گرمی قضا کی آخری ساعت تک جسم کے ساتھ چپکی رہتی ہے۔ حافظہ جس نے گلاب اور سڑے ہوئے چوہے کو ایک ہی خانے میں ڈال رکھا ہے انہیں گڈمڈ کر دیا ہے۔

ایک بار پھر آج چوٹی سنسان پڑی ہے۔ دونوں نے آفس کے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا تھا اور آفس کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی نکل آئے تھے۔ (کیا زندگی بھر وہ یہ کرتے نہیں آئے تھے؟)

دو لانچ پشتے سے لگ کر واپس جا چلے تھے۔ ان میں سے ایک تو اب بھی دریائے وسط پر بالکل غیر متحرک نظر آرہا تھا۔

دونوں خاموش کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا بات کی ابتدا پوری بات کو ختم کر ڈالے گی اور اس سے وہ خوفزدہ تھے۔ آخر متین نے پہل کی۔

"اس ماہ میرے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا"۔

"اور میرے ساتھ بھی نہیں۔ جو اپنے آپ ایک بڑا واقعہ ہے"۔

"یوں ہونے کو تو بہت کچھ ہوا۔ مگر اندر کا سناٹا جوں کا توں قائم رہا"۔

دینا تھ نے سر اٹھا کر متین کی آنکھوں میں دیکھا۔

"دنیا اپنی موجودہ صورت میں ہمارے کسی کام کی نہیں"۔ وہ بولا۔

"تو اب ایک ہی راستہ جاتا ہے"

"کوئی بھی راستہ جس پر چل کر ہمیں اپنا یروشلم دکھائی دے"۔

"اس کے لئے ہمیں نئے سرے سے اس شہر کی منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔ خود ہمیں اپنے آپ کو کسی جراب کی مانند پلٹنا ہوگا"۔

دونوں کی آنکھیں ملیں اور مشینی انداز میں وہ اس نئے عمل میں مصروف ہو گئے جیسے ان کے پاس مزید غور و فکر کے لئے سکت نہ رہ گئی ہو۔

انہوں نے سب سے پہلے ہاوڑہ پل کو اسکے دونوں ٹاور اور اینکر کے ساتھ اکھاڑ کر دریا میں غرق کر دیا۔ اور تمام لانچ، بجرے اور بادبانی وذخانی کشتیاں پل کے آہنی جال میں مچھلیوں کی طرح الجھ کر رہ گئے۔ انھوں نے دونوں طرف کے اڑان پلوں کا رخ آسمان کی طرف موڑ دیا اور پہیوں والی مختلف الشکل گاڑیاں آسمان سے گرتی دکھائی دیں، خلاء میں رکتی نظر آئیں۔ انہوں نے شاہراہوں پر چلنے والے تمام راہگیروں کو سر کے بل پلٹ دیا اور وہ اپنے ہاتھوں کے بل چل کر ٹانگوں کو "V" (وکٹوری) کی علامت میں اٹھائے ہوئے نظر آنے لگے۔ انہوں نے ٹرام کی پٹریوں کو اکھاڑ کر ٹریفک کانسٹبل کے سروں پر نصب کر دیا۔ اب ٹرام گاڑیاں پٹریوں کے باہر دوڑ رہی تھیں، اپنے خوانچوں اور ٹھیلوں میں بیٹھے خود بک رہے تھے، طوائفیں گاہک خرید رہی تھیں، کتوں کی دمیں سیدھی تھیں، ٹیلیفون رسیور میں جانور بول رہے تھے، سورج میدان کے بیچوں بیچ زمین کو فحش انداز میں چیر کر اندر جا رہا تھا، رستوران کے اندر طشت پر انسانی ہونٹ اور زبانیں سرد ہو رہے تھے، لنگڑے بھکاری نے اپنی بیساکھی کے سارے آسمان کو زمین پر گرنے سے روک رکھا تھا، ٹی وی کے آسمان سے پرندے کمرے کے اندر آرہے تھے، عمارتوں کی منزلیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر فضا میں جھول رہی تھیں، لفٹ میں پھنسے ہوئے لوگ امن عالم کا گیت گا رہے تھے۔ وکٹوریہ میموریل کے گنبد پر بیٹھی بگل بردار پری اپنے قدو قامت میں وکٹوریا میموریل کی عمارت سے دگنی ہو گئی تھی، شہر کی پوری آبادی میٹرو کی زمیں دوز دنیا سے دہائی دے رہی تھی، ایڈن گارڈن کا اسٹیڈیم آسمان سے لٹک رہا تھا جس کی گیلیریز سے کافی کے کاغذی پیالے، کیلے اور سنتروں کے چھلکے، سڑے گلے اخبار، مڑے تڑے کاغذ ان آئی شیڈ، ماسک اور بوتلیں نیچے گر رہے تھے۔ رائٹرس بلڈنگز کی چوٹی پر لہراتے قومی جھنڈے کو ایک کبڑے نے بلند کر رکھا تھا جسکا بے ہنگم جوش ایک طاقتور بلب کی مانند روشن تھا اور راج بھون کے پھاٹک پر کھڑے پتھر کے شیر گرج رہے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کے سہارے کھڑے، ایک دوسرے سے کندھا لگائے مسکرا رہے تھے۔ یا شاید انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

"آخرکار ہمارا یروشلم ہمیں مل ہی گیا۔ ہمیں نئے سرے سے اسکی مرمت کرنی چاہئے، اس کے گرد حفاظتی دستے قائم کرنے چاہئے"۔

انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر آنکھوں کے گڑھے خالی تھے۔

دونوں کی پتلیاں چوبی فرش پر گر کر چور چور ہو گئی تھیں۔

ڈرامہ

ایک اندھے کا مکالمہ

کردار : ایک بوڑھا، ایک نابینا، ایک چور، ایک مالی، ایک سب انسپکٹر، ایک کانسٹبل، ایک کتا۔

(مقام-ایک پبلک پارک)

(وقت-دوپہر)

(پردہ اٹھتے ہی پارک کے اندر ایک پیڑ کے نیچے لکڑی کی ایک بنچ دکھائی دیتی ہے جسکے ایک سرے پر ایک ادھیڑ عمر کا نابینا شخص قیمتی لباس پہنے تاریک عینک لگائے ہوئے کتے کی زنجیر تھامے بیٹھا ہے۔ شخص جو کافی عمر دراز ہے اور معمولی کپڑے پہنے ہوئے ہے بنچ کے دوسرے سرے پر بیٹھا اپنے عصا کے دستے پر ٹھوڑی ٹکائے اندھے کی طرف تاک رہا ہے)۔

بوڑھا . آپ کو کتا پالنے کا شوق ہے؟

نابینا : نہیں، یہ کتا میری مجبوری ہے۔ میں اندھا ہوں اور اسکی رہنمائی کے بغیر چل نہیں سکتا۔

بوڑھا : تب تو اسے کافی ٹریننگ دینی پڑی ہوگی!

نابینا . میں نے اسے ایک پٹ شاپ سے خریدا ہے جسنے اسی مقصد کے لئے اسے خاص طور پر ٹرینڈ کیا ہوا ہے۔

بوڑھا : لگتا ہے کتا آپ کو پسند کرتا ہے۔ وہ کتنی خاموشی سے بیٹھا ہے۔

نابینا : مجھے نہیں معلوم۔ مگر کبھی کبھار مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ جانور کا دماغ۔ کون جانے وہ کسی دن مجھے کسی بس کے نیچے لے جائے۔

بوڑھا : (نفی میں سر ہلاتا ہے) ممکن نہیں۔ کتا ایک وفادار جانور ہے۔ اور پھر وہ خود مرنا ہرگز نہ چاہے گا۔

نابینا : کیا پتہ۔ یہ یقین سے کہا تو نہیں جا سکتا کہ جانور خودکشی نہیں کرتے۔

بوڑھا : اگر اسے پیٹ بھر کھانا ملے اور دم ہلانے کے لئے ایک مالک

نابینا اور وقت گزاری کیلئے ایک کتیا۔ (ہنستا ہے) اور اسی کا مسئلہ ہے۔ اسی لئے میں ڈرتا ہوں۔ ویل مجھے یاد آیا (بوڑھے کی طرف مڑ کر پوری توجہ کے ساتھ) آپکے پاس کوئی کتیا ہے؟

بوڑھا (ناخوشگواری سے) میں جانور نہیں پالتا۔ خاص طور پر اس مقصد کیلئے۔

نابینا : تو ایسا کوئی دوست جسکے پاس کوئی کتیا ہو؟

بورھا : میرے پاس ایسا کوئی دوست نہیں۔ (سامنے کی طرف جھک کر) اچھا تم اس پٹ شاپ سے، میرا مطلب جہاں سے یہ کتا لائے ہو، ایک کتیا بھی تو خرید سکتے تھے؟

نابینا : میں نے سوچا تھا۔ پھر میں نے سوچا، فرض کرلو ان دونوں نے اپنا پریوار لگا لیا تو۔

بوڑھا : تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہفتہ میں ایک دن اسے آزاد چھوڑ دو۔ شہر کے گلی کوچوں میں اسے پارٹنر ڈھونڈنے میں کیا دقت ہوگی۔ یوں بھی اسے ہفتے میں ایک دن چھٹی تو ملنی ہی چاہئے۔

نابینا : نا بابا۔ میں اسے کسی گندی بیماری کا شکار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ رہا چھٹی کا، تو زیادہ تر میں بیمار رہتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے جب میں اپنی زندگی اور موت سے لڑائی لڑتا ہوں تو یہ بیٹھا میرے لئے آہیں بھرتا ہے؟

بوڑھا : میں نہیں جانتا، میں تو تمہارے کتے کو آج ہی دیکھ رہا ہوں۔ کیا تم جنم سے اندھے ہو؟

نابینا : نہیں۔ پہلے سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ پھر ایک دن اوپر والے نے کچھ اور ہی فیصلہ کیا۔ میری صرف ایک آنکھ روشن تھی۔ اسکی نسیں دھیرے دھیرے سوکھ گئیں۔ آج کل اس طرح سے زیادہ اندھے ہو رہے ہیں۔

بوڑھا . تم کافی امیر لگتے ہو۔ تم نے نئی آنکھ کیوں نہیں لگوائی؟

نابینا . شروع شروع میں گھر والوں نے مجھ سے اصرار بھی کیا تھا۔ مگر پھر بھی دھیرے دھیرے مجھے اس اندھے پن کی عادت پڑ گئی۔ میرے خیال میں اندھے کو مرنے پر کچھ زیادہ کھونا نہیں پڑتا۔ کچھ آواز اور احساسات کے علاوہ باقی دنیا کو وہ کھو ہی چکا ہوتا ہے۔ پھر اس پانے اور کھونے کے عمل کو پھر سے کیوں دہرایا جائے اور پیدائشی اندھے تو بالکل ہی نہیں کھوتے۔

بوڑھا : کیا نام رکھا ہے؟

نابینا : اپنا؟

بوڑھا : نہیں، کتے کا۔ میں نے ایسا کوئی پالتو کتا نہیں دیکھا جسے نام نہیں دیا گیا ہو۔

نابینا میں نے اپنے کتے کو کوئی نام دیا ہے۔

بوڑھا : پھر اسے کیسے پکارتے ہو؟

نابینا : رونق بول کر۔

بوڑھا . یہ بھی ایک نام ہے۔

کہانی

پـــــتِ، دید

معمول کے مطابق ہاوڑہ پل اسکی عینک کے شیشوں سے چپک جاتا۔

"بڑا بھیانک پل ہے، پل صراط سے بھی زیادہ نا قابل اعتبار، مگر ناگزیر"۔ متین نے اپنی عینک کی سطح ہاوڑہ پل کو الگ کر کے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ رکھ کر اس کا جائزہ لیا، قبل اس کے اسے واپس اسکی جگہ پر رکھ دے۔ وہ دیناتھ کے ساتھ ہر شام رائٹرس بلڈنگ سے بابو گھاٹ لانچ پکڑنے کے لئے آتا۔ آج پشتے پر بھیڑ کم تھی اور ہوا تیز۔ دیناتھ پشتے پر ریلنگ سے لگا کھڑا تھا۔ ہوا سے اس کے کپڑے اندر سے پھول گئے تھے۔ بلکہ یہ ہوا تو اسے بھی اب غبارے کی طرح بھرتی جارہی تھی۔ کیا ہمارے خیالات ہمارے اندر اسی طرح ہوا بھرنا شروع نہیں کر دیتے یہاں تک کہ ہم ان کے دباؤ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے نظر آنے والے ٹکڑوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔

"شکر ہے بھگوان!" دیناتھ نے داہنی آنکھ پر آئے ہوئے پسینہ کے واحد قطرے کو دونوں پپوٹوں کے درمیان مسلتے ہوئے کہا۔ "دن تو کسی طور نکل جاتا ہے۔ مگر یہ کلکتہ تو ببول کا پیڑ ہے ببول کا پیڑ، تم جتنی بھی احتیاط کے ساتھ اس سے علیحدہ ہونے کی کوشش کرو، کہیں نہ کہیں خراش پڑ ہی جاتی ہے"۔

"خراش!" متین ہنسا۔ وہ عینک ناک پر ٹکا چکا تھا۔ "یہ شہر تو اتنی ساری خراشیں میری عینک پر ڈال چکا ہے کہ اب ہر چیز مجھے کرچیوں میں منقسم نظر آتی ہے"۔

لانچ آیا۔ مسافر اترے۔ مسافر چڑھے۔ لانچ کے اندر دونوں ریلنگ کے پاس کھڑے رہے جس کے نیچے رنگین ٹیوب جھول رہے تھے۔ دریا پار انگریزوں کے زمانے کے گودام گھر مفتوح سے کھڑے تھے۔ دور بندرگاہ کی طرف دیس بدیس کے جہاز اپنے جھنڈوں کے ساتھ گویا پانی پر فراموش کر دیئے گئے تھے۔ ہگلی ندی کا گدلا پانی لانچ کے نیچے سے یوں ابل رہا تھا جیسے وہ لانچ کو اسکے مسافروں سمیت آسمان کی طرف ڈھکیلنا چاہتا ہو۔ دیناتھ نے دیکھا، متین اپنی ہتھیلیوں سے کچھ الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی غیر مرئی چیز جسے متین کے علاوہ کوئی دیکھ نہ پارہا تھا۔

دیناتھ نے پانی کی بوتل، ٹفن کے ڈبے، بنگلہ ناول اور انگریزی اخبار والی رکسن کی تھیلی کو اپنے داہنے کندھے سے بائیں کندھے پر منتقل کرتے ہوئے متین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "ریلنگ کو میں اپنی ہتھیلی سے چھڑا رہا ہوں"۔ متین نے اس کے سوال کی آہٹ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ کنارا لگنے پر ریلنگ کا اچھا خاصہ میری ہتھیلی پر رہ جاتا ہے۔ بلکہ اکثر تو میں دوسری صبح اس ریلنگ کو تھامے ہوئے ہی جاگتا ہوں"۔

دیناتھ نے بھی اپنی داہنی ہتھیلی پر نظر ڈالی۔ وہاں ریلنگ تو موجود نہ تھا مگر اسکے کی لکیریں کچھوؤں کی طرح رینگ رینگ کر اس کی ہتھیلیوں، انگلیوں کی پوروں سے باہر لٹک رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر مٹھی بھرلی، مگر اس کے کھلے احساس سے بھاگ نہ سکا جو دیر تک اس کے اندر کچھوے پیدا کرتے رہے۔ لانچ کنارے لگا اور لوگوں کو اٹھا کر چل پڑا۔ انسانی بھیڑ کے سمندر سے گذر کر دونوں ہاوڑہ اسٹیشن کے مخصوص پلیٹ فارم پر آئے اور بردوان لوکل انہیں اٹھا کر کلکتہ سے دور لے گئی۔

دوسرے دن کا آفس۔

تھوڑی دیر کیلئے کام بند۔ دفتر کا سارا عملہ وسیع راہداری میں مجتمع تھا جہاں یونین کا ایک نیتا دھواں دھار تقریر کر رہا تھا۔ الفاظ، الفاظ، الفاظ۔ دیناتھ تقریر کے خاتمہ کے بعد اپنی میز پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ الفاظ کی چنگاریوں نے اسکے دونوں کان گرم کر دئے تھے۔ اس نے دراز باہر کھینچ کر ڈبے سے ایک جیمس کلپ نکال کر اسکا یو والا سرا سیدھا کیا اور اسکے وی والے سرے سے کانوں کو کریدنے لگا۔ الفاظ اس کے کانوں سے نکل نکل کر میز پر، قلم دان پر کیڑے مکوڑوں کی طرح گرنے لگے، کلبلانے لگے۔ الفاظ جو ننگے تھے، خوبصورت تھے، کھیسیں نکال کر نہیں رہے تھے، ریح خارج کر رہے تھے، الفاظ جن کی شریانوں میں ابکائی بھری تھی، جنکی شرمگاہوں سے گھنے بال اگ آئے تھے، جن کے کوڑھ روز روشن کی طرح عیاں تھے اور جن کے جبڑوں کے درمیان چھپکلیاں پھنسی کلبلا رہی تھیں۔

اس نے جلدی جلدی میز کو صاف کیا اور فائل کھول کر اس میں منہمک ہو گیا۔ مگر وہ کچھ ہی دیر کام میں من لگا پایا تھا کہ اس نے دیکھا الفاظ جو کاغذ پر لکھے جارہے تھے انھوں نے واپس اسکی انگلیوں پر یلغار کرنا شروع کر دیا تھا، بلکہ اب تو یہ اس کی انگلیوں کو چبھنے بھی لگے تھے۔ اس نے قلم پھینک کر ان لفظوں کو واپس کاغذ پر مسلنے کی کوشش کی۔ مگر الفاظ بڑے ڈھیٹ ثابت ہوئے۔ انھوں نے بھونکنا شروع کر دیا اور اسکی انگلیوں میں دانت گڑانے لگے۔ وہ کرسی کو پیچھے کی طرف دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ہتھیلی کو پھیلا کر دیکھنے لگا۔ الفاظ للی پٹ کے بونوں کی طرح اسکی انگلیوں کو رسی سے باندھ رہے تھے، ان پر بھالے چلا رہے تھے، دانت پیوست کر رہے تھے۔ وہ بھاگم بھاگ غلام گردش میں آیا اور غلام گردش سے ٹوئلٹ کے اندر۔ اس نے بیسن کے اندر داھنا ہاتھ ڈال کر فرغل کو گردش دے کر ٹپ کا منھ کھول دیا۔

تیز رفتار پانی سارے الفاظ بہا کر بیسن کے پائپ کے اندر لے گئے

ہاتھ ٹھنڈا پڑا تھا۔ اس میں زندگی کی رمق دھیرے دھیرے واپس لوٹ رہی تھی۔

اس دن اسکے تمام فائل بند رہے۔ یوں بھی کام کرنے کے باوجود ان دنوں سرکاری آفسوں میں کام آگے کب بڑھتا ہے، کہیں نہ کہیں تو فائل کو رکنا ہی پڑتا ہے۔

وقت پر ٹفن کا ڈبہ کھلا۔ بوتل کا پانی پی لیا گیا۔ ناول کے چند صفحات پڑھ لئے گئے، اخبار کا آخری صفحہ تک دیکھ لیا گیا۔

اور جب وہ بابو گھاٹ پہنچا تو متین اسکا منتظر تھا۔ وہ دانت کرید رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ اس نے دیپناتھ کو دیکھتے ہی دور ہاوڑہ پل کی طرف اشارہ کیا۔

"آج میں نے اس سے بدلا لے لیا"۔

"کس سے؟" دیپناتھ شاید اس کے اشارے کو سمجھ نہیں پایا

"اس پل سے"۔

"وہ کیسے۔ اور مبارک ہو"۔

"وہ ایسے کہ عینک توڑ ڈالی۔ گرچہ اسے توڑنے میں ایک راہگیر نے میرا ساتھ دیا جو زیبرا کراسنگ پر مجھ سے ٹکرا گیا۔ اوہ، تم اسکے چہرے سے ٹپکتی ہوئی ندامت کو دیکھتے۔ مگر کچھ بھی ہو، یہ پل اب ختم ہو چکا ہے۔ اب جو دیکھ رہے ہو وہ کچھ بھی نہیں ہے صرف یہ تمہاری عادت ہے کہ یہ ہاوڑہ پل تمہیں دکھائی دے رہا ہے، اس ستارے کی مانند جسے فنا ہوئے اربوں برس بیت چکے ہیں مگر جو اپنی روشنی کی مسافت کے سبب ہمیں دکھائی دیتا رہتا ہے"۔

"اور اس پر چلنے والے راہگیر، اور دوڑتی ہوئی گاڑیاں، بس، ٹرام اور ٹیکر؟ تم انہیں کیا کہو گے؟"

"سب ہوا میں معلق ہیں۔ میرا یہ چیلنج تم دیواروں پر لکھ سکتے ہو کیونکہ عوام کے پاس اب مطالعے کے نام پر صرف دیواریں ہی رہ گئی ہیں۔ میں بردوان کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں گرچہ اب ہماری زمینداری رہی نہیں مگر میری پشت میں تمام کے تمام حاجی گزرے ہیں اور یہ وہ لوگ تھے جو سال کے زیادہ تر حصے تبلیغی جماعتوں کے ساتھ گذارا کرتے تھے۔ تم دیکھ رہے ہو۔ میں جھوٹ نہیں کہتا"۔

"اور تم دانت کیوں کرید رہے ہو؟"

"بلا وجہ۔ بسا اوقات اس عمل سے ہماری لاعلمی میں بڑے بڑے نفسیاتی مسائل حل ہو جاتے ہیں"۔

دیپناتھ لانچ کے اندر ایک بنچ پر بیٹھا رہا۔ متین ریلنگ کے سامنے کھڑا رہا اور ہاوڑہ پل کی طرف تاک رہا تھا۔ عینک نہ ہونے کے سبب اسکی آنکھوں کو تکلیف پہنچ رہی تھی۔ بوبازار اسٹریٹ جاکر نئی عینک بنوانی ہی ہوگی۔ زندگی بھی کبھی کبھار کتنی بے مقصد، بے معنی ہو جاتی ہے۔ جیسے مباشرت کے بعد کی مباشرت جسے آپ اخلاقی فرض سے یا انصاف پسندی کے جذبے سے متاثر ہو کر ادا کرتے ہیں۔

متین ایک سیکشن آفیسر ہے، ایک نچلے درجے کا افسر جو برسوں تک سرکاری کرسیاں سیاہ کرنے کے بعد اس مقام تک پہنچا ہے۔ کچھ عرصے سے اسکا آفس راج بھون کے احاطے میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں لان میں ابتک پھول پودوں کی قطاریں زندہ ہیں، بڑے بڑے دروازوں اور قد آدم دریچوں پر کہنہ و بے رنگ چق پڑی ہیں اور گاتھی طرز کے ستونوں نے زمین کی کوکھ سے گویا ہاتھ نکال کر از منۂ وسطیٰ کے طرز کی محرابی چھتوں کو سنبھال رکھا ہے۔ متین اپنی میز کے سامنے بیٹھا کھلی ہوئی کھڑکی کے پار پودوں کی قطاروں میں پھولوں کے دھبوں کو تیرتے دیکھتا رہتا ہے۔ خود اسکی آنکھوں میں ایک رقیق سا مادہ تیر رہا ہے جو بار بار رومال سے صاف کرنے کے باوجود اپنی جگہ موجود ملتا ہے۔ عینک ٹھیک نہیں آئی ہے۔ اُسے پھر سے جانچ کروانی ہوگی۔ مگر پھول آخر پھول ہیں، یہ کسی کی بینائی کے محتاج نہیں۔ کچھ عجیب نہیں اگر کبھی یہ پھول اس کے نتھنوں سے رینگ کر باہر نکل آتے ہیں جنکی مہک سے اسکے منجمد احساسات کی برف پگھلنے لگتی ہے۔ زندگی کا، زندہ رہنے کا اتنا شدید احساس اسے اور کبھی نہیں ہوتا۔ مگر وہ مڑ کر جب الماری کھول کر کسی فائل کو نکالتا ہے تو یہ پھول اس کے نتھنوں سے واپس ناک کے اندر سما جاتے ہیں اور مردہ چوہے جو لکڑی کی طرح سخت ہوتے ہیں، انکی جگہ باہر نکل آتے ہیں۔ وہ انکی سڑاندھ برداشت نہیں کر پاتا۔ وہ ناک پر رومال دبائے اپنی کرسی پشت سے ٹکا، چھت سے لٹکتے بھاری بھرکم دقیانوسی پنکھے کو پوری نصف صدی کی وفاداری کے ساتھ چکر لگاتے دیکھتا رہتا ہے۔

زندگی اسی طرح گذرتی ہے۔ کہیں پر کوئی واقعہ پیش نہیں آتا سوائے اس کے کہ قلم کار کی روشنائی سوکھنے لگتی ہے، کاغذ پیلے پڑنے لگتے ہیں۔ لیکن اب تو الفاظ بھی گویا مقام بدلنے لگے ہیں۔ انہیں اب لغت کی چہار دیواری میں رہنا پسند نہیں۔ بلکہ وہ تو کاغذ کی دنیا سے جلوس کی شکل کسی ایسی کائنات کی طرف نکل پڑتے ہیں جہاں سے انہیں واپس لانا ممکن نہیں ہوتا۔ متین کو الفاظ کی اس بیوفائی کا پتہ ہے۔ ان میں سے بہت سارے الفاظ کو اس نے کلکتہ کی سڑکوں پر چلتے، پارک میں ستاتے یا کسی ہائیڈرنٹ پر نہاتے دیکھا ہے۔ یہ متین کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں اور متین اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے۔ راج بھون کے احاطے میں وہ ایک ناقص رائے کی طرح بھاری بھرکم ستونوں کے درمیان سہما سہما دکھائی دیتا ہے۔ کبھی پھولوں کی کیاری تک نکل جاتا ہے۔ لیکن اکثر اپنے سائے کو سمیٹنے کے لئے اسے پیچھے کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ اس کا سایہ جو آنکھوں کی جگہ دو سوراخ لیے کسی فینس کے مڑے ہوئے زنگ خوردہ کونے سے الجھا اسے پکارتا رہتا ہے، اپنے بھدے کولھے ہلاتا رہتا ہے۔

چوبی پشتے پر بلا کی بھیڑ تھی۔ متین اور دیپناتھ کاغذی چونگوں میں جھال موڑی کھا رہے تھے۔ مرچوں کی جلن سے دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں، لطف سے دوبالا ہو رہی تھیں۔ ہاوڑہ اسٹیشن کی قدیم عمارت دریا کی

کیلئے پال کے گھر کی کنڈی کھنکھنائی۔ پال نے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے چائے پیش کی۔ چائے نوشی کے دوران پال کے آنگن میں رکھی ایک بوڑھی عورت کی مورتی تھی جس کے چہرے کی جھریوں سے ہمدردی، شفقت اور محبت ٹپک رہی تھی۔ مسز شکتی چٹوپادھیائے نے بڑی تعریف کی اور مورتی کے بالکل قریب جاکر اسے فن کاری کا نادر نمونہ قرار دیتے ہوئے کہا "مسٹر پال واقعی آپ نے مٹی میں روح پھونکنے کا کام کیا ہے"۔

چائے ختم ہوتے ہی کہا "اب درگا پرتیما دکھائیے اور جلد کیجئے لاری لیکر آرہا ہوں۔ ڈائرکٹ درگا استھل جانا ہے"۔ مسٹر پال نے مسکراتے ہوئے کہا "ماں درگا کو دوسری شکل میں آپ کیوں تلاش کر رہے ہیں آپ کے سامنے جو مورتی ہے کیا ماں کی شکل اس سے بہتر ہو سکتی ہے۔ آپ اسے لے جایئے۔ یہی درگا پرتیما ہے مسز شکتی چٹوپادھیائے۔ "اچانک بھڑ گئے اور زوردار لہجے میں کہا "مذاق مت کرو"۔

مسٹر پال نے آہستہ سے کہا "آپ گھبرائیے مت۔ میں مذاق نہیں کررہا ہوں بلا جھجک اسے لے جایئے"۔ شکتی چٹوپادھیائے نے گرجتے ہوئے کہا "یہ کھوسٹ اور بدشکل بڑھیا درگا پرتیما ہے "اور ایک دھکے میں اسے زمین بوس کردیا پھر دروازے سے باہر جاتے ہوئے کہا "بس لو تین دن اور رہ گئے ہیں۔ اب کوئی بھی کمہار آرڈر نہیں لے گا۔ تمہیں ہی بنا کر دینا ہے، اگر نہیں تو پھر یاد رکھنا زندہ بھینٹ چڑھا دوں گا"۔

پال چپ چاپ زمین بوس درگا پرتیما کو دیکھتا رہا اور آنکھوں سے بھاگیرتی بہتی رہی۔ وہ مہینوں کی محنت اور عقیدت سے بنائی درگا پرتیما کی یہ درگت دیکھ کر نہ جانے کن سوچوں میں بھٹکتا رہا۔ بھٹکتے بھٹکتے وہ مانو ٹھکرجی کی اس گلی میں پہنچ گیا جہاں ٹھٹھری ہوئی سردی میں رات گئے ایک بوڑھیا سسکتی رہتی تھی۔ اس رات کو بڑھیا بری طرح کانپ رہی تھی وہ شال اوڑھے چہل قدمی کر رہا تھا۔ اسے ترس آگیا اور اپنی شال بڑھیا کو اوڑھا کر اپنے گھر چلا آیا۔ صبح کو اٹھا تو گلی میں چادر ایک طرف پھینکی ہوئی تھی اور بڑھیا بھی نہیں تھی۔ لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بڑھیا مانو ٹھکرجی کی ماں ہے۔ مانو ٹھکرجی اسے باقی زندگی گزارنے کے لئے شہر کے ایک اولڈ مین ریسٹ ہاؤس میں جانے کو کہہ رہے تھے۔ وہ بڑھیا تیار نہیں ہوئی تو اسے سزا کے طور پر اس نے سردی میں گھر سے باہر کردیا تھا۔ رات کسی نے چادر دے دی اس لئے مانو ٹھکرجی صبح کو بہت غصے میں تھے کہہ رہے تھے "کچھ لوگ میرا گھر خراب کرنا چاہتے ہیں اور گھسیٹ کر بڑھیا کو گھر میں لے گئے اور چادر ایک طرف پھینک دی ہے"۔

پال انہی سوچوں میں گم زمین پر بکھرے مورتی کے ٹکڑوں کو جتن سے یکجا کرنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مٹی کے ٹکڑے نہیں۔ مانو ٹھکرجی کی ماں ہے۔ پھر اس کی بیوی جو پاس ہی کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی اس نے دلاسا دیتے ہوئے سمجھایا۔ جانے بھی دو۔ جو ہوا سو ہوا دوسری پرتیما تیار کردو ورنہ شکتی چٹوپادھیائے واقعی ہم لوگوں کا جینا دوبھر کردے گا۔

پال ایک بچے کی طرح ابل پڑا اور سسک سسک کر کہنے لگا "تم ہی بتاؤ ردپا میں نے کونسی غلطی کی تھی۔ ماں کیسی ہوتی ہے۔ کون سی ماں ہوگی جو اس سے بہتر ہوگی۔ کیا کوئی ماں اپنے بچوں کا دکھ درد بانٹ کر اس قدر تندرست و توانا رہ سکتی ہے جیسا وہ لوگ ماں درگا پرتیما میں دیکھنا چاہتے ہیں"۔ پھر آہستہ سے بڑبڑایا "یہ لوگ صرف عورت کی پرتیما چاہتے ہیں اور میں نے ایک ماں کی پرتیما بنادی تھی۔ ردپا تم ہونہی کھڑی رہو"۔

پال نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ردپا کو ایک ٹک دیکھنے لگا۔ پال کی نگاہیں اس کے خدوخال کا جائزہ لے رہی تھیں اور اس کی سوچ اسکے ذہن کے ابارشن میں مشغول میں مشغول تھی کیوں کہ اسے شکتی چٹوپادھیائے کی درگا پرتیما بنانی تھی۔

نظمیں

لنس زدہ

جلتی بلب کی روشنی میں
آنکھیں خیرہ رہ جاتی ہیں
جو کچھ بھی ہم دیکھتے ہیں
وہ سب بجلی کی آنکھوں سے
بجلی کے غائب ہوتے ہی
ہاتھ میں پتھر
دل میں غصہ
لب پر گالی
سب یوں ساتھ وقوع ہوتے ہیں
جیسے اندھی رات میں تارے
تب محسوس یہ ہوتا ہے
یہ آنکھیں تو لنس زدہ ہیں یا خیراتی
اپنی آنکھیں کھو بیٹھا ہوں!

پوکھرانی بچے

آنگن آنگن چاند ستارے
خوشی کے نغمے گاتے ہیں
جھوم جھوم کر کہتے ہیں
پوکھران کی دھرتی سے
میرے ابو آنگن میں
ایسا سورج لائینگے
جس کی کرنوں میں ہم بچے
جنم جنم تک کھیلیں گے
بچے تو بچے ہوتے ہیں
وہ کیا جانیں
ان کے ابو،
پوکھران کی دھرتی سے
برف کی تھالی ہاتھ میں لے کر
سورج لانے نکلے ہیں!



صدیق عالم

میری پیدائش مغربی بنگال کے ایک دور افتادہ ضلع پورولیا میں ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ (پرولیا ۱۹۵٦ء میں بہار سے بنگال منتقل کیا گیا تھا)۔

میں نے اپنے لکھنے کی شروعات افسانہ نویسی سے کی مگر بہت جلد شاعری اور ڈرامہ کی طرف بھی راغب ہو گیا۔ میرے بہترین ڈراموں میں کبڑا بچہ، جیک اور جل، چار کہار، کائنات ایک خودکار مشین ہیں۔ میری نظمیں ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو چکی ہیں جن میں دو طویل نظمیں "محشرستان" اور "تخلیق کا نوحہ" ہیں۔ میری طالب علمی کے دور میں میرا ایک افسانوی مجموعہ "آخری چھاؤں" شائع ہوا جو اب نایاب ہے۔ ایک منظوم ناول مکمل کر چکا ہوں۔

میرے مشہور افسانوں میں گھاس، مسکراہٹ اور پھول دان، نفرت کا حق، اکٹوپس، کلائڈ سکوپ، آخری چھاؤں، کبھی دو پیرِ فرتوت، بنجامن کا فلیٹ وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان دنوں اسسٹنٹ کمشنر سیلز ٹیکس، (حکومت مغربی بنگال) کے عہدے پر فائز ہوں اور کلکتہ میں اپنی شریک حیات اور دو بچوں کے ساتھ خاموش زندگی گزارنا پسند کرتا ہوں۔

پتہ : 15A, Tarak Dutta Road
Calcutta - 700019
Phone : (033) 240-9973

کالے کوس

دل تو آوارہ صفت اور ست گام فلک
پاؤں رکھوں توز میں رکتی ہے
اور چلتا ہوں تو ہر چیز بکھر جاتی ہے
میں ہی میں ہوتا ہوں جس سمت نظر جاتی
کہیں بادل میں ہیں شب تاب سے تارے گویا
اپنی آنکھوں کے لئے بھی ہو ضروری یہ فریب
کس سمندر سے اٹھاؤں میں گہر دیدہ زیب؟
جس طرف دیکھوں ہے صحرائے بسیط
کارواں ریت کے تودوں میں ہیں مدفون سبھی
آسماں دھول سے لپٹا ہوا محراب کوئی
جس سے گرتے ہیں طلائی سکے
ریت بھی جن سے بکھر جاتی ہے
میں ہی میں ہوتا ہوں جس سمت نظر جاتی ہے

کس نے لمحات کے پیروں میں چڑھائی زنجیر
جیسے مرغابی کوئی سبزۂ آوارہ پر
چھونا چاہے وہ آسماں کو مگر
خواہشیں وقت کی لے جائیں اسے زیرِ آب
اور میں اپنے ارادوں میں اسیر
کتنی چٹانوں سے ٹکراتا ہوں
جاگ کے چلتا ہوں دو چار قدم
اپنے اندر یوں ہی چلتے ہوئے سو جاتا ہوں

دن کے تیور سے ابھرتا ہے سوالوں کا ہجوم
ہم کہ ہیں گردشِ دوراں کے ستائے انساں
اپنے الفاظ میں طاقت وہ کہاں
بس کسی طور یہاں عمر گذاری جائے
ہم سخن کتنے ستارے ہیں فلک میں روشن
اُن کو ہمراز کروں، اُن کے اشارے سمجھوں
اپنی آنکھوں سے ٹپک جاتا ہے جو قطرۂ خوں
اس کو دامن میں سمیٹوں کہ کردوں نذرِ آب
کاش دے پاتے کبھی اپنے سوالوں کے جواب
یوں ہی جیتے تنہا یوں ہی مرتے ہم
اک نئے دن کا خدا بن کے جیا کرتے ہم

ہو یا بلی کا، جسے وہ پیار سے گود میں لیکر ہر شام سیڑھیوں پر گھنٹوں بیٹھی رہتی تھی۔

دوسرا اہم کردار پیٹر کا ہے جو بے روزگار ہو چکا ہے، اسے عورتوں سے چڑ ہے کیونکہ اس کی بیوی عیاش طبع ہے۔ اس لئے پیٹر وقت کا ستایا ہوا اور مظلوم نظر آتا ہے۔ وہ شہر چھوڑ کر جانا چاہتا ہے کیونکہ وہ اپنی بیوی سے بد ظن ہے اس لئے عورتوں کے لئے توہین آمیز الفاظ استعمال کرتا ہے۔ وہ کرب سے کراہ اٹھتا ہے۔

''نہیں گرینی! میں تنہا جا رہا ہوں، آجکل ہماری عورتیں تاش کا پتہ بن گئیں ہیں جو کسی کے ہاتھ چلا جاتا ہے، وہ اسے خوب پھینٹتا ہے، کھیلتا ہے اور جب مڑ تڑ جاتا ہے تو اسے پھینک دیتا ہے اور پھر نیا خرید لیتا ہے''۔

افسانہ نگار نے ان جملوں کی آڑ میں زندگی کی حقیقت کو بڑی صفائی سے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے جو معاشرے کی زبوں حالی اور مغربی طرز زندگی کو بے جا طریقے سے قبول کرنے والوں پر گہرا طنز ہے۔

تیسرا کردار روزی لینڈ کا ہے جو عیاش ہے۔ اسے شوہر کی فکر نہیں۔ وہ اپنی طرز سے زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ تاش، شراب اور مردوں کے ساتھ بیباکانہ گھومنے میں اسے عار نہیں، افسانہ نگار نے ہمارے سماج کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ صحیح معنوں میں نئی نسل بے راہ روی کا شکار نظر آتی ہے جس نے افسانہ نگار کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

آخری اور اہم کردار خود مصنف کا ہے جو اپنے کمرے کی کھڑکی سے ساری باتوں کا معائنہ کرتا ہے اور تمام حقائق اس کے سامنے عریاں ہو جاتے ہیں۔ افسانہ نگار حساس ہے اس لئے وہ متفکر نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے کافی بھی نیم کا رس لگنے لگتی ہے۔

افسانے میں مکالمہ کے ذریعہ کردار کی شخصیت بہت حد تک واضح ہو گئی ہے۔ مکالمے مختصر اور آسان ہیں اس لئے قاری انہیں پڑھکر بوریت کا شکار بھی نہیں ہوتے۔ مکالمہ نگاری کا کمال یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ اپنے کرداروں کی شخصیت پر روشنی ڈالے اور پلاٹ کو آگے بڑھانے میں مدد دے۔ اس بات کی روشنی میں بھی افسانے کے کرداروں کے مکالمے نہ صرف ان کی شخصیت کے اندرونی تصادم کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ پلاٹ کو بھی آگے بڑھانے میں مدد پہنچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی بیوی کے بارے میں پیٹر کے خیالات، اس کے ذہنی تصادم کی عمدہ مثال ہیں۔

''نیم کا رس'' ایک معاشرتی افسانہ ہے جس میں شروع سے آخر تک فسردہ فضا اور ''ہیجان خیز سناٹے'' کا احساس ہوتا ہے۔ افسانہ نگار نے ایسے حالات کو قلم بند کیا ہے جو کسی بھی عام آدمی کی زندگی میں رونما ہو سکتے ہیں۔ دراصل یہ وہ حقیقت ہے جس سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں۔

کسی بھی افسانے میں ایک مرکزی کردار کا ہونا لازمی ہوتا ہے جس کے گرد افسانے کا پلاٹ گھومتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ کردار شروع سے ہی افسانے میں نظر آئے بلکہ یہ کہیں سے بھی نمودار ہو سکتا ہے لیکن مرکزی کردار کے سامنے آجانے کے بعد قاری اس کا انجام جاننے کے لئے متجسس نظر آتا ہے اور عام طور پر افسانے کا اختتام مرکزی کردار پر ہی ہوتا ہے لیکن اس افسانے میں ''گرینی'' کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے جبکہ یہ افسانہ، پیٹر کا المیہ ہے اور آخر میں افسانے کا اختتام پیٹر پر ہی ہوتا ہے حالانکہ قارئین کسی اور فہم میں رہتے ہیں۔ یہ دراصل افسانے کی کامیابی کا راز ہے۔

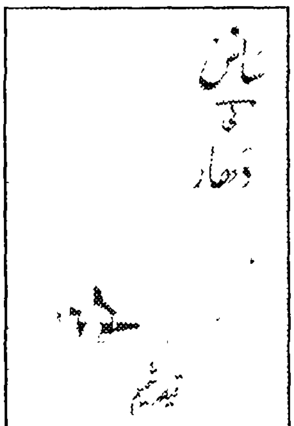
ان باتوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ''نیم کا رس'' جاوید نہال کا ایک بہترین افسانہ ہے۔ انہوں نے ایک ساتھ واحد متکلم اور واحد غائب کی تکنیک کا تجربہ بھی اس افسانے میں کیا ہے۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ ایک افسانے میں بہ یک وقت ایک ہی تکنیک استعمال کی جاتی ہے لیکن جاوید نہال نے ایک ہی افسانے میں دونوں تکنیک کا استعمال کیا اور بہت خوبی سے کیا، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ''نیم کا رس'' ان معنوں میں بھی انکا بہترین افسانہ ہے۔

قیصر شمیم کا مجموعۂ منظومات



''پہاڑ کاٹتے ہوئے''

اور مجموعۂ غزلیات



''سانس کی دھار''



شبیر اصغر

نام : شبیر احمد
ادبی نام : شبیر اصغر
پیدائش : ۴ر فروری ۱۹۶۶ء
ولدیت : اصغر علی
تعلیم : ایم اے، (اردو)
پیشہ : تجارت
تصنیف : الف، افسانوں کا مجموعہ ۱۹۹۹ء
وابستگی : معاون مدیر — ماہنامہ طالب علم، (بچوں کا ماہنامہ ہوڑہ)
موجودہ پتہ : C/O, N. A. R
62, COWIES
GHAT ROAD
SHIBPUR
HOWRAH
711102 (W.B)

افسانہ

ابارشن

(ABORTION)

وہ مٹی گوندھتے گوندھتے سوچ رہا تھا

ماں میں نے کبھی تجھے نہیں دیکھا، ذہن کی ہر بنتی بگڑتی شکل میں تجھے تلاش کرتا رہا ہوں۔ کبھی گمان گزرتا ہے کہ تجھ جیسی مہربان ماں یقیناً اس بہتی ندیا جیسی ہوگی جو نہ جانے کتنی بنجر زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے دل کہتا ہے نہیں، یہ تیری شبیہ نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ جب یہ جڑھتی ہے تو کسی کی تمیز ہی نہیں کر سکتی جب کہ ماں بھی اپنی اولاد کا بُرا نہیں چاہ سکتی ہے۔ ماں تیری ذات تو اس سورج جیسی ہوگی جو بیک وقت سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے مگر نہیں۔ تو سورج جیسی بھی نہیں ہوگی۔ یہ تو اپنی محبت سے جہاں سورج مکھی کو مسکراہٹ دیتا ہے وہیں گلوں کی پنکھڑیوں پر کھلنے والے شبنم کے وجود کو ختم کر دیتا ہے۔ رات کی رانی کو جھلسا دیتا ہے۔ نہیں تو یقیناً ان سب سے بہتر ہوگی، پھر میں مٹی کو حیران کن نظروں سے دیکھنے لگا اور یکایک مٹھی بھر گیلی مٹی اٹھا کر مسکرایا اور بڑبڑانے لگا۔ ''ماں! ممکن ہے کوئی آدمی سونے کے پہاڑ کی قیمت دے دے مگر یہ ناممکن ہے کہ میری مٹھی میں بند اس مٹی کی قیمت دے سکے۔ آج میں اس مٹی سے تیری شبیہ بناؤں گا۔ جو بالکل تیرے جیسی ہوگی۔۔''۔

اتنے میں کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی آنے والا شخص مسٹر شکتی چٹوپادھیائے مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوا اور بولا ''شکریہ مسٹر پال! لگتا ہے کہ آپ میرے آرڈر کا کام شروع کر چکے ہیں' وہ مسکرا کر بولا ''ایسا ہی سمجھئے''۔

مسٹر شکتی چٹوپادھیائے نے مڑتے ہوئے کہا ''آپ اپنے کام میں لگے رہئے اور ہاں مورتی ایسی ہو کہ دیکھنے والا دنگ رہ جائے''۔ اس جملے کو سنتے ہی پال کا ذہن چند لمحے پہلے جس کیفیت میں گم تھا وہ کھو گئی۔ پال کو اچانک وہ دن یاد آگئے جب اسکی شادی کی پہلی سالگرہ سے قبل ہی اس کی بیوی حاملہ ہو گئی تھی۔ اور وہ بار بار مسٹر پال سے کہتی ''تم عجیب آدمی ہو، ابھی شادی کے سال بھی نہیں لگے اور بچہ !لوگ کیا کہیں گے۔ پھر نہ جانے لڑکا ہو گا کہ لڑکی۔ چلو میرا ابارشن کرادو، گھر والوں نے مشورہ دیا کہ پہلے ایمریو چیک کروا لیتے ہیں۔ اگر لڑکا رہا تو حمل رہے گا اور لڑکی رہی تو ابارشن کروا دینا۔ ایمریو چیک میں لڑکی کی رپورٹ آئی اور اسے مجبوراً اپنی بیوی کا ابارشن کروانا پڑا۔ اسے لگا کہ شکتی چٹوپادھیائے نے اس کے ذہن کا ایمریو چیک کر لیا اور ابارشن کر کے چلا گیا۔ اس نے بند مٹھی کو زور سے بھینچا۔ مٹی انگلیوں کے درمیان سے بیچ بیچ باہر نکلنے لگی۔ وہ چونکا اور بڑبڑایا۔ ''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ماں! میرے ذہن میں تیری بنتی ہوئی شبیہ کسی عورت کے رحم میں پلنے والا کیڑا نہیں جسکا اتنی آسانی سے کوئی ابارشن کر دے''۔

وہ مٹھی میں مٹی اکٹھا کرنے لگا اور پھر پوری یکسوئی سے مورتی بنانے میں منہمک ہو گیا۔ مسٹر شکتی چٹوپادھیائے کے کبھی کبھی فون آنے پر کہ کیا میرے آرڈر کا کام ہو رہا ہے وہ اطمینان دلاتا اور پر جوش لہجے میں کہتا۔ ''دیکھئے گا درگا ماں کی ایسی مورتی بناؤں گا جو واقعی ماں ہوگی''۔

وہ دن رات اپنے ذہن پر نقش شبیہ کو مٹی میں ڈھالتا رہا آخر وہ دن بھی آگیا جب مسٹر شکتی چٹوپادھیائے نے پرتما کو درگا استھل پر لے جانے

سایہ دے کر اوروں کو جو جلتی دھوپ میں سوتا ہے
بوڑھا مالی ایسے شجر کا بیج بھلا کیوں بوتا ہے

اسکی آنکھوں تک آ پہنچی چاند کی اک معصوم کرن
اب اسکی بھیگی پلکوں پر نرم اجالا سوتا ہے

ممتا کی آنکھوں نے کتنے خواب سنہرے دیکھ لئے
لیکن وہ معصوم تو اب تک جھولے ہی میں سوتا ہے

دھرتی پر اک پیڑ لگا تو کتنے دعویدار ہوئے
شاخ کسی کی، پھول کسی کا، ثمر کسی کا ہوتا ہے

اک بھوکے مزدور کے دل کو ملتی ہے راحت کیسی
مٹی کی اک گڑیا لے کر جب بچہ خوش ہوتا ہے

اپنے گھر کے بوڑھوں کو اک بوجھ سمجھنے لگتے ہیں
غزلؔ سنا ہے شہروں میں ہی اکثر ایسا ہوتا ہے

ماہئے

واپس نہیں آنا ہے
اک دن ہمیں جانا ہے

دوزخ میں وہ جائیگا
مال یتیموں کا
جو لوٹ کے کھائیگا!

احساس جواں رکھنا
یاد رکھیں لیکن

بچوں کو پڑھانا ہے
رشوت کا زمانہ ہے

کہہ مکرنیاں

جسکی گود میں میں سو جاؤں
چین سے ساری رین بتاؤں
دور رہے جو مجھ سے دن بھر
اے سکھی ساجن؟ نہ سکھی بستر

دشمن سے وہ خوف نہ کھائے
وقت پڑے تو جان لٹائے
سچ پوچھو تو ہے من موجی
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی فوجی

اپنے قد پہ اکڑا جائے
طوفانوں کو منہ نہ لگائے
سخت بہت ہے اسکی فطرت
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی پربت!

میٹھی میٹھی بات کرے وہ
لیکن سب کے کان بھرے وہ
ہو جاتی ہے مجھ سے اَن بن
اے سکھی ساجن؟ نا، ری پڑوسن!

شاعر، ناقد، نثر نگار
دکھتی رگ پہ اسکا وار
اس کے ادب میں کچھ نہیں منفی
اے سکھی کون؟ مظفر حنفی!

نظم

کاش

میں نے دیکھا تو ہے
محفلِ شاعری میں یہی بارہا!!
جب بھی کوئی غزل گنگناتی ہوں میں
اجنبی سی ہزاروں نگاہیں وہیں
دادو تحسین لئے دیکھتی ہیں مجھے!

میں نے دیکھا تو ہے
میرے گفتار کی روشنی سے سدا
کتنے انجان چہرے دمک اٹھتے ہیں
کتنے ہونٹوں پہ نغمے مچل اٹھتے ہیں
لوگ خوش فہمیوں میں ہوں جیسے بہت

کاش میں دیکھتی
وہ نگاہِ کرم جسکی خاطر یہ دل
زندگی بھر یونہی بس مچلتا رہا
چاہ میں جسکی میں شاعرہ بن گئی
غم کا اظہار ہی میرا فن بن گیا

کاش میں دیکھتی
اس کے چہرے پہ بھی اک خوشی کی دمک
اس کے ہونٹوں پہ بھی اک ہنسی کی کھنک!
اس کی باتوں میں بھی چاہ کی اک جھلک
اس کی آنکھوں میں بھی داد کی اک چمک

جاوید نہال کا ایک افسانہ
"نیم کا رس"

مغربی ادب کی جن اصناف نے ادب کے شیدائیوں کو بے حد متاثر کیا ان میں افسانہ نویسی کا فن بھی شامل ہے۔ آہستہ آہستہ یہ فن مقبولیت کی سمت بڑھنے لگا اور آج اردو افسانہ نویسی کی عمر سو برس ہونے کے قریب ہے۔

اردو افسانہ نگار مغرب کی کورانہ تقلید سے گریز کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش میں سر گرداں رہے اور ملکی، سماجی اور مقامی حالات کو افسانے کے قالب میں ڈھالنے کی سعی کرتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقامی ماحول اور کردار کو حتمی طور پر سب سے پہلے پریم چند نے پیش کیا۔ انہوں نے پہلی بار ہندوستانی سماج کی سچی عکاسی کی اور آنے والے افسانہ نگاروں کیلئے ایک نئی راہ متعین کی جس نے ان کے بعد نئے لکھنے والوں کو کافی تعداد میں اپنا ہمسفر بنایا۔ مغربی بنگال کی رہنمائی کرتے ہوئے جاوید نہال بھی نظر آتے ہیں۔

جاوید نہال ۱۹۴۸ء سے افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوئے۔ انکے افسانوں کی تعداد ساٹھ ستر کے قریب پہنچتی ہے لیکن ان کا پہلا افسانہ جس نے انہیں اردو ادب کی دنیا بہ حیثیت افسانہ نگار متعارف کروایا "الگ الگ راستے" کے عنوان سے کلکتہ کے مشہور ہفتہ دار اخبار "اجالا" میں شائع ہوا۔ اسکی اشاعت نے جاوید نہال کے نام کو بطور افسانہ نگار ایک نئی سمت دی اور وہ عمر کی آخری سرحد تک بے تحاشہ اس سمت پر چلتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "پھول رانی" شائع ہوا جن میں شامل افسانوں کا مزاج ترقی پسندانہ تھا جس نے بعد میں تغیرات زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے استعاراتی وعلامتی افسانوں کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اور "پھول رانی" کی لے بیانیہ انداز کے بجائے گنجلک انداز بیانی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ لیکن "ثبات صرف تغیر کو ہے زمانے میں" کے مصداق افسانہ نے جب ایک بار پھر سادہ بیانی کی طرف مراجعت کی تو جاوید نہال کے افسانوں کے نقش بھی واضح ونمایاں نظر آنے لگے۔

"نیم کا رس" اسی زمانے کی وہ تخلیق ہے جسکا انداز بیان اسے دونوں طرز کے افسانوں کا نقطۂ اتصال ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا انداز بیان نہ تو بہت سادہ ہے اور نہ ہی گنجلک بلکہ اسکا پلاٹ دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری باتیں صاف صاف نہیں ہیں۔

"نیم کا رس" ایک افسانہ ہے۔ جو افسانہ ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے کافی قریب نظر آتا ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک محلے کے بوسیدہ سے بنگلہ نما مکان میں "گرینی" رہتی ہے جو مکان کی مالکہ ہے اس کی عمر ۵۰ کے لگ بھگ ہے۔ اس کے ساتھ ہی پیٹر اور روزی (جو میاں بیوی ہیں) رہتے ہیں۔ پیٹر بے روزگار ہے اور مجبور بھی جبکہ اس کی بیوی عیاش طبع ہے۔ اس لئے پیٹر کو عورتوں سے نفرت ہے جبکہ گرینی اس کی ہمدرد ہے اور اسے وقتاً فوقتاً تسلی بھی دیتی ہے۔ اسی محلے کے دوسرے مکان میں افسانہ نگار رہتا ہے جو اپنی کھڑکی سے یہ تمام نظارے کسی تماش بین کی طرح دیکھتا رہتا ہے اور زندگی کی کڑوی سچائیوں کو کافی (Coffee) کی طرح پی لیتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید نہال کو زبان وبیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے الفاظ کے وہ جوہر دکھائے ہیں جو قاری کو مبہوت کر دیں۔ 'نیم کا رس' میں خوبصورت تشبیہات کے ساتھ بڑے سلیقے سے منظر نگاری کی ہے۔ اور اس میں کامیاب نظر آتے ہیں کیونکہ قاری کا ذہن چند لمحوں کے لئے الفاظ اور تشبیہات کے خوبصورت تانے بانے میں الجھتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے۔ نڈھال سورج کی کرنیں، جوان بیوہ کا پھیکا حسن، زمین کو گنجے کا سر، چاندی اور شراب وغیرہ ایسی تشبیہات ہیں جو فوراً اپنی جانب توجہ مبذول کر لیتی ہیں۔ انہی تشبیہات کے استعمال نے افسانے کی فضابندی میں کافی معاونت کی ہے کیونکہ انسانے کی کہانی اپنے المیہ ہونے کے سبب جس ماحول کی متقاضی تھی اس ماحول کو تخلیق کرنے میں اس فضابندی نے کافی مدد کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورا افسانہ شروع سے آخر تک ایک مایوس کن فضا سے بوجھل نظر آتا ہے اور یہ وحدت تاثر کی ایک اچھی مثال ہے۔

اس افسانے میں چار فعال کردار ہیں جن میں مرکزی کردار مس گرینی کا ہے۔ افسانے میں گرینی کی واضح تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔ وہ ایک بوڑھی عورت ہے جس نے زندگی میں بہت نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ ایک ہندوستانی کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ کلکتہ چلی آتی ہے اور زندگی کے بقیہ دن یہیں گزار رہی ہے۔ گرینی ایک رحم دل عورت ہے۔ ساتھ ہی ممتا کے جذبات سے پُر بھی، کیونکہ جب نیم کی ٹہنی ایک چھوٹے سے بچے کے ہاتھ میں چبھ جاتی ہے تو وہ اس کے ہاتھوں سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہے اور فوراً اس کے ہاتھ دھو کر سفید کپڑے سے باندھ دیتی ہے، ساتھ ہی اس کی ماں کی بد احتیاطی پر بہت غصہ بھی ہوتی ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے خوشگوار لمحات زیادہ دنوں تک نہیں دیکھے کیونکہ جس کے دام محبت میں گرفتار ہو کر وہ کلکتے پہنچی تھی اس نے اسے بہت جلدی آزاد کر دیا تھا لیکن یہ ایسی آزادی تھی جس نے اسے ماں بننے کے جذبے سے محروم کر دیا تھا۔ وہ اس کھلی فضا میں بھی اس لئے گھٹن محسوس کرتی تھی کہ اس کی زندگی کا آنگن سونا تھا۔ اسی احساس نے اسے بچوں سے محبت کرنا سکھایا تھا چاہے وہ انسان کا بچہ

زندگی میں حسیں حادثہ بھی تو ہو
خواہشوں کے لئے یہ غذا بھی تو ہو

برف زاروں میں کب تک ٹھٹھرتی رہوں
کچھ نہ کچھ دھوپ کا سلسلہ بھی تو ہو

شمع یوں ہی جلانے کا کیا فائدہ
آ کے لپٹے کچھ ایسی ہوا بھی تو ہو

اس بھرے شہر میں کیوں اکیلی پھروں
ساتھ میرے کوئی آپ سا بھی تو ہو

ہے نہ آہٹ کوئی اور نہ کوئی تھکن
اس سے ملنے کا اک تجربہ بھی تو ہو

ہو چکیں مرنے جینے کی باتیں بہت
وہ مرے واسطے اب فنا بھی تو ہو

میں بُلانے کو اسکو بلاؤں مگر
اپنا گھر اس کی خاطر سجا بھی تو ہو

مشورہ

دلوں میں تم
کدورت کے شجر کی
پرورش کرنا
فصیلِ جسم کے دیوار و در پر
نفرتوں کے شبد ہی لکھنا
عناد و بغض کو
ایماں بنا لینا
ملے موقع تو
اپنوں کے ہی سر کو تم
قلم کرنا
مگر جس وقت ملنا تم کسی سے
تو لبوں پر مسکراہٹ یوں سجا لینا
کہ جیسے تم سراپا آدمیت ہو
دلوں کی ہے خبر کس کو

ایک نظم

میں کب تک طاقِ نسیاں میں
تقدس کی کتابوں کی طرح خود کو
سجا کر یوں ہی رکھوں گی
کہ وہ آئے
مجھے چھو لے
مجھے کھولے
مرے ہر ایک صفحے پر
نشانی ثبت کر جائے
پھر اس کی نیند میں خود کو
میں شامل کر کے سو جاؤں
کہ میں صرف ایک عورت ہوں
خدا میرے
بتا مجھ کو
یہ کیسی رسم دنیا ہے
ترا قانون کیسا ہے
(سدا ایسا ہی ہوگا کیا)
یہ خواہش میں بھی رکھتی ہوں
کہ وہ آئے
مجھے دیکھے
مجھے سوچے
مرے کربِ اذیت کو
سمجھنے کی کرے کوشش
مگر ہوتا ہے کب ایسا
وہی معمول ہے اس کا
میں ہر شب روز مرتی ہوں
مگر پھر بھی میں جیتی ہوں
کبھی دل میں
یہ جذبہ جاگ اٹھتا ہے
بغاوت میں بھی کر بیٹھوں
سبھی کہنہ اصولوں کی
اڑا دوں دھجیاں لیکن
مری ماں کا حسیں چہرہ
مری نظروں میں آتا ہے
نصیحت جس نے یہ کی تھی
ہر اک لمحہ
سعادت مند بیوی کی طرح رہنا ہمیشہ تم
(کہ وہ بھی اک سعادت مند بیوی تھی)
اسی اک بات کی خاطر
میں اپنے اشک پیتی ہوں
کبھی رہ کر کچن میں یا کبھی بچوں میں بہلاتی ہوں میں خود کو
میں ہونٹوں پر
سجائے مسکراہٹ زندہ رہتی ہوں
کہ بننا ہے مجھے بھی جنتی بیوی

غزل

یہ کام کرکے دیکھ لوں، اک ضد یہ آج ہے
طوفاں سے جاکے پوچھ لوں کیسا مزاج ہے

محنت کشوں کے بچے ہی روتے ہیں بھوک سے
صدیوں سے اپنے شہر میں کیسا رواج ہے

تحفے میں اس نے دے دیئے کانٹے ببول کے
شوقِ برہنہ پا کا یہی اک علاج ہے

سچ بولنے میں جان کا خطرہ تو ہے مگر
میں کیا کروں کہ میرا حسینی مزاج ہے

وہ دور تھا کہ قدر تھی مہر و خلوص کی
یہ دور ہے دلوں پہ عداوت کا راج ہے

اس نے کبھی کسی کی مدد کی نہیں غزلؔ
وہ شخص جس کے سر پہ سخاوت کا تاج ہے

سب کھلونوں کو نہ یکجا ایک الماری میں رکھ
فرق کچھ تو دشمنی میں اور دلداری میں رکھ

زندگی کے بعد بھی در پیش ہوگا اک سفر
نیکیاں کچھ ساتھ اپنے اسکی تیاری میں رکھ

گھر سے باہر اوڑھ لے تو مسکراہٹ کی ردا
آنسوؤں سے بھیگے تکیے چار دیواری میں رکھ

دوسروں پہ کھل نہ جائے تیری الجھن کا سبب



شگفتہ یاسمین غزلؔ

نام: شگفتہ یاسمین
ادبی نام: شگفتہ یاسمین غزلؔ
والد کا نام: سید ارشد رضا
پیدائش: ۵ ستمبر ۱۹۷۰ء۔ اکبر پور (نوادہ۔ بہار)
تعلیمی لیاقت: ایم۔اے۔بی۔ایڈ۔ Ph. D. جاری
آغاز شاعری: ۱۹۸۵ء
تلمذ: ابتدا میں عبدالرشید ارماں (مرحوم) اور پھر جناب قیصر شمیم (منسلک ہوں اب بھی)۔
اصناف سخن: نثری تحریروں میں مقالے، مضامین، رپورتاژ وغیرہ۔ دیگر اصناف میں غزل، نظم، ماہیہ، کہہ مکرنی وغیرہ شامل ہیں۔
زیر اشاعت: ''رباعیات پرویز شاہدی۔ تحقیق و تنقیدی مطالعہ'' نامی کتاب
مشغلہ: ۱۹۹۲ء سے کلکتہ دوردرشن پر اردو نیوز ریڈر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہوں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو پر بھی اناؤنسر کی حیثیت سے متعین ہوں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدر آباد) کی ایک شاخ کلکتے کے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں کھلی ہے اس میں گیسٹ لیکچرر کے عہدے پر فائز ہوں۔

پتہ: 65/1E, Tiljala Road
Calcutta - 700 046
فون: (033) 280-3529

ن احساس نے اسے
مایا تھا چاہے وہ انسان کا بچہ

غزلیں

نظر مبذول کرنا چاہتا ہوں   غزل کو پھول کرنا چاہتا ہوں
ترے قدموں میں سر اپنا جھکا کر   خطا مقبول کرنا چاہتا ہوں
کبھی اترو کہ اے تارو زمیں پر   تمہیں مقبول کرنا چاہتا ہوں
لکھا ہے اس نے خط ترکِ وفا کا   سبب موصول کرنا چاہتا ہوں
ترے اخلاق کی تعریف میں اب   قلم مشغول کرنا چاہتا ہوں
شمیم انجم لگا کر دل کسی سے
سراسر بھول کرنا چاہتا ہوں

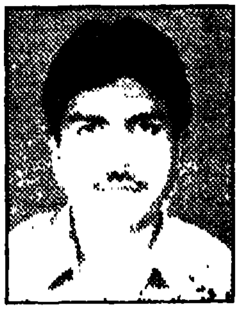
☆ ☆ ☆

زندگی بچوں کی مانند ہمکتی ہے ابھی
ہے تہی دست مگر شاخ لچکتی ہے ابھی
لیکے آئی تھی ہوا اس کے بدن کی خوشبو
میرے کمرے کی ہر اک چیز مہکتی ہے ابھی
دیکھ کر لب پہ تبسم کی مچلتی موجیں
خامشی مجھ میں اترنے سے جھجکتی ہے ابھی
چوڑیاں ٹوٹے ہوا ویسے زمانہ لیکن
ایک آواز سماعت میں کھنکتی ہے ابھی
یہ تو سچ ہے کہ مجھے بھول گیا تو لیکن
تیری انگنائی مرا راستہ تکتی ہے ابھی

☆ ☆ ☆

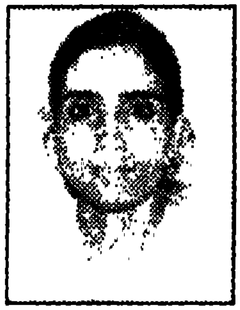
جو بعدِ ترکِ دلداری دعائیں اس نے بھیجی ہیں
ہمارے واسطے شبھ کامنائیں اس نے بھیجی ہیں
گلوں کی پنکھڑی، اشکوں کے موتی تتلیوں کے پر
یہ دیدہ زیب غزلوں کی قبائیں اس نے بھیجی ہیں
کہیں آہیں کہیں نالے ہیں تحریروں میں پوشیدہ
لفافے میں غمِ دل کی ادائیں اس نے بھیجی ہیں
ابھی مٹی کے تن والے نہ نکلیں گھر سے سڑکوں پر
برسنے کے لئے کالی گھٹائیں اس نے بھیجی ہیں
اگر گنوائیں کم پڑجائیں گے ذرّات صحرا کے
ہمارے شہر میں اتنی بلائیں اس نے بھیجی ہیں
ہے گر جینا مرا مشکل تو مرنا اس سے مشکل ہے
مجھے کس جرم کی ایسی سزائیں اس نے بھیجی ہیں

☆ ☆ ☆



شمیم انجم وارثی

اصل نام : محمد شمیم انصاری
قلمی نام : شمیم انجم وارثی
تاریخ ولادت : ۳۰ر مئی ۱۹۶۶ء
جائے ولادت : کمرہٹی۔ کلکتہ
آبائی وطن : موضع۔ ڈمراؤں، ضلع۔ بکسر، صوبہ۔ بہار
مستقل سکونت : ماڈل ڈانگہ روڈ۔ گارولیا۔ اتر ۲۴ پرگنہ۔ مغربی بنگال۔ ۷۴۳۱۳۳
والد کا اسم گرامی : عبدالعزیز انصاری (مرحوم)
تعلیم : اسکول فائنل
ذریعۂ معاش : ملازمت
شاعری سے مراسم : ۱۹۸۷ء سے
پہلی مطبوعہ غزل : ماہنامہ "انشاء" کلکتہ مارچ ۱۹۸۸ء۔
وابستگی : معاون مدیر۔ رسالہ "دستک" ہوڑہ
کتابیں : روپ روپ تیری تجلی (نعتیہ) ۱۹۹۳ء
تصنیف : مغربی بنگال میں ماہیا نگاری (تذکرہ) ۱۹۹۹ء
پتہ : M D ROAD, GARULIA
N 24 PGS - 743133



شگفتہ طلعت سیماؔ

نام : شگفتہ طلعت سیماؔ

والد کا نام : جناب ابوذر مانی۔ جوائنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن اینڈ اسپورٹس (یوپی)

پیدائش : ۲۳ر ستمبر ۱۹۷۳ء الہ آباد

تعلیم : ایم۔اے

آغاز شاعری : ۱۹۸۹ء

پہلا شعر : ۱۴ر سال کی عمر میں ؎

جس سے آنکھیں ہمیشہ منور رہیں
تم ہتھیلی پہ لکھی وہ تحریر ہو

اعزازات : (۱) ایس ایس کھنہ کالج الہ آباد کی بہترین شاعرہ کا اوارڈ ۱۹۹۲ء
(۲) اسلامیہ کالج الہ آباد کے طرحی مشاعرہ میں اول پوزیشن ۱۹۹۳ء
(۳) دھنباد کلا سمیلن، دھنباد کا بہترین شاعرہ کا اوارڈ ۱۹۹۵ء
(۴) دارجلنگ مہیلا سدن کی طرف سے شاعری کے لئے اوارڈ ۱۹۹۸ء

وابستگی : (۱) سکریٹری "بزم یاراں" کلکتہ
(۲) ڈائریکٹر "اردو رائٹرس ایسوسی ایشن، حیدر آباد
(۳) نائب صدر "بزم ادب" دارجلنگ
(۵) نائب صدر "دارجلنگ مہلا سدن، دارجلنگ

تصانیف : (۱) اس چہرے کے نام (غزلیات) زیر طباعت
(۲) چوتھے در کا خواب (نظمیں) زیر ترتیب
(۳) صوفیائے الہ آباد کی خدمات (تحقیق و تنقید) زیر ترتیب

ادارت : ایڈیٹر سہ ماہی "اثبات و نفی"۔

رہائش : ۸۹/۵، رپن اسٹریٹ، شبلی ہاؤس، کلکتہ-۷۰۰۰۱۶

فون : (۰۳۳) ۲۲۹۴۵۳۱

غزلیات

اب ارادہ ہے کریں ہم بھی سفر پانی میں
کاش مل جاتی کوئی راہ گزر پانی میں

اک صدی بیت گئی ریت پہ چلتے چلتے
کیا کریں پاؤں بھی جلتے ہیں مگر پانی میں

شب تھی برسات کی، وہ خواب میں آیا کیوں تھا
تن مرا ڈوبا رہا تا بہ سحر پانی میں

سانس لیں کون سے پربت کے مکاں میں جاکر
کیا وہاں جلتا نہیں کوئی بھی گھر پانی میں

اک اسی بات پہ سیماؔ ہوئی بدنام بہت
ڈھونڈتی رہتی تھی کیا اس کی نظر پانی میں

٭ ٭ ٭

نیا کچھ سانحہ سا چاہتا ہے
مجھی میں وہ ٹھہرنا چاہتا ہے

وہ رکھ کر قید خوشبو میں ہمیشہ
مجھے محسوس کرنا چاہتا ہے

سفر ہے ختم تو خوابوں میں پھر کیوں
وہ کوئی رنگ بھرنا چاہتا ہے

ملے تھے جب خداؤں کی طرح ہم
وہ قصہ ان دنوں کا چاہتا ہے

میں کب تک شانت موجوں میں رہوں گی
سمندر تو بپھرنا چاہتا ہے

جسے پایا نہیں اس کے لئے بھی
ہمارا دل تو رونا چاہتا ہے

مرے شانے پر اپنا سر وہ رکھ کر
کوئی قصہ بتانا چاہتا ہے

نہ جانے کب کوئی آجائے ملنے
مرا چہرا سنورنا چاہتا ہے

اسے دیکھوں کھلی آنکھوں سے کیسے
وہ بس خوابوں میں آنا چاہتا ہے



شہناز نبی

نام : شہناز نبی
والد کا نام : غلام نبی
والدہ کا نام : سلیم النساء
پیدائش : کلکتہ ۔ ۲۰ مارچ ۱۹۵۸ء
تعلیم : ایم اے (اردو)
پی ۔ ایچ ۔ ڈی
تحقیق کا موضوع : ۱۹۶۰ء کے بعد اردو
تنقید کا ارتقا
پتہ : ۱۲۸ اے، رپن لین ۔
کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۱۶
فون : ۲۲۹-۶۲۷۲ (۰۳۳)
پیشہ : درس و تدریس
ملازمت : سینیر لیکچرار ۔ شعبۂ اردو
کلکتہ یونیورسٹی
سیاسی وابستگی : کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا،
مارکسٹ، کونسلر، کلکتہ
میونسپل کارپوریشن ۔

تصنیفات :

۱۔ بیدی ایک جائزہ ۔ (مرتبہ)
۲۔ بچوں کے ڈرامے ۔ (بنگلہ سے ترجمہ)
۳۔ بشاس گھاتک ۔ (کرشن چندر کے اردو ناول 'غدار' کا بنگلہ ترجمہ)
۴۔ بھیگی رتوں کی کتھا ۔ (شعری مجموعہ)
۵۔ مجھے مت چھوڑ ۔ (ہندی شعری مجموعہ)
۶۔ لسانیات اور دکنی ادبیات ۔ (تحقیق و تنقید)
۷۔ اردو ڈراما، آغا حشر اور صید ہوس (تحقیق و تنقید)

۱۔ اس کے علاوہ کرشن چندر، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے افسانوں کا بنگلہ ترجمہ
۲۔ جدید اردو شاعری پر بنگلہ میں مضمون ۔
۳۔ شہریار، گوپی چند نارنگ، ترقی پسند تحریک، قواعد کیا ہے، فیض پر خلوص لہجے کا شاعر، کبیر، منٹو کے افسانوں میں ضمنی کردار، غالب اور گھر، عملی تنقید اور دیگر مضامین
۴۔ اردو کے چند جدید شعراء مثلاً شہریار، ندا فاضلی، محمد علوی وغیرہ کی نظموں کا بنگلہ ترجمہ
۵۔ بچوں کے دو عظیم بنگلہ شاعر ۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور شوکمار رائے کی نظموں کا اردو ترجمہ
۶۔ ہندی افسانوں کا اردو ترجمہ
۷۔ قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ہندی ترجمہ

ذرا اتنا بتا مجھ کو

مجھے تسلیم کہ میں نے ترے آدم کو بہکایا
وہ تھا جنت گزیں
لیکن اسے دنیا کی دوزخ میں
مری اک سر پھری خواہش نے
کیسے کیسے بھٹکایا
مجھے تسلیم کہ اس بے گنہ دھرتی پہ
پہلے قتل کی مُوجب ہوئی ہوں میں
مرے ہی واسطے
رشتوں کے آئینے میں
پہلی دفعہ بال آیا
مجھے تسلیم کہ میری ہوس کی تیز آندھی نے
لباسِ یوسفِ کنعاں پرزہ پرزہ کر ڈالا
مگر اتنا بتا مجھ کو
کہ بیت اللحم میں کس نے
ترے بخشے ہوئے دھبّے سے ماتھے کو سجایا تھا
کہ وہ تھا کون جو پہلے پہل
اک اُمّتی پہ ایمان لایا تھا
کہ کس کی کوکھ اُجڑی کربلا کی پیاسی دھرتی پر
تری سرکش انا کو کس کی آہوں نے سنبھالا تھا
ذرا اتنا بتا مجھ کو ......!

سنڈریلا

ذہن
جیسے طلسماتی ہرنی کے پیچھے
کوئی شاہزادہ
گھنے جنگلوں سے اُلجھتا ہوا
جا گرے ایک اندھے کنویں میں
یہ دوزخ کہ جس میں لپکتے ہیں شعلے
اسے سرد کرنے کی خاطر کہاں تک
پڑھے جائیں گے معرفت کے رسالے
کھنکتی ہوئی چوڑیوں سے براہِ تعصب

رہیں گی خفاکب تلک
ٹاٹ کی بے تکی چندیاں
برتنوں پر کہاں تک خموشی کی لیپ
کبھی ٹین کے چھپر وں پر ڑ کے کوئی سورج
کبھی آنکھوں میں ہنسے اک اجالا
پتیلی سے اُڑتی ہوئی راکھ
بالوں پہ جمنے لگی ہے
وظائف کے نسخوں کی تعداد
جھکتے ہوئے طاق پر
دن پہ دن بڑھ رہی ہے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم

یہ جی چاہتا ہے
کسی دن
کسی کو بتائے بنا
میں نکل جاؤں چپ چاپ
تنہا سفر پر
اکیلے اکیلے بھٹکتی پھروں
شہر در شہر
مجھ کو نہ پہچانے کوئی
مرے کیس الجھے ہوئے ہوں
کہ پلّو مرا لوٹتا ہو زمیں پر
کہ ٹوٹی ہو چپّل
کہ میلے ہوں ناخن
کہ آنکھوں میں وحشت
کہ سانسوں میں الجھن
جہاں کوئی مجھ کو
مرا نام لے کر نہ ہرگز پکارے
مرے پاس آکر کبھی یہ نہ پوچھے
تمہیں کیا ہوا۔۔؟

دستِ بے دعا

طلب کچھ بھی نہیں میری
قسم تجھ کو تری بخشش کی
مجھ کو معاف رکھنا ہر عنایت سے
ترے بھنڈار میں ہر اک کی خاطر
کچھ نہ کچھ ہوگا
جگانے والے
تیرے راج میں ہرگز کوئی سوتا نہیں بھوکا
کہ پتھر کے تلے بھی چیونٹیوں کو رزق ملتا ہے
مگر میں کیا کروں
محرومیوں کی دھوپ میں چل کر
ترے ہاتھوں سنوارا دل اگر اتنا بگڑ جائے
کہ خواہش پاؤں دھرنے سے ڈرے
احساس مر جائے
کہ جس منزل پہ پانا اور کھونا ایک ہو جائے
اک ایسے دل پہ اپنی بخششیں ضائع نہ کر
تو معاف رکھ
ہر اک عنایت سے۔۔۔!

غزلیں

کسی صحرا کی وحشت ہو گئے ہیں
ہم اپنی وسعتوں میں کھو گئے ہیں
کسی کی آنکھ میں حیرت بنے تھے
کسی کے آنسوؤں میں رو گئے ہیں
کبھی تہہ کر کے رکھا ہے سرہانے
کبھی یادوں کو اوڑھے سو گئے ہیں
ہمیں بھی شوق تھا تصویرِ عریاں
ہمارے بھی لبادے کھو گئے ہیں
انہیں ڈھونڈو ہمارے آنسوؤں میں
پسِ دیوارِ گریہ جو گئے ہیں

شاخوں پہ اندھیرا منڈلائے
ہم کیسے وقتوں گھر آئے
اک آہٹ دبکی بیٹھی ہے
اک سایہ گلی میں لہرائے
اک اینٹ کھسکتی چوبارے
اک خود رو پودا مسکائے
لوبان کا گہرا تیز دھواں
مغموم سی خوشبو پھیلائے
اک آدھا روشن صحن ہنسے
اک مدّھم کمرہ مسکائے

کون کہتا ہے نہیں آتا میسّر آئینہ
خود نگہداری کو رکھا ہے مقرر آئینہ

دل تجھے لوٹا ہی دے گا تیری ساری وحشتیں
چن کے رکھتا ہے ترا اک ایک پتھر آئینہ

گاہے گاہے بھی نہیں دیتا سوالوں کے جواب
بولتا رہتا تھا پہلے جھوٹ اکثر آئینہ

ایک چہرہ میرے جیسا ہی مجھے لوٹا تو دے
عکس بوتے تھک رہی ہے آنکھ بنجر آئینہ

اسکو دیواروں میں چن کر مطمئن کیسے رہوں
پیش وپس کے منظروں میں ایک منظر آئینہ

ہم نے ہی کیا تراشا اسے اور خدا کیا
بارے کچھ اہتمام ادھر بھی ہوا کیا
ہم رسمِ عشق اپنی طرح سے نبھا گئے
وہ ٹیڑھی چال اپنی طرح سے چلا کیا
محفل میں اس سے کھنچ کے ہوئے کس قدر خجل
وہ خوش خصال ایسا کہ ہنس کر ملا کیا
شاید اسی کا نام رکھا ہے کسی نے دل
کانٹا سا ایک پہلو میں ہر دم چبھا کیا
دادِ ہنر میں اس کی ہے ایجاد اسطرح
اشعار میرے اوروں کے منہ سے سنا کیا

اور میں سہم کر برگد کے پیڑ کی عظیم بانہوں میں سمٹ گئی میں نے اپنے آپ کو محفوظ خیال کیا اور بے ترتیب سانسوں کو قابو میں کرنے لگی۔ میرا اس طرح ڈرنا اور سہمنا تمہارے لئے کوئی نئی چیز تو نہ تھی لیکن تمہارے لاشعور میں پتہ نہیں کون سی بدگمانی تھی کہ تم پھر اکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"بھئی یہاں کون ہے جس سے تم ڈر رہی ہو؟"

"عادت سی ہے" میرے لہجے کی بے بسی کو تم نے محسوس کر لیا اور تمہیں اپنے جملے پر افسوس ہونے لگا۔

تم نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا اور مجھے خود سے قریب کر لیا۔ "کچھ خیال مت کرنا دراصل مجھے ایک بات پریشان کر رہی ہے"۔

"کون سی بات کانت!" میں نے تمہاری طرف دیکھا اور تمہارے ہونٹوں پر دیر سے رُکا ہوا جملہ اچانک آزاد ہو گیا۔

"باہر کی دنیا سے تم خوفزدہ کیوں ہو؟ یہ اچانک تمام طاقتوں سے رشتہ ختم کر کے انہیں تم مسمار کیوں کر دینا چاہتی ہو ـــ؟" میرے اندر بجلی سرایت کر گئی تمہارا اکھڑا اکھڑا لہجہ مجھے بدگمان نہ کر سکا۔ میں جانتی تھی سفر کے دوران سفر کی کٹھنائیوں سے پریشان ہو کر ہمسفر رہبر کو ہی بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ میں نے لمبے ناخنوں سے ہی بائیں ہاتھ کی انگلی میں انگشتری پر جمے ہوئے سونے کی نوکوں کو اٹھایا اور نیلا پتھر نکال لیا جس سے میرا آئیڈیل وابستہ تھا۔ تم نے پتھر لے لیا اور زیر لب کہنے لگے "نیلا رنگ" ـــــ امن و شانتی" میں نے کہا "مساوات، برابری" اور ہم وہی الفاظ جوڑ جوڑ کر جملے بنانے لگے جن کا وجود جیتی جاگتی دنیا میں پتھر تھا اور اس کے خواہش مند لوگ تلاش میں سفارشیں لئے پھرتے تھے ـــ پھر یکبارگی نہ جانے تمہارے جی میں کیا آئی کہ پتھر کو تم نے برگد کے قریب جوہڑ میں پھینک دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ تم نے پتھر نہیں خود مجھے جوہڑ میں پھینک دیا ہو۔ آہستہ آہستہ کہتے گئے۔

"تم پتھر کو خدا سمجھتی ہو، ناکامی کو زندگی کا نقاب پہنانا چاہتی ہو۔ پتھروں میں مساوات ڈھونڈتی ہو۔ جانتی ہو یہ سب بچپنا ہے"۔

میری آنکھوں سے موم پگھلنے لگا۔ میں دبے دبے لفظوں میں کہتی گئی۔ ہم لوگ دیواروں سے گھبرا پڑے ہیں۔ باہر کی گرم ہوا ہمیں جھلس کر رکھ دے گی کانت!" اور تم نے روشنی دکھائی۔ "یہی پودا ایک تناور درخت بن جائے گا۔ دیواروں سے اونچی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی باہر کی طرف پھیلیں گی تو خود لوگوں کی نگاہیں اٹھیں گی"۔

"ــــ بس بس کانت میں سمجھ گئی"۔

خوش آئند مستقبل کا ہیولا دیکھ کر انجانی سی چیخ منہ سے نکلی اور میں نے کہا دراصل میں نے پیچھے مڑ کر دور کی چیزوں کو دیکھا تھا اور سامنے کی چیزیں چھوڑ دی تھیں تم نے جملہ مکمل کیا "دور کی چیزیں یا سراب ہوتی ہیں یا سہانا ڈھول"۔

روح کا بوجھل پن گندے مواد کی طرح بہہ گیا۔ ماضی اور مستقبل نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ حال کا احساس جیسے سردیوں میں نرم گرم بستر کا مزہ دینے لگا۔ پیروں کو توانائی مل گئی اور ہم اندھیرے سے نکل آئے۔ پیڑ کے نیچے پھیلا ہوا اندھیرا تحلیل ہوتا گیا۔ رات کی چاندنی میں نہایا ہوا برگد کا پیڑ مارے خوشی کے ادھر ادھر جھوم رہا تھا۔

"کبھی کبھی اندھیرا اچھا ہوتا ہے۔ لوگ گھبرا کر روشنی کی تلاش میں کیوں نکلتے ہیں"۔

"اندھیرا اچھا ہے، رات خوبصورت ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ چلنا نصیب ہے۔ دیکھا کتنی ڈھیر ساری خوشیاں ایک جگہ جمع ہو گئیں"

تمہارے نزدیک رات خوبصورت تھی اور اندھیرا اچھا! باتوں کو قبول کرتے ہوئے بھی مسترد کر دینے کا فن تمہیں آتا تھا تمہاری لے میں میں نے لے ملائی۔ "تم مصور ہو، میں شاہکار ہوں، ہماری گفتگو کا افسانہ ہے، تمہاری گفتگو شاعری ہے"۔

اور ہم دونوں مل کر قہقہے لگانے لگے۔ نقرئی گھنٹیوں کی سی آواز فضا میں گھلنے لگی۔ ایک خوشبو سی پھیلی اور دل و دماغ جیسے معطر ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا رات ایک خوبصورت لڑکی ہے جسے چاند چاہتا ہے اور زمین پر پھیلی ہوئی روشنی چاہنے والے اور چاہے جانے والے کے درمیان کی چیز ہے چاہت، ہے پتھر ہے، دیوتا ہے۔

(کہانی کار۔ ساعت کے لئے رک کر سوچتا ہے۔ باہر نسلی، مذہبی اور ذاتی امتیاز کا مجسمہ چوراہے پر نصب ہے)

کہانی پھر اپنی سمت کو بڑھتی ہے۔

تم نے مجھے ٹوکا "یہ ہنستے ہنستے اچانک چپ سی کیوں لگ گئی؟"

"کچھ نہیں زمین کی طرف دیکھ رہی تھی"۔

"کیا دیکھا تم نے؟"

"یہی کالا آدمی، گورا انسان، طاقتور خدا، ادنٰی بندے"

"پھر دیوانگی شروع نا!"۔

"نہیں نہیں میں کہہ رہی ہوں کہ سب ایک ساتھ بیٹھے ہیں اور پہچانے نہیں جاتے"۔

پھر ہم لوگ چلتے رہے، چلتے رہے اور ساحل پر روشنی کے دیئے اکا دکا آنکھوں میں آنے لگے۔ "اس چاند رات کو لوگوں نے ساحل پر دیئے کیوں جلائے ہیں؟" میں نے تم سے پوچھا۔

''یہ لوگ ملاح ہیں اور اپنی کشتیوں کے اندر چراغ رکھتے ہیں کہ روشنی بہت ضروری ہے''۔ میں تمہاری بات کی تہہ تک پہونچ گئی۔

''ہاں کانت! روشنی بہت ضروری ہے اور کبھی کبھی اندھیرا بھی، تاکہ روشنی کا احساس ہو''۔

اور ساحل آگیا۔

''جب چاند بالکل بیچ آسمان پر آجائے گا تو یہ لوگ اپنی کشتیاں کھول دیں گے، تم کشتی کا انتخاب کرلو''۔ تم کھڑے کھڑے کشتیوں کا جائزہ لینے لگے۔

''کشتی کا انتخاب کیسا۔ ملاح اپنی کشتی میں سوراخ نہیں رکھتے''۔ میں نے جملہ ادا کیا اور الوداعی نظروں سے تمہاری طرف دیکھا۔ تمہارے چہرے پر چاہت کا نور پھیلا تھا۔ تم مخاطب ہوئے ''جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں وہاں کے لوگوں میں گھل مل جانا ۔۔۔۔ اور کبھی کبھی مجھے بھی یاد کرلینا۔ لیکن اُداسی کے ساتھ نہیں''۔

تمہارے ہونٹوں پر ایک مجبور مسکراہٹ (فطری عمل) ابھری۔

''ہاں کانت! تم اطمینان رکھنا۔ میں دور کی چیزوں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کروں گی''۔ میں نے اپنی آنکھوں کو انگلیوں سے ٹٹولا۔ ایک ٹھنڈی سانس میرے اندر سے خارج ہو کر ہوا میں مل گئی اور فضا یکبارگی مکدر ہو گئی۔

''اچھا کانت الوداع!''

ہم نے مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا۔ میں قریب کی کشتی میں بیٹھ گئی اور کشتی ایک دم سے ڈول گئی، تم ساحل پر کھڑے رہ گئے۔ ملاح نے ڈور کھول دی اور جیسے کشتی نے کیچڑ پر اپنا توازن ٹھیک کیا ہو پھر پانی کے دوش پر سوار ہو گئی۔ ۔۔۔۔ دریا کے شور کے باوجود کشتی آگے بڑھتی گئی اور تم دور ہونے لگے۔ تمہارا وجود گھٹتا گیا اور ایک نقطہ بھی جب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو میرے سینے میں کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں اور دل ڈوب گیا۔

۔۔۔۔۔۔ ملاح کے گیت اب کانوں کو چھو رہے تھے۔ بڑا ہی سوز بھرا گیت تھا۔ میں نے اپنے کان بند کرلئے۔ تم ہی نے تو کہا تھا ''کبھی کبھی مجھے یاد کرلینا لیکن اداسی کے ساتھ نہیں''۔

۔۔۔۔۔ کشتی فضا کی بانہوں سے لپٹ کر پانی کی سطح پر مرے مرے قدموں سے چلتی رہی اور جب بہت دور چلی گئی تو اپنے آپ پر لاکھ قابو رکھنے کے باوجود خود کو روک نہ سکی۔ ایک بار مڑ کر دیکھنے کی خواہش نے سر پٹکا۔ اور میں مڑی۔ ۔۔۔ ساحل اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ میں نے کشتی کے اندر چراغ جلا لیا اور دوسری کشتی کے ملاحوں سے کہنے لگی۔

''تم بھی اپنی اپنی کشتیوں میں چراغ جلالو''۔

(اور رات کے سناٹے میں جب محافظ بھی سو گئے تو وہ اس چوراہے پر گیا جہاں نسلی، مذہبی، ذاتی استیار کا دیو پیکر مجسمّہ نصب تھا۔ آہستہ آہستہ وہ مجسمّہ کے اوپر چڑھا اور مجسمّہ پر اس طرح کہانی کو آویزاں کیا کہ صبح آنے جانے والوں کی نظر پڑے)

اور پھر کہانی کار صبح ہوتے ہی وہاں گیا۔ مجسمہ کے گرد بھیڑ لگی تھی۔ وہی قوی ہیکل لوگ جن سے اس کی پرانی دشمنی چلی آرہی تھی، ان کی آنکھیں اُبل رہی تھیں، اور ان کے حکم پر چند لوگ کہانی اتارنے کے لئے مجسمے پر چڑھ رہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہوا کہ مجسمہ لوگوں کے بوجھ کو سہہ نہ سکا اور منہ کے بل طاقتور لوگوں پر آنے لگا۔

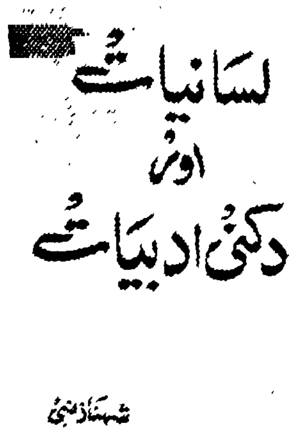
''یہ دیوتا کا قہر ہے''۔ مجمع میں سے کچھ سادھو چیخے اور طاقتور لوگ پلٹ کر بھاگنے لگے۔ مجسمہ منہ کے بل گر پڑا تھا۔ کہانی مجسمہ کے نیچے دب گئی صرف وہ حصّہ باہر تھا جس پر لکھا تھا

''تم بھی اپنی اپنی کشتیوں میں چراغ جلالو''۔

شہناز نبی کی تین کتابیں







آہستہ آہستہ تمہاری آنکھوں میں اترنے لگی اور مجھے ڈر سا لگنے لگا یہ خاموشی کہیں اس خوبصورت رات پر حاوی نہ ہو جائے اور میں تمہیں جگانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اچانک تم نے نظروں کو مجھ پر ٹکا دیا۔ جب تم جسمانی طور پر تھک جاتے تھے تو اپنا سر میرے شانوں پر ٹکا دیا کرتے تھے۔ تم کہتے تھے "ایسا اس لئے کرتا ہوں کہ تم سے کچھ تازگی ادھار لے سکوں (ہر پہلا شخص یہی سوچتا ہے کہ دوسرا اس سے کہیں زیادہ تازہ دم ہے) اور جب سوچتے سوچتے تمہارا ذہن رکنے لگتا تو ہتھیلی پر چہرہ رکھ کر اپنی آنکھوں کو میری آنکھوں میں حلول کرنے لگتے اور تمہاری سانس سرد لہر بن کر میرے جسم میں اترنے لگتی۔ خاموشی طویل ہو رہی تھی اور اسے توڑنے کے لئے الفاظ کے پتھر مل ہی نہیں رہے تھے کہ اچانک

اچانک چاند کا ہالہ کھڑکی کے کونے پر نظر آنے لگا۔ "اب چلنے کا وقت ہو رہا ہے"۔ تم نے سرگوشی کی "جانتی ہو جیسے چاند کے گرد روشنی کا ہالہ ہے نا ویسی گلابی سی روشنی تمہاری آنکھوں میں پتلیوں کے گرد چھٹکی ہوئی ہے"۔ دراصل تم کہنا چاہتے تھے آنکھوں میں گلابی ڈورے پڑ رہے ہیں۔ میرے اوپر سر درد چھا رہا ہے اور اب چلنے کا وقت آ گیا ہے...... پھر ایسا لگا جیسے چاند تھوڑا سا اُچھلا اور بالکل کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا ہو جیسے چہروں کی خاموش گفتگو کے دوران ہی ایک صدی بیت گئی۔

ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں سُرور میں ڈوب تو رہی تھی لیکن پھر بھی اپنے پورے ہواس میں تھی۔ نہ تو میں نے تمہارے شانے پر اپنا سر رکھا اور نہ تم نے اپنے ہاتھ میری کمر کے گرد حائل کئے لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اس سہارے کے بغیر بھی آج کی رات تمہارے بغیر میں بے سہارا رہ جاتی، تنہا ہو جاتی ساتھ ساتھ چلنے سے چاندنی کا للف

دوبالا ہو رہا ہے۔

"پتہ نہیں چاندنی راتوں سے ایسی تمہاری کون سی یادیں وابستہ تھیں کہ اس طرح بہکنے لگتے۔ میری نیم وا آنکھوں نے تمہیں شاید متوجہ کیا۔ تم میرے سُر در کی تہہ تک پہونچ گئے۔ تم تو یوں بھی مجھ سے وابستہ چھوٹی سے چھوٹی بات محسوس کر لیتے تھے۔ تم نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور میری انگلیوں کو اپنی مٹھی میں سمیٹ لیا"۔

میں چاہتا ہوں یہاں کوئی سواری کر لوں۔ تمہیں چلنے کی عادت نہیں ہے تھک جاؤ گی"۔ "نہیں کانت! سواری کے اندر تمہاری خوبصورت چاندنی کا گزر کہاں؟ میرا کیا میں تو اندھیرے کی عادی ہوں۔ ہاں چاند رات کا تمہارے ساتھ رہنا ضروری ہے"۔

"شرط یہ ہے کہ تم بھی ساتھ رہو"۔

"تم نے جملہ پورا کیا اور ہاتھ بڑھا کر چپکے سے میرا جوڑا کھول دیا۔ زلفیں میرے شانے پر بکھر گئیں اور میرا چہرہ کالے بالوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ اُسی وقت ۔ ۔ ہاں ٹھیک اسی وقت ایک ننھے بادل کا ٹکڑا چاند کے نیچے سے گزرتا ہوا ایک دم رک گیا۔ زمین پر ایک دھند سی پھیلی اور تم نے میری زلفوں کا رنگ اپنے ہونٹوں سے چوس لیا پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ میں نے جوڑا باندھ لیا۔ چاند بادل سے نکل آیا۔ رات پھر روشن ہو گئی"۔

"مسرت کا یہ لمحہ بہت جلد گذر گیا" تم اُداس ہونے لگے لیکن مسرت طویل ہو گئی، لمحہ تو مر جاتا ہے، خوشی کا ہو یا غم کا۔ بس یادیں رہ جاتی ہیں"۔

(کہانی کار نے اپنا قلم رکھ دیا ہے، وہ سوچتا ہے اس لمحاتی مسرت کو وہ طویل بنا سکتا اگر ۔ لیکن وہ اس

قسم کے چھوٹے چھوٹے پڑاؤ پر نہیں رُک سکتا تھا ...... یہ اس کی منزل نہیں۔ وہ پھر قلم اٹھاتا ہے)

ہم اِسی طرح باتیں کرتے ہوئے چار قدموں کے ساتھ چلتے رہے۔ رہگزر سنسان تھی۔ فضا میں خنکی تو تھی لیکن ہوا رکی ہوئی تھی اور مجھے نہ تو رُکی ہوئی چیزیں بھاتی ہیں نہ رکنا مجھے پسند ہے، خاموشی کھلنے لگی اور بہت ممکن تھا اس یکسانیت سے گھبرا کر میری خاموشی دم توڑ دیتی۔ بالکل اسی وقت دور میں نے اندھیرا پھیلا ہوا دیکھا۔

"جلدی کرو کانت! وہ اندھیرا دیکھ رہے ہو۔ وہ میرے اندر حبس پیدا کر رہا ہے"۔

لیکن تم نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ بڑی بے پروائی سے ٹہلتے گئے "تم بہت جلد جذباتی ہو جاتی ہو اور تمہیں تو جیسے ناکامی اور اندھیرے کی بات یاد رہتی ہے۔ آخر تم زندگی کو شکست خوردگی کی نظروں سے کیوں دیکھتی ہو؟"

لیکن تمہارا اکھڑا ہوا لہجہ مجھے بدگمان نہ کر سکا۔ میرے سامنے ایک ہی مقصد تھا "یکسانیت کی موت..."

(ایک بار وہ پھر ٹھٹکتا ہے۔ باہر کی دنیا کا ATMOSPHERE اس کے سامنے پھیلتا ہے۔ بے بسی، رنج اور غصہ کی حالت میں تخلیق کار مر جاتا ہے۔ لہٰذا وہ پھر قلم اُٹھاتا ہے۔)

منجمد لمحوں کے پھیلنے کے خوف نے میرے قدم بھاری کر دیئے اور میں تمہارے ساتھ چلتی گئی اور وہ اندھیرا قریب آ گیا

ہر ایک قدم بڑھانے [illegible]



شہود عالم آفاقی

نام : شہود عالم
ادبی نام شہود عالم آفاقی
پہلے عالم تخلص تھا پھر استادِ محترم علامہ ابرا حسنی کے مشورے سے شہود تخلص رکھا۔
والد کا نام عبدالشکور
والدہ کا نام حلیمہ بی بی
پیدائش ۱۹۴۰ء مقام دسنہ ضلع پٹنہ (نالندہ)
تعلیم میٹرک
تلمذ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک ساجد القادری ابروی سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں انہیں کے مشورے سے سحابِ سخن ابرا حسنی سے اپنے کلام پر اصلاح لینی شروع کی۔
صحافت ۱۹۷۱ء سے بلکچھیا کلکتہ سے ماہنامہ ''شہود'' کا اجراء کیا۔
کتابیں ۱۹۷۵ء میں ''اختر تاقب'' نامی کتاب ترتیب دی۔
''دشتِ بیکراں'' اولین مجموعہ۔ ۲۰۰۰ء
اعزاز ماہنامہ انشاء نے میرے بارے میں ایک قابل قدر گوشہ شائع کیا۔
ایوارڈ : کبیر داس ایوارڈ ملا۔
قیام ۸۳-اے، بلکچھیا روڈ، کلکتہ - ۷۰۰۰۳۷

غزلیں

پھول پتوں کو سلامت نہیں رہنے دیگی
اب ہوا پیڑ کی عزت نہیں رہنے دیگی

آسمانوں کو یہ چھوتی ہوئی دولت کی ہوس
اونچے لوگوں میں شرافت نہیں رہنے دیگی

ظلم کی رُت جو یونہی چلتی رہی تو اک دن
شہر میں کوئی عدالت نہیں رہنے دیگی

ہر خد و خال کو نظارے کی دعوت اک دن
آئینہ خانوں کی عظمت نہیں رہنے دیگی

مل کے ہم رہنا بھی چاہیں تو نہیں رہ سکتے
متحد ہم کو سیاست نہیں رہنے دیگی

اب کے اِس ڈھنگ سے ہے بارشِ سازش کہ شہود
قتل کی کوئی شہادت نہیں رہنے دیگی

*

یہ میرے دور کا کیا سانحہ نہیں
کوئی مجرم کٹہرے میں کھڑا نہیں
بناتا ہوں ہمیشہ اپنا رستہ
کبھی پیچھے کسی کے میں چلا نہیں
سروں کی فصل کاٹی جارہی ہے
مگر سب چپ ہیں کوئی بولتا نہیں
زمانے کی شکایت کیا کروں میں
میرا بیٹا میرا اپنا ہوا نہیں
پکارا تو بہت تھا دوستوں کو
کسی کے گھر کا دروازہ کھلا نہیں
غریبوں کا لہو جس میں نہیں ہے
تمہارے شہر میں ایسا دیا نہیں
شہود اکساتا ہے وجدان میرا
زبردستی کا میں شاعر بنا نہیں

یہ گھر کا گھر جو کھنڈر ہوا ہے
سپاہیوں کا گذر ہوا ہے

اندھیری شب کا جو سرغنہ تھا
وہی نقیبِ سحر ہوا ہے

جب اوڑھ لی ہے ہوا کی چادر
چراغ تب معتبر ہوا ہے

ہمیں نے سچائیاں اگائیں
یہ معرکہ ہم سے سر ہوا ہے

مرا ہی سر خاک پر پڑا تھا
بلند میرا ہی سر ہوا ہے

رکھیل ہیں اُسکے اہلِ دانش
یہ مال و زر کا اثر ہوا ہے

ہوا ہے جب بھی وطن پہ حملہ
شہود سینہ سپر ہوا ہے

اُن سے انعام پاتے نہیں ہیں
ہاں میں ہاں جو ملاتے نہیں ہیں
دیکھئے جبرِ فصلِ بہاراں
پھول ہیں مسکراتے نہیں ہیں
ہے بھروسہ ہمیں بازؤں پر
ہم سفینہ جلاتے نہیں ہیں
سونے دیتے نہیں ہیں مسائل
خواب تک دیکھ پاتے نہیں ہیں
پہلے اپنی ضرورت تھی اُن کو
اب وہ ملتے ملاتے نہیں ہیں
ہنستے لب مسکراتی سی آنکھیں
اب کہیں پائے جاتے نہیں ہیں
ہے غزل میں شہود اپنا تیور
سُر کسی سے ملاتے نہیں ہیں

اُڑائیں ختم کردیں ہم کبھی ایسا نہیں کرتے
ہوا بھی تیز ہوتی ہے تو سمجھوتہ نہیں کرتے

بچھا کر اپنا سایہ سوگئے ہیں نیند جب آئی
تپش ہے دھوپ میں کتنی یہ ہم سوچا نہیں کرتے

ہمارے اشک برسانے پہ لوگوں کو شکایت ہے
مگر رونے کی ہے کیا وجہ یہ پوچھا نہیں کرتے

بہت اچھی طرح ہے ہم کو اپنے قد کا اندازہ
ہم اپنا سایہ لمبا دیکھ کر اچھلا نہیں کرتے

تمہیں روکا ہے کس نے جس کو چاہو قتل کر ڈالو
ہمارے ملک میں قاتل سزا پایا نہیں کرتے

غمِ کوزہ گراں میں ہم شہود آنسو بہاتے ہیں
مگر مٹی کے برتن میں کبھی کھایا نہیں کرتے

نظمیں

تضاد

کل دیوانوں کی ٹولی نے
اہلِ خرد کے شیش محل کو
پتھر سے مسمار کیا تھا
جس پر ہم سب چیخ اٹھے تھے
آج اُس شیش محل کے
ٹکڑے
انجانے رہگیر کے تلوے
دھار سے اپنی
کاٹ رہے ہیں
آج مگر خاموش ہیں ہم

سبز پتّے

سبز پتے
چلچلاتی دوپہر
سارا رس
پینے کی خاطر مضطرب ہیں
غالباً اُن کو نہیں اسکی خبر کہ
اُن سے پہلے بھی ہزاروں سبز پتے
اس ہوس میں
زرد ہو کر
سوگئے ہیں خاک کی آغوش میں

ماہیئے

وہ شعر جو اچھا تھا
کاٹ دیا اُس کو
نقاد کا بچہ تھا

یہ بات ہے کچھ دن کی
بوجھ تھے دھرتی کے
عزت ہے بہت جن کی

انسان وہ ڈھپ کے ہیں
عیب نہ گن بھائی
استاد ادب کے ہیں

ایک قطعہ

بات ہو علم یا سیاست کی
حد سے آگے اگر نکلتی ہے
اس حقیقت کو جانتے سب ہیں
چھوٹی مچھلی بہت اچھلتی ہے



سلیم خاں ہمراز

نام — سلیم خاں

قلمی نام — سلیم خاں ہمراز

والد کا نام — عبدالرحیم خاں (مرحوم)

پیدائش — مٹیابرج، کلکتہ - ۱۲، دسمبر ۱۹۵۸ء

تعلیم — بی۔ اے۔

پیشہ — سرکاری ملازمت

پہلا افسانہ — "سپنوں کی سزا"۔ "کہکشاں" بمبئی ۱۹۷۸ء

تصنیف — "ڈیڈ لائن" پہلا افسانوی مجموعہ عنقریب منظرِ عام پر آرہا ہے اور "ندی میں اُترتا سمندر" دوسرا افسانوی مجموعہ بھی ترتیب دے رہا ہوں۔

تخلیقات — ملک اور بیرون ملک کے تقریباً سو پرچوں میں ابتک چار سو کے قریب افسانے شائع ہو چکے ہیں اور یہ سفر اب بھی جاری ہے۔

پتہ — J-6 (فرسٹ فلور) رام نگر لین،
گارڈن ریچ (مٹیابرج)
کلکتہ - 700024
فون . (033) 469-8780

افسانہ

پتلیوں میں پگھلتا سورج

وہ چیخ نہ جانے کس کے حلق سے نکلی تھی جو میرے کان سے ہوتی ہوئی جسم میں اُتری اور خون کے ساتھ رگوں میں دوڑنے لگی تو میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، وہ خواب تھا یا حقیقت، کیسے کہوں کہ میں اس وقت خواب اور حقیقت کے درمیان معلق تھا، لیکن اُس شخص کو کبھی نہیں بھول سکتا جس کے بدن پر سفید لباس تھا۔ آنکھوں پر دراز پلکیں سایہ فگن تھیں۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کا گلاس تھا اور میرا حلق مدتوں کی پیاس سے سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔

تم پیاسے ہو، لو یہ پانی پی لو۔

بے اختیار میرا ہاتھ گلاس کی طرف بڑھا تھا لیکن وہ چیخ.......

چیخ اور وجود کے درمیان کا وقفہ صفر تھا۔ جب میری آنکھیں کھلیں تو نہ وہ شخص تھا نہ وہ پانی کا گلاس۔ میں جہاں موجود تھا اُس کے قریب ہی وہ تاریک کیپسول تھا جس کے سفر سے میں حال ہی میں واپس آیا تھا۔ اس طویل سفر میں مجھے پانی کی ایک بوند بھی نہیں ملی تھی۔ پیاس نے حلق میں کانٹے بو دیے تھے۔ آنکھوں میں دُھند سی چھا گئی تھی۔ جب میں اپنا سفر مکمل کر کے کیپسول کے دروازے پر پہونچا تھا تو مجھے وہ شخص ملا جس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا اور جس نے میری پیاس کی شدت کا اندازہ کر کے کہا تھا۔

"تم پیاسے ہو، لو یہ پانی پی لو"۔ لیکن تاریک کیپسول کا سفر ختم کر کے بھی میری پیاس ختم نہیں ہوئی تھی، پانی یہاں بھی عنقا ہے۔ حدّ نظر تک ریگ زار ہی ریگ زار ہے، طویل سفر کی تھکن اور پیاس نے میرے جسم اور ذہن کو عجیب سے اضمحلال اور کش مکش میں مبتلا کر دیا ہے، میں سوچنا چاہتا ہوں تو لگتا ہے احساس کی ساری رگیں شل ہو گئی ہیں۔ قوت فیصلہ جواب دے چکی ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پاتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ آگے بڑھوں؟ دائیں، بائیں یا پیچھے؟

ہر طرف یکساں، نیلا آسمان زمین کے قدموں میں جُھکا ہوا ہے، میں نیلے کیپسول کے بیچ قید کر دیا گیا ہوں، جس کے چاروں طرف کی دوری برابر ہے۔ میں کس طرف جاؤں۔

کون بتائے مجھے کہ یہاں میں خود اپنا راہبر بن کر آیا ہوں، یہاں مجھے خود پانی کے لئے جدوجہد کرنی ہے۔

اچانک مجھے قدموں کی چاپ سُنائی دینے لگی اور میری آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ کوئی میری طرف آرہا ہے۔ اب میں اس سے پوچھوں گا۔ کیا تاریک کیپسول کے سفر کا انجام یہی ہوتا ہے؟

کیا خود اپنی رہبری کرنے والوں کے احساس کی رگیں میری ہی طرح شل ہو جاتی ہیں۔

میں آنکھیں پھاڑ کر قدموں کی چاپ کی طرف دیکھتا ہوں لیکن کچھ نظر نہیں آتا، بس ٹپ ٹپ، ٹپ قدموں کی چاپ، سُورج نکل ہی رہا ہے۔ سایہ تب پھیلے گا جب کرنیں جسم میں گھسنے لگیں گی۔ مگر قدموں کی آواز ہی تو بیک وقت چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی ہیں اور کوئی نظر نہیں آتا صرف سناٹے کو چیرتی ہوئی ٹپ.... ٹپ.... ٹپ.... قدموں کی چاپ۔ کیا میں پہلے بھی یہ آواز سُن چکا ہوں۔ میں غور

کرتا ہوں لیکن ذہن پر کوئی لہر نہیں اُٹھتی۔

یا اللہ تو ہی رہبری کر۔ آخر وہ کون ہے جو آرہا ہے؟ کتنی دور سے آرہا ہے کہ نظر نہیں آتا؟ کیوں آرہا ہے؟ کب آئے گا؟ یہ سوال میں اپنے ذہن سے کرتا ہوں لیکن جواب میں وہی سناٹے کی بازگشت۔

میرا سر چکرانے لگا تو میں نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ قدموں کی چاپ قریب آتے آتے تھم گئی اور ساتھ ہی ایک آواز سُنائی دی۔ تم پیاسے ہو، لو یہ پانی پی لو۔

یہ آواز میری جانی پہچانی تھی، یہی آواز میں ایک بار تاریک کیپسول کے دروازے پر بھی سُن چکا ہوں۔

میں نظریں اُٹھاتا ہوں، وہی سفید پوش میرے پاس کھڑا تھا۔ اس وقت بھی اس کے لب مُسکرارہے تھے۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ لبالب ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا گلاس اور میری ہونٹوں پر جمی ازلی پپڑیاں اس کی منتظر تھیں کہ میں اس گلاس کو ہونٹوں سے لگاؤں اور غٹ غٹ ایک ہی سانس میں سارا پانی پی جاؤں۔

میں نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

مجھے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں پھر کوئی چیخ نہ گونجے اور میری آنکھیں جھپک جائیں اور پھر جب میں دیکھوں، سفید پوش پانی سمیت غائب ہو چکا ہو لیکن میں نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سفید پوش چلنے لگا۔

"سنو! تم کہاں جارہے ہو، مجھے یہ گلاس دیتے جاؤ"

لیکن اب وہ گونگا اور بہرہ ہو گیا تھا، نہ اُس کے قدم رُکے، نہ اُس نے میری بات کا جواب دیا۔

میں اس امید پر اُس کے پیچھے چلنے لگا کہ ممکن ہے کچھ دور جاکر وہ رک جائے اور گلاس مجھے دے دے۔

کئی بار میرے دل میں یہ خیال آیا کہ بڑھ کر گلاس چھین لوں، میں نے ارادے کی تکمیل کے لئے قدموں کی رفتار تیز کی۔ اُس کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ سورج اپنے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ اس کی کرنیں جب جسم میں گھس کر نمی جذب کرنے لگیں تو میری پیاس اور تھکن میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جب میں تھک کر بیٹھ جاتا تو وہ مسکراتے ہوئے گلاس میری طرف بڑھاتا۔

"تم پیاسے ہو، لو یہ پانی پی لو"۔ اور جب میں گلاس کی طرف جھپٹتا تو وہ پھر چلنے لگتا۔

سورج سر پر آگیا۔ کرنیں دماغ سے اُتر کر نمی جذب کرنے لگیں اور سایہ جسم میں گھس گیا تو میں نے سوچا اب دوڑ کر اسے قبضہ میں کرنا چاہیے۔ بوڑھا آدمی مجھ سے تیز نہیں بھاگ سکتا۔ اس طرح میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا، نظریں ملیں تو وہ بولا۔

"تم پیاسے ہو، لو یہ پانی پی لو"۔ تمہاری ایسی کی تیسی۔ میں نے جھلا کر اس پر چھلانگ لگادی، لیکن وہ آدمی تھا یا چھلاوہ، وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا، اس کی مسکراہٹ نے میری جھلاہٹ میں اضافہ کر دیا اور پھر میں پے درپے چھلانگ لگاتا چلا گیا۔ کئی بار تو مجھے ایسا لگا کہ وہ میری گرفت میں آہی گیا ہو لیکن وہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کر کے فاصلہ برقرار رکھتا۔

سورج ڈھلنے لگا اور میں چھلانگ لگاتے لگاتے مضمحل ہو گیا، لیکن وہ بوڑھا نہ جانے کس مٹی سے بنا تھا۔ اتنی دوڑ دھوپ کے بعد بھی وہ تر و تازہ نظر آرہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اب بھی مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"رک کیوں گئے، بڑھو اور یہ گلاس لے لو، تم پیاسے ہو نا؟"

میرے پاؤں لہو لہان ہو گئے تھے جس سے خون بوند بوند رس کر سڑک کی دھول میں جذب ہو رہا تھا۔ میرا جسم اس لئے حرکت کر رہا تھا کہ وہ حرکت کا عادی ہو گیا تھا، ورنہ پیاس اور تمام دن دوڑنے کی تھکن نے میرا وہ حال کر دیا تھا کہ اگر میں خود کو آئینہ میں دیکھتا تو پہچاننا مشکل ہوتا۔ احساس بے بسی اور مایوسی نے میرا عجیب حال کر دیا تھا۔ پھر یہ خیال بھی تھا، تھوڑی دیر بعد سورج ڈوب جائے گا، اندھیرا پھیل گیا تو میں اس شخص کا تعاقب کیسے کروں گا، کیسے اپنی پیاس بجھاؤں گا۔ کیسے۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔۔۔۔

"سنو! رک جاؤ، یہ گلاس مجھے دے دو"۔

لے لو، میں تو خود تمہیں دینا چاہتا ہوں، تم آگے بڑھو بھی۔ اور سورج غروب ہو گیا۔

اندھیرا پھیل گیا۔ وہ شخص تو اب نظر نہیں آرہا تھا لیکن گلاس تو اندھیرا ہوتے ہی روشن ہو گیا تھا۔ میں نے اسے حاصل کرنے کی آخری کوشش کرنی چاہی، لیکن ٹھیک اُسی وقت نہ جانے کس چیز سے ایسی ٹھوکر لگی کہ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اوندھے منہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ تب وہ شخص رکا اور دھیرے دھیرے چل کر میرے پاس آیا۔ کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا، کہیں میں اٹھ کر اس پر جھپٹ نہ پڑوں، لیکن جب میرے بدن میں حرکت نہیں ہوئی تو اس نے اطمینان سے سر ہلایا۔

پھر اس نے تین بار تالی بجائی۔ تالی کی آواز ختم ہونے سے پہلے جانے کہاں سے بہت سے سائے نکل آئے، ان کے ہاتھوں میں تختیاں تھیں۔

سایوں کو دیکھ کر اس نے سر ہلایا اور جھک کر گلاس میرے بائیں طرف رکھ دیا۔

اور دوسرے ہی لمحے آنے والے سائے مجھے تختیوں سے ڈھک رہے تھے۔

چاہتا ہے تمہارا کلیجہ چیر ڈالوں۔ ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر تمہارا گوشت چیل کوؤں کو کھلا دوں۔ تم جانتے ہو تم خونی ہو قاتل ہو۔ تین بے گناہوں کا خون تمہاری گردن پر ہے۔ میں تمکو قانون کے حوالے نہیں کرونگی۔ کیونکہ اس سے میری رسوائی کے چرچے پھیلتے ہی جائینگے۔ میں خود تمہیں تمہاری تعمیر کردہ دوزخ کی آگ میں جھونک دونگی۔ وہاں تم تل تل کر کے روز آہستہ آہستہ جلو گے اور مرو گے۔ خدا بھی تمہیں اس گناہ عظیم کی سزا ضرور دے گا۔ تم بھی میرے باپ کی طرح تڑپ تڑپ کر مرو گے۔ انکی موت کا سایہ تمہارا پیچھا کرتا رہے گا۔ تم چین کو ترپو گے۔ تمکو کبھی چین نصیب نہ ہوگا۔ میرے غم اتنے تھے کہ سہارنے مشکل ہو رہے تھے۔ کوئی غم بانٹنے والا نہ تھا۔ ان حالات میں اکیلی تنہائیوں کا سفر طے کرنا میرے لئے بہت دشوار ہو رہا تھا۔ میری راہوں میں تو انگارے بکھرے ہوئے تھے۔ ذلت کی راہ کی انتہا تو موت ہے اور میں موت کا انتظار کر رہی تھی۔

ہسپتال میں زہر کی گولیاں ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی کہ بچی رو پڑی۔ اس کی آواز نے میرے شکستہ دل میں ممتا کی جوت جگادی۔ مردہ دل میں جان سی ڈال دی۔ ممتا نے سوال کیا تیرے مرنے کے بعد اس بچی کا کیا حال ہوگا۔ کس کے سہارے چھوڑ کر جارہی ہے اس شیطان کے جس نے تجھے ذلت اور رسوائی کے گڈھے میں دھکیل دیا۔ اس کا حال تیرے حال سے بھی بدتر ہوگا۔ تیرے دامن کے داغ تو موت بھی نہیں مٹاسکتی۔ تو ماں ہے اس کی حفاظت کرنا تیرا اول فرض ہے۔ میں صلیب پر لٹکی ہوئی بھی جینے کے لئے مجبور ہوگئی۔ میں ہار گئی۔ ممتا جیت گئی۔

آپ تو جانتی ہیں ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول کر لوگ کتنا فریب دے سکتے ہیں۔ کرشن تھوڑی انگریزی بول لیتا ہے۔ ڈاکٹر کی جعلی ڈگری بھی حاصل کرلی ہے۔ نسخہ لکھنا تو آتا نہیں ہے۔ مریضوں کو گولیاں اور دوائیاں دیتا ہے۔ مریض کہتے ہیں اسکے ہاتھ میں شفا کی چھڑی ہے۔ جادو ہے ہاتھوں میں۔ ذرا سا چھو بھی دے تو مرض کوسوں دور بھاگ جاتا ہے۔ بہت عزت اور نام کمارہا ہے۔ دولت کی جھنکار ہے۔

میں نے کہا اتنی دولت ہے پھر تمکو یہ نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بولا ضرورت ہے میڈم۔ دراصل وہ ڈاکٹر بنکر اپنے ماضی کو بھلا دینا چاہتا ہے۔ وہ بھلا دینا چاہتا ہے اپنے دونوں بچوں کو اپنی بیوی کو اور اس جھونپڑی کو جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ وہ انہیں کبھی یاد نہیں کرتا۔ لیکن میں اسکو ایسا کرنے بھی نہیں دونگی۔ اسکی بیوی ہو کر میں ہسپتال میں صفائی والی کا کام کروں اس سے زیادہ شرم کی بات اس کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ سخت سزا اس کو بھوگنی پڑے گی۔ میں کون تھی۔ کیا تھی۔ کوئی نہیں جانتا۔ میرے ماں باپ۔ گھر۔ عزت۔ بچپن کی سہیلیاں اس نے سب کچھ چھین لیا۔ اپنے سماج کے لئے تو میں کب کی مرچکی ہوں۔ اس نے مجھے جڑ سے اکھاڑ دیا۔ جڑوں کے بغیر درخت کیسے ہرے رہ سکتے ہیں۔ میری زندگی تو لق و دق صحرا کردی ہے۔ میرا چین درہم برہم کردیا ہے۔ پھر میں اس کو عزت اور وہ بھی جھوٹی عزت سے کیوں جینے دوں۔ میں اسکی خوشیاں کبھی پوری نہیں ہونے دونگی۔ ایک دن وہ اپنی فریبی زندگی سے عاجز آہی جائے گا۔ اور اسکی جھوٹی شان اور عزت کا مینار چکنا چور ہو جائیگا۔

وہ خاموش ہوگئی۔ کچھ وقفہ کے بعد بولی میں درد سہتے سہتے تھک گئی ہوں۔ کوئی میرا ہمدرد نہیں، ساتھی نہیں۔ آج آپ کی آنکھوں میں رحم اور پیار دیکھا تو دل کے زخم پھٹ پڑے۔ اندر ہی اندر ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ درد برداشت نہ کرسکی تو یہ خون کے آنسو بہہ نکلے۔ داستان غم زباں پر آگئی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہا تمہاری کہانی تو بہت ہی دردناک ہے۔ میرا تو دل دہل گیا۔ بیتی کو تو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ بھلا نہیں سکتا۔ خوش رہنے کی کوشش تو کرسکتی ہو۔ اسکے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بہت اداس ہو کر بولی جسکی زندگی میں ذلت کی گہری تاریکیاں ہوں، جسے روشنی کی ایک کرن دور دور تک نظر نہ آئے وہ کیا جانے خوشی کیا چیز ہے۔ یوں تو اس نے مجھے دوائی خانے ہی میں مصلوب کردیا تھا۔ لیکن ان سانسوں کا تانا بانا آج تک جاری ہے۔ بس سمجھ لیں میں دکھوں کا چلتا پھرتا پہاڑ ہوں۔ اور آہستہ آہستہ موت کی طرف کھسک رہی ہوں۔

میں نے اس سے کہا تم ہر وقت مرنے کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ خدا نے ہر انسان کو کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ وہ اٹھی اور بولی میں بدنصیب کیا کسی کے کام آسکتی ہوں۔

کئی برسوں کے بعد وہ مجھے ملی۔ اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے بولی یہ مرد عورتوں کو چین سے جینے نہیں دیتے۔ کوئی بھی خوبصورت جوان لڑکی دیکھی اور انکے دل مچلنے لگتے ہیں۔ ہر لڑکی کو گندی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس رات کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ سڑکیں سونی پڑی تھیں۔ ہم بس کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک ایک ٹیکسی رکی۔ دو آدمی اترے اور پونم کو ٹیکسی کے اندر کھینچنے لگے۔ ہم زور سے چلائے کسی مرد نے آگے بڑھ کر مدد نہیں کی۔ عورتوں نے ملکر ان آدمیوں پر حملہ کردیا۔ انہوں نے چاقو سے وار کیا۔ ہم نے پونم کو ان بدمعاشوں کے چنگل سے بچالیا۔ اگر ہم کامیاب نہ ہوتے تو پونم کا شوہر دوسری شادی کرلیتا اسکے دو بچے بے ماں کے رہ جاتے۔ میں نے کہا اب اپنی زندگی کی اہمیت سمجھ میں آئی۔ تم نے پونم کی عزت بچالی۔ اسکے خاندان کو برباد ہونے سے بچالیا۔ تم واقعی بہت

بہادر اور ہمت والی ہو۔ اپنی زندگی کی جنگ تو لڑ ہی رہی ہو۔ دوسروں کے لئے بھی اپنی جان جوکھوں میں ڈالتی ہو۔ اسکی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بولی اُس وقت اتنی ہمت اور زور ہوتا تو اپنے آپ کو بچا لیتی۔ چھوٹی تھی۔ کچھ بھی نہ کر سکی۔ ذلت کی زندگی جیئے جا رہی ہوں۔

میں نے اس کی بیٹی کے لئے پوچھا۔ پہلی بار آنکھوں میں جگنو کی سی چمک دیکھی۔ بولی میڈم وہ بہت خوبصورت اور ذہین ہے۔ پری جیسی لگتی ہے۔ ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔ بھلے ڈاکٹر بن جائے۔ ہے تو صفائی والے کی بیٹی۔ اس سے شادی کون کرے گا۔ شادی کے وقت تو لوگ خاندان کی جڑوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ سسرال والے ہزاروں سوال کرتے ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا خدا نے انسان بنائے ہیں اور جوڑے بھی وہی بناتا ہے۔ اس کے گھر میں ذات پات کا جھگڑا ہی نہیں ہے۔ وہی سب کا مالک ہے۔ دور دراز ملک سے شہزادہ آئے گا اور تمہاری پری کو لے جائیگا۔ وہ مسکرادی۔

کچھ ہفتوں کے بعد وہ مجھے سڑک پر ملی۔ بولی کرشن کو اسکے جرم کی سزا مل گئی۔ گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اچانک بس آئی اور اسے دور تک کھینچ کر لے گئی۔ اسکا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا۔ سڑک پر خون میں لپٹا پڑا تھا۔ درد میں تڑپ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رُک رُک کر بولا مجھ جیسے گنہگار کے لئے یہ سزا بھی کم ہے۔ اس دن کے بعد میں ہر پل تڑپتا ہی رہا ہوں۔ میں تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اور وہ زور سے چلایا اور اسکی سانسیں بند ہو گئیں۔

میری زندگی کا بھیانک دور گزر گیا اور میری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ میں اسکو معاف نہیں کر سکی۔ اسکی موت بھی میرے دل کی جلن کو ٹھنڈک نہیں پہنچا سکی۔ میں نے دوسرے دن نوکری چھوڑ دی۔ لیکن نہ جانے یہ دیا بنا تیل کے بھی کیسے جلتا رہا۔ زندگی میں عورت کو پیار کرنے والا ہمسفر چاہیئے۔ میں دلہن بنتی۔ مہندی لگتی۔ باجے بجتے۔ عزت سے اپنے گھر جاتی۔ آدمی کی محبت پانا عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ اس شخص کو میں کیسے معاف کر دوں جس نے مجھے بیہوش کر کے میری عزت لوٹ لی۔ مجھے تو نصیب میں بس دکھوں کا خزانہ ہی ملا۔

وہ پھر رونے لگی۔ میں نے اسکی خوشیوں کے لئے ایک چھوٹی سی دعا دل میں کر ڈالی۔

کچھ مہینوں کے بعد وہ مجھے بازار میں ملی۔ ہنس کر بولی میڈم پری کو شہزادہ لے گیا۔ وہ خود شادی کی بات کرنے میرے پاس آیا تھا۔ اسکا نام اور پتہ سنکر تو میرے جسم میں آگ لگ گئی تھی۔ جی چاہا اسے گھر سے نکال دوں۔ وہ ان سماج کے رکھوالوں میں سے ایک کا بیٹا تھا۔ جنہوں نے میرے ماں باپ کو اتنا ذلیل کیا کہ دونوں نے مجبور ہو کر موت کو گلے سے لگا لیا۔ وہ میرے سامنے بھکاری بنا کھڑا تھا۔ میں نے کہا یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ ہم تمہاری طرح اونچی ذات کے نہیں ہیں۔ وہ بولا میں ذات پات نہیں مانتا۔ میں امریکہ میں رہتا ہوں وہاں تو گھر صاف کرنے والی بھی موٹر میں آتی ہے۔ پہلے میرے ساتھ بیٹھکر چائے پیتی ہے پھر کام کرتی ہے۔ یہاں لوگ ابھی تک جہالت کے جال میں پھنسے ہیں۔ میں نے کہا یہ تمہاری سوچ ہے تمہارے گھر والے کبھی اس رشتے کو قبول نہیں کرینگے۔ پہلے جا کر اپنے گھر والوں سے مشورہ کرو۔ وہ اداس ہو کر بولا میرا تو اپنا کوئی بھی نہیں بچا۔ پچھلے سال گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ بڑی بیدردی سے میرے ماں باپ کو قتل کر دیا۔ میں نے سوچا اس سے اچھا لڑکا کہاں ملے گا۔ میرے محلے کے سب سے رئیس کا بیٹا ہے۔ میری ذات کا ہے۔ اس نے رجسٹری کروائی اور دو دن کے بعد دونوں امریکہ چلے گئے۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ میری بیٹی کو خوشیاں مل گئیں۔ لڑکا بہت شریف اور محبت کرنے والا ہے۔

میں نے اس سے کہا اب کیا کروگی۔ وہ مسکرا کر بولی زندگی کے ہر موڑ پر ایک نیا راستہ ضرور دکھائی دیتا ہے۔ ابھی تک تو اپنی بیٹی کے لئے زندہ تھی۔ اب باقی کی زندگی ان بے سہارا۔ بے گھر بیٹیوں کے نام لکھ دی ہے جو مردوں کے ہاتھوں میری طرح برباد ہو چکی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو کہیں گھر نہیں ملتا۔ میرے پتاجی بہت دولت چھوڑ گئے ہیں۔ انکی زمین پر اسی محلے میں ان ٹھکرائی ہوئی لڑکیوں کے لئے ایک گھر بنا رہی ہوں۔ اسکول بناؤنگی۔ میرے پتاجی کا گھر ان بیگناہ لڑکیوں کا سائبان ہوگا۔ میں اس راستے سے گزری ہوں۔ مجھ سے زیادہ ان کے دکھ اور کون سمجھ پائے گا۔ ایک لڑکی کی بھی زندگی سنوار دوں تو اپنے سارے غم بھول جاؤنگی۔ میں نے کہا یہ سچ ہے جو سولی پر لٹکتے ہیں وہی مسیحا ہوتے ہیں۔ میری دعا ہے خدا تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔

پہلی بار میں نے اسکے چہرے پر سکون اور خوشیاں دیکھی تھیں۔

افسانوی مجموعہ

"ساوتری گوسوامی کے افسانے"



یہ بھی خیال نہیں رہا سڑک کے سب لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ہانپتی کانپتی گھر پہنچی۔ ٹھنڈا پانی پیا تو راحت ملی۔ ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور میں کام میں الجھ گئی۔ پھر یہ واقعہ بالکل بھول گئی۔

اس قیامت کے دن میں دوائی لیکر جوں ہی پلٹی اس نے میرا ہاتھ پھر تھام لیا۔ کہنے لگا تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں نے غصہ سے ہاتھ جھڑک کر کہا مجھے تم جیسے بیہودہ لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے۔ پلک جھپکتے ہی وہ شیر کی مانند میرے اوپر لپکا اور مجھے دبوچ لیا۔ میں پوری قوت سے چلائی۔ میری آواز دیواروں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ انتہائی خوف کا عالم تھا۔ کوئی میری مدد کو نہیں آیا۔ بہت ہاتھ پیر مارے اس کے پنجوں سے رہائی نہیں ملی۔ اس نے میرے چہرے پر کوئی خوشبودار چیز چھڑکی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دھندلاہٹ میں وہ مجھے ایک خونخوار شیر کی مانند خوفناک نظر آرہا تھا۔ پھر مجھ پر کیا بیتی مجھے کچھ نہیں معلوم۔ جب ہوش آیا تو اس کی خوفناک صورت دیکھ کر میں زور سے چیخ پڑی۔ میں رو رہی تھی اور وہ حیوان ہنس رہا تھا۔ میں اٹھ نہ سکی تو اس نے سہارا دیا۔ اپنی صورت آئینہ میں دیکھ کر دہشت سے دیر تک چلاتی رہی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور میرے کپڑے شیاملی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ میں تو تباہ ہو چکی تھی۔ اور مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی۔

اس نے پھر سے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اب مجھ میں چلانے کی قوت بھی نہ تھی۔ میرا حال تو اس نازک سی تتلی سا تھا جسکو سنگدل لڑکے نے انگلیوں میں دبا کر چھوڑ دیا ہو۔ تتلی کے پر ٹوٹ چکے تھے۔ لڑکا تتلی کو زمین پر تڑپتا دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ تتلی اڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ ظالم لڑکا تتلی کی بے بسی اور اپنی فتحیابی پر خوش ہو رہا تھا۔ شاید اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ رکشہ سے گھر پہنچی۔ شدت خوف سے جسم لرز رہا تھا۔ اماں نے میرے پاؤں کی آہٹ سنتے ہی کہا تیرے باپو کا حکم ہے کہ سورج ڈوبنے سے پہلے گھر لوٹ آیا کر۔ تو جانتی ہے میں دل کی مریض ہوں گھبراہٹ سے دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔ اماں سے کچھ بھی بتانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ نہا دھو کر ان کے پاس گئی۔ درد کی شدت سے جسم ٹوٹا جاتا تھا۔ میری کیفیت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں جلدی سونے چلی گئی۔ ڈر کا جذبہ ایسا طاری ہوا کہ رات بھر آنکھیں پھاڑے چھت تاکتی رہی۔ مجھے خبر بھی نہ تھی کہ اس شام میری زندگی کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈھل چکا تھا اور پھر کبھی سحر نہ ہوگی۔ میں تو شادی کی اہمیت بھی نہیں سمجھتی تھی۔ بس اتنا جانتی تھی بڑی دھوم دھام سے بارات آتی ہے۔ دلہن کو خوب سنوارا جاتا ہے۔ شہنائی بجتی ہے۔ چاروں طرف پھولوں کی مہکار ہوتی ہے۔ سات پھیروں کے بعد ڈھیر سارا جہیز لے کر دلہا راجا اپنی دلہن کو لے جاتا ہے۔ آگے کیا ہوتا ہے اس کی خبر نہ تھی۔

میری طبیعت بہت خراب رہنے لگی۔ میں روتی اور سوچتی ضرور میرے ساتھ کچھ برا ہوا ہے۔ کیا ہوا تھا۔ جانتی نہ تھی۔ میں نے اماں سے کچھ بھی نہیں کہا اپنی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ انکی باتیں سنکر تو میری جان ہی نکل گئی۔ بڑی بھیانک حقیقت میرے سامنے تھی۔ شدید خوف سے میں کانپ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کئی سوال کئے۔ ایک کا بھی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ جب انہوں نے سب کچھ کھل کر بتایا تو میں حیران و پریشان پھٹی پھٹی نظروں سے اس کو گھورتی ہی رہ گئی۔ آنسو بہتے رہے۔ پھر یکایک میری سمجھ میں آیا کہ اس قیامت کے دن میں ہنستی کھیلتی چودہ سال کی نادان لڑکی دوائی خانے گئی تھی۔ اور کچھ ہی گھنٹوں کے بعد۔ بے انتہا درد لئے شرم و حیا سے لدی لٹی عورت اس دروازے سے برآمد ہوئی تھی۔ گھبراہٹ سے میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا زمین پھٹ گئی ہے۔ اور میں زمین میں دھنستی جا رہی ہوں۔ ڈاکٹر نے اور بہت کچھ پوچھا۔ میں کچھ بھی سمجھ نہیں پائی اور پھر بے بسی اور دکھوں سے لپٹی میں زور زور سے رونے لگی۔ ڈاکٹر بہت نیک اور مہربان دل کی ہیں۔ میری حالت میری بے گناہی کا ثبوت تھی۔ وہ میرے حال پر افسوس کر رہی تھی۔ انکا ہمدردانہ سلوک دیکھکر میں نے سارا قصہ ان کو سنایا اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ میری مجبوری کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ وہ بولیں ان مردوں کی ہوس کی ماری کئی برباد لڑکیاں انکے پاس آچکی تھیں۔ دو نے تو خودکشی کرلی۔ کرتیں بھی کیا۔ یہ مرد شادی تو کرتے نہیں۔ ان بیچاریوں نے اپنے دکھوں سے نجات پالی۔

مجھ میں اب بابا کے سامنے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ سڑک پر کھڑی سوچ رہی تھی اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ میں سیدھی دوائی خانے گئی۔ وہ سنکر بہت خوش ہوا۔ میں غصہ سے ابل رہی تھی اور وہ بے غیرت ہنس رہا تھا۔ بولا یقین کرو میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ بہت چاہتا ہوں تمکو۔ تمکو پانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ میرا جی چاہا اسکا منہ نوچ لوں۔ میں تو غصہ سے سلگ رہی تھی۔ تڑک کر حقارت سے بولی اسکو تم محبت کہتے ہو۔ محبت کرنے والے جان دے دیتے ہیں لیکن ایسی نیچ حرکتیں کبھی نہیں کرتے۔ تم جیسے بدکار۔ ہوس پرست انسان کا جب ضمیر مر جاتا ہے تو وہ نیک اور بد کی پہچان نہیں کر سکتا۔ وہ لاپرواہی سے بولا۔ اب تم جو چاہو کہو اب تو تم میری ہو میں نے کہا میں اب ایک زندہ لاش ہوں۔ لاشوں پر کسی کا حق نہیں ہوتا۔ انکو تو جلا دیتے ہیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اور کھینچتا ہوا پاس والے مندر لے گیا۔ اسکے پھولوں کا ہار میرے گلے میں لعنت کا طوق بن گیا۔ جبراً میں

اسکی بیوی قرار دے دی گئی۔ اس صورتحال میں مجھے اور کوئی دوسرا راستہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

گلی کوچوں کو پار کر کے اس کے گھر پہنچے۔ اسکے دو بچوں اور بیوی نے رو رو کر میرا استقبال کیا۔ وہ بیچاری نفرت کی آگ میں جل رہی تھی اور میں شرمسار مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ منٹوں میں اسکے چھوٹے سے گھر میں عجیب سے لوگوں کی بھیڑ جم گئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا سڑکوں اور گھروں کی صفائی کرنا انکا پیشہ تھا۔ وہ سب شاید میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہم دو بے زبان عورتیں جو اسکے کھونٹے سے بندھی تھیں زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس کو جان سے مار ڈالونگی لیکن اس کی بیوی کو تڑپتے دیکھ کر میں نے ارادہ بدل دیا۔ سوچا سزا مجرم کو دینا چاہئے نہ کہ ان دو معصوم بچوں کو اور اس بے بس عورت کو جسکے شوہر نے اسے منجدھار میں ڈوبنے کو چھوڑ دیا ہے۔ میری جان نہایت غمگین تھی۔ سوچا کہیں بھاگ جاؤں پر میں بد نصیب غموں کی ماری جاتی بھی کہاں۔ رات بیٹھے بیٹھے کاٹ دی۔ صبح ہوتے ہی وہ مجھے دوسرے مکان میں لے گیا۔ میں اس کا بورڈ دیکھکر حیران تھی۔ وہ فریبی کمپاؤنڈر سے ڈاکٹر کرشن بن گیا تھا۔

میں گھر نہیں پہنچی تو فی الفور یہ سنسنی خیز خبر ساری نواحی میں پھیل گئی۔ محلے میں تہلکہ مچ گیا۔ میری کھوج شروع ہو گئی۔ بات چھپنے والی تو تھی نہیں۔ مندر کے پنڈت نے سب کچھ بتادیا۔ یہ بھی بتایا کہ کرشن مجھے زبردستی کھینچ کر لے گیا تھا۔ کسی نے میری مجبوری کو نہیں سوچا۔ محلے کے لڑکوں نے دوائی خانہ توڑ پھوڑ ڈالا۔ دوسرے دن جب اس پر حملہ کیا تو بزدل نے اپنی جان بچانے کے لئے الزام میرے سر لگا دیا۔ سر بازار بڑے غرور سے بولا میں اسے نہیں لے گیا وہ ہی میرے پیچھے ہولی تھی۔ جاکر اپنے محلے کی لڑکیوں کو سمجھاؤ۔ میرے پیچھے پیچھے گھومتی ہیں۔ سنتے ہی لڑکوں کے آگ ہی تو لگ گئی۔ میرا گھر گھیر لیا۔ میرے پتا جی کا سر تو پہلے ہی شرم سے جھک گیا تھا۔ کسی سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ آپ تو جانتی ہیں ہمارا سماج کسی کو معاف نہیں کرتا۔ مجھ جیسی مجبور بے کس اور بے گناہ کو بھی نہیں۔ سماج کے رکھوالوں نے میری مجبوری کی سزا میرے بے قصور ماں باپ کو دی۔ انکا حقہ پانی بند کر دیا۔

صفائی والے کی بیوی کا لیبل تو اس نے میری پیشانی پر لگا ہی دیا تھا۔ وہ میرے سامنے آیا۔ جی چاہا اسکو جان سے مار ڈالوں۔ پھر اسکی بلکتی بیوی اور دونوں معصوم بچوں کی آنسو بھری آنکھیں میری راہ میں حائل ہو گئیں۔ میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ مجھے بچوں سے بیحد پیار ہے۔ ایک بچہ میری کوکھ میں سانسیں لے رہا تھا۔ اسکی دھیمی سی آواز میرے دل تک پہنچتی تھی۔ مجھے بچالو۔ مجھے جینے دو۔ اس آواز نے مجھے خودکشی نہیں کرنے دی۔ اور جینے پر مجبور کر دیا۔ میں سر تا پا آگ کا گولا بن گئی تھی۔ وہ میرے قریب آیا۔ میں پیچھے کھسکی اور زور سے کہا اب میں وہ ناتواں اور نادان لڑکی نہیں رہی جسکو تم نے برباد کیا تھا۔ تم نے میری معصومیت پر ڈاکہ ڈالا ہے، اس جہنم کی آگ میں تمکو بھی جلنا ہوگا۔ شاید تمکو نہیں معلوم انسان کا مرتبہ تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن تم تو انسان ہی نہیں ہو۔ انسان کی انسانیت ہی مر جائے تو اسکی حیثیت ایک جانور جیسی رہ جاتی ہے۔ دنیا والے تمہیں ایک شریف اور مہربان انسان سمجھتے ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو بتاؤں کہ باطن میں تم کتنے زہریلے انسان ہو۔ مجھے بیہوش کر کے تم نے میرے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا ہے اس کے لئے خدا تمکو بہت سخت سزا دے گا۔ تم نے ایک ہنستی کھیلتی لڑکی کا خون کر دیا۔ میری اور میرے ماں باپ کی عزت خاک میں ملا دی۔ اب میرے پاس کھونے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ اگر تم اپنی عزت برقرار رکھنا چاہتے ہو تو میرے سامنے آنے کی جرأت کبھی نہیں کرنا۔ تمہارا یہ کاغذی محل میں پل بھر میں پھونک ڈالوں گی۔ اسکی نظریں جھک گئیں۔ شاید پہلی بار اس نے اپنے جرموں کا احساس کیا تھا۔

لڑکوں نے اس کے گھر کا پتہ لگا ہی لیا۔ جب ذات کا پتہ چلا تو میرے پتا جی کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہی۔ پل بھر میں محلے والے انکی نیکیاں بھول گئے۔ جو انکے رحم و کرم پر پلتے تھے انہوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ سب نے ایک آواز ہو کر کہا جو اپنی ہی بیٹیوں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر نہیں رکھ سکتے انہیں شریفوں کے محلے میں رہنے کا حق نہیں۔ میرے بابا میری بیمار ماں کو لیکر کہاں جاتے۔ وہ جہاں بھی جاتے میری رسوائی کے چرچے ان سے پہلے پہنچ جاتے۔ دنیا ان دونوں کے لئے بہت چھوٹی ہو گئی تھی۔ پتا جی اپنی ذلت و خواری برداشت نہیں کر سکے۔ اس رات دونوں نے آگ لگا کر اپنے دکھوں سے چھٹکارا پالیا۔

کوئی محسوس بھی نہیں کر سکتا مجھ پر کیا بیت رہی تھی۔ جب مجھے پتہ چلا اسکی لگائی آگ میں میرے والدین بھی بھسم ہو گئے تو میری برداشت کی حدیں ٹوٹ گئیں۔ دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لگتا تھا میرے مرنے کی نوبت آگئی ہے۔ ہر سانس پر گماں ہوتا تھا کہ یہ آخری سانس ہے۔ لیکن ان سانسوں پر بھی تو بنانے والے کا اختیار ہے۔ اور مجھے تو بہت رسوائی اور غم اٹھانے باقی تھے تو یہ سانسیں رکتیں کیسے۔ میں تو بالکل پاگل سی ہو گئی تھی۔ بابا کی چوکھٹ سے دور تھی لیکن ان کے دل سے تو دور نہیں تھی۔ اب میرے بارے میں سوچنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا آسمان اور زمین ٹل جائینگے لیکن تم جیسے فریبی بدکار انسان کی بدی ہمیشہ قائم رہے گی اور دوسرے انسانوں کو برباد کرتی رہے گی۔ مجھے تم سے بیحد نفرت ہے۔ جی

سمیت مٹاڈالا حرف غلط کی طرح! وہ بہت خوش تھا کہ آسمان پر اُس کے بابا کی روح کو آج بڑا سکون ملا ہوگا!--- لیکن، وہ زیادہ دیر خوش نہ رہ سکا۔ اس کے کانوں نے سنا۔ دوسرے گاؤں میں مانگانام کے دو اور اشخاص موجود ہیں، اپنی تمام نشانیوں کے ساتھ۔ مانگانام ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔ خون کھول اٹھتا تھا۔ ان کے خلاف بچپن ہی سے سُن سُن کے اس کے دل میں زہر بھر گیا تھا۔ نفرت کا زہر! وہ تڑپ اُٹھا اور پھر کسی طرح انھیں بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک دن پھر معلوم ہوا کہ تیسرے گاؤں میں بھی مانگانام کے کچھ ملیچھ ہیں۔

پھر کتاب کے کئی اوراق غائب تھے۔

آگے پڑھنا شروع کیا آج سردار کی برسی ہے۔ اس کے بڑے سے سنگی بت کے ارد گرد قبیلے کے مرد، عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے زرق برق لباس میں ملبوس، اپنے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کا ہار لئے صبح سے موجود تھے۔ اور ان کی مضطرب آنکھیں رانگا کے دروازے پر لگی ہیں۔ کب دروازہ کھلے۔ کب وہ باہر آئے۔ قاعدے کے مطابق بت کے گلے میں پہلا ہار اُسی کو ڈالنا تھا

دھوپ سروں پہ چڑھ آئی۔ رانگا اپنے مکان سے باہر نہیں آیا تو مجمع میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ چند بڑے بوڑھوں نے ایک خالی گوشے میں جاکر آپس میں کچھ صلاح ومشورے کئے۔ پھر ایک بہت ہی بوڑھا شخص دھیرے دھیرے چل کر اس کے بند دروازے کے قریب گیا۔ اور نہایت ادب واحترام سے آواز دی۔ "سردار، مبارک گھڑی بیتی جارہی ہے۔ تشریف لائیے اور " تبھی دروازے کے پٹ دھڑام سے کھلے۔ اور مجمع میں موجود تمام افراد حیران رہ گئے۔ خلاف توقع آج رانگا کی آنکھوں سے خوشی اور عقیدت کے پھول برسنے کے بجائے نفرت اور غصے کے شعلے لپک رہے تھے۔ چہرے پر محبت کی جگہ کراہیت تھی۔ اور ہاتھوں میں پھول مالا کے بدلے بھاری سا پھاؤڑا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے بڑھا اور بُت کے سر پر پوری قوت سے پھاؤڑا دے مارا۔ بُت کا سر دور جاگرا۔ پھر اسی شدّت سے دائیں بائیں کراری ضربیں لگائیں اور بُت کے آشیر واد دینے کے انداز میں اٹھے ہوئے دونوں ہاتھ زمین پر آرہے ... تب تک کچھ جوانوں نے بڑھ کر رانگا کو زیر کرلیا۔ "یہ کیا کر رہے ہو سردار؟؟ یہ تمہارے بابا ہیں "

"نہیں!" وہ غصے میں جھاگ اُگلتے ہوئے بڑے زور سے چیخا۔ "یہ میرا باپ نہیں۔ میرا سب سے بڑا دشمن ہے یہ" پھر سسکیاں بھرتے ہوئے بولا۔ اس نے کبھی مجھے محبت کی تعلیم نہیں دی۔ صرف نفرت کرنا سکھایا نفرت! اس نے میرے اندر نفرت کی ایسی آگ بھر دی کہ میں ایک پل بھی چین کا سانس نہ لے سکا۔ برسوں سے جل رہا ہوں۔ اور شاید مرنے کے بعد بھی یہ آگ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ "

ظفر نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی اور سامنے پھیلے ہوئے اخبار کی سُرخیوں میں ڈوب گیا۔

فراغ روہوی

کا

ماہیوں کا مجموعہ



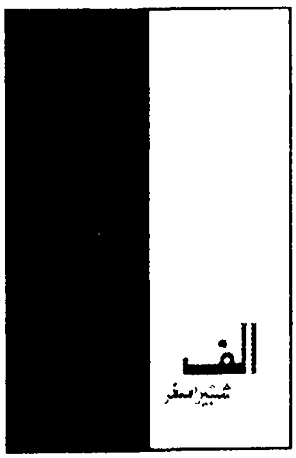
چھیّاں چھیّاں

مشتاق انجم کا دوسرا

افسانوی مجموعہ



شبیر اصغر کا افسانوی مجموعہ



الــف

نام : ساوتری گوسوامی

ایک بھرے پُرے خاندان میں میرا جنم ہوا جہاں محبت اور احترام کی فضا میں ہم گیارہ بھائی بہن سانسیں لیتے تھے۔ میرے والد عیسائی پادری تھے اور والدہ ٹیچر اور سوشل ورکر۔ وہ دونوں اصلاً گجرانوالہ کے خالص سکھوں میں سے تھے۔ بعد میں عیسائی ہو گئے تھے۔

میں ابھی گیارہ برس کی بھی نہ تھی کہ اچانک میری والدہ چل بسیں۔ ان کو اپنے بچوں کے مستقبل کی بیحد فکر تھی۔ بسترِ مرگ پر ہدایت دی کہ میری بچیوں کو لکھنؤ کے مشہور امریکن انگلش میڈیم اسکول کے ہوسٹل میں بھیج دیا جائے۔ ان کی ناگہانی موت کا مجھے بہت گہرا صدمہ ہوا۔

اردو زبان سے مجھے شروع ہی سے لگاؤ تھا۔ لال باغ اسکول میں منشی جی (ماسٹر صاحب) کے زیر نگرانی یہ شوق روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ ہندوستان کا بٹوارہ کیا ہوا ہماری مقدس زمین دوزخ بن گئی۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ میں نے سڑکوں پر قتلِ عام ہوتے دیکھا۔ چاروں طرف سے درد بھری چیخیں سنائی دیتیں جو میرے دل کے کونے کونے میں سما گئیں۔ خدا کی مخلوق کی یہ حالتِ زار دیکھ کر میں نے نرسنگ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ تیرہ سال دل و جان سے مریضوں اور غریبوں کی خدمت کرنے سے دل کو تسلی اور راحت نصیب ہوئی۔ اسی دوران میں نے مہیلا کالج لکھنؤ سے انٹر پاس کیا۔

میری شادی ڈاکٹر آنند لال گوسوامی سے ہوئی۔ جو انڈین ریلویز میں ڈائرکٹر جنرل، کے عہدے سے کئی سال قبل رٹائر ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں ایک بنگالی ہندو برہمن کی شادی ایک عیسائی پادری کی بیٹی کے ساتھ ہونا عام بات نہیں تھی۔

خدا نے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ پھر ان کی پرورش میں مصروف ہو گئی۔ زندگی کی جدوجہد میں قلم نہ جانے کہاں کھو گیا۔ بس وقت ملتا اس میں کتابیں پڑھتی۔ لکھنے کی تشنگی بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی ڈاکٹر گوسوامی کا تبادلہ گورکھپور ہوا، میں نے قلم اٹھایا۔ میں اردو ڈرامے لکھتی اور وہ گورکھپور ریڈیو اسٹیشن سے ریلے ہوتے۔ وقت اور بیتا بچے بڑے ہو گئے۔ اور اپنے اپنے آشیانوں میں جا بسے۔ بڑی بیٹی سمیتا گوسوامی (اب سمیتا چیٹی) آسٹریلیا میں متمکن ہے۔ چھوٹی بیٹی مدھومیتا ہمارے ساتھ ہے۔ بیٹا رابی شنکر امریکہ میں مقیم ہے۔

ف۔ س۔ اعجاز صاحب کی توجہ اور رہنمائی میں ۶۹ سال کی عمر میں افسانہ نگار بن پائی ہوں۔ اسی سال میرا افسانوی مجموعہ انشاء پبلی کیشنز سے شائع ہوا ہے جو میرے لئے روحانی خوشی کا باعث ہے۔

اس وقت ہم میاں بیوی آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔

پتہ کلکتہ : 48, LakeTemple Road
Calcutta - 700 029

پتہ بیرونِ ملک : C/o. Mr. Arvind Chetty
1, Hellam Grove, BOORAGOON
W. A. - 6154 - PERTH, Australia
Ph : 61-9-364-5621

افسانہ



ساوتری گوسوامی

اسکے آنسوؤں اور آہوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے اخلاقاً اسے اپنے کمرے میں بلا کر کہا شیاملی آج تمہاری نوکری کا پہلا دن ہے۔ خوش ہونے کے بجائے تم تو ماتم منانے لگیں۔ ایم۔ اے کی ڈگری جیبوں میں ڈالے جوان لڑکے اور لڑکیاں کڑی دھوپ میں دفتر دفتر نوکری کی تلاش میں سرگرداں مارے مارے پھرتے ہیں۔ جوتوں کے تلے گھس جاتے ہیں اور بیچاروں کو ایک چھوٹی سی نوکری نصیب نہیں ہوتی۔ دن پر دن بے روزگاری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔ سرکاری نوکری تو خدا کی نعمت سمجھی جاتی ہے۔ وہ سر جھکا کر بولی میڈم۔ یہ نوکری میرے لئے نعمت نہیں لعنت ہے۔ مجھے نہیں معلوم مجھ بے گناہ کو خدا نے اتنی سخت سزا کیوں دی۔

وہ اپنی بربادی کا افسانہ تفصیل سے سنانے لگی۔ سسک سسک کر بولی محلے میں میرے پتاجی کا بڑا نام تھا۔ غریب انکو بھگوان کہتے تھے۔ بابا کہتے تھے غریبوں کی دل کھول کر مدد کرو۔ یہ دل سے دعائیں دیتے ہیں۔ ان کی دعائیں کام آتی ہیں۔ میری بیٹی سدا خوش اور آباد رہے گی۔ جو نصیب میں تھا نہیں وہ ملتا کیسے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج کم تھا۔ میں اکلوتی بیٹی تھی۔ ضد کر کے اسکول جاتی رہی۔ بابا کہتے تھے اسکول بنوا دونگا۔ ماسٹرنی بنے گی میری بیٹی۔ میں انکے خواب پورے کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اچانک قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ قلم ہاتھ سے گر گیا اور یہ جھاڑو آ گئی۔

وہ بیحد غمگین تھی۔ کچھ وقفہ بعد بولی۔ اماں بیمار تھیں۔ ڈاکٹر گھر آ کر دیکھ جاتے تھے۔ میں دوائی خانے سے دوا لے آتی تھی۔ دوائی دیتے وقت اس ظالم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں ڈر کر بھاگی۔ دہشت کا غلبہ اتنا زبردست تھا مجھے

کہہ مکرنیاں

پیار سے اک اک تنکا جوڑا
کتر سمجھ کسی کو نہ چھوڑا
لرن لرن اک تار میں باندھی
اے سکھی، دھاگا
نا سکھی، گاندھی !

ذ، کروں تو پاس اور آئے
مـ ـے بدن سے لپٹا جائے
ـٹ کھٹ، ضدی، عقل کا کچّا
اے سکھی، ساجن؟
نا سکھی، بچّہ !

کاندھوں پر جب چڑھ کر جائے
نیناں روئیں، من مسکائے
دکھ سے پُور تکیں ہمجولی
اے سکھی، ارتھی؟
نا سکھی، ڈولی !

وعدے یوں تو خوب کریگا
کیا کوئی مجبوب کریگا
ٹکا کام، خبر نہیں لیتا
اے سکھی، سیّاں؟
نا سکھی، نیتا !

کل تھی دوست، بنی اب دشمن
کچھ ہو گدگدی، کچھ ہو اُلجھن
خوب کسا میں کچھ نہ بولی
اے سکھی پھندہ
نا سکھی، چولی !

ماھئیے

(۱)

ہر دُکھ سے گذر جانا
بھیک کے ٹکڑوں سے
بہتر ہے کہ مر جانا

(۲)

سب دیکھیں بھلی صورت
آج ہوا یہ کیا
دیکھے نہ کوئی سیرت

(۳)

اک کیف سا چھایا ہے
جھوم اُٹھا یہ دل
خط یار کا آیا ہے

(۴)

دیوانوں کو کیا سوجھا
گاندھی کا گن گائیں
ہنسا کی کریں پوجا

(۵)

جنتا کو جو توڑے گا
سوچ میرے بھائی
کیا دیس کو جوڑے گا

(۶)

اللہ رے شباب اُن کا
سبز دوپٹے میں
چہرہ ہے گلاب اُس کا

دوھے

تب اور اب کے سنت کی، بتلائیں کیا بات
رکھتے تھے وہ سوئی ڈور، قینچی ان کے ہات

توے کروڑ جان کو، لگ گیا چپ کا روگ
توڑ نہ ڈالیں دیس کو، یہ تھوڑے سے لوگ

بے مارے مر جاؤں گا، اُس دن میں تو آہ
جس دن میرے شعر پر، مُورکھ کر دے واہ

کچھ پھولوں کو چُن لیا، کچھ کو چھانٹ دیا
دیکھی گئی نہ ایکتا، سب کو بانٹ دیا

آ ـــــ

اپریل کی خوشگوار صبح تھی۔ ظفر اپنے کمرے میں چیئر پہ بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں گرم گرم چائے کی پیالی۔ سامنے میز پر تازہ اخبار۔ اخبار میں سُرخیاں اور سُرخیوں پر نظریں۔ اس نے چائے کا گھونٹ لیا۔ چائے گو کہ میٹھی تھی لیکن کڑواہٹ حلق سے اُتر کر اس کے پورے وجود میں پھیل گئی۔ آج کل کی اخباری سُرخیاں؟ واقعی بہت سُرخ ہوا کرتی ہیں۔ جیسے سیاہی سے نہیں خون سے جمائی جانے لگی ہوں!۔۔۔ اُس نے سوچا۔ کیا یہی رام کی دھرتی ہے؟ کرشن کا دیس۔ گوتم۔ نانک اور چشتی کا وطن ہے؟ اسے ملک کا مستقبل خزاں رسیدہ پتے کی طرح ڈولتا نظر آیا۔

''نئے دور کے حاتم صاحب کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟'' جیسے کمرے میں دفعتاً بہت سی کانسے کی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھیں۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ دروازے پہ مالکِ مکان کی لڑکی روحی بادامی رنگ کے شلوار جمپر میں ملبوس اسی کلر کا باریک دوپٹہ گلے میں پھنسائے پنکھڑیوں جیسے گلابی ہونٹوں پر کلیوں سی مسکراہٹ اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں شرارت لئے کھڑی تھی۔

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ تشریف لے آیئے۔ آپ ہی کا گھر ہے۔'' (دھیرے سے) ''اور دل بھی!'' ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور وہ موسم بہار کے جھونکے کی طرح اپنے جلو میں رنگ و نور اور نکہت سمیٹے خراماں خراماں چلکر آئی اور میز پر ایک چھوٹی سی گٹھری رکھتے ہوئے اس کے دائیں

طرف بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے گٹھری کی جانب دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

"آپ کی امانت! وہ اداس لہجے میں بولی۔ ظفر نے اسکی آنکھوں میں سوالیہ نگاہیں ڈال دیں۔ روحی نے مزید اُداس ہوتے ہوئے بتایا۔"رحیم چچا پچھلے ہفتہ انتقال کر گئے!"

"اوہ!" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ آخری وقت وہ آپ کو بہت یاد کر رہے تھے" وہ کہہ رہی تھی۔ اُن کی نظریں آپ کو بار بار تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن آپ کو بمبئی کے چکر لگانے سے فرصت ہو تب نا...... 'کی...... سی' کا خیال کریں!" روحی نے لفظ کسی کو قدرے کھینچ کو کہا تھا۔ جس پر ظفر نے بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اُس نے اپنی گردن جھکالی تھی اس کی آنکھوں میں حیا اور شکایت کا ملا جلا رنگ تیر آیا تھا۔ اب ظفر کی نگاہیں گٹھری پر تھیں اور ذہن رحیم چچا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح "روحی منزل" کے کرایہ دار تھے۔ ایک دن ان کا جوان اکلوتا بیٹا ایک حادثے میں مر گیا۔ بیوی بھی بیٹے کے غم میں گھل گھل کر ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ بیوی اور بیٹے کی موت سے وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ اور تنہائی کے جان لیوا کرب نے انہیں ایک دم سے توڑ کر رکھ دیا تھا...... ایک شام روحی کے والد ان سے کہہ رہے تھے: "بڑے میاں۔ ایک اکیلی جان کے لئے اتنا بڑا اور مہنگا کمرہ پھنسائے رکھنے سے کیا فائدہ؟ کوئی چھوٹا موٹا سا اور کم کرائے کا کمرہ ڈھونڈ لیتے تو بہتر ہوتا۔" اسی وقت کہیں سے ظفر آگیا تھا اور بولا تھا۔ "سیٹھ جی، کرائے کی بات ہے تو اس کے لئے بے فکر رہئے۔ میں اپنے روم کے ساتھ ان کے کمرے کا بھی کرایہ دے دیا کروں گا"۔ روحی جو اس وقت اپنے والد کے قریب ہی کھڑی تھی۔ آنکھوں آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور پھر اس کے پیچھے ہی اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ لبوں سے شکریہ ادا کرنے کے لئے۔ "آپ نے بڑا اچھا کیا ظفر صاحب۔ میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ وہ اس بڑھاپے میں کہاں جائیں گے۔ آجکل مکان ملنا کوئی آسان بات ہے! ابّا کو تو بس روپے چاہئیں"۔

پھر ٹھہر کر بولی۔ "ہاں، رسید آپ کے نام سے کٹے گی۔ روپے میں دے دیا کروں گی"۔

اس پر ظفر نے روحی کو بڑی تیز نظروں سے گھورا تھا۔ وہ سٹپٹا کر رہ گئی تھی۔ وہ بولا تھا۔ "روحی صاحبہ ہاتھی کے دانت او، مرد کی بات نکل گئے تو نکل گئے"۔ تب سے وہ رحیم چچا کا کرایہ ہی نہیں ادا کر رہا تھا بلکہ اوپر سے چپکے سے کچھ رقم بھی تھما دیا کرتا تھا۔ "یہ آپ کے لڑکے کی طرف سے ہے!"

روحی بھی بیٹی کی طرح ان کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اور تبھی سے ظفر اسے موم کی گڑیا کہا کرتا تھا۔ اور وہ اسے نئے دور کے حاتم کے نام سے پکارتی تھی...... "گٹھری کھول کر آپ اپنی امانت دیکھ لیجئے"۔ روحی نے خاموشی توڑی۔ ظفر نے گٹھری کھولتے ہوئے پوچھا۔ "رحیم چچا نے آپ کو کچھ نہیں دیا؟" اس نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔ "کیوں نہیں، ڈھیر ساری دعائیں دی ہیں" ظفر نے گٹھری کھولتے ہوئے شرارت سے اسے دیکھا۔ "کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ شرما گئی۔ "ڈھیر ساری دعاؤں میں سے ایک آدھ تو ضرور ایسی ہوگی......" "کیسی؟" "یہی کہ ...... جلد سے جلد آپ کے ہاتھ پیلے ہوں، پوتوں پھلو، دودھوں نہاؤ......"۔ "دھت!" اسکا گورا چہرہ شرم سے ایک دم انگارہ ہو گیا۔ اور اس نے اپنی نظریں نیچی کرلیں...... ظفر نے گٹھری کھول کر دیکھا ان کی استعمال کی ہوئی چند چیزیں تھیں۔ جن میں ایک بہت ہی پرانی کتاب بھی تھی۔ جسے ظفر نے جھپٹ کر اٹھالیا۔ وہ نئی اشیاء میں اپنے لئے جتنی کشش پاتا تھا۔ اتنی ہی دلچسپی اسے پُرانی چیزوں سے بھی تھی۔ وہ جلدی جلدی کتاب اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جلد غائب تھی۔ ورق بھی کہیں کہیں سے پھٹے ہوئے تھے---

"آپ کتاب دیکھئے میں چلتی ہوں۔ کالج کے لئے تیاری کرنی ہے" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ظفر نے روکا۔ "چائے تو پیتی جائیے"۔ روحی نے معذرت کی۔ ابھی اور کئی کام ہیں شام کو آؤں گی تو آپ کے ہاتھوں سے بنی چائے بھی پیوں گی اور آپ سے قلم نگری کی باتیں بھی سنوں گی"۔

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی--- ظفر ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ بڑی احتیاط سے پنے کھول رہا تھا۔ "نفرت" اس عنوان پر اس کی نظریں ٹک گئیں۔ وہ پڑھنے لگا-- لکھا تھا

"صدیوں پہلے کی بات ہے۔ ہانگا قبیلے کا سردار سانگا بسترِ مرگ پر پڑا اپنے دس سالہ بیٹے سے رُک رُک کر کہہ رہا تھا ...... سانگا ہمارے درمیان ...... ایسے ہے ...... جیسے ...... کسی محفل میں بن بُلایا مہمان ...... کباب میں ہڈی ...... یا پھر ...... کسی بہت ہی خوبصورت جسم پر ...... کوڑھ کا بدنما داغ ...... بیٹے ...... یہ ہماری آخری خواہش ہے ...... مانگا کو ...... اس کی ایک ایک نشانی سمیت اس طرح مٹادینا۔ جیسے کسی حرف غلط کو مٹادیا جاتا ہے ...... سمجھے بیٹا ......؟"

"بابا آخر اس کا جرم" بیٹے نے دھیرے سے پوچھا "اسکا جرم؟" باپ کی آنکھیں سُرخ ہو کر ابل آئیں۔ "بہت بڑا جرم کیا ہے اس ملیچھ نے۔ ہم نے انسانوں کے بیچ جو لکیر کھینچی تھی۔ یہ اسے مٹا دینا چاہتا ہے ...... کیا یہ کم بڑا جرم ہے ...... بولو؟ اگر یہ ہوا چل پڑی تو -- ہمارے پیروں کی دھول، ہمارے سروں پر سے اُڑے گی۔ ہمارا تاج۔ ہماری سرداری سب کچھ اس غلیظ دھول میں اٹ کر رہ جائے گا ......" اس کے بعد کئی اوراق ندارد تھے ...... آگے تحریر تھی۔ "رانگا نے جوان ہوتے ہی مانگا کو، اس کی ایک ایک نشانی

وہ اب مزید برداشت کرنے کے قابل ہی نہیں رہ گئے تھے۔۔ ماضی کی یادیں۔۔ حال کی بے رخی اور مستقبل میں اٹھنے والے طوفانوں کو سوچ کر وہ سہم جاتے۔ وہ چاہتے کہ یا تو کوئی تیز آندھی انہیں اڑا لے جائے یا یہ دھرتی پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ !" وہ زینے سے لگ کر بیٹھ گیا درختوں کی اوٹ سے اس کی نگاہیں اب بھی دہکتے ہوئے شعلوں پر مرکوز تھیں بوندا باندی کے ڈر سے بچے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی جانب بڑھ رہے تھے !

"تم بھی چند گھنٹوں کے ہی مہمان ہو ہونہہ! آگ اور پانی کا کبھی ملاپ ہوا ہے؟ بارش کی بوندوں کے پڑتے ہی تم بھی سرد پڑ جاؤ گے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ آج حامد میاں ان کے لئے ایک بھولی بسری کہانی بن گئے ہیں!" وہ بڑبڑاتا ہوا اب بھی شعلوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"حامد میاں! ہاں شاید انہوں نے اپنی ذات کو قدرت کا ایک گھناؤنا سا کھیل تسلیم کر لیا تھا"۔ وہ انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔

"وہ آخر یہ کیوں نہ سمجھ سکے کہ کھیل وہ نہیں تھے بلکہ کھیل تو وہ تھا جو ان کے ساتھ کھیلا جا رہا تھا محض ایک تفریح کی خاطر!"

اب بجلی کی کڑک کے ساتھ موسلادھار بارش شروع ہو چکی تھی مویشی پناہ لینے کی خاطر یہاں وہاں پھلانگیں لگا رہے تھے۔ ٹپ ٹپ ٹپ! پانی کے قطرے بنگلے کی چھت پر پڑ کر ایک عجب سی آواز پیدا کر رہے تھے!

"اف! ایسی ہی ایک شام وہ بھی تھی " وہ دوبارہ ماضی کی یادوں کو بٹورنے لگا "ہر کسی کی زبان پر ایک ہی ذکر تھا۔ ہر جگہ ایک ہی چرچا تھا حامد میاں گذر گئے حامد گذر گئے۔ حامد میاں کا دیہانت ہو گیا کسی کا خیال تھا کہ انہوں نے خودکشی کر لی ہے پر خودکشی کی وجہ؟ ان کی موت کا راز؟ ان کی مرتیو کا کارن؟ وہ بیمار نہیں تھے۔ ان کی ہتیا نہیں ہوئی تھی ... نہ ہی انہوں نے خودکشی ہی کی تھی۔ تو پھر؟"

وہ خاموش ہو گیا... پھر بولا.. "وہ گلابی خط!" اس کے تصور میں حامد میاں پھر ابھر آئے "وہ اس خط کو کبھی ہونٹوں سے لگاتے تو کبھی دل سے۔ پھر۔ اس کی خوشبو کو ناک کے قریب لے جا کر محسوس کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ۔ یہ کسی فیروزہ کا محبت نامہ تھا ان کے نام.." دلال چند کا گلا رندھنے لگا۔ حامد میاں کے الفاظ اسے یاد آنے لگے!

"دلو! تمہاری باتیں درست نکلیں۔ آج۔ آج۔ میری زندگی کا سب سے اہم دن ہے!" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ حامد میاں اب بھی اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلائے آسمان کی جانب پرواز کر رہے ہیں۔ وہ کافی بلندی تک پہنچ گئے۔ ان کا فلک شگاف قہقہہ فضا میں گونج رہا تھا۔ وہ اس خط کو بار بار ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا رہے تھے۔ پھر۔ پھر اچانک ان کی آواز بند ہونے لگی، آخرکار وہ نڈھال ہو کر فرش پر الٹ گئے!

"آہ!" دلال چند کا سکتہ ٹوٹا... اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس خط کی مہک تمام بنگلے کو معطر کرنے کے بعد اس کے دماغ میں بسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسکے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے سر کو تھامے سسکنے لگا۔

"آہ۔ حامد میاں مر گئے تھے.. !"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے گرد و نواح اندھیرا ہی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پھر اچانک آسمان کی جانب سے ایک کرن اس کی طرف بڑھنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ ایک چندھیا دینے والی روشنی میں تبدیل ہو گئی۔ قریب تھا کہ دلال چند کا جسم جل کر بھسم ہو جائے..... وہ چیخ اٹھا۔ !

۔ "حامد میاں۔ میرے دوست، میرے محسن! مجھے معاف کر دو..... وہ خط.. ..وہ گلابی خط ... وہ خوشبو سے معطر خط نقلی تھا۔ کسی فیروزہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ خط میں نے اپنے انہی ہاتھوں سے لکھا تھا.. محض ایک تفریح کی خاطر.. مجھے کیا پتہ تھا کہ....!"

وہ چہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا!

"تمہاری موت کا ذمہ دار میں ہوں میں ... تمہارا دلو" اس کی سسکیوں کی آواز بادل کی گرج میں دب کر رہ گئی۔ وہ اب بھی رو رہا تھا زار و قطار....!

پھر.... پھر.... ایک دھماکہ ہوا... دل کو ہلا دینے والا دھماکہ... دلال چند بھی اس سے ایک لمحہ کے لئے لرز کر رہ گیا۔ پھر اس نے دہشت کے عالم میں انگلیوں کے درمیان سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ آسمان سے گرتی ہوئی بجلی کی وہ دھار تیز روشنی کے لباس میں مزین زمین کو چھو گئی... اور واپس لوٹ گئی۔ اسے بنا نقصان پہنچائے ہی...! وہ چیخ اٹھا.. "شاید شاید.. حامد میاں نے مجھے معاف کر دیا ہے!".... اس نے آس پاس نظر دوڑائی اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ ہر سو اجالا ہی اجالا لگنے لگا تھا۔ بارش بھی تھم چکی تھی اور جانور میدانوں میں چرنے کی خاطر بڑھ آئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ شمشان میں بھی اندھیرا چھا گیا تھا.. !

دلال چند آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور... اسکی زبان سے بے اختیار نکلا۔ !

"ہاں! حامد میاں نے مجھے معاف کر دیا ہے ہاہاہا۔ کیوں نہ کرتے بھلا! ان کا دل تھا ہی اتنا بڑا ..ہاہاہا!" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بنگلے سے باہر آ گیا۔ قدم بڑھاتا ہوا وہ شمشان گھاٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا... مگر اس کے قہقہوں کی آواز اب بھی فضا میں گونج رہی تھی!

ساگر چاپدانوی



نام : عبدالحمید
قلمی نام : ساگر چاپدانوی
والد کا نام : عبدالوحید
آبائی وطن : جون پور، یو۔پی
جائے ولادت : چاپدانی، ہگلی، مغربی بنگال
تاریخ پیدائش : ۲۲، فروری ۱۹۳۵ء
پتہ : ۳۸، چونیز گارڈن، تھرڈ لین، شیب پور، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۲ (ویسٹ بنگال)
پیشہ : تجارت
آغاز شاعری : ۱۹۴۷ء
اشاعت : ۱۹۵۳ء

غزل

ڈھونڈ کبھی دیوانے میری مٹھی میں
ہیں انمول خزانے میری مٹھی میں
اب ہیں حدِ نظر تک لہراتے کھیت
کل تھے چند ہی دانے میری مٹھی میں
کھولوں تو ہو جائیں رُسوا کتنے شریف
بند ہیں وہ افسانے میری مٹھی میں
روٹی، بھاجی، یا پھر کھاؤں سرد ہوا
بچے ہیں دو ہی آنے میری مٹھی میں
آج اور کل کا حال بتا سکتا ہوں میں
بند ہیں کئی زمانے میری مٹھی میں
محنت کی چابی سے کھول کے دیکھنا ہے
بند ہیں یار خزانے میری مٹھی میں
پیسے میں ہوتا ہے بڑا جادو ساگر
آہی گئے ہیں "سیانے" میری مٹھی میں

نظمیں

اپسرا

وہ مہرباں ملی تھی یہیں پر اگلے برس!
میں تب سے ڈھونڈ رہا ہوں گلی گلی اُسکو
ملے تو سر کو جھکا کر بہ احترام وخلوص
ادا میں اس کی عنایت کا شکریہ کر دوں
زمیں نکل گئی مہرو وفا کے پیکر کو
پری تھی، اُڑ گئی پھر کوہ قاف کی جانب؟
کبھی کبھی بڑی جھنجھلاہٹیں بھی ہوتی ہیں
یہ کام خط کے ذریعہ بھی تو نہیں ممکن
نہ اُسکا نام ہی جانوں، نہ اُسکے گھر کا پتہ
سہانی شام، بڑا ہی حسین موسم تھا
خنک ہواؤں میں خوشبو تھی موگرے کی رچی
کھڑا تھا بجلی کے کھمبے سے پُشت ٹیکے ہوئے
غزل کا موڈ تھا، سگریٹ تھی لبوں میں دبی
تبھی گلی سے نکل آیا ایک بد اطوار
سمجھ کے دوسرے فرقے کا ایک فرد مجھے
یہ چاہتا تھا، شکم میں اُتار دے خنجر
وہ جھپٹی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی:
"ارے سریش! کہاں رہ گئے تھے رستے میں؟
چلو کہ وقت سینما کا نکلا جاتا ہے!"

اے میرے عکس

اے میرے عکس، مرے حال پہ ہنستا کیوں ہے؟

کیا کہا؟ اب میری آنکھوں میں وہ رونق نہ رہی
گال مُرجھاگئے، ہونٹوں پہ تبسم نہ رہا
زندگی میں میری ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ ہے آج
کوئی ہلچل نہ رہی، کوئی تلاطم نہ رہا

ماہ وانجم کو پکڑنے کے حسیں خواب گئے
سیم وزر سے وہ چمکتے ہوئے دن رات کہاں
وہ اُمنگیں، وہ شرارت، وہ لطیفے بھی نہیں
بات کرتا ہوں مگر بات میں وہ بات کہاں

جانی پہچانی سی آواز پڑی کانوں میں
کولھو کے بیل کی مانند وہیں گھوم لیا
ایسا ہوں، جیسے کھلونا کوئی چابی والا
دی گئی چابی تو ہنس بول لیا، جھوم لیا

اے میرے عکس، مرے دوست، میرے غم کے شریک
ایک تُو سمجھے مرا درد، میری بیتابی
آج مزدور کی صورت میں ہوں میں صرف مشین
اور زردار کے ہاتھوں میں ہے میری چابی

اے میرے عکس، مرے غم پہ سسکتا کیوں ہے

تھی تو محض ان کی جو حامد میاں کے سرمائے کی رکھوالی دل و جان سے کرتیں پر یہ کچھ دشوار ہی تھا کیونکہ ان کی شان و شوکت باہر سے تو ان کی خوبیاں ہی لگتیں مگر جب کسی فرد کی نظر ان پر جا پڑتی تو یہی خوبیاں خامیوں کا لبادہ اوڑھے اس کے رو برو آجاتیں اور دیکھنے والا انگشت بدنداں ہو کر پہلے تو سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیتا پھر نہایت ہی نرمی سے کہتا" بیچارہ!"

دراصل حامد میاں کی جسمانی ساخت کچھ تھی ہی ایسی ! ٹھگنا قد، کالی رنگت، کھچڑی بال، جسم کے مقابلے میں کہیں بڑا سر، آنکھوں پر چشمہ، انگریزی لباس اور اوپر سے بہرے ! انہیں اس کا احساس بھی تھا اسی لئے تو عموماً اپنے قریبی دوست دلال چند سے پوچھتے "دلو! مجھ میں جسمانی خوبصورتی نہیں میں بالکل تنہا بھی ہوں کیا کوئی لڑکی مجھ سے شادی کرے گی؟"

حالانکہ یہ سوال حامد میاں کئی مرتبہ دہرا چکے ہوتے اور دلال چند اسے سن سن کر تنگ بھی آچکا ہوتا مگر محض ان کا دل رکھنے کی خاطر وہ انہیں نہ تو ٹوکنا پسند کرتا اور نہ ہی تردید کرنا لہٰذا وہ پہلے تو اپنے دماغ پر زور دیتا، پھر دونوں کاندھوں کو اچکاتے ہوئے انہیں دلاسہ دیتا۔

"حامد میاں! آپ نہیں سمجھ سکتے ان آفت کی پڑیوں کو یہ اچھی سمجھتی ہیں کہ جسمانی خوبصورتی تو بس عارضی ہوتی ہے ان کو اپنے محبوب سے، اپنے شوہر سے کچھ اور ہی توقع ہوتی ہے!"

"وہ کیا؟"

"ایک سنہرا مستقبل اور اس مستقبل کی سرکھشا!"

"سچ؟" خوشی سے انکی آنکھیں چمکنے لگتیں!

"بالکل سچ! اور یہ آپ کا تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!"

جہاں دلال چند کا جواب حامد میاں کو کچھ دیر کے لئے الجھا کر رکھ دیتا وہیں انہیں اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی ملتا۔ اور وہ محسوس کرنے لگتے کہ ان کے اندر ایک طلسمی قوت ابھرنے لگی ہے۔ "یہ میں کہاں کھو گیا تھا!" وہ چونک اُٹھا .... اس نے بے نیازی کی ایک نظر سڑک پر ڈالی۔ پھر جلا ہوا سگریٹ زمین پر پھینکتے ہوئے وہ قدموں سے مسلنے لگا۔

"راجی؟" وہ ٹھٹھک گیا۔ اسے سبزی والی راجی نظر آئی۔ راجی کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نظر آنے لگے۔ حنائی بالوں کے اوپر سبزی کی ٹوکری رکھے وہ اٹھلاتی ہوئی دلال کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ دلال چند نے محسوس کیا کہ عمر کی کئی منزلیں عبور کر لینے کے باوجود وہ اب بھی وہی راجی لگتی بیس سال قبل والی۔ وہی بھولپن، وہی سر تال "میں سبزی والی آئی۔ راجی سبزی والی آئی۔" اس کی یہ صدا دلال چند کے سارے وجود میں اتر گئی دلال چند کے قریب سے ہوتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی۔

"کمبخت! بے رخی سے منہ پھیر کر یہاں سے نکل گئی"۔ اسکے لہجے میں طنز تھا "یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھے پہچان ہی نہ سکی ہو! پر سالی اب بھی پہلی جیسی زبردست چیز ہی لگ رہی ہے"۔ وہ اسی طرح دم بخود سا کھڑا عجیب دلآویز نظروں سے رجی کے مٹکتے ہوئے کولہوں کو دیکھ رہا تھا اسے لگا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں یک لخت بند ہونے لگی ہیں اور اس کا سینہ پھولنے لگا ہے!

"بھگوان جانے اسے وہ دن یاد ہیں بھی یا نہیں میں شرارتاً سبزی خریدنے کے بہانے اسے چھو لیا کرتا تھا۔ پر یہ سالی ٹھری پتھر کی مورت تمام جوش ولولوں سے عاری.. پیسے لیتی اور اسے کمر سے کسے پلو میں باندھ کر وہاں سے رفو چکر ہو جاتی۔ اور میں؟ میں پاگل سا دیوانہ سا اپنے جذبات کو بس میں کئے اسے تکتا ہی رہ جاتا۔ آہ!" وہ بے چین ہو اٹھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھرنے لگیں اس نے گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ... "کہیں۔ کہیں کسی نے میری چوری پکڑ تو نہیں لی ہے؟" وہ جیب سے رومال نکال کر چہرے پر رگڑنے لگا حالانکہ۔ راجی دلال چند کے لئے اجنبی نہیں تھی مگر نجانے کون سی طاقت اسے اس سے باتیں کرنے کو روک رہی تھی وہ آگے نکل گئی اور اور اسکی آواز اب بھی فضا میں گونج رہی تھی!

"میں سبزی والی آئی۔ راجی سبزی والی آئی!"

"ارے! اتنی دیر سے یونہی کھڑا ہوں۔ کہیں پتھر کا تو نہیں ہو گیا ہوں؟" اس نے ہنستے ہوئے خود کو ہلانے کی کوشش کی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ وہ راجی کے خیالوں میں محو حامد میاں کے بنگلے کے بالکل قریب آن پہنچا۔ اس نے ڈیوڑھی سے جھانک کر اندر دیکھا۔ وہاں کسی کو نہ پاکر اطمینان کر لیا اور قدم مزید آگے بڑھانے لگا!

"توبہ!" اسے لگا کہ ایک شدید ناقابل برداشت بدبو کا بھبکا اس کی ناک سے گزر کر سارے جسم میں ایک لرزش سی پیدا کر رہا ہے۔ ناک دبائے بنگلے کے پچھواڑے میں آگیا۔ اس کی نظر اس اسکول کی طرف گئی جو پچھلے کئی سالوں سے یونہی سر اٹھائے کھڑا تھا۔ ایک ٹک وہ اسے دیکھے ہی جا رہا تھا!

"بچے نظر نہیں آرہے ہیں؟" وہ سوچنے لگا!

یوں لگ رہا ہے جیسے پوری عمارت خالی ہو چکی ہو یہاں تک کہ احاطہ بھی ویران!" وہ سرگوشیوں میں بولا۔

"ارے ہاں! ان دنوں تو سکولوں میں گرمی کی چھٹیاں چل رہی ہیں۔" اسے خیال آیا۔

"ہاہاہا۔ میں بھی کتنا بھلکڑ ہوں! دراصل بوڑھا جو ہو چلا ہوں۔ یہ اور بات ہے

کہ وقت سے پہلے ہی۔۔ " ہنستے ہوئے وہ اپنے
آدھے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"ہونہہ! میں ہٹلکز ہوں۔۔۔ بے وقوف کی حد تک سیدھا سادا بھی ضرور ہوں۔۔ مگر اس کے معنی یہ تو نہیں کہ میں بالکل احمق ہی ہوں! میں کیا سمجھتا نہیں تھا کہ روزانہ صبح آٹھ بجے سے شام تین بجے تک حامد میاں "دی لائٹ آف انڈمان" کے مطالعے کے بہانے اس دلہیز پر کیوں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ان کا دریہ بتاتا تھا کہ انہیں کسی سے۔ ۔!" وہ سوچنے لگا!

"وہ جن کی زلفوں کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ اسی سکول کی ایک معلمہ آرتی بالا تھی۔۔ !"

"آرتی بالا!" وہ سر کھجاتے ہوئے بڑبڑایا۔ "دراصل اس میں حامد میاں کا بھی کیا قصور! انڈمان کا یہ جادو تھا ہی ایسا۔ حامد میاں تو درکنار کسی کا بھی اس سے بچنا محال تھا۔ آرتی بالا۔ یعنی حامد میاں کا پہلا۔ لیکن یک طرفہ عشق!" وہ ہاتھوں کو پیچھے کی طرف باندھے مرجھائے اور سوکھے ہوئے پتوں پر ٹہلنے لگا۔ "حامد میاں کی حالت بھی اس وقت انہی پتوں کی سی ہوگئی تھی جب انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی آرتی کے قدموں کی چاپ اب تنہا نہیں رہی ہے بلکہ کسی اور راہ گیر کے قدموں کی آواز بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئی ہے۔ ان کی بے چینی بڑھنے لگی تھی اور اس طرح انہوں نے کئی دن گزار لئے وہ دن تو ان کے لئے قیامت سے کم نہیں تھا جس دن وہ پردیسی آرتی بالا کو لے گیا۔ دور، کہیں دور جزیرہ داپر سے بھی دور۔۔ آرتی بالا کے جاتے ہی حامد میاں کی زندگی میں ایک تبدیلی سی آگئی۔ انہوں نے دوردراز جو اسکول کے صحن میں کھلتا تھا، بند کرلیا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے!"

سائیں سائیں۔۔۔! تیز ہوا کے جھونکوں نے اس کے خیالوں کا تسلسل توڑ دیا۔۔۔

اس کی نظریں ان پتوں پر دوڑنے لگیں جو کھڑکھڑاہٹ کی آواز لئے ہوا کے ریلوں کے ساتھ زمین پر یہاں وہاں منتشر ہوکر بکھرنے لگے تھے!

"مگر۔۔۔ مگر واہ حامد میاں! وہ اس ذہنی انتشار میں زیادہ دنوں تک نہیں رہے۔ بہت جلد بستی والوں نے انہیں ایک نئے مرحلے کی جانب مڑتے دیکھا!" دلال چند مضطرب سا یہاں وہاں ٹہلنے لگا۔ "ہوا یوں کہ آرتی بالا کے چلے جانے کے بعد حامد میاں نے ایک نئے شوق کو اپنا لیا تھا۔۔ ریڈیو سننے کا شوق! ان کا یہ انداز بھی سبھوں سے مختلف تھا۔ سننے سے معذور تھے لہٰذا جب وہ اپنا سیٹ آن کرتے تو دور دور تک کے گھروں میں ریڈیو چلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ کسی نے ان سے شکایت کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ ان دنوں ریڈیو ہی حامد میاں کا ساتھی ہے۔ اور ریڈیو ہی ان کا غمگسار ہے۔ حامد میاں کو بھی تو پرچھائیں کے پیچھے دوڑنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ ادھر وہ ریڈیو اناؤنسر شانو کی مسحور کن آواز کے دیوانے ہونے لگے تھے۔ گھنٹوں گھنٹوں وہ شانو کے خیال میں ڈوبے رہتے۔ اور۔ کبھی کبھی تو شانو کے پیش کئے گئے نغموں کے ساتھ وہ آواز ملاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کے سنگ تھرکنے بھی لگتے۔ اس طرح ان کی یہ پسند پہلے تو محبت اور پھر اس کے بعد دیوانگی کی شکل اختیار کرنے لگی۔ پر مرد بھلے ہی خود کو کتنے ہی عقل مند کیوں نہ سمجھیں لیکن عورتوں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی۔ اب حامد میاں بھی تو آخر مرد ہی تھے۔۔۔ ان کی دال بھی شانو کے آگے نہ گل سکی۔ بہت جلد وہ یہ جان چکے تھے کہ آرتی بالا کی طرح شانو کے بھی محبوب نظر وہ نہیں ہیں۔ [illegible] ان کا یہ جنون بھی تمام ہوا۔ !"

دلال چند کو کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا، بس درختوں کی خاموش قطاریں ہی تھیں۔ کون ہوسکتا ہے؟ وہ گھبرا گیا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی کیونکہ وہ اپنے ہی قدموں کی آواز سن کر چونک اٹھا تھا۔ !

"شانو کے بعد وہ پھر مضمحل اور اداس نظر آنے لگے۔ اور پھر جلد سنبھل بھی گئے غرضیکہ حامد میاں کے لئے یہ معمول سا بن گیا تھا۔ کئی کئی لڑکیاں، حامد میاں کی توجہ کا مرکز بنتی رہیں۔ ان سے بچھڑتی رہیں۔ حامد میاں کا دل ٹوٹتا رہا اور پھر سنبھلتے رہے۔ ان کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔۔ چلتا رہا۔" آسمان پر بادل چھانے کی وجہ سے گہری شام کا دھوکا ہونے لگا تھا۔ دلال چند نے دائیں ہاتھ کی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر سوچا۔ "دن ڈھلنے پر تو ہے مگر وقت زیادہ نہیں ہوا ہے، پھر نجانے کیوں؟"

دور اسے شمشان میں ایک تیز روشنی نظر آئی۔ اسے خیال آیا "ممکن ہو کہ کوئی مردہ جلایا گیا ہو اور آگ اب تک جل رہی ہے!" وہ بنا پلک جھپکائے روشنی کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ آگ بھی قدرت کا عجیب شاہکار ہے! اگر یہ مردہ جسم کو چھو جائے تو اسے تکلیف نہیں ہوتی۔ پر زندہ جسم اگر اس کی زد میں آجائے تو۔ آہ!" وہ کراہ اٹھا۔

"وہ بھی تو ایک زندہ جسم تھا۔۔۔ اس میں بھی محسوس کرنے کی شکتی تھی۔ ایک دھڑکتا دل تھا۔۔ اور اس دل کے اپنے ارمان تھے۔ مگر کسی نے ان کے جذبات کی قدر نہ کی۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ آرتی بالا، شانو، رینوکا، جمیلہ، اختری۔ ہر کسی نے محض ان کی ظاہری بدصورتی ہی دیکھی۔ کسی نے بھی ان کی [illegible] کی۔ وہ ہر کسی کے لئے ایک معمولی سا لفظ "بیچارہ" بن کر رہ گئے تھے۔ اور اسی ایک لفظ نے انہیں احساس کمتری کا شکار بنا دیا تھا۔

پار کے تو نہیں؟" رکمنی نے شک ظاہر کیا۔

رام لال نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اسکے ذہن میں بھی کچھ ایسی ہی بات چل رہی تھی۔

رام لال کی آنکھ ابھی ٹھیک سے لگی بھی نہیں تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ رام لال بستر پر اٹھ بیٹھا، رکمنی بھی جاگ گئی، منّی دوسری چارپائی پر سو رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی تیز کرتے ہوئے رام لال نے کہا۔ "اس سے کون ہو سکتا ہے؟"

رکمنی نے کوئی جواب نہیں دیا، پر اس نے رام لال کے بازو کو کس کر تھام لیا۔ جیسے وہ رام لال کو دروازہ کھولنے سے منع کر رہی ہو۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی، اس بار بھی آواز ہلکی تھی۔

"کون؟" رام لال نے پوچھا۔

"اپنی ماچس لے لو"۔ مختصر سا جواب آیا۔

رام لال اچانک سرد پڑ گیا۔

"وہی لوگ ہیں؟" رکمنی نے دبی آواز میں پوچھا۔

رام لال نے سر کے اشارے سے اقرار کیا۔

"مت کھولو دروازہ"۔

لیکن رام لال نے دروازہ کھول دیا۔

لالٹین کی ہلکی روشنی میں چار آدمی کمرے کے اندر نظر آئے۔ پہلے آدمی کے ہاتھ میں پستول تھی۔

"تم ہماری بات مانتے ہو تو پھر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، اور اگر تم نے حماقت دکھائی تو نتیجے کے تم خود ذمہ دار ہو گے"۔

رام لال چپ رہا، رکمنی اس سے چپٹی کھڑی رہی۔

"ہم لوگ آدھی رات تک یہاں ٹھہریں گے، پھر تم دونوں ہمیں سرحد تک چھوڑ آؤ گے، ہم اندھیرے میں راستہ نہیں طے کر پائیں گے، اس درمیان ہمارے لئے کچھ کھانے کا بندوبست کر دو"۔

رام لال نے رکمنی کی طرف دیکھا۔

رکمنی رسوئی کی طرف جانے لگی، اسی شخص نے کہا۔

"کوئی نادانی مت کرنا، ہم لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں"۔

رام لال کو بولنے والے کا لہجہ بڑا ناگوار گذرا، وہ کائر نہیں تھا۔ اور خاص طور سے رکمنی کے سامنے خود کو بے بس ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن وہ کوئی بیوقوفی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی پرواہ نہیں تھی، رکمنی کو کوئی نقصان پہنچے، اسے ہرگز گوارہ نہیں تھا۔

چاروں نے اپنی پیٹھ پر لدے تھیلے اتارے، عجیب سے تھیلے تھے وہ، پھر سب زمین پر بیٹھ گئے۔ رام لال کھڑا رہا۔

بیٹھ جاؤ، پہلے والے شخص نے کہا۔

رام لال نے منّی کی طرف دیکھا۔

"بچّی کو یہیں چھوڑ دو، صرف تم دونوں ہمارے ساتھ جاؤ گے"

"نہیں، ہم اپنی بچّی کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے" رام لال کچھ کر گزرنے کو تیار ہو گیا۔

اجنبی نے اس کی طرف پستول تان لی۔

رکمنی لپک کر سامنے آگئی۔

"نہیں تم جیسا کہو گے، ہم وہی کریں گے"۔

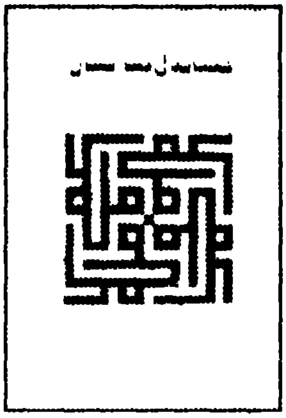
رکمنی اور رام لال آگے اور وہ چاروں ان کے پیچھے چل رہے تھے، تاریکی کی گود میں سمٹا ہوا سناٹا جیسے کچھ اور پھیل گیا تھا۔ پیروں تلے سوکھے پتوں کے چرمرانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ رام لال کو اپنے قدم بڑے تھکے تھکے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید رکمنی کا بھی یہی حال تھا۔

رام لال سوچ رہا تھا، لیکن کیا سوچ رہا تھا، خود اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ایک سوچ دوسری سوچ سے الجھ رہی تھی، اسکے بازو پر رکمنی کی گرفت کبھی سخت کبھی نرم پڑ رہی تھی، شاید اس کے ذہن میں بھی کوئی تیز ہوا بہہ رہی تھی۔

سرحد سے کچھ ہی دوری پر رام لال کو احساس ہوا، پیچھے آنے والوں کے پیروں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی، اس نے اور رکمنی نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔

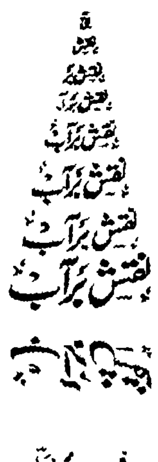
وہ چاروں نہیں تھے!

ہندی سے اردو میں مترجمہ کہانیاں



"کتنا بدل گیا انسان"

از : نوشاد مومن



فیروز عابد کا افسانوی مجموعہ

نقش بر آب



ساجدہ عندلیب رحمٰن

نام : ساجدہ عندلیب رحمٰن

تاریخ پیدائش : ۲۲ر نومبر ۱۹۶۳ء

والد کا نام : حبیب الرحمان

تعلیم : ہائر سکنڈری (گورنمنٹ گرلس ہائر سکنڈری اسکول۔ پورٹ بلیئر ،انڈمان)
بی اے، بی ایڈ (کلکتہ یونیورسٹی)
ایم اے (کلکتہ یونیورسٹی)
ادیب کامل (علی گڑھ)

وطن : پورٹ بلیئر ۔انڈمان

افسانہ نگاری کا آغاز : ۱۹۹۰ء

زبانیں : اردو، انگریزی، ہندی اور بنگلہ ۔

موجودہ ملازمت : ہسٹری ٹیچر ، تھومس ڈے ہائی اسکول، خضر پور۔ کلکتہ - ۷۰۰۰۲۳

مشاغل : دوردرشن کلکتہ میں نیوز کاسٹر (اردو) اور آل انڈیا ریڈیو کلکتہ میں اردو اناؤنسر رہ چکی۔

افسانوی مجموعہ : بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے۔

مستقل پتہ : 1/M/H/10، ابراہیم روڈ، کلکتہ ـ ۷۰۰۰۲۳

فون : ۳۵۱۳-۴۴۹ (۰۳۳)
۷۰۶۹-۴۴۹ (۰۳۳)

خواھشیں ایسی کہ......!

"دلو! مجھے نہیں لگتا کہ تمہاری باتیں کبھی درست ثابت ہوں گی۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو سمجھ لینا کہ وہ دن میری زندگی کا سب سے اہم دن ہوگا"۔ حامد میاں کے الفاظ دلال چند کے کانوں سے بار بار ٹکرا رہے تھے ۔ ۔!

"اف!" وہ پریشان سا حامد میاں کے بوسیدہ بنگلے کے صحن پر ایک سرسری نظر ڈالنے لگا۔ ہر طرف گھاس ہی گھاس... کہیں کہیں دھتورے کی جھاڑیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں ... اور ساتھ لگا یہ ویران سا بنگلہ... پرانے طرز کا یہ بنگلہ کسی زمانے میں خوبصورت ضرور تھا پر اب اس کی حالت خستہ تھی!

چار مینار سگریٹ کا کش لے کر وہ دہیں سے دور تک جاتی اس ویران سڑک کو دیکھنے لگا!

"بھلوا، ججو، کالا چاند ... نجانے اب کہاں ہوں گے؟" اسے اپنے بچپن کے دوست واحباب یاد آنے لگے ... وہ دوست جو اس کے ہمراہ اس سڑک پر مٹر گشتی کیا کرتے تھے!

"ایک ددکان ۔ ہاں ہاں ایک دوکان یعنی جگدیش ۔ محض چھیڑنے کی خاطر ہم نے اسے یہ نام دیا تھا ۔!" وہ مسکرانے لگا!

"اب کیا کرتے؟ قصور تو اس کی دائیں آنکھ کا تھا جو ہر وقت بند رہا کرتی تھی.... اور ... وہ ۔ کالا چاند! کالا چاند یعنی شمبھو ناتھ ..... سیاہ فام! اس کی دادی اکثر دلار سے اسے پکارتیں ۔ بیٹا چاند.....!" اس کا تبسم اب قہقہے میں بدلنے لگا۔ "ہاہاہا بھلے ہی وہ ہماری مختصر سی چنڈال چوکڑی کا سرغنہ تھا مگر میں نے ہی اسے مذاقاً کہا تھا ... ابے! تو چاند تو ضرور ہے مگر ۔ گہن لگا ہوا! اور ... تب سے ہی وہ نہ صرف ہمارا بلکہ محلے بھر کا "کالا چاند" بن گیا تھا۔ اس کے لئے وہ اکثر مجھے کوسا بھی کرتا تھا!" یک بیک وہ خاموش ہو گیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر یہاں وہاں دیکھنے لگا۔

"ہے بھگوان!" وہ کچھ دیر رکا پھر بولا "ماضی کی کتنی یادیں وابستہ ہیں اس مقام سے!"

اس نے محسوس کیا کہ ان بیس سالوں میں اس علاقے میں کئی تبدیلیاں آگئی تھیں ... حالانکہ سڑک کے آخری حصے میں چند گھروں پر مشتمل وہ چھوٹی سی بستی اب بھی موجود تھی ... مگر.... راستوں کے دونوں طرف پھیلی کھیتوں کی ہریالی تو غالباً غائب ہی ہو چکی تھی! جابجا اینٹ کے بنے سرکاری کوارٹرز نظر آرہے تھے۔ کافی آگے ایک چھوٹی سی پہاڑی اور اس کے بیچوں بیچ ہندؤں کا شمشان گھاٹ!

شمشان سے لگا سمندری ساحل اور دور، کہیں دور نمکین پانی کی سطح پر ہنس کی مانند تیرتا جزیرہ وائپر ۔ پھر حامد میاں کا یہ جاذب نظر بنگلہ ۔!

"حا ... حامد ... میاں!" دلال کا حلق خشک ہونے لگا۔ اس نے گھبرا کر آسمان کی جانب دیکھنے کی کوشش کی ... "واہ رے اوپر والے، تیری لیلا ہی نیاری ہے... جہاں تم نے حامد میاں کو یہ کشادہ بنگلہ دیا وہیں اس سے بھی وسیع دل عطا کیا ۔ تاکہ ۔ اس میں نہ صرف ان کا بلکہ دوسروں کا درد بھی سما سکے!"

یوں تو حامد میاں کے پاس عزت، دولت، بنگلہ و نوکر چاکر سبھی کچھ تھا۔ اگر کمی

عالم عالم عشق بھی تنہا
تنہا حسن بھی عالم عالم

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

نگاہِ ناز میں روزِ ازل کی کیفیت
ارے یہ کب کے فسانے سنائے جاتے ہیں

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

اور ایسے ہی سیکڑوں اشعار ہیں جنھوں نے شروع شروع انھیں اپنے ہم عصروں سے گلے ملوایا اور بعد کو ایسا جدا کیا کہ وہ اقبالؔ اور یاسؔ یگانہ چنگیزی کی طرح سبھوں سے الگ اور تنہا نظر آئے۔



شھود عالم
آفاقی
کا
مجموعۂ کلام
دشتِ بیکراں
قیمت ۷۰ روپے

مزاحیہ

شادی کا دوسرا رخ

جناب عالی شادی کا دوسرا رخ اس وقت تک پیش نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اسکے پہلے رُخ کی کچھ جھلکیاں نہ پیش کردی جائیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے میری بھی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے دولہا اور سرکس کے جوکر آپ نے ضرور دیکھے ہونگے۔ خدالگتی کہئے گا۔ ہے کوئی فرق ان دونوں میں؟ چنانچہ مجھے بھی ایک دن ایک بھلے مانس کی جگہ لولو بناڈالا گیا تھا۔ سر پر صافہ، صافے کے نیچے کارچوبی کام کی پٹی۔ پٹی سے جھولتا ہوا بیلے چمبیلی کے پھولوں سے گندھی ہوئی لڑیوں کا کمر سے نیچے تک آیا ہوا ایک سہرہ ورنہ نکاح نہیں ہوتا۔ کمر سے لٹکی ہوئی زربفت سے منڈھی ہوئی نیام میں ایک زنگ آلود تلوار۔ معلوم نہیں کس کی تھی۔ گھوڑے پر اس طرح سوار تھا جیسے کوئی نو آموز سائیکل پر بیٹھتا ہے۔ اب گرا کہ جب گرا۔ ناک پر ایک سرخ ریشمی رومال۔ یہ شاید اسلئے کہ محفل کی بھیڑ میں کوئی بو محسوس نہ کی جاسکے۔ سسرال کے دروازے پر گھوڑا پہنچا۔ میں بھلا چنگا تھا لیکن سسرال والوں نے اپاہج سمجھ کر گود میں اٹھا لیا اور سجے سجائے ایک دیوان خانے میں لے گئے۔ ایک تخت پر قالین بچھا ہوا تھا۔ کامدار سرخ غلاف کے دو گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے۔ انکے سہارے میری زندہ لاش کو بٹھا دیا گیا۔ رومال ناک پر تھا اور سہرے کو میرے چہرے پر وقت نکاح تک اس لئے پڑا رہنا تھا کہ کہیں کوئی میری صورت نہ دیکھ لے اور دلھن کو جا لگائے اور وہ ''ہوں'' کرنے سے انکار نہ کردے! ہمارے قاضی صاحب تشریف لائے۔ مہر کے قضیے پر حسب معمول شریفانہ تو تو میں میں ہوئی۔ لڑکی والے بیس ہزار سے کم پر راضی نہیں ہوئے۔ میری جیب میں کل پینتیس روپے تھے۔ انیس ہزار نو سو پینسٹھ کی معمولی رقم کم پڑ رہی تھی۔ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مہر دیتا کون ہے۔ میں نے کہا منظور! کچھ شریف لوگ زنان خانے میں تشریف لے گئے۔ دلہن نے ''ہوں'' کی یا نہیں مجھے نہیں معلوم۔ کیونکہ میں نے نہیں سنی۔ شریف لوگ واپس آگئے۔ ان لوگوں نے وہ ضروری ''ہوں'' سن لی تھی۔ کس نے ہنکاری بھری کون جانے!

کچھ دیر بعد مجھے زنان خانے میں لیجایا گیا۔ بڑی بوڑھیاں زیادہ تھیں۔ کم سنیں کم۔ یہ احتیاط شاید اس لئے برتی گئی تھی کہ کہیں کسی اور کم سن خوبصورت محترمہ کو دیکھ کر میں ایک اور نکاح کے لئے تیار نہ ہو جاؤں۔ یوں بھی بیک وقت چار بیبیاں جائز ہیں۔ لیکن میں نے یہ شریفانہ حرکت نہیں کی۔ اس دن صرف ایک پر ہی قناعت کرلی۔ اب سہرا الٹ دیا گیا تھا اور عورتیں جھانک جھانک کر صورت دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ کوئی ڈرا نہیں۔ ھندوستانی گھرانے کی عورتیں بھی کچھ کم جی دار

نہیں ہوتیں۔ کانوں میں بھنک پڑی کہ دستر خوان لگ چکا ہے اور دولہا میاں یعنی مجھ معصوم کو کھانا کھلایا جائیگا۔ تصور میں چھنے ہوئے قورے کا پلاؤ، میوے دار مرغ مسلم، بالائی ملے شامی کباب، شیر مال، یاقوتی زردہ یا سفیدہ رقص کرنے لگے۔ لیکن یہ تصور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا کیونکہ جب دستر خوان پر جانے کیلئے تیار ہوا تو معلوم ہوا کہ جوتا غائب ہے۔ دلہن کے رشتے کی کسی چھوٹی بہن نے اپنے شوہر یا ہونے والے شوہر کیلئے چرالیا تھا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔

قصہ مختصر میں ابتک آدمی تھا اب شوہر بنا دیا گیا۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔ میر تقی میر دلی والے پر بھی شاید ایسی ہی کوئی آفت آئی تھی جو کہا—— "جسکو چاہے خدا خراب کرے!"

شادی کا دوسرا رخ یوں شروع ہوتا ہے کہ دلھن صاحبہ اپنے گھر سے میرے گھر میں آگئیں۔ پہلی مشکل یہ درپیش ہوئی کہ انہیں رکھا کہاں جائے۔ میرے دولت خانے میں صرف ڈیڑھ کمرہ۔ ان کا سامان ڈیڑھ کمرے سے زیادہ۔ اس پر مزید وہ خود۔ شادی کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے یہ سربستہ راز مجھ پر کھل گیا۔ روزِ مقدّر، ساعت نیک، تقریب مبارک، ادائیگی فرض، لغت کے یہ سب الفاظ محض دکھاوے کے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لڑکیاں بڑی ہوکر جب اپنے گھر میں سمانے کے قابل نہیں رہتیں تو انہیں ایک عدد شوہر کے گھر بھیج دیا جاتا ہے کہ جاؤ بیٹی اب اپنے شوہر کے گھر کی تنگی ناپو! معاشرے کی اس ضرورت کو مہذب الفاظ میں تقریب شادی خانہ آبادی کہتے ہیں۔ چنانچہ میرے گھر کی آبادی بڑھ گئی۔ سامان میں ایک عدد بیوی کا اضافہ ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وطن کو تو آزادی مل گئی لیکن میری آزادی چھن گئی۔ جو محترمہ دلہن بنکر سمٹی سمٹائی شرمیلی سی آئی تھیں۔ انہوں نے ہاتھ پیر نکالے اور بیگم بن گئیں اور گھر پر قبضہ کرلیا۔ تاریخ میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ انگریز تاجر بنکر آئے تھے اور ھندوستان کے حاکم بن گئے۔ بیگم بھی دلہن بنکر آئی تھیں اور گھر کی مالک بن گئیں۔ خیر گرے ہوئے دودھ پر کون آنسو بہائے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ مجھ پر قبضہ کرنے لگیں۔ یہ بات یقیناً تشویشناک تھی۔ مجھے اپنے اطوار و حرکات کی آزادی سلب ہوتی نظر آئی۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے کہ شیو کیا اور صابن لگا برش یونہی چھوڑدیا۔ دانتوں کا برش کتابوں کی الماری میں، جوتے کا پالش لکھنے کی میز پر، روشنائی کی شیشی پلنگ کے نیچے۔ ہر چیز جہاں جی چاہا سلیقہ سے رکھدی۔ کسی کی روک ٹوک نہیں۔ ہر چیز آسانی سے مل بھی جایا کرتی تھی۔ قلم ڈھونڈھنے لگا تو دیاسلائی کی ڈبیہ مل گئی۔ ایک بار جوتے سے رومال نکل آیا۔ شاید اسی سے جوتا چمکایا تھا۔ لیکن یہ خوشگوار ماحول باقی نہیں رہا۔ جس طرح لارڈ کلائیو نے شاہ عالم کو چکمہ دیکر بنگال کی دیوانی حاصل کی تھی اسطرح مسکرا مسکرا کر بیگم نے میرے سجے سجائے گھر کی دیوانی حاصل کر کے مجھے دیوانہ بناڈالا۔

زیادہ وقت نہیں لونگا۔ چند المناک واقعے سن لیجئے۔ ایک دن میں حسب معمول صبح تڑکے کوئی ساڑھے نو بجے پاؤں پر پاؤں پھیلائے روزانہ قتل ہونے والوں کی خبر کو بڑی دلچسپی سے پڑھ رہا تھا کہ بیگم آئیں اور بولیں

"چلئے ناشتہ کرلیجے۔ میز پر چائے ٹھنڈی ہورہی ہے"۔

"چائے تو پلنگ پر بھی ٹھنڈی ہوسکتی ہے"۔ میں نے کہا——

"بھیج دو یہیں پر ایک پیالی چائے اور دو توس!"

"میری توبہ! بیگم بولیں—— "بھلا پلنگ پر ناشتہ کیا جاتا ہے!"

چائے بہت دور تھی اسلئے میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

ایک دن میں ٹی۔ وی۔ پر بہت اہم فلم دیکھ رہا تھا۔ ہیرو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اپنے دشمن پر کودنے ہی والا تھا کہ بیگم نے آکر سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ بولیں

"ارے سنتے ہیں! کراسن تیل، کوئلہ، کچھ ملتا ہی نہیں۔ چولہا کیسے جلے گا؟" یہ معاملہ بھی فلم کے ہیرو ں جیسا کچھ اہم سا محسوس ہوا۔ بہت غور کرنے کے بعد میں نے کہا

"دیکھو بیگم بہت سے کپڑے تم اب پہنتی نہیں ہو۔ گھر میں کچھ کرسیاں ضرورت سے زیادہ ہیں اور تمہارے میکے والا صندوق بھی ٹوٹتا جارہا ہے۔ روزانہ کے اخبارات ایک کونے میں الگ ڈھیر ہیں۔ ان سبھوں سے ہفتے عشرے تک چولھا جلاؤ۔ آئندہ اللہ مالک ہے؟" یہ کہکر میں پھر فلم دیکھنے لگا۔ مگر افسوس کہ ہیرو پہاڑ سے کود چکا تھا اور ایک ٹہنی سے لٹکا ہوا گانا گارہا تھا۔

"کپڑے، کرسیاں، صندوق جلادوں، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" بیگم نے تعجب سے پوچھا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں بیگم۔ کپڑے جتنے کم ہونگے۔ دھوبن کی دھلائی اتنی ہی کم ہوگی۔ رہیں کرسیاں تو نہ وہ ہونگی نہ لوگ بیٹھیں گے۔ صندوق میں رکھا ہی کیا ہے سوائے صندوق کے——" میں پھر فلم دیکھنے لگا اور بیگم نے باورچی خانے جاتے جاتے میکے چلے جانے کی دھمکی دیدی۔ ایسی دھمکیاں پہلے بھی مل چکی تھیں۔

غلام بھی نہیں۔ فراقؔ کو انگریزی ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ کیٹس، شیلے، براؤننگ، لارنس اور سمرسٹ مام وغیرہ ان کے محبوب فنکار تھے۔ کیٹس، شیلے اور مام کے یہاں لطیف جنسی کیفیتیں ملتی ہیں۔ براؤننگ اور لارنس کے یہاں اظہارِ جذبہ کی بے باکیاں ہیں۔ ایسی لطیف جنسی کیفیتوں سے اردو غزل حسرتؔ سے قبل، نہ تو آشنا تھی نہ "بنام تہذیب" ناآشنار کھی گئی تھی۔ تہذیب کی یہ طلائی زنجیریں زیادہ مضبوط نہیں تھیں۔ فراقؔ نے انھیں توڑ ڈالا۔ توڑنا مشکل بھی نہ تھا۔ جس ادب میں میر اثرؔ (خواب و خیال) اور شوقؔ لکھنوی (فریب عشق و بہار عشق) کی تقریباً بے لباس مثنویاں موجود ہیں وہاں غزل میں لطیف اشاراتِ جنسی کو داخل کر لینا ناممکن نہ تھا۔ ہندی دیو مالائی کہانیوں اور گیتوں میں جو ترغیب جنسی ملتی ہے۔ فراقؔ اس سے کماحقہٗ واقف تھے، خود ان کی زندگی "شراب و راگ و رنگ ——" سے مملو تھی۔

کوئی فن کار بھی، باوجود اپنے کسی جامد نظریاتی عقیدے کے اپنی تحت الشعوری یا لاشعوری تحریکوں سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن وہ فن کار جو ایسی تحریکوں کو ایک حسین شعور کا لباس عطا کر دے اس کی فن کاری موردِ انتقاد و عتاب ہوتے ہوئے بھی وہاں ہو گی جہاں مقابلہ ناممکن ہو گا۔ فراقؔ کی فن کاری ایک ایسے ہی مقام پر ہے جہاں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں۔ تخیل میں اصلیت (Originality) کی جستجو کسی ریگستان میں ایک نئے ذرّے کی تلاش کے مترادف ہو گی۔ کون اردو شاعر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا فلاں شعر بلحاظ تخیل بالکل نیا ہے! غالبؔ نے تو اعتراف نہیں کیا لیکن اقبالؔ سچ بول گیا ——

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

فراقؔ نے "کھوئے ہوؤں کی جستجو" تو خیر نہیں کی اور نہ کہیں اس کا اشارہ کیا لیکن میرؔ سے مصحفیؔ اور آتشؔ و مومنؔ سے حسرتؔ موہانی تک جو تاثر اور جذباتی رجحان انھوں نے قبول کیا اور انگریزی اور ہندی ادب سے جو تاثرات ان پر قائم ہوئے انھیں رنگ و روپ کے مختلف لباسوں کیساتھ اردو غزل میں پیش کر دیا۔ کہیں کہیں یہ لباس بہت باریک بھی ہو جاتے ہیں لیکن اتنے نہیں کہ شائستگی پر حرف آئے۔ مکمل عریانیت میں وہ کشش نہیں ہوتی جو باریک حجابات میں ہوا کرتی ہے۔ فراقؔ باریک رجحانات کے شاعر ہیں۔ یہ حجابات جنسی بھی ہیں تصوفانہ بھی۔ وہ نہ اپنے معشوق کو برہنہ دیکھنا پسند کرتے ہیں نہ ذاتِ باری کو عریاں۔ سب کچھ سامنے آجائے تو باقی کیا رہ جائے گا۔ ہر جستجو معطل، ہر تلاش ختم!

فراقؔ کی شاعری میں عشق کی جو جسمانیت اور نفسیاتِ حسن سے واقفیت ملتی ہے وہ اردو غزل میں نئی چیز ہے اور جس رنگ میں ملتی ہے وہ فراقؔ کا رنگ ہے! فراقؔ مجموعی طور پر جذبات و وارداتِ عشق کے شاعر ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری میں وہی لطیف و بلیغ اشاریت ملتی ہے جس سے مومنؔ کی شاعری عبارت ہے اور وہی شوق و سوز و گداز ملتا ہے جس نے حسرتؔ کو غزل میں "سچ بولنا" سکھایا۔ فراقؔ کی شاعری ہماری آپ کی اسی دنیا کی شاعری ہے۔ وہ "جوش تخیل میں تا فلک" کی باتیں نہیں کرتے۔ یہی رنگ ان کے تصوف کا بھی ہے۔ ان کے یہاں اصغرؔ کی ماورائی اڑان نہیں ملے گی۔ فانیؔ کی طرح کارزار ہستی میں انھیں بھی محرومیوں اور ناکامیوں سے سابقہ پڑا۔ وہ کہیں مایوس و غمزدہ تو نظر آتے ہیں لیکن قنوطیت پسندی ان کی فطرت نہیں۔ ان کی شاعری پر اصغرؔ کا یہ شعر صادق آتا ہے: ——

غزل کیا ہے شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغرؔ
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

فراقؔ کے مطالعہ سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ریاضؔ، حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور یاسؔ یگانہ جن منازل تک پہنچ کر ٹھہر گئے فراقؔ کاروانِ غزل کو وہاں سے صرف آگے ہی نہیں لے گئے بلکہ اقبالؔ کی طرح غزل کو نئی منزلوں سے آشنا کیا اور اسے نئی قدریں عطا کیں۔ چراغ سے چراغ ہمیشہ جل سکتا ہے اور جلتا آیا ہے۔ نئے چراغ کی لو تیز بھی ہو سکتی ہے، مدھم بھی۔ لیکن فانوس اپنے رنگ نہیں بانٹا کرتا۔ فانوس کا رنگ فانوس بنانے والوں کے ذوق پر منحصر ہے۔ فراقؔ نے بہت سے چراغوں سے روشنی لی لیکن اپنے چراغوں کو جن رنگ برنگ فانوسوں میں پوشیدہ کیا انھوں نے معنوی کرنوں کو وہ تہہ داری بخشی جس کے بارے میں مجنوںؔ گورکھپوری کہہ اٹھے ——

"فراق کے اکثر اشعار پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے پاؤں زمین پر جمے ہوئے ہیں اور ہمارے ہاتھ ستاروں تک پہنچے ہیں"۔

اب کچھ ان "ستاروں" کو دیکھا جائے جہاں تک ہمارے ہاتھ پہنچے ہیں۔ اور کچھ اُن "ستاروں" کا بھی اندازہ کیا جائے جن سے فراقؔ نے اپنے ستاروں کو نئی روشنی دی اور نئے فانوس عطا کئے: ——

حسرتؔ موہانی ۔ نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وارداتِ قلبی اور نفسیاتِ عشق کے اس مضمون پر اضافہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ فراقؔ بھی اس کیفیت سے گزرے اور جو کہا وہ خوب کہا: ——

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

اور "یاد کرنے" اور "بھلانے" کے عمل میں جب زندگی کے دن

بہت بیت گئے تو فراقؔ نے ایک اور چراغ جلایا:——

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

حسرتؔ اور فراقؔ میں ایک لطیف فرق ہے۔ حسرتؔ یار کے آگے بے بس ہیں۔ مصائب و مشاغل زندگی میں معشوق کی یاد نہیں آئی اور جب آئی تو آتی چلی گئی۔ یہ بالکل فطری کیفیت ہے۔ اس میں کسی شعوری عمل کو دخل نہیں۔ فراقؔ کے یہاں معشوق کا یاد آنا یا نہ آنا خود ان کے شعوری عمل پر منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اسی عمل میں ان کی زندگی کے دن بیت گئے۔

جوشؔ ملیح آبادی ؎ گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا

فراقؔ ؎ فسردہ پا کے محبت کو مسکرائے جا
اب آ گیا ہے تو اک آگ سی لگائے جا

فراقؔ کے یہاں جو کیفیت ہے وہ جوشؔ کے شعر میں نہیں ہے اگرچہ معنوی ہم آہنگی موجود ہے۔ آتشِ افسردہ میں دوبارہ آگ جلوا دینے کی خواہش فنی لحاظ سے بھی خوبصورت ہے۔

اقبالؔ ؎ گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی اپنے توہمات میں

دلِ وجود کو چیر ڈالنے والی نگاہِ تیز فراقؔ کے قبضہ وقدرت میں نہیں تھی لیکن وارداتِ عشق کی چند کیفیتیں اور جذبے، جن میں ان کی عمر کٹ گئی، ان کے لئے توہمات ہی ثابت ہوئے۔ یعنی ہر کیفیت بے حقیقت ہی ٹھہری۔ کہتے ہیں:——

لطف و ستم، جفا و فا، یاس و امید، قرب و بُعد
عشق کی عمر کٹ گئی، چند توہمات میں

میرؔ ؎ جس پہ سب بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

تلمیح سے قطع نظر، اس بے پناہ شعر میں جو لطافت و اشاریت ہے وہ فراقؔ کے حصے میں نہیں آئی جب اسی خیال کو وہ برملا کہہ گئے:——

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

معشوق کو دیکھ کر بے خود و بے حواس ہو جانے کے خیال کو جامیؔ سے غالبؔ اور ان کے بعد کے شعراء تک نے اتنی بار اپنے اشعار میں باندھا ہے کہ اس میں کوئی نیا پن نہیں رہا۔ لیکن جامیؔ کے اس خیال پر جو اضافہ کیا تھا اس سے آگے جانا ہی مشکل نظر آتا تھا۔ فراقؔ اس مشکل کو حل کر گئے اور اردو کو ایک بڑا ہی خوبصورت شعر دے ڈالا۔ ملاحظہ ہو:——

جامیؔ : مرا طاقتِ دیدنِ او کجا ست
کہ بے خود شوم ہر کہ نامش بُرد

غالبؔ : دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

فراقؔ : ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حسنِ یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

ذرا غور کیجئے جامیؔ نام سن کر ہی بے خود ہو جاتے ہیں۔ طاقتِ دید کہاں؟ غالبؔ دیکھنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن ان کے اندر کا رقیب انھیں دیکھنے نہیں دیتا۔ انھیں اپنے آپ پر رشک آجاتا ہے اور حالتِ رشک میں نظر کام نہیں کرتی۔ فراقؔ کے یہاں معاملہ ہی دوسرا ہے۔ حسنِ یار پر نظر پڑتے ہی ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے بجلی گرے اور سب بھسم ہو جائے۔ اس شعر کی تہہ داری کا کوئی ٹھکانہ ہے:——

اقبالؔ : ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اس لافانی حقیقت کو اتنے خطیبانہ انداز سے اقبالؔ ہی کہہ سکتا تھا۔ دوسروں کی ہمت نہ ہوتی۔ لیکن فراقؔ نے اس چراغ کو ایک نیا فانوس عطا کیا:——

جولاں گہہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

مومنؔ : ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

فراقؔ : گردشِ آسماں سے ڈرتا ہوں
بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت

آیئے اب فراقؔ کے کچھ وہ اشعار دیکھیں جہاں وہ تنہا نظر آتے ہیں:——

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

میں نہیے بالوں کی ہے سفیدی، فسردہ عہدِ شباب لے لو!
جنوں کی یہ بیڑیاں سنبھالو، بجھے ہوئے التہاب لے لو!
یہ میری رسوائیوں کے کنگن، یہ قید کا ہر عذاب لے لو!
یہ دوستوں کی ملامتیں ہیں، یہ دشمنوں کا عتاب لے لو!
جو میکدے سے مجھے ملا ہے وہ ساغرِ بے شراب لے لو!
جو تھا مرا انتظارِ ہستی، وہ منتظر انقلاب لے لو!
یہ میری محرومیوں کے دفتر، شکستہ انبارِ خواب لے لو!
لو آج رکھ دی تمہارے آگے متاعِ عمرِ زیاں رسیدہ
کھلی ہوئی ہے کتابِ ہستی، ورق ورق کا حساب لے لو!

سنّاٹا ـــــ!

نہ اب یقین نہ کوئی گماں نہ کوئی جنوں
نہ آرزو کہ کسی رُخ کی جستجو کر لوں
نہ اضطراب کوئی ہے نہ خواب ہے، نہ سکوں
ہے غم رسیدہ دلِ داغ دار کیا کیجئے
چراغ گل ہے، دھوئیں کا شمار کیا کیجئے

ملا جو راہ میں کوئی تو بے وطن کی طرح
جو ان کی یاد بھی آئی تو راہ زن کی طرح
حریفِ شور و غمِ حادثات بن نہ سکی
حریفِ مشکلِ راہِ حیات بن نہ سکی
حریفِ دردِ دل و ممکنات بن نہ سکی

نظامِ کہنۂ ہستی کو بارہا پرکھا
.. کم عیار ملا، وزن میں وہ کم ٹھہرا
اسے بدلنے کی اب آرزو نہیں باقی
نظامِ نو کے لئے جستجو نہیں باقی
کوئی بھی بات ہو اب گفتگو نہیں باقی

قلم کو لفظ، تخیل کو شعر ملتے نہیں
کوئی بھی نغمہ ہو اب دل کے تار ہلتے نہیں

شکستہ ساز سے جھنکار کی توقع کیا
شکستہ تیغ سے پیکار کی توقع کیا
شکستہ دست و پا، رہوار کی توقع کیا

کسے خبر ہے کب ان کا پیام آجائے
کسے خبر ہے کہاں اپنی شام آجائے
ہزار حیف کہ گل بے بسی میں کمہلائے
وجودِ ظلم پہ دل تلملا کے رہ جائے
جگر کی آگ ان آنکھوں سے پانی برسائے

کرشمہ سازیٔ حسن و ادا کی بات نہیں
خرد کے قول، جنوں کی صدا کی بات نہیں
نہ کوئی آئینہ باقی کہ منہ دکھا کے چلوں
نہ اب رقیب جسے راہ سے ہٹا کے چلوں
نہ بام پر کوئی جلوہ کہ سر اٹھا کے چلوں

ملا جو اب کوئی پتھر اُسے اٹھالوں گا
اور اس سے توڑوں گا شیشہ میں اس زمانے کا
بلا سے شیشۂ ہستی بکھر کے رہ جائے
کسی کرچ میں تو صورت کوئی نظر آئے
کہیں تو میرا جنوں کوئی ہم سفر پائے
کوئی تو ہو جو مری راہ سے گزر جائے!

خود کلامی ـــــ!

عجب سناٹا چھایا ہے، زمیں چپ آسماں چپ ہے
ہے یوں سہمی ہوئی محفل کہ ہر افسانہ خواں چپ ہے
ہراساں قہقہے، افسردہ نغمے، آرزو ترساں
دلوں پر اوس طاری ہے، مکیں چپ ہیں، مکاں چپ ہے
یہی ہے وقت سالک اپنے دل کو تول لے تو بھی
یہی ہے وقت کہ حق بول لے، حق کی زباں چپ ہے

مضمون

فراقؔ گورکھ پوری —— عشق کے روپ کا شاعر!

فراقؔ پر ان کی زندگی ہی میں بہت کچھ لکھا جا چکا تھا۔ ان کی موت کے بعد بھی کچھ کم نہیں لکھا گیا۔ شاید ہی کوئی پہلو ہو جو نظر انداز ہوا ہو۔ پھر بھی کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں کچھ باقی رہ گیا ہے۔ تلاش مکمل نہیں ہوئی، پانے کو ابھی بہت کچھ ہے۔

فراقؔ نے اردو ادب کو کیا دیا؟ اس سوال کے جواب یکساں نہیں ملے۔ مل بھی نہیں سکتے تھے۔ اور اگر سبھوں کے جوابات کا تجزیہ کیا جائے اور جمع تفریق کی مشق سے کام لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے اگر فراقؔ نہ ہوتے تو شاید اردو شاعری میں کچھ نہ ہوتا، یا فراقؔ کے ہونے نے اردو غزل کی جو قدریں تھیں ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ اس افراط و تفریط کے طوفان میں نئی راہ کی تلاش کچھ کم ہی کی گئی ہے۔

کیوں نہ یہ دیکھا جائے کہ فراقؔ نے اپنے پیش رووں اور ہم عصروں سے کیا لیا اور ہمیں کیا دیا۔ لین دین کا معاملہ تنہا نہیں ہوا کرتا۔ طرفین و فریقین کی ضرورت پڑتی ہے۔ قدیم اساتذہ خاص طور پر مصحفیؔ، مومنؔ اور غالبؔ سے کچھ دیر کیلئے قطع نظر کرتے ہوئے یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ ان کے ہم عصر اہل طرز اور نامور شعراء میں کون ہستیاں تھیں جن سے لاشعوری طور پر متاثر ہو سکتے تھے۔ ایک مختصر فہرست بنائی جائے تو یہ نام نظر آتے ہیں:——

(۱) ریاضؔ خیر آبادی	۱۸۴۸ء——۱۹۳۴ء	۸۶ سال
(۲) آرزوؔ لکھنوی	۱۸۶۹ء——۱۹۵۱ء	۸۲ سال
(۳) ثاقبؔ لکھنوی	۱۸۶۹ء——۱۹۵۲ء	۸۳ سال
(۴) حسرتؔ موہانی	۱۸۷۵ء——۱۹۵۱ء	۷۶ سال
(۵) فانیؔ بدایونی	۱۸۷۹ء——۱۹۴۱ء	۶۲ سال
(۶) اصغرؔ گونڈوی	۱۸۸۴ء——۱۹۳۶ء	۵۲ سال
(۷) یاسؔ یگانہ عظیم آبادی	۱۸۸۴ء——۱۹۵۶ء	۷۲ سال
(۸) جگرؔ مراد آبادی	۱۸۹۰ء——۱۹۵۵ء	۶۵ سال
(۹) جوشؔ ملیح آبادی	۱۸۹۴ء——۱۹۸۲ء	۸۶ سال

اس فہرست میں اقبالؔ کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ کیوں کہ بقول رشید احمد صدیقی —— "آج اقبالؔ اور ترقی پسندی سے کس کو مفر ہے"۔ فراقؔ سب سے بعد کو پیدا ہوئے (۱۸۹۶ء) اور ۸۶ سال کی عمر پا کر سب سے بعد کو رخصت ہوئے (۱۹۸۲ء)۔ ریاضؔ خیر آبادی سے جوشؔ ملیح آبادی تک جتنے شعراء ہیں فراقؔ کی زندگی کے شعوری حصے میں سب کے سب بہت عرصے تک بقید حیات رہے۔ اور سبھوں کا کلام اور انداز بیان فراقؔ کی نظروں سے گزرا اور بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فراقؔ نے سوائے جوشؔ کے بقیہ سبھوں سے اثر قبول کیا۔ کسی سے کم کسی سے زیادہ۔ لیکن اپنے تاثر کو انھوں نے ایسا شعری جامہ عطا کیا کہ پہچان مشکل ہو گئی اور عنوان بدل گئے۔ یہ لباس اور عنوانات کچھ اس طرح بدلے کہ فراقؔ کو قدیم و رائج تنقیدی اصولوں پر پرکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ فراقؔ نے اپنے اظہار جذبات و خیالات کے مقابلے میں عروضی اصولوں تک کی پرواہ نہیں کی۔ ایسا ہونا بھی ناگزیر تھا۔ کوئی بڑا فنکار لکیر کا فکر نہیں رہ سکتا۔ ہر بڑے فنکار کے یہاں فکری و فنی قدریں یا بدلتی ہیں یا ان میں اضافہ ہوتا ہے۔ نئی قدروں اور اضافوں کی پہچان کے لئے نئے تنقیدی شعور کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو فن کار ہی عطا کر دیتا ہے۔ اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ اور فراقؔ کو ان ہی کسوٹیوں پر پرکھا جا سکتا ہے، کہیں اور نہیں۔

فراقؔ کے یہاں متفرق رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ غزلوں کا مزاج مختلف نظر آتا ہے تو پھر فراقؔ کا رنگ کیا ہے اور کون سا ہے۔ نیاز فتحپوری فرماتے ہیں:——

"جہاں تک مجھے معلوم ہے فراقؔ کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں ہے۔ اور ایسا شخص جو ہر رنگ میں کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے حقیقتاً کسی کا شاگرد ہو بھی نہیں سکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اگر ہم اس وقت یہ معلوم کرنا چاہیں کہ فراقؔ کا اصل رنگ کیا ہے تو ہم کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے —— ان کا میلان وہی ہے جو مصحفیؔ کا تھا کہ جس رنگ کو اپنا لیا اور ذہین و بیقرار طبیعت رکھنے والے شاعروں کو اکثر اسی نیرنگی میں مبتلا پایا گیا ہے —— الخ ("ایک نوجوان ہندو شاعر")

اس کے باوجود فراقؔ کا اپنا رنگ بھی ہے جو انگریزی ادب اور ہندو دیومالائی کہانیوں اور شاعری کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ عام طور پر شعر و ادب میں کلاسکیت اور جدید انداز فکر و بیان کو دو متضاد یا متخالف قسمیں قرار دے کر گفتگو کی جاتی ہے گویا انھیں یکجا نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماضی سے بالکل مستغنی ہو کر مستقبل کا کوئی خواب کبھی بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ زندگی کے ہمہ گیر احساس میں ماضی کی پرچھائیاں اور مستقبل کی جھلکیں ایک دوسرے کو کاٹ جایا کرتی ہیں۔ فراقؔ کے یہاں یہ حقیقت بڑی شدت لئے ہوئے ہے۔ فراقؔ کے یہاں جو صورت بار بار نمایاں ہوتی ہے وہ قدیم و جدید، کلاسکی، رومانی اور عصری تصوراتی اشکال کا ایک حسین امتزاج ہے۔ فراقؔ نے اس شعور کی نفی نہیں کی ہے، جو قدیم تھا اور اس شعور سے بیگانہ اور بدظن بھی نہیں جو آج کے عہد کی دین ہے۔ فراقؔ کی شاعری اگر آج کی اصطلاح میں "انقلابی" نہیں تو بندھی ٹکی روایتوں کی

گوشۂ سالک لکھنوی

میں نہیں رہا تو نہیں رہا، یہ وجود کیا، مرا نام کیا
مجھے صرف اتنا خیال ہے مرے بعد تیرا مقام کیا
کبھی گیسوؤں کی تھی تیرگی، کبھی تابناکیٔ رُخ ملی
یہی صبح و شام کی زندگی، مری صبح کیا، مری شام کیا
یہ حیات عرصۂ جنگ ہے، ذرا بڑھ کے ہو تبر آزما
جو نہیں ہے تیغ شرر نشاں، تو یہ خالی تیری نیام کیا
نہ ہو جس میں لذتِ درد و غم نہیں چاہئے مجھے وہ اِرم
نہ جہاں ہو دل میں کوئی چبھن وہاں اہلِ دل کا مقام کیا
جہاں ہر دریچہ ہی بند ہو وہاں روشنی کا گذر کہاں
نہ ہو جس کے دل میں کوئی کسک تو وہ سمجھے میرا کلام کیا
مری جستجو میں حرم نہیں، مری آرزو میں صنم نہیں
میں ہوں زندگی، میں رکوں کہاں، یہ سجود کیا، یہ قیام کیا

میں سالک ہوں، ہر اک منزل کا کیف و کم مجھے دے دو
دیے ہیں راہ میں شعلے تو اب شبنم مجھے دے دو
لگی وہ آگ اس گھر میں کہ آنسو جل گئے سارے
مری یہ خشک آنکھیں لے لو، چشم نم مجھے دے دو
سمجھتے ہو مرا دامن ہے پُر خوشیوں کے پھولوں سے
تو یہ دامن تمہارا ہے، تم اپنے غم مجھے دے دو
دکھائی دی ہے جس میں آج تک انساں کی بربادی
میں اپنی شکل تو دیکھوں، وہ جامِ جم مجھے دے دو
اگر اپنا سمجھتے ہو تو میرے غم سنبھالو تم
اگر اپنا سمجھتے ہو تو اپنے غم مجھے دے دو

م بھلا سا
سیماب روش، پیار کا پیا سا
جہاں ایک
لر آتا ہے مجھ کو تو خدا سا
کروں کیا
سا تھا، یہ صحرا ہے ذرا سا

مجبوری و محرومی کی دل سوز فضا میں
اک یاد کسی کی ہے جو دیتی ہے دلا سا
کیا وقت تھا، ہر شام تھی اک محفلِ یاراں
کیا وقت پڑا ہے کہ نہیں کوئی شنا سا
بھٹکا ہوا راہی جو سر راہ ملا تھا
صورت سے نظر آتا تھا اک راہ نما سا

لو میں تو چلا، کب تک دیکھوں کون اپنا پرایا ساتھ چلے
دوریٔ منزل کم تو نہ ہوگی چاہے یہ دنیا ساتھ چلے
کھا کھا کے فریب راہ براں اور اپنی راہوں سے نالاں!
ہر موڑ پر ایسے لوگ ملے جو تنہا تنہا ساتھ چلے
تھی منزل جن کی گلشن تک وہ گلشن گلشن ساتھ رہے
ان کی بھی کوئی منزل ہوگی جو صحرا صحرا ساتھ چلے
اک ان کا بھی بجرہ ہے جو آسودۂ ساحل رہتا ہے
اک اپنی کشتی طوفاں طوفاں دریا دریا ساتھ چلے
جب آئی تھکن تو نیند آئی جاگے تو آگے اور بڑھے
کیا مرنے جینے کی باتیں جب مرنا جینا ساتھ چلے

ہوس اور عشق میں ہونا تھا کچھ تو امتیاز آخر
جلی پروانوں کے جھرمٹ میں شمعِ دل گداز آخر
جنوں افزا کرم ان کا بنا سامانِ رسوائی
حجابِ جور تھا وہ التفاتِ دلنواز آخر
فرازِ شوق آ پہنچا مقامِ کبریائی تک
سرِ دار و رسن ہوگی شہیدوں کی نماز آخر
سلامت ہے جنوں تو رقص میں آئیں گے دیوانے
اگر ہیں بیڑیاں قائم تو بج اٹھے گا ساز آخر
ہے کس کی یاد ہنگامِ سحر سالک کی پلکوں پر
چھپایا تھا جسے اب تک ہوا ظاہر وہ راز آخر

اب ایسی باتیں کوئی کرے جو سب کے من کو لبھا جائیں
کوئی تو ایسا گیت چھیڑے وہ جس کو سنیں اور آ جائیں
بے تال ہے کیسی یہ سرگم، بے لہرا پنچم ہے مدّھم
جو راگ ہے دیپک اس من میں اس راگ کو کیسے گا جائیں
اب چلنا ہے تو چلنا ہے کیا پاؤں کے چھالوں کو دیکھیں
اس دھرتی کی پگ ڈنڈی سے کوئی تو ٹھکانا پا جائیں
یہ میرا لہو، وہ تیرا لہو، یہ میرا گھر، وہ تیرا ہے
جو آگ لگی ہے دونوں میں اب جاتے جاتے بجھا جائیں
یہ ڈھیر نہیں ہے مٹی کا، اِک سالک تھک کر سویا ہے
کچھ اُوس گرادو پلکوں سے، کچھ پھول یہاں لہرا جائیں

خوش ہوگئے الفاظ، کبھی رو گئے الفاظ
جو دل پہ گذرتی ہے وہی ہو گئے الفاظ
سوچا تھا کہ لکھ ڈالوں ذرا اپنا فسانہ
آیا جو ترا نام توسب کھو گئے الفاظ
کہنا تو بہت چاہا تھا، کچھ کہہ نہ سکا میں
جذبات کی یلغار میں گم ہو گئے الفاظ
اس کھیت سے نفرت بھی محبت بھی اُگی ہے
کاٹا ہے وہی میں نے جسے بو گئے الفاظ
نفرت کا چڑھا رنگ تو وہ بن گئے نشتر
یاد اُن کی جو آئی تو غزل ہو گئے الفاظ
منصف کو یقیں کیسے ہو ہم قتل ہوئے تھے
ہر دامنِ روداد کا خوں دھو گئے الفاظ
خاموشیٔ سالک پہ سب اک روز کہیں گے
محفل سے اُٹھا کون، یہ کیوں رو گئے الفاظ

راہ کا پتھر——

دشمن ہو کہ اب دوست، کوئی فرق نہیں ہے
دشمن کا کوئی تیر بھی اُس تک نہیں جاتا،
جو دوست ہیں اب اور ملامت نہیں کرتے،
اب وقت کی رفتار میں آواز نہیں ہے

وش کے بقیہ
ہاتھوں

اب کوئی بھی
الفاظ ہیں خامو
جو کھو گئی وہ پی
جو مے کدہ بردوش
ساقی کی نظر میں تھ
——کیا ر ں بنوں ہو
وہ عالمِ دیوانگی اب یاد نہیں ہے
اب یاد نہیں کیسی تھی زنجیر کی جھنکار
——کوڑوں کی وہ پھنکار
——زنداں کی وہ دیوار
ٹوٹے ہوئے آئینے میں شکلیں ہیں شکستہ
ہے خواب کی لہروں میں کوئی تاج محل گم،
یا کوئی تھکا ماندہ مسافر کہیں سو جائے
یا جیسے سفینہ سرِ ساحل کہیں ڈوبے
یا جیسے کسی آنکھ نے پی ڈالے ہوں آنسو،
ناکام کے ہونٹوں پر غمگین تبسّم
یا جیسے کسی راج محل کا کوئی پتھر
بوسیدہ و کم وزن
بے جنگ فصیلوں سے سرِ راہ بکھر جائے
اور آج یہی حال ہے اس کا
وہ سنگِ سرِ راہ تھا ٹھکرایا گیا ہے
منزل کی کسی راہ میں خاموش پڑا ہے
وہ راہ کا پتھر!

متاعِ عُمرِ زیاں رسیدہ!

چھپا کے رکھی ہے جو بھی دولت، اے محتسب پیش کر رہا ہوں
سوال معلوم ہیں مجھے سب، لو آج ان کا جواب لے لو!
یہ میرے سینے میں آرزوؤں اور حسرتوں کے بڑے دفینے
یہ داغِ دل لعلِ بے بہا ہے، یہ درد کے قیمتی نگینے
یہ آب دار آنسوؤں کے موتی، چھپے ہوئے غم کے یہ خزینے

غزلیں



زرینہ زرّیں

نام زرینہ خاتون
قلمی نام . زرینہ زرّیں
والد کا نام سید مطیع الرحمٰن
تاریخ پیدائش ۱۹/اکتوبر ۱۹۶۸ء۔ کلکتہ
آبائی وطن بہار
تعلیم ایم اے اردو۔ کلکتہ یونیورسٹی
شغل تعلیم و تعلم
تصنیف "حلقہ ارباب ذوق اور اردو نظم"
پتہ ۳۰/۱اے۔ آغا مہدی
اسٹریٹ، کلکتہ-۷۰۰۰۱۲
فون (033) 216-2362

الجھنوں میں گذر گئے ایّام
مجھ کو دیوانہ کر گئے ایّام
تشنگی ہے کہ بڑھتی جاتی ہے
ریت آنکھوں میں بھر گئے ایّام
بے بسی کا حساب کس سے لوں
ریزہ ریزہ تو کر گئے ایّام
دل کے ناسور اب بھی رستے ہیں
ہائے کیا حال کر گئے ایّام
تاج پوشی ہوئی ہے کانٹوں سے
معتبر مجھ کو کر گئے ایّام
رنج و غم میں بھی آرہا ہے لطف
ان کے صدقے سنور گئے ایّام
سرخ رو کون ہوگیا زرّیں
خونِ دل سے نکھر گئے ایّام

دل سے دل کا ہے سلسلہ کوئی
یا ہے یہ میرا واہمہ کوئی
شہر کے موڑ پر ہے سناٹا
سامنے پھر ہے مسئلہ کوئی
پھر چھٹی جس پہ آج دستک ہے
ہونے والا ہے حادثہ کوئی
وقت ہے امتحان کا زرّیں
اب تو کرنا ہے فیصلہ کوئی

مسکراہٹ کے کچھ پھول برسایئے
چشم مے گوں کے بھی جام چھلکایئے
ساری شمعوں کی لو ماند پڑجائیگی
اب خدارا نہ یوں بے حجاب آیئے
ذکر مت چھیڑیے عنبریں رات کا
میری یادوں کو ایسے نہ مہکایئے
کچھ تصور کو میرے جلا تو ملے
کوئی تازہ غزل آپ بن جایئے
میرے مہتاب سے کوئی جاکر کہے
آپ زرّیں کے گھر کو بھی چمکایئے

صداقت مانگ لفظوں میں خدا سے
جلا فن کو ملے گی اِس نوا سے
تو چسپاں کر لبوں پر بجلیاں اب
کبھی کچھ مل بھی جاتا ہے دعا سے
یہ سارے ہاتھ پتھریلے ہیں یارب
نہ ہونگے سرخ یہ رنگِ حنا سے
رہِ تجدید پتھریلی بہت ہے
چلیں گے، ہو لہو پانی بلا سے
غزل میں تجربہ اپنے جہاں کا
سمویا ہم نے ہے زرّیں ادا سے

ریت ریت ہر چہرہ، اِن میں تو جدا ہو جا
بن سکے مسیحا تو، جذبہ آشنا ہو جا
ریزہ ریزہ آئینہ، اور جاں گسل لمحے
آب یاریٔ غم کر، درد کی دوا ہو جا
ناؤ اپنی کیوں ڈوبے، مکر کے سمندر میں
چھین بھی لے اب چپّو، خود ہی ناخدا ہو جا
زندگی کا حاصل تو، خامشی نہیں سائیں
حرف حرف چنگاری بھر لے لب کشا ہو جا
وقتِ آزمائش ہے، رنج کے ہیں کیا معنی؟
چشمِ جستجو وا کر، عین مدّعا ہو جا
روح کے شرارے سے بجلیاں سی کوندیں گی
زخمِ دل رفو کر لے غیب کی ندا ہو جا



سالک لکھنوی

نام : سالک لکھنوی

پتہ : ۲، سوترکن اسٹریٹ، کلکتہ-۷۲ فون : ۰۳۳-۲۳۷۸۲۸۴

خاندانی نام : شوکت ریاض کپور

والد کا نام : تلسی رام کپور (اسلام قبول کرنے سے پہلے)
طارق ریاض کپور عرف محمد احمد
(۱۹۰۹ء میں اسلام قبول کرنے کے بعد)

پیدائش : ۱۶؍ دسمبر ۱۹۱۳ء لکھنؤ (اتر پردیش)

تعلیم : بی۔اے، سینٹ زیویرس کالج، کلکتہ، بی۔کام، سیٹی کالج، کلکتہ۔
دبیر کامل (فارسی) لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ۔

اسیری : بسلسلۂ تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" ۱۹۴۲ء —— ۱۹۴۳ء

شغل : افسانہ نگاری، تنقید نگاری، شاعری، ترجمہ، صحافت، سیاست، سماجی خدمت۔

تصانیف : عذرا اور دیگر افسانے (افسانوں کا مجموعہ) ۱۹۴۱ء
پسِ شعر (تشریحِ اشعار بطرزِ نو) ۱۹۸۱ء
بے سر دپا (طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۲ء
بنگال میں اردو نثر کی تاریخ —— آغاز تا حال ۱۹۹۸ء

ترجمہ : کامریڈ مظفر احمد —— حیات و خدمات ۱۹۸۳ء

شعری مجموعہ : کلامِ سالک ۱۹۹۹ء

مناصب : سابق نائب صدر یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ۔
سابق سکریٹری اور صدر سی ایم او ہائی اسکول کلکتہ
سابق سکریٹری اور نائب صدر انجمن ترقی اردو، (ہند) کلکتہ
آلڈرمین، کلکتہ کارپوریشن ۱۹۸۵ء —— ۱۹۹۰ء
چیرمین مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ ۱۹۹۱ء تا حال
ایڈیٹر روزانہ "آبشار" کلکتہ ۱۹۸۸ء تا حال
جوائنٹ ایڈیٹر ہفتہ وار "آثار" کلکتہ ۱۹۵۹ء —— ۱۹۶۱ء

اعزازات : "جنگ آزادی" اوارڈ ۱۹۵۷ء
عبد الرزاق ملیح آبادی اوارڈ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۹۸۳ء

غزلیں

مرے سینے میں سوزِ آرزو کس کی عنایت ہے
سبو میرا، مئے ناب سبو کس کی عنایت ہے
جہانِ خاک زا میں ایک ذرّہ ہے وجود اپنا
مگر ذرّے میں ذوقِ جستجو کس کی عنایت ہے
گریباں کہکشاں کا تھام لیتی ہے نظر اپنی
جنون و شوق، شورِ ہائے و ہو کس کی عنایت ہے
یہ مانا باغباں میں ہوں، یہ صحنِ گلستاں میرا
مگر پھولوں میں جوشِ رنگ و بو کس کی عنایت ہے
مصوّر ہوں، یہ میرے رنگ ہیں، یہ مُو قلم میرا
مگر تصویر میں رنگِ نمو کس کی عنایت ہے
یہ مضراب و سرود و سازِ محفل سب مرے، لیکن
مغنّی کا دلِ آہنگ جو کس کی عنایت ہے
یہ ممکن ہے نگاہِ عشق سے پنہاں رہے جلوہ
مگر احساسِ زلفِ مشک بو کس کی عنایت ہے
یہ میری بندشِ الفاظ، یہ میری غزل سالکؔ
مرے شعروں میں پنہاں گفتگو کس کی عنایت ہے

★ ("سبو ز ماست و لے بادہ در سبو ز کجاست" —— اقبالؔ)

ترا منشا الٰہ العالمیں ایسا نہ ہوتا تھا
ہزاروں آستاں اور اک جبیں ایسا نہ ہوتا تھا
طلسمِ رنگ و بو دنیا، فدائے رنگ و بو انساں
مکاں ایسا جو ہوتا تھا مکیں ایسا نہ ہوتا تھا
ترا یہ مے کدہ؟ مخمور ہیں چند اور سب پیاسے
نہیں ایسا نہ ہوتا تھا، نہیں ایسا نہ ہوتا تھا!
کہیں اک در کی خاطر بارشِ سنگ اک جبیں پر ہو
کہیں ہر در پہ جھک جائے جبیں ایسا نہ ہوتا تھا
ترا سالکؔ جو ٹھکراتا رہا ہر دین و دنیا کو
وہ ہو جائے شریکِ اہلِ دیں ایسا نہ ہوتا تھا

ینے
تی نگینے
م کے یہ خزینے

کہ وہ جاتے وقت اپنی آنکھیں یہیں چھوڑ گیا تھا تاکہ وہ اپنوں کی رہبری اور غیروں کی نگرانی کرتی رہیں۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ اس کی روانگی کے اتنے لمبے عرصے بعد بھی اس کے منحوس سائے نے ان لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے جنہیں وہ اپنوں سے خارج کر گیا تھا —— ہماری بے چینی کی یہی وجہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ہمیں نجات کا کوئی راستہ دکھائی دیا تو ہمیں ایسا لگا کہ ہمیں سب کچھ مل گیا ہے اور ہمیں اس کے سوا کچھ اور نہیں کرنا ہے ہم زمین کے اس جوڑ کی چوڑیوں کو ڈھیلا کرنے میں لگ جائیں ——

اور پھر ہم نے وہی کرنا شروع کر دیا جس کے لئے ہم بے چین تھے۔

اس کے لئے ہم نے تمام ضروری اوزار اکٹھا کر لیے تھے اور زمین کو دو آہنی شکنجوں میں جکڑ بھی لیا تھا۔ ہمیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ زمین کا ڈبا بھی عام ڈبّوں جیسا ہی ہے یعنی کرنا صرف یہ ہے کہ ڈھکن کو بائیں طرف گھمایا جائے اور برتن کو داہنی طرف۔ اب صرف یہ طے کرنا باقی تھا کہ کس کو ڈھکن سمجھا جائے اور کس کو برتن کیوں کہ جیسا کہ ہم یہ بتا چکے ہیں، دونوں حصے کم و بیش برابر ہی معلوم ہوتے تھے۔ غلطی ہونے پر اندیشہ یہ تھا کہ چوڑی کہیں اور بھی نہ کس جائے۔ چناں چہ ہم نے وہی کرنے کا فیصلہ کیا جو ایسی غیر یقینی حالت میں بالعموم کیا جاتا ہے یعنی ہلکے ہلکے دونوں کو آزمانا شروع کیا۔ ابھی ہمارے شکنجے پورا زور بھی نہیں لگا سکے تھے کہ اچانک ایک آواز سن کر ہم ٹھٹک گئے لیکن کچھ دیر بعد یہ سوچ کر پھر کام میں جٹ گئے کہ شاید یہ ہمارا واہمہ تھا لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بات وہم کی نہیں تھی، حقیقت میں کوئی بول رہا تھا کیوں کہ پھر کسی نے بڑی سخت آواز میں یہ کہا — خبردار! تم لوگ کیا کر رہے ہو؟

ہم زمین کے جوڑ کو کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہم نے جواب دیا اور پھر یہ پوچھا کہ تم کون ہو؟

جوڑ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے 'تم کیوں اسے کھولنا چاہتے ہو۔ اس نے پھر سختی سے سوال کیا۔

ہم لوگ حال سے تنگ آ گئے ہیں اس لئے بھاگ جانا چاہتے ہیں

ہم میں سے ایک ماضی میں لوٹ جائے گا اور دوسرا مستقبل میں گھر بنائیگا۔

وہ کیسے؟

یہ ہم بعد میں بتائیں گے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ کون ہو؟ کیا اسی بند ڈبے جیسی زمین کے اندر رہتے ہو؟

جو جی میں آئے سمجھ لو۔ لیکن کچھ پوچھنے سے پہلے تم کو یہ بتانا ہو گا کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ جوڑ کھل جائے گا تو تم دونوں وہاں پہنچ جاؤ گے جس کا خواب دیکھ رہے ہو؟

ارے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جوڑ کھل جائے گا تو زمین کے دونوں ٹکڑے آزاد ہو کر ایک دوسرے کی مخالف سمت میں تیزی سے گھومنے لگیں گے۔ گردش جتنی تیز ہو گی، دن رات اتنی تیزی سے رخصت ہوں گے اور اسی طرح سال بھی۔ یعنی پچھم کے رُخ گھومنے والا کم سے کم عرصے میں حال کو پار کر کے مستقبل میں جا پہنچے گا اور پورب کی طرف گھومنے والا اسی تیزی سے نکل کر ماضی میں واپس چلا جائیگا۔

اچھا یہ بات ہے! تم لوگ تو بہت بڑے سائنس داں معلوم ہوتے ہو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ تب حال کا کیا بنے گا؟

حال! حال سے ہمیں کیا مطلب۔ حال رہے یا جہنم میں جائے ہماری بلا سے۔

لیکن تم ان تینوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ حال کے بغیر ماضی کچھ بھی نہیں اور مستقبل کا تو کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکے گا۔ حال کی اچھی بری یادوں کو ہی تو ماضی کہتے ہیں اور اس کی امیدوں اور اندیشوں کا نام مستقبل ہے۔ کیا غلط ہے؟

"پتا نہیں"۔ "یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ زمین کے دونوں ٹکڑے مخالف سمت میں گردش کرتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تو کیا ہو گا۔ کیا یہ دنیا باقی رہ جائیگی، تم لوگوں نے کیا اس پر بھی غور کیا ہے؟"

ارے بھائی! بولتے کیوں نہیں، کیا سوچنے لگے؟ وہ بولے جا رہا تھا۔

تم خواہ مخواہ ہمیں ڈرا رہے ہو۔ ہم تمہارے بھرّے میں آنے والے نہیں ہیں۔ زمین کے دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ وہ جس محور پر گھوم رہے ہیں وہ ایک مقناطیسی ڈور ہے جو انھیں ہر حال میں باندھے رہے گی —— یہ کہہ کر ہم نے اپنی دانست میں ایک بڑا تیر مارا لیکن وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا چنانچہ برجستہ یہ سوال کر بیٹھا۔

اس کی ضمانت ہے کہ یہ ڈور کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ زمین کے دونوں ٹکڑے دو مخالف سمتوں میں ناچنا شروع کریں گے۔ تو کیا ایک نئی قوت جنم نہ لے گی جو دونوں کو ایک دوسرے کی طرف کھینچنے کے بجائے انھیں ایک دوسرے سے پرے دھکیلنے کی کوشش کرے گی اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ نئی قوت تمہاری مقناطیسی ڈور سے بھی زیادہ طاقتور ہو جائے۔ تب کیا ہو گا؟ کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے؟

سوچ میں پڑ گئے! اب کیوں نہیں بولتے۔ جواب نہ پا کر وہ بولا!

ہم واقعی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اسلئے اسکے سوال کا جواب دینے کے بجائے ہم نے یہ کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کہ پہلے وہ یہ تو بتائے کہ وہ ہے کون؟

تم دو ہو نا؟۔ ہماری بات سن کر وہ بولا۔

ہاں ہم دو ہی ہیں!۔

تو یہ سمجھو میں تیسرا ہوں۔ اور پھر ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے کہنا شروع کیا ——! اچھا یہ تو بتاؤ۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ زمین کی محوری

گردش تیز ہو جانے سے سال بھی تیزی سے آنے جانے لگیں گے۔ سورج کے گرد زمین کے ایک چکر کی تکمیل کا نام ہی تو سال ہے۔ دن رات والے چکر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو اس سے دن رات چھوٹے ہو کر پانچ چھ گھنٹوں کے یا پھر اس سے بھی کم وقفے کے ہو سکتے ہیں لیکن سورج کے گرد گردش پر تو اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ سال میں دن رات کی تعداد بڑھ کر دگنی تگنی ہو جائے گی۔ وہ بولے ہی چلا جا رہا تھا جس سے ہماری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے سارے پروگرام کو چوپٹ کرنے پر تل گیا ہے اس لیے ہمیں غصہ بھی آنے لگا تھا چنانچہ ہم نے ایک اور سوال داغا ——— تمھیں یہ کیسے معلوم ہے کہ زمین کی محوری گردش تیز ہوگی تو سورج کے گرد اس کے سالانہ چکر پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟

میرے پاس اس کا واقعی کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن تمہارا جو خیال ہے، اس کا بھی تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ اگر ہو تو پیش کرو۔

ایک بار پھر ہم پھنس گئے کیونکہ ہمارے پاس بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسئلے پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

ہم جواب سوچ ہی رہے تھے کہ وہ پھر بولا ——— ثبوت نہ میرے پاس ہے اور نہ تمہارے پاس لیکن دونوں میں ایک فرق ضرور ہے۔

وہ کیا؟۔ ہم نے سوال کیا۔

وہ یہ ہے کہ اگر تمہاری بات صحیح ثابت ہوئی تو تم یہ کہہ سکو گے کہ دیکھا، ہمارا اندازہ کتنا درست ہے۔ لیکن میری بات درست ہوئی تو

تو کیا؟

تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ تم سب اور تمہارے ساتھ پوری دنیا کا خاتمہ ہو چکا ہوگا۔ اور تم یہ سننے کیلئے موجود نہ ہوگے کہ دیکھو میں نہ کہتا تھا

تم پھر چپ ہو گئے ——— کچھ تو بولو ——— اچھا یہ تو بتاؤ بھاگ جانے کے لئے اتنے بے چین کیوں ہو؟

یہ سن کر ہم نے اپنی پوری آپ بیتی سنادی اور یہ بھی بتادیا کہ کانا فرشتہ ہی سارے فساد کی جڑ ہے جس کے بہکاوے میں آکر پہلے تو اپنوں نے ہمارا شمار غیروں میں کیا اور پھر ہم کو ایسا دشمن سمجھنا شروع کر دیا جس کی سرکوبی گویا ان کے اپنے وجود کے لئے ضروری ہو گئی ہو۔ ہم سے ایسی ایسی سرگرمیاں منسوب کی جانے لگی ہیں جو ہماری سکت سے بھی باہر ہیں۔ ہم لاکھ دہائی دیں کوئی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ہم بے ضرر ہیں۔ وہ یہی کہے جا رہے ہیں کہ آسمان پر ہر طرف تمہارے آدمی منڈلا رہے ہیں اور تمہاری طاقت بڑھانے کے درپے ہیں۔

یہ کہہ کر ہم چپ ہوگئے اور یہ انتظار کرنے لگے کہ وہ کچھ بولے۔

تو یہ بات ہے۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے ——— اور کچھ ٹھہر کر اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ دیکھو، حال سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ کم از کم ابھی تو نہیں۔ البتہ تم اس میں رہتے ہوئے اس سے دو دو ہاتھ کر سکتے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری اٹھاپٹک سے اسکی شکل و صورت کچھ بدل جائے لیکن وہ رہے گا تمہارے ساتھ ساتھ۔ یہ تو ہوئی ایک بات۔

دوسری بات یہ ہے کہ سارے فساد کی جڑ صرف کانے فرشتے کو سمجھنا ٹھیک نہیں کیوں کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے ذمہ دار وہ لوگ بھی ہیں جو یہ دیکھ کر تلملا رہے تھے کہ تمہاری وجہ سے ان کا رعب داب اٹھتا جا رہا ہے۔ وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے اپنے لوگ انھیں چھوڑ کر تمہاری طرف دیکھنے لگیں۔ اسلئے موقع ملتے ہی انھوں نے کانے فرشتے کا سہارا لے لیا اور اس کی مدد سے ان تمام لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا جو تمہاری طرف جھکنے لگے تھے۔

لیکن یہ سب تم کیوں سنا رہے ہو؟ ——— اپنا سارا خواب چکنا چور ہوتے دیکھ کر ہم تقریباً چیخ پڑے۔

——— تاکہ تم یہ سمجھ سکو کہ تمہارا اصلی مسئلہ کیا ہے اور اب تمہیں کیا کرنا ہے۔

اور سنو تم نے یہ کیا کہا کہ تم دو ہو۔ آخر دونوں ایک کیوں نہیں۔ کیا تم نے اس پر غور کیا ہے؟ تمہارے اپنے بیان کے مطابق تم دونوں کی بیماری ایک ہی ہے تو پھر دو مختلف علاجوں کی ضرورت کیوں؟ کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں۔ پہلے اس پر غور کر لو۔

اب تو ہم واقعی بوکھلا گئے اور ایک دوسرے کو اس طرح دیکھنے لگے گویا یہ پوچھ رہے ہوں کہ اب کیا کیا جائے۔

ہمارا کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر بولا ——— میں جانتا ہوں کہ تمہاری بیماری بہت پیچیدہ ہے۔ دونوں کو ایک بنانا آسان نہ ہوگا۔ اس کے لئے آپریشن کے ذریعہ دلوں کو بدلنا ہوگا۔ پھر یہ بتاتا چلوں تو اچھا ہوا کہ تمہارے ستم گروں کا حال بھی کچھ اچھا نہیں ہے۔ وہ صرف دیکھنے میں ایک لگتے ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان پر گہرے رنگ کی جو پالش چڑھی ہوئی ہے، اس نے ان کے بیشمار جوڑوں کو چھپا رکھا ہے۔ ذرا اسا کھرچو گے تو وہ نظر آنے لگیں گے۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے، یہ تم بخوبی جانتے ہو۔ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اتنا ضرور خیال رکھنا کہ کچھ کرنے سے پہلے اپنا علاج کرا لینا تاکہ ——— اتنا کہہ کر وہ چپ ہوا تو کچھ نہ بولا۔

ہم نے کئی بار اس کو مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ کوئی آواز نہیں آئی ———

معلوم ہوتا ہے کہ وہ چلا گیا۔ چلو لوٹ چلیں ——— اپنے ٹوٹے ہوئے سپنوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم نے یہ سوچا۔

استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات کو یہ بات بُری تو معلوم ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اثر و رسوخ سے محروم کسی بھی فنکار کی تخلیقات کا اس وقت تک نوٹس نہیں لیا جاتا ہے جبتک اُس سے کوئی کام لینے کی ضرورت نہ پیش آجائے۔ کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ چونکہ فیض پہنچانے کی بڑی صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے ان کی مداحی وقت بے وقت ہوتی رہتی ہے اور اکثر ان کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ گویا اب ہندوستان میں ان سے بڑا کوئی دوسرا نہیں رہ گیا ہے، لیکن حقیقت چونکہ کچھ اور ہی ہوتی ہے اس لئے اس قسم کی تحریریں کتابی شکل اختیار کرنے کے باوصف نہ تو کبھی شرف قبولیت حاصل کرپاتی ہیں اور اس لائق سمجھی جاتی ہیں کہ انھیں سند کے طور پر کہیں پیش کیا جاسکے۔

آزادی کے بعد کے دور میں یہاں افسانہ نگاروں اور شاعروں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ ان کی تخلیقات کو نقد و تبصرے کے ذریعے اتنا آگے بڑھایا جاسکتا تھا کہ دوسرے علاقوں کے لوگ ان کا نوٹس لینے پر مجبور ہوتے اور ان کا موازنہ اپنے افسانہ نگاروں اور شاعروں سے کرتے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا جس سے نہ صرف ان افسانہ نگاروں اور شاعروں کا نقصان ہوا جو اپنے بس بھر ادب کی خدمت کرنے کی کوشش کررہے تھے بلکہ وہ لوگ بھی گھاٹے میں رہے جنھوں نے اپنے فرض کی ادائیگی سے محض اس لئے کوتاہی کی کہ اول الذکر اس لائق نہیں تھے کہ وہ انھیں اس کا کوئی صلہ دے سکتے۔ حوصلہ افزائی کے اس فقدان کی وجہ سے ان میں سے کچھ تو بیٹھ گئے اور جو رہ گئے ان میں اپنے فن کو ترقی دینے کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہ گیا۔ جہاں تک خود کو تنقید نگار سمجھنے والوں کا تعلق ہے انہیں اس طرح نقصان پہنچا ہے کہ انہوں نے اپنے فرض کی ادائیگی سے کوتاہی برتی تو وہ موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا جو انہیں تنقید نگار کی حیثیت سے شاید منوالیتا اور اس طرح وہ آج بھی انہیں لوگوں کو صف میں پڑے ہوئے ہیں جنکے ذکر کی ضرورت پیش آتی ہے تو صرف یہ کہہ کر بات ختم کردی جاتی ہے کہ "وہ بھی شامل ہیں"۔ ان چند نکات پر اظہار خیال کرنے کے بعد میں اپنی بات ختم کرتا ہوں اور اس امید کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ یہاں لکھنے پڑھنے والوں میں جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور جو انہیں آگے بڑھنے اور حیثیت منوانے سے روکتی ہیں ان پر اسی جذبے کے ساتھ غور کیا جائیگا۔ جسکے تحت وہ پیش کی گئی ہیں اور ذرا دیر کے لئے بھی یہ نہ سوچا جائیگا کہ مقصد کسی کو ذلیل کرنا یا اس کا مضحکہ اڑانا ہے۔ اس کے بر خلاف نیت صرف یہ ہے کہ بحث کا دروازہ کھولا جائے جسکی میرے خیال میں اشد ضرورت ہے۔

(مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ایک سمپوزیم میں پڑھی گئی تحریر)

افسانہ

چلو لوٹ چلیں

ہم دو تھے۔ ایک وہ اور دوسرا میں۔ وہ بھی جانا چاہتا تھا اور میں بھی۔ دونوں کی خواہش ایک تھی اور تمنا بھی ایک جیسی لیکن پھر بھی مختلف۔ دونوں کی منزلیں ایک دوسرے سے ناقابل حساب دور۔ وہ پچاس برسوں پیچھے لوٹ جانا چاہتا تھا اور میں پچاس برس آگے نکل جانے کا خواہاں۔ حال سے دونوں برگشتہ اور اس سے چھٹکارا پانے کی تڑپ دونوں کے دلوں میں تھی لیکن بھاگنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اسے ایسی کوئی گاڑی نہیں ملتی تھی جو اسے ماضی میں پہنچادے اور مجھے کوئی ایسی مشین دستیاب نہیں تھی جو ایک جست میں مجھے حال سے باہر کردے۔ گاڑیوں کی کمی نہیں تھی۔ آواز سے تیز چلنے والی بھی تھیں اور روشنی کا پیچھا کرنے والی بھی لیکن ان میں سے کوئی ہمارے مطلب کی نہیں تھی۔ ہمیں تو ضرورت ایسی مشین کی تھی جو وقت کی رفتار سے تیز ہو اور جو ماضی، حال اور مستقبل کو گھر آنگن بنادے۔

ہم میں سے کوئی سائنس داں نہیں تھا اس لئے ہماری نظر میں مسئلہ صرف اتنا تھا کہ کرۂ ارض کو کیسے گھمایا جائے کہ گزرے ہوئے پچاس سال پھر واپس آجائیں اور میرا دوست پھر اسی ماحول میں پہنچ جائے جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اور جس کی یاد اسے بری طرح ستارہی تھی یا پھر ارض کی موجودہ گردش کو اُسی رُخ پر کیسے تیز کردیا جائے کہ وہ ایک پل میں اگلے پچاس برس پار کرلے اور میں ایک ایسے ماحول میں پہنچ جاؤں جسے میں نے دیکھا تو نہیں لیکن نجانے کیوں یہ یقین تھا کہ وہ ہر لحاظ سے شاندار ہوگا۔

بات انہونی سی لگتی تھی لیکن ہم لوگوں کے دل اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ہم یہ سوچتے تھے کہ سائنس نے بہت سی ناممکنات کو ممکنات کے دائرے میں داخل کردیا ہے۔ سرحدیں ٹوٹ رہی ہیں، فاصلے سکڑ رہے ہیں، سیاروں پر کمندیں ڈالی جارہی ہیں اور اربوں اور کھربوں میل کے سفر کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس لئے اب ممکن ہو جائے گا کہ انسان اپنی پسند کے دور میں رہا کرے خواہ وہ ماضی میں ہو یا حال اور مستقبل میں۔ صرف دیر سویر والی بات رہ گئی ہے۔ وہ بھی سوچتا تھا اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ کسی نہ کسی دن ایسا ہو رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ناکامیوں اور مایوسیوں کے باوجود ہم ہار ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور مخالف سمت میں چلتے بھی رہتے تھے۔ وہ حال سے نکلنے کے لئے پورب کا رُخ اختیار کیے ہوئے تھے اور میں مستقل کو پکڑنے کے لئے پچھم کی طرف دوڑ رہا تھا۔ لیکن حال سے نبھانے کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی تھیں۔ ہم گھوم پھر کر وہیں رہ جاتے تھے جہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک مسئلہ اور بھی تھا جو کم سنگین نہیں تھا لیکن اس پر ہم اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکے تھے۔ اسے یہ سوچ کر بعد کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا کہ جب وقت آئے گا، دیکھ لیا جائے گا۔ وہ یہ تھا کہ میں اس کے ساتھ پچاس سال پیچھے جانے کے لئے تیار نہیں تھا اور اسے میرے اگلے پچاسویں برس کی مفروضہ خواب ناک فضا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دونوں کے راستے نہ صرف الگ الگ بلکہ مخالف سمت میں بھی تھے۔ ہاں مسئلہ صرف اس طرح حل ہو سکتا تھا کہ پہلے میں اس کے ساتھ چلوں اور واپس آکر اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں یا پہلے وہ میرے ساتھ چلے اور تب مجھے اپنے ساتھ لے جائے۔

یہ تصور دونوں کے لئے بڑا ہی عجیب و غریب تھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اس قسم کی الجھنوں پر ہم سر دست غور کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہر بات کے ممکن ہونے کا خیال ہمارے ذہنوں پر ایسا سوار تھا کہ ہم اس بات کو بھول گئے تھے کہ ہر ممکن بات بھی ہر وقت ممکن نہیں ہوا کرتی۔ چنانچہ ہمیں یہ یقین تھا کہ یہ تمام باتیں اتنی معمولی ہیں کہ قبل از وقت ان پر غور کرنا بیکار ہے۔ وقت آنے پر مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا اس لئے ہمیں صرف اس بات کی فکر ہونی چاہئے کہ زمین کی گردش ہماری مرضی کے تابع ہو جائے۔ سیدھے کہیں تو سیدھی گھومے۔ الٹے کہیں تو الٹی اور ٹھہرو کہیں تو ساکت ہو جائے۔ اپنی اس خواہش کا ہم اعلان تو نہیں کرتے تھے کیونکہ ہمیں یہ خوف تھا کہ لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے اور ہمیں پاگل سمجھیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری خواہش اسی قسم کی تھی اور ہم سنجیدگی سے اسے بروئے کار لانے کی جدو جہد بھی کر رہے تھے۔ ہم اس کے لئے طرح طرح کی مشینوں کا جائزہ لے رہے تھے اور یہ بھی معلوم کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ ہمارے کرۂ ارض کی ساخت میں کہیں کوئی ایسی بات تو پوشیدہ نہیں ہے جو ہمارے مطلب کی ہو۔ ہم جستجو میں لگے رہے اور ہر اس چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے جس کا تعلق اپنی اس زمین کی ساخت سے ہو سکتا تھا تاکہ اس کی بناوٹ کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

پھر ایک دن اچانک ایک چونکا دینے والے انکشاف نے ہمیں دم بخود کر دیا۔ یہ انکشاف بہت بڑا، انتہائی سنسنی خیز اور ہمارے لئے بڑا ہی ولولہ انگیز تھا۔ ہوا یہ کہ اپنی کیلی پر گھومتی ہوئی زمین کے بیچوں بیچ ایک جوڑ کا پتا لگ گیا جو عام طور پر دکھائی نہیں دیتا ہے۔ مزید چھان بین سے یہ معلوم ہوا کہ زمین ایک بند ڈبے کی طرح ہے جس کا ڈھکن ڈبے کے تقریباً برابر ہی ہے۔ دونوں کے سرے پیچ دار ہیں۔ چوڑیوں نے ڈبے اور اس کے ڈھکن کو ایک دوسرے سے جکڑ رکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی ہم اچھل پڑے اور ہمیں ایسا لگا کہ ہم کو سب کچھ مل گیا ہے اور اب ہمیں کچھ اور سوچنے سمجھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

یہاں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم پاگل تھے یا ہمیں کتے نے کاٹا تھا۔ ہم بھاگ جانا چاہتے تھے تو اسکی وجہ یہ تھی کہ ایک کانے فرشتے کا منحوس سایہ ہم پر پڑ گیا تھا جو ہمیں پریشان کیے ہوئے تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں موجود تھیں لیکن ان کی بناوٹ الگ الگ تھی۔ اُنکی پتلیوں کے رنگ بھی دو طرح کے تھے اور پھر ان پتلیوں کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ ایک میں حرمت کی جھلک تھی تو دوسری میں خشونت کی کڑک۔ جسے وہ مروّت بھری آنکھ سے دیکھ لیتا تھا اس کے بارے میں یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ اس کا بیڑا پار ہو گیا ہے اور جس پر خشونت کی نظر پڑ جاتی تھی، کہاوت کے مطابق اس کا ستیاناس ہو جاتا تھا۔

اس نے ایک بار بہت سے لوگوں کو جمع کر کے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ ایک اوتار ہے۔ عذاب و ثواب کی کنجی اس کے پاس ہے۔ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے، ان کے تمام دکھ دلدر دور ہو جائیں گے اور جو ایسا نہیں کریں گے وہ دوزخ کے کندے بنیں گے۔ لیکن اس نے کھل کر کبھی یہ نہیں بتایا کہ آخر وہ کون سا راستہ ہے جس پر چلنے کی وہ وکالت کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے پیغام کو عام کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کا سارا کام خفیہ ہوا کرتا تھا۔ وہ کہتا کچھ تھا اور کرتا کچھ اور تھا۔ وہ لوگوں کو ٹولیوں میں جمع کرتا تھا اور ان سے کانا پھوسی کرتا تھا۔ اس کے بعد انھیں یہ ہدایت کرتا تھا کہ اس سے انھوں نے جو کچھ بھی سنا ہے، اسے بس اپنے تک رکھیں۔ اس کے مداح اس پر پورا پورا عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لئے بروقت سب کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا تھا کہ اپنے پجاریوں کو کیا سکھا رہا ہے۔ ہاں بعد میں یہ ضرور سننے میں آجاتا تھا کہ وہ یہ پرچار کر رہا ہے کہ یہاں سبھی لوگ ایک دوسرے کے اپنے نہیں ہیں۔ اس لئے لوگوں کو سب کی فکر کرنے کے بجائے صرف اپنوں کا خیال رکھنا چاہئے اور اچھا تو یہ ہوگا کہ عقل مندوں کی یہ بات گرہ میں باندھ لی جائے کہ غیروں تک صرف وہی چیزیں پہنچیں جو اپنوں کے کام کی نہ ہوں۔ جس کے لئے اس کی رائے یہ بھی ضروری ہے کہ ان داتا کی حیثیت اپنے لوگوں کو ہی حاصل رہے۔ اس کے بعد اس قسم کی بھی اڑتی ہوئی خبریں سنائی دیں کہ اس کے خیال میں یہاں جو دو طرح کے لوگ بستے ہیں ان میں سے ایک تو وہ ہیں جو اس زمین کے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو بعد میں آسمان سے ٹپکے تھے ——— اور ان دونوں کے درمیان وہی فرق ہے جو ایسی دو مخلوقوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد ——— اور اس کو گئے ہوئے بھی ایک زمانہ ہو گیا ہے ——— یہ کہا جانے لگا ہے کہ نئے اور پرانے لوگوں کے درمیان امتیاز کے لئے وہ ایک کسوٹی چھوڑ گیا ہے جس کے مطابق وہ شخص یقیناً آسمانی ہوگا جو یہ کہہ کر اندھیرے میں چلنے سے انکار کرے کہ اسے روشنی کی ضرورت ہے کیونکہ ایسی بات صرف اسی کی زبان سے نکل سکتی ہے جس کو اپنے پرکھوں سے من کا اجالا نہ ملا ہوگا۔ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا اور ان پر بھروسا نہ کرنا ضروری قرار دیا جا رہا ہے اور اب تو یہ بھی کہا جانے لگا ہے

ندرت اور اس کے ساتھ خیال آفرینی، تہہ داری، پیکر تراشی اور منظر نگاری، پرانے خیالات کو اس طرح پیش کرنے کی صلاحیت کہ وہ بالکل نئے معلوم ہونے لگیں یا ان کے حسن میں اضافہ ہو جائے یہ اور اِس قسم کی بعض دوسری باتیں شامل ہوا کرتی ہیں اسی کے ساتھ اِس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ شاعر یا ادیب، قاری اور سامع کو کس حد تک اپنے ساتھ لیکر چل پایا ہے اور آج کل تو یہ بھی دیکھا جانے لگا ہے کہ تخلیق کار نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے، اُس سے اسکی وہ سماجی ذمّے داریاں پوری ہوئی ہیں یا نہیں جنکے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ اُس پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ ذمّے داریاں کیا ہیں ان کے بارے میں شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ من مانے طور پر مسلط کی جاتی ہیں جس سے تنقید نگاروں کو اِس بات کا مزید ایک موقع ہاتھ آجاتا ہے کہ وہ کسی بھی تخلیق کو خاص عینک سے دیکھنے کی آزادی حاصل کر لیں، لیکن اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں تو یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ تخلیق اپنے اصول و قواعد خود مرتب کرے یا تنقید کی احکام برداری کرتی رہے۔

جہاں تک تنقید نگار کا تعلق ہے، اس کا آغاز گرچہ یونانی فلسفی ارسطو نے کیا تھا جس نے یونانی ڈراموں کے حوالے سے اپنے دور کی شاعری کا تجزیہ کیا تھا، اور تنقید کے کچھ اصول بھی وضع کر دیئے تھے لیکن تنقید کے نام پر آج ہمارے سامنے علمی شکل میں جو فن موجود ہے وہ ہمیں ۱۹ویں صدی سے ورثے میں ملا ہے۔ اس صدی میں سائنس کے علاوہ جن علوم و فن کا ترقی ہوتا تھا یا جنکی تنظیم نو ہوتی تھی، ان میں ادبی تنقید کا فن بھی شامل ہے۔ اردو زبان میں یہ فن مغربی زبانوں بالخصوص انگریزی سے آیا ہے۔ اس سے قبل اردو کو صرف ان تذکروں سے روشناس ہونے کا موقعہ ملا تھا جو اس کے شاعروں کے بارے میں بہ زبان فارسی مرتب ہوا کرتے تھے۔ ان تذکروں میں اول تو زیر بحث شعراء کے کلام پر کوئی رائے زنی نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی تھی تو بس اتنی کہ شاعر کی حیثیت اور علمیت پر مزید کچھ روشنی پڑ جائے۔ اردو میں جو لوگ تنقیدی ذہن لے کر سب سے پہلے نمودار ہوئے ان میں سر سید احمد، مولوی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، حالی۔ شبلی اور نساخ وغیرہ قابل ذکر ہیں، گرچہ صرف حالی اور شبلی نے خصوصی شہرت حاصل کی لیکن یہ بات بھی تذکرے کے لائق ہے کہ اِس ہراول دستے میں شمولیت کا فخر نساخ کی شکل میں بنگال کو بھی حاصل تھا۔ لیکن ۲۰ویں صدی میں ہم قدم رکھتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۱۴ء میں ہونے والی پہلی جنگ عظیم کے بعد جو لوگ سامنے آئے، ان میں بنگال کا بمشکل ایک فرد تھا۔

تنقید نگاروں کی یہ دوسری صف کافی طویل تھی جس کے قابل ذکر لوگوں میں حسرت موہانی، مجنوں گھورکھپوری، نیاز فتح پوری، اثر لکھنوی، عندلیب شادانی، محی الدین قادری زور، عبدالماجد دریا آبادی، عزیز احمد، محمد حسن عسکری اور احتشام حسین شامل تھے۔ ان میں بنگال کی نمائندگی عندلیب شادانی کیا کرتے تھے لیکن ان کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد ہی پنجاب سے کلکتہ منتقل ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ قاضی عبدالغفار ایسے دوسرے شخص تھے جن کا تعلق بنگال سے صرف اس حد تک تھا کہ انہوں نے کلکتے میں چند سال بطور صحافی بسر کئے تھے۔ بعد میں یہ فہرست کچھ اور آگے بڑھتی ہے تو ہمیں بنگال کا کوئی بھی فرد نظر نہیں آتا۔ اس فہرست کے تمام لوگ دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جنکے یہاں نام گنوانے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

اب کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ نساخ کے بعد کلکتے میں لکھنے پڑھنے کا کام بند ہو گیا تھا۔ اور اس لئے تنقیدی نگاری بھی نہیں ہو رہی تھی۔ بلاشبہ ایسا نہیں تھا۔ کام سبھی ہو رہے تھے لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ راجدھانی کی منتقلی کی وجہ سے اردو سے تعلق رکھنے والا ادبی اور ثقافتی مرکز ایک بار پھر شمال اور جنوب کی طرف منتقل ہو گیا تھا جسکی وجہ سے بنگال کے لوگ دوسرے علاقوں سے کٹ کر تقریباً ایک کونے میں پڑے رہ گئے تھے۔ یہاں جو کچھ پڑھا جاتا تھا وہ یہیں رہ جاتا تھا جسکی ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ جو لوگ لکھنے پڑھنے کا کام یہاں کر رہے تھے وہ اس بات کی کوئی خاص جدوجہد نہیں کرتے تھے کہ دوسرے علاقوں کے لوگ انہیں جانیں پہچانیں اور وہاں انکی ادبی حیثیت تسلیم کی جائے۔ یہاں یہ عرض کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ کہیں بھی کسی باہری کو آسانی سے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے لئے سخت جدوجہد کی جاتی ہے تب کسی کو کوئی جگہ مل پاتی ہے اور یہاں اِس بات کا اعتراف نہ کرنا غلط ہوگا کہ اِس قسم کی جدوجہد کے جذبے کا فقدان یہاں بالعموم رہا ہے۔ اسکی طرف نہ پہلے کبھی توجہ دی گئی اور نہ آج دی جا رہی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کی کوشش ذرا بھی نہیں کی جاتی کہ حصول شہرت کے لئے صرف علمی استعداد ہی کافی نہیں ہوا کرتی۔ اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور جب کوئی اپنی پوری توانائی اس پر صرف کر دیتا ہے تو شہرت کی دیوی اس کے قدم چومتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور ہے لیکن وہ ذرا دیر بعد۔ آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ گزشتہ پچاس برسوں میں مغربی بنگال میں تنقید نگاری کا کیا حال رہا ہے۔ یہاں لکھنے پڑھنے والوں پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہاں نہ تو تخلیق کاروں کی کبھی کمی رہی ہے اور نہ تنقید نگاروں کی۔ کام ہر شعبے میں ہوتا رہا ہے اور ایسے لوگ اِس پورے عرصے میں برابر موجود رہے ہیں جو نقد و تبصرے کے کام سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ہاں! انھوں نے اس کام کو دوسرے کاموں پر ترجیح نہیں دی۔ مثلاً پرویز شاہدی کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ تقسیم ملک سے قبل وہ شاعری کیساتھ تنقید نگاری کے فن سے

بھی دلچسپی رکھتے تھے اور اس کے لئے اپنے جریدے "جدید اردو" کے صفحات استعمال کرتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے ایک لمبے عرصے تک اس صنف میں کوئی خاص کام نہیں کیا۔ یہی بات جمیل مظہری، ابراہیم ہوش اور سالک لکھنوی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ یعنی انہوں نے بھی اس شعبے میں مسلسل کوئی کام نہیں کیا۔ بعد میں جو لوگ سامنے آئے انکی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں لطیف الرحمٰن، جاوید نہال، پروفیسر مشتاق احمد، ڈاکٹر عبدالرؤف، قیصر شمیم، اقبال کرشن، اعزاز افضل، علقمہ شبلی، نصر غزالی، راز عظیم، خالق عبداللہ، سیدالابرار اور احسن شفیق کا نام لیا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو رخصت ہوگئے ہیں۔ کچھ بیٹھ گئے ہیں اور تھوڑے سے ایسے ہیں جو کبھی کبھار کچھ لکھ لیا کرتے ہیں۔

گذشتہ بیس بائیس سال کے دوران مزید جو لوگ اس میدان میں آئے ان میں ف س اعجاز، ظہیر انور، یوسف تقی، شہناز نبی، کلیم حاذق، ابوذر ہاشمی، ابوبکر جیلانی، فیروز عابد، معصوم شرقی، عاصم شہواز شبلی، خواجہ نسیم اختر، مقصود دانش، اشفاق احمد اور عنبر شمیم قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان سب میں بھی یہ بات مشترک ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اس فن کو ترجیحی انداز میں نہیں اپنایا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے بھی ہیں جو اب تک یہ طے نہیں کرسکے ہیں کہ ان کے لئے کون سی صنف زیادہ موزوں ہوگی۔ وہ بیک وقت کئی گھوڑوں پر سواری کی کوشش کررہے ہیں۔ کبھی وہ افسانہ لکھتے ہیں تو کبھی شعر گوئی کی طرف مائل ہوجاتے ہیں اور جب ان کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا تو وہ نقد و تبصرے کے کام سے بھی دلچسپی سے لیا کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی صنف میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں بناپاتے۔ یہ ہے وہ بات جس کا ذکر مغربی بنگال کی ادبی پسماندگی کے اسباب کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔

بظاہر اس قسم کے حضرات بعض بڑے لوگوں مثلاً آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی اور ہمارے اپنے درمیان موجود سالک لکھنوی اور مظفر حنفی کی پیروی یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ جب یہ لوگ بیک وقت کئی میدانوں میں اپنے جوہر دکھا سکتے ہیں تو ہم بھی ایسا کیوں نہیں کرسکتے۔ لیکن انھیں یہ احساس نہیں ہے کہ "تانہ بخشند خدائے بخشندہ" والی بات بھی تو ہے۔ جوہر ایک کے حصے میں نہیں آیا کرتی۔ مظفر حنفی کا نام آگیا ہے تو یہ بھی سنتے چلئے کہ بعض نوجوان شعراء ان کی تقلید کرتے ہوئے بسیار گوئی کا راستہ بھی اختیار کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ پتہ نہیں کہ ان لوگوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جو بات مظفر حنفی جیسے کہنہ مشق شاعر کے لئے روا ہوسکتی ہے، وہ ان کے لئے نہیں ہوسکتی۔ اس کے برخلاف ان کے جیسے نووارد اور نوآموز شاعر کو اِس سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

یہ غالب کے آم نہیں ہیں کہ بہت ہوں اور میٹھے ہوں۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا جسکے لئے اظہار معذرت کرتے ہوئے اب میں اس سوال کو زیر بحث لانا چاہوں گا کہ اتنے بہت سے لوگوں کی موجودگی کے بعد کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی بنگال میں تنقید نگاروں کی کمی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جواب "نہیں" بھی ہوسکتا ہے اور "ہاں" بھی۔ نہیں اس لئے نقد و تبصرہ کرنیوالوں کی فہرست ماشاءاللہ کافی طویل ہے اور ہاں اس لئے کہ ان میں سے کسی نے خود کو تنقید کے لئے وقف کرنا تو درکنار اس پر پوری پوری توجہ بھی نہیں دی ہے اور اس لئے تنقید نگار کی حیثیت سے ان کی اپنی کوئی شناخت بھی نہیں بن پاتی ہے۔ اس موقع پر یہ ذکر کردینا بھی مناسب ہوگا کہ جب تک کسی کام سے کوئی شخص مسلسل ایک لمبے عرصے تک منسلک نہیں رہتا اس وقت تک اس کام کے حوالے سے اس کی کوئی شناخت نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی کو شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے تو کسی افسانہ نگار کی حیثیت سے۔ اور جنکا ان دونوں صنفوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ان کا شمار مزاح نگاروں، انشاء پردازوں، خاکہ نویسوں میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن انھیں تنقید نگار بہر حال تصور نہیں کیا جاتا۔

مغربی بنگال میں تنقید نگاروں کی کمی کا احساس پایا جاتا ہے اس کی وجہ دراصل یہی ہے کہ جو کام غیر معمولی دماغ سوزی اور سخت ریاض کا طالب ہوتا ہے اس کو یہاں روارودی میں کیا جاتا ہے۔ جو حضرات اس فن سے "پارٹ ٹائم" دلچسپی رکھتے ہیں وہ اگر اسے "فل ٹائم" میں بدل دیں تو اس قسم کا کوئی مسئلہ باقی نہ رہ جائیگا لیکن ایسا صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب ہمارے شاعر اور ادیب اس بات کو سمجھ لیں کہ تنقید بذات خود ایک جداگانہ ادبی صنف ہے جو تخلیقی صنفوں سے کسی طرح کمتر نہیں ہے کیونکہ اسکے ذریعے شعری اور نثری تخلیق کے ایسے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جن میں سے بعض کے وجود کا احساس عمل تخلیق کے دوران خود تخلیق کار کو بھی نہیں ہوتا یہ تنقید نگار جو اپنی موشگافیوں کے ذریعے کبھی کبھی اسے یہ بتاتا ہے کہ اس کی تخلیق کا ایک پہلو تو یہ بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شعری اور ادبی نگارشات کی مختلف پرتوں کو الٹ پلٹ کر کھنگالنے کے کام سے تنقید نگار ہی بخوبی واقف ہوتا ہے جو اُسے طویل ذہنی ورزش کے ذریعہ حاصل ہوا کرتا ہے اور اس ورزش کے بغیر یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ کوئی شخص نقاد کہلانے کا حقدار ہوجائیگا۔

یہاں یہ بات بری طرح کھٹکتی ہے کہ مقامی تنقید نگاروں کی تحریروں میں ان کا ضمیر جاگتا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ بات بالعموم دیکھی جارہی ہے کہ یہاں تنقید کو دوست نوازی اور مطلب براری کے لئے

اطلاعات کے نمائندے نے یہ کہہ کر بات ٹالنی چاہی کہ ڈرائیور کو وہاں کا رستہ معلوم نہیں ہے۔ یہ سن کر میں نے اسی نوجوان کو کہیں بس میں راستہ بتانے کیلئے بٹھالیا اور بس بستیوں کی گلیوں اور کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی وہاں پہونچی اور ہم لوگ مقبرے کے اندر گئے تو اسکے سنگ مرمر کے فرش پر خون کے کئی چکتے نظر آئے جو اس بات کے گواہ تھے کہ لوگوں کو فرش پر فیک کر ذبح کیا گیا ہے۔ ایک اخبار نویس نے اپنی ٹارچ مزار پر ڈالی تو وہ بھی ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ اس نے ٹارچ کا رخ اندر کی طرف کیا تو اس میں کئی کٹے پھٹے جسم نظر آئے جس میں ایک لڑکی یا عورت کی لاش بھی معلوم ہوتی تھی۔ اس قسم کے کتنے ہی دردناک منظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ جن میں ٹراموں کو روک کر ان کے مسافروں کو چاقو بازی کا نشانہ بنانے کے ہولناک واقعات بھی شامل ہوتے تھے۔ ایسے واقعات بھی ہوتے تھے کہ کچھ لوگ ٹرکوں میں بھر کر تیزاب بھرے بلب لے کر دوسرے فرقے کے محلے میں گھستے اور تیزاب کی بارش کرتے ہوئے نکل جاتے۔ ایسے ٹرکوں میں تیزاب کے حملے کا علاج کرنے کیلئے بالٹیوں میں بھرا ہوا املی کا پانی بھی موجود ہوتا تھا کہ جوابی حملہ کا مقابلہ کیا جائے یا اپنے ہی کسی فرد پر تیزاب کے چھینٹے پڑ جائیں تو علاج کرلیا جائے۔ بمبئی میں ایسے لوگ بہت کم تھے جو فسادات کی بے شرط مذمت کرتے ہوں۔ ہندو مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کو جائز اور ضروری سمجھتے تھے تو مسلمان کیلئے ہندوؤں کا خون مباح ہو گیا تھا۔ صرف دو آدمی واقعی ایسے ملے جو اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ ان میں سے ایک تو بمبئی کے وزیر اعظم بالاجی کھیر تھے۔ دوسرے محکمہ اطلاعات کے ڈائرکٹر ایس۔ اے۔ ایّر جو جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے اور نیتاجی کی عارضی حکومت آزاد ہند میں جو سنگاپور میں قائم ہوئی تھی وزیر اطلاعات رہ چکے تھے۔ ایّر صاحب جن کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اردو اخبار نویسوں کی شکایتیں دور کرنے کی بھی حتی الامکان مخلصانہ کوشش کرتے تھے۔

۱۹۴۳ء میں اتر پردیش کی گورنری حکومت نے جب کمیونسٹ پارٹی کے تینوں اخباروں کے اپنے صوبے میں داخلے پر پابندی لگائی تو ہماری ایسوسی ایشن نے اسکی مذمت کی۔ ساتھ ساتھ کچھ اور بھی سلسلہ جنبانی ہوئی اور تھوڑے دنوں بعد ہی یہ پابندی اٹھالی گئی۔

آزادی کے بعد جب مسلمانوں سے وطن کی وفاداری کا ثبوت دینے کا مطالبہ شروع ہوا تو اسکے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ آخر یہ فرض بھی ہماری انجمن ہی نے زور شور سے انجام دیا اور اسکی سخت تجویز کی سارے اخبارات میں اشاعت ہوئی۔

غزلیں

جوش پر آیا نہیں ہے رقصِ مستانہ ابھی
رہنے دو گردش میں تھوڑی دیر پیمانہ ابھی

جام خالی ہو کسی کا، کوئی خُم کے خُم چڑھائے
یار سمجھے ہی نہیں آدابِ میخانہ ابھی

عشق کی فطرت نہ بدلی ہے نہ بدلے گی کبھی
شمع روشن کیجئے آتا ہے پروانہ ابھی

سن رہے ہیں آرہی ہے ہر طرف تازہ بہار
اپنا گھر کیوں لگ رہا ہے مجھ کو ویرانہ ابھی

دیدیا دل ہم نے پورا ہو گیا یوں ایک باب
مان جائیں آپ تو پورا ہے افسانہ ابھی

اے فریدی وہ ستاتے ہیں ستالینے بھی دو
کم سنی ہے اور ہیں اطوار طفلانہ ابھی

✻ ✻ ✻

بری دنیا میں خوشی ہے نہ خوشی کے آنسو
باہنر روتا ہے یاں بے ہنری کے آنسو

جن کا دعوا تھا کہ جنت میں وہ لے جائیں گے
دے رہے ہیں ہمیں دریوزہ گری کے آنسو

وہ جو کہتے ہیں کہ ہیں راہبر و قائدِ قوم
دیتے ہیں راہ کی بس گم شدگی کے آنسو

مرتے دم حلق میں ٹپکانے کے پانی کا ہے قحط
ہیں پر افراط سے آشفتہ سری کے آنسو

کچھ تو وہ ہیں جو بنا بھی چکے دنیا کو بہشت
ہم بہاتے ہیں فقط مردہ دلی کے آنسو

دیکھتا ہوں جو میں انسانوں کے پھیلے ہوئے ہاتھ
روکے رکتے نہیں احساسِ خودی کے آنسو

آگ سے، خون سے اور موت سے یوں کھیلتا ہوں
مجھ سے دیکھے نہیں جاتے ہیں کسی کے آنسو

جب کوئی مرحلۂ دار و رسن آتا ہے
بہہ نکلتے ہیں فریدی کے خوشی کے آنسو

واہ کیا رابطۂ قلب و نظر ہوتا ہے
تیر لگتا ہے اِدھر زخم اُدھر ہوتا ہے
اک جنوں ہی ہوسِ لعل و گہر ہوتا ہے
دل کے جوہر ہی سے ممتاز بشر ہوتا ہے
پہلے خط آتے تھے لاتے تھے خوشی کے پیغام
اب تو خط دیکھ کے دل زیر و زبر ہوتا ہے
اس قدر قرب پہ اللہ رے دوری اے دوست
تیرا دامن مرے اشکوں ہی سے تر ہوتا ہے
گر جگائے نہ دلوں کو تو ہے بے کار یہ شور
حرم و دیر میں جو شام و سحر ہوتا ہے
یوں تو میں معتقدِ خوئے برہمن بھی نہیں
شیخ کچھ اس سے بھی کوتاہ نظر ہوتا ہے
سنگدل ہے اسے رو رو کے فریدی سمجھاؤ
سنتے ہیں پانی کا پتھر پہ اثر ہوتا ہے



رئیس احمد جعفری

نام : رئیس احمد جعفری

والدین کے اسمائے گرامی : سید احمد (مرحوم) فاطمہ عالیہ (مرحومہ)

تاریخ پیدائش : ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۲ء (اسکول سرٹی فکٹ کے مطابق)۔ گھریلو روایت کے مطابق پیدائش دو سال پیشتر ہوئی۔

جائے پیدائش : مہگاؤں (الہ آباد سے ۲۴ کیلو میٹر پچھم) گرانڈ ٹرنک روڈ پر واقع

تعلیم : مکتبی تعلیم کانپور مہگاؤں کے مدرسہ عزیزیہ اور اناوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول سے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول مرزاپور سے میٹرک ۱۹۴۷ء میں۔ مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج الہ آباد سے انٹر کامرس ۱۹۴۹ء میں۔

بیوی اور کنبہ : بیوی رضیہ خاتون۔ دو بیٹیاں اور ان کے بچے۔

کلکتہ آمد : بنارس کے سیوا پوری آشرم سے کوآپریٹو سکریٹری کی تربیت پائی جہاں مجھے ڈیڑھ سو "چھاتروں" میں تنہا "مُسلم چھاتر" سمجھا جاتا تھا۔ وہاں سے ۱۹۴۹ء ہی میں کلکتہ آیا۔ ۵۰ء اور ۶۴ء کے فسادات دیکھے۔ ۱۹۶۴ء کے فساد کے دوران ڈیفنس آف انڈیا رولس کے تحت جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ رہائی کے پندرہ ماہ کے بعد ہند پاک جنگ ہوگئی اور ایک بار پھر جیل بھیج دیا گیا۔

صحافتی زندگی : ۵۰ سالہ صحافتی زندگی میں سوائے "روزنامہ ہند" کے کلکتے کے ہر اخبار سے تعلق رہا۔ روزنامہ "آزاد ہند"۔ روزنامہ "عصر جدید"۔ موجودہ روزنامہ "آبشار" سے وابستگی کی مدت طویل رہی ہے۔ بزرگ صحافی اور ناول نگار رئیس احمد جعفری کا ہم نام ہونے کی وجہ سے میری تحریروں کو لوگ ان کی تحریریں سمجھنے لگے تو میں نے اپنا نام کبھی رئیس جعفری کبھی احمد رئیس جعفری لکھا۔ لیکن ادھر کافی دنوں بعد لکھنے پڑھنے کا کام شروع ہوا تو یہ سوچ کر ایک بار پھر اپنا پورا نام لکھنے لگا ہوں کہ ہم نام بزرگ صحافی کو رخصت ہوئے زمانہ ہو چکا ہے اور اب کوئی الجھن نہیں پیدا ہوگی۔

پتہ ۲۸/ مدن موہن برمن اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۰۰۰۰۷

[illegible] رئیس احمد جعفری

مغربی بنگال میں تنقید نگاروں کی کمی کے اسباب

مغربی بنگال میں تنقید نگاروں کی کمی کے اسباب پر گفتگو کرنے سے قبل یہ نامناسب نہ ہوگا کہ تنقید نگاری کے بارے میں بھی کچھ باتیں ہو جائیں، کیونکہ اس کے بغیر میرے خیال میں موضوع پر ٹھیک سے گفتگو ہو بھی نہ سکے گی۔ تنقید کا لفظ سامنے آتا ہے تو ذہن فوراً اس بات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ کسی شعری یا نثری تخلیق میں کتنی خوبیاں ہیں۔ یہ جاننے اور یہ معلوم کرنے کی بات ہو رہی ہے کہ وہ خامیوں اور کمزوریوں سے کتنی پاک ہے۔ یہ بات مختصراً یوں کہی جاسکتی ہے کہ محاسن اور عیوب کے دیانتدارانہ جائزے کا نام تنقید ہے۔ تنقید نگار جب یہ کام کرنے بیٹھتا ہے تو وہ بالعموم ان اصولوں کو سامنے رکھتا ہے جو سالہا سال کی کاوشوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو گئے ہیں اور جنہوں نے اس فن کو دھیرے دھیرے باضابطہ ایک علم میں تبدیل کر کے ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو اس کی غالب پوزیشن سے ہٹا دیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ذہنی تحفظات نقد و تبصرے کے بعد ان سے مکمل طور پر خارج ہو گئے ہیں اور اب ذاتی تعصبات تنقید پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ ناپسندیدہ نگارشات میں پائی جانے والی عام کمزوریوں اور خامیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی جد و جہد اور من پسند تخلیقات میں نظر نہ آنیوالی خوبیوں کو کرید کرید کر تلاش کرنے اور پھر انھیں مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرنے کی کوششیں آج بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کی عکاسی وہ تنقیدی اختلافات بھی کرتے ہیں جو بعض تخلیقات کے بارے میں مختلف تنقید نگاروں کے درمیان اس حد تک پائے جاتے ہیں کہ کسی کی نظر میں اگر کوئی تخلیق اعلیٰ پائے کی ٹھہرتی ہے تو کسی دوسرے کی نظر میں وہ کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی، تاہم یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سارا کام بہر حال انہی اصولوں کے دائرے میں رہ کر ہی کرنا پڑتا ہے جو اس عرصے میں عام ہو چکے ہیں۔ اگر کسی کو کوئی ایسی رائے پیش کرنے کی خواہش ہوتی ہے جو ان اصولوں پر پوری نہ اترتی ہو تو اُسے نہ صرف بہت کھینچ تان کرنی پڑتی ہے بلکہ ایسی توجیہات کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے جن سے قاری کے منہ کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خود تنقید کا اعتبار مجروح ہونے لگتا ہے۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ [illegible] ہے۔ اس معاملے میں جن باتوں کا [illegible] وہاں کی [illegible] ثقافت اور [illegible]

فلسطین کی تقسیم پر احتجاج

جنگ شروع ہونے سے پہلے تک کانگریس اور مسلم لیگ اپنے اپنے طور پر امریکہ، برطانیہ اور کانفرنس کی فلسطین کو وطنِ یہود بنانے کی پالیسی کی مخالفت کرتی رہی تھی مگر جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد ان کی ساری توجہ ملکی مسائل تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لئے ۱۹۴۶ء میں جب اینگلو امریکی کمیٹی نے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور فلسطینی عرب اس کی مخالفت میں برطانوی فوج کے ظلم وستم کا نشانہ بننا شروع ہوئے تو اس صورت حال پر آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا۔ اگر چہ ہندوستانی مسلمان کا دل تڑپ رہا تھا۔ آخر یہ ذمے داری بھی ہماری جماعت نے اپنے ذمے لی۔ جو قومی حالات کو دیکھتے ہوئے مسلمانان ہند کا نفس ناطقہ بننے پر مجبور ہوگئی تھی۔ ۸ر مئی ۱۹۴۶ء کو مجلس عاملہ کا جلسہ طلب کیا گیا جس میں کئی جوشیلی تقریروں کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کی تحریک اور ڈاکٹر محمد اشرف کی تائید سے تقسیم فلسطین کی تجویز کے خلاف سخت تجویز منظور ہوئی۔ اسکے بعد معین الدین حارث نے یہ تجویز پیش کی کہ لفظی احتجاج کے ساتھ کوئی عملی احتجاج بھی ہونا چاہئے۔ جس کیلئے اردو کے اخباروں کی ایک دن کی ہڑتال مناسب ہوگی۔ عبدالحمید انصاری کی تائید سے یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوگئی۔ ۱۰ر مئی کو بمبئی کے تمام اردو اخبار بند رہے جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہو سکتا ہے۔ بمبئی کے مسلمانوں نے اس پر زبردست اظہار اطمینان کیا اور اردو کے اخباروں کے وقار میں اضافہ ہوا۔

اخباروں کی ترقی کیلئے

اسکے علاوہ ایسوسی ایشن نے یہ کوشش بھی کہ اردو اخباروں کے کارکنوں کو ہفتے میں ایک دن کی چھٹی مع اجرت ملا کرے مگر اور تو اور ہمارے ممبر اخباروں کے مالکوں نے بھی تجویز کی تائید تو کر دی مگر اس پر عمل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ تاہم جنگ کی وجہ سے جب کاغذ کی قلت اور مہنگائی کا سامنا ہوا تو ایک دن کی چھٹی کرنے لگے جس سے ماہوار تنخواہ پانے والوں کا کچھ بھلا ہوا۔ جنگ کے زمانے میں کاغذ بڑی مشکل سے تھوڑا تھوڑا ہی نہیں ملنے لگا تھا بلکہ دام بھی دس بیس گنا ہو گئے تھے اور کبھی کبھی تو نیوز پرنٹ کے بجائے پتنگ بنانے میں کام آنے والے جیسے رنگین کاغذوں پر بھی اخبار چھپتے تھے مگر جنگی کاموں اور جنگی پروگنڈے کے اشتہار زیادہ ملنے لگے تھے۔

حوالے کی کتابیں

ایک اور تجویز یہ بھی منظور ہوئی تھی کہ ہر اردو اخبار کے دفتر میں ڈکشنری اور حوالے کی کتابیں فراہم کی جائیں تاکہ جنگی خبروں کا ترجمہ کرنے میں سہولت ہو۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا تھا کہ بعض اخباروں کے دفتر میں ڈکشنری ضرور نظر آنے لگی۔

اردو اخبار کے دفتروں میں حوالے کی کتابیں رکھنے کا رواج سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' میں ہوا اسکے بعد مولانا محمد علی نے ''ہمدرد'' کیلئے اس کو بامِ عروج تک پہونچایا۔ چنانچہ قاضی عبدالغفار کا بیان ہے کہ وہ جب ہمدرد کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوئے مولانا نے ایک خاص مضمون لکھنے کی فرمائش کے ساتھ دس بارہ کتابوں کے نام بتا کر کہا پہلے ان کو پڑھ کر نوٹ تیار کر لو پھر مضمون لکھنا۔ انہوں نے مشقت کے بعد جو مضمون لکھا اسے مولانا نے کئی بار نظر ثانی کرانے کے بعد قابل اشاعت قرار دیا۔ اس قسم کی مثال کسی اردو اخبار میں آج تک دیکھنے یا سننے کی نہیں ملی۔ ان اخباروں میں خاص مضامین بہت کم لکھوائے جاتے ہیں کچھ لوگ اپنا شوق پورا کرنے کیلئے کسی پسندیدہ یا نفع بخش موضوع پر مضمون لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ کئی ایسے ادارے قائم ہیں جو برائے نام معاوضے پر یا مفت ہی خاص مضمون بھیجتے رہتے ہیں اور ان کو بھی دوسرے طریقوں سے اپنی آمدنی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ مرکزی حکومت بھی کافی مضامین مفت فراہم کر دیتی ہے اور وہ یک طرفہ ہونے کے باوجود جگہ بھرنے میں کام آجاتے ہیں۔ سوویت یونین کے خاتمے سے پہلے سوویت سفارت خانے کا دفترِ اطلاعات بھی اخباروں کے دفتروں میں مضامین کے ڈھیر لگاتا رہتا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے سوشلسٹ ملکوں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کر رکھا تھا۔ امریکہ بھی اس دوڑ میں پیچھے نہ تھا اور اب صرف وہ تنہا اس میدان میں رہ گیا ہے۔ مضامین کی اس بھرمار کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام اخباروں میں یکساں مضامین ہی شائع ہوتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں کہ کئی اخباروں میں ایک ہی دن میں ایک ہی مضمون شائع ہوتا ہے یا دو چار روز بعد ان کی تکرار ہو جاتی ہے۔ اور مزے کی بات یہ کہ دیکھ بھال کی کمی کی وجہ سے ایک ہی مضمون کئی کئی بار بھی شائع ہو جاتا ہے۔ انگریزی کے کئی نامور آزاد اخبار نویس میں بھی اخباروں کو قیمتاً مضمون فراہم کرتے اور دوسری زبانوں کے اخباروں سے ہزاروں روپے ماہوار کماتے ہیں۔ مگر یہ مضمون عام طور پر کسی نہ کسی سیاسی، سماجی اور اقتصادی نکتۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھے جاتے ہیں۔ خالص قومی مفاد یا عوامی شعور کی بیداری ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ آزادی سے پہلے اردو اخبار میں صرف اہم تاریخی سورماؤں کی بہادری اور کشور کشائی کی داستانوں کو اہمیت دی جاتی تھی مگر آزادی کے بعد اکثریت کی فرقہ

پرستی اور مسلم اور اسلام دشمنی کے توڑ کیلئے خالص مذہبی مضامین کو خاص مقام حاصل ہو گیا ہے۔ حد تو یہ کہ مسلم ملکوں کے بعض ارباب اقتدار کے بھی خوب خوب قصیدے لکھے جاتے ہیں جو ہرچہ استاد ازل گفت ہماں ی گویم کے مصداق ہوتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اکثریت اور اقلیت کے مزاج بگڑے ہوئے ہیں اوران کی اصلاح کرنے والا کوئی نہیں۔ حالانکہ قلم اور کاغذ کا صحیح مصرف یہ ہے کہ

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

(مولانائے روم)

خیر۔ یہ تھی دکھ بھرے دل کی فریاد جو نامناسب مقام پر ابل پڑی اور اس کی کئی جگہ تکرار بھی ہو گئی۔

فسادات کی خبریں

ہندو مسلم رائے کا جو سلسلہ سوراج اور خلافت کی تحریک کے خاتمے کے بعد ۱۹۲۳ء میں شروع ہوا تھا ۱۹۴۰ء سے کانگریس اور مسلم لیگ اختلافات اور دونوں فرقوں خصوصاً ہندوؤں میں ایک انتہا پسندانہ گروہ کے منظم طور پر عالم وجود میں آجانے کی وجہ سے بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ سارے ملک کے ساتھ بمبئی شہر اور اسکے مضافات بڑی شدت سے اس کی لپیٹ میں تھے۔ معلوم تو یہ ہوا تھا کہ دونوں فرقوں کے سرمایہ داروں نے چاقو بازوں کی پرورش اور حفاظت کے وسیع انتظامات کر رکھے ہیں۔ یہ حقیقت تو میری چشم دید ہے کہ جو لوگ چاقو بازی یا تیزاب اندازی کی پاداش میں گرفتار ہوتے تھے ان کی ضمانت پر رہائی کیلئے عدالتوں کے اندر یا باہر کچھ لوگ میز کرسی بچھائے اور نوٹوں کی گڈیاں سامنے رکھے ساہوکاروں کی طرح بیٹھے رہتے تھے اور ضمانت پر رہائی کا حکم ملتے ہی رقم دے کر ملزموں کو چھڑا لیتے تھے۔ تاکہ وہ اپنا کام پھر جاری کر دیں۔ ہندوؤں میں یہ انتظام بہت وسیع پیمانے پر تھا۔ مسلمانوں کیلئے محدود مگر تھا۔ جو لوگ یہ کام کرتے تھے انہوں نے خود کو ریلیف کمیٹیوں کی صورت دے رکھی اوران کو آدمیوں اور روپے کے علاوہ ٹیلیفون اور موٹروں تک کی سہولت حاصل تھی۔ وہ پولس سے بھی گہرے تعلقات رکھتے تھے اور اسکے ذریعے بھی اپنے جان لیوا کارندوں کیلئے رعائتیں حاصل کر لیتے تھے۔ الغرض سارا نظام گنڈوں اور ان کے سرپرستوں کے قبضے میں آگیا تھا اور قانونی کارروائی ڈھکوسلا ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی برائے نام کچھ سرکاری احکام صادر ہوتے رہتے تھے مثلاً فسادات کی شدت کے زمانے میں یہ حکم جاری ہوا کہ ہلاک اور زخمی ہونے والوں کے نام یا فرقے وارانہ اعداد نہ چھاپے جائیں۔ صرف تعداد بتادی جائے۔ اس حکم کی زد سے بچنے کیلئے اردو کے اخباروں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہندوؤں کے مرنے والوں کیلئے سرایا ہلاک ہوا لکھنے لگے اور مسلمانوں کیلئے جاں بحق ہوا جیسے الفاظ کا استعمال ہونے لگا۔ ریلیف کمیٹیوں کے پاس یہ اعداد ضرور رہتے تھے کہ کہاں کون مارا گیا اور زخمی ہوا اوران سے خفیہ طور پر صحیح اعداد مل جاتے تھے جس علاقے میں کوئی واردات ہوتی تھی اس کی ریلیف کمیٹی کو ٹیلیفون یا کسی اور ذریعے سے جانی نقصان اور اس کی نوعیت معلوم ہو جاتی تھی۔ ہندوؤں کی ریلیف کمیٹیوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ فلاں جگہ ایک مرغا کاٹا گیا ہے اور مسلمانوں سے کہا جاتا تھا فلاں جگہ ہمارا ایک وکٹ گر گیا ہے۔ اسکے دونوں طرف سے فوراً جوابی کاروائی کر کے کھاتا ٹھیک کرنے کی کاروائی کی جاتی تھی۔

انہی دنوں جب یہ حکم جاری ہوا کہ حادثے ہونے کی جگہ بھی نہ بتائی جائے تو ہماری ایسوسی ایشن نے اس بنیاد پر احتجاج کیا کہ اس طرح ناواقف لوگ کسی بھی فسادزدہ علاقے میں جاکر اپنی جان گنوا سکتے ہیں تو اس حکم میں اتنی نرمی کی گئی کہ صرف پولس تھانے کا نام ظاہر کر سکتے ہیں۔ فسادات کی خبریں زیادہ تر پولس کمشنر کے دفتر سے شام کو اخبار نویسوں کو دی جاتی تھیں کیونکہ شہر کی حالت اتنی مخدوش تھی کہ ان کا آزادی سے خبریں حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے ہماری ایسوسی ایشن کی تحریک پر تمام اخباروں کے نمائندوں نے حکومت سے اخبار نویسوں کو ایسے مقامات پر لے جانے کے انتظام کا مطالبہ کیا جہاں کوئی بڑا واقعہ ہوا ہو۔ آخر بڑی رد وکد کے بعد فیصلہ ہوا کہ پولس کمشنر کے دفتر سے روزانہ رات کے آٹھ بجے ایک بس چلا کرے گی جس کی حفاظت کیلئے دو بندوق بند سپاہی اور محکمہ اطلاعات کا ایک کارکن ہوا کرے گا۔ ایک دن یہ بس پریل میں پہنچی جہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین کی بنوائی ہوئی مسجد کے قرب وجوار میں مسلمانوں کی کچھ آبادی باقی تھی تو دیکھا کہ وہاں مکانوں کے اوپر سے دونوں طرف سے پتھر اور آگ کے گولے پھینکے جارہے ہیں جو تیل میں بھیگے ہوئے کپڑوں یا مٹی کا تیل بھری ہوئی نلیوں کے ہوتے تھے۔ چند پولیس والے بے بسی کے عالم میں کھڑے ہوئے ہیں۔ مسجد کے امام مولانا خمیدی سے ملنے کا تو وقت نہ تھا جو میرٹھ کے رہنے والے اور مولوی محمد اسمٰعیل کے خاندان سے تھے تاہم اتنا معلوم ہو گیا کہ وہ خیریت سے ہیں اور مسجد چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ اتنے میں ایک نوجوان نہایت پریشان میرے پاس آیا اور کہا کہ آج یہاں سے کچھ دور ایک مقبرے میں بڑی مارکاٹ ہوئی ہے جس میں بڑی مشکل سے بچا ہوں لہٰذا آپ لوگ اس مقام کو بھی دیکھ لیں۔ میں نے دوسرے اخبار نویسوں سے کہا تو وہ بھی تیار ہو گئے مگر محکمہ

اصطلاحات سے بھر کر اردو کو غیر ملکی زبان ثابت کیا جارہا ہے۔

ریڈیو اور اردو

آزادی سے پہلے ریڈیو اسٹیشنوں پر انگریزی اور اردو ہی کا زور تھا مگر اردو کی جڑ کاٹنے کی کوشش بھی جاری تھی۔ ریڈیو کے مشہور پارسی مبصر بابی طالع یار خان نے جن کا بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن سے کوئی جھگڑا چل رہا تھا اخباروں میں یہ اعتراض کیا کہ ریڈیو والے اردو اور دوسری زبانوں میں براہ راست مواد لکھوانے کے بجائے انگریزی سے ترجمہ کیوں کرواتے ہیں تو ٹائمس آف انڈیا کے ریڈیو مبصر نے جو پان کے قلمی نام سے لکھتا تھا یہ جواب دیا کہ دیسی زبانوں میں لکھنے والے ملتے ہی نہیں اس پر سخت احتجاج ہوا مگر چونکہ کسی اور زبان کے ادیبوں اور صحافیوں کی کوئی جماعت نہ تھی اس لئے اس الزام کا جواب دینے کیلئے عام جلسہ کرنے کی ذمے داری ہماری ایسوسی ایشن پر ڈالی گئی۔ ۱۷جون ۱۹۴۱ء کو جناح ہال میں مرہٹی کے ادیب پروفیسر پھڑکے کی صدارت میں جلسہ ہوا جس میں تمام زبانوں کے دو سو سے زیادہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے حصہ لیا اور ریڈیو کی انگریزی پرستی پر سخت احتجاج کیا گیا۔ اسکے بعد ایسوسی ایشن کے اسٹیشن ڈائرکٹر کو ایسے اردو ادیبوں کی ایک فہرست بھیجی جو اردو میں ہر موضوع پر معیاری مواد قلم بند کر سکتے تھے۔ اس میں ہندو اور مسلمان مصنفان شامل تھے۔ اسکے بعد آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر اور اردو کے مشہور ادیب احمد شاہ بخاری پطرس بمبئی آئے تو ایسوسی ایشن کے ایک وفد نے ان کو ایک میمورنڈم دیا۔ انہوں نے ویسے تو بڑی خوش اخلاقی کا ثبوت دیا اور کچھ وعدے بھی کئے مگر چونکہ دہلی میں بھی اردو اور ہندی کی کشمکش زور پکڑ کر چکی تھی اس لئے وہ کوئی مدد نہ کر سکے۔ ہوا صرف یہ کہ ان کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی شاہ بخاری بمبئی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر ہو کر آگئے اور جنگ کی وجہ سے وہاں اردو والوں کی بھی کچھ پوچھ ہونے لگی۔

مادری زبان

آزادی کے بعد جب مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں اور کارخانوں سے اور اردو زبان کو قومی زندگی سے دور رکھنے کی مہم چلی تو بمبئی پریسیڈنسی کی حکومت نے بھی یہ حکم جاری کر دیا کہ بچوں کو صرف حقیقی مادری زبانوں میں تعلیم دی جائے اور حقیقی مادری زبانیں مرہٹی، گجراتی اور کنڑ قرار دے کر اردو کے اسکولوں کو بند کرنا شروع کر دیا۔ ایسوسی ایشن نے اسکے خلاف سخت تجویز منظور کی تو حکومت کچھ سوچنے پر آمادہ نظر آئی مگر اسکے کچھ دنوں بعد ہی دستور بن کر آیا تو اس میں یہ سہولت موجود تھی کہ بچوں کی مادری زبان وہی مانی جائے جو ان کے والدین بتائیں۔ ساتھ ہی ساتھ جواہر لال، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن اور دوسرے حضرات کی جدو جہد کے نتیجے میں اردو کو اہم قومی زبانوں میں جگہ مل گئی جس سے اس کی وقتی طور پر کچھ جان بخشی ہو گئی اگرچہ اسے کچھ علاقوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کا مطالبہ قبول نہ کیا گیا۔ تاہم پولس ایکشن کے بعد تقسیم کردہ ریاست حیدر آباد کے علاقے تلنگانہ میں ہندؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ مطالبے کی بنا پر اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل گیا اور اسکے کئی سال بعد بہار میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مگر کانگریس کے وعدوں اور نیم دلانہ کوشش کے باوجود اتر پردیش کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی جہاں اردو کو سرکاری اسکولوں سے عملاً خارج ہی کر دیا گیا ہے اور صرف تھوڑے سے مذہبی مدرسوں میں وہ ذریعۂ تعلیم ہے۔ بر خلاف اسکے سنسکرت کو لازمی زبان قرار دیدیا گیا ہے۔ حیدر آباد میں مولانا آزاد کے وزیر تعلیم اور جواہر لال کے وزیر اعظم ہونے کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی کو جہاں اردو ہی واحد ذریعہ تعلیم تھی تیلگو زبان کی یونیورسٹی بنانے کے بہانے اردو کا خاتمہ کر دیا گیا مگر وہ ۴۰ سال سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی تیلگو یونیورسٹی نہ بن سکی اور اس پر انگریزی ہی مسلط چلی آتی ہے۔ کسی درس گاہ پر اتنا بڑا ظلم ہونے کی مثال ملنی مشکل ہے۔ پھر بھی وہاں اردو ابھی تک زندہ اور رو بہ ترقی ہے اور یہی صورت مہاراشٹر میں بھی ہے جہاں کے مسلمانوں نے اردو کی تعلیم کا معقول انتظام کر لیا ہے اور وہاں کی کانگریسی حکومتیں بھی اس کی مخالفت کرنے کے بجائے کچھ نہ کچھ مدد ہی کرتی چلی آرہی ہیں۔ مغربی بنگال میں بھی پرائمری سے ہائر سکنڈری تک ایسے اسکول کافی تعداد میں ہیں جہاں اردو ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ مذکورۂ بالا جلسے میں ایک تجویز کے ذریعے خبر رساں ایجنسیوں سے جو سب انگریزی ہی کی تھیں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ دوسری زبانوں کے اخباروں کی رائے کی طرح اردو اخباروں کی رائے بھی جاری کیا کریں تاکہ غیر اردو داں اُن سے بھی واقف ہوں مگر اس تجویز کو نہ اس وقت قبول کیا گیا نہ یہ ابھی تک قابل عمل مانی گئی ہے۔

بابائے اردو کا استقبال

ہماری انجمن نے باہر سے آنے والی اہم صحافتی شخصیتوں کا استقبال بھی اپنی خدمات میں شامل کر رکھا تھا۔ چنانچہ لاہور کے اخبار ”نوائے وقت“ کے بانی اور ایڈیٹر حمید نظامی اور ”زمیندار“ کے مشہور عالم ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان کا استقبال ہوا۔ اس زمانے میں چونکہ کاغذ کا

کوٹا بمبئی ہی سے ملتا تھا اس لئے پشاور تک کے اخباروں کے مالک بمبئی آتے رہتے تھے۔ ان میں دہلی کے اخبار "جنگ" کے مالک میر خلیل الرحمٰن اور ان کے رقیب اخبار "انجام" کے شیخ عبداللہ اور "شمع" کے حافظ محمد یوسف بھی ہوتے تھے مگر ان لوگوں سے صرف بات چیت ہی ہوا کرتی تھی۔ میر خلیل الرحمٰن جو کراچی جاکر اردو کے سب سے بڑے اخبار جنگ اور اسکی کئی ذیلی اشاعتوں کے بانی و منتظم اور کروڑ پتی تک ہوئے اُن دنوں بڑے پھٹے حالوں نظر آتے تھے۔ حمید نظامی کافی باشعور سلیقہ مند اور حالات زمانہ سے باخبر تھے۔ آجکل نوائے وقت اور جنگ پاکستان کے متعدد مقامات سے شائع ہوتے ہیں اور صحافتی معیار میں غیر ملکی اخباروں کا کامیابی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ روز نامہ جنگ کا تو ایک انٹرنیشنل ایڈیشن لندن برطانیہ سے بھی شائع ہوتا ہے۔ فروری ۱۹۴۵ء میں بمبئی کی انجمن ترقی اردو نے جس کے صدر مشہور مورخ اور تعلیم اے۔ اے۔ اے (اصغر علی آصف علی) فیضی، سکریٹری سابو صدیق ٹیکنیکل انسی ٹیوٹ کے پرنسپل سید شہاب الدین دسنوی اور معاون سکریٹری مدن موہن کالیا تھے اور جس کی مجلس عاملہ میں تمام اہم اردو اخباروں کے ایڈیٹر بھی شامل تھے اپنی بڑی کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا تو بابائے اردو مولوی عبدالحق کو بھی مدعو کیا۔ ان کے بمبئی آنے کے بعد ہماری ایسو سی ایشن نے ان کے خیر مقدم کا فیصلہ کر کے ان کو دعوت دیدی۔ جگہ وہی خلافت ہاؤس تجویز ہوئی جس کا دل ہر مہمان کا استقبال کرنے کیلئے کھلا رہتا تھا۔ اردو کے تمام اخبار نویسوں کے علاوہ حضرت جگر مراد آبادی۔ ساغر نظامی اور مجروح سلطانپوری بھی خاص دعوت پر شریک ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالحمید قاضی نے پہلی اور سجاد ظہیر نے دوسری خیر مقدمی تقریر کی۔ ثانی الذکر نے مولوی صاحب کی دہلی میں مرکزی انجمن ترقی اردو کی عمارت کی تعمیر کی جدوجہد کا خاص طور پر ذکر کیا اور حاضرین سے تعاون کی اپیل کی۔ جس کا فوری اثر ہوا۔

مولوی صاحب نے اپنی مختصر تقریر میں اردو کے حال اور مستقبل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اردو یونیورسٹی کے قیام کو خاص طور پر ضروری بتایا۔ دوسرے دن اردو کانفرنس میں اس معنی کی تجویز بھی منظور ہوئی جو آزادی کے ۵۰سال بعد حیدر آباد میں مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسٹی کے قیام کی صورت میں عالم وجود میں آئی ہے۔ ہاں دہلی میں اردو گھر کی عمارت ضرور بن گئی ہے مگر سو دقتوں کے بعد۔ رہی یونیورسٹی تو جس ملک میں اردو کی بنی بنائی اور دینا میں واحد اردو یونیورسٹی کا خاتمہ کردیا گیا ہو وہاں دوسری یونیورسٹی بننے کی توقع کیسے ہوسکتی ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب اردو والے خود ہی انگریزی اور ہندی کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ لگا رہے ہوں۔ اردو کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے بچے اردو کو گھٹیا زبان کہکر نظر انداز کررہے ہوں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں بھی اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز کو زہر سمجھا جارہا ہو۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس موقع پر ایک سوال کے جواب میں یہ بھی کہا کہ گاندھی جی کی ہندوستانی زبان اور اس کے لئے دیوناگری اور فارسی رسم خط اختیار کرنے کی تجویز اردو کیلئے تباہ کن ثابت ہوگی اور اس کی کئی ٹھوس دلیلیں بھی دیں۔

مولوی صاحب جو کسی زمانے میں بڑے خوش پوش آدمی مانے جاتے تھے اس دن اونچی باڑھ کی پرانی سی ترکی ٹوپی۔ ہلکے زرد رنگ کی معمولی کپڑے کی شیروانی۔ لٹھے کا علی گڑھ پاجامہ اور کالے بوٹ پہنے ہوئے تھے اور اپنی محبوبہ اردو کی بدحالی کی منھ بولتی تصویر نظر آرہے تھے۔ داڑھی بھی منت پذیر شانہ نظر آرہی تھی مگر ذہنی طور پر بڑے چوکس تھے مگر پاکستان نے ان کے سارے کس بل کو توڑ کر رکھ دیا تھا جہاں وہ اردو کی خدمت کا بڑا ولولہ لیکر گئے تھے اور اپنے مقصد کیلئے بڑی جدوجہد بھی کی تھی۔

استقبالیہ جلسے کا خرچ

مولوی صاحب کے استقبالیہ جلسے پر جس میں ۲۵-۳۰ آدمی شریک تھے ایسو سی ایشن کے صرف ۲۵؍روپے ۲؍آنے کا خرچ آیا تھا۔ اگرچہ جنگ چھڑنے کے بعد سے اس وقت ہر چیز کی قیمت دگنی تگنی ہوچکی تھی۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

کیلے چھ درجن ۴؍روپے آٹھ آنے۔ سنترے پانچ درجن ۷؍روپے آٹھ آنے۔ کیک اور پیسٹری چار درجن آٹھ روپے۔ قینچی سگریٹ کا ایک ڈبہ (۵۰ سگرٹ) ایک روپے دو آنے۔ ماچس کی چار ڈبیاں۔ ۲ آنے، دودھ ایک سیر ۱۵ آنے۔ متفرق ۲؍روپے دو آنے کل۔ ۲۵؍روپے دو آنے۔ اُن دنوں عموماً وکٹوریہ، ایڈورڈ اور جارج پنجم کے چاندی کے روپے چلتے تھے۔ ایک روپیہ ۱۶ آنے کا اور ایک آنہ چار پیسے کا ہوتا تھا۔ چائے کا سامان اور برتن زاہد صاحب نے مفت مہیا کئے تھے۔

بابائے اردو کا خیر مقدم۔ کتنا مفید اور کتنا کم خرچ۔ اس کانفرنس کے ساتھ ایک شاندار کل ہند مشاعرہ بھی ہوا تھا جس کا حال شہاب الدین دسنوی صاحب نے اپنے مضامین میں اور ۹۳ء میں شائع ہونے والی کتاب۔ "دیدہ شنیدہ"۔ میں تفصیل سے کردیا ہے اس لئے میں دوبارہ محنت کرنے سے بچ گیا ہوں۔

نے سستی شہرت حاصل کرنے کیلئے ان دونوں اخباروں اور ان کے مالکوں سے گھٹیا قسم کی قلمی جنگ کرنا ضروری سمجھا۔ جب میں "اقبال" میں آیا تو مجھے بھی حافظ جی کے خلاف لکھنے کی فرمائش کی گئی مگر میں حتی الامکان اس سے بچتا رہا۔ صرف ایک بار ہی ان پر چوٹ کی اور وہ بھی متانت کے ساتھ۔ جب اقبال میں ٹیلی پرنٹر لگا تو میں نے لکھا کہ اپنی سائنس دانی کی وجہ سے حافظ جی بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے ہمارے ٹیلی پرنٹر کے تار میں لنگر ڈال رکھا ہے اور اسکی مدد سے ٹک ٹک کی آواز سے خبریں بناتے رہتے ہیں۔

میں نے اپنی روش شروع ہی سے دوسری رکھی۔ میں اخبار کے مالک، ایڈیٹر اور کارکن کو سلام کرنے میں سبقت کرتا۔ موقع ہوتا تو دو چار باتیں بھی کر لیتا۔ شدہ شدہ یہ خیال ہوا کہ کج خلقی اور تنگ نظری کی اس فضا کو ختم کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اردو اخبار نویسوں کی ایک جماعت بنانے کا ذکر دبے لفظوں میں کرنا شروع کیا اور رائے عامہ کو بڑی حد تک ہموار کرلیا۔ اس کام میں ایک تو اس وجہ سے بھی سہولت ہوئی کہ زیادہ تر اخبار کم و بیش مسلم لیگ کے حامی ہو کر ایک ہی راگ الاپ رہے تھے جس میں مسلم اتحاد کا جذبہ بھی شامل تھا۔ دوسرے ۳/ ستمبر ۳۹ء کو جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے اردو اخباروں کے سامنے نئے نئے مسائل آنے لگے تھے۔ لہٰذا ایک دن ہمت کر کے میں نے اردو اخبار نویسوں کے مشورتی جلسے کا اعلان کر دیا اور جگہ خلافت ہاؤس رکھی جہاں کافی آدمیوں کے آرام سے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر میں ڈرتے ڈرتے وہاں پہونچا۔ ڈر یہ تھا کہ کافی لوگ آئے ہیں یا نہیں مگر حاضرین کی تعداد دیکھکر بڑی ہمت بندھی۔ حیرت کی بات ہے کہ رئیس احمد جعفری بھی اپنی علیحدگی پسندی کو تیاگ کر آگئے تھے۔ صرف حافظ جی کی کمی تھی مگر اسکی وجہ یہ تھی کہ ان کو اس ڈر سے دعوت ہی نہیں دی گئی تھی کہ وہ کہیں کوئی جھگڑا کھڑا نہ کر دیں۔ جلسے کی غرض و غایت بتائی تو چاروں طرف سے تائید ہوئی۔ اسوسی ایشن کے قیام کا فیصلہ ہو گیا اور اغراض و مقاصد بنانے کا کام میرے سپرد ہو گیا۔ دوسرے جلسے میں اغراض و مقاصد جو ایک چھوٹی سی کاپی میں لکھ کر لے گیا تھا کچھ ترمیموں کے ساتھ منظور کر لئے گئے اور مجلس عاملہ کا انتخاب ہو گیا۔ شروع میں ممبروں کی تعداد ۳۰ تھی مگر کمیونسٹوں کے بمبئی آنے کے بعد اس میں پانچ چھ آدمیوں کا اضافہ ہو گیا اور اسوسی ایشن مسلم لیگی۔ کانگریسی اور کمیونسٹ اخبار نویسوں کا ایک خوبصورت گلدستہ بن گئی جو سب اردو صحافت کی حفاظت اور ترقی کیلئے ایک جسم اور ایک جان تھے۔

ز اتحادِ مگس شہد می شود پیدا
خدا چہ لذتِ شیریں در اتفاق نہاد

یہ واقعہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں ہوا تاسیسی اجلاس میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں اخبار نویسوں کے علاوہ مشہور انقلابی عالم اور بھوپال کی حکمراں نواب شاہجہاں بیگم کے دوسرے شوہر نواب صدیق علی خاں کے چھوٹے بیٹے نواب شمس الحسن خاں بھی شامل تھے جو ان دنوں خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ زاہد علی صاحب ابن مولانا شوکت علی نے سب کی مہمانداری کی تھی۔ اس جماعت کے قیام کا سارے ملک میں خیر مقدم ہوا تھا اور لکھنؤ میں "حقیقت" کے ایڈیٹر اور مالک انیس احمد عباسی اور حیدر آباد میں قاضی عبدالغفار مالک و مدیر پیام نے بھی اس قسم کی جماعتیں قائم کی تھیں۔ لکھنؤ والی جماعت کا نام یوپی جرنلسٹس ایسوسی ایشن اور حیدر آباد کی جماعت کا نام انجمن صحافت حیدر آباد تھا۔

ایسوسی ایشن کا جنرل سکریٹری تو شروع سے آخر تک میں ہی رہا اور خازن عبدالحمید انصاری۔ مگر دوسرے عہدے دار بدلتے رہے۔ پہلے انتخاب میں صدارت خلافت کے ایڈیٹر قطب الدین صدیقی کو ملی۔ جوائنٹ سکریٹری ولی شاہجہاں پوری ہوئے۔ ۴۱ء میں دوسرا انتخاب ہوا تو صدیقی صاحب کے وطن چلے جانے کی وجہ سے سجاد ظہیر صدر ہوئے، اور جوائنٹ سکریٹری ذاکر حسین فاروقی۔ جنگ کی وجہ سے تیسرا انتخاب ۴۳ء میں ہوا تو صدر کا عہدہ ڈاکٹر عبدالحمید قاضی کے حصے میں آیا اور نائب صدر معین الدین حارث بنائے گئے۔ عاملہ کے ممبروں میں ڈاکٹر اشرف اور علی بہادر خاں کے سالے رئیس احمد خاں کو بھی شامل کیا گیا جو ہلال کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ عبدالحمید بویرے بھی آگئے۔ اسکے بعد بھی سالانہ انتخابات ہوتے رہے یہاں تک کہ ۴۹ء میں قاضی صاحب کے پاکستان اور میرے حیدر آباد چلے جانے کی وجہ سے ایسو سی ایشن کا خاتمہ ہو گیا۔

مختلف انتخابات میں جو لوگ مجلس عاملہ کے ممبر ہوتے ان میں غلام احمد خاں آرزو۔ محمد احسن۔ شہزادہ ایاز۔ مرزا ادیب (مصور) عبدالباری ساقی (مغل لائن) عباس اورنگ آبادی، احمد علی، سبط حسن، عثمان حسین خان، مرزا اشفاق بیگ (قومی جنگ) خالد اختر افغانی (طارق) عبدالمغنی (قومی جنگ) شامل ہیں۔

ان میں سے مرزا ادیب برصغیر کے بڑے ادیب تھے۔ لمبے، گورے چٹے آدمی مگر ایک ٹانگ میں لنگ تھا۔ وہ تا ایں دم پاکستان میں زندہ و سلامت ہیں اور ادبی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

عبدالباری ساقی نے جو ایک ٹانگ سے لنگڑے تھے اور چھڑی لے کر کود کود کر چلتے تھے علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ

دن دہلی میں مولانا محمد علی کے اخبار میں ''ہمدرد'' میں کام کیا تھا پھر بمبئی آگئے تھے اور مولانا شوکت علی نے مغل لائن کا پبلسٹی افسر بنوا دیا تھا۔ بڑے تیز وطرار آدمی تھے اور آخر میں مغل لائن کے ڈائریکٹر بھی ہوگئے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کھادی کی شیروانی کی جیب میں شراب کا ایک چپٹا اَدھا ہر وقت رکھتے تھے اور موقع ملتے ہی چڑھا لیتے تھے۔ اور دوسروں کی تواضع بھی کردیتے تھے۔ خلافت ہاؤس میں انکا طوطی بولتا تھا کیونکہ مغل لائن اور سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کمپنی میں جو خالص ہندوستانی ادارہ تھا حاجیوں کو لانے لیجانے کیلئے سخت معاہدہ ہوتا تھا اور مولانا شوکت علی مغل لائن کیساتھ تھے۔ ایک مرتبہ بیگم محمد علی مرحومہ نے انکی اچھل کود دیکھ کر کہا کہ اسکی دوسری ٹانگ ہوتی تو نہ جانے کیا کرتا۔ انہوں نے فوراً جواب دیا وہ ہوتی تو سندھیا کمپنی نہیں ہوتی۔ سندھیا کمپنی جیسا کہ میں نے بتایا، خالص ہندوستانی تھی اور ایک وقت میں جب اسکی مالی حالت خراب ہوئی تھی تو بمبئی کے مسلمان تاجروں نے مالی مدد کرکے اسے ڈوبنے سے بچایا تھا۔

عبدالباری ساقی جو بہاری تھے خود تو انتہائی رند مشرب تھے مگر انکی بیوی انتہائی دیندار تھیں پھر بھی وہ انکو برداشت کرتی رہیں۔ کئی سال ہوئے کہ پٹنہ میں انکا انتقال ہوگیا۔ خالد اختر افغانی، خاکسار تحریک کے لیڈر تھے اور ۴۷ء میں پاکستان واپس چلے گئے۔ عبدالمغنی امروہے کے رہنے والے تھے اور آزادی کے بعد جب کیونسٹ پارٹی نے کانگریس کا تختہ الٹنے کی تحریک شروع کی تو ٹرام کو آگ لگاتے ہوئے پولس کی گولی سے ہلاک ہوگئے۔

ایسوسی ایشن کی خدمات

۸؍ دسمبر ۱۹۴۱ء کے جلسے میں جو سید سجاد ظہیر کی صدارت میں ہوا تھا شہزادہ ایاز کی پیش کردہ یہ تجویز منظور ہوئی کہ چونکہ فلموں کا سارا کام اردو میں ہوتا ہے اس لئے سرٹیفکٹ میں انکی زبان اردو یا کم سے کم ہندوستانی لکھوائی جائے۔ اس تجویز کی نقلیں تمام فلم سازوں کو بھیجی گئیں۔ مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ صرف سہراب مودی نے اپنی مشہور فلم ''پکار'' کی زبان اردو لکھوائی اور ٹائٹل بھی نہایت شاندار خط میں لکھے ہوئے اردو ہی میں دیئے۔ دوسروں نے زبانی طور پر یہ ضرور کہا کہ اگر فلموں کی زبان اردو لکھی جائے گی تو بہت سے لوگ ناراض ہوجائینگے۔ مگر یہ بات جھوٹ ہے۔ چند سال کے اندر کئی فلم سازوں کے اپنی فلموں کی زبان اردو لکھوانے کے بعد بھی وہ فلمیں چلیں اور کسی نے برا نہ مانا۔

ڈاک خانہ میں اردو

نئی نسل کو شاید معلوم نہ ہوکہ انگریزوں کے زمانے میں اردو کے منی آرڈر بھی ملتے تھے اور اردو میں پتہ لکھی ہوئی ہر چیز قبول بھی کی جاتی تھی۔ اسی طرح اردو میں پتہ لکھے ہوئے خط بھی براہ راست تقسیم کئے جاتے تھے مگر مسلم لیگ کی تحریک کے زور پکڑنے کے ساتھ ساتھ اس سہولت کی فراہمی میں آنا کانی ہونے لگی تھی۔ اردو کے منی آڈر چھپا کر رکھ دیئے جاتے تھے اور خط پر پتے کی تحریر کا خط بدلنے کے بہانے ڈیڈلیٹر آفس (مردہ خطوط کے دفتر) میں ڈال دئے جاتے تھے۔ لہٰذا ۸؍ دسمبر ۱۹۴۱ء کے جلسے میں سبط حسن کی پیش کردہ تجویز کے ذریعے بمبئی کے پریسیڈنسی پوسٹ ماسٹر جنرل سے طرز عمل میں تبدیلی کرنے اور ڈاک خانہ میں اردو داں عملہ رکھنے کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ طلب کرنے پر اردو کے منی آرڈر مل سکتے ہیں اور اردو میں پتہ لکھے منی آرڈر قبول بھی کئے جاسکتے ہیں۔ حالانکہ یہ سفید جھوٹ تھا۔ اکثر ڈاک خانوں میں اردو کے منی آرڈر دیتے ہی نہ تھے اور جو شخص اردو میں پتہ لکھ کرلے جاتا تھا اس سے انگریزی میں لکھ کر دینے کو کہا جاتا تھا یا کوئی کلرک مہربانی کرتا تو یہ کہہ دیتا تھا کہ قطار سے الگ ہوجاؤ۔ بعد میں تم سے یہ پوچھ کر انگریزی میں پتہ لکھیں گے۔ اردو پتے والے خطوط کے بارے میں پوسٹ ماسٹر جنرل صاحب کا یہ فرمان تھا کہ ڈاکئے کیونکہ اردو نہیں جانتے اس لئے اردو کے جو خط ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں ان کی زبان بدلوانی پڑتی ہے اور اس میں کافی وقت لگ جاتا ہے اس لئے ایسوسی ایشن اردو والوں کو یہ مشورہ دے کہ وہ اپنے خطوں پر انگریزی میں پتہ لکھا کریں۔ تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی۔ اور آج نہ تو اردو کے منی آرڈروں کا کہیں نام ونشان ہے۔ نہ خطوں میں فوری طور پر پتے کی تحریر بدلوانے کا رواج۔ خود کلکتے میں یہ عالم ہے کہ جس خط پر اردو میں پتہ ہوتا ہے اسے ''ڈی لیڈ لیٹر آفس'' (دفتر تاخیری خطوط) میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جس کا نام بدل کر ریٹرنڈ لیٹر آفس کردیا گیا ہے۔ جہاں یہ کام کرنے والا ایک آدھ آدمی ہی رکھا جاتا ہے اور یہ خط دنوں تو کیا ہفتوں کی تاخیر سے تقسیم ہونے کی نوبت آتی ہے۔ وجہ یہ کہ اردو کو فرقہ پرست مسلمانوں اور پاکستان کی زبان قرار دیا گیا ہے مگر انگریزی کو شیرِ مادر کی طرح نوش جاں کیا جارہا ہے۔ اوپر اوپر سے اردو کی تھوڑی بہت سرپرستی ہورہی ہے مگر اندر ہی اندر اس کی جڑیں کاٹی جارہی ہیں اور کچھ مسلمانوں کی دکانوں اور گھروں کے علاوہ ہر جگہ سے اس کا نام ونشان مٹایا جارہا ہے۔ گاندھی اردو اور ہندی کو ملاکر ہندوستانی بنانے کو کہتے تھے مگر اب ہندی کو سنسکرت کے الفاظ اور

اور صدر شعبہ ہونے کے بعد ۱۹۶۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ ان مصروفیتوں کے دوران ہی ۔ علمی تحقیق کے سلسلہ میں چھ ماہ کیلئے ایران۔ بغداد۔ بصرہ۔ کربلا اور نجف کا سفر کیا۔ فارسی زبان کی خدمات کی وجہ سے جن میں تصنیف و تالیف بھی شامل تھیں ایران میں ان کی شہرت روز افزوں تھی لہٰذا ۱۹۶۶ء میں ایرانی علوم و فنون کی تہران میں ہونے والی عالمی کانگریس میں ان کو سرکاری طور پر مدعو کیا گیا اور محمد رضا شاہ پہلوی نے شرف باریابی بھی بخشا۔

ڈاکٹر مقبول احمد

کوئی آدمی اپنی ذاتی محنت۔ لگن۔ صلاحیت اور استقامت سے کیا کچھ ہو سکتا ہے اسے دیکھنا ہو تو بہترین نمونہ ڈاکٹر مقبول احمد ہی نظر آتے ہیں۔ اعظم گڑھ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بسلسلہ کاروبار بنارس میں مقیم ہوئے مگر عین عنفوان شباب میں کسی ظالم نے رمضان کے مہینے میں روزہ کھولنے کے بعد شہید کر دیا تو حالات یکسر بدل گئے۔ پھر بھی بڑے بھائی اور والدہ نے ہمت نہ ہاری۔ تعلیم کا آغاز بنارس کے ایک مدرسے سے ہوا پھر انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی نوبت آئی تو بنارس کے ہریش چندر کالج درجہ اول میں امتیاز کے ساتھ میٹرک کیا پھر کوئنس کالج سے آئی ایس سی۔ پھر میڈیکل تعلیم کے لئے کلکتہ آئے اور میڈیکل کالج سے ۱۹۴۸ء میں ایم بی بی ایس میں کامیابی حاصل کی۔ دشواریوں کا ہجوم تھا مگر بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد۔ اگر خارے بود گل سینہ گردد کا معاملہ ہوا۔ انگلستان گئے۔ پہلے ایڈنبرا کالج سے پھر لندن کے میڈیکل کالج سے ایف آر سی ایس کی ڈگریاں امتیاز کے ساتھ حاصل کر کے کلکتہ واپس آگئے تو یہاں تقسیم ملک کے اثرات کی وجہ سے دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ مقابلہ دشوار تھا اس لئے پٹنہ کے میڈیکل کالج میں قسمت آزمائی کی مگر ناکام رہے اور پھر کلکتے میں ملازمت کی کوشش شروع کی اور آخر کار نیشنل میڈیکل کالج نے ان کی خدمات حاصل کیں اور یہاں انہوں نے اپنی سرجری کی مہارت کا خوب خوب مظاہرہ کیا اور شاگردوں کی ایک فوج تیار کر دی جو دل و جان سے انکا دم بھرتی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شہرت بھی آسمان پر پہونچتی رہی۔ وہ ابھی تک کلکتہ کے بہترین معالجوں اور سرجنوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کا فیض کلکتہ کے اسلامیہ کالج سے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس کے جواہر لال نہرو کالج تک کی آبیاری کر رہا ہے۔ ابتدائی زندگی کی صعوبتوں نے انکو مخلوق خدا کا ہمدرد اور پکا مذہب پرست بنادیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی اپنی علمی اور سماجی فلاح و بہبود پر بھی کمربستہ کر دیا ہے جس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو مختلف اخباروں میں اشاعت پذیر ہونے کے بعد "مضامین مقبول" کی صورت میں اشاعت پذیر ہو کر ملک و ملت کی بیماریوں کا علاج کر رہے ہیں۔ ان کے بیٹے اور بیٹی بھی اعلیٰ درجے کی تعلیم سے فیض یاب ہو کر ملک کے اندر اور باہر شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اعتراف ہے کہ ان کی کامیاب اور بامراد زندگی میں ان کی اہلیہ خاشعہ بیگم کا بڑا حصہ ہے۔ جن کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک ممتاز خاندان سے ہے۔

ف۔ س۔ اعجاز

۱۵ سال پہلے کی بات ہے کہ "انشاء" کا پہلا شمارہ کلکتے میں منصۂ شہود پر آیا۔ اسکی سج دھج اور معیار دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کلکتہ اور ایسا شاندار رسالہ۔ مدیر کا نام دیکھا تو سخت حیرت ہوئی کیونکہ اُس وقت تک یہ نام میں نے بہت کم پڑھا یا سنا تھا۔ ممکن ہے ف۔ س۔ اعجاز کالج کی تعلیم کے دنوں میں اسکے کسی گوشے میں اردو کا چراغ رہے ہوں مگر بڑی مسجد کے اطراف و جوانب میں جو کلکتے کا اردو بازار ہے اس نام سے عام طور پر کوئی واقف نہ تھا۔ رسالے کے مضامین دیکھ کر سب محو حیرت تھے۔ اور یہ خیال عام تھا کہ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں مگر جوں جوں دن گزرتے گئے اور اعجاز انشاء کے ذریعہ حالات حاضرہ کے زود گو، پُر گو اور قادر الکلام شاعر۔ بیباک، اصلاح پسند مدیر اور نقاد و مبصر کی صورت میں جلوہ پذیر ہوتے گئے تو ابتدائی غلط فہمی کے چہرے سے نقاب اترتا چلا گیا اور انشاء کے ساتھ ان کی شہرت بھی کلکتے کے اردو بازار سے نکل کر سارے مغربی بنگال اور پھر پورے ملک سے نکل کر اردو کے بین الاقوامی حلقوں تک پہونچ گئی۔ انشاء برابر ترقی کرتا چلا گیا اور ملک کا صحیح معنوں میں پہلا بین الاقوامی رسالہ بن گیا۔ اس نے اس خیال کو بھی مسترد کر دیا کہ کلکتہ اردو اخباروں کیلئے چاہے کچھ بھی ہو مگر رسالوں کیلئے قبرستان سے کم نہیں۔ یہاں سے اتنی طویل مدت تک کوئی معیاری سے معیاری رسالہ اس سے پہلے نہیں نکلا تھا۔ اسکے ہر عام اور خصوصی نمبر نے دھوم مچادی تھی اور یہ اعزاز اسے آج بھی حاصل ہے۔ اگرچہ اہل اردو کی بے توجہی کی وجہ سے مالی اعتبار سے اسکی بنیاد اتنی مضبوط نہیں جتنی ہونی چاہئے تھی اور وہ زیادہ تر اپنے مالک اور مدیر کی ہمت مردانہ کے سہارے زندہ ہے۔ اس بیماری کا علاج اردو کے دوستوں کے دست شفا کا محتاج ہے۔

اعجاز اور انشاء کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے میرے نیم مردہ جسم میں جان ڈالنے

میں بڑا کام کیا۔ اس کی اشاعت سے میں نے پہلے دن ہی سے دلچسپی لی اور اعجاز صاحب نے جو بھی کہا اسے حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کی اور بڑھاپے۔ کمزوری اور بیماری کو بھی سدّ راہ نہ ہونے دیا خصوصاً نئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرہ نویسی کے معاملے میں۔ اس لئے میری تمنا ہے کہ انشاء زندہ ہی نہ رہے بلکہ اور ترقی کرے اور اس میں اردو کے دولت مند حامی بھی دل کھول کر حصہ لیں۔

کلیم الدین شمس

صورت کے قلندر مگر صلاحیت کے سکندر۔ کلیم الدین شمس کا آبائی وطن بہار کا کوئی گاؤں ہی سہی مگر پیدائش۔ تعلیم و تربیت۔ ترقی کا میدان کلکتہ میں ہے۔ تعلیم میں ایم۔ اے۔ ایل ایل بی ہونے سے پہلے ہی کلکتہ خلافت کمیٹی کے ذریعہ میدان سیاست میں آئے۔ پہلی منزل کلکتہ کارپوریشن ہوئی۔ پھر اسمبلی میں پہونچے تو فارورڈ بلاک کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈپٹی اسپیکر کا عہدہ سنبھالا اور بڑی کامیابی سے سنبھالا۔ پھر کابینہ کے درجے میں وزیر زراعتی مارکیٹنگ ہوئے، پھر وزیر خوراک ہوئے جو اب تک چلے آرہے ہیں اور یقین ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی کرسی مستقل ہے۔ قومی اور ملی درجوں کے سیاسی۔ تعلیمی اور سماجی کاموں میں بھی لگاتار حصہ لیتے ہیں اور جلسوں میں جوشِ خطابت سے مسلمانوں کی رگوں میں تازہ خون دوڑانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

خلیل عباس صدیقی

ٹھوس علمی قابلیت کے مالک۔ باعمل محقق مگر خاموش قومی خدمت گزار۔ کلکتہ یونیورسٹی کے علم الانسان میں پی ایچ ڈی۔ ۳۰ سال سے زیادہ کی مدت کیلئے این تھرو پولو جیکل سروے آف انڈیا کے اہم کارکن۔ آئی سی ایس آر کے سینیر فیلو۔ ایشائک سوسائٹی کے ریسرچ پروفیسر۔ ہندوستان کے قدیم رسوم ورواج کے مستقل محقق۔ ان موضوعات پر ۱۵ کتابوں اور سو سے زیادہ مقالوں کے مصنف اور آج بھی حاشیہ نشیں اقلیتوں کے حالات کے محقق۔ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح و ترقی کے مجاہد اور بنگالی مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے بعض سروے پر مبنی ضخیم اردو کتاب کے مصنف۔ فرقہ پرستی کے خلاف مضامین کے انگریزی مجموعے "ہندوستان میں فرقہ پرستی کی جڑیں" کے مصنف۔ خلیل عباس واقعی علم اور تحقیق کا پہاڑ ہیں اور گنگا کے واقعی چمکدار اور کارآمد موتی۔

مظفر حنفی

اردو کے مشہور شاعر۔ نقاد۔ مصنف۔ مولف۔ مضمون نگار اور شاعروں کے استاد مظفر حنفی دس سال سے کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے متمکن بھی گنگا کے موتیوں میں شامل ہوچکے ہیں۔ دعا ہے کہ یہ تعلق مستقل ہوجائے۔ عالم گیر شہرت کے مالک اس شاعر اور ادیب کی تعریف میں اور کیا لکھا جائے۔ لہٰذا صرف یہ کہہ کر رخصت چاہتا ہوں۔

برو این دام بر جائے دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

میرے زمانے میں بمبئی کی اردو صحافت اور صحافی

۳۷ء میں جب میں بمبئی پہونچ کر اخبار نویسی کے سمندر میں کودا تو اردو اخباری برادری کی حالت یہ تھی کہ ہر اخبار والا دوسرے اخبار کے مالک اور ایڈیٹر کے خون کا پیاسا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے کارکن بھی اس قدر خوف زدہ رہتے تھے کہ ایک دوسرے سے بات کرنا تو درکنار سلام ودعاء سے بھی کتراتے تھے۔ اس لئے کہ اگر مالک یا ایڈیٹر کو معلوم ہوجائے گا تو وہ غدار قرار دے کر یہ یک بینی و دو گوش نکال باہر کردے گا۔ گالی گلوج کا سلسلہ سب سے پہلے حافظ علی بہادر خاں نے مولانا شوکت علی اور انکے خاندان کے خلاف اپنے اخبار "ہلال" سے شروع کیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ جو بھی نیا اخبار نکلا اس

محمد خالد صدیقی جو ماہر معالج قلب ہیں ان کی یادگار موجود ہیں اور میرے قلب ناتواں کو بھی توانائی بخشتے رہتے ہیں۔

پروفیسر محمد زبیر صدیقی ہی کی وضع قطع کے ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ جن کا نام اکرام حسین یاد پڑتا ہے۔ وہ معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے اور سارا فخر اس پر تھا کہ ٹیپو سلطان کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے مذہب کا حال معلوم نہیں مگر محرم میں ایک ماتمی جلوس کا اہتمام ضرور کرتے ہیں جو میسور فیملی کا جلوس کہلاتا ہے۔ ٹیپو سلطان کی اولاد کلکتے میں اب تک موجود ہے۔ اس کے لئے بڑے بڑے اوقاف بھی ہیں مگر انکے غلط مصرف کی شکایت عام ہے۔ اسی لئے اس خاندان کے اکثر لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ دھرم تلے میں ٹیپو سلطان کی مسجد موجود ہے جو اس خاندان کے کسی فرد نے مولانا خیر الدینؒ کے مشورے سے تعمیر کرائی تھی۔ یہ سنیوں کیلئے ہے۔

نواب فاروقی

نواب خندکار غلام محی الدین فاروقی۔ بارہ بھوئیاں خاندان کے فرد۔ رتن پور (بنگلہ دیش) کے جاگیردار۔ جن کے بزرگوں نے انگریزوں سے بھی جنگ کی تھی۔ اہلیہ سر عبدالکریم غزنوی کی بیٹی اور سر عبدالحلیم غزنوی کی بھتیجی کنیز فاطمہ صاحبہ۔ عملی زندگی بنگال سول سروس میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے سے شروع کی مگر بیزار ہو کر استعفیٰ دے دینے میں دیر نہ لگی اور سیاست میں آکر بنگال کے وزیر تعمیرات ہوئے۔ جب فضل الحق اور خواجہ ناظم الدین بھی وزیر تھے۔ ۲۷ء سے ۳۷ء تک اس عہدے پر رہے اور ۲۹ء میں تیستا ندی کا پل تعمیر کرایا۔ پھر وزیر تعلیم ہوئے تو پورے صوبے کا دورہ کر کے اس کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کیلئے جگہ جگہ اسکول اور کالج قائم کئے۔ قانون ساز کونسل کے ممبر ہوئے اور کچھ دن لیڈر بھی رہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد جب جنرل ایوب خاں نے زمینداروں پر پابندیاں عائد کیں تو انہوں نے ایسٹ بنگال زمیندار ایسوسی ایشن بنا کر ایوب خاں سے مل کر ان کو رام کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر مقدمے بازی بھی ہوئی جو بے نتیجہ رہی۔ سرکا خطاب بھی پایا اور دبدبے کا یہ عالم تھا کہ آزادی کے بعد جب برطانیہ کی ملکہ کلکتہ آئیں تو ان کو خاص طور پر ملاقات کیلئے بلایا۔ سیاست سے کنارہ کش ہو کر کئی بینکوں کے ڈائریکٹر رہے اور کلکتے کے شیرف بھی بنائے گئے۔ آدمی بڑے روشن خیال اور زندہ دل بھی تھے۔ جب سنا کہ منصور علی خاں پٹودی اور شرمیلا ٹیگور (عائشہ بیگم) کی محبت میں کچھ لوگ رخنہ ڈال رہے ہیں تو شادی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر اسے حسنِ انجام تک پہونچایا۔ ملک اور بنگال کی تقسیم کے مخالف اور سہروردی اور سرت بوس وغیرہ کے اس منصوبے کے حامی تھے کہ بنگال کو کچھ دنوں کیلئے آزاد رہنے دیا جائے تاکہ وہ اطمینان سے ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی میں شرکت کا فیصلہ کر سکے۔ مگر سردار پٹیل نے ڈاکٹر بدھان چندر رائے سے بنگال اور بہار کو ملا کر بنگال کی مسلم اکثریت کے خاتمے کی تجویز پیش کرا کے بنگال کی تقسیم کا سامان کر دیا۔

فاروقی صاحب بڑے شاندار آدمی تھے۔ لمبے چوڑے نہ تھے مگر درمیانہ قد کے چھریرے اور ورزشی جسم۔ گورے رنگ۔ خوبصورت ناک نقشے کے مالک تھے۔ کشتی نما ٹوپی۔ شیروانی۔ چست پاجامے اور چمکدار جوتے میں سب سے ممتاز نظر آتے تھے۔ مجھے کئی بار مکان پر آنے کو کہا مگر بدقسمتی سے یہ عزت حاصل نہ کر سکا۔ سنا تھا کہ گھر بھی شاندار ہے۔ کھانا بھی بہت عمدہ کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ مکان میں قلمی اور مطبوعہ بنگالی۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی۔ اور اردو کتابوں کا بہت بڑا کتب خانہ بھی ہے جس میں اورنگ زیب کا لکھا ہوا قرآن مجید بھی ہے۔ آخری بار جب ملے تو ضعف بینائی کی وجہ سے ایک آدمی کو ساتھ لائے تھے۔ آخر ۲۴ اپریل ۸۴ء کو انکے انتقال کی خبر بھی مل ہی گئی جو ۹۰ سال کی عمر میں ہوا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

جسٹس مسعود

میرے کلکتہ وارد ہونے کے وقت یہاں کے سب سے معزز غیر سیاسی مسلمان بیرسٹر ایس۔ اے۔ مسعود۔ تھے۔ جو مسلم نمائندوں کو اپنے مکان پر جمع کر کے مسلمانوں کی تعلیمی۔ سماجی اور اقتصادی حالت کو تباہی سے بچانے پر زور دیتے تھے اور اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ کلکتہ ہائی کورٹ کا جج ہو جانے کے بعد ان کی اہمیت میں اور اضافہ ہوا مگر مسلمانوں کے مسائل سے انکی دلچسپی قائم رہی۔ آخر میں کچھ دنوں کیلئے چیف جج بھی ہوئے اور اسکے بعد بین الاقوامی عدالت انصاف کے جج ہو کر کئی سال جنیوہ میں رہے۔ وہاں صرف کام ہی نہیں کیا بلکہ اس عدالت کا معیار بلند کرنے کیلئے کئی اصلاحات بھی کیں۔ وہاں سے آکر سارا وقت مسلمانوں کو اعلےٰ سرکاری ملازمتوں کیلئے تیار کرنے میں اور فرقہ پرستی کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد کیلئے ہونے والے جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرنے میں صرف کرنے لگے تھے۔ چاہے وہ کسی جماعت کے زیر اہتمام ہوں۔ بائیں بازو کی طرف جھکاؤ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود بھی جاری رہا۔ زیادہ تر ملاقات ایسے ہی موقع پر ہوتی تھی۔ اب آخری ملاقات

سوشلسٹ یونٹی سنٹر کے زیر اہتمام خضر پور کے چوراہے پر ہونے والے ایک اجتماع میں ہوئی جس میں علالت کے باوجود تشریف لے آئے تھے اور اسکے چند روز بعد ہی مستقل جدائی کی خبر مل گئی۔ اللہ بخشے۔

خواجہ محمد یوسف

کلکتے کے سر برآوردہ باشندوں میں خواجہ محمد یوسف کو بھی اونچا درجہ حاصل ہے۔ یہ خود ساختہ انسان ہیں۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول بنیاپوکھر سے ممتاز استادوں کا چہیتا شاگرد رہ کر حاصل کی اور انگریزی لکھنے اور بولنے میں خاص مہارت حاصل کرلی۔ سنٹرل کالج د موجودہ مولانا ابوالکلام آزاد کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے اسلامی تاریخ وتمدن میں ایم۔اے اور ایل ایل بی کر کے انصاف کرنے میں ججوں کی مدد شروع کی اور ایسا نام کمایا کہ سنئیر سرکاری ایڈوکیٹ اور پھر جج ہوگئے۔ جج سے حال ہی میں سبکدوش ہوکر سارا وقت مسلمانوں کی علمی، تعلیمی، سماجی اصلاحی، و ترقی کے کاموں میں اس حد تک صرف کررہے ہیں کہ گھر والوں کو بے توجہی کی شکایت تک ہوجاتی ہے۔ ایران سوسائٹی سے خاص لگاؤ ہے۔ تاریخ خصوصاً اسلامی دور کی تاریخ سے خاص دلچسپی ہے اور اردو میں مضمون نگاری کا خاص میدان بھی یہی ہے اگرچہ انگریزی کے بھی اعلیٰ درجے کے مقرر اور محرر ہیں۔ اللہ عمر دراز کرے۔ کیونکہ فربہی کی وجہ سے نورالحسن ثانی کہلاتے ہیں اور اب اس میں کمی کی طرف خاص طور پر مائل ہوئے ہیں۔ قانونی دوڑ دھوپ کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اور سرکاری تحقیقاتی کمیشنوں کی ذمہ داری خاص مشغلہ ہے۔ حال ہی میں مغربی بنگال اقلیتی کمیشن کے سربراہ بھی بنادئے گئے ہیں۔

ایم۔اے۔مجید

کلکتے کے مسلمانوں کی ایک اہم فیض رساں ہستی ایم۔اے۔ مجید صاحب بھی ہیں۔ جو پہلے مسٹر تھے اور اب مولانا ہوگئے ہیں۔ ان کی زندگی بڑی بصیرت افروز ہے۔ ۱۹۲۱ء میں بہار میں پیدا ہوئے مگر پانچ سال کی عمر ہی میں یتیم ہوجانے کے بعد اپنے خالو کے ساتھ کلکتہ میں آکر حصول تعلیم میں لگ گئے یہاں تک کہ فارسی میں امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کر کے سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے جس سے ۷۹ء میں رہائی ملی مگر وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے سماجی خدمت میں دلچسپی لینے لگے تھے جو یقیناً بچپن کی سخت اور تلخ زندگی کا دیا ہوا سبق تھا۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو سخت زندگی گزارنے کے بعد جب اچھے دن دیکھتے ہیں تو غریبوں کے لئے سخت گیر ہوجاتے ہیں۔ دوسرے اسکے برعکس بہت رحمدلی سے کام لیتے ہیں۔ مجید صاحب اس دوسرے زمرے کے آدمی ہیں۔ یونیورسٹی میں فارسی کا طالب علم ہونے کی وجہ سے وہ ڈاکٹر محمد اسحٰق کے دامن تربیت میں آئے تو زندگی بھر کے لئے علمی کاموں میں اسکے دست راست ہوگئے۔ ۵۴ء سے ۷۳ء تک صوبائی انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۵۳ء سے کئی سال تک اسلامیہ ہائی اسکول کی گورننگ باڈی کے ممبر اور خازن رہے اور اس کی نئی عمارت کی تعمیر میں اہم حصہ لیا۔ سی ایم او پرائمری بوائز اور گرلس اسکولوں سے وابستہ ہوکر جنرل سکریٹری کے عہدے تک پہونچے اور ان کو ہائی اسکول تک پہونچا کے اور نئی عمارت سے بہرہ مند کر کے چین لیا۔ دہلی میڈیکل ہاسپٹل اور یتیم خانہ اسلامیہ میں بھی برسوں جنرل سکریٹری کا کام سنبھالے رہے اور یتیم خانے کی ترقی میں خاص حصہ لیا جب کہ شعبہ نسواں کی شاندار عمارت لاکھوں روپے کے خرچ سے زیر تعمیر ہے اور ایک حصہ مکمل ہوچکا ہے۔ کلکتے میں کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کا جو ادارہ بھی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اس کو بھنور سے نکالنے کیلئے مجید صاحب کا نام لیا جاتا ہے اور کمال یہ ہے کہ دسوں جماعتوں کا اعزازی سکریٹری ہونے پر بھی ان کا دامن صاف ستھرا ہے اور کسی میں اُن پر انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں ہے۔ عمر شریف ۷۵ سال کے قریب ہوجانے کے باوجود ہر کار مشکل کو ہمت مرداں سے کررہے ہیں اور نوجوانوں کیلئے مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔ ایران سوسائٹی جیسے اہم اور باعمل ادارے کی رونق زیادہ تر انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔

ڈاکٹر محمد اسحٰق

ڈاکٹر محمد اسحٰق کو ان کے کارناموں کی وجہ سے اس صدی کا کلکتے کا سب سے بڑا علم پرست اور تعمیر پسند کہہ سکتے ہیں۔ وہ یکم نومبر ۱۸۹۸ء کو کلکتے میں پیدا ہوئے۔ پہلے بی ایس سی ہوئے۔ پھر عربی میں ایم اے کیا۔ پھر یونیورسٹی کی طرف سے لندن جاکر زمانہ حاضرہ کی فارسی نظم کے عنوان سے تحقیق کر کے ۳۰ء میں پی ایچ ڈی کا اعزاز حاصل کیا۔ کچھ دن کلکتہ کارپوریشن میں کام کرنے کے بعد ۴۴ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی اور اسلامی علوم کے معاون لیکچرر ہوگئے۔ دو سال کے اندر ہی کلکتہ واپس آکر اسلامیہ کالج میں عربی اور فارسی کے لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا جس کا اصل نام اسلامیہ کالج تھا مگر آزادی کے بعد سنٹرل کلکتہ کالج کردیا گیا اور کئی سال بعد مولانا ابوالکلام آزاد کالج ہوگیا۔ ۴۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے لیکچرر ہوگئے اور پھر ریڈر

ساتھ موسیٰ سیٹھ کے مسافرخانہ میں مقیم ہوئے۔ ایک دن ایک تاجر نے ان کا کرتا پھٹا دیکھ کر ان کو دس روپئے کپڑے بنوانے کو دئے۔ مولانا نے ان میں سے دو تین روپئے میں ایک جوڑا بنوا کر باقی روپئے ان کو واپس کر دئے!۔ افسوس کہ حکیم زماں صاحب ۹۴ء کے وسط میں شدید بیماریوں میں مبتلا ہو کر کئی سال چلنے پھرنے سے معذور ہو کر حال ہی میں خالق حقیقی سے جاملے۔ مولانا حکیم محمد زماں حسینی کے فرزند اکبر بھی انہی کی طرح عالم دین اور طبیب ہیں۔ وہ بھی علمی و ادبی حلقوں میں مشہور و معروف ہیں اور اپنے والد کا صحیح جانشیں بننے میں لگے ہوئے ہیں۔ چونکہ آجکل حالات زمانہ کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے اکثر اردو اخباروں نے جمعہ کے دن مذہبی مواد شائع کرنے کو بھی رواج بنالیا ہے اس لئے "آزاد ہند" کے جمعہ ایڈیشن میں دونوں حضرات کے مضامین بھی التزاماً شائع ہوتے رہے ہیں۔ شریعت کی تمام پابندیوں کے ساتھ مولانا حسینی کی دختر خالدہ نے اردو میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر لیا ہے۔ اور وہ بھی کار آمد مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف میں لگی ہوئی ہیں۔ حالات زمانہ کے مطابق مولانا کے دوسرے فرزندوں کے بعد ان کے پوتے بھی انگریزی تعلیم میں بھی امتیاز حاصل کر رہے ہیں۔

سیاہ فام اور جلالی آنکھوں والے مولانا ابو سلمہ شفیع صاحب بھی جو بہار کے مدرسہ عالیہ کے استاد اور تحریکِ خلافت کی پیداوار تھے۔ علمائے دین میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ اصلاح عقائد و معاشرہ کیلئے چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی چھاپتے رہتے تھے۔ نماز عیدین کے برسوں امام بھی رہے۔

مولانا ابوالمحفوظ الکریم معصومی بھی کلکتے کے مشہور دین عالم ہونے کے ساتھ اردو، فارسی، اور عربی کی گرامر اور ع، ض کے بھی ماہرین اور تینوں زبانوں میں نظم و نثر لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ حال میں مدرسہ عالیہ کے شیخ الحدیث کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ بیدار مغز اور دور اندیش ہونے کی وجہ سے اردو اکاڈمی سے بھی عملی طور پر وابستہ ہیں اور مذاقاً ان کو مغربی بنگال کا شیخ الاسلام بھی کہا جاتا ہے۔ خاندانی صدمے سہنے پر بھی آپ مسکراتے رہتے ہیں اور دل کا درد ظاہر کرنے میں بخیل ہیں مگر اس کو صبر و تحمل کی معراج بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت مغربی بنگال کے وقف بورڈ کے صدر بھی ہیں کیونکہ ریاست کی کمیونسٹ حکومت سے خوشگوار تعلقات رکھنے کے اصول پر بھی کاربند ہیں۔

مولوی عبدالعلی برکتی عالم کے علاوہ ایک خانوادۂ صوفیا سے بھی منسلک تھے۔ جمیعتہ علماء کو باعمل کرنے کے کام میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی بڑی مدد کرتے تھے۔ اور انکے اس میدان کے دوسرے ساتھی پروفیسر شاہ وصی الدین تھے۔ برکتی صاحب مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے بعد مدرسہ عالیہ کے پرنسپل کے عہدے کیلئے بنگالی۔ غیر بنگالی کا سوال اٹھا کر اس عہدے پر بھی پہونچ گئے تھے۔ انتقال ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ آدمی خوش مزاج تھے۔

کلکتے کے دینی حلقوں میں قاری عبدالقوی مرحوم بھی سر بر آوردہ ہستی تھے۔ شہر کے سب سے بڑے دینی مدرسے مدرسہ عظمتیہ کے بانی تھے۔ اور اس کے لئے وقف ہوگئے تھے۔ کلکتے کے علاوہ آپ نے دوسرے مقامات پر اور اڑیسہ میں بھی مدرسے کی کئی شاخیں قائم کی تھیں جو سب کامیابی سے چل رہی ہیں۔ ان کا انتقال ہوگیا اور انکے بڑے بیٹے مولوی فضل الرحمٰن ان کے مہتمم ہیں۔ دوسرے بیٹے مولوی حفظ الرحمٰن اپنی تربیت گاہ چلا رہے ہیں۔ اول الذکر نماز عیدین کی امامت بھی کرتے ہیں۔

گورنر پروفیسر سید نورالحسن

کلکتہ آنے پر اہم ترین لوگوں سے ملنے کا موقع ۱۵؍ اگست اور ۲۶ جنوری کو راج بھون میں ہونے والے عصرانوں میں ملنا شروع ہوا جن میں سیکڑوں آدمی مدعو کئے جاتے ہیں۔ جس وقت میں یہاں آیا تو بلبل ہند سروجنی نائیڈو کی دختر پدمجا نائڈو گورنر تھیں، جن سے حیدر آباد میں مل چکا تھا۔ اسکے بعد جب شری تری بھون نرائن سنگھ جیسے گاندھی وادی گورنر ہوئے تو انہوں نے اتنی جدت کی کہ عید کے دوسرے دن راج بھون میں سویوں کی دعوت کے ساتھ قوالی بھی کرانے لگے۔ اسی طرح دیوالی کا جشن بھی ہونے لگا اور ہندو مسلم خیر سگالی کا اچھا مظاہرہ دیکھنے کو ملنے لگا۔ آخر میں جب پروفیسر سید نورالحسن گورنر ہو کر آئے تو انہوں نے رمضان میں افطاری کے ساتھ کھانے کا انتظام بھی کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ لکھنؤ سے باورچی لاتے تھے جو ان کے زیر ہدایات ایسے نفیس کھانے پکواتے تھے کہ جن کو کھا کر کافر بھی مسلمان ہونے کے خواہش مند ہو جاتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کھانے کے بعد رخصت ہوتے وقت شکریہ ادا کیا تو میں نے کہا کہ شکریہ تو آپ کا ادا کرنا ہے کہ آپ نواب حامد علی خاں کی شاہی دستر خوانی کو زندہ کر رہے ہیں۔

نورالحسن صاحب کی شادی رام پور کے نوابی خاندان میں ہوئی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں تاریخ کے لیکچرر ہوئے۔ پھر مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر، پھر وزیر تعلیم ہوئے۔ آخر میں دس سال گورنری کی۔ اور تاریخ بنائی۔ مغربی بنگال کی بائیں محاذ کی حکومت کا کئی گورنروں سے بگاڑ رہا مگر نورالحسن مرحوم نے ساری مدت ایک چھوٹے سے وقفے کو چھوڑ کر مرکز اور صوبائی

حکومت کے پورے اعتماد اور بنگالیوں کی محبت کا مرکز رہ کر گزاری، وہ جس اخلاق دردمندی اور دوراندیشی کا پیکر تھے، علمی، ادبی اور فنی ماہروں کے فلک نشین، بنگالی حلقوں کے آفتاب تھے، ایسا گورنر شاید ہی کسی دوسرے صوبے کو میسر آیا ہو۔ان کے نائب صدر بننے کی خبر بھی اڑی تھی مگر نہ کلکتہ ان کو چھوڑنے کو تیار تھا نہ وہ کلکتے کو۔ ان کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کی بگڑتی ہوئی صحت جسمانی تھی۔وہ بڑھیا کھانے کثرت سے نوش جاں کرنے کی وجہ سے بے حد موٹے ہوگئے تھے۔ خصوصاً اوپر کا دھڑ ٹانگوں کیلئے ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔ جس سے چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ جلسوں کی صدارت کرنے کیلئے جو شہ نشین بنائے جاتے تھے ان میں چڑھنے کیلئے گن کر صرف پانچ سیڑھیاں بنائی جاتی تھیں۔ ایک خاص کرسی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ہوائی جہاز میں لفٹ کے ذریعہ پہونچائے جاتے تھے۔ کئی گز لمبی خاص حفاظتی پٹی باندھی جاتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اردو اکاڈمی کے دفتر کا بھی اس وجہ سے معائنہ نہ کر سکے کہ اس کی لفٹ چھوٹی تھی اور لفٹ تک جانے سے پہلے دس بارہ سیڑھیاں پل صراط بنی ہوئی تھیں۔ پھر بھی اردو کی ترقی کی طرف پوری توجہ کرتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے منسوب ثقافتی مرکز کے قیام کا انہوں نے ہی انتظام کیا تھا۔ موٹاپے کی وجہ سے ان کا دل۔ گردے۔ جگر کمزور ہوگئے تھے اور وہ بیماریوں کی پوٹ ہوکر رہ گئے تھے۔ آخر کار وہ ایسے گرے کہ سیٹھ سکھ لال کرنانی ہاسپٹل میں ہفتوں سخت مصیبت اٹھاکر اور دہلی اور کلکتے کے ماہر معالجوں کی ساری کوشش کے باوجود اس دنیا سے اٹھ گئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے احاطہ میں ذاکر صاحب کے قریب دفن کردئے گئے۔ سارے اعضاء کے بیکار ہو جانے کے باوجود ان کا دماغ آخر تک کام کرتا رہا اور دلکش چہرے پر فطری مسکراہٹ بھی قائم رہی۔دو معتبر گواہوں جناب احمد سعید ملیح آبادی اور جناب کلیم الدین شمس کا بیان ہے کہ آخری سانس لینے سے دو تین دن پہلے انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اور ان کو گواہ بنا کر تجدید ایمان کرلی تھی۔

پروفیسر نورالحسن سے پہلے اس صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائیاں مغربی بنگال میں انتہائی ہنگامہ خیز رہیں۔ کانگریس حکومت برقرار رکھنے کیلئے اور بایاں بازو خصوصاً سی پی آئی (ایم) حکومت حاصل کرنے کیلئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھیں۔ بایاں بازو بات بات پر تشدد مظاہرے، ہڑتالیں اور رائٹرس بلڈنگ کے گھیراؤ میں سرگرم تھا تو حکومت اسے انتہائی سختی سے دبانے ہیں۔ کرفیو لگنا۔ گولی چلنا۔ بموں کے دھماکے ہونا، روز کا معمول تھا۔ گھر سے نکلنا اور راستہ چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اسمبلی کے اندر بھی ہنگامہ ہوتا رہتا تھا اور سب سے بڑا ہنگامہ مسٹر دھون کی گورنری کے زمانے میں ہوا جو برطانوی دور کے آئی سی ایس تھے اور اترپردیش سے بھیجے گئے تھے۔ایک دن وہ اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں افتتاحی خطبہ دینے آئے تو بائیں بازو کے ممبروں نے ان کا راستہ روکا اور دھینگا مشتی کی۔ عورتیں راستے میں لیٹ گئیں۔ وہ بڑی مشکل سے اسپیکر کی نشست گاہ تک پہونچے مگر خطبہ پڑھنا شروع کرتے ہی ان کا پرشور گھراؤ ہوگیا۔ گھونسے اور لاؤڈ اسپیکروں کی سلاخیں چلنے لگیں۔ وہ تھوڑی دیر خطبہ پڑھتے رہے پھر پچھلے دروازے سے نکل گئے۔ان کے بعد بائیں بازو کے مخالف گورنر تو آئے مگر مسٹر دھون جیسا نہ آیا۔ نورالحسن نے معاملات کو ٹھنڈا رکھا اور ان کے دور میں بائیں بازو کی حکومت بے روک ٹوک چلتی رہی جو ۱۹۷۷ء میں برسر اقتدار آئی تھی۔

محمد زبیر صدیقی

راج بھون کے اجتماعوں میں اُس انسان سے سب سے پہلے متعارف ہوا جس سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ وہ تھے پروفیسر زبیر صدیقی۔ عمر ستر سال سے زیادہ۔ دبلے پتلے مگر تنے ہوئے۔ داڑھی مونچھ سے بے نیاز۔ کشتی نما کالی مخملی ٹوپی۔ معمولی کپڑے کی سیاہ شیروانی، علی گڑھ پاجامہ اور سادے سے دیسی جوتے۔ ہاتھ میں ہلکی سی چھڑی۔ چہرے پر متانت۔ انجان آدمی کسی پرائمری اردو اسکول کا مدرس سمجھے۔ رنگ آبنوسی مگر چہرہ مہرہ بے عیب۔ ایسا آدمی اور راج بھون کے سربرآوردہ مہمانوں میں۔ خود بخود ان کے قریب جانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ کسی بوجھ بجھکو سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ انہوں نے نام بتایا تو دل کی کلی کھل اٹھی۔ کسی سے تعارف کرانے کی درخواست کئے بغیر ہی میں ان کے پاس پہونچا۔ اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ آپ کی کتاب فردوس الحکمت سے استفادہ کرچکا ہوں۔ یہ علم طبابت کی مشہور اور قدیم عربی کتاب ہے جو انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کی پروفیسری کے زمانے میں ایڈٹ کرکے شائع کی تھی۔ ان دنوں وہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے سربراہ تھے مگر وہ عربی کے ساتھ اردو۔ فارسی۔ اور انگریزی پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ راج بھون میں ان کی آمد صوبائی پبلک سروس کمیشن کا رکن ہونے کی بنا پر ہوتی تھی۔ یہ اعزاز پرانے پروفیسروں کو ملازمت کے آخری حصے میں مل جاتا ہے۔ اسی نسبت سے پروفیسر مسعود حسن سے بھی ملاقات رہتی تھی (بعد میں پروفیسر اعزاز افضل بھی اسی عہدے پر سرفراز ہوئے تھے)۔ محمد زبیر صدیقی کبھی کے خدا کو پیارے ہو چکے ہیں مگر ان کے صاحبزادے

رئیس الدین فریدی

مختصر حالات زندگی

پیدائش ۱۹۱۵ء۔ امروہا۔ (یوپی)۔ تعلیم۔ جبل پور (مدھیہ پردیش) خانگی۔ کانگریس میں شرکت مگر جلد علیحدگی پر مجبوری۔ (۱۹۳۶ء) بمبئی آمد اور روزانہ ہلال میں سب ایڈیٹری۔ پھر ایڈیٹری (۳۷۔ ۱۹۳۸ء) روزانہ اقبال کی ایڈیٹری (۳۹۔ ۴۱ء)۔ روزانہ خلافت کی ایڈیٹری (۴۲۔ ۴۹)۔ بمبئی کے اردو اخبار نویسوں کی مغائرت مٹانے اور اخباروں کی آواز کو قومی بنانے کے لئے بمبئی اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کا قیام ۴۲ء میں اور ۴۹ء تک اسکے جنرل سکریٹری کے عہدے کی ذمہ داری۔ بمبئی پریس ایڈوائزرس کمیٹی کی رکنیت (۴۵۔ ۴۹ء) جب مرارجی دیسائی بمبئی پریسیڈنسی کے وزیر داخلہ تھے۔ جواہر لال نہرو کے ایماء پر حیدر آباد سے جاری ہونے والے اخبار شعیب کی جوائنٹ ایڈیٹری (۴۹۔ ۵۱ء)۔ اخبار ملاپ دہلی کے حیدر آباد ایڈیشن میں کام (۵۱۔ ۵۲ء)۔ بمبئی کو واپسی اور اتحاد کی ایڈیٹری۔ بمبئی کے اخبار انقلاب کے حیدر آباد ایڈیشن کی ایڈیٹری کیلئے حیدر آباد واپسی (۵۳۔ ۵۵ء)۔ پھر سیاست اور سلطنت میں جز وقتی کام۔ ۵۷ء میں دہلی آمد اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں لال بہادر شاستری جی کی قیادت میں اردو کے شعبۂ پبلسٹی میں کام۔ پھر پیام وطن نامی اخبار سے مختصر تعلق۔ ۱۹۵۷ء میں مولانا حفظ الرحمٰن کے ایماء سے روزانہ ہند کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے کلکتہ آیا اور ۹۸ء تک اس سے تعلق رہا۔ اس دوران میں ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانگریس کے پٹنہ کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کی اور اس کا رکن ہوا۔ ۷۵ء میں اسکے سالانہ اجلاس کی مجلس استقبالیہ کا جنرل سکریٹری منتخب ہوا جو کلکتے میں ہوا تھا۔ ۷۶۔ ۷۹ء میں بنگال فلم جرنلس ایسوسی ایشن کا نائب صدر اور ۸۰۔ ۸۴ء میں مشرقی ہند کے فلم سرٹیفائنگ بورڈ کے رکن کی حیثیت سے کام کیا۔ ۷۹ء میں آل انڈیا ایڈیٹرس کانگریس کے اجلاس میں شرکت کیلئے شملے کا سفر کیا۔ اسی سلسلے میں دہلی میں صدر ہند شری وی۔ وی۔ گیری کے ساتھ چائے نوشی کا موقع ملا۔ چھوٹے اخباروں کی کئی جماعتوں سے تعلق رہا۔ ۷۳ء میں شمالی اور



رئیس الدین فریدی
سابق مدیر ''روزانہ ہند''۔ کلکتہ

پتہ
H-13, Pocket K
Phase II, Sheikh Sarai
New Delhi - 110017
Phone (011) 648-9060

وسطی ہند کا اخبار نویسوں کے وفد کے ساتھ دس دن کا سرکاری دورہ کیا جس کا انتظام گجرال صاحب نے مرکزی وزیر اطلاعات کی حیثیت سے کیا تھا۔ مغربی بنگال کی اردو اکادمی کے قیام کے بعد سے اس کی کونسل اور مختلف کمیٹیوں کے رکن کی حیثیت سے کام کیا اور تین سال تک اسکے اردو صحافتی ٹریننگ سینٹر کا بار بھی تنہا ہی اٹھایا۔ ۸۲ء میں اکادمی نے میری ادبی سرگرمیوں کا حال انتخاب کلام کے ساتھ شائع کیا اور روزنامہ ''آزاد ہند'' کے ہفتے وار ایڈیشن میں ۸۳۔ ۸۴ء میرے حالات زندگی ۱۲۵ کے قریب قسطوں میں شائع ہوتے۔ چند مکمل ابواب ''انشاء'' میں چھپ چکے ہیں۔ ۸۴ء میں دہلی کے ادارے تنظیم برائے مفاہمت اور دوستی نے ۱۰ ہزار روپے کا انعام دیا جو اس وقت کے مرکزی وزیر غلام نبی آزاد کے ہاتھوں وصول کیا۔ ۱۹۹۶ء میں آل انڈیا قومی تنظیم جواہر لال نہرو ایوارڈ بھی موصوف ہی نے دیا۔ ۷۱ء میں بنگلہ دیش سے اظہار یگانگت کیلئے نئی دہلی میں اردو اخباروں کے منتخب ایڈیٹروں کا جو اجلاس ہوا اس میں بھی شرکت کی اور ۸۴ء میں اس قسم کا اجتماع اندرا جی نے اپنے دفتر میں پنجاب میں دہشت گردی کے مسئلے پر غور کرنے کو بلایا اس میں بھی حصہ لینے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اپنی قلم کشی کی ساٹھ سال سے زیادہ کی مدت میں جس کے دن بائیس ہزار سے زیادہ ہوتے ہیں کم سے کم بائیس ہزار کالم ایڈیٹوریل۔ نوٹ اور تقریباً اتنے ہی مزاحیہ کالم لکھے ہونگے۔ اس سے بہت زیادہ کالموں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہوگا۔ سیکڑوں خاص مضمون۔ ریڈیو کیلئے تقریریں۔ غزلیں اور نظمیں الگ ہیں۔ ابتداء میں ۲۰۔ ۲۵ افسانے بھی لکھے مگر طرح طرح کی مجبوریوں کی وجہ سے ان کو جمع نہ کر سکا اور ان کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ مالی مشکلات یا کسی کی خوشامد نہ کرنے کی وجہ سے انکی کتابی صورت میں اشاعت کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ کم سے کم دو کتابیں جو مرتب کی تھیں ''ماہرین'' کی کم توجہی کی نظر ہو گئیں۔ کئی سو صفحات کے حالات زندگی کئی سال سے کسی صاحبِ ثروت کی توجہ کے محتاج ہیں پھر بھی مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ میں نے جتنی دنیا دیکھ لی وہ کروروں روپے خرچ کرنے پر بھی دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہی میری سب سے بڑی کمائی ہے۔

گردش ایام تیرا شکریہ
ہم نے ہر پہلو سے دنیا دیکھ لی

تذکرۂ احباب کلکتہ

گنگا کے موتی

۱۹۵۷ء میں جب میں کلکتہ آیا تو تقسیم ملک کے اثرات کے باوجود کلکتے میں گوشت پوست کے آبدار موتیوں کی کمی نہ تھی۔ ان میں سے جن کو دیکھنے اور برتنے کا موقعہ ملا اور ان کے گہرے نقوش صفحۂ دل پر جلوہ گزیں ہوئے ان میں سے بعض کا ذکر کئے بغیر چارہ نہیں۔

حکیم محمد زماں حسینی و دیگر علماء

اس بیان کو مذہبی بزرگوں سے شروع کیا جائے تو پہلا نام مولانا حکیم محمد زماں حسینی ہی کا زبان قلم پر آتا ہے۔ آبائی وطن اتر پردیش کا ضلع بلیا تھا اور اب کلکتہ ہے۔ ایک مذہبی خاندان کا فرزند ہونے کی وجہ سے ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند سے درس اسلامی کے ساتھ علم طب کی تکمیل کے بعد کچھ دنوں کے بعد لائل پور کے مدرسہ ربانیہ میں درس دیا جو اب پاکستان میں ہے اور فیصل آباد کہلاتا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں کلکتہ آکر کولوٹولہ میں قاسمی دواخانہ قائم کیا۔ جو بانی دارالعلوم اور مجاہد اسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے اسم گرامی سے موسوم ہے۔ ان کی حسینیت مولانا حسین احمدؒ سے روحانی نسبت کی دین ہے۔ ابتدا ہی سے جسمانی مریضوں کا علاج کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی روحانی جلا کا کام بھی شروع کر دیا تھا جو مختلف مساجد میں جاری رہ کر مدتوں سے کولوٹولہ کی مسجد میں جاری ہے اور صحیح بخاری کی تشریح کے بعد قرآن مجید کی تفسیر سے نہایت ذمے داری اور فصاحت کے ساتھ تشنگان رشد وہدایت کو سیراب کرتے رہے اور اسی لئے مفسر قرآن کہلاتے ہیں۔ کسی زمانے میں طبابت کیساتھ سیاست سے بھی دلچسپی تھی اور بڑا بازار ضلع کانگریس کی عاملہ کی رکنیت تک پہونچ گئے تھے۔ پھر جمعیۃ علمائے ہند کی صوبائی شاخ کو سنبھالا اور صدر کے عہدے تک پہونچے۔ کانگریس اور جمعیۃ سے وابستگی اور کھدر پوشی کی قیمت مسلم لیگ کے زور کے زمانے میں گالیاں کھا کر بھی ادا کی۔ کلکتے میں وہ غالباً واحد مسلمان عالم دین تھے جن کو کل ہند حیثیت حاصل رہی۔ وہ دارالعلوم دیوبند۔ ندوۃ العلماء۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔ اور کئی دوسرے قومی درجے کے اداروں سے اعزاز کے ساتھ وابستہ رہے۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال کے بعد جن کے وہ ہمیشہ معاون رہے ان کے رسالے برہان کے نگران کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ کلکتے کے اسلامیہ یتیم خانہ۔ اسلامیہ ہاسپٹل اور حج کمیٹی کے ذریعہ بھی عوام کی خدمت کی۔ مولوی ابوسلمہ محمد شفیع کے سفر حج اور علالت کے دوران میں خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ہونے والی نماز عیدین کی امامت بھی کی۔ مولانا حسینی اچھے مقرر بھی تھے اور جلسوں کے علاوہ اہم مذہبی موقع پر ریڈیو سے بھی تقریریں کرتے رہے۔ کتابیں جمع کرنے، لکھنے پڑھنے کا شوق بھی فطرت ثانیہ تھا۔ مضامین کے علاوہ دو مختصر کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ایک القانون فی الطب جو ایران سوسائٹی کے زیر اہتمام منائے جانے والے بوعلی سینا کے ہزار سالہ جشن پیدائش کیلئے مقالے کی صورت میں قلم بند ہوئی تھی۔ دوسری شیخ بوعلی سینا کی سیرت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والا مقالہ جو ایشیاٹک سوسائٹی کے مذاکرے میں پڑھا گیا تھا۔ اس پر اردو اکاڈمی نے انعام بھی دیا تھا۔ مضامین کا ایک مجموعہ "مقالات شریعت و حکمت" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور ان کا مطب جسمانی مریضوں کے علاوہ دینی اور علمی و ادبی اہل شوق کی آماجگاہ بھی تھا۔ اس صدی کی کلکتے کی اسلامی زندگی کے وہ قلزم معلومات تھے۔ تبرکاً اور نصیحتاً ان کے بیان کردہ دو واقعات کا ذکر بھی کئے دیتا ہوں۔

ایک دن انہوں نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم سے جمعیۃ علمائے ہند میں شرکت کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا کہ میں مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا رکن تھا مگر اسکے صدر مفتی کفایت اللہ (رح) سے اختلاف رائے ہو جانے کی وجہ سے کنارہ کش ہو گیا اور اب اس وجہ سے کسی جماعت سے وابستہ ہونے سے معذور ہوں کہ اخبار نویس کو ہرگز کسی جماعت سے وابستہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ آزادئ صحافت کیلئے مضر ہوتا ہے۔ مولانا ملیح آبادی کی یہ رائے نہایت قیمتی ہے مگر افسوس کہ اس پر بہت لوگ عمل نہ کر سکے اور اب تو اس کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ صحافت سرمایہ داری اور سیاست کی غلام ہو چکی ہے اور اخبار نویس انکے آلۂ کار ہو کر رہ گئے ہیں۔

ایک اور بصیرت افروز واقعہ مولانا حسینی نے یہ بتایا کہ سوراج اور خلافت کی تحریک کے دنوں میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ مدرسہ عالیہ کو متحرک کرنے کیلئے ناخدا کی مسجد میں نیا مدرسہ قائم کر کے گاندھی جی سے اس کا افتتاح کرایا تو مولانا حسین احمد مدنی (رح) اسکے مدرس ہو کر آئے اور دوسرے مدرسوں کے

بتادیا۔ مجھ سے کہا گیا، بیگم صاحبہ کے کمرے میں چلو۔ مجھے تامل ہوا۔ مدتوں ایک ہی گھر میں رہا تھا اور پردہ بھی کانا تھا، مگر کبھی اچٹتی نگاہوں سے بھی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میرا پس وپیش دیکھ کر کہا گیا، بیگم صاحبہ مُصر ہیں کہ تم پہنچو وقت آخری ہے دیر نہ کرو— مجبوراً جانا پڑا۔ واقعی بیمار کا آخری وقت تھا، مگر نہ جانے کہاں سے قوت آگئی تھی میرا ہاتھ پکڑ لیا کہنے لگیں "آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ "اُن" سے کہنا کہ تمہارے نام پر مر رہی ہوں مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا!"

(ذکر آزاد صفحہ نمبر ۴۲۹-۴۳۰)

زلیخا کی موت نے عوام کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مسلم، غیر مسلم، اور تمام سیاسی جماعتوں نے ان کے غم میں خون کے آنسو بہائے اور ماتم کیا۔ کلکتے کے محمد علی پارک میں تعزیتی جلسہ ہوا، جس میں بنگال کے مشہور شاعر اور صحافی جناب ابراہیم ہوش نے زلیخا کی وفات پر ایک نظم کہی جو مختلف اخبارات اور رسائل میں بھی شائع ہوئی۔ اس نظم کے چند اشعار پیش ہیں

آج تک دیکھا نہ ہوگا عالمِ ایجاد نے
جان دی جس بے کسی میں بیگمِ آزاد نے
آؤ اے مرغانِ گلشن اشک افشانی کریں
آؤ اے صحرا کے ذرّو مرثیہ خوانی کریں
آؤ اے اہلِ وطن سب مل کے ہوں ماتم گسار
آؤ ہم رو رو کے اپنے خون کو پانی کریں
باغ پر آئے خزاں اور باغباں ہو قید میں
کارواں لُٹ جائے میرِ کارواں ہو قید میں
ایسی بیگم جان دے اور وہ سرِ بالیں نہ ہو
اے خدا ایسی کسی کی موت غم آگیں نہ ہو
مرتے دم بھی اپنے بیگانوں سے جو ملنے نہ دے
یوں کسی کی مملکت میں جبر کا آئیں نہ ہو
آہ! وہ آنکھیں جو حسرت لے گئیں دیدار کی
یہ بھی اک طرزِ عنایت تھی مرے سرکار کی
ایسی موتیں ہوتی ہیں سرمایۂ نقشِ دوام
تا ابد باقی رہے گا ہوش مرحومہ کا نام
جب مرتب ہوگی مستقبل میں تاریخِ وطن
حرفِ خونیں سے رقم ہوگا یہ قصہ لاکلام

(مولانا ابوالکلام آزاد کے پاسپورٹ کا خفیہ فائل "شانتی رنجن بھٹاچاریہ صفحہ نمبر ۴۷، ۴۸")

حضرت محل:

حضرت محل کا نام امراؤ تھا۔ حضرت محل ان کا لقب تھا۔ واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ایک مجلس میں انہیں پہلی بار دیکھا اور اپنے پری خانہ میں لے آئے۔ اس پری خانے میں خوبصورت عورتیں ہی رہتی تھیں جو رقص و سرود کی تعلیم پاتی تھیں۔ لہٰذا امراؤ بھی اس سے مستفیض ہونے لگیں اور انہیں "مہک پری" کا خطاب دیا گیا۔

لیکن جب واجد علی شاہ کو یہ علم ہوا کہ، مہک پری، اُن کے بچے کی ماں بننے والی ہیں تو انہوں نے "مہک پری" کو پردے میں بیٹھا کر افتخار النسا خانم، کا خطاب عطا کیا۔ افتخار النسا خانم، کا خطاب عطا کیا۔ افتخار النسا خانم نے اگست ۱۸۴۶ء میں برجیس قدر کو جنم دیا برجیس قدر کا اصل نام رمضان علی رکھا گیا۔

واجد علی شاہ جب تخت نشیں ہوئے تو بعض دوسری محلات کی طرح انہیں بھی "محل" کے درجے سے نوازا اور "حضرت محل" لقب دیا۔ ۷؍ فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کرکے جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لئے کلکتے بھیج دیا۔ واجد علی شاہ نے روانگی کے وقت اپنے ساتھ کچھ بیگمات کو لے لیا۔ لیکن حضرت محل قیصر باغ میں رہ گئیں اور جو وظیفہ مقرر تھا اسی پر قناعت کرکے اپنی زندگی بسر کرنے لگیں۔

حضرت محل میں بظاہر سوائے حسن کے کوئی خاص صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن وقت اور حالات نے ان کے جوہر باطن کو آشکار کیا۔ ایک صنف نازک، اور پردہ نشین ہونے کے باوجود جنگ آزادی میں اس قدر مستعدی اور گرم جوشی سے حصّہ لیا کہ اودھ کے عوام اور حکومت انگشت بدنداں رہ گئے۔

۱۰؍ مئی ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی کا پہلا شعلہ میرٹھ میں بھڑکا تو لکھنؤ سمیت قرب وجوار میں سارے علاقے اس کی لپیٹ میں آگئے۔ ان تباہ کن حالات میں نظامِ حکومت کو سنبھالنے کا خیال آیا اور برجیس قدر کی تخت نشینی کی تجویز پیش ہوئی تو کافی غور وخوض کے بعد یہ طے ہوا کہ بیگمات محل سے اس کی اجازت لے لی جائے لیکن اس سلسلے میں کسی نے صاف گوئی سے کام نہ لیا۔ صرف حضرت محل نے فوراً اجازت دے دی اور یہ کہا کہ یہ لڑکا تمہارا ہے جیسا تم مناسب جانو کرو۔ لیکن خورد محل نے کہا کہ انگریز اس کے بدلے واجد علی شاہ کو موت کی سزا نہ دے دیں۔

۸؍ جولائی ۱۸۵۷ء کو راجا جے لال سنگھ فوجی افسروں کے ساتھ قصر شاہی میں آئے اور برجیس قدر کو دیکھا۔ شہزادے کی کمپنی نے ان لوگوں کو کش مکش میں ڈالا لیکن بعض شرائط کے ساتھ شہزادے کی تخت نشینی منظور کرلی گئی۔

برجیس قدر کی حکومت ۵؍ جولائی ۱۸۵۸ء تک رہی۔ حضرت محل نظامِ حکومت کے متعلق خود مشورے دیتیں اور سارے احکام انہی کی منظوری سے نافذ ہوتے۔ لیکن جب انگریز لکھنؤ پر قابض ہوئے تو حضرت محل میدانِ جنگ میں جا پہنچیں اور ان لوگوں کا حتی المقدور جم کر مقابلہ کیا۔ انگریزوں نے انہیں لڑائی سے دست بردار ہونے کی تلقین کی۔ اس سلسلے میں ملکہ وکٹوریہ نے نومبر ۱۸۵۸ء میں

ایک فرمان جاری کیا، جس میں مجرمین و معاونینِ قتل کے سوا سب کے لئے عفو کا اعلان کیا گیا تھا، نیز والیانِ ریاست کے حقوق و احترام کی حفاظت کا وعدہ درج تھا۔ اس میں یہ بھی تھا کہ سب کو قانون کی پناہ حاصل ہوگی۔

بعض طبقوں نے اس اعلان کی بڑی تعریف کی۔ لیکن حضرت محل نے اپنے بیٹے برجیس قدر کی طرف سے اس فرمان کی مخالفت کی۔ ایک شجاعانہ اور دلبرانہ جواب شائع کیا:

۱۔ انگریزوں کے وعدۂ عفو پر ہرگز اعتبار نہ کرو۔ ان کا شیوہ یہی ہے کہ کسی کا جرم معاف نہیں کرتے۔

۲۔ ملک کو کمپنی کی نگرانی سے نکال کر ملکہ کی نگرانی میں لے لینے سے اصل صورتِ حال میں کیا تبدیلی ہوئی۔ جب کہ کمپنی کے قوانین، اس کا بندوبست، اس کے ملازم، اور اس کا عدالتی نظام بدستور باقی ہے۔

۳۔ ملکہ کہتی ہے کہ کمپنی کے تمام معاہدوں کو پورا کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ لیا جا چکا ہے وہ انگریزوں ہی کے قبضے میں رہے گا۔ اس سلسلے میں حضرت محل نے اودھ کے نقصانات، ضیاعِ سلطنت، انگریزوں کے تصرفات وغیرہ کی تفصیل بیان کی۔

۴۔ انگریزوں سے عفوِ جرم کی کوئی مثال کسی کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی۔

۵۔ کہا گیا ہے کہ قیامِ امن کے بعد ہندوستانیوں کو رفاہ عامہ کے کاموں میں لگایا جائے گا، سڑکیں بنیں گی، نہریں کھدیں گی، ہندوستانی صرف اسی کام کے لائق رہ گئے ہیں۔

(اٹھارہ سو ستاون، از سریندر ناتھ سین صفحہ نمبر ۵۸۔۳۵۷)

حضرت محل کی دلیرانہ سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن ٹائمز کے نامہ نگار ڈبلیو، ایچ، رسل نے کہا کہ ''حضرت محل کو لکھنؤ کے دفاع میں روحِ رواں کی حیثیت حاصل تھی۔ اس نے پورے اودھ کو اپنے فرزند کی حمایت پر آمادہ کر لیا تھا۔ تمام امراء اور رؤساء اس کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھا چکے تھے۔ ایسی سرگرمیٔ عمل اور جوش و ہمت کی مثالیں ہر جگہ نہیں مل سکتیں۔

''بیگم نے انگریزوں کے خلاف لامتناہی جنگ کا اعلان کر دیا تھا اور انگریزوں نے فرماں روایانِ اودھ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ کیا اس حقیقت میں کوئی شبہ ہے کہ یہ بادشاہ نہایت نازک مواقع پر انگریزوں کو مالی امداد اور قرض دیتے رہے؟ مگر اس احسان کو یک قلم پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ لہٰذا بیگم کا غصہ بے جا نہیں سمجھا جا سکتا''۔

(رسل کی ڈائری، جلد اول صفحہ اول ۲۲۴،۲۷۵)

یہ حقیقت ہے کہ حضرت محل نے وطن کی حریت اور حمیت کے لئے وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جس کی ہر ایک نے ستائش کی اور ان کی خوبیوں کو سراہا۔

سبز پوش عورت: یہ ایک گمنام خاتون تھی، جو تاریخ۔ میں سبز پوش عورت کے نام سے زندہ جاوید ہے، اس مسلمان بوڑھی عورت کا کام یہ تھا کہ جنگ آزادی کے زمانے میں مردانہ پوشاک زیب تن کر کے گھوڑے پر سوار ہو کر سڑکوں پر صدا لگاتی کہ آؤ چلو خدا نے تمہیں بہشت میں بلایا ہے۔ اس مجاہدانہ صدا سے لوگوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہوتا تھا۔ عوام جلوس کی شکل میں شریک ہو جاتے تھے۔ وہ انگریزوں کے خلاف تلوار اور بندوق سے مقابلہ کرتی۔ اس کے ساتھی اس سے غداری کرتے اور میدانِ جنگ میں اسے تنہا چھوڑ کر چلے جاتے تھے، مگر یہ بہادر اور جانباز خاتون تنہا لڑتی، کیوں کہ تلوار اور بندوق چلانے میں ماہر تھی، اس کی بہادری کے لوگوں میں خوب چرچے تھے۔ بعض لوگ اس کے سلسلے میں قصہ کہتے ہیں کہ

''اس عورت میں غضب کی دلیری تھی۔ اس کو موت کا کچھ خوف نہ تھا، وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی، کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا، کبھی گھوڑے پر وہ تلوار اور بندوق چلانے میں ماہر تھی، اس کی جرأت اور ہمت دیکھ کر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا''۔

(بیگمات کے آنسو صفحہ نمبر ۱۲۶)

ایک دن بیچاری جنگ کرتی ہوئی انگریزی مورچے کے قریب جا پہونچی اور زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑی۔ اسے گرفتار کر کے انبالہ بھیج دیا گیا۔ اس کے سلسلے میں لفٹنٹ ہڈسن نے ڈپٹی کمشنر انبالہ کو جو خط لکھا وہ اس مسلمان عورت کی بہادری کا ثبوت ہے۔

''میں تمہارے پاس ایک مسلمان بڑھیا کو روانہ کر رہا ہوں۔ یہ عجیب قسم کی عورت ہے اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی اور خود ہتھیار باندھ کر ان کی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچے پر حملہ کرتی تھی۔ جن سپاہیوں کو اس سے سابقہ پڑا وہ کہتے ہیں کہ اس نے بار بار دلیرانہ اور مردانہ حملے کیے اور مستعدی سے ہتھیار چلائے۔ اس میں پانچ مردوں کے برابر طاقت ہے۔ جس روز گرفتار ہوئی اس دن گھوڑے پر سوار تھی اور شہر کے باغیوں کو فوجی تربیت سے لڑا رہی تھی۔۔۔۔۔۔ یہ بہت ہی اندیشہ ناک عورت ہے''۔

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از ڈاکٹر تارا چند، صفحہ نمبر ۱۸۸ء)

مذکورہ بالا خواتین کے عظیم الشان کارنامے اس الکٹرونک دور کی خواتین میں سخت سے سخت کام پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے آہنی ارادے اور غور و فکر میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

مولانا شوکت علی آئے اور انہوں نے مہاتما جی کی تجویز آزادی کی تائید کی۔ اس کے بعد مولانا کی والدہ بی اماں آئیں اور انہوں نے بھی رزولیشن کی تائید کردی۔ اس حیرت انگیز تقریر نے پانسہ پلٹ دیا اور خود ڈاکٹر بھگوان داس نے مخالفت چھوڑ کر تائید کردی اور دوٹنگ کے وقت کہا کہ جب خود بھارت ماتا بی اماں کے روپ میں آگئی ہیں تو میں تائید کرتا ہوں"۔

(صدق جدید لکھنؤ ۲۶ر جنوری ۱۹۶۸ء)

جنگ آزادی سے وابستہ تمام تحریکوں اور سرگرمیوں سے بی اماں کو اتنی محبت اور الفت تھی جس کی کوئی انتہا نہیں۔ ۱۹۲۴ء میں کامریڈ جب دوبارہ شائع ہوا اس زمانے میں وہ چل نہیں سکتی تھیں۔ پھر بھی ڈولی پر بیٹھ کر پریس گئیں۔ پہلے فرمے کا پروف دیکھا اور خوش ہوکر کارکنوں کو مٹھائی تقسیم کی۔ لیکن جب ہندو مسلم اتحاد کانفرنس ہوئی اور بی اماں اپنی علالت کے باعث اس کانفرنس میں شریک نہ ہوسکیں تو ان کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا۔ وہ اپنی ضعیف العمری اور علالت کے باوجود اخیر دم تک قوم وملت کی خدمات انجام دیتی رہیں اور ۱۳ر نومبر ۱۹۲۴ء کو اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

ان کی وفات پر سارے ملک میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ ایک جلسہ علی گڑھ اچل تالاب پر ہوا جس میں سوامی ستیہ دیوی نے تقریر کی اور اس تقریر میں انہوں نے کہا

"بھائی ماتا جی تو ماتا جی ہی تھیں، جب ہم جوان ہمت ہار جاتے تو وہ آگے بڑھتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم دکن میں دورہ کررہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر لوگ ہمیں لینے آئے۔ ہم نے پوچھا تمہارا گاؤں کتنی دور ہے وہاں کیسے جاتے ہو۔ انہوں نے کہا گاؤں اسٹیشن سے تیس میل دور ہے۔ ہم لوگ پیدل یا گاڑی پر جاتے ہیں۔ ہم نے کہا بھائی ہم نے تو تار دے دیا ہے اور جلسے میں پہنچنا ہے۔ ہم تمہارے ساتھ نہیں جاسکتے۔ وہ نراش ہوکر جانے لگے۔ ماتا جی کو پتہ لگا۔ لوگوں کو بلایا اور کہا، "بیٹا تمہارے ساتھ میں چلوں گی۔ موٹروں میں سبھی جاتے ہیں۔ بیل گاڑی میں میں جاؤں گی۔ بوڑھی ماتا اتر پڑیں۔ ہم جوان بھی اتر پڑے۔ اس طرح ماتا جی ہم کو بتا گئیں کہ کام کیسے ہوتا ہے۔ ماتا جی تو ماتا جی ہی تھیں"۔

("علی برادران کی والدہ محترمہ بی اماں" از سید محمود ٹونکی)

زلیخا بیگم: زلیخا بیگم جو دنیائے علم و ادب میں زلیخائے ہند کے نام سے معروف ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد مولانا خیرالدین کے محبوب ترین مرید آفتاب الدین صاحب کی صاحبزادی تھیں، جنہیں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات بننے کا شرف حاصل تھا۔ ایک دن اسی زلیخا نے مولانا آزاد کی محبت اور آزادئ وطن کے لیے تڑپتے تڑپتے اپنی جان دے دی۔

زلیخا مشرقی ماحول کی پروردہ خاتون تھیں۔ چنانچہ ایک خاتونِ خانہ کے تمام اوصاف سے مزین، شوہر پرست جاں نثار، غمگسار، اور وطن کی پرستار تھیں۔ وہ مولانا آزاد کی تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں سخت سے سخت حالات میں بھی دیوار بن کر حائل نہیں ہوئیں بلکہ اپنی زندگی کے سارے عیش و آرام بالائے طاق رکھ کر اپنے عزم و ارادے میں پختہ قدمی کا ثبوت دیا۔

زلیخا کے مذکورہ بالا اوصاف کے اعتراف میں مولانا خود رقم طراز ہیں:——

"وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا، تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا، اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی، تو وہ اپنا اضطراب، خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ بدل دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوش گوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور علی زندگی میں رفیق و مددگار"۔ (غبار خاطر صفحہ نمبر ۲۳۶، ۲۳۷)

شوہر کی محبت کے ساتھ رفتہ رفتہ وطن کی محبت بھی زلیخا کی شریانوں میں سرایت کرگئی۔ اور ان کے دل میں بھی حصولِ آزادی کے لئے شعلے بھڑک اٹھے۔ ۱۹۲۲ء میں جب مولانا آزاد کے مقدمے کا فیصلہ ہوا، اور انہیں ایک سال کی سزائے قید ہوئی تو زلیخا نے مہاتما گاندھی کو احمد آباد اور بردولی کے پتوں پر تار دیا تھا۔ وہ تاریک ایک خاتونِ خانہ کی ملک و ملت کے لئے بے خوفی، بلند ہمتی، حوصلہ مندی، وسیع القلبی اور فرض شناسی کی اعلیٰ ترین مثال ہے اسے پڑھکر اس بات سے آگاہی ہوتی ہے کہ خرابئ صحت کے باوجود زلیخا انگریزی حکومت کے خلاف اپنے دل میں کیسا جوش اور کتنے شدید جذبات رکھتی تھیں:

"میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کا فیصلہ آج سنادیا گیا، انہیں صرف ایک سال قیدِ سخت کی سزا ی گئی۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سننے کے لیے ہم تیار تھے۔ اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملہ میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی۔ یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے، جس کے وہ

مستحق تھے۔ میں آپ کو اطلاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوئی ہے، اس کے لیے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کردی ہیں۔ اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو انکی موجودگی میں انجام پاتے تھے۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہے لیکن میں خدا سے مدد کی پوری امید رکھتی ہوں۔ البتہ ان کی جگہ صرف بنگال ہی میں خالی نہیں ہے بلکہ تمام ملک میں اور اس کے لیے سعی کرنا میری دسترس سے بالکل باہر ہے''۔

''میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانے میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں، اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس درسی آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ گزشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہو گئی ہے، دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں۔ اس لیے باوجود میری خواہش کے مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح کی محنت اور مشغولیت کے کام میں حصہ لوں۔ لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ میں آج سے بنگال پراونشیل خلافت کمیٹی کے کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی''

''انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ان کے پُر محبت واحترام سلام کے بعد یہ پیغام آپ کو پہونچادوں کہ اس وقت دونوں فریق میں سے کسی فریق کی حالت بھی فیصلہ یا صلح کے لیے تیار نہیں ہے۔ نہ گورنمنٹ، نہ ملک۔ اس لیے ہمارے آگے صرف اپنے تئیں تیار کرنے ہی کا کام در پیش ہے۔ بنگال جس طرح آج سب سے آگے ہے آئندہ منزل میں بھی پیش پیش رہے گا۔ براہ عنایت ''بردولی تعلقہ'' پر بنگال پراونس کے نام کا بھی اضافہ کر دیجئے۔ اور اگر کوئی وقت فیصلہ کا آئے تو ہم لوگوں کی رہائی کو اتنی اہمیت نہ دیجئے جتنی آج کل دی گئی ہے۔ رہائی کو بالکل نظر انداز کر کے مقاصد کے لیے شرائط کا فیصلہ کرائیے''۔

(قولِ فیصل، صفحہ نمبر ۱۰۰)

مولانا کی شب وروز کی شمولیت اور قید وبند کی پیدا کردہ مستقل جدائی سے خاموش جنگ لڑتی اور سلگتی ہوئی زلیخا کو تپ دق جیسے موزی مرض نے آگھیرا۔ مولانا ۱۹۴۱ء میں نینی جیل میں تھے۔ وہاں اُن سے زلیخا خط وکتابت کرتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا ذکر نوکِ قلم پر کبھی نہیں لاتی تھیں۔

مولانا نے زلیخا کے اس طرز عمل کو بڑی شدت سے محسوس کیا، اس کا اظہار وہ یوں فرماتے ہیں: ''میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم وبیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں، لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا، تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب وہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی، تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آرہی تھی''۔

(غبار خاطر صفحہ نمبر ۲۳۵،۲۳۴)

جولائی ۱۹۴۱ء کے آخری دنوں میں ملک کے چاروں طرف ایک طوفان برپا تھا اور یہ خبر گرم تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو گرفتار کر کے ہندوستان کے باہر کسی نامعلوم جگہ بھیج دیا جائے گا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں: ''گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات بھی کر لیے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے تحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے''۔

(غبار خاطر صفحہ نمبر ۲۳۵)

زلیخا بیگم کی نظر ان تمام حالات پر تھی اور انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس طرح کے صدمے سے دوچار ہونے والی ہیں۔ مولانا آزاد ۲؍ اگست ۱۹۴۱ء کو پروگرام کے مطابق آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے لیے جب بمبئی روانہ ہوئے تو زلیخا نے حسب معمول دروازے تک خاموشی سے رخصت کیا اور سوائے خداحافظ کے کچھ نہیں کہا لیکن ان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ان کا خاموش چہرہ مولانا کو سدا کے لئے الوداع الوداع کہہ رہا تھا۔ مولانا اجلاس کے بعد گرفتار کر لئے گئے اور قلعہ احمد نگر میں مقید ہو گئے۔

زلیخا اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے بالکل بستر سے لگ گئیں۔ لیکن آخری سانس تک مولانا کی کامیابی اور ملک کی آزادی کی دعائیں مانگتی ہوئی ۱۹؍ اپریل ۱۹۴۳ء کو اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

''ذکرِ آزاد'' میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی زلیخا کے آخری لمحات کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

''۱۹؍ اپریل ۱۹۴۳ء کی صبح نو دس بجے فون آیا کہ بیگم صاحبہ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ فوراً پہنچ گیا۔ گھر کے اداس نظارے ہی نے سب کچھ

جس کا اک گہرا اثر
دل پہ ہے طاری کب سے
زندگی تیرے لئے
جنگ نہیں تو کیا ہے؟
زندگی—
سچ ہے کہ اک زنداں ہے
اور اسی زنداں میں
قید ہیں کتنے انسان!
زندگی کچھ بھی سہی
روز، نئی صبح کے ساتھ
ایک نیا خواب بھی ہے !

گم شدہ

ہندی رنجیت کیتیش
اردو ڈاکٹر خالدہ حسینی

وہ لاپتہ ہے
۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کی آدھی رات ہی سے
اس کے گم ہونے کی رپورٹ
اس کی شناخت کے ساتھ
تھانے میں درج کرا کے
اس کا باپو
اس کے گم ہونے کے غم میں چل بسا؟
اس کے سر اور سینے پر
زخم کے گہرے نشان ہیں
پچھلے پینتالیس سال سے،
وہ بہروپیا بنا گھومتا رہا
کبھی مندر، کبھی مسجد، کبھی گرودوارے میں
کبھی اسٹیج پر نظر آیا
تو کبھی گلیارے میں
ایک دن جٹاؤں والے پجاری کے بھیس میں بھی
لوگوں نے اسے دیکھا!
اور پولیس کو یہ اطلاع بھی ہے
وہ سڑکوں پر گھومتا پھرتا ہے
بہت دن گزر گئے
لوگوں نے سوچا
اب وہ لوٹ کر کبھی نہیں آئے گا
لیکن ایک دن ایک تاریخی عمارت کے
ملبے کے نیچے
ادھیڑ عمر کے ایک فقیر کی لاش ملی
اس کا چہرہ اتنا بدرنگ اور بدنما ہو گیا تھا
کہ اسے پہچان پانا بھی مشکل تھا
پولیس جائے واردات پر پہنچی
لاش کی جیب سے
اس کا فوٹو ملا
سبھی نے پہچان لیا،
"ارے یہ تو وہی گم شدہ ملک ہے"

مضمون

تحریکِ آزادی —— اور مسلم خواتین

ہمارا ہندوستان، جسے انگریزی حکومت نے سونے کی چڑیا کہہ کر دو سو سال سے زیادہ عرصے تک محکوم رکھا تھا، اس کی آزادی کی جدوجہد میں لاکھوں ہندوستانیوں نے اپنی خوشحال زندگی کی انمول مسرتیں اور بیش بہا جانیں قربان کردیں۔ ان میں ملک وملت کے عظیم رہنما اور جانباز سپاہی بھی تھے، جنہیں تاریخ مجاہدینِ آزادی اور شہیدانِ وطن کے نام سے یاد کرتی ہے۔

ملک کی تحریکِ آزادی میں نہ صرف مردوں بلکہ ان کیساتھ عورتوں نے بھی دوش بدوش حصہ لیا ہے، جن کی یادیں وقتاً فوقتاً تازہ کی جاتی ہیں اور آزادی "جشنِ طلائی" کے موقع پر وہ بھی مردوں کی صف میں شامل ہیں۔ لیکن افسوس! وہ مسلمان عورتیں آج بھی محروم ہیں جن کی شخصیتیں اور ناقابلِ فراموش کارنامے تاریخ کے اوراق میں گم ہیں، حالانکہ اپنے افعال و اعمال اور استقلال واستقامت کے ساتھ انہوں نے اپنے نورِ چشم، اپنے شریکِ حیات اور سرمایۂ حیات کو وطن عزیز کے لئے قربان کر کے اپنی حب الوطنی کا ثبوت فراہم کیا تھا، دراصل یہ خواتین بھی جنگِ آزادی کی "مجاہدات" کہلانے کی مستحق ہیں اور ہر جشنِ آزادی پر ان خاتون مجاہدین کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہئے۔

تمہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو
تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی

اُن "مجاہدات" کی حیات اور خدمات کی کچھ جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں۔

بھارت ماتا، بی اماں: "بی اماں"

اور "بھارت ماتا" علی برادران مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ ماجدہ کا لقب تھا۔ ان کا اسمِ گرامی آبادی بانو بیگم تھا۔ ان کے شریکِ حیات کا نام عبدالعلی خاں تھا۔ وقت اور حالات کی ستم ظریفی اور اللہ کی مرضی کہ بی اماں ۲۷ر سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ بی اماں عالی ہمت، حوصلہ مند، کشادہ دل اور روشن دماغ خاتون تھیں۔ اللہ نے انہیں چھ اولادوں سے نوازا تھا۔ جن میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ سبھوں کی پرورش و پرداخت میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مشکل سے مشکل حالات اور ناسازگار ماحول کا خوش دلی اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ مذہبی اور مغربی تعلیمات سے اپنے بچوں کو سنوارا اور ان کے معصوم دلوں کو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار کردیا۔ بڑے ہوکر محمد علی اور شوکت علی نے آفتاب ومہتاب بن کر دنیا کو منور کیا۔

مولانا محمد علی ایک قومی رہنما، ایک

زبردست صحافی ایک بلند پایہ انگریزی داں اور ایک زبردست نثر نگار تھے۔ محمد علی اور شوکت علی، دونوں بھائی علی برادران کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ زمانہ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کا تھا۔ جن کے روحِ رواں یہی تھے۔ محمد علی نے انگریزی ہفت روزہ "کامریڈ" اور اردو روزنامہ "ہمدرد" شائع کیا تاکہ ان اخبارات کے ذریعہ ملک و ملت کی آزادی کا شعور اور تڑپ پیدا ہو۔ انہوں نے اپنی صحافتی اور سیاسی سرگرمیوں سے انگریزی حکومت کے خلاف عوام میں نفرت اور بغاوت کی آگ بھڑکا کر سارے ملک کو ہلا ڈالا۔ لیکن وہ جو کچھ بھی تھے، اپنی والدہ کی وجہ سے تھے۔ اسی لئے تو انہوں نے خود کہا ہے:

"میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے اس والدۂ مرحومہ کے ذریعہ پہنچایا ہے"۔ (جامعہ مولانا محمد علی نمبر حصہ دوئم: مولانا محمد علی مرحوم از ضیاء الرحمٰن بچھرایونی۔ صفحہ نمبر ۴۸)

بی اماں نے اپنے بچوں کے ساتھ قوم کے بچوں میں بھی بیداری پیدا کی اور ان کے دلوں کو بھی آزادیٔ وطن کی محبت سے آشنا کیا، وطن کی جنگِ آزادی کے زمانے میں بچے بچے کی زبان پر یہی تھا، "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو"۔ یہ پوری نظم "صدائے خاتون" کے عنوان سے مشہور تھی۔ یہ اسی نظم ہے جس میں اماں کے جذبات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہو تمہیں میرے گھر کا اجالا
تھا اسی واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلیٰ
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
میرے بچوں کو مجھ سے چھڑایا
دل حکومت نے میرا دُکھایا
میرے بچوں کو پکڑا سفر میں
کس طرح چین ہو مجھ کو گھر میں
خاک دنیا ہے میری نظر میں
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحان میں اترنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
گر ذراسست دیکھوں گی تم کو
دودھ ہرگز نہ بخشوں گی تم کو
میں دلاور نہ سمجھوں گی تم کو
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
پھانسی دی جائیگی تم کو جانی
مانگنا مت حکومت سے پانی
بات رکھ لیجیو خاندانی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
دین دنیا میں پاؤگے عزت
سب کہیں گے شہیدِ خلافت
اے محمد علی اور شوکت
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بی اماں کے سینے میں ایک ماں کا ممتا بھرا دل بھی تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں علی برادران جب نظر بند ہو گئے تو بی اماں کی صحت بری طرح متاثر ہوئی، اور وہ اس قدر کمزور ہو گئیں کہ دوسرے کے سہارے کے بغیر چل نہیں سکتی تھیں، لیکن جب دوسری بار ۱۹۲۱ء میں محمد علی اور شوکت علی گرفتار کئے گئے اور ان کے خلاف ایسی دفعات لگائی گئیں جن میں پھانسی تک کی سزا تھی تو حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ ان خطرناک واقعات نے ان کے دل و دماغ و جسم کو توانائی بخش دی اور اس بُری خبر سے بجائے خوفزدہ ہونے کے ان کی زندگی اور پُرجوش ہو گئی۔ انہوں نے اپنا نقاب ہٹایا اور پکار اٹھیں: "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو"۔ اور خود بھی جلسے جلوسوں میں سرگرم حصّہ لینے لگیں۔ دھواں دھار تقریریں کرتیں اور دور دراز، علاقوں اور ملکوں کا سفر بھی کرتی تھیں۔ ان ساری مشغولیات کے ساتھ نماز اور تہجد کبھی قضا نہ ہوتا۔

۱۹۲۳ء میں جامعہ ملیہ میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا اور اس جلسے کی صدارت حکیم اجمل خاں صاحب نے فرمائی اور بنگال کے مشہور عالم، سائنس داں سر پی۔ سی رائے نے سندیں تقسیم کیں۔ اس جلسے میں بی اماں نے بھی تقریر کی، وہ چھوٹی سی تھی لیکن بڑی پُرمعنی اور پُر تاثیر تھی۔ انہوں نے کہا۔

"بیٹا میں نے برقع اتار دیا (برقع نہیں صرف نقاب اتارا تھا) اب اس ملک میں کسی کی آبرو باقی نہیں جو میں برقع پہنوں، میں نے اپنے جھنڈے کو لال قلعہ سے اترتے دیکھا، میری آرزو ہے کہ اس بدیسی جھنڈے کو بھی اترتے دیکھوں"۔

(صدق جدید لکھنؤ ۲۶ر جنوری ۱۹۶۸ء)

ہندوستان کے تمام سیاسی لیڈروں کے دلوں میں اماں کی کتنی قدر و منزلت تھی، پنڈت سندر لال کی درج ذیل عبارت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے:

"۱۹۱۹ء تھا کہ مراد آباد میں صوبے کی پولیٹیکل کانفرنس ڈاکٹر بھگوان داس کی صدارت میں منعقد ہوئی، وہاں مہاتما جی موجود تھے۔ میں نے ترکِ موالات والا رزرویشن پیش کیا۔ سارے پرانے لیڈروں نے مخالفت کی۔ تین دن گزر گئے اور رزولیشن پاس نہ ہو سکا۔ آخر میں

مرتب کیا جس پر نولاکھ ٹنکے صرف ہوئے (معاصرِ عالمگیری، حیدر آباد، شمارہ ۲۱۸، صفحہ نمبر ۳۹-۵۲۹)۔ آج بھی فتاویٰ عالمگیری اسلامی قوانین کے لئے ایک کتاب الاستناد کی حیثیت رکھتا ہے اور عدالتوں میں اِسے نظیر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اورنگ زیب کے قاضیوں کے فرمانِ تقرری میں حسب ذیل ہدایات رہتی تھیں:-
''ایماندار، غیر جانبدار اور عادل ہونا ضروری ہے۔ مقدمہ کی کاروائی فریقین کے سامنے کھلی عدالت میں ہونا چاہیئے۔ قاضی اپنے حدود کے اندر کسی سے تحفہ تحائف قبول نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی ہر شخص کی دعوت یا تقریب میں شریک ہو سکتا ہے۔ اس کا نقر اس کی شان ہو گی۔'' خفی خان نے ''منتخب الالباب'' میں خیال ظاہر کیا ہے کہ خاندان تیموریہ کے کسی حکمران نے عدل و انصاف کے ساتھ اتنی لگن نہیں دکھائی جتنی اورنگ زیب نے۔ عدلیہ کا ڈھانچہ جسے بابر اورنگ زیب تک پروان چڑھایا گیا تھا وہ ۱۷۱۸ء تک تو قائم رہا لیکن اس کے بعد کمزور حلمرانوں کے دور میں سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور ۱۷۶۵ء تک اس پر زوال آگیا۔

مغلیہ دور میں عدلیہ سے متعلق چند نلتوں کا ذکر ضروری ہے۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ مقدمہ یا اپیل دائر کرنے کی مدتیں معین تھیں۔ شرح وقایہ کے اصولوں پر عمل کیا جاتا تھا۔ اگر مدعی پندرہ سال کے اندر اپنا دعویٰ پیش نہ کرے تو اس کا دعویٰ عدالت میں قابل قبول نہیں ہوتا تھا لیکن وقف اور وراثت کے معاملات میں تیس سال کی میعاد تھی (ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ڈیورنگ مسلم رول ان انڈیا از وحید حسن، صفحہ نمبر ۱۲۴)۔ کورٹ فیس اور اسٹامپ ڈیوٹی کے متعلق کچھ صاف معلومات نہیں پائی جاتی ہیں لیکن فتاویٰ عالمگیری میں درج ہے کہ قاضی مدعی سے کاغذ اور روشنائی کی قیمت جمع کرنے کو کہتے تھے۔ سلطان نصیر الدین محمد شاہ نے البتہ اپنے عہد میں جائداد کی دس سے پندرہ فیصد رقم بطور کورٹ فیس ادا کرنے کا حکم دیا تھا (دی ایڈمنسٹریشن آف جسٹس اِن میڈیول انڈیا از محمد بشیر احمد صفحہ نمبر ۹۹-۱۹۷) لیکن راقم الحروف کو اس پر شبہہ ہے۔ مغل دور میں تحکیم (آربی ٹریشن) نے بڑا فروغ پایا۔ آربی ٹریٹر فریقین نامزد کرتے تھے اور ان کے فیصلہ پر قاضی کو نظر ثانی کرنے کا اختیار تھا (ایضاً صفحہ نمبر ۳۳-۱۳۲)۔

تین قسم کی سزائیں دی جاتی تھیں - حد، تعزیر اور قصاص۔ حد کا تعلق شریعت سے تھا اور حدود چوری، ڈکیتی، زنا، زنا بالجبر، اسلام سے انحراف اور شراب نوشی پر لگتے تھے۔ تعزیر کے تحت سزائیں جالی سکے بنانے، جوا کھیلنے، معمولی چوری وغیرہ میں دی جاتی تھیں۔ قصاص (خون کے عوض معاوضہ۔ یعنی عوضانہ) مقتول کے ورثہ کو قاتل ادا کرتا تھا۔ غداری خدا اور مذہب کے خلاف ایک جرم تھا اور اس کی سزا موت تھی (ایضاً ۲۷-۲۲۳)۔ سزائے موت سرِ عام دی جاتی تھی۔ ابن بطوطہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک شخص جس نے غداری کا جرم کیا تھا اس کے گوشت کو چاول میں بھون کر ہاتھیوں کے سامنے پھینکا گیا۔

سلطانوں کے زمانہ میں عمارتِ عدلیہ کا نام دار القضا یا دار العدل تھا لیکن مغلوں نے اِسے عدالت خانہ یا کچہری میں تبدیل کر دیا۔ قاضی کے بیٹھنے کی جگہ اونچی ہوتی تھی اور اُسے مسندِ قاضی کہا جاتا تھا۔ اس کے دونوں طرف مفتی علماء اور دوسرے افسران بیٹھتے تھے۔ قاضی کے سامنے کی میز رنگین کپڑے سے ڈھکی رہتی تھی اور قاضی کے سامنے کلرک آف دی کورٹ اور گورنمنٹ پلیڈر بیٹھتے تھے۔ فریقین بھی قاضی کے سامنے ایک ہی صف میں بیٹھتے تھے گرچہ ان کے مراتب میں فرق ہو (ایضاً صفحہ نمبر ۶۸-۶۷، ۱۱۷-۱۱۶)۔ مدعی اپنی عرضداشت قاضی کے سامنے پیش کرتا۔ مدعی زبانی بھی اپنا دعویٰ پیش کر سکتا تھا اور کاتب اُسے قلمبند کرتا۔ اس کے بعد پروانہ عدالت مدعی علیہ پر جاری کیا جاتا۔ اگر مدعی علیہ دعویٰ سے انکار کرتا تو قاضی ISSUES (یعنی کن نکتوں پر فیصلہ ہو) قلمبند کرواتا اور پھر گواہوں کی باری آتی۔ اگر مدعی علیہ حاضر نہیں ہوتا قاضی ایک طرفہ فیصلہ سنا دیتا لیکن اس سے قبل قاضی ایک لائق قانون داں کو یک طرفہ مقدمہ کی کارروائی سننے کے لئے غیر حاضر مدعی علیہ کی طرف سے مقرر کرتا (فقہ فیروز شاہی اور فتاویٰ عالمگیری)۔

عدالتوں کے فیصلے ایک رجسٹر میں لکھے جاتے جسے کتاب الحکم کہا جاتا تھا لیکن آج یہ دستیاب نہیں ہیں۔ اورنگ زیب نے مظہر نامہ رائج کیا جس میں مختلف مقدموں میں اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے درج کئے جاتے تھے اور اُسے قاضیوں اور مفتیوں کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ (اِسے آج کل کے لا رپورٹس سمجھئے)۔ فتاویٰ عالمگیری میں درج ہے کہ فریقین قانون داں کو اپنے مقدمے پیش کرنے کے لئے مقرر کر سکتے تھے۔

مندرجہ بالا حقائق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلم حکمراں اپنے کمال عروج کے زمانے میں بھی عدل کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ البتہ عدلیہ میں خوبیاں اور خامیاں دونوں تھیں کیونکہ ہر حکمران کے دور میں کچھ تبدیلیاں ہوا کرتی تھیں لیکن ایک بات اظہر من الشمس ہے کہ سلاطین دہلی اور شہنشاہان مغلیہ نے کبھی بھی عدل و انصاف میں کوتاہی نہیں کی اور اگر ضرورت پڑتی تو وہ پوری طرح اس میں دخل دیتے تاکہ حق بہ حقدار رسید کا زرین اصول قائم اور مستحکم رہے۔

خالدہ حسینی

نام : خالدہ

قلمی نام : خالدہ حسینی

والد : مفسرِ قرآن مولانا حکیم محمد زماں حسینیؒ

پیدائش : کلکتہ۔ یکم جنوری ۱۹۶۲ء

تعلیم : ایم۔ اے (علی گڑھ) پی ایچ ڈی (لکھنؤ)

ادبی زندگی کا آغاز : ۱۹۸۳ء

تلمذ : پروفیسر قیصر شمیم

پہلا مضمون : شیخ سعدی کی انفرادیت (۱۰ر اپریل ۱۹۸۳ء کو ہفتہ وار ''اجالا'' کلکتہ میں شائع ہوا۔

پہلی نظم : نیا سال (۲۷ر دسمبر ۱۹۸۷ء ہفتہ وار ''اجالا'' کلکتہ میں شائع ہوئی)

پہلی کتاب : کھٹی میٹھی کہانیاں (ہندی کہانی کے تراجم پر مشتمل ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی)

میری تحقیقی کتاب : ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی خدماتِ فارسی (جنوری ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی)۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اس پر مجھے پانچ ہزار روپے کے اوّل انعام سے نوازا۔

شوہر کا اسم گرامی : ڈاکٹر افتخار احمد

پتہ : چاندنی فارمیسی
چاندنی چوک اسٹریٹ، کلکتہ -۷۲

فون : (033) 237-2290 P.P.

گم صُم لمحے

ماں، اے ماں!
تیری گود میں برسوں پہلے
جب اک چاند کا ٹکڑا آیا
تو نے جھک کر اُس کو دیکھا
اُس کی پیشانی کو چوما
من ہی من میں تو مسکائی
اپنے نورِ چشم کی خاطر
آنکھوں میں کچھ خواب سجائے
مستقبل کے محل بنائے
دھوپ جلانے جب جب آئی
تو، نے اپنے پیار کا آنچل
لختِ جگر کے سر پہ رکھا
سرد ہوا جب کاٹنے دوڑی
تو نے لپک کر اُس سے بچایا
وقت پڑا تو تُو خود روئی
اور ہمیشہ لعل کو اپنے
تُو نے ہنسایا
لیکن اے ماں
آج تُو کتنی افسردہ ہے
تیری پلکیں بھیگی ہوئی ہیں
کیسا دکھ تیری ان بوڑھی آنکھوں میں ؟
تیری آنکھیں آج خلا میں کھو جاتی ہیں
اور تو، گم صم ہو جاتی ہے،
آخر کیوں؟
ماں، اے ماں
کچھ تو بتا!

وہ شخص

پھولوں کی مہک
کانٹوں کی چبھن
دونوں کی ادا اک مدت سے
دیتی ہے جسے پہچان اپنی
وہ شخص لئے آنکھوں میں چمک
سینے میں چبھن
ہونٹوں پہ ہنسی
دیتا ہے دعا
اس کو تو چمن پیارا ہے بہت
دے دے کے لہو رہتا ہے مگن
ماتھے پہ نہیں کوئی بھی شکن
ہے کیسی لگن!

زندگی

زندگی
سیج نہیں پھولوں کی،
کبھی کانٹوں، کبھی انگاروں کا بستر بھی تو ہے
آتی جاتی ہوئی سانسوں میں کبھی
سکھ کی مہک ہوتی ہے
اور کبھی
دکھ کا دھواں ہوتا ہے
کبھی چہرے پہ چمک اٹھتا ہے
مسکان کا رنگ
کبھی آنکھوں سے چھلک پڑتا ہے
بے رنگ لہو
کبھی ہوتی ہے شب و روز چبھن
کبھی ہوتی ہے گھٹن!
زندگی ایک شکنجہ ہے
کہ جس میں پھنس کر
آدمی چاہے نکلنا، تو نکلنا مشکل!
زندگی ایک معمہ ہے
جسے حل کرنا ——
کیا تیرے بس میں ہے اے عمرِ رواں!
کچھ تیرے بس میں نہیں!!
زندگی ایک معمہ نہیں، اک دھوکہ ہے،
جو شب و روز ہے جاری کب سے،

تصور کرتے تھے اور ان کی سلطنت میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ غریبوں پر ظلم کرے یا امیر اور با اثر لوگ قانون کا ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ ہر فرد کو قانون شکنی کی سزا ملتی تھی چہ جائے کہ اس کا رتبہ کتنا ہی بڑا یا چھوٹا ہو۔ شیر شاہ کی حکومت میں پانچ ہزار قاضی اور نوے قاضی القضاۃ تھے اور محکمہ عدلیہ کے اخراجات سالانہ چھ کروڑ ٹنکہ تھے (اسٹڈیز اِن میڈیویل انڈین ہسٹری از پی۔ سارن۔ صفحہ نمبر ۹۹)۔

ہندوستان کی تاریخ میں مغلوں کا دور ایک شاندار عہد سمجھا جاتا ہے۔ یہ عہد اپنی شان و شوکت، جاہ و جلال اور اقتدار میں انتہائی عروج پر تھا۔ بابر سے اورنگ زیب کے عہد تک ہندوستان ایک متحد اور مستحکم ملک بن کر ابھرا اور ایک با اثر اور پُر وقار شعبۂ عدلیہ تھا۔ شہنشاہانِ مغلیہ اپنے کو عدل کا سر چشمہ تصور کرتے تھے اور ان کی خواہش رہتی تھی کہ مشرقی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے خود مقدمات کا فیصلہ کھلی عدالت میں کریں۔ اس اصول پر مغل بادشاہوں نے بڑی کامیابی سے عمل کیا اور اس سے متعلق بے شمار دستاویزیں دستیاب ہیں۔ جنہیں مغلوں کے شاہی مورخوں اور یورپین سیاحوں نے قلم بند کیا ہے (مغل ایڈمنسٹریشن از سر جادو ناتھ سرکار، صفحہ نمبر ۱۰۶)۔

شہنشاہ وقت سلطنت کا سربراہ اعلیٰ ہوتا تھا اور اپنے کو "ظل اللہ فی الارض" تصور کرتا تھا۔ اس کی کابینہ میں کئی وزراء ہوتے تھے جن کا سربراہ وزیر ہوتا اور اس کا درجہ وزیر اعظم کا تھا۔ وزیر کے ماتحت تمام محکموں کی نگرانی ہوتی تھی سوائے محکمۂ عدالت کے۔ دوسرے وزیروں کا ذکر مع قلمدان کے درج ذیل ہے -

دیوان اعلیٰ (مالیات، مالگزاری اور کاشت کاری)، میر بخشی (فوجی نظام اور افسر خزانہ)، قاضی القضاۃ (نظام عدلیہ، جیل، کسٹم، بیت المال اور مساجد)، داروغہ توپ خانہ (اسلحہ سازی)، داروغہ ڈاک (پوسٹ ماسٹر جنرل)، میر سامان یا خان سامان (انتظام خانہ شاہی)، صدر الصدور (مذہبی امور) اور محتسب ممالک محروسہ (اخلاقیات)۔

شہنشاہ سلطنت کا منصف اعلیٰ ہوتا تھا اور وہ دیوانی اور فوجداری مقدمات کا پورا مجاز تھا اور بطور سربراہ سلطنت شہنشاہ ہی کے سامنے آخری اپیل پیش کی جاتی تھی۔ "کورٹ آف اپیل" کی حیثیت سے قاضی القضاۃ کے ساتھی قاضی حضرات شہنشاہ کے ساتھ فیصلہ سنانے میں تعاون کرتے تھے۔ مشہور مورخین الیٹ اور سَر جادو ناتھ سرکار نے اعتراف کیا ہے کہ عظیم مغل بادشاہوں کے دربار میں انصاف بے مثل تھا اور ہر فریادی بلا جھجک اپنی التجا بادشاہ کے حضور میں پیش کر سکتا تھا (ہسٹری آف انڈیا، جلد ہشتم، صفحہ نمبر ۱۵۸ اور ایکڈولس آف اورنگ زیب از جادو ناتھ سرکار صفحہ نمبر ۱۷۸)۔

قاضی القضاۃ کے اختیارات درج ذیل تھے :- دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرنا، صوبائی عدالتوں کی نگہبانی کرنا، جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی امامت کرنا، شاہی تقریبات میں شرکت کرنا، شہنشاہ کو حلف دلانا اور اجراء احکام شرعیہ۔ قاضی القضاۃ کی مدد کے لئے دو قاضی مقرر کئے جاتے تھے جن کا درجہ آج کے سپریم کورٹ کے ججوں کے مساوی سمجھئے۔ شہنشاہ نئے قوانین بناتے اور نئے ٹیکس لگاتے وقت قاضی القضاۃ سے مشورہ کرتے۔ شہنشاہ قاضی القضاۃ کی تقرری جید عالموں اور نیک سیرت انسانوں میں سے کرتے تھے۔ قانون دانی میں اعلیٰ صلاحیت کا حامل ہونا ضروری ہوتا تھا اور اگر ضرورت پڑتی تو قانون دانوں کے بورڈ کے سامنے اُسے پیش ہونا پڑتا (فتاویٰ عالم گیری، جلد سوئم، صفحہ نمبر ۳۸۷ اور مغل ایڈمنسٹریشن، صفحہ نمبر ۲۹)۔ دیوان قضا صرف مالگذاری اور دیگر مالی مقدمات کے لئے مخصوص تھا۔

ہر شہر اور بڑے موضعوں میں ایک قاضی مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کے اختیارات مندرجہ ذیل تھے :- مقدمات کا فیصلہ کرنا، فساد اور ظلم کو روکنا، نکاح پڑھانا، یتیم لڑکیوں کی شادی کروانا، وراثت کو ورثا میں تقسیم کرنا، عیدین اور جمعہ کی جماعتوں کی امامت کرنا، زکوٰۃ اور کسٹم کی ادائیگی پر نگاہ رکھنا اور اوقاف کی جائدادوں کی بطور ٹرسٹی نگہبانی کرنا۔ سلاطین دہلی کے طرز پر ہر فوجی چھاؤنی میں ایک قاضی لشکر یا قاضیٔ اردو مقرر کیا جاتا تھا اور اس کے اختیارات فوجی چھاؤنی کے حدود تک محدود رہتے تھے۔ قاضی کا تقرر عالم اور ممتاز شخصیتوں میں سے کیا جاتا تھا۔ اس کا مسلمان ہونا، اور آزاد ہونا لازمی تھا۔ قاضی کی عدالت کو دار القضا کہا جاتا تھا۔

عدالتوں میں چار قسم کے افسران ہوا کرتے تھے :- داروغۂ عدالت، مفتی، محتسب اور میر عدل۔ داروغۂ عدالت جسے داروغہ کچہری بھی کہا جاتا تھا اس کا کام عرضیاں جمع کرنا اور انھیں قاضی کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا۔ مفتی قاضیوں کو قانونی نکتوں اور ضابطوں پر صلاح و مشورہ دیتے تھے۔ مفتی قانون داں ہوا کرتے تھے اور شاہی سند کے ذریعہ ان کا تقرر ہوتا تھا۔ قاضی القضاۃ کی عدالت میں جو مفتی مقرر ہوتا تھا اسے مفتیٔ اعظم یا صدر جہاں کہا کرتے تھے۔ مفتیٔ اعظم کے فرائض میں وقف جائداد اور لاخراج زمینوں کا انتظام اور وظائف و امداد کا دینا بھی شامل تھا (آئینۂ اکبری، جلد اول، ترجمہ بلوک مان و گیرٹ، صفحہ نمبر ۱۸۵)۔ محتسب فوجداری مقدمات دائر کیا کرتے تھے جس میں شراب اور نشہ آور ادویات کا فروخت کرنا، جوار و کنار، سڑکوں اور بازاروں کی نگہبانی کرنا، ملاوٹ شدہ

اشیاء کی فروخت کو روکنا، مکانوں کی تعمیر کی اجازت دیناوغیرہ شامل تھا۔

مورخ مورلینڈ کاخیال ہے کہ میر عدل کے اختیارات کو کسی مورخ نے صحیح طور پر قلمبند نہیں کیا ہے۔ ولسن نے میر عدل کے متعلق لکھا ہے کہ وہ عدلیہ کاایک افسر تھااور عدالتوں پر نظر رکھتااور قاضیوں کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے کا مجاز تھااور سزامیں ردّوبدل بھی کر سکتا تھالیکن ایڈورڈ اور گیرٹ ''مغل رُول اِن انڈیا'' میں رقمطراز ہیں کہ وہ صرف اعلیٰ افسر تھاجو قاضیوں کے احکام کی تعمیل کرواتا تھا(صفحہ نمبر۱۹۱)۔ مگر بنی پرشاد نے لکھا ہے کہ قاضی مقدمات کی شنوائی کرتے تھے اور میر عدل سزا سناتا تھا(ہسٹری آف جہانگیر، صفحہ نمبر ۱۱۰)۔ جادو ناتھ سرکار نے میر عدل کے دائرہ کار کواور بھی تذبذب میں ڈال دیا ہے۔ ان کے خیال میں میر عدل فوجداری مقدمات کا قاضی تھا (انیک ڈوٹس آف اورنگ زیب، صفحہ نمبر ۱۷۵)۔ ایک جدید محقق کے مطابق میر عدل کا درجہ کلرک آف دی کراؤن کا تھااور وہ عدالت کے فیصلوں پر عمل کرواتا تھا۔

میر عدل میں اور بھی عملے ہوتے تھے مثلاً پیش کار، کاتب، صاحبِ مجلس، امین، ناظر، میر دھا، مچلکانویس، تحویلدار، واقع نویس، دفتری اور اردلی۔ اورنگ زیب نے وکیل شرعیہ کا عہدہ رائج کیاجو حکومت کے مقدمات کی پیروی کرتا۔ وہ حکومت کے حق میں جو فیصلے ہوتے اُنہیں جاری کرواتا اور قاضیوں کے تحت جو جائدادیں بطور ٹرسٹ ہوتیں ان کے متعلق قانونی مشیر کا کام انجام دیتا۔ وکیل شرعیہ کی تنخواہ یومیہ ایک ٹنکہ تھی (منتخب الباب از خفی خاں، جلد دوئم، صفحہ نمبر ۵۲-۲۴۹)۔ ہندوؤں کے پرسنل لأ کے مقدمات کی تشریح عالم برہمن کیا کرتے تھے جنہیں شاستری کہا جاتا تھااور ان کا درجہ مفتی کا ہوتا تھا۔ صدر، فوجدار، کوتوال اور عمل گذار گرچہ محکمہ عدلیہ کے جز نہیں تھے پھر بھی انہیں چند عدالتی فرائض انجام دیناپڑتے تھے۔

سلطنت مغلیہ صوبوں، سرکاروں اور پرگنوں میں منقسم تھی اور انتظامیہ شیر شاہ کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلایا جاتا تھا۔ صوبہ دار کا درجہ گورنر کا ہوتا تھااور امن وامان بر قرار رکھنا اس کی خاص ذمہ داری تھی۔ بنگال اور گجرات کے صوبہ داروں کو ناظم کہا جاتا تھا۔ صوبہ دار کے محکمہ عدلیہ کا سربراہ صوبائی قاضی القضاۃ ہوتا تھا۔ مرأۃ احمدی میں درج ہے کہ گورنروں کی عدلیہ پر مکمل دسترس تھی۔ سرکاروں اور پرگنوں کے عدلیہ کا ڈھانچہ بھی صوبوں کی طرز پر تھا۔ سرکار کے قاضی کو شریعت پناہ کہا جاتا تھا۔ موضعوں میں پنچایت سسٹم کا رواج تھااور پنچائت کے سربراہ کے مختلف نام تھے مثلاً چودھری، مقدم، پٹیل، چیٹی، مُرل، منڈل، وغیرہ۔ سربراہ پنچائت کوتوال یا تھانہ دار کے صلاح و مشورہ سے کام کرتا (ہسٹری آف ہندوستان از ڈو، جلد سوئم، صفحہ نمبرLVIII)۔

عام طور پر مغل شہنشاہ قانون کے بہت پابند تھے۔ انصاف کرنا ان کے لئے مقدس تھااور وہ ذاتی طور پر عدلیہ پر نظر رکھتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ قیدیوں کے مقدمات کا جلد از جلد فیصلہ ہو جائے(مغل گورنمنٹ اینڈ ایڈ منسٹریشن از شری رام شرما، صفحہ نمبر۲۲۱)۔ اکبر کے متعلق مشہور مورخ ونسینٹ اسمتھ نے آئینۂ اکبری سے اکبر کے الفاظ اس طرح نقل کئے ہیں:- ''اگر میں نے کسی کے خلاف قصور کیا ہے تو میں خود اپنے کو سزادونگا''۔ اس کے بعد ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہ صرف شہنشاہ کا قول ہی نہیں تھا بلکہ انھوں نے اپنے زمانے کے مطابق انصاف کر کے دکھا دیا(اکبر۔ دی گریٹ مغل، صفحہ نمبر ۳۴۴)۔ اکبر کی شاہی عدالت اس کے ''دولت خانہ'' میں لگتی تھی جہاں وہ مقدمات کا فیصلہ کرتے اور اپیل کی شنوائی بھی ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ نے رحلہ میں التتمش کے انصاف کے گھنٹے کا ذکر کیا ہے۔ جہانگیر نے بھی التمش کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے آگرہ کے محل میں قلعہ کے باہر سونے کا گھنٹہ لٹکایا تھا جسے بجا کر عام رعایا شہنشاہ سے انصاف طلب کرتی تھی۔ عدلِ جہانگیری مشہور ہے۔ یورپین سیاح تھیو نوٹ نے صاف لکھا ہے کہ کسی عدالت سے بھی سزائے موت کا حکم ہونے پر جہانگیر کی تصدیق کے بغیر اس پر عمل نہیں ہو سکتا تھا(سفر نامہ، جلد سوئم، باب دہم، صفحہ نمبر۱۹)۔

شاہ جہاں میں انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اپنے تیس سالہ دور حکومت میں شاہ جہاں نے ہر روز ساڑھے چار گھنٹہ انصاف کے لئے وقف کر دیا تھااور مقدمات کا فیصلہ خود صادر کیا کرتے تھے (دی اسٹیٹ اینڈ رلیجن اِن مغل انڈیا از مکھن لال رائے چودھری، صفحہ نمبر ۲۵۲)۔ سیاح ٹیورنیر کا کہنا ہے کہ شاہجہاں کے دور میں بادشاہ اور رعایا کا رشتہ باپ اور اولاد کا تھا۔ رائے بھارامل نے ''تاریخ ہند'' میں اس بادشاہ کی انصاف پسندی کی بہت تعریف کی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے بھی عدلیہ کی عظمت کو برقرار رکھا۔ وہ بذات خود عوام کی شکایت پر غور کرتے اور انصاف کرتے وقت مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تمیز نہیں کرتے تھے (ایضا صفحہ نمبر ۲۵۴)۔ اورنگ زیب نے فرمان جاری کیا تھا کہ اگر کسی فرد کا حکومت پر کوئی دعویٰ ہے تو وہ حکومت کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ ۱۶۶۳ء میں اورنگ زیب نے سات جید قانون دانوں کا ایک بورڈ زیر صدارت شیخ نظام لاہوری تشکیل دیا تھا تاکہ اسلامی قوانین کا ایک معتبر مسودہ تیار کیا جاسکے۔ بورڈ نے سات سال کی محنت کے بعد مشہور ''فتاویٰ عالمگیری''

اختیارات دیوانِ قضا کے ذریعہ استعمال کرتا تھا، دوسرا دیوانِ مظالم اور تیسرا کورٹ مارشل کے ذریعہ۔

دیوانِ قضا کے تحت دیوانی مقدمات کا فیصلہ ہوا کرتا تھا جس کا سربراہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا۔ دیوان مظالم کی سربراہی خود سلطان کیا کرتا اور قاضی القضاۃ اس کی مدد کرتا۔ سلطان کی غیر حاضری میں امیر داد دیوان مظالم کی صدارت کرتا۔ حاجب کی سربراہی کی پوزیشن کلرک آف دی کراؤن کی ہوتی تھی۔ سلطان محمد بن تغلق دیوان قضا اور دیوان مظالم کی صدارت ہفتہ میں دوبار سوموار اور جمعرات کو کیا کرتے تھے۔ لودھی سلطانوں کے دور میں صدارت کی ذمہ داری وزیر کو دے دی گئی تھی جس کی مدد ایک قاضی اور بارہ قانون داں کیا کرتے تھے۔ عہدِ خلجی میں وزیر کا عہدہ آج کل کے کابینہ کے وزیر کا نہیں بلکہ وزیرِ اعظم کا ہوا کرتا تھا۔ کبھی سلطان صوبہ داروں کو بھی دیوانِ مظالم کی صدارت کی اجازت دیتے تھے اور ان کی مدد قاضی اور صاحبِ دیوان کیا کرتے تھے۔ دیوان میں دو قسم کے افسران ہوتے تھے — مہتمی اور مفتی۔ اول مقدمہ کے واقعات اور حالات پر غور کرتا اور دوسرے قانونی حکم سناتے۔ اس کے علاوہ امیر اور متصرف بھی دیوان کے عملہ میں شامل تھے۔

قاضی القضاۃ جس کا عہدہ ملک کے چیف جسٹس کا ہوتا تھا وہ نظام عدلیہ کا سربراہ ہوتا تھا۔ اور اس کی پوزیشن عدلیہ میں سلطان کے بعد آتی تھی۔ منہاج سراج نے ''طبقات ناصری'' میں قاضی القضاۃ کی ذمہ داری کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے — آئینی اور نیم آئینی۔ مثلاً مقدمات کا فیصلہ کرنا، اعزازات سے نوازنا، اماموں کا تقرر کرنا، اخلاقیات پر نظر رکھنا، قانونی افسران کی نگاہبان کرنا اور تعلیمی اداروں کے نظام کو دیکھنا۔ سلطانی کی جب تخت نشینی ہوتی تھی تو قاضی القضاۃ سلطان سے حلف لیتا تھا۔ قاضی القضاۃ کی عدالت میں ایک یا دو قاضی اس کی مدد کے لئے مقرر کئے جاتے تھے۔ قاضی القضاۃ حکومت کے قوانین مرتب کرنے میں مشورہ دیتا۔ سلطان اسے سفارتی مشن میں بھی بھیجتے تھے۔ سلطان اپنی سلطنت کے سب سے اہم اور صاحب علم شخص کو قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کرتا تھا (تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی صفحہ ۵۸)۔ قاضی القضاۃ کی تنخواہ پانچ ہزار تنکہ ماہانہ ہوتی تھی جو آج کے کم و بیش پچاس لاکھ روپیہ کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ قاضی القضاۃ کے بہت سارے مراعات تھے۔

امیر داد حکومت کا ایک اعلیٰ افسر ہوتا تھا اور اکثر اس کا تقرر جید عالموں اور اعلیٰ عہدہ داروں میں سے ہوتا تھا۔ امیر داد سلطان کی غیر حاضری میں صوبہ داروں اور سیول اور ملیٹری افسران کے خلاف شکایتیں سنتا اور فیصلہ صادر کرتا۔ سلطان کی غیر حاضری میں انتظامیہ اور عدلیہ کے انتظامات اس کے سپرد ہوتے تھے۔ یہ قاضیوں کا حکم تعمیل کرواتا اور اگر اس کے خیال میں کوئی غلط فیصلہ قاضی نے صادر کیا ہے تو وہ اس کی نشان دہی کرتا اور وہ قاضی کے فیصلہ کو روکنے کا بھی مجاز تھا۔ پولیس کا پورا محکمہ امیر داد کے ماتحت تھا۔ امیر داد کی ماہانہ تنخواہ چار ہزار تنکہ تھی۔

ہر شہر میں ایک قاضی مقرر کیا جاتا تھا۔ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے علاوہ قاضی اور بھی کئی کام انجام دیتے تھے مثلاً وصیت نامہ پر عمل کروانا، اوقاف کی نگہبانی کرنا، یتیموں اور دماغی توازن کھوئے ہوئے لوگوں کی جائداد کا انتظام کرنا، شہروں اور شاہ راہوں پر ناجائز قبضہ کو روکنا، سڑکوں کو ٹھیک حالت میں رکھنا، غریب عورتوں کی امداد کرنا، جن جائداد پر مقدمات چل رہے ہیں ان کی نگرانی کرنا اور جمعہ اور عیدین کی جماعتوں کی امامت کرنا۔ قاضی صوبہ داروں کے ماتحت نہیں ہوتے تھے اور آزادانہ اپنے اختیارات کا استعمال کرتے تھے۔ ان کی تنخواہ ایک ہزار تنکہ ماہانہ ہوتی تھی۔ ہر فوجی چھاؤنی میں ایک قاضی ہوتا تھا جسے قاضیٔ لشکر یا قاضیٔ اردو کہتے تھے۔ یہاں اردو کے معنی لشکر یا فوج کے ہیں۔ اس قاضی کے اختیارات فوجی چھاؤنی تک محدود رہتے تھے۔

قاضی القضاۃ، امیر داد اور قاضی کی کثیر تنخواہ کی وجہ یہ تھی کہ وہ مالی طور پر مطمئن رہیں اور رشوت سے پاک۔ علاء الدین خلجی کے زمانہ میں ایک ایک گائے کی قیمت ۳۔ سے ۴۔ تنکہ اور بھینس کی ۴۔ سے ۵۔ تنکہ تھی۔

حکومت عدالت میں مفتیوں کو مقرر کرتی تھی۔ یہ قانون کے ماہر ہوتے تھے اور ان کا کام قاضیوں کو انصاف کرنے میں قانونی صلاح و مشورہ دینا ہوتا تھا۔ جب کوئی مسئلہ درپیش آتا تو قاضی مفتیوں کو اس پر بحث کرنے کو کہتا اور ان کے دلائل پر غور کرتا۔ سلطان التمش نے محتسب کا عہدہ رائج کیا۔ محتسب کی عدلیہ میں ایک اہم پوزیشن تھی اور وہ احکام شریعت کی خلاف ورزی پر مقدمہ چلاتا۔ اخلاقیات اور کمزوروں کے حقوق پر نظر رکھنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ کوتوال چھوٹے جرائم کے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ کوتوال کے فرائض میں شہر کے امن و امان پر نظر رکھنا، لاوارث لوگوں کی جائداد کے قانون کے تحت نظم و نسق قائم کرنا، قبرستانوں، شمشان گھاٹوں اور ذبیحہ خانوں کے انتظام پر نگرانی رکھنا شامل تھا۔ کوتوال کا تقرر میر آتش کی سفارش پر ہوتا تھا۔

شیر شاہ نے دیوانی انتظامیہ کے لئے منصف منصفاں کا عہدہ رائج کیا۔ ان کے فرائض میں پرگنہ کے افسران پر نگرانی رکھنا، فریقوں

کے درمیان جائدادوں کے حدود کے تنازعہ کا فیصلہ کرنا اور قصبوں میں خود اختیاری برقرار رکھنا شامل تھا۔ شیر شاہ نے دو اور عہدوں کا اضافہ کیا:- شقدار اور شقدار شقدراراں جو فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔

سلطنت کو کئی صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر صوبے میں کئی سرکاریں ہوتی تھیں اور ہر سرکار پرگنوں میں منقسم تھی۔ اگر پرگنہ ممکن نہ ہو تو چند مواضع کا ایک گروپ بنادیا جاتا تھا۔ ہر گاؤں میں پنچائت سسٹم تھا اور سلطانوں نے پنچایت کو ہمیشہ فروغ دینے کی کوشش کی۔ ہر صوبہ کا سربراہ ناظم صوبہ ہوتا تھا اور امن وامان قائم رکھنا اس کا اولین فرض تھا جس کی پوری ذمہ داری اس پر عائد ہوتی تھی۔ وہ صوبائی عدلیہ کا بھی سربراہ ہوتا تھا۔ ہر صوبہ میں محکمۂ قضا ہوتا جس کا افسر اعلیٰ صوبہ کا قاضی القضاۃ ہوتا تھا۔ ناظم صوبہ کو جنگی قیدیوں اور ملک دشمن عناصر کو سزائے موت دینے کا حق نہیں تھا۔

عدالت کی کاروائی مندرجہ ذیل اصولوں پر ہوتی تھی:- قرآن و سنت، صحابہ کرام کی صحیح روایات، اجماع الامت، استحسان کو مدنظر رکھتے ہوئے قاضیوں کے فیصلے، استصلاح اور استصحاب۔ مگر بقول ویسی فلنجرلڈ قرآن اور سنت انصاف کے اصل الاصول تھے۔ دیوانی مقدمات میں ہندوؤں کو اپنے پرسنل لاً پر عمل کرنے کا پورا اختیار تھا۔ ہندوؤں کے قوانین کی تشریح عالم برہمن کیا کرتے تھے جنہیں پنڈت کہا جاتا تھا۔ پنڈت کا درجہ مفتی کے برابر ہوتا تھا۔ پنڈتوں کے سسٹم کو التتمش نے خلافتِ عباسیہ کے طرز پر رائج کیا تھا۔ دوسرے غیر مسلم مذاہب کے لوگ اپنے قوانین کے تحت انصاف پاتے تھے اور حکومت کی طرف سے ان کی مذہبی روایات پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی تھی۔ قوانین موجودہ دور کی طرح ایکٹ یا ردلس یا آڈر کے ذریعہ نافذ نہیں کئے جاتے تھے بلکہ سلطان کے فرمان کے ذریعہ نافذ ہوتے تھے جسے صدارتی آرڈیننس سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ فرمان کئی طرح کے ہوتے تھے:- احکام شرعیہ، دیوانی قانون، قانون شاہی، قانون عرف، عدالتوں کی نظیریں اور اخلاقیات و طریقہ کار سے متعلق قانون۔

سلاطین دہلی نے ہمیشہ انصاف کو مقدس تصور کیا۔ قطب الدین ایبک نے انصاف میں بڑا نام کمایا اور اس کی حکومت بہترین قوانین پر چلتی تھی (ہسٹری آف انڈیا از ایلفنسٹون، صفحہ نمبر ۳۶۳ اور رائز آف مسلم پاور اِن انڈیا از بریکس، جلد اول صفحہ نمبر ۱۹۹)۔ التتمش نے اپنے محل کے باہر ایک گھنٹہ لگا رکھا تھا جس کی رسی کو حاجت مند پکڑ کر بجاتے تھے اور سلطان اس کی آواز پر بہ نفس نفیس انصاف کرنے کے لئے حاضر ہوجاتے اور عدالت کی کاروائی فوراً شروع ہوجاتی تھی۔ جہانگیر کا انصاف کا گھنٹہ التتمش کی نقل تھی۔ ساتھ ہی ساتھ التتمش بھیس بدل کر یہ جاننے کیلئے گھوما کرتے کہ رعایا کے ساتھ ٹھیک انصاف ہوتا ہے یا نہیں (رحلہ از ابن بطوطہ، ترجمہ گلی صفحہ نمبر ۱۱۲)۔ اس کی حکومت میں کافی قانون داں موجود تھے۔ بلبن نے ایک صوبہ دار کو قتل کے جرم میں سزائے موت سنائی تھی۔

بقول ابن بطوطہ سلطان محمد بن تغلق نے اور سلطانوں کے مقابلے میں قانون اور انصاف کی بڑی قدر کی تھی۔ مورخ ضیاء الدین برنی رقمطراز ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے محمد بن تغلق کے خلاف ایک مقدمہ قاضی کی عدالت میں دائر کیا۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا۔ سلطان محمد بن تغلق قاضی کی عدالت میں حاضر ہوئے اور ادب کے ساتھ قاضی کو سلام کیا۔ سلطان کے ساتھ اس کے محافظ نہیں تھے۔ قاضی کا فیصلہ سلطان کے خلاف ہوا اور سلطانِ وقت کو جرمانہ اور ہرجانہ ادا کرنا پڑا۔ (تصور کیجئے آج کے ہندوستان میں اس قاضی کا کیا حشر ہوتا) تاریخ شاہد ہے کہ محمد بن تغلق کے خلاف کئی مقدمات دائر ہوئے تھے اور اسے اکثر مقدمات میں جرمانہ یا ہرجانہ ادا کرنا پڑا۔ (تحفۃ النظار غرائب الامصار و عجائب الاستار، قاہرہ ایڈیشن، صفحہ نمبر ۲۸۵)۔ ایک دفعہ ملا شیخ شہاب الدین نے قاضی القضاۃ کمال الدین صدر جہاں کے سامنے محمد بن تغلق کو ظالم کہا تو سلطان نے فوراً اپنی تلوار نکال لی اور قاضی سے کہا کہ مجھے ظالم ثابت کیا جائے۔ جیسا کہ شہاب الدین نے الزام لگایا ہے اور اگر الزام ثابت ہوجائے تو اس تلوار سے میری گردن اڑا دی جائے (رحلہ ترجمہ از مہدی حسین صفحہ نمبر XXI)۔ ایک دفعہ ایک مقدمہ میں مدعی علیہ کی حیثیت سے محمد بن تغلق قاضی کی عدالت میں حاضر ہوئے تو قاضی صاحب سلطان کو دیکھتے ہی ادب سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلطان عدالت سے واپس اپنے محل چلے آئے اور قاضی کو یہ کہتے ہوئے برخواست کرنے کا حکم صادر کیا کہ جو قاضی عدل کی کرسی پر بیٹھ کر میرے لئے کھڑا ہوجاتا ہے وہ مقدمہ کا فیصلہ غیر جانبدارانہ طور پر نہیں کرسکتا ہے۔ سلطان نے نئے قاضی کا تقرر کیا اور مقدمہ کی کاروائی عمل میں آئی (ایضاً)۔ اسی سلطان نے جب ابن بطوطہ کو قاضیٔ القضاۃ کی عدالت میں قاضی مقرر کیا تو تاکید کی کہ یہ نہ سمجھو کہ قاضی دہلی کا عہدہ تمہارے لئے کم تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے تمہیں پورے انہاک کی ضرورت پڑے گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے ایک عزیز دوست کو جرم قتل ثابت ہونے پر سر قلم کرنے کی سزا صادر کی تھی۔

شیر شاہ عدل کو مذہب اسلام کا ایک ج

اگر بچانا ہو شیشے کو یورشِ غم سے
تو آپ دشتِ تمنا میں حاشیہ رکھئے

یہ رسمِ خندہ لبی بوجھ بن گئی یارو!
چھپا کے کتنا بھلا دل کا آبلہ رکھئے

زمیں بوسی پہ مائل ہیں کھوکھلی شاخیں
غرور وقت کا ٹوٹے گا حوصلہ رکھئے

پرایا غم بھی احاطے میں اپنے جو رکھ لے
حبیب ایسا نگاہوں کا زاویہ رکھئے

ٹوٹے ہیں خواب، شہرِ تمنا اداس ہے
اب فرصتِ نشاطِ نظر کس کے پاس ہے

رہے حبیب دور امیرانِ شہر سے
ان کی طبیعتوں میں خدائی کی باس ہے

تمام عمر عداوت کا دکھ اٹھانا کیا
جہاں خلوص نہ ہو اس جگہ پہ جانا کیا

متفرق غزلیہ اشعار

مسرت نگہِ طائرانِ دام کی دھوپ
ہمارے لب کی ہنسی کیا کہ جیسے شام کی دھوپ

وہی سکوتِ مسلسل وہی حیات کا سوگ
مٹا سکی نہ اندھیروں کو اہتمام کی دھوپ

کبھی کبھی مجھے تنہائیوں کے آنگن میں
اداس کر گئی پہروں تمہارے نام کی دھوپ

خودی فروخت نہ کریوں نہ عرضِ حال بڑھا
ہر ایک در پہ نہ تو کاسۂ سوال بڑھا

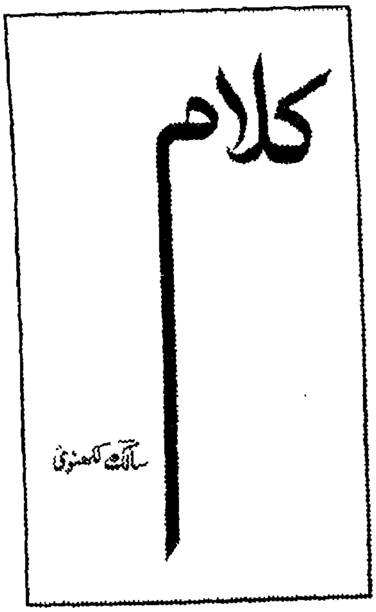
کسی بھی جرم کی اس جا سزا نہیں ملتی
لبوں سے قرضِ مسرت کا یرغمال بڑھا

خرقہ پوشانِ جنوں ہم ہیں ہمیں مت چھیڑو
ضد کروگے تو شہنشاہ بھی ہو جائیں گے

یہ سزا گاہِ تمنا ہے یہاں توکچھ لوگ
زندہ رہنے کی تمنا کی سزا دیتے ہیں

توڑ کر روز امیری کے مزاجوں کا غرور
مفلسی ہم تجھے طاقوں پہ سجا دیتے ہیں

"کلام"



حضرت سالک لکھنوی

کا مجموعۂ کلام

عہدِ وسطیٰ میں ہندوستان کا نظامِ عدلیہ



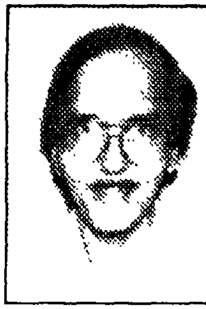
جسٹس خواجہ محمد یوسف
4.C,North Range
Calcutta - 700014
Phone : (033) 284-5437

جسٹس خواجہ محمد یوسف، عمر ۶۸ سال، آزادی کے بعد ۱۹۷۷ء میں مغربی بنگال حکومت کی جانب سے کلکتہ ہائی کورٹ میں مقرر کئے گئے پہلے سینئر مسلم ایڈوکیٹ ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ہائی کورٹ کی بنچ میں شمولیت سے ان کے مرتبہ میں اضافہ ہوا۔ تقسیم کے بعد "انڈین بار" میں سے مقرر کئے گئے اولین مسلمان جج ہیں۔ مغربی بنگال میں کسی تحقیقاتی کمیشن کی قیادت (چیئر مین شپ) کرنے والے اولین مسلم جج بھی آپ ہیں۔ از آں بعد حکومت تریپورہ کے تحت انہیں دو تحقیقاتی کمیشنوں کی چیئر مین شپ تفویض کی گئی۔ اس وقت آپ مغربی بنگال اقلیاتی کمیشن، حکومت مغربی بنگال کے چیئر مین ہیں۔ جسٹس یوسف کئی تعلیمی، ادبی اور سماجی وثقافتی تنظیموں بشمول غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ایران سوسائٹی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ویلفیئر اینڈ بزنس مینجمنٹ، ویسٹ بنگال فیڈریشن آف یونائیٹڈ نیشنز ایسو سی ایشن، رابندر بھارتی سوسائٹی، انجمن مفید الاسلام، ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ سے مختلف حیثیتوں میں وابستہ ہیں۔

عہدِ وسطیٰ میں ہندوستان کے جتنے حکمراں گزرے ہیں ان میں زیادہ تر انصاف پسند اور رائج الوقت قانون کی پوری تعمیل کرتے تھے۔ اسلام میں حکمراں عوام کا مالک نہیں بلکہ اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور حکومت چلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمراں اپنے کو "نیاز مند درگاہِ الٰہی" تصور کرتے تھے۔ اسلام نے انصاف کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس وصف کو قرآن حکیم میں "عدل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے انسان کے لئے انصاف اور اصولِ معدلت اس کا نصب العین ہونا چاہئے۔

حقیقتاً ہندوستان میں مسلم دور حکومت کا آغاز ۱۲۰۶ء سے غلام خاندان کے حکمرانوں سے ہوتا ہے۔ اس خاندان کے سلاطین نے ہندوستان کو اپنی مادرِ وطن تسلیم کیا اور وہ اسی مٹی کے ہوکر رہ گئے۔ تیرہویں صدی کے اوائل سے مسلمان اس عظیم برصغیر کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے۔ اس میں شک نہیں کہ حالات زمانہ کے اعتبار سے لاتعداد لوگ اس سر زمین پر آئے اور یہاں سے واپس گئے لیکن آنے والوں کی تعداد جانے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔

دہلی کے سلاطین نے ہمیشہ عدل کو ترجیح دی۔ محکمۂ عدلیہ کو جامع اور پُر وقار طریقہ پر منظم کیا اور محکمۂ عدلیہ کی کارگذاری کے لئے مختلف افسران مقرر کئے گئے۔ عدالت کی کارروائی کھلے عام ہوا کرتی تھی جو آج تک جاری ہے۔ سلطنت کا سب سے بڑا عہدہ دار خود سلطانِ وقت ہوتا تھا اور نظام عدلیہ کا وہ مختار کُل تھا۔ سلطان کے تین مختلف فرائض منصبی تھے — (۱) دین کی محافظت اور رعایا کے درمیان عدل و انصاف کرنا (۲) امراء اور اعلیٰ عہدہ داروں کی سربراہی کرنا اور (۳) فوج کے کُل اختیارات کو بطور سپہ سالار اعظم سنبھالنا۔ سلطان اپنے اول



پَون مُسکرا

نام: پَون مُسکرا
ولدیت: (آنجہانی) شری لال مُسکرا
تاریخ ولادت: ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۰ء
تعلیم: بی۔کام (Honours)
Diploma (Direction)
National School
of Dramas
پیشہ: تجارت
پتہ: ۱۷ر شیکسپیئر سرانی، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۱
فون: گھر (033) 282-9382
آفس (033) 238-3895

خود سے کیا اُس کو ملائیں خود میں کھو جائے گا وہ
ہوش میں آئے گا پھر مایوس ہو جائے گا وہ

نرم خوابوں کا بچھونا ہے مگر ملتا نہیں
تلخ یادوں کی ہی چادر تان سو جائے گا وہ

اُلٹو جانا ہے بھنور میں منہ چھپانا ہے وہیں
جاتے جاتے پر مری کشتی ڈبو جائے گا وہ

کام ہیں اُس کو بہت سے یہ نہیں ہے اُس کا کام
کاٹنی تم کو ہے غم کی فصل بو جائے گا وہ

قرض ہے سو بانٹ لینا وہ ذرا جلدی میں ہے
لو یہ اُس کا بوجھ لو، سامان لو جائے گا وہ

وقت کا مارا ہوا ہے، وہ تھکا ہارا بھی ہے
موت اُس کا دم نہ لے ایسے ہی سو جائے گا وہ

غــزلیــات

جہاں دیکھو وہیں قربانیاں ہیں
نگاہوں کو بڑی حیرانیاں ہیں

پیالے سے لبوں تک دوریاں ہیں
مچلتے حادثے کچھ درمیاں ہیں

کہیں دامن تمہارا جل نہ جائے
سنا ہے اس کے پیچھے بجلیاں ہیں

سیاہی سے ہوا ہے نام روشن
ترے اخبار کی ہم سرخیاں ہیں

لڑکپن عمر کا جاتا نہیں ہے
وہی ہم ہیں وہی نادانیاں ہیں

لگا رکھے ہیں جو تالوں پہ تالے
کہاں رکھوگے اتنی چابیاں ہیں

زد میں آوارہ تصور کے وہ صورت آگئی
دل کے آگے پھر کوئی پتھر کی مورت آگئی

پھر پھنسانا ہے نظر کو پھر ضرورت آگئی
پھر چھڑانا ہے گریباں، پھر مصیبت آگئی

آپ کو بے وقت کی تکلیف دینے پھر یہاں
میں نہ آتا، پر کچھ ایسی ہی ضرورت آگئی

کل نہ آئے تھے قیامت کی گھڑی تھی کل کی رات
آج آئے ہیں قیامت پر قیامت آگئی

زندگی، مشکل ہے کتنی اب کہاں اسکی تمیز
پھر میرے ہاتھوں میں پل دو پل کی جنت آگئی

پھر اسی کوچے میں آیا دل نے چھوڑا تھا جسے
کیا پتا کس بات پر اس کی طبیعت آگئی

آسمانوں میں اچھالے گا وہ اب
مجھ کو دنیا سے اٹھالے گا وہ اب

کھال کے بال تو سب نوچ لئے
بال کی کھال نکالے گا وہ اب

مفت میں اُس نے مجھے بیچ دیا
میرے حصے کی بھی کھالے گا وہ اب

میری مٹی کو بہت پیٹ چکا
مجھ کو تندور میں ڈالے گا وہ اب

مل گئی ہے اُسے اچھی قیمت
موت میری نہیں ٹالے گا وہ اب

سانس لینے پھر نہ آؤں گا یہاں
میں کسی کا ہو نہ پاؤں گا یہاں

شور و غل کی بھیڑ میں کھو جائے گا
میں کوئی نغمہ نہ گاؤں گا یہاں

کیا پتا ملنے سے پہلے خاک میں
اور کتنوں کو ملاؤں گا یہاں

آگیا ہوں آسماں کے پار اب
ہر مصیبت کو بلاؤں گا یہاں

ہوچکا ہے یہ جہاں میرا پَون
کیا ملے گا کیا چراؤں گا یہاں



حبیب ہاشمی

قلمی نام : حبیب ہاشمی
تعلیم : ایم۔اے۔اردو
پیدائش : ۱۹۴۲ء
جائے پیدائش : ہوڑہ۔مغربی بنگال

پتہ : 464, G. T. Road (South)
Shibpur, Howrah - 2
فون : (033) 660-8576

والد مزدور تھے۔ بچپن میں انتقال کر گئے۔زندگی عُسرت میں گزری۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے پرورش کی۔ بعض شعراء مصنوعی بھوک کے قصے لکھتے ہیں۔ میں نے بھوک اور فاقہ کشی کے کرب کو جھیلا ہے۔ میری شاعری کی مرکزیت ماں اور صرف ماں ہونی چاہئے۔ مگر میں ماں جیسی پاکیزہ شئے کو اپنی شاعری کا عنوان بنا کر اسے سر راہ نہیں لانا چاہتا۔ ماں کیا ہے، بہن کی محبتیں کیا ہیں اس کا عملی تجربہ اور مشاہدہ میرے پاس ہے۔ میری شاعری میں کرب و غم ہیں وہ میرے لاشعور کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری اور مقالہ نویسی کی اچھی مہارت ہے۔ افسوس ہے کہ فی الوقت کوئی سند نہیں پیش کر سکتا۔ دراصل ماضی کی مفلسی نے مجھے کاہل، غیر ذمہ دار اور بیکار سا بنا دیا ہے۔ غزل اور انکے مختلف اشعار پیش کرتا ہوں۔ ہندوستان کے تقریباً تمام موقر اور ممتاز رسائل میں آج سے ۲۵ برس پہلے میری تخلیقات چھپ چکی ہیں۔ مشاعرہ میری مالی ضرورت ہے۔ مشاعرے میں مقبول ہونے کے لئے میں نے صحافتی اور سستی شاعری نہیں کی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ دانشوران ہند و پاک کی نگاہوں میں ایک حیثیت ملی ہے۔ میں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ آزاد نظمیں۔ نثری نظمیں۔ وہ ابھی تک کہیں چھپوائی نہیں ہیں۔ میں نے غزل کو ہی معتبر صنفِ سخن سمجھا ہے۔

غزل

اب کہاں کوئی مجھے خواب سہانے دے گا
تیرا قصہ بھی وہی خواب پرانے دے گا
سامنے حال کا غم، پشت پہ ماضی کی تھکن
اب یہ رستہ مجھے منزل پہ نہ جانے دے گا
در و دیوار پہ تنہائی کے کانٹے رکھ دو
جو بھی آئے گا وہ زخموں کے خزانے دے گا
تم عبث اپنی بصیرت کو جلا دیتے ہو
سلسلہ کرب کا آنسو نہ بہانے دے گا
دل کو اک ضبطِ تسلّی ہے کہ وہ شہرِ غزل
آسرا مجھ کو بھی نفرت کے بہانے دے گا
اسی امید میں لمحوں کے قفس میں ہوں حبیبؔ
وقت مجھ کو بھی مسرّت کے زمانے دے گا

اپنی پلکوں کو مری یاد سے نم کر لینا
بھولنے والے کبھی خود پہ ستم کر لینا
تم کو آسائشِ ماحول سے فرصت جو ملے
میری بربادیٔ حالات کا غم کر لینا
حال جب بھی تمہیں دکھ دے تو غلافِ دل پر
اپنے ماضی کی حکایات رقم کر لینا
جب گزرنا کبھی تم شہر کے بازاروں سے
آرزؤں کی ہری شاخ قلم کر لینا

خوشی کی چھاؤں میں اس طرح رابطہ رکھئے
غموں کی دھوپ کو اپنے لئے ردا رکھئے
تعلقات میں تھوڑا سا فاصلہ رکھئے
قریب ہو کے نہ بنیاد حادثہ رکھئے
پرانے زخموں کی تفصیل جاننے کے لئے
نظر کے سامنے لمحوں کا آئینہ رکھئے
پلٹ کے آئیں گی ماضی کی گم شدہ یادیں
فصیلِ شب کا دریچہ ذرا کھلا رکھئے
یہ شہر، شہرِ ہوس ہے کسی بھی گوشے سے
یہاں خلوص کا ہرگز نہ آسرا رکھئے



بازغ بہاری

نام : محمود عالم ادبی نام : بازغ بہاری

پیدائش غالباً ۱۹۴۲ء
موضع اجے پور، ضلع نالندہ، صوبہ بہار

تعلیم شاعری کے لئے جتنی نہایت ہی ضروری ہے

والدین کے نام : مرحوم دیانت علی انصاری ۔ مرحومہ مجیدہ بی بی

اہلیہ کا نام : ناظمہ بیگم۔

اولادیں لڑکے دو۔ سنجر ہلال بھارتی۔ عمر غزالی اور
لڑکیاں تین عشرت پروین۔ زینت پروین۔
راحت پروین۔

ورودِ کلکتہ ۱۹۶۰ء

مشغلہ بزنس چھوٹا سا۔

میدانِ ادب میں داخلہ ۱۹۷۱ء۔ ابتداء افسانوں سے کی جو پٹنہ اور کلکتہ کے اخباروں میں شائع ہوئے۔

آغاز شاعری ۱۹۷۴ء۔ غزلیات جو کلکتہ کے اخبارات میں شائع ہوئیں۔

ابتدائے منظوم ظرافت ۱۹۷۸ء جو ہنوز قائم ہے اور تادمِ مرگ قائم رہے گی۔ اولین ظریفانہ شعری مجموعہ ''من خوب می شناسم'' اشاعت اگست ۱۹۹۹ء
شاعری کی بیشتر اصناف پر طبع آزمائی کر چکا ہوں۔ مثلاً قطعہ۔ رباعی۔ دوہا۔ ماہیا۔ مسدس۔ مخمس۔ اربع، مثنوی، قصیدہ، پیروڈی، تضمین اور ظریفانہ غزلیات۔ ملک اور بیرونِ ملک میں مشاعرے پڑھ رہا ہوں اور سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

پتہ ۱۴۵ / بی، چترنجن ایونیو، کلکتہ - ۷۰۰۰۰۷

تری شانِ جلّ جلالہٗ

ترے بس میں ہے میری آبرو تری شان جلّ جلالہٗ
مجھے چاہے جیسے نچائے تو تری شان جلّ جلالہٗ

نئی روشنی کا ہے یہ اثر ردا ماں کے سر پہ تو ہے مگر
بنا پردہ بیٹی ہے اور بہو تری شان جلّ جلالہٗ

یوں تو معتبر وہ ادیب ہے فنِ شاعری کا نقیب ہے
مگر اوٹ پٹانگ ہے گفتگو تری شان جلّ جلالہٗ

میں ہوں شاعروں میں جو خوش گلو تو مشاعروں میں ہوں سرخرو
تو نے بخشی عزت و آبرو تری شان جلّ جلالہٗ

یوں تو شیخ اہلِ زبان ہے یوں تو لکھنؤ میں مکان ہے
مگر عضو کو وہ پڑھے عضو تری شان جلّ جلالہٗ

کوئی مضمر اس میں بھی راز ہے کلو تیس روپے جو پیاز ہے
یہ بھی کھیل ہے ترے ہی ٹھرو تری شان جلّ جلالہٗ

وہ جو سر پہ تاجِ خطاب ہے تو وہ بازغؔ عالیجناب ہے
لو! گدھا بھی ہے مدظلہٗ تری شان جلّ جلالہٗ

اردو کی زبوں حالی

اک مردِ جواں ریلوے لائن پہ پڑا تھا
کچھ دور کھڑا غور سے میں دیکھ رہا تھا
سوچا، یہ غم و رنج کا مارا تو نہیں ہے
گردش میں بچارے کا ستارا تو نہیں ہے
میں نے کہا، مرنے کا ارادہ ہے بھتیجے
یوں خودکشی کرنے کا ارادہ ہے بھتیجے
بولا کہ چچا جان، میں آفت میں گھرا ہوں
صحرائے جنوں خیز میں بے صوت و صدا ہوں
عاجز غمِ دنیا سے ہوا اس طرح حضرت
جینے کی تمنا ہے نہ دل میں کوئی حسرت

اپنوں سے نہ غیروں سے رہا اب کوئی رشتہ
ہے ساتھ فقط میرے مقدر کا نوشتہ
آلائشِ دنیا سے میں رنجور ہوا ہوں
تب جا کے پئے خودکشی مجبور ہوا ہوں
سمجھایا اسے میں نے کہ یہ کام غلط ہے
سن لو کہ غلط کام کا انجام غلط ہے
رکھنا یہ سدا یاد بزرگوں کی نصیحت
کہ خودکشی کرنے میں ہے رسوائی و ذلت
تم مر کے اگر جاؤگے اس طرح یہاں سے
پھر کیسے ملاؤگے نظر ربِّ جہاں سے
جانا ہی اگر ہے تمہیں دنیا سے بھیجے
جانے کے لئے اور بہت سے ہیں طریقے
ہو کام کوئی، چاہئے کرنے کا سلیقہ
مرنے کا تو بہتر ہے یہ آسان طریقہ
تم خود ملک الموت کو گھر اپنے بلالو
مرنا ہے تو اردو کا اک اخبار نکالو

جہنم کی خوشبو

رنج و غم اور آفت و افلاس کا مارا ہوا
ایک شاعر آخرش، اللہ کو پیارا ہوا

دیکھ کر کھاتے میں دنیاوی عمل اور فعل کو
اک فرشتے نے کہا شاعر سے، دوزخ میں چلو

جب ہوا داخل جہنم میں تو شاعر نے کہا
مرحبا !کیا مستقر ہے یہ سکون و امن کا

یہ لثاثی بھینی بھینی خوشبوئیں، بادِ صبا
یہ تلطف یہ تلذذ یہ تعیش یہ مزہ

یہ گھٹائیں، یہ فضائیں اور یہ فصلِ بہار
خوب ہے تیری مشیت، واہ رے پروردگار

سن رہا تھا غور سے داروغۂ دوزخ یہ بات
دفعتاً بولا وہ شاعر سے، براہِ التفات

زنگ آلودہ ہیں تیری عقل و دانش کے ظروف
یہ جہنم در جہنم ہے ارے او بیوقوف

آتشِ دوزخ کو بھی کہتا ہے تو فصلِ بہار
اور جہنم میں نظر آتا ہے تجھ کو مرغزار

یہ بتا! آیا ہے تو دنیا کے کس استھان سے
جھٹ سے شاعر نے کہا، ڈائرکٹ ہندستان سے

آدرش

اک دوشیزہ نیم برہنہ چنچل سی
ساکت پانی میں ہو جیسے ہلچل سی
اک دن میں نے اس سے پوچھا، اے جولی
بے بی اسٹوڈنٹ ہو تم تو کالج کی
تم جو اپنے تن کی نمائش کرتی ہو
انگریزی فیشن کی نمائش کرتی ہو
یہ بے شرمی یہ عریانی، شرم کرو
تم ہو لڑکی ہندستانی شرم کرو
دخترِ قوم و حرمتِ ہندستان ہو تم
شیواجی اور ٹیپو کی سنتان ہو تم
پرکھوں کی تہذیب کو رسوا کرتی ہو
بے بی کچھ تو سوچو، یہ کیا کرتی ہو
ہنس کر بولی، آپ بھی کیسے انکل ہیں
چھپن سال کے ہوگئے پھر بھی بوتل ہیں
پُرکھوں کے سانچے ہی میں تو ڈھلتی ہوں
گاندھی جی کے آدرشوں پر چلتی ہوں
ہم سب کو جو راہ دکھایا کرتے تھے
وہ بھی کپڑے کم ہی پہنا کرتے تھے

برقع

مٹی پلید ہو گئی "پردہ" کے نام کی
یہ دخترانِ قوم کا کیا حال ہوگیا
اب تو بجائے چہرے کے ہے ناک پر نقاب
اس دورِ انحطاط میں فیشن کی یہ وبا
پوچھی جو میں نے ایک پڑوسن سے کل یہ بات
پردہ سمٹ کے رہ گیا کیوں ناک پر بوا
بولیں جناب، ناک ہے ناموسِ خاندان
کرتی ہوں میں بس اسلئے ڈیفنس ناک کا

قطعہ

دانشور و ادیب سخنور ہوں یا عوام
بیٹھے ہوئے ہیں فرض سے منہ اپنا موڑ کر
لیکن وہ جس کو کہتے ہیں اسمگلروں کی ٹیم
رکھتے ہے ہندو پاک تعلق کو جوڑ کر

رُباعی

یہ جوش و جنوں عشق کا ماشاء اللہ
دلہن ہے اگر دادی تو پوتا نوشاہ*
تہذیب و تمدن نے نئی کروٹ لی
لاحول ولاقوۃ الا باللہ

* (پڑوسی ملک کی ایک ساٹھ سالہ ضعیفہ نے اپنے سگے پوتے سے عشق کر کے شادی کر لی تھی)

آواز سن کر چونکی تھی۔ گڈی سے حلیہ پوچھا اور پھر جھانک کر دیکھا تو یقین ہو گیا" اس نے پیالی رکھتے ہوئے پوچھا" یہ گڈی کہاں گئیں"

"پڑوسیوں کو آپ کی اطلاع دینے"

"اچھا میں چلتا ہوں۔ تمہاری بھابھی تو سامنے آئیں نہیں۔ انہیں سلام عرض کر دو۔ جیتے رہے تو پھر ملیں گے"

وہ اٹھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اسے دور جانا تھا۔ مگر ٹرین بانکا گھاٹ اسٹیشن سے جونہی گزری اس کا ارادہ متزلزل کیوں ہو گیا؟ شہر کو چھوڑ کر ایک بار نکلا ہے تو پاؤں میں چکر ہی چکر ہے۔ کہیں چین نہیں۔ کس جستجو میں وہ شہر شہر مارا پھرتا ہے۔ سوچا تھا شاید بے قرار طبیعت اپنی تسکین کا کچھ سامان اس گلی کی دھول میں سمیٹ لے۔ اگلا اسٹیشن آیا اور وہ اتر گیا۔ سامان مرزا لے وہاں رکھنے میں کسی مصلحت کو دخل نہیں تھا۔ مرزا نے خود دوسری ملاقات کی صورت یہی نکالی کہ سامان رکھ لیا۔ وہ آٹو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ پوری گلی میں عجیب کیفیت رہی۔ دبے سے خیریت پوچھی تو ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ مسجد کے پاس رشی کے ابا کو سلام کیا بیچارے نے جواب دیا مگر سوچتے رہے ہوں گے کہ کون تھا۔

رشی نے اسے روکنا چاہا مگر وہ "آئندہ" کہہ کر دروازے سے نکل آیا۔

اس نے باہر قدم نکالے تو لگا کوئی نظر اس کے تعاقب میں ہے۔ گلی کے آخری چھور سے تیز تیز قدم بڑھاتی گڈی چلی آرہی تھی۔ اس نے قریب آکر کہا "انکل پوری گلی کو پتہ ہے کہ آپ آگئے ہیں۔ میں نے جسے بھی آپ کا نام بتایا وہ پہچان گیا۔ اور شاید گڈی کا کہنا درست بھی تھا کہ اس گلی میں نئی کھڑکیاں، نئی دروازے نئی چھتیں، نئی بالکنیاں آباد ہو گئی تھیں۔ اس کی نئی مشکل یہ تھی وہ سلسلہ وار ایک ایک گھر کا احاطہ کر کے بڑھنا چاہتا تھا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے مگر شکلیں سامنے آجانے سے ترجیح کا مسئلہ آکھڑا ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے اٹل ارادے کے ساتھ کہ اب پلٹ کر نہیں آنا ہے دلی کے دروازے پر کھڑی ایک بچی کو پکارا۔ نجو ماموں کے بچوں سے خیریت پوچھی۔ نسیم کے دروازے کے پیچھے ایک ہلچل تھی جسے سنجیدہ "آداب عرض ہے" کے ساتھ اس نے شانت کر دیا۔ شکیلہ کے دروازے پر پڑے ہوئے تالے سے ٹکرا کر اس کی نگاہ لوٹ آئی۔ اس نے قدم آگے بڑھائے تو گڈی آگے آگے تھی۔ اجنبی کا ساتھ دینا گڈی کو پتہ نہیں کیوں اچھا لگا تھا۔ اسے بھی گڈی کے ساتھ کوئی کوفت نہیں تھی۔ اس نے گڈی سے پوچھا۔

"تمہیں یہ دیوار کیسی لگتی ہے"

"اچھی" پھر گڈی نے بات آگے بڑھائی "جن صاحب نے میدان خریدا ہے انہیں محلے کے لڑکوں کی دھما چوکڑی سے چڑ تھی۔ اس لئے گھیر دیا۔ ہم خوش ہیں۔ ہمارے پچھواڑے کا پورا حصہ محفوظ ہے۔ پیچھے دالان پر جو کمرہ ہے وہاں ہم سکون سے پڑھتے لکھتے ہیں"

گڈی کو پتہ نہیں ہوگا کہ یہ اجنبی گلی سے کتنا آشنا ہے اور شاید تبدیلیوں سے اس کے دکھی ہونے کا اندازہ گڈی کو قطعی نہیں ہوا۔ کارپوریشن نے راستہ پکا کرنے کیلئے سیمنٹ کی جو بڑی بڑی سلیں بچھادی تھیں ان پر پڑنے والی جوتوں کی آواز اُسے ناگوار گزر رہی تھی۔ وہ تو اس مٹی کو پہچانتا تھا جو اس کے جوتے کے تلے کا نقش اپنے سینے پر اتار لیتی تھی۔ اس نے سوچا کیسی نرم گیلی خوشگوار مٹی ان سلوں میں دفن ہو گئی۔

"گڈی۔ تم اس پکے راستے پر کھیلتی ہو کیا؟" اس نے گڈی سے یونہی پوچھ لیا۔

"پہلے جب میں بہت چھوٹی تھی کھیل لیتی تھی مگر گرنے سے چوٹ بہت لگتی تھی اس لئے بچنے لگی"

اس نے گڈی کو بتایا کہ پہلے اس گلی میں صرف مٹی تھی اور آنے جانے کی وجہ سے گلی کے ٹھیک بیچوں بیچ گھاس نہیں اگتی تھی پھر بھی دور سے پوری گلی دونوں طرف سے گھاس سے ڈھکی پگڈنڈی جیسی معلوم ہوتی تھی۔

"اچھا۔ تب تو گلی خوبصورت لگتی ہوگی۔ پر میں نے تو سلیں ہی دیکھی ہیں"

وہ گڈی سے باتیں کرتے ہوئے چہار دیواری والے میدان اور کھنڈر بن جانے والی حویلی کے درمیان کی مسافت طے کر چکا تھا۔ اب اس کے پاؤں بیچ بیچ زمین میں گڑنے لگے تھے۔ اس گلی میں اس کی منزل یا اس کا مرکز یہی مکان تھا جس کے دونوں دروازوں پر تالے جھول رہے تھے۔ اس مکان کے حوالے سے وہ گلی کو پہچانتا تھا اور اسے۔ اس گلی کا سفر اس مکان سے شروع ہو کر اسی مکان پر ختم ہوتا تھا۔ ایک پل میں پورا مکان اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ یہ دہلیز ہے اندر میز کرسیاں ہوں گی۔ کتابوں کی الماری ہوگی۔ طاق پر گلدان ہوگا کچھ تصویریں ہوں گی۔ دو ایک طغرے جیسا چھوٹا سا دروازہ اُسارے میں کھلتا ہوگا۔ تین طرف صحن۔ بیچ میں آنگن۔ ایک طرف باورچی خانہ آمنے سامنے دو کمرے۔ یہ صدر دروازہ ہے۔ دروازے سے باورچی خانے تک نیم روشن گلیارہ۔ کیسی رونق رہتی تھی گھر میں۔ صبح مسجد میں اذان کے ساتھ ہی ہو جاتی تھی۔ ضروریات سے فراغت کے بعد ہی نماز پھر تلاوت کلام پاک اور اس کے بعد نصابی کتابوں کے سبق پڑھنے کا شور۔ بیبیاں باورچی خانے میں مصروف۔ مردوں کے آفس جانے کی تیاری۔ بچوں کے اسکول کا کام نپٹانے کی جلدی۔ دن کے اس پہر میں کیسی جاندار گہما گہمی رہتی تھی اس گھر میں۔ مگر دروازوں پر تالے جھولتے دیکھ کر اس کا دل ملول ہو اٹھا۔ اس نے چاہا کہ تالا توڑ کر اندر گھس پڑے۔ مگر چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکا کہ اس

نے ان گنت موقعوں پر دل کی آواز ایسی ہی ان سنی کی تھی۔ اس نے سوچا اندر سناٹا اور گہرا ہوگا۔ ادھڑی ہوئی دیواریں، کسی طرف جھکتے ہوئے دروازے، اپنی خستگی کا رونا روتی ہوئی چھت، مکڑی کے جالے، دیکھ کر اسے اور دکھی ہونے کے سوا کیا ہاتھ آئے گا۔

اس نے بھاری قدموں سے وہ فاصلہ بھی طے کر لیا جو اس مکان کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تھا اور پھر جیسے اس پر ساری مشکلیں آسان ہو گئیں۔

اسی مکان کے ٹھیک سامنے کھڑی ماسٹر مہتہ کی بیٹیوں کو دیکھ کر وہ صرف مسکرایا۔ اسے ان کے نام بھی یاد نہیں رہے تھے۔ کس سے کیا بات کرتا۔ پھر رکنا بھی نہیں تھا اسے۔ خالی زمین پر کھڑی ہونے والی بالکل نئی عمارت کے مکینوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔ نولی خاں کے دروازے پر کھڑی خواتین کو اس نے احترام کے ساتھ سلام کیا۔ دعائیں اس کے پیچھے اپنے آنچل پسارے دور تک آئیں۔

اپنے بچپن کے ہم جماعت نسیم کے دروازے پر۔ اس نے نسیم سے مصافحہ کیا۔ نسیم نے اندر آنے کا اصرار کیا مگر اس نے نسیم کا پنجہ زور سے دبا کر چھوڑ دیا ''ملیں گے اگر خدا لایا''۔

نجمی کے یہاں کوئی نہیں تھا۔ امام باڑے کے قریب رکے بغیر اس نے اندر جھانکا اور آگے بڑھ گیا۔ ہر گھر کے دروازے پر ملنے والوں نے اسے روکنے کو کہا اور ہر جگہ اس نے ''پھر کبھی'' کہہ کر معذرت کر لی۔

مگر ابو طیب کے دروازے پر رک جانا پڑا۔ اس سن رسیدہ خاتون نے اسے ننھے بچوں کی طرح گلے لگایا تھا۔ وہ بھی شاید کسی سایۂ شفقت کا متلاشی تھا۔ تھم گیا۔

''گڈی اب تم جاؤ میں کچھ دیر یہاں رکوں گا۔ اس کے بعد عالم صاحب سے ملوں گا۔ اور تم جانتی ہو کہ اس کے آگے سڑک ہے''

''اچھا انکل۔ خدا حافظ''

گڈی نے اس پراسرار، خوش پوش اجنبی کو ایک بار پھر بھرپور نظروں سے دیکھا اور اس کے دعائیہ کلمات سمیٹتی ہوئی واپس چل پڑی۔ آخری گھر سے گڈی کے گھر تک کا فاصلہ آٹھ دس گھروں کا ہی تھا مگر یہ بھی اسے لمبی دوری لگ رہا تھا۔ وہ ان چند لمحوں میں الجھ گئی تھی۔

آخر یہ تھا کون؟

گڈی تھکے تھکے قدموں سے لوٹ کر آئی تو دیکھا کہ رخشی اب بھی دروازے کے قریب ہی موجود ہے۔

''چلے گئے؟''

گڈی کا جواب تھا ''ہاں'' مگر اسی سانس میں وہ ''نہیں ابھی نہیں'' بھی کہہ گئی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''عالم صاحب کے مکان کے پاس سے انہوں نے مجھے واپس کر دیا۔ طیب چچا کی بہن نے انہیں گلے لگایا تھا''

''بیچ میں جو ایک گھر پڑتا ہے۔ کیا گھر جس میں دو دروازے ہیں، وہاں گئے تھے کیا؟''

''رکے تو تھے۔ دروازوں پر تالوں کو دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ لوگ کیسے ہیں۔ خود تو پردیس میں ہیں اور مکان کو تالا لگا رکھا ہے۔ ویسے یہ تھے کون؟''

گڈی نے پل بھر رک کر رخشی کی طرف دیکھا اور کہا ''اس مکان تک جس کا ذکر آپ کر رہی ہیں اطمینان سے گئے تھے مگر اس کے بعد انکی رفتار تیز ہو گئی پھر اس مکان کے جو کچھ لوگ برابر والی زمین پر نیا مکان بنا کر رہ رہے ہیں ان سے نہ ملے۔ نہ دعا سلام کیا۔ بس آگے بڑھ گئے، جانتا تو انہیں اس گلی میں ہر کوئی ہے۔ ہر کسی نے ان کو روکا مگر وہ ''پھر کبھی'' کہہ کر ٹالتے چلے گئے۔ آنٹی آپ بتایئے نا کہ وہ آخر کون تھے؟''

رخشی نے دروازہ بند کیا اور گڈی کو جواب کا منتظر حیران و پریشان چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

WITH BEST COMPLIMENTS FROM :

Datex-Ohmeda

Datex - Ohmeda (India) Pvt. Limited

Block - EP & GP , Plot - XI - 16, Sector - V (Salt Lake), Calcutta - 700 091 (India)

Phone : (91-33) 357-3994-99 • Fax : (91-33) 357-4001

Leaders in Medical Equipment Business

دو نظمیں

شہد میں ڈوب جا

شہد چکھ
شہد کا ذائقہ اپنے ہونٹوں پہ رکھ
شہد آنکھوں میں مل
شہد سے غسل کر
شہد مالش بھی کر
شہد ہی کو بچھا
شہد ہی اوڑھ لے
شہد تحفہ میں لے
شہد ہی دان کر
شہد کی جستجو میں بسر
شہد کی آرزو میں ہی جی
شہد کو اپنے سطر پہ لا
شہد کی آہٹوں کو بھی سن
شہد منظر بنا
شہد کو گنگنا
شہد کا اظہار کر
شہد پر رقص کر
شہد ہو آسمانوں زمینوں میں ہر سمت جلوہ نما
شہد میں ڈوب جا
شہد سے جسم کو، قلب کو، ذہن کو، روح کو
کر کے رکھ تربتر اس قدر
شہد ہی تیری پہچان ہو
شہد کا نام آئے تو لب پر ترا نام ہو!

اظہارِ جذبات کر

بات کر
گر ہو ممکن، ملاقات کر
کارڈ لکھ
تار دے
بھیج کر
فون پر، فیکس راِی میل پر
ویب پر
تُو اُسے کھل کے آگاہ جذبات کر
بات کر
کارڈ لکھ، تار دے، فون کر
جا کے مل
جیسے ممکن ہو، اظہار جذبات کر
رابطہ منقطع ہو نہ الفاظ واحساس کا
بات کر اپنے ہم راز سے
یا تو الفاظ سے یا تو آواز سے
بات کر اپنے ہم راز سے
یا تو الفاظ سے یا تو آواز سے
دھیان رکھ
خامشی موت ہے
زندگی صوت ہے!

اجنبی [illegible]

وقت کا فاصلہ شناسا چہروں کو بھی کیسا اجنبی بنا دیتا ہے اس کا اندازہ زاہد کو تھا مگر شدت سے اس وقت احساس ہوا جب اُس کی دستک پر گول مٹول سی ایک لڑکی دروازہ کھول کر نکلی اور اسے پلکیں جھپکا کر دیکھنے لگی۔

''نوشاد ہیں''؟

''جی نہیں۔ ڈیوٹی پر گئے ہیں''

''اچھا''

''اُن کا تبادلہ ہو گیا ہے''

''نوشاد کون ہیں تمہارے''

''ابّی''

''دادی ہیں''

اور اس سوال کا جواب دینے سے پہلے پلکیں جھپکاتی گول مٹول سی لڑکی دونوں پٹ بند کر کے اندر چلی گئی۔ اسے لگا یہ دروازہ اس پر کھلا ہی نہیں تھا۔

اس نے جیب سے پیکٹ نکالا ایک سگریٹ سلگا کر ہونٹوں سے لگایا اور تیلی دکھائی۔ پھر ایک گہرا کش لے کے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ پھر کھلا۔ پھر وہی گول مٹول سی لڑکی کھڑی تھی۔

''وہ آپ کو معلوم نہیں کہ دادی اب یہاں نہیں رہتی ہیں؟''

''نہیں!''

''آپ کا نام؟''

''یہ بتاؤ گھر میں اور کون کون ہیں؟''

''میں تو ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ امی ہیں اور آنٹی ہیں''

''آنٹی کو بتاؤ زاہد ظفر آیا ہے''

دروازہ پھر بند ہو گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ اس مکان کے برابر ایک بڑا سا میدان تھا مگر اسے ایک اونچی دیوار نے ڈھک لیا ہے۔ دروازہ بھی ہے۔ پتہ نہیں اس دیوار کے پیچھے خالی زمین ہے یا رہائشی مکان یا وہی کھلا ہوا سبز میدان۔ سامنے والی عمارت کے ڈھانچے میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی

ہے مگر یہ کنسٹرکشن بھی نیا نیا نہیں ہے۔ لمبی چوڑی حویلی اپنی پرانی آب و تاب گنوا چکی ہے۔ اس کا جتنا حصہ بھی نظر آ رہا ہے یہ تاثر دینے کے لئے کافی ہے کے حویلی کھنڈر بن چکی ہے۔ حویلی کے پہلو میں بنے مکان کی بھی حالت خستہ ہے مگر اس سے متصل زمین پر خوبصورت عمارت دکھائی دے رہی ہے۔ اس نے سوچا تغیرات کا عجب چکر ہے۔ عروج و زوال، عدم و وجود ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں جیسے چاند کے تعاقب میں سورج، دن کے پیچھے دوڑتی رات۔ زمینیں وہی ہیں مگر ان پر عمارتوں کے ڈھانچے کتنے بدل گئے ہیں۔ اس گول مٹول سی لڑکی کا وجود نہیں تھا اور اب اس کی دادی کہیں اور منتقل ہو گئی ہیں۔ بچی نے بتایا ہے کہ آنٹی گھر پر ہیں۔ پتہ نہیں کون ہے؟ وہ بھی تو بہت سے نام بھول چکا ہے۔ چہرے ان برسوں میں جانے کس حد تک بدل گئے ہوں۔ نام سے بھی پہچان مشکل ہے۔ چہرے سے بھی شاید یہی دشواری، عارضی طور پر ہی سہی، ہو۔ اس دوران میں اس کا سگریٹ انگلیوں میں پھنسا بجھ گیا ہے اور وہ ابھی اندر سے اب تک نہیں لوٹی۔ اس نے پھر گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ گلی سنسان تو پہلے ہی جیسی ہے مگر اب رونق میں بھی کچھ کمی آ گئی ہے۔

وہ گلی میں واقع جس مکان کے دروازے پر کھڑا تھا اس کے ٹھیک سامنے والے مکان پر اس کی نظر گئی۔ کچا مکان اب آدھا کچا تھا آدھا پکا۔ پہلے اس میں ایک ہی دروازہ تھا اب دروازے ہیں۔ یہ گلی ہی کیا اس گلی میں واقع مکان میں رہنے والے ہر شخص سے وہ کبھی واقف تھا۔ گلی، لیمپ، پوسٹ، مکانوں کے نکلے ہوئے چھجے، دروازوں کے دونوں طرف بڑے چبوترے، برآمدے، مسجد، امام باڑہ، میدان، درخت اس گلی کی ہر چیز سے اس کی اپنی زندگی کا کوئی پل کسی نہ کسی طرح وابستہ تھا۔

دروازے پر چرچراہٹ ہوئی۔ اس کی نگاہ بچی کو دیکھنے اٹھی مگر اس بار دوسرا چہرہ سامنے تھا کچھ کمہلایا کچھ کھلا ہوا۔ ملال اور مسرت کی ملی جلی کیفیت اس کے چہرے پر موجود تھی اور آنکھوں میں شناسائی کی بہت تیز چمک۔

"اندر آ جائیے۔ اصل میں گڈی بہت باتونی ہے۔ خواہ مخواہ آپ کو کھڑا رہنا پڑا"

اس نے اوٹ سے بلانے والی آواز کے چہرہ سمیت غائب ہونے کے بعد دروازے کے پٹ اور زیادہ کھلے دیکھے اور قدم بڑھا کر اندر داخل ہو گیا۔

"ایک زمانے کے بعد کیسے بھول پڑے"۔ آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"بس یوں ہی" اس کا جواب مختصر تھا۔

"مجھے پھر افسوس ہے کہ آپ کو دروازے پر کھڑا رہنا پڑا"

"اصل قصور گڈی کا نہیں۔ میرا ہے۔ مجھے پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا کہ میں کون ہوں"

وہ اندر اندر سوچ بھی رہا تھا۔ واقعی قصور میرا ہے۔ میں طور طریقے ہی بھلا بیٹھا ہوں۔ یوں بھی آنا جانا کم ہو گیا ہے۔ پھر شہر میں فون کا چکر ہے۔ پہلے خبر کر دی اور بعد میں پہنچے۔ کون ہو، کہاں کے ہو کا کوئی جھمیلا ہی نہیں۔

"آپ بیٹھئے نا"

"شکریہ۔ مہلت تو کم ہی ہے میرے پاس۔ مگر سوچا ہے کہ دروازے دروازے ہر کسی سے مل لوں گا۔ گڈی اتنا کریں کہ منو کے یہاں میرے یہاں آنے کی خبر کر دیں"۔ "منو بھائی تو اب یہاں نہیں رہتے۔ بھائیوں میں مکان کا بٹوارہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنا حصہ نہیں لیا۔ اب ایک حصے میں ولی رہتے ہیں دوسرے میں نسیم" وہ کوئی متبادل سوچ ہی رہا تھا کہ گڈی اس بار ٹرے لئے آ گئی۔ "انکل آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھئے نا" گڈی نے آنگن میں بچھی ہوئی چوکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس پر اتنی دیر میں اس نے سفید چادر بھی ڈال دی تھی۔ اس نے ایک نظر گڈی کو دیکھا ایک نظر اس کے ہاتھ پر ڈالی۔

اس نے تھوڑے سے کھلے تھوڑے سے کمہلائے ہوئے چہرے کو دیکھا پھر سوچنے لگا اس سے پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اندر گھستے ہی آنگن میں بچھی چوکی پر بیٹھ جاتا اور چلاتا ہے "کوئی چائے وائے پلانے والا"۔ کہیں سے کہیں سے قہقہوں کی کھنک ابھرتی اور ذرا سے وقفے کے بعد چائے کی پیالی لئے کوئی ہاتھ اُس کی طرف بڑھ آتا۔ گھر میں تب کئی لڑکیاں تھیں۔ کچھ جوان ہو چکی تھیں کچھ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھیں اور کچھ اس سے بھی کئی قدم پیچھے تھیں۔ ہنس مکھ، ملنسار، خوش مزاج تعلیم یافتہ یا زیر تعلیم وہ سب کے بارے میں پوچھنے کی جسارت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس گڈی سے جو بد ذات خود ننھی سی بچی نہیں تھی وہ کیسے پوچھتا کہ اس کی دوسری آنٹیاں کہاں ہیں مگر یہ جو چہرہ اس کی شناخت میں آیا تھا برسوں کی دوری پر دھیمے دھیمے روشن ہو رہا تھا۔ چائے کی ٹرے میں ایک کوندا سا لپک گیا۔ فوراً ایک نوجوان لڑکی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی اور اسی کے ساتھ نام بھی۔ مگر وہ جھجکا یہ کہیں رخشی نہیں ہوئی تو؟ اس نے چائے کی پیالی اٹھائی۔ "چمن کو دیکھے تو اب لگتا ہے صدیاں ہو گئیں۔ بنی شاید پچھلی بار نظر آئی تھیں۔ ۲۰ برس پہلے اور رخشی تم تب شاید گڈی جیسی ہوں گی یا کچھ بڑی۔ تمہیں میری شکل یاد رہ گئی، حیرت ہے" "آپ بدلے ہی کتنے ہیں۔ بدن ذرا بھاری ہو گیا ہے۔ چہرے پر ذرا سنجیدگی ہے اور سوٹ تو شاید رعب جمانے کے لئے پہن رکھا ہے۔ باجی اسے صرف توند اور گالوں کی شادابی کا نام دیتیں۔ میں تو



اختر بارکپوری

نام : سید اختر حسین
قلمی نام : اختر بارکپوری
ولدیت : سید عبدالعزیز شاہ
جائے پیدائش : بارکپور
آبائی وطن : بنگلور
ادبی زندگی کا آغاز : ۱۹۸۷ء
مدیر : دوماہی دستخط
ملازمت : گورنمنٹ آف انڈیا
پتہ : آؤٹ پوسٹ۔ نئی بستی، پوسٹ بارکپور، ۲۴/پرگنہ (شمالی) ۷۴۳۱۰۱
فون : (۰۳۳) ۵۶۱-۲۶۴۰

غزلیں

اس کی نیت میں جب کہ صفائی نہیں
رہنما قابل رہنمائی نہیں

ہم تھکے حال چلتے رہے دم بہ دم
راستوں کو مگر موت آئی نہیں

سر ہتھیلی پہ لیکر بھٹکتا رہا
حق نوائی اسے راس آئی نہیں

آپ ہیں چشمِ تر اور میں نے ابھی
داستانِ محبت سنائی نہیں

خود بخود عکس مجھ میں ابھرتا رہا
میں نے تصویر تیری بنائی نہیں

نوکِ مژگاں پہ جگنو چمکنے لگے
کیسے کہدوں تری یاد آئی نہیں

جس سے اختر ملے منزلوں کا پتہ
شمع ایسی کسی نے جلائی نہیں

عمرِ تمام پیار کی دولت نہیں ملی
حسرت ہی رہ گئی تیری قربت نہیں ملی

سب کا خیال ہے مجھے لیکن کروں میں کیا
دم لینے کی تو مجھ کو بھی فرصت نہیں ملی

کٹیا میں ہم غریبوں کی رحمت خدا کی ہے
اونچی حویلیوں کو یہ نعمت نہیں ملی

آئی ہے جب سے پاس وہ جانِ غزل مری
لفظوں کے کاروبار سے مہلت نہیں ملی

شہرت کے آسمان پہ اختر کو کیا ملا
عزت ملی سکون کی دولت نہیں ملی

ماہیے

اب ایسی سزا مت دے
خاک نہ ہو جاؤں
نفرت کو ہوا مت دے

آمادہ تھے لڑنے پر
باغ میں کچھ بچے
اک تتلی پکڑنے پر

اس رت کو بدلنے دو
آئینگے پھر پنچھی
پیڑوں کو تو پھلنے دو

تاریخ بناتا ہے
اپنے قلم سے جو
سوتے کو جگاتا ہے

شب بھر کی تھکن اختر
راز بتادے گی
بستر کی شکن اختر

کہہ مکرنیاں

اسکے دم سے روپ سہائے
دیکھ کے سجنا بھی مسکائے
من کو بھائے اسکی کھن کھن
اے سکھی پیسہ۔؟
نا سکھی۔ کنگن!

سب سے پہلے راگ سنائے
بوسہ لے کر پھر تڑپائے
سونا کردے سب کا دوبھر
اے سکھی۔ عاشق؟
نا سکھی۔ مچھر!

نام : ایس۔ ایم۔ زین العابدین

قلمی نام : اشہر ہاشمی

پیدائش پٹنہ سٹی۔ ۱۳ ر مارچ ۱۹۵۳ء

والد کا نام سید محمد عبدالقیوم (مرحوم)

تعلیم : بی۔ کام۔ (کلکتہ یونیورسٹی)

آغاز شاعری . ۱۹۷۰ء

پیشہ : صحافت

ملازمت : ۱۹۷۳ء میں روزنامہ "عصر جدید" سے آغاز، ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک بطور اسسٹنٹ ٹیچر نظامیہ، یوپی اسکول میں، مئی ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۲ء تک روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ سے وابستگی، مئی ۱۹۹۲ء سے اگست ۱۹۹۶ء تک روزنامہ "قومی آواز" نئی دہلی سے بطور سب ایڈیٹر وابستگی، ستمبر ۱۹۹۶ء سے یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (UNI) کی اردو سروس سے وابستہ۔

کتابیں . بدلتے موسم کی آہٹ (مجموعۂ غزلیات) ۱۹۸۸ء

انعامات : مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا بہترین کتاب کا دوسرا انعام۔

مستقل پتہ : ۳۱ ر روشن گلزار لین ہوڑہ-۷۱۱۱۰۱

موجودہ پتہ : مکان نمبر - ۱۹۳، بلاک - بی، گلی نمبر-۴، منڈاولی، فاضل پور، دہلی-۱۱۰۰۹۲

فون : ۲۰۵۳۳۹۱ (۰۱۱) رہائش

۳۳۵۵۸۴۰ (۰۱۱) دفتر

فیکس : ۳۳۱۳۴۴۳ (۰۱۱)

۳۷۱۶۲۱۱ (۰۱۱)



اشہر ہاشمی

۳ غزلیں

شور کیسا یہ مرے دل کے خرابے سے اٹھا
شہر جیسے کہ کوئی اپنے ہی ملبے سے اٹھا

یا اٹھا دشت میں دیوانے سے بار فرقت
یا ترے شہر میں اک چاہنے والے سے اٹھا

یا مری خاک کو مل جانے دے اس مٹی میں
یا مجھے خون کی للکار پہ کوچے سے اٹھا

تو میرے پاس نہیں ہوتا یہ سچ ہے لیکن
تری آواز پہ ہر صبح میں سوتے سے اٹھا

چاک پہ رکھتا ہے تو لمس بھی دے ہاتھوں کا
میری پہچان تعقل کے اندھیرے سے اٹھا

دل کہ ہے خون کا اک قطرہ، مگر دنیا میں
جب اٹھا حشر اسی ایک علاقے سے اٹھا

یہ اجالوں کی عنایت ہے کہ بندہ اشہر
اپنے سائے پہ گرا، اپنے ہی سائے سے اٹھا

وہ جو میری نظر کا دھوکا ہے
ہر طرف منظروں پہ چھایا ہے

غیر ذاتی ہے دوسری ہر شئے
ذائقہ آدمی کا اپنا ہے

جنگلوں میں گذرتی کالی رات
چپ ہواؤں سے پوچھتی کیا ہے

آنکھ کھاتی ہے جرم کی چغلی
اشک دل خون کرکے آتا ہے

دھول میں اور وہ سراسر پھول
ٹوٹ کر اس کو مجھ پہ گرنا ہے

اُس سے کہنا ہے اب وہی اشہر
جو وہ سننے کی آس رکھتا ہے

عجب خموشی فضائے طلب پہ طاری ہے
نہ میری ہچکی نہ آواز پا تمہاری ہے

بچھڑ کے تم سے بسر کرنی ہے جو عمر مجھے
وہ ایک شب ہے مگر سوگوں پہ بھاری ہے

ہے برق عکس ذرا سا مری طبیعت کا
کہ اس میں میری تڑپ میری بے قراری ہے

ازل سے لازمی ٹھہرا ہے عشق کا مضمون
اسے کبھی نہ یہ سمجھو کہ اختیاری ہے

مرے کناروں سے ٹکرا کے ہو رہی ہے فنا
ہر ایک موج مری، عکسِ بے قراری ہے

تمہارا ساتھ ہے صحرا میں سائباں جیسا
تمہارا ساتھ مگر کتنا اختیاری ہے

کہانی کی طرف آتا ہوں۔ ذہن پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے ''دوشیزہ کو جب بدمست خریداروں کی بات پر یقین آگیا کہ اس کے محبوب نے اسے بیچ ڈالا ہے تو آنسو پونچھ کر بستر کے دستر خوان پر تر نوالہ بن گئی۔ زندگی کا یہ روپ پہلے تو عجوبہ لگا۔۔۔۔۔ پھر اچھا! دو صحت مند اور امیر ترین مرد پوری توجہ، فریفتگی اور والہانہ پن سے دوشیزہ کے عورت پن پر قصیدہ پڑھنے لگے۔ یہ سلسلہ دوشیزہ کی عادت بن گیا۔

''ایک دن دوشیزہ کے دونوں عاشق، تجارتی معاملے میں الجھ پڑے۔ ہاتھاپائی کرتے ہوئے دونوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ دوشیزہ کے ہاتھ آگئی تنہائی اور ڈھیر ساری دولت۔ خلاف توقع دولت اور آزادی کے لمحے دوشیزہ پر نیند طاری کرنے لگے، ہفتہ عشرہ تک نیند کے حصار میں رہنے کے بعد دوشیزہ کا جھکاؤ مذہب کی طرف ہوا۔ اس نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا، باتیں اچھی لگنے لگیں۔ پڑوسیوں کو خبر ہوئی تو ماضی بھول کر اس کا احترام کرنے لگے۔ حویلی کے احاطے میں مختلف موضوعات پر دوشیزہ کی تقریریں ہونے لگیں۔ گزرتے ایام کے ساتھ جوق در جوق لوگ آنے لگے۔ دوشیزہ کو روحانی ماں کہنے لگے۔ دوشیزہ کو روحانی ماں میں اعتبار اور شناخت کی نعمت ملنے لگی۔

''ایک دن تقریر کے بعد سوال و جواب کی نشست میں چند عورتوں نے پوچھا کہ ساری دنیا میں عورتوں کا استحصال کیوں ہوتا ہے؟'' اس نے جواب تو دیا۔۔۔ مگر خواتین کو تشفی نہ ہوئی۔ دوشیزہ نے انہیں مطمئن کرنے کے لئے تھوڑا سا وقت مانگا، اور موضوعاتی مطالعے میں ڈوب گئی، فلسفہ ادب نفسیات اور تاریخ سے گزرتے ہوئے ایک ضخیم کتاب ہاتھ لگی۔ بہت سارے وجوہات کی بنا پر اس کتاب نے چونکا یا۔ اس نے مصنف کا نام جاننے کے لئے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی، لیکن مصنف نے غالباً نام رکھنے سے اجتناب برتا تھا۔ پوری کتاب میں عورتوں کے تئیں جو واقعات یا نکات ملے، ان میں سے چند جملوں نے دوشیزہ کو سوچ کے جنگل میں ڈال دیا، پہلا جملہ تھا —

''عورت تمہاری کھیتی ہے۔ تم اس کے کسان ہو۔ ہل چلاؤ''۔ دوسرا جملہ ''دنیا کے تمام سامانوں میں بہترین سامان ہے عورت، استعمال کرو'' تیسرا جملہ تھا۔ ''عورت مرد کی پسلی کی ہڈی سے بنی ہے، اس لئے اس کے مزاج میں کجی ہے''۔ اور چوتھا جملہ ''عورت ناقص العقل ہے''۔

سفید ساڑی پہنے ایک جوان بیوہ نے پوچھا۔ ان جملوں سے دوشیزہ نے کیا نتیجہ نکالا؟ ''تفکرات کے سمندر میں غواصی کے بعد جملوں کے اسرار کا ادراک جب دوشیزہ کو ہوا تو اسے کہا کہ فطری زندگی ہی سب سے زیادہ آرام دہ ہو سکتی ہے۔ انسان کی فطرت، سب سے بڑی اور سب سے بہتر رہنما ہوتی ہے اسلئے ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی فطرت کے اشارے پر زندگی کے اصول اپنی مرضی سے بنائے''۔ قصہ گو لمحہ بھر کو رکا۔ حاضرین کے مزاج کا جائزہ لیا۔ پانی کے چند گھونٹ پی کر تازہ دم ہوا۔۔۔ اور شروع ہوا — صاحبو! طے شدہ تاریخ پر لوگ دوشیزہ کی حویلی پر وعظ و نصیحت کے لئے پہنچے تو وہاں کا بدلا ہوا ماحول دیکھ کر تحیر زدہ رہ گئے دوشیزہ نے صوفیانہ لباس کی جگہ ساحرانہ ملبوسات زیب تن کر لئے۔ حویلی کا باوضو ماحول نشیلی فضا میں ڈوب گیا۔۔۔ خادماؤں کو ملازمت سے برخاست کر کے دوشیزہ نے سارے کے سارے مرد ملازم رکھ لئے۔ دوشیزہ کی آنکھوں میں اعتماد دیکھ کر کسی نے پوچھنے کی جرأت بھی نہ کی دولت کی فراوانی اور حسن کی تابانی کے آگے دنیا کی زبان پر تالے پڑ گئے مردانِ شہر، دوشیزہ کی خواب گاہ کے خواب دیکھنے لگے۔۔۔۔۔۔ دوشیزہ جس پر مہربان ہوتی وہ مسرت کے بوجھ سے نیم وحشی ہو جاتا۔ ہانپتے دم ہلاتے مردوں کے جھنڈ کو دیکھ کر دوشیزہ قہقہے لگاتی ہوئی اس کتاب کے مذکورہ جملے دہرانے لگی۔

ایک دن اس نے اعلان کیا، ایک انار سو بیمار کے مصداق بہت پریشان ہوں۔ ہر کوئی میری دید کا طالب ہے۔ ہر کوئی ایک شب کا سوالی ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شب وصال کا جام اسی دیوانے کو پلاؤں گی، جو صبح کو میرے ہاتھ سے زہر کا جام پی کر ہمیشہ کی نیند سونے کو تیار ہوگا۔ دوشیزہ نے ادھر اعلان کیا، اُدھر شب وصال کے تمنائی حویلی پہنچنے لگے۔۔۔ پھر وہی ہوا جو دوشیزہ چاہتی تھی۔ رات بھر دوشیزہ کے حسن کے خمار میں جینے کے بعد صبح کو زہر کا پیالہ منہ سے لگا کر چار کاندھوں پر لوگ جانے لگے۔ یہ سلسلہ دنوں تک چلتا رہا۔

ایک دن سمندر کو غور سے دیکھتے ہوئے دوشیزہ بڑبڑانے لگی ''سمندر اور عورت میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔۔۔ دونوں بے کنار۔۔۔ پر اسرار۔۔۔۔ پرکشش گہرے اور خطرناک ہوتے ہیں''۔ ڈوبتے سورج کو دیکھتے ہوئے دوشیزہ اداس ہوگئی۔ اور سمندر میں دھیرے دھیرے اترنے لگی۔۔۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کی بانہوں میں گم ہو گئی۔ حاضرین میں سے ایک نوجوان نے کہا ''اے قصہ گو! دوشیزے نے زندگی کا خاتمہ اس طرح کیوں کیا؟ دوشیزہ کی قربت کی چاہ میں لوگوں نے اپنی جانیں کیوں گنوائیں؟''

کیونکہ خواب پورا ہونے کے بعد انہیں یہ دنیا مقصد سے خالی اور لایعنی لگنے لگی۔

کیا آپ بھی دنیا کو بے معنی اور مقصد سے خالی سمجھتے ہیں؟ نوجوان کے پوچھنے پر قصہ گو نے کہا ''میں تو بس یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا اگر بے معنی ہے بھی تو اسے بامعنی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اسی لئے میں کہانی سناتا ہوں۔۔۔۔ اور

آپ سنتے ہیں... کیونکہ ڈھیر سارے دن جو بیت گئے۔ ان میں سے کچھ کھٹی میٹھی یادیں بنے کچھ دھوپ... کچھ ابرِ رحمت اور کچھ تھوڑا سا پچھتاوا... تھوڑی سی کسک بن کر یادوں کے تہہ خانے میں محفوظ ہوگئے... گذران کے مرحلے سے جوجھتے ہوئے جب حال کچھ مہلت دیتا ہے تو ماضی نامہ کھول کر یاد نگر بسا لیتا ہوں، کیونکہ سانسوں کا کارواں لٹنے والا ہے اور زندگی، موت کی چادر اوڑھ کر ہجرت کرنے والی ہے... وقت کم ہے مستقبل طے شدہ !

اس لئے قصہ گوئی کے ذریعہ انسانی زندگی کو ایک وجہ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ میری آواز سینہ بہ سینہ سفر کرتے ہوئے بے کیف حقیقت کا مقابلہ کر سکے۔

قصہ گو خاموش ہو جاتا ہے۔ محفل برخواست ہوتی ہے۔ لوگ جانے لگتے ہیں دوسرے دن آنے کیلئے—!!

کمال جعفری کی تالیف



ذکر محفوظ

اُردو اکادمی دہلی
کی چند اہم مطبوعات

اردو کلاسیکل ہندی اور انگریزی ڈکشنری

مرتب : جان۔ٹی۔ پلیٹس، صفحات : ۱۲۵۹،
قیمت . ۲۵۰روپے

دِلّی آخری دیدار

مصنف : سید وزیر حسن دہلوی
مرتب . سید ضمیر حسن دہلوی
صفحات ۴۷، قیمت ۲۰روپے (تیسرا ایڈیشن)

داغ دہلوی حیات اور کارنامے

مرتب : ڈاکٹر کامل قریشی، صفحات ۲۳۸،
قیمت : ۵۰روپے (دوسرا ایڈیشن)

کلیات مکاتیب اقبال (جلد اول)

مرتب سید مظفر حسین برنی، صفحات ۱۲۰۸،
قیمت ۱۵۰روپے، (چوتھا ایڈیشن)

کلیات مکاتیب اقبال (جلد دوم)

مرتب . سید مظفر حسین برنی، صفحات ۱۲۲۴،
قیمت ۱۵۰روپے (تیسرا ایڈیشن)

کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم)

مرتب سید مظفر حسین برنی، صفحات ۱۱۶۸،
قیمت ۱۵۰روپے (دوسرا ایڈیشن)

کلیات مکاتیب اقبال (جلد چہارم)

مرتب سید مظفر حسین برنی، صفحات . ۱۲۰۸،
قیمت ۲۵۰روپے

سوانح دہلی

مصنف . شاہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی
مرتب . مرغوب عابدی
صفحات : ۶۴، قیمت : ۲۰ (چوتھا ایڈیشن)

عالم میں انتخاب دِلّی

مصنف مہیشور دیال، صفحات ۵۱۶،
قیمت ۷۰ روپے (تیسرا ایڈیشن)

دیوانِ حالی

مقدمہ . رشید حسن خاں، صفحات ۲۳۲،
قیمت ۳۰روپے (چھٹا ایڈیشن)

چراغِ دہلی

مصنف میرزا حیرت دہلوی،
صفحات ۵۳۶، قیمت ۵۰روپے (دوسرا ایڈیشن)

دلّی کی آخری بہار

مصنف علامہ راشد الخیری، مرتب سید حسن دہلوی
صفحات ۱۲۷، قیمت ۲۵روپے (چوتھا ایڈیشن)

اردو غزل

مرتب ڈاکٹر کامل قریشی، صفحات ۳۵۹،
قیمت ۵۰روپے (تیسرا ایڈیشن)

آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل

مرتب . پروفیسر عنوان چشتی، صفحات ۳۸۴،
قیمت . ۶۵روپے (تیسرا ایڈیشن)

آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ

مرتب : پروفیسر شمیم حنفی، صفحات ۲۵۵،
قیمت . ۴۰روپے (تیسرا ایڈیشن)

فوائد الفواد (حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات کا مجموعہ)

مرتب و مترجم: خواجہ حسین ثانی نظامی، صفحات ۱۰۸۸،
قیمت . ۱۰۰روپے (چوتھا ایڈیشن)

افسانہ

کہانی سنو گے.............؟



انیس النبی

نام	انیس النبی
تاریخ پیدائش	۲ر جولائی ۱۹۵۸ء
جائے پیدائش	۲/۴ بی، شاہ امان لین خضر پور، کلکتہ - ۷۰۰۰۲۳
فون	(۰۳۳) ۴۴۹-۱۴۱۳
والدین	سید محمد وحید النبی صالحہ خاتون صاحبہ
تعلیم	ایم اے (اردو ادب)
پیشہ	ٹیلیویژن اور فیچر فلموں کیلئے کہانی اور ڈائیلاگ لکھتا ہوں۔
مشغلہ	افسانہ نگاری / طنز و مزاح نگاری / اسٹیج ڈرامے اور ریڈیائی ڈرامے لکھنا / اردو ٹائپ رائٹنگ کرنا / اردو نواز غیر مسلموں کو اردو کی تعلیم دینا۔ باب العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تصنیف "نہج البلاغہ" کا پابندی سے مطالعہ کرنا۔ تاریخ اور نفسیات کے علاوہ اردو ترجموں کے ذریعہ عالمی ادب کا مطالعہ کرنا۔

قصہ گو نے کہا "گندم کی چاہ میں لوگ اس تیزی سے بھاگ رہے ہیں کہ مت پوچھو، سرپٹ . . بے لگام دوڑے جا رہے ہیں۔ بھوک سے بھرے بوجھل پیٹ لے کر دشت آرزو میں بھٹک رہے ہیں۔ کسی کو فرصت نہیں کہ جیون کی کڑواہٹ دور کرنے کے لئے باغ تصور کی سیر کرے۔ لیکن آپ سب کو یکجا دیکھ کر آج میں بہت خوش ہوا۔ قصہ گوئی کا جو سلسلہ ٹوٹ چکا تھا، آج پھر شروع ہوا۔ خیر مقدمی کلمات کے بعد قصہ گو نے حاضرین کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ عورتوں کی دلچسپی دیکھ کر اس نے زیر لب کہا، یہ عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ داستانیں بناتی ہیں، پاگل خانے بھرواتی ہیں، اور خود بے خبر رہتی ہیں۔ انکی اس بے خبری سے باخبر رہنے والے مرد کبھی عاشق بن جاتے ہیں کبھی عیاش۔ کبھی کسی آنکھ نے کسی عاشق کو عیاش نہیں پایا اور کبھی کوئی عیاش، عاشق نہ بن سکا۔

قصہ گو کا تصوراتی سلسلہ ایک آدمی کے تخاطب سے ٹوٹ جاتا ہے "اے ساحرِ گویائی! ہم انتظار کی چادر پہ بیٹھے تیری خوش کلامی کے طلسم میں گم ہونے کو بے چین ہیں"۔ یہ ٹھیک کہتا ہے کلام دلفریب کے خالق! ایسی داستان چھیڑ جو ماضی اور مستقبل کی حد بندیوں سے پرے آج کا قصہ لگے، جسے سنکر مسرت کے باغ کھل اٹھیں، بصیرت کی وادیاں گنگنا اٹھیں۔

یہ مسرت یا بصیرت کے احساس تو اضافی ہوتے ہیں میرے ہمدم! قصہ گو نے کہا۔ ایک مرگ نینی بول پڑی "ہم تمہارے مقناطیسی لب و لہجے کے دیوانے ہیں قصہ گو! تم نہیں جانتے، کس کس جتن سے تمہاری محفل میں آپائی ہوں۔ شوہر کو سلا کر، محبوب کو رلا کر اس دلپذیر شام کے نور کو اپنے دامن میں بھرنا چاہتی ہوں، اور تم ہو کہ ہماری پیاس کا امتحان لے رہے ہو! مرگ نینی کی شکن آلود پیشانی کا احترام کرتے ہوئے قصہ گو آغاز کرتا ہے۔ صاحبو! صدیوں پہلے ریگزاروں کے درمیان، کھجوروں کے شہر میں ایک عورت نے مردوں کا اعتدال چھین لیا تھا۔ اس کا حسن، دینا کی ساری میٹھی اور بڑی زبانوں کے استعاروں اور تشبیہوں کے اختیار سے بالاتر تھا۔ عالم نوخیزی میں تجربے کی روشنی پاکر جب اسے اپنے وجود میں شبابِ دو آتشہ کا سراغ ملا تو رب کے آگے دوزانو ہو کر شکرانہ ادا کرنے کے بعد غرور کے زرہ بکتر سے لیس ہو کر مردوں کو زیر کرنے کا اس نے ایک سلسلہ شروع کر دیا۔

"اس نے ایسا کیوں کیا؟" حاضرین میں سے ایک نسوانی آواز ابھری "مرد تو مجازی خدا ہوتے ہیں، چھوتے ہیں تو عورت میں جان پڑتی ہے۔ شکر کے بجائے ظلم کا طریق — ! چہ معنی دارد؟

مطلب اس کا یہ ہوا کہ انسان گو کہ اخلاقی سماج میں سانسیں لیتا ہے لیکن اپنے اندرون کی نفسیاتی دنیا ہی میں جیتا ہے، ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی بنیاد پر ہی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے، پھر آدمی زندگی بھر عمل اور رد عمل کے دلدل میں پھنس کر جیتا مرتا رہتا ہے۔ اس دوشیزہ کا لاشعور بھی بچپن سے زخمی تھا۔ عورت کی زندگی کا پہلا مرد، اس کا باپ ہوتا ہے، معیار اور محبت کا امین ہوتا ہے۔ دوشیزہ نے دس سال کی عمر میں اپنے باپ کو ہوس کے گھوڑے پر نفس کی تیزگامی کا شکار دیکھا تو چپ سی

ہو کر رہ گئی۔ ماں نے پہلے تو ضبط سے کام لیا، مگر شوہر کے بھٹکتے شب و روز کو دیکھتے دیکھتے ایک دن پھسل گئی۔ اور لڑکی قیامت کا انجام دیکھتی رہ گئی۔

چند برسوں بعد کچی عمر کی پختہ سڑک پر چلتے چلتے ایک شہزادے نے آواز دی، اس نے لبیک کہا۔ ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ روشنی، دھوم، ہوا، پھول ستاروں کی باتیں ہونے لگیں۔ باتیں ختم ہوئیں تو جذبات کے پاؤں تھکن سے بھاری ہونے لگے، سورج سوا نیزے پر آگیا، حالات کی حدت سے سر چکرانے لگا۔ دوشیزہ گھبرا گئی۔ شریکِ سفر کو ڈھونڈنے لگی، اور ڈھونڈتی ہی رہی۔ لمحے سرکتے سرکتے سالوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ یکسانیت، غم کو زائل کرنے لگی۔ دوشیزہ نے نظریں اٹھائیں تو دو آنکھیں، میزبان کی طرح استقبال کرنے لگیں۔ اس نے پھر لبیک کہا۔ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو گئے، انضمام کے خمار کی بلندی سے لڑھکنے کا احساس دوشیزہ کو اس وقت ہوا جب دو بدمست سرمایہ داروں کی زبانی علم ہوا کہ وہ منہ مانگے داموں بک چکی ہے۔ عالم حیرانی میں جانِ عزیز کو پکارنے لگی، مگر وہ صدا حقیقت کے پہاڑ سے ٹکرا کر بازگشت کی صورت مایوس کر گئی۔

قصہ بیان کرتے کرتے قصہ گو کی نگاہ، ایک آبدیدہ خاتون پر پڑی ”اے خاتون! بہار جس سے حسد کرے وہ نکھار ہے تو، مگر غم کا سایہ تیرے وجود کی چاندنی کو ماند کیوں کر رہا ہے؟ بتا ذرا، میں جاننا چاہتا ہوں! خاتون کی سسکیاں تیز ہو گئیں، قصہ گو پریشان ہو گیا۔ اور حاضرینِ محفل قصے کا تسلسل منقطع ہونے پر قصہ گو پریشان ہو گیا۔ اور حاضرین محفل قصے کا تسلسل منقطع ہونے پر قصہ گو سے شاکی ہونے لگے۔ ایک بھدی سی ادھیڑ عمر عورت ابل پڑی ”اے قصہ گو! اگر رونے والی آنکھیں اتنا متاثر کرتی ہیں تو ہم جیسوں کی آنکھوں پر تم جیسوں نے دھیان کیوں نہیں دیا۔۔۔۔۔ وقت کے ہچکولوں سے روتے روتے ہماری آنکھیں سوکھ گئیں۔ اگر ہمارے پاس حسن کی دولت یا شباب کی شہرت ہوتی تو تمہارے دلِ پُر درد سے نکلے ہوئے چند بول ہمارے حصے میں بھی آجاتے۔ بھدی عورت کے بھونڈے خیالات سے قصہ گو کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے۔ لیکن اداسی کو جھٹک کر غمزدہ خاتون کے قصۂ درد کی تفصیل جاننے کے لئے قصہ گو اس کے پاس گیا تو اس کی منہ لگی ملازمہ بول اٹھی، غم تو اس دنیا میں بہت سے ہیں۔ لیکن کچھ غم اظہار کی آزادی کے بجائے احساس کی گھٹن بن جاتے ہیں۔ بی بی صاحبہ کے اجاڑ پن کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے، سپنوں کے رتھ پر سوار ہو کر پھولوں کے بستر پہ اتاری گئیں۔ اور کئی برس تک بی بی جی کے دل کی بستی میں قوس قزح کے رنگ بکھرتے رہے۔ ایک ہی جیسی مسرت انگیز زندگی کی طوالت کی یکسانیت، جب اداس کرنے لگی تو قدرت نے ان کی گود بھرنے کے لئے کوکھ ہری کر دی، لیکن قدرت کی فطرت میں قرار کہاں؟ ایک صحت منداور خوش شکل بچہ تولد ہوا۔ تین دن تک ماں کی چھاتی چوستا رہا پھر مر گیا۔ ماں، بچے کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی بچہ آپریشن سے پیدا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ماں، اسپتال کے بستر پہ سلے ہوئے پیٹ اور ٹیسیں مارتی ہوئی دودھ ٹپکاتی، بھری چھاتی لے کر لوٹ رہی تھی اور ادھر معصوم بچے کے کفن دفن کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس قیامت کو گزرنے آج پورے سات دن بیت گئے، لیکن آنکھوں کی جھڑی تھمنے کا نام نہیں لیتی۔

ملازمہ کی زبانی خاتون کی بدنصیبی کا ماجرا سنکر قصہ گو اس خاتون کی بھیگی چولی کے جذباتی احتجاج پر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمن و رحیم سے زیادہ قہار و جبار ہے۔

خبردار جو رب العالمین کے خلاف تو نے ایک بھی منفی لفظ منہ سے نکالا۔ حاضرین میں سے ایک پیر خمیدہ قصہ گو پر برس پڑا۔ اگر ہم تیرے فنِ گفتار کے شیدا ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تیرے سرکش خیالات کو بے لگام چھوڑ دیں۔ ارے نادان! جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا، اور جو نظر آتا ہے، وہ ہوتا نہیں۔ پس منظر کی یا پیش منظر کی یہ آنکھ مچولی تو قیامت تک جاری رہے گی۔ کیا تجھے حضرت موسیٰ اور حضرتِ خضر کی اس تاریخی گفتگو کا علم نہیں، جس میں مشیتِ ایزدی کے پرت در پرت راز کھلتے گئے۔

مجھے سب علم ہے۔ قصہ گو نے کہا۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ حقیقت کا راز تاریخ سے نہیں، بصیرت سے منکشف ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں تاریخ لکھی گئی، اور لکھی جاتی رہیگی۔ لہٰذا اس موضوع سے اجتناب کرتے ہوئے بس یہی عرض ہے کہ آپکی محفل میں ایک قصہ گو ہی نظر آنا چاہتا ہوں۔

کیوں ——؟

کیونکہ قصہ گو خوابوں کا تقسیم کار ہوتا ہے۔ زمین کے نیچے اور آسمان کے اوپر کی بندشوں سے آزاد رہتا ہے خوف اور خواہش سے ماورا ہوتا ہے۔

ہم قصہ سننے آئے ہیں، قصہ گو کی فطرت یا نفسیات جاننے نہیں۔ مجلس کے آخری سرے پر بیٹھا ایک شخص بول اٹھا ”جو قصہ تم نے شروع کیا تھا، اسے چھوڑ کر حاضرین کے مسائل میں الجھ گئے“۔

قصے تو مسائل سے جنم لیتے ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر قصہ گوئی کے دوران اگر مسائل، مسئلے کھڑے کرنے لگیں تو وقت کی آنکھوں سے لمحوں کا کاجل چرا کر اس بزم آرائی کا کیا مطلب؟

جیسی آپکی مرضی، قصہ گو نے کہا۔ میں

کہہ مکرنیاں

روپ کنول کس جا لے جاؤں
چڑھتی جوانی کیسے بچاؤں
کھیا بھیجے ہے سوغات
کا سکھی، پریت
نا سکھی، گھات

انکو کر لیا اپنے بس میں
ٹوٹ گئی ہیں ساری قسمیں
اب تو جلائے ہے وہ تن من
کا سکھی، ساجن
نا سکھی، سوتن

بات بات پر ٹوکے جائے
گرہستی کے گر بتلائے
کرے ہے ہر دم وہ بکواس
کا سکھی، ساجن
نا سکھی، ساس

(افسانہ)

سراب

شہلا کی شادی کے پورے ۸ سال ہونے کے باوجود ابھی تک اس کی گود خالی تھی، لیکن اس میں اسکا کیا قصور تھا۔ مزاروں پر حاضریاں، گنڈے، تعویز، علاج و معالجہ، کوئی کسر بھی تو اس نے نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مگر اسکی ساس اسے بانجھ ہونے کا طعنہ دینے سے کب چوکتی۔ طعنے سن سن کر اس کا جینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اگر اس کے خاوند عرفان نے اسے پیار نہ دیا ہوتا تو شاید وہ ایک پل بھی جی نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ اگر وہ عرفان کو اولاد کی خوشی نہ دے پائی تو کیا ہوگا؟ مردوں کا کیا اعتبار۔ نگاہیں بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ پھر اسکے اپنے بھی ارمان ہیں اور اسکے والدین کی پوتے اور پوتیوں کو کھلانے کی تمنائیں بھی۔ کہیں ان کی یہی تمنائیں عرفان کو دوسری شادی پر مجبور نہ کر دیں۔

"پھر میرا کیا ہوگا؟ اس گھر میں میری کیا وقعت رہ جائیگی۔ سوتن، اسکے بچے، عرفان کا بدلتا ہوا مزاج، جھڑکیاں، طعنے، تکرار، طلاق کی دھمکی اور ان سب کے بیچ میرا بے وزن وجود، نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا قبل اسکے کے یہ دن دیکھنا نصیب ہو میں اپنے وجود کو ختم کرلونگی"۔

اسی سوچ میں وہ گم تھی کہ جیسے کسی اجنبی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "شہلا یہ تم کیا سوچ رہی ہو کیا تمہیں اسکا یقین ہے کہ تم بانجھ ہو۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں عورت کو بانجھ کہہ کر اس پر مہر تصدیق ثبت کردی جائے۔ یہ سائنسی دور ہے اور پھر میڈیکل ٹسٹ تو یہ بتا ہی دیتا ہے کہ خرابی کس میں ہے؟ مرد میں یا عورت میں۔ کیا کبھی تم نے اسے جاننے کی کوشش کی ہے"۔ شہلا کی زبان سے بیساختہ نکل گیا "نہیں"۔ شہلا کو اس اجنبی آواز نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر اسے اچانک خیال کہ علاج تو میں نے بھی بہت کرائے۔ اور عرفان کی بھی طبی جانچ ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر اومادیوی نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ بھگوان پر بھروسہ رکھو۔ خرابی کس میں ہے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا"۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسنے مجھ سے کچھ چھپایا ہو۔ پھر کیا کیا جائے! خرابی کس میں ہے یہ کس طرح معلوم کیا جائے"۔ یہ خیال آتے ہی جیسے اسے کچھ اطمینان سا ہو گیا۔

"دیدی نمستے" شہلا یہ کہہ کر ڈاکٹر اوما دیوی کی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر اومادیوی نے پوچھا "دیدی بات دراصل یہ کہ آپ نے تو میرا بہت علاج کیا۔ میرے خاوند کے بھی میڈیکل ٹسٹ کرائے لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ شہلا کی آواز لڑکھڑا کر رہ گئی، ہاں ہاں کہو، کیا کہنا چاہتی ہو ڈاکٹر اوما دیوی نے دوبارہ پوچھا۔۔۔ اسکی بار شہلا نے ایک ہی سانس میں پورا جملہ کہہ ڈالا۔ "دیدی آپ مجھے یہ بتائیں کہ خرابی کس میں ہے"۔

"ہوں تو یہ معلوم کرنے آئی ہو" ڈاکٹر اوما نے دھیمے لہجے میں کہا، "لاؤ مجھے تمام رپورٹیں دے دو" ڈاکٹر اوما نے رپورٹیں دیکھنے کے بعد شہلا سے کہا، "مسز عرفان! میرا خیال ہے کہ عورت کو سب کچھ نہیں معلوم کرنا چاہئے ورنہ اسکا رہا سہا چین بھی چھن جاتا ہے۔ لیکن تم اسی مقصد کے تحت آئی ہو اس لئے نہ بتاؤں تو تمہارے من کو ٹھیس لگے گی، حقیقت یہ ہے کہ خرابی تم میں نہیں بلکہ تمہارے شوہر کے ٹسٹ رپورٹ میں کچھ ایسی خرابی ہے جس کے سبب اس سے اولاد کا ہونا ناممکن نظر آتا ہے"

شہلا یہ سن کر اٹھی اور اپنے گھر آ گئی۔ خرابی اس میں نہیں بلکہ اس کے شوہر میں ہے۔ دنیاوالے اسے بانجھ ہونے کا طعنہ غلط دیتے ہیں یہ سوچ کر اسے نہ صرف اطمینان ہوا بلکہ اسکا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ لیکن اسی ساعت اسکی امیدوں کی شمع جیسے بجھ گئی ہو اور وہ نڈھال ہو کر پلنگ پر گر پڑی۔ صبح عرفان کو ناشتہ دیتے ہوئے اسکے جی میں آیا کہ ڈاکٹر اوما کی بات عرفان کو بتا دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہ اس بات کو اپنے سینے میں دفن کر دینا چاہتی تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ خاموشی کے ساتھ وہ حسب سابق اپنی ساس سے بانجھ ہونے کا طعنہ سنتی رہی۔ لیکن فرق صرف یہ ہوا تھا کہ اب آبدیدہ ہونے کے بجائے ساس کے اس طعنے پر مسکرا دیتی "آج میری چھوٹی بہن کا خط آیا ہے اب وہ تین بچوں

کی ماں بن چکی ہے۔ کتنی خوش قسمت ہے وہ۔ بھرا پُرا گھر۔ گھر میں بچوں کی کلکاریاں۔ سماج میں وقار۔ شوہر کی نگاہ میں سرخرو۔ اور ایک میں ہوں جس کی قسمت میں ساس سے بانجھ ہونے کا طعنہ لکھ دیا گیا ہے جبکہ دونوں کی شادیاں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ شادی میں بڑی بوڑھیوں نے کتنی دعائیں دی تھیں۔ بٹی دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو"۔ سب کی سب بیکار گئیں۔ یوں شہلا کی سوچ کا سلسلہ دراز ہوتا ہوا اچانک اس کی آنکھوں میں مسز صفدر کا خوشیوں سے لبریز چہرہ پھر گیا۔ مجھے تو مسز صفدر کی زندگی پر رشک آنے لگا ہے۔ کتنی شاد و خرم رہا کرتی ہے وہ، اس کے اشارے پر چلنے والے شوہر۔ خوشیاں، قہقہے، آنگن میں پھول جیسے کھیلتے ہوئے بچے۔ پھر مسٹر صفدر کی پرکشش شخصیت کا خیال آتے ہی جیسے اسے کسی نے جھنجوڑ دیا "شہلا! صفدر کی ذات سے تمہیں کیا لینا ہے اس پر تمہارا کیا حق ہے؟ حق تو کچھ بھی نہیں لیکن---" وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔ "شہلا اماں کہتی ہیں کہ میں دوسری شادی کرلوں مگر میں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ میں تمہاری محبت کے بیچ دیوار کھڑی کرنا نہیں چاہتا۔ بہت لوگوں کے گھر بچہ نہیں ہوتا ہے۔ اگر میں بھی خدا کی اس نعمت سے محروم ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اماں کہتی ہیں تو کہتی رہیں میں سننے والا نہیں"

یہ کہہ کر عرفان کمرے سے باہر نکل گیا اور شہلا فکر کی اتھاہ گہرائیوں میں گر کر سوچنے لگی "آخر اماں کی زبان سے وہ بات نکل گئی جس کا اندیشہ تھا اور یہ ایک دن ہو کر رہے گا۔ آخر ایک سعادت مند بیٹا اپنی ماں کی بات کب تک ٹال سکتا ہے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دونگی"۔ "پھر کیا کروگی"۔ "شہلا نے اپنے آپ سے سوال کیا؟--- تمہاری گود تو خالی ہے، ہاں ہے تو ضرور لیکن خالی گود بھری بھی تو جاسکتی ہے لیکن کیسے؟"

میں نے سوچ لیا ہے۔ لیکن یہ پاپ ہے شہلا! پاپ ہے تو ہوا کرے--- میں تو بچے کیلئے سب کچھ کرنے کو--- مسز صفدر میکے گئی ہوئی ہے۔ صفدر صاحب بیمار ہیں۔ انکے گھر تو آتی جاتی ہوں۔ اگر ایسے وقت میں نہ گئی تو کیا مسز صفدر شکایت نہ کریگی۔ ملازم تو ہے لیکن اپنے اوپر بھی تو ہمسائیگی کا کچھ فرض بنتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے شہلا کے قدم صفدر کے گھر کی جانب اٹھ گئے۔ ارے بہت تیز بخار ہے۔ انکا سر دھو ڈالو۔ شہلا ملازم کو ہدایت دیکر انکے سرہانے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی "مسز صفدر کب تک آئینگی" شہلا نے پوچھا۔ اسی ہفتہ میں آنے کو کہہ گئی تھیں لیکن میکے جانے کے بعد کچھ تو تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ مسٹر صفدر نے جواب دیا۔ ویسے تو رحمت آپکا خیال رکھتا ہی ہے پھر بھی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم دیجئے گا۔ شہلا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "آپ کی ہمدردی کا بہت بہت شکریہ" صفدر نے جواب دیا "اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ ہمسائے کا بھی تو کچھ حق ہوتا ہے" شہلا نے گفتگو جاری رکھنا چاہا لیکن اس سے آگے وہ کوئی بات نہ کرسکی۔ کچھ دیر اور رکی اور پھر اپنے گھر چلی آئی۔ دوسرے دن بھی ایک انجانی کشش نے صفدر کی مزاج پرسی کیلئے شہلا کو اس کے گھر تک پہونچا دیا۔ آج شہلا نے اچانک صفدر کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا "کہئے کیسی طبیعت ہے" "خدا کا شکر ہے۔ اب بخار بالکل نہیں۔ انشاءاللہ کل تک ٹھیک ہو جاؤنگا۔ صفدر نے کہا۔ شہلا کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر اپنے گھر لوٹ آئی۔ تیسرے دن جب شہلا صفدر کے گھر پہونچی تو صفدر پوری طرح صحت مند نظر آرہے تھے۔ شہلا کو دیکھتے ہی پرتپاک لہجے میں اسے بیٹھنے کو کہا۔ "آپ نے میرے لئے بہت زحمت اٹھائی ہے مسز عرفان سمجھ میں نہیں آتا کہ آپکا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ صفدر شہلا سے مخاطب تھے لیکن شہلا کے خیالات کہیں اور بھٹک رہے تھے جسے صفدر نے محسوس کرتے ہوئے کہا۔ کچھ اداس نظر آرہی ہیں کہیں مسٹر عرفان سے--- "نہیں ایسی کوئی بات نہیں" پھر کیا بات ہے۔ اگر آپ مجھے اپنا سمجھتی ہیں تو اس ناتے ہی آپ کو ضرور بتانا چاہئے"۔ "بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو زبان پر لائی نہیں جاسکتیں ہیں مسٹر صفدر۔ شہلا نے جواب دیا"۔ "لیکن آپ کی اداسی کا سبب تو میں جان کر ہی رہونگا" یہ کہتے ہوئے صفدر شہلا کے قریب آگئے اتنے قریب۔ جہاں فاصلے کی گنجائش باقی نہ ہو اور انہیں ساعتوں میں ایک لمحہ وہ بھی آیا جہاں اس کے تحت الشعور نے اسے خود فریبی کے حوالے کر دیا۔

نئی شراب کا نشہ صرف نیا ہی نہیں تیز بھی ہوتا ہے اور جب چسکا پڑ جائے تو--- "کل مسز صفدر واپس آگئی"۔ یہ سن کر شہلا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس کے باوجود اسے ایک قلبی اطمینان کا احساس بھی تھا۔ مسز صفدر آج شہلا سے ملنے آئی تھیں۔ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ مسز صفدر کا چھ ماہ کا بچہ ہمک ہمک کر شہلا کی جانب بڑھنے لگا۔ شہلا اسے اپنی گود میں لیکر پیار کرتے ہوئے بولی۔ "آپ خوش قسمت ہیں مسز صفدر کہ اللہ نے آپ کو بچوں سے نوازا ہے"۔

یہ تو ٹھیک ہے مسز عرفان مگر زیادہ بچے بھی تو پریشانیوں کا سبب بن جاتے ہیں۔ میں تو عاجز آگئی ہوں۔ اچھا ہوا کہ اس کے ڈیڈی نے اس کے پیدائش کے بعد ہی اپنا آپریشن کرالیا ہے"

اچانک شہلا کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے گناہوں سے تعمیر شدہ تصوراتی محل کچھ اس طرح ڈھے گیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے کچل کر رہ گئی!۔



انجم عظیم آبادی

پتہ : دفتر روزنامہ آبشار، ۱۳ پر فلاسر کار اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۲
فون ۲۳۳۲-۳۵۴ (۰۳۳) رہائش

۱۹۴۴ء میں میری پیدائش ریاست بہار کے ایک موضع بہیڑہ (Bahera) تھانہ سلاؤ۔ ضلع نالندہ میں ہوئی میرے والد محترم عبدالقادر نے گھریلو نام نعیم الدین رکھا۔ اور میں نے اپنا ادبی نام انجم عظیم آبادی منتخب کیا۔ میری پیدائش دیہات میں ہوئی لیکن شہر کلکتہ میں ہوش سنبھالا اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ گھریلو حالات نصابی تعلیم کی تکمیل میں دیوار بن گئے۔ مغربی بنگال فارمیسی کونسل سے رجسٹرڈ فارماسسٹ کی سند حاصل کی۔ تقریباً ۳۰ برسوں سے اسی وسیلے سے روزی کما رہا ہوں۔ لیکن بارہ سالوں سے روزنامہ آبشار کلکتہ سے بھی بحیثیت صحافی وابستہ ہوں۔ شاعری کے علاوہ۔ افسانہ نویسی، تبصرہ نگاری، صحافتی قطعہ نگاری، رپور تاژ نگاری، مضمون نگاری کے ساتھ اخباری ضرورت کے تحت فیچر اور کبھی کبھی فکاہیہ مضمون بھی لکھ لیتا ہوں۔ ابتک تقریباً ایک درجن سے زائد افسانے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دیگر نثری تخلیقات کا بیشتر حصہ روزنامہ آبشار کے عمومی و خصوصی شماروں میں سے شائع ہوا ہے، شعری اصناف میں نظم سے زیادہ لگاؤ ہے۔ لیکن غزل، رباعی، قطعہ، ماہیے، کہہ مکرنیاں وغیرہ بھی کہتا ہوں۔ جنکی اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ ادبی، سماجی، علمی، ثقافتی، سیاسی اور ٹریڈ یونین تحریکوں سے جڑا ہوا ہوں۔ اور حسب سکت عملی طور پر حصہ لیتا ہوں۔ اندازے کے مطابق ایک درجن سے زائد تنظیموں سے منسلک ہوں جن میں ان تنظیموں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں

سکریٹری۔ انجمن ترقی اردو ہند شاخ مغربی بنگال۔ رکن جنرل کونسل مغربی بنگال اردو اکاڈمی۔ چیئرمین لٹریری سب کمیٹی مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ۔ سکریٹری بزم احباب کلکتہ (۵۷ سال پرانی ادبی انجمن)۔

سکریٹریٹ ممبر ڈیمو کریٹک فورم فار نیشنل انٹگریشن کلکتہ۔

رشتۂ خوں

کبھی سانسوں سے بھی نزدیک تھے ہم
مگر حالات نے آہستہ آہستہ
ہمارے خون کے رشتوں میں حائل
دوریاں کر دیں
نہ اب پہلی سی وہ باتیں
نہ اب وہ زاویے اپنی نگاہوں کے
سبھی اپنے مسائل کی ردا کاندھوں پہ ڈالے ہیں
مسافر شام والے ہیں
کہاں فرصت کہ اب گرتی ہوئی دیوار کو دیکھیں
شریک درد بن جائیں
بس اک بندھن لہو کے درد کے
دھاگوں کا باقی ہے
تمنا ہے، رہے قائم
یہ اک بندھن جو تار رشتۂ خوں سے
عبارت ہے

محور

عذاب زیست سے حاصل مفر کسے ہے یہاں
حیات سے تو مسائل جڑے ہوئے ہونگے
کہ چاک ہونگے گریباں کبھی سلے ہونگے
ہیں دھوپ چھاؤں کی مانند
رنج و راحت بھی
کسی کی گرم نگاہی کسی کی چاہت بھی
شکست ہوگی کبھی فتح و کامرانی بھی
ترانے عیش کے ہونگے تو نوحہ خوانی بھی
ہمیں حیات کے محور پہ گھومنا ہوگا
جبینِ شام و سحر یونہی چومنا ہوگا
سفر حیات کا در پیش ہے اگر ہمکو
ہوائے تند ہو، طوفان ہو یا ہو گرد و غبار
یہی ہے شرط، قدم اپنے ہم بڑھاتے رہیں
چراغ عزم و عمل راہ میں جلاتے رہیں

خیالِ ہم سفر

یہ مانا تیز ہو چلنے میں
اکثر چھوڑ دیتے ہو
انہیں پیچھے
تمہارے ساتھ جو چلتے ہیں راہوں میں
مگر یہ تیز گامی جب
تمہیں ٹھوکر لگائیگی
گرائیگی
تو خود سے اٹھ نہ پاؤ گے
اٹھائیگا تمہارے پیچھے پیچھے
آنے والا ہم سفر تمکو
تو بہتر ہے شریکِ کارواں رہنا
خیالِ ہم سفر رکھنا

غزل

تاجرانہ ذہن ہم رکھتے نہیں
قند کے بدلے میں سم رکھتے نہیں
صاف گوئی پر ہی رکھتے ہیں یقیں
بات میں ہم پیچ و خم رکھتے نہیں
سیم و زر سے ہیں تہی داماں مگر
دولتِ اخلاص کم رکھتے نہیں
ہر طرف ہے گو بلاؤں کا نزول
پھر بھی اپنی چشم نم رکھتے نہیں
ہو نمائش سیم و زر کی جس جگہ
ایسی محفل میں قدم رکھتے نہیں
رعب انجم پرجے کیوں آپکا
مرتبہ کچھ وہ بھی کم رکھتے نہیں

رباعیات

انساں ہو تو انسان کی عظمت سمجھو
اس گوہر نایاب کی قیمت سمجھو
تم اہلِ حرم ہو کہ پرستارِ صنم
انسان کی خدمت کو عبادت سمجھو

آداب انا سے جو گزر جاؤ گے
تنہائی کے عفریت سے ڈر جاؤ گے
تم بھی تو ہو اسی سماج کے اک فرد
یوں سب سے الگ رہ کے تو مر جاؤ گے

کیوں سرحدِ ادراک سے دوری ہے میاں
کیوں فکر کی تصویر ادھوری ہے میاں
اس دورِ پرآشوب میں جینے کے لئے
حالات سے سمجھوتہ ضروری ہے میاں

غزل

اپنی جیب تھی خالی خالی کرتے کیا
خوش پوشی کی لاج نبھالی کرتے کیا
کرنا تھا کچھ کام جنابِ عالی کو
ہم ٹھہرے رتبوں سے خالی کرتے کیا
خود کو سمجھا سب سے بڑھ کر کارگزار
تھی یہ اپنی خام خیالی کرتے کیا
تم تو سایہ دار شجر تھے بانٹتے چھاؤں
ہم ٹھہرے اک سوکھی ڈالی کرتے کیا
ذرہ ہو کر جان لیا خود کو خورشید
کرنوں سے تھا دامن خالی کرتے کیا
باہر جھوم رہا تھا موسم پھولوں کا
اندر روٹھی تھی ہریالی کرتے کیا
گھر کے اثاثوں کا مالک تھا ساہوکار
اپنے گھر کی ہم رکھوالی کرتے کیا

غزل

دھوپ چھاؤں ذہنوں کا آسرا نہیں رکھتے
ہم غرض کے بندوں سے رابطہ نہیں رکھتے

زعم پارسائی میں کب خیال ہے انکو
طنز تو وہ کرتے ہیں آئینہ نہیں رکھتے

وہ غرورِ تقویٰ میں بس یہی سمجھتے ہیں
ہے فقط خدا ان کا ہم خدا نہیں رکھتے

سازشیں علامت تو پست ہمتی کی ہیں
سازشیں جو کرتے ہیں حوصلہ نہیں رکھتے

تم ہوس پرستوں کے سینکڑوں خدا ٹھہرے
ایک ہے خدا اپنا دوسرا نہیں رکھتے

کس طرح منور ہو خانۂ شعور انجم
ذہن کے دریچوں کو تم کھلا نہیں رکھتے

ماہیے

سرکار ہو جیسی بھی
گرد نہ چہرے سے
مزدور کے جائیگی

مربوط ہوں کیا رشتے
ٹوٹ ہی جاتے ہیں
جب ہوں نہ برابر کے

دیہات کو چھوڑ آیا
شہر میں بے گھر ہوں
کیا خود پہ ستم ڈھایا

احساس کا پیکر ہوں
درد سے رشتہ ہے
اے یار سخنور ہوں

سمندِ ایّام برق پا ہے
اٹھو کہ تاریخ ہر ورق پر
تمہارا شبہ نام ڈھونڈتی ہے
نہ دینگے آواز اس کے شہپر
جو وقت اڑتا چلا گیا ہے
زمیں آنکھوں سے مت کریدو
نہ مل سکیں گی وہ ہڈیاں جو
زمین کا تاریک گہرا سینہ
نگل چکا ہے، نیا قرینہ
سکھاؤ پامال زندگی کو

(غلام روحوں کا کارواں)

کس ذکارانہ چابکدستی سے وہ عام ذہنوں کو اپنی جنگ میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی یہ شاعری دھیمی آنچ کی مانند سلگتی رہے گی جبتک کہ باطل کے خیمے اس آنچ میں جل کر راکھ نہ ہو جائیں۔ شعری ہیشگی یا ابدیت اسی کا نام ہے۔ جس طرح محبت، ہمدردی، خلوص لازوال قدریں ہیں اسی طرح ظلم، عناد، بغض نہ ختم ہونے والی علّتیں ہیں۔ فنونِ لطیفہ ان علّتوں سے بلند ہونے کا نام ہے۔

شاید اس بات سے آپ بھی متفق ہوں کہ ن م راشد، میرا جی کے بعد اخترالایمان ایک ایسا شاعر ہے جو اردو شاعری کو غزل کے سوالات سے بچی ضمانتوں پر چھڑانے میں مصروف رہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ ہماری نظمیہ شاعری میں معنیاتی اور موضوعاتی ہمہ گیری پیدا کرنے کی بے مثال کوششیں کیں۔ جب کہ جوش، فراق اور فیض جیسے پایہ کے شاعر بھی اس صنف کو غزل کی حراست سے آزاد کرانے میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اخترالایمان کی کلیات "سر و سامان" اس کی گواہ ہے کہ ان کے یہاں نظمیہ شاعری کمال عروج پر ہے۔

اپنی کُل شاعری کو اخترالایمان نے تین اہم مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ تقسیم نہ کہہ کر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنی تخلیقی زندگی کو تین مراحل سے گذارا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ان تینوں مراحل میں (یعنی تاریک سیارہ سے پہلے، تاریک سیارہ اور تاریک سیارہ کے بعد) ماضی بعید، ماضی قریب کے محاضرات کو موجود کل سے یوں پیوست کیا ہے کہ سارے زمانی بُعد معدوم ہو گئے ہیں۔ احساس ماضی اور شعور عصر کے مخلوط ہونے کی چند بہترین مثالیں پیش کرتا ہوں

....

یہ رہبرانِ زندگی خبر نہیں کہاں گئے
وہ کون سا جہان ہے ازل نہیں ابد نہیں
دراز سے دراز تر ہیں حلقۂ ہائے روز و شب
یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں
ہے مرکزِ نگاہ پر چٹان سی کھڑی ہوئی
ادھر چٹان سے پرے وسیع تر ہے تیرگی
اسے پھلانگ بھی گیا تو اس طرف خبر نہیں
عدم خراب تر ملے۔ نہ موت ہو نہ زندگی؟

(نقشِ پا)

کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو
کیا خبر وقت دبے پاؤں چلا آیا ہو
زلزلہ، اُف یہ دھماکا یہ مسلسل دستک
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو

....

توڑ دے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤنگا

(موت)

ماضی، حال و مستقبل پر مکاں میں زماں ان پر حادی ہے۔ وقت ان گھروندوں، ان چہار دیواریوں کو ڈھائے گا ہی اور مکان کے قیدی کا معدوم ہونا مقدر ہے۔ ہماری تہذیب و تمدّن کی یہ طویل تاریخ وقت کے حصار میں فقط ایک لمحہ ہے اور فرد ایک Atom محض۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اخترالایمان نے جو اپنی شاعری کی نشاندہی "سر و سامان" میں کی ہے وہ محض قارئین کی آسانی کے لئے ہے ورنہ فلسفیانہ سطح پر تاریک سیارہ سے پہلے، تاریک سیارہ اور تاریک سیارہ کے بعد ایک غیر منقسم اکائی ہے۔ ان کی نظمیں مکانی قید کو توڑتی نظر آتی ہیں۔ اگر اخترالایمان غزل کے میڈیم سے اپنے اس فلسفۂ کائنات و حیات کی ترسیل کی کوشش کرتے تو شاید ناکام رہتے کہ غزل کے پاس اتنا بڑا کینوس ہی نہیں ہے۔ لیکن اب بھی غزلیہ شاعری کو ہمارے ادبی سماج میں وہی برتری حاصل ہے جو صدیوں پہلے حاصل تھی۔ جو ہمارے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ حال ہی میں ایک رسالے میں ایک غیر مقیم ہندوستانی (NRI) ادیب نے بڑی ترش بات کہی ہے جو ہمارے لئے تازیانہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں درس و تدریس سے منسلک رہا ہوں۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کا تقابلی جائزہ بھی لیتا رہا ہوں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اردو شاعری یا شاعر عالمی ادب میں اپنا کوئی مقام نہ بنا سکے۔ اردو شاعری کے نکّو ہونے کا سبب انہوں نے یہ بتایا کہ ہماری شعری تخلیقات کا تقریباً ۷۰ فیصد حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ گویا غزل اب بھی مملکت شاعری کی شہزادی Diana جو اپنی تمام علّتوں اور بوالہوسی کے باوجود اقلیم شعر پر اپنا شاہانہ تسلط قائم کئے ہوئی ہے۔ مجھے شاہزادیوں سے کوئی بیر یا بغض نہیں ہے مگر میں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ اردو ادب میں غزل کا وہی مقام ہو جو آج ملکۂ برطانیہ کا ہے۔ جس طرح پارلیمنٹ میں مختلف و محرک خیالات کی نمائندگی کرنے کے لئے انتہائی حساس اور باخبر لوگ جمع ہوتے اس طرح اردو نظموں کا ایک ایسا فورم قائم ہو جو مشاعروں کا متبادل ہو سکے۔ اخترالایمان کچھ ایسا ہی چاہتے تھے۔ کیونکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں یہ صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ دور کیوں

جائیں بنگلہ شاعری کو ہی لے لیجئے ان کے یہاں آہیر تی یا بھاشہ پاٹھ میں واہ واہ نہیں ہوتی۔ ان کی نظموں اور گیتوں میں وہ ریزہ خیالی نہیں ہوتی جو اردو غزلوں کا شیوہ ہے۔ ان کی نظموں کی فکری اور تخلیقی بلندی کا اعتراف اس صدی کے پہلے حصّے میں ہی ساری دنیا نے کر لیا تھا۔ ان معروضات کا لب و لباب یہ ہے کہ اردو شاعری کو بشیر بدری سے نجات دلا کر اسے Single channel - سے Multi-channel بنایا جائے۔

اخترالایمان ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے مشاعرے اور فلمی دھوم دھڑکے میں بھی اردو شعر کو کثیرالجہت فکری Channel سے متعارف کرنے کی جسارت کی اور ایسے نئے اور تازہ موضوعات کو برتا جن کی متحمل غزل نہیں ہو سکتی تھی۔ مثال کے طور پر ذات کا ساعت بہ ساعت، لحظہ بہ لحظہ نالسٹالجیائی لمحوں سے گذرنا اور ایک ایسے جہاںِ تابناک کی بازیافت کرنا جس میں حقائق اپنے طلسماتی وجود کی کینچلی اتار کر محوِ رقص ہوتے ہیں کو کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

....

اگر میں یہ پردہ ہٹادوں جسے لفظ ماضی سے تعبیر کرتے رہے ہیں
اگر میں حدودِ زماں و مکاں سب مٹادوں
اگر میں یہ دیواریں جتنی کھڑی ہیں گرادوں
تو ہر قید اٹھ جائے، یہ زندگی جو قفس ہے
یونہی دیکھتے دیکھتے تتلیاں سب بکھر جائیں اس کی
اور انسان اپنے صحیح روپ میں ہر جگہ دے دکھائی
کسی غار کے منہ پہ بیٹھا، کسی سخت الجھن میں غلطاں
کہیں شعلہ دریافت کرنے کی خواہش میں پیچاں
کہیں زندگی کو نظامِ مسلسل میں لانے کا خواہاں
جہاں کو حسیں دیکھنے کی تمنا میں کوشاں
زمیں دور تک ایسے پھیلی ہوئی ہے
کشادہ کوئی خوانِ نعمت ہے جیسے
جہاں کوئی پہرہ نہیں کوئی تخصیص و تفریقِ انسان
یہ سب کی ہے، سب کے لئے ہے۔ یہاں سب ہیں مدعو۔

(کوزہ گر)

اخترالایمان کی ایک اور مختصر سی نظم کی طرف اشارہ کرنا چاہونگا جس کا عنوان ہے "کوہِ ندا کا بلاوا"۔ تلمیح سے قطع نظر اگر غور کیا جائے تو اس نظم میں یااخی۔ یااخی کی بازگشت کرۂ ارضی پر وجود میں آنے والے پہلے آدم زاد کا بلاوا ہے۔ آج کے آدم زادوں کے لئے یہ ایک عمیق اور اچھوتا موضوع ہے اردو شاعری کے لئے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں پیدا شدہ آواز کبھی مرتی نہیں۔ وہ فضائے بسیط میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اگر قوتِ کشش کے زدن سے یہ آوازیں کسی طرح کھینچ لی جائیں تو ہم آج بھی انہیں سن سکتے ہیں۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم اس Frequency کو پالیں۔ آوازیں مختلف اقسام کی ہوتی ہیں۔ شور، ہنگامہ، دھماکہ یہ Frequency کی اونچی سطحیں ہیں۔ لیکن اخترالایمان اس پہلے آدم زاد کی آواز یا اخی، یااخی، اس شور اور ھنگامہ میں بھی سن رہا ہے۔ بھائی کے قتل کے بعد انسانی دردمندی کا جاگنا پھر فضائے بسیط میں گردش کرتی ہوئی آواز "یااخی، یااخی" کو پالینا پنبہ بگوشوں کا کام نہیں۔ یہ تو اخترالایمان ہی کر سکتے تھے۔ "کوہ ندا کا بلاوا" استعارہ ہے اس دردمندی کا جس نے پہلی بار سفاکی پہ وار کیا تھا۔ آج ہم تمدن کے اس موڑ پر ہیں جہاں بھائیوں کا قتل بے دریغ ہو رہا ہے۔ شاعر اخترالایمان کی Frequency یااخی، یااخی، کہہ کر بلانے والے آدم بھائی کی Frequency سے مل گئی ہے۔ آدم بھائی کی اس دردمندی کو اس دھرتی پر دوبارہ لانے کے بلاوے کو لبیک کہتے ہوئے شاید اخترالایمان نے ہمارے درمیان سے رخصت چاہی ہے۔ لیکن رخصت بھی چاہی ہے تو اس دعا کے ساتھ

ہم نفس دعا مانگیں
روشنی کے مینارے
ماہ و آسماں تارے
ٹوٹ کر بکھر جائیں
کوہ و دشت و دریا سے
کانپتی صدا اٹھے
اے خدائے لافانی
مختصر جہاں بانی
مدتوں کی تاریکی
روشنی سے دھل جائے
چشمہ ٔ بقا پھوٹے
آسمان تازہ پر
آفتاب تازہ ہو
زندگی کے شانوں پر
موت کا جنازہ ہو

نظم "قیامت"

مرے)۔

اتہاس ہی کیوں وہ خود بھی سنگ میل سے پھسل کر کسی ان سوجھی دشا میں ڈوب جاتا تو پھر کچھ بھی کہنے کو کوئی نہ بچ پاتا۔ ان کہی کہانی کی طرح یہ سڑک بھی ایک دن غائب ہو جاتی۔ ہر چیز بالکل خالی خالی سی ہو کر رہ جاتی۔ خالی پن کے سوا کیا بچ رہتا۔ جب وہ زیادہ جھنجھلا اٹھتی تو لونڈے پھر پل پڑتے اور کہتے "بندھا ہوا ہاتھی۔ بیل کا کھونٹا، کارنیول کا نیوا سانڈ دیکھنا چاہتی ہو تو چلی جاؤ ہری ہرناتھ چھتر کے میلے میں۔ وہاں زمین ہی زمین ہے میدان ہی میدان ہے۔ وہاں کوئی سڑک نہیں۔ کوئی پھسلن نہیں"۔ اس نے بہت ہی اداس لہجے میں یہ بھی بتایا کہ وہ امرود کھا کر ہی نہیں سکتی جینے کے لئے اسے امرود کا بدل چاہئے۔ امرود بہت ہی سرد ہوتا ہے۔ اس کے بیج میں سات گھڑے پانی کی تاثیر ہوتی ہے۔ اگر کسی دن وہ امرود کھا گئی تو وہ اپنے ہی پانیوں میں غرق ہو جائیگی۔ ڈوب جائے گی۔ شاید اسی لئے کوئی بھی نہیں آتا اس کے نزدیک۔ سب کو یہ خدشہ ہے کہ یہ عورت ہی ہزار گیلن پانی اٹانے والی ایک ٹنکی ہے۔

اف اس کی یہ رلا دینے والی خواہش کہ کاش کوئی آکر اسے نچوڑ دیتا، تکیے کے غلاف کی طرح اور ٹانگ دیتا اس الگنی پر جس پر وہ زندگی بھر خشک اور تر ہونے کا مزہ لیتی۔ "خشک اور تر" کی وہ عجیب سی خواہش مگر وہ امرود اور امرود کا باغ۔ امرود کا باغ تو اس کے اندر ہی اگتا رہتا ہے۔ ہواؤں کے اتنے تیز جھکڑ چلتے ہیں کہ اندر ہی اندر اس کا سب کچھ ویران ہو جاتا ہے۔ دیودت بھی اس کے اندر باغ کی طرح لگا تھا مگر وہ بھی اس تیز جھکڑ کا شکار ہوا۔ دیودت جنگلی پھول کی طرح کہیں بھی اگ جاتا۔ چاہے زمین بوڑھی ہو۔ بنجر ہو۔ جوان ہو۔ اس کے علاوہ دیودت چور بھی تھا۔ امرود کی چوری اس کی دوسری بری لت تھی۔

اسے اس کی بری لت کی مقناطیسیت برابر گدگداتی۔ کاش کہ دیودت اس کے باغ کے امرود پر چھاپے مارتا۔ آخر ایک رات جب امرود کے دانے رس بھر جانے سے شگاف آلود ہو رہے تھے دیودت باغ میں گھس پڑا۔ امرود کے دانوں کی خوشبو وہ جھیل نہ سکا۔ دیودت چور اس رات "ہاں" اور "نا" کے بیچ جو سیڑھی تھی اس سے اس طرح بے دھڑان کودا کہ اس کے پاؤں تلے کی زمین ہی غائب ہو گئی۔ نہ جانے کون سی بے سمت سڑک اسے کہاں اٹھا کر لے گئی۔ حالانکہ اس نے اس سے دو ٹوک کہا تھا کہ یہ امرود... یہ باغ اور..... اور سب کچھ دیودت ہی کا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔ مگر اس کی یہ لمبی خاموشی ذرا بھی نہیں کھلی۔ کبھی کبھی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز اچھی ہے اور کچھ اچھا لگے۔ اس کے لئے ہم کیا نہیں کرتے۔ اس کی وہ لمبی خاموشی بھی شاید کبھی کبھی کچھ اچھا لگنے کی علامت سی ہو گئی تھی۔ جب کچھ اچھا لگنے کی علامت ہمیں جیتے جی موت کی طرف دھکیلنے لگتی ہے تو ہم ان علامتوں کے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہی انتظار زندگی کی صورت لئے ہمیں جینے کی دعوت دیتا ہے۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جیتے ہیں اور مرے میں جیتے ہیں۔ میں نے نہ جانے کیوں اس کے خاموش ہونٹوں سے اپنی انگلی چھوا دی اور وہ برقی لہروں کی طرح جیسے اپنے اندر واپس آ گئی۔ کچھ دیر مجھے تکنے میں معروف رہی پھر کچھ سوچ کر میرے دیئے ہوئے سکوں کو گننے لگی۔ گننے کے بعد وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگی جیسے وہ آدمی نہیں ڈوبتا ہوا جہاز تک رہی ہو۔ میں نے پوچھا "کیا کچھ کم ہیں" اس نے کہا نہیں، کم نہیں زیادہ ہیں۔ اس نے احتجاجی لب و لہجہ میں بات شروع کی کہ آخر میں اسے پیسے زیادہ کیوں دیتا ہوں۔ وہ اس بات پر بضد تھی کہ وہ زیادہ پیسوں کے لئے نہیں جیتی۔ لکہ اس لئے جیتی ہے کہ کچھ ایسے رشتے ہوا کرتے ہیں جن کے انتظار میں کسی نہ کسی طور جینا ہی چاہئے۔ دراصل جینا اور نہ جینا ان ہی رشتوں کے سلسلے ہیں۔ ان ہی رشتوں کی کڑیاں ہیں۔ ان میں سے کسی بھی ایک کڑی کی ناوقت کمی ہمارے درمیان قیامت برپا کر سکتی ہے اور ہم سب اس آخری دن کو کسی نہ کسی طرح آنے نہیں دینا چاہتے۔ کیا تم قیامت کو ٹالنا نہیں چاہتے؟۔

اس کے اندر کا پانی پل پل اسے پینے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اپنا لہو پلا پلا کر خوش کرتی ہے کہ زندگی کی توسیع ضروری ہے۔ وہ بیس برسوں تک اس سنگ میل سے لگ کر بیٹھی رہی اور میں اپنے معمولات بلا کسی ترمیم و اضافے کے دہراتا رہا۔ دفتر، گھر، سڑک، امرود اور وہ۔ جینے کی مستقل راہیں۔ زندگی کی پانچ انگنائیاں۔ جیسے ان ہی انگنائیوں میں کھیل کود کر اپنے آپ کو منظر سے ہٹا لینا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

شاید زندگی کو کسی نہ کسی موڑ پر آ ہی جانا ٹھہرا تھا کہ ایک دن دفتر سے نکلا تو جیب خالی تھی۔ دفتر کے ساتھی سب ہی نکل چکے تھے۔ آفس سے نکل کر میں دیر تک شہر میں ادھر ادھر ٹاپلے کھاتا پھرا۔ اس امید میں کہ شاید وہ امرود والی میرا انتظار دیکھ کر سڑک چھوڑ دیگی اور اندھیرا ابھی اچھا خاصا بڑھ جائیگا۔ ایسا ہی ہوا۔

جب اندھیرا کچھ گہرا ہوا تو میں نے سائیکل کی پیڈل دبائی اور بڑی تیزی سے گھر کے لئے روانہ ہوا۔ اندھیرے میں مجھے ایسا لگا کہ اس سنگ میل سے ایک سایہ اب بھی چپکا ہے۔ اور وہ سایہ یقیناً وہی ہے جو اپنے ڈونگے میں ڈھیر ساری توقعات سجائے برائے فروخت لئے بیٹھی ہے۔

جب جیب خالی ہو تو اندھیرا اور بھی گہرا

ہو جاتا ہے۔ اسی گہرے اندھیرے میں چپکے سے آگے نکل گیا۔ مگر گھر پہنچا تو اچانک یاد آیا کہ بیوی کو A.T.S. کی سوئی لگوانی ہے۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر۔ ورنہ ٹٹنس سے وہ اکڑ جائیگی۔

جلدی جلدی دوا کیلئے کچھ پیسے لئے اور الٹے پاؤں شہر کی طرف لوٹنے لگا۔ سنگ میل کے قریب پہونچا تو ٹریفک جام تھا۔ لوگوں کی بھیڑ اکٹھی تھی۔ اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا۔ میں نے سائیکل سے اتر کر بھیڑ کی وجہ دریافت کی۔ جواب ملا "ارے پہلوان وہ اپنے امرود بس ایک ہی گاہک کے ہاتھ بیچا کرتی تھی۔ سارا دن بلاک آفس والے بابو کا انتظار کرتی اور وہی آکر اس کے امرود خریدتا۔ آج وہ بوڑھا بابو نہ آیا اس ہتھنی کے امرود خریدنے۔

"تو پھر کیا ہوا"

"ہونا کیا تھا، آج وہ خود ہی تمام امرود کھا گئی"

میں نے اس سنگ میل کی طرف دیکھا۔ ایک سایہ اب بھی اس سے چپکا تھا مگر ساکت۔ سڑک بالکل جام ہو چکی تھی۔ ہاتھی، گھوڑے، ٹم ٹم، بگھی اور سوار سب کے سب کھڑے تھے ساکت و خاموش۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ سکوت، یہ ٹھہراؤ اچھا لگنے لگا۔

کیا زندگی میں کچھ اچھا لگنے کے لئے اتنی مدت، اتنی خاموشی، اتنے ٹھہراؤ کی ضرورت پڑتی ہے؟ اس سوال کے ساتھ ہی میں نے سائیکل کی پیڈل دبائی مگر سائیکل آگے نہ بڑھ سکی کیوں کہ سائیکل کی چین نہ جانے کب اتر چکی تھی۔

پنبہ بگوش لوگو سنو یہ اختر الایمان ہے

یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ جو درجہ اردو افسانے میں قرۃ العین حیدر کا ہے وہی کم و بیش شاعری میں اختر الایمان کا ہے۔ اپنی زندگی کا ایک تہائی اردو شاعری پر نچھاور کرنے والا یہ شاعر اپنی عظمتوں کا اعتراف ناقدین سے گرچہ نہ کروا سکا مگر فن شعر کو یہ اعتراف ہے کہ اس شاعر کی بدولت اردو نظم کو سر بلندی حاصل ہوئی ہے۔

عجیب بات ہے کہ زندگی کا آغاز یتیم خانے میں کرنے کے باوجود اپنی شاعری کو اس تنفر اور تحقیر سے آلودہ نہ کیا جس کے مرتکب اس کے ترقی پسند ہم عصر ہوئے۔ حاکم طبقہ کے مظالم یقیناً ایسے تھے کہ دردمند شاعر کا دل ان کے تئیں نفرتوں کی آماجگاہ بن جاتا۔ ایک سچے فنکار کو یہیں پر خود کو سنبھالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر نہ سنبھل سکے تو شاعری جذب ہنگامی ہو کر رہ جائے گی اور اسے وہ دوام حاصل نہ ہوسکے گا جو بڑی شاعری کا خاصہ ہے۔ اختر الایمان بھی ایک بڑے شاعر تھے۔ غالب، نظیر اور ٹیگور کے زمانے میں ہندوستانی ترقی پسندی کا لیبل ایجاد نہ ہوا تھا۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان تینوں شعراء کو اپنے زمانے کے فرماں رواؤں کے مظالم کا احساس نہیں تھا اور پس ماندہ طبقوں کے افراد سے انھیں ہمدردی نہیں تھی۔ غالب اور ٹیگور دونوں ہی طبقۂ اشرافیہ سے تھے مگر ان کا رابطہ ہمیشہ نچلے طبقوں کے افراد سے رہا۔ غالب کی نچلے طبقات کے حالات و کوائف میں شرکت و دلچسپی سے آپ حضرات اچھی طرح واقف ہیں۔ ٹیگور کے یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ ٹیگور کے ڈرامہ "اچھے اپرشی" میں محنت کش طبقہ کی بالادستی کا خواب دیکھنا اور "گھرے بائرے" میں غریب مسلمان رعایا کو مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے ہندو راجہ کا محل سے نکل کر جلتی ہوئی بستی میں جا کر مارا جانا غریبوں کے لئے دردمندی کی ایسی نظیر پیش کرتا ہے جو شاید نامور ترقی پسند قلم کاروں کی تحریر میں بھی مشکل سے مل سکے، اور نظیر کے بارے میں تو ایک ہی خیال ہے کہ وہ اردو کا پہلا عوامی شاعر تھا۔ ان تینوں شاعروں نے اپنی برہمی کا اظہار بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے کیا۔ کہیں سطحیت کے شکار نہ ہوئے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں محاذوں پر لڑنے والے کئی سپاہی دنیا کے عظیم شاعر تصور کئے گئے ہیں۔ جنگ کی ہولناکی، انسان کے ہاتھوں انسان کشی اور اس سے پیدا شدہ حزن و ملال ان کی شاعری کی ترجیحات رہیں مگر دشمن کے سپاہیوں کے لئے گالی یا حقارت کا جذبہ ان کی شاعری میں کبھی نہ رہا۔

اختر الایمان کی پرورش بھی یتیموں کی طرح ہوئی۔ خیرات کی روٹی کی ستم کوشی کے پس پشت جو نام نہاد غیر طبقہ اور خیراتی حصول کے ظالم منتظمین کے خلاف ان کے باطن میں ایک جنگ ضرور تھی مگر اس جنگ کو تخلیقی سطح پہ لڑا۔ یعنی دل کے سارے غبار کو شاعری میں منتقل کر کے ایک ناقابلِ فراموش مرقع میں تبدیل کر دیا۔

اٹھو محبت کے پاسبانو
یہ کوہ و صحرا یہ دشت و دریا
تمہارے اجداد گا چکے ہیں
یہاں پہ وہ آتشیں ترانہ
جو گرمیٔ بزم تھا مگر اب
گزر گیا اس کو اک زمانہ



انیس رفیع

اصل نام — انیس الرحمٰن خان ولد حاجی محمد رفیع خان
قلمی نام — انیس رفیع
یوم پیدائش — ۵ جنوری ۱۹۴۵ء
جائے پیدائش — موضع سلیم آباد ضلع ا۔ ویشالی، بہار
تعلیم — ایم۔اے، ایل ایل بی، کلکتہ یونیورسٹی
ملازمت — ٹیچر مدرسہ عالیہ کلکتہ، اسلامیہ اسکول کلکتہ، ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف پالیٹکل سائنس، جے ایل کالج بہار یونیورسٹی رہنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی۔ موجودہ ملازمت دور درشن میں بہ حیثیت ڈائریکٹر (مظفر پور، بہار)
مستقل پتہ — ۴۰، رتو سرکار لین، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳
فون — (033) 235-2129
ادب و ثقافت — مولانا آزاد کالج کلکتہ سے ڈرامے اور لٹریری میگزین میں شمولیت کا آغاز۔ ۱۹۶۰ء
انگریزی اردو میں صحافتی مضامین کا سلسلہ۔ افسانہ نویسی کی مشق۔ مزاحیہ ڈرامے اور طنز و مزاح نویسی، رپورتاژ نگاری۔
افسانہ نویسی — باضابطہ افسانہ نویسی کا آغاز 'شاعر' بمبئی ۱۹۶۹ء سے
تصنیف — افسانوں کا مجموعہ 'اب وہ اترنے والا ہے' ۱۹۸۰ء سے قبل کی کہانیاں۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۴ء
ایوارڈ — Critic Circle of India (دلی) اردو اکادمی (یوپی) اردو اکادمی (مغربی بنگال)
کانفرنس، سیمینار — افرو ایشائی رائٹرز کانفرنس (Afro-Asian Writers' Conference) منعقدہ دلی ۱۹۶۹ء۔ اردو اکادمی دلی، اردو اکادمی مغربی بنگال، ہندی اردو کتھا سماروہ، الہ آباد۔ اردو اکادمی بہار، حلقۂ ادب، پٹنہ۔ ریسرچ کانگریس: خدابخش لائبریری پٹنہ۔ وغیرہ
فکر و نظر — سماج و ادب میں قائم نظریوں سے انحراف کا آغاز ۱۹۶۷ء سے۔ ایم اے سیاسیات کی طالب العلمی کے زمانے میں بنگال کی فکری کروٹ کے زیر اثر ترقی پسندی (نام نہاد) تنہائیت، اجنبیت (Alienation) کو ہوا دینے والی جدیدیت سے یکسر منحرف۔ اردو ادب میں Neo-Socio-Political realism کو اردو قارئین سے متعارف کرانے کی پہلی کوشش۔ جنس (SEX) یعنی Human Creative Energy کو تخلیقی ادب میں بطور علامت برتنے کا تجربہ۔ شعر و ادب میں اصلاحی اور (درسی) پند و نصائح کے پہلوؤں سے روگردانی کرتے ہوئے مواد و ہیئت کے نئے تجربے کی طرفداری (اب بھی جاری ہے)۔ انسانوں میں عقلیت، حکمت اور جذباتی صداقت کے امتزاج سے تازہ معنویت کی تعمیر کرنا میرے لئے مستحسن فعل ہے۔ لہٰذا جائز و ناجائز کی بحث میں کم الجھتا ہوں۔

سات گھڑے پانیوں والی عورت

سات گھڑے پانیوں والی ایک عورت۔

وہ اکثر کہا کرتی تھی۔

ہاں وہی امرود والی جو سڑک کے کنارے سنگ میل کے پہلو میں بیٹھا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی تمہاری نظر کبھی کبھی بہت میٹھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن اس مٹھاس کی بُو اس تک پہنچنے کے قبل ہی کہیں ادھر اُدھر کی جھاڑیوں میں بس جاتی اور وہ بس اسی سنگ میل کی طرح امرود کے ڈونگے کے ساتھ گڑی رہتی۔

یہ آئینہ جسے آج میں دیکھ رہا ہوں اور جسے بیس سالوں سے دیکھتا آرہا ہوں کبھی کچھ نہیں بتاتا، کبھی مجھے میری نظر تک نہیں پہنچاتا۔ ورنہ شاید مجھے یہ معلوم ہوتا کہ نظروں کی مٹھاس کیا شئے ہوتی ہے۔ ایک دن میں اسے یہ آئینہ ہی دے آؤں گا کہ اس جھوٹے پر اپنا عکس مل دے ورنہ یہ مجھے زندگی بھر ستائے گا۔ آخر یہ کیا کرشمہ ہے کہ جھوٹا آئینہ نہ کبھی ٹوٹتا ہے اور نہ کبھی کسی کے ہتھے چڑھتا ہے۔ اور اگر کسی دن چڑھ گیا تو نہ جانے میری بیوی مجھ سے کیا سوال کر بیٹھے اور آئینہ کوئی بے تکا سا جواب دینے سے بھی قاصر ہو جائے۔

وہ امرود کے ڈونگے کو دن بھر اگورا کرتی بلکہ ڈونگے سے زیادہ سڑک ہی اگورتی۔ آنے جانے والے اغل بغل سے خرید کر نکل جاتے۔ اور میں جب اپنی فائلوں سے پیچھا چھڑا کر اس سڑک سے گزرتا تو ڈونگے کے سب امرود کچھ کچے اور کچھ پکے، میرے حوالے کر دیتی اور میں چند سکے اس کے دست سوال پر رکھ دیتا۔ اپنی یہ عادت میری سمجھ سے باہر تھی۔ آخر میں یہ کچے پکے امرود کیوں خریدتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میرے یہ سکے کسی کی زندگی کی ڈور کو ایک ذرا لمبا کر دیتے ہیں۔

آتے جاتے موسموں نے مجھے کئی بار سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دن بھر اپنے اندر بھرے پانیوں کو دھوپ میں کیوں خشک کرتی ہے۔ اگر اسے زندہ رہنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنی بھوک امرود کھا کر کیوں نہیں بجھالیتی، میں اپنا یہ سوال اسکے سامنے برابر دہراتا۔ وہ میرے سوالوں کو برابر ٹال جاتی اور میں بھی ہمیشہ اس کے بچے کھچے امرود حسب معمول خرید لیتا۔

وہ بہت اداس تھی۔ ایک دن سائیکل کا پنکچر ٹھیک کرنے کے لئے سائیکل کو ایک دوکان میں رکھکر وقت گزاری اور امرود خریدنے اس کے پاس جا نکلا۔ میں نے اس کے بچے کھچے امرود خریدے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی کیوں کہ آج امرود کا ایک دانہ بھی نہ بک سکا تھا۔ منہ میں کھانے کے نام پر ایک کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی۔ وہ اٹھنے لگی تو ڈگمگائی۔ ڈگمگا کر پھر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی بات ایک بار اور دہرائی کہ جس دن من نہ کرے وہ سڑک پر نہ آئے گھر پر ہی امرود.......

اس نے فوراً ہی بات کاٹ دی۔ یہ سڑک ہی اس کی زندگی تھی۔ اس کا وجود لاوجود سب کچھ اسی سڑک پر منتشر اور یکجا ہوا ہے۔ خود کو سمیٹتی ہے تو اس سڑک پر ہوتی ہے خود کو بکھیرتی ہے تو بھی اسی سڑک پر ہوتی ہے۔ سڑک اور سنگ میل سے الگ وہ خود کو ایک ہلکی سی ناپید ہوتی شئے محسوس کرتی ہے۔ یہ سڑک اسکے پرکھوں نے بنوائی تھی۔ لیکن جو بناتا ہے وہ بھول جاتا ہے اور بتانے والا اسے بغیر یاد رکھے جی نہیں سکتا۔ اب یہ سڑک سیدھی گزر جاتی ہے۔ کبھی یہ اس کے دروازے سے ہو کر گزرتی تھی۔ مگر اب وہ سڑک کالوں کی بھینٹ چڑھ گئی ہے اور اب وہ خود دروازے سے چل کر اس جاتی ہوئی سڑک پر آتی ہے اور امرود کے ڈونگے سجا کر بیٹھ جاتی ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی شروع ہوا کرتا ہے دکھوں کا تہوار۔ انت۔ بالکل انت۔ سڑک کی میڈھ پر چڑھتے ہی بچے اسے چڑانے کی مشق کرتے۔ لونڈے طعن کی کمان پر تیر چڑھائے اسے چھلنی کرنے کے وجوہات ڈھونڈنے لگتے۔ کوئی کہتا ''اس سڑک پر گھوڑے اور سانڈ دوڑتے ہیں ہاتھی تو اسے سونگھتا بھی نہیں''۔ وہ بھی انہیں جواباً کہتی ''یہ بھاگتے ہوئے ہاتھی، گھوڑے اور سانڈ اسے پسند نہیں، بلکہ سخت ناپسند ہیں'' اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ خود یہ سڑک بڑی نرم اور کٹھور ہے۔ اس نے اپنی پیٹھ پر جیسے پھسلن کی لیپ چڑھا رکھی ہو۔ اس پر چلنے کیلئے گول پہیے کی ضرورت ہے، ٹانگوں کی نہیں۔ اک ذرا کسی نے اس پر پاؤں دھرا کہ پھسلا۔ پل بھر کے لئے بھی کوئی ٹک نہیں پاتا۔ بریک اور لگام اگر آدمی نے نہ ایجاد کئے ہوتے تو شاید سارا اتہاس اس سڑک سے پھسل کر خندقوں میں گر جاتا۔ (اور جب ہم سے ہمارا اتہاس ہی روٹھ جائے یا چھن جائے تو جینے یا مرنے کی تفصیل کی اہمیت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ پھر کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ مرنے والا مرتے سمے چاک سے بلیک بورڈ پر اپنا نام لکھ کر

تالیفات جو زبان و بیان کے اغلاط کی نشاندہی سے آگے نہیں بڑھتیں۔ یہاں تک کہ علامہ وحشت نے اپنے پیشرو و بنگالی شعراء پر جو سرسری مضامین لکھے، ان میں اس طرح کی آرا پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۱) ''۔۔۔۔ کلام کا رنگ وہی ہے جو ان کے لکھنؤ اور دلی کے معاصرین کا تھا''۔

(مضامین وحشت صفحہ نمبر ۔ ۱۸)

(۲) ''۔۔۔۔ نساخ، ناسخ، و آتش کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ موجودہ زمانے میں ان کا کلام پھیکا ہی معلوم ہوگا''۔ (صفحہ نمبر ۱۹۸)

تنقید کو اس کے پیروں پر ایستادہ کرنے میں یہ جزیات کتنے معاون ہو سکتے ہیں؟ ذرا سوچئے۔

(۲) فن تنقید کی بات جب بھی کی جائیگی لازمی طور پر اس کی تعریف اور تعینِ قدر کے سوالات ذہن میں اٹھیں گے۔ ادبی تنقید ایک مشکل فن ہے۔ تنقید کے نصابوں میں اسکی گوناگوں تعریفیں ملتی ہیں۔ میں ان کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ تنقید ایسا نہیں ہے۔ تنقید اعتراض اور نکتہ چینی نہیں ہے۔ یہ محض توصیف و تحسین بھی نہیں ہے۔ تنقید دراصل عملِ احتساب ہے۔ تخلیقی حیثیت کی شناخت اور ادبی مرتبے کا تعین ہے۔ نقاد فن پارے کے حسن و قبح کا تجزیہ کر کے اس کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ اس لئے نقد ادب سے پہلے فہم ادب کی منزل ہے۔ ادب کے اندر ادیب کے فکر و احساس اور اسالیب بیان کے جتنے اسرار مخفی ہیں نقاد انہیں ایک ایک کر کے بے نقاب کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ علوم جدیدہ اور عصری رجحان و رویہ سے بھی رجوع کرتا ہے تاکہ تخلیقات کی زیریں لہروں کو گرفت میں لے سکے۔ اس کی زبان سر تا سر تنقیدی ہوتی ہے اور اس کے اخذ کردہ نتائج دوٹوک، معروضی اور غیر تعصبی ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں کسی شاعر پر تبصرہ کرتے ہوئے جب کوئی نقاد یہ کہتا ہے کہ وہ فلاں کے رنگِ سخن میں ڈوبا ہوا ہے یا اعزاز افضل کا شعر پرویز شاہدی کے رنگ میں ہے تو یہ کلمات مجھے غیر تنقیدی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو پرویز شاہدی میں انفرادیت نہیں تھی یا پھر اعزاز افضل کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اگر تنقید شاعرانہ خصوصیات اجاگر نہ کر سکے تو یہ اس کی کوتاہی ہے۔ وہ دن گئے جب سبھوں کو ایک لاٹھی سے ہانک دیا جاتا تھا۔ بنگال میں تنقید کے نام پر جو لکھا گیا ہے وہ پیش پا افتادہ، اکہرا، اور تعمیم زدہ ہے۔ الفاظ کے ہیر پھیر سے ایک ہی بات دوسری جگہ چسپاں کر دی جاتی ہے۔ تنقید فیشن یا فارمولا نہیں ہے کہ جو چاہے اپنا لے۔ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک۔۔۔ ''یا یہ مقالہ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے'' یا کسی کسی شعر میں پرویزیت بھی جھلکتی ہے'' (صفحہ ۲۷۱) جیسے گول مول فقرے ممدوح کے خواص بیان کرنے کے بجائے محض رائے زنی (Comment) پر محمول ہیں۔ آخر کوئی تو خوبی ہے جو مومن اور فیض کے درج ذیل متحد المعنی شعروں کی انفرادی شان ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
(فیض)

یہ اور اس قبیل کی دوسری خوبیوں کی نشاندہی کیلئے بہت سی اصطلاحیں بروئے کار آتی ہیں جو تنقیدی کاروائی کو موثر اور مربوط بناتی ہیں۔ جدید اردو تنقید نے ادب کی تفہیم و تفسیر کے سلسلے میں بہت سی اصطلاحیں رائج کی ہیں۔ جس سے استفادے کا عمل جاری رہے گا۔

(۳) ۲۰ ویں صدی ادبی تنقید کی صدی ہے۔ مغرب کے نقادوں نے ادبی مباحث میں بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ برصغیر میں بھی اردو تنقید مائل بہ ارتقاء ہے۔ تنقید کے سبھی دبستانی اصول برتے گئے ہیں۔ تاثراتی تنقید (جو کہ خالص وجدانی اور ذوقی چیز ہے) اب بھلائی جا چکی ہے، اس کی جگہ تنقید کے ہمہ گیر اصول ادب و تہذیب کے رشتوں پر غور کرنے کیلئے برتے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً جہاں تنقید کی مجموعی فضا کھلی کھلی سی نظر آتی ہے۔ اس کے برخلاف مغربی بنگال میں انقباض پایا جاتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ نہ تو یہاں تنقیدی ذہن پایا جاتا ہے اور نہ تنقیدی اصول و اکتسابات کی جلوہ گری۔ تنقیدی ذہن تو خیر فطرت کی دین ہے مگر وسعت مطالعہ اور فنی جستجو کے بغیر آپ دشت تنقید میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ سہل پسندی کی شکار تحریروں کا جو حال ہونا چاہئے۔ اس کا نظارہ یہاں عام ہے۔

(۴) ہمارے یہاں تنقید کا جو المیہ ہے اسے یہاں کے ادب کا المیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ جب کسی ماحول میں شعر و ادب کے اعلیٰ نمونے ظہور میں آتے ہیں تو تنقیدی اذہان کو مہمیز لگتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر عظیم تخلیقات اصرار کرتی ہیں کہ انہیں توجہ سے پڑھا جائے اور ان کے محاسن اجاگر کئے جائیں۔ آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں تو میں عرض کروں کہ بنگال میں ایک بھی فنکار ایسا نہیں ہوا جسے بڑا فنکار کہا جائے۔ بڑے ادب کی عدم موجودگی میں تنقیدی کاروائی بے اثر رہتی ہے۔ اب اگر دو چار نقاد ہوتے بھی تو صورتحال کتنی مختلف ہوتی؟۔ مثال کے طور پر جاوید نہال اور اعزاز افضل پر شائع شدہ نمبروں کا مطالعہ کریں تو واضح ہوگا کہ ان میں سوانحی اور شخصی باتیں زیادہ اور فنکاری کا محاسبہ کم کم ہے۔ توصیفی کلمات پر کسی کی کاوش کو ٹال دینا آسان ہے مگر شاعر و

ادیب کی تخصیص اور اہمیت بیان کرنا مشکل مرحلہ ہے۔ اور تنقید ایک مشکل فن ہے۔

(۵) تنقیدی کارناموں کیلئے تنقیدی ماحول کا ہونا از بس ضروری ہے۔ بنگال میں تنقیدی ماحول کی افسوسناک کمی ہے۔ تنقیدی ماحول سے میری مراد بحث و تمحیص سے پُر وہ سرگرمیاں ہیں جو نت نئے موضوعات کو راہ دیتی ہیں۔ عصری ادب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی اقدار کے تئیں نئے زاویے وضع کئے جاتے ہیں۔ شعر وادب کے حوالے سے فنکار کی شخصیت کی دریافت کے ساتھ ساتھ تہذیبی رجحانات پر روشنی ڈالی جاتی ہے نیز متنازعہ ادبی مسئلہ حتمی رخ اختیار کیا جاتا ہے۔ سمینار کے نام پر ہمارے یہاں اکہرے موضوعات پر Paper-Reading ہوتی ہے۔ مثلاً حسرت موہانی پر سمینار، وحشت کلکتوی پر سمینار، بنگال میں اردو شاعری پر سمینار، بنگال میں نثری اصناف پر سمینار منعقد ہوتے ہیں تاکہ نزاعی مسئلہ پر قطعیت کے ساتھ نتائج اخذ کئے جائیں۔ ہندوستان میں بھی عرصہ ہوا اس نوع کے مذاکروں کی ابتدا ہو چکی ہے۔ دہلی میں گوپی چند نارنگ نے اردو افسانہ پر سمینار کے طویل اجلاس اور ورکشاپ کا اہتمام کیا تھا۔ اس طرح صنف افسانہ کے مسائل و معاملات پر یر حاصل گفتگو بے شمار غلط فہمیوں کے ازالے کا سبب بنی۔ ماضیٔ قریب میں ایسے دو سمینار مرحوم ظفر اوگانوی کی تحریک پر منعقد ہوئے تھے۔ ایک "موجودہ اردو ادب اور عصری حسیت" خضر پور میں اور "بنگال میں اردو شاعری ـــــ مسائل اور امکانات" ہوڑہ میں۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر فکر انگیز مسائل پر تنقیدی نوعیت کی محفلیں آراستہ نہ ہوں تو وہ ماحول کہاں سے تیار ہوگا جو نئی اور پرانی دونوں نسل کے افراد کو برانگیختہ کرے۔ بنگال میں ان عوامل کی عدم موجودگی تنقیدی کارناموں کے رواج میں مانع ہے۔

(۷) ادب کے کسی مرکز میں تنقید کا بازار سب سے پہلے وہاں کے شاعروں نے گرم کیا ہے۔ شاعر کی تنقیدی بصیرت بجائے خود ایک دلیل ہے۔ اردو تنقید کی پہلی اینٹ مولانا حالی نے رکھی جو ایک اچھے شاعر بھی تھے بعد ازاں یہ روایت اتنی مستحکم ہوئی کہ آل احمد سرور، فراق، شمس الرحمٰن فاروقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وزیر آغا۔ وحید اختر اور سردار جعفری کے نام بغیر کسی کاوش کے زبان پر آجاتے ہیں۔ مغربی بنگال کے بعض شعراء نہایت رچے ہوئے شعور کے ہیں لیکن ان کی طرف سے عملی یا نظری تنقید کی شروعات نہیں ہوئی۔ آخر مصرعۂ طرح دیکر بھی مشاعرہ کے لئے غزل لکھوائی جاتی ہے نا۔

یہ ہیں وہ اسباب جو مغربی بنگال میں تنقید کی نمود میں مانع ہیں۔ ان اطلاعات کی روشنی میں یہاں تنقید کی نمود کیلئے کن اقدامات کی ضرورت ہے سر دست مجھے اس سے علاقہ نہیں۔ البتہ مضمون ختم کرنے سے قبل اُن اصحاب قلم کا مختصر ذکر کرنا چاہونگا جن کی تحریریں تنقید نما ہوتی ہیں۔ سالک لکھنوی، شاہ مقبول احمد، جاوید نہال، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، ڈاکٹر عبدالرؤف کا مطالعہ گہرا اور نقطۂ نظر تقابلی ہے لیکن ان کا خاص میدان تحقیق و تدوین ہے۔ تنقیدی لب ولہجہ والے مضامین کم بہت کم پائے جاتے ہیں۔ شانتی رنجن کے ذخیرۂ مضامین میں مجھے تلاش کے باوجود ایک بھی تنقیدی بیان نہیں ملا۔ جو کچھ ہے Descriptive ہے۔ جاوید نہال کے یہاں معیار سازی اور استدلال کی کمی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ ادب کے استاد تھے، خاصا وقت ادب کی تدریس میں دیا تھا۔ لیکن ان کے مباحث فکر و فن کے تمام اوصاف پر محیط نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عبدالمنان کے یہاں مباحث سے زیادہ تزئین کاری اور محاکمہ سے زیادہ کاریگری ملتی ہے۔ وہ بے روح الفاظ کا جال بُن کر اس میں خود قید ہو جاتے ہیں۔ سالک لکھنوی کلکتہ کی ادبی دنیا میں نادر مظہر ہیں۔ انہوں نے نظم و نثر کی آئینہ سازی میں اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی نثر میں ایجاز، شفافیت اور کلاسیکی رکھ رکھاؤ بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہی رکھ رکھاؤ اور شرافت نفس انہیں سب کی حوصلہ افزائی پر مائل کرتی ہے۔ وہ ترک و اختیار کا معیار نہیں برتتے اور تنقید اکہری اور توازن سے عاری ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ظفر اُوگانوی بطور افسانہ نگار کافی شہرت رکھتے ہیں لیکن انکی ذات میں ایک نقاد سانس لیتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں تنقیدی ذہن رکھتے تھے۔ ادبی مسئلہ کی تہہ میں اترنے، اسے استدلال کا جامہ پہنانے اور تنقیدی بیانات کے ذریعہ معیار و اقدار کی جستجو انہیں اپنے معاصرین میں انفرادی مقام عطا کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے اندر اور باہر ادب کو بطور ڈسپلن عام کرنے میں ان کی عملی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی تحریروں میں بھی تنقید کا تفاعل کچھ کم نہیں۔ خاص طور سے انہوں نے بعض افسانوں کے عمدہ تجزیاتی مطالعے پیش کئے ہیں۔ مجھے ان اسباب کا علم نہیں کہ انہوں نے عملی تنقید پر مبنی مضامین اتنے تھوڑے کیوں لکھے۔ وہ اردو کو جو کچھ دے سکتے تھے اس کا عشر عشیر بھی نہ دے سکے۔ بہر کیف ان کے مضامین کی تنقیدی سطح بلند ہے۔ لیکن مجموعی طور پر بنگال میں تنقید کے نام پر لکھی جانے والی تحریروں میں تنقیدی بصیرت کا فقدان نظر آتا ہے۔ ان میں درج مباحث اکہرے، پیش پا افتادہ اور تعمیم زدہ ہوتے ہیں۔ ایسے میں دوسروں کو متاثر کرنے یا برانگیختہ کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

نیا سال

سبھی کہہ رہے ہیں۔ ''نیا سال آیا''
میں ہر جنوری میں یہی سنتا آیا ہوں بچپن سے ابتک
مگر آج تک یہ سمجھ میں نہ آیا
یہ خوشیاں، یہ جشن و طرب کس لئے ہیں؟
نئے سال میں ہوگا آخر نیا کیا؟
نیا سال بھی ہوگا سالِ گزشتہ کے جیسا
جو ہو تا رہا ہے وہی پھر سے ہوگا
وہی خونی منظر، فسادات، دنگے
وہی ظلم و جبر اور وہی بے ایمانی
غریبی پہ حاوی امیری رہے گی
وہی لوگ ہونگے، وہی دن بھی ہوگا، وہی رات ہوگی
وہی ہوں گے دیوار و در اور آنگن
وہی اپنی حالت جو کل تھی رہے گی
نہ بدلے گا موسم، نہ بدلے گی دنیا
نیا کچھ نہ ہوگا
پرانی رہے گی ہر اک شئے یہاں کی
فقط اک کلنڈر نیا ہوگا دیوار پر!!

غزلیں

لوگ کتابیں، ناول، اور رسالے پڑھتے ہیں
اپنا شوق الگ ہے ہم تو چہرے پڑھتے ہیں

مسجد سے بھی اچھے مجھ کو لگتے ہیں اسکول
کیونکہ ان میں ننھے ننھے فرشتے پڑھتے ہیں

دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں ہم تب اپنے بچے
ہنستے، کھیلتے، کھاتے، پیتے، لکھتے، پڑھتے ہیں

آج کی آہٹ میں سن لیتے ہیں کل کی آواز
حال میں ہم مستقبل کے اندیشے پڑھتے ہیں

جس پستک میں لکھے ہوئے تھے گاندھی کے اقوال
اس پستک کو اب دیمک اور کیڑے پڑھتے ہیں

رقص میں شعلوں کے شامل ہیں در پردہ وہ بھی
دیر و حرم میں جو دن رات صحیفے پڑھتے ہیں

منصب، تمغے، اونچے عہدے ملتے ہیں ان کو
شان میں حاکمِ دوراں کی جو آج قصیدے پڑھتے ہیں

دوانہ جن کو ہیں کہتے، عجیب ہوتے ہیں
کہ ایسے لوگ تو سب سے عجیب ہوتے ہیں
جو دیکھنے میں تو لگتے ہیں آدمی کی طرح
وہ بستیوں کے درندے عجیب ہوتے ہیں
رُتوں کے ساتھ بدلتے ہیں خال و خد انکے
سیاسی لوگوں کے چہرے عجیب ہوتے ہیں
گزار دیتے ہیں عمریں بس ایک وعدے پر
کسی کو چاہنے والے عجیب ہوتے ہیں
چراتا ہے کوئی ان کو نہ مانگتا ہے کوئی
یہ درد و غم کے خزانے عجیب ہوتے ہیں
انا کو بیچ کے جیتے ہیں کس طرح جانے
امیرِ شہر کے چمچے عجیب ہوتے ہیں
کمالؔ سب سے الگ ہے تمہارا طرزِ سخن
غزل کے شعر تمہارے عجیب ہوتے ہیں

منزل نہ کوئی راہنما گھر سے چل پڑے
آوارگی کا لینے مزہ گھر سے چل پڑے

گوتم کی طرح ہم نے بھی چپ چاپ ایک رات
گھر میں کسی سے کچھ نہ کہا گھر سے چل پڑے

رختِ سفر میں باندھ لیا ہم نے اے کمالؔ
بیوی کا بوسہ، ماں کی دعا، گھر سے چل پڑے

ایک گوشے میں پڑا رہتا ہے بوڑھا گھر میں
طاق پر جیسے کہیں کوئی صحیفہ گھر میں
رٹتا رہتا ہے شب و روز ترا نام فقط
دل ہے سینے میں مرے یا کوئی طوطا گھر میں
بوڑھے ماں باپ کی خدمت میں لگا رہتا ہوں
میرا کعبہ بھی ہے گھر میں میرا طیبہ گھر میں
وہ مصاحب ہے وہ دربار میں یوں رہتا ہے
جیسے رہتا ہو کوئی پالتو کتا گھر میں
ایک تنہائی ہے، سناٹا ہے، خاموشی ہے
اپنے گھر میں نہیں رہتا ہوں میں مردہ گھر میں
میں وہ مسلم ہوں جو گاتا ہے بھجن بھی اکثر
میں وہ کافر ہوں جو رکھتا ہے مصلا گھر میں
قیدیوں رہتے ہیں دل میں مرے دنیا کے غم
جانور قید ہوں جیسے کسی چڑیا گھر میں
ہم غریبوں کے مقدّر میں کہاں عید بھلا!
سال بھر رہتا ہے روزے کا مہینہ گھر میں
پہلی تاریخ مہینے کی ہے سو آج کمالؔ
سب کا پیارا ہوں میں سب کا ہوں چہیتا گھر میں

یوں چکھو تو پھیکا پانی
پیاس لگے تو میٹھا پانی
لوگ سزائیں کاٹ رہے ہیں
دنیا بھی ہے کالا پانی
اس کی سخاوت اللہ اللہ!!
بھوکے کو ہے دیتا پانی
چاہت کا اندازہ کر لے
میں پیاسا تو ٹھنڈا پانی
حق گوئی کا مجرم ہوں میں
بند ہے میرا حقہ پانی
میری آنکھ سے بن کر نکلا
خون کا اک اک قطرہ پانی
دیکھا، پرکھا، سوچا، سمجھا
پانی پیسہ، پیسہ پانی

نام : اشفاق احمد
سال ولادت : نومبر ۱۹۶۱ء
والد ماجد : الحاج غلام مصطفےٰ
رہائش : ۶۔ڈی مولانا محمد علی روڈ (خضر پور) کلکتہ ۷۰۰۰۲۳
آبائی وطن : ضلع گیا (بہار)
تعلیم : اردو ادب میں ایم۔ اے (کلکتہ یونیورسٹی)
پیشہ : ملازمت، محکمہ سیلز ٹیکس (حکومت مغربی بنگال)
انعامات : امتحانات میں نمایاں کامیابی پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی اور کلکتہ یونیورسٹی کے انعامات
مشغلہ : وقتاً فوقتاً ادبی مقالہ نگاری



اشفاق احمد

بنگال میں تنقید کیوں نہیں؟

"مغربی بنگال میں آزادی کے بعد کے ادبی سرمائے کا جائزہ لیجئے تو سب سے حیرت انگیز حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ اس علاقے میں جہاں فورٹ ولیم کالج کے وسیلے سے اردو میں عام فہم ادبی نثر کی بنیاد پڑی تھی، آج قابل ذکر نثر نگاروں کی تعداد افسوسناک حد تک کم ہے۔ میری یہ بات بے موقع اور بے محل بھی نہیں ہے کہ علامہ وحشت اور پرویز شاہدی سے لیکر علقمہ شبلی اور منور رانا تک تخلیق کاروں کا ایک طویل کارواں ہے جس سے ہماری تنقید بے اعتنائی برتتی چلی آرہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر اس خطے نے دو چار نقاد بھی پیدا کئے ہوتے تو صورتحال یقیناً مختلف ہوتی!"

یہ کلمات ڈاکٹر مظفر حنفی کے مضمون "مغربی بنگال کا شعری مزاج" کے بالکل آغاز میں درج ہیں۔ واضح رہے کہ یہ مضمون "روح ادب" کے "بنگال میں اردو شاعری نمبر بابت ۱۹۸۵ء" میں شامل ہے۔ یہاں دو مسلمات کا اعادہ کیا گیا ہے۔ پہلا تو یہ کہ جس خطے میں سادہ اور سلیس نثر کی بنیاد پڑی وہاں آج قابل ذکر نثر نگاروں کی کمی ہے۔ دوسرے یہاں کے شعراء تنقید گزیدہ رہے ہیں۔ آخری بات بھی قریب قریب مسلم ہی ہے کہ اس خطے نے دو چار نقاد بھی پیدا کئے ہوتے تو صورتحال یقیناً مختلف ہوتی! مطلب یہاں ایک بھی نقاد نہیں ہوا۔ جو بات ڈھکے چھپے انداز میں بیان ہوتی یا پھر نجی گفتگو کا موضوع بنتی مظفر صاحب نے اسے برملا کہہ دیا۔ خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کیلئے مسلم انسٹی ٹیوٹ نے ایک سمپوزیم منعقد کیا ہے۔ بنگال میں تنقید نگاروں کی کمی کے اسباب پر غور وخوض کے بعد جو نکات میرے ذہن میں آئے وہ یہاں بے کم وکاست درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) ادب کیا زندگی کے ہر شعبے میں روایت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہر کارنامے کا عکس پچھلے نقوش میں موجود ہوتا ہے۔ اردو میں ادبی نثر کے نقوش گہرے پڑ چکے تھے۔ جب فورٹ ولیم کالج نے انہیں سلیس اور صیقل کیا۔ بنگال میں شاعری اور نثر نگاری دونوں کی خوشگوار روایت ہے لیکن تنقید کی نہیں۔ واضح رہے کہ ادبی نثر اور ادبی تنقید مترادف اصطلاحیں نہیں ہیں۔ کسی دور ادب کی تاریخ قلمبند کیجئے جزوی طور پر سہی دورِ زرّیں کی منزل آتی ہے۔ بنگال میں تنقید کی نہ کوئی تاریخ ہے نہ دورِ زرّیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ روایت سازی قدما کا وطیرہ سمجھا جاتا ہے۔ بنگال میں جو تذکرے لکھے گئے ہیں اس کا تنقیدی حصہ بہت کمزور ہے۔ زیادہ سے زیادہ "انتخاب نقص" اور اس طرز کی دیگر

جملے ہوا کرتے تھے۔ خاص طور سے Aesop کی کہانیاں اس سلسلے میں کافی شہرت رکھتی ہیں۔

ہمارے یہاں بچوں کے مشاغل پر یا انکی بلا واسطہ تجرباتی تربیت کے لئے جسے مجملاً ڈائرکٹ اکسپرینس کہا جاتا ہے، کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔ صرف کہانیوں اور نظموں کو ہی اہم سمجھ کر تخلیقات پیش کی جارہی ہیں مگر بچوں کی ذہنی نشو نما میں انکے مشاغل کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کیلئے انکی خاص اہمیت ہے۔ ان مشاغل میں مختلف طرح کے کھیل، پتے، پنکھ اور سکے اور ٹکٹیں جمع کرنا، جلد سازی، تصاویر اور خبروں کا البم تیار کرنا، کھلونے بنانا، باغبانی وغیرہ شامل کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہندستان گیر پیمانے پر بھی بہت کم کتابیں سامنے آئی ہیں جن میں ''ڈاک ٹکٹ کی داستان''، ''پھول اور میں'' اور ''پرندوں کی دنیا'' اہم ہیں۔ ویسے فزیکل ایجوکیشن کے نام پر کچھ درسی کتابیں تجارتی نکتۂ نظر سے ضرور لکھی گئی ہیں مگر ان سے بچوں کی ضرورت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ حقیقتاً یہ مشاغل تکنیک اور مہارت سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں ادب کے زمرے میں داخل نہیں کیا جاسکتا پھر بھی نشو نما اور تعمیر سیرت و شخصیت میں ان کا اہم کردار ہوتا ہے لہٰذا بچوں کی ضرورتوں کے پیش نظر اس طرف توجہ دینا بھی ہمارا فرض بنتا ہے۔

بچوں کے لئے تخلیقی ڈراموں کا فقدان ہے۔ اس سلسلے میں کمال احمد اور ظہیر انور کی طرف نظریں اٹھتی ہیں۔ محترمہ شہناز نبی نے بنگلہ سے بچوں کیلئے ڈرامے ترجمہ کئے ہیں۔ محترمہ خالدہ حسینی بھی بنگلہ اور دیگر زبانوں سے بچوں کیلئے کہانیاں ترجمہ کرتی ہیں جو شائع ہوتی رہتی ہیں۔ علقمہ شبلی کی ''بوستاں کی کہانیاں''، اور سالک لکھنوی کی چند ایک نظمیں اور ترجماتی ادب کے قلیل ترین اثاثے ہیں۔ ترجمے کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ضرور ہے مگر بچوں کے ادب میں ان کا داخلہ خطرے سے خالی نہیں۔ بلکہ میں تو انہیں بچوں کیلئے شجر ممنوعہ گردانتا ہوں کیونکہ میری نظر میں ان سے مندرجہ ذیل خرابیاں راہ پاجانے کا خدشہ ہوتا ہے

(۱) ترجماتی ماحول میں بچے اجنبیت محسوس کرتے ہیں اور انکی دلچسپی ختم ہوجاتی ہے۔

(۲) اپنی زبان سے متعلق انکے اندر احساس کمتری جنم لے سکتی ہے۔

(۳) مقابلتاً دوسری زبانوں کے اپنی زبان کے ادیبوں کے تعلق سے بے اعتنائی بے ہنری اور کم مائیگی کا تصور بچوں کے ذہن میں پرورش پاسکتا ہے۔

(۴) ادیبوں میں تساہلی پیدا ہوتی ہے اور تخلیقی صلاحیتیں بتدریج ماند پڑتی جاتی ہیں اور آسانی سے دستیاب کتابوں کے ترجمے سے عہدہ برآ ہونے کی عادت پڑجاتی ہے۔

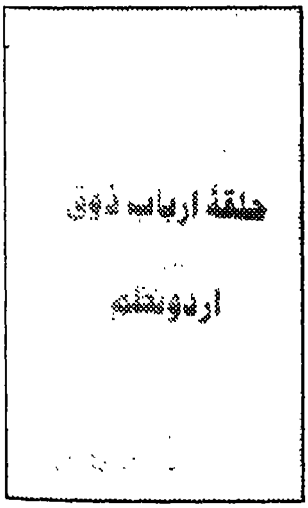
۵ سے پندرہ (۱۵) برسوں تک کے بچوں کیلئے تو اسے سم قاتل ہی کا درجہ دینا چاہئے تکنکی اور معلوماتی کتابوں کی بات دوسری ہے۔ اس عمر کے بچوں کیلئے بلاواسطہ ترجمہ کے بجائے اخذ مواد سے کام لیکر اپنے ماحول کے مانوس حیطۂ عمل میں کرداروں کی پیشکش اس طرح ہونی چاہئے کہ ماخوذ پر تخلیق غالب رہے جس طرح مشہور روسی ادیب ٹالسٹائی نے AESOP کی جرمن FABLES کا روسی زبان میں ترجمہ تو کیا تھا مگر کہانیوں کے حرکت و عمل کو اپنے ماحول کا رنگ دیکر آزادانہ تخلیق کا درجہ دے دیا تھا۔

مہماتی کہانیوں اور سائنس فکشن کی کمی کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح سے مملو کہانیاں یا مضامین کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ یوں تو پورے ہندوستان میں بچوں کیلئے اس ادب کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے مگر بنگال کی سر زمین میں شاید یہ بیج بوئے ہی نہیں گئے۔ یہاں بھی یوسف ناظم کی تصنیف ''پلک نہ مارو'' اور ظ۔ انصاری کی کتاب ''حاجی بمبا کی ڈائری'' ہی سے جذبۂ مزاح کی تسکین ہوتی ہے۔

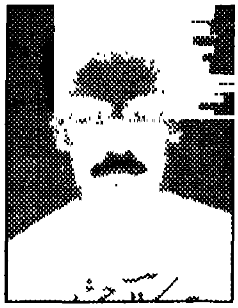
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کا نثری ادب مغربی بنگال کی سر زمین پر بے حد تشنہ ہے اور ادباء و شعراء سے سنجیدگی کے ساتھ توجہ کا طالب ہے۔



نور پیکر کا شعری مجموعہ
سرابوں کے درمیان



حلقۂ ارباب ذوق
زرینہ زریں کی تحقیقی کتاب



احمد کمال حشمی

نام : احمد کمال حشمی
قلمی نام : احمد کمالؔ حشمی
ولدیت : محمد حشم الدین (حشمؔ الرمضان)
پیدائش : ۲۴ اگست ۱۹۶۵ء
آبائی وطن : بلیا (یو۔پی)
تعلیم : بی۔ایس۔سی
پیشہ : ریونیو آفیسر شعبۂ ارضی و اصلاحاتِ ارضی ، حکومت مغربی بنگال
آغاز شاعری : ۱۹۸۷ء
تالیف : "آیاتِ سخن" (کلکتہ کے مضافات کی شاعری کا انتخاب)
زیرِ ترتیب : دستِ خزاں (غزلوں کا مجموعہ)
سنگِ بنیاد (تضمینوں کا مجموعہ)

پتہ : ۱/۲۸/ایچ، گلی نمبر ۲ نیا بازار
کانکی نارہ۔ ۷۴۳۱۲۶
فون : ۵۸۱-۰۲۷۴ (۰۳۳)

ماھئے

محفوظ ہے ساحل پر
وہ یہ سمجھتا ہے
افسوس ہے جاہل پر

یہ چڑھتی جوانی ہے
اس پہ نہیں قابو
سیلاب کا پانی ہے

زخموں پہ نمک رکھدے
درد لگے میٹھا
کچھ دل میں کسک رکھدے

ہم شام سے بیٹھے ہیں
پوچھ یہ مت ہم سے
کس کام سے بیٹھے ہیں

ہائیکو

آنکھیں ہیں بے خواب
جیسے کوئی ندی ہو
برسوں سے بے آب

لفظوں کا انبار
لیکن معنی کی قلت
گھٹنوں تک سرمار

جھینگر کی آواز
جانے کب تک آئے گا
ہمدم اور ہمراز

چھوٹا اسٹیشن
چھک چھک چھک چھک کرتی ریل
بوجھل بوجھل من

ہاتھوں میں اخبار
میز پہ چائے کی پیالی
من بھائے اتوار

چھوٹا سا تالاب
جس کو کہتے ہیں سب آنکھ
اس میں بھی سیلاب

جاگتی آنکھوں کا سپنا

سارے سپنے
بند آنکھوں سے
دیکھے جاتے ہیں
اور جب
آنکھیں کھلتی ہیں تو
سارے سپنے
مٹی میں مل جاتے ہیں
لیکن
جیون وہ سپنا ہے
جو جاگتی آنکھوں سے
دیکھا جاتا ہے
اور جب آنکھیں
بند ہو جاتی ہیں
یہ خواب
ادھورا رہ جاتا ہے

گٹھری کا بوجھ

مرے سر پہ گٹھری
جو رکھی ہوئی ہے
بہت وزنی ہے
اسمیں
شان اور تکبر
غرور اور نخوت
کے پتھر بندھے ہیں
میں برسوں سے
یہ بوجھ سر پر اٹھائے
جئے جا رہا ہوں
میں اس کے تلے دب کے
آہستہ آہستہ
خود ذات میں اپنی
دھنستا چلا جا رہا ہوں
میں کوتاہ قد اور کوتاہ گردن
بھی ہونے لگا ہوں
یہ محسوس کر کے
میں یہ سوچتا ہوں
کسی دن
میں اس وزنی گٹھری
کو رکھ دوں زمیں پر
مگر۔۔۔
ایسا کرنے میں
مجھ کو مرا سر
جھکانا پڑے گا
جو میری طبیعت کو
ہرگز
گوارا نہیں ہے۔

ہیں۔ ۵ سے ۱۵ برس کی عمر بچوں کے ادب کے لئے بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیوں کہ اس دوران میں اگر مناسب نشو نما اور ہمہ جہت ترقی کا خیال نہیں رکھا جائے اور انکی گونا گوں نفسیاتی ضرورتوں کی تکمیل میں کمی ہو تو پھر بچے کی شخصیت خط مستقیم کے بجائے خط منحنی پہ چل نکلتی ہے۔ لہٰذا یہ احساس بہت ضروری ہے کہ جو ادب ہم ۵ برس کے بچے کے لئے لکھ رہے ہوں کہیں وہ ۱۲ یا ۱۵ برس کی عمر کے بچے کیلئے تو نہیں تیار ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں بچوں کے ذخیرہ الفاظ پر بھی عمر کے لحاظ سے تجربے ہوئے ہیں جن کو مدِ نظر رکھ کر اگر ادب کی تخلیق کی جائے تو بچوں کی عمر اور انکے لئے تخلیق کردہ ادب میں مناسبت رکھی جا سکتی ہے۔ ایک مشہور لسانی ماہر اسمتھ کے مطابق عمر کے اعتبار سے بچوں میں بتدریج لفظیات کا ذخیرہ مندرجہ ذیل طور پر ہوتا ہے۔

عمر (سال)	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۱۲
ذخیرۂ الفاظ	۴	۲۷۲	۸۹۶	۱۵۴۰	۲۰۷۲	۲۵۷۲	۱۵۰۰۰

علاوہ بریں ہم کیوں لکھتے ہیں کی طرف بھی اگر توجہ رہے تو ہماری پیش کش مزید ذمہ دارانہ ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں نمونۃً درج ذیل اقتباس نامناسب نہیں ہوگا۔

(We) creat a learning situation to stimulate curiosity and independent thinking develop solving skills promote planning and execution of projects and self learning involving acquisition of knowledge through observation of phenomena creative thinking and activities.

(Frame Work-1987)

متذکرہ مقاصد کے حصول کے لئے بچوں کا ادب بہت معاون ثابت ہوتا ہے اگر وہ حقیقتاً ادب کی کسوٹی پر کھرا اتر جائے۔ بچوں کیلئے ادب تحریر کرنا سہل پسندی یا سہل انگاری نہیں ہے بلکہ پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ اگر ذرا بھی لغزش ہوئی تو بچے کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اس ادب کا لکھنے والا گویا مختلف رخ پہ بہنے والی دو کشتیوں پر سوار ہوتا ہے۔ ایک کشتی ماضی کی طرف کھینچتی ہے تو دوسری مستقبل کی طرف اور ان دو کشتیوں میں توازن وہی قائم رکھ سکتا ہے جو ایک ماہر شناور ہو۔ بچوں کے ادب کا مزاج داں ہو اور اسے اس بات کا احساس ہو کہ ادیب کے قلم سے سرزد ہونے والا ہر لفظ وہ مہر ہے جو بچوں کے مستقبل پر ثبت ہوتی ہے۔ لہٰذا بچوں کا ادب ادیب و شاعر سے بہت احتیاط کا طالب ہوتا ہے۔ ساتھ ہی انکے قلم کی جولانیوں سے ایسی سحر انگیزی کا بھی مطالبہ کرتا ہے جس میں بچے ہنستے، کھیلتے، اچھل کر حیرت و تجسس کی تشفی، مبہم جویانہ کامرانیوں کی مسرت، خلی و قائدانہ امنگوں کی تسکین، مسائل سے نمٹنے کی منطقی پیش رفت کا اطمینان اور ثقافتی قدروں کے تحصیلی عناصر کے شہوت تو ژرہے ہوں۔ بچوں کی زندگی سے ایسا ہی ڈیڈیکیشن رکھنے والے ادیب و شاعر جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو انکی پرواز تخیل کی ترجمانی کیلئے مناسب الفاظ ENID BLYTON کی کہانی A BASKET OF BROWNIES کی ننھی خدمت گزار پریوں کی طرح مچل اٹھتے ہیں۔

THE BROWNIES BEGAN TO TWITTER LIKE BIRDS IN THEIR EXCITEMENT------

"YES, YES!" THEY CRIED, TAKE US LITTLE BOY! WE CAN EASILY SQUEEZE OURSELYES INTO YOUR BASKET.

بہر کیف، آزادی کے بعد مغربی بنگال میں بچوں کے ادب پر جب نظر پڑتی ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ یہاں کے شعراء و ادباء جو تخلیقات پیش کر رہے ہیں ان میں بیشتر بچوں کی نفسیاتی اور انکی ضروریات سے بخوبی واقف ہیں اور شعوری طور پر اپنی ذمہ دارانہ تحریروں سے بچوں کی نشو نما میں حصہ لے رہے ہیں۔ ماضیٔ قریب میں بچوں کے ادب سے جن شاعروں اور ادیبوں نے دلچسپی لی ہے ان میں جرم محمد آبادی، جمیل مظہری، سالک لکھنوی، پرویز شاہدی اور اشک امرتسری کا نام لیا جا سکتا ہے اور اس ادب کی صحیح روایت انہیں حضرات سے شروع بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ متذکرہ اشخاص نے سنجیدگی سے اس طرف دھیان نہیں دیا اور وقتاً فوقتاً ہی لکھتے رہے پھر بھی انکی تخلیقات بچوں کے ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں اور بنگال میں اس ادب کی تخلیق کرنے والوں کیلئے تحریک انگیز ثابت ہوئی ہیں مگر بچوں کے شاعر یا ادیب کی حیثیت سے ان میں کسی کی بھی کوئی پہچان نہیں بن سکی۔ کیونکہ انکے یہاں تواتر قائم نہیں رہ سکا۔ اردو دنیا نے بچوں کے ادب میں مغربی بنگال سے جس شاعر کو اعتبار بخشا ہے وہ شاعر علقمہ شبلی ہیں۔ انہوں نے ڈیڈیکیشن کے ساتھ بچوں کی مختلف دلچسپیوں کا خیال رکھتے ہوئے انکی خواہشوں کی تکمیل کی ہے اور کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی مختلف نظموں میں بچوں کی عمر کا لحاظ رکھتے ہوئے کھیل کھیل میں نصیحتوں کے اشارے دیئے ہیں۔ دوسرا اہم شاعر جس نے صرف بچوں کیلئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے وہ ہیں جناب حشمت کمال پاشا۔ انکی تخلیقات بھی دو کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن انکی بعض نظمیں بچوں کی

نفسیات سے لگا نہیں کھاتیں اور ادب جانے کی حد تک طوالت کی حائل ہیں۔ صرف آسان زبان اور مناسب مواد ہی ضروری نہیں بلکہ ہیئت کا خیال بھی رکھنا اس ادب کا خاصہ ہے۔ میرا مقصد تنقید نہیں ہے بلکہ اس طرف توجہ دلانا ہے کہ بچوں کو پابند نظمیں اور مترنم بحریں زیادہ اپیل کرتی ہیں۔

متذکرہ شعراء کے علاوہ، سید حرمت الاکرام، مظہر امام، ساگر چاپدانوی، محی الدین شاہین، معصوم شرقی، ذوالنورین صدیقی، محسن باعشن حسرت، شہناز نبی اور احمد کمال حشمی کا نام بھی بچوں کے ادب سے منسلک ہے اور خوشی ہے کہ یہ شعراء پوری سنجیدگی کے ساتھ بچوں کیلئے ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ اس باب میں جناب عاصم شہنواز شبلی کی کتاب ''مغربی بنگال اور بچوں کا ادب'' اپنی نوعیت کی بنگال میں پہلی کتاب کا درجہ رکھتی ہے جس میں متذکرہ تمام شعراء کی تصویروں کے ساتھ سوانحی کوائف اور انکی تحریر کی خصوصیتیں درج ہیں اور نمونۂ کلام بھی۔ بچوں کیلئے کہانیاں، افسانے اور ڈرامے لکھنے والوں میں سالک لکھنوی، نشاط الایمان، جاوید نہال، عابد ضمیر، شین کریمی، مشتاق اعظمی، نذیر یوسفی کمال احمد، شوکت عظیم، محمد شان اور جمیل ارشد کی تخلیقات کے اقتباسات دیئے گئے ہیں مگر حاذق انصاری مرحوم کا ذکر نہیں۔ حالانکہ انہوں نے ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۴ء کے دوران بچوں کی کہانیوں پر مشتمل اپنی کتاب ''فردوسی'' شائع کی تھی۔ اس میں تین کہانیاں تھیں۔۔۔ (۱) فردوسی فارسی شاعر۔ (۲) رادھا ناتھ سکدھر۔ (۳) شریر لڑکا۔ اسی کتاب میں بچوں کیلئے اپنی دوسری تصنیف ''بھروسہ'' کی اشاعت کا بھی اشتہار تھا۔

ان دنوں فیروز اطہر کی بچوں کی نظمیں اور قیوم بدر کی (روتے روتے ہنسنا سیکھو)، ارشد نیاز کی (آسمان کے ہاتھی، چاند کی پریاں)، خورشید اختر فرازی کی (عبرت) اور سلمیٰ تسکین کی (امیری غریبی) کہانیاں سامنے آئی ہیں درجہ نہم دہم کیلئے فزکس کی درسی کتاب مرتب کرنے والے جناب عبدالودود انصاری بچوں کیلئے سائنسی مضامین تواتر کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ انکے مضامین روزانہ پیش آنے والے ماحولیاتی چھوٹے چھوٹے مسائل پر مبنی ہوتے ہیں اور حساب، فزکس اور کیمیا کے پیچیدہ مسائل کو کہانی کی شکل دینے کی کامیاب کوشش بھی نظر آتی ہے۔ ایک اور اہم نام ایم۔ علی کا بھی ہے جنہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دلچسپیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نظمیں، تمثیلی مشاعرے کیلئے غزلیں اور قطعات اور ڈرامے کی تخلیق ہی نہیں کی ہے بلکہ انہیں اسٹیج پر بھی پیش کیا۔ انکی ایک نظم کا مطلع ہے ؎

آؤ بچو تمہیں بتائیں باتیں کچھ قرآن کی
خدا نے اپنے نبی کو بھیجا ہے جو اس فرمان کی
۔۔۔۔ بندے تیرے ہم

اچھائی اور برائی کی تمیز پیدا کرنے کیلئے بچوں کے دو گروپ۔۔۔۔ ''اچھا گروپ'' اور ''برا گروپ'' کے درمیان قوالی طرز پر الف سے ی تک کے حروف پر مبنی نظم تحریر کی اور اسے اسکول کے سالانہ جلسے میں پیش بھی کرایا۔ نمونے کے طور پر اچھے گروپ کا یہ مصرعہ ؎

الف سے اللہ جو ہر اک شے میں مستور ہے

اور برے گروپ کا یہ مصرعہ ؎

ب سے بیگم تاش کی جو میری نظر کا نور ہے

۔۔۔۔۔ نظم کی نوعیت کے اشارئیے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے بچوں کے تمثیلی مشاعرے کیلئے مختلف غزلیں بھی دلچسپ انداز کی لکھیں۔ بچوں کے لئے انہوں نے علم و جہل پر ایک ڈرامہ ''آگ اور راگ'' بھی پیش کیا تھا۔ لیکن یہ تخلیقات کسی اخبار یا رسالے کی زینت نہیں بن سکیں جس کی وجہ سے انکی اہمیت صرف جلسوں تک محدود ہو کر رہ گئی اور عام بچے اس سے فیض نہیں اٹھا سکے۔

اس جائزے سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ بچوں کے لئے مغربی بنگال میں جو شاعری ہو رہی ہے اس میں مواد و ہیت کے لحاظ سے تنوع تو ہے مگر نئی راہ نکالنے کے چکر میں بچوں کی نفسیات سے گریز بھی ہے۔ عام طور پر طویل اور غیر مترنم نظموں یا دوسرے لفظوں میں آزاد نظموں کی تخلیق پر زیادہ زور نظر آتا ہے جو بچوں کے لئے نامناسب ہونے کے علاوہ انکے ذہن میں اکتاہٹ اور نتیجتاً شعری ادب سے غیر دلچسپی بھی پیدا کر سکتی ہے۔ یہاں ۵ برس سے کم عمر بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی مترنم نرسری نظموں کی بے حد کمی ہے جس کی طرف شعراء نے تقریباً توجہ ہی نہیں دی ہے۔ علاوہ بریں چھوٹی چھوٹی نظمیہ کہانیوں کی تخلیق بھی نہیں کے برابر ہے۔ اس پس منظر میں مغربی بنگال میں بچوں کا شعری ادب بھی زیادہ قابل اطمینان نہیں ہے۔

مغربی بنگال کا بالغ نثری ادب جس طرح قابل افسوس ہے اس طرح اعزاز افضل کی زبان میں ''بچکانہ ادب'' کا نثری حصہ ماتم کناں ہے آج اس ادب کے نام پر جو کچھ بھی سرمایہ ہے وہ ناکافی کے علاوہ غیر متناسب بھی گردانا جاسکتا ہے۔ جتنی کہانیاں بھی میں دیکھ سکا ہوں انہیں صرف دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک داستانی اور دوسرا اخلاقی یا اصلاحی۔ داستانی کہانیاں الف لیلیٰ اور لوک کہانیوں کے طرز پر تصوراتی ہیں جبکہ بیشتر اصلاحی اور اخلاقی کہانیاں ہیں جن میں افسانوی انداز اختیار کیا گیا ہے اور براہ راست نصیحت سے گریز کی شعوری کوشش کی گئی ہے جو اچھی نشانی ہے۔ کہانیوں کے بیچ میں یا آخر میں اصلاحی اور اخلاقی نوٹ یا جملے چسپاں کرنے کی روایت اصل میں یونانی قصوں سے شروع ہوتی ہے جن کے آخر میں ہمیشہ اصلاحی

نظمیں

تو پھر

—— تو پھر

ایسا ہو کہ ——

یہ رقص کرتی سرزمیں الٹے

یہ بزمِ ماہ و انجم، کہکشاں، عرش بریں الٹے

زمیں کی دھول اڑ کر چشمِ گردوں میں اتر جائے

فرشتوں کی جبینِ نور پہ کالک سنور جائے

کشش سیارگاں کے درمیاں کچھ اس طرح پنپے

کہ شیشوں کی طرح ٹکرا کے چکنا چور ہو جائیں

خلائیں بیوگی کے سوگ میں آنگن سے سر پھوڑیں

کراہیں رابطے کی جستجو میں تن بدن نوچیں

شکستوں کی ابوالہولی جہانوں پر مسلط ہو

خدا۔۔۔

تو پھر۔۔۔

قیامت ہو۔۔۔''

صبح، دوپہر اور شام

صبح۔۔۔ دوپہر

دوپہر۔۔۔ اور شام

اس بیچ یہی ہوتا ہے بار بار

سورج

آہستہ آہستہ چڑھتا ہوا

نصف النہار تک پہنچ جاتا ہے

اور پھر

بتدریج اترتا ہوا

تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے

مگر

اس بیچ

کیا کچھ نہیں ہوتا یہ مت پوچھ

میرے بچے

میں

تیری ہنستی ہوئی آنکھوں میں

بسورتی ہوئی اداسیاں نہیں دیکھ سکتا

دیکھ

جب تو

پاؤں پاؤں چلتا ہوا

ان کبڑی بلندیوں سے گزر جائیگا

اس وقت بھی

سورج

صبح ——— دوپہر

دوپہر ——— اور شام

کے بیچ

چڑھتا اترتا رہے گا

اس وقت بھی

یہی کچھ ہوگا

لیکن

تو بھی

میری طرح

صرف دیکھ سکیگا

بول نہیں پائیگا!!''

”تنہائیاں“ — ف۔س۔اعجاز



(غزلیں - نظمیں)

آزادی کے بعد مغربی بنگال میں بچوں کا ادب

بچوں کے ادب کا سوال جب بھی اٹھتا ہے تو ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی آشکار ہو جاتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل تک اور تیسری دہائی کے بعد تک کا دور اس ادب کا ظلماتی دور ہے۔ کیونکہ اس دور میں بچوں کی ضروریات اور انکی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تصنیف کی کوئی منظم کوشش کی ہی نہیں گئی اور نہ ہی شاعروں اور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی۔ اگر اس دور کے مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کی نصابی کتابوں کی فہرست سامنے آئے تو یہ بات ضرور ثابت ہوگی کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے درسی کتابیں ضرور تھیں مگر ان کا دائرہ عمل چونکہ خالص علمی ہوتا ہے لہٰذا انکی حیثیت بچوں کو ضروری معلومات فراہم کرنے کی کاغذی مشین کی ہوتی ہے جسکا تعلق بچوں کے جذبۂ تجسس، انکی تفریح اور پروازِ تخیل کی تسکین سے کچھ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں استاد کی گھورتی ہوئی آنکھیں، جبری اور مشق و عمل کی روزانہ یکسانیت دلچسپ نصاب کو بھی ایک ایسا بوجھ بنا دیتی ہے جسے بچے قہر اجبر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اور اسطرح تعلیم کا صحیح مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ استاد کی جنبشِ ابرو اور ”مولا بخش“ کی کاری ضربیں بچوں کی فطری خواہشوں اور جبلتوں پر خوف کی پروردہ شرافت اور علمیت کا پردہ ضرور ڈالتی ہیں مگر جب وقت کے تناؤ میں یہ پردہ کھنچتا ہے تو سو جگہ سے مسک جاتا ہے۔ اس وقت استاد کے تبحرِ علمی اور زبان کی پختہ روایات پر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں اردو کی اہلیتی روایت کا مختصراً ذکر ضروری ہو جاتا

ہے۔

دلّی میں اردو کی صبح کاذب سے لیکر دکن میں اسکی صبح صادق تک کا زمانہ عبوری ہونے کے ساتھ ساتھ اسکی زبردست نشو نما کا بھی عہد ہے جس کے دوران اس نے اپنے اندر اظہار کی بھی اہلیت پیدا کرلی تھی مگر تصنیف و تالیف کا سورج توقف سے طلوع ہوا اور وہ بھی پند و نصائح کے رسالوں اور مثنویوں کی شکل میں۔ درسی تصنیف کی شعوری کوشش کا پتہ نہیں چلتا۔ جس طرح صبح کاذب کے دوران "خالق باری" کی تصنیف کو بچوں کے ادب میں بھی اولیت حاصل ہے اسی طرح معراج العاشقین، جل ترنگ، قصہ سیف الملوک، یوسف زلیخا، شاہ بہرام وبانوے حسن، قصہ لال وگوہر اور پنچھی نامہ کو بھی ادب اطفال کے ابتدائی نمونوں میں گردانا جاسکتا ہے۔ کیونکہ دکنی زبان میں (اردو) تصنیف کی گئیں یہ کتابیں اپنے مواد اور دلچسپی کے لحاظ سے جہاں سن رسیدہ اشخاص کیلئے باعث لطف ہیں وہیں بچے بھی ان سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔

اگر اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اردو میں بچوں کے ادب کی روایت دوسری جدید ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں تقریباً دوسو سال پرانی ہے جبکہ ہندی اور خاص طور سے بنگلہ میں بچوں کے ادب کی روایت فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے شروع ہوتی ہے اور حقیقتاً وہ بھی ۱۸۱۷ء میں اسکول بک سوسائٹی کے قیام کے بعد۔ مگر جس طرح بنگلہ ادب میں بچوں کے ادب کی طرف شعوری کوشش کی گئی اس طرح اردو میں بچوں کے ادب کی طرف ادباء وشعراء نے دھیان نہیں دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے بچوں کے ادب کا کام دونوں زبانوں میں ہتوپ دیش، شکنتلا، بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی جیسی کتابوں کے ترجمے سے چلتا رہا۔ ترجمے کا یہ جوا بنگلہ نے بہت جلد اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا اور ادبی تخلیقات نظم ونثر ایشور چندر ودیا ساگر اور اکھے کمار دت جیسے صاحبانِ علم وفن کی معیت میں سامنے آنے لگیں اور "دِگ درشن پتریکا" پشو بندی، "بالک بندھو"، "سکھا"، "بالک"، "ساتھی"، "ساکھا ساتھی"، اور "موکول"، جیسے رسالوں نے اس ادب کی ترقی وترویج میں نمایاں کام انجام دیئے مگر اردو "باغ وبہار"، "باغ اردو"، "اخلاق ہند (ہتوپ دیش کا ترجمہ) طوطا کہانی، شکنتلا اور قصہ مادھو مل وکام کنڈلا (بیتال پچیسی) کے سحر میں اس طرح جکڑی رہی کہ بچوں کا ادب تخلیقی نگارشات کیلئے ایک عرصے تک تڑپتا رہا۔ ایسا نہیں ہے کہ بنگال میں صاحبانِ علم وہنر اور شعراء وادبا کی کمی رہی ہو بلکہ اس طرف سے ان کی بیگانگی اور عدم توجہی بچوں کے ادب کو فضول بکواس سے زیادہ اہمیت نہیں دینے کی وجہ سے تھی۔ وہ اسے ہرایرے غیرے کی جولان گاہ سمجھ کر صرف نظر کرتے رہے یا اپنے معیار کی سیڑھیاں اترنا کسر شان سمجھتے رہے یا بڑوں کیلئے اپنی تخلیقی کاوشوں میں اس قدر مشغول رہا کرتے تھے کہ بچوں کی طرف سے ایک طرح سے غافل ہوگئے تھے بچوں کی اہمیت انکی نظر میں تھی لیکن شاید ایسی نہیں تھی جسکا اظہار نیشنل پالیسی آن ایجوکیشن کے مرتبین نے مندرجہ ذیل لفظوں میں کیا ہے:

(A child, a human being is a positive asset and a precious national resource which needs to be nurtured and developed with tenderness and care, coupled with dynamism.

لیکن اس فریضے سے غفلت کی شکایت ہم بنگال کے اپنے بزرگوں سے بھی نہیں کرسکتے کیوں کہ اسکا احساس بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک بنگال سے باہر کی ریاستوں میں بھی اس قدر شدّت کے ساتھ نہیں تھا جیسا کہ آج ہے۔ پچھلی دہائیوں میں ہندوستان کے دیگر شہروں میں بچوں کے ادب کے نام پر جو تخلیقات سامنے آئیں انکا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو صرف یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آسان اور سلیس زبان میں کوئی قصہ، کوئی نظم، کوئی افسانہ یا کوئی ڈرامہ اگر لکھ دیا جائے تو اسے بچوں کا ادب سمجھ لیا جائے گا۔ بچوں کی ضروریات کا احساس، انکی نفسیات کا پاس نہیں تھا اور منزل بہ منزل درپیش مسائل سے نبرد آزما ہونے والی اہلیتوں کی بتدریج ترقی سے ناآشنا تھے۔ لہٰذا اکثر کتابیں پڑھ کر جان لاک کی پائپ لائن تھیوری یاد آجاتی ہے جس میں کتابوں کو چشمۂ علم گردانا گیا ہے جس کی موجوں سے بچوں کے خالی دماغ کے برتن کو بھرنا مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا مختلف عمر کے بچوں کی مختلف دلچسپیوں کو پسِ پشت ڈال کر انہیں عقلمندی کے کڑوے گھونٹ دیئے جاتے رہے۔ اس صورتحال کی وجہ یہ ہے کہ اس ادب میں ادبی ضرورتوں کا لحاظ نہیں رکھتے ہوئے بچوں کی عمر اور انکے فطری مشاغل سے چشم پوشی برتی گئی ہے۔ اسکے علاوہ نقادانِ فن نے بھی اس ادب سے اپنی عدمِ دلچسپی کا ثبوت فراہم کیا ہے اور اس ادب کا احتساب انکے لئے شاید وقت کا زیاں ٹھہرا ہے ورنہ بچوں کے ادب کی سمت اور لکھنے والوں کے رویئے اور پیش کش میں بہت پہلے خوشگوار تبدیلیاں اجاگر ہوئی ہوتیں۔

بچوں کے ادب میں موجودہ غیر متو ن اور غیر متناسب مواد ہیئت اور تکنیک کی صورتحال قابل افسوس ہے اور اجمالی تجزیئے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ہمارے ادب کے لکھنے والے اکثر کنفیوژن کے شکار رہتے ہیں کہ ہم کس عمر کے بچوں کے لئے کیا مواد پیش کررہے

نہ تغافل، نہ تجاہل کا اثر ہوتا ہے
تم جدھر ہوتے ہو رخ سب کا ادھر ہوتا ہے

تیغ ہوتی ہے، لہو ہوتا ہے، سر ہوتا ہے
یہ تماشہ تو یہاں شام و سحر ہوتا ہے

تم مری دشت نوردی پہ تعجب نہ کرو
راس آجائے تو ویرانہ بھی گھر ہوتا ہے

منزلِ دار کو انجام تگ و دو نہ سمجھ
منزلِ دار سے آغاز سفر ہوتا ہے

نیند میں بھی وہی بستر وہی سائے کی تلاش
خواب میں بھی وہی اجڑا ہوا گھر ہوتا ہے

کیوں ترے شہر میں آئین زباں بندی ہے
کیا ترے دل پہ بھی نالوں کا اثر ہوتا ہے

گھر گئے اپنے گناہوں کی سیاہی میں رئیسؔ
حشر کا دن بھی اندھیرے میں بسر ہوتا ہے

تلخیٔ گردشِ ایام لئے پھرتے ہیں
جو نہ خالی ہو وہی جام لئے پھرتے ہیں

اک نشانی ترے گمنام لئے پھرتے ہیں
اپنے ہونٹوں پہ ترا نام لئے پھرتے ہیں

اک چراغ سحر اندام لئے پھرتے ہیں
تیرگی ہم ترا انجام لئے پھرتے ہیں

کج روی، کج کلہی، کج نظری، کج فہمی
اپنے سر ہم کئی الزام لئے پھرتے ہیں

جب سے دیکھا ہے ترے شہر میں ویرانی کو
ہم تصور میں در و بام لئے پھرتے ہیں

جو شکاری تھے، شکاری ہیں، وہ بدلیں کیسے
کبھی دانہ تو کبھی دام لئے پھرتے ہیں

ڈر گئے اتنا اندھیروں سے کہ اب چاند کے ساتھ
لوگ سورج بھی سر شام لئے پھرتے ہیں

وہ تبسم کہ جسے ڈھونڈ رہی ہے دنیا
ہم وہ سوغات سرِ عام لئے پھرتے ہیں

پھر کوئی تازہ غزل آج سنائیں گے رئیسؔ
یہ خبر شہر کے گلفام لئے پھرتے ہیں

ہمارے دل ہمارے خون کی حدت سے جلتے ہیں
چراغ اپنے کسی کی بزم میں قسمت سے جلتے ہیں

کہاں ہیں اس طرف بھی آئیں سایہ بانٹنے والے
مرے بچے ابھی تک دھوپ کی شدت سے جلتے ہیں

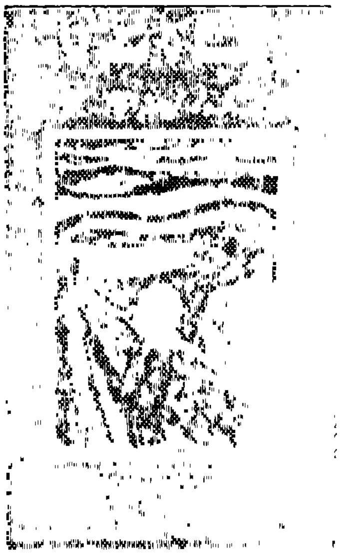
کبھی آئے مگر وہ تاپنے والا نہیں آیا
ہم اپنی آگ میں جس کیلئے مدت سے جلتے ہیں

زمانہ آپ کی بالا قدی پر رشک کرتا ہے
غضب ہے آپ بھی میرے قد و قامت سے جلتے ہیں

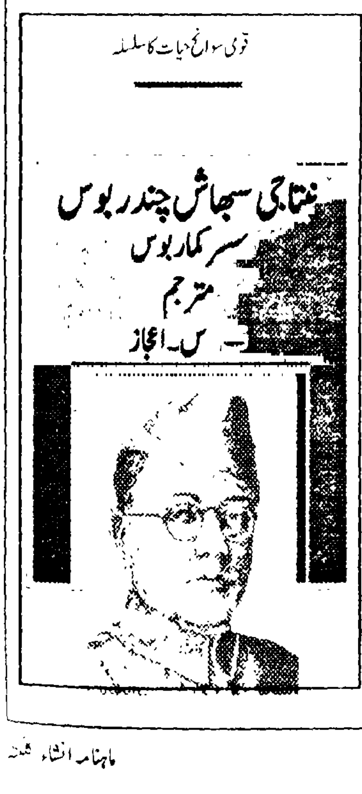
دبی ہو راکھ کے اندر جو چنگاری ہمیں سمجھو
ہوا جتنا بجھائے ہم اسی شدت سے جلتے ہیں

رئیسؔ احباب کی اس دورخی فطرت کو کیا کہئے
مری تعریف کرتے ہیں مگر شہرت سے جلتے ہیں

ف۔س۔اعجاز
کی ۲ کتابیں



یورپ کا سفرنامہ





احسن شفیق

نام : محمد شفیق
ادبی نام : احسن شفیق
مقام پیدائش . ضلع بلیا، یوپی (اپائل)
تعلیم : ابتدائی تعلیم یوپی میں ہوئی۔ بی۔ اے، ایم۔ اے، اور بی۔ ایڈ کلکتہ سے کیا۔
پیشہ : لکچرر، اردو میڈیم گورنمنٹ پرائمری ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، نالی کل، ہگلی۔
کتابیں (۱) کبڑی بلندیاں (مجموعۂ کلام) ۷۸ء
(۲) بن گیت (سنتالی لوک گیتوں کا ترجمہ بنگلہ سے) ۹۰ء

پتہ : 51/17
Cowies Ghat Road
Shibpur
Howrah-711102

غزلیں

جن سے امیدیں ہوں، وہ منہ پھیر لیں احسن تو کیا
وقت ہی دشمن ہوا ہے، دوست ہیں دشمن تو کیا

ہم ہیں نادیدہ پرندے گلشنِ احساس کے
راہ میں حائل فصیلوں میں نہیں روزن تو کیا

زیست تیرے گیسوؤں کے سائے اب تک ہیں عزیز
کرتی ہے اٹکھیلیاں مجھ سے بری الجھن تو کیا

سر کٹانا، آگ پہ چلنا، بری تہذیب ہے
گرم ہو مقتل تو کیا، دہکے کوئی گلخن تو کیا

آپکے جذبِ تنفر کو تو راحت مل گئی
بستیوں میں سُونے لگتے ہیں اگر آنگن تو کیا

پچھلے موسم نے لگائی آگ، اب ڈوبیں گے ہم
گھن گرج کے ساتھ آیا ہے اگر ساون تو کیا

اپنی فطرت پر کبھی تو آئیں گے لوح و قلم
آج ادبار و نحوست میں ہیں فکر و فن تو کیا

بڑھتے جانا ہی شریعت ہے سفر کی اے شفیق
دن کی تاریکی سے نکلے رات ہے روشن تو کیا

وسعتِ صحرا، ریگِ رواں، دامن پھیلاؤ
امن واماں سوغات ہے لے لو، خوش ہو جاؤ

جسم وجاں پہ دھوپ اور دھول کا موسم کب تک
میرے فلک پر بھی کوئی بادل اپجاؤ

شہرِ ستم میں، سبزۂ الفت، حسنِ طلب
ساون کے اندھے کو اب کوئی سمجھاؤ

زیرِ زمیں تو صدیوں سے سیرابی ہے
سطح پہ دودھ بتاشے کی گنگا چھلکاؤ

تنہائی کی نسلیں روز ترقی پر
پیار کا یہ کیسا موسم مجھ کو سمجھاؤ

کربِ تعلق ہر اک گام پہ ہنستا ہے
لمحہ بھر مل بیٹھے تو پہروں الگاؤ

منظر منظر دنیا سرابی، روشن ہے
منزل منزل تشنہ لبی، ہر پل ترساؤ

اب تو وہ بھی اہلِ کرم ٹھہرے ہیں شفیق
قربت کا دعویٰ ہے تو الجھن سلجھاؤ

رباعیات

(۱)
جبریل کا پر ہے تُو اے شاخِ نبات
تجھ سے ہے تنقید و تفسیرِ حیات
صورت گرِ احساس و جذبات ہے تُو
جنبش کے تری صید، تخیل کے جہات

(۲)
کیا عہد کی تقویم ہے معلوم نہیں
شخصیتِ صد نیم ہے معلوم نہیں
ناداں لئے پھرتے ہیں دستور شفیق
شہرت تقسیم ہے معلوم نہیں

(۳)
انسانی الفت کے افسانے الگ
رشتے کے، رشوت کے پیمانے الگ
اپنوں میں، غیروں میں فطرت تقسیم
عظمت کی تسبیح کے سب دانے الگ

(۴)
پہلو میں ہر وقت مچلتا کیا ہے
جگنو سا سر ذہن چمکتا کیا ہے
بے نام خلش کوئی کہ کربِ تخلیق
بے چین ہمیشہ مجھے رکھتا کیا ہے

اٹھی تھی کہ الامان والحفیظ! خیمۂ غزل کی ریشمی طنابیں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ شرافتِ جذبات اور متانت افکار کے قدم زمینِ شعر سے اکھڑنے ہی والے تھے کہ وحشت نے غالب کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا اور آخری سانس تک تھامے رکھا۔ شاعر تو بہت ہیں۔ سب کی مٹھیاں کھول کر دیکھئے۔ کس کی ہتھیلیوں پر نیل پڑے ہیں۔

غالب کا تتبع وحشت کا عیب نہیں، ہنر ہے۔ وحشت نے غالب کا منہ نہیں چڑایا تھا کہ "زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجے دہن بگڑا" کہہ کر ان کا مذاق اڑایا جائے۔ علامہ نے غالب کے سنجیدہ اور پروقار لہجے میں گفتگو کرنے کا فن سیکھا تھا۔ اور خلوص اور لگن سے سیکھا تھا کہ سنئے تو لگے غالب بول رہے ہیں۔ بات جب "یک جان دو قالب" کے مرحلے سے گزر کر "من تو شدم تو من شدی" کی منزل تک پہنچ جائے تو من و تو کے درمیان فاصلہ کہاں باقی رہ جاتا ہے؟۔

غالب کے فن نے کلامِ وحشت کے قالب میں دوسرا جنم لیا تو اس میں ہلسی کی کون سی بات ہوئی؟ اردو کی شعری دنیا میں "آواگون" کا عمل صدیوں سے جاری ہے۔ میر، مصحفی کے قالب میں، سودا، ذوق کے قالب میں، بیدل، غالب کے قالب میں پہلے ہی جنم لے چکے تھے۔ انیس کو چکبست کے قالب میں حلول کرتے کس نے نہیں دیکھا؟ داغ کے اوتار تو گلی گلی دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ بعض پاک روحیں یہ دعویٰ بھی کرتی ہیں کہ

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ایم

ادب میں تقلید جرم ہے تو اس کے مجرم دہلی اور لکھنؤ میں بھی دندناتے پھرتے ہیں، کلکتے والے وحشت تنہا، کالا پانی، کیوں کاٹیں؟ عدالتِ نقد سب کو انڈمان کیوں نہیں بھیج دیتی؟

سورج سے مستعار ہے تو ہوا کرے، چاند کی روشنی بھی اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے۔ چاندنی کو دھوپ کون کہے گا؟ تقلیدِ غالب کے باوجود کلام وحشت کی ایک تاریخی حیثیت ہے اور رہے گی۔ سورج اپنا خراج وصول کر چکا ہے۔ اب چاند کا قرض ہم کو چکانا ہے۔ سود نہ سہی، اصل ہی سہی۔

اپنی کتابوں کی نکاسی کے لئے "انشاء" میں ان کا اشتہار دیجئے۔ انشاء تمام عالم اردو میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے قارئین باذوق اور فعال واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ کتب و رسائل کی رفتار سے آگاہ ہونا پسند کرتے ہیں۔

NATIONAL HAIR OIL

نیشنل ہیئر آئل

بالوں کو جھڑنے اور سفید ہونے سے روکتا ہے۔ اس سے بال گھنے اور چمکدار ہوتے ہیں۔ یہ دماغ کو ٹھنڈک اور طاقت دیتا ہے۔

ہمارے دیگر آزمودہ یونانی نسخے:

میکسیٹیون ٹانک۔ بالک جیون ٹانک۔

اکسیر صدر (نزلہ، زکام اور کھانسی کی دوا)۔

جربول (خارش کی دوا)۔ موتی منجن۔



نیشنل دوا خانہ

۱۱۷، رابندر اسرانی، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳

نام : رئیس احمد
قلمی نام : احمد رئیس
ابتدائی سالوں میں رئیس آنولوی کے نام سے شاعری کیا کرتا تھا مگر آنولوی تلفظ کی ادائیگی میں چونکہ دشواری ہوتی تھی اس لئے احمد رئیس نام سے لکھنا شروع کر دیا۔
پیدائش : ۱۹۴۲ء
مقام : قصبہ آنولہ ضلع بریلی
والد کا نام : جناب عبدالجلیل (خلد آشیانی)
تعلیم : ہائی اسکول کا امتحان شری سبھاش انٹر کالج آنولہ سے پاس کیا۔ ادیب کامل جامعہ اردو علی گڑھ کلکتہ سے پاس کیا اور گریجویشن کا امتحان علیگڈھ سے دیا۔
پیشہ : تجارت
شرف تلمذ : جناب اعزاز افضل
انعامات : انجمن ترقی اردو ھند سے بہترین شاعری کرنے کا انعام کتابوں کی صورت میں ۱۹۶۸ء میں اور یوتھ فیسٹیول میں نظم گوئی کے مقابلے میں ایک سند، اور ایک تمغہ ۱۹۶۸ء میں ہی حاصل کیا۔ اسکے علاوہ چترانشی آگرہ اور آسنسول میونسپل کارپوریشن کے علاوہ کئی مقامات سے اعزازات اور انعامات حاصل کئے۔
موجودہ پتہ : ۱۴، بولائی دت اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۳
فون : ۲۳۵۶۸۵۵ (۰۳۳)
۲۳۵۵۰۴۵ (۰۳۳)



احمد رئیس

غزلیں

ضبط کے سارے فسانے خواب ہو کر رہ گئے
جام یاد آیا تو ہم بے تاب ہو کر رہ گئے

کیسے کیسے تیرنے والوں کو دریا کھا گیا
کیسے کیسے ناخدا غرقاب ہو کر رہ گئے

وہ سمندر جن کے ساحل تک نظر آتے نہ تھے
ایسے سمٹے گاؤں کے تالاب ہو کر رہ گئے

تیرا چہرہ بجھ گیا آنکھیں بری دھندلا گئیں
کیسے کیسے آئینے بے آب ہو کر رہ گئے

راہ کا روڑہ سمجھ کر جن کو ٹھکراتے تھے لوگ
اب وہ پتھر گوہرِ نایاب ہو کر رہ گئے

اب نظر آتا نہیں زخموں کا کوئی پیرہن
جسم وقفِ اطلس و کمخواب ہو کر رہ گئے

اب نہ وہ آنکھیں ہیں باقی اور نہ وہ منظر رئیس
زندگی کے سب حقائق خواب ہو کر رہ گئے

تصدیق نہیں کرتی یہ راہگذر سب کی
سننے میں تو یکساں ہے رودادِ سفر سب کی

ہے گردشِ دوراں پر مرکوز نظر سب کی
یہ رات تو سب کی ہے کیا ہوگی سحر سب کی

جز اہلِ بصیرت کے کس نے انھیں دیکھا ہے
اٹھنے کو تو اٹھی تھی محفل میں نظر سب کی

امید کی شاخیں بھی کس درجہ گھنیری ہیں
اک پیڑ کے سائے میں ہوتی ہے بسر سب کی

ہیں اہلِ وفا جتنے سب دار کے قابل ہیں
اعزاز نہ دے مجھ کو توہین نہ کر سب کی

ہو نغمۂ مستانہ یا نالۂ زیرِ لب
صیاد کے کانوں تک پہنچے گی خبر سب کی

اربابِ ہوس نے کب دیکھا ہے رئیس ان کو
کہتے ہیں تو کہنے دو جھوٹی ہے نظر سب کی

نہ کھا فریب، نظر جانبِ سراب نہ کر
ہر ایک ریگِ رواں پر گمانِ آب نہ کر
نشہ چڑھے تو ذرا دل ٹٹولنا ساقی
ابھی سے ظاہر و باطن کا احتساب نہ کر
خدا نخواستہ اپنے ہی خال و خد نکلیں
نقاب رہنے دے چہرے کو بے نقاب نہ کر
نہ جانے رات ابھی کتنے روپ بدلے گی
چراغ دیکھ کے تصدیقِ آفتاب نہ کر
یہ بے دلی سے بھلا دل پہ ہاتھ کیا رکھنا
نگاہ پھیر لے توہینِ اضطراب نہ کر
ابھی تو سامنے آئیں گے راستے لاکھوں
ابھی سے جادۂ منزل کا انتخاب نہ کر
گذر گئی شبِ زنداں میں جو گذرنا تھی
رئیس دن کے اجالے میں ذکرِ خواب نہ کر

چراغ ہیں ہم، جو ہم سے مانگو گے اپنی اجرت وہی ملے گی
جلاؤ گے روشنی ملے گی، بجھاؤ گے تیرگی ملے گی

زمین کی طرح جتلا ہیں سب اپنے اندر کے زلزلے میں
پہاڑ کے دل میں جا چھپو گے تو اس میں بھی تھر تھری ملے گی

ہم آج اپنے لہو میں تیریں، تم اپنے خنجر کا زنگ دھولو
تمہیں نیا حوصلہ ملے گا، ہمیں نئی زندگی ملے گی

ہم ایک دنیائے آب و گل ہیں، نہ صرف دریا نہ صرف صحرا
تم آج سیراب ہو رہے ہو تو کل تمہیں پیاس بھی ملے گی

یہ ہم نے مانا کہ قابل دید ہے تصور کا شہر لیکن
وہاں سے لوٹے تو ہر تجلی نظر سے روٹھی ہوئی ملے گی

وہ اک بہار آفریں ترانہ، ہے جس سے معمور ساز فردا
سنو گے کل وقت کی زباں سے تو میری آواز ہی ملے گی

جلائے ہیں بت کدے کی چوکھٹ پہ کافروں نے چراغ لیکن
ادھر سے گزریں گے اہل ایماں تو ان کو بھی روشنی ملے گی

آنگن آنگن خانہ خرابی ہنستی ہے معماروں پر
پتھر کی صورت ڈھال رہے ہیں شیشے کی دیواروں پر

زخم لگے تو بس یہ جانو، چوٹ پڑی نقاروں پر
آج لگا دو جان کی بازی، ٹوٹ پڑو تلواروں پر

اہل جنوں کی لالہ کاری موسم کی پابند نہیں
فصل خزاں میں پھول کھلے ہیں زنداں کی دیواروں پر

کہتے ہیں خوش قامت کس کو دیکھ نکل کر گلشن سے
کیسے کیسے سرو رعنا چلتے ہیں انگاروں پر

اس ساحل پر ناؤ پڑی ہے، اُس ساحل پر مانجھی ہے
بیچ ندی میں تیرتی لاشو اپل بن جاؤ دھاروں پر

ہم پیڑ ہیں اپنے ریاض کا پھل، کچھ پایا ہے کچھ پائیں گے
کچے ہیں تو پتھر کھاتے ہیں، سوکھے تو جلائے جائیں گے
جب کچھ بھی نیا ہم کہہ نہ سکے، کیا آپ نیا کہہ پائیں گے
اسلاف کو ہم دہراتے ہیں، کل آپ ہمیں دہرائیں گے
ہے فکرِ سحر تو پلکوں پر اشکوں کے دیئے روشن رکھئے
سورج کو گہن لگ جائے گا، یہ چاند اگر کجلائیں گے
ہے ظرف شناسی پیشِ نظر تو پیاس کی گہرائی میں اتر
ہم صحرا صحرا ترسے ہیں، دریا دریا پی جائیں گے
اس فلسفۂ آزادی سے واقف نہ تھے اے شوریدہ سری
زنداں سے جو قیدی چھوٹیں گے، زنجیر ہمیں پہنائیں گے

مضمون

علّامہ سیّد رضا علی وحشت

شخصیتیں بھی کتنی پُر فریب ہوتی ہیں، کسی نے اپنے ہونٹوں پر مونالیزا کی سی پُر اسرار مسکراہٹ کی قوس قزح بکھیری اور ہمارا دل اس کی رنگارنگی پر فریفتہ ہوگیا۔ کسی نے اپنے کھردرے پن پر ابوالہول کی طرح رعب اور جلال کا پردہ ڈالا اور ہم مارے خوف کے سرنگوں ہوگئے۔ کسی نے اپنے خد و خال پر برگزیدگی کی ملمع سازی کی اور ہم اس کے قدموں پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے لگے۔

وحشت کی شخصیت نہ مونالیزا کی طرح پُر اسرار ہے، نہ ابوالہول کی طرح رعب و جلال کا مجسمہ، نہ گوتم کی طرح تقدس و برگزیدگی کی تصویر، اس کے باوجود، ہم ان کے لئے اپنے دل میں محبت، احترام اور عقیدت کا جذبہ پاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے نقوش تیکھے نہ سہی، اپنے اندر ایک انفرادی شان ضرور رکھتے ہیں۔ پُر وقار ادبی شخصیتوں کی بھیڑ میں ہماری نظروں کو اپنی طرف متوجہ کر لینے کی صلاحیت ان میں موجود تھی۔

وحشت کاروانِ عہدِ رفتہ کے مقلد بھی تھے اور عصرِ نو کے قافلہ سالار بھی۔ ان کی وضع احتیاط نے غالب کی شاگردی کے باوجود داغ کے سوقیانہ پن کو منہ نہ لگایا۔ وہ شاہراہِ عام سے ہٹ کر ایک ایسے راستے پر گامزن ہوئے جہاں ہر نقشِ پا دیوار کی طرح بلند تھا۔

غالب کے جادۂ فکر سے سلامت روی کے ساتھ گزرنا کچھ وحشت ہی کا کام تھا۔ ان کے شعورِ سفر اور توازنِ رفتار نے دوسرے مسافرانِ ادب کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ اس دشوار گزار وادی میں آج قافلوں کی جو بھیڑ نظر آتی ہے ان کی رہنمائی کا سہرا وحشت ہی کے سر ہے۔

تکلف بر طرف بہتوں نے مسابقت کی ٹھانی مگر کوئی بھی اس دوڑ میں وحشتؔ کی گرد کو نہ پاسکا۔ عزیزؔ لکھنوی کی فکر کا ڈانڈا غالبؔ کی سرحدِ ادراک سے اتنا قریب نہیں جتنا وحشت کا جادۂ تخیل۔

وحشتؔ کی سی تہہ بہ تہہ شخصیتیں اردو ادب میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ فارسی پر عبور، انگریزی پر قدرت، اردو پر حکومت، ایک طرف خان بہادر۔ دوسری طرف عجز وانکسار کا پتلا، حکام رس۔ مگر احباب کی دادرسی پر ہمہ وقت آمادہ۔

شاگردوں کے اشعار کی اصلاح تو سب کرتے ہیں لیکن شاگردوں کے ذہن کی اصلاح کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ وحشتؔ کے فیضِ تربیت نے اردو ادب کو کئی ممتاز شاعر دیئے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں ان کا پہلا دیوان شائع ہوا تھا تو بزرگانِ ادب نے اس کا کھلے دل سے استقبال کیا تھا مگر نئی نسل کے حافظے نے وحشتؔ پر اپنے سب دروازے بند کردیئے ہیں۔ اور ایک وحشتؔ ہی پر کیا منحصر ہے ان کے ہم عصر اساتذہ عزیزؔ لکھنوی، صفیؔ، بیخودؔ، سائلؔ، نوحؔ، ان میں سے کس غریب کو آج داخلے کی اجازت ملتی ہے؟ اور تو اور آرزوؔ اور جگرؔ کے نام بھی بے دخلی کا نوٹس جاری کیا جارہا ہے۔ سب شاعر یاس یگانہ چنگیزی کی طرح ڈھیٹ کہاں ہیں کہ دھکے کھائیں اور اڑے رہیں۔ صدر دروازہ نہ سہی، چور دروازہ سہی، کمندیں ڈالنا، سیندھ لگانا بھلے مانسوں کا شیوہ نہیں۔ وحشتؔ اور ان کے معاصرین کا فن ''یگانہ آرٹ'' نہیں تھا۔ نستعلیق اور خوددار لوگ تھے کیا کرتے؟

؎ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وانہ ہوا

نئے حافظے میں رہائش کا مسئلہ ہر دور میں پیچیدہ رہا ہے ''قدیم باشندے'' بے گھر نہ ہوں تو ''تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل'' کہاں کھپائے جائیں۔ وحشتؔ تو یوں بھی پردیسی تھے۔

؎ اک ہمصفیر نے بھی نہ پوچھا کہاں چلے؟

خان بہادر سید رضا صاحب کے پرستار بہت تھے۔ بے چارے وحشتؔ کلکتوی کا پرسانِ حال کوئی نہ تھا۔ اترا شحنہ مردک نام۔

شخصیت جب فن کو سہارا دیتی ہے تو اس سے اپنا حقِ خدمت وصول کئے بغیر نہیں چھوڑتی۔ یہ ٹیکس بہتوں کی طرح وحشتؔ کو بھی ادا کرنا پڑا۔

ستّر سال کی عمر میں تلوے کھجلائے اور فکرِ مستقبل نے رختِ سفر بندھوایا تو وطنی رواداری بھی خدا حافظ کہنے پر مجبور ہوگئی۔ ہمارے شاعر نے اس وقت ترکِ وطن کی ٹھانی جب لوگ سفر آخرت کی تیاری کرتے ہیں۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وحشتؔ ہندوستانی شہریت سے خود دست بردار ہوئے تھے۔ حالات نے کلامِ وحشتؔ کے شہری حقوق بھی چھین لئے۔ غریب اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ سچ ہے کرے کوئی، بھرے کوئی۔

کراچی سے ان کی صاحب زادی لکھتی ہیں کہ ''ترانۂ وحشت'' کی پانچ سو جلدیں آج تک اپنی قسمت کو رو رہی ہیں''۔ محترمہ چاہتی ہیں کہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی تعاون کا ہاتھ بڑھائے۔ پیش کش سر آنکھوں پر --- مگر

؎ خانۂ ملاح در چین است و کشتی در فرنگ

صورتِ خاک میں پنہاں۔ کلام گردِ مہ و سال میں گم۔ دیکھا ہو تو ''چشم ماروشن، دلِ ماشاد'' کہیں پڑھا ہو تو اُٹھتے بیٹھتے کلمہ پڑھیں۔ نیا قلم شخصیت پر کیا لکھے؟ فن پر کیوں کر لکھے؟ بزرگوں نے وحشتؔ کے بارے میں حالیؔ، شبلیؔ اور صفیؔ لکھنوی وغیرہ کے کلماتِ خیر پر قناعت کرلی۔ کسی کو یہ احساس تک نہ ہوا کہ وحشتؔ کے کارنامے جملے نہیں تفصیل چاہتے ہیں، اور تفصیل کا میدان ''آہ اور واہ'' کے پاؤں سے طے نہیں ہوتا۔ تجربہ یہی بتاتا ہے کہ زبان جب قلم کا ہاتھ پکڑ کر چلنے سے انکار کردیتی ہے تو مُنہ کے بل گر پڑتی ہے اور توصیفی کلمات جب کاغذی لباس پہننے سے گریز کرتے ہیں تو ہوا میں تحلیل ہوجاتے ہیں۔ کوتاہ قلمی اور زبان درازی کے بادل گرجتے تو بہت ہیں، برستے کبھی نہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ وحشتؔ کے ارشد تلامذہ میں کئی حضرات ملک کی اعلیٰ درسگاہوں سے وابستہ تھے۔ تھوڑی سی توجہ فرماتے تو اپنی نگرانی میں استاد پر تحقیقی مقالہ لکھوا سکتے تھے۔ بد نصیب وحشتؔ ان کی نظرِ التفات سے بھی دور رہے ؎

دیکھا جو مُڑ کے میں نے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

خواجہ تاشوں کی کچھ لاج رکھی تو مولانا شاکر کلکتوی نے رکھی۔ مرحوم تھے تو نادار لیکن آدمی تھے کردار کے۔ کمر باندھ کر اُٹھے تھے کہ کچھ کر گزریں گے مگر مفلسی ''کالی بلی'' بن کر راستہ کاٹ گئی۔ مکاتیبِ وحشتؔ کی ترتیب واشاعت اسی مردِ قلندر کے خلوصِ عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ پتلی سی کتاب علامہ کی وہ تصنیف ہے جو دیوانِ اول کی طباعت کے پچپن سال بعد ان کے وطنِ عزیز (کلکتہ) سے اشاعت پذیر ہوئی۔ **''فاعتبرو یا اولی الابصار''.**

اب مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے ''مضامینِ وحشتؔ'' شائع کی ہے۔ یہ ایک نیک شگون ہے لیکن ؎

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

غالب کا مقلد، کوئی ادبی اچھوت نہ تھا کہ اس کے سائے سے بھی دور رہا جاتا۔ جہاں وہ تھا وہاں دار ورسن کی آزمائش تھی۔

داغؔ اور ان کے ان گنت ہوا خواہوں کے بھیس میں رکاکت وابتذال کی ایسی آندھی

نہ آنکھیں باقی جو خواب دیکھیں!

ہزاروں صدیوں سے ریت کی اس چمکتی چادر کو اوڑھ کر میں پڑی ہوئی تھی
ہزاروں صدیوں سے ریت کے آتشیں بگولوں کی مار کھا کھا کے مر رہی تھی
کہ میری چھاتی پہ پاؤں رکھ کر جو اونٹ کے قافلے گزرتے
کسی کے قدموں کی ریت اڑتی
تو ساری وادی میں ایک آواز گونج اٹھتی
"زمیں کی بیٹی یہ پوکھرن ہے
اجاڑ، ویران، بانجھ، بنجر یہ پوکھرن ہے"
صدائے لعنت سے سہم کر میں جو اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھرتی
تو اپنے ہونٹوں پہ اپنے ہی دودھ کا میں سواد پاتی
یہ دودھ جو میری چھاتیوں میں اُبل اُبل کر بھی منجمد تھا
شریر میرا عجب سے جذبوں کی آگ میں تب جھلنے لگتا
مری نگاہوں میں خواب کا اک سہانا منظر سا جاگ اٹھتا
کہ اک دیالا زمیں کا بیٹا
اُٹھائے کاندھے پہ اپنے تیشہ
شریر کو چھونے بڑھا ہے
اُسے مرے سخت بازوؤں نے جکڑ لیا ہے
وہ میرے اندر سما گیا ہے
اُس کے تیشے کی چوٹ سے یہ شریر میرا
خوشی کے نشے میں جھوم اٹھا ہے
نمو کی خواہش مری رگوں میں مچل اٹھی ہے
پڑی ہے تیشے کی چوٹ پیہم
تو میرے اندر ابل رہی جوئے شیر جیسے
رواں ہوئی ہے
بدن کی وادی میں جشن سا ہے
فقط مسرت کا اک سماں ہے
کہ پوکھرن اب نہ بانجھ ہے نہ اجاڑ بنجر
کہ میرے دامن میں دھان بھی ہے
لہو بھی پانی بھی

کارخانوں کی چمنیوں کا دھواں بھی
محنت کا عزم بھی ہے
ہے اس کنارے سے اس کنارے
تلک مسرت کا اک سویرا
ہے میرے شانوں پہ فاختاؤں کا بھی بسیرا

مگر مرے خواب اس سے پہلے
کہ اک حقیقت کا روپ لیتے
نہ جانے کس نے وہ سحر پھونکا
قیامت آئی
زمیں سے آکاش تک اجالوں کے تیز نیزوں کی ایک یلغار
جس کی زد پہ ہوں میں اکیلی، نہتی تنہا
مگر نہیں اجلی فاختائیں بسیرا جن کا تھا میرے شانے پہ
وہ بھی پل بھر میں خاک دخوں میں بدل گئی ہیں
سفید پر بھی فضا میں بکھرے پڑے ہیں ہر سو
وہ اک اجالا
جو دیوتا کا شراپ بن کر
برس گیا ہے
مری بصارت کو ڈس گیا ہے
وہ سارے سپنے بکھر گئے ہیں
جو میری آنکھوں میں پل رہے تھے
میں ریت کے آتشیں بگولوں کی مار کھا کھا کے بچ رہی تھی
ہزاروں صدیوں سے جی رہی تھی

یہ سانحہ کیسا سانحہ ہے
نہ خواب ایسا جو زندگی دے
نہ آنکھیں باقی جو خواب دیکھیں!



اعزاز افضل

نام ۔ سید ابوالاعزاز افضل
قلمی نام ۔ اعزاز افضل
تاریخ پیدائش ۲۰ جولائی ۱۹۳۶ء
والد مولوی سید ابوالفضل
والدہ میمونہ خاتون
رفیقۂ حیات سلمہ افضل
اولادیں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں۔
تعلیم ۔ ایم اے (گولڈ مڈلسٹ) کلکتہ یونیورسٹی
اساتذہ (شاعری میں) سید ابوالحسن رنگ لکھنوی، پرویز شاہدی
ملازمت سی ایم او ہائی اسکول، کلکتہ ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۶ء
ہگلی محسن کالج، ہگلی ۔ ۶۶ء تا ۶۹ء۔ مولانا آزاد کالج (اسسٹنٹ) پروفیسر، ریڈر، صدر شعبۂ اردو ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۹ء
ممبر، پبلک سروس کمیشن، مغربی بنگال ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۵ء
تصنیفات : زخم صدا --- ۱۹۷۴ء
اَن پڑھ آندھی --- ۱۹۸۰ء
مقتل کی شاعری (بنگلہ ترجمہ) ۱۹۹۲ء
قلم برداشتہ (مجموعۂ قطعات) ۹۵ء
اعزاز، اکرام، انعام ۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی ۱۹۷۴ء اور ۱۹۸۰ء
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ (مغربی بنگال اردو اکیڈمی) ۱۹۸۳ء
امتیازِ میر (آل انڈیا میر اکیڈمی، لکھنؤ) --- ۱۹۸۵ء
بھارتیہ بھاشا پریشد۔ کلکتہ (اعزاز و اکرام) --- ۱۹۹۹ء
حکومت مغربی بنگال (اعزاز و اکرام) --- ۲۰۰۰ء
جشنِ اعزاز افضل --- ۱۹۸۰ء
اعزاز افضل نمبر (سہ ماہی رابطہ کلکتہ) --- ۱۹۹۴ء

پتہ ۔ 84/7, Ripon Street
Calcutta - 700016
فون ۔ (033) 229-6727

غزلیں

کسی کے ساتھ چلنا عمر بھر اچھا نہیں لگتا
مگر کیا کیجئے تنہا سفر اچھا نہیں لگتا

ہزاروں دامنوں کی خواہشوں کا پاس ہے ورنہ
مجھے اپنی ریاضت کا ثمر اچھا نہیں لگتا

ہوئے بے خانماں ہم اپنی افتادِ طبیعت سے
یہ گھر اچھا نہیں لگتا، وہ گھر اچھا نہیں لگتا

کسی تصویر کا بس ایک ہی رخ دیکھتے رہئے
محبت کا یہ اندازِ نظر اچھا نہیں لگتا

گئے وہ دن کہ ہر گردن حسیں معلوم ہوتی تھی
ہو خنجر ہاتھ میں تو کوئی سر اچھا نہیں لگتا

ہواؤ ! میرے بام و در پہ بھی احسان کر جاؤ
ہزاروں بستیوں میں ایک گھر اچھا نہیں لگتا

روز ساحل کی جگہ منجدھار رکھ جاتا ہے کون
ایک دریا ہر ندی کے پار رکھ جاتا ہے کون

منقطع کیوں ہو چلے سب رشتہ ہائے اعتماد
بدگمانی کی چُھری پر دھار رکھ جاتا ہے کون

ڈال دے گردن نہ تیشہ بھی کہیں تھک ہار کے
راستے میں روز اک دیوار رکھ جاتا ہے کون

نیند کی تقدیر میں زنداں کی راتیں بھی نہیں
روزنوں پر صبح کے آثار رکھ جاتا ہے کون

یہ شکستہ ساز، یہ ٹوٹے ہوئے جام و سبو
تیری خلوت کو سرِ بازار رکھ جاتا ہے کون

محتسب سے کون پوچھے ایک ساغر کے عوض
میکدے میں جبّہ و دستار رکھ جاتا ہے کون

جانتے ہیں اور منزل کا پتہ دیتے نہیں
راستوں کے حلق پر تلوار رکھ جاتا ہے کون

غربت میں جب کھلا ہوا زنداں کا در ملا
بے خانماں یہ سمجھے کہ رہنے کو گھر ملا

اُس دورِ دار و گیر سے اس دورِ عدل تک
جس دار پر نگاہ کی اپنا ہی سر ملا

معروفِ گفتگو تو رہے ساری عمر ہم
وقفہ مکالمے کا بہت مختصر ملا

سوئے تو برف گھلتی رہی پور پور میں
جاگے تو سارا جسم پسینے سے تر ملا

اس میں حیات و موت کی تخصیص کچھ نہیں
یہ دل تو جس کسی سے ملا ٹوٹ کر ملا

دیکھا تو ہر جبیں پہ لکھا تھا ''خوش آمدید''
آواز دی تو بند ہر اک دل کا در ملا

رہا سنگیت کا پوجا سے سمبندھ تو اس سلسلے میں اتنا ہی کہ پوجا کی روایت کو اگر سام وید سے مانا جائے تو وہ بنیادی طور پر سُروں کی ہی پوجا ہے۔ کوئی اور قدیم گرنتھ سنگیت کو اتنا اونچا مقام نہیں دیتا جتنا سام وید دیتا ہے۔ سنگیت کو سُر کا صنم مان لیں تو یہ بھی کہ سنگیت ہی پہلی مورتی پوجا ہے۔

''سلیم، کن خیالوں میں گم ہو گئے بھئی؟''

میں کتاب بند کر دیتا ہوں۔ انوراگی سے پوچھتا ہوں۔

''یار، یہ لڑکی گاتی بھی ہے۔۔۔؟''

''گاتی ہی نہیں، بہت اچھا گاتی ہے''۔

انوراگی کا جواب ہے۔ اور پھر انوراگی بتاتا ہے کہ بھوپال میں جنمی اس بنگالی لڑکی نے ہندی میڈیم سے تعلیم پائی ہے۔ یہاں کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اس کا شوہر کیمسٹری کا پروفیسر ہے۔

اور پروفیسر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ ابھی لوٹا ہے۔ آتے ہی انوراگی سے لپٹ گیا ہے۔ یہ دولہا بن کر بھوپال گیا تھا۔ وہاں اس نے انوراگی کو ہر ایک کام میں آگے آگے دیکھا تھا۔ اس سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ اب جو اپنے گھر میں اسے دیکھا ہے تو حیرت اور بے پناہ خوشی سے اس کا سواگت کیا ہے۔ انوراگی نے بھارتیہ گیان پیٹھ کے حوالے سے میرا تعارف کرایا ہے۔ گیان پیٹھ ابھی خبروں میں ہے کہ اس نے بنگالی ادیب تارا شنکر بندھوپادھیائے کو ان کے ناول ''گن دیوتا'' کو اپنے دوسرے ایک لاکھ روپے کے گراں قدر انعام سے نوازا ہے۔ پہلا انعام ملیالم شاعر جی شنکر کروپ کو پچھلے برس ان کے شعری مجموعہ ''اوٹا کُجل'' پر دیا گیا تھا۔ اس کا ہندی ترجمہ ''بانسری'' کے نام سے بھارتیہ گیان پیٹھ نے شائع کیا تھا جس کا سرورق نیشنل اسکول آف ڈرامہ والے 'القاضی' سے خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔

اور باتیں شروع ہو گئیں۔ مجھے ذرا بھی حیرت نہیں کہ کیمسٹری کا پروفیسر ادب پر بھی خاصی نظر رکھتا ہے کہ یہاں بنگالی عورتیں بھی روزانہ اخبار پڑھتی ہیں۔ گھر گرہستی کے کاموں سے کچھ وقت مطالعے کے لئے بھی نکال لیتی ہیں۔ فنون لطیفہ سے بھی اپنا لگاؤ برقرار رکھتی ہیں۔ لیکن باتوں کے دوران میں یہ محسوس کئے بنا نہ رہ سکا کہ گرودیو رویندر ناتھ ٹیگور ان کی نظروں میں سب سے بڑے شاعر سہی۔ کوئی گھر شائد ہی ان کی تصویر سے خالی ہو۔ پھر بھی اب گرودیو کی ماورائی اور آفاقی شاعری کا سحر ٹوٹتا لگ رہا ہے۔

رویندر سنگیت کی یکسانیت سے بھی لوگ اوبنے لگے ہیں۔ حالانکہ کشور کمار نے رویندر سنگیت کو اس کے بندھے ٹکے اصولوں سے الگ ہٹ کر گایا ہے۔ اس کے گائے ہوئے یہ گانے تازگی اور نئے پن کا احساس بھی دلاتے ہیں۔

ہاں نذرل بیشک مقبول ہے کہ قاضی نذرل اسلام نے ''اگنی وینا'' سے دلوں میں ایک عجیب سی جھنکار پیدا کر دی ہے۔ حافظ کی غزلوں سے اس نے حسن و عشق، زندگی کا رس اور آہنگ لے کر اپنے گیتوں کی جو فضا بنائی ہے اور فارسی راگ راگنیوں کے امتزاج سے ان گیتوں کو سُروں سے سنوارا ہے تو سچ مچ ان نغموں کی رنگا رنگی دلوں کے پاس بھرے اندھیروں میں امید اور خوشی کی شمع جلا دیتی ہے۔

اور پھر باتیں ستیہ جیت رے کی ہونے لگی ہیں۔

ستیہ جیت رے کی سلسلہ وار کہانی ''پھیلو دا'' کے دلچسپ کردار کی باتیں مصوری کی باتیں۔ ستیہ جیت رے نے اپنی ابتدائی زندگی میں کتابوں کے سرورق بھی خوب بنائے ہیں۔ اور مجھے یاد آیا ''جناکی'' کے سرورق نے مجھے بھی بیحد متاثر کیا تھا۔ ''جناکی'' بنگلہ میں جگنو کو کہتے ہیں۔ فلیٹ برش سے صرف 'جناکی' لکھ دیا گیا تھا اور رنگوں کے تال میل سے ہی یہ تاثر پیدا کیا گیا تھا جیسے جگنو چمک رہا ہو۔ یہ کتاب سگنیٹ پریس نے شائع کی تھی۔

ستیہ جیت رے کی فلموں کی باتیں چلی ہیں تو میں کہتا ہوں کہ بھئی، میں تو گرویدہ ہوں رتوِک گھٹک کا۔ پروفیسر اس بات کا بُرا نہیں مانتا۔ میری پسند کی داد دیتا ہے اور میں مطمئن ہوں کہ ان کے ہیرو ورشپ کے جذبے کو میں نے ذرا بھی ٹھیس نہیں لگائی۔ انہیں ٹھیس تو اس وقت لگتی جب میں محبوب یا شانتا رام کا نام لے لیتا۔

باتوں باتوں میں شام اُتر آئی ہے۔ اور یہ تب جانا جب جلتی ہوئی لوبان کی تیز خوشبو نے گھیر لیا ہے۔

سُشمتا لوبان جلاتی ہوئی کمرے میں آئی ہے اور ایک خاص زاویے سے ہاتھ گھماتی ہوئی چاروں طرف 'دھونا' دکھاتی ہے۔ کہتی ہے۔۔۔ ''آپ لوگوں کا اور شام کی دیوی کا سواگت ایک ساتھ کر رہی ہوں''۔

اور پھر شنکھ پھونکنے لگتی ہے کہ مہمانوں کا اور 'شام کی دیوی کا آنا شبھ ہو' منگل مے ہو! اور پھر کچھ دیر بعد اپنی ساری کا پلّو کھونسے دونوں ہاتھوں میں تھال سجائے دوبارہ نمودار ہوئی ہے کہ ہم لوگ اب تھوڑا جل پان کر لیں۔

انوراگی کہتا ہے ''ماں نے تمہارے گھر کا پانی پینے کو منع کیا ہے''۔

''مجھے پتہ ہے تم ماں کا کہنا کہاں مانتے ہو''۔ سُشمتا جواب دیتی ہے۔ کہتی ہے 'کھاؤ، کھانے کا پیسہ رکھ دینا۔ ماں کے آدیش کا پالن ہو جائیگا''۔

انوراگی کے پاس اس بار کوئی جواب نہیں۔ اور ہم تینوں کھانے لگتے ہیں دو طرح کی سبزیوں کے ساتھ گرم گرم پوریاں، بیگن بھاجا تھال کے کنارے پر چٹکی بھر نمک دھرا ہوا اور لیموں کا ایک ایک ٹکڑا بھی کٹوریوں میں کھجور کے گڑ کی کھیر جسے یہاں 'پائس' کہتے ہیں۔ یعنی جل پان نہیں۔۔۔ پورا کھانا۔

سُشمتا اور پروفیسر کی ضد کے آگے ہم نے سپر ڈال دی ہے۔ اور اب طے کر لیا ہے کہ دھرم شالہ سے اٹھ کر یہیں آ جائیں۔

اور جب ہم مختصر سے سامان کے ساتھ

رکشے پر لدے یہاں آئے تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ گلی سنسان تھی۔ لیکن سشمتا کا گھر جاگ رہا تھا اور اس رت جگے میں ہمیں بھی شامل ہونا ہے۔

سشمتا پوچھتی ہے۔ "آپ لوگ روٹی کھائینگے یا بھات۔۔۔؟"

"نا بابا۔۔۔ اب اور کچھ نہیں"۔ ہم دونوں ایک ساتھ بول پڑتے ہیں۔

"تو کیا بنا کھائے سو جائینگے۔؟ سشمتا حیرت کا اظہار کرتی ہے۔

"اور نہیں تو کیا"۔ انوراگی کا جواب ہے۔

لیکن ذرا دیر بعد سشمتا 'سندیس' اور "مشٹی دہی" لے آتی ہے کہ ہم بغیر کچھ کھائے سوئینگے کیسے۔

اور سونا کہاں نصیب کہ ہم نے سشمتا سے پوچھ لیا ہے "سنا ہے تم بہت اچھا گاتی ہو"۔

"اچھا بُرا تو میں نہیں جانتی۔ ہاں گاتی ضرور ہوں"۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا"۔ انوراگی درمیان میں ہی بول پڑتا ہے "یقین جانو' یہ بہت اچھا گاتی ہے۔ بھوپال میں جب تک رہی کالج کے ہر فنکشن میں گانے بجانے کا بھی آئٹم ہوتا اور کوئی گائے نہ گائے سشمتا ضرور گاتی اور دوسرے روز اس کے گائے ہوئے گیت، غزل اور بھجن کالج کے احاطوں سے نکل کر شہر میں گونجتے رہتے۔

اتنے میں پروفیسر بھی آجاتا ہے اور کہتا ہے۔۔۔

"تو ہو جائے نا سشمتا کا گان"۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ جب محفل جمتی ہے۔ یہاں چاروں طرف ناریل، کیلے اور سپاری کے درخت ہیں۔ بیچ میں یہ گھر ہے۔ اب ہمیں کسی کو خلل پڑنے کا اندیشہ کہاں۔

سشمتا نے گرو وندنا چھیڑی ہے۔ طبلے پر سنگت کا پروفیسر شوہر کر رہا ہے۔ اور مجھے وہ شام یاد آگئی ہے جب میں فاتح فرخ کے ساتھ سرود نواز استاد دبیر خاں کے پاس بیٹھا ہوں۔ استاد کا درس ختم ہو چکا ہے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی ہیں کہ استاد کہتے ہیں کہ گانا تو اب گنگو بائی ہنگل گاتی ہے۔ آواز میں اتنا وزن جسے آپ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اُس دن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ بھلا آواز کا وزن بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ لیکن آج جب یہ نازک اندام سی لڑکی گا رہی ہے تو میں اس کی آواز کا وزن سچ مچ محسوس کر رہا ہوں۔

گرو وندنا کے بعد اس نے سورداس کا بھجن اٹھایا ہے۔ "جب ہری مُرلی اَدھر دھری"

راگ ہے ملہار۔ جسے ملار بھی کہا جاتا ہے۔ اور پھر دوسرا بھجن

"جس دن بَرَست نین ہمارے

سدا رہت پاوس رتو ہم پہ، جب تیں سیام سدھارے"۔

ایک طرف گوپیاں اپنی آنکھوں سے کبھی نہ تھمنے والی آنسوؤں کی جھڑی کو دیکھتی ہیں اور دوسری طرف برسات کے موسم کو۔ اور ظاہر ہے اس بھجن کے لئے بھی ملہار ہی مناسب راگ ہے۔ اور پھر ایک پر ایک بھجن۔

اور اب ودیاپتی کا پد۔ ودیاپتی کا وہی پد جو گرودیو رویندر ناتھ کو بھی بہت اچھا لگتا تھا۔

"سکھی، کی پوچھبی انوبھو موئے"۔

اور۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ اب بیحد چونکانے والے انداز میں ایک بھوجپوری گیت چھیڑ دیا ہے سشمتا نے۔۔۔۔"۔

"ایہی ٹھیاں نتھنی ہرانی ہو راما"۔

اور ابتک جو ہم سُر ساگر میں بہے جا رہے تھے۔ ایسا لگا جیسے اسی جگہ ہم نے اپنا بہت کچھ، سب کچھ گُم کر دیا ہو۔ رات کا آخری پہر بھی بیت چلا ہے۔ دیپ چندی تال پر نٹ بھیرو راگ کی دھن چھیڑ دی گئی ہے۔ چودہ ماتراؤں والی دیپ چندی کو میں اپنی انگلیوں پر ترتیب دیتا ہوں، طبلے کی آواز کو پکڑتا ہوں تو مجھے لگتا ہے پروفیسر کے ہاتھ تھک چکے ہیں اسی لئے بہک رہے ہیں۔ لیکن سشمتا کی آواز میں اب بھی وہی دم ہے۔ پھر بھی آواز تھم جاتی ہے۔ ہاتھ رک جاتے ہیں۔

اور میں سوچتا ہوں یہ سنگیت کی دنیا بھی کتنی چھوٹی ہے۔ صرف سات سُروں پر آدھارت۔ لیکن یہی سات سُر ساری زندگی پر محیط ہیں۔ دُکھ سُکھ صبح شام رات دن آتے جاتے موسم۔

سردی گرمی برسات۔ خزاں اور بہار۔

زندگی اور موت

موت اور زندگی!

اور زندگی کا شیدائی تو انوراگی بھی ہے۔ اپنا انوراگی جو بڑا اچھا شاعر ہے اور ایک اچھا آدمی بھی۔ لیکن مجھے اس پر بارہا غصہ بھی آیا ہے۔ غصہ اس وقت جب اس کے ساتھ میں بازار سے گذرا ہوں۔ کیا مجال جو کسی دوکان کے شوکیس کو اچھی طرح دیکھے بغیر راستہ طے کر لے۔ اور مصیبت یہ کہ صرف شوکیس کو ہی دیکھ کر نہیں رہ جاتا بلکہ دوکان سے کوئی نہ کوئی چیز پسند کر کے خرید بھی لیتا ہے۔ میں انوراگی کی ان باتوں سے بہت بور ہو رہا ہوں۔ وہ سمجھاتا ہے۔۔۔ "بس سلیم، اب نہیں"۔ لیکن دو قدم چلنے پر کوئی دوکان پھر اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک اور سامان کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

اور یہ بوریت اس وقت تک میرے ساتھ رہی ہے جب تک انوراگی نے یہ نہ جان لیا ہے کہ اپنے پاس مل ملا کر اتنے ہی پیسے رہ گئے ہیں جن سے گھر لوٹا جا سکے۔

اور آج ہم دونوں لوٹ رہے ہیں۔

انوراگی ہوشنگ آباد اور میں کلکتے کی اور۔

کلکتہ۔۔۔ جہاں کی مصروف زندگی میں، میں انوراگی سے پھر ملنے کا بہانہ ڈھونڈا کرونگا اور جہاں شانتی نکیتن کی یاد سے ہی جیون میں سکھ اور شانتی کا رس گھلتا رہیگا۔

سوار ہوا ہے اور یہ ٹیڑھے میڑھے الٹے سیدھے پیکر بنانے لگا ہے اسے یہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اور دونوں میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔

ایک دن شیفالی کو قائل کرنے کے لئے ہیر یشور نے گرودیو کے بھتیجے کی مثال دی جس نے گرودیو روندر ناتھ کی رومانیت کے خلاف ڈھاکہ اسکول کے بدھ دیو بسو اور جیونانند داس کے اثر میں آکر ایک اُلو پال لیا تھا گرودیو کو معلوم ہوا تو ایک دن بلا کر ڈانٹا...

''سن رے ہمارے گھر میں دو اُلو ایک ساتھ نہیں رہ سکتے''۔

لیکن باغی من کی پکار اور جدیدیت کی لہر دب نہ پائی۔ بنگال کی نئی شاعری اور جواں سال چتر کاروں کا گروپ اس بات کا گواہ ہے کہ روندر ناتھ ٹھاکر ادبی جنگ ہار گئے اور میدان نئے فنکاروں، نئے رچنا کاروں کے ہاتھ رہا۔ لیکن شیفالی ان باتوں سے قائل نہیں ہوئی۔ اور گرودیو کے نام کا جادو بھی اس پر چل نہ پایا۔

یوں تو بنگالیوں کے تقریباً ہر گھر میں رقص و موسیقی کی روائت رہی لیکن شیفالی نے تو کلاسیکل ڈانس کا ڈپلوما چنڈی گڑھ سے لیا ہے۔ وہ ہم لوگوں کے درمیان حائل نہیں ہوئی۔ اور روندر ناتھ کے ڈانس ڈرامہ ''شیاما'' کی ریہرسل میں لگ جاتی ہے۔ اس میوزیکل ڈرامے کو وہ دو مہینے بعد اسٹیج کریگی۔

اور ہریشور کہتا ہے.....

''یہ شیفالی بھی خوب ہے۔ گھوم پھر کر گرودیو کے ''چنڈالیکا'' ''تاشیر پوجا'' اور ''شیاما'' کو ہی اسٹیج کرتی رہتی ہے۔ میں کئی بار اس سے کہہ چکا کہ شمالی ذیر بہت ہوا۔ اب ذرا اپنی لائن بدلو اور ایڈورڈ باونڈ کو اٹھاؤ۔ مگر یہ کچھ سنتی ہی نہیں...''۔

''ارے بھائی، تم کیسے۔ تم ایڈورڈ باونڈ کے ڈرامے میں ڈانس پچویشن پیدا کرو۔ یہ بیشک اسے اسٹیج کریگی...''۔

میں ہریشور کی بات کا جواب دیتا ہوں۔

اس بات پر بڑے زور کا قہقہہ لگتا ہے۔ شیفالی کے پاؤں ناچتے ناچتے اچانک تھم جاتے ہیں۔ وہ قہر بھری نظروں سے ہم لوگوں کو دیکھتی ہے۔ اور میں شرمسار سا اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔ میں موضوع بدلنے کے لئے دھیرے سے کہتا ہوں۔

''ابھی حال میں جیونانند داس کا شعری مجموعہ بہت خوبصورت انداز میں چھپ کر آیا ہے۔ تم نے دیکھا کیا...''۔

''ہاں، اچھا یاد دلایا تم نے...''۔

ہیر یشور کہتا ہے اور لپک کر دوسرے کمرے سے وہ کتاب اٹھا لاتا ہے۔ بغیر کسی تمہید کے کتاب میں سے ایک نظم بنگالیوں کے مخصوص لب و لہجے میں سنانے لگتا ہے۔

انوراگی میری طرف دیکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ کیا کہنا چاہتا ہے میں ہاتھ کے اشارے سے ہیر یشور کو روک دیتا ہوں اور کہتا ہوں ''تم ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ میں اس کا ترجمہ کرتا جاؤں کہ انوراگی بھی ان نظموں کا لطف اٹھا سکے...''۔

اور ہیر یشور پھر سے پڑھنے لگتا ہے۔ میں ترجمہ کرتا جاتا ہوں

''میرا بنگالی من
آج رات
دور دھرتی کی خوشبو سے بھر اُٹھا ہے
ایک دن آکاش تلے موت آکر
انجانی گھاس کے سینے پر
مجھے سو جانے کے لئے کہے
تب اس گھاس میں
بنگالی گھاس کی سونف جیسی خوشبو رچی رہے گی
حسینہ کی چھاتیوں میں جیسے پہلی بار
ماں بننے پر مکھن تیرتا ہے
تمام کائنات میں عجیب سی شانتی رہتی ہے
گھاس
آنکھ
سفید ہاتھ
اور دودھ بھری چھاتیاں...''

اور اب ہیریشور ایک دوسری نظم سنا رہا ہے

''ہو سکتا ہے شام کی ہواؤں میں
گِدھ اُڑتے نظر آئیں
ہو سکتا ہے سیمل کی ڈال پر
ایک اُلو پکارے
جس پر لکشمی سوار ہو
ہو سکتا ہے کوئی بچّہ
آنگن کی گھاس پر
دھان کی کھیل بکھیرتا دکھائی دے
ہو سکتا ہے کوئی نوجوان
روپہلے گدلے پانی میں
بوسیدہ بادبان والی کشتی تیرائے
یا جھیل کے اس پار
چاندی جیسے بادلوں میں
سفید بگلے اڑتے نظر آئیں
پُرسکون اندھیرے میں
پاؤ گے مجھے بھی
اُن ہی میں
کہیں نہ کہیں تم''

انوراگی نے آج جدیدیت پر بحث کرتے ہوئے یہ ایک بات کہہ دی تھی کہ جدیدیت اپنی جغرافیائی حدوں میں سمٹ کر نہیں رہ جاتی۔

اس کا کردار تو بین الاقوامی ہوتا ہے۔

لیکن جیونانند داس کی شعری کائنات میں بنگال اپنی تمام تر مرکزیت کے ساتھ بولتا ہے۔ یہ کویتائیں دھان کی خوشبو سے رچی بسی کویتائیں ہیں۔ ان کی علاقائیت ہی ان کی سندرتا ہے جو انہیں علاقے سے باہر پھیلاتی ہے۔ آج شام سے ہی انوراگی بہت اداس ہے اور بےچین بھی۔ بھوپال میں اُس کے پڑوس میں ایک بنگالی خاندان رہتا ہے۔ سشمتا اس کے ساتھ ہی پلی بڑھی پڑھ لکھ کر جوان ہوئی ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے وہ بیاہ کر یہاں آئی

ہے۔ اس کے گھر کا پتہ اس کی چھوٹی سی نوٹ بک میں درج تھا۔ وہ نوٹ بک اسے مل نہیں رہی ہے۔ کئی بار اپنے سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھ چکا۔

میں کہتا ہوں: ''یار، بھگوان باہو بلی کا نام لے کر سو جا۔ صبح **انا للہ و انا علیہ راجعون** کہہ کر تلاش کرنا مل جائیگی۔۔''۔

اور ایسا ہی ہوا۔

لیکن سُشمتا کا مکان ڈھونڈھنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ پھر بھی ہم وہاں پہنچ گئے۔

ابھی ہم ایک موڑ پر اس کے گھر کا پتہ پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ سُشمتا نے انوراگی کو دور سے ہی دیکھ لیا ہے۔ لگتا ہے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ اور میری آنکھیں سُشمتا کو یوں دیکھ رہی ہیں جیسے کبھی ارجن نے سر دورتت پر چترانگدا کو دیکھا تھا۔ اور رویندر ناتھ نے روپسی چترانگدا کی تخلیق کی تھی۔ بول اُٹھے تھے۔

کاہارے ہیر پلام، آہا
سے کی ستیہ، سے کی مایا
سے کی کایا
سے کی سورن کرنے رنجت چھایا
کس کو دیکھا ہے میں نے، کیا کہنا
یہ حقیقت ہے یا کوئی سپنا
ہے کوئی کایا، یا کہ ہے مایا
یا سنہری کرنوں کے دھاگوں کا
ہے کوئی جال
یا محض چھایا

لیکن یہاں کایا، مایا اور سنہری کرنوں سے مایا کا سوال کہاں۔ ایک حقیقت ہے جو ...ی ہے اور انوراگی سے 'خوشیوں سے ...لی ہوئی لگ رہی ہے---

''...دادا تم آئے کب''۔

''...را سامان کہاں ہے''۔

''گھر سے بھاگ کر آئے ہو کیا''۔

''اور ہاں، چاچی اچھی ہے نا''۔

''یہ کیسی ہے''۔

''ماں سے مل کر آئے ہو یا نہیں؟''۔

اور انوراگی اُسے بہت اطمینان سے کہتا ہے کہ وہ چار دنوں سے یہاں آیا ہوا ہے اور دھرم شالے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

یہ سنتے ہی وہ پھٹ پڑتی ہے---

''تو کیا ہم اتنے پرائے ہو گئے۔ آپ تو آپ اپنے ساتھ ایک مہمان کو بھی گھر رہتے دھرم شالے میں ٹھہرا لیا۔ اب میری سنو، اور یہاں آرام سے رہو۔ کل پہلی بوجا ہے۔ ٹھاکر دوارے میں خوب بھجن، بھگتی گان سننے کو ملینگے۔۔''۔

اور وہ انوراگی کا ہاتھ پکڑ کر لگ بھگ گھسیٹتی ہوئی گھر لے جاتی ہے۔ میں بھی پیچھے ہو لیتا ہوں۔

ٹالی کا مکان سادہ، خوبصورت اور بیحد پر سکون ہے۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے ہیں وہ بہت وسیع ہے۔ پلنگ پر چادر کے اوپر شانتی نکیتن اسٹائل کی شیتل پاٹی بچھی ہے کہ بنگالیوں کے گھروں میں پلنگ پر چادر کے اوپر چٹائی بچھانے کا عام رواج ہے۔ دیوار سے لگی ایک کافی بڑی میز پر دو پھولدانوں میں رجنی گندھا کے پھول لگے ہیں۔ اُن کے بیچ گرد دیو رویندر ناتھ ٹھاکر کی بڑی سی تصویر لگی ہے۔ دوسری طرف دیوار پر سوامی وویکانند کی تصویر ٹنگی ہے۔

''آپ لوگ آرام سے بیٹھیں۔ میں ابھی آئی۔۔''۔

سُشمتا یہ کہکر غائب ہو جاتی ہے۔ اور میں میز پر رکھی کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگتا ہوں۔ اور ایل ایم کرمپ کی The lady of the lotus اٹھا لیتا ہوں۔ یہ احمدل عمری کی فارسی تصنیف ''شہید وفا'' کا انگریزی ترجمہ ہے جو غالباً اکبر کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔

صفحوں کو الٹتے ہوئے ایک بڑے سے کاغذ پر ہندی میں لکھی ہاتھ کی زنانہ تحریر دیکھتا ہوں۔ ٹھٹھک جاتا ہوں۔

سورداس کا پد لکھا ہے۔

جب ہری مُرلی اُدھر دھرنی
راگ ملار۔ ساتھ ہی نوٹیشن بھی لکھے ہوئے ہیں۔

اور پیا بن ناگن کاری رات
انکھیاں ہری درشن کی پیاسی
اور بھی سورداس کے کئی پد میوزیکل نوٹیشن کے ساتھ لکھے ہیں۔

ایک جگہ راگ ٹوڑی، کاٹ کراس کی جگہ 'بھیروی ٹھاٹ' لکھا ہے۔ ایک سیدھا سادا سا جملہ ایسا بھی لکھا ہے جس نے میری فکر کو مہمیز کیا ہے۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ یہ لڑکی بھجنوں کی دیوانی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ شاستریہ سنگیت کے اصولوں اور سورداس پر اس کے ذہن میں کچھ سوالیہ نشانات بھی ہیں۔

اور میں سوچتا ہوں۔ سُشمتا آئے تو اُسے بتاؤں کہ سورداس اور شاستر پر سنگیت کی روپ ریکھا سمجھنے کے لئے ہندستانی سنگیت کی تاریخ کے ان صفحات کو پلٹنا ہوگا جو اس زمانے کے سنگیت سے متعارف کراتے ہیں۔

لوچن پنڈت کی 'راگ ترنگنی' ہردے نارائن دیو کی تصنیف 'ہردے کوتک' اور 'ہردے پرکاش' اور آہوبل کی 'سنگیت پاریجات' سے سورداس اور اُن کے سنگیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اور یہ بھی کہ ہندوستانی سنگیت کوئی جامد اور ٹھہری ہوئی اکائی نہیں، متحرک شئے ہے اور ہر زمانے میں اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ بھیرو راگ اگر آج سمپورن جاتی کا راگ ہے تو کبھی وہ اوڈو جاتی کا راگ بھی رہ چکا ہے۔ ٹوڑی، بھیروی ٹھاٹ کے نزدیک ہی تو ہے۔ سور ساگر کے پدوں کو سورداس کس طرح گاتے تھے اور راگ، سُر، تال اور لے کے ساتھ گیتوں کے حرفوں اور لفظوں کا کیا رشتہ رہتا تھا اس کی چنتا چھوڑ کر گائک کو کسی مقبول راگ کے سُروں میں باندھ لینا چاہئے۔۔۔۔۔۔

بدل دو۔۔۔"۔

اور ان شبدوں کو کاٹتی ہوئی ایک آواز ابھرتی ہے۔ گرودیو رویندر ناتھ ٹیگور کی آواز۔

"ہے جننی، دنیا کو بجنے دے جس میں یہ سنسار ڈوب جائے۔ اور ایک بار ہم اپنا وجود بھول جائیں۔ ایک گیت کے سُر میں سب بندھ جائیں۔ کون کہاں ہے۔ کس کا آواگون ہوتا ہے سبھی ایک پل کے لئے آتے ہیں' چلے جاتے ہیں۔ جیسے ساگر کے کنارے ریت پر چھایا اور ریکھاؤں کا کھیل "۔

اور۔۔۔ "یہ 'چت پرنی' ہے۔

یہ مٹی کی ہی مٹی کے بھتوں سے پاٹی ہوئی 'شیاملی' ہے۔

گرودیو کی یہ کٹیا بہت پیاری تھی۔ گاندھی جی بھی جب آتے تو یہیں ٹھہرتے اور دیکھتے گرودیو یہاں بیٹھکر اپنی کویتائیں سنایا کرتے تھے۔۔۔"۔

باجپئی جی بتاتے ہیں۔

اور میں سوچتا ہوں شیاملی مٹی سے گرودیو کا رشتہ تو بے حد فطری ہے۔ وشو بھارتی کے کیمپس اور شانتی نکیتن کے سارے ماحول کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ فطرت کے ساتھ اس یونیورسٹی کا کتنا گہرا لگاؤ ہے۔ پھر یہ کہ آشرم کا روپ نوٹل اسٹرکچر کے ساتھ ماحول کی مطابقت سے ایک آئیڈیل۔۔۔ جو رویندر ناتھ کے شاعرانہ ذہن کی ہی پیداوار ہے۔

اور اب ہم اُن درختوں کے جھنڈ سے ہو کر جو جتندر ناتھ کے ہاتھوں لتاؤں کا روپ دھار چکے ہیں ایک کُنج میں آجاتے ہیں۔ جسے گرودیو نے 'پمپاسر دور' کا نام دے رکھا ہے۔

اور میں پمپاسر دور کا نام سنتے ہی جیسے رامائن کے عہد میں جا پہنچتا ہوں۔ پمپاسر دور۔۔۔ رام چندر جی۔۔۔ بالی۔۔۔ سگریوں۔۔۔ اور پھر۔۔۔ ساری یادیں سمٹ سمٹ کر بکھرنے لگتی ہیں۔

"گرودیو نے ہر جگہ کے بڑے اچھے اچھے نام دے رکھے ہیں۔۔۔"۔

میں باجپئی جی کی آواز پر چونک اٹھتا ہوں۔۔۔

"لوگ تو دور دور سے اُن کے پاس نام رکھوانے چلے آتے تھے اور وہ بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے ناموں کے رکھنے میں۔۔۔"۔

میں انوراگی کی اور دیکھتا ہوں۔ وہ بھی شائد اس پمپا سر دور میں پہنچ کر میری ہی طرح کوئی خواب دیکھنے لگا ہے۔

انوراگی، جو شاعر ہے اور جسے مجھ سے زیادہ سپنے بُننے کا ادھیکار ہے۔

یوں 'انوراگی کئی بار کہہ چکا ہے۔۔۔

"سلیم بھائی تم تو مجھ سے بھی زیادہ کوی ہو"۔

اور میں اس زیادہ کوی ہونے پر غور کرنے لگتا ہوں۔

آج شانتی نکیتن آئے ہوئے تیسرا دن ہے۔ ہم دونوں پروگرام کے مطابق ٹھیک دس بجے 'رویندر سدن' پہنچ جاتے ہیں۔

میں باجپئی جی کی ٹیبل پر رکھے کتابوں کے ڈھیر میں سے فارسی مجلہ "ایران" کا ایک بہت پرانا شمارہ اٹھالیتا ہوں۔ جو ٹیگور پر خصوصی شمارہ ہے۔

کہا جاتا ہے گرودیو کے پتا مہارشی دیو ناتھ فارسی کا بہت ہی ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہر صبح پوجاپاٹ کے بعد، پوجا پر ہی بیٹھے ہوئے فارسی کی کوئی غزل بھی ضرور پڑھتے تھے اور وہ غزل عام طور پر حافظ شیرازی کی ہوتی تھی۔

اور رویندر ناتھ ٹیگور نے اپنے ایران کے سفر میں دیوان حافظ سے فال بھی دیکھی تھی۔

اور باجپئی جی رویندر سدن کی ایک ایک چیز کو بڑے پیار سے دکھا رہے ہیں۔

رویندر سدن؛ جہاں گرودیو کی زندگی کے ہر پل کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔

اور اب ہم ٹہلتے ہوئے چھتم تلے آجاتے ہیں۔۔۔۔ چھتم تلے؛ جہاں پوجا تو ہوتی ہے لیکن کوئی مورتی نہیں ہے۔

'چینی بھون' دیکھنے کے بعد ہم لوگ 'ہندی بھون' پہنچے ہیں تو میں نے پوچھا ہے۔

"آپ کے ہندی وبھاگ کا کیا حال ہے؟"

"جب تک 'بنارسی داس جی رہے۔ بہت اچھا رہا۔ لیکن ہم سب تو گھُٹ گھُٹ کے جیتے ہیں"۔

یہاں آئے ہوئے پچھمی چندر جی نے تاکید کی تھی کہ شانتی نکیتن میں ہم گوسائیں جی سے ضرور ملیں گے۔ اور اُنہیں یہ زبانی پیغام بھی دیں گے کہ گیان پیٹھ کو انکے مشوروں کی ضرورت ہے۔ گاہے گاہے نوازتے رہیں۔ پچھمی چندر جی نے ان کے بارے میں کچھ اور نہیں بتایا تھا۔

باجپئی جی سے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کیا تو انہوں نے بتایا کہ گوسائیں جی بہت ساری بھاشاؤں کے گیاتا ہیں۔ ابھی طویل بیماری سے صحت یاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ اور یہ دن رات آرام کرسی پر پڑے، کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں آرام ہی آرام ہے۔

اور ہم لوگ بھی جب ان کے یہاں پہنچے تو یہ آرام کرسی پر تو نہیں، پلنگ پر گاؤ تکئے کی ٹیک لگائے دونوں ٹخنوں کو موڑے مولانا آزاد کی تفسیر القرآن کے مطالعے میں محو تھے۔ اُن کے پاس ہی "تذکرہ ملائے ہند" رکھی تھی۔

اُنھیں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا گیا۔

لیکن میں پل بھر کیلئے کنفیوز ہو کر رہ گیا۔

حالانکہ میرے کنفیوز ہونے کا کوئی جواز نہ تھا کہ میں تو ہندی کے نامور ادیب سچتا نند، ہیرانند، واتسائن، اگیئے کو بیحد شستہ اردو میں باتیں کرتے سنا ہے۔ پچھمی چندر جی کو 'بالِ جبریل' اپنے تکئے کے نیچے رکھ کر سوتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ اقبال اور ادھر حالیہ دنوں میں مولانا آزاد کا مطالعہ بہت باقاعدگی سے کیا کرتے ہیں۔ پھر بھی۔۔۔۔ پچھمی چندر جی نے تو

ان کا نام گوسائیں جی ہی بتایا تھا اور باجپئی جی بھی اسی نام سے ملانے لائے ہیں۔

انہوں نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔

اس بیچ وہ تفسیر القران کو اپنے پلنگ سے قدرے اونچی ٹیبل پر جو پاس ہی پڑی تھی، رکھ چکے تھے۔ ان کے اشارے پر ہم لوگ بھی بیٹھ گئے تو وہ مخاطب ہوئے۔ کبھی چندر جی کی خیریت پوچھی اور پھر تذکرۂ علمائے ہند کو اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے گویا ہوئے۔۔۔۔

"جنگ آزادی میں علماؤں کا بڑا ہاتھ رہا۔ وہ تو درمیان میں پاکستان آگیا اور بہت کچھ بٹ گیا۔ زمین کا ہی نہیں۔ خاندانوں اور دلوں کا بھی بٹوارا ہو گیا"۔

گوسائیں جی ذرا رکے اور کہنے لگے۔۔۔۔

"آزاد تو مولانا کہے جاتے ہیں۔ ان کی بات ہی الگ ہے۔ اُن کے یہاں جو علمی وقار ہے وہ دوسروں کو نصیب کہاں۔۔۔۔"

اور پھر خیالوں میں ڈوب گئے۔ ابھرے تو کہنے لگے ۔۔۔۔ "میرے پڑوس میں ایک عالم تھے، بڑے جید عالم۔۔۔۔ شاہ فضل رحمان۔۔۔ شبلی نے ندوہ کی بنیاد رکھی تو ان کا بھرپور تعاون انہیں حاصل ہوا۔ ترجمے بھی خوب کیے۔ قرانِ کریم کی کچھ سورتوں کا ترجمہ کیا تھا۔ جسے گلشن ابراہیمی پریس لکھنو نے شائع کیا تھا۔۔۔۔۔"

اور اب وہ جیسے اپنے ذہن پر زور دے رہے تھے۔۔۔۔

(انّا صببنا الماءَ صبّاً ثم شققنا الارض شقّاً)

اس کا ترجمہ انہوں نے کتنی خوبصورتی سے کیا تھا۔ یہ کہ

ہم نے جھم جھم برکھا برسائی
پھر تڑا تڑ دھرتی پھاڑی

"تجلی" کا ترجمہ

کچھ دیکھا کچھ نہ دیکھا

کیا تھا جو میرے جی کو ایسا بھایا کہ کچھ نہ پوچھئے۔۔۔۔۔۔"

مذہب پر بولنے کا میں اختیار نہیں رکھتا۔ لیکن اس سوچ میں ضرور پڑ گیا ہوں کہ تجلی کیلئے کچھ دیکھا کچھ نہ دیکھا تک تو ٹھیک لیکن قرآن حکیم کے ترجمے اتنے بے تکلف لفظوں کے متحمل ہو سکتے ہیں کیا۔۔۔اور اسی گھڑی مجھے رگ وید کے منتر یاد آئے۔ جہاں اس طرح کا اندازِ بیان عام ہے کہ:

"ہے اِندر! جب پانی کے لئے تم نے بادلوں کو پھاڑ ڈالا۔ تمہارے سامنے گوؤں کا پیغام لے کر سرما ظاہر ہوئی۔۔۔۔۔"

اور یہ کہ

"مستی سے چور گایوں کی طرح آگے بہتی ہوئی دھارا کے ساتھ ندیاں سمندر میں داخل ہو گئیں۔۔۔۔"

لیکن میں خاموش رہا۔

اور بھی وہ نہ جانے کیا کچھ بتاتے کہ ایک آدمی کمرے میں آکر اُنہیں ٹوک گیا کہ ڈاکٹر نے زیادہ بولنے سے منع کیا ہے۔

اٹھنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا پھر بھی ہم چلنے کو تیار ہو گئے۔

اٹھتے اٹھتے گوسائیں جی نے ہمیں پھر تھام لیا۔

"جانے سے پہلے آپ لوگ مجھ سے پھر ایک بار ملینگے۔ ابھی چند روز ہوئے میں نے قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" پڑھا ہے۔ یہ کتاب اپنی سفارشات کے ساتھ کبھی چندر جی کو دونگا۔ آپ لیتے جائیے۔۔۔"انوراگی کی زبان پر تو تالا لگا تھا۔ میں بھی حیرت سے دم سادھے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے سامنے میں کیا بولوں۔ حالانکہ مجھے یہ کہنا تھا کہ 'آگ کا دریا' میں نے بھی پڑھا اور سب سے پہلے اس کی تلخیص تیار کر کے کبھی چندر جی کی پرسنل فائل میں رکھوادی تھی اور اس سلسلے میں جب ان سے باتیں ہوئیں تو اپنی بے خبری پر مجھے خود ترس آیا تھا کہ گیان پیٹھ انعام کے لئے خالق کا ہندوستانی شہری ہونا ضروری ہے۔ اور محترمہ تو پاکستانی ہیں۔ پر کتاب بھی غالباً بسم اللہ الرحمان الرحیم کے مجموعی اعداد جتنے صفحوں پر پاکستان سے ہی چھپ کر آئی ہے۔

گوسائیں جی سے رخصت ہو کر میں اپنے مصور دوست بیریشور بنرجی کے چھوٹے سے، خوبصورت سے گھر میں انوراگی کے ساتھ بیٹھا ہوں۔

اس کے گھر میں 'یامنی رائے' کی پینٹنگز کا بہت اچھا انتخاب ہے۔

جس طرح اپنے پڑوس آسام میں مشہور رقاص 'وشنو رابھا' کی سرکردگی میں لوک ناچ اور لوک گیت کے روپ میں ایک لہر چل رہی ہے اور رویندر ناتھ اور نذرل کی مہربانیوں سے جہاں بنگال کے دیہاتوں سے نکل کر 'بھٹیالی' اور 'باؤل گان' شہر کی دلچسپیوں کا بھی مرکز بنا ہے۔ اسی طرح یامنی رائے کی چترکلا شہری زندگی کو دیہات کی صحت مند فضا سے روشناس کرا رہی ہے۔

میرے دوست کے مزاج میں لیکن ایک عجیب سا بدلاؤ آیا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو آنگن میں ایک طرف سبزیاں اُگی تھیں، اور ایک طرف کئی رنگوں کے گلاب۔ مگر آج انکی جگہ ببول کے باغ لگے ہیں اور صحن میں دسیوں قسم کے کیکٹس۔ اس کی بیوی شفالی نے بتایا کہ ان پر جدیدیت کا ایسا نشہ چڑھا ہے کہ یہ اپنے کمرے کی پیلے پیلے پھولوں سے سجاوٹ کرتے ہیں۔ کمرے ادھر اُدھر کانٹے بکھرے رہتے ہیں جو صاف صفائی کرتے، جھاڑو بہارو کرتے انگلیوں میں چبھ جاتے ہیں۔

شیفالی کا مزاج خاصا رومانی ہے۔ پھر بھی بیریشور جب تک مٹی کے برتنوں پر نقش، پیکروں کو کینوس پر منتقل کرتا رہا یہ سہن کرتی رہی۔ لیکن اب جب سے اس پر جدیدیت کا بھوت

رپورتاژ :

شانتی نکیتن اور بنگالی من

میں شانتی نکیتن جارہا ہوں۔ میرے ساتھ بھوپال مدھیہ پردیش کا ہندی کوی راجندر انوراگی بھی ہے۔

کلکتے میں انوراگی سے میری ملاقات کچھ عجیب ڈھنگ سے ہوئی ہے۔ یوں تو جب سے ہندی ماہنامہ "گیانودے" میں میرے مضمون "باتیں جن میں سگندھ پھولوں کی"---کا ایک قسط وار سلسلہ شروع ہوا ہے میں نے اپنے آس پاس مداحوں کی ایک بھیڑ جمع کرلی ہے۔ اسی طرح پچھلے دنوں میری ایک کہانی "دھرم یگ" میں آئی تو جن دوستوں نے پچھلے خطوط لکھے ان میں ایک خط دھرم یگ کے ایڈیٹر دھرم ویر بھارتی کی معرفت مجھ تک پہنچا۔

اور وہ خط تھا راجندر انوراگی کا۔ ابتک میں انوراگی سے ذاتی طور پر واقف نہ تھا۔ ہاں گیانودے میں اُس کی کچھ کویتائیں ضرور شائع کی گئی تھیں۔

جواب میں میں نے انوراگی کو ایک خط لکھ دیا۔ خط "رفتار عالم" کے لیٹر پیڈ پر لکھا تھا۔ ہفتہ وار اخبار رفتار عالم میرے اور فاتح فرخ کے اشتراک سے مندر اسٹریٹ سے نکلنے لگا تھا۔ انوراگی کو میں نے بھارتیہ گیان پیٹھ سے اپنی وابستگی نہیں لکھی تھی۔ چند عشرہ بعد مجھے انوراگی کا دوسرا خط ملا!

"پیارے سلیم بھائی،

نمن چڑھانے میں اگر پربھو کے پاؤں مل جائیں تو وہ نمن خوش قسمت ہے۔ چڑھانے والے کا فرض تو وہیں پورا ہوجاتا ہے جہاں وہ انجلی کو آنکھوں تک لاکر بکھیر دیتا ہے، بھارتی جی نے میرے نمن آپ تک پہنچا دئے انکی مہربانی۔ آپنے قبول کئے آپکی نوازش۔ اور آپنے اتنا پیارا خط لکھا کہ میں احساس کرسکا اپنے نمن صحیح جگہ چڑھانے کا ویسے بھارتی جی کو خط لکھنے کے بعد مجھے اس بات کی خواہش تو نہ تھی۔ میں تو محض اتنے میں ہی خوش تھا کہ جس نے مجھے سکھ دیا میں اُسے سراہ سکا۔ سورج کو جل چڑھانے والی بھاونا ہی مجھے ایسے خط لکھنے کو اکساتی ہے لیکن یہ جانتا ہوں کہ سورج صرف میرے لئے ہی نہیں اگا ہے۔ مگر میں نے اس کی روشنی میں حصہ بنایا ہے اور اس کو جل پھول چڑھانا خود اپنے آپ کو مطمئن کرنا ہے۔ سورج میرے پھول قبول کرے۔ الگ سے ایک کرن میرے ہی لئے بھیجے۔ یہ امید رکھنا پاگل پن نہیں تو کیا ہے۔ آپ نے کرن بھیجی میرے سر ماتھے !اور یہ شائد اس لئے کہ میں خود بھی تو سورج ہوں تمہارا ہم سفر ہوں"۔

ساتھ ہی اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ محترمی کبھی چندر جی جین کے بُلاوے پر وہ جلد ہی کلکتہ آرہا ہے اور وہ کلکتہ آکر مجھ سے ضرور ملے گا۔

خط ملنے کے چند روز بعد ہی ایک شام جب میں "رفتار عالم" کے دفتر پہنچا تو کھادی کی دھوتی' سلک کا کرتا اور سلکن فریم کا خوبصورت چشمہ لگائے میری ہی کرسی پر بیٹھا مجھے ایک شخص نظر آیا۔ ابھی میں چونک کر سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس نے اپنا تعارف کرایا راجندر انوراگی۔۔۔۔ میں نے احمد سلیم کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔

اور پھر باتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا۔

گھنٹہ بھر خوش گپیوں میں گذار کر کالج اسٹریٹ سے گذرتے ہوئے ٹرام کے کھمبے پر گرو دیو رویندر ناتھ ٹیگور کی تصویر اور نیچے کوی کو لاکھوں سلام۔ اور دوسری طرف للکار بھری کمیونسٹ پارٹی کی شوبھا یاترا کا پروگرام۔ اور میں انوراگی کو بتاتا ہوں کہ بنگالی رن بھومی میں بھی اُترنے پر اپنی جمالیاتی نظر کو نہیں بھولتا اور "شوبھا یاترا" نہ کہہ کر "شوبھا یاترا" ہی کہتا ہے۔

انوراگی شانتی نکیتن جانے سے پہلے کالی گھاٹ کے کالی مندر جاکر کالی ماں کا درشن کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی اُسے اٹھارہویں صدی کے شیاما گان کے گائک سادھک رام پرساد پر بھی کچھ ضروری نوٹ تیار کرنا ہے۔ سو' میں اس کی معاونت کو آگے بڑھتا ہوں، بتاتا ہوں کہ رام پرساد کی اہمیت چیتنیہ دیو سے کسی طرح کم نہیں آنکی جاتی۔ ماں سے پیار کا بڑا اچھوتا اظہار ہوا ہے ان گیتوں میں:

"ماں میری سادھنا اکارت گئی
آشا پوری نہیں ہوئی
ایک ایک کر کے سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا
لیکن ماں، تو ایک بار بھی بیٹے کے پاس نہیں آئی
اس بار میں ہی تجھے نگل جاؤنگا
اور حلق سے نیچے اتار کر دل میں بٹھالونگا
اور مانسی کملوں سے تیری پوجا کرونگا "

ایک آدھ سادھک نے کالی کو بیٹی روپ میں بھی جانا ہے۔ بیٹی کے روپ میں ماں کی پوجا تو سبھی بنگالی کرتے ہیں کہ ان کے یہاں بیٹیوں کو ماں کہکر پکارا جاتا ہے۔ درگا پوجا کے موقع پر ہر ایک کا وشواس ہے کہ ماں اس کے گھر بیٹی کے روپ میں آتی ہے۔ ششٹھی کے دن اس کی آمد کیلاش پربت سے 'شوہر کے گھر سے ہوتی ہے۔ نومی کو وہ پھر سسرال لوٹ جاتی ہے۔ اس موقع پر آگمنی 'اور وجیا دو طرح کے گیت گائے جاتے ہیں۔ آگمنی 'آمد پر سواگت کا گانا ہے اور وجیا عظمت کا کیرتن۔ ان گیتوں میں بیٹی کے لئے ماں کی ممتا کا بھرپور اظہار ہے۔ اس میں بنگالی ماں کا بے چین ممتا بھرا دل جھانکتا ہے۔ درگا پوجا کے آخری دن لگتا ہے ہواؤں میں درد بہہ رہا ہے کہ آج بیٹی وداع ہو رہی ہے اور شیو کی پیاری اُما شوہر کے گھر جارہی ہے۔

اور ہم دونوں شانتی نکیتن جارہے ہیں۔ ہوڑہ سے ٹرین ہم لوگوں کو لے کر بول پور کے لئے روانہ ہوگئی ہے۔ ڈبے میں اطمینان سے بیٹھ کر

انوراگی نے بیگ سے کالے مخمل کا خوبصورت سا بٹوہ نکالا ہے۔ جسے اس کے دوست نسیم احمد کی بیوی نے اپنے ہاتھوں بنا کر دیا ہے اور جو بھوپال کی خاص چیز ہے۔ اور پھر انوراگی نے چھوٹے سے سروتے سے چھالیہ کاٹی ہے الائچی کے دانے ملائے ہیں۔ پیپر منٹ ڈالی ہے اور میری طرف بڑھادیا ہے۔ انوراگی اب خود اس میں ذرا سا تمباکو اور چونا ملا کر کھائیگا۔ میں اس کے اس شوق پر مر مٹا ہوں۔ وہ مجھے تسلی دیتا ہے کہ بھوپال جاکر میرے لئے بھی ایک خوبصورت سا بٹوہ بھیج دیگا۔

انوراگی نے ساگر یونیورسٹی سے انگریزی میں میرٹ کے ساتھ ایم اے کیا ہے۔ پچھلے پانچ برسوں سے بھوپال کے ڈگری کالج میں پروفیسری کر رہا ہے۔

گاڑی بول پور پہنچتی ہے تو دونوں وقت گلے مل رہے ہوتے ہیں۔ شانتی نکیتن بول پور سے دو میل کی دوری پر ہے۔ ہم دونوں رکشے پر لد کر چل پڑتے ہیں۔ لیکن وہاں پہنچنے پر پتہ لگتا ہے کہ یونیورسٹی میں کل سے پوجا کی ایک مہینے کی چھٹی ہو چکی ہے۔ اور گیسٹ ہاؤس بند ہے۔ گیسٹ ہاؤس کے ماحول نے گھیر لیا ہے۔ اور رات سر پر کھڑی ہے۔ رات خوبصورت بھی ہے۔ لیکن یہ خوبصورت رات آج ہم یہاں نہیں بتا سکیں گے۔

گیسٹ ہاؤس کا مینیجر ہمدردی جتاتا ہے ------ ''بابو جی شہر میں بھی ہوٹل ہے۔ آپ لوگ وہیں ٹھر جائیں------''۔

اور ہم اس رکشے پر لدے بول پور آجاتے ہیں----انڈیا ہوٹل۔

انڈیا ہوٹل رہنے کیلئے بری جگہ نہیں لیکن کھائینگے کیا۔-انوراگی تو جین ہے ہی۔ پیاز لہسن بھی نہیں کھاتا۔ مجھے بھی کھانے پینے کی بہت سی چیزوں سے پرہیز رہا ہے۔ ہوٹل کے مینیجر کو اس کا احساس ہوا تو اس نے بنگلا میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ لوگ چنتا نہ کریں۔ کھانے کے لئے سبزیوں کا انتظام ہو جائیگا---''۔

سبزیوں کا انتظام تو ہوا۔ لیکن روٹی نہ مل سکی' چاول ہی رہے۔ بنگالی منیجر نے مجبوری جتائی--''میرے یہاں کوئی روٹی پکانا ہی نہیں جانتا--''۔

سبزیاں اچھی تھیں لیکن چاول ہم دونوں سے چل نہیں رہے ہیں۔ پھر بھی ہم سنتوش کر لیتے ہیں کہ رات بھر کی بات ہے۔ صبح باجپئی جی کے یہاں چلینگے کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائیگا۔

میں صبح بہت سویرے سو کر اٹھا ہوں۔ برش کرتا ہوا باتھ روم کی طرف جاتا ہوں کہ مچھلی کی تیز بساندھ مجھے ایکدم سے چکرا دیتی ہے۔ باورچی خانے کے باہر ایک عورت بیٹھی مچھلی دھو رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر مجھے اُبکائی آنے لگی ہے۔ میں الٹے پاؤں واپس آیا ہوں۔ انوراگی کی آنکھ کھلی ہے۔ وہ بڑے پیار سے ''شبھ پربھاتم'' کہتا ہے۔ اور میں اُسے جتاتا ہوں---- ''یہاں اب نہیں رہنا ہے۔ جلدی سے نہادھو کر بھاگ چلیں--''۔

اور ہم دونوں نہا کر تیار ہو جاتے ہیں اور آچاریہ موہن لال باجپئی سے ملنے چل پڑتے ہیں۔

آچاریہ موہن لال باجپئی ہندی کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہیں اور ساتھ ہی رویندر سدن کے بھی کرتا دھرتا ہیں۔ بچھی چندر جی نے اُنہیں فون پر ہم لوگوں کے شانتی نکیتن پہنچ کر اُن سے ملنے کی بات کہہ دی تھی۔ اُنہیں انتظار تھا۔

انہوں نے اپنے خوبصورت سے گھر میں مسکراتے ہوئے پر جوش انداز میں سواگت کیا۔ ہم جب اُن کے یہاں پہنچے تو وہ برآمدے میں شیشے کی طرح چمکتے ہوئے ننگے فرش پر تہمد باندھے بیحد چھوٹے سے ٹائپ رائٹر پر کچھ لکھ رہے تھے۔

میٹھے اتنے کہ ہم نے اُن سے باتیں کرتے ہوئے کئی بار اپنے منہ میں شہد کی مٹھاس پائی۔

انوراگی کے گھر والوں سے باجپئی جی کے پرانے سمبندھ رہ چکے ہیں۔ باجپئی جی ایک ایک کی خیریت جاننا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے بڑھاوا دیتے ہیں---- ''سلیم صاحب گیانودے والی آپکی لیکھ مالا، باتیں جن میں سگندھ پھولوں کی'' خوب ہے۔ لیکن گیانودے کے ہی خاص نمبر 'ہندستانی خاندان نمبر' میں آپ کا مضمون ''حرم کے پس منظر میں مغل شہزادیاں'' میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا۔ بہت اچھا لگا--''۔ اپنی تعریف سن کر خوشی سے پھول جاتا ہوں۔ اور ڈرائنگ روم میں ٹنگی ایک مغل پینٹنگ کو دیکھنے لگتا ہوں۔

باجپئی جی نے دن میں کئی بار گیسٹ ہاؤس فون کیا تھا کہ ہم لوگوں کے رہنے کا کوئی انتظام ہو سکے۔ مگر بھلا ہو' منیجر بھی اب کہیں چھٹیاں بتانے چلا گیا ہے۔ اور ہم دونوں اُسی دن ایک دھرم شالہ میں اُٹھ آئے ہیں۔

باجپئی جی کو اس کا افسوس ہے کہ ہم چھٹیوں کے دنوں میں کیوں آئے جب بہت ساری چیزیں نہیں دیکھ سکتے۔ پھر بھی وہ ایک ایک کر کے سب کچھ دکھا ہی رہے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے جیسے اُن کا بس چلے تو یہاں کی ڈھیر ساری شانتی سمیٹ کر زادِ راہ کے طور پر ہمارے حوالے کر دیں۔

باجپئی جی کے گھر سے نکلتے ہوئے میں سرسوتی کی ایک بڑی سی تصویر کے سامنے کھڑا ہوں۔ بیحد نازک خطوط پر بنائی ہوئی پینٹنگ ہے یہ۔ جسے مہاراشٹر کے مصوّر دتّاترئے دیولالیکر نے بنائی ہے۔ رنگوں کا کمپیزیشن بھی دیکھنے لائق ہے۔ اور تب ہی ایسا لگا جیسے 'سام وید' کے کلمات آکاش وانی بن کر نازل ہونے لگے ہیں

''اے شاعرِ اعظم'' آسمانوں سے تمہارے مدھر، اَن دیکھے سُر گیت بن کر اس دھرتی کو حاصل ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنیں رقص کرتی ہیں اور زمانہ امرت کی بارش میں شرابور ہو اُٹھتا ہے۔ ہواؤں کی بھینی بھینی خوشبو سے ذرّہ ذرّہ جھوم اٹھتا ہے۔

آؤ انسانوں کے دل کے تاروں کو جھنکار دو۔ ان کے سکوت کو آواز میں

"میرے بھائی" :

ملیح آبادی آگے لکھتے ہیں:

"بنانے کے سلسلے میں ایک بات نہایت مضحکہ خیز ہے اور اس مضحکے کا شکار بہت سے "عقل مند" بن چکے ہیں۔ مولانا جب کسی کو بنانا چاہتے تھے یا اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تو اکثر "میرے بھائی" کہہ کر باتیں کرتے تھے۔ یار لوگوں نے خود ہی طے کر لیا کہ مولانا کا "میرے بھائی" کہہ دینا ان کے لیے کوئی بڑا اعزاز ہے حالانکہ خود مولانا نے مجھ سے کہا۔ "میرے بھائی" کہہ کر لوگوں کو بناتا ہوں۔ کروں کیا، بھوت ملتے ہی نہیں۔ "میرے بھائی" کی رشوت پاکر خوش خوش چلے جاتے ہیں۔ لیکن بولتے بولتے یہ جملہ ان کا کلام سا بن گیا تھا۔ اور آخر عمر تک زبان پر چڑھ رہا"۔

(ذکرِ آزاد)

اچھے وقتوں میں ہنسنا، بولنا اور دل لگی کرنا تو آسان ہے، مگر مصیبت کے دنوں میں بھی آدمی زندہ دل، ہنس مکھ اور پر مذاق رہے، یہ بڑا وصف ہے۔ جیل خانہ کی قید و بند تو مولانا کے لیے آسان مصیبت تھی مگر مولانا جب شدید مالی پریشانیوں میں ہوتے اور نوبت فقر و فاقہ کی ہوتی تب ان کے اندر کا بڑا انسان اور زور زور سے کھلکھلا کر ہنسنے لگتا تھا۔ مولانا پر تنگ دستی ہمیشہ چھائی رہی۔ کیوں کہ روپیہ پیسے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک وقت ہاتھ بالکل خالی ہو گیا۔ فاقوں کی نوبت آگئی۔ مولانا بہت نفاست پسند تھے۔ سخی دل تھے، دل کھول کر خرچ کرتے، صرف اپنے آپ پر نہیں دوسروں پر بھی۔۔۔۔ حاجت مندوں کی ضرورتیں قرض لے کر پوری کرتے۔ خود گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ پیتے، موٹا سستا لباس پہنتے اور روکھی سوکھی پر قناعت کرتے۔ معمولی کرتا، لنگی اور ٹوٹی چپل سے کام چلاتے۔ تنگ دستی کے دنوں کی داستان ملیح آبادی کی زبانی

"مولانا نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ ہاتھ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نور نظر تھے۔ ہر طرف دولت بکھری ہوئی تھی۔ ایسے آدمی کے لیے تنگ دستی دوسروں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتی ہے۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس زمانے میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ ماتھے پر کبھی بل نہیں دیکھے۔ کبھی جھنجھلائے نہیں۔ بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ ان "خشک" دنوں میں مولانا کی بشاشت و ظرافت عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔

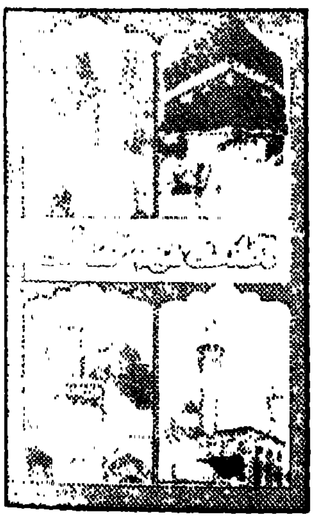
"ارہر، مسور، مونگ کی ابالی دال اور بیچ نکلے چاول بارہا یہ ہمارا دوپہر کا کھانا ہوتا تھا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا کھانا ہوتا تھا! اور یہی وقت ہوتا تھا جب مولانا کی بے پناہ خطابت و ذہانت ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑی ہو جاتی تھی اور مولانا کی زبان بے روک ٹوک چل نکلتی تھی، طوفانوں پر طوفان اٹھاتی تھی۔۔۔۔ آخر کھانے کو نپٹانا ہی پڑتا تھا۔ اب مولانا کی فصاحت و بلاغت، ابالی دال اور بھات کے فضائل و مناقب کے بیان پر ایسی رواں دواں ہو جاتی کہ آدمی محو حیرت ہو کر رہ جائے۔ یہ سب دالوں سے افضل کیوں ہے۔ بگھاری نہ جائے تو تندرستی ہی کے لیے نہیں خود زندگی کے لئے بھی گارنٹی ہے۔ بگھار دینے سے دال کے خواص کس طرح بدل جاتے ہیں اور وہ کیوں تندرستی کے لیے خطرہ بن جاتی ہے؟۔۔۔ اس جلیل القدر انسان کی یہ تقریریں اس لیے ہوتی تھیں کہ اپنے رفیقِ طعام کو بہلائے رکھے۔ اور احساس نہ ہونے دے کہ تنگ دستی کی مجبوریاں گھیرے ہوئے ہیں۔ میں تو سب کچھ جانتا تھا، مگر انجان بنا رہتا تھا کہ مولانا کی بشاشت میں فرق نہ آئے"۔

(ذکرِ آزاد)

اور آزاد ہندوستان کے وزیرِ تعلیم بن کر دس سال آزاد نے اس طرح گزارے کہ نہ کہیں گھر بنایا نہ بینک بیلنس چھوڑا۔ بعد وفات واجبات کی ادائیگی ذاتی گاڑی بیچ کر کی گئی۔ پورا زمانہ وزارت صرف تین عدد شیروانیوں میں گزار دیا، جو پرانی پڑ کر جابجا رفو دار ہو گئی تھیں۔ آزاد اپنے پیچھے فقط علم و دانش کا خزانہ چھوڑ گئے اور اپنی زندگی کی ایسی داستانیں جنہیں زمانہ کان لگا کر شوق سے سن رہا ہے۔ یہ باغ و بہار شخص کسی کو دکھ دیے بغیر ہنستا ہنساتا دنیا سے رخصت ہوا۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

احمد سعید ملیح آبادی کا ایک سفرنامہ "بغداد سے مدینہ منورہ تک"





احمد سلیم

خاندانی نام : احمد حسین
قلمی نام : احمد سلیم
ولدیت : محمد اسحاق
پیدائش : ۱۶، جنوری ۱۹۳۶ء
جائے پیدائش
اور آبائی وطن : سہسرام، بہار
تلمیذ : اشک امرتسری
ملازمت : ہندی ماہنامہ گیانودے، بھارتیہ گیان پیٹھ
پیشہ : درس و تدریس رقص، موسیقی، مصوری۔

ادبی سفر کا آغاز تقریباً چار دہائی پہلے 'آجکل' اردو اور 'آجکل' ہندی سے ہوا۔ اردو آجکل میں ہندی شاعر سُمترا نندن پنت پر اور ہندی آجکل میں میر تقی میر پر۔

غزلیں شاہراہ اور آئینہ میں شائع ہوئیں۔

ہندی کہانی اور مضامین دھرم یگ، ساپتاہک ہندوستان، گیانودے، گیان پیٹھ پتریکا میں۔

اردو کہانی روح ادب اور شب خون میں۔

سنسکرت نظموں کے ترجمے کئے۔ ایک ہی موضوع پر دو نظموں کا ترجمہ شب خون میں شائع ہوا تھا: ''ندی، دو نظمیں سنسکرت سے''۔ کلکتہ کے مندرا اسٹریٹ سے اپنے دوست فاتح فرخ کے اشتراک سے ہفتہ وار اخبار نکالا --- ''رفتار عالم''۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے ہم دونوں کا نام ایک ساتھ جاتا تھا۔

ہندی ماہنامہ گیانودے میں میرے مضمون کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا ''باتیں جن میں سگندھ پھولوں کی'' یہ سلسلہ سال بھر تک چلا۔ بعد میں بھارتیہ گیان پیٹھ نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔

بھارتیہ بھاشا پریشد نے ہندوستان کی چودہ زبانوں کے ناولوں کی تلخیص دو جلدوں میں شائع کی تھی۔ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں میں بھی رہا۔

اردو ناولوں کی تلخیص دوسری جلد میں شامل ہے۔

ریڈیو کے لئے بہت سارے فیچر لکھے۔ جن میں واجد علی شاہ اختر اور مٹیا برج، داغ اور مُنّی بائی حجاب، کوئی آئے ہاتھ مہندی رچائے اور ہندوستانی رقص پر۔

ہندی میں ''تماشائی'' کے عنوان سے غالب پر ایک ناول لکھ رہا تھا جس کی آٹھ قسطیں ہندی ماہنامہ ''گیانودے'' میں شائع ہوئی تھیں۔

پتہ : ۲ ر گریرسن روڈ، کلکتہ-۷۱۱۱۰۱

اور سستے بسکٹ ہوتے تھے۔ یہ بسکٹ مولانا کی سسرال کالن اسٹریٹ میں بنتے تھے۔ بہت، خستہ اور لذیذ ہوتے تھے۔ چائے کبھی لپٹن اور کبھی بروک بانڈ کی ہوتی تھی۔ چائنائی کا معاملہ بہت بعد شروع ہوا۔ "

(ذکرِ آزاد)

اُس دور میں بھی چائے نوشی اور چائے تیاری کے معاملے میں مولانا کا ذوق اور اہتمام بہت بلند تھا۔ ملیح آبادی کہتے ہیں:

"نہایت لذیذ چائے بناتے تھے۔ مجھے تو کیتلی تک چھونے کی اجازت نہیں تھی۔ فرمایا کرتے تھے بھدّے ہاتھ ہیں۔ چائے جیسی لطیف و نازک چیز کو گوارہ نہیں ہو سکتے۔ پیالیاں تک دھونے کی ممانعت تھی۔ ہنستے اور کہتے مولوی صاحب، آپ کا ہاتھ پیالی کو لگا اور چائے دانی کے اندر کی چائے غارت ہو گئی۔"

(ذکرِ آزاد)

مولانا سگریٹ بہت پیتے تھے۔ ایک لحاظ سے چین اسمو کر تھے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں اور گاندھی جی کے سامنے صرف مولانا آزاد کش پر کش لگاتے اور راکھ جا بجا بکھر جاتی۔ پان مولانا نہیں کھاتے تھے، لیکن کبھی پان کھانے پر آگئے تو ہر پانچ سات منٹ پر گلوری منھ میں جاتی اور تمباکو بھی ڈھیر بھر ڈالتے۔ امرتسر سے کلکتہ ایک سفر میں لالہ لاجپت رائے مولانا کے ہم سفر تھے۔ مولانا ملیح آبادی اور آزاد کو پان کھاتے دیکھ کر لالہ جی نے ٹوکا کہ یہ بڑی میلی اور مضرِ صحت عادت ہے۔ مگر جب سلیقے سے پان بنا کر لالہ جی کو پیش کیا گیا اور اصرار کر کے کھلایا گیا تو ہر گلوری کے ساتھ تمباکو کی مقدار میں اضافہ کیا جاتا رہا۔ ہوڑہ اسٹیشن پر اتر کر لالہ جی نے حسرت سے کہا کہ اب ایسے اچھے پان کہاں ملیں گے اور انہیں بتایا گیا کہ ہر جگہ ملیں گے، صرف تمباکو ڈال لیا کیجیئے گا تو لالہ جی نے حیرت ظاہر کی کہ میں نے تو تمباکو چکھی تک نہیں۔ تب انہیں بتایا گیا کہ آپ راستے بھر ہر پان کے ساتھ تمباکو کھاتے آئے ہیں۔ اس پر مولانا آزاد نے لالہ جی کو مشورہ دیا۔ "پان بغیر تمباکو کے کھانا گناہ بے لذت ہے اور مذاقِ سلیم کی عدالت میں سنگین جرم!"

جواھر لال کی چائے اور گڑخوری:

مولانا آزاد کو مٹھاس سے ذرا بھی رغبت نہیں تھی۔ جب کہ جواہر لال مٹھاس اور کھٹاس کے دیوانے تھے۔ چائے کے معاملے میں بھی مولانا نہرو کو بد ذوق سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

"جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں۔ خواصِ یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی، لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے، شاہراہ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔ اور اپنی لپچو و سچو ہی کی قسموں پر قانع رہتے ہیں۔۔۔۔ شکر اور گڑ کی دنیا اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئی ہے کہ آدمی ایک کا ہو کر پھر دوسرے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی گڑ کھا لیا، شکر کی لطافت کا احساس پھر ان میں باقی نہیں رہا۔ جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں، اس لیے گڑ سے بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لئے اس درجہ نمایاں ہے، انہیں بھی محسوس کراؤں، لیکن نہ کرا سکا اور بالا آخر تھک کر رہ گیا،"

(غبار خاطر)

ڈاکٹر محمود کے کوّے:

احمد نگر قلعہ میں ڈاکٹر سید محمود بھی نظر بند تھے۔ جیل میں ان کے مشغلوں کے بارے میں مولانا نے کتنی بذلہ سنجی سے بیان کیا ہے:

"یہاں کمروں کی چھتوں میں گوریاؤں کے جوڑوں نے جا بجا گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ دن بھر ان کا شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہوا کہ ان کی بھی کچھ تواضع کرنی چاہئے۔۔۔۔۔۔۔ چھپرہ میں ایک مرتبہ انہوں نے مرغیاں پالی تھیں۔ دانہ ہاتھ میں لے کر آ، آ کرتے تو ہر طرف سے دوڑی ہوئی چلی آتیں۔ یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا، لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے۔ کہنے لگے۔ عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں۔ گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

"میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشوہ و ناز کی تغافل کیشیوں کے لیے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیاز عشق کے دعووں کے ساتھ ناز حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں۔۔۔۔

"یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی میناؤں کے بھی دو تین جوڑے آنکلتے ہیں اور اپنی غرر غرر اور چیو چیو کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ اب محمود صاحب نے گوریاؤں کے عشق پر تو واسوخت پڑھا، مگر اُن آہوانِ ہوائی کے لیے دامِ ضیافت بچھا دیا۔۔۔ "روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کھڑے ہوتے۔ پھر جہاں تک حلق کام دیتا۔ آ، آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلائے عام میناؤں کو

ملتفت نہ کر سکی۔ البتہ شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا۔ میں نے کوؤں کو شہرستانِ ہوا کا دریوزہ گر اس لیے کہا کہ کبھی انہیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ طفیلیوں کے غول میں بھی بہت کم دکھائی پڑے۔ ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہنچے، صدائیں لگائیں اور چل دیئے۔

ع فقیرانہ آئے صدا کر چلے!

''بہر حال محمود صاحب، آ، آ کے تسلسل سے تھک کر جوں ہی مڑتے، یہ دریوزہ گرانِ کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے۔۔۔۔

''محمود صاحب کی صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کوؤں کی کائیں کائیں کی روشن چوکی برابر بجتی رہتی تھی۔ اب جو ان کا دسترخوانِ کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑی۔ ایک دو دن تو لوگوں نے صبر کیا۔ آخر ان سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لیے ملتوی ہی کر دیجیے ورنہ ان تمر کمانِ یغما دوست کی تمر کتازیاں، کمروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دیں گی اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوؤں کو خبر ملی ہے۔ اگر فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں کہ تمام دکن کے کوے قلعۂ احمد نگر پر حملہ بول دیں۔۔۔''

مولانا کی حجامت:

خلافت تحریک کا زور تھا اور پرنس آف ویلز کی ہندوستان میں آمد پر اس کے بائیکاٹ کی مہم جاری تھی۔ مولانا آزاد، مولانا ملیح آبادی، سی۔ آر۔ داس، سبھاش چندر بوس اور بہت سے لوگ کلکتہ میں گرفتار کر کے علی پور سینٹرل جیل میں قید کر دیے گئے۔ جیل کی کوٹھری کے دروازے پر مولانا نے موٹا کمبل تان دیا اور گوشہ نشین ہو گئے۔ باہر نکلنا بالکل بند کر دیا۔ نہانا بھی چھوڑ دیا۔ سخت گرمی کے دن تھے۔ گرمی دانوں اور خارش سے سارا جسم بھر گیا۔ آخر ملیح آبادی کے بے تکلفانہ اصرار پر راضی ہو گئے کہ جسم پر اسپرٹ کی مالش ملیح آبادی کریں۔ اسپرٹ لگائی گئی تو ناقابلِ بیان تکلیف ہوئی اور ضبط کرنے کی کوشش میں مولانا کبھی کسی پرند کی اور کسی جانور کی بولی بول کر تکلیف کو بہلانے کی کوشش کرتے۔ چند روز میں اچھے ہو گئے۔

اب ایک اور مشکل پیش آئی کہ مولانا کی حجامت بہت بڑھ گئی۔ جیل کے حجام سے کام لینا منظور نہیں تھا۔ مولانا کے سر پر بال بہت گھنے اور سخت تھے۔ جیل کے باہر کلکتہ میں ایک نائی مقرر تھا جو خود کو ''کنگ آف باربرس'' (King of barbers) کہتا تھا۔ وہی مولانا کے تار جیسے سخت بال کترا کرتا تھا۔ اس وقت حجام کی اجرت چار آنے تھی۔ مگر مولانا اپنے نائی کو پانچ روپے دیتے تھے۔ ملیح آبادی نے تجویز رکھی کہ وہ مولانا کی حجامت بنائیں گے۔ پہلے تو مولانا نے مذاق اڑایا مگر جب ملیح آبادی نے یقین دلایا کہ بال کاٹنے کی باقاعدہ مشق ہے تو بڑی حجتوں کے بعد راضی ہوئے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''میں نے قینچی چلانا شروع کی تو دخل دینے لگے، مولوی صاحب، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اس طرح نہیں، اس طرح! کبھی سر ہٹا لیا، کبھی ہاتھ پکڑ لیا۔ عرض کیا۔ یہ نہ کیجیے۔ کہیں دو ملاؤں میں مرغی حرام نہ ہو جائے۔ مجھے کام کرنے دیجیے۔ بال تو بہر حال کٹ ہی جائیں گے۔ برے کٹے تو بھی چند روز میں خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کو کہیں جانا تو ہے نہیں، اسی کوٹھری میں بند رہنا ہے۔

''پھر بھی مداخلت جاری رہی۔ عرض کیا، قینچی لگ گئی تو ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔ اب چین سے بیٹھئے۔ میں نے کام ختم کیا اور بال جھاڑ دئے تو بڑی ناقدانہ نگاہوں سے آئینہ دیکھا، پھر ہنسنے اور کہنے لگے۔ واہ، آپ تو چھپے رستم نکلے۔ میں تو سمجھا تھا بھیڑا بنا ڈالیں گے۔ مگر نہیں، واقعی آپ خوب حجامت بناتے ہیں!''

(ذکرِ آزاد)

دونوں دوست ایک دوسرے کو دیر تک بناتے رہے اور چٹکلے ہوتے رہے۔ آخر مولانا کچھ سمجھے۔ ملیح آبادی کہتے ہیں:

''مولانا نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتے ہی رہے پھر کہنے لگے: اب میں سمجھا۔ یہ کہیے کہ آپ مجھے بناتے رہے ہیں۔ عرض کیا، معاذاللہ! میری مجال کہ آپ کو بناؤں۔ فرمانے لگے: نہیں مولوی صاحب، میں خود زندہ دلی پسند کرتا ہوں۔ اب ہم مل کر دوسروں کو بنایا کریں گے۔ میں نے لاکھ کہا کہ وہ بات نہیں، جس کا آپ کو شبہ ہوا ہے، مگر ہنستے اور کہتے رہے اب لوگوں کو بنانے میں مزہ آئے گا۔ اکیلا آدمی بنائے اور سمجھنے والا کوئی نہ ہو تو اس کی مثال مور کی سی ہے جو جنگل میں اکیلا ناچ رہا ہو۔ اس دن سے لوگوں کو بنانا میرا اور مولانا کا مشترک شغل بن گیا، مگر اس طرح کہ بننے والا سمجھنے نہ پائے۔ جب مولانا کسی کو بنانا چاہتے تو مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے اور میں معاملہ سمجھ جاتا''۔

(ذکرِ آزاد)

چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں، پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال سکتی ہو۔۔۔''

(غبار خاطر)

یہ ادبی شہ پارہ اس آدمی کی تحریر ہے جو احمد نگر کی سنگی دیواروں کے پیچھے طویل قید و بند کی زندگی گزارنے داخل ہوا تھا اور فوجی جیل کی کوٹھری میں کڑے پہرے اور ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ میں تنہا بیٹھا ہوا، رات کے پچھلے پہر، جب سارا قلعہ محوِ خواب ہوتا، اپنی قلبی واردات میں خود کلامی کی شکل میں خطوط کے انداز میں کاغذ پر محفوظ کرتا جاتا۔ جیل میں تنہائی کی پہاڑ جیسی راتیں اس کی انجمنِ خیال آراستہ کرتیں:

''جس قید خانہ میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے''۔۔۔۔

(غبار خاطر)

خلوت نشینی آزاد کی پسند تھی، تنہائی ان کی مونس تھی۔ طبیعت کا یہی سانچہ اور تقاضا تھا

''میں اپنی طبیعت کی اس افتاد سے خوش نہیں ہوں۔ نہ اسے حسن و خوبی کی کوئی بات سمجھتا ہوں۔ یہ ایک نقص ہے کہ آدمی بزم و انجمن کا حریف نہ ہو اور صحبت و اجتماع کی جگہ خلوت و تنہائی میں راحت محسوس کرے۔۔۔۔ لیکن اب طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے توڑا جا سکتا ہے مگر موڑا نہیں جا سکتا۔۔۔ اس افتادِ طبع کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقت حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور اور پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں، میں دوسروں کو سبک سر تصور کرتا ہوں، اس لئے ان کی طرف بڑھتا نہیں۔ حالانکہ مجھے خود اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا۔ دوسروں کی فکر میں کہاں کر سکتا ہوں۔۔۔۔''

(غبار خاطر)

ابوالکلام آزاد کی خلوت پسندی، زندگی بسر کرنے کا ان کا اپنا طریقہ اور حق تھا۔ یہ شخصی آزادی اور پرائیویسی، دنیا کے ہر انسان کی طرح آزاد کا بھی حق تھا۔ طبیعت کے اس سانچے میں ڈھلنے کا سبب ان کے خاندانی حالات تھے۔ مولانا ایک کٹر مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مولانا خیرالدین کی سختی کا یہ عالم تھا کہ اپنی اولاد کو کسی مکتب و مدرسہ میں بٹھانے کے روادار نہیں ہوئے۔ بھائیوں بہنوں کی تمام تعلیم گھر میں ہوئی، جس میں خود مولانا خیرالدین نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ مولانا کو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سحر خیزی کی عادت بھی مولانا کو اپنے والد سے ورثے میں ملی۔

اس سانچے میں ڈھلے ہوئے فیروز بخت محی الدین احمد نے جب ہوش سنبھالا تو سب سے پہلے ان کے اندر ایک چنچل شاعر جاگ اٹھا۔ مولانا کے ادبی ذوق کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ پھر ادب کی وہ کون سی صنف ہے جس کی طرف آزاد کی طبیعت نہیں گئی اور انہوں نے میدان سر نہ کیا۔ شاعری کے ساتھ مولانا کو موسیقی اور گانے بجانے کا بھی شوق ہوا۔ موسیقی کے فن سے مولانا نے گہری دلچسپی لی۔ ریاض کیا۔ ستار اور بینا بجانے میں کافی مشق بہم پہنچائی۔ اسی شوق میں ''معارف النغمات'' کے نام سے فن موسیقی پر ایک کتاب مرتب کی۔

مولانا کے عہد شباب کی داستان کافی رنگین ہے جسے بلیغ اشاروں اور ''اردوئے معلّی'' میں خود نوشت سوانح ''تذکرہ'' میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں

''جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید و روشِ عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس حال میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لئے اپنا نقشِ قدم رہ نما چھوڑا۔ رندی و ہوس ناکی کا عالم رہا تو اس کو بھی ناتمام نہ چھوڑا۔ عشق کی خود فراموشیاں رہیں تو وہاں بھی کسی وادی اور کسی گوشے سے اپنے قدم ناآشنا نہ رہے۔'' (تذکرہ)

آزاد عہد شباب کے تقاضوں سے بہت جلد فارغ ہوئے۔ فرماتے ہیں:

''چوبیس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرتِ شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا۔ گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال زمانے سے الٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے میں کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا۔

کام تھے عشق میں بہت، پر میر
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

(غبار خاطر)

قلعۂ احمد نگر کی اسیری ہے جس کی مدت لا معلوم اور باہری دنیا سے رشتہ منقطع پھر بھی مولانا کی باغ و بہار شخصیت اپنے لیے کیسے کیسے سامان رب مہیا کرتی اور لطف اندوز ہوتی ہے۔ مولانا اپنے کردار خود ڈھالتے ہیں زران سے محظوظ ہوتے ہیں۔

چیتا خاں:

''یہاں پہنچنے کے چند دنوں تک تو صرف جیلر ہی سے سابقہ رہا۔ ایک دو مرتبہ کلکٹر اور سول سرجن بھی آئے۔ پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا اسی دن ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا آئی۔ ایم۔ ایس سے تعلق رکھتا ہے۔ میجر ایم سینڈک نام ہے اور یہاں کے لئے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے۔ میں نے جی میں کہا: یہ سینڈک بینڈک کون کہے۔ کوئی اور نام ہونا چاہیے۔ جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ حافظہ نے یاد دلایا کہ کہیں نظر سے گزرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں اس قلعہ کا قلعہ دار چیتا خاں نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے ان حضرت کا نام چیتا خاں ہی رکھ دیا کہ اول بہ آخر نسبتے دارد۔ ابھی دو چار دن بھی نہیں گزرے تھے کہ یہاں ہر شخص کی زبان پر چیتا خاں تھا۔ قیدی اور وارڈر بھی اسی نام سے پکارنے لگے۔ کل جیلر کہتا تھا کہ آج چیتا خاں وقت سے پہلے گھر چلا گیا۔ میں نے کہا: چیتا خاں کون؟'' کہنے لگا۔ ''میجر اور کون؟۔۔۔''

(غبار خاطر)

چینی چائے:

چینی چائے ''وائٹ جیسمین'' مولانا کو بہت مرغوب تھی۔ جسے وہ پیار سے ''گوری چنبیلی'' بھی کہتے تھے۔ اس کی لذت کا ذکر مولانا نے کس طرح مزے لے لے کر اور ایک اندازِ دلبری سے ''غبار خاطر'' میں کیا ہے جو خود اپنی جگہ ایک ادب پارہ ہے:

''آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ تین بجے سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیتا ہوں۔۔۔ یہ وقت میرے اوقات زندگی کا سب سے زیادہ پرکیف وقت ہوتا ہے، لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشے کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں اور ایک ماہر فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں۔ پھر جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اوّلیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سر و سامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہ خانوں کے عرق کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دور صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کرتا ہے۔''

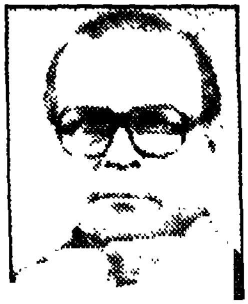
چائے نوشی کے ذوق اور اس سے لذت کوشی کے بیان کو مولانا کے قلم سحر نگار نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اپنے ذوق شوق اور دوسروں کی بدذوقی کا گلہ بھی مولانا کس انداز میں بیان کرتے ہیں:

''وہ چینی چائے جس کا میں عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہو گئی اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنس گراں مایہ سے آشنا نہیں۔۔۔ مجبوراً ہندوستان کی اسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدے کے، بموجب کہ ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں۔۔۔ سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں چائے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چائے کو چائے کے لیے پیتا ہوں۔ لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں۔۔۔ عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتی کو جو ہندوستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے، سمجھتے ہیں چائے ہے اور پھر اس کی مختلف قسمیں کر کے ایک کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس ترجیح کے بارے میں باہم رد و کد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے سیلون کی چائے بہتر ہے دوسرا کہتا ہے دارجلنگ کی بہتر ہے۔۔۔ حالانکہ ان خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں وہ سرے سے چائے ہے ہی نہیں''۔

(غبار خاطر)

مولانا آزاد کے رفیقِ قدیم، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ۱۹۲۰ء کے بعد اپنا دور رفاقت شروع ہونے کے زمانے کی بات لکھی ہے:

''صبح تین چار بجے ضرور جاگ جاتے تھے۔ اس وقت میرا ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اچھا خاصا ناشتہ کرتے تھے اور مرغ کی یخنی بھی پیتے تھے۔ سات بجے پھر چائے اور ناشتہ ہوتا تھا۔ اس موقع پر اکثر میری حاضری ضروری تھی۔ عام طور پر ٹوسٹ، مکھن



احمد سعید ملیح آبادی

نام : احمد سعید ملیح آبادی

والد کا نام : عبدالرزاق ملیح آبادی (مرحوم)

پیدائش : مئی ۱۹۲۶ء (تاریخ لا معلوم۔ والدہ مرحومہ کو یاد تھا کہ جمعہ کا دن تھا اور صلوٰۃ کے لئے اذان ہو رہی تھی۔ محلّہ مرزا گنج۔ قصبہ ملیح آباد، ضلع لکھنؤ۔

علمی مشاغل : اردو، عربی، فارسی، انگریزی، ہندی کی ابتدائی تعلیم گھر میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد قصبہ کے مختلف اسکولوں میں پڑھائی جاری رہی۔ اس زمانے میں ملیح آباد میں کوئی ہائی اسکول نہیں تھا۔ والد کے حکم پر مدرسہ اصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں داخل ہوا۔ چند سال بعد جماعت اسلامی کی برپا کی ہوئی شورش کے سبب نظام مدرسہ درہم برہم ہوا تو دارالمصنفین اعظم گڑھ اٹھ گیا اور وہاں تقریباً تین سال قیام رہا۔ پھر کلکتہ میں "نظر بند" ہوا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ ۱۹۴۰ء سے مضامین لکھنے کی مشق شروع ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے باضابطہ صحافت اور والد محترم کے جاری کردہ اخبار "آزاد ہند" کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ "آزاد ہند" کا ہفت روزہ ایڈیشن بروز اتوار "اجالا" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

سفر : پاکستان، ایران، سعودی عرب (بغرض حج و عمرہ)، چند روز یورپ، عراق وغیرہ۔

تصنیفات : (۱) "اللہ کے گھر میں" (سفر نامۂ حج)۔ اشاعت ۱۹۷۶ء
(۲) "آج کا پاکستان"۔ اشاعت ۱۹۷۸ء
(۳) "بغداد سے مدینہ منورہ تک"۔ اشاعت ۱۹۹۸ء

انعامات و اعزازات :

اترپردیش اردو اکیڈمی نے "آج کا پاکستان" کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں "غالب ایوارڈ" (صحافت) غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے دیا۔ دیگر کئی اداروں نے بھی اعزازات سے نوازا۔

کچھ "انشاء" کے تعلق سے :

"ماہنامہ انشاء" نے میری حیات اور خدمات صحافت پر خصوصی نمبر ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ اس میں مدیر انشاء ف۔ س۔ اعجاز نے ایک نیا تجربہ کیا تھا۔ "آزاد ہند" میں میرے چھپے ہوئے کئی اداریوں پر انھوں نے سوالات قائم کر کے مختلف موضوعات پر میرا ایک "غائبانہ انٹرویو" ترتیب دیا تھا۔ یہ ایک طویل اور معروضی انٹرویو تھا جس کا ترجمہ بعد میں نیپالی زبان میں ہوا۔ انشاء نے بابری مسجد کے انہدام کے بعد ۹۳ء اپنا "بابری مسجد نمبر" اہتمام سے شائع کیا۔ جس میں اس کے مدیر نے بابری مسجد سے متعلق میرے لکھے ہوئے "آزاد ہند" کے ۴۲؍ اداریوں کو ایڈیٹ (edit) کر کے ایک بڑے قومی اور صحافتی نقطۂ نظر سے اپنے مضمون کے ساتھ شائع کیا۔ ان کا ترجمہ احمد آباد، گجرات کے نامور شاعر جناب رحمت امروہوی نے گجراتی زبان میں کیا اور ایک مکمل کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کے دو ایڈیشن نکلے۔

رکنیت : آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس، (نئی دہلی) ممبر اردو ایڈیٹرس کانفرنس (نئی دہلی)۔ کونسل برائے فروغ اردو (نئی دہلی)۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی (گورننگ باڈی)۔ دیگر کئی اداروں سے بھی وابستگی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد...... ایک باغ و بہار شخصیت

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام کے بارے میں عام تصور یہ قائم کرلیا گیا ہے کہ وہ ایک انتہائی خشک مزاج، بد دماغ، کم آمیز اور کم گو شخص تھے۔ جن پر ہر وقت تبحرِ علم کی بے پناہ سنجیدگی اور تمکنت چھائی رہتی تھی۔ عام انسانوں سے الگ تھلگ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں اونچی جگہ پر اکیلے بیٹھے تھے۔ ہنسنا بولنا نہیں جانتے تھے۔

مولانا آزاد کو قدرت نے جہاں بے حساب ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا، اور ان کا دماغ ایک عجائب خانہ تھا، جس میں علم و دانش کے گوہرِ نایاب اپنی اپنی جگہ سجے ہوئے تھے، وہیں قدرت نے انہیں ایک شخصیت کے سانچے میں بھی ڈھالا تھا۔ بے شک مولانا لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے۔ انہیں انسانوں کے ہجوموں سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ خلوت و تنہائی ان کی مجلس آرائی تھی۔ مولانا نے اپنے لئے عالی شان ایوانِ علم و عرفان تعمیر کیا تھا۔ اس میں تنہا بیٹھنا اور تصنیف و تالیف سے شغل رکھنا انہیں پسند تھا۔ مجمع عام میں مولانا بہت لئے، دئے، باوقار، سنجیدہ اور متین رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر عبقریت کی دبیز نقاب بھی پڑی نظر آتی۔ اپنی تحریروں کی روانی اور تقریروں کی طوفان خیزی میں ایسے نظر آتے جیسے کسی دوسری دنیا کی پراسرار مخلوق ''کوہِ ندا'' سے صدا دے رہی ہے۔ لیکن اس تمام سنجیدگی، متانت اور تمکنت کے پیچھے ایک ایسا باغ و بہار اور چنچل شخص چھپا ہوا تھا جس کا دل ہر وقت ہنستا اور طبیعت مچلتی رہتی۔ مولانا کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اپنی زندگی اور شخصیت کے جس پہلو کو کھولنا چاہتے بس اتنا ہی حصہ سامنے آتا اور باقی عام نظروں سے پوشیدہ رہتا۔ انہیں اپنے اوپر اتنا قابو تھا کہ تعلقات میں روزِ اوّل جس کے ساتھ جو حد بندی کرلی، اس حصار کو دوسرا کوئی توڑ کر مولانا کے قریب نہیں بڑھ سکتا تھا۔ مولانا اپنے بعض احباب سے بے تکلف بھی ہوتے تھے اور وہ یارانِ محفل مولانا کی شوخیٔ طبع سے لطف اندوز ہوتے۔ مولانا آزاد اگر زاہد خشک اور روکھی سوکھی طبیعت کے ہوتے تو ان کی تحریروں اور تقریروں میں ادبِ عالیہ کی وہ دل آویزی اور چاشنی نہ ملتی جس پر زمانہ آج سر دھنتا ہے۔ رانچی کی چار سالہ نظربندی میں تذکرہ اور قلعہ احمد نگر کی اسیری میں ''غبار خاطر'' جیسے ادبی شاہ کار تخلیق نہ ہوتے۔ نہ عہد شباب کا ''نالۂ گرم اور آہِ سرد'' سنائی دیتے۔ ''وائٹ جیسمین''، چینی چائے کی داستانِ رندانہ، چیناخاں کا کردار، چڑیا ...ے کی کہانی، ڈاکٹر سیّد محمود کے کوّے اور دوسرے بہت سے ادبی شہ... سے اردو ادب کا دامن خالی رہ جاتا۔

خوش رہو اور خوش رہنے دو:

مولانا لکھتے ہیں:

''ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بہ یک وقت سیکڑوں چہروں پر پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر غبار آئے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے، وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے، لیکن اسی ایک لہرے سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوتی، ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کا حصّہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کرسکے گی۔ اگر ہمارے چاروں طرف غم ناک چہرے اکھٹے ہو جائیں۔ ہم خود خوش رہ کر اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں۔۔۔۔۔

''عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرے لے کر پھرے گا، اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔۔۔۔ مذہب اور روحانیت کی دنیا میں تو زہدِ خشک اور طبعِ خشک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دین داری اور ثقالتِ طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں۔۔۔۔

''آپ جانتے ہیں کہ اہل ذوق کی مجلسِ طرب، تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی۔ اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہوتی ہے۔۔۔۔ لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔۔۔

''ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقّع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقّع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں اس میں ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے

کرشنہ احمد سعید ملیح آبادی

مرثیہ کے بند لکھ کر دیئے تھے۔ مجتہد العصر سید محمد کی خدمت میں یہ تین بند بھیجے تھے۔ پھر کیا عجب کہ حسین میرزا کو بھی خاص طور سے یہ بند سنائے اور لکھ کر دیئے ہوں۔ رضا گپتا نے اس کا زمانہ قبل ۱۸۶۰ء قرار دیا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مرزا نے ۱۸۶۰ء کے دوران ہی میں یہ بند لکھے ہوں۔ (طاہر ایڈیشن: صفحہ نمبر ۱۱۵-۱۱۶؛ نسخۂ عرشی (نقش ثانی) ص ص ۳۸۷۔ ۳۸۹، ایضاً صفحہ نمبر ۵۲۱، دیوان غالب (کامل) صفحہ نمبر ۳۴۹۔ ۳۵۰)

۱۱۔ مرثیہ کے بعد قصائدِ چہار گانہ کی ترتیب طاہر ایڈیشن (۱۱۶۔ ۱۲۸) میں ٹھیک وہی ہے جو نسخہ متداولہ (مالک رام ایڈیشن صفحہ نمبر ۱۸۳۔ ۱۹۶) میں ہے۔ مابعد کے مشمولات (طاہر ایڈیشن صفحہ نمبر ۱۲۸ تا صفحہ ۱۳۷) نسخہ متداولہ (مالک رام ایڈیشن۔ صفحہ نمبر ۱۹۶۔ ۲۱۱) سے بلحاظ ترتیب بہت زیادہ مختلف ہیں۔ ان میں سے مشہور سہرا (خوش ہوا ے بخت) نسخۂ حسین میرزا میں اپنی جگہ پر موجود ہے جبکہ نسخہ متداولہ سے یہ خارج رہ گیا تھا) اور آنجہانی مالک رام کو بدرجہ مجبوری اسے اپنے ایڈیشن میں ضمیمہ بنانا پڑا (مالک رام ایڈیشن ص ۲۱۵ - ۲۱۶)، نسخۂ متداولہ میں بعنوان متفرقات ایک قطعہ پنج بیتی ہے (مالک رام ایڈیشن: صفحہ نمبر ۲۰۵)۔ اس کی بیت چہارم غالباً طاہر ایڈیشن کے کاتب کی غفلت سے چھوٹ گئی ہے۔ وہ بیت حسب ذیل ہے:

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور ہیں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

(طاہر ایڈیشن: ص ص ۱۳۵ کا مقابلہ مالک رام ایڈیشن سے کیا جائے)۔

اس کے بعد نو (۹) ابیات پر مشتمل قطعہ حسین مرزا کے نسخہ میں، ''مثنوی در صفت انبہ'' (نسخہ متداولہ مالک رام ایڈیشن صفحہ نمبر ۱۹۶ تا صفحہ نمبر ۱۹۸) سے پہلے درج ہے قطعۂ ہذا کا پہلا شعر ہے:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا (۹ شعر)

یہ قطعہ ۱۸۵۷ء کی عکاسی کرتا ہے اور علائی کے نام ایک خط میں درج ہے (اردوئے معلّٰی (حصہ اول) صفحہ ۳۲۵) طاہر ایڈیشن میں صفحہ نمبر ۱۳۸ نواں شعر اس طرح ہے

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

ہمارے پیش نظر اردوئے معلّٰی (ایڈیشن مطبع فاروقی دہلی ۱۳۲۶ھ) میں بجائے (یارب) 'غالب' ہے۔ رضا گپتا نے ''یارب'' ہی نقل کیا ہے۔ (دیوان غالب کامل۔ صفحہ نمبر ۳۴۲)

۱۲۔ نسخہ حسین میرزا (آغا طاہر ایڈیشن)
گئی ہیں سال کے رشتے ہیں بیس بار گرہ۔ الخ

(کل ۲۵ شعر۔ ص ص ۱۴۰۔ ۱۴۲) یہ قصیدہ راجہ شیودان سنگھ والیٔ الور کی شان میں ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ لکھا گیا۔ قرینہ وعلائم سے ہویدا ہے کہ یہ قصیدہ خود مرتب وکاتب نسخہ دیوان نے زائد اوراق میں نقل کیا ہوگا۔ نسخہ تاباں میں بھی یہ قصیدہ صفحہ نمبر ۱۵۷ کے حاشیہ پر لکھا ہوا ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھیے نسخۂ عرشی (نقش ثانی) ص ص ۳۷۸۔ ۳۷۹؛ ایضاً صفحہ نمبر ۵۲۰۔ رضا گپتا ص ص ۳۵۵۔ ۳۵۶) کچھ لفظی اختلافات رضا گپتا کے پیش کردہ متن اور اس نسخہ کے مندرجات میں ملتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۲۔	(دوسرا مصرعہ)	ہوا کرے گی ہر اک سال آشکار گرہ
	نسخہ حسین میرزا	. . . . . . پیش کار گرہ
۳۔	(پہلا مصرعہ)	یقین جان مری گانٹھ کا جو تاگا ہے
	نسخہ حسین میرزا	نسخہ حسین مرزا . . . جو ہے تاگا
۴۔	(پہلا مصرعہ)	گرہ سے اور گرہ کی امید کیوں نہ بڑھے
	نسخہ حسین میرزا	.. پڑے
۸۔	(دوسرا مصرعہ)	روان ہو تار یہ فی الفور دانہ دار گرہ
	نسخہ حسین میرزا	. . . . دانہ دار گرہ
۱۲۔	پہلے مصرعہ کا شروع	انہیں کی سال گرہ
	نسخہ حسین میرزا	. . انہی کی سال گرہ
۱۵۔	(پہلا مصرعہ)	ہزار دانے کی تسبیح چاہتا ہے بنے
	نسخہ حسین میرزا	. ہے یہی
۱۶۔	(پہلا مصرعہ)	عطا کیا ہے خدا نے وہ جاذبہ اس کو
	نسخہ حسین میرزا	عطا کیا ہے خدا یہ جاذبہ اس کو
۱۷۔	(دوسرا مصرعہ)	بچی نہ ازپئے بندِ نقاب یار گرہ
	نسخہ حسین میرزا	بچے ....
۱۹۔	(دوسرا مصرعہ)	کروڑوں ڈھونڈھ کے لاتا یہ خاکسار گرہ
	نسخہ حسین میرزا	کروڑ ڈھونڈھ کے . .
۲۰۔	(دوسرا مصرعہ)	پڑی ہے غم کی مرے دل میں پیچدار گرہ
	نسخہ حسین میرزا	دل میں مرے، غم کی

۱۳۔ قصیدہ ۲۶ شعروں پر مشتمل جس کا مطلع ہے۔

مرحبا سال فرخی آئیں۔

الخ (نسخہ حسین میرزا (طاہر ایڈیشن) صفحہ نمبر ۱۴۲ تا صفحہ نمبر ۱۴۴) نواب یوسف علی خان بہادر، ناظم کے جشن غسل صحت کے موقع پر ۲۵، دسمبر ۱۸۶۴ء تا ۸، جنوری ۱۸۶۵ء کسی وقت لکھا گیا (نسخۂ عرشی (نقش ثانی) صفحہ نمبر ۳۸۰-۳۸۱، رضا گپتا ص ص ۳۵۷-۳۵۹)۔ نسخۂ تاباں

میں بھی یہ قصیدہ حاشیے پر ہے۔ طاہر ایڈیشن میں بھی بیت نمبر ۹ کے بعد ''تمہ'' کالفظ مرقوم ہے جو حواشی پر اندراج کی نشاندہی کرتا ہے۔ رضا گپتا کے متن سے آغا طاہر ایڈیشن درج ذیل ابیات کے بعض الفاظ میں مختلف نظر آتا ہے:

۱۔	معرعہ دوم (طاہر ایڈیشن)	''عید شوال، ماہ فرودرین''
	رضا	عید شوال و ماہ فرودرین
۷۔	پہلا مصرعہ (طاہر ایڈیشن)	تین تہوار۔۔۔ الخ
	رضا	تین تیوہار۔۔۔ الخ
۱۱۔	پہلا مصرعہ	پیشکار حضور شوکت و جاہ۔۔۔ الخ
	رضا	پیش گاہ۔۔۔ الخ
۱۵۔	پہلا مصرعہ	انجمن چرخ گوہر آگین فرش
	رضا	انجم چرخ الخ (بہ اضافت)
۱۸۔	دوسرا مصرعہ	کہ جہاں داد گر کا نام نہیں
	رضا	کہ جہاں گدیہ گر ـــــ الخ
۲۷۔	پہلا مصرعہ	مرکب خاص یوں زمین پر تھا
	رضا	موکب خاص ـــــ الخ

۱۴۔ قصیدہ میمیہ، کل ۲۸ شعروں پر مشتمل (طاہر ایڈیشن: صفحہ نمبر ۱۴۴-۱۴۶)۔ اس کا مطلع یوں شروع ہوتا ہے۔

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام۔۔۔ الخ

یہ قصیدہ نسخۂ تاباں میں بھی ملتا ہے۔ اندرونی شہادتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ قصیدہ ہذا ۳۱ جنوری ۱۸۶۷ء کے بعد ہی کہا گیا۔ تفصیلات کا بیان عرشی زادہ نے بہت خوب کیا ہے (دیکھئے نسخہ عرشی (نقش ثانی) صفحہ نمبر ۳۸۲۔۳۸۶، ایضا صفحہ ۵۲۱؛ رضا گپتا (ص ص ۳۶۴ تا ۳۶۵)

یہ قصیدہ بہر حال شکایت نامہ ہے جو ممدوح کی خدمت میں مرزا نے ارسال کیا تھا چنانچہ بیت نمبر ۲۱ شاہد ہے:

جو واں نہ کہہ سکا وہ لکھا ہے حضور کو
دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام

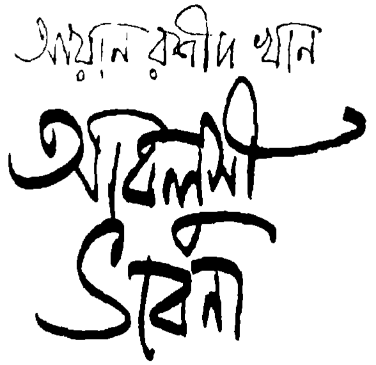
ممدوح کا نام حسین میرزا کے اصل نسخہ کے مطابق ہی (منگلوڈ) چھپا ہے (... ایڈیشن ص ۱۴۴، تیسرا شعر) نسخۂ تاباں میں بھی (منگلوڈ) لکھا گیا ہے مگر ... ہے۔ دیکھئے افادۂ عرشی زادہ و رضا گپتا، صفحات محولہ بالا میں)۔ ... اکاد کا اختلاف بھی لائق توجہ ہیں۔ انکے علاوہ ایک جگہ آغا ... بیاض رہ گئی ہے اسکی نشان دہی بھی مقصود ہے، ملاحظہ فرمایئے:

	مصرعہ دوم	استادہ ہوگئے لب دریا پہ جو خیام
	رضا	... جب خیام
۱۷۔	مصرعہ اولی	عزت پہ اہل نام کی ہستی کی تھی بنا
	رضا	.... ہے بنا
۲۵۔	مصرعہ اولی	امر جدید کا نہیں ہے سوال (طاہر ایڈیشن ص ۱۴۶)
	رضا	امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال

یعنی طاہر ایڈیشن میں (تو) ساقط ہے اور (نہیں ہے) کے بعد ہے بیاض ہے پھر (سوال) کالفظ ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل نسخہ بقلم حسین میرزا میں بھی کم از کم یہ 'بیاض' موجود، تھی اور آغا طاہر نے اصل نسخے کی پابندی کرنے میں حتیٰ الامکان کوتاہی نہیں کی۔

۱۵۔ طاہر ایڈیشن میں قصیدۂ مذکورہ کے ختم ہوتے ہی 'رباعیات' کی سرخی لگائی گئی ہے ص ص ۱۴۶-۱۴۷) جس کے تحت نسخہ متداولہ کی سولہ رباعیات میں سے صرف چھ رباعیات (مالک رام ایڈیشن، زیر رقم ۸، ۷، ۹، ۱۲، ۱۵، ۱۶) ملتی ہیں۔ آخری رباعی پر ایڈیشن تمام ہوگیا ہے اور ایک جملہ کاتب کا نوشتہ ملتا ہے، ''حررہ جری عجائب رقم امر دہوی'' اس ورق کا دوسرا صفحہ سادہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اصل نسخہ، نوشتہ بقلم حسین میرزا کے خاتمہ (ترقیمہ) کا فوٹو بلاک الگ ورق پر ثبت ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ آخری اوراق کچھ ضائع بھی ہوئے ورنہ رباعیات کی تعداد کم نہ ہوتی۔ واللہ اعلم۔

دوستوں اور نیک لوگوں کے لئے
عین رشید کی اردو نظموں
کا مجموعہ بنگالی زبان میں



''آبلوسی بھابنا''
(آبنوسی خیال)

(۸) مجھ کو وہ دو لہ ے ھا ے ہ پ

زہر کچھ اور سہی آب بقا اور سہی

نے ایک اور ام ورن د ہ یہ ر ب

"امام ظاہر و باطن، امیر صورت و معنی
علی ولی اسداللہ جانشین نبی ہے"

(طاہر ایڈیشن: صفحہ نمبر ۱۷)

اس شعر کی کتابت اس طور پہ کی گئی ہے کہ اوپر کے دونوں ہم قافیہ یف شعروں کا اسے جزو نہ سمجھ لیا جائے۔ اوپر کے محولہ دو شعر نسخہ ل مکتوبہ ۱۸۲۱ء میں کسی اضافہ کے بغیر درج ہیں جبکہ انکے بعد کا تنہا ایک پنج بیتی غزل کا مقطع ہے۔ یہ غزل نسخہ بخط شاعر (۱۸۱۶ء) میں ملتی ، (دیکھئے رضا گپتا: صفحہ نمبر ۱۷۹؛ صفحہ نمبر ۲۴۱)۔

۸۔ نسخہ متداولہ کی مشہور غزل: "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر اہش پہ دم نکلے" الخ کل نو شعروں پر تمام ہوتی ہے (مالک رام ایڈیشن: فحہ نمبر ۱۷۰-۱۷۱ (رقم ۲۲۰)۔ حسین میرزا کے نسخے میں مقطع سے پہلے یل کا شعر اضافی ہے:

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

(طاہر ایڈیشن: صفحہ نمبر ۱۰۷) رضا گپتا کے مرتبہ نسخے میں بھی اسی غزل کے دس شعر ہیں مگر اس طرح کہ ارمغانِ غالب (صفحہ نمبر ۳۰۸) کے حوالہ سے ذیل کا شعر اس غزل کا مطلع اول بنادیا گیا ہے:

زرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے، جو دل نکلے تو دم نکلے

(رضا گپتا: صفحہ نمبر ۳۲۶) بقول عرشی زادہ مولانا مہر نے تاباں کے نسخہ (حاشیہ صفحہ نمبر ۱۳۸) سے اس مطلع کو نقل کیا تو اس کے ساتھ مذکورہ بالا شعر (وہی کافر صنم نکلے) بھی لکھا، مگر طبع دوم میں اس شعر کو اس لئے حذف کر دیا کہ یہ شاہ ظفر کا ہے اور نسخہ مذکورہ میں سہواً درج ہو گیا تھا۔ ملاحظہ ہو دیوان ظفر ۴/ ۱۴۷ (نسخۂ عرشی (نقش ثانی) صفحہ نمبر ۴۳۰ حاشیہ ۲)۔

کہا جاسکتا ہے کہ نسخۂ حسین میرزا میں بھی یہ شعر بر بنائے سہو درج ہو گیا ہوگا۔ مگر غور کرنے کی جا ہے کہ سہو کا ایسا توارد انتہائی درجہ نادر الوقوع اور محتاج دلیلِ قوی ہے۔ پھر اس کا بھی امکان ناقابل انکار ہے کہ بادشاہ کے عظیم ذخیرہ شعری میں ایک آدھ شعر کہیں سے اچٹ کر رُل مل گیا ہو تو دشوار نہیں۔ بہر حال مرزا کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

گو واں نہیں تو واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

(طاہر ایڈیشن: صفحہ نمبر ۱۱۱ بہ تکرار (تو) نسخہ متداولہ میں (پہ دان) مالک رام ایڈیشن: ص ص ۱۸۰-۱۸۲) کے بعد آغا طاہر ایڈیشن میں ایک قطعہ (ہفت بیتی) اور مرثیہ کے تین بند ملتے ہیں (طاہر ایڈیشن ص ص ۱۱۵-۱۱۶): قطعہ کا پہلا شعر ہے:

اٹھا اک دن بگولہ سا جو میں کچھ جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے (کل ۷ شعر)

یہ قطعہ رسالہ مخزن ماہ اپریل ۱۹۰۷ء میں بحوالہ میجر سید حسن بلگرامی شائع ہوا تھا۔ عرشی زادہ نے اس کی تفصیل بہت خوب پیش کی ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ قطعہ حسین میرزا کے نسخے میں بھی درج ہے (دیکھئے نسخہ عرشی (نقش ثانی) صفحہ ۳۵۱ حاشیہ نمبر ا/ صفحہ نمبر ا/ ایضا صفحہ نمبر ۵۲۰)۔ رضا گپتا نے اسے تقریباً ۱۸۱۰ء کا کلام قرار دیا ہے اور اس پر الگ ایک مضمون کے ضمن میں بحث کی ہے (دیکھئے دیوان غالب کامل صفحہ نمبر ۱۰۳ نیز صفحہ نمبر ۴۵ تا صفحہ نمبر ۴۷؛ ایضا ماہنامہ شاعر جلد ۵۶ شمارہ ۱۰ (بمبئی) ص ص ۱۳۔(۱۵)۔۱۹)

حسین میرزا کے نسخہ کو مخزن اور شاعر نیز دیوان غالب کامل کے مندرجہ متن سے درج ذیل اختلافات ہیں:

تیسرا شعر (مصرعہ اول)۔

ع کہا میں نے کہ (او گمنام) آخر ماجرا کیا ہے

آغا طاہر ایڈیشن : (او ناکام)

چوتھا شعر (مصرعہ ثانی)۔

ع تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے

آغا طاہر ایڈیشن : (تو یوں رویا)

چھٹا شعر (مصرعہ اول)۔

ع اسی کے زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو

آغا طاہر ایڈیشن : "اسی کی زلف" ؛ "مجکو"

ساتواں شعر (مصرعہ دوم)۔

ع کہ جل کر ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے

آغا طاہر ایڈیشن : "ہو گیا تھا خاک"

اس قطعہ کی زبان و اسلوب کے سلسلہ میں لوگوں کے عام خیالات سے راقم کو اتفاق نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ قطعہ کا مضمون خیام سے منسوب ایک رباعی کا چربہ پیش کرتا ہے اور اس قطعہ سے منظوم ترجمہ نگاری کی بابت مرزا کا خاص انداز اجاگر ہوتا ہے۔

۱۰۔ مرثیہ کے تینوں بند، ظاہر ہے کہ مطابق اصل، طاہر ایڈیشن میں ثبت شدہ ملتے ہیں۔ مولوی مہیش پرشاد کی شہادت بھی گزر چکی ہے کہ اس نسخہ کے زائد اوراق میں مرثیہ کے تینوں بند درج ہیں۔ ریاض سندیلوی کا بیان لوگوں نے نقل کیا ہے کہ انہیں مرزا نے اپنے دست خاص سے

المعروف بہ نقیر کو خط مورخہ ۳، جنوری ۱۸۵۵ء میں مرزا نے تحریر فرمایا ہے۔

"آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں، فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی۔ ہاں ہندی غزلیں قلعہ کے مشاعرہ میں دو چار لکھی تھیں، سو وہ یا تمہارے دوست حسین میرزا صاحب کے پاس، یا ضیاء الدین خان صاحب (کے) پاس، میرے پاس کہاں! آدمی کو یہاں اتنا توقف نہیں کہ وہاں سے دیوان منگوا کر نقل اتروا کر بھیج دوں" (اردوے معلی (حصہ اول) صفحہ نمبر ۹۸)

سید بدرالدین احمد نے پھر کبھی ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ بہ سلسلۂ دیوان مرزا کو چھیڑا تھا اور حسین میرزا کے حوالہ سے کوئی بات بھی لکھی تھی، تو میرزا یوں رقمطراز ہوئے:

"پیر و مرشد! آج نواں دن ہے حسین میرزا کو الور گئے۔ اگر ہوتے تو ان سے پوچھتا کہ حضرت میرا دیوان کس مطبع میں طبع ہوا اور حاشیے اس پر کس نے چڑھائے۔ خدا جانے حسین میرزا نے کیا کہا اور حضرت کیا سمجھے۔۔۔۔" (پھر اسی سیاق میں لکھتے ہیں) "رہا دیوان! اگر ریختہ کا منتخب کہتے ہو تو وہ اس عرصہ میں دلی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا، اور تیسری جگہ آگرہ میں چھپ رہا ہے۔ فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا پھر نہیں چھپا مگر ہاں سال گزشتہ میں منشی نول کشور نے شہاب الدین کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خان نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا وہ منگالیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں، یعنی کوئی مصرعہ میرا اس سے خارج نہیں۔ اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔۔۔" (دیکھئے اردوے معلی (دہلی ۱۳۲۶ ہجری) صفحہ نمبر ۱۰۰)

خلاصہ بحث یہ کہ 'حسین مرزا' جو ذوالفقار الدین حیدر کا عرف ٹھہرا اس سے کسی محقق کا صرف نظر کرنا موجب استعجاب ضرور ہے خواہ اسکی بنا کسی غلط فہمی ہی پر کیوں نہ قائم ہو! یہ بات لائق ذکر ہے کہ 'ذکرِ غالب' کے دوسرے ایڈیشن میں صرف ایک جگہ (صفحہ نمبر ۱۱۷ مطبوعہ ۱۹۵۰ء) حسین میرزا' بالکل صحیح لکھا ہے۔ پھر معلوم نہیں کن وجوہ کی بناء پر زمانۂ مابعد کے ایڈیشن سے یکسر یہ جملہ ہی نکال دیا گیا۔

مرزا کے دیوان ریختہ کا وہ قلمی نسخہ جس کی کتابت حسین میرزا نے بقلم خود کی تھی اس کے ترقیمہ کی عبارت (بخط شفیعا، شش سطری) آغا محمد طاہر مرحوم کی شکر گزاری کے ساتھ سطور ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ "این کتاب مستطاب بتاریخ ششم جمادی الثانی ۱۲۷۷ ہجری مطابق بستم دسمبر ۱۸۶۰ء

۲۔ روز پنجشنبہ در شہر دہلی شاہجہاں آباد، از دست سید ذوالفقار الدین حیدر الموسوی المعروف

۳۔ حسین میرزا، عفی عنہ، ابن نواب مبارز الدولہ ممتاز الملک میرزا حسام الدین حیدر خان بہادر، حسام جنگ

۴۔ مرحوم و مغفور باتمام رسید

ہر کہ خواند دعا طمع دارم — زآنکہ من بندۂ گنہگارم

۵۔ یکون الخط فی القرطاس دھرا — وکاتبہ، رمیم فی التراب

۶۔ "۔۔ ۔ تم تم تم" (دیوان غالب و طاہر ایڈیشن) فوٹو بلاک مابعد صفحہ ۱۴۸، ۱۳۵۵ھ)

ترقیمہ کی سطر چہارم کی محاذات میں دائیں جانب نچلے گوشے میں مرزا غالب کی مہر ثبت ہے اور اس کے اوپر تلے دو دو جملے آڑی ترچھی سطور میں بالفاظ ذیل مکتوب ہیں:

۱۔ (خط شفیعا)۔ "نگاشتہ حضرت غالب"۔ (تحریر حسین میرزا)

۲۔ (خط نستعلیق)۔ "نگارندہ را آفرین و نگرندگانی را نوید" (بقلم مرزا غالب)

۳۔ (مہر مربع)

جنگ بہادر نظام اسد اللہ خان الملک نجم الدولہ دبیر	(یعنی نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ)

۴۔ (نستعلیق)۔ "بندہ علی ابن ابیطالب ۱۲۔" (مرزا نے حسین میرزا کے نام ایک خط مورخہ بروز سہ شنبہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء کو اس سجع پر ختم کیا ہے: "بندۂ علی ابن ابی طالب آرزومند مرگ غالب"۔ دیکھئے اردوے معلی (حصہ اول)، صفحہ ۲۶۳)

۵۔ (نستعلیق) "اسد اللہ خان غالب ۱۲۔' (مرزا نے بہر دو جگہ بارہ کا ہندسہ رقم فرمایا اس کی بابت خود فرماتے ہیں (بندہ اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہون) دیکھئے اردوے معلی (حصہ اول) خط بنام حاتم علی مہر، صفحہ نمبر ۲۰۶)

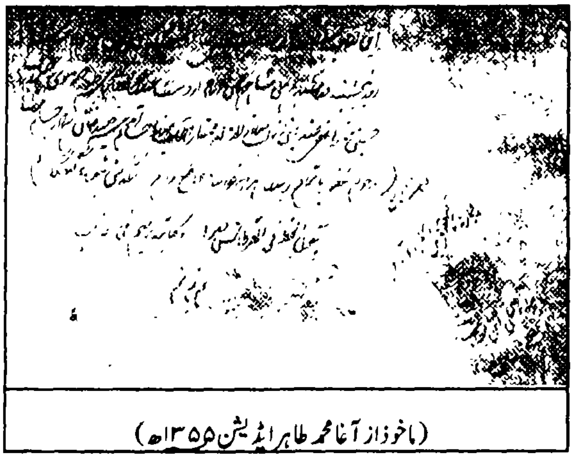
یہ مہر وہی ہے جو حسب تحقیق آنجہانی مالک رام مرزا نے ۱۲۶۷ھ میں بنوائی تھی (دیکھئے نسانۂ غالب (۱۹۷۷ء صفحہ نمبر ۸۵-۸۴)

اس نسخہ کو معروف غالب شناس، مولوی مہیش پرساد نے دیکھا تھا۔ چنانچہ موصوف کا مقالہ بعنوان "دیوان غالب کے قلمی نسخے" زمانہ (کانپور) بابت فروری ۱۹۴۰ء میں چھپا۔ افسوس کہ زمانہ کا یہ شمارہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ بہر حال ذیل کا ایک اقتباس ملاحظہ کیلئے پیش کیا جاتا ہے:

"یہ نسخہ اب جناب سید احمد میرزا صاحب کے پاس ہے،

جو کاتب موصوف (حسین میرزا) کے پوتے ہیں۔ جن کا اصل مکان چھتہ چوہیا محلہ فراش خانہ، دہلی میں ہے۔ لیکن میں نے جناب سید صاحب اور ان کے اعزا کی مہربانی سے اس نسخہ کو مارچ ۱۹۳۴ء میں ٹیلی گراف اسکوائر، نئی دہلی میں دیکھا تھا۔ جہاں سید صاحب اس وقت مقیم تھے اس نسخے کے زائد اوراق میں مرزا کے لکھے ہوئے مرثیے کے وہ تمام بند درج ہیں جن کا محض پہلا بند مولانا حالی نے 'یادگار غالب' میں درج کیا ہے" (دیکھئے دیوان غالب۔ نسخۂ عرشی (نقش ثانی۔ صفحہ ۵۲۲)

آغا طاہر کے مختصر دیباچہ میں یہ فقرہ ملتا ہے: "انہوں نے منتخب کلام کا ایک صحیح نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر مرزا کو دیا۔" الخ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخۂ زیر بحث، ہے تو دیوان کے نسخۂ منتخب متداول ہی کی نقل؛ تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ حسین میرزا نے نقل کرنے میں لکھی ہی



(ماخوذ از آغا محمد طاہر ایڈیشن ۱۳۵۵ھ)

مارنے کا کام کیا ہوگا۔ ان کو غالب کے کلام سے جو شغف تھا اس کی بناء پر جا بجا متن میں، پھر حواشی پر اضافے کچھ تو دوران کتابت ہی میں اور کچھ اتمام نسخہ کے بعد بھی اپنی پیرانہ سالی کے آخری ایام میں کیے ہوں گے، اضافہ کرتے رہنے کی گنجائش جو انہوں نے اپنے نسخے میں نکال رکھی تھی اس کا ثبوت یوں بھی ملتا ہے کہ زائد اوراق کی شہادت مولوی مہیش پرشاد نے بھی دی ہے۔ بدین وجہ آغا طاہر کے ایڈیشن کو جہاں نسخۂ متداولہ سے اختلاف ہے بلحاظ الفاظ یا ترتیب، با مواد، اس کی اہمیت لائق مطالعہ ہے خصوصاً درج ذیل امور نظر انداز کرنے کے نہیں ہیں۔

۱۔ ردیف ن کی چوتھی غزل:

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
(کل ۹ شعر، طاہر ایڈیشن۔ (صفحہ نمبر ۴۰-۴۱)

رضا گپتا نے اسکا تخمینہ ۱۸۶۱ء بتایا ہے، دلیل، خط بنام علائی مورخہ ۳/ مارچ ۱۸۶۷ء ہے (دیکھئے دیوان غالب کامل، صفحہ نمبر ۳۶۳۔ ۳۶۴، حاشیہ ۳)

اس غزل کا ساتواں شعر، مصرعہ دوم نسخہ عرشی و رضا گپتا میں اس طرح ہے:

"ہوں میں کلام نغز و لے ناشنیدہ ہوں"

حسین میرزا کے نسخہ میں بطرز ذیل ہے:

"ہوں میں کلام نغز دئیے ناشنیدہ ہوں" (طاہر ایڈیشن۔ صفحہ نمبر ۴۱) آٹھواں شعر، مصرعہ ثانی متداول یوں ہے:

"پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں"

جبکہ حسین میرزا کے نسخہ میں (زمرے) کی بجائے (فرقہ) کا لفظ ہے (طاہر ایڈیشن: صفحہ نمبر: ۴۱)

۲۔ ردیف ہائے ہوز کے تحت نسخۂ متداولہ میں دو مختلف غزلوں کے صرف تین شعر ہیں۔ یہ اشعار نسخۂ حسین میرزا میں بھی بر موقع ملتے ہیں۔ پھر ایک غزل ۱۴ شعروں پر مشتمل ملتی ہے جس کا مطلع ہے:

شب وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ
(طاہر ایڈیشن: صفحہ نمبر ۶۲-۶۳)

اس کی اولین اشاعت مرزا کی زندگی میں محمد عبدالکریم کے 'گلدستۂ انجمن' (مطبع اکبری، دہلی ۱۸۶۱ء) میں ہوئی لیکن اس کا انکشاف ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مضمون (ماہ نو، بابت مارچ ۱۹۶۵ء) میں کیا۔ جبکہ نواب سعید احمد خان کے حوالہ سے یہ غزل روزنامہ ہمدرد دہلی (جلد ۱۔ شمارہ ۳۔ صفحہ نمبر ۳ کے سرورق پر ۱۹۱۳ء میں چھپی۔ گلدستہ کے متن میں درج ذیل شعر کا اضافہ ملتا ہے جو ترتیب میں بارہواں شعر ہے:

جو بعدِ قتل مرادشت میں مزار بنا   لگا کے بیٹھتے ہیں، اس سے راہ زن تکیہ

(دیکھئے نسخۂ عرشی (نقش ثانی) صفحہ نمبر ۴۲۴-۴۲۵ رضا گپتا صفحہ ۳۶۳)۔ اس شعر کا دو ماخذوں سے خارج رہ جانا ظاہر کرتا ہے کہ میرزا کی نظر ثانی کے بعد عبدالکریم کو یہ غزل دستیاب ہوئی ہوگی ورنہ نواب سعید احمد خان اور حسین میرزا دونوں کا بربنائے سہو بارہویں شعر کو چھوڑ دینا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ ردیف یائے مثناۃ کی ابتداء حسین میرزا کے نسخے میں اس بیت سے ہوتی ہے۔

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گوہر سا کرے

دیوانِ غالبؔ اردو کا نسخہ بخطِ حسین میرزا
اور
اس پر مبنی ایڈیشن کی اہمیت

اس نسخہ کی کتابت سید ذوالفقارالدین حیدر نے کی تھی جن کا سلسلۂ نسب حضرت موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ شہرت ان کی حسین میرزا کے عرف سے ہوئی۔ نواب مبارزالدولہ ممتاز الملک میرزا حسام الدین حیدر خان بہادر حسام جنگ حسین میرزا کے والد ماجد تھے۔

میرزا حسام الدین حیدر کا تخلص نامیؔ تھا۔ ان کے دیرینہ تعلقات الٰہی بخش خان معروف سے قائم تھے۔ بقول مولانا حالی، غالب کے ابتدائی دور کا کلام، میرزا حسام الدین حیدر ہی نے لکھنؤ میں میر تقی میر کو سنایا تھا، اور سن کر میر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا، تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا" (دیکھئے یادگار غالب ص ۱۲۳ (حاشیہ)؛ ذکرِ غالب (مالک رام؛ ۱۹۷۶ء) ص ص ۴۱۔ ۴۲)

حسین میرزا اور مرزا غالب کے باہمی تعلقات کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ مشہور محقق مالک رام نے 'ذکرِ غالب' میں جا بجا ان کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ محقق موصوف نے 'حسین میرزا' کا نام ہر جگہ 'ناظر حسین میرزا' لکھا ہے۔ چنانچہ مرزا کی فارسی تصانیف کے ضمن میں 'کلیاتِ نظمِ فارسی، مطبوعہ دارالسلام، دہلی ۱۸۴۵ء کا تعارف ختم ہوتے ہی ذیل کے الفاظ ملتے ہیں:

(۱) اس کے بعد جتنا کلام ہوا، وہ نواب ضیاء الدین احمد خان اور ناظر حسین میرزا کے پاس جمع ہوتا رہا۔ مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان صاحبوں کے گھر لٹے تو اس میں یہ بھی ضائع ہو گیا" (ذکرِ غالب (محولہ بالا ایڈیشن ص ۱۵۴) ۱۹۲۲ء میں شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے، اردوے معلی کا ایک ایڈیشن شائع کیا تھا۔ اس کے بیان میں محقق موصوف فرماتے ہیں:

(۲) "۔۔ خود ناشر نے حصہ دوم کے آغاز میں دو خطوں کا اضافہ کیا ہے۔ جو میرزا نے سجاد میرزا مرحوم (خلف ناظر حسین میرزا) کے نام لکھے تھے، اور انہیں مکتوب الیہ کے خاندان (آغا محمد طاہر مرحوم) سے دستیاب ہوئے تھے۔۔" (ذکرِ غالب صفحہ نمبر ۱۷۰- ۱۷۱)۔ ذیل کا بیان بھی پیش نظر رکھنے کا ہے:

(۳)۔۔۔ میرزا نے ابتدائی چند برس کے بعد اپنا کلام اپنے پاس نہیں رکھا، نہ کوئی بیاض ہی اسکے لئے بنائی۔ نواب ضیاء الدین احمد خان، اور میرزا ذوالفقار الدین حیدر خان عرف ناظر حسین میرزا نے، انکی نظم ونثر محفوظ کرنے کا التزام کر رکھا تھا۔ دونوں حضرات نے اسکے کلام کے قلمی نسخے بہت اہتمام سے تیار کروائے تھے؛ جب غدر ہوا اور دونوں کے گھر لٹے تو کتابخانے بھی ورق ورق ہو گئے۔ اسکے ساتھ میرزا کے دیوان اور مصنفات بھی ضائع ہو گئے"۔ (ذکر غالب: صفحہ نمبر ۲۱۵۔ ایضاً "ایڈیشن دوم، صفحہ نمبر ۱۸۱۔ ۱۹۵۰ء)

میرزا کے عقیدہ کے بحث میں بھی ایک جگہ محقق موصوف یوں رقمطراز ہیں:

(۴) "۔۔۔۔ اسکے علاوہ یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے تعلقات نواب حسام الدین حیدر خان کے خاندان سے نہایت ابتدائی زمانے سے تھے۔ اور ان کے صاحبزادے ناظر حسین میرزا انکے ہجولی تھے" (ذکر غالب: صفحہ نمبر: ۲۵۱، ایضاً ایڈیشن دوم (۱۹۵۰ء صفحہ نمبر ۲۲۳)۔

اقتباسات منقولۂ بالا اس خانوادۂ موسویہ سے مرزا کے گوناگوں تعلقات کو جیسا کچھ الم نشرح کرتے ہیں، اس پر مزید کچھ اضافہ کرنا غیر ضروری ہے۔ بس وہی ایک بات ازالۂ غلط فہمی کیلئے محتاج تحقیق رہ گئی ہے کہ آنجہانی مالک رام نے بدون تردد، حسین میرزا کا نام ہر جگہ 'ناظر حسین میرزا لکھا ہے، تو آخر اس کی کوئی ڈھکی چھپی سہی، بنیاد ہے بھی یا نہیں؟ آیا وہ حسین میرزا کی شخصیت الگ اور ناظر حسین میرزا کی شخصیت الگ قرار دیتے ہیں یا اول الذکر ہی کو ناظر حسین مرزا، کہتے چلے گئے ہیں؟

اس سلسلے میں یہ بات خوب خوب سمجھ لینے کی ہے کہ حسین میرزا اور ناظر حسین مرزا فی الواقع دو الگ الگ شخص نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ مگر چونکہ محقق موصوف نے بڑے وثوق کے ساتھ "ناظر حسین میرزا، بہ اضافہ ناظر، لکھا اور کہیں بھولے سے بھی مجرد "حسین میرزا" یعنی بدوں اضافۂ ناظر نہیں لکھا، لہٰذا غایت درجہ کی خوش اعتقادی قاری کو اس گمان میں مبتلا کر سکتی ہے کہ دونوں دو شخص ہیں یا پھر یہ کہ حسین میرزا کی اصلیت بیچ بیچ نا قابل وثوق ہے یا اس کا وجود خارجی تسلیم بھی کیا جائے تو غالب کے سلسلے میں یہ شخص لائق توجہ یکسر نہیں ہے ورنہ آنجہانی محقق کی ایسی مستند کتاب اس نام سے خالی نہ رہ جاتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ محققِ ہذا نے جب

ذوالفقار الدین حیدر ہی کا عرف ناظر حسین میرزا بتایا ہے تو تھوڑی سی جانبداری برت کریوں کہنے کا جواز نکالا جا سکتا ہے کہ وہ 'حسین میرزا' کو بھی پہچانتے ہیں، مگر اتنی سی کسر بہر حال باقی رہ گئی ہے کہ انکے ذہن میں ذوالفقار الدین حیدر کا عرف 'ناظر حسین میرزا' بہ اضافۂ ناظر، کسی طرح راسخ ہو کر بیٹھ گیا ہے کہ وہ اس اضافی لفظ کے بغیر 'حسین مرزا' کے عرف ہونے کا کسی طرح اقرار نہیں کرتے۔

اس لغزشِ قلم کی وجہ ہمارے خیال میں محقق موصوف کے پیش نظر ماخذوں کا کوئی متفقہ و سنجیدہ بیان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کہیں کوئی چلتی پھرتی سی بات جو دکھائی دی وہ دل میں کھب گئی پھر نوک خامہ سے جزوِ تحقیق بنکر ثبت ہوتی چلی گئی ہے۔

اصل عرف ذوالفقار الدین حیدر کا "حسین میرزا" ہے۔ اس کا ثبوت ماضیٔ قریب سے ماضیٔ بعید تک ماخذوں کی ورق گردانی بہ تکرار پیش کرتی ہے۔ چنانچہ حسین میرزا کے خاص نسخے پر مبنی ایڈیشن کی پیش کش ۱۳۵۵ ہجری مطابق ۱۹۳۶ء میں آغا محمد طاہر نبیرۂ حضرت آزاد مالک آزاد بکڈپو، کوچہ چیلان دہلی نے کی تھی۔ انہوں نے اپنے ایڈیشن کے تعارفی نوٹ میں اصل نسخہ کے بلند مرتبہ کاتب کا تعارف بالفاظ ذیل ثبت فرمایا ہے۔

"مدت سے آرزو تھی کہ غالب کا اردو دیوان شائع کروں۔ مگر ایسا کہ سند ہو، اور سب قسم کے عیوب سے پاک ہو۔ خوش قسمتی دیکھئے کہ اپنے ہی گھر میں ایک مستند قلمی نسخہ نکل آیا یعنی میرے نانا جناب حسین میرزا صاحب۔ اعلیٰ اللہ مقامہ۔ نواب ناظر قلعۂ معلّٰی، ذی علم، صاحب ذوق صاحب سخن، مرزا کے دوست بلکہ عاشق زار تھے۔ وہ انتخاب میں بھی شامل تھے، انہوں نے منتخب کلام کا ایک صحیح نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر مرزا کو دیا۔ مرزا نے پڑھ کر دستخط اور مہر سے مزین کر کے بطور یادگار واپس کر دیا۔ جواب بھی میری ننہال میں مرزا کے محبت بھرے تعلق کو زندہ کرتا ہے۔" [آغا طاہر، دیوان غالب (3rd Edition) صفحہ نمبر ۲]

آغا طاہر کا یہ بیان 'آفتاب آمد دلیل آفتاب' کا مصداق ہے۔ بات صاف ہو گئی کہ ذوالفقار الدین حیدر کا عرف 'حسین میرزا' ہے۔ البتہ اس بیان میں 'نواب ناظر قلعۂ معلّٰی' کے القاب بھی درج ہیں جو بظاہر 'حسین میرزا' کے شاہی منصب کی نشان دہی کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یہیں سے ہمارا خیال ہے کہ کبھی کسی نے 'ناظر' کا لفظ جوڑ کر 'ناظر حسین میرزا' بھی لکھ دیا اور اس سے راست یا بالواسطہ آنجہانی مالک رام اس حد تک متاثر ہوئے کہ 'ذکر غالب' میں انہوں نے ہر جگہ ناظر حسین میرزا ہی لکھا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ ترکیبِ ہٰذا خود مرزا ہی کی روانیٔ قلم و شوخیٔ تحریر کی پیداوار ہے مرزا جو خود اپنی بابت 'غالب علی شاہ' لکھنے سے باز نہیں آتے (دیکھئے اردوے معلّٰی (۱۳۲۶ھ) حصہ اول صفحہ نمبر ۱۷۶، ۱۸۸ (بنام حکیم غلام نجف خان)؛ صفحہ نمبر ۱۸۸ (بنام حکیم ظہیر الدین احمد خان)، صفحہ نمبر ۱۹۰ (بنام نواب میر ابراہیم علی خان، وفا: صفحہ نمبر ۳۰۸ (بنام نواب امین الدین احمد خان) ایک آدھ بار اپنے دوست 'حسین میرزا' کو انہوں نے 'ناظر حسین مرزا' بھی لکھا ہے۔ میرزا یوسف علی خان عزیز سے ارشاد فرماتے ہیں:

"واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ ہاں بھائی ضیاء الدین خان، اور ناظر حسین میرزا صاحب، ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سوان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی، نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا، پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں" (اردوے معلّٰی (حصہ اول ۱۳۲۶ھ مطبوعۂ فاروقی دہلی۔ صفحہ نمبر ۱۶۴ تا ۱۶۵)

یہاں مرزا نے صاف 'ناظر حسین میرزا' لکھا ہے لیکن اسی مضمون کا اعادہ جب وہ مرزا حاتم علی مہر سے کرتے ہیں تو یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

"میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین خان اور حسین میرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں" الخ۔۔۔ (عود ہندی۔ ۱۹۲۷ علی گڑھ۔ صفحہ نمبر ۱۰۵، اردوئے معلّٰی (مطبوعۂ فاروقی ۱۳۲۶ھ صفحہ نمبر ۲۰۸)

یہاں جو مرزا نے (ناظر) کا لفظ چھوڑ دیا تو یہ سہو و فرد گزاشت نہیں بلکہ اصلیت پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دلیل تو خود ذوالفقار الدین حیدر کا اپنا بیان ہے جو سطور آئندہ میں بضمنِ ترتیب پیش کیا جا رہا ہے۔ پھر خود مرزا کے مکاتیب ہیں، چنانچہ ذوالفقار الدین حیدر کے نام متعدد خطوط میرزا کے جو ہماری نظر سے گزرے ہیں، انمیں کہیں بھی اس اضافی لفظ کا استعمال نہیں ملتا (دیکھئے، اردوے معلّٰی (حصہ اول) صفحہ نمبر ۲۵۸ تا ۲۶۳) ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یوسف مرزا کے خطوط میں مرزا نے بارہا، ناظر جی، لکھا اور غالباً "حسین مرزا، ہی کو مراد لیا ہے (دیکھئے اردوئے معلّٰی۔ حصہ اول۔ صفحہ نمبر ۲۶۳ تا ۲۷۷)

یہاں تک جو اقتباس پیش کئے گئے ہیں وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہیں۔ لہٰذا زمانہ ماقبل کا ایک اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے۔ سید بدر الدین احمد

Admission - 2000 /01

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

(پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت ۱۹۹۸ء میں قائم مرکزی یونیورسٹی)

نظامت فاصلاتی تعلیم

اعلان داخلہ - 2000-2001

اردو ذریعۂ تعلیم اور فاصلاتی طریقے سے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لئے درخواستیں مطلوب ھیں :

۱۔ **بی اے / بی کام / بی ایس سی سال اول میں داخلہ بذریعہ اہلیتی امتحان۔**

رسمی تعلیمی قابلیت نہ رکھنے والے امیدواروں کو بی اے / بی کام / بی ایس سی میں داخلے کے لئے اہلیتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ یہ امتحان ملک کے منتخب مقامات پر ۲۲ر اکتوبر ۲۰۰۰ء بروز اتوار منعقد ہوگا۔ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری ۲۰۰۱ء کو اپنی عمر کے ۱۸ سال مکمل کرلیں۔ اہلیتی امتحان کے لئے خانہ پری کی ہوئی درخواست مع رجسٹریشن فیس ۱۰۰ر روپے وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ر ستمبر ۲۰۰۰ء ہے۔ تاخیر فیس ۵۰ر روپے (جملہ ۱۵۰ر روپے) کے ساتھ یہ فارم ۱۵ر اکتوبر تک جمع کئے جاسکتے ہیں۔

۲۔ **بی اے / بی کام / بی ایس سی میں راست داخلہ**

۳۔ **چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے کمپیوٹنگ**

کورس نمبر ۲ اور ۳ کے لئے ایسے امیدوار درخواست دینے کے اہل ہیں جنہوں نے کسی مسلمہ بورڈ / ادارے / یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ یا 10+2 یا ان کے مساوی امتحان میں کسی بھی ذریعہ تعلیم سے کامیابی حاصل کی ہو۔ انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دئے گئے کورسوں کی فہرست پراسپکٹس میں شائع کی گئی ہے۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست اور وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۰ء ہے۔

(بی ایس سی پروگرام صرف حیدرآباد، بنگلور، گلبرگہ اور ممبئی میں اور کمپیوٹنگ پروگرام صرف حیدرآباد، کرنول، بھیونڈی اور ممبئی میں دستیاب ہے۔)

۴۔ **چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے اہلیت اردو بذریعہ انگریزی**

۵۔ **چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے اہلیت اردو بذریعہ ھندی**

۶۔ **چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے غذا اور تغذیہ**

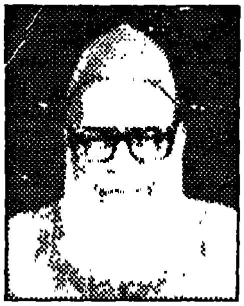
کورس نمبر ۴، ۵ اور ۶ میں داخلہ کے لئے کسی رسمی تعلیمی قابلیت یا اہلیتی امتحان میں کامیابی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری ۲۰۰۱ء کو اپنی عمر کے ۱۸ سال مکمل کرلیں۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۰ء ہے۔ یونیورسٹی اور اس کے پروگراموں سے متعلق تفصیلی معلومات پراسپکٹس میں فراہم کی گئی ہیں۔ پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر یا بذریعہ ڈاک نیچے دئے گئے پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بی اے / بی کام / بی ایس سی کورسوں کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت شخصی طور پر حاصل کرنے کی صورت میں ۳۵ روپے اور بذریعہ ڈاک ۴۰ر روپے ہے۔ کسی بھی سرٹیفکیٹ کورس کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت نقد ۱۰ر روپے اور بذریعہ ڈاک ۱۵ر روپے ہے۔ (بذریعہ ڈاک پراسپکٹس منگوانے کے لئے مطلوبہ رقم کا بنک ڈرافٹ **مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی** کے نام اور حیدرآباد میں قابل ادا ہونا چاہئے۔ ڈاک سے داخلہ فارم منگوانے کے لئے ڈرافٹ صرف نیچے دئے گئے پتے پر ارسال کریں۔)

ڈائرکٹر، ڈسٹنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ڈیلکس کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۸

پروفیسر محمد سلیمان صدیقی، رجسٹرار

ابو محفوظ الکریم معصومی



نام : ابو محفوظ الکریم معصومی

ولدیت : مولانا محمد امیر حسن (م ۱۹۴۳ء)

پیدائش : ۳۱، اگست ۱۹۳۱ء

محلہ مہواٹولہ (یا) سرائے، قصبۂ بہار شریف (سابق ضلع پٹنہ) حال ضلع نالندا

پتہ : ۳۳/۱۔ سی، ہرے کرشنا کونار روڈ (بنیاپوکھر روڈ) کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۴

تعلیمی اسناد : (۱) سنٹرل مدرسہ اکزامنیشنز بنگال (کلکتہ) سے جو امتحانات پاس کیے:

(ا) عالم گورنمنٹ اسکالر شپ Rs.8/= ماہانہ) ۱۹۴۲ء۔

(ب) فاضل گورنمنٹ اسکالرشپ Rs.15/= ماہانہ) ۱۹۴۴ء

(ج) ممتاز المحدثین (درجہ اول میں پہلی پوزیشن) ۱۹۴۶ء

(۲) ایسٹ بنگال سکنڈری بورڈ، ڈھاکہ سے:

(د) ہائی اسکول اکزامنیشن ۱۹۴۹ء

(۳) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے :

(ہ) پری یونیورسٹی ۱۹۶۳ء

(و) بی اے (درجۂ اول، پہلی پوزیشن) یونیورسٹی مڈل حاصل کیا، ۱۹۶۷ء

(ز) ایم اے (عربک) درجۂ اول میں پہلی پوزیشن۔ مڈل حاصل کیا، ۱۹۶۹ء

ملازمت : (۱) اسسٹنٹ مولوی (ڈی پی آئی ویسٹ بنگال کے تحت) Rs.90/= گریڈ میں۔ شعبۂ عربی کلکتہ مدرسہ سے وابستگی، اپریل ۱۹۴۹ء سے فروری ۱۹۵۰ء تک

(۲) لکچرر، اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر (ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ ویسٹ بنگال کے تحت (شعبۂ عربی، کلکتہ مدرسہ) فروری ۱۹۵۰ء سے اکتوبر ۱۹۶۸ء تک

(۳) پروفیسر آف حدیث اینڈ تفسیر اکتوبر ۱۹۶۸ء سے اگست ۱۹۹۱ء تک

(۴) ملازمت سے سبکدوشی اگست ۱۹۹۱ء

اعزازات : (۱) ۱۹۷۷ء میں عربی کے ممتاز استاذ کی حیثیت سے کل ہند سطح پر ٹیچرس اوارڈ اور نقد انعام سے نوازا گیا۔

(۲) ۹۰ء - ۹۱ء میں راشٹر پتی اوارڈ (عربی زبان میں سند امتیاز اور سالانہ رقم) کا حصول

تحقیق و تالیف

(۱) ابن جریر طبری کی عظیم تفسیر کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ (بزبان عربی، غیر مطبوعہ) اسکے تعارف میں، اردو میں پہلا مقالہ لکھا اور چھپوایا (دیکھئے "معارف" شمارہ اکتوبر ۱۹۴۸ء (علامہ سید سلیمان ندوی میرے استاذ الاستاذ تھے۔ انکی ادارت کا آخری دور تھا)۔ نیز ملاحظہ ہو اسلامک کلچر، جنوری۔ اپریل (۲) متعدد تحقیقی اور اہم مقالات معارف کے علاوہ مجلّہ برہان، دہلی، ششماہی علوم القرآن (علی گڑھ)، مجلّہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)۔ (۳) ہند دبیرون ہند (دمشق و سعودی عربیہ وغیرہ) کے عربی مجلات میں بڑی تعداد مقالات کی چھپی۔ ایک مجموعہ عربی مقالات کا جلد اشاعت پذیر ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ (۴) بُویہی سلاطین محمد جان اور وزیر الصاحب بن عباد کے درباری شاعر ابو سعید محمد بن محمد رستمی اصفہانی (پانچویں صدی ہجری کے اوائل تک یہ شاعر زندہ رہا) کے چند نادر قصائد کا مجموعہ مفصل مقدمہ و تحقیقی حواشی کے ساتھ بعنوان الرستمیات، مجمع البحوث الاسلامیہ (پاکستان) نے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔

متفرقات : (۱) میری عربی شاعری ۱۹۳۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ اردو شاعری کا مجھے دعویٰ نہیں ۔ چند قطعات و قصائد مقامی اخبارات میں چھپے ہیں۔ ایک طویل مثنوی (قلمنامہ) مرحوم ظ۔ انصاری کے آخری دورِ ادارت میں 'انقلاب' ممبئی میں شایع ہوئی۔ فارسی شاعری سے بھی قدرے دلچسپی ہے۔

(۲) سیمناررون میں شرکت : (۱) انٹر نیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹس (منعقدہ نیو دہلی ۶۳۔ ۱۹۶۴ء میں شرکت کی، عربی میں مقالہ پیش کیا اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیا۔

(۲) کلکتہ (ایشیاٹک سوسائٹی، ایران سوسائٹی، مسلم انسٹی ٹیوٹ) بانکی پور (خدا بخش اورینٹل لائبریری) اور لکھنؤ (ندوۃ العلماء) کے بیشتر اہم سمیناروں میں شرکت کی۔

گیا جس کا موضوع زراعت اور کھیتی باڑی تھا۔

اسی طرح ناشروں کو دئے جانے والے ایوارڈ بے قاعدگی کا شکار ہیں۔ یہاں بھی چراغ تلے اندھیرا ہے۔ کلکتے سے شائع شدہ عمدہ ترین کتابوں پر ان کے ناشروں کو معمولی اور دہلی کے ناشروں کو اوسط درجہ پروڈکشن پر زیادہ مالیت کے انعامات دئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اکیڈمی ان سے لاکھوں روپے کی کتابیں ادھار خریدتی ہے۔

ہر سال چند کتابوں کی اشاعت پر مصنفین کو اکیڈمی مالی امداد دیتی ہے۔ لیکن جن کے لئے اعانت منظور کی جاتی ہے وہ بیچارے خود کو بندھوا مزدور سمجھنے لگتے ہیں۔ اکیڈمی کتاب کی لاگت اور قیمت فروخت فی فرما خود مقرر کرتی ہے چاہے ادیب اس بجٹ میں کتاب چھپوا سکے یا نہیں۔ اگر کوئی اچھی کتاب چھاپ کر اس کے ذریعہ سماجی مرتبے میں اضافے کے ساتھ تھوڑا بہت منافع کمالے تو اکیڈمی کے ارباب اقتدار کو برا کیوں لگتا ہے؟ ادیبوں کے بھی پیٹ ہوتا ہے۔ ان کے بھی بیوی بچے ہوتے ہیں۔ کوئی دوسری اکیڈمی مالی امداد دینے کے لئے مصنفوں پر سختی سے قیمت فروخت کی شرط عائد نہیں کرتی لیکن ہمارے صوبے کی اکیڈمی ایسا کر رہی ہے جس سے مالی امداد لینے والے ادیب امداد لے کر بھی ناخوش نظر آتے ہیں، کہ خودداری بھی گئی، پورا بھی نہیں پڑا۔ اس مسئلے کا حل اسطرح ممکن ہے کہ اکیڈمی ادیبوں کو معقول اور خاطر خواہ اعزازیہ دے کر کتابیں خود چھاپے اور انکی فروخت کا بندوبست کرے۔

ایک صالح رائے یہ ہے اکیڈمی کو انعامات کی درجہ بندی از سر نو کرنی چاہئے۔ انعامات کی تعداد دوگنی اور روپے کی دن پر دن گرتی ہوئی ساکھ کے پیش نظر انعامات کی رقمیں چار گنی کر دینی چاہئیں۔ تاکہ اعزازات کا مرتبہ کم سے کم دہلی اردو اکادمی کے ہم پلہ ہو جائے۔

صحافتی خدمات کے لئے بھی مناسب ایوارڈوں کا اجرا ضروری ہے۔ فی الوقت ایسا کوئی انعام مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی جانب سے نہیں دیا جاتا۔

اردو تھیٹر کی کمی

اکیڈمی کو اردو ڈرامہ کو پنپنے کا پورا پورا موقع دینا چاہئے۔ کلکتے میں چند اچھے ڈرامہ کار موجود ہیں۔ لیکن ناٹک کے اس تاریخی شہر میں اردو تھیٹر موجود نہیں ہے جسکی وجہ سے اردو ڈرامہ پسپا ہو رہا ہے۔ جدید لوازمات کے ساتھ ایک تھیٹر کا قیام بہت ضروری ہے جسے پیشہ وارانہ طور پر استعمال کیا جاسکے اور منافع بخش بنایا جاسکے۔ اکیڈمی کے توسط سے اس کے لئے پچاس لاکھ روپے سرکار سے حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔

کلکتے کا عصری ادب نمبر

انشاء کا تیرہواں خصوصی شمارہ کلکتہ اور اس کے مضافات کے اردو ادبا، شعراء، محققین، ناقدین، ڈرامہ نگاروں کی پذیرائی کے لئے وقف ہے۔ زیادہ سے زیادہ مقامی اہل قلم کی اس میں نمائندگی ممکن بنائی گئی ہے۔ ہر عمر اور مزاج کے رائٹر اپنے اچھے سے اچھے رنگ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ جو جتنی اصناف میں طبع آزمائی کرتا ہے ان کے معیاری نمونے، اس کے مختصر کوائف، تصویر، پتہ اور فون نمبر شامل اشاعت ہو رہے ہیں۔ ہر ایک کے لئے بطور اعزاز ایک گوشہ مختص ہوا ہے جس کی طوالت بقدر اصناف ہے۔ البتہ اس کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ متعلقہ گوشہ مختصر سے مختصر ہوتے ہوئے بھی ادیب کے تخلیقی رجحان اور اسکی قوت اختراع کا پتہ دے سکے۔ اسطرح ۶۹ شرکاء کے لئے ۶۹ گوشے تیار ہوئے ہیں جنھیں اُن کے اسمائے گرامی کے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ نمبر کے سلسلے میں بطور خاص یہ چند باتیں ہمارے پیش نظر تھیں:

(۱) آج کلکتے کے فنکار یک جہت ہو کر کیسا ادب لکھ سکتے ہیں یہ ہم سب دیکھ لیں اور اپنے مقام و مرتبہ سے واقف ہو جائیں۔

(۲) انشاء کے توسط سے کلکتے کا عصری ادب تمام عالم اردو میں پہنچ جائے تاکہ دنیا کے مجموعی اردو ادب میں کلکتہ کا حصہ بھی مقرر ہو۔

(۳) کلکتے والوں کو شکایت رہی ہے کہ ناقدین نے ان کے فن کو موضوع بنا کر نہیں لکھا۔ یہ شکایت بے جا تھی کیونکہ کلکتے والوں نے اپنی تخلیقات باہر کم پہنچائیں۔ ہاں اس شمارے نے اب معاصر نقادوں پر ذمہ داری عائد کر دی ہے کہ وہ ادبیات کلکتہ کا مطالعہ کریں اور اسے اپنا موضوع تحریر بنائیں۔ اور اسطرح نئی جہات سے خود آشنا ہوں اور ہمیں بھی اپنے زاویہ ہائے نظر سے آگاہ ہونے کا موقع دیں۔ اسی لئے مشمولہ نگارشات کی تجزیہ آرائی سے ہم نے گریز کیا ہے۔ بعض ماہرین اپنی لاعلمی میں کلکتہ کو ایک کمتر تخلیقی امیج کا شہر سمجھے ہوئے تھے۔ اب وہ خود دیکھ لیں گے کہ کلکتہ کن امکانات سے پُر ہے اور اس وقت خود احتسابی کے عمل سے گزرنے کیلئے آمادہ بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادبیات اردو کے سلسلے میں کلکتہ ایک لسانی دبستان نہ سہی، فکری دبستان کا درجہ ضرور رکھتا ہے۔

(۴) مقامی سطح پر تنقید نگاری کا فقدان ہے جس کی بابت چند مضامین اس شمارے میں شامل کئے گئے ہیں۔ اگر یہ واقعی ایک خلا ہے تو اسے پُر کرنا ضروری ہے۔ تنقید تخلیق کی رہنما ہے لیکن معلو صورتحال میں تنقید بھی تو کسی ک

رہنمائی چاہتی ہے۔ جو تنقید نگاروں کی قلت کی صورت میں اسے صرف انشاء جیسے معتبر صحافتی وسیلے سے مل سکتی ہے۔ امید ہے کہ اس شمارے سے ایک نیا اندازِ نقد سامنے آئے گا۔ البتہ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ جن لوگوں نے تنقید نگاری کے فقدان کی طرف متوجہ کیا ہے انکی نیت تو ٹھیک ہے لیکن بنگال میں کون کیا لکھ رہا ہے اور کیا کیا لکھ چکا ہے اس سے وہ خود لاعلم نظر آتے ہیں۔ اسی لئے صورتحال کا جائزہ لیتے وقت وہ ایک طرف زیادہ جھک گئے ہیں۔ کاش وہ کم سے کم پچھلے چند برسوں میں لکھی گئی مقامی تنقید سے بھی واقف ہوتے اور حد درجہ مایوسی کا اظہار نہ کرتے۔ بہر حال ان کے مضامین تخلیق کاروں کے لئے واقعی اہم ہیں۔ اسی شمارے میں اصل تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں جن سے کچھ لوگوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔ اور ان کی مایوسی چھٹ جائے گی۔

انشاء نے ادب میں عالمی رجحانات کی زیادہ سے زیادہ پرورش اور ترجمانی کی ہے۔ اس شمارے کے ذریعہ مقامی اردو فنکاروں کی نمائندگی کر کے ہم صرف ایک مقامی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو رہے ہیں بلکہ اردو کی مروجہ بین الاقوامیت کی تکمیل کی جانب یہ ایک ٹھوس قدم ہے تاکہ جدید ادب کی شفافیت (transparency) بڑھ جائے اور مشرق اور مغرب روبرو ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔

یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ ۹۵ء میں انشاء کا ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ایک "کولمبس شمارہ" اسکنڈے نیویائی ادب نمبر شائع کیا گیا تھا جو براعظم اسکنڈے نیویا کے چھ ممالک ڈنمارک، ناروے، سویڈن، فن لینڈ، گرین لینڈ اور آئس لینڈ کے اصل علاقائی ادب اور دیگر فنون نیز وہاں بسے ہوئے تارکین وطن کے اصل ادب کا بامعنی مرقع تھا۔ وہ آج تک اسکنڈے نیویا کے اہم ادیبوں کی انفرادی شناخت کا اولین اور واحد حوالہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی انشاء نے اردو صحافت کو عالمی موضوعات اور باخبری دی ہے۔ ۹۳ء میں شائع شدہ "عالمی اردو افسانے نمبر" کو لوگ ابھی تک بھولے نہیں ہیں جس میں ۱۲ ممالک کے ۷۰ اردو افسانہ نگاروں نے بطور خاص شرکت فرمائی تھی۔ "کلکتے کا عصری ادب نمبر" بھی اردو صحافت میں اچھوتا اور پہلا تجربہ ہے۔ جس طرح انشاء کے سابق خصوصی نمبروں کی نئے پرانے رسالوں نے تقلید کی، امید ہے یہ تجربہ بھی قابلِ تقلید سمجھا جائے گا۔

کاش سبھی نمایاں بین الاقوامی رسائل اس زمانے میں اپنے اپنے شہر کی قدروں کو بھی اونچا اٹھائیں اور مقامی ادیبوں کو عزت دیں۔ عصر حاضر میں دہلی، حیدر آباد، ممبئی، لکھنؤ، لاہور، کراچی، لندن کسی شہر کے پاس اپنے مجموعی ادب کا تعارف نامہ نہیں ہے لیکن کلکتہ اپنا مکمل اور زندہ ادبی حوالہ رکھتا ہے۔ اس کے لئے ہم ان ۶۹ قلمکاروں کو مبارکباد پیش کر رہے ہیں جنکی شمولیت اس شمارے میں ہوئی ہے۔ ان کی فرد شناسی کیلئے اس شمارے کی اشاعت کلکتے کی صحافت کا ایک زرّیں باب ہے۔ اور پر احوال کلکتہ کے معروضی بیان میں جو نشترزنی کی گئی اسکی افادیت مسلّم ہے۔ یہ جرّاحی صرف خلوص نیت پر مبنی ہے۔ انشاء نے ادب میں کلکتے کو پہلی بار ہر طرح خود کفیل کرنے کی بے لوث اور انتھک کوشش کی ہے۔ کاش لوگ اسے صحیح اسپرٹ میں لیں۔

علی سردار جعفری

۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء —— یکم اگست ۲۰۰۰ء

مجروح سلطانپوری کی موت کی یاد تازہ تھی کہ ممتاز ترین، ترقی پسند شاعر، ادیب، نقاد، ماہر اقبالیات علی سردار جعفری نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

جعفری صاحب کو بہت سے انعامات حاصل ہوئے جن میں اقبال سمان، گیان پیٹھ ایوارڈ، پدم شری کا خطاب، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، سجاد ظہیر ایوارڈ، اقبال میڈل پاکستان، مخدوم ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ادبی کارنامے اردو کا سرمایہ ہیں۔ اشتراکی نظریئے کے تحت لکھا گیا ان کا شعری ادب ناقابل فراموش ہے۔ "نئی دنیا کو سلام" ۱۹۴۸ء "خون کی لکیر" ۱۹۴۹ء "امن کا ستارہ" ۱۹۵۰ء "ایشیا جاگ اٹھا" ۱۹۵۰ء "پتھر کی دیوار" ۱۹۵۳ء "ایک خواب اور" ۱۹۶۴ء "پیراہن شرر" ۱۹۶۵ء اور "لہو پکارتا ہے" ۱۹۷۸ء ان کی موثر اور یادگار نظموں پر مشتمل مجموعے ہیں۔ نثر میں بھی ان کے انمٹ نقوش "لکھنؤ کی پانچ راتیں" ۱۹۶۲ء "پیغمبران سخن" ۱۹۷۰ء "اقبال شناسی" ۱۹۷۷ء "ترقی پسند ادب کی نصف صدی" وغیرہ تصنیفات کی شکل میں باقی ہیں اور سدا رہیں گے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی سماجی و ثقافتی خدمات کی طویل فہرست ہے۔ وہ ایک بہترین دانشور ہی نہیں زبردست مقرر اور صحافی بھی تھے۔ نئی نسل کے ادیب ان کی نگارشات سے ذہنی اور فکری تحریک حاصل کرتے رہیں گے۔ سامراج واد کے خلاف اور امنِ عالم کی حمایت میں ان کی آواز ہمیشہ بلند ہوتی رہی۔ ان کی موت سے علم و ادب کی دنیا میں خلا واقع ہوا ہے اسے پُر کرنا بہت مشکل ہے۔

عین رشید

—— م : ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۰ء

یہ شمارہ زیر طبع تھا کہ کلکتہ کے چہیتے، ذہین شاعر و دانشور عین رشید کے انتقال کی افسوسناک خبر موصول ہوئی۔ بوقتِ مرگ وہ تقریباً ۶۰ر سال کے تھے۔ ۱۰ر ستمبر کو ایک ہوٹل میں کسی تقریب میں ان پر اچانک دل کا دورہ پڑا اور کچھ دیر بعد، اسپتال پہنچنے سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے پسماندگان میں ان کی بیوی اور دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں۔ خدا انہیں صبر دے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

اردو میں اب تک انکی کوئی کتاب نہیں آئی ہے لیکن بنگلہ زبان میں انکی اردو نظموں کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اور بنگلہ میں ہی انہوں نے شکتی چٹوپادھیائے کے اشتراک سے کلام غالب کا ترجمہ کیا ہے۔ وہ اپنے ہر انتساب میں "دوستوں اور نیک لوگوں کے لئے" ضرور لکھتے تھے۔ ان کی زندگی کی آخری نظم جس کا عنوان بھی "آخری نظم" ہے اسی خاص نمبر میں گوشۂ عین رشید میں شامل ہے۔

یک وقت زبان اور تہذیب کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن کلکتے کا مقامی اردو شاعر صرف اردو زبان کا نمائندہ مانا جاتا ہے تہذیب کا نہیں۔ کیونکہ تعلیم یافتہ اردو تہذیب کا دار و مدار محض زبان سے واقفیت اور شغف پر نہیں ہے۔ بلکہ اس تمام تہذیب کی کشید پر ہے جو دہلی، لکھنؤ یا دکن میں پیدا اور مستحکم ہوئی اور زبان اس کا صرف ایک اہم جزو ہے۔ کلکتہ نے عموماً شمالی ہند کے صالح تہذیبی اقدار کو اپنائے بغیر اردو کو اپنایا ہے اور عملاً اس زبان کی اساس اپنی مقامی بولی پر رکھدی ہے جو قواعد و تلفظ کی پابندی سے عاری ہے۔ خصوصاً کلکتے کی بستیوں کی زبان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا جس نے اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک اردو تعلیم (چنانچہ تحریری زبان کی بھی) فصاحت اور شیرینی کو بگاڑ رکھا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمہ تہذیبی عوامل میں اردو زبان کا کیا تعامل ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ موجودہ عالم صورتِ حال بدل گئی ہے اور اب اردو سے وابستہ ہونے کے لئے اردو تہذیب سے وابستہ ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔ ایک تو اردو تہذیب اپنی مرکزیت کھو چکی ہے۔ دوسرے آج اردو اپنے غیر تہذیبی شہروں میں ہی زیادہ آباد ہو رہی ہے اور پنپ رہی ہے۔ لیکن جدید کلکتہ تو پھر بھی خوش نصیب ہے کہ اردو کی تہذیبی وراثت سے زیادہ (جغرافیائی) فاصلے پر نہیں کھڑا ہے۔ اس لحاظ سے اسے کئی اردو شہروں پر سبقت حاصل ہے۔ چنانچہ کلکتے کے تعلق سے اردو زبان کے مسخ ہونے کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ غلط کار مدرسوں اور ادیبوں کو بخشا جائے گا۔ کیا تخلیقی ادائیگی زبان پر مناسب دسترس کے بغیر ممکن ہے؟

مشاعرے

اردو زبان کی ترویج میں مشاعرے کا بڑا ہاتھ ہے۔ دوسرے شہروں کی طرح کلکتہ میں بھی مشاعروں کا رواج ہے۔ لیکن اب مشاعروں کا رنگ ڈھنگ بدل گیا ہے۔ گو سامعین کی بہت بڑی تعداد موجود ہے لیکن ٹکٹ خرید کر مشاعرہ سننے کا چلن باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اسی لئے اسٹیج پر اب گلیمر بھی نظر نہیں آتا۔ سڑکوں پر جو کھلے مشاعرے ہوتے ہیں ان کا انعقاد سیاسی لوگوں یا علاقائی کلبوں کی جانب سے ہوتا ہے۔ کلبوں کے مشاعروں پر بہ یک وقت سوشل اور اینٹی سوشل عناصر کا غلبہ ہوتا ہے۔ اچھی نشستیں بھی بہر حال منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

کسی زمانے میں یہاں مشاعرہ سماج اور تہذیب کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب بڑے مشاعروں کا دور ختم ہو چکا ہے۔ تہذیبی مشاعروں کا آخری دور نواب دہلوی کی ''آرزو مجلس'' کے ساتھ ختم ہو گیا۔ نواب صاحب کے انتقال سے پہلے محمد علی لائبریری بھی اچھے مشاعرے کرواتی تھی لیکن اب یہ لائبریری بے عمل ہو کر رہ گئی ہے۔ اس پر برسوں سے دوکانداروں اور تاجروں کا غلبہ ہے جن کا علم و ادب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ بعض ادب دوست، ادب نواز بھی کمیٹی میں شامل ہیں لیکن ان کی چلتی کم ہے۔

آخری دور میں شری شیام سندر جھن جھن والا نے اپنی تنظیم ''ملن مندر'' کی طرف سے اور جناب وسیم الحق نے اپنے ادارے ''مغل آرٹس'' کے زیر اہتمام کئی بھرپور مشاعرے کروائے۔ ان میں سے مواخر الذکر نے روزنامہ ''اخبار مشرق'' کے اجرا کے بعد اس شوق کو خیر باد کہہ دیا۔ افضل اقبال نے ایک اچھے منتظم کی حیثیت سے نام کمایا گرانڈ ہوٹل میں بھی مشاعرے کروادیے لیکن بالآخر انھوں نے بھی یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ دراصل اس شہر میں اردو کلچر کی سرپرستی کرنے والے فراخدل اور با استعداد لوگ جن میں ہندو پنجابی، سندھی، مارواڑی یا دہلی برادری کے افراد پیش پیش رہا کرتے تھے ایک ایک کر کے سب خدا کو پیارے ہو چکے ہیں جن کی کمی آج کوئی پوری نہیں کر سکتا۔

ریڈیو۔ ٹیلی ویژن۔

کلکتہ میں آل انڈیا ریڈیو ایک ہفت روزہ اردو پروگرام ''کہکشاں'' کے عنوان سے پیش کرتا ہے جو آدھ گھنٹے کا ہے اور کلکتہ B پر رات ساڑھے نو بجے سے سنا جاسکتا ہے۔ اس میں آٹھ آٹھ منٹ کے سلسلوں میں کلام شاعر، افسانہ، 'مجاہدین آزادی' عام تقریریں، فن اور شخصیت، تہوار و تقریبات، کتابوں پر تبصرے، آپ کی صحت کے ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ کبھی کبھی مباحثہ بھی پیش کیا جاتا ہے اور مہینے میں ایکبار آدھ گھنٹے کا مشاعرہ ''بزمِ سخن'' نشر کیا جاتا ہے۔

کلکتہ ''دوردرشن کیندر'' ٹیلی ویژن پر مہینے میں دو پروگرام مباحثہ / مشاعرہ پچیس تیس منٹ دورانیے کے پیش کرتا ہے۔ یہ پروگرام دن میں ساڑھے بارہ بجے دکھائے جاتے ہیں۔ یہ وقت عام ناظرین کی سہولت کا نہیں ہے اس لئے ٹی وی پروگرام جن حلقوں کے لئے دکھایا جاتا ہے وہ اسے دیکھنے سے محروم رہتے ہیں۔ روزانہ رات کو دوردرشن سے اردو خبریں بھی نشر کی جاتی ہیں مگر دس منٹ کی۔ یہ پروگرام ابھی تک سائنٹفک نہیں بنایا جاسکا اور نہ صحیح ہنر اس کے پیچھے کار فرما نظر آتا ہے۔ اور پھر دس منٹ میں تمام اہم خبروں کا احاطہ بھی نہیں ہوتا۔ ریڈیو پروگرام نسبتاً بہتر کہے جاسکتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس زمانے میں شہروں میں ریڈیائی نشریات سننے کی عادت لوگوں میں نہیں رہی۔ اسلئے کیسے بھی پروگرام ہوں انکی سماجی

اہمیت وافادیت پہلے جیسی نہیں رہ گئی ہے۔ کلکتہ دور درشن کیندر میں برسوں سے کوئی صحیح اور مستقل اردو پروڈیوسر موجود نہیں ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے!۔

خوش آئند تبدیلیاں اور نئے تقاضے

کلکتہ کے ادیب برسوں سے تحقیق وتنقید کی اصناف سے غافل تھے۔ لیکن اب وہ تنقید کے منصب سے آگاہ اور خود احتسابی کے عمل سے گزرنے کے لئے آمادہ نظر آنے لگے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کلکتے کی تخلیقی رفتار پہلے سے تیز ہوگئی ہے، اس لئے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تنقیدی شعور کند اور نکمتہ رہ جائے۔ ہمارے نئے شاعروں، افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نگاروں کی فنی اور علمی صلاحیتوں میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ کم کم وقفے سے تازہ کار تحقیقی، تنقیدی اور فنی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت اس کا ثبوت ہے۔ ہاں ان کوششوں کو تنظیمی نکھار لگانے کی دیر ہے۔ مثلاً ادبی سمینار، مذاکرات اور ورکشاپ ہمارے یہاں نہیں ہو رہے ہیں، وہ ہونا چاہئیں۔ لیکن یہ اکیلے کسی ادیب یا دو چار لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ان کاموں میں پورا پورا وقت اور دھیان دینا پڑتا ہے اور ان کیلئے فعال کارندے درکار ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ کار آمد اور نتیجہ خیز سمیناروں میں ماہرین کی موجودگی بلکہ انکی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسی تقریبات کا انعقاد اچھے اداروں اور وافر سرمائے کے بغیر ممکن نہیں۔

مغربی بنگال کا سیاسی نظام آزادی کے بعد سے ابتک کئی بار تبدیل ہوا اور اندازہ ہے کہ وہ پھر ایک نئی تبدیلی سے گزرنے والا ہے۔ اب جو ادب یہاں لکھا جارہا ہے اس میں ایک نیا تنوع اور کھلاپن ہے اور اس میں آئندہ تبدیلی کے اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ آئندہ برسوں میں کلکتے کے مقامی اردو ادب میں "لبرلزم" (Librerealism) کی ایک نئی ہوا چلے گی جو "غیر نظریاتی سیاست" کی دین ہوگی۔ اس موڑ پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ گرچہ کلکتے کا اردو ادب اپنی موجودہ شکل میں ملک کے مجموعی اردو دھارے میں بہہ رہا ہے لیکن اس کے اور بنگالی ادبیات کے بیچ ایک طویل فکری اور نظری فاصلہ بہر حال ہے جسے کم کرنے کے لئے اردو والوں کو ادب اطفال، ناول نویسی، ڈرامہ نگاری، طنز و مزاح، انشائیہ نگاری اور اپلائڈ (applied) فنون سے وابستہ نگارشات کی جانب خاص طور پر متوجہ ہونا چاہئے۔

صوبائی اردو اکیڈمی

کلکتہ میں ایک صوبائی اردو اکیڈمی بھی ہے۔ یہ ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور انہیں سالانہ انعامات دینے کا سرکاری ادارہ ہے۔ اس کا نظام پچھلے کئی سال سے بگڑا ہوا ہے۔ انعامات کی تقسیم منصفانہ طور پر نہیں ہورہی ہے۔ کئی موقعوں پر مستحق محروم کردئے جاتے ہیں اور غیر مستحقین کو نواز دیا جاتا ہے۔ جس سے فضائے ادب مکدر ہوتی نظر آرہی ہے۔ اکیڈمی کے انعامات کا پیمانہ کیا ہے کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ تاعمر (مراد پچھلے دس سال) خدمت اردو کرتے رہنے کے عوض جو انعام مقرر ہے وہ عموماً ایسے ادیب یا شاعر کو دیا جارہا ہے جو لکچرر یا پروفیسر رہا ہو چاہے اس نے صحیح معنوں میں ادب کی خدمت انجام دی ہو یا نہ دی ہو۔ ناقدین سراہیں گے کہ دو تین شعری مجموعے خلق کرنا اپنی جگہ ایک اہم بات سہی لیکن ان سے ادب میں کچھ ارتعاش بھی پیدا ہوا ہو یہ ایک دوسری بات ہے۔ دس سال ادب کی بنگالی اور دس سال ادب کی خدمت ایک سی باتیں نہیں ہوسکتیں؟ تدریسی خدمات کی بھی کوئی کسوٹی تو ہوتی ہے۔ کوئی "ادیب۔ مدرّس" سرسید اور ذاکر حسین کو آئیڈیل بنائے تو کیا کہنے۔ یوں تو طوطا رٹائی کی پکار بھی سرکار سے ٹیچروں کو ملتی ہے۔ البتہ صحیح خادمین اردو ادب محروم ہی رہ جاتے ہیں۔ چند سال قبل ایک ریٹائرڈ پروفیسر موصوف کو سب سے بڑے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ موصوف بزرگ، خلیق انسان اور شفاف شخصیت کے مالک ضرور تھے لیکن پچھلے تیس سالوں میں انھوں نے کوئی ادبی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ اتفاق سے ایوارڈ کا اعلان ہونے کے بعد وہ رحلت فرما گئے۔ افسوس کہ ایوارڈ اپنے ہاتھوں سے لینا ان کے مقدر میں نہیں تھا۔ سو، مغربی بنگال اردو اکیڈمی ایوارڈ دیتی ہے یا جنازوں کو کاندھا آجکل کچھ پتہ نہیں چلتا (شہرت تو ایوارڈوں کی ہی ہوتی ہے)۔ کہتے ہیں خدا جوانی کا حج زیادہ پسند فرماتا ہے لیکن ہماری اکیڈمی جوانی کی ادبی ریاضت قبول نہیں کرتی۔ سبحان اللہ!۔

اسی طرح کتابوں پر ظلم ڈھائے جارہے ہیں۔ ۹۷ء میں ایک کتاب "خوابوں کے اسرار" شائع ہوئی جو اردو میں اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب تھی۔ اس کا موضوع خواب، نیند اور ادب تھا۔ ناقدین نے کتاب کا اچھا استقبال کیا لیکن مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے ضابطے کے تحت اس کی ۵ جلدیں (جنکی قیمت ہزار روپئے تھی) جمع لینے کے بعد اسے مبلغ پانچ سو روپئے کے انعام سے نوازا۔ جبکہ ۸ سال کی سخت محنت سے کتاب تیار کی گئی اور کتاب کی اشاعت سے قبل جزوی طور پر اسکے چھ ابواب دہلی کے سرکاری ادبی رسالے میں قسط وار شائع ہوئے تو مصنف کو ان کا معاوضہ ۱۸۰۰ روپے ملا تھا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اسی سال (۹۷ء میں) اکیڈمی کی جانب سے تین ہزار روپے کا انعام ایک ایسی کتاب کو دیا

ڈاکٹر وفا راشدی کا حوالہ دینا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ادبیات کلکتہ کے سلسلے میں کچھ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ برسوں پہلے وہ کلکتہ سے ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) اور پھر کراچی (مغربی پاکستان) چلے گئے جہاں رہ کر انہوں نے سندھ اور دیگر موضوعات پر کئی خاص علمی کام انجام دئے لیکن کلکتہ ان کی یادوں اور تحریروں کا مستقل موضوع ہے۔

موجودہ زبان و ادب کا جائزہ

یہاں تک جو باتیں لکھی گئیں ان کا انشاء کے اس شمارے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ پچھلے بیس تیس سال سے برصغیر کے بہت سے اردو داں اپنے خاندانوں سمیت ہجرت کر کے برطانیہ، شمال مغربی یوروپ، اٹلی، جرمنی، امریکہ، کناڈا، مشرق وسطیٰ، افریقہ اور اب آسٹریلیا میں بھی جا بسے ہیں کلکتے کے بارے میں اردو کے تعلق سے انہیں کچھ خاص جانکاری نہیں ہے۔ اور جو ہے بھی تو بہت دھندلی سی۔ بہت سے تو صرف انشاء کی وجہ سے ہی کلکتے کو جانتے ہیں۔ انہیں پتہ نہیں کہ یہاں سے اردو کے پانچ روزنامے شائع ہوتے ہیں اور بنگالی وہندی کے بعد اردو یہاں کی پچیس فی صد آبادی کی زبان ہے۔ اگرچہ سرکاری زبان کے طور پر اسے ثانوی زبان کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن مستقبل میں ایسا ہونے کا امکان ہے۔ بشرطیکہ اہل اردو متحد اور منظم ہو کر اس کا مطالبہ کریں۔ اس لئے یہ ضروری معلوم ہوا کہ یہاں کلکتہ اور اردو کا تاریخی ذکر مختصر طور پر کر دیا جائے۔

اب کلکتے کے موجودہ ادبی ماحول، مسائل وامکانات، تخلیقی رویّوں اور ادیبوں کے طرز عمل کے بارے میں کچھ بے لاگ اور دو ٹوک باتیں کرتے ہیں۔ شہر کے حسی پس منظر میں یہ مطالعہ کم دلچسپ نہ ہوگا۔

کلکتہ کی عمر اس وقت ۳۱۰ سال ہے۔ نہ صرف یہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ بلکہ ۱۹۱۱ء تک برٹش انڈیا کا مرکز اقتدار ہونے کا فخر بھی اسے حاصل رہا ہے۔ اس شہر کا اپنا ماضی ہے جو صنعتی وتجارتی، ثقافتی اور سماجی تحریکات کے علاوہ مختلف فنون لطیفہ کی تابندہ یادوں سے معمور ہے۔ کلکتہ کے سوچنے کا اپنا انداز ہے۔ سیاسی بصیرت کے حوالے سے ایک عام رائے ہے کہ کلکتہ جس بات کو آج سوچتا ہے باقی ہندوستان اسے بیس برس بعد سوچنا شروع کرتا ہے۔

ادب زندگی کا آئینہ ہے اور کلکتہ کی زندگی زیادہ سے زیادہ تضادات سے پُر ہے اور متنوع بھی۔ یہاں رات دن تعیش وافلاس کے بے ساختہ مناظر ایک ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شہر غریب سے غریب کی کفالت کر سکتا ہے۔ جبکہ بے روزگاری بھی یہاں بہت زیادہ ہے۔ دوسری خاص بات یہ کہ کلکتہ دنیا کے انتہائی دور دراز مقام پر رونما ہونے والے کسی بھی سیاسی۔ انسانی معرکے سے خود کو الگ تھلگ نہیں رکھ پاتا۔ اگر امریکہ ویتنام یا عراق پر بمباری کرے تو چوبیس گھنٹوں کے اندر کلکتہ میں اس کے خلاف ہر جانب سے سڑکوں پر احتجاج شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے نہ صرف اس شہر کے حساس ہونے کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیاداری اور وضع انسانیت میں کس قسم کی دلچسپی رکھتا ہے۔ تاریخی طور پر اور مزاجاً بھی، کلکتہ رد عمل، جلوسوں اور ہڑتالوں کا شہر قرار دیا جاتا ہے۔ سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی نے ایکبار اس کی بگڑی ہوئی تعمیراتی صحت اور بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی کے پیش نظر اسے مردہ قرار دیدیا تو ان کے خلاف کلکتہ کے سیاستدانوں، دانشوروں اور فنکاروں نے سخت احتجاج کیا۔ جب سے ایک ناول پر مبنی کلکتہ کے پس منظر میں ایک انگریزی فلم "The City of Joy" بنی ہے کلکتے کو ادب میں "شہر مسرت" یا "شہر نشاط" کے نام سے یاد کیا جانے لگا ہے۔ حالانکہ اس فلم کے خلاف بھی شروع میں یہاں کچھ لوگ صف آرا ہوئے تھے۔ الزام تھا کہ اس کے ذریعہ کلکتے کی غریبی پر حملہ کیا گیا ہے۔

بنگال میں انسانی زندگی پے بہ پے عوامی تحریکوں سے متاثر ہوتی آئی ہے اس لئے یہاں کا عوامی مزاج امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کا نہیں ہے۔ بائیں طاقتوں کے عروج کی تاریخ واضح طور پر تیس بتیس سال پرانی ہے۔ اس میں نکسلائٹ تحریک بھی شامل ہے جو اپنی شدت اب تک زائل کر چکی ہے۔ پچھلے چوبیس سال بائیں سیاسی جماعتوں کے زیر حکمرانی رہنے کے سبب یہاں فرقہ وارانہ منافرت دوسرے صوبوں سے بہت کم رہی ہے۔ اس سے آپسی رواداری بڑھی اور کلچر پر خوشگوار اثر پڑا۔ لیکن اس کے باوجود اردو دانشوروں کی اکثریت بنگالی دانشوروں کی طرح آزاد فکر وذہن کی مالک نہیں رہ سکی۔ اور اس نے خود کو حکمراں پارٹیوں کا اطاعت گزار اور ان کے سیاسی مفاد کا محافظ بنائے رکھا جس سے بہتوں کی تخلیقی صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔ بالعموم وہ زندگی اور فطرت کی جمالیات کے قریب نہیں جا سکے اور ایک منہ بند گلی کے مسافر بن کر رہ گئے۔ ایک خواہ مخواہ کے جبر اور بزدلی کو اپنا شعار بنا بیٹھے۔ یہ بیڑیاں اپنے پاؤں میں انہوں نے خود پہنی تھیں۔

۸۶ - ۸۸ء میں کمیونسٹ روس میں پریسترائکا (prestroica) اور گلاسنوسٹ (glasnost) کے نام پر لوگوں کو کیمونزم کے اثر سے نکلنے کی ترغیب بلکہ دعوت دی جا رہی تھی لیکن کلکتہ کے اردو ادیب جن میں ایک بڑا حلقہ ٹیچروں اور سرکاری ملازموں کا ہے۔ اپنے لال

پیرِ مغاں کے ہاتھوں سرخ آگہی کے جام پیتے رہے۔ بنگالی ادیب و شاعر بھی یہ جام پیتے تھے لیکن ان کا تخلیقی طرزِ عمل جدا تھا۔ وہ عوامی ادب کے علاوہ حقیقت، جمالیات اور نیچر کے پرستار ہو کر ایسا ادب بھی تخلیق کرتے رہے ہیں جو آفاق میں گم ہو۔ جدید بنگالی شعر و ادب کے موضوعات اردو موضوعات سے اسی لئے مختلف اور زیادہ متنوع نظر آتے ہیں۔ اور ان کے یہاں عوامیت بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اردو والے عوامیت کو تخلیقی سانچے میں کامیابی سے نہیں ڈھال سکے۔

یہی بات ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں ہندوستان کی ترقی پسند ریاستوں میں بھی سیاسی وارداتوں کے اثرات کو کسی ایک عینک سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جب فرقہ پرستوں نے رام رتھ یاترائیں نکالیں، جب بابری مسجد شہید کر دی گئی یا جب سابق وزیرِ اعظم راجیو گاندھی کا قتل کر دیا گیا تو دیگر شہروں کی طرح کلکتہ میں حکمراں پارٹیوں کے لوگ بھی سڑکوں پر آکر چلائے لیکن یہ صرف اجتماعی آوازوں کا ایک کورس (chorus) تھا ان میں اردو ادیبوں کی ماتمی لے کم تھی۔ اب الگ سے دیکھئے کہ جب ایک مسجد گرادی جاتی ہے تو اس کا وہ مستقل دکھ ایک غیر مسلم کمیونسٹ کو نہیں ہو سکتا جو ایک مسلم کمیونسٹ کو ہوگا۔ اسی طرح حضرت بل (سری نگر) کا ملٹری محاصرہ یا جنگجوؤں کے ہاتھوں معصوم امرناتھ یاتریوں کے قتل کی واردات یا گولڈن ٹمپل (امرتسر) پر فوج کشی ہمارے اخلاقی اقدار اور رواداری اور سیاسی وابستگیوں کو پامال کر دیتی ہے۔ اور اسی لئے اقلیتی اور اکثریتی فرقے سے منسوب یا جڑے ہونے کے احساس سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ہے۔ لوگوں کو یاد ہوگا گولڈن ٹمپل پر اندرا گاندھی کے عہد میں فوج کشی اور پھر دلی میں ہندو سکھ فسادات کے خلاف آزاد قلم، روشن خیال ادیب سردار خشونت سنگھ نے کس طرح احتجاج کیا تھا اور اپنا سرکاری اعزاز پدم شری لوٹا دیا تھا۔ جب دکھ پہنچتا ہے، سب تنہا جزیرے ہو جاتے ہیں!۔ ایک معمولی بنگلہ دیشی ادیبہ تسلیمہ نسرین کو مغربی بنگال کے غیر اردو ترقی پسندوں نے کیسا سر چڑھا رکھا ہے جبکہ اس کے لٹریچر میں اگر کچھ بات ہے تو صرف یہ کہ وہ مسلم کلچر کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے۔ ان تمام وارداتوں پر کلکتہ کے اردو ادباء کے ذہنی ردِ عمل کا مطالعہ کریں تو اپنی سیاسی جماعت کے ساتھ ان کی وابستگی قابلِ تعریف نظر آتی ہے لیکن صحیح ترقی پسندانہ نظریے کے ساتھ کمٹ منٹ میں وہ نیل نظر آتے ہیں۔ دیگر زبان والوں نے اپنا اثاثۂ فکر و نظر کہیں کسی کے ہاتھ رہن نہیں رکھا۔ البتہ ادھر کچھ برسوں سے بنگال کے اردو ادیبوں میں ایک روشن خیالی آتی نظر آرہی ہے۔ یقیناً اب یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگنی چاہئے کہ تخلیقی محرکات کو ہر جبر سے آزاد رکھنا کتنا ضروری ہے۔ اور نظریاتی وابستگی بدلے ہوئے حالات میں کیا معنی رکھتی ہے۔

تمام تخلیقی عوامل و محرکات میں سماجی متعلقات کلکتہ کے نمائندہ عصری ادب میں بہت نمایاں ہیں۔ ہمارے کچھ ادیب ایسے بھی ہیں جو بعض مواقع پر اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر وضاحتی اسلوب اختیار نہیں کر سکے لیکن اپنے ضمیر کی آواز کو دبا بھی نہ سکے۔ ایسے میں انھوں نے تمثیل یا علامت نگاری کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس "شعوری" طرز کی پیراکی کا سہارا لے کر انہوں نے ادب کے وقتی دھارے میں بہنا چاہا۔ جہاں "غیر اشتراکی مرکزی طاقتوں" کے اقدامات اور پالیسیوں یا عالمی سامراجی قوتوں کے خلاف لکھنا ہوتا وہ ذرا جرأت اور وضاحت سے گفتگو کرتے اور جہاں مقامی امور کو موضوع بناتے وہاں گنجلک اور مبہم انداز اختیار کر لیتے۔ ان رویوں سے منافقت اور سطحیت کا جنم ہوتا ہے۔ چنانچہ پچھلے کئی برسوں میں کلکتہ کے کم ادبا مستقل فنکار بن پائے ہیں۔ لیکن جنھوں نے اپنے دل، دماغ اور آنکھوں کے دریچے کھلے رکھے انہوں نے معیاری ادب کے اکثر و بیشتر تقاضوں کو پورا کیا۔ ان میں سے بعض اب "یونیورسل" ادب کے بڑے دائرے میں ہیں۔ وہ تازہ دم اور پُر اعتماد ہیں۔ ان کے موضوعات ملک کے دیگر اردو فنکاروں سے مماثل ہیں۔ انھوں نے انقلابی حقیقت پسندی کے ساتھ رومانیت کو بھی جا بجا اپنی تحریروں میں سمویا ہے اور انہیں پُر اثر بنایا ہے۔

مدرّسین کی لِسانی غفلت

کلکتے میں اردو کی تہذیبی و لسانی نوعیت پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اردو ٹیچروں اور ادیبوں کی ایک تعداد ایسی بھی ہے جس نے مقامی اردو بولی کو شائستۂ آداب کرنے میں دانستہ اور شعوری دلچسپی نہیں لی۔ وہ ایک قسم کی لسانی بے خبری میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کے خ۔ ز۔ ش۔ ق۔، تذکیر و تانیث اور املا درست نہیں ہوتے۔ کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ جس شہر نے اردو نثر کو ضوابط و قواعد دئے وہاں کوئی ادیب و مدرس تنخواہ لے کر ایسی اردو پڑھائے جو گفتگو اور تحریر میں نقائص کی موجب ہو۔ ایک اچھے استاد یا مدیر سے پوچھئے کہ اسے کسی صحیح ادیب کا غلط مسودہ پڑھنے میں کیسی کوفت ہوتی ہے۔ اور کہاں کہاں نشان لگانا پڑتے ہیں۔ (غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ!)۔ اردو ایسی سبک زبان کہ ان اسقام اور لغزشوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بنگالی شاعر بنگالی زبان کے ساتھ بنگالی تہذیب کا بھی نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے جیسے دلی، اتر پردیش اور دکن کا اردو شاعر یہ

C. Abdul Hakeem College of Engineering & Technology

(MUSLIM MINORITY INSTITUTION)

MELVISHARAM - 632 509 (VELLORE DISTRICT)

PHONE : 04172-67387 / 68187

FAX : 04172-68387

(APPROVED BY AICTE & GOVT. OF TAMILNADU, AFFILIATED TO THE UNIVERSITY OF MADRAS)

ADMISSION 2000 - 2001

1. *Computer Science & Engineering*
2. *Electrical & Electronics Engineering &*
3. *Mechanical Engineering*

ELIGIBILITY : 60% AGGREGATE IN MATHS, PHYSICS & CHEMISTRY FOR +2 STUDENTS AND TAMIL NADU RULES FOR DIPLOMA STUDENTS. COST OF APPLICATION FORM IS RS. 250/- BY CASH OR RS. 275/- BY POST.

Hostel facilities available for both Boys & Girls

S. Ziauddeen Ahmed, B.A.
Chairman

V. M. Abdul Latheef, B.E.
Correspondent

Dr. D. I. Kannappan, B.E., M.Sc. (Engg.), Ph.D.,
Principal

کلکتہ، اردو اور "کلکتے کا عصری ادب نمبر"

کلکتہ اور اردو کے تعلق سے بات چیت کا ایک ایسا موقع ہاتھ آیا ہے کہ کچھ دور رس باتیں کی جاسکتی ہیں۔

پہلے کلکتہ اور تاریخِ ادبِ اردو کے تعلق سے کچھ گفتگو ہوگی۔ اس شمارے سے متعلق آخر میں کچھ گوش گزار کیا جائے گا۔

کلکتے میں اردو کا تاریخی پس منظر

فرنگی راج میں کلکتہ میں گورنر جنرل لارڈ ویلسلی کے دور اقتدار (۱۷۹۸ء۔ ۱۸۰۵ء) میں فورٹ ولیم کالج کا قیام ہوا۔ ہندوستان میں عام اردو نثر نگاری کی ابتدا اسی کالج کے قیام سے ہوئی۔ اس سے پیشتر صرف شاعری اردو زبان کی اصل پہچان اور سرمایہ تھی۔ شاعری کا فروغ دکن، دہلی اور لکھنؤ میں ہوا۔ لیکن کلکتے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اردو نثر کا ارتقا یہاں ہوا۔ اردو نثر کا داستانی دور اپنے وقت اور نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ ۱۸۰۰ء فورٹ ولیم کے قیام سے ۱۸۵۷ء کے غدر تک بنگال میں جو نثری ادب وجود میں آیا وہ داستانوں اور قصے کہانیوں پر مشتمل تھا۔ یہ ادب اردو میں ترجمے کے ذریعہ منتقل ہوا تھا، اصلاً اردو میں لکھا گیا ادب نہیں تھا۔

۱۸۰۰ تا ۱۸۲۰ء کے دوران کلکتہ میں ... مصنفوں نے پچاس کتابیں اردو میں تصنیف ... اور ترجمہ کیں اور فورٹ ولیم کالج سے باہر ... ہندوستان میں اتنی کتابیں اردو نثر میں شاید ... لکھی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ایسٹ ... کمپنی نے ۱۸۰۰ء میں رکھی اور ماہر لسانیات ڈاکٹر جان گل کرسٹ (۱۷۵۹ء۔۱۸۴۱ء) کو کالج کے ہندوستانی شعبے کا صدر منتخب کیا گیا۔ کالج اگرچہ ۱۸۵۴ء تک قائم رہا لیکن اسکی ادبی سرگرمیاں ۱۸۲۸ء میں ختم ہو چکی تھیں۔ کالج میں چھاپہ خانہ وجود میں آیا اور ۱۸۰۳ء ہی سے کلکتے میں اردو کتابیں چھپنا شروع ہو گئی تھیں۔ لکھنؤ، دہلی اور کان پور میں ۱۸۳۷ء سے قبل کسی اردو چھاپہ خانے کا سراغ نہیں ملتا۔

فورٹ ولیم کالج میں دہلی، لکھنؤ اور لاہور تک سے انشا پردازوں کو مدعو کیا گیا جن میں میر امّن دہلوی، میر بہادر علی حسینی، سید حیدر بخش حیدری، مرزا کاظم علی جواں، نہال چند لاہوری، للو لال جی، بینی نرائن، مظہر علی ولا، مرزا علی لطف وغیرہ شامل تھے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی سرپرستی میں ان انشا پردازوں اور نثر نگاروں نے جو کارنامے انجام دئے ان کے نتیجے میں اردو پہلی بار ایک علمی زبان بنی اور پہلی بار اسے ضابطہ اور قواعد سے آشنا کیا گیا۔ "چہار درویش"۔ "قصۂ حاتم طائی" اور "گل بکاؤلی" کے علاوہ مختلف تذکروں، تواریخ، فلسفۂ اسلام، قرآن، توراۃ، انجیل وغیرہ کے تراجم تکمیل کو پہنچائے گئے۔

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ کلکتے ہی سے پنڈت ہری ہر دت نے اردو کا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" ۱۸۲۲ء میں شائع کیا۔ اس طرح اردو صحافت کی بنیاد کلکتے میں ہی پڑی۔ (دنیا کا پہلا فارسی اخبار بھی، جو ہفت روزہ تھا اسی سال کلکتے سے ۱۲ اپریل کو چھپنا شروع ہوا۔ اس کا نام "مراۃ الاخبار" تھا اور اسے راجہ رام موہن رائے نے نکالا تھا)۔

کلکتہ میں ذکرِ اردو ہو اور سلطان واجد علی شاہ کا نام نہ آئے تو بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ واجد علی شاہ ماہ مئی ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے جلا وطن ہو کر مٹیا برج پہنچے جو کلکتے سے تین چار میل جنوب میں دریائے ہگلی کے کنارے آباد تھا۔ اور آج بھی آباد ہے۔ واجد علی شاہ کے ساتھ لکھنؤ کے کئی مستند شعرا اور مصاحبین بھی یہاں آئے اور انکی بدولت مٹیا برج لکھنوی تہذیب و ثقافت کے رنگ میں رنگ گیا۔ واجد علی شاہ خود شاعر تھے اور اختر تخلص فرماتے تھے۔ ان کی مثنویوں میں چوتھی مثنوی "حزنِ اختر" تاریخی اہمیت کی حامل ہے جو انہوں نے قلعۂ فورٹ ولیم میں دو سالہ نظر بندی کے دوران کہی تھی۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام بڑی دلچسپی اور استقلال سے انجام دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اردو اور فارسی نظم و نثر میں انکی کتابوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔

یہ تھی کلکتہ میں اردو کے ابتدائی سفر کی مختصر روداد۔ کلکتہ میں اردو ادب و صحافت کا دائرہ وسیع کرنے والوں میں یہ چند نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں: عبدالغفور نساخ، خان بہادر سید رضا علی وحشت، لطیف احمد اکبر آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، واصف بنارسی، اشک امرتسری، راحت آرا بیگم، پرویز شاہدی، جمیل مظہری۔ ان کے بعد بہت سے نام ہیں۔ ان میں سید حرمت الاکرام، جرم محمد آبادی، ابراہیم ہوش، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، جاوید نہال بھی ہیں۔ یہ سب مرحومین ہیں۔ زندوں کا ذکر یہاں نہیں ہے لیکن ایک محقق

نوٹ: یہ فہرست شرکاء کے ناموں کے (صرف) پہلے حروف کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے۔

امریکہ میں مقیم شاعر **صِفوَت [illegible] صِفوَت**

کی دو نہایت با معنی اور دیدہ زیب کتب

مثنوئ وقت   فکرِ فردا







کے بعد تیسری کتاب

مثنوئ رسول

بھی انشاء پبلی کیشنز کلکتہ سے حاصل کیجئے۔

اس کے علاوہ انگریزی شاعری کی کتاب

TIAMBIC

جس میں تخلیقِ کائنات کی کہانی ایک ہزار چوبیس اشعار میں بیان کی گئی ہے آپکی خدمت میں حاضر ہے۔

مثنوئ وقت کا ہندی ایڈیشن انشاء پبلی کیشنز کلکتہ سے شائع ہونے والا ہے

Insha Publications

25-B, Zakaria Street, Calcutta - 700 073

Ph : (91-33) 235-4616, 235-3107

Fax : (91-33) 235-3107

E-mail : safe@caltiger.com

کلکتے کا عصری ادب نمبر

ہندوستان کا ممتاز بین الاقوامی رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

خصوصی شمارہ

ستمبر/اکتوبر ۲۰۰۰ء

کلکتے کا عصری ادب نمبر

Calcuttey Ka Asri Adab Number

سابقہ خصوصی شمارے :

(۱) احمد سعید ملیح آبادی نمبر (۲) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نمبر
(۳) ادیبوں کی حیات معاشقہ (۴) قمر رئیس نمبر
(۵) انشاء عالمی اردو افسانے (۶) بابری مسجد نمبر (۷) صدی شمارہ
(۸) اسکینڈے نیویائی ادب نمبر (۹) نیاز فتحپوری نمبر (۱۰) دلیپ سنگھ نمبر
(۱۱) بخش لائلپوری نمبر (۱۲) انور شیخ: ادب و متاز عہ افکار۔

مکمل گرافکس : ثاقب فیروز — انشاء گرافکس

۲-اے، کنائی سیل اسٹریٹ، کلکتہ-۷۰۰۰۷۳ فون : ۲۳۵-۳۱۰۷ (۰۳۳)

ای میل : safe@caltiger.com

Mailing Address :
Mahnama Insha
Insha Publications
25-B, Zakaria Street, Calcutta - 700 073
Phone : 033-235-4616 ★ Fax : 033-235-3107
E-mail : safe@caltiger.com

ISSN : 0971 - 6009

جلد : ۱۵ ● شمارہ : ۱۰ - ۹

رہنما : احمد سعید ملیح آبادی
پروفیسر قمر رئیس

مدیر : ف۔ س۔ اعجاز

مشیران : محمد امیرالدین، افضل اقبال

اس شمارے کی قیمت :

ہندوستان میں : -/200 روپے

غیر ممالک میں : 15 £ یا US$ 25

زرسالانہ میں اس شمارے کی قیمت شامل نہیں۔

عام شمارے کی قیمت :

ہندوستان میں : -/20 روپے

سال میں چھ شمارے شائع ہوتے ہیں۔

سالانہ ممبری فیس:

ہندوستان میں : -/120 روپے

غیر ممالک میں : 15 £ یا

US $ 25

CARE :
Drafts / Cheques are accepted in favour of "M/s. Insha Publications"
(U.K. Subscribers are advised to send bearer B.P.O.)



Raja Ram Mohun Roy

Gurudeb Rabindra Nath Tagore

Imambara Hooghly, Clock Dial in Persian

Film Actor Guru Dutt in his film about Calcutta "Pyasa"

A Normal Traffic Scene

Queen Victoria's Statue in Victoria Memorial

Calcutta's Tercentenary Celeberation, 1989
An old tram car driven by horses.

…gger's street in Maldan

West Bengal's Chief Minister Mr. Jyoti Basuin horse drawn tram carriage on the Tercentenary Celeberation of Calcutta

سرورق پر کلکتے کے ماضی و حال کی چند جھلکیاں علامتی طور پر پیش کی گئی ہیں۔ دو انسانی چہروں کے کلوز اپ قابل توجہ ہیں۔ اوپر بائیں جانب عالمی شہرت یافتہ پاپ سنگر اوشا اتھپ ہے جنکی ساڑی پر بنگلہ زبان میں "کلکتہ کلکتہ" چھپا ہوا ہے اور ماتھے پر بنگلہ حرف "ক" (یعنی "ک" برائے کلکتہ) کی بندیا نمایاں ہے۔ چند برس قبل اسکے خلاف بایاں محاذ حکومت کے وزیر آنجہانی جتین چکرورتی (انتہا پسند سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر) نے کئی بار زبردست تحریک چلائی لیکن پھر بائیکاٹ ختم کر دیا گیا۔ اوشا اتھپ نے بہر حال مشرقی سنسکرتی اور کلکتہ کو ہمیشہ عزت دی ہے۔

دوسرا نمایاں چہرہ ذہین شاعر اور دانشور مرحوم مبین رشید کا ہے جو ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۰ء کو اچانک انتقال فرما گئے۔ "کلکتے کا عصری ادب نمبر" کے اعلان کا انہوں نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا تھا اور اس کا انہیں بے چینی سے انتظار تھا۔ افسوس وہ اسے دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے۔ دیگر تصاویر انقلاب، احتجاج، تحریک آزادئ نسواں، محرومی، اشتعال کا تاثر لئے ہوئے ہیں۔ رقص اور مورتی کی اوٹ سے جھلکتے ہوئے نسائی لب و رخسار مسحور کن شعری و افسانوی زاویے بنا رہے ہیں۔ اسٹیج اور نقاب ڈرامہ کی علامت ہیں۔ اوپر کھلی کتاب کے بازو میں ادیب نے ہاتھوں میں قلم … ۲۱ … نے سرنامہ "کلکتے کا عصری ادب نمبر" تحریر کیا ہے۔

NAURATANS
SAREE EMPORIUM



بنارسی
اور
پیور سلک

شاہانہ، زرق برق اور دلکش ساڑیوں کا مرکز

نورتنس ساڑی ایمپوریم

ایوریسٹ ہاؤس۔ ۴۶ سی، چورنگی روڈ (نزد برلا پلانیٹوریم) کلکتہ -۷۰۰۰۷۱ ● فون : ۲۸۸-۲۲۶۲

اِنشا

ISSN : 0971 - 6009

عید مبارک



شرکاء

نصر ملک۔ نعیمہ ضیاء الدین۔ سلطان جمیل نسیم۔
گلزار۔ طاہر نقوی۔ شمشاد ندیم۔ شائستہ سید ایمن۔
عطیہ خان۔ مختار احسن انصاری۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان۔
ملک زادہ منظور احمد۔ ایم آئی ساجد۔ شباب للت۔
مامون ایمن۔ ف۔ س۔ اعجاز و دیگر۔

-/20

ISSN : 0971-6009





NAURATANS
SAREE EMPORIUM

بنارسی
اور
پیور سلک

شاہانہ، زرق برق اور دلکش ساڑیوں کا مرکز

نورتنس ساڑی ایـ پ ریم

ایوریسٹ ہاؤس۔ ۴۶ سی، چورنگی روڈ (نزد برلا پلانیٹوریم) کلکتہ -۷۰۰۰۷۱ ● فون : ۲۸۸-۲۲۶۲

نفیس
اور
خوشنما
ڈیزائنوں
میں

MADE IN MADRAS

NAKHUDA

MADRAS HANDLOOM

PAHAR CHAND & COMPANY
58, LOWER CHITPUR ROAD
CALCUTTA – 700 073

پختہ دھاگوں
سے بنی
پکّے رنگوں
والی

TRADE MARK
MADE IN MADRAS

TARANA
BRAND
तराना

HANDLOOM TEXTILES

PAHARCHAND & COMPANY
98 RABINDRA SARANI
CALCUTTA-700 073

کافی
دنوں
تک
چلنے والی
لُنگیاں

911 ۹۱۱
Madras Handloom
911
TRADE MARK MADE IN MADRAS

PAHAR CHAND & COMPANY
58, LOWER CHITPUR ROAD
CALCUTTA – 700 073

پہاڑ چند اینڈ کمپنی
مینوفیکچرر اور ہینڈلوم سوتی لنگیوں
اور شرٹنگ کپڑوں کے ایکسپورٹر
۹۸۔ رابندر سرانی۔ کلکتہ۔۷۳

Pahar Chand & Co.
Manufacturers & Exporters of
HANDLOOM COTTON LUNGIES & SHIRTING
98, RABINDRA SARANI,
CALCUTTA - 700 073 (INDIA)
Tel 215 9461 Fax : 091-033-300666
Cable LUNGIKING

انشاء

ہندوستان کا ممتاز بین الاقوامی اردو رسالہ

ISSN : 0971 - 6009

جلد: ۱۵ | نومبر دسمبر ۲۰۰۰ء | شمارہ: ۱۲-۱۱

فہرست

مدیر: ف۔ س۔ اعجاز

اس شمارے کی قیمت : ۲۰ روپے

زر سالانہ : ۱۲۰ روپے

مغربی ممالک سے : £ 15

or

US $ 25

INSTRUCTIONS FOR PAYMENT

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات روانہ کی جائیں۔

امریکہ سے انٹرنیشنل منی آرڈر روانہ کئے جائیں جو کلکتہ میں امریکن ایکسپریس بنک سے نقد واجب الادا ہوں۔

گرافکس : ثاقب فیروز
انشاء گرافکس

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

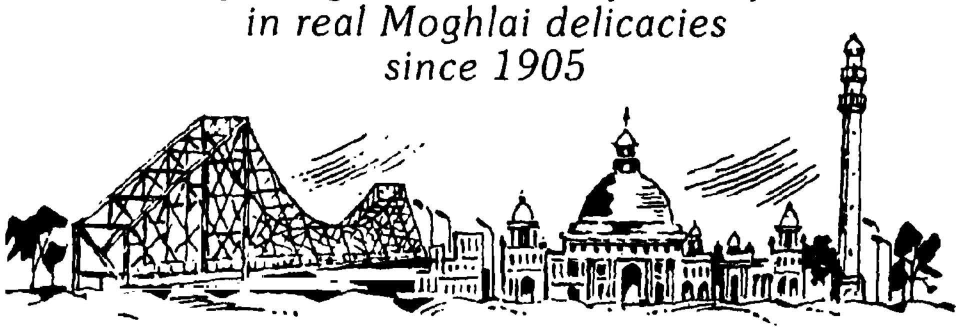
خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ:
۲۵۔ بی، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳۔ فون: ۲۳۵-۳۶۱۶

Fax : (91 33) 232-0104 Attn. "MAHNAMA INSHA" • E-mail : safe@caltiger.com
Website : http://www.astroatlas.com/inshapublications

RIH

KING
of the
KITCHENS

A name that has been
spelling unrivalled superiority
in real Moghlai delicacies
since 1905



Royal Indian Hotel

147, Rabindra Sarani, Calcutta - 700073
Telephone : 238-1073

اٹل بیانات

کچھ دن پہلے بی جے پی کے مہان نیتا، دیش کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کا آپریشن کے ذریعہ ایک گھٹنا تبدیل کیا گیا لیکن پاؤ کی جراحت دل بھی بدل ڈالے گی، بھلے لوگوں کو یہ گمان نہ تھا۔

۶ر دسمبر کو بابری مسجد کے آٹھویں یوم شہادت پر واجپئی نے رام جنم بھومی بابری مسجد احتجاج کو قومی جذبات کے اظہار سے تعبیر کرتے ہوئے اسے قومی تحریک قرار دیا۔ انھوں نے واضح لفظوں میں کہاکہ مندر کی تعمیر کابی جے پی کاایجنڈا تشنۂ تکمیل رہ گیا ہے۔ اب اس پر عمل کیا جائے گا اور مسجد کی جگہ مندر تعمیر کیا جائے گا۔

کچھ مہینوں سے بھارتیہ جنتا پارٹی نے بابری مسجد کے معاملے کو معلقاً سرد خانے میں ڈال رکھا تھا۔ حال میں پارٹی کے صدر بنگارو لکشمن نے مسلمانوں کے ساتھ مفاہمانہ رویہ اختیار کرنے کی حکمت عملی کا کئی بار اعلان کیا۔ بی جے پی نے اپنی شریکِ اقتدار پارٹیوں کے ساتھ جو مشترکہ ایجنڈا بنا رکھا ہے اس پر کاربند رہنا دراصل اس کی مجبوری ہے لیکن یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ اسکی حلیف تیلگو دیشم پارٹی، ترنمول کانگریس وغیرہ اقتدار کی ہوس میں اس کی ہر ناجائز بات اور غلط اقدام کی تائید کرنے پر ہر وقت آمادہ ہیں۔ ''سیکولرزم'' ہندوستان کا سب سے بے آبرو لفظ ہے اور کون پارٹی ہے جس نے سیکولرزم کی عزت نہیں اتاری۔ آزادی کے ۵۲ سال بعد ایک سیاسی کشاکش سے نکتہ یہ برآمد کیا گیا کہ مندر اور مسجد کا تنازعہ اصل قومی تحریک تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر آزادی کی تحریک کیا تھی؟

واجپئی کا اٹل فیصلہ ہے کہ مسجد جہاں تھی وہاں مندر بنایا جائے گا۔ دراصل انھیں ڈر ہے کہ عنقریب اسمبلی انتخابات میں انکی پارٹی سے ہندو ووٹرس چھن جائیں گے۔ اس لئے ایکبار پوری طرح ماحول کو گرم کر دینا چاہئے۔ اس کوشش میں انھوں نے اپنی اوقات اور اصلیت جتادی ہے۔ اور بہانگ دہل اپنے اکلوتے مسلم وزیر شاہنواز حسین کی افطار پارٹی میں مسجد کی جگہ مندر بنانے کے عزم کا اعادہ کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ وہ مندر بنانے کے دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ مسجد گرائے جانے کا انھیں افسوس ہے لیکن اب مسلمان چاہیں تو عدالت سے الگ ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ کرلیں اور اپنی مسجد پانچ چھ کیلو میٹر کے فاصلے پر بنالیں۔

بی جے پی کا شیوہ رہا ہے کہ جب کبھی اس کے حالات بگڑتے ہیں اور سیاسی خسارہ درپیش ہوتا ہے وہ ہندو کارڈ کی ترپ استعمال کرتی ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ واجپئی کا کردار بھی دیگر زعفرانی لیڈروں سے الگ نہیں نکلا۔ انھوں نے ایک معتدل، بردبار، قوم پرور لیڈر، عظیم پارلیمنٹیرین اور قرینے کے شاعر کی جو امیج بنار کھی تھی وہ اب میلی ہو گئی ہے۔ ان کا اصل چہرہ آر ایس ایس کے سویم سیوک کا ہے۔ اور وہ جب چاہیں اپنا رنگ بدل سکتے ہیں۔ ایسے لیڈروں کو افطار پارٹی میں مدعو کرنا روزے کی توہین ہے۔ لال کرشن ایڈوانی، مرلی منوہر جوشی اور اوما بھارتی بابری مسجد کے چارج شیٹ لگے ملزم ہیں اور قانوناً انھیں اپنے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دینا چاہئے لیکن یہ پوری ڈھٹائی سے ابھی تک اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں اور وزیر اعظم کو ان سے استعفیٰ لینا نہیں ہے۔ وہ ان تینوں کو مجرم نہیں بلکہ قومی تحریک کے ہیرو ہیروئن مانتے ہیں۔ حالانکہ جب مسجد گری تو واجپئی جی نے اس مذموم فعل سے اپنی بیگانگی اور مسجد گرائے جانے پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اب ان کا مذکورہ بیان کچھ اور ہی ثابت کر رہا ہے۔ آج تک کسی وزیر اعظم نے اپنے عہدے پر رہتے ہوئے ایسا گمراہ کن سیاسی بیان نہیں دیا۔ ان کے اس بیان سے یہ تو طے ہو ہی گیا کہ مسجد کے مدعیان یعنی مسلمان اُن کے نظریۂ قومی تحریک کی رو سے ولین ہیں۔ آئندہ ماہ الہ آباد میں کمبھ میلے کے وقت منعقد ہونے والے وشو ہندو پریشد کے ''دھرم سنسد'' سے پہلے بی جے پی نیتا کا یہ بیان خاص معنی رکھتا ہے۔ اب وہ اپنی قومی تحریک کو تیز کریں گے۔ آر ایس ایس کے صدر کے۔ ایس۔ سدرشن نے فرمایا ہے کہ ان بیانات نے ثابت کر دیا ہے کہ محاذی سیاست کرنے کے باوجود اٹل بہاری واجپئی کا دل اپنے صحیح مقام پر ہے۔ بیشک واجپئی کا دل اپنے صحیح ٹھکانے پر ہے۔ کبھی کبھی دل کو تنہا چھوڑنے کی بات اور ہے۔ ورنہ وہ ایک مرد دانا ہیں اور عقل کی پاسبانی میں ڈھکے چھپے وہی کام کرتے رہے ہیں جو انھیں کرنا تھے۔ ان کے دو بیمار گھٹنوں میں سے ایک بفضلِ خدا درست ہو گیا ہے (دوسرا بھی اللہ کرے ٹھیک ہو جائے)۔ اتنے پر ہی انھوں نے دیش کی تاریخ کے گھٹنے توڑنے کا بیڑہ اٹھالیا ہے۔

ایک طرف ماہِ رمضان کے احترام میں واجپئی نے کشمیر میں جنگ بندی کا اعلان کر کے اپنے خیر سگالانہ تدبّر کی کمائی میں اضافہ کیا ہے تو دوسری طرف اپنی ہی قوم کے اندر اسی رمضان کے مہینے میں شر کے بیج بو دیئے ہیں۔ اقلیتوں کو چاہئے کہ وہ بھی ایسے ہی دو ٹوک اور سیدھے فیصلے کیا کریں۔ فساد پیدا کرنے والے سانپ کے منہ کی کھجور بننے سے بہتر ہے کہ اُس کے گلے کی چھچھوندر بن جاؤ۔ واجپئی کا یہ بیان اتحاد شکن ہے۔ اسکی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ ملک کے عوام کو مندر مسجد میں ایسی دلچسپی نہیں ہے جیسی بی جے پی اینڈ کمپنی کو ہے۔ ڈر ہے یہ بیان کسی غیر قومی تحریک کا جنم داتا ثابت ہو گا۔

فون سیکس

پچھلے دنوں تیلگو دیشم پارٹی کے ایک ممبر پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ میں فون سیکس پر بحث چھیڑی کہ ہندوستان کے سبھی بڑے اخبارات آجکل ٹیلیفون سیکس یعنی فون پر جنسی چٹخاروں والی بات چیت کے اشتہارات چھاپ رہے ہیں جس سے نوجوانوں اور بچوں کا اخلاق بگڑتا جارہا ہے۔

پارلیمنٹ میں اس سوال کو اٹھنا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ اس فون کی سہولت مہانگر ٹیلی فون نِگم لمیٹڈ کی طرف سے دی جاتی ہے جو سرکار کے قبضے میں ہے۔ اس لحاظ سے حکومت کو فحاشی کا مجرم قرار دیا جانا چاہئے۔ پارلیمانی امور کے وزیر پرمود مہاجن نے بھی اسے جرم قرار دیا ہے اور سبھی سیاسی پارٹیوں نے فون سیکس پر پابندی عائد کرنے کی تجویز کی حمایت کی ہے۔

ہندوستان کے بڑے اخبارات مالی منفعت کی خاطر جنسی بکواس کے اشتہارات چھاپ کر خراب کام کر رہے ہیں جس سے وہ خود واقف ہیں۔ کسی شریف عورت کو جب رانگ نمبر ملا کر کوئی بدقماش گندی باتیں کہتا ہے اور ملنے ملانے پر اکساتا ہے تو اس عورت کا ذہن کتنا پریشان ہوتا ہے کوئی اس کا اندازہ کرے۔ ایسے گمنام فون سے شریف گھرانے کے لوگ بری طرح اپ سیٹ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ پولیس کیس بنتا ہے۔ خوش نصیبی سے ایسے جرم کا ارتکاب روکنے کے لئے call identifier ایجاد ہو چکا ہے۔ پھر ایک شریف سوسائٹی میں حکومت کے زیر نگرانی ایسے ٹیلیفونی بندوبست کی کیا گنجائش ہے جس کی مشتہری جنسی اختلاط کے ہیجان انگیز پوز کے ساتھ اخباروں میں کی جاتی ہو۔ کچی عمر اور اوباش قسم کے لڑکے لڑکیوں کے اس برائی میں ملوث ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اس آوارہ گفتگو کی قیمت ایک روپیہ بیس پیسے فی دو سکنڈ ہوتی ہے۔ ایک ایم پی نے اقرار کیا ہے کہ جب وہ گھر پر نہیں ہوتا، اس کے بچے ان نمبروں کو ڈائل کرتے ہیں اور چھیڑ خوباں اور فلمی گپ شپ کے نام پر زبانی (oral) تلذذ کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک کانگریسی ممبر پارلیمنٹ نے اسے بجا طور پر گھریلو طوائفیت (Home prostitution) کا نام دیا ہے۔ جب ملک قانون ساز ادارے کے ممبران اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعلِ قبیح گھریلو طوائفیت ہے تو پھر اس کا روک کیوں نہیں کرتے۔ لطف کی بات ہے کہ ایک کانگریسی ایم پی نے پارلیمنٹ میں انکشاف کیا ہے کہ کچھ ممبران پارلیمنٹ بھی یہ فون نمبر استعمال کرتے ہیں۔ سابق وزیر اعظم چندر شیکھر کا بیان ہے کہ پارلیمانی کاغذات کے ذریعہ ایسے فون نمبر گشت کر رہے ہیں۔ بہر حال کئی ممبران نے وزیر مواصلات پر دباؤ ڈالا ہے کہ وہ ان آوارہ ٹیلی فونی سہولتوں کو فی الفور ختم کرائیں۔ ایسے فون نمبروں سے لائن کاٹنے کا تکنیکی بندوبست فوراً کرنا چاہئے۔ اور مخرب اخلاق اشتہارات دینے اور چھاپنے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی ضروری ہے۔ ابتک تو کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کے اشتہارات ہی چھپا کرتے تھے اب نوجوانی زائل کرنے کا اشتہار بھی چھپنے لگا ہے۔ انٹرنیٹ پر ایسی خرافات پہلے ہی مہیا ہیں۔ اس برائی کو ابھی نہ روکا گیا تو عنقریب peepshow جیسے جنسی تماشے بھی انڈیا میں شروع کر دیے جائیں گے اور ان کے اشتہارات بھی اخباروں میں آنے لگیں گے۔ ہندوستانی کلچر گھر کا رہ جائے گا نہ گھاٹ کا۔

صفوت علی صفوت (امریکہ)

کی منفرد انداز کتاب **"مثنویٔ وقت"**

کا ہندی ایڈیشن انشاء پبلی کیشنز سے شائع ہونے والا ہے۔

مصنف کی دیگر کتب:

- فکرِ فردا (مضامین)
- TIAMBIC (تخلیقِ کائنات کی کہانی ۱۰۲۴ اشعار میں بہ زبان انگریزی)



کلکتے کا عصری ادب نمبر

پچھلا شمارہ ''کلکتے کا عصری ادب نمبر'' مطابق ستمبر اکتوبر ۲۰۰۰ء انشاء کی پندرھویں سالگرہ پر اہتمام سے شائع ہوا۔ یہ انشاء کا تیرھواں خصوصی نمبر ہے۔ اسکی قیمت اندرون ملک ۲۰۰ روپے اور بیرون ملک 25 US$ / £15 ہے اور یہ زر سالانہ سے الگ ہے۔ جن مستقل ممبروں نے آرڈر دیا انہیں خاص نمبر روانہ کیا جاچکا ہے۔ جنھیں مطلوب ہو اب آرڈر دے کر منگوالیں۔ قیمت منی آرڈر سے یا بینک ڈرافٹ سے بنام "Insha Publication" روانہ فرمائیں۔ شمارہ رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کر دیا جائے گا۔ اب اس کا اسٹاک کم رہ گیا ہے۔ اس لئے تاخیر نہ کریں۔

''کلکتے کا عصری ادب نمبر'' کا ناقدین نے پرجوش استقبال کیا ہے۔ یہ تاریخی دستاویز صوری اور معنوی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اس میں تخلیقات کا انتخاب سختی سے کیا گیا ہے۔ شاعری، افسانوں، ڈراموں اور مضامین کا تنوع قابل داد ہے۔ کلکتے کے ۶۹ قلمکاروں کے لئے ۶۹ گوشے قائم کئے گئے ہیں جنھیں پڑھکر کلکتے کے ادبی مقام و مرتبہ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ ہر قلمکار کے مختصر سوانحی کوائف مع تصویر شامل کئے گئے ہیں۔ اس شمارے نے اردو صحافت کو ایک نیا رجحان دیا ہے اور کلکتے کے ادب و صحافت کو نئی بلندی عطا کی ہے۔

''کلکتے کا عصری ادب نمبر'' کے شرکاء کے لئے ایس۔ ایچ۔ ممتاز الدین کے جاری کردہ انشاء ایوارڈز



مدیر کے علاوہ ۶۸ قلمکاروں نے اس نمبر میں شرکت کی ہے اور ان سربلند شرکاء کیلئے کلکتے کی موقر ونامور گھڑی کمپنی مسرز ایس۔ ایچ۔ ممتاز الدین نے انشاء ایوارڈز کا اجراء فرمایا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک "10x15" سائز کا لیمنیٹڈ بورڈ ہے جس پر انشاء کے تیرہ خاص نمبروں کے ٹائیٹلوں کے عکس دیکھے جاسکتے ہیں۔ ساتھ ہی ہر قلمکار کے نام لکھی ہوئی یادگار سندِ اعزاز اور کوارٹز گھڑی سے اسے مزین کیا گیا ہے۔

ہم اس ایوارڈ کے اجراء کے لئے مسرز ایس۔ ایچ۔ ممتاز الدین بالخصوص اس کے قائد جناب فیروز الدین صاحب کے ممنون ہیں اور تمام ایوارڈ یافتگان کی جانب سے ان کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ خاص نمبر اور ان ایوارڈوں نے کلکتے کے ادیبوں میں مسرت، اعتماد اور امنگ کی لہر دوڑادی ہے۔ ہم ان ۶۸ قلمکاروں کے بھی بیحد ممنون ہیں کہ انھوں نے فراخدلی سے اس شمارے کی پذیرائی کی۔ آئندہ بھی ہم ان ادباء و شعراء کی خدمت کرتے رہیں گے۔

ف۔س۔اعجاز

دعا پارے

(۱)

یا خدا یا خدا
خشک آنکھوں سے میری یہ سیلاب کب
کیسے جاری ہوا

میں ہوں بے آسرا
ناخدا ناؤ میری لگی ڈوبنے
تُو بچا تُو بچا

میری بگڑی بنا
تو نہ چاہے تو بندے کی چلتی نہیں
تو ہے مشکل کشا

کوئی رستہ سجھا
عقل گم ہے، نظر دیکھتی کچھ نہیں
تو ہی پردہ اٹھا

ربّہٖ جود و سخا
کوئی ہمدم نہیں کوئی مونس نہیں
ایک تیرے سوا

زخم دل کا ہرا
اِک پر اِک وار دنیا کا کب تک سہوں
بھر دے گھاؤ مرا

ہائے مکر و ریا
لوگ آنکھوں سے سرمہ چرا لیتے ہیں
وقت کی ہے ادا!

خوب ہے یہ صلہ!
ٹوٹ کر میرے ماتھے سے موتی گرے
جب پسینہ بہا

ماہِ نو کی عطا
فاقہ مستی ہی روزہ کشا بن گئی
جشن ہے عید کا

ایک سجدہ ادا
آستانے پہ تیرے گنہگار کا
سر ہے کب سے جھکا

ہو جو تیری رضا
ہاتھ آئیں مسرت کے دو چار دن
اور مانگا ہی کیا

میں نے کیا لکھ دیا؟
روح کی سرخوشی ایک پھیکی ہنسی
اپنا ہی مرثیہ!؟

سلسلہ! سلسلہ!!
جانے کب ختم ہو، جانے کب تک چلے
درد کا قافلہ

اس قدر مت جگا
خواب کیا ہیں کہ اب شائبہ تک نہیں
آنکھ میں نیند کا

کچھ تو ڈھارس بندھا
ایک کمزور اور ناتواں آدمی
میرا غم ہے بڑا

(۲)

دل سے اٹھی دعا
لب پہ عاصی کے بے ساختہ آگیا
نامِ خیرالوریٰ

نورِ صلّیِ علیٰ
اک کرن قلب میں جھلملانے لگی
اک اجالا ہوا

حوصلہ ہی نہ تھا
لب پہ جب تک نہ آیا تھا ذکرِ نبی
جی میں تھا وسوسہ



اسماعیل پرواز
۲۴۲، بلیلیس روڈ، ہوڑہ

آئی ہے عیدِ سعید

لیکے انعام خدائے برتر
آشتی امن و محبت کا گہر
آئی ہے عیدِ سعید
اپنے حلقے میں مسرت لے کر
فرحت و کیف کی دولت لے کر
آئی ہے عیدِ سعید
چہرۂ شوقِ عبادت نکھرا
روزہ داروں کا مقدر چمکا
آئی ہے عیدِ سعید
ہنس کے ملتے ہیں گلے یار و عدو
پیار ہی پیار کا عالم ہر سو
آئی ہے عیدِ سعید
بندگی کتنی سرافراز ہے آج
کتنی شاداں جبینِ ناز ہے آج
آئی ہے عیدِ سعید
مرحبا، مرحبا کہئے پرواز
سب سے دل کھول کے ملئے پرواز
آئی ہے عیدِ سعید

نعتیہ ہائیکو

شبنم سنبھلی
Khateeb Jama Masjid P.O REN
Dist. Nagaur - Rajasthan 341514

ہو صبح یا شام
دل میں تیری یاد بسی ہے
لب پر تیرا نام

دو عالم کے مختار
دائی حلیمہ تم پر واری
تم کو ماں سے پیار

شکل بشر ہو نور
رحمتِ حق، تم بن کر آئے
دل کا چین و سرور

بچپن ہے کیا خوب
شمس و قمر سے کھیلا کیا ہے
وہ رب کا محبوب

جگ کا پالنہار
رات اور دن رحمت کی نبی پر
ہے کرتا بوچھار

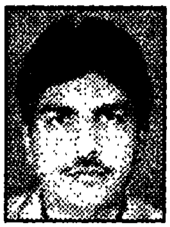
حضرت موسیٰ طور
رب کا تم نے لامکاں میں
جلوہ دیکھا حضور

جنت کے حقدار
صدیق و عمر، عثمان و علی ہیں
دوست نبی کے چار

دل پر چھایا نور
عشق میں تیرے ہوگئے سب غم
شاہِ بطحا دور

شہرِ مدینہ دور
جانے کو دل کرتا ہے پر
شبنم ہے مجبور

عید کے ماہیئے



شمیم انجم وارثی
ایم ڈی روڈ۔ گاردلیا۔
اتر ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

یوں عید منائیں گے
ایک تری جیسی
تصویر بنائیں گے

•

تب عید مری ہوگی
تن پہ یتیموں کے
پوشاک نئی ہوگی

•

یوں عید منا بھائی
دشمنِ جانی کو
سینے سے لگا بھائی

•

کیا عید چلی آئی
بوڑھے جواں سب کے
ہونٹوں پہ ہنسی آئی

•

اے عید تو جب آنا
روٹھے ہوئے پی کو
ہمراہ لئے آنا

•

عید آئی قرینے سے
لگ جا شمیم انجم
محبوب کے سینے سے

•

رمضان: عبدیت کی تربیت کا مہینہ

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

رمضان المبارک کی عبادات (روزہ، تلاوت، ذکر اللہ، نماز و نوافل، خیر خیرات، محتاجوں کی امداد، ضرورت مندوں کی خدمت کے اعمال صالحہ) کا اجر و ثواب عام دنوں کے مقابلے میں دس گنا سے ستر گنا تک پہنچا کر عبدیت کی تربیت کی جاتی اور اسے تقویت دی جاتی ہے۔ ایک صوفی شاعر کہتا ہے:

کیا کرم ساقی کا ہے ہر ایک مستانے کے ساتھ
اک صراحی بھی ملا کرتی ہے پیمانے کے ساتھ

خواہشاتِ نفس، بھوک پیاس اور فعل زوجیت پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس طرح پہلا عشرہ (ترقی کی پہلی منزل) رحمت کے لیے، دوسرا عشرہ (دوسری منزل) مغفرت کے لیے اور تیسرا عشرہ (آخری منزل) نجات کے لیے خاص کیا گیا۔

جب دو منزلوں سے گزر کر تکمیل و ترقی کی آخری منزل آتی ہے تو شبِ قدر میں نورِ حق آسمانِ دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے۔ شب اسراء میں عبدِ خاص کا عروج کامل تھا، وہاں نورِ حق کے نزول کا سوال نہیں تھا۔ لیکن بندۂ مومن کا عروج محدود ہے اس لئے نورِ حق کی آسمانِ دنیا پر جلوہ فرمائی ہوئی۔ اب جس بندۂ مومن و متقی کی روح کا آئینہ جس قدر صاف و شفاف ہوتا ہے وہ اسی قدر نورِ حق اور جلوۂ حقیقت کو اپنے اندر سمولیتا ہے۔ شبِ قدر توبہ و استغفار اور آہ و بکا کی خاص رات ہے اور توبہ ذاتِ حق کو بہت زیادہ پسند ہے۔

اسی کردار کے سبب وہ غنی کریم آقا، اپنے بندوں کی حاجت روائی کا اعلان کرتا ہے اور ان کے دل پر سکینہ نازل فرماتا ہے۔

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

علامہ اقبال نے بڑے نکتے کی بات کہی ہے۔

رسول پاکؐ نے جن باتوں کو روزے کے لیے نقصان دہ فرمایا وہ تمام باتیں عبدیت اور تواضع کے خلاف ہیں اور ان سے انسانی حقوق پر برا اثر پڑتا ہے آپ نے جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے کو خاص طور پر روزے کے حق میں ہلاک قرار دیا، ماں باپ کے نافرمان، حکومت کے ظالم اہل کار، سود خوار اور بندگانِ الٰہی کے سماجی حقوق ضائع کرنے والوں کیلئے شب قدر کی بشارت سے محرومی کا اعلان فرمایا۔ اس مہینے کی عبادات اہل ایمان کے اندر جن صفات کا پختہ رنگ پیدا کرتی ہیں وہ رسولِ رحمت کے ان دو ارشادات میں پیش کی گئی ہیں:

(۱) حضرت ابن عباسؓ نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا: "وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں جس کا پڑوسی بھوکا رہے اور وہ پیٹ بھر کر کھانا کھائے"۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں: "ایک شخص نے حضورؐ سے پوچھا فلاں شخص روزہ نماز اور صدقہ و خیرات میں بڑی شہرت رکھتا ہے مگر وہ اپنی زبان درازی سے پڑوسی کو تکلیف پہنچاتا ہے آپ نے فرمایا: "وہ جہنم میں جائے گا"۔ پھر اس سائل نے پوچھا: حضور! فلاں شخص نماز روزے کی ادائیگی میں بہت کوتاہی کرتا ہے مگر اپنے پڑوسی کو اپنی زبان زوری سے تکلیف نہیں پہنچاتا۔ آپ نے فرمایا وہ جنت میں جائیگا"۔ (مشکوٰۃ: ۴۲۴)

روزے کی اصلی غرض

مفتی عزیز الرحمٰن

احقر کہتا ہے، حدیث شریف میں ہے:

كَم مِن صَائمٍ لَيسَ لَهُ مِن صِيَامِهِ إلاّ الظَّمَأ و كَمْ مِن قائمٍ لَيسَ لَهُ مِن قِيَامِهِ إلاّ السَّهَر.

(بہت سے روزے دار ہیں کہ ان کے روزے سے سوائے تشنگی کے کچھ حاصل نہ ہوا اور بہت سے تہجد گزار اور شب بیدار ہیں کہ ان کی شب بیداری سے سوائے جاگنے کے کچھ حاصل نہیں)

غرض یہ ہے کہ روزہ اور شب بیداری سے جو اصلی غرض ہے (ثواب کا حاصل ہونا اور حق تعالیٰ کی رضا) جب وہ غرض حاصل نہ ہوئی تو سوائے بھوکا پیاسا رہنے اور بیداری کی مشقت اُٹھانے کے کچھ حاصل نہ ہوا۔

دوسری حدیث میں ہے:

مَن لَم يَدَع قَولَ الزُّورِ والعَمَلَ بِه فَلَيسَ لِلّٰه حَاجَةٌ في أن يَدَعَ طَعَامَهُ وشَرَابَه . (رواه البخاری)

(جو شخص روزے میں جھوٹ بولنا، اور بُرے اعمال کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں)

حق تعالیٰ فرماتا ہے:

"لَعَلَّكم تتقُونَ ايّاماً معدُودَاتٍ"

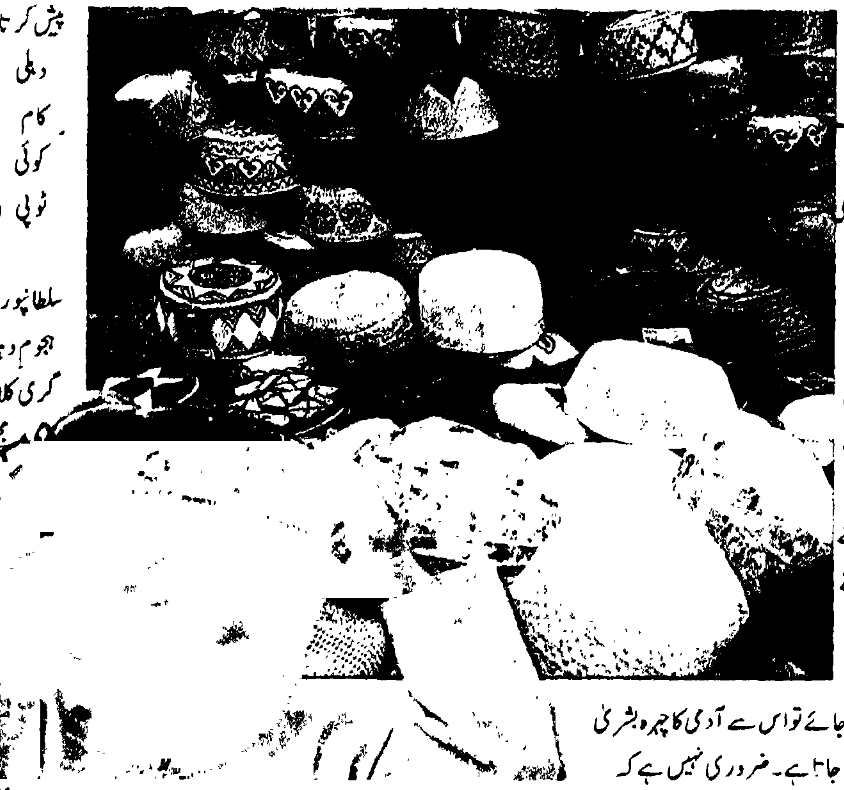
("تاکہ تم روزے کی وجہ سے گناہوں سے بچو چند روز"۔۔ یا "شاید تم پرہیزگار ہو جاؤ، چند دن ہیں گنتی کے)

کوشش کرنی چاہیے کہ اس ماہِ مبارک کی رضا حاصل ہو، اور روزے کا حق ادا ہو جائے، منقول ہے کہ ایک بزرگ نے اس ماہِ مبارک کو ایک پارسا مرد کی صورت میں دیکھا تو دریافت کیا: تم روزے داروں سے خوش بھی رہے ؟اور خوش بھی جاتے ہو ؟؟اس نے کہا: میں روزے داروں سے خوش نہیں کہ انھوں نے روزے کا حق ادا نہ کیا، مگر حضرت حجۃ اللہ نقش بند ثانی رحمۃ اللہ علیہ، کہ وہ بیماری کے سبب روزہ نہ رکھ سکے اور اس وجہ سے پشیمان و نادم ہیں، ان کی پشیمانی و ندامت، مجھ کو روزے داروں کے روزے سے زیادہ پسند آئی۔ سچ ہے: ع "بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم"

ٹوپی

فیچر: ف۔ س۔ اعجاز

ہر سر ٹوپی نہیں پہنتا اور جو ٹوپی پہنتا ہے وہ بھی ہر وقت اسے اپنے سر پر نہیں رکھتا۔ پھر بھی ٹوپی سماجی پہناوے کا ایک اہم حصہ ہے۔ میں خود کبھی تین چار طرح کی ٹوپیاں استعمال کرتا تھا۔ لیکن عید بقرعید کے علاوہ سردیوں میں ہی ٹوپی پہنتا تھا۔ ہاں ایک موقع اور آیا تھا جب جناح ٹوپی بڑے شوق سے پہنی تھی۔ جب میں دولہا بنا تھا اور مسلم سوشل فلم کے ہیرو کی طرح تہذیب سے جھک جھک کر نذرِ سلامی قبول کی تھی اور اپنی شیروانی کی جیب کو بھرا تھا۔ پہننے کے لئے ٹوپی کا انتخاب صحیح کیا جائے تو اس سے آدمی کا چہرہ بشری مکمل ہو جاتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ کوئی محض خود نمائی کے لئے ٹوپی کا شعار اپنائے۔ کالج کے ابتدائی ایام میں مجھے بری طرح کا سائنا سائنس ہوا تو E.N.T. اسپیشلسٹ نے مجھے ٹوپی پہننے کا مشورہ دیا تھا جس پر میں نے عمل کیا۔



ٹوپی یعنی کلاہ پر کئی زاویوں سے اشعار موزوں کئے گئے ہیں جو یا تو کسی کی شانِ خسروی سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر کسی کی انا یا کسی صاحب اختیار کو ہدف طنز و ملامت بنا کر کہے گئے ہیں۔ اب چونکہ کلاسک کو عوام نے فراموش کر دیا ہے اس لئے ان اشعار میں انہیں خاص جاذبیت نظر نہیں آتی۔ اب تو بس ٹوپی پہنتے ہیں تو پہنتے ہیں۔

ٹوپی سے جڑے ہوئے کئی محاورے بھی ہیں جو اہل زبان آج بھی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ٹوپی اچھالنا، ٹوپی اچھلنا، ٹوپی بدلنا، ٹوپی قدموں میں رکھنا، ٹوپی بدل بھائی، ٹوپی سے بھی مشورہ کرنا چاہئے وغیرہ۔ ٹوپی سے متعلق ''فرہنگ آصفیہ'' سے ایک شعر نقل کر رہا ہوں ۔

وہ بدگماں ہوں کہ خط دیکھے بند کیں آنکھیں
چڑھائی باز کی ٹوپی سرِ کبوتر پر
(وزیر)

میر تقی میر کا ایک قطعہ بھی پیش کرتا ہوں ۔

دہلی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

ٹوپی سے متعلق مجروح سلطانپوری کا ایک شعر مجھے یاد آتا ہے ۔

ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

مجھے اپنا بھی ایک شعر آپ کو سنانا ہے جس کے پیچھے ایک ماجرا ہے۔ بابری مسجد گرنے کے بعد وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے کثرت سے ٹوپی پہننا شروع کر دیا تھا اور مسلم علماء کے گھروں اور مزاروں کے طواف کرنے لگے تھے۔ ہر روز

بناسپتی علماء اور مزاروں کے سجادہ نشینوں کے ہاتھوں ٹوپی پہنتے ہوئے یا صافہ باندھتے ہوئے ان کی ایک تازہ تصویر اخباروں میں ضرور آیا کرتی تھی تب مجھ سے ایک شعر سرزد ہوا تھا۔ پہلے مطلع سن لیجئے پھر وہ شعر ۔

خدا میرے دن رات پیدا کرے گا
نہیں ہے تو اوقات پیدا کرے گا
مری ناپ کی گر نہیں کوئی ٹوپی
یہ سر احتیاجات پیدا کرے گا

اور آپ نے دیکھا کہ نرسمہا راؤ نے "ندامت پروف" ٹوپی کی نئی انڈسٹری ہندوستان میں کھول دی۔ نام نہاد سیکولر سماج میں اسکی بڑی کھپت ہے۔ میرا دل کہتا ہے راؤ صاحب نے اتنے موزوں کاسٹیوم کے لئے مرحوم فلمساز کے۔ آصف (اصل مغل اعظم) کو خواب میں دیکھا ہوگا اور اتنی پیاری ٹوپی انہی کے مشورے سے خریدی ہوگی۔

ٹوپی سے متعلق نثری ادب کا دامن بھی خالی نہیں۔ جادوئی ٹوپی، سلیمانی ٹوپی وغیرہ سے متعلق کہانیاں بھری پڑی ہیں۔ خواجہ احمد عباس مرحوم کا بھی ایک طنزیہ افسانہ مجھے کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ گلزار صاحب نے "کاغذ کی ٹوپی" کے عنوان سے ایک عمدہ افسانہ دیا ہے، اگرچہ اس میں ٹوپی دوسری طرح کی ہے۔

روس میں ٹوپی کو پاپاخ کہتے ہیں اور وہاں یہ عام پہنی جاتی ہے۔ داغستان کے شاعر و ادیب رسول حمزاتوف جو میرے سب سے زیادہ پسندیدہ ادیب ہیں جنکی ایک تحریر کے عوض میں اپنی سبھی تحریریں انہیں دے سکتا ہوں، کا لکھا ہوا ایک ماجرا نقل کر رہا ہوں جو انہوں نے اپنی سوانح حیات "میرا داغستان" میں سر اور ٹوپی (پاپاخ) کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم کیا ہے۔ یہ تین شکاریوں کا قصہ ہے جسے بیان کر کے رسول حمزاتوف نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ شکاری کے پاس سر تھا بھی یا نہیں؟ اب آپ حمزاتوف کا بیان سنئے اور لطف اٹھایئے۔ شاید اسے پڑھ کر کسی کی عقل کا بند دروازہ بھی کھل جائے۔ قصہ یوں ہے:

"تین شکاریوں کو پتہ چلا کہ گاؤں کے قریب گھاٹی میں ایک بھیڑیا آگیا ہے۔ تینوں نے طے کیا کہ اسے پکڑ کر مار ڈالنا چاہئے۔ اس کے لئے انہوں نے جو طریقے اپنائے ان کے بارے میں لوگوں میں بہت ساری کہانیاں مشہور ہیں۔ میں آپ کو وہ کہانی سناتا ہوں جو میں نے بچپن میں سنی تھی۔

"شکاریوں سے بچنے کی کوشش میں بھیڑیا ایک غار میں جا چھپا۔ غار کے اندر جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ بھی بہت تنگ، بس اتنا کہ ایک آدمی کا صرف سر اندر جا سکے۔ شکاری ایک چٹان کی اوٹ میں چھپ گئے اور اپنی رائفلوں سے غار کے تنگ دہانے کا نشانہ لے کر انتظار کرنے لگے کہ بھیڑیا غار سے باہر آئے۔ لیکن بھیڑیا بھی بیوقوف نہ تھا وہ بڑے اطمینان سے اپنی پناہ گاہ میں آرام کرتا رہا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہار اسی کی ہونی تھی جو صبر کھو بیٹھتا۔

"آخر ایک شکاری اس انتظار سے اکتا گیا۔ اس نے غار میں گھسنے اور بھیڑیئے کو باہر نکلنے پر مجبور کرنے کی ٹھانی۔ شکاری دہانے پر پہنچا اور پھر اس نے غار کے دہانے میں سر ڈال دیا۔ اس کے ساتھی خاصی دیر تک انتظار کرتے رہے اور یہ سمجھ نہ سکے کہ آخر شکاری نے کیوں نہ اندر جانے کی کوشش کی اور نہ سر باہر نکالنے کی۔ انتظار کی بھی حد ہوتی ہے، آخر انہوں نے اپنے ساتھی کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اسے کھینچ کر باہر نکالا گیا تو پتہ چلا کہ سر غائب ہے۔

"اب باقی دونوں شکاریوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ جب اس نے غار کے اندر گھسنے کی کوشش کی تھی تو اسکے سر تھا بھی یا نہیں؟ ایک شکاری کا کہنا تھا کہ مجھے تو لگتا تھا کہ اس کے پاس سر ہے، دوسرے کو اس پر اصرار تھا کہ اسکے پاس سر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"آخر وہ لوگ بے سر کی لاش گاؤں لائے اور لوگوں کو اس المناک واقعے کی تفصیل بتائی۔ ایک معمر بزرگ نے کہا کہ بھیڑیئے کی ماند میں گھسنے کا اس نے جو فیصلہ کیا اسے دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ایک عرصہ پہلے ہی وہ سر سے محروم ہو چکا تھا یا غالبًا بچپن سے ہی اس کے پاس سر نہ تھا۔ لوگوں نے سوچا کہ اس سوال کا مستند جواب اسکی بیوہ ہی سے مل سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا:

"میں کیسے بتا سکتی ہوں کہ اسکے پاس سر تھا یا نہیں؟ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ہر سال اپنے لئے ایک نئی پاپاخ خریدا کرتا تھا۔"

اب اس کے بعد ٹوپیوں سے متعلق محترمہ غزالہ وہاب کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ آپ کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ یہ مضمون حال میں میری نظر سے گذرا اور مجھے پسند آیا۔ مصنفہ بڑی اچھی اسکالر اور صحافی ہیں۔ انہوں نے طرح طرح کی قدیم و جدید ٹوپیوں کا ذکر کر کے ہمارے سروں پر احسان فرمایا ہے۔ لیکن اچھا ہوتا اگر وہ اپنے مضمون میں پیشہ ورانہ ٹوپیوں کا بھی ذکر کرتیں جو مثلاً قوال یا چنا جور گرم بیچنے والے استعمال کرتے ہیں۔ قوال کو اس کی مخصوص ٹوپی اور چنا جور گرم والے کو اس کی بنارسی دو پلی ٹوپی سے شناخت اور مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ پھر بھی غزالہ وہاب کا مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ ان کا مضمون پڑھ کر ہی میرے جی میں آئی تھی کہ میں ٹوپی پر کچھ لکھوں۔ جو میں نے لکھ دیا ہے۔

غزالہ وہاب لکھتی ہیں:

ناپ میں چھوٹی ہو سکتی ہے لیکن ٹوپی کے ساتھ کئی پر لطف باتیں جڑی ہوئی ہیں۔ یہ پہناوے کا ایک حصہ ہے۔ یہ کسی کے افکار، عقیدے یا عمر کے کسی دور کی نمائندہ ہوتی ہے۔ بناوٹ اور ناپ کا فرق اتفاقی امر نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک پوری تاریخ چھپی ہوتی ہے۔ چنانچہ کھادی کی بنی ہوئی سیدھی سادی گاندھی کیپ ہو یا اون اور مخمل سے تیار کردہ کڑھی ہوئی کشمیری ٹوپی ہو اس کے اپنے لوازمات ہوتے ہیں۔ صرف وہ سامان جس سے یہ بنی ہو اور صرف سماجی اسٹائل یا ثقافتی انداز ہی اہم نہیں بلکہ رنگوں کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ آزادی کی تحریک کے دوران بہت سے لوگ سیاسی بیانات دینے کے لئے مختلف رنگوں کی ٹوپیاں پہنا کرتے تھے۔ مثلاً زعفرانی رنگ دائیں بازو کے سیاستدانوں کے ساتھ جڑا ہوا تھا، ہرا کسانوں اور سفید گاندھی وادوں سے مخصوص تھا جبکہ مولوی مولانا کالے رنگ کی ٹوپیاں پہنتے تھے۔

بہر حال موجودہ دور میں ٹوپی اپنی اخلاقی اہمیت کھو بیٹھی ہے۔ اب یہ نوجوانوں کا ''فیشن بیانیہ" (Fashion Statement) بن چکی ہے۔ لا ابالی نسل تو اپنے شانوں پر اپنا مخصوص انداز چپکائے رکھنا پسند کرتی ہے۔ اس نے اپنے اسٹائل کا وزن ٹوپی پر رکھ چھوڑا ہے۔ کسی کالج میں پہنچ جائیے آپ نوجوانوں کو مختلف طرز کی ٹوپیاں پہنے ہوئے دیکھیں گے۔ کسی کے سر پر شملہ ٹوپی نظر آئے گی، کسی کے سر پر Benetton کی سکیچر برانڈ Twill کیپ دکھائی دے گی جس پر ٹوپی ساز کمپنی کا سمبل جھلملا رہا ہوگا۔ بینیٹن کمپنی کا کہنا ہے کہ وہ مرد، عورتوں اور بچوں کے لئے ٹوپیاں بناتی ہے۔ اونی ٹوپیاں صرف جاڑے میں بکتی ہیں لیکن ٹویل Twill اور کارڈورائے ٹوپیاں سال بھر فروخت ہوتی ہیں۔ صرف بچے اور نوجوان ہی ٹوپیاں استعمال کرتے ہوں ایسا نہیں ہے۔ بہت سے لوگ انہیں صرف اس لئے خریدتے ہیں کہ یہ سردی سے سر کو بچاتی ہیں اور آرام دیتی ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ انہیں اپنے شخصی تاثر یا وضع کی خاطر پہنتے ہیں۔ بینیٹن ٹوپیاں دو سو سے تین سو روپے میں ملتی ہیں۔ یہ اونچی نوکدار، گول بیچ میں سے نکلتی ہوئی یا گول مڑی ہوئی بھی ہوتی ہیں۔

تقریباً سبھی اسپورٹس ویئر تیار کرنے والی کمپنیاں ٹوپیاں بھی بناتی ہیں۔ مثلاً ایڈیڈاز (Adidas) ٹوپیاں ریفلیکٹر کے لئے مشہور ہیں جو 360 ڈگری تک عکس اندازی (Reflectivity) کی ضامن ہوتی ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر ٹوپی پہننے والا رات میں جوگنگ یا چہل قدمی کر رہا ہے تو لوگ اسے بغیر بتی کے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ایڈیڈاز کی اس ٹوپی کی ایک خاصیت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کے سامنے کے گنبد یا کوہان میں ایک ایسا استر لگا ہوتا ہے جو اس کی بناوٹ کو اصلی حالت میں قائم رکھتا ہے۔

نہرو ٹوپی	دراصل یہ گاندھی ٹوپی ہے جسے اولاً نہرو نے پھر دیگر کانگریسیوں نے مقبول بنایا۔ تحریک آزادی کے دوران اسے مجاہدین آزادی پہنا کرتے تھے۔ آج اسے گاندھی واد اور غیر گاندھی واد سبھی سیاستداں پہنتے ہیں۔
بیس بال ٹوپی (Base Ball)	یہ بے چین طبیعت کے نوجوانوں کے لئے ہے۔ اسے پہننے کے لئے کھلاڑی ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسے سیدھا، الٹا جیسے چاہیں گھما کر پہنیں، ہر طرح ٹھیک لگتی ہے۔
بندر ٹوپی	جاڑے سے بچنے کے لئے پرانی طرز کی ٹوپی۔ بوڑھے لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ یہ اون سے بنائی جاتی ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو زبردستی پہناتی ہیں تاکہ وہ سردی سے محفوظ رہیں۔
فر والی ٹوپی	اس کا زمانہ اب لد گیا ہے۔ چند سیاستداں اسے پہنا کرتے تھے۔ وی۔ پی۔ سنگھ نے اس کا استعمال سب سے زیادہ کیا۔ اب اس کی جگہ مخمل کی ٹوپی چل گئی ہے جسے زیادہ تر ملا حضرات پہنتے ہیں۔
تنکوں والی ٹوپی	چھٹیوں میں سیر تفریح کے دوران اسے مرد، عورت، بڑے، بچے سبھی پہنتے لیتے ہیں۔
بیریٹ (Beret)	یہ انقلابی ٹوپی ہے۔ چی گوئیوآرا نے اسے نظریاتی ٹوپی بنا دیا تھا۔ دوسرا نامی شخص رسوائے زمانہ چارلس شوبھراج ہے جس نے اسے اپنایا۔ دوسرے لوگ اسے سردیوں میں بغیر کسی نظریاتی وابستگی کے پہنتے ہیں۔

ایڈیڈاز کی ٹوپیوں میں بیس بال (Baseball)، گولف، ٹینس اور کرکٹ ٹوپیاں شامل ہیں۔ اور انکی قیمت 250 سے 300 روپے تک ہوتی ہے۔ Lewis(لیوس) کیپ، ویکینڈرس کیپ، نائک (Nike) برانڈ کیپ کی اپنی اپنی خصوصیات اور قیمتیں ہیں۔

"آرچیز" (Archies) کاغذ کی بنی ہوئی دعوتی ٹوپیوں کا ماہر ہے۔ یہ ٹوپیاں حروف تہجی، ہندسوں اور جسمی ستاروں کی شکل میں تیار کی جاتی ہیں۔ ایسے ڈپارٹمینٹل اسٹور بھی ہیں جہاں یوروپین مردانہ ہیٹ دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں خواتین کیلئے کچھ نہیں ہے۔ البتہ اسپورٹ ٹوپیاں مردوں اور عورتوں دونوں میں مستعمل (Unisex) ہیں۔ لیکن ابھی تک ہندوستانی خواتین نے مغربی طرز اختیار نہیں کیا ہے اور وہ اپنے سروں پر دوپٹے اور اسکارف ہی رکھتی ہیں۔

دوسری طرف وہ ٹوپیاں ہیں جو مذہبی تعلق سے پہنی جاتی ہیں۔ مثلاً یہودیوں میں Skull ٹوپی، پارسیوں میں پھیٹیا یا مسلمانوں میں اونچی ٹوپی (جس قسم کی مرزا غالب پہنا کرتے تھے) کا رواج ہے۔ اس قسم کی ٹوپیاں گلی کوچوں میں مل جاتی ہیں۔ عام طور پر مسجدوں کے پاس ایسی ٹوپیاں بکثرت ملتی ہیں۔ یہ ہزاروں رنگوں میں اور کئی طرح کی تراش میں تیار کی جاتی ہیں۔ عام ٹوپیوں کے علاوہ کشیدہ کی گئی سوتی، ریشمی اور مخمل کی ٹوپیاں بھی مل جاتی ہیں۔ کھال (فر) کی ٹوپیاں بھی دستیاب ہیں۔ 35 روپے سے 400 روپے تک کی ورائٹی پائی جاتی ہے۔ بروکیڈ کی ٹوپی اب کم ملتی ہے۔

دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے باہر ایک محمد شفیق ہیں جو زندگی بھر ٹوپیاں ہی بیچتے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "اگرچہ تہواروں پر بزنس اونچا ہوتا ہے لیکن خراب بھی نہیں ہوتا۔ لوگوں کو عبادت کرنی ہے اور ٹوپیاں پہنی ہیں۔ جو لوگ مذہبی مقصد سے ٹوپی لیتے ہیں وہ عام قسم کی ورائٹی لیتے ہیں، کڑھی ہوئی یا کشتی نما"۔

فینسی ٹوپیاں وہ لیتے ہیں جو فینسی ڈریس یا کاسٹیوم پہنتے ہیں۔ آجکل زردوزی کی ٹوپیاں عنقا ہو گئی ہیں لیکن شادی بیاہ کے موقعوں کیلئے لوگ آرڈر دے کر بنوا لیتے ہیں۔ سوتی بنی ہوئی ٹوپیاں بنگلہ دیش سے درآمد کی جاتی ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کوالٹی میں ہندوستانی ٹوپیوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ داستانی عہد کی ٹوپی کا آغاز دلچسپ ہے۔ شمالی ہند کا سر کا روایتی پہناوا پگڑی تھی جو الگ الگ علاقے اور موسم کے اعتبار سے لمبائی میں زیادہ یا کم ہوا کرتی تھی۔ ٹوپی کا رواج سرد خطوں مثلاً شمال مغربی سرحدی صوبوں، پنجاب اور وادئ کشمیر کے حصوں میں محدود تھا۔ چونکہ ان علاقوں میں جاڑے کا ساں بہت دھندلا ہوا کرتا تھا اور لباس عموماً گہرے رنگ کے ہوا کرتے تھے لوگ اپنے اس سر کے لباس کو میک اپ کے طور پر بھی اپناتے تھے۔ کشمیری لوگ اپنی ٹوپیاں قدرے لمبی اور گہرے رنگوں میں بنایا کرتے تھے جن پر کشیدہ کاری کی جاتی تھی۔

آج ہندوستان میں سب سے زیادہ مقبول ٹوپی گاندھی ٹوپی ہے، گرچہ اس کا رواج دیر سے پنپا۔ جب مہاتما گاندھی ایک آل انڈیا ڈریس کوڈ ایجاد کرنے کے لئے کوشاں تھے تو انہوں نے کئی تجربے کئے حتیٰ کہ بدنام زمانہ سولا ٹوپی بھی اختیار کی۔ [سولا ٹوپی دراصل Solar Hat یعنی شمسی ہیٹ کا بگڑا ہوا تلفظ ہے]۔ یہ ٹوپی برٹش کے ساتھ مخصوص تھی اور اس طرح بیرونی تشخص کی علامت بن گئی تھی۔ سولا (شمسی) پودوں کے گودے سے تیار کی جاتی تھی اور برٹش ہیٹ کا ہندوستانی روپ تھی۔ یہ ہلکی بلب نما (Bulbous) اور ہندوستانی موسم گرما کے لئے مناسب تھی۔

گاندھی جی کو ٹوپی بہت پسند تھی۔ اس کے باوجود وہ اسے ہندوستانی پہناوے کا حصہ نہیں بنا پائے۔ ایکدن اتفاقاً نوا کھالی تکلوں اور کھادی کپڑے کے ایک ٹکڑے سے یونہی کھیلتے ہوئے انہوں نے سفید رنگ کی کشتی نما کھادی ٹوپی بنائی اور اس پر اطمینان حاصل کر لیا۔ اس کے فوراً بعد انڈین نیشنل کانگریس نے اسے نیشنلزم کے نشان کے طور پر منظور کر لیا۔ مگر حیرت اس پر ہے کہ مہاتما گاندھی نے اس ٹوپی کو ایجاد کیا۔ اس کا نام بھی رکھا لیکن وہی ایک لیڈر ایسے تھے جنہیں اس ٹوپی میں نہیں دیکھا جاتا تھا۔

ہندوستان میں مرد کے سر کا پہناوا ہمیشہ پاکیزہ و متبرک سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی مردوں نے شرٹ اور پتلون جیسے مغربی لباس تو اپنا لئے لیکن آج تک ہیٹ کو وہ دل سے قبول نہیں کر پائے۔ بے شمار ہندوستانی لوگ سوٹ اور سفاری کے ساتھ بھی پگڑی یا ٹوپی ہی پہنتے ہیں۔ ایما تاریو اپنی کتاب "Clothing Matters" میں رقمطراز ہے "مغربی پوشاک پورے طور پر قبول کرنے کے باوجود بیشتر ہندوستانی مرد اپنے سروں کے لئے ہندوستانی پہناوے پگڑی یا دیسی ٹوپی کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہندوستانی کلچر میں سر کو طہارت کا مرکز تصور کیا جاتا ہے بلکہ سر کے لباس کو اپنی اپنی ذات یا مذہبی فرقے کی خاص پہچان مانا جاتا ہے۔"

سماجی متعلقات سے ہٹ کر ٹوپی صرف آرام یا اسٹائل کی شئے سمجھی جاتی ہے۔ اور پسند کی ورائٹی کم نہیں ہے، جس کو جو اچھی لگے خریدے اور پہن لے۔

شہر کلکتہ کی منتخب خوش ذائقہ

جنتا مٹھائیاں

سندیش	گلاب جامن	رس گلا	قلاقند	ملک کیک	رابڑی
چم چم	پیسٹری نما مٹھائیاں	لڈّو	نمکینیات		

مختلف اقسام کے حلوے

Janta Sweet MART

اپنے مہمانوں کی تواضع کے لئے دسترخوان کی
زینت بنائیے۔ ہر تہوار، تقریب، پکنک اور
سفر کے موقع پر جنتا مٹھائیاں نوش فرمائیے۔

جنتا سوئیٹ مارٹ ۵۳۔اے، کبی تیرتھ سرانی، خضر پور، کلکتہ۔۷۰۰۰۲۳

گلزار
"Bokiyana"
Pali Hill, Bandra
Mumbai-400050

تروینیاں

کانٹے والی تار پہ کس نے گیلے کپڑے ٹانگے ہیں
خون ٹپکتا رہتا ہے اور نالی میں بہہ جاتا ہے

کیوں اس فوجی کی بیوہ ہر روز یہ وردی دھوتی ہے

ہل واہا تھا "ہوری" نے اور زمیں دار کے کھیت ہوئے
غلّہ بیچا بنیئے نے، اور داتا کی تعریف ہوئی

مٹی کی گودی پھر خالی جس نے کھیت اُگائے تھے

اب تو ادب، ہنر و فن بھی بانٹ چکے ہم
آواز آئے گی نہ اب پرواز جائے گی

قینچی سے کوئی آسمان کاٹ رہا ہے

آؤ زبانیں بانٹ لیں اب اپنی اپنی ہم
نہ تم سنو گے بات، نہ ہم کو سمجھنا ہے

دو اَن پڑھوں کو کتنی محبت ہے ادب سے

سامنے آئے مرے، دیکھا مجھے، بات بھی کی
مسکرائے بھی پرانی کسی پہچان کی خاطر!

کل کا اخبار تھا، بس دیکھ لیا، رکھ بھی دیا

چڑیاں اُڑتی ہیں مرے کانچ کے دروازے کے باہر
ناچتی دھوپ کی چنگاریوں میں جان بھری ہے

اور چِتا کا میں تودہ ہوں جو کمرے میں پڑا ہے

Stallion BRAND
SCHOOL BAGS,
SOFT LUGGAGE,
POUCH & FILE BAGS,
SHOPPING BAGS,
TRAVELLING KITS ETC.

Shahenshah International
MANUFACTURERS & EXPORTERS
12, ZAKARIA STREET, GROUND FLOOR
CALCUTTA - 700 073
TEL : 235-4026, FAX : 91-33-2356562
PAGER : 9610-611468

SRS Gold Medalists

S. Rahmatulla & Sons
Decorators
30/2A, Rani Rashmoni Road,
Calcutta - 700 087
Phone : Off :244-1261 ; 244-8311



اسحاق ملک
H.NO 22-1-873
سلطان پورہ، حیدر آباد-۲۴ (اے پی)

جلوہ گر جب نہیں وہ یارِ عید
کیف پرور نہیں بہارِ عید
ہم وہ محرومِ دید ہیں جن کو
عید پر بھی ہے انتظارِ عید
چاند اُدھر اور تم اِدھر نکلے
آگیا ہم کو اعتبارِ عید
آؤ للہ پھر گلے ملنے !
آگئی صبحِ زرنگارِ عید
کر ادا رسمِ شانِ محبوبی
دے کوئی تحفہ یادگارِ عید
عید کے ساتھ تم جو آجاؤ
اور پُر کیف ہو بہارِ عید
غم کے ماروں کی عید کب ہوگی
مدتوں سے ہے انتظارِ عید
اے ملکؔ ہم کو مل نہیں سکتی
جس خوشی پر ہے انحصارِ عید

نظر میں سماکر جدا ہوگیا
وہ بکھرے ہوئے خواب سا ہوگیا
مجھے کچھ نئے خواب دکھلا گئی
تجھے زندگی! آج کیا ہوگیا
تری زلف بازو پہ کیا آگئی
پسینہ مرا عطر سا ہوگیا
جسے تاک کر میں گیا تھا کبھی
وہ پھل بھی شجر سے جدا ہوگیا
خدا کے لئے مجھ کو زاہد بتا!
یہاں میکدہ تھا سو کیا ہوگیا
بڑی سادہ لوحی سے ہم لٹ گئے
لٹیروں کا آخر بھلا ہوگیا
مرا دل رہا میرا دل مدتوں
نہ جانے یہ کیوں آپ کا ہوگیا
کہاں ہیں وہ احباب دورِ کہن
زمانے بتا کون کیا ہوگیا
ملکؔ دل کی عظمت بھی جاتی رہی
یہ گھر بھی کھلا راستہ ہوگیا

ایک تبسم سے کیا ہوگا
غم نہ ہمارا ہلکا ہوگا
آپ کا جلوہ جلوہ ہوگا
دیکھنے والا رسوا ہوگا
یہ تو بتا اے رسمِ محبت
کون یہاں پر کس کا ہوگا
جانِ تصور اُس کو بتاؤں
چاند سا جس کا مکھڑا ہوگا
اتنی بڑھے گی جان کی تلخی
زہر پئیں تو میٹھا ہوگا
دور ملکؔ وہ جتنے ہونگے
اُتنا تعلق گہرا ہوگا

غزلیں

ایس۔اے۔فہیم
H. No. 4/1/1/7A, Upstairs
Bafna Building
Opp. Jahangir Plaza
King Koti Road
Hyderabad - 500 001

بلندی فکر کی عرشِ بریں ہے — نگاہ و دل کی پستی ہی زمیں ہے
مجھے اسباب پر اُتنا نہیں ہے — مشیت پر جری جتنا یقیں ہے
تری محفل بھی خلوت آفریں ہے — کہ میرا راز داں کوئی نہیں ہے
فرازِ آسماں کو چھونے والے — ترے پاؤں کے نیچے ہی زمیں ہے
اُچٹتی دھوپ کا سایہ کہیں پر — سمٹتے دن کی گہرائی کہیں ہے
حقیقت ہے کہ تیرے اِس جہاں میں
ترا بندہ ہی تیرا ہم نشیں ہے

ایک نظم

بے قرار آنکھوں میں روشنی چراغوں کی
آرزو کی قندیلیں شاخ شاخ پلکوں پر
یوں دھنک بکھرتی ہے جیسے تیرگی بھاگے
کنج کنج گلشن میں نغمگی کی لہریں ہیں
تختۂ صنوبر ہے یا گلاب کے گجرے
لمحۂ مسرت بھی کتنا روح پرور ہے
روشنی ہے، خوشبو ہے، پیار کی حکومت ہے
خسروی ہے صحرا پر، دبدبہ ہے، سطوت ہے
وقت سایہ افگن ہے، دھڑکنوں میں گلشن میں
زیست مہرباں سی ہے، حسن اور مستی ہے

ماہیے

انصاف کے زینے پر
قتل گواہوں کا
اِک داغ ہے سینے پر

پھر گھر سے نکلنا ہے
دشتِ جنوں بتلا
کس راہ پہ چلنا ہے

یہ کیسا پرندہ ہے
معذور کئے پر سے
لیکن ابھی زندہ ہے

سب سے بڑا شو روم جہاں زپ چین، بیگ کے
لوازمات، فوم، ریکسن، ڈینڈرائٹ وغیرہ دستیاب ہیں۔

اے۔ ایل۔ ایس۔ ایس۔ اے۔ بخاری اینڈ سنز

A. L. S. S. A. Bukhari & Sons

Biggest Show Room of

Zip Fasteners, Bag Fittings, Foam PVC, RexinE and Dendrite

Exporter & Importer

A ALS S

38/A/9, Chandney Chowk Street, Calcutta - 700 072

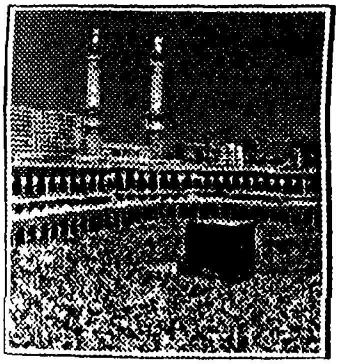
Phone : 236-3444 / 6802, 237-7399

Sister Concern

SAFA MARWA

38/B/4, Chandney Chowk Street, Calcutta - 700 072

Phone : 236-6802



میٹھا
کھانا زندگی میں
مٹھاس بھر دیتا ہے۔
**مٹھائیوں
کے شہنشاہ**
پیش کرتے ہیں

خوش ذائقہ لڈّو، رس بھری جلیبیاں،
طرح طرح کے حلوے
اور
مشہورِ عالم لچھے اور کھجلے۔

حاجی علاء الدین سوئٹ میٹ شاپ

۵۸/۵۶، فیرس لین (چونا گلی) کلکتہ - ۷۳ فون : ۲۳۷-۷۴۶۳

Haji Alauddin Sweet Meat Shop

56, Phears Lane, Calcutta - 73 ● Ph : 237-7463

KHIZAR & CO.

PHILIPS

LUNGIES AND HANDKERCHIFFS

MANUFACTURERS OF
PHILIPS & BONUS
BRAND
HANDLOOM LUNGIES

98, RABINDRA SARANI
CALCUTTA - 700 073
PHONE : 235-8548
RESI. : 238-7698

KHIZAR & CO.

انجم شرقی! سعید انجم!!

نصر ملک
Vaerbrovej 40/ST-2, DK-2880, BAGSVAERD,
Copenhagen (Denmark)

"سنو! مغرب میں تخلیق پانیوالے اردو ادب کے تخلیقکار ہم ہی تو ہیں۔ سائیں سچا ہو کہ قیصر تمکین، جتندر بلّو یا افتخار نسیم، صفیہ صدیقی، تم نصر ملک، خالد سہیل، رضیہ فصیح احمد، مصطفٰے کریم ہم سبھی ایک ہی تو ہیں اور اپنے اپنے اکثر افسانوں اور کہانیوں کے کردار بھی ہم خود ہی ہیں! یہ تو تسلیم کرتے ہو نا؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ جن کرداروں کو ہم نے اپنی کہانیوں اور افسانوں میں کردار کے طور پر لیا ہے کیا ہم ان سے انصاف کرپائے ہیں؟ یہ اردو ادب ہم جو تخلیق کر رہے ہیں اس کے حقیقی وارث ہم ہی ہیں یا پھر وہ جو اپنے ناموں کے ساتھ معروف دانشور و محقق ہونے کے دم چھلے لگائے سال میں ایکبار ادھر کا رُخ کرتے اور ہماری تخلیقات کو اپنے تحقیقی مکالموں کے لئے خام مال کے طور پر ساتھ لے جاتے ہیں اور پھر وہ جو اس خام مال کے ساتھ کرتے ہیں کیا وہ جائز ہے؟ میاں صاحب! ضروری ہے کہ وقت کے ہاتھ سے نکلنے سے پہلے پہلے ہم سبھی قلمکار جن کا ذکر میں نے کیا ہے اور وہ ہمارے قبیلے کے دوسرے مثلاً منیر الدین احمد، شہلا علاؤالدین، حیدر قریشی، ہرچرن چاولہ، شاہدہ وسیم، رفعت مرتضٰے ان سب کے وہ نقوش پا تلاش کئے جائیں جو ان سب نے، ہم سب نے اپنے اپنے ادبی سفر پر چلتے ہوئے اب تک ادھر اُدھر چھوڑے ہیں! نصر ملک سن رہے ہو؟ یہ سگریٹ کے لمبے کش تمہیں لے ڈوبیں گے! کیا سوچ رہے ہو؟"

سعید انجم مسلسل بولے جارہا تھا۔

وہ ایسٹر کی چھٹیاں گزارنے، بیوی بچوں کے ساتھ ہمارے ہاں آیا ہوا تھا لیکن اس نے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے میرے ساتھ اہم باتیں کرنی ہیں۔ اسے آئے چار دن ہو گئے تھے اور دن بھر ادھر اُدھر گھومنے کے بعد گھر واپسی پر کھانا کھانے کے بعد ہر شام، اس کا ایک ہی تقاضا ہوتا "نصر ملک! ادھر آؤ' وہ جو میں تمہیں بتا رہا تھا......" اور پھر وہ بولنا شروع ہو جاتا اور آج بھی وہ اپنی بات کو آگے بڑھا رہا تھا۔

"تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم سب نے اپنی اپنی جگہ جو ادب کہانیوں اور افسانوں کی صورت میں تخلیق کیا ہے اور مسلسل کرتے چلے جارہے ہیں اسکی کتنی اہمیت ہے؟ یہ ادب ہمارے حال کا ہی عکاس نہیں بلکہ یہ ہمارے مستقبل کا اثاثہ بھی ہے میں نہیں چاہتا کہ یہ ادب محض ماضی کے اوراق میں دب کر رہ جائے اور اُدھر سے آنے والے اسے "مین اسٹریم" سے باہر والوں کی تحریریں قرار دے کر ایک طرف رکھ دیں یا پھر اپنے مقصد کے لئے جب چاہیں جتنا چاہیں استعمال کرتے ہوئے ہمارے کندھوں پر کھڑے اپنا قد بلند کرتے رہیں اور ان مغرب و امریکہ، سکینڈ نیویا اور کینیڈا والوں کو کبھی خبر ہی نہ ہو کہ ان کے ہاں آنے والے ہم بدیشی کیا سرمایۂ چھوڑ گئے ہیں۔ نصر ملک! اگر ایسا ہوا تو یہ موت ہوگی! ہمارے لکھے ہوئے لفظوں کی موت!! میاں صاحب، یہ ہماری موت ہوگی!!!"

وہ صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا میرے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایش ٹرے میں بجھا رہا تھا۔ "سگریٹ اور کافی، میں کہتا ہوں تمہیں اور کچھ نہیں سوجھتا؟" اس کے لہجے میں حکم نہیں، عاجزی سی تھی تبھی تو اس نے میری کافی کی پیالی میرے آگے بڑھا دی تھی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ جو ہم ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں ہم ایک ہی پیڑ کی شاخیں ہیں اور ہماری جڑیں بھی ایک ہی دھرتی میں پیوست ہیں اور وہ ہے، اردو ادب!"

میں اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ جہاں میں اپنی روایتی عادت سے ہٹ کر اسے ٹوکے بغیر، ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا اور وہ بھی یوں لگ رہا تھا جیسے تہیہ کئے ہوئے تھا کہ اس نے جو کہنا ہے وہ کچھ سنے بغیر ہی کہنا ہے اور ابھی اسی وقت ہی کہنا ہے۔

"تم جانتے ہو کہ امریکہ و برطانیہ اور مشرقِ وسطٰی کے ممالک اور خلیجی ریاستوں میں آئے دن اردو مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ لندن کو تو کہنے والے اردو کا یورپی مرکز کہتے ہیں۔ وہاں اردو کے نام پر کئی ادارے قائم ہیں۔ قیصر امام، فیضان عارف، ساقی فاروقی، مقصود الٰہی شیخ، بخش لائلپوری اور وہ جن کے نام میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں یہ سب تو برطانیہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کے منہ بولتے ابواب ہیں، ہیں کہ نہیں؟ یہاں خود تمہارے ہاں بھی تو ایسا ہی ہے۔ خود اپنے آپ ہی کو دیکھو! کیا یہ ممکن تھا کہ انڈے کی مانند اس چھوٹے سے ڈنمارک کے قومی ریڈیو اسٹیشن سے تین بار اردو میں نشریات ہوں گی؟ یہی حال ناروے میں ہے۔ احباب اپنی تخلیقات، شاعری، کہانیوں اور افسانوں کے مجموعے شائع کر رہے ہیں اور یورپ و امریکہ میں مقیم اردو لکھاریوں کی نگارشات و تخلیقات پر پاکستان و ہندوستان میں

بہت کچھ لکھا بھی جارہا ہے لیکن ہمارے ہاں سکینڈ نیویا، میرا مطلب ہے ناروے، سویڈن اور ڈنمارک میں بھی اگر چہ کچھ ہو رہا ہے لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے نا یہ خوش کن تو ہے لیکن یہ نہ تو مستحکم ہے اور نہ ہی اتنا پائیدار اس کا قائم و دائم رہنا ہی ہماری ابدی حیات ہے! سن رہے ہو؟ تم نے پھر سگریٹ سلگالی یار! بہو کاٹ، سلگتے رہو لیکن میری بات دھیان سے سنو"۔

"دیکھو جناب رات بہت گزر چکی ہے اور صبح ہمیں تمھاری تقریب میں بھی جانا ہے میرے خیال میں اب کچھ سو لیا جائے" میں نے اس کی کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب گیارہ بجنے والے ہیں"۔

"ہاں رات گزر نہیں چکی۔ البتہ گزرے گی ضرور، صبح ضرور آئے گی، یہ میرا یقین ہے، تم بھی تسلی رکھو، اگلی صبح ہماری ہی ہوگی! گزر جانے دو اس رات کو! تم اپنی سگریٹ پھونکو، رات کو چھوڑ دو اس کو گزرنے دو، اس صبح کو دیکھو جو طلوع ہونے کو ہے اور جس کے ماتھے کا سورج ہم بنیں گے! ہاں تو میں کہہ رہا تھا....." وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر بولنے لگا۔

"تم نے کراچی سے شائع ہونے والے "افکار" کا وہ خصوصی شمارہ تو پڑھا ہی ہوا ہے جو برطانیہ میں اردو کے حوالے سے ایک خاص شمارہ ہے۔ میں نے تمھاری کتابوں میں دیکھا تھا خود میں نے پڑھا ہوا ہے۔ "افکار" پہلا پرچہ ہے جس نے ہم مغرب میں رہنے والے اردو لکھاریوں اور ہماری تخلیقات کی جانب توجہ دی اور ہمیں پاکستان، بھارت اور جہاں جہاں اردو پڑھی جاتی ہے وہاں متعارف کرایا۔ یہ غالباً ۱۹۸۱ء کی بات ہے۔ افکار کے اس خصوصی شمارے میں صرف برطانیہ میں اردو زبان و ادب کا احاطہ کیا گیا ہے اور اب تو یہ بھی بہت پرانی بات ہو چکی ہے اور پھر تمھیں یاد ہے بمبئی کے تاریخ ساز اردو جریدے شاعر نے اردو کی نئی بستیوں کے عنوان سے ایک خاص شمارہ شائع کیا تھا جس میں ناروے میں اردو ادب کو اکٹھا کیا ہے اور اس سے بھی پہلے کلکتہ سے ف۔ س۔ اعجاز کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ انشاء کا سکینڈے نیویا میں اردو اور سکینڈے نیویائی ادب اردو زبان میں والا خصوصی شمارہ جو ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا تھا اردو پرچوں میں اپنی مثال آپ ہے۔ لاہور سے "تخلیق" کا خلیجی ریاستوں میں اردو نمبر اور سعودی عرب میں اردو پر حیدر آباد، دکن کے شگوفہ کا خاص شمارہ اور پشاور سے شائع ہونے والا سمندر پار کے اردو قلمکاروں کا جریدہ اور کراچی کا منشور جو ہم مغرب میں مقیم اردو لکھاریوں کی تخلیقات کو نمایاں پیش کرتا ہے اور ایک نظریاتی تحریکی پرچہ ہے یہ سب کچھ ہمارے ہی ادبی وجود سے متعلق ہیں لیکن جناب! اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے ایک آدھ کو چھوڑ کر جن رسائل کا میں نے نام لیا ہے ان کے تعلقات ہم لکھاریوں سے کتنے ہیں؟ کیا وہ ہماری تحریروں کے کرداروں اور ان کے کرداروں کے حالات اور ان سے متعلقہ واقعات کا بھی تجزیاتی جائزہ لے سکیں گے؟" وہ بولے جارہا تھا اور میری آنکھوں کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ اس نے موضوع ہی ایسا ہی چھیڑ دیا تھا۔ میں نے سگریٹوں کا نیا پیکٹ کھولا تو اس نے میری خالی پیالی میں خود کافی انڈیل دی۔ میں اسکی اس حرکت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ "میرے خیال میں اب میں ساری رات بیٹھ سکتا ہوں" میں نے کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"یار سعید تم جو کچھ کہہ رہے ہو یا کہنا چاہتے ہو اس کا لب لباب تو یہی ہے کہ ہم مغرب اور خاص کر سکینڈے نیویا میرا مطلب ہے ڈنمارک، سویڈن اور ناروے وغیرہ کے اردو ادیبوں کے اپنے اپنے ملکوں سے ہجرت کے اسباب، ان اسباب کے ہماری تخلیقات پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اور خود ان ملکوں میں جہاں ہمیں معاشی تگ و دو کے مسائل در پیش ہیں اور اس حالت کے باوجود نیک نیتی سے تخلیق کئے ہوئے ہمارے افسانے ہماری کہانیوں ہماری آئندہ کی نسلوں کے لئے ایک جگہ محفوظ کئے جائیں اور اردو زبان و ادب کے عالمی فروغ کے لئے جو حصے ہم ڈال چکے ہیں اور ڈال رہے ہیں اس کا تجزیہ کیا جائے تاکہ مسائل و تخلیقات میں مطابقتوں اور تفرقات کی نشاندہی کی جائے اور انہیں یکسانیت کی ایک ایسی لڑی میں پرو دیا جائے جو ہمارے تخلیق کئے ہوئے ادب کو "مین اسٹریم" میں شامل بھی رکھے اور اپنے الگ وجود کو یوں برقرار بھی رکھے کہ ان ملکوں کے ایسے ادیب و لکھاری ہیں جو ان ملکوں کی اپنی اپنی زبانوں یعنی ڈینش، سویڈش یا پھر نارویجین زبانوں میں لکھنے کی بجائے اردو زبان کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں، لیکن یار سعید! اس کام کو تو تم پہلے ہی شروع کر چکے ہو اپنی کتاب، "مغرب کے اردو افسانے" کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ اور پھر سویڈن سے سائیں سچا کی مرتب کردہ "شناخت کی تلاش" جو کلکتہ سے انشاء پبلی کیشنز سے چھپی وہ بھی تو اسی سلسلے کی ایک اولین یادگار تخلیق ہے!"

"تم نے ٹھیک کہا۔ میرے خیال میری بات کو اب سمجھے ہو لیکن یہ کام جو تمہیں "مغرب کے اردو افسانے" میں نظر آتا ہے اپنی جگہ پر مکمل سہی لیکن ہے ادھورا.....ادھورا اس لئے کہ میں نے اس کتاب میں یورپ میں مقیم اردو کے جن دس افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا تجزیاتی جائزہ لیا ہے اس کے بعد اب ان کی نئی تخلیقات ہی نہیں بلکہ کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں



سعید انجم کی وفات سے ایک دن پہلے ۲۰ را پریل ۲۰۰۰ء، جمعرات کو تو نسبیکن کے نیو یلی گارڈن میں اتاری گئی تصویر
(دائیں سے بائیں) سعید انجم کے صاحبزادے یاسر انجم، نصر ملک اور سعید انجم۔

اور پھر نئے کہانی کار اور افسانہ نگار بھی سامنے آرہے ہیں اور اس لئے اب اس ادھورے کام کو آگے بڑھایا جائے اور اردو ادب کے اس سرمائے کو دیکھا، پرکھا اور اکٹھا کیا جائے اور یہ کام ہم اب کر سکتے ہیں، کل نہیں!۔۔۔ آج اس کام کیلئے مواد کی دستیابی قطعاً مشکل کام نہیں بلکہ میں نے تو اس دن سے جب میری کتاب ''مغرب کے اردو افسانے'' شائع ہوئی تھی تبھی سے ہمعصروں کی نئی تخلیقات اردو رسالوں اور اپنے توسط سے اکٹھی کرنی شروع کر دی تھیں اور اب تو ایک انبار ہے میرے پاس۔۔۔ میں نے ان تخلیقات کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ان پر کچھ ''لکھا'' بھی ہے''۔ وہ بولے جارہا تھا۔ میں نے پیکٹ سے سگریٹ نکالی تو اس نے فوراً اسے میز پر پڑے لائیٹر کو اُٹھالیا ''لاؤ میں سلگا دیتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے اس نے لائیٹر جلایا اور میرے ہونٹوں میں دبی سگریٹ کے قریب لے آیا میں نے ایک لمبا کش لیا اور لاپرواہی سے دھواں اُڑانے لگا ''تم نے ان تخلیقات میں کیا پایا ہے جو تمھاری پہلی کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے؟ میں نے پوچھا۔ شاید ہم دونوں ہی کو اب رات بیتے جانے کا کوئی احساس نہیں رہا تھا۔

''ہاں! یہ ایک اچھا سوال ہے''۔ وہ بولا۔ ''دراصل ''مغرب کے اردو افسانے'' کتاب میں میں نے یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ افسانہ نگاروں کے موضوعات کیا ہیں، وہ کن کرداروں کی جانب توجہ دیتے ہیں اور کیوں؟ اور مغرب کے یہ اردو افسانہ نگار کن واقعات کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اب۔۔۔ اب۔۔''۔۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے یوں رکا جیسے کچھ یاد کر رہا ہو اور پھر بولا۔

''میں نے اپنے تئیں یہ کام تو جہاں تک ممکن تھا پورا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ یہ اردو افسانہ نگار جو مشرق سے ہجرت کر کے مغرب میں آن بسے ہیں اور انہوں نے ان نئے ممالک میں پیش آنے والی تمام تر مشکلات اور اپنے سماجی و معاشی مسائل کے باوجود اب تک اپنا تخلیقات کا سلسلہ منقطع نہیں کیا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سارے سفر نے انہیں تخلیقی سطح پر کس طرح متاثر کیا ہے؟ اور اس سفر کے دوران اُن کی شخصیت اور سوچ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں تو یہ کس موڑ پر رونما ہوئیں اور ان تبدیلیوں کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ ''مغرب میں اردو افسانے'' کے کام کو اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ مغرب میں اردو لکھاریوں کی تخلیقات میں پوشیدہ ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات میں اجتماعی مشترکات سامنے آئیں اور دیکھا جائے کہ انہوں نے ماضی کی بوسیدہ روایات اور تنگ نظری سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا اور اس طرح اُن کی شخصیات میں عالمگیریت کے جو رنگ داخل ہوئے ہیں، حقائق کے ان کئی رخوں اور رنگوں نے اردو ادب پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں؟'' میں نے اسے کچھ وضاحت کرنے کو کہا تو وہ بولا ''میں نے محسوس کیا ہے کہ اپنے اپنے ملکوں اور معاشروں سے ہجرت اور مغربی ممالک میں طویل قیام کے بعد اردو ادیبوں میں بین الاقوامیت اور انسانی اخوت و ہمدردی پروان چڑھی ہے اور میں ان کی تحریروں میں یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ ان میں سے بیشتر ادیب ملک و مذہب، رنگ و نسل اور ثقافتی تنگ نظری کی حدود سے باہر نکل چکے ہیں اور وہ اپنے نظریات اور طرز زندگی پر گامزن رہتے ہوئے دوسروں کے نظریات کا بھی

احترام کرتے ہیں۔ میں اس چیز کو بھی اجاگر کرنا اور سامنے لانا چاہتا ہوں اور دوسری جانب کئی ثقافتوں کے درمیان روزمرہ کی اپنی زندگی گزارنے والے ان اردو افسانہ نگاروں کو ان کے اپنے قبیلے کے "مین اسٹریم" والے کن خانوں میں رکھتے ہیں؟ یہ ہے وہ کام جو میں کرنا اور اسکے لئے تم جیسے دوستوں کا تعاون چاہتا ہوں"۔ اتنا کہنے کے بعد اب وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا گویا مجھ سے کوئی اقرار کرانا چاہتا تھا۔ ابھی میں کچھ سوچ رہا تھا کہ وہ پھر بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ جب واپس اوسلو جاؤں تو اس کام کا آغاز کردوں، خاکہ تو میں نے تمہیں بتا ہی دیا ہے اب میں امریکہ، برطانیہ، جرمنی، کینیڈا وغیرہ میں دوستوں کو بھی لکھنا چاہتا ہوں اور سائیں سچا، تم اور خالد کو تو خاص طور پر اس کام میں ساتھ ملانا چاہتا ہوں، اب جب میں اوسلو جاؤں گا تو تم تینوں کو اپنے منصوبے کا باقاعدہ خاکہ بنا کر بھیجوں گا اور پھر۔۔۔"۔۔ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔۔۔۔

"ٹھیک ہے سعید یار! یہ باتیں تو اپنی جگہ جب کہو گے ہم بھی "سوچیں" گے کہ تمہارے "سوتے جاگتے خواب" کی کیا تعبیر نکلتی ہے؟ ہاں یہ امید قائم ہے کہ جب تم اپنے منصوبے پر چل نکلو گے اور تمہارے دوست احباب ساتھ ہونگے تو "سب اچھا ہوگا" اب ہمیں سونا چاہئے"۔ میں نے اپنی سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا۔ "کل ہمیں اس تقریب میں بھی جانا ہے جو تمہارے اعزاز میں شہر میں منعقد ہو رہی ہے۔ یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے کل تمہیں اپنا ایک افسانہ سناؤں گا "ابرزادی"۔۔۔۔ یہ نیا افسانہ ہے" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور اپنا بستر لگانے لگا۔ میں نے بھی اپنا کمبل لیا اور صوفے پر ہی دراز ہو گیا۔ "اچھا سعید یار "شب بخیر" اب صبح سوچیں گے۔۔۔۔"۔۔ میں نے اپنا کمبل تان لیا تھا۔

"شب بخیر" اس کی آواز آئی، اور پھر اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ مجھ سے پہلے بیدار ہو چکا تھا اور اپنے آپ انجکشن لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ایک عرصہ سے "شوگر" کا مریض تھا اور ہر روز صبح سویرے اسے اپنے بلڈ پریشر اور شوگر کی دوائیں کھانا اور انجکشن لگانا پڑتا تھا۔

ناشتے کی میز پر آج وہ بہت ہی خوش اور ہشاش نظر آرہا تھا اور اپنے بچوں یاسر اور حنا اور بیوی طلعت سے دن کے پروگرام پر باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ میری اہلیہ ھما کی خدمت گزاری کو سراہ رہا تھا اور وہ تھی کہ اس کی باتوں پر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ انہیں باتوں کے دوران اب وہ وہی رات والا موضوع چھیڑ بیٹھا تھا۔ "یار تم اور سائیں سچا گرمیوں میں چند دن کے لئے میرے پاس اوسلو کیوں نہیں آجاتے اور جس منصوبے کا میں نے رات کو ذکر کیا تھا اسے بھی دیکھ لیں گے اور پھر اکٹھے اس پر عمل بھی شروع کر دیں گے اور سیر بھی ہو جائے گی"۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا شائد اسے کچھ اور یاد آگیا تھا۔ "تم ڈینش کہانیوں کے اپنے تراجم کا مجموعہ کب چھپوا رہے ہو؟" وہ بڑی خود اعتمادی سے بولا۔

"یار سعید! اب تم ان باتوں کو چھوڑو، دیکھو یہیں بیٹھے بیٹھے ایک بجنے کو ہے، تم اٹھو اور تیاری کرو، جہاں تمہارے اعزاز میں "شام افسانہ" کی تقریب کا شہر میں اہتمام کیا گیا ہے، وہ جگہ یہاں سے قدرے دور بھی ہے، تم چھوڑو ان باتوں کو اور اٹھو اب۔ بس تیاری کرو، نہالو ویسے بھی آج جمعتہ المبارک ہے، یار اٹھو!" میں نے کہا۔ ھما اور طلعت آپا ناشتے کے برتن اٹھا رہی تھیں اور دونوں بچے یاسر اور حنا آپس میں چھیڑ چھاڑ میں لگے ہوئے تھے۔ وہ اٹھا اور بچوں کی جانب بڑے پیار سے دیکھتا ہوا باتھ روم کی طرف چلدیا۔ "کتنی دور ہے وہ جگہ جہاں تقریب منعقد ہونا ہے؟" اس نے جاتے جاتے پوچھا

"ذرا دور ہے یہاں سے، کوئی آدھ پون گھنٹہ ہو سکتا ہے لگ جائے"۔ میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو، اب میں تیار ہوتا ہوں، آدھ پون گھنٹہ کا سفر، میں تمہیں دس پندرہ منٹ میں لے جاؤں گا" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے پیچھے باتھ روم کا دروازہ بند کر چکا تھا۔

تھوڑی دیر میں شیو کر کے وہ باتھ روم سے باہر نکلا۔ "کہو کیسا لگ رہا ہوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے شرارتاً پوچھا۔

"سمارٹ!" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارے کان کے قریب شائد تھوڑا سا صابن لگا رہ گیا ہے۔

وہ مسکراتا ہوا واپس باتھ روم میں چلا گیا۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ وہ باتھ روم کے دروازے کی دہلیز کا سہارا لئے کھڑا، ہمیں متوجہ کرنے کیلئے کچھ کہتے ہوئے لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کا دایاں بازو قدرے آگے بڑھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس کا کوئی ناٹک سمجھا۔ "سعید یار اب مذاق کا وقت نہیں!" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ ناٹک نہیں کر رہا تھا۔۔۔۔ "مجھے۔۔ فا۔۔۔ف۔۔۔ فا۔۔۔ ل۔۔۔۔ ج، فالج" اسکی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا، اور طلعت آپا کی مدد سے اسے صوفے پر ہی لٹا دیا۔ ھما اس کے فالج زدہ بازو کی مالش کر رہی تھی اور طلعت آپا اس پر جھکی اسے حوصلہ دلا رہی تھیں۔ دونوں بچے ایک دوسرے سے چمٹے ماں سے لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی سے ایمبولینس کو ہنگامی مدد کے لئے فون کیا تو ایک ڈاکٹر اور اسکا مددگاریوں حاضر ہوگئے

جیسے بالکل گھر کے دروازے کے باہر پہلے ہی سے منتظر تھے۔ فوری طبی امداد کے تحت انہوں نے آناً فاناً جو کر سکتے تھے کیا اور بڑی پھرتی کے ساتھ اسے اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں رکھ دیا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہسپتال تک کے آٹھ دس منٹ کے اس سفر میں اسکی آنکھیں کھلی تھیں، وہ میری بات سن سکتا تھا لیکن جواب دینے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر مسلسل اسکا بلڈ پریشر کنٹرول کر رہا تھا۔ ''تمھارے دوست کی حالت بہت، بہت ہی۔۔''۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا ''اسے ''برین ہیمرتج'' ہوا ہے اور یہ فالج دراصل ایک ضمنی عمل ہے'' ایمبولینس ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے احاطے میں رکی تو دو تین ڈاکٹر اور نرسیں وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ امدادی عملہ اسے اسٹریچر پر ہی ایمرجنسی وارڈ کے اندر لے گیا۔ ''تم بھی آسکتے ہو'' ایک نرس میرا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ ابھی ہم اندر جاکر بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک سرجن میرے پاس آتا ہوا بولا ''ہمیں افسوس ہے ہم یہاں کچھ نہیں کرسکتے۔ ہمیں مریض کو قریب ہی دوسرے ہسپتال میں لے جانا ہے جہاں سپشلیسٹوں کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ تمہیں بھی ساتھ ہی جانا ہوگا''۔

ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی بڑی تیز رفتاری سے جونہی دوسرے ہسپتال پہنچی تو اسے اسٹریچر ہی پر خصوصی وارڈ میں لے جاتے ہوئے، مجھے ویٹنگ روم میں انتظار کرنے کو کہا گیا۔

میں نے سعید کو سٹریچر پر بے حس و حرکت لیٹے ہوئے دیکھا۔ اسکی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پتلیوں میں جنبش تھی۔ میری اپنی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ویٹنگ روم میں بیٹھا، سر جھکائے میں طلعت آپا، بچوں، یاسر اور حنا کے بارے میں سوچ رہا تھا اور سعید کی صورت حال میرے سامنے تھی۔ میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ ایک ڈاکٹر نے میرا شانہ تھپتھپایا ''جس مریض کو ''ہیآرلود'' ہسپتال سے یہاں لایا گیا ہے کیا تم ہی اس کے ساتھ آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ڈاکٹر خیریت تو ہے نا؟'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

''ویسے تو ابھی تک خیریت ہے البتہ تمہارے عزیز کی حالت اچھی نہیں'' وہ مجھے اپنے ساتھ لئے چلتے ہوئے بولا۔ اب ہم ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ''یہ تمہارا۔۔ عزیز'' اس نے ایک بستر کی جانب اشارہ کیا۔

سعید انجم لیٹا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ دیکھنا چاہا تو ڈاکٹر نے ایک لمحے کے لئے مجھے روک لیا۔ ''سنو اس حالت میں اگر یہ آٹھ گھنٹے گزار گیا تو ممکن ہے اڑتالیس گھنٹے بھی گزار جائے اور اگر یہ کسی صورت بچ گیا تو زندگی بھر کے لئے چلنا پھرنا تو درکنار یہ بول بھی نہیں سکے گا۔۔۔۔ میں تمہیں یہ بتا کر مایوس نہیں کر رہا ہوں، فالج کی وجہ سے اس کے جسم کا دایاں حصہ بالکل مفلوج ہو چکا ہے اور ''برین ہیمرتج'' بھی انتہائی گمبھیر ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم اسے دیکھ لو اور یہاں بیٹھے رہنے اور انتظار کرنے کی بجائے گھر والوں کو جاکر صورتِ حال سے آگاہ کردو، تمہارا فون نمبر تو اب ہمارے پاس ہے ہی''۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے جھک کر اس کے چہرے پر دیکھا۔ اور پھر ضبط نہ کرسکا۔ وہ نہ بول سکتا تھا اور نہ پہلو بدل سکتا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور ڈبڈبائی بھیگی آنکھوں سے اسے خدا حافظ کہتا ہوا کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وہی ڈاکٹر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی ''اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم تمہیں فوراً مطلع کرینگے''۔

میں ڈگمگائے قدموں اور بوجھل سر کے ساتھ ہسپتال سے باہر نکلا اور ٹیکسی لے کر سیدھا گھر پہنچا۔ میں نے طلعت آپا اور بچوں کو تسلی دی۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کا فون آچکا تھا۔ میں نے اسے واپس فون کیا تو اس نے بتایا کہ بہتر یہی ہوگا کہ ہم سعید کے پاس آجائیں ''ہمارا مشاہدہ ہے کہ مسلمان ایسے وقت میں مریض کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتے ہو جب وہ۔۔۔۔''۔۔ ڈاکٹر کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ ''ہم پہنچ رہے ہیں'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ فون پر گفتگو سے طلعت اور حما نے اندازہ کر لیا تھا اور وہ بچوں کو ہسپتال ساتھ لے جانے کے لئے تیار کر چکی تھیں۔

کوئی پندرہ بیس منٹ میں ہم ہسپتال کے اس وارڈ میں تھے جہاں سعید کو رکھا گیا تھا۔ ابھی ہم ویٹنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک نرس نے مجھے باہر بلایا اور اپنے دفتر میں لے گئی۔ ''بیٹھو!'' اس نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ ''دراصل میں تمہیں اس لئے یہاں لائی ہوں کہ تمہیں بتا سکوں کہ۔۔۔۔ کہ، تمہارا عزیز۔۔''۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھا ہوا تھا۔ ''تم چاہو تو میں تمہیں اس کے پاس لئے چلتی ہوں''۔ وہ میرا بازو تھامے مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ''وہ رہا تمہارا عزیز! دیکھو تو کیسے آرام میں سو رہا ہے''۔

''سعید! یہ تم نے کیا کیا یار؟ یار!۔۔۔۔ تم؟'' میں اسکی میت سے لپٹا آنسو بہا رہا تھا۔ ''تمھیں صبر کرنا چاہئے۔۔۔۔ صبر، اب تمھیں اپنے ان عزیزوں کو بھی بتانا ہوگا جو انتظار گاہ میں بیٹھے ہیں''۔ نرس بولی۔ اور مجھے بازو سے سہارا دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے جانے لگی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، تین شمعوں کی ہلکی نیلگوں روشنی میں، وہ بڑے آرام کے ساتھ بیڈ پر لیٹا ہر قسم کے دکھ درد سے آزاد، گہری نیند سو رہا تھا۔

''کیسا ہے سعید! کیا حال ہے اس کا؟''

بقیہ صفحہ نمبر ۵۴ پر

غزلیں

ایم. آئی. ساجدؔ
Postfach 1249
D-79782 Lauchringen
GERMANY



قریب آئے کہ دور بھاگے کوئی بھی صورت بھلی نہیں ہے
یہ زندگی بھی عجیب شے ہے کبھی ہے بس میں کبھی نہیں ہے
تجھے میں اپنا بناؤں کیسے، گلے سے اپنے لگاؤں کیسے
ابھی ادھورا سفر ہے میرا، ابھی تو منزل ملی نہیں ہے
فضول ہے اب، اے جان مجھ سے کسی طرح کی امید رکھنا
میں مر چکا ہوں نہ جانے کب کا اگرچہ میت اٹھی نہیں ہے
نصیب میرا برا تھا یا پھر وفا میں کوئی کمی تھی شائد
کہ جس کو چاہا سبھی سے بڑھ کر اس کی چاہت ملی نہیں ہے
رواں ہیں آنکھوں سے اپنی آنسو، عجیب موسم ہے عاشقی کا
غموں کے بادل تو چھٹ گئے ہیں مگر یہ بارش تھمی نہیں ہے
ڈرو نہ ہرگز قدم بڑھاؤ، در فلک کو اکھاڑ پھینکو
دعائیں کرنا عبث ہے ساجدؔ قبولیت کی گھڑی نہیں ہے

رات گئے جب گھر جاتے ہیں
اپنے آپ سے ڈر جاتے ہیں
سورج نکلے تو خوابوں کے
گھنگرو ٹوٹ بکھر جاتے ہیں
تیشہ ہو یا ریل کی پٹری
مرنے والے مر جاتے ہیں
اب آنکھوں کے خالی دریا
کیوں اشکوں سے بھر جاتے ہیں
وہ بھی دیکھ کے چپ رہتا ہے
ہم بھی روز گزر جاتے ہیں
سوکھے پیڑ کی شاخوں سے
پنچھی ہجرت کر جاتے ہیں
زندہ ہو احساس تو ساجد
پھول بھی زخمی کر جاتے ہیں

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد
Res. Seemant Nagar,
Kanchan Behan Marg
Lucknow - 226022

صبح کی تیز دھوپ میں، اسکے سوا بہت ہوا
دل کی کلی نہ کھل سکی، رقصِ صبا بہت ہوا
پہنی زرہ ہوس کی پھر، سوچ کے میں نے آخرش
مقتلِ راہِ شوق میں، کارِ وفا بہت ہوا
ہوگی ہر اک دعا قبول، قبلہ بدل کے دیکھ لو
کعبۂ شہرِ یار میں، سجدہ ادا بہت ہوا
پھرتی رہی برہنہ سر، بانوئے شہرِ حرّیت
کوئی مگر نہ لاسکا، ذکرِ ردا بہت ہوا
اُسکے بدن کی چاندنی، فکر میں میرے ڈھل گئی
رنگِ سخن کے واسطے، رنگِ قبا بہت ہوا
یہ بھی خدا کی شان ہے، رزم گہہِ حیات میں
زخم تو مجھ کو کم لگے، حشر بپا بہت ہوا

معمول پہ ساحل رہتا ہے، فطرت پہ سمندر ہوتا ہے
طوفاں جو ڈبو دے کشتی کو، کشتی ہی میں اکثر ہوتا ہے
جو فصلِ خزاں میں کانٹوں پر، رقصاں و غزل خواں گزرے تھے
وہ موسمِ گل میں بھول گئے پھولوں میں بھی خنجر ہوتا ہے
ہر شام چراغاں ہوتا ہے، اشکوں سے ہماری پلکوں پر
ہر صبح ہماری بستی میں، جلتا ہوا منظر ہوتا ہے
اب دیکھ کے اپنی صورت کو اک چوٹ سی دل پر لگتی ہے
گزرے ہوئے لمحے کہتے ہیں، آئینہ بھی پتھر ہوتا ہے
اس شہرِ ستم میں پہلے تو منظورؔ بہت سے قاتل تھے
اب خود ہی مسیحا قاتل ہے، یہ ذکر برابر ہوتا ہے

وصیت



نعیمہ ضیاء الدین
SCHOPENHAUER STR32
63263 NEU- ISENBURG
(Germany)

شبنمی رات دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ رخشی نے اخبار سے نظر اٹھا کر انوار کی جانب رخ پھیرا۔ خواب گاہ کی حرارت بخش پُر سکون فضا جو تھکے ہارے انسان کو صرف رات میں ہی دستیاب ہوتی ہے اپنی آسودگی کے باعث اس لمحے کس قدر خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ بالخصوص یورپ کی مسابقت بھری مشینی زندگی میں کہ جہاں انسان رفتہ رفتہ اپنے ہی پھیلائے ہوئے خواہشوں کے شیطانی جال میں غیر محسوس طریق پر الجھتا جا رہا ہے۔ انوار آج کی موصول شدہ ڈاک دیکھ رہا تھا۔ ''تم ہسپتال گئے تھے فیصل کو دیکھنے.... '' رخشی نے اخبار لپیٹ کر اس سے دریافت کیا۔

''ہاں.... '' وہ اداسی سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

تو پھر۔ بچے کی حالت کیسی تھی...؟''

''بدستور.....'' انوار کے لہجے میں حزن کی آمیزش نمایاں تھی۔

''جب تک کڈنی ٹرانسپلانٹ نہیں ہوتی تب تک تو بہتری کے آثار یا امکانات مفقود ہیں''۔

''انوار تم نے یہ خبر دیکھی۔۔۔اسی کو پڑھکر مجھے فیصل کا خیال آیا تھا۔ یہاں لکھا ہے کہ ایشیائی کمیونٹی میں آرگن ڈونیٹ کرنے یا خون کا عطیہ دینے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے''۔

''وہ تو ہے''۔۔انوار مسکرایا۔اب میں سمجھا کہ تم کیوں ''ول'' (will) کے لئے زور دے رہی ہو۔ اور کیوں ڈونر (doner) کارڈ حاصل کیا ہے''۔

''نہیں ....'' رخشی نے نگاہیں جھکالیں۔ ''تم اب بھی شائد مکمل طور پر نہیں سمجھے''۔

''اچھا''۔۔انوار پُر خیال انداز میں سر ہلانے لگا۔۔''ڈرتی ہو۔۔۔؟ ہے نا''۔۔

''ہاں''۔۔

''موت سے۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ موت سے۔۔۔ مجھے بچپن سے ہی تنگ یا بند جگہ کا خوف لاحق ہے۔۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔۔۔ قبر کا۔۔۔ لحد کا۔۔۔اور سلوں کے پیچھے بند ہو جانے کا۔۔۔ منوں مٹی تلے دفنانے کا تصور ہی میری سانسیں روک دیتا ہے''۔

''لیکن مردے سانس نہیں لیتے۔ اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ دفنایا جائے یا جلایا جائے''۔۔

''پر زندہ کو تو پڑتا ہے نا۔۔۔اس سوچ سے ہی سانس رکتی ہے کہ موت کے بعد کیا ہوگا۔۔۔اور پھر بقول تمہارے اگر مردے کے لئے دفنانا یا جلانا یکساں ہے تو کچھ بھی ہوتا رہے۔ آخر کیا فرق پڑتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مرنے کے بعد میرے تمام اعضاء ڈونیٹ کئے جائیں اور باقی جسم سپرد آتش کر دیا جائے''۔

''ٹھیک ہے، مردے کو تو شاید کوئی فرق نہ پڑے لیکن زندوں کو۔۔ یعنی ان کو جو اس ڈونر کے فیملی ممبر ہیں انہیں بہت فرق پڑے گا۔۔ رخشی! تم اس شہرت یافتہ خاتون قلم کار کو کیوں بھول جاتی ہو کہ جس نے ایسی ہی سپرد آتش کر ڈالنے کی وصیت کی تھی اور اسے کس طرح سے ہدف ملامت بنایا گیا۔۔ سب سے زیادہ تنقید کرنے والی تو ایک عورت ہی تھی۔۔ ایسی عورت جو خود قلم کار بھی ہے۔۔۔۔۔۔ محض جنسیات پر لکھ لکھ کر شہرت کمانے والی عورت۔۔ایک ایسی قلم کار کو بھی سپرد آتش کر ڈالنے والی وصیت پر اعتراض تھا۔۔ عوام کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ عام روش سے ہٹ کر قدم اٹھانے کی غلطی کوئی معروف شخصیت بھی کرے تو اس کی دھجیاں اڑا دی جاتی ہیں''۔

''کمال ہے'' رخشی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور آزردگی کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔۔ سینے میں گرہیں ڈالتے حرف لبوں پر بلبلوں کی مانند پھوٹتے چلے گئے۔

''کم از کم انسان کو اپنی موت کے بعد تو اپنے جسم پر اختیار مل ہی جانا چاہیئے۔۔۔ میرے آرگن میرے ہیں۔۔۔ میں جو چاہوں ڈونیٹ کردوں اور بقیہ جسم جہاں چاہوں پھینک دوں''۔۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے۔۔۔؟'' انوار نے رُخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔۔''معاشرے کے جنگل میں بااختیار شکاریوں نے اپنے ہی جیسے باقی سب انسانوں کو بہتر چارے کے طور پر اپنے حصولِ اقتدار کی خاطر اپنی مرضی اور خوشی کے مچان پر باندھ رکھا ہے۔ ہر جاندار کیلئے ایک مخصوص دائرہ یا حلقہ ہے، جس سے باہر نہیں نکلا جاسکتا۔۔۔ اور اس سے ہٹ کر قدرت کے اصول بھی دیکھو تو اس نے اپنی ہی حد بندی کر رکھی ہے۔ حتیٰ کہ زمین کی بھی کششِ ثقل ہے، جس سے نکلنے کا راستہ نہایت دشوار ہے''۔

لیکن زندگی کی حد تک نا۔۔ موت کے بعد بھی زندگی کے اس خیر و شر میں حصہ داری نباہنا کہاں کا انصاف ہے''۔۔

''جو بھی رائج ہے سو رائج ہے''۔۔

انوار نے خطوط سمیٹ کر ٹیبل پر رکھے اور خود بستر پر دراز ہو گیا۔

"انوار شام میں تمہارا کیا پروگرام ہے" رخشی نے میز پر ناشتہ لگاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔۔۔انوار تولیہ شانے پر لٹکائے ابھی ابھی واش روم سے باہر آیا تھا۔۔۔۔ بالوں کو نرم ہاتھوں سے تھپکتے اور سوچتے ہوئے بولا۔۔۔

"وہی۔۔۔ حسب معمول ویک اینڈ پر کیسینو"۔۔اس کا لہجہ اُسی مخفی جوشیلی راحت سے لبریز تھا، جو ہفتے کے پانچ یکساں دن گزارنے کے بعد پانچویں شام میں اسطرح دریافت ہو جاتی ہے گویا زندگی اپنے ہونے کا اور وقت اپنی موجودگی کی کشش کا احساس دلادے۔۔رفتار سفر دائرے میں گھومتے گھومتے تھم کر ایک جلتی بجھتی روشنیوں کے اسرار میں لپٹی عمارت کے دروازے تک لے آئے۔۔۔ جس پر درج ہو "ویک اینڈ" موجودہ زمانے کا ہر شخص جس کا شدت سے منتظر رہتا ہے۔۔۔۔ بچے سے لے کر بڑے تک۔۔۔

سنی اور سپنا ابھی تک ناشتے کی میز پر موجود نہیں تھے۔۔۔رخشی نے ایک کرسی کھینچی اور اس پر ٹک گئی۔ علیم الدین صاحب کے ہاں آج میلاد ہے۔"۔۔

"اوہ۔۔۔"انوار بھی ساتھ والی نشست پر آبیٹھا۔۔۔

"آج تو جمعہ بھی ہے"

"ہاں۔۔ ڈیڈ۔"۔۔ سنی اپنے کمرے سے باہر آتے آتے پکارا۔ آج تو جمعہ ہے اور مسجد میں "پرے"(Pray) کیلئے بھی جانا ہے"

"نماز۔۔ بیٹا۔۔جمعہ کی نماز کے لئے جانا ہے"۔۔رخشی نے بیٹے کی تصحیح کی

"سوری مام۔۔ نماز جمعہ کیلئے۔۔اب تو ٹھیک ہے"

"ہاں"۔۔ رخشی نے اثبات میں سر ہلایا۔۔

"سنی نے خواب یاد دلایا۔۔۔تم بہر حال جمعہ پڑھنے تو جاؤ گے ہی۔۔اور سنی بھی جائے گا"۔۔ ہا۔۔۔ں۔۔۔ں۔۔۔ں۔۔" انوار نے ایک طویل ہنکارا ابھرا۔۔۔

"چلو ایسا کر لیتے ہیں۔۔۔کہ جمعہ کے بعد ذرا سی دیر کو علیم الدین کے ہاں ہو آئیں گے۔۔۔یہ سوسائٹی میں منہہ دکھانے کا بڑا مسئلہ ہے۔۔۔ذرا سی کوئی شکایت ہو جائے تو وہ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔۔۔وہاں سے اپنے دوستوں کی طرف ہوتا ہوا میں ان کے ساتھ کیسینو چلا جاؤں گا"۔۔

"اور مجھے ادھر پھنسا جاؤ گے۔۔۔ علیم صاحب کے گھر"۔۔

"نو ماما۔۔ سپنا بھی گفتگو میں حصہ لینے کیلئے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی"۔۔ آف کورس میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ مگر صرف تھوڑی دیر کو۔۔۔مام ہم تو آج رات فلم دیکھنے جارہے ہیں نا۔۔۔ آپ چاہیں تو آپ بھی اپنی فرینڈ کے ساتھ پروگرام بنالیں۔۔۔ سنی تو as usual ڈسکو میں ہی ہوگا—" وہ تینوں بہت جلدی میں تھے۔ سنی نے سپنا کی بات پر اثبات میں سر ہلایا۔۔۔

"ہاں مام۔۔۔ پرے کے ختم ہوتے ہی میں چلا جاؤں گا۔"۔۔

"بائی۔"۔۔

"بائی۔"۔۔

نشست گاہ میں گرمائی دوپہر کی سنہری دھوپ اپنی نصل کاشت کر چکی تھی۔ کھلی کھڑکی سے باہر منظر کے کینوس پر زرد شگوفوں کے گچھوں میں نیم مستور سرخ آتشیں رنگت کا لمبی چونچ والا پرندہ کچھ کریدنے میں لگا تھا۔ زندگی کے کیلنڈر پر اور ایک ہندسہ اپنی گنتی کے اختتام کی جانب رواں تھا۔۔۔نارسیدہ لمحوں کا خود ساختہ سلسلہ جسے سہولت کی خاطر وقت کے عنوان سے پکارا جاتا ہے اور جس کی رقص گاہ میں اسرار اور رموز کے دائرے بنا حرف احتجاج کے محض گھومتے رہنے پر مجبور ہیں۔ نشست گاہ کا فرنیچر باہر پائیں باغ میں نکال دیا گیا تھا۔ جہاں خواتین اور لڑکیاں دیوار سے ٹیک لگائے سر ڈھانپ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ابھی ابھی قرآن خوانی کی مجلس کا اختتام ہوا تھا۔اور اب باہر والے مختصر لان کی جانب سے برتن لگائے جانے کی آوازیں نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ماحول تبدیل ہوتا چلا گیا۔ سب سے پہلے نوجوان دوشیزائیں اٹھیں اور صاحبِ خانہ کی نوجوان لڑکی کے ساتھ اس کے کمرے کو چل دیں۔ پھر خواتین کے سروں پر احتیاط سے جمائے گئے دوپٹے کھسک کر شانوں پر ڈھلکتے چلے گئے۔ بالآخر موضوعات تبدیل ہوگئے۔ اور اپنی اپنی دلچسپی کے امور و حالات پر تبادلہ خیال ہونے لگا۔ علیم الدین صاحب کے ہاں قرآن خوانی ختم ہو گئی تھی۔ میز پر سہ پہر کی چائے لگائی جا چکی تھی۔

"ماما آپ حد سے زیادہ آئیڈیا لسٹ ہیں۔"۔۔ سنی جھنجلایا ہوا تھا"۔ آئیڈیلیازم صرف کتابوں اور خیالوں میں اچھا لگتا ہے۔۔۔ ریالٹی (Reality) بالکل مختلف چیز ہوتی ہے۔ آپ کا جذبہ بہت اچھا ہے۔۔۔ ہم سب اسے پریز (praise) کرتے ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔"۔۔وہ ہچکچا کر خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیا بیٹے۔۔۔؟ اچھی بات کسی کو تو کرنی چاہئے۔۔ میرے خیال میں تو خیر! سب کو صرف اچھی بات کرنی چاہئے"۔

"جنت میں ہوا کریں گی اچھی اچھی باتیں۔۔ جانِ من۔۔۔انوار مسکرایا"۔۔اگر اس نے یعنی اوپر والے نے دنیا کو ہی فردوس بریں بنانا ہوتا تو پھر الگ دنیا کیوں بناتا۔۔۔یہاں یوں سمجھو کہ ایک ٹنڈر کھلا۔"جو ہے جیسا ہے"

کی بنیاد پر اسے سوسائٹی نے منظوری دی ہے اور حاصل کر لیا ہے"۔

"پاپا آپ تو بات کو بلاوجہ الجھاؤ میں لے جاتے ہیں"۔ سنی دوبارہ موضوع گفتگو کی طرف پلٹا۔ "آرگنز ڈونیٹ کرنا کوئی بری بات نہیں۔۔۔ یہ تو انتہائی اچھا ہے۔۔۔ ہم ایڈمائر Admire کرتے ہیں۔ لیکن۔!"

لیکن وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ اور لیکن پر زور دے کر اپنی بات کی اہمیت واضح کرتے ہوئے پھر سے گویا ہوا۔ "لیکن معاملہ اس سوسائٹی کا ہے۔ جس میں ہم نے زندہ رہنا ہے۔ اور موو (Move) کرنا ہے۔ صاف اور سیدھی بات بس اتنی سی ہے۔ باقی سب کا سب آئیڈیل ازم ہے۔۔۔۔۔۔ بس باتیں۔۔۔۔ اب آپ ایک غیر جذباتی سیدھی، اور صاف ریالٹی کو دیکھیں۔ ماما! آپ یا کوئی بھی شخص جو آرگن ڈونیٹ کر رہا ہے، جب مر جائے گا تو اس کی ڈیڈ باڈی وہاں ہسپتال پہنچانا ہوگی"۔ چیر پھاڑ کرنے کے لئے۔ اور اس کے فیملی ممبر رہ جائیں گے گھر پر جہاں لوگ تعزیت کو آتے ہیں۔ انہیں ان کا سامنا کرنا ہے۔ ان کے طنز کو سہنا ہے۔ اور منہ چھپائے پھرنا ہے۔ وہ باقی زندہ بچ رہنے والے یعنی اس وصیت کرنے والے کے رشتہ دار تو سر اٹھانے کے لائق ہی نہ رہیں گے"۔

سنی باقاعدہ طیش میں آ گیا تھا۔ جملے کے اختتام تک اس کی آواز بلند ہو گئی اور وہ جھلا کر، خاموش ہو رہا۔ "ہاں بھئی"۔ انوار دیر تک اثبات میں سر ہلائے گیا۔ "کہتا تو تمہارا بیٹا صد فی صد درست ہے۔ صرف اس ایک دن یعنی انتقال والے دن ہی نہیں بلکہ بعد میں بھی تا حیات ان بچ رہنے والوں کو بار بار سولی پر لٹکایا جائیگا۔ یہ ہیں اُس عورت کے بھائی، باپ، بیٹا یا بیٹی، جس نے اپنی لاش کی چیر پھاڑ کرا دی تھی۔۔۔ اور خود اس دنیا سے جاتے جاتے نار جہنم کو اپنے لئے منتخب کیا تھا۔۔۔ آہ۔۔۔ہ۔۔۔۔۔ہ۔ وہ سرد اور طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"رخشی دنیا بڑی سنگدل، ظالم، کمینی ہے۔ دوسرے کے دکھوں پر ان کی ذلت و جگ ہنسائی پر ہی تو اپنی مجلس سجائے بیٹھی ہے۔ ابھی تمہارے بچوں کی شادیاں ہونا ہیں۔ کون کرے گا ان سے رشتے یا کون ہوں گے ان کے سسرال والے۔ تمہاری موت کے روز یہ تو منہ چھپاتے پھریں گے۔ انوار دم بھر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے گویا گویا ہوا۔

"تم زندگی میں تو سب کے لئے پرابلم بنتی ہی رہی ہو اب مر کر تو مصیبت نہ پیدا کرو۔ ساری عمر میں تمہاری ذات پر یہ لطیفہ دہراتا رہا ہوں کہ کسی کی گھروالی دریا میں ڈوب کر مر گئی۔ لوگ پانی کے بہاؤ کے رخ اس کی لاش ڈھونڈنے کے لئے جانے لگے، تو ستم رسیدہ شوہر بولا کہ اسے الٹے رخ پر جا کر تلاش کرو۔ ہر کام وہ الٹا کرتی تھی۔ ضرور مری بھی الٹے رخ پر ہی ہو گی۔ خدارا کم از کم مرنے کے لئے تو سیدھا طریقہ منتخب کر ڈالو"۔

رخشی زچ ہو کر تیز آواز میں چلائی۔

"ہر وہ کام تو خوش اسلوبی، جوش اور لطف سے انجام دیتے ہو کہ جس سے اس معاشرے یا خاندانی نظام میں برائی کے جراثیم پنپنے کا بھرپور اندیشہ پایا جاتا ہو۔۔۔ قمار بازی، شراب، سود خوری، دھوکہ دہی اور در پردہ عورتوں سے گناہ آلود تعلق"۔

بچوں کی موجودگی کے سبب اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ مگر انوار کو جیسے اپنی الفاظ سے سہارا مل گیا۔

"یہی بات۔ یہی ایک نکتہ یار از ہی تو بتانا چاہتا تھا۔ ابھی ابھی جو تم نے خود کہا ہے۔ "در پردہ تعلق" تو گویا اصل حقیقت کا اظہار تو تم نے خود کر دیا ہے۔۔۔ کہ اک پردہ سا رکھو اور سب کچھ کرتے پھرو۔۔۔ مزے سے۔۔۔ بس وہ پردہ نہ اٹھ سکے کیونکہ غلاف کے باہر جو ننگی حقیقت ہے۔ یا جو مکمل سچائی ہے وہ کوئی نہیں سہہ پاتا"

"ماما پلیز آپ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کریں" سنی کے لہجے میں خاصی قطعیت تھی۔

"ہم سے یہ سب نہیں ہو پائے گا" وہ اپنی بات کہہ کر چل دیا۔ اب اس کے حساب سے وصیت باطل ہو گئی تھی۔ رخشی نے رات کی تاریکی میں ڈوبے کمرے پر نگاہ دوڑائی۔ انوار سو چکا تھا۔ اور اندیشے، خدشات، واہمے، خوف کی بے پناہ بھیانک صورتیں لے کر جاگ اٹھے تھے۔

"سنو رخشی۔۔۔۔۔ کیا تم واقعی ڈونیٹ کرنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔۔؟"

"ہاں"۔ وہ خود سے پورے یقین کے ساتھ مخاطب ہوئی۔۔۔ پر ایک باریک منحنی سی سرگوشی اور بھی تو ابھری تھی۔ بہت قریب، ساعت کے قریب۔۔ بلکہ ساعت کے اندر کہیں۔ جہاں خیال کی گردش خون کی روانی میں گھلنے کو آغاز کرتی ہے۔

"رخشی سچ تو یہ ہے کہ تم ڈرتی ہو۔۔۔!"

"ہاں" اس نے خوف کی دلدل میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے تھوک نگلا۔ رخشی کا حلق پوری طرح سے خشک ہو رہا

"ہاں میں ڈرتی ہوں۔۔۔ قبر کا خوف، مٹی تلے دب جانے کا خوف۔۔ مختصر جگہ پر بند ہو جانے کا خوف"۔

رخشی کی سانس کا پنڈولم اس تصور کے احساس سے ہی بے طرح تیز ہو گیا اور اس قدر شدت سے بجنے لگا کہ جیسے کوئی قوت پوری طاقت سے لوہے کے گھڑیال پر ضرب لگا رہی ہو "گڑل۔ گڑل۔ گڑل۔ خوف اس قدر بھیانک بھی ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اس وقت تک نہیں جانا جا سکتا کہ جب تک کسی کو خوف کی تاریک

ترکیھا میں ہاتھ، پیر باندھ کر پھینک نہ دیا جائے۔ لرزہ خیز سیاہی کی پتلی سی سرنگ میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جارہا جسم اپنی سانس میں خوف کو چھو کر محسوس کر سکتا ہے۔ اپنے ہر عضو کو اس گاڑھی بوجھل، کاٹ دار سیاہی میں دھنستا ہوا محسوس کر سکتا ہے۔ اور خود کو بے بسی کی سینہ چیر رہی وحشتوں کی تیز کاٹ دار دھار پر ریزہ ریزہ کٹتا ہوا محسوس کر سکتا ہے۔ مگر وہ کر کچھ نہیں سکتا"۔

رخشی تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اور تیز تیز سانسوں کی دھونکنی سے پھٹ رہے سینے کو معمول پر لانے کی اس پرانی المناک تگ ودو میں مصروف ہو گئی کہ جس میں وہ خود کو ایک عرصے سے الجھا ہوا پا رہی تھی۔

"کیا معلوم لوگ سچ کہتے ہوں"۔ کوئی سینے کے اندر سے کراہا۔ اب وہ اس گرداب سے باہر آگئی تھی۔ اور دوبارہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔

"لوگ کہتے ہیں کہ کٹا پھٹا جسم یونہی آدھا ادھورا اٹھے گا۔ روزِ قیامت اس کی بخشش نہیں ہوگی۔؟"

"تم مانتی ہو بخشش کو یا روزِ قیامت کو۔!"

"میں شک کا شکار ہوں۔ ہاں اور نہیں، میں پھنسا وجدان۔ کبھی اثبات تو کبھی نفی کا گمان۔ بیچ کا اندیشہ۔ تشکیک کا، ظن کا ہیولا۔ پر لوگ تو یہی کہتے ہیں اور عقیدہ بھی۔ کہ لاش کی بے حرمتی یا سپردِ آتش کرنا جائز نہیں۔۔۔ ایسا شخص گویا خود ہی جہنم قبول کر رہا ہے"۔ وہی کاٹ دار سرگوشی پھر ویسے ہی ساعت کے قریب نہیں بلکہ ساعت کے اندر خون میں گھل رہے خیال میں ابھری۔

"لیکن خوف!" وہ کراہ اٹھی۔ اصل وحشت تو خوف کی ہے۔ منوں مٹی تلے دب جانے کا خوف"

"جلنے کا ڈر نہیں ہے کیا؟"

"شاید ہے! پر دب جانے کا خوف"۔

رخشی نے جھرجھری سی لی۔ کالی گاڑھی سیاہی کی، کھنچتی دلدل پھر سے جسم کے ارد گرد اپنی وحشت ناک گرفت کا آکٹوپس جمانے کو بڑھتی چلی آرہی تھی۔

ویک اینڈ کی آخری رات انوار کے مشاغل میں ترتیب کے لحاظ سے گھر پر اک ذرا سا سکون حاصل کر لینے کی رات ہوا کرتی تھی۔

"جب بھی خرید کر لاؤ ایک دھڑکا سا ضرور لگا رہتا ہے"۔ اس نے سنہرے، چمکیلے سیال سے لبریز لانبی دیدہ زیب بوتل ہاتھ میں مضبوطی سے تھامی۔ اندر مشروب سبک روی کی نزاکت سے چھلکنے لگا۔

"کیسا دھڑکا۔؟" رخشی نے طعام گاہ میں برتن لگاتے اٹھاتے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہی اپنے کسی ایشیائی بندے کی نظر میں آجانے کا خدشہ"۔ نمایاں دلار آمیز دلداری و دلنوازی کے تسکین یافتہ جذبات میں سرشار ہو رہے انوار نے ہاتھ میں تھامے بلوریں پیالے کے اندر نزاکت کے ساتھ مطلوبہ مقدار ڈالی اور اسے اٹھا کر روشنی میں غور سے دیکھنے لگا۔

"پہلے کچھ دیر تو میں ہر ایک کاؤنٹر کا جائزہ لیتا ہوں کہ کس قطار میں کالے بالوں والا کھڑا ہے۔ جب پوری طرح سے تسلی ہو جائے تو کھانے پینے کے سامان میں چھپائی ہوئی بوتل نکال کر کاؤنٹر پر رکھتا ہوں"۔ سرور بخش لمحوں میں وہ مسلسل پرلطف گفتگو کرتا تھا۔

"ہم انسانوں سے کس قدر ڈرتے ہیں۔!"

"ہاں"۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیونکہ انہیں میں رہتے جو ہیں۔ یہ ایک ہی دنیا ہے۔ ہم اپنے اپنے سہنے کیلئے کوئی دوسری دنیا نہیں بنا سکتے"۔

راہداری میں رکھے فون کی گھنٹی پر دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ اور رخشی فون اٹھانے چل دی۔

"کس کا تھا۔؟" وہ فون سن کر واپس لوٹی تو انوار نے بڑا سا گھونٹ بھر کر دریافت کیا۔؟"

"علیم الدین صاحب کے گھر سے تھا۔ ان کے دادا کا انتقال ہو گیا ہے۔۔۔ وطن میں۔۔۔!"

"اوہو... ہو...... ہو"۔ انوار کے لہجے میں اک کوفت زدہ بیزار سی جھنجھلاہٹ ابھری۔ "بوڑھے آدمی تھے۔ پھر بھی علیم الدین کے ہاں جانا تو ہوگا۔ دنیا کی خاطر۔۔۔ تعزیت،

یاد

گھرے سناٹے کی چادر
جب ہر جانب تن جاتی ہے
جب تاروں کا جھلمل آنچل
شب لا کر اُسے اُڑھاتی ہے
سینے میں اپنے چھپاتی ہے
پلکوں کے زینے سے چڑھ کر
پھر ہولے ہولے آنکھوں میں
نیند اپنے پاؤں جماتی ہے
پردیس میں تب اک بیٹے کو
اپنی ماں یاد آجاتی ہے



بیگم آصف اظہار علی
Gulposh House 725
Greater Azad Enclave (W)
Sector - 1, Dhorral (Aligarh)

سوئم، قل وغیرہ۔ سب کچھ انجام دینا ہوگا ہاں ......ں"۔ رخشی کا لہجہ انتہائی ٹوٹا ہوا اور آواز بے حد دھیمی تھی"۔ ایک وقت کا کھانا بھی ہمیں اپنی باری پر پہنچانا ہوگا۔ پچیس، تیس لوگ ہیں اس علاقے میں اپنی جان پہچان والے جو کہ میت کے گھر پُرسے کو آئینگے"۔

"دنیا داری ہے رخشی ڈارلنگ۔ اِس بناوٹی، ظالم اور منافق دنیا کی دنیا داری کہ جس میں ہم رہتے بستے ہیں۔ جیتے مرتے ہیں--- یہاں جینے مرنے کا خراج دینا ہی پڑتا ہے"۔ انوار نے سنہری، چمکیلی، لانبی دلکش بوتل کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

"اک پردہ سا رکھنا ہے--- اب اسے ہی دیکھو کیسے کانچ کا غلاف اوڑھا ہے اس نے ورنہ یہ بہہ جائے گی۔ خلاص--- سب ختم--- انسان کو بھی پردہ، غلاف، دیوار منافقت وغیرہ وغیرہ چاہئے۔ ورنہ سب ختم۔ نہ سماج نہ سوسائٹی۔ نہ ملنے جلنے والے--- نہ اس حیوان ناطق کی بولتی چالتی زندگی--- آہ-- ہ-- ہا--- آ--- آ۔"-- اس نے ایک اور گھونٹ بھرا-- لطف و سرور سے اس کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں--- اور پسندیدہ دنیا اس کے تخیل کے دائرے میں آہستہ آہستہ اترتے سائے کی مانند آگے ہی آگے بڑھتی آرہی تھی۔ وہ دنیا کہ جس میں وہ اپنی خواہش کے مطابق رہنا سہنا چاہتا تھا۔ آرزوئیں جس جزیرے میں حسب منشا پھول کھلاتی ہیں۔ اور تمنائیں جہاں اپنی پگڈنڈیوں پر دور اندر تک دل کی انگلی تھامے لئے جاتی ہیں۔ ہولے ہولے سرگوشی میں من پسند انکشاف کرتے ہوئے کہ "آؤ وہاں چلیں جہاں روشنی، صبا، پرندے، نغمات اور پرشباب دوشیزاؤں کے جھرمٹ محض تمہارے انتظار میں چشم براہ ہیں——"

"کھانا کب لگاؤں۔؟ رخشی نے کچن سے نکل کر دریافت کیا تو اُسے جواب میں ہمیشہ کی طرح انوار کی اس مخصوص دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے سابقہ پڑا جو ہر ویک اینڈ کی شام پوری طرح سے سیر ہو جانے کا اپنا بھرپور نقش انوار کے ہونٹوں پر جمایا کرتی تھی--- پرسکون، سکھی، شانت مسکراہٹ۔

وہی گزشتہ ہفتے کا قرآن خوانی والا ماحول پھر سے روبرو تھا--- اندر نشست گاہ میں فرنیچر ہٹا کر سفید چادریں قالین کے اُوپر بچھادی گئی تھیں--- لڑکیاں، عورتیں دیر تک چنے پڑھتی رہیں--- باہر مردانے میں ہر آنے والا دعائے مغفرت کرواتا۔

"مرحوم بڑے نیک انسان تھے۔"--

"اس میں کیا شک ہے"۔

"پرانے وقتوں کے لوگ سچے، محنتی، اور ایماندار ہوا کرتے تھے"۔

"آج کی نسل تو مشینی ہے--- مشینی"۔

"علیم الدین صاحب ہماری تعزیت قبول کریں"۔

"ہم اس جانکاہ صدمے میں آپ کے ساتھ ہیں"۔

اندر عورتیں سپارے پڑھنے کے بعد اب گفتگو کے مرحلے پر پہنچ گئی تھیں۔

"انجام بخیر ہو جائے"۔

"ہاں--- بس یہی اللہ پاک سے دعا ہے کہ عزت رکھ لے۔"--

"مردہ خراب نہ ہو۔"--

"مسلمانوں نے اپنا علیحدہ قبرستان بنوا کر بڑا نیک کام کیا ہے"۔

"اب کم از کم تسلی تو ہو جاتی ہے کہ بے حرمتی نہ ہوگی"۔

"سنا ہے کہ اسپتال میں مرنے والے کے اعضاء ہی نکال لیتے ہیں"۔

"توبہ توبہ مردے کو بھی نہیں بخشتے"۔

"مرنے والا تو موت سے مرتا ہے پر اُس کے عزیز و اقارب مرنے والے کی بے حرمتی سے مر جاتے ہیں"۔

"توبہ ہے ایسی موت تو خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے--- جس میں لاش کی بھی عزت نہ رہ جائے"۔

"ہم تو یہ جانتے ہیں خوشی میں بھلے شریک نہ ہو غم میں ضرور شامل ہو جاؤ"۔

"بندہ ہی بندے کی دعا ہے--- آج تیری کل میری باری ہے"۔

رخشی آہستہ آہستہ چلتی باہر نکل آئی--- سامنے صدر دروازے کے قریب لوگ آجارہے تھے۔ علیم الدین صاحب اور ان کے جوان بیٹے مردوں سے گلے مل مل کر انہیں رخصت کررہے تھے۔ وہ سڑک پر پارک کی ہوئی اپنی گاڑی تک پہنچی۔ انوار اسٹیرنگ تھامے اُس کا منتظر تھا۔

"یہ رسم بھی بڑی سوچ بچار کے بعد بنی ہوگی"۔

"ہیں ....ں...کون سی رسم ..." رخشی نے بے دھیانی سے شوہر کو دیکھا۔

"یہی پُرسہ دینے اور تعزیت کرنے کی رسم--- غم بانٹ لینے سے گویا صدمہ آدھا ہو جاتا ہے"۔

ہوں...ں....ں....." رخشی نے ہنکارا ابھرا۔

"کیا سوچ رہی ہو۔؟"

ہو...وں....ں...کچھ نہیں ...."

وہ چلتی گاڑی سے باہر دیکھے گئی--- پھر کچھ دیر کے بعد سنجیدگی سے بولی۔

"میں ڈونر کارڈ واپس کررہی ہوں---- تم بھی میری ول (Will) پھاڑ دینا۔"--



A. L. S. JAMAL MOHAMED COMPANY

A HIGHCLASS VARIETY SHOP FOR ALL BAG, BRIEFCASE, LUGGAGE AND SHOE RELATED MATERIAL

38/A/7, Chandney Chowk Street, Calcutta - 700 072

Phone : 27-9982/26-3691

اے عید کے چاند



شگفتہ طلعت سیما
''شبلی ہاؤس''
۸۹/۵، رپن اسٹریٹ
کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۶

اے عید کے چاند
تیری سیمیں جھلملاہٹ کی گواہی میں
ہم دونوں نے
اپنی چاہت کا اقرار کیا تھا
پیار کرتے رہنے کی قسمیں کھائی تھیں
ایک دوسرے کے قدم سے قدم ملاکر
دکھ سکھ کی راہوں پہ چلنے کا وعدہ کیا تھا
اور
ہم دونوں
ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے
نشیب کی راہوں پہ چلتے ہوئے
جب فراز کے قریب آگئے
تو اس سے پہلے
کہ
مل جاتی منزل ہمیں
جانے کیا ہو گیا
کہ جیسے مجھ کو گہن لگ گیا
یا اُس چاہت کے اقرار کو کسی کی نظر لگ گئی
جس کا تو اکیلا شاہد ہے، گواہ ہے
وہ میرا غم گسار
وہ میرا ہم نظر
وہ میرا ہم سفر
وہ میرا ہم قدم
ایک دن چپکے سے
کہیں کھو گیا۔!!
تو نے کہیں دیکھا ہے اسے
تو بتا
اے عید کے چاند!

غزل



عاصم شہنواز شبلی
صدر شعبۂ اردو
دارجلنگ گورنمنٹ کالج
دارجلنگ

ہو کوئی اس طرح سرشارِ انا اچھا نہیں
اپنا ہی چہرہ نگاہوں میں رہا اچھا نہیں

یہ تو سچ ہے ان سے مل کر ہوں جدا اچھا نہیں
یہ بھی سچ ہے ساتھ ان کا ہو سدا اچھا نہیں

کون آیا ہے یہاں اور کون آئے گا یہاں
رات دن رکھا کرو یوں در کھلا اچھا نہیں

زندگی کا حسن آنکھوں سے نہاں ہو جائے گا
آئینے میں صرف خود کو دیکھنا اچھا نہیں

ہو کبھی خوشیوں کی بارش دل میں بھی میرے خدا
زندگی بھر سر پہ سایہ دھوپ کا اچھا نہیں

کب تلک چلتی رہے پامال رہ پر شاعری
ایک ہی ڈھب پر کریں تکیہ سدا اچھا نہیں

تجربوں نے کردیا ہے زندگی سے آشنا
جانتا ہوں کیا ہے اچھا اور کیا اچھا نہیں

زندگی ہے ایک میلہ یاد کا عاصم میاں
یوں اداسی کی ردا تو اوڑھنا اچھا نہیں

غزلیں

سید عبدالقادر شکیب
۱-۶-۴۱۱/۱۱/۱،A، مشیر آباد،
حیدر آباد-۵۰۰۰۴۸



یہ جھوٹی شان، یہ جھوٹی اُڑان رہنے دو
تم اپنی ذات کا کچا مکان رہنے دو

صلیبِ وقت لہو مانگتی ہے مانگنے دو
دلوں میں درد کا رشتہ جوان رہنے دو

مرے لہو سے ہے سارے چمن میں رنگینی
مرے لہو کا میاں، امتحان رہنے دو

روایتوں کا بھرم ٹوٹ کر نہ رہ جائے
روایتوں کو یونہی حرز جان رہنے دو

یوں سبز باغ دکھا کر نہ دل کو تڑپاؤ
مری زمیں پہ یہی آسمان رہنے دو

کسی کی یاد میں سب کچھ بھلا چکا ہوں شکیبؔ
مرا وجود نہ نام ونشان رہنے دو

ڈاکٹر پنہاں
1752 Alpine dr.
Cairollton TX 75007. USA

یہ کون مرے دل میں یہ کہتا ہے کہ میں ہوں
محسوس کروں اس کو تو لگتا ہے کہ میں ہوں

کیوں کھیلتا رہتا ہے نہ جانے کوئی دل سے
نادان کے ہاتھوں میں کھلونا ہے کہ میں ہوں

یادیں ہیں کہ رہ رہ کے سلگ اُٹھتی ہیں اکثر
بادل کوئی تھم تھم کے برستا ہے کہ میں ہوں

وہ رنگ وہ خوشبو مری اب مجھ میں کہاں ہے
یہ شاخ سے ٹوٹا ہوا غنچہ ہے کہ میں ہوں

رستے کا مجھے ہوش نہ منزل کی خبر کچھ
طوفان میں اُڑتا ہوا پتا ہے کہ میں ہوں

آنسو مرے ہنس ہنس کے یہی پوچھ رہے ہیں
سیلاب میں بہتا ہوا تنکا ہے کہ میں ہوں

جو برسرِ پیکار رہا تیرہ شبی سے
ہارا جو سحر سے وہ ستارہ ہے کہ میں ہوں

کچھ اور ہی عالم ہے مری ذات میں پنہاںؔ
دنیا میں کوئی اور ہی دنیا ہے کہ میں ہوں

رشمی بادشاہ
62 B, Tagore Road
Cantt. Kanpur 208001
(U.P.)

اکیلی چھوڑ کر دنیا میں مجھ کو کھو نہ جانا
میں ساری عمر جاگوں گی کہیں تم سو نہ جانا

سدا محسوس ہو جس کی خلش نس نس میں مجھ کو
کوئی ایسا ادھورا لمس مجھ میں بو نہ جانا

میرا دشمن تو سارا آسماں ساری زمیں ہے
میرے تم ہو تو ان جیسے کہیں تم ہو نہ جانا

جو تم نے روح کے اقرار نامے پر لکھا تھا
کہیں وہ نام اپنی زندگی سے دھو نہ جانا

ابھی تک آرزو کا درد میری جلد میں ہے
نئی حسرت کوئی دے کر مرے دل کو نہ جانا

خدا خود بولتا ہے شاعری میں سچ ہے رشمیؔ
وہ شاعر کیا زمانے کا مقدر جو نہ جانا

ڈاکٹر زینت اللہ جاویدؔ
Gulshan-E-Iqbal Colony
786 Chowk
Malerkotla - 178023 (PB)

تم دیکھتے ہو آئینہ بردار کون ہے
میں دیکھتا ہوں آئینہ کردار کون ہے

خود اپنے دل سے پوچھ گریباں میں جھانک کر
ہم بے وفا ہوئے تو وفادار کون ہے

دن میں چراغ دیکھ کے ہنستے ہیں مجھ پہ لوگ
میں ڈھونڈتا ہوں صاحبِ کردار کون ہے

دو پل کے واسطے کبھی آکر تو بیٹھ جا
یہ بھی تو دیکھ سایۂ دیوار کون ہے

میدانِ جنگ میں کسے پھولوں کی آرزو
دنیا یہ دیکھتی ہے کہ تلوار کون ہے

جاویدؔ ہم بھی حاشیہ بردار تو نہیں
کیا دیکھنا کہ رونقِ دربار کون ہے

سبھی کے تیور بدل رہے ہیں، میں سخت لہجے میں بولتا ہوں
بہت سے اُلجھے ہوئے سوالوں کی گرہیں اکثر میں کھولتا ہوں

اُسی کا جادو، اُسی کی خوشبو، مری غزل میں رواں دواں ہے
میں اپنی میزانِ زندگی پر اُسی کے خوابوں کو تولتا ہوں

یہ شہرِ وحشت، بہت دنوں سے مجھی کو پاگل سمجھ رہا ہے
میں تلخ لہجے کی محفلوں میں کبیرؔ بانی کو گھولتا ہوں

زرو جواہر کی شوخ دُنیا عجیب نظروں سے دیکھتی ہے
ترے تصور میں جی رہا ہوں، ترے خیالوں میں ڈولتا ہوں

بہت سویرے، وہ کون میرے قریب آکے، یہ کہہ گیا ہے
میں حرفِ آخر کہاں سے لاؤں، میں ہر زمانے میں بولتا ہوں

انور ندیم، 261-5th Lane, Nishatganj, Lukhnow - 7

MAHADEVIA
& MEHTA

پورے
خاندان کیلئے
ایک دکان

STANROSE • GWALIOR • Mafatlal • Siyaram's

EXCLUSIVE APPROVED RETAIL SHOWROOMS

• فیملی فیبرکس اور ہزاروں ہزار کٹ پیس۔ • سب سے بڑا کٹ پیس سینٹر۔

• کم قیمت میں بہترین شرٹ! آپ دیکھ کر ہی یقین کر پائینگے۔

PLUS
READYMADES

CERTIFICATE OF GUARANTEE
M & M
SHIRTS
Rs. 169/- to Rs. 229/- ONWARDS

WE ACCEPT
MAJOR
CREDIT CARDS

ضمانت کی سند
ایم اینڈ ایم شرٹس
۱۶۹تا۲۲۹روپے اور زائد

Roxy Cinema Building AND 2, Brabourne Road, Calcutta

مہا دیویا اینڈ مہتا

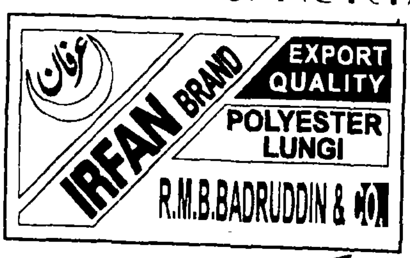
راکسی شوروم کے اوقات ۱۰ربجے سے ۸ربجے تک، سنیچر اور اتوار کو تمام دن کھلی رہے گی۔

رمضان کی مبارکباد قبول
فرمائیں اور عید کی خریداری
کیلئے تشریف لائیں!
خاندان بھر کیلئے
کپڑوں کا زبردست خزانہ!
سوٹنگ، شرٹنگ، بلاؤز،
ساڑیاں ڈریس مٹیریل
اور چادروں کا
زبردست اسٹاک اور
ہزاروں ہزاروں
★ کٹ پیس ★

آر۔ ایم۔ بی۔ پروڈکٹس

عرفان، معاذ، شابی اور صوفی برانڈ
ٹیری کاٹن لنگیاں اور کرتہ مٹیریل

SUITINGS, SHIRTINGS & KURTA MATERIALS



آر۔ ایم۔ بی۔ بدرالدین اینڈ کمپنی ۵۷، لورچیت پور روڈ، کلکتہ۔۷۰۰۰۷۳ فون : ۲۳۵-۹۶۵۴

R. M. B. BADRUDDIN & CO.

57, Lower Chitpur Road (96, Rabindra Sarani), Calcutta - 700 073 Ph : 235-9654

سچ کے سوا کچھ نہیں



سلطان جمیل نسیم (کراچی)

خالہ جان کے ہندوستان سے خط آتے رہتے تھے اور وہ اپنے ہر خط میں بچوں کے بڑے ہونے، پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ملازمت نہ ملنے اور لڑکیوں کے رشتے عنقا ہو جانے کے سلسلے میں ہر وقت پریشان رہنے کے بارے میں ضرور لکھتی تھیں اور آخر میں تان اس بات پر ٹوٹتی تھی کہ ان کو کسی طرح پاکستان بلالیں۔۔ ان کے خطوں میں اسقدر یکسانیت ہوتی تھی کہ ہم اکثر ان کا پوسٹ کارڈ پڑھے بغیر اپنی طرف سے خط کا مضمون اماں کو سنادیا کرتے تھے۔ خط سننے کے بعد اماں وہ پوسٹ کارڈ ہم سے لیکر چاروں طرف سے گھما کے دیکھتی تھیں اور پھر تکیہ کے نیچے رکھتے ہوئے کہتی تھیں۔

"ارے ہو سکے تو بلالو۔ میں بھی ایک نظر اُسے دیکھ تو لوں۔ اب وہی ایک تو رہ گئی ہے اماں باوا کی نشانی"۔

ہم اماں کو تسلی دیتے اور وہ مطمئن ہو جاتیں۔ کم از کم ہم یہی سمجھ لیتے تھے۔

ایک دن جب ہم دونوں بھائی دفتر میں بیٹھے نہایت ضروری ٹیلیفون کا انتظار اس طرح کر رہے تھے کہ باتیں ہونٹوں کا راستہ بھول گئیں تھیں اور کان ٹیلیفون کی آنے والی گھنٹی پر لگے تھے اب آئے کہ اب آئے۔ اس انتظار کے عالم میں میرا ذہن خدا جانے کیا کیا تانے بانے بن رہا تھا کہ بالکل بے دھیانی میں یکایک اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھ بیٹھا

"وقو۔ ہم خالہ جان کے خط پڑھے بغیر اپنی طرف سے جو مضمون گھڑ کے سنادیتے ہیں تو کیا ہم اپنی ماں کو دھوکہ نہیں دے رہے ہیں۔؟"

اس کا ذہن ابھی تک نہ معلوم کن خیالوں کی گزرگاہ میں بھٹک رہا تھا۔ میری بات سن کر پہلے تو حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر پوچھا۔

"کیا کہا آپ نے۔؟"

میں نے اپنی بات دہرائی تو وہ ہنس دیا۔

"دھوکہ کیسا بھائی جان۔ آپ نے ان کے کئی خط پڑھے ہیں۔ سب کا مفہوم ایک سا ہی ہوتا ہے۔ بس لفظ ذرا آگے پیچھے ہوتے ہیں"۔

"مگر وقو۔ میں سوچتا ہوں کہ....."

"ایک تو آپ مجھے وقو کہنا چھوڑ دیجئے۔ آپ جانتے ہیں وجاہت مرزا نام ہے میرا۔ اکثر آپ اسٹاف اور کلائنٹس کے سامنے بھی مجھے اس شارٹ نام سے پکار لیتے ہیں۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ دوسرے یہ کہ خالہ کے بارے میں نہ سوچا کیجئے۔ وہ وہاں اطمینان سے بیٹھی ہیں ہم یہاں......"

میں اُس کی بات سن کر ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر میں نے پوچھا۔

"تمھیں خالہ کی صورت یاد ہے۔؟"

"نہیں"۔

"ہاں کیا یاد ہو گی۔ سال بھر کے تو تھے۔ مجھے یاد ہے۔ میں کوئی بارہ تیرہ برس کا تھا جب پاکستان آیا اور اب چالیس کے پیٹے میں ہوں۔ مجھے ان کی صورت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ہم دونوں بھائیوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اماں سے زیادہ ہمارا لاڈ کرتی تھیں"۔

"مجھ سے کتنا لاڈ کرتی تھیں یہ مجھے تو ذرا یاد نہیں۔ ہاں آپ سے جو محبت جتاتی ہونگی تو اس کے پیچھے بھی کوئی مطلب ہو گا"۔

میں اس کی بات سن کر ہنس دیا اور بولا۔

"مجھ سے۔! ایک بارہ تیرہ سال کے لڑکے سے اُنھیں کیا مطلب ہو سکتا تھا"۔

"وہ اپنی کسی لڑکی سے آپ کے ساتھ شادی کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں"۔

"تمھیں یاد ہے۔؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا

"نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اماں سے سنا تھا"۔

میں نے معمول کے مطابق وقو کے اکھڑے ہوئے لہجے پر کوئی توجہ نہیں دی اور کہا۔

"خالہ کی بڑی بیٹی نفو اُس زمانے میں چار پانچ سال کی تھی۔ گول مٹول، سرخ سفید۔ اب تو بہت بڑی ہو گئی ہو گی"۔

"یہ نفو کیا نام ہوا۔؟"

میں نے کہا "نام تو اُس کا نفیسہ خاتون تھا مگر سب پیار میں نفو نفو کہتے تھے"۔

"اس کا مطلب ہے نام بگاڑنے کا رواج ہمارے خاندان میں خاصا پرانا ہے"۔

میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور کہا۔

"ابا میاں نے ساتھ آنے کے لئے خالو جان سے کتنا کہا مگر وہ مانے ہی نہیں۔ مٹی جو وہیں کی تھی"۔

"جو لوگ وہاں رہ گئے ہیں اُن سب کی مٹی وہیں کی ہے۔ پھر یہاں آنے کے لئے کیوں مرے جارہے ہیں"۔

"یار خاندان بکھر گئے ہیں۔ آجائیں تو ہمیں بھی سپورٹ ہو جائے گی۔ اللہ کے فضل سے ہمارا کاروبار بھی تو ایکسپینڈ (Expand) ہو رہا ہے"۔

"ابا میاں بھی اپنا مکان اُن کے نام کر آئے تھے۔ نانا کی جائداد میں سے بھی اپنا حصہ ان ہی کے نام کر دیا تھا۔ ہمارے مکان کا تو سنا ہے بیچ باچ کے تیا پانچا کر دیا۔ اب تک اُسی مشترکہ جائداد سے سانپ کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔ ہم نے تو کوئی کلیم (Claim) بھی نہیں کیا۔ وہ لوگ کسٹوڈین سے بھی بچے ہوئے ہیں۔ پھر یہاں آنے کے لئے کیوں تڑپ رہے ہیں۔؟"

میں جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وجّو نے کہا۔

"اب رہی یہ بات کہ ہمارا کام بڑھ رہا ہے۔ تو بھی ہمیں اُن کی سپورٹ نہیں چاہئے۔ یہاں آدمیوں کی کچھ کمی ہے۔؟ ٹیکنیکل کام پنجابی جس طرح کرتا ہے وہ کوئی نہیں کر سکتا۔ فزیکل لیبر میں آپ نے دیکھ ہی لیا۔ پٹھان سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ اِن ہندوستان سے آنے والوں کا دماغ تو ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ کام کم کرتے ہیں اپنی بادشاہی کے قصّے زیادہ سناتے ہیں۔۔"۔

ارے بھئی آنے والا کچھ نہ کچھ چھوڑ کر تو آتا ہی ہے اور جو چیز چھوٹ جائے اس کی یاد بہت عرصہ تک ساتھ رہتی ہے"۔

"جانے دیجئے اِن باتوں کو۔ وہ لوگ آگئے پھر بھی میں اُنھیں اپنے ساتھ نہیں رکھونگا۔ نجانے رشتے داری کی آڑ میں کیا کیا رعایتیں مانگ بیٹھیں"۔

اس موضوع پر میں اور وجّو شاید اور باتیں کرتے مگر پھر وہ ضروری ٹیلیفون آگیا جس کے انتظار میں ہم بیٹھے تھے۔ ساری باتیں آئی گئی ہو گئیں۔

خدا جانے اب یہ خالہ جان کے جذبے کی کشش تھی یا اماں جان کی دعاؤں کا اثر۔ کہ سقوط ڈھاکہ سے چار پانچ سال پہلے وہ پاکستان آہی گئیں۔ دو مرتبہ ان کے ویزے کی تجدید کرائی۔ ہمارے گھر کا ہی نہیں بلکہ دور پاس کے جس عزیز کے یہاں وہ ملنے کے لئے گئیں اس کا رہن سہن دیکھکر خالہ کا جذبہٴ رشک بڑھتا ہی گیا۔

وجاہت نے ایک بار اُن سے بہت ہی بے رُخی کے ساتھ بات کی تھی اور پوچھا تھا کہ ہمارا گھر کتنے میں بیچ ڈالا۔ خالہ نے جواب میں بچوں کی بیماریوں اور بیروزگاریوں کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد کہ ابا کے ایک دوست کاشی رام نے آٹھ ہزار روپے دیکر مکان اپنے پاس رہن رکھ لیا ہے۔ لڑکے کہتے ہیں انشاءاللہ اُسے جلدی چھڑا لیں گے۔ اتنا سننے کے بعد وجاہت نے ان سے پھر کبھی بات نہیں کی۔ اس لئے اکثر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کے اپنے قریب بیٹھا لیتیں اور اپنی خواہش کا برملا اظہار کر دیا کرتی تھیں۔

"بیٹا۔ ہم سب کو بھی تم پاکستان بلالو۔ وہاں تمہارے تین بھائی ہیں۔ یہاں آکے دست و بازو بنیں گے۔ ماشاءاللہ سب پڑھے لکھے ہیں۔ انگریزی تو ایسی فر فر بولتے ہیں کہ منہ دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ مگر جب تمہارا اردو میں لکھا ہوا خط جاتا ہے تو سب ایک دوسرے پر ٹالتے ہیں۔ آخر پنڈت کاشی رام سے پڑھوا کر سنتی ہوں۔ وہ خط کم سناتے ہیں املے اور قوائد کی غلطیاں زیادہ نکالتے ہیں۔ اُن کا یہ سجاؤ دیکھکر اب نقو ہی الگل بچو سے پڑھ کر سنا دیتی ہے۔ دیکھو بیٹا۔ ایم اے بی اے کرنے کے بعد رشید نے پرچون کی دوکان کھول لی ہے۔ عزیز ایک اسکول میں ماسٹری کر رہا ہے۔ بس قدیر کو اللہ اللہ کر کے دوائیوں کی کمپنی میں نوکری مل گئی ہے۔ چار بہنوں کی ذمہ داری ہے اُن پر۔۔ لڑکیوں کو بھی کہاں تک پڑھائے جائیں۔ بہنوں کی وجہ سے خود بھی لنڈورے بیٹھے ہیں۔ یہاں آجائیں تو اپنوں میں لڑکیوں کی بھی کھپت ہو جائے گی اور لڑکے بھی تمہاری طرح کچھ بن جائیں گے"۔

پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہتیں۔

"گھر بھی ٹوٹ رہا ہے۔ جگہ جگہ سے چونا جھڑ رہا ہے۔ ایک کمرے کی چھت تو بارش میں پرنالہ بن جاتی ہے۔ ہفتہ بھر تک لڑکیاں پانی سونتی رہتی ہیں مگر سیلن جونک کی طرح چمٹ کے بیٹھ جاتی ہے۔ ابا میاں نے گھر بھی ایسا بنایا کہ ہم آٹھ جنے پتہ ہی نہیں چلتا کس کونے میں سمائے ہوئے ہیں۔ ابھی تو اونے پونے بک بھی جائیگا۔ بالکل ہی ڈھے گیا تو ملبے کی قیمت کون دے گا"۔

غزل

تسنیم فاروقی

تھمی بداس ہارگ، لکھنؤ-۲۲۶۰۰۳

ذرہ ذرہ جہاں سچ چند کا کردار کہے
کس کی ہمت ہے کہ ہم جیسوں کو غدار کہے

ہم جو چاہیں تو عدالت یہاں وہ قائم ہو
کس کا سر کاٹ کے آئی ہے یہ تلوار کہے

لوگ جذبات میں خبروں کو ڈبو دیتے ہیں
شاعری وہ نہیں ہوتی ہے جو اخبار کہے

سب کے ہاتھوں میں غلامی کے حلف نامے ہیں
اب قبیلے میں وہی ہوگا جو سردار کہے

ہم سویرے کا اجالا ہیں غزل مشرب ہیں
ہم وہ لکھیں گے جو ہم سے نگہ یار کہے

خود پہ الزام نہ لیجے کسی بدگوئی کا
آپ دیوار سے کہہ دیجئے دیوار کہے

اپنی ہی گونج بنو اپنی فضاؤں میں رہو
وہی گنبد کا مقدر ہے جو مینار کہے

خالہ جان سال بھر رہ کر گئیں۔ ہر روز یہی باتیں۔ جانے کے بعد ان کے خطوں کا پھر سلسلہ شروع ہو گیا۔ اماں جان بار بار جواب بھیجنے کی تاکید کرتیں تو میں اپنے بیٹے نفیس کو جو اُس زمانے میں ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ کاغذ قلم دیکے اماں جان کے پاس بیٹھا دیتا۔ جو وہ بولتیں نفیس لکھتا رہتا۔ پھر وہی خط پوسٹ کرادیا جاتا۔

ایک روز کونا کٹا ہوا پوسٹ کارڈ ملا۔ جو انگریزی میں لکھا گیا تھا اور جس میں خالہ جان کے انتقال کی خبر تھی۔

اماں جان۔۔ اپنی ماں جائی کے لئے دو چار دن روتی رہیں۔ اماں جان کے رونے اور اپنی مصروفیت میں ہم تعزیت کے چند لفظ بھیجنے بھی بھول گئے۔

وجاہت کے سر میں یکایک کناڈا جانے کا سودا سما گیا اور بغیر لاگ لپٹ رکھے اُس نے چلتے ہوئے کاروبار میں سے اپنا حصہ الگ کر لیا۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ اس طرح تو بچے کھچے کاروبار از سر نو سنبھالنے میں برسوں لگ جائیں گے مگر اس نے ہمیشہ کی طرح دوٹوک انداز میں کہہ دیا

"یہ آپ کا ہیڈک (Headache) ہے۔ مجھے اپنے بچوں کا فیوچر عزیز ہے ابھی جو opportunity مل رہی ہے میں اسے کھونا نہیں چاہتا"۔۔

وجاہت چلا گیا۔ اب عید بقر عید پر اماں جان کے نام اس کا کارڈ آجاتا ہے۔ مگر میری آمدنی دوگنی محنت کرنے کے باوجود بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بڑے ہوتے بچوں کے سبب بس اتنی رہ گئی ہے کہ گھر کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے۔

میرے بیٹے نفیس نے سائنس میں گریجویشن کر لیا ہے اور ملازمت کے لئے اِدھر اُدھر کوشش کرتا رہتا ہے۔

ایک بار کسی دوست نے مشورہ دیا تھا کہ نفیس کو بھی اپنے ساتھ ہی کام پر لگالوں۔ مگر ایک تو اس کا رجحان نہیں۔ دوسرے سوکھی ہوئی گائے کو ایک آدمی دوہے یا دو۔ دودھ تو اتنا ہی دے گی جتنی اُس کے بدن میں جان ہے۔

یہ اُس روز کی بات ہے جس دن نفیس نے دفتر آ کے مجھ سے کہا۔

"ابو۔ بڑی سفارش یا کچھ لیے دیئے بغیر نوکری نہیں مل سکتی"۔

میں اس کی بات کا جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا۔

"اگر آپ کہیں سے ڈیڑھ دو لاکھ روپے کا بندوبست کر دیں تو میں ایس آئی ہو جاؤں گا۔ آپ سے پرامس کرتا ہوں ملازمت ملنے کے بعد سال بھر میں یہ روپے واپس کر دونگا"۔

اس کی بات سن کر میرے وجود میں ایک ابال سا اٹھا پھر میری آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا جواب سن کر نفیس بپھر جائے گا اور جس طرح میری عدم موجودگی میں اپنی ماں کے سامنے میری کم ہمتی اور ایمانداری کے الزام لگاتا ہے۔ اب وہ سب میرے رو برو کہدیگا۔ مگر میرے جواب دینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کیونکہ ایک صاحب مجھے پوچھتے ہوئے آئے۔ لباس اور شخصیت مرعوب کن تھی۔ قریب آنے کے بعد انھوں نے پھر میرا نام لیا۔ جب میں نے کہا فرمایئے" تو ان صاحب نے کہا۔

"آداب۔ میرا نام عبدالرشید ہے اور میں آپ کی ہندوستان والی مرحوم خالہ کا بیٹا ہوں"۔

میں اُٹھ کر اُن سے بغلگیر ہوا۔ پھر پوچھا۔

"آپ انڈیا سے آرہے ہیں۔؟"

"جی نہیں۔ فی الحال تو دبئی سے آرہا ہوں۔ میری ماں کی خواہش تھی کہ میں ایک مرتبہ پاکستان جا کے آپ سب سے ملوں اور خالہ اماں کو سلام کے لئے حاضر ہوؤں۔ بڑی مشکل سے دو دن کا وقت نکال کے آسکا ہوں"۔

"گھر چلئے۔ سامان کہاں ہے آپ کا۔؟

ایک رات کی تو بات ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہوں اور سامان۔ صرف یہ بریف کیس ہے"۔

اماں پر عمر کا بوجھ اتنا پڑ چکا تھا کہ وہ چلنے پھرنے سے بھی لاچار ہو چکی تھیں۔ بہت اونچا سننے لگیں تھیں۔ اس لئے بھائی عبدالرشید جو کچھ کہتے رہے وہ میں تقریباً چیخ چیخ کر اماں جان کے گوش گزار کرتا رہا۔

"اماں جان۔ بھائی عبدالرشید فرمارہے ہیں کہ چاروں بہنیں ماشاء اللہ اپنے گھر کی ہو گئی ہیں۔ دو اپنے بچوں کے ساتھ امریکہ میں ہیں اور دو جدّہ میں۔ سب بھائیوں کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ بھائی عبدالعزیز الہ آباد میں رہتے ہیں اور یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ بھائی عبدالقدیر دبئی میں ہیں اور بھائی عبدالرشید کے ساتھ ہی کاروبار کر رہے ہیں۔ اماں جان۔ بھائی عبدالرشید مجھے ڈھائی لاکھ روپے کا ڈرافٹ دے رہے ہیں۔ یہ ابا کے مکان کی قیمت ہے۔ نانا جان والی حویلی دوبارہ بنوالی ہے فرمارہے ہیں آپ دیکھیں گی تو پہچان نہیں سکیں گی۔ اور یہ بھی فرمارہے ہیں کہ پاکستان کے خاص طور سے کراچی کے حالات زیادہ سازگار نہیں ہیں۔ اس لئے وہ نفیس کو ویزا بھیج کر دبئی بلالیں گے اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں بھی"۔

اتنا کہنے کے بعد مجھ سے ان کا کہا دہرایا نہیں گیا۔

جھوٹی شان جتانے والوں پر سچ کا سامنا کرتے ہوئے کیا گزرتی ہے یہ آج معلوم ہوا۔

رمضان اور عید کی خوشیاں مُبارک ہوں!

FANCY MATERIAL PARADISE

فینسی میٹریل پیراڈائز

Manufacturers, Representatives, Importers & Exporters
of Leather Bag Fittings & Accessories,
Nylon, Mesh, Adhesive etc.

25B, CHANDNEY CHOWK STREET, CALCUTTA - 700072
PH : 237-9039 / 236-0953 FAX : 91-33-2360953

SISTER CONCERN

Alfatha International, CALCUTTA-700072

NATIONAL HAIR OIL

نیشنل ہیئر آئل

بالوں کو جھڑنے اور سفید ہونے سے روکتا ہے۔ اس سے بال گھنے اور چمکدار ہوتے ہیں۔ یہ دماغ کو ٹھنڈک اور طاقت دیتا ہے۔

ہمارے دیگر آزمودہ یونانی نسخے :

میکسیطون ٹانک۔ بالک جیون ٹانک۔

اکسیر صدر (نزلہ، زکام اور کھانسی کی دوا)۔

جر بول (خارش کی دوا)۔ موتی منجن۔

نیشنل دوا خانہ

۱۱۷، رابندر اسرانی، کلکتہ -۷۰۰۰۷۳



ڈاکٹر اسلم حنیف
گنور۔ ضلع بدایوں ، یو۔پی (۲۰۲۵۲۲)

سولھویں شب کا چاند

سرخ تھال کی مانند
چاند آسماں پر پھر
آج دیر سے اُبھرا
اس کے سینے پر شب خوں
مار کر شبِ ظلمت
پھر پسِ زمیں جاکر
منھ چھپائے بیٹھی ہے

ٹی۔ وی۔

زندگی واہ ری زندگی
شب کی گنجان تنہائیوں میں تنا
ذہن کا وہ مقدس سفر کیا ہوا
جو ہمیں ایسے منظر عطا کرتا تھا
زیست جن کے تجسس میں رہتی تھی
ـــــــــ ہر دم رواں

اور اب
سارا احساس کمرے کے
ـــــ اس گوشے میں
مرتکز ہو گیا ہے جہاں
ٹی وی رکھا ہوا ہے

جب سے گھروں میں
ٹی وی آیا ہے
گھر کے اک اک فرد کی آنکھیں
ـــــــ خوابوں کے بجائے
زندہ مناظر دیکھتی ہیں
اس لئے نیند کی بیداری کے قصے
اپنا وجود
کھونے لگے ہیں

۲غزلیں

انور پردیسی
دیدار بخش لین، کلکتہ-۱۶

ہے دل کی ضد کہ جلوۂ گلزار دیکھنا
پھولوں کے آئینے میں رخِ یار دیکھنا

وہ دوپہر وہ اُس کی تمازت کدھر گئی
کیوں چھپ گیا ہے سایۂ دیوار دیکھنا

جنسِ ہنر کا کوئی خریدار ہی نہیں
کس رنگ میں ہے گرمئی بازار دیکھنا

محشر بپا کرے تو کرے لشکرِ عدو
گرنے نہ پائے سر سے یہ دستار دیکھنا

اتنی سکت کہاں کہ اُسے میں گرا سکوں
اونچی بہت ہے سچ کی دیوار دیکھنا

میرے چمن میں آگ ہے کیسی لگی ہوئی
انور ہے کون برقِ شرربار دیکھنا

وسیمؔ مینائی
تارین جلال نگر شاہجہاں پور-۲۴۲۰۰۱ (یو۔پی۔)

جام مئے سے غمِ ایّام غلط کرتے ہیں
چند فنکار یہی کام غلط کرتے ہیں

بے سبب دیتے ہیں الزام غلط کرتے ہیں
لوگ مظلوم کو بدنام غلط کرتے ہیں

راز کی بات بھی کہہ دیتے ہیں دنیا بھر سے
میرے ہمراز بڑے کام غلط کرتے ہیں

رات دن چوس رہے ہیں جو غریبوں کا لہو
آپ ان لوگوں کا اکرام غلط کرتے ہیں

آشنا ہوتے وہ تہذیبِ وفا سے اے کاش
جو مرے پیار کو بدنام غلط کرتے ہیں

مستحق ہوں کہ نہ ہوں سب کو یہ دینے والے
ایک سا دیتے ہیں انعام غلط کرتے ہیں

ہم نے مانا کہ غریبوں کے مسیحا ہیں آپ
اپنی تعریف سرِ عام غلط کرتے ہیں

حیف! صد حیف! کہ اس دور کے زردار وسیمؔ
بسر اپنی سحر و شام غلط کرتے ہیں

بدنام بشرؔ، بگان پاڑا، وارڈ نمبر ۷، پوسٹ و ضلع۔ پاکوڑ ۸۱۶۱۰ (بہار)

پیام

ہر شام و سحر گم صُم
دیتی ہے صدا اکثر
اے خاک بسر سُن لے
ہستی ہے تری پل بھر
دُنیا ہے تیرا مسکن
ہر ظلم و ستم پڑھ لے
جس راہ ملے جو بھی
وہ نقشِ قدم پڑھ لے
باقی نہ رہے کچھ بھی
ہر کرب والم پڑھ لے
بن رُت کی ہوئی بارش

اپنوں کی رچی سازش
پل پل جو ہوئی تجھ پر
غیروں کی ہر اک یورش
کب کیسے ہوئی تیری
ناکام ہر اک کاوش
سب ذہن نشیں کرلے
اعمال حسیں کرلے
ہر تجربہ تو اپنا
انمول نگیں کرلے

اک دن ہے مقرر وہ
کچھ اس پہ یقیں کرلے
جب وقت وہ آئے گا
ہوگا نہ حجاب اس کا
جو عقل تجھے دی تھی
لے گا وہ حساب اس کا
ہاں تیرا خدا تجھ سے
مانگے گا جواب اس کا

ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

طاہر نقوی
G-3، سنی آرکیڈ۔ بلاک-7، گلشن اقبال، کراچی-75300



آفس جانے کے لئے جیسے ہی میں نے قدم آگے بڑھایا، سائرہ نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "ابو۔ کیا آج آپ بریف کیس ساتھ نہیں لے جائیں گے؟"

میرے قدم اسی جگہ رک گئے۔ میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ قدم آگے بڑھانے سے پہلے خود مجھے اپنے اندر کوئی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ سائرہ نے مسکرا کر مجھے دیکھا گویا اس نے میری اس کمی کو بھانپ لیا ہو۔ اس کے اس پر اسرار رویے سے میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اور جواب میں میرے منہ سے ٹوٹے پھوٹے بے معنی لفظ نکلے۔ اسی لمحے سامنے سے میری چھ سالہ بیٹی تانی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرا بریف کیس تقریباً گھسیٹتی ہوئی آئی۔ اسے دیکھ کر میں چونک گیا۔ میرے لاشعور میں کوئی کمی شاید اسی لئے تھی۔ میرے وجود کے اندر کسی لطیف جذبے کے تحت کوئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بڑھ کر تانی سے بریف کیس لیا اور اسے پیار کیا۔ اس کی ماں بریف کیس روزانہ مجھے اسی طرح پکڑایا کرتی تھی کیونکہ جاتے ہوئے اپنا بریف کیس اٹھانا میں ہمیشہ بھول جاتا تھا۔ سائرہ مسکرا مسکرا کر یہ سب دیکھتی رہی۔ پھر میں تیزی کے ساتھ اپنے فلیٹ سے نکل کر سیڑھیاں اترنے لگا۔

تانی ابھی کم سن ہونے کے باوجود بہت ہوشیار تھی۔ وہ اپنا کام خود کرتی۔ نہاتی، بالوں میں کنگھی کرتی، میلے کپڑے دھوبی کو دیتی اور دھلے ہوئے کپڑے سلیقے سے الماری میں رکھتی۔ یہ سب وہ بہت احتیاط سے کرتی۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تین برس قبل اس کی ماں کا انتقال ہوا تو میں اکیلا اور تانی کی حالت خاموش گڑیا کی سی ہو کر رہ گئی۔ مرتے وقت اس کی ماں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تانی کو شفقت اور پیار دینے والی ماں ضرور لاؤں گا۔ تب سائرہ گھر میں آئی۔ مناسب رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے سائرہ کی شادی کی عمر نکل چکی تھی اور شاید اب اس کی عمر ایسی تھی جس میں عورت ماں بننے کی صلاحیت سے محروم رہتی ہے۔ چنانچہ میں نے یہی سوچ سمجھ کر اس سے دوسری شادی کی تھی۔ اپنی محرومیوں کو دور کرنے کے لئے۔ تانی کے لئے اس کی آنکھوں میں ممتا اور پیار کا طوفان ہر لمحے امڈا رہتا۔ جس روز وہ میرے گھر میں داخل ہوئی تانی کونے میں کھڑی اسے کھوجنے والی نگاہوں سے دیکھتی رہی اور جیسے ہی سائرہ کی نظر اس پر پڑی اس نے بڑھ کر تانی کو گود میں لینے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ تانی نے اس کے ہاتھ بے دردی سے دھتکار دئے۔ سائرہ کے چہرے پر ناگواری کا کوئی تاثر نہیں آیا مگر تانی کے اس سلوک سے خود میں الجھن میں پڑ گیا۔ اور معاملے کو سنوارنے کے لئے سائرہ سے بولا "تم ابھی نئی ہو اسی لئے۔۔۔"۔ میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا اور سائرہ کو دیکھنے لگا۔ سائرہ خاموش رہی اور اپنے چہرے سے اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنے پر سکون مزاج اور اپنائیت سے میرے گھر میں دوبارہ خوشیاں بھرنی شروع کر دیں۔ اور رفتہ رفتہ گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

سائرہ کو آئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ تانی اسے اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتی بلکہ سائرہ اگر تانی کا بستر لگاتی تو تانی اسے بگاڑ دیتی اور دوبارہ خود اپنی

مرضی سے بچھاتی۔ اس کے اسکول یونی فارم کو استری کرتی تو تانی اسے پھینک دیتی۔ ہوم ورک کرانے کے لئے قریب آتی تو تانی بستہ بند کر کے اٹھ جاتی۔ تانی کے اس برتاؤ سے سائرہ کو دھکا لگتا، اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگتا اور یوں معلوم ہوتا جیسے اسے شدید گھٹن محسوس ہو رہی ہو۔ اسی کیفیت میں ایک روز اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"آخر تانی مجھے اپنا کیوں نہیں مانتی"۔

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔ میں پہلے تو کشمکش میں مبتلا رہا پھر اسے سمجھانے لگا۔۔۔

"تمہیں ابھی بچوں کی ضد اور عادتوں کا تجربہ نہیں"۔

سائرہ اپنے آنسو بھرے چہرے سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ان چیزوں کے لئے عورت کو سیکھنے یا تجربہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی"

میں لاجواب ہو گیا۔ تاہم بات بناتے ہوئے میں پھر بولا۔

"تانی کو اپنی ماں اچھی طرح یاد ہے۔ ابھی تمہیں اپنا سمجھنے کو تیار نہیں۔ اس کا ذہن بنانا پڑے گا اور یہ سب وقت کے ساتھ دھیرے دھیرے ہوگا"

سائرہ چپ رہی البتہ چہرے سے مایوس لگ رہی تھی۔ چند ثانئے کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"شاید میرے نصیب میں اولاد کا سکھ نہیں۔ میں نے اولاد والے شوہر سے شادی کو اسی لئے ترجیح دی تھی۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔"۔

اس کی آنکھیں دوبارہ بھر آئیں۔

سائرہ جیسے جیسے تانی کے قریب ہونا چاہتی، تانی مدّ و جزر کے پانی کی طرح اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ ادھر میں جذبات کے اس سمندر کے تلاطم کو کنارے سے کھڑا دیکھتا رہتا اور اس میں ٹھہراؤ آنے کا بے بسی سے انتظار کرتا رہتا۔

روز مرہ کی طرح ایک مرتبہ سائرہ نے مارکیٹ سے آکر سامان فرج میں رکھنے کے بعد کپڑے بدلنے کے لئے اپنی الماری کھولی تو اسے بجلی کا سا دھکا لگا۔ الماری کا ایک خانہ خالی تھا۔ تانی کی ماں کے کپڑے وہاں سے غائب تھے۔ اور بیڈ روم میں لگی تانی کی ماں کی تصویر بھی اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔ سائرہ حیران اور پریشان ہو گئی۔ وہ اس بارے میں تانی سے معلوم کرنا چاہتی تھی مگر وہ کھیلنے کے لئے باہر گئی ہوئی تھی۔ چنانچہ سائرہ اپنی بے قراری کے عالم میں اس کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ تانی کی رائیٹنگ ٹیبل پر وہ تصویر رکھی تھی اور ماں کے کپڑے بھی تانی کی الماری میں ترتیب سے رکھے تھے۔ سائرہ یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئی اور اس نے اپنے آپ کو خلاء میں معلق پایا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کا دل ڈوب رہا ہو، اس کے وجود میں گھٹن کا احساس اور بڑھ گیا۔ سائرہ یہ دھچکا بھی ضبط کر گئی اور کسی پر کچھ عیاں نہ ہونے دیا۔ یہ سب یونہی ہوتا رہا لیکن سائرہ نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ کوئی اچھی ڈش شوق سے بناتی اور تانی کو کھلانا چاہتی تو تانی دو ٹوک انداز میں جواب دیتی کہ مجھے ان کے ہاتھ کی کوئی چیز نہیں کھانی۔ ایسے موقع پر سائرہ کو دکھ ہوتا۔ میں اس صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے یہی کہتا کہ چلو اس کے کھانے کے لئے ملازمہ کچھ بنا دے گی۔ سائرہ اور تانی کے درمیان زیادہ تر نوکرانی ٹیلی فون کا کام کرتی۔ کبھی سائرہ خود مخاطب کرتی تو تانی منہ پھیر لیتی اور جواب دینے کے بجائے وہاں سے اٹھ کر چلی جاتی۔ اس پورے عرصے میں اپنی ممتا کی چادر تانی کے بدن پر ڈالنے کی ناکامی کا سائرہ کو شدید دکھ تھا، اس کا وجود ڈھ رہا تھا۔ پھر ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔

کسی فنکشن میں جانے کے لئے سائرہ تیار ہو رہی تھی، ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں بہت ساری چوڑیاں رکھی تھیں۔ سائرہ نے اپنے کپڑوں سے میل کھاتی ہوئی دراز میں سے نکال کر ابھی چند چوڑیاں اپنی کلائی میں ڈالی تھیں کہ ایک طوفان سا آ گیا۔ یکایک تانی غصیلی بلی کی مانند نا جانے کہاں سے آکر سائرہ پر جھپٹ پڑی اس نے چوڑیاں اٹھا کر فرش پر دے ماریں اور گرج کر بولی۔

"تم نے میری ماں کی چوڑیوں کو ہاتھ کیوں لگایا"

پھر سائرہ کے کپڑے پکڑ کر نفرت اور غصہ سے کھینچنے لگی۔ سائرہ اس اچانک حملے سے بوکھلا گئی۔ میں یہ سارا تماشہ کمرے کے دروازے سے لگا دیکھ رہا تھا۔ سائرہ کی کس مپرسی کی حالت میں نہ دیکھ سکا۔ میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا، میں نے بڑھ کر ایک طمانچہ تانی کے گال پر مارا اور گرجا۔

"تانی یہ کیا کیا تم نے۔ یہ تمہارا اتنا خیال کرتی ہیں اور تم ہمیشہ ان کی بے عزتی کرتی ہو"

تانی سہم کر رونے لگی اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگی کیونکہ میری شخصیت کا یہ رخ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ غصہ کے مارے خود میرا برا حال تھا، میں اس کو دوسرا طمانچہ مارنا ہی چاہتا تھا کہ سائرہ نے دوڑ کر تانی کو بچاتے ہوئے اپنی گود میں بھر لیا۔ اور مجھ پر غرائی۔ "خبردار۔ میری بچی کو ہاتھ مت لگانا"۔

اس لمحے مجھ سے خوف زدہ ہو کر تانی سائرہ سے چمٹ گئی اور اس کے وجود میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ سائرہ خود بھی اسے اپنے وجود میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ آج اس کے روئیں روئیں سے ممتا پھوٹی پڑ رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود کی تمام گھٹن اب جاتی رہی ہو۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان اور آسودگی کا ایسا اجالا تھا جو ماں کے چہرے پر آسمان سے اترتا ہے۔!!!

غزلیں

وقار مانوی
۱۶۸۱۔ گلی تخت والی۔ سوئی والان،
دریا گنج۔ نئی دہلی-۲

خوشی بھی اپنی یہاں، غم بھی اپنا اپنا ہے
کسی کا درد یہاں کون بانٹ سکتا ہے

اور ایک ہم کہ ہمیں زندگی نے مار دیا
نہیں تو عام گلہ مرگِ ناگہاں کا ہے

وہ لوگ جن کی تماشاگری کی شہرت تھی
ہیں آج خود ہی تماشا، یہ کیا تماشا ہے

ہم اپنے عہد کی رنگینیوں میں گم تھے، ہمیں
خبر نہ تھی کہ زمانہ بدل بھی سکتا ہے

علاجِ زخمِ تمنا کی فکر کر ناداں
یہ زخم وہ ہے جو ناسور بن کے رستا ہے

کرم یہ تا بہ کجا، اشک پونچھنے والے
یہ سوچ لے کہ یہ رونا تو عمر بھر کا ہے

ہماری موت ہی ثابت کرے گی یہ کہ وقار
یہاں کسی کے لئے کوئی مر بھی سکتا ہے

عارف شفیق
کراچی (پاکستان)

عذاب کیسے میرے شہر پر اتارے گئے
جو لوگ جان سے بڑھ کر تھے مجھ کو پیارے گئے

بلند امن کا پرچم تھا سرحدوں پہ مگر
مرے ہی شہر پہ لشکر مرے اتارے گئے

وہاں وہاں سے اٹھے گی صداقتوں کی صدا
جہاں جہاں سرِ مقتل لہو کے دھارے گئے

کنواری لڑکیاں کیا خواب دیکھیں دلہن کے
مرے قبیلے کے سارے جوان مارے گئے

حسین رونقیں وہ ساحلِ سمندر کی
وہ چاند راتیں محبت کے استعارے گئے

وہ زندگی بھی تو اب خواب جیسی لگتی ہے
حسین خواب سمجھ کر جسے گزارے گئے

لہو سے دیپ جلانے کی رت میں پھر عارف
نہ جانے کتنی ہی ماؤں کے چاند تارے گئے



ڈاکٹر انور مینائی
الامین ایجوکیشنل کامپلکس۔ کولار۔ کرناٹک

جھوٹی چاہت جھوٹی آشا جھوٹے رشتے
ایسے میں ہم کیسے پکاریں رشتے رشتے

جسم ہیں پیاسے، پیاسی روحیں، پیاسے رشتے
چاروں طرف ہیں اندھے جذبے اندھے رشتے

اپنی ذات کے اندھے غار میں گم ہو کر بھی
مدت سے میں جھیل رہا ہوں دکھ کے رشتے

دور جزیروں سے آتے ہیں خط خوشبو کے
دیں گے اب آواز مجھے انجانے رشتے

پاگل بن کر ان کے پیچھے بھاگتے ہو کیوں
کھو جائیں گے بن کر ڈھلتے سایے رشتے

اپنی روح کا رشتہ سب سے اچھا رشتہ
اپنوں اور پرایوں کے سب جھوٹے رشتے

اندھی کٹیا میں گم ہو کر بھی خوش ہوں انور
ڈسنے لگے تھے مجھ کو اُجالے بن کے رشتے

وجے میرٹھی
G.I.C.Hastinapur (Meerut) 250404

اس غریبی کا سبب کردار ہے
اس لئے اس سے ذرا سا پیار ہے

یہ پرندہ تاکتا ہے آسماں
اِسکا شاید کچھ اُفق کے پار ہے

اب اٹھی ہے آنکھ تو پھر دیکھئے
کوئی تو منظر پسِ دیوار ہے

لاکھ یہ آواز مدھم ہو مگر
اس میں اک تہذیب کی جھنکار ہے

جھک گئے کندھے کہ ان پر دوستو
عمر بھر سے زندگی کا بار ہے

اب تو بیداری کا موسم ہی گیا
خاک اب یہ دِل وجے بے دار ہے

ایسے ایسے ناروا فرمان صادر کیوں ہوئے؟
تم میں ہی تقسیم سب لعل و جواہر کیوں ہوئے؟

کیا بتائیں تم کو ہم دانستہ کافر کیوں ہوئے
سر جھکا کر ایک بت کے در پہ حاضر کیوں ہوئے؟

پُر خطر ہیں اور منزل پر بھی پہنچاتی نہیں
ہم نگوڑے ایسی راہوں کے مسافر کیوں ہوئے؟

گل ہی کیا گلزار مل سکتا تھا غیرت کے عوض
اب یہ مت پوچھو کہ ہم کانٹوں پہ شاکر کیوں ہوئے؟

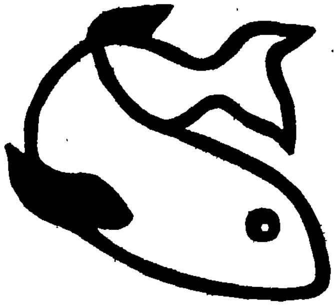
کس نے گلشن سے انہیں حکمِ جلاوطنی دیا
شاخِ گل سے بے سبب بے دخل طائر کیوں ہوئے؟

پوچھنا ہے آپ کی اندھی سیاست سے ہمیں
مستحق فنکار ہی محروم آخر کیوں ہوئے؟

کتنے شکنی اور دریودھن ہوئے دوزخ رسید
یاد ہے؟ برباد وہ عیار شاطر کیوں ہوئے؟

عمر بھر اب اِس حماقت پر لہو روؤ شباب
غیر مُسلم ہو کے تم اردو کے شاعر کیوں ہوئے؟

ڈاکٹر شباب للت
9, Hydevale, Chaura Maidan, Shimla



نازفش کمپنی

Naaz Fish Company

Exporter of fish

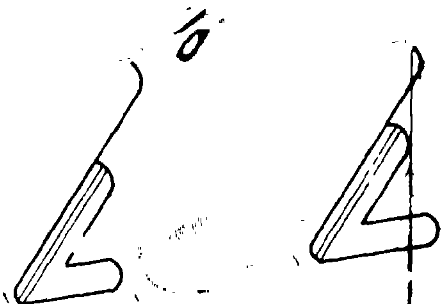
(Syed Gauhar Maqsood)

H. I. T. FISH MARKET
HOWRAH - 1

Phone : 660-5755
660-2985

آپ کے قریب
ترین جوتوں کی دکان پر
دستیاب

ٹائٹس
جوتے



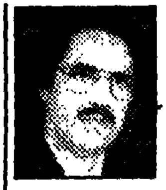
اسکول جوتوں کے ماہر

گلوبل فٹ ویر اینڈ لیدر
کرافٹ انڈسٹریز

۲۵، پولوک اسٹریٹ، کلکتہ-۷۰۰۰۰۱
فون نمبر: ۲۳۵-۱۷۳۶/۲۳۵-۸۱۳۸

غزلیں

نثار جیراجپوری
شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج
اعظم گڑھ۔۲۷۶۰۰۱



فلک کا رنگ کچھ بدلا ہوا ہے
پرندہ دیکھ کر سہا ہوا ہے
بلندی سے زمیں کی سمت سورج
سوا نیزے پہ آٹھہرا ہوا ہے
اجالے کی حدیں گم ہو گئیں سب
اندھیرا چار سو پھیلا ہوا ہے
نمک بھی دال میں پھیکا ہے شاید
مزہ بھی منہہ کا کچھ بدلا ہوا ہے
کوئی سنتا نہیں رب کی ستائش
نثار ہر آدمی بہرا ہوا ہے

عنوان چشمی
E-126, Sector 41, Noida (U.P.)
(Gautambudh Nagar)

رباعی

"دُنیا"

جنگل کے حظیرے کی طرح دنیا
افتادہ جزیرے کی طرح ہے دنیا
باطن کی خدا جانے ہے ظاہر تو خراب
بستی کے فقیرے کی طرح ہے دنیا

دیومنی پانڈے

کتنا بھی مشکل ہو، لیکن ہر حالت میں جینا ہے
لاکھ زندگی زہر ہو پھر بھی ہنستے ہنستے پینا ہے

بھیڑ تو ہے ہر سُو اپنوں کی، پر کوئی ہمدرد نہیں
زخم دیا ہے جو دنیا نے، اپنے ہاتھوں سینا ہے

نفرت کا اک چڑھتا دریا، پیار کا ساحل کوسوں دور
وقت کے ہاتھوں میں پتواریں، اپنے پاس سفینہ ہے

بارہ مہینے ایسے گزرے جیسے لمبا ریگستان
ساتھ سفر میں رہنے والا کیول دھول پسینہ ہے

مول بھاؤ کی اس نگری میں سب کی اپنی اپنی رائے
جس کو بھی گاہک مل جائے سچ مچ وہی نگینہ ہے

دین دھرم کی ہم کیا جانیں ہم تو جانیں دل کی بات
پیار چھپا ہے جہاں وہیں پر، متھرا اور مدینہ ہے

دیوانہؔ روہتگی
RZH- 164,Gali No 6,
Raj nagar . Part 2,
Palam Colony,
New Delhi- 110045

مقدّر کا دھنی ہوں، یا کوئی قسمت کا مارا ہوں
میں اِس دُنیا میں جو کچھ ہوں، مرے آقا تمہارا ہوں

بڑھے جاتا ہوں دنیا میں، سہارے ہی پہ میں آگے
غلط کہتی ہے یہ دُنیا، جہاں میں بے سہارا ہوں

مری ہی ذات سے خوشیاں ہیں وابستہ زمانے کی
نظارہ ہوں میں خوشیوں کا، میں خوشیوں کا نظارہ ہوں

کسی کے کام کیا آؤں ؟ کوئی اپنائے کیوں مجھ کو؟
کسی کے زخمِ دل کا میں نہ مرہم ہوں، نہ چارا ہوں

اُٹھائے بھی کوئی نظریں مری جانب تو آخر کیوں؟
کوئی گل ہوں، نہ غنچہ ہوں، قمر ہوں میں، نہ تارا ہوں

جسے سمجھا نہیں اب تک میں، اُلفت کی وہ بازی ہے
اِسے سوبار جیتا ہوں، اِسے سوبار ہارا ہوں

مجھے دل سے جو اپنائے تو کوئی خاک اپنائے
نہ ہوں میں زخم کا مرہم، نہ بیماری کا چارا ہوں

مجھے دیوانہ کہتے ہیں، میں اُلفت کا ہوں دیوانہ
میں اے دیوانہ! دُنیا میں فقط اُلفت کا مارا ہوں

جدائی



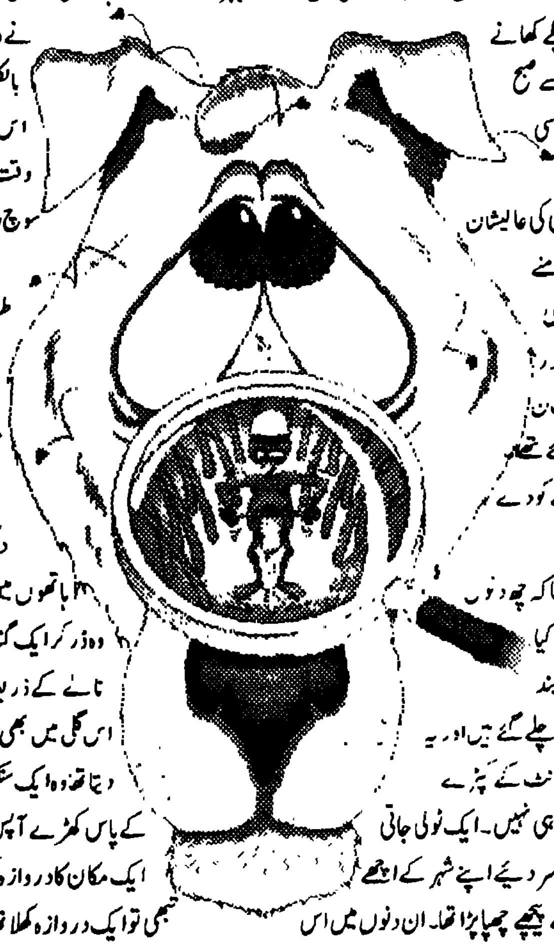
ہمت رائے شرما
20, Ankool Apartments
5th Floor
S. Q. Ldr. Hormindar Singh Rd.
Seven Bunglows
Mumbai - 400061

آج کیوں محفلِ ہستی ہے فسردہ ساماں؟
آج کیوں چاک ہے ملبوسِ خرد کاداماں؟
آج کچھ اور ہی رنگت ہے پری خانے میں
آج "بدلی ہوئی صورت" ہے صنم خانے میں
آج الیاس کو رہبر کی ضرورت کیوں ہے؟
دل میں معصوم فرشتوں کے کدورت کیوں ہے؟
آج پہونچے ہیں ستاروں کے شرارے دل تک
گرتے پڑتے چلے آتے ہیں سہارے دل تک
آ ج اِس دل کا کوئی مونس و غم خوار نہیں
آج وہ دن ہے کہ کوئی بھی طلبگار نہیں
آج برہم سا نظر آتا ہے دنیا کا نظام
آج پھوٹا ہے کہیں بادۂ تقدیر کا جام
آج لٹتی ہیں مقدّر کی تجلّی گاہیں
آج مسدود ہیں قدموں پہ ترستی راہیں
آج کس "طور" سے "شیرازۂ ظلمت" بکھرا
دھل کے شبنم میں شبِ تار کا دامن نکھرا
گر گیا ہوش کے رہوار سے دل کا راکب
آج آنکھوں سے برستے ہیں شہابِ ثاقب
جھمکھا سا ہے گھٹاؤں کا افق کے اُس پار
جن کے "دامن میں ہے مستور کسی دل کا قرار"
آج احساس کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
چند ذرّے ہیں جو تاروں میں ڈھلے جاتے ہیں
دل کی اُجڑی ہوئی سنسان سرائے کے قریب
کارواں آتے ہیں۔ رُکتے ہیں۔ چلے جاتے ہیں
ایک "دھندلا سا نشاں ہے جسے منزل کہہ لو"
نامرادی کا ہے مسکن جسے اب دل کہہ لو

سگِ اشتہا

شمشاد ندیم
پوسٹ بکس نمبر ۲۰۔ دھام پور-۲۴۶۷۶۱ (یوپی)

اسے اس مندر کے باہر زندگی جیتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا تھا معلوم نہ تھا۔ وہ جب سے پیدا ہوا تھا اس نے اپنے آپ کو اسی مندر کی سیڑھیوں پر پایا تھا وہ لاوارث تھا لیکن جلد اسے احساس ہوا کہ مندر ہی اس کا وارث ہے مندر میں جو بھی شردھالو کچے کھانے چڑھاوے کے روپ میں لاتے اسی میں سے صبح سے شام تک اسے کچھ نہ کچھ ملتا رہتا تھا۔ اسی طرح اس کی زندگی برسوں سے چل رہی تھی۔ سردی میں مندر کے پیچھے ہی پجاری کی عالیشان کٹیا کے باہر سمٹا پڑا رہتا۔ برسات میں سامنے کھڑے پیپل کے پوکھر میں پناہ لیتا اور گرمی میں پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں پڑا رہتا۔ مندر آنے والے بھگتوں کی چپلوں جوتوں اور سامان کی حفاظت کرتا۔ بھگت بھی اسے جان گئے تھے اسی لئے وہ بھی الگ سے کچھ نہ کچھ کھانے کو دے دیتے تھے۔



لیکن اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھ دنوں سے لوگ مندر کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ مندر کا دروازہ چھ دنوں سے بند ہے۔ پجاری کی کٹیا کیوں بند ہے وہ کہاں چلے گئے ہیں اور یہ لمبی لمبی لوہے کی مانند ڈنڈے لیے خاکی پرنٹ کے کپڑے پہنے کون لوگ ہیں۔ کبھی مندر سے ہٹتے ہی نہیں۔ ایک ٹولی جاتی ہے دوسری آجاتی ہے۔ وہ پاؤں میں اپنا سر دیئے اپنے شہر کے اچھے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔ وہ پجاری کی کٹیا کے پیچھے چھپا پڑا تھا۔ ان دنوں میں اس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ دوڑ سکتا۔ ایک دو دن تو اس نے مندر کے پیچھے پھینکی گئی جھوٹھن سے کام چلایا تھا جبکہ اچھے وقت میں وہ اس روکھے چڑھاوے کو سونگھتا تک نہ تھا۔ شہر میں دنگا ہوئے چھ دن گزر رہے تھے۔ بھگوان کو خدا کا اور خدا کو بھگوان کا دشمن بنا دیا گیا تھا۔ مندر مسجد ایک دوسرے کے بیری بنے تھے۔ ہر آدمی ان دنوں اپنے اس پڑوسی سے خوفزدہ تھا جو دوسرے مذہب کا ماننے والا اور ایک زمانے سے اسکے ساتھ زندگی بسر کرتا آیا تھا لیکن آج ہر شخص کے دل میں ایسا خوف بیٹھایا گیا تھا کہ وہ ہر دوسرے مذہب کے ماننے والے کو اپنا دشمن سمجھ رہا تھا۔ چھ دن پہلے رات میں مندر مسجد کے نام پر شہر میں دنگا ہو گیا تھا۔ اسے یاد ہے کہ شہر میں گولیاں چل رہی تھیں کچھ لوگ مندر کی رکشا کو کھڑے تھے۔ بم پھٹ رہے تھے چیخ و پکار آگ۔۔ چاروں طرف شور ہی شور تھا۔ ہاہاکار مچی تھی۔ شہر کو کیا ہوا تھا اسکی سمجھ میں نہ آیا تھا اب اس نے سوچا کہ کس طرح یہاں سے نکل کر دوسرے محلے میں چلا جائے تاکہ کھانے کو کچھ مل سکے۔ اور پرانوں کی رکشا ہو سکے اسلئے دوپہر کے وقت جب خاکی وردی والے لوگ آرام کرنے لگے تو اس نے وہاں سے نکلنے کی سوچی۔ چھ دن سے وہ بالکل بھوکا تھا۔ اسکا جسم جواب دے رہا تھا۔ اس کے پاؤں اٹھ نہیں رہے تھے لیکن اس وقت وہ اپنے پرانوں کی رکشا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے کسی بھی طرح اپنے پیٹ کی آگ بجھانی تھی وہ ہمت یکجا کر کے کسی طرح اٹھا۔ پجاری کی سنگ مرمر سے بنی خوبصورت کٹیا کے پیچھے سے جو راستہ دوسرے محلے میں نکلتا تھا وہ اس پر بڑھ گیا۔ گلی پار کر کے وہ سڑک پر آگیا در چوک پر بھی کئی خاکی وردی والے دکھائی دے رہے تھے کہیں یہ لوگ اپنے ہاتھوں میں پکڑی لوہے کی چھڑوں سے مار نہ دیں وہ ڈر کر ایک گندے نالے میں گھس گیا اور چھپتے چھپاتے نالے کے ذریعہ دوسرے محلے کی گلیوں میں جا نکلا۔ اس گلی میں بھی سناٹا تھا دور دور تک کہیں کوئی دکھائی نہ دیتا تھا وہ ایک سنکری گلی میں مڑ گیا تین آدمی ایک مکان کے پاس کھڑے آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے پاس میں ہی ایک مکان کا دروازہ کھلا تھا شاید یہ لوگ یہیں کے لوگ تھے تبھی تو ایک دروازہ کھلا تھا۔ درواز کھلا دیکھ کر اس کے جسم میں پھرتی اسے آگئی اسے لگا کہ اب اسے کھانے کو کچھ مل جائے گا۔

وہ اپنی پوری طاقت سے دوڑ لگا کر اس گھر میں گھس گیا اور اندر پہنچ کر ہانپنے لگا۔ گھر کی ایک بزرگ عورت نے اسے روٹی کا ایک ٹکڑا دینا چاہا لیکن ایک چھوٹے، تقریباً سات سالہ بچے نے روٹی کو اس کے سامنے پہنچے سے پہلے ہی بزرگ عورت کے ہاتھ سے یہ کہتے ہوئے چھین لیا "یہ تو

مندر والا کتا ہے ''میں اسے روٹی ہر گز نہیں دونگا۔

عورت کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا۔ اسکا ہاتھ ہوا میں اٹھا لیکن پیچھے سے بچے کے باپ کے ذریعہ پکڑ لیا۔ ''یہ نا سمجھ ہے۔ معصوم ہے۔ اماں جان مفاد پرست گندے ذہنوں نے انسانیت کے دو ٹکڑے مذہب کے نام پر کر دیئے ہیں اور ان ٹکڑوں کا نام رکھا ہے مندر مسجد۔ ہندو اور مسلم '' تو پھر ابّو جان ہندو مسلم مندر مسجد کے نام پر کیوں لڑتے ہیں۔ ان لوگوں سے سیدھے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے انسانیت کے دو ٹکڑے کئے ہیں۔ کیوں نہیں لڑتے ان درندوں سے جو مذہب کی بنیادوں میں تشدد کی آگ بھرتے ہیں۔ سب انسان مل کر ان گندے مفاد پرست لوگوں کا صفایا کیوں نہیں کر دیتے۔ ان وحشی لوگوں کی وجہ سے ہم اپنے دوستوں راجو اور شیامو کے ساتھ کھیل تک نہیں سکتے۔

''نہیں میرے بچے ان گندے لوگوں کے خلاف ایسے نہیں کہتے۔ لاؤ مجھے یہ روٹی دو۔ اس کے بھوکے کتے کو ضرورت ہے بھوکا لگتا ہے''۔

لیکن ابو جی یہ تو۔۔۔۔ ''باپ نے بچے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا''۔ بیٹے جانوروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ان جانوروں کا ایک مذہب ایک زبان اور ایک ہی پیغام ہوتا ہے۔ محبت اور وفاداری جو بھی محبت سے ان سے پیش آیا اسی کے وفادار ہو گئے۔ اور یہی انسانیت ہے جو آج افسوس انسانوں میں نہیں ہے۔'' بچہ اپنے باپ اور دادی کو خالی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔

باپ نے کتے کو روٹی دیدی جس سے کتے کی بھوک تو شاید کچھ کم ہوئی لیکن مستقبل کی امانت اس بچے کے ذہن کی بھوک کو وہ نہ مٹا سکا بچہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی سماج اتنا گندہ ہو گیا ہے کہ سچ کو سچ نہیں کہہ سکتے۔

کتا لپک کر روٹی کھا چکا تھا اور اب اس آدمی کے قدموں میں اپنا سر لئے بیٹھا تھا گویا وہی اس کا مندر ہو۔

دو کتابیں زیر اشاعت ھیں:

اے۔ امیر النساء کا سفر نامہ

''ارض مقدس میں چند روز''

ف۔ س۔ اعجاز کا مجموعہ منظومات

صاحبِ فن

آرڈر روانہ کر دیجئے۔

یوم عید سعید پر

قارئین انشاء

کو دلی مبارکباد

اور

نیک خواهشات

محمد ارشد جمال

۳، گرین پارک

کلکته-۱۹

چار کنکر یا ر

شایستہ سیّد ایمن، نیویارک

وہ گرمیوں کی ایک بے کیف سی شام تھی۔ زویا گھر کی گھٹن سے گھبرا کر باہر کی فضا میں نکل آئی۔ گھر کے پچھواڑے دُور تک پھیلی جھیل، جھیل میں کِل کاری مارتی رنگ برنگی مرغابیاں، کنول کے پھول، چاروں طرف اونچے اونچے، سرسبز درخت، اور فضا میں تیرتے پھرتے چھوٹے بڑے بادلوں کے ٹکڑے، زویا کی خلوت کو جلوت میں بدلنے لگے۔ وہ جب بھی بے قرار ہوتی، یہ ماحول اُس کیلئے قرار کا سبب بن جاتا تھا۔ یہ ماحول، زندگی کے آئینے میں اُس کا عکس تھا۔

کسی جھیل سے گہری اور اس کے فطرتی سکوت سے زیادہ پُر سکون نظر آنے والی زویا کی شخصیت تہوں سے لدی تھی۔ اِن تہوں میں ایک تہہ زخموں کی ایک رواں دواں ندی تھی۔ اس ندی کی لہریں آس کی نہیں، یاس کی پیاسی تھیں۔ لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ، آنکھوں سے عیاں طمانیت اور گفتگو میں سکون کے خاکے، تہہ دار فریب تھے۔ دُنیا والوں کیلئے راز چھپانے والے دھوکے تھے۔ زویا کا چہرہ، اُس کے عکس کا تضاد تھا۔ اس تضاد کا علم اُس کی اپنی آنکھوں کو بھی نہ تھا کہ وہ دھڑکنوں، آنکھوں اور لبوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے کا ہنر جانتی تھی۔ اُس نے سانسوں کے تواتر کو ماضی، حال اور مستقبل کے دائروں سے الگ رکھا تھا۔

آج نجانے کیوں اور کیسے دھڑکنیں، آنکھیں اور لب۔۔۔ ماضی، حال اور مستقبل زویا کے مضبوط ضبط کے زنداں میں بند نہ رہنے کا عزم کئے نظر آتے تھے۔ خواب، حقائق، حادثے اور اندیشے ایک دوسرے سے گلے مِل رہے تھے۔ زویا کا وجود بکھرنے کا تمنّائی تھا۔

زویا نے اپنے قریب سے ایک کنکری اُٹھا کر جھیل میں پھینکی تو دائرے نمودار ہونے لگے۔ ان دائروں سے زویا کا ماضی بھی اُبھرا۔۔۔۔ اُس کی ایک بہن، ایک بھائی، اور والدین کے خاکے لمحہ بھر میں آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے، سکول کی چند ایک سہیلیوں، زینب، خولہ اور عالیہ کے خاکے بنے اور مِٹ گئے، بابل کے گھر سے پیا سنگ گھر نکالا نقش کی صورت اُبھرا اور مِٹ گیا۔ زویا، زاہدؔ راٹھور سے بیاہ کر اپنے گھر آگئی۔ یہ منظر اس کی نظروں میں جَما رہا، دھوپ چھاؤں کی سی ایک آشنا کیفیت پیدا کرتا رہا۔

یہ ابھی کل ہی کی ایک بات ہے۔ وہ بیس برس پہلے زویا جمالی سے زویا راٹھور بَنی تھی۔ زاہد پیشے کے اعتبار سے سِول انجینئرَ تھا، اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے وہ جس چیز کی خواہش کرتا وہ اُسے مِل جاتی۔ نیز تقدیر بھی اُس پر مہربان تھی۔ زویا کا بڑا بھائی نور جمالی اس کا ہم جماعت بھی تھا اور سب سے قریبی دوست بھی۔ اُسے زویا اچھی لگی کہ وہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ باکردار بھی تھی اور بااخلاق بھی، وہ ذہین بھی تھی اور متین بھی۔ بیرسٹر کمال جمالی کو بھی زاہد پسند آیا۔ اس پسند میں زویا کی پسند بھی شامل تھی۔۔۔ یوں زویا کالج پورا کرنے کی حسرت دل ہی میں لئے، زاہد راٹھور کی بیوی بنی اور ایک خوشگوار روایت میں ضم ہوگئی۔

غزل

مامون ایمنؔ، نیویارک

ازل سے عشق یک سَر زندگی ہے
اِسی میں غم، اِسی میں ہر خوشی ہے
خوشی میں غم کی جو صورت چھپی ہے
وہی دِل کی لگی ہے، دِل کی لگی ہے
جہاں میں رقص فرما جاں کنی ہے
کہیں اِک پھول کے لب پر ہنسی ہے
انوکھا رنگ ہے اب جاں رَسی کا
پرانی یاد میں شوخی نئی ہے
بہاروں کی بکھرتی کرچیوں میں
خزاں اپنی ہی صورت ڈھونڈتی ہے
کسی لب پر کہانی ہے اَنا کی
کسی سینے میں نیزے کی اَنی ہے
بدلتا جا رہا ہے وقت کیوں کر
تپش بادل میں، صحرا میں نمی ہے

انتخاب

خامشی سے جب کوئی
لمحہ مسکراتا ہے
لمحہ گنگناتا ہے
میرے پاس آتا ہے
بے نشان یادوں کو
محفلیں بناتا ہے

زندگی کے میلے میں
لوگ مِل کے ہنستے ہیں
پاکے خود کو میں تنہا
قُرب کی، محبت کی
ساعتیں پروتا ہوں

میں بھی خود سے کتنا ہوں
راستے سے ہٹتا ہوں
اپنے خول سے باہر
آکے خود کو پاتا ہوں
زندگی کے خاکوں کو
زندگی بناتا ہوں

جذب کا ہر اک دریا
شوق کا ہر اک ساگر
آس کا ہر اک سورج
اِس کا ہر اک سایہ
ڈبڈباتی آنکھوں سے
غم شعار اشکوں سے
خواب میں ڈبوتا ہوں

زخم سب رفو کرکے
خود سے گفتگو کرکے
اِک قرار کی خاطر
بے قرار ہوتا کرکے

ذات کے سرابوں میں
ضبط کو سموتا ہوں
تج کے منزلیں ساری
آرزو کی راہوں میں
اپنا بوجھ ڈھوتا ہوں

شادی کے چار برس بعد، زاہد، زویا، تزئین اور تمکین کے ساتھ تعلیمی ویزا پر بوسٹن آ گیا۔ وہاں زاہد نے سکالر شپ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پھر فلوری ڈا کی ایک کنسٹرکشن کمپنی کی آفر پر پورا خاندان اُورلینڈو منتقل ہو گیا۔ ڈزنی ورلڈ، یونیورسل سٹوڈیوز اور سیکڑوں قدرتی جھیلوں کا شہر۔۔۔ اُورلینڈو۔ زویا اور زاہد کے والدین نے اس بات پر خوشی کا اظہار نہ کیا کہ وہ امریکا میں، اِمی گریشن لے کر، مستقل طور پر قیام کریں۔ بعدِ وطن کے معاشی اور دیگر حالات کے پیشِ نظر دونوں گھرانوں نے اپنا فیصلہ بدلا اور زویا اور زاہد کی مالی مدد کی۔ یوں چار افراد پر مشتمل یہ بھلا چنگا خاندان ہنٹرز کریک کے ایک اچھے سے مکان میں خوش حال زندگی گذارنے لگا۔

زویا نے جھیل میں دوسری کنکری پھینکی۔

زاہد راٹھور ایک کار ایکسیڈنٹ میں دُنیا سے ہمیشہ کیلئے منہ موڑ کر، منوں مٹی تلے جا سویا۔ شب و زر کا ربط ٹوٹنے لگا۔ زویا دو ننھی منّی کونپلوں کے ساتھ زندگی کے صحرا میں تنہا رہ گئی۔ اِمی گریشن کا کیس، فیصلے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔۔۔ اب زویا کے سامنے صرف دو راستے تھے۔۔۔ وطن یا اُورلینڈو۔ اُس نے بزرگوں کی شدید مخالفت کے باوجود، اورلینڈو میں رہنے کا فیصلہ کیا اور ایک گِفٹ شاپ میں آف دی بُکس کام کرکے، نشیب و فراز سے مقابلہ کرنے لگی۔ وقت اُڑتا رہا۔۔۔ گِفٹ شاپ میں زویا اور بیالیس سالہ ڈاکٹر آزر شیخ کی ملاقات ہوئی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ معصومیت سے آگے بڑھا۔

آزر لاٹری کے ذریعے امریکا آیا تھا۔ وہ میڈیکل کے امتحانات نہ پاس کرنے کے باعث اپنا کاروبار کرتا تھا۔ مالی طور پر کسی قدر خوش حال تھا۔ اب امریکی شہری اور وطن کے چند دوستوں کے قرب کے باوجود تنہا تھا۔

زویا کو آزر میں تحفظ، اعتماد اور وقار کے جواہر نظر آئے۔۔۔ اپنے لئے بھی اور سترہ سالہ تزئین اور پندرہ سالہ تمکین کیلئے بھی۔ زویا راٹھور، زویا شیخ بن گئی۔ چار افراد کی زندگیاں ایک نئی راہ پر گام زن ہو گئیں۔

زویا نے تیسری کنکری جھیل میں پھینکی۔

آزر شراب کا دل دادہ نکلا۔ اُس کی آنکھ میلی تھی۔ اُس نے زویا، تزئین اور تمکین کے گرین کارڈز کیلئے پچاس ہزار ڈالرز کا مطالبہ کیا۔ اُس کا ہر لفظ زویا کے وجود میں کرچیاں بَن بَن کر اُترنے لگا۔ زویا نے آزر سے طلاق لیکر، دوبارہ متذبذب لیکن باعزت زندگی گذارنے کا فیصلہ کیا۔

اب جھیل بظاہر پُر سکون تھی

زویا چوتھی کنکری ہاتھ ہی میں لئے، خاموشی سے گھر میں داخل ہوئی۔ آئینے نے اُس کا استقبال کیا۔ اُسے اپنے چہرے اور عکس میں یگانگت نظر آئی۔ وہ پہلے چونکی پھر جھومی اور پھر دو اَمانت کلیوں کے کمرے کی جانب مسکراتی ہوئی لپکی۔



ساجھے داری کا نیوتا

ہندی نظم : اَنکھکیات

سب سے پہلے اپنی بات
میں نے دھول سے کہی
کیونکہ دھول سے آخر میں کہی ہوئی بات
دھول ہوتی ہے

دھول سے پہلے پہل ملنا
کم از کم شہر میں
نہایت ضروری ہے
اور خطرناک
کیونکہ
وہ تمہاری پہچان پر
پورے طور سے چھائی ہوتی ہے
اور وقت کے ساتھ ساتھ

پک کر جھڑ جاتی ہے
تمہاری زمین کے پکنے کے ساتھ
بشرطیکہ وہ ٹھوس اور پختہ ہو

دھول کا پہلا رشتہ
آنکھوں سے بنتا ہے
اور آنکھ
ہر رشتے کے لئے ذمہ داری ہوتی ہے
کیونکہ آنکھ کے پاس
کھلے رہنے کی بے چینی ہوتی ہے

اور کامیابی
آنکھ کی اس مستقل یاترا میں
دھول کا رشتہ ابتدائی مرحلے پر
دعوت اور پڑاؤ کا ہوتا ہے

اس لئے دھول سے کہتا ہوں
اپنی بات
کہ
بے چین آنکھوں تک
میرا یہ پیغام
وہ خود بخود پہنچا دے گی
کہ میری زمین کا نیوتا
آخری ساجھے داری کا ہے!

قدرت کے انمول خزانے سے
اصلی خشک میوے !

● آپ کی خدمت میں
● آپ کے اعزّا و احباب کی خدمت میں



ہر طرح کے سامانِ تغذیہ اور گرم مصالحہ جات بھی ہمارے اسٹور سے خرید فرمائیں !

HELLO : 39-3490

CC city centra

CENTRE OF QUALITY DRY FRUITS AND SNACKS
146, MAHATMA GANDHI ROAD
CALCUTTA-700007

۲۲۲۲ء میں پڑپوتے سے ملاقات

مختار احسن انصاری
DY. S. P.(Retd)
B-13/703/AL-HATEEM, MILLATNAGAR, OSHIWARA
ANDHERI (W), MUMBAI-400053

پُنر جنم کے تو ہم قائل نہیں لیکن اپنے ہی اہلِ خاندان سے پُنر ملن کا ہمیں اس وقت قائل ہونا پڑا جب بازو کی قبر میں دفن کئے ہوئے مردے کا انٹرویو لیکر منکر نکیر واپس لوٹ گئے۔ ہوا یوں کہ قبر کھودڈ نے ہماری قبر کے بازو میں اس انداز سے قبر کھودی تھی کہ دونوں قبروں کے درمیان ململ کی طرح مٹّی کا پردہ حائل رہ گیا تھا۔ پڑوسی مُردے نے جب اطمینان کی سانس لی تو ہم نے درمیان میں حائل مٹی کا پردہ ہٹادیا۔ مٹّی گرنے کی آواز سُن کر NEW COMER پڑوسی نے کروٹ بدلتے ہوئے ہماری جانب رُخ کیا اور سلام کرتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ وعلیکم السلام کہتے ہوئے ہم نے خیریت دریافت کی اور دنیا سے پردہ کر جانے کی تاریخ پوچھی۔

مصافحہ لینے کے بعد پڑوسی مُردے نے ۲ر فروری ۲۲۲۲ء کہا تو ہم چونک پڑے۔ اور بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا۔ ”یعنی ہمیں قبر میں تشریف لائے دو سو برس ہوگئے“۔ نام دریافت کرنے پر مردہ صاحب نے اپنا نام آنند کمار انصاری بتایا تو ہم پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شجرہ پوچھنے پر آنند کمار اپنے باپ، دادا، پردادا کے نام بتانے شروع کئے تو اس کے ساتویں دادا ہم خود نکلے۔ یعنی وہ ہماری ساتویں پشت میں تھا۔ اپنے ہی پڑپوتے کو اپنے سامنے دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ درازیٔ عمر کی دعا دینے سے قاصر تھے اسی لئے اچھی صحت، خوشحالی اور جنّتی ہونے کی دعائیں دیں۔ اور پھر اپنا نام ظاہر کرتے ہوئے اس پر انکشاف کیا کہ وہ ہماری ساتویں پشت میں ہمارا پڑپوتا ہے۔ آنند کمار بھی خوش ہوا۔ اپنی آل اولاد کا حال دریافت کرنے کے بعد ہم نے وہ سوال داغ ہی دیا جو اس کی آمد کے وقت سے ہی ہمیں کھٹک رہا تھا۔ ہم نے پوچھا ”بیٹے یہ بتاؤ، تمہارے ابا نے اسلامی نام نہ رکھتے ہوئے، تمہارا نام آنند کمار کیوں رکھا ہے؟!“ اس نے ہمارے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا ”دادا حضور۔۔ اب ہندوستان میں رہنے والے سارے لوگ اسی انداز کے نام رکھتے ہیں۔ اور عربی فارسی ناموں کا چلن ختم ہوچکا ہے“۔

ہم نے سوچا ہمارے عہد میں بھی سات پُڑا پہاڑ کی وادیوں میں رہنے والے آدی باسیوں کے نام بھی لالی سنگھ پاڑوی، پرتاب سنگھ مان سنگھ وساوے، گلاب سنگھ وجیۓ سنگھ تڑوی وغیرہ ہوتے تھے لیکن وہ لوگ شریعت اور صوم وصلاۃ کے پابند تھے۔

ہم نے اپنے پڑپوتے آنند کمار سے پوچھا۔ ”بیٹے، تم زندگی میں کام دھندا کیا کرتے تھے“ اس نے بڑے ادب سے لیکن فخریہ انداز میں جواب دیا۔ ”ہم آل انڈیا سینٹرل یونیورسٹی بنارس کے ہسٹری ڈپارٹمینٹ کے انچارج یعنی شعبۂ تاریخ کے صدر تھے، تاریخ پڑھاتے تھے“

ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ ہماری نسل میں ایسے عالم فاضل پیدا ہورہے ہیں۔ لیکن ہم ”آل انڈیا یونیورسٹی“ نہ سمجھ پائے تو دریافت کرنے پر اس نے وضاحت کی۔ ”دادا جان! اب ہندوستان بھر میں ایک ہی یونیورسٹی تعلیمی نظام کو کنٹرول کرتی ہے۔ جو وطن کے پایۂ تخت بنارس میں ہے۔ دراصل دنیا کے ہر ملک نے چاند اور مریخ کو آپس میں تقسیم کرلیا ہے۔ اور سیٹلائٹ قائم کر کے وہیں اپنے اپنے ملک کا کاروبار سنبھالا جاتا ہے۔ ان دونوں سیّاروں پر بھی لوگوں کی اچھی خاصی تعداد رہائش پذیر ہے“

ہم نے دریافت کیا ”کیا اس دور میں بھی بھارت کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے والے راشٹر پتا مہاتما گاندھی اور کانگریس اور جمعیت العلماء کے مہان نیتاؤں کو لوگ یاد کرتے ہیں؟

ہمارے پوتے نے استعجابیہ لہجے میں پوچھا ”یہ مہاتما گاندھی کون تھے؟ بھارت کے راشٹر پتا تو پرم پوجیہ ہیگڈے وار گروجی کو مانا جاتا ہے۔ جن کی قربانیوں کی وجہ سے ہندوستان کو آزادی ملی تھی۔ اور گرو گولوالکر، بالا صاحب دیورس، راجندر سنگھ رجو بھیّا، سوتنتر ویر ساورکر، مہاویر نتھو رام گوڈسے، آچاریہ شیاما پرشاد مکھرجی، سواستک لیگ کے بانی ایم آر جیئے کر، بی ایس مونجے، بالو گوکھلے، سر سنگھ چالک کے ایس سدرشن، مہاگرو اشوک سنگھل اور شیر ہندوستان بال ٹھاکرے وغیرہ عظیم وطن پرست نیتاؤں کی ہی قربانیوں اور کاوشوں سے ہندوستان غلامی کی لعنت سے آزاد ہوا تھا۔ اور ہندو مہا سبھا، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل سیاسی پارٹیوں نے ہی تو ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ ہم تو تاریخ میں یہی پڑھاتے آئے ہیں اور آج پہلی بار سنا ہے ہم نے۔۔۔۔۔“۔

ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہم نے کہا۔ ”بیٹے! تم شعبۂ تاریخ آل انڈیا یونیورسٹی کے صدر تھے۔ کیا تمھیں کانگریس پارٹی کے بے لوث جیالوں کے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم؟ کیا موہن داس کرم چند گاندھی، پنڈت جواہر لال

نہرو، موتی لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، بھگت سنگھ، سبھاش چندر بوس، بابو راجندر پرساد، بال گنگا دھر تلک، بال کرشن گوکھلے، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمود الحسن، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، بھولا بھائی ڈیسائی، پرفل چندر گھوش، وجیا لکشمی پنڈت، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، آصف علی، ارونا آصف علی، اوشامہتہ، ایس ایم جوشی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت گوبند ولبھ پنت، ولبھ بھائی پٹیل، بھارت رتن ڈاکٹر بھیم راؤ آمبیڈکر، مہاتما جیوتی باپھلے وغیرہ ہزاروں مجاہدین آزادی کا نام تاریخ میں شامل نہیں ہے؟"

ہمارے پوتے نے تعجب خیز نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان میں سے پنڈت گوبند ولبھ پنت، ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر آمبیڈکر اور مہاتما پھلے کا نام شامل ہے۔ باقی لوگ کون تھے یہ تو ہم بھی نہیں جانتے۔ آج تو مجاہدین آزادی کی حیثیت سے تاریخ میں وہی نام شامل ہیں جو ہم نے آپ کو بتائے ہیں۔ اور راشٹر پتا کی حیثیت سے ہم ہیگڈے وار گرو جی کا ہی نام پڑھاتے آئے ہیں۔ البتہ آپ نے ایک نام گاندھی جی جو بتایا ہے یہ وہی مہاتما گاندھی تو نہیں جسے مہا شورویر ناتھورام گوڈسے نے ملک اور قوم کا غدار مانتے ہوئے گولیوں سے بھون کر بھارت راشٹر کی عزّت بچائی تھی۔۔"۔

اپنے ہی خون کے ذریعے ایسی گھناؤنی باتیں سُن کر ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے قبر میں ہمارا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ہم نے اپنے پوتے کو جنگِ آزادی کے سچے واقعات اور اصل تاریخ بتائی تو وہ حیران اور ششدر رہ گیا۔

ہم نے پوچھا۔ کیا بابا صاحب امبیڈکر کی سر براہی میں تیار کیا گیا، 'دستور ہند' یعنی Constitution Of India پر آج بھی عمل ہو رہا ہے؟

پوتے نے حیرت سے ہماری جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "دستور ہند تو سابق وزیر اعظم شری لال کرشن جی کی سر براہی میں تیار کیا گیا تھا۔ البتہ بھارت رتن بابا صاحب امبیڈکر کو ہندوستان کا ایک طبقہ آج بھگوان گوتم بُدھ کا اوتار مانتا ہے اور دل سے پوجا کرتا ہے۔ اور اُس طبقے کے مذہبی جذبات کا خیال رکھتے ہوئے حکومتِ ہند نے اتوار کی بجائے بُدھ کے روز کو تعطیل کا دن ظاہر کر دیا ہے۔

ہمارا اگلا سوال تھا۔ "کیا آج بھی قومی پرچم کی حیثیت سے وہ ترنگا قائم ہے جس کے درمیانی سفید حصّے میں اشوک چکر ہوتا ہے؟

ہمارے پوتے نے کہا آپ کس زمانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمارا قومی پرچم ترنگا نہیں بھگوے رنگ کا جھنڈا ہے۔ جس کے درمیان میں سنسکرت میں اوم لکھا ہوا ہے اور ترشول بنا ہوا ہے۔

ہم نے درمیان میں دریافت کیا۔ "کیا مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی وغیرہ نیشنل لیڈروں کے جو مجسّمے ہمارے زمانے میں چوراہوں، آفسوں اور مناسب مقامات پر نصب کئے گئے تھے وہ محفوظ ہیں؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "اب تو صرف راشٹر پتا ہیگڈے وار گرو جی، مہا پُرش گرو گولواکر، راشٹر رتن بالا صاحب دیورس، بھارت رتن بابا صاحب امبیڈکر کے مجسمے ہر گاؤں اور شہر کے چوراہے پر نصب ہیں۔ البتہ راجیندر سنگھ رجّو بھیّا، آچاریہ سدرشن، شیرِ بھارت بالا صاحب ٹھاکرے، وشو وجیتا اشوک سنگھل وغیرہ بھی کہیں کہیں ہیں۔ جن کے جنم دن پر ہمارا قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گانا لازمی ہے۔ مذکورہ قومی ترانے کو راشٹر کوی

یك مصرعی نظمیں

رؤف خیر
۱۹/۲۰۲۔۱۰۔۹، گولکنڈہ،
رسالہ بازار،
حیدر آباد۔۵۰۰۰۰۸ (اے پی)

شیشے میں بال ہے کہ انھیں خط نہیں ملا
اب تک! کمال ہے کہ انھیں خط نہیں ملا
کاغذ پہ رکھ دیا تھا کلیجہ نکال کے
کتنا ملال ہے کہ انھیں خط نہیں ملا
آتا نہیں یقین کہ وہ بد گمان ہیں
میرا خیال ہے کہ انھیں خط نہیں ملا
اُن سے تو رات اپنی ملاقات بھی ہوئی
دشمن نہال ہے کہ انھیں خط نہیں ملا
میرا یہ حال ہے میں لکھتا ہوں رات دن
ان کا یہ حال ہے کہ انھیں خط نہیں ملا
کیا کیا لکھا تھا ہم نے نہ جانے رؤف خیرؔ
یہ نیک فال ہے کہ انھیں خط نہیں ملا

۱۔ سلمان رشدی کے لئے ۔
تمھاری آنکھ نصاریٰ ہے دل یہودی ہے

۲۔ انکاؤنٹر ۔
شہید ہو گئے فرضی لڑائیوں میں کئی

۳۔ خیال ۔
مرے خیال میں اس کا خیال ہی سچ ہے

۴۔ سمجھوتا ۔
پہلے خود اپنے آپ سے سمجھوتا کیجئے

۵۔ ٹِپ ۔
ہر ٹپ کے ساتھ اور بھی کھلتی گئی تھی وہ

۶۔ انسان ۔
اپنی ہی جنت سے جو محروم ہے وہ شدّاد ہے یہ

۷۔ وراثت ۔
مری شاخِ ثمر در بے پرندہ ہو نہیں سکتی

میتھلی شرن جی نے لکھا تھا"۔

ہم نے کہا۔ "نہیں، یہ ترانہ تو سر محمد اقبال نے لکھا ہے جو اردو کے عظیم ترین شاعر اور فلاسفر تھے"۔

بچے نے جواب دیا۔ "علامہ اقبال کا ترانہ پڑوسی ملک میں گایا جاتا ہے۔ جس میں لفظ "ہندوستان" کو نکال کر اُن کے ملک کا نام ڈال دیا گیا ہے۔

ہم نے پوچھا۔ "آج کل قطب مینار، لال قلعہ، تاج محل وغیرہ تاریخی عمارتوں کے بارے میں کیا پڑھایا جارہا ہے؟"

پوتے نے کہا۔ "قطب مینار؟ وہ دھرم مینار تو نہیں جو دہلی میں مہرولی کے قریب ہے۔؟

ہم نے کہا۔ "ہاں وہی عظیم مینار، لیکن کیا اب اُسے دھرم مینار کہتے ہیں؟"

تو پوتے نے جواب دیا۔ "ہاں اُسے راجہ دھرم ویر نے بنایا تھا اسی لئے اُسے دھرم مینار کہتے ہیں اور تاج محل یعنی تیجو محل جو آگرہ میں ہے اُسے راجہ تیجومل نے بنایا تھا اور لال قلعہ دتّی کے راجہ بھوج نے بنایا تھا"۔

ہم نے کہا۔ "بیٹا! قطب مینار تو بادشاہ قطب الدین ایبک نے اور تاج محل اور لال قلعہ، مغل شہنشاہ شاہجہاں نے بنوایا تھا"۔

پوتے نے کہا۔ "سیٹیلائٹ کے ذریعے تو ہم وہی تاریخ پڑھاتے تھے جو ہم نے آپ کو بتائی ہے۔ ممکن ہے آپ کے دور میں قطب الدین ایبک اور شاہ جہاں کا نام رہا ہو۔ لیکن مزید تحقیقات کے بعد ہی راجہ دھرم ویر، راجہ تیجومل اور راجہ بھوج کا نام ظاہر ہوا ہے"۔

ہم نے پوچھا۔ "مزید تحقیقات سے مطلب کہیں پروفیسر پی این اوک کی تحقیقات تو نہیں"۔

پوتے نے جواب دیا۔ "جی ہاں دادا حضور۔۔۔ تقریباً دو سو برس قبل پونہ کے پروفیسر پی۔این۔اوک کی تحریر کردہ تاریخ ہی ہم یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے"۔

اتنا سننا تھا کہ سر سے کفن سرکا کر ہم اپنے بال نوچنے لگے۔ اور سر کھجاتے وقت ہمیں بابری مسجد کی یاد آگئی۔ سوچا حال دریافت کرلیں کیونکہ ہمارے دور میں تو شاہی امام اور مسلم لیڈران شہادت کے بعد بابری مسجد وہیں بنائیں گے کا دعویٰ کرتے تھے۔

ہم نے اپنے لاڈلے سے پوچھا۔ "ہمارے زمانے میں ایودھیا میں ایک بابری مسجد تھی جسے ہٹلری ذہنیت رکھنے والے چند کٹر شدت پسندوں نے شہید کردیا تھا۔ اب وہاں کیا ہے؟"

ہمارے پوتے نے بھی اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "بابری مسجد کے تعلق سے ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ البتہ ایودھیا میں رام جنم بھومی کے مقام پر خالص سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک ویراٹ (عظیم) رام مندر ہے جسے رام جی کے دونوں فرزندوں شری لو اور شری کُش نے بنایا تھا۔ اور ہزاروں سال سے وہ مندر وہیں قائم ہے۔ البتہ ہندوستان کی تاریخ میں "بابر" نامی لنکا کے راون کے ایک اوتار کا ذکر ہے جو شری رام کے کئی سو سال بعد ہندوستان میں لوٹ مار کرنے آیا تھا اور ہندوستان میں مغل راج قائم کرکے اُس کی آل اولاد صدیوں تک بادشاہی کے نام پر بھارت واسیوں کو لوٹتی رہی"۔

ہماری زبان سے نکلا۔ "لاحول ولا قوۃ اِلاّ باللہ"۔ بعد ازاں ہم نے پوچھا کاشی اور متھرا کی مسجدوں کا کیا حال ہے؟ کیونکہ ہمارے زمانے میں اُنہیں متنازع قرار دینے کی کوشش کی جارہی تھی۔

ہمارے لاڈلے پوتے نے بتایا۔ "تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل اُن دونوں مساجد کے تعلق سے ووٹنگ کروائی گئی تھی۔ اور الکشن میں مسلم اور سیکولر پارٹیوں کو شکست ہوگئی تھی اب وہاں شیو جی اور کرشن جی کے مندر ہیں۔ اسی طرح سینکڑوں مقامات پر الکشن کے نام پر کھیلے ہوئے اور مسجدوں کی جگہ اب مندروں نے لے لی ہے۔ پوتے نے ہم پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ہمارے بزرگوں نے دانشمندی کا ثبوت دیا ہوتا اور قوم کے افراد مسلک اور مذہب کے نام پر اپنی علیحدہ علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہیں بناتے تو شاید یہ نوبت کبھی نہیں آتی"۔

ہم نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "بے شک اپنے ہی بزرگوں کی غلطیوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے تمھاری نسلوں کو"۔

ہمیں یاد آیا۔۔۔ کہ پوتے نے چاند پر رہائش کی بات کی تھی۔ اس لئے دریافت کیا۔ "بیٹے! کیا تم بھی چاند پر ہو آئے ہو؟"

پوتے نے فخر سے کہا۔ "ہاں دادا جان! دنیا کے تمام ملکوں کی یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ کے صدروں کی میٹنگ چاند پر تھی۔ ہم بھی گئے تھے۔ بے شک بہت خوبصورت ہے چاند اور تحقیقات سے اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ تقریباً سترہ سو سال پہلے چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔ دنیا کے تمام سائنس دانوں نے متفقہ طور پر اعلان کردیا ہے کہ "شق القمر" کا واقعہ بالکل سچا ہے۔ اور چاند پر ہو آنے والے ہزاروں سائنس دانوں نے وحدانیت پر ایمان لاکر اسلام قبول کرلیا ہے۔ تمام عالم میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔

ہم نے الحمد اللہ کہا اور پوتے سے کہا۔ "قبر ہی میں تیمم کرلو۔ نماز میں تمام مرحوم رشتہ داروں سے ملاقات ہوگی۔۔۔ اور پھر اللہ اکبر اللہ اکبر۔۔۔ اذان کی آواز کانوں میں گونجتے ہی ہماری آنکھ کھل گئی۔ جاگے تو اپنے آپ کو بستر پر پایا۔ یعنی ابھی ہمیں۔۔۔ "مرحوم" کا لقب نہیں عطا ہوا تھا۔

اکیسویں صدی اور ہم

اکرام فتحپوری
۴۱، یوسف زئی۔ فتح پور (یو۔ پی۔)

الف (۱) اکیسویں صدی کا آغاز ایسے دن ہوا جس کا نام سنیچر ہے۔ سنیچر عام طور سے منحوس دن گردانا جاتا ہے۔ گو اسلام کی نظر میں سب دن یکساں ہیں۔ نہ کوئی اچھا نہ بُرا۔ پھر بھی لفظ "اچھا یا بُرا" برصغیر سے جڑا ہوا ہے اور اسے الگ کرنا کم از کم ہم جیسے انسان کے بس کی بات نہیں جو دنیاوی معاملات میں بری طرح مصروف ہیں۔ یہ دنیا اچھی ہے یا بُری اس کا انحصار یہاں کے رہنے یا بسنے والوں پر ہے۔ فی الحال غور کرنے پر آثار کچھ اچھے نظر نہیں آتے کیوں کہ جس طرف دیکھو کسی اچھی صورتِ حال کی کمی کا احساس ہوتا ہے چاہے وہ انفرادی طور سے دیکھا جائے چاہے اجتماعی۔ یہ لمحۂ فکر ہمیں مجبور کرتا ہے کچھ سوچنے کچھ سمجھنے اور پھر قدم آگے بڑھانے پر۔

(۲) جب سوچا تو سمجھے کہ علامتیں کسی طرح بھی اچھی نہیں ہیں۔ جب سمجھا تو یہی کہ ہمیں اپنے کو وقت کے تقاضے کے مطابق ڈھالنا ہوگا کیونکہ خود ہم میں اتنی برائیاں سرائیت کر گئی ہیں کہ ہم قدم اٹھانا چاہیں تو مشکل عمل نظر آتا ہے۔ آخر ایسا کیوں؟ جواب خود ہمارے ارد گرد چکر لگا رہا ہے مگر ہم اسے گرفت میں لینے سے قاصر ہیں کیوں کہ خود اپنے کو بھول گئے ہیں کہ ہم کیا تھے کیا ہو گئے۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلمان پر غیر مسلم بھی آنکھ موند کر بھروسہ کرتا تھا اور فی زمانہ ہم اپنے آپ پر اعتبار کرتا ایک دھوکہ، ایک ... سمجھنے لگے

چکے ہو کہ ہم تمہارے قریب آنا عیب سمجھنے لگے ہیں۔ تمہارے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اب کچھ نہیں ہے۔

تم اخلاقی طور سے دیوالیہ ہو چکے ہو۔ روحانیت کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے تم نے سارے اسلامی اصول جانے انجانے ترک کر دیئے ہیں۔"

(۳) ابھی تک میں نے ادبی زبان کا استعمال نہیں کیا، یا یہ کہئے کہ میں ادبی زبان لکھنے سے قاصر ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ میرا تخاطب ہی ایسے لوگوں سے ہے جو ادبی زبان سمجھ ہی نہیں سکتے یعنی ان کا سب کچھ زمانے کے ہاتھوں لٹ چکا ہے اور وہ دیوانے بنے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ بھی شاید سچ ہی ہو کہ میں ڈاکٹر مناظر ہرگانوی، ف۔ س۔ اعجاز یا ہر چرن چاؤلہ کی زبان میں بات کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے بھی اکیسویں صدی کا ڈر ستا رہا ہے اور میری دلی تمنا ہے کہ اس صدی کی شروعات سوچ سمجھ کر اور ایک جانی بوجھی اسکیم یا پلان کے تحت ہو اور اس کے لئے مثبت تحریک کا خاکہ سامنے ہو تاکہ ہمارے قدم صحیح پڑیں۔ بقول جگر مراد آبادی۔

پاؤں پڑ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

کبھی ایک نعتیہ شعر کہا تھا۔

اخلاق سے ناپا ہے انسان کی عظمت کو
کیا خوب ... سرکارِ دو عالم کی

... خود بخود

... اکیسویں صدی کا

... تاکہ ہمارے ...

و شخصی مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں اور ہمیں کسی کو کسی صورت گھیٹنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہم ہر انسان کو اسی پیمانے سے ناپ کر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔ یہ دوسروں سے چرائی ہوئی اونچ نیچ کی ذہنیت اپنی موت آپ مر جائے اور اس خطے کی تعمیل فطری طور سے عمل میں آئے جس میں جلی حرفوں میں لکھا ہے کہ نہ کوئی بڑا نہ چھوٹا، نہ کوئی امیر نہ غریب، نہ کوئی گورا نہ کالا، نہ کوئی مرد نہ زن۔ نہ کوئی بچہ نہ جوان" اور ہر مسجد میں ننگا ہمارا منہ چڑھا رہا ہے کیوں کہ اسکو ہم نے اپنایا نہیں۔ علامہ اقبال نے ہماری توجہ بہت پہلے مبذول کرائی تھی اور کہا تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ہم نے تو یہی راہ اپنائی تھی مگر ہمارے رہنماؤں اور ملاؤں نے اپنی ساکھ جمانے کے لئے ہمیں بہکا دیا اور غلط راہ پر ڈال دیا۔ مگر ہم اس کو یک لخت ترک کر کے راہِ مستقیم پر لگ سکتے ہیں۔ کاش ہمیں خدا اس کی توفیق عطا فرمائے۔ قرآن پاک کو ٹٹولا گیا تو اس میں اس قسم کی کوئی تھیوری نہیں ملی۔ نبیؐ کریم کے ارشادات نے بھی ہمیں اس سے باز رہنے کی تلقین سختی سے کی ہے۔

(۴) ہمارے اندرونی اختلافات کو ہموار کرنے کے لئے ڈاکٹر اقبال نے کھلے لفظوں میں فرمایا ہے کہ۔

اللہ بھی، ایمان بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

مگر ہم ہیں ...

کیا ...
یہ نیک ...

اتفاق کو کسی نہ کسی بہانے چکنا چور کرتے رہتے ہیں جس سے سماجی اور انفرادی بکھراؤ میں مزید اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے اور ہمارے لئے دماغی اضطراب کا باعث بنتا جارہا ہے۔ مختصراً ہر شخص الجھنوں اور فکروں کا شکار بن کر رہ گیا ہے۔ ہم خوشی کے لئے ترس گئے ہیں۔ ماحول آپسی توڑ پھوڑ کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ ہم اسی میں اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ

مقدر کا جامہ شکن در شکن ہے
کوئی زندگی کو سنوارے کہاں تک
(کوثر جائسی)

(۵) ڈاکٹر جمیل جالبی فرماتے ہیں "یہ کام اختلاف کے فتنے جگانے۔ محض اپنی سیاسی دوکان چمکانے کے لئے اپنے معاشرے کے باطن میں فرقہ پرستی کو ابھارنے، جہل اور غفلت سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہمیں اپنے ذہن کے بند دریچوں کو کھولنا ہوگا۔ ہمیں اس وقت امام غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسی ہستیوں کی ضرورت ہے جو کھلے دل و دماغ سے عہدِ حاضر کے مسائل کو سمجھ کر اس کا حل تلاش کریں اور اسے ایک نظام کی صورت میں پیش کریں۔ سچے دینِ فطرت کی ترویج و اشاعت کا اس سے بہتر موقع بیسویں صدی کے آخر (اکیسویں صدی کے شروع) میں آج صدیوں بعد آیا ہے۔ خدارا اسے ضائع نہ کیجئے۔ اسی عمل نے، اسی راستے پر چل کر آپ (ہم) اکیسویں صدی کو اپنی صدی بنا سکتے ہیں"

سماجی انتشار اور انفرادی اضطراب دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ

تہذیب ہر طرف ہے مگر پھر بھی آدمی
بے موت مر رہا ہے یہ کیسا دیار ہے

ب(۱) اقتصادی سوال پر راقم الحروف دماغ کافی پرانی بات پر جاتا ہے۔ عرصہ ہوا انگریز دانشور نے ہندوستانی مسلم اوقاف کی اسٹیٹکس (اعداد و شمار) اخبار میں شائع کرائی تھی اور اسکے تحت اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر مسلم سماج اپنی وقف شدہ جائیدادوں کو منظم کرلے تو ہندوستان میں کوئی مسلم فقیر نظر نہ آئے۔ اسکی یہ بات مذاق بن کر اڑ گئی۔ مگر آج اسکی اہمیت پر بار بار سر دھننا پڑتا ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ واقعی اسکی دلیل سچائی سے پرے نہ تھی۔ سماج کے مختلف افراد انہیں جائیدادوں کو ہڑپ کر رئیس اعظم بن گئے ہیں اور غیر منظم مسلم سماج ان کا کچھ نہ کر سکا۔ اب بھی اگر ہم اس سمت توجہ سے کام لیں تو ہماری معاشی بدحالی درست ہو سکتی ہے۔ مگر اب حالات مشکل سے مشکل تر ہو گئے ہیں کیوں کہ موجودہ حکومتیں ان پر اپنی غاصبانہ نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ پھر بھی بچی کھچی ٹٹ پٹ جائیدادوں کو تحویل میں لیکر انہیں منظم کیا جا سکتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟

(۲) آیئے! ہم ایک اور پہلو پر غور کریں یعنی فطرہ اور زکوٰۃ پر جو کیا تو جارہا ہے مگر بے دلی سے یا جتنا کیا جانا چاہئے اتنا نہیں کیا جارہا۔ اگر ہر مسلمان اپنی آمدنی کا ۵ء۲ فیصد زکوٰۃ نکالتا رہے (یہ شرعی درہے) تو بھی ہماری اقتصادی حالت میں بہتری کے امکانات روشن ہو جائیں اور ہماری زبوں حالی کچھ کیا بہت کچھ بہتر ہو جائے۔ اس سلسلے میں شمسی جماعت کو منتظماً مستعد پاتا ہوں۔ جس سے ہمیں سبق لینا چاہئے۔

(۳) اس کے لئے ہمارے صاحب حیثیت حضرات کو آگے آنا چاہئے اور انہیں اپنی اضافی دولت کو پیداواری کاموں میں استعمال کر کے روزگار کے مواقع فراہم کرنا چاہئے۔ کچھ نیک دل انسان اس فریضے کو نبھا ضرور رہے ہیں مگر اس میں اضافے اور تیزی لانے کی سخت ضرورت ہے۔

(۴) مسلم سماج میں تجارتی ذہنیت کو فروغ دینا ہمارا فرض ہو جاتا ہے۔ چھوٹے موٹے دھندوں میں لگنے سے ہم مسلمانوں کو پرہیز نہیں کرنا چاہئے۔ جیسے سیلس مین بننا، درمیانی ایجنٹ بننا۔ چھوٹی دکانیں رکھنا وغیرہ۔ ان کاموں میں لگے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انہیں ایسے کاموں میں بے عزّتی کا احساس نہ ہو۔ ہم نے دیکھا ہے اس معاملے میں سندھی اور پنجابی بہت تیز ہیں۔ وہ سڑکوں کی پٹریوں پر دکان لگا کر کپڑا بیچنا۔ خوانچوں اور ٹھیلوں پر چاٹ بیچنا فخر سمجھتے ہیں جبکہ مسلمان ایسے کاموں سے کتراتے یا بچتے ہیں۔ ان کاموں کو باعزت کام تصور نہیں کرتے چاہے ان کے بال بچے دو وقت کی روٹی کے لئے ترسیں۔

(۵) عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ مسلمان ٹیکنیکل کام میں ہوشیار ہوتے ہیں جیسے سائیکل۔ موٹر سائیکل۔ کار۔ موٹر۔ ٹرک و ٹریکٹر وغیرہ کی مرمت۔ مگر اسے کسرِ شان سمجھ کر نہیں کرتے جبکہ وہ اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔

(ج) ماضی اس بات کا گواہ ہے کہ مسلمان علم و حکمت کے ہر شعبے میں رہبری کا مجاز رکھتا تھا۔ مگر موجودہ حالات بالکل اس کے برعکس تصویر پیش کر رہے ہیں۔ ہم نے پچھلی صدیوں میں بھرپور غفلت شعاری سے کام لیا ہے یا ہمیں نیند کی گولیاں اتنی کھلائی گئیں کہ ہم سوتے رہے۔ محترم شان الحق حقی صاحب نے اشارۃً تحریر فرمایا ہے کہ "علم کی طرف سے بے توجہی کہ پرجا کی سوچ کو سوتا رہنے دیا جائے، ایک طرف شہنشاہیت کی پسند خاطر تھی تو دوسری طرف مذہبی اجارہ داروں کے موافق مطلب"

(ص۔۲۰، انشاء جنوری فروری ۲۰۰۰ء)

ظاہر ہے کہ حکومت اور فلائیت نے متحد ہو کر عوام کو علم سے قصداً بے بہرہ رکھا۔ یہ

ہماری بہت بڑی بقسمتی ہی کہی جاسکتی ہے مگر اس پر اشک سوئی بے سود نظر آتی ہے اور کوسنے سے بھی مطلب براری نہیں ہوتی۔ بلکہ بصورت تحریک ہم اس کمی کو پورا کرنے میں لگ جائیں تو بہتر ہوگا۔ ہمیں پچھڑے پن کو تیز رفتاری سے دور کرنا ہوگا۔ سارے وسائل جنگی پیمانے پر اس سمت لگانے ہونگے۔ ہمیں اجتماعی جدوجہد کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنا ہوگا۔ تعلیمی اداروں اور تعلیم سے متعلق اشخاص کو متحرک کرنا ہوگا۔ یہ کام بظاہر مشکل نظر آتا ہے مگر غیر ممکن نہیں۔ ہم مثبت پلاننگ کے ذریعہ اسکو آسانی سے کر سکتے ہیں مگر اس کے لئے زبردست قومی تعاون و اتحاد کی ضرورت ہوگی۔

(۲) ایک دوسرا اقتباس بھی ہمارے علمی پچھڑے پن پر روشنی کا موجب ہے، ملاحظہ ہو ''اوّل تو ہم مسلمان، یہ سمجھ کر کہ جدید علم کی طرف بھاگنا بدعت اختیار کرنا اور ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے، علم و ہنر کی ایجاد سے دور رہے اور مات پر مات کھاتے رہے۔ حالانکہ علم کا حاصل کرنا نہ صرف نیک کام بلکہ پوری طرح تحقیق شدہ علم کی مخالفت کرنا دین کی طرفداری کے بجائے دین کے مخالفین پیدا کرنے کے برابر ہے''۔ (ص۔ ۱۷، انشاء جنوری فروری ۲۰۰۰ء)
علم سے گریز ہم نے بہت ہی نیک نیتی سے کیا تھا۔ بدعت سے بچنا چاہا۔ بے یقین اور غیر نافع تحقیق میں تضییع اوقات سے منہ موڑا۔ دنیا طلبی کی آلائش سے دور رہے۔ لیکن اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ قدرت نے اپنے راز اس طرح مستور رکھے ہیں کہ ان کی تلاش میں سرگردانی لازمی ذریعہ علم ہے۔ ان تک پہنچنے کے لئے پہلے سے کوئی راستہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ بس اس غلطی کی پاداش میں صدیوں کا فرق پڑ گیا اور ہم پیچھے رہ گئے بلکہ بہت پیچھے'' (ص۔ ۱۵، انشاء جنوری فروری ۲۰۰۰ء) غرض تاویلیں متعدد ہیں مگر سب بے سود اور وقت ضائع کرنے کے مترادف۔

(د) آیئے! اب ہم ایک ایسے نکتے کی طرف توجہ مرکوز کریں جس کو مذہبی اور دینی راہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس محور سے ہم ہٹے تو نہیں ہیں مگر بہک ضرور گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے مسلمان وہی ہے جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو۔ اگر ہم اس پیمانے سے خود کو ناپیں تو شاید نتیجہ صفر ہی ہو۔ کیونکہ ہم زمانے کی گرد سے اتنا متاثر ہو چکے ہیں کہ خود کو پہچاننا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو گیا ہے۔ شاعرانہ انداز میں کہا جاسکتا ہے کہ

بہروپیوں کا بھیس بنائے ہوئے ہیں لوگ
چہرے پہ ایک چہرہ لگائے ہوئے ہیں لوگ

ہمارے مذہبی رہنماؤں نے اتنی ایجنسیاں قائم کر رکھی ہیں کہ ہم سڑک چھاپ مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم۔

اِدھر جائیں یا اُدھر۔

اس سلسلے میں ہمیں شان الحق حقی صاحب کی بات زیادہ اپیل کر رہی ہے۔ یعنی ''انسان معقولات کی نسبت منقولات میں زیادہ یقین رکھتا ہے۔ معقولات تو اپنے آپ کو زبردستی منواتے ہیں اور خود اپنی حجت بن جاتے ہیں۔ منقولات آنکھ بند کر کے قبول کئے جاتے ہیں'' آگے چل کر وضاحت کی ہے کہ ''ماننے کے لئے ماننا (ایمان الغیب)'' حالانکہ یہ مشترکہ نکات میں سے ایک ہے مگر ہے اہم۔ نیز سمجھ میں آنے والا۔ اس رہ پر چل کر انسانی سکون بھی پاتا ہے اور چلتے رہنے کی روشنی بھی۔ اب ہمیں اپنے ایمان کی حفاظت قرآن اور احادیث کی روشنی میں کرنی ہوگی اور امریکی اور عربی سودی ڈالروں سے محفوظ رہنا ہوگا ورنہ ہم دوزخ کے کندے بن کر رہ جائیں گے۔ میزائل اور ہوائی حملے کر کے، متحدہ قوتیں، عالمِ اسلام کو دہلانے اور دھمکانے کی کوشش کر رہی ہیں اور ہم دین والے انتشار کا شکار ہیں۔ انہیں علامتوں کے مدِ نظر علامہ اقبال نے کہا تھا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہمیں مذہب کے دامن میں محبت اور پیار کے پھول بھر کر فضا میں بکھیرنا اور ماحول کو خوشگوار بنانا ہوگا۔ اکیسویں صدی میں ہمیں پیار ہی پیار کے نغمے لٹانے ہیں تاکہ سکتے عوام سکھ کی نیند سو سکیں اور دنیا ارتقائی اقدام جوش و خروش سے آگے بڑھا سکے۔ ہمیں سارے جہان کو سمجھانا ہے کہ۔

جنوں کو چھوڑو محبت کی رسم عام کرو
وطن کی خاک کو سجدہ کرو، سلام کرو

بقیہ انجم شرقی! سعید انجم!!

ڈیننگ روم میں میرے داخل ہوتے ہی طلعت آپا نے پوچھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے تھاما اور کمرے سے باہر لے آیا۔ ''مجھے کچھ تو بتاؤ، کیسی حالت ہے سعید کی؟'' وہ بولی۔ ''آپا سعید کو اب کوئی تکلیف نہیں رہی وہ ہر دکھ سے آزاد، آرام سے سو رہا ہے''۔ میں نے کہا اور طلعت کو اس کمرے میں لے گیا جہاں سعید، ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا۔ ''میاں بیوی کی اس ''ملاقات'' کے منظر کی میں تاب نہ لا سکا۔ تھوڑی دیر بعد، میں طلعت کو ساتھ لئے واپس ڈیننگ روم میں آیا تو ہما دونوں بچوں کو بازوؤں میں لئے کھڑی تسلی دے رہی تھی۔ ان تینوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اب طلعت کو دیکھتے ہی دونوں بچے اس سے لپٹ گئے تھے اور وہ ان کو سعید کے کمرے کی جانب لئے جارہی تھی۔ ہما، جوان کو سہارا دیئے ہوئے تھی اس نے پیچھے مڑ کر میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تمھیں تو سعید بھائی کو تقریب میں اپنے ساتھ شہر لے جانا تھا جہاں اس نے تمھیں اپنا افسانہ سنانا تھا۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ ہمیں ''ابرزادی'' کی کہانی سنانے والا آج خود آسمانوں کی جانب پرواز کر گیا تھا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر



عطیہ خان
52, Brent Way
London N3 IAP (U.K.)

اورنگ زیب کے طرز حکومت نے مغلیہ سلطنت کے زوال کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اسکے بعد کوئی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی سے کام لینے والا بادشاہ دہلی کے تخت پر نہیں بیٹھا جو حالت کو بگڑنے سے بچا لیتا۔ جتنے بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ سب کمزور اور عیش پسند تھے۔ ۱۷۸۸ میں غلام قادر روہیلہ نے عارضی طور پر دہلی پر قبضہ کرلیا تھا۔ اسکے بعد مراٹھوں نے دہلی پر قبضہ کیا اور شاہی خاندان کی سخت توہین کی۔ ۱۸۰۳ میں انگریزوں نے مراٹھوں کو ہرایا اور مغل بادشاہ، شاہ عالم کو دہلی کا تخت واپس دلا دیا۔ لیکن یہ حکومت صرف برائے نام تھی۔ کشمیری گیٹ کے پاس ایک برٹش ریزیڈنٹ مقرر کر دیا گیا اور حقیقت میں انگریز ہی حکمراں ہو گئے تھے۔

شہنشاہ اکبر نے انپڑھ ہونے کے باوجود یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیتی حکومت قائم رکھنے کیلئے یہاں کے اکثریتی طبقے کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے۔ اکبر کے بعد آنے والے بادشاہوں نے بھی یہی اصول اپنایا۔ داراشکوہ نے بھگوت گیتا اور اپنشد کا فارسی ترجمہ کرایا تھا۔ خود اسنے اسلام اور ہندو مذہب کے تقابلی مطالعے پر ایک کتاب لکھی تھی جسکا نام تھا مجموعہ البحرین۔ اگر داراشکوہ کو تخت نشین ہونے کا موقع ملتا تو وہ یقیناً ہندو مسلم اتحاد کو اور زیادہ مستحکم بناتا لیکن اسکے چھوٹے بھائی اورنگ زیب نے اسے اور دوسرے بھائیوں کو قتل کروا کے اور اپنے باپ شاہ جہاں کو قید کر کے حکومت حاصل کرلی۔ اکبر نے جزیہ ختم کر دیا تھا جسے اورنگ زیب نے دوبارہ ہندوؤں سے وصول کرنا شروع کر دیا۔ شیواجی نے اسکے خلاف احتجاج کیا اور برابر اورنگ زیب سے لڑتا رہا۔ اورنگ زیب نے غیر مسلم پر جزیہ لگا کر اور اپنی تنگ نظری اور مذہبی شدت پسندی سے فرقہ وارانہ دشمنی کی بنیاد ڈال دی۔ دراصل مذہبی رواداری ہی صحیح معنوں میں مذہب ہے۔ مذہبی تعصب سے انسانیت اور روحانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر اگر اورنگ زیب کے بعد ہی تخت نشین ہوتے تو وہ انتہائی ہمدرد، رعایا کی دیکھ بھال کرنے والے انصاف پسند اور رحم دل بادشاہ ہوتے۔ خدا نے ان کے پہلو میں ایک وسیع، دردمند اور حساس دل رکھا تھا۔ لیکن جب بہادر شاہ تخت نشین ہوئے تو مغلیہ حکومت صرف لال قلعے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ تخت نشینی کے وقت بہادر شاہ کی عمر ساٹھ سال کی تھی اور حکومت کی حالت یہ تھی کہ ملک خدا کا۔ سلطنت بادشاہ کی اور حکم کمپنی بہادر کا۔ اسلئے بادشاہ ہوتے ہوئے بھی ملک کے انتظام پر انکا کوئی اختیار نہیں تھا۔ انھیں اپنی مجبوری اور بے بسی کا پوری طرح احساس تھا جو ان کی شاعری میں عیاں ہوتا ہے۔



بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ پکے مسلمان تھے لیکن ان میں فرقہ داریت کا کہیں گذر نہیں تھا۔ ان کے دربار میں رکھشا بندھن، دسہرہ، ہولی، دیوالی اور بسنت پنچمی سب ہی تہوار منائے جاتے تھے۔ یہ سیکولر ہونے کی دانستہ کوشش نہیں تھی۔ یہ اصلی میل ملاپ تھا جسکی بنیاد اکبر نے ڈالی تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے مذہبی کٹر پن سے ہندو اور مسلمانوں کا میل جول روک دیا تھا لیکن ختم نہیں کر سکے تھے۔ بہادر شاہ کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا میل جول پھر سماج کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ مغلوں نے ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے گائے کی قربانی بند کر دی تھی اور گائے کی جگہ اونٹ کی قربانی ہوتی تھی۔ انگریز ریزیڈنٹ ٹامس منکاف نے بقرعید پر گائے کی قربانی کی اجازت دیدی جس کی وجہ سے ہندوؤں نے احتجاج کیا لیکن فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔

اگرچہ بہادر شاہ کو ملک کی حکومت پر کوئی اختیار نہیں تھا لیکن دہلی

کی تہذیب کو انھوں نے ایک خاص رنگ دیا۔ انھوں نے علوم و فنون اور مصوری و شاعری کی سرپرستی کی۔ وہ خود ایک اسکالر تھے۔ انھوں نے سعدی کی گلستان پر تبصرہ لکھا تھا۔ خطاطی میں بھی ماہر تھے۔ خزانہ خالی ہوتے ہوئے بھی انھوں نے باغوں سے مغلوں کے لگاؤ کی روایت قائم رکھی۔

دہلی کا وہ زمانہ اردو شاعری کا سنہری دور تھا۔ بیک وقت بہت سے اعلیٰ پائے کے شاعر دہلی میں موجود تھے۔ بہادر شاہ خود ایک اعلیٰ پائے کے شاعر تھے اور ظفر انکا تخلص تھا۔ لیکن اس دور کے شعراء میں غالب کے علاوہ اور کسی شاعر کے کلام کو ہر زاویے سے نہیں دیکھا گیا ہے اور ظفر کے کلام پر تو بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ زمانے کے دستور کے مطابق فاتح حاکموں کے سامنے شکست خوردہ بادشاہ کا نام کون لیتا اور اسکی شاعری کو کیوں اہمیت دی جاتی۔

بہادر شاہ ظفر کے پہلے استاد شاہ نصیر تھے۔ اسکے بعد ذوق ان کے استاد ہوئے اور ذوق کے انتقال کے بعد چند سال ظفر، غالب کی شاگردی میں رہے۔ ظفر کو ستاسی سال کی عمر دراز ملی لیکن وہ ساری رنج والم میں کٹ گئی۔ ساٹھ سال کی پختہ عمر میں تو وہ تخت نشین ہوئے جبکہ خزانہ خالی تھا۔ حکم انگریزوں کا چلتا تھا۔ پھر ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد تو انھوں نے کیا نہیں دیکھا۔ شہزادوں کا سفاکانہ قتل، قید تنہائی اور پھر جلاوطنی۔ اکیس شہزادے ایک دن میں سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ اسکے علاوہ بیشمار لوگوں کو قتل کر کے انکی لاشوں کی چاندنی چوک میں نمائش کی گئی۔ خود بہادر شاہ کو لال قلعے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر دیا گیا تھا۔ انگریز سیاحوں کیلئے وہ ایک تماشہ بن گئے تھے۔ جو انگریز انھیں دیکھنے آتے تھے ان میں سے ایک نے بہادر شاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک کمزور بڈھا گندے کپڑوں میں ملبوس ایک چارپائی پر بیٹھا رہتا تھا اور جب کوئی انگریز اسکے پاس جاتا تو وہ اپنا حقہ ایک طرف رکھکر سلام کرتا اور کہتا کہ انھیں دیکھکر بڑی خوشی ہوئی۔ ذلت و خواری کی اس حالت کو پہنچا دینے کے بعد انگریزوں نے اکتوبر ۱۸۵۸ میں انھیں جلاوطن کر کے، بیل گاڑی میں بٹھا کر زندگی بھر کیلئے رنگون بھیج دیا۔ اپنی زندگی کے آخری پانچ سال رنگون میں جلاوطنی کی حالت میں گذار کر وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

بہادر شاہ سے اگر حکومت انگریزوں نے چھینی تھی تو انکی شاعری ان کے استادوں کے شاگردوں نے چھین لی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ آدھا دیوان شاہ نصیر کا ہے اور باقی ساڑھے تین دیوان استاد ذوق کے عطا کردہ ہیں۔ اسکے بعد حالی نے یادگار غالب لکھتے ہوئے اپنے استاد سے عقیدت مندی کے جوش میں ظفر کا باقی کلام غالب کے بستے میں باندھ دیا۔ ہمارے بزرگ وفاداری اور عقیدت مندی کے جوش میں اکثر انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے تھے۔ ظفر کی شاعری کا اپنا الگ انفرادی رنگ ہے جسمیں نہ تو شاہ نصیر کی شاعری کا رنگ نظر آتا ہے نہ ذوق کا اور نہ ہی غالب کا۔ غالب اور ذوق اس زمانے کے مشہور ترین شعراء میں تھے لیکن ظفر کی شاعری کا رنگ اپنے دونوں استادوں کے رنگ سے مختلف ہے انھوں نے فکر و فن کی اپنی الگ دنیا بسائی تھی۔ انکی بسیار گوئی نے ضرور انھیں نقصان پہنچایا اور بہت سے اشعار کا معیار پست ہے۔ لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بڑے بڑے استادوں کے کلام میں بھی غیر معیاری اشعار ملتے ہیں۔ خدائے سخن میر تقی میر کے کلام میں انتہائی پست درجے کے اشعار موجود ہیں۔ کسی بھی شاعر کا درجہ اُسکے بہترین اشعار کی روشنی میں مقرر کیا جاتا ہے اور ظفر کے کلام میں انتہائی بلند پایہ اشعار کی کوئی کمی نہیں ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی ساری زندگی رنج والم اور محرومی و مجبوری کی حالت میں گذری۔ انکی داخلی بے چینی اور سوزش پنہاں کی تپش ان کے کلام سے عیاں ہوتی ہے۔ یوں تو وہ شہنشاہِ ہند تھے لیکن حکومت کے سارے اختیارات انگریزوں نے چھین لئے تھے۔ اپنی مجبوریوں کا اظہار ظفر انتہائی پروقار طریقے سے کرتے ہیں۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کیلئے گرچہ بنانا تھا مجھے
کاش خاک درِ جانانہ بنایا ہوتا
نشّۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

ظفر کے عہد کا آشوب انکی داخلی زندگی کا سوز و درد بن گیا ہے اور یہ درد و کرب برابر انکے کلام میں نظر آتا ہے۔

پڑے ہیں سوزِ محبت سے دل پہ جتنے داغ
ستارے اتنے نہ ہوویں گے آسماں کیلئے
شمع جلتی ہے پر اسطرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے
آہ کب سینے سے اے ہم نفساں نکلے ہے
دل میں اک آگ سلگتی ہے دھواں نکلے ہے

ظفر کی زندگی کے آخری ایام رنگون میں جلاوطنی اور اسیری کے عالم میں گذرے لیکن زندگی کا وہ حصّہ جو دہلی میں گذارا اسمیں بھی وہ

حالات کے اسیر تھے اور اس اسیری اور ذہنی جلاوطنی کا ذکر ظفر مختلف پیرایوں میں کرتے ہیں جن میں انھوں نے قفس' آشیاں' صیاد' عندلیب وغیرہ اردو شاعری کے استعاروں کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ کبھی انتہائی مجبوری اور بے بسی کا اظہار اسطرح کرتے ہیں۔۔

اے اسیران خانۂ زنجیر
تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا
باندھے پر صیاد نے ایسے ہم اڑ سکتے نہیں
ہوگا کیا کھڑکی قفس کی اب اگر کھل جائیگی

تو کبھی زنداں کے نگہبانوں کو بھی اپنے دکھ میں شریک کر لیتے ہیں۔

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

اور کبھی اس قید سے چھٹکارہ پانے کا حوصلہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔

قفس کے ٹکڑے اڑادے جو پھڑ کے اے صیاد
اگرچہ دم نہیں مرغ شکستہ بال میں کچھ
قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے
اسیرو کرد کچھ رہائی کی باتیں

ہر قسم کی مذہبی خانہ بندی سے پرے صرف انسانیت انکا مسلک ہے۔

صوفیوں میں ہوں نہ رندوں میں نہ میخواروں میں ہوں
اے بتو بندہ خدا کا ہوں گنہگاروں میں ہوں
میری ملت ہے محبت میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دینداروں میں ہوں

ظفر نے لمبی بحروں میں بھی بڑی خوبصورت غزلیں لکھی ہیں جو اپنی موسیقیت اور روانی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ خواہ انکے مضامین عاشقانہ ہوں یا ناصحانہ۔

نہیں عشق میں اسکا تو رنج ہمیں کہ شکیب و قرار ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا
ظفر آدمی اسکو نہ جانئے گا ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا
پوچھتے کیا ہو مجھ سے عزیز و حال غم تنہائی کا
میں تھا اور غم خانہ تھا غم خوار غم جانانہ تھا
بل بے تپ اندوہ محبت اُف رے گرمئی داغ فراق
دل تھا کیا پہلو میں ہمارے گویا آتش خانہ تھا

رنگون میں جلاوطنی کے زمانے کا جو کلام ہے وہ انکی بے بسی، بیکسی اور زندگی کی بے معنویت کے شدید احساس کا اظہار ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں میں وہ بیکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروں کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد انگریزوں نے جو ظلم و ستم کئے انکا اظہار اس مسلسل غزل میں کیا ہے۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گناہ
ولے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں انکے غبار ہے
نہ دبایا زیر زمیں انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں
نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشان مزار ہے
سبھی جادہ ماتم سخت ہے کہوں کیسی گردش بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے

حب الوطنی ظفر کی رگ رگ میں بسی تھی۔ انھیں ہندوستان کے ذرّے ذرّے سے محبت تھی۔ وطن میں رائج ہر رسم و رواج سے ہر مذہب اور تہذیب سے انھیں دلی لگاؤ تھا اسی لئے انھوں نے ٹھمری، گیت، بھجن وغیرہ میں بھی اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔

جن گلین میں پہلے دیکھیں لوگاں کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگاں بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں
ایسی انکھیاں میچ پڑے ہیں کروٹ بھی نہیں لے سکتے
جنکی چالیں البیلی اور چلنے میں چھل بلیاں تھیں
یہ منوا ہے مورکھ لوبھی سب ہی پر للچاوے ہے
چاتر ہو تو اس مورکھ کو جیسے بنے سمجھاؤ جی
سدھ بدھ دی کرتار نے تم کو سوچ سمجھ کر کرنا کچھ
ایسی کرنی مت کرنا جو کر کر پھر پچھتاؤ جی

ظفر کے دور کے شعراء میں غالب کے علاوہ اور کسی بھی شاعر کے کلام پر بہت زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ لیکن ظفر کے ساتھ جو زیادتی کی گئی وہ زیادتی بھی کسی اور کے ساتھ نہیں ہوئی کہ انکے کلام کو انکے استادوں سے

بقیہ صفحہ نمبر ۶۷ پر

قرۃ العین حیدر کا افسانہ ”اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے“

ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں
ریڈر، شعبۂ اردو، بہار یونی ورسٹی، مظفر پور، بہار

زیر مطالعہ افسانہ قرۃ العین حیدر کے آخری افسانوی مجموعہ ”روشنی کی رفتار“ کا ہے۔ افسانے کے تجزیے سے قبل اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمالیجیے تاکہ قصہ ذہن میں تازہ ہو جائے۔

اس افسانے کا قصہ نجن میاں اور جمال آرا کی ملاقات و تعلقات پر مبنی ہے۔ نجن میاں علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ ایک بار گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے یہاں رائے بریلی چلے گئے۔ ماموں کی لڑکی سے ان کی ٹھیکرے کی مانگ تھی، اس لئے وہ ان سے سخت پردہ کرتی تھی۔ نجن میاں گھر میں بور ہو جاتے تو سائکل لے کر سیر کو نکل جاتے، ایک دن رائے بریلی کے مضافات میں موضع کریم گنج سے ان کا گزر ہوا۔ اچانک آم کے جھنڈ سے کوئل کی کوک جیسی ایک آواز بلند ہوئی اور رام پوری چاقو کی طرح سیدھی ان کے دل میں اترتی چلی گئی۔ نجن میاں موسیقی کے رسیا تھے۔ علی گڑھ میں گایا کرتے تھے اور کلاسیکل میوزک بھی سیکھ رکھی تھی۔ وہ اس نسائی آواز پر عاشق ہو گئے اور روزانہ اس مکان کے اردگرد منڈ لانے لگے۔ ایک دن جب لڑکی نے انترہ اٹھایا تو وہ جھنجلا گئے اور ڈانٹ کر اصلاح بھی دی۔ اس پر کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھلا، دو سیاہ آنکھوں نے درز سے جھانکا، پھر پٹ زور سے بند ہو گیا۔ نجن میاں نے پھر مشورہ دیا: ”بی بی قدرت نے تمہارے گلے میں نور بھر دیا ہے۔ بس ذرا سرگم پر محنت کر ڈالو“۔ اس کا کچھ، جواب نہ ملا۔ نجن میاں ایک روز پھر پہنچے۔ وہ علی گڑھ کے کھلنڈرے تو تھے ہی۔ سائکل کی گھنٹی بجائی اور بند کھڑکی کو دستک دے کر کہنے لگے: ”بی بی ہم تمہاری آواز کے مرید ہیں۔ ایک گلاس پانی بھجوادو“۔ انہیں دروازے کی جانب آنے کو کہا گیا۔ مراد آبادی کٹورا سرکا کر باہر رکھ دیا گیا، اس طرح کہ وہ پانی دینے والے کے ہاتھ کی جھلک بھی نہ دیکھ سکے پھر انھوں نے لڑکی سے تعارف پیدا کیا اور انھیں چند سوالوں کے جواب ملے جن سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ لڑکی سخت پردے میں رہتی ہے، گانا اسے فطری طور پر آتا ہے، اس کی تعلیم اس نے کسی سے نہیں حاصل کی ہے۔ اس کے ابا جی میں منصرم تھے۔ ان پر فالج گر گیا ہے اور وہ کھاٹ پر پڑے رہتے ہیں۔ اس کے دو بھائی تھے، دونوں مر گئے، بہن اس کی کوئی نہیں۔ لڑکی کا یہ حال سن کر نجن میاں کو بڑا ترس آیا اور وہ دوسرے روز لکھنؤ چلے گئے جہاں سے اپنی پسند کے گانوں کے چند رکارڈ خرید لائے۔ ریکارڈوں کا ڈبا دینے گئے۔ اس بار بھی دروازہ ذرا سا کھلا اور ڈبا اندر لے لیا گیا۔ جمال آرا نے شکریہ ادا کیا۔ نجن میاں نے گانے کی فرمایش کی تو اس نے جگر مراد آبادی کی غزل کے اشعار گا کر سنائے۔ دفعتاً نجن میاں کا جی بھر آیا اور وہاں سے اس ارادے کے ساتھ واپس ہوئے کہ اب اس الم ناک ماحول کا رخ نہ کریں گے۔ انھوں نے سوچا کہ ”آدمی کی اپنی پریشانیاں ہی کیا کم ہیں جو پرائے دکھ بھی سمیٹ لئے جائیں“۔

لیکن رائے بریلی سے رخصت ہونے سے قبل ایک بار وہ پھر وہاں گئے۔ اس بار انھیں منصرم صاحب (والد جمال آرا) کی نازک حالت کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جمال آرا کا طوق بازار کے لالہ نے سود میں مار لیا ہے جس کی وجہ سے وہ اس دن بہت روئی تھی۔ نجن میاں وہاں سے بہت اداس اٹھے اور دل میں یہ کہتے ہوئے چلے گئے:

”تم جو کچھ بھی ہو اور جو کوئی بھی ہو، بے چاری بچی اللہ کے حوالے“۔

جانے کو تو وہ چلے گئے لیکن وہ آواز ان کو ہونٹ (HAUNT) کرتی رہی۔ ان کی شادی ہو گئی وہ تین بچوں کے باپ ہو گئے۔ خوش حال ازدواجی زندگی تھی۔ وہ بمبئی میں ملازمت کرتے تھے اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن رات کے سناٹے میں، بھی جاگتے ہوئے اور بھی عالم خواب میں وہ آواز ابھرتی۔ ایک احساس جرم و گناہ ان کو کچوکے لگاتا کہ انہوں نے اس لڑکی کی مصیبت کا مفصل حال کیوں نہ معلوم کیا اور اس کی مدد کیوں نہ کی۔ پشیمانی اور ضمیر کے چرکے وہ سہتے رہے کہ ایک دن اچانک جب وہ دفتر سے لوٹ کر اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے ایک پاٹ دار سریلی آواز ابھری جو دیگر عورتوں سے ہم کلام تھی۔ نجن میاں کی بیوی اور دوسری عورتیں ایک گانے والی سے فرمایش کر رہی تھیں کہ وہ غزل سنائے۔ جب مومن کی غزل ”کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو“ گائی جانے لگی تو نجن میاں بے ساختہ پہچان گئے۔ یہی غزل اسی آواز میں وہ اکیس سال قبل کریم گنج میں سن چکے تھے۔ وہ اضطراب سے کروٹیں بدلتے رہے اور سنتے رہے تا آنکہ عورتوں نے گانے والی سے اس کی داستان حیات سنانے کی فرمایش کی۔ گانے والی کے ساتھ ایک معمر اور ضعیف انسان تھا۔ اس نے گانے والی کی پوری کہانی سنائی۔ نجن میاں نے ڈرتے ڈرتے

کھڑکی سے جھانکا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک بیالیس سال کی عورت ایک چھوٹی بچی کے قد کی ہے، سفید غرارہ پہنے ہوئے اور سر پر گلابی ململ کے دوپٹے سے سلیقہ کے ساتھ سر اور ماتھا ڈھانپے ہے جس طرح عورتیں نماز پڑھتے وقت سر اور ماتھا ڈھانپتی ہیں۔ عورتیں نے سکے پھینک دئے، جمال آرا نے چن لئے اور لکھنوی انداز میں بیگمات کو سلام کیا۔ بوڑھے بندو خاں نے جن کی کمر جھک گئی تھی، اپنی آقازادی کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور دونوں چلے گئے۔

قصہ اصلاً یہیں ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار نے قصہ کی معنوی جہت کو ابھارنے کے لئے اور تہذیبی مرقع نگاری کی خاطر ایک اور پیراگراف لکھا ہے جو قصہ سے مربوط ہے اور اس کی تہ داری، حزن اور PATHOS میں اضافہ کرتا ہے اور طنز کو تیکھا بنادیتا ہے۔ بونی کے گانے کی آواز نکڑ پر سے دوبارہ ابھری ہے اور نجن میاں کے کانوں سے ٹکراتی ہے لیکن بلیک مارکیٹ کرنے والے سیٹھوں کے بچوں کے چھوڑے ہوئے ''ایٹم بموں'' کے شور میں اس کی آواز ڈوب جاتی ہے۔

یہ قصہ بہ ظاہر سیدھا سادھا معلوم ہوتا ہے لیکن اسے بہ غور پڑھیے تو اس کے نیچے معنی اور قصے کی ایک اور پرت ملے گی۔ اس افسانے کی مرکزی کردار جمال آرا (بونی) جو رائے بریلی کی رہنے والی ہے، دراصل اردو زبان ہے جس کی آواز کی شیرینی اور جس کے شعر و نغمہ کی دل آویزی کا ایک زمانہ قائل و گرویدہ ہے۔ اس پر افتاد یہ پڑی ہے کہ اس کا جسمانی ارتقا رک گیا ہے اور اس کے ایک ایک سرپرست و محافظ رخصت ہوگئے۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی سرزمین اس کے لئے تنگ ہوگئی۔ وہ اپنے اصل علاقے سے نکل کر گلی گلی اور شہر شہر کی خاک چھانتی ہوئی بمبئی پہنچتی ہے۔ اس پر ترس سب کھاتے ہیں۔ اسکا سچا عاشق کوئی نہیں۔ بھلا بونی سے کوئی کیا عشق کرے گا اور کون اسے اپنائے گا۔ اس کا سچا محافظ و محسن صرف اسی کا بہشتی (بندو خان) ہے جو اسے اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے۔ یہ بونی رائے بریلی کی رہنے والی ہے اور یہی وہ علاقہ ہے جسے اردو کا اصل و مرکزی علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ زمانے کا جو اندازہ افسانے کے مطالعے سے ہوتا ہے، یہ وہ پر آشوب زمانہ ہے جب ملک پر آفت آئی تھی، ملک تقسیم ہوا تھا اور اردو سے تعصب برتا جانے لگا۔ سب سے پہلے یو۔ پی۔ ہی کے اسکولوں، کالجوں اور دفتروں سے اردو نکالی گئی۔ اس زمانے میں جمال آرا رائے بریلی اور لکھنؤ سے نکل کر بمبئی کا رخ کرتی ہے۔ قارئین کرام جانتے ہیں کہ اردو کے بیش تر شعرا و ادبا جو اتر پردیش کے رہنے والے تھے، پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بمبئی چلے گئے۔ فلموں کے گیت لکھ کر، مکالمے تحریر کرکے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے لگے، لیکن وہاں بھی اردو کی آواز (جمال آرا کی آواز) بلیک مارکیٹ کرنے والے ساہوکاروں اور سیٹھوں کے لونڈوں کے ہاتھوں چھوڑے جارہے ''ایٹم بموں'' کے شور میں دب گئی۔ یعنی بے ہنگم زبانوں کے شور میں، دولت کی ریل پیل اور چکا چوندھ میں، تعصب کی آگ اور مذہبی جنون میں اردو کی نغمگی، موسیقی، شایستگی اور متانت کھوگئی، گم ہوگئی۔ افسانے کا اختتام ملاحظہ فرمایئے:

''سڑک کی روشنیاں، جگمگا اٹھی تھیں۔ گھر گھر ریڈیو پر بے صدا دھیمی آواز میں فلمی گیت گونج رہے تھے۔ دیوالی آنے والی تھی اور بلیک مارکیٹ کرنے والے سیٹھوں کے بچے سڑک پر ''ایٹم بم'' چھوڑ رہے تھے، جن کی بھیانک آواز سے دل بلیوں اچھل پڑتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا ساری زندگی میدان جنگ میں تبدیل ہوگئی ہے۔ زندہ لاشوں کے پرخچے اڑ رہے ہیں۔ انسان اپنی لاشیں خود اپنے کندھوں پر اٹھائے اس جہنم زار میں سرگرداں ہیں۔ گلی میں انار چھوٹ رہے تھے۔ پھلجھڑیاں، پٹاخے اور مزید ''ایٹم بم''۔

''آتش بازی کے ان دھماکوں کے بعد چند منٹ کے لئے ذرا خاموشی چھائی اور پھر سڑک کے نکڑ پر سے بونی کی آواز بلند ہوئی: ''وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر، مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو، اجی کہ نہ یاد ہو''۔ آواز دور ہوتی چلی گئی اور ''ایٹم بم'' کے لرزہ خیز دھماکوں میں کھوگئی''۔

یہ پورا افسانہ ایک مکمل تمثیل (ALLEGORY) ہے۔ جمال آرا اردو زبان ہے۔ بندو خان جمال آرا کی داستان الم بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ تین سال کی عمر میں اسے زبردست بخار آیا تھا اور اس کے بعد اس کا قد بڑھنا رک گیا۔ تمام علاج و معالجے کے باوجود وہ ویسی ہی رہ گئی۔ ''زبردست بخار'' دراصل زمانے کا وہ آشوب ہے جب فرقہ وارانہ جنون اٹھا تھا اور ملک تقسیم ہوا تھا۔ منصرم صاحب کا مفلوج ہونا اور پھر انتقال کر جانا اشارہ ہے اردو کے سر پرستوں اور نوابوں کے خاتمے کا۔ بندو خان اردو کے شاعر و ادیب کے رمزیہ اور تمثیلی کردار ہیں جو ہر حال میں اردو کا ساتھ دیتے ہیں۔ گرچہ انکی جسمانی، اقتصادی اور سماجی حالت نہایت ابتر ہے لیکن وہ اردو کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ گرچہ ان کی انگلیاں فگار ہیں وہ اسے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک جگہ بندو خان کے ہاتھ اور انگلیوں کا بیان اس طرح ملتا ہے: ''اس کی دونوں ہتھیلیاں اور ساری انگلیاں زخمی تھیں اور زخم بہت بھیانک معلوم ہو رہے تھے''۔

نجن میاں علیگی نوجوان اہل اردو کے نمائندہ ہیں۔ جو مصیبت کی گھڑی میں اردو کا ساتھ نہیں دیتے۔ لیکن ان کا ضمیر ان کو کچوکے دیتا اور چرکے لگاتا رہتا ہے حالات کے جب تھپیڑے لگے اور اردو کے برے دن آئے تو اردو والوں نے بھی اردو کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اردو زبان اور شعر و ادب کے مطالعے سے تعلق توڑ کر اپنے

اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے لئے دیگر زبانوں اور علوم کو سیکھنے اور حاصل کرنے میں لگ گئے۔ اردو سے خالی محبت کا دم بھرنے والوں پر طنز بھی بہت گہرا ہے۔

اس افسانے میں تقسیم وطن کے بعد لکھی ہوئی جگر مراد آبادی کی ایک غزل کے تین اشعار جمال آرا نے اپنی مترنم آواز میں پڑھے ہیں۔ ان اشعار میں بھی اس وقت کے معاشرتی و سیاسی حالات کی جانب بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ ان اشعار کی روشنی میں بھی افسانے کی وہ تعبیر جو میں نے پیش کی ہے، درست معلوم ہوتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھے ہو سیر چمن مبارک مگر یہ راز چمن بھی سن لے
کلی کلی خون ہو چکی تھی شگفت گل ہائے تر سے پہلے
یہ نالہ کیوں ہے، یہ نغمہ کیوں ہے، یہ آہ کیسی، یہ واہ کیسی؟
یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے

اس غزل کے ان اشعار کے علاوہ دوسرے گیتوں کے جو بول نقل ہوئے ہیں وہ بھی بلیغ اشارے ہیں۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے گیت کا بول "چھارہی کالی گھٹا۔۔۔"۔ ادبار کے بادل جو منڈلا رہے تھے، ان کی جانب اشارہ ہے۔ پھر مومن کی غزل: "کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" دراصل اردو کی فریاد اور یاد دہانی ہے کہ اے لوگو! کبھی تم مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے اور اب وہ محبت بھلا بیٹھے ہو۔ اسی طرح افسانے کے آخر میں جب جمال آرا وہ گیت گاتی ہے: 'میں نے لاکھوں کے بول سہے۔۔۔'۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا بہت مذاق اڑایا گیا مجھ پر طنز و تعریض کے تیر و نشتر چلائے گئے لیکن میں نے سب کو خاموشی اور صبر سے ساتھ برداشت کیا۔ افسانے کے آخر میں ایک عورت جمال آرا سے کہتی ہے:

"بڑا جگر ہے تمہارا بی بی! گلی گلی گھوم کر دنیا بھر کی باتیں سنو ہو، مذاق اڑواؤ ہو اپنا"۔

افسانہ شروع ہوتا ہے قصہ کی انتہا سے۔ نجن میاں رات میں سوئے ہوئے سوچ رہے ہیں۔ گزشتہ شام انہوں نے جمال آرا کو دیکھا ہے۔ آج سے اکیس سال پہلے انہوں نے اس کی آواز سنی تھی، اس کے گانے کے عاشق ہوئے تھے اور آج اس کا سراپا اور چہرہ دیکھا تھا۔ پورا قصہ فلیش بیک (FLASH BACK) کی تکنیک پر لکھا گیا ہے۔ نجن میاں جو جمال آرا کے عاشق ہیں ان کو آخر تک یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ جمال آرا ایک بونی ہے۔ اکیس سال کے بعد جب وہ بمبئی میں ان کے اپارٹمنٹ کے سامنے آکر گاتی ہے تو وہ اس کو دیکھتے ہیں اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ افسانے کے قاری کو بھی بلکل آخر میں جمال آرا کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پورے قصے میں ایک تجسس (SUSPENSE) کی کیفیت برقرار رہتی ہے اور اچانک جب جمال آرا کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو قاری اور افسانے کے کردار نجن میاں دونوں مبہوت و متحیر رہ جاتے ہیں۔

زیر مطالعہ افسانے میں قرۃ العین حیدر کے فن کی متعدد خصوصیات اور خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔ اوّل تو اس افسانے کا قصہ بھرپور ہے۔ قصے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک ظاہری سطح جو جمال آرا اور نجن میاں کی ملاقات و تعلقات پر مبنی ہے اور ایک باطنی سطح جس میں اردو جمال آرا کے روپ میں مجسّم نظر آتی ہے اور جلاوطنی و دربدری اور کس مپرسی کی حالت سے گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تمثیل اور رمز کے سبب ابہام و ستریت کا ایک ہلکا پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن جوں ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ تمثیلی ہے، اشاروں کی بلاغت اور رمز و کنایہ کی معنویت از خود آشکارا ہونے لگتی ہے۔ قصہ بھرپور ہونے کے سبب دلچسپ اور قابل فہم ہے۔ الیگری (ALLEGORY) کا شبنمی پردہ افسانے کو معما اور چیستاں نہیں بناتا بلکہ افسانے کی معنویت و بلاغت کو دو چند اور پُرلطف کردیتا ہے۔ مبہم نویسی اور ناقابل فہم علامتوں سے یہ افسانہ پاک ہے۔

جمال آرا کی داستان بیان کرتے ہوئے افسانہ نگار نے تہذیبی مرقع نگاری کا بھی حق ادا کیا ہے۔ تقسیم ہند کے وقت کی وہ تہذیب جو اردو علاقوں میں پائی جاتی تھی اس کی منظر کشی نہایت اختصار لیکن بلیغ جامعیت سے ساتھ کی گئی ہے۔ جمال آرا کے مکان اور اس کے گرد و پیش کا جو بیان ہے اس سے اس تہذیب کے خد و خال ابھرتے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے حزن والم کا عنصر غالب ہے۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

"گھٹائیں جھوم جھوم کر اٹھیں اور چھما چھم مینہ برسنا شروع ہوگیا۔ نجن میاں گھبرا کر ایک چھتنار درخت کے نیچے ہو لئے۔

"سنو ذکر ہے کئی سال کا۔۔"۔

"حق اللہ!" درگاہ کی طرف سے ایک جگر پاش نعرہ بلند ہوا۔ نجن میاں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پھر بھورے مکان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی۔

"بھورا مکان، ہرے روشن دان اندھی آنکھوں کے ایسے، بٹول کی نارنگیوں کا پیڑ، آم کے جھنڈ، باولی اور تکیہ اور برگد۔۔۔۔ سب ایک ناقابل برداشت نحوست، ویرانی اور الم کی دھند میں لپٹے پانی میں بھیگا کئے"۔

منقولہ بالا اقتباس کو پڑھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکان، درخت سب اردو تہذیب کی حالت زار پر ماتمی لباس پہنے ملول و افسردہ کھڑے ہیں اور سرد آہیں بھر رہے ہیں۔ اس کے برعکس وہ اقتباس دوبارہ ملاحظہ فرمائیے جس میں جمال آرا (اردو) بمبئی کی سڑکوں پر غزلیں سناتی ہے۔ وہاں جمال آرا کی آہ و فغاں بلیک مارکیٹ کرنے والے ساہوکاروں کی پر شور تہذیب اور مادیت کی ریل پیل اور چکا چوندھ میں ڈوب جاتی ہے۔ بمبئی کی جس تہذیب کی مرقع کشی کی گئی ہے وہ

صرف بمبئی کی تہذیب نہیں بلکہ پورے ملک کی وہ تہذیب ہے جس کی تقریبات اور تیوہاروں میں دولت کی نمائش، چیخ پکار، حشر خیزی اور ہنگامہ آرائی ہوتی ہے۔

جلاوطنی قرۃ العین حیدر کا اہم موضوع ہے۔ اس افسانے میں بھی اردو کی جلاوطنی کا قصہ بیان ہوا ہے۔ آزادی کے بعد اردو جلاوطن ہوگئی۔ اپنے گھر اور اپنے علاقے سے نکالی گئی اور دربہ در خاک چھاننے لگی۔ یہ جلاوطنی بھی عجیب جلاوطنی ہے۔ انسانوں کی جلاوطنی دیکھی اور سنی جاتی ہے۔ زبان کی جلاوطنی دیکھنا ہو تو اس افسانے کو پڑھنا چاہئے۔ اردو غیر اردو علاقوں میں کس طرح کس مپرسی کے دن گزارتی ہے اور کس کس طرح اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اسکی ناقدری ہوتی ہے۔ جو لوگ اردو نہیں جانتے وہ بھی "اردو گجل" کی فرمائش کرتے ہیں: "اچھا وہ گجل سنادو جو پہلے سنائی تھی۔ گجراتن ہم سائی نے ہاتھ بڑھا کر روپے کا نوٹ سرکایا"۔

وقت کا فلسفہ یا تصور زماں بھی قرۃ العین حیدر کے فن کا خاص جز ہے۔ اس افسانے میں بھی وہ تاریخ سے اپنا مواد لیتی ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت کے حالات اور اسکے بعد کے حالات جو اردو کے تعلق سے رونما ہوئے، اس افسانے میں بہ طور خاص منعکس ہوئے ہیں۔ وقت کے گزرنے سے متعلق افسانہ نگار کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

"کئی مہینے، شاید ایک برس گزر گیا۔ وقت بھی عجیب مسخری شے ہے۔ ہم اتنے مزے سے کہتے ہیں۔ وقت گزر گیا، حالانکہ وقت گزرنا اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ ہم قبر کے زیادہ نزدیک پہنچ گئے اور کیسی زندگی گزار کے! کتنی بے انصافیاں اور ذلتیں سہہ کے! زندگی یا قسمت کی کتنی ستم ظریفیوں، کا نشانہ بن کے؟ اور جب مر جائیں گے تو سب کی قبریں ایک سی معلوم ہوتی ہیں۔ دکھ سہنے کے لئے بھی تو بار بار تھوڑا ہی پیدا ہوں گے"۔

اس اقتباس میں جب افسانہ نگار کہتی ہیں: دکھ سہنے کے لئے بھی بار بار تھوڑا ہی پیدا ہوں گے"۔ تو یہ زندگی کو اس کے تمام مصائب و آلام کے ساتھ قبول کرنے کا اعلان و اظہار ہے۔ یہ پر وقار و پر عزم رویہ قرۃ العین حیدر کے فن کے وزن و وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ ان کے اس جملے کو پڑھتے ہوئے مرزا غالب کا مندرجہ ذیل شعر بے ساختہ ہمارے حافظے میں گونجنے لگتا ہے

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

افسانہ نگار کے تصور زماں سے متعلق ایک اور نکتہ جو اس افسانے میں بھی ابھر کر سامنے آیا ہے یہ ہے کہ انسان بے بس اور مجبور ہے۔ وقت کے سیل بے پناہ کے آگے اس کی کچھ نہیں چلتی۔ وقت اپنے بطون میں حادثوں اور سانحوں کو چھپائے رکھتا ہے اور اچانک انسان پر ان کا نزول شروع کر دیتا ہے۔ جمال آرا بخار میں مبتلا ہوتی ہے، اس کے جسم کی نشو و نما رک جاتی ہے، اس کا حسن و شباب کمھلا کر رہ جاتا ہے۔ اس کے محافظ و سرپرست یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس کا گھر، اس کا علاقہ اس سے چھن جاتا ہے اور وہ شریف زادی ناز و نعم کی پلی ہوئی در در کی خاک چھاننے لگتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں زندگی کے الم ناک پہلوؤں کی عکاسی خصوصیت سے ملتی ہے۔ ان کے کردار ظفریابی و شادکامی سے دور دور ہی رہتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی جمال آرا کی بدنصیبی و تیرہ بختی ہی کا بیان شروع سے آخر تک ہے۔ قرۃ العین حیدر کی یہ خصوصیت انکو انگریزی کے مشہور ناول نگار تھامس ہارڈی سے قریب و مشابہ کر دیتی ہے۔ ہارڈی کے قصوں میں بھی زندگی کے الم ناک پہلو ہی کا ذکر ہر جگہ ملتا ہے۔

قرۃ العین حیدر ماضی قریب کی نہایت معتبر روداد بیان کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے اس عہد کی تاریخ و تہذیب کی باز یافت کی جاسکتی ہے۔ ان کے افسانے تاریخی دستاویز سے زیادہ سچے اور معتبر ہیں۔ جب مورخ نامعتبر اور جھوٹے ثابت ہوں گے اس وقت قرۃ العین حیدر کے افسانے ہمارے عہد کو آئینہ دکھلائیں گے۔ زیر مطالعہ افسانہ میں بھی تقسیم ہند کے بعد اردو اور اہل اردو پر جو بیتی اس کی نہایت موثر اور سچی عکاسی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو صرف ایک اقتباس جس میں بندو خاں اپنی آقا زادی کی داستان الم بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مکان بیس روپے مہینہ کرایے پر اٹھادیا۔ میں سقہ ہوں ذات کا۔ میرے لڑکے آوارہ نکل گئے۔ لکھنؤ جا کر وہ بن گئے شہدے، ادھر میرے ہاتھوں کے زخم بڑھ گئے تو کام چھوٹ گیا۔ سوچا بٹیا کا مکان بکوادوں تو دو وقت کی روٹی کا بندوبست ہو جائے، جن کا کرجہ منصرم صاحب پر پہلے سے چڑھا ہوا تھا۔ پھر آپ جانو ہندوستان پاکستان ہوگیا۔ مکان کے دام دو کوڑی کے نہیں رہے۔ اجی مکان تو کیا بکتا، منصرم صاحب کے مرنے کے بعد مہاجن نے اس کی کرکی ہی کروالی۔ مجھے اس کے شاگرد پیشے سے نکلنا پڑا۔ اور صاحب پھر ہم سب تو کبوتر شاہ کے چھپر تلے پڑ رہے"۔

طنز قرۃ العین حیدر کے فن کا جزو لاینفک ہے۔ انکا طنز نہایت لطیف لیکن بہت گہرا ہوتا ہے۔ نجن میاں کی خالی خولی محبت پر جو طنز کا وار ہے اسے ملاحظہ فرمایئے۔ پھر جمال آرا اور بندو خان کی حالت زار کے مقابلے میں بمبئی کے ساہوکاروں اور سیٹھوں کی دولت، منڈی اور استحصالی تہذیب کو جس تنقید و طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، وہ افسانے کی جان ہے۔

الختصر قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ ان کا نمائندہ افسانہ ہے جس میں اردو کی حالت زار کا نہایت دل ہلا دینے والے انداز میں بیان ہے۔ اس افسانہ میں قصہ نہ صرف ایک دل چسپ قصہ رہتا ہے بلکہ اپنے عہد کی تاریخ و تہذیب کی زندہ اور متحرک تصویر بن جاتا ہے۔

"سن سیٹ پوائنٹ" (Sunset Point)

پروڈیوسر : سونی میوزک 4984004
آڈیو کیسٹ : 65 روپے
CD : 295 روپے
خیال، تحریر اور بیانیہ : گلزار
سنگیت : وشال
آوازیں : بھوپندر اور چترا
مبصر : ف۔ س۔ اعجاز

آواز کی صنعت میں سُروں پر چلتا افسانہ ایک نیا تجربہ ہے۔ ظاہر ہے یہ تجربہ وہی تخلیق کار کر سکتا ہے۔ جو بیک وقت افسانہ نگار اور شاعر واقع ہوا ہو۔ سُروں پر چلتے اس اوّلین افسانے "سن سیٹ پوائنٹ" کے خالق گلزار ہیں جنھیں HMV نے "گلزار، دی جینیئس" کے لقب سے نواز رکھا ہے۔

"سن سیٹ پوائنٹ" کا سُننے والا بھی ایک نئے تجربے سے گزرتا ہے کہ اسے افسانہ بھی سننا ہے اور نغمات بھی۔ اس میں کچھ مشکلیں بھی ہیں۔ کیسٹ پر گیت کئی کئی بار سُنا جاتا ہے جبکہ افسانہ بار بار نہیں سنا جاتا۔ کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ کہانی کتنی موثر ہے اور اس میں گیت صحیح جگہ پر دیے گئے ہیں یا نہیں۔ اور سامع بغیر ڈسٹرب ہوئے پہلی ہی بار ایک گھنٹہ کی فرصت سُننے کیلئے نکال سکتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں رائٹر اور پروڈیوسر / پبلشر کیلئے بھی رسک ہے۔

"سن سیٹ پوائنٹ" گلزار کی جدتِ طبع کا ایک اور نمونہ ہے۔ ایک چھوٹے اور مختصر افسانے میں، جسے خود انھوں نے بیان کیا ہے، آٹھ گیتوں کو سمو دیا ہے۔ گیتوں میں اُن کے مخصوص مزاج کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ گیت نظموں کی فضا لئے ہوئے ہیں۔ اگر گیتوں کی تعداد صرف چھ ہوتی [ایک male : Solo، ایک Female : Solo، دو ڈوئیٹ، ایک کورس] اور کہانی کو ذرا اُبھلنے پھولنے اور قد نکالنے کا موقع دیا جاتا تو شاید اثر اور دلکشی بڑھ جاتی اور زیادہ توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ کہانی کی ریکھا ٹوٹ ٹوٹ نہ جاتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ایک چھت کے نیچے افسانہ اور شاعری ایک دوسرے سے عشق فرما رہے ہیں یا کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔

ایک عورت [illegible]

"بڑا جگر ہے"

دنیا بھر کی باتیں سنو

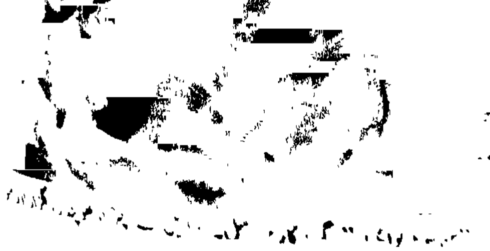
پس منظر میں جاری وشال کی فراہم کردہ [illegible] جس کے لئے وشال مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اگر گیتوں کو الگ سے سوچیں تو وہ عمدہ ہیں۔ ٹورنٹو میں اکیسویں منزل پر گایا گیا دوگانا "آسمانی رنگ ہے، آسمانی آنکھوں کا" خوب ہے بلکہ اکیسویں صدی کی نئی لفظیات کی پہچان ہے۔ "آسماں کاٹ کر پہن لو جسم پر / روحوں کو اڑنے دو" ایسے خوبصورت بول دوسرے گیتوں میں بھی جابجا سنائی دیتے ہیں۔ وشال کی میوزک کہانی اور گیتوں کے بدلتے موسموں کو اجاگر کرتی ہے۔ جہاں گیت کے بول اور سنگیت زیادہ ملگجی اور رومانی ہو گئے ہیں وہاں مجھے محسوس ہوا کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں شاور کے نیچے ولایتی صابن کی ٹکیہ سے بدن مل کر نہار ہا ہوں۔ (آخر آسمان کا ایک ٹکڑہ جسم پر لپیٹنے سے پہلے کچھ تیاری بھی ضروری ہے)۔ ایسے پُر مزاج سُروں کی بلندی کا ہوائی جائزہ (aerial view) تھوڑا رومانٹک ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ پتہ نہیں یہ سنگیت کا اثر تھا یہ گیت کا!۔

بھوپندر کا گایا ہوا گیت "تیرے جانے سے تو کچھ بدلا نہیں" طبیعت میں میٹھی کڑوی اداسی گھول دیتا ہے۔ جل بھر دے رے" گیت بھی پسند آتا ہے۔ چترا کی آواز چکنی ہے۔ بھوپندر کا گلا پچھلے چند سالوں کی بہ نسبت جوان معلوم ہوا (اور گائیں گے گلزار کو تو گلا گلزار ہو جائے گا)۔

کیسٹ کا عنوان جگجیت سنگھ کی تقلید میں انگریزی رکھا گیا ہے۔ نام اردو یا ہندی ہونا چاہئے۔ بلا ضرورت انگریزی کیوں؟





تبصرۂ کتب

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں)

نام کتاب . **حرفِ غزل**
شاعر . **صابر گوالیاری**
قیمت : ۸۰روپے
ملنے کا پتہ : E-65، ایل آئی جی کالونی، اندور، مدھیہ پردیش
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

"حرفِ غزل" صابر گوالیاری کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں کہیں کہیں اخلاق و کردار کی عظمتوں کی سمت لطیف اشارے بھی ہیں اور کہیں سماجی ناہمواریوں، افراتفری اور کس مپرسی کی فضاؤں سے اظہار بیزاری بھی۔ اس بیزاری کے باوصف ان کا پیرایۂ اظہار غم و غصہ یا پُر زور احتجاج کی صورت نہیں اختیار کرتا۔ کلامِ صابر کی یہ صورت حال ان کے اعتدال پسند ذہن کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جس کا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے روایتی لب و لہجہ میں ہلکی سی تازگی اور شگفتگی دے کر غزل کو وہ وقار عطا کیا ہے کہ جس پر نہ تو کلاسیکیت کی مہر ہی ثبت کی جاسکتی ہے اور نہ صابر گوالیاری پر اس سے بھرپور اجتناب کا الزام ہی عاید ہو سکتا ہے۔

شاعری محض برملا اظہار جذبات کا نام نہیں ہے بلکہ اردو غزل کی شان ہی رمز و ایما کی لطافتوں سے عبارت ہے۔

صابر نے اپنے احساسات اور ان کے مفصلات اپنی اعتدال پسندانہ ذہنی اپج سے اشاروں اور کنایوں کی اوٹ سے اس طرح ظاہر کئے ہیں کہ ان کی اثر آفرینی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان میں روح کو وجد میں لانے کی کیفیات بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ غالباً اسی اعتبار سے وہ رمز شناسِ غزل ہونے کے دعویدار بھی ہیں۔

OOOOOO

نام رسالہ . **"تخلیق"** [خلیجی ریاستوں میں اردو]
مدیر . **اظہر جاوید**
ملنے کا پتہ : بھگوان اسٹریٹ، پرانی انار کلی، لاہور ۵۴۰۰۰
قیمت : اندرون پاکستان دوسو روپے
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

"تخلیق" کا زیر نظر شمارہ نمبر ۱۱ جلد ۳۰ "خلیجی ریاستوں میں اردو" کی ادبی ...ں کے اذکار کے لیے خصوصی طور پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کی تیاری میں بقول ...۹۹ء تک کم و بیش سات سال صرف ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فکر ...دشوار گزار ہوتی ہیں۔ کبھی اس راہِ پُر خار کے درپیش مسائل حوصلہ شکنی کرتے ہیں او کبھی ہم سفر کی کمی اور طعنۂ احباب کا سامنا ہوتا ہے۔ اسی قسم کی دشواریاں اظہر جاوید کے سامنے بھی تھیں چنانچہ اس طویل عرصے میں اکثر انھیں طعن و تشنیع کے وار سہنے پڑے جن سے ان کی ہمت پست اور ارادہ ڈانواں ڈول ہوتا رہا۔ اسی اندھیرے میں محض چند مخلصین کی حوصلہ افزائیوں نے اس کی تکمیل کے لیے پھر سے کمر ہمت باندھنے کے لئے اکسایا۔ آخر کار اپنی دیرینہ آرزو اور جذب صادق کا دامن تھام کر وہ آگے بڑھے۔ محترمہ لبنیٰ جاوید منظور نے اس بڑی ادبی خدمت کے لیے بے لوث معاونت کی ہے۔ بقول مدیر بغیر ان کے تعاون کے کام ممکن نہ تھا۔ ابتدائی صفحات میں مرزا سلطان بیگ نے "سعودی عرب ایک فلاحی مملکت" عنوان کے تحت عرب کے سماجی معاشی معاشرتی تہذیبی حالات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ظہور الاسلام جاوید نے سات صفحات میں متحدہ عرب امارات میں ادب اور شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ خلیجی ممالک مثلاً سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے الگ الگ ابواب قایم کیے گئے ہیں اور پھر ذیلی سرخیاں دیگر ان ممالک کے مشہور شہروں اور امارات وغیرہ میں مقیم اردو شعرا اور ادباء کے مختصر سے تعارف کے بعد ان کی نگارشات شامل کی گئی ہیں۔ اس طرح عرب کے متعلقہ شہروں میں ۹۱ اور متحدہ عرب امارات میں ۵۴ شعرا اور ادباء کے تعارف اور ان کے کلام تک رسائی کی راہیں ہموار کر کے اظہر جاوید نے اچھا ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔

مطالعہ سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ اپنے وطن عزیز میں نہ سہی ساری دنیا میں اردو کی ترویج و ترقی توسیع و فلاح کے امکانات بہت قوی ہیں۔ آج نہیں تو کل اس کی مہاجرانہ حالت ضرور ختم ہوگی اور یہ از سر نو اپنے اقدار کی بازیافت کرلے گی۔ خلیجی ممالک میں اردو کے امکانات سمجھنے کے لئے یہ نمبر ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتا ہے۔

OOOOOO

نام کتاب . **میری نیندان کے خواب**
مصنف : **قمر نقوی** (نقشبندی)
ناشر لالہ زار اکیڈمی۔
۱۶-ڈی-۳، جناح کالونی، اسٹریٹ ۵۱،
مسلم روڈ، سمن آباد (لاہور)
قیمت . ۱۵۰روپے
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

"نیم سوز" اور "ریشۂ حنا" کے بعد "میری نیندان کے خواب" قمر نقوی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ دیگر مشاغل حیات کے دوش بدوش وہ تصنیف و تالیف کے معاملے میں بھی نہایت زود کار اور بسیار نویس ہیں۔ چنانچہ قریب دو درجن کتابیں منظر عام پر لانے کے بعد وہ آج کل "اردو ادب میں بے ادبی کی تاریخ"۔ "رسول معظم" اور "شکار شاہکار" نامی کتابیں ترتیب دے رہے ہیں۔ قمر نقوی کا وطن لاہور ہے۔ لیکن ان کے اجداد قصبہ آسیون ضلع اناؤ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ جہاں قمر نقوی نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ گذارا تھا۔ ان دنوں وہ تلسا (امریکہ) میں پُر آسائش اور مطمئن زندگی گذار رہے ہیں پھر بھی اکثر انھیں "وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی تھی"۔ جس کا اظہار بھی انھوں نے اپنی نظموں میں کیا ہے ۔

کبھی تو خواب میں آئے نوائے آسیون
کہ ڈھونڈھتے ہیں دل و جاں فضائے آسیون

دل و نظر میں بسا ہے جمالِ آسیون
برابر آتا رہا ہے خیالِ آسیون

جسم کو ہجرت کئے گو ایک عرصہ ہو گیا
دل اسی صورت سے ہے اب تک لگاؤ میں
مدتیں گذریں قمرؔ گاؤں سے بچھڑے ہوئے
جل رہا ہے آج تک دل کا دیا گاؤں میں

قمر نقوی امریکہ جیسے اردو سے نابلد دیش میں رہتے ہوئے بڑے عزم و استقلال سے پرورش لوح و قلم میں مصروف ہیں۔ یہ بات کچھ کم لائق ستائش نہیں ہے کہ جدیدیت اور مادیت کی دنیا میں پروان چڑھنے والی شاعری اردو روایات سے ہم آہنگ ہونے کے علاوہ عصری آگہی۔ فکری آگہی۔ بلندیٔ تخیل اور محاکات کے لطف سے مزین ہے۔ قمر نقوی نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کی رو میں کھل کھیلنے سے گریز کرتے ہوئے شائستگی زبان کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ کثیر تصانیف ہونے کی وجہ سے ان کی زبان میں پختگی، بیان میں دل آویزی اور جاذبیت ہے۔ نادر الوجود تشبیہات۔ استعارے اور علامتوں کے استعمال نے اشعار میں حسن اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ نئے موضوعات اور معمولی مضامین کو اپنی جدت طبع سے متنوع انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ مثلاً اپنوں سے دکھ پہونچنے کا شکوہ طرح طرح سے کیا گیا ہے لیکن قمر نقوی نے جس طرح اسے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔

سبق ہی ایسا سکھادیا ہے مجھے کتابِ بادفا نے
کہ جسم زخمی ہوا کرے پھر بھی دشمنوں سے ہی پیار کرنا

قمر نقوی نہایت حساس دل رکھتے ہیں۔ اس موجودہ روشِ زمانہ اور دم توڑتی انسانیت سے فکر مند بھی ہیں ۔

پہلے سے یہ زمین حسیں تر تو ہوگئی
انسانیت تو اب بھی مؤدب نہیں ہوئی

حقیقت ہے کہ جب انسان کسی المیہ پر رو لیتا ہے تو اپنے غم کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ قمر نقوی نے اس سچائی کو نظم کیا ہے۔ شعر میں حصارِ دیدۂ تر کی ترکیب اور اس کی انفرادیت کی مثال شاید اردو شاعری میں مشکل سے ہی نظر آئے گی ۔

آنسو حصارِ دیدۂ تر سے گذر گیا
ٹوٹے جو بند، درد کا دریا اتر گیا

"حالات کا رخ کیا ہوگا" عنوان کے تحت قمر نقوی نے دورِ حاضر کی جو تصویر پیش کی ہے۔ اس میں صرف ان کا اضطراب ہی نہیں جھلکتا ہے بلکہ ان کی سرشت جو سنجیدہ [illegible]

ہے۔ وہ اقطار السموات پر کمندیں ڈالنے کے بجائے ارضی مسائل سے بحث کرتے ہیں۔ وہ لفظوں کے گورکھ دھندے میں الجھانے کے بجائے صاف سادہ زبان اور ایسے لطیف پیرائے میں اپنے محسوسات ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے اشعار دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ قمر نقوی کے یہاں رومانی فضائیں بھی ہیں اور معرفت و مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی۔ ان کے رومان کا یہ انداز دیکھئے ۔

کسی کے فیضِ جمال کا تھا کوئی تو ایسا حسین لمحہ
ہری رگ و پے میں آج بھی جیسے کھل رہے ہوں گلاب سارے

اور خدائے قدوس کے ارحم الراحمین ہونے پر قمر نقوی کا یہ اعتقاد اور ایمان بھی ملاحظہ کریں ۔

جب بھی آتا ہے قمرؔ شانِ کریمی کا یقیں
دل کا ہوتا ہے تقاضا کوئی تقصیر کروں

بطور مشتے از نمونہ خروارے حقیقت سے لبریز چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

چوسنے والو ہوا جاتا ہے رس پھولوں کا ختم
گلستاں مر جائے گا رہ جائے گی بھونروں کی قوم
زندگی قدر کے قابل تھی مگر یہ دنیا
اس گرانمایہ کی توقیر نہ کرنے پائی
دوسروں کے لئے آئینہ تو بنتے ہیں سب ہی
اپنے چہرے کا کوئی دیکھنے والا بھی نہیں
سایہ جو بے وفا ہے وہ سب کو عزیز ہے
جو دھوپ ہم نشیں ہے مقرب نہیں ہوئی

اور شعر ۔

ہر حسیں بات کو اشعار میں ڈھالا میں نے
ہوں قلم کار میری حاشیہ آرائی کو دیکھ

قمر نقوی کی یہ شاعرانہ تعلی نہیں ہے بلکہ واقعی یہ کہنے کا ان کو بجا طور پر حق حاصل ہے۔ قمر نقوی کے ذکر کے سلسلے کی ایک اور کڑی "جشن قمر" نامی کتابچہ ہے جو امریکہ میں ان کے اعزاز میں منائی جانے والی ایک تقریب کی روداد ہے۔ جس کا سنہ اور مقام اشاعت ۱۹۹۹ء۔ تلسا اوکلا ہوما۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ہے۔ کتاب عارف حسن نقوی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس کی تقسیم کا بھی لالہ زار اکیڈمی لاہور ہے۔
تازہ ترین اطلاع کے مطابق اب قمر نقوی نے اپنا ادبی نام نقشبندی اختیار کرلیا

00000

کتاب کا نام: صہبا لکھنوی۔ شخصیت اور ادبی خدمات
مرتب: [illegible]
قیمت: دو سو روپیہ
ناشر: [illegible] مطبوعات کراچی
سنہ: [illegible]

[illegible]

دوسرے
افسانے میں لہجے
خوشگوار اور موثر ہے بلکہ
پس منظر میں جاری و
جس کے لئے وشاً

ادب صہبا لکھنوی کے لئے اس سے بڑھ کر خراج عقیدت اور کیا ہو سکتا ہے۔ کتاب کے آغاز 'حرفے چند' میں مرتب نے لکھا ہے کہ "صہبا لکھنوی صاحب افکار کے ذریعہ اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دیتے آرہے ہیں۔ ادب دوست حلقوں میں زبانی طور پر اسکی تعریف ہوتی رہی ہے لیکن باضابطہ دستاویزی صورت میں اس کا اعتراف ضروری ہے تاکہ آئندہ نسلیں علم وادب اور تہذیبی اقدار کے ارتقا کے لئے اپنے بزرگوں کی جدو جہد سے باخبر رہیں۔ انہیں یاد رکھیں اور ان کے عمل وکردار کی روشنی میں تعمیر وترقی کا راستہ تلاش کریں"۔ اس نقطۂ نگاہ سے یہ کتاب مزید اہمیت کی حامل بن جاتی ہے کہ نئی نسل بزرگوں کو یاد رکھے اور اُن سے اپنی ترقی کے مرحلے طے کرے۔

کتاب میں صہبا لکھنوی کے سلسلے میں وافر مواد جمع کیا گیا ہے۔ مستند ادباء سے لکھوائے گئے مضامین معلوماتی بھی ہیں تاثراتی بھی۔ ان میں کچھ مختصر ہیں چند طویل۔ خصوصاً ڈاکٹر حنیف فوق، محمد احمد سبزواری، احمد ندیم قاسمی، علی جواد زیدی، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر حسن منظر، احمد زین الدین۔ پروفیسر عبدالقوی ضیاء (علیگ) اور نسیم سید نے صہبا صاحب کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر اس بھرپور طریقے سے گفتگو کی کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ کتاب کے آخری صفحات صہبا صاحب کی چند شعری تخلیقات سے مزین کئے گئے ہیں اس لئے کہ ایک کامیاب مدیر ہونے کے قبل صہبا صاحب نے اردو شاعری کے گیسو بھی سنوارے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'ماہ پارہ' اس بات کا ثبوت ہے۔ بچوں کے لئے دس کہانیوں کا ایک سیٹ بھی شائع کر چکے ہیں۔ چند ادبی کتابیں بھی مرتب کیں جیسے مجاز ایک آہنگ۔ ارمغان مجنوں۔ رئیس امروہوی فن وشخصیت۔ منٹو ایک کتاب وغیرہ۔ علاوہ ازیں ادبی سفر نامہ "میرے خوابوں کی سرزمین" بسلسلہ سابق مشرقی پاکستان کی تصنیف کی۔ لیکن جس طرح چودھویں کی رات میں چاند کی روشنی سے ستاروں کی چمک معدوم ہو جاتی ہے افکار کی ترتیب اور ادارت نے بھی ان کے ساتھ کچھ ایسا ہی کیا۔

کتاب میں شامل مختصر سوانحی خاکے کے بموجب افکار کی اشاعت کا پہلا دور اپریل ۱۹۴۵ء میں بھوپال سے شروع ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں صہبا صاحب افکار سے لا تعلق ہو کر ایچی منتقل ہو گئے اور وہیں سے ۱۹۵۱ء میں ان کی ادارت میں افکار کا دوسرا دور شروع ہوا رفتہ رفتہ پورے برصغیر میں اعلیٰ پائے کے شعراء وادباء کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔

افکار نہ صرف باقاعدگی سے شائع ہوتا آرہا ہے۔ بلکہ اس نے خاص نمبروں کی اشاعت میں اپنا ایک الگ مقام بھی بنالیا۔ متعدد خاص نمبر شائع کرکے ادب کی تاریخ ئی۔ کئی افسانہ نمبر، کئی سالنامے، کئی خاص نمبر، ڈراما نمبر، دو نئی تخلیق نمبر، دو غالب مبر۔ دو اقبال نمبر۔ منٹو نمبر۔ مجاز نمبر، امیر خسرو نمبر، لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر، بھوپال دو کانفرنس نمبر، رائٹرز کنونشن، انقلاب نمبر، آزادی نمبر، برطانیہ میں اردو نمبر، اور دوسرے خصوصی شمارے شائع کرکے صہبا صاحب نے اپنے عزم اور حوصلے کی روشن مثال قائم کی۔

صہبا صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے زندہ ادیبوں اور ...پر بھی نمبر شائع کئے۔ جوش، حفیظ، فیض، مصطفےٰ زیدی، کرشن چندر، اختر حسین ...وی اور سردار جعفری پر خصوصی نمبر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔
...لیٰ پائے کے مخلص مدیر کو لاکھوں سلام اور مرتب نکہت بریلوی کو ایک

OOOOOO

نام رسالہ : ششماہی "رابطہ"۔ "مظہر امام نمبر"

ترتیب : **نذرالاسلام نظمی**

پتہ : H-16/283, Sangam Vihar
Near Talimabad
New Delhi - 110062

قیمت : پچاس روپے

مبصر : پی۔پی۔ سریواستو رند ساغری

ششماہی رسالہ "رابطہ" کا "مظہر امام نمبر" نذرالاسلام نظمی نے ترتیب دیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ آج کل نامعتبر شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں پر ادبی نمبروں کی بہتات نظر آرہی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ نمبر واقعی داد و تحسین کا مستحق ہے۔ مظہر امام اس عہد کے ان معروف شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف نظم اور غزل کے میدان میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے بلکہ "آزاد غزل" کی داغ بیل بھی ڈالی جو اردو شاعری میں جرأت مندانہ روایت شکنی کی واحد مثال ہے۔ اس نمبر میں مظہر امام کی شاعری اور نثر نگاری کے ہر پہلو پر ایسے ایسے ذی شعور اور صاحبِ فن حضرات نے اظہار خیال کیا ہے کہ بے اختیار ان کے مطالعے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

اس نمبر میں چھہتر (۷۶) ذی شعور اور صاحبِ فن شخصیتوں کے مضامین اور آرا شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مظہر امام کی شعری اور نثری تخلیقات کے عمدہ نمونے بھی شامل ہیں جن میں تنقید بھی ہے اور خاکہ بھی جو ان کی نثر نگاری کے فن کو اجاگر کرتے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ "مظہر امام کی غزلوں میں روایت کی پاسداری کے ساتھ نئے احساس کی جلوہ گری ملتی ہے"۔ یہ نیا احساس جس کے نت نئے کرشمے عشق کے نت نئے روپ کی عکاسی کرتے ہیں، زندگی کی فتح وشکست، امید وبیم، حوصلہ مندی، حسرتوں، زخموں، اور الجھنوں کو نئے انداز میں آئینہ دکھاتے ہیں۔ میں کرشن چندر کے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں کہ "مظہر امام کی شاعری میں آپ کبھی یقین سے ابہام کی طرف جاتے ہیں اور کبھی ابہام سے یقین کی طرف۔ یہ دو رویہ حرکت ہی مظہر امام کی شاعری کی خصوصیت ہے اور انہیں دوسرے شاعروں سے الگ کرتی ہے"۔

مظہر امام کی غزل جمالیاتی تسکین کا باعث ہے۔ ان کے تجربے سنجیدہ لمحات کے ایسے تجربے ہیں جو احساس اور روح کے سانچے میں ڈھلتے نظر آتے ہیں اور غم، نشاط، اضطراب، انبساط، افسردگی، نغمگی اور تازگی کی خبر لاتے ہیں۔ "مظہر امام نمبر" ادبی دنیا میں بڑی گرمجوشی سے لیا جائے گا۔ جس کے لئے ترتیب کار نذرالاسلام نظمی داد کے مستحق ہیں۔

OOOOOO

نام کتاب : ذکرِ محفوظ (پروفیسر محفوظ الحق کا مجموعۂ مضامین)

مرتب : **کمال جعفری**

قیمت : ۱۲۵؍روپے

ملنے کا پتہ : ہارون رشید فردوسی
114/A، مدن موہن برمن اسٹریٹ، کلکتہ - ۷

مبصر : اعجاز علی ارشد

پروفیسر محفوظ الحق مرحوم بڑے باصلاحیت انسان تھے۔ آج کل کے

پروفیسروں کے برعکس مطالعے اور تحقیق کا شوق رکھتے تھے اور اپنے زمانے میں ان کے بہت سارے اہم تحقیقی مضامین مقتدر علمی وادبی رسالوں میں شائع بھی ہوئے مگر ان کی ایک نہیں کئی ٹریجڈیاں رہیں۔ ایک تو وہ صرف چھیالیس سال زندہ رہے، دوسرے اپنی زبان میں کوئی تحقیقی کتاب نہ چھپوا سکے، تیسرے انہوں نے زیادہ تر فارسی زبان وادب کو اپنا میدانِ تحقیق بنایا، چوتھے وہ خالص تحقیق کی دنیا تک محدود رہے، جس کی طرف لوگوں کی توجہ ذرا کم ہی رہی ہے، اس لئے آج کی نسل انہیں تقریباً فراموش کر چکی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ پچاس برس گزر جانے کے سبب زمانے کی گرد نے ان کے مضامین کی تحقیقی چمک کو کچھ نہ کچھ ضرور متاثر کیا ہے۔ یہ تمام امور حوصلہ شکنی کے لئے کافی تھے۔ مگر کمالؔ جعفری نے جو نہ تو محفوظؔ صاحب کے رشتے دار ہیں نہ قرابت دار، نہ ان کے تحت کام کرتے تھے۔ نہ ان کے طالب علم رہے ہیں محض علمی وادبی ذوق کے زیر اثر ان مضامین کو ترتیب دے کر ایک قابلِ ستائش کام کیا ہے۔

پروفیسر محفوظؔ کے جو مضامین شاملِ کتاب ہیں ان میں سے دو زیب النساء بیگم سے متعلق ہیں۔ دو تذکروں سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک گارساں دتّاسی کے بارے میں ہے جس کی بنیاد بہر حال تذکرہ ہی ہے۔ کمال جعفریؔ صاحب نے آخر میں محفوظؔ صاحب کے چند مطبوعہ وغیر مطبوعہ خطوط بھی شائع کر دیئے ہیں جن کی یہاں چنداں ضرورت نہ تھی۔ بہر حال ان سے محفوظؔ صاحب کے علمی ذوق وشوق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

OOOOOO

نام کتاب ۔ حرفِ دلنواز (شعری مجموعہ)

شاعر ۔ کمال جعفری

قیمت ۱۲۵روپے

ملنے کا پتہ ہارون رشید فردوسی

114/A، مدن موہن برمن اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۰۰۰۰۷

مبصر اعجاز علی ارشد

کمال جعفریؔ کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۸۱ء میں چھپا تھا۔ 'حرفِ دلنواز' ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے اس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں جن کی روشنی میں کمالؔ کی دردمندی، مذہبی واخلاقی قدروں سے وابستگی اور ذہن کی کلاسیکی تشکیل کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی اور پروفیسر اعزاز افضلؔ نے اپنی مختصر آراء میں ان امور کی طرف اشارے کئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ غزل گو شاعروں کی بھیڑ میں جو وصف کمال جعفریؔ کا نشانِ امتیاز ہے وہ ان کا تعمیری اور اصلاحی نقطۂ نظر ہے۔ یہ نقطۂ نظر کسی نظریاتی کمٹ منٹ کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی شخصیت کے وسیلے سے ان کی شاعری کے پیکر میں اتر آیا ہے۔ ان کی شاعری میں انانیت سے گریز، خوش اخلاقی، وضع داری، دردمندی کے پہلو جلوہ گر ہیں۔ میں ان کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

انا کو خاک میں اپنی ملا کے دیکھ ذرا
فنا کی شکل میں جلوے بقا کے دیکھ ذرا
شمار ہوگا ترا بھی فلک نشینوں میں
زمین والوں کو اپنا بنا کے دیکھ ذرا

آپ نازاں ہیں بہت اپنی انا پر لیکن
بات کرنے کا تو لوگوں سے سلیقہ رکھئے

خاکساری میں سر بلندی ہے
اے زمین ہم کو آسمان نہ کر
کبر کی جس میں ہو جھلک شامل
خود میں پیدا وہ آن بان نہ کر

شوق سے کوئی ملنے آئے تو
اپنے چہرے کو زرد مت رکھنا

جس میں غیبت فروغ پاتی ہے
ایسی محفل سے کیجئے پرہیز

جی رہے ہو مگر خیال رہے
ہے چکانا حساب پل پل کا

اس دور میں یہ کہنا کچھ آسان نہیں ہے ؎

وہ لوگ جن کو میں اکثر برا سمجھتا تھا
انہیں قریب سے دیکھا تو مجھ سے بہتر ہیں

آج کل جو لوگ حسنِ اخلاق اور سلوک ومعرفت کی اس منزل پہ ہیں، وہ عام طور سے عصر حاضر کے مسائل وحالات سے بے خبر کسی گوشۂ تنہائی کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ مگر کمال جعفریؔ وہ صوفی ہیں کہ آدابِ میخانہ سے بھی واقف ہیں اور حالاتِ زمانہ سے بھی۔ عہدِ حاضر کے بعض اہم رجحانات کی طرف کمال جعفریؔ نے فنکارانہ اشارے کئے ہیں۔ مثلاً ؎

مسئلوں کے جال میں لپٹا ہوا
آدمی ہے اپنا زندانی نہ پوچھ

شاہ راہوں پہ ٹانگوں کا ہجوم
جیسے ہر راستہ ہو مقتل کا

اتنے چہرے ہیں کہ چہروں میں ہے گم ہر چہرہ
کس طرح دے کوئی اس بھیڑ میں آواز مجھے ؟

کمالؔ جعفری کے بارے میں تیسری اہم بات یہ ہے کہ ان کا لہجہ راست اور سادہ ہے۔ پچھلے چند برسوں میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ابہام گوئی کے برخلاف براہ راست مخاطبت کی افادیت اور تاثیر زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے کمال جعفریؔ کی غزلیں دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

OOOOOO

نام کتاب : سخن ور (حصہ چہارم) تذکرۂ شعراء اور شاعرات
مؤلفہ و مصنفہ : سلطانہ مہر
قیمت : پاکستان میں ۴۰۰ روپے۔ بیرون پاکستان ۲۰ امریکی ڈالر
ناشر : Meher Book Foundation
20873, East Walnut Canyon Road
Walnut, CA 91789 (U.S.A)
Ph . (909)444-0065 ● Fax : (909)444-0077
E-mail : rehan@aol.com
مبصر : ف۔ س۔ اعجاز

سلطانہ مہر شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار، صحافی اور محقق ہیں۔ اور ان کے تخلیقی کارنامے قابل رشک ہیں۔ سخن ور چہارم ان کی پندرھویں تصنیف ہے جو مختلف ممالک کے ۹۰ چنندہ شعراء و شاعرات کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ ہر تذکرہ دلچسپ و دلنشین ہے۔

ایک سوال نامے کے ذریعہ ہر شاعر کا انٹرویو لیا گیا ہے جو اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اس کے اپنے ایک شعر (بطور نمونۂ تحریر)، اسکی تصویر اور اس کے نمونۂ کلام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ترتیب و پیشکش مثالی ہے۔ سوال نامہ ایک ہی ہے لیکن ان سات سوالوں کے جواب ہر شاعر نے پوری آزادی بے باکی اور خلوص سے دئے ہیں اور اپنے سوانحی کوائف اور تخلیقی و تنقیدی رجحانات بھی لکھ دئے ہیں۔ سلطانہ مہر نے انھیں اس چابکدستی اور سلیقے سے ایک لڑی میں پرویا ہے کہ پوری کتاب تابدار موتیوں کی مالا دکھائی پڑتی ہے۔ ۵۱۲ صفحات کی اس کتاب کی افادیت آج بھی مسلّم ہے اور آئندہ وقتوں کے لئے بھی طے شدہ ہے۔ سلطانہ مہر کے دستِ صحافت نے تحقیق کو متنوع رنگ دے دئے ہیں۔ کتاب کو پڑھ کر انوکھا سرور اور آگہی حاصل ہوتی ہے۔ اکثر اچھے اچھے پیشہ ور محقق اور سرکاری ادبی ادارے اس پیانے کا کام ڈھنگ سے انجام نہیں دے پاتے جو سلطانہ مہر نے اکیلے انجام دیا ہے۔ ظاہر ہے مؤلفہ ر مصنفہ کا خلوص اور لگن انمول ہے اور جو لوگ ان کے ادبی کیریئر سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انھیں کبھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ نہیں رہی۔ اس کتاب کی اشاعت میں جناب ابو بکر وکیل نے مؤلفہ سے ہر ممکن تعاون کیا ہے۔ ابو بکر وکیل صاحب لاس انجلس کے ادبی، سماجی اور رفاہی حلقوں میں بڑی عظمت و وقار کے حامل ہیں۔ انکی فراخدلی اور ادب پروری کے طفیل عالم اردو میں ایک کار آمد کتاب کا اضافہ ہوا ہے جس کے لئے وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب اردو کا ایک مستقل اثاثہ ہے۔

اس کتاب میں شامل ہندوستانی شعراء و شاعرات مندرجہ ذیل پتے پر تین سو روپے صرف ڈاک خرچ منی آرڈر سے ارسال کردیں تو انہیں کتاب اعزازی طور پر مہر بک فاؤنڈیشن، امریکہ سے روانہ کردی جائے گی۔

OOOOOO

عید کی مبارکباد قبول فرمائیں!

JAMSHED ALI MOLLA

- SRN Enterprises
- Giriraj Enclave Pvt. Ltd.
- SRN Enterprises Pvt. Ltd.
- Sunny Trading Agency
- Joy Ma Kali Rice Mill
- Earthpro Sales Pvt. Ltd.
- Gypsun Impex Pvt. Ltd.
- M/s. Jamshed Ali Molla
- Gunkali Commodities Pvt. Ltd.
- Ankleswar Management Pvt. Ltd.
- Ultaco Commercial Pvt. Ltd.
- Sunny Rock Estates & Developers Pvt Ltd.
- Al - Habib Welfare & Charitable Trust

Office :

"Ajit Sen Bhawan", 13, Crooked Lane
Calcutta - 700069
Phone : 248-6220 Fax · 248-3668

17, Colonel Biswas Road, Calcutta - 700019
Phone : 280-4446 (R) 240-3377
E-mail . jamshed@cal2 vsnl net in

Residence :

AG-27, Salt Lake City, Sector - II,
Calcutta - 700091
Phone · 321-6744
Mobile : 98310 - 04267

احوال و اخبار

لندن میں یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی کی عالمی اردو کانفرنس
موضوع: "اکیسویں صدی اور اردو زبان میں نئے امکانات"

مندرجہ بالا موضوع کے تحت یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی نے اہتمام کیا عالمی اردو کانفرنس کا برونائی گیلری، لندن یونیورسٹی میں۔ ۲۷ اگست ۲۰۰۰ کو، مجلس اوّل کا انعقاد ہوا۔ صدارت پاکستان کے نامور محقق اور نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرمائی۔ انکے ساتھ جو مسند نشین تھے۔ اردو کی مایہ ناز ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر، ہندوستان کے ماہر غالبیات ڈاکٹر کالی داس، گپتا رضا اور یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی کے صدر جناب ساحر شیوی۔ جنرل سکیٹری اطہر راز کی اچانک علالت کی وجہ سے راقم الحروف کو نظامت کے فرائض انجام دینا پڑے۔

جناب ساحر شیوی نے کانفرنس کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے دو بڑے مرکز پاکستان اور ہندوستان سے ہٹ کر یورپ اور امریکہ میں عالمی اردو کانفرنس کا یکے بعد دیگرے انعقاد ہو رہا ہے۔ ۲۰ فروری کو اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام لندن میں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ جون میں نیویارک میں اردو کی عالمی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا اور اب اگست میں تیسری بار لندن میں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ جس کا اہتمام یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی کر رہی ہے۔

جناب عبدالطیف پالیکر، کانفرنس کے کوارڈینیٹر نے انگریزی زبان میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم ممنون ہیں جناب انور شیخ، لیوٹن بارو کونسل اور میلینیم فیسٹول کے، جنکی بدولت اس کانفرنس کی عملی صورت پیدا ہوئی۔

خاکسار نے مقررین کو دعوت دینے سے قبل حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، حاضرین یہ وہ سرزمین ہے جہاں اردو آئی نہیں حاجات کی جھولی پھیلا کر لائی گئی، ضروریات کی آلۂ کار بن کر۔ اس ملک کی ملکہ معظمہ کے ایک خادم منشی عبدالکریم جو آگرہ کی جیل میں دس روپیہ ماہانہ کے منشی تھے، یہاں خادم کی حیثیت سے آئے۔ جب ملکہ وکٹوریہ کو اردو زبان اور ادب کا شوق پیدا ہوا، تو انکے اتالیق بن گئے۔ ملکہ وکٹوریہ کو اردو زبان سے وابستگی اسقدر پیدا ہو گئی کہ وہ اردو زبان میں اپنی ڈائری لکھتی تھیں۔

آپ حضرات کو یہ جان کر فخر محسوس ہوگا کہ اردو زبان کی تاریخ کا ایک نیا باب آپ کے سامنے مرتب ہو رہا ہے۔ اس کانفرنس کا انعقاد ان دانشوران سے ہو رہا ہے، جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ عجب حسن اتفاق ہے کہ یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی کے پیٹرن جناب انور شیخ جنکی مادری زبان پنجابی ہے، پانچ کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس سوسائٹی کے صدر، جناب ساحر شیوی، جنکی مادری زبان کوکنی ہے، اور بارہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہم نے اس کانفرنس میں خاص مدعو کیا ہے ان حضرات کو جنکی مادری زبان اردو نہیں ہے اور ان اہل زبان کو بھی جو رہنمائی کر سکیں اکیسویں صدی کے لئے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کو مدعو کیا گیا تھا لیکن خرابیٔ صحت کی وجہ سے وہ تشریف نہ لا سکے البتہ انہوں نے اپنا مضمون بھیجا جسکو حیدر قریشی صاحب (جرمنی) نے پیش کیا۔ اسکا عنوان تھا "اکیسویں صدی میں اردو ادب کے امکانات"۔

شاعر احسان سہگل صاحب ہالینڈ سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے خطاب کرتے ہوئے، پہلے تو اردو کی داستان بیان کی پھر فرمایا کہ اردو کے عاشقوں کو بقائے اردو کے لئے بھرپور کوشش کرنا چاہیئے۔

ترکی کے مندوب ڈاکٹر خلیل طوق ار، استنبول یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں۔ مقالہ کا عنوان "ترکی میں اردو کی سرگزشت" (تاریخی پس منظر، آج اور آئندہ سے متعلق درپیش مسائل) فخریہ انداز میں کہا کہ اردو لفظ ہی ترکی زبان سے اخذ کیا ہوا ہے۔ اردو زبان کا رواج سلطنت عثمانیہ کے دور میں قائم ہو گیا تھا۔ جو ہندوستانی لوگ انگریزی راج سے مطمئن نہ تھے وہ ترکی میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ انکے لئے تین اخبار اردو میں شائع ہوتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے ساتھ انکی اشاعت ختم ہو گئی۔ لیکن آجکل ترکی میں تین یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبہ جات قائم ہیں اور ہر سال تیس چالیس طلبہ و طالبات بی اے کی ڈگری حاصل کر رہے ہیں۔ اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں "دراصل ایک فرد کی حیثیت سے جس کے دل میں اردو کی بیحد محبت ہو میں یہ بتاتا چلوں کہ اردو ایک باصلاحیت، شیریں اور اثر آفریں زبان ہے اور اگر خود اہل زبان چاہیں تو علمی و فلسفی میدانوں میں اردو کی جس کمی اور نااہلی کی بات ہو رہی ہے جلد ہی اسکی تلافی کر سکتے ہیں"۔

ڈاکٹر کیول دھیر ہندوستان سے تشریف لائے ہیں، مادری زبان پنجابی ہے۔ وہ اردو، ہندی اور پنجابی زبان میں افسانہ لکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہندوستان اور پاکستان سے نکل کر جہاں جہاں ہم لوگ پہنچے ہیں، ہم باتیں تو اردو میں کرتے ہیں لیکن ہمارے بچے انگریزی میں جواب دیتے ہیں۔ آپ لوگوں نے یہ کانفرنس منعقد کی ہے زبان کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے۔ کیا ان بدلتے ہوئے حالات میں زبان کی قدروں کی پاسبانی کر پائینگے؟ کیونکہ ان بدلتے ہوئے حالات میں چینل اور سٹلائیٹ کی بدولت اردو کی خوشبو دور دور تک پھیلے گی۔ انہوں نے اردو کے دانشوران سے درخواست کی کہ اردو ادب کی ڈائرکٹری کی سخت ضرورت ہے، جس پر ابھی تک کسی نے دھیان نہیں دیا۔

ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز نے بتایا "جب میں کیمبرج یونیورسٹی میں قدیم یونانی زبان کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس دوران برصغیر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو طالب علم اپنی علاقائی زبانوں میں گفتگو کرتے تھے۔ جس زبان نے مجھے گرویدہ بنا دیا تھا وہ تھی اردو زبان۔ اور میں نے اسی زبان میں ڈاکٹریٹ کی۔ اب یہاں فرنچ، جرمن، اسپینش کے بعد اسکولوں میں چوتھی زبان اردو ہو گئی ہے۔ جو حوصلہ افزا بات ہے۔" حاضرین کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا "اردو ایک زندہ زبان ہے اور زندہ رہیگی۔ افسوس اسکا ہے کہ ابھی تک کوئی اچھی لغت تیار نہیں ہوئی ہے، اور نہ ہی اچھے ترجمے غالب اور اقبال کے کلام کے ہوئے ہیں۔"

ڈاکٹر سعادت سعید انقرہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ انکی مادری زبان پنجابی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان جو کہ اردو کی جنم بھومی تھی۔ اب وہاں اردو دھیرے دھیرے دم توڑ رہی ہے۔ لیکن آج پنجاب اسکی ترویج کے لئے کوشاں ہے۔ پنجاب نے عظیم ادیب و شاعر پیدا کیئے۔ درحقیقت یہ زبان نہ تو ہندوستان کی ہے اور نہ ہی پاکستان کی بلکہ عوام کی ہے۔

ڈاکٹر حسن رضوی (پاکستان) نے کہا کہ "فیض صاحب نے کہا تھا ہندوستان میں تک لتا منگیشکر کی آواز زندہ ہے، ہندوستان میں اردو زندہ رہیگی۔ یہ صدی الیکٹرونک ...ی صدی ہوگی، ہمکو اردو کے فروغ کے لئے اس کو استعمال کرنا ہوگا۔ مغرب میں ...و کے روشن امکانات کے لئے ضروری ہے کہ پرنٹ میڈیا میں اردو کے ذریعے نئی نسل ...ی ثقافت اور تہذیب سے شناس کرایا جائے۔"

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (ہندوستان)، 'کوہسار جرنل' کے مدیر ہیں۔ کوئی ...ی کتابوں کے مصنف بھی۔ آپکے مقالہ کا عنوان تھا "اکیسویں صدی اور اردو زبان میں ...انات" اردو کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اور انکے نتائج بیان کرتے ہوئے ...وں نے کہا "نئے رنگ، نئے ڈھنگ، نئے انداز، نئے الفاظ اور نئی تشبیہوں کی چاندنی سے ...و زبان اور ادب روشن ہیں جن میں ماضی ہے، حال ہے، اور مستقبل کا عکس بھی ہے، ...یہ اکیسویں صدی کا عکس ہے۔" پھر اکیسویں صدی پر روشنی ڈالتے ہوئے "تعلیم ...ئے تعلیم از کار رفتہ تخیل بن جائیگا۔ رجحان کے پیش نظر زیادہ یافت والی تعلیم ضروری ہوگی۔ اہم تکنیکی اور تدریسی و تربیتی مسائل پر جدید ترین فاصلاتی تعلیم کے تحت غور و خوض ...دو والوں کی منزل ہوگی۔"

...پروفیسر آلیین ڈیزدلیئر، صدر شعبۂ اردو، پیرس یونیورسٹی، فرانس۔ انکی کوئی ...ہ تصنیفات ہیں۔ انکے مضمون کا عنوان تھا "اردو کے رسم الخط کے تحفظ کا مسئلہ۔" ...نہوں نے بتایا کہ وہ اردو زبان کے ساتھ برصغیر ہندوپاک کی تاریخ بھی پڑھاتے ہیں، جسکی وجہ سے رسم الخط کی اہمیت کا اندازہ ہوا کیونکہ دستاویزات اور مخطوطات، جو فارسی اور اردو زبان میں ہیں اور نایاب ذخیرہ ہے، انگریزوں کے آنے سے پہلے ان تاریخی نشانیوں کی وجہ سے رسم الخط کے تحفظ کی اہمیت ناگزیر ہوگئی ہے۔ اسکے علاوہ اردو ادب میں میر سے اقبال تک زبان کی لطافت اور فکری نعمتوں سے آنے والی نسل محروم ...جائیگی۔

پروفیسر سید محفوظ علی۔ "آگہی" کے مدیر ہیں۔ انکی مادری زبان اردو ہے لیکن انہوں نے مقالہ انگریزی میں پڑھا۔ مفہوم یہ تھا کہ اردو زبان میں مقابلہ کرنے کی سب خوبیاں موجود ہیں، اکیسویں صدی میں اسکا نام بلند رہیگا۔

پروفیسر عبدالقوی ضیا (کینیڈا) نے کہا "میرے نزدیک اردو کی بقا اور اس کی ارتقا ...ا حساس ہر وقت رہتا ہے اور اسکے فروغ کی جدوجہد میں لگا رہتا ہوں۔ اب کینیڈا میں تین یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جارہی ہے۔ آجکل کینیڈا میں چودہ جریدے اردو میں نکل رہے ہیں۔"

ہمایوں ظفر زیدی (ہندوستان) نے کہا "میری اطلاع کے مطابق، سنہ ۱۹۴۷ء میں جتنے اردو اخبار نکلتے تھے اس سے دگنی تعداد میں آجکل شائع ہو رہے ہیں۔ یہ ضرور ہوا ہے ...ہ اردو کا کلاس چینج ہو گیا ہے۔ اب سید زادے اردو نہیں پڑھ رہے ہیں، اسکے برخلاف ...اکھوں کی تعداد میں کاریگر پیشہ لوگوں کے بچے اردو پڑھ رہے ہیں۔ ہمارے مشہور اردو کے شعراء اور ادباء کے بچے اردو سے ناواقف ہیں۔ دینی اور تبلیغی جماعتوں کے توسط سے ...ردو کا فروغ ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں اردو کا مستقبل اتنا تاریک نہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے۔"

ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا، ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم دیتی ہیں۔ انکے مضمون کا عنوان تھا "اردو کے حالات اور امکانات ایک غیر زبان کی نظر میں"۔ ان کی آمد سے پہلے حاضرین پر تکان سے غنودگی کا عالم پیدا ہو گیا تھا۔ آپکی شستہ اور سلیس اردو سے بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ ہال میں جہاں چہ میگوئیوں سے جھنجھناہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ انکی شیریں آواز سے سناٹا طاری ہو گیا۔ انھوں نے بتایا کہ سوویت یونین کے ختم ہونے سے اردو کے فروغ کو نقصان پہنچا۔ مالی امداد ختم ہوگئیں، جسکی وجہ سے ترجموں کی اشاعت ختم ہوگئی۔ انہوں نے اپنا مقالہ ان الفاظ پر ختم کیا: "روس میں اکیسویں صدی میں اردو کے امکانات کے بارے میں میری ذاتی رائے کی بات ہے تو روس میں اردو کی نئی بہاروں کی امید میں تین باتوں سے وابستہ کرتی ہوں۔ اول ہمارے ذخیرے کافی بڑے ہیں۔ دوسری۔ اردو کے دوستوں کے ساتھ تعاون، تیسری بقول اقبال:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

جس وقت مقالہ ختم ہوا۔ ہال تالیوں سے گونج گیا

ڈاکٹر یان مارک، صدر شعبۂ اردو، چارلس یونیورسٹی، چیک ریپبلک۔ انکے مضمون کا عنوان تھا "پراگ میں اردو تعلیم" پہلے تو بتایا کہ کس طرح مشہور چیک مستشرق او تاکار پرتولد نے مشرقی زبانوں کی بنیاد ڈالی۔ بتایا کہ ۱۹۵۰ سے اردو اور ہندی کی تعلیم دی جارہی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں: "جب تک ادبی شاہکاروں کا غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ نہیں ہوں گے، لوگوں کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی پیدا نہیں ہوگی اور اگر کسی ملک کے ادب سے دلچسپی پیدا نہیں ہوگی تو پھر اس ملک سے اور اسکی زبان سے دلچسپی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اس نکتہ کو پاکستانی ادیب اچھی طرح سے سمجھتے ہیں"۔

ڈاکٹر جمیل جالبی، صدر اجلاس اول نے خطبہ صدارت میں کہا کہ کس طرح سے ہندوی زبان سے رسم الخط کی پہچان پر اردو زبان نے جنم لیا اور یہ زبان ابلاغ اور رابطے کی واحد زبان اور مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے متعدد دریاؤں کا سنگم بن گئی۔ پھر زبانوں کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ زبانیں قوموں کے اقتدار کے ساتھ چڑھتی ہیں اور انکے زوال کے ساتھ اترتی ہیں۔ دوسری جنگ کے بعد فرانسیسی زبان کے ساتھ یہ ہی ہوا۔ انگریزی زبان کا اقتدار امریکہ کے کاندھوں پر سوار ہے اور ساری دنیا میں چھا رہی ہے۔ اکیسویں صدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال کے تجربہ سے تو یہ ثابت ہوا ہے کہ ہندوپاکستان میں انگریزی زبان لنگوا فرینکا نہیں بن پائی۔ اردو عام بول چال اور ادب کی زبان اسی طرح برقرار رہے گی۔ ہجرت کرنے والی پہلی نسل کے اہل ذوق کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ یورپ اور امریکہ کے عالمی معیار کے مطابق یہاں رہ کر اپنی زبان میں ادب تخلیق کریں اور اپنے سائنسی اور علمی و ادبی موضوعات پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کریں۔ دلاسا دیتے ہوئے کہتے ہیں "اکیسویں صدی میں ہجرت کرنے والی پہلی نسل کے تعلق سے تخلیقی سطح پر مجھے روشن امکانات نظر آرہے ہیں۔ لندن سے ایک معیاری سہ ماہی رسالہ بھی شایع کرنے کی ضرورت ہے جس میں انگلستان و یورپ اور امریکہ میں لکھنے والوں کی معیاری تحریریں بھی شائع کی جائیں اور مسائل و افکار پر بحثوں کا دروازہ کھولا جائے اور ہر سال ان تمام تخلیقات و تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے جو ایک سال میں لکھی گئی ہیں۔ فکر انگیزی، خیال افروزی، روشن خیالی اور ادب کا عالمی معیار اس رسالے کی شناخت ہو۔ اسی کے ساتھ "یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی" کے پلیٹ فارم سے اردو میں علم و ادب کے تعلق سے جدید و زندہ موضوعات پر سالانہ لیکچر کا بھی انتظام مفید ہوگا۔"

دوسرے اجلاس میں ایوارڈ کا انتظام کیا گیا تھا جو کہ زیر صدارت ماہر غالبیات ڈاکٹر کالی داس گپتا رضا شروع ہوا۔ رضا صاحب نے صدارتی مقالہ ان الفاظ پر ختم کیا "اگر

اردو زبان کی ہستی شعر و سخن ہی کے بل بوتے پر تسلیم کی جاتی رہے گی تو بھی اس کی ہمہ گیر رنگینی اسے اکیسویں صدی ہی میں زندہ نہیں رکھے گی بلکہ اسے زندہ جاوید بنائے رکھے گی۔ میں اردو زبان کے نئے امکانات کی جستجو میں بار بار ابھروں گا کیونکہ اردو زبان قدامت پسند نہیں، فطرتاً نئی زبان ہے۔ اور یہ ہمیشہ نئی زبان رہے گی"۔

اسکے بعد ایوارڈ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو کہ دو اقساط میں تھا۔ ایک تو ان مقامی حضرات کو ایوارڈ دیا جا رہا تھا۔ جن کی بے لوث خدمات اردو کی ترقی اور ترویج میں ہیں۔ ان میں سرِ فہرست جناب محمود ہاشمی، جنہوں نے ۱۹۶۱ میں ہفت روزہ "مشرق" نکالا۔ جو سنگم بن گیا، سماجی، تجارتی، تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں کا۔ جس نے اردو زبان کو فیضیاب کیا۔ اسکی اشاعت سے یورپ میں اردو زبان کی تعلیم و ترویج کا دور شروع ہوا۔ آپکو دیا گیا صحافت پر "مولانا محمد علی جوہر" ایوارڈ جناب مجاہد ترمذی کو دیا گیا۔ "فیض احمد فیض" ایوارڈ، آپ نے ۱۹۸۳ء میں فیض اکیڈمی کی بنیاد ڈالی، ۱۹۸۴ء میں پہلا انٹرنیشنل سیمینار، فیض صاحب کی موجودگی میں منعقد کیا۔ اسکے بعد گاہے گاہے سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالغفار عزم کو "مولانا حسرت موہانی" ایوارڈ دیا گیا۔ آپ گزشتہ دس سال سے ہر ماہ ادبی نشست کا انتظام کرتے رہتے ہیں۔ جناب سوہن راہی کو ساحر لدھیانوی ایوارڈ گیت سازی پر۔ جناب شمس الدین آغا کو کو آغا حشر کاشمیری ایوارڈ، ڈرامہ نگاری پر۔ محترمہ بلقیس درانی کو "خاتون" ایوارڈ۔ آپ خواتین کے لئے ادبی محفلوں کا انتظام ہر سال کرتی ہیں۔

دوسرے دور میں مہمانوں کو ایوارڈ تقسیم ہوئے۔ اسمیں ڈاکٹر جمیل جالبی کو "اردو ۲۰۰۰ ایوارڈ" ڈاکٹر کالی داس گپتا رضا کو "غالب ایوارڈ" ڈاکٹر یان مارک کو "مولانا شبلی نعمانی ایوارڈ" پروفیسر عبدالقوی ضیا کو "سر سید احمد ایوارڈ"، ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز کو "ڈاکٹر جون گل کرسٹ ایوارڈ"۔ پروفیسر آلیکن ڈیزدلیر کو "گارسن دتاسی ایوارڈ" ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا کو "سردار جعفری ایوارڈ"۔ ڈاکٹر خلیل طوق تار کو "علامہ اقبال ایوارڈ"۔ ڈاکٹر کیول دھیر کو "منشی پریم چند ایوارڈ" ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو "مولانا الطاف حسین حالی ایوارڈ"، ترغیب بلند نقوی کو "رئیس امر ایوارڈ"۔ پروفیسر سید محفوظ علی کو "ظفر علی ایوارڈ"۔ حیدر قریشی کو "حفیظ جالندھری ایوارڈ"۔ ڈاکٹر حسن رضوی کو "ناصر کاظمی ایوارڈ"۔ ڈاکٹر سعادت سعید کو "ن م راشد ایوارڈ"۔ یہ سب ایوارڈ محترمہ قرۃ العین حیدر کے ہاتھوں تقسیم کیے گئے۔ (جو مندوب ایوارڈ کے اعزاز سے محروم رہے انکو نقد رقم سے سرفراز کیا گیا۔)

یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی نے آغاز کیا ہے ایوارڈ کا جو ہر سال پیش کیا جائیگا۔ اسمیں ایک ادیبہ یا شاعرہ کو، ایک اس ادیب یا شاعر کو جس نے یورپ میں آنکھ کھولی، ایک اردو کے خدمت گار اور ایک تخلیق کار کو۔ یہ ایوارڈ صرف یورپ کے ساکنان کے لئے مخصوص ہونگے۔

۲۸ اگست کو مشاعرہ کا انتظام کیا گیا، جو لیوٹن میں منعقد ہوا، اسکی نظامت ڈاکٹر حسن رضوی نے کی، مشاعرہ دو نشستوں میں تقسیم ہوا۔ پہلی نشست کے صدر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔ اس نشست میں صرف مقامی شعراء نے اپنے کلام سنایا، شعراء حضرات کوئی چالیس کے قریب تھے۔ دوسری نشست میں پروفیسر عبدالقوی ضیا کی صدارت میں مہمان شعراء نے کلام سنایا۔ لیوٹن لندن سے تیس میل فاصلہ پر ہے پھر بھی آخر وقت تک ہال بھرا ہوا تھا۔ اتنا مقبول مشاعرہ لیوٹن میں پہلی مرتبہ اور انگلستان میں دوسری مرتبہ ہوا۔

رپورٹ صابر ارشاد عثمانی۔ مرسلہ : عبدالغفار عزم

ضروری اعلان اردو ٹرسٹ برطانیہ لندن کے زیر اہتمام منعقدہ پہلی عالمی اردو کانفرنس

لندن، مورخہ ۲۶ر اور ۲۷ر فروری ۲۰۰۰ کی قرارداد کی رو سے "عالمی مجلس مشاورت اردو" کی تشکیل میں شرکت کیلئے اہلِ اردو (خدامانِ زبان و ادب) سے اپنی رضامندیاں اردو ٹرسٹ لندن کے پتہ پر ارسال کرنے کی گذارش ہے۔

پتہ یہ ہے:

Urdu Trust

75, Margaret Street, London WIN 7H B

PH : 01716315263 ● Fax : 01714364754

مجاز اکادمی لندن کی ادبی نشست

مجاز اکادمی لندن کی جانب سے پاکستان سے آئے ہوئے اُردو کے شاعر دانشور اور مجلّہ "ارتقا" و "ماورا" کے مدیر جناب حسن عابد صاحب اور جناب خالد شریف کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا انعقاد ہوا۔ یہ نشست غزل گائک بی بی سی ہندی سروس کی پروڈیوسر محترمہ سدھا شرما کے خوشنما اور مزیّن مکان پر اتوار دس ستمبر کو برگزار ہوئی۔ صدارت مشہور ترقی پسند شاعر جناب بخش لائلپوری نے کی۔ نشست کا آغاز حسبِ روایت کلام مجاز سے ہوا جس کو سدھا شرما کی مدھر آواز میں بہت پسند کیا گیا۔ پھر حیدر طباطبائی نے حسن عابد کے فن پر ایک مقالہ پڑھا جس میں بتایا گیا کہ حسن عابد نے غزل کے فارم کا استعمال تخلیقی سطح پر کیا ہے اور اب اس طرزِ فکر کے شعرا کی تعداد بہت کم رہ گئی۔ وہ اپنی شاعری میں نئے اسلوب سے شاہراہ ارتقاء پر قافلۂ فکر و نظر کی سمت دانشمندانہ انداز سے بدل رہے ہیں۔ اس کے بعد مشہور افسانہ نگار نقاد اور صحافی جناب قیصر تمکین نے حسن عابد سے متعلق بتایا کہ میرا اور حسن عابد کا تعلق انجمن ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے کے بعد آنے والوں میں ہے۔ حسن عابد نے تعلیم حاصل کر کے اپنے کو بکاؤ مال نہیں بنایا، نہ وہ سرکاری نوکری میں گئے اور نہ ہی کبھی کسی کا قصیدہ لکھا بلکہ جو اعلیٰ مقصد اُن کے اشعار میں ملتا ہے وہی اُن کی زندگی میں بھی پنہاں ہے۔ محفل مشاعرہ کا آغاز مشہور افسانہ نگار اور شاعر محترمہ فیروزہ جعفر سے ہوا۔ فیروزہ جعفر نے کئی نظمیں اور غزلیں پیش کیں۔ اس کے بعد جناب باقر نقوی۔ محترمہ زہرہ نسیم، جناب اکبر حیدر آبادی۔ محترم حسین شیر علوی اور صدر مشاعرہ بخش لائلپوری نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ پھر مہمان شاعر محترم خالد شریف صاحب نے غزلیں سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا اور آخر میں حسن عابد صاحب نے سیاسی اشارے لئے ہوئے نظمیں اور غزلیں پیش کیں۔ اس نشست میں مشہور افسانہ نگار و "ادبِ لطیف" لاہور کی مدیرہ محترمہ صدیقہ بیگم اور افسانہ نگار شاہدہ احمد۔ عزیز احمد۔ جعفر نقوی اور پرائم ٹی۔ وی کی نمائندہ محترمہ ارسا خان نے شرکت کی۔ اس کے بعد صدر مجاز اکادمی حیدر طباطبائی نے مہمانوں کے تشکر کے ضمن میں کہا کہ مجاز اکادمی ایک ادبی ادارہ ہے۔ جہاں شعرائے کرام میں تقدیم و تاخیر و صدارت اور مہمانِ خصوصی وغیرہ کی خرافات نہیں۔ یہاں ہر طرح کی نمائش و خوشامد سے بے نیاز ادبی گفتگو ہوتی ہے۔ مجاز اکادمی ترقی پسند تحریک کے اُصولوں پر گامزن دیارِ غیر میں اُردو کی شمع روشن کئے ہوئے ہے۔ مجاز اکادمی کے بانی قیصر تمکین صاحب اور سرپرست حسین شیر علوی و بخش لائلپوری نے بھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

حیدر طباطبائی، لندن

حصولِ علم دُنیا کی عظیم ترین خوشی۔ پروفیسر جیراجپوری

وائس چانسلر کے هاتهوں گلبرگه یونیورسٹی میں کرونو بائیو لاجی پر دو روزہ قومی سمینار کا افتتاح۔

حیدر آباد ۱۵ اکتوبر: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر م شمیم جیراجپوری نے کہا کہ حصولِ علم دنیا کی عظیم ترین خوشی ہے۔ علم کی شمع روشن کرنا انتہائی مشکل کام ہے لیکن اگر ایک بار یہ شمع کسی کے دل میں منور ہو جائے تو پھر اسے کوئی بھی تیز و تند ہوا گل نہیں کر سکتی اور وہ اس سے عمر بھر لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ اور اس شمع سے نجانے کتنی اور شمعیں روشن ہو سکتی ہیں۔ اُنہوں نے ان حالات کا اظہار گلبرگہ یونیورسٹی میں حیاتیاتی گھڑیاں (Chronpbiology / Biological clocks) کے موضوع پر منعقد دو روزہ قومی سمپوزیم کا افتتاح کرنے کے بعد اپنی تقریر میں کیا۔ سمپوزیم کا انعقاد انڈین سوسائٹی فار کرونو بائیو لاجی کے تعاون سے گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبۂ حیاتیات نے کیا تھا۔ یونیورسٹی کیمپس میں واقع ڈارون ہال میں منعقد اس سمپوزیم کے افتتاحی اجلاس کی صدارت شعبۂ حیوانیات کے صدر پروفیسر بی این جوشی نے کی جبکہ دیگر مہمانان میں انڈین سوسائٹی آف کرونو بائیو لاجی کی نائب صدر ڈاکٹر رادھا گ نرائن، سکریٹری ڈاکٹر اتل کمار پتی اور ملک کے بیشتر اہم اداروں سے وابستہ ماہرین کرونو بائیو لاجی شامل تھے۔

پروفیسر جیراجپوری نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ دنیا دو چیزوں پر قائم ہے۔ ایک ہم آہنگی (rhythmicity) ہے اور دوسری چیز تضاد ہے۔ جاندار ہوں، غیر جاندار ہوں یا بظاہر غیر جاندار نظر آنے والے جاندار ہوں ان سبھوں کے وجود، بقا اور فنا کا تعلق ہم آہنگی اور تضاد پر منحصر ہے۔ سبھی کو کئی ایک دوسروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک دوسرے سے زندگی اور توانائی حاصل کرتے ہیں۔ زندہ یا باقی رہ کر بھی دوسروں کے کام آتے ہیں اور فنا یا ختم ہو کر بھی کسی نہ کسی طرح نئی آنے والی زندگیوں کے لیے کار آمد ہوتے ہیں۔

وائس چانسلر نے کہا کہ ہر ایک جاندار خواہ ہم اسے simple کہتے ہوں یا complicated سبھی قدرت کے نایاب نمونے اور شاہکار ہیں۔ سبھی اپنی بناوٹ کے اعتبار سے یکتا اور اچھوتے نمونے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ تمام تر ترقیوں، اعلیٰ سطحی تحقیقات اور نت نئی ایجادات کے باوجود سائنس قدرت کے کرشموں اور کاریگری کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس دنیا میں قدرت کے پیدا کردہ 1.75 ملین معلوم جاندار ہیں جبکہ یک اندازے کے مطابق 50 ملین سے لے کر ایک بلین تک نامعلوم جاندار بھی موجود ہیں۔ سائنس اب تک ان میں سے صرف ایک یعنی انسان کے جسم کی بناوٹ اور اُس کی ساخت کی نزاکت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکی ہے اور نہ ہی آب و ہوا اور فضا و ماحول کی تبدیلی یا عدم توازن سے اُس میں پیدا ہونے والی خرابیوں پر قابو پایا جا سکا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انسانی جسم کے صرف ایک پرزے دل ہی کو لے لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں سال سے پوری دنیا میں دل پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے لیکن آج بھی ہم اس دل پر پوری طرح قدرت نہیں پا سکے ہیں۔ ہر روز نہ جانے کتنی تعداد میں لوگوں کی موت صرف حرکت قلب بند ہو جانے سے یا اس کے عدم توازن کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔

پروفیسر جیراجپوری نے سمپوزیم کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ حیاتیاتی گھڑیاں انسان اور جانوروں میں تو موجود ہیں ہی، مگر نباتات بھی جو زندگی گزارتے ہیں ان میں بھی معمولات کا دخل ہوتا ہے۔ وہ بھی صبح شام، طلوع و غروب آفتاب، باد و باراں اور موسم کی سختی و نرمی سے معینہ اثرات قبول کرتے ہوئے اپنے وجود کو قائم رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحقیقات اور مشاہدات کی روشنی میں کئی مثالیں نیل پا اور کئی خوردبینی جراثیم (Parasites) کا حوالہ دیتے ہوئے ثابت کیا کہ سبھوں میں حیاتیاتی گھڑیاں پائی جاتی ہیں اور سب اپنے اپنے معمولات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں یا اپنے وجود کو قائم رکھتے ہیں۔

سائنسدانوں اور خاص طور پر نوجوان سائنسدانوں کو مخاطب کرتے ہوئے پروفیسر شمیم جیراجپوری نے کہا کہ یہ رویہ اور رجحان غلط اور گمراہ کن ہے کہ کسی بھی موضوع پر سائنسی تحقیق کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ کسی بھی تحقیق کو حتمی اور آخری مان لینا تحقیق کے دروازوں کو مقفل کرنے اور امکانات کو مسدود کر دینے کے مترادف ہے۔ انہوں نے کہا کہ سائنس میں جو تحقیق ہوئی ہے وہ عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ سائنس کو ابھی منزلیں طے کرنی ہیں۔ سائنسدانوں کو چاہئے کہ وہ انسان کے ساتھ نباتاتی زندگیوں کے تحفظ کو بھی یقینی بنائیں۔ اس میں خود انسان کی اپنی بھلائی پوشیدہ ہے۔

واضح رہے کہ کرونو بائیو لاجی اس حیاتیاتی سائنس کو کہتے ہیں جس میں "وقت" کو اساس مان کر تحقیق کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی کے خون یا پیشاب وغیرہ کی جانچ مختلف وقت میں کرنے سے اس کے اثرات و نتائج میں کیسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔۔۔۔ سائنس کی اس شاخ کو ہندوستان میں دن بدن مقبولیت اور اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔

مرسلہ ڈاکٹر ظفرالدین، پبلک ریلیشنز افسر (انچارج)

پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری
انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی کے نائب صدر منتخب

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسی کے وائس چانسلر اور معروف سائنس داں پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کو سائنسی میدان میں ان کی تحقیقی اور انتظامی صلاحیتوں کے پیش نظر انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی کا نائب صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اس عہدے کی مدت تین سال ہے۔ ہندوستان میں موجود سائنسی اکیڈمیوں میں یہ اکیڈمی سب سے زیادہ معتبر اور باوقار تسلیم کی جاتی ہے جس کا ہیڈ کوارٹر نئی دہلی میں واقع ہے۔

پروفیسر سید ظہور قاسم کے بعد پروفیسر جیراجپوری پہلے مسلمان سائنسداں ہیں جنہیں اس عہدے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ظفرالدین، پبلک ریلیشنز افسر (انچارج)

مشتاق انجم کے افسانوی مجموعہ "تلاش" کا اجرا

(کلکتہ) ۱۴ر اکتوبر کو ادارہ امداد الغربا ہال (ہوڑہ) میں جناب مشتاق انجم کے افسانوں کے دوسرے مجموعہ "تلاش" کی رسمِ اجرا انجام دی گئی۔ جلسے کی صدارت مشہور افسانہ نگار سعید پریمی نے کی اور نظامت کے فرائض جناب ایم۔ علی WBCS نے انجام دئے۔ مہمانوں کی گلپوشی کے بعد رائٹرز ایسوسی ایشن ہوڑہ کے مؤسس استاد شاعر جناب قیصر شمیم نے اپنی افتتاحی تقریر سے جلسہ کا آغاز کیا۔ کلکتہ کے مشہور ادبی جریدہ انشاء کے مدیر جناب ف۔ س۔ اعجاز نے "تلاش" کی رسم اجرا ادا کی۔

ڈاکٹر ہری کنور رائے کنور۔ جناب کلیم حاذق۔ جناب مقصود دانش اور محترمہ شگفتہ یاسمین غزل نے مشتاق انجم کے افسانوں سے متعلق اپنے مضامین پڑھ کر سنائے۔

جناب مشتاق جاوید نے مصنف کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ مشتاق انجم نے اپنے ادبی رہنما جناب قیصر شمیم کو اپنی جانب سے ایک خوبصورت شال کا نذرانہ پیش کر کے ان سے کسب فیض کا اعتراف کیا۔ حاجی مختار احمد صاحب نے مشتاق انجم کو ایک خوبصورت تحفہ پیش کیا۔

صدر جلسہ جناب سعید پریمی اور جناب قیصر شمیم کے علاوہ ماہنامہ "نیا دور" لکھنو کے مدیر جناب شاہنواز قریشی، جناب ظہیر انور، جناب ف۔ س۔ اعجاز، جناب احسن شفیق اور جناب رفیق انجم نے مشتاق انجم کے افسانوں پر اظہار خیال کیا اور یہ اعتراف کیا کہ مشتاق انجم کو انسانی نفسیات اور عصری تقاضوں کا پاس ولحاظ ہے۔ ان کی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانا چاہیے۔ زندگی کی سچائیوں اور دل میں اُتر جانے والی باتوں سے بھری پُری اس کتاب کی پذیرائی اردو دوست ضرور کریں گے۔ جناب مشتاق انجم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے آراء کو بسر و چشم قبول کیا۔

الحاج مختار احمد نے "تلاش" کی پہلی کاپی ایک ہزار ایک روپے میں، دوسری کاپی جناب مطرب بلیاوی نے پانچسو روپے میں اور تیسری کاپی محترمہ نذرانہ خاتون نے ایک سو ایک روپے میں خریدی۔ اسکے علاوہ کئی شعراء ادباء اور ادب دوستوں نے مقررہ قیمت پچاس روپے ادا کر کے کتابیں خریدیں، آخر میں سکریٹری حشمت فتح پوری نے ایسوسی ایشن کی جانب سے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(حشمت فتح پوری۔ شب پور، ہوڑہ)

لندن میں "آئین سخنوری" کا اجراء

حیدر طباطبائی کی تصنیف "آئین سخنوری" کا اجراء ۸ اکتوبر کو یونیورسٹی آف لندن کے بروناِئی ہال میں "سہ ماہی ارتقاء" کراچی کے مدیر حسن عابد کی صدارت میں منعقد ہوا۔

نظامت کے فرائض ارسلا خان نے انجام دئے۔ اس پُر رونق تقریب کا آغاز لندن میں اُردو شعراء کے اس نذرانۂ محبت سے ہوا جو صاحبِ "آئین سخنوری" کے لیے قطعات، رباعیات و نظموں پر مبنی تھا۔ ان شعرائے کرام میں ناظر فاروقی، اعجاز احمد اعجاز، نور جہاں نوری، آغا محمد سعید، پروفیسر محمد شریف بقا، ڈاکٹر عبد الغفار عزم، ساحر شیوی، اطہر راز، منصور معجز، اور جناب بخش لائلپوری کے نتائج فکر شامل تھے۔ پروفیسر محمد شریف بقا نے اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی ایک معیاری نظم حیدر طباطبائی کے انداز تحریر کی تعریف میں پڑھی۔

پروگرام کا حصہ دوم محفل مناثرہ پر مبنی تھا جس کا آغاز عتیق فریدی کے مقالے سے ہوا۔ عتیق فریدی نے کہا کہ حیدر طباطبائی کی تحریر میں ان کے ایمان، کردار، شخصیت اور مرتبے کی بلندی پوری طرح واضح نظر آتے ہیں۔ اس کتاب میں ہماری کلاسیک روایت کے درخشاں پہلو دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مدعو تھے لیکن وہ اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر لندن تشریف نہ لاسکے، اس لیے موصوف نے آئین سخنوری پر ایک سیر حاصل تبصرہ بذریعہ ویڈیو ٹیپ ارسال کر دیا تھا جو پروگرام کے درمیان ٹی۔ وی کے اسکرین پر پیش کیا گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مختصر تعارف قیصر تمکین نے پیش کیا اور بتایا کہ پروفیسر نارنگ شرق و غرب کے مطالعہ سے سرشار ہیں لیکن وہ کبھی بھی غرب سے مرعوب نہیں ہوئے۔ اس کے بعد بذریعہ ویڈیو ٹیپ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جی نے فرمایا کہ "آئین سخنوری" روز۔ روز شائع ہونے والی کتابوں سے مختلف ہے۔ حیدر طباطبائی کی نثر میں معیاری صلاحیت ہے۔ "آئین سخنوری" اردو تاریخ میں ایک نئے ورق کی حیثیت رکھتی ہے۔ تقریباً چالیس منٹ تک ڈاکٹر نارنگ نے آئین سخنوری پر مفصل اور مدلل بحث کی۔ اس کے بعد بی بی سی لندن کی مشہور براڈکاسٹر اور غزل سنگر محترمہ سدھا شرما نے اپنی مدھر آواز میں علامہ اقبال کی مشہور حمد لاالٰہ الا اللہ سے پروگرام کا آغاز کیا۔ پھر قیصر تمکین صاحب نے آئین سخنوری کے چند مثبت نکات کی جانب سامعین کی توجہ مبذول کرائی۔ پھر ڈاکٹر سعادت سعید نے، جو انقرہ یونیورسٹی ترکی میں اردو کے پروفیسر ہیں اور خاص طور سے اس پروگرام میں شرکت کے لیے لندن تشریف لائے تھے، اپنے مقالے میں بتایا کہ کتاب آئین سخنوری عام روایات سے ہٹ کر علمی، ادبی اور ثقافتی اُمور پر مناسب ترین نادر و نایاب کتاب ہے۔ آخر میں صدر جلسہ حسن عابد نے اپنے طویل مقالے میں کہا کہ اُمید ہے کہ حیدر طباطبائی ادب میں اسی طرح سے نئے ابواب کا اضافہ کرتے رہیں گے۔ یہ تقریب انجمن ترقی پسند مصنفین، تحریک اُردو اور مجاز اکادمی کی جانب سے برگزار ہوئی تھی، آخر میں مشہور ترقی پسند شاعر بخش لائلپوری نے مہمانوں کے شکریہ کے ضمن میں کہا کہ حیدر طباطبائی کی چند دوسری اعلیٰ قسم کی کتابیں عنقریب منظر عام پر آرہی ہیں۔ اس تقریب میں معززان لندن نے شرکت کی جن میں حسین مشیر علوی، بین الاقوامی شہرت یافتہ موسیقار محمود مرزا، پروفیسر محمد عارف، رشید شیخ بیرسٹر، اکبر حیدر آبادی اور ملک فضل حسین وغیرہ بھی شامل تھے۔

مرسلہ: ارسلہ خان (لندن)

لاس اینجلس میں سلطانہ مہر کو ایوارڈ

امریکہ میں مقیم صف اول کی اردو شاعرہ، افسانہ نگار، ناقد اور سرگرم صحافی محترمہ سلطانہ مہر، جو کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں، کو انکی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر کیلی فورنیا کی نامور سماجی شخصیت جناب [illegible] کی جانب سے ایوارڈ پیش کیا گیا۔

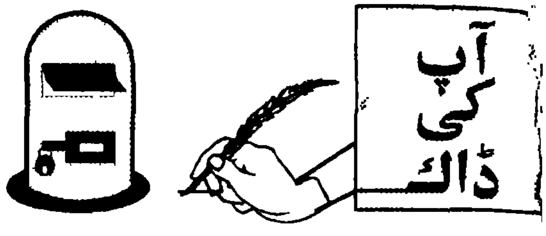
بقیہ کتنا ہے بد نصیب ظفر

منسوب کر دیا گیا لیکن اب جبکہ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ظفر کا کلام ان کیا ستادوں کی دین نہیں خود ان کے دکھی دل کی پکار ہے جو فکر و فن کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے، ابھی تک جبکہ ہندوستان کو آزادی حاصل کئے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ پہلی جنگ آزادی کے اس سپاہی کو کوئی خراج عقیدت نہیں پیش کیا گیا ہے جس نے وطن کی محبہ اور حصول آزادی کیلئے سب کچھ لٹا دیا اور وطن سے دور بے بسی اور بیکسی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ آخری وقت بھی جسکا غم یہ تھا کہ ؎

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کیلئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ماخذات

۱۔ Nehru The Making of India -by M.J.Akbar
۲۔ نوائے ظفر۔ خلیل الرحمٰن اعظمی
۳۔ یادگار غالب۔ مولانا الطاف حسین حالی



(مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

○ محترمہ اے امیر النساء کے سفر نامہ کی مقبولیت کا راز ان کے انداز بیان میں ہے۔ نہایت بے تکلف نثر قاری کو اپنے ساتھ ٹھنڈے پانی کے آہستہ بہتے ہوئے چشمے کی طرح بہالے جاتی ہے۔

منظوم تخلیقات جاندار اور معیاری ہیں خصوصاً طاہر تلہری کی حمد خوبصورت ہے۔ ''کلکتے میں معرکۂ غالب و قتیل'' از ڈاکٹر وفا راشدی میں بعض تحقیقی اشارے کام کے معلوم ہوئے۔ انہوں نے غالب و قتیل کے حوالے سے دیگر مناصموں کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اور آپ کا اداریہ ''آؤ کلچر سے کھیلیں'' اس شمارہ کا ''حاصل'' ہے۔

مختار شمیم، اندور

○○○○○○

○ ''انشاء'' میں کلچر پر اداریہ (آؤ کلچر سے کھیلیں) توجہ طلب ہے۔ کلچر کا مقصد ہے انفرادی ملکیت۔ اس پر بنیادی ماہیت کے لحاظ سے کسی کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ یہ نادر و نایاب ہیروں کے قبضہ سے مختلف ہے جس کے لئے لوگ ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ بلکہ یہ بہت نمایاں طور پر انسانی ہے جس میں سبھی لوگ شریک ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ فطرتاً یہ جنگ کا ایک ذریعہ نہیں ہے۔ اتنا بھی نہیں جتنا ایک معنی میں مذہب کو کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں کلچر کو مذہب اور ـت سے مراد معین کر دیا گیا ہے اور جیسا کہ آپ نے بتایا، لکھنؤ کو لکشمن پور کا نام دینے کا ـسوبہ بنایا جارہا ہے اس طرح کے خاص قسم کے روپ کی نشو و نما کو ہم کلچر کے زمرے ـمیں نہیں رکھ سکتے۔ آپ نے جن موضوعات کو چھوا ہے ان سے ہٹ کر میں کہنا چاہوں گا ہمارے یہاں آج کلچر زیادہ انفرادی حیثیت اختیار کرنے پر مجبور ہوتا جارہا ہے کیونکہ ـضح طور پر منتخب افراد اور مخصوص سیاسی پارٹی نے اسے خود تک محدود کر لیا ہے۔ پیچیدہ ـلئوں کے ادراک کی قدر و قیمت کا اندازہ ہم کہاں لگا رہے ہیں؟ فلسفہ، ادب اور آرٹ کی ـبہت آئیں تو ہیگل نے دعویٰ کیا تھا کہ صرف ایک شخص اس کے فلسفہ کو سمجھتا تھا۔ اور وہ ـاسے نہ سمجھ سکا۔ لیکن پیچیدگی سے کسی قدر سادگی کی طرف واپسی بھی دیکھی جاسکتی شیکسپیئر اور ملٹن کی مکمل اور ہم آہنگ تخلیقات کے بعد برنس (Burns) اور ورڈ کی سادہ شاعری کافی لطف انگیز محسوس ہو سکتی ہے۔ جب ہم سائنس سے متعلق ـرات کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں تو ان نتائج کو زیادہ سادہ اور عام فہم بنانے کا ـتا ہے۔ ادب اور فلسفہ عالمانہ زبان اور تصنع آمیز ابہام سے گزر کر عوام کی ـضح تعبیرات کی سمت بڑھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ٹالسٹائی اپنی غیر ـمر (Homer) اور شیکسپیئر کی مذمت اور اس نظریہ کے پیش کرنے ـہے جو مقبول ہے، ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ ٹالسٹائی کی ـنقد کی جاسکتی ہے۔ اس کی تردید میں رابندر ناتھ ٹیگور کی ـدیا جاسکتا ہے۔ بہر حال آپ نے کلچر کی مختلف، نوع بہ نوع اور ـا ہیں اور انسانی فطرت کے اعلیٰ عناصر کی نشاندہی کی ہے۔۔۔۔ اس شمارے میں وفا راشدی، بلراج کومل اور سرور عالم راز سرور کے مضامین توجہ طلب ہیں!

ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی۔ بھاگلپور

○○○○○○

○ آپ کا اداریہ ''آؤ کلچر سے کھیلیں'' پڑھنے کی توفیق ہوئی اور میں اتنا متاثر ہوا اسقدر متاثر ہوا کہ جی چاہا فوری یہ خط لکھنے کو۔ ہندوستان کے در و دیوار میں سیاست کے بڑھتے ہوئے موٹے موٹے چوہوں نے جگہ جگہ جو بل بنا رکھے ہیں ان سے تہذیب اور انسانیت کا قلعہ مسمار ہونے کے قریب ہے۔ یہ رینگتے ہوئے بم ہمارے کلچر کو تہس نہس کر ہی کر دم لیں گے۔

آپ نے اپنی تحریر میں جن مضر زاویوں پر روشنی ڈالی ہے فی الحقیقت وہی ہماری پسپائی کا باعث ہیں۔ وطن عزیز کا جو درد آپ کے سطور میں پنہاں ہے وہ بیحد محسوس کن ہے۔ بلکہ Red light signal ہے۔ متن کا یہ جملہ مجھے اچھا لگا۔

''۔۔۔۔ سیاسی جماعتوں سے لے کر دیپا مہتا اور شبانہ عظمیٰ تک انڈین کلچر کے ساتھ سب کھلواڑ کر رہے ہیں۔۔۔۔''

دراصل ملک کی ان پرتوں میں جو زمین کی طاقت ہیں ان میں سرائیت کر رہا ہے یہ تیزاب۔ ایسے اداریوں کی انتہائی ضرورت ہے۔ ادب کے حساس نفسیاتی اداریوں میں سے ایک اہم اداریہ ہے آپ کا یہ ایڈی ٹوریل۔

تسنیم فاروقی۔ لکھنؤ

○○○○○○

○ محترمہ امیر النساء کا ''ارض مقدس میں چند روز'' آخری قسط پڑھنے کے بعد میں نے وہ سبھی شمارے یک جا کر لیے ہیں۔ اس نے کچھ وافر متاثر کیا ہے اسے دوبارہ پڑھوں گا۔ زیرِ نظر شمارہ کے مضامین پختہ اور معلوماتی ہیں سرور عالم راز سرور کا ''غزل اس نے چھیڑی'' میں غزل کی کھلی اڑائی گئی ہے۔ دوھایا سہ مصرعی اصناف کے بارے میں جو انہوں نے اظہار خیال کیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ سوال کسی اصناف کا نہیں مفہوم و موضوعات کا ہے۔ اصناف تو فقط وسیلہ ہیں۔ بات کسی زبان میں کی جائے اگر اس میں دم خم ہو تو اپنا تاثر چھوڑے بغیر نہیں رہتی۔

غزلیات میں اکثر روایتی اشعار کی بھرمار ہوتی ہے۔ آخری صفحات میں قمر سنبھلی کی غزل اور نیویارک کی مشاعرہ رپورٹ میں چند اچھے شعر ملے۔ بقیہ تمام مشمولات لائق تحسین ہیں۔ دوھوں کی پسندیدگی کے لیے درد چاپدانوی اور دیگر حضرات کا مشکور ہوں۔

بھگوانداس اعجاز، نئی دہلی

○○○○○○

○ مئی رجون کا انشاء ملا۔ طویل علالت کے بعد کی گرانی اور تساہل نے تقریباً بے عمل بنا دیا تھا اور رابطوں میں پہلے کی سی سرگرمی باقی نہ رہی۔ پھر بھی آپ کی صحافتی کامرانیوں اور فتوحات کی خبریں ادھر اُدھر کے جرائد سے بھی ملتی رہی ہیں۔ خود انشاء نے حلقہ احباب کی مناسب تواضع اور شخصی نکھار کے اضافے کے لئے جو بھی اقدامات کئے اُن کا اوراق جریدہ پر منعکس ہونا قدرتی تھا۔ جو ترقی و کامیابی کی آزمودہ راہ بھی ہے اور کلید رسم و راہ بھی!

اختر ضیائی، لندن

○○○○○○

○ مئی جون کا انشاء مکمل تو نہیں جہاں تک پڑھ سکا ہوں اسی کی روشنی میں اپنے تاثرات پیش کر رہا ہوں۔ گفتنی کے تحت آپ کا اداریہ ''آؤ کلچر سے کھیلیں'' پڑھا۔ کلچر کے تعلق سے جن باتوں پر آپنے زور دیا ہے وہ قابل ستائش ہیں۔

البتہ پورے اداریے سے متفق نہیں ہوں۔ ہاں ان سطور سے صد فیصد متفق ہوں کہ "جدید فیشن میں عریانیت اور فحاشی مغرب کی کورانہ تقلید اور دیسی فلموں کے ذریعہ بھارتی سماج میں داخل ہو کر ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس والے ہندوستانی کلچر کے تحفظ کے لئے اصولی جنگ کرنا چاہیں تو فلم اور ٹیلی ویژن میں عریانیت کے خلاف آواز اٹھائیں اور حسیناؤں کے انتخابات پر بھی پابندی لگوائیں۔ آئیڈیل ہندوستانی مرد اور عورت کا تصور جب تک نہیں بدلے گا انڈیا کا کلچر نہیں سدھرے گا"۔

الیکٹرونک میڈیا میں ٹیلی ویژن سماج پر مکمل طور پر اثر انداز ہو گیا ہے۔ فلموں میں عریانیت تو ہے ہی لیکن ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے اشتہارات ان سے کہیں زیادہ گندے ہوتے ہیں۔ ابتدا میں جو سیریل پیش کیا جاتا رہا وہ صاف ستھرا ہوا کرتا تھا لیکن آہستہ آہستہ اب ان سیریلوں میں عریانیت قدم جمانے لگی ہے۔ اگر اسے روکا نہیں گیا تو دن پر دن مزید عریانیت اپنی جگہ بنائی جائیگی جو معاشرے پر اثر انداز ہوگی۔ ان تمام خرابیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

امیر النساء صاحبہ کا سفر نامہ کتابی صورت میں آرہا ہے یہ خبر باعثِ مسرت ہے۔ جناب بخش لائلپوری کو ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازے جانے پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نیز انکی شریکِ حیات کی صحت یابی کیلئے دعاگو ہوں۔ جناب بخش کی خدمات فروغ اردو کے حوالے سے قابل ستائش ہیں۔ جناب نثار راہی کا افسانہ "وطن کے لوگ" پسند آیا۔ اقبال انصاری کی منی کہانیوں میں میری بستی کے کیس" دل کو چھوتی ہے۔ حمیر ارحمان کی تینوں غزلیں مجموعی طور پر اچھی ہیں البتہ پہلی غزل کے درج ذیل دو اشعار معنوی اعتبار سے اچھے تو ضرور ہیں لیکن ان میں فنی سقم موجود ہے۔

۱۔ سورج میری آنکھوں تک آنے سے پہلے ہی
اپنے اوپر روک لیا ہے اسکی چھاؤں نے
۲۔ فصلیں بونے والے ہاتھ ابھی تک خالی ہیں
دانہ دانہ بانٹ لیا ہے پورے گاؤں نے

سرور عالم راز سرور کا مضمون "غزل اس نے چھیڑی" اچھا مضمون ہے۔ طنز و مزاح کے معروف شاعر حضرت نظر برنی کے شعری مجموعے "گستاخی معاف" پر جناب فیصل صدیقی کا تبصرہ پڑھا۔ نظر صاحب کا یہ قطعہ خاص طور پر پسند آیا

دفاتر کے اناڑی ساتھیو! یہ غور سے سن لو
لیاقت میں رکھا کیا ہے دیانت میں دھرا کیا ہے؟
خوشامد تم کرو ایسی کہ ہر "سی۔ آر" سے پہلے
خود افسر تم سے یہ پوچھے "بتا تیری رضا کیا ہے"

چونکہ سرکاری دفتروں میں کنفیڈنشیل رپورٹ کی خاص اہمیت ہے اسی پر پروموشن ہوتا ہے اس لحاظ سے انکا یہ کہنا کہ سی۔ آر۔ سے پہلے افسر خود پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے بہت خوب ہے۔

جناب مشتاق انجم نے اپنے تبصرے میں لفظ پول کو تذکیر استعمال کیا ہے جبکہ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی نے پول کو تانیث لکھا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ جب مجھے یہ لفظ لکھنے کی ضرورت پیش آئیگی تو میں کیا لکھونگا۔ ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش کا "صحت اور ہومیوپیتھی" کے عنوان کے تحت متواتر شائع ہونے والے مضامین پڑھتا ہوں۔ انکے مضامین سے بیماریوں کی پوری کیفیت سے قارئین کو علم ہو جاتا ہے۔ اب رہی بات ہومیوپیتھی علاج کرانے یا نہ کرانے کی تو یہ اپنی پسند کی بات ہے، مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی عمدہ ہے۔

انجم عظیم آبادی، کلکتہ

OOOOOO

O "انشاء کا شمارہ مئی جون ۲۰۰۰ء باصرہ نواز ہوا۔ کافی دنوں بعد انشاء پڑھنے کو ملا۔ اسلئے بیحد خوشی و مسرت ہوئی۔ صوری و معنوی اعتبار سے "انشاء" کا معیار کافی بلند ہوا ہے۔ پہلے کے مقابلہ میں اب بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ چند کالموں کے اضافہ کے ساتھ ہی متنوع موضوعات پر جامع، معیاری اور معلومات سے بھرپور تخلیقات شائع کی گئی ہیں۔ اداریہ بڑا ہی معنی خیز اور حالاتِ حاضرہ کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔ اس شمارہ میں شامل تمام نثری و شعری تخلیقات عمدہ ہیں خصوصاً امیر النساء کا سفر نامہ بہت پسند آیا۔ انگریزی سے ترجمہ کیا ہوا آپکا مضمون "بنارس اور بیوہ معاشرہ" انتہائی اہم ہے۔ ڈاکٹر الفیہ عبداللہ بخش کا مضمون "صحت اور ہومیوپیتھی" معلوماتی ہے، اسکے علاوہ سرور عالم راز کا مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے، آصف الرحمٰن طارق کا افسانہ "پلنگ" اور ڈاکٹر محمود شیخ کا افسانہ "بھری دوپہر میں آگ" پسند آیا۔ شعری تخلیقات میں صلاح الدین نیر، رزّاق افسر اور واجد سحری کی غزلیں اچھی لگیں۔ "احوال و اخبار" کالم بہت خوب اور معلوماتی ہے۔ تبصرے بہت عمدہ ہیں۔

رفیق احمد، مئو (یوپی)

OOOOOO

O ماہ مئی و جون کا اداریہ بہت خوب رہا۔ ڈاکٹر وفا راشدی صاحب، بلراج کومل صاحب و جابر حسین صاحب کے مضامین معلوماتی اور لائق تحسین ہیں۔ حصۂ منظومات میں رزّاق افسر، رحمٰن ربانی، نامی نادری، شارق عدیل، احمد سعید فیض آبادی، حمیر ارحمان، جلیس نجیب آبادی و محترم عنوان چشتی صاحب کی تخلیقات متاثر کر گئیں۔ افسانے متاثر نہ کر سکے۔ ڈاکٹر اقبال انصاری کی منی کہانیاں اور نثار راہی صاحب کا افسانہ ہی قابل مطالعہ لگا۔!

بدنام بشر۔ پاکور (بہار)

OOOOOO

O مئی، جون کا شمارہ ملا مشمولات پسند آئے۔ آپ کا ترجمہ "بنارس اور بیوہ معاشرہ" بہت اچھا اور بروقت ہے۔ گفتنی "آؤ کلچر سے کھیلیں" کے تحت اٹھائی گئی باتیں بے شمار ہندوستانیوں کے دل کی آواز ہے۔ آصف الرحمٰن طارق کے افسانہ "پلنگ" میں پلنگ مسجد سے لانا غیر مانوس سا لگا کیوں کہ ابتک کھاٹ ہی سنا گیا ہے۔ ویسے کہانی اچھی لگی۔ جناب نثار راہی اور ترنم ریاض نے بہت متاثر کیا۔ آخر میں سرورق کے تعلق سے ایک بات کہ "انشاء انشاء" کی کمپیوٹر پرنٹنگ دور سے دیکھنے میں "نشہ سا لگتا ہے۔ تبدیلی ممکن ہو تو بہتر ہے۔ ویسے انشاء کا مطالعہ نشہ سے کم نہیں ہے۔

شبیر اصغر، ہوڑہ

OOOOOO

O شمارۂ جولائی اگست میں "آپ کی ڈاک" میں "انور شیخ: ادب متنازعہ افکار" سے متعلق قارئین کے خطوط دلچسپ ہیں اور انور شیخ صاحب کے لئے لمحۂ فکریہ بھی۔ "گوشۂ مجروح سلطان پوری" بھرپور ہے۔ مقصود الٰہی شیخ کا افسانہ "لاگے نہ مورا من" حیدر طباطبائی اور انور شیخ کے مضامین بہت اچھے ہیں۔ حصۂ منظومات متاثر کرتا ہے بالخصوص عاصی کاشمیری اور بخش لائلپوری اور ڈاکٹر پنہاں کی تخلیقات۔

رئیس الدین رئیس۔ علی گڑھ

OOOOOO

O مجروح سلطان پوری کا گوشہ بہت اچھا ہے۔ اقبال مہدی اور مقصود الٰہی شیخ کے افسانے۔ نصرت ظہیر کا لکھا ہوا خاکہ "م۔ افضل"۔ حیدر طباطبائی، رؤف خیر اور انور شیخ کے مضامین اچھے لگے۔ نظمیں اور غزلیں تمام اچھی ہیں۔ اتنا

ت پرچہ شائع کرنے پر مبارکباد۔

انوار فیروز۔ راولپنڈی۔ پاکستان

OOOOOO

O میں نے دو ہفتہ پہلے آپ کو ایک خط لکھا تھا۔ اب میں نے
ے حضرت مجروح سلطان پوری کے نام منسوب انشاء کا خاص شمارہ پڑھا ہے۔۔۔
، مجروح صاحب پر آپ کا یہ مضمون، دانش اور نگارش کا ایک عمدہ، معتبر امتزاج
س میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ اس مضمون میں آپ کا اُسلوبِ نقد و نظر،
ت کو outgrow کرتا نظر آتا ہے۔ مبارکباد۔

مامون ایمن۔ نیویارک، امریکہ

OOOOOO

O تازہ شمارہ انشاء نظر سے گذرا۔ آپ کی ذہانت کی داد دوں گا کس
رتی سے آپ نے مقصود الٰہی شیخ اور اقبال مہدی کے افسانے بروقت چھاپے ہیں۔
مہدی کا افسانہ افتخار نسیم اور حماد فریدی جیسے بہت سے لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔
خوب باتیں چل رہی ہیں۔ چلئے یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔

سلیمان اختر (یوپی)

OOOOOO

O اس مرتبہ کے انشاء میں مجروح سلطانپوری پر آپ کا مضمون
ہے۔ آپ نے ان کی شخصیت اور شاعری کا معروضی محاکمہ کیا ہے جو قابلِ تحسین

نامی انصاری، کانپور

OOOOOO

O گوشۂ مجروح سلطانپوری دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اس
یں جناب ثاقب صاحب نے انوار فیروز کی غزل کے مطلع کے ساتھ بہت زیادتی کی
مطلع:

تھا جو دشمن بھلا (نے) لگتا ہے
ہائے کیوں آشنا سا لگتا ہے

مطلع کا مصرع اولاء اس طرح سے ہونا چاہئے تھا۔ ع. تھا جو دشمن بھلا سا لگتا
ہے جیسے کہنہ مشق و استاد شاعر و ادیب کی نظر سے کاتب کی غلطی گذر گئی تعجب

عرفان پربھنوی۔ پربھنی

OOOOOO

O گوشۂ مجروح سلطانپوری دیکھا تو اس بار سب سے پہلے اُسی کو
لوظ ہوا اور اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ مجروح یقیناً ان شاعروں میں سے
جن کا ادبی سرمایہ گو کہ کم ہے لیکن بڑا ہی گرانقدر ہے اور اُن کی ادبی حیثیت کو
تا ہے۔ فلموں میں تو انھوں نے بعض بعض جگہوں پر اپنی غزلیں بھی دیدی
اور سات کی دہائی میں انھوں نے بڑے ہی بامعنی اور بامقصد گیت لکھے جو آج
تے ہوئے بیحد اچھے لگتے ہیں۔ اِدھر آکر زمانے کے مزاج کے اعتبار سے وہ
بھی گیت لکھنے لگے تھے۔ مضمون "مجروح کے چند یادگار گیت" میں ان کے
ن کا خوبصورت احاطہ کیا گیا ہے، وہ بھی کون سا گیت کب لکھا گیا! کس فلم میں
ں اداکار پر فلمایا گیا تھا۔ لیکن جناب افضل اقبال صاحب سے ایک جگہ بھول
۔ گیت "او میرے دل کے چین" "شہزادہ" فلم کا نہیں ہے بلکہ فلم "میرے جیون
ساتھی" کا ہے جس میں آر۔ ڈی۔ برمن کی موسیقی تھی اور اس فلم میں اس وقت کی
سپرہٹ جوڑی راجیش کھنہ اور تنوجہ نے کام کیا تھا۔ گیت راجیش کھنہ پر فلمایا گیا تھا۔

فراق جلال پوری، امیڈ کر نگر (یوپی)

OOOOOO

O انور شیخ معمولی درجہ کے ادیب و شاعر ہیں پھر بھی آپ نے
ان کو انشاء کے صفحات پر جگہ دی۔ کیا اس لئے کہ وہ برطانیہ میں رہتے ہیں؟ آپ نے
تحریر کیا ہے کہ مجروح صاحب یہ بات اونچی آواز میں کہا کرتے تھے کہ وہ ترقی پسند غزل
کے باضابطہ اولین شاعر ہیں۔ شاید یہ ضد مجروح صاحب میں اس لئے پیدا ہوئی کہ اُن کو
نظر انداز کیا گیا تھا۔ مجروح صاحب تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہی ۱۹۴۵ء میں بمبئی
آنے کے بعد ہوئے۔ اس سے پہلے وہ جگر صاحب کے حلقۂ اثر میں رہے۔ مجروح
صاحب نے کبھی اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ وہ کس طرح ترقی پسند غزل کے قائد
ہیں۔ ہاں اگر اُن کو اِس بات پر ناز رہا ہو کہ انھوں نے غزل میں ارضِ ماسکو کو سلام
کرنے کی بات کہی ہے تو یہ اور بات ہے۔

"میری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں"

مجروح صاحب سے بہت پہلے جذبی، مجاز اور فیض ایسی غزلیں کہہ رہے تھے
جنھیں ترقی پسند غزلوں کی نمائندہ غزلیں کہا جاسکتا ہے۔
مجاز کا یہ شعر ؎

"بہت مشکل ہے، دنیا کا سنورنا
تیری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے"

فیض کا پہلا شعری مجموعہ "نقش فریادی" ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا جس میں ایسا
شعر موجود تھا ؎

"دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے"

چودھری محمد نعیم نے ۲۱ جنوری ۱۹۸۴ء میں شکاگو کی ایک ادبی محفل میں مجروح
صاحب کی غزل پر ایک مضمون پڑھا تھا جس میں مجروح صاحب بھی موجود تھے۔ یہ
مضمون "کتاب نما" میں اپریل ۱۹۸۴ء کو شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ مجروح کی ۱۹۴۷ء کی
ایک غزل کا ایک شعر ہے

"گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر ترے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غمِ جانانہ برسوں سے"

کہا جاسکتا ہے کہ اِس شعر میں وہی بات دہرائی گئی ہے جس کو فیض نے چند سال
پیشتر اپنی بیحد مشہور اور عہد آفرین نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ"
میں پیش کیا تھا اور جس کا یہ مصرعہ ضرور مجروح کے ذہن میں گونجا ہوگا ؎

"اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

مجروح صاحب کا ایک بیان "بیسویں صدی" شمارہ فروری ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا
تھا جس میں انہوں نے فیض احمد فیض کے بارے میں لکھا تھا "مجھے کہنے دیجئے کہ ہم ترقی
پسندوں میں سب سے بڑا شاعر نہیں گیا بلکہ ترقی پسندوں کا میر تقی میر چلا گیا" اس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ مجروح بھی اور سب کی طرح فیض احمد فیض کو ترقی پسندوں میں سب سے
بڑا شاعر مانتے تھے۔ یہاں مجروح صاحب نے یہ نہیں کہا کہ ترقی پسندوں میں نظم کا سب
سے بڑا شاعر چلا گیا۔
مجروح صاحب کی غزلوں کا ایک مختصر مجموعہ "غزل" کے نام سے شائع ہوا تھا

...سب سے اپنا تمام تر صلاحیت سمی لیتوں میں صرف کر دی۔ فلموں میں ان کا "یوگ دان" ساحر اور شکیل بدایونی سے کسی طرح کم نہیں۔ جس طرح ساحر کے فلمی نغموں کا مجموعہ "گاتا جائے بنجارہ" شائع ہوا تھا اس طرح مجروح صاحب کے فلمی نغموں کا مجموعہ بھی شائع ہونا چاہیے۔

خلیل تنویر، اودے پور

ooooo

○ "انشاء" کا اپنا ایک خاص امیج ہے۔ اور آپ نے صحافت کی دنیا میں اپنے خاص نمبروں کے ذریعہ تہلکہ مچا رکھا ہے۔ ویسے اس کے عام شمارے بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ ابھی ہم انور شیخ والے شمارے کا لطف ہی لے رہے تھے کہ گوشۂ مجروح والا شمارہ آگیا۔ آپ نے مجروح کو بروقت خراج عقیدت پیش کر کے حق ادا کیا۔

مجروح کا خط بھی فلسفۂ عشق پر روشنی ڈالتا ہے۔ مجروح کا یہ کارنامہ قابلِ داد ہے کہ "غزل بیزاری" کے ترقی پسند رویئے کے باوجود انہوں نے غزل سے اپنا ناتا نہ توڑا۔ بالآخر ترقی پسند بھی غزل کی طرف لوٹ آئے ؎

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل۔

مجروح نے فلمی دنیا کو بھی شعریت سے بھرپور غزلیں دیں۔ ان کے دم سے فلم میں اردو زندہ تھی۔ ان کے اٹھ جانے سے اردو کو سخت دھکا پہنچا۔

انور شیخ کے مضمون میں اردو کے تعلق سے بعض تلخ حقائق کا اظہار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ملکوں کی سیاست پر بھی کھل کر لکھا ہے۔ اسلامی جمہوریہ کے بجائے کوئی صرف "جمہوریہ" پر قانع رہنا چاہتا تھا تو کوئی سوشلزم کو بھی "اسلامی" رنگ دینا چاہتا تھا مگر انہوں نے "شرعی قانون" (قال اللہ و قال رسول اللہ) کو "عربی اقدار" کا جو نام دیا ہے وہ ان کی اپنی "سوچ" ہے اور وہ مشکل سے بدل جائے گی۔ اردو کے ساتھ اسلامی اقدار تو ہمیشہ جڑی رہی ہیں اور جڑی رہیں گی۔ یہ بھی طے ہے۔

رؤف خیر، حیدر آباد

ooooo

○ آپ کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ محترمہ اے۔ امیر النساء کا سفر نامہ اس قدر علمی اور ادبی تھا اور اپنی سادگی، صفائی اور دینی جذبے اور شعور کے توازن سے پُر اثر تھا کہ اس کے مطالعہ کے بعد سمندِ شوق کو اک تازیانہ لگا اور ایک مختصر سفر یروشلم کا دو دوستوں کے ہمراہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

اگر یہ سفر نامہ کتابی شکل میں آرہا ہو تو ایک نسخہ بھجوا دیجئے۔ جو بھی رقم ہو گی علیحدہ ارسال کر دوں گا۔ نیز مصنفہ کی خدمت میں ہدیہ تحسین پیش کریں۔ میرے ایک دوست جو ہمسفر تھے اس سفر کے حوالے سے ایک مضمون رقم فرما رہے ہیں۔ انشاء اللہ تکمیل کے بعد روانہ کیا جائے گا۔

اے۔ آر۔ انصاری، مانچسٹر (برطانیہ)

ooooo

○ پچھلا شمارہ انور شیخ کو نذر کر کے آپ نے ایک منفرد شخصیت سے روشناس کرادیا جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انشاء کا تازہ شمارہ زیرِ نظر ہے۔ "گوشۂ مجروح سلطان پوری" چھاپ کر آپ نے مجروح کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اقبال مہدی کا افسانہ "تمہیں کیا کہہ کے مخاطب کروں" اور مقصود الٰہی شیخ کا افسانہ "لاگے نہ مورا من" بہت عمدہ ہیں۔ شعری تخلیقات صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے بھرپور ہیں جن میں مجروح سلطان پوری کی منتخب غزلیں 'مبارک نسیم'

...چند ... ہیں۔

الف۔ ناظم، پہلی بھیت (...)

ooooo

○ جولائی، اگست کے شمارے میں انور شیخ کا "اردو آئینہ ادب" جیسا غیر حقیقی مضمون شائع ہوا ہے۔ غلامانہ ذہنیت اور انحطاطی بصیرت کا ... نہایت عبرت انگیز نثری مرثیہ ہے۔ جس کا احساس خود مریض کو بھی نہیں ہے۔ ... کسی مستند ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہئے۔ یہاں ہم صرف انہی اعتراضات پر ... کریں گے جن کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں 'اردو کسی قوم کی نہیں مذہب کی زبان ہے۔ ذرا وہ یہ بتائیں کہ میر تقی میر، غالب، اقبال، فیض، فراق، پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اور راجندر سنگھ بیدی کا مذہب کیا ہے؟ جناب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "اردو مقامی روایات و جذبات کی آئینہ دار نہیں بلکہ عربی اور ... اقدار کی عکاس ہے"۔ کیا ہم اس اعتراض کو پریم چند کے ناول، گئودان، مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان، سجاد ظہیر کے ناولٹ 'لندن کی ایک رات'، کرشن چندر کے 'شکست' اور بیدی کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' پر منطبق کر سکتے ہیں؟ تیسری شکایت ملاحظہ فرمائیں "اردو کی لسانی خاصیتیں بھی عرب و ایران سے مستعار ہیں" جہاں لسانی خصوصیات کا سوال ہے مصنف کو چاہئے کہ انگریزی زبان و ادب کا مطالعہ کرے۔ بتائے کہ انگریزی زبان میں، عربی، فارسی، عبرانی اور یونانی زبان کے کتنے الفاظ مستعار لئے گئے ہیں اور وہ یہ بھی بتائیں کہ او ہنری، الیگزنڈر ڈوما، اور رائڈر ہیگرڈ جیسے بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب مقامی لب و لہجہ پر داستانویت کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

ایک روز مارک ٹوئن نیویارک کی سڑکوں پر کھڑا اونچی اونچی عمارتوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ایک شخص نے دریافت کیا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے جواب دیا "اپنے پاؤں کے نیچے زمین تلاش کر رہا ہوں"۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ آریائی قوم کا تعلق وسطِ ایشیاء سے ہے۔ جرمن قوم سنٹرل ایشیا سے ہزاروں میل کی دوری پر آباد ہے لیکن ہٹلر، خود کو آریہ کہتا تھا۔ کیوں؟ اقبال نے 'برہمن زادہ' 'مرید ہندی' کی اصطلاح کیوں ایجاد کی؟ اس شعر کا خالق کون ہے، ہندوستانی، عربی، یا ایرانی؟

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو، مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ 'اردو وطن کشی کی زبان بن چکی ہے اور یہی اسکی روح ہے۔ کیا اس مفروضے کا اطلاق، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کی زبان پر بھی کیا جا سکتا ہے؟ آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ میں زبان کے کیا مسائل ہیں۔ ان ممالک کے نام بتائیے جہاں زبان وطن کشی کا سبب بنی تھی؟ تاریخ میں زبان کی خاطر کتنی جنگیں ہوئیں؟ کتنے ملک تقسیم ہوئے؟ مہاتما بدھ نے 'سنسکرت' کے مقابلے درس و تبلیغ کے لئے 'پراکرت' ہی کو کیوں چنا تھا؟ آپ فرماتے ہیں، جس دن پنجاب نے اردو سے آنکھ پھیر لیں، زبان کی ارتھی اٹھ جائیگی۔ اس جملے کو اگر ہم یوں پڑھیں تو کیسا رہے گا 'جس دن ہندوستان اور پاکستان نے انگریزی یا امریکہ سے آنکھیں پھیر لیں، زبان کی ارتھی اٹھ جائیگی۔' آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ آپ نے ابھی تک کتنی زبانوں کو کاندھا دیا ہے؟ کیا آپ اس زبان کی ارتھی کو کاندھا دینے پنجاب تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ پانچویں شکایت مصنف کی ذہنی پسماندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ بھارت میں اردو زبان بٹوارے کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ اس کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے۔ پنڈت آنند نارائن ملا نے فرمایا تھا! "میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا!" رہی بات جذبۂ قومیت سے پیدا ہونے والی حقارت کی۔۔۔۔ تو اس کا جواب ہندوستان میں رائج 'ورد...

سما نکہ ۱۱اس رہیں۔ بقیہ مضمون لائق اعتناء نہیں ہے۔ لہٰذا خاموشی بہتر ہے۔ پھر
تنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ احساسِ کمتری کا شکار افراد ہندوستان کی غربت وافلاس اور
سی اقدار کو اپنا نشانہ بنا کر دیارِ غیر میں سرخروئی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ امریکہ اور
یوپ کی اخلاقی پستی انہیں دکھائی ہی نہیں دیتی۔ جناب انور شیخ کو معلوم ہونا چاہئے کہ
یکہ میں ورجن لڑکیوں کو کنوارپن برقرار رکھنے کے لئے اسکالرشپ دی جارہی
ہے۔۔۔

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

ڈاکٹر محمود شیخ۔جبلپور

OOOOOO

O انشاء کا جولائی اگست کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ

اس شمارے میں مراسلوں کے حصے میں انور شیخ کے خیالات کے حوالے سے
یسے خطوط شائع ہوئے ہیں جن سے چند نام نہاد مسلمانوں کے فکری زوال اور ذہنی
ل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے مجھے انور شیخ والا شمارہ نہیں ملا لہٰذا میں اُن کے
ے میں کسی مثبت یا منفی ردِعمل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ البتہ اُن کے بارے
چند مراسلے پڑھ کر یہ خط لکھنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔

انور شیخ کے خیالات بھلے سے کچھ بھی ہوں انہیں اپنے جذبات کے اظہار کا
ق حاصل ہے۔ البتہ اگر وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام یا اس سے وابستہ بنیادی
ردد کریں تو اُن پر مناسب برہمی کو برملا ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اب ان خطوط کا لب د
ان میں چھپے ہوئے ناخواندہ اور جاہل مسلمانوں کی جہالت ملاحظہ فرمایئے۔

ایک اخبار کا سابق مدیر لکھتا ہے کہ انور شیخ کو چاہئے تھا کہ اسلام سے ابتدا کرنے
لس اس سے بھی پرانے مذہبوں کی خرابیاں بے نقاب کرتے۔ اس قسم کی ذہنیت کو
یب اور شائستگی کے کس خانے میں رکھا جائے جہاں ہم اپنے گریبان میں جھانکنے کے
سروں کے کپڑے پھاڑنے کا درس دیتے ہیں۔ رئیس الدین فریدی نے "روزانہ
نے ادارتی دور میں اردو صحافت کو کیا کیا دین عطا کی ہوگی اس خط سے اُس کی کسی
ہو جاتی ہے۔ یہ محض اُن کے جذبات کا کھوکھلا پن ہے اور کچھ نہیں۔

کی ایک مسجد کے امام نے انور شیخ کو اُمتِ مسلمہ میں نفاق پھیلانے کی
الزام دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام جیسے انسان نواز اور اتحاد کے
ب کو خانوں میں تقسیم کرنے والے بھی مسجدوں کے امام اور ملا ہوتے ہیں
اقبال نے کہا تھا ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

اور کسی اختر حسین نے تحریر فرمایا ہے۔ اختر حسین اگرچہ مولوی نہیں لگتے
مولوی گنج میں ضرور رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مُراسلے میں یاوہ گوئی اور
ی ساری حدود کو روندا ہے۔ تسلیمہ نسرین کا ناول "لجا (شرم) جب میں نے
افسانوی اسلوب میں بی جے پی کے کسی پمفلٹ کا Reproduction لگا۔
کتاب کو اپنے ذاتی کتب خانے میں رکھنے کے قابل نہیں سمجھا اور اسے ردّی
لیکن ایک خاتون کو انتہائی بے ہودہ لہجے میں "کوڑے دان میں پڑی فاحشہ"
یاد کرنا فکری فحاشی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کیا اختر حسین اُس کوٹھے پر
اں انہوں نے نسرین کو دیکھا تھا؟ اسی طرح انور شیخ کو گھٹیا شاعر کہنا بھی ایک
خاص کر جو مولوی گنج میں رہتا ہو، کسی صورت میں زیب نہیں دیتا۔

ع تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

اقبال کے حوالے سے ایک مراسلہ نگار رام پرکاش کپور نے تجویز پیش کی ہے
کہ اس ضمن میں جگن ناتھ آزاد سے رجوع کیا جائے۔ آزاد کے بارے میں میری یہی
رائے ہے کہ انہوں نے اقبال کے [illegible] اردو زبان میں جو خرافات بک چکی ہے غالباً کسی
اقبال شناس نے اس طرح سے اقبال کا استحصال نہیں کیا ہوگا۔ میں نے اس سلسلے میں
"اقبال اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر" نامی اپنی کتاب میں آزاد کی اُن تاریخی غلط بیانیوں کی
واضح طور پر نشاندہی کی ہے جن کا وہ تین سال سے کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں!

انور شیخ ہی کے حوالے سے یہ بھی کہوں گا کہ انہوں نے زیرِ بحث شمارے میں
اُردو زبان پر جو تلخ و ترش مقالہ لکھا ہے غالباً چند اُردو نواز امام۔ ملا اور خطیب اُس پر بھی
اُنہیں حکمِ کفر دیں گے۔ انور شیخ نے اردو کے حوالے سے بے حد صاف گوئی سے کام لیا
ہے۔ اردو کو جس طرح سے مسلمانوں کی زبان بنا کر پیش کیا گیا وہی اردو کے زوال کا باعث
بن سکتا ہے۔

ہمارے کشمیر میں بھی اردو کو اس غرض سے سرکاری زبان جاری رکھنے کا فیصلہ
کیا گیا کیونکہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جبکہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں ہماری
اپنی زبان کشمیری کو طاقِ نسیاں میں ڈال کر اردو کو ہمارے سروں پر سوار کیا گیا ہے اور جلد
یا بدیر اسے ان سروں سے اترنا ہوگا۔

غلام نبی خیالؔ، ۱۵، راول پورہ ہاؤسنگ کالونی، سری نگر-۱۹۰۰۰۵ (کشمیر)

OOOOOO

O لیجئے انور شیخ کے ایک موسیرے بھائی (نصر ملک) اور نکل آئے
جو رقم طراز ہیں کہ "اقبال کو محض اقبال۔ انسان۔ رہنے دیا جائے اسے فرشتہ نہ بنایا
جائے" انشاء جولائی اگست ۲۰۰۰ء صفحہ ۹ لائن ۳)۔ اس سے پہلے وہ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے
حوالے سے لکھ چکے ہیں کہ "اقبال کے انسان ہونے اور انسان کے خطا و نسیاں کا مرکب
ہونے کے ضمن میں (تحقیق) کی کوشش کرنی چاہئے" وہ بھی توڑ مروڑ کر کیونکہ ڈاکٹر سید
یحییٰ نشیط نے صرف یہ لکھا ہے کہ "اقبال کوئی فرشتہ نہیں تھے کہ ساری کمزوریوں سے بالا
تر ہوں۔ وہ ایک انسان تھے اور انسان خطا و نسیاں کا مرکب ہوتا ہے لیکن یہ شیطانی عمل
ہے کہ اسکی اچھائیوں کو برائیوں کے زمرے میں ڈال کر پیش کرے۔ انور شیخ نے اقبال
کے تعلق سے یہی عمل کیا ہے" (انشاء مارچ اپریل ۲۰۰۰ء ص۔ ۱۲۱ کے آخری پیرا میں)
مگر نصر ملک صاحب نے ہدایت دی ہے کہ "علامہ اقبال کو فرشتہ نہ بنایا جائے" آج تک
کسی نے علامہ اقبال کو فرشتہ نہیں کہا اور نہ لکھا۔

اس کے بعد محترم لکھتے ہیں کہ "اقبال اور احمدیت ایک متنازعہ فیہ معاملہ ہے"۔
انہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ معاملہ مدتِ مدید ہوئے دفن ہو چکا ہے۔ نصر ملک صاحب پھر
سے ابھارنے اور بحث کرانے پر بضد ہیں کیونکہ ان کے دل میں چور یعنی شک ہے اور دنیا
میں شک کا کوئی علاج نہیں ہے۔

موصوف کا سوال ہے کہ "اقبال کو اگر احمدیت سے کوئی انس۔ ربط و تعلق نہیں
تھا اور اگر اقبال واقعی احمدیت سے بیزار تھے تو انھوں نے اپنے نورِ چشم جاوید۔ اپنی دختر
منیرہ کی پرورش کے لئے اپنے خاندان کے سبھی عبادت گزاروں پر اپنے ایک احمدی رشتہ
دار کو فضیلت کیوں دی؟"

سوال موصوف کی لاعلمی ظاہر کرتا ہے کیونکہ علامہ اقبال نے اپنے وصیت
نامے کے ذریعہ چار اشخاص کی ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی کے ذریعہ انکے بچوں کی
پرورش کی گئی تھی۔ کسی فردِ واحد کے ذریعہ نہیں۔ کمیٹی میں جن لوگوں کو نامزد کیا گیا تھا
ان کے ناموں کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:

۲۔ شیخ اعجاز احمد۔ سب جج۔ برادرزادہ من مقر۔
۳۔ چودھری محمد حسین۔ ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور۔
۴۔ منشی طاہر الدین۔

جس میں کثرت رائے سے کام کرنے کی واضح ہدایت تھی اور ہے۔ رائے مساوی نہ ہونے پر صدر انجمن حمایتِ اسلام۔ لاہور کی رائے پر عمل کرنے کی ہدایت بھی شامل تھی۔ منشی طاہر الدین پر خاص اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ (وصیت نامہ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

موصوف کا یہ کہنا کہ "اقبال اور احمدیت پر تحقیق کی ضرورت ہے" کچھ لاجیکل نہیں لگتا کیونکہ یہ مانگ منافقانہ ہے اور منافق کی بات ارشادِ محمدی کے مطابق ماننا ضروری نہیں۔ اس قسم کی باتیں اسلامی اتحاد میں دراڑ اور انتشار پیدا کراتی ہیں جو غیر مسلموں کا رویہ ہے۔ ایسی ذہنیت دلائل کو نہیں مانتی کیونکہ ان میں ایمان کی کرن نہیں ہوتی۔ علامہ نے ۱۲/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اپنے عقائد دینی کے بارے میں خود تحریر فرمایا ہے کہ "میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقایدِ دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہوں (اقبال نمبر ۱۹۷۷ء ص۔ ۱۲۸) آگے چل کر فرماتے ہیں "باقی دینی معاملے میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں، بغرض جزوی مسائل کے سوا جو ارکانِ دین میں سے نہیں، سلف سالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے۔۔۔ اس بدقسمت ملک ہندوستان میں علماء نے جو دینی عقائد کے لئے فرقے مخصوص کر دیئے ہیں ان سے احتراز کرے (جاوید کے لئے)۔ بعض فرقوں کی طرف لوگ محض اس واسطے مائل ہو جاتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے دینوی فائدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ بڑا بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کر دے۔ غرض یہ ہے کہ طریقۂ حضراتِ اہلِ سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہئے اور آئمہ اہلِ بیعت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہئے (ص ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۷/ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

المختصر ؎
دوستوں سے اس قدر صدمہ ہوا
دشمنوں کے سب گلے جاتے رہے

اکرام فتحپوری
۱۴۱، یوسف زئی، فتحپور، یوپی-۲۱۲۶۰۱

OOOOOO

O تازہ انشاء بھی مل گیا اور اس سے پہلے والا بھی۔ آپ بھی خوب لاتے ہیں۔ نیاز فتحپوری کی شیر دانی کا استر دکھایا اور اب انور شیخ صاحب کے بخیے اُدھیڑے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط کو میری طرف سے مبارکباد دیجئے۔ اُن کا ایک ایک وار بڑا بھرپور ہے۔ آپ نے دوستی کا اور کچھ حضرات نے شیخ جی کے "بڑے پن" کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ اور رعایت میں کاہے کی مزے داری۔

شکیل گوالیاری۔ لوہا گڑھ۔ لشکر۔ (گوالیار)

OOOOOO

O انشاء کی تخلیقات نظم و نثر کا مزاج اور معیار الگ، منفرد اور مفید ہوتے ہیں۔ یہ قارئین کے دل و دماغ اور روح کو روشنی، گرمی اور تحریک عطا کرتے ہیں۔ عصری حسیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ مبارکباد۔ شمارہ کے مطالعے کے بعد یہ تاثر آپ کو تحریر کر رہا ہوں براہ کرم توجہ فرمائیں کہ جولائی اگست کے شمارے میں شائع میرے مکتوب (مضمون) "تشنگی و سیرابی" میں پروف ریڈنگ کی چند اغلاط شائع ہو گئی ہیں۔ برائے مہربانی صحیح فرمائیں۔۔۔ (۱) صفحہ ۱۲۔ کالم ۲۔ سطر ۵ میں۔۔۔ "روح کی ۔۔۔ سے طویل تر ہے"۔۔۔ کو اِس طرح کر لیں کہ۔۔۔ "روح کی عمر جسم کی ۔۔۔ ہے۔ (۲) صفحہ ۱۳۔ کالم ایک۔ سطر ۲۷ میں "سنت" کو "سُنت" کر لیں۔ آ ۔۔۔ پڑھیں۔ (۳) صفحہ ۱۴۔ کالم ایک۔ سطر ۲۶ میں۔۔۔ "طبعی قوت اور حاد ۔۔۔ "طبعی موت اور حادثاتی موت" کو "طبعی موت اور حادثاتی موت" کر لیں۔

اسرار اکبر آ

OOOOOO

O آپ نے انور شیخ صاحب پر انشاء کا خصوصی شمارہ ۔۔۔ ادبی حلقوں سے زیادہ مذہبی حلقے میں ہلچل پیدا کر دی ہے۔ انور شیخ صاحب ۔۔۔ تخلیقات اور افسانوں میں تو کوئی جان نہیں ہے البتہ انکا مطالعہ بہت وسیع ہے ۔۔۔ رویے سے موصوف نے شہرت حاصل کرنے کا آسان طریقہ اختیار کیا ہے ۔۔۔ بھی شخصیت اور کوئی بھی انسانی عمل غیر متنازعہ نہیں ہے بلکہ انسانی کیا رحمانی ۔۔۔ متنازعہ ہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ انسانی فلاح و بہبود کے لئے کون سی باتیں ۔۔۔ ہیں اور ہمارے کس رویئے سے اسے مزید تقویت پہنچ سکتی ہے؟ مذہب اور خدا ۔۔۔ شک کرنا اور اسکے نقائص نکالنا میری ناقص فہم سے دنیا کا سب سے آسان کام ۔۔۔ لئے کسی بڑے مطالعے یا غور و خوض کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بہر حال خیال ا ۔۔۔

طہور منصوری نگاہ، پوسٹ بکس-۳۰، ریوا

OOOOOO

O انشاء کے مارچ و اپریل ۲۰۰۰ء شمارہ نمبر ۳۔ ۴ میں مضمون "اقبال کا نظریۂ عقل و عشق" اس بات کا غماز ہے کہ انھیں اسلام اور ق ۔۔۔ کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ انور شیخ نے اقبال کے عشق اور کلام اقبال کے وسیلے سے ضرب کاری کی ناتمام کوشش کی ہے۔ یہ عقل پرستی ہے جو انھیں صراط مستقیم ۔۔۔ کئے ہے یا پھر عارضی شہرت اور حصولِ زر کے چکر میں گردش کر رہے ہیں۔ انور ۔۔۔ کو عاقل اور فلسفی سمجھتے ہیں لیکن وہ فلسفۂ عشق ہی سے نابلد ہیں۔

انھیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ عقل اور عشق میں کیا فرق ہے۔ عقل ۔۔۔ چیز کو سمجھا جاتا و پرکھا جاتا ہے حاصل نہیں کیا جا سکتا اور عشق سے حاصل کیا جاتا۔ ۔۔۔ کام کو انجام تک پہنچانے کے لئے دلی جذبے کا ہونا ضروری ہے۔ خود انور شیخ کی اد ۔۔۔ بھی دلی امنگ سے تعلق ہے۔ عقل کا فکر سے رشتہ ہے اور عشق کا منزل سے۔ ا ۔۔۔ اقبال نے عقل پر عشق کو ترجیح دی ہے۔ اقبال فلسفۂ عشق سے واقف تھے۔ اسی و ۔۔۔ اقبال کا کلام جذباتی اور پراثر ہے۔ جو شاعری جذبات سے خالی ہو گی وہ پا ۔۔۔ کر سکتی۔ اور نہ فن پارہ ہو سکتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں آج تک جتنے ۔۔۔ معرکے سر ہوئے ہیں خواہ مذہبی ہوں یا سیاسی، جذبات کے زیرِ اثر ہوئے ایں ۔۔۔ جذبات کا دل سے تعلق ہوتا ہے۔ اسی جذبے کو عشق کہتے ہیں اور یہی شعلہ ۔۔۔ جاتا ہے تو دل کی موت ہو جاتی ہے۔ اس لئے اقبال نے کہا ہے ؎

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشۂ نظر کا فساد

فلسفی سے اقبال کو لگاؤ اس لئے نہیں ہے کہ وہ صرف فکر میں غرق ہو کر رہتا ہے اور ملا کی فکر و نظر میں باہمی تضاد رہتا ہے۔ عشق عقل پر غالب ۔۔۔ عقل کو ختم کر کے عاشق کو جنون کی حد میں داخل کر دیتا ہے۔ جو عاشق ۔۔۔ باحواس ہوتے ہیں وہ سالک کہلاتے ہیں اور جو عشق میں بے خود ہو جاتے ہیں مجذ ۔۔۔ کہلاتے ہیں۔ مجذوب کبھی بدحواسی میں شریعت سے ہٹ کر چلنے لگتے ہیں۔ اسی وجہ

صوفی ہوں یا رشی منی، شاعر ہوں یا ادیب، مفکر ہوں یا فلسفی، اگر ان کے قول و فعل قرآن کے خلاف ہیں تو ان لوگوں کے قول و فعل کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ انسانی فکر اور قرآن کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا کے کسی بھی خطہ کے فلسفی کے نظریات اگر قرآن کے خلاف ہیں تو اسلام میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ قرآن کی روشنی میں خدا تو احد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ وہ نور ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ کائنات کا خالق ہے، کائنات اس کی تخلیق ہے، کائنات فانی ہے، بقا صرف خدا کو ہے۔ انور شیخ نے اپنے مفروضہ میں فلسفیوں و اہل یونان کے نظریات و عقائد اور اصفیاء کے اصولوں کو اقبال اور صوفیوں سے منسوب کیا ہے جو بے بنیاد ہے۔ نہ ایسے عقیدے و نظریات صوفی مسلک میں ملتے ہیں نہ اقبال کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ انور شیخ نے مضمون کو گنجلک اور پیچیدہ بنا کر قاری کے ذہن کو الجھا کر گمراہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ انور شیخ نے اپنے تعارف نامے میں جو انشاء مارچ و اپریل ۲۰۰۰ء شمارہ نمبر ۳۔ ۴ میں ہے اپنا مذہب انسانیت بتایا ہے۔ میں پوچھتا ہوں لفظ انسانیت انور شیخ کے ذہن میں کہاں سے آیا۔ انسانیت کا لفظ انھیں کہاں سے ملا۔ کیا بعثت نبوی سے قبل انسانیت نام کی کوئی چیز موجود تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت کا شیرازہ اس طرح بکھرا تھا کہ کہیں بھی انسانیت کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ یوں تو بہت سے مفکر و فلسفی آتے رہے اور آسمانی کتابوں اور صحیفوں کا نزول بھی ہوتا رہا۔ اور وہ کتابیں بھی موجود تھیں جن کا اثر بقول انور شیخ ہندوستان سے لے کر یونان کے فلسفیوں تک پر حاوی تھا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی انسانیت کی شکل مکمل نہ ہو سکی۔ انسانیت تو بڑی بات ہے خود اپنے آپ کو انسان نہ سمجھ سکے۔ اشرف المخلوق ہوتے ہوئے بھی اپنے کو جانور سے ابتر سمجھتے تھے۔ نہ طہارت کے اصول ہی معلوم تھے نہ ناپاکی کا خیال تھا نہ حلال و حرام کی تمیز تھی۔ یہ اعجاز اسلام اور قرآن کا ہے کہ پیغمبر اسلام درس دے کر ساری دنیا کو حلقۂ انسانیت میں لے آئے۔ اس لئے میری انور شیخ سے یہی گذارش ہے کہ وہ اسلام کو قرآن کی اور قرآن کو حدیث نبوی کی روشنی سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ ھدایت دے گا اور ایمان کی روشنی ملے گی۔

نظیر سلمانی، ۲۶، یوسف زئی، فتحپور (یوپی)

ooooooo

○ ''انشاء'' کا ''انور شیخ: ادب و متنازعہ افکار'' نمبر زیر مطالعہ آیا۔ آپ نے ''گفتنی'' میں ''یہ شمارہ'' کے عنوان سے لکھا ہے ''(انور شیخ۔ ادب و متنازعہ افکار) انشاء کا ایک اہم شمارہ ہے جس کا مجموعی تاثر ستائشی شمارے کے بجائے ایک ''اینٹی نمبر'' کا ہوگا۔ جب آپ کو یہ احساس پہلے ہی سے تھا کہ یہ نمبر ''اینٹی نمبر'' کہلائے گا تو پھر آپ نے یہ نمبر نکالا ہی کیوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ صحافت بے باک، نڈر اور بے لاگ ہوا کرتی ہے۔ اسے نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ وہ کسی کے دباؤ میں آسکتی ہے۔ حالانکہ اس شمارے میں آپ نے ''انور شیخ کے متنازع افکار'' کے عنوان سے اپنی بے باکی اور بے خوفی کا ثبوت ضرور فراہم کیا ہے مگر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اس شمارے میں اپنے مضمون ''انور شیخ کی کتاب 'ابدیت''' میں انور شیخ کی جو کھنچائی کی ہے وہ آپ نہیں کر سکے۔ آپ اپنے اداریئے کے دوسرے پیراگراف میں رقمطراز ہیں ''انور شیخ کی فلسفیانہ تحریروں پر ابتک کسی نے کچھ لکھنے کی نہیں ٹھانی۔ شیخ ایک لامذہب آدمی ہیں مگر ان کی بیشتر تحریریں مذہب سے سروکار رکھتی ہیں۔ وہ برسوں سے ہندوستان کی تقسیم اور شاعر مشرق علامہ کے افکار کے خلاف خامہ فرسائی کرتے آرہے ہیں۔ در پردہ انہوں نے اسلامی عقائد و معاملات پر شب خون مارا ہے۔ ان کے خلاف بہت پہلے ایک فتویٰ صادر ہو چکا ہے لیکن بقول شیخ ان کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ حال میں بعض اردو اخبارات نے شیخ کی تحریروں کے خلاف نمایاں خبریں شائع کی ہیں۔ ایک مسلم ہندی ہفت روزہ نے صفحۂ اول پر اشتعال انگیز سرخی لگا کر مسلمانوں سے سوال کیا ہے کہ وہ اس دوسرے سلمان رشدی کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ حالانکہ یہ کام خود اس اخبار کو کرنا چاہئے تھا لیکن شیخ کے افکار کے رد میں اس نے کسی معتبر صاحبِ قلم کا کوئی مضمون شائع نہیں کیا۔ دراصل ہمارا پریس بعض معاملات میں جلد باز تو واقع ہوا ہے لیکن اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھتا ہے۔ پریس کا کام لوگوں کو صرف باخبر کرنا نہیں بلکہ انہیں Educate کرنا بھی ہے''۔۔۔ کسی نے نہیں ٹھانی مگر آپ نے تو چند معتبر اور مستند قلمکاروں سے انور شیخ کی تحریروں پر لکھوالیا اور خود بھی تو لکھا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ان کی بکواس تحریر (ابدیت) کا جواب مدلل اور دندان شکن دیا ہے۔ پڑھنے کے بعد شیخ کے ہوش اڑ جائیں گے اور اگر انکے ہوش اڑیں نہیں تو ٹھکانے ضرور لگ جائیں گے۔ ''شیخ لامذہب آدمی ہیں'' آپ نے لکھا ہے اور خود شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ''میرا مذہب انسانیت ہے''۔ کوئی بتائے جو لامذہب ہے اسے یہ حق کس نے دیا کہ وہ دوسروں کے مذاہب میں کیڑے نکالے، اپنی لایعنی باتوں سے دوسرے مذاہب کے لوگوں کی کھلی دل آزاری کرے یا مجھے بذاتِ خود انور شیخ بتائیں کہ انکا مذہب انسانیت انہیں یہ نہیں بتاتا ہے کہ مذہب اسلام آفاقی مذہب ہے اور قرآن مقدس آسمانی کتاب ہے جسکا تخلیق کار خدائے لم یزل ہے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول اور محبوب ہیں۔ خدائی کتاب یا رسولؐ کی ذاتِ مقدس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانا گناہ ہے۔ کیا انور شیخ کا مذہب (انسانیت) یہ نہیں بتاتا ہے کہ خدا نے ساری کائنات رسولؐ کے صدقے میں تخلیق کی ہے۔ اگر رسول کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو خدا دنیا کی کوئی شے نہیں بناتا۔ پھر انکا مذہب (انسانیت) کہاں سے آتا۔ انور شیخ یہ بھی بتائیں کہ کیا مذہبِ اسلام انسانیت کا حامل نہیں ہے؟ کیا مذہبِ اسلام یہ نہیں بتاتا کہ خدا کے بندوں سے محبت و اخلاص سے پیش آنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے؟ کیا انور شیخ یہ نہیں جانتے کہ قرآنِ مقدس ضابطۂ حیات ہے اور رسولؐ کی ساری زندگی نمونۂ قرآن مجید ہے۔ پھر انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ خدا اور رسولؐ سے متعلق متنازعہ اور دل کو شاق گزرنے والی باتیں کہیں؟ آپ کا (جناب ف۔ س۔ اعجاز) ایک جملہ بڑا عجیب و غریب ہے اور وہ یہ ہے ''در پردہ انہوں نے (انور شیخ نے) اسلامی عقائد و معاملات پر شب خون مارا ہے'' آپ بھی مسلمان ہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان سے اچھی طرح واقف ہیں پھر آپ نے انور شیخ پر گوشہ یا انور شیخ نمبر کیوں نکالا جبکہ اردو ادب میں ان کی پہچان نہیں ہے۔ ایسے شخص جسکے ذہن و دل میں مذاہب کے تئیں غلاظت بھری ہو اس پر نمبر نکالنا وہ چاہے ''اینٹی نمبر'' ہی کیوں نہ ہو اچھی بات نہیں ہے۔

انور شیخ ''میرا تعارف'' میں لکھتے ہیں کہ ''بعض لوگ مجھ پر اسلام دشمنی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ انکا یہ رویہ مناسب نہیں ہے میرا مذہب انسانیت ہے اسلئے جو دین یا دھرم توہم پرستی سکھاتا ہو میں اس پر عقلی نظر ضرور ڈالتا ہوں شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جسکا میں نے تنقیدی جائزہ نہ لیا ہو۔ یہ انسانیت دوستی کا تقاضہ ہے اور اس سے مراد مذہب آزاری نہیں''۔ حالانکہ انور شیخ کو اپنی ذات پر عقلی نظر ڈال کر تنقیدی جائزہ لینے کی زیادہ ضرورت ہے۔ انور شیخ کا مذہب (انسانیت) بھی عجیب مذہب ہے۔ وہ موصوف کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ دوسرے کے مذاہب کا تنقیدی جائزہ لیں اور اپنی ذات پر کوئی نظر ہی نہ ڈالیں۔ موصوف اگر اپنی ذات پر اپنی عقلی نظر ڈالکر تنقیدی جائزہ لیں تو مجھے یقین ہے دوسرے مذاہب خاص طور سے مذہبِ اسلام کا تنقیدی جائزہ لینا ہمیشہ کے لئے بھول جائینگے۔ ویسے موصوف کو چاہئے کہ کبھی کبھی تعریفی جائزہ بھی لے لیا کریں تاکہ انکے ذہن و دل کی آلائش دھل سکے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب سے آپ نے ''ابدیت'' پر مضمون لکھوا کر کارِ نیک انجام دیا ہے۔ انہوں نے الحاد کو خوب خوب آئینہ دکھایا ہے اور انور شیخ کے اس غرور

دیتا ہوں۔

شمس افتخاری،شیب پور، ہوڑہ

OOOOOO

○ "انور شیخ ادب و متنازعہ افکار" واقعی اہم اور رونگٹے کھڑے کرنے والا شمارہ ہے۔ آپ کا مضمون پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جناب انور شیخ کی سوچ سب سے الگ اور اہم ہے۔ اُن کے خیالات سے ضروری نہیں کہ ہم سب متفق ہوں۔ مگر ہندوستان کی تقسیم اور برِ صغیر میں امن و شانتی کا پچھلے پچاس سالوں میں نہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ پاکستان۔ ہندوستان اور بنگلہ دیش کو ماضی کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملکر اور محبت اور خلوص کے ساتھ بغیر کسی مذہب۔ زبان۔ قوم کے فرق کے رہنا چاہئے۔ ایک لمحے کی غلطی نے صدیوں کی سزا دی ہے۔ 'اسلام' اور 'اسلامی ملک' یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اسلام تو آج انگلینڈ۔ امریکہ۔ چین۔ ہندوستان میں موجود ہے حالانکہ یہ اسلامی ملک نہیں ہیں۔ اور اسلامی ملک بھی آپس میں کہاں تک امن سے رہ رہے ہیں آپ کو ایران۔ عراق۔ سعودی عرب۔ افغانستان۔ ترکی وغیرہ کے حالات سب پتا ہیں۔ خیر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے جناب انور شیخ جیسی شخصیت کو اپنے رسالہ کا موضوع بنایا۔

جگدیش چندر بترہ "سرائیکی" سینیئر ایڈوکیٹ، سپریم کورٹ آف انڈیا،
جیون وہار، ۳۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

OOOOOO

○ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں۔ عدیم الفرصتی کے باعث ٹالتا رہا۔ بات دراصل یہ تھی کہ 'انور شیخ نمبر' پڑھکر خوشی بھی ہوئی اور دُکھ بھی۔ خوشی اس لئے کہ انور شیخ پر نمبر نکال کر آپ نے جس دلیری کا ثبوت دیا ہے اس کی داد دیے بنا نہیں رہ سکتا اور دُکھ اس لئے کہ اتنا ضخیم شمارہ شائع کرنے کے باوجود انور شیخ کی اصلی پرسنلٹی پر پوری طرح روشنی نہیں پڑی۔

انور صاحب کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کے لئے ضروری یہ تھا کہ ان کے مداحوں اور مخالفوں دونوں کے تاثرات حاصل کئے جائیں۔ بد قسمتی سے انور صاحب کو کچھ کفر پرستوں نے بدنام کر کے اسلام دشمن سمجھ لیا ہے۔ مگر خود وہ اور ان کی اہلیہ (مضمون انشاء میں شامل ہے) اس بدنامی کو ایک سوچی سمجھی چال سمجھتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ انور صاحب ہندوستان کے کلچر سے بہت متاثر ہوں۔ یا پھر اسلام کی کچھ روایتوں سے بغاوت کر رہے ہوں مگر اسکا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسلام دشمن ہیں۔ اس جدید دور میں نظریوں پر جتنا ہو سکے کھل کر بات کرنے سے ہی ان کا صحیح مطلب نکالا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے انور صاحب کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ ہوا اور میں نے ان کے خیالات میں ایسی کوئی نفرت یا حقارت نہیں پائی۔ ان کی دو کتابوں سوز و ساز اور آگ اور پانی کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ ان سے کئی مسائل پر بحث بھی ہوئی۔ تاہم میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے سلمان رشدی کی کتاب 'شیطانی آیات' کا مطالعہ کر کے یہ بات جان لی کہ جہاں سلمان رشدی کسی Personal Vendetta کے تحت کتاب لکھ چکے ہیں اور انہوں نے اسلام کے بانی کے متعلق ناجائز الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے حتیٰ کہ ان کی فیملی کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ انور صاحب کی کتابوں میں ایسی کوئی بات یا شدید ردِ عمل نہیں ملتا۔

خیر آپ نے جس طریقے سے یہ نمبر نکالا ہے۔ آپ ... تنازعات سے اپنے آپ کو کوسوں دور رکھا۔ اور صاف طور پر بچ نکلے ... پرستانی ہوتی

انگریزی مضمون بہت ہی عمدہ ہے۔ انور شیخ کے کیریر گراف، ہجرت اور انگلستان میں Settlement کا مشاہدہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ وہ اس سائنٹفک دور میں زیادہ تر سائنسی اصولوں پر چلنے کے خواہاں ہیں اور ہر چیز کی چھان بین کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ کبھی کبھار جذبات کی رو میں بہہ کر بہک جاتے ہیں۔ سوشل کمٹمنٹ) ... ہے ان کی غزلوں، نظموں اور افسانوں میں تنوع کا فقدان ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک ... بات کو بار بار دہرانا چاہتے ہیں۔

ان کی کہانی 'چاندی کی دلہن' مجھے خود بھی بہت پسند ہے۔ کشمیری میں ایسے لڑکے کو جس کی ناک بہتی ہو، 'کھنو موت' کہتے ہیں۔ ایسا پلاٹ ڈھونڈنا تو بہت مشکل ہے۔ ایک ٹیچر اپنے ہی اسٹوڈنٹ جس کی ناک بہتی رہتی ہو کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور پھر جب پہلی بار وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دونوں کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ یہ سب انہوں نے بخوبی اس کہانی میں بیان کیا ہے۔

دیپک بدکی، پوسٹ ماسٹر جنرل، وڈودرہ ریجن،
ڈاک بھون، پرتاپ گنج، وڈودرہ-۳۹۰۰۰۲ (گجرات)

OOOOOO

○ "انور شیخ: ادب و متنازعہ افکار" واقعی انشاء کا ایک اہم شمارہ کہلانے کا مستحق ہے۔ انشاء کے پلیٹ فارم سے آپ کی نگرانی میں وقتاً فوقتاً خصوصی شمارے منظر عام پر آتے رہے ہیں۔ اب انور شیخ جیسے بے دین کے سلسلے میں "اینٹی نمبر" شائع کر کے آپ نے ملی اور ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ اس نمبر میں جہاں انور شیخ کے خیالات و افکار یکجا کئے گئے ہیں وہیں شیخ کے افکار کے رد میں معتبر اصحاب قلم کے مدلل مضامین بھی شائع کئے گئے ہیں جس سے ایک بالغ نظر مدیر کی سنجیدگی اور مذہب سے والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ مذہب اسلام نے کفر کے خلاف آواز اٹھانے کی بات کہی ہے۔ آپ نے بھی انور شیخ جیسے لامذہب آدمی کی بکواس پر خاموشی برتنے کی بجائے دو ٹوک جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اس اعلان کے ساتھ کہ "دشمنِ اسلام کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسکی یلغار سے ملتِ اسلامیہ کی ذہنی اور فکری قوتیں سلب نہیں ہو گئی ہیں ہمارے حواس بجا ہیں اور ہم بول سکتے ہیں"۔ "انور شیخ کے متنازعہ افکار" کے عنوان سے تقریباً دس صفحات پر پھیلا ہوا آپ کا مضمون مدلل اور عالمانہ ہے۔

اقبال کے سلسلے میں انور شیخ نے عقل و عشق کے حوالے سے اقبال پر جس طرح اوچھے حملے کئے ہیں اقبال کی روح کانپ گئی ہوگی۔ بھلا ہو ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا جنہوں نے انور شیخ کی دھجیاں اڑا دیں۔

کہنے کو اس شمارے میں بہت کچھ ہے مگر مختصراً اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے یہ اینٹی نمبر شائع کر کے نہایت جرأت اور بے باکی کا ثبوت دیا ہے۔

مشتاق انجم، ہوڑہ

مشتاق انجم کا دوسرا افسانوی مجموعہ
ت ش
قیمت : ۵۰؍روپے مجلد
ملنے کا پتہ : 11/2, Hem Ghosh Lane, Shibpur
Howrah - 711102

DR. ZAKIR HUSSAIN LIBRARY PERIODICAL SECTION J.M.I., N. DELHI
225698
17-1-05

West Bengal Essential Commodities Ltd.

(A Government of West Bengal Undertaking)

11-A, Mirza Ghalib Street, Calcutta - 700 087

★ *West Bengal Essential Commodities Supply Corporation suppli best quality cement manufactured by renowned cement companie to the Government departments as well as local autonomou concerns and housing co-operative societies at rates comparatively cheaper than the market rates with an object of development of West Bengal.*

★ *Iodine added salt are supplied at low prices through rationing system to give protection against many complicated diseases occuring due to deficiency of iodine.*

★ *The purified and health canducive "Palmolein Oil" imported from abroad packed in 15 kg. tin and 1 litre poly pouch are sold at low prices through rationing system.*

★ *We are committed to accomplish the resposibility for distributior of sugar through rationing system.*

Please Contact

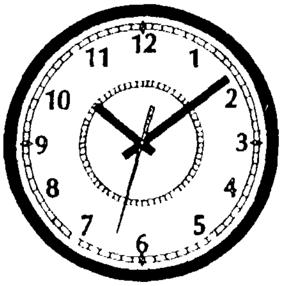
Head Office : 11-A, Mirza Ghalib Street, Cclcutta - 700 087

Branch Office : Durgapur, Midnapore, Malda, Siliguri and Chinsurah (Selling Centres)

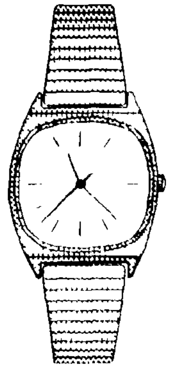
15
d No D 103 / 99
al Regn WB / CC - 550

MAHNAMA INSHA
NOV - DEC 2000 (EID NUMBER)

ISSUE 11 - 12
R N I Regd No 44083 / 86
ISSN 0971 - 6009



SHM



ایس۔ ایچ۔ ممتازالدین

مشہور ہندوستانی اور انٹرنیشنل برانڈ کی گھڑیوں اور ٹائم پیسز کے ڈائرکٹ ڈیلر

S. H. MUMTAZUDDIN

4, RADHA BAZAR STREET, CALCUTTA 700 001
PHONE
SHOW ROOM 225-4193
SERVICE CENTRE 225-3659
OFF 225-0080, 225-4624
FAX 225 0081

BRANCHES :

43N, DIAMOND HARBOUR ROAD, CALCUTTA - 700 034
PHONE 468 4899

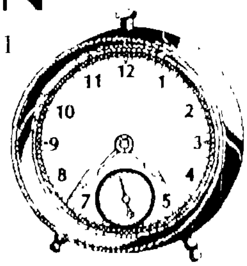
4/1, CAMAC STREET, CALCUTTA - 700 016
PHONE 282-7704-05

ANGORA

خوشنما ڈیزائنوں میں سوئس طرز کی سائنٹفک مشینوں والی

انگورہ کوارٹز گھڑیاں

ANGORA



PRINTED AT INSHA PUBLICATIONS 6-A KANAI SEAL STREET, CALCUTTA 700 073
PRINTED AND PUBLISHED BY F. S. EJAZ & PUBLISHED FROM 25 B, ZAKARIA STREET CALCUTTA 700 073